ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیان السبحان

کا

پارہ مطالب

یعتذرون

فاضل اجل حضرت مولینا سید عبد الدائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں ۱۳۵۶ ہجری سے باقساط برابر شائع ہو رہی ہے

ناظرین مولوی کے مسلسل اصرار پر کتابی صورت میں بفضلہ

بصورت پارہ

بھی چھپ رہی ہے۔ خدا کے کرم سے یہ گیارہواں پارہ

زبان عبد الحمید خان [illegible]

[illegible]

یہ پارہ تیرہ آنے ۱۳ کا ہے

اور

عبد الحمید خان کے اپنے حمیدیہ پریس دہلی میں چھپ کر شائع ہوا

ضروری گذارش

تفسیر بیان السبحان جو مولوی میں چودہ سال سے باقساط شائع ہو رہی ہے اس درجہ مقبول ہے کہ جو بھائی تفسیر شائع ہونے کے چند سال بعد خریدار مولوی ہوئے وہ گذشتہ تفسیر کے حاصل کرنے کے لئے بے قرار ہو گئے اور چونکہ علیحدہ کتابی صورت میں نہ تھی اور مولوی کے لئے خاص طور سے لکھوائی جاتی تھی اس لئے ایسے بھائیوں کے لئے گذشتہ تفسیر کی فراہمی ناممکن تھی

گو دس پارے پورے ہونے کے بعد خیال آیا کہ دس پارے ہی کتابی صورت میں شائع ہو جائیں کہ لوگ آسودگی کے ساتھ تلاوت تفسیر کر لیں لیکن جنگ کی ہولناک گرانی نے یہ مقصد پورا نہ ہونے دیا اس کے بعد دن بدن ابتری زیادہ ہوتی رہی اور ۱۹۴۷ء کے خونیں انقلاب اور مالی تباہی سے یہ تصور بھی مشکل تھا کہ تفسیر بیان السبحان کبھی کتابی صورت میں آ سکے گی۔

اب لادینی حکومت میں مسلمانوں کیلئے فرداً فرداً قرآن و اسلام کی حفاظت فرض عین ہو گئی اور مولوی نے اس کام کو جدید انداز میں شروع کیا تو صدہا مخلص ناظرین مولوی نے مشورہ دیا کہ تفسیر بیان السبحان معلومات قرآنی کے سلسلہ میں سب سے بہتر تفسیر ہے اور آج سب سے زیادہ مسلمانوں کو قرآن کے نزدیک لانے کی ضرورت ہے اس لئے شائع شدہ تفسیر کا کتابی صورت میں اشد ضروری ہے۔

اپنی سی حالت سب کی جانتا ہوں جب مجھ میں تفسیر کے پانچ پارے یکجا چھاپ لینے کی سکت نہیں تو میرے بھائیوں میں اس کے خریدنے کی قدرت بھی مجھ سے کم ہو گی لہذا یہ طے ہوا کہ پارہ پارہ شائع ہو ایک پارہ جب ہدیہ ہو جائے تو اس کی قیمت سے دوسرا پارہ چھاپ لیا جائے کاغذ کی خصوصاً اور دوسری گرانیوں کی پیش نظر پانچ صفحوں پر ایک پیسہ لاگت آتی ہے اسلئے یہ پارہ کا ہدیہ ایک پیسہ کے چار صفحات ہو گا باقی نفع میں جلدیں جائے گی۔

یہ پارہ (۲۰۸) صفحہ کا ہے اس لئے اسکا ہدیہ تیرہ آنہ مجلد ہے اس سے آگے چھپوانا آپ کے اختیار میں ہے جلدی یہ پارہ سب بھائی خرید لیں۔

دعا گو عبد الحمید

گیارھواں پارہ (۱۱)

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ

مسلمانو جب تم اُن کے پاس لوٹکر جاؤ گے تو وہ عذر پیش کرینگے

قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ

(اے نبی) تم کہدینا تم بہانے نہ کرو ہم تمہارا یقین نہیں کرینگے ہم کو تمہاری خبریں

مِنْ اَخْبَارِكُمْ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ

اللہ نے بتادی ہیں اللہ اور رسول تمہارے کام ابھی

رَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ

دیکھیگا پھر تم کو لوٹ کر اس کے پاس جانا پڑے گا جو باطن و ظاہر کا

الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

جاننے والا ہے اُس وقت وہ تم کو بتادے گا کہ تم کیا کرتے تھے

سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ

اب وہ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھا جائینگے جبکہ تم اُن کے پاس لوٹ کر جاؤ گے

لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ؕ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۫

تاکہ تم اُن سے درگذر کرو لہٰذا تم اُن سے درگذر کرو واقعی وہ گندے ہیں

وَمَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءً ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○

اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے یہ اُس کی جزا ہے جو وہ کرتے تھے

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ

وہ تمہارے سامنے قسمیں کھائینگے تاکہ تم اُن سے راضی ہو جاؤ سو اگر تم اُن سے راضی بھی

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ○

ہو جاؤ تب بھی اللہ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں ہوتا

تفسیر یہ ایک بلند آہنگ پیشین گوئی ہے جو حرف بحرف پوری ہوئی تبوک سے واپس ہونے کے وقت راستہ ہی میں رسول اللہ صلعم کو اُن تمام واقعات سے مطلع فرما دیا جو مدینہ میں کے بعد اہل نفاق کی طرف سے لطور معذرت پیش آنیوالے تھے حاصل ارشاد یہ ہے کہ جب تم لوگ تبوک سے لوٹ کر مدینہ پہونچوگے تو منافق قسمیں کھا کر تم کو راضی اور خوش کرنے کے لئے اپنی غیر حاضری کی حیلہ تراشی اور بہانہ سازی کرینگے تاکہ تم اُن کی گرفت نہ کرو اور چشم پوشی کر کے درگذر کرو سو تم ان کی گرفت نہ کرنا درگذر کر لینا مگر اُن سے صاف طور پر کہہ دینا کہ اب تم ہمارے سامنے کوئی عذر پیش نہ کرو تمہاری ہر قسم کی معذرت بیکار ہے ۔ ہم تمہاری کسی قسم کی معذرت کا یقین نہیں کرینگے اللہ نے ہم کو تمہاری تمام خبریں بتادی ہیں آیندہ اللہ اور اُس کا رسول تمہاری حالت اور کرتوت کو دیکھیگا ۔ اس کے بعد تم کو اللہ کے سامنے جانا ہوگا جو ظاہر و باطن سے واقف ہے وہاں سب قلعی کھل جائیگی ۔ آیات کے آخری فقرہ میں مسلمانوں کو تنبیہ کیگئی ہے کہ اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تب بھی خدا ان سے راضی نہ ہوگا یعنی اگر ان کی وجاہت ، پُر زور قسمیں ، آپس کے تعلقات ، آیندہ کے لئے عہد و پیمان ، ظاہری خلوص اور معاملات اسلامی سے پُر فریب دلچسپی تمہاری رضامندی

کا موجب بن بھی جائیں تب بھی یہ چیزیں خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتیں وہ کسی طرح ان سے راضی نہیں ہو سکتا۔ ان کی روحیں، عقائد، اعمال، اقوال، افکار و خیالات سب ناپاک ہو چکے ہیں۔ گویا یہ مجسم ناپاکی ہیں جن کے پاک ہونے کی امید ہی نہیں۔ لہذا تم ان سے قطع تعلق کر لو۔ کوئی سروکار نہ رکھو۔

مقصود بیان :- آیندہ واقعات کے متعلق پر زور صراحت اور مسلمانوں کو منافقوں سے محترز رہنے کی ہدایت، اس بات کا حکم کہ قطعی منافق کی حیلہ سازی سے کبھی مسلمان کو دھوکہ نہ کھانا چاہئے اور اس کی باتوں کا ہرگز یقین نہ کرنا چاہئے اللہ تعالیٰ عالم کل ہے اس سے ظاہر و باطن کوئی چیز مخفی نہیں۔ منافقوں کی قسمیں ناقابل اعتبار ہیں اسلام اور شریعت طہارت ہے کفر و بداعمالی گندگی ہے۔ منافق مجسم پلیدی ہیں۔ مسلمان چونکہ پاک ہے اس لئے اس کا ناپاک سے کچھ تعلق نہیں۔ منافقوں کی حماقت کی صراحت کہ یہ عجب بیوقوف ہیں مسلمانوں کو راضی کرنا چاہتے ہیں باوجودیکہ خدا کو ناراض رکھتے ہیں۔ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر منافق اپنی ظاہری پُرفریب حالت دکھا کر کسی مسلمان کو دھوکہ دے بھی دیں تب بھی اللہ کو فریب نہیں دے سکتے۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ

رو گنوار کفر و نفاق میں بہت سخت ہیں　　اور اسی قابل ہیں

اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى

کہ ان احکام سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر　　نازل

رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَمِنَ الْاَعْرَابِ

کئے ہیں　　اور اللہ جاننے والا صاحب تدبیر ہے بعض گنوار ایسے بھی ہیں

مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ

جو راہِ خدا میں خرچ کرنے کو تاوان سمجھتے ہیں اور تم پر حوادث آنے کے

الدَّوَآئِرَ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَاللّٰهُ

منتظر رہتے ہیں اُنہی پر گردش بد پڑے اور اللہ

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ

سننے والا جاننے والا ہے اور بعض بادیہ نشین ایسے بھی ہیں جو اللہ

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ

اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسکو قربت الٰہی

عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَآ اِنَّهَا

اور رسول کی دعاؤں کا ذریعہ بناتے ہیں سن لو واقعی وہ

قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ

ان کے لئے قربت کا ذریعہ ہے عنقریب اُن کو اللہ اپنی رحمت میں داخل کریگا

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ع

بلاشبہ اللہ غفور رحیم ہے

تفسیر اوپر کی آیات میں عموماً اہل نفاق کا بیان تھا شہری اور دیہاتی کی کوئی تفصیل نہ تھی۔ ان آیات میں خصوصیت کے ساتھ دیہاتیوں کا ذکر فرماتا

ہے۔ عام قاعدہ ہے کہ آدمی جسقدر جاہل ہوگا جسقدر بے علم ہوگا جسقدر علماء اور عقلاء کی صحبت سے دور رہیگا اتنا ہی گنوار اور شدید الخلق ہوگا اس کی عقل پر جہالت کا زنگ چڑھا ہوگا۔ دماغ پر نادانی اور کفر کے پردے پڑے ہونگے اور دل پر گمراہی کی مہر ثبت ہوگی۔ دیہاتی عموماً دانشمندوں اور عقلمندوں سے میل جول کم رکھتے ہیں دانا اور بینا لوگوں کی صحبت ان کو میسر نہیں ہوتی اسلئے عام طور پر گمراہ اور سیاہ دل ہوتے ہیں۔ ہاں بعض دیہاتی سمجھدار بھی ہوتے ہیں اہل علم کی صحبت سے مستفیض اور دانشمندوں کے اقوال و افعال سے خوشہ چین ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اگرچہ جاہل طبقہ کے ساتھ رہتے ہیں مگر ان میں دانش و بینش کا مادہ تیار ہوتا ہے کسی صاحب نظر کی ادنیٰ التفات کی ضرورت ہوتی ہے اور اکسیر کے ملنے سے ان کی خاک بھی اکسیر بن جاتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کا بیان آیت مذکورہ میں کیا گیا ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ :- قوانین الٰہی اور سنت رسول اللہ صلعم سے بے بہرہ رہنے اور کفر و نفاق میں شدید ہونے کے سزاوار یہ دیہاتی عموماً ہوتے ہیں دیہاتیوں میں سے بعض لوگ مثلاً اسد، غطفان اور تمیم کے قبائل کے اکثر افراد سخت منافق ہیں اگرچہ بظاہر مسلمانوں سے ملے ہوئے ہیں، احکام اسلامی کی ظاہری تعمیل بھی کرتے ہیں زکوٰۃ اور صدقات بھی دیتے ہیں مگر یہ سب ظاہری ہوتا ہے صداقت اسلام ان کے دلوں میں راسخ نہیں ہوتی، جو کچھ راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں تاوان اور ڈانڈ سمجھ کر خرچ کرتے ہیں اور ہر وقت منتظر رہتے ہیں کہ مسلمان کسی گردش میں پھنس جائیں مگر ان کی امید پوری نہ ہوگی بلکہ بربادی اور بُرائی کے چکر میں یہ خود ہی پھنسینگے۔ ہاں کچھ دیہاتی پکے خالص مومن بھی ہیں مبداء و معاد پر ان کا ایمان ہے جو کچھ کار خیر میں صرف کرتے ہیں اسکو قرب الٰہی اور دعائے رسول اللہ کے حصول کا ذریعہ قرار دیتے ہیں یعنی محض اسلئے دیتے ہیں کہ قرب الٰہی حاصل ہو اور رسول اللہ صلعم کی دعائیں ان کو نصیب ہوں تو واقعی ان کے یہ صدقات قرب الٰہی کا

ذریعہ بنینگے اُن کو اللہ اپنی رحمت میں داخل فرمائیگا اور غلطیاں معاف کردیگا۔

حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیٰ کہتے ہیں میرے باپ اپنی قوم کے صدقات کا مال لائے اور عرض کیا یارسول اللہ حضور میرے لئے دعا فرمائیں۔ حضور نے دعا کی اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی اٰلِ اَبِیْ اَوْفٰی

مقصود بیان :۔ جہالت سے گریز کرنے کی طرف، اہل علم اور ارباب ہدایت کے ساتھ رہنے کی طرف ضمنی اشارہ، مسلمانوں کی بدخواہی سے ممانعت اور اس امر پر ضمنی تنبیہ کہ مسلمانوں کی بدخواہی کرنی نفاق ہے۔ یہ سب منافقوں کا کام ہے۔ کار خیر میں بخلوص خاطر صرف کرنے کی مدح اور تاوان کے طور پر صرف کرنے کی مذمت اور اس امر کی طرف تلمیح کہ مؤمن کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ قرب الٰہی حاصل ہو۔ قرب الٰہی کے حصول میں بڑی سے بڑی قربانی کرنی لازم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا مؤمن کے لئے باعث نجات اور وسیلۂ فلاح دارین ہے۔

آیت سے اعمال حسنہ اور دعائے رسول صلعم کا وسیلہ ہونا بھی وضوح ثابت ہوتا ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ

اور پہلے پہل سبقت کرنے والے مہاجرین و

الْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ

انصار اور وہ لوگ جنہوں نے اخلاص کے ساتھ انکی پیروی کی

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ

اُن سے اللہ راضی اور وہ اللہ سے راضی اللہ نے اُنکے لئے

جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ

گھنے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے اندر نہریں بہتی ہیں جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ

اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝

رہینگے یہی بڑی کامیابی ہے

تفسیر اس آیت کا مطلب دو طرح بیان کیا گیا ہے ہم دونوں مطلب ذیل میں بیان کرتے ہیں۔ بنائے اختلاف یہ ہے کہ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَ الْاَنْصَارِ میں لفظ مِنْ کا کیا مفہوم ہے؟ سعید بن مسیب وغیرہ کے نزدیک مِنْ تبعیض کے لئے ہے یعنی مہاجرین و انصار میں سے وہ بعض صحابی جو سابقین اولین تھے۔ محمد بن کعب وغیرہ کے نزدیک مِنْ بیانیہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ سابقین اولین یعنی کل صحابہ مہاجرین و انصار۔

پہلی تقدیر پر حاصل ارشاد یہ ہوگا کہ مہاجرین و انصار میں سے وہ لوگ جن کو سبقت و اولیت کا درجہ حاصل ہے اور ان کے علاوہ وہ لوگ جنھوں نے قول و عمل میں سابقین اولین کی پیروی کی خواہ یہ پیروی کرنے والے صحابی ہوں یا تابعی یا قیامت تک آنے والے مسلمان۔ ان سب لوگوں سے خدا خوش ہوگا اور وہ خدا سے خوش ہوں گے۔

دوسری تقدیر پر حاصل ارشاد اس طرح ہوگا کہ سابقین اولین یعنی کل مہاجرین و انصار اور ان کے بعد آنے والے وہ مسلمان جنہوں نے انکی پیروی کی یہ سب لوگ مغفور رہیں خدا ان سے خوش وہ خدا سے خوش۔

دونوں مطلبوں کا نتیجۂ اختلاف یہ ہوگا کہ پہلی تقدیر پر تو سابقین اولین میں صحابہ کا ایک خاص گروہ داخل ہوگا عام صحابی اس گروہ میں داخل نہ ہونگے بلکہ وہ صحابی جنہوں نے قول و عمل میں سابقین اولین کی پیروی کی اور دوسرے صحابہ

کے بعد قیامت تک آنے والے مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو سابقین اولین کے پیرو رہے یہ سب متبعین کا گروہ کہلائیگا اور امامت کا درجہ صرف اُس گروہ کے صحابہ کو حاصل ہوگا جسکو سبقت و اولیت کا درجہ حاصل تھا۔ دوسری تقدیر پر عام صحابہ کو سابقین اولین کا اعزاز حاصل ہوگا اور سب امامت کے مرتبہ پر فائز ہوں گے اور دور صحابہ کے بعد آنے والے اشخاص کو اتباع کے دائرہ میں داخل کیا جائیگا اگرچہ بقول ملا علی قاری بالاجماع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے والا مومن جسکو صحابی کہا جاتا ہے غوث قطب سے جس نے رسول اللہ صلعم کو نہ دیکھا ہوا فضل ہے لیکن اگر سابقین اولین سے صحابہ کا خاص گروہ مراد لیا جائے تو اُس گروہ کی تعیین کرنی لازم ہے۔ سابقین اولین کے دو حصّے تھے مہاجرین اور انصار۔ عطاء بن یسار وغیرہ کے نزدیک ہر دو گروہوں میں سے جو لوگ جنگ بدر میں شریک تھے وہ ہی سابقین اوّلین تھے یعنی تیرہ سو تیرہ نفوس۔ سعید و قتادہ و ابن سیرین کہتے ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کی طرف نماز پڑھی وہ سابق کہلائے گویا ہجرت کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد تک والے صحابہ سابقین اوّلین تھے۔ یہ قول اول کے قریب ہے کیونکہ جنگ بدر بھی ہجرت کے دوسرے سال واقع ہوئی۔ شعبی کے نزدیک بیعت رضوان والے یعنی ۶ھ میں جب صلح حدیبیہ ہوئی تو اُس وقت تک کے تمام صحابہ سابقین اوّلین کا حکم رکھتے ہیں۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ انصار میں سے سات آدمی عقبۂ اولیٰ والے اور ستّر آدمی عقبۂ ثانیہ والے اور مہاجرین میں سے وہ لوگ جنہوں نے ہجرت اولیٰ بھی کی تھی۔ واللہ اعلم۔ بہرحال آیت میں صراحت ہے کہ سابقین اولین کا اتباع لازم ہے۔ سابقین اور انکے متبعین سے خدا راضی ہو چکا۔

حدیث میں وارد ہے کہ میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں جسکے پیچھے جاؤ گے راہ ہدایت مل جائیگی۔ ایک اور صحیح حدیث میں آیا ہے کہ یہ آیت میری تمام امت کے واسطے ہے اور رضامندی کے بعد پھر ناراضی نہیں۔

مقصود بیان :- اس بات کی صراحت کہ سابقین اولین اہل ہجرت میں سے بھی

تھے اور انصار میں سے بھی۔ صحابۂ کرام کی فضیلت کا اظہار اور اس امر کی ترغیب کہ قول و عمل میں صحابہ کی پیروی کرنی چاہیئے۔
اس بات کی نقل کہ صحابہ کے طریقہ پر چلنے والا بھی دوامی جنتی ہے اور اللہ اُس سے ہمیشہ کے لیئے راضی رہیگا۔ گویا صحابہ شمعِ ہدایت ہیں جو اُن کی روشنی میں چلیگا وہ منزل مقصود پر پہنچ جائیگا۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ ۖ

اور تمہارے گرد و نواح کے بعض گنوار منافق ہیں

وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ ۖ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ

اور بعض اہل مدینہ بھی (منافق ہیں) یہ نفاق پر اڑ رہے ہیں

لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ

تم ان سے واقف نہیں ہو ہم اُن کو جانتے ہیں ہم اُن کو دوہری سزا دینگے

ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ

بالآخر بڑے عذاب کی طرف اُن کو لوٹا دیا جائے گا

تفسیر یہ آیت بھی منافقوں کی حالت بیان کرنے اور اُن کے افراد کی فی الجملہ تعیین کرنے کے لیئے نازل ہوئی۔ قبائل اسلم، اشجع اور غفار مدینہ کے باہر آ کر مقیم ہو گئے تھے اُن میں سے بعض آدمی منافق تھے اسی طرح مدینہ کے اندر بھی بہتیرے آدمی بظاہر مسلم اور دل میں کافر تھے۔ ان سب کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی رسول پاکؐ کو منافقوں کے حالات اور علامات تو معلوم تھے لیکن بعض کو تعیین کے ساتھ آپ نہیں جانتے تھے۔ ایک مرتبہ حضورؐ نے جبیر بن مطعمؓ کے کان میں چپکے سے فرمایا تھا میرے

ساتھیوں میں بعض منافق ہیں لیکن حضورؐ نے اُن کا پردہ فاش نہ کیا بلکہ حضرت حذیفہ کو بھی اُن کے ہمراہی منافقین کا پردہ فاش کرنے سے منع فرمایا تھا لیکن کبھی حضورؐ نے نام بنام پکار کر منافقوں کو اپنی مجلس سے نکلوا دیا تھا اور اُن کو برسر عام رسوا کیا تھا۔ چنانچہ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ایک بار جمعہ کے روز حضورؐ تقریر کرتے کھڑے ہوئے اور فرمایا او فلاں تو منافق ہے نکل جا اے فلاں تو بھی نکل جا تو بھی منافق ہے۔ اسی طرح چھتیس ۳۶ اشخاص کو نکلوا دیا۔ حضرت عمرؓ مسجد سے فاصلہ پر رہتے تھے جس وقت یہ منافق نکل کر جا رہے تھے تو حضرت عمرؓ راستے میں آتے ہوئے ملے اور خیال کیا شاید نماز ہو گئی۔ شرم کے مارے اُن لوگوں سے چھپنے لگے اُدھر منافقوں کو بھی اپنی مزید رسوائی کی شرم تھی اس لئے وہ بھی حضرت عمرؓ سے چھپنے لگے جب حضرت عمرؓ مسجد میں پہنچے تو ایک صحابی نے مطلع کیا کہ حضورؐ نے ان کو مسجد سے نکال دیا ہے (اسنادہ جید وفی مسند احمد عن ابن مسعود مثل ذلک)

ابن عباسؓ کے قول پر دو مرتبہ عذاب دینے سے مراد ایک مرتبہ دنیا میں رسوائی اور دوبارہ عذاب قبر دینا ہے۔ اور عذاب عظیم سے مراد دوزخ کا عذاب ہے۔ قتادہ کہتے ہیں عذاب دنیا اور عذاب قبر مراد ہے۔ واللہ اعلم۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ مدینہ کے اندر اور باہر کچھ لوگ منافق موجود ہیں جن کو تعیین شخصی کے ساتھ تم نہیں جانتے وہ نفاق پر اڑے ہوئے ہیں عنقریب ان کو دو عذاب دیئے جائیں گے اور پھر آخرت میں تو سب سے بڑا عذاب ہوگا ہی۔

مقصود بیان :- رسول پاکؐ کا بعض منافقوں سے بالتعیین واقف ہونا اور اکثر سے ناواقفیت۔ منافقوں کو دوبار عذاب دینے کی پیشینگوئی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفاق کا درجہ کفر سے بھی بڑا ہے۔ نفاق سے بچنے کی تعلیم۔ وغیرہ۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا

اور کچھ لوگ اور ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کر لیا ہے ایک نیک کام کو

صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ

دوسرے بُرے کام کے ساتھ ملا لیا　امید ہے کہ اللہ اُن کی توبہ قبول

عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

فرما لے　کیونکہ اللہ غفور رحیم ہے

تفسیر جنگ تبوک کو نہ جانے والے لوگوں کے حق میں جب گذشتہ آیات سے وعید نازل ہوئیں تو حضرت ابولبابہ وغیرہ مخلص مؤمنوں نے اعتراف قصور کیا اور نادم ہوکر مسجد کے ستونوں سے اپنے آپ کو بندھوا دیا اور کھانا پینے کا عہد کر لیا اور قسم کھائی کہ ہم نہ کھلینگے جب تک ہماری توبہ قبول نہ ہوگی اور حضور والا خود اپنے ہاتھ سے نہ کھولینگے ورنہ یونہی مرجائینگے بغیر قبول توبہ کے ہم زندہ رہنا نہیں چاہتے چنانچہ یہ آیت قبول توبہ کے متعلق نازل ہوئی اور حضورؐ نے خود دست مبارک سے اُن کو کھولا (رواہ ابن عباس رضؓ)

مفسرین کے نزدیک آیت کا مورد اگرچہ خاص ہے مگر حکم عام ہے۔ ابو عثمان کہتے ہیں میرے نزدیک قرآن میں یہ آیت مؤمنوں کے لئے کمال امید گاہ ہے (رواہ الطبرانی)

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جن لوگوں نے اپنے قصور کا اعتراف کیا اور گناہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اُن کے اعمال اچھے بُرے دونوں طرح کے ہیں تو اُنکی توبہ قبول ہونے کی امید ہے۔

مقصود بیان : مؤمن گناہگاروں کو توبہ کرنے کی ترغیب۔ اس بات کا تشریح کہ خالی اعتراف گناہ سے توبہ متحقق نہیں ہوتی جب تک یہ عزم قوی نہ ہو کہ آئندہ ایسی حرکت نہ ہوگی اگرچہ سرزد ہو جاوے۔ آیت سے کرامیہ وغیرہ کا رد بھی ہوتا ہے جن کا قول ہے کہ گناہ کرنے سے آدمی مؤمن نہیں رہتا۔ وغیرہ۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ

ان کو پاک صاف بنانے کیلئے ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ وصول کرو اور

تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ط اِنَّ صَلٰوتَكَ

ان کو دعا دو تمہاری دعا ان کے لئے

سَكَنٌ لَّهُمْ ط وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا

باعث تسکین ہے اور اللہ خوب سنتا جانتا ہے کیا اُن کو نہیں معلوم ہو چکا

اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَ

کہ اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور

يَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○

اُن کی زکوٰتیں لیتا ہے اور اللہ ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے

تفسیر جنگ تبوک میں شریک نہ ہونے والے مخلص مومنوں کی توبہ جب قبول ہوگئی تو انہوں نے اپنا کُل مال بطور صدقہ خدمت گرامی میں پیش کیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! اسی مال نے ہم کو گناہ میں ڈالا اس کو قبول فرما لیجئے۔ اُس وقت آیت مذکورہ کا نزول ہوا اور حضورؐ نے اُن کا تہائی مال بطور اجتہاد یا بمفہوم آیت قبول فرما کر فقرا اور اصحاب احتیاج کو تقسیم فرما دیا۔ آیت کا نزول اگرچہ خاص اشخاص کے متعلق ہے مگر حکم عام ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جن لوگوں کے اعمال مخلوط ہوں کچھ اچھے ہوں اور کچھ بُرے اور وہ توبہ کرنے کے بعد بطور کفارہ مال پیش کریں تو اُن کے مال میں سے کچھ حصہ بطور

صدقہ لے لو تاکہ عموماً گناہوں سے بطفیل صدقہ اُن کی روحیں پاک صاف ہو جائیں اور اُن کے لئے استغفار و دعائے رحمت بھی کرو کیونکہ تمہاری دعا اُن کے لئے سکونِ خاطر کا باعث اور سبب نزول رحمت ہے۔ حضرت حذیفہ رض کی روایت ہے کہ حضور نے جسکے لئے دعائے رحمت کی اُس پر اُسکی اولاد پر اور اسکی اولاد کی اولاد پر نزول رحمت ضرور ہوا یعنی تین پشت تک رسول اللہ صلعم کی دعا کا اثر رہا (رواہ احمد) ایک عورت نے عرض کیا حضور صلعم میرے اور میرے شوہر کے لئے دعا فرمائیے۔ حضور نے فرمایا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْكِ وَعَلٰى زَوْجِكِ۔ ابو اوفیٰ نے جب اپنی قوم کی طرف سے مال صدقہ پیش کیا تو حضور صلعم نے دعا دی اور فرمایا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰٓى اٰلِ اَبِيْ اَوْفٰى (رواہ البخاری و مسلم)

اس سے آگے ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور اُن کے صدقات کو مقبول فرماتا یعنی اُن کو صدقات کا کامل ثواب عطا فرماتا اور گناہوں کو دور کر دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ توبہ کرنے والے چونکہ منافق نہیں اسلئے اُن کی توبہ بھی قبول ہے اور امداد مسلمین کیلئے وہ جو مال پیش کریں وہ قابل منظور ہے البتہ منافقوں کا مال قابل قبول نہیں جسطرح اوپر کی آیت میں اسی صورت میں بیان کیا گیا۔

مقصود بیان :- گناہوں سے توبہ کرنا چاہیئے۔ بطور کفارہ کچھ مال بھی مسلمانوں کی امداد کے لئے دینا چاہیئے۔ یہ مومن کی علامت ہے۔ صدقہ دینے سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ روح پاک اور دل گناہوں کی کدورت سے صاف ہوتا ہے۔ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام قربانی کا خواستگار ہے جان کی قربانی ہو یا مال کی مخلص مومن کیلئے قربانی لازم ہے۔ توبہ اور قربانی علامت ایمان ہے۔ اگر جان کی قربانی کا موقعہ نہ ہو تو کم از کم مال کی قربانی ہی کرنی چاہیئے۔ مِنْ اَمْوَالِهِمْ میں مِنْ کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ اسلام کے احکام انسان کی زندگی کو تباہ کرنے والے اور آدمی کو محتاج قلاش کر دینے والے نہیں۔ وصول صدقات میں بھی کچھ مال لینا چاہیئے کل مال نہ لینا چاہیئے اگرچہ دینے والا بطیب خاطر دے۔ الا ظفر دیتا ہو

ایماء ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر دعا مسلمانوں کے حق میں مستجاب ہے
کوئی دعا مردود نہیں ضمنی طور پر اس امر پر دلالت ہے کہ مسلمانوں کو رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے۔ حضور کی دعا
فلاح دارین کا وسیلہ ہے۔ وغیرہ۔

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ

کہدو کہ عمل کئے جاؤ پھر آگے تمہارے اعمال کو اللہ اور اس کا رسول

وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ

اور مسلمان دیکھینگے اور عنقریب تم کو لوٹ کر اس کے پاس جانا ہوگا جو باطن

وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

و ظاہر کو جانتا ہے وہی تم کو جتا دیگا جو کچھ تم کر رہے تھے

تفسیر مجاہد کے نزدیک یہ کلام تہدید و وعید کے طور پر ہے اس صورت میں روئے سخن اُن پہلے منافقوں کی طرف ہوگا جو تبوک میں شریک نہ ہو سکے تھے اور جھوٹے عذر پیش کر دیئے تھے اور توبہ نہ کی تھی اور ان کے نفاق کی صراحت خدا تعالیٰ نے مختلف آیات میں کر دی۔ گویا اول اہل نفاق کا بیان تھا بیچ میں توبہ شعار مومنین کا بیان ہوا۔ پھر اول گروہ کی طرف روئے بیان کر دیا گیا۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ کلام کا رُخ عام متخلفین کی طرف پھیرا جائے خواہ وہ منافق ہوں یا توبہ کر لینے والے مسلمان۔ اس صورت میں کلام میں صرف تہدید نہ ہوگی بلکہ ترہیب کے ساتھ ترغیب بھی ہوگی۔ منافقوں کے حق میں دھمکی ہوگی اور توبہ کرنے والے مومنوں کے حق میں بشارت و ترغیب۔

آیت کا مطلب ظاہر ہے کہ اے وہ لوگو جو جہاد تبوک میں بلا عذر شرعی کے شریک

نہ ہوئے اور پھر آکر معذرت کی۔ بہرحال تم سب اپنی جگہ پر عمل کئے جاؤ تمہارے
آئندہ اعمال کو اللہ بھی دیکھ لیگا اور اس کا رسول بھی اور رسول اللہ صلعم کے ساتھی
مؤمن بھی۔ خود ظاہر ہو جائیگا کہ تم اپنے عذر میں سچے ہو یا جھوٹے۔ پھر مرنے کے بعد
تم سب کو اللہ کے سامنے جانا ہے وہ ظاہر و باطن اور چھپے کھلے کو جانتا ہے اسلئے
جو کچھ تم دنیا میں کرتے ہو اُس کی سزا جزا تم کو وہ دیگا۔

اللہ کا علم تین طرح کا ہے۔ ایک وہ جو محض ذات الٰہی کے ساتھ مخصوص ہے کسی
نبی یا ولی کو اُس سے واقفیت نہیں۔ ظاہر و باطن کو بطریق اکمل جاننا، حقیقت و کنہ
سے واقف ہونا، کل عالم کا علم ازلی قدیم میں استحضار، یہ سب خصوصیت باری
تعالیٰ کی ہے۔ دوسرا علم وہ ہے جس سے واقفیت بعض یا کل انبیاء کو بھی ہے
اللہ نے انبیاء کو وہ نور عطا فرمایا جس سے اُن کے دل پاکیزہ اور منور ہو گئے
اور وہ بعض اعمال خلائق سے بعیان و بیان واقف ہو گئے۔ اس میں ہر قسم کی وحی اور
الہام انبیاء داخل ہے۔ تیسرا علم وہ ہے جس سے انبیاء کے علاوہ اولیاء بھی واقف
ہیں۔ جس طرح انبیاء اللہ کے نور ذات سے بعض اشیاء کا علم رکھتے ہیں اسی طرح اولیاء
اور خاص خاص مؤمن نور صفات سے اشیاء کو دیکھتے ہیں۔ یہی کشف اولیاء ہے
اسی تیسرے قسم کے علم کو آیت میں بیان کیا ہے کہ منافقوں کے اعمال کو دیکھ کر
اُن کی اندرونی حالت کو جانچنا اور ایمان و عدم ایمان کو معلوم کرنا اللہ کا کام بھی
ہے اور رسول اللہ صلعم کا بھی۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ مؤمن کی فراست سے
بچو۔ اسی نور ذات کو آیت اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ میں توسم
سے تعبیر کیا گیا ہے۔ رہی پہلی قسم تو اُس کے سَتُرَدُّوْنَ الخ میں اشارہ کر دیا
گیا کہ تمہارے اندرونی و بیرونی اعمال عقائد اور نیتیں اور ارادے اللہ سے
تو مخفی ہو ہی نہیں سکتے وہ ظاہر و باطن کا عالم ہے اور سزا جزا اسی پر مرتب ہوگی
مگر تمہاری ظاہری حسنات اور بیرونی اعمال کو دیکھ کر رسول اللہ صلعم اور مؤمن بھی
تمہارے اندرون کا پتہ لگا لینگے۔

مقصود بیان:- ترغیب وترہیب - رسول اللہ ؐ اور خاص مؤمنوں کے مخصوص علم کی صراحت اور اپنے خاص فیضان کی طرف اشارہ - اس امر کی نفس کہ اللہ سے کوئی چیز (باعتبار علم ازلی قدیم کے) مخفی نہیں اس لئے کوئی شخص اس سے کوئی کام چھپا نہیں سکتا - سزا جزا کا ترتب اعمال پر ہوگا اور اعمال سے واقفیت اللہ کو ہے تو گویا اللہ کی واقفیت کی بموجب سزا جزا ہوگی اور چونکہ اللہ کی واقفیت میں غلطی ہونا ناممکن ہے لہذا جزا سزا میں غلطی ہونا بھی ناممکن ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ

اور کچھ لوگ اور بھی ہیں جن کا معاملہ اللہ کے حکم پر ملتوی ہے خواہ اُن کو سزا دے یا

اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

اُن پر توجہ فرمائے اور اللہ دانا صاحب تدبیر ہے

تفسیر جو لوگ جنگ تبوک پر نہ گئے تھے اُن کے تین گروہ تھے - اول گروہ منافقین دویم وہ خالص مؤمن جو بغیر کسی نفاق کے محض آسائش اور آرام طلبی کی وجہ سے شریک نہ ہوئے اور خدمت گرامی میں حاضر ہو کر کچھ وہ عذرات معمولی کر کے سچے دل سے توبہ کر لی - سویم وہ لوگ جنہوں نے سچے دل سے توبہ کر لی مگر زبان سے معذرت کا کوئی لفظ نہ نکالا - منافقوں کا حکم شروع سورت میں بیان ہوتا چلا آیا - اس کے بعد متصل آیات میں اُن توبہ کرنے والے مسلمانوں کا جنہوں نے ندامت کے ساتھ اعتراف قصور کیا حکم مذکور ہو گیا - ایسے لوگوں میں حضرت ابولبابہ بھی داخل تھے تیسرے نمبر پر صرف تین آدمی رہ گئے - مرارہ بن ربیع - ہلال بن امیہ - کعب بن مالک - انہوں نے توبہ تو سچے دل سے کر لی مگر زبان سے کوئی لفظ نہ نکالا - بقول ابن عباسؓ ومجاہد وضحاک وعکرمہ وغیرہ آیت کا نزول انہی کے حق میں ہوا - حاصل ارشاد یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے معاملہ میں تاخیر کر دی گئی ہے

نہ تو ابھی اُن کی توبہ قبول ہونے کی صراحت کی گئی ہے نہ عذاب دینے کی۔ اللہ کو اختیار ہے کہ اُن کو اُن کے کیئے کی سزا دے یا اُن کی توبہ قبول فرمائے۔ اس آیت کے حکم کی تعمیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے معاملہ کو معلق چھوڑ دیا۔ گروہ اہل اسلام کو اُن سے سلام کرنے کی ممانعت کر دی۔ بیویوں کو کچھ دنوں کے لیئے جدا ہو جانے کا حکم دیدیا۔ ان تینوں کی توبہ قبول ہونے کی صراحت آئندہ آیت وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا الخ میں آئیگی۔

مقصود بیان :- اس امر کی صراحت کہ توبہ کو (باوجودیکہ خالص دل سے ہو) قبول کرنے نہ کرنے کا اللہ کو اختیار ہے اگرچہ رحمت الٰہی غضب الٰہی پر غالب ہے اور امید ہے کہ توبہ کرنیوالوں کی توبہ قبول ہوگی مگر اللہ پر واجب نہیں کہ اُنکی توبہ ضرور قبول کرے اس بات کی ضمنی صراحت کہ اُن تینوں آدمیوں نے سچے دل سے توبہ کی تھی۔ کیونکہ اگر اوپرے دل سے کی ہوتی تو عدم قبول توبہ کی صراحت تعیین کے ساتھ کر دی جاتی معاملہ کو معلق نہ چھوڑا جاتا۔ وغیرہ

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّ

جن لوگوں نے تکلیف پہنچانے کفر کرنے

تَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ

مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے اور اُن لوگوں کے گھات لگانے کے لیئے

حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ

ایک مسجد بنا کر کھڑی کر دی ہے جو پہلے سے خدا اور اُسکے رسول سے لڑ رہے ہیں اور البتہ

اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ

قسمیں کھائیں گے کہ سوائے بھلائی کے ہمارا کچھ مقصود نہ تھا خدا گواہ ہے

إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا ۚ لَّمَسْجِدٌ

کہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں　تم اس مسجد میں ہرگز نہ کھڑے ہوا البتہ جس مسجد کی

أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ

بنیاد اول دن سے پرہیزگاری پر رکھی گئی ہے وہ تمہارے نماز پڑھنے کے

أَن تَقُومَ فِيهِ ۚ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن

زیادہ لائق ہے　اس میں ایسے لوگ ہیں جو خوب پاک رہنے کو

يَتَطَهَّرُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ ۝

پسند کرتے ہیں　اور اللہ بھی خوب پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے

تفسیر

ابن کثیر وغیرہ نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں تشریف فرما ہونے سے پہلے خاندان خزرج میں ابو عامر نام کا ایک شخص تھا جو زمانۂ جاہلیت میں نصرانی ہو گیا تھا اور جوگیوں سنیاسیوں کی طرح محنت و مشقت کرتا تھا۔ جاہل اس کو بڑا خدا رسیدہ اور عابد زاہد جانتے سمجھتے جب حضور والا ترک وطن کے بعد مدینہ تشریف فرما ہوئے اور مسلمانوں کا ہجوم ہوا تو ابو عامر کو جلن پیدا ہوئی اور بدر میں جب حضور کو فتح ہوئی تو کھلا دشمن بن گیا، وہ مشرکین مکہ سے ساز باز کر کے ان کو مسلمانوں سے لڑنے پر آمادہ کیا۔ پھر جب جنگ احد میں مسلمانوں پر قدرے مصیبت پڑی تو وہ خوب خوش ہوا اور بالآخر جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہونی شروع ہو گئیں اور جنگ حنین میں قبائل ہوازن کو شکست ہوئی تو علی الاعلان اپنی صداقت و حقانیت کا قول کیا اور کہنے لگا میں ثابت ایسا ہی ہوں حضور نے ہر چند سمجھایا بجھایا مگر اس نے ایک نہ مانی

اور بھاگ کر ملک شام کو چلا گیا تاکہ وہاں رہ کر مسلمانوں کے مقابلہ کی تیاری کرے اور جمعیت اسلامیہ کو شکست دینے کے لئے لشکر جمع کرے۔ اس کے بارہ چیلے مدینہ میں موجود تھے جو بظاہر مسلمان اور درپردہ منافق تھے۔ ابو عامر نے ان منافقوں کو پیام بھیجا کہ تم ایک مسجد بناؤ اور بظاہر مسلمانوں کی دلداری کرتے رہو۔ مجھ سے قیصر روم نے فوج اور سامان دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ میں عنقریب فوج لیکر آنا ہوں میرے تمام خطوط اور قاصد اسی مسجد کے پتہ پر پہنچا کریں گے۔ چنانچہ اس کے طرفداروں نے ایک مسجد تعمیر کی اور مسجد بن گئی تو حضورؐ کی خدمت میں عرض گذار ہوئے کہ حضورؐ وہاں نماز پڑھ کر ہمارے لئے برکت کی دعا فرمائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا میں اس وقت سفر تبوک کا ارادہ کر چکا ہوں اللہ نے چاہا تو لوٹ کر دیکھا جائیگا چنانچہ حضورؐ تشریف لے گئے۔ ادھر منافقوں نے اس مسجد سے چار کام لینے شروع کر دیئے (۱) مسجد قباء والوں کو ضرر رسانی (۲) کفر کی اشاعت کو مسلمانوں کے مقابلہ میں انہوں نے مسجد تعمیر کی اور اس سے مقصود مسلمانوں پر فخر کرنا اور اپنی قوت کا نمودار کرنا تھا گویا یہ مسجد کفر کا اڈا اور مرکز تھی (۳) مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنا۔ پہلے سب مسلمان مسجد قباء میں جمع ہوتے تھے اور سب یکدل تھے اب منافقوں نے اُن کے دو ٹکڑے کر دینے چاہے ایک ٹکڑا مسجد قباء میں اور دوسرا اُن کی مسجد میں۔ اس تفریق سے اُن کو مسلمانوں میں اشاعت نفاق اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کا موقعہ ملا (۴) ابو عامر خدا اور اُس کے رسولؐ کا دشمن تھا رسول اللہؐ سے مناظرہ بھی کر چکا تھا اور اسلام کے خلاف مشرکین عرب کو اُبھار بھی چکا تھا اور اسلام کی بیخ کنی کے لئے ملک شام میں لشکر کشی کے لئے گیا ہوا تھا اُسکے لئے ایک کمیننگ منافقوں نے اس مسجد کو بنایا۔ لیکن بالآخر تمام مبلغین نفاق ناکام ہوئے۔ ابو عامر کا کوئی ساتھی نہ رہا۔ ملک شام میں وہ تنہا بے یار و مددگار مر گیا۔ حضورؐ نے اسکو بددعا بھی یہی دی کہ بے یار و مددگار مرے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جن منافقوں نے مسلمانوں کی مسجد سے علیحدہ مسجد تعمیر کی

تاکہ مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں کفر کی اشاعت کریں اہل اسلام میں تفرقہ ڈالیں اور خدا و رسول کے دشمن کی کمینگاہ تیار کریں اور اس واقعی نفاق آفرینی کے باوجود قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اس تعمیر سے ہمارا مقصد محض نیکی ہے ۔مینہ بوندی اور جاڑے پالے کے کمزور مسکین مسلمانوں کو آرام پہنچانے کے لئے ہم نے یہ مسجد بنائی ہے ۔ درحقیقت وہ جھوٹے ہیں ۔ لہذا اے رسول تم اُن کی مسجد میں کبھی نماز نہ پڑھنا ۔ تمہاری نماز کیلئے تو وہی مسجد مناسب ہے جسکی بنا ر اول دن سے تقویٰ اور خدا ترسی پر رکھی گئی ہے ۔

مسجد تقویٰ سے مراد مسجد قباء ہے کذا قال البخاری ۔ ابن عباس رضؓ ، حسن بصری ضحاک اور شعبی وغیرہم سے بھی یہی مروی ہے ۔ بیضاوی نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے ۔ صاحب کمالین نے بھی اسی قول کو پسند کیا ہے ۔حضرت عمر رضؓ ، ابن عمر رضؓ ، زید بن ثابت رضؓ ابو سعید خدری رضؓ اور سعید بن مسیب رضؓ وغیرہم کے نزدیک مسجد نبوی مراد ہے ۔ ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے ۔حضرت ابو سعید خدری رضؓ کی روایت ہے کہ مسجد تقویٰ کے متعلق دو شخصوں نے اختلاف کیا ۔ ایک نے کہا مسجد قباء ہے ۔ دوسرے نے کہا مسجد رسول اللہ ﷺ ہے ۔ حضور ﷺ نے فرمایا وہ میری مسجد ہے (رواہ احمد والترمذی وصححہ والنسائی ومسلم وغیرہم)

اس سے آگے مسجد تقویٰ کو تعمیر کرنے والوں اور اُس میں عبادت کرنیوالوں کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ :۔

اُس مسجد میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو پاک صاف رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ بھی پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے ۔

حضرت ابو ہریرہ رضؓ کی روایت ہے کہ یہ آیت اہل قباء کے حق میں نازل ہوئی حضرت ابو ہریرہ رضؓ کہتے ہیں وہ لوگ پانی سے استنجاء کیا کرتے تھے (رواہ ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ) ابن عباس رضؓ سے مروی ہے جب یہ آیت اتری تو حضور اقدس ﷺ نے عویمر بن ساعدہ سے دریافت کیا پاک وہ کیا طہارت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے تمہاری ثنا فرمائی ہے ؟ عویمر نے عرض کیا ہم سوا اس کے اور کچھ نہیں جانتے کہ ہم

میں سے ہر عورت مرد پانی سے استنجا کرتا ہے حضور نے فرمایا وہ (طہارت) یہی ہے
(رواہ الطبرانی واحمد وابن خزیمۃ فی صحیحہ ورواہ ابن جریر عن خزیمۃ بن ثابت واحمد
عن محمد بن عبد اللہ بن سلام)

چند مسائل ابن کثیر کہتے ہیں آیت میں دلیل ہے کہ وہ قدیمی مساجد جن کی بنیاد اول دن سے تقوی پر قائم کی گئی ہو اُن میں نماز پڑھنی مستحب ہے۔ اور ایسی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنی بھی افضل ہے جو پرہیزگار اور عابد زاہد اور ظاہری باطنی نجاستوں سے پاک صاف رہتی ہو۔

تفسیر سراج میں ہے کہ جو مسجد شہرت دکھاوٹ یا ریاکاری کے لئے بنائی جائے یا اللہ کی رضامندی کے حصول کے علاوہ اُس کی کوئی اور غرض ہو یا حرام یا مشکوک مال سے اُس کی تعمیر ہو اُس میں نماز پڑھنی حرام ہے۔

عطاء سے مروی ہے کہ جب اللہ نے فتوحات عنایت کیں تو حضرت عمرؓ نے گورنروں اور عاملوں کو لکھا کہ جابجا مسجدیں بنواؤ مگر خیال رکھو کہ ایک ہی شہر میں ایسی دو مسجدیں مت بنوانا کہ ایک سے دوسری کو مضرت پہونچے۔

مقصود بیان:- جس مسجد یا عبادت گاہ کی تعمیر سے مقصد یہ ہو کہ عام مسلمانوں کو یا دوسری مسجد کے نمازیوں کو ضرر پہونچے یا اسلام کو نقصان اور کفر کو قوت حاصل ہو یا مسلمانوں میں تفرقہ اور پھوٹ پڑے یا اُس کو کافروں کی کمینگاہ بنانا غرض ہو بہر حال وہ عبادت گاہ قابلِ شکست ہے بہت سی ظاہری نیکیاں بھی مضرت اسلامیہ کی باعث ہوتی ہیں کیونکہ اُن کی بناء فساد پر ہوتی ہے۔ مسجد ضرار میں نماز پڑھنی حرام ہے نماز اُس مسجد میں پڑھی جائے جسکی تعمیر محض خوشنودی خدا حاصل کرنے کے لئے کی گئی ہو۔
شرک اور معاصی سے بچنا اور پرہیزگاری پر قائم کی ہوئی ہر چیز قابل مدح ہے۔ طہارت جسمانی ہو یا روحانی بہر حال مسلمانوں کیلئے ضروری اور اللہ کو پسند ہے۔ آیت میں ضمنی ہدایت ہے کہ مسلمانوں کو ریاکاری کی ہر چیز اور مسلمانوں کو ضرر پہونچانے کے ہر قول و عمل سے پرہیز رکھنا بلکہ اُس کی مخالفت کرنی چاہئے یہانتک کہ جو عبادتگاہیں

اس قسم کی ہوں اُن سے بھی قطع تعلق کر لینا لازم ہے ۔ وغیرہ

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ

بھلا جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف و خوشنودی پر رکھی ہو

وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ

وہ بہتر ہے یا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی ایسی گھاٹی کے

عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ

کنارہ پر رکھی جو گرنے کو ہی ہو اور دوزخ میں اُس کو

جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

لے گرے اور اللہ ظالم لوگوں کو سیدھا راستہ نہیں بتاتا

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ

جس عمارت کو انہوں نے بنایا ہے یہ ہمیشہ ان کے دلوں میں باعث شبہہ (نفاق)

قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ ع ۱۱

بنی رہے گی تاوقتیکہ ان کے دل ٹکڑے نہ ہو جائیں اور اللہ دانا صاحب تدبیر ہے

تفسیر مخلص اہل ایمان اور دو غلے منافقوں کی حالت اور ہر گروہ کا مآل کار خداوند تعالیٰ اس آیت میں مثال دیکر سمجھاتا ہے ۔ امام رازی رح فرماتے ہیں یہ تمام عالم میں اس سے بڑھ کر کوئی مثال منافقوں کے حال کے مطابق نہیں پاتا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ دو قسم کے آدمی ہیں اور ہر ایک نے اپنی عمارت علیحدہ بنائی ہے

ایک کے پیش نظر تو کفر و عصیان سے بچنا اور اللہ کی خوشنودی کا حاصل کرنا ہے۔ اس نے
عمارت محض اس لئے بنائی کہ کفر کی بیخ کنی ہو اور اللہ راضی ہو۔ دوسرے کی عمارت
کی بنیاد فساد پر قائم ہے اس نے گہرے گڈھے کے بالکل کمزور کنارہ پر اپنی عمارت
کی نیو رکھی یعنی اسکی نیت میں نفاق و معصیت ہے۔ ظاہر ہے کہ اول شخص کی عمارت
تو بہ اچھی اور افضل ہوگی اور دوسرے کی عمارت کمزور بودی اور گر جانے والی ہوگی
یہی حال مؤمن اور منافق کا ہے۔ مؤمن کی بنائی ہوئی مسجد چونکہ خلوص نیت پر مبنی ہے
اس لئے افضل اور مقبول ہے اور منافقوں کی بنائی ہوئی مسجد نفاق پر مبنی ہے
گویا وہ دوزخ کے گڈھے کے کنارہ پر بنائی گئی ہے جو بہت جلد گر جائے گی
خود بھی جہنم رسید ہوگی اور اپنے بنانے والوں کو بھی اپنے ساتھ دوزخ میں لیجائیگی
چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت قتادہ کی روایت ہے کہ مسجد ضرار کی عمارت مکمل
نہ ہونے پائی تھی کہ وہ (منافق) جہنم میں جا پڑے۔ حضرت جابر بن عبداللہ رض
کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیکھا کہ مسجد ضرار
سے دھواں نکلتا تھا (رواہ الحاکم) ابن جریر ابن جریج کی روایت ہے کہ کچھ لوگوں
نے وہ مقام کھودا جہاں مسجد ضرار تھی تو وہاں سے دھواں نکلتا پایا۔ خلف بن
یاسین کہتے ہیں وہ مسجد ضرار جس کا قرآن میں تذکرہ ہے میں نے دیکھا کہ اسمیں سے
ایک پتھر سے دھواں نکلتا تھا اور اب وہ کوڑا گھر ہے (رواہ ابن جریر) الغرض منافقوں
کی اور ان کی مسجد کی معنوی تمثیل تو خدا تعالیٰ نے آیت میں بتا دی تھی اور مرنے
کے بعد ان کا نتیجہ عمل ظاہر فرمایا ہی تھا مگر دنیا میں بھی مسجد کی تباہی اور آتش زدہ
ہونا دکھا دیا۔ جب مسجد ضرار بنانے والے منافقوں کی مراد پوری نہ ہوئی اور اللہ تعالیٰ
نے ان کا پردہ فاش کر دیا اور ان کا گرو ابو عامر خوار و ذلیل ہو کر مر گیا تو اب ان کو
اپنی حالت کی بنا پر سخت اندیشہ ہوا کہ خدا جانے مسلمان ان کے ساتھ کیا
سلوک کرینگے لیکن اس اندیشہ اور خوف کے باوجود عداوت سے پھر بھی بدور ہی
رہے دلوں سے نفاق نہ نکلا۔ اسی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ :-

وہ مسجد ضرار جو انہوں نے بنائی ہے مرتے دم تک ان کے دلوں میں مجسم نفاق اور از سرتاپا شک بنی رہیگی ان کے دلوں سے شک اور نفاق ہرگز نہ جائیگا بغیر موت کے ان کے دلوں سے شک نہ نکلے گا

مقصود بیان :- مؤمن و منافق کے عمل کی ایک بیش بہا تمثیل - اس امر کی صراحت کہ نفاق کی بنا دوزخ کے کنارہ پر ہے اور نہایت کمزور ہے عنقریب گرجائیگی اور دوزخ میں گرادیگی - اس بات کی نفی کہ منافقوں کے دل سے کبھی نفاق زائل نہ ہوگا - اس امر کی ترغیب کہ مؤمن کی بناءِ عمل محض تقویٰ اور اللہ کی رضامندی ہونی چاہیئے - وغیرہ -

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ

بلا شبہ اللہ نے مسلمانوں سے اُن کا جان و مال اس قیمت پر خرید لیا

وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ

کہ ان کے لیئے جنت ہے وہ خدا کی راہ

فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ

میں لڑتے ہیں قتل بھی کرتے ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ

اللہ کے ذمہ یہ وعدہ توریت اور انجیل

وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ

اور قرآن میں پختہ ہو چکا اور اللہ سے زیادہ کون اپنے وعدہ کا پورا ہے

فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ

اب تم اپنے سودے پر جس کا معاملہ تم نے اللہ سے کیا ہے خوشیاں مناؤ

بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

اور یہی بڑی کامیابی ہے

تفسیر منافقوں کے مقابلہ میں اب خالص پختہ مومنوں کے اوصاف اور اُن کا نتیجۂ خیر بیان فرماتا ہے۔ یہ آیت صرف مجاہدین کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام پختہ کامل اہل ایمان کو شامل ہے اسی لئے حسن بصریؒ نے فرمایا تھا لوگو سچے کانوں سے سنو قسم ہے ذات پاک کی یہ خریداری محض نفع اور سراسر فائدہ ہے اللہ تعالیٰ نے روئے زمین کے تمام مومنوں سے قیامت تک کے لئے سودا کر لیا واللہ کوئی مومن اس بیع سے محروم نہیں رہا۔ ہجرت سے بعد جب لیلۃ العقبہ میں حضور اقدس نے انصار کے ایک گروہ سے بیعت لی تو انصار نے عرض کیا جو شرائط آپ کو منظور ہوں ہم سے لے لیجئے۔ فرمایا اللہ کے متعلق تو تم پر لازم ہے کہ اُسکی توحید پر قائم رہو شرک نہ کرو۔ اور میری ذات کیلئے یہ شرط ہے کہ جسطرح اپنی جان مال کی حفاظت کرتے ہو ویسی ہی میری مدد کرو۔ انصار نے عرض کیا اگر ہم اسکو منظور کرلیں تو ہم کو کیا معاوضہ ملیگا؟ فرمایا جنت۔ انصار بولے واللہ ہم نے بیع میں سراسر نفع پایا۔ اب ہم نہ بیع پھیرنے دینگے نہ خود پھیرینگے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اللہ نے ایمان والوں سے ایک سودا کیا یعنی جس طرح بیع و شراء میں عوضین کا تبادلہ ہوتا ہے اسی طرح اللہ نے ایمان والوں سے عقد معاوضہ کیا۔ اہل ایمان اپنے جان و مال اللہ کے ہاتھ فروخت کریں اللہ اس کے عوض اُن کو جنت عطا فرمائیگا۔ خریدنے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی راہ میں جان و مال قربان کردیں۔ جو لوگ کلمۂ الٰہی کے مخالف ہیں اُن سے لڑیں۔ اگر قتل کا موقعہ آجائے

تو ماریں اور مارے جائیں اس کی مخصوص قیمت اللہ بصورت جنت اُن کو عطا فرمائیگا۔ اللہ نے اپنے مختلف فرمانوں میں اس کا سچا وعدہ لیا ہے۔ توراۃ میں بھی انجیل میں بھی اور قرآن میں بھی اور اللہ سے بڑھ کر وعدہ کا پورا کون ہوسکتا ہے۔ لہذا مومنوں کو اُن کی جانی و مالی قربانی کا معاوضہ ضرور ملیگا جو قیمت ٹھہرگئی وہ ضرور ادا کیجائیگی کیسا عجیب اور عمدہ سودا ہے جسمیں سراسر فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اللہ ہی نے جان و مال عطا کیا اور پھر اپنے عطیہ کو خود ہی خرید ا۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔

اللہ نے توریت کے سفر استثناء کے ۲۸ ویں باب میں چودہویں درس تک اس عقد معاوضہ کے مضمون کو بیان کیا ہے اور ۳۲ ویں باب کے دوسرے درس کے اندر بھی یہی مفہوم ظاہر کیا ہے۔ انجیل متی کے اندر ۵ باب۔ ۱۲ درس کا بھی یہی مطلب ہے اور قرآن میں تو جابجا اسکا ذکر ہی فرمایا ہے۔

مقصود بیان:۔ ایک عجیب عقد معاوضہ کا بیان جس میں بائع بھی عجیب ہے اور مشتری بھی عجیب۔ مبیعہ بھی عجیب ہے اور قیمت بھی عجیب۔ بیچنے والے اہل ایمان مبیعہ جان و مال۔ خریدار خدا۔ قیمت جنت۔ بازار اسلام۔ راہ خدا میں جان و مال سے کوشش کرنے کی ترغیب خصوصًا جہاد کرنے پر برانگیختگی۔ اس امر کی صراحت کہ اللہ اپنے وعدہ سے خلاف نہیں کرتا ہے۔ گویا اللہ کی ذات کے لئے وعدہ کی خلاف ورزی شرعًا محال ہے۔ اس امر کی صراحت کہ عقد معاوضہ کا یہ قاعدہ اللہ کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔ صرف اسلام ہی نیا مذہب نہیں جسمیں جہاد کا حکم دیا گیا ہو بلکہ عیسائیوں اور یہودیوں کی مذہبی کتابیں بھی اسی فرمان سے بھری ہوئی ہیں۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ

یہی لوگ ہیں توبہ کرنیوالے عبادت گذار حمد کرنے والے اللہ کی راہ میں سفر کرنیوالے

الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ

رکوع سجدہ کرنے والے نیک کام کا حکم

بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

دینے والے اور بری بات سے منع کرنے والے اور

وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ

اللہ کی حدوں کا خیال رکھنے والے اور مسلمانوں کو خوشخبری سنادو

تفسیر

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ انہی مؤمنوں کی مدح ہے جن کی جانوں اور مالوں کو اللہ نے خرید فرمایا۔ اس آیت میں نو ۹ صفات بطور مدح کے ذکر فرمائے۔ ہم آیت کا مختصر مطلب لکھنے کے بعد سابق و لاحق آیات ملا کر ذرا مفصل فوائد تحریر کریں گے

حاصل ارشاد یہ ہے کہ قابل مدح وہ خاص مؤمن ہیں جو ۱ شرک و نفاق اور معصیت سے منہ موڑ کر اللہ سے رشتہ جوڑنے والے ہیں۔ جو ۲ محض اللہ کی پرستش کرتے ہیں کسی غیر کو اس کی ذات و صفات میں شریک نہیں کرتے۔ جو ۳ ہر حال میں اللہ کی ثنا و ستائش کرتے امر تقدیری پر رضامند اور خوش رہتے اور ہر دکھ سکھ میں اللہ کی حمد کرتے ہیں۔ جو ۴ روزوں کے ذریعہ اپنی خواہشات کے زور کو توڑتے اور نفس کے حملوں کا مقابلہ کرتے ہیں (یا بہ مطلب کہ) طلب علم جہاد اور ہجرت کے لئے ملک میں پھرتے ہیں۔ نمبر ۵ و ۶ جو خصوصیت کے ساتھ اللہ ہی کے سامنے رکوع کرتے یعنی اسی کے سامنے جھکتے اور انہی کے سامنے سجدے میں گرتے ہیں یعنی شرعی نماز خشوع و خضوع سے ادا کرتے ہیں۔ جو ۷ شرعی مامورات پر دوسروں کو بھی پابند بنانے کی عملی اور قولی کوشش کرتے ہیں۔ جو ۸ شرعی ممنوعات سے دوسروں کو بھی بقدر امکان روکتے

ہیں۔ اگر قوت ہوتی ہے تو ہاتھ سے مدد کرتے ہیں۔ اتنی قوت نہیں ہوتی تو زبان سے حمایت کرتے ہیں اور یہ بھی ممکن نہیں ہوتا تو اپنی قلبی نفرت کا ہی حسب موقعہ اظہار کرتے ہیں اور دل سے ممنوعات کو برا جانتے ہیں جو اللہ کے تمام مقررہ قوانین پر کاربند رہتے ہیں۔ اللہ نے جو حدیں مقرر کردی ہیں ہر چیز اور ہر حکم کا ایک خاص دائرہ رکھا ہے اس سے آگے نہیں بڑھتے۔ غرض یہ کہ عبادات معاملات اور خطرات میں حکم الٰہی سے سرمو تجاوز نہیں کرتے۔ ایسے کامل ایمان والوں کو حیات ابدی اور سعادت سرمدی کی بشارت دیدو۔

چند فوائد

(۱) ان آیات میں اللہ نے حق پرست گروہ کو اول مومن فرمایا پھر ان کے آٹھ یا نو اوصاف ذکر فرمائے۔ چونکہ اللہ کی ہستی اور صفات کمالیہ کا اقرار اور دل سے عقیدہ رکھنا مسلمان کا اولین فرض ہے اس لئے ایمان کو سب سے پہلے بیان کیا اور چونکہ اللہ کی ذات و صفات کا حقیقی اقرار اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ شرک و نفاق کو چھوڑ کر کل باطل زنجیریں توڑ کر اللہ سے رشتہ جوڑا جائے۔ لہذا اس کو لفظ توبہ سے تعبیر فرمایا اور توبہ کی تکمیل اسی وقت ممکن ہے جبکہ اخلاص کے ساتھ صرف اللہ کی عبادت کرے ہر وقت عمل اور قول ہی سے اس کی الوہیت و ربوبیت کا اقرار کرے اور اللہ کی عظمت و کبریائی کا عملی اعتراف کرے۔ اس مفہوم کو لفظ عَابِدُوْنَ سے ظاہر فرمایا پھر اعتراف عظمت اس وقت تک صحیح نہیں مانا جائیگا جب تک تقدیر پر ایمان کامل نہ ہو ہر نعمت و مصیبت کو اللہ کی مشیت کے تابع جانے کسی غیر کی طرف منسوب نہ کرے بلکہ اپنی عبادت کی توفیق بھی اسی کی طرف سے سمجھے اور ہر حالت میں اسکی رضا پر راضی رہے مصیبت کو بھی راحت سمجھکر اللہ کی ثنا کا اظہار حرکات و سکنات اور گفتار و اطوار سے کرے۔ اس مضمون کو لفظ حَامِدُوْنَ سے بیان فرمایا پھر ثنا پر باری تعالیٰ کا گفتار و اطوار سے ظہور اور تقدیر الٰہی پر عملی رضا اس وقت ممکن ہے جب نفسانی خواہشات کا زور ٹوٹا ہوا ہو جذبات شیطانی مغلوب ہوں اور مادی

تو ہی معتدل ہو جائیں۔ اس مطلب پر لفظ صَآئِمُوْنَ دلالت کرتا ہے خواہش و ہوس کی شکست اور جذبات پر تسلط جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ غیر اللہ کی طمع اور خوف نہ ہو۔ محترم انسانیت کو کسی مخلوق کے دروازہ پر ذلیل نہ کیا جائے۔ بس اللہ ہی سے لَو لگی ہو اُسی کے سامنے سر جھکتا ہو وہی مرکز عبادت ہو۔ اسی امر کا اظہار رَاکِعُوْن اور سَاجِدُوْن کے الفاظ سے کیا۔ یہاں تک تو اُن صفات کا بیان تھا جو براہِ راست اللہ سے تعلق رکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے آگے اُن اوصاف کا اظہار فرمایا جن کا تعلق باہم انسانوں سے ہے۔ انسانوں کے معاملات و تعلقات کی دو ہی صورتیں ہیں اور بندوں کی خیر خواہی کی دو ہی شکلیں ممکن ہیں۔ اگر کسی کو کار خیر سے رُکتا ہوا دیکھے تو اُس پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دے خواہ ترغیب زبانی ہو یا قلمی یا عملی۔ اور اگر کسی کو بُرے کام میں مبتلا دیکھے تو بقدر امکان اُس کے ارتکاب سے روکے خواہ زبان سے یا قلم سے یا ہاتھ سے۔ ان دونوں صفات کو لفظ اٰمِرُوْن اور نَاھُوْنَ سے بیان فرمایا۔ پھر سب کے آخر میں ایک نواں وصف بیان فرمایا جس کا تعلق نہ فقط حقوق اللہ سے ہے نہ فقط معاملات عباد سے بلکہ دونوں کو شامل ہے یعنی قوانین الٰہیہ اور ضوابط شریعت پر کاربند ہونا یعنی قرآن و حدیث پر عمل کرنا بدعات اعتقادی و عملی سے پرہیز رکھنا۔ بندوں کے ساتھ معاملات کرنے میں اُن ہدایات کی نگہداشت کرنا جو اللہ اور اُس کے رسول نے بیان کر دی ہے۔

(۲) سیاحت کے لغوی معنی سیر کرنے کے ہیں اگرچہ صاحب قاموس نے ایک قید اُور لگا دی ہے کہ اللہ کی عبادت کی نیت سے زمین پر پھرنے کو سیاحت کہتے ہیں مگر عام اہل لغت کے نزدیک یہ قید غلط ہے۔ سیاحت ہر سیر کو کہتے ہیں خواہ ثواب و عبادت کی نیت سے ہو یا گناہ و فجور کے ارادہ سے۔

لفظ سَآئِحُوْنَ سے آیت میں جمہور مفسرین کے نزدیک مراد روزہ دار ہیں۔ ابن کثیر نے ابن مسعود کا بھی یہی قول نقل کیا ہے بلکہ علی بن طلحہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں جہاں سیاحت کا لفظ آیا ہے وہاں روزہ ہی مراد ہے۔ عوفی اور

سعید بن مسیب بھی اسی کے قائل ہیں۔ حضرت عائشہ رضؓ نے فرمایا اس امت کی سیاحت روزہ ہے (رواہ ابن جریر) مجاہد، سعید بن جبیر، عطاء خراسانی، عبد الرحمن سلمی اور ضحاک وغیرہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضؓ کی مرفوع روایت ہے کہ سائحین صائمین ہیں (رواہ الحاکم)

لیکن ابن کثیر نے بحوالہ ابو داؤد بروایت ابو امامہ بیان کیا کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے سیاحت کی اجازت دیجیے۔ فرمایا میری امت کی سیاحت یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ (قد رواہ ابن ماجۃ والحاکم وصححہ) یہ اجازت مانگنے والے عثمان بن مظعون تھے۔ کذا نص علیہ بعض الحفاظ۔

ابن مبارک نے بروایت ابن لہیعہ مرفوعاً بیان کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری امت کیلئے سیاحت کی بجائے جہاد کو اور ہر بلندی پر تکبیر کہنے کو قائم کر دیا ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سائحین سے مراد مجاہدین ہیں۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ سیاحت کرنیوالوں سے مراد علم دین کے طالب ہیں (رواہ ابن ابی حاتم) عکرمہ نے یہ بھی فرمایا کہ بعض کم فہم سیاحت کا یہ مفہوم سمجھتے ہیں کہ جنگلوں اور پہاڑیوں میں بسر کرنا ہے یہ اُن کی غلط فہمی ہے کیونکہ یہ امر مشروع نہیں

مقصود بیان:- اہل ایمان کے خصوصی اوصاف کا پیرایۂ مدح میں بیان، اور تمام اہل اسلام کو در پردہ ان اوصاف کو حاصل کرنے کی ترغیب۔ اس امر پر ضمنی تنبیہ کہ جب تک مومن میں یہ اوصاف موجود نہ ہوں وہ مومن کامل نہیں ہو سکتا۔ صرف زبانی اقرار یا اوپری دل سے توحید و رسالت و قیامت پر عقیدہ ایمان کو کامل کرنے کیلئے کافی نہیں بلکہ مذکورہ بالا نو اوصاف ایمان کے اجزاء یا کم از کم کمال ایمان کیلئے شرائط ہیں۔ واللہ اعلم۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا

نبی کو اور مسلمانوں کو یہ بات زیبا نہیں کہ

[illegible] تو اب تک دوزخ والوں کے لئے جائز نہیں کہ

لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ

مشرکوں کے لئے وہ دعا مغفرت کریں

بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝

خواہ وہ اُن کے رشتہ دار ہی ہوں

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ

رہا ابراہیم کا اپنے باپ کے واسطے استغفار کرنا

اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا

تو وہ صرف اُس وعدہ کی وجہ سے تھا جو ابراہیم نے اس کیا تھا لیکن جب

تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ

ابراہیمؑ پر کھل گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اُس سے قطع تعلق کر لیا

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۝

بلاشبہ ابراہیم بڑا نرم دل اور بردبار تھا

تفسیر سورۂ براءۃ کے متعدد مقامات پر بیان فرمایا تھا کہ کافروں اور مشرکوں سے ترک موالات واجب ہے یہاں مصرح فرما دیا کہ کافر خواہ کتنا ہی قریبی رشتہ دار ہو اگر کفر پر مر جائے تو اُس کے لئے استغفار کرنا بھی جائز نہیں چہ جائیکہ دینی تعلقات قائم رکھنا۔ حکم آیت تا قیامت تمام مؤمنوں کے لئے منصوص اور واجب ہے۔ آیت کے سبب نزول کے متعلق

تین روایات ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ چند اسباب کے موجود ہونے کے بعد آیت کا نزول یکبارگی سب کے متعلق ہوا ہو کما قال الشیخ ابن حجر۔

سیوطی نے اس آیت کا نزول دو مرتبہ اتقان میں تحریر کیا ہے ایک بار ہجرت سے پہلے مکہ میں ابو طالب کے انتقال کے بعد اور دوسری بار مدینہ میں۔ تینوں اسباب ہم ذیل میں مختصر لکھتے ہیں۔

(۱) ابن کثیر نے بروایت ابن مسیب بیان کیا کہ ابو طالب کے انتقال کے وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور فرمایا چچا اب تو لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہدو۔ میں تمہاری مغفرت کے لئے اللہ کے سامنے اس کلمہ کو بطور حجت کے پیش کرونگا۔ اس وقت ابو جہل اور عبداللہ بن ابی امیہ ابو طالب کے پاس موجود تھے۔ کہنے لگے ابو طالب! کیا تم عبدالمطلب کی ملت سے منہ موڑ لوگے؟ بعض روایات میں آیا ہے کہ ابو طالب نے کہا اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ مشرکین قریش مجھے ڈر جانے کا عیب لگائینگے تو میں ضرور یہ کلمہ کہہ لیتا اور تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا غرض ابو طالب نے ملت عبدالمطلب پر ہونے کا اقرار کیا اور اسی حالت پر انتقال ہو گیا۔ حضورؐ نے فرمایا میں تمہارے لئے استغفار کرونگا جب تک مجھے ممانعت نہ کر دی جائے اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی (رواہ احمد واصلہ فی الصحیحین)

حضرت علی رضہ فرماتے ہیں ابو طالب کا انتقال ہو گیا تو میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا آپ کے بوڑھے گمراہ چچا کا انتقال ہو گیا فرمایا دفن کر دو اور پھر میرے پاس آنے تک کوئی بات نہ کرنا۔ الحدیث (رواہ ابو داؤد) اس شان نزول پر ایک اعتراض ہوتا ہے کہ ابو طالب کا انتقال ہجرت سے پہلے مکہ میں ہوا اور یہ آیت مدنی ہے۔ اس اعتراض کو دور کرنے کیلئے ابن کثیر نے تکرار نزول کا قول اختیار کیا ہے اور ابن حجر نے تاخیر نزول کا یعنی ابن کثیر کے نزدیک یہ آیت ایک مرتبہ مکہ میں ابو طالب کے انتقال کے بعد نازل ہوئی اور دوبارہ

مدینہ میں۔ اور ابن حجر نے کہا کہ اگرچہ انتقال ابو طالب کا مکہ میں ہوا لیکن مدت کے بعد بمصلحت ممانعت استغفار کا یہ حکم مدینہ میں نازل ہوا۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۲) تبوک کے بعد غزوۂ عسفان یا سفر عمرہ میں مکہ کے قریب ایک واقعہ پیش آیا۔ حضرت بریدہ کہتے ہیں ہم لوگ تقریباً ایک ہزار سوار حضورؐ کے ہمرکاب ایک سفر (یعنی عمرہ یا غزوۂ عسفان) میں تھے۔ حضورؐ نے ایک مقام پر قیام فرمایا دو رکعت نماز پڑھی پھر ہماری طرف رخ کیا۔ اس وقت حضورؐ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کھڑے ہوکر عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ قربان حضور کی کیا حالت ہے؟ فرمایا میں نے اپنے پروردگار سے اپنی ماں کے لیئے استغفار کرنے کی اجازت مانگی تھی مگر اجازت نہ ملی۔ والدہ کے آگ میں جلنے پر مجھے ترس آیا جس سے میرے آنسو بہنے لگے۔ پہلے میں نے تم کو تین باتوں سے منع کیا تھا ایک تو تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا لیکن اب زیارت کیا کرو۔ تاکہ آخرت کی یاد ہو۔ دوسرے تم کو تین روز کے بعد قربانی کا گوشت کھانے سے منع کیا تھا لیکن اب جو چاہو کرو کھاؤ اور رکھ چھوڑو۔ تیسرے تم کو چند قسم کے برتنوں میں پانی نبیذ پینے سے منع کیا تھا مگر اب جس برتن میں چاہو پیو لیکن نشہ آور چیز نہ ہو (رواہ احمد وغیرہ) اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس واقعہ کے متعلق آیت کا نزول متعدد صحابہ کی روایت سے ابن جریر و طبرانی وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

(۳) حضرت علیؓ فرماتے ہیں ایک شخص اپنے مشرک والدین کے لئے استغفار کر رہا تھا میں نے کہا وہ مشرک تھے اور تو اُن کے لیئے استغفار کرتا ہے؟ کہنے لگا کیا حضرت ابراہیمؑ نے اپنے مشرک باپ کے لئے استغفار نہیں کیا تھا؟ میں نے یہ واقعہ خدمت اقدسؐ میں عرض کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جب مشرکوں کا جہنمی ہونا بنص قرآن معلوم ہو گیا۔ اب اگر کوئی شخص بحالت کفر مر جائے اور کفر پر مرنا متحقق ہو تو ایسی صورت میں کسی مسلمان

کے لئے جائز نہیں کہ اس کے لئے دعاءِ مغفرت کرے اگرچہ وہ کتنا ہی قریبی رشتہ دار ہو۔ عام مسلمان تو درکنار نبی کے لئے بھی جائز نہیں کہ کسی مُردہ کافر کے لئے استغفار کریں۔ رہی یہ بات کہ ابراہیمؑ نے اپنے باپ (تارخ) کے لئے دعائے مغفرت کی تھی باوجودیکہ وہ کافر تھا تو اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ اس وقت ابراہیم کو یقینی طور پر معلوم نہ تھا کہ میرا باپ کفر پر جما رہیگا اور کسی طرح مؤمن نہ ہوگا اس لئے باپ سے دعائے مغفرت کا وعدہ کر لیا اور وعدہ کو وفا کرنے کے لئے اُس کے لئے دعاءِ مغفرت کی کیونکہ احتمال باقی تھا کہ شاید وہ مؤمن ہو جاوے لیکن جب وحی سے متحقق ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ وہ کسی طرح ایمان نہیں لائیگا اور کفر پر جما رہیگا تو ابراہیمؑ نے اُس سے اظہارِ بیزاری کیا۔ یا یہ مطلب کہ ابراہیم چونکہ رحم دل تھے اور احتمال تھا کہ شاید باپ ایمان لے آئے اسلئے استغفار کا وعدہ کر لیا اور اسکے لئے استغفار کرتے رہے لیکن جب باپ کفر پر مر گیا اور اُس کا کافر ہونا متحقق ہو گیا تو اُس سے اظہارِ بیزاری کیا۔ مجاہد، ضحاک، قتادہ وغیرہ نے یہی مطلب بیان کیا ہے۔ ابن عباس رضؓ سے بھی یہی روایت ہے۔

تحقیق الفاظ اَوَّاہٌ کے معنی ہیں بہت دعا مانگنے والا (ابن مسعودؓ) بہت رحم اور ترس کھانے والا (مجاہد و قتادہ و حسن بصری وغیرہ) ابن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ حبشی زبان میں اَوَّاہ کے معنی ہیں کامل یقین رکھنے والا۔ علی بن ابی طلحہ کی روایت میں ہے توبہ کرنے والا مؤمن۔ ابن جریر نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے۔

سعید بن جبیر کے قول کے بموجب اَوَّاہ کے معنی ہیں تسبیح پڑھنے والا۔ مجاہد کا ایک قول ہے کہ وہ شخص جو حدودِ الٰہی سے تجاوز نہ کرے اللہ سے ڈرتا ہے اگر پوشیدہ گناہ ہو جائے تو پوشیدہ توبہ کر لے وہ اَوَّاہ ہے۔ حضور اقدس صلعم نے بہت زیادہ قرآن پڑھنے والے کو اَوَّاہ فرمایا ہے۔ ابن جریر نے ابن مسعود کے قول کو ترجیح دی ہے اور سیاقِ عبارت کے لئے یہی مناسب

مقصود بیان :- کفار کے لئے دعاء مغفرت کرنے کی ممانعت اگرچہ ان سے کتنا ہی قریبی تعلق ہو - اس امر کی صراحت کہ کفار کے بخشنے کے متعلق عام مؤمنوں کی دعا تو درکنار رسول اللہ صلعم کی دعا بھی مقبول نہیں بلکہ اُنکے لئے استغفار کرنا جائز ہی نہیں - در پردہ اس امر کی تلقین کہ کافر کی مسلمان سے کوئی یگانگت نہیں رہتی - ہر اللہ کا دشمن مسلمان کا دشمن ہے - کوئی دینی مذہبی تعلق اُس کا مسلمان سے باقی نہیں رہتا گویا قرآن پاک نے قومیت اور قرابت کی بناء محض مذہب پر قائم کی - اس بات کی صراحت کہ جب ابراہیمؑ کو اپنے باپ کے مسلمان ہو جانے کا احتمال تھا اُس وقت اُنہوں نے استغفار کیا تھا لیکن جب باپ کا کفر ثابت ہو گیا تو اظہار بیزاری کر دیا - اس سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ اگر گناہ کے علاوہ وعدہ کر لیا جائے تو اس کا ایفاء ضروری اور اگر گناہ پر کوئی معاہدہ ہو جائے تو اُسکی خلاف ورزی ضروری ہے - بندگان خدا پر ترس کھانا شیوۂ نبوت ہے - حضرت ابراہیمؑ کو اس صفت میں کمال تھا۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ

اور اللہ ایسا نہیں کہ راہ پر لا چکنے کے بعد کسی قوم کو گمراہ

هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ

کر دے تاوقتیکہ اُن چیزوں کو کھول کر بیان نہ کر دے جن سے وہ بچتے رہے ہیں

اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ

بلاشبہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے آسمانوں

مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ؕ

اور زمین کی حکومت اللہ ہی کے لئے ہے وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے

وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ

اور اللہ کے سوا نہ تمہارا کوئی حمایتی ہے نہ مددگار

تفسیر اس سے پہلے کی آیت میں مشرکوں کے لئے استغفار کرنے کی ممانعت تھی لیکن ممانعت سے پہلے بہت لوگ اپنے اقارب مشرکین کے لئے جو مر گئے تھے استغفار کیا کرتے تھے اور بہت سے لوگ جو استغفار کرتے تھے اس ممانعت سے پیشتر مر چکے تھے اور جو زندہ تھے اُن کو اپنے فعل پر سخت ندامت اور خوف تھا کہ ہم گمراہ ہو گئے۔ اس کے جواب میں تسلی کے لئے آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔ ابن جریر نے اسی تقریر کو پسند کیا ہے۔ لیکن مجاہد کہتے ہیں کہ یہ آیت بطور عموم نازل ہوئی۔ ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ گرفتارانِ بدر سے مسلمانوں نے جو فدیہ لیا تھا اُس کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی۔ مقاتل کلبی کہتے ہیں کہ منسوخ پر عمل کرنے کے متعلق آیت کا نزول ہوا۔ میرے نزدیک اول الذکر شان نزول سیاق عبارت کے زیادہ مناسب ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اللہ جب کسی قوم کو ہدایت کر دیتا ہے تو پھر اسکو گمراہ نہیں قرار دیتا۔ اُن سے وہ مواخذہ نہیں کیا جاتا جو گمراہ سے کیا جاتا ہے تاوقتیکہ اُن کے سامنے تمام ممنوعات بیان نہ کر دے یعنی جب ممنوعات کی تفصیل اور اُن سے بچنے کی ہدایت کر دیتا ہے اور پھر وہ اُن کا ارتکاب کرتے ہیں تو اُس وقت اللہ اُن سے مواخذہ کرتا ہے۔ غرض یہ کہ ممانعت سے پہلے تم نے مشرکوں کے لئے استغفار کی تو اس سے تم گمراہ اور گنہگار نہیں ہوئے۔

قطعی ترک موالات کے حکم سے مسلمانوں کے دل میں یہ کھٹکا پیدا ہوا کہ جب اللہ نے تمام کافروں کی دوستی سے منع کر دیا خواہ وہ کتنے ہی قریب عزیز ہوں اور ہماری طاقت معلوم ہے تو پھر اُن کی مدد کے بغیر کس طرح کامیابی ہو سکتی ہے۔ اس شبہہ کو دور کرنے کے لئے آگے فرماتا ہے کہ :-

آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ ہی کی ہے موت اور زندگی اسی کے اختیار و تصرف میں ہے وہی قادر مطلق ہے وہی بس کرتا ہے کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت نہیں وہی تمہارا کارساز حمایتی اور مددگار ہے۔

مقصود بیان :- اگر اللہ نے کسی کو ایمان و اسلام کی توفیق دی اور وہ مسلمان ہو گیا لیکن بعض امور کے تفصیلی احکام نازل نہ فرمائے تو ان امور کے کرنے نہ کرنے سے آدمی گناہگار نہ ہوگا۔ یہیں سے بعض علماء نے استخراج کیا کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے شریعت جس امر کے متعلق خاموش ہے صراحۃً ممانعت نہیں کی ہے وہ جائز ہے۔ جو شخص لاعلم اور غافل رہا وہ مکلف نہیں۔ جس شخص نے ناسخ پر علم سے پہلے منسوخ پر عمل کر لیا وہ گناہگار نہ ہوگا۔ مثلاً شراب کی حرمت ہوئی اور دور کے رہنے والوں کو فوری علم نہ ہوا یا بمیشہ علم نہ ہوا اور وہ اتنے زمانہ تک پیتے رہے تو گناہگار نہ ہونگے۔ حکم پہنچ جانے کے بعد خلاف ورزی کرنیوالا ماخوذ ہوگا وغیرہ

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِیِّ وَالْمُهٰجِرِیْنَ

اللہ نے نبی پر اور ان مہاجرین و انصار پر توجہ فرمائی

وَالْاَنْصَارِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ

جنہوں نے مشکل کے وقت نبی کا ساتھ دیا

الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ یَزِیْغُ قُلُوْبُ

باوجودیکہ ان میں سے ایک گروہ کے دل ڈگمگا جانے کے

فَرِیْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ

قریب ہو چکے تھے لیکن بالآخر اللہ ان پر مہربان ہوا واقعی وہ ان پر

رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○

بڑا مہربان اور رحیم ہے

تفسیر جس وقت رسول پاک ہو کا ارادہ ہوا کہ شوکت اسلامی کا مظاہرہ کرنے کے لئے تبوک سرحد شام کی طرف تشریف لے جائیں تو تمام مسلمانوں کو ہمرکاب چلنے کا عام حکم دیدیا۔ مسلمان اُس وقت سخت نادار تھے۔ قحط سالی تھی باغات خشک تھے، کھیتیاں اجاڑ تھیں، عام مفلوک الحالی تھی پھر مزید یہ کہ سخت ترین گرمی کا زمانہ تھا ریگستان اور اُس پر لُوہ نہ کہیں پانی نہ دانہ نہ سبزہ نہ پھل۔ حضورؐ نے مالی امداد دینے کی مسلمانوں سے اپیل کی حسب الایما حضرت عثمانؓ نے بہت کچھ امداد دی۔ بالآخر تقریباً ستر ہزار پیادے اور سوار چل دیے۔ قتادہ کہتے ہیں اثناءِ راہ میں اہل اسلام کو سخت تکالیف و مصائب کا سامنا ہوا۔ لوہ کی سخت لپیٹ پیاس کی تکلیف بھوک کی شدت، اس قدر سخت حالی کہ دو دو آدمی ایک ایک چھوارا پھاڑ کر بانٹ لیتے اور ایک چھوارا کو چند آدمی باری باری سے چوس لیتے اور اس پر پانی پی لیتے۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے حضرت عمرؓ نے فرمایا ہم سفر تبوک میں حضورؐ کے ہمرکاب ایک پڑاؤ پر اُترے اور اتنی پیاس لگی کہ دم سوکھ گیا بعض آدمیوں نے اونٹ ذبح کر کے اُس کے اندر سے پانی کی تھیلی نکال کر کچھ پانی پیا اور کچھ جگر پر ملا رواہ ابن حبان والحاکم والبیہقی وابن جریر یا ان مصائب سے تنگ آکر بعض کمزور مسلمانوں کے دلوں میں شیطانی وسوسہ پیدا ہوا اور ایک کمزور خیال اس بات کا ہوا کہ رسول اللہؐ کی ہمرکابی چھوڑ دیں کیونکہ ادھر تو بھوک پیاس کی تکلیف، گرمی اور لوہ کی شدت اُدھر فوج میں منافقوں کی ریشہ دوانیاں، کمزور مسلمان اگرچہ رسولؐ کے ساتھ سے نہ مڑے مگر دل میں وسوسہ ضرور رہا۔ ان شدائد کو دیکھ کر صدیق اکبرؓ نے خدمت گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ! حضورؐ کی دعا میں اللہ نے اثر عطا فرمایا ہے آپ

ہمارے لئے دعا فرما دیجئے۔ ارشاد فرمایا ابو بکرؓ! کیا تم کو یہ بات پسند ہے؟ صدیق اکبرؓ نے عرض کیا جی ہاں۔ حضورؐ نے دست مبارک اٹھائے۔ ہاتھ نیچے نہ کئے تھے کہ پانی پڑنے لگا۔ لوگوں نے تمام برتن بھر لئے پانی ختم گیا۔ لوگوں نے ادھر ادھر جا کر دیکھا تو لشکر سے باہر پانی کا نشان بھی نہ تھا۔ دلوں کے مڑ جانے کے قریب ہو جانے اور اللہ کی رحمت کے یہی معنی ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ غزوہ تبوک کو روانگی کا زمانہ سخت گرمی کا تھا اسلئے بعض خالص مومن بھی باقتضاء البشریت آرام و آسائش کے خیال کے ساتھ روانہ نہ ہوئے لیکن بعد کو خدا نے اُن کے دلوں میں دلولۂ اسلامی پیدا کیا اور وہ تنہا تنہا ہو کر راستہ میں لشکر سے آملے۔ مثلاً ابو خیثمہ ایک انصاری تھے مالدار تھے تبوک کو جب اسلامی لشکر روانہ ہو گیا تو یہ آرام طلبی کی وجہ سے ساتھ نہ گئے ایک روز اپنے باغ کو گئے سایہ کے نیچے بیٹھے بیوی نے چاروں طرف چھڑکاؤ کر دیا اور بستر بچھا دیا تازہ کھجوریں اور سرد پانی ان کے پاس لا کر رکھا۔ یہ ماحول کو دیکھ کر بولے خوشگوار سایہ، ٹھنڈی ہوا، پختہ میوہ، ٹھنڈا پانی، خوبصورت خدمتگار سب کچھ سہی لیکن رسول اللہؐ چٹیل میدان میں غبار آلود فضا میں اور لُو میں یہ اچھا نہیں ہے یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے تلوار لٹکائی نیزہ اٹھایا اونٹ پر سوار ہوئے اور با رفتاری کے ساتھ سرپٹ چل دیے۔ ایک روز رسول اللہؐ نے نظر اٹھا کر راستہ کی طرف دیکھا ایک سوار ریتلا راستہ دوڑتا نظر آیا حضورؐ نے فرمایا (خدا کرے) ابو خیثمہ ہو۔ تھوڑی دیر میں ابو خیثمہ حاضر خدمت ہو گئے۔ حضورؐ نے خوش ہو کر اُن کے لئے دعاء مغفرت کی۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق آیت نازل ہوئی جنہوں نے شروع میں آرام طلبی اختیار کی لیکن بعد کو آرام و آسائش پر لات مار کر شریک سفر ہو گئے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ:- اللہ نے اپنے نبی اور اُن مہاجرین و انصار پر رحمت نازل فرمائی جنہوں نے مشکل کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا

(مصائب سے تنگ آکر) قریب تھا کہ اُن میں کی ایک جماعت کے دل (رسول اللہ کی ہمرکابی سے) پھر جاتے مگر اللہ نے اُن پر نظر التفات فرمائی الخ

مقصود بیان:- مہاجرین و انصار پر نظر کرم ہونے کا اظہار۔ اس بات کی مدح کے پیرایہ میں صراحت کہ مہاجرین و انصار نے دشواری کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا اور منہ نہ موڑا۔ اس امر کی تصریح کہ اللہ کی اُن پر مہربانی تھی ورنہ اُن میں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی چھوڑنے کا خیال کر چکی تھی۔ اللہ کی رافت عامہ اور رحمت شاملہ کی لفظ۔ وغیرہ۔

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا

اور اُن تین شخصوں پر بھی مہربان ہوا جن کا معاملہ ملتوی رکھا گیا تھا یہاں تک کہ جب

ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ

زمین باوجود فراخی کے اُن پر تنگ ہو گئی

وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا

اور اُن پر اُن کی جانیں دو بھر ہو گئیں اور انھوں نے سمجھ لیا کہ سوا

مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ

خدا کے کہیں پناہ نہیں تو آخر میں اللہ اُن پر مہربان ہوا

لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ۧ

تاکہ وہ توبہ کئے رہیں بلاشبہ اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے

ع ۱۱

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَ

مسلمانو! اللہ سے ڈرو اور

كُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ○

سچوں کے ساتھ شامل رہو

تفسیر یہ آیت اُن تین مؤمنوں کے حق میں نازل ہوئی جو اغوائے نفس اور آرام طلبی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تبوک کو نہیں گئے تھے اور جب حضورؐ واپس تشریف لائے تو خدمت گرامی میں حاضر ہو کر انھوں نے اعتراف قصور کیا اور دوسرے منافقوں کی طرح جھوٹے عذر نہ پیش کئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی توبہ قبول نہ فرمائی اور حکم الٰہی کا انتظار کیا یہانتک کہ یہ آیت نازل ہوئی اور ان کی توبہ قبول ہوئی۔ یہ تین حضرات مرارہ بن ربیع بن عمرو عامری اور کعب بن مالک خزرجی اور ہلال بن امیہ بن عامر واقفی تھے۔ سعید بن جبیرؓ کی روایت میں مرارہ بن ربیع کی بجائے ربیع بن مرارہ آیا ہے۔ حسن بصری نے ربیع بن مراد کہا ہے لیکن روایت اول ہی صحیح ہے۔ صحیحین میں یہی وارد ہے۔

ہم حضرت کعب بن مالک کی زبانی آیت کا مفصّل قصّہ جو امام احمد اور زہری نے بیان کیا ہے نقل کرتے ہیں۔ بخاری و مسلم نے بھی یہ حدیث بیان کی ہے۔ حضرت کعبؓ کہتے ہیں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے جہاد کئے میں سب میں ہمرکاب رہا البتہ بدر میں شریک نہ ہوا تھا اور حضورؐ نے عدم شرکت بدر پر کسی کو عتاب بھی نہیں کیا۔ کیونکہ آپ قریش کے قافلہ کی تلاش میں نکلے تھے۔ اتفاق سے بغیر کسی میعاد کی تعیین کے دشمنوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں لیلۃ العقبہ میں بھی حاضر تھا جبکہ ہم سب نے حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت اسلام کی تھی

میرے نزدیک بدر کی حاضری سے لیلۃ العقبہ کی حاضری زیادہ اہم تھی اگرچہ
لوگوں میں بدر کی زیادہ شہرت ہے۔ ہاں تبوک میں میں رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب
نہیں گیا جس کا قصہ یہ ہے کہ غزوۂ تبوک کے زمانہ میں مجھے اتنی دسترس اور
قوت تھی کہ اس سے پہلے کسی جہاد کے وقت اتنی دسترس نہیں ہوئی۔ اس
غزوہ کے وقت میرے پاس دو سواریاں تھیں پہلے کبھی کسی غزوہ کے وقت دو
سواریاں اکٹھی میرے پاس نہیں ہوئیں۔ رسول پاک ﷺ کا دستور تھا کہ اگر
کسی جہاد کا ارادہ فرماتے تو آپ صراحت کے ساتھ کم فرماتے در پردہ اپنا ارادہ
ظاہر کر دیتے۔ غزوۂ تبوک کا جب ارادہ کیا تو کھلم کھلا بیان فرما دیا اور مقصد
کی تعیین فرما دی تاکہ لوگ سامان درست کر لیں کیونکہ زمانہ سخت گرمی کا تھا۔
سفر دور دراز اور بیچ میں چٹیل میدان تھا۔ دشمنوں کی تعداد کثیر تھی۔ حضور ﷺ
کے ساتھ جانے والے مسلمان اس قدر کثرت سے تھے کہ کسی رجسٹر میں تمام نام
اُن کا اندراج دشوار تھا۔ اسی وجہ سے جن لوگوں نے بچھڑنا چاہا اُن کا عموماً
یہ خیال ہوا کہ جب تک وحی نازل ہو میرے بچھڑنے کی اطلاع حضور ﷺ کو نہ ہوگی
حضور ﷺ نے اس غزوہ کا ارادہ ایسے وقت میں کیا جبکہ لذیذ پھلوں کی طرف
رغبت اور آرام دہ سایہ کی خواہش تھی۔ میں روزانہ مسلمانوں کے ساتھ
چلنے کے لئے سامان درست کرنے کا ارادہ کرتا تھا مگر بغیر کسی فراہمی کے ویسے
ہی لوٹ آتا تھا اور دل میں کہتا تھا جب چاہوں گا کر لوں گا۔ غرض وقت یونہی
گذرتا گیا۔ ساتھیوں نے خوب کوشش کر لی۔ ایک روز حضور ﷺ نے بہ نیت
جہاد کوچ کر دیا مؤمن ہمرکاب ہوئے میں نے کچھ سامان نہ کیا تھا خیال کیا
کہ ایک دو دن بعد سامان کر کے روانہ ہو جاؤں گا اور فوج سے جا ملوں گا دوسرے
روز صبح کی نماز کے بعد بھی سامان کی درستگی کے لئے نکلا مگر بغیر کسی درستگی کے
واپس آ گیا۔ دوسرا دن بھی اسی طرح گذرا۔ اسی ٹال مٹول میں وقت گذرتا گیا
یہاں تک کہ فوج دور جا پہنچی۔ میں نے ارادہ کیا کہ روانہ ہو کر جا ملوں۔ کاش

میں نے یہی کیا ہوتا لیکن میری تقدیر میں نہ تھا عجب حالت تھی شہر میں نکلتا تو دل گھبراتا سوا ان لوگوں کے جو نفاق میں ڈوبے ہوئے تھے یا سوا ان لوگوں کے جن کو اللہ نے معذور قرار دیا تھا اور کوئی دیکھنے والا نہ ملتا تھا۔ تبوک پہنچنے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یاد نہیں فرمایا۔ جب تبوک پہنچ گئے تو ایک روز محفل صحابہ میں تشریف فرما ہوتے اور فرمایا کعب بن مالک کو کیا ہو گیا؟ خاندان بنو سلمہ کے ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ! اسکو آرام طلبی اور بناوٹ سجاوٹ نے روک لیا۔ معاذ بن جبل بولے تم نے یہ بھونڈی بات کہی یا رسول اللہ! واللہ ہم کو سوا بھلائی کے اس کی کوئی بات معلوم نہیں حضورؐ خاموش رہے۔ بالآخر جب مجھے اطلاع ملی کہ حضورؐ واپس آ رہے ہیں تو مجھ پر افکار کا ہجوم ہو گیا اور جھوٹی تدبیریں بنانے لگا تا کہ حضورؐ کی ناراضگی اور ناخوشی سے کل کسی طرح بچ جاؤں اپنے آدمیوں سے ہر ہوشیار آدمی سے رائے لیتا تھا۔ جب یہ اطلاع ملی کہ حضورؐ کی سواری قریب آ پہونچی تو میرے دل سے تمام جھوٹے منصوبے مٹ گئے اور یقین ہو گیا کہ کسی جھوٹی بات سے رہائی ناممکن ہے لہذا صداقت کی اظہار کا پختہ ارادہ کر لیا۔ صبح کو مدینہ میں حضورؐ تشریف فرما ہوئے۔ حضورؐ کا قاعدہ تھا کہ سفر سے واپس تشریف لاتے تو پہلے مسجد میں آ کر دو رکعت نماز پڑھتے پھر لوگوں کی طرف رُخ کر کے بیٹھتے۔ حسب معمول حضورؐ نے یہی کیا۔ جو لوگ تبوک سے بچھڑ رہے تھے اُنہوں نے حاضر ہونا شروع کیا مسلسل اپنے اپنے عذر پیش کرتے اور قسمیں کھاتے رہے۔ یہ لوگ کچھ اوپر اسی آدمی تھے۔ حضورؐ ان کے ظاہری عذر کو قبول فرماتے اور استغفار کرتے اور ان کے باطن کو اللہ کے علم و حساب پر چھوڑ دیتے یہاں تک کہ میں نے حاضر ہو کر سلام کیا۔ حضورؐ نے غضب آلود تبسم فرمایا اور فرمایا ادھر آ۔ میں آگے بڑھ کر سامنے بیٹھ گیا۔ فرمایا تو کیوں رہ گیا؟ کیا تو نے سواری نہیں خریدی تھی؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر میں حضورؐ کے سوا کسی اور دنیادار آدمی کے سامنے

بیٹھتا تو مجھے یقین ہوتا کہ میں (جھوٹ بول کر) اس کے غصہ سے بچ جاتا کیونکہ
میں زبان آور طرار ہوں لیکن بخدا مجھے یقین ہے کہ اگر میں آپ سے جھوٹ بولوں کہ
آپ بظاہر مجھ سے راضی ہو جائیں تو ایسا ممکن ہے اور اگر میں آج آپ سے سچ بات
کہدوں تو آپ ضرور خشمگین ہونگے مگر مجھے امید ہے کہ اللہ کی طرف سے میرا انجام
اچھا ہوگا۔ لہذا عرض کرتا ہوں کہ واللہ مجھے کوئی عذر نہ تھا بلکہ اس زمانہ تخلف
سے پہلے میں کبھی اتنا خوش حال اور جاندار نہ تھا۔ حضور نے فرمایا اس شخص نے
سچ کہا پھر مجھ سے فرمایا اٹھ جا یہاں تک کہ اللہ تیرے حق میں فیصلہ کرے میں
اٹھ آیا۔ بنی سلمہ کے کچھ لوگ میرے پیچھے آئے اور کہنے لگے واللہ ہم کو نہیں
معلوم کہ اس سے پہلے تو نے کوئی نافرمانی کی ہو (یہ پہلا قصور تھا) تجھ سے
اتنا نہ ہو سکا کہ اور لوگوں کی طرح کوئی عذر کر دیتا اور اس (غلط عذر کی تلافی
کے لئے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرے لئے استغفار فرماتے تو کافی
تھا۔ الغرض لوگ مجھے برابر ملامت کرتے رہے یہاں تک کہ میرا ارادہ ہوا کہ
لوٹ کر پھر خدمت گرامی میں حاضر ہوں اور اپنے پہلے قول کے خلاف عرض کروں لیکن
لوگوں سے میں نے پوچھا کیا میری طرح کسی اور کو بھی حکم ملا ہے؟ کہنے لگے ہاں دو شخص
اور بھی ہیں جن کو تیری طرح حکم ملا ہے۔ میں نے پوچھا وہ کون ہیں؟ بولے مرارہ بن ربیع
عامری اور ہلال بن امیہ واقفی۔ جب انھوں نے ان دونوں آدمیوں کے نام لئے تو میں
نے اپنی راہ لی اور جھوٹے عذر کا خیال ترک کر دیا۔ غرض جو لوگ ہمرکاب نہ گئے تھے
ان میں سے صرف ہم تین آدمیوں سے بات چیت کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے مسلمانوں کو منع کر دیا تھا۔ چنانچہ لوگ ہم سے بچنے لگے ہماری طرف سے
بدل گئے یہاں تک کہ مدینہ کی سرزمین مجھے وہ نہیں معلوم ہوتی تھی جو پہلے تھی
اسی حالت پر ہم کو پچاس دن گذر گئے جس کی تفصیل یہ ہے میرے دونوں ساتھی
تو بیتاب ہو کر ایک جگہ بیٹھ گئے اور اپنی کوٹھریوں میں گوشہ گیر ہو کر گریہ زاری
میں مشغول ہو گئے مگر میں جیت اور جری تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ نمازوں میں

شریک ہوتا اور بازاروں میں پھرا کرتا مگر مجھ سے کوئی شخص کلام نہیں کرتا تھا حضور اقدس ؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا آپ نماز کے بعد یادِ الٰہی میں مشغول ہوتے میں سلام کرتا اور دل میں کہتا کہ میرے سلام کے جواب میں لبِ مبارک کو جنبش ہوئی یا نہیں ؟ پھر میں آپ ہی کے قریب نماز کو کھڑا ہوتا اور نظر چرا کر دیکھتا تو آپ کو اپنی طرف متوجہ پاتا اور میں نظر اٹھاتا تو حضورؐ نظر پھیر لیتے اسی طرح مدت گذر گئی مسلمانوں سے ترک تعلقات کو بھی زمانہ گذر گیا۔ ایک روز میں ابو قتادہ کے باغ کی دیوار پر چڑھ گیا وہ میرا چچا زاد بھائی اور سب سے زیادہ پیارا تھا۔ میں نے اُسکو سلام کیا مگر بخدا اُس نے مجھے سلام کا جواب نہ دیا۔ میں نے کہا ابو قتادہ ! میں تم کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں تم کو معلوم ہے کہ مجھے اللہ اور اُس کے رسول ؐ سے بہت محبت ہے وہ سُن کر خاموش رہا۔ میں نے دوبارہ قسم دی تو وہ پھر بدستور خاموش رہا۔ میں نے سہ بارہ قسم دی وہ پھر بھی خاموش رہا مگر اتنا لفظ ضرور کہا اللہ اور اُس کا رسول ہی خوب جانتا ہے۔ یہ سُن کر بے اختیار میرے آنسو نکل پڑے اور کود کر واپس آگیا۔ ایک روز میں مدینہ کے بازار میں پھر رہا تھا ایک نبطی ملک شام سے غلہ فروخت کرنے لایا تھا میں نے سنا کہ وہ میرا پتہ معلوم کر رہا ہے، لوگوں نے میری طرف اشارہ کر دیا۔ اُس نے مجھے لا کر شاہ غسان کا خط دیا میں چونکہ پڑھا ہوا تھا اسلئے پڑھنا شروع کر دیا اُسمیں لکھا تھا ہم کو اطلاع ملی ہے کہ تمہارے ساتھی نے تم پر ظلم کیا ہے خدا نے تم کو خواری اور مصیبت (میں رکھنے ، رنج سہنے کے لئے نہیں پیدا کیا) لہذا تم ہم سے ملجاؤ۔ ہم تمہاری بہت ہمدردی کریں گے۔" میں نے خط پڑھ کر دل میں کہا یہ بھی اللہ کی طرف سے آزمائش ہے۔ یہ خیال کر کے تنور کے پاس جا کر وہ خط اُسمیں ڈال کر جلا دیا۔ اس کے بعد جب منجملہ پچاس کے چالیس دن گذر گئے تو حضورؐ نے ایک پیامبر کے ذریعہ حکم بھیجا کہ اپنی بیوی سے الگ ہو جا۔ میں نے پوچھا کیا طلاق دیدوں کیا حکم ہوا

ہے؟ قاصد نے کہا نہیں بلکہ الگ رہو قربت نہ کرنا۔ حضور اقدس ﷺ نے ایسا
ہی حکم میرے دونوں ساتھیوں کو بھیجا تھا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا تم جا کر
اپنے میکے میں رہو جب تک خدا تعالیٰ اس کے متعلق کوئی حکم نازل فرمائے
لیکن ہلال بن امیہ کی بیوی نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول
اللہ! ہلال ایک بوڑھا اور کمزور آدمی ہے کام کاج کرنے کے لیئے اس کا
کوئی خادم بھی نہیں اگر میں اس کا کام کر دیا کروں تو یہ امر خلاف منشا تو نہ
ہوگا؟ فرمایا نہیں مگر وہ تجھ سے قربت نہ کرے وہ بولی یا رسول اللہ! واللہ
اس کو تو کسی چیز کی حس نہیں ہے۔ واللہ جب سے اس کا یہ معاملہ ہوا ہے اس
وقت سے اب تک وہ برابر روتا رہا ہے۔ حضرت کعبؓ کہتے ہیں مجھ سے میرے
بعض دوستوں نے کہا اگر تو بھی بیوی سے خدمت کرانے کی رسول اللہ ﷺ
سے اجازت لے لیتا تو اچھا تھا۔ ہلال کی بیوی کو حضور ﷺ نے اجازت دیدی ہے
میں نے کہا خدا کی قسم میں اجازت نہیں مانگوں گا معلوم نہیں حضور کیا فرمائیں
پھر میں تو تندرست اور جوان ہوں۔ غرض اسی حالت میں دس دن اور
گذر گئے اور ترک مکالمہ کے حکم کو پچاس دن پورے ہو گئے پچاسویں رات
کی صبح کو میں نے اپنے بالاخانہ کی چھت پر فجر کی نماز پڑھی اس وقت عجیب حالت
تھی اپنی جان دوبھر ہو رہی تھی زمین باوجود فراخی کے تنگ نظر آتی تھی۔ میں نماز
پڑھ کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک بلند آواز منادی نے نہایت بلند آہنگی سے سلع
پہاڑی پر چڑھ کر ندا دی بشارت ہو تجھ کو اے کعب بن مالک! آواز سنتے ہی
میں سرنگوں سجدہ میں گر پڑا اور سمجھ گیا کہ اللہ کی طرف سے کشائش آگئی یعنی
اس نے ہماری توبہ قبول فرمالی۔ حضور والا ﷺ نے نماز صبح کے بعد ہماری توبہ قبول ہونے
کی اطلاع لوگوں کو دیدی تھی۔ لوگ مجھے اور میرے دونوں ساتھیوں کو بشارت
دینے کے لئے دوڑے۔ خاندان بنو اسلم میں سے ایک شخص گھوڑے پر سوار
ہو کر میری طرف دوڑا۔ ایک اور اسلمی شخص پیادہ دوڑا اور کوہ سلع پر چڑھ کر پکارا

اسکی آواز گھوڑے سے پہلے پہونچی جب وہی شخص جسکی آواز میں نے سنی تھی میرے پاس پہنچا میں نے اسکے احسان بشارت کے شکریہ میں اپنے تن کا لباس اتار کر اسکو پہنا دیا باوجودیکہ میری ملک میں سوا اُن دو کپڑوں کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہ تھا۔ میں نے دو کپڑے ایک شخص سے عاریت لیکر پہن لئے اور خدمت گرامی میں حاضر ہونے کے ارادہ سے چلا۔ راستہ میں گروہ گروہ اہل اسلام مجھ سے ملتے اور توبہ قبول ہونے کی بشارت و مبارکباد دیتے تھے یہانتک کہ میں مسجد میں داخل ہوا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے طلحہ بن عبیداللہ نے اٹھ کر لپک کر مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارکباد دی مگر طلحہ کے علاوہ کوئی اور مہاجر مبارکباد دینے نہیں کھڑا ہوا۔ میں نے حضورؐ کو سلام کیا حضورؐ کا چہرہ فرط مسرت سے دمک رہا تھا۔ ارشاد فرمایا ایسے اچھے دن کی تجھ کو بشارت ہو پیدائش سے لیکر اس وقت تک کے تمام ایام سے یہ دن تیرے لئے بہتر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ مسرت کے وقت چہرۂ مبارک ماہ پارہ کی طرح دمکنے لگتا تھا اور اس علامت سے واضح طور پر لوگ مسرت کا اندازہ کر لیتے تھے۔ میں نے سامنے بیٹھ کر عرض کیا میں اپنی توبہ کے قبول ہونے کے شکریہ میں اپنے کل مال سے صاف الگ ہونا در راہ اللہ اور اسکے رسول کے حضور میں بطور صدقہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ فرمایا کچھ حصہ اپنے پاس بھی رکھو وہ بہتر رہے لئے بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا بہت خوب جو حصہ میرا خیبر میں ہے اس کو بچا لونگا۔ پھر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے میری صداقت ہی نے بچا لیا اب توبہ کے شکریہ میں عہد کرتا ہوں کہ جب تک دنیا میں باقی ہوں سچ ہی بولونگا چنانچہ اس وقت سے آج تک کبھی عمداً میں نے کوئی جھوٹی بات نہیں کہی اور امید ہے کہ جب تک زندہ رہونگا اللہ مجھے جھوٹ سے محفوظ رکھیگا۔ حضرت کعبؓ نے فرمایا قبول توبہ ہی کے متعلق اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں:۔ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ

الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ سے وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ تک اللہ نے مجھے اسلام کی نعمت
جب سے عطا فرمائی اُس کے بعد سے کوئی نعمت میرے لیئے اس بات سے بڑھ کر نہیں ہوئی
کہ میں نے حضور اقدس ﷺ سے سچ سچ عرض کر دیا اگر کہیں میں جھوٹ بول دیتا تو میں بھی اسی طرح
برباد ہو جاتا جیسے وہ لوگ برباد ہوئے جنہوں نے جھوٹ بولا تھا اُنہی کے متعلق اللہ
نے نازل فرمایا سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ سے لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ تک
حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم تین آدمیوں کو جو قرآن میں مؤخر قرار دیا تو یہ مؤخر ہونا بہ نسبت
اُن لوگوں کے ہے جو غزوۂ تبوک پر نہیں گئے تھے کیونکہ اُنہوں نے حضور ﷺ سے جھوٹے
عذر کر دیے تھے۔ حضور ﷺ نے اُن سے بیعت لیکر اُن کے لئے دعاءِ مغفرت کر دی تھی
اور ہمارے معاملہ کو پیچھے چھوڑ دیا تھا یہاں تک کہ اللہ نے اس امر کے متعلق حکم
نازل فرمایا (قال الحافظ ابن کثیر ہذا حدیث حسن صحیح قد رواہ البخاری و مسلم
من حدیث الزہری بنحوہ)

مقصود بیان :- رسول اللہ ﷺ کا استغفار اُسی وقت کافی ہوگا جب خود
گناہگار دل سے تائب ہو۔ ظاہری صورت سے توبہ کرنا اور رسول اللہ ﷺ سے استغفار
کرانا کافی نہیں۔ نیکوں کی پیروی اور اتباع کو ترک نہ کرنا چاہیئے بلکہ حق کی طرف
مائل ہونا چاہیئے خواہ بہکانے والے کتنا ہی بہکائیں۔ اگر گناہگار اپنے اہل و عیال
اور مال و منال سے ترک تعلق کر کے دل سے خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو رحمتِ
الٰہی اُس پر نازل ہو جاتی ہے۔ توبہ کرنے والے کی توبہ ایسی ہونی چاہیئے کہ تمام
زمین بلکہ اپنی جان بھی اُس پر تنگ ہو جائے اور یقین کرلے کہ اللہ کے سوا کوئی
جائے پناہ نہیں معمولی لذتِ نفس اور آرام جان حاصل کرنے کی وجہ سے بھی
انسان سخت ترین گرفت میں آجاتا ہے اس لئے جان و مال کی قربانی کرنی اور
خواہشِ نفس کو ترک کرنا لازم ہے۔ اللہ نے مومنوں کی جانیں اور مال خرید لیا
ہے۔ حضرت کعب اور اُن کے دونوں ساتھیوں نے چونکہ مبیع کو روکا تو مجرم قرار
دیئے گئے لیکن صدقِ دل سے پھر فروخت کی ہوئی چیز پیش کر دی تو قصور معاف

ہوا۔ سچ بولنا سچوں کے ساتھ شامل ہونا اور ہر وقت صداقت کا اظہار کرنا ہے۔ قول عمل نشست برخاست خواب بیداری حرکت و سکون ہر چیز میں صداقت کو ملحوظ رکھنا

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ

اہل مدینہ کو اور ان کے گرد نواح کے دیہاتیوں کو مناسب

الْأَعْرَابِ أَن يَتَخَلَّفُوا عَن رَّسُولِ اللَّهِ

نہ تھا کہ رسول اللہ کی ہمراہی سے پیچھے رہ جائیں

وَلَا يَرْغَبُوا بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِ ذَٰلِكَ

اور نہ یہ مناسب تھا کہ رسول کی جان سے زیادہ اپنی جان کو چاہیں کیونکہ ان

بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا

لوگوں کو راہ خدا میں جو پیاس تکلیف اور

مَخْمَصَةٌ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَطَئُونَ

بھوک پہونچتی ہے اور جس مقام کو پامال کرتے اور

مَوْطِئًا يَغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُونَ مِنْ

اس کی وجہ سے کافروں کو غصہ آتا اور جو چیز دشمن سے پاتے ہیں

عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِ عَمَلٌ صَالِحٌ

ہر ایک کے عوض نیک عمل ان کے لئے لکھے جاتے ہیں

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝

کیونکہ اللہ مخلصوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ہے

وَلَا يُنفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً

اور وہ جو کوئی چھوٹی بڑی چیز خرچ کرتے ہیں

وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ

اور جو میدان طے کرتے ہیں سب کچھ اُن کے لئے لکھ لیا جاتا ہے

لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

تاکہ اللہ اُن کے اعمال کا بہتر سے بہتر عوض عطا کرے

تفسیر چونکہ غزوۂ تبوک میں ساکنانِ مدینہ اور حوالی مدینہ کو چلنے کی دعوت دی گئی تھی دور کے رہنے والے مسلمانوں کو عمومی دعوت نامے نہیں بھیجے گئے تھے اسلئے خصوصیت کے ساتھ مدینہ اور اطراف مدینہ والوں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ:۔

کسی طرح جائز نہ تھا کہ مدینہ کے رہنے والے اور وہ دیہاتی جو مدینہ کے چاروں طرف رہتے ہیں اپنی جانیں بچا کر بیٹھے رہیں اور رسول اللہ صلعم کا ساتھ نہ دیں یعنی اپنی جان پیاری سمجھنا اور رسول پاک صلعم کو یونہی چھوڑ دینا کس طرح جائز ہے جب رسول اللہ صلعم بنفس نفیس جہاد پر تشریف لیگئے اور راہِ خدا میں اپنی جان کو پیش کیا تو پھر کسی دوسرے کی جان اتنی کب گراں مایہ ہوسکتی ہے کہ جہاد سے منہ موڑ کر تن آسانی اور آرام طلبی کے لئے گھر بیٹھے رہیں۔ حقیقتاً رسول اللہ صلعم کے ہمرکاب جانا فرض تھا کیونکہ راہِ خدا میں سفر کرنے والوں کو دورانِ سفر میں جس قسم کی بھی تکلیف

اٹھانی پڑے بھوک ہو پیاس ہو تھکان ہو کسی ایسے مقام پر چلنا پڑے جو کفا
کی ناخوشگواری کا سبب ہو دشمن سے مقابلہ ہو جائے اور انہیں دشمن کو شکست ہو
اُن کے آدمی گرفتار ہو جائیں مال لوٹا جائے، بہرحال کچھ بھی ہو ہر حرکت کے
عوض مجاہد کے لئے نیکی لکھی جاتی ہے اور نیکی کا اجر رائگاں نہیں جا سکتا اس کے
علاوہ راہِ خدا میں جو کچھ تھوڑا بہت خرچ کریں یا سفر کریں سب کا اجر براہِ
راست اللہ عطا فرمائے گا۔

تلمیح:- جہاد کے متعلق بکثرت احادیث وارد ہیں۔ زید بن خالدؓ کی روایت
ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا جس نے غازی کا سامان درست کر دیا اُس نے
جہاد کیا اور جس نے غازی کے پیچھے خبر گیری کی اُس نے جہاد کیا۔ سہل بن سعد
ساعدیؓ کی روایت ہے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ کی راہ میں ایک روز کا
رباط یعنی ایک روز مستعد اور تیار ہو کر رہنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ ابو سعید
خدریؓ سے مروی ہے ایک شخص نے حضور اقدس ﷺ سے پوچھا کون آدمی افضل
ہے؟ فرمایا وہ مومن جس نے اللہ کی راہ میں اپنی جان سے جہاد کیا (معالم ز
سراج) شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عثمان رضؓ کو اس آیت
کا بڑا حصہ نصیب ہوا کیونکہ انہوں نے اس جہاد میں بڑا مال خرچ کیا۔ حضرت
عبدالرحمن بن حباب سلمی کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے جیش العسرۃ کی امداد کی ترغیب
دلائی تو حضرت عثمانؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ سو اونٹ مع پالان و مہار
کے میرے ذمہ۔ حضور ﷺ نے دوبارہ ترغیب دی تو حضرت عثمانؓ نے عرض کیا یا
رسول اللہ! سو اونٹ مع پالان و مہار کے مزید میرے ذمہ۔ حضور ﷺ ممبر سے ایک
زینہ اُتر آئے اور پھر امداد کی اپیل کی۔ حضرت عثمانؓ نے عرض کیا حضور اور سو اونٹ
مع پالان و مہار کے میرے ذمہ۔ حضور ﷺ نے دست مبارک کو جنبش دیتے ہوئے
فرمایا عثمان اس کے بعد جو کچھ کرے اُس پر کچھ (مواخذہ) نہیں۔ عبدالرحمن بن
سمرہؓ کی روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ ہزار اشرفیاں اپنے کپڑے میں لائے

جس سے حضور ﷺ نے جیش العسرت کا سامان فراہم کیا۔ حضرت عثمانؓ نے اشرفیاں لا کر حضور ﷺ کی گود میں ڈال دیں۔ سرکارِ عالی ﷺ ان اشرفیوں کو بار بار الٹتے پلٹتے اور فرماتے تھے عثمان آج کے بعد جو کچھ بھی کرے اُسکو کچھ ضرر نہ ہوگا۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ

اور یہ ٹھیک نہیں کہ مسلمان سب کے سب نکل کھڑے ہوں

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ

اُن کے ہر گروہ میں سے چند آدمی اس غرض سے کیوں نہیں نکلے

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ

کہ دینی مسائل میں سمجھ پیدا کریں اور واپس آ کر اپنی قوم کو

إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۝

ڈرائیں تاکہ وہ بھی (ممنوعات سے) پرہیز رکھیں

تفسیر اس آیت کے اسباب نزول مختلف بیان کیے جاتے ہیں اور شان نزول کے اختلاف سے مطلب میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے ہم کسی قدر تفصیل آمیز لبسط سے تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔

ابن کثیر کی رائے ہے کہ جب مؤمنوں کو غزوۂ تبوک سے بچھڑنے پر ملامت کی گئی تو عام مؤمنوں کے دلوں میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی چنانچہ تبوک کے بعد جب کسی جہاد پر حضور اقدس ﷺ نے کوئی سریہ روانہ کیا تو سب لوگ چلے گئے اس پر مذکورہ بالا آیات کا نزول ہوا۔

حضرت ضحاک فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خود جہاد کو تشریف

(۱) ان آیات کا مقصود بیان اگلی آیت سے ہے کے مقصود بیان کے ذیل میں درج ہے۔

لے جاتے تو کسی مسلمان کے لئے غیر حاضری جائز نہ تھی سوا ایسے لوگوں کے جو معذور
تھے اور جب حضورؐ خود تشریف نہ لے جاتے بلکہ چھوٹی چھوٹی کمپنیاں کسی صحابی
کے زیر کمانڈ روانہ کرتے تو کسی مسلمان کے لئے جائز نہ تھا کہ بغیر حضورؐ کی اجازت
کے شریک جہاد ہو جاتا لہذا کچھ لوگ ہمراہ چلے جاتے اور کچھ رہ جاتے۔ روانہ ہو جانے
کے بعد جو کچھ احکام الٰہی نازل ہوتے تو جو لوگ حاضر ہوتے وہ اسی وقت فائدہ
اٹھاتے باقی جہاد پر جانے والے حضرات جب واپس آتے تو یہ لوگ اس وقت انکو
بتا دیتے۔ یہ طریقہ اسی حکم کے تحت تھا جسکی تعلیم آیات وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ
الخ میں دی گئی ہے۔ ضحاک کے قول کا خلاصہ یہ نکلا کہ جہاد کو عام طور پر جانا اس
وقت واجب تھا جب حضورؐ خود تشریف لیجاتے اور دعوتِ جہاد بھی عام ہوتی
اگر حضورؐ خود شریک نہ ہوتے یا دعوت عام نہ ہوتی تو عموم شرکت واجب کیا
جائز بھی نہ تھی۔ اس تقدیر پر آیات کا مطلب یہ ہوگا کہ اہل ایمان کو اختیار
نہیں کہ سب کے سب جہاد پر چلے جائیں (اور رسول اللہؐ مدینہ میں مقیم ہوں) ایسا
کیوں نہیں کرتے کہ ہر قبیلہ اور ہر گروہ میں کے کچھ لوگ جہاد کو چلے جاتے اور کچھ لوگ
رسول اللہؐ کے پاس رہ جاتے تاکہ اہل اقامت کو ان احکام کا علم ہوتا رہتا جو
مجاہدین کی روانگی کے بعد اللہ نازل فرماتا اور پھر جب اہل جہاد واپس آتے تو یہ
اہل اقامت مجاہدین کو وہ احکام پہنچا دیتے۔ علی بن ابی طلحہ اور قتادہ کی روایت
ابن عباسؓ سے ہے وہ بھی ضحاک کے قول کی تائید کرتی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی ایک دوسری روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ جب حضور
اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ مضر کے لئے بد دعا کی اور وہ سخت ترین قحط
میں مبتلا ہو گئے تو ان میں کی ایک کثیر التعداد جماعت بظاہر مسلمان ہو کر مدینہ
میں آئی اور حضور اقدسؐ کے پاس مہمان ٹھہری۔ مدینہ کے مسلمانوں کو اس کے
آنے سے تکلیف ہو گئی اور چونکہ دراصل یہ مسلمان نہ تھی اسلئے آیات مذکورہ نازل
ہوئیں اور حضورؐ نے ان کو نکال دیا۔ اس تقدیر پر آیات کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ سب

جو سب کے سب چلے آئے۔ ایسا کیوں کیا۔ مومنوں کی یہ علامت نہ تھی اگر مسلمان ہو گئے تھے تو کچھ لوگ آکر احکام دین سیکھ کر چلے گئے ہوتے اور نہ آنے والے لوگوں کو ان احکام کی اطلاع دیدی ہوتی۔

حضرت عکرمہ رضہ کی روایت ہے کہ جب آیات اِلَّا تَنْفِرُوْا الخ اور مَا کَانَ لِاَهْلِ الْمَدِیْنَةِ الخ وغیرہ نازل ہوئیں جن سے مفہوم ہوتا تھا کہ جہاد پر جانا عموماً واجب ہے تو منافق کہنے لگے کہ پھر تو وہ سب مومن برباد ہو گئے جو دور جنگلوں میں تھے اور رسول اللہ صلعم کے ہمرکاب نہ جا سکے تھے۔ منافقوں کے اس قول کے رد میں خدا تعالیٰ نے آیت وَمَا کَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ اور آیت وَالَّذِیْنَ یُحَاجُّوْنَ فِی اللّٰهِ الخ نازل فرمائیں۔ اس تقدیر پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ سب مسلمانوں کا جہاد پر جانا لازم نہیں ایسا کیوں نہ ہو کہ ہر قبیلہ میں کا ایک گروہ رسول اللہ صلعم کے ہمرکاب جہاد کو جائے اور دوران سفر میں قرآن مجید کے جو احکام نازل ہوں اُن کو سمجھے اور پھر واپس آنے کے بعد اُن لوگوں تک وہ احکام پہنچائے جو جہاد پر نہیں گئے تھے بلکہ امور معاش وغیرہ کی تکمیل کے لئے یا کسی اور دینی ضرورت سے رہ گئے تھے۔

حضرت مجاہد کی روایت ہے کہ آیۂ کریمہ اُن چند صحابہ کے حق میں نازل ہوئی جو تبلیغ اسلام کے لئے دور دراز دیہات میں نکل گئے تھے وہاں ان کو مدت زیادہ لگ گئی۔ دینی ضرورت کی وجہ سے کچھ دنوں ٹھہرنا پڑ گیا اور خدا تعالیٰ نے وہاں اُن کو دولت و مال بھی عطا کیا۔ ایک تو تبلیغ احکام الٰہی کا شوق۔ دوسرے کاروباری مشغولیت غرض وہاں سے وہ واپس نہ آسکے بعض لوگوں نے اُن سے کہا بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ لوگوں نے اپنے یاروں اور عزیزوں کو چھوڑ دیا اور ہمارے پاس آکر رہ پڑے۔ ان الفاظ کے سنتے ہی ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ عوفی نے ابن عباس رضہ سے جو روایت نقل کی ہے اس سے بھی مجاہد کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مقصود بیان :- جب حضور اقدس ﷺ بنفس نفیس جہاد میں شریک ہوں تو پھر ہر اس مومن کے لئے جسکو دعوت جہاد پہنچ گئی ہو اور شرعی عذر بھی نہ ہو شریک ہونا واجب ہے۔ رسول کی محبت اپنی جان سے زیادہ ہونا ضروری ہے۔ اپنی جان کو عزیز رکھنا اور رسول اللہ ﷺ پر اپنی جان قربان نہ کرنا کسی طرح جائز نہیں راہ خدا میں جو کچھ تکلیف اٹھائی جائے اور تھوڑا بہت جو کچھ مال صرف کیا جائے اس کا ثواب ضرور ملیگا۔ راہ خدا میں جہاد کرنا احسن الاعمال ہے۔ آیت میں اس طرف بھی ایما ہے کہ جہاد کے موقع پر حربی کفار کے مقابلہ میں ایسی ہر تدبیر کرنی لازم ہے جس سے کفار کو نقصان پہنچے اور ان کی ناخوشگواری کا باعث ہو۔ دشمنوں کو جانی اور مالی نقصان پہنچانا بھی اجر عظیم کا موجب ہے۔

دین میں فقاہت حاصل کرنیکے لئے انتہائی کوشش کرنا اور مشقت اٹھانا لازم ہے۔ ہر فرقہ میں سے ایک گروہ ضرور امام وقت کے پاس جاکر دینی احکام سیکھے اور واپس آکر اپنی قوم کو بتائے۔ تمام مسلمانوں کا ایک ہی رخ کی طرف ہو جانا خواہ وہ جہاد ہو یا تحصیل مسائل دینیہ کسی طرح جائز نہیں۔ تکمیل معاش بھی ضروری چیز ہے۔ آیت سے ان طلباء علم کی مدح مستنبط ہوتی ہے جو علم دین کے حصول کے لئے دور دراز سفر اختیار کرتے اور بیکسی کی زندگی بسر کرتے ہیں دین میں فقاہت حاصل کرنیکے یہ معنی نہیں کہ نماز روزہ کے مسائل سیکھے جائیں بلکہ عام طور پر حرام و حلال کا علم مراد ہے، خواہ عبادات میں ہو یا معاملات میں وجدانیات میں ہو یا اخلاقیات میں۔ وغیرہ

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ

مسلمانو! اپنے آس پاس کے کافروں سے

مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً ؕ

لڑتے چلو اور لازم ہے کہ وہ تم میں سختی پائیں

الربع

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ○

اور جانے رہو کہ اللہ پرہیزگاروں کا حامی ہے

تفسیر اشاعت اسلام اور تبلیغ احکام اس وقت تک ناممکن ہے جب تک میدان صاف نہ ہو کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ ہو۔ مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیاں اور فتنہ انگیزیاں کرنے کا دروازہ بند نہ کر دیا جائے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مدینہ کے اندر اور باہر کچھ لوگ مسلمانوں کو ضرر پہنچانے کی انتہائی کوشش کرتے تھے۔ مدینہ کے یہودی اور دوسرے کفار ہر وقت مسلمانوں کی بیخ کنی کی تدبیروں میں سرگرم رہتے تھے۔ کبھی قبائل قریش کو مسلمانوں پر چڑھائی کرنے پر آمادہ کرتے کبھی قبیلۂ ہوازن کو بھڑکاتے قریش کے قافلہ نے حارث غسانی بادشاہ شام کو جا کر ورغلایا حارث نے ہرقل شاہ روم کو آمادہ کیا۔ غرض مسلمانوں کے خلاف ایک عام لہر تھی جو اطراف ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایسے وقت میں آیت مذکورہ نازل ہوئی اور مسلمانوں کو حکم ہوا کہ اسلام کے خلاف سازشوں کی بیخ کنی کرو اور کافروں سے قتال کرو اور جہاد میں ابتدا ان لوگوں سے ہونی چاہئے جو قریب ترین رہنے والے ہیں۔ قریب کے رہنے والوں سے مراد بعض علماء کے نزدیک بنو قریظہ اور بنو نضیر کے یہودی ہیں۔ بعض کے نزدیک شام کے عیسائی مراد ہیں لیکن چونکہ آیت میں کوئی تخصیص نہیں اس لئے آیت کو عموم ہی پر محمول کرنا اولیٰ ہے۔ حضور ؐ نے اسی آیت کے موافق کفار سے جہاد کئے پہلے اقارب کو تبلیغ اسلام کی پھر اہل حجاز کو پھر عام عرب کو پھر تبوک والوں پر چڑھائی کی۔ حضور ؐ کے خلفاء نے بھی اسی پر عمل کیا۔ عرب سے فارغ ہو کر ملک شام عراق وغیرہ ممالک کو فتح کیا اور کفر کی بستیوں میں اسلام کا جھنڈا گاڑا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ مسلمانو! پہلے پاس کے رہنے والے کافروں سے جہاد کرو اور انتہائی جرأت، صبر، استقلال اور مضبوطی سے کرو مگر خواہش نفس اور دنیا طلبی کو

اس قتال میں دخل نہ دو بلکہ تقویٰ قائم رکھو اللہ کے واسطے جہاد کرو اور کفار کی کثرت، اُن کے اسلحۂ جنگ کی بہتات اور قوت و شوکت کی فراوانی سے اندیشہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم ترک گناہ اور دنیا طلبی سے بچتے رہو گے اور باہمہ بے ہمہ کی تعلیم پر عمل کرتے رہو گے تو فتح تمہاری ہو گی۔ اللہ تمہارے ساتھ ہو گا کیونکہ اللہ اہل تقویٰ کی مدد کرتا ہے تم متقی رہو گے تو تمہاری بھی مدد کریگا۔

مقصود بیان :- جہاد کا حکم۔ کفار کے مقابلہ میں جرأت صبر اور استقلال رکھنے کا امر۔ کافروں کی کثرت اور اُن کے ساز و سامان کی فراوانی سے اندیشہ نہ کرنے کی ضمنی تلقین اور اس امر کی صراحت کہ مسلمان کے پیش نظر ہر وقت تقویٰ ہونا چاہیئے۔ اللہ اہل تقویٰ کی مدد کرتا ہے خواہ اُنکے حریف کتنے ہی قوی ہوں وغیرہ

وَإِذَا مَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن

جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو بعض منافق کہتے ہیں

يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِ إِيمَانًا ۚ

تم میں سے کس کے ایمان میں اس سورت سے اضافہ ہوا؟

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا

جو ایمان رکھتے ہیں اُن کے ایمان میں اس سے اضافہ ہوتا ہے

وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ

اور وہ خوش ہوتے ہیں　　اور جن کے

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ

دلوں میں مرض ہے　　ان میں اس سے اور گندگی بڑھ

رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ اَوَلَا يَرَوْنَ

گندگی بڑھتی ہے اور کفر کی حالت میں یہی کہ مرجاتے ہیں کیا وہ نہیں دیکھتے

اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ

کہ ہر سال ایک بار یا دو بار اُن کی آزمائش کی جاتی ہے

مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝

پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت پکڑتے ہیں

تفسیر مفسر سراج و بیضاوی وغیرہ نے بیان کیا کہ جہاد دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو تلوار کے ذریعہ سے دوسرا برہان و حجت سے۔ منافق چونکہ بظاہر اسلام کے مدعی تھے اسلئے اُن کے مقابلہ میں تلوار سے جہاد کا حکم نہ تھا لیکن برہانی جہاد ضروری تھا۔ منافق اپنی باطنی خباثت سے اہل ایمان کو راہ حق سے روکتے تھے اور طرح طرح کے شکوک مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے تو اُن کے مقابلہ کیلئے جب تک اُنکی فریب کاریاں ظاہر نہ کردی جائیں اور مسلمانوں کو اُن کی فتنہ پردازیوں کی اطلاع نہ دیدی جائے اُس وقت تک فساد کی جڑ نہیں کٹ سکتی۔ کھلم کھلا کافر اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں کرتے تھے جن کی بندش کے لئے جہاد کا حکم گذشتہ آیت میں دیا گیا۔ منافق اندرونی طور پر مسلمانوں کو بہکا کر شجرۂ اسلام کی جڑ کاٹنے کی کوشش کرتے تھے اُن کے پول کھولنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جب قرآن پاک کا کوئی حصہ جدید نازل ہوتا تو منافق چونکہ خود مؤمن نہیں اسلئے بطور مذاق کے بھولے بھالے مسلمانوں کے دلوں میں شک ڈالنے کے لئے اُن سے کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم بھی مؤمن ہیں مگر ان آیات

کے نزول سے ہمارے ایمان و یقین میں تو کچھ اضافہ نہیں ہوا تم میں سے کس کے ایمان میں بیشی ہوئی؟ واقعی منافقوں کو آیات سے کوئی ایمانی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ مگر مسلمانوں کے ایمان میں ضرور اضافہ ہوتا ہے اُن کے دلوں میں فرحت اور روحوں میں سرور پیدا ہوتا ہے یہ اپنے اپنے ظرف کا اختلاف ہے۔ صحت و مرض کا اختلاف ہے قابلیت کا اختلاف ہے۔ جن کے دل صحیح ہیں جنکی روحیں سالم ہیں اُن کو غذاءِ آیات سے مزید قوت ایمانی حاصل ہوتی ہے اور یہ مقوی غذا اُن کے لئے مفرح اور کیف آور ہوتی ہے لیکن جن کے دل بیمار ہیں روحیں مضمحل اور افسردہ ہیں فطری قوتیں نجس ہیں اُن کو اس پاکیزہ مفرح غذا سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے اُن کے روحانی مرض میں مزید اضافہ ہوتا ہے کفر کی خباثت میں اور زیادتی ہو جاتی ہے اور مرتے دم تک یہ مرض پیچھا نہیں چھوڑتا۔ باوجودیکہ عبرت اور نصیحت دلانے کے لئے ہر سال اُنکی آزمائش کی جاتی ہے اور طرح طرح کی تکلیفوں سے اُن کو دوچار ہونا پڑتا ہے مگر دل سے حق کی طرف رجوع نہیں کرتے اور واقعاتِ عبرت دیکھتے ہوئے بھی نصیحت حاصل نہیں کرتے

توضیح یُفْتَنُوْنَ فِیْ کُلِّ عَامٍ مَّرَّۃً اَوْ مَرَّتَیْنِ کی تفسیر علماء نے مختلف طور پر کی ہے۔ مجاہد کے نزدیک سختی قحط اور گرسنگی مراد ہے۔ ابن عطیہ کے نزدیک مختلف بیماریاں۔ قتادہ نے کہا کہ ہر سال منافقوں کو بمجبوری رسول اللہ ؐ کے ہمرکاب دو ایک مرتبہ جہاد پر جانا ہوتا تھا۔ حضرت حذیفہ رض کا قول ہے کہ منافق ہر سال کوئی ایسا جھوٹ بولتے تھے جس سے کچھ لوگ دین سے پھر جاتے تھے (عن ابن سعید باسناد آخر) بعض کہتے ہیں کہ منافق ہر سال دو ایک بار فضیحت ہوتے تھے یا دو ایک بار ایمان کی طرف آکر پھر مرتد ہو جاتے تھے یا ہر سال دو ایک مرتبہ عہد شکنی کرتے تھے۔ بیضاوی کہتے ہیں کہ آیت میں چونکہ کوئی تخصیص نہیں اس لئے عموم معنی پر حمل کرنا اولیٰ ہے۔

مقصود بیان:۔ قرآن سرچشمۂ فیض اور آفتاب ہدایت ہے اُسکی نورپاشی یکساں ہے لیکن اختلاف قابلیت کی وجہ سے بعض کو فائدہ اور بعض کو نقصان پہنچتا ہے۔ خدایا قرآن کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ انسان کے خود روحانی امراض اور قلبی کثافتیں اُسکو تباہ کرتی ہیں۔ گویا آیت سے یہ امر مستنبط ہوتا ہے کہ قرآن سے جس شخص کو ہدایت حاصل نہ ہو بلکہ شکوک میں اضافہ ہوتا جائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا دل بیمار ہے روح کثیف ہے دماغ پر زنگ چڑھ گیا ہے اور اسکی قوتوں میں عفونت کا مادہ موجود ہے نور قرآنی سے اُن میں اور تعفن پیدا ہوتا ہے۔ آیت میں اس بات کی صراحت ہے کہ تنگی معاش بیماری قحط سالی حکام کا تغلب اور ظلم غرض ہر تکلیف درحقیقت خدا کی طرف سے آزمایش ہوتی ہے لیکن جو بدبخت ہیں اُن کو واقعات عبرت سے بھی کوئی تنبہ حاصل نہیں ہوتا۔ بطور مفہوم مخالف مسلمانوں کو نصیحت ہے کہ ہر مصیبت کے وقت خدا کی طرف رجوع کریں اور صدق دل سے توبہ کریں۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ

اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو اُن میں سے ایک دوسرے کی طرف

اِلٰى بَعْضٍ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ

دیکھتا ہے کہ تم کو کوئی دیکھتا تو نہیں ہے پھر

انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ

چل دیتے ہیں اللہ نے اُن کے دل پھیر دیئے ہیں کیونکہ یہ لوگ

قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ○

سمجھ نہیں رکھتے

تفسیر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ جب کوئی سورۃ نازل ہوتی تو آپ مسجد مبارک میں آکر بیٹھتے مسلمان چاروں طرف حلقہ کر لیتے حضور تلاوت فرماتے مسلمان سننے میں اس قدر غرق ہوتے کہ کسی کو دوسرے کی طرف توجہ کرنے کا خیال بھی نہ آتا ۔ حسب معمول جب سورۂ براءۃ نازل ہوئی اور حضور نے مسجد میں تشریف لاکر تلاوت فرمائی اور اسمیں منافقوں کی حالت کا کچا چٹھا کھول کر بیان کیا گیا تو منافقوں نے چپکے چپکے کھسکنا شروع کیا اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر آپس میں کہنے لگے دیکھو کوئی مسلمان تم کو دیکھتا تو نہیں ہے ؟ لیکن مسلمانوں کو ان کے دیکھنے کا کب ہوش تھا وہ تو کلام الٰہی کے سننے میں ہمہ تن غرق تھے اسلئے منافقوں کو موقعہ ملا اور وہ چپکے چپکے چل دیئے اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی ۔

ماحصل ارشاد یہ ہے کہ منافقوں کی عجیب حالت ہے جب قرآنی سورت نازل ہوتی ہے اور اُن کے سامنے برسر عام پڑھی جاتی ہے تو اُن کو اس کے سننے سے ایسی نفرت ہوتی ہے کہ وہاں بیٹھنا بھی گوارا نہیں ہوتا اور چونکہ کھلم کھلا اٹھکر آنے سے نفاق کے اظہار کا اندیشہ ہوتا ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں مسلمان ہم کو منافق سمجھنے لگیں اسلئے آپسمیں ایک دوسرے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں دیکھو کہیں کوئی تم کو دیکھ تو نہیں رہا ہے ۔ یہ کہنے کے بعد موقعہ کو غنیمت سمجھ کر منہ موڑ کر چل دیتے ہیں یا بمجبوری بیٹھے رہتے ہیں مگر بادل ناخواستہ اُن کے دل حق کے سننے سے پھرے رہتے ہیں چونکہ راہ حق اور سچی بات کو سمجھنے کی وہ کوشش نہیں کرتے اور نہ سمجھتے ہیں اس لئے اللہ بھی اُن کے دلوں کو حق سے پھیر دیتا ہے ۔

ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ بندوں کے دل اللہ کے دست قدرت میں ہیں ادھر ادھر جیسے چاہتا ہے موڑ دیتا ہے ۔

مقصود بیان :۔ منافقوں کی حالت زار کا بیان ۔ اس بات کی طرف ہدایت کہ بادل ناخواستہ بیٹھا رہنا منافقوں کے لئے سود مند نہیں ہوتا ۔ دوبدوہ مسلمانوں کے

ذوق شوق کی مدح کہ کلام حق کے سننے میں ایسے ڈوبے ہوتے ہیں کہ کسی اور طرف توجہ کرنے کا اُن کو خیال بھی نہیں ہوتا۔ کلام ربانی کی تلاوت کے وقت اُن کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ کون آیا اور کون گیا۔ اس بات کی صراحت کہ جو لوگ خود دانش وفقاہت حاصل کرنا نہیں چاہتے راہ حق کی طرف مائل نہیں ہوتے اس بے توجہی کی یاداش میں اللہ اُن کے دلوں کو بالکل سچائی کی طرف سے پھیر دیتا ہے۔ وغیرہ

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ

بیشک تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول آچکا ہے　جس کو

عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ

تمہاری تکلیف گراں گذرتی ہے وہ تمہاری بھلائی کا حریص ہے اور ایمان والوں پر

رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ

شفیق و مہربان ہے　اسپر بھی اگر وہ رو گردانی کریں تو (اے نبی) تم کہدو

حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ

کہ مجھکو اللہ کافی ہے اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اُسی پر میں نے بھروسہ کیا

وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝

اور وہی عرش عظیم کا مالک ہے

ع ۱۶ / ۵

تفسیر تقریبًا پوری سورت میں منافقوں کے قبائح اور شکوک و شبہات کا بیان کر کے اب نفاق کی اصلی وجہ ضمنًا بیان کر کے وہ وجوہ ظاہر فرماتا ہے جن پر غور کرنے کے بعد نفاق کا مادہ زائل ہوجاتے۔ نفاق کا اصل مبدا

یہ تھا کہ اہل نفاق رسول پاکؐ کے نشست برخاست کے اطوار گفتار رفتار انسانی معاشرت اور تمام خواب وخور کے ضروریات اپنی طرح دیکھتے تھے اور اپنا مثل خیال کرتے تھے۔ اب باوجود معجزات اور خرق عادات دیکھنے کے انکو حضورؐ کی رسالت کا کسی طرح یقین نہ آتا تھا کبھی ایمان کی طرف کو مائل ہو جاتے پھر تھوڑی دیر کے بعد کوئی شک پیدا ہوتا اور نفاق کی طرف رجوع کر لیتے خدا تعالیٰ نے ان آیات میں حضور ذالاؐ کے چند خصائل پسندیدہ اور اخلاق حمیدہ ذکر فرما کر نبوت کو ثابت کیا ہے۔ ان آیات میں حسب ذیل اوصاف کا تذکرہ ہے

(۱) لَقَدْ جَآءَكُمْ۔ یعنی یہودی اور عیسائی اور دیگر مذاہب وملل والے جس نبی کے منتظر تھے اور رسول اللہؐ کے دعویٰ نبوت کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے یہ شبہہ اُن کا غلط ہے بلا شبہہ یقیناً ان کا رسول آگیا اور یہ تم پر خدا کا بڑا احسان ہے کہ وہ بیماہ راست تمہارے پاس آیا ممکن تھا کہ کہیں دوسرے ملک میں پیدا ہوتا اور بالواسطہ اُس کا اعلانِ رسالت تم تک پہنچتا لیکن تم پر یہ اللہ کا کرم ہے کہ وہ بلا واسطہ تمہارے پاس آیا۔ ایسی صورت میں اللہ کے احسان کا انکار اور رسول کی رسالت کی تکذیب خلاف دانش ہے۔

(۲) رَسُوْلٌ۔ یعنی جو رسول تمہارے پاس پہنچا وہ بڑا عظیم الشان ہے انبیاء تو اور قوموں میں بھی مبعوث ہوئے مگر ایسا عالی مرتبہ رسول کہیں مبعوث نہ ہوا۔ اللہ کا یہ دوسرا احسان ہے کہ اُس نے سب سے زیادہ عظمت والا رسول تمہاری ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا۔

(۳) مِّنْ اَنْفُسِكُمْ۔ اللہ کا تم پر یہ تیسرا احسان ہے کہ اُس نے تمہاری قوم اور ملک میں سے ہی اپنا رسول مبعوث فرمایا جو تمہارے لئے باعث فخر وعزت قرار پایا۔ ہوسکتا تھا کہ یہ شرف کسی اور قوم کو حاصل ہوجاتا مگر اللہ نے تم کو یہ شرف اپنی رحمت سے عطا فرمایا۔ تم میں سے مبعوث ہونے کا ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ اُس کے کل حالات سے تم واقف ہو سچائی عفت اور کل چال چلن کا تم کو

علم ہے کوئی غیر قوم کا ہوتا تو اُس کے ابتدائی احوال تم کو معلوم نہ ہوتے اب بھی اگر تم کو اسکی نبوت میں شک باقی رہے تو یہ اللہ کی احسان فراموشی اور ناحق کوشی ہے۔

(۴) عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ۔ اللہ کا یہ چوتھا احسان ہے کہ اُس نے ایسا رسول مبعوث فرمایا جو تمہارا دلی دردمند اور خیرخواہ ہے وہ چیز جو تم کو تکلیف دہ اور ضرر رساں ہے اُس پر شاق و گراں ہے کافروں کا کفر کرنا اللہ کی جناب میں گستاخانہ کلمات بکنا مشرکوں کا شرک کرنا منافقوں کا نفاق کرنا مفسدوں کا فساد پھیلانا متکبروں کا آیات الٰہی سے منہ موڑنا اور گناہگاروں کا گناہ کرنا سب اس رسول پر گراں ہے۔ وہ چیز جو دنیا و دین میں تمہاری بربادی و ہلاکت کا باعث ہو اُس پر شاق ہے۔

(۵) حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ اللہ کا یہ پانچواں احسان ہے کہ وہ رسول تمہارا شفیق و رفیق ہے اسکی شفقت کی یہ حالت ہے کہ گویا تمہاری بہبودی اور عافیت کی اسکو حرص ہوگئی ہے۔ ہر نقل و حرکت میں اسکو فائدہ مدنظر ہے۔

(۶) بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔ اللہ کا یہ چھٹا احسان ہے کہ وہ رسول اگرچہ تمام کائناتِ انسانی کا خیرخواہ اور بہبودی طلب ہے مگر خصوصیت کے ساتھ وہ اہل ایمان پر مہربان اور رحیم و کریم ہے۔ ایمان کا فائدہ اگرچہ مؤمنوں کو پہونچتا ہے اور پہونچیگا مگر وہ رسول بھی مؤمنوں کا خاص طور پر ہمدرد غمخوار مونس اور مہربان ہے۔ بخاری حدیثوں میں حضورؐ کی رافت و رحمت کے واقعات مفصل مذکور ہیں۔ یتیموں مسکینوں فقیروں بیواؤں بیماروں غریبوں غرض ہر بیکس و بے بس طبقہ کے ساتھ جو شفقت حضورؐ فرماتے تھے وہ اپنی نظیر خود ہی ہے۔

اس سے آگے ارشاد ہوتا ہے کہ ان احسانات و انعامات کے باوجود بھی اگر یہ لوگ راہ راست پر نہ آئیں تو اے نبی تم بھی ان کی پروا نہ کرو اور اُس اللہ پر کامل بھروسہ رکھو جو اپنی الوہیت ربوبیت اور عظمت و قدرت میں یگانہ اور بے ہمتا ہے۔

مقصود بیان :- اسباب نفاق کو زائل کرنے کے لئے مختلف وجوہ کا بیان۔ رسول پاک صلعم کی عظمت اور علو مرتبہ کی صراحت، حضور کے اوصاف کریمہ کی تفصیل اللہ کے اوصاف سے متصف ہونے کی وضاحت۔ اس امر کی در پردہ تلقین کہ جب رسول باوجود اس قدر عظمت و شان کے تمہارا بہترین ہمدرد اور مونس و غمخوار ہے اور اُسکی مہربانی حرص کی حد تک پہنچ چکی ہے تو تمہارا بھی فرض ہے کہ اُسکی رسالت کی تصدیق اور اس کے احکام کی تعمیل کرو کیونکہ اسی میں تمہاری بہبودی اور بھلائی ہے۔ آیت میں اول حضور کی شفقت عامہ کا ذکر فرمایا پھر خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں پر حضور صلعم کی رحمت و رافت کا تذکرہ کیا۔ گویا اس طرف اشارہ کیا کہ رسول اللہ صلعم کافروں کے کفر دور کرنے کی کوشش فرمانے والے صادقین پر رحمت گناہ گاروں پر رافت نافرمانوں کی شفاعت اور اہل طاعت کیلئے دعا فرمانیوالے ہیں دشمنوں سے انتقام ذاتی نہیں لیتے بلکہ اُن کے اصلاحِ حالات کی کوشش کرتے ہیں۔ بدی کا بدلہ بدی سے نہیں دیتے بلکہ شفقت عامہ کو کام میں لاتے ہیں۔ وغیرہ۔

سُورَةُ يُونُسَ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَتِسْعُ آيَاتٍ وَإِحْدَىٰ عَشَرَ رُكُوعًا

سورۂ یونس مکہ میں نازل ہوئی اسمیں ایکسو نو آیتیں ہیں اور گیارہ رکوع ہیں

اس سورت میں ایک سو نو آیات ہیں۔ حسن بصری، عطاء، عکرمہ اور جابر بن زید کے نزدیک کل سورت مکی ہے یعنی ہجرت سے قبل نازل ہوئی لیکن فَإِن كُنتَ فِي شَكٍّ الخ صرف دو آیات مدنی ہیں۔ ابن عباس رض اور قتادہ کے نزدیک تین آیات مدنی ہیں۔ کلبی نے آیت وَمِنْهُم مَّن يُؤْمِنُ بِهِ کو بھی مدنی کہا ہے۔ قرطبی کا قول ہے کہ شروع سے لیکر چالیس آیات تک مکی ہے باقی مدنی۔

اس سورت میں حضرت یونس کا عظیم العبرت قصہ بیان فرمایا ہے اس لئے اس کا نام ہی سورۂ یونس ہو گیا۔ تمام صحابہ اس کو اسی نام سے موسوم کرتے تھے اس سے پہلے وہ سورتیں تھیں جو ہجرت کے بعد نازل ہوئی تھیں۔ اس جگہ

سے مکی سورتوں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ مدنی سورتوں میں بنیادی مسائل کم اور نکاح طلاق میراث حقوق جہاد سیاست اور معاملات کے متعلق احکام عموماً ہیں۔ مکی سورتوں میں عقائد و اصول کی عمومی تعلیم دی گئی ہے۔ جس وقت حضور اقدسؐ نے اعلان رسالت فرمایا اس وقت کل عالم جہالت و گمراہی کے سمندر میں غرق تھا باطل عقائد اور بدکاریوں کی کالی گھٹائیں ہر طرف چھائی ہوئی تھیں۔ نور فطرت گم تھا ہدایت و صداقت کی روشنی معدوم تھی عموماً دنیا میں اور خصوصاً عرب میں چند طبقات تھے جن کے عقائد مندرجہ ذیل تھے:۔

(۱) بعض لوگ خدا کی ہستی کے منکر تھے اُن کے نزدیک عالم کے لئے کسی واجب الوجود قدیم ازلی ابدی خالق مطلق کی ضرورت ہی نہ تھی دہراور نیچر کو اجرام علویہ اور اجسام سفلیہ کا موجد سمجھتے تھے۔ آج کل یہ خیال اہل مادہ میں ترقی پذیر ہے۔

(۲) بعض لوگ خدا کے قائل تھے واجب الوجود کی ہستی کو ضروری سمجھتے تھے مگر معبود واحد نہ جانتے تھے طرح طرح سے شرک کرتے تھے۔ اپنے اپنے دیوتاؤں کو انہوں نے خدائی اختیارات دے رکھے تھے اللہ کی طرح اُنکی پرستش کرتے تھے۔ پیام الٰہی اور نبوت اُن کے نزدیک ضروری چیز نہ تھی۔ خالق ضرور خدا تھا مگر تصرفات اور احکام دوسروں کے جاری تھے۔ حکم الٰہی بندوں تک پہنچنا لازمی نہ خیال کیا جاتا تھا۔ قیامت اور حشر و نشر کا عقیدہ ان کے نزدیک لغو تھا عذاب ثواب کا تصور ہی نہ تھا۔

(۳) تیسرا گروہ خدا کا قائل تھا حشر اجساد کا بھی منکر نہ تھا۔ عام نبوت کی ضرورت کا بھی اسکو احساس تھا کچھ انبیاء اور بعض آسمانی کتابوں کی حقانیت کا بھی مقر تھا مگر حضور اقدسؐ کی رسالت کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ رسول پاکؐ کے انسانی اطوار کو یہ مانع نبوت خیال کرتا تھا۔ حضورؐ کو امی اور نادار سمجھ کر اُن کے انکار و تعجب میں اور بھی اضافہ ہوتا تھا۔

ان تمام طبقات کے مجمل خیالات وعقائد کو ظاہر فرمانے کے بعد مکمل اور جامع تردید اس سورت میں کیگئی ہے۔ ہم ہر ایک کی تفصیل آیات کے ذیل میں لکھینگے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ○ اَكَانَ لِلنَّاسِ

یہ پر از حکمت کتاب کی آیتیں ہیں کیا لوگوں کو

عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ

اس بات سے تعجب ہوا کہ ہم نے انہی میں سے ایک شخص کے پاس بذریعہ وحی

اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا

یہ حکم بھیجا کہ لوگوں کو ڈراؤ اور ایمان والوں کو خوش خبری سناؤ

اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ قَالَ

کہ ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس سچا پایہ ہے کافر

الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ○

کہتے ہیں کہ یہ شخص کھلا ہوا جادوگر ہے

تفسیر چونکہ کفار کے عقائد کی تردید، خیالات کے ابطال، نبوت کے اثبات اور صداقت کے اعلان کے لئے سب سے پہلے ضروری تھا کہ قرآن کا کتاب اللہ ہونا ثابت کیا جاتے اس لئے سب سے اول فرمایا الٓرٰ۔

یعنی یہ قرآن اُنہی حروف سے مرکب ہے جن سے تمام عربی کلام بنتا ہے۔ اگر یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہ ہوتا اگر اس کی ترکیب قدرت بشری سے خارج نہ ہوتی تو عرب کے زبان آور شیریں بیان بھی ایسا کلام بنا لاتے لیکن باوجود مکرر سہ کرر اعلانِ مقابلہ کے کسی کو جرأت نہ ہوئی اور کوئی ایسا کلام نہ بنا سکا تو ظاہر ہے کہ یہ کتاب اللہ کی بنائی ہوئی ہے۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ قرآن کی یہ آیات جو نازل ہو چکیں یا ہو رہی ہیں یا آئندہ ہونگی ان میں فقط اعجازی بلاغت ہی نہیں فقط اتنی ہی بات نہیں کہ اس ترکیب کا کلام کوئی نہیں بنا سکتا بلکہ یہ کتاب حکیم کے احکام ہیں اس کے اندر دین اور دنیا کے اصلاح کے قوانین ہیں۔ عقائد عبادات معاملات سیاسیات حقوق اور مواریث کے مکمل ضوابط موجود ہیں اور ایسی عظیم الشان مکمل کتاب کے قواعد ہیں جو خود تنہا کتاب کہلانے کی مستحق ہے جس کے ہر مسئلہ اور ہر جزئیہ میں حکمت و دانش کے دریا موجزن ہیں۔ اس کے باریک نکتوں اور دقیق مصالح تک عقل بشری کی رسائی بطور خود ناممکن ہے۔

ہم نے تِلْكَ کا اشارہ آیات قرآن کی طرف قرار دیکر تفسیری مطلب بیان کیا ہے جس طرح عام مفسرین نے کیا ہے۔ لیکن مجاہد قتادہ اور حسن بصری کی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تِلْكَ سے اشارہ توریت انجیل زبور یعنی دیگر کتب آسمانی کی طرف ہے۔ اس تقدیر پر نہایت عمدہ مطلب یہ ہو گا کہ حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت عیسٰیؑ تک جتنے صحیفے اور کتابیں مختلف انبیاء پر نازل ہوئیں اُن سب کے عقائد و احکام اسی قرآن کا ایک حصہ ہیں۔ قرآن کے اصول و ضوابط سے دیگر الہامی کتب کے بنیادی مسائل سر مو اختلاف نہیں رکھتے بلکہ قرآن اُن سے زیادہ کامل اور پُر از حکمت ہے اُن کی تکمیل و تائید کرنے والا اور اُن کے مقصد کو ثابت کرنے والا ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کے الہامی ہونے کا انکار کیا جا سکے۔ غرض یہاں تک تو قرآن کی صداقت

اور منزل من اللہ ہونے اور رسول اللہ صلعم کی حقانیت وسچائی کا
بیان ہوا۔ اس سے آگے کافروں کے تعجب انگیز انکار کی تینوں شاخیں اور
انکار کا نتیجہ ظاہر فرماتا اور اس پیرایہ میں ظاہر فرماتا ہے کہ خود وجوہ انکار
پر غور کرنے سے انکار کی بیخ کنی ہو جاتی ہے۔ کفار کو تصدیق سے مانع تین
امور تھے ایک تو اُن کو اس بات پر تعجب ہوتا تھا کہ بھلا آدمی کیونکر رسول
ہو سکتا ہے کسی آدمی کو اللہ سے اتنا قرب ہو جائے کہ اُس کو رسول بنا دیا
جائے یہ کس طرح ممکن ہے۔ اگر نبی کا ہونا ہی ضروری تھا تو کسی فرشتہ یا جن کو
نبی بنا کر بھیجا جاتا۔ دوسرا شبہہ یہ تھا کہ خیر اگر آدمی ہی کو نبی بنایا جاتا تو
کسی غیر معمولی فوق البشریت آدمی کو بنایا جاتا ہم میں سے ہی ایک معمولی آدمی
کے پاس کس طرح اللہ کا پیام آسکتا ہے جو بالکل ہماری طرح پیدا ہوا جس کا
کھانا پینا چلنا پھرنا سونا جاگنا ہماری مثل ہے وہ ہمارا ہی ایک فرد ہے
تیسرا شبہہ یہ تھا کہ خیر اگر ہمارے ہی کسی آدمی کا نبی ہونا ضروری تھا تو یہ
جزا سزا کے احکام ثواب عذاب کا جھگڑا مابعد الموت کا قصہ حشر جسمانی کا
قضیہ اور قیامت کا واقعہ اپنے اندر کیا ضرورت رکھتا ہے۔ غرض انہی اسباب
وعلل کے ماتحت کفار نے تعجب انگیز پیرایہ میں حضور صلعم کی نبوت کا انکار کر دیا
لیکن قرآن ناطق اور دیگر معجزات جو معمولی انسانوں سے سرزد نہیں ہو سکتے
حضور صلعم کی صداقت کے روشن دلائل تھے اور جب کافروں نے نبوت کو ماننے
سے انکار کر دیا تو لامحالہ ان معجزات کی کوئی توجیہ کرنی پڑی مجبوراً کہنے لگے
ضرور یہ معجزات معمولی انسانوں سے صادر نہیں ہو سکتے فوق البشریہ طاقت
کی ضرورت ہے لہذا محمد صلعم جادوگر ہیں یعنی ان افعال کا صدور ان کے جادوگر
ہونے کی خود دلیل ہے۔ چونکہ کافروں نے اپنے وہمی وسوسوں کو عقلی براہین
سمجھ لیا تھا اسلئے حضور صلعم کو کھلا ہوا جادوگر کہدیا۔ خدا تعالیٰ نے کافروں کے
وجوہ تعجب کو انکاری طرز میں بیان فرمایا جس کا مدعا یہ ہے کہ آدمیوں کے لئے

آدمی ہی کا پیامبر ہونا ضروری ہے ورنہ غیر نوع کے افراد سے آدمی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ پھر ایسے آدمی کا نبی ہونا بجائے خود ثابت شدہ حقیقت ہے جس کے طور طریق اور ابتدائی حالات سے سب لوگ واقف ہوں۔ غیر ملک کا اجنبی آدمی زیادہ محل شکوک ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد غرض نبوت کی طرف اشارہ کیا کہ اخروی سزا جزا عذاب ثواب لازم ہے۔ دنیوی اعمال وافعال کا نتیجہ ضروری ہے۔ نیک وبد اچھے بُرے برابر نہیں ہو سکتے۔ عدالت وانصاف کے خلاف ہے کہ تمام مختلف افعال کا نتیجہ ایک جیسا ہو۔ غرض یہاں تک نبوت عامہ کی ضرورت حشر جسمانی اور سزا جزا کا وجوب رسول پاک ﷺ کی رسالت اور قرآن مجید کی صداقت ثابت ہو گئی۔

تنبیہ قَدَمَ صِدْقٍ کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ قدم اس سامان کو کہتے ہیں جسکو مسافر قافلہ میں سے منزل گاہ پر پہلے بھیجدیتے ہیں یہاں مراد وہ نیک اعمال ہیں جن کو اہل ایمان اپنی زندگی میں ہی پہلے سے توشۂ آخرت بنا کر بھیجدیتے ہیں (رواہ الحاکم عن ابی بن کعب، ابن عباس، ابن جریر کی روایت ہے) مجاہد میں نماز روزہ زکوٰۃ تسبیح تہلیل وغیرہ اعمال مراد لئیں۔ ضحاک اور ربیع بن زید کا بھی یہی قول ہے علی بن ابی طلحہ کی روایت کے بموجب وہ سعادت ازلی مراد ہے جو نیکوکار مومنوں کی تقدیر میں ازل سے مقرر ہو چکی ہے۔

مقصود بیان: قرآن کی صداقت اور منزل من اللہ ہونے کا مجمل کامل ثبوت نبوت عامہ کی ضرورت۔ آدمی کے نبی ہونے کا وجوب۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی دلیل۔ کفار کے وجوہ تعجب کا بیان۔ اس بات کی طرف ضمنی اشارہ کہ جب بات کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہو سکتی اور آدمی لاجواب ہو جاتا ہے تو کسی غیبی طاقت کے اقرار کرنے پر مجبور ہوتا ہے لیکن اہل بصیرت اس کو الہام وحی اور رسالت کہتے ہیں کوتاہ بین کج فہم اسکو جادو کہنے لگتے ہیں۔ وغیرہ۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

بلاشبہہ تمہارا رب وہی اللہ ہے جس نے آسمانوں کو

وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى

اور زمین کو چھ دن کے (دور) میں پیدا کیا پھر عرش کا

عَلَى الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مَا مِنْ

ارادہ کیا وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے اُس کی

شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهٖ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ

اجازت سے پہلے کوئی سفارش نہیں کرسکتا یہی اللہ تمہارا

رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ○

پروردگار ہے تو تم اسکی عبادت کرو کیا تم غور نہیں کرتے

إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا

اسی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے اللہ کا وعدہ سچا ہے

إِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهٗ لِيَجْزِيَ

بلاشبہہ وہی شروع میں پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ پیدا کریگا تاکہ نیکو کار

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ

مسلمانوں کو انصاف سے جزا دے

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِیْمٍ

اور کافروں کے لئے تو اُن کے کفر کی پاداش میں کھولتا ہوا پانی پینا

وَّعَذَابٌ اَلِیْمٌۢ بِمَا کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ

اور دردناک عذاب　　مخصوص ہے

تفسیر ان آیات میں تین فرقوں کے عقائد کا ابطال کیا ہے۔ ایک وہ جو واجب الوجود کی ہستی کے منکر ہیں۔ دہر اور نیچر کو ہر چیز کا موجد جانتے ہیں اور موجد کے لئے فاعل مختار ہونا تسلیم نہیں کرتے۔ دوسرا فرقہ وہ جو جزا سزا اور عذاب ثواب کو لغو خیال کرتا ہے۔ حشر جسمانی کا نہ فقط منکر ہے بلکہ اس کو احمقانہ عقیدہ جانتا ہے۔ تیسرا وہ مشرک طبقہ جو اللہ کے وجود کا تو قائل ہے مگر شرک فی الصفات کرتا ہے صفاتِ الوہیت مخلوق میں مانتا ہے۔ اپنے دیوتاؤں اور جھوٹے معبودوں کو متصرف اور فاعل مختار جانتا ہے اور اُن کی غلط پرستش اس لئے کرتا ہے کہ وہ اللہ کے قرب کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہیں اور بارگاہ الٰہی میں سفارش کریں گے اور ہمارے کام آئیں گے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ:۔ تمام کائنات حادث ہے ناپید سے پیدا ہوئی عدم سے وجود میں آئی اور ہر حادث کے لئے محدث کا ہونا ہر موجود کے لئے موجد کا وجود لازم ہے پھر محدث و موجد بھی ایسا ہو جو قادر مطلق ہو فاعل غیر مختار نہ ہو۔ اسی کے دست قدرت میں ایجاد و ابقاء کی رسی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اضطراراً بغیر اختیار کے پیدا کر کے عضو معطل کی طرح بیٹھ رہا۔ تربیت و انتظام کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ایسا موجد و محدث، اللہ اور بس اللہ ہے وہ سب کا خالق ہے مربی وہی منتظم ہے۔ اُس کی صفات و ذات میں کوئی شریک نہیں۔ الوہیت و ربوبیت میں کوئی حصہ دار نہیں بلکہ اُسکی اجازت کے بغیر کوئی کسی کی سفارش بھی نہ کرسکیگا۔ جب تمام

اُسی کی پرستش زیبا ہے کس قدر عبرت انگیز اور نصیحت خیز ہے۔ یہ امر کہ خالق مربی کو چھوڑ کر غیروں کی پرستش بامید شفاعت کی جائے اور غیر بھی وہ جن کو سفارش کا حق بھی نہیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ اللہ موجد مبقی اور مربی ہونے کے ساتھ امور معاد کا بھی مالک مختار ہے۔ آغاز سے بھی اُسی کا تعلق اور انجام بھی اُسی سے وابستہ سب کو اُسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے وہی مرکز حقیقی ہے۔ وہی بحر ناپید اکنار ہے۔ تمام قطرات اُسی کی طرف لوٹینگے اور بالآخر اُسکے پاس پہنچکر سب کو غرض تخلیق سے دوچار ہونا پڑیگا یہ ہستی یہ کائنات بیکار نہیں پیدا ہوئی۔ جو کوئی جیسا کریگا ویسا آخرت میں بھریگا۔ سزا جزا عذاب ثواب ہر ایک کو برداشت کرنا ہوگا۔ اول وجود کا رنگ دوسرے وجود میں نمایاں ہوگا۔ اس عالم کے افعال کی جھلک اُس عالم میں نظر آئیگی۔ یہاں کے اعمال کا اثر وہاں نکلے گا۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ کے وعدہ میں دروغ کا احتمال نہیں۔

مقصود بیان:۔ اللہ کے قادر مطلق اور رب مختار ہونے کا مدلل اعلان۔ وحدانیت ذاتی و صفاتی کا پرزور اثبات۔ مصنوع سے صانع اور موجود سے موجد پر استدلال۔ اس امر کی صراحت کہ خدا کی الوہیت و ربوبیت میں کوئی شریک نہیں۔ اُس کی اجازت کے بغیر کوئی کسی کی سفارش نہیں کر سکتا۔ مبدء و معاد سب اُسی کے دست قدرت میں ہے۔ اللہ کے وعدہ میں غلطی محال ہے۔ تخلیق عالم بے کار نہیں۔ اعمال کی جزا بہ انصاف کے ساتھ ملے گی۔ وغیرہ

تذییل سعید بن اسحاق بن کعب بن عجرہ کہتے ہیں جب آیت اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ الخ مکہ میں نازل ہوئی تو سواروں کے ایک بہت بڑے گروہ سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے دریافت کیا تم کون لوگ ہو؟ اُنہوں نے جواب دیا ہم جن ہیں مدینہ سے آ رہے ہیں یہی آیت ہمارے سفر کا باعث ہے۔

(ابن ابی حاتم)

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا

وہی خدا ہے جس نے سورج کو چمکیلا بنایا اور چاند کو روشن بنایا

وَقَدَّرَهُ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ

اور اُس کی منزلیں مقرر کیں تاکہ تم کو برسوں کی گنتی اور حساب

وَالْحِسَابَ ۚ مَا خَلَقَ اللَّهُ ذَٰلِكَ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ

معلوم ہو سکے اللہ نے ان کو بغیر مصلحت کے نہیں پیدا کیا

يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝ إِنَّ فِي

وہ اپنے نشانہائے قدرت سمجھدار قوم کے لئے کھول کر بیان کرتا ہے۔ رات

اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي

و دن کے ہیر پھیر میں اور ہر اُس چیز میں جو خدا نے آسمان و

السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَّقُونَ ۝

زمین میں پیدا کی ہے پرہیزگاری رکھنے والی قوم کیلئے ضرور نشانہائے قدرت ہیں

تفسیر اوپر کی آیات میں آغاز و انجام اور مبدء و معاد کو اپنے ہی دست قدرت میں بیان فرما کر منکرین حشر کی پُر اثر الفاظ میں تسکین کی تھی اب کائنات کی پیدائش پر تبصرہ اور موجودات کی ہستی کی اصل غرض بیان فرما کر اپنی قدرت و کمال کے دلائل اپنے حیرت انگیز تصرفات سے ثابت کر کے امکان حشر

اور اپنے وجود و وحدانیت کا ثبوت اور شرک کی تردید فرماتا ہے۔
حاصل ارشاد یہ ہے کہ اللہ ہی نے سورج وچاند میں روشنی پیدا کی یعنی مادہ کا فطری خاصہ کثافت و تاریکی ہے لیکن آفتاب و ماہتاب کے مادہ کو اس نے روشن کیا اور ایسا روشن کیا کہ کامل روشنی بنا دیا جس سے تمام عالم روشن ہو جاتا ہے پھر آفتاب و ماہتاب میں سے ہر ایک کے منازل سیر اور مقامات رفتار مقرر فرمائے اس نور بخشی اور تقدیر منازل کے دو فائدے ہیں۔ اول تو قدرت الٰہی کا مظاہرہ ہوتا ہے ان کے طلوع وغروب سے کائنات کی تصویر نشاط اور مرقع حدوث سامنے آجاتا ہے۔ دوسرے فصول کا مبادلہ سالوں کی آغاز و اختتام اور اوقات کا شمار معلوم ہوتا ہے۔ اہل بصیرت اور دانشمند طبقہ جانتا ہے کہ یہ آیات قدرت الٰہی ہیں۔ علامات حدوث عالم ہیں۔ آثار وجود واجب ہیں۔ براہین وحدانیت ہیں۔ اللہ نے ان کو بیکار نہیں پیدا کیا۔ یہ زندگی صحت اور رزق کے اسباب ہیں لیکن سب حکمت الٰہی کے مسخر اور قدرت خداوندی کے تابع ہیں خود نہیں پیدا ہو گئے۔ خود بخود ان کا باضابطہ انتظام اور باقاعدہ طلوع وغروب نہیں ہوتا ہے نہ ان میں خود کوئی تاثیر و قدرت ہے۔ شب و روز کا اختلاف اور تمام کائنات ارضی و سماوی اپنے اندر خاص درس بصیرت رکھتی ہے مگر صرف انہی لوگوں کے لئے جن کے عقائد صحیح اور اعمال شستہ ہیں جو مخلوق سے نظر بچا کر خالق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، مصنوع سے صانع پر استدلال کرتے ہیں، سب سے پہلے شرک سے بچتے ہیں پھر ہر قسم کے گناہ سے پرہیز کرتے ہیں پھر غیر اللہ سے قطعاً منہ موڑ کر اللہ ہی سے رشتہ جوڑتے ہیں بس ایسے ہی لوگوں کو ہر چیز میں اللہ کی قدرت اور ہستی کا تماشا نظر آتا ہے۔

مقصود بیان:۔ مصنوع سے صانع پر استدلال تنظیم عالم سے وحدانیت اور قدرت الٰہی کا اثبات۔ آفتاب و ماہتاب کی پیدائش کے اغراض کا بیان اس امر کی صراحت کہ عالم کی پیدائش بیکار نہیں مگر فائدہ اندوز دہی لوگ

ہوتے ہیں جو اہل بصیرت اور ستی ہیں اپنی جبلی نظر مصنوعات پر مقصور و محدود نہیں بلکہ غیر اللہ کے خیال سے اپنے عقائد کو غیر اللہ کے دیکھنے سے اپنی نظر کو غیر اللہ کی تعظیم سے اپنے اعضاء کو اور غیر اللہ کے تصور تک سے اپنے احساس و وجدان کو بچاتے ہیں وغیرہ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا

جو لوگ ہم سے ملنے کے امید وار نہیں اور دنیوی زندگی کو

بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ

پسند کرتے ہیں اور اُسی میں جی لگا بیٹھے ہیں اور جو لوگ

هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ

ہماری قدرت کی نشانیوں سے غافل ہیں ایسے ہی لوگوں کے اعمال کی

النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ

پاداش میں اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور جو لوگ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ

مؤمن نیکوکار ہیں اُن کے ایمان کی وجہ سے اللہ اُن کو مقصود تک

بِاِيْمَانِهِمْ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ

پہونچا دیگا اور آسایش کے باغوں میں اُن کے نیچے نہریں

فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ

بہتی ہوں گی اُن باغوں میں اُن کی ندا سبحانک

اَللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ

اللّٰھم ہوگی اور باہم دعائے خیر سلام ہوگا اُن کی آخری

دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

بات یہ ہوگی کہ ہر ستایش کا استحقاق اُس اللہ کو ہے جو رب العالمین ہے

تفسیر اوپر کی آیات میں وجود واجب وحدانیت ذاتی وصفاتی، حشر نشر اور مقصد تخلیق عالم بیان فرمایا تھا۔ ان آیات میں مقصد تخلیق کو پورا کرنے والوں اور اُس سے خلاف ورزی کرنے والوں کی معادی جزا سزا کا بیان فرماتا ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ کائنات انسانی کے دو گروہ ہیں۔ اول وہ لوگ جن کی نظر مادی دنیا اور اُس کے عیش وطرب پر محدود ہے ان کے خیال میں شاخوں کا رجوع جڑ کی طرف اور قطرات کی واپسی سمندر کی جانب قطعاً لغو ہے۔ خدا کی طرف لوٹکر جانا بیہودہ عقیدہ ہے۔ حشر نشر عذاب ثواب احمقانہ خیال ہے۔ دنیوی زندگی بس زندگی ہے۔ اس کا تنعم اور عیش ہی مقصود ازلی ہے۔ یہ لوگ آیات قدرت سے غافل ہیں۔ مصنوع سے صانع پر موت سے اُخروی زندگانی پر استدلال نہیں کرتے۔ مادی تغیرات پر غائر نظر نہیں ڈالتے۔ یہ گروہ کفار و منکرین کا ہے۔ کفر اور انہماک فی اللذات کی وجہ سے ان کی سزا جہنم ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اللہ کی توحید الوہیت ربوبیت تصرف کل قدرت کاملہ اور خلق وتقدیر کا یقین رکھتا ہے۔ مصنوعات سے صانع پر استدلال کرتا ہے۔ احکام الٰہی رسالت قیامت عذاب ثواب حشر نشر وغیرہ پر ایمان رکھتا ہے اور ایمان کے مطابق نیک عمل بھی کرتا ہے۔ اس کو آخرت میں عیش تو ملیگا ہی دنیا میں ایمان و ایقان کی وجہ سے حقیقت واسرار کے پردے اسکی نظر سے اٹھ جائینگے، نور عرفان اسکی

روح کو روشن کر دے گا۔ حقائق عالم کا اس پر انکشاف ہوگا۔ کارخانۂ عالم کے سربستہ رازوں سے اسکو واقفیت حاصل ہوگی، راہ حقیقت مل جائیگی اور وہ منزل مقصود پر پہونچ جائے گا۔

تنبیہ یَهْدِيهِمْ رَبُّهُم بِإِيمَانِهِمْ کی تفسیر ہم نے وہی کی ہے جو بیضاوی اور بعض دیگر محققین نے کی ہے مگر بعض مشایخ نے دوسری تفسیریں کی ہیں۔ ابن جریر نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ اُن کو ایک نور عطا کریگا جس سے اُن کو راستہ مل جائیگا۔ ابن کثیر کا قول ہے کہ پل صراط پر نور ایمان کی وجہ سے وہ پار ہو جائینگے۔ قتادہ نے ایمان سے اعمال صالحہ مراد لئے ہیں۔

مقصود بیان:۔ یوم الآخرت پر ایمان رکھنا اسلام کا ضروری جزو ہے۔ مومن کو انجام بیں ہونا چاہئے۔ اُس کی نظر صرف دنیاوی زندگانی پر محصور نہ ہونی چاہئے۔ آیات قدرت سے غافل بنا رہنا اور تغیرات عالم سے فنائے عالم اور حیات بعد الممات پر استدلال نہ کرنا مذموم ہے۔ نیکوکار اہل ایمان پر حقائق عالم اور معرفت الٰہی کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ آغاز و انجام دونوں پر اللہ کو استحقاق حمد ہے۔ جن لوگوں کی نظری اور عملی قوتیں درست ہیں اُن کو آخرت میں جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی نعمتیں ملیں گی۔ وغیرہ۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللَّهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُم

لوگ جس طرح بھلائی کی فوری طلب کرتے ہیں اگر ایسی ہی جلدی اُن پر سختی

بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ إِلَيْهِمْ أَجَلُهُمْ ۖ فَنَذَرُ

واقع کر دیتا تو کبھی کی اُن کی اجل آچکی ہوتی مگر ہم اُن لوگوں کو

الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ

چھوڑ دیے رکھتے ہیں جو ہم سے ملنے کے امید وار نہیں ہیں ناکہ وہ اپنی سرکشی

يَعْمَهُوْنَ ۝ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ

میں کہاں بھٹکتے رہیں جب انسان پر کوئی تکلیف آتی ہے تو

دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا فَلَمَّا

لیٹے بیٹھے کھڑے ہم کو پکارتا ہے لیکن جب

كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ

ہم اُس کی تکلیف دور کردیتے ہیں تو اُمنہ پھیر کر چل دیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے

اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ

کہ مصیبت پڑے پر ہم کو پکارا ہی نہ تھا بات یہ ہے کہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو اُنکے کرتوت

مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

یوں ہی آراستہ کر کے دکھائے جاتے ہیں

تفسیر شیخ ابن کثیر وغیرہ نے اس آیت کا سبب نزول اگرچہ نہیں لکھا ہے مگر ابن جریر نے بروایت یا بدروایت شان نزول اس طرح بیان کی ہے کہ مشرکین مکہ نے جب آیات بینات کی تکذیب کی اور قرآن مجید کو سحر کہا اور قرآن کی مسلسل وعیدوں کی پرواہ نہ کی اور کہنے لگے جس وعید کا تم بار بار تذکرہ کر رہے ہو اس کو نور الا دو تو ان آیات کا نزول ہوا۔

تفصیل اجزاء

تعجیل جلد دینا - استعجال جلد چاہنا - شر سے مراد یا تو وہ عذاب ہے جس کی دھمکی کافروں کو دی جاتی تھی یا محض بدی کی سزا مراد ہے - خیر سے مراد ہر بھلائی ہے۔

اوپر کی آیات میں عذاب آخرت کی دھمکی دی گئی تھی اس پر شبہ ہو سکتا تھا کہ اب دنیا ہی میں خدا ہم کو کفر و انکار کی سزا کیوں نہیں دیتا قیامت تک کیوں ٹالتا ہے؟ اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ خدا رحیم ہے اُسکی رحمت نہیں چاہتی کہ یہ لوگ یکدم فنا ہو جائیں اگر خدا لوگوں کی برائی کی سزا ایسی جلد دیدیا کرے جیسا وہ بھلائی کیلئے جلدی کیا کرتے ہیں تو ان کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا مگر اُسکی رحمت کاملہ غضب میں تعجیل کرنی نہیں چاہتی بلکہ منکروں اور کافروں کو وقت مقررہ تک ڈھیل دیتا رہتا ہے لیکن اس پر بھی وہ اپنی سرکشی اور گردن تابی میں سرگردان و حیران پھرتے رہتے ہیں۔

بیضاوی وغیرہ مفسرین نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ خدا تعالیٰ ان کی درخواست خیر کو جس طرح جلد قبول فرماتا ہے اگر اتنی جلد درخواست سزا کو قبول فرماتا تو ان کا کام تمام ہو چکا ہوتا مگر خدا ایسا نہیں کرتا بلکہ وقت مقررہ تک چھوڑے رکھتا ہے جب مقررہ مدت پوری ہو جاتی ہے تو اُس وقت انکو ہلاک کرتا ہے یا موت طبعی بھیجتا ہے لیکن اس تاخیر گرفت سے عذاب آخرت نہیں ٹل سکتا۔

اس سے آگے فرماتا ہے کہ بدکار اور سرکش انسان کی بھی عجیب حالت ہے گناہ و سرکشی کے عوض جب اللہ اس کو دنیا میں کسی مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے تو اُس وقت کھڑا بیٹھا اللہ کو پکارتا ہے اور جب مصیبت دور ہو جاتی ہے تو آنکھیں پھیر لیتا ہے گویا کبھی سابقہ ہوا خدا سے نہ پڑا تھا وہی شرک و بدعت وہی سرکشی و گمراہی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ راحت و مصیبت اور دکھ سکھ ہر حالت میں خدا کی طرف رجوع کرتا اور سچے دل سے توبہ کرتا مگر وہ راحت و چین میں غافل ہو جاتا ہے اور مصیبت و تکلیف میں گڑگڑاتا ہے حد اعتدال پر قائم نہیں رہتا اور چونکہ

بدکاری سے نکالا ہر اُس کو کوئی ضرر پہونچتا نظر نہیں آتا اسلئے بدکاری اور بھی اسکی
نگاہ میں محبوب ہو جاتی ہے۔ فسق و فجور اور شرک و کفر میں اور بھی تیز ہو جاتا ہے
شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ یہ حال تو کافر مشرک اور بدبختی بے وقوف کا ہے رہے
وہ لوگ جن کو اللہ نے توفیق ہدایت عطا فرمائی ہے وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں ۔
اللہ نے خود فرمایا ہے اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔ حدیث صحیح میں
بھی آیا ہے کہ مؤمن کی حالت بھی کیسی اچھی ہے جو کچھ اللہ اُس کے حق میں حکم جاری فرماتا
ہے وہ اُس کے لئے بہتری لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اگر اُس کو ضرر پہنچتا ہے تو وہ صبر کرتا
ہے لہذا اُس کے لئے بھلائی ہوتی ہے اور اگر اُس کو نفع پہونچتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے
تب بھی اُس کے لئے بھلائی ہوتی ہے مگر یہ بات سوائے مؤمن کے اور کسی کو
نصیب نہیں (الحدیث فی الصحیحین)

تنبیہ مجاہد نے آیت وَلَوْ یُعَجِّلُ اللّٰہُ الخ کو کفار مکہ کے متعلق نہیں کہا ہے
بلکہ اُن تمام لوگوں کے متعلق کہا ہے جو انتہائی غصہ کی حالت
میں مغلوب الحواس ہو کر اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ ہم کو ذلیل وخوار کر دے
ہمارے رزق و روزی میں برکت نہ دے ہم غارت ہو جائیں جوانی نصیب نہ ہو
بچے مر جائیں وغیرہ وغیرہ ۔ اگر اللہ ان کی یہ بددعا قبول فرمالے جیسے بھلائی کی
دعا قبول کرنے میں تعجیل فرماتا ہے تو ضرور ان کو تباہ و برباد کر دے ۔

مقصود بیان :- شر اور برائی کی دعا کرنا ممنوع ہے ۔ اللہ اپنے بندوں
پر مہربان ہے ورنہ یکدم عذاب بھیجکر سرکش انسانوں کو تباہ کر دیتا گویا گنہگاروں
کے گناہ اگرچہ فوری ہلاکت کے متقاضی ہیں مگر اللہ کی رحمت اُن کو بچاتی ہے مقررہ
اجل سے پہلے کوئی ہلاک نہیں ہو سکتا میعاد زندگی بہرحال پوری ہوتی ہے ۔ اللہ کی
ڈھیل سے کافر و سرکش آدمی ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے سرکشی اور طغیان میں اور بھی
بڑھتا چلا جاتا ہے گویا تاخیر عذاب اُس کے لئے مزید تباہی کا باعث بن جاتی ہے
کافر و منکر سب بمجبوری اضطراراً مصیبت کے وقت اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

گویا وجود الٰہی کا اقرار اور اس کی قدرت کاملہ کا اعتراف نظری اور خلقی ہے ہستی باری تعالیٰ کے منکر بھی مصیبت کے وقت اقرار کرنے اور اس سے مدد مانگنے پر مجبور ہوتے ہیں اگرچہ ان منکروں کی استعانت وقتی ہوتی ہے اور اہل ایمان ہر وقت اللہ سے لو لگائے رہتا ہے۔ آیت میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ انسان کو دکھ سکھ ہر حالت میں خدا کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ وغیرہ

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا

یقیناً ہم تم سے پہلی قوموں کو جبکہ اُنہوں نے ظلم کیا اور اُن کے

ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ

پاس اُن کے پیغمبر معجزات لے کر آئے ہلاک کر چکے ہیں

وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا كَذٰلِكَ نَجْزِى

کیونکہ وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لے آتے ہم مجرم قوم کو

الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ

یونہی سزا دیتے ہیں اُن کے بعد پھر ہم نے تم کو

خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ

زمین میں جانشین کیا تاکہ دیکھیں

كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۝

تم کیا کرتے ہو

تفسیر

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت میں صرف کفار مکہ کو خطاب ہے مگر صحیح یہ ہے کہ تمام اہل مکہ کو خطاب ہے کفار ہوں یا مومن مگر مقصود خطاب صرف اہل مکہ ہی نہیں ہیں بلکہ روئے زمین کے کل انسانوں کی طرف روئے سخن ہے خواہ نزول کے وقت موجود ہوں یا آئندہ ہونے والے ہوں۔ ہلاک کی دو صورتیں ہیں باطنی اور ظاہری۔ باطنی ہلاکت تو یہ ہے کہ بظاہر اگرچہ آدمی صحیح تنومند مرفہ الحال اور فارغ البال ہو مگر اس کا دل مردہ ہو قوت فکریہ گمراہ ہو۔ اس کو وہی تدبیر سوجھتی ہو جو روحانی تباہی کا موجب ہے اس کا باطن مسخ ہو چکا ہو نور ایمان کی ایک جھلک بھی کسی وقت اس کے دل پر نہ پڑتی ہو اور ظاہری ہلاکت کے یہ معنی ہیں کہ تمام اسباب عیش اور سامان راحت فنا ہو جائے زندگی تباہ ہو جائے اہل وعیال اور مال ومنال برباد ہو جائے نسل منقطع ہو جائے اور بالآخر ذلت کی موت آ جائے۔ آیت میں دونوں طرح کی ہلاکت مراد ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ کچھ کفار مکہ ہی پر منحصر نہیں ہے ان سے پہلے بھی ایسے بہت سے آدمی اور قومیں گذری ہیں جنہوں نے حقائق عبودیت کو نہیں پہچانا، وساوس وشہوات کی پیروی کی۔ بارگاہ عظمت پر خلوص کے ساتھ سر فگندہ نہ ہوئے پیغمبروں نے ہر چند سمجھایا واضح آیات اور کھلے کھلے نشانات دکھا کر راہ راست پر آنے کی دعوت دی لیکن انہوں نے ایک نہ سُنی وہ ازلی گمراہ تھے ایمان لانے والے ہی نہ تھے پھر کس طرح راہ راست پر آتے۔ بالآخر جب انہوں نے حق کو نہ پہچانا اور صداقت کی تکذیب کی تو اللہ نے اُن کو ہلاک کر دیا اُن کا نام نشان صفحہ ہستی سے مٹا دیا اونچے محل سرسبز باغ اور تمام سامان عیش خاک میں مل گیا اور ابدی بربادی نصیب ہوئی مالک علام خدا جلۂ قدرت اور سنت الٰہی ہے کہ مجرموں کو ایسی ہی سزا دی جاتی ہے۔ مقصود فطرت کے خلاف کام کرنے والے یونہی تباہ ہوتے چلے آئے ہیں ان سب کے بعد تمہاری (یعنی امت محمدیہ کی) باری آئی اور تمہارے اعمال کے امتحان کا وقت آیا تم کو اللہ نے گذشتہ اقوام کا جانشین بنایا تاکہ

تمہارے افعال و حرکات کی آزمایش ہو جائے اگر تم نے ایمان و ایقان کے ساتھ اچھے کام کئے اور اپنے معبود کی عظمت و جلال کا اعتراف کرتے ہوئے اللہ کے رسول کی دعوت پر لبیک کہی تو دائمی نجات نصیب ہوگی۔ اور اگر وحید الٰہی کے منکر ہو کر دنیوی آسایش پر فریفتہ ہو کر اپنی رائے پر عمل کر کے مطمئن ہو کر بیٹھے رہے تو تم کو بھی ابدی ہلاکت سے ہمکنار ہونا پڑے گا۔

نکتہ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ کی تفسیر میں بیضاوی نے بیان کیا ہے کہ لفظ کیف بتا رہا ہے کہ خود کسی فعل کی ذات قابل اعتبار اور مقصود اصلی نہیں ہے مثلاً کوئی کافر نماز کے افعال ادا کرے اور بظاہر نماز پڑھے تو ایسی نماز نا قابل اعتبار ہے۔ اعتبار درحقیقت کیفیت اور حسن باطن کا ہے ایمان کے ساتھ خالص عبادت کی نیت بغیر ریاکاری اور دکھاوٹ کے معتبر ہے ورنہ ظاہری صورت بے کار ہے۔

ایک سوال اللہ کا علم ازلی اور ابدی ہے اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں نہ بندوں کی کل حالت اور ہر حالت کے کل کوائف خوب جانتا ہے پھر بندوں کی آزمائش کرنی اور امتحان کے بعد حقیقت اعمال کو معلوم کرنا بعد جانچ کرنا اور فرماں برداری و نافرمانی کو دیکھ کر کافر و مومن کا امتیاز کرنا کیا معنے رکھتا ہے اور لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ کا کیا مطلب ہے؟

جواب اس شبہ کا حل دو طرح سے کیا گیا ہے (۱) لِنَنْظُرَ کا لفظ ڈرانے اور دھمکی دینے کے لئے ہے اگرچہ کل جزئیات اور تمام آنے والے واقعات سے واقف ہے مگر اس سے تہدید کرنی مقصود ہے کہ ہوشیار رہو اور نیک اعمال کئے جاؤ۔ جو لوگ فرماں برداری کی کوشش کرتے ہیں ہم ان کے اعمال کو دیکھتے ہیں اور جانتے ہیں۔ گویا برے کاموں سے تہدید اور نیک اعمال کی ترغیب مقصود ہے (۲) لِنَنْظُرَ بطور استعارہ کے استعمال کیا گیا ہے یعنی جیسے کوئی امتحان کے لئے کسی کو مقرر کرتا ہے ایسا ہی تمہاری سمجھ کے لائق ہم نے معاملہ

کیا ہے۔ حافظ ابن جریر نے ایک حسن حدیث اس جگہ نقل کی ہے چونکہ اس حدیث کا تعلق آیت کے مفہوم کے ساتھ خاص طور پر ہے اس لئے ہم بھی اس کا ترجمہ نقل کرتے ہیں۔

حضرت عوف بن مالک رضی نے حضرت ابو بکر صدیق رضی سے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ آسمان سے ایک رسی نیچے کو لٹکی حضور رسول اکرم ص اس رسی کو پکڑ کر خوشی خوشی اوپر تشریف لے گئے رسی پھر دوبارہ لٹکائی گئی تو آپ اسکو پکڑ کر چڑھ گئے۔ اسی سلسلہ میں میں نے دیکھا کہ لوگ ممبر کے آس پاس بیٹھے ہیں لیکن عمر رضی تین ہاتھ سب سے آگے ہیں۔ اس خواب کے بیان کے وقت حضرت عمر رضی بھی موجود تھے کہنے لگے عوف! معاف کرو ہم کو اس خواب کے سننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت ابو بکر رضی کی وفات کے بعد جب حضرت عمر رضی خلیفہ ہوئے تو آپ نے عوف رضی کو بلا کر خواب بیان کرنے کی فرمائش کی۔ عوف رضی نے کہا کیا آپ نے مجھے جھڑکا نہ تھا؟ فرمایا اس وقت مجھے گوارا نہ تھا کہ تم رسول اللہ ص کے خلیفہ کو انکی وفات کی خبر سناؤ اس وجہ سے میں نے تم کو بیان خواب سے روکا تھا غرض عوف نے خواب بیان کیا۔ جب حضرت عمر رضی کے تین ہاتھ آگے ہونے کا ذکر آیا تو آپ نے فرمایا ایک ہاتھ تو یہ ہے کہ وہ خلیفہ ہوگا۔ دوسرا یہ ہے کہ اللہ کے معاملہ میں وہ کسی ملامت گر کی ملامت کرنے کی پرواہ نہ کریگا۔ تیسرے ہاتھ سے مراد یہ ہے کہ وہ شہید ہوگا۔ اس کے بعد آیت ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ الخ تلاوت کر کے فرمایا اے عمر! تو خلیفہ تو ہو گیا اب دیکھنا ہے تو کیسے کام کرتا ہے۔ الحدیث۔

مقصود بیان: گذشتہ اقوام کی تباہی صرف انکی ستم شعاری اور بدکاری کی وجہ سے تھی۔ ان کو پیغمبروں نے سمجھایا۔ معجزات اور دلائل و شواہد پیش کئے مگر انھوں نے نہ مانا اور سرتابی کرتے رہے۔

ایمان و کفر اور ہدایت و ضلالت ازلی چیز ہے۔ جس کے متعلق ازل میں بے ایمان ہونا مقرر ہو چکا وہ ہرگز ایمان نہیں لائیگا۔ ضابطۂ قدرت ہے کہ بدکار مفسد تباہ

کر دیے جاتے ہیں۔ امت محمدیہ اس زمین کی وارث بطور خلافت کے ہوئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو انکی بھی آزمایش کرنی مقصود ہے۔ اگر فرماں بردار مومن اور اطاعت شعار رہینگے تو کامیاب اور سرخرو ہونگے ورنہ گذشتہ اقوام کی طرح برباد ہو جائینگے۔ وغیرہ

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ

جب اُن کے سامنے ہماری صاف صاف آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو جو لوگ

الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ

ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی دوسرا قرآن

غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ

ہمارے پاس لاؤ یا اسی کو بدل ڈالو (اے نبی) کہدو کہ مجھے اپنی طرف سے اسکو بدلنے

اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ

کا اختیار نہیں میں تو اُسی کا تابع ہوں

اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ

جو میرے پاس وحی کے ذریعہ سے بھیجا جاتا ہے اگر میں اپنے رب کا حکم نہ مانوں

عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○

تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا ڈر رہتا ہے

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ

(اے نبی) کہدو کہ اگر خدا چاہتا تو میں اُسکو تمہارے سامنے نہ پڑھتا

وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا

اور نہ تمہیں اللہ اس سے خبردار کرتا میں تو اس سے پہلے بھی ایک زمانہ تک تم میں رہا

مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ فَمَنْ اَظْلَمُ

کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے

مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ

جو اللہ پر دروغ بافی کرے یا اُس کی آیتوں کو

بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

جھٹلائے بالتحقیق مجرموں کا بھلا نہیں ہوتا

تفسیر قرآن پاک کی آیات متفرق اوقات میں نازل ہوتیں اور مختلف اصلاحی مضامین لیکر نازل ہوتیں۔ کچھ آیات سُن کر تو کفار خاموش رہتے کیونکہ مضامین اُن کی طبائع کے موافق ہوتے لیکن اصولی آیات میں اُن کی خواہشات کے خلاف احکام نازل ہوتے تو اُنکو گراں گزرتا۔ مثلاً غیر اللہ کی پرستش کی ممانعت، بتوں کی مذمت اور اُن کا مجبور محض ہونا، غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے ہوئے جانور کی حرمت و تکفیر، دنیوی زندگانی پر عدم اطمینان کی تعلیم، حیات بعد الممات، حشر نشر، عذاب ثواب اور حساب کتاب کا عقیدہ، نیک اعمال کرنے کا حکم، اللہ کے صفات کمالیہ کا اظہار اور اسی قسم کے مضامین کی آیات اُن کو ناگوار ہوتیں۔ چونکہ اللہ کی عظمت و کبریائی سے جاہل تھے، مخلوق کو خود مختار جانتے تھے۔ راہِ عقل چھوڑ کر کفر کی پابندی کرتے تھے، بجائے اس کے کہ خود کجروی ترک کر دیں راہِ مستقیم کو اپنے کجرو نفوس کی طرف موڑنا چاہتے تھے اور پیام الٰہی کو رسول اللہ کا

ایجاد کردہ حکم یقین کرتے تھے، اسلئے اپنی خواہشات پر اللہ کہ آیات قرآنی میں تبدیل تغیر اور تحریف کے خواستگار تھے۔ چنانچہ بعض سرداران قریش نے ایک مرتبہ حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ آپ یا تو کوئی دوسرا قرآن لائیے یا اسی میں تبدیلی کر دیجئے جسمیں ہمارے معبودوں کی مذمت نہ ہو تو ہم ایمان لائینگے اُس پر ان آیات کا نزول ہوا

حاصل ارشاد یہ ہے کہ :- یہ کفار بھی عجیب جاہل ہیں۔ آیات الٰہی اور احکام قرآنی کو شش کر تبدیل یا تغیر کے طالب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا تو اس قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن ہی نئے لے آؤ جس میں ہمارے عقیدہ کے خلاف باتیں نہوں یا اسی کو رہنے دو مگر اسمیں سے وہ باتیں نکال ڈالو جو ہماری خواہش کے مطابق نہیں ہیں۔ اے نبی تم ان سے کہدو کہ دوسرا قرآن لانا تو کیا معنی رکھتا ہے میں تو اپنی طرف سے اس قرآن میں بھی ذرہ برابر تغیر و تبدل نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے اپنے نفس کی طرف سے کچھ پیش ہی نہیں کیا ہے۔ میں تو صرف انہی احکام و پیامات کا پیرو ہوں جو اللہ نے بذریعہ وحی میرے پاس بھیجے ہیں مجھے کسی قسم کے تصرف کا حق ہی نہیں ہے اگر ذرہ برابر تبدیل کروں تو عذاب آخرت کا اندیشہ لگا ہوا ہے جو کچھ میں تم کو سناتا ہوں وہ اللہ کی مشیت اور ارادہ سے ہے۔ اگر خدا کی مشیت ہوتی تو میں کوئی آیت تمہارے سامنے تلاوت نہ کرتا اور نہ کسی حکم کی اطلاع دیتا۔ دیکھو اس سے پہلے مدت دراز تک (۴۰ سال) میں تم میں رہا۔ اتنا طویل عرصہ گذارا لیکن کوئی آیت کوئی شعر کوئی نظم کوئی نثر اور کوئی حکم نہیں سنایا اگر اپنی طرف سے میں بیان کرنے والا ہوتا تو اس سے پہلے کبھی کسی قسم کی کوئی آیت سنائی ہوتی جب میری کل گذشتہ عمر ہر قسم کے دعوٰی سے خالی ہے تو پھر اب کس طرح اپنی طرف سے کلام بنا کر اللہ پر بہتان تراشی کر سکتا ہوں۔ تم دماغ سے ذرا سوچ سمجھ کو کام نہیں لیتے۔ اتنے بے عقل ہو گئے۔ ذرا غور کرو کہ دو باتوں کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں اگر باوجود مرسل من اللہ نہ ہونے کے کوئی شخص دعوٰی کرے کہ یہ حکم اللہ کیطرف سے

مجھ پر نازل ہوا ہے تو انجام کار وہ تباہ اور ناکام ہوگا اور اگر واقعی کوئی حکم یا پیام اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور کوئی شخص اس کی تکذیب کرے اور سچ نہ مانے تو وہ تباہ و برباد اور نامراد ہوگا۔ بہرحال مجرم کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔ جب میں مدعی رسالت ہوں اور تم بلاوجہ منکر ہو تو آئندہ دیکھ لینا کہ فلاح و کامیابی کس کو حاصل ہوتی ہے۔ اگر میں سچا ہوں گا تو مجھے فتح حاصل ہوگی اور اگر تم حق پر ہوگے تو تم کامیاب ہو گے۔ توریت و انجیل سے بھی قرآن کے اس مضمون کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام ؓ نے اپنے مسلمان ہونے سے قبل کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا جب حضور اقدس ؐ مدینہ میں تشریف لائے تو میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ چہرۂ نورانی جھوٹوں کا نہیں ہو سکتا۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ حضور اقدس ؐ کے پاکیزہ اقوال آپ کی صداقت رسالت کی روشن دلیل ہیں اور مسیلمہ اور سجاح اور اسود وغیرہ جھوٹے مدعیان نبوت نے جو شیطانی وحی کا اظہار کیا اور اللہ پر افترا باندھا اس کے جھوٹ اور افترا ہونے کا خود انہی کے متبعین نے اقرار کیا۔ چنانچہ عمرو بن العاص اور مسیلمہ کی باہم دوستی تھی۔ ایک مرتبہ عمرو حالت کفر میں مسیلمہ کے پاس گئے۔ مسیلمہ نے پوچھا عمرو! آج کل تمہارے گروہ والوں کی کیا خبر ہے؟ عمرو نے جواب دیا میں نے محمد ؐ کے ساتھیوں سے ایک چھوٹی سی سورت سنی ہے تو عجیب عظمت والی ہے۔ مسیلمہ نے کہا وہ کونسی سورت ہے؟ عمرو نے سورۃ کوثر پڑھ کر سنائی۔ مسیلمہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا عمرو! ایسی ہی ایک سورت مجھ پر نازل ہوئی ہے اور وہ یہ ہے:۔ یا وبر یا وبر انما انت اذنان وصدر وسائرک حفر و نقر۔ کیوں کیسی ہے؟ عمرو نے جواب دیا واللہ میں تجھے کذاب جانتا ہوں۔

مقصود بیان:۔ اس بات کا اظہار کہ جو لوگ خواہش نفس کے بندے ہو کر الٰہی کے منکر اور قیامت کی تکذیب کرنے والے ہیں وہ پیام الٰہی کو اپنے ہوائے ہوس کے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی حکم یا آیت ان کو اپنی خواہش کے

خلاف نظر آتی ہے تو ناگوار گذرتی ہے اور اضطراراً تبدیل و تغیر کے خواستگار ہوتے ہیں وہ اللہ کی عظمت، رسول کی صداقت اور مرتبۂ نبوت سے ناواقف ہیں۔ رسول پاک اپنی طرف سے کوئی دینی بات نہیں فرماتے تھے صرف وحی کے تابع تھے اگر اجتہاد فرماتے تو اس کو وحی کی طرف منسوب نہ کرتے تھے رسول پاک کی زندگی پاکیزہ تھی۔ نبوت سے پہلے بھی آپ کی زندگی میں کوئی بات گرفت کے قابل نہ تھی اسی لئے حضور اپنی پوری زندگانی کو اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش فرماتے تھے۔ جھوٹے نبی کو اور سچے نبی کی تکذیب کرنے والوں کو کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوتی اگر کچھ دنوں کے واسطے کامیابی نظر بھی آئے تب بھی انجام کار تباہی سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے۔ وغیرہ۔

وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ

یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر اس چیز کی پرستش کرتے ہیں جو نہ انھیں نقصان پہنچا سکتی ہے

وَلَا يَنفَعُهُمْ وَيَقُولُونَ هَٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا

نہ نفع اور کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاں یہ ہمارے

عِندَ اللَّهِ ۚ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا

سفارشی ہونگے (اے نبی) کہدو کہ کیا تم اللہ کو وہ بات بتاتے ہو جسے وہ

يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ ۚ سُبْحَانَهُ

نہیں جانتا نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں وہ پاک ہے

وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ○ وَمَا كَانَ النَّاسُ

اور ان کی شرک آمیز باتوں سے برتر ہے اور لوگ تو

إِلَّا أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا ۚ وَلَوْلَا

ایک ہی امت تھے مگر پھر وہ جدا جدا ہو گئے اگر ایک

كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ

بات تمہارے پروردگار کی طرف سے نہ ہو چکی ہوتی تو اُن کی

بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۝

باہمی اختلافی باتوں کا فیصلہ ہو چکا ہوتا

تفسیر احکام الٰہی سے سرتابی کرنے اور ان کو نہ ماننے کی دو وجہیں تھیں
ایک تو خواہش نفس کی پیروی اور ہوا پرستی۔ دوسری یہ کہ کفار مکہ کا
عقیدہ تھا کہ دنیا کی ہر مصیبت کو ہمارے معبود سفارش کر کے دور کرا دیتے ہیں ہر کام
کے دیوتا مختار ہیں اگر بالفرض عذاب اور سزا کا جھگڑا ہوا بھی تو ہمارے یہ معبود
شفاعت کر کے ہم کو رہا کرا لینگے۔ اس کے رد میں اللہ نے یہ آیات نازل فرمائیں
حاصل ارشاد یہ ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر کفار ایسے باطل اور بے حقیقت معبودوں
کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع۔ اگر اُن کی پرستش
کی جائے تو فائدہ نہیں پہنچا سکتے اور پرستش نہ کی جائے تو ضرر نہیں دے سکتے
پھر ان کی عبادت کس خوف و رجاء کی وجہ سے ہے۔ جب کافروں کو اس کا کوئی جواب
نہیں ملتا تو کہتے ہیں ہمارے یہ معبود اللہ سے ہماری سفارش کرتے ہیں یعنی
دنیا میں جو مہم ہم کو پیش آتی ہے اسکو سفارش کر کے اللہ سے پورا کرا دیتے ہیں اور
آخرت میں بھی شفاعت کرا کے ہم کو چھڑا لینگے۔ عرب کے مشرکوں کا بھی یہی عقیدہ
تھا اور عیسائی بھی اسی کے قائل ہیں کہ مسیح ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو گئے۔ وہ
باپ سے سفارش کر کے ہم کو عذاب سے بچا لینگے لیکن یہ انکی خام خیالی ہے

خدا تعالیٰ فرماتا ہے اللہ کے علم میں سفارشیوں کا وجود ہی نہیں اور اللہ کے احاطۂ علمی سے کوئی چیز خارج نہیں پھر جب ایسے سفارشیوں کی ہستی کا علم آسمانوں و زمینوں میں کہیں خدا کو نہیں تو تم کہاں سے ایسے سفارشی لا سکتے ہو۔ یہ تمہارے خیالات فاسدہ ہیں۔ اللہ کے کارخانۂ قدرت میں ایسے سفارشی شریک نہیں ہو سکتے وہ شریکوں سے پاک اور بری ہے اس کی مرضی و مشیت میں کسی کو دخل نہیں۔ کفار عرب لاجواب ہو کر کہہ دیا کرتے تھے کہ ہم اگر دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں اور مورتیوں کو پوجتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہمیشہ سے یونہی ہوتا چلا آیا ہے قدیم سے یہی دستور تھا اس کی تردید کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تمہارا یہ کہنا غلط ہے کیونکہ آفرینش آدم سے لیکر مدت دراز تک سب لوگ فطرت کے موافق ایک ہی ملت اور ایک ہی گروہ یعنی موحد و مومن تھے لیکن کچھ مدت کے بعد فطرت الٰہیہ کے خلاف کجروؤں اور گمراہوں نے اہل توحید سے اختلاف کر کے بت پرستی اور گمراہی اختیار کر لی۔ ابن عباس رض فرماتے ہیں حضرت آدم ؑ سے لیکر حضرت نوح ؑ تک دس قرن گذرے۔ اس زمانہ میں سب ملت اسلام پر تھے اس کے بعد اختلاف واقع ہوا اور بعضوں نے غیر اللہ کی پرستش شروع کی بعض اہل تفسیر کا قول ہے کہ حضرت ابراہیم کے وقت سے عمرو بن لحی کے زمانہ تک سب لوگ (یعنی تمام اہل عرب) ملت ابراہیمی پر تھے پھر عمرو نے بت پرستی ایجاد کی۔ بیضاوی نے کہا کہ زمانہ آدم ؑ سے لیکر قتل ہابیل یا زمانہ نوح ؑ تک سب لوگ دین حق پر تھے پھر کفر و شرک شروع ہوا۔ بہرحال حاصل کلام یہ ہے کہ بت پرستی قدیم نہیں ہے بلکہ توحید قدیم ہے۔ بت پرستی انسانی دماغ کی ایجاد ہے مگر خدا نے دنیا میں حق و باطل اور صدق و کذب کا فیصلہ کرنا نہ چاہا اس وجہ سے اختلاف باقی رہا نوشتۂ ازلی ہے کہ صدق و کذب کا امتیاز اور کامل انکشاف قیامت کے دن ہوگا۔ اگر یہ ازلی نوشتہ نہ ہوتا تو دنیا ہی میں فیصلہ ہو چکا ہوتا اور اہل باطل کی بیخ کنی کر دی گئی ہوتی۔

مقصود بیان :- توحید الوہیت و ربوبیت کا پُر زور دلیل کے ساتھ اثبات ۔ اس بات کی طرف ایما کہ معبود میں اتنی قدرت ہونی چاہئے کہ کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکے تاکہ خوف و بیم کا مرکز بن سکے ورنہ خواہ مخواہ کی پرستش بے سود اور باطل ہے ۔ اس امر کی صراحت کہ توحید قدیم ہے بُت پرستی بعد کی ایجاد ہے اس بات کی وضاحت کہ دنیا میں کفر و اسلام اور حق و باطل کا اختلاف نوشتہ ازل کے موافق ہے ۔ خدا تعالیٰ دنیا میں صدق و کذب کا کامل انکشاف اور آخری فیصلہ کرنا نہیں چاہتا تاکہ تخلیق عالم کا مقصود اصلی یعنی امتحان پورا ہو سکے ۔ وغیرہ

وَيَقُولُونَ لَوْلَآ أُنزِلَ عَلَيْهِ ءَايَةٌ مِّن

یہ کہتے ہیں کہ تمہارے رب کی طرف سے کوئی معجزہ کیوں نہ اس پر

رَّبِّهِۦ ۖ فَقُلْ إِنَّمَا ٱلْغَيْبُ لِلَّهِ فَٱنتَظِرُوٓا۟

نازل کیا گیا کہدو کہ غیب کی بات اللہ ہی جانے تم انتظار کرو

إِنِّى مَعَكُم مِّنَ ٱلْمُنتَظِرِينَ ۝ ع ۲

میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں شامل ہوں

تفسیر رسول پاک ؐ کے معجزات بینات تمام انبیاء سے زائد تھے ۔ محسوس بھی اور معقول بھی ۔ جاہلوں کے سمجھنے کے قابل بھی تھے اور اہل عقل کے لئے غور طلب بھی ۔ درختوں کا اپنی جگہ سے ہٹ کر زمین پھاڑتے ہوئے آنا ، پہاڑوں کا کلمۂ توحید پڑھنا ، چاند کا ٹکڑے ہو جانا ، اونٹ کا صاف زبان میں اظہار کرنا ، جاندار اور بے جان کا حضور کو سلام کرنا ، ستونوں کا گریہ کرنا ، انگلیوں سے پانی کا جاری ہونا اور اس سے ایک

لشکر کا سیراب ہو جانا، زہریلے گوشت کا بولنا کہ میں زہر آلود ہوں پھر سب سے بڑھ کر قرآن کی بلاغت اور اُن ضوابط کا بیان جن کی تدوین سے دنیا بھر کی جمہوریتیں عاجز ہیں، آئندہ واقعات کو صحیح طور پر ظاہر کرنا اور گذشتہ تاریخی واقعات پر تبصرہ کرنا جس سے اہل تنقید بھی ششدر رہ جاتے ہیں۔ پھر حضورؐ کی معجزانہ عملی زندگی غیبی طاقت لئے ہوئے، اخلاقی تسخیر، یہ سب چیزیں فرداً فرداً بجائے خود معجزہ تھیں جو حق طلب اور جویائے حقیقت کی تسلی کے لئے کافی سے زیادہ مواد اپنے اندر رکھتی ہیں مگر پھر بھی جو ازلی کافر اور معاند متعصب تھے وہ رسول پاکؐ کو مغلوب کرنے کی نیت سے اور اہل اتقاد کے طبقہ میں فساد پھیلانے کے لئے بیہودہ طور پر معجزات طلب کرتے تھے کبھی کہتے یہ پہاڑ سونے کا ہو جاتے، کبھی کہتے فرشتہ اُتر کر ہم سے تمہاری صداقت کا اظہار کرے۔ غرض اسی قسم کی بے سرد پا باتیں کرتے ایک تو اس قسم کی فرمائش کی تکمیل ضابطہ قدرت اور قانون نبوت کے خلاف تھی۔ دوسرے یہ کہ کل طلب معجزات معاندانہ تھی۔ ظہور معجزہ کے بعد بھی ایمان لانے کی امید نہ تھی اور ایمان نہ لانے پر عذاب کا آنا لازم تھا جسطرح معجزات مطلوبہ دیکھنے کے بعد گذشتہ اقوام پر عذاب نازل ہوئے اور حضورؐ کو ساکنان حرم کی تباہی منظور نہ تھی ایک تو حرم کے اندر عذاب کا نزول خلاف آداب حرم تھا پھر کافروں کی تباہی کے بعد ان کی نسلیں منقطع ہو جاتیں تو آئندہ ایمان لانے والا کون ہوتا جسطرح گذشتہ اقوام کی نسلیں منقطع ہو گئیں اسی طرح دو رنبوی کے کفار کی ہلاکت کے بعد آئندہ مسلمانوں کے پیدا ہونے کی امید جاتی رہتی۔ غرض انہی مصالح کے تحت حضورؐ نے پُرحکمت انکار کر دیا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ: کفار کہتے ہیں تم پر کوئی ایسی عظیم الشان علامت نبوت اور نشانی کیوں نمودار نہیں ہوتی جس سے ہماری تسلی ہو جاتے اے نبی تم ان سے کہدو کہ مخلوق کی نظر سے جو چیزیں غائب ہیں اُن کا علم تو اللہ ہی

کو ہے کسی کو اُن کا اختیار نہیں اور معجزات بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں لہذا وہ بھی خدا ہی کے اختیار میں ہیں چاہے ظاہر فرمادے نہ چاہے نہ ظاہر فرمائے۔ میرا کام صرف احکام کا پہنچانا ہے۔ لہذا اگر تم میری رسالت پر ایمان نہ لائے تو عذاب کے منتظر رہو۔ میں بھی تم پر عذاب نازل ہونے کا منتظر ہوں۔

ابن جریر نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت میں تمام غیبی امور ہیں وہی ہر امر کا انجام جانتا ہے اگر مطلوبہ معجزات دیکھنے کے بغیر تم مجھپر ایمان نہ لاؤ تو میرے اور اپنے حق میں حکم الٰہی کا انتظار کرو دیکھو وہ کیا حکم دیتا ہے۔ ابن جریر کی توضیح کی بنا پر اس آیت میں کافروں کو تہدید ہوگی کہ دیکھو عنقریب تم کو ذلت اور اسلام کو فتح حاصل ہوگی۔

مقصود بیان: فرمائشی معجزات کا ظہور ہر وقت نہیں ہوا کرتا غیبی امور کا علم اور ان پر تصرف صرف خدا کے قبضہ میں ہے۔ کافروں کو عذاب کی تہدید اور اسلام کے غلبہ کی درپردہ بشارت اور انتظار حکم وغیرہ۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ

جب ہم تکلیف پہنچ چکنے کے بعد لوگوں کو — اپنی رحمت کا مزہ

ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا ؕ

چکھاتے ہیں تو اُسی وقت وہ ہماری قدرتوں میں حیلے بنانے لگتے ہیں

قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا ؕ اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ

تم کہدو کہ اللہ بہت جلد تدبیر کرنے والا ہے جو کچھ تم حیلہ بازی کر رہے ہو ہمارے

مَا تَمْكُرُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي

فرشتے اُسکو لکھ لیتے ہیں — وہی اللہ اُن کو خشکی اور — تری میں

الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ط حَتّٰىٓ اِذَا كُنْتُمْ فِى الْفُلْكِ

پھراتا ہے یہاں تک کہ جب وہ کشتیوں میں ہوتے ہیں

وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا

اور کشتیاں اُن کو لیکر موافق ہوا کی مدد سے چلتی ہیں اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں

جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ

تو یکدم تند ہوا کا جھونکا آکر لگتا ہے اور ہر طرف سے لہریں

مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ

آتی ہیں اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ اُن کا گھراؤ ہو گیا

دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ لَئِنْ

تو اس وقت اللہ کو خلوص عبادت کے ساتھ پکارنے لگتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ اگر

اَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ

تو نے ہم کو اس سے نجات دیدی تو ہم شکرادا کرنیوالوں میں سے ہو جائیں گے

فَلَمَّآ اَنْجٰىهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ

لیکن جب اللہ اُن کو بچا دیتا ہے تو زمین پر ناحق شرارت کرنے

بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ

لگتے ہیں لوگو! تمہاری شرارت کا وبال

عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ مَّتَاعَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا

تمہاری ہی جانوں پر ہے دنیوی زندگی میں مزے اڑا لو

ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُکُمْ فَنُنَبِّئُکُمْ

بالآخر ہماری ہی طرف تم کو لوٹنا ہے ہم تمہارے اعمال کو

بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

تم کو بتا دیں گے

تفسیر جب حضور ؐ کی بددعا سے اہل مکہ ہفت سالہ قحط میں مبتلا ہوئے اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ بھوک کی وجہ سے لوگوں کو آسمان پر دھواں نظر آنے لگا مُردار کی کھال اور درختوں کی چھال تک کھا گئے تو ابو سفیان جیسے کچھ لوگ نادم ہو کر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر گڑگڑائے رحمۃ للعالمین کو اُن پر رحم آیا۔ آپ نے دفع قحط کی دعا کی اللہ نے وہ بلا دفع کی اور فراخی حاصل ہوئی اُس وقت لازم تھا کہ کفر کو چھوڑ کر ایمان کی طرف رُخ کرتے مگر انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ جونہی قحط دفع ہوا اور روٹی ملنے لگی آیاتِ الٰہی پر نکتہ چینی کی اور بھی زور سے کوشش کرنے لگے۔ رسول اللہ ؐ کی نبوت میں طعن اور جرح کرنے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کی۔ قرآن کی امثال پر ناجائز گرفت شروع کر دی۔ غرض ہر ممکن صورت سے حضور ؐ کو ایذا دیتے اور کلمۂ توحید کے پابند نہ ہونے کی کوشش کرتے اُس وقت آیات مذکورہ کا نزول ہوا۔

آیات کا نزول اگرچہ صرف کفار کے حق میں ہوا ہے مگر حکم آیات میں وہ تمام احسان فراموش کافر داخل ہیں جو مصیبت کے وقت تو اللہ کی طرف عارضی رجوع کر لیتے ہیں اور مصیبت دور ہونے پر وہی کفرانِ نعمت کرتے ہیں۔ چونکہ عام ہے اسی لئے

اہل تفسیر نے رحمت سے رفع قحط اور ضرّاء سے قحط نقط مراد نہیں لیا ہے بلکہ دو طرح سے مطلب بیان کیا ہے۔ ضرّاء سے مراد ہر جسمانی مصیبت ہے مثلاً بیماری و بار، قحط سالی، بے روزگاری، افلاس وغیرہ اور رحمت سے مراد جسمانی تکالیف کا ازالہ ہے۔ مطلب ظاہر ہے کہ مصیبت پڑتی ہے تو کفار مجبور ہو کر اللہ کی طرف رجوع کرتے اور تکالیف کا ازالہ کر دیا جاتا ہے تو آیات الٰہیہ کی تکذیب اور صداقت ربانیہ میں جرح قدح کرنے کی سینکڑوں تدبیریں کرنے لگتے ہیں۔ پیٹ بھرتا ہے مصیبت جاتی ہے تو دور کی سوجھنے لگتی ہے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ضرّاء سے مراد عقل کی کمزوری، بچپن کی عمر، سادہ مزاجی اور کم سمجھی ہے اور رحمت سے مراد تدبر، دانائی، عقلمندی اور سن بلوغ ہے۔ انسان کی عمر جس وقت کم ہوتی ہے وہ کوتاہ بین کم فہم اور کوتاہ اندیش ہوتا ہے تو طبیعت سادہ اور پاکیزہ ہوتی ہے لیکن جونہی جوان ہوا دست و بازو میں توانائی آئی دماغ میں روشنی اور عقل میں تیزی پیدا ہوئی تو اب کارخانۂ قدرت، ضوابط نیچر اور احکام الٰہیہ میں چون و چرا کرنے لگتا ہے۔

خدا تعالیٰ اپنے نبی کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ تم ان کفران نعمت کرنیوالوں سے کہدو کہ اللہ تمہارے اس مکر و حیلہ تراشی کی سزا بہت جلد دیگا اُسکو تمہاری یہ فریب کاری معلوم ہے، اُس کے فرشتے تمہاری ان عیاریوں کو لکھ لیتے ہیں۔ لامحالہ ان کی پاداش سے تم چھوٹ نہیں سکتے۔

اس سے آگے سرکش نافرمان کافران نعمت کے کفران کی ایک خاص صورت بیان فرماتا ہے جس کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد مذکورہ بالا عام قاعدہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ:- اللہ نے خشکی اور دریا میں سفر کرنے کی توفیق دی اور اُسی نے سفر کی طاقت اور اُس کے ذرائع بتائے۔ چنانچہ جب کشتیوں میں سوار ہو کر لوگ سفر کو نکلتے ہیں اور ہوا موافق ہوتی ہے تو کشتیاں خوب چلتی ہیں

لیکن جب ہوا مخالف ہوئی تند جھونکے آنے لگے موجوں نے چاروں طرف سے گھیرا اور غرق ہو جانے کا یقین ہو گیا تو اُس وقت ہوش حواس باختہ ہو جاتے ہیں کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی مجبوراً قادرِ مطلق کی طرف دوڑتے ہیں اللہ سے نجات کی دعائیں کرتے ہیں، شکر گذاری اور اطاعت شعاری کے وعدے کرتے ہیں اللہ کو رحم آجاتا ہے بیڑا پار لگ جاتا ہے کشتی منزل مقصود پہنچ جاتی ہے تو پھر وہی گردن کشی اور سرتابی کرنے لگتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے میں نے کیسی اچھی تدبیر کی کوئی کہتا ہے یہ میری تجربہ کاری کا نتیجہ ہے۔ اللہ کی طرف کسی کا خیال بھی نہیں جاتا وہی کفرانِ نعمت وہی فساد انگیزی اور وہی سابقہ فتنہ طرازی ہوتی ہے۔ اللہ فرماتا ہے لوگو! اس شرارت، شرک انگیزی اور نافرمانی کا نتیجہ بد خود تم کو اُٹھانا پڑے گا۔ تم خیال کرتے ہو کہ ہم خدا کو دھوکا دیکر کامیاب ہو گئے مال و دولت صحت طاقت سب کچھ ہم کو حاصل ہو گیا اب کوئی ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے یہ خیال تمہارا غلط ہے خوب یاد رکھو کہ دنیا کے جس عیش و طرب مال و منال اور اہل و عیال پر پھولے ہوئے ہو وہ چند روزہ ہے ناپائیدار ہے فانی ہے دنیوی زندگانی کے مزے عنقریب زائل ہو جانے والے ہیں کچھ دنوں عیش کرلو آخر میں تم سب کو ہمارے پاس آنا ہے۔ مرکز کی طرف ضرور لوٹو گے اُس وقت کیے کی سزا ملے گی۔ اعمال کی پاداش بھگتنی ہوگی اور معلوم ہوگا کہ بدکاری کا یہ نتیجہ ہے۔

مقصود بیان: - فارغ البالی اور فراخ حالی کے وقت انسان اور زیادہ سرکش ہو جاتا ہے اور خدا کو بالکل بھول جاتا ہے۔ اللہ کے پنجہ سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔ کسی کی تدبیر اور مکاری اُس سے پیش نہیں جا سکتی۔ اللہ کے فرشتے انسان کی باطنی تدبیروں اور اندرونی حیلسازیوں کو بھی لکھ لیتے ہیں۔ بندوں کا اور اُن کے افعال کا خالق اللہ ہی ہے، سیر و سفر کی توفیق بھی وہی دیتا ہے بظاہر نتائج اسباب سے وابستہ نظر آتے ہیں کشتی کی سبک روی منزل مقصود پر

پہنچاتی ہے اور اس کی عوقابی تباہی پیدا کرتی ہے مگر درحقیقت ان تمام امور کا فاعل خدا ہے۔ انسان کی نظر ظاہر اسباب پڑتی ہے۔ اسکی وجہ سے وہ ظاہری اسباب کی موافقت سے شاداں و فرحاں اور مخالفت سے کبیدہ اور غمگین ہو جاتا ہے۔ انسان کی سرشت یہ ہے کہ شدت و سختی کے وقت مضطر ہو کر فقط اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مضطر کی دعا قبول ہوتی ہے اگرچہ وہ کافر ہو۔ اللہ کی ناشکری اور نافرمانی کا نتیجہ خود انسان کے حق میں بُرا ہوتا ہے اگرچہ اپنے کو کامیاب جانتا ہے۔ دنیوی عیش چند روزہ ہے آخرت میں ذرہ ذرہ کی سزا جزا ہو گی۔ وغیرہ۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ

بس دنیوی زندگی کی مثال تو اُس پانی کی سی ہے جس کو ہم نے

مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ

اوپر سے اتارا ہو جس کی وجہ سے زمین کا سبزہ مل جل کر نکلا ہو

مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ؕ حَتّٰٓى اِذَآ

جس کو آدمی اور جانور کھاتے ہوں یہاں تک کہ جب

اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ

وہ زمین اپنا بناؤ سنگھار کر چکے

وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ

اور اُس کے مالک سمجھنے لگیں کہ وہ کھیتی اُن کے ہاتھ لگ گئی

أَتٰىهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا

تو یک دم رات کو یا دن کو اس پر ہمارا حکم آ پہنچے اور ہم اسکو

حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ ۚ كَذٰلِكَ

کاٹ کر ڈھیر کر دیں اور یہ معلوم ہو کہ کل وہ یہاں تھی ہی نہیں اسی طرح

نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○

ہم قدرت کی نشانیاں غور کرنے والی قوم کے لئے بہ تفصیل بیان کرتے ہیں

تفسیر اوپر کی آیت میں مجمل طور پر بتایا تھا کہ دنیوی زندگی ناپائیدار ہے جس مال و منال اور عیش و طرب پر انسان ریجھا ہوا ہے اور جسکی وجہ سے کفرانِ نعمت اور اللہ سے غفلت کرتا ہے وہ فانی ہے - اسی کی تفصیل و توضیح ان آیات میں بیان کی گئی ہے اور انسانی زندگی کو سبزہ کی زندگی سے تشبیہ دیکر فنائے حیات اور زوال قوت کا نقشہ اہل بصیرت کی آنکھوں میں کھینچا گیا ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جب آثارِ علویہ امہات سفلیہ میں تاثیر کرتے ہیں کائنات آسمانی کے اثر سے زمین سے بخارات اٹھتے ہیں اور پھر ان میں انقلاب و استحالہ ہو کر پانی کی شکل میں اوپر سے بارش ہوتی ہے اور شکم زمین میں یہ پانی پہنچتا ہے مٹی اور پانی کا امتزاج ہوتا ہے اس خلط ملط سے سبزہ اگتا ہے جسکو آدمی اور مویشی کھاتے ہیں زمین سرسبز ہو جاتی ہے کھیت لہلہانے لگتے ہیں۔ غلہ کی بالیاں پک جاتی ہیں کاشتکار کو یقین ہو جاتا ہے کہ عنقریب کل پرسوں میں ہم کاٹ لونگا اور اس پر قبضہ کر لونگا یک دم کوئی آندھی اولہ بجلی وغیرہ ناگہانی مصیبت آتی ہے سرسبز اور لہلہاتے کھیت کو صاف کر دیتی ہے روئیدگی بالیدگی اور تمام سرسبزی فنا ہو جاتی ہے ہریالی کے بجائے خاک اڑنے لگتی ہے۔ بھوسہ کا

تنکا ہوا میں منتشر ہو جاتا ہے اور کاشتکار حسرت کے ساتھ سر پکڑ بیٹھ جاتا ہے
یہی حال انسانی زندگانی کا ہے مردانہ جوہر کا نزول ہوا زمین رحم نے اسکو
قبول کیا مردانی اور نسوانی جوہر کے اختلاط سے مادۂ حیات تیار ہوا چند روز
کے بعد حسین و جمیل مورتی پیدا ہوئی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی جوان رعنا بن گئی فصل
جوانی کی بہار آئی پھول پھل آئے خوشہ چینی کا وقت آنے ہی کو تھا کہ یک دم
بادِ تند چلی حوادث کا ہجوم ہوا ناگہانی مرض یا کسی اور مصیبت نے آ گھیرا اسباب
عیش خاک میں مل گئے حسن و جوانی فنا ہو گئی چہرہ زرد پڑ گیا سبزۂ زندگانی خشک
ہو گیا، ایک ایک ریزہ ہو کر ہوا میں اڑنے لگا پاؤں میں روندا جانے لگا
خاک سے نکلا تھا پھر خاک میں مل گیا کوئی امید بر نہیں آئی داغ حسرت سینہ
میں رہا۔ اعزا و اقارب مال و منال اہل و عیال دولت و جاہ حکومت و سطوت
عزت و شوکت تباہ ہو گئی۔ جس بے ثبات حسن، ناپائدار جوانی، فانی عیش
اور چند روزہ جاہ و حشم پر پھولا نہ سماتا تھا اس کا نام نشان بھی نہ رہا چشم
بصیرت اور توجہ حقیقتا کی ضرورت ہے دانشمند اور سوچنے والے انسان ایسی
تمثیلات و تشبیہات سے عبرت اندوز ہو سکتے ہیں۔ آیات قدرت اور آثار
نیچر کو دیکھ کر خلاق عالم اور کارساز مطلق کی ہستی اور اس کی قدرت کاملہ پر
استدلال کر سکتے ہیں۔ پس دعوت غور ہے اہل بصیرت کو اور دعوائے تفکر
ہے ناقص دماغ رکھنے والوں کو۔

مقصود بیان :- انسانی زندگانی کو سبزہ کی سے تشبیہ دیکر زندگانی
کی بے ثباتی کا چند وجوہ سے اثبات۔ پانی اور مٹی کے اختلاط سے سبزہ پیدا
ہوتا ہے۔ مرد اور عورت کے جوہر کے امتزاج سے انسان بنتا ہے۔ سبزہ
کے جمنے پیدا ہونے اور بڑھنے پر طرح طرح کی امیدیں اس سے وابستہ
ہوتی ہیں۔ انسان کے حمل پیدائش اور تدریجی بالیدگی بھی دلکش ہوتی ہے
کبھی عین بہار کے وقت کسی ناگہانی مصیبت کی وجہ سے سبزہ سوکھ جاتا ہے

انسان بھی کبھی عالم جوانی میں کسی اتفاقی حادثہ یا مرض کی وجہ سے مرجاتا ہے کبھی سبزہ اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر زرد پڑجاتا اور خشک ہوجاتا ہے اُس کا بھوسہ بن جاتا ہے، بھوسہ ہوا میں اڑجاتا اور خاک میں مل جاتا ہے۔ انسان بھی بوڑھا ہوکر کمزور ہوجاتا اور بالآخر مرکر مٹی میں مل جاتا ہے، اس کا ذرہ ذرہ خاک ہوجاتا ہے خاک ہوا میں اُڑجاتی ہے۔ وغیرہ۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ

اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جسکو چاہتا ہے

مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ لِلَّذِيْنَ

سیدھا راستہ بتا دیتا ہے جن لوگوں نے

اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ؕ وَلَا يَرْهَقُ

نیکی کی اُن کے لئے بھلائی بھی ہے اور کچھ زیادتی بھی اور اُن کے چہروں پر

وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

نہ سیاہی ہوگی نہ ذلت یہی لوگ

الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ

جنتی ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور جن لوگوں نے

كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ ۢ بِمِثْلِهَا ۙ

بُرے کام کئے اُن کو اُن کی بُرائی کی برابر سزا ملے گی

وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ مَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ

اور اُن پر ذلت چھا جائیگی   اُن کو خدا سے کوئی بچانے والا

عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ

نہ ہوگا   معلوم ہوگا کہ اُن کے چہرے   اندھیری رات کے

قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ مُظْلِمًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ

ٹکڑوں میں چھپا دیئے گئے ہیں   یہی لوگ

النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

النصف

دوزخی ہیں   جس میں وہ ہمیشہ رہینگے

تفسیر اوپر کی آیات میں دنیا کی بے ثباتی اور حیاتِ انسانی کی ناپائیداری بیان کر کے اہل بصیرت کو دعوت فکر دی تھی اور جو لوگ اس زندگانی پہ کیوں مطمئن ہو گئے بیٹھے ہیں خوش بیانی کے ساتھ دریدہ دہ اُنکی بیوقوفی کا اظہار کیا تھا۔ ان آیات میں بتانا چاہتا ہے کہ یہ عالم اگرچہ ناپائیدار ہے مگر بیکار نہیں۔ یہ کشت آخرت ہے مرنے کے بعد وہ جنس کاٹنی ہے جو یہاں بوئی تھی۔ اصل رہنے کا مقام دارِ آخرت ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ :- اگرچہ بے وقوف لوگ اس دنیا کو دار اقامت سمجھے ہوئے ہیں اور اسی کو مقصود اصلی جانتے ہیں مگر درحقیقت یہ عافیت اور سلامتی کا مقام نہیں ہے بلکہ دار نجات دوسرا ہے یہ اُس کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اللہ تمام انسانوں کو عام دعوت دے رہا ہے کہ ابدی نجات اور دوامی سلامتی کے گھر کی طرف آؤ۔ یہ دعوت اگرچہ عام ہے مگر اسپر لبیک کہنے والے

اور ندائے الٰہی کو قبول کرنے والے وہی ہیں جن کو اللہ سیدھے راستے پر ڈال دینا چاہے (صراطِ مستقیم راہ اسلام ہے اور راہِ اسلام میں بھی راستی کے درجات مختلف ہیں۔ عام مسلمانوں کا راستہ محض ایمان و یقین ہے خاص اہل ایمان کی راہ عین الیقین ہے اور مخصوص محسنین کا طریقہ حق الیقین ہے۔ اول گروہ اہل برہان ہے۔ دوسرا کاشف اسلام اور اہل بیان ہے اور تیسرا اصحاب عرفان اور اہل عیان ہے) اس دنیا میں جو لوگ اچھا بیج بوئیںگے آخرت میں ان کو اچھا ثمرہ ملیگا اور اصل تخم سے کہیں زائد ملیگا ان کو عمر کی بربادی اور کوشش کے رائگاں ہونے کا افسوس نہ ہوگا نہ دوسرے کاشتکاروں کے سامنے ذلت و رسوائی ہوگی۔ اللہ کے سامنے بھی معزز ہونگے اور بندوں کے سامنے بھی سرخرو۔ اور جن لوگوں نے ردّی بیج بویا ہے ان کے پھل اور پیداوار میں بھی اتنی ہی خرابی ہوگی جتنی تخم میں تھی دوسرے کاشتکاروں کے سامنے بھی پیداوار اٹھاتے وقت ذلیل اور شرمندہ ہونگے اور اللہ کی نظر میں بھی رسوا۔

تنقیح مبحث

حُسْنیٰ سے مراد جنت اور زِیَادَۃ سے مراد جنت کے علاوہ دوسری نعمتیں ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک حُسْنیٰ سے مراد وہ ثواب ہے جو نیکیوں کی برابر ہوگا اور زِیَادَۃ سے مراد دس گونہ سے لیکر سات سو گونہ تک اجر ہے۔ بعض کا قول ہے کہ زِیَادَۃ سے مراد مغفرت اور رضوانِ الٰہی ہے لیکن اکثر اہل تحقیق کے نزدیک حُسْنیٰ سے مراد جنت اور زیادۃ سے مراد دیدارِ الٰہی ہے۔ شیخ علکبری نے تبیان میں لکھا ہے کہ حضور اقدس صلعم نے اس آیت کی یہی تفسیر فرمائی ہے صحیح مسلم ابن ماجہ ترمذی اور مسند احمد میں بھی یہی تفسیر مروی ہے۔ صدیق اکبر رضہ حذیفہ بن یمان رضہ ابن عباس رضہ سعید بن مسیب رضہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ ابن سابط، مجاہد، عکرمہ عامر، عطار، ضحاک، حسن بصری، قتادہ، سدی اور ابن اسحاق وغیرہ سے بھی

یہ ہی روایت ہے اس کی تائید میں بکثرت احادیث وارد ہیں۔ اور یہ تفسیر تقریباً حد تواتر کو پہنچ گئی ہے۔ ابن جریر نے مختلف احادیث اسی کی تائید میں نقل کی ہیں

مقصود بیان :۔ آیت دلالت کر رہی ہے کہ دعوت عمومی اور ہے اور ہدایت خصوصی اور۔ گویا امر دعوت اور ہے اور ارادۂ ہدایت علیحدہ چیز ہے عمومِ دعوت اظہارِ محبت ہے اور خصوصی ہدایت اظہارِ حکم و قدرت۔ ہدایت خاص خدا کے دستِ قدرت میں ہے۔ جو شخص مرتے دم تک گمراہی پر اصرار رہا اُس کو ہدایت کرنا اللہ نے نہ چاہا۔ نیکو کاروں کو نیکیوں کا بدلہ بھی ملیگا اور مزید انعامات سے بھی سرفراز ہوں گے اور اُن کی عزت بھی کی جائیگی اور جنت میں ہمیشہ ابد الآباد تک رہینگے بدکاروں کو صرف اُن کی بدی کا عوض ملیگا اُن پر زیادتی نہ ہوگی۔ اگر وہ کافر ہیں تو ہمیشہ جہنم میں رہینگے اور اُن کے مُنہ قیامت کے دن سیاہ ہونگے اور وہ ذلیل بھی ہونگے وغیرہ

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ

اور جس دن کہ ہم ان سب کو جمع کر کے مشرکوں سے

أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ أَنْتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ

کہیں گے کہ تم اور تمہارے شریک اپنی جگہ پر ٹھہرو

فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُمْ مَا كُنْتُمْ

اس کے بعد اُن میں باہم پھوٹ ڈال دینگے اُن کے شرکاء کہیں گے کہ تم

إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ۝ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا

ہماری تو پرستش کرتے نہ تھے پس اللہ ہمارے تمہارے درمیان

بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ

شہادت دینے کے لئے کافی ہے ہم تو تمہاری پرستش سے بالکل

لَغٰفِلِيْنَ ۝ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّا

بے خبر تھے وہاں ہر شخص اپنے گذشتہ کئے ہوئے اعمال کو

أَسْلَفَتْ وَرُدُّوْٓا إِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ

جانچ لیگا اور سب کو اللہ کے پاس لوٹا کر بھیجا جائیگا جو ان کا مالک حقیقی ہے

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ع

اور جو کچھ وہ افتراء بندی کیا کرتے تھے سب کھو جائے گی

ع ۳ النصف

تفسیر تحقیق اجزاء

حشر کے لغوی معنی ہیں جمع کرنا۔ یہاں قبروں سے نکال کر میدانِ قیامت میں جمع کرنا مراد ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ حشر موت ہے۔ شاید مجاہد کی مراد اس تفسیر سے یہ ہے کہ حشر قیامت دور نہ سمجھو جو مر گیا اس کا حشر ہو گیا۔ لِلَّذِيْنَ أَشْرَكُوْا سے عام مشرکین مراد ہیں۔ جو لوگ اللہ کے علاوہ کسی اور کی پوجا کرتے ہیں خواہ فرشتوں کی دیوتاؤں کی جنات کی ارواح انبیاء و اولیاء کی یا عناصر و کواکب کی یا مورتیوں کی یا یونہی غیر اللہ کو حاجت روا و مشکل کشا سمجھ کر ہر کار روبار میں اُن کو پکارتے اور اُن کی نذر و نیاز کرتے اور بھینٹ چڑھاتے ہیں یہ سب غیر اللہ کے پرستار ہیں بلکہ جو لوگ ہوا و ہوس، شہرت، دولت اور حکومت کے پجاری ہیں وہ بھی مشرک ہیں۔ اُن سے بھی قیامت کے دن مذکورہ الفاظ کہے جائینگے۔
مشرکانہ سے مراد علامہ عکبری صاحب تبیان کے نزدیک بت ہیں جنکو مشرکین

اپنے خیال میں روزی مال اور اولاد کا داتا سمجھتے تھے اور قیامت کے دن بارگاہ الٰہی میں اپنا سفارشی جانتے تھے۔ قیامت کے دن اللہ اُن کو گویائی عطا کر دیگا۔ رازی اور صاحب سراج کا قول ہے کہ اُن کو وقتی زندگی بھی عطا کرے گا۔ بیضاوی نے بعض اہل تفسیر کا قول نقل کیا ہے کہ مسیح اور ملائکہ مراد ہیں۔ خطیب نے لکھا ہے کہ ہر وہ چیز مراد ہے جو اللہ کے سوا پوجی گئی خواہ شیطان ہو جن ہو آدمی ہو مورتی ہو فرشتہ ہو یا بت ہو۔ یہی قول بہتر ہے اور تعمیم مقام کے بھی مناسب ہے

زَیَّلْنَا کے معنی ابن کثیر نے لکھے ہیں کہ ہم مشرکوں اور اُن کے معبودوں کو ممتاز کر دینگے۔ بیضاوی اور خطیب نے فَرَّقْنَا ترجمہ کیا ہے یعنی ہم مشرکوں اور اُن کے معبودوں کو جدا جدا کر دینگے۔ اُس روز عابد و معبود کی جگہ علیحدہ علیحدہ ہو گی اور ایک کا دوسرے سے رشتہ منقطع ہو جائیگا اور مشرکوں کی وہ امید پوری نہ ہوگی جو دنیا میں کیا کرتے تھے کہ یہ معبود قیامت کے دن بارگاہ الٰہی میں ہماری سفارش کرینگے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ:- قیامت کے دن سب کو جمع کر کے مشرکوں سے خطاب کرتے ہوئے خدا تعالیٰ فرمائیگا کہ تم اپنی جگہ ٹھیرو اور وہ باطل معبود جن کی تم پرستش کرتے تھے اور اپنے خیال میں اُن کو صفات و قدرت میں خدا کا شریک اور سفارشی جانتے تھے اپنی جگہ ٹھہریں۔ اس کے بعد خدا تعالیٰ اُن معبودوں سے مشرکوں کا رشتہ اتصال منقطع کر دیگا اور دونوں گروہوں میں جدائی ہو جائیگی اور مشرکوں کا وہ زعم غلط ثابت ہوگا کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں اور شرکاء اپنی پاکدامنی اور بریت ظاہر کرنے کیلئے کہیں گے اور اللہ کی قسمیں کھا کر خدا کو گواہ کرتے ہوئے کہینگے کہ تم ہماری پرستش ہرگز نہ کرتے تھے بلکہ اپنے وسوسوں اور نفسانی خواہشات کے پرستار تھے جسکو چاہا تم نے معبود و مسجود بنا لیا، ہم کو تو تمہاری پرستش کا پتہ بھی نہیں

جب مشرکین و مشرکانہ کا باہمی فیصلہ اور انقطاعی مکالمہ ہو چکیگا اور اہل شرک کو سفارش کی امید باقی نہ رہیگی تو اعمال ذاتی اعمال کی طرف رجوع ہوگا جس نے دنیا میں جیسا کیا ہے ویسا بھگتنا پڑیگا۔ جھوٹے معبود کافور ہو جائینگے۔ ہر قسم کی بہتان تراشی اور شرک بندی زائل ہو جائیگی صرف ایک مولیٰ اور سچا مولیٰ رہ جائیگا اور اُس کی طرف سے سزا جزا اٹھانی پڑے گی۔

مقصود بیان:۔ شرک کی پُرزور تردید۔ مشرکوں کے زعم فاسد کی پُر شوکت الفاظ میں بیخ کنی۔ اس امر کی صراحت کہ حشر سب لوگوں کا ہوگا۔ معبودانِ باطل کا کوئی رشتہ مشرکوں سے نہ ہوگا۔ آیت سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جن دیوتاؤں پیروں فقیروں اور عناصر کو اکثر لوگ پرستش یہ پجاری کرتے ہیں اُن کو اپنی پوجا کا علم بھی نہیں چہ جائیکہ خوش ہونا اور مدد کرنا۔ اس امر کی صراحت کہ غیر اللہ کی پرستش درحقیقت اپنے نفس اور خواہش نفس کی پرستش ہے جس کو چاہا معبود بنا لیا۔ بالآخر ہر شخص کا رجوع اپنے اعمال کی طرف ہوگا جیسے اعمال ہونگے ویسی سزا دی جائیگی۔ مجموعہ آیات سے مستنبط ہوتا ہے کہ شائبہ شرک سے بھی پرہیز لازم ہے۔ جس بات میں شرک کی آمیزش ہو اُس سے بھی کنارہ کشی ضروری ہے۔ مشرکین کے حق میں شفاعت کی امید کا بھی انقطاع ہے نہ کہ گناہگار اہل توحید کے حق میں

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

(اے نبی) کہدو کہ آسمان و زمین سے تم کو کون رزق دیتا ہے؟

اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ

یا گوش و چشم کا کون مالک ہے؟ اور کون

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ

جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے

مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ

پیدا کرتا ہے؟ اور کون کام کی تدبیر کرتا ہے؟ لامحالہ وہ یہی کہیں گے

اللَّهُ فَقُلْ أَفَلَا تَتَّقُونَ ○ فَذَٰلِكُمُ

کہ اللہ (ہی ایسا کرتا ہے) تم کہدو کہ پھر تم ڈرتے کیوں نہیں یہی اللہ

اللَّهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ

تمہارا سچا رب ہے اب حق کے بعد بجز گمراہی کے

إِلَّا الضَّلَالُ فَأَنَّىٰ تُصْرَفُونَ ○ كَذَٰلِكَ

کیا رہا تم کہاں سے پھرے جاتے ہو (اے محمد!) تمہارے

حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِينَ فَسَقُوا

رب کا حکم یعنی یہ کہ فاسق ایمان نہیں لائینگے

أَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ○ قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ

اسی طرح ثابت ہوگیا (اے محمد) تمہارے شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے

مَنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ قُلِ

جو ابتدائً کسی چیز کو پیدا کرے پھر دوبارہ بھی (ویسا ہی) کرے تم کہدو کہ

اللّٰہُ یَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ یُعِیۡدُہٗ فَاَنّٰی

اللہ ہی ابتداءً پیدا کرتا ہے پھر وہی دوبارہ پیدا کرے گا تم کہاں سے

تُؤۡفَکُوۡنَ ۝ قُلۡ ہَلۡ مِنۡ شُرَکَآئِکُمۡ

پھرے جاتے ہو تو پوچھو کیا تمہارے شریکوں میں سے کوئی بھی ایسا ہے

مَّنۡ یَّہۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰہُ یَہۡدِیۡ

جو راہِ حق دکھائے کہدو کہ اللہ ہی راہِ حق

لِلۡحَقِّ ؕ اَفَمَنۡ یَّہۡدِیۡۤ اِلَی الۡحَقِّ اَحَقُّ

دکھاتا ہے تو کیا راہِ حق دکھانے والا زیادہ قابلِ اتباع

اَنۡ یُّتَّبَعَ اَمَّنۡ لَّا یَہِدِّیۡۤ اِلَّاۤ اَنۡ یُّہۡدٰی

ہے یا وہ شخص جو بغیر ہدایت کئے کے خود بھی راہ نہیں پا سکتا

فَمَا لَکُمۡ ۟ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ ۝ وَمَا یَتَّبِعُ

تمہیں کیا ہو گیا کیسا انصاف کرتے ہو بات یہ ہے کہ اُن میں سے

اَکۡثَرُہُمۡ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ

اکثر لوگ محض اٹکل پر چلتے ہیں اور اٹکل حق کے

مِنَ الۡحَقِّ شَیۡئًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَفۡعَلُوۡنَ

مقابل ہیچ ہے بلاشبہ اللہ اُن کی حرکات سے واقف ہے

تفسیر

گذشتہ آیات میں حشر کا منظر دکھا کر شرک سے بازداشت کی تھی اور ترہیبی شکل میں غیر اللہ کی پرستش سے ممانعت فرمائی تھی۔ ان آیات میں اپنی الوہیت و وحدانیت کو ثابت کرنے کے لئے یہاں تین دلیلیں بیان کیں :- (۱) تخلیق و تربیت (۲) آغاز و انجام پر قدرت (۳) ہدایت کا اختیار

پہلی دلیل کی چار شاخیں ہیں: (۱) تربیت جسمانی اور اس کے اسباب کی فراہمی۔ علمی اور ذہنی درستگی اور ادراکی سلسلہ کی ہر کڑی کی ہمواری جاندار سے بیجان اور بیجان سے جاندار کی تخلیق یعنی تخلیق پر قدرت مطلقہ یہ تین شاخیں تو عالم خلق سے تعلق رکھتی تھیں۔ چوتھی شاخ کا تعلق صرف عالم امر اور مجردات سے ہے یعنی تمام غیر مادی کائنات کا انتظام بھی اسی کے دست قدرت میں ہے۔

اس دلیل کا ماحصل یہ ہے کہ :- روزی کون دیتا ہے؟ آسمان اور زمین سے رزق کے اسباب کون پیدا کرتا ہے؟ بارش کرنا چاند سورج سے سردی گرمی پہنچانا ان میں اعتدال قائم رکھنا اور ان کے ذریعہ سے تمام زہریلے مواد کو دور کرنا غلہ میوہ زمین سے نکالنا درخت کا زمین اور ہوا سے اپنی غذا کھینچ کر نمو کرنا اور پھل پھول لانا اور اس پیداوار سے انسان وحیوان کے لئے روزی مہیا کرنا اگر خدا کی کارسازی نہیں تو اور کس کی ہے؟

علمی اور ادراکی سلسلہ کی ہمواری مسموعات و مرئیات کے احساس کرنے والی قوتوں کی درستگی سننے اور دیکھنے کی قوتیں عطا کرنا اور ان کو صحیح رکھنا اگر خدا کی کارسازی نہیں تو اور کس کی ہے۔

مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مردہ کو پیدا کرنا یعنی بے جان جواہر منوی سے جاندار انسان و حیوان کو اور جاندار انسان و حیوان سے بیجان

نطفہ کو بنانا یا زندہ دل مؤمن سے مُردہ کافر کو اور مُردہ روح کافر سے زندہ روح مسلم کو پیدا کرنا اگر اللہ کی خلاقی نہیں تو اور کس کی ہے۔ اس تخلیق کی قدرت مطلقہ کا سوا اللہ کے کون مالک ہے۔

عالم امر کا مدبر کون ہے اور غیر مادی کائنات کا سلسلۂ انتظام کس کے ہاتھ میں ہے بارش بجلی کڑک آگ پانی ہوا مٹی اور تمام موجودات کے انتظام کے لئے مختلف کارکن فرشتوں کا تقرر کس نے کیا۔ انسانی تحفظ کے لئے لاکھوں غیبی مخلوق کا تعین کس کا مرہون خلق ہے؟ ان تمام سوالات کا متفقہ اور مسلمہ جواب بس ایک ہی ہے۔ وہ یہ کہ یہ کل کارسازی اللہ کی ہے۔ جب بالاتفاق اللہ کی یہ کارسازی مسلم ہے تو پھر غیر اللہ کی طرف توجہ کرنا خدا سے منہ موڑنا اور دوسروں سے رشتہ جوڑنا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے کیوں دوسروں سے تعلق توڑ کر اللہ سے سلسلہ نہیں جوڑتے۔ کیوں حق سے پھر کر باطل کی طرف دوڑتے ہو۔ بس یہی بات یہ ہے کہ اس قدر دلائل براہین اور آثار قدرت دیکھنے اور ان کو تسلیم کرلنے کے بعد بھی جو یہ کفار دعوت الٰہی پر لبیک نہیں کہتے اور صداقت اسلام کو نہیں مانتے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان پر ازلی نوشتہ کی مار ہے۔ یہاں تک پہلی دلیل کا بیان تھا دوسری دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ آغاز و انجام کا مختار مطلق ہے بغیر مادہ کے کل مادی کائنات کی تخلیق اس نے کی، نیست سے ہست اور معدوم سے موجود کیا۔ بحر قدم سے فانی قطرات نکال کر فضائے عدم میں پھیلائے۔ نور ابدی کے مرکز سے زوال پذیر کرنیں منتشر کیں اور پھر سب کو لوٹا کر اپنی طرف بلا لیگا۔ تمام قطرات سمندر سے اور شعاعیں آفتاب سے جا ملیںگی۔ کیا اللہ کے علاوہ کوئی اور بھی ایسا ہے جو ان صفات کا مالک ہو؟ کیا وہ باطل اور فانی ہستیاں جن کو الوہیت و معبودیت میں اللہ سے ملاتے ہو فانی کو قدیم کا اور باطل کو حق کا مرتبہ دیتے ہو کوئی بھی اس خلاقی اس قدرت

اور اس ہمہ گیر طاقت کا مالک ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر کیوں گمراہ ہوتے ہو کیوں بھٹکے پھرتے ہو۔ سچ کو چھوڑ کر جھوٹ کی طرف اور راہ راست سے منہ موڑ کر کج مج پگڈنڈیوں پہ مارے مارے پھرتے ہو۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

کفار کو یہ بات تو تسلیم تھی کہ تمام عالم کا خالق خدا ہے لیکن محل نزاع یہ بات تھی کہ وہ حشر اجساد اور اعادۂ معدوم کے قائل نہ تھے۔ قیامت اور حیات ثانی کے منکر تھے پھر کیونکر طرز کلام وہ اختیار کیا جو اہل اقرار کے لئے مناسب تھا اور ایک اختلافی بات کو مسلّمہ مسئلہ کے پیرایہ میں ظاہر کیا

ازالہ:۔ جو بات مخالف کے نزدیک تسلیم نہ ہو اور اس کا ظہور اس حد تک پہنچ گیا ہو کہ قدرے غور کرنے کے بعد بھی اہل بصیرت کو یقین آسکتا ہو تو اہل بلاغت اسکو بطور استفہام انکاری کے ذکر کرتے ہیں جس سے مخاطب کے دماغ کے باقیماندہ شکوک کا ازالہ ہو جاتا ہے کفار اگرچہ اعادہ کے قائل نہ تھے اور حشر نشر کے منکر تھے لیکن جب روشن دلائل سے حشر کا ثبوت اس قدر ہو گیا کہ گویا حیات ثانی کا لزوم مثل بدیہی کے قرار پا گیا تو اس کو بھی مسلّمات میں سے قرار دیکر استفہام میں داخل کر دیا گیا۔

تیسری دلیل کا حاصل یہ ہے کہ اللہ ہدایت کرنے والا ہے یعنی کل عالم کو اللہ ہی حق کا راستہ دکھاتا ہے۔ پتھروں کو درختوں کو کیڑوں مکوڑوں اور دوسرے چرندوں پرندوں درندوں کو اور سب سے بڑھ کر اس نے انسانوں کو بقاء جسمانی اور بقاء نوعی کے بھی راستے بتا دیئے اور روحانی اور ابدی سلامتی کی طرف بھی رہنمائی کی اس کے سوا کون ہے جو پتھروں اور دوسرے جمادات کو یہ بات سکھاتا ہے کہ وہ اپنے صنفی اور نوعی ذرات کو کھینچکر اپنے اندر ملاتے ہیں اور پھر کس نے ان کے اندر ایسی قوت عطا کی

جو اُن کے ذرات کو پراگندگی و انتشار سے بچا کر یکجا سمیٹے ہوئے ہے۔ پتھر کے ذرات ہوا میں کیوں نہیں بکھر جاتے۔ سنگ خارا کے اندر سنگ موسلی، سنگ مرمر یا یاقوت و نیلم کے ذرات کیوں نہیں گھس جاتے۔ یہ ہدایت ان بیجان ذرات کو کس نے دی کہ وہ اپنے ہی ہم نوع ذرات کے ساتھ مل کر اپنی ہی نوع کا کوئی فرد تیار کرتے ہیں۔ درختوں کو کس نے بتایا کہ فضا سے ہوا کو اور زمین کے اندر سے پانی کھاد وغیرہ کو جذب کریں۔ پھر ان کے اندر جو جاذبہ قوت ہے اُسکو کس نے تعلیم دی کہ جذب کئے ہوئے اجزاء کو اتنے زمانہ تک روکے رکھے کہ اُن میں تحلیل نئی صورت کا کوئی جسم تیار ہو جائے۔ فضلات کو خارج کرنا اور جوہر اصلی کو برقرار رکھ کر درخت کا جزو بنانا کس نے تلقین کیا۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ ایک کھاد ایک ہوا ایک مٹی سے صرف اختلاف جاذب کی وجہ سے مختلف نوع کے درخت پیدا ہوتے ہیں۔ سیب کے درخت میں ایک ہی قسم کی غذا سیب کے درخت کی شکل قبول کرتی ہے اور وہی غذا انار کے درخت میں پہونچ کر انار کے درخت کو بڑھاتی اور پرورش کرتی ہے۔ پھر ہر درخت اور ہر سبزہ کو ایسی جدا جدا قوت کس نے مرحمت کی کہ وہ اپنے ہی نوع کے مطابق رنگ، جسم، شکل اور پھل پیدا کرتی ہے کسی انار کے درخت کا رنگ سیب کے درخت کی طرح نہیں ہوتا۔ کوئی امرود کا درخت تاڑ کے درخت کی برابر نہیں پہنچتا۔ کسی سرو کے درخت کی شکل انار کے درخت کی طرح نہیں ہوتی اور کسی آم کے درخت میں بیر نہیں پیدا ہوتے۔ یہ عرضی اور جوہری اختلافات ان کو کس نے سکھائے؟ پھر ہر کیڑے مکوڑے کو حصول رزق اور رہنے سہنے کا طریقہ کس نے بتایا۔ پرندہ بندوق کو دیکھ کر کیسے یہ تصور قائم کر لیتا ہے کہ اس کے اندر سے ایک گولی نکلیگی اور میرے آ کر لگیگی اور میں مر جاؤنگا لہذا اُڑ جانا چاہئے۔ دوستی دشمنی کے جذبات اور شہوت و غضب کی قوتیں جانوروں میں کس نے پیدا کیں۔ بقائے جسمانی و نوعی کے تمام قوانین ان کو کس نے پڑھائے۔ ان سے انسانوں کے اندر تغذیہ

تمہیہ کا سلسلہ کس نے قائم کیا۔ احساس شعور ادراک اور تعقل کس نے پیدا کیا قوت عالمہ و عاملہ کے فرائض کی تلقین کس نے کی اور ان سب سے بڑھ کر روح کائنات کے تصرفات مطلقہ کا اقرار اور نیچر کی رنگینیوں کا اعتراف کل کائنات کے ذرہ ذرہ کو کس نے تعلیم دیا۔ یہ سب کارفرمائی اللہ کی ہے۔ کیا فرضی شرکاء الوہیت میں سے کوئی ہے جو ایسا کر سکے۔ ان کو تو خود بھی اپنا ہوش نہیں وہ تو اپنے ہر فعل و عمل میں محتاج ہیں، رہنمائی اور ہدایت تو بجائے خود رہی وہ خود دوسروں کے دست نگر ہیں تو اب مقام غور ہے کہ وہ خدائے برتر و برحق جو ہادی مطلق ہے حقانیت نجات فطری اور سلامتی روح و نفس کا راستہ بتانے والا ہے۔ معبود اور رب ہونے کا زیادہ استحقاق رکھتا ہے یا یہ مجبور بیکس بے بس مخلوق۔ ذرا بتلاؤ کہ جسکو ذرا بھی سمجھ ہے وہ ان دونوں میں سے کس کی پیروی کریگا تم معذور اور بے عقل نہیں ہو پھر کیوں بے عقل بنتے ہو۔ کیونکہ ایسا فیصلہ کرتے ہو جو فطرت عالم کے خلاف ہے جس سے مخلوق کو خالق بے بس کو قادر اور ممکن فانی کو قدیم سرمدی کا ہم پلہ قرار دیتے ہو۔ اس سے آگے فرماتا ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ اپنے دماغی اختراعات کی پیروی کرنے والے ہیں اور دماغی تراش خراش حقائق واقعیہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی یعنی کچھ لوگ تو اندھے اور بے فہم مقلد ہیں ان کو اس بات کا بھی شعور نہیں کہ ہمارا کیا مسلک کیا طریقہ اور کیا مذہب ہے ہم کس کی پرستش کرتے ہیں اور پرستش کیا چیز ہوتی ہے۔ رہا بڑا فرقہ تو وہ بھی عقل و بصیرت سے بیگانہ ہے۔ وہمیات کو عقلیات اور عملیات کو حقائق سمجھ بیٹھا ہے حقانیت و نفس الامر سے ان کا کوئی سروکار نہیں۔ دماغ نے جو بات بھی بمشارکت وہم گھڑ لی وہی ان کے نزدیک حق اور واجب القبول ہے مگر حق کا حصول گمان و تخمین سے اور صداقت واقعیہ کا اخذ وہم و تخیل سے ناممکن ہے حصول حق کے لئے روشن عقل فطری نور سلیم بصیرت الہام دھانی

اور وحی ربانی کی ضرورت ہے۔ نہ یہ اس جو مادی کثافتوں میں آلودہ ہیں کیا حقانیت کا وجدان کر سکتے ہیں۔

مقصود بیان:۔ استدلالی اور برہانی شکل میں وحدانیت والوہیت کا اثبات۔ تخلیق و تربیت آغاز و انجام اور ہدایت و رہنمائی کے کل اختیارات کا مالک ظاہر کر کے ہر قسم کے شرک کی بیخ کنی۔ اس امر کی صراحت کہ مجبور و بیکس قابل معبودیت نہیں۔ خلاق مطلق اور قادر حقیقی ہی لائق الوہیت ہے۔ آیت میں صریح دلیل ہے اس بات پر کہ عقائد میں خالی گمان کافی نہیں بلکہ امر یقینی اور ادراک عقلی ہونا چاہیئے۔ جملہ افعال کا خالق خدا ہے۔ راہ راست وہی ہے جو خدا نے بتائی ہو اور وہ راہ اسلام ہے۔ انسانی ہوش و حواس راہ حقیقت تلاش کر لینے کے لئے کافی نہیں جب تک الہام ربانی اور وحی الٰہی نہ ہو لہذا کافروں کا یہ گمان غلط ہے کہ ہم کو بھی معرفت الٰہی حاصل ہے۔ وغیرہ۔

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى

یہ قرآن ایسا نہیں کہ سوائے خدا کے کوئی اپنی طرف سے

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ

بنا لے بلکہ یہ تو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق

بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ

اور شریعت کی تفصیل ہے اس میں کوئی شک

فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ

نہیں یہ رب العالمین کی طرف سے ہے کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ

افۡتَرٰىهُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّثۡلِهٖ

پیغمبر نے اس کو خود بنا لیا ہے کہہ دو کہ اچھا تم اگر سچے ہو تو اس جیسی

وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ

ایک سورت ہی بنا لاؤ اور اللہ کے علاوہ

اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۞ بَلۡ كَذَّبُوۡا بِمَا

جس کو پا سکو بلا لو بات صرف یہ ہے کہ جسکے سمجھنے پر

لَمۡ يُحِيۡطُوۡا بِعِلۡمِهٖ وَلَمَّا يَاۡتِهِمۡ تَاۡوِيۡلُهٗ ؕ

ان کو قابو نہ ہوا اور جس کی حقیقت ان کے دماغ میں نہ آئی اسکی تکذیب کرنے لگے

كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ فَانْظُرۡ

اسی طرح ان سے پہلے والے بھی تکذیب کرتے رہے ہیں مگر دیکھ لو

كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيۡنَ ۞

ظالموں کا انجام کیسا ہوا

تفسیر اوپر کی آیات میں بیان کیا گیا تھا کہ اکثر کفار اپنے گمان اور دماغی ایجاد کی پیروی کرتے ہیں حقیقت اور نفس الامر سے ان کا کچھ تعلق نہیں۔ کفار کا اختراع دماغی چند طور پر تھا۔ اللہ کی ذات و صفات کے متعلق رسالت و نبوت کے متعلق، قیامت کے متعلق، قرآن کے متعلق۔ اول الذکر تینوں شقوں کی وضاحت پُراثر بیان کے ساتھ کر دی گئی۔ اب مؤخر الذکر کی حقیقت

ان آیات میں بیان فرماتا ہے - قرآن کو وہ لوگ انسانی کلام جانتے تھے - اس کی تردید چار صورتوں سے فرماتا ہے :-

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے ، پرورش پائی جوان ہوئے ، درمیان عمر کو پہنچے ، نہ کسی سے پڑھا نہ لکھا ، نہ علماء سے میل جول کے مواقع میسر آئے ، اس کے باوجود ایک ایسی کتاب پیش کی جس میں گذشتہ آسمانی کتابوں کے تمام اصول کی تائید ہے جو عقائد و اصول احکام دوسری آسمانی کتابوں میں موجود ہیں وہی اس میں موجود ہیں - اگر قرآن خدا کا کلام نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر تحصیل علم کئے اور بلا پڑھے لکھے اور بدون اختلاط علماء کے کیسے معلوم ہو گیا کہ سابقہ کتب میں بھی یہی احکام و عقائد بیان کئے گئے ہیں -

(۲) اللہ نے اپنے بندوں کے واسطے جو احکام مقرر کر دیے ہیں اُنکی پوری تفصیل قرآن میں ہے یعنی معنوی اعتبار سے بھی قرآن کا کلام الٰہی ہونا ثابت ہے کیونکہ اس کے اندر جو تعلیم دی گئی وہ فطرت الٰہیہ اور قانون فطرت کے موافق ہے - کوئی انسانی کتاب ایسی نہیں ہو سکتی کہ اُس کے کل مضامین ضابطۂ قدرت اور قانون نیچر کے موافق ہوں - قرآن کے کل مضامین لوح محفوظ یعنی لوح فطرت کے مطابق ہیں -

(۳) قرآن کے الفاظ ، الفاظ کی ترکیب ، کلام کی رفتار ، احکام کی تفصیل گذشتہ واقعات کے بیان ، آئندہ امور کے متعلق پیشین گوئی - اللہ کی ذات و صفات کے متعلق عقیدہ ، قیامت ، حشر نشر ، عذاب ثواب کے متعلق توضیح غرض کل مضامین میں اہل بصیرت کو سر مو شک کی گنجائش نہیں - قرآن نے جو قواعد اصلاح مقرر کئے اُن سے بہتر قوانین آج تک دنیا کے عقلاء پیش کر سکے قرآن نے گذشتہ واقعات کی جو تفصیل کی اہل تاریخ اُس سے انکار نہ کر سکے قرآن نے آئندہ امور کے متعلق جو پیشین گوئیاں کیں واقعات نے اُن کو صحیح

ثابت کر دیا۔ قرآن نے اصلاح بشری کے لئے جن باتوں کی تعلیم دی اہل عقل نے اُن کے اصلاحی ہونے کو تسلیم کر لیا۔ یہ تمام امور بتا رہے ہیں کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔
(۴) قرآن دعوت مقابلہ دے رہا ہے۔ بلاغت کلام اور صحت مضامین کے لحاظ سے قرآن اپنے کو بے نظیر کہتا ہے اور الہامی ہونے کا مدعی ہے جس کسی کو شک ہو وہ مقابلہ کے لئے تیار ہو جائے۔ اپنے تمام مددگاروں کو بلا لے جہاں تک ممکن ہو اپنے ہمنوا شعراء بلغاء زبان آور اور فلسفی دماغ رکھنے والے علماء کو جمع کرے اور سب سے درخواست کرے کہ تبادلۂ خیال کے بعد بالاتفاق کوئی حصۂ کلام جو قرآن کی تین آیات کی برابر ہو اس کی طرح بنا کر لے آؤ۔ اگر قرآن انسانی کلام ہے تو تم بھی انسان ہو۔ فصاحت بلاغت طلاقت کہانت اور شاعری کا دعویٰ ہے، قرآن کو بھی شاعری اور کہانت کہتے ہو۔ لہذا کوشش کرو کہ ایک ہی سورت بنا لو۔ جب مقابلہ ناممکن ہے تو ہتھیار ڈال دو اور قائل ہو جاؤ کہ قرآن کی ساخت انسانی طاقت سے بالاتر ہے۔ اس سے آگے کفار کی حماقت پر ریمارک کرتا ہے جسکی توضیح یہ ہے کہ قرآن کے اندر دو چیزیں ہیں (۱) گذشتہ واقعات کا تاریخی بیان، سابقہ اقوام کی تباہی کا اظہار اور اُس سے عبرت اندوز ہونے کی دعوت، اللہ کی توحید ذاتی و صفاتی کی تفصیل، ضرورت رسالت کی تحقیق، وجود ملائکہ کا اثبات، اُن قوانین پر عمل کرنے کی تعلیم جو عالم میں امن پھیلانے اور فساد مٹانے کے ذمہ دار ہیں۔ فرائض الٰہیہ اور حقوق عباد کی ادائیگی وغیرہ (۲) آئندہ امور کے متعلق پیشین گوئیاں خواہ اُن آئندہ امور کا تعلق دنیوی واقعات سے ہو جیسے فتوحات ملکیہ یا بعد الموت سے ہو۔ کفار نے قرآن کو سننے کے ساتھ ہی بلا سوچے تکذیب کر دی اور بالاتفاق پکار اٹھے غلط غلط۔ حالانکہ اُن کو سوچنا سمجھنا اور غور کرنا چاہئے تھا قرآنی حقائق و علوم کی تحقیق کرنی چاہئے تھی معارف قرآنیہ کی تحصیل لازم تھی۔ اس کے بعد جو بھی فیصلہ کرتے، کرتے۔ پھر آئندہ واقعات

کے متعلق پیشین گوئیوں کے جانچنے کا تو اُن کو موقع ہی نہ آیا تھا باوجود موقع نہ آنے کے اُن کی بھی تکذیب کر بیٹھے یہ ان کی سراسر حماقت تھی۔ انہوں نے وہی رنگ ڈھنگ اختیار کیا جو ان سے پہلے دوسری قومیں اختیار کر چکی تھیں، جو سلوک سابقہ اقوام نے اپنے زمانہ کے انبیاء سے کیا وہی کفار عرب نے رسول اللہ صلعم کے ساتھ کیا بالکل انہی کے نقش قدم پر چلے لہذا نتیجہ بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ جو نتیجہ سابقہ اقوام کا ہوا وہی ان کا ہوگا اُن کو برباد کر دیا گیا یہ بھی برباد کر دیئے جائینگے۔ اُن کا نام نشان مٹ گیا ان کا بھی مٹ جائیگا وہ دائمی جہنمی ہوئے یہ بھی ہمیشہ کیلئے جہنم رسید ہونگے۔

مقصود بیان :- قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا مدلل ثبوت، اس بات کی طرف اشارات کہ کسی کتاب کے الہامی ہونے کی جانچ کے لئے چار باتوں کو دیکھنا چاہیئے (۱) اُس کے مضامین سابقہ کتب الٰہیہ کے مضامین کی اصولی تائید کرتے ہیں یا نہیں (۲) کتاب فطرت کے احکام و تعلیم کے مطابق اسکی تعلیم ہے یا نہیں؟ قوانین نیچر کی خلاف ورزی کی گئی ہے یا نہیں (۳) اصحاب بصیرت اور عقل سلیم رکھنے والے غور و فکر کے بعد اُس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ کیا تقلید کی تعصب کی پٹی آنکھوں سے کھول کر چشم رواداری سے دیکھنے والے اُس کی صداقت و حقانیت کے قائل ہیں یا نہیں؟ (۴) اُس کتاب کی طرح کوئی کتاب الفاظ و معانی کے اعتبار سے پیش کرنا طاقت بشری سے بالاتر ہے یا نہیں؟ انسانی دماغ اور دماغ کی کل طاقتیں ایسی کتاب بنانے سے عاجز ہیں یا نہیں؟ اگر چاروں باتوں کا جواب اثبات میں ہو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ کتاب آسمانی ہے۔ اور اگر جواب نفی میں ہو تو وہ کتاب الہامی نہیں ہے خود ساختہ ہے۔ قرآن ان چاروں علامات کا حامل ہے لہذا الہامی ہے۔

آخری آیت سے یہ بات بھی مستنبط ہوتی ہے کہ قرآن کی صداقت

و حقانیت جانچنے کے لئے پہلے اس کو سوچنا سمجھنا اور اس کے معارف و حقائق کو حاصل کرنا لازم ہے۔ وغیرہ

وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ

ان میں سے بعض لوگ تو اس پر ایمان لے آئینگے اور بعض لوگ

لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝

ع ۱۰ ۹

ایمان نہ لائینگے اور تمہارا رب مفسدوں کو خوب جانتا ہے

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ

اب بھی اگر تمہاری تکذیب کیئے چلے جائیں تو تم کہدو میرا کرنا میرے لئے اور تمہارا

عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَ

کرنا تمہارے لئے میرے کام کے تم ذمہ دار نہیں اور

اَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ

تمہارے کام کا میں ذمہ دار نہیں ان میں سے بعض لوگ سننے

يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ

کے لئے تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے اگرچہ

كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ

وہ نہ سمجھیں اور بعض لوگ ان میں سے تمہاری طرف

إِلَيْكَ ۚ أَفَأَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوا

دیکھتے ہیں تو کیا تم اندھوں کو راہ دکھا دوگے اگرچہ ان کو

لَا يُبْصِرُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ

سوجھتا نہ ہو بلاشبہ اللہ لوگوں پر کچھ ظلم نہیں کرتا

شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝

بلکہ لوگ ہی اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں

تفسیر ان آیات کی تفسیر مفسرین نے دو طرح کی ہے اول تو یہ کہ مِنْهُمْ میں هُمْ کی ضمیر اہل مکہ کی طرف راجع ہے اور يُؤْمِنُ صیغۂ مضارع بمعنی حال کے ہے اور ایمان سے مراد شرعی ایمان نہیں بلکہ صرف تصدیق قلبی اور یقین مراد ہے۔ دوسری تفسیر یہ کہ هُمْ سے اہل مکہ ہی مراد ہیں اور يُؤْمِنُ صیغۂ مضارع بمعنی استقبال ہے اور ایمان سے شرعی ایمان مراد ہے۔ اس صورت میں پیشین گوئی ہوگی جو حرف بحرف پوری ہوئی۔

اول تفسیر کی بناء پر حاصل ارشاد یہ ہے کہ اہل مکہ میں سے بعض لوگ اسے یقیناً رسول کو سچا جانتے ہیں لیکن محض عناد اور خاندانی دشمنی کی وجہ سے زبان سے صداقت کا اقرار نہیں کرتے۔ قرآن کی خبروں کا بارہا تجربہ کیا اور ان کی سچائی کو دیکھ کر دل سے معترف بھی ہوئے مگر سرکشی اور کینہ پروری نے زبانی تسلیم سے روک دیا۔ چنانچہ ابو جہل اسی شرم و عار سے انکار کرتا تھا کہ اگر ہم لوگ ایمان لے آئینگے تو بنی ہاشم کے تابع ہونا پڑیگا باوجود یکہ ہم ان کی برابر ہیں اور یہ اقرار کرتا تھا کہ بیشک محمدؐ سچے ہیں مگر ہم نے کوشش کر کے ان کی برابری حاصل کر لی ہے۔ اب ہم بنی ہاشم کے تابع نہیں ہوں گے۔ ہاں

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو دل سے ہی قرآن اور رسولؐ کو سچا نہیں جانتے۔ اپنی کج فہمی اور عناوت کی وجہ سے تکذیب کرتے ہیں حقیقت میں یہ دونوں گروہ مفسد ہیں ایک دیدہ و دانستہ یقین کرتے ہوئے ظلمت کفر سے نور اسلام کو چھپانا چاہتا ہے اور دوسرا اپنی کوتاہ فہمی اور تاریکی دماغ کی وجہ سے شرک کا فساد اور کفر کی تباہی پھیلانے پر تلا ہوا ہے اللہ ان مفسدوں کو خوب جانتا ہے اُن کے حرکات بد اور فساد انگیزی کی ضرور سزا دیگا۔ دوسری تفسیر کی بناء پر مطلب یہ ہوگا کہ اہل مکہ میں سے بعض لوگ تو آئندہ سچے مسلمان ہو جائینگے اگرچہ اس وقت معاند اور کافر ہیں لیکن بعض لوگ بدستور کفر پر قائم رہینگے اور خدا ہی کو معلوم ہے کہ کون کفر پر جما رہیگا اور کون ایمان لے آئیگا۔

اس سے آگے کفار کو تہدید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے جسکا خلاصہ یہ ہے کہ اے نبی اب بھی اگر یہ تمہاری تکذیب کرتے ہیں اور نہیں مانتے تو ان سے کچھ تعرض نہ کرو اور صاف صاف کہدو کہ تمہارے اعمال تمہارے ساتھ میرے اعمال میرے ساتھ جیسا تم کروگے تم پاؤگے جیسا میں کرونگا میں پاؤں گا میرے اعمال کا تم سے کچھ تعلق نہیں تمہارے اعمال کا مجھ سے کوئی سروکار نہیں۔ مقاتل و کلبی کے قول پر یہ آیت آیۃ السیف سے منسوخ ہے یہاں کفار کو اُن کے عقیدہ پر چھوڑ دینے کا حکم ہے اور آیۃ السیف میں جہاد و قتال کا حکم ہے۔ لیکن رازی کے نزدیک یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں۔ ناسخ وہ آیت ہوتی ہے جس سے منسوخ کا حکم اٹھ جائے اور آیۃ السیف سے اس آیت کا حکم زائل نہیں ہوتا دونوں اپنی اپنی جگہ پر محکم ہیں۔ اس آیۃ کا ماحصل یہ ہے کہ جیسا جو کریگا اُس کا پھل بھگتیگا۔ کسی کے اعمال دوسرے کے اعمال پر اثر انداز نہیں ہونگے رسولؐ کا کام ہدایت کرنا ہے مانو یا نہ مانو۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو قبائل قریش و خزاعہ کے ایمان لانے کی والہانہ خواہش تھی۔ حضور برا کہنا نہ اُن کو تبلیغ و ہدایت کی کوشش فرماتے تھے

ہدایت کی دو ہی صورتیں ہیں قول اور عمل - حکم اور فعل زبان سے کہنا اور خود کرنا حضورؐ نے ہدایت کا کوئی دقیقہ اٹھا کر نہیں رکھا۔ زبان مبارک سے قوانین نجات اور ضوابط عافیت کی تعلیم دیتے شرائع قرآنی سکھاتے وعظ و پند کرتے فصیح و بلیغ تقریریں فرماتے، طرزِ کلام میں برہانی اور خطابی ہر رنگ کو پیش فرماتے مگر سب بے سود۔ بہت سے لوگ کان لگا کر سنتے مگر اس طرح جیسے بہرے سنتے ہیں سنتے تھے اور حقیقتاً نہیں سنتے تھے فائدہ کچھ نہ اٹھاتے تھے کرتے وہی تھے جو دل چاہتا تھا جانوروں کی طرح منہ اٹھا کر کان کھڑے کر کے متوجہ ہوتے مگر سمجھتے خاک نہ تھے۔ ہوا و ہوس ان کی عقل کو غور و خوض کرنے سے روکتے تھے معانی تک رسائی نہیں تھی خالی الفاظ کی روانی کچھ اثر انداز نہ ہوتی تھی۔ پھر حضورؐ اپنی زندگی کی ہر شاخ، اخلاق، عادات، شمائل، خصائل، نشست برخاست، گفتار، رفتار، اطوار اور خواب و بیداری کی کل پاکیزگیاں نمونۂ عمل بن کر پیش فرماتے، دنیوی معاملات کو اطاعت الٰہی کے ساتھ جوڑ کر دکھاتے مگر اندھوں کو کیا سوجھے خوب نظر اٹھا کر دیکھتے مگر حضورؐ کو نہ دیکھ سکتے۔ آنکھیں تھیں مگر عقل و فہم کا نور نہ تھا بصر کے مالک تھے مگر بصیرت سے کورے ایسے اندھوں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے اس لئے بطور تسلی کے حضورؐ کو خطاب کرتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ اندھے اور بہرے ہیں بظاہر سنتے اور دیکھتے ہیں مگر ان کا سننا اور دیکھنا بے ثمر ہے تم ان بے عقل بہروں کو کیسے سنا سکتے ہو۔ ان کے پاس گوش ہوش ہی نہیں۔ ان عقل کے اندھوں کو کیا راستہ بتا سکتے ہو ان کے پاس بصیرت بھی ہی نہیں۔ لہٰذا کچھ فکر نہ کرو جیسا کوئی کریگا ویسا بھریگا۔ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا یعنی کسی کے ہوش حواس سلب کر کے اسکو اندھا بہرا بنا دے اور پھر گرفت کرے ایسا نہیں کرتا بلکہ لوگ اپنی جانوں پر خود ظلم کرتے ہیں یعنی اپنے حواس اور فہم کو بگاڑ کر ان کے فوائد سے محروم ہو جاتے ہیں۔

حضرت ابو ذر غفاری رضی کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کرلیا ہے اور تمہارے درمیان بھی حرام کر دیا ہے پس تم آپس میں ظلم مت کرو۔ اس حدیث کے آخر میں ہے اے میرے بندو! یہ سب تمہارے ہی اعمال ہیں جو میرے احاطۂ علمی میں ہیں اُن کا بدلہ تم کو پورا پورا دونگا جسکو بھلائی ملے وہ اللہ کی حمد و ثنا کرے اور جسکو بھلائی نہ ملے وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے (رواہ مسلم)

ابن کثیر نے آخر آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ جب اللہ نے اپنی مخلوق میں سے ایک قوم کو نبوت و ولایت کے لئے برگزیدہ کیا اور دوسری قوم کو گمراہی و بداعمالی کے لئے الگ کر دیا تو وہی مالک و خالق ہے جو چاہے کرے اس میں ظلم کو کیا دخل ہے پس کافر پر کچھ ظلم نہیں جبکہ لطائف مشاہدہ سے اُن کی تربیت فرمائی کیونکہ ازل ہی میں اُن کو اپنے لطف کے واسطے پیدا کرنا مقدر فرما دیا تھا۔

مقصود بیان :- صرف تصدیق قلبی بغیر زبانی اقرار کے ایمان کے لئے کافی نہیں۔ ہر شخص کا عمل اُس کے لئے مفید یا مضر ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف تبلیغ کرنا تھا کسی کے ماننے نہ ماننے کا حضور سے سوال نہ کیا جائے گا جو شخص کور بصیرت ہو وہ اندھا ہے اگرچہ اُسکی آنکھیں روشن ہوں جس شخص کے گوش ہوش نہ ہوں وہ بہرا ہے اگرچہ خوب سنتا ہو۔ ازلی بدبختوں کو آفتاب ہدایت کی موجودگی بھی بینا نہیں کر سکتی۔ صاحب بیضاوی نے کہا ہے کہ آیت میں دلیل ہے کہ انسان پتھر کی طرح بے اختیار نہیں ہے جیسا کہ فرقہ جبریہ کا قول ہے میں کہتا ہوں آیت میں اس امر کی بھی دلیل ہے کہ آدمی مختار مطلق اور خالق بھی کسی چیز کا نہیں ہے جیسا کہ فرقۂ معتزلہ کا خیال ہے۔ ازل میں حکمت الٰہی کے موافق جن لوگوں کو عقل قدسی نظر جبروتی اور سماع ملکوتی حاصل نہیں قبول حقائق کی استعداد اور فہم دقائق کی قابلیت موجود نہیں وہ الہام وحی

کے منکر ہو جاتے ہیں۔ گویا حقائق علوم غیب اور دیدار ملکوت انسان کے اختیار میں نہیں بلکہ موہبت الٰہی ہے۔ بشری اکتساب کو اسمیں دخل نہیں ہے۔ رسول اللہ صلعم کو ظاہری آنکھوں سے دیکھنا حصول نجات کے لئے کافی نہیں بلکہ چشم بصیرت سے دیکھنا تمام سعادتوں کے حصول کا سرچشمہ ہے اسی لئے باجماع اہل اسلام صحابہ کی برابر کسی امت والے کا مرتبہ نہیں ہو سکتا

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَأَنْ لَّمْ يَلْبَثُوٓا إِلَّا سَاعَةً

اور جس دن اللہ ان کو جمع کریگا تو ایسا معلوم ہوگا کہ (دنیا میں) ان کا قیام صرف

مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُونَ بَيْنَهُمْ ۚ قَدْ

گھڑی بھر دن تھا (وہاں) آپسمیں ایک دوسرے کو پہچانینگے بلا شبہہ

خَسِرَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِلِقَآءِ اللّٰهِ وَ

برباد ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے ملنے کو جھوٹ کہا اور

مَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ۝

وہ راہ پر نہیں آئے

تفسیر اوپر کی آیات میں کافروں کا اندھا بہرا ہونا اور حق سے اعراض کرنا ظاہر کیا تھا۔ اس آیت میں اعراض عن الحق کی سزا اور کیفیت بیان فرماتا ہے جو قیامت کے دن کافروں کی ہوگی۔

تحلیل اجزاء حشر سے مراد قبروں سے نکالنا۔ ساعۃ من النھار سے مراد قلیل وقت۔ دن کی ساعت کی تخصیص بقول ابن کثیر کے اس وجہ سے کی کہ رات کی ساعات کی بہ نسبت دن کے اوقات کو آدمی زیادہ پہچانتا ہے

میرے نزدیک ایک توجیہ یہ بھی اچھی ہے کہ آخرت کے اوقات کے مقابلہ میں قیام قبر کا پورا زمانہ ایک ساعت سے زیادہ نہیں ہے جو دن پچاس ہزار سال کی برابر ہو اُس کے مقابلہ میں دنیوی لیل و نہار اور اُس کے اوقات کیا وقعت رکھ سکتے ہیں۔ تعارف باہمی سے مراد بقول ابن کثیر و بیضاوی تعارف شفقت ہے ابتدا میں سب دنیوی دوست ایک دوسرے کو پہچان کر اظہار مہربانی کرینگے لیکن قرطبی کے نزدیک تعارف ملامت مراد ہے کیونکہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ اگرچہ اہل قیامت ایک دوسرے کو پہچانینگے مگر ہر ایک اپنی فکر میں ہوگا کسی کو کسی کی پرواہ نہ ہوگی۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ کافروں کو وہ دن یاد کرنا چاہئے جبکہ بحکم الٰہی سب لوگ اپنی اپنی قبروں یا مدفن یا جائے روپوشی سے نکل کر ایک میدان میں آئینگے اُس وقت اُن کو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا دنیا یا قبر کے زمانہ کا قیام ایک ساعت سے زیادہ نہ تھا۔ ابتداءِ حشر کے وقت وہ باہم (رشتہ داروں اور دوستوں کی) شناخت بھی کرینگے اور میدانِ حشر میں اُن کو علم ہوگا کہ جو لوگ خدا کے سامنے جانے اور دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کے منکر تھے وہ راستی پر نہ تھے اب بالکل اٹھانا اُن کے لئے لازم ہے دنیوی زندگانی کی تجارت میں اُنکو نقصان ہوا نفع نہ ملا۔

ایک شبہ تعارف سے تعارف ملامت مراد لیا جائے یا تعارف شفقت بہرحال بعض دوسری نصوص کے یہ خلاف ہے۔ مختلف احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔ برہنہ بدن غیر مختون ابتدائی پیدائش کیطرح محشور ہونا بروایت حضرت عائشہؓ ثابت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ منظر کے ہولناک ہونیکی وجہ سے کسی کو کسی طرف توجہ کرنے کا موقعہ ہی نہ ملیگا چہ جائیکہ شناخت کرنا

جواب اوقات حشر مختلف ہونگے ابتداء میں زیادہ ہیبت ناک منظر نہ ہوگا البتہ عجیب ضرور ہوگا اُس وقت ایک دوسرے کی شناخت ہوگی۔ کچھ مدت کے بعد میں ایسا ہولناک ہوجائیگا کہ ہر شخص کو اپنی ہی پڑی ہوگی دوسرے کو دیکھنے

اور اُس کی طرف نظر اٹھانے کا خیال بھی پیدا نہ ہوگا۔

مقصود بیان:- خطابی رنگ میں وجود قیامت کا ثبوت - اس امر کی صراحت کہ قیامت کے دن بھی لوگ باہم ایک دوسرے کو شناخت کرینگے - اس بات پر نص کہ دنیوی زندگانی یا قبر میں رہنے کا زمانہ روز حشر کے مقابلہ میں ایک ساعت سے زیادہ نہ معلوم ہوگا - وغیرہ -

وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ

اور اگر ہم اس عذاب میں سے جس کا ان سے وعدہ کر رہے ہیں کچھ حصہ تم کو

اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ

دکھا دیں یا (نزول عذاب سے پہلے) تم کو وفات دیدیں بالمحالہ تم سب کو ہمارے ہی پاس لوٹ کر آنا ہے

شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ۞ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ

پھر اُن کے اعمال پر اللہ گواہ ہوگا ہر امت کے لئے ایک

رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ

پیغمبر ہے جب اُن کا پیغمبر اُن میں آ چکا تو (اب) اُن میں

بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۞

باہم انصاف سے فیصلہ کیا جائیگا اُنکی حق تلفی نہیں کیجائیگی

تفسیر: یہ آیت سابقہ مضمون کا تتمہ ہے۔ شروع سے لیکر یُظْلَمُوْنَ تک مطلب واضح ہے اور دنیا و دین کے عذاب کی کافروں کو وعید ہے رسول پاک کو خطاب کرتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس عذاب کی کافروں کو تہدید کیگئی

ہے اُس کا کچھ حصہ اگر ہم تم کو تمہاری زندگی میں دکھا دیں اور کافروں پر دنیا ہی میں کچھ عذاب نازل کر دیں (مثلاً جنگ بدر کے وقت کافروں کی تباہی یا مکہ کی قحط سالی وغیرہ) یا حسبِ منشاء قدرت کے مطابق تم کو وفات آجائے اور تم اُن کے دنیوی عذاب کا کچھ آنے والا حصہ بھی نہ دیکھ سکو۔ بہرحال اُن کے اعمال و افعال ہمارے مشاہدہ اور علم سے باہر نہیں۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُن کو تمام اعمال کی ضرور سزا دیگا اور یہ عذاب میں مبتلا ہونگے۔

اس سے آگے کی آیت کی تفسیر دو طرح کی گئی ہے ۱ آیت میں اس ضابطہ کا بیان ہے جو اللہ کی طرف سے دنیا میں جاری ہے۔ اللہ بغیر جرم اور بدون اتمامِ حجت کے کسی قوم پر عذاب نہیں کرتا کوئی قوم قانونِ فطرت سے سرتابی کرتی ہے۔ امن کی بجائے فساد انصاف کے بجائے ظلم حق شناسی کی بجائے ناحق کوشی اختیار کرتی ہے تو اس کی ہدایت کے لئے اگرچہ اللہ نے عقل و حواس ہوش وغیرہ سب کچھ پیدا کر دیا ہے مگر پھر بھی بطور تکمیل حجت کے ایک نبی کو ضرور مبعوث فرماتا ہے۔ نبی مبعوث ہو کر ان کو ہدایت کرتا ہے۔ اس پر جو لوگ سرتابی کرتے ہیں اور گمراہی پر اڑے رہتے ہیں ان پر دنیا و دین میں عذاب کی مار پڑتی ہے۔ دنیا میں بربادی اور آخرت میں دوامی ہلاکت نصیب ہوتی ہے ہر شخص کو اس کے کئے کا عوض ملتا ہے ذرہ برابر کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا اسی لئے دوسری آیت میں آیا ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا۔

۲ دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس آیت میں اُس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے جو ہر قوم کو پیش آئیگا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر قوم میں ایک نبی ضرور پیدا ہوا ہے جب قیامت کا دن ہوگا سب لوگ میدانِ حشر میں جمع ہونگے نیک الگ اور بد الگ ہونگے کافروں کے کفر پر شہادت دینے کے لئے ان نبی کو مقام حساب میں طلب کیا جائیگا۔ ہر نبی اپنی قوم کی شہادت دیگا۔ کافر اسکے جواب میں کہینگے کہ ہمارے نبی نے ہم کو پیغام الٰہی ہی نہیں پہونچایا اس وقت امتِ

محمدیہ کو شہادت کے لئے بلایا جائیگا۔ نیکو کار مسلمان انبیاء کے قول کی تصدیق بشہادت قرآنی کرینگے۔ اسوقت سب کا باہمی فیصلہ کیا جائیگا کافروں کو جہنم میں بھیجدیا جائیگا اور انبیاء کو مراتب عالیہ پر سرفراز کیا جائیگا۔ سیاق آیات کے یہ تفسیر مناسب ہے اسلئے ابن کثیر نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

مقصود بیان: کافروں کو دنیاوی عذاب میں بھی مبتلا ہونے کی وعید اس امر کیطرف ایما۔ کہ ہمارے رسول بھی دیگر انبیاء کیطرح رسول ہیں جس طرح حسب عادت قدرت کے موافق وہ دنیا سے روپوش ہونے سے نہ بچ سکے اسی طرح رسول پاک بھی ضرور پردہ پوش ہونگے۔ اس بات کی صراحت کہ ہر امت کیلئے ضرور ایک نبی مبعوث ہوا ہے اور نبی کی بعثت قانون قدرت کے مطابق ضروری ہے۔ عدل الٰہی اس کا مقتضی ہے کہ بغیر اتمام حجت کے سزا جزا نہ دی جائے۔ اس سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ ہدایت و رہنمائی کیلئے عقل بشری کافی نہیں ورنہ رسول کی کیا ضرورت تھی رہجاتی ہے

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ

یہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو

صَادِقِينَ ۝ قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا

(تو وہ واقع کرا دو) تم کہدو کہ میں اپنے لئے کسی نقصان نفع کا

وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ۗ لِكُلِّ أُمَّةٍ

اختیار نہیں رکھتا سوائے اس کے کہ جو اللہ چاہے ہر امت کا

أَجَلٌ ۚ إِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَأْخِرُونَ

ایک خاص وقت ہے جب ان کا وقت آجائیگا تو پھر گھڑی بھر نہ دیر کر سکینگے

سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ○ قُلْ اَرَءَيْتُمْ

نہ جلدی کر سکیں گے کہدو بھلا دیکھو تو

اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا

اگر تم پر دن میں یا رات میں اللہ کا عذاب آ پڑے تو

يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ○ اَثُمَّ اِذَا مَا

گنہگار اس سے پہلے کیا کر لیں گے کیا پھر جب آ ہی پڑے گا تب ہی

وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ آٰلْئٰنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ

اس کا یقین کروگے (اس وقت کہا جائیگا) اب مانا حالانکہ تم اس کی

تَسْتَعْجِلُوْنَ ○ ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا

جلدی مچایا کرتے تھے اس وقت ظالموں سے کہا جائے گا

ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ هَلْ تُجْزَوْنَ

کہ دوامی عذاب کا مزہ چکھو جو کچھ کمایا کرتے تھے

اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ○

اُسی کی یہ سزا پا رہے ہو

تفسیر کفار مکہ کو قیامت اور عذاب تو آب پر یقین نہ تھا جب رسول اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے صحابہ نے ان کو قیامت کے عذاب سے ڈرایا

اور بدافعالی سے روکا تو مذاق اُڑانے لگے اور قیامت کی تعیین کا سوال کرنے لگے۔ سوال سے ان کی غرض تحقیق و تفتیش نہ تھی کہ تحقیق کے بعد جو کچھ مہلت ملجائے اسمیں آخرت کا سامان فراہم کرلیں بلکہ استہزاء و استبعاد مقصود تھا۔ اسی مضمون کو ان آیات میں بیان فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:-

کفار مکہ صراحۃً (اور کفار عالم ضمناً اور رضاءً) کہتے ہیں کہ جس عذاب قیامت کی تم ہم کو دھمکی دیتے ہو وہ کب تک آئیگا۔ اگر وعدۂ عذاب سچ ہے تو وہ عذاب ہمپر لے آؤ۔ اے نبی! تم ان سے کہدو کہ مجھے اپنی ذات کے نفع نقصان کا بھی کوئی اختیار نہیں۔ ہاں جتنا خدا نے دیا ہے اور جتنا وہ چاہے اتنا میں کرسکتا ہوں یعنی تم لوگ بالکل جاہل اور ناواقف ہو خدا کی ہمہ گیر قدرت کا بھی تم کو علم نہیں تم مجھکو عذاب کا مالک سمجھتے ہو حالانکہ یہ غلط ہے میں نے اس کا دعویٰ نہیں کیا اللہ ہی مالک مختار اور خالق ہے وہی ضرر اور نفع پہنچانے والا ہے وہی عذاب لانے والا ہے مجھے نہیں معلوم کہ کب آئیگا۔ اگر عذاب میں کچھ تاخیر ہے اور تم کو مہلت مل گئی ہے تو اس سے مقررہ وعدہ کو غلط نہ سمجھو کیونکہ ہر قوم کی بقاء کی ایک خاص میعاد ہے جب میعاد مقرر پوری ہو جاتی ہے اور آخری وقت آجاتا ہے تو موت ٹالے سے نہیں ٹلتی۔ مقررہ اجل سے کوئی قوم آگے پیچھے نہیں ہو سکتی۔ پھر طلب سے فائدہ ہی کیا۔ علم عذاب تو اُس شخص کو فائدہ مند ہو سکتا ہے جو اُس سے بچنے کی پہلے سے تیاری کرنا چاہے اور بچاؤ کے سامانات فراہم کرے اگر راتوں رات یا دن کو مقررہ عذاب آ بھی گیا تو تم اس سے پہلے کیا کرلوگے۔ جب عذاب آجائیگا کیا اُس وقت توبہ کروگے حالانکہ اُس وقت توبہ سود مند نہ ہوگی صاف کورا جواب ملجائیگا کہ اب یہ وہی عذاب آ پہنچا جسکی طلب تم پہلے سے کرتے تھے۔ پس اس وقت سوائے حسرت و افسوس کے کوئی چارۂ کار نہ ہوگا اور دوامی تباہی نصیب ہوگی۔

مقصود بیان: کفار کی جہالت کا اظہار۔ اس امر کی صراحت کہ نفع اور نقصان کسی کے ہاتھ میں نہیں یہاں تک کہ اشرف الرسل افضل الکائنات محمد رسول اللہ بھی کسی کے فائدہ اور ضرر بلکہ اپنے خیر و شر کے بھی مالک و مختار نہ تھے۔ دوسرے انبیاء اور اولیاء کا تو ذکر ہی بیکار ہے گویا کارخانۂ قدرت کا کوئی مالک و متصرف نہیں۔ ہاں اللہ نے اپنی مشیت سے جسکو جتنا اختیار دیدیا ہے اتنا ہی اسکو حاصل ہے ہر قوم کی بقاء کی ایک خاص مدت مقرر ہے اختتام مدت پر اسکی تباہی لازم ہے اللہ کا عذاب اور قیامت کا وقوع یقینی ہے اسلئے پہلے سے اسکے لئے توشہ فراہم کر لینا ضروری ہے مرنے کے وقت کافر کی توبہ مقبول نہیں بلکہ عذاب آخرت کی علامات دیکھنے کے وقت بھی قبول نہیں

وَيَسْتَنْبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ ۖ قُلْ إِي وَرَبِّي

وہ تم سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا وہ (عذاب) واقعی ہے؟ کہدو یقیناً بلا اشتباہ اپنے رب کی قسم

إِنَّهُ لَحَقٌّ ۖ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ ۝ ع ۱۲

وہ واقعی ہے اور تم عاجز نہیں کر سکتے

وَلَوْ أَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ ظَلَمَتْ مَا فِي الْأَرْضِ

(اس روز) اگر کسی گنہگار کے پاس دنیا کی کل چیزیں ہوں تب بھی وہ

لَافْتَدَتْ بِهِ ۗ وَأَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا

اپنے چھڑانے کے لئے دیدیگا اور عذاب کو دیکھ کر وہ اپنی ندامت

رَأَوُا الْعَذَابَ ۖ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ

کو چھپا لینگے اور انصاف سے ان کا فیصلہ کیا جائے گا

وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ أَلَآ إِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ

حق تلفی نہیں کی جائیگی　خوب سمجھ لو کہ جو کچھ　آسمانوں میں اور

وَالْأَرْضِ ۗ أَلَآ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ

زمین میں ہے یقیناً اللہ ہی کا ہے آگاہ رہو کہ اللہ کا وعدہ بلا شبہہ سچا ہے مگر اکثر

لَا يَعْلَمُونَ ۝ هُوَ يُحْيِى وَيُمِيتُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝

لوگ نہیں جانتے　وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور اُسی کی طرف تم کو لوٹکر جانا ہوگا

تفسیر جب قیامت کی وعید اور عذاب کی دھمکی حد سے بڑھ گئی اور دنیوی عذاب کے آثار بھی کچھ مختلف اوقات میں کافروں نے دیکھ لئے تو ان کے دل سے وہ مذاق و استہزاء کا خیال کچھ کم ہوا اور سوچا کہ شاید یہ لوگ سچ کہتے ہوں لیکن تھی انکے نزدیک بالکل نئی بات اچنبے میں آگئے۔ آباؤ اجداد کے طریقہ اور عقیدہ کی تغلیط گوارا کر لینے کو دل نہ چاہتا تھا لیکن جب ملید آہنگی سے حشر اجساد کا دعویٰ کیا گیا تھا اسکی تردید بھی نا ممکن تھی غرض اسی کشمکش و پیچ میں بولے کہ کیا واقعی روز قیامت حق ہے یا تم ہم سے مذاق کر رہے ہو۔ ایسا ہی سوال بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے ذبح گاؤ کے متعلق کیا تھا کہ ذبح گائے کے متعلق تم ہم سے ہنسی تو نہیں کر رہے ہو۔ کم بختوں کو اتنی عقل نہ تھی کہ انبیاء مذاقیہ احکام صادر نہیں کرتے۔ ذرا ذرا سے ایک انچ نہیں ہٹتے۔ صاحب بیضاوی کے نزدیک روز قیامت کے متعلق سوال کرنے والا ایک یہودی عالم حیی بن اخطب تھا جو کسی کام سے مکہ میں آیا تھا۔ مگر ابن کثیر نے اسکی تغلیط کی ہے کیونکہ یہودی حشر نشر اور معاد کے قائل تھے ان کو انکاری لہجہ میں اس مضمون کا سوال کرنے کا موقع نہ تھا۔ انکار کرنے والے صرف بت پرست مشرک تھے۔ اُنہوں نے حضرتؐ سے یہ سوال کیا تھا اور وہی ایسے سوال کر سکتے تھے

انہی کو تعجب اور حیرت تھی کہ مرنے اور ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد تمام ذرات کا مل کر اور پھر مجسم ہو کر زندہ ہونا کس طرح ممکن ہے۔
ماحصل ارشاد یہ ہے کہ: کفار مکہ تم سے حقانیت قیامت کے متعلق دریافت کرتے ہیں کہ کیا واقعی حشر کا کوئی دن ہوگا؟ با خواہ مخواہ کا یہ مذاق ہے تم پر ذرہ طریقہ پر اُن سے کہدو کہ قسم ہے اُس خدا کی جو میرا موجد اور تربیت کرنے والا ہے قیامت کا دن ضرور ہوگا (تم ذرہ ذرہ ہو جاؤ۔ تمہاری خاک کا ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں اُڑ جائے دریا میں ڈوب جائے یا آگ میں جلجائے بہرحال تمہاری کوئی حالت روز قیامت کو آنے ذرات کو سمٹ کر مجسم ہوتے اور دوبارہ زندہ ہو کر حساب کتاب کے بعد عذاب ثواب پانے سے نہیں روک سکتی۔ کوئی کام قدرت الٰہی سے خارج نہیں وہ سب کچھ کر سکتا ہے اُس روز کافروں کو پچھتانا پڑیگا۔ اُس وقت اُنکی یہ حالت ہوگی کہ اگر کوئی روئے زمین کا کل مال انکے قبضہ و ملک میں ہو اور عذاب سے بچنے کیلئے وہ مال اُن سے طلب کیا جائے تو چھٹکارا پانے کیلئے دے ڈالیں۔ مگر ایسا موقع کہاں ممکن ہوگا۔ عذاب کو سامنے دیکھ کر دلوں میں خلوص نیت کے ساتھ بہت پشیمان ہونگے کہ افسوس ہم نے رسول کا فرمان نہ مانا لیکن وقت گذرجانے کے بعد پشیمانی کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔ فیصلہ انصاف کے ساتھ کیا جائیگا۔ جو شخص جس لائق ہوگا اُسکے ساتھ وہی سلوک کیا جائیگا۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بازپرس ہوگی اور ظالم و مظلوم کا جھگڑا عدل کے ساتھ نبٹایا جائیگا۔ عالم میں جو کچھ ہے اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے اُسی کے تصرف میں ہے اس کی عظمت و قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں۔ لہذا قیامت کا وعدہ بھی برحق ہے اور کیونکہ اُسکی عظمت و قدرت اور روز قیامت کے وقوع میں شک ممکن ہے۔ جبکہ یہ بات بدیہی ہے کہ سب کو پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے کوئی اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ کسی شے کو پیدا کر سکے۔ پھر مارنا بھی وہی ہے کوئی کسی پر موت نہیں بھیج سکتا ہزار جتن کرے مگر مار نہیں سکتا۔ جب ایجاد و فنا کا قانون اُسی کا جاری کیا ہوا اور اسی کی قدرت میں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اُسکے پاس لوٹکر جانے سے انکار کیا جا سکے۔

مقصود بیان :- وقوع قیامت کا مکمل ثبوت دو دلیل کے ساتھ اثبات، کفار کی حالت سقیمہ کا اظہار، عدل الٰہی کی صراحت، ہمہ گیر قدرت اور محیط کُل طاقت کی نفس اس امر کی توضیح کہ وعدۂ الٰہی میں کذب محال ہے۔ اس بات کا حتمی فیصلہ کہ اکثر انسانوں کی عقل قدرت الٰہیہ کے سمجھنے اور اس پر یقین رکھنے سے قاصر ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ

لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نصیحت

مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ

اور دلی بیماریوں کی شفاء

وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ

اور ہدایت اور رحمت آ پہنچی تم کہدو کہ

اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا ط

اللہ کے فضل و رحمت پر ہی اُن کو خوش ہو جانا چاہیئے

هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ۝

جن چیزوں کو وہ جمع کر رہے ہیں اُن سے یہی بہتر ہے

تفسیر دلائل توحید اور اثبات قیامت کے بعد اب دلیل رسالت اور طریق ہدایت کو بیان فرماتا ہے۔ اَلنَّاسُ سے مراد ابن کثیر کے نزدیک خاص اہل مکہ ہیں لیکن خصوص مورد کے باوجود حکم میں عموم باقی ہے اسلئے کل دنیا کے انسانوں کی طرف روئے سخن ہے لیکن ابن جریر کے نزدیک خطاب

ہیں مخصوص نہیں بلکہ مورد ہی عام ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ :- دنیا بھر کے رہنے والو انسانوں ہوشیار ہو جاؤ۔ اللہ کی حجت اب تمام ہوگئی اللہ کی کتاب قرآن مجید تمہارے پاس آ پہونچی عبرت کی نظر سے پڑھنے والوں اور سمجھنے والوں کیلئے یہ مکمل وعظ ہے۔ حال و مآل اور خیر و شر سے آگاہ کرنیوالی ہے دلوں کی بیماریوں کو دور کرنے کیلئے شفاء مجسم ہے۔ ہر قسم کی بد اعتقادی غلط خیالات بے بنیاد وہمیات کا اس سے ازالہ ہو جاتا ہے سیدھا راستہ دکھانا کجروی سے بچانا بداعمالی سے روکنا اور عملی زندگی کی اصلاح کرنا اس کا مقصد ہے۔ خلاصہ یہ کہ قرآن نظری و عملی حکمت کا عظیم الشان مجموعہ ہے باطل عقائد اور بے بنیاد شکوک کیلئے شفاء ہے اس سے قوت نظریہ کی اصلاح ہو جاتی ہے اور نیک اعمال کی رغبت دلانے کے دلائل اور بد اعمالی سے باز رکھنے کے براہین اس میں موجود ہیں۔ لہذا قوت عملیہ کی بھی اس سے اصلاح ہو جاتی ہے لیکن یہ تمام فوائد انہی کو حاصل ہوتے ہیں جن کی قسمت میں ایمان ہے نعماء الٰہیہ کے خزائن سے وہی بہرہ اندوز ہوتے ہیں جن کے دلوں میں ازلی نور ہدایت ہے۔ لہذا اہل ایمان کو خدا کے اس فضل و رحمت سے خوش ہونا چاہئے کفار کے اندوختہ مال سے فضل الٰہی کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔

شفاء سے مراد بعض مفسرین نے عام شفاء لی ہے خواہ روحانی امراض کیلئے ہو یا سینہ کے مادی امراض کیلئے۔ روحانی امراض کی تفصیل کتب اخلاق میں موجود ہے۔ شک بے اعتقادی کینہ بغض باہمی عداوت وغیرہ روحانی امراض میں داخل ہیں اور سینہ کے مادی امراض کو قرآن سے شفاء ہو جاتی ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے حضورؐ کے سامنے سینہ کی کسی بیماری کی شکایت کی حضورؐ نے قرآن پڑھنے کا حکم دیا اور فرمایا یہ شفاء لما فی الصدور ہے (اخرجہ ابن المنذر و ابن مردویہ) ایک اور شخص کو حلق کی شکایت تھی حضورؐ نے اسکو بھی یہی دوا بتائی اور شہد بھی پینے کو بتایا (اخرجہ البیہقی فی الشعب)

فضل و رحمت سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق سلف کا اختلاف ہے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا فضل قرآن ہے اور رحمت دین اسلام۔ حسن، ضحاک مجاہد اور قتادہ کا قول ہے فضل ایمان ہے اور رحمت قرآن۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ فضل الٰہی قرآن ہے اور رحمت یہ کہ تم کو ان میں سے (یعنی اہل ایمان میں سے) کر دیا (رواہ ابو الشیخ و ابن مردویہ) امام کرخی نے آیت کی ایک تفسیر تصوف آمیز نہایت بہترین کی ہے۔ فرماتے ہیں اہل ایمان کے درجات متفاوت ہیں ظاہری شریعت کے پابند باطنی طہارت کے دلدادہ۔ نور حق کے مظہر اور صدق و یقین میں حد کمال تک پہنچنے والے۔ یہ تمام مراتب ایمان والوں کے ہیں آیت میں قرآن کے چار اوصاف بیان کیے گئے ہیں: موعظت، شفاء، ہدایت اور رحمت۔ موعظت کہنے سے تو اس طرف اشارہ ہے کہ ظاہری نجاستوں کو دور کرنے اور بیرونی قبائح و ممنوعات سے احتراز کرنے کی قرآن تعلیم دیتا ہے۔

شفاء صدر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جتنی اندرونی بیماریاں، روحانی گناہ اور وجدانی خرابیاں ہیں سب کو قرآن دھو کر باطن کو پاک صاف کر دیتا ہے۔ پہلا مرتبہ شریعت کا ہے اور دوسرا مرتبہ طریقت کا۔

ہدایت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ اہل ایمان جن کی رسائی صدیقوں کے درجہ تک ہے ان کے باطن میں قرآن کی وجہ سے نور حق جلوہ افگن ہوتا ہے یہ مرتبہ حقیقت کا ہے۔ اور رحمت کہنے سے حد کمال تک پہنچانے اور ناقص کو کامل بنانے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ مرتبہ نبوت ہے۔ کرخی کے قول کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کفار کے لئے موعظت ہے۔ سب سے پہلے ان کو ظاہر شریعت کا پابند بنانا چاہتا ہے اور اہل ایمان کے لئے شفاء اور ہدایت اور رحمت ہے۔ گویا قرآنی مضامین و قواعد سے غیر مسلم مسلم، اور مسلم ولی خاص، اور ولی صدیق بن جاتا ہے اور صدیق کا باطن بھی نور نبوت سے روشن ہو جاتا ہے۔ اگرچہ لقب نبوت نہیں ملتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ کتاب پاک میں موعظت ہے یعنی احکام عبودیت
اور شفاء ہے یعنی انوار ربوبیت اور ہدایت ہے یعنی انوار صفات اور رحمت
ہے یعنی مشاہدۂ ذات کے ابواب۔ بعض کا قول ہے کہ کتاب پاک بیراہ غافلوں کیلئے
موعظت ہے۔ بیماران محبت کیلئے شفاء ہے۔ دل و جان سے جو لوگ اسی کی جستجو
میں ہیں ان کے لئے ہدایت ہے اور واصلین کیلئے رحمت۔

مقصود بیان:۔ شافعیؒ نے ان آیات سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ شریعت
کے فرائض تفصیلی کے ساتھ کفار بھی مکلف ہیں۔ قرآن کے چاروں اوصاف کا
بیان اور اس امر کی صراحت کہ قرآن سے فائدہ اٹھانے والے وہی لوگ ہیں جن کے اندر
فطری طور پر نور ایمان مرکوز ہے۔ جو نور ازلی سے محروم ہیں ان کو قرآن کی کوئی
نصیحت، کوئی روحانی امراض کو شفاء دینے والا قاعدہ، کوئی راہ راست
بتانے والا ضابطہ اور کوئی تسکین بخشنے والا پیام مہربانی سود مند نہیں"
دنیوی مال و منال اور شوکت و جلال سے قرآن اور قرآن کی ہر آیت کہیں بہتر
ہے۔ گویا آیات ایمان بالقرآن کی ترغیب اور محبت مال سے نفرت دلائی گئی ہے
اور کفار کے اس نظریہ غرور کو ڈھایا ہے جو ائمہ کفر کا مسلمہ تھا۔ مدعا: بغیر
اتباع شریعت کے اس سے اوپر کے تمام کمالات یعنی طریقت و حقیقت و معرفت
کا حصول ناممکن ہے۔ پس آیت مبارکہ تازیانۂ عبرت ہے ان لوگوں کیلئے جو احکام شرعی
کی خلاف ورزی کرتے ہوئے معرفت کے مدعی ہیں اور طریقت و حقیقت کو شریعت سے جدا خیر سمجھے ہوئے ہیں

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِّنْ رِّزْقٍ

کہدو بھلا دیکھو کہ اللہ نے تمہارے لئے جو رزق اتارا ہے

فَجَعَلْتُمْ مِّنْهُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰهُ اَذِنَ

اس میں سے تم نے کچھ حلال اور کچھ حرام قرار دے لیا پوچھو کیا اللہ نے تم کو

لَكُمْ اَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُوْنَ ○ وَمَا ظَنُّ

اجازت دی ہے یا اللہ پر افتراء کرتے ہو اور جو لوگ

الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ

اللہ پر دروغ بافی کرتے ہیں قیامت کے دن کے متعلق اُن کا

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى

کیا خیال ہے بلاشبہ لوگوں پر اللہ بڑا فضل

النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُوْنَ ○ ع ۶ ۱۱

رکھتا ہے مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے

تفسیر ابن عباس، مجاہد، ضحاک، قتادہ اور عبدالرحمن بن زید وغیرہ سے مروی ہے کہ کفار عرب طرح طرح کے جاہلانہ قوانین بنا رکھے تھے بعض قسم کے جانور جن کو بحیرہ سائبہ وغیرہ کہتے تھے خود اپنی رائے سے اپنے اوپر حرام کر رکھے تھے اُن کی تردید کیلئے ان آیات کا نزول ہوا تاکہ قانون الٰہی کے حق ہونے کا اقرار کریں۔ اُسی کی تحلیل و تحریم کو مانیں اور خود رائی کو ترک کریں۔ مالک بن نضلہ کہتے ہیں کہ ایک روز میں شکستہ حالت بنائے ہوئے حضور گرامی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ارشاد فرمایا تیرے پاس کچھ مال ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں اونٹ گھوڑے بکریاں باندی غلام سب کچھ ہے۔ فرمایا جب اللہ نے تجھے دیا ہے تو وہ پسند فرماتا ہے کہ اپنے عطیہ کا تجھ پر اثر دیکھے۔ اس کے بعد فرمایا تیرے اونٹوں کے بچے صحیح سالم کامل الاعضاء پیدا ہوتے ہیں پھر تو استرہ اٹھا کر خود اُن کے کان کاٹ دیتا ہے اور کہتا ہے

یہ بحیرہ ہو گیا اور کسی کی کھال چیر کر کہتا ہے یہ حرام ہو گیا پس اپنے اور اپنے اہل و عیال پر اُن سے فائدہ اٹھانا حرام کر لیتا ہے (یہ کونسی دانش کی بات ہے)

حاصل ارشاد بر قول رازی یہ ہے کہ :- تم لوگ جن چیزوں کے متعلق حرمت یا حلت کا حکم لگاتے ہو تو اپنی خواہش نفس اور رائے سے لگاتے ہو جسکو کوئی ہوشمند پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ تحریم و تحلیل طبعزاد اور خود تراشیدہ فعل نہ ہونا چاہئیے۔ حرام و حلال کا واقعی علم سوا اُس طریقہ کے جو اللہ کی طرف سے معلوم ہے ناممکن ہے اور طریقۂ الٰہیہ کا علم بغیر وساطت رسول ؐ کے ناممکن ہے۔ لہذا تحریم و تحلیل کا جو حکم تم کو رسول دیں اور قرآن ظاہر کرے اُسی کو مانو خود رائی کو چھوڑ دو۔ اللہ پاک بندوں پر خود بڑا مہربان ہے۔ اُس نے سمجھنے کو عقل دی، رسول بھیجکر ہدایت بخشی، کتابیں بھیجکر حرام و حلال کا علم مرحمت کیا۔ اسکے باوجود اکثر لوگ خواہشات کے پیرو بن کر عقل سلیم سے فائدہ نہیں اٹھاتے قول رسول کو نہیں مانتے اور احکام کتاب اللہ کی پرواہ نہیں کرتے بجائے شکر کے کفران نعمت کرتے ہیں اپنے تراشیدہ احکام کو حکم الٰہی قرار دیتے ہیں ایسے کافران نعمت اور بہتان تراشوں کی طرف سے قیامت کے دن بازپرس کے وقت کیا جواب ہوگا۔

ابن جریر نے لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ نے دنیا میں لوگوں پر عذاب نازل کرنے میں تعجیل نہیں فرمائی یہ اُنپر بڑی مہربانی کی ورنہ اس خود تراشیدہ تحریم و تحلیل کا تو اقتضاء یہی تھا کہ فوراً عذاب نازل ہو جاتا۔

ابن کثیر نے کہا اللہ نے بڑا فضل کیا کہ آدمیوں کے لئے مخلوقات کے منافع مباح کر دیے اور حرام انہی چیزوں کو کیا جو ان میں ضرر رساں تھیں اگرچہ اللہ کے اس فضل کے عوض لوگ ناشکری کرتے اور حرام حلال خود بنا لیتے ہیں۔

مقصود بیان :- اپنی طرف سے کسی چیز کو حلال اور کسی کو حرام قرار دینے پر وعید۔ کلام الٰہی اور احادیث رسول کے مقابلہ میں محض کورانہ تقلید کی در پردہ

مذمت۔ اس امر کی صراحت کہ تحریم و تحلیل محض اللہ کا کام ہے۔ خود رائی کو اسمیں دخل نہ دینا چاہیئے۔ گویا تمام اشیاء کا واقعی حسن و قبح جاننا عقل کا کام نہیں بلکہ اس کا مدار حکم الٰہی پر ہے۔ اللہ پر بہتان باندھنے والوں اور خود تراشیدہ حکم کو مسئلہ شریعت بنانے والوں کے لیئے عذاب آخرت کی دھمکی۔ وغیرہ۔

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَّمَا تَتْلُوا مِنْهُ

(اے محمدؐ) تم کسی حال میں کیوں نہ ہو اور قرآن میں سے

مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا

کچھ ہی کیوں نہ پڑھتے ہو اور (لوگو) تم کچھ ہی عمل کیوں نہ کرتے ہو مگر ہم کو

عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ وَمَا يَعْزُبُ

تمہارے کاموں کی اطلاع ہوتی ہے جب تم اُن میں مشغول ہوتے ہو اور تمہارے

عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَ

رب سے ذرہ برابر زمین و آسمان میں

لَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ

غائب نہیں بلکہ نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز ہے نہ

اَكْبَرَ اِلَّا فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ○

بڑی جو روشن کتاب (لوح محفوظ) میں نہ ہو

تفسیر | اوپر کی آیات میں کفار کی خود ساختہ تحریم و تحلیل کی مذمت کی تھی

ان آیات میں مسئلہ مذکورہ کی علت بیان کرنی غرض ہے۔ انسانی عقل کا دائرہ بلوغ بہت تنگ ہے مابعد الموت اور غیر محسوس چیزوں کا تو ذکر ہی کیا بعض اشیاء نیم محسوس بلکہ محسوس ہیں ان کی حقیقت اور ذاتی احوال وخاصیات تک کامل طور پر انسانی دماغ کی رسائی نہیں۔ قیامت کے تمام احوال اللہ کے صفات، فرشتوں کی ہستی اور ان کے افعال واعمال کی طرف سے انسانی ذہانت بالکل تاریکی میں ہے۔ محسوس کائنات کا حسن وقبح اور اچھائی برائی کامل طور پر سمجھنا بھی طاقت بشری سے خارج ہے اور ظاہر ہے کہ جب واقعات اور اشیاء کا علم ہی نہیں تو پھر کسی چیز کو برا سمجھ کر حرام قرار دینا اور کسی چیز کو اچھا جان کر حلال بنا لینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ تحریم وتحلیل تو اس کا کام ہونا چاہیے جو صحیح طور پر ہر چیز کے افعال خواص ذاتی ماہیت اور دنیوی واخروی نتائج سے واقف ہو۔ انسان کوتاہ فہم ناقص علم اور تنگ عقل ہے، حلت وحرمت کا فیصلہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں بلکہ اس کا قطعی علم اللہ کے دست قدرت میں ہے کیونکہ انسان کسی حالت میں ہو جو کام بھی کر رہا ہو جس کام کو بھی شروع کرے بلکہ علاوہ غیر محسوس کائنات کے محسوس موجودات کا بھی ذرہ ذرہ اس کے علم سے باہر نہیں۔ اللہ کی علمی کتاب (لوح محفوظ) میں ہر وقت سب کچھ موجود رہتا ہے لہذا تحریم وتحلیل کا حکم بھی وہی دے سکتا ہے۔

بعض مفسرین کا قول ہے کہ وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ سے مراد ہے رسول پاک کی نماز روزہ کل عبادات، شان کبریائی میں غور وخوض بندگان خدا کے ایمان لانے کی حرص وغیرہ اور وَلَا تَعْمَلُونَ میں خطاب کفار مکہ کو ہے۔ اس سے مراد ہے ان کا انکار قرآن کرنا، اللہ کا شریک بنانا، انجام سے بے خبر ہونا اس کے بعد وَمَا يَعْزُبُ میں عموم ہے گویا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ کی نماز روزہ حج ذات وصفات خداوندی میں غور اور تلاوت قرآن وغیرہ سے خدا تعالیٰ بخوبی واقف ہے اور کفار کے حرکات قبیحہ کو بھی بخوبی جانتا ہے بلکہ آسمان

وزمین کی ذرہ برابر اور اس سے کوئی چھوٹی چیز بھی علم الٰہی سے باہر نہیں۔
علم الٰہی تمام کائنات کو محیط ہے - حاصل دونوں تفسیروں کا ایک ہے۔
مقصود بیان :- علم الٰہی کے محیط کل ہونے کی صراحت - اس سے فلاسفہ
کے اس نظریہ کی تردید ہوتی ہے کہ واجب الوجود کو جزئیات مادیہ کا علم من حیث
الکلیات ہے تفصیلی علم نہیں - تحریم و تحلیل کا ضابطہ اور محض ذات الٰہی میں اس کا
تحقق - ایک ہی آیت میں رسول پاک اور کفار مکہ کو خطاب کر کے اس لطیف مضمون
کی طرف ایماء کہ اللہ نیکوں کی نیکی اور بدوں کی بدی دونوں سے واقف ہے مگر اسکو
کسی کی پرواہ نہیں جو کچھ کرتا ہے بندہ اپنے لئے کرتا ہے - وغیرہ -

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ

خوب سن لو کہ خاصان خدا کو نہ کچھ خوف ہوگا

لَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ الَّذِينَ آمَنُوا وَ

نہ وہ غمگین ہونگے جو لوگ ایمان لائے اور

كَانُوا يَتَّقُونَ ○ لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ

پرہیزگاری کرتے ہیں اُن کو دنیوی زندگانی میں بھی خوشخبری ہے

الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ

اور آخرت میں بھی اللہ کی باتیں نہیں بدلتیں

اللَّهِ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ○

یہی بڑی کامیابی ہے

تفسیر | **تحلیل اجزاء**

ولی کے لغوی معنی ہیں قریب نزدیک گویا ولی اللہ کے معنی ہوئے اللہ سے قرب رکھنے والا لیکن خدا نہ جسم ہے نہ جسمانی نہ مادہ نہ مادی نہ اُس سے کسی کی قرابت جسمانی ممکن ہے نہ اُس سے کسی کا رشتہ - اس لئے ولی کے مجازی معنی ہیں اختلاف ہے متکلمین کے نزدیک ولی اللہ اُسکو کہتے ہیں جو اللہ سے محبت رکھتا ہو یعنی اللہ کا فرمانبردار اور اطاعت شعار ہو - اہل تصوف نے بھی محبت اطاعت کو مدار ولایت قرار دیا ہے - اسی آیت میں اولیاء کی تفسیر اس طرح بیان کی ہے کہ جو لوگ اہل ایمان و تقویٰ ہیں وہ اولیاء اللہ ہیں - ایمان کے مختلف مراتب ہیں ایمان بالغیب - ایمان بالمعرفۃ - ایمان بالیقین - ایمان بالحق - اسی طرح تقویٰ کے مدارج بھی غیر محصور ہیں - ابتدائی درجہ یہ ہے کہ مومن شرک سے پرہیز کرے اور انتہائی درجہ یہ کہ غیر اللہ سے منہ موڑ کر اپنے پرائے بلکہ اپنی ذات کو چھوڑ کر دنیا و مافیہا سے رشتہ توڑ کر محض اللہ سے تعلق جوڑے - دل اور روح پر محبت الٰہی کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ اللہ کی ذات و صفات میں محو ہو کر فنا فی اللہ اور بقاء باللہ کے درجہ پر پہنچ جائے اس مختصر بیان سے واضح ہو گیا کہ ایمان و تقویٰ کے مراتب کے اختلاف سے اولیاء کے مراتب بھی متفاوت ہیں - ہر مومن بھی ولی ہے اور ایمان و تقویٰ کی انتہائی چوٹی پر پہنچنے والا بھی ولی ہے - ناقص و کامل اور ادنیٰ و اعلیٰ کا فرق ہے لیکن ولایت کے ابتدائی درجہ پر فائز ہونے والے کے لئے بھی ایمان و اطاعت شرط ہے ا‌ونچے درجات والے درجات کا تو ذکر ہی کیا ہے کوئی شخص بغیر شرعی ایمان و عبادت کے ولی نہیں بن سکتا وہ جھوٹا ہے جو صوفیوں کو احکام شرع سے مستثنیٰ سمجھتا اور کہتا ہے کہ شریعت طریقت سے جدا چیز ہے - در حقیقت دونوں ایک ہی ہیں آغاز کا نام شریعت اور ترقی کرتے کرتے انتہا پر پہنچنے کا نام طریقت حقیقت اور معرفت ہے -

ابوالسعود کا قول ہے کہ تقویٰ کے مراتب متعدد ہیں - ابتدائی مرتبہ یہ ہے کہ شرک سے پرہیز کرے اگرچہ اُس سے گناہ سرزد ہو اور انتہائی درجہ یہ ہے کہ طاعت

قائم ہو، گناہوں سے اجتناب کرنے شبہات سے دور رہے اور طریقہ سنت پر مستقیم ہو۔ یہاں آخری مرتبہ مراد ہے۔

ابو حنیفہ اور شافعی کا قول ہے کہ اگر علماء اولیاء نہیں تو پھر کوئی ولی نہیں۔ تو ذہبی نے کہا یہ اُن عالموں کا ذکر ہے جو علم کے موافق عمل کرتے ہیں۔ قشیری کا قول ہے کہ جس طرح نبی معصوم ہوتا ہے اسی طرح محفوظ ہونا ولی کی شرط ہے پس جس پر شرع کا اعتراض ہو وہ فریب خوردہ اور فریب دہندہ ہے ولی نہیں۔ ولی وہی ہے جس کے افعال واقوال شرع کے موافق ہوں۔ سعید بن جبیرؓ اور ابن عباسؓ نے فرمایا اولیاء الٰہی وہی بندے ہیں جن کے دیکھنے سے اللہ کی یاد آجائے یہ پہچان اُن کی پیشانی اور آثار سے ہوتی ہے۔ ایک مرفوع حدیث بھی اسی مضمون کی ہے جسکو بزار نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے حضور اقدسؐ نے فرمایا بعض بندے ایسے ہیں جن پر انبیاء و شہداء غبطہ کریں گے۔ دریافت کیا گیا یا رسول اللہ وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا وہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے بغیر مالی اور نسبی شرکت کے اللہ کے واسطے باہم محبت کی ہوگی اُن کے چہرے نورانی ہونگے اور نور کی کرسیوں پر وہ متمکن ہونگے۔ لوگوں کے خوف کے وقت اُن کو خوف نہ ہوگا اور لوگوں کے غم کے وقت اُن کو غم نہ ہوگا۔ اس کے بعد حضورؐ نے آیت اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ الخ تلاوت فرمائی (رواہ ابن جریر وصححہ الحاکم و ابوداؤد و ابن ابی حاتم والبیہقی عن عمر بن الخطاب رضؓ وقال الحافظ اسنادہ جید)

عمرو بن جموح سے مروی ہے کہ اسی وقت بندہ کا ایمان خالص ہوتا ہے جب اللہ ہی کے واسطے محبت اور دوستی کرے اور اسی کے واسطے بغض کرے۔ بندہ نے جب ایسا کیا تو اللہ کیطرف سے ولایت کا مستحق ہوگیا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندوں میں سے میرے اولیاء اور میری خلق میں سے میرے احباء وہ ہیں جو میری یاد میں رہتے ہیں اور میں اُن کی یاد کے وقت میں اُن کو یاد کرتا ہوں (رواہ احمد وغیرہ)

بُشریٰ سے اس سے مراد یا تو سچے خواب اور مکاشفات ہیں یا وہ خوشی مراد ہے

جو موت کے وقت اولیاء کرام کو حاصل ہوتی ہے اس قفس جسمانی سے اُن کی ارواح کو نجات ملتی ہے۔ محب و محبوب کا درمیانی حجاب اٹھ جاتا ہے یا وصال حبیب کا وقت آجاتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جب ابن ملجم نے نیزہ یا خنجر مارا تو بے ساختہ آپ نے فرمایا فزت ورب الکعبۃ رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا۔ پھر جب وفات کا وقت آیا اور محبوب حقیقی کے جمال باکمال کی ضیاء پاشی شروع ہوئی تو فرمایا جاء الحبیب۔ کلام مجید ناطق ہے کہ مرنے کے وقت اولیاء کے سامنے خوبصورت فرشتے آتے ہیں اور کہتے ہیں کچھ نہ ڈرو اپنے مالک کے رضوان میں چلو یا اس سے مراد جنت کی وہ خوشخبری ہے جو پروردگار عالم نے اپنے اولیاء کرام کو الہامی کتابوں میں دی ہے۔ قرآن پاک میں بھی آیا ہے يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ۔ وغیرہ۔

كَلِمٰتِ اللّٰهِ سے مراد وعدہ الٰہی اور قانون قدرت ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے دوست ہیں جنہوں نے تن من اللہ کی راہ میں قربان کردیا ہے جن کو رضاء مولیٰ کے علاوہ کسی بات سے سروکار ہی نہیں، جن کی زندگی اور موت دشمنی اور دوستی سب اللہ کے واسطے ہے۔ غرض جو لوگ اولیاء اللہ ہیں مرنے کے بعد اُن کو کسی آئندہ مصیبت کا خوف یا گذشتہ بات کا رنج نہ ہوگا۔ دنیا میں بھی اُن کی زندگی جذبات حزن و خوف سے پاک ہو جاتی ہے اور آخرت میں بھی وہ ان باتوں سے آزاد ہوں گے اور صرف یہی نہیں آخرت ہی پر بس نہیں بلکہ دنیا و آخرت دونوں میں اُن کے لئے خصوصیت کے ساتھ نجات و کامرانی کی بشارت ہے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے یہ وعدہ الٰہی ہے جس میں تغیر و تبدل ناممکن ہے۔

مقصود بیان :- اولیاء کے معنی کی توضیح کہ جو لوگ ایماندار و متقی ہیں وہی اولیاء اللہ ہیں۔ اولیاء کے مراتب کا بیان۔ اس امر کی صراحت کہ جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اُس کا ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا میں بھی شاد و بامراد رہتا ہے اور آخرت

میں کبھی بےخوف و مطمئن۔ اس امر کی تصریح کہ وعدہ الٰہی کی خلاف ورزی ناممکن ہے، اللہ
کے قول میں کذب محال ہے، قانون قدرت اٹل ہے نیکی کا بدلہ بھی نیک ہوتا ہے (آدم) وغیرہ

وَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ إِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا

(اے محمدؐ) تم کو ان کی بات غم میں نہ ڈالے واقعی سارا غلبہ اللہ کو ہے

هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ أَلَا إِنَّ لِلَّهِ مَنْ

وہی سنتا اور جانتا ہے خوب سن لو کہ آسمانوں میں

فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ وَمَا

اور زمین میں جو بھی ہیں وہ اللہ ہی کے ہیں جو لوگ

يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ

اللہ کو چھوڑ کر شریکوں کو پکارتے ہیں وہ کس کے پیچھے

شُرَكَاءَ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ

پڑے ہوئے ہیں بس وہ تو اپنے خیال کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور

هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ۝ هُوَ الَّذِي جَعَلَ

نری اٹکلیں دوڑاتے ہیں اللہ وہی ہے جس نے رات کو

لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ

تمہارے آرام کے لئے بنایا اور دن کو

مُبۡصِرًا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ۝

روشن بنایا اس میں گوش (ہوش) رکھنے والوں کیلئے نشانہائے قدرت ہیں

تفسیر مشرکین عرب توحید سے منہ موڑ کر صفات الٰہیہ میں دوسروں کو شریک قرار دیتے باری تعالیٰ کی شان میں گستاخیاں کرتے اور رسول برحق کو ساحر کاہن اور شاعر کہتے سخت کلامی سے پیش آتے۔ یہ تمام امور کفار کی تباہی اور ابدی بربادی کے اسباب تھے۔ حضور اقدس ؐ رحمۃ للعالمین تھے بندگان خدا کو تباہی کے غار میں گرتا دیکھ کر سخت غمگین ہوتے پھر باری تعالیٰ کی شان میں گستاخیاں سن کر مزید رنجیدہ ہوتے اس لئے یہ آیت کریمہ حضور ؐ کی تسلی دینے اور کفار کو ان کے باطل عقیدہ پر تنبیہ کرنے کے لئے نازل فرمائیں۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ:۔ کفار کو اپنی دولت قوت اور جاہ و جلال پر ناز ہے یہ کمزور مسلمانوں کو ستاتے اور اہل حق کی دل آزاری کرتے ہیں اللہ اور اُس کے رسول کے متعلق مغرورانہ الفاظ زبان سے نکالتے ہیں اے رسول آپ کو اِن بیہودہ حرکات سے کچھ رنجیدہ نہ ہونا چاہئے۔ ان کو کوئی عزت حاصل نہیں۔ عزت اور غلبہ تو کامل طور پر اللہ ہی کو حاصل ہے اور وہ آپ کا مددگار ہے لامحالہ آپ کو ان پر غلبہ عطا کریگا اور ان کی سرکشیوں کی سزا دیگا۔ وہ ان کے تمام اقوال و اعمال کو سنتا اور جانتا ہے اور ان کے انجام سے بھی واقف ہے رہا کافروں کا یہ گمان کہ ان کے باطل معبود اور مصنوعی شرکاء الوہیت کچھ اختیار و قوت رکھتے ہیں اور نقصان نفع پہنچانے کی ان میں طاقت ہے یہ محض باطل گمان ہے کیونکہ کل عالم میں جو عظیم الشان و دانشمند کائنات ہے اور جو کمزور و بے عقل ہستیاں ہیں سب اللہ کی مخلوق مملوک مسخر اور مطیع حکم ہیں کسی کو سرتابی کی مجال نہیں پھر معبود و مسجود ہونے کا استحقاق سوائے خدا کے اور کو کس طرح ہو سکتا ہے درحقیقت شریک الوہیت کوئی بھی نہیں محض ان کا گمان ہے برہان و دلیل سے منہ موڑ کر

یہ لوگ فقط گمان و وہم کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں گمان و تخمین قائم کر لیا کہ اللہ کے سوائے دوسرے معبود نفع نقصان پہونچا سکتے ہیں لہذا ان کی پرستش کرنے لگے یہ معبود پرستی نہ ہوئی بلکہ وہم پرستی ہوئی۔ ان کو اتنا نہیں سوجھتا کہ رات اور دن تو اللہ نے بنائے سکون و چین کے لئے رات کو تاریک بنایا اور کام کاج کے لئے دن کو روشن پیدا کیا گویا ایجاد کے علاوہ تربیت ابقاء کا بھی اسی نے سروسامان کیا۔ پھر ایسے قادر مربی خالق کو چھوڑ کر معذور مربوب مخلوق کی پرستش کرنا کتنا احمقانہ فعل ہے

مقصود بیان :- عزت و غلبہ ہمیشہ حق و اہل حق کو حاصل ہوتا ہے۔ باطل پرستوں کی طرف سے دل آزاری اور ستم شعاری پر رنج نہ کرنا چاہیئے۔ کل عالم اللہ کا مملوک و مخلوق ہے۔ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ کا لفظ کہنے سے اس طرف اشارہ کیا کہ کفار بہت زیادہ احمق ہیں باوجود ذی ہوش اور اصحاب دانش ہونے کے ایسی مخلوق کی پرستش کرتے ہیں جو بے عقل اور عاجز محض ہے۔ وہم و گمان کی پرستش حرام ہے۔ قابلِ اتباع وہی بات ہے جو عقلاً و نقلاً قطعی ہو۔ رات کی تاریکی سکون جسمانی و روحانی کا باعث ہے اور دن کی روشنی کاروبار اور ذرائع معاش کے حصول وغیرہ کیلئے مفید ہے۔ گویا انسانی زندگی کا مدار سکون و حرکت پر ہے اور سکون و حرکت کیلئے شب و روز کا وجود لازم ہے۔ نور و ظلمت دونوں وجودی چیزیں ہیں یہ کہنا غلط ہے کہ ایک عدمی اور دوسرا وجودی ہے۔ وغیرہ۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبۡحٰنَهٗ

وہ کہتے ہیں کہ خدا نے بیٹا بنا رکھا ہے وہ تو پاک

هُوَ الۡغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي

بے نیاز ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے

الْاَرْضِ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بِهٰذَا

اُسی کا ہے تمہارے پاس اُس کی کچھ بھی دلیل نہیں

اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ

کیا تم اللہ پر وہ بات کہتے ہو جس سے تم خود ناواقف ہو (اے محمدؐ) تم کہدو

اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ

کہ جو لوگ اللہ پر دروغ بندی کرتے ہیں وہ کامیاب

لَا يُفْلِحُوْنَ ۝ مَتَاعٌ فِي الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا

نہ ہوں گے دنیا میں تھوڑے سے مزے اڑانا ہے پھر ان سب کو ہماری طرف

مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِيْقُهُمُ الْعَذَابَ

لوٹنا ہے ہم اُن کے کفر کی پاداش میں ع

الشَّدِيْدَ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝

سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے

ع ۱۰ ۱۲

تفسیر عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ مسیح نعوذ باللہ اللہ کے بیٹے تھے اسی طرح بعض مشرکین عرب ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔ اب بھی عملی طور پر ہندو دھرم دیوتاؤں اور دیویوں کا قائل ہے جس کے اندر خدا کا حلول کرنا ثابت کیا جاتا ہے اور بعض لوگ تو عملی طور پر اُن کو خدا کی اولاد مانتے ہیں اوپر کی آیت میں عام شرک کی تردید پُرزور دلائل کے ساتھ کی گئی ان آیات میں

خاص طور پر ابنیت و ابوّت کے عقیدہ کی بیخ کنی فرماتا ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اللہ تین صفات سے متصف ہے جن میں سے ہر ایک عقیدۂ ولادت کے لئے کافی ہے (۱) اللہ کی ذات تمام صفات کمالیہ سے موصوف ہے۔ ہر قسم کے عیب اور نقصان سے پاک ہے اُس کی ذات کی تکمیل کیلئے کسی حالت منتظرہ کی ضرورت نہیں اور بیٹے کا وجود خود دلالت کرتا ہے کہ ایک وقت میں باپ کا وجود تھا اور بیٹے کا نہ تھا۔ باپ بیٹے سے ہمیشہ مقدم ہوتا ہے۔ گویا ایک وقت میں باپ کو صاحب ولد نہیں کہا جاتا تھا جب اولاد ہو گئی تو صاحب ولد کہنا صحیح ہوا جس کا مدعا یہ ہوا کہ بعض تکمیلی صفات باپ میں پہلے موجود نہ تھیں وجود ولد کے بعد پیدا ہو گئیں اور اللہ کی شان میں کسی تکمیلی صفت کا عدم ماننا اُسکی ذات کی تنقیص ہے۔ حالانکہ اُس کی ذات ہر عیب و نقصان سے پاک ہے پھر کس طرح اُسکو صاحب اولاد قرار دیا جا سکتا ہے اور کیوں اُسکی ذات کو ناقص مانا جاتا ہے (۲) بیٹے کی ضرورت دو بناء پر ہوتی ہے ایک تو بقاء نوع کیلئے ایک شخص ہمیشہ زندہ اور قائم نہیں رہ سکتا بقاء شخصی محال ہے اب اگر سلسلۂ توالد و تناسل جاری نہ ہو تو کچھ زمانہ کے بعد نوع کا ہی خاتمہ ہو جائیگا۔ لامحالہ سلسلۂ نوعی کے بقاء کے لئے بیٹا بیٹی اور پھر ان کی نسل در نسل کی ضرورت ہے۔ دوسرے اُس وقت اولاد کی ضرورت ہوتی ہے جب باپ ضروریات کی تکمیل بذات خود نہ کر سکے فرائض و مہمات کی ادائیگی کامل طور پر نہ کر سکے کسی دستگیر اور معاون کا محتاج ہو۔ اللہ ان دونوں لغویتوں سے بے نیاز ہے نہ تو اسکو اپنی نوع کے بقاء کی ضرورت ہے کیونکہ وہاں نوع اور شخص ایک ہی ہیں اسکی ذات کو فناء عدم اور زوال کا احتمال ہی نہیں وہ ابدی سرمدی قدیم لم یزل ہے واجب الوجود ہے عدم کو اُسکی ذات کی طرف راستہ ہی نہیں مل سکتا لہٰذا اُسکو اولاد کی ضرورت نہیں۔ پھر وہ اپنی کارسازی اور خلاقی میں بے نیاز ہے۔ رزاقی، تربیت ایجاد اور ابقاء میں کسی کا محتاج نہیں، تمام مشاغل الوہیت خود ہی سر انجام دے سکتا ہے

اور سونپتا ہے اور دیتا رہے گا اُس کو اولاد کی کیا ضرورت (۳) نتیجہ توالد یہ ہے کہ نوعی افراد کا اضافہ ہو جاتے۔ ایک گھوڑے سے مختلف گھوڑے ، ایک آدمی سے چند آدمی ، ایک خاص نوع کے پرندہ سے اُسی نوع کے چند پرندے پیدا ہو جاتے ہیں لیکن اللہ کی شان میں اس بات کا احتمال بھی نہیں آسمان و زمین یعنی کل عالم میں اس کا ہم نوع ایک بھی نہیں۔ جو کچھ ہے اس کا مملوک مخلوق اور مسخر ہے۔ پھر اولاد باپ کی ہم نوع ہوتی ہے اور مملوک و مخلوق نہیں ہوتی باپ بیٹے کا خالق نہیں ہوتا بلکہ بیٹا اُس کا جزء ہوتا ہے۔ اللہ ہر چیز کا مالک خالق اور حاکم مطلق ہے۔ پھر کیونکر کوئی مخلوق اُس سے رشتۂ تولد قائم کر سکتی ہے۔ اس سے آگے مطلب یہ ہے کہ یہ تو استحالۂ ولادت کے دلائل ہیں، تمہارے پاس اپنے عقیدہ کو ثابت کرنے کے لئے کیا دلیل ہے؟ اگر کوئی دلیل ہو تو پیش کرو۔ جب عقیدہ کا کوئی عقلی نقلی ثبوت نہیں تو کیوں اللہ پر بہتان تراشی کرتے ہو۔ جو بات نہیں جانتے اُس کو کیوں اللہ کی طرف منسوب کرتے ہو۔

اچھا اللہ کی صداقت رسالت اور دعویٰ کی سچائی کا ایک اور واضح ثبوت یہ ہے کہ جو لوگ اللہ پر دروغ بندی کرتے ہیں ان کو دین دنیا میں کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور رسول کو شبانہ روز بہبودی و کامرانی حاصل ہے تم دلائل براہین قوت اور حجت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے پھر کیوں اپنے عقیدہ پر اڑے ہوئے ہو اور کیوں تعلیم رسول کو سچ نہیں جانتے۔ اب رہی یہ بات کہ تم دولتمند اور فارغ البال ہو اور مسلمان مفلس و نادار ہیں تو اس سے اپنی کامیابی نہ سمجھو۔ کیونکہ یہ چند روزہ عیش و طرب ہے کچھ دنوں مزہ اڑا لو۔ آخر سب کو خدا کے سامنے پہونچ کر اپنی کفر طرازیوں کی سخت ترین سزا بھگتنی ہے۔

مقصود بیان :- استحالۂ توالد کی چار دلائل کا بیان۔ ضرورت توالد پر اجمالی تبصرہ۔ اس امر کی طرف اشارہ کہ عقائد قائم کرنے کے لئے عقلی و نقلی دلیل کی ضرورت ہے۔ اعتقادی امور میں تقلید کرنی ناجائز ہے۔ جس قول و فعل

پر شرعی دلیل نہ ہو وہ جہالت ہے۔ آیت سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اہلِ ایمان جن باتوں پر اعتقاد رکھتے ہوں اُن سب کا ثبوت قطعی دلائل سے ہونا چاہئے (کذا ذکرہ البیضاوی) اللہ پر دروغ بندی کرنے والے کو فلاحِ آخرت نصیب نہیں ہوتی۔ اللہ ظالم نہیں کہ کافروں کو خواہ مخواہ عذاب دے بلکہ اُن کے کفر کی پاداش میں اُن پر عذاب ہوگا۔ وغیرہ۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ م اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ

اور اُن کو نوح کا قصہ سُنا دو جبکہ نوح نے اپنی قوم سے کہا

يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَ

اے میری قوم اگر تم کو میرا رہنا اور

تَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ

آیاتِ الٰہی کو سمجھانا ناگوار گذرا ہے تو میرا بھروسہ تو اللہ پر ہے

فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ

تم سب اپنے کام کو اور شریکوں کو جمع کر لو تاکہ پھر تمہارے کام میں

اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا

تمہارے لئے کوئی اشتباہ نہ رہے پھر میرے ساتھ سب کچھ کر ڈالو اور

تُنْظِرُوْنِ ○ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ

مہلت نہ دو اس کے بعد بھی اگر تم رُخ پھیرے رہو گے (تو کوئی وجہ نہیں معلوم کرتی

مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَ

کیونکہ میں نے تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگا میرا معاوضہ تو بس اللہ کے ذمہ ہے اور

اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

فرمانبردار رہنے کا مجھے حکم دیا گیا ہے

فَكَذَّبُوْهُ فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ

غرض لوگوں نے نوح کی تکذیب کی تو ہم نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو کشتی میں بچا لیا

وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ

اور ان کو جانشین بنایا اور جن لوگوں نے ہماری آیات کی

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ

تکذیب کی تھی ان کو غرق کر دیا سو دیکھو جن کو ڈرایا گیا تھا ان کا انجام

الْمُنْذَرِيْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا

کیسا ہوا پھر نوح کے بعد ہم نے اور پیغمبروں کو ان کی قوموں

اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا

کے پاس بھیجا اور پیغمبر ان کے پاس معجزات لیکر پہنچے مگر یہ لوگ بھی

لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ

اس چیز کو ماننے والے نہ تھے جسکو وہ پہلے جھٹلا چکے تھے

كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ؁

ہم حد سے بڑھنے والوں کے دلوں پر یونہی مہر کر دیتے ہیں

تفسیر آیات سابقہ میں توحید رسالت نبوت اور قیامت کے مباحث روشن دلائل کے ساتھ بیان کر کے مخالفین کے شبہات کا ازالہ بہترین پیرایۂ کلام میں فرمایا تھا اب یہاں سے چند مقاصد کے ماتحت گذشتہ انبیاء اور ان کی اقوام اور تبلیغ اسلام کا تذکرہ کرتا ہے مقاصد حسب ذیل ہیں:- (۱) گذشتہ واقعات کے سننے سے رسول پاکؐ اور صحابہ کو تسلی ہو اور تبلیغ وایمان پر مزید پختگی پیدا ہو کہ ہمیشہ سے کفار کا یہی دستور چلا آیا ہے کہ اہل حق کو بقدر امکان تکلیف دیتے رہتے ہیں نیز کفار مکہ کو عبرت ہو کہ انبیاء کی اطاعت نہ کرنے اور ان سے سرتابی کرنے کی وجہ سے گذشتہ اقوام تباہ ہو چکی ہیں شاید ہمارا بھی وہی حشر ہو۔ (۲) ایک قسم کا کلام سنتے سنتے سننے والے کو کلام کا لطف و کیف اتنا نہیں آتا جتنا اس کے اندر ہوتا ہے۔ اسلوب بیان کی تبدیل ضروری چیز ہے پہلے برہانی طریقہ تھا اب خطابی طریقہ ہے پہلے دعوت خوردمی گئی تھی اب درس عبرت دینا مقصود ہے۔ (۳) گذشتہ انبیاء اور ان کی اقوام کے مفصل واقعات و حالات بیان کر کے حضور اقدس صلعم کا اعجاز ظاہر کرنا مقصود ہے کہ باوجودیکہ آپ لکھے پڑھے نہیں نہ علماء سے میل جول اور معاشرت کا موقعہ ملا پھر بھی ہزاروں برس پہلے کے ایسے واقعات بیان کئے اور ان سے ایسے بیش قیمت نتائج نکالے جو عمل سے سر مو متفاوت نہیں۔ اہل تاریخ اور گذشتہ الہامی کتابوں کے پڑھنے والے سر جوڑ کر بیٹھ جائیں اور کوشش کریں کہ بیان قرآن کی کوئی تغلیط کر سکیں یہ ناممکن ہے۔ ان آیات میں حضرت نوحؑ کے قصہ سے آغاز فرمایا۔

تحقیق اجزاء مَقَامِیْ وَتَذْكِیْرِیْ۔ مقام سے مراد یا تو وجود اور ہستی ہے یا بقا وطول مراد ہے کیونکہ حضرت نوحؑ نے طوفان سے پہلے چھ سو برس تبلیغ فرمائی۔ یا کھڑا ہو کر وعظ کہنا مراد ہے جس طرح کہ واعظوں کا قاعدہ ہے

آخری معنی کو اہل تفسیر نے ترجیح دی ہے۔

فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ یعنی پختہ ارادہ کرلو پورا سامان مہیا کرلو اُن معبودوں کو بھی اپنی حمایت کی دعوت دے لو جن کو تم نے اللہ کا شریک کر رکھا ہے آپس کا مشورہ درپردہ مت رکھو بلکہ خوب صاف صاف ارادہ مصمم کرلو اور پوری طاقت کے ساتھ میرے ہلاک کرنیکی کوشش کرلو

خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ نوح کو جب وعظ کہتے کہتے اور نصیحت کرتے کرتے طویل مدت گذر گئی اور کفار بھی تنگ آکر ڈرانے دھمکانے لگے کہ ہم تم کو قتل کر ڈالینگے ورنہ ان پند و نصائح سے باز آجاؤ تو آپ نے فرمایا لوگو! اگر تم میری طویل نصائح سے تنگ آگئے ہو اور مجھے قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو سب مل کر انتہائی کوشش کر دیکھو باہم مشورہ سے عزم کو پختہ کرلو کوئی بات اٹھا کر نہ رکھو اپنے شرکاء کو بھی حمایت کیلئے بلالو خوب کھل کر ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ سب مل کر مجھ پر چڑھائی کرو مجھے تمہاری کچھ پرواہ نہیں اگر ایسے بھی تم میرا کچھ نہ بگاڑ سکے اور اس کے باوجود میری نصیحت سے منہ موڑا اور سرکشی نہ چھوڑا تو یہ تمہاری مادانی ہے کیونکہ میں تم سے وعظ و نصیحت کے کسی معاوضہ کا خواستگار نہیں نہ دولت و مال چاہتا ہوں نہ عزت و شہرت نہ جاہ و حکومت۔ بس اللہ ہی سے تو اب و معاوضہ کا خواستگار ہوں۔ اسی نے مجھے حکم دیا ہے کہ اس کے احکام کا مطیع رہوں اور فرماں پذیری و استقامت رکھوں اور اپنے نفس و ارادہ کو اسی کے سپرد کردوں۔ چنانچہ میں نے اسی کے حکم کی تعمیل کی ہے مجھے اب نہ کسی سے کچھ خوف ہے نہ لالچ۔ میرے بیم و رجاء کا مرکز بس اسی کی ذات ہے۔ غرض کافروں نے نہ مانا اللہ نے اُن کو غرق کر دیا۔ جو مومن تھے اُن کو تباہ شدگان کا جانشین بنایا۔ ڈوبے ہوؤں کی املاک و اراضی نجات یافتہ طبقہ کے ہاتھ میں آئیں اور انہیں سے نسل انسانی کی افزائش ہوئی اور خلافت الٰہیہ کا اعزاز انہی کو حاصل ہوا پھر کچھ مدت کے بعد کفر و شرک کی تاریکی پھیلنے لگی حق پر باطل غالب آنے لگا تو اظہار صداقت اور اعلان صداقت کے لئے ہود، صالح ابراہیم، لوط، شعیب وغیرہ انبیاء کو مبعوث کیا۔ مگر ہر نبی کو اسی کی قوم کی ہدایت

کے لئے بھیجا۔ انبیاء نے پہونچکر اپنی صداقت اور اپنے اقوال کی حقانیت کے
بہت ثبوت پیش کئے مگر کافر جس بات کو ایک مرتبہ نہ مانتے تھے اُسکو ماننے والے
ہی نہ تھے چونکہ انہوں نے راہ حق سے تجاوز اور حد اعتدال سے باہر قدم رکھدیا
تھا اسلئے خدا نے اُن کے دلوں پر گمراہی کی مہر لگادی اُن کی تقدیر میں سعادت
ایمان ہی نہ تھی وہ ازلی کافر تھے۔ قانون قدرت ہی یہی ہے کہ جو ہدایت کا خواستگار
نہ ہو اُسکو ہدایت نہیں کی جاتی بلکہ گمراہی کی مُہر اُس کے دل پر لگادی جاتی ہے۔

مقصود بیان :۔ کفار کو تباہی و بربادی کی دھمکی۔ اہل ایمان کو کافروں کی
ایذارسانی پر صبر کرنے کی تلقین اور اللہ پر بھروسہ رکھنے کی ہدایت۔ اس بات
کا درپردہ حکم کہ اہل ایمان کو غیر اللہ سے خوف نہ کرنا چاہئے نہ امید۔ مؤمن کو مرکز
بیم ورجاء فقط ذاتِ الٰہی کو بنانا چاہئے۔ اپنے کل ارادے خواہشات یہانتک
کہ خودی کو رضاءِ مولا کے سپرد کردینا لازم ہے۔ اس امر کا ضمنی اظہار کہ بالآخر
اہل حق غالب آتے ہیں۔ باطل پرست برباد ہو جاتے ہیں۔ خلافت الٰہیہ کا استحقاق
صرف اہل حق کو ہی ہے۔ آیت صراحۃً دلالت کر رہی ہے کہ مختلف انبیاء کو صرف
اُنہی کی قوموں کی ہدایت کیلئے بھیجا گیا تھا کوئی دعوت عالمگیر نہ تھی۔ جو
لوگ خود ہدایت کے خواستگار نہیں ہوتے اور خود راہ حق سے ہٹ کر اپنے اوپر
زیادتی کرتے ہیں اللہ بھی اُنکی گمراہی پر مُہر ثبت فرمادیتا ہے پھر اُنکو ہدایت نصیب نہیں ہوتی
تمام افعال اللہ کی قدرت اور مشیت کے تابع ہیں بندہ کا اور سب کا خالق خدا ہے۔ وغیرہ۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسٰى وَهٰرُوْنَ

اس کے بعد ہم نے موسیٰ و ہارون کو فرعون اور اس کی قوم کے پاس

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا فَاسْتَكْبَرُوْا

اپنے نشانہائے قدرت دے کر بھیجا مگر وہ تکبر کرنے لگے

وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ ۝ فَلَمَّا جَاءَهُمُ

اور وہ تھے ہی گنہگار غرض جب ہماری طرف سے

الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا إِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ

ان کے پاس حق بات پہنچ گئی تو کہنے لگے یقیناً یہ تو کھلا ہوا جادو ہے

مُّبِينٌ ۝ قَالَ مُوسٰى أَتَقُولُونَ لِلْحَقِّ لَمَّا

موسیٰ نے کہا کیا جب حق بات تمہارے پاس آگئی تو کیا تم ایسا

جَاءَكُمْ أَسِحْرٌ هٰذَا وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ ۝

کہتے ہو کیا یہ جادو ہے جادوگروں کا تو بھلا نہیں ہوتا

قَالُوا أَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا

کہنے لگے کیا تم اس لئے آئے ہو کہ ہم کو اس دین سے پھیر دو جس پر ہم نے اپنے

عَلَيْهِ آبَاءَنَا وَتَكُونَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ

باپ دادا کو پایا ہے اور تم دونوں کی سرداری ملک میں

فِي الْأَرْضِ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِينَ ۝

ہو جائے ہم تم دونوں کا یقین نہیں کرنے کے

تفسیر

حضرت نوح کے بعد مجمل طور پر دیگر انبیاء کا تذکرہ فرماتا ہے کیونکہ آپ پہلا صاحب شریعت عظیم المرتبہ رسول تھے۔ قرآن پاک میں حضرت

موسیٰ کا قصہ متفرق مقامات میں مذکور ہے لیکن ہر موقعہ پر جدا نوعیت رکھتا ہے اور مقتضاء حال کے مطابق پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ ہم ان آیات میں تفصیلی تبصرہ کرینگے۔ آغاز قصہ سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ کے ضروریات مثلاً مصر فرعون، ساحر، میدان، مقابلہ وغیرہ کے تفصیلی حالات بیان کردیے جائیں تاکہ آیات کا مقصد کافی طور پر ذہن نشین ہو جائے۔

فرعون مصر اور موسیٰ

فراعنۂ مصر بڑے شکوہ وطنطنہ کے فرماں روا ہوئے اور اتنی طویل فرماں روائی کی کہ شاید کسی اور خاندان کو نصیب ہوئی ہو۔ یہ ضرور ہوتا رہا کہ کبھی مستقل آزاد بادشاہ رہے کبھی مقتدر فرماں رواؤں کے باجگذار بنتے رہے۔ حدود حکومت میں بھی مختلف زمانوں میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ ان کا سلسلۂ نسب بنی اسرائیل کے نزدیک قحط بن حام بن نوح تک پہنچتا ہے۔ رومی مورخ ہیروڈیش نے قبط بن لاکث بن مصر بن منصر بن حام کی اولاد بتایا ہے۔ سہیلی نے قبطی بن کنعان بن حام کی نسل قرار دیا ہے۔ علامہ مسعودی کے نزدیک بھی منصر ہی کی نسل سے تھے۔ شروع میں فراعنۂ مصر کلدانیوں کے باجگذار تھے۔ بابل کے نمرود ان کے حکمراں تھے۔ منصر کے بیٹے مصر نے مستقل حکومت قائم کی۔ اسی کے نام پر ملک کا نام بھی مصر ہو گیا۔ ایک طرف یمن تک دوسری طرف مراکو تک علاقہ زیر نگین ہو گیا۔ مصر کے پوتے قبط کے نام سے قبطی قوم مشہور ہوئی جو آج تک مصر میں آٹھ فیصدی کے تناسب سے موجود ہے۔ قبط کے وقت میں جزیرۂ عرب کے والا حقات کے حکمراں شداد بن مداد نے جبزی مصر پر قبضہ کر لیا تھا مگر فرعون مایتق بن مداتی نے جو مسلم تھا قوم عاد سے پھر دوبارہ چھین لیا۔ کچھ مدت کے بعد حکومت مصر کے فرماں روا پھر مشرک ہوگئے۔ کبھی حو یا ایسی مدبّرہ شاہزادیوں کے ہاتھ میں عنان حکومت پہنچی۔ کبھی دلیفہ جیسی کمزور عورتیں حکمراں ہوئیں۔ غرض نظم ونسق کی ابتری اور رعایا کی بے چینی کی بدولت ولید بن دومغ عملیقی شاہ شام نے مصر کو فتح کر لیا۔ ولید کے بعد اس کا بیٹا ریان ہوا۔ اسی کے دور میں حضرت یوسف مبعوث ہوئے۔

ریان مسلمان ہو گیا تھا لیکن اس کے بعد قابوس کی کافرانہ حکومت ہوئی۔ اس نے بنی اسرائیل کو مٹانے کا شغل بنیاد رکھا۔ اس کے بیٹے کاشم نے اس مقصد کو پورا کرنے کی مزید کوشش کی۔ کاشم کے بیٹے لاہب نے بھی بنی اسرائیل کی بیخکنی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ لاسب کے معزول ہونے کے بعد شاہی خاندان کی ایک عورت دلوکہ نامی حکمراں ہوئی۔ غرض بنی اسرائیل کی بربادی و تباہی کے درپے قابوس سے لیکر ولید بن مصعب کے زمانہ تک ہر فرعون مصر رہا۔ ان ظلم و ستم شعاری کی پاداش میں اہل مصر پر مختلف عذاب آتے رہے۔ کبھی بخت نصر کی شکل میں آیا جس نے فرعونی قوم کو قتل کر ڈالا۔ کبھی سکندر یونانی کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ عنان حکومت ولید بن مصعب کے ہاتھ میں آئی۔ ولید بڑے جاہ و جلال کا بادشاہ تھا عقلمند اور فاضل بھی تھا کامیاب حکمراں بھی تھا اس لئے بڑے مضبوط اور شاندار قلعے تعمیر کئے اور شہر آباد کئے تھے۔ یوں تو شہر عین الشمس اور طیبس بھی بہت عظیم الشان شہر تھے مگر پایہ تخت ہونے کے اعتبار سے شہر منف کو جو عظمت و شہرت حاصل تھی وہ اور کسی شہر کو نہ تھی۔ یہ اتنا عظیم بالشان شہر تھا کہ جو شہر پناہ اس کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے تھی اس کے ستّرہ دروازے تھے اس میں چار خوبصورت نہریں بھی جاری تھیں جو اس ہنرمندی اور کمال سے بنائی تھیں کہ چاروں فرعون کے تخت کے نیچے سے گذرتی تھیں۔ فرعون کے محل میں کروڑوں جواہر جڑے تھے اور اسی کے اندر بیٹھ کر وہ بزعم خود شاہنشاہی نہیں خدائی کر رہا تھا۔ اس کے عہد میں دنیا کی کوئی سلطنت اس سے بڑی اور مقتدر نہ تھی۔ مصری بالعموم صابئی مذہب کے تھے جو کلدانیوں سے انہوں نے حاصل کیا تھا۔ کلدانیوں کی طرح قبطیوں میں بھی سحر و ساحری کا بڑا چرچا تھا۔ بڑے بڑے صاحب کمال ساحر اور کاہن و نجومی آباد تھے اور مختلف ستاروں کے ناموں پر بڑے بڑے مندر بنے ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰؑ اسرائیلی تھے۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت یعقوبؑ کے درمیان تین پشت کا فرق ہے۔ موسیٰ بن عمران بن قاہت بن لاوی بن یعقوب۔ حضرت موسیٰؑ کی والدہ یوحانذ

بن لاوی بن یعقوب کی دختر تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ عمران کے ہاں ۷۳ سال کی عمر میں ہارون ؑ اور ۸۰ سال کی عمر میں موسیٰ ؑ پیدا ہوئے اور عجیب حیرت انگیز طریقہ پر پیدا ہوئے جو کہ سورہ بقرہ میں ہم لکھ آئے ہیں اسلئے مزید لکھنے کی ضرورت نہیں۔ فرعون کے محل میں حضرت موسیٰ ؑ نے شاہزادوں کی طرح پرورش پائی وہیں جوان ہوئے۔ جوان ہو کر ایک قبطی کے قتل کی وجہ سے مصر سے فرار ہو کر مدین پہنچے۔ حضرت شعیب ؑ کی صاحبزادی صفورا سے نکاح کیا۔ دس سال وہاں قیام کرنے کے بعد عازم مصر ہوئے۔ راستہ میں کوہ سینا کے پاس تاج نبوت سے سرفراز ہوئے۔ فرعون کی دست درازی ظلم اور تکبر و استبداد حد سے بڑھ چکا تھا۔ مشیت کو بنی اسرائیل کی نجات مقصود تھی۔ بنی اسرائیل کے ہزاروں نوزائیدہ بچوں کو فرعون تہ تیغ کر چکا تھا پانچ سال تک یہ سفاکانہ رسم جاری رہ چکی تھی۔ ہمیشہ جوان بوڑھے اور نوجوان اسرائیلی مردوں اور عورتوں سے بیگار میں پہاڑوں کے پتھر ڈھلوائے جاتے تھے۔ کافروں کی شامت اعمال تباہی کے کنارے آ لگی تھی۔ حضرت موسیٰ ؑ کو خلعت نبوت سے سرفراز کر کے تبلیغ توحید کا حکم ہوا۔ اسرائیلیوں کی نجات اور فرعون کی تباہی پر مامور فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ مصر جا کر فرعون کو دعوت توحید دو۔ حضرت موسیٰ ؑ فوراً عازم مصر ہو گئے ادھر حضرت ہارون ؑ کو بشارت مل گئی جنہوں نے شہر سے باہر نکل کر بھائی کا استقبال کیا۔ دونوں نے شہر منف میں فرعون کے محل کے دروازہ کے سامنے لوگوں کو دعوت توحید دینی شروع کر دی۔ فرعون تو خدا بنا بیٹھا تھا غضبناک ہو کر دونوں کو دربار میں طلب کیا۔ آپ نے بے باکانہ فرمایا:- میں رب العالمین کا رسول ہوں مجھے اللہ نے یہ حکم دیکر بھیجا ہے کہ تم بنی اسرائیل کو چھوڑ دو اور میرے ساتھ روانہ کر دو۔ فرعون نے بہت رد و کد کے بعد کہا رب العالمین کون ہے؟ آپ نے فرمایا کل جہان کا پروردگار۔ فرعون نے کہا اگر کسی اور کو معبود قرار دو گے تو قید کر دونگا پھر وہیں پڑے رہو نگے۔ آپ نے فرمایا میرے پاس بینات رسالت بھی ہیں۔ فرعون نے گرج کر کہا اگر سچا ہے تو پیش کر۔ حضرت موسیٰ ؑ نے عصا اور ید بیضاء کے معجزات

دکھائے فرعون اور دیگر اشراف سہم گیا اور کچھ بس نہ چلا بولے یہ بڑا جادوگر ہے کھلا ہوا جادو دکھاتا ہے۔ آپ نے فرمایا کم بختو یہ جادو نہیں معجزہ رسالت حق کو جادو نہ کہو جادوگر کامیاب نہیں ہوتے، ان کی زندگی خباثت سے پُر ہوتی ہے۔ یہ اللہ کی دی ہوئی غیبی طاقت ہے۔ کہنے لگے ہم تو کسی طرح یقین کرنے کے نہیں تم یقیناً جادوگر ہو اور جادو کے زور سے ملک پر تسلط و اقتدار جمانا چاہتے ہو ہم اس طرح اپنے باپ دادا کا مذہب نہ چھوڑینگے غرض اشراف سے مشورہ کرنے کے بعد فرعون نے چاروں طرف سے جادوگروں کو بلا لیا۔ ارض کنعان، افریقہ اور بلاد مصر میں جادوگروں کا زور تھا، ہر طرف سے جادوگروں کو طلب کیا گیا مقابلہ کی تاریخ مقرر ہوئی ایک میدان میں سب جمع ہوئے لاکھوں تماشائی بھی طاغوتی اور رحمانی قوتوں کو دیکھنے آئے لیکن حضرت موسیٰؑ کے معجزہ کے سامنے کسی کے جادو کی پیش نہ گئی، مغلوب ہو کر ایمان لے آئے۔ فرعون کے آدمیوں کو بھی حضرت موسیٰؑ کی صداقت کا کچھ کچھ یقین ہو چلا تھا لیکن فرعون کے ڈر کے مارے چند آدمیوں کے علاوہ کوئی ایمان نہ لایا۔ فرعون کی دست درازی پہلے ہی سے بہت تھی اب تو زچ ہو کر اس نے مزید ظلم ڈھانا شروع کر دیے۔ بنی اسرائیل بیکس اور بے بس تھے۔ مظالم سے تنگ آکر حضرت موسیٰؑ سے کہنے لگے ہم پر ایک تو پہلے سے مظالم ہو رہے تھے امید تھی کہ آپکی وجہ سے نجات ہو جائیگی مگر آپ کے خروج کے بعد تو ظلم کے پہاڑ ہم پر ٹوٹ پڑے اب کیا کریں، آپ نے ان کو تسلی دی، صبر اور توکل کی تلقین کی، نصرت الٰہی کا یقین دلایا سب کے ایمان تازہ ہو گئے، تجدید قول و قرار کیا۔ صدق دل سے اللہ پر توکل کیا، دربارگاہ الٰہی میں نصرت و نجات کی دعا کی۔ حضرت موسیٰؑ سے پہلے بنی اسرائیل مشرکانہ رسوم پر چلنے لگے تھے، فرعون کے پرستار تھے۔ ستاروں کی بھی پوجا کرتے تھے۔ کچھ ڈر کے مارے ایسا کرتے تھے بعض کے دل زنگ آلودہ ہو گئے۔ نبی کی بعثت کے بعد گمراہی اور ایسی کھلی گمراہی کیسے باقی رہ سکتی تھی اس لئے حکم ہوا اسرائیلیو! غیر اللہ کی پرستش چھوڑ دو اللہ ہی کی عبادت کرو لیکن کیسے کرو۔ عبادت خانہ کوئی نہ تھا آزاد نہ تھے۔ فرعون

کا تھا وتسلط تھا وہ کیسے اپنے سوا دوسرے کے سامنے سر جھکتا دیکھ سکتا۔ حکم ہوا کہ
شہر میں اپنے اپنے مکان ایسے بناؤ جو ایک دوسرے کے سامنے ہوں تمام محلوں
سے سمٹ کر یکجا آباد ہو جاؤ۔ ضرورت کے وقت اتحادی طاقت کا بھی استعمال کر سکو
اور سب اپنے گھروں میں اللہ کی عبادت بھی کر سکو پھر کامیابی اور نجات لازم
ہے خدا کامران و بامراد کریگا۔ افکار و غموم دفع کرنے کے لئے اور شاہد مراد سے ہم
آغوش کرنے کیلئے نماز اکسیر اعظم ہے اللہ کی طرف توجہ کرو۔ اہل ایمان کی مدد بشر
ہی کرے گا۔ اس کے بعد جب بنی اسرائیل کی کشتی کنارے لگنے کو آئی اور اہل حق کی نجات کا
وقت قریب آگیا تو قبطیوں پہ بلاؤں کا نزول شروع ہوا تین سال تک قحط پڑا پھر بارش
ہوئی تو اس سے وبا پھیلی۔ سیلاب عظیم آیا ستر ہزار قبطی مر گئے۔ مور ملخ کھٹمل
جوں اور مینڈکوں کی شکل میں عذاب الٰہی نمودار ہوا۔ پھر مصر کے ہر کنوئیں تالاب
ندی نہر اور دریا کا پانی قبطیوں کے واسطے خون ہو گیا۔ لیکن اللہ اکبر سنگدلی ہو تو ایسی
ہو اور ہوش پر پردے پڑے ہوں تو ایسے ہوں فرعون پر ان بلاؤں کا کوئی واقعی اثر
نہ پڑا۔ عذاب کو دفع کرنے کے لئے حضرت موسیٰؑ سے استدعا کرتا جب عذاب جاتا رہتا
تو پھر وہی سرکشی اور طغیان۔ بنی اسرائیل جان سے تنگ آ گئے۔ آخر تھے حضرت یعقوبؑ
کی اولاد حضرت موسیٰؑ سے کہنے لگے تم ہم کو طفل تسلیاں اب تک دیتے رہے اب ہم
میں صبر کی تاب نہیں۔ تمہاری وجہ سے تو اور ہم تباہ ہو گئے۔ حضرت موسیٰؑ پیغمبر تھے
اور جلیل القدر پیغمبر۔ جوش آ گیا اپنی قوم کی تباہی نہ دیکھی گئی۔ دونوں بھائیوں نے بارگاہ
الٰہی میں دعا کی اور قبطیوں کی بربادی ہلاکت کی استدعا پیش کی۔ وحی ہوئی تمہاری دعا
قبول کر لی گئی۔ تم دونوں ایمان و یقین پر ثابت قدم اور عبادت و ورع پہ پختہ رہو ان
نادانوں جاہلوں کی راہ عمل ہرگز اختیار نہ کرنا۔ ہم عذاب نازل کرتے ہیں حجت تمام
ہو چکی تھی بیس سال تبلیغ کرتے گزر گئے تھے قبطیوں کا ظلم حد سے بڑھ چکا تھا وقت
آ گیا تھا کہ اگلی قوموں کی طرح یہ قوم بھی تباہ کر دی جائے۔ حضرت موسیٰؑ پر وحی نازل
ہوئی کہ اسرائیلیوں کو یہاں سے نکال کر شام کو لیجاؤ۔ چنانچہ ایک تاریخ مقرر کر دی گئی

مکان تو ایک جگہ سب کے ہو ہی گئے تھے سب تیار ہو گئے پہلے قربانیاں کرائیں۔ پھر ایک رات کے سناٹے میں سب نکل کھڑے ہوئے۔ طبری نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ عورتوں اور بچوں کے علاوہ چھ لاکھ تیس ہزار سوار اور بیس ہزار پیادے تھے۔ ابن خلدون نے اس تعداد کو مبالغہ پر محمول کیا ہے کہ مصر میں آتنی تعداد بنی اسرائیل کی کہاں تھی۔ پھر چند صدیوں میں اسرائیلی نسل کی اتنی افزونی بھی خلاف درایت ہے۔ بہرحال جتنے اسرائیلی مصر میں تھے سب راتوں رات نکل کھڑے ہوئے۔ توریت میں لکھا ہے کہ چلتے وقت بنی اسرائیل نے قبطیوں کی عورتوں بچوں اور مواشی کو جسقدر ممکن ہوا قتل و غارت کیا اور چل دیے صبح کو عید الفصیح تھی اس کی خوشی میں کوئی قبطی بنی اسرائیل کا تعاقب بھی نہ کر سکا پہلے اور دیگر رسوم عید سے فارغ ہو کر قبطیوں کا لشکر جمع ہوا۔ فرعون ان کو لیکر اسرائیلیوں کے تعاقب میں چلا۔ بنی اسرائیل نکلنے کو تو نکل کھڑے ہوئے مگر تھے پریشان اور خوفزدہ۔ جب فرعون کا لشکر نمودار ہوا تو حواس بجا نہ رہے آگے زخار دریا موجیں مار رہا تھا پیچھے فرعونی لشکر موجزن تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے پانی پر اپنی لاٹھی ماری فوراً دریا خشک ہو گیا یا سمٹ گیا۔ بارہ راستے پیدا ہو گئے بنی اسرائیل دریا میں گھس گئے۔ کسی کا دامن بھی ترنہ ہوا۔ سب امن و امان سے پار اتر گئے۔ فرعون لشکر کو لیکر دریا پہ پہنچا تو دریا کو خشک دیکھ کر خوش ہوا مگر مشیروں نے کہا دریا میں جزر و مد ہوتا ہے یہ جزر کا وقت ہے آپ بھی فوج کو داخل ہونے کا حکم نہ دیں۔ قضا آئی تھی فرعون مع لشکر کے گھس پڑا۔ جب سب لشکر اندر داخل ہو گیا تو موج آئی سب کو برابر کر گئی پانی سے آگے نہیں پہنچا دریا۔ پانی کی ایک لہر نے فرعون کی لاش کو باہر پھینک دیا تاکہ لوگوں کو فرعون کے ڈوبنے کا یقین ہو جائے اور فرعون کی لاش کو دیکھ کہ فرعون کی خدائی کے نہ مرنے کا احتمال بھی نہ رہے اور آئندہ نسلیں بھی عذاب الٰہی اور پیغمبروں کی معجزانہ غیبی طاقت کا یقین کرتے ہوئے عبرت اندوز ہوں۔ آج تک لندن کے شاہی عجائب خانہ

میں فرعون کی لاش موجود ہے۔ جب بنی اسرائیل کو فرعون کے ہاتھ سے نجات پا جانے کا یقین ہوگیا اور اُس کا نظام سلطنت درہم برہم ہوگیا تو حضرت موسیٰ نے یوشع بن نون کی زیر سیادت ۲۴ ہزار اسرائیلیوں کو مصر پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجدیا۔ قبطیوں پر ہیبت تو چھا ہی گئی تھی کسی نے کچھ تعرض نہ کیا۔ حضرت یوشع اپنی طرف سے حاکم مقرر کر کے چلے آئے پھر سب مل کر کوہ طور کے دامن میں پہنچے سجدہ ہائے شکر ادا کئے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل نے مسلسل نافرمانیاں شروع کردیں جن کی پاداش میں مبتلائے مصائب ہوتے رہے اور مدت کے بعد حضرت موسیٰ اور آپ کے خلفاء نے ملک شام اور ارضِ کنعان کو فتح کیا۔ یروشلم پر قبضہ کیا بنی مواب اور بنی مدین جو کنعان کے زبردست خاندان تھے سب مسخر ہوئے عمالقہ کو شکست ہوئی۔ اب ہم آیات کی تفسیر کیطرف رجوع کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ تحقیق اجزاء بھی کرینگے:

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنۢ بَعْدِهِم مُّوسَىٰ وَهَٰرُونَ۔ حضرت موسیٰ مستقل نبی تھے اور حضرت ہارون اُن کے وزیر مددگار۔ نبی مرسوی تھا ہارون موسیٰ کے تابع تھے

مَلَإِيْهِ۔ ملاء سے مراد یا تو اشراف قوم ہیں یا عام قوم مراد ہے

جَآءَهُمُ الْحَقُّ۔ حق کے آنے سے مراد یہ ہے کہ معجزات واضحات سے حق کھل گیا تھا اور حضرت موسیٰ کا مقابلہ ناممکن ہوگیا تھا۔

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُونَ۔ یعنی ساحروں میں ایسی طاقت نہیں ہوتی کہ اُن کا مقابلہ ہی نہ کیا جاسکے یہ قوت نصرت معجزات میں ہے یا یہ مطلب کہ جادوگر کامیاب نہیں ہوتے۔ دنیا و دین میں اُن کو فلاح و بہبودی نصیب نہیں ہوتی۔ ہمیشہ خوار خستہ اور خبیث رہتے ہیں میں ایسا کیوں کرنے لگا تھا۔

وَتَكُونَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ۔ یعنی ملک مصر میں تم دونوں کی حکومت ہوجائے اور ہم تمہارے تابع ہوجائیں۔

مقصود بیان :- ایک زمانہ میں ایک سے زائد نبی ہو سکتے ہیں لیکن ایک متبوع دوسرا تابع۔ حضرت موسیٰ و ہارون۔ فرعون اور اُس کی ہدایت کے لئے

مبعوث ہوئے تھے۔ فرعون والے عادی مجرم تھے جو عادی مجرم ہو جاتا ہے اس کے دماغ پر غرور اور تکبر کا پردہ پڑجاتا ہے دل زنگ آلود ہو جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ حق و صداقت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔
گذشتہ زمانہ میں ہر مافوق العادت چیز کو لوگ سحر کہنے لگے تھے۔ سحر اور معجزہ میں تمیز نہ کر سکتے تھے۔ ساحر کو فلاح نصیب نہیں ہوتی یعنی اس کی دنیوی زندگی خبیثانہ گذرتی ہے اور آخرت میں بھی تباہ ہوتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ سحر کرنا حرام ہے۔ فرعون کے طرفدار خیال کرتے تھے کہ موسیٰ و ہارون سلطنت چھیننا چاہتے ہیں۔ وغیرہ

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُونِي بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ○

فرعون بولا میرے پاس ہر ماہر جادوگر کو لے آؤ

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا

غرض جب جادوگر آ گئے تو موسیٰ نے کہا جو کچھ تم کو ڈالنا ہے

مَاۤ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ○ فَلَمَّاۤ اَلْقَوْا قَالَ

ڈالو چنانچہ جب وہ ڈال چکے تو موسیٰ نے کہا

مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ اِنَّ اللّٰهَ

یہ جو تم لائے ہو جادو ہے اللہ اس کو یقیناً

سَيُبْطِلُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ

بگاڑ دے گا کیونکہ بلاشبہ مفسدوں کے کام کو اللہ

الْمُفْسِدِيْنَ ○ وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ

درست نہیں رکھتا اور اللہ حق کو حق کر دکھاتے گا

وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ○

اگرچہ مجرموں کو برا معلوم ہو

فرعون نے ربوبیت کا دعویٰ کیا تھا

تفسیر — تحقیق اجزاء اور تفسیری مطلب

موسیٰ نے دعوت توحید دی۔ وہ عاجز ہوکر آپ کو جادوگر کہنے لگا اور مقابلہ کیلئے تیار ہوگیا۔ اپنے تمام فکری اور عملی قوتوں سے نبوت پر غلبہ پانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ قصہ قرآن میں متعدد مقامات میں ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن پیرایۂ بیان اور نتیجہ ہر جگہ مختلف نکالا ہے۔ حضرت نوح کے قصے سے پہلے اسی سورت میں بیان کیا گیا تھا کہ کفار کو قیامت اور حشر و نشر کے متعلق شکوک و شبہات ہیں اور وہ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ یہاں فرعون کے انکار رسالت اور اسکی تمام نظری و عملی کوششوں کا تذکرہ ہے نتیجہ ظاہر ہے کہ جسطرح فرعون باوجود عظمت شان اور جلالت قدر کے نبی کا کچھ نہ بگاڑ سکا اور اللہ کا بول بالا ہو کر رہا اسی طرح تم لوگ بھی رسول اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے خود ہی ذلیل و برباد ہوگے۔

بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ یعنی فرعون نے حکم دیا کہ جہاں تک مل سکیں بڑے بڑے ماہر فن جادوگروں کو بلاؤ۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی اطراف ملک سے ہزاروں جادوگر جمع کئے گئے۔ سمندر کے کنارے اسکندریہ کے میدان میں مقابلہ ہوا حضرت موسیٰ نے جرأت و دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے جادوگروں کے ساحرانہ طاقت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے فرمایا جو کچھ تم کو جادو کرنا ہے کرو۔ جادوگروں نے

نظر بندیاں کیں۔ طلسمی سانپ بنائے اور ان کو میدان میں چھوڑا۔

قَالَ مُوْسٰی یعنی حضرت موسیٰؑ نے فرمایا ہاں جادو یہ ہے جو تم نے کیا جو میں نے کیا وہ جادو نہ تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ابھی اللہ اس کو مٹا دیگا۔ بے حقیقت چیز یقیناً باطل ہوتی ہے یہ دھوکہ دہی ہے جس سے دنیا میں تباہی پھیلتی ہے اور تباہ کاروں کے کرتوت نہیں پھلتے۔

مقصود بیان :۔ پیغمبر بے باک ہوتا ہے۔ کسی جابر دیا جادوگر سے نہیں ڈرتا۔ موسیٰ علیہ السلام بڑے جری تھے۔ سحر بے حقیقت چیز ہے صرف فریب اور دھوکہ دہی ہے۔ جادوگر متمند ہے۔ اس بات کی صراحت کہ کرامت کے مقابلہ میں جادو کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔ معجزہ اور کرامت افعال الٰہیہ حقہ میں سے ہیں اور سحر افعال باطلہ میں سے۔ حق باطل پر بالآخر غالب آتا ہے۔ وغیرہ۔

فَمَآ اٰمَنَ لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ

پھر موسیٰ کو اُن کی قوم کے چند لڑکوں کے سوا کسی نے نہ مانا

عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهِمْ

اور وہ بھی فرعون اور اُس کے حکام سے ڈرتے ہوئے

اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي

کہ کہیں فرعون اُن کو تکلیف نہ پہنچائے کیونکہ فرعون اُس ملک میں

الْاَرْضِ ۚ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ وَ

بڑھا چڑھا تھا اور اُس نے ہاتھ چھوڑ رکھا تھا

قَالَ مُوْسٰی یٰقَوْمِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ

موسیٰ نے کہا اے میری قوم اگر تم خدا پر یقین

بِاللّٰہِ فَعَلَیْہِ تَوَکَّلُوْٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ ○

رکھتے ہو تو اُسی پر بھروسہ رکھو اگر تم فرماں بردار ہو

فَقَالُوْا عَلَی اللّٰہِ تَوَکَّلْنَا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا

قوم والے بولے ہم اللہ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں اے ہمارے رب ہم پر

فِتْنَۃً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ○ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِکَ

ظالم قوم کا زور نہ آزمانا اور اپنی رحمت سے

مِنَ الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ○

کافر قوم سے ہم کو بچالے

تفسیر غرض ساحروں کی سحر افگنی کے بعد حضرت موسیٰؑ کی باری آئی آپ نے عصا اور یدِ بیضاء کا معجزہ دکھایا۔ جادوگر مغلوب ہو کر مسلمان ہو گئے۔ عام وخاص سب سہم گئے۔ کچھ کچھ موسیٰ ؑ کی صداقت کا سکہ اُن کے قلوب پر بیٹھ گیا مگر فرعون اور اس کے اشاف سے ڈرتے تھے کہیں فرعون اُن پر سختی نہ کرے کیونکہ بڑا جبار اور طاقتور اور زبردست بادشاہ تھا۔ اس سرزمین میں اُس کا بڑا دور تھا اس لئے قبطیوں میں سوائے چند آدمیوں کے (فرعون کی بی بی آسیہ۔ شاہی خزانچی اور اسکی بیوی اور بعض دوسرے افراد) اور کوئی ایمان نہ لایا۔ اس واقعہ کے بعد فرعون نے مزید مظالم کے پہاڑ ڈھانا شروع کئے کوئی سختی اور تکلیف نہ تھی جو اسرائیلیوں سے

اٹھا کر رکھی ہو۔ آخر کو تنگ آکر بنی اسرائیل نے پاس آ کر شکایت حضرت موسیٰؑ سے کی۔ آپ نے ان کو تسلی دی اور فرمایا بھائیو اگر تم کو اللہ کی ہستی اور ہمہ گیر طاقت اور میری رسالت پر یقین ہے تو اُس پر بھروسہ رکھو اور اس توکل کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب تم اپنی جانیں مال اولاد اور کل جذبات و خواہشات کو اسی کے سپرد کر کے بیچون و چرا اس کے حکم کے تابع ہو جاؤ بغیر توکل و تسلیم کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس تسلی آمیز پیغام نے قوم کے مُردہ دلوں میں نئی روح پھونک دی نسیم ہدایت نے ایمان کی افسردہ شاخ کو از سرِ نو سرسبز کر دیا۔ مخلص اہل مومن بولے یا نبی اللہ ہمارا بھروسہ تو محض اللہ ہی پر ہے۔ الٰہی اس ظالم قوم کو ہم پر مسلط نہ کر (کذا روی عن مجاہد) ان کافروں کے پنجہ سے ہم کو رہائی عطا کر، چنانچہ دعا قبول ہوئی (کذا قال الطیبی)

مقصود بیان :- عام انسان مادی اور ظاہری طاقتوں سے مرعوب ہو کر مجبوراً حق کو چھوڑ دیتے ہیں۔ فرعون بڑا سرکش جبار اور سفاک بادشاہ تھا مصر کی سرزمین میں اس سے بڑا آدمی کوئی نہ تھا۔ بنی اسرائیل پر ظلم کرنے میں وہ حد سے بڑھ چکا تھا۔ اہل حق مصائب سے تنگ آکر کبھی مضطر ہو جاتے ہیں اور ان کے قدم بھی راہ حق سے ڈگمگانے لگتے ہیں لیکن انا م بازی کی ادنیٰ تنبیہ پر ہوشیار ہو کر راہِ صداقت پر مستقیم ہو جاتے ہیں۔ توکل کا مرتبہ دعا سے مقدم ہے۔ دعا کرنے والے کو پہلے ذاتِ الٰہی پر بھروسہ کرنا چاہیئے پھر اپنے عزم و کوشش میں پوری تن دہی سے کام کو انجام دینا چاہیئے۔ ظالم اور سخت حکام کا تسلط بھی رعایا کے حق میں عذاب ہے۔ وغیرہ۔

وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰ وَأَخِيهِ أَن

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کے پاس وحی بھیجی کہ

تَبَوَّءَا لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوتًا وَّ

مصر میں اپنی قوم کے لئے گھر بنائے رکھو اور

اجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَّأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ

اپنے گھروں کو رو بقبلہ کر لو اور پابندی سے نماز پڑھو

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ○

اور ایمان والوں کو بشارت دیدو

تفسیر

کسی ظالم طاقتور قوم سے مقابلہ کرنے اور طاغوتی قوتوں کو شکست کے لئے ظاہری تدبیروں کی بھی ضرورت ہے اور باطنی اصلاح نفس بھی لازم ہے۔ فرعون کی تباہ کاریاں اور ستم شعاریاں آسانی کے ساتھ زائل ہونے والی نہ تھیں۔ یوں تو خدا تعالیٰ قادر ہے۔ اسکو کسی سبب اور ذریعہ کی ضرورت نہیں لیکن اسی کا قانون ہے کہ بغیر اسباب کے کسی کام کی سر انجام دہی نہیں ہوتی۔ جادوگروں سے مقابلہ کے بعد فرعون اور زیادہ ہوگیا۔ مصر میں اسرائیلیوں کے جتنے عبادت خانے تھے سب اس نے برباد کردیے تھے۔ لوگ ڈر کے مارے خفیہ عبادت کرتے تھے۔ باری تعالیٰ کو منظور تھا کہ اسرائیلیوں میں اجتماعی طاقت پیدا ہو اور اجتماعی قوت کے ساتھ وہ فرعون کا مقابلہ کریں۔ اس لئے ظاہری تدبیر تو یہ بتائی کہ مصر کے اندر اسرائیلیوں کے مکان ایک شہر ہونے چاہئیں۔ دوسری تعلیم یہ تھی کہ اپنے گھروں میں ہی نماز پڑھو اللہ سے مدد کی دعا کرو۔ روحانی طاقت بڑھاؤ۔ عبادت الٰہی سے دلوں کو روشن بناؤ۔ اس کے بعد کامیابی لازم ہے۔ جو لوگ اہل ایمان ہیں ان کو فتح حاصل ہوگی۔

قِبْلَةً ۔ قبلہ سے مراد ابراہیم ۔ مجاہد ۔ ابو مالک ۔ ربیع ۔ ضحاک اور زید بن اسلم کے نزدیک جائے نماز ہے ۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ اپنے گھروں کو نماز کی جگہ قرار دو ۔ گھروں کے اندر نماز پڑھو بعض لوگ کہتے ہیں کہ گھروں میں مسجدیں بنالو یعنی گھروں کے اندر نماز کی خاص جگہ مقرر کرلو جو قبلہ رخ ہو (کذا رواہ عکرمہ عن ابن عباس رض) ابن قیم نے تحقیق کیا ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے اس وقت قبلہ مقرر نہ ہوا تھا صرف اجتہاد پر تھا ۔ چنانچہ انہوں نے صخرۂ بیت المقدس اختیار کیا ۔

وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ ۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل کو ابتداء ہی سے گھروں میں نماز پڑھنے کا حکم ہو گیا (ہکذا قال مجاہد وابراہیم وغیرہم)

مقصود بیان :- بنی اسرائیل ہر جگہ نماز نہ پڑھ سکتے تھے تعیین مسجد لازم تھی ۔ طاغوتی قوتوں سے مقابلہ کرنیکے لئے حتی الامکان ظاہری تدبیروں کا بھی فرض ہے اور روحانی روشنی کی بھی مصیبت کے وقت نماز کیطرف رجوع کرنا چاہیئے ۔ حضرت موسیٰ نبی مستقل تھے اسی لئے وحی اگرچہ موسیٰ وہارون دونوں کے پاس آئی مگر بشارت دینے کا حکم صرف حضرت موسیٰ ؑ کو ہوا ۔ کامیابی کی بشارت صرف مومنوں کے لئے ہے ۔ وغیرہ ۔

وَقَالَ مُوسٰى رَبَّنَآ إِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ

موسیٰ نے عرض کیا اے ہمارے رب تو نے دنیوی زندگانی میں فرعون

وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

اور اس کے سرداروں کو آرائش اور بکثرت دولت دے رکھی ہے

رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ رَبَّنَا

تاکہ تیرے راستہ سے وہ لوگوں کو بہکائیں اے ہمارے رب

اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

ان کے مال ملیا میٹ کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے۔

فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ

کہ ایمان ہی نہ لائیں یہاں تک کہ دردناک عذاب دیکھ لیں

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَ

اللہ نے فرمایا تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی تم مستقیم رہو اور

لَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

ناواقف لوگوں کے راستہ پر نہ چلو

تفسیر جب بنی اسرائیل کی تکلیف کا زمانہ ختم ہونے کے قریب پہنچا اور حضرت موسیٰؑ نے کافروں کو سمجھانے کی انتہا کر دی لیکن جاہلوں نے موسوی دعوت کو خود غرضی اور نفسانی ہوس پر محمول کیا اور کہنے لگے تم ملک پر اقتدار قائم کرنا چاہتے ہو ایسا ہو نہیں سکتا۔ ہم ہرگز ایمان نہ لائینگے۔ اُدھر عام بنی اسرائیل کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا بالآخر مجبور ہو کر حضرت موسیٰؑ نے بددعا کی اور فرعون والوں کی تباہی کی استدعا پیش کی۔

اِنَّكَ اٰتَيْتَ ۔ دولت وعیش ہر فساد کی جڑ ہے اس سے انسان کور بصیرت ہو جاتا ہے۔ فرعون کی دولت اور اس کے اُمراء کا سامانِ حرب اُس زمانہ میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا۔ کنعانیوں کا جاہ وحشم اور اسبابِ عیش قبطیوں کے مقابلہ میں ناقابلِ ذکر تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے بددعا کی کہ الٰہی تو نے جو اُن کو آسائشیں پر بہار زندگیاں اور راحت آفرین سامانِ طرب دے رکھا ہے بس یہی وجہ ہے کہ یہ

گمراہیاں پھیلا رہے ہیں اور وہ راہِ راست سے لوگوں کو بھٹکا رہے ہیں تو ان کے اموال کو برباد کر دے۔ طمس سے مراد ابن عباس رضی اور مجاہد کے نزدیک ہلاک کرنا اور مٹانا ہے۔ ضحاک ابو العالیہ اور ربیع نے کہا کہ اس بد دعا سے اللہ نے اُن کے اموال کو پتھر بنا دیا۔ قتادہ کہتے ہیں ہم کو خبر ملی ہے کہ اُن کی کھیتیاں پتھر ہو گئی تھیں اگرچہ ان بزرگوں کے قول کے مطابق پتھر ہو جانا بھی قدرتِ الٰہیہ سے بعید نہیں مگر جب تک صحیح روایت نہ ہو اُس وقت تک تباہی کی کوئی خاص صورت متعین کرنا ناقابلِ یقین ہے لہذا اطمس سے مطلق بربادی و تباہی مراد لینا ہی اولیٰ ہے۔

وَاشْدُدْ۔ ابن عباس رضی کے نزدیک بندش کرنے سے مہر لگا دینا ہے یعنی اُن کے دلوں پر ایسی گمراہی کی مُہر لگا دے کہ آئندہ ایمان ہی نہ لا سکیں اور ایمان لائیں بھی تو ایسے وقت میں کہ ایمان مفید نہ ہو۔

عَذَابَ الْاَلِیْمَ سے مراد ابن عباس رضی کے نزدیک ڈوبنے کا عذاب ہے۔ سیاقِ آیات سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔

قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا۔ اگرچہ دعا کرنے والے صرف حضرت موسیٰ تھے مگر حضرت ہارون نے کہی تھی اسلئے ایک کی دعا کو دونوں کی دعا قرار دیا۔ ابو العالیہ ابو صالح عکرمہ محمد بن کعب اور ربیع وغیرہ کی روایات سے ثابت ہے کہ حضرت ہارون آمین کہتے جاتے تھے۔
ابن کثیر نے اس آیت سے یہ مسئلہ استخراج کیا ہے کہ اگر نماز میں صرف امام سورۂ فاتحہ پڑھے اور مقتدی آمین کہیں تو قرأتِ امام کو قرأتِ مقتدی بھی قرار دیا جائے گا۔

فَاسْتَقِیْمَا۔ ابن عباس رضی کے نزدیک حکمِ استقامت کا مطلب یہ ہے کہ میری فرمانبرداری پر قائم رہو۔ بیضاوی نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اتمامِ حجت دعوتِ توحید اور دعا پر جمے رہو جلدی مت کرو جو تم نے مانگا وہ ضرور

ہونے والا ہے لیکن اپنے وقت پر ہوگا۔

وَلَا تَتَّبِعَآنِّ یعنی اُن جاہلوں کا طریقہ اختیار نہ کرو جو کارخانۂ قدرت سے ناواقف ہیں اور قانونِ فطرت کو نہیں جانتے اور ہر دعوٰی کا فوری اثر چاہتے ہیں۔ اس میں بنی اسرائیل کو تنبیہ ہے کہ موسیٰؑ کی دعا قبول ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ فوری اثر پیدا ہو جائے۔ چنانچہ ابن جریج کی روایت میں ہے کہ اس بددعا کے بعد فرعون چالیس سال زندہ رہا لیکن محمد بن کعب وغیرہ اہل روایت نے صرف چالیس روز زندہ رہنا بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

مقصودِ بیان:۔ دنیوی عیش و راحت اور کثرتِ مال تمام گمراہیوں کا سرچشمہ ہے۔ دلوں پر ایسی مہر لگا دینا کہ پھر راہِ راست پر آنے کا احتمال بھی نہ رہے اللہ ہی کا کام ہے ورنہ حضرت موسیٰؑ ایسی دعا نہ کرتے۔ لیکن کاسب بندہ ہے۔ آدمی سرکشی اور حد سے بڑھی ہوئی نافرمانی اس گمراہی کا سبب بن جاتی ہے۔

آیت سے صاف واضح ہے کہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو خواہ ولی ہو یا نبی۔ اللہ کی فرمانبرداری پر استقامت ہر ایک کے لئے لازم ہے۔ اللہ کی مدد اُسی کو حاصل ہوتی ہے جو اللہ کے حکم پر قائم رہتا ہے۔ دعا کرنے کے بعد فوری اثر کا طالب ہونا جہالت ہے قبولِ دعا کے لئے فوری اثر لازم نہیں۔ جاہلوں کا اتباع کرنے سے باز رہنے کا تاکیدی حکم۔ وغیرہ۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ

اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا کے پار اتار دیا

فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ بَغْيًا

پھر فرعون نے اور اس کی فوجوں نے ظلم و زیادتی سے

عَدْوًا ۭ حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ

ان کا پیچھا کیا　یہاں تک کہ جب فرعون　ڈوبنے لگا

قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ

تو لگا کہنے کہ مجھے یقین ہو گیا سوا معبود کے جس کو بنی اسرائیل مانتے ہیں

بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَاۗءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝

اور کوئی معبود نہیں　اور میں بھی فرماں برداروں میں سے ہوں

آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ

(ہم نے کہا) اب ایمان لایا حالانکہ اس سے نافرمان تھا اور مفسدوں میں

الْمُفْسِدِيْنَ ۝ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ

شامل رہا　آج ہم تیری لاش　بچا دیں گے

لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً ۭ وَاِنَّ كَثِيْرًا

تاکہ بعد کو آنے والوں کے لئے نشانی ہو　بلا شبہ بہت سے

مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝ ع

لوگ　ہماری آیات قدرت سے　غافل ہیں

ع ۹

تفسیر غرض حضرت موسیٰؑ کی دعا قبول ہوئی۔ وحی الٰہی ہوئی کہ سب اسرائیلیوں کو لیکر مملکت مصر سے نکل جاؤ۔ حسب الحکم ایک

رات کو حضرت موسٰی مع تمام بنی اسرائیل کو لے کر چل دیئے اور بحر قلزم یا بحر سویز پر پہونچے۔

فَاَتْبَعَهُمْ فرعون نے بھی اپنا لشکر لے کر تعاقب کیا۔ بَغْيًا وَّعَدْوًا کے معنی بعض مفسرین نے یہ بیان کئے ہیں کہ فرعون قول و عمل دونوں میں حد سے بڑھ گیا تھا۔

عکرمہ نے فرمایا قرآن میں لفظ عَلَا و اور عُتُوًّا جس جگہ آیا ہے ہر جگہ سرکشی اور غرور کے معنی ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ غرور اور تکبر کے ساتھ فرعون نے تعاقب کیا اور آفتاب نکلنے کے وقت بنی اسرائیل تک پہونچ گیا۔ اسرائیلی بہت پریشان ہوئے حواس بجا نہ رہے سامنے موج زن سمندر تھا پیچھے جرار لشکر تھا مجرمانہ فرار کر کے آئے تھے قبطیوں کے زیور بھی بقدر امکان ساتھ لے آئے تھے اور جہاں تک ہو سکا اُن کے بچوں اور مویشیوں کو بھی ہلاک کر چکے تھے۔ غرض اسی اضطرار میں حضرت موسٰیؑ سے بار بار پوچھنے لگے اب کیا ہو گا؟ آپ نے فرمایا مجھے پروردگار نے اسی راہ چلنے کا حکم دیا ہے۔ بولے پھر تو ہم پکڑے گئے۔ حضرت موسٰیؑ نے فرمایا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا پروردگار میرے ساتھ ہے وہ خود رہنمائی فرمائے گا تم خوفزدہ نہ ہو۔ تھوڑی دیر میں دریا کے کنارے پہونچکر حسب وحی حضرت موسٰیؑ نے سمندر میں لاٹھی ماری۔ لاٹھی مارتے ہی دریا میں بارہ راستے پیدا ہو گئے پانی سمٹ گیا ہر خاندان ایک راستہ میں داخل ہو کر پار پہنچ گیا۔ قدرت الٰہی سے پانی میں کچھ دریچے اور روشندان بھی کھلے رہے تھے کہ پانی کے اندر سے ہر قبیلہ دوسرے کو دیکھتا جاتا تھا۔ اتنے میں فرعون بھی لشکر لئے آ پہونچا اور پس و پیش اور مشورہ کے بعد دریا میں گھوڑا ڈال دیا پانی بدستور خشک رہا۔ جب سب لشکر دریا میں داخل ہو گیا تو موجوں میں تلاطم پیدا ہوا

لشکر غرق ہوگیا۔ فرعون بھی غوطے کھانے لگا۔ جب اس کو یقین ہوگیا کہ اب غرق ہوا چنگل موت سے نجات ناممکن ہے تو اضطراری طور پر بولا مجھے یقین ہوگیا کہ اس خدا کے علاوہ جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے ہیں اور کوئی معبود نہیں۔ میں بھی اسی پر ایمان لے آیا اور اب میں اسی کا فرماں پذیر ہوں ندا ہوئی اس نے تمام عمر جب ایمان کا موقع تھا تو ایمان نہ لایا اور فساد ہی پھیلاتا رہا اب جبکہ ایمان کا وقت نہ رہا تو اضطراری طور پر ایمان لایا اور فرماں پذیر بننے کا اقرار کیا۔

شیخ محی الدین ابن عربی کا قول ہے کہ آیت میں فرعون کا ایمان نہ قبول ہونے کی صراحت نہیں اور چونکہ اس نے ایمان کا اظہار تین الفاظ میں بطور تاکید کیا اسلئے اس کا ایمان مقبول ہوا اور وہ مومن مرا۔ مگر محققین نے اس کے قول کی تردید کی ہے کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے یَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ۔ نیز ایک اور جگہ آیا ہے وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ۔ یدنی نجات کا مطلب حسن بصری کے نزدیک یہ ہے کہ ہم تیری خالی لاش دریا کے باہر پھینک دینگے۔ عبداللہ بن شداد نے کہا کہ پوری لاش بغیر کسی کمی اور تغیر کے باہر پھینک دینگے

ابو صخر نے کہا کہ فرعون اس وقت سونے کی زرہ پہنے ہوئے تھا۔ بدن سے مراد زرہ ہے یعنی ہم تیری لاش مع زرہ کے باہر پھینک دینگے۔

ابن عباس رض نے فرمایا کہ بعض اسرائیلیوں کو فرعون کے ڈوبنے کا یقین نہ آتا تھا اس لئے حکم ہوا کہ فرعون کی لاش معہ زرہ کے باہر پھینک دے تاکہ بنی اسرائیل ساحل پر اس کو مرا ہوا دیکھ لیں۔

بعض مفسرین نے لِمَنْ خَلْفَكَ سے آیندہ قوم مراد لی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آیندہ نسلوں کی عبرت کے لئے ہم تیری لاش بچا لینگے۔

بنی اسرائیل کی نجات کا واقعہ محرم کی دس تاریخ کو ہوا۔ اسلئے یہودی

عاشورہ کا روزہ رکھتے ہیں۔

مقصود بیان:- اللہ زبردست کارساز اور غیبی طاقت کا مالک ہے نبی کے حکم سے سرکشی کا نتیجہ تباہی ہے۔ اِتّبَعَ کا لفظ بقول اصمعی دلالت کر رہا ہے کہ فرعون نے اسرائیلیوں کا پیچھا کیا مگر اُن کو پکڑ سکا تھا۔ بَغْيًا وَّعَدْوًا کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ فرعون کے دماغ میں غرور و تکبر کا بھوت بیٹھا ہوا تھا اور بنی اسرائیل کو روکنے کا اُسے حق نہ تھا۔ اس سے صاف واضح ہے کہ اگر مظلوم ظالم کے پنجہ سے نجات پانے کے لئے کوشش کرے تو اس کو حق ہے اضطراری ایمان جبکہ آثار موت نمودار ہو گئے ہوں مقبول نہیں۔ بنی اسرائیل پر فرعون کی سطوت اور اُس کا رُعب اس قدر چھایا ہوا تھا کہ ان کو فرعون کی غرقابی کا یقین دلانے کے لئے لاش کو باہر پھینکا گیا۔ آیات میں رسول پاکؐ کی صداقت اور قرآن کے الہامی ہونے کا ناقابل تردید ثبوت ہے، کہ حضورؐ نے باوجود اُمی ہونے کے ایسا مفصّل واقعہ صحیح صحیح بیان فرمایا کہ تمام علماء تاریخ بھی اسکی صحت کے مقر ہیں یہاں تک کہ مرتے وقت فرعون نے جو الفاظ کہے تھے وہ بھی ظاہر فرما دیے اور پھر اُس کا نتیجہ بھی ذکر کر دیا وغیرہ

وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ مُبَوَّأَ

ہم نے بنی اسرائیل کو　ایک نیک مقام میں

صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ

جگہ دی　اور انھیں　چیزیں کھانے کو　دیں

فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۭ

تو اُنہوں نے　تاوقتیکہ اُن کے پاس علم نہ آیا اختلاف نہ کیا

اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِىْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
قیامت کے دن تمہارا رب ان کے اختلافی امور کا
فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝
فیصلہ فرما دے گا

تفسیر ان آیات میں غرق فرعون کے بعد کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور قبطیوں کی تباہی کے بعد جو انعامات اللہ نے اسرائیلیوں پر کئے تھے ان کے اظہار کی ابتداء یہاں سے کی گئی ہے۔ لیکن اسی آیت کے اختتام پر بنی اسرائیل کی انتہائی سرکشی و گمراہی کو بھی ظاہر کیا گیا ہے جس سے خاص مقصد یہ ہے کہ اسرائیلی نافرمانی کا خداوندی انعامات سے مقابلہ کر کے اہل نظر کو عبرت اندوزی کا موقعہ دیا جائے۔

مُبَوَّاَ صِدْقٍ سے مراد ابن جریرؒ کے نزدیک مصر و شام ہے کیونکہ بقول ابن جریر قبطیوں کی تباہی کے بعد حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو لیکر دوبارہ مصر گئے تھے اور وہاں اسرائیلی حکومت قائم کی تھی۔ بیضاوی نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ لیکن اکثر مفسرین اور اہل تاریخ واپسی مصر کے قائل نہیں۔ لہٰذا ان کے نزدیک مقام صدق سے اردن یا فلسطین یا یروشلم یا فارس مراد ہے۔ آیت میں تین امور کو بیان فرمایا ہے۔ اسرائیلیوں کو خدا نے منازل صدق عطا فرمائے۔ اُن کو پاکیزہ حلال یا لذیذ چیزیں کھانے کو عطا فرمائیں۔ علم حق اور شریعت الٰہیہ کے حصول کے بعد بنی اسرائیل میں اختلافات اور تفرقہ ہو گیا اور مختلف فرقے بن گئے۔

قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ جب قبطی ہلاک ہو گئے اُن کا آفتاب عروج زوال پذیر ہو گیا۔ اسرائیلیوں کا ان پر کامل اقتدار ہو گیا۔ شام ارض کنعان

اردن اور بعض حصص فارس پر بھی اُن کا تسلط ہو گیا اور اسی دوران مدت میں سرکشی اور طغیان کے عوض بنی اسرائیل عذاب الٰہی میں گرفتار بھی ہوتے رہے اور توبہ کے بعد اُن کی حالت درست ہوتی رہی عمالقہ سے مقابلہ کرنے کے انکار کے عوض چالیس سال ایک بیابان میں حیران و پریشان پھرنا پڑا سب وہیں مر کھپ گئے۔ نوجوانوں کو لیکر یوشع بن نون وہاں سے نکلے بیت المقدس کو فتح کیا مدت تک وہاں بنی اسرائیل کی حکومت رہی۔ پھر اُن کی نافرمانی کی وجہ سے عذاب الٰہی بخت نصر شاہ بابل کی شکل میں نمودار ہوا۔ بخت نصر نے اُن کو خوب قتل غارت اور اسیر کیا۔ مدت کے بعد پھر حکومت اُن کے ہاتھ آگئی پھر اُن کی حالت خراب ہوئی تو شاہان یونان کا ان پر تسلط ہو گیا۔ گمراہی زیادہ پھیل گئی تو مسیح مبعوث ہوتے۔ اسرائیلیوں نے شاہ یونان کو قتل عیسیٰؑ پر آمادہ کیا لیکن حضرت عیسیٰؑ محفوظ کر لئے گئے۔ دین عیسوی پھیلا۔ چند ہی دنوں کے بعد اسرائیلیوں نے شریعت عیسوی میں تبدیلی شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ تحریف ہوتی رہی۔ تقریباً ۳۲۵ء میں شاہ قسطنطین فیلسوف نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اس نے کامل طور پر دین عیسوی میں تغیر کر دیا گرجا گھروں میں تصویریں لٹکائیں۔ پرستش صلیب شروع کر دی۔ تثلیث و حلول کے عقیدہ کی بنا رکھی، سور کا گوشت حلال کیا۔ مشرق کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھنے کی تعلیم دی اپنے تحریفی عقائد پر علماء سے دستخط کرائے۔ اکثر نے خوشی خاطر مہریں ثبت کر دیں۔ بعض نے بمجبوری بعض بھاگ کر جنگلوں میں روپوش ہو گئے۔ غرض اس طرح شریعت موسوی کی طرح تعلیم عیسوی بھی کچھ سے کچھ ہو گئی اور اس تحریف و تبدیل کے علمبردار علماء تھے۔ اللہ نے ہزاروں نعمتوں سے سرفراز کیا اور اس کے عوض بجائے شکر و فرماں برداری کے اسرائیلیوں نے کفران نعمت کیا۔ ان کا یہ اصول اختلاف قیامت تک ختم ہونے والا نہیں بس حشر کے بعد ہی حق و باطل اور صواب و خطا

کا فیصلہ کیا جائے گا۔

تنبیہ صحیح احادیث میں آیا ہے کہ یہودیوں کے اکہتر فرقے ہوئے اور نصاریٰ کے بہتر فرقے ہوئے مگر میری امت کے تہتر فرقے ہو جائیں گے جن میں سے ایک جنتی اور باقی دوزخی ہوں گے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ! وہ جنتی فرقہ کون ہے؟ فرمایا جس پر میں اور میرے ساتھی ہیں (رواہ الحاکم والحدیث فی السنن والمسانید)

آیت فَمَا اخْتَلَفُوْا الخ کی تفسیر جو ہم نے بیان کی وہی اکثر مفسرین نے بیان کی ہے اور اختلاف سے باہمی مذہبی تفرقہ مراد لیا ہے۔ لیکن بعض اہل تفسیر نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ علمائے یہود و نصاریٰ توریت و انجیل میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف اخلاق اور علامات برابر پڑھتے چلے آتے تھے یہاں تک کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے قرآن نازل ہوا حضور سے متواتر معجزات سرزد ہوئے تو باوجود علم صادق کے محض دنیا پرستی اور حصول زر کے سبب صداقت رسول سے انحراف کرنے لگے اور ایمان نہ لائے اور سیکڑوں بے بنیاد حجتیں پیش کرنی شروع کر دیں۔

مقصود بیان :- بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے انعامات کیے مگر انہوں نے کفرانِ نعمت کیا۔

اس امر کی طرف اشارہ کہ اللہ تعالیٰ جن چیزوں کو حلال کرتا ہے وہ پاک اور ستھری ہوتی ہیں۔ گویا جن چیزوں کے اندر خباثت اور نجاست ہوتی ہے وہی حرام کی جاتی ہیں۔ وغیرہ

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ

پس اگر (بالفرض) تم اس چیز میں شک کرتے ہو جو ہم نے تم پر نازل کی ہے

فَسْئَلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ

تو اُن لوگوں سے دریافت کرلو جو تم سے پہلے کتاب پڑھتے ہیں

قَبْلِكَ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ

بلاشبہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس حق پہنچ چکا

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝ وَلَا

تم شک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ ہو اور نہ

تَكُوْنَنَّ مِنَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ

اُن لوگوں میں سے جنہوں نے اللہ کے آیات کی تکذیب کی

اللّٰهِ فَتَكُوْنَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ

ورنہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے بلاشبہ جن لوگوں پر

حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

تمہارے رب کا حکم ثابت ہوگیا ہے وہ یقین نہ کریں گے

وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰيَةٍ حَتّٰى يَرَوُا

تاوقتیکہ وہ دردناک عذاب نہ دیکھ لیں اگرچہ سارے

الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝ فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ

معجزے اُن کے پاس آموجود ہوں پھر ایسی کوئی بستی کیوں نہ ہوئی

اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ

کہ (عذاب دیکھنے کے بعد) ایمان لانا اُس کو مفید ہوتا　ہاں یونس کی قوم

لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ

جب ایمان لے آئی تو ہم نے دنیوی زندگانی میں　ذلت کا عذاب

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ ۝

اُن سے اٹھالیا　اور ایک مدت تک اُن کو فائدہ اٹھانے دیا

تفسیر ان آیات کی تفسیر سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض علماء کا ایک شبہہ (جو ان آیات پر ہے) اور اس کا جواب بیان کردیا جائے۔

آیت میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم کو شک ہو اور قرآن کے بیان کردہ قصص کے متعلق خلاف واقع ہونے کا کوئی احتمال ہو تو علماء اہل کتاب سے پوچھو وہ بیان قرآنی کی تائید و تصدیق کریں گے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صداقت قرآن میں شک کس طرح ہو سکتا تھا۔ اگر آپ کو بھی وحی میں شک ہو یا مفہوم وحی میں خلاف واقع ہونے کا احتمال ہو تو دوسروں کو بدرجہ اولیٰ ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ اگر آپ کو بیانِ الٰہی میں شک ہوتا تو اہل کتاب سے بھی پوچھنے کا کیا نتیجہ۔ ان کی تصدیق سے بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شک دور نہیں ہو سکتا تھا۔

اس شبہہ کے ازالہ کی کئی صورتیں ہیں اور سب کا مدار تاویل پر ہے۔

(۱) خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے اور آپ ہی کی طرف روئے سخن بھی ہے لیکن کلام کی بنا فرض پر ہے۔ یعنی اگر آپ کو شک ہو تو اہل کتاب

سے دریافت کرلو یہ قصص ان کی کتابوں میں بھی اسی طرح مذکور ہیں اور واقعی صحیح ہیں ان میں تحریف نہیں کی گئی ہے۔ قرآن ان کی تصدیق کرتا ہے یہودیوں اور عیسائیوں نے اگرچہ اپنی کتابوں میں تحریف و تبدیل کرلی تھی لیکن بالکل انقلاب نہ کیا تھا کچھ اصل اور کچھ خود تراشیدہ الفاظ و مضامین ملاکر اپنے مذاہب کی بناء ان پر رکھی تھی لہذا جن مضامین کی صداقت کے متعلق قرآن ناطق ہو ان سے استشہاد صحیح ہے۔

(۲) اس کلام سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید استقامت عطا کرنا مقصود ہے اسی لئے حضور نے ان آیات کے نزول کے بعد فرمایا مجھے نہ کچھ شک ہے نہ میں کسی سے کچھ پوچھتا ہوں اسمیں امت کے لئے تصدیق کی پختگی اور ایقان کا استحکام مقصود ہے۔

(۳) اگرچہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن اس خطاب سے مقصود یہ ہے کہ دوسرے سننے والوں کے دلوں میں بیانِ قرآنی کی صداقت جم جائے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا۔ ایک اور آیت میں بھی فرشتوں کو خطاب کرتے ہوئے خدا تعالیٰ نے وہ قول نقل کیا ہے جو قیامت کے دن فرمائے گا کہ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ فرشتے اس کے جواب میں عرض کرینگے۔ سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ الخ۔ گویا پہلے کلام سے غرض یہ ہے کہ فرشتے جواب کی صراحت کردیں اور اہل شرک کو مایوسی ہو جائے۔

(۴) خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر روئے سخن کفار کی طرف ہے خصوصاً قریش مشار خطاب ہیں کیونکہ ان کو اہل کتاب کے علم پر بڑا اعتماد تھا اور یہود و نصارٰی ہی کو وہ عالم جانتے تھے۔ مطلب یہ ہوا کہ اے رسول! ان قریش سے کہدو کہ اگر تم کو ان واقعات میں شک ہو تو جاؤ اہل کتاب سے پوچھ لو وہ بھی ان کی تصدیق کرینگے۔

آیات کا تفسیری مطلب بیان کرنے سے قبل ہم حضرت یونس ؑ کا مختصر قصہ بیان کرتے ہیں تاکہ آیت کے مطالب کی توضیح ہو جائے۔
یونس بن متی جن کو عبرانی زبان میں یونہ کہا گیا ہے ملک شام میں ۸۶۲ سنہ قبل مسیح میں پیدا ہوئے اور یہودیوں کی ہدایت پر مامور ہوئے۔ آپ کے زمانہ میں چار انبیاء اور بھی تھے۔ اشعیا۔ عوزیا۔ اموص۔ یوشلے۔ بعض کے نزدیک یوشلے حضرت یونس ؑ ہی کا نام ہے۔ آپ کو حکم ملا جا کر نینوا والوں کو ہدایت کرو۔ نینوا ملک شام سے مشرق کی طرف موصل کے قریب دریائے دجلہ کے مشرقی کنارہ پر ایک بہت بڑا شہر تھا تہذیب و تمدن میں بابل، منفا اور بیت المقدس سے کم نہ تھا۔ حسب الحکم آپ نینوا کو چل دیے۔ بعض اہل تاریخ کے نزدیک آپ نینوا نہ پہنچے بلکہ یافہ ہوتے ہوئے ترسیس (علاقہ شام) میں چلے گئے کیونکہ آپ کو یقین تھا کہ خدا تعالیٰ بڑا مہربان ہے اتنی کثیر تعداد اور متمدن آبادی کو ہلاک نہ کرے گا اور لوگ میری توہین نہ کریں گے لیکن محققین کے نزدیک آپ نینوا پہونچ گئے یہودیوں کو ہدایت کی لیکن وہ اپنی تہذیب اور دولت کے نشہ میں مست تھے ایک نہ سنی دیوانہ کہتے، مذاق اڑاتے پھبتیاں کسے آوازے چست کرتے، لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاتے اور کوئی پروانہ کرتے۔ مجبور ہو کر آپ نے نزول عذاب کی دعا کی۔ دعا قبول ہوئی۔ آپ نے دوران تقریر میں چالیس یا تین روز کے بعد عذاب نازل ہونے کا اعلان کر دیا اور خود پہاڑ میں جا چھپے۔ چالیسویں یا تیسری صبح کو افق پر ایک ابر سرخ نمودار ہوا جو دیکھتے ہی دیکھتے تمام آسمان پر محیط ہو گیا اور چنگاریاں نکلنی شروع ہوئیں گرمی پھیلی خون رگوں میں کھولنے لگا۔ لوگ علامات عذاب دیکھ کر گھبرا گئے پریشان ہو کر حضرت یونس ؑ کی تلاش میں نکلے لیکن کچھ پتہ نہ چلا مجبوراً بادشاہ سے لیکر بے نوا فقیر تک سب جمع ہو کر توبہ کے لئے نکلے اور ابر کے نیچے اکٹھے ہو کر ایسی عاجزی سے دعا کی اور اس قدر گڑگڑا کر توبہ کی کہ رحمت الٰہی

جوش میں آ گئی۔ چالیس یا تین شبانہ روز گریہ و زاری کرنے پر توبہ قبول ہوئی۔ چینگاریاں نکلنی موقوف ہوئیں ابر چھٹ گیا اور مطلع صاف ہو گیا۔ اکتالیسویں دن یا چوتھے دن حضرت یونسؑ قوم کی حالت تباہ ہونے اور عذاب کے نازل ہونے کا یقین کر کے ملاحظہ حالات کے لئے واپس آ رہے تھے راستہ میں ایک آدمی سے کیفیت دریافت کی۔ اس نے مفصل واقعہ کہہ دیا۔ نزول عذاب اور پھر اس کا ٹل جانا سب کچھ ظاہر کر دیا۔ آپ کبیدہ خاطر ہو گئے اور خیال کیا اگر اب قوم والوں کے پاس جاؤں گا تو وہ میرا مذاق اڑائیں گے اس لئے نینوا کی بجائے فرات کی طرف رُخ کیا اور حکم الٰہی کا انتظار نہ کیا بڑے آدمیوں کی ادنیٰ بات پر بھی گرفت ہو جاتی ہے۔ فوراً عتاب الٰہی میں ماخوذ ہوئے اور شکم ماہی میں گرفتار کر دیے گئے۔ باقی قصہ اپنے موقعہ پر آ ئے گا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ:۔ اے کفار قریش! ہم نے جو موسیٰؑ اور فرعون کا واقعہ بیان کیا ہے اگر تم کو اس میں شک ہو تو جن لوگوں کے تبحر علمی کے تم قائل ہو ان سے پوچھ دیکھو اہل کتاب کو تم خازن علم جانتے ہو ان ہی سے دریافت کر لو وہ بھی تمہاری تصدیق کریں گے۔ لہٰذا تم قطعاً اس کی صداقت میں شک نہ کرو۔ ورنہ تمہارا بھی وہی حال ہوگا جو دیگر اہل تکذیب کا ہوا۔ جو نقصان ان کو اٹھانا پڑا تم کو بھی وہی اٹھانا ہوگا۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ جو ازلی گمراہ ہیں جن کی تقدیر میں جہنمی ہونا لکھا جا چکا وہ جب تک اپنی آنکھوں سے عذاب آخرت یا عذاب موت نہ دیکھ لیں ان کو کسی معجزہ یا دلیل قدرت یا برہانِ فطرت کا یقین نہ آئیگا مگر عذاب کے علامات اور یقینی آثار دیکھنے کے بعد ایمان لانا قابل قبول نہیں سوائے قوم یونسؑ کے کسی آبادی کا اضطراری ایمان قبول نہ ہوا فقط یونسؑ کی امت نے جب آثار عذاب دیکھ کر سچی توبہ کی تو اللہ نے ان کو

عذاب سے بچا لیا اور ایک مدت تک وہ رہتے بستے رہے

مقصود بیان:۔ آیات سے اس بات کا استنباط ہوتا ہے کہ جن واقعات و قصص کو دوسری مذہبی کتابیں بیان کردیں اور قرآن پاک ان کی تصدیق کرے تو وہ صحیح ہیں۔ گویا دوسری مذہبی کتابوں کا بعض حصہ اب تک بھی صحیح ہے اگرچہ اکثر حصہ میں تغیر و تبدل کرلیا گیا ہے۔

قرآن پاک نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے خواہ احکام و عقائد ہوں یا مواعظ و نصائح یا معجزات و خوارق یا واقعات و قصص اس سے اس گروہ کے قول کی غلطی ظاہر ہوتی ہے جو کہتا ہے کہ قرآنی عقائد احکام اور قوانین و ضوابط تو ضرور صحیح ہیں مگر قصص و واقعات صرف دیگر تاریخی کتابوں کی طرح اہمیت رکھتے ہیں مفید یقین نہیں۔ علامات عذاب کے ظہور کے بعد ایمان لانا قابل قبول نہیں۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ

اگر تمہارا رب چاہتا تو زمین کے سب آدمی

كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى

ایمان لے آتے سو کیا تم لوگوں کو مجبور کرسکتے ہو کہ

يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ

وہ باایمان ہو جائیں حالانکہ بغیر حکم خدا کے ایمان لانا

اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَجْعَلُ

کسی شخص کے اختیار میں نہیں اور اللہ

الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ قُلِ

ناسمجھ لوگوں پر گند کی ڈالتا ہے (اے محمد) کہدو

انْظُرُوْا مَاذَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

کہ دیکھو آسمانوں میں اور زمین میں کیا کچھ ہے

وَمَا تُغْنِى الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ

لیکن جو قوم نہیں مانتی اُس کے لئے نشانیاں اور دھمکیاں

لَّا يُؤْمِنُوْنَ ○ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ

کچھ کام نہیں آتیں سو یہ اُنہی لوگوں کے واقعات جیسے حالات

اَيَّامِ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ

کے منتظر ہیں جو ان سے پہلے گذر گئے (اے محمد) کہدو

فَانْتَظِرُوْا اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ○

کہ انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں

ثُمَّ نُنَجِّىْ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ

(لیکن نزول عذاب کے بعد) ہم اپنے رسولوں کو اور مسلمانوں کو بچا لیتے ہیں اسی طرح

حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ ع

ہمارا ذمہ ہے کہ ایمان والوں کو نجات دیں گے۔

تفسیر

اوپر کی آیات میں بیان کیا گیا تھا کہ جو ازلی گمراہ ہیں اُن سے ایمان لانے کی امید نہیں۔ ان آیات میں بتانا چاہتا ہے کہ آیاتِ قدرت: براہین فطرت دلائل قولی اور حجج عملی کو پیش کرنا صرف اتمام عذر کے لئے ہے ورنہ بغیر اذن الٰہی کے کوئی ایمان نہیں لا سکتا کوئی نشانی اور کوئی موعظت سودمند نہیں ہو سکتی رسول کو اگر یہ خواہش اور حرص ہے کہ کل دنیا مسلمان ہو جائے اور کفر کا نشان تک نہ رہے۔ لیکن مشیت الٰہی کو بدل دینا طاقتِ رسول سے خارج ہے اگر خدا چاہتا تو سب کو مسلمان بنا دیتا لیکن بمصلحت اُس نے ایسا نہیں کیا۔ لہذا رسول اللہ صلعم کو بھی مشیت الٰہی کے تابع ہونا چاہیئے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی انتہائی خواہش تھی کہ تمام عرب کے آدمی مسلمان ہو جائیں۔ لوگوں کے ایمان نہ لانے سے حضور صلعم کو تکلیف ہوتی تھی اور حد درجہ اندوہ و ملال ہوتا تھا خدا تعالیٰ نے ان آیات میں اپنے رسول کو تسلی عطا فرمائی۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اگر اللہ کی مشیت ہوتی اور خدا چاہتا تو سب آدمی اہل ایمان ہو جاتے۔ کوئی شخص اللہ اور اُس کی توحید کا منکر نہ رہتا لیکن خدا نے ایسا نہ چاہا لہذا آپ کو بھی زبردستی مؤمن بنانے کی خواہش نہ چاہیے اپنی خواہش کو اُس کی منشاء کے موافق بنانا چاہیئے۔ اللہ نے لوگوں کو عقل دی ہے سوچنا ان کا کام ہے اس کے اذن کے بغیر کوئی مؤمن نہیں ہو سکتا۔ یعنی جو عقل سلیم رکھتے ہیں نفسانیت اور ضد سے پاک ہیں ان کو ہدایت نصیب ہو جاتی ہے اور جو بے سمجھ ہیں عقل سے صحیح کام نہیں لیتے ان کے دلوں میں کفر و شرک کی گندگی بھری رہتی ہے۔ اس کلام سے شبہ ہوتا تھا کہ پھر تبلیغ اور وعظ و پند بالکل بیکار ہے۔ ہدایت کے لئے عقل انسانی کافی ہے رسالت اور دعوت توحید کی کچھ ضرورت نہیں۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے فرماتا ہے کہ اے نبی! تم عام دعوت دیدو اور اعلان کر دو کہ لوگو! آسمان اور زمین اور ان کی موجودات کو نظرِ غور سے دیکھو عجائب قدرت کا مشاہدہ کرو مصنوع سے

صانع کا مخلوق سے خالق کا انتظام عالم سے صاحب قدرت وارادہ علیم کا خود پتہ چل جائے گا۔ غرائب کائنات اللہ کی الوہیت وحدانیت اور فردانیت بتائینگے لیکن یہ فائدہ ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لانا چاہیں عبرت اندوز نظر رکھتے ہوں۔ باقی جو لوگ کور بصیرت ہیں بحکم الٰہی وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں ان کے لئے یہ تمام آیات واضحات ہر قسم کی وعید ہر طرح کی ہدایت اور ہر نوع کی دعوت بیکار رہے۔ خلاصۂ ازالہ یہ نکلا کہ نوشتۂ تقدیر کے موافق جن کی قسمت میں ایمان لانا ہے ان کے لئے آیات قدرت تبلیغ رسول اور ہدایت وتوفیق کی ضرورت ہے وہ عبرت اندوز دماغ رکھتے ہیں۔ ان کی عقلیں سالم ہیں۔ لہٰذا ادنیٰ تحریک وتنبیہہ کے بعد راہ راست پر آجاتے ہیں اور جو لوگ کج منش کج فہم اور کوتاہ بصیرت والے ہیں نوشتۂ ازلی کے موافق ایمان سے محروم ہیں۔ ان کے لئے ہر برہان دلیل ہر آیت اور ہر ثبوت بیکار رہے صرف اتمام عذر کے لئے ان کو دعوت ایمان دیدی جائے اور بس۔

اس سے آگے فرماتا ہے کہ یہ کفار جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب اور کفر پر اصرار کئے جا رہے ہیں ان کے حالات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ کافروں کے نتائج بد کی طرح یہ بھی اپنے نتائج دیکھنے کے منتظر ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ جس طرح سابق کفار اپنے انبیاء کی تکذیب کی اور رسولوں کی ہلاکت کے منتظر رہے اسی طرح یہ بھی رسول خدا کی تکذیب کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بربادی کے منتظر ہیں۔ اے رسول ان سے کہدو کہ اچھا تم بھی انتظار کرو میں بھی منتظر ہوں دیکھو نتیجہ کس کے موافق رہتا ہے۔ بالآخر تم ہی ہلاک ہوگئے اور رسول خدا کا بال بیکا نہ ہوگا کیونکہ اللہ کا یہ دستور ہے کہ جب کفار اور اہل ایمان کا مقابلہ ہوا تو اللہ نے کفار کو ہلاک کردیا اور انبیاء و مومنین کو بچا لیا۔ یہی

حال اب ہوگا۔

ایک شبہہ اور اُس کا ازالہ

اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ اللہ پر کوئی چیز واجب نہیں اگر وہ چاہے تو اپنے فضل و کرم کی بارش کردے اور چاہے تو عذاب دے بہرحال عدل و انصاف ہے کسی کا اس پر کچھ وجوبی حق نہیں ہے۔ لیکن اس آیت میں حَقًّا عَلَيْنَا فرمایا جس سے صاف طور پر نجات مؤمنین کا وجوب ثابت ہو رہا ہے۔

اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ اللہ نے جس بات کا وجوبی وعدہ فرمایا ہے گویا اللہ نے اپنی طرف سے اور اپنے تفضل سے یہ بات لکھدی ہے کہ ہم ضرور اہل ایمان کو نجات دینگے یہی مضمون مختلف صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے۔

مقصود بیان :- اللہ کی مشیت و ارادہ پر کفر و ایمان پر موقوف ہے۔ انسان مؤمن و کافر اسی کی مشیت سے ہوتا ہے، اللہ کی مشیت نہیں کہ سب لوگ مؤمن بن جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو توسیع اہل ایمان کی بہت زیادہ رغبت تھی۔ جبریہ مسلمان بنانا ناجائز ہے۔

اہل بصیرت ہی کو تمام آیات و دلائل سود مند ہوسکتے ہیں۔ جو لوگ فطری نور سے بے بہرہ ہیں ان کو کسی عملی قولی اور برہانی دلیل سے فائدہ نہیں پہونچتا۔

اہل حق بالآخر غالب آتے ہیں اور کفار کا انجام تباہی ہے۔ اللہ نے اپنی رحمت و کرم سے اہل ایمان کی نجات کا قطعی ضروری وعدہ فرمایا ہے۔

آخری آیت میں اس طرف لطیف اشارہ ہے کہ عنقریب اسلام کو غلبہ اور فتح حاصل ہوگی، مسلمانوں کو کامرانی نصیب ہوگی اللہ کا بول بالا ہوگا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین پھیل کر رہے گا۔ کفار و مشرکین اور اعدائے اسلام کو شکست ہوگی۔ غلبہ کفر ٹوٹ جائے گا اور شرک کی دنیا تباہ ہو جائے گی۔ وغیرہ۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ

تم کہدو کہ لوگو! اگر میرے دین میں تم کو کوئی شک ہے

مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ

تب بھی میں خدا کے علاوہ اُن کو نہیں پوج سکتا جن کی تم

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ

پرستش کرتے ہو بلکہ میں تو اُسی اللہ کی پرستش کرتا ہوں جو

يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ

تمہاری جانیں قبض کرلیتا ہے مجھے تو حکم ملا ہے کہ ایمان والوں میں

الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ

شامل رہو اور حق کی طرف ہو کر دین پر

لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

اپنی ذات کو قائم رکھو اور مشرک نہ ہو

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَ

اور اللہ کے علاوہ اُس کو معبود نہ بناؤ جو نہ تم کو فائدہ پہنچا سکتا ہے

لَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ

نہ نقصان اگر تم نے ایسا کیا تو اُس وقت تم بھی ظالموں میں

الظّٰلِمِیْنَ ○ وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ

شمار کیے جاؤ گے اگر اللہ تم کو تکلیف پہونچائے

فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ یُّرِدْكَ

تو سوائے اس کے کوئی دور کرنے والا نہیں اور اگر تمہارے حق میں وہ

بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ یُصِیْبُ بِهٖ مَنْ

بھلائی چاہتا ہے تو اُس کے فضل کو کوئی ہٹانے والا نہیں اپنے بندوں میں سے جس کو

یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ○

چاہتا ہے وہ اپنا فضل پہنچاتا ہے وہی غفور رحیم ہے۔

تفسیر ابتدائے سورت سے اوپر کی آیت تک خدا تعالیٰ نے انسان کی اصلیت، حقیقت، مسائل توحید و معاد اور اُن کے دلائل بیان فرمائے گئے۔ اب یہاں اتمام عذر کے بعد آخری فیصلہ بطور تنزّل کے فرماتا ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اے نبی تمام لوگوں سے خواہ وہ مکہ کے ہوں یا مدینہ کے یا کہیں اور کے علی الاعلان کہدو کہ حجت الٰہی تمام ہو چکی توحید و معاد پر عقلی و فطری دلائل کا بیان ہو چکا۔ اللہ کی الوہیت و ربوبیت اور حشر اجساد کا ثبوت کامل طور پر کر دیا گیا۔ اب بھی اگر تمہاری کور باطنی تم کو یقین کی طرف نہیں آنے دیتی اور میرے دین کے مسائل توحید، رسالت، قیامت وغیرہ میں تم کو کچھ شک باقی ہے تو بس میرا تم سے کوئی تعلق و تعرض مذہبی نہیں۔ تم اللہ کو چھوڑ کر جاندار و بے جان مخلوق کی پرستش کرتے ہو۔ میں اللہ کے سوا

کسی جاندار مخلوق کی بھی پوجا نہیں کر سکتا نہ مسیح کی نہ ملائکہ کی نہ ارواح و جنات وغیرہ کی چہ جائیکہ بے جان کی بلکہ میری پرستش کا مرکز تو فقط ذات الٰہی ہے۔ تمام دنیا کو چھوڑ کر مخلوق سے رشتہ توڑ کر اُسی کی طرف منہ موڑنے کا مجھے حکم ہے کیونکہ وہی قادر و متصرف ہے۔ زندگی اور موت اُسی کے قبضہ میں ہے۔ موت کلید آخرت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مارنے والا وہی ہے، اُس کے علاوہ زندگی کا بقا بھی اُسی کے دست قدرت میں ہے اُس کے سوا کوئی نفع نقصان پہونچانے والا نہیں۔ اور جب کسی سے نفع کی امید اور ضرر کا اندیشہ نہیں تو کیوں اس کی پرستش کی جائے۔ فائدہ اور نقصان تو اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔ اگر وہ کسی کو نقصان پہونچانا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا اور نفع پہونچانا چاہے تو کوئی منع نہیں کر سکتا۔ لہٰذا وہی مستحق پرستش ہے اور میرا رُخ اُسی کی طرف ہے۔ غیر اللہ کی پرستش کی حرمت فطری قانون ہے جس سے میں بھی مستثنیٰ نہیں۔ اگر بالفرض میں بھی ایسا کرنے لگوں تو میرا بھی وہی نتیجہ ہوگا جو دوسرے حق فراموشوں اور باطل کوشوں کا ہے۔

مقصود بیان:۔ لطیف پیرایۂ بیان میں شرک کی ممانعت۔ محض اللہ کی پرستش کا حکم۔ اس بات کی صراحت کہ جان قبض کرنا اور نفع نقصان پہونچانا اللہ ہی کا کام ہے۔ ہر وقت دین حق کی طرف توجہ رکھنے اور باطل سے منہ موڑ کر حق کی طرف مائل ہو جانے کا امر۔ اس امر کی صراحت کہ شرک سخت ترین جرم ہے اگر بالفرض نبی سے سرزد ہو جائے تو نبوت، ایمان، اعزاز سب کچھ ساقط کر کے نافرمانوں اور ناحق کوشوں کے زمرہ میں اُس کو داخل کر دیا جائے۔ وغیرہ

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ

تم کہدو کہ لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس

مِن رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي

حق آ پہونچا اب جو کوئی ہدایت حاصل کرے وہ اپنے ہی لئے ہدایت حاصل

لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۖ

کرتا ہے اور جو گمراہ ہوجائے اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے

وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ ۝ وَاتَّبِعْ مَا

میں تمہارا ذمہ دار نہیں ہوں (اے محمدؐ) تم اسی پر چلو جو

يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ

تمہارے پاس وحی بھیجی جاتی ہے اور صبر کرو یہاں تک کہ اللہ خود ہی فیصلہ کردے

وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ۝ ع

وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے

ع ۱۱ ۱۶

تفسیر اقامت حجت اور اتمام عذر کے بعد اب ان آیات میں بندوں پر الزام ثابت کر کے اپنے رسول کو اقامت تبلیغ وحی پر تسلی فرماتا ہے:

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اے رسول اعلانِ عام کر دو کہ اب حق آ چکا رسول برحق اور قرآن صادق آگیا۔ حق و باطل کا فیصلہ ہو چکا۔ اسلام کے سوا کل مذاہب منسوخ ہو چکے جس کو ماننا ہے مانے نہ ماننا ہے نہ مانے۔ مانیگا اپنا بھلا کریگا نہ مانیگا اپنا نقصان کریگا۔ رسول ص کا کام صرف پہونچا دینا اور احکام الٰہی کا اطلاع دینا ہے وہ کسی کا ذمہ دار نہیں ہے۔ اس لیے کسی سے کفر و اسلام کی باز پرس نہیں کی جائیگی۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کرنے وحی الٰہی پر چلنے

اور غیبی انتظار کرنے کا حکم دیا ہے۔

مجاہد و ابن عباسؓ کا قول ہے کہ ان آیات کا حکم آیت جہاد سے منسوخ ہوگیا ہے۔ ابن کثیر نے اس قول کی توجیہ میں فرمایا کہ مجاہد کی مراد اصطلاحی نسخ نہیں ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ ایک خاص وقت تک رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم الٰہی صبر و تحمل کیا۔ اس کے بعد قتال و جہاد کا حکم ہوا تو جہاد کیا۔

بیضاوی اور کشاف نے اس مقام پر ایک حدیث مرفوعاً بیان کی ہے جس کو ثعلبی واحدی اور ابن مردویہ نے بروایت ابی بن کعب نقل کیا ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ سورۂ یونس پڑھنے والوں کو ثواب قوم یونس کے اہل ایمان کی تعداد کے برابر ملتا ہے۔ یہ حدیث موضوع ہے ابن جوزی نے اس کی صراحت کی ہے۔

مقصود بیان: اس امر کی صراحت کہ نزول قرآن کے بعد اب کسی کو لاعلمی پر قائم رہنے اور باطل پرستی پر جما رہنے کا موقعہ نہیں رہا۔

در پردہ اس بات کا بیان کہ حق وہی ہوتا ہے جو اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے اس لئے یہی حق ہے اس کے ہوتے ہوئے اب کوئی مذہب قابل قبول نہیں ہے

مِنْ رَّبِّكَ کے لفظ سے اس طرف بھی ایماء کر دیا کہ الٰہی مذہب کی ضرورت صرف اتمام حجت کے لئے ہے انسانی عقل ایجاد مذہب کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کے لئے وحی ربانی کی ضرورت ہے۔

اس امر کی بھی تصریح کر دی کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم صرف تبلیغ رسالت کے ذمہ دار ہیں کسی کے ماننے نہ ماننے کی ان سے باز پرس نہ ہوگی۔

آخر میں وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ فرما کر غیبی امداد حاصل ہونے کا بھی اجمالاً امیدوار فرما دیا اور صبر کرنے کا حکم دے کر یہ بات در پردہ ظاہر کر دی کہ ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے آگے پیچھے نہیں ہوتا اور محض اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ وغیرہ

سورۃ ہود مکیۃ وھی مائۃ وثلث وعشرون ایۃ وعشر رکوعات

سورۂ ہود مکہ میں نازل ہوئی۔ اس میں ۱۲۳ آیتیں اور دس رکوع ہیں

حسن بصری، عکرمہ، عطاء خراسانی، جابر، مجاہد اور ابن زید کے نزدیک یہ سورت پوری کی پوری مکی ہے۔ ابن عباسؓ اور قتادہ نے صرف آیت وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّهَارِ الخ کو مدنی قرار دیا ہے۔ مقاتل کے نزدیک دو آیات مدنی ہیں ایک آیت فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ الخ اور دوسری آیت وَاُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ الخ۔ حضرت ابی بن کعبؓ کی روایت ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعہ کے روز سورۂ ہود پڑھا کرو (رواہ الدارمی و ابوداؤد والبیہقی) طبرانی نے ایک حدیث نقل کی ہے جسکو ترمذی نے حسن قرار دیا ہے کہ ایک روز حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! حضور پر بڑھاپے کی سفیدی جلدی آگئی۔ فرمایا مجھے ہود اور واقعہ اور مرسلات اور عم یتساءلون اور اذا الشمس کورت نے سپید کر دیا۔

اس سورۃ میں ۱۲۲ یا ۱۲۳ آیات ہیں اسمیں عموماً قیامت، حشر، نشر، جنت و دوزخ وغیرہ کے احوال کو بیان کیا گیا ہے۔ اس کا نزول بھی اسی ہنگامہ میں ہوا جب جہالت و بت پرستی کا بازار گرم تھا اور خدا پرستی جرم تھی۔ چونکہ اسمیں حضرت ہودؑ کا عبرت انگیز قصہ بیان کیا گیا ہے اس لئے سورت کا نام ہی ہودؑ قرار پا گیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰیٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ

الٓرا۔ یہ قرآن ایسی کتاب ہے جسکی آیتیں جانچ لی گئی ہیں پھر مفصل بیان

مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۙ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا

باخبر اللہ کی طرف سے اُن کو واضح کر دیا گیا ہے کہ سوائے اللہ کے کسی کی پرستش

اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۙ

نہ کرو اُس کی طرف سے میں تم کو ڈرانے والا اور خوش خبری سنانے والا ہوں

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ

اور اپنے رب سے معافی مانگو پھر اسی کی طرف رجوع کرو

يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى

وہ تم کو ایک وقت معین تک اچھا فائدہ دے گا

وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۭ وَ

اور ہر بزرگی والے کو اُس کی بزرگی کے موافق درجے دے گا

اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ

اگر تم رُخ پھیرو گے تو مجھے تمہارے متعلق بڑے دن کے عذاب

يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ

کا اندیشہ ہے اللہ کی طرف تم کو لوٹنا ہے اور وہ

عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ

سب کچھ کر سکتا ہے خوب سُن لو کہ یہ لوگ اپنے سینوں کو

صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ ۚ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ

دوہرا کئے ڈالتے ہیں تاکہ (اپنی دلی باتیں اللہ سے چھپالیں آگاہ ہو کہ جس وقت

ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ

(سونے کیلئے) اپنے کپڑے اوڑھ لیتے ہیں تو اُس وقت بھی اللہ اُنکے ظاہر و باطن سے واقف ہوتا ہے

إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

وہ یقیناً دلوں کی باتیں جانتا ہے

تفسیر بعض اہل علم نے بیان کیا ہے کہ الٓر کے الف سے اَللّٰہ لام سے جبرئیل اور ر سے رسول مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سورت اللہ کی طرف سے بواسطۂ جبرئیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہے۔ لیکن اس قسم کی تاویلات محض قیاسی ہیں تحقیقی نہیں ہیں۔

حروف مقطعات کے اندر جو کچھ حقائق پوشیدہ ہیں اُن کا واقعی علم اللہ کے رسول ہی کو تھا ہم کو اُس کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کلام الٰہی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے۔ روئے خطاب رسول کی طرف ہے۔ عام لوگوں کے سمجھنے کے لئے فلاح دارین کے قواعد و ضوابط احکام و اعمال کافی ہیں کلام الٰہی کا کچھ حصہ اور شاہی فرمانوں کا کچھ ٹکڑا ایسا ہوتا ہے جس کو صرف مخاطب ہی سمجھتا ہے کچھ رموز اور تلمیحات ہوتے ہیں جن سے فائدہ پذیر وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس فرمان آتے ہیں۔

الٓر کے بعد قرآن کے تین اوصاف بیان کئے:- اس کی آیات محکم ہیں - اس کی آیات مفصل ہیں - اس کا نزول خدا کی طرف سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن ایک عظیم الشان کتاب ہے اتنی عظیم الشان جس کی مثال

ناممکن ہے۔ اس کی آیات مضبوط ہیں صحیح دماغ رکھنے والوں کو انتہائی غور و خوض کے بعد ان کے اندر کوئی خرابی اور خلل نظر نہیں آتا۔ تمام گذشتہ اخبار صحیح ہیں آئندہ واقعات کے متعلق پیشین گوئیاں سچی ہیں۔ جن قواعد و ضوابط کی قرآن نے تعلیم دی ہے وہ سعادت دارین کا سرچشمہ اور ناقابل نسخ ہیں۔ اس کے احکام تہذیب اخلاق سے لے کر سیاست ملک تک سب کے سب درست ہیں۔ نجات اخروی اور سعادت ابدی کے حصول کی جو شاہراہ اس نے قائم کی وہ عقلمندوں اور بصیرت والوں کے لئے دستور العمل ہے۔ اس پر مزید یہ کہ الفاظ کی شستگی اور شیرینی، عبارت کی رونق و سلاست اور طریق ادا کی بلاغت ناقابل انکار بلکہ معدوم النظیر ہے۔ ایسی جامع کتاب یقیناً اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے نہ یہ اوراقِ پارینہ کی طرح تر و خشک اور ہر قسم کے مزخرفات سے بھری ہوئی ہے نہ افراط و تفریط کی حامل ہے کہ دیگر آسمانی کتابوں کی طرح اس کے بیان کردہ قوانین و احکام قابلِ نسخ ہوں

اس کے بعد فرمایا کہ قرآن کی آیات مفصل ہیں یعنی اگر مجموعی حالت کا لحاظ کیا جائے تو قرآنی آیات و قوانین حشو و زوائد سے پاک اور افراط و تفریط سے شستہ ہیں اس لئے محکم اور ناقابل نسخ ہیں لیکن اگر مجموعی حالت کو دیکھنے کے بعد تفصیلی کیفیات کی طرف رجوع کیا جائے اور ہر قسم کی آیت پر جداگانہ گہری نظر ڈالی جائے تب بھی اس کے اندر کوئی خرابی اور خلل معلوم نہ ہوگا اور بالآخر قائل ہونا پڑے گا کہ ان تمام آیات کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو حقائق اشیاء سے واقف اور کل کائنات و مصالح کائنات کو جاننے والا ہے۔ اسکے بعد فرماتا ہے کہ آیات قرآنیہ میں تین امور کی تفصیلی تعلیم دی گئی ہے (۱) محض اللہ کی پرستش کرو (۲) اپنے پروردگار سے استغفار کرو (۳) اللہ کی طرف رجوع کرو۔ ظاہر ہے کہ قرآن کا اصل مطلوب نظر شرک کی بیخ کنی ہے اور شرک کا سرچشمہ غیر اللہ کی عبادت ہے اس لئے توحید فی العبادت کا حکم سب سے

پہلے دیا تاکہ شرک کا استیصال ہوجائے اور حکم بھی مدلل دیا۔ اول تو یہ فرمایا کہ اللہ کی عبادت کرو۔ اللہ کے معنی ہیں ذات جامع صفات کمالیہ۔ جب اللہ تمام صفات کمالیہ کا خزانہ ہے تو پھر اسکے ہوتے ہوتے ایسی دوسری ہستیوں کی پرستش کرنی جو ذات وصفات کے لحاظ سے ناقص ہیں عقلاً درست نہیں گویا اللہ کا اللہ ہونا ہی توحید فی العبادت کا موجب ہے اور اللہ کی الوہیت کے مقر کفار و مشرک بھی ہیں۔ لہذا اُن پر لازم ہے کہ اسکی عبادت کریں۔ اس کے بعد جزاو سزا اور عذاب و ثواب کی صراحت کردی یعنی یہ بات واضح کردی کہ مستحق عبادت وہی ذات ہونی چاہیئے جو قادر مطلق ہو، متصرف حقیقی ہو، اعمال کا نتیجہ اُس کے دست قدرت میں ہو اور چونکہ اللہ کے سوا کوئی ہستی اعمال کے نتیجہ پر قادر نہیں لہذا اُسکی عبادت کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو نتیجہ اچھا نکلیگا اور بصورت خلاف ورزی سزا دیجائیگی۔ توحید فی العبادت کے حکم کے بعد استغفار کا حکم دیا گیا اور استغفار کے بعد توبہ کا۔ استغفار کے معنی ہیں گناہوں کی مغفرت کا خواستگار ہونا اور توبہ کے معنی ہیں رجوع کرنا۔ جب تک کسی آئینہ کا زنگ صاف نہ کردیا جائے اُسپر جلا ناممکن ہے بعض سرکش جب گناہ کا ارتکاب ترک نہ کردے خلوص عبادت اور جلاء روحانی نہیں پیدا ہوسکتی پہلے تخلیہ کا مرتبہ ہے پھر تحلیہ کا اسلئے فرمادیا کہ پہلے گناہوں کو چھوڑ دو گذشتہ خطائیں معاف کرالو، ہر قسم کی بُری بات کو ترک کرو پھر صفائی کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرو۔ دل سے بھی رجوع کرو زبان سے بھی اور اعضاء جسمانی سے بھی۔ غرض یہ کہ ممنوعات سے باز رہو پھر اوامر کی تعمیل کرو۔ اس کے بعد اطاعت و نافرمانی کے جُدا جُدا نتائج بھی بیان کردیے۔ اطاعت و فرماں پذیری کا نتیجہ فلاح دارین ہے۔ دنیوی عافیت وعیش بھی نصیب ہوگا اور اُخروی نجات بھی حاصل ہوگی۔ یُمَتِّعۡکُمۡ سے دنیوی کامرانی اور یُؤۡتِ سے آخرت کی سعادت مراد ہے اور نافرمانی کا انجام آخرت کی تباہی ہے کیونکہ اللہ کے پاس جانا لازم ہے اور وہ ہر طرح کی سزا بھی دے سکتا ہے لہذا نافرمانی کی سزا بھی دے گا۔

ایک شبہہ اور اُس کا ازالہ

آیت یُمَتِّعْکُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اللہ کے فرماں پذیر نیکو کار رہیدے ہیں اُن کو دنیوی کامرانی نصیب ہوتی ہے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات ایماندار نیکو کار نہایت تنگدست اور خستہ حال ہوتے ہیں یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے
اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ نے ایمانداروں اور نیکوں سے عمومی حالت میں فراغ دستی عزت اور حکومت و استقلال کا وعدہ فرمایا ہے۔ یعنی قومی حیثیت سے اُن کو عزت و وقار اور عیش و دولت نصیب ہوتی ہے اگرچہ بعض افراد صرف آزمائش کیلئے تنگی اور پستی میں رکھے جاتے ہیں لیکن جب افراد قوم عموماً سرکشی اور نافرمانی کرنے لگتے ہیں تو قوم کی عزت حکومت وقار عیش و آرام سب کچھ زائل ہو جاتا ہے۔ توریت میں بھی مختلف مقامات پر اسکی تصریح کر دی گئی ہے۔

اَلَآ اِنَّھُمْ سے بِذَاتِ الصُّدُوْرِ تک۔ اس آیت کی شان نزول میں اہل تفسیر اور اصحاب روایت کا اختلاف ہے۔ بخاری نے بروایت ابن عباس بیان کیا کہ بعض لوگ رفع حاجت کے وقت جب کپڑے اوڑھ لیتے اور خیال کرتے کہ اس طرح ہم خدا کی نظر سے محفوظ رہیں گے۔
صاحب کمالین نے بیان کیا کہ یہ آیت ایک منافق کے حق میں نازل ہوئی جو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے سرتابی کرتا پشت پھیر لیتا منہ چھپا لیتا اور کپڑے لپیٹ لیتا تھا تاکہ حضور اُس کو نہ دیکھیں (رواہ ابن جریر عن عبداللہ بن شداد بن الہاد) بیضاوی نے اس قول پر اعتراض کیا کہ آیت بالاتفاق مکی ہے اور مکہ میں منافقوں کا وجود ہی نہ تھا۔ صاحب کمالین نے جواب دیا ہے کہ مکہ میں بھی ایک منافق تھا جس کا نام اخنس بن شریق تھا۔ ابن کثیر نے اس آیت کی جو تفسیر بحوالہ ابن عباس رض بیان کی ہے اُس سے کسی خاص مورد کی تعیین نہیں ہوتی۔ ابن عباس رض فرماتے ہیں کہ سینہ دوہرا کرنے سے مراد ہے اللہ کی ہستی میں شک کرنا اور گناہ کا ارتکاب کرنا یعنی بعض لوگ اللہ کے وجود میں

شک کرتے اور در پردہ چھپ کر گناہ کرتے اور یہ خیال کرتے کہ اللہ کو ہماری ان بدفعلیوں کی اطلاع ہی نہیں ہو سکتی۔ مجاہد اور حسن کا بھی یہی قول ہے۔

میرے نزدیک اولیٰ یہ ہے کہ شانِ نزول کی تعیین نہ کی جائے اور آیت کو باعتبار سیاق سابق کلام سے مربوط رکھا جائے۔

شروع میں اللہ کی عبادت اس سے استغفار اور توبہ کرنے کا حکم دیا تھا اس آیت سے لیکر خَلَقَ السَّمٰوٰتِ تک اللہ کے تین صفات ذکر فرما کر اس کی معبودیت کا ثبوت پیش کیا ہے

آیت کا حاصل یہ ہے کہ بعض لوگ خدا سے چھپنے کے لئے درپردہ بداعمالیاں کرتے ہیں یعنی دروازے بند کر کے کپڑوں میں لپٹ کر گناہ کرتے ہیں۔ دلوں میں نفاق و شک کی پرورش کرتے اور عداوتِ رسولؐ کو چھپا کر رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ اُن کا محض گمان ہے۔ اللہ اُن کے دلوں کی حالت خوب جانتا ہے کوئی چیز اس سے مخفی نہیں رہ سکتی۔ لہذا وہی معبود ہونے کا استحقاق بھی رکھتا ہے۔

مقصود بیان :- عظمتِ قرآن کا اعلان۔ اس امر کی صراحت کہ قرآن کے پیش کردہ قوانین و ضوابط ناقابلِ تنسیخ ہیں افراط و تفریط سے پاک ہیں۔ اس کے بیان کردہ واقعات صحیح ہیں۔ اس کے طریق ہدایت بالکل واضح ہیں۔ اس کی بلاغت فصاحت سلاست حلاوت اور طراوت معدوم المثال ہے۔ آیت میں اس بات کی بھی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ حقائق اشیاء سے واقف ہے، مصالح کائنات کو جانتا ہے لہذا اس کے قوانین ضرور مبنی بر حقائق اور پُر از حکمت ہیں۔ آیات میں توحید پر قائم رہنے اور منہیات سے اجتناب کرنے اور اوامر کی تعمیل کرنے کی نہایت شستہ انداز میں تعلیم دی گئی ہے اور یہ بات بھی بتادی کہ جو قومیں قوانینِ الٰہی پر چلتی ہیں اُن کو دنیا میں بھی کامرانی حاصل ہوتی ہے اور دینی سعادت بھی نصیب ہوتی ہے۔ وغیرہ

———— (گیارہواں پارہ ختم ہوا) ————

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیانُ السُّبحانُ

کا

پارہ نمبر ۱۲

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ

فاضلِ اجل حضرت مولانا سید عبد الدائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں ۱۳۵۶ھ سے باقساط ہر ماہ شائع ہو رہی ہے

عطاء الرحمٰن صدیقی مالک وسیم بکڈپو دیوبند
نے برائے اشاعت معارف القرآن
محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند (یو۔پی) سے شائع کیا

بارھواں ۱۲ پارہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ

اور زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں کہ اللہ کے ذمہ اس کی روزی نہیں وہ اُس کے رہنے

مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝

کی جگہ اور اُس کے سپردِ خاک ہونے کے مقام کو جانتا ہے سب لوحِ محفوظ میں موجود ہے

تفسیر یہ بھی اللہ کے معبودِ برحق ہونے کا ثبوت ہے۔ عمومی رزق کی کفالت اور احاطۂ علمی دو باتیں اس آیت میں بیان فرمائی ہیں۔
[1] لفظ عَلَی اللّٰہِ سے معلوم ہوتا ہے کہ مخلوق کو رزق دینا اللہ پر واجب ہے۔ وجوب دو قسم کا ہوتا ہے: وجوب الزامی اور وجوب اختیاری [2]۔ امام رازی نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ پر مخلوق کو رزق دینا بطور اختیار واجب ہے۔ یعنی اللہ نے اپنے فضل و احسان سے تمام مخلوق کے رزق کی کفالت فرمائی ہے۔

بعض مفسرین کے نزدیک عَلَی اللّٰہِ بمعنی مِنَ اللّٰہِ کے ہے۔ مجاہد کے قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس کا قول بیان کیا ہے کہ مُسْتَقَرٌّ سے مراد زندگی میں ٹھہرنے اور رہنے کا ٹھکانہ اور مُسْتَوْدَعٌ سے مراد مدفن ہے۔ ابن مسعود سے مرفوعاً مروی ہے کہ اگر تم میں سے کسی کی موت کسی زمین میں سے مقدر ہو تو وہاں جانے پر اس کو کوئی ضرورت مجبور کرے گی۔ یہاں تک کہ جب وہ انتہاء مقام پر پہنچ جائے گا تو اس کی روح قبض کی جائے گی اور قیامت کے روز زمین عرض کرے گی یہ وہ ہے جو تو نے مجھے بطور ودیعت سپرد فرمایا تھا (رواہ الحاکم وصححہ) مجاہد، ضحاک اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کا (دوسرا قول) ہے کہ مُسْتَقَرٌّ سے مراد رحمِ مادر اور مُسْتَوْدَعٌ سے مراد پشتِ پدر ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک مُسْتَقَرٌّ سے مراد سیرگاہ اور مُسْتَوْدَعٌ سے مراد قیام گاہ ہے۔ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ سے مراد لوحِ محفوظ یا علمِ الٰہی ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اللہ ہی تمام مخلوق چرندہ، پرندہ، درندہ وغیرہ کی روزی کا کفیل ہے۔ وہی سب کو رزق عطا فرماتا اور رزق کے ذریعہ سے زندگی کو باقی رکھتا ہے اور وہی کل مخلوق کی ہر حالت کو جانتا ہے۔ حالتِ عدم اور حالتِ وجود کے تمام لوازم و مقتضیات و کیفیات سے وہی واقف ہے، پھر کون سی وجہ کہ اس کے سوا دوسرے کی پرستش کی جائے اور اس کی ربوبیت و الوہیت میں کسی غیر کو شریک بنایا جائے۔

مقصودِ بیان ہر جان دار کے رزق کا اللہ کفیل ہے۔ اللہ ہر جزئی کی حالت کو بلا واسطہ جانتا ہے۔ خواہ جزئیات مادیہ ہوں یا غیر مادیہ۔ علمِ الٰہی کا تعلق ممکنات سے قبل از وجود ہوتا ہے۔ ہر جان دار کے مرنے کی جگہ دفن ہونے کا مقام مقرر ہے۔ اللہ کی لوحِ محفوظ میں ہر چیز کی پیدائش سے قبل کل معلومات کا اندراج ہے کسی کا استثناء نہیں ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى

اُسی نے آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن کے دوروں میں پیدا کیا اور اُس وقت اُس کا عرش پانی

الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۗ وَلَئِن قُلْتَ إِنَّكُم مَّبْعُوثُونَ مِن بَعْدِ الْمَوْتِ

پر تھا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرنے والا ہے (اے محمدؐ) اگر تم کہو کہ مرنے کے بعد یقیناً تم سب زندہ کئے جاؤ گے تو

لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ وَلَئِنْ أَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ

کافر ضرور کہیں گے کہ بس یہ تو کھلا ہوا جادو ہے اور اگر چند روز کے لئے ہم اُن سے عذاب کو

إِلَىٰ أُمَّةٍ مَّعْدُودَةٍ لَّيَقُولُنَّ مَا يَحْبِسُهُ ۗ أَلَا يَوْمَ يَأْتِيهِمْ لَيْسَ مَصْرُوفًا

ملتوی کر دیں تو کہیں گے عذاب کو کیا چیز روک رہی ہے خوب سن لو کہ جس دن اُن پر عذاب آئے گا تو ٹالے نہ ٹلے گا

عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ ع

اور وہی اُن کو گھیر لے گا جس کا وہ مذاق اُڑاتے تھے

اوپر کی آیت میں اپنی ربوبیت اور احاطۂ علمی سے اپنی الوہیت پر استدلال فرمایا تھا۔ اس آیت میں خلاقیت سے الوہیت کو ثابت کرتا ہے اور اپنی قدرت کاملہ کا اظہار فرما کر حشر بعد الموت کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

اس آیت کے چار حصے ہیں: (۱) کل عالم کا چھ روز کے دور میں پیدا کرنا۔ (۲) تخلیق عالم سے قبل عرش الٰہی کا پانی پر ہونا۔ (۳) نیک و بد کی آزمائش کر کے تمام مخلوق کو جمع کرنا۔ (۴) تاخیر عذاب کی وجہ۔ نمبر اول کی تشریح سورۃ بقر میں گزر چکی ہے۔ اس کی تکرار غیر مفید ہے۔ نمبر دوم کی تحقیق سے قبل چند احادیث نقل کرنی ضروری ہیں جن سے اصل مقصد کی وضاحت ہوتی ہے عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ ایک روز بنی تمیم اور اہل یمن خدمت گرامی میں حاضر ہوئے حضورؐ نے بنی تمیم سے فرمایا بنی تمیم تم بشارت قبول کرو۔ بنی تمیم نے جواب دیا حضورؐ آپ نے بشارت تو دے دی کچھ (مال بھی) دے دیجئے حضورؐ نے اہل یمن کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تم بشارت قبول کرو۔ یمن والوں نے کہا ہم نے بشارت قبول کی، لیکن یہ فرمائیے کہ سب سے پہلے کیا چیز تھی؟ ارشاد فرمایا ہر چیز سے پہلے اللہ تھا اور اس کا عرش پانی پر تھا اور لوح محفوظ میں اس نے ہر چیز کا تذکرہ فرمایا ہے۔ اس حدیث کو احمد، مسلم اور بخاری نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔

عبد اللہ بن عمرو بن عاصؓ سے مروی ہے حضور اقدسؐ نے فرمایا کہ آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال (یعنی ایک طویل مدت) پہلے مقادیر خلائق کو مقدر فرمایا اور اس کا عرش پانی پر تھا (رواہ مسلم) ابو ہریرہ، ابو زرین اور بعض دیگر صحابہؓ کی روایات سے بھی عرش کا پانی پر ہونا ثابت ہے۔ مجاہد، ربیع بن انس، وہب، ابن منبہ، ضمرہ، قتادہؒ وغیرہم علماء کا بھی یہی قول ہے۔

پانی پر عرش الٰہی تھا۔ اس کو فلسفی دماغ رکھنے والے مشکل سے قبول کریں گے۔ بالاتفاق یہ امر مسلم ہے اور بعض احادیث سے بھی مترشح ہے کہ اس کائنات سے پہلے گیس اور ہوا تھی، ہوا نے آبی شکل اختیار کی۔ پانی پر عرش ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ پانی پر عرش سوار تھا بلکہ صرف فوقیت اور علو دکھانا مقصود ہے جس طرح موجودہ کائنات کے اوپر عرش ہے۔ اسی طرح وجود کائنات سے قبل جب پانی ہی پانی تھا تو عرش پانی سے اوپر تھا اور پانی سے اوپر ہوا تھی۔ گویا مبدا تخلیق عرش الٰہی تھا جس نے ہوا کو پیدا کیا اور ہوا سے پانی بنایا۔ اب رہی یہ بات کہ عرش سے آیت میں کیا مراد ہے؟

عرش کے لغوی معنی ہیں بلندی اور رفعت۔ عرش الٰہی بھی سب سے بلند ہے۔ اسی لئے اس کو عرش کہا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آیت

میں لغوی معنی مراد ہوں یعنی مبدء تخلیق آب و ہوا محض تصرف اور قدرتِ الٰہی تھا۔ کائنات میں کوئی چیز اس وقت پیدا نہ ہوئی تھی۔ صرف ہوا اور پانی کی تخلیق ہوئی تھی اور یہ تخلیق بھی ایجادی شکل میں تھی۔ بغیر مادہ کے ہوئی تھی۔ پانی اور ہوا کا مادہ بھی پہلے موجود نہ تھا۔ اللہ نے اپنی رفعت، شان اور علو قدرت سے ان کے مادہ کو نیست سے ہست کیا اور ان کی صورت کو عدم سے وجود میں لایا۔ لفظ عَلیٰ استیلاء اور غلبہ اور کامل تصرف ظاہر کر رہا ہے۔

(۲) اللہ نے تخلیق عالم صرف انسانوں کی آزمائش کے لئے کی کہ کون نیک ہے کون بد۔ کس کے اعمال سب سے اچھے ہیں۔ کس کے اچھے کس کے برے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کو قبل تخلیق بھی اس کا کامل علم تھا اور آزمائش صرف علم حاصل کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ لہٰذا امتحانِ الٰہی بے سود ہے۔ صاحبِ بیضاوی نے اس شبہ کا حل اس طرح کیا ہے کہ تمام عالم میں کل اسباب و مواد انسان کے وجود و معاش کے موجب اور اعمال کے ضروریات ہیں نہ وجود خالق سے اس پر استدلال کیا جاسکتا ہے۔ نظری الٰہی کے یہ دلائل ہیں۔ گویا ان کی تخلیق اس طرح ہوئی ہے جیسے آزمائش کے لئے ہونی چاہیئے۔ واقع میں اگرچہ اللہ کو کسی امتحان کی ضرورت نہیں، مگر بظاہر تخلیق عالم امتحانی صورت پر دلالت کررہی ہے۔ پھر نیکی اور بدی کے مختلف درجات ہیں۔ کوئی سب سے برا کوئی سب سے اچھا۔ ادنیٰ اور اعلیٰ کے درمیان غیر محدود مراتب ہیں۔ تمام عالم کی فطرت بتارہی ہے کہ انسان کو سب سے بہتر اعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور صحیح ترین عقیدہ رکھنا چاہیئے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے عالم کی تخلیق بلا مادہ کے انسانی اعمال کو آزمانے کے لئے کی اور ظاہر ہے کہ جس موجد نے ایجاد بغیر مادہ کے اول مرتبہ کی وہ اعادہ بھی کرسکتا ہے، لیکن اگر کفار سے کہا جاتا ہے کہ تم کو دوبارہ مادی جسم کے ساتھ زندہ کیا جائے گا تو وہ اس کو جادو سے تعبیر کرتے اور سحر کی طرح بے حقیقت چیز جانتے ہیں اور منکر حشر کے لئے دھمکیاں سن کر فوراً اپنی جہالت کی وجہ سے عذاب نازل نہیں ہوتا تو عدم نزول کی وجہ دریافت کرتے ہیں۔ حالانکہ وقت سے پہلے عذاب نہیں آسکتا اور نہ مقررہ وقت پر آچکنے کے بعد ٹل سکتا ہے۔ جب عذاب آجائے گا اس روز ان کو چاروں طرف سے استہزاء انگیزیوں کی سزا مہیا ہو جائے گی۔

مقصودِ بیان خلاقیت اور قدرتِ کاملہ سے الوہیت پر استدلال۔ اس امر کی طرف لطیف ایماء کہ جس خدا نے زمین و آسمان کو بغیر مادہ کے پیدا کیا وہ سب کو فنا کرنے کے بعد انسان کا اعادہ بھی کرسکتا ہے۔ تخلیق انسانی کی اصل غرض کی صراحت اور فلسفۂ قیامت کی جانب دقیق ایماء۔ اس امر کی تصریح کہ خطاب قرآنی کے مقابلے میں کفار لاجواب ہو کر اس کو سحر سے تعبیر کرتے ہیں۔ تاخیر عذاب کی اصل وجہ کہ ہر کام کا ایک وقت معین ہے وغیرہ۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ○

اگر ہم اپنی طرف سے انسان کو نعمت کا مزہ چکھا کر پھر چھین لیتے ہیں تو بلاشبہ وہ ناامید و ناشکر ہو جاتا ہے

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ

اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آرام کا مزہ چکھاتے ہیں تو کہنے لگتا ہے کہ سختیاں مجھ سے دور ہوگئیں (اور اُس وقت) وہ یقیناً

لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ○ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ

خوب اتراتا اور شیخی مارتا ہے ہاں جن لوگوں نے صبر کیا اور نیک کام کئے انہی کے لئے مغفرت اور اجرِ عظیم مخصوص ہے

تفسیر اس آیت کا مورد اگرچہ ولید بن مغیرہ یا عبداللہ بن امیہ مخزومی ہے، مگر حکم عام ہے کافر و مومن کا امتیازی اساسی فرق بیان فرمایا ہے اور سچے مومن و کافر کا نمایاں امتیاز ظاہر کر دیا ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ دکھ سکھ راحت و تکلیف تو آنے جانے والی چیزیں ہیں۔ دنیا میں کوئی اچھا برا آدمی ایسا نہیں جس پر عیش و مصیبت کا تبادلہ نہ ہوتا ہو، مگر نقطۂ نظر ہر ایک کا جدا جدا ہے۔ کسی کی نظر سبب پر محدود ہے، کوئی اصل فاعل کو مسبب قرار دیتا ہے۔ بعض لوگ تو ایسے ہیں کہ ان پر اللہ کی طرف سے تھوڑی سی راحت آئی اور پھر کسی وجہ سے اس آسائش کا زوال ہو گیا تو ناامید ہو جاتے ہیں اور طرح طرح سے قدرا کا مقابلہ کرتے اور قول و عمل سے کفر کا اظہار کرتے ہیں۔ چونکہ ان کی نظر صرف حال کو دیکھتی ہے۔ ماضی و مآل ان کو سجھائی نہیں دیتا اور راحت و عیش کو اپنا دائمی حق سمجھے ہوئے ہوتے ہیں اور دنیوی آسائش پر ایسے غش ہوتے ہیں کہ اس آسائش کے زوال کو چھیننا اور کھینچنا تصور کرتے ہیں، اس لئے موجودہ حالت کو دیکھ کر مآل سے بھی ناامید ہو جاتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی محیط کل قدرت کاملی و قولی انکار کر کے کفر کے گڑھے میں گر پڑتے ہیں۔ اسی طرح تکلیف کے بعد اگر ان کو کچھ نعمت حاصل ہوتی ہے تو چونکہ ان کا منتہائے تصور صرف عالم حسی ہے، لذائذ روحانی اور عالم جاودانی سے غافل ہیں، اس لئے نعمت و راحت کے نشے میں ایسے بھول جاتے ہیں کہ گزشتہ زمانے کو بھول کر اور مستقبل کی طرف سے آنکھوں پر پردہ ڈال کر کہنے لگتے ہیں کہ اب ہمارا برا زمانہ گیا دوبارہ نہیں آئے گا۔ الغرض موجودہ عیش پر اترانے اور اکڑنے لگتے ہیں۔ یہ طبقہ کافروں کا ہے جن کی نظر صرف موجودہ حالت کو دیکھتی ہے، کارساز حقیقی تک نہیں پہنچتی۔ ہر موجودہ حالت کو وہ ناقابلِ زوال خیال کر لیتے ہیں، لیکن انھیں کے مقابلے میں بعض اشخاص ایسے بھی ہیں جن کا دائرۂ تعقل وسیع ہے، ان کے تصور کی نگاہ غیر محدود ہے۔ وہ ہر چیز کا فاعل حقیقی اللہ کو جانتے ہیں اور دنیا کے ہر دکھ سکھ کو قابلِ زوال یقین کرتے ہیں، نہ عیش میں پڑ کر اللہ کی طرف سے غافل ہو جاتے ہیں نہ دکھ میں مبتلا ہو کر مایوس ہو جاتے ہیں۔ ہر قسم کے دکھ سکھ اور عیش و راحت پر صبر کرتے ہیں اور کسی حالت میں نیکوکاری کو نہیں چھوڑتے۔ ان کی اعتقادی اور عملی زندگی کو راحت و رنج کا تبادلہ برباد نہیں کر سکتا۔ یہ گروہ اہلِ حق کا ہے جو مغفرتِ الٰہی اور اجرِ جزیل کا مستحق ہے۔

مقصودِ بیان کفر و اسلام کے امتیازی فرق کا بیان۔ انسان کی طبعی حالت کا اظہار۔ اس بات کی ضمنی صراحت کہ دنیا کا ہر دکھ سکھ زوال پذیر ہے کسی کو بقا حاصل نہیں، اس لئے مصیبت کے وقت راحت سے مایوسی یا راحت و آرام کے وقت مصیبت سے بے خوف ہو کر غرّہ ہو جانا نہ چاہیئے۔ ہر عیش و رنج کا فاعل اللہ کو سمجھنا چاہیئے۔ کسی حالت میں بھی نیکوکاری کو ترک نہ کرنا چاہیئے۔ مایوس ہو جانا، اترانا اور فخر کرنا کفر کی علامت ہے۔ رنج پر صبر رکھنا، نعمت پر شکر کرنا اور دنیا کے دکھ سکھ میں پھنس کر نیکوکاری کو ترک نہ کرنا اہلِ حق کی نشانی ہے وغیرہ۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ أَن يَقُولُوا لَوْلَا أُنزِلَ

تو کیا جو وحی تمہارے پاس آئی ہے اُس کا کچھ حصّہ چھوڑ بیٹھو گے اور تمہارا دل اس سے تنگ ہو جائے گا صرف اس وجہ سے کہ کافر کہتے ہیں

عَلَيْهِ كَنزٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ ۚ إِنَّمَا أَنتَ نَذِيرٌ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ○

کیوں اس پر کوئی خزانہ نہ اُترا یا اُس کے ساتھ کوئی فرشتہ نہ آیا تم تو صرف ڈرانے والے ہو اور اللہ ہر چیز کا ذمہ دار ہے

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم

کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن نبی نے بنا لیا ہے کہہ دو کہ تم بھی اس طرح دس خود ساختہ سورتیں بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جس کو بلا سکو

مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ○ فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا

بلالو اگر تم سچے ہو پس اگر وہ مددگار تمہارا کہنا نہ کریں تو جان لو کہ اللہ ہی کے حکم سے قرآن

أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ

نازل کیا گیا اور اُس کے سوا کوئی معبود نہیں تو کیا اب بھی تم مسلمان ہوتے ہو

تفسیر رسول پاکؐ ہمیشہ غیر اللہ کی پرستش سے منع فرماتے اور اللہ کے سوا دوسرے باطل معبودوں کی عبادت سے نہایت سختی کے ساتھ روکتے اور کافروں کے خود ساختہ بتوں کی تحقیر و توہین فرماتے تھے۔ اپنی تعلیم کو الہامی تعلیم اور اپنے قول کو خدائی قول ظاہر کرتے تھے اور اس کے ثبوت میں قرآن کی صداقت، حقانیت اور اعجازی بلاغت کو پیش کرتے تھے۔ عبداللہ بن اُمیہ مخزومی وغیرہ کفار کے دلوں پر چونکہ کفر کی مہریں لگ چکی تھیں اور ان کی چشم عقل پر جہالت کے موٹے موٹے پردے پڑے تھے، اس لئے وہ حضورؐ کے مقابلے میں بطور مناظرہ صرف رسالت و وحی کی توہین کے لئے کہا کرتے تھے کہ اگر تم اپنے قول و دعوے میں سچے ہو تو پھر اس قدر مفلس و معمولی آدمیوں کی طرح ضرورت مند کیوں ہو؟ کیوں غیب کا خزانہ تمہارے پاس نہیں آجاتا، تمہارے لئے پہاڑ کو سونے کا نہیں کر دیا جاتا کہ ہم کو بھی تمہاری رسالت کا یقین آجائے یا ایسی صورت ہو جائے کہ کوئی فرشتہ اتر کر تمہاری تصدیق کرے اور ہمارے سامنے تمہاری حقانیت کی شہادت دے۔ جب ان مطلوبہ دلائل سے کوئی بھی دلیل تمہارے پاس نہیں تو پھر ہم کو کیا حق ہے کہ اپنی تعلیم کو سچی تعلیم اور اپنے قول و عمل کو ہدایت کہو اور ہمارے بتوں کی تحقیر کرو۔ پھر کم بخت جاہل توہینِ وحی و رسالت پر ہی بس نہ کرتے بلکہ رسول پاکؐ کو مفتری اور کلام الٰہی کو خود ساختہ کلام کہتے تھے۔ لہٰذا یہ اسباب ایسے تھے کہ دھوکہ میں پھنس جانے والے انسان دھوکہ میں آسکتے تھے اور کوتاہ نظر و کمینے والے امید کر سکتے تھے کہ اب تو رسول اللہؐ بتوں کو بھلا بُرا نہیں کہیں گے۔ اس کے علاوہ کفار کی تیرہ باطنی جب مذکورہ حالت تک پہنچ چکی تھی تو ان کو مزید پیام ہدایت پہنچانا بے سود تھا، اس لئے خدا تعالیٰ نے بطور جواب محض اپنے رسولؐ کو تسلی دینے کے لئے آیات مذکورہ نازل فرمائیں۔

حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ کفار جو بطور استہزاء و تمسخر تم سے بار بار مہمل سوال کرتے ہیں اور بیہودہ سوالات کے جواب نہ ملنے پر بعض لوگوں کو یہ اُمید کرنے کا موقع ملتا ہے کہ اب تم وحی الٰہی کے کسی حصہ کی تبلیغ ترک کر دو گے یعنی ان کے بتوں کی تحقیر سے اعراض کرنے لگو گے تو یہ خیال و اُمید غلط ہے، تم کو تنگ دل نہ ہونا چاہیئے۔ تم پیام الٰہی پہنچائے جاؤ۔ تمہارا کام صرف اندیشہ ناک باتوں سے مطلع کرنا اور نتیجۂ بد کی خبر دینا ہے کامیابی اور تاثیر کے تم ذمہ دار نہیں ہو۔ رہا کفار کا تم کو مفتری کہنا تو اس کا جواب علی الاعلان یہ ہے کہ کفار بھی اپنے تمام مددگاروں اور باطل معبودوں کو ملا کر سب کی اعانت سے قرآن کی کچھ سورتیں بنا لائیں اور جب وہ ایسا نہیں کر سکتے تو ان کو یقین کر لینا چاہیئے کہ قرآن کی وسعت دامنی کا احاطہ انسانی علم نہیں ہو سکتا۔ اس کا تعلق محض علم الٰہی سے ہے۔ اسی نے اپنے علم بے پایاں سے اس کو نازل فرمایا ہے اور وہی اعتقادی، عملی اور قولی توحید کا حکم دے رہا ہے۔

ضروری توضیح مفسرینؒ نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت مذکورہ میں جن دس سورتوں کی مثل بنا کر لانے کا چیلنج دیا ہے وہ مندرجہ ذیل سورتیں ہیں:- بقرہ۔ آل عمران۔ نساء۔ مائدہ۔ انعام۔ اعراف۔ انفال۔ توبہ۔ یونس۔ ہود۔ لیکن بقول ابن کثیر اہل تحقیق کے نزدیک خصوصیت کی کوئی وجہ نہیں عمومی دعوت زیادہ مناسب ہے۔

ایک بات یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ اس جگہ دس سورتیں بنا لانے کا چیلنج دیا اور سورۂ بقرہ وغیرہ میں صرف ایک چھوٹی سی صورت پیش کرنے کی دعوت دی تھی۔ دونوں میں توافق کی صورت نزول میں تقدم و تاخر کے اعتبار سے ہے۔ سورۂ بقرہ مدنی ہے۔ اس کا نزول مؤخر ہے، سورۂ یونس اگرچہ مکی ہے، مگر سورۂ ہود سے مؤخر ہے۔ گویا ترتیب اس طرح سے ہوئی کہ پہلے سورۂ ہود میں دس سورتیں پیش کرنے کی دعوت دی پھر سورۂ یونس میں ایک سورت بنا کر لانے کا چیلنج دیا پھر مدینہ میں پہنچنے کے بعد سورۂ بقرہ نازل ہوئی تو اس میں بھی ایک ہی سورت بنانے کا حکم نازل ہوا (کذا قال الامام الرازی)

مقصود بیان - رسول پاکؐ کو تسلی دی کہ کفار کی طرف سے رسالت و وحی کا جو مذاق اڑایا جاتا تھا اس سے تنگ [illegible]

الٰہی کی تبلیغ سے باز نہ رہنے کا حکم۔ کفار کی تیرہ باطنی اور کور دماغی کی صراحت اور اس بات کی وضاحت کہ یہ لوگ مشاہدہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ قرآنی صداقت، جامعیت اصول، طرز ادا، بلاغت معانی، فصاحت الفاظ وغیرہ اگرچہ اہل بصیرت کو اقرار حقانیت پر مجبور کرتی ہے، مگر یہ لوگ بہت زیادہ کوتاہ نظر ہیں۔ ان کو تو سچائی کی روشنی نظر نہیں آتی۔ آیت سے یہ بات بھی مستنبط ہوتی ہے کہ اگرچہ دعوت و تبلیغ کی ناکامی کا یقین ہو پھر بھی اپنا فرض ادا کرنا اور دعوت تبلیغ کرنا لازمی امر ہے وغیرہ۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا

جو لوگ دنیوی زندگی اور اس کی رونق چاہتے ہیں ہم اُن کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں پورا پورا دیدیتے ہیں اور وہ یہاں

لَا يُبْخَسُونَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ

نقصان میں نہیں رہتے یہی لوگ ہیں کہ سوائے آگ کے اُن کے لئے آخرت میں کچھ نہ ہوگا اور دنیا میں جو

مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

کچھ انہوں نے کیا کیا ہوگا وہ ملیامیٹ ہوجائے گا اور جو کچھ وہ کرتے تھے نابود ہوگا۔

تفسیر

انس بن مالک اور حسن بصری کے نزدیک اس آیت کا نزول یہود و نصاریٰ کے حق میں ہوا۔ مجاہد کے نزدیک عام ریاکاروں کے حق میں۔ بعض کے نزدیک منافقوں کے بارے میں آیت مذکورہ نازل ہوئی، اور بقول مفسر سراج کے اکثر علماء کے نزدیک عام اہل کفر مراد ہیں۔ ابن عباس رضؓ نے فرمایا جس نے طلب دنیا کے لئے کوئی نیک کام کیا تو اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں ہی اس کا ثواب عطا فرما دیتا ہے، لیکن آخرت میں اس کو ثواب نہ ملے گا۔ ضحاک وغیرہ سے بھی یہی قول مروی ہے۔ آیت کو عموم پر محمول کرنا میرے نزدیک اولیٰ ہے کیونکہ عام طور پر کچھ سمجھ دار اہل کفر حجت پیش کیا کرتے تھے کہ اتباع قرآن اور اسلام کی کیا ضرورت ہے۔ مسافروں کو کھانا کھلانا، یتیموں کی پرورش کرنی، بھوکوں اور ناداروں کی خبرگیری کرنا، راستوں پر کنویں کھدوانے اور سایہ دار درخت لگانے بہت سے نیک کام ہم کرتے ہیں اور ان کا مقبول ہونا بھی آثار سے ثابت ہے۔ ہم ایسے کاموں کی وجہ سے دنیا میں خوب پھلتے پھولتے ہیں۔ اولاد و مال میں برکت، امن و تندرستی نصیب ہوتی ہے۔ سو یہی بات کافی ہے۔ اس کا جواب آیت میں دیا گیا ہے۔ (کذا قال العلامۃ المحقق عبدالحق)

یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ آیت میں صرف ارادہ کا ذکر ہے لیکن محض ارادہ مقصود نہیں بلکہ اصل غرض عمل خیر بارادہ دنیا ہے۔ قرطبی نے اکثر علماء کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ آیت مطلق ہے جس طرح آیات ﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا﴾ الخ اور ﴿وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا﴾ مطلق ہیں، لیکن ان سب کی تقیید سورۂ سبحان الذی کی اس آیت میں کر دی گئی ہے۔ ﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ﴾ الآیۃ گویا ثواب دنیوی عطا کرنا بھی اللہ کی مشیت پر موقوف ہے۔ لازم نہیں اور آخرت میں تو بہرحال ایسے لوگوں کو کوئی اجر نہیں ملے گا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جو لوگ دنیا میں نیک کام کرتے ہیں لیکن اس نیکی سے ان کا اصل مطمح نظر صرف زینت دنیا ہوتی ہے۔ چاہتے ہیں کہ نیک مشہور ہو جائیں، لوگ ان کی عزت کریں، چندہ دینے والوں کی فہرست میں سب سے پہلے ان کا نام ہو یا مال و اولاد کی کثرت حاصل ہو یا کوئی دنیوی فائدہ حاصل ہو۔ اللہ چونکہ منصف ہے کسی کی نیکی ضائع نہیں فرماتا، اس لئے فقط دنیا میں اس کی نیکی کا پورا پورا اجر عطا فرما دیتا ہے۔ شہرت، عزت، اولاد و مال کی کثرت سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے، لیکن چونکہ ان کا منتہائے نظر آخرت نہیں ہوتی اور نہ آخرت کو وہ واقعی کوئی چیز جانتے ہیں اور

ان کے اعمال آخرت کے لائق ہوتے ہیں، نہ ایمان و اخلاص کا کوئی نشان۔ ان کے اعمال ہوتا ہے، اس لئے آخرت کا کوئی حصہ ان کو نصیب نہ ہوگا۔ دنیا میں جو کچھ کرا لیتے ہیں وہ یہیں رہ جائے گا۔ آخرت میں کوئی ان کا کام آنے کی نہیں، وہاں ان کی کوئی نصیب نہ ہوگا۔

مقصود بیان

اس آیت میں مطلقاً نیت عمل اور اس کی جزا کو مدار سعادت بتایا گیا ہے۔ ایمان، اخلاص اور اسلام اس کے بنیادی اجزاء ہیں اور آخرت جہاں کا یقین ہے، ان باتوں کی اس کے نزدیک لازمی ہے۔ اس امر کی صراحت کی ضرورت ہے کہ حصول دنیا کو قرار دینا آخرت میں مفید نہ ہوگا۔ اہل ایمان اچھی چیز ہے۔ آخرت میں کوئی بدلہ نہ ہوگا۔ جو شخص دنیا ہی کو مقصود بنا لے اللہ اس کی حق تلفی نہیں کرتا۔ ورنہ مسلمانوں کو ریاکاری سے حفاظت اور اس امر کی تلقین ہے کہ ہر عمل کی اصل غرض سعادت آخرت کو قرار دینا چاہئے۔ اپنے ارادوں اور نیتوں کو دنیوی مفاد کے حصول پر محدود نہ رکھو وغیرہ۔

أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ

پس کیا جو شخص اپنے پروردگار کی طرف سے روشن دلیل پر ہو اور اس کے ساتھ خدا کی طرف سے گواہ بھی ہو اور اس سے پہلے موسیٰ کی کتاب

إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ

پہلے موسیٰ کی کتاب پیشوا اور رحمت تھی۔ یہی لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور سب فرقوں میں سے جو کوئی اس کا منکر ہو تو دوزخ اس کا وعدہ گاہ ہے

فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ○

(اے مخاطب) اس قرآن کی طرف سے تو شبہ میں نہ ہو بلاشبہ یہ تیرے رب کی طرف سے برحق ہے لیکن اکثر لوگ نہیں مانتے۔

تفسیر

اس آیت کا مصداق بعض مفسرین نے صرف حضورؐ کی ذات گرامی کو قرار دیا ہے۔ بعض نے مومنین اہل کتاب کی طرف اشارہ ظاہر کیا ہے، لیکن اکثر کے نزدیک حکم میں عموم ہے۔ ہر مومن مخلص اس کا مصداق ہے۔ آیت میں ان کا بصورت استفہام بیان کیا ہے۔ غرض اہل ایمان اور اہل کفر کا موازنہ کر کے اہل ایمان کو نجات کا حامل قرار دیا ہے کیونکہ ان کے ایمان کے ثبوت کے لئے تین براہین موجود ہیں: بَیِّنَۃ، شَاہِد مِن اللہ اور تورات۔ بَیِّنَۃ سے مراد کیا ہے؟ اس میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ قابل ترجیح قول یہ ہے کہ اس سے عقل اور نور فطرت مراد ہے۔ وہ دل کی آنکھ جو حق و باطل میں تمیز کرتی اور قرآن کے احکام و ضوابط کو حق کے موافق بیانتی ہے۔ کلام الٰہیہ کا کوئی جزئیہ اور کوئی عقیدہ اس کو خلاف عقل و خلاف واقعہ نظر نہیں آتا۔ یہی نور فطرت اقرار توحید و رسالت اور صداقت اسلام و ایمان کی واضح دلیل ہے۔ ہاں جن لوگوں نے اس دل کی آنکھ پر مادیت پرستی اور شرک و کثافت کے پردے ڈال دیئے ان کو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ قرآن پاک میں اسی بینہ کو دوسرے مقام پر فطرۃ اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ صحیحین میں بروایت ابوہریرہؓ مروی ہے کُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ الخ صحیح مسلم میں بروایت عیاض بن حمارؓ منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے اپنے بندوں کو راستی کی طرف مائل پیدا کیا لیکن پھر شیاطین ان کے پاس آئے اور ان کے دین سے ان کو بہکا دیا۔ سنن و مسانید میں بکثرت مروی ہے کہ ہر بچہ اسی ملت پر پیدا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی زبان کھلے اور وہ اپنا عقیدہ بیان کرے۔

شَاهِدٌ مِّنْهُ من جانب اللہ۔ ابن عباسؓ، مجاہد، عکرمہ، ابوالعالیہ، ضحاک، ابراہیم نخعی اور سدی وغیرہم نے کہا کہ شاہد سے مراد جبرئیلؑ ہیں۔ حضرت علیؓ اور حسن بصریؒ کی روایت ہے کہ حضورؐ کی ذات گرامی مراد ہے۔ دونوں قولوں کے معنی قریب قریب ہیں۔ فرض رسالت دونوں نے ادا کیا۔ من جانب اللہ دونوں نے شہادت دی۔ حضرت جبرئیلؑ نے حضورؐ تک پیام الٰہی پہنچایا اور حضورؐ نے امت تک۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا قریش میں سے ہر ایک کے حق میں قرآن کا کوئی حصہ ضرور نازل ہوا ہے۔ کسی نے عرض کیا آپ کے حق میں کیا نازل ہوا؟ فرمایا کہ سورۂ ہود میں تو آیت

اگر من کان علی بینۃ الخ نہیں پڑھتا۔ پس حضور اقدسؐ بینہ ہیں اور میں شاہد ہوں۔ اخرجہ ابو نعیم وابن ابی حاتم وابن عساکر کی روایت میں حضرت علیؓ کا شاہد ہونا مرفوع بھی وارد ہے، لیکن ابن کثیر نے ان دونوں روایتوں کی تضعیف کی ہے اور کہا ہے کہ اس کا کہنے والا کوئی ثابت نہیں۔ میرے نزدیک بینہ سے نور فطرت وعقل وشاہد سے قرآن ووحی مراد ہے اور یہی قول اہل تحقیق نے قابل ترجیح قرار دیا ہے۔

کتٰب موسیٰ یعنی توراۃ چونکہ توراۃ نے حضور اقدسؐ کی رسالت عامہ اور ختم نبوت کی شہادت دی ہے اور بقول زجاج کے حضورؐ کے حلیہ اور شمائل بھی اس میں مفصل مذکور ہیں۔ پھر اصول توریت وقرآن میں کوئی فرق بھی نہیں۔ حضور والاؐ کی ذات اور قرآن واسلام کے متعلق اس میں پیشین گوئیاں بھی موجود ہیں، اس لئے حقانیت قرآن کی تصدیق اس سے بدرجۂ اتم ہوتی ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ دو فریق ہیں ایک تو وہ جس کے پاس اپنے عقیدہ اور عمل کے لئے تین دلیلیں موجود ہیں۔ اس کا عقیدہ اور عمل فطرت کے بھی مطابق ہے اور قرآن کے بھی اور توریت کے بھی عقل ونقل دونوں اس کے واسطے شاہد عدل ہیں۔ دوسرا وہ جس کے پاس کوئی دلیل نہیں ظاہر ہے کہ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ پہلا حق وصداقت کا حامل ہے۔ دوسرا گمراہی وتباہی کے غار میں سرنگوں۔ پہلا گروہ اہل ایمان کا ہے اور دوسرا گروہ کفار کا ہے۔ پہلا قرآن ورسول کو سچا جانتا ہے اور دوسرا غلط ودروغ۔ اس سے آگے ارشاد ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی گروہ اور کسی مذہب والا ہو اگر وہ رسول اللہؐ کی تصدیق نہ کرے گا بلکہ انکار کرے گا تو اس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ صحیح مسلم میں بروایت ابو موسیٰ اشعری مرفوع حدیث وارد ہے کہ اس امت کا کوئی شخص ہو یہودی ہو یا عیسائی۔ اگر اس کو میری رسالت کی اطلاع مل جائے اور وہ ایمان نہ لائے تو بیشک وہ دوزخی ہوگا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں میں جب کوئی حدیث سنتا تو اس کا مصداق قرآن پاک میں ضرور پاتا۔ چنانچہ جب مجھے ابو موسیٰ اشعری کی روایت کردہ مذکورہ حدیث پہنچی تو میں نے قرآن میں اس کا مصداق تلاش کیا۔ تلاش کے بعد مجھے مذکورہ آیت سے حدیث مذکور کی تصدیق ہوگئی۔ اس سے آگے قرآن کریم کی حقانیت میں شک کرنے کی ممانعت اور اہل باطل کے گروہ کی کثرت کا اظہار ہے۔ قرآن کی حقانیت میں رسول اللہؐ کو تو کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس لئے اگرچہ خطاب بظاہر رسول پاکؐ کو ہے، مگر روئے سخن امت کی طرف ہے۔

مقصود بیان اسلام کی حقانیت وصداقت کی مختلف دلائل کا بیان۔ اس بات کا ضمنی اظہار کہ قواعد اسلام اور ضوابط قرآن اور عقائد اسلام خواہ ان کا تعلق مغیبات سے ہو یا قیامت ودوزخ وجنت سے بہرحال اسلام کا کوئی حصہ خلاف عقل نہیں ہے۔ اس امر کی صراحت کہ بغیر تصدیق رسولؐ کے نجات ناممکن ہے۔ خواہ بجائے خود کوئی توحید خالص کا دعویٰ کرے وغیرہ۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۚ أُولَٰئِكَ يُعْرَضُونَ عَلَىٰ رَبِّهِمْ وَيَقُولُ

اس سے بڑھکر ظالم کون ہے جو اللہ پر دروغ بندی کرے ان لوگوں کو ان کے رب کے حضور میں پیش کیا جائے گا اور گواہ

الْأَشْهَادُ هَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ۝ الَّذِينَ

کہیں گے کہ انہی لوگوں نے اپنے رب پر دروغ بندی کی تھی سن لو خدا کی لعنت ہے ان ظالموں پر جو

يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ۝ أُولَٰئِكَ لَمْ

راہ خدا سے روکتے ہیں اور اس میں کجی ڈھونڈتے ہیں اور وہی آخرت کے منکر ہیں یہ لوگ زمین میں

يَكُونُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ۘ يُضَاعَفُ لَهُمُ

(امر الٰہی کو) کمزور نہیں کر سکتے اور نہ ان کے لئے اللہ کے سوا کوئی حمایتی ہے ان کو سزا دوگنی دی

الْعَذَابُ ۚ مَا كَانُوا يَسْتَطِيعُونَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوا يُبْصِرُونَ ○ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا

جائے گی ۔ یہ نہ سن سکتے تھے نہ دیکھ سکتے تھے ۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنا نقصان خود کیا

أَنفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ○ لَا جَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ○

اور ان کی گزشتہ افتراء بندی سے غائب ہو گئی لامحالہ آخرت میں یہی لوگ زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں گے

تفسیر ان آیات میں خدا تعالیٰ نے کافروں کی مذمتیں بیان فرمائیں جن میں سے بعض کا تعلق دنیوی حیات سے ہے اور بعض کا آخرت سے اور مقدم الذکر مؤخر الذکر کی علت ہے ہم تفصیل وار تفسیر کرتے ہیں ۔

(۱) کفار مکہ جھوٹے بھی تھے اور افترا پرداز بھی ۔ ان کا دروغ قولی بھی تھا اور عملی بھی اور اعتقادی بھی ۔ بتوں کو اپنا شفیع سمجھتے اور اسی کی بنا پر ان کی پرستش کرتے ۔ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے ۔ قرآن کو کلام بشر کہتے ۔ اپنے مذہب کی بہت باتوں کو اللہ کی طرف منسوب کرتے اور دعویٰ کرتے کہ ان باتوں کو کرنے کا ہم کو اللہ نے حکم دیا ہے ۔ قیامت کے منکر تھے ۔ حشر نشر عذاب ثواب وغیرہ کو ڈھکوسلا خیال کرتے تھے ۔ صفات الوہیت میں اللہ کے ساتھ مخلوق کو شریک کرتے تھے ۔ لہٰذا ارشاد ہوا کہ ایسے لوگوں سے زیادہ بے جا حرکت کرنے والا حق ناشناس اور تباہ حال کون ہو سکتا ہے جو عقائد ، اعمال اور اقوال میں افترا پرداز اور کافر ہوں ۔

(۲) قیامت کے روز رسوائی اور ذلت کے ساتھ ایسے لوگوں کو بارگاہِ الٰہی میں پیش کیا جائے گا کیونکہ وہی ان کا رب ہے ۔ اسی نے پیدا کیا اور تدریجی ترقی دے کر حد کمال تک پہنچایا لہٰذا محاسبہ کا اسی کو حق ہے ۔

(۳) ایسے ظالموں کی افتراء پردازی اور دروغ تراشی کی شہادت بڑے بڑے گواہ دیں گے ، وہ کون گواہ ہوں گے ؟ مجاہد کے نزدیک نیکی اور بدی کو لکھنے والے فرشتے مراد ہیں ۔ مقاتل کے نزدیک عام انسان بغیر تعین و تخصیص کے ، ابن عباسؓ کے نزدیک انبیاءؑ و مرسلینؑ ۔ قتادہ کے قول کے موافق عام خلائق خواہ انسان ہوں یا دوسری مخلوق ۔ گویا علی الاعلان شہادت دی جائے گی ۔ میرے نزدیک اگر مجرم کے خود ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء مراد لئے جائیں تو احادیث و قرآن کے مضامین کے موافق ہوگا ۔

(۴) جب شہادت کی تکمیل ہو جائے گی اور جرم ثابت ہو جائے گا تو بارگاہِ الٰہی سے ندا ہوگی ان ظالموں کو ہماری رحمت سے دوری ہو یہ کسی طرح رحمتِ الٰہیہ سے مستفید ہونے کے سزاوار نہیں ۔ لہٰذا ان بہکانے والوں اور بھٹکنے والے گمراہوں کو رحمت سے دور کر دو ۔ ایسا کیوں ہوگا ؟ اس لئے کہ

(۵) یہ دوسروں کو راہِ حق سے روکتے تھے ۔ رہنمائی بجائے خود رہی سیدھا راستہ چلنے والوں کو بہکاتے تھے جس طرح آج کل پادری ، آریہ ، قادیانی اور اسلام کے بہت سے علماء ، مشایخ اور سرکاری سرپرست کا سہ لیس کیا کرتے ہیں ۔

(۶) پھر دوسروں کو گمراہ بنانے کے ساتھ خود بھی کجرو تھے ۔ کج روی ہی کو پسند کرتے تھے اور راہ راست کو چھوڑ کر کج راہی کی تلاش میں رہتے تھے ۔

(۷) یہ دنیوی زندگانی کو ہی اصل حیات سمجھتے تھے ۔ آخرت کے منکر تھے یعنی وجود قیامت کا ہی ان کو انکار تھا ۔ جنت ، دوزخ ، حشر نشر ، حساب کتاب اور اجر و عتاب تو درکنار رہے ۔

(۸) دنیا میں اگرچہ اپنی قوت ، شوکت ، عزت ، حکومت ، جتھے اور کثرت مال و اولاد پر مغرور تھا ، مگر اللہ کی گرفت سے یہ کسی طرح باہر نہیں ہو سکتے تھے ۔ اگر اللہ ان کی گرفت کرتا تو ان کا کوئی حامی ان کو بچا نہیں سکتا تھا ۔ ان کے فرضی معبود بالکل عاجز تھے ۔ کسی میں ان کی حمایت کرنے کی قوت نہ تھی ۔

(۹) ان کے گوش نیوش نہ تھے ۔ صداقت وحقانیت کے سننے سے بہرے تھے ۔ نہ حق کی بات ان کو سوجھائی دیتی تھی ۔ گویا اندھے تھے اور بہرے بھی ۔

(۱۰) لامحالہ ان پر دوچند عذاب ہوگا ایک تو گمراہ ہونے کا دوسرا گمراہ کرنے کا ۔

(۱۱) چونکہ انہوں نے دنیا میں ایسے اعمال واقوال کا ارتکاب کیا اور ایسی سیاہ راہ زندگی پر گامزن ہوئے جو خلاف حق تھی ۔ نقصان کو نفع سمجھ کر اختیار کیا ، زیاں کو سودا اور ہلاکت کو عافیت سمجھا ۔ لہٰذا آخرت میں یہ برباد ، ذلیل اور ہلاک ہوں گے اور ان کی جتنی افتراء پردازیاں تھیں سب بھول جائیں گے ۔

مقصود بیان اللہ پر دروغ تراشی اور افترا کرنا سب سے زیادہ بےجا حرکت ہے ۔ جو حکم اللہ نے نہیں دیا اس کو اللہ کی طرف منسوب کرنا سخت ترین ظلم ہے ۔ لہٰذا مسلمانوں کو احکام شریعت کے بیان کرنے میں انتہائی احتیاط کرنی چاہئے ۔

قیامت کے دن فرشتے یا انبیاء ومرسلین یا علماء یا ہم عام مخلوق یا خود انسانی اعضاء انسان کی بدکرداری کی شہادت دیں گے ۔ کوئی کافر مشرک رحمِ الٰہی سے متمتع نہیں ہو سکتا ۔ کج روی اور اغواء چونکہ علیحدہ علیحدہ مستقل جرم ہیں لہٰذا ان میں سے ہر ایک کی مستقل سزا دی جائے گی ۔ گویا دراصل اشارہ اس طرف ہے کہ گمراہی اگرچہ بذات خود بری چیز ہے ، مگر گمراہ کنی مزید تباہی پیدا کرنے والی ہے ۔ اللہ کی گرفت سے کوئی باہر نہیں ہو سکتا خواہ کتنا ہی عظیم الشان پُرشکوہ بادشاہ ہو یا کثیر المال تاجر یا فولادی بازو رکھنے والا پیل تن پہلوان ۔

قیامت کے دن جب مصائب کا سامنا ہوگا تو انسان اپنے تمام دماغ زائیدہ باطل خیالات کو بھول جائے گا اس وقت کوئی کچھ کام نہ آئے گا نہ کسی کی سفارش کام آئے گی وغیرہ ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ					
ان جو لوگ	ایمان لائے	اور اچھے کام کئے	اور اپنے رب کے سامنے عاجزی کی	تو وہی	جنتی
الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِ					
ہیں	جس میں وہ ہمیشہ	رہیں گے	ان دونوں گروہوں کی مثال ایسی ہے	جیسے ایک اندھا اور بہرا ہو	اور دو
وَالسَّمِيْعِ ۭ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝					
بینا اور شنوا	کیا یہ	دونوں حالت	میں برابر ہو سکتے ہیں	تم غور نہیں کرتے	

تفسیر اوپر کی آیات میں کفار کے افعال شنیعہ اور نتائج بد کا ذکر تھا ۔ ان آیات مکہ ابتدائی حصہ میں اہل ایمان کی مدحیہ حالت کا بیان اور نتیجہ کا اظہار کیا ہے اور مؤخر الذکر حصہ میں کفار ومومنین کی حالت تمثیلی انداز میں بیان کی ہے تاکہ ایک ذہنی چیز محسوس کی شکل میں آجائے اور عقلی مفہوم کا حسی نقشہ کھنچ کر سامعین کے دماغوں میں ثبت ہو جائے ۔

حصہ اوّل کا حاصل یہ ہے کہ دوامی طور پر جنت کے مالک وہی لوگ ہیں جن میں یہ تین صفات موجود ہوں :۔ (۱) وہ مومن ہوں یعنی اللہ کی توحید تمام انبیاء کی رسالت اور قیامت کو مع اس کی تفصیلات کے مانتے ہوں ۔ فرائض دینیہ کے منکر نہ ہوں ۔ قضا وقدر اور فرشتوں کے وجود کے قائل ہوں وغیرہ ۔

(۲) نیکوکار ہوں ۔ وہ امور جن کو کرنے سے عقل وشرع روکتی ہے اور جن کا ارتکاب دنیا اس بجائے صلاح کے فساد پیدا کرتا ہے ایسے امور کو

ترک کرتے ہوں اور جن امور سے عالم کی اصلاح وخیر وابستہ ہے اس کو اختیار کرتے ہوں۔ (۳) اللہ سے ڈرتے ہوں متقی ہوں، اسی کے سامنے خشوع خضوع کرتے ہوں، عبادت اور نیکی ریاکاری سے نہیں بلکہ خدا کے ڈر سے کرتے ہوں. خلاصہ یہ کہ جو لوگ قولاً، عملاً اور اعتقاداً نیکوکار اور حق پرست ہوں وہی اہلِ نجات اور صالحِ سعادت ہیں۔ انھیں کو دوامی راحت نصیب ہوگی۔

مؤخر الذکر ٹکڑے کا حاصل یہ ہے کہ کافر اندھے اور بہرے کی طرح ہیں جن کو نہ کچھ سنائی دیتا ہے نہ وہ کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ ان کو نہیں معلوم کہ دنیا کے اندر صوتی کیفیت اور معنوی وشکل خوبی کیا ہوتی ہے۔ اچھی بری آواز، خوبصورتی، بدصورتی، خوش رنگی اور بد رنگی دیدہ زیبی اور باصرہ سوزی کیا چیز ہوتی ہے۔ یہی حال کافر کا ہے اس کو نہیں معلوم کہ حق و ناحق، صادق و کاذب کیا چیزیں ہیں۔ اس کے کان حق کی سنائی سے بہرے ہیں اور اس کی آنکھیں صداقت کو دیکھنے سے اندھی ہیں۔ رہا مسلمان تو وہ آنکھوں والا ہے اس کے گوش ہوش کھلے ہوئے ہیں۔ وہ ہر چیز کو دیکھتا اور سنتا ہے، حق ناحق کو پہچانتا ہے اور صادق و کاذب میں تمیز کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ کافر و مومن برابر نہیں ہو سکتے۔ دونوں کے شرف و مرتبہ میں بڑا فرق ہے۔ بینا و نابینا سامع و غیر سامع میں مساوات نہیں ہو سکتی۔

مقصدِ بیان اہلِ سعادت کے صفات ثلثہ کا بیان اور اس امر کی طرف لطیف ایما کہ مسلمان کے لئے عمل صالح کے ساتھ ایمان اور فروتنی و خشوع بھی لازم ہے۔ مخصوص پیرایۂ بیان میں کفار و مومنین کی تصویر کشی اور بلیغ طرز ادا میں تبلیغ اسلامی وغیرہ۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ إِنِّي لَكُمْ نَذِيرٌ مُبِينٌ ۝ أَنْ لَا تَعْبُدُوا إِلَّا

ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کے پاس (یہ کہہ کر) بھیجا کہ میں تم کو صاف صاف ڈرانے والا ہوں تم اللہ کے سوا کسی کی پرستش

اللَّهَ ۖ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ أَلِيمٍ ۝ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ

نہ کرو مجھے تمہارے متعلق تکلیف دہ دن کے عذاب کا اندیشہ ہے تو نوح کی قوم میں سے کافر سردار بولے

قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا

ہم تو تم کو اپنی طرح آدمی جانتے ہیں اور ہمارے خیال میں تو تمہارے پیرو بجز ان لوگوں کے جو ہم میں رذیل ہیں

بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ۝

اور کوئی ہوا نہیں اور وہ بھی سرسری نظر سے اور ہمیں اپنے اوپر تم لوگوں کی کوئی بڑائی بھی نظر نہیں آتی بلکہ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں

تفسیر مذکورۂ بالا آیات میں ترغیب، ترہیب، کفار و اہلِ ایمان کی تفصیل اور اسلام کی تبلیغ بلیغ ترین طرز ادا کے ساتھ کی گئی تھی۔ چونکہ تبلیغ و دعوت کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ نافرمانوں اور سرکشوں کا نتیجہ بد ظاہر کیا جائے تاکہ ان کے عبرتناک حالات پڑھنے کے بعد حاضرین و مخاطبین کو نصیحت ہو اور وہ سرتابی چھوڑ دیں۔ اسی مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآن پاک میں مختلف مقامات پر مختلف قصص بیان فرمائے ہیں بلکہ بعض قصوں کو تو چار چار، پانچ پانچ مقام پر قدرے تطویل، اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کہیں مفصل کہیں مختصر لیکن مقتضائے حال کا لحاظ رکھا ہے۔ ہر موقعہ پر اتنا ہی قصہ بیان کیا ہے جتنی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود تکرار و اعادہ کے جدید لذت اور نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ حسب معمولِ قرآنی یہاں بھی چند قصوں کو مختصر ذکر کیا ہے اور ابتداء حضرت نوحؑ کے قصہ سے کی ہے۔ کیونکہ نوحؑ آدم ثانی تھے۔ آپ سے دوبارہ نسلِ انسانی چلی۔ اس کے علاوہ آپ کا قصہ بھی اپنی نوعیت اور عبرت انگیزی میں یکتا۔

حضرت نوح کا قصہ توریت میں بھی مفصل آیا ہے، مگر بعض مقامات پر بیانِ قرآن سے کچھ مختلف ہے۔ تفسیر آیات کے وقت ہم جابجا اختلاف اور اس کے مواقع کا تذکرہ کریں گے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جب حضرت نوح نے قوم میں شرک اور بداعمالی کو پھیلتے دیکھا تو شروع میں توحید دل کی طرف راغب کیا اور اہلِ توحید کی نجاتِ آخرت اور دوامی سعادت کا ذکر کیا۔ جب کسی طرح کی ترغیب مفید نہ ہوئی تو عذابِ الٰہی سے ڈرایا۔ کیونکہ انسان فطرتاً حصولِ منفعت سے زیادہ دفعِ مضرت کا خواستگار ہوتا ہے۔ خوف کا مرتبہ طمع سے بڑھ کر ہے۔ طمع اختیاری ہوتی ہے اور خوف مجبور کن۔ غرض بشیر و ترغیب جب بے سود ثابت ہوئی تو مجبوراً انذار و ترہیب کی طرف آپ مائل ہوئے اور انذار بھی دو عذابوں سے۔ عذابِ دنیا یعنی طوفان سے اور عذابِ آخرت یعنی دوزخ سے۔ مگر قوم نے ایک نہ سنی۔ سرچشمہ کفر ہمیشہ غرور ہوتا ہے۔ غرور ہی انکار کا اصل مرکز ہے اور غرور کا سبب دولت و مال ہے، اس لئے غریبوں نے تو کسی قدر آپ کی فہمائش کا اثر لیا مگر دولت مند طبقہ پر کوئی نصیحت کارگر نہ ہوئی۔ بجائے فرماں پذیری کے سردارانِ قوم اور مالدار لوگ کھلم کھلا انکار کر گئے۔ اور نہ صرف انکار بلکہ تین شبہے بھی حضرت نوح کی رسالت پر ظاہر کئے۔ اول تو یہ کہ تم فرشتہ نہیں، کوئی اور غیبی مخلوق نہیں ہماری طرح انسان ہو۔ کوئی پس پردہ طاقت تمہارے ساتھ نہیں پھر کیا وجہ کہ تم رسالت کا دعویٰ کرتے ہو۔ دوسرے یہ کہ تمہاری پیروی کرنے والے اور تمہارا ساتھ دینے والے صرف نچلے طبقہ کے لوگ ہیں۔ کوئی باوجاہت بھلا آدمی تمہارے گروہ میں داخل نہیں پھر ہم تمہارا ساتھ دے کر اور تمہارا قول مان کر کیوں ذلیل ہوں۔ اس کے علاوہ نچلے طبقہ نے بھی بغیر سوچے سمجھے اور تامل کئے بغیر تمہاری پیروی اختیار کی ہے۔ ان میں اول تو بصیرت ہی اتنی نہیں کہ اچھے برے اور صحیح غلط میں تمیز کر سکیں اور جو کچھ سمجھ ہے بھی تو اس سے انھوں نے کام نہیں لیا۔ تیسرے یہ کہ تم کو اور تمہاری جماعت کو ہم پر کیا فضیلت حاصل ہے۔ تم ہماری طرح دولتمند نہیں۔ تمہارے اندر ہماری ایسی تہذیب نہیں۔ ہمارے ایسے آدابِ معاشرت نہیں۔ پھر کس طرح اعلیٰ ادنیٰ کی پیروی کر سکتا ہے۔

مقصودِ بیان عام طور پر جاہل طبقہ معیارِ فضیلت دولت مندی کو قرار دیتا ہے۔ انکار و کفر کی اصل جڑ بھی دولت مندی ہے۔ کوتاہ فہم لوگ ہمیشہ سے یہ سمجھتے چلے آئے ہیں کہ مقتدا اور پیشوا کو کسی اور غیبی مخلوق کا فرد ہونا چاہئے انسان نہ ہونا چاہئے اور اس کے ساتھ خفیہ طاقت کا ہونا بھی ضروری ہے پھر اس کا مالدار ہونا بھی لازم ہے۔ غریب تابع کی اذان کو بھی غلط کہا جاتا ہے۔ آیات میں اس طرف اشارہ ہے کہ حق کی طرف میلان کرنے والے زیادہ تر غریب ہی لوگ ہوتے ہیں اور معیارِ فضیلت دولت نہیں بلکہ حق پرستی ہے۔

حضرت نوح نے کفار کے تینوں شبہات کا ازالہ انتہائی حسنِ کلام کے ساتھ کیا اور فرمایا:۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ

نوح نے کہا اے میری قوم دیکھو تو سہی اگر میں اپنے رب کی طرف سے دلیل پر قائم ہوں اور اس نے اپنی طرف سے مجھ کو رحمت عطا کر دی اور

عَلَيْكُمْ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا اِنْ

تم کو وہ نہ سوجھی تو کیا اس کو ہم تمہارے سر منڈھ دیں حالانکہ تم اس سے بیزار ہو۔ اے میری قوم میں اس پر تم سے مال کا بھی تو خواستگار نہیں ہوں میرا

اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ

اجر تو اللہ ہی کے ذمہ ہے اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اُن کو نکال بھی نہیں سکتا۔ بلاشبہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں مگر بات یہ ہے کہ میں

قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ مَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ؕ اَفَلَا

خیال میں تم نادان قوم ہو ۔ اے میری قوم اگر میں ان کو نکال دوں تو اللہ کے مقابلہ میں میری کون مدد کرے گا کیا تم

تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ

غور نہیں کرتے ۔ میں تم سے یہ تو نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں نہ

لَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ

میں اپنے آپ کو فرشتہ کہتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ جو لوگ تمہاری آنکھوں میں حقیر ہیں ان کو اللہ بھلائی عطا نہ

خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۚ ۖ اِنِّيْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

کرے گا جو کچھ اُن کے دلوں میں ہے اللہ ہی اُس کو خوب جانتا ہے اگر میں ایسا کہوں تو میں ظالم ہوں

تفسیر (۱) تم کہتے ہو کہ میں تمہاری طرح انسان ہوں پھر تم کو خدا نے کیوں رسول بنایا ؟ تو بے شک یہ صحیح ہے کہ میں انسان ہوں مجھے نبوت کا کوئی ذاتی استحقاق نہیں ، لیکن یہ اللہ کی عنایت اور رحمت ہے وہ جسے چاہے عطا فرمائے ، اس نے مجھے راہ راست دکھائی ۔ معجزات اور نبوت عطا کی تم کو کھلا ہوا سیدھا راستہ اور معجزات بھی نہ سوجھیں تو میرا اس میں کیا قصور ۔ میں زبردستی حقانیت و راستی کو تمہارے سر تو ڈال نہیں سکتا ۔ رہی یہ بات کہ شاید تم خیال کرو کہ نوح نبوت و ہدایت کا دعویٰ کر کے ہماری دولت چھین کر مال دار بننا چاہتا ہے تو یاد رکھو میں تم سے بالکل مال کا خواستگار نہیں ہوں ، تم سے کسی قسم کا معاوضہ نہیں چاہتا اللہ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں اُسی سے اجر کا طالب ہوں ۔

(۲) تم کہتے ہو کہ غریب و کمزور طبقہ نے میرا ساتھ دیا اور وہی میرے ساتھ ہے اور تم ان سے اختلاط گوارا نہیں کرتے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب یہ لوگ موفق ہوگئے ، میری رسالت کا انھوں نے اقرار کر لیا اور اپنے پچھلے عقائد چھوڑ دیئے اور میرے گروہ میں داخل ہوگئے اور یہ یقینی بات ہے کہ ان کو بھی ایک روز خدا کے سامنے جانا ہے ، ان کے لئے بھی عذاب و ثواب اور نجات و ہلاکت مقرر ہے تو پھر ان کو میں کس طرح اپنے پاس سے نکال سکتا ہوں ۔ یہ تمہاری نادانی ہے کہ تم ان کو انسانیت سے خارج سمجھتے ہو ۔ یہ بھی انسان ہیں اور انسانوں کی طرح مکلف ہیں ۔ اگر میں ان کو اپنے پاس سے علیحدہ کر دوں گا تو غضب الٰہی نازل ہوگا اور اللہ کی ناراضگی سے پھر مجھے کون بچائے گا ۔ تم ان کو ذلیل جانتے ہو اور تمہاری آنکھیں ان کو رذیل دیکھتی ہیں تو یہ تمہاری غلطی ہے ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کو کبھی دنیا و آخرت میں کوئی خیر عطا نہیں کرے گا ۔ مجھے کیا معلوم ان کے دلوں کی کیا حالت ہے ؟ ان کے دلوں میں ایمان ہے یا نہیں ۔ بظاہر تو یہ مومن ہیں اور مومن ہونا ان کے استحقاق خیر کی دلیل ہے پھر تمہاری طرح میں ان کو کس طرح رذیل سمجھ کر اپنے پاس سے دور کر سکتا ہوں ۔

(۳) رہی میری فضیلت تو ظاہر ہے کہ مجھے نہ تو فرشتہ ہونے کا دعویٰ ہے نہ غیب دانی کا نہ میں مدعی ہوں کہ میرے پاس اللہ کے غیبی خزانے موجود ہیں یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ نبی کو فرشتہ یا غیب داں ہونا چاہیئے اور نہ یہ ضروری ہے کہ رسول کے پاس دولت کے انبار لگے ہوں اور وہ مال دار طبقہ میں پیدا ہو ۔

مقصود بیان کھلی ہوئی حقانیت بھی کور بصیرت اشخاص کو نہیں سوجھتی ۔ ہدایت و ضلالت اللہ کا کام ہے ۔ انسان کا خود اس معاملہ میں ارادہ ہونا ضروری ہے ۔ نبی کا کام نہیں کہ زبردستی کسی کو راہِ راست پر کھینچ لائے ۔ نبوت وہبی چیز ہے اختیاری

نہیں۔ جاہلوں کے جواب میں حلم اور بردباری سے کام لینا اخلاق نبی ہے۔ نبی کسی مال و حکومت کا خواستگار نہیں ہوتا۔ غریب طبقہ اگر مومن ہو گیا ہو تو اس مالدار طبقہ سے بہتر ہے کہ جو کافر ہو۔ مومن غریب ہی انبیاء کی صحبت کا زیادہ مستحق ہے۔ دولت و افلاس کو معیار بلندی و پستی قرار دینا نادانی ہے۔ نبی نہ فرشتہ ہے نہ غیب داں نہ خزائن قدرت کا مالک۔ معیار سعادت ایمان ہے جو دلوں کے اندر ہوتا ہے اور دلوں کی حالت اللہ ہی خوب جانتا ہے وغیرہ۔

قَالُوْا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَکْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ کُنْتَ مِنَ

قوم والے بولے نوح تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑا کیا اگر تم سچے ہو تو جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو

الصّٰدِقِیْنَ ○ قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْکُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ○ وَ

اُس کو لے آؤ نوح نے کہا اگر اللہ چاہے گا تو اس کو لے آئے گا اور تمہارا قابو نہیں چلتا اگر

لَا یَنْفَعُکُمْ نُصْحِیْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَکُمْ اِنْ کَانَ اللّٰهُ یُرِیْدُ اَنْ

اللہ تم کو بے راہ چلانا چاہے تو میں کتنی ہی تم کو نصیحت کرنا چاہوں مگر بے سود

یُّغْوِیَکُمْ ؕ هُوَ رَبُّکُمْ ۫ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

ہوگی وہی تمہارا رب ہے اور اُسی کے پاس تم کو لوٹ کر جانا ہے

تفسیر آیت کا مطلب ظاہر ہے کہ جب کفار حضرت نوحؑ کے پرشوکت جواب سے خاموش ہو گئے اور کچھ جواب نہ دے بن پڑی تو ہٹ اور ضد پر اتر آئے اور جاہلانہ طور سے کہنے لگے نوح تم بڑے جھگڑالو ہو۔ تم نے توحید نبوت اور معاد کے متعلق جھگڑے کو بڑا طول دیا۔ اب مزید سوال جواب کی ضرورت نہیں جو کچھ تم سے ہو سکے کر دکھاؤ۔ تم ہم کو ناگہانی آفت کے آنے سے ڈراتے ہو۔ اگر سچے ہو تو موعود آفت ہمارے سر پہ لے آؤ۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا لوگو! عذاب اور آفت کا لانے والا تو اللہ ہی ہے۔ جب خدا اپنا عذاب بھیجے گا تو تمہارا کوئی قابو اس کے مقابلہ میں نہ چل سکے گا۔ میں نے تم کو نصیحت کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ تم ازلی گمراہ ہو تو میں کتنی بھی خیر خواہی کرنی چاہوں تو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ تمہاری ضلالت و ہدایت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے کیوں کہ وہی تمہارے مبداء و معاد کا مالک ہے۔

مقصود بیان کفر و ایمان بارادہ الٰہی ہے۔ اللہ کسی کے کفر کو گوارہ نہیں فرماتا، لیکن اس کی مشیت کے بغیر بندہ مومن ہو بھی نہیں سکتا۔ مومن بنانا اور کفر کے دائرہ سے نکالنا نبی کی قدرت سے بھی خارج ہے۔ جب انسان دلائل کے مقابلے میں لاجواب ہو جاتا ہے تو جاہلانہ ہٹ پر اُتر آتا ہے۔ نبی اُمت کا خیر خواہ ہوتا ہے اگرچہ لوگ اس کو خیر خواہ نہیں سمجھتے۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَیْتُهٗ فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ○ (ع)

(اے محمد) کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ نبی نے قرآن کو خود بنا لیا ہے تم کہہ دو کہ اگر میں نے خود بنا کر دروغ بندی کی ہو تو میرا جرم میرے ذمہ ہے مگر تمہارے جرم میں بری الذمہ ہوں

تفسیر مقاتل کے نزدیک یہ کلام حضرت نوحؑ کے قصہ میں بطور جملہ معترضہ کے آگیا ہے، کفار مکہ کے حق میں نازل ہوا ہے اور روئے خطاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہے۔ ابن کثیر نے اسی قول کو پسند کیا ہے۔ امام رازی کے نزدیک حضرت نوحؑ کے قول کا تکملہ ہے۔ کیونکہ دوران قصہ نوحؑ میں کفار مکہ کی حالت کا بیان اور رسول پاکؐ کو خطاب فرمانا اصول بیان کے خلاف ہے۔ مطلب ظاہر ہے کہ حضرت نوحؑ نے بطور اتمام حجت فرمایا۔ اگر میں سچا ہوں اور تم میری تکذیب کر رہے ہو تو لامحالہ تم کو اس کی سزا ملے گی اور اگر میں نے افتراء بندی اور دروغ تراشی کی ہے تو اس کا وبال مجھ پر پڑے گا تم پر اس کا وبال نہ آئے گا۔ پھر خواہ مخواہ میری تکذیب کرتے ہو۔

وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَن يُؤْمِنَ مِن قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ آمَنَ فَلَا

نوح کے پاس وحی بھیجی گئی تھی کہ تمہاری قوم میں سے سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لا چکے ہیں اور لوگ ہرگز ایمان نہ لائیں گے لہٰذا تم

تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا

اُن کی حرکات کا غم نہ کرنا اور ہمارے سامنے ہمارے حکم کے مطابق کشتی بناؤ اور

تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ۝ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ

ظالموں کے بارے میں مجھ سے بات نہ کرو کیونکہ اُن کو ضرور غرق کیا جائیگا نوح کشتی بنا رہے تھے اور جب کبھی ان کی طرف سے ان

مَلَأٌ مِّن قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ ۚ قَالَ إِن تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ ۝

کی قوم کے کچھ سردار گزرتے تھے تو اُن کا مذاق اڑاتے تھے نوح کہتے تھے اگر تم اب ہم پر ہنستے ہو تو جس طرح تم ہمارا مذاق اڑا رہے ہو ہم بھی ضرور تمہارا مذاق اڑائیں گے

فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ۝

آگے تم کو معلوم ہو جائیگا کہ کس پر رسوا کرنے والا عذاب آئے گا اور دوامی عذاب نازل ہوگا

تفسیر جب اتمام حجت ہو چکا اور کوئی نصیحت سودمند نہ ہوئی تو حضرت نوحؑ کو قوم کی تباہی کا بڑا غم ہوا۔ وحی آئی نوحؑ ان لوگوں کے کرتوت کا کچھ غم نہ کرو، جو لوگ ایمان لے آئے لے آئے آئندہ کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ تبلیغ ختم کرو اور ہماری وحی کے علم کے مطابق کشتی بنانا شروع کر دو۔ حضرت نوحؑ نے اپنے بیٹے کنعان کے متعلق عرض کیا تو ارشاد ہوا نوح کسی ظالم ناشناس کے متعلق کچھ نہ کہو۔ ہر ظالم کے ڈوبنے کا قطعی مبرم حکم ہو چکا۔ غرض حضرت نوحؑ نے کشتی بنانی شروع کی اور بروایت ابن عباس دو سال تک بناتے رہے۔ کشتی کتنی لمبی چوڑی اور کتنی اونچی تھی؟ اور کس لکڑی کی تھی اس کی تفصیل اسرائیلی لٹریچر میں مختلف طور پر آئی ہے اور چونکہ کوئی قول یقینی نہیں، اس لئے ہم کو اس کے ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ بہرحال حضرت نوحؑ جس وقت کشتی بناتے تھے تو کور باطن کافر آپ کا مذاق اڑاتے تھے اور کہتے تھے نوحؑ اب تک تم پیغمبر تھے اب بڑھئی ہو گئے۔ کیسے دیوانے ہو۔ پانی کہاں ہے دریا ہے دور خشکی میں ناؤ کیسے چلے گی۔ حضرت نے جواب دیا اب تو تم ہم سے مذاق کر رہے ہو کیونکہ حقیقت تمہاری نظروں سے اوجھل ہے۔ عنقریب ہم تمہارا مذاق اڑائیں گے تم کو کچھ ہی زمانے کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ دوامی اور لازوال عذاب کس پر نازل ہوتا ہے۔ محمد اسحاق نے بروایت عبید بن عمیر لیثی بیان کیا ہے کہ حضرت نوحؑ کی قوم آپ کو بہت زیادہ تکلیفیں دیتی، لیکن آپ معاف فرما دیتے اور بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے پروردگار یہ لوگ نادان ہیں ان کو معاف فرما دے۔ جب قوم کی سرکشی حد سے بڑھ گئی اور حضرت پر سختیاں بہت زیادہ ہونے لگیں تو بارگاہ خداوندی میں شکایت کی اور قوم کے حق میں بددعا کی اسی وقت عذاب کا حکم ہوا اور حضرت نوحؑ کے پاس مذکورۂ بالا وحی نازل ہوئی۔

مقصودِ بیان ظالموں اور حق ناشناسوں پر رحم کھانا اور ان کی تباہی پر غم کرنا نہ چاہیئے۔ حضرت نوحؑ کو بذریعہ وحی معلوم ہو گیا کہ آئندہ کوئی ایمان لانے والا نہیں۔ نوحؑ نے بعض کافروں کی نجات کی خواستگاری کی تھی، لیکن منظور نہ ہوئی اور اہلِ ظلم کے لئے دُعا کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ ظاہر پرست، کور باطن اور حقیقت ناشناس ہوتے ہیں، اس لئے اہلِ حق و معرفت کا مذاق اڑاتے ہیں وغیرہ۔

حَتّٰىٓ اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ

یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ پہنچا اور تنور جوش مارنے لگا تو ہم نے کہا کہ سوا ان لوگوں کے جن کو غرق ہونے کا پہلے حکم ہو چکا ہے ہر

اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ○

قسم میں سے دو دو نر و مادہ اور اپنے گھر والے اور مسلمان سوار کر لو نوح کی معیت میں سوا چند آدمیوں کے کوئی ایمان نہ لایا تھا

وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَهِيَ

نوح نے کہا کشتی میں سوار ہو جاؤ اللہ کے نام ہے اُس کا چلنا اور ٹھہرنا میرا رب بلاشبہ غفور رحیم ہے کشتی

تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ

اُن کو پہاڑوں کی طرح لہروں میں لئے جا رہی تھی اُس وقت نوح کا بیٹا ایک کنارے پر تھا نوح نے اس کو آواز دے کر کہا بیٹے

ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ○ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ

ہمارے ساتھ سوار ہو جا کافروں کے ساتھ نہ رہ وہ بولا میں پہاڑ کی پناہ لے لوں گا وہ مجھے پانی

مِنَ الْمَآءِ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ وَحَالَ بَيْنَهُمَا

سے بچا لے گا نوح نے کہا آج خدا کے قہر سے کوئی بچانے والا نہیں ہاں جس پر خدا خود رحم کرے (وہی بچ سکتا ہے) اتنے میں دونوں

الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ○ وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ

کے درمیان موج حائل ہو گئی اور وہ ڈوبنے لگا اور حکم دیا گیا اے زمین اپنا پانی جذب کر لے اور اے آسمان تھم جا پھر

وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○ الربع

پانی سکھا دیا گیا اور کام تمام کر دیا گیا جودی پر کشتی جا ٹھہری اور کہہ دیا گیا کہ ظالم لوگ دور ہوں

تفسیر آیات کا مطلب واضح ہے۔ ہم تحقیق اجزاء کے لئے چند امور ذکر کرتے ہیں۔ (۱) تنّور کے معنی میں اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک تنور کے معنی ہیں روئے زمین۔ تورات میں بھی کل سطح زمین سے پانی کے اُبلنے کا تذکرہ ہے۔ امام رازی نے اسی قول کو پسند کیا ہے۔ ابن عباس، عکرمہ، زہری اور ابن عیینہ کی یہی روایت ہے۔ تنّور کشتی کے وسطی نشیبی حصہ کو کہتے ہیں، جہاں پانی جمع ہو جاتا ہے۔

یہ قول حسن بصری کا ہے۔ تنوّر کے معنی ہیں طلوع فجر یعنی جب نور کا تنور سا ہوگیا یہ قول حضرت علی کا ہے۔ تنور سے مراد کوفہ کی مسجد ہے یعنی جہاں اب مسجد کوفہ ہے وہ مقام مراد ہے یہ قول مجاہد کا ہے۔ مجاہد سے یہ بھی روایت ہے کہ تنور کا مقام کوفہ کے اندر داخل ہونے والے کے دائیں جانب باب کندہ کے متصل واقع ہے۔ شعبی قسم کھا کر کہتے تھے کہ ناحیۂ کوفہ ہی سے تنور اُبلا تھا۔ تنور (اونچی زمین یا مرتفع مقام کو کہتے ہیں۔ یہ قول قتادہ کا ہے۔ تنور اُس چشمہ کا نام ہے جس کو عین الوردہ کہا جاتا ہے اور جو ملک شام کے ایک جزیرہ میں واقع ہے۔ بکذا روی عن عکرمہ ومقاتل۔ تنور سے یہی روٹی پکانے کا تنور مراد ہے۔ قالہ عطیہ وحسن واکثر المفسّرین۔ نحاس نے فرمایا مذکورہ اقوال میں باہم اختلاف نہیں کیونکہ پانی ضرور روٹی پکانے کے تنور سے نکلنا شروع ہوا۔ آگ کے مقام سے پانی نکلنا کرشمۂ قدرت اور معجزۂ نوحؑ تھا۔ اس کے بعد تمام روئے زمین سے پانی اُبلنا شروع ہوا اور آسمان سے جھماجھم برسنے لگا۔ قرآن میں آیا ہے۔ فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا۔ ہوسکتا ہے کہ فجر کے وقت اُبلنا شروع ہوا ہو اور سب سے زیادہ طوفان عین الورد سے پیدا ہوا ہو۔ میرے نزدیک بھی تنور کے حقیقی معنی مراد لینا اولیٰ ہے۔

(۲) نوح نے اپنے بیٹے کو آواز دے کر کشتی میں سوار ہونے کو کہا مگر وہ سوار نہ ہوا اور ڈوب گیا۔ اس کا نام مفسرین اہل اسلام نے کنعان بتایا ہے اور کنعان کی ماں کا نام راعلہ لکھا ہے اور تصریح کی ہے کہ راعلہ بھی اپنے بیٹے کے ساتھ غرق ہوگئی کیوں کہ وہ بھی کافرہ تھی۔ لیکن تورات کے سفر پیدائش میں لکھا ہے کہ نوح کے صرف تین بیٹے تھے۔ حام، سام، یافث اور ان تینوں نے کشتی میں سوار ہوکر طوفان سے نجات پائی۔ البتہ کنعان حام کا بیٹا اور نوحؑ کا پوتا تھا جو غرق ہوا۔ میرے نزدیک تورات کی تصریح صرف اختراعی ہے اور قرآن کا بیان صحیح ہے کیونکہ تورات کی صراحتیں خود باہم مختلف ہیں۔ تورات کے ۹ باب میں ہے کہ حام نے اپنے باپ نوح کو بحالت مخموری خیمہ کے اندر برہنہ پایا جس پر سام اور یافث نے اس پر کپڑا ڈھانک دیا۔ ۱۸ تا ۲۳ پھر ۲۴ میں ہے کہ جب نوح شراب کے نشہ سے ہوش میں آیا تو جو اس کے چھوٹے بیٹے نے اس کے ساتھ کیا تھا اسے معلوم کیا تب وہ بولا کنعان ملعون ہو۔ وہ اپنے بھائیوں کے غلام کا غلام ہوگا (۲۶ پھر ۲۷) خدا یافث کو پھیلائے وہ سام کے ڈیروں میں رہے اور کنعان اس کا غلام ہو۔ اب سوچنا چاہیئے کہ چھوٹے بیٹے سے کون مراد ہے۔ حام یا کنعان؟ اگر حام نے برہنگی دیکھی تو کنعان غریب کا کیا قصور جو اس پر لعنت کی گئی اور سام کو حام کا غلام کیوں بنایا گیا۔ اگر کنعان کو حام کا بیٹا قرار دیا جائے اور حام کے لئے نوح نے بددعا کی، اس لئے کنعان بھی ملعون قرار پایا۔ تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ کنعان کے تین بھائی اور بھی تھے۔ مصر، فوط اور کوش پھر فقط کنعان ہی کیوں ملعون قرار پایا۔ اس تقریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ چھوٹے بیٹے سے کنعان ہی مراد ہے اور یہی تصریح تفسیر اہل اسلام کے مطابق ہے۔

(۳) قرآن پاک نے جودی پہاڑ پر کشتی کا ٹھہرنا ظاہر کیا ہے، مگر تورات کے سفر پیدائش باب ۷، ورس ۴ میں صراحت ہے کہ ارارات پر کشتی ٹھہری۔ اس کی تحقیق پادری میتھر نے لغات بائبل کے صفحہ ۶۰-۶۱ پر کی ہے کہتے ہیں ارارات سرزمین آرمینیا کا ایک صوبہ ہے۔ رہی یہ بات کہ آرمینیا کے کس پہاڑ پر کشتی ٹھہری؟ تو سکندر کے زمانے میں بریسس نے صراحت کر دی ہے کہ کوہستان کردستان میں جودی نامی ایک پہاڑ ہے جو آرمینیا کے جنوبی جانب ہے، اسی پہاڑ پر کشتی ٹھہری۔ یہاں ایک خانقاہ بھی تعمیر ہوئی تھی جو کشتی کی خانقاہ کہلاتی تھی۔ سنہ ۷۷۶ء میں بجلی نے اس کو نابود کردیا، لیکن شمال کی جانب ایک اور پہاڑ ہے جس کو یورپین ارارات اور آرمینی نے مسیس اور ترک گرداغ کہتے ہیں اور اہل فارس کوہِ نوح کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ولیم بنک اپنے جغرافیہ میں لکھتے ہیں کہ شہر اردن جو کبھی آرمینیا کا پایۂ تخت تھا اور اب ایک قصبہ کی حیثیت رکھتا ہے اس کے پاس کوہ ارارات واقع ہے جس پر کشتی ٹھہری تھی۔ صاحب مراصد نے جودی کا محل وقوع علاقہ موصل دجلہ کے شرقی جانب قرار دیا ہے۔ مذکورۂ بالا صراحات سے ثابت ہوتا ہے کہ کوہ ارارات اور کوہ جودی کا سلسلہ ملتا ہے اور ارارات آرمینیا کا ایک حصہ ہے۔ کوہستان ارارات کا سلسلہ کردستان کے پہاڑوں سے ملتا ہے۔ ارارات اور کوہستان جارجیہ کو ملانے والا جودی ہے۔ جودی پر قیام کے بعد جب پانی خشک ہوگیا تو حضرت نوح اہل وعیال کو لے کر علاقہ آرمینیا کے ایک گاؤں میں آکر رہے۔ اس گاؤں کا نام ارگوری مشہور رہا۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں آتش فشانی اور زلزلہ کی وجہ سے یہ گاؤں تباہ ہوگیا۔

(۴) طوفان تمام سطح زمین پر آیا تھا یا کسی خاص ملک میں اس کے متعلق اہل تاریخ کا اختلاف ہے۔ ابن خلدون وغیرہ نے لکھا ہے کہ لوگوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ طوفان نوح کل روئے زمین پر آیا تھا اور کشتی میں بیٹھنے والوں کے علاوہ تمام دنیا کی آبادی تباہ ہوگئی تھی پھر کشتی والوں میں سے سوائے نسل نوح کے اور

لوگ بلا ولد مر گئے۔ تمام زمین پر نوح کی ہی نسل پھیلی، اسی لئے آپ کو آدم ثانی کہا جاتا ہے۔ ابن اثیر نے کامل میں لکھا ہے کہ مجوسی عموماً طوفان نوح سے انکار کرتے ہیں۔ ہاں بعض مجوسی اقرار کرتے ہیں تو وہ بھی فقط ملک بابل میں طوفان آنے کے قائل ہیں۔ کیومرث کی اولاد مشرق میں رہا کرتی تھی وہاں تک طوفان نہیں پہنچا۔ اسی طرح اہلِ ہند، ایرانی اور چینی اس طوفان کا اقرار نہیں کرتے۔ بعض اہلِ فارس کہتے ہیں کہ طوفان ضرور آیا تھا، مگر عام نہ تھا۔ عقبہ حلوان سے آگے نہیں بڑھا۔ مقریزی نے خطط میں لکھا ہے کہ تمام اہلِ کتاب خواہ یہودی ہوں یا عیسائی یا مسلمان اس امر پر متفق ہیں کہ اولادِ آدم کا ابقا صرف حضرت نوح کی نسل سے ہوا، مگر مصری، ہندی، ایرانی اور چینی طوفان کے قطعاً منکر ہیں۔ ان بعض قائل ہیں تو وہ بھی اتنے کہ ملک بابل اور اس کے غربی حصو میں طوفان آیا تھا۔ اہلِ فارس کے نزدیک کیومرث آدم اول تھا جو مشرقی ملکوں میں رہتا تھا۔ اس کی اولاد طوفان سے غرق نہیں ہوئی۔

مقصودِ بیان امرِ الٰہی کے مقابلے میں کل دنیا کی کوئی حقیقت نہیں۔ آگ سے پانی نکال کر خدا تعالیٰ اپنے امر سے کل دنیا کو تباہ کر سکتا ہے۔ سرکشی اور کفر کا نتیجہ سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں۔ نبی کی نافرمانی موجب بربادی ہے۔ نبی مستجاب الدعوات ہوتا ہے۔ حضرت نوح کو حکم تھا کہ پرندوں، درندوں اور چرندوں کی ہر نوع کا ایک ایک جوڑا کشتی میں سوار کر لو۔ نجات پانے والے صرف اہلِ کشتی ہی تھے۔ اللہ کا نام لے کر کام کرنا برکت، سعادت اور نجات کا باعث ہے۔ مجوس پرست انسان مخلوق کو اپنا پشت پناہ خیال کرتا ہے۔ جس طرح کنعان نے پہاڑ پر بھروسہ کیا۔ پیغمبر زادگی بغیر توحید و فرماں برداری کے بے سود ہے۔ نسب موجب نجات نہیں بلکہ عمل باعثِ عافیت ہے۔ آسمان و زمین سب حکمِ الٰہی کے تابع ہیں۔ اس قصہ میں ان مسلمانوں کے لئے درسِ بصیرت ہے جو ایک اللہ کو چھوڑ کر نام نہاد فقیروں سے مدد چاہتے ہیں اور دربدر جبیں سائی کرتے پھرتے ہیں۔ بالآخر عذابِ الٰہی سے کوئی بچانے والا نہیں۔ ہاں اسی سے رحم کی التجا کی جائے تو اُمید ہے کہ نجات ہو جائے وغیرہ۔

وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ

نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا اے میرے رب! میرا بیٹا بھی میری اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے تو سب سے

أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ۝ قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ ۖ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ

بڑا حاکم ہے　اللہ نے فرمایا نوح! وہ تیری اہل میں سے نہیں ہے۔ اس کے عمل اچھے

صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۖ إِنِّي أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ

نہیں ہیں۔ جس بات کا تجھے علم نہیں اس کے متعلق سوال نہ کر میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ تو نادانوں میں

الْجَاهِلِينَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ ۖ

شامل نہ ہو　نوح نے عرض کیا پروردگار جس بات سے میں ناواقف ہوں اس کے متعلق سوال کرنے سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں

وَإِلَّا تَغْفِرْ لِي وَتَرْحَمْنِي أَكُن مِّنَ الْخَاسِرِينَ ۝

اگر تو مجھ کو نہ بخشے گا اور مجھ پر رحم نہ کرے گا تو میں خسارہ میں پڑ جاؤں گا۔

تفسیر اللہ نے حضرت نوح سے وعدہ فرمایا تھا کہ میں تیری اہل کو غرق نہیں کروں گا۔ کنعان باپ کے حکم کے باوجود کشتی میں نہ بیٹھا۔ حضرت نے فہمائش کی مگر اس نے ایک نہ مانی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک موج آئی حضرت نوح اور کنعان کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ ڈوبنے لگا۔ باپ کا دل

بیتاب ہو گیا۔ اللہ کا وعدہ یاد آیا پکار اٹھے پروردگار تیرا وعدہ سچا ہے تو نے میرے اہل کو بچانے کا وعدہ کیا تھا میرا بیٹا میرے اہل میں داخل ہے۔ اس کو بچا دے۔ حکم ہوا نوح بے وقوف نہ بنو تمہارے اہل میں وہ لوگ داخل ہیں جو تمہارے پیرو ہوں جن کے کرتوت اچھے ہوں یہ تمہارے اہل میں داخل نہیں جس چیز کا تم کو علم نہیں اس کے متعلق آئندہ درخواست بھی نہ کرنا حضرت نوح نے یہ عتاب آمیز حکم سنتے ہی اللہ کی معافی چاہی اور اپنے قصور کا اعتراف کیا کنعان غرق ہو گیا۔
بعض لوگ کہتے ہیں کہ کنعان نوح کا بیٹا نہ تھا بلکہ حرامی تھا اس لئے اس کو نوح کی اہل میں سے قرار نہیں دیا گیا مگر یہ غلط ہے۔ نوح کے اہل میں نہ قرار دینے کی وجہ صرف خرابی عمل ہے۔ خرابی عمل سے نسبی رشتہ تو قطع نہیں ہوتا۔ حضرت نوح کی نظر نسبی رشتہ پر تھی۔ مگر مدار نجات نیک اعمال تھے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے کنعان کو اہل نوح میں شمار نہیں کیا۔ رہا حرامی ہونا تو اس کے ثبوت کی ضرورت ہے۔ حضرت ابن عباس نے تو صراحت کر دی ہے کہ کسی نبی کی بیوی نے زنا نہیں کیا پھر کیوں کر کنعان کو حرامی قرار دیا جا سکتا ہے۔

مقصود بیان مدار سعادت عمل ہے۔ نسبی رشتہ کوئی چیز نہیں۔ قربت نسب سے نہیں بلکہ عمل سے پیدا ہوتی ہے۔ وعدۂ الٰہی میں دروغ ناممکن ہے۔ نسبی محبت اضطراری چیز ہے جس سے انبیاء بھی خالی نہیں۔ اگر بیٹے کے اعمال بھی خلاف شرع ہوں تو اس سے قطع تعلق کر لینا چاہئے۔ خلاف شرع کوئی دعا نہ کرنی چاہئے۔ اولاد سے محبت و عداوت بھی محض اللہ کے لئے ہونی چاہئے۔ جاہلانہ بدی بلا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو مقام جاہلین سے دور فرما دیا ہے۔ حضرت نوح سے اجتہادی غلطی ہوئی اور اجتہادی غلطی بھی علم کے بعد موجب توبہ ہے۔ چنانچہ حضرت نوح نے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کر کے توبہ کی اور خدا تعالیٰ نے ان پر برکتیں نازل فرمائیں۔

قِيلَ يٰنُوحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۚ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ

حکم ہوا نوح ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ اترو تم پر اور ان جماعتوں پر جو تمہارے ساتھ ہیں برکتیں شامل ہیں اور دوسرے (کافر) فرقوں کو

ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ

ہم چند روز فائدہ اٹھانے دیں گے پھر ہماری طرف سے ان کو دردناک عذاب ہوگا (اے محمد) یہ غیب کی چند خبریں ہیں ہم تم کو بھیج رہے ہیں اس سے پہلے تم اور تمہاری قوم ان

تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ ع

سے واقف نہ تھی صبر کرو انجام بخیر پرہیزگاروں کا ہی ہوتا ہے

تفسیر طوفان کم ہوا کشتی ٹھہری، زمین خشک ہوئی۔ حضرت نوح کو اترنے کا حکم ہوا حضرت نوح کو اندیشہ ہوا کہ پانی کی وجہ سے ہر طرف عفونت پھیل گئی ہے، اگر کہیں قیام کیا جائے تو بیمار ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ پھر کھانے پینے کو کہاں سے آئے گا؟ زمین کی کل پیداوار فنا ہو گئی۔ ارشاد ہوا نوح اس کا اندیشہ نہ کرو۔ ہماری طرف سے سلامتی، جسمانی عافیت اور رزق کی برکت تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو شامل ہوگی اور فقط رزق کی برکت ہی نہیں بلکہ مختلف برکتیں نصیب ہوں گی۔ افعال و اعمال میں برکت، عمر میں برکت، زندگی میں برکت، روحانی برکت، آخرت کی برکت اور بالآخر دائمی نجات۔ البتہ کچھ قومیں ایسی ہوں گی جن کو دنیا میں عیش و آرام اور راحت و چین ملے گا۔ کچھ زمانے تک وہ مزہ اڑائیں گے۔ اور بالآخر انجام برا ہوگا، اخروی سعادت نصیب نہ ہوگی۔

مقصود بیان قانون قدرت یہ ہے کہ پھول کے ساتھ کانٹا، خیر کے ساتھ شر اور رحم کے ساتھ برا لگا رہتا ہے۔ اللہ نے پہلے ہی حضرت نوح کو بتا دیا تھا کہ اگرچہ اس وقت تمام کفار تباہ ہو گئے لیکن آئندہ قانون قدرت کے مطابق کچھ قومیں شریر اور بدکار بھی ضرور ہوں گی جن کو دنیوی زندگانی میں عیش و راحت عطا کی جائے گی مگر انجام کار عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ قرآن پاک کے اندر گزشتہ واقعات کی صحیح تفصیل اعجازی ہے۔ اہل شرک کی ایذا رسانی پر صبر کرنا انبیاء کا شیوہ ہے۔ انجام کار کامیابی اہل تقویٰ کو حاصل ہوتی ہے۔ آیت میں مسلمانوں کے لئے ایک پیام نصیحت ہے کہ اہل باطل کے عروج

غلبہ سے خوف زدہ ہو کر حق کے دامن کو نہ چھوڑنا چاہیئے۔ آخر میں فتح اہل حق کو ہی ہوگی۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ إِنْ أَنتُمْ

اور ہم نے عاد کی طرف اُن کے قومی بھائی ہود کو بھیجا ہود نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں تم سب دروغ بافی

إِلَّا مُفْتَرُونَ ۝ يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي

کرتے ہو اے میری قوم میں تم سے اس کی کوئی اُجرت نہیں مانگتا میری اُجرت اُس خدا کے ذمہ ہے جس نے مجھے

فَطَرَنِي ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ

پیدا کیا ہے کیا تم سمجھتے نہیں ہو اے میری قوم اپنے رب سے استغفار کرو توبہ کرو وہ ابر باراں تم پر

عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ ۝ قَالُوا يَا هُودُ مَا

بھیج دے گا اور قوت پر قوت تمہاری بڑھادے گا تم مجرم بن کر رُخ نہ پھیرو قوم والے بولے ہود!

جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِي آلِهَتِنَا عَن قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ۝

تم ہمارے پاس کوئی دلیل لے کر نہیں آئے تمہارے کہنے سے ہم اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہم تمہارا یقین کرنے والے ہیں

إِن نَّقُولُ إِلَّا اعْتَرَاكَ بَعْضُ آلِهَتِنَا بِسُوءٍ ۗ قَالَ إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ

ہماری رائے میں تو تم کو ہمارے کسی معبود نے بُری طرح جھپٹ لیا ہے ہود نے کہا میں خدا کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں ان سے بیزار ہوں

مِّمَّا تُشْرِكُونَ ۝ مِن دُونِهِ ۖ فَكِيدُونِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنظِرُونِ ۝ إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى

جن کو تم خدا کو چھوڑ کر شریک ٹھہراتے ہو اب تم سب مل کر تدبیریں کر ڈالو اور مجھے مہلت نہ دو میرا بھروسہ اُس اللہ پر ہے

اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُم ۚ مَّا مِن دَابَّةٍ إِلَّا هُوَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ

جو میرا اور تمہارا رب ہے ہر جاندار کی چوٹی اُسی کے دستِ قدرت میں ہے میرا رب سیدھے راستہ پر ہے۔

فَإِن تَوَلَّوْا فَقَدْ أَبْلَغْتُكُم مَّا أُرْسِلْتُ بِهِ إِلَيْكُمْ ۚ وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّي قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا

اس پر بھی اگر تم رُخ پھیرے رہو تو جو پیام دے کر مجھے بھیجا گیا ہے وہ میں تم کو پہنچا چکا میرا رب تمہاری بجائے کسی دوسری قوم کو قائم کر دے گا اور تم

تَضُرُّونَهُ شَيْئًا ۚ إِنَّ رَبِّي عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ ۝

اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے میرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے

تفسیر یہ واقعہ قوم عاد کا ہے۔ عاد دو قوموں کا نام ہے۔ عادِ اوّل اور عادِ ثانی۔ عادِ اوّل سام بن نوح کی اولاد میں سے تھے اور حضرت نوحؑ سے آٹھ سو برس بعد ان کا دور تھا۔ ان کا مسکن ملک یمن تھا۔ یمن ان کا دارالسلطنت صنعا میں انھوں نے ایک قصر تعمیر کیا تھا جس کا نام عمدان تھا۔ بقول صاحب قاموس قصر عمدان ہفت منزلہ تھا اور ہر منزل کی بلندی چالیس گز تھی۔ یہ قصر حضرت عثمان کی خلافت تک کچھ باقی تھا۔ حضرت ہود عادِ اوّل ہی کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے۔ عاد ثانی کا بادشاہ شداد مشہور تھا۔ لقمان بھی اسی میں سے تھے۔ حضرت صالح کو اسی کی ہدایت کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ علامہ ابنِ سعید نے لکھا ہے کہ شداد بن مراد بن شداد بن عاد نے حدود ملک کو بہت وسیع کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ قبط بن مصر کے ہاتھ سے جنوبی مصر کو بھی چھین کر ممالک یمن میں شامل کر کے قبط کو اپنا باجگذار بنا لیا۔

آیت کا حاصل مطلب یہ ہے کہ جب (جنوبی عرب میں) قوم عاد نے سرکشی شروع کر دی اور اس کی شرک سازی حد سے بڑھ گئی تو انھیں کی قوم میں ہود کو خدا تعالیٰ نے اپنی رسالت کے لئے انتخاب کیا۔ حضرت ہود نے توحید کی تبلیغ پر زور دلائل کے ساتھ کی۔ شرک کی تردید بلیغ طرز میں کی اور کافروں کو جو عموماً خیال ہوتا ہے کہ نبی کا مقصود نبوت کے دعویٰ سے شاید حکومت و دولت کا حصول ہے۔ اس خیال کا بھی ازالہ کیا اور چونکہ قوم عاد کاشتکار تھی۔ باغ اور کھیتی عموماً ان کے ذرائع معاش تھے اور بقول ضحاک تین سال سے بارش نہ ہوئی تھی، اس لئے حضرت ہود نے خشک سالی کو نتیجۂ نافرمانی قرار دیتے ہوئے استغفار و اطاعت کی ترغیب دے کر قحط سالی دور ہونے کا لالچ بھی دیا۔ پھر بقول عکرمہ قوم عاد کی نسل میں بھی کمی ہو گئی تھی۔ تیس سال سے پیدائش کی بہت قلت تھی۔ پیغمبر کے بشرط فرماں پذیری کثرتِ اولاد کا بھی وعدہ کیا، لیکن سرکش قوم نہ ماننے والی تھی نہ مانی۔ بجائے اطاعت کے پیغمبر کو مجنون اور مخبوط الحواس قرار دیا اور بولے ہمارے کسی دیوتا نے ناراض ہو کر تجھے پاگل بنا دیا ہے۔ ہم تیرے کہنے سے اپنے دیوتاؤں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ حضرت ہود نے کافروں کے کفر سے اظہار برأت کرتے ہوئے انتہائی جرأت کے ساتھ اعلان کر دیا کہ تم کیا اور تمہارے دیوتا کیا تم میں جتنی طاقت ہے سب صرف کر ڈالو اور بغیر کسی رعایت و مہلت کے میرے ضرر پہنچانے کی کوشش کرو۔ میرا بھروسہ محض اللہ پر ہے۔ اسی کے دستِ قدرت میں کل دنیا اور اہلِ دنیا کے تصرفات ہیں۔ اس کے بعد دھمکی بھی دی کہ اگر تم میرا کہا نہ مانو گے تو برباد کر دیئے جاؤ گے۔ سطح زمین کو تمہارے ناپاک وجود سے اللہ خالی کر دے گا۔ کافروں سے اللہ کا کوئی تعلق نہیں۔ تمہاری بجائے وہ دوسری قوموں کو اسی زمین پر آباد کر دے گا۔ اس کی زد سے تم باہر نہیں ہو۔ الخ۔

مقصود بیان لفظ اَخَاھُمْ کہنے سے اس طرف ایماء ہے کہ ہود کوئی غیر نہ تھے جن کا چال چلن عاد کو معلوم نہ ہو بلکہ انھیں میں سے تھے۔ نبی کا کام تبلیغ توحید ہے۔ توحید کے ساتھ اصلاح اعمال کا بھی وہ حکم دیتا ہے۔ حضرت ہود نے بھی دونوں باتوں کی نصیحت کی۔ درپردہ اس امر کا بھی اظہار ہے کہ مال و دولت کی کمی، خشک سالی اور اولاد کی قلت گو بظاہر کسی سبب کے تحت معلوم ہو، لیکن اس کی وجہ اللہ کی نافرمانی ہے۔ جب اللہ کسی کو مردود کرتا ہے تو وہ اپنی رائے اور گمان کو تمام حکمتِ الٰہیہ پر محیط خیال کرنے لگتا ہے۔ خدا رسیدہ انسان دنیا کی کسی طاقت و شوکت سے نہیں ڈرتا، اس کا بھروسہ فقط ذاتِ الٰہی پر ہوتا ہے وغیرہ۔

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ

جب اُن پر ہمارا عذاب آ پہنچا تو ہود کو اور ہود کے ساتھی مسلمانوں کو اپنی رحمت سے ہم نے بچا لیا اور بڑے سخت عذاب سے

عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝ وَتِلْكَ عَادٌ ۟ۙ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا

نجات دی یہی قوم عاد تھی جس نے اپنے پروردگار کی آیتوں کا انکار کیا اور اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی اور ہر سرکش

اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ

مخالف کے کہنے پر چلے نتیجہ یہ ہوا کہ اس دنیا میں بھی اور قیامت کے دن بھی اُن کے پیچھے لعنت لگادی گئی خوب سن لو

عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۝

عاد نے اپنے رب کا انکار کیا آگاہ ہو کہ ہود کی قوم عاد پر لعنت

تفسیر سرکشوں کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو قہر الٰہی جوش میں آیا، آندھی کا ایک زبردست طوفان اٹھا جس نے کل آبادی کو تہ و بالا کر دیا۔ ہزاروں لاکھوں لاشوں کے انبار گلی کوچوں میں لگ گئے، مکانوں کے اندر دب گئے، ہوا سے اڑ کر پہاڑوں اور درختوں سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ رسول پاک کے زمانے تک ان کے کھنڈر اور آثار موجود تھے۔ سر راہ سے گزرنے والے عرب ان کو دیکھتے اور چلے جاتے تھے۔ حضرت ہود کو ان کی جماعت سمیت خدا نے بچا لیا۔

ایک شبہ کا ازالہ ہود کی قوم میں سوائے حضرت ہود کے اور کوئی پیغمبر نہ ہوا پھر ان کی تباہی کو رسولوں کی نافرمانی کا نتیجہ کیوں قرار دیا اور عصوا رسلہ کیوں فرمایا؟ ایک شبہ ہے جس کا جواب دو طرح دیا گیا ہے۔ اول یہ کہ پیغمبر وقت پر ایمان لانا اس شرط پر موقوف ہے کہ اس سے پہلے کے تمام پیغمبروں کو مانا جائے۔ قوم ہود نہ صرف حضرت ہود کی تکذیب کرتی تھی بلکہ آپ سے پہلے کے کسی پیغمبر کو نہیں مانتی تھی۔ نہ نوح کو، نہ ادریس و شعیب وغیرہم کو۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ تمام پیغمبر فرض رسالت اور اصول پیغمبری میں یکساں ہیں، اس لئے اگر ایک پیغمبر کا بھی انکار کر دیا جائے تو باوجود دوسرے پیغمبروں کی تصدیق کے ایسے شخص کو تمام پیغمبروں کا منکر قرار دیا جائے گا۔ قوم ہود نے حضرت ہود کا انکار کیا کیونکہ دوسرے پیغمبروں نے ہود کی رسالت کی تصدیق کی اور جب پیغمبروں کی رسالت کی تصدیق کو نہ مانا تو گویا ان کی بھی تکذیب کی۔

مقصود بیان نجات محض رحمت الٰہی ہے۔ کسی استحقاق پر مبنی نہیں ہے۔ حضرت ہود کو ان کی جماعت سمیت خدا نے نجات دی، محض اپنے رحم و کرم سے لفظ برحمۃ میں اس طرف اشارہ ہے کہ کسی کو اپنے اعمال و اقوال پر خواہ کیسے ہی نیک ہوں گھمنڈ نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ دعویٰ نجات اعمال پر مبنی ہے نہ خرد سعادت، یہ تو فضل الٰہی ہے۔ وہ اپنی رحمت سے جس کو چاہے نجات عطا فرمائے۔ ظالم، مغرور، سرکش اور سربلند کافروں اور فاسقوں کی بات نہ ماننی چاہیئے وغیرہ۔

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ

اور ثمود کے قومی بھائی صالح کو ہم نے ان کے پاس بھیجا صالح نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو جس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اسی

اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ

نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور زمین پر آباد کیا تم اس سے استغفار کرو توبہ میرا رب

قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ۝ قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ

قریب اور دعا قبول کرنے والا ہے قوم والے بولے صالح اس سے پہلے تو ہم کو تم سے امیدیں تھیں کیا تم ہیں منع کرتے ہو اس چیز کی

أَنْ نَعْبُدَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا وَإِنَّنَا لَفِي شَكٍّ مِمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ○

ہمارے باپ دادا پرستش کرتے رہے اُن کی پرستش سے تم ہم کو منع کرتے ہو جس چیز کی عبادت کیطرف تم ہم کو بلا رہے ہو ہم کو اس میں ایسا شک ہے کہ دل نہیں ٹھہرتا۔

تفسیر عاد ثانیہ جس کا نام ثمود ہے بڑی پرجبروت قوم تھی۔ جنوبی مصر تک اس کا تسلط ہو گیا تھا۔ تمدن بھی اس کا اپنا تھا۔ شداد ایسا بادشاہ اسی قوم میں ہوا۔ لقمان ایسے دانشمند بھی اسی میں تھے۔ حضرت صالح کو خلعتِ رسالت سے آراستہ فرما کر اس جابر قوم کی ہدایت کے لئے مقرر فرمایا۔ صالح اور ہود میں دو سال کا فرق تھا۔

حضرت صالح کی عمر دو سو اسی برس کی ہوئی۔ قوم ثمود مقام حجر کی رہنے والی تھی۔ حجر ایک علاقہ تھا جس کا محل وقوع شام و مدینہ کے درمیان ایک پہاڑی حصہ تھا۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ قوم ثمود شرک اور بداعمالی میں مبتلا ہو گئی۔ توحید الوہیت و ربوبیت کو چھوڑ بیٹھی تو اللہ نے اس کی ہدایت کے لئے ایک مخصوص فرد کو منتخب فرمایا جس کا نام صالح تھا۔ حضرت صالح نے واحد و یکتا اللہ کی عبادت کی ترغیب دی اور فرمایا اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر اس سرزمین میں تم کو آباد کیا (یا بقول ضحاک) تمہاری عمریں دراز کیں۔ الغرض تمہاری ایجاد اور ابقاء اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔ لہٰذا اسی کی طرف رجوع کرو۔ نافرمان قوم نے جواب دیا صالح ہم کو تو تم سے اس سے قبل بڑی بڑی اُمیدیں لگی ہوئی تھیں۔ خیال تھا کہ تم قوم کی اصلاح کرو گے۔ دنیا میں ہمارے کام آؤ گے ہمارے مندروں کا تحفظ کرو گے اور تم اُلٹے ہماری تباہی کے درپے ہو گئے۔ بھلا تمہارے کہنے سے ہم آبا و اجداد کے دین کو کیسے چھوڑ دیں اور کس طرح اپنے اسلاف کے معبودوں سے منہ موڑ لیں۔ تمہاری دعوت کی حقانیت کا ہم کو یقین نہیں، اس لئے ہم اپنے دین کو چھوڑ کر تمہارا دین نہیں قبول کر سکتے۔

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّي وَآتَانِي مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ

تو صالح نے کہا اے میری قوم دیکھو تو میں اپنے رب کی طرف سے دلیل پر قائم ہوں اور اُس نے اپنی رحمت مجھ کو عطا کی ہے اب اگر

يَنْصُرُنِي مِنَ اللَّهِ إِنْ عَصَيْتُهُ ۖ فَمَا تَزِيدُونَنِي غَيْرَ تَخْسِيرٍ ○ وَيَا قَوْمِ هَٰذِهِ

میں اس کی نافرمانی کروں تو اللہ کے مقابلہ میں میری کون مدد کرے گا تم تو میری نقصان رسانی میں اضافہ ہی کر رہے ہو اے میری قوم یہ

نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ وَلَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ

اللہ کی اونٹنی تمہارے لئے نشانِ قدرت ہے اس کو اللہ کی زمین پر کھانے پھرنے دو کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ ورنہ تم پر

عَذَابٌ قَرِيبٌ ○ فَعَقَرُوهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوا فِي دَارِكُمْ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ ۖ ذَٰلِكَ

فوری عذاب آپہنچے گا الغرض قوم والوں نے اونٹنی کے پاؤں کاٹ ڈالے صالح نے کہا اب تین دن کم اپنے گھروں میں مزے کر لو یہ

وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوبٍ ○ فَلَمَّا جَاءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَالِحًا وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ

وعدہ جھوٹا نہیں ہے بالآخر جب ہمارا عذاب آپہنچا تو اپنی مہربانی سے ہم نے صالح کو اور اُس کے ساتھی مسلمانوں کو بچا لیا

مِنَّا وَمِنْ خِزْیِ یَوْمِئِذٍ ۗ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ ○ وَاَخَذَ الَّذِیْنَ

اور اُس دن کی رُسوائی سے (محفوظ رکھا) بیشک تمہارا رب قوی اور غالب ہے اور اُن ظالموں کو

ظَلَمُوا الصَّیْحَۃُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ ○ کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْھَا ۗ اَلَآ

ایک چیخ نے پکڑ لیا جس کی وجہ سے وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ گر کر (مرگئے) معلوم ہوتا تھا کہ اِن گھروں میں وہ رہتے ہی نہ تھے آگاہ ہو

اِنَّ ثَمُوْدَا کَفَرُوْا رَبَّھُمْ ۗ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ○ ع

کہ ثمود نے اپنے رب کا انکار کیا سُن لو ثمود پر لعنت ہو

تفسیر

حضرت صالحؑ نے فرمایا بھائیو! اللہ نے مجھے معجزات اور نبوّت محض اپنے کرم سے بغیر کسی استحقاق کے عطا کی۔ میرے پاس اپنی نبوت کے ثبوت کی واضح نشانی موجود ہے۔ کیا اس پر بھی تم کو شک ہی رہے گا۔ ایسی صورت میں اگر میں تمہارا قول مان لوں اور تبلیغ کو ترک کر دوں تو ایک تو تم تباہ ہو پھر میں بھی تباہ ہو جاؤں گا۔ نقصان پر نقصان ہوگا۔ دیکھو اللہ کی بھیجی ہوئی مخصوص طور پر یہ اونٹنی بطور معجزہ تمہارے سامنے ہے (اونٹنی کی مفصل حالت کا بیان سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے) چونکہ اونٹنی سے ڈر کر قوم ثمود کے مویشی بھاگتے تھے پھر اونٹنی سب جانوروں کا چارہ بھی کھا جاتی تھی، اس لئے لوگوں نے اس کو روکنا چاہا۔ حضرت صالح فرمایا دیکھو ایسا نہ کرنا۔ کوئی تکلیف اس کو نہ پہنچاؤ ورنہ عنقریب عذاب الٰہی آجائے گا۔ لوگوں نے پیغمبر کی نصیحت نہ مانی کمینگاہ میں چھپ کر ایک کمبخت نے اونٹنی کے تیر مارا دوسرے نے کوچین کاٹ ڈالیں اور دوں نے مل کر ذبح کر لی۔ حضرت صالح کو علم ہوا دوڑے آئے۔ اونٹنی کی پارہ پارہ ہیئت کو دیکھ کر رونے لگے۔ قوم نے مذاق اڑایا۔ بولے اب وہ موعود عذاب کہاں گیا؟ صالح نے فرمایا اچھا اب دار دنیا میں تین روز سے زیادہ تمہاری زندگی نہیں (تمہارے چہرے اوّل روز زرد، دوسرے روز سرخ اور تیسرے روز سیاہ ہو جائیں گے۔ چوتھے روز عذاب آجائے گا) یہی ہوا چوتھا روز شروع ہونے پر آسمان و زمین سے گونج پیدا ہوئی، تھوڑی دیر میں غیر دلوں کے بھی دل پھٹ گئے۔ گھروں کے اندر مرے کے مرے رہ گئے۔ صالح اور ان کے ساتھیوں کو صرف نجات ملی اور وہ بھی بغیر استحقاق کے۔ محض اللہ کے فضل و کرم سے۔

مقصودِ بیان

حضرت صالح صرف اپنی قوم کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ اللہ کی الوہیت کی دلیل اس کی ربوبیت ہے۔ قوم کے مقابلے میں بھی حضرت صالح نے فرمایا چونکہ اللہ رب ہے، اس لئے توبہ بھی قبول فرما لیتا ہے۔ سب آدمی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ یعنی غالب عنصر مٹی ہے۔ آیت دلالت کر رہی ہے کہ حضرت صالح نبوت سے پہلے بھی نیک قوم کے ہمدرد اور غریب پرور تھے۔ تقلید پرستی انسان کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے۔ آباؤ اجداد کے رسم و رواج کے مقابلے میں آدمی اس شفیق ناصح کی خیر خواہی سے بھی سرتابی کرتا ہے جس کی نیکی اور بہی خواہی مسلم الثبوت ہوتی ہے۔ غیر محسوس کی پرستش میں محسوس پرستوں کو ہمیشہ شکوک ہوتے ہیں۔ نبوّت رحمتِ الٰہی ہے کسبی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود بہت زیادہ ظاہر پرست قوم تھی اسی وجہ سے اونٹنی کی شکل میں معجزہ ان کے لئے پیش کیا گیا۔ آیات کے اندر اہل ایمان کے لئے خزانۂ نصیحت موجود ہے کہ اہل حق کا اتباع لازم ہے۔ سرکشی اور طغیان سے عذاب الٰہی آتا ہے۔ بدکرداروں کو جہاں تک ممکن ہو نصیحت کی جائے۔ ایمان اور نیکوکاری دنیوی اور اُخروی نجات کا سبب ہے، مگر محض اللہ کے فضل و کرم سے بغیر کسی ایجاب و استحقاق کے وغیرہ۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ

اور ہمارے فرشتے ابراہیمؑ کے پاس خوش خبری لے کر پہنچے اور بولے سلام۔ ابراہیمؑ نے کہا سلام پھر تھوڑی دیر میں

جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ

ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آئے لیکن جب دیکھا کہ ان فرشتوں کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھتے تو متوحش ہوئے اور دل

مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۝ وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ

میں کچھ ڈرے فرشتوں نے کہا آپ اندیشہ نہ کریں ہم کو قوم لوط کی جانب بھیجا گیا ہے اُس وقت ابراہیم کی بیوی کھڑی تھی

فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰۤى

وہ ہنس پڑی ہم نے اُس کو اسحٰق کی اور اسحٰق کے بعد یعقوب کے پیدا ہونے کی بشارت دی وہ بولی ہائیں میرے

ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ قَالُوْۤا

بچہ ہوگا حالانکہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرے شوہر بوڑھے ہیں واقعی یہ عجیب بات ہے فرشتے بولے

اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ۝

کیا تم اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو تم پر اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہیں بلاشبہ وہ سزاوار حمد اور بزرگی والا ہے۔

تفسیر

اس مقام پر حضرت ابراہیمؑ کا قصہ مستقل طور پر نہیں بلکہ حضرت لوطؑ کے قصہ کے ذیل میں بیان فرمایا ہے۔ اسی لئے طرزِ بیان مستقل نہیں بیان فرمایا۔ حضرت نوحؑ سے ۱۰۴۲ برس بعد حضرت ابراہیم ملک بابل میں مبعوث ہوئے۔ اس زمانے میں کلدانیوں کا بہت زور تھا۔ بادشاہ حمورابی کو زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا مفصل قصہ پہلے گزر چکا، اعادہ فضول ہے۔ آپ نے کفار کے مقابلے کے بعد فلسطین اور اطراف شام میں سکونت اختیار کی۔ ۱۷۵ برس دنیا میں رہے۔ آپ کے صاحبزادے اسحاق کی عمر ۱۸۰ سال کی ہوئی اور حضرت اسحاق کے بیٹے یعقوب کی عمر ۱۴۷ سال کی ہوئی۔ حضرت لوطؑ ابراہیم کے بھانجے یا بھتیجے تھے اور بابل سے آپ کے ساتھ آئے تھے۔ لوطؑ بھی پیغمبر تھے، اگر حضرت ابراہیم کے تابع۔ حضرت لوطؑ کی قوم لواطت کے مرض میں مبتلا تھی۔ آپ نے نصیحت کی، نہ مانی تو عذاب کے فرشتے انسانی شکل میں نازل ہوئے، لیکن قوم لوطؑ کو تباہ کرنے سے پہلے حضرت ابراہیم کی طرف آئے۔ آپ اس وقت باہر کھڑے تھے۔ سرشت میں مہمان نوازی تھی، اس لئے گھر میں لا کے کھانا سامنے رکھا، مگر آدمی نما فرشتوں نے ہاتھ نہ بڑھایا آپ نے اس وقت تک نہ پہچانا تھا۔ بمقتضائے بشریت ملکی دستور کے مطابق دل میں اندیشہ پیدا ہوا کہ شاید یہ لوگ دشمن ہیں کسی بدی کے ارادے سے آئے ہیں، اسی لئے میرا کھانا نہیں کھانا چاہتے۔ اس وقت فرشتوں نے واقعہ کا اظہار کیا۔ حضرت سارہ بھی موجود تھیں۔ حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کی نجات کی خبر سن کر ہنس پڑیں۔ فرشتوں نے ان کو ایک سعادت مند ذی شان لڑکا ہونے کی بشارت دی اور نہ فقط لڑکا ہونے کی بلکہ پوتا ہونے کی بھی۔ حضرت سارہ کو تعجب ہوا بیرانہ سالی میں اولاد ہونا بھی واقعی عجیب ہے۔ فرشتوں نے قدرتِ الٰہی کا حوالہ دیتے ہوئے تعجب رفع کر دیا۔ فرشتوں کی تعداد کتنی تھی؟ اس میں اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے۔ عطاء کے قول پر صرف جبرئیل، میکائیل اور اسرافیل تھے۔ ضحاک نے نو کی تعداد ظاہر کی ہے۔ سدی نے گیارہ اور مقاتل

نے بارہ محمد بن کعب کے نزدیک آٹھ تھے۔ بہر حال بالاتفاق جبرئیل ضرور تھے۔

مسئلے آداب اسلام میں مذکور رہے کہ چھوٹا بڑے کو، کھڑا بیٹھے کو اور آنے والا کھڑے کو سلام کرے۔ چنانچہ فرشتوں نے حضرت ابراہیم کو سلام کیا۔ لیکن جملۂ فعلیہ استعمال کیا۔ حضرت ابراہیم نے سلام کا جواب دیا، مگر جملۂ اسمیہ استعمال کیا اور ظاہر ہے کہ جملۂ اسمیہ کسی زمانے کا محتاج نہیں اور فعل کے لئے اقتران زمانہ ضرور ہے۔ لہٰذا حضرت ابراہیم کا سلام فرشتوں کے سلام سے احسن ہوا۔ یہی قرآن کا حکم ہے۔ ہر آدمی کو سلام کرنا چاہیئے خواہ جان پہچان ہو یا نہ ہو۔ فرشتے آدمی کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ نبی اور

مقصودِ بیان ولی بعض غیبی مخلوق کو نہ پہچان سکیں۔ مہمان نوازی انبیاء کا شیوہ ہے۔ انسان فطرتاً (خواہ کتنا ہی عظیم المرتبہ ہو) خلاف چیز کے ظہور پر تعجب کیا کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت سارہ کو بڑھاپے میں اولاد کی بشارت سُن کر تعجب ہوا۔ اللہ ہر طرح قادر ہے۔ ظاہری اسباب نہ ہونے کی حالت میں بھی اپنی رحمت سے نواز سکتا ہے۔ نیک اولاد بھی اللہ کی رحمت ہے۔ حضرت ابراہیم کا سارا گھر بابرکت تھا۔ آیات میں درپردہ اشارہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے کسی وقت مایوس نہ ہونا چاہیئے نیکی کی کوشش کرتی چاہیئے اور خدا سے ہر وقت دعا کرتے رہنا لازم ہے وہ قادر برتر ہے، دعا قبول فرماتا ہے وغیرہ۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِیْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ ۝

غرض جب ابراہیم کا ڈر جاتا رہا اور خوش خبری پہنچ گئی تو وہ قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگے۔

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَحَلِیْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِیْبٌ ۝ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ

بلاشبہ ابراہیم بردبار نرم دل (ہماری طرف) رجوع کرنے والے تھے (ہم نے کہا) ابراہیم یہ بات چھوڑ دو تمہارے رب

جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمْ اٰتِیْهِمْ عَذَابٌ غَیْرُ مَرْدُوْدٍ ۝

کا حکم آ پہنچا اُن پر اٹل عذاب آنے والا ہے

تفسیر فرشتوں کے اظہار سے حضرت ابراہیم کی جھجک دور ہوئی اور قوم لوط پر عذاب نازل ہونے کی وعید سُنی تو چونکہ آپ فطرتاً نرم خو واقع ہوئے تھے۔ کسی خطاکار کو فوری سزا دینا پسند نہیں کرتے تھے اور ہر معاملہ میں خلوص کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اس لئے امید ہوئی کہ شاید میری سفارش سے اللہ اس عذاب کو ٹال دے اور قوم لوط کو ہدایت یاب ہونے کا موقع مل جائے۔ اس اُمید کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرشتوں سے جھگڑا کرنے لگے اور سفارش پر اُتر گئے۔ فرشتوں نے کہا ہم اس بستی کے رہنے والوں کو ضرور برباد کر کے چھوڑیں گے۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا وہاں اگر پچاس مسلمان ہوں تب بھی کیا تم ان کو تباہ کر دو گے؟ فرشتوں نے کہا نہیں۔ فرمایا اگر چالیس ہوں؟ فرشتوں نے کہا نہیں۔ فرمایا اگر بیس ہوں؟ فرشتوں نے کہا نہیں۔ دس اور پانچ کے جواب میں بھی فرشتوں نے عذاب نازل کرنے سے انکار کر دیا تو آپ نے یہ یقین کرتے ہوئے کہ لوط تو ضرور مومن کامل ہے۔ فرمایا اگر ایک مومن ہو تب کیا کرو گے؟ فرشتوں نے کہا جب بھی ہلاک نہ کریں گے۔ فرمایا تو وہاں لوط موجود ہے۔ فرشتوں نے کہا ہم کو معلوم ہے کہ وہاں کون کون اہل ایمان ہے۔ ہم سب مومنوں کو بچالیں گے، صرف کافروں کو تباہ کر دیں گے آپ اب اس معاملہ میں کچھ نہ فرمایئے۔ جو عذاب آنا تھا آچکا اب لوٹایا نہیں جا سکتا۔

مقصودِ بیان پیغمبروں کو بھی کبھی باقتضائے بشری دشمنوں کی جھجک ہوتی ہے۔ اگرچہ ان کا کامل یقین ہوتا ہے کہ سوائے خدا کے کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ حضرت ابراہیم فطرتاً رحیم، مہربان، نرم دل، بردبار اور مخلص واقع ہوئے تھے۔ پیغمبروں

کی سفارش گناہگاروں کے حق میں جائز ہے حضرت ابراہیمؑ کا مجادلہ جہالت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ مقام انبساط پر پہنچنے کی وجہ سے تھا۔ اسی لئے آپ نے گناہگاروں کے حال پر شفقت فرماتے ہوئے سفارش فرمائی۔ جلیل الشان پیغمبر کی درخواست بھی قبول نہیں کی جاتی۔ قضائے مبرم کسی طرح نہیں پلٹ سکتی۔ اپنے وقت پر پوری ہو کر رہتی ہے وغیرہ۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ

اور جب ہمارے فرشتے لوطؑ کے پاس پہنچے تو ان کی وجہ سے لوطؑ غمگین اور تنگدل ہوئے اور بولے یہ بڑا سخت

عَصِيبٌ ۝ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُونَ اِلَيْهِ ۖ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ

دن ہے اور لوطؑ کے پاس ان کی قوم دوڑتی ہوئی آئی اس سے پہلے یہ لوگ بدکاریاں کیا کرتے

السَّيِّاٰتِ ۚ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ

تھے لوطؑ نے کہا اے میری قوم یہ میری بیٹیاں ہیں نہایت پاکدامن ہیں تمہارے لئے موجود ہیں تم اللہ سے ڈرو مہمانوں کے حق

فِيْ ضَيْفِيْ ۭ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ

میں مجھے رسوا نہ کرو کیا تم میں سے کوئی بھی بھلا مانس نہیں ہے قوم والے بولے تم خوب واقف ہو کہ ہم کو تمہاری بیٹیوں کی

مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ۝

کوئی حاجت نہیں اور جو ہماری غرض ہے اُسکو بھی خوب جانتے ہو

تفسیر حضرت ابراہیمؑ سے گفتگو کرنے کے بعد فرشتے سدوم کی آبادی کی طرف چلے۔ چار فرسنگ کا فصل تھا۔ نہر سدوم پر پہنچے۔ حضرت لوطؑ کی بیٹی پانی بھر رہی تھی۔ لڑکی سے دریافت کیا کہ مسافروں کے ٹھہرنے کا کوئی ٹھکانا بھی یہاں ہے؟ لڑکی نے حضرت لوطؑ سے آکر واقعہ بیان کیا۔ حضرت لوطؑ جاکر پوشیدہ طور پر ان کو گھر لائے، مگر بہت دل تنگ تھے۔ اندیشہ تھا کہ اگر قوم والوں کو خبر ہوگئی تو سخت رسوائی اٹھانی پڑے گی۔ وہ کمبخت اپنی خصلت سے باز نہ آئیں گے۔ لوطؑ کی بیوی نے اپنے مہمانوں کے حسن کی تعریف قوم والوں سے کی اور ان کو بلوایا۔ لوگ آکر حضرت لوطؑ کے مکان پر جمع ہوگئے۔ اس کے آگے مطلب ظاہر ہے۔ دو باتیں بیان کرنا ضروری ہیں۔

(۱) حضرت لوطؑ کی اپنی لڑکیاں تھیں جن کو قوم والوں کے نکاح میں دینا چاہتے تھے یا قوم کی لڑکیاں تھیں؟ اول قول عام مفسرین کا ہے ظاہر آیات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ قوم کافر تھی پھر کس طرح حضرت لوطؑ نے اپنی بیٹیوں کا نکاح ان سے کرنا گوارا کیا۔ اس کا جواب ہے کہ آپ کو قوم کی ہدایت مقصود تھی، کفر و لواطت سے پاک کرنا غرض تھا۔ ہوسکتا ہے بلکہ اغلب ہے کہ آپ نے فرمایا ہو لوگو کفر چھوڑ دو اور مسلمان ہو جاؤ لواطت سے توبہ کرو میری لڑکیوں سے نکاح کرلو۔ یہ فعل واقعی تمہارے لئے کامل ترین طہارت کا ہے اور ہوسکتا ہے کہ اس وقت کی شریعت میں مسلمان عورت کا نکاح کافر مرد سے جائز ہو۔

لیکن قوی ترین قول مجاہد کا ہے کہ لوطؑ کی کوئی بیٹی نہ تھی۔ چونکہ ہر نبی اپنی اُمت کا باپ ہوتا ہے، اس لئے حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کی بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں قرار دیا۔ ابن کثیر نے قتادہ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے۔ اس قول کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اگر حضرت لوطؑ کی بیٹیاں تسلیم بھی

کرلی جائیں تو وہ چند ہوں گی اور قوم والوں کی تعداد بہت تھی۔ چند لڑکیوں کا سیکڑوں کے ساتھ نکاح کیسے ہوسکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ آپ نے شفقتِ پیغمبری سے قوم کی بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں قرار دیا تھا۔

(۲) حضرت لوط نے فرمایا هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ یعنی یہ لڑکیاں تمہارے لئے بہت پاک ہیں۔ شبہ ہوتا ہے کہ کیا یہ فعل لواطت سے بھی پاک تھا۔ کہ حضرت لوط نے سلسلۂ ازدواجی کو اس کے مقابلے میں پاکیزہ تر فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوط کی قوم والے لواطت کو پاک فعل سمجھتے تھے۔ حضرت لوط ان کو سمجھانا چاہتے تھے کہ کمبختو! اپنی جہالت اور بیہودگی کچھ بھی سمجھو، لڑکوں سے فعل بد کو پاک جانو یا ناپاک بہرحال اتنا ضرور ہے کہ لواطت سے جماع زیادہ پاک فعل ہے پھر صحیح بات کیوں نہیں مانتے۔

مقصودِ بیان کسی کے مہمانوں کی رسوائی درحقیقت میزبان کی رسوائی ہے۔ مہماں نوازی پیغمبرانہ شیوہ ہے۔ امرد نما فرشتوں کو مہمان رکھنے سے حضرت لوط پریشان اور تنگ دل ضرور ہوئے تھے۔ حضرت لوط نے فرشتوں کو شروع میں نہیں پہچانا تھا۔ لواطت نجس فعل ہے۔ پیغمبر اُمت کا باپ ہوتا ہے۔ ازلی بدبختوں کو دانشمندی کی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی وغیرہ۔

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ ○ قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ

لوط نے کہا کاش مجھ میں تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی یا کسی زبردست سہارے کی پناہ مل جاتی　مہمانوں نے کہا لوط! ہم تمہارے رب کے فرشتے ہیں

لَنْ یَّصِلُوْٓا اِلَیْکَ فَاَسْرِ بِاَهْلِکَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَلَا یَلْتَفِتْ مِنْکُمْ اَحَدٌ

ان لوگوں کی رسائی تم پر نہ ہوسکے گی تم کچھ رات رہے سے اپنے　گھر والوں کو　لے جاؤ　اور تم میں سے　کوئی　مڑ کر　نہ دیکھے

اِلَّا امْرَاَتَکَ ؕ اِنَّہٗ مُصِیْبُہَا مَآ اَصَابَہُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَہُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَیْسَ الصُّبْحُ

ہاں تمہاری بیوی　ضرور مڑ کر دیکھے گی اُس پر بھی وہی عذاب آئے گا جو اُن پر آئے گا　ان کا وقت مقررہ صبح ہے　کیا　صبح

بِقَرِیْبٍ ○ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِیَہَا سَافِلَہَا وَاَمْطَرْنَا عَلَیْہَا حِجَارَۃً

قریب نہیں ہے　غرض جب ہمارا عذاب آپہنچا تو ہم نے اس بستی کو زیر زبر کردیا　کنکریلے پتھر　ان پر تہ بہ تہ

مِّنْ سِجِّیْلٍ ۬ۙ مَّنْضُوْدٍ ○ مُّسَوَّمَۃً عِنْدَ رَبِّکَ ؕ وَمَا ہِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ ع

برسائے　جن پر خدا کی طرف سے　نشان کردیئے گئے تھے　اور وہ بستی ان ظالموں سے　کچھ دور　بھی نہیں　ہے

تفسیر حضرت لوط کی بیوی نے چھت پر چڑھ کر یا باہر نکل کر خوبصورت مہمانوں کے آنے کی اطلاع قوم کو پہنچا دی اور قوم والے دوڑتے آئے تو حضرت لوط نے دروازہ بند کرلیا اور خود دروازے کے باہر لوگوں کو سمجھانے اور روکنے لگے۔ لوگوں نے ایک نہ مانی۔ دروازہ نہ کھلا تو دیواروں سے چڑھنے لگے۔ حضرت لوط مضطرب ہوکر کہنے لگے کاش مجھ میں بذاتِ خود تمہاری مدافعت کی قوت ہوتی یا میرا خاندان یہاں موجود ہوتا تاکہ تم کو دور کرسکتا۔ وجہ یہ تھی کہ سدوم کے باشندے اگرچہ تعداد میں چار لاکھ تھے مگر حضرت لوط کا رشتہ دار کوئی نہ تھا۔

امام نووی نے رکنِ شدید سے ذاتِ الٰہی مراد لی ہے مگر یہ تفسیر غلط ہے۔ سیاقِ آیات کے بھی خلاف ہے اور حدیث کے بھی۔ ابوہریرہؓ کی روایت سے ثابت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت لوط کے اس قول کو قابلِ استغفار قرار دیا تھا اور فرمایا تھا۔ رَحِمَ اللّٰہُ لُوْطًا اِنْ کَانَ یَاْوِیْ

الیٰ رکن شدید ہیں۔ اگر ذاتِ الٰہی مراد لی جائے تو پھر قابلِ استغفار اس قول کو کس طرح قرار دیا جاسکتا ہے۔
عذاب کا وقت آیا تو فرشتوں نے کل بستی کی زمین بالکل اُلٹ دی ہر ٹکڑے کو زیر زبر کر دیا۔ یہ پانچ بستیاں تھیں۔ سب سے بڑی آبادی سدوم کی تھی۔ کل بستیوں کو مؤتفکات کہا جاتا ہے۔ زیر زبر کرنے کے بعد اس زمین پر پتھر یا کنکر یا اینٹوں کی بارش ہوئی حسن بصری اور سدی کا قول ہے کہ ہر پتھر پر مہر سی لگی تھی۔ قتادہ، عکرمہ اور افراز کا قول ہے کہ ہر پتھر پر سرخ و سیاہ لکیریں تھیں۔ ابن جریح کہتے ہیں کہ پتھروں پر ایک خاص نشانی تھی جس سے واضح طور پر شناخت ہوسکتی تھی کہ یہ زمین کے پتھر نہیں ہیں۔ آیات کا مطلب واضح ہے۔

مقصودِ بیان جسمانی طاقت بھی عجیب چیز ہے۔ حضرت لوطؑ کے مکاشفات کا سلسلہ اس وقت بند تھا، اس لئے فرشتوں کو نہ پہچان سکے اور ظاہری اسباب کی طرف نظر دوڑائی، جسمانی قوت اور خاندانی طاقت کی تمنا کی۔ آیت سے در پردہ یہ امر مستنبط ہوتا ہے کہ نزولِ عذاب کا وقت صبح کا تھا۔ گویا رحمت اور عذاب دونوں صبح کے قریب نازل ہوتے ہیں۔ بدکاروں کی تباہی کو مُنہ موڑ کر بھی نہ دیکھنا چاہیئے۔ جہاں تک ممکن ہو عذاب سے جلد از جلد بھاگنا لازم ہے۔ لواطت سخت ترین جرم ہے جس کی سزا بھی بہت اہم ہے کم از کم پتھروں سے مارنا اور ہلاک کرنا چاہیئے۔ موجودہ مسلمانوں کے لئے قصۂ لوط میں درسِ عبرت پوشیدہ ہے۔ قوم لوط کی بستیوں کو اُلٹ دینے سے اس طرف اشارہ ہے کہ وہ بھی وضعِ فطرت کے خلاف عمل کرتے تھے۔ لواطت عکسِ فطرت ہے۔ لہٰذا خدا نے بھی دنیا ہی میں ان کی آبادیوں کو اُلٹ دیا وغیرہ۔

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ وَلَا
اور اہلِ مدین کی جانب ہم نے اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا شعیب نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو جس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور

تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ اِنِّىْٓ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ
ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو میں تم کو (اس وقت) آسودہ دیکھ رہا ہوں مگر ایک احاطہ کُن دن کے عذاب سے اندیشہ

يَوْمٍ مُّحِيْطٍ ۝ وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ
کر رہا ہوں اے میری قوم انصاف سے پوری ناپ تول کیا کرو اور لوگوں کو چیزیں کم

اَشْيَاۗءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ
نہ دیا کرو اور زمین پر فساد پھیلاتے مت پھرا کرو اگر تم ایماندار ہو (تو سمجھ لو) اللہ کا حلال

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ڬ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝
نفع تمہارے لئے بہتر ہے اور میں تم پر نگہبان نہیں ہوں

تفسیر یہ پانچواں واقعہ قوم مدین کا ہے۔ مدین قوم کا بھی نام ہے اور شہر کا بھی اور حضرت ابراہیمؑ کے صاحبزادے کا بھی۔ مقریزی نے خطط میں لکھا ہے کہ قوم مدین مدیان بن ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ مدیان کی بیوی قنطورا بنت یقطان کنعانیہ تھی۔ بحر قلزم کے کنارے تبوک کے محاذ پر چھ منزل کے فاصلے پر قوم مدین آباد ہوئی تھی۔ اس بستی کو مدین کہا جاتا تھا۔ ابن کثیر نے بیان کیا کہ مدین عرب کا ایک قبیلہ تھا جو حجاز و شام کے درمیان آباد تھا انھیں کے مسکن کو مدین کہا جاتا تھا۔ بہرحال جب اس قوم کی بدکاری حد سے بڑھ گئی۔ شرک اور فسق و فجور رہزنی اور ناپ تول میں کمی کرنے

حضرت شعیب کو نبی بنا کر اصلاح پر مامور فرمایا۔ حضرت شعیب نے توحید کا اعلان کیا، شرک سے منع کیا، ناپ تول پورا کرنے کی ہدایت کی، رہزنی اور تباہ کاری کی ممانعت کی، یہ بھی فرمایا کہ اس وقت تم لوگ خوش حال اور آسودہ ہو۔ تم کو اس بے ایمانی کی ضرورت نہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں عذاب الٰہی نہ نازل ہو جائے۔ لیکن قوم پر کوئی اثر نہ ہوا۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ

قوم والوں نے کہا شعیب! کیا تمہاری نماز تم کو یہ بات سکھاتی ہے کہ ہم اُن چیزوں کی عبادت چھوڑ بیٹھیں جن کی پرستش ہمارے

فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ۝

باپ دادا کرتے رہے ہیں یا اپنے مال میں حسبِ منشار تصرف نہ کر سکیں تم ہی تو بڑے بردبار نیک چلن ہو

تفسیر توحید اور اصلاح عمل کی ہدایت سے۔ سرتابی کی توحید کے مقابلے میں قدیمی رسم و رواج کو ترجیح دی اور بآسانی دستور العمل کو ترک کرنے پر رضامند نہ ہوئے ناپ تول میں کمی کرنے کو جائز تصرف مالی سمجھے اور اس کی بندش کو حقوق نجات کی بندش خیال کیا اور بقول ابن عباس (مزاحیہ لہجہ میں) بولے کیا تمہاری نماز ہم کو یہ بات سکھاتی ہے کہ ہم چیزوں کی عبادت چھوڑ بیٹھیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے رہے ہیں۔ یا اپنے مال میں حسب منشار تصرف نہ کر سکیں۔ تم تو بڑے نیک اور سیدھے سادے آدمی ہو۔ تجارتی رنگ سے واقف نہیں۔

مقصودِ بیان حضرت شعیبؑ نے اصلاح عمل سے پہلے توحید کی تبلیغ کی اور درستگی عمل کو ایمان پر مشروط کیا۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ شرعی طور پر کوئی نیکی بغیر ایمان و توحید کے قابل قبول نہیں۔ جن لوگوں کے دماغ مسخ ہو جاتے ہیں اور دلوں پر رنگ چڑھ جاتا ہے وہ اصلاحی اقدامات (نہ قوانین کو آزادی کی بندش سمجھتے ہیں۔ قوم شعیبؑ نے بھی صحیح وزن و پیمائش کی ہدایت کو تجارتی آزادی کے لئے روک سمجھا۔ رسم و رواج اور باپ دادا کا دستور العمل انسان کو عقل و بصیرت کی بات سے روکتا ہے۔ قانونِ عدل کے خلاف کام کرنا زمین پر تباہی پھیلانے کا سبب ہے۔ آیت وَلَا تَعْثَوْا سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قوم شعیبؑ مرفہ الحال تھی۔ پورے قصہ سے یہ امر بھی مستفاد ہوتا ہے کہ نبی کا کام فقط عقائد اور عبادات کی ہی اصلاح نہیں بلکہ سوشل اور کمرشیل اصلاح کے قوانین قائم کرنا اور ان پر کاربند ہونے کی ہدایت کرنا بھی فرائض نبوت میں سے ہے وغیرہ۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ

شعیب نے کہا اے میری قوم! میں اپنے رب کی طرف سے دلیل پر قائم ہوں اُسی نے مجھ کو اپنی طرف سے اچھی روزی عطا کی ہے

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ

اور میں نہیں چاہتا کہ تمہارے برخلاف خود وہ کام کروں جس سے تم کو منع کرتا ہوں تو بقدرِ امکان درستگی حالت ہی چاہتا ہوں

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ۝ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ

اور مجھے توفیق صرف اللہ ہی کے فضل سے ہے اُسی پر میرا بھروسہ ہے اور اُسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں اے میری قوم میری مخالفت کہیں تمہارے لئے

أَن يُصِيبَكُم مِّثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ ۚ وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنكُم

اس بات کی باعث نہ ہوجائے کہ جیسے قوم نوح یا قوم صالح پر عذاب آپڑا تھا تم پر بھی ویسے ہی آپڑے اور لوطؑ کی قوم بھی تم سے

بِبَعِيدٍ ۝ وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ ۚ إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ ۝

دور نہیں ہے تم اپنے رب سے توبہ استغفار کرو بیشک میرا رب مہربان اور بڑی محبت کرنے والا ہے

تفسیر کسی ریفارمر اور مصلح کے پیام ہدایت کے متعلق بدباطن کور بصیرت طبقہ کو چار قسم کے شبہات ہوا کرتے ہیں۔ اول تو یہ کہ یہ شخص ہماری طرح ہے۔ اس میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے کہ یہ ہم کو ہدایت کرتا ہے۔ بلاوجہ ہمارے آباؤ اجداد کے دستور العمل کو ترک کراتا اور سب کے مقابلے میں اپنی صداقت کا اعلان کراتا ہے۔ دوئم یہ کہ اس نے رہبری اور لیڈری کا جامہ صرف کھانے پینے کے لئے پہنا ہے۔ ہم سے نذرانے اور تحائف وصول کرنا چاہتا ہے اور بغیر محنت کے ہماری گاڑھی کمائی پر ہاتھ صاف کرنے کا خواستگار ہے۔ سوئم یہ کہ اس کی عملی زندگی خود ہی قول کے مطابق نہیں۔ ممبر اور اسٹیج پر کھڑے ہو کر جن باتوں سے ہم کو روکتا ہے خلوت خانۂ خاص میں ان ہی کا ارتکاب کرتا ہے پھر ہم اس کے قول کو کیوں مانیں؟ ہم کو تو نمونۂ عمل کی ضرورت ہے نہ کہ منافق رہنما کی۔ چہارم یہ کہ اگر دو چار دس بیس آدمیوں کی اس اصلاحی تحریک کو مان بھی لیا تب بھی کیا ہوگا، کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو یہ کیسے راہِ راست پر لا سکتا ہے۔ نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ حضرت شعیبؑ کے قول پر بھی کفار کی طرف سے یہی شبہات ہوتے تھے، اس لئے آپ نے تفصیل وار سب کے جوابات دے دیئے۔ پہلے شبہ کے جواب میں فرمایا برادرانِ قوم تم میری ظاہری حالت دیکھ کر اور قومی نسبی تعلقات کو پیشِ نظر رکھ کر میرے قول کی صداقت میں شک نہ کرو۔ پروردگار نے حجت واضحہ، روشن دلیل اور برہان نمایاں عطا فرمائی ہے۔ میرے پاس غیب سے وحی آتی ہے۔ تم مجھے بے وقوف اور سیدھا سادہ آدمی سمجھتے ہو یہ تمہاری غلطی ہے۔ جو بصیرت و بینائی مجھے حاصل ہے وہ تم کو حاصل نہیں۔ حق تعالیٰ کی طرف سے مجھے نورِ یقین اور علم وہبی میسر ہے، اس لئے میں اپنی صداقت کا اعلان کر رہا ہوں۔ دوسرے شبہ کے جواب میں فرمایا مجھے پروردگار نے خزانۂ غیب سے رزقِ وسیع عطا فرمایا ہے۔ فراخ دست اور مرفہ الحال بنایا ہے۔ مجھے تمہارے مال کی کوئی ضرورت نہیں نہ تم سے مجھے کوئی لالچ ہے۔ تیسرے شبہ کے جواب میں فرمایا میرا چال چلن تمہارے سامنے ہے۔ اگر میں تم کو ٹیڑھا راستہ دکھاتا تو خود اس پر نہ چلتا۔ میں ایسا نہیں ہوں کہ خود چھپ کر یا اعلانیہ ایک کام کروں اور تم کو اس سے منع کروں۔ میرا ظاہر و باطن ایک ہے۔ جس چیز کے باطل ہونے کا اعلان کرتا ہوں اس سے خود بھی پرہیز کرتا ہوں اور اپنی زندگی کو تمہارے لئے نمونۂ عمل بناتا ہوں۔ چوتھے شبہ کا ازالہ اس طرح فرمایا کہ میرا اعتماد تو محض ذاتِ الٰہی پر ہے۔ مبداء اور معاد پر مجھے کامل یقین ہے۔ جہاں تک میرے امکان میں ہے اصلاح کی کوشش کرنا میرا فرض ہے اور کوشش کی کامیابی اور ناکامی بھی اللہ کے دستِ قدرت میں ہے۔ کثرت و قلت کا یہاں کچھ سوال ہی نہیں۔ نہ کثرت سے مجھے خوف ہے نہ قلت کی طرف خاص میلان۔ اپنا فرض ادا کرنا مقصود ہے اور چونکہ محض ذاتِ الٰہی پر بھروسہ ہے۔ اگرچہ کوشش محدود ہے، اس لئے عام اصلاح کی یقینی امید ہے نہ کسی کی موافقت پر تکیہ ہے نہ مخالف کا خوف۔ مطمحِ امید صرف ذاتِ واحد ہے۔ اس سے آگے صرف ترہیبی اور ترغیبی کام ہے۔

مقصودِ بیان کسی کی ظاہری مساوات دیکھ کر اس کے باطن کو حقیر نہ سمجھنا چاہیئے۔ اہلِ باطن اپنی بیرونی حالت دوسرے معمولی آدمیوں کی طرح رکھتے ہیں، لیکن ان کے دل نورِ ازلی سے روشن اور ان کے دماغ علوم یقینیہ کے مسکن ہوتے ہیں جو حقایق اور اصلاحی امور پیغمبر کو دیکھتے ہیں وہ دوسروں کو دکھائی نہیں دیتے۔ رہنما کو لالچ اور خوف سے آزاد ہونا چاہیئے۔ پیٹ پال لیڈر اور تن پرور پیر ہدایت نہیں کر سکتے۔ ان کو قوم کا رہنما بننے کا کوئی حق نہیں ہے۔ رہبری کا کوئی معاوضہ جائز نہیں۔ ریفارمر کی عملی زندگی بھی قول کے مطابق ہونی چاہیئے مگر مرکزِ امید ذاتِ الٰہی کو ہی سمجھنا چاہیئے۔ بغیر توفیقِ الٰہی کے کوئی کوشش نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی۔ اگر کوشش محدود بھی ہو، مگر بھروسہ اللہ کی ذات پر ہو۔

کامیابی کا یقین رکھنا چاہیئے۔ در پردہ آیت میں ایما اس طرف بھی ہے کہ اندھا دُھند توکل درست نہیں۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر اور زبان کاٹ کر گوشہ نشین ہو جاتا اور پھر اللہ پر بھروسہ رکھنا کسی طرح روا نہیں ہے کوشش شرط ہے۔ جہاں تک ممکن ہو کوشش کی جائے۔ لیکن آغاز و انجام کا مالک اللہ ہی کو جاننا چاہیئے۔ دنیوی طاقت پر بھروسہ یا اس سے خوف حق بیں نظر والے کے لئے جائز نہیں۔ صرف ذاتِ خداوندی کو اپنی کوشش کا مرکز سمجھنا چاہیئے وغیرہ۔

قَالُوا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرٰىكَ فِينَا ضَعِيفًا ۚ وَلَوْلَا

قوم والے بولے اے شعیب! ہم تمہاری باتوں کا بہتیرا حصہ نہیں سمجھتے اور ہم اپنے اندر تم کو کمزور جانتے ہیں اگر تمہاری

رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۖ وَمَا أَنتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ أَرَهْطِي أَعَزُّ عَلَيْكُم

برادری نہ ہوتی تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے اور تم ہمارے نزدیک باعزت نہیں ہو شعیب نے کہا اے میری قوم کیا میری برادری تمہارے نزدیک

مِّنَ اللّٰهِ وَاتَّخَذْتُمُوهُ وَرَاءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۖ إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝

اللہ سے زیادہ قابلِ لحاظ ہے اور اللہ کو تم نے پسِ پشت ڈال دیا جو کچھ تم کر رہے ہو میرا رب اس کو گھیرے ہوئے ہے

تفسیر باطل پرست کور دانش طبقہ کو جب کوئی دانش و عقل کا جواب بن نہیں پڑتا تو وہ جہالت پر اُتر آتا ہے اور بصیرت آمیز مناظرہ سے بھاگ کر مجادلہ پر پہنچ جاتا ہے۔ قوم شعیبؑ نے بھی ایسا ہی کیا۔ پیغمبر کے پُرحکمت بلیغ کلام کا مقابلہ جب دلائل سے نہ کر سکے تو جاہلانہ طرزِ گفتگو اختیار کیا۔ بولے شعیبؑ تیری بکواس کا بیشتر حصہ لایعنی ہے تیری یہ بیہودہ گوئی ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ تیرے خاندان والے ہمارے ساتھ ہیں۔ تُو تنِ تنہا ہے یا بہت دگا سہی۔ تیرے خاندان کا خیال ہے کیوں کہ وہ ہمارا دوست اور ہمارا ساتھی ہے۔ ورنہ اب تک ہم نے پتھروں کی مار سے تیرا ڈھیر کر دیا ہوتا۔ ہم تیری طاقت سے مرعوب نہیں صرف تیرے کنبہ والوں کا پاس لحاظ ہے۔ حضرت شعیبؑ نے فرمایا برادرانِ قوم تم عجیب کوتاہ فہم ہو۔ تمہارے نزدیک میرے کنبہ والے اللہ سے زیادہ باعزت اور طاقتور ہیں۔ تم نے کنبہ والوں کا تو پاس لحاظ کیا اور اللہ کی قدرت و طاقت اور عزت و اکرام کو پسِ پشت ڈال دیا۔ یاد رکھو اللہ کی گرفتاری سے چھوٹ نہیں سکتے تمہارے کرتوت کا خدا کو پورا علم ہے۔

حضرت علیؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا قسم ہے اس خدائے برتر کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ قوم شعیبؑ نے جلالِ الٰہی سے تو خوف نہیں کیا بلکہ پیغمبر کے کنبہ والوں سے ڈرے۔

نحاس اور زجاج کے قول کے مطابق ضعیف کے معنی نابینا کے ہیں۔ کیونکہ حضرت شعیبؑ کثرتِ گریہ سے نابینا ہو گئے تھے۔ سعید بن جبیر اور شداد بن اوس کی روایت کردہ احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے (اخرجہ ابن عساکر و الواحدی) لیکن عام مفسرین نے اس معنی کو غلط قرار دیا ہے۔ علی بن عیسیٰ، بیضاوی، سیوطی، ابن کثیر، رازی اور دیگر محققین کے نزدیک ضعیف کے وہی معنی مراد ہیں جو عام متبادر ہیں۔

مقصودِ بیان کور دانش طبقہ دلائل سے عاجز ہو کر جاہلانہ حرکات اور معاندانہ دستور کو اختیار کر لے لگتا ہے۔ حضرت شعیبؑ کا طرزِ خطابت نہایت بلیغ اور پُرحکمت تھا۔ پوری قوم کو کوئی جواب بن نہیں پڑتا تھا۔ کوتاہ فہم لوگوں کی نظر ظاہری تعلقات اور بیرونی اسباب پر ہوتی ہے۔ اُن کی روحانی بینائی زائل ہو چکی ہے۔ اس لئے باطنی حقائق سے واقف نہیں ہوتے۔ چند افراد کی طاقت خدا کی طاقت سے بڑھ کر سمجھتے ہیں۔ بلکہ خدا کا نام اور اس کی جلالی صفات کا نشان ان کے دلوں سے محو ہو جاتا ہے۔ خالق کے رشتہ سے زیادہ مخلوق کے رشتہ کا ان کو پاس لحاظ ہوتا ہے۔ آیت سے ضمنی طور پر یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ اللہ کے حقوق کے مقابلے میں مخلوق کے کسی تعلق کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے اور نہ خدا کی طاقت کے مقابلے میں مخلوق کی

طاقت کو سمجھنا چاہیئے وغیرہ۔

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ؕ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ

اے میری قوم تم بھی اپنی جگہ عمل کیے جاؤ میں بھی کر رہا ہوں عنقریب جان لوگے کہ کس پر رسوا کرنے والا عذاب آئے گا

وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ؕ وَارْتَقِبُوْۤا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ۞ وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا

اور کون جھوٹا ہے تم منتظر رہو میں تمہارے ساتھ منتظر ہوں غرض جب ہمارا عذاب آپہنچا تو ہم نے اپنے فضل سے

وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِىْ

شعیب کو اور اس کے ہمراہی مسلمانوں کو بچالیا اور ان ظالموں کو ایک چیخ نے پکڑ لیا جس کی وجہ سے وہ اپنے گھروں

دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۞ ۙ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ۞

میں اوندھے ہو کر گر پڑے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کبھی وہاں رہتے ہی نہ تھے خوب سن لو جس طرح ثمود پر پھٹکار پڑی ویسے ہی مدین والوں پر لعنت

تفسیر جب حضرت شعیبؑ کو یقین ہو گیا کہ یہ قوم اپنی بداعمالیوں پر قائم رہے گی اور آباؤ اجداد کے مسلک سے نہ ہٹے گی تو اظہار برأت اور تنبیہ و وعید کے طور پر فرمایا لوگو جب نہیں مانتے تو جو کچھ تمہارا دل چاہے کیے جاؤ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس پر قائم رہوں گا۔ چونکہ قوم نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم تمہاری بہت سی باتوں کو نہیں سمجھتے اور یہ بھی کہا تھا کہ تمہارے خاندان کا پاس لحاظ ہے ورنہ تمہاری کیا حقیقت تھی۔ اب تک سنگسار کر دیا ہوتا، اس لئے آپ نے فرمایا میری طاقت اور کمزوری کا علم اور اپنے افعال کا نتیجہ بداعمالی چند روز میں تم پر ظاہر ہو جائے گا۔ اس سے آگے مطلب صاف ہے۔

خاص نوٹ سورۂ اعراف و عنکبوت میں مذکور ہے فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ یعنی قوم شعیبؑ پر زلزلہ آیا اور اس جگہ مذکور ہے کہ سخت چیخ کی وجہ سے وہ ہلاک ہوئے۔ ان دونوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے، لیکن واقع میں توافق ہے کیوں کہ زلزلہ ضرور آیا تھا اور زلزلے کے ساتھ ایک غیبی کرخت گرج دار آواز بھی تھی جس کی وجہ سے جو جس جگہ تھا وہیں مرا رہ گیا ہل بھی نہ سکا۔

ایک امر یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ قوم شعیبؑ اور اصحاب الایکہ دونوں ایک ہی قوم تھے۔ اصحاب الایکہ پر آسمان سے آگ برستی تھی جس کو عذاب ظلہ کہا جاتا ہے اور قوم شعیبؑ زلزلہ اور رجفہ کے عذاب میں مبتلا ہوئی۔ اس بنا پر اصحاب الایکہ قوم شعیبؑ نہیں قرار پا سکتے، لیکن یہ بھی کسی قدر کوتاہ فہمی ہے۔ کیونکہ خاص شہر مدین کے رہنے والے تو زلزلہ اور رجفہ سے ہلاک ہوئے تھے اور شہر کے چاروں طرف رہنے والے اصحاب الایکہ کہلاتے تھے۔ ان پر عَذَابُ الظُّلَّةِ آیا تھا لیکن تھے دونوں گروہ حضرت شعیبؑ کی اُمت کے۔

مقصود بیان آیت میں در پردہ ہدایت ہے کہ بدکاروں کی بدکاریاں دیکھ کر ان کو انتہائی ممانعت کی جائے۔ اگر وہ کسی طرح نہ مانیں تو ان سے اظہار برأت کر دیا جائے۔ ناپ تول میں کمی کرنی سخت ترین عذاب کا سبب ہے۔ اس سے بڑی بڑی قومیں ہلاک ہو گئیں ہیں۔ عذاب صرف ظالموں پر ہوتا ہے۔ اہل عدل کو خدا تعالیٰ اپنی رحمت و کرم کی وجہ سے عذاب سے محفوظ رکھتا ہے وغیرہ۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۙ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا

ہم نے موسیٰ کو اپنے معجزات اور واضح دلیلیں دے کر فرعون اور اس کے حکام کے پاس بھیجا تھا مگر فرعون کے کہنے پر

اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ۝ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

چلے حالانکہ فرعون کی بات ٹھیک نہ تھی قیامت کے دن وہ قوم کے آگے آگے ہوگا

فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ۝ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً

اور سب کو دوزخ میں اُتار دے گا اور وہ بُری جگہ ہے جس پر اُن کو اُتارا جائے گا اس دنیا میں بھی اور قیامت کے دن بھی اُن

وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ۝

کے پیچھے لعنت لگادی گئی یہ بڑا انعام ہے جو اُن کو دیا گیا

تفسیر

آیات کا تفسیری مطلب بیان کرنے سے پہلے چند الفاظ کے مرادی معنی کی تحقیق ضروری ہے۔ (۱) آیات اور سلطان مبین سے کیا مراد ہے؟ مفسر فتح البیان اور بیضاوی کے ایک قول پر آیات سے مراد توریت ہے، لیکن یہ قول غلط ہے کیونکہ آیت میں فرمایا ہے کہ ہم نے فرعون اور اس کے گروہ کے پاس موسیٰ کو آیات لے کر بھیجا۔ اب اگر آیات سے توریت مراد لی جائے تو لازم آتا ہے کہ حضرت موسیٰ جس وقت رسول اللہ بنا کر فرعون کے پاس بھیجے گئے تھے اُس وقت آپ کے پاس توریت موجود ہوتی۔ حالانکہ ایسا نہ تھا۔ توریت تو بہت بعد طور پر آکر ملی تھی۔

مفسر سراج نے آیات سے معجزات مراد لئے ہیں۔ ابن کثیر کے نزدیک کھلی نشانیاں مراد ہیں۔ رہی یہ بات کہ سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ سے کیا مراد ہے؟ سلطان غلبہ کو کہتے ہیں۔ غلبہ سے کس قسم کا غلبہ مراد ہے؟ اکثر اہلِ تفسیر نے غلبہ سے حجت اور واضح دلیل، برہان قطعی، ناقابلِ مغلوبیت ثبوت مراد لیا ہے۔ اس صورت میں شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ آیات، اور سلطان مبین میں کیا فرق ہوگا؟ اس کا ازالہ یہ ہے کہ معجزات دو طرح کے ہوسکتے ہیں۔ ایک تو وہ جس کو دیکھ کر معمولی سمجھ رکھنے والے کو غلطی کا شبہ ہوسکتا ہے۔ دوسری قسم وہ جس کو معمولی آدمی بھی شک کی نظر سے نہ دیکھ سکے۔ روشن دماغ اور کوتاہ بصیرت ہر دو فرقوں کے نزدیک اُس معجزہ کی صداقت ناقابلِ شبہ ہو۔ آیات سے معجزات کی اول قسم مراد ہو اور سلطان مبین سے دوسری قسم۔

میرے نزدیک بہتر جواب یہ ہے کہ آیات اور سلطان مبین دونوں سے معجزات ہی مراد ہیں، لیکن مختلف اعتبارات اور جدا جدا حیثیات کے پیشِ نظر لفظ اٰيٰتِنَا سے اس طرف اشارہ ہے کہ معجزاتِ موسیٰ ہماری قدرت، عظمت، ربوبیت والوہیت کی واضح نشانیاں تھیں اور سلطان مبین سے ملکی اور قومی فتح مراد لی ہے۔ واللہ اعلم۔

(۲) اِلرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ۔ بقول کلبی رفد کے معنی زیادتی کے ہیں۔ یعنی لعنت در لعنت بہت بڑی چیز ہے۔ ابن کثیر نے اسی معنی کو پسند کیا ہے۔ مجاہد نے فرمایا کہ قیامت کے روز ان کے واسطے ایک لعنت کا اضافہ کیا گیا تو دو لعنتیں ہوگئیں۔ علی بن طلحہ نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد دنیا و آخرت کی لعنت ہے۔ ضحاک و قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔

(۳) وِرْد کہتے ہیں گھاٹ کو۔ اَوْرَدَ کے معنی ہیں گھاٹ یا پانی پر اُتار لے گے۔ اس لفظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ بظاہر فرعون نے اپنے ساتھ والوں کو بحر قلزم میں اتارا تھا، لیکن درحقیقت پانی میں نہ اُتارا تھا آگ میں داخل کیا تھا۔ پانی میں غرق کرا کے آگ میں پہنچا دیا۔

اب ہم تفسیری مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جب خدا تعالیٰ نے افرادِ انسانی کی ہدایت کے لئے مختلف زمانوں میں نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، ابراہیمؑ، لوطؑ اور شعیب علیہم السلام کو مبعوث فرمایا اور ہر پیغمبر کو نبوت کے ثبوت کے لئے کوئی نہ کوئی معجزہ بھی عطا فرمایا تو لوگوں نے سب کی تکذیب کی محسوس پرستی کی طرف مائل رہے۔ غیر محسوس خدا اور غیبی عقائد سے پرہیز کیا۔ بالآخر خدا نے ان کو ہلاک کیا۔ چونکہ ہر نبی کو مخصوص اور قلیل معجزات عطا کیے گئے تھے، اس لئے خیال ہو سکتا تھا کہ ان معجزات کو نہ ماننے والے ممکن ہے بے قصور ہوں۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شخص کا دماغ صرف ایک معجزہ دیکھ کر پیغمبر کی صداقت کا یقین کرلے۔ خدا نے اتمامِ حجت کیوں نہ کیا اور کیوں ہر ایک پیغمبر کو متواتر بکثرت معجزات عطا نہ فرمائے جس سے کم فہم طبقہ کو بھی ہدایت ہو سکتی۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کا قصہ شروع فرمایا اور ان الفاظ میں بیان کیا جن سے کوئی شبہ باقی نہ رہ سکے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ فقط یہی نہیں کہ ہم نے نوح، ہود، صالح وغیرہم کو ایک ایک معجزہ دے کر اقوام کی ہدایت کے لئے بھیجا بلکہ ایسا بھی ہوا کہ ایک پیغمبر کو بکثرت دلائل نبوت اور براہین توحید عطا فرما کر مبعوث کیا، مگر سرکش باغیوں نے پھر بھی نہ مانا۔ دیکھو موسیٰ کو مختلف نشانیاں، دلائل توحید اور براہین نبوت دے کر ہم نے مبعوث کیا تاکہ وہ فرعون اور اس کے گروہ کو ہدایت کریں، مگر کسی نے موسیٰ کی نہ سُنی۔ فرعون کے نقشِ قدم پر چلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں فرعون ہلاک ہوا وہاں اس کے طریقے پر چلنے والے بھی غارت ہوگئے کیونکہ فرعون کا مسلک غلط تھا۔ دنیا میں بھی وہ سب قوم کا پیشوا تھا اور قیامت کے دن وہ تمام قوم کا پیشوا ہوگا۔ رسوائی کا جھنڈا اس کے ہاتھ میں ہوگا اور کل پیروی کرنے والے اس کے ساتھ دوزخ میں جائیں گے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع حدیث ہے کہ جاہلیت کے شاعروں کا علم بردار امرؤ القیس ہوگا (رواہ احمد)

مقصودِ بیان

مذکورہ ساتوں قصوں کے بیان میں اصل اشارہ اس طرف ہے کہ سُننے والوں کو عبرت حاصل ہو۔ اہلِ حق اپنے خالق کی الوہیت، ربوبیت اور قدرت کو پہچانیں، اہلِ حال مقاماتِ اسرار سے واقف ہوں، سرکشوں کا نتیجۂ بد نظروں کے سامنے آجائے اور فرماں برداروں پر جو کچھ فیضانِ انعام ہوا اُس کو سُن کر ایمان و نیکی کی طرف رغبت ہو۔ حضرت موسیٰؑ کے واقعات سے خصوصیت کے ساتھ مندرجۂ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔ موسیٰؑ کو بکثرت معجزات عطا کیے گئے تھے۔ ایسی قطعی برہان بھی دی گئی تھی جس کے مقابلے میں فرعون اور اس کا تمام شکوہ و جلال مغلوب تھا۔ اللہ کی طاقت جس کے ساتھ ہو، اگرچہ وہ تنہا بے یار و مددگار ہو، مگر اپنے حریف پر غالب آتا ہے، خواہ اس کا حریف شہنشاہِ اعظم ہو۔ صداقت اور حقانیت مغلوب نہیں ہو سکتی۔ فرعون یقیناً گمراہ تھا اور گمراہی پر اس کا انتقال ہوا۔ مرتے وقت بھی اُس نے توبہ نہیں کی۔ کج راہی کے عقیدۂ بد میں مبتلا ہونے والا نہ صرف پیشوا ہی ہوتا ہے بلکہ اس کے تمام پیرو اور مقلد بھی ماخوذ ہوتے ہیں۔ اظہارِ حق علی الاعلان شیوۂ انبیاء ہے۔ اہلِ حق حق کو ظاہر کرنے میں کسی طاقت سے مرعوب نہیں ہوتے اس میں مسلمانوں کے لئے بھی درسِ بصیرت ہے کہ دولت، مال، عزت، حکومت اور ہر قسم کی طاقت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تم کو اظہارِ حق اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی کوشش کرنی چاہیئے۔ باطل پرست مقابل کی طاقت اور شوکتِ ظاہری سے نہ ڈرو۔ سُنتِ موسیٰ پر عمل کرو۔ بالآخر تم ہی کامیاب ہوگے وغیرہ۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ○ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ

یہ بستیوں کی چند خبریں ہم تم کو سنا رہے ہیں اُن میں سے بعض بستیاں تو موجود ہیں اور کوئی جڑ سے کٹ گئی ہے ہم نے اُن پر ظلم نہیں کیا

وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِيْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ

بلکہ انھوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا جب اللہ کا عذاب آپہنچا تو اُن کے وہ معبود کچھ کام نہ آئے جن کی عبادت وہ خدا

اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ۝ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ

کو چھوڑ کر　کرتے تھے　اور وہ معبود اُن کی تباہی میں مزید اضافہ کا سبب ہے　تمہارے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے

رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

جبکہ وہ بستیوں کی گرفت کرتا ہے　بشرطیکہ وہ　ظالم ہوں　اُن کی گرفت　واقعی　دردناک ہے　اس میں ان لوگوں کے لئے

لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ؕ ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ

نشانِ قدرت ہے جو آخرت کے عذاب سے　ڈرتا ہو　وہ ایسا دن ہوگا　جس میں لوگوں　کو جمع کیا جائے گا اور وہی دن ہوگا جس میں لوگوں کو حاضر کیا جائیگا

تفسیر ان آیات میں گزشتہ کل قصص و واقعات کا نچوڑ ظاہر فرمایا ہے۔ ہم چند فقروں کی توضیح کرتے ہوئے خلاصہ مطلب بیان کرتے ہیں۔

(۱) ابن کثیر کے نزدیک قائم سے معمور آبادیاں اور حصید سے مراد تباہ ویرانے ہیں۔ بعض لوگوں نے ابن عباسؓ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں قائم سے وہ بستیاں مراد ہیں جن کے کچھ آثار باقی ہیں اور ان کی شناخت ہو سکتی ہے اور حصید سے مراد وہ ویرانے ہیں جن کی آبادی کا نام نشان بھی مٹ گیا اور وہ خود بھی فرسودہ ہو کر مٹ گئے۔

(۲) اللہ کی گرفت سخت ہے۔ حضرت ابو موسیٰ کی روایت ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا ظالم بندہ کو اللہ ڈھیل دیتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اس کی گرفت کر لیتا ہے تو پھر اس کو رہائی نہیں دیتا۔ حضور والاؐ نے مذکورہ ارشاد کے بعد آیت اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ تلاوت فرمائی (رواہ البخاری ومسلم)

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جن بستیوں کے واقعات کا تذکرہ کیا گیا اُن میں کچھ بستیاں اب صفحۂ زمین اپنا نام نشان رکھتی ہیں، کچھ آثار ان کے دکھائی دیتے ہیں (مثلاً مدینہ سے تبوک جاتے وقت راستہ میں قوم ثمود کا کنواں، اونٹنی کی آمد و رفت کا راستہ وغیرہ حضور والاؐ نے لشکر والوں کو دکھایا تھا۔ بلکہ اب بھی بہت سے نشانات باقی ہیں) اور کچھ بستیوں کی نمود بھی مٹ گئی۔ اللہ نے ان کو تباہ کر دیا۔ اُن کے جھوٹے دیوتا اور ناطاقت فرضی معبود کچھ اُن کی مدد نہ کر سکے بلکہ باطل معبودوں کی پرستش خود پرستاروں کے حق میں تباہی کا سبب ہوئی۔ اس سے آگے فرماتا ہے کہ گزشتہ اقوام ہی پر کیا حصر ہے ضابطۂ الٰہی اور قانونِ قدرت ہی یہی ہے کہ جب کوئی قوم حق سے سرکشی کرتی اور قانونِ فطرت کی خلاف ورزی کرتی ہے تو خدا اس کی گرفت کرتا ہے اور ایسی گرفت کرتا ہے کہ پھر رہائی ناممکن ہو جاتی ہے وغیرہ۔

مقصودِ بیان گزشتہ اقوام کے واقعات کا بیان کا نچوڑ۔ مسلمانوں کے لئے درسِ عبرت۔ قانونِ الٰہی کا اظہار۔ اس امر کی صراحت کہ خدا ظالم نہیں وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ انسان کی زیان کاری اور بداعمالی خود اس کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے، اگرچہ مسبب خدا ہے۔ اللہ کی گرفت سخت ہے اُس سے رہائی ناممکن ہے۔ قیامت میں سب کا جمع ہونا اور حاضر ہونا ضروری ہے وغیرہ۔

وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ؕ يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ

ہم اُس کو چند روزہ مدت ہی کے لئے ملتوی کئے ہوئے ہیں　جب وہ دن آپہنچے گا تو کوئی شخص بغیر اذنِ خدا کے نہ بول سکے گا پھر لوگوں میں سے

شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ○ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ○

کوئی بدبخت ہوگا کوئی نیک بخت — جو لوگ بدبخت ہیں — وہ آگ میں ہوں گے — اور آگ کے اندر اُن کی چیکار دہاڑ ہوگی

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ

اس میں ہمیشہ رہیں گے — جب تک آسمان و زمین — قائم رہیں گے — ہاں جو تمہارا — رب چاہے — تمہارا رب

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ○ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا

جو چاہتا ہے کر ڈالتا ہے — جو لوگ — نیک بخت ہوں گے — وہ جنت میں — ہمیشہ رہیں گے — جب تک

دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ عَطَاۗءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ○

آسمان و زمین — قائم رہیں گے — ہاں جو تمہارا — رب چاہے — یہ بخشش غیر منقطع ہوگی

تفسیر تفصیل و تحقیق مباحث سے قبل ہم آیات کا مختصر تفسیری مطلب بیان کرتے ہیں۔ گزشتہ آیات میں بیان فرمایا تھا کہ قیامت کا ایک دن مقرر ہے جس میں تمام آدمیوں کو سمیٹ کر جمع کیا جائے گا اور اعمال کی شہادت لی جائے گی۔ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ قیامت کا وہ مقررہ دن کب ہوگا اس میں تاخیر کی کیا وجہ ہے؟ اس دن کی مفصل کیفیت کیا ہوگی؟ قیامت کا دن کس کام کے لئے مقرر کیا گیا ہے؟ ان سب باتوں کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے چونکہ اس عالم کی زندگی کی ایک میعاد مقرر ہے جب تک وہ میعاد پوری نہ ہو جائے قیامت نہیں آسکتی۔ جب دنیوی زندگی کے ایام پورے ہو جائیں گے تو فوراً قیامت آجائے گی۔ وہ دن ایسا ہول انگیز اور وحشت ناک ہوگا کہ بغیر اجازت کے کوئی شخص بھی بات نہ کر سکے گا منہ سے کوئی لفظ بھی نہ نکال سکے گا۔ رہی یہ بات کہ اُس روز کیا ہوگا، کس کام کے لئے قیامت کا دن مقرر کیا گیا ہے؟ اس کے متعلق فرماتا ہے کہ نیکوں اور بدوں کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔ کچھ لوگ ازلی بدبخت ہوں گے وہ دوامی طور پر دوزخ میں رہیں گے اور کچھ لوگ ازلی خوش نصیب ہوں گے وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ نہ دوزخ کے عذاب کو کبھی انقطاع ہے نہ جنت کے ثواب کو کبھی فنا۔ خصوصاً جنت کے اندر انعاماتِ الٰہی تو لازوال اور بے انتہا ہیں۔ اب ہم آیات پر تفصیلی تبصرہ کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ قیامت کا ایک دن مقرر ہے۔ اس کے آنے کی مدت محدود ہے۔ ایک قلیل مدت تک دنیا باقی ہے، جب وہ مدت ختم ہو جائے گی قیامت آجائے گی۔ دنیوی بقا کتنی ہی طویل ہو، مگر پھر محدود ہے اور محدود چیز غیر محدود کے مقابلے میں قلیل ہے۔ قیامت کا یقینی علم سوائے اللہ کے کسی کو نہیں صرف چند آثار احادیث میں بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً دنیا کی مردم شماری میں عیسائیوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔ دولت و قوت میں بھی عیسائی بڑھ کر ہوں گے۔ عرب کے چند محدود قطعات مسلمانوں کے قبضہ میں رہ جائیں گے۔ باقی دنیا پر کافروں کا تسلط ہو جائے گا۔ خروج دجال اور ظہور مہدی ہوگا۔ یہ تو آثار کبریٰ میں سے ہے۔ آثارِ صغریٰ تو وہ بکثرت ہیں جن کو عام طور پر علماء اسلام جانتے ہیں۔

۲۔ قیامت کے دن بغیر اذن الٰہی کے کوئی کسی سے کچھ بات نہ کرسکے گا نہ کر سکے گا یعنی واقعات قیامت کی ہولناکی اور جلال الٰہی کے ظہور کے سبب کوئی بات نہ کر سکے گا۔ زبان سے کوئی لفظ نہ نکلے گا۔ ہاں جس کو اللہ کی طرف سے اذن ہوگا وہی بولے گا۔ صحیحین کی حدیث شفاعت میں مذکور ہے کہ سوائے پیغمبروں کے اور کوئی شخص اس دن بات نہ کر سکے گا اور اگر پیغمبر کچھ کہیں گے تو یہی کہیں گے یارب سَلِّمْ سَلِّمْ۔ پروردگار بچالے۔ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسری آیات میں بصراحت مذکور ہے کہ قیامت کے دن کفار غلط بیانی اور دروغ گوئی کریں گے۔ دنیا میں جو کچھ شرک اور کفر

کرتے ہیں اس سے مکر جائیں گے ۔ مثلاً کہیں گے رَبَّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ۔ دوسری جگہ آیا ہے ۔ يَوْمَ تَأْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَفْسِهَا ۔ ابن عباسؓ
نے اس شبہ کا ازالہ اس طرح فرمایا ہے کہ روز قیامت کے تین حصے ہوں گے ۔ ابتدائی حصہ میں انتہائی حیرت و ہیبت کی وجہ سے کوئی کچھ نہ بول سکے گا ۔
دوسرے حصے میں کفار بات تو نہ کر سکیں گے ، مگر ان کے اعضاء ان کی بداعمالیوں کی شہادت دیں گے پھر تیسرے حصہ میں انبیاء اولیاء وغیرہم سفارش کرکے
گناہ گار اہلِ ایمان کو رہا کرائیں گے اور کفار پر عذاب کی مار ہوگی تو اس وقت کفار اپنی بداعمالیوں سے مکر جائیں گے اور اپنے کرتوت سے انکار کریں گے ۔

؎۲ قیامت کے دن صرف دو فرقے ہوں گے ۔ بدبخت اور خوش نصیب ۔ یعنی ایک گروہ تو وہ ہوگا جو فیصلۂ ازلی کے موافق سعادت مند ہوگا ۔
دوسرا گروہ وہ ہوگا جو ازلی تجویز کے بموجب شقی اور بدبخت ہوگا ۔ اوّل گروہ نجات یافتہ اور دوسرا گروہ مبتلائے عذاب ہوگا ۔ اہلِ سنّت کے قول
پر ان دو گروہوں کے درمیان کوئی تیسرا گروہ نہ ہوگا ۔ مخلص اہلِ ایمان خواہ باعمل ہوں یا بے عمل ، پاک صاف ہوں یا مرتکب کبائر ۔ بہر حال اوّل
گروہ میں داخل ہیں ۔ کیونکہ سعادت مند کے یہاں یہ معنی ہیں کہ کبھی نہ کبھی اس کو جنّت مل جائے ۔ ظاہر ہے کہ اگر رائی برابر ایمان دل میں ہوگا تو کسی
وقت دوزخ سے رہائی ضرور ہوگی ۔ خواہ اعمال کیسے ہی خراب ہوں ۔ رہے کفار تو وہ شقی گروہ میں داخل ہوں گے ، ان کی رہائی کبھی نہ ہوگی ۔ فرقۂ
معتزلہ کے نزدیک وہ مؤمن بھی جو مرتکب کبائر ہیں ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے ۔ معتزلہ کا علمبردار زمخشری اہلِ سنّت پر طعن کرتا ہوا آیت اَمَّا الَّذِيْنَ
شَقُوْا سے کفار اور مرتکب کبائر اہلِ ایمان مراد لیتا ہے ، مگر شوکانی نے مختلف احادیث کی روشنی میں اس کی کافی تردید کر دی ہے ۔

؎۳ کفار کے دوامی دوزخی ہونے اور اہلِ ایمان کے دوامی جنّتی ہونے میں علماء کا اختلاف ہے ۔ اس آیت میں صراحۃً بیان کیا گیا ہے
کہ کفار دوزخ میں رہیں گے ۔ ہاں اگر اللہ چاہے گا تو ان کو کبھی نکال لے گا ۔ بعض علماء کا یہی مسلک ہے ۔ علماء کا یہ گروہ اپنے مقصد کے ثبوت میں
مندرجہ ذیل حدیث پیش کرتا ہے ۔ عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے ثابت ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا جب کہ جہنم میں کوئی نہ ہوگا اور دوزخ
کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے ، لیکن یہ بات مدتوں جہنم میں پڑے رہنے کے بعد ہوگی ۔ معلوم ہوا کہ کفار کو بھی آخر میں رہائی مل جائے گی (رواہ
بحمد فی مسندہ) ابن تیمیہ نے یہی قول فاروق اعظمؓ ، ابن عباسؓ ، ابن مسعودؓ ، ابو ہریرہؓ ، انس بن مالکؓ کا بیان کیا ہے ۔
آیت سے استدلال کی نفی تو ہم بعد کو کریں گے ۔ اوّل حدیث کا مطلب بر طریق اہلِ سنّت بیان کرتے ہیں ۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایک
زمانہ ایسا بھی آئے گا جب کہ دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے اور اس کے اندر کوئی کمزور ایمان والا بھی نہ ہوگا ۔ اس مطلب کی تائید
حدیث شفاعت مرویہ صحیحین سے بھی ہوتی ہے ۔ رہا آیت سے استدلال کا رد تو اس کے متعلق ابو سعید خدریؓ کا تفسیری قول کافی ہے کہ قرآن
پاک میں جس جگہ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۔ آیا ہے وہاں دوام غیر منقطع مراد ہے اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آیت مذکورہ انقطاعِ عذاب پر دلالت کرتی
ہے تو بقول ابن عباسؓ آیت اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ اس کی ناسخ ہے ۔ ہاں اسی آیت سے دوام عذاب
پر ایک شبہ اور ہو سکتا ہے وہ یہ کہ عذاب کی مدت کو بقاءِ آسمان و زمین کی مدت پر معلق کیا ہے یعنی جب تک آسمان و زمین معلق ہوں گے ، کفار
دوزخ میں رہیں گے اور آسمان و زمین کا وجود تو دوامی نہیں لہٰذا عذابِ کفار بھی دوامی نہیں ہو سکتا ۔ اس شبہ کا ازالہ اس طور پر کیا جا سکتا ہے
کہ آسمان و زمین سے یہ دنیوی آسمان و زمین مراد نہیں بلکہ آخرت کے آسمان و زمین مراد ہیں جس کی صراحت آیت يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ
الْاَرْضِ الخ میں کر دی گئی ہے کیونکہ اس آسمان و زمین کی بربادی تو وجود قیامت سے ہو جائے گی اور دوزخ کا عذاب اس کے بعد ہوگا پھر
عذاب کو ان کی بقاء پر معلق کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ یہی قید اہلِ جنّت کے لئے بھی آیت میں مذکور ہے ۔ اس سے انقطاع
عذاب ہو سکتا ہے تو انقطاع ثواب بھی ہونا چاہیئے ۔ حالانکہ جنّت کا عدم انقطاع بالاجماع ہے ۔

مقصودِ بیان

بقاءِ دنیا کی میعاد معیّن ہے ۔ میعاد معیّن گزر جانے کے بعد قیامت آئے گی ۔ قیامت کا دن نہایت ہولناک ہوگا ۔
بغیر اذنِ الٰہی کوئی کسی سے بات نہ کر سکے گا ۔ انسانوں کی دو ہی قسمیں ہیں سعید اور شقی ۔ درمیان میں کوئی تیسری
صنف نہیں ۔ دوزخی دوزخ میں اور جنّتی جنّت میں ہمیشہ رہیں گے ۔ آخرت کے آسمان و زمین دنیوی آسمان و زمین سے علیحدہ ہوں گے ۔

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ ۭ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُهُمْ

تو اے مخاطب) تو اُن چیزوں سے شک میں نہ ہو جس کی یہ لوگ پرستش کرتے ہیں یہ ایسی ہی چیز کی پرستش کرتے ہیں جیسے ان سے پہلے اُن کے باپ دادا

مِّنْ قَبْلُ ۭ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ۝ۧ

پوجا کرتے تھے ہم بغیر کمی کے ان کا حصہ پورا پورا دیں گے

تفسیر انبیاء اور ان کی اقوام کے قصص اور مؤمنین و کافرین کے نتائج بیان کرنے کے بعد رسول اللہ کی قوم کی حالت بیان فرماکر مسلمانوں کے شکوک کو (اگر کافروں کی حالت دیکھ کر پیدا ہوئے ہوں) زائل فرماتا ہے۔ کفار اور باطل پرستوں کا عام عقیدہ ہوتا ہے کہ ہمارے دیوتا اور معبود پیر فقیر ہمارے مددگار ہیں۔ انھیں کے طفیل سے ہم کو رزق، دولت اور ترقی حاصل ہوتی ہے۔ اگر ہم اس کے خلاف کریں گے تو برباد ہو جائیں گے۔ ہماری دولت اور رفاہیت زائل ہو جائے گی۔ اگر ان کی پرستش اور ان سے عقیدت حق نہ ہوتی تو ہم اس قدر دولت مند کیوں ہوتے، ہم ضرور تباہ کر دیے جاتے وغیرہ۔ کافروں کی حالت چونکہ عموماً دولتمندی میں مسلمانوں سے اچھی ہوتی ہے، اس لئے اہل اسلام کے دلوں میں اس شیطانی تقریر کا اثر ہو سکتا تھا اور بنا بریں خداوند تعالیٰ رسول پاکؐ کو خطاب فرماتا ہے۔ خطاب اگرچہ رسولؐ کو ہے، مگر روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ مسلمانوں تم کافروں کی رفاہیت اور دنیوی تمول دیکھ کر یہ نہ خیال کر لینا کہ یہ جو دیوتاؤں اور باطل معبودوں کی پرستش کرتے ہیں ان کی دولت مندی اسی کا ثمرہ ہے۔ جھوٹے دیوتا ان کو دولت مند بنا دیتے ہیں ان کے دیوتاؤں کے ہاتھوں میں تو کچھ بھی نہیں ہے، سب کچھ ہمارے ہی ہاتھ میں ہے۔ اچھائی ہو یا برائی، نیکی ہو یا بدی، آرام ہو یا تکلیف ہم ہی ہر ایک کا مقررہ حصہ پورا پورا دیتے ہیں۔ بت اور دیوتا کچھ نہیں دیتے۔ بات یہ ہے کہ باطل پرستی کی جب کوئی وجہ نہیں ملتی اور کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے تو مجبوراً ایسی توجیہ کرتے ہیں ورنہ واقع میں یہ محض مقلد ہیں۔ جس چیز کی ان کے اسلاف پرستش کرتے چلے آئے ہیں۔ اسی کی پوجا یہ کرتے ہیں۔ حق ناحق سے کوئی بحث نہیں۔

مقصود بیان کورانہ تقلید اسلاف کی در پردہ مخالفت۔ خوشی راحت، دولت و افلاس سب مقدر ہے۔ کفر و اسلام سے دنیوی رزق میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ جو مقدر ہے وہ ضرور پورا پورا ملے گا وغیرہ۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی لیکن اس میں اختلاف کیا گیا اگر ایک بات تمہارے رب کی طرف سے پہلے نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان کا باہمی فیصلہ

بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ۭ اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ

کر دیا گیا ہوتا یہ لوگ اس کی طرف سے بے چینی انگیز شک میں ہیں ان سب کو اُن کے اعمال کا پورا پورا بدلہ تمہارا رب ضرور دے گا وہ ان سب کے اعمال سے

خَبِيْرٌ ۝ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

باخبر ہے جیسا تم کو حکم دیا گیا ہے اُس پر تم اور وہ لوگ جنھوں نے تمہارے ساتھ توبہ کی ہے سیدھے چلے رہو اور تم حد سے آگے نہ بڑھو اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

تفسیر کفارِ عرب جس طرح توحید کے منکر تھے اسی طرح حضور اقدس کی نبوت کو نہ مانتے تھے۔ اس سے رسول پاکؐ کو صدمہ تھا۔ حضورؐ کی تسلی کے لئے حضرت موسیٰؑ کا حوالہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ رسالت کا انکار اور احکام الٰہی سے سرتابی کوئی نئی بات نہیں بلکہ پیشتر سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ جو صحوا ہم نے موسیٰ پر تورات نازل کی تھی، اس کو بعض لوگوں نے مانا بعض نے نہ مانا۔ بعض آدمیوں نے کچھ احکام مانے کچھ نہ مانے۔ کسی نے الفاظ میں تحریف کردی، کسی نے معنی بگاڑ دیے، بعض نے تورات کو اپنی مقصد برآری کا ذریعہ بنایا۔ جو حکم چاہا دیا اور جس سے چاہا منع کیا اور جب چاہا جائز کیا۔ اس پھوٹ اور اختلاف کو خدا دور کر سکتا تھا خواہ اس صورت سے کہ پھوٹ ڈالنے والوں کو تباہ کر دیتا، خواہ اس طرح کہ اختلاف پیدا کرنے والوں کو اختلاف کی طاقت ہی نہ دیتا، لیکن یہ تو قانونِ قدرت ہے، فیصلۂ ازلی ہے کہ مومن و منکر، شقی و سعید اور نیک و بد سے دنیا آباد ہو۔ اسی ازلی فیصلے کا لحاظ کرتے ہوئے خدا نے منکروں اور پھوٹ ڈالنے والوں کو برباد نہیں کیا۔ چنانچہ اب تک وہ اضطراب انگیز شک اور توہم پرستی میں بدستور مبتلا ہیں اور خدا نے ان کو چھوڑ رکھا ہے۔ ہاں آخرت میں ہر ایک کے عمل کا پورا پورا بدلہ دے گا وہاں چھوٹ نہ ہوگی لہٰذا تم کو بھی کفار کے کفر و انکار اور ان کی سرتابی سے کچھ صدمہ نہ کرنا چاہیئے۔ اللہ سب کی حالت جانتا ہے تو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ البتہ تم اپنے کام میں درست رہو اور تمہارے ساتھی اور ہر شخص جو مومن ہو اس کو راہِ اسلام پر قائم رہنا چاہیئے، مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ حد سے بڑھ جاؤ اور اعتدال سے بھی تجاوز کر جاؤ (نوافل میں اتنا غلو کرو کہ صحت تباہ ہو جائے اور بالآخر ان کا التزام نہ کر سکو)

آیت فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ کے معنی کی توضیح مختلف علماء نے مختلف طور پر کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا استقامت درحقیقت یہ ہے کہ اوامر و نواہی کی پابندی کرو، لومڑی کی طرح حیلے بہانے نہ ڈھونڈو۔ ابوالسعود نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ لفظ استقامت تمام اصولی و فرعی احکام اور علمی اور عملی کمالات کو جامع ہے اور اس کو پورا کرنا بہت دشوار ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ استقامت عقائد و اعمال دونوں کو شامل ہے۔ حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی کی روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے اسلام کے متعلق ایسی بات بتا دیجئے کہ حضور کے بعد مجھے اور کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ فرمایا اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ کہو اور پھر استقامت اختیار کرو (مسلم)

ابن عباسؓ فرماتے ہیں اس آیت سے زیادہ سخت اور شاق حضورؐ کے حق میں اور کوئی آیت نہیں اتری۔ صحاح و سنن میں مذکور ہے کہ حضورؐ نے فرمایا مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا یعنی سورۂ ہود کی اسی آیت نے جس میں استقامت کا حکم ہے۔ حسن بصری کی روایت ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضورؐ نے فرمایا شَمِّرُوْا شَمِّرُوْا یعنی دامن سمیٹ کر، کمر باندھ کر مضبوطی کے ساتھ تعمیل احکام کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔ پھر اس کے بعد کسی نے آپ کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔

مقصدِ بیان اسلام میں تفرقہ اور کتب الٰہیہ کا انکار اور ان میں اختلاف پیدا کرنا قانونِ ازلی کے مطابق ہے ضابطۂ قدرت ہی یوں ہے کہ کچھ مومن اور کچھ کافر کچھ موحد اور کچھ پھوٹ پیدا کرنے والے ہوں تاکہ حق و باطل کا امتیاز ہوتا رہے اور اس زمین کی آبادی قائم رہے۔ حضرت موسیٰ کی تورات میں اختلاف پیدا ہونے کی خبر دینے سے اس طرف ایماء ہے کہ آئندہ مسلمان بھی قرآن میں اختلاف کریں گے اگر الفاظ میں نہیں تو معانی میں تحریف و تبدیل ضرور کریں گے اور پھر آخرت میں حق و باطل اور صادق و کاذب کا نتیجہ سامنے آجائے گا۔ لفظ فَاسْتَقِمْ سے صراحۃً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلام نام اعتدال اور میانہ روی کا ہے۔ افراط و تفریط دونوں اسلام سے خارج ہیں۔ گمراہی کا تو کفر ہونا ظاہر ہے مگر کج راہی بھی کفر ہے۔ نوافل و اعمالِ خیر میں ناقابلِ برداشت زیادتی کی بھی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ جس طرح نواہی و اوامر سے سرتابی کو گمراہی خیال کرتا ہے لفظ كَمَا أُمِرْتَ سے صاف واضح ہے کہ قانونِ اسلام قانونِ الٰہی ہے۔ عقلاء کی تصنیف اجماع اور وضع کو اس میں دخل نہیں۔ شریعت کے تمام عقائد اور فرائض و واجبات نیز سنن مؤکدہ الہامی چیزیں ہیں۔ عقل سے ان میں تغیر تبدل نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ ان میں سے کوئی حکم خلافِ عقل و بصیرت بھی نہیں ہے۔ وَلَا تَطْغَوْا کا لفظ بتا رہا ہے کہ شریعت قانونِ عدل ہے اور عدالت کا ہی نام شریعت ہے۔ اس سے ہٹنا خواہ کسی جانب ہو یا زیادتی کی طرف بہرحال طغیان ہے گویا عدالتِ الٰہیہ کا مظہر قانونِ شرع ہے جو دنیا میں انصاف قائم کرنے، امن پھیلانے اور طمانیت میں رضا ذکر نے کے لئے آیا ہے۔ جور و طغیان، ظلم و زیادتی وغیرہ کا جز ہیں اس سے مظہر بانی ہیں وغیرہ۔

وَلَا تَرْكَنُوٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ

اور ظالموں کی طرف نہ جھکو ورنہ تم کو بھی آگ لگے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا نہ تمہاری مدد کی جائے گی۔

تفسیر یہ آیت گزشتہ آیت سے وابستہ ہے۔ پہلی آیت میں استقامت کا حکم دیا تھا۔ اس جگہ فرمایا کہ دنیا کی ثروت دیکھ کر یا عزت، عروج، حکومت اور دولت وغیرہ کے حصول کے لئے ظالموں کی طرف مائل نہ ہو۔ اپنی استقامت کو کسی خوف یا کسی لالچ کے سبب نہ چھوڑو۔ ظالموں کی طرف میلان کرنے کا نتیجہ دوزخ ہے۔ توضیح معنی سے قبل ہم آیت کے دونوں اجزاء کی تشریح کرنی چاہتے ہیں۔

۱۔ رکون کی ممانعت ہے۔ قرطبی نے رکون کے معنی بھروسہ کرنا، ٹیک لگانا، اعتماد کرنا اور پسند کرنا لکھے ہیں۔ ابن جریر نے بروایت ابن عباسؓ بیان کیا ہے کہ رکون کے معنی جھکنا، مائل ہونا ہیں۔ ابن عباسؓ سے دوسری روایت میں ہے لَا تَرْكَنُوٓا کے معنی ہیں کہ ظالموں سے آشتی، مداہنت اور مصالحت نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ان کے گفتار و کردار کو دیکھ کر چپ ہو کر بیٹھ رہو۔ فتح البیان میں بروایت عکرمہ و قتادہ منقول ہے کہ ظالموں سے دلی دوستی اور ان کی اطاعت کرو۔ کشاف میں لکھا ہے کہ رکون سے مراد خفیف میلان ہے۔

۲۔ ظالموں سے کون لوگ مراد ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس میں ہر ظالم داخل ہے۔ خواہ مشرک عادل ہو جس نے اپنے نفس پر فقط ظلم کیا ہے، مخلوق پر ظلم نہیں کیا یا مشرک ظالم ہو جو دونوں طرح سے ظلم کرتا ہے اپنے نفس پر بھی اور مخلوق پر بھی یا مسلم ظالم ہو جو مخلوق پر ظلم کرتے ہیں۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ اہلِ عدل کو چھوڑ کر ستم گاروں اور نافرمانوں سے اُنس، دینی ربط ضبط اور باطنی اختلاط نہ کرو۔ ظالموں کے ظلم کی حمایت کسی طرح نہ کرو۔ نہ رفتار و کردار سے نہ اعلان و اخفاء سے نہ سکونت و خاموشی سے۔ بلکہ اس کے خلاف جہاں تک ممکن ہو کوشش کرو۔ نرمی اور شفقت سے اس کو سمجھاؤ۔ پھر سختی کا موقع ہو تو درشت لہجہ سے فہمائش کرو۔ یوں بھی نتیجہ نہ نکلے تو ظالم کے خلاف عملی اقدام کرو اور کسی طرح مقابلہ نہ ہو تو ترکِ تعلقات کرلو ورنہ ظالم کے ساتھ تم بھی دوزخ میں جاؤ گے۔ ظالم آگ کا مجسمہ ہے تم کو بھی جلا کر خاکستر کردے گا۔

نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ جس میلان سے آیت میں ممانعت کی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ظالموں کی وضع اور حالت کو دل سے پسند کیا جائے۔ دوسروں کو ظالموں کے قول و فعل کی خوبی سمجھائی جائے اور اس کے ساتھ کسی ظلم میں شرکت کی جائے۔ رہے دنیوی معاملات تو کسی جائز فائدے کے حصول کے لئے یا مضرت کو دور کرنے کے لئے ظالموں سے ملنے جلنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ قرطبی کے قول کا بھی یہی مفاد ہے۔ اہلِ تحقیق کی بھی یہی رائے ہے۔

مقصودِ بیان ظالموں کی حمایت کرنے بلکہ اُن سے اندرونی دوستی رکھنے اور ان کی طرف قلبی میلان کرنے کی ممانعت۔ آیت سے صاف واضح ہے کہ اسلام آشتی اور امن کا علمبردار ہے ظلم اور دراز دستی قطعاً بندش کرنی چاہتا ہے۔ بلکہ اپنے پیروؤں کو بھی ستمگاروں کی طرف مائل ہونے سے روکتا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جس نے ظالم کے لئے درازیٔ عمر کی دعا کی اُس نے پسند کیا کہ دنیا میں اللہ کی نافرمانی زیادہ پھیلے (کذا فی السراج) آیت میں درپردہ تبلیغ ہے اس بات کی کہ ظالم سے نہ خوف کرو نہ طمع رکھو بلکہ اس کے خلاف علم جہاد بلند کرو۔ اس کی طاقت کی افزونی اور دولت کی فراوانی تم کو اعلانِ حق سے نہ روکے کیوں کہ کارساز درحقیقت خدا ہے۔ اس کی امداد و نصرت تم کو کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی نہ اس کی دشمنی تمہارا کچھ بگاڑ سکتی ہے وغیرہ۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۭ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّـيِّاٰتِ ۭ

اور دن کے دونوں سروں پر اور رات کے کچھ حصہ میں نماز باقاعدہ پڑھتے رہو کیونکہ نیکیاں قطعی طور پر بدیوں کو دور کردیتی ہیں۔

ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۝ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

یہ نصیحت ماننے والوں کے لئے نصیحت ہے اور صبر رکھو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا

اس آیت کی شانِ نزول میں مختلف روایات کے لحاظ سے کمی بیشی ہے۔ ترمذی، بخاری، مسلم، مسند احمد اور ابن جریر کی روایات کم و بیش ہیں۔ سب کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی مجاہد کی بیوی سے ایک شخص نے معانقہ اور لامسہ کیا اور فوراً خوفِ خدا دل میں پیدا ہوا تو بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر قصہ عرض کر دیا۔ حضورؐ نے جواب دینے میں تامل فرمایا۔ کچھ دیر سرنگوں رہے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن جریر نے ابوامامہ کی روایت سے اتنا مزید بیان کیا کہ وہ شخص بے قراری کے ساتھ جواب کا منتظر کھڑا رہا۔ نماز کا وقت آیا تو اُس نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز کے بعد حضورؐ نے اُس سے فرمایا کیا تو نے پورا وضو کیا تھا اور ہمارے ساتھ نماز پڑھی تھی؟ اُس نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا تو گناہ سے ایسا پاک ہو گیا جیسا پیدا ہونے کے بعد تھا، لیکن اب ایسا نہ کرنا۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ حضرت معاذ نے عرض کیا حضور یہ حکم کیا فقط اسی کے لئے ہے؟ فرمایا نہیں بلکہ سب اُمت کے لئے ہے۔

اب ہم توضیح مطلب سے پہلے آیت کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اَلصَّلٰوۃ سے مراد ابن مسعودؓ کے نزدیک پنجگانہ فرائض ہیں۔ ابن عباسؓ نے نوافل کو بھی داخل سمجھا ہے۔ اکثر محدثین نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ قرطبی نے ابن مسیب، وضحاک وغیرہ کا بھی یہی قول بتایا ہے۔
دن کے دونوں کناروں کی نماز سے مراد کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ ابن زید وغیرہ کا قول یہ ہے کہ طرفِ اوّل سے فجر کی نماز اور طرفِ دوئم سے مرادِ مغرب کی نماز ہے اور زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ سے مراد عشاء کی نماز ہے۔ ابن جریر نے اس قول کو پسند کیا ہے۔ حسن، ضحاک، قتادہ وغیرہ کے قول پر طرفِ اوّل فجر ہے اور طرفِ دوئم ظہر اور عصر اور زُلَفْ سے مراد مغرب و عشاء ہے۔ فخر الدین رازی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔
آیت میں تین امور کی ہدایت کی ہے پنجگانہ نماز ادا کرنا، نیکی کرنا، صبر کرنا، ظاہر ہے کہ دین و دنیا انہیں تینوں کے مجموعہ کا نام ہے حقِ الٰہی ادا کرنا یعنی ویسی عبادت کرنی جو مخصوص ذاتِ الٰہی کے ساتھ ہے مخلوق کا کوئی نفع نقصان اس سے وابستہ نہیں۔ یوں تو اللہ کی یاد دل میں رکھنے کا قطعی حکم ہے۔ لیکن خصوصی یاد کے لئے بھی پانچ وقت مقرر فرما دیئے ہیں تاکہ جو لوگ عمومی بجا نہ لاسکیں وہ کم از کم پنجگانہ مقررہ اوقات میں تو خدا کی یاد کر ہی لیا کریں۔ دوسرا حکم ہے نیکی کرنے کا۔ اس میں ہر نیک عمل داخل ہے۔ زکوٰۃ دینا، غریبوں مسکینوں کی امداد کرنا، اہلِ استحقاق کی پرورش کرنا، اعزا اقارب، احباب و اجانب سے اچھا سلوک کرنا، دنیا میں امن پھیلانا، فساد کی بیخ کنی کرنا وغیرہ تمام اعمالِ خیر کو یہ حکم شامل ہے تیسرا حکم صبر کرنے کا ہے۔ صبر کے معنی ہیں نفس کو روکنا۔ مراد یہ ہے کہ کل ممنوعات سے نفس کو روکا جائے۔ ہر وہ چیز جو دنیا کی تکلیف کا باعث ہو اور اس سے اصلاحِ عالم تباہ ہوتی ہو خواہ اس کا تعلق اخلاق و وجدانیات سے ہو یا معاشرت اقتصاد اور سیاست سے۔ بہر حال ہر ضرر رساں قول و فعل اور ایماء و کنایہ سے ہاتھ زبان اور تحریر و تقریر کو روکا جائے۔

حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمانوں کو ضرر نہ پہنچے۔ یہ بھی فرمایا تھا کہ بہترین آدمی وہ ہے جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ اب رہی یہ بات کہ نیکیوں سے برائیاں کیسے دُور ہو جاتی ہیں تو اس کے متعلق حضرت معاذؓ کی روایت ہے حضورؐ نے فرمایا اگر کوئی خطا صادر ہو جائے تو اس کے بعد نیکی کر جس سے وہ محو ہو جائے گی اور لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کر (احمد) ظاہر ہے کہ نیکی وہی شخص کرے گا جو بدی سے لوٹ کر نیکی کی طرف متوجہ ہو تو گویا دوامی بدی جذبہ توبہ سے معدوم ہو جائیں گے۔ رہ گیا گزشتہ بدی کا عذاب تو وہ نیکی کی طرف میلان کرنے سے زائل ہو جائے گا اور اگر کسی پر کچھ ظلم کیا ہے تو اس کا بدل اس طرح ہو جائے گا کہ علاوہ توبہ کرنے کے اس کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے جس کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔

مقصودِ بیان ۔ دنیا میں قانونِ عدالت جاری کرنے کے لئے تین امور کی ہدایت۔ عبادت، افادۂ خیر، ممانعتِ شر۔ اس امر کا اظہار

کہ برائی کرنے کے بعد اسی طرح کی نیکی کرنے سے دوامی شر اور عذاب گناہ کا زائل ہو جاتا ہے وغیرہ۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُونِ مِنْ قَبْلِكُمْ أُولُوا بَقِيَّةٍ يَنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْأَرْضِ

تم سے پہلی صدیوں میں ایسے سمجھدار لوگ کیوں نہ ہوئے جو ملک میں فساد کرنے سے منع کرتے

إِلَّا قَلِيلًا مِمَّنْ أَنْجَيْنَا مِنْهُمْ ۗ وَاتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مَا أُتْرِفُوا فِيهِ وَكَانُوا مُجْرِمِينَ

ہاں اُن میں سے تھوڑے آدمی ایسے تھے جن کو ہم نے بچا لیا تھا اور ظالم لوگ اُسی راہ پر چلے جس میں اُن کو عیش ملا اور وہ مجرم تھے

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ ۝ وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ

اور تیرا رب ایسا نہیں کہ کسی بستی والے کو ظلماً ہلاک کر دے باوجودیکہ وہاں کے باشندے اصلاح میں لگے ہوئے ہوں اگر تمہارا رب چاہتا تو سب لوگوں

النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً ۖ وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ ۝ إِلَّا مَنْ رَحِمَ رَبُّكَ ۚ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۗ

کو ایک ہی طریقہ کا کر دیتا مگر یہ ہمیشہ مختلف رہیں گے ہاں وہ جس پر تیرا پروردگار رحم کرے اُسی کے لئے اُن کو پیدا کیا ہے

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝

اور تمہارے رب کی یہ بات پوری ہو گئی کہ میں دوزخ کو جن و انس سب سے بھر دوں گا۔

تفسیر گزشتہ آیات میں کچھ قوموں کی ستمگاری اور بدکاری بیان کر کے اُس کا عذاب اور نتیجہ بد ظاہر فرمایا تھا پھر ظلم سے انحراف کر کے قانونِ عدل پر قائم رہنے کا حکم تھا پھر ظالموں سے ترکِ تعلقات کی ہدایت تھی۔ آخر میں عدالتِ عامہ کو پھیلانے اور فساد و تباہی کی جڑیں کھودنے کے اصول ثلثہ ذکر فرمائے تھے۔ اب ایک عام ریمارک کرتا ہے کہ ہمیشہ سے دستور یہی چلا آیا ہے کہ جہاں آدمی عیش میں پڑا تو خدا کو بھول جاتا ہے، لوگوں کو ہدایت کرنی چھوڑ دیتا ہے، ظلم سے باز داشت نہیں کرتا اور سیہ کار بداطوار طبقہ اسی طریقہ کی پیروی کرتا ہے جس میں بظاہر ہر نظر اس کو جسمانی راحت اور بدنی عیش حاصل ہوتا دکھائی دیتا ہے، لیکن درحقیقت یہ اس کی مجرمانہ حرکت ہوتی ہے۔ اس سے دنیا میں تباہی پھیلتی ہے، اللہ کی مخلوق خستہ و پریشان ہو جاتی ہے۔ بالآخر خدا ایسے لوگوں کو نابود کر دیتا ہے چنانچہ گزشتہ اقوام کو انھیں اسباب کی بنا پر اللہ نے تباہ کر دیا۔ ہاں وہ تھوڑے افراد جو صلاح و اصلاح پر قائم رہے تھے۔ اللہ نے ان کو بچا لیا۔ مثلاً لوطؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ، شعیبؑ، صالحؑ اور نوحؑ وغیرہم کو بچا لیا اور ان کی تباہ کار قوموں کو برباد کر دیا۔ جب تک لوگ قانونِ اصلاح کے پابند رہتے ہیں دنیا میں امن قائم رکھتے ہیں۔ تباہی نہیں پھیلاتے، اللہ ان کو برباد نہیں کرتا۔ جب وہ سرکشی فتنہ و فساد کرنے لگتے ہیں خدا ان کو ملیامیٹ کر دیتا ہے۔

اب شبہ ہو سکتا تھا کہ پھر گناہ گار، بداطوار اور ستم شعار طبقہ کو خدا نے پیدا ہی کیوں کیا اور اگر کیا تھا تو ان کی کایا کیوں پلٹ دی۔ کیوں سب کو ہدایت و اصلاح کے ایک نقطہ پر جمع نہ کر دیا۔ حق و باطل اور خیر و شر کا تفرقہ آپس میں جاری ہی کیوں کیا اور اگر جاری کیا تھا تو باقی کیوں رکھا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی مشیت ہی یوں ہے، ورنہ نہ گمراہ ہوتے نہ یہ پھوٹ پڑتی۔ اس شبہ کے ازالہ کے لئے تہدیدی لہجہ میں فرماتا ہے کہ ہاں اگر خدا چاہتا تو ایسا سب کچھ کر سکتا تھا سب لوگ مرکزِ حق پر آ جاتے اور اختلاف مٹ جاتا، لیکن اس کی مشیت ایسی نہ ہوئی۔ دوزخ بھی اسی نے پیدا کی اور ازلی فیصلہ کہ کچھ لوگ جنتی ہوں، کچھ دوزخی۔ ہمیشہ سے یہی دستور چلا آیا ہے کہ کچھ لوگ دینِ حق سے الگ ہو گئے، راہِ راست چھوڑ بیٹھے، طریقِ انبیاء سے

اختلاف کرنے لگے، فرقے فرقے بن گئے اور جن لوگوں پر خدا کا فضل تھا، جس گروہ پر اُس نے رحم کرنا چاہا وہ طریق انبیاء پر قائم رہا اس نے تعلیم رسول سے سرمو اختلاف نہ کیا۔ پہلا گروہ دوزخی اور دوسرا جنتی ہے۔ درحقیقت تخلیق کا تو مقصود ہی یہ تھا کہ لوگ دائرۂ رحم میں آجائیں۔ جماعت سے الگ نہ ہوں اور طریق انبیاء کو نہ چھوڑیں، مگر لوگوں نے ایسا نہ کیا اور قبل از تخلیق جو ازلی فیصلہ ہو چکا تھا وہ پورا ہو کر رہا۔

ایک تائیدی حدیث

میں فتح البیان سے ایک حدیث نقل کرتا ہوں جس کو ابوداؤد اور ترمذی نے بروایت ابوہریرہؓ بیان کیا ہے کہ حضور اقدسؐ نے فرمایا کہ یہودیوں کا تفرقہ اکہتر۷۱ یا بہتر۷۲ فرقوں میں ہو گیا اور نصاریٰ کا بہتر۷۲ فرقوں میں۔ مگر عنقریب میری اُمت تہتر۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی۔

امیر معاویہ کی روایت ہے حضورؐ نے فرمایا آگاہ رہو کہ تم سے پہلے اہل کتاب تو بہتر۷۲ فرقوں تک تقسیم ہوتے تھے، مگر اس اُمت کے فرقے تہتر۷۳ ہو جائیں گے، جس میں سے بہتر۷۲ دوزخ میں اور ایک جنت میں ہوگا اور وہ فرقہ جماعت (کا) ہے۔ شیخ حافظؒ نے مستدرک سے جو روایت نقل کی ہے، اس میں اتنا زائد ہے کہ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ ایک فرقہ کس حالت پر ہوگا؟ فرمایا جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔

ایک شُبہ

آیت وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ صاف بتا رہی ہے کہ اللہ نے لوگوں کو اختلاف اور تفرقہ کے لئے ہی پیدا کیا۔ حالانکہ دوسری آیت میں مذکور ہے کہ اللہ نے اپنی معرفت کے لئے سب کو پیدا کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق پرستی اور سنتِ انبیاء پر چلنے کے لئے سب لوگ پیدا کئے گئے ہیں نہ کہ تفرقہ اور اختلاف کے لئے۔

شُبہ کا ازالہ

ذٰلِكَ کا مشارٌ الیہ اختلاف نہیں بلکہ رحمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مقصودِ تخلیق تو صرف یہ تھا کہ سنتِ انبیاء پر چل کر لوگ دائرۂ رحمت میں داخل ہو جائیں، مگر بجائے جماعتی نقطہ پر جمع ہونے کے وہ مرکز کو چھوڑ بیٹھے اور لگے آپس میں لڑنے جھگڑنے۔ عکرمہ نے جو روایت بیان کی ہے اس میں یہی مطلب مذکور ہے۔ مجاہد، ضحاک، قتادہ اور عطاء وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔ چنانچہ عطاءؒ کے پاس دو آدمی کچھ مذہبی جھگڑا کرتے ہوئے آئے۔ آپ نے فرمایا تم نے بہت جھگڑا پھیلایا ہے۔ ایک شخص بولا ہم کو اسی واسطے پیدا کیا گیا ہے۔ عطاء نے فرمایا تم جھوٹ کہتے ہو۔ وہ شخص کہنے لگا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ عطاء نے فرمایا اس کا یہ مطلب نہیں کہ جھگڑے اور اختلاف کے لئے اللہ نے پیدا کیا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جماعت اور رحمت کے لئے ان کو پیدا کیا گیا ہے (رواہ ابن وہب باسنادہ)

مقصودِ بیان

اگر لوگ فسق و فجور اور بداعمالی میں مبتلا ہوں تو اہلِ حق کا فرض ہے کہ ہر ممکن صورت سے ان کو منع کریں ورنہ جو عذاب ان پر نازل ہوگا وہی اس خاموش گروہ پر بھی ہوگا۔ زمین پر تباہی اور فساد پھیلانا حکمِ الٰہی کے خلاف ہے۔ گویا اس سے اس طرف ایما ہے کہ عدالتِ الٰہیہ کو دنیا میں پھیلانے کی انتہائی کوشش کرنی چاہیئے اور قوانین ظلم کی بیخ کنی کرنی لازم ہے۔ عیش پرستی اور بادۂ راحت سے سرشاری انسان کو باطل پرست بنا دیتی ہے۔ ظالم گروہ اسی راہ پر چلتا ہے جس سے اس کی عیش پرستی میں فرق نہ آئے۔ جب تک اہلِ ملک قوانین اصلاح اور ضوابط عدل کے پابند رہتے ہیں، اللہ ان کو برباد نہیں کرتا۔ جب حق و انصاف کو چھوڑ کر تباہی و فساد کی اشاعت کرنے لگتے ہیں تو خدا ان کو غارت کر دیتا ہے۔ اس میں موجودہ مسلمانوں کے لئے درسِ بصیرت ہے ان کی موجودہ ذلت و نکبت کا اصل سبب ہی یہ ہے کہ قوانین اصلاح اور ضوابطِ عدل کو انھوں نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ جب تک شریعت کے بتائے ہوئے اصول کی پیروی نہیں کریں گے یوں ہی پستی اور تباہی کے غار میں پڑے رہیں گے اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو سب لوگ دینِ حق اور راہِ مستقیم پر آجاتے، مگر پھر حق و باطل کا امتیاز جاتا رہتا۔ ہمیشہ سے عالم کا یہی دستور رہا ہے کہ کچھ لوگ اہلِ حق اور باطل پرست ہوتے ہیں۔ یہ دستور ہمیشہ جاری رہے گا۔ گویا دینی تفرقہ اور اختلاف قانونِ ازلی کے مطابق ہے۔ تخلیق کی اصل غرض صرف یہ تھی کہ لوگ جماعت کی طرف آئیں اور اختلاف نہ کریں۔ اختلاف کے لئے انسان پیدا نہیں کیا گیا وغیرہ۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ

(اے محمدؐ!) ہم انبیاء کے یہ سارے قصے تم سے بیان کرتے ہیں تاکہ اس سے تمہارے دل کو تقویت دیں اور تمہارے پاس ان قصوں

الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ وَقُل لِّلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ اعْمَلُوا عَلَىٰ

میں حق بات اور مسلمانوں کے لئے وعظ و نصیحت کی چیز پہنچ گئی جو لوگ ایمان نہیں لاتے تم ان سے کہہ دو کہ تم اپنی جگہ اپنے عمل کرو

مَكَانَتِكُمْ إِنَّا عَامِلُونَ ۝ وَانتَظِرُوا إِنَّا مُنتَظِرُونَ ۝ وَلِلَّهِ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ

ہم بھی عمل کر رہے ہیں اور منتظر رہو ہم بھی منتظر ہیں اور آسمان و زمین کا علم غیب اللہ

وَالْأَرْضِ وَإِلَيْهِ يُرْجَعُ الْأَمْرُ كُلُّهُ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ ع ۱۰

ہی کو ہے اسی کی طرف سارا کام لوٹایا جاتا ہے لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو تمہارا رب تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے

تفسیر یہ آیات پوری سورت کا نچوڑ ہیں۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ کفار و مشرکین قرآن کے بیان قصوں کو اوراقِ پارینہ کی داستانیں کہتے ہیں۔ ان کا یہ خیال غلط ہے۔ ہم نے بیان قصص میں دو فائدے ملحوظ رکھے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ کفار کی سرکشی، نافرمانی اور استہزاء کو دیکھ کر تمہارے دل میں جو کبیدگی، طبیعت میں اضمحلال اور دماغ میں مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ گزشتہ انبیاء کے حالات، ان کی تبلیغی کوششیں اور ان کی قوموں کی سرکشی و نافرمانی کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ کبیدگی زائل ہو جائے۔ طبیعت میں سکون، دماغ میں اطمینان اور دل میں ثبات پیدا ہو جائے اور کفار کی ہر سرتابی و نافرمانی پر صبر کرو۔ دوسرے یہ کہ چونکہ ان تمام قصص میں حق و باطل کا امتیاز اور صداقت و کذب کا تفرقہ کر دیا گیا ہے، اس لئے اصل حقانیت واضح ہو جاتی ہے اور اصل حقانیت کے سمجھ میں آنے کے بعد اہل ایمان کو عملی اصلاح کا موقع ملتا ہے اور ان کو حیاتِ عاملہ کی درستگی کے لئے ایک درس حاصل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا تم اہل کفر کی تشنیع سے کشیدہ نہ ہو بلکہ ان سے کہہ دو کہ تم اپنے مرکز پر قائم رہو، ہم اپنا کام کئے جائیں گے تم بھی اپنے عقائد پر قائم رہو ہم بھی کوشش کئے جائیں گے۔ تم بھی اپنے ثمرات عمل کے منتظر رہو ہم بھی اپنے حاصل کوشش کے منتظر ہیں نتیجہ خود سامنے آ جائے گا۔

اس سے آگے خدا تعالیٰ نے نہایت مختصر جامع الفاظ میں تعلیم الٰہی کا خلاصہ اور اسلام کا نچوڑ اپنے رسول کو خطاب کرتے ہوئے عام مسلمانوں کے لئے پیش فرمایا ہے جس کے تین ٹکڑے ہیں۔ اوّل کا تعلق اصلاح و عقائد سے ہے۔ دوسرے کا تعلق تقویٰ اور طہارت سے اور تیسرے کا تعلق معرفت و حقیقت سے۔ اوّل نمبر کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ تمام جہاں میں جو چیز مخلوق کی نظر سے غائب ہے، اس کا باطنی اور حقیقی علم محض اللہ ہی کو ہے اس کے سوا اور کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا یہ اللہ کی مخصوص صفتِ کمالیہ ہے۔ پھر مرکز کل بھی یہی ہے۔ تمام قطرات اسی بحر ناپیدا کنار کی طرف لوٹتے ہیں۔ یہی مرجع کل ہے۔ یہ اس کی قدرتِ کاملہ ہے۔ جب یہ دونوں کمال اسی کو حاصل ہیں لہٰذا اس کے ہی سامنے سر تسلیم خم کیا جائے اور اسی کی عبادت کی جائے۔ مال سے بھی اعضاءِ بدنیہ سے بھی اور دل و جان سے بھی۔ یہ دوسرا درجہ تقویٰ، طہارت اور بیرونی درستگی کا ہے۔ اس کے بعد تیسرے درجہ کے متعلق فرماتا ہے کہ اس کی عبادت کرنے کے یہ معنی نہیں کہ پھر کسی کی طرف رجوع کیا جائے یا مرکز بیم و رجا کسی اور کو قرار دیا جائے۔ نہیں۔ بلکہ اسی پر کامل بھروسہ رکھا جائے۔ اسباب کو اسباب جانتے ہوئے تمام اسباب کی باگ اللہ ہی کے ہاتھ میں سمجھی جائے اور اسی کو مرکز تمنا بنایا جائے۔ یہ آخری درجہ ہے اس درجہ میں آدمی کو پہنچ کر حق الیقین حاصل ہوتا ہے۔ اس سے آگے نوعِ انسان کے لئے اور کوئی مقام نہیں۔

مقصودِ بیان قصص انبیاء کے بیان سے جو غرض ہے اس کا اظہار آیت سے یہ بات ذرا پردہ واضح ہوتی ہے کہ عبرت اندوزی کے لئے صحیح قصص بیان کرنا ناجائز نہیں بلکہ سنتِ انبیاء اور طریقۂ قرآنی ہے۔ اس سے اصل مدعا کی تبلیغ میں کافی مدد ملتی ہے، لیکن غلط قصص بیان کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ علمِ غیب صرف اللہ ہی کو ہے یعنی علم مخلوق کی وہاں تک رسائی نہیں ہے خواہ کوئی ولی ہو یا نبی۔ یہاں تک کہ سرورِ انبیاء کو اللہ کے مخصوص خزانۂ غیب کا پتہ نہیں۔ جتنا خدا نے دے دیا مل گیا۔ باقی کا علم کچھ نہیں جس طرح مرکزِ کل ہونا اللہ کی مخصوص شان ہے اسی طرح عالم الغیب ہونا خاص صفتِ کمالیہ ہے، مرکزِ بیم و رجاء اللہ ہی ہے۔ اسی پر توکل رکھنا لازم ہے، لیکن اسباب کو چھوڑ دینا بھی حماقت ہے۔ ہاں اسباب کو مسبب اور آثار کو موثر سمجھنا خلافِ توکل بلکہ خلافِ اسلام ہے۔ اس سے آدمی کافر ہو جاتا ہے وغیرہ۔

سُوْرَةُ يُوْسُفَ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَاحِدٰى عَشَرَةَ اٰيَةً وَاثْنَا عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۂ یوسف مکہ میں نازل ہوئی اس میں ایک سو گیارہ آیتیں ہیں اور بارہ رکوع ہیں

اس سورت میں کل ایک سو گیارہ (۱۱۱) آیات، ایک ہزار نو سو چھیانوے (۱۹۹۶) کلمات اور سات ہزار ایک سو چھیتر (۷۱۷۶) حروف ہیں۔ بعض اہلِ روایت کا خیال ہے کہ ہجرت کے وقت مکہ اور مدینہ کے درمیان اس کا نزول ہوا۔ ابن عباسؓ اور قتادہ کے قول کے مطابق چار آیات کے علاوہ باقی سورت مکی ہے، لیکن اکثر محققین کی رائے ہے کہ کل سورت مکی ہے۔ حافظ اور قرطبی نے اسی پر جزم کیا ہے۔ مفسر سراج نے بھی اسی کو پسند کیا ہے سببِ نزول میں اختلاف ہے۔ ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ سے یہودیوں نے سوال کیا کہ آپ ہم سے یعقوبؑ اور ان کی اولاد کا حال بیان کریں اس وقت یہ سورت نازل ہوئی۔ سورت چونکہ بالاجماع مکی ہے، اس لئے یہودیوں کے سوال کرنے پر نزولِ سورت کی کوئی وجہ نہیں۔ اسی بناء پر دیگر مفسرین نے بیان کیا ہے کہ یہودیوں نے مکہ کے کافروں سے کہلا بھیجا کہ محمدؐ جو عاد و ثمود کے حالات بیان کرتا ہے یہ کچھ مشکل بات نہیں، عرب کے مشہور و معروف واقعات ہیں۔ ہاں اس سے پوچھو کہ یعقوبؑ کی اولاد مصر میں کیوں گئی تھی؟ اور یوسف اور اس کے بھائیوں میں کیا معاملہ گزرا اور یوسف مصر کیوں پہنچا؟ یہ باتیں بجز مورخینِ اہلِ کتاب کے ان پڑھ آدمی خصوصاً مکہ کا رہنے والا کہ جہاں ان باتوں سے کان بھی آشنا نہیں، ہرگز نہ بتا سکے گا۔ چنانچہ اہلِ مکہ نے حضرتؐ سے حسبِ ہدایتِ یہود سوال کیا۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

ابن جریر و حاکم نے بروایت سعد بن ابی وقاص اور صرف ابن جریر نے بروایت ابن عباسؓ بیان کیا ہے کہ حضورؐ پر قرآن نازل ہوا ایک مدت تک آپؐ لوگوں کو سناتے رہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ حضورؐ ہم امید وار ہیں کہ گزشتہ اقوام کے کچھ حالات آپ بیان فرما دیتے تو آیات الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الخ نازل ہوئیں۔ پھر صحابہ نے حدیث کی آرزو کی تو آیت اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا۔ الخ نازل ہوئی۔

عون بن عبداللہ کی مرسل روایت کے آخر میں ہے کہ صحابہ نے حدیث چاہی تو اللہ نے ان کو احسن الحدیث کی راہ بتلائی اور قصہ کی خواستگاری کی تو احسن القصص کا راستہ بتا دیا۔ سعید بن جبیر کی روایت کے آخر میں ہے کہ صحابہ نے خدمتِ گرامی میں عرض کیا حضورؐ گزشتہ لوگوں کے حالات بیان فرمائیے۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔

حافظ ابن عساکر نے مختلف روایات کی باہمی تائید سے اس روایت کی فضیلت میں حضور اقدسؐ کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ اپنی باندی اور غلاموں کو یہ سورت سکھاؤ۔ کیونکہ جو مسلمان اس کو پڑھے گا یا سکھائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی سکراتِ موت کو آسان کر دے گا اور اس کو ایسی قوت عطا فرما دے گا کہ وہ پھر کسی مسلمان پر حسد نہ کرے گا۔ یعنی اس کی حالت قابلِ رشک ہو جائے گی وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ نَحْنُ نَقُصُّ

یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن اتارا ہے تاکہ تم سمجھ سکو ہم وحی کے ذریعے

عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝

سے قرآن تمہارے پاس بھیج کر ایک عمدہ قصہ تم سے بیان کر رہے ہیں اگرچہ تم اس سے پہلے بے خبر تھے

تفسیر تفسیر آیات سے قبل ہم پورا قصہ حقانی سے اخذ کر کے لکھتے ہیں۔ اس میں کچھ اقتباس اسلامی کتب کا ہے اور کچھ اہل کتاب کی کتابوں کا اور کچھ موجودہ زمانے کی تحقیقات کا۔ اختلافی نوٹ ہر تفسیر کے موقعہ پر لکھا جائے گا۔

حاران سے کوچ کر کے حضرت ابراہیم ملک کنعان میں حبرون کے پاس مقیم ہوئے۔ آپ کی رہائش خیموں میں تھی۔ اسحاق بھی اسی جگہ سکونت پذیر تھے۔ آپ کے بڑے صاحبزادے عیص کوہ شعیر میں جا بسے اور یعقوب اپنے باپ کی وصیت کے بموجب حاران سے چل کر اپنے حقیقی ماموں نخور کے بیٹے لابن کے ہاں گئے۔ نخور کی دو بیٹیاں تھیں۔ لیاہ جس کی آنکھیں چوندھی تھیں اور چھوٹی راحل یا راحیل جو بہت خوبصورت تھی۔ یعقوب کو راحل پسند آئی۔ سات برس تک لابن کی بکریاں چرائیں، آخر راحل سے نکاح ٹھہر گیا، لیکن نکاح کی صبح کو اپنے پاس بجائے راحل کے لیاہ کو پایا۔ ماموں سے شکایت کی تو ایک ہفتے کے بعد ماموں نے راحل سے بھی نکاح کر دیا۔ لیاہ کے جہیز میں ایک لونڈی زلفہ بھی آئی تھی۔ حضرت یعقوب کی اولاد بترتیب ذیل ہوئی۔ لیاہ کے بطن سے روبن پھر سنعون پھر لاوی پھر لیواوہ پھر اشکار پھر زبلون پیدا ہوئے۔ زلفہ کے بطن سے جد اور آشر پیدا ہوئے اور راحل کے شکم سے یوسف اور پھر بن یمین پیدا ہوئے۔ راحل کے جہیز میں جو بلہ نامی جو لونڈی آئی تھی اس کے بطن سے ذان اور نفتالی ہوئے۔ یہ کل بارہ بیٹے ہوئے۔ بیس برس کے بعد یعقوب اپنے اہل و عیال کو لے کر کنعان میں آگئے اور سیلون نامی گاؤں میں سکونت پذیر ہو گئے۔ سیلون، بنجل اور نابلس کے وسط میں واقع تھا۔ نابلس کا قدیم نام سکم تھا۔ یہ بیت المقدس سے تیس میل اور سرما سے سات میل پر واقع ہے۔ اسی کے قریب دو ڈیڑھ میل کے فاصلے پر وہ کنواں ہے جس میں بھائیوں نے یوسف کو ڈالا تھا۔ اسی کے قریب ایک احاطہ کے اندر یوسفؑ اور یعقوبؑ کی قبریں ہیں۔ یوسف کی عمر سترہ برس کی تھی اور آپ راحیل متوفیہ کی یادگار تھے اور حسن میں بھی سب سے ممتاز تھے۔ والد کو آپ سے سب اولاد سے زیادہ محبت تھی۔ ایک روز آپ نے خواب میں دیکھا کہ چاند سورج اور گیارہ ستارے مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ صبح کو باپ سے خواب کہا۔ باپ علم نبوت سے واقف تھے۔ فوراً یوسف کو منع کر دیا کہ اپنے بھائیوں سے اس کا تذکرہ نہ کرنا۔ بمقتضائے کمسنی یوسف نے باوجود ممانعت کے خواب کا تذکرہ کر دیا۔ بھائیوں کو رشک پیدا ہوا۔ یعقوب کی تمام اولاد نابلس کی وادی میں بھیڑ بکریاں چرایا کرتی تھی۔ ایک روز وہاں پہنچ کر سب نے یوسفؑ کے قتل کر ڈالنے کا ارادہ کیا، مگر سب سے بڑے بھائی روبن نے ممانعت کی اور کہا خونریزی نہ کرو، اس کو ایک کنوئیں میں ڈال دو۔ چنانچہ یوسفؑ کو ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا اور خود جا کر کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ اتنے میں اسماعیلیوں کا ایک قافلہ آتا دکھائی دیا جو جلعاد سے گرم مصالحہ اور روغن بلساں لاد کر مصر لے جانا چاہتا تھا۔ قافلے نے آکر ڈیرہ کیا اور کنوئیں پر پانی لینے کے لئے کسی کو بھیجا۔ جونہی اس شخص نے کنوئیں میں ڈول ڈالا۔ یوسفؑ نے ڈول پکڑ لیا۔ رسی اور کھینچی تو اوپر نکل آئے۔ قافلے کو خبر ملی تو اہل قافلہ نے یوسف کو چھپا لیا۔ بھائیوں کو بھی برآمدگی کی اطلاع مل گئی تھی ان کا بھی خفیہ آدمی لگا ہوا تھا۔ روبن فوراً کنوئیں پر پہنچا، لیکن یوسف کو نہ پایا پھر یہوداہ کی صلاح سے سب نے بالاتفاق یوسف کو قافلہ والوں کے ہاتھ بیس درم کو بیچ ڈالا اور جو کرتا یوسف کا اتار لیا تھا اس کو بکری کے بچے کے خون سے رنگین کر کے باپ کے پاس شام کو لے گئے اور کہہ دیا کہ بھیڑیے نے یوسف کو پھاڑ ڈالا اور اپنے قول کے ثبوت میں خون آلود کرتہ پیش کر دیا۔ حضرت یعقوب نے فرمایا اس میں کچھ سازش ہے وہ کیسا بھیڑیا تھا کہ یوسفؑ کو تو پھاڑ کر کھا گیا اور پیرہن کسی جگہ سے نہ پھٹا۔ خیر اللہ مالک ہے اب مجھے رونے کے سوا کچھ کام نہیں۔ قبر تک روتا جاؤں گا۔ ادھر قافلے والوں نے مصر

پہنچ کر طیفار یا بوتیفار کے ہاتھ یوسف کو فروخت کر دیا اور گراں ترین قیمت وصول کی۔ بوتیفار امیر کبیر اور مصر کی حکومت کا وزیر اعظم تھا۔ اسی کا لقب عزیز تھا۔ عزیز نے یوسف کو لے جا کر اپنے گھر بار اور تمام کارخانوں کا مختار کر دیا اور اپنی بیوی کو ان کی عزت و توقیر کی تاکید کی۔ یوسف پیکر نور اور مجسم جمال تھے، عزیز کی بیوی ان پر ریجھ گئی اور ایسی فریفتہ ہوئی کہ عزت و ناموس کی بھی پرواہ نہ کی اور طرح طرح سے یوسف کو فریب دے کر ترغیب دی اور وصل کی خواستگاری کی۔ پیغمبر ہونے والا انسان پہلے سے ہی معصوم ہوتا ہے۔ یوسف نہ مانے مجبوراً زلیخا نے ایک روز تخلیہ پا کر پیراہن پکڑ لیا اور سر ہو گئی۔ یوسف پیراہن کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پیچھے یہ بھی بھاگی دروازے پر عزیز آتا ہوا ملا عورت تمثال کر ہے۔ فوراً زلیخا نے یہ بات بنائی اور اُلٹا یوسف پر الزام لگایا کہ یہ مجھ سے بُرا ارادہ رکھتا تھا میں نے شور مچایا تو پیراہن میرے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگا۔ عزیز نے یوسف کو ملامت کی۔ یوسف نے انکار کیا۔ زلیخا کے گھر والوں میں سے ایک شیر خوار بچے نے بقدرت الٰہی شہادت دی کہ اگر کرتا آگے سے پھٹا ہوا ہے تو یہ سچی ہے اور اگر پیچھے کا دامن پھٹا ہوا ہے تو یوسف سچا ہے۔ کرتا پیچھے سے پھٹا ہوا تھا۔ عزیز کو یوسفؑ کی صداقت ظاہر ہو گئی۔ زلیخا کو ملامت کی، یوسفؑ کو تسلی دی اور اخفاء معاملہ کی ہدایت کر دی۔ عشق اور مشک چھپانے سے نہیں چھپتا۔ رفتہ رفتہ مصر کی امیر زادیوں اور شہزادیوں کو خبر پہنچ گئی۔ سب نے زلیخا کو آڑے ہاتھوں لیا کہ اپنے غلام سے مُنہ کالا کرنا چاہتی ہے۔ زلیخا نے اپنی مجبوری اور برارت کے اظہار کے لئے ایک روز سب عورتوں کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد پھل سامنے آئے۔ زلیخا نے سب عورتوں کے ہاتھوں میں ایک ایک پھل اور اس کے کاٹنے کے لئے ایک ایک چھری دے دی۔ اُدھر یوسف کو بنا سنوار کر ایک جگہ چھپا رکھا تھا اور کہہ دیا تھا کہ جب میں اشارہ کروں تو تم فوراً ان عورتوں کے سامنے سے گزرنا۔ جونہی عورتوں نے ترنج اور چھریاں ہاتھوں میں لیں زلیخا نے یوسف کو اشارہ کیا وہ برآمد ہوئے عورتیں دیکھ کر ششدر رہ گئیں ہوش و حواس درست نہ رہے اور بجائے ترنج کے چھریوں سے ہاتھ کاٹ لئے۔ اُس وقت زلیخا نے طعن کے طور پر کہا کہو اب وہ تمہاری ملامت و سرزنش کہاں گئی۔ یہی تو وہ شخص ہے جس کے عشق پہ مجھے ملامت کرتی تھیں۔ اس کے بعد بولی اگر اب بھی یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو سخت ذلیل ہوگا میں اسے جیل بھجوا دوں گی، وہاں اس کو یہ عیش و آرام یاد آئے گا۔ یوسف بولے مجھے اس تہمت سے قید پسند ہے۔ زلیخا کا دل تو نہ چاہتا تھا، مگر تمام لالچ کے ذرائع ختم ہو چکے تھے۔ خیال کیا کہ شاید تکلیف اٹھا کر یہ راہِ راست پر آ جائے۔ یہ سوچ کر عزیز سے کہا کہ تمام مصر کی عورتیں مجھے بدنام کرتی ہیں اس کو دفع کرنے کی صرف ایک شکل ہے کہ یوسف کو قید کر دیجئے نہ یہ ہوگا نہ میری بدنامی ہوگی اور گزشتہ بدنامی بھی دُھل جائے گی۔ عزیز کو یوسف کی صداقت تو ظاہر ہو ہی چکی تھی، مگر بدنامی کو رفع کرنے کے لئے اس نے یوسف کو جیل بھجوا دیا۔ اسی دوران میں دو اور شخص جیل میں پہنچے۔ ایک شاہی ساقی دوسرا خانساماں۔ ان دونوں پر بادشاہ کو زہر دینے کی سازش کرنے کا الزام تھا۔ ایک روز ان دونوں نے خواب دیکھا اور چونکہ یوسف جیل خانہ میں نیک اور پاک دامن مشہور ہو گئے تھے، اس لئے ہر ایک نے اپنا اپنا خواب آپ سے بیان کیا۔ ساقی نے کہا میں نے ایک انگور کا درخت دیکھا، اس کی تین شاخیں نکلیں، ہر شاخ میں پھول پھل آئے اور اس کے گچھوں میں انگور آ گئے۔ فرعون کا خاص پیالہ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس میں انگوروں کو نچوڑا اور فرعون کے ہاتھ میں دیا۔ دوسرے نے کہا میں نے دیکھا کہ میرے سر پر تین خوان روٹیوں کے ہیں اوپر کے خوان میں پرندے جھپٹے مار کر روٹیاں لئے جا رہے ہیں۔ یوسف نے تعبیر دینے سے پہلے اعلانِ توحید کیا، دینِ حق کی ہدایت کی اور چند نصیحتوں کے بعد فرمایا تینوں خوشوں سے مراد تین دن ہیں۔ تین روز کے بعد ساقی اپنے عہدے پر بحال ہو جائے گا اور دوسرے سے فرمایا تین خوانوں سے بھی مراد تین دن ہیں۔ تین روز کے بعد جس طرح ساقی اپنے عہدے پر بحال ہوگا تجھے سولی دی جائے گی اور پرندے تیرے سر کا بھیجا کھائیں گے۔ چنانچہ تین روز کے بعد ساقی کو پہلے عہدے پر مامور کیا گیا اور خانساماں کو پھانسی دے دی گئی۔ یوسف نے ساقی سے کہہ دیا تھا کہ جب تو فرعون کے دربار میں پہنچے تو میرا حال کہہ دینا کہ ایک غریب پردیسی جس کو بھائیوں نے غلام بنا کر بیچا، پھر مصر میں آ کر وہ تیرے عزیز کے ہاتھ فروخت ہوا۔ اس عزیز کی بیوی نے تہمت لگا کر قید کرا دیا ہے وہ بے قصور ہے اس کو چھوڑ دیا جائے۔ جس کا مرتبہ زیادہ ہوتا ہے اس کو مشکل بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ذرا سی بات پر گرفت کر لی جاتی ہے۔ خدا تعالیٰ کو یہ بات پسند نہ آئی کہ اس کا خاص بندہ دوسروں سے التجا کرے۔ حکم ہوا کہ دوسروں سے درخواست کرنے کی پاداش میں ابھی اتنی ہی اور قید بھگتو گے۔ چنانچہ ساقی جب بحال ہو کر سابقہ خدمت پر پہنچا تو اس کو یوسف کی یاد بھی نہ رہی۔ چند سال کے بعد

فرعون نے ایک خواب دیکھا کہ وہ لب دریا کھڑا ہے۔ دریا کے اندر سے سات موٹی خوبصورت گائیں نکلیں اور نیستان میں چرنے لگیں۔ اس کے بعد اور سات گائیں دُبلی بدنما دریا سے برآمد ہوئیں اور گھاٹ پر آکر کھڑی ہوئیں اور ان موٹی گائوں کو کھا گئیں۔ یہ ہیبت ناک خواب دیکھ کر فرعون کی آنکھ کھل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر سو گیا۔ دوبارہ خواب میں دیکھا کہ ایک ٹہنی میں سات بالیاں سرسبز دانوں سے بھری ہوئی نکلیں اور ان کے بعد سات بالیاں اور نمودار ہوئیں جو خشک اور پتلی تھیں۔ خشک بالیاں سبز بالیوں کو لپٹ گئیں اور ان کو کھا گئیں۔ غرض صبح کو فرعون جاگا اور مصر کے تمام کاہنوں، نجومیوں اور دانش مندوں کو جمع کر کے خواب کی تعبیر دریافت کی۔ سب نے بالاتفاق کہا یہ یوں ہی واہی خیالات ہیں ہم ان کی تعبیر نہیں دے سکتے۔ اس وقت بحکم الٰہی ساقی کو حضرت یوسفؑ کی یاد ہوئی۔ فرعون سے فوراً عرض کیا جب میں اور خانساماں قیدخانہ میں تھے تو ہم نے وہاں ایک خواب دیکھا تھا۔ وہاں یوسف نامی ایک عبرانی جوان بھی قید تھا اُس نے ہمارے خوابوں کی تعبیر دی تھی اور جیسی تعبیر دی تھی ویسا ہی ہوا۔ اگر حکم ہو تو قیدخانہ جا کر اس سے پوچھ کر آؤں۔ حسب الحکم ساقی یوسف کے پاس آیا اور بادشاہ کا خواب بیان کیا۔ آپ نے فرمایا یہ ایک ہی خواب ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس کو دوبارہ یوں دکھایا ہے کہ یہ واقعہ ضرور ہونے والا ہے، فیصلۂ الٰہی ہو چکا ہے۔ وہ موٹی سات گائیں اور سات سبز بالیاں ارزانی کے سات سال ہیں۔ ان سالوں میں خوب بارش، خوب پیداوار اور خوب ارزانی ہوگی اور وہ سات دُبلی گائیں اور سات خشک بالیاں قحط کے سات سال ہیں۔ ارزانی کی ہفت سالہ مدت کے بعد ہفت سالہ قحط پڑے گا جو گزشتہ ارزانی کے زمانے کے تمام اندوختہ کو کھا جائے گا۔ فرعون کو چاہیے کہ وہ ایک ہوشیار آدمی دیہات کے بندوبست کے واسطے مقرر کر دے تاکہ تحصیل داروں کے ذریعہ سے ارزانی کے زمانے میں کم سے کم ضروری خوراک کے علاوہ تمام غلہ جمع کر لیا جائے اور پھر قحط کے زمانے میں اس اندوختہ کو صرف کیا جائے اور چونکہ سات سال تک غلہ کی بقا مشکل ہے گھُن کے کھا جانے اور گل جانے کا اندیشہ ہے، اس لئے بالیوں میں ہی دانے محفوظ رکھے جائیں جب ہفت سالہ قحط گزر جائے گا تو بہت بارش ہوگی اور خوب پیداوار ہوگی۔ ساقی نے واپس آکر فرعون سے بیان کیا اُس نے سُن کر بہت پسند کیا اور تمام اسٹاف نے تائید وتحسین کی۔ فرعون ملاقات کا مشتاق ہوا اور خاص ہرکارہ کو یوسف کے بلانے کے لئے بھیجا۔ آپ نے فرمایا رہائی سے قبل میرے اُس جُرم کی تحقیق کر لو جس کی پاداش میں مجھے قید کیا گیا ہے۔ مصر کی امیر زادیوں سے دریافت کر لیا جائے کہ اُن کے سامنے عزیز کی بیوی نے مجھے بلایا تھا اور اُن کے ہاتھ چھُری سے کٹ گئے تھے، ان سے دریافت کرنے پر حقیقت ظاہر ہو جائے گی۔

چنانچہ بادشاہ نے مصر کی امیر زادیوں کو بلایا اور سب سے دریافت کیا، سب نے اور خود عزیز کی بیوی نے یوسف کی پاک دامنی کا اقرار کیا۔ آپ نے تواضع کے طور پر فرمایا میں اس بات سے کچھ اپنا تفاخر نہیں چاہتا، میں بھی انسان ہوں میرے ساتھ بھی نفس ہے، لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے شر سے محفوظ رکھتا ہے۔ غرض آپ فرعون کے پاس گئے۔ فرعون نے آپ کے حسنِ صورت اور خداداد لیاقت سے سلیقۂ انتظام کا اندازہ کر لیا اور فریفتہ ہو گیا اور کہنے لگا میں نے تجھے اپنی کل رعایا کا مختار کیا۔ بجز تخت نشینی کے اور کوئی مرتبہ تجھ سے باقی نہیں رکھا، اب تو میرا نائب اور مختارِ کل ہے جو چاہے کر۔ اس کے بعد اپنی انگشتری آپ کو پہنا دی۔ آپ نے ملک کا پورا انتظام اور قحط سے مقابلہ کرنے کا بندوبست کیا۔ حضرت یوسف نے سات برس تک خوب کاشت کرائی اور جتنی پیداوار ہوئی سوائے ضروری مصارف کے سب کو خرید کر جمع کرا دیا۔ آٹھویں سال قحط شروع ہوا۔ بارش نہ ہوئی۔ مصر، شام اور کنعان وغیرہ کے لوگ جیخ اُٹھے تو یوسفؑ نے مناسب نرخ مقرر کر کے دیسی اور پردیسی سب کو اسی بھاؤ غلہ دینا شروع کر دیا۔ البتہ پردیسی کو ایک اونٹ سے زیادہ دینے کا حکم نہ تھا۔ پہلے ہی سال قحط زدہ مخلوق کی کل نقدی خرچ ہو گئی۔ دوسرے سال زیورات اور جواہر کے عوض غلہ خرید کر کھایا۔ تیسرے سال چوپائے اور مویشی فروخت کئے۔ چوتھے سال باندی غلام بیچے۔ پانچویں سال تمام جائیداد و مکانات فروخت کئے۔ چھٹے سال اولاد کو بیچا اور ساتویں سال تمام اہلِ مصر اپنے آپ کو فروخت کر کے یوسف کے غلام ہو گئے۔ اس ہفت سالہ قحط کا اثر چونکہ دُور دور پہنچ گیا تھا، اس لئے کنعان بھی اس سے نہ بچ سکا۔ نیز شہرت بھی چاروں طرف پھیل گئی کہ مصر میں سلطنت کی طرف سے سستی قیمت پر غلہ فروخت ہوتا ہے۔ چنانچہ یوسفؑ کے دسوں بھائی بن یامین کو باپ کے پاس چھوڑ کر غلہ لینے مصر آئے۔ مدت دراز گزر چکی تھی اور کسی یوسفؑ کی حالت کے انقلاب کا واہمہ بھی نہ تھا، اس لئے کسی نے یوسف کو نہ پہچانا، مگر آپ نے پہچان لیا اور ناواقف بن کر پوچھا تم کون ہو؟ کہاں سے

آئے ہو؟ شاید جاسوس ہو اس ملک کی خراب حالت دریافت کرنے آئے ہو؟ بھائیوں نے کہا نہیں ہم جاسوس نہیں ہیں بلکہ آپ کے غلام ہیں۔ ایک ہی باپ کے بارہ بیٹے تھے ایک کھو گیا ایک کو باپ کی تسلی کے لئے چھوڑ آئے ہیں اور دس حاضر ہیں۔ کنعان کے رہنے والے ہیں غلہ لینے آئے ہیں۔ آپ نے دس اونٹ غلے سے بھروا دئے۔ بھائیوں نے کہا ہمارا گیارہواں بھائی بھی ہے جو باپ کے پاس رہ گیا ہے، اُس کا بھی حصہ دے دیجئے۔ یوسفؑ نے کہا کہ یہ بات تو خلاف ضابطہ ہے۔ ہاں اگر سچے ہو تو یہ بات ہو سکتی ہے کہ تم اپنے ایک بھائی کو یہیں میرے پاس چھوڑ جاؤ باقی غلہ لے کر جاؤ اور پھر اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر آؤ۔ یوسفؑ چونکہ خود اپنے بھائی سے ملنا چاہتے تھے، اس لئے اس کی تدبیریں کیں۔ اوّل تو اپنی مہمان نوازی ظاہر کر کے وعدہ کیا کہ اگر اب کی مرتبہ بھائی کو لے کر آئے تو ایسی ہی خاطر پھر کی جائے گی۔ دوسرے دھمکی بھی دی کہ اگر نہ لائے تو میں سمجھوں گا کہ جھوٹے ہو اور تمہارا حصہ بھی آئندہ سوخت ہو جائے گا۔ تیسرے جو کچھ غلہ کی قیمت (کچھ درہم یا چمڑہ کا سامان وغیرہ) بھائیوں نے پیش کی تھی وہ بھی ان کے اسباب میں چھپا کر غلہ کے ساتھ اونٹوں پر لدوا دی تاکہ گھر پہنچ کر جب اُن کو غلہ کے اندر اپنا سامان ملے تو نبی زادگی کے اقتضاء اور دیانت و ایمانداری کے زیر اثر واپس لانے پر مجبور ہوں۔ غرض شمعون کو یوسفؑ کے پاس چھوڑ گیا باقی بھائی لوٹ کر باپ کے پاس آئے۔ کل سرگذشت بیان کی اور بن یامین کو ساتھ بھیجنے کی درخواست بھی کی۔ حضرت یعقوبؑ کو یہ کیفیت سُن کر رنج ہوا۔ بولے میرا بیٹا تمہارے ساتھ نہ جائے گا۔ اُس کا بھائی مر گیا وہ اکیلا رہ گیا اگر راستہ میں اُس پر کچھ آفت آئی تو تم میرے بڑھاپے کے بالوں کو غم کے ساتھ گور میں اتار دو گے۔ کچھ زمانہ اسی میں گذر گیا لایا ہوا غلہ ختم ہو گیا تو یعقوبؑ سے پھر باصرار استدعا کی۔ آپ نے فرمایا اچھا تو پختہ قول قسم کر دو اللہ کو ضامن بناؤ کہ جب تک تم خود نہ گھر جاؤ اس کو چھوڑ کر نہ آؤ گے۔ یہوداہ نے کہا میں ضامن ہوتا ہوں، آپ مجھ سے لینا اگر واپس لا کر نہ اس کو آپ کے پاس بٹھا دوں تو ابد تک اس کا گناہ مجھ پر رہے گا۔ حضرت نے قول قرار لے کر بن یامین کو ساتھ کر دیا۔ جو نقدی اور سامان غلہ کے بوروں میں آ گیا تھا اس کو بھی واپس لے جانے کا حکم دیا۔ کچھ میوے، گرم مصالحہ، شہد اور روغن بلسان بطور ہدیہ ساتھ کیا اور چونکہ سب بھائی تندرست، حسین اور قوی تھے، اس لئے نظر بد کے خوف سے صرف شفقتِ پدری کے تحت فرمایا کہ ایک دروازے سے سب مل کر نہ داخل ہونا۔ اگرچہ یعقوبؑ خوب جانتے تھے کہ تقدیر الٰہی کو کوئی تدبیر پلٹ نہیں سکتی پھر بھی عالم اسباب کا لحاظ کرتے ہوئے شفقتِ پدری کا اظہار فرمایا۔ جب سب بھائی مصر پہنچے تو گزشتہ قیمت اور ہدایا تحائف جو کچھ ساتھ لائے تھے شاہی ملاحظہ میں پیش کی۔ بن یامین کو دیکھ کر کہا کیا تمہارا چھوٹا بھائی یہی ہے؟ اس کے بعد فرمایا اے میرے فرزند! خدا تجھ پر مہربان ہے۔ کہنے کو یہ لفظ کہہ دیا، مگر دل بھر آیا ضبط نہ ہو سکا خلوت خانہ میں تشریف لے گئے اور خوب روئے۔ کھانا کھلانے کا وقت آ گیا اور دسترخوان چُنا گیا اور دو دو بھائیوں کو ساتھ بٹھایا گیا۔ بن یامین اکیلا رہ گیا اور یوسف کو یاد کر کے رونے لگا۔ یوسف نے کہا بن یامین کیوں روتا ہے؟ اپنے بھائی یوسف کی بجائے مجھے اپنا بھائی سمجھ لے، کیا یہ بات تجھے پسند نہیں؟ بن یامین نے کہا آپ کو بھائی کہنا میرا فخر ہے، مگر آپ میرے باپ یعقوب اور ماں راحیل سے پیدا نہیں ہوئے۔ حقیقی بھائی یوسفؑ کی آگ کیوں کر بجھے! یوسفؑ سے یہ سُن کر ضبط نہ ہو سکا، رو دئے اور بیتاب ہو کر چہرہ سے حجاب ہٹا دیا اور بولے تیرا بھائی یوسفؑ میں ہی ہوں۔ بن یامین لپٹ گیا۔ یوسفؑ نے اخفاء راز کی تاکید کر دی اور بن یامین کو روکنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ ایک شاہی چاندی کا پیالہ بن یامین کے بورے کے اندر رکھ دیا۔ جب وہ سب غلہ لے کر روانہ ہو گئے تو پیچھے سے آدمی دوڑایا کہ تم ہمارا پیالہ لے گئے ہو؟ انھوں نے انکار کیا۔ یوسفؑ نے کہا اگر کسی کے سامان میں پیالہ نکل آئے تو اس کی کیا سزا ہو گی؟ انھوں نے انکار کیا کہ ہم چور نہیں۔ دیکھئے ہم نے اپنے اونٹوں کے مُنہ پر جالی لگا رکھی ہے تاکہ کسی کے باغ یا کھیت کا نقصان نہ کریں۔ ہمارا خاندان نبوت کا خاندان ہے۔ اگر ہم میں سے کسی کے سامان میں شاہی پیالہ نکل آئے تو اس چور کی سزا بس یہی ہے کہ اس کو غلام بنا لیا جائے۔ حضرت یوسفؑ نے سامان کی تلاشی شروع کرائی۔ ہوتے ہوتے بن یامین کے اسباب میں پیالہ ملا۔ بھائیوں نے بن یامین کو سرزنش شروع کی اور بولے اسی پر منحصر نہیں اس کا بھائی بھی اس سے پہلے چوری کر چکا تھا۔ یہوداہ چونکہ باپ سے اپنی ضمانت دے کر لایا تھا، اس لئے یوسفؑ سے کہنے لگا ہمارا باپ بوڑھا ہے وہ سُن کر مر جائے گا اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو آپ رکھ لیجئے۔ یوسفؑ نے جواب دیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ چوری کوئی کرے اور سزا بھگتے کوئی دوسرا۔ پھر سب

بھائیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ روبین نے کہا کہ میں تو یہاں سے نہیں جا سکتا تا وقتیکہ براہِ راست اللہ کا حکم میرے پاس نہ آجائے یا باپ کی اجازت نہ ہو۔ تم جا کر والد سے ماجرا بیان کردو اور کہہ دو کہ ہم نے اپنے علم کے مطابق ضمانت کی تھی غیب کا علم ہم کو نہ تھا آپ کے بیٹے نے چوری کی اور پکڑا گیا ہما... س میں کچھ قصور نہیں۔ یہ لوگ کنعان گئے، خبر سنائی۔ حضرت یعقوب کو انتہائی صدمہ ہوا اور روتے روتے آنکھیں سفید اور بے نور ہوگئیں، مگر صبر کے سوا چارہ کیا تھا۔ بیٹوں پوتوں نے کہا کب تک آپ اپنی جان دھنیں گے۔ یوسف کی یاد آپ کے دل سے جاتی ہی نہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ یہ یاد آپ کی جان لیوا نہ بن جائے۔ حضرت یعقوب نے فرمایا میں تم کو تو کچھ تکلیف نہیں دیتا اللہ ہی کے سامنے اپنے رنج و حزن کا اظہار کرتا ہوں اور چونکہ حضرت یعقوبؑ کو بفراست یا بنورِ نبوت یہ یقین تھا کہ یوسفؑ کی گزشتہ خواب کا پورا ہونا لازم ہے۔ بھائیوں سمیت اُس کا زندہ رہنا ضرور ہے، اس لئے فرمایا اللہ نے جو علم مجھ کو عطا فرمایا ہے تم کو نہیں دیا۔ تم کو نہیں معلوم کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو۔ نا اُمیدی کا فروں کا شیوہ ہے۔ پھر مصر جاؤ اور دونوں بھائیوں کی تلاش کرو۔ حسب الحکم اولادِ یعقوب پھر مصر پہنچی۔ عزیز کے دربار میں حاضری دی۔ باپ کا سلام کہا جو کچھ کھوٹے سکے ساتھ لائے تھے وہ بھی پیش کیے اور چشم پوشی و احسان کے طالب ہوئے۔ اپنی گرسنگی اور نسلِ یعقوبؑ کی شکستہ حالی بھی ظاہر کی اور آخر میں باپ کا پیام بھی پہنچا دیا کہ اے عزیز! میرا ایک بیٹا تو پہلے گم ہو چکا اُس کا چھوٹا بھائی رہ گیا تھا اُس کو آپ نے روک لیا۔ رحم فرما کر اس کو چھوڑ دیجیے تاکہ میری تسلی ہو۔ اختتام عرض داشت کے وقت یہ بھی کہا کہ ہمارے باپ نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اگر بن یامین کو نہ چھوڑ دو گے تو ایسی بد دعا کروں گا جس کا اثر تمہاری سات نسلوں تک باقی رہے گا۔ یوسفؑ پیامِ یعقوب سُن کر ڈر گئے اور اپنے کنبہ کی خستہ حالی دیکھ کر کچھ نہ کر سکے بولے کیا تم کو یاد ہے کہ تم نے اپنے بھائی یوسف کے ساتھ کیا کیا تھا؟ یوسفؑ کا نام سُن کر یہ چکرائے کہ عزیزِ مصر کو یوسف سے کیا واسطہ، اس کو اس کی حالت کا کیا علم! پھر غور کیا تو کچھ پہچانا بھی، اس لئے بول پڑے کیا سچ مچ تم ہی یوسفؑ ہو؟ حضرت یوسفؑ نے جواب دیا ہاں میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔ سب نے اپنے قصور کا اعتراف کیا۔ یوسف نے خطا معاف کی۔ یہ خبر مصر میں مشہور ہوگئی اور فرعون کو پہنچی، اُس نے یوسفؑ سے ان کے تمام خاندان کو بلانے کی درخواست کی۔ یوسف نے اپنا کُرتا بھائیوں کو دیا۔ بڑا ساز و سامان درست کر کے روانہ کرنا چاہا اور کہہ دیا کہ میرے باپ کے مُنہ پر یہ کُرتا جا کر ڈال دینا وہ بینا ہو جائیں گے اور یہ بھی کہا کہ اپنے تمام خاندان کو میرے پاس لے آؤ۔ قافلہ مصر سے چل دیا جب کنعان تین روز کی مسافت پر رہ گیا تو حضرت یعقوبؑ کو پیراہن یوسفؑ کی بُو محسوس ہوئی۔ پوتوں سے تذکرہ کیا انھوں نے دیوانہ بنایا۔ تین روز کے بعد یہوداہ کرتا لے کر پہنچ گیا اور جاتے ہی باپ کے چہرے پر ڈالا، فوراً آنکھیں روشن ہوگئیں۔ یہوداہ نے یوسف اور بن یامین کی خیریت اور مصر میں یوسفؑ کا جاہ و جلال بیان کیا۔ سب بیٹے باپ کے قدموں پر گر پڑے اور عرض کیا ہمارا قصور اللہ سے معاف کرا دیجیے ہم خطا وار ہیں۔ یعقوبؑ نے کہا عنقریب اللہ سے تمہارے لئے دعائے مغفرت کروں گا اور وہ ضرور بخش دے گا۔ اس کے بعد حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے پوتوں وغیرہ ستر اشخاص کی جماعت لے کر مصر کو چل دیئے۔ چند منزل پہلے یہوداہ کو یوسفؑ کے پاس بھیج دیا۔ یوسفؑ شاہانہ ٹھاٹ کے ساتھ استقبال کو آئے اور باپ کو لے جا کر اپنے محل میں فروکش کیا اور اپنے تخت پر اپنے باپ اور سوتیلی ماں کو بٹھایا۔ سامنے گیارہ بھائی بیٹھے سب نے آدابِ وزارت ادا کیے اور تعظیماً جھک گئے۔ یوسفؑ نے کہا آج میرے اُس خواب کی تعبیر پوری ہوئی جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا۔ پھر حضرت یعقوب کو فرعون سے ملوایا اُس نے ایک قطعۂ اراضی حوالیِ شہر میں اولادِ اسرائیل کے ساتھ مخصوص کر دیا جس کا نام رعمسیس تھا۔ مصر میں تشریف لانے کے وقت حضرت یعقوب کی عمر ۱۲۰ سال کی تھی۔ بقول اہلِ کتاب سترہ سال یہاں قیام رہا اور ۱۳۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ انتقال کے وقت یوسفؑ کو وصیت کی کہ مجھے مصر میں دفن نہ کرنا میں اپنے باپ دادا کے گورستان میں سوؤں گا۔ مرنے سے کچھ دیر پہلے اپنی اولاد کو بلایا اور توحید اور ملتِ ابراہیمی پر قائم رہنے کی نصیحت کی اور ہر بیٹے کو اس کیلئے مناسب دعائے برکت دی پھر ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گئے۔ حضرت یوسفؑ نے کیمیاوی ترکیب سے میت کو محفوظ رکھا۔ مصر کے بڑے لوگوں کا دستور یہی تھا۔ فرعون کا اسٹاف اور عمائدِ شہر اور خاندانِ یعقوب جنازہ کو لے کر کنعان آئے۔ یہاں پہنچ کر خاندانی قبرستان میں دفن کیا۔ حضرت یوسفؑ وزارت پر قائم رہے۔ آپ کے دو صاحبزادے تھے افرائیم اور منشی یا منسیا۔ جب ایک سو بیس برس

کاسن ہوگیا تو ایک رات خواب دیکھا کہ ایک نہایت پُرفضا مقام ہے وہاں چند کرسیاں لگی ہیں۔ ابراہیمؑ ، اسحاقؑ ، یعقوبؑ اور راحیل مختلف کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ یعقوبؑ اور راحیل رو کر یوسفؑ سے لپٹ گئے اور بولے فرزند کب تک اپنی راہ دکھائے گا ہم تیرے مشتاق ہیں اب آجا۔ آنکھ کھلی تو روح پر ایک کیف طاری تھا۔ عالم قدس میں اپنے بزرگوں سے ملنے کی بیقراری تھی۔ تمام دنیا کے لذائذ فانیہ سے یک لخت دل سرد ہوگیا۔ بیدار ہوتے ہی بارگاہِ الٰہی میں دعا کی کہ پروردگار! مجھے سلف صالحین سے ملا دے۔ دعا قبول ہوئی۔ وقت وفات بھائیوں سے وصیت کی کہ ایک بار پھر تم کو ملک شام جانا ہے یہاں تم اور تمہاری اولاد کچھ زمانے کے بعد نہ رہ سکے گی۔ تمہاری زندگی میں ہجرت کرنی پڑے یا تمہاری اولاد کی زندگی میں یا نسل اسرائیل میں تو میری میت بھی ساتھ لے جانا۔ وصیت کے بعد وفات ہوگئی۔ مصر میں ماتم بپا ہوگیا۔ لاش کو کیمیاوی ترکیب سے خوشبودار کرکے سنگِ مرمر کے تابوت میں بند کرکے سپرد خاک کردیا گیا۔ آپ کی وفات کے بعد جب فرعونِ موسیٰ کا زمانہ آیا تو جذبۂ دشمنی کے ساتھ اختلاف دینی بھی ہوگیا۔ بنی اسرائیل حقوق شہریت سے محروم کردیئے گئے طرح طرح کے مصائب اُن پر ٹوٹ پڑے۔ بادشاہ سے لے کر ادنیٰ امزدور تک سب اُن کے مخالف بن گئے یہ ترکِ وطن پر مجبور ہوئے مگر فرعون کا کھٹکا لگا ہوا تھا کہ اگر ہجرت کرکے شام کو چلے گئے تو وہاں کی حکومت جو مصر کی حریف تھی اور مدت سے مصر پر اُس کا دانت تھا) سے مل کر کہیں حملہ نہ کریں، اس لئے ہر ممکن دباؤ سے روکتا رہا۔ بالآخر خدا نے موسیٰ کو مبعوث فرمایا اور فرعون پر غالب کیا۔ آپ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے شام کو چلے۔ اُس وقت حضرت یوسفؑ کی ہڈیاں بھی ساتھ لے لیں موسیٰؑ راستہ میں ہی فوت ہوگئے۔ بنی اسرائیل ہڈیوں کو لے کر کنعان پہنچے اور نابلس کے قریب دفن کیا۔

زلیخا کے متعلق آسمانی کتب خاموش ہیں، مگر اہلِ سیرت نے لکھا ہے کہ یوسفؑ کی زلیخا سے شادی ہوئی تھی۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی بھی پیدا ہوئی تھی۔

بیان قصہ کے دوران میں جو نصیحت انگیز، عبرت خیز واقعات ہیں تفسیری مطالب بیان کرنے کے وقت سب کو بیان کریں گے۔

اب ہم آیات کی تفسیر ذکر کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ سورۂ یوسفؑ قرآن مبین کی آیات ہیں۔ ان سے قرآن کی حقانیت، صداقت اور منزل من اللہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ایسے واقعات جو جزیرۂ عرب کے نہیں بلکہ بیرونِ عرب کے ہیں اور حال کے نہیں بلکہ ہزاروں برس پہلے کے ہیں اور جن کا علم بجز علمائے اہلِ کتاب اور خاص خاص مورخین کے عام لوگوں کو نہیں۔ ایک اُمّی ان پڑھ مکہ کا باشندہ کس خوبی، سلاست اور صداقت کے ساتھ بیان کر رہا ہے۔ اگر یہ غیبی الہام نہیں تو اور کیا ہے۔ ان آیات اور نشانیوں کی صداقت دیکھ کر پورے قرآن کی حقانیت کا یقین کرلینا چاہیئے اور خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن اللہ کی واضح اور روشن کتاب ہے۔ حق و باطل اور حرام و حلال میں امتیاز کرنے والی اور اچھے برے راستے کو بتانے والی ہے خود ساختہ نہیں۔ رہی یہ بات کہ جب یہ آسمانی کتاب ہے تو عربی زبان میں کیوں نازل کی گئی، دوسری زبانوں پر عربی کو کیوں ترجیح دی گئی تو اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ایک تو صاحب کتاب عرب ہے پھر جس ملک میں پیدا ہوا اس کے باشندوں کی زبان عربی ہے اور پھر عربی زبان بھی الفاظ مبادی اور مشتقات کے اعتبار سے طویل الذکر ہے۔ اگر کسی اور زبان میں نازل کی جاتی تو پہلی طور پر سمجھ میں کیسے آتی۔ کھلے طور پر فہمائش تو عربی زبان میں ہی ہوسکتی تھی۔ لہٰذا تمہارے سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کے لئے قرآن کو عربی زبان میں نازل کیا۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ چونکہ ہم نے یہ قرآن بذریعہ وحی تم پر نازل کیا اور قرآن تمام آسمانی کتابوں میں اکمل وافضل اور اعلیٰ ہے، اس لئے قصہ بھی وہ بیان کرتے ہیں جو تمام قصوں سے مورد تفصیل اور نتیجہ کے اعتبار سے اچھا ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں افضل گروہ انبیاء کا ہے۔ پھر کسی نبی کو ابتدا سے اور آغاز عمر سے آخری حصۂ عمر تک ایسے واقعات اور گوناگوں انقلابات سے واسطہ نہیں پڑا جیسا حضرت یوسفؑ کو پڑا۔ لہٰذا عجیب ترین قصہ اگر کوئی ہوسکتا ہے تو یوسفؑ کا ہے۔ اس کے اندر تفریح خاطر حسن و عشق کی کرشمہ کاریوں کا تذکرہ بھی ہے۔ بتصویر انقلاب بھی ہے۔ نبی کی عصمت و عظمت کا اظہار بھی ہے۔ قدرتِ الٰہی کی ہمہ گیری کا بیان بھی ہے اور مسلمانوں کے لئے درسِ بصیرت بھی ہے۔ بادشاہوں سے لے کر غلاموں تک کے واقعات و معاملات، عورتوں کی مکاری، دشمنوں کی ایذا رسانی پر صبر، قدرت ہوتے ہوئے درگزر، حبیب و محب کے اشارات و حالات سب کچھ مفصل طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے۔ اے نبی! تم وحی اور نزول قرآن سے پہلے اس قصے سے واقف بھی نہ تھے۔ یعنی یہ قرآن قطعی

طور پر الہامی اور آسمانی ہے تمہارا ساختہ نہیں۔ تم کو کسی نے یہ قصہ نہیں بتایا۔ کسی کو شک نہ کرنا چاہیئے کہ رسول خود اپنی طرف سے بیان کر رہے ہیں یا کسی کتابی عالم سے پوچھ کر ظاہر کرتے ہیں۔

مقصودِ بیان صداقت قرآنی اور حقانیت رسالت کے پُرزور دلائل کا اظہار۔ اس امر کی صراحت کہ قرآن مبین ہے یعنی حق و باطل کا فیصلہ کرنے والا اور حرام و حلال میں تفریق کرنے والا ہے۔ اس کے احکام میں کوئی خفا و شک و شبہ نہیں۔ اس کے اندر افراط ہے نہ تفریط بلکہ شاہراہ مستقیم ہے جو بالکل کھلی ہوئی ہے۔ جس کا دل چاہے آنکھیں بند کر کے چل دے۔ قرآن کے عربی میں نازل کرنے کی اصل علت و حکمت کا بیان۔ قصۂ یوسفؑ کے احسن القصص ہونے کی تصریح۔ اس بات کی وضاحت کہ قرآن کے لئے زیبا نہیں کہ اس کے اندر جھوٹے سچے تر و خشک ہر قسم کے قصے بیان کئے جائیں بلکہ نتیجہ خیز افضل ترین قصہ کو بیان کرنا ہی ایسی عظیم الشان کتاب میں مناسب ہے۔ اس بات کی صراحت کہ اس سورت کے نزول سے پہلے حضرت یوسفؑ کا قصہ رسول پاکؐ کو معلوم نہ تھا۔

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ

(یاد کرو کہ) جب یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا ابا میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج و چاند دیکھے میں نے دیکھا کہ

لِي سَاجِدِينَ ○ قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ

یہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں باپ نے کہا بیٹا اپنا خواب اپنے بھائیوں سے نہ بیان کرنا ورنہ تمہارے حق میں وہ مکاری کرنے

كَيْدًا ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ○ وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ

لگیں گے شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے تمہارا رب اسی طرح تم کو برگزیدہ کرے گا

وَيُعَلِّمُكَ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ وَعَلَىٰ آلِ يَعْقُوبَ كَمَا

اور تم کو خوابوں کی تعبیر کا علم سکھائے گا اور تم پر اور اولاد یعقوب پر اپنا احسان پورا کرے گا جیسے

أَتَمَّهَا عَلَىٰ أَبَوَيْكَ مِن قَبْلُ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○

اس سے پہلے تمہارے دونوں دادا ابراہیم و اسحٰق پر پورا کیا تمہارا رب دانا با حکمت ہے

تفسیر ان آیات کے ہم تین حصے کرتے ہیں :- (۱) ارشاد ہوتا ہے کہ یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا کہ میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے کہ وہ مجھ کو سجدہ کر رہے ہیں (یعقوبؑ نے کچھ توجہ اور غور سے دریافت کیا تو یوسف نے کہا ہاں) میں نے ان کو سجدہ کرتے دیکھا۔ صحیح خواب کی دو قسمیں ہیں۔ قابل تاویل اور واضح۔ قابل تاویل وہ خواب جس کا مطلب کچھ اور ہو اور کسی دوسرے پیرایہ میں ظاہر کیا گیا ہو اور واضح وہ خواب ہے کہ اصل واقعہ دکھا دیا جائے جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو دکھایا گیا تھا کہ آپ حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کر رہے ہیں۔ صحیح دونوں خواب ہوتے ہیں۔ بصراحت حدیث ہر صحیح خواب نبوت کے ۳۶ یا ۴۶ اجزاء میں سے ایک جزء ہے، مگر اول کی صحت کی وضاحت محتاج تعبیر ہے اور دوسرا تعبیر سے مستغنی ہے۔ حضرت یوسفؑ کا خواب قابل تاویل تھا یا واضح؟ اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ حافظ ابن عساکر نے اس کو صریح اور واضح قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ یوسفؑ نے گیارہ ستارے اور چاند سورج نہیں دیکھے

تھے بلکہ گیارہ بھائی اور ماں باپ کو سجدہ کرتے دیکھا تھا۔ آپ کی مراد ستاروں اور آفتاب و ماہتاب سے برادران اور والدین ہی کی شخصیتیں تھیں جس کا ظہور چالیس برس اور بقول حسن بصری اسی برس بعد کو ہوا۔ ابن عساکر نے اس قول کو ابن عباس، قتادہ، ضحاک، سفیان ثوری اور عبدالرحمٰن بن زید کی طرف منسوب کیا ہے۔ باقی مفسرین کے نزدیک خواب قابل تاویل تھا۔ واقع میں یوسفؑ نے گیارہ ستارے اور چاند سورج ہی خواب میں دیکھے تھے۔ جن کی تعبیر تفسیر اور تشریح سے حضرت یعقوبؑ بھی واقف تھے اور حضرت یوسفؑ بھی۔

کتب یہود میں مؤخرالذکر قول کو بیان کیا گیا ہے بلکہ ابن جریر نے بروایت عبدالرحمٰن بن سابط تو یہاں تک بیان کیا ہے کہ حضورؐ کی خدمت میں بستانہ یہودی حاضر ہوا اور عرض کیا جن کواکب کو یوسفؑ نے خواب میں دیکھا تھا بتائیے ان کے کیا نام تھے؟ حضورؐ کچھ دیر خاموش رہے یہودی چلا گیا۔ حضرت جبرئیلؑ آئے۔ آپ نے یہودی کو طلب کیا۔ جب وہ آگیا تو فرمایا اگر میں تجھے ان کے نام بتادوں گا تو کیا تو مسلمان ہو جائے گا؟ اس نے اقرار کیا۔ فرمایا اُن کے نام ہیں جریان، طارق، ذیال، قابس، ذوالکتفین، وثاب، عمودان، فلیق، مصبح، ضروح، قرح۔ بیہقی نے دلائل النبوۃ میں ابو یعلیٰ موصلی اور ابوبکر بزار اور ابن ابی حاتم نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ روایت غلط اور موضوع ہے۔ تمام ناقلین کا مرجع سُدّی ہیں اور سدی سے اُن کے شاگرد حکم بن ظہیرہ نے روایت کی ہے اور حکم بن ظہیر و بقول جرجانی ساقط الاعتبار ہے، اس لئے یہ روایت غلط ہے۔ کتب حدیث میں کسی اور راوی کی تائید سے یہ روایت منقول نہیں ہے۔ ہاں اتنا محقق ہے کہ کتب یہود کی صراحت قرآن کی ظاہری آیات کے مطابق ہے اور اہل کتاب کے نزدیک یہ خواب صریح نہیں بلکہ مؤوّل تھی۔

سٰجِدِیْنَ سے کیا مراد ہے؟ اس میں بھی دو قول ہیں۔ جو لوگ قائل ہیں کہ اسلام میں ہی اس نہیں بلکہ ہر گزشتہ شریعت میں سوائے خدا کے اور کیلئے حقیقی سجدہ کرنا یعنی کسی کے سامنے بارادۂ تعظیم پیشانی زمین پر رکھنا ناجائز اور حرام تھی۔ اُن کے نزدیک سجدہ سے مجازی سجدہ یعنی جھکنا اور گردن جھکانا مراد ہے اور جو لوگ اسلام کے علاوہ دوسری آسمانی شریعتوں میں غیر اللہ کے لئے حقیقی سجدے کے جواز کے قائل ہیں اُن کے نزدیک یہاں بھی حقیقی مفہوم ہی مراد ہے۔ رہا ہماری شریعت میں غیر اللہ کو حقیقی سجدہ تو یہ بالاتفاق حرام ہے۔ احادیث اس کے متعلق وارد ہیں۔ جن کا تذکرہ اس جگہ خارج از بحث ہے۔

(۲) حضرت یعقوبؑ نے خواب کو سُن کر بنورِ فراست اور بعقلِ نبوّت سمجھ لیا کہ یوسفؑ کا خواب اس کے عالی مرتبہ ہونے کی نشانی ہے اور ممکن ہے کہ صاف طور پر جان لیا ہو کہ اس کی تعبیر ماں باپ اور بھائیوں کا سجدہ کرنا ہے۔ بہرحال حضرت یوسفؑ کو ہدایت کی کہ اس کا تذکرہ اپنے بھائیوں سے نہ کرنا۔ وہ اگرچہ بھائی ہیں، لیکن شیطان بھی شیطان ہی ہے۔ کسی انسان کا تقرب بارگاہِ الٰہی میں اُسے گوارہ نہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بھائیوں کو تباہ کرنے اور تجھے نتیجۂ خواب کے ظاہر ہونے سے پہلے مصیبت میں مبتلا کرانے کے لئے بھائیوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالے اور وہ تیرے خلاف کوئی اسکیم بنائیں اور پھر تجھے تکالیف اٹھانی پڑیں۔

حضرت یوسفؑ نے یہ خواب سات برس یا بارہ برس یا سترہ برس کی عمر میں جمعہ کو شبِ قدر میں دیکھا تھا (ابن اثیر)

(۳) حضرت یعقوب نے خواب سُن کر جواب کے ذیل میں نورِ فطری سے یا بوحی ربانی چند باتیں آئندہ کے متعلق اور بھی یوسف کو بتائیں۔ (۱) اللہ نے جس طرح تم کو یہ خواب دکھایا وہ تمہاری عظمت و مرتبت کی دلیل ہے۔ ایسا ہی اور مدارج و مراتب سے تجھے سرفراز فرمائے گا۔ نبوت دے گا عصمت برقرار رکھے گا، ہزاروں کو تیرے ہاتھ پر مسلمان کرے گا وغیرہ۔ (۲) (بقول مجاہد) وہ خوابوں کی صحیح تعبیر دینے کا علم تجھے عطا کرے گا اور اپنی پوری نعمت (جو تیرے لائق ہوگی) تجھے عطا کرے گا یعنی نبوّت، ثروت، اعزاز و جلال عنایت کرے گا۔ چنانچہ آپ کی مفصل کیفیت ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ بعد میں آپ اور آپ کی نسل بڑے جاہ و جلال کے ساتھ رہی۔ حضرت یعقوبؑ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ تجھے ہی خدا تعالیٰ اپنے انعام سے سرفراز نہیں فرمائے گا بلکہ میری دوسری نسل کو بھی گوناگوں نعمتیں مرحمت کرے گا۔ جس طرح تیرے اسلاف ابراہیم و اسحاق کو نوازا تھا ویسے ہی میری نسل کو نوازے گا۔ حضرت یعقوبؑ نے اپنا تذکرہ بطور انکسار نہیں کیا۔

اکثر مفسرین نے اتمام نعمت سے مراد نبوت مع سلطنت لی ہے، لیکن مفسر سراج نے بروایت ابن عباسؓ صرف نبوت سے تفسیر کی ہے۔

بعض علماء نے یہیں سے استخراج کیا ہے کہ یوسفؑ کے دوسرے بھائی بھی نبی تھے کیونکہ حضرت یعقوب کی دعا اور پیشین گوئی کے موافق ان کو بھی کامل نعمت سے سرفراز ہونا چاہئے اور کمالِ نعمت نبوّت ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ ابراہیم واسحاق پر جس نعمت کا فیضان ہوا تھا اُس سے تشبیہ دینا اور حضرت یوسفؑ پر جو انعام ہوا تھا اُسی کے ذیل میں دیگر اولادِ یعقوب کا تذکرہ کرنا بتا رہا ہے کہ نوعیت نعمت ایک ہی سی ہے یعنی نبوّت، لیکن میرے نزدیک یہ دلیل بہت کمزور ہے۔ دانشمند اس قول کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ دنیوی نعمت کا کمال وعروج، عزت جلال، دولت حکومت وغیرہ مراد ہو اور اگر روحانی نعمت ہی مراد ہو تب بھی کیا ضرور ہے کہ سب کے سب نبی ہوں۔ ولایت، کرامت، کمالِ جان اور قربِ الٰہی یہ تمام درجات تکمیل ہیں۔ واللہ اعلم۔

مقصودِ بیان انبیاء کا خواب صحیح ہوتا ہے۔ خواب اور پیش آنے والے واقعہ میں مناسبت ضرور ہوتی ہے۔ یہ ضرور نہیں کہ خواب کے مفہوم کا ظہور فوراً ہو جائے۔ ہوسکتا ہے کہ بیسیوں برس کے بعد ہو۔ شیطان انسان کا دشمن ہے۔ نبی زادے بھی اس کے خطرات سے محفوظ نہیں وغیرہ۔

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِلسَّائِلِينَ ○ إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ

بلاشبہ اُس کے اور اُس کے بھائیوں کے قصہ میں سوال کرنے والوں کے لئے کچھ نشانیاں ہیں جبکہ بھائیوں نے کہا کہ یوسف اور اُس کا بھائی ہمارے باپ کو

إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ○ اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ

ہم سے زیادہ پیارا ہے حالانکہ ہم طاقتور ہیں واقعی ہمارے باپ صریح غلطی میں ہیں یوسف کو مار ڈالو یا کسی ملک میں ڈال آؤ

أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ○ قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ لَا

تمہارے باپ کی توجہ خالص تمہاری طرف ہو جائے گی اور اُس کے بعد تم اچھے لوگ ہو جاؤ گے ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا یوسف کو

تَقْتُلُوا يُوسُفَ وَأَلْقُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ○

قتل نہ کرو بلکہ ایک اندھے کنوئیں میں ڈالی دو تاکہ کوئی راہ چلتا اُس کو اُٹھا کر لے جائے اگر تم کو کرنا ہے۔

تفسیر ہر آیت کی تشریح جدا جدا کرنی ضروری ہے:- (۱) یوسفؑ کے بھائی کتنے تھے اور کون کون تھے؟ اہلِ کتاب اور بعض مورخین اسلام سے جو تعداد اور اسماء کی تفصیل منقول تھی وہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ معالم، بیضاوی اور سراج میں مذکور ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی پہلی بیوی آپ کے ماموں لیان کی دختر لیا نامی تھی۔ اس کے بطن سے روبیل، شمعون، لاوی (دال کے ساتھ) زبلون (اور بقول قرطبی زبولون) یہ کل چھ بیٹے تھے۔ سراج اور فتح میں ہے کہ سب سے بڑا روبیل تھا پھر بقول صاحب معالم دولونڈیاں بھی تھیں جن کے نام زلفی اور بلہم تھے۔ رازی اور قرطبی نے بلہم کی بجائے بلہہ لکھا ہے۔ ان دونوں سے چار بیٹے تھے:- دان، نفتالی، جاد، اشر۔ قرطبی نے نفتالی کی بجائے نفتونا اور اشر کی جگہ اوشیر لکھا ہے۔ پھر راحیل ہمشیرہ لیا کے بطن سے دو لڑکے یعنی یوسف اور بن یامین ہوئے۔ بعض نے لکھا ہے کہ راحیل سے فقط بن یامین تھا اور راحیل کے بعد حضرت یعقوب نے وفضا سے نکاح کیا تھا اس سے یوسفؑ پیدا ہوئے، مگر یہ قول ضعیف ہے۔ عام اہلِ خبر نے لکھا ہے کہ لیا کے انتقال کے بعد حضرت یعقوبؑ نے راحیل سے نکاح کیا تھا، مگر صحیح یہ ہے کہ لیا کی موجودگی ہی میں راحیل سے نکاح ہوا تھا اور اس وقت کی شریعت میں دو بہنوں سے اجتماعی نکاح صحیح تھا۔ راحیل کا انتقال تو یوسفؑ کی یا بن یامین کی پیدائش کے وقت ہو گیا تھا۔ لیا باقی تھی

جو حضرت یعقوبؑ کے ساتھ مصر گئی تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ لیا کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔

(۲) آیات سے کون سی نشانیاں مراد ہیں؟ اس کی کوئی تعیین نہیں کی گئی۔ جمع کا صیغہ اور اس پر تنوین ہونا یہ بات بتا رہا ہے کہ کثیر اور عظیم الشان نشانیاں مراد ہیں۔ مفسرین نے قیاس آرائی کی ہے۔ میرے نزدیک صحیح مطلب یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت رسول پاکؐ کے صدق رسالت انسانی آغاز و انجام، انقلاباتِ زمانہ وغیرہ۔ غرض اکثر عبرت انگیز نصیحت خیز نشانیاں تذکرۂ یوسفؑ کے ذیل میں اہل بصیرت اور دانش مند طبقہ کے لئے موجود ہیں جس کی تفصیل ہر موقعہ پر کی جائے گی۔

(۳) سائلین کی ہدایت کے لئے آیات ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جو لوگ یوسفؑ کا قصہ دریافت نہیں کرتے اُن کے لئے یہ بیان موجب نصیحت نہیں بلکہ یہ اظہار واقعہ ہے۔ چونکہ بعض لوگوں نے حضور اقدسؐ سے بطور امتحان حضرت یوسفؑ کا واقعہ دریافت کیا تھا، اس لئے فرمایا کہ اس قصہ کا نزول محض تفریح خاطر کے لئے نہیں بلکہ اس کے اندر عبرت و نصیحت کے خزائن پوشیدہ ہیں۔ سوال کرنے والے اگر غور کریں گے اور نصیحت حاصل کرنی چاہیں گے تو یہ قصہ ان کے لئے سرچشمۂ ہدایت ثابت ہوگا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ یوسفؑ کے دس بھائیوں نے آپس میں کہا کہ باپ کی نظر میں یوسفؑ اور اس کا حقیقی بھائی بن یامین بہت چڑھا ہوا ہے، ہم میں سے کسی کے ساتھ باپ کو اتنی محبت نہیں جتنی ان دونوں سے ہے۔ باوجودیکہ کشش محبت کے اسباب ہم لوگوں کے اندر زیادہ ہیں، ہم طاقت ور ہیں، ہمارا جتھا ہے، کل کام کاج ہم کرتے ہیں اور یہ دونوں حقیر ضعیف لڑکے ہیں دنیا کے کسی مطلب کے نہیں نہ باپ کی خدمت کر سکتے ہیں نہ بُرے وقت میں آڑے آسکتے ہیں۔ اس معاملے میں ہمارے باپ یقیناً غلط راستے پر ہیں۔ کوئی تدبیر ایسی کرو کہ ہمیشہ کے لئے یہ قصہ ختم ہو جائے بہتر ہے کہ یوسف کو قتل کر ڈالو یا کسی دور دراز ملک میں پھینک آؤ نہ یہ ہوگا نہ باپ کو ہماری طرف سے کشیدگی ہوگی۔ کل توجہ ہماری ہی جانب ہو جائے گی۔ روبیل (بقول) محمد بن اسحاق یہودا (بقول سدی) نے کہا بھائیو! حسد کو اتنا نہ بڑھاؤ قتل کرنا زیبا نہیں۔ مقصود تو یہ ہے کہ باپ کی نظر سے یوسف اوجھل ہو جائے۔ اس کی اچھی ترکیب یہ ہے کہ یوسف کو لے جا کر کسی اندھے خشک کنوئیں میں ڈال دو۔ کوئی آتا جاتا مسافر ادھر سے گزرے گا نکال کر لے جائے گا۔

چند شبہات اور اُن کا ازالہ

تفسیر سراج و کبیر میں اس موقعہ پر شبہات کا تذکرہ کیا ہے اور پھر ان کا ازالہ کیا ہے۔ ہم بھی قدرے ترمیم کے ساتھ نقل کرتے ہیں:۔

(۱) اگر اولاد میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی جائے اور کسی کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جائے تو اس سے دوسروں کے دلوں میں حسد پیدا ہوتا ہے۔ پھر نبی نے ایسا کام کیوں کیا جو منشاء حسد تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے کسی سلوک میں امتیاز نہیں رکھا تھا۔ البتہ قلبی محبت میں کمی بیشی ضرور تھی اور دلی محبت اضطراری چیز ہے۔ اختیار سے خارج ہے نہ محبت کی برابری پر انسان مکلف ہے۔

(۲) حضرت یعقوبؑ کے بیٹے نبی ہوں یا نہ ہوں تاہم باپ کی نبوت پر یقین رکھنے والے اور کامل مومن ضرور تھے پھر کیوں نبی پر اعتراض کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لڑکوں کی رائے کی غلطی تھی۔ ان کو یعقوبؑ کی نبوت پر ایمان ضرور تھا، مگر وہ باپ کے اس فعل کو ان کی رائے پر محمول کرتے تھے۔ دینی بات نہیں سمجھتے تھے اور واقعی مذہبی امر تھا بھی نہیں اور جب اپنے اندر کشش محبت کے اسباب اپنی سمجھ کے موافق زیادہ پائے تو باپ کی رائے کی تغلیط کو خلاف اصول نہ سمجھا۔

(۳) باپ کو گمراہ کہا۔ حالانکہ اُن کی نبوت کو مانتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مذہب کے اعتبار سے اُن کو گمراہ نہیں کہا بلکہ معاملات دنیوی میں ان کو غلط رو کہا۔ گویا یوسفؑ کو ترجیح دینا چونکہ کوئی الہامی فعل نہ تھا، اس لئے انھوں نے اس حرکت کو مصالح دنیوی کے خلاف سمجھتے ہوئے ضرر انگیز ثابت کرنا چاہا۔

مقصود بیان

صاف طور پر آیت دلالت کر رہی ہے کہ قرآن کے اندر جو قصص مذکور ہیں وہ تفریح خاطر کے لئے نہیں بلکہ عبرت حاصل کرنے اور نصیحت پکڑنے کے لئے ہیں۔ شروع آیت میں زلیخا کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ فقط یوسفؑ اور ان کے بھائیوں

کا قصہ قرار دیا۔ اس سے اشارہ اس طرف ہے کہ زلیخا کا قصہ اصل مقصود نہیں۔ یہ ضمنی طور پر ذکر کیا گیا ہے یعنی جہاں تک ممکن ہو شہوانی عشق کی خبر چھپا کر مرد مومن کا گریز کرنا چاہیئے، لیکن اگر بالتبع بغیر اصل غرض بنائے ہوئے حسن و عشق کا تذکرہ آجائے تو استفراغ بھی نہ کر دینا چاہیئے۔ انسان کتنا ہی ایمان دار ہو باقتضاء بشریت اس کی ظاہری نظر بیرونی اسباب پر جاتی ہے۔ جس طرح یوسفؑ کے بھائیوں نے یوسفؑ کو ناکارہ اور اپنے کو مستحق ظاہر کرنے کے لئے اپنی جماعت اور طاقت کا تذکرہ کیا۔ حسد سے بہت کم لوگ پاک ہیں۔ نبی زادے کہ بھی باوجود کامل الایمان ہونے کے اس سے نہ بچ سکے۔ یوسفؑ کے بھائی یوسفؑ کے قتل یا جلا وطنی کو برا فعل سمجھتے تھے، مگر بشری کینہ بجھانے کے بعد استغفار کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ۝ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ

غرض باپ سے بولے ابا کیا وجہ ہے کہ آپ یوسف کے معاملہ میں ہمارا اعتبار نہیں کرتے ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں کل اُس کو ہمارے ساتھ بھیجیے تاکہ خوب کھائے

وَيَلْعَبْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ

کھیلے ہم اُس کی قطعی حفاظت کریں گے باپ نے کہا مجھے اس کا غم ہے کہ تم اُس کو لے جاؤ گے اور اندیشہ ہے کہ تم کو خبر بھی نہ ہو اور کوئی بھیڑیا

وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ۝ قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّاۤ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ۝

اُس کو کھا جائے بولے اگر اُس کو بھیڑیا کھا جائے حالانکہ ہم جماعت کی جماعت ہیں تو یہ تو ہمارے لئے خسارہ کی بات ہے

تفسیر غرض جب برادران یوسفؑ کا عزم پختہ ہو گیا تو باپ سے سب نے بالاتفاق کہا کہ کل صبح ہم جنگل کو تفریح کرنے جائیں گے۔ بہتر ہے کہ آپ یوسف کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دیجئے۔ گھر میں بیٹھے بیٹھے وہ بھی تنگ آگیا ہے وہ بھی کچھ سیر سپاٹا کرلے گا اور آزادی سے کچھ جنگل کے پھل کھائے گا۔ ہم اس کی انتہائی نگہداشت بھی رکھیں گے۔ کسی قسم کا خطرہ بھی نہیں ہے۔ کیا آپ کو یوسف کے متعلق ہمارا اعتبار نہیں ہے۔ ہم تو اس کے بلاشک خیر خواہ ہیں۔ حفاظت کی ہر ممکن تدبیر کریں گے۔

تحقیق کیا لعب اور کھیل کود جائز ہے جو نبی زادوں نے درخواست کی اور نبی نے اجازت دے دی؟ اس کا جواب اہل علم نے اس طرح دیا ہے کہ کھیل دو قسم کا ہوتا ہے ایک تو وہ جو ذکر الٰہی سے غافل کرے۔ دوسرا وہ جو دینی امور سے مانع نہ ہو۔ مؤخر الذکر صورت اگرچہ بظاہر لعب نظر آتی ہے، مگر واقع میں وہ لعب نہیں ہوتی۔ مثلاً باغوں کی سیر، گھوڑے کی سواری کے کرتب، تیر اندازی اور نشانہ بازی کا مظاہرہ، باہم مقابلے پر دوڑنا وغیرہ یہ تمام کھیل جائز ہیں۔ ان سے بدن میں قوت، اعضاء میں چستی اور دل کو تفریح حاصل ہوتی ہے۔ اولاد اسرائیل کا کھیل بھی اسی قسم کا تھا۔ آیت اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ الخ اس پر دلالت کر رہی ہے۔ اوّل قسم ناجائز ہے اور درحقیقت یہی سبب ہے بھی۔ ثانی قسم تو صورۃً لعب کے مشابہ ہے۔ اس پر لعب کا اطلاق مجازی ہے۔

چونکہ برادران یوسف کو پہلے ہی سے خطرہ تھا کہ باپ کا گمان ہماری دوستی کے متعلق ٹھیک نہیں ہے، اس لئے ہر جملہ میں اپنی خیر خواہی اور وعدہ تحفظ کو انتہائی پر زور لہجہ میں ظاہر کیا جس سے یعقوبؑ مزید چیں بہ چیں ہو گئے، لیکن تقدیر کا وار خالی نہیں جاتا۔ حضرت یعقوب نے بیٹوں کے حسد کا تو اظہار نہیں کیا بلکہ یوسفؑ کو روکنے کے لئے کلام کا رخ بدل کر دو وجہیں ظاہر کیں۔ بولے اگر تم یوسفؑ کو لے جاؤ گے تو اس کی جدائی کا غم (دن بھر) مجھے رہے گا۔ پھر یہ بھی اندیشہ ہے کہ تم لوگ تو کھیل کود میں مشغول ہو گے یوسف چھوٹا ہے کہیں اس کو بھیڑیا نہ کھا جائے۔ یعقوبؑ مراد بھیڑیے سے یا تو یہی جنگلی درندہ تھا۔ کنعان کے جنگل میں بھیڑیے تھے بھی بہت۔ یا آپ نے برادران یوسف کے حسد کو بھیڑیا قرار دیا۔ اور درپردہ ان کو ان کی غیرہ باطنی پر تنبیہ کی۔ تفسیر سراج میں مذکور ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے خواب دیکھا تھا کہ یوسفؑ پر بھیڑیے نے حملہ کیا اور

انبیاء کے خواب جھوٹے نہیں ہوتے۔ اس لئے اگر بھیڑیئے سے مراد حسد لیا جائے تو ممکن ہے حضرت کی معذرت آمیز وجہ ممانعت سن کر بیٹوں کا دماغ بھرا ہو اور حسد کی آگ بھڑک کر باپ کو یوسف کی جدائی ایک دن بھی گوارا نہیں اور ہم روزانہ دھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں تو کچھ پرواہ نہیں۔ مگر مصلحت وقت کے پیش نظر حسد کو چھپایا اور بولے ہمارا پورا جتھا ہے ہم طاقت ور بھی ہیں۔ اس پر بھی اگر زبردستی بھیڑیا کھا گیا تو ہماری انتہائی کمزوری ہوگی۔ ہمارا عدم وجود برابر ہے۔ حضرت یعقوبؑ کے اندیشہ کا جواب کچھ بھی نہ دیا اپنی جماعت اور قوت کا تو اظہار کیا، مگر غفلت کی کوئی صراحت نہیں کی۔

مقصودِ بیان انبیاء و اولیاء پر اسرار غیب ہر وقت منکشف نہیں ہوتے۔ روشنی کا ایک خاص وقت ہوتا ہے۔ اولادِ یعقوبؑ نے یعقوبؑ کے سامنے پُرفریب الفاظ کہے اور آپ دھوکا کھا گئے۔ اس سے ثابت ہوا کہ انبیاء کا دنیوی فریب کھا جانا وحی کی صفت میں جائز اور صحیح ہے۔ شیخ نے کہا ہے کہ اللہ کی شان تہاری بھی عجیب ہے۔ جب اس نے تجلی قہر فرمائی تو وہ لوگ جن کے نام نبوت و رسالت کی فہرست میں درج تھے ان کی فطرتیں کیسی بدل ڈالیں۔ حزن اور خوف خدا رسیدہ بندوں کو بھی ہوتا ہے۔ لیکن وہ عالم اسباب میں سے کسی کو مؤثر حقیقی اور مسبب نہیں سمجھتے بلکہ قانونِ فطرت اور ضابطۂ الٰہی کے موافق ہر چیز کو اس کے سبب سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کو یوسفؑ کی جدائی کا غم اور بھیڑیئے کے کھا جانے کا اندیشہ ہوا، لیکن یہ سب سلسلۂ اسباب کے تحت تھا وغیرہ۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا

آخر کار جب یوسف کو لے گئے اور باہم اتفاق کر لیا کہ کسی اندھے کنوئیں میں اس کو ڈال دیں اور ہم نے اس کے پاس وحی بھیجی کہ تو ضرور ان کو ان کی یہ حرکت جتلائے گا

وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ وَجَاءُوا أَبَاهُمْ عِشَاءً يَبْكُونَ ۝ قَالُوا يَا أَبَانَا إِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا

اور وہ پہچانیں گے بھی نہیں (غرض کنوئیں میں ڈال دیا) اور رات کو روتے ہوئے باپ کے پاس آئے کہنے لگے ابا ہم باہم دوڑنے گئے تھے اور یوسف کو اپنے سامان کے

يُوسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَأَكَلَهُ الذِّئْبُ ۖ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَنَا وَلَوْ كُنَّا صَادِقِينَ ۝ وَجَاءُوا عَلَىٰ

پاس چھوڑ دیا تھا بھیڑیا اس کو کھا گیا مگر آپ کو ہمارا یقین نہ آئے گا گو کہ ہم سچے ہوں اور یوسف کے کرتے پر

قَمِيصِهِ بِدَمٍ كَذِبٍ ۚ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ وَاللَّهُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ

جھوٹ موٹ کا خون لگا لائے، باپ نے کہا یہ بات نہیں ہے بلکہ تم نے خود دل سے یہ بات بنائی ہے خیر اب صبر ہی بھلا ہے اور تمہارے بیان پر اللہ ہی سے مدد مانگی جاتی ہے

تفسیر وہب بن منبہ اور دیگر اہل اخبار نے بیان کیا ہے کہ بھائیوں نے یوسفؑ کو لبھایا اور دریافت کیا کیا تمہارا دل ہمارے ساتھ جنگل چلنے کو چاہتا ہے؟ یوسفؑ نے اثبات میں جواب دیا۔ بھائیوں نے کہا چلو پہلے باپ سے کہہ دو۔ یوسفؑ باپ کے پاس پہنچے اور خواہش کا اظہار کیا۔ یوسفؑ کی خواہش سے باپ مجبور ہو گئے اور جانے کی اجازت دے دی۔ سب بھائی چل دیئے۔ راستے میں زد و کوب اور دوسری طرح کی تکلیفیں نہایت بے رحمی کے ساتھ بھائیوں نے یوسفؑ کو دیں۔ جب کوئی پشت پناہ نہ ملا تو یوسفؑ نے باپ کو یاد کیا۔ بعض نے پچھاڑ کر قتل کر دینا چاہا۔ مگر روبیل یا یہودا نے روکا اور بالاتفاق ایک اندھے کنوئیں میں لٹکا کر ادھ بیچ سے رسی کاٹ دی۔ آپ تہ میں گرے۔ گرنا تو ضرور چاہیئے تھے، لیکن بحکم الٰہی حضرت جبرئیلؑ نے کنوئیں میں پہنچ کر بازو تھام کر آہستہ سے ایک پتھر پر بٹھا دیا اور حضرت ابراہیم کا وہ کرتا جو حضرت یعقوبؑ تک بطور وراثت پہنچا تھا اور یوسفؑ کے گلے میں بطور تعویذ بندھا تھا کھول کر پہنا دیا اور اللہ کی طرف سے پیام پہنچایا کہ گھبراؤ نہیں عنقریب تم کو رہائی

ملے گی اور درجات عالیہ پر فائز ہو گے۔ تمام بھائی تمہارے سامنے ندامت کے ساتھ سر جھکائے ہوں گے اور ان تمام واقعات کا تم ان کو اطلاع دو گے۔

ابن جریر نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ ایّامِ قحط میں جب برادرانِ یوسف مصر غلّہ لینے پہنچے تو حضرت یوسفؑ نے ان کو پہچان لیا مگر وہ نہ پہچان سکے۔ آپ نے غلّہ ناپنے کا پیمانہ طلب کیا اور ہاتھ میں لے کر اس کو انگلی سے کھنکھنا کر فرمایا یہ پیمانہ مجھے بتا رہا ہے کہ تمہارا ایک علاتی بھائی یوسف تھا باپ کو اس سے زیادہ محبت تھی تم نے اس کو لے جا کر اندھے کنوئیں میں ڈال دیا۔ پھر دوبارہ پیالہ جھنکار کر فرمایا یہ پیالہ بتا رہا ہے کہ تم نے باپ کے پاس جا کر کہا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا اور اپنے قول کے ثبوت میں خون آلود کرتہ پیش کیا۔ بھائیوں کو یہ بات سُن کر تعجب ہوا۔ ابن عباس نے فرمایا آیت لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ۔ اسی کے متعلق ہے۔

ایک شبہ حضرت یوسف کنوئیں میں ڈالے جانے کے وقت کم سن تھے نبی نہ تھے پھر وحی کس طرح آئی اور کیوں کر بارِ نبوت کو آپ نے برداشت کیا؟

ازالہ (۱) ہر قسم کی وحی اُس وقت نہیں آئی تھی بلکہ وحی کی ایک خاص قسم تھی یعنی یوسف کے پاس جبرئیلؑ ایک پیر مردِ شفیق کی شکل میں پہنچے اور پیامِ الٰہی پہنچا کر تسکین دی۔ اس قسم کی وحی نبوت کی محتاج نہیں ہے۔

(۲) جس طرح حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰؑ کے پاس زمانہ طفولیت میں وحی بھیجی گئی تھی ایسی ہی حضرت یوسفؑ کے پاس وحی بھیجی گئی (یہ قول اُس گروہ کا ہے جو صغیر بچّہ کو بھی نبوت سے سرفراز ہونا جائز سمجھتا ہے)

(۳) وحی سے مراد الہام اور القاء ہے۔ اللہ نے حضرت یوسفؑ کو الہام کیا تھا فرشتہ کو نہیں بھیجا تھا اور الہام کے واسطے نبوت کی ضرورت نہ تھی۔

(۴) معتزلہ کا خیال ہے کہ اُس وقت یوسفؑ کی عمر سترہ سال تھی گویا آپ بالغ ہو چکے تھے بچّہ نہ تھے، مگر یہ قول خلافِ عقل معلوم ہوتا ہے۔ سترہ سالہ نوجوان کو بھیڑیا اٹھا کر لے جائے عرفاً اس کا اندیشہ اُن ممالک میں نہیں کیا جاتا جو دن رات بھیڑیوں کے خوگر ہیں۔

نوٹ بے رحمی اور مار پیٹ کرنے کا تذکرہ کتابِ الٰہی اور احادیثِ رسول اللہؐ میں نہیں ہم نے تفسیر سراج وغیرہ سے نقل کیا ہے، لیکن اس سب کا ماخذ صیہونی اقوال و روایات ہیں جن کی نہ تصدیق کی جا سکتی ہے نہ تکذیب۔

اس سے آگے آیات کا مطلب صاف ہے۔ آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ یعقوبؑ بیٹوں کے قول کی تصدیق نہ کی اور فرمایا تم لوگ اپنے نفس کے پھندے میں ہو۔ تم نے خود یہ جھوٹا قصہ گھڑا ہے (ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اگر بھیڑیا کھاتا تو کرتا بھی پھاڑتا۔ شعبی، حسن، قتادہ وغیرہم سے بھی یہ قول مروی ہے) اب کارۂ چارہ سوائے صبرِ جمیل کے اور کچھ نہیں۔ میں تمہاری دروغ بافی کے خلاف اللہ ہی سے مدد کا خواستگار رہوں وہی میرا مددگار ہے۔

علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ صبر دو طرح کا ہوتا ہے جمیل اور غیر جمیل۔ جمیل کے یہ معنی ہیں کہ تقدیرِ الٰہی پر راضی ہو۔ اس رضا بالقضا سے ایک نورِ مشاہدہ پیدا ہوتا ہے۔ اس نور میں آدمی غرق ہو جاتا ہے۔ پھر سوائے خدا کے اور کسی سے اپنے غم کی شکایت نہیں کرتا۔ حضرت یعقوبؑ کا صبر بھی ایسا ہی تھا۔ آپ نے بھی فرمایا اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ۔ اور صبر غیر جمیل میں رضائے الٰہی پیشِ نظر نہیں ہوتی۔ یہ درجہ مجبوری کا ہے۔

مجاہد نے صبرِ جمیل کے معنی عدمِ جزع کے لئے ہیں۔ ثوری کا قول ہے کہ صبرِ جمیل کے یہ معنی ہیں کہ درد و مصیبت کو کسی سے بیان نہ کرے اور پھر مزید یہ کہ اس میں اپنے نفس کی خوبی نہ سمجھے۔ حبان بن ابی جبلہ کی مرسل حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس صبر میں مُنہ سے شکایت نہ نکلے وہ صبرِ جمیل ہے۔ بعض اہلِ تفسیر نے اتنا اور زیادہ کہا کہ جس نے بیان کیا اُس نے صبر نہ کیا۔

خاص نکتہ شعبی نے یہاں ایک خاص نکتہ بیان کیا ہے کہ یوسف کی قمیص بھی ایک عجیب چیز تھی۔ بھائیوں نے قمیص اتار کر خون سے آلودہ کر کے باپ کے سامنے پیش کی تو قمیص نے ان کے قول کی تکذیب کی کیونکہ کہیں سے نہ پھٹی تھی۔ زلیخا کے

دروازہ میں عزیز کے ملنے کے وقت ننھے بچے نے شہادت دی کہ قمیص کو دیکھ لیا جائے اگر آگے سے پھٹی ہے تو زلیخا سچی ہے اور پیچھے سے پھٹی ہے تو یوسف سچا ہے۔ بالآخر قمیص نے زلیخا کا مکر چلنے نہ دیا اور یوسف کو پاک دامن ثابت کیا۔ پھر قمیصِ یوسفؑ حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں پر پڑی تو اُن کو روشن کر دیا۔ گویا قمیص کیا تھی ایک نور تھا جو کسی قسم کی نجاست اور عیب سے میلا نہ ہوتا تھا۔

مقصود بیان

بچے کے پاس بھی وحی آسکتی ہے خواہ وحی عرفی ہو یا الہام خاص۔ اللہ نے کنوئیں کے اندر کم سنی میں ہی یوسف کے پاس وحی بھیجی تھی اور آئندہ مراتب عالیہ کے حصول کی خبر دے دی تھی۔ مجرم اگرچہ بناوٹی گریہ کر سکتا ہے مگر جن کو خدا نے بصیرت دی ہے وہ نقل و اصل میں فرق کر لیتے ہیں۔ گویا کسی مدعی یا مدعا علیہ کا رونا اس کی صداقت کی دلیل نہیں ہے۔ یوسف کو بھیڑیئے نے نہیں بلکہ بھائیوں نے کسی جانور کے خون سے آلودہ کر کے اُس کو پیش کیا تھا۔ حضرت یعقوبؑ بیٹوں کی مکاری کو پہچان گئے تھے۔ آیت میں مسلمانوں کے لئے ایک خاص درس ہے کہ مصائب کے وقت صبرِ جمیل اختیار کریں، کسی سے اپنے اندوہ و غم کی شکایت نہ کریں اور مصائب دور کرنے کی اللہ ہی سے دعا کریں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں کوشش بالکل نہ کریں بلکہ مقصد یہ ہے کہ درد و مصیبت کا نوحہ کرتے نہ پھریں، اللہ سے دعا کریں اور مصیبت دور ہونے کی جائز کوشش کریں جس طرح حضرت یعقوبؑ نے کیا وغیرہ۔

وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ ۖ قَالَ يَا بُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَ[ـامٌ]

اور ایک قافلہ آ نکلا انھوں نے اپنے سقہ کو بھیجا سقہ نے کنوئیں میں ڈول ڈالا اور بول اُٹھا آہا بڑی خوشخبری کی بات ہے یہ تو لڑکا [ہے]

وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ○ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ

اور قافلہ والوں نے یوسف کو مال سمجھ کر چھپا لیا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے اللہ اس سے خوب واقف ہے بھائی یوسف کو چند کھوٹے درہموں [کی]

دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ۚ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿ع﴾

قیمت پر بیچ آئے کیونکہ وہ اُس سے بیزار تھے

ع ۱۲

تفسیر

حضرت یوسفؑ کنوئیں کے اندر ایک روز یا تین روز رہے۔ یہودا کھانا لا کر پہنچا دیتا تھا۔ اتفاقاً اُدھر سے بنی خزاعہ کا ایک قافلہ گزر رہا تھا جو مصر جا رہا تھا۔ کنوئیں کے قریب اُس نے قیام کیا (یعنی یہ کنواں عام گزرگاہ کے قریب تھا جہاں مسافر اُترا کرتے تھے۔ اسی بنا پر بعض لوگوں نے اس کو بیت المقدس کا کنواں قرار دیا ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ قافلہ شام یا مدین سے آرہا تھا۔ راستہ بھول کر ادھر آنکلا۔ اُس کو کنواں معلوم نہ تھا کیوں کہ یہ آبادی سے دُور تھا اور سوائے چرواہوں کے عام قافلہ والے اس سے پانی نہ لیا کرتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ کنواں خشک تھا۔ بعض کے نزدیک پانی تھا، مگر کھاری (یوسفؑ کی برکت سے میٹھا ہو گیا) اور مالک بن زعر خزاعی پانی لینے کنوئیں پر بھیجا۔ مالک نے جا کر کنوئیں میں ڈول ڈالا، یوسف ڈول میں بیٹھ گئے۔ مالک نے کھینچا تو خوبصورت لڑکا۔ انتہائی خوشی سے چلّا اٹھا، آہاہا۔ یہ تو عجیب لڑکا [ہے]

آیت وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً کے مفسرین نے دو معنی بیان کیے ہیں۔ ابن جریر، مجاہد اور سدی نے تو یہ مطلب بیان کیا ہے کہ مالک کے ساتھ جو قافلے والے کنوئیں پر آئے تھے انھوں نے یوسف کو پایا اور اس بات کو قافلہ کے دوسرے آدمیوں سے چھپا لیا تاکہ یوسف کو بطور سرمایہ تجارت کے خاص اپنے لئے محفوظ کر لیں دوسروں کو شریک ہونے کا موقعہ نہ دیں۔ ابن عباس و ضحاک وغیرہ کا قول ہے کہ بھائیوں نے یوسف کی حالت کو چھپا لیا۔ یعنی یہودا جو یوسف کی خبر رکھتا تھا۔ جب کنوئیں پر آیا اور اس کو معلوم ہوا کہ قافلے والے نکال کر لے گئے تو اس نے دوسرے بھائیوں کو اطلاع کی۔ سب بھائی جمع ہو کر قافلہ سے ملے۔ یوسف کی اصلی حالت ظاہر نہ کی بلکہ اس کو مفرور غلام قرار دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ [ہم]

اس کو لینا نہیں چاہتے۔ کیونکہ اس کے بیچنے کی ہم کو خواہش و رغبت نہیں۔ تھوڑے داموں کو فروخت کریں گے۔ الغرض قافلہ والوں نے برادران یوسف سے یوسف کو چند کھوٹے داموں میں خرید لیا۔ ابن مسعود نے درہم کی تعداد ۲۰ اور مجاہد نے ۲۲ بتلائی ہے۔ ابن عباس۔ بکالی، سدی، قتادہ اور عطیہ نے اتنا اور اضافہ کیا کہ ۲۰ درہم کو فروخت کیا اور ہر بھائی نے دو دو درہم لے لیے۔ محمد بن اسحاق اور عکرمہ نے چالیس ۴۰ درہم لکھے ہیں۔

مقصودِ بیان نیک بختی اور بدنصیبی ازلی چیز ہے۔ یوسفؑ کے بھائی بدنصیب تھے۔ ایسے گنج گراں مایہ کو چند کھوٹے سکوں میں انتہائی بے رغبتی کے ساتھ فروخت کر ڈالا اور اہلِ قافلہ کیسے خوش قسمت تھے کہ دُرِ بے بہا کو مفت پایا۔ جوبن کا تماشا آنکھوں والوں کو دکھائی دیتا ہے۔ یوسف کی شان اور ان کے روحانی آفتاب کی کرنیں نہ بھائیوں کو نظر آئیں نہ قافلہ والوں کو۔ اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ روحانی روشنی کو دیکھنے کے لئے روحانی آنکھوں کی ضرورت ہے۔ اولیاء اللہ کو مادی آنکھیں رکھنے والے نہیں پہچانتے۔ آیات اس مفہوم پر بھی دلالت کر رہی ہیں کہ آدمی کو کسی قسم کی مصیبت سے تنگ آ کر مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ یہ مصیبت کامرانی کا پیش خیمہ ہو۔ جس طرح یوسف کے مصائب حصولِ سلطنت کا باعث ہوئے اور خدا تعالٰی نے کل مصر والوں کو ان کا غلام بنا دیا۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِن مِّصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ

اور اُس مصری شخص نے جس نے یوسفؑ کو خریدا تھا اپنی بیوی سے کہا اس کی خوب تواضع کرنا شائد یہ ہمارے کام آئے یا ہم اس کو بیٹا

وَلَدًا ۚ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ وَاللَّهُ

بنالیں اسی صورت سے ہم نے یوسف کو اس ملک میں قوت عطا کی اور تاکہ ہم اس کو خوابوں کی تعبیر سکھاویں (یہ تدبیر کی)، اللہ اپنے

غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا ۚ

کام پر قادر ہے مگر اکثر آدمی ناواقف ہیں جب یوسفؑ اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکمت و علم عطا کیا

وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ۝

ہم اسی طرح نیکی کرنے والے کو بدلا دیتے ہیں

تفسیر جب حضرت یوسفؑ کو مسافروں کے ہاتھ فروخت کر کے اُن کی حراست میں دے دیا تو بے فکر ہو گئے اور سمجھ لیا کہ اب باپ کی پوری توجہ ہماری ہی طرف ہوگی۔ لیکن خدا کو منظور کچھ اور تھا۔ کنعان مقامِ سلطنت نہ تھا۔ یوسف کو نبوت کے ساتھ سلطنت دینی مقصود تھی۔ بھائیوں کی دشمنی اور یہ ناشائستہ حرکات ان کے عروج کے لئے اکسیر ثابت ہوئیں۔ اگر اس طرح فروخت نہ کئے جاتے تو مصر کیسے پہنچتے اور مملکتِ مصر کیسے حاصل ہوتی۔ غرض قافلہ مصر پہنچا۔ اس زمانے میں مصر کا بادشاہ خاندان عمالقہ میں سے تھا جس کا نام ریان اور لقب فرعون تھا۔ ابن جریر کے نزدیک حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا فرعون ریان کا پوتا تھا۔ کیونکہ ریان کے بعد قابوس اور قابوس کے بعد ولید پھر مصعب حکمراں ہوئے۔ یعنی مصعب فرعونِ موسیٰ تھا۔ فرعون مصر کا ایک وزیر خزانہ یا وزیر اعظم تھا جس کا نام بقول اہلِ کتاب پوتیفار یا اطیفار اور بروایت عوفی از ابن عباس قطفیر اور بقول محمد بن اسحاق اطفیر بن روحیب یا روحب تھا اور لقب عزیز تھا۔ ملکی نظم و نسق عزیز کے ہی قبضہ میں تھا۔ عزیز مصر اولاد تھا۔ اس کی بیوی بقول محمد بن اسحاق راعیل بنت رماییل تھی اور راعیل ریان بن ولید شاہِ مصر کی بھانجی تھی۔ دیگر اصحاب سیر نے راعیل کی بجائے زلیخا نام لکھا ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ راعیل نام تھا اور زلیخا لقب۔ بہرحال مالک بن زعر یوسفؑ کو مصر کے بازار میں لے گیا اور

فروخت کرنا چاہا۔ قیمت بیش از بیش ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ آخری بولی عزیز مصر کے نام چھوٹی۔ عزیز مصر حضرت یوسف کو لے کر اپنے گھر آیا اور چونکہ لاولد تھا اُس نے اپنی بیوی سے کہا اس کو اچھی طرح رکھنا کوئی دکھ نہ پہنچنے پائے۔ اس کے بشرہ سے آثار بلندی ظاہر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارے کارخانوں کے انتظام کے لئے بہترین کارندہ ثابت ہو اور شاید ہم اس کو بیٹا ہی بنالیں۔

برادران یوسفؑ نے سمجھا تھا کہ نبوت شاید میراث ہے اور چونکہ باپ کی محبت یوسف سے بہت ہے، اس لئے یقیناً وہ اسی کو اس وراثت کا مالک کردیں گے اور ان کا خیال یہ بھی غالب ہوا کہ نبوت ولایت تدبیر سے حاصل ہو سکتی ہے، مگر یہ دونوں خیال غلط تھے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ کا حکم کوئی نہیں روک سکتا۔ ہم کو مقصود تھا کہ یوسف کو ظاہری اور باطنی ترقی دیں۔ ملک میں بھی اس کا اثر اور تسلط پھیلائیں اور خواب کی تعبیر بھی اس کو سکھائیں۔ یعنی تعبیر خواب کا علم دے کر اسرار الٰہیہ اور علوم غیبیہ اس کے ذریعہ سے کھولیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جب یوسف پختہ عمر کو پہنچ گئے اور عقل و قوت کے لحاظ سے حکومت و معرفت کے قابل ہوگئے تو اللہ نے ان کو حکومت مصر بھی عطا کی اور نبوت بھی۔ یوسفؑ کو کتنی عمر میں پہنچ کر حکومت اور علم حقیقی ملا؟ اس میں اختلاف ہے۔ ابن عباس، مجاہد اور قتادہ نے ۳۳ سال ضحاک نے ۲۰ سال، عکرمہ نے ۲۵ سال، حسن بصری نے ۴۰ سال، سدی نے ۳۰ سال مختلف رائیں قائم کی ہیں۔

مقصودِ بیان یوسف کے مصائب کا خاتمہ انتہائی عروج پر ہوا۔ اس میں ایماء اس جانب ہے کہ مسلمانوں کو بھی تکلیف سے ڈرنا اور مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ نیکو کاروں کو خدا ایسا ہی انعام دیا کرتا ہے۔ تم کرو گے تم پاؤ گے۔ یوسف نے راہِ استقامت سے لغزش نہ کھائی مدّن کو ملا۔ آیت میں اس کی بھی فی الجملہ صراحت ہے کہ عام آدمی ظاہری تدبیروں کو مؤثر جانتے ہیں، حالانکہ یہ غلط ہے ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔ خدا تعالیٰ دشمن سے دوست کا کام نکالتا اور منشاءِ قدرت کو پورا کرتا ہے۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِىْ هُوَ فِىْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ

یوسف جس عورت کے گھر میں تھا اُس عورت نے یوسف کو پھسلایا اور دروازے بند کر کے کہنے لگی لو آؤ یوسفؑ نے

مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّىْۤ اَحْسَنَ مَثْوَاىَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْ

کہا خدا بچائے بیشک عزیز میرا آقا ہے اُس نے مجھے اچھی طرح رکھا حق تلفی کرنیوالوں کا بھلا نہیں ہوتا ہے اُس عورت نے یوسف کی طرف ارادۂ بد کیا اور اگر

لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۤءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ۝

یوسف نے اپنے رب کی برہان کو نہ دیکھ لیا ہوتا تو وہ بھی عورت کی طرف ارادہ کر ہی چکا ہوتا اس بات کی وجہ یہ تھی کہ ہم یوسف سے بے حیائی اور برائی کو دور رکھنا چاہتے تھے بلاشبہ وہ ہمارے نیک بندوں میں سے تھا

تفسیر آیات کا تفسیری مطلب بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند امور کی تحقیق کردی جائے:۔ (۱) عزیز کی بیوی نے یوسفؑ کو پھسلایا اور وصل کی طرف مائل کیا جب یہ حربہ کارگر نہ ہوا تو دروازے مضبوطی کے ساتھ بند کردیے اور زبردستی کرنی چاہی۔ لفظ هَيْتَ بقول حسن بصری سریانی ہے اور سدی کے نزدیک قبطی ہے اور بخاری نے بروایت عکرمہ بیان کیا کہ حورانی ہے لیکن دیگر بڑے تابعین و صحابہ نے تصریح کی ہے کہ یہ لفظ عربی ہے۔

(۲) یوسف پر زبردستی کا بھی کوئی اثر نہ ہوا اور خدا کی پناہ مانگی اور فرمایا میں ایسی بیجا حرکت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ وہی میرا پروردگار ہے، اسی نے میری عزت و آرام میں اضافہ فرمایا اور قید سے نکال کر اس مرتبہ پر پہنچایا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یوسف نے عزیز مصر کو اپنا رب قرار دیا اور عزیز ہی کے متعلق فرمایا اَحْسَنَ مَثْوَاىَ لیکن اگرچہ یہ قول شرعاً درست ہے کیونکہ رب سے رب حقیقی مراد نہیں بلکہ مربی اور سرپرست مراد ہے، مگر یوسفؑ کی شان دیکھتے ہوئے سوءِ ادب پر مبنی ہے، یوسفؑ نبی تھے اور نبی سوائے خدا کے کسی دوسرے کو اپنا مجازی رب نہیں کہہ سکتا۔

(۳) زلیخا نے یوسف کا ارادہ کیا اور یوسف نے زلیخا کا ارادہ کیا ۔ کس چیز کا ارادہ کیا ، کیا مقصد تھا ، ارادہ کا کیا مطلب ہے؟ اس کے متعلق چند قول ہیں :- ۱؎ زلیخا نے وصل یوسف کا ارادہ کیا اور یوسف نے زلیخا کے وصل کا پختہ ارادہ کرلیا ۔ مبادی سے درجۂ اوسط پر پہنچے اور قریب قربت پہنچنے کو تھے کہ برہانِ الٰہی کو دیکھا اور زنا سے باز رہے ۔ اس قول کی تائید میں مختلف تابعین و صحابہ کے اقوال پیش کئے جاتے ہیں ، لیکن اصول روایت کے لحاظ سے سب غلط یا کمزور ہیں ۔ ابن کثیر نے اسی بنا پر کسی قول کو نقل نہیں کیا ۔ ہم بھی نہیں بیان کرتے ۔ رازی نے بھی ان روایات کے ثبوت سے انکار کیا ہے اور چونکہ اس قول پر نبی کی تنقیص لازم آتی ہے اور آیت کی صراحت کے بھی خلاف ہے ، اس لئے ہمارے نزدیک یہ مطلب صحیح نہیں ۔ ۲؎ ارادہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ دل میں عزم کرلیا ، سوچا ، غور کیا ، خواہش غالب آئی ، ابھی ابتدائی حرکت کا صدور بھی نہ ہوا تھا کہ برہانِ رب دیکھنے کے بعد عزم فسخ کر دیا ۔ اس قول پر بھی قلبی زنا ثابت ہوتا ہے جس کی انبیاء کی شان پاک ہے ۔ ۳؎ زلیخا نے یوسف سے وصال چاہا اور یوسف نے بھاگنے کا قصد کیا ۔ یہ قول معنی کے اعتبار سے اگرچہ صحیح ہے ، مگر کلام عربی میں تحریف اور عرب کے محاورہ کے خلاف ہے ، اس لئے ضعیف ہے ۔ ۴؎ آیت وَهَمَّ بِهَا جزاءِ مقدم ہے ۔ لَوْلَآ اَنْ رَّاٰى بُرْهَانَ رَبِّهٖ شرط مؤخر ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یوسف اپنے رب کی برہان کو نہ دیکھ لیتا تو قصد کر ہی چکا تھا ۔ حاصل یہ کہ چونکہ اس نے برہانِ الٰہی کو دیکھ لیا ، اس لئے قصد ہی نہ کیا ۔ یہ قول ابو علبیہ کا ہے جس کو ابو حاتم نے روایت کیا ہے ۔ اس مطلب میں اگرچہ تنقیص انبیاء لازم نہیں آتی ، مگر عربی محاورہ کے خلاف ہے ۔ ابن عربی نے اس کو محل تامل قرار دیا ہے ۔ ۵؎ یوسف نے زلیخا کا قصد ضرور کیا هَمَّ کے لغوی معنی قصد ہی کرنے کے ہیں ، لیکن قصد سے وہ مراد نہیں ہے جو کوتاہ اندیش راویوں نے یہودیوں کی اختراع دہ غی پر اعتبار کر کے بیان کی ہے ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ یوسفؑ نے باقتضائے بشری اُس عورت کی اضطراری خواہش کی ۔ بات یہ ہے کہ قصد اور خواہش کی دو قسمیں ہیں ایک اختیاری دوسری غیر اختیاری ۔ اختیاری خواہش کا مطلب بالکل ظاہر ہے جس طرح عام طور پر بالارادہ کام کئے جاتے ہیں اور اختیار کو ان میں دخل ہوتا ہے ۔ غیر اختیاری خواہش وہ ہوتی ہے کہ خود بخود بمقتضائے خلقت کسی طرف میلان طبعی ہوجائے اور دل جھک جائے ۔ مثلاً خوبصورت چیز دیکھ کر اس کو پسند کرنا ، بدصورت سے نفرت کرنا ، ترشی کھاتے دیکھ کر منہ سے پانی جاری ہوجانا ۔ حضرت یوسفؑ کا قصد اس طرح کا تھا ۔ امام بغوی نے معالم التنزیل میں بعض محققین کا قول نقل کیا ہے کہ قصدِ یوسف سے مراد خطراتِ نفس ہیں ۔ اس سے مراد بھی وہی غیر اختیاری رغبت ہے ۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ جس طرح سخت گرمی میں روزہ دار سرد پانی دیکھتا ہے اور خود بخود اس کی طبیعت پانی کی طرف مائل ہوجاتی ہے ، لیکن وہ اپنے اختیار سے روزہ میں پانی پینے کو خلاف شریعت جان کر طبیعت کو روکتا ہے یا کوئی نوجوان تندرست آدمی کسی حسین و دل کش عورت کو دیکھتا ہے تو اس کو اس کی طرف طبعی رغبت ہوتی ہے ، مگر وہ اپنی عقل کو کام میں لاکر نتائج دنیوی و اُخروی پر غور کر کے نفس سے جہاد کرتا اور طبیعت کو روکتا ہے ۔ اسی طرح یوسف بھی آدمی تھے ۔ طبعی غیر اختیاری میلان اُن کو ہوا ، لیکن عقل و نبوت کی روشنی میں وہ اس تاریک راستے پر چلنے سے بچ گئے ۔ بیضاوی نے بھی یہی مطلب بیان کیا ہے کہ یہاں قصد سے مراد ہے طبیعت کا میلان کرنا ' شہوت و عقل میں مقابلہ کرنا ۔ ثعلبی نے بیان کیا ہے کہ یوسف نے قصد کیا وہ بغیر عزم تھا ۔ یہ قصد محض نفس کے خطرات تھے ۔ آپ قوت سے فعل میں لانا اُن کو نہ چاہتے تھے ۔ یہی مطلب میرے نزدیک حق ہے اور افسوس ہے اردو اور فارسی کے اُن مفسرین پر جنہوں نے بیہودہ روایات کو صحیح جان کر اس آیت کے مطلب میں دھوکا کھایا ۔ خدا ان کو معاف فرمائے ۔ دیکھو اس کے آگے خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ شیخ ابو السعود نے اس آیت کا صاف مطلب اس خوبی سے بیان کیا کہ ہمارا مدعا بغیر کسی شبہ کے ثابت ہوجاتا ہے ۔ فرماتے ہیں اگر یوسف نے بدی کا ارادہ کیا ہوتا اور تائید الٰہی اُس بدی سے یوسف کو بچایا جاتا تو اس طرح کلام ہونا چاہیئے کہ یوسف نے ارادہ کرلیا تھا ۔ اگر وہ برہانِ رب کو نہ دیکھتا تو مرتکب ہوجاتا ۔ ہم نے اس کو اپنی طرف سے برہان دکھائی تاکہ اس کو بدی سے بچالیں ۔ خدا تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا بلکہ یوں فرمایا ہم نے یوسف کو برہان دکھائی تاکہ اس کی طرف سے بدی کو پھیر دیں ۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ بدی نے اس کی جانب بڑھنے کا ارادہ کیا ، مگر اس کی اختیاری خواہش اس کے خلاف تھی ، ہم نے اس کو برہان دکھائی تاکہ اُس کے

پاس بدی کو پہنچنے ہی نہ دیں۔

(۴) ابن ہمان ربہ - میں بھی علماء کا اختلاف ہے۔ جن لوگوں نے علمائے سلف پر اتہام لگایا اور ان سے صحیح وغلط روایات نقل کی ہیں انھوں نے برہان کے معنی کی توضیح اس طرح کی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے فعل قبیح کا ارادہ کرلیا اور قریب تھا کہ واقع ہوجائے مگر غیب سے ممانعت کی آواز سُنی۔ اس پر بھی باز نہ آئے تو دوبارہ پھر وہی آواز سُنی پھر تیسری بار سُنی۔ آخر میں حضرت یعقوبؑ کی صورت دیکھی کہ آپ دانتوں میں انگلی دبائے کھڑے ہیں۔ یہ دیکھ کر یوسفؑ ہٹ گئے۔ بعض نے لکھا ہے کہ یوسفؑ کو مکان یا دیوار یا چھت پر ممانعت کے کچھ جملے نظر آئے۔ بعض کا قول ہے کہ بحکم الٰہی جبرئیل نازل ہوئے اور انھوں نے آکر یوسف کو منع کیا۔ ہمارے نزدیک برہان سے وہی روحانی روشنی اور عقلی باز داشت مراد ہے جو قوت شہوانی پر غالب آجایا کرتی ہے۔ خطرۂ نفس پیدا ہوتا ہے، مگر خدا تعالیٰ اپنی رحمت سے الہام عقلی کے ذریعہ اپنے خاص بندہ کو اُس فعل بد کے نتائج سے آگاہ فرما دیتا ہے اور پھر وہ بندہ فعلِ بد سے رُک جاتا ہے۔ یوسف کے لئے اگرچہ غیر اختیاری کشش کا سرمایہ کافی موجود تھا، ہر چیز اشتہار خیز تھی، مگر دور نبوت اور عقلی معرفت ارتکاب قبیح سے مانع آئی۔

آیات کا واضح مطلب یہ ہے کہ زلیخا نے ہر چند بہکایا دھمکایا، دروازے مقفل کر دئے، لیکن یوسف نہ مانے۔ بجائے ماننے کے زلیخا کو بھی اس خواہش سے روکا اور فرمایا خدا کا یا عزیز کا مجھ پر یہ احسان ہے اور میں ایسی کھلی خیانت کروں، مجھ سے یہ بیجا حرکت نہیں ہو سکتی۔ بیجا حرکت کرنے والوں کا نتیجہ اچھا نہیں ہوتا۔ زلیخا نے نہ مانا وصل کا پختہ ارادہ کرچکی تھی اور باقتضائے بشری یوسف کو بھی غیر اختیاری خواہش ہوگئی تھی، مگر فطری برہان الٰہی اور عقلی نور سامنے آیا۔ یوسف نے اس کو دیکھا اور فعل بد سے محفوظ رہا۔ یہ صرف اللہ کا فضل تھا کہ ہر برائی کے حملہ کو یوسف کی طرف سے اللہ نے دفع کر دیا۔ کیونکہ تقدیر ازلی میں یوسف خدا کا خالص مخلص اور برگزیدہ بندہ تھا پھر نوشتۂ تقدیر کے خلاف کس طرح ہونا ممکن تھا۔

مقصودِ بیان امیر ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا فقیر نفسانی جال سے سوائے اللہ کے خاص بندوں کے بہت کم لوگ محفوظ رہتے ہیں زلیخا نے یوسف کو بہکایا بھی، دروازہ بھی مکمل طور پر بند کر دیا تھا۔ تالیف اور رجھانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی، مگر یوسفؑ نے زنا کا ارادہ نہیں کیا۔ آیت میں درپردہ اس بات کی بھی مسلمانوں کو تلقین ہے کہ محسن کُشی اچھی نہیں ہوتی۔ محسن کوئی ہو اس کا احسان ماننا لازمۂ اسلام ہے۔ امانت میں خیانت خصوصاً محسن کی آبرو ریزی بہت بُرا فعل ہے۔ اللہ کے جو نیک بندے ہوتے ہیں مصیبت کے وقت اللہ ان کی کارسازی کرتا ہے۔ باوجود تمام اسباب شیطنت کے جمع ہونے کے پھر بھی شیطان ان پر مسلط نہیں ہو سکتا۔ سعید ہونا ازلی حکم ہے جو بدل نہیں سکتا وغیرہ۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَّأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ۚ قَالَتْ مَا جَزَاءُ

اور دونوں دروازے کی طرف دوڑے عورت نے یوسفؑ کا کرتہ پیچھے سے پھاڑ ڈالا اور عورت کا شوہر دروازے کے پاس دونوں کو ملا عورت بولی جو شخص تیری بیوی سے

مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوٓءًا إِلَّآ أَنْ يُّسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ

بدکاری کا ارادہ کرے اس کی سزا سوا اس کے کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو قید کر دیا جائے یا کوئی اور دردناک سزا ہو یوسف نے کہا اسی نے مجھ کو بہکایا تھا اور عورت

نَّفْسِي وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا ۚ إِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ

کے خاندان میں سے ایک شخص نے گواہی بھی دی کہ اگر یوسف کا کرتہ سامنے سے پھٹا ہے تو عورت سچی ہے اور یوسف

مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

جھوٹا ہے اور اگر اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت جھوٹی ہے اور یوسف سچا ہے

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۭ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ۝ يُوْسُفُ

لیکن جب دیکھا تو کرتہ پیچھے سے پھٹا نظر آیا عزیز بولا یہ تم عورتوں کا فریب ہے بلاشبہ تمہارا فریب بڑا ہے یوسف تم

اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ ښ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕيْنَ ۝

اس بات کو جانے دو اور اے عورت تو اپنے قصور کی معافی مانگ تو ہی تھی مجرم تھی

تفسیر خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جب یوسف نے زلیخا کا کہنا نہ مانا اور فتنے سے بچنے کے لئے بھاگے تو زلیخا ان کے پیچھے پکڑنے کو دوڑی۔ کعب احبار نے بعض اخبار یہود سے نقل کیا ہے کہ سات دروازے تھے اور سب مقفل تھے۔ یوسف جس دروازے تک پہنچے بحکم الٰہی وہ کھل جاتا۔ غرض آخری دروازے پر پہنچے۔ زلیخا نے کرتے کا دامن پیچھے سے پکڑ کر کھینچا۔ کپڑے کا ٹکڑا ہاتھ میں آگیا، یوسف نکل گئے۔ دروازے پر عزیز مصر شاہی اسٹاف کے ایک آدمی کے ساتھ آ نکلا۔ عورت کو اپنی رسوائی کا اندیشہ ہوا فوراً بات بنائی، لیکن یہ بھی ڈر تھا کہ غیرت میں آکر کہیں عزیز قتلِ یوسف کا حکم نہ دے دے۔ اس لئے بولی جس نے تیری بیوی پر بری نیت ڈالی ہو اس کی سزا سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ کچھ مدت اس کو قید رکھا جائے یا کوئی سخت جسمانی سزا دی جائے گویا یوسف کو قتل سے بچانے کی سزا بھی خود تجویز کر دی۔ حضرت یوسفؑ نے اپنی براءت کا اظہار کیا۔ زلیخا کو اس جرم کا مرتکب قرار دیا، مگر انتہائے شرم کے مارے زلیخا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نہیں فرمایا بلکہ غائبانہ ضمیر کے ساتھ فرمایا اسی نے مجھے اغوا کیا تھا۔ میرا اس میں کیا قصور ہے۔ عزیز کشمکش و پیچ میں ہوا کہ کیا فیصلہ کرے۔ زلیخا دروازے پر ہے۔ آٹھ سنگار کئے ہوئے ہے۔ یوسف کے کرتے کا دامن ہاتھ میں ہے پھر کس طرح یوسف کو جھوٹا کہے۔ پھر یہ بھی جانتا ہے کہ حرم شاہی کے اندر سیکڑوں نوکروں اور ماماؤں کی موجودگی میں ایک غلام کی یہ ہمت ہو سکتی ہے کہ حرم شاہی پر نظر ڈالے۔ اُدھر زلیخا بیوی ہے۔ غلام کے مقابلے میں بیوی کی تکذیب کس طرح ممکن ہے غرض تحقیقات شروع کی۔ زلیخا کے گھر کے ہی ایک شخص نے یوسف کی براءت اور زلیخا کے جرم کی شہادت دی۔ یہ شاہد کون تھا؟ اس میں اختلاف ہے۔ ابن عباس، حسن بصری، ضحاک، سعید بن جبیر، ہلال بن یساف اور ابوہریرہ سے مروی ہے کہ وہ گہوارہ کا بچہ تھا۔ بلکہ ایک حدیث صحیح اس کے متعلق ابن جریر نے نقل کی ہے۔ اس حدیث میں منجملہ ان لڑکوں کے جنہوں نے شیر خوارگی کی حالت میں کلام کیا ہے شاید یوسف کو بھی شامل کیا ہے، لیکن مجاہد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی داڑھی والا مرد تھا، بعض روایات میں آیا ہے کہ ہرنی نے شہادت دی تھی یا کوئی غیبی آواز آئی تھی، لیکن موخر الذکر تمام روایات کمزور ہیں۔ صحیح اول ہی قول ہے۔ مِنْ اَهْلِهَا کا لفظ اسی پر دلالت کر رہا ہے اور ایک مرفوع حدیث بھی اس کی موید ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ عزیز کے ساتھ اسٹاف کا جو آدمی تھا پہلے اس نے شہادت دی ہو اور ممکن ہے کہ غیبی آواز بھی آئی ہو یا ہرنی بولی ہو، مگر عزیز کے نزدیک قابلِ اعتبار جو شہادت تھی وہ شیر خوار بچہ کی تھی۔

مقصودِ بیان آیات بتا رہی ہیں کہ عورتوں کا فتنہ اور ان کی مکاری زبردست بلا ہے۔ زلیخا نے فوری طور پر ایسی بات گھڑی جس کو سوچنے کے لئے کافی دیر کی ضرورت تھی۔ نیک بندہ اگر اپنی نیکی پر قائم رہے تو غیب سے اس کی مدد کے سامان ہو جاتے ہیں۔ شیر خوار بچہ کا گویا کر دینا خدا کے نزدیک کوئی بڑا کام نہیں۔ اس نے یوسف کی صداقت ظاہر کرنے کے لئے بچہ کو گویا کر دیا۔ گویا اس میں مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ صداقت و حقانیت پر قائم رہو کسی لالچ یا خوف سے سچائی کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ اللہ غیب سے تمہاری مدد کرے گا۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا

شہر میں کچھ عورتیں کہنے لگیں کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کو پھسلا کر کاربراری چاہتی ہے اس کے دل میں وہ غلام جگر پکڑ گیا ہے ہم خیال

لَنَرَاهَا فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ

کرتی ہیں کہ عورت کھلی ہوئی غلطی میں ہے عزیز کی عورت نے جب اُن کی غلطی سُنی تو اُن کو بُلوا بھیجا اور اُن کے لئے ایک مجلس

مُتَّكَأً وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ

آراستہ کی اور اُن میں سے ہر ایک کو ایک ایک چھری دی اور بولی یوسف! ان کے سامنے نکل کر آجاؤ عورتوں نے جب یوسف کو دیکھا تو

وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ۝ قَالَتْ

(حسن بشری سے) بڑھ کر پایا اور اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور کہنے لگیں حاشا للہ یہ آدمی نہیں ہے یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے عزیز کی عورت

فَذَٰلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِي فِيهِ وَلَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ وَلَئِنْ لَمْ

بولی تو یہی وہ شخص ہے جس کے بارے میں تم نے مجھے طعنے دیئے میں نے واقعی اُس کو پھسلانا چاہا تھا مگر یہ بچا رہا اگر میرے حکم کے

يَفْعَلْ مَا آمُرُهُ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُونًا مِنَ الصَّاغِرِينَ ۝ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ

مطابق یہ نہ کرے گا تو ضرور اس کو قید کر دیا جائے گا اور ضرور بے عزت ہو گا یوسف نے کہا پروردگار! یہ عورتیں جس چیز کی مجھے

مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝

دعوت دے رہی ہیں اُس سے تو مجھے قید خانہ زیادہ پسند ہے اگر تو مجھ سے اُن کا فریب رفع نہ کرے گا تو میں اُنکی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہل بن جاؤں گا

فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

یوسف کی دعا اُس کے رب نے قبول کی اُن کے فریب کو یوسف سے رفع کر دیا کیونکہ وہ سُننے والا جاننے والا ہے

تفسیر یوسف نے اگرچہ اس واقعہ کا اظہار کسی سے نہیں کیا، لیکن عشق کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ مصر کی عورتوں کو اطلاع مل گئی کہ زلیخا کو یوسف سے عشق ہے۔ کچھ امیر زادیاں جن کی سرگروہ ساقی طباخ منصرم اصطبل جلیہ اور شاہی حاجب کی بیویاں تھیں، باہم کہنے لگیں کہ زلیخا کو اپنے غلام سے عشق ہو گیا ہے اور ہر طرح اس کو ترغیب دیتی ہے مگر وہ قابو میں نہیں آتا۔ ہمارے نزدیک تو زلیخا کی یہ انتہائی غلطی ہے۔ عشق کا بھوت اس پر بری طرح سوار ہے وہ تو دیوانی ہو گئی ہے۔ ان عورتوں کا مقصود اس قول سے یہ تھا کہ انکشاف حالت ہو جائے اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ آخر وہ کیسا آدمی ہے کہ زلیخا باوجود بے مثل حسین ہونے کے اس کے عشق میں دیوانی ہوئی جاتی ہے۔ زلیخا کو اس بات کی اطلاع مل گئی۔ فوراً اس نے ایک زنانہ مجلس آراستہ کی۔ یوسفؑ کو ایک جگہ چھپا دیا۔ سب عورتوں کی دعوت کی۔ ہر

ایک کے ہاتھ میں پھل کاٹنے کے لئے ایک ایک چھری دے دی۔ اُدھر زلیخا کا اشارہ پاکر یوسف خلوت خانہ سے برآمد ہوئے اِدھر عورتوں کے ہوش پراگندہ ہو گئے اور بولیں حاشا کلا یہ آدمی نہیں فرشتہ ہے، نور مجسم ہے۔ چونکہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ فرشتہ نہایت نورانی مخلوق ہے۔ ممکن ہے اُس زمانے میں بھی یہ خیال عام ہو، اس لئے عورتوں نے حضرت یوسفؑ کے آدمی ہونے سے انکار کیا اور فرشتہ کہا۔ بعض مفسرین نے یہ مطلب بھی لکھا ہے کہ عورتوں نے کہا حاشا یہ شخص غلام نہیں۔ غلام ایسی دلفریب شکل کے مالک نہیں ہوتے۔ یہ تو کوئی معزز بادشاہ ہے گویا اس صورت میں مَلَکٌ کا ترجمہ بادشاہ ہوگا۔ عورتوں نے مذکورہ الفاظ زبان سے بے ساختہ کہے۔ اُدھر چھری ترنج پر چھوڑ رکھی تھیں، لیکن ترنج کٹنے کی بجائے ہاتھ کٹ گئے۔ ایسا ہوتا بھی ہے کہ جب انسان کسی وجہ سے انتہائی جوش یا مدہوشی میں ہوتا ہے تو جسمانی تکالیف کا اس کو احساس بھی نہیں رہتا۔ زلیخا کو موقعہ مل گیا اُس نے فوراً کہا ہاں یہ وہی شخص ہے جس کی چاہت میں میں گرفتار ہوں۔ اسی کے متعلق تم نے مجھ پر طعن کئے تھے۔ حسنِ صورت کے معائنہ میں جب سب عورتوں کو زلیخا نے شریک کرلیا اور سب نے اعتراف کرلیا اور زلیخا کو معذور سمجھا تو اس کے بعد یوسف کے حسنِ سیرت کو بیان کیا۔ کہنے لگی ہاں میں نے ہی اس کو اغوا کیا تھا، لیکن اس نے نہ مانا مجھ سے بچا رہا، لیکن اب میں صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ اگر اس نے میرا کہنا نہ مانا تو ذلیل ہوگا اور جیل میں بھر دیا جائے گا۔ زلیخا نے جب ہر قسم کی ترغیب اور لالچ کی انتہا کردی تو اب دھمکی اور ترہیب پر اُتر آئی کہ شاید اسی طرح کاربرآری ہو جائے، لیکن جس کو خدا بچا رکھے اور جو ازلاً معصوم ہوتا ہے اس پر کوئی داؤں چل نہیں سکتا۔ حضرت یوسف اپنے نفس کو بچاتے بچاتے تنگ آگئے تھے اُدھر عورتیں بھی زلیخا کی طرف داری میں یک زبان ہوگئی تھیں۔ مجبوراً آپ نے تمام عیش و عشرت میں لات ماری، خونِ نبوت جوش میں آیا اور بارگاہ الٰہی میں دعا کی پروردگار! یہ عورتیں مکار ہیں، زلیخا وصل کی طلب گار ہے اور دوسری عورتیں سفارشی ہیں۔ گویا باعث جرم میں سب ہیں۔ مجھے ان کے پنجے سے نجات دے۔ میں جیل کو اس فعل شنیع پر ترجیح دیتا ہوں اور قید کو جا نا پسند کرتا ہوں۔ اگر ایسے وقت میں تو میری مدد نہ کرے گا اور ان کی مکاری کو دفع نہ کرے گا تو شاید میں بھی نادانوں کا سا کام کر بیٹھوں اور انہیں کے زمرہ میں میرا بھی شمار ہو جائے۔ خدا نے حضرت یوسف کی دعا قبول فرمائی۔ علماء نے لکھا ہے کہ امتحانِ مصائب پر آدمی کو دلیر نہ ہونا چاہیئے۔ اگر یوسف قید خانے کی التجا نہ کرتے تو لا محالہ عورتوں کے مکر سے رہائی مل جاتی، لیکن طول مدت سے گھبرا کر آپ نے قید خانے جانے کو ہی پسند کیا۔

مقصودِ بیان

مصر کی عورتوں نے زلیخا پر طعن و تشنیع مکاری کے تحت کی تھی وہ خود یوسف کو دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔ حسنِ صورت اور شکل کی نظر فریبی انسان کے حواس کو معطل اور ہوش کو پراگندہ کر دیتی ہے اُس کو اپنے تن من کا ہوش نہیں رہتا۔ زلیخا نے حضرت یوسف کی پاک دامنی کی شہادت دی تھی۔ اللہ کے خالص بندے اُن اسبابِ عیش و ذرائع راحت کو جو دوامی تباہی کا باعث اور معصیتِ الٰہی کا سبب ہوتے ہیں ٹھکرا کر مصائب و تکالیف کو پسند کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک لذائذ گناہ سے آلامِ فرماں پذیری قابلِ ترجیح ہوتے ہیں۔ اس میں مسلمانوں کو در پردہ نصیحت ہے کہ وہ دنیوی شوکت و جاہ اور لذت و نعمت جو اُخروی تباہی کا سبب ہو ہرگز اختیار نہ کریں بلکہ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ، فاقہ، مرنے، قید ہونے اور گوناگوں تکالیف برداشت کرنے کو قابلِ ترجیح سمجھیں۔ کسی عیش و عشرت کے پُر فریب جال میں نہ پھنسیں۔ آخری آیات بتا رہی ہیں کہ بُرائی کو دور کرنے والا اور انسان کی عصمت کو بچانے والا بس اللہ ہی ہے۔ کافر ہو یا مؤمن سب کے کل امور اسی کے دستِ قدرت میں ہیں۔ گناہ کرنا جاہل کا کام ہے۔ اگرچہ دنیوی علوم میں وہ کتنا ہی عقل مند ہو، مگر اللہ کا نافرمان جاہل ہوتا ہے وغیرہ۔

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰیٰتِ لَیَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِیْنٍ ؏ وَدَخَلَ مَعَهُ

پھر نشانیاں دیکھ چکنے کے بعد بھی اُن لوگوں کی رائے ہوئی کہ یوسف کو ایک مدت کے لئے قید کردیں یوسف کے ساتھ دو جوان اور بھی

ع ۱۴

السِّجْنَ فَتَیٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَ قَالَ الْاٰخَرُ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ

قید خانہ میں داخل ہوئے (ایک روز) ایک شخص نے کہا میں نے خواب میں کہا کہ شراب نچوڑ رہا ہوں دوسرے نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے

اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ

کہ سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں اور اس میں سے پرندے کھا رہے ہیں ہماری نظر میں تم نیک آدمی ہو ہمیں اس کی

الْمُحْسِنِیْنَ ۝ قَالَ لَا یَاْتِیْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖۤ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِیْلِهٖ قَبْلَ اَنْ

تعبیر بتادو یوسف نے کہا جو کھانا تم کو ملتا ہے اس کے آنے سے پہلے پہلے میں تم کو اس کی تعبیر بتادوں گا

یَّاْتِیَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ ؕ اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ

یہ منجملہ اُن باتوں کے ہے جو مجھے میرے پروردگار نے سکھائی ہیں کیونکہ میں نے ایسی قوم کا دین چھوڑ رکھا ہے جن کا اللہ پر ایمان نہیں ہے

هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ

اور نہ آخرت کو وہ مانتے ہیں اور اپنے باپ دادا ابراہیم اسحٰق اور یعقوب کے دین پر

یَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ

میں چلتا ہوں ہمیں کسی طرح شایاں نہیں کہ کسی چیز کو اللہ کا شریک قرار دیں ہم پر اور سب لوگوں پر یہ اللہ

عَلَیْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ۝

کا فضل ہے مگر اکثر لوگ احسان نہیں مانتے

تفسیر زلیخا نے عزیز سے کہا یہ عبرانی مجھے پبلک میں رسوا کرتا پھرتا ہے اور کہتا ہے کہ زلیخا نے مجھے بہکایا تھا اور خود پاک دامن بنتا ہے بہتر ہے کہ اس کو اس وقت تک جیل خانے میں رکھا جائے کہ یہ تذکرہ مٹ جائے۔ عزیز کو یوسفؑ کی پاک دامنی شہادت کے ذریعہ معلوم ہو چکی تھی، لیکن غیرت اور آبرو کے تحفظ کے لئے اس نے انصاف کو قربان کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مشیران کار سے پوچھا تو انھوں نے بھی قید کر دینے کا مشورہ دیا۔ بالآخر قید کو بھیجا گیا۔ جس زمانے میں یوسف جیل خانے گئے اسی دوران میں دو آدمی اور بھی شاہی معتوب ہو کر قید ہوئے تھے۔ بقول قتادہ ایک ساقی تھا دوسرا باورچی یا مندرم ملبخ۔ محمد بن اسحاق نے ساقی کا نام بنلا اور باورچی کا نام مجلت لکھا ہے۔ شیخ سدی نے بیان کیا ہے کہ ان دونوں پر بادشاہ کو زہر دینے کی سازش کرنے کا الزام تھا چونکہ حضرت یوسف جیل خانے میں مشہور ہو گئے تھے۔ عبادت زہد و پرہیزگار خوش خلقی مروت وغیرہ صفات حسنہ میں جیل خانے کے اندر آپ کا نظیر نہ تھا، اس لئے ان دونوں قیدیوں کو آپ سے خاص تعلق ہو گیا تھا۔ ہر دم آپ کا ہی دم بھرتے تھے۔ حضرت نے فرمایا اللہ تم کو برکت دے، مگر جو کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے میرے لئے اس کی محبت مزید تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ پھوپھی نے مجھے پیار کیا تو مجھ ضرر پہنچا۔ باپ نے محبت کی تو مجھے تکلیف اٹھانی پڑی

زلیخا نے محبت کی تو جیل خانہ نصیب ہوا - دونوں نے کہا حضرت ہماری محبت اختیاری نہیں ہم مجبور ہیں - الغرض ایک شب دونوں نے خواب دیکھا یا جھوٹا خواب بنا کر لائے تاکہ یوسف کی صداقت کی آزمائش کریں - آپ نے تعبیر خواب سے پہلے اس احسان کا اظہار فرمایا جو اللہ نے آپ کے حال پر فرمایا اپنی قوتِ قدسیہ اور روحانیت کو بھی بیان کیا پھر انتہائی خوش اسلوبی سے دینِ حق کی تبلیغ اور توحیدِ الٰہی کی تعلیم بھی دی اور ضمناً اس بات پر روشنی ڈالی کہ یہ علم خداداد مجھے اس لئے عطا ہوا ہے کہ میں خالص موحد اور دینِ حق کا پیرو ہوں -

مقصود بیان عزیز اور اس کے اسٹاف والوں نے مشورہ کرنے کے بعد بمصلحت حضرت یوسفؑ کو قید کیا تھا - یوسف جیل خانے کے اندر بھی نیکوکار ہی رہے - نہ شاہی محلات کا عیش ان کو بدکار بنا سکا نہ جیل خانے کے مصائب و شدائد - مسلمانوں کے لئے اس کے اندر سرمایۂ عبرت پوشیدہ ہے کہ توحید، عصمت اور اصلاحِ عمل ایسی چیز ہے کہ نہ دنیا کی کوئی عشرت و رفاہیت اس کا مقابلہ کر سکتی ہے نہ شدید ترین تکلیف - لہٰذا نیکی کی طرف میلان اور بدی سے ہر حالت میں گریز کا شعار ہونا چاہیئے - مقولہ نقل کرنے سے اس طرف بھی اشارہ ہے کہ نیکوکاری عجیب چیز ہے موافق مخالف اور دشمن دوست سب نیک آدمی کے گرویدہ ہوتے ہیں - آغاز میں چاہے دشمنی کریں، مذہبی مخالف ہوں، مگر انجام کار حقانیت کا اقرار کرنا ہی پڑتا ہے - اپنے واقعی کمال کو بمصلحت وقت بغیر کسی فخر کے ظاہر کرنا جائز ہے جس طرح حضرت یوسفؑ نے کیا - مسلمان کا فرض ہے کہ انتہائی مصیبت میں گرفتار رہنے کے باوجود دینِ حق اور توحیدِ الٰہی کی تبلیغ سے غافل نہ ہو جس طرح حضرت یوسفؑ جیل خانے کے اندر بھی اعلانِ حقانیت سے غافل نہ رہے، لیکن طریقۂ تبلیغ عاقلانہ ہو - دانشمندی کے ساتھ غیر محسوس طور پر مخاطب کے ذہن کو آہستہ آہستہ حق کی طرف کھینچے - جیسے حضرت یوسفؑ نے کیا - اپنی صداقت، اسرارِ الٰہیہ سے واقفیت اور دینِ حق کو استقامت کو فخریہ لہجے میں نہ بیان کرے بلکہ اگر کہیں بطور اظہارِ واقعہ بیان کرنا ہی ہو تو کہے یہ محض اللہ کا فضل ہے ورنہ میں کیا اور میری طاقت کیا - حضرت یوسف نے بھی اپنے فضائلِ دینی اور کمالاتِ روحانی کا اظہار کرنے کے بعد فرمادیا کہ یہ محض اللہ کی مہربانی ہے وغیرہ -

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○

اے میرے رفیقانِ جیل کیا متفرق معبود بہتر ہیں یا اکیلا باجبروت اللہ

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ

تم اللہ کے سوا صرف ناموں کی پرستش کرتے ہو جو تمہارے اور تمہارے باپ دادا کے خود ساختہ ہیں اللہ نے ان

اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ

کی دلیل نہیں نازل فرمائی حالانکہ حکومت سوائے اللہ کے کسی کی نہیں اسی نے حکم دیا کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو یہی

الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

سیدھا مذہب ہے اور لیکن اکثر لوگ ناواقف ہیں

تفسیر حضرت یوسفؑ تبلیغ کے طریقے کے ماہر تھے اور کیوں نہ ہوتے نبی تھے، نبی کے بیٹے اور نبی کے پوتے پر پوتے تھے - آپ نے ایسا نہیں کیا کہ دونوں قیدیوں کے باطل دیوتاؤں کو گالیاں دینے لگتے یا ان کے اعتقادیات کی توہین کرتے بلکہ پہلے اپنے

کمالات کا اظہار کیا پھر کمالات کا اصل سبب، عقیدہ توحید اور دینِ حق کی پابندی کو قرار دیا، اس لئے در پردہ دینِ کفر اور عقیدۂ شرک کا بطلان ہوا۔ پھر فرمایا فرض کرلو کہ معبود سینکڑوں ہیں کوئی چیچک کو دفع کرنے والا ہے، کوئی پانی برسانے والا، کوئی ہوا چلانے والا، کوئی دھوپ اور روشنی دینے والا، لیکن ان کے باوجود ایک معبود ایسا ہے جس کے قبضہ میں عالم کی ہر چیز یہاں تک کہ تمہاری ہستی بھی ہے تو پھر) خود ہی غور کرو کہ در بدر ٹھوکریں کھانی اور ہر دیوتا کے سامنے سر جھکانا بہتر ہے یا اُس یگانہ بے ہمتا خدا کے سامنے جو سب پر غالب اور سب سے زیادہ زبردست ہے۔ اس کے بعد آپ صاف مطلب پر اُتر آئے اور فرمایا یہ جتنے دیوتا تم نے بنا رکھے ہیں یہ سب بے حقیقت ہیں ان میں کسی قسم کی کوئی طاقت نہیں۔ تم نے اور تمہارے اسلاف نے بس نام گھڑ لئے ہیں جن کا مسمّٰی معدوم ہے ان کی ربوبیت اور الوہیت کی عقلی دلیل تو ہو ہی نہیں سکتی۔ رہی نقلی مذہبی تو وہ بھی مفقود ہے۔ اللہ نے ان کی خدائی کی کوئی دلیل و حجت نازل نہیں فرمائی۔ حقانیت و بطلان یا صدق و کذب کا فیصلہ کرنے والا سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں اور خدا نے ان کی حقانیت کی شہادت نہیں دی تو پھر ان کی پرستش کیوں کرتے ہو۔ محض اللہ کی پرستش کرو اس کا یہی حکم ہے۔

خاص نکتہ آیت اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ سے خوارج نے فقہ کے مسئلہ تحکیم اور پنچ بنانے کی ممانعت پر استدلال کیا ہے اور روافض نے بھی خلافت کو منصوص قرار دینے اور اجماع کے ممنوع ہونے پر اسی آیت سے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر یہ ہر دو فریق کی غلط فہمی ہے۔ تحکیم اور پنچ بنانا ممنوع ہے اور ضرور ممنوع ہے، مگر اس وقت جب کہ پنچایت خلافِ قانونِ الٰہی ہو اور احکامِ شرعیہ کو پسِ پشت ڈال کر فیصلہ کرے۔ بالکل تحکیم کی ممانعت پر تو آیت سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح حرمت اجماع اور تنصیص خلافت پر بھی اس سے استدلال ممنوع ہے۔ اگر اجماع آیاتِ قرآنیہ کے خلاف ہو تو ضرور واجب الترک ہے، لیکن اگر کسی مختلف فیہ حکم میں (جس کی حرمت و حلت ظاہری آیات و احادیث سے نہ کھلتی ہو یا احادیث میں تعارض و تناقض نظر آتا ہو یا بظاہر نظر آیات میں باہم اختلاف محسوس ہوتا ہو) اجماع اہلِ علم ہو جائے تو کون سی قباحت لازم آتی ہے۔ یہ تو خود بخود حکمِ الٰہی کی اشاعت ہے۔ حاکم اور شارع تو بہرحال خدا ہے، لیکن اس کے حکم کو سمجھنے والے تو انسان ہیں۔ اگر عقلمند انسانوں کا اس کے کسی خاص حکم پر انتہائی غور و خوض کے بعد اجماع ہو جائے تو کیا برائی ہے۔ حدیث میں تو صاف طور پر آیا ہے۔ لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ جب کسی زمانے کے اہل الرائے اور اصحابِ بصیرت نے باہم تبادلۂ خیالات کے بعد کسی حکمِ الٰہی کا کوئی خاص مطلب سمجھ لیا اور سب نے اتفاق کرلیا کہ کلامِ الٰہی کا یہی مطلب ہے یا احادیث رسولؐ میں فلاں مقدم فلاں مؤخر فلاں ناسخ فلاں منسوخ ہے تو ظاہر ہے کہ ایسے اجماع کی مخالفت شرعاً کس طرح جائز ہے۔ اکثر اربابِ فہم کی مخالفت تو ہمیشہ کوتاہ فہم لوگ کیا کرتے ہیں سب کو نہیں کر سکتا۔ یہ سائنس کی تحقیقات اور آثارِ قدیمہ کے انکشافات تو نہیں کہ ہر شخص اپنی جدا تحقیق کرے۔ یہ تو مسائلِ شرعیہ اور احکام نقلیہ ہیں۔ دینِ الٰہی کلام عربی میں ہے۔ عربی کلام واضح ہے۔ ایسی حالت میں کل علمائے حق کی مخالفت اور قرنِ اول کے کل جلیل القدر صحابہ کی کمیٹی کی تردید احمقانہ فعل نہیں تو اور کیا ہے۔

مقصودِ بیان حضرت یوسفؑ کے طریقۂ تبلیغ کو ظاہر فرما کر اہلِ اسلام کو دربردہ تلقین کہ عقائدِ حقہ اور دینِ حق کی تبلیغ احمقانہ طور پر نہ کرو بلکہ دلائل و براہین کے ساتھ کرو اور دلائل کو بھی اس طرح بیان کرو کہ مخاطب کے ذہن میں جم جائیں اور اپنے عقائد کے خلاف سُن کر بھی اُس کو ناگواری نہ ہو۔ آیت اِنِ الْحُكْمُ بتارہی ہے کہ شارع اور حاکم بس اللہ ہی ہے۔ عالم کا نظم درست رکھنے کے لئے قانونِ عدل کو نازل کرنا اُسی کا کام ہے۔ یہ آیت آج کل کے مسلمان مجسٹریٹوں، ججوں اور لیڈروں کے لئے تازیانۂ عبرت ہے جو ہر بات میں انگریزی ضابطۂ فوجداری یا ضابطۂ دیوانی کی تلاش کرتے ہیں اور احکامِ الٰہیہ کو ادنیٰ التفاتِ نظر کا بھی مستحق نہیں سمجھتے وغیرہ۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ

اے میرے رفیقانِ جیل تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلائے گا اور دوسرے کو سولی دی جائے گی اور پرندے اس کے

الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝ۭ وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ

سر کو نوچ کر کھائیں گے جس بات کی تم تحقیق چاہتے تھے اُس کا فیصلہ ہو چکا یوسف نے اس شخص سے کہا جو اُس کے

نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ

خیال میں رہا ہونے والا تھا کہ اپنے آقا کے سامنے میرا بھی تذکرہ کر دینا لیکن شیطان نے آقا سے ذکر کرنا اُس کو فراموش کر دیا

فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ۝ۭ

اُس وجہ سے یوسف قید خانہ میں کئی سال رہا

تفسیر ہو سکتا تھا کہ حضرت یوسفؑ سوال کے اختتام کے وقت خواب کی تعبیر بیان کرنی شروع کر دیتے۔ لیکن آپ نے ایسا نہ کیا بلکہ پہلے تبلیغ توحید کی پھر خواب کی تعبیر شروع کی۔ وجہ یہ تھی کہ طباخ کا خواب ہلاکت آفریں تھا۔ تین روز کے بعد اس کی موت مقدر تھی۔ اگر پہلے سے تعبیر دے دیتے تو پھر توحید اور دین حق کی بات نہ سنتا۔ موت کا غم اس پر مسلط ہو جاتا اور بالآخر بے ایمان مرتا۔ حضرت کو یہ منظور نہ تھا، اس لئے پہلے احکام حق پہنچائے پھر تعبیر دینی شروع کی۔ تعبیر سننے کے بعد (بروایت ابن کثیر بحوالہ قول ابن مسعود و مجاہد و عبدالرحمن بن زید) دونوں قیدیوں نے کہا کہ ہم نے تو یونہی جھوٹ بات بنائی تھی کوئی خواب نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا خواب دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو (تمہارا مقصود رہائی کے متعلق دریافت کرنا تھا تو) اللہ کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا (خواب دیکھنے نہ دیکھنے کو اس میں کوئی دخل نہیں) میرے نزدیک ابن کثیر کی روایت نہایت ضعیف ہے۔ اکثر اہلِ تحقیق نے اس کی تضعیف کی ہے۔ لہٰذا صحیح یہی ہے کہ قیدیوں نے واقعی خواب دیکھا تھا۔ غرض تعبیر خواب کے بعد حضرت یوسفؑ نے ساقی سے کہا کہ تو جب فرعون کے پاس پہنچے تو میرا بھی تذکرہ کرنا اور بے قصور ہونا ظاہر کرنا۔ حضرت یوسفؑ نے خود ہی جیل کی درخواست کی تھی اور قید ہونے کی بارگاہِ الٰہی میں دعا کی تھی مگر قید کی مصیبت سے اس قدر تنگ آ گئے تھے کہ خدا سے دعا کرنے کی بجائے ساقی سے سفارش کے خواستگار ہوئے۔ یہ بات مرتبۂ نبوت کے خلاف تھی۔ کہ اللہ کو یہ امر پسند نہ آیا کہ اس کا خاص بندہ دوسروں سے التجا کرے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساقی کو مدت تک یوسفؑ کی یاد ہی نہ آئی۔

امام رازی نے فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یوسفؑ نے ساقی سے درخواستِ سفارش کی۔ شیطان نے اُس وقت اللہ کی یاد سے اُن کو غافل کر دیا۔ جس کا پھل یہ ملا کہ چند سال مزید جیل میں رہنا پڑا۔ ساقی کی رہائی تک پانچ سال گزر رہے تھے۔ اس کے بعد تین یا پانچ یا سات سال اور گزارنے پڑے۔ کل میعاد قید آٹھ یا دس یا بارہ سال کی ہوئی۔ وہب بن منبہ کے قول کے بموجب سات سال اور ضحاک (از ابن عباس) کی روایت بارہ سال قید میں رہے۔ واللہ اعلم۔

مقصودِ بیان آیت قُضِيَ الْاَمْرُ الخ بتا رہی ہے کہ خواب صرف ذریعۂ علم ہے خود مؤثر نہیں۔ جو کچھ ہونا ہوتا ہے اس کا فیصلہ پہلے سے اللہ کی طرف سے ہو جاتا ہے۔ جس کا علم خواب کے ذریعہ سے آدمی کو ہوتا ہے اور خدا کے خاص بندوں کو دوسرے انکشافی ذرائع سے بھی معلوم ہو جاتا ہے جس طرح حضرت یوسفؑ کو معلوم ہو گیا۔ خاص بندوں کی معمولی لغزش بھی قابلِ گرفت ہوتی ہے۔

جن کا مرتبہ زیادہ ہوتا ہے اُن کی گرفت بھی زیادہ ہوتی ہے ۔ محض ساقی سے سفارش کرانے پر حضرت یوسفؑ کو مزید قید میں رہنا پڑا ۔

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنبُلَاتٍ

(بالآخر) بادشاہ نے کہا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دُبلی گائیں کھا جاتی ہیں اور سات سبز بالیاں ہیں

خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ ۖ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِن كُنتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ

اور دوسری (سات) خشک بالیاں ہیں ۔ اے اہلِ دربار اگر تم خواب کی تعبیر دیا کرتے ہو تو میرے خواب کی تعبیر دو

قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ

درباروالے بولے یہ تو پریشان خیالات ہیں اور ہم خیالات کی تعبیر نہیں جانتے

بیضاوی نے ان آیات کا تفسیری مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ شاہِ مصر نے خواب میں دیکھا کہ ایک خشک نہر سے موٹی تازی سات گائیں نکلیں اور اسی نہر سے سات دُبلی گائیں برآمد ہوئیں ۔ دُبلی گائیں موٹی گایوں کو کھا گئیں ۔ اسی طرح سات سبز اور سات خشک بالیاں دیکھیں ۔ یہ خواب دیکھ کر بادشاہ خوف زدہ ہوا ۔ اشاف والوں سے تعبیر دریافت کی ۔ انھوں نے اس خواب کو پریشان بتایا اور تعبیر دینے سے انکار کر دیا

عام طور پر خواب کی حالت میں بھی دماغ اپنا کام کرتا رہتا ہے خواہ صحیح یا غلط ۔ بیداری کی حالت میں جو صورتیں آدمی کے خیال میں جمع ہوجاتی ہیں دماغ اُنھیں کو خواب کی حالت میں اُلٹ پلٹ کیا کرتا ہے ۔ اگر دماغ یا معدہ میں کوئی فاسد مادہ جمع ہوجاتا ہے تو اس کی کیفیت عجیب طرح سے نظر آتی ہے ۔ مثلاً کسی کو نزلہ زکام ہے یا دماغ میں بلغم بڑھ گیا ہے تو خواب میں دیکھتا ہے کہ دریا میں تیر رہا ہوں یا بارش ہو رہی ہے یا طوفان آرہا ہے یا کوئی شراب پی کر یا کوئی چیز کھا کر سویا اور صفرا میں حرکت پیدا ہوئی تو خواب میں دیکھتا ہے کہ آگ جل رہی ہے یا ہوا میں اڑا جا رہا ہوں ، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب معدہ اور دماغ اصلی حالت پر ہے ، قوتِ واہمہ نفس ناطقہ کے افعال میں دخل بھی نہیں دے رہی ہے ، قوتِ متصرفہ کی کارگزاری بھی درست ہے تو انسانی دماغ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ نفس ناطقہ کی توجہ عالم قدس کی طرف ہوتی ہے ۔ آئندہ پیش ہونے والے واقعات کی جو کیفیت وہاں نقش ہوتی ہے نفس اس کو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے پھر کبھی تو بالکل اصل کیفیت مفصل طور پر دماغی حواس کو بتا دیتا ہے جیسا کہ صریح خواب میں ہوتا ہے اور کبھی عالم قدس کے معلومات کے مناسب مادی اشیاء کو تلاش کر کے اور رموزوں مادی لباس پہنا کے دماغ کے سامنے پیش کرتا ہے یہ خواب قابلِ تاویل اور محتاجِ تعبیر ہوتا ہے ۔ جس وقت آدمی بیدار ہوتا ہے تو اس کے دماغ میں اصلی واقعات تو ہوتے نہیں البتہ اُن واقعات کے مناسب صورتیں اور مادی جامے ہوتے ہیں جن کا تعبیری علم ہر شخص کو نہیں ہوسکتا ۔ خاص خاص علم رکھنے والے واقف ہوتے ہیں مثلاً زبیدہ نے خواب دیکھا کہ بے انتہا آدمی مجھ سے قربت کر رہے ہیں بظاہر خواب نہایت مکروہ ہے مگر اہلِ تعبیر نے تعبیر کی کہ تم کوئی ایسا کارِ خیر کرو گی جس سے ہمیشہ لوگ کثرت فیض یاب ہوں گے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔ زبیدہ نے ایک نہر کھدوائی اور آج تک عرب کے مختلف اطراف کے رہنے والے اور دور دراز ملکوں سے آنے والے اس سے سیراب ہوتے ہیں اور اب تک یہ خیر جاری باقی ہے ۔ فرعون کے خواب کو کاہنوں اور نجومیوں نے خواب پریشان کہا کیونکہ اصل حقیقت سے وہ آگاہ نہ تھے ، لیکن بادشاہوں کے خواب لطافتِ معدہ اور نظافتِ دماغ کی وجہ سے اکثر صحیح ہوتے ہیں ۔ چنانچہ یہ خواب صحیح تھا ۔

وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ

لیکن اُن دونوں قیدیوں میں وہی رہائی پانے والا بول اُٹھا اور مدت کے بعد اُس کو یاد آئی کہ میں تم کو اس کی تعبیر بتا دوں گا تم

فَاَرْسِلُوْنِ ۝ یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ

مجھے بھیج دو (چنانچہ اُس نے یوسف سے جا کر کہا) یوسف اے راست گو شخص ہم کو اس خواب کا جواب دو کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو

یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْۤ

سات دُبلی گائیں کھائے جاتی ہیں اور سات سبز بالیاں ہیں اور دوسری (سات) خشک بالیاں ہیں تا کہ میں لوگوں کے پاس

اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ

لَوٹ کر جاؤں شاید اُن کو بھی علم ہو جائے یوسف نے کہا تم سات برس لگ کر کھیتی کرو گے

دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝ ثُمَّ

تو جو کچھ کاٹو اس کو بالوں سمیت رکھ چھوڑو ہاں تھوڑا سا نکال لو جو تمہارے کھانے میں آئے اس کے

یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ یَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا

بعد سات برس ایسے سخت آئیں گے کہ جو کچھ تم نے پہلے جمع کر رکھا ہوگا اس کو کھا جائیں گے ہاں تھوڑا سا

قَلِیْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ۝ ثُمَّ یَاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِیْهِ یُغَاثُ

رہ جائے گا جو تم روک رکھو گے اس کے بعد ایک سال ایسا آئے گا کہ بارش ہوگی

النَّاسُ وَفِیْهِ یَعْصِرُوْنَ ۝ۧ

اور لوگ شیرہ نچوڑیں گے

تفسیر جب نجومی اور کاہن بادشاہ کے خواب کی تعبیر دینے سے عاجز ہو گئے تو اس وقت ساقی کو یوسف کی یاد آئی اور اجازت لے کر وہ یوسف کے پاس قید خانے میں گیا اور خواب بیان کیا۔ یوسف نے صحیح تعبیر دی۔ صدیق وہ شخص ہے جو بالکل سچا ہو۔ اگر کمال یقین، کمال ایمان اور کمال تصدیق احکام الٰہی رکھتا ہو، معاملات میں سچا، قول و فعل و نیت میں سچا اور ظاہر و باطن میں سچا ہو تو وہ اصطلاحی صدیق ہے۔ جس طرح حضرت ابوبکرؓ صدیق تھے اور اگر خاص خاص امور میں اس کے اندر سچائی پائی جائے تو معیں امور کے لحاظ سے اس کو صدیق کہا جائے گا۔ حدیث صحیح میں آتا ہے کہ آدمی سچ بولتا رہتا ہے اور سچ ہی بولنے کا ارادہ رکھتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ یہاں صدیق لکھا جاتا ہے اور آدمی جھوٹ بولتا ہے اور جھوٹ ہی بولنے کا قصد رکھتا ہے۔ بالآخر خدا کے ہاں اُس کو کذاب لکھا جاتا ہے۔

ساقی نے یوسف کو صدیق اس وجہ سے کہا کہ آپ غیب کے حالات پورے پورے کمال سچائی کے ساتھ بوحی یا بالہام بیان فرماتے تھے اور سچے مکاشف کے ذریعہ گزشتہ اور آئندہ واقعات بیچ صحیح ظاہر فرما دیتے تھے چنانچہ ساقی کو اس کا تجربہ بھی ہوگیا تھا۔

مقصود بیان گائے اور بالی کو چونکہ خشک سالی اور ارزانی سے مناسبت تھی۔ گائے کا موٹا ہونا اور بالی کا سبز ہونا کثرتِ پیداوار پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح گائے کا دبلا ہونا اور بالیوں کا سوکھ جانا قحط سالی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پھر لاغر اور خشک کا فربہ اور سبز کو کھا جانا بتاتا ہے کہ قحط کے زمانے میں لوگ ارزانی اور پیداوار کے زمانے کے اندوختہ کو کھا جائیں گے اور بالآخر خشک سالی فراخ حالی کو تباہ کر دے گی۔ انھیں مناسبات کو دیکھ کر حضرت نے بعلم صدری خواب کی تعبیر دی۔ ساقی کا یوسفؑ کو صدیق کہہ کے خطاب کرنا بتا رہا ہے کہ سچائی آخر میں غالب آجاتی ہے اور دشمنوں اور مخالفوں سے بھی اپنا اعتراف کرا لیتی ہے۔ کہاں بادشاہ کا خاص مصاحب ساقی اور کہاں ایک غریب الوطن عبرانی غلام۔ پھر زبان جدا، مذہب و ملت جدا، خاندان جدا، اتنے تغایر واختلاف کے باوجود ساقی یوسف کی سچائی کے اقرار پر مجبور ہوتا ہے اور اس کی زبان سے بجائے یوسف کے صدیق کا لفظ نکلتا ہے۔ اس سے صداقت وحقانیت کے غالب آنے کی طرف اشارہ ہے۔ لفظ تَزْرَعُوْنَ بتا رہا ہے کہ اگرچہ مسبب کل خدا تعالیٰ ہے اور عالم کا کوئی سکون وعمل بغیر اس کی منشا کے نہیں ہوتا، مگر پھر بھی یہ عالم اسباب ہے۔ آدمی پر لازم ہے کہ اسباب کی فراہمی کی کوشش کرے۔ فَذَرُوْهُ الخ سے اس طرف اشارہ ہے کہ تدبیر کی درستی اور صحیح طریقے پر کوشش کرنا مقتضائے فطرت ہے۔ انگھڑ اور غلط کوشش درحقیقت کوشش ہی نہیں بلکہ شکستِ کوشش ہے۔ جو لوگ اندھے توکل کو ذریعۂ معرفت سمجھے بیٹھے ہیں یا دوسروں کے دست نگر ہونے کو انتہائی کوشش جانتے ہیں اُن کو اس سے نصیحت حاصل کرنی چاہیئے۔ لفظ اِلَّا قَلِیْلًا بتا رہا ہے کہ آدمی کو آئندہ کے غم میں اتنا پریشان بھی نہ ہونا چاہیئے کہ ضروری اور لازمی مصارف کو بھی ترک کر کے مرنے سے پہلے مر جائے۔ اعتدال اور احتیاط بہترین چیز ہے۔ نہ پیٹ پر پتھر باندھنا اور کوڑی کوڑی جوڑنا جائز فعل ہے نہ بندۂ شکم ہونا اور حرص واسراف کے ہاتھوں تباہ ہونا قابلِ ستائش حرکت ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِىْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ

بادشاہ نے کہا میرے پاس یوسف کو لے آؤ قاصد جب یوسف کے پاس پہنچا تو یوسف نے کہا اپنے آقا کے پاس لوٹ کر

فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِىْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ اِنَّ رَبِّىْ بِكَيْدِهِنَّ

جا اور اس سے دریافت کر کہ اُن عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے میرا رب اُن کے فریب سے

عَلِيْمٌ ۝ قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ

خوب واقف ہے بادشاہ نے کہا عورتو! جب تم نے یوسف کو پھسلایا تھا تو اس وقت حقیقت حال

قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ

کیا تھی؟ عورتوں نے کہا حاشَ للہ ہم نے اس کی ذرا بھی بُرائی نہیں دیکھی عزیز کی بیوی بولی اب تو حق بات

حَصْحَصَ الْحَقُّ ز اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

ظاہر ہوگئی میں نے اُس کو پھسلایا تھا لاشبہ وہ سچا ہے

تفسیر آیات کا مطلب ظاہر ہے حضرت یوسف کے پاس جب قاصد بلانے آیا تو آپ اس کے ساتھ نہ گئے۔ اس کے دو سبب تھے ایک تو یہ کہ مخلوق پر بھروسہ کرنے پر آپ کو پہلے عتاب ہو چکا تھا، اس لئے گزشتہ قصور کی تلافی کرنی چاہتے تھے اور رہائی کے کچھ زیادہ مشتاق نہ رہے تھے۔ دوسرے گزشتہ الزام و تہمت سے اپنی پاک دامنی ظاہر کرنی چاہتے تھے جس کی بہترین ترکیب یہی تھی کہ گزشتہ مجلس والی عورتیں اور زلیخا خود آپ کی عفت کی شہادت دیں۔

امام احمد نے مسند میں بروایت حضرت ابوہریرہؓ بیان کیا ہے کہ حضور اقدسؐ نے (بطور تواضع و انکسار) ارشاد فرمایا کہ اگر یوسفؑ کی بجائے میں ہوتا تو (رہائی کی) دعوت کو جلد قبول کر لیتا اور اپنی بریت کا عذر نہ ڈھونڈتا صحیحین میں بھی یہ روایت مذکور ہے، مگر قدرے تغیر کے ساتھ۔ حضرت عکرمہ کی مرسل روایت ہے حضورؐ نے فرمایا مجھے یوسفؑ کا صبر و کرم بہت اچھا معلوم ہوتا ہے خدا ان کو بخشے۔ جب اُن سے بادشاہ کے خواب کی تعبیر پوچھی گئی تو ذاتی کرم کو کام میں لاکر (فوراً) بتادی۔ اگر میں ان کی بجائے ہوتا تو اس وقت نہ بتاتا جب تک رہا ہونے کی شرط نہ کر لیتا، جب اُن کے پاس بادشاہ کا قاصد بلانے آیا (تو انھوں نے حجت کی) اگر میں ان کی بجائے ہوتا تو دروازہ کی طرف سب سے آگے ہوتا، مگر یوسفؑ نے تہمت سے چھٹکارا کرنا چاہا تھا۔

مقصودِ بیان: تہمت سے بچنا اور مواقع تہمت سے گریز کرنا انسان پر لازم ہے۔ اگر مدعی خود مدعا علیہ کی صداقت کی شہادت دے تو زیادہ قابلِ وثوق ہے۔ مظلوم اگر انفصال و تحقیق مقدمہ پر مصیبت برداشت کرتا رہے اور صبر کرے اور تحقیقات پر اصرار کرے تو جائز ہے۔ حاکم وقت یا کسی اور کو اگر بطریق مجاز رب یعنی غریب پرور یا ان داتا کہا جائے تو جائز ہے، مگر بطریق حقیقت اگر غیر اللہ کے لئے استعمال کیا تو قطعاً حرام بالکل شرک ہے۔ اس سے احتراز لازم ہے وغیرہ۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ كَيْدَ

یہ بات اس لئے ہوئی تاکہ عزیز جان لے کہ میں نے چھپ کر اس کی خیانت نہیں کی اور اللہ خیانت کاروں کے فریب کو

الْخَآئِنِيْنَ ۝

چلنے نہیں دیتا

تفسیر اوپر کا مقولہ زلیخا کا تھا یہ مقولہ حضرت یوسفؑ کا ہے۔ گویا یوسف کے قول کے بیچ میں خدا تعالیٰ نے زلیخا اور دوسری عورتوں کا قول ذکر فرمایا۔ سراج، معالم اور بیضاوی وغیرہ تفسیروں میں یہی مذکور ہے اور اکثر مفسر اسی کے قائل ہیں، لیکن ابن تیمیہ نے آخر تک زلیخا کا مقولہ قرار دیا ہے اور اس کے متعلق ایک رسالہ لکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ یہ تمام مواعظ بلیغہ زلیخا نے ہی کہے تھے۔ میرے نزدیک ابن تیمیہ کا قول بعید از قیاس ہے۔ زلیخا اُس وقت تک کافرہ تھی۔ یوسف کی نبوت اور اللہ کی توحید کی قائل نہ تھی۔ جیسا کہ اکثر کتب سیر سے واضح ہے پھر ایک منکر توحید کی زبان سے ایسے تبلیغی اور توحیدی الفاظ شاہی دربار میں نکلنا کس قدر بعید ہے۔ واللہ اعلم۔

فائدہ آیت وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ زلیخا کا مقولہ ہے۔ زلیخا چاہتی تھی کہ یوسف کو زنا اور ارادۂ زنا اور اغوا وغیرہ کی ہر تہمت سے پاک ظاہر کر دے۔ جب عورتوں نے شہادت دی کہ معاذ اللہ حاشا للہ ہم نے یوسف کی کوئی بدچلنی نہیں دیکھی اور زلیخا نے میرزا اقرار کیا کہ میں نے ہی اس کو اغوا کیا تھا اس کا کوئی قصور نہ تھا تو حاضرین کے دلوں میں شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید یوسف سے کوئی ناشائستہ حرکت سرزد ہو گئی ہو۔ اگرچہ زلیخا کے بہکانے سے ہی ہو بہر حال زنا کا احتمال باقی رہتا تھا۔ اگرچہ اغوا کا شبہ زائل ہو گیا تھا اس لئے زلیخا نے حضرت یوسف کے عدم خیانت اور پاک دامنی کی تصدیق کر دی

بارھواں پارہ ختم ہوا

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیان السبحان

کا

پارہ نمبر ۱۳

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ

فاضلِ اجل حضرت مولانا سیّد عبدالدائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں ۱۳۵۶ھ سے باقساط ہر ماہ شائع ہوتی رہی،

ناظرینِ مولوی کے اصرار پر

آستانہ کتاب گھر پوسٹ بکس نمبر ۱۲۰۶ اسوئیوالان نمبر ۱۵۶۵ نئی دہلی

ہدیہ فی پارہ چھ روپے

تیرھواں پارہ

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ

اور میں اپنے آپ کو پاک نہیں کہتا ۔ بے شک نفس بُری بات سکھاتا ہے ۔ ہاں اگر میرا رب رحم کرے

اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

بلا شبہ میرا رب غفور رحیم ہے

تفسیر یہ بھی حضرت یوسفؑ کے قول کا تتمہ ہے ۔ آپ نے اپنی عصمت و عفت ظاہر کی ، مگر آخر میں یہ بھی فرما دیا کہ میں اپنے نفس کو [illegible] بندہ بشر ہے ، نفس سرکش ساتھ لگا ہوا ہے جو ہر وقت گناہ کا خیال دل میں ڈالتا رہتا ہے ۔ مگر پروردگار کی رحمت میرے شامل حال تھی اُس نے بچا لیا ۔

ابن کثیر نے بحوالہ ابن جریر ابن عباس کی طرف منسوب کرتے ہوئے ایک روایت نقل کی ہے جس کا آخر حصہ یہ ہے کہ جب یوسفؑ نے ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ کہا تو جبریل نے کہا کیا اس روز بھی تم نے خیانت نہیں کی تھی جب کہ زلیخا کی طرف ارادہ کیا تھا ؟ اس پر حضرت یوسفؑ نے کہا وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ الخ ۔ مجاہد ، عکرمہ ، سعید بن جبیر ، ابن ابی الہذیل ، ضحاک ، حسن ، قتادہ اور سدی سے یہ روایت مروی ہے ، لیکن اہل تحقیق نے بیان کیا ہے کہ مؤخر الذکر تمام تابعین و تبع تابعین کا مقصود یہ ہے کہ ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ یوسف کا مقولہ ہے زلیخا کا قول نہیں ۔ آخری قول کی سند کی ضرورت ہے ۔ یہ روایت فرقہ حشویہ کی مضمون ایجاد ہے جو یوسف کو بلکہ ہر نبی کو کسی نہ کسی طرح داغ دار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور انبیاء کو معصوم نہیں جانتے ۔ محققین کی نظر میں ایسی روایات کسی طرح قابل اعتبار نہیں ۔

ایک ضروری نکتہ نفس کیا چیز ہے ؟ ظاہر ہے کہ وہ شیطان نہیں ، قلب نہیں ، فرشتہ نہیں ، عقل نہیں ، کوئی خارجی چیز نہیں تو پھر کیا ہے ؟ میرے نزدیک جب تک طبیعت بشری ناجائز شہوت و غضب کی طرف مائل رہتی ہے اس کو نفس امارہ کہا جاتا ہے ۔ جب اس سے آگے بڑھتی ہے تو خیر و شر ، طاعت و گناہ اور نیکی بدی میں کشمکش جاری رہتی ہے ۔ بُرے فعل پر اپنے کو ملامت کرتی ہے اور گناہ سے روکتی ہے تو اس کو نفس لوامہ کہا جاتا ہے ۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر سکون روح اور اطمینان ایمانی حاصل ہو جاتا ہے تو نفس مطمئنہ کا درجہ آجاتا ہے ۔ حضرت یوسفؑ آخری درجہ پر فائز تھے ، اسی اطمینان ایمانی اور کمال الیقین کی وجہ سے معصیت سے محفوظ رہے تو آپ نے اپنی پاکدامنی اور عدم خیانت کا اظہار کیا ، لیکن [illegible] طبیعت بشریت کے دائرہ سے الگ تھی ؟ اس شبہ کو زائل کرنے کے لئے آپ نے فرما دیا کہ میں ابتدائی اور [illegible] کے لحاظ سے اپنے کو پاک دامن نہیں کہتا ۔ نفس امارہ اور طبیعت تو میرے پاس بھی ہے ، مگر خدا رحیم ہے ۔ [illegible] کے وسوسہ سے بچا لیا اور میں پاک دامن رہا ۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ نفس [illegible] جب اللہ کی صفت اس عالم قبول میں آتی ہے تو اس کو [illegible] اسی وجہ سے انسان نفس کو [illegible] ان اعمال و افعال کے ارتکاب کرنے پر آمادہ کرتا ہے جو [illegible] انہی ہوتا ہے ۔ [illegible] فطری مجھے بھی ان ہی امور کی طرف لیجانا چاہتا ہے جو [illegible] کا موجب ہوا [illegible] کرنے والے ہیں ، لیکن اللہ کی [illegible] امتحان سے بچا لیا یعنی میرے اندر دونوں صفات موجود

قہر قدم اور رحمت قدم، مگر رحمت قہر پر غالب آئی۔
شیخ ابوحفص کا قول ہے کہ نفس بالکل تاریکی ہے اور اس کا چراغ سِرِّ باطن ہے اور اس چراغ کا نور توفیق الٰہی ہے۔ پس توفیق الٰہی جس کی مددگار نہ ہو وہ بالکل تاریکی میں رہے گا بلکہ بالکل تاریک ہوگا۔ گویا رحمت نام ہے توفیق کا اور نفس نام ہے تاریکی کا اور سِرِّ باطن نام ہے چراغ کا۔ تاریکی کو دور کرنے والی چیز چراغ ہے، مگر اللہ کی توفیق وہ رحمت کے سبب ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا

بادشاہ نے کہا میرے پاس یوسف کو لے آؤ میں خالص طور پر اُس کو اپنے لئے رکھوں گا پس جب بادشاہ نے یوسف سے کلام کیا تو کہا بلاشبہ آج تم

مَكِينٌ أَمِينٌ ۝ قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ۝ وَ

ہمارے ہاں باعزت اور معتبر ہو یوسف نے کہا آپ مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیں میں اُن کا محافظ اور دانا ہوں اسی

كَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا

طرح ہم نے یوسف کو اُس ملک پر قابض کر دیا جہاں چاہتا رہتا تھا جسے چاہتے ہیں ہم اپنی رحمت پہنچاتے

مَنْ نَشَاءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۝ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝ (ع)

ہیں اور نیکی کرنے والوں کا اجر نہیں کھوتے اور آخرت کا اجر تو ان لوگوں کے لئے بہت ہی اچھا ہے جو مومن ہیں اور پرہیزگار رہتے ہیں

تفسیر تفسیر سراج میں بروایت ابن عباس بیان کیا ہے کہ دوبارہ ایلچی قید خانہ میں حضرت یوسف کے پاس گیا۔ لباس فاخرہ پیش کیا۔ آپ نے قبول کیا۔ غسل کر کے شاہی خلعت پہن لیا۔ چلتے وقت نہایت حسرت سے جیل والوں کو رخصت کیا اور وقت وداع فرمایا پروردگار ان بے کسوں کے دل مہربان فرما۔ باہر نکل کر جیل کے دروازہ پر لکھا یہ مکان امتحان گھر ہے۔ زندوں کا مقبرہ ہے، غم والم کی کوٹھری ہے۔ دوستوں کے تجربہ کا اور دشمنوں کے مضحکہ کا مقام ہے۔ اس کے بعد شاہی دربار میں پہنچے۔ عبرانی زبان میں سلام کیا۔ بادشاہ نے بڑی مہربانی کے ساتھ بٹھایا اور تعجب کے ساتھ کہنے لگا بڑے بڑے ساحر و کاہن میرے خواب کی تعبیر سے عاجز ہیں اور یہ نوجوان واقف ہے۔ اس کے بعد زبانی تعبیر دینے کی خواہش کی آپ نے بالمشافہ بھی وہی تعبیر دی جو پہلے دے چکے تھے۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد فرعون نے بفراست جان لیا کہ اس کے اندر قابلیت و کاردانی کے جوہر پوشیدہ ہیں۔ بولا آج سے تم ہمارے قابل اعتبار مقرب ہو۔ ہم تم کو امانتدار جانتے ہیں۔ پھر قحط سے محفوظ ہونے کی تدبیر پوچھی۔ آپ نے مذکورہ بالا رائے دی۔ فرعون نے کہا تو ایسے زبردست کام کا ذمہ دار کون ہوگا؟ حضرت یوسف نے فرمایا آپ مجھے فنانس اور ریونیو کا حاکم بنا دیجئے۔ میں آمد و خرچ کے حساب کتاب سے خوب واقف ہوں۔ ابن کثیر نے بروایت شیبہ بن نعامہ یہ مطلب بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف نے فرمایا جو کچھ آپ مجھے بطور ودیعت دیں گے میں اس کی خوب حفاظت کروں گا اور ایام قحط کا علم بھی مجھے خوب ہے۔ (رواہ ابن ابی حاتم) گویا ابن کثیر کے نزدیک خزائن سے مراد غلہ ہے، لیکن صاحب معالم نے خزائن سے مراد خراج و محاصل ملکی کو قرار دیا ہے۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ اگر یوسف خود امارت کی درخواست نہ کرتے تو اسی وقت حاکم بنا دیئے جاتے، لیکن درخواست کرنے پر ایک سال تاخیر کے بعد مقرر کئے گئے۔

امام رازی فرماتے ہیں اللہ کی عجیب قدرت، دیکھو کہ جب یوسف نے قید خانہ سے نکلنے میں ڈھیل ڈالی تو امراء کے ساتھ بلوائے گئے اور جب

خود درخواست امارت میں جلدی کی تو اللہ نے خواہش پوری کرنے میں ایک سال کی تاخیر کردی۔ اس میں اشارہ ہے کہ انسان کو تمام امور اللہ کے سپرد کردینے چاہئیں۔ اس سے آگے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس طرح (یعنی جیسی امانت پرہیزگاری اور خدا پرستی کے صلہ میں) ہم نے یوسف کو قید خانے سے نکال کر شاہی دربار میں پہنچایا اور بادشاہ کا معتمد بنایا اسی طرح ملک مصر میں ہم نے اس کی جڑوں کو مضبوط کردیا اس کو حکومت دے دی۔ (بقول سدی و عبدالرحمن بن زید) یوسف جس طرح چاہتا ملک میں تصرف کرتا تھا کوئی روک ٹوک کرنے والا نہ تھا۔ تفسیر سراج میں بروایت ابن عباس بیان کیا ہے کہ یوم درخواست سے جب ایک سال کی میعاد گزر گئی تو فرعون نے یوسف کو اپنی انگشتری اور تاج اور تلوار اور تخت سپرد کردیا اور تمام امور مملکت تفویض کردیئے۔ یوسف نے کہا تخت پر بیٹھ کر تو آپ کی سلطنت کو مستحکم کروں گا اور پھر سے سلطنت کا انتظام درست رکھوں گا۔ رہا تاج تو یہ میرے باپ دادا کا لباس نہیں پھر بادشاہ نے اعلان کردیا کہ آج سے یوسف نائب سلطنت ہے۔ ابن کثیر نے بروایت محمد بن اسحاق بیان کیا کہ اطفیر کا انتقال اسی زمانے میں ہوگیا۔ ابن کثیر نے بروایت فضیل بن عیاض یہ بھی لکھا ہے کہ عزیز مصر کی بیوی یوسف کے راستہ میں (ایک روز) جاکر کھڑی ہوئی اور آواز کے ساتھ کہنے لگی لائق ستائش ہے وہ اللہ جو وحدہٗ لاشریک ہے، جس نے طاعت کے سبب غلاموں کو بادشاہ کردیا اور نافرمانی کی وجہ سے بادشاہوں کو غلام بنا دیا۔ معالم و سراج میں بروایت ابن زید یہ بھی بیان کیا ہے کہ ملک مصر میں حضرت یوسفؑ کی ذات سے عدل قائم ہوا۔ آپ کے ہاتھ پر بادشاہ بھی مسلمان ہوگیا اور رعایا میں بھی بہت سے لوگ۔

اس سے آگے خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم جس کو چاہتے ہیں اپنی رحمت سے نوازتے ہیں (لیکن یاد رکھو کہ یوں تو اللہ کی رحمت اسی کی مشیئت کے تابع ہے وہ جس کو چاہے دے) مگر نیکوکاروں کو ہم ثواب ضرور دیتے ہیں (دنیا میں بھی دیتے ہیں اور آخرت میں بھی) لیکن کوئی ضروری نہیں کہ دنیا میں ہر شخص کو اس کی نیکی کا پھل مل جائے۔ ہاں آخرت کا ثواب ضرور ملے گا اور وہ پرہیزگار اہلِ ایمان کے لئے دنیا کے ثواب سے کہیں بڑا اور بہتر ہے۔

مقصودِ بیان حضرت یوسفؑ نہایت دانا اور سلیقہ مند تھے۔ شاہِ مصر ان کی گفتگو اور ان کی دانائی کو دیکھ کر سمجھ گیا۔ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ مسلمان کو ہر موقع کے مناسب گفتگو کرنی چاہیئے۔ غریب سے اس کے لائق اور بادشاہوں سے اس کے مناسب۔ حضرت یوسفؑ کی استدعا رحکومت کو ظاہر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر مخلوقِ الٰہی تکلیف میں ہو، ظلم، قحط و فلاکت کی شکار بنی ہوئی ہو اور کوئی شخص اس قابل ہو کہ حکومت کرکے ان کے مصائب کو دور کرسکے تو ایسی صورت میں امارت و حکومت کی درخواست کرنی بے جا نہیں بلکہ ضروری ہے۔ حضرت یوسف نے حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ اپنے لئے کہا اس سے اس مقصود کی جانب ایما کرنا مقصود ہے کہ اگر خلقِ خدا کے فائدے کے لئے آدمی اپنی حسنِ قابلیت، استعداد، علمی تجربہ اور تمام ذاتی خصوصیات کو ظاہر کرے تو ناجائز نہیں بلکہ مناسب ہے۔ لفظ مَكَّنَّا بتا رہا ہے کہ خدا تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی جڑیں حضرت یوسف کی وجہ سے مصر میں مستحکم کردی تھیں۔ یَتَبَوَّأُ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف اگرچہ لقب کے لحاظ سے وزیر تھے، مگر کل اختیاراتِ شاہی کے مالک تھے۔ مصر میں جو کچھ چاہتے کر گزرتے، کوئی روکنے والا نہ تھا۔ آیت نُصِیْبُ سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے جس قدر انعامات و عطیات ہیں وہ کسی استحقاق کی بنا پر نہیں نہ بطور ایجاب یا جو کچھ ہیں بلکہ محض اس کے رحمت و کرم پر مبنی ہیں۔ پھر وَلَا نُضِیْعُ سے اس طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کو بھی نیکوکاری کی کوشش کرنی چاہیئے کسی کی نیکی ضائع نہیں جاتی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص اپنی نیکی کے صلے کا یہیں خواستگار بن جائے اور یوسفؑ کی طرح بادشاہ بننے کا امیدوار ہو جائے بلکہ مناسب یہ ہے کہ ثمرۂ نیکی آخرت میں تلاش کرے اور عاقبت کے ثواب کا امیدوار ہو وہ ثواب دنیوی اجر سے بڑا ہے، مگر ایمان و اعمالِ بد سے احتراز لازم ہے۔ متقی وہی لوگ ہیں جو اعمالِ بد سے بچتے اور نیک کاموں سے رغبت رکھتے ہیں۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ یُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَیْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ○ وَلَمَّا جَهَّزَهُمْ

پھر یوسفؑ کے بھائی آکر اُس کے پاس پہنچے یوسفؑ نے اُن کو پہچان لیا مگر وہ یوسف کو نہ پہچان سکے جب یوسف نے اُن کا سامان تیار

بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ

کر دیا تو کہا (اب کی بار) اپنے علاتی بھائی کو بھی میرے پاس لانا دیکھو ہیں پورا پورا پیمانہ دیتا ہوں اور بہترین مہماں

الْمُنزِلِينَ ۝ فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ ۝ قَالُوا

نواز ہوں اگر تم اس کو میرے پاس نہ لاؤ گے تو پھر تم کو میرے پاس بھرتی نہ ملے گی اور ... بھی نہ پھٹکنا اُن لوگوں نے

سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ۝ وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي

کہا ہم اس کی طرف سے باپ کو پھسلائیں گے اور ہم ضرور ایسا کریں گے یوسفؑ نے اپنے خدمتگاروں سے کہہ دیا کہ ان لوگوں کا سامان بھی ان کی

رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝

بوریوں میں رکھ دو تاکہ جب یہ واپس ہو کر اپنے گھر والوں کے پاس پہنچیں تو سامان کو پہچان لیں ممکن ہے لوٹ آئیں

تفسیر آیات کا مطلب صاف ہے ۔ بھائیوں نے یوسفؑ کو نہ پہچانا ۔ صغر سنی میں چھوڑا تھا اور اب یوسفؑ میانہ عمر کو پہنچ گئے تھے پھر غلام بنا کر فروخت کیا تھا تخت شاہی پر پہنچنے کا ان کو گمان بھی نہ تھا پھر بقول عطاء حضرت یوسف شاہی لباس پہنے تھے اور بقول مفسر سراج حاجبوں کو حکم دے دیا تھا کہ بھائیوں کو دُور رکھا کرو ۔ اس کے علاوہ یہ بھی روایت ہے کہ مصر کی عورتوں سے چہرہ چھپانے کے لئے آپ چہرے پہ حجاب ڈالے رہتے تھے ۔

مقصودِ بیان حضرت یوسفؑ نے بذات خود عبرانی مہمانوں سے گفتگو کی ۔ اس میں لطیف اشارہ اس طرف ہے کہ پردیسی کی خاطر داری بادشاہ ... اور بادشاہ ... بذات خود ... لازم ہے ۔ بجائے اِخْوَةُ يُوسُفَ کہنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ علاتی بھائیوں کو شرعاً بھائی کہا جاتا ہے اور کوئی بھائی اپنے بھائی پر کتنا ہی ظلم کرے ۔ یہاں تک کہ اس کو قتل کرنے کا بھی ارادہ کرے تب بھی رشتہ اُخوت منقطع نہیں ہو سکتا گو ... کا انقطاع ناممکن ہے ۔ أَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ سے یہی حضرت یوسفؑ کے اخلاق کریمانہ کی طرف ایماء ہے کہ باوجودیکہ بھائیوں نے ان کے ساتھ ... کی تھی ، مگر انہوں نے اپنے ذاتی کرم کی بنا پر کوئی مواخذہ نہیں کیا بلکہ ان کی انتہائی خاطر مدارات کی ۔ یوسفؑ کے بھائیوں نے آپ کو نہ پہچانا ۔ اہل حقیقت نے اس کا مفہوم یہ نکالا ہے کہ انسان کی معصیت حجاب بن جاتی ہے ۔ گناہ گار نافرمان انسان نہ خطاب الٰہی کو سنتا ہے نہ جلوۂ حق دیکھتا ہے نہ آثار قدرت کا مشاہدہ کرتا ہے بلکہ دل کے اندر ہی اندر محبوس اور نفس کی تاریکی میں معطل رہتا ہے ۔ بلکہ خاصانِ خدا کی شناخت بھی اس کو نہیں ہوتی اس کو امتیاز نہیں ہوتا کہ کس کے اندر نورِ حق پرتو فگن ہے اور کون تاریکی میں ہے یہی وجہ ہے کہ عام لوگ اولیاء کو نہیں پہچانتے ۔ حضرت یوسفؑ نے بھائیوں سے کہا تھا کہ اگر تم اپنے علاتی بھائی کو نہ لائے تو پھر میں تم کو غلہ نہ دوں گا اور نہ میرے پاس آنا بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف اپنی میزبانی کے معاوضہ کے طالب تھے جو بزرگوں کا قاعدہ نہیں ہے ، مگر حقیقت کچھ اور تھی ۔ آپ کے کلام سے درپردہ اس طرف اشارہ مستنبط ہوتا ہے کہ جو شخص محبت الٰہی کے راستے میں عہدِ ... کو پورا نہ کرے اس پر وصال کی راہیں تنگ کر دی جاتی ہیں ۔ جو شخص احکام عبودیت کی خلاف ورزی کرے وہ مقام قرب ... رہتا ہے ۔ حضرت یوسفؑ ... کی طلب نہ کی تھی بلکہ یہ ظاہر فرمایا تھا کہ اگر تم اپنے عہد پر قائم نہ رہے اور وعدہ کو پورا نہ کیا تو مجھے بھی حق ہے کہ تم سے ترک تعلق کر لوں اور ... دوں ۔ حضرت یعقوبؑ یوسف سے محبت رکھتے تھے ۔ یہ محبت وہ تو نہ تھی جو خالق کل سے تھی ۔ تاہم مجازی محبت انتہائی ترقی پر پہنچ چکی تھی ... اور آگے بڑھ کر محبت حق سے مانع ہوتی اس لئے

غیرت حق کو گوارا نہ ہوا کہ یوسفؑ یعقوبؑ کے پاس رہیں۔ پھر یعقوبؑ کو بن یامین سے محبت ہوئی اور انھوں نے یوسف کا بدل ان کے بھائی کو سمجھا۔ یہ بھی حق تعالیٰ کو گوارہ نہ ہوا۔ اس میں بھی شرکت محبت کی بو آنے کا احتمال تھا اور اس سے بھی خدا کے خاص بندے کا مرتبہ کم ہوجانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے یوسف کی زبان سے بن یامین کو طلب کرایا اور پھر تدبیر سے مصر میں رکھ کر یعقوب کو خالص اپنے لئے بنا لیا۔ حضرت یوسف آغاز ہی میں کل کیفیت کا اظہار کرسکتے تھے اور بھائیوں سے تمام گزشتہ واقعات کہہ سکتے تھے مگر آپ نے یہ بات اس کے موقعہ پر ظاہر کی تاکہ بھائیوں کو اپنے کرتوت پر ندامت ہو اور وہ سمجھ لیں کہ تقدیر الٰہی کو کوئی تدبیر بدل نہیں سکتی اور فضیلت شرف ہے۔ بڑا اور چھوٹا بھائی ہونا باعث امتیاز نہیں۔ تدبیر یوسف سے مسلمانوں کو سبق ملتا ہے کہ ہر کام کو اس کے وقت اور موقع پر کریں۔ مگر خلاف شریعت اور خلاف شرع نہ ہو۔ حضرت یوسف نے بھائیوں کا کل سامان ان کے غلے کی بوریوں میں پوشیدہ رکھوا دیا۔ آپ نے خیال کیا کہ گھر پہنچنے کے بعد جب وہ سامان کو غلہ کے اندر دیکھیں گے تو پرایا مال ہرگز گوارا نہ کریں گے اور سمجھیں گے کہ غلطی سے یہ سامان رکھ دیا گیا ہے۔ لامحالہ لوٹانے آئیں گے۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ حضرت یوسفؑ کے بھائی اگرچہ ایک غلطی کے مرتکب ہو گئے تھے، مگر واقع میں وہ نیک، خداپرست اور امانت دار تھے۔ پرایا مال کھانا ان کو گوارا نہ تھا۔ ان کی فطرت صالح تھی۔ دوسرے یہ احتمال بھی تھا کہ شاید ان کے پاس اور مال نہ ہو اور وہ دوسری مرتبہ بھی غلہ کے عوض آئندہ پیش کرنے سے قاصر ہوں اور اس بنا پر نہ آئیں، اس لئے آپ نے ان کا سامان واپس کر دیا تاکہ اسی کو لے کر پھر آجائیں۔ اس زمانے کے مسلمانوں کو اس بیان سے اتنی نصیحت ملتی ہے کہ عہد کی پابندی لازم ہے۔ امانتداری شیوۂ انبیاء ہے۔ پرایا مال ہضم کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ کسی کی غلطی سے ناجائز فائدہ نہ اٹھانا چاہیے وغیرہ۔

فَلَمَّا رَجَعُوٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ

غرض جب وہ لوٹ کر اپنے باپ کے پاس پہنچے تو بولے اے ابا ہم سے بھرتی روک دی گئی آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے تاکہ ہم بھرتی لے آئیں

وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ

ہم اس کی ضرور حفاظت کریں گے　باپ نے کہا میں اس پر تمہارا ایسا ہی اعتبار کرتا ہوں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی کے متعلق کیا تھا　خیر

قَبْلُ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ○ وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا

خدا بہترین نگہبان ہے　وہی سب سے زیادہ مہربان ہے　جب ان لوگوں نے اپنا سامان کھولا　تو اس میں

بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا

اپنا سرمایہ پایا جو ان کو واپس کر دیا گیا تھا　کہنے لگے ابا ہمیں اور کیا چاہیے　یہ ہمارا سرمایہ بھی واپس کر دیا گیا　اب ہم اپنے

وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ○ قَالَ

گھر والوں کے لئے غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی نگہداشت رکھیں گے اور ایک اونٹ کی بھرتی زیادہ لیں گے یہ بھرتی تو سہل ہے　باپ نے کہا

لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ

میں اس کو ہرگز نہ بھیجوں گا تاوقتیکہ تم خدا کو گواہ کر کے مجھ سے پختہ عہد نہ کرو کہ جب تک تمہارا گھیراؤ نہ ہو جائے　تم ضرور اس کو میرے پاس لے آؤ گے

بِكُمْ ۚ فَلَمَّا آتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ ○ وَقَالَ يَا بَنِيَّ لَا

پاس لے آؤ گے غرض جب باپ کو انہوں نے پختہ قول قرار دیدیا تو باپ نے کہا ہمارے اس قول پر اللہ ذمہ دار ہے پھر کہا میرے بیٹو!

تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ ۖ وَمَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ

ایک دروازہ سے سب داخل نہ ہونا بلکہ علیحدہ علیحدہ دروازوں سے داخل ہونا مگر میں اللہ کے حکم سے تم کو

اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۖ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ○

بالکل نہیں بچا سکتا حکم تو بس اللہ ہی کا ہے اسی پر میرا بھروسہ ہے اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے

تفسیر حضرت یوسفؑ کے بھائی لوٹ کر جب گھر پہنچے تو باپ سے عزیز کی بہت تعریف کی کہ اس نے ہماری بڑی خاطر تواضع کی اور غلے کے اونٹ بھی بھر کر دیئے (ایک روایت میں ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں سے فرمایا اب کی مرتبہ تم جاؤ تو میرا اس سے سلام کہنا اور کہہ دینا کہ ہمارا باپ پیغمبر ہے۔ آپ کے احسان کے عوض وہ بارگاہِ الٰہی میں دعا کرتا ہے کہ خدا کبھی آپ کو پریشانی نہ رکھے۔ اس وقت بیٹوں نے کہا اے باپ آئندہ کے لئے بادشاہ نے کہہ دیا ہے کہ اگر اپنے علاتی بھائی کو نہ لاؤ گے تو میرے پاس نہ آنا میں غلہ نہ دوں گا لہٰذا آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی بن یامین کو بھیج دیں تاکہ ہم کو مقررہ غلہ مل جائے اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اس کی حفاظت رکھیں گے اولاد اسمٰعیل نے بن یامین کو اس موقع پر بھائی اس وجہ سے کہا کہ حضرت یعقوب پر گفتگو کا اثر جم جائے اور وہ سمجھ لیں کہ بن یامین ان کا بھائی ہے اور بھائی ہمیشہ بھائی کا شفیق اور مہربان ہوتا ہے پھر یہ حفاظت کا پختہ وعدہ بھی کر رہے ہیں، اس لئے اب دغا نہ کریں گے۔ لیکن بیٹوں کی گفتگو کا باپ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ فرمایا میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ تم نے یوسف کی کیا اور تمہاری حفاظت کیا۔ تم نے پہلے کون سی حفاظت کی تھی کہ اب مجھے تمہارا اعتبار ہو۔ محافظ تو اللہ ہے اس کی حفاظت سے نگہداشت ہو سکتی ہے۔ رہی یہ بات کہ تم اس کو بھائی کہہ کر اپنی رحمت و شفقت کا اظہار کر رہے ہو تو یہ بھی غلط ہے، ارحم الراحمین تو خدا ہے۔ تمہارے رحم و کرم کی حقیقت تو معلوم ہو چکی اللہ کی رحمت کی ضرورت ہے۔ جب بیٹے لاجواب ہو گئے اور سامان کھولا اور غلہ کے اندر اپنا سرمایہ ملا تو اب بات بن گئی کہنے لگے باپ دیکھئے ہم نے عزیز کی مہمان نوازی کا تذکرہ غلط نہیں کیا تھا۔ اس نے ہمارا سامان بھی واپس کر دیا۔ اب تو ہمارے ساتھ بھائی کو کر دیجئے۔ ہم اس کی برادرانہ حفاظت کریں گے۔ ہمارے بال بچوں کو بھی اناج مل جائے گا اور اس کے حصہ کا اونٹ بھر غلہ اور بھی ملے گا حضرت یعقوبؑ جب بیٹوں کے اصرار پر مجبور ہو گئے تو فرمایا میں تمہاری پناہ میں تو دے نہیں سکتا نہ تمہارے زبانی وعدے کا اعتبار ہے۔ ہاں اگر اس بات کا عہد کرو اور خدا کو ضامن کرو کہ جب تک تم سب مغلوب نہ ہو جاؤ اور کوئی دشمن تمہارا محاصرہ نہ کر لے اس وقت تک تم اس کی حفاظت کرو گے بیٹوں نے اللہ کو گواہ کر کے عہد کیا۔ حضرت یعقوبؑ نے فرمایا دیکھو اللہ حاضر ناظر ہے۔ ہمارے معاہدے کا ضامن ہے۔ دغا نہ کرنا۔

اس کے بعد با قتضائے شفقتِ پدری بیٹوں کو نصیحت کی اور جمہور صحابہ و تابعین کی صراحت کے بموجب آپ کو اپنی اولاد کے متعلق نظر لگنے کا اندیشہ تھا، اس لئے اجتماعی صورت میں شہر میں داخل ہونے کی ممانعت فرما دی۔ اول تو ان میں سے ہر ایک کا حسن خود نظر فریب اور دل کش تھا پھر سب بھائی تھے باہم مشابہ تھے ناک نقشہ اور رنگ ایک تھا۔ ان کا اجتماع فریبا صورتوں کا سامان پیدا کرتا تھا، اس لئے آپ نے جدا جدا داخل ہونے کی ہدایت کی تاکہ نظر بد سے کسی طرح حفاظت ہو جائے، لیکن آپ نبی تھے حقائق عالم سے واقف تھے۔ جانتے تھے کہ نظر میں بھی تاثیر خدا نے پیدا کی ہے۔ میری تدبیر تقدیر کو بدل نہیں سکتی مسبب محض خدا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ یہ تو صرف ظاہری تدبیر ہے ورنہ کارساز تو اللہ ہی ہے۔ میں اللہ کی مقرر کردہ تکلیف کو کسی طرح دفع نہیں کر سکتا۔ کل عالم کا فیصلہ، راحت، مصیبت، اچھائی برائی اور نفع نقصان

تو اسی کے ہاتھ میں ہے لہٰذا بھروسہ اسی پر ہے اور بھروسہ کرنے کے قابل بھی وہی ہے۔

نظر کی تحقیق علماء اہلِ سنت متفق ہیں کہ نظر لگنا حق ہے۔ فرقہ معتزلہ نظر کو ایک لغو چیز سمجھتا ہے۔ ہم نظر بد کی تاثیر کے ثبوت میں دو دلیلیں بیان کرتے ہیں نقلی اور عقلی۔ (۱) صحیح مسلم میں وارد ہے کہ ایک خوبصورت گورے رنگ کے صحابی کو دوسرے شخص نے دیکھ کر کہا کیسا خوبصورت ہے۔ حضورؐ کو یہ الفاظ ناگوار گزرے اور فرمایا تجھے ماشاء اللہ کہنا نہ آتا تھا۔ چنانچہ وہ خوبصورت صحابی واپس گئے تو راستہ ہی میں اُن کو سخار سا آگیا اور چہرہ زرد پڑ گیا۔ حضورؐ کو اطلاع ملی تو آپ نے نظر لگانے والے کو بلا کر بیمار کے پیچھے کھڑا کیا اور ایک برتن میں پانی لے کر اس کے بیسوں ناخون و دیگر مخصوص اعضاء اس پانی میں ڈبو کر صحابی کے سر پر سے اس برتن کو اتار کر نظر لگانے والے پر پانی ڈال دیا اور پھر اس کو نظر پھیرے ہوئے واپس چلا جانے کا حکم دیا اس سے صحابی کو صحت ہوگئی۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے حضورؐ نے فرمایا نظر حق ہے۔ امام احمد کی روایت میں اس کے ساتھ اتنا زیادہ ہے کہ نظر کے ساتھ آدمی کا حسد اور شیطان ملا ہوا ہوتا ہے۔

امام مسلم کی روایت میں آیا ہے کہ نظر بد اونٹ کو ہانڈی میں اور آدمی کو قبر میں داخل کر دیتی ہے۔ صحاح و سنن کی روایت ہے کہ حضور والا حسنین کے لئے بطور تعویذ یہ دعا پڑھتے تھے۔ اُعِیْذُکُمَا بِکَلِمٰتِ اللّٰہِ التَّامَّاتِ مِنْ کُلِّ شَیْطٰنٍ وَّ ھَامَّۃٍ وَّ عَیْنٍ لَامَّۃٍ۔

عبادہ بن صامت کہتے ہیں دن چڑھے میں حضورؐ کی خدمت میں مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ آپ پر بیماری کی تکلیف سخت ہے۔ پھر واپس آکر پچھلے دن میں گیا تو میں نے بیماری میں افاقہ دیکھا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا میرے پاس جبرئیل آئے تھے اور یہ افسون پڑھا تھا۔ بِسْمِ اللّٰہِ اَرْقِیْکَ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ یُّؤْذِیْکَ مِنْ کُلِّ عَیْنٍ حَاسِدٍ اَللّٰہُ یَشْفِیْکَ۔

حضرت جعفر بن ابی طالب کے بچے گورے گورے خوبصورت تھے۔ آپ کے یہاں کام میں شریک ہوگئے۔ ایک روز حضرت اسماءؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ان کو بہت جلد نظر لگتی ہے۔ کیا نظرِ بد دور کرنے کے لئے میں ان پر رقیہ وافسون پڑھوں؟ فرمایا ہاں۔

ایک روز حضور والا ام المومنین ام سلمہؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ وہاں ایک بچہ بیمار تھا۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ اس کو نظر لگ گئی ہے۔ فرمایا تم اس پر رقیہ کیوں نہیں کرتے ہو یعنی جھاڑ پھونک سے نظر اتار دو۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضور اقدس نظر لگانے والے کو وضو کرنے کا حکم دیتے پھر اسی پانی سے اس شخص کو غسل دینے کا حکم دیتے جس کو نظر لگی ہوتی۔

ان قوی اور باوثوق روایات کے ہوتے ہوئے نظر بد کی تاثیر کا انکار کرنا کس قدر جہالت ہے۔

(۲) یہ بالکل مشاہدہ ہے اور پیش پا افتادہ حقیقت ہے اور ہر شخص کا تجربہ ہے کہ بعض کی نظر سے ہیبت، بعض کی نظر سے خفت، بعض کی نظر سے دلیری، بعض کی نظر سے محبت اور بعض کی نظر سے عداوت پیدا ہوتی ہے۔ پھر کشش اور انقلاب حقیقت مسمریزم کی رکھنے والے دن رات کرتے ہی رہتے ہیں۔ تخیل کو یکسو کرنے کے بعد کسی پر نظر جمانا ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ مرض کو کھینچ لینا، معمول کو تسخیر کر لینا ماہرین مسمریزم کے نزدیک معمولی کام ہے۔ ایسے مشاہدات اور تجربات کے باوجود نظر بد کا انکار کرنا کمزوری فہم کی دلیل ہے۔ بات یہ ہے کہ لوگ نظر کو مؤثر سمجھتے ہیں اور حقیقتِ نظر مؤثر نہیں ہوتی نہ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہوتے ہیں بلکہ دماغی تخیل کی یکسوئی جس کا اظہار نظر یا زبان سے ہوتا ہے ... اثر پیدا کرتا ہے اب جس طرح کا تخیل ہوگا ویسا ہی اثر ہوگا۔ نظر لگانے والے کا تخیل عموماً حاسدانہ ہوتا ہے اور اگر مشفقانہ بھی ہو تب بھی اس کے اندر چونکہ حسد کا ملکہ اور شیطنت کی راسخ قوت ہوتی ہے، اس لئے یہ عارضی شفقت اس کے اصل ملکہ سے مغلوب ہو جاتی ہے اور قوتِ راسخہ کے زیر اثر یا زبان کام کر جاتی ہے۔

مقصودِ بیان آیت وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ بتا رہی ہے کہ اگر اپنے اہل و عیال کے متعلق آدمی اپنے کو نگہبان اور محافظ کہے تو جائز ہے۔ رزق کا ذمہ دار اگرچہ خدا تعالیٰ ہے، مگر اسی عالم اسباب میں تدبیر کرنی باختیار خود سبب ہے۔ یوسفؑ کے بھائیوں نے جو

اہتمام رزق کی ایسی پُر تکلیف تدبیریں کیں اور حضرت یعقوبؑ نے بھی ان کی موافقت کی۔ اس سے کارخانۂ قدرت کے انتظام اور ضابطۂ قدرت کے عموم اور حکم کسب کی پابندی کی طرف اشارہ ہے۔ یعقوبؑ اگرچہ مقرب الٰہی تھے، مگر انتظام قدرت اور ضابطۂ فطرت سے وہ بھی مجبور تھے۔ ان کو بھی فراہمی معاش کے لئے دنیوی انتظام کرنا پڑتا تھا۔

آیت فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا سے یہ بات واضح ہے کہ درحقیقت نگہبان اور محافظ تو اللہ ہی ہے، آدمی کی رحمت و شفقت اور نگہداشت حفاظت ظاہری ہے۔ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا الخ سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی شخص سے اس کی صداقت پر پختہ قسم اور اللہ کی ضمانت لینی صحیح ہے۔ اَللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ کا مضمون دلالت کر رہا ہے کہ سچ بات پر اللہ کو گواہ کرنا صحیح ہے اور عظمت کبریائی کی نگہداشت سب سے اعلیٰ ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں کو نظر بد سے بچنے کی جو تدبیر بتائی اس سے مسلمانوں کو نصیحت حاصل کرنی چاہیئے اور علم و عقل کے امکانی اسباب پر کاربند رہنا چاہیئے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یقین رکھنا چاہیئے کہ مدبّر و مؤثر اور فاعل حقیقی محض ذات الٰہی ہے اسی کے تصرفات عالم میں جاری ہیں۔ کوئی تدبیر اس کے حکم کو بدل نہیں سکتی، مگر کورانہ توکل اور اسباب کو بالکل ترک کرنا بھی خلاف عقل و شرع ہے وغیرہ۔

وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ۭ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ

الحاصل وہ باپ کی ہدایت کے موافق داخل ہوئے مگر یہ فعل اللہ کے حکم سے بالکل نہیں بچا سکتا

شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ۭ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ

تھا صرف یعقوبؑ کے دل میں ایک خطرہ تھا جس کو انھوں نے پورا کرلیا مگر وہ بلاشبہ صاحب علم تھے کیونکہ ہم نے اُن کو تعلیم دی تھی

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۧ

اور اکثر لوگ ناواقف ہیں

تفسیر آیات کا مطلب صاف ہے۔ حضرت یوسفؑ کے بھائی حسب ہدایت والد مصر میں گئے، لیکن والد نے شفقت پدری کے اقتضاء کو پورا کیا تھا ورنہ واقع میں ان کو حقیقت معلوم تھی۔ امام نخعی نے بیان کیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کو معلوم تھا کہ عزیز مصر میرا بیٹا یوسف ہے، لیکن آپ کو اجازت نہ تھی کہ اس راز کو ظاہر کریں۔ اس روایت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انبیاء و اولیاء کو کچھ باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں کہ جن کو ظاہر کرنے کی ان کو اجازت نہیں ہوتی، لیکن اس کے باوجود ان کا ظاہری برتاؤ ایسا ہوتا ہے کہ گویا بالکل واقف نہیں ہیں۔

آیت وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ الخ کی تفسیر میں بعض واقفان اسرار نے بیان کیا ہے کہ علوم پانچ طرح کے ہوتے ہیں۔ (۱) دنیا حاصل کرنے کے لئے تجارت، صنعت و حرفت وغیرہ۔ (۲) انتظام دنیوی کے لئے کل قوانین سیاست اور ضوابط انتظام میں داخل ہیں۔ (۳) وہ علم جو موجب زینت ہے طبیعت میں جولانی اور تحقیقات عالم کی استعداد پیدا کرتا ہے۔ تمام علوم صنعیہ والٰہیہ اس میں داخل ہیں۔ (۴) وہ علم جس سے زہد و عبادت، خطرات نفس سے بچاؤ اور اوامر و نواہی کی واقفیت ہو جائے۔ یہ ظاہری شرائع کا علم ہے۔ (۵) وہ علم جو آزادی اور انقطاع کے لائق ہو اور شاہد مقصود سے ہمکنار کر دے۔ یہ شرافت میں بہتر ہے، لیکن اس میں دھوکہ اور غلطی بہت ہو جاتی ہے۔ صحت و غلطی کو جانچنے کا معیار ظاہر شریعت کی مطابقت و عدم مطابقت ہے۔ [illegible] یہ علم کا یہ آخری مرتبہ مراد ہے جو محض عطیۂ ربانی ہے۔

مسعود بیان آیات بتارہی ہیں کہ صرف ظاہری اطمینان کے لئے تدبیر کرنی اگرچہ ناجائز نہیں، مگر حقیقت پر نظر رکھنی لازم ہے۔ اکثر لوگ اپنی اسکیموں اور تدبیروں پر مغرور ہو جاتے ہیں اور کارخانۂ قدرت کے اندر مخفی حقیقی کارساز سے غافل ہوتے

ہیں۔ اہلِ معصیت کو ایسا نہ ہونا چاہیئے وغیرہ۔

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّىٓ اَنَا اَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ

جب یہ لوگ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو یوسف نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا میں تیرا بھائی ہوں جو حرکات یہ کرتے

بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

رہے ہیں تو اُن سے رنجیدہ نہ ہو

تفسیر درمیانی قصہ کلام پاک میں نہیں بیان کیا۔ کھانے پر دو دو بھائیوں کو ساتھ بٹھانا اور بن یامین کا تنہا رہ جانا اور یوسف کا اس کو اپنے ساتھ یہ کہہ کر بٹھانا کہ تم مجھے اپنے بھائیوں کے بجائے سمجھو اور پھر بن یامین کا یوسف سے اپنے بھائیوں کی سرد مہری کی شکایت کرنا اور حقیقی بھائی کو بہ حسرت لہجہ میں یاد کرنا کچھ نہیں بیان کیا گیا۔ سراج و معالم میں تفسیر آیات کے ذیل میں مفصل واقعہ موجود ہے۔ ہم بھی ابتدا میں لکھ آئے ہیں دوبارہ لکھنا موجب طوالت ہے۔ یہاں یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ اگر یوسف بن یامین کو اچانک اطلاع دے دیتے تو شادی مرگ ہو جانے کا اندیشہ تھا، اس لئے بتدریج آگاہ کیا۔ پھر یہ آزمائش تھی کہ بھائیوں کا برتاؤ بن یامین کے ساتھ کیسا ہے؟ واقعی وہ اس کو اپنا چھوٹا بھائی جانتے ہیں یا وہی سوتیلے کا برتاؤ کرتے ہیں جب سب بھائی دو دو ہو کر بیٹھ گئے اور بن یامین کو تنہا چھوڑ دیا تو ان کی محبت کی حقیقت بھی آشکارا ہو گئی۔

مقصودِ بیان آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ سب سے پہلے حضرت یوسفؑ نے واقعہ کی اطلاع بن یامین کو ہی دی۔ بن یامین کو کچھ شک ہوا تو مؤکد طور پر فرمایا میں درحقیقت تیرا بھائی ہوں۔ اس میں کچھ شک نہیں ہے۔ یوسف کے اس برتاؤ سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ آدمی فطرتاً حقیقی بھائی سے جتنی محبت رکھتا ہے اتنی غیر حقیقی سے نہیں رکھتا۔ گویا نسب کا قرب و بعد محبت کی زیادتی و کمی کا سبب ہے وغیرہ۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِى رَحْلِ اَخِيهِ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ

پھر جب اُن کا سامان تیار کر دیا تو ایک کٹورا اپنے بھائی کی خورجین میں رکھوا دیا اور منادی نے ندا دی

اَيَّتُهَا الْعِيرُ اِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ۝ قَالُوا وَاَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُونَ ۝ قَالُوا

کہ اے قافلہ والو تم ضرور چور ہو اور اُن کی طرف مُنہ کر کے بولے تمہاری کیا چیز گم ہو گئی ہے انہوں

نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَلِمَنْ جَاءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِيمٌ ۝ قَالُوا تَاللّٰهِ

نے کہا شاہی پیمانہ ہم کو نہیں ملتا جو شخص اس کو لے آئے گا اس کو ایک بار شتر غلہ ملے گا اور میں اس کا ضامن ہوں یہ بولے

لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِى الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِينَ ۝

تم کو معلوم ہے کہ ہم اس ملک میں فساد پھیلانے نہیں آئے اور نہ کبھی ہم چور تھے

تفسیر

مفصّل قصہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ ان آیات میں کچھ اختصار کے ساتھ اسی کا بیان ہے۔ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ وہ برتن جو بن یامین کے کجاوہ میں چھپایا گیا ہے۔ ابن اسحاق اور اکثر علماء کے قول کے بموجب چاندی کا تھا بعض نے سونا ظاہر کیا ہے۔ عکرمہ کہتے ہیں چاندی کا تھا اور اس کو غلہ ناپنے کا پیمانہ بنا دیا گیا تھا اور مرصع بجواہر تھا۔ ابن زید کا قول ہے کہ وہ پانی پینے کا کٹورا تھا مگر اس وقت اس سے غلہ ناپا جاتا تھا۔ ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور ضحاک کا بھی یہی قول ہے۔ سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ صُوَاعَ الْمَلِكِ چاندی کا تھا اس سے پانی پیتے تھے اور اتنا تھا جتنا عرب میں کٹورا ہوتا ہے اور حضرت عباسؓ کے پاس اسلام سے پہلے ایسا ہی پیالہ تھا۔ ان تمام روایات کا نتیجہ یہ نکلا کہ سقایہ اور صواع ایک ہی چیز تھی۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

منادی نے قافلہ والوں کو ندا دی تم چور ہو کیا محض شبہ کی بنا پر کسی کو چور کہنا جائز ہے اور پھر حضرت یوسف کو تو معلوم تھا کہ بن یامین کے کجاوہ میں پیالہ میں نے خود پوشیدہ کرایا ہے۔ ایسی صورت میں کسی پر چوری کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا لہٰذا رازی نے اس کا جواب دیا ہے کہ جب پیالہ گم ہو گیا تو حضرت یوسفؑ نے خود آدمی کو بھیج کر کہلوایا کہ پیالہ قافلہ والوں میں سے کسی کے پاس ہوگا یا خود شاہی خادموں کا ادھر خیال گیا۔ بہر حال آدمی دوڑا اور اس نے بغیر اجازت یوسف کے یہ الفاظ کہہ کر قافلہ والوں کو پکارا۔ آپ نے نہ اجازت دی اور نہ ناراضی ظاہر کی۔ قرآن میں صرف اتنا مذکور ہے کہ یوسف نے پیمانہ پوشیدہ کرا دیا یہ نہیں ہے کہ آواز بھی خود دلوائی۔

مقصود بیان

بادشاہ کا فرض ہے کہ رعایا کے فقر و فاقہ کی خبر گیری کرے اور نہ فقط اپنی رعایا کی بلکہ اس کی سلطنت میں آنے والا کوئی مسافر بھی بھوکا نہ مرے اور یہ بھی جائز ہے کہ مسافروں کے اہل و عیال کے لئے کچھ سرمایۂ معاش ان کے ساتھ کر دے جس طرح حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں کو دیا۔ اگر حسنِ تدبیر سے کوئی لطیف حیلہ کیا جائے جس سے کسی کو نقصان پہنچانا مقصود نہ ہو بلکہ فائدہ پہنچانا ہو تو جائز ہے جیسا حضرت یوسف نے بن یامین کے کجاوہ میں پیالہ پوشیدہ کرا دیا تھا۔ چور کو دریافت کرنے میں مشتبہ لوگوں کی تلاشی جائز ہے اور تلاش کے لئے کسی خاص شخص کو مامور کرنا بھی درست ہے۔ اگر کوئی شخص واقعی مجرم ہو اور اس کے اس جرم کا انکشاف نہ ہو سکے تو اغلب ہے کہ اسی قسم کے کسی اور جرم میں وہ مشتبہ قرار دیا جائے۔ اگرچہ اس نے یہ دوسرا جرم نہ کیا ہو جس طرح برادرانِ یوسف نے یوسف کو بطور سرقہ فروخت کر دیا اور ان کا جرم ابتدا میں نہ کھلا، لیکن شاہی پیمانہ چوری ہونے پر ان کو سارق کہا گیا باوجودیکہ سارق نہ تھے یہ جرم اوّل کی فطرتی سزا تھی۔ حصول وصال اور حصولِ سعادت کے بعد دنیا کی ہر ندامت اور سرزنش اور ہر بدترین خطاب آدمی کو ہیچ معلوم ہوتا ہے اس پر کسی طعن تشنیع اور ناسزا الفاظ کا اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ بن یامین کو جب بھائی کا وصال حاصل ہو گیا تو دوسرے بھائیوں کی سرزنش و نکوہش اور شاہی آدمیوں کا ان کو سارق کہنا کوئی چیز ان کی ناگواری کا باعث نہ بنی۔ اس میں ایما ہے اس بات کی طرف کہ جو لوگ قربِ الٰہی پر پہنچ جاتے ہیں اور ان کو لذتِ وصال حاصل ہو جاتی ہے ان کو دنیا کے نابینا اور بدباطن لوگ کچھ بھی کہیں۔ مکار ریا ہوس پرست یا مجنون و دیوانہ کے لقب سے یاد کریں، مگر ان کو اس سے تکلیف نہیں ہوتی وغیرہ۔

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ○ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ

شاہی آدمیوں نے کہا اگر تم جھوٹے ہو تو چور کی کیا سزا ہے؟ انھوں نے کہا سزا یہ ہے کہ جس کی خورجین میں پیمانہ پایا جائے وہی شخص

جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ○ فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ

اُس کا عوض ہے ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں پھر یوسف نے اپنے بھائی کی خورجین سے پہلے اُن کی خورجینوں کی تلاشی شروع کی

اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ

اور بعد کو وہ پیمانہ اپنے بھائی کی خورجین سے نکال لیا ہم نے یوسفؑ کو یہ تدبیر بتائی تھی کیونکہ شاہی قانون میں وہ اپنے بھائی کو نہ پکڑ سکتا

الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ ۗ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ○

تھا　ہاں اگر مشیت خدا ہوئی تو خیر　ہم جس کے چاہتے ہیں درجے بلند کرتے ہیں　اور ہر جاننے والے سے　بڑھ کر　جاننے والا ہے

تفسیر جب منادی کی نداسُن کر بھائیوں نے اپنی بریت ظاہر کی اور بولے ہم اہل تقویٰ ہیں مفسد نہیں ہیں، چوری ہمارا شیوہ نہیں ہے تو شاہی چوب داروں نے کہا اگر تمہاری چوری ثابت ہو جائے تو تم کیا سزا تجویز کرتے ہو؟ اہل قافلہ نے کہا جس کے سامان میں پیمانہ برآمد ہو جائے اس کو غلام بنا لیا جائے۔ چور کو سزا دینے کا ہمارے یہاں یہی دستور ہے۔ قانون مصر میں اگرچہ چور کو غلام بنانے کی سزا نہ تھی، مگر برادرانِ یوسف نے اپنی شریعت کے مطابق یہ سزا تجویز کی گویا چوری سے اپنا بری ہونا نہایت بے باکی سے ظاہر کیا۔ غرض تفتیش و تلاشی شروع کی گئی۔ سب سے پہلے دوسرے بھائیوں کے سامان کی تلاشی لی آخر میں بن یامین کا سامان کھولا۔ اس میں پیمانہ برآمد ہوا۔ نتیجہ میں وہ سزا تجویز کی گئی جو اہل قافلہ نے خود بیان کی تھی اور بن یامین کو روک لیا گیا۔

آیت کَذٰلِکَ کِدْنَا لِیُوْسُفَ کے ذیل میں ابن اعرابی نے کہا کہ کید کے معنی ہیں تدبیر کرنا خواہ کسی حق مقصد کے لئے ہو یا باطل کے لئے۔ یوسف نے جو تدبیر کی وہ حق مقصد کے لئے تھی۔ تفسیر سراج میں ہے کہ مخلوق کا کید تو حیلہ اور مکر ہوتا ہے اور اللہ کا کید تدبیر حق کا نام ہے۔

مقصودِ بیان آیات سے ثابت ہے کہ کسی کا حق ضائع کرنے کے بغیر حیلہ و تدبیر کرنا چاہیئے۔ قانون مصر میں چور کی سزا غلامی نہ تھی۔ بن یامین کو روکنے کی تدبیر حضرت یوسفؑ کو الہام سے معلوم ہوئی۔ حضرت یوسف کو اپنے بھائیوں پر بہت زیادہ فضیلت حاصل تھی۔ معیارِ فضیلت علم ہے اور بھائی بھی عالم تھے۔ دنیا میں کسی کو کمال علمی حاصل نہیں۔ ہر عالم سے بڑھ کر عالم ہوتا ہے۔

قَالُوا إِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ

یہ لوگ کہنے لگے اگر اس نے چوری کی تو اس سے پہلے اس کا بھائی بھی چوری کر چکا ہے　یوسفؑ نے اپنے دل میں اس بات کو چھپا رکھا　ان پر

يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ أَنْتُمْ شَرٌّ مَكَانًا ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ ○ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ

ظاہر نہ کیا　اور (یوں) بولے تم بُرے درجہ کے آدمی ہو　اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو اس کو اللہ خوب جانتا ہے　یہ بولے　اے عزیز

إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ ۖ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ○

اس کا ایک بوڑھا باپ ہے　اس لئے اس کی بجائے ہم میں سے کسی کو پکڑ لیجئے　ہم جانتے ہیں　آپ　بھلائی　کرنے والے ہیں

قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ أَنْ نَأْخُذَ إِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهُ إِنَّا إِذًا لَظَالِمُونَ ○ ع ۹

یوسف نے کہا خدا بچائے کہ ہم سوا اس کے جس کے پاس ہم کو اپنا سامان ملا ہے　اور کسی کو پکڑ بیں اگر ہم ایسا کریں گے تو ہم ظالم ہوں گے

تفسیر پہلے تو برادرانِ یوسف نے نہایت بے باکی سے کہا تھا کہ جس کے پاس پیمانہ برآمد ہوا اس کو گرفتار کر کے غلام بنا لیا جائے، لیکن جب بن یامین کے سامان میں برآمد ہوا اور شرمندہ ہوئے تو بن یامین کو طعن و سرزنش کرنے کے بعد عزیز سے اپنی بے تعلقی

اور بن یامین کا سوتیلا پن ظاہر کرنے کے لئے غصہ میں بولے اگر یہ شخص اب چوری کرتا ہے تو کچھ تعجب کی بات نہیں اس سے پہلے اس کا (ماں جایا) بھائی بھی چوری کر چکا تھا۔ سعید بن جبیر نے بروایت قتادہ بیان کیا ہے کہ یوسف نے اپنے نانا کا بت چرا کر توڑ ڈالا تھا۔ محمد بن اسحاق نے بروایت مجاہد بیان کیا ہے کہ حضرت یعقوب کی ایک بڑی بہن تھی اور اولاد ابراہیم کا دستور تھا کہ حضرت ابراہیم کی کمر کا پٹکا (جو بہت متبرک سمجھا جاتا تھا) بڑی اولاد کو ملا کرتا تھا خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ چنانچہ وہ پٹکا حضرت اسحاق کے توسط سے حضرت یعقوب کی بڑی بہن کو ملا تھا۔ پھوپھی نے یوسف کو گود لے لیا تھا۔ یعقوب کو یوسف کی جدائی کی تکلیف ہوئی تو وہ بہن کے پاس یوسف کو لینے گئے۔ بہن کو یہ بات منظور نہ تھی انھوں نے یوسف کو روکنے کی ایک تدبیر کی۔ حضرت اسحاق کا پٹکا چھپا کر یوسف کی کمر میں باندھ دیا۔ جب حضرت یعقوب یوسف کو لے جانے لگے تو بہن نے وہی پٹکا تلاش کیا ہوتے ہوتے یوسف کے پاس برآمد ہوا۔ یعقوب مجبور ہو گئے کیونکہ شریعت کا دستور ہی یہ تھا کہ جس کے پاس چوری کا مال برآمد ہو اس کو صاحب مال روک سکتا تھا۔ بہن نے یوسف کو روک لیا۔ برادران یوسف نے اسی قصہ کی طرف اشارہ کیا۔ مجاہد نے یہ قصہ اسرائیلیوں کی کتابوں سے اخذ کر کے بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم ہیم ہے یا غلط۔ تفسیر سراج میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت یوسف نے گھر کی ایک مرغی پکڑ کر فقیر کو دے دی تھی۔ وہب کا قول ہے کہ دسترخوان کا کھانا چھپا کر آپ فقیر کو دیدیتے تھے۔ ابن انباری کہتے ہیں کہ مذکورہ واقعات میں کوئی فعل بھی سرقہ نہیں تھا، مگر بھائیوں نے غصہ میں عار دلانے کے لئے اس کو سرقہ قرار دیا۔ بہر حال یوسف کو بھائیوں کی زبان سے حسد آمیز تہمت آمیز کلام سن کر بھی غصہ نہ آیا۔ آپ نے دل ہی دل میں کہا تم نے اس سے بھی بڑھ کر شرارت کی تھی۔ یعنی اس نے پیمانہ چرایا یا اس کے بھائی نے پٹکا چرایا تھا تو تم نے زندہ آدمی کو چرا کر غلام بنا کر فروخت کر دیا۔ جب سب بھائی مجبور ہو گئے اور دیکھا کہ یہاں کسی طرح دال گلتی نظر نہیں آتی تو عاجزانہ طرز میں کہنے لگے جناب والا اس کا باپ بہت بوڑھا ہے اُس اس سے اُنس ہے۔ مہربانی فرما کر اس کو چھوڑ دیجئے اور اس کی بجائے ہم میں سے کسی ایک کو روک لیجئے۔ یوسف نے جواب دیا ہرگز نہیں ہو سکتا ہم اسی کو پکڑیں گے جس کے پاس ہمارا مال برآمد ہوا ہے۔ دوسرے کو پکڑنا تو قطعاً ظلم ہے۔

زمخشری اور بیضاوی نے کہا ہے کہ یوسف کی اصل مراد یہ تھی کہ اللہ نے بذریعہ وحی مجھے حکم دیا ہے کہ جس کے پاس پیمانہ برآمد ہو اس کو گرفتار کر لوں۔ اس حکم کی خلاف ورزی کرنا ظلم ہے۔ ابن عادل نے لباب میں بیان کیا ہے کہ شاید اللہ نے اس بات کا حکم دیا تھا اور کسی مراعات کرنے سے جو بن یامین کی رہائی کے متعلق ہو منع کر دیا تھا۔

مقصود بیان امام رازی نے بیان کیا ہے یہ واقعہ دلالت کرتا ہے کہ جب حاسد اپنے حسد سے کوئی فعل کرتا ہے تو باوجود تکمیل فعل کے پھر بھی اس کے دل پر محسود کی طرف سے آگ جلتی رہتی ہے۔ دیکھو بھائیوں نے صرف حسد کی بنا پر کنوئیں میں ڈالا پھر غلام بنا کر فروخت کیا، مگر حسد کی آگ نہ بجھی۔ مدت دراز کے بعد بھی طعن آمیز جملہ کہہ گزرے۔ پھر حضرت یوسف کی عالی ہمت اور عادلانہ کیفیت بھی دیکھنی چاہیئے کہ اپنے اوپر جھوٹی تہمت سنتے ہیں اور زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ سچ ہے ہر شخص کا حوصلہ جدا ہے۔ نکر ہر کس بقدر ہمت اوست اس کے اندر مسلمانوں کو درس دیا گیا ہے کہ حاسدوں کے حسد کی پرواہ نہ کرو اور ان کی دریدہ ذہنی کا مقابلہ بیہودہ گوئی سے نہ کرو۔ خواص شامی نے اپنے وعظ میں اس قصہ کے ذیل میں فرمایا تھا کہ اس واقعہ میں تنبیہ ہے اس بات پر کہ نصیحت کرنے والا لوگوں کی زبان درازی برداشت کرے جو نقش جہالت اور تہمت ہو گی۔ خود زبان نہ کھولے۔

فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ

غرض جب ناامید ہو گئے تو مشورہ کرنے کے لئے الگ ہو بیٹھے بڑا بولا کیا تم کو معلوم نہیں کہ تمہارے باپ نے تم سے خدا

أَخَذَ عَلَيْكُم مَّوْثِقًا مِّنَ اللَّهِ وَمِن قَبْلُ مَا فَرَّطتُمْ فِي يُوسُفَ ۖ فَلَنْ أَبْرَحَ

کا پختہ قول و قرار لے لیا تھا اور اس سے پہلے تم یوسف کے بارے میں قصور کر چکے ہو میں تو ہرگز اس ملک سے

الْأَرْضَ حَتَّىٰ يَأْذَنَ لِي أَبِي أَوْ يَحْكُمَ اللَّهُ لِي ۖ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ۝ ارْجِعُوا

الگ نہ ٹلوں گا تاوقتیکہ میرے باپ مجھ کو اجازت نہ دیں یا خدا حکم نہ دیدے وہی بہترین حکم دینے والا ہے تم لوگ

إِلَىٰ أَبِيكُمْ فَقُولُوا يَا أَبَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ

اپنے باپ کے پاس لوٹ کر جاؤ اور ان سے کہو کہ ابا تمہارے بیٹے نے چوری کی اور ہم نے وہی کہا تھا جس کی ہم کو خبر تھی غیب کی باتوں کے ہم

حَافِظِينَ ۝ وَاسْأَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعِيرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا ۖ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝

نگراں نہ تھے جس بستی میں ہم تھے اس سے اور جس قافلہ میں ہم آئے ہیں اس سے پوچھ لو اور ہم بلاشبہ سچے ہیں

تفسیر آیات کا مطلب صاف ہے۔ چند امور تشریح طلب ہیں۔

(۱) بڑے بھائی سے کون سا بھائی مراد ہے؟ بیضاوی، معالم اور اکثر تفسیر والوں نے روبیل مراد لیا ہے۔ مفسر سراج نے کہا کہ شاید عقل میں بڑا مقصود ہو جو شمعون تھا ابن کثیر کے نزدیک یہی واجح ہے اسی نے قتل یوسف سے بھائیوں کو روکا تھا۔

(۲) بڑے بھائی نے کہا میں تو یہاں سے ہٹ نہیں سکتا جب تک باپ اجازت نہ دیں یا اللہ مجھے حکم نہ دے۔ اہل ظاہر نے اس سے استخراج کیا کہ یوسف کے بھائی پیغمبر تھے ورنہ براہ راست اللہ کے حکم دینے کے کیا معنی؟ میرے نزدیک یہ غلط فہمی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بڑے بھائی نے کہا یا تو باپ اپنی طرف سے بغیر وحی کے مجھے اجازت دیں اور مجھے معذور سمجھیں یا اللہ ان پر وحی نازل فرمائے جس سے ہماری بے قصوری ثابت ہو ان دو باتوں کے بغیر میں یہاں سے نہیں جا سکتا۔

(۳) بیضاوی نے اس موقعہ پر ایک روایت نقل کی ہے کہ برادران یوسف نے جب بن یامین کی رہائی کے لئے اصرار کیا اور عزیز مصر نے کسی طرح نہ چھوڑا تو سب کو غصہ آیا۔ غصہ کے مارے روبیل کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور بولا اے عزیز قسم ہے خدا کی یا تو ہمارے بھائی کو چھوڑ دے یا میں ایسی چیخ ماروں گا کہ حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے۔ یوسف نے اپنے چھوٹے بچے کو حکم دیا کہ جا کر روبیل کو ہاتھ سے چھو دے۔ بچے نے حکم کی تعمیل کی۔ روبیل کا غصہ فوراً فرو ہو گیا کیونکہ اولاد اسرائیل کا دستور ہی یہ تھا کہ جب کسی کو غصہ آتا اور نسل یعقوب کا کوئی فرد ان کو ہاتھ لگا دیتا تو غصہ زائل ہو جاتا۔ روبیل بولا یہاں تخم یعقوب سے کوئی شخص ضرور ہے۔ تفسیر سراج وغیرہ میں یہ روایت مفصل مذکور ہے، اگر محض غلط اور اسرائیلیوں کی تصنیف کردہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام نے صاف فرمادیا تھا کہ یہودی بہتان تراش قوم ہے۔ بات یہ تھی کہ بنی ہاشم میں پیدائشی اثر یہ چلا آ رہا تھا کہ غصہ کے وقت اگر ان کے خاندان کا کوئی آدمی ان کی پشت پر ہاتھ لگا دیتا تو غصہ دور ہو جاتا تھا۔ حضرت عباس کا یہ حال تو مشہور ہی ہے۔ یہودیوں نے بنی ہاشم کی یہ حالت سن کر اپنے اسلاف کی طرف منسوب کر دیا۔ جس طرح عیسائیوں نے جب مسیح کو ابن اللہ کہا تو ان کی ریس میں یہودیوں نے بھی عزیر کو خدا کا بیٹا قرار دے لیا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم

مقصود بیان عقل مند اور ذی شعور مجرم کو تنہائی کے وقت اپنے قصور کا اعتراف ہوتا ہے جس طرح برادران یوسف نے تخلیہ کے وقت حضرت یوسف کے متعلق اپنے قصور کا اعتراف کیا آیت وَمَا شَهِدْنَا بتا رہی ہے کہ شہادت کی بنا علم

پر ہے۔ واقعہ کے مطابق یا غیر مطابق ہونے کا شہادت سے تعلق نہیں۔ کیونکہ غیب کا علم خدا کو ہے، مگر شہادت کے وقت اپنے علم کا اظہار کر دینا چاہیئے۔ کفالت کو شہادت کہنا صحیح ہے۔ اولاد یعقوب نے بن یامین کی ذمہ داری کی تھی اسی کو شہادت سے تعبیر کیا۔ کسی بدیہی واقعہ کے متعلق اہلِ کفر کو بھی شاہد بنانا صحیح ہے وغیرہ۔

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ

یعقوبؑ نے کہا، نہیں تمہارے دلوں نے یہ بات بنائی ہے خیر اب تو صبر ہی اچھا ہے امید ہے کہ ان سب کو اللہ میرے پاس لے

جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ○ وَتَوَلَّىٰ عَنْهُمْ وَقَالَ يَا أَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ

آئے گا وہی بلاشبہ واقف اور مصلحت بین ہے یعقوب نے اُن کی طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا یوسف پر افسوس ہے

وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ○ قَالُوا تَاللَّهِ تَفْتَأُ تَذْكُرُ يُوسُفَ

اور رنج کے مارے (روتے روتے) اُن کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور اُن کا دل گھٹنے لگا بیٹے بولے بخدا تم سدا یوسف کی یاد کرتے رہو گے

حَتَّىٰ تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ مِنَ الْهَالِكِينَ ○ قَالَ إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي

یہاں تک کہ بیمار پڑ جاؤ گے یا مر جاؤ گے یعقوب نے کہا میں اپنے رنج و غم کا شکوہ اللہ ہی سے

إِلَى اللَّهِ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○

کرتا ہوں اور وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے

تفسیر بڑے بھائی کو چھوڑ کر باقی نو بھائی کنعان کو گئے اور حضرت یعقوب کو واقعہ کی اطلاع دی۔ باپ نے (بہ تفسیر بیضاوی) جواب دیا تم غلط کہتے ہو۔ بات صرف یہ ہے کہ یہ تمہاری کارستانی ہے کہ قانونِ مصر کے خلاف شریعت ابراہیم کا فتویٰ دے کر بن یامین کو گرفتار کرایا۔ اگر تم ایسی بات نہ کہتے تو ہرگز بن یامین گرفتار نہ ہوتا۔ خیر اب تو صبر کرنا ہی مناسب ہے اور صبر جمیل ہی میرے لئے بہتر ہے۔ اُمید ہے کہ منقریب ان (تینوں) کو اللہ مجھ سے ملائے گا۔ یہ الفاظ آپ نے بنورِ الٰہی مکاشفہ کے ذریعہ فرمائے تھے۔ پھر فرمایا اللہ ہی کو پورا علم ہے کہ واقعہ کیا ہوا اور وہی اپنی مصلحتوں سے واقف ہے۔ یعنی وہی واقف ہے کہ اس سرگزشت میں کیا اسرار ہیں۔ اس کے بعد لڑکوں کی طرف زیادہ التفات نہ کی اور خلق سے منہ موڑ کر خالق کی طرف توجہ کر کے کہا آہ یوسف۔ لیس آہ کے سوا کوئی اور لفظ زبان سے نہ نکلا۔ دم گھوٹتے رہے مخلوق سے کوئی شکایت نہ کی۔ رنج کو اندر ہی اندر پی جاتے (کظم دہ بمعنیٰ ک) ہاں اتنی بات ضرور ہوگئی کہ (روتے روتے) غم کے مارے آنکھیں سفید پڑ گئیں۔ بروایت متواتر چھ سال تک نابینا رہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ آنکھوں کا نور کم ہوگیا تھا۔ شاید طبقہ عینیہ یا ثقبۃ النور میں پانی اُتر آیا ہو۔

باپ کی آہ و بُکا کی کثرت دیکھ کر فقط بیٹوں نے یا بیٹوں اور پوتوں نے کہا آپ تو یوسف کو اتنا یاد کرتے ہیں کہ کسی وقت یوسف کی یاد جاتی ہی نہیں۔ اگر یہی حال رہا تو آپ ادھ مرے ہو جائیں گے یا مر ہی جائیں تو بعید نہیں۔ حضرت یعقوب نے فرمایا لڑکو میں تم سے کچھ نہیں کہتا اپنی پریشانی اور رنج اللہ سے شکوہ کرتا ہوں۔ مجھے بعلم نبوت معاملاتِ الٰہی کا جو علم ہے اس سے تم ناواقف ہو۔ یعنی تم اپنے فعل پر میرے فعل

کو قیاس مت کرو۔ میں اللہ کی رحمت و حکمت سے جتنا واقف ہوں تم اتنے واقف نہیں۔ میرا رونا بھی حکمت پر مبنی ہے نبی کے دل میں جو نورِ فراست چمکتا ہے وہ عام مؤمنوں کے قلبی نور سے زیادہ روشن ہوتا ہے۔

مقصودِ بیان مصیبت کے وقت مسلمان پر لازم ہے کہ دنیا سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے جس طرح حضرت یعقوب نے کیا۔ زیادہ ہائے ہوا اور واویلا کرنا آدابِ ایمان کے خلاف ہے۔ اگر اضطراری آہ نکل جائے تو کچھ ہرج نہیں۔ اپنی مصیبت اور کوفت کو دربدر بیان کرتے پھرنا اہلِ تقویٰ کا کام نہیں۔ بلکہ مومن پر لازم ہے کہ جو کچھ شکوہ شکایت کرنا ہو وہ اپنے رب سے کرے۔ نبی کو علم الٰہی ہوتا ہے وہ عام لوگوں کو نہیں ہوتا۔ درد اور دکھ کے وقت اضطراری رونا جائز ہے وغیرہ۔

مسئلہ گریہ کی تحقیق کم فہم حضرات اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت یعقوب باوجود نبی ہونے کے بیٹے کے فراق میں روتے اور ایسے روئے کہ آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ یہ امر خلافِ شانِ نبوت ہے اور شریعتِ اسلامیہ میں بھی ناجائز ہے۔ اس مسئلہ کو ذرا تحقیق سے بیان کرتا ہوں۔ آیاتِ احادیث اور اقوالِ صحابہ و علماء سے ثابت ہے کہ کفار چونکہ آخرت کے قائل نہیں، اس لئے مصیبت پڑنے پر وہ بدحواس ہو جاتے ہیں۔ قلب میں صبر کی صلاحیت زائل ہو جاتی ہے۔ انتہائی اضطراب اور بے چینی سے جزع فزع کرتے ہیں۔ چونکہ ایسی بدحواسی دلالت کرتی ہے کہ یہ شخص ارادۂ الٰہی پر قائم نہیں بلکہ مرضیٔ مولا کا منکر ہے، اس لئے اس قسم کا جزع فزع کرنا قطعاً حرام ہے خواہ کوئی روئے یا نہ روئے آنکھوں سے آنسو نکلیں یا نہ نکلیں۔ اسی کے متعلق فرمایا ہے کہ نوحہ کرنا جاہلیت کی رسم ہے۔ جاہلیت کے زمانہ میں عورتیں باہم مل کر یا تنہا تنہا گریبان پھاڑتیں، منہ اور بال نوچتیں، پچھاڑیں کھاتیں اور مجالسِ نوحہ منعقد کرتیں۔ بین کرنے والی کچھ پیشہ ور عورتیں مقرر تھیں۔ جو لوگ دولت مند تھے وہ اپنی میت پر زوردار نوحہ کرانے کے لئے ان عورتوں کو مدعو کرتے اور جتنی رقم ان کو ملتی وہ اسی کے موافق بین کرتی تھیں۔ ایسا نوحہ بالکل حرام ہے۔ رہا رقتِ قلب کے تحت آنسو بہنا سکون کے ساتھ رونا تو یہ جائز ہے۔ حضور کے صاحبزادے ابراہیم کا انتقال ہوا تو سرکار کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا ابن عوف یہ نرم دلی ہے دل غمگین ہوتا ہے اور آنکھ میں آنسو بھر آتے ہیں اور ہم صرف وہی بات کہتے ہیں جس سے ہمارا رب خوش ہو۔ اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے بے شک غمگین ہیں (مسلم و بخاری) جب حضرت زینب کی صاحبزادی کا وقتِ وفات آیا تو انھوں نے حضور کو بلایا۔ دو مرتبہ کے بلانے پر آپ تشریف لے گئے۔ صاحبزادی اس وقت دم توڑ رہی تھیں۔ حضور رونے لگے۔ ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ روتے ہیں؟ فرمایا میرا رونا شفقت کا ہے (بخاری) حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ کاشانۂ نبوت میں کسی کا انتقال ہوا۔ عورتوں نے رونا شروع کیا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو جھڑکا اور منع کیا۔ حضورؐ نے فرمایا عمرؓ ان کو رہنے دو۔ دل کو صدمہ پہنچتا ہے آنکھ آنسو بھر لاتی ہے اور زمانہ قریب ہے (نسائی) حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ عثمان بن مظعون کی میت کو حضورؐ نے بوسہ دیا اس وقت آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے (ترمذی و ابوداؤد) حضورِ گرامیؐ کا وقتِ وفات آیا تو سیدہ زہراؓ نے کہا وَاکَرْبُ اَبَتَاہُ۔ ہائے میرے باپ کی تکلیف۔ حضورؐ نے فرمایا لختِ جگر آج کے بعد تیرے باپ پر کبھی کرب نہ ہوگا۔ جب حضورؐ پردہ پوش ہو گئے تو جناب سیدہ روئیں اور فرمایا۔ یَا اَبَتَاہُ اَجَابَ رَبًّا دَعَاہُ یَا اَبَتَاہُ مَنْ جَنَّتُ الْفِرْدَوْسِ مَاوَاہُ یَا اَبَتَاہُ اِلٰی جِبْرِیْلَ نَنْعَاہُ۔ جب حضورؐ کو سپردِ خاک کر دیا تو سیدہ پاک نے فرمایا انس تم لوگوں کے دل نے کیسے گوارہ کیا کہ تم نے حضورؐ پر مٹی ڈال دی۔ یہ تو جوازِ گریہ کی احادیث ذکر کی گئیں۔ اب ذرا اس نوحہ کے متعلق بھی ارشاداتِ نبوی دیکھئے جس کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اُم المومنین حضرت اُم سلمہؓ کے شوہر ابوسلمہ کا انتقال ہوا تو آپ نے ارادہ کیا کہ ایسا بیٹنا ڈالوں گی جو یادگار رہے ایک عورت بھی آپ کی شرکت کو آئی۔ اتنے میں حضور والا تشریف فرما ہوئے اور فرمایا اری تو چاہتی ہے کہ جس گھر سے اللہ نے شیطان کو نکالا (یعنی اسلام آنے سے کفر بھاگ گیا ہے) پھر اسی گھر میں شیطان کو داخل کرے۔ ام المومنین رضؓ یہ سن کر باز رہیں (مسلم) حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ جب حضرت جعفر بن ابی طالب اور زید بن حارثہ اور ابن رواحہ کی شہادت کی خبر آئی تو حضور مسجد میں بیٹھے تھے اور آپ پر حزن و ملال ظاہر تھا۔ اتنے میں کسی شخص نے جعفر کی عورتوں کا رونا بیان کیا۔ حضورؐ نے منع کرایا اس نے دوبارہ آکر بیان کیا آپ نے پھر منع فرمایا۔ تیسری بار آکر پھر کہا وہ نہیں مانتیں۔ فرمایا تو

ان کے مُنہ میں خاک بھر دے (رواح اصحاب الصحاح) حضرت عمرؓ کی وفات کے قریب صہیبؓ روتے آئے اور کہنے لگے میرے بھائی سردار بھائی۔ حضرت عمرؓ نے اسی حالت میں فرمایا صہیبؓ مجھ پر روتے ہو؟ حضورؐ نے تو فرمایا تھا کہ پسماندوں کے رونے سے میت پر عذاب ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسری احادیث میں بھی میت پر رونے کی ممانعت وارد ہے، مگر اس سے مراد وہی نوحہ ہے جس کی رسم جاہلیت میں تھی۔ یعنی جزع فزع کرنا، کپڑے پھاڑنا، مُنہ پیٹنا، بال نوچنا اور پچھاڑیں کھانا۔ حضرت یعقوب علیہ السّلام کا گریہ محض رقتِ قلب اور اندرونی حزن کے ماتحت تھا نوحہ نہ تھا۔ آیت وَهُوَ كَظِيمٌ صاف بتا رہی ہے کہ آپ رنج کو گھونٹتے رہتے اس کے علاوہ کوئی چیز بھی منہ سے نہ نکالتے۔ فقط آنکھوں سے آنسو بہاتے اور اپنی مصیبت دفع ہونے کی اللہ سے دعا کرتے۔ دل میں نا اُمیدی کو آنے نہ دیتے۔ کافروں کی طرح رحمتِ الٰہی سے مایوس نہ ہوتے بلکہ بیٹوں سے بھی آپ نے فرمایا تھا مجھے اللہ کی طرف سے وہ علم عطا ہوا ہے جس سے تم واقف نہیں ہو۔ مجھے یوں ہی رہنے دو میں خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْــَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ

بیٹو! جاؤ　یوسف کی اور اس کے بھائی کی　تلاش کرو　اور اللہ کی رحمت　سے نا اُمید　نہ ہو

اِنَّهٗ لَا يَايْــَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

اللہ کی　رحمت سے　وہی لوگ　نا اُمید ہوتے ہیں　جو کافر　ہیں

تفسیر اے بیٹو! جاؤ اور اس کے بھائی کی تلاش ذرا ہوشیاری اور بیدار ی احساس سے کرو۔ اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہونا۔ نا اُمیدی مومن [illegible] ایمان کا شیوہ نہیں۔ محض کافروں کی خصلت ہے۔ ان آیات میں سابقہ آیت کا بیان ہے۔ پہلے مجمل طور پر اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ فرمایا تھا یہاں اس کی کسی قدر تفصیل کر دی مگر راز سے مکمل آگاہ پھر بھی نہ کیا کیونکہ یہ علمِ الٰہی میں خیانت تھی، اسرارِ قدرت کی پردہ دری تھی، اللہ کے کارخانے میں دخل تھا۔ در پردہ حکم دے دیا کہ اب تک تمہارے حواس پر پردہ پڑا تھا۔ ذرا اس پردہ کو ہٹاؤ اور یوسف کو پہچانو۔ اس کے ساتھ بن یامین بھی ہے۔ گویا فی الجملہ آپ نے تعیین کر دی کہ کہیں اور جگہ جانے کی ضرورت نہیں ہے مصر ہی کو جاؤ اور بن یامین کے پاس جاؤ۔ جہاں بن یامین ملے گا وہیں یوسف بھی ملے گا۔ بڑے بیٹے کو تلاش کرنے کا حکم نہ دیا کیونکہ وہ اپنی مرضی سے مصر میں ٹھہرا تھا اور حصولِ اذن کے پانے کے بعد آسکتا تھا۔ اللہ اکبر قدرتِ الٰہی بھی عجیب ہے اس کے سربستہ رازوں کو کون سمجھتا ہے۔ اگر کسی کو کچھ اطلاع ہو بھی جاتی ہے تو مجال نہیں کہ دم مار سکے اور کسی طرح اس کو ظاہر کر سکے۔ حضرت یعقوبؑ نے چاہِ کنعان میں یوسف کی تلاش نہ کرائی۔ زلیخا کے محل میں نہ کرائی۔ مصر کے جیل خانے میں نہ کرائی۔ کیونکہ اس وقت تک اجازت نہ تھی۔ اب وقت آیا حکمتِ الٰہیہ کا اقتضاء ہوا تو تختِ شاہی پر یوسف کو ڈھونڈا جاتا ہے اور کس تدبیر سے تلاش کی جاتی ہے کہ جنہوں نے یوسف کو کھویا تھا مشیتِ الٰہی کے خلاف اپنی برتری اور بہتری کی تدبیر کی تھی انہیں سے یوسف کی تلاش کرائی جاتی ہے اور گم کرنے والوں کو ڈھونڈنے پر مامور کیا جاتا ہے۔

مقصودِ بیان آیات دلالت کر رہی ہیں کہ حضرت یعقوبؑ کو یوسف کی زندگی کا اور مصر میں موجود ہونے کا پورا علم تھا، مگر آپ صراحتًہ ظاہر نہیں فرماتے تھے بلکہ در پردہ ایماء و اشارہ کے طور پر ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو۔ یوسف کی جستجو کرو، امید ہے کہ اللہ سب کو ملا دے گا گویا ان آیات سے اس طرف اشارہ ہے کہ واقفانِ اسرار اظہار کے مجاز نہیں۔ جب اور جس قدر اذنِ الٰہی ہوتا ہے اسی وقت اور اسی قدر اظہار کرتے ہیں۔ حکمتِ الٰہی کا پردہ فاش نہیں کرتے۔ در پردہ امتِ مسلمہ کو ہدایت ہے کہ تم میں سے جو کوئی صفاتِ غیبیہ سے واقف ہو جائے تو بدون اجازت اس کا اظہار نہ کرے۔ یہ آدابِ عرفان کے خلاف ہے۔ آیت میں صاف حکم دیا گیا ہے کہ رحمتِ الٰہیہ سے کسی وقت مایوس

نہ ہونا چاہیئے۔ اگرچہ کامیابی کا ظاہری سبب کوئی بھی نہ ہو، اگر مسبب الاسباب پر نظر رکھنی لازم ہے وہ اسباب پیدا کر سکتا ہے۔ آخر میں اس کی بھی صراحت ہے کہ کافر ہی رحمتِ الٰہیہ سے مایوس ہوتے ہیں یعنی ان کا اعتقاد چونکہ اللہ کی غیبی طاقت پر نہیں ہوتا ان کی نظر ظاہری اسباب پر منحصر ہوتی ہے، اس لئے جہاں ظاہری اسباب کا فقدان ہوا اور ان پر مایوسی چھائی وغیرہ۔ آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ تمام کارخانہ قدرت اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ ظاہری ذرائع مؤثر نہیں۔ مؤثر فقط قدرتِ باری ہے۔ اس کی رحمت پر سب کچھ موقوف ہے۔ اس سے ان فرقوں کے عقیدے کی بھی تردید ہوتی ہے جو انسان کو مختارِ مطلق مانتے ہیں اور خلاقِ اسباب آدمی کو قرار دیتے ہیں۔ گویا ان کو رحمتِ الٰہیہ کا یقین نہیں اور نہ قدرتِ خداوندی پر ان کا ایمان ہے وغیرہ۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَيْهِ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ

غرض جب یہ یوسف کے پاس پہنچے تو کہنے لگے اے عزیز ہم پر اور ہمارے گھر والوں پر بڑی سختی ہے ہم ناقص پونجی

مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ ۝

لائے ہیں آپ ہم کو پوری بھرتی دیدیجئے اور ہم پر خیرات کیجئے اللہ خیرات کرنے والوں کو جزا دیتا ہے

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ۝ قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ

یوسف نے کہا کیا تم واقف ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا جب تم نادان تھے بھائی بولے کیا واقع

لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَاۤ اَخِىْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ

میں آپ ہی یوسف ہیں؟ یوسف نے کہا میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے اللہ نے ہم پر احسان کیا جو شخص

مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ

ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوں کا اجر برباد نہیں کرتا بھائیوں نے کہا خدا کی قسم بلاشبہ

اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـئِيْنَ ۝ قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ

تم کو اللہ نے ہمارے اوپر برتری عطا کی ہے اور بلاشبہ ہم ہی خطاوار تھے یوسف نے کہا آج تم پر کوئی الزام نہیں خدا تم

اللّٰهُ لَكُمْ ؗ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝ اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِىْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ

کو معاف کرے وہی بہترین مہربان ہے میرے اس کرتہ کو لے جاؤ اور میرے باپ کے چہرے پر جا کر ڈال دو

اَبِىْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِىْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ ع

تاکہ وہ بینا ہو جائیں اور میرے پاس سب گھر والوں کو لے آؤ

تفسیر باپ کے حکم کے مطابق بیٹے مصر کو گئے۔ اس مرتبہ غلہ لانا مقصود نہ تھا بلکہ یوسف کی تلاش اصل غرض تھی۔ مادۂ حسن فائل ہو چکا تھا۔ کارخانۂ قدرت کے سربستہ راز کے انکشاف کا وقت قریب آگیا تھا، مگر پھر بھی عالم اسباب پر نظر کرتے ہوئے تحصیل معاش کا بہانہ کیا اور اپنے حقیر سرمایہ کو لے کر عزیز مصر کے دربار میں پہنچے اور انتہائی عاجزی کے ساتھ اپنے اہل و عیال کے فقر و فاقہ کا اظہار کیا (بقول ابن اسحاق) یوسفؑ کے آنسو بھر آئے ضبط نہ ہو سکا۔ اذنِ الٰہی بھی ہو چکا تھا۔ آپ نے حقیقت ظاہر کر دی اور فرمایا یاد کرو تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا لیکن اس وقت تم لوگ نادان تھے۔ تم نے نادانی سے ایسی ناشائستہ حرکات کا ارتکاب کیا۔ آخری فقرہ فرما کر حضرت یوسف نے بھائیوں کو زیادہ شرمندہ کرنا نہ چاہا بلکہ ان کے زمانۂ جہالت کے ذکر کر کے ایک عذر بیان کر دیا کہ تم نے جو کچھ کیا نادانی سے کیا۔ پھر بھائیوں کے استفسار کا ایجابی جواب دیتے ہوئے اپنی حکومت، عزت اور برتری کی اصل وجہ یعنی الہام الٰہی کو بھی ظاہر کر دیا اور یہ انعام جس بنا پر ہوا اس کو بھی بیان کر دیا کہ جو شخص ممنوعات الٰہیہ سے پرہیز رکھتا ہے اور اوامر خداوندی پر کاربند رہتا ہے اللہ اس کو خالص نیکوکاروں کے زمرہ میں داخل فرما لیتا ہے اور نیکوکاروں کی کوشش رائیگاں نہیں جاتی، یہی قانونِ قدرت ہے برادرانِ یوسف اپنی غلطی پر نادم تو پہلے ہی تھے، مگر کھلم کھلا اقرار کا موقع نہیں آیا تھا۔ یوسف کی تقریر سن کر اور ان کی عظمت دیکھ کر اب یوسف کی فضیلت اور اپنے قصور کا اعتراف کیا اور یہ ظاہر ہے کہ اعتراف کے بعد بلند حوصلہ ہستیاں انتقامی کارروائی نہیں کرتی ہیں۔ حضرت یوسف نے بھی فطری اور وہبی علوِ ہمت سے کام لے کر سب کو معاف کر دیا، لیکن آدابِ نبوت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی طرف سے مغفرت کا اظہار نہیں کیا بلکہ مغفرتِ الٰہی کی دعا کی۔ بات یہ تھی کہ بھائیوں کے قصور میں تین ہستیوں کا تعلق تھا۔ ۱۔ خود حضرت یوسفؑ کا ۲۔ اللہ کی نافرمانی کا ۳۔ باپ کو دھوکہ دینے کا۔ حضرت یوسفؑ نے اپنا حق لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ کہہ کر معاف کر دیا اور اللہ کے حق کی معافی کی دعا مانگی، لیکن بصیغۂ مضارع تاکہ والد کا ادب باقی رہے اور وہ کامل طور پر دعائے مغفرت کریں۔ اس کے بعد آپ نے اپنا قمیص لے کر باپ کے پاس جانے اور ان کے چہرہ پر ڈالنے اور سب متعلقین کو ساتھ لانے کی بھائیوں کو ہدایت کی اور یہ فرما دیا کہ والد کے چہرے پر قمیص ڈالو گے تو ان کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔

مقصود بیان آیت وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا دلالت کر رہی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں پر مال صدقہ حرام نہ تھا بلکہ سفیان بن عیینہ نے تو اسی آیت سے یہ مسئلہ استخراج کیا ہے کہ سوائے ہمارے آقائے محترم کے کسی نبی پر صدقہ حرام نہ تھا۔ برادرانِ یوسف نے اپنی عاجزی، تنگدستی اور محتاجی کو ظاہر کر کے عزیز مصر کے دل میں جذبۂ رحم کو ابھارنا چاہا تھا، اور اسی تدبیر سے وہ اپنی غرض کی جستجو کرنی چاہتے تھے کہ اگر عزیز کو رحم آگیا تو باپ کی ہدایت کے موجب اپنا مدعا ظاہر کریں گے ورنہ چپ رہیں گے۔ اس بات سے اس طرف اشارہ ہے کہ اپنی حاجت کے لئے جائز طور پر حیلہ کرنا شرعاً ناجائز نہیں ہے۔

آیت قَدْ مَنَّ اللّٰهُ الخ سبق دے رہی ہے کہ مسلمان کو خدا تعالیٰ جو برتری، فضیلت، اور نعمت عطا فرمائے اس کو محض انعام الٰہی سمجھے۔ اپنی کوشش اور قابلیت کا نتیجہ نہ جانے۔ آیت مَنْ يَّتَّقِ الخ بتا رہی ہے کہ انعام الٰہی کے مستحق فرماں بردار بندے ہوتے ہیں۔ جو لوگ نیکوکار ہوتے ہیں اللہ ان کو ضرور نوازتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کا قول لَا تَثْرِيْبَ الخ دلالت کر رہا ہے کہ بلند ہمت شخص کو اقتدار حاصل ہونے پر انتقام نہ لینا چاہئے بلکہ درگذر کرنی چاہئے اور معاف کر دینا چاہئے۔ کمزور سے بدلہ لینا علوِ ہمت کے منافی ہے وغیرہ۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ○

اور جب قافلہ جدا ہوا تو ان کے باپ نے (لوگوں سے) کہا اگر تم مجھے سٹھیا ہوا بہکا نہ کہو تو (بتاؤں) کہ مجھے یوسفؑ کی بو آ رہی ہے

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ ○ فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ

متعلقین نے کہا خدا کی قسم آپ تو اپنی پرانی غلطی میں ہیں پھر جب خوشخبری دینے والا آگیا تو اس نے باپ کے چہرے پر کرتہ ڈال دیا

فَارْتَدَّ بَصِيرًا ۚ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ ۚ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

اور وہ بینا ہو گئے اور بولے کیوں میں نے تم سے نہیں کہا تھا مجھے اللہ کی طرف سے وہ علم ہے جو تم کو نہیں ہے

قَالُوا يَا أَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا إِنَّا كُنَّا خَاطِئِينَ ۝ قَالَ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ

بیٹوں نے کہا ابا ہمارے گناہوں کی معافی مانگئے بلاشبہ ہم قصوروار ہیں یعقوبؑ نے کہا میں تمہارے لئے اپنے رب سے

رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝

دعائے مغفرت کروں گا وہی غفور رحیم ہے

تفسیر غرض جب برادرانِ یوسف کا قافلہ پیراہنِ یوسف کو لے کر مصر چلا تو کچھ ہی دور پہنچنے پایا تھا کہ حضرت یعقوبؑ کو یوسفؑ کی خوشبو محسوس ہوئی۔ ابن کثیر نے بقول ابن عباس بیان کیا ہے کہ جب قافلہ شہر سے چلا تو ہوا چلی اور اس نے قمیصِ یوسفؑ کی خوشبو حضرت یعقوبؑ کو پہنچائی۔ پس آپ نے آٹھ روز کی مسافت سے خوشبو کا احساس کر لیا۔ حسن اور ابن جریج کا قول ہے کہ درمیان میں اسی فرسنگ کا فاصلہ تھا۔ حضرت یعقوبؑ نے پوتوں سے فرمایا مجھے پیراہنِ یوسف کی خوشبو آ رہی ہے، اگر تم اس کو حواس کی خرابی سے بے وقوفی اور نادانی سے تعبیر کرو گے۔ پوتوں نے جواب دیا آپ تو اپنی پرانی غلطی پر قائم ہیں۔ یوسف کہاں اور اس کی خوشبو کہاں۔ ابن عباسؓ نے اس جگہ ضلال کا ترجمہ خطار اور غلطی کیا ہے اور یہی درست ہے۔ کچھ مدت کے بعد جب خوش خبری دینے والا (بقول مجاہد وسدی) یہودا آیا اور باپ کے چہرہ پر پیراہن ڈالا تو معجزۂ یوسفی سے باپ کی آنکھیں اصلی حالت میں ہو گئیں۔ بیضاوی نے زمخشری کے اتباع میں حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں روشن ہونے کی یہ تاویل تحریر کی ہے کہ فرطِ خوشی سے بدنی قوت میں جوش پیدا ہو گیا جس سے بینائی درست ہو گئی، مگر یہ تاویل بعید از عقل ہے۔ فرقۂ معتزلہ جس کا امام زمخشری ہے حضرت یعقوبؑ کی بینائی زائل ہونے کا قائل ہی نہیں ہے اور آنکھوں کے سفید ہو جانے کے معنی گرفت گریہ کو قرار دیتا ہے۔ اسی لئے بینا ہونے کی بھی اس نے ایسی تاویل کی جو طب اور شرع دونوں کے خلاف ہے۔ بیضاوی نے اس کا اتباع کیا۔ صحیح صرف یہ بات ہے کہ یہ یوسفؑ کا معجزہ تھا جس کی اطلاع آپ نے قبل از روانگی دے دی تھی۔ غرض آنکھیں روشن ہونے کے بعد حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کیوں میں نے نہیں کہا تھا کہ اللہ کی طرف سے جو علم مجھے عطا ہوا ہے اس سے تم واقف نہیں۔ سچ ہے خاصانِ خدا کا الہام اور کشف غلط نہیں ہوتا۔ شیخ سعدی نے لکھا ہے کہ کسی نے حضرت یعقوبؑ سے پوچھا کہ آپ نے مصر سے تو بوئے پیراہن سونگھ لی، کنعان کے کنوئیں میں کیوں نہ دیکھ لیا۔ فرمایا ہم لوگوں کا حال بجلی کی چمک کی طرح ہے جب چمکی دیکھ لیا نہ چمکی نہ دیکھا۔ جب سب بیٹے باپ کے پاس پہنچ گئے تو اپنے قصور کی معافی کے طالب ہوئے اور یہ بھی عرض کیا کہ آپ ہمارے لئے خدا سے دعائے مغفرت کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا میں عنقریب تمہارے لئے دعائے مغفرت کروں گا۔ قیصی کہتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے اس وقت دعائے مغفرت بالکل نہ کی کیونکہ ان کو معلوم نہ تھا کہ یوسفؑ نے ان کو معاف کر دیا ہے یا نہیں اور حق یوسفؑ کا تھا لیکن دعا کا وعدہ کر لیا۔ بیضاوی نے بھی اس کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ اس امر کی تائید ایک روایت سے ہوتی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصر پہنچنے کے بعد حضرت یعقوبؑ نے قبلہ رو کھڑے ہو کر دعائے مغفرت کی اور ان کے پیچھے یوسفؑ نے آمین کہی اور یوسفؑ کے پیچھے دسوں بھائی نہایت عاجزی کے ساتھ لرزتے، کپکپاتے کھڑے رہے اور بالآخر جبرئیل نے قبول دعا کی بشارت دی۔ ابن مسعود، ابراہیم تیمی، عمرو بن قیس اور ابن جریج وغیرہم کا قول ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے سحر کے وقت دعائے مغفرت کرنے کا وعدہ کیا، لیکن معالم وسراج وابن عباس کا قول مروی ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے دعا کرنے میں شب جمعہ تک تاخیر کی۔ ممکن ہے یہ واقعہ پنج شنبہ کا ہو دوسرے روز جمعہ کے وقت حضرت یعقوبؑ نے دعائے مغفرت کی ہو۔

مقصود بیان جن کے باطنی حواس تیز ہوتے ہیں ان کو محبوب کی خوشبو کا احساس دور سے ہوتا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے پیراہن یوسف کی بُو دور سے پالی تھی۔ حقیقت شناس آدمی کو ظاہر پرست طبقہ مجنون اور بے وقوف سمجھتا ہے۔ اس کے قول کو دیوانے کی بڑ جانتا ہے۔ اگر واقع میں وہ خود پاگل ہوتا ہے۔ حقیقت اس کی نظروں کے سامنے نہیں ہوتی۔ پیراہن یوسفؑ سے حضرت یعقوبؑ کی آنکھیں روشن ہوگئی تھیں۔

جو لوگ آداب قرب سے واقف ہیں وہ کسی کے لئے دعائے مغفرت بھی بغیر حصول اجازت کے لئے اور بدون موقع کے نہیں کرتے۔ انبیاء کا علم اپنے زمانے کے لوگوں سے زائد ہوتا ہے لیکن کل علم ہوتا ہے خداداد وغیرہ۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ اٰوٰى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ

غرض جب یوسفؑ کے پاس پہنچے تو یوسف نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں داخل ہو امن کے ساتھ اگر اللہ کی

اٰمِنِيْنَ ؕ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ

مشیت ہو یوسفؑ نے اپنے ماں باپ کو اٹھا کر تخت پر بٹھالیا اور سب اُس کے سامنے سجدہ میں گر گئے یوسف نے کہا ابا یہ میرے

رُءْيَایَ مِنْ قَبْلُ ؗ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ

پہلے خواب کی تعبیر ہے میرے رب نے اُس کو سچ کر دکھایا اُس نے میرے ساتھ احسان کیا کہ مجھے قید سے

السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِیْ وَبَيْنَ

نکالا اور تم سب کو گاؤں سے لے آیا بعد اس کے کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان

اِخْوَتِیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝

جھگڑا ڈالا میرا رب جو کچھ چاہتا ہے تدبیر سے کرتا ہے وہی خبردار و مصلحت بین ہے

تفسیر معالم، سراج اور بیضاوی میں لکھا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے کل خاندان کی سواری اور ان کا سامان اٹھانے کے لئے سو اونٹنیاں معہ ساز و سامان کے روانہ کی تھیں۔ انھیں اونٹنیوں پر سوار ہو کر حضرت یعقوبؑ تمام خاندان سمیت مصر پہنچے۔ شہر کے باہر حضرت یوسفؑ نے استقبال اور قیام کا بندوبست کر دیا تھا۔ بقول ابن کثیر بادشاہ بھی کثیر جماعت امراء کے ساتھ استقبال کو آیا تھا۔ سیوطی نے تحبیر میں اور قرطبی وغیرہ نے لکھا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی عمر اس وقت ۱۳۰ سال کی تھی۔ شہر کے باہر حضرت یوسفؑ والدین سے ملے اور سب کو شہر میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ اس وقت حضرت یعقوبؑ کے ساتھ یوسفؑ کی حقیقی والدہ تھیں یا خالہ جن کو محاورہ عرب کے موافق والدہ کہا گیا۔ معالم و سراج میں ابن عباس کا قول اور تفسیر ابن کثیر میں سدی اور عبدالرحمن بن زید کا قول نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی خالہ لیا تھیں۔ بیضاوی نے اس قول کی تضعیف کی ہے اور لکھا ہے کہ لیا کا انتقال تو راحیل کے نکاح سے پہلے ہو چکا تھا۔ ابن کثیر نے بقول ابن اسحاق و ابن جریر لکھا ہے کہ اس وقت یوسفؑ کے ماں باپ دونوں زندہ تھے۔ ابن جریر کا قول ہے کہ کوئی قابل اعتماد دلیل نہیں پائی جاتی اس بات کی کہ یوسفؑ کی والدہ مر گئی تھیں۔ حضرت یعقوبؑ جس وقت مصر پہنچے تو آپ کے کنبہ کی تعداد ستر یا بہتر اور بقول مسروق تہتر تھی اور عاشورہ کے دن داخل ہوئے تھے۔

سجدہ سے حقیقی سجدہ مراد ہے یا صرف جھکنا۔ اس کی تفصیل ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔ اگر حقیقی سجدہ ہی مراد ہو تب یہ معنی ہوں گے کہ یوسفؑ کے والدین اور بھائی یوسفؑ کی عزت و عظمت کو دیکھ کر سربسجود ہو گئے اور بارگاہِ الٰہی میں نسلِ اسرائیلی کے اعزاز کا شکر ادا کیا گویا مسجود خدا تھا اور یوسف کا اعزاز سبب سجدہ۔ اس کے بعد یوسفؑ نے اللہ کے احسانوں کا تذکرہ کیا اور خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا کی۔

مقصودِ بیان والدین کی تعظیم لازم ہے۔ حضرت یوسف نے بھی باوجود اس قدر عظمت شان کے والدین کی تعظیم کی۔ آیت اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ بتا رہی ہے کہ کامیابی، عزت، عافیت وغیرہ کا کتنا ہی یقین ہو، مگر انشاء اللہ کہنا اور پیش آنے والے واقعہ کو مشیت الٰہی کے سپرد کرنا لازم ہے۔ اونچا بٹھانا بھی اعزاز کی ایک قسم ہے۔ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ خاندان کے کسی فرد کی عزت و حکومت سے پورے خاندان کی عزت بڑھتی ہے جس کا شکریہ واجب ہے اور شکر کی انتہائی شکل سجدہ ہے۔ آیت وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْ تعلیم دے رہی ہے کہ آدمی کتنا ہی عالی قدر اور خود مختار حکمران ہو جائے اور حصول عزت میں اس نے کیسی ہی قابلیت اور کوشش صرف کی ہو، مگر اس کو انعام الٰہی سمجھے اور اپنی کوشش کا نتیجہ نہ جانے۔ دیہات سے نکل کر کسی متمدن شہر میں عزت کے ساتھ رہنا بھی انعام الٰہی ہے خصوصاً کنعان سے نکل کر مصر پہنچنا اور وہاں حکومت پر فائز ہونا تو نعمتِ غیر مترقبہ تھی کیونکہ بابل کی عظمت تباہ ہو چکی تھی۔ مصر بابل سے ٹوٹ کر خود مختار سلطنت ہو گئی تھی۔ ایسی سلطنت کا حصول تو بعید از امید تھا۔ آیت مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الخ دلالت کر رہی ہے کہ بھائیوں کو خواہ وہ علاتی ہوں محبت و الفت سے رہنا چاہیئے۔ بھائیوں کی باہمی عداوت شیطانی حرکت ہے۔ آخری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا ہے کر لیتا ہے اور ایسی باریک و مدرس تدبیر کرتا ہے جس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں ہوتا وغیرہ۔

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ

اے میرے رب تو نے مجھے بادشاہت عطا کی اور خوابوں کی تعبیر دینی سکھائی اے آسمان و زمین کے پیدا

وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ○

کرنے والے تو دنیا و دین میں میرا کارساز ہے مجھے اسلام کی حالت میں ہی موت دیجو اور نیک لوگوں کے ساتھ ملا دیجو

تفسیر جب خدا تعالیٰ نے یوسف کو پوری نعمتوں سے سرفراز فرمایا تو ایک روز تخلیہ کے وقت ماں باپ اور بھائیوں سے انعامات الٰہی کا تذکرہ کیا اور آخر میں روئے سخن مخلوق سے ہٹا کر خالق کی طرف کر کے دعا کی جس میں اول ان مادی اور روحانی نعمتوں کو بیان کیا جو اللہ نے ان کو دی تھیں۔ پھر خدا کی صفتِ عالیہ کو ظاہر کر کے اپنے نیک انجام کی خواہش کی۔

لفظ مِنَ الْمُلْكِ سے بعض مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ شاید یوسفؑ خود مختار بادشاہ ہو گئے تھے۔ مگر یہ غلط ہے۔ ملک سے مراد ہے حکومت اور چونکہ وزیر اعظم تھے اسی لئے حکومت حاصل تھی۔

احادیث سے مراد خوابیں ہیں جیسا کہ اکثر مفسرین کا خیال ہے یا کلام الٰہی ہے جو اس وقت تک صحیفوں کی شکل میں حضرت ابراہیم وغیرہ پر نازل ہو چکا تھا۔

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا کے تفسیری معنی میں علماء کا بڑا اختلاف ہے۔ بعض لوگ اس کو دعائے موت قرار دیتے ہیں اور اپنے قول کے ثبوت میں اقوال و آثار پیش کرتے ہیں جس کا تذکرہ ہم ابتدائے سورت میں کر آئے ہیں، مگر ہمارے نزدیک حق یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے مرنے کی دعا نہ کی تھی بلکہ اس دعا سے آپ کا مقصود محض وقت وفات کا اسلام تھا۔ گویا تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا کے معنی ہوئے پروردگارا تو مرنے کے وقت مجھے مسلمان رکھنا۔

مقصود بیان حضرت یوسف کی یہ دعا بتا رہی ہے کہ دنیا کی نعمتیں کتنی ہی عظیم الشان ہوں۔ یہاں تک کہ سلطنت مل جائے، مگر آخرت کی نعمت کے بغیر ناکارہ اور ہیچ ہیں۔ اسی لئے اہل عرفان دنیا و دین دونوں کی بہتری کی دعا کرتے ہیں اور آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس دعا کے آخری الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ زمرۂ صالحین میں داخل ہونا سب سے بڑی نعمت ہے۔ آیات کی ترتیب سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ دعا کرتے وقت مسلمان پر لازم ہے کہ سب سے پہلے ان احسانوں کا تذکرہ کرے جو اللہ نے اس پر مبذول فرمائے ہیں۔ پھر اللہ کے عمومی صفاتِ کمال کو ذکر کرے۔ پھر اللہ کو اپنا کارساز جانتے ہوئے اپنے کل امور اُس کے سپرد کر دے اور آخر میں اصل مدعا کو ظاہر کرے۔ احادیث اور اقوال صحابہ میں بھی یہی تعلیم دی گئی ہے وغیرہ۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ

(اے محمد) غیب کی یہ چند خبریں بذریعہ وحی ہم تم کو بتا رہے ہیں جب انھوں نے اپنے مشورہ کو پختہ کر لیا تھا اور فریب کر رہے تھے تو تم اُس وقت

يَمْكُرُوْنَ ۝ وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ

وہاں موجود نہ تھے لیکن اکثر لوگ ماننے والے نہیں خواہ تم (کتنی ہی) حرص کرو تم اُن سے کوئی

عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ع

مزدوری بھی نہیں مانگتے ہو یہ تو سارے جہان کے لئے ایک نصیحت ہے

تفسیر حضرت یوسف اور ان کے بھائیوں کا قصہ ختم کرنے کے بعد قصے کی اصل غرض بیان فرماتا ہے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ ہم نے جو پیغمبر کا قصہ ان کی طرز زندگی آزمائش کے وقت ثابت قدم رہنا اور عروج و ترقی کے وقت شکر کرنا اور اللہ کی یاد کرنا اور رنج و راحت میں نفس کا تزکیہ کرنا وغیرہ بیان کیا۔ یہ غیب کی خبر ہے۔ ہزاروں برس پہلے کا واقعہ ہے عرب میں عام طور پر لوگ اس سے واقف نہ تھے۔ جس زمانے کا قصہ ہے اس زمانے میں تم بھی موجود نہ تھے، لیکن ہم نے تمہارے پاس وحی بھیجی اور کل واقعہ کی اطلاع دی۔ یہ بات قرآن کی حقانیت اور تمہاری رسالت کی صداقت کی دلیل ہے، مگر اس کے باوجود اکثر لوگ تمہاری تصدیق نہ کریں گے۔ تم کتنی بھی کوشش کرو، انتہائی شفقت سے کام لو، لیکن وہ ایمان لانے والے ہی نہیں۔ تاہم تمہارا فرض ادا ہو جائے گا۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ حضور نے فرمایا بعض لوگ آگ جلاتے ہیں۔ پتنگے پروانے آگ میں گرنے لگتے ہیں وہ شخص ہر چند ہٹاتا اور دفع کرتا ہے، مگر کیڑے زبردستی گرتے ہیں۔ یہی حال میرا ہے۔ میں تمہاری کمر پکڑ کر تم کو دوزخ میں گرنے سے روکتا ہوں، مگر تم نہیں مانتے اس میں گرے پڑتے ہو۔

عرب میں دستور تھا کہ جب کوئی دشمن کسی قوم پر شب خون مارنے کے ارادے سے چڑھائی کرتا اور اس قوم میں سے کسی کو قبل از وقت اطلاع مل جاتی تو وہ برہنہ ہو کر قوم میں گشت کرتا اور چلاتا اور دشمن کے آنے کی اطلاع دیتا۔ لوگ آگاہ ہو کر راتوں رات بندوبست کر لیتے۔ اس شخص کو نذیر کہا جاتا تھا۔ حضور اقدس نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی نذیر نے کسی قوم کو دشمن کے حملہ کرنے کی اطلاع دی، کچھ لوگوں نے اس کے قول کو سچ مانا اور اپنے کو بچا یا وہ عافیت میں رہے۔ بعض نے اس کی تکذیب کی ان پر دشمن نے اچانک حملہ کر دیا تو وہ ذلت و ہلاکت میں پڑے۔ یوں ہی میں بھی تمہارے لئے نذیر عریاں ہوں۔ میں تم کو آگاہ کرتا ہوں کہ تمہارے سامنے عذاب شدید ہے۔ بچو، بچو۔ اسی طرح بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ رسول پاک کو انتہائی حرص تھی کہ کسی طرح لوگ مسلمان ہو جائیں اور عذاب دائمی سے نجات پائیں۔ اسی حرص کی طرف آیت وَلَوْ حَرَصْتَ۔ الخ

میں ارشاد کیا گیا ہے۔
اس سے آگے حضورؐ کی صداقت و حقانیت کی دوسری دلیل بیان فرماتا ہے کہ اے نبی تم ہدایت و رہنمائی کا کوئی معاوضہ ان سے طلب نہیں کرتے۔ نہ عزت نہ حکومت نہ مال نہ کوئی اور ذاتی فائدہ جو کچھ کہتے ہو انہیں کے فائدے کے لئے کہتے ہو۔ عذاب الٰہی سے بچانے کے لئے یہ قرآن نازل کیا گیا ہے۔ اس میں تمام دنیا کی ہدایت کے لئے قوانین نصیحت موجود ہیں اور رمنوا ابلاشائستگی درج ہیں۔ پھر انتہائی حماقت ہے کہ ایسی صورت میں بھی تمہاری نصیحت کی یہ لوگ قدر نہیں کرتے۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہؐ اپنے پاس ایک پائی بھی نہ رکھتے تھے۔ جس قدر مال دولت محاصل زمین خراج عشر اور زکوٰۃ وغیرہ کی رقمیں وصول ہو کر آتی تھیں، آپ ایک ایک پائی تقسیم کر دیتے تھے۔ آپ نے کبھی دونوں وقت تہائی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ سونے کے لئے کبھی آرام دہ نرم بستر اختیار نہیں کیا، رہنے کے لئے کبھی شاندار مکان نہ بنایا۔ بادشاہ یا امیر کا لقب کبھی اپنے لئے پسند نہیں کیا۔ بڑھیا لباس کبھی زیب تن نہیں فرمایا۔ خادموں، نقیبوں اور چوب داروں کے پرے اپنے پاس نہ رکھے۔ شاہانہ دربار کبھی نہ سجایا۔ ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر ذرا غور کرنا چاہیئے کہ پھر حضورؐ کی کون سی دنیوی غرض تھی کہ لوگوں کو حلقہ بگوش اسلام بنا کر آپ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ کون سا معاوضہ تھا جس کو آپ لینا چاہتے تھے سوائے اس کے کہ لوگوں کو نصیحت کرتے تھے اور انہیں کے فائدے کے لئے کرتے تھے یہی مطلب ہے وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ کا اور یہی معنی ہیں إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ کے۔

مقصود بیان اہل بصیرت کی ہدایت کے لئے رسول اللہؐ کی تصدیق و حقانیت کے دلائل کا بیان۔ اس امر کی صراحت کہ حضور اقدسؐ کو لوگوں کے مسلمان ہونے کی انتہائی خوشی تھی بلکہ یہ خواہش حرص کے درجہ تک پہنچ گئی تھی، مگر یہ خواہش نفسانی اغراض کے تحت نہ تھی۔ صرف اُمت کے فائدے کے لئے تھی۔ اس امر پر تنبیہ کہ دنیا میں کافروں کی کثرت اکثر رہے گی۔ اس بات کا بلند آہنگی سے اعلان کہ قرآن پاک کل دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہے۔ کسی قوم اور کسی ملک کی تخصیص نہیں۔ گویا رسول پاکؐ کی بعثت تمام دنیا کے لئے ہے۔ خواہ گورے ہوں یا کالے حجازی ہوں یا عجمی وغیرہ۔

وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّونَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُونَ ○

زمین و آسمان میں بہتیرے نشانہائے قدرت ہیں جن پر یہ گزرتے ہیں مگر اُن کی طرف سے منہ پھیرے گزرتے ہیں

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ○ أَفَأَمِنُوا أَنْ تَأْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ

ان میں سے اکثر اللہ کو نہیں مانتے اور مانتے بھی ہیں، تو شریک قرار دیتے ہوئے کیا یہ لوگ اس بات سے بیخوف ہیں کہ اللہ کے

مِنْ عَذَابِ اللَّهِ أَوْ تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ○

عذاب کی اُن پر کوئی آفت آ پڑے گی یا اچانک اُن پر قیامت آ جائے گی اور اُن کو خبر بھی نہ ہوگی

تفسیر اوپر کی آیات میں رسول پاکؐ کی صداقت کی دو دلیلیں بیان کی تھیں۔ گزشتہ واقعات کی اطلاع دینا بغیر کسی کے سکھائے پڑھائے ہوئے اور بغیر طلب معاوضہ کے تبلیغ و ہدایت کرنا۔ اب یہاں تیسری دلیل بیان کرتا ہے۔ جس سے توحید رسالت اور پیام رسولؐ کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ عام لوگ عجیب کور بصیرت واقع ہوئے ہیں۔ مضمون قرآن پر وہ غور نہیں کرتے۔ رسول کے طریقہ تبلیغ اور عزم و ہمت پر وہ توجہ نہیں کرتے اور آیات قدرت کا وہ مطالعہ نہیں کرتے۔ آسمانوں اور زمینوں میں قدرت کی غیر متعدد نشانیاں ہیں۔ آسمان کے ہر ستارے سے، سمندر کے ہر قطرے سے، ریگستان کے ہر ذرے سے، پہاڑوں کے ہر پتھر سے اور درختوں کے ہر پتے سے اللہ کی ربوبیت وحدانیت ٹپک رہی

ہے، مگر وہ غفلت کی حالت میں ہر چیز کی طرف سے گزر جاتے ہیں اور خاموش آوازِ قدرت کو کان دھر کے نہیں سنتے۔ اکثر لوگ اللہ کو اگر مانتے بھی ہیں تو اس طرح سے جو شرک آمیز ہے۔ دعویٰ کرتے ہیں ایمان کا اور عقیدہ رکھتے ہیں شرک کا۔ ابن کثیر نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے جس کو بیہقی نے صحیح میں تعلیقاً اور رزین نے مسنداً روایت کیا ہے کہ جب کافروں سے پوچھا جاتا ہے کہ تم کو کس نے پیدا کیا ہے اور آسمان و زمین کا کون خالق ہے تو جواب دیتے ہیں کہ سب کا خالق اللہ ہے۔ پس یہ تو ان کا ایمان ہے، لیکن وہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا دوسروں کی۔ پس یہ ان کا شرک ہے۔ مجاہد، عکرمہ، عطا، شعبی، قتادہ اور عبدالرحمن بن زید کا یہی خیال ہے، لیکن ابن عباس کے مذکورہ قول سے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آیت وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ کا نزول فقط قریش کے حق میں ہوا تھا۔ تخصیص کی کوئی وجہ نہیں بلکہ اس زمانہ میں جو لوگ بھی ایسے تھے، اللہ کو خالق جاننے کے باوجود غیر اللہ کو شریک سمجھتے تھے، سب آیت کے ذیل میں آتے ہیں خواہ مشرکین عرب ہوں جو بت پرستی کرتے تھے یا صابی ہوں جو ستارہ پرست تھے یا مجوسی ہوں جو آتش پرست تھے یا یہودی ہوں جو عزیر کو ابن اللہ اور اپنے علماء و مشائخ کو حاکم مطلق یقین کرتے تھے یا عیسائی ہوں جو مسیح کو خدا بنا لیا کرتے تھے۔ آیت کا مورد کوئی خاص نہیں اور خاص ہو تب بھی حکم عام ہے۔ ہر شرک آمیز ایمان رکھنے والا آیت کے ذیل میں داخل ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے قیامت تک جو شخص بھی صفاتِ الٰہیہ کا وجود کسی غیر میں ثابت کرے گا یا کرتا تھا یا کرتا ہے اور تصرفاتِ خداوندی کا مالک دوسری کو جانتا ہے وہ مومن مشرک ہے۔ مومن اور ایمان آمیز شرک یا شرک آمیز ایمان کسی طور پر قابلِ قبول نہیں لہٰذا نہ لائقِ اعتبار ہے۔ ایمان کے ساتھ شرک جمع نہیں ہو سکتا۔ صحیحین میں ایک اور روایت آئی ہے کہ مشرکین عرب خانہ کعبہ کا جس وقت طواف کرتے تو وقتِ طواف یہ الفاظ کہتے۔ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ۔ یعنی بدل و جان ہم تیری عبادت میں حاضر ہیں۔ تیرا کوئی شریک نہیں سوائے صرف وہی تیرا شریک ہے جو خود تیرا ہے تو اس کا مالک ہے وہ تیرا مالک نہیں۔ صحیح مسلم میں ہے کہ جب کفار لَا شَرِيْكَ لَكَ کہتے تو حضور ﷺ اس سے اگلے الفاظ ادا کرنے سے روکتے اور فرماتے بس بس۔ یعنی اس سے آگے کچھ نہ کہو۔ یہ قصہ بھی موردِ نزول نہیں، مگر حکمِ آیت اس کو بھی شامل ہے۔ بعض علماء اس کے بھی قائل ہیں کہ یہ آیت منافقوں کے حق میں نازل ہوئی، مگر صحیح وہی ہے جو ہم نے اوپر لکھ دیا کہ مورد خاص نہیں اور اگر کوئی مخصوص واقعہ سببِ نزول ہو بھی تب بھی حکم عام ہے۔

توحید کے دلائل و براہین صدقِ رسول بیان کرنے کے بعد آگے وعید و ترہیب کے طور پر فرمایا کہ کیا ان مشرکوں کو اس بات کا خوف نہیں کہ ان پر اچانک اللہ کی طرف سے کوئی عذاب آسکتا ہے (اللہ کے سوا ان کے لیے جو معبود ہیں اس کو دفع نہیں کر سکتے) یا موت کا وقت آجائے اور ان کو اس کی کسی علامت سے پیشتر احساس بھی نہ ہو (اس وقت یہ کیا کر سکتے ہیں اور کس طرح عذابِ الٰہی سے بچ سکتے ہیں)

مقصودِ بیان

آیاتِ قدرت پر گہری نظر ڈالنے اور ان سے معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کی لطیف تعلیم۔ شرک آمیز توحید کے ناقابلِ اعتبار ہونے کی بالصراحت۔ موجودہ زمانے کے ان مسلمانوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ درسِ عبرت جو پیروں فقیروں کی نذر نیاز کرتے، مزاراتِ اولیاء سے مرادیں مانگتے، گنڈے تعویز کرتے اور مختلف اقسام کے شگون کے قائل ہیں اور اس کے واسطے سیکڑوں طرح کے حیلے تراشتے ہیں۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ اگر کسی فعل یا عقیدہ میں شرک خفی کی بو بھی آتی ہو تو اس سے گریز کریں، تاکہ کہیں ان کی توحید شرک آمیز نہ ہو جائے اور پھر تمام کیا کرایا برباد ہو جائے اور وہ اپنے خیال میں اپنے کو مومن دین دار سمجھے بیٹھے رہیں۔ آخری آیات میں اشارہ ہے کہ عذابِ الٰہی آنے کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں نہ موت کا کوئی مخصوص زمانہ ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَ
تم کہہ دو کہ یہ میرا راستہ ہے　میں اور جو میرے تابع ہیں　اللہ کی طرف　سمجھ بوجھ کر　بلاتے ہیں　اللہ

سُبۡحٰنَ اللّٰهِ وَمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ○ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ

اللہ پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں (اے محمد) تم سے پہلے ہم نے آدمی ہی

اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَيۡهِمۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡقُرٰىؕ اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ

بھیجے تھے ہم ان کے پاس وحی بھیجتے تھے اور وہ بستیوں کے رہنے والے تھے کیا یہ ملک میں چل پھر کر نہیں

فَيَنۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡؕ وَلَدَارُ الۡاٰخِرَةِ

دیکھتے کہ ان سے پہلے لوگوں کا انجام کیا ہوا اور بیشک دارِ آخرت

خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ اتَّقَوۡاؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ○

پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے کیا یہ لوگ سمجھتے نہیں

تفسیر جب ایمان کی مدلل ترغیب اور وعید آمیز دعوت کا بیان ہو چکا تو اب واضح الفاظ میں تبلیغ کا حکم دیا۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ اے نبی تم صاف طور پر کہہ دو کہ خالص توحید کا اقرار اور شرک سے بیزاری، یہی میری راہِ زندگی ہے، یہی میری سنت ہے۔ اللہ کی ذات پر ایمان لانے کی ہی میں دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی اسی عقیدہ و عمل پر قائم ہوں اور میرے پیرو بھی اسی طریقہ پر قائم ہیں۔ پھر ہماری یہ راہِ زندگی اور دعوتِ توحید و ایمان بلا سوچے اندھا دھند نہیں بلکہ خوب سوچ سمجھ کر دلائل و براہین کی روشنی میں ہم نے اس کو اختیار کیا اور دانش و بصیرت کے ساتھ ہی دوسروں کو اس راہ پر چلنے کو بلاتے ہیں۔ ہم اللہ کو تمام عیوب و نقائص سے پاک اور ہر قسم کے جلی و خفی شرک سے منزہ جانتے ہیں اور کسی طرح ہم مشرکوں کے گروہ میں سے ہونا بھی پسند نہیں کرتے۔

یہاں تک توحید کی تبلیغ تھی اس سے آگے کفار کے وہمی شبہات کا جواب ہے۔ حضور اقدس کی رسالت پر کافروں کو شبہ تھا بلکہ عمومی نبوت کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ کا پیغامبر آدمی ہو یہ کس طرح ہو سکتا ہے، خدا کا پیغام آدمی کے پاس کس طرح آسکتا ہے۔ آدمی آدمی ہے خدا خدا ہے۔ دونوں میں یوں بعید ہے۔ خدا تعالیٰ اس کا جواب دیتا ہے کہ ذرا چل پھر کر دیکھو اس سے پہلے بھی ہم نے آدمیوں کو ہی پیغامبر بنایا تھا۔ یعنی فرشتہ اور جن کو آدمیوں کی ہدایت کے لئے پیغامبر بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ آدمیوں کے ہی پاس ہم وحی بھیجتے چلے آئے ہیں۔ وہ آدمی بھی انھیں بستیوں کے رہنے والے تھے۔ کسی اجنبی نوع کے افراد نہ تھے نہ انسانیت عامہ سے کوئی جداگانہ شکل رکھتے تھے۔ پھر ان کے مخالف بھی ہوئے اور موافق بھی۔ کچھ لوگوں نے ان کی ہدایت کے موافق عمل کیا، شرک اور معاصی کو ترک کیا اور ممنوعات سے گریز کیا۔ کچھ لوگوں نے سرکشی کی۔ نافرمانوں کا انجام کیا ہوا؟ اس کو ذرا چل پھر کر (علاقۂ شام و عراق میں) دیکھو خود ان کا نتیجہ نظروں کے سامنے آجائے گا۔ مرنے میں تو اچھے بُرے فرماں بردار اور نافرمان سب شریک تھے، مگر انجام اچھا انھیں لوگوں کا ہوا جو نیکوکار تھے۔ بعض علماء نے اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَيۡهِمۡ سے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ جنات میں کوئی نبی نہیں گزرا۔ میرے نزدیک یہ استنباط غلط ہے۔ آیت کا سیاق و سباق نیز مفہوم بتا رہا ہے کہ آدمیوں کی ہدایت کے لئے خدا تعالیٰ نے آدمیوں کو ہی پیغامبر بنا کر بھیجا یعنی جن وغیرہ کو نہیں بھیجا، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ جنات کی ہدایت کے لئے بھی کسی جن کو نبی بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ جنات بھی عذاب و ثواب کے اسی طرح مکلف ہیں جیسے انسان۔ تخلیقِ جن و انس دونوں کی غرض عرفان و عبادت ہے۔ اور یہ متفق علیہ ہے کہ علاوہ ہمارے آقائے کریم کے کسی اور آدمی کو اللہ نے جنات کی ہدایت کا حکم نہیں دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جنات

میں بھی انبیاء گزرے ہیں۔ ورنہ ان کے مقابلے میں اللہ کی طرف سے اتمامِ حجت نہ ہوگا۔ ہاں لفظ رجالاً سے اس بات پر استدلال کیا جا سکتا ہے کہ کسی عورت کو شرعی نبی بنا کر خدا نے نہیں بھیجا۔

مقصودِ بیان لفظ بصیرت دلالت کر رہا ہے کہ اسلام کے تمام اصول اور شریعت کے تمام منصوص ضوابط عقلِ انسانی کے مطابق ہیں۔ قرآن کا کوئی جزئیہ خلافِ بصیرت نہیں۔ گویا عقل سلیم کا استخراج اور قرآنی منصوصات ایک ہی ہیں، لیکن عقل کا وہم سے پاک ہونا مشکل ہے اور سلامتِ فکر کا کوئی معیار نہیں، اس لئے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ جو حکم اپنی سمجھ میں نہ آئے اس کو خلافِ عقل قرار دے کر ترک کر دیا جائے۔

آیت میں علمائے اسلام کے لئے ایک خاص سبق ہے کہ تبلیغِ اسلام دلائل کی روشنی میں کرو۔ راہِ حق کی طرف برہان کے ساتھ دعوت دو۔ پھر اسی آیت سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اسلام کی اشاعت قوت و تلوار سے نہیں ہوئی نہ اس کی اجازت ہے۔ بلکہ بصیرت اور اصول کی روشنی میں ہوئی۔ ہاں بے وقوفوں کی دست برد سے تحفظ تلوار کے ذریعہ سے ہوا۔ اس امر پر بھی آیت سے روشنی پڑتی ہے کہ عالمانِ دین کے لئے تبلیغ اسلام لازم ہے۔ آیت وَمَآ اَرْسَلْنَا الخ بتا رہی ہے کہ آدمیوں کی ہدایت کے لئے خدا نے آدمیوں کو ہی پیغامبر بنا کر بھیجا نہ فرشتہ کو پیغام رسانی پہ مامور کیا نہ جن کو نہ کسی غیبی مخلوق کو۔ کوئی عورت بھی نبی نہیں ہوئی پھر بادیہ نشین اور سنگ دل خانہ بدوش صحرائی بھی پیغمبر نہیں ہوئے۔ بلکہ بستیوں کے رہنے والے مہذب اور شائستہ انسان نبی ہوئے۔

نوٹ: قَرْيَة کا لفظ جب مدینہ کے مقابل استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد گاؤں ہوتا ہے اور جب اسی لفظ کو بادیۃ کے مقابل استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد عام بستی ہوتی ہے خواہ بڑی ہو یا چھوٹی۔ گویا صحرا نشین خانہ بدوش اقوام کے خلاف قریہ کے ساکن شمار کئے جاتے ہیں۔ اس آیت میں مؤخر الذکر صورت سے استعمال کیا گیا ہے۔ اول الذکر استعمال قرآن میں نہیں ہے وغیرہ۔

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَیْــٴَـسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّیَ

یہاں تک کہ جب پیغمبر ناامید ہو گئے اور لوگوں نے گمان کیا کہ ہم سے جھوٹا وعدہ کیا گیا تھا تو ان کو ہماری مدد آ پہنچی اور جس شخص کو ہم

مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَ لَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ

نے چاہا بچا لیا اور ہمارا عذاب مجرموں سے نہیں پھیرا جاتا

تفسیر یہ آیات سابقہ آیت سے مربوط ہیں۔ بلاغت کا لحاظ کرتے ہوئے کچھ عبارت محذوف ہے۔ پورا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ہدایتِ انبیاء پر چلے اور ایمان کے ساتھ تقویٰ اختیار کیا ان کو تو دنیوی و اخروی فلاح حاصل ہوئی اور جو سرکش ایمان نہ لائے اور فوری عذاب بھی ان پر نہ نازل ہوا اور برابر کفر پر جمے رہے۔ ان کی حالت یہ ہوئی کہ انبیاء نے انتہائی تبلیغ کی۔ خدا کے احکام پہنچائے۔ نافرمانی و فرماں پذیری کے نتائج دکھلائے، مگر سرکش طبقہ سرکشی سے باز نہ آیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ پیغمبروں کو ان کے ایمان کی طرف سے ناامیدی ہو گئی اور پیغمبروں نے یقین کر لیا کہ اب یہ ہماری رسالت کی تصدیق نہ کریں گے۔ اس وقت اللہ کی مدد اور غضب کا دریا جوش میں آیا۔ غیب سے انبیاء کی مدد کی گئی۔ جن لوگوں کا بچانا مقصود تھا ان کو بچا لیا گیا اور باقی گروہ کو غضب کے عذاب میں تباہ کر دیا گیا۔

بیضاوی اور بعض دیگر مفسرین نے بعض تابعین کی روایت کی بنا پر آیات کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ کافروں کو عذابِ الٰہی سے بچے رہنے پر غرہ نہ ہونا چاہیئے۔ ذرا غور و عبرت کی نظر سے دیکھیں کہ گزشتہ اقوام کو بھی مہلت دی گئی تھی یہاں تک کہ رسول ناامید ہو گئے کہ شاید ان کافروں پر ہم کو کامیابی عطا نہ کی جائے گی۔ کیونکہ باوجود شدتِ کفر اور ایذاءِ انبیاء کے وہ لوگ اسی طرح ناز و نعمت و ثروت میں تھے۔ بلکہ دولت مندی کا مزید دروازہ ان پر

کھول دیا گیا تھا الخ۔

میرے نزدیک جن روایات کی بنا پر یہ مطلب بیان کیا گیا ہے اُن کی صحت میں بھی اہلِ تحقیق کو تامل ہے۔ دیکھو تفسیر ابن کثیر۔ پھر سمجھ دار آدمی ویسے بھی اس مطلب کو صحیح نہیں مان سکتا کیونکہ اس سے انبیاء کے ایمان کی کمزوری ثابت ہوتی ہے۔ معمولی مومن کے لئے یاس و نا امیدی کفر ہے پھر طبقۂ انبیا کس طرح مایوس ہو سکتا تھا۔ رحمتِ الٰہی سے نا اُمیدی تو شیوۂ اہلِ ایمان نہیں۔ وعدۂ الٰہی جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ ہاں کفار کی طرف سے مایوسی ہو سکتی ہے۔ جب انتہا کو پہنچ جائیں اور کافروں کی ظاہری حالت دیکھ کر کہ کسی طرح ان کے ایمان لانے کا وہم بھی نہ ہو سکے تو ایسے وقت ہر شخص کو ان کی حالت سدھرنے سے مایوسی ہوگی۔ انبیاء کی مایوسی بھی اسی طرح کی تھی سینکڑوں ہزاروں برس تبلیغ کے بعد بھی جب قوم کی حالت اصلاح پذیر نہ ہوئی تو لامحالہ قوم کی طرف سے ان کو مایوسی ہونی چاہیئے تھی۔

مقصودِ بیان کافروں کو عذاب کی دھمکی۔ رسولِ پاک ﷺ کو امداد و نصرت کا ضمنی وعدہ۔ قانونِ قدرت کا بیان کہ ایمان دار طبقہ نجات پاتا ہے اور مشرک و منافق سے عذابِ الٰہی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ مسلمانوں کو در پردہ تسلی کہ مصائب و تکالیف سے گھبرا کر تم کو مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ ابھی وقت نہیں آیا۔ گزشتہ اہلِ ایمان نے اس سے زیادہ تکالیف برداشت کی ہیں۔ جب وقت آئے گا تو نصرتِ الٰہی تمہارے شاملِ حال ہوگی اور کافروں کو برباد کر دیا جائے گا وغیرہ۔

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن

عقل والوں کے لئے بلاشبہ اُن کے حالات میں عبرت ہے (یہ قرآن) بنائی بات تو ہے نہیں بلکہ اُن

تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿ع﴾

کتابوں کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے تھیں اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ایمان دار لوگوں کے لئے ہدایت و رحمت ہے

تفسیر گزشتہ انبیاء نے جب اپنی قوموں کو توحید و اصلاحِ عمل کی تعلیم دی تو جن لوگوں نے ان کی ہدایت کو نہ مانا۔ ان کی دولت، ثروت اور خوشحالی میں چند روز کے لئے اگر اضافہ کر دیا گیا اور کچھ مدت مزید ڈھیل دے دی گئی، مگر انجام کار ان کا کل سرمایہ تباہ ہو گیا۔ ہستیاں برباد ہو گئیں نہایت حسرت کے ساتھ ان کا خاتمہ ہوا اور دوامی عذاب میں وہ مبتلا ہو گئے اور جن لوگوں نے انبیاء کی تعلیم کو مانا، خالص توحید کا اقرار کیا اور اصلاحِ عمل کی کوشش کی وہ بظاہر چند روز کے لئے تکلیف میں رہے۔ کافروں نے طرح طرح کی اذیتیں اُن کو پہنچائیں۔ یہاں تک کہ بالکل مقاطعہ کر کے رزق کا دروازہ اُن پر بند کر دیا تاکہ مجبور ہو کر وہ کفر کی طرف لوٹ آئیں، مگر انھوں نے صبر کیا۔ آخر کار کافروں کی کوئی تدبیر پیش نہ گئی اور چند روزہ تکلیف کے بعد ان کو دنیوی و اُخروی عیش حاصل ہو گیا۔ یہ واقعاتِ عبرت ہیں۔ نصیحت اندوزی اور بصیرت کوش دماغ والوں کے لئے ان کا نتیجہ ظاہر ہے کہ کفر و بد اعمالی کا نتیجہ بُرا اور ایمان و اصلاحِ عمل کا انجام اچھا ہے، مگر اہلِ شقاوت کے لئے ان واقعات کے اندر مزید گمراہی کا فتنہ پوشیدہ ہے۔ شیطان ان کے دل میں وسوسہ پیدا کرتا ہے کہ یہ تمام واقعات ہم کو ایمان کی ترغیب دینے کے لئے بیان کئے جاتے ہیں، ورنہ سب فرضی ہیں۔ حقیقت میں ایک واقعہ بھی صحیح نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ اس وہم کو دور کرنے کے لئے فرماتا ہے یہ فرضی اور مصنوعی واقعات نہیں۔ بیانِ قرآن دروغ نہیں، افترا نہیں۔ ذرا توریت اٹھا کر دیکھو اس میں تمام واقعات مفصل مذکور ہیں۔ قرآن مجید نے تو اس کی تصدیق کی ہے۔ انجیل بھی پڑھو خود معلوم ہو جائے گا کہ قرآن نے اسی کے مطابق بیان کیا ہے۔ عبرانی اور سریانی زبان کی کتابوں میں جن واقعات کو پہلے بیان کیا جا چکا ہے انھیں کو قرآن میں اب بیان کیا ہے، لیکن اس سے یہ شبہ ہرگز نہ کرنا چاہیئے کہ قرآن نے جب گزشتہ آسمانی کتب کے واقعات کی تصدیق کی تو اس کی ضرورت ہی کیا تھی وہی کتابیں کافی تھیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن فقط تصدیق کنندہ ہی نہیں بلکہ ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے جن احکام کی ضرورت تھی ان کا

بیان بھی قرآن میں مفصل ہے ۔ حلال حرام، مکروہ، فرائض، واجبات، مستحبات غرض جن قواعد و ضوابط کی عملی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے سب کو قرآن نے بیان کیا ہے، لیکن تر و خشک اور اچھے بُرے کو مخلوط نہیں کیا بلکہ حق و باطل اور خیر و شر کا امتیاز کر دیا ۔ سیدھا راستہ بتا دیا، کج راہی سے بچنے کا حکم اور مفید و مضر میں فرق کر دیا ۔ اب جو لوگ اس کو سچا مان کر اس کے اصول پر چلیں گے ان کے لئے قرآن رحمت مجسم ہے ۔ ان کے ظاہری باطنی اخلاق کا تزکیہ ہو جائے گا ۔ کامیابی و کامرانی کی راہیں ان کے سامنے کھل جائیں گی اور دین دنیا کی فلاح ان کو حاصل ہوگی ۔ الغرض قرآن کے اندر چار خصوصی اوصاف ہیں ۔ (۱) گزشتہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے ۔ یہ اس کے آسمانی کتاب ہونے کی دلیل ہے ۔ ایک بے پڑھا لکھا آدمی عربی میں صحیح صحیح واقعات وہ واقعات جو عبرانی اور سریانی زبانوں کی کتابوں میں مذکور ہیں بیان کرتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ وحی کے ذریعہ سے بیان کرتا ہے ۔ ورنہ عرب کے ایک ایسے اُمی کو جس کا اختلاط اہلِ کتاب سے کبھی نہ رہا ہو کیا علم کہ توریت و انجیل میں واقعات کی تفصیل کیا ہے (۲) قرآن کے اندر اصلاح عقائد کے اصول اور عملی زندگی کو شائستہ بنانے کے کل قوانین و قواعد مفصل موجود ہیں ۔ کافر و مومن ہر شخص ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے ۔ (۳) قرآن لوگوں کو ہدایت کی تعلیم دیتا ہے، سچائی کی تلقین کرتا ہے اور نیک بننے کی ترغیب دیتا ہے (۴) جو لوگ اس کو سچا جانتے ہیں ان کی دونوں جہان کی زندگیاں سُدھر جاتی ہیں ۔ قرآن ان کے لئے رحمتِ مجسم ہے ۔

آغاز سورت میں فرمایا تھا کہ یہ قرآن مبین کی آیات ہیں ۔ اختتام پر مبین ہونے کی تفصیل فرما کر سورت کو ختم کیا ہے ۔

مقصودِ بیان قرآن کے الہامی ہونے کی صراحت ۔ قرآن کے اوصاف اربعہ کا بیان ۔ اس بات کی وضاحت کہ ضوابطِ قرآن سراسر ہدایت اور رحمت ہیں، لیکن بصیرت رکھنے والے دماغ اور قلب کی ضرورت ہے ۔ چشمۂ نور سے اُسی کو فائدہ پہنچتا ہے جس میں روشنی سے نفع اٹھانے کی قابلیت ہو ۔ قرآن سے بھی وہی لوگ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں ذوقِ فطری ہو ۔

سُوْرَةُ الرَّعْدِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَلٰثٌ وَّاَرْبَعُوْنَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ رعد مکی ہے　اس میں ۴۳ آیتیں ہیں　اور چھ رکوع ہیں

سعید بن جبیر، حسن بصری، عکرمہ، عطاء، جابر تابعی اور عبدالرحمٰن بن زید کے قول پر یہ سورت مکی ہے ۔ حضرت عبداللہ بن زبیر، کلبی اور مقاتل کے نزدیک مدنی ہے ۔ مفسر سیوطی نے لکھا ہے کہ اگر یہ سورت مکی ہو تو آیات وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الخ اور وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا الخ ضرور مدنی ہوں گی اور اگر سورت کو مدنی کہا جائے تو آیات ذیل کی ہوں گی ۔ وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ دو آیت تک اور بقول بعض آیت هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ تا لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ بھی مدنی ہے ۔

عام اہلِ تفسیر کے نزدیک پوری سورت میں ۴۳ آیات ہیں اور بیضاوی میں ایک قول کے بموجب ۴۵ کی بھی صراحت ہے ۔ تفسیر سراج میں ہے کہ اس کے کلمات ۸۵۵ اور حروف

جابر بن زید کہتے ہیں کہ مرنے کے وقت سورۂ رعد پڑھنی بہتر ہے اس سے نزع کی سختی میں کمی اور موت کی تکلیف میں آسانی ہو جاتی ہے اور دنیا سے کوچ کرنے کا زیادہ افسوس نہیں ہوتا ۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم کرنے والا ہے

الٓمّٓرٰ ۚ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ ؕ وَالَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ الۡحَـقُّ وَلٰـكِنَّ

یہ کتاب کی آیتیں ہیں اور جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ حق ہے مگر

اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ○

اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے

تفسیر مشرکین مکہ اور عام کفار کا خیال تھا کہ قرآن کلام الٰہی نہیں بلکہ حضور اقدس کا تراشیدہ دماغ تھا۔ اس خیال کو قرآن پاک میں جا بجا خدا تعالیٰ نے دور فرمایا۔ یہاں بھی اسی کا ازالہ کیا گیا۔ مقاتل نے ان آیات کے نزول کا سبب یہی بیان کیا ہے۔

کتاب سے مراد کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے اور اسی وجہ سے مطلب میں بھی اختلاف ہو گیا۔ جمہور مفسرین کا قول ہے کہ کتاب سے مراد قرآن مجید ہے اور وَالَّذِیۡ سے جملہ مستقل علیحدہ ہے۔ یہ قول سیوطی کا بھی ہے اور اسی کو ابن عباس کا قول بھی بیان کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سورۂ رعد میں جو آیات مذکور ہیں وہ قرآن مجید کی آیات ہیں یہ انسانی ساخت کی ممنون نہیں نہ جدید تراشیدہ ہیں۔ اس کے بعد فرمایا یہ درگار کی طرف سے جو کچھ بھی تم پر اتارا گیا وہ سب حق ہے۔ دماغی اختراع کو اس میں دخل نہیں۔

مجاہد قتادہ کا قول ہے کہ کتاب سے مراد کتب سابقہ ہیں۔ ابن کثیر نے اسی کو پسند کیا ہے اور ظاہر لغوی کا بھی یہی مختار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ آیات بلاشبہ تورات و انجیل و قرآن تینوں آسمانی کتابیں ہیں اور سب باہم موافق ہیں۔ مضمون میں اختلاف نہیں۔

میرے نزدیک جمہور کا قول بہتر ہے۔ چونکہ اس سورت میں عموماً کفار کے عقائد کی تردید کی گئی ہے اور آثار ربوبیت دکھا کر الوہیت و توحید کو ثابت کیا ہے اور قطعی طور پر ماورائے ادراک اور بالائے طبیعت اشیاء کے متعلق فیصلہ کر دیا ہے۔ پھر دوسرے بیان میں اصلاح عمل کی تبلیغ اور ضوابط قدرت کا بیان بھی کیا ہے۔ اسی لئے کفار کو اپنے ہزاروں برس کے فرسودہ عقائد کی بیخ کنی دیکھتے ہوئے شبہ ہو سکتا تھا کہ محمد کو ہماری قدیمی مسلمات کے ابطال کا کیا حق ہے؟ بنا بریں شروع ہی میں خدا تعالیٰ نے فرما دیا کہ سورۂ رعد کی آیات قرآن مجید کی آیات ہیں۔ اس کے بعد پھر بھی شبہ ہو سکتا تھا کہ اگر قرآن کی آیات ہیں تو کیا کمال ہے۔ قرآن کو ہمارے بزرگوں کی تحقیقات اور اعتقادیات کے مقابلے میں حقانیت کے اعلان کرنے کا کس طرح حق پیدا ہوا؟ تو فرمایا قرآن پورا قرآن اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے اور اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب ضرور حق ہے۔ لہٰذا قرآن اور قرآن کی کل آیات حق ہیں، سچی ہیں، واقعی ہیں (تمہارے بزرگوں کے خود تراشیدہ عقائد غلط اور اختراعی مسلمات باطل ہیں) لیکن اس کے باوجود بہت سے آدمی قرآن کو حق نہیں مانتے اس کو کتاب الٰہی نہیں جانتے۔ (اور اپنے موروثی بوسیدہ عقائد پر قائم ہیں) اہل ایمان کا گروہ بہت کم ہے۔

مقصود بیان ابن عباس سے منقول ہے کہ الٓمّٓرٰ میں الف سے اَنَا اور لام سے اللّٰہ اور میم سے اَعۡلَمُ اور را سے آدمی کی طرف اشارہ ہے۔ معنی یہ ہوئے کہ میں اللہ ہوں جانتا ہوں اور دیکھتا ہوں یا یوں کہو کہ الف سے الوہیت لام سے اللہ میم سے محمد اور را سے رسالت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی الوہیت اللہ ہی کے لئے ہے اور محمد اس کے رسول ہیں۔ اہل حق نے حروف مقطعہ سے دوسرے مضامین کی طرف بھی اشارہ مراد لیا ہے، مگر یہ سب علمی موشگافیاں ہیں۔ واللہ اعلم۔ ان مقطعات سے اصل مراد کیا ہے۔ آیات مذکورہ میں قرآن کی حقانیت اور تعلیمات قرآن کی صداقت ظاہر فرمائی ہے اور کفار کے عقائد کا بر ان ازالہ فرمایا ہے اور دونوں کی دلائل بیان فرمائی ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ وَسَخَّرَ

اللہ ہی ہے جس نے آسمان بغیر ستونوں کے اونچے بنائے تم دیکھتے ہی ہو پھر وہ عرش پر جلوہ فرما ہوا اور سورج و

الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ

چاند کو کام میں لگالیا ہر ایک وقت مقرر تک چل رہا ہے وہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے اور نشانہائے قدرت مفصل بیان کرتا

بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ

ہے تاکہ تم اپنے رب سے ملنے کا یقین کرو اسی نے زمین کو بچھایا اور اس میں پہاڑ اور نہریں بنائیں

وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ

اور ہر میوے کی دو دو قسمیں نر و مادہ زمین میں پیدا کیں وہی رات کو دن سے چھپا لیتا ہے غور کرنے

ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ

والی قوم کے لئے ہیں نشانہائے قدرت ہیں اور زمین میں کچھ ٹکڑے باہم پاس پاس ہیں اور انگوروں کے

اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ ۫ وَنُفَضِّلُ

باغ ہیں اور کھیتی ہے اور کھجوروں کے درخت ہیں کچھ جڑ ملے ہوئے اور کچھ بغیر ملے ہوئے اور سب ایک ہی پانی سے سینچے جاتے ہیں اور ہم

بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُكُلِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

مزے میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دیتے ہیں اس میں سمجھدار قوم کے لئے نشانہائے قدرت ہیں

تفسیر اوپر کی آیات میں قرآن کو الہامی کتاب فرما کر اس کی حقانیت کی صراحت کی تھی۔ ان آیات میں صاف ربوبیت و الوہیت کے مفصل بیان فرما کر اللہ کی توحید، عظمت اور قدرت کو ثابت فرماتا ہے کیونکہ نزولِ قرآن کے مقصد کی ایک شاخ اصلاح عقیدہ بھی ہے اور عقیدہ کی اصلاح اس وقت تک ناممکن ہے جب تک طبیعیات اور ماوراء طبیعیات کا متصرف حقیقی اور مالک مختار خدا کو نہ ثابت کیا جائے اور نہ مانا جائے۔ ہم خلاصۂ مطلب سے قبل آیات کا تجزیہ کر کے ہر ٹکڑے کی ضروری تحقیق کرتے ہیں۔

(۱) اللہ نے آسمانوں کو بغیر مرئی اور محسوس ستونوں کے بلند کیا۔ اہلِ کتاب کی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان ستونوں پر قائم ہے لیکن ستون ہماری نظروں کے سامنے نہیں۔ ابن کثیر نے اس پہلے قول کو ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور حسن بصری وغیرہ کی طرف منسوب کر کے دونوں کو باہم ضم کر دیا۔ مفسر معالم نے بھی فی الجملہ اس کی تائید کی ہے۔ مگر واقع میں اہلِ کتاب کا یہ قول غلط کیا قابلِ توجہ بھی نہیں۔ انتہائی مضحکہ انگیز ہے۔ رہی مجاہد وغیرہ کی روایت تو اگر وہ صحیح بھی ہو تب بھی آسمانوں کا ستونوں پر ہونا اس سے ثابت نہیں۔ کیونکہ ان جلیل القدر علماء کے قول کا مطلب یہ ہے کہ آسمان کے قیام کے لئے کوئی مادی ستون نہیں یا تو قانون جذب کے تحت قائم ہیں یا اللہ کی غیبی طاقت نے کوئی اور سبب

ان کی بقا کا بنا دیا ہے۔ جو ہم کو آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوہ قاف پر آسمانوں کا ستون کھڑا ہے اور اس پر قیام السمٰوٰت ہے۔

(۲) اللہ عرش پر مستوی ہے۔ اس کی تحقیق ہم سورۂ بقرہ میں کر چکے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ معتزلہ کے نزدیک استواء کے معنی غلبۂ قدرت اور تسلط تدبیر کے ہیں یا متوجہ ہونے کے ہیں اور اہل سنت کے نزدیک استواء اپنے حقیقی معنی پر ہے اور اللہ کی پوشیدہ نا قابل فہم صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے نہ تو وہ استواء مراد ہے جو عارض جسم میں ہے اور جس کا فرقہ مجسمہ قائل ہے اور جس سے اللہ کا جسم ہونا لازم آتا ہے۔ نہ غلبہ تسلط مراد ہے بلکہ استوائے الٰہی کی کیفیت ہی جدا ہے جو ادراکِ مخلوق سے خارج ہے جس طرح دیگر صفاتِ الٰہیہ کا کماحقہ علم ناممکن ہے۔

(۳) چاند اور سورج سب فرمانِ الٰہی کے تابع ہیں اور سب کی رفتار مقدار مقرر ہے۔ یعنی مقررہ رفتار سے نہ کوئی آگے بڑھتا ہے نہ پیچھے ہٹتا ہے۔ سورج چاند سے یا چاند سورج سے پہلے نہیں ہو سکتا۔ ہر ایک کی چال کے منازل اور درجات مقرر ہیں۔ قیامت تک اسی چال سے دونوں چلیں گے۔

(۴) اللہ امر کی تدبیر کرتا ہے یعنی امرِ عالم کی تدبیر فرماتا ہے۔ انتظامِ عالم کو عرش سے فرش تک درست رکھتا ہے یا اپنے امر کی تدبیر کرتا ہے جس حکمت پر نظام قائم ہے اسی کے مطابق عالم کو چلاتا ہے یا یہ مطلب کہ عالمِ امر یعنی عالمِ ارواح کی تدبیر کرتا ہے۔ اوپر کی آیات میں عظیم الشان مادی کائنات کی تخلیق کا ذکر تھا اور عالمِ اجسام کا وجود دستِ قدرت میں ظاہر کیا تھا۔ اس آیت میں عالمِ ارواح کی تخلیق و تدبیر کا کامل اختیار اپنے واسطے بیان فرمایا۔

(۵) اللہ صاف صاف نشانیاں بیان فرماتا ہے تاکہ ان کو دیکھ کر آدمیوں کو اللہ کے پاس جانے کا یقین ہو جائے یعنی عالمِ اجسام و عالمِ ارواح کی تخلیق اور پھر ان کا انتظام اور ایک قانون کے مطابق سب کی رفتار رہتا رہی ہے کہ ان سب کا موجد، قادر، مختار، منتظم ایک اللہ ہی ہے۔ اسی کے دستِ قدرت میں تمام جہان کی عنانِ تصرف ہے۔ وہ ہر چیز کو مقررہ زندگی دیتا ہے اور پھر اس سے یہ عارضی لباسِ حیات لے لیتا ہے اور پھر دوبارہ زندگی عطا کرتا ہے۔ ایسی صورت میں انسان کو دوبارہ زندہ کرنا اور اپنے سامنے بلانا کیا مشکل کام ہے۔

(۶) اللہ نے زمین بچھائی اس پر پہاڑوں کی میخیں قائم کیں اور دریا، ندی، نالے جاری کئے۔ مطلب یہ کہ اللہ نے زمین کو بچھایا۔ خواہ سطحی شکل میں یا کروی شکل میں۔ اگر زمین کی شکل سطحی مانی جائے تب تو جہات کشش میں یکانگت، ہمواری اور یکسانی نہ ہوگی۔ کسی جانب کشش زائد ہوگی کسی جانب کم۔ اور اگر زمین کی شکل گول مانی جائے تو مرکز کشش ہر طرف یکساں ہوگی اور قوتِ کشش کے ماتحت زمین اپنی جگہ قائم رہے گی (خواہ ساکن ہو یا حرکت وضعی کرتی رہے۔ بہرحال اپنی جگہ قائم رہے گی) لیکن کرۂ زمین کی ذاتی حالت یکساں نہیں ہے کہیں خشکی زیادہ ہے کہیں پانی زیادہ ہے۔ کسی جگہ پانی اوپر چڑھ آیا ہے کہیں مٹی ابھر آئی ہے۔ پانی کی وجہ سے مسکونہ زمین کی اصل شکل بدل گئی ہے۔ لامحالہ قوت و ضعف کے لحاظ سے کشش کی طاقت میں بھی اختلاف ہو جانا لازم ہے۔ پھر زمین کا اپنی جگہ پر بقا کس طرح ممکن ہے۔ خدا تعالیٰ نے زمین کو پیدا کرنے اور بچھانے پھیلانے کے بعد جاذب کی حالت کو درست رکھنے اور زمین کو اپنی جگہ برقرار رکھنے کے لئے مختلف اطراف میں اپنی حکمتِ بالغہ کے ماتحت پہاڑوں کی میخیں قائم کیں تاکہ زمین میں اضطرابی حرکت نہ پیدا ہو اور زمین پر زندہ رہنے والی مخلوق زندہ رہ سکے۔

(۷) اللہ نے طرح طرح کے پھل پیدا کئے اور ہر قسم کے پھل کو دو طرح کا بنایا یعنی کسی کو شیریں اور کسی کو ترش کسی کو سیاہ اور کسی کو سفید۔ کسی کو چھوٹا اور کسی کو بڑا بنایا یا پھر ہر نوع کے پھل کی دو صنفیں پیدا کیں نر اور مادہ۔ کھجور، اپیتہ، یوکلپٹس وغیرہ میں نر و مادہ ہونا تو ہر جاہل بھی جانتا ہے، لیکن تحقیقاتِ طبیعیات کے علمبردار خصوصیت سے واقف ہیں کہ عالم میں کوئی پھول اور کوئی پھل ایسا نہیں جس میں دونوں صنفیں نر و مادہ نہ پائی جاتی ہوں۔ موجودہ سائنس بھی اس کی تائید کرتی ہے۔ عالم میں کسی سبزہ اور کسی پھل کی پیداوار بغیر تلقیح کے نہیں ہو سکتی اور تلقیح کے لئے نر و مادہ دونوں کی ضرورت ہے۔

(۸) اللہ نے شب و روز کا سلسلہ قائم کیا۔ دن کی روشنی کو رات کی تاریکی سے وہی چھپاتا ہے یعنی تاریکی نام ہے روشنی نہ ہونے کا۔ آفتاب غروب ہوا روشنی معدوم ہو گئی۔ اندھیرا چھا گیا حرکت کی بجائے عالم پر سکون چھا گیا۔ وجود پر عدم طاری ہوا۔ ہستی کی جگہ نیستی نے لے لی اور بیدار کائنات خواب میں چلی گئی۔

(۹) یہ تمام تصرفات اور انتظامات اس لئے کئے تاکہ اہلِ بصیرت غور سے ان کا مطالعہ کریں۔ آیاتِ قدرت سے اللہ کی توحید الوہیت اور ربوبیت کا یقین کریں۔ عالم کے قانونِ توارث، قانونِ تغیر، قانونِ بقا اور قانونِ وجود عدم کو دیکھیں گہری نظر سے دیکھنے کے بعد غور کریں۔ غور کر کے ان تمام انتظامات کو اتفاقی اتصال وانفعال کا نتیجہ نہ قرار دیں۔ بلکہ اس سے اللہ کی قدرت، صنعت، اختیار، علم، ارادۂ حکمت اور ہمہ گیری کو سمجھیں۔ اس کو خالق، موجد، علیم وبصیر اور وحدہٗ لاشریک جانیں۔

(۱۰) زمین ایک ہے، لیکن اس کے ٹکڑے مختلف ہیں باوجودیکہ باہم متصل ہیں، مگر خاصیت، کیفیت، مزاج اور قابلیت میں جدا جدا ہیں کوئی ٹکڑا شور ہے، کوئی قابلِ زراعت، کوئی سخت کوئی نرم، کوئی سیاہ، کوئی سرخ، کوئی زرد کوئی سفید، ایک ٹکڑا پتھریلا تو دوسرا ریتیلا اور تیسرا چکنی مٹی کا، کسی ٹکڑے کا آدھا حصہ خراب ہے اور آدھا اچھا۔ (ابن عباس، مجاہد، سعید اور ضحاک وغیرہ سے یہی تفسیر مروی ہے) غرض باوجود مادہ کی یکسانی کے خواص جدا جدا ہیں۔ ایسا کیوں ہے صرف اللہ کی قدرت، علم، حکمت اور اختیار وارادہ کے سبب ہے۔

(۱۱) زمین پر مختلف اقسام کے درخت ہیں۔ باغ ہیں۔ طرح طرح کی کھیتیاں ہیں۔ ایک جڑ سے دو شاخہ نکلتا ہے۔ کبھی تنہ ایک ہوتا ہے اور اوپر چل کر دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ہر شاخ کی شکل جدا، رنگ علیحدہ اور ضخامت مختلف ہے۔ پھلوں کی مقدار نوعیت اور کیفیت میں بھی فرق ہے۔ کوئی خوشبودار اور لذیذ ہے اور بدبودار اور بدمزہ۔ لذیذ ہونے میں بھی درجات کا اختلاف ہے۔ باوجودیکہ غذا سب کی ایک ہے۔ ایک ہی پانی سے سب کو سیراب کیا جاتا ہے۔ زمین بھی ایک ہی ہے پھر اتنی کھلی ہوئی بیگانگی کیوں ہے؟ محض اللہ کی مشیت اور اس کی ہمہ گیر طاقت کی وجہ سے۔

(۱۲) یہ سب براہینِ قدرت ہیں، دلائلِ ربوبیت ہیں، شواہدِ صنعت ہیں، آثارِ الوہیت ہیں، لیکن کوتاہ فہم، کور بصیرت اور کند ذہن رکھنے والوں کے لئے نہیں بلکہ ہوش حواس بصیرت ودانش رکھنے والوں کے لئے۔ ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں، سمجھتے ہیں، سوچتے ہیں، غور کرتے ہیں اور مصنوعات سے صانع پر استدلال کرتے اور آثار سے موثر تک پہنچتے ہیں۔

کل آیات کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ عظیم الشان عرش اور اونچے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے پیدا کرنے والا، آفتاب وماہتاب کو مقررہ رفتار اور معین وقت تک چلانے والا عالم کا انتظام کرنے والا، زمین کو پھیلا کر اس پر پہاڑ کی میخیں قائم کرنے والا اور دریاؤں کو بہانے والا، ہر قسم کے پھل پھول کھیتی باڑی پیدا کرنے والا، رات کی تاریکی سے دن کی روشنی کو ڈھانکنے والا، ایک مادہ کی اور ایک قوام کی زمین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر ٹکڑے کو دوسرے سے مختلف بنانے والا اور ایک ہی پانی سے قسم قسم کے درخت اور جدا جدا مزے کے پھل پیدا کرنے والا محض اللہ ہی ہے۔ لہٰذا وہی لائقِ پرستش والوہیت ہے۔

اہلِ باطن کے لئے چند اشارات

تفسیری مطلب تو ہم نے بیان کر دیا، لیکن اہلِ باطن کے لئے کچھ رموز واشارات بھی ظاہر کرتے ہیں جن سے اہلِ ذوق ہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ پاک باطن والے کہتے ہیں کہ انسانی ارواح آسمان ہیں۔ بشری قلوب عرش ہیں۔ ستون مادہ ہے۔ شمس وقمر معرفت وعلم ہیں۔ تدبیر امر سے مراد ہے بشریت کی تکمیل بصفاتِ ملکوتی۔ تفصیل آیات سے مراد ہے تفصیل معارف بانوار یقین۔ مطلب کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ نے ارواح کو بغیر مادہ کے پیدا کیا جو ازل سے ابد تک بقائے قدم باقی ہیں پھر قلوب انسانی پر اپنے انوار تجلی کا ظہور کیا، معرفت اور علم کو قلب سے روح تک جاری کیا۔ قلب سے روح تک جو مسافت ہے یعنی معرفت وعلم کے لئے اجل مقرر ہے معرفت وعلم (چاند سورج) میں قبض وبسط طلوع وغروب ہوتا رہتا ہے۔ اسی معرفت وعلم کی رفتار عالم عقل میں یا انوار مشاہدات ہوتی رہتی ہے۔ اللہ ہی انسانیت کی تکمیل کرتا ہے۔ یعنی انسان کے اندر ملکوتی صفات پیدا کرتا ہے۔ وہی اپنی آیات یعنی معارف کی تفصیل انوار یقین کے موافق کرتا ہے۔ جہاں نورِ ایمان زائد ہے وہاں معرفت زائد ہے۔ جہاں ایمان کی روشنی کم ہے وہاں معرفت بھی کم ہے۔ اللہ نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ صرف اس لئے کہ انسان کو ملکوتی بصیرت کے ذریعہ سے معرفت کا مشاہدہ اور صفاتِ الٰہیہ کی تجلی حاصل ہو جائے اور حصولِ معرفت وتجلی صفت کے بعد اہلِ یقین کے درجہ تک اس کی رسائی ہو جائے۔

ابن عطا کا قول ہے کہ تدبیر امور تقدیر ازلی کے موافق ہے اور تفصیل آیات تعلیمِ الٰہی کی رفتار کا نام ہے۔ اس سے انسان کو اپنی مجبوری کا یقین

ہوجاتا ہے۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ اللہ ہی تمام امور اوران کے تمام احوال کو مقرر فرماتا پھر اس تقرر کے موافق جاری فرماتا ہے۔
اہلِ بصیرت کہتے ہیں کہ زمین سے مراد مادہ ہے۔ پہاڑوں سے مراد جسمانی صورتیں ہیں۔ انہار سے مراد نوعی صورتیں ہیں۔ ثمرات سے مختلف احوال و مدارج مراد ہیں۔ مطلب یہ کہ اللہ نے ایک مادہ پیدا کیا مادہ کو باقی رکھنے کیلئے صورِ جسمیہ پیدا کیں، صورِ جسمیہ اور مادہ کے اختلاط سے جسم بنا پھر اجسام کا باہم نوعی اختلاف مختلف نوعی صورتوں کی وجہ سے ہوا اور انھیں نوعی صورتوں کے اختلاف کا نتیجہ مختلف کیفیات، حالات، رنگ اور بو کی شکل میں ظاہر ہوا۔

مقصودِ بیان

عالمِ اجسام و عالمِ ارواح کا خلاقِ مطلق اوران کا انتظام کرنے والا اللہ ہی ہے۔ موجد بھی وہی ہے اور مربی بھی۔ لہٰذا معبود بھی اسی کو ہونا چاہیئے۔ چاند اور سورج فرمانِ الٰہی کے تابع ہیں۔ ان کی سیرگاہ اور وقت، رفتار اور انتہاءِ رفتار مقرر ہے۔ زمین کا ہر پھل نر و مادہ ہوتا ہے۔ زمین ایک ہے اس کے ٹکڑے جدا جدا ہیں، لیکن متصل ہیں۔ باوجود اتصال کے خاصیات و کیفیات میں مختلف ہیں۔ اسی بنا پر جو پھل پھول اور درخت زمین سے پیدا ہوتے ہیں وہ اگرچہ پانی سے ہی غذا حاصل کرتے ہیں، مگر کیفیات، شکل اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں۔ مادی اور فاعلی قوتوں کے اتحاد کے باوجود نتائج و کیفیات کا اختلاف دلالت کرتا ہے کہ ہر چیز کی تخلیق ایک فعالِ مطلق کے ہاتھ میں ہے جو مختار و حکیم ہے۔ جیسا چاہتا ہے کرتا ہے اور جب تخلیق کی باگ اسی کے دستِ قدرت میں ہے تو وہی لائقِ پرستش بھی ہے۔ آیات میں دعوت دی گئی ہے کہ مصنوعات اور آیاتِ قدرت میں غور و فکر کرو۔ سوچو سمجھو اور نتیجہ پر پہنچو۔ عقل و تدبیر سے کام لو۔ اثر سے مؤثر تک اور نتیجۂ فعل سے فاعل پر استدلال کرو۔ گویا اس سے درپردہ اس طرف اشارہ ہے کہ قابلِ غور مصنوعات کے حالات ہیں۔ صانع کے متعلق غور کرنا اور عقلی گھوڑے دوڑانا عبث فعل ہے۔ وہاں عقل کی رسائی نہیں لہٰذا ذاتِ الٰہی کے متعلق کچھ نہ سوچو۔ مظاہرِ قدرت کو دیکھ کر صفاتِ الٰہیہ کا فی الجملہ علم حاصل کرنا اہلِ ایمان کا خاصہ ہے۔ وہ قومیں گمراہ ہیں جو ذاتِ الٰہی کا تجزیہ کرتی ہیں۔ اس کی ذات کے متعلق کوئی ریمارک کرنا گمراہی ہے۔ اس کی حقیقت تک پہنچنا ناممکن ہے وغیرہ۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ؕ۬ اُولٰٓئِكَ

اور اگر تم تعجب کرو تو (زیادہ) عجیب اُن کا قول ہے کہ جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا پھر ہم از سرِ نو پیدا ہوں گے — یہی ہیں وہ لوگ

الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

جنھوں نے اپنے رب کا انکار کیا انہی کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور یہی دوزخی

النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○

ہوں گے جس کے اندر وہ ہمیشہ رہیں گے

تفسیر

اوپر کی آیات میں بیان فرمایا تھا کہ مصنوعِ قدرت اور آثار وحدانیت سے انھیں لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے جو عقل و فہم سے کام لیتے ہیں۔ جن کے دلوں میں ایمان کا نور ہے جو غور و فکر کے اثر سے مؤثر تک پہنچتے ہیں۔ ان آیات میں ان بد باطن سیاہ دل کافروں کا بیان ہے جو مظاہرِ قدرت کی طرف سے چشمِ بصیرت بند کر لیتے ہیں اور باوجود شواہد و مظاہرہ کے اللہ کی توحید و خلاقی کو نہیں مانتے۔ چونکہ حضور اقدس ﷺ توحید کے سمندر میں مستغرق تھے۔ شواہدِ ملکوت و جبروت مشاہدہ کرتے اور تمام نشاناتِ قدرت میں اللہ کی وحدانیت و قدرت کا معائنہ فرماتے تھے، اس لئے بد باطن کور چشم کافروں کے حال پر آپ کو تعجب ہوتا تھا۔ حضور کو ایک اچنبا تھا کہ باوجود اس قدر واضح آیات اور کھلی ہوئی بینات کے کافر کس طرح اللہ کی

وحدانیت اور میری رسالت میں شک کرتے ہیں اور کیوں اپنی آنکھوں سے میرے قول کی صداقت کو نہیں دیکھتے۔ آفتاب کا انکار کس طرح ممکن ہو۔
خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی تم کو ان کی حالت پر تعجب ہوتا ہے، لیکن اس سے زیادہ تعجب انگیز تو ان کا انکار معاد ہے یہ کہتے ہیں کہ جب ہم مرکر
مٹی ہو گئے تو از سر نو تخلیق ہماری کس طرح ممکن ہے (یعنی وحدانیت ذات تو پھر کسی قدر مخفی چیز ہے۔ خدا کی خلاقی صفت تو بالکل واضح ترین بدیہیات
میں سے ہے۔ کل عالم اجسام و عالم ارواح کا خالق جب وہی ہے تو مٹی سے دوبارہ انسان کو پیدا کرنا کیا مشکل کام ہے) اس کے بعد فرماتا ہے
یہی لوگ کافر اور اللہ کے منکر ہیں (خدا کو عاجز سمجھتے ہیں گویا خدا کو جانتے ہی نہیں) ان کی سزا دوامی جہنم ہے۔

مسئلہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ بعض گناہ گار مومن بھی دوزخ میں جائیں گے، لیکن بقدر مشیت الٰہی کے عذاب اٹھا کر جہنم سے رہا کر دئیے جائیں گے
اور نہر حیات میں غوطہ دے کر جنت میں داخل کر دئیے جائیں گے۔ بعض مومن گناہ گار مرد کی دوزخ سے رہائی انبیاء، صلحاء اور ملائکہ کی شفاعت سے ہوگی۔
بہر حال ہمیشہ کے لئے دوزخ میں گناہ گار مومن نہ رہے گا۔ غیر منقطع عذاب صرف کافروں پر ہوگا۔

مقصود بیان

انکار ذات کی بہ نسبت انکار صفات زیادہ عجیب ہے۔ خصوصاً معاد جسمانی کا انکار تو اللہ میں عجز پیدا کرتا ہے۔ ذات
وصفات کے انکار سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ ذات الٰہی میں ایسی صفات ماننا جس سے اس کی تنقیص لازم آئے یا کسی
کمالی صفت کا انکار کرنا دونوں موجب کفر ہیں۔ حشر جسمانی کا انکار کفر ہے۔ کافر ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے یعنی جو کافر ہوگا وہ ہمیشہ دوزخ میں نہ
رہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ مدت کے لئے دوزخ میں بھیج دیا جائے اور پھر سزا اٹھا کر یا دوران میعاد میں کسی وجہ سے رہائی پا جائے وغیرہ۔

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۗ وَإِنَّ

(اے نبی) یہ لوگ بھلائی سے پہلے تم سے برائی طلب کرتے ہیں حالانکہ ان سے پہلے بہت سے واقعات گزر چکے ہیں اور تمہارا

رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۖ وَإِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

رب لوگوں کو باوجود ان کے ستمگار ہونے کے معاف کرتا ہے اور تمہارا رب سخت عذاب والا بھی ہے

تفسیر

قرآن پاک کا طرز تبلیغ بھی عجیب ہے۔ انکار قیامت کو گزشتہ آیت میں تعجب انگیز پیرایہ بیان میں ظاہر فرما کر تنبیہ کی تھی کہ وجود قیامت
اس قدر بدیہی اور کھلا ہوا ہے کہ اس کا انکار ناممکن ہے۔ اس پر نضر بن حارث کہا کرتے تھے کہ اگر تمہارا یقین حق ہے اور قیامت ضرور
آنی ہے اور عذاب و ثواب لازم ہے تو پھر تاخیر کیوں ہے؟ جو کچھ ہونا ہے وہ آج ہی ہو جائے تاکہ ہم کو بھی یقین ہو جائے۔ اس قول کی تردید میں
خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ یقین آنے اور عبرت حاصل کرنے کے لئے گزشتہ اقوام کی مثالیں کافی ہیں۔ غیر معدود نظیریں گزر چکی ہیں۔ سابق انبیاء
کی منکر قوموں پر دنیا ہی میں عذاب نازل ہو چکا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا عذاب ابھی نازل کر سکتا ہے، لیکن خود نہیں کرتا۔ باوجود شرک
و کفر اور معصیت کے اپنی رحمت عامہ کی وجہ سے اب مواخذہ نہیں کرتا اس نے ڈھیل دے رکھی ہے۔ مدت تک مہلت ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں
کہ کبھی گرفت نہ کرے گا۔ مواخذہ ضرور کرے گا۔ اس کا آخری عذاب بہت سخت ہے۔

مَثُلٰت کے معنی میں اہل تفسیر کا اختلاف ہے۔ ابن انباری کا قول ہے مثلات وہ عذاب ہیں جن کا اثر سزا یافتہ اشخاص یا اقوام میں
بعد کو بھی بطور عیب باقی رہتا ہے۔ قتادہ اور ابن عباس نے اس کا ترجمہ عقوبات کیا ہے۔ یعنی گزشتہ امتوں پر جو عذاب نازل ہو چکے ہیں وہ سب
مثلات ہیں۔ میری نظر میں وہ نصیحت انگیز عبرت خیز انواع عذاب جو دوسروں کو شرک و معصیت سے روکنے کا باعث ہوں مثلات کے
ذیل میں داخل ہیں۔

ایک شبہ۔ آیت اِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ دلالت کر رہی ہے کہ مشرکین بھی قابل مغفرت ہیں اور وہ بھی غفران الٰہی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں

ازالہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اللہ مشرکین کے لئے بھی مغفرت کرنے والا ہے بشرطیکہ مرتے وقت وہ توبہ کرلیں، لیکن یہ جواب ضعیف معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ توبہ کرنے کے بعد مشرک مشرک ہی نہیں رہتا۔ مقاتل کا جواب اس سے بہتر ہے کہ ۱۔ مغفرت کی دو صورتیں ہیں ایک عمومی دوسری خصوصی۔ دنیا میں آدمی کیسا ہی گناہ کرے۔ فسق فجور، کفر و شرک وغیرہ۔ مگر خدا تعالیٰ قبل از وقت اس کی گرفت نہیں کرتا۔ موت تک ڈھیل دیتا رہتا ہے۔ اور آخر وقت تک درگزر فرماتا ہے۔ یہ عمومی مغفرت ہے جس سے فائدہ اندوز مومن بھی ہیں اور کافر بھی۔ اگر خدا تعالیٰ کی یہ عمومی مغفرت نہ ہوتی تو سطح زمین پر کوئی جاندار زندہ نہ بچتا۔ دوسری آیت میں ہے۔ لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ۔ دوسری خصوصیت مغفرت وہ آخرت میں ہوگی اور اہلِ ایمان کے ساتھ مخصوص ہے۔ میرے نزدیک سادہ جواب یہ ہے کہ اس آیت سے مغفرتِ الٰہی کا عموم معلوم ہوتا ہے۔ مومن ہو مشرک ہو کوئی بھی ہو اگر بغیر توبہ کے مر جائے تو اس کی مغفرت ہو سکتی ہے، لیکن دوسری آیت جس کا نزول اس آیت کے بعد ہے بتا رہی ہیں کہ مشرک کی مغفرت کبھی نہ ہوگی لہٰذا آیت کا عموم مخصوص البعض ہوگیا اور اس کے ذیل میں صرف اہلِ ایمان ہی داخل رہے۔ یہ جواب اس صورت میں ہو کا جب مغفرت سے اُخروی مغفرت مراد لی جائے جیسا کہ سیاق آیات سے معلوم ہوتا ہے تو مقاتل کا جواب بہتر ہے۔

مقصودِ بیان آیت میں در پردہ ہدایت ہے کہ زندگی کو غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ جتنی بھی مہلت ہے اس میں نیکی کی بیش از بیش کوشش کرنی لازم ہے۔ گزشتہ تاریخ سے سبق لینا ضروری ہے۔ اللہ کی رحمت عام ہے۔ باوجود سرکشی اور نافرمانی کے اس کی دنیوی رحمت میں کمی نہیں ہوتی۔ آخری آیات میں بیم و رجا کا مظاہرہ ہے اور فی الجملہ ضمناً اشارہ ہے کہ بیم و رجا کے درمیان ہی ایمان کا مرتبہ ہے۔ مومن کو نہ خدا کی رحمت سے مایوس ہونا چاہیئے نہ خدا کی گرفت سے بے خوف وغیرہ۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اِنَّمَآ اَنْتَ

کافر کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی کھلا ہوا معجزہ کیوں نہیں اُتارا گیا (اے محمد) تم تو صرف

مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ

ڈرانے والے ہو اور ہر قوم کا ایک راہ دکھانے والا ہوتا ہے اللہ جانتا ہے اس چیز کو جو ہر مادہ اپنے پیٹ میں لئے ہوتی ہے اور پیٹ کے

الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ۭ وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ ۝ عٰلِمُ الْغَيْبِ

گھٹنے بڑھنے سے بھی واقف ہے اور ہر چیز اُس کے نزدیک اندازہ سے ہے وہ ظاہر و باطن

وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ ۝

کو جاننے والا سب سے بڑا اور عالی شان ہے

تفسیر خدا تعالیٰ نے اپنے رسول پاکؐ پر اس قدر کثیر آیات و معجزات کا نزول فرمایا کہ ان کے بیان کے لئے ضخیم مجلدات کی ضرورت ہے۔ آنکھوں والوں کو معجزات دکھائی دئے۔ آیات باہرات نظر آئیں۔ ایمان میں ترقی یقین میں اضافہ ہوتا گیا، لیکن کوتاہ نظر محسوس پرست طبقہ کو شرک کی تاریکی ڈھانکے ہوئے تھی۔ اس کو حق کی روشنی کیسے سوجھتی۔ معجزات کی کثیر مقدار بھی اس کی ہدایت کے لئے کافی نہ ہوئی۔ محض عناد سے روزانہ نئے نئے معجزات کی فرمائش اس کا شیوہ ہوگیا۔ یہ معاند گروہ کبھی معاندانہ طرز میں کہتا کہ صفا کو سونے کا کردو۔ مکہ کو کشادہ کردو۔ یہاں سے

پہاڑ ہٹ جائیں۔ سبزہ زار اور نہریں ہو جائیں۔ کبھی کہتا غیبی خزانے ہم پر کیوں نہیں اترتے۔ فرشتہ نازل ہو کر تمہاری صداقت کی شہادت کیوں نہیں دیتا۔ حضور والاؐ نے ان کورباطن کافروں کے وعدہ پر نظر فرما کر چاہا کہ ان کی تکمیل کی عرض داشت کے لئے دعا کریں، مگر بذریعہ وحی حکم ہو گیا کہ ہدایت وایمان مقدر ہے اسباب پر منحصر نہیں۔ اگلی قوموں نے اسی طرح اصرار کے ساتھ معجزات مانگے لیکن پھر ایمان نہ لائے۔ تقدیر غالب ہوئی آخر کار عذاب میں تاخیر نہ ہوئی یہی قانونِ الٰہی ہے۔ حضورؐ یہ فرمان سُن کر دعا کرنے سے باز رہے اور التجا کی کہ ان کو ہلاک نہ کیا جائے میں ہدایت کرنے کی کوشش کروں گا۔ جب اس تیرہ باطن طبقہ کے لئے عقل وبصیرت کی کوئی روشنی کافی نہ ہوئی تو فتنہ میں معاندانہ رنگ میں بولے آخر کیا بات ہے کہ تمہارے اوپر کوئی نشانی (یعنی ایسی محسوس نشانی جو ہماری ہدایت کے لئے کافی ہو) نہیں اتاری جاتی۔ خدا تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے کہ محمدؐ تمہارا کام محض عذاب الٰہی سے ڈرانے کا ہے۔ ہر قوم کا ایک راہنما ہوتا ہے اور ہر اُمت کا ایک پیغمبر ہوا ہے۔ تم بھی راہنما ہو۔ عذاب سے ڈرانے والے یعنی ایمان کی طرف بلانے والے ہو (سینہ چیر کر ایمان داخل کر دینا اور منزل مقصود پر پہنچا دینا تمہارا کام نہیں۔ یہ کام اللہ کا ہے۔ بغویؒ نے آیات مذکورہ کی تفسیر میں کہا کہ خدا تعالیٰ نے خالص وحی کے ذریعہ سے جن آیات کو رسول اللہؐ پر نازل فرمایا اہل کفران کو شمار میں نہ لائے۔ اور ایسے معجزات کے طالب ہوئے جیسے موسیٰ وعیسیٰ کو دیئے گئے تھے۔ اس پر حکم ہوا کہ ہم کو صرف انذار وترہیب کے لئے بھیجا گیا ہے۔ تم سے پہلے اور پیغمبر بھی بھیجے گئے۔ تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ مناسب حال کوئی ایسا معجزہ دکھاؤ جس سے صحت نبوت کا ثبوت ہو جائے۔ یہ لازم نہیں کہ جو کچھ کفار کہیں اس کو پیش کرو۔ امام رازی نے اسی تفسیر کو پسند کیا ہے۔

آیت لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ کے مطلب میں اختلاف ہے۔ ابن عباس کے نزدیک ہادی سے مراد راہ راست کی طرف بلانے والا۔ مجاہد کے نزدیک ہادی سے نبی مراد ہے۔ سعید بن جبیر، ضحاک ومجاہد وغیرہ نے آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ تم فقط منذر ہو اور اللہ ہر قوم کا ہادی ہے۔ یعنی تم ہادی نہیں ہو۔

میرے نزدیک آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اے رسول تم فقط منذر ہو۔ عذاب الٰہی سے ڈرانا تمہارا کام ہے اور تم ہی ہر قوم کے ہادی ہو۔ ہر قوم کو راہ راست دکھانا اور اللہ کی طرف بلانا بھی تمہارا کام ہے۔ گویا منذر اور ہادی دونوں صفتیں رسول کی بیان کی گئیں۔ عکرمہ اور ابوالضحیٰ کا بھی یہی قول ہے۔

جب آیت مذکورہ میں بیان کر دیا کہ نبی کا کام صرف رہنمائی ہے۔ منزل پر پہنچانا اللہ کا کام ہے تو اس سے آگے خدا تعالیٰ کے وہ خصوصی اوصاف بیان کئے جن سے اس کے علم کی ہمہ گیری، عمومی تسلط اور جلالت شان ظاہر ہوتی ہے۔ ان آیات کے تین حصے ہیں۔ (۱) ہر مادہ کے رحم کے اندر جو حمل ہوتا ہے اللہ اس سے خوب واقف ہے اور قطعی طور پر جانتا ہے کہ وہ حمل نر ہے یا مادہ (سیوطی) خوبصورت ہے یا بدصورت، جنتی ہے یا دوزخی اس کی عمر زیادہ ہے یا کم (ابن کثیر) صحیحین میں ابن مسعود کی مرفوع روایت منقول ہے جس کا آخری حصہ یہ ہے کہ حالت حمل میں جب آدمی گوشت کے لوتھڑے کی مانند ہوتا ہے اس وقت ایک فرشتہ مقرر کیا جاتا ہے۔ اس کا رزق، اس کی عمر، اس کے اعمال یعنی جنتی یا دوزخی ہونا یا نر مادہ ہونا لکھ لیتا ہے۔ (۲) رحم کی کمی بیشی کو بھی اللہ ہی جانتا ہے یعنی مدت حمل کی صحیح مقدار سے اللہ ہی واقف ہوتا ہے کہ بچہ کتنے زمانے میں پیدا ہوگا۔ پورے نو مہینے یا اس سے کم یا اس سے زیادہ (بعض علماء نے اس سے خون حیض کی کمی بیشی مراد لی ہے) اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ (۳) اللہ کے نزدیک ہر چیز کا اندازہ مقرر ہے جس سے بڑھاؤ گھٹاؤ نہیں ہو سکتا۔ ہر چیز کی مقدار عمر، حجم، خوبصورتی، بدصورتی، اچھائی برائی غرض ہر حالت، ہر کیفیت، اور ہر نوعیت مقدر ہے۔ اس کو ظاہر باطن اور غیب وحضور کا علم ہے۔ کوئی چیز اس کے علمی احاطہ سے خارج نہیں۔ لہٰذا اس نے اپنے علم کے بموجب کل چیزوں کا مخصوص اندازہ کر لیا اور وہی مخصوص اندازہ اس کے لئے مقرر فرما دیا۔ صحیح حدیث میں تقدیر خیر وشر پر یقین کرنے کو مدار ایمان قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کے سامنے جب معبد جہنی کا یہ قول نقل کیا گیا کہ تقدیر کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ بندہ کے افعال کے نتیجہ کا نام تقدیر ہے تو آپ نے فرمایا تم ان لوگوں سے بوقت ملاقات کہہ دینا کہ میرا ان سے اور ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قسم ہے اللہ کی اگر ان کے پاس کوہ احد کی برابر سونا ہو اور وہ اس کو خیرات کر دے تو اللہ اس کو قبول نہ فرمائے گا جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ لائے گا۔

(رواہ اصحاب الصحاح)

مقصودِ بیان ازلی بدبختوں کو نشان معرفت مفید نہیں ہوتا وہ ہمیشہ مزید نشانیاں طلب کرتے رہتے ہیں۔ محسوس پرست دماغ رکھنے والے عقل و بصیرت سے کورے رہتے ہیں وہ محسوس جاہلانہ معجزہ چاہتے رہتے ہیں اور ایسے ہی معجزہ کو معیارِ نبوت جانتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم کے قبضہ میں نہ تھا کہ کسی کو مومن بنا سکتے۔ آپ کا کام صرف تبلیغ تھا۔ مقصود تک پہنچانا اللہ کے بس میں ہے۔ یہ آیت ان عالم نما جاہلوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہے جو غیر اللہ سے مرادیں مانگتے اور بیڑا پار کرنے والے جانتے ہیں۔ شکم مادر کے اندر بچہ کے کل احوال کا قطعی علم اللہ ہی کو ہوتا ہے۔ اگرچہ ظنی اور تخمینی علم ڈاکٹروں، حکیموں اور دیگر تجربہ کاروں کو بھی قرائن سے ہو جاتا ہے، مگر ان کا یہ علم یقینی اور قطعی نہیں ہوتا صرف فنی مہارت کے تحت ہوتا ہے۔ ہر چیز کی ہر حالت، ہر کیفیت اور ہر مدت مقرر ہے۔ تقدیر ازلی ہر چیز کو محیط ہے۔ نتیجۂ عمل کا نام تقدیر نہیں بلکہ باعثِ عمل کا نام تقدیر ہے وغیرہ۔

سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَ

برابر ہے تم میں سے جو چپکے سے بات کہے اور جو چلا کر کہے اور جو رات میں چھپا رہے اور جو

سَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ

دن میں چلنے والا ہو انسان کے آگے پیچھے نگہبان فرشتے ہوتے ہیں جو بحکم خدا

مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَآ

اُس کی حفاظت کرتے ہیں اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا تاوقتیکہ وہ اپنی اندرونی حالت نہ بدلیں اگر اللہ کسی

اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ۝

قوم پر مصیبت ڈالنی چاہتا ہے تو وہ ٹل نہیں سکتی اور سوائے خدا کے ان کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔

تفسیر ایک روز جناب رسول پاک صلعم مع صحابہ کے مسجدِ نبوی میں تشریف فرما تھے۔ عامر بن طفیل شاعر اور اربد بن ربیعہ حاضرِ خدمت ہوئے عامر حسین بہت تھا مگر کانا تھا۔ لوگ اس کی طرف تکنے لگے۔ عامر نے سامنے آکر کھڑے ہو کر عرض کیا محمد! اگر میں تم کو مان لوں تو مجھ کو کیا دے گا؟ حضورؐ نے فرمایا جو دوسرے مسلمانوں کو ملتا ہے پائے گا وہی تم کو ملے گا۔ عامر بولا اگر اپنے بعد جانشینی کی دستاویز لکھ دو تو مسلمان ہو جاؤں۔ حضورؐ نے فرمایا یہ میرے اختیار میں نہیں ہے حق تعالیٰ جس سے چاہے کام لے۔ عامر نے کہا اچھا یہ نہیں تو ملک تقسیم کر لو صحرائی حصہ میرا اور سکنائی آپ کا۔ حضورؐ نے فرمایا یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ عامر نے کہا پھر کیا؟ حضورؐ نے فرمایا گھوڑے دے سکتا ہوں اس شرط پر کہ جہاد کیا کرو۔ عامر نے کہا اچھا خلوت میں چل کر کچھ بات سُن لیجئے۔ حضورؐ اُٹھ کھڑے ہوئے اور باتیں ہونے لگیں۔ عامر نے اپنے رفیق اربد کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ جس وقت میں باتوں میں مشغول کروں تو پیچھے سے تلوار چلا دینا۔ چنانچہ اربد آیا اور تلوار سونتی، مگر وہ بالشت بھر نکل کر نیام میں پھنس گئی۔ حضورؐ نے پیچھے رُخ کیا تو اربد کو تلوار نکالنے کی کوشش میں پایا۔ اس وقت بارگاہِ الٰہی میں دعا کی الٰہی یہ دونوں تیرے حوالے جس طرح چاہے میرا بدلہ لے۔ چنانچہ اربد پر تو بجلی گری اور وہ جل کر سوختہ ہو گیا۔ باوجود یہ کہ ابر تھا نہ غبار کھُلا آسمان تھا اور عامر یہ کہہ کر بھاگ گیا کہ محمد نے اپنے رب سے بددعا کر کے میرے دوست کو تو ہلاک کرا دیا۔ دیکھو میں بھی کیسا جرار لشکر لے کر آتا ہوں۔ یہ کہہ کر قبیلہ بنی سلول کی ایک

عورت کے ہاں جاکر ٹھہرا۔ صبح ہوئی تو روانگی کی تیاری کی۔ دفعتاً کان کی جڑ میں درد اور سوزش ہوئی اور طاعون کی گلٹی برآمد ہوئی۔ زندگی سے مایوس ہو گیا۔ غصہ میں بھرا ہوا جنگل کی طرف بھاگا اور چلایا اے موت جلد آ اگر محمد کو اور تجھ کو دیکھ پاؤں تو نیزہ مارے بغیر نہ رہوں۔ یہ کہہ کر گستاخانہ شعر پڑھے۔ دفعتاً غیبی طمانچہ ایسا لگا کہ زمین پر گر گیا آخر پھر اٹھا اور گھوڑے پر چڑھا اسی حالت میں دم نکل گیا۔ اسی واقعہ کے متعلق ان آیات کا نزول ہوا۔ اس شانِ نزول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے لَہٗ کی ضمیر رسول پاکؐ کی طرف راجع ہوگی۔ ابن عباسؓ کا یہی قول ہے۔ معالم میں آیت کی شانِ نزول بھی یہی مذکور ہے، لیکن حکم کو عمومی قرار دیا ہے۔

حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ چھپ کر کوئی بات کرے یا آواز سے پکار کر خدا کے نزدیک سب برابر ہے۔ اس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ رات کی تاریکی میں چھپ کر کام کرنے والا اور دن میں علی الاعلان کرنے والا دونوں برابر ہیں۔ غرض کہ اللہ سمیع وبصیر ہے۔ اس کی سماعت میں اخفاء اور مجاہرہ سے فرق نہیں پڑتا۔ چپکے چپکے باتیں کرنا اور پکار کر کرنا دونوں اس کے نزدیک برابر ہیں۔ اسی طرح اس کی بصارت ونظر میں یکسانی ہے۔ دن کی روشنی میں کوئی کام کیا جائے یا رات کی تاریکی میں تنہائی کے اندر چھپ کر، بہرحال وہ دیکھتا ہے۔ اس کے دیکھنے کے لئے رُخ، جہت، مقابلہ اور روشنی کی ضرورت نہیں۔ اس سے آگے فرماتا ہے کہ ہر انسان کی حفاظت کے لئے بحکم خدا کچھ فرشتے مقرر ہیں جو انسان کے آگے پیچھے ہر وقت لگے رہتے ہیں اور ان کا باہم تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔

مُعَقِّبٰت سے کون فرشتے مراد ہیں؟ اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ شیخ حافظ کا قول ہے کہ ان سے مراد چار فرشتے ہیں ایک آگے رہتا ہے ایک پیچھے، ایک دائیں طرف دوسرا بائیں طرف۔ آگے پیچھے والے فرشتے انسان کو مکروہات ومصائب سے بچاتے ہیں اور دائیں بائیں والے اچھے بُرے اعمال لکھتے ہیں۔ ان چاروں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ دن کے فرشتے اور ہیں اور رات کے اور۔

مجاہد کا قول ہے کہ ہر آدمی کی حفاظت کے لئے ایک فرشتہ مقرر ہے جو خواب وبیداری میں جن وانس، سانپ بچھو اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کی ضرر سے آدمی کو بچاتا رہتا ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ سعید بن جبیر نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آدمی کی حفاظت فرشتے اس طرح آگے پیچھے سے کرتے رہتے ہیں جس طرح بادشاہ کا باڈی گارڈ حفاظت کرتا ہے۔

بعض احادیث میں نگہبان فرشتوں کی تعداد ستر ہزار فی آدمی بیان کی ہے۔ بعض میں دس فرشتے بیان کئے گئے ہیں۔ بہرحال معقبات سے اعمال لکھنے والے اور حفاظت کرنے والے دونوں طرح کے فرشتے مراد ہیں۔ جن کا صبح شام تبادلہ ہوتا رہتا ہے تعداد کتنی ہی ہو۔

اس کے بعد خدا تعالیٰ نے ایک عام ضابطۂ قدرت بیان فرمایا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کے ظاہری باطنی احوال کو درست رکھنے اور اس کی حفاظت کرنے کے لئے غیب سے اسباب فراہم کر دئے ہیں۔ کفر وایمان اور معصیت وطاعت سے اس عمومی انعام میں کوئی فرق نہیں ہوتا، مگر انسان خود اپنی حالت بدل ڈالتا ہے اور اس نعمتِ الٰہی کو بگاڑ دیتا ہے جو خدا تعالیٰ نے اس کو عطا کی ہوتی ہے تو پھر اللہ بھی اس کی حالت کو خراب کر دیتا ہے اور اس سے اپنی نعمت چھین لیتا ہے۔ اس وقت فرشتے اس کے پاس سے ہٹ جاتے ہیں۔ کوئی اس کا محافظ، نگہبان اور حامی نہیں رہتا اور بلا امدادِ الٰہی اس کی حالت تباہ ہو جاتی ہے۔

مقصودِ بیان

اللہ کے احاطۂ علمی سے کوئی چیز خارج نہیں۔ اس کے سننے میں آواز کی شدت وضعف سے فرق نہیں آتا۔ نہ اس کا دیکھنا روشنی، جہت اور مقابلے کا محتاج ہے۔ گویا آیات میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ سمیع، بصیر، مادہ اور عوارضِ مادہ سے پاک ہے۔ اس کے دیکھنے سننے کی کیفیت ہی کچھ اور ہے۔ انسان کی حفاظت کے لئے کچھ غیبی فرشتے ہر وقت مقرر رہتے ہیں اور ان کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ جب تک انسان خود اپنی حالت نہ بگاڑے اللہ اس کو برباد نہیں کرتا جب وہ خود اسباب ہلاکت فراہم کرتا ہے تو اللہ اپنی نعمت چھین لیتا ہے۔ اس آیت میں موجودہ دور کے مسلمانوں کے لئے خزائنِ عبرت پوشیدہ ہیں مسلمانوں کی موجودہ بربادی خود آمدہ ہے۔ ان کے اندر ظلم کوشی اور حق فراموشی کے وہ عیوب موجود ہیں کہ اگر ان کو دور کرنے کی کوشش نہ کی گئی تو اللہ اپنی نعمت ان سے بالکل چھین لے گا۔ اب تک ان کی حکومت، عزت، دولت اور قوت فنا ہو گئی ہے، آئندہ ان کا وجود منفرد ہستی

سے مٹا دیا جائے۔ کاش ہمارے علماء، مشائخ اور لیڈر اس آیت سے سبق لیں اور قوم کی ہر تباہی کو تقدیر الٰہی پر محمول کرنے کی بجائے اپنے اعمال کو اس کا کفیل قرار دیں۔ شہرت، مال اور نام آوری کی ہوس کو ترک کر کے خلوص کے ساتھ قوم کے افعال و اعمال کی اصلاح کی کوشش کریں اور خود کو نمونۂ عمل بنائیں وغیرہ۔

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَطَمَعًا وَيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ۝ وَيُسَبِّحُ

وہی تم کو ڈرانے اور امید دلانے کو بجلی دکھاتا ہے اور بھاری بادلوں کو پیدا کرتا ہے اور رعد

الرَّعْدُ بِحَمْدِهِ وَالْمَلَائِكَةُ مِنْ خِيفَتِهِ وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ

اس کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتا ہے اور فرشتے اس کے خوف سے (اس کی حمد کرتے ہیں) اور وہی بجلیاں بھیج کر

فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللَّهِ وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ ۝

جس پر چاہتا ہے اُن کو گراتا ہے یہ کافر اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں حالانکہ وہ سخت قوت والا ہے

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ لَا يَسْتَجِيبُونَ لَهُمْ

اُسی کی عبادت ٹھیک ہے اور جو لوگ اُس کو چھوڑ کر غیر کو پکارتے ہیں وہ ان کی دُعا بالکل قبول نہیں کرتے

بِشَيْءٍ إِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ إِلَى الْمَاءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهِ وَمَا

ہاں اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اپنی دونوں ہتھیلیاں پانی کی طرف پھیلائے تاکہ پانی اس کے مُنہ میں آپہنچے حالانکہ پانی اس کے منہ میں نہیں پہنچ سکتا

دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ ۝

اور کافروں کی جتنی پکار ہے سب گمراہی میں ہے

تفسیر اوپر کی آیات میں علم الٰہی کی ہمہ گیری اور قدرتِ الٰہی کا بھی احاطہ بیان فرمایا تھا، لیکن طرزِ بیان بلیغانہ تھا جس سے دانش مند لوگ تو فائدہ ضرور اٹھاتے تھے، مگر کور بصیرت محسوس پرست طبقے کے فہم کی وہاں تک رسائی نہ تھی، اس لیے ان آیات میں طریقہ تبلیغ بدل دیا اور وہ طرز ادا اختیار کیا جس پر غور کرنے کے بعد عام سطحی نظر رکھنے والے بھی توحید الوہیت و ربوبیت کے قائل ہو جائیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ الوہیت کا استحقاق اسی کو ہو سکتا ہے جس کی طاقت اور قدرت سب سے بڑی ہو، جس میں نفع نقصان پہنچانے کی قوت ہو، جو مرتبی بھی ہو اور مصیبت کے وقت کام بھی آسکے اور چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ مندرجہ ذیل چار افعال کا بلا شرکت غیرے تنہا ہی مختار ہے اور اسی کے دستِ قدرت میں ذیل کے افعال ہیں، اسی لئے وہی معبود برحق اور الٰہ مطلق ہے۔ (۱) اللہ کے حکم سے بجلی چمکتی ہے جس سے بارش کی امید اور ہلاکت کا اندیشہ ہوتا ہے (بیضاوی) (۲) اللہ بادلوں کو اٹھاتا ہے جو پانی سے بوجھل ہوتے ہیں وزنی چیز کی خاصیت ہے کہ نیچے کو گرے، مگر بادل باوجود پُر آب اور بھاری ہونے کے اوپر کو اٹھتا ہے۔ یہ بھی قدرت کی ہمہ گیری ہے۔ (۳) بادل میں گرج ہوتی ہے۔ جو نام ہے آپس کے ہوائی اجزا کے مجموعہ کا، پانی اور ہوا کا مزاج مرطوب ہے اور رطوبت گرج کے منافی ہے، مگر بادل میں گرج ہوتی ہے۔

یہ بھی احاطۂ قدرت کی نشانی ہے ۔ اکثر مفسرین نے صراحت کی ہے کہ رعد ایک فرشتے کا نام ہے جو ابر پر مامور ہے ۔ حدیث میں آیا ہے کہ رعد ایک فرشتہ ہے جو بجلی کے کوڑے سے بادلوں کو ہانکتا ہے ۔ اہلِ عقل تحقیقات کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جس طرح انسانی نفوس ہوتے ہیں اُسی طرح نفوس ملکی اور نفوس اجرام علوی ہیں ۔ نفوس انسانیہ انسانی ابدان کا تحفظ، تربیت اور تدبیر کرنے میں مشغول رہتے ہیں اور اجرام علوی کے نفوس ان اجرام کا تحفظ اور تدبر کرتے رہتے ہیں ۔ ہر ستارہ کا نفس علیحدہ ہے، ہر آسمان کا نفس جدا ہے ۔ ان نفوس کو اہلِ فلسفہ طبائع کہتے ہیں اور شرع میں ان نفوس کی تعبیر کبھی ملائکہ کے لفظ سے کی جاتی ہے ۔ گویا رعد کو حدیث میں جو فرشتہ کہا گیا ہے، اُس سے مراد ہے بادل کی طبیعتِ مدبرہ اور بجلی کے کوڑے مارنے کا مطلب ہے جرم سحابی کی تدبیر و تنظیم ۔ رعد اور دوسرے فرشتے اللہ کے ڈر سے اس کی تسبیح میں مشغول ہو جاتے ہیں ۔ رعد کی تسبیح اگرچہ آدمی اور دوسرے حیوانات نہیں سمجھتے، مگر ہیبت ناک آواز سب سنتے ہیں ۔ بادل کی گرج اللہ کی قدرت و یکتائی کو بزبانِ حال بیان کرتی ہے ۔ (۴) اللہ جہاں چاہتا ہے بجلی گراتا ہے ۔ مضبوط پہاڑ، مضبوط مکان اور سرسبز درخت کوئی چیز بھی اگر اس پر بجلی گر جائے تو سالم نہیں بچتی ۔ یہ تو اللہ کی جبروتی طاقت ہے ۔ رہے وہ معبودہائے باطلہ جن کی پرستش کی دعوت اہلِ کفر دیتے ہیں اُن کے اندر ہمہ گیر قدرت اور پُرزبردست طاقت ہونا تو درکنار اتنی بھی ان کو توفیق نہیں کہ اپنے پرستاروں اور پکارنے والوں کی دعا ہی قبول کر سکیں اور کسی قسم کا نفع نقصان پہنچا سکیں یا نقصان دفع کر سکیں ۔ اُن کو پکارنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی پیاسا پانی پینے کے لئے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے، مگر پانی خود بخود اُس کے ہاتھ میں نہیں آسکتا اور نہ مُنہ تک پہنچ سکتا ہے ۔ جب تک پانی کو اٹھا کر مُنہ تک نہ لے جایا جائے گا پی نہ سکے گا ۔ یہی حال کافروں کا ہے ۔ بے عقل بتوں کو پکارتے ہیں ۔ بتوں میں کوئی حس نہیں کچھ طاقت و اختیار نہیں پھر کس طرح کسی کی حاجت روائی کر سکتے ہیں ۔

مقصودِ بیان بلیغ اور آسان طرز بیان میں توحید کی تبلیغ تمام کائنات عنصری کے تابع حکم الٰہی ہونے کا اظہار و غیر اللہ سے مدد مانگنے والوں کی حماقت کا اظہار وغیرہ ۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ

اور جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے خواہ خوشی سے یا نیز اُن کے سائے صبح و شام اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں

وَالْاٰصَالِ ۩ السجدة قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط قُلِ اللّٰهُ ط قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ

ناخوشی سے (اے محمد) پوچھو کہ آسمانوں کا اور زمین کا رب کون ہے (پھر خود ہی) کہدو اللہ ہے کہدو کیا تم نے اُس کے سوا

مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ط قُلْ هَلْ يَسْتَوِي

اور حمایتی بنالئے ہیں جو اپنے نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتے کہدو کیا نابینا اور بینا

الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۵ لا اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۵ ع اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاۗءَ

برابر ہو سکتا ہے یا اندھیری اور اُجالا برابر ہو سکتا ہے یا انھوں نے اللہ کے ایسے شریک بنا رکھے ہیں

خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ط قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ

جنھوں نے اللہ کی ایسی مخلوق بنائی ہو اسی وجہ سے پیدائش اُن کی نظر میں یکساں ہو گئی تم کہدو کہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہے وہی یکتا

الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا

اور باجبروت　ہے　اس نے　اوپر سے پانی　برسایا　جس کی وجہ سے نالے اپنے اندازہ کے موافق بہنے لگے

فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۭ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ

اور پھولے ہوئے جھاگ کو ریلے کے پانی نے اُٹھالیا　اور جس چیز کو　یہ زیور　یا سامان بنانے کے لئے آگ میں　تپاتے ہیں

حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ڛ

اس میں بھی ویسا ہی جھاگ　ہے　اسی طرح اللہ حق و باطل کی مثال　ظاہر　فرماتا ہے

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاۗءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي

چنانچہ جھاگ تو　رائیگاں　چلے جاتے ہیں　اور جو چیز لوگوں کے لئے کارآمد ہوتی ہے　وہ زمین میں ٹھہری

الْاَرْضِ ۭ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۝

رہتی ہے　اسی طرح اللہ　مثالیں بیان　فرماتا ہے

تفسیر ان آیات میں کبھی الوہیت کا استحقاق چار خصوصی اوصاف سے ثابت کیا ہے اور غیر اللہ سے ان اوصاف کی نفی کرکے اُن کی الوہیت کو باطل کیا ہے۔

ماحصل ارشاد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ چار مخصوص صفات کا حامل ہے۔ (۱) ہر چیز اللہ کے حکم سے مسخر اور مطیع فرمان ہے چاروناچار اُس کے حکم سے سرتابی نہیں کرسکتی۔ شعور رکھنے والی مخلوق ہو یا بے شعور۔ سب قانونِ قدرت کے زیر حکم ہیں۔ اصول ہوں یا فروع کسی چیز کی ذات ہو یا اُس کا سایہ ہر ایک ضابطۂ الٰہی سے خارج نہیں یا یوں کہو کہ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ الخ سے ارواح و نفوس کی طرف اشارہ ہے جو شوق میں آکر انوارِ ذات کی تجلی سے اُس کی طرف جھکتے ہیں اور سایہ سے مراد اُن کے اجسام ہیں جو طبعاً آفتاب ہستی کے طلوع و غروب کے وقت سجدہ کرتے ہیں۔ بہرحال سجدہ سے مراد اطاعت، فرماں پذیری اور انقیاد ہے۔ (کما قال محی الدین ابن عربی) طَوْعًا سے مراد ہے بالارادہ فرماں پذیر ہونا اور كَرْهًا سے مراد ہے بلا ارادہ طبعاً مطیع حکم ہونا۔

(۲) انتظام عالم کو برقرار رکھنے والا بالائی اور زیریں مخلوق کی تربیت کرنے والا آباء علویہ اور امہات سفلیہ کی نگرانی کرنے والا آسمانوں اور زمینوں کے سلسلۂ نظم کو درست رکھنے والا سوائے اللہ کے کوئی نہیں۔

(۳) ہر چیز کو عدم سے وجود میں لانے والا نیست سے ہست کرنے والا بھی خدا ہی ہے۔ عالم میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کو خدا نے نہ پیدا کیا ہو۔

(۴) اللہ کا تسلط ہمہ گیر ہے اُس کی قدرت عمومی ہے۔ عالم کی کوئی چیز اس سے سرکشی نہیں کرسکتی وہ اپنے اس تسلط میں یگانہ... اور بے ہمتا ہے۔

جب یہ چاروں اوصاف خدائے واحد کے اندر موجود ہیں تو بالکل ظاہر ہے کہ اُس کے سوا کسی کو الوہیت کا استحقاق نہیں ہوسکتا۔ اگر

اُس کے علاوہ کسی اور کو معبود و مسجود فرض کیا جائے تو نفع یا ضرر پہنچانے کی طاقت اُس میں ہونی چاہیئے۔ اُس کو قدرت تخلیق کا حامل ہونا لازم ہے۔ کوئی ایسی چیز بھی ہونی ضروری ہے جس کو اُس نے پیدا کیا ہو۔ جب ان امور میں سے کوئی بات نہیں تو پھر الوہیت یا ربوبیت میں کسی غیر کو اللہ کا شریک قرار دینا فطرت عقل اور ہدایت کے خلاف ہے۔

اس سے آگے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ حق و باطل کی دو مثالیں ہیں: - آبی اور آتشی۔ پہلی مثال یہ ہے کہ ابر رحمت سے پانی برستا ہے اور ندی نالے بھر جاتے ہیں۔ کوئی نالہ چھوٹا ہوتا ہے کوئی بڑا۔ ہر ایک میں جتنی وسعت ہوتی ہے پانی اس میں اتنا ہی سماتا ہے۔ جب نالے بھر کر بہنے لگتے ہیں تو کف اوپر آجاتا ہے مگر کف بے کار چیز ہے اور پانی کارآمد ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد کف پھٹ جاتا ہے نیچے بیٹھ جاتا ہے اور پانی خالص رہ جاتا ہے جو باغوں اور کھیتوں کو سرسبز کرتا ہے۔ اسی طرح جب مبدء فیاض سے فیض جاری ہوتا ہے، رسول پاک کے ذریعہ سے نورِ ایمان ابر رحمت سے برستا ہے تو اہلِ بصیرت کے قلوب اس سے بھر جاتے ہیں یعنی جس کا حوصلہ ہوتا ہے اور جس قدر ظرف ہوتا ہے اتنا ہی نورِ ایمان اُس میں سماتا ہے۔ جب قلوب حسب تفاوت مرتبہ ایمان سے لبریز ہو جاتے ہیں تو مختلف اطراف میں نور کا بہاؤ ہوتا ہے، لیکن باطل اور ناحق کا کف حق کے پانی پر چند روز کے لئے غلبہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اہلِ باطل اپنے تمام سرمایۂ دنیا کو لے کر اُن پر چڑھ دوڑتے ہیں۔ حکومت، عزت، دولت، صحت وغیرہ سب کچھ اُن کے ہاتھ میں نظر آتا ہے، لیکن یہ غلبہ اور تسلط عارضی اور چند روزہ ہوتا ہے۔ انجام کار اہلِ حق کو فتح اور باطل کو ہر طبقہ کو شکست ہوتی ہے۔ اللہ کا بول بالا ہوتا ہے اور پھر اہلِ ایمان کے دلوں کا نورِ حق زمین اور اہلِ زمین کو شاداب کرتا ہے۔ قوانین عدل جاری ہوتے ہیں۔ نیکی اور خیر کی اشاعت ہوتی ہے اور ظلم و جور کی بیخ کنی ہو جاتی ہے۔

دوسری مثال کا حاصل بھی اسی کے قریب ہے جو کوئی چیز آگ میں پگھلائی جاتی ہے تو کف اوپر آجاتا ہے۔ جھاگوں کے نیچے اصل جوہر سونا چاندی یا پیتل وغیرہ ہوتا ہے لیکن جھاگوں کا یہ عروج اور بلندی دیرپا نہیں ہوتی۔ تھوڑی دیر میں کف غائب ہو جاتا ہے اور اصل جوہر نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ حق و باطل کی بھی یہی صورت ہوتی ہے۔ چند روز کے لئے باطل کو عروج ہوتا دکھائی دیتا ہے لیکن انجام کار اس کی ہستی مٹ جاتی ہے اور حق کو دوامی غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔

شیخ امام نے ان آیات کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اہلِ باطل اور منافقوں کی حالت بیان کرنے کے لئے سورۂ بقرہ کے آغاز میں خدا تعالیٰ نے دو مثالیں بیان فرمائی تھیں۔ ایک آبی دوسری آتشی۔ فرمایا تھا مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا الخ پھر اس سے آگے فرمایا۔ أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ الخ اسی طرح کافروں کی حالت کی وضاحت کے لئے سورۂ نور میں دو مثالیں بیان کی تھیں آتشی اور آبی۔ فرمایا تھا وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ الخ پھر اس سے آگے فرمایا تھا أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَغْشَاهُ مَوْجٌ الخ سورۂ رعد کی مذکورہ بالا آیات میں بھی خدا تعالیٰ نے حق و باطل کی توضیح کے لئے دو مثالیں بیان فرمائی تھیں ایک آبی اور دوسری آتشی۔ یہ قرآن کی عجیب بلاغت ہے۔ کہ باوجود اختلاف مواقع کے اور باوجود طرز ادا کی نیرنگی کے اثبات مدعا میں یک رنگی رہتی ہے۔

مقصودِ بیان نہایت بلند آہنگی اور یقینی محسوس دلائل سے توحید اور الوہیت کا اثبات۔ اس امر کی صراحت کہ کل دنیا اللہ کے زیر حکم ہے۔ کوئی بالارادہ اطاعت کرتا ہے کوئی بلا ارادہ اپنی فطرت کے لحاظ سے۔ کیونکہ مخلوق اپنے ارادہ کو بدل سکتی ہے اپنی فطرت کو نہیں بدل سکتی۔ پس عقل مند ہیں وہ لوگ جو اپنے ارادے کو فرماں پذیر بنائیں ورنہ بجبر اطاعت تو تمام مخلوق ہی کرتی ہے۔ استحقاق الوہیت کے عام ضابطہ کا بیان کہ جو خالق مربی اور نفع نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتا ہو وہی معبود و اِلٰہ ہونے کا مستحق ہے۔ اعمٰی اور بصیر کے لفظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ مومن بصیر ہے اُس کی بصارتِ عقل فطرت کے رُخ کو دیکھتی ہے اور کافر اندھا ہے اس کو فطرت کا رُخ دکھائی نہیں دیتا۔ وہ حکم الٰہی کی فطری اطاعت تو کرتا ہے۔ کارخانۂ قدرت سے باہر نہیں ہو سکتا۔ اپنی مادی عقل اور جسمانی قوتوں کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ مگر یہ فطری اطاعت اُس کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس لئے وہ اپنے ارادہ اور اختیار سے اللہ کے حکم کا مطیع نہیں بنتا۔ تاریکی اور

نور کے لفظ سے بھی اس جانب ایما رہے کہ اللہ کا انکار کرنا اور اس کے حکم سے سرتابی کرنی تاریکی ہے۔ ایسے کافر کا نور فطرت افسردہ ہو جاتا ہے اور اہل ایمان اطاعت شعار بندہ کی روح روشن، دل منور، دماغ جلا یاب ہوتا ہے۔ حق کی روشنی اور فطرت کی چمک اس کو جگمگا دیتی ہے۔ آخری مثالوں میں اس مضمون کی طرف اشارہ ہے کہ ناحق اور کفر کا اگرچہ عارضی چند روزہ تسلط ہو جائے اور غالب بھی آ جائے تو اہل ایمان کو اس سے شکستہ دل نہ ہونا چاہیئے۔ تھوڑی مدت میں وہ جھاگوں کی طرح بیٹھ جائے گا اور حق نمایاں ہو کر رہے گا اور پھر حق کا ظہور دیرپا ہوگا وغیرہ۔

لِلَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَالَّذِينَ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُ لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا

جن لوگوں نے اپنے رب کا حکم مانا اُن کے لئے بہتری ہے اور جن لوگوں نے حکم نہ مانا اُن کے پاس اگر زمین کی تمام چیزیں بلکہ

فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لَافْتَدَوْا بِهِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ سُوءُ الْحِسَابِ

اتنی ہی اور ہوں گی تب بھی وہ دے کر چھوٹنا چاہیں گے انہی لوگوں کے لئے حساب کی سختی ہے

وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۞

اور اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بُری جگہ ہے

تفسیر ان آیات میں قرآن و پیامِ ہدایت کو ماننے والوں کے اور نہ ماننے والوں کے نتائج بیان فرمائے ہیں۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ جن لوگوں نے دعوتِ رب کو برغبت و شوق قبول کیا یعنی غیر اللہ سے منہ موڑ کر اللہ کے ہو رہے۔ اُن کے لئے بہتری ہی بہتری ہے۔ (حُسْنٰی کی تفسیر ابن عباسؓ نے جنت سے کی ہے یہی قول جمہور مفسرین کا ہے) اور جن لوگوں نے دعوتِ حق کو قبول نہ کیا یعنی رسول پاک کو نہ مانا اور قرآن کی صداقت سے انکار کیا اور عقائد اسلامیہ کی تکذیب کی تو ان لوگوں کا نتیجہ بہت بُرا ہوگا۔ موت کے بعد یا علامات موت ظاہر ہونے کے وقت جب اُن کو عذابِ آخرت نظر آئے گا تو اس وقت وہ دل سے خواستگار ہوں گے کہ اگر روئے زمین کی کل دولت سے دوگنی دولت اُن کے پاس ہو اور کل سرمایہ دینے کے بعد اُن کی جان عذاب سے چھوٹ سکے تو وہ اس میں دریغ نہ کریں۔ اس کے بعد حساب کا وقت آئے گا تو ان سے اعمال کی باز پرس بھی بہت سخت ہوگی کسی صغیرہ گناہ سے بھی درگذر نہ کی جائے گی۔ اس کے بعد عذاب جہنم میں اُن کو گرفتار کیا جائے گا اور اُن کے اعمال کی سزا اُن کو پوری پوری دی جائے گی وغیرہ۔

أَفَمَن يَعْلَمُ أَنَّمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ أَعْمَىٰ ۚ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ

بھلا جو شخص یقین رکھتا ہے کہ جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اُتارا گیا وہ حق ہے کیا اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو نابینا ہے بس

أُولُو الْأَلْبَابِ ۞ الَّذِينَ يُوفُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَلَا يَنقُضُونَ الْمِيثَاقَ ۞

نصیحت تو عقل والے ہی قبول کرتے ہیں جو کہ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور قول و قرار کو نہیں توڑتے

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ

اور جس چیز کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اُس کو جوڑتے ہیں اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور حساب کی سختی

سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۝ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ

کا خوف رکھتے ہیں اور اپنے رب کی خوشنودی کے لئے صبر کرتے ہیں اور باقاعدہ نماز پڑھتے ہیں اور

اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ

ہمارے دیئے ہوئے کو پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں اور بھلائی سے برائی کو دفع کرتے ہیں انہی لوگوں کا

عُقْبَى الدَّارِ ۝ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ

انجام بخیر ہے ان کے لئے دوامی جنتیں ہیں جن کے اندر وہ اور اُن کے باپ دادوں بیویوں اور اولاد میں سے جو لائق

وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا

ہونگے وہ داخل ہوں گے اور ہر دروازے سے فرشتے اُن کے پاس آکر کہیں گے تمہارے صبر کے صلہ میں تم پر سلامتی

صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝ وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ

ہو پس یہ پچھلا گھر خوب ہے اور جو لوگ قول قرار پختہ کرنے کے بعد عہد شکنی کرتے

مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى

ہیں اور جس چیز کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو توڑتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلاتے

الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ۝

ہیں اُنہی پر پھٹکار ہوگی اور اُن کے لئے بُرا گھر ہے

تفسیر ان آیات میں نیکوں اور بدوں کی تفصیل فرماکر ہر ایک کا مآل کار ظاہر فرمایا ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ اَفَمَنْ يَّعْلَمُ سے اَعْمٰى تک یعنی یہ پوری آیت حمزہ اور ابوجہل کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ حمزہ بن عبدالمطلب کو بینا اہل علم اور صاحب یقین فرمایا اور ابوجہل کو نابینا کور بصیرت قرار دیا۔ مفسر خازن نے کہا کہ سبب نزول اگرچہ خاص ہو، مگر آیت کے معنی عام ہیں۔

مذکورہ آیات میں اہل بصیرت کے چند اوصاف ذکر فرمائے ہیں۔ ہم ہر ایک کی جدا جدا تفصیل کرتے ہیں۔

(۱) اللہ کے عہد کو پورا کرنا یعنی اللہ کی الوہیت و ربوبیت کا جو اقرار کیا۔ انبیاء اور کتب سماویہ کی جو تصدیق کی اور قانون الٰہی کی پابندی کا جو معاہدہ کیا اُس کی خلاف ورزی نہ کرنا۔ (۲) پیمان کو نہ توڑنا یعنی اطاعت و فرماں پذیری کا جو پیمان اللہ سے کیا یا کوئی نذر مانی یا کسی کار خیر

کرنے کی قسم کھائی یا مخلوق میں سے کسی کے ساتھ کوئی غیر ممنوع وعدہ کیا اُس کو پورا کرنا (عہد و میثاق کی پابندی کا تذکرہ قرآن میں بیس مقام پر آیا ہے قتادہ) (۳) جس چیز کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو جوڑنا۔ اکثر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد کنبہ پروری اور قرابت داری کی نگہداشت ہے۔ صلۂ رحم کی شریعت اسلامیہ میں انتہائی تاکید کی گئی ہے۔ بعض مفسرین نے عام میل مراد لیا ہے۔ یعنی جن لوگوں سے اللہ نے میل رکھنے کا حکم دیا اُن سے میل رکھنا۔ امن عام، اصلاح خلق، حسنِ سلوک سب چیزیں اس میں داخل ہیں۔ (۴) اللہ سے ڈرنا، اعمال اچھے ہوں یا بُرے، بہرحال خوفِ خدا کرنا یعنی اپنے کل اقوال و اعمال کو احسانہائے الٰہی کے مقابلے میں ہیچ سمجھنا اور اس بات کا ہر وقت خیال رکھنا کہ ہماری کوشش رائیگاں نہ جائے اور ہم غضبِ الٰہی میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ جب اللہ کا خوف ہر وقت پیشِ نظر رہتا ہے تو گناہوں کی جرأت ہی نہیں ہوتی۔ (۵) حساب کی سختی کا اندیشہ رکھنا یعنی اپنے نفس سے ہر وقت محاسبہ کرنا کہ کتنی نیکیاں اور کتنی بدیاں سرزد ہوئیں۔ حساب اگرچہ ذرہ ذرہ کا ہوگا اور کوئی شخص بلا محاسبہ نہیں بچ سکتا، لیکن بعض کے حساب میں آسانی کی جائے گی زیادہ موشگافی نہ کی جائے گی اور بعض کے حساب میں سختی ہوگی۔ ادنیٰ فعل سے بھی چشم پوشی نہ کی جائے گی۔ سُوْٓءَ الْحِسَابِ کی آخری شق ہے۔ (۶) اللہ کی رضا جوئی کیلئے ہر تکلیف و مصیبت پر صبر کرنا، اُن ممنوعات سے نفس کو روکنا جن کی خواہش ہوتی ہو۔ اوامر کی پابندی رکھنی، حکمِ الٰہی کی تعمیل میں کتنی ہی کلفت ہوتی ہو اُس کو برداشت کرنا، لیکن یہ سب کچھ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کرنا۔ مال و دولت، عزت و حکومت اور شہرت کے خیال کو تحمل مصائب کے وقت دل سے نکال دینا۔ (۷) ٹھیک وقت پر پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنا سستی، ریاکاری کو دخل نہ دینا۔ (۸) صدقات، خیرات، زکوٰۃ غرض حقوقِ مالی ادا کرنا خواہ علی الاعلان ہو یا در پردہ چھپ کر خفیہ ہو یا اعلانیہ (۹) بدی کے عوض نیکی کرنا اور دشمنوں کی ایذا پر صبر کرنا۔

اہلِ دانش کے یہ خصوصی اوصاف ہیں جو علمی و عملی تمام خوبیوں کو جامع ہیں۔ ان کے خلاف جو لوگ بے وقوف اور کور دانش ہیں ان کے اندر مندرجہ ذیل خصوصیات ہوتی ہیں:-

عہدِ الٰہی کو توڑنا، قرابت، رشتہ داری، دوستی کا لحاظ نہ کرنا اور ہر قسم کے قول قرار کو توڑنا؛ امن عام کو تباہ کرنا، ملک میں فساد مچانا، مخلوق پر ظلم کرنا، اللہ اور بندوں کے حقوق ادا نہ کرنا۔

اوّل الذکر طبقہ کا نتیجہ اخروی عیش و آرام ہے اور مؤخر الذکر گروہ رحمتِ الٰہی سے دور رہے گا اور مآل کار عذاب میں گرفتار ہوگا۔

مقصودِ بیان اہلِ ایمان بینا اور کافر نابینا ہیں۔ عقلمند وہی ہے جس کے اندر مذکورہ اوصاف ہوں۔ آیات میں وفائے عہد، کنبہ پروری، شدائد و مصائب پر صبر اور مالی صدقات و خیرات کی بلیغ ترین تعلیم دی گئی ہے۔ اس بات کی بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ مصائب کی برداشت اور تکالیف پر صبر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا جائے دنیوی غرض شامل نہ ہو۔ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ صدقہ، زکوٰۃ، خیرات غرض ہر مالی صرف جو راہِ خدا میں کیا جائے کسی طرح کیا جائے خواہ کھلم کھلا علی الاعلان یا خفیہ اور در پردہ۔ بہرحال قابلِ مدح ہے۔ بدی کے عوض نیکی کرنے کی بھی مختصر الفاظ میں ہدایت کی گئی ہے حسنہ اور سیئہ کے الفاظ ہر نیکی بدی کو شامل ہیں۔ اس میں ہر قسم کی معافی احسان اور ترک انتقام داخل ہے۔ وَمَنْ صَلَحَ الخ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ اہلِ جنت کے اصول و فروع اور بیویاں بھی اُن کے ساتھ جنت میں جائیں گی۔ بشرطیکہ ان میں جنت کے اندر جانے کی قابلیت ہوئی یعنی ایمان دار ہوئے اور ان کی حالت دخولِ جنت کے مناسب ہوئی۔ بِمَا صَبَرْتُمْ کی قید دلالت کر رہی ہے کہ نفس پر جائز دباؤ ڈال کر خواہشات سے روکنا اور مادی قوتوں کو شریعت کی اجازت کے مطابق مغلوب رکھنا اور خواہشات کو تعلیم اسلامی کے موافق ترک کرنا خوشنودیٔ خدا کا باعث، دخولِ جنت کا سبب اور جنت کے اندر اعزاز و احترام کا باعث ہے وغیرہ۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

اللہ جس کی روزی میں چاہتا ہے فراخی اور تنگی کرتا ہے اور لوگ دنیوی زندگی پر ریجھے ہوئے ہیں

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۟ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

حالانکہ آخرت کے مقابلہ میں دنیوی زندگی بے حقیقت چیز ہے کافر کہتے ہیں اس پیغمبر پر

لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ

کوئی کھلا معجزہ اس کے رب کی طرف سے کیوں نازل نہ کیا گیا؟ کہہ دو کہ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ چھوڑ دیتا ہے

وَيَهْدِيْۤ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۟ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ

اور جو اس کی طرف رجوع ہوتا ہے اس کو اپنی طرف آنے کا راستہ بتا دیتا ہے یہ لوگ وہی ہیں جو ایمان لائے ہیں اور یاد الٰہی سے ان کے دلوں کو

بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۟ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

اطمینان حاصل ہوتا ہے خوب سمجھ لو کہ اللہ کی یاد سے دلوں کو چین حاصل ہوتا ہے جو لوگ مومن اور نیکوکار ہیں

الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ وَحُسْنُ مَاٰبٍ ۟

ان کے لئے خوش حالی اور اچھا ٹھکانا ہے

تفسیر ابتدائے اسلام سے اب تک جب سے نزول اللہ کافروں کی حالت کا عمومی تناسب دیکھا جاتا ہے تو یہ ان میں کفار عموماً دولت مند اور مرفہ الحال نظر آتے ہیں اور مسلمان ہمیشہ تنگ دست، نادار اور دنیوی مصائب کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ مسلمانوں اور کافروں کی ظاہری حالت دیکھ کر عموماً غیر مسلم اور بعض مسلم بھی اس شبہ میں پڑ جاتے ہیں کہ مسلمانوں پر بحیثیت مذہب خدا کی طرف سے ادبار ہے۔ خدا ان کے مذہب کو پسند نہیں کرتا۔ اگر خدا ان سے راضی ہوتا تو دنیا میں سب سے زیادہ مالدار یہی قوم ہوتی۔ اس کے علاوہ عموماً کفار علمبرداران اسلام کو مفلس اور اپنے بھائی بندوں کو مالدار دیکھ کر پھولے نہیں سماتے اور غریب مسلمانوں کے سامنے اکڑتے ہیں خدا تعالیٰ ان آیات میں اس شبہ کا ازالہ فرماتا ہے کہ رزق کی کمی بیشی اور تنگی فراخی تو اللہ کے دست قدرت میں ہے۔ خدا جس کو چاہتا ہے فراخ دست کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تنگ دست بنا دیتا ہے، مگر (عاقبت نا اندیش) لوگ دنیوی زندگی (کے عیش و آرام) پر اکڑتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ آخرت کی زندگی کے مقابلے میں اس دنیوی زندگی کی کوئی وقعت نہیں۔ یہ ایک حقیر اور ناقابل ترجیح متاع سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے اس کو معیار فضیلت نہیں قرار دیا۔ لہٰذا اس پر اکڑنا بے جا ہے۔ حضرت مستورد کی روایت میں ہے کہ حضور اقدس نے ارشاد فرمایا آخرت کے مقابلے میں دنیا کی بس اتنی حیثیت ہے جتنی سمندر کے مقابلے میں اس انگلی کی نمی ہوتی ہے جو ڈبو کر نکالی گئی ہو (رواہ احمد والمسلم) دنیا اور متاع دنیا کے بے مقدار ہونے کے متعلق بکثرت صحیح احادیث وارد ہیں جن کا ذکر موجب طوالت ہے۔

مکہ کے معاندین کافر یہ بھی کہا کرتے تھے کہ آخر ایسی کوئی محسوس نمایاں نشانی کیوں نہیں نازل ہوتی جس سے ہمارے شکوک و شبہات زائل

ہوں اور ہم مسلمان ہو جائیں (اس کی تفصیل اسی سورت میں اوپر گزر چکی ہے) گویا کہ نزولِ کی نظر میں رسول پاکؐ کے بیسیوں معجزات خصوصاً زندہ قرآن جو با عتبار طرزِ بیان، عمرانی تمدن اور سوشل اصول کی جامعیت، الٰہیات کے نفیس مباحث کی تفصیل، گزشتہ اقوام کی تاریخ اور آئندہ واقعات کے اظہار کے اعتبار سے ہم معجزہ تھا کافی تھا۔ وہ ایسے نمایاں معجزات کے باوجود جاہلانہ معجزات کے طالب تھے اور طرح طرح کی فرمائشیں کرتے رہتے تھے، لیکن یہ فرمائشیں نمائشی اور معاندانہ ہوتی تھی طلبِ حق مقصود نہ تھیں، اس لئے ایسی خواہشات قبول نہ کی جاتی تھیں۔ کفار کے مذکورہ بالا ...... سوال کے جواب میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اطمینان اور ایمان کے لئے تو قرآن کافی ہے۔ جن لوگوں کو ایمان کی خواہش ہوتی ہے اور طلبِ حق جن کا شعار ہوتا ہے اُن کی ہدایت تو اس سے ہو جاتی ہے، لیکن جس کو اللہ گمراہ چھوڑنا چاہے اُس کو کون ہدایت کرے۔ یعنی جو لوگ ازلاً توفیقِ ایمان سے محروم ہیں اور معاندانہ رنگ میں آیاتِ الٰہی سے سرکشی کرتے ہیں اُن کی ہدایت نہیں ہو سکتی۔ اس سے آگے نیکوکار اہلِ ایمان نیک انجام بیان فرماتا ہے

مقصودِ بیان دنیا کی کوئی چیز قابلِ افتخار اور معیارِ فضیلت نہیں نہ دولت، نہ حکومت نہ طاقت۔ ہدایت و گمراہی خدا کے اختیار میں ہے، لیکن قابلیت کے اختلاف کی وجہ سے خدا نے کسی کو گمراہ اور کسی کو راہ یاب کر دیا ہے۔ جو لوگ اللہ کی طرف خلوص کے ساتھ رجوع کرتے ہیں اور اللہ کی یاد سے اطمینانِ قلب حاصل کرنا چاہتے ہیں اُن کو خدا ہدایت کر ہی دیتا ہے۔ گویا ان آیات میں اس طرف اشارہ ہے کہ تقدیرِ اور حکمِ الٰہی پر الزام لگانا بے جا ہے۔ سب سے پہلے طلبِ صادق کی ضرورت ہے۔ جو بندہ بانبرہ جو خدا کی طرف دوڑتا ہے اللہ اس کی دستگیری کرتا ہے اور گم کردہ راہ نہیں چھوڑتا۔ ذکرِ الٰہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے وغیرہ۔

ایک خاص نکتہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ قلب کی غذا یادِ الٰہی ہے ورنہ دل تاریک اور مردہ ہو جاتا ہے۔ اللہ کو یاد کرنے سے اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ آدمی جب اللہ کو خلوصِ قلب کے ساتھ یاد کرتا ہے اور اس کے تمام جمالی و کمالی اوصاف پر غور کرتا ہے اور صفاتِ توحید کا یقین کرتا ہے تو لامحالہ سکونِ خاطر ہوتا ہے۔ مفسر سراج نے لکھا ہے کہ یہاں ارشاد فرمایا کہ یادِ خدا سے دلوں میں اطمینان پیدا ہوتا ہے اور سورۂ انفال میں فرمایا کہ مومن وہ لوگ ہیں جن کے دل یادِ الٰہی کے وقت خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ گویا یادِ الٰہی اطمینان اور خوف، دونوں کا سبب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی اللہ کے عذاب اور قہر کو یاد کرتا ہے تو اس کا دل خوف زدہ ہو جاتا ہے اور جب اس کی رحمت و مغفرت کو یاد کرتا ہے تو دل میں سکون حاصل ہوتا ہے۔ میرے نزدیک کسی تاویل کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ رحمت کی اُمید اور قہر کا خوف اسی بنا پر کہا گیا ہے۔ اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ۔

یہ امر سمجھ لینا ضروری ہے کہ ذکرِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں ظاہری اور باطنی۔ ظاہری ذکر زبان سے بھی ہوتا ہے اور کانوں سے بھی۔ دوسرے سے سُن کر بھی زبان و گوش کے ذکر سے دل کو طمانیت ضرور حاصل ہوتی ہے مگر بطریق تربیت و توحید رہا باطنی ذکر تو اس کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل یہ کہ اللہ کے انعامات پر غور کیا جائے۔ مصنوعات اور مخلوقات پر نظرِ فکر ڈالی جائے اور دماغ کے اس عمل سے دل کے اندر اللہ کی عظمت و جلالت سما جائے۔ دوم یہ کہ قلب کا اپنا کوئی فعل نہ ہو بلکہ محض عالمِ غیب سے مخصوص تجلیات کا ظہور بطورِ کشف ہو جائے، یہی خالص طمانیت ہے

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَا۟ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ

اسی طرح ہم نے تم کو ایسی امت میں بھیجا ہے جس سے پہلے بہت سی اُمتیں گزر چکی ہیں تاکہ تم اُن کو وہ قرآن پڑھ کر سناؤ جو بذریعہ وحی

اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۭ قُلْ هُوَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ

ہم نے تمہارے پاس بھیجا ہے اور رحمٰن کا انکار کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ میرا رب ہے اُس کے سوا کوئی معبود نہیں

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ ○

اُسی پر میرا بھروسہ ہے اور اُسی کی طرف میرا رجوع ہے

تفسیر ابوجہل نے سنا کہ رسول اللہؐ ان الفاظ میں دعا کرتے ہیں یا اللّٰہُ یا رحمٰنُ تو اپنے ہم خیال لوگوں سے جا کر اس نے کہا کہ محمد اللہ کو پکارتا ہے مگر اللہ کے ساتھ ایک اور معبود کا بھی نام لیتا ہے۔ ہمیں تو رحمان الیمامہ کے علاوہ کسی اور رحمٰن کا نام معلوم نہیں۔ یعنی رحمٰن الیمامہ جو مسیلمہ (کذاب) کا خطاب ہے۔ مگر وہ معبود نہیں۔ پھر یہ رحمٰن جس کو محمد پکارتے ہیں کون ہے؟ (معالم) ابن عباس کا قول ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں کو قریش کے سامنے بیان کیا اور حکم فرمایا کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو انھوں نے انکار و ناپسندیدگی اور نفرت کیا اور بولے رحمٰن کیا چیز ہے؟ قتادہ نے بیان کیا کہ معاہدۂ حدیبیہ کے لئے قریش کی طرف سے سہیل بن عمرو نمائندہ بن کر آیا اور صلح کی مجلس منعقد ہوئی۔ حضور اقدسؐ نے حضرت علیؓ کو صلح نامہ لکھنے پر مامور فرمایا۔ آپ نے لکھنا شروع کیا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سہیل نے کہا ہم تو سوائے یمامہ والے کے دوسرے کو رحمٰن نہیں جانتے۔ تم ہمارے دستور کے موافق بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ لکھو (بخاری) اسی طرح کے چند واقعات ان آیات کے اسباب نزول ہیں۔ اگرچہ قتادہ نے مؤخرالذکر حصہ کو کئی شان نزول قرار دیا ہے۔

گزشتہ آیات میں کفار کے معجزہ طلب کرنے کا ذکر کر کے جواب دیا تھا کہ معجزہ دیکھنے کے بعد بھی ازلی گمراہ ہدایت یاب نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کو ظاہری معجزہ کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ اُن کے لئے باطنی معجزات ہر وقت موجود ہیں۔ طلب معجزہ کا دوسرا جواب ان آیات میں دیا ہے۔

○ حاصل ارشاد یہ ہے کہ کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی دنیا میں نئے نبی نہیں آئے جو بات بات پر ظاہری معجزات کی طلب کی جاتی ہے۔ سلسلۂ انبیاء پہلے ہی سے جاری ہے تو کیا منکروں کے کہنے سے ہر وقت وہ ظاہری معجزات دکھایا کرتے تھے۔ معجزہ کا ظہور کبھی کبھی بوقت ضرورت ہو جاتا ہے ورنہ اصل مقصود تو پیغام الٰہی کا پہنچا دینا ہے۔ اللہ کی طرف سے ہدایت کا پیغام آنا ہی عظیم الشان نعمت ہے، مگر یہ کفار رحمٰن کا انکار کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کو رحمٰن نہیں مانتے۔ حالانکہ رحمٰن ہی درحقیقت پروردگار عالم ہے۔ اسی جہان کی تربیت اُسی کے دست قدرت میں ہے زندگی کے کل کاروبار میں اسی پر بھروسہ رکھنا لازم ہے اور یہ بھی یقین رکھنا ضروری ہے کہ آخر کار رب کی بازگشت اور واپسی بھی اُسی کے پاس ہوگی۔

خلاصۂ بیان یہ نکلا کہ اللہ نے گزشتہ اقوام کی ہدایت اور انجام کی سعادت اور رب کی معرفت اور تزکیۂ نفوس کے قواعد سکھانے کے لئے بھی انبیاء بھیجے اسی طرح ان لوگوں کے نفوس کی تکمیل کے لئے تم کو مامور کیا اور قرآن نازل فرمایا مگر ان کی کوربا طنی کی یہ حالت ہے کہ وہ رسول کی بعثت اور قرآن کے نزول کو اللہ ہی کی رحمت نہیں جانتے بلکہ اللہ کو رحمٰن ہی نہیں مانتے۔ بہر حال وہ مانیں یا نہ مانیں تم کو کہہ دینا چاہیے کہ زندگی اور مابعد زندگی کے کل امور اُسی ذات کے ہاتھ میں ہیں جس کو میں رحمٰن کہتا ہوں۔

نوٹ:- بیضاوی، سراج، معالم اور جلالین میں كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جس طرح ہم نے تم سے پہلے تمہاری پیدائش کی بشارت دینے والے اور تمہارے احوال کی اطلاع دینے والے پیغمبروں کو بھیجا تھا اُسی بشارت اور اطلاع احوال کے موافق تم کو نبی بنا کر بھیجا۔ میرے نزدیک یہ مطلب ظاہر آیت کے خلاف ہے۔

مقصودِ بیان رسول پاک کی بعثت کوئی نئی نہ تھی۔ گزشتہ اقوام کی ہدایت کے لئے خدا نے اور انبیاء بھی مبعوث فرمائے تھے، بعثت رسول کی غرض تبلیغ قرآن ہے بلکہ وہ تمام احکام جو وحی جلی یا خفی کے ذریعہ سے رسول پاک کے پاس پہنچے ہوں، اُن سب کو تم کو سنانا اور قوم کے پاس پہنچانا نبی کا فرض ہے۔ خدا تعالیٰ کے اسمائے صفات میں لفظ رحمٰن کا اطلاق شرعی اسلامی ایجاد ہے۔ اہل عرب اللہ کو رحمٰن نہیں کہا کرتے تھے۔ آخری آیت رعد کے طور پر ایک مخصوص تعلیم یہ دے رہی ہے کہ اقرار الوہیت سے اقرار ربوبیت مقدم ہے۔ اللہ

کی ربوبیت سے اس کی الوہیت کی طرف ترقی ہوتی ہے۔ گویا پہلے نظامِ عالم کی درستگی، احتیاج، حدوث، باضابطہ تغیرات اور کون و فساد کے سلسلے پر نظر ڈالنی چاہیے اور جب تمام کائنات کی علاوہ اس ذات واجب الوجود قرار پا جائے اور یہ یقین ہو جائے کہ تمام عالم کے ایجاد و بقا کی لگام ایک ذات کے ہاتھ میں ہے تو پھر اس کی الوہیت و توحید کا اقرار کیا جائے۔ ایک لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ صفات کا درجہ ذات سے ہماری لئے مقدم ہے۔ اللہ کے صفات کو تو ہم فی الجملہ سمجھ سکتے ہیں، مگر حقیقت اور ذات ہمارے احاطۂ ادراک سے خارج ہے پھر صفات میں بھی صفاتِ فعلیہ کا مرتبہ صفاتِ ذاتیہ کی بہ نسبت ہمارے لئے مقدم ہے۔ اللہ کی صفاتِ فعلیہ کا جو علم ہم کو ہو سکتا ہے وہ صفاتِ ذاتیہ کا نہیں ہو سکتا۔ پھر صفاتِ فعلیہ میں سے بھی ان صفات کا علم زیادہ ہو سکتا ہے جو اضافیہ ہیں یعنی جو منفعل متاثر اور مفعول کو چاہتی ہیں مثلاً صفت خلق کے لئے کوئی مخلوق اور صفتِ ربوبیت کے لئے کوئی مربوب ہونا چاہیے۔ اس تقریر کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہلِ بصیرت پہ لازم ہے کہ پہلے اللہ کی صفاتِ نسبیہ اضافیہ پر غور کریں۔ صفتِ خلق، تربیت اور کائنات میں اللہ کو جو تغیر کرتا رہتا ہے اُس کو گہری نظر سے دیکھیں ان اضافی صفات پر غور کرنے کے بعد غیر اضافی صفات کا علم ہو جائے گا۔ پھر ان صفات کو جاننے سے ذاتی صفات مثلاً وجود علم اور حیات و توحید کا انکشاف ہوگا پھر درجاتِ علم کا یہاں اختتام ہو جائے گا اور بالآخر اعتراف کرنا پڑے گا کہ انجامِ کار سب کو اپنے مرکز کی طرف لوٹنا ہے۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ

اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا کہ اس سے پہاڑوں میں رفتار پیدا ہوتی یا اُس سے زمین کاٹ دی جاتی یا اس کے ذریعہ سے مُردوں سے بات چیت

الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ؕ اَفَلَمْ يَايْــَٔسِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ لَّوْ يَشَآءُ

کی جاتی (اب بھی یہ ایمان نہ لاتے) بات یہ ہے کہ سب کام اللہ کے ہاتھ ہے کیا پھر بھی مسلمانوں کی اس بات سے تسکین نہیں ہوتی کہ اگر خدا چاہتا تو سب

اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ

لوگوں کو ہدایت کر دیتا اور کافروں کو اُن کے کئے پر ہمیشہ مصیبت پہنچتی رہے گی یا وہ

اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۟ؒ

مصیبت اُن کے گھروں کے قریب ہی نازل ہوگی۔ یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آپہنچے گا بلاشبہ اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا

تفسیر طلبِ معجزات کا یہ تیسرا جواب ہے۔ کفارِ مکہ نے حضور اقدس ﷺ سے عرض کیا تھا کہ اگر تم ہم کو مسلمان بنانا چاہتے ہو تو اپنے قرآن کے ذریعہ سے مکہ کے پہاڑوں کو ان کی جگہ سے ہٹا دو اور دور کر دو تاکہ ہماری کھیتی باڑی اور باغ پھلواری کے لئے زمین کشادہ نکل آئے یا ہوا کو مسخر کر دو کہ ہم بآسانی زمین کی مسافت طے کر سکیں اور ملک شام میں جا کر تجارت کریں۔ یا ہمارے بزرگوں یعنی قصی بن کلاب کو زندہ کر دو کہ ہم ان سے بات چیت کر کے تمہارا نبی ہونا معلوم کر لیں۔ ان تمام مہمل سوالات کا جواب ان آیات میں ہے۔

ابن کثیر کے نزدیک قرآن سے مراد دوسری آسمانی کتابیں ہیں، لیکن عام مفسرین کے نزدیک یہی قرآن مراد ہے۔ اول قول پر مطلب یہ ہوگا کہ اگر گذشتہ آسمانی کتابوں میں سے کسی کتاب کے ذریعہ پہاڑوں کو اُن کی جگہ سے ہٹایا گیا ہوتا تو زمین کو چیر کر نہریں نکالی گئی ہوتیں یا مسافت طے کرائی گئی ہوتی یا مُردوں کو زندہ کرا دیا گیا ہوتا تو اس قرآن سے بدرجۂ اولیٰ یہ کام سرانجام دئے جاتے۔ خدا عاجز نہیں سب کچھ کر سکتا ہے۔ دوسرے قول کے بموجب مطلب یہ ہوگا کہ اگر بفرضِ محال تمہاری خواہش کے بموجب ایسے محسوس معجزات ظاہر بھی کر دیئے جائیں تب بھی کیا فائدہ۔ نفس کی تاریکی دور

ہونے، عقل کی آنکھیں روشن ہونے اور روح میں نورِ معرفت پیدا ہونے کے لئے تو ہر معجزہ سے بڑھ کر قرآن موجود ہے۔ جب قرآن سے اس کے نزدیک پر کوئی اثر نہ ہوا تو دوسرے معجزوں سے کیا ہو سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہدایت و گمراہی سب اللہ کے دست قدرت میں ہے۔ اگر وہ چاہتا تو سب لوگوں کو راہ راست پر لے آتا، لیکن اس کی حکمت اس کی مقتضی نہیں ہے۔ ابن کثیرؒ کے قول کی تائید قتادہ کے قول سے ہوتی ہے اور عام مفسرین کے قول کے ثبوت میں ابو سعید خدریؓ، ابن عباسؓ اور شعبی وغیرہم کے اقوال ہیں۔

... کافروں کو ذلت و نکبت، مصیبت، غلامی اور عذاب قیامت کی بھی دھمکی دی گئی ہے۔ آیت لَا یَزَالُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا کی تفسیر میں علماء کا کسی قدر اختلاف ہے۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ کافروں پر آئندہ کوئی نہ کوئی بلا اور مصیبت پڑتی رہے گی جو ان کے لئے باعث عبرت ہوگی اور بالآخر وعدہ الٰہی آ جائے گا۔ یعنی مکہ فتح ہوگا۔ وعدہ الٰہی سے مراد اکثر صحابہ و تابعین کے نزدیک فتح مکہ ہے اور حسن بصری کے نزدیک قیامت مراد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برابر مسلمانوں کے گروہ مکے کے اطراف میں جہاد کے لئے روانہ فرماتے رہتے تھے جو چاروں طرف حملہ کرتے تھے اور اہل مکہ کی عبرت کا سبب بنتے تھے۔ بالآخر ایک دن مکہ پر چڑھائی کا وقت آیا اور مکہ فتح ہو گیا۔

مقصودِ بیان

آیت وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا الخ پر لطف دلالت کر رہی ہے اس مقصود پر کہ قرآن کا کام راہ راست بتانا، ظلم و جور کی بیخ کنی کرنا، عدل کے قوانین پیش کرنا، روحوں کو روشن کرنا، دلوں کی تاریکی دور کرنا، اللہ اور مخلوق کے فرائض کی تفصیل کے ساتھ بیان، سوشل اور تمدنی اور نفسانی اصلاح کرنا ہے۔ پہاڑوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا، اُن کی جگہ سے ہٹا کر زمین کشادہ کرنا یا قبروں سے مردوں کو اکھاڑنا اس کا کام نہیں۔ قرآن خزانۂ علوم ہے، کنز معارف ہے۔ مجموعۂ قوانین ہے، سرچشمۂ ہدایت ہے۔ مسمریزم کی کتاب یا جادو کا دفتر نہیں۔ جب کور بصیرت طبقہ کو قرآنی غرض کا ہی علم نہیں اور مقصد رسالت ہی کی طرف توجہ نہیں تو ایسے بیہودہ سوالات پورے کرنے کے بعد ان کی ہدایت ناممکن ہے۔ آخری آیات میں آئندہ کے واقعات کی خبر بھی دی گئی ہے (پیشین گوئی)۔ عنقریب مکہ اور اطراف مکہ فتح ہوگا۔ اس پیشین گوئی میں ایک خاص رمز اس طرف بھی ہے کہ دنیا میں دو قسم کے آدمی ہوتے ہیں عقل مند اور بے وقوف سمجھ دار بصیرت والے اور متعصب جاہل۔ اہل بصیرت کے لئے تو قرآن سرچشمۂ صد ہدایت ہے۔ رسول پاکؐ کی شخصیت ان کے لئے صداقت مجسم ہے۔ لیکن کور فہم متعصب جاہل روحانی طاقت اور عقل کی روشنی اور قرآن و رسول اللہ کی ذات کے قائل نہیں ہوتے۔ ان کے لئے تو مادی طاقت کا تسلط، ظاہری شوکت و سطوت اور غلبہ و حکومت کی ضرورت ہے۔ وہ حقانیت و صداقت کو دلائل کی روشنی میں نہیں دیکھتے بلکہ ظاہری جلال و شکوہ اور دنیوی عروج و غلبہ کو باعث صداقت جانتے ہیں۔ ایسے بدنصیبوں کے لئے تلوار کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ عنقریب مسلمانوں کی تلوار بھی ان کے سروں پر آنے والی ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَأَمْلَيْتُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ

بہتیرے پیغمبروں کی تم سے پہلے بھی ہنسی اڑائی جا چکی ہے چنانچہ کافروں کو ہم نے مہلت دی پھر اُن کو دھر پکڑا

فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝ أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَجَعَلُوا

تو دیکھو ہوا عذاب کیسا تھا۔ بھلا جو ہر شخص کے اعمال پر مطلع ہو (اُن کو بے سزا دئے چھوڑ دے گا)، انھوں نے اللہ

لِلَّهِ شُرَكَاءَ قُلْ سَمُّوهُمْ أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ أَمْ بِظَاهِرٍ

کے شریک بنا رکھے ہیں، کہو ذرا ان کے نام تو لو، کیا تم اللہ کو وہ بات جتاتے ہو جس کو زمین میں (رکھیں)، وہ نہیں جانتا یا اوپری باتیں

مِنَ الْقَوْلِ ۭ بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَنْ

بناتے ہو نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ کافروں کی فریب کاریاں اُن کے لئے آراستہ کردی گئی ہیں اور اُن کو راہِ راست سے روک دیا گیا ہے اور جس

يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ

شخص کو اللہ گمراہ چھوڑ دے تو اُس کا کوئی ہادی نہیں اُن کے لئے عذاب ہے دنیوی زندگانی میں بھی اور آخرت کا

الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ۝ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ

عذاب تو بہت ہی سخت ہے اور اُن کو اللہ سے کوئی بچانے والا نہیں جس جنت کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے

الْمُتَّقُوْنَ ۭ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ اُكُلُهَا دَاۗىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ۭ تِلْكَ عُقْبَى

اُس کی صفت یہ ہے کہ اُس کے اندر نہریں بہتی ہوں گی اُس کے پھل اور سایہ لازوال ہوگا یہ پرہیزگاروں

الَّذِيْنَ اتَّقَوْا ڰ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِيْنَ النَّارُ ۝

کا انجام ہوگا اور کافروں کا انجام آگ ہے

تفسیر جب آدمی کی عقل تاریک ہوجاتی ہے اور خالی حواس رہ جاتے ہیں تو وہ سمجھنے لگتا ہے کہ فہم و دانش نام فقط حواس کے احساس کا ہے۔ لہٰذا جن چیزوں کو وہ حواس سے سمجھ سکتا ہے اُن کا تو اقرار کرلیتا ہے اور جہاں تک حواس کی رسائی نہیں ہوتی اور ان کو سمجھنے کے لئے عقل کی ضرورت پڑتی ہے اُن کا وہ انکار کردیتا ہے۔ کافروں کی عقل چونکہ تاریکی کے پردوں میں ہوتی ہے اور صرف حواس روشن ہوتے ہیں، اس لئے وہ امرِ آخرت، رسالت وحی اور دیگر غیبی امور کا انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ ان امور کا سمجھنا عقل کی روشنی پر موقوف ہے۔ اور چونکہ اللہ کی صنعت تخلیق اور ایجاد کی صفتیں مصنوعات و مخلوقات کے مطالعہ سے ظاہر ہوجاتی ہیں اور مصنوعات کو ذریعہ حواس کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور کافروں کے حواس درست ہیں، اس لئے وہ ان اوصاف کا انکار نہیں کرتے، مگر اس میں بھی فی الجملہ خرابی واقع ہوجاتی ہے۔ کیونکہ ان کے پیش نظر دنیوی حکومت و انتظام کا سلسلہ ہوتا ہے۔ اسی ظاہری سلسلے پر وہ کارخانۂ قدرت کے انتظام کو بھی قیاس کرلیتے ہیں اور جس طرح دنیوی بادشاہوں کے لئے وزراء، عمال حکومت اور ارکان ہوتے ہیں اور سب مل کر حکومت میں بادشاہ کے شریک ہوتے ہیں اسی طرح وہ اللہ کو بھی ایک بادشاہ کی حیثیت سے زیادہ درجہ نہیں دیتے اسباب ظاہری کو موثر جانتے اور مختلف اولیاء انبیاء، ملائک اور دیوتاؤں کو اللہ کا شریک حکومت اور عمال و کارکن کہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان آیات میں کفار کے اس قیاس و شریک آفریں رائے کی تردید کرتا اور رسول پاک صلعم کو تسلی دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ

اے رسول! تم سے پہلے بھی پیغمبروں کا مذاق اڑایا گیا ہے یعنی کافروں کے عقل کی تاریکی کی وجہ سے غیبی امور کا انکار کیا اور وحی و رسالت کا مذاق اڑایا ہے ان کی نظر میں رسالت ایک مضحکہ انگیز چیز تھی۔ ان کے قیاس کی رسائی وحی خداوندی تک نہ تھی اور اللہ بھی اُن کو ڈھیل دیتا رہا۔ خوشحالی و نعمت اور عیش و نشاط کے دروازے ان پر کھول دیئے، مگر انجام کار ان کی گرفت ہوئی۔ اس کے بعد مخلوق کو خالق پر قیاس کرنے کی تردید کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ (۱) جو خدا ہر شخص کے اندرونی و بیرونی اعمال سے واقف ہو اس کو ناواقف

محتاج مطلق مخلوق پر قیاس کرنا کس طرح صحیح ہے۔ (۲) اللہ کی حکومت و الوہیت میں ایسے افراد کو شریک سمجھنا جن کے نام بھی نہیں معلوم جو واقفیت تو در کنار۔ کس قدر غلط عقیدہ ہے۔ نام لینے سے خود واضح ہو جائے گا کہ یہ نام یا تو بتوں کے ہیں اور فرضی ہیں یا اللہ کی مخلوق سے آدمیوں یا جنوں یا فرشتوں کے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مخلوق خالق کے ساتھ الوہیت میں شریک نہیں ہو سکتی۔ (۳) خدا کے ساتھ کسی کو شریک سمجھنے کا مطلب تو یہ ہے کہ ان مشرکوں کا علم اللہ کے علم سے بھی زائد ہے کیونکہ اللہ کو کوئی اپنا شریک معلوم نہیں اور یہ لوگ شریک کا وجود ثابت کرتے ہیں تو گویا علم الٰہی سے بڑھ کر اپنی واقفیت ثابت کرتے ہیں اور یہ بات بالکل احمقانہ ہے کوئی سمجھ دار آدمی اس کو مان نہیں سکتا۔ (۴) یا یوں کہنا چاہیئے کہ اللہ کا کوئی شریک تو ان کو بھی معلوم نہیں مگر (رسوم کی پیچ کرتے ہوئے) یہ اوپری باتیں بناتے ہیں تو اوپری باتیں بنانے سے شریک کا وجود ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس سے آگے مشرکوں کے شرک کی اصل وجہ بیان فرماتا ہے کہ بس بات صرف اتنی ہے کہ ان کی فریب کاری ان کی نظروں میں کھب گئی ہے۔ یعنی غیر اللہ کی پرستش اور شرک اگرچہ ان کے لئے مفید اور نتیجہ خیز نہیں اور نہ اس کا کوئی عقلی ثبوت ہے، مگر آباؤ اجداد کی رسم ہے اور چونکہ اس کی ناشائستہ حرکات اور فاسد خیالات عادۃً ہیں، پشت در پشت سے چلے آتے ہیں اور تمام برادری والے ان میں مبتلا ہیں، اس لئے یہ لوگ ان کو چھوڑنا نہیں چاہتے بلکہ دوسروں کو بھی راہ حق سے روکتے ہیں۔ گویا ہدایت و راہ یابی ان کی قسمت ہی میں نہیں ہے اور جو چیز قسمت میں نہیں وہ کس طرح ان کو مل سکتی ہے، اس لئے گمراہ ہیں اور گمراہ رہیں گے۔ اس کا نتیجہ آخرت میں بھی ان کے لئے برا ہوگا اور دنیا میں بھی خراب ہوگا۔ آخرت کی سزا تو بہت ہی سخت ہے دنیوی سزا بھی ان کو طرح طرح سے ملیگی۔ مثلاً قحط، وبا، گرانی، گرفتاری، بال بچوں کی تباہی، شکستہ حالی، پریشانی، شیرازۂ قوم کی پراگندگی وغیرہ۔ اس سے آگے مطلب صاف ہے۔

مقصودِ بیان

رسول پاک کو تسلی اور اس امر کی بالجملہ صراحت کہ تاریک عقل والے چونکہ رسالت و وحی کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے، اس لئے لوگ ہمیشہ سے پیغمبروں کا مذاق اڑاتے آئے ہیں۔ شرک فی الالوہیت کی مدلل بیخ کنی، رسوم قبیحہ سے باز رہنے کی زوردار مخصوص ہدایت اور اس امر کی طرف ایما کہ آدمی کو حق سے روکنے والی چیز درحقیقت آباؤ اجداد کی کورانہ تقلید ہے اس بدترین فعل کو آدمی بڑا قابل استحسان سمجھتا ہے اور گمراہ ہوتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی تقلید کے پُر فریب جال میں پھنسا کر عقل و بصیرت کی روشنی سے محروم کر دیتا ہے۔ اس بات کی صراحت کہ جس کو اللہ گمراہ چھوڑ دیتا ہے اسکو کوئی راہ راست پر نہیں لا سکتا۔ خواہ نبی ہو یا ولی یا کوئی اور۔ آیت میں کافروں کو دنیوی عذاب کی بھی دھمکی دی گئی ہے کہ اگر رسول پاک سے یوں ہی سرکشی کرتے رہے تو دنیا میں بھی خراب خستہ ہوں گے۔ چنانچہ یہ پیشین گوئی بدلائلہ اکمل پوری ہوئی۔ حضور کی زندگی ہی میں بڑے بڑے سرداران کفر قتل، خوار اور ذلیل ہوئے اور کچھ مدت کے بعد تو سرزمین عرب کفر کے نام سے بھی پاک ہو گئی۔ آیت میں اس امر کی بھی صراحت ہے کہ جنت کے پھل اور وہاں کا سایہ ناقابل زوال اور لازوال ہے یعنی جنت کا جب کوئی پھل توڑا جائے گا تو فوراً اس کی جگہ اسی قسم کا دوسرا پھل نمودار ہو جائے گا اور اس پھل کا دائمی سلسلہ قائم رہے گا۔ سایہ بھی ہمیشہ رہے گا یعنی وہاں دھوپ نہ ہوگی کیونکہ دھوپ ہی تکلیف کی چیز ہے البتہ روشنی ہوگی اور جملہ راحت کے سامان مہیا ہوں گے وغیرہ۔

وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمِنَ الْأَحْزَابِ مَن يُنكِرُ

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس قرآن سے خوش ہوتے ہیں جو تم پر نازل کیا گیا ہے اور بعض گروہ بعض کا انکار

بَعْضَهُ ۚ قُلْ إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا أُشْرِكَ بِهِ ۚ إِلَيْهِ أَدْعُو وَإِلَيْهِ

کرتے ہیں تم کہہ دو کہ مجھے یہی حکم ہوا ہے کہ اللہ کی عبادت کروں اور اس کا شریک نہ بناؤں اُسی کی طرف میں بلاتا ہوں اور اسی کی

مَاٰبِ ۝ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ

میرا رجوع ہے اسی طرح ہم نے قرآن کو عربی میں خاص حکم (لے کر) اُتارا اب اگر حکم آچکنے کے بعد بھی تم اُن کی خواہشات پر

مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝ ع

چلوگے تو اللہ سے نہ کوئی تمہارا حمایتی ہوگا نہ بچانے والا

تفسیر گزشتہ آیات میں شرک کی تردید اور توحید کا اثبات کیا تھا چونکہ اہل کتاب توحید کے قائل تھے اور آسمانی مذہب کا اپنے فرقے کو حامل سمجھتے تھے اور نیز وہ قیامت اور حشر و نشر وغیرہ کا بھی اقرار کرتے تھے، اس لئے ان آیات میں اہل کتاب کے احوال ہی کا بیان کیا گیا۔

یہودیوں اور عیسائیوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا ایمان واقعی طور پر اپنی مذہبی کتابوں پر بھی تھا اور قرآن کو بھی وہ سچی آسمانی کتاب جانتے تھے اور اس کے کل احکام کو مانتے تھے۔ ان کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں۔ یہودی گروہ میں سے حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے اور عیسائیوں میں سے چالیس نجران کے آٹھ یمن کے اور بتیس حبش کے بیان کئے جاتے ہیں۔ یہ گروہ اہل ایمان کا تھا جس کو دوگنا ثواب ملنے کی حدیث میں صراحت موجود ہے، لیکن کتابی اہل ایمان کے خلاف اکثر لوگ ایسے تھے کہ رسالت و وحی کے طریقے سے تو انکار نہ کرتے تھے۔ اپنی مذہبی کتابوں کو بھی مانتے تھے، مگر حضورؐ کی رسالت کے قائل نہ تھے اور ان کی مذہبی کتابوں میں حضور اقدسؐ کے جو احوال مذکور تھے ان میں طرح طرح کی تحریفیں اور تبدیلیاں کر لی تھیں اور قرآن نے جن احکام میں کتب سابقہ سے اختلاف کیا ہے ان کو بھی تسلیم نہ کرتے تھے۔ اس قسم کے مختلف گروہ تھے۔ ایک پارٹی کعب بن اشرف کی تھی اور دوسری حسید کی، تیسری عاقب کی وغیرہ۔ ان دونوں گروہوں کے متعلق خدا تعالیٰ نے ان آیات میں تصریح فرمائی جس کا حاصل ارشاد یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے جو لوگ فی الحقیقت اپنی آسمانی کتاب کو مانتے ہیں وہ تو نزول قرآن سے مسرور ہیں۔ قرآن کے ہر حکم پر ان کا ایمان ہے اور وہ ہر آیت کو سبب ہدایت جان کر خوش ہوتے ہیں، لیکن انہیں اہل کتاب میں سے کچھ لوگ قرآن کے بعض حصوں کو نہیں مانتے اور ان احکام کا انکار کرتے ہیں جو ان کی خواہش کے خلاف ہیں۔ تم ان کو سمجھا دو کہ توحید و عدم شرک میں تو میں تم سے متفق ہوں۔ جس توحید کا تمہاری کتابوں میں حکم ہے اُسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ رہے احکام تو زمانے کے اختلاف سے احوال مختلف ہوتے ہیں اور اختلاف احوال احکام کے اختلاف کا مقتضی ہے۔ خلاف احوال کا ہی اقتضاء ہے کہ جہاں پہلی کتابیں سریانی اور عبرانی زبانوں میں اتاری گئیں اُن کی جگہ قرآن کا عربی میں نازل کیا گیا اور خاص احکام اتارے گئے۔ اس کے انکار کی اُن کو کوئی وجہ نہیں۔

مقصود بیان تمام آسمانی الہامی مذاہب توحید و عدم شرک کی تعلیم میں برابر ہیں۔ یہ بنیادی عقیدہ ہے جس کی ہدایت ہر آسمانی کتاب میں کی گئی ہے، مگر احکام جزئیہ ہر کتاب کے مختلف ہیں اور زبانیں بھی جدا جدا ہیں اور اس اختلاف کی وجہ محض اختلاف احوال ہے، مذہب الٰہی انسانی خواہش کا تابع نہیں ہوتا نہ انسانی میلان خاطر سے اس میں تغیر کیا جا سکتا ہے۔ ان الفاظ سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے اُن جاہل علماء اور نادان مشائخ کو جنہوں نے دین کو لہو و لعب اور بازیچۂ اطفال قرار دے رکھا ہے جس طرح دل چاہتا ہے آیات و احادیث کو توڑ مروڑ کر اپنے مقصود کے مطابق بنا لیتے ہیں اور دین میں طرح طرح کی بدعتیں پیدا کرتے ہیں کہیں رقص و سرود کے جلسے ہیں اور ان کو ذریعہ معرفت خیال کیا جاتا ہے کہیں حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیا جاتا ہے اور اس کو کمال علمی کا مظاہرہ سمجھا جاتا ہے۔ (اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ وَمَا كَانَ

ہم نے تم سے پہلے بہتیرے رسول بھیجے تھے۔ اور اُن کو بیویاں اور اولاد بھی دی تھیں اور کسی رسول کی طاقت

لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا

نہ تھی کہ بغیر حکم خدا کے کوئی معجزہ پیش کر سکتا ہر وعدہ کی لکھت ہے اللہ جو چاہتا ہے مٹا دیتا

يَشَاۤءُ وَيُثْبِتُ ۚۖ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۝

ہے اور (جو چاہتا ہے) برقرار رکھتا ہے اسی کے پاس کتاب ہے

تفسیر عرب کے مشرک اور مکہ کے کافر حضور اقدس کی نبوت پر طرح طرح شبہات کیا کرتے تھے جن میں سے ایک یہ تھا کہ جس کو اللہ تعالیٰ دنیا میں رسول بنا کر بھیجے اس کو فرشتوں کی مانند دنیا کی باتوں سے پاک ہو جانا چاہیئے (حقانی) بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ انسان پیغمبر ہو نا ہی نہ چاہیئے، فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجنا چاہیئے (ابن کثیر) یہ کیسے نبی ہیں جن کے بیوی بچے ہیں، کھاتے پیتے، دنیا کے کاروبار کرتے اور بازار سے خرید و فروخت کرتے ہیں پھر ایک بیوی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ متعدد بیویاں ہیں۔ (رسول پاکؐ کے تعدد ازواج پر آج کل کے آریہ بھی اعتراض کرتے ہیں) کافروں کا ایک شبہ یہ بھی تھا کہ آپ ہمارے کہنے کے مطابق معجزات کیوں نہیں دکھلاتے۔ آپ کیسے پیغمبر ہیں کہ اتنا اختیار بھی آپ کو نہیں ہے۔ ایک شبہ یہ بھی تھا کہ جس عذاب اخروی اور مصیبت دنیوی کی آپ ہم کو دھمکی دیتے ہیں اُن کو ابھی کیوں نہیں لانے، تاخیر کیوں ہے؟ ایک شبہ یہ بھی تھا کہ ہم کو جو کچھ تعلیم دے رہے ہیں کہ یہ حکم خدا کا ہے تو پھر کچھ زمانے کے بعد اس کو منسوخ کیوں کر دیتے ہو؟ پھر جب سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے تو تم کو کوئی اختیار نہیں جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ (۱) تمام شبہات کا ترتیب وار جواب ان آیات میں دیا گیا ہے

حاصل ارشاد یہ ہے کہ ابراہیم کے وقت سے اب تک مختلف انبیاء آدمی ہی تھے۔ سب عورت کے پیٹ سے پیدا ہوئے کھاتے پیتے، بازاروں میں چلتے پھرتے اور خرید و فروخت کرتے تھے۔ کیا ان کے بیوی بچے نہ تھے، کیا ان کو بیوی بچوں سے رغبت نہ تھی۔ آدمی کا جوڑا تو مقتضائے بشریت میں سے ہے اور انبیاء بھی بشر ہونے کے لحاظ سے مقتضائے بشریت سے پاک نہیں ہو سکتے۔ رہا فرمائشی معجزوں کا ظہور تو معجزات انبیاء کھیلنے اور مذاق اڑانے کے لئے نہیں ہوتے۔ پیغمبروں کو اظہار معجزات کا کوئی ذاتی اختیار نہیں بلکہ درخواست معجزہ بھی ان کے اختیار سے خارج ہے۔ (۲) اللہ جب چاہتا ہے اپنے رسول مقبول کے ہاتھ پر معجزہ کا ظہور کرتا ہے اور جب اس کی مصلحت نہیں ہوتی معجزہ کا ظہور نہیں ہوتا۔ تمام واقعات لوح محفوظ میں درج ہیں اور ہر بات کا ایک مقرر وقت لکھا ہوا ہے۔ جلدی کرنے سے کوئی کام وقت سے پہلے نہیں ہوا کرتا۔ کیونکہ دنیا میں ہر چیز کے لئے ایک سبب مقرر ہے کوئی سبب خفی ہے کوئی ظاہر۔ پھر سبب کی تاثیر کا بھی ایک اندازہ ہے جس کو اثر کہتے ہیں۔ اگر سبب پیدا کرنے اور اس میں خاص اثر رکھنے سے خدا معطل نہیں ہوا بلکہ مختار ہے جب چاہے کسی کی دعا وغیرہ سے اس کی تاثیر اندازہ سے کم یا زیادہ کر دے اور جب چاہے اُس کی تاثیر ویسی ہی رکھے۔ دیکھو آدمی کبھی کنکری کے مارنے سے مر جاتا ہے اور کبھی گولی کھا کر بھی بچ رہتا ہے اور ہر چیز کا اندازہ اللہ کے علم میں ہے وہ ہرگز بدل نہیں سکتا۔ جو حکم خدا کی مرضی سے بدلتا رہتا ہے اُس کو تقدیر معلق کہتے ہیں جس حکم کے ناقابل تغیر ہونے کی صراحت ہو وہ تقدیر مبرم ہے۔ لہٰذا عذاب اور سزا کا بھی ایک وقت مقرر ہے وقت سے پہلے نہیں آسکتا اور ہر شریعت اور ہر حکم کا بھی ایک وقت مقرر ہے۔ وقت ہی کے موافق شرائع اور احکام نازل ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ مالک ہے مصلحت وقت کے مناسب جس شریعت اور جس حکم کو چاہے منسوخ فرما دے اور جس کو چاہے برقرار رکھے۔ مدت، وقت، ترمیم اور تنسیخ سب کچھ لوح محفوظ میں موجود ہے اس سے علم الٰہی کا تغیر لازم نہیں آتا۔ بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ زمانے کے تغیرات اور ان تغیرات کے مطابق شرائع و احکام کا تغیر علم الٰہی میں ہے۔

بعض صحابہ و تابعین سے مروی ہے کہ محو و اثبات میں ہر شے کے مٹانے اور باقی رکھنے کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں تک کہ قبول دعا کے بعد

عمر میں کمی بیشی اور رزق میں زیادتی کمی اور سعادت وشقاوت کا تبادل بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی کی عمر مقدر دس برس کی تھی خدا تعالیٰ اس کو بیس برس کی بھی کر دیتا ہے۔ کسی کی تقدیر میں رزق کم تھا اس کا رزق بڑھا دیتا ہے۔ کسی شخص کے مقدر میں شقی ہونا لکھا تھا، مگر وہ مومن صالح ہونے کے بعد سعید ہو جاتا ہے، لیکن یاد رہے کہ یہ تمام تبدیلیاں قضائے معلق میں ہو سکتی ہیں قضائے مبرم میں نہیں ہو سکتیں۔ یعنی انہیں چیزوں میں اور اسی وقت ہو سکتی ہیں جن کی تبدیلی کے متعلق لوح محفوظ یا علم الٰہی میں صراحت کر دی گئی تھی اور یہ لکھ دیا گیا ہو کہ فلاں شخص کی عمر رزق اس قدر ہے اور پھر وہ فلاں عمل کرے گا تو اس کی عمر رزق میں اس قدر اضافہ یا کمی کر دی جائے گی یا فلاں شخص شقی ہوگا، لیکن آخر وقت ایمان و عمل صالح کی وجہ سے سعید ہو جائے گا۔ گویا چیزوں کا محو و اثبات بھی لوح محفوظ میں لکھا ہے۔ قضائے مبرم نہیں تھی۔

میرے نزدیک اگرچہ آیت یَمْحُوا اللّٰہُ الخ عام ہے کسی خاص چیز کے محو و اثبات کی اس میں صراحت نہیں، مگر سیاق آیات بتا رہا ہے کہ شرائع اور احکام کی ترمیم، تبدیلی اور نسخ کی طرف اس سے خصوصی اشارہ ہے واللہ اعلم۔

مقصودِ بیان سلسلۂ انبیاء آغاز آفرینش آدم سے چلا آتا ہے۔ بہت سے انبیاء کے بیوی بچے تھے۔ لفظ ازواج دلالت کر رہا ہے کہ اقتضائے زوجیت علائق بشری میں سے ہے، شانِ نبوت کے منافی نہیں۔ آیت مَا کَانَ بتا رہی ہے کہ اظہار معجزہ کسی نبی کی اختیاری چیز نہیں۔ بغیر حکم الٰہی صدورِ معجزہ ناممکن ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت کی جا سکتی ہے کہ جب اظہارِ معجزہ انبیاء کے اختیار میں نہیں تو اظہارِ کرامت بھی اولیاء کے اختیار سے خارج ہے۔ جب تک اذنِ الٰہی نہ ہو کسی ولی کی کرامت سرزد نہیں ہو سکتی۔ اسی آیت سے فرمائشی معجزات کے عدمِ صدور کی وجہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ خلافِ وقت کسی چیز کا ظہور نہیں ہوتا۔ ہر تقدیر حکم کا ایک وقت مقرر ہے۔ تقدیر معلق میں ترمیم تنسیخ ہو سکتی ہے، مگر یہ ترمیم و تنسیخ بھی لوح محفوظ میں موجود ہے۔ نسخ شرائع کی اصل وجہ پر بھی اس سے روشنی پڑتی ہے۔

اہلِ بصیرت کے لئے چند نکات انبیاء کو ازواج و اولاد عطا کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ عارف باللہ ہوتے ہیں اُن کو دنیا کا کوئی شغل ادائے فرض سے مانع نہیں ہو سکتا۔ باوجود معاملاتِ دنیوی میں مشغول ہونے کے ایک ہی ذات سے ان لوگوں کو لو لگی رہتی ہے۔ وَمَا کَانَ لِرَسُوْلٍ سے یہ مقصود ہے کہ اہلِ باطن اور مخلص مومن کوئی مجاہدہ و ریاضت کشف و کرامت کے لئے نہ کریں۔ بغیر حکم الٰہی کسی ریاضت سے کرامت کا ظہور نہیں ہوتا۔ تمام امور مقدر ہیں۔ لِکُلِّ اَجَلٍ کِتَابٌ سے اس طرف اشارہ ہے کہ برگزیدہ بندے مراتب و درجات کو وقت سے پہلے نہیں پا سکتے۔ لہٰذا استقامت لازم ہے اور مایوسی کفر ہے۔

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ

جو وعدہ ہم اُن سے کرتے ہیں اگر اس کا کچھ حصہ تم کو دکھا دیں یا (بغیر دکھائے) تمہاری روح قبض کر لیں، بہر حال تمہارے ذمہ تو پیام پہنچا دینا ہے

عَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ

ہمارے ذمہ حساب ہے کیا یہ دیکھتے نہیں کہ ہم سب طرف زمین کو گھٹاتے چلے آتے ہیں

وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ؕ وَهُوَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ وَقَدْ مَكَرَ

اور اللہ حکم دیتا ہے اس کے حکم کو کوئی پیچھے ڈال نہیں سکتا وہ جلد حساب لینے والا ہے ان سے پہلے لوگ

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيْعًا ؕ يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ ؕ وَ

بھی فریب کر چکے ہیں مگر سب تدبیریں اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں ہر شخص جو کچھ کرتا ہے اللہ اس سے واقف ہے اور

سَيَعْلَمُ الْكُفّٰرُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا

کافروں کو عنقریب علم ہو جائے گا کہ انجام بخیر کس کا ہے کافر کہتے ہیں کہ تم پیغمبر نہیں ہو

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۝

تم کہہ دو کہ اللہ اور وہ لوگ جن کو کتاب کا علم ہے میرے تمہارے درمیان شہادت دینے کو کافی ہیں

تفسیر یہ آیات سابقہ کا تتمہ ہے۔ گزشتہ آیت میں فرمایا تھا کہ کسی رسول کو اظہار معجزہ اور نزولِ عذاب کا کوئی ذاتی اختیار نہیں، اللہ کی مشیت و اذن پر موقوف ہے۔ اسی مضمون کی تائید میں ان آیات کا نزول ہوا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جس سزا اور عذاب و بربادی کفار کا وعدہ کیا گیا ہے وہ رسول کی زندگی میں ہو جائے یا اُن کی وفات کے بعد۔ بہر حال رسول کے مراتب میں نہ اوّل الذکر کی وجہ سے کوئی اضافہ ہوتا ہے نہ موخر الذکر کی وجہ سے کوئی کمی۔ رسول کا کام تو پیامِ الٰہی کو پہنچا دینا ہے۔ ہدایت وعدہ وعید جو کچھ ہو اللہ کی طرف سے وہ پہنچانے والے ہیں۔ وعدہ وعید کو پورا کرنا ان کا کام نہیں نہ لوگوں کے ماننے نہ ماننے سے اُن کا تعلق ہے۔ حساب کرنا اور سرکشی کی صورت میں گرفت کرنا تو اللہ کا کام ہے۔ اس کے بعد کافروں کی طرف روئے سخن فرماتا ہے کہ کیا ابھی کافروں کو اپنی بربادی میں کچھ شک ہے؟ کیا ان کو دکھتا کہ سرزمین کفر ہر طرف سے کم ہوتی چلی آرہی ہے۔ چاروں طرف سے اسلام کو غلبہ ہو رہا ہے، کفر کی طاقت ٹوٹ رہی ہے۔ اللہ کا قطعی فیصلہ ہو چکا کہ کفر ملیا میٹ ہو کر رہے گا اور اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا۔ اللہ کے حکم کو کوئی پلٹ نہیں سکتا۔ رہی یہ بات کہ پھر تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟ تو یہ اللہ کی مخصوص مصلحت ہے۔ کفر کی تباہی کی تاخیر سے اہلِ کفر اللہ کے وعدہ کی تکذیب پر استدلال کرتے ہیں اور کرتے چلے آئے۔ ہر حکمت و تدبیر کو اللہ خوب جانتا ہے۔ اس تاخیر کے اندر بھی اس کی مصلحت مضمر ہے۔ نتیجۂ کفر عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جنگ بدر میں جب کافروں کو شکست ہوئی اور بہت سے مشرکوں کی لاشیں قتل کئے جانے کے بعد کنوئیں میں پھینکی گئیں تو اختتام جنگ پر حضور گرامیؐ نے لاشوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم سے جو ہمارے رب نے وعدہ کیا تھا وہ ہم نے پالیا اور تم کو جو وعید دی گئی تھی درحقیقت تم نے بھی اس کو پالیا۔ اس حدیث کی بنا پر عُقْبَى الدَّار سے فتح و کامرانی بھی مراد ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اکثر مفسرین نے نتیجۂ آخرت مراد لیا ہے، مگر عموم اولیٰ ہے۔ اس سے آگے کفار کے انکار رسالت کو نقل کر کے فرماتا ہے کہ ثبوت رسالت کے لئے دو شہادتیں کافی ہیں۔ اوّل تو اللہ کی شہادت قرآن پکار کر کہہ رہا ہے کہ محمدؐ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ دوئم اہلِ کتاب کی شہادت۔ اہلِ کتاب سے کون اشخاص مراد ہیں؟ اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت جندب کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے حق میں اس آیت کا نزول ہوا، لیکن اس صورت میں یا تو اس آیت کو مدنی ماننا ہوگا یا یہ کہنا ہوگا کہ حضرت عبداللہ ہجرت سے قبل مسلمان ہو گئے تھے۔ حدیث الاحبار میں صراحت ہے کہ ہجرت سے قبل حضرت عبداللہؓ ایمان لا چکے تھے۔ نیز دلائل النبوۃ میں امام ابو نعیم اصفہانی نے یوسف بن عبداللہ بن سلام کی روایت بیان کی ہے کہ ایک روز میرے باپ نے علماء یہود سے کہا میرا دل چاہتا ہے کہ اب کی مرتبہ اپنے دادا ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی مسجد یعنی کعبہ میں جا کر عید کروں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ مدینہ سے روانہ ہو کر مکہ پہنچے۔ وہاں دیکھا کہ لوگ حج کر کے واپس ہو رہے ہیں اور جناب رسول اللہؐ کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ حضورؐ نے عبداللہ کو دیکھ کر فرمایا کیا تم عبداللہ بن سلام ہو۔ عبداللہ نے جواب دیا جی ہاں۔ حضورؐ نے قسم دے کر فرمایا عبداللہ سچ بتا کیا تو میرا تذکرہ توراۃ میں نہیں پاتا؟ عبداللہ نے کہا آپ پروردگار کے کچھ اوصاف بیان فرمائیے۔ حضورؐ نے سورۂ اخلاص پڑھ دی۔ عبداللہ نے فوراً کلمۂ توحید پڑھا اور مدینہ واپس آ گئے، لیکن اپنے اسلام کو مخفی رکھا۔ یہاں تک کہ حضور اقدسؐ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے۔ اس وقت عبداللہ کھجور کے درخت پر چڑھے ہوئے تھے خوشی میں اوپر سے کود پڑے الخ۔ اس حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ ہجرت سے قبل مسلمان ہو گئے تھے۔

اکثر مفسرین نے عام علمائے اہلِ کتاب مراد لئے ہیں جن میں حضرت عبداللہ بن سلام بھی تھے۔ ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔ قتادہ نے فرمایا علمائے اہلِ کتاب میں سے عبداللہ بن سلام، سلمان فارسی اور تمیم داری ہیں۔ گویا خدا تعالیٰ نے مشرکین مکہ سے فرمایا کہ اگر تم کو محمدؐ کی رسالت کی تصدیق نہیں ہے تو توریت وانجیل کے عالموں سے دریافت کر لو وہ انبیائے سابقین کی نبوت اور محمدؐ کے حالات صفات حلیہ اور دیگر امتیازی علامات کے متعلق شہادت دیں گے۔ تم اگر ناواقف ہو تو واقف کاروں کی شہادت کو مانو۔ الغرض رسالت محمدی کو ثابت کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے عقل ونقل دونوں کی شہادت پیش کی۔ عقلی شہادت تو یہ کہ قرآن خود رسالت کو ثابت کر رہا ہے اسی پر غور کر و عقل و دانش سے کام لو اور سمجھو کہ رسول کے علاوہ کیا کوئی اور بھی ایسی جامع بلیغ کتاب پیش کر سکتا ہے؟ (اللہ کی شہادت سے یہی شہادت مراد ہے) اور نقلی شہادت حاصل کرنے کے لئے اہلِ کتاب سے دریافت کرنے کا حکم دیا۔

سورۂ رعد اس آیت پر ختم ہوگئی۔ پوری سورت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات وصفات کا بیان، مکارم اخلاق کی تعلیم، دنیا وآخرت کے متعلق مختلف نصائح، سعید وہ ہے جس نے تعلیم رسول پر عمل کیا۔ شقی وہ ہے جس نے اُس سے روگردانی کی۔ استقامت اصل ہے موت تک حد ہے، دنیا امتحان گاہ ہے، جہالت دوامی موت ہے اور علم ہی زندگی ہے۔

مقصود بیان

رسول پاکؐ کا کام صرف تبلیغ ہے۔ اندرونی اعمال کا محاسبہ خدا تعالیٰ کرنے والا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ حضور نے مسلمانوں سے جو وعدے فرمائے تھے یا کافروں کو جو دھمکیاں دی تھیں وہ حضورؐ کی زندگی ہی میں پوری ہو جائیں۔ مسلمانوں کی فتح اور کافروں کی شکست کی تکمیل حضور اقدسؐ کی وفات کے بعد بھی ہوئی۔ آیت اَوَلَمْ یَرَوْا الخ بتا رہی ہے کہ کسی قسم کی فتح ہو یکدم انقلابی شکل میں اُس کی تکمیل نہیں ہوتی بلکہ آہستہ آہستہ تدریجاً ہوتی ہے۔ اسلام کو کفر پر غلبہ ہوا، مگر رفتہ رفتہ ممالک کفر میں کمی آتی گئی اور تسلط اسلام بڑھتا گیا۔ یہی آیت ظاہر کر رہی ہے کہ خدا تعالیٰ کو جو کچھ کرنا مقصود ہوتا ہے اور جو بات ہونے والی ہوتی ہے اُس کے آثار پہلے ہی ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اہلِ عقل اُن آثار وعلامات کو دیکھ کر اصل نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں اور بے وقوف اپنی جہالت میں گم رہتا ہے۔ آیت فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ بتا رہی ہے کہ انسانی تدبیر کے نتیجے کو اُلٹ دینا اللہ کے قبضے میں ہے۔ اُس کے مصالح اور حکمتوں کی طاقت غیر محدود ہے۔ سَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ الخ کے الفاظ میں کافروں کو دھمکی ہے کہ انجام کار تم کو شکست، ذلت، رسوائی اور عذاب آخرت سے دوچار ہونا پڑے گا اور مسلمانوں کو غلبہ، حکومت، سطوت اور دوامی نجات حاصل ہوگی۔ آخری آیت میں سبق دیا ہے کہ کسی مدعا کو ثابت کرنے کے دو ہی طریقے ہوتے ہیں یا تو شہادت فطرت اور عقلی تدبر وتفکر یا علماء کے قول کی تقلید۔ رسولِ پاکؐ مظہر حق اور جلوہ گاہِ حقیقت ہیں۔ اُن کی ذات وصفات پر غور کرنے کے بعد خود ان کی صداقت واضح ہو جاتی ہے اور اگر کسی کور باطن کو ان کے چہرے پر جلوۂ حق نظر نہ آئے تو وہ دیگر علماء سے دریافت کر کے تصدیق کر لے وغیرہ۔

سُوْرَةُ اِبْرَاهِيْمَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ اثْنَتَانِ وَّخَمْسُوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ ابراہیم مکہ میں نازل ہوئی اس میں باون آیتیں ہیں اور سات رکوع ہیں

حضرت زبیر، جابر بن زید، قتادہ، عکرمہ، حسن بصری، ابن کثیر، مفسر سلرج اور بیضاوی وغیرہم کے نزدیک یہ سورت مکی ہے۔ سیوطی کے نزدیک دو آیات یعنی اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ الخ کو مستثنیٰ کیا ہے۔ بعض نے بجائے دو کے ان تین آیات کا استثنا کیا ہے جن میں مقتولین بدر کا ذکر ہے۔ ابن عباسؓ نے صرف ان دو آیات کا استثنا کیا ہے جن میں جنگ بدر کے مشرک مقتولوں کا بیان کیا گیا۔

حسب صراحت بیضاوی کل آیات ۵۱ ہیں۔ بعض کے نزدیک ۵۰ یا ۵۲ یا ۵۵ ہیں۔ کلمات کی تعداد ۸۳۱ ہے۔ اور حروف کا شمار تین ہزار چار سو چونتیس ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان اور بڑا رحم کرنے والا ہے

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ

یہ قرآن ایک کتاب ہے جس کو ہم نے تم پر اتارا ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف اُن کے رب کے حکم سے لاؤ

بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي

یعنی اُس زبردست قابلِ حمد اللہ کے راستہ کی طرف لاؤ جو کائنات سماوی و ارضی

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۙ

کا مالک ہے اور اُن کافروں کے لئے سخت عذاب سے تباہی ہے

الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ

جو دنیوی زندگانی کو آخرت کے مقابلہ میں محبوب سمجھتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روکتے

اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۗ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ ۢ بَعِيْدٍ ۝

ہیں اور اُس میں کجی ڈھونڈتے ہیں یہی لوگ ایک طویل گمراہی میں ہیں

تفسیر اگرچہ عالمِ انسانی کی ہدایت کے لئے سطحِ زمین پر ہزاروں انبیاء بھیجے گئے لیکن موجودہ تینوں آسمانی مذاہب کا مرجع حضرت ابراہیمؑ کی ذات ہے۔ یہودی اور عیسائی اور مسلمان سب کے سب اپنے گروہ کو ملتِ ابراہیمی کا پیرو بتاتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ خالص موحد اور صالح مؤمن اور حق پرست اصحابِ یقین میں سے تھے۔ ایمان و ایقان کی آخری چوٹی پر آپ پہنچ چکے تھے۔ آپ کے دو صاحبزادے اولوالعزم نبی تھے۔ اسمٰعیلؑ و اسحاقؑ۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل میں عدنانی عرب ہیں اور حضرت اسحاق کی نسل سے تمام اولادِ اسرائیل ہے۔ جب امتدادِ زمانہ کی وجہ سے بنی اسرائیل گمراہ ہوئے تو مختلف انبیاء ان کی ہدایت کے لئے آتے رہے، مگر عرب کی ہدایت کے لئے حضرت اسمٰعیلؑ کے بعد نبی نہیں پیدا ہوا، لیکن یاد رہے کہ اولادِ اسمٰعیل یا اولادِ اسحاق سب اصل کے اعتبار سے سامی ہیں۔ رہی آرین اور تورانی نسل قرآن کو شریعتِ اسلامیہ نے اہلِ کتاب قرار نہیں دیا۔ تاہم اتنا یقینی ہے کہ ان کی ہدایت کے لئے بھی مختلف اوقات میں مختلف نبی مبعوث ہوئے ہوں گے اور ان پیغمبروں پر پیامِ الٰہی بصورتِ صحیفہ نازل ہوا ہوگا۔ رسولِ پاکؐ کی بعثت سے قبل تمام عالم کفر و ضلالت کی تاریکی میں گھر چکا تھا۔ اولادِ اسمٰعیلؑ بت پرست، بیشتر افراد بت پرست، ستارہ پرست اور شیطان پرست تھے۔ اسرائیلیوں کے دو فرقے تھے یہودی اور عیسائی۔ یہودیوں نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت داؤدؑ کی تعلیم کو فراموش کر دیا تھا۔ توحید کی بجائے شرک، حق پرستی کی جگہ ہوا پرستی اور اصلاحِ عالم کے عوض افسادِ عالم کا بیڑہ انہوں نے اٹھا لیا تھا۔ عیسائی توحید کے قائل تھے، مگر ان کی توحید شرک آمیز تھی۔ اُن ہی کا ایک فرقہ حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا کہتا تھا۔ توراۃ میں جا بجا حسبِ خواہش تغیرات کر لئے تھے۔

کہیں عبارت بدل ڈالی تھی اور اکثر جگہ معانی میں تحریف کرنے لگے تھے۔ اُن کے علماء حرام و حلال کے مالک اور خود شارع بن بیٹھے تھے۔ مختلف انبیاء ان کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے، مگر انھوں نے بہتوں کو قتل کر ڈالا۔ بالآخر حضرت عیسیٰ بھیجے گئے۔ کچھ لوگوں نے آپ کی تعلیم کو مانا اور اکثر نے مخالفت کی۔ عیسائی فرقہ کچھ زمانے تک تو صحیح توحید پر رہا، لیکن پھر ایسا راہِ راست سے ہٹا کہ اصل مسلک کو بھی بھول گیا۔ حقانی علماء کو چُن چُن کر قتل کیا گیا اور تین سو برس کے بعد تو تثلیث، الوہیت مسیح اور صلیب پرستی نے ایسا رواج پایا کہ بُت پرست اقوام بھی اُن سے پیچھے رہ گئیں۔ رہی آرین اور تورانی نسلیں تو ان کی سکونت ایران، چین، ہندوستان، سیام اور مغربی ممالک میں تھی۔ اُن کی حالت بھی ناقابلِ ذکر ہو گئی تھی۔ کفر والحاد کی کوئی شاخ ایسی نہ تھی جس نے ان کے اندر پرورش نہ پائی ہو اور پھر پرورش پاکر بارآور نہ ہوئی ہو اور پھر بارآور ہو کر عظیم الشان درخت کی شکل نہ اختیار کر لی ہو۔ بُت پرستی، عناصر پرستی، کواکب پرستی، ملائکہ پرستی غرض ہر طرح کی غیر اللہ پرستی ان میں متمکن اور شائع ہو گئی تھی۔ یہ وقت تھا اور یہ ہمہ گیر تاریکی تھی جس نے دلوں کی روشنی، روحوں کا نور اور فطرت کی شعاعوں کو بجھا دیا تھا۔ آفتابِ حق کی کرنیں باطل کی گھٹا میں روپوش ہو گئی تھیں کہ خدا تعالیٰ نے نافِ زمین یعنی معمورۂ ہستی کے وسط سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر کتابِ ہدایت دے کر مامور فرمایا کہ اس آفتابِ عالمتاب (یعنی قرآن پاک) کی روشنی سے دنیا کو منور کر دو۔ لوگوں کو کفر والحاد، ظلم و استبداد، عدم مساوات اور افراط و تفریط کی تاریکی سے نکال کر توحید، عدل، مساوات اور ایمان و اصلاح کی روشنی کی طرف لاؤ، سب کو راہِ حق دکھاؤ، اللہ کی طرف بلاؤ کیونکہ وہی آسمان و زمین کا موجد، مربی اور قائم رکھنے والا ہے۔ اسی کے دستِ قدرت میں ان کا وجود ہے۔ کسی غیر کو اس کے مقابلے میں الوہیت و ربوبیت کا استحقاق نہیں ہو سکتا۔ یہی راہِ نور اور صراطِ مستقیم ہے۔ اب جو لوگ اس کا انکار کریں گے، راہِ نور پر نہ چلنا چاہیں گے، راہِ تاریک سے نور کے راستے پر نہ آئیں گے، جن کے آثار و علامات یہ ہوں گے کہ (۱) آخرت کی حقیقی زندگی پر وہ دنیوی عارضی زندگی کو ترجیح دیں گے۔ اُن کے پیشِ نظر محض دنیوی عیش و طرب اور نعمت و راحت ہوگی آخرت کی راحت و تکلیف کا اُن کو عقیدتاً و عملاً انکار ہوگا۔ غرض یہ کہ وہ دنیا پر شیفتہ و فریفتہ ہوں گے (۲) اور خود ہی گمراہ نہ ہوں گے بلکہ دوسروں کو بھی راہِ حق سے روکیں گے۔ کبھی دنیوی لالچ دے کر، کبھی تقلیدِ آباء کی تعلیم دے کر، کبھی کوئی شیطانی کرشمہ دکھا کر، کبھی اپنی جھوٹی کرامت اور غلط کشف دکھا کر اور کبھی اپنی باطل رائے اور انتہائے عقل کی جھوٹی روشنی نمودار کر کے لوگوں کو سیدھے راستے سے بھٹکائیں گے (۳) اور راہِ حق کو اپنی نفسانی خواہش سے ٹیڑھا کرنا چاہیں گے، اپنے مقصد کے موافق قرآن میں تاویل، تحریف اور تبدیل و تغیر کریں گے۔ ایسے لوگ کج فطرت، کور بصیرت اور تاریک روح والے ہیں، اُن کی گمراہی بہت لمبی ہے۔ ان کی سزا بس دوزخ ہے۔

مقصودِ بیان تمام مخلوق تاریکی کے تہ بہ تہ پردوں میں ہے اور اللہ کا نور بالکل ظاہر ہے (انتہائے ظہور کی وجہ سے آنکھوں میں مادی نور رکھنے والے اس کو نہیں دیکھ سکتے) لِتُخْرِجَ کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ راہِ حق ہی روشن راہ ہے اور تمام راستے تاریک ہیں۔ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ سے اس طرف اشارہ ہے کہ رسول پاکؐ اور دیگر ہادیانِ اُمت سب کے سب رہنما ہیں، کسی کو منزلِ مقصود پر پہنچانے کی طاقت نہیں۔ جب تک اللہ کا اذن نہ ہو کوئی رہنما ہدایت نہیں کر سکتا۔ قلوب میں تر و تازگی اور فہم و درایت سب اللہ کی مشیت و ایجاد سے ہوتی ہے، کسی کو اس کا اختیار نہیں۔ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ الخ اس جانب ایماء ہے کہ اللہ کو استحقاقِ الوہیت بے وجہ اور بلا سبب نہیں۔ جب تمام مخلوق اسی کے دستِ قدرت میں ہے تو بلاشبہ وہی مستحقِ الوہیت ہے پھر وہی غالب بھی ہے، اس سے زیادہ کوئی صاحبِ قوت بھی نہیں۔ اس کے علاوہ اس کی ذات و صفات تمام عیوب و نقائص سے پاک اور ہر قسم کی ستائش کے قابل ہیں۔ لہٰذا وہی ربوبیت کا مستحق ہے۔ آیات میں کافر لوگوں کے تین اوصاف بیان کرنے سے اس مضمون کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمان کے پیشِ نظر محض حیاتِ اخروی ہونی چاہیئے۔ دنیوی زندگانی اس کا اصل مطمح نظر نہ بننی چاہیئے۔ پھر اس کو نہ صرف خود راہِ راست پر مستقیم ہو جانا چاہیئے بلکہ دوسروں کا بھی رہنما ہونا چاہیئے۔ جہاں تک ممکن ہو حق کی تبلیغ کرے پھر راہ پیمائی اور راہ نمائی میں خواہشِ نفس کو دخیل نہ بنانا چاہیئے۔ اللہ کے احکام کو اپنی مرضی کے مطابق بنانے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے وغیرہ۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ

اور ہم نے ہر رسول کو اُس کی قومی زبان میں ہی (پیام پہنچانے کے لئے) بھیجا تاکہ لوگوں سے کھول کر (احکام) بیان کرے اس کے بعد اللہ

يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

جس کو چاہے گمراہ چھوڑ دے اور جس کو چاہے ہدایت کر دے وہی غالب اور مصلحت بین ہے

تفسیر اوپر کی آیات میں بیان کیا تھا کہ قرآن پاک کا نزول اس لئے ہوا کہ لوگ تاریکی سے نکل کر روشنی میں آ جائیں، لیکن یہ غرض اسی حقت پوری ہو سکتی تھی کہ قرآن براہِ راست جس قوم میں نازل ہوا ہے وہ اس کے مطالب و معانی سمجھ سکے ۔ اگر اس کی زبان کو چھوڑ کر دوسری زبان میں نازل ہوتا تو اس قوم کو مطلب سمجھنے میں بڑی دشواری ہوتی ۔ چنانچہ اسی مصلحت کو پیش نظر رکھ کر قرآن کو عربی میں نازل فرمایا بلکہ اس آیت میں بطریقِ عموم فرما دیا کہ ہر نبی کو ہم نے اس کی قومی زبان میں پیام ہدایت دے کر بھیجا تاکہ واضح طور پر کھلم کھلا قوم والوں کو پیامِ الٰہی سمجھا سکے اور ان کو ہدایت حاصل ہو سکے ، لیکن جو لوگ کور باطن اور ازلی بد بخت ہیں ان کی تاریکی کو کوئی مشعلِ ہدایت دور نہیں کر سکتی ۔ آفتاب سے ان کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہوتی ہے ۔ ابر رحمت کے برسنے سے ان کے گھورے سے مزید تعفن پیدا ہوتا ہے ، اس لئے آگے ارشاد فرماتا ہے کہ ہدایت و گمراہی تو اللہ کے قبضہ میں ہے یعنی رسول اور کتاب فقط ذریعہ ہدایت اور ابر رحمت ہیں ۔ گمراہ چھوڑنا یا راہ یاب کرنا اللہ کا کام ہے ۔ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ چھوڑ دیتا ہے ۔ فیض قدسی سے اس کو فائدہ نہیں پہنچتا اور جس کو چاہتا ہے اس کو ہدایت کر دیتا ہے ۔

ایک شبہ جب قرآن کی زبان عربی بلکہ قریشی ہے اور یہ زبان اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ عرب والوں کی سمجھ میں خوب آ سکے اور حضور اقدس کھول کھول کر ان کے سامنے بیان کر سکیں تو ظاہر ہے کہ آپ کی بعثت بھی صرف عرب کے لئے تھی عمومی بعثت نہ تھی ورنہ قومی زبان میں نازل ہونے کی یہ حکمت و مصلحت کس طرح پوری ہو سکتی ہے ۔

ہم اس شبہ کا حل کرنے سے پہلے مناسب سمجھتے ہیں کہ آیات و احادیث سے ثابت کر دیں کہ حضور اقدس کی عمومی بعثت تھی ۔ آپ تمام دنیا کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے نہ فقط انسان بلکہ جنات کی ہدایت کا کام بھی آپ کے سپرد تھا ۔

ایک آیت میں آیا ہے قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا لفظ جَمِيْعًا بتا رہا ہے کہ کل آدمیوں کے لئے حضور کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا ۔

دوسری آیت میں آیا ہے وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ لفظ كَآفَّةً بھی ہمارے مدعا پر صریح دلالت کر رہا ہے ۔

تیسری آیت میں قرآن کے متعلق وارد ہے ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ یعنی قرآن تمام عالم کے لئے موجب نصیحت ہے جب قرآن کی ہدایت عمومی ہے تو رسول پاک کی بعثت بھی عمومی ہوئی ۔ صحیح حدیث میں آیا ہے حضور نے فرمایا ۔ بُعِثْتُ اِلَى الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ ۔ مجھے کالے اور گوروں یعنی مشرق اور مغرب کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہے ۔

صحیحین میں حضرت جابر کی روایت ہے کہ حضور نے شاہ روم ، والیٔ مصر ، شاہ حبش اور بعض دیگر حکام کو خطوطِ ہدایت بھیجے تھے ۔ اگر بعثت عام نہ ہوتی تو بیرونِ عرب کیوں تبلیغ کرتے ۔ اب ہم اصل شبہ کے حل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔ قوم و امت میں فرق ہے ۔ قوم کا اطلاق دو معنی پر ہوتا ہے خاص اور عام ۔ خاص قوم تو کسی شخص کی قرابت دار یا زائد سے زائد اس کے ہم وطن کہلاتے ہیں اور عام قوم میں تمام وہ لوگ داخل ہیں جو اس کے ہم ملک یا ہم زمانہ ہیں ۔ آیت مذکورہ میں اول معنی مراد ہیں ، لیکن اس سے عمومی بعثت کا انکار کرنا غلطی ہے ۔ چونکہ اکثر انبیاء کرام جس زبان میں پیامِ الٰہی لے کر آتے اُسی زبان کے جاننے والوں تک اُن کی تبلیغ و بعثت محدود رہی ہے ۔ مگر یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے ۔ بعض انبیاء

ایسے بھی گزرے ہیں جن کی کتاب یا قوم کی زبان اگرچہ مخصوص تھی، مگر ان کی بعثت بعض دوسری قوموں کے لئے تھی مثلاً حضرت یوسف کی زبان عبرانی تھی مگر آپ نے جیل خانے والوں کو بھی تبلیغ توحید کی۔ بلکہ شاہ مصر اور بعض دیگر قبطی آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔ حضرت موسیٰ کی کتاب اور قوم بنی اسرائیل کی زبان بھی عبرانی تھی، مگر فرعون والوں اور اصحاب فرعون کو بھی تبلیغ و توحید کا حکم آپ کو دیا گیا تھا۔ یہی صورت ہمارے رسول کی تھی۔ اگرچہ آپ کی، آپ کی قوم کی اور قرآن کی زبان عربی تھی، مگر آپ کی تبلیغ صرف عرب پر محدود نہ تھی۔ تمام کالے گورے توحید و رسالت پر مکلف تھے۔ رہی یہ بات کہ پھر بیان مسائل اور فہم شریعت تفصیلی طور پر دوسری قوموں کے لئے کس طرح ممکن تھا؟ اور قومی زبان میں کتاب نازل کرنے کا کیا فائدہ؟ تو ظاہر ہے کہ پیام الٰہی براہ راست کسی ایک مخصوص زبان میں نبی کے پاس آنا لازم تھا۔ کیوں کہ اگرچہ خدا تعالیٰ قادر تھا کہ دنیا کی ہزاروں اقوام کے پاس ہزاروں زبانوں میں جدا جدا ایک ہی پیام دے کر ایک ہی نبی کو بھیج دیتا اور وہ ہی تمام زبانوں سے واقف ہوتا اور رسالت خود دنیا کے ہر حصہ اور خطہ میں ہر قوم کے پاس پہنچ کر ان ہی کی زبان میں اللہ کا پیام ان کو پہنچاتا، مگر عادتاً ایسا ناممکن تھا۔ قدرت اور ہے اور عادت اور چیز ہے۔ لامحالہ کسی مخصوص زبان کو اختیار کرنا پڑا اور چونکہ سب سے پہلے انھیں لوگوں کی اصلاح مقصود تھی جن میں نبی پیدا ہوا، پرورش پائی اور نبی کی خوبی سے ان کو کامل واقفیت تھی، اس لئے انھیں کی زبان کو ذریعۂ تبلیغ قرار دینا لازم ہوا۔ لہٰذا قرآن پاک بزبان عربی نازل ہوا جس پر عمل کرنے کا حکم سب سے پہلے رسول پاک کے اقارب کو ہوا پھر عمومی عرب کو اور پھر تراجم و تفاسیر کے ذریعہ سے تمام عالم کو۔ قرآن پاک کی زبان بھی اگرچہ آسمانی اور الہامی ہے، مگر بعثت اور زبان میں فرق ہے۔ زبان صرف نزولی ہے۔ جس قوم میں نزول ہوا اسی کی زبان اختیار کی گئی، مگر بعثت عمومی ہے جو ترجمہ کے ذریعہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ بعثت کو کتابی زبان پر سمجھ لینا خلاف دانش ہے۔

مقصود بیان آیت دلالت کر رہی ہے اس مضمون پر کہ آدمیوں کی ہدایت کے لئے خدا تعالیٰ نے کسی جن یا فرشتہ کو نبی بنا کر نہیں بھیجا۔ ہمیشہ آدمی ہی رسول رہا۔ ہر پیغمبر احکام الٰہی کو اپنی قومی زبان میں لایا یعنی جو پیغمبر اللہ کی وحی اور اس کا نزولی کلام لایا وہ قومی زبان ہی میں لایا تاکہ قوم والوں کو سمجھنے میں سہولت ہو۔ کتاب الٰہی سرچشمۂ ہدایت اور ابر رحمت ہے۔ اس کے ذریعہ سے روشن دل والے ہدایت پاتے ہیں اور کور رنش مزید گمراہی میں پڑتے ہیں۔ ہدایت دینا اور گمراہ چھوڑنا اللہ کا فعل ہے جو حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ آیت کا آخری حصہ بتا رہا ہے کہ خدا تعالیٰ عالم، صاحب ارادہ اور مختار ہے وغیرہ۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ۵

اور ہم نے موسیٰ اپنی نشانیاں دے کر بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ

وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝ وَاِذْ

اور اُن کو اللہ کے دن یاد دلاؤ اس میں ہر صابر شکر گزار کے لئے بلاشبہ نشانیاں ہیں قدرت ہیں جب

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اس احسان کو یاد کرو جو اللہ نے تم پر کیا ہے جبکہ تم کو فرعون والوں سے

فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ

نجات دی وہ تم کو بری طرح سے تکلیف دیا کرتے رہیں اور تمہارے بیٹوں کو مار ڈالتے تھے اور لڑکیوں کو

ع ۲ ۱۲

نِسَآءَكُمْ ۚ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَآءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ع وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن

زندہ چھوڑ دیتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی اور جب تمہارے رب نے جتا دیا تھا کہ اگر تم

شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ۖ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ ○ وَقَالَ مُوسَىٰ

شکر کرو گے تو میں تم کو اور زیادہ دوں گا اور ناشکری کرو گے تو میری مار سخت ہے اور موسیٰ نے کہا

إِن تَكْفُرُوا أَنتُمْ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۙ فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ ○

کہ اگر تم اور زمین کے سب لوگ کافر ہو جائیں تب بھی اللہ بے پروا اور قابلِ ستائش ہے

تفسیر ان آیات کا حاصل یہ ہے کہ محمدؐ کوئی نئے نبی بن کر نہیں آئے نہ کوئی جدید انوکھا پیام خدا لائے بلکہ ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے دیکھو خدا نے موسیٰ کو بھی مختلف معجزات و آیات دے کر نبی بنا کر بھیجا تھا اور حکم دیا تھا کہ مخلوقات کے دلوں پر کفر و جہالت معصیت اور شرک جلی و خفی کے تاریک پردے پڑے ہوئے ہیں ان کو ہدایت کی روشنی سے آہستہ آہستہ دور کر دو۔ تاریکی کے پردوں سے نکال کر نور کے پردوں میں لے آؤ یعنی مادی کثافت اور شہوانی و غضبی قوتوں کے تسلط سے آزاد کر کے روحانیت اور علم کی طرف لے آؤ اور ان کے دلوں سے غفلت کا زنگ دور کرنے کے لئے اللہ کے انعامات و احسانات یاد دلاؤ۔ مثلاً معجزات کے ذریعہ سے فرعون کو مغلوب کرنا، ساحروں کا ایمان لانا، طوفان، ٹڈی، جوں اور خون وغیرہ کا عذاب اہل مصر پر نازل کرنا۔ بحیرۂ قلزم میں فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دینا اور بنی اسرائیل کو بچا لینا۔ جنگل بیابان میں ابر کو خیمہ کی طرح سایہ فگن کرنا اور بے آب و گیاہ میدان میں غیب سے بصورت من و سلویٰ رزق پہنچانا، غالب و اہل کو مغلوب کر کے بنی اسرائیل کو ان پر حکمران بنانا وغیرہ۔ مجاہد و قتادہ وغیرہ کا قول ہے کہ اَیَّامُ اللّٰہ سے مراد ہیں انعام الٰہی کے ایام حضرت ابی بن کعب نے فرمایا اَیَّامُ اللّٰہ سے مراد ہیں اس کی نعمتیں۔ ابن کثیر نے کہا کہ مرفوع حدیث میں بھی یہی تفسیر آئی ہے۔ (کما رواہ ابن جریر وغیرہ) غرض اللہ کے احسانات اُن کو یاد دلاؤ۔ اہلِ بصیرت کو فائدہ پہنچے گا۔ جو لوگ مصائب پر صبر کرنے والے اور ہر دکھ میں ایمان و عملِ صالح پر قائم رہنے والے ہیں اور جو لوگ راحت و عیش میں شکر کرنے والے اور خدا کو نہ بھولنے والے ہیں ان کو گزشتہ مصائب اور پھر مصائب سے نجات کے واقعات سن کر ہدایت و نصیحت ہوگی۔

ایک صحیح حدیث میں حضور اقدسؐ کا فرمان مروی ہے کہ مومن کا ہر معاملہ بھی کیسا اچھا ہے۔ اللہ اس کے لئے جو کچھ بھی جاری فرماتا ہے وہ اس کے حق میں بہتر ہی ہوتا ہے۔ اگر اس کو کوئی مضرت پہنچی اور اس نے صبر کیا تو اس کے لئے بہبودی ہو گئی اور اگر اس کو راحت و مسرت حاصل ہوئی اور اس نے شکر کیا تب بھی اس کے لئے بہبودی ہو گئی۔ حضرت قتادہ نے فرمایا کہ بہت اچھا ہے وہ بندہ جس نے دکھ میں صبر کیا اور سکھ پایا تو شکر کیا۔

حضرت موسیٰ نے حکم الٰہی کی تعمیل کی اور اپنی قوم کو گزشتہ مصائب و انعامات کی یاد دہانی کی ان کو بتایا کہ دیکھو تم میری پیدائش سے قبل کس قدر ذلت و مصیبت میں تھے۔ اگر تمہارے ہاں کوئی نرینہ اولاد ہوتی تھی تو قبطی اس کو قتل کر دیا کرتے تھے اور اگر لڑکی پیدا ہوتی تھی تو اس کو چھوڑ دیا کرتے تھے (حقوق شہریت سے تم کو محروم کر رکھا تھا۔ حکومت میں تمہارا کوئی حصہ نہ تھا، مزدوری سختی کے ساتھ کراتے تھے، رات کو دیتے تھے، تمہاری عورتوں سے ناقابلِ برداشت مشقت لیتے تھے) اور یہ تمام مصائب پروردگار کی طرف سے آزمائش تھے۔ پھر نبوت کے بعد خدا نے دور کر دئیے حکومت تم کو عطا کی۔ راحت و عیش سے تم کو ہمکنار کیا۔ دشمنوں پر تم کو غالب کیا۔ یاد رکھو کہ اگر اللہ کی نعمتوں

کا شکر کرو گے اس کے حکم پر چلتے رہو گے تو اس نے وعدہ کر لیا ہے کہ تم کو زوال نہ ہوگا بلکہ مزید عیش و راحت اور عزت و حکومت اور نجات آخرت حاصل ہوگی اور اگر کفرانِ نعمت کیا، احکامِ الٰہی کو پس پشت ڈال دیا، کتابِ الٰہی کی پرواہ نہ کی اور شریعت کی خلاف ورزی کی تو موجودہ نعمت، حکومت، عزت وغیرہ بھی چھن جائے گی۔ اللہ کا عذاب سخت ہے وہ تم کو تباہ کر دے گا اور انجام کار دائمی عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے یہ بھی فرمایا تھا کہ لوگو خوب سمجھ لو طاعت و معصیت سے تمہارا ہی نفع نقصان وابستہ ہے اللہ کی کوئی غرض اس میں شامل نہیں ہے۔ اگر سطح زمین کے تمام جن و انس بھی کفر کرنے لگیں اور کوئی خدا کو نہ مانے اور اس کے حکم پر نہ چلے تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ بہرحال محمود ہے اور تمام کی طاعت و معصیت سے لاپرواہ ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے فرمانِ اقدس نقل کیا ہے کہ اللہ فرماتا ہے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے تمام جن و انس متقی ہو جائیں اور ایک دل بن جائیں تب بھی میری بادشاہت میں کوئی اضافہ نہ ہوگا اور اگر تمہارے سب اگلے پچھلے تمام جن و انس ایک میدان میں جمع ہو کر کھڑے ہوں اور ہر آدمی اپنی آرزو طلب کرے اور میں اس کی آرزو پوری کر دوں تب بھی میرے خزانۂ غیب میں کوئی کمی نہ ہوگی، مگر اتنی جتنی سمندر میں سوئی ڈبو نے سے پانی میں کمی ہو جاتی ہے۔ الحدیث

حضرت انس کی مرفوع حدیث میں ہے کہ جس کو شکر کی توفیق دی گئی وہ زیادتی سے محروم نہ ہوگا (رواہ البخاری فی تاریخہ والضیاء فی مختارہ) ترمذی نے نوادر میں بھی ابوہریرہؓ کی روایت سے اسی مضمون کی ایک حدیث نقل کی ہے۔

مقصودِ بیان اقرارِ توحید اور عمل صالح نور ہے اور کفر و معصیت تاریکی ہے۔ ظلمات کو جمع اور نور کو واحد لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے اندر تمام مادی قوتیں چند در چند ہیں اور خواہشِ نفس کی نوعیت گوناگوں ہے جن میں سے ہر ایک مستقل تاریکی ہے اور نورانی قوت ایک ہے۔ اس کا تسلط بھی ایک ہی طرح کا ہے گویا افراط و تفریط کو چھوڑ کر راہِ عدل صرف ایک ہی ہے۔ درحقیقت صراطِ مستقیم عقلاً بھی ایک ہونی چاہئے۔ مختلف گمراہ کن پگڈنڈیاں غیر محدود ہوتی ہیں، مگر مقصود تک پہنچانے والا آسان ترین سیدھا راستہ ایک ہی ہوا کرتا ہے یہی راہِ نور ہے۔ ذَكِّرْهُمْ الخ کا لفظ بتا رہا ہے کہ ترہیب و ترغیب کے لئے گزشتہ مصائب و انعامات کا تذکرہ ضروری ہے اس سے دلوں کا زنگ دور ہو جاتا ہے۔ وعظ و نصیحت بے سود نہیں لیکن صَبَّارٍ شَكُورٍ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ مومن کے لئے صبر و شکر کا التزام ضروری ہو استقامت اور ثباتِ قلب لازمی چیز ہے۔ مصیبت سے نہ گھبرانا اور عیش پر نہ اترانا ایمان کی خصوصیت ہے۔ حضرت موسیٰ کے پر مغز نصائح نقل کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی گزشتہ قومی تاریخ پر گہری نظر ڈالنی چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ ہماری ابتدائی حالت کیسی پست تھی، پھر خدا نے ہم کو کس قدر عروج پر پہنچا یا اور اب ہماری کیا حالت ہے۔ پستی و بلندی اور عروج و زوال کے اصل اسباب کیا ہیں۔ ہمارا قومی اور شخصی تنزل و ترقی کن امور سے وابستہ ہے۔ آیات کے آخری فقرے پیام دے رہے ہیں کہ اللہ تمام عالم کی طاعت و معصیت سے غنی ہے۔ اس کو کسی کی اطاعت سے فائدہ نہیں پہنچتا۔ نہ کسی کی نافرمانی سے نقصان۔ شکر و کفرانِ نعمت کا نفع نقصان خود انسان ہی کو پہنچتا ہے۔ نعمت کا شکر کرے گا یعنی اللہ کے احکام پر چلے گا تو نعمت میں مزید اضافہ ہوگا۔ کفرانِ نعمت کرے گا تو اگرچہ فوری عذاب نازل نہ ہو، مگر بالآخر نعمت چھینی لی جائے گی اور دوامی خسران حاصل ہوگا۔

پوری آیات میں جہاں مسلمانوں کو شکر، صبر، اطاعت اور صبر اندوزی کا سبق دینا مقصود ہے وہاں یہودیوں کو بھی تنبیہ کرنا غرض ہے کہ حکومت عزت اور شوکت و جلال کا زوال تمہارا خود آوردہ ہے اور تمہاری سرکشی ہی اس بربادی کی اصل وجہ ہے وغیرہ۔

أَلَمْ يَأْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ ۛ وَالَّذِينَ مِنْ

کیا تم کو اُن لوگوں کی خبر نہیں پہنچی　جو تم سے پہلے ہو چکے ہیں　یعنی قوم نوح　اور عاد　اور ثمود　اور وہ لوگ جو اُن کے

بَعْدِهِمْ ۛ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ ۚ جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ

بعد ہوئے جن کا علم بس اللہ ہی کو ہے اُن کے پیغمبروں کے پاس دلائل لے کر پہنچے مگر انہوں نے

فَرَدُّوا أَيْدِيَهُمْ فِي أَفْوَاهِهِمْ وَقَالُوا إِنَّا كَفَرْنَا بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ

اپنے ہاتھ (تعجب سے) اپنے منہ میں رکھ کر کہا ہم اُس حکم کو نہیں مانتے جو تمہارے ذریعے سے بھیجا گیا ہے

وَإِنَّا لَفِي شَكٍّ مِمَّا تَدْعُونَنَا إِلَيْهِ مُرِيبٍ ۝ قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ الثلثة

جس بات کی طرف تم ہم کو بلا رہے تھے ہم اس کی طرف سے اضطراب آمیز شک میں پڑے ہیں پیغمبر بولے کیا اُس خدا کے وجود میں

شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ

شک ہے جو آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے وہ تم کو بلاتا ہے تاکہ تمہارے قصور معاف کرے

وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ۚ

اور ایک وقت مقرر تک تم کو رہنے دے

تفسیر ابن جریر کا ظاہر قول ہے کہ یہ حضرت موسیٰ کے کلام کا تتمہ ہے۔ گویا حضرت موسیٰ کو جو حکم دیا گیا تھا کہ ایام الٰہی کی یاد دلاؤ۔ اس کی تعمیل حضرت موسیٰ نے اس طرح کی کہ سب سے پہلے انہیں کے گزشتہ واقعات کی یاد دہانی کی۔ قوم فرعون کے مصائب میں مبتلا ہونا اور پھر ان سے نجات پانا بیان کیا اور آخر میں گزشتہ اقوام کے قصص عبرت حاصل کرنے کے لئے بیان فرمائے۔ ابن کثیر نے ابن جریر کے اس قول کو محل تامل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ مجاہد نے ایام اللہ کی تفسیر احسانات الٰہیہ سے کی ہے۔ گزشتہ اقوام کے تذکرے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے علاوہ توریت میں عاد و ثمود کا کہیں تذکرہ نہیں۔ میں کہتا ہوں اگر توریت میں عاد و ثمود وغیرہ اقوام کا تذکرہ نہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت موسیٰ نے قوم کو وعظ کے وقت بھی ان ہلاک شدہ اقوام کا تذکرہ نہ کیا ہوگا۔ تاہم میرے نزدیک بھی حضرت موسیٰ کے کلام کا تتمہ یہ آیات نہیں بلکہ حسب سابق آیات..... میں بیان کر دیا گیا کہ محمد ﷺ کوئی نئے نبی بن کر نہیں آئے بلکہ آپ تو مثیل موسیٰ ہیں آپ سے بہت پہلے موسیٰ بھی آ چکے ہیں اور یہی کام کر چکے ہیں جو آپ اب کرنا چاہتے ہیں تو اب روئے سخن اہل عرب کی طرف کیا جاتا ہے اور ان آیات میں اُن عرب والوں کو ہی براہ راست خطاب کیا جاتا ہے جو حضور اقدس ﷺ کے مخالف تھے اور حضور ﷺ کی نبوت میں گوناگوں شک کیا کرتے تھے اور اپنے اسلاف کے مذہب کو چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ فقط موسیٰ اور بنی اسرائیل پر ہی منحصر نہیں بلکہ تم سے پہلے دنیا میں اور قومیں بھی گزر رہی ہیں۔ نوح کی قوم اور عاد (ہود کی قوم) اور (صالح کی قوم) ثمود (چونکہ ان تینوں قوموں کا مسکن سرزمین عرب ہی تھی اور اکثر لوگوں نے اس کے ویران مکان اور اجاڑ کھنڈرات اور تباہ شدہ آثار دیکھے تھے، اس لئے ان تینوں کا تو صراحۃً نام لیا اور دوسری قوموں کے متعلق فرمایا کہ یہی تین نہیں بلکہ ان کے بعد اور قومیں بھی گزر رہی ہیں۔ جن کے نسب سوانح حیات اور مسکن و ماویٰ کو یقینی طور پر سوائے خدا کے کوئی بھی نہیں جانتا۔ اللہ کے پیغمبر ان کی ہدایت کے لئے ان کے پاس گئے تو انہوں نے پیغمبروں کی ہدایت کو نہ مانا اور ان کی تکذیب کی (منہ میں ہاتھ لے جانے کا مطلب یا تو نہ ماننا اور انکار کرنا ہے جیسا کہ ابو عبیدہ نے بیان کیا ہے۔ اور مجاہد، قتادہ، محمد بن کعب وغیرہ کا بھی یہی قول ہے) یا غصہ سے انگلیاں کاٹنا مراد ہے (یہ ابن مسعود کا قول ہے) یا یہ مطلب ہے کہ انبیاء

کے قول کو نہایت تعجب سے سُنا اور اتنا کھل کھلا کر ہنسے کہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لئے (یہ قول ابن عباس کا ہے) اور بولے ہم کو تمہاری باتوں کا اعتبار نہیں ہم تمہاری رسالت کو نہیں مانتے اور اللہ کے متعلق جو کچھ اوصاف تم بیان کرتے ہو اس میں بھی ہم کو قوی شک ہے۔ پیغمبروں نے نہایت تعجب کے لہجے میں دریافت کیا کہ کیا تم ہدایت کے منکر ہو۔ کیا اللہ کی ہستی، توحید اور صفتِ تخلیق میں تم کو شک ہے۔ یہ تو بدیہی چیز ہے کہ اللہ تمام عالم کا موجد اور نیست سے ہست کرنے والا ہے اس کا انکار کس طرح ممکن ہے۔ رہی ہماری رسالت تو ظاہر ہے کہ کسی ذریعہ سے وہ اپنا پیامِ ہدایت تم کو پہنچائے گا چنانچہ ہمارے ذریعہ سے اُس نے تم کو دعوتِ حق دی، مگر اس سے اس کی اپنی کوئی ذاتی غرض وابستہ نہیں بلکہ تمہارا ہی دنیا و آخرت میں نفع ہے۔ اگر اللہ کی دعوت کو قبول کرو گے تو وہ تمہارے تمام قصوروں کو معاف فرما دے گا اور دنیوی زندگی میں بھی تم عذاب سے بے خوف ہو کر مقررہ میعاد تک زندہ رہو گے۔

قَالُوٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ؕ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا

وہ بولے تم تو ہم ہی جیسے بشر ہو تم ہم کو اُن چیزوں سے روکنا چاہتے ہو جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے رہے ہیں

فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ

لہٰذا کوئی صریح معجزہ لاؤ پیغمبروں نے اُن سے کہا بے شک ہم تمہاری طرح انسان ہیں مگر اللہ

اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا

اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے اور ہم کو طاقت نہیں کہ بغیر حکم خدا کے کوئی معجزہ تمہارے سامنے

بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ

پیش کریں اور اللہ ہی پر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیئے اور کیا وجہ کہ ہم اللہ پر بھروسہ نہ کریں حالانکہ وہ

هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝

ع ۲ ۱۴

ہم کو ہماری راہیں دکھا چکا جو ایذا تم ہم کو پہنچاؤ گے ہم اُس پر ضرور صبر کریں گے اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیئے

تفسیر کفارِ قوم پیغمبروں کے گزشتہ جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور چونکہ پیغمبروں نے اللہ کی ہستی، توحید اور صفتِ تخلیق کو ہدایت کے دعوے کے ساتھ بیان کیا تھا، اس لئے اللہ کے متعلق گفتگو چھوڑ کر پیغمبروں کی رسالت پر تین شبہات کئے:- اوّل تو یہ کہ تم ہماری طرح آدمی ہو فرشتے ہو نہ جن نہ اور کوئی غیبی مخلوق۔ معمولی انسان کا نبی ہونا کس طرح ممکن ہے۔ دوئم یہ کہ تم نئی باتیں بنا کر اور نئی تعلیم دے کر ہم کو اپنے آبا ؤ اجداد کے طریقہ سے پھیرنا چاہتے ہو۔ جن دیوتاؤں کی پرستش ہمارے اسلاف کرتے چلے آئے ہیں ہم اُن کو کس طرح ترک کر سکتے ہیں۔ سوئم یہ کہ اگر تم کو پیغمبری کا دعویٰ ہے تو کوئی ایسا معجزہ پیش کرو جس سے تمہارے دعوے کا ثبوت ہو جائے۔ پیغمبروں نے تینوں شبہات کا جواب ترتیب وار دیا۔ اوّل شبہ تھا کہ نبوت و بشریت میں منافات۔ دوسرا شبہ تھا کہ تمہارے کہنے سے ہم اسلاف کی رسم کو ترک نہیں کر سکتے۔ اس کا جواب تو اس طرح دیا کہ ہاں بظاہر ہم تمہاری طرح آدمی ہیں، لیکن نبوت اللہ کا باطنی فضل ہے۔ نبوت نہ ملنے کی کیا دلیل ہے۔ حق تعالیٰ اپنے فضل سے جس کو چاہے عطا فرمائے اور جب نبوت خدا داد عطیہ ہے تو پیغمبر کے قول سے آبائی رسم و رواج کو ترک نہ کرنا کیسا۔ فضل خداوندی کے سامنے رسم و رواج کیسا

حقیقت ہے۔ تیسرا شبہ طلب معجزہ کے متعلق تھا اُس کا جواب دیا کہ یہ نبی کے اختیار میں نہیں اللہ کے اختیار میں ہے۔ جب چاہے اور جو چاہے معجزہ ظاہر فرمائے۔ پھر معجزہ ایمان کے لئے مؤثر حقیقی بھی نہیں۔ ایمان تو احسانِ خداوندی ہے لہٰذا اسی پر نظر رکھنی چاہیئے وہی توفیق دے اور ایمان نصیب ہو اور چونکہ سیاقِ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار نے پیغمبروں کو مارنے اور تکلیف دینے کی دھمکی بھی دی تھی، اس لئے انبیاء نے فرمایا ہم تم سے ڈرتے نہیں۔ ہمارا بھروسہ تو اللہ ہی پر ہے اُسی نے ہم کو راہ حق پر گامزن کیا ہے اُس کے حکم کی تعمیل میں ہم کو کیا ڈر ہو سکتا ہے، تم جو کچھ ہم کو تکلیف دو گے ہم اس پر مضبوطی کے ساتھ صبر کریں گے۔

مقصودِ بیان اقوام وانبیاء کی تعداد صحیح طور پر کوئی نہیں جانتا۔ آبائی مالوفات اور سلف کے رسم ورواج کے خلاف سُن کر انسان کو اچنبا بھی ہوتا ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔ اللہ کی ہستی اور توحید اتنی بدیہی ہے کہ کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ آسمان وزمین کی ایجاد الوہیت وربوبیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اسی بنا پر امام الموحدین حضرت امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ توحید کو نہ ماننے پر کوئی شخص معذور نہیں سمجھا جا سکتا۔ بندہ کو ہدایت کرنے میں اللہ کی کوئی ذاتی غرض شامل نہیں بلکہ انسان ہی کا دنیوی واخروی فائدہ ہے۔ ظاہر پرست طبقے والے کو رباطن آدمیوں کو انسانیت سے اوپر کوئی اور درجہ دینا چاہتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ مقربانِ الٰہی کا طبقہ نوع انسانی سے جدا کوئی اور گروہ ہونا چاہیئے۔ انبیاء صورت، جسمانیت، مقتضائے بشریت اور دیگر انسانی خصوصیات میں دوسرے آدمیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ نبوت ورسالت محض اللہ کا فضل ہے۔ کوشش وریاضت سے یہ چیز حاصل نہیں ہوتی، اسی لئے اہل سنت کا اجماع ہے کہ جو کوئی نبوت کو کسبی چیز اور نتیجۂ کوشش سمجھے وہ کافر ہے۔

معجزہ لوازم نبوت میں سے نہیں ہے نہ نبی کی اختیاری چیز ہے جب اللہ کی طرف سے اجازت ہوتی ہے معجزہ کا ظہور ہوتا ہے۔ اہل ایمان وہی ہیں جن کا بھروسہ اللہ ہی پر ہو۔ غیر اللہ کی مدد، قوت، حکومت اور طاقت کا اعتماد ولالچ نہ ہو۔ آیات کا آخری حصہ تعلیم دے رہا ہے کہ اہل حق کو تبلیغ حق میں جو مصائب اٹھانی پڑیں اور صداقت کی اشاعت میں جو تکلیفیں برداشت کرنی ہوں اُن کو انتہائی جواں مردی واستقامت سے برداشت کریں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں آیات میں انبیاء کی تبلیغ اور اشاعت حق کی جس کوشش کا تذکرہ کیا ہے وہ بتا رہا ہے کہ توکل نام ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے کا نہیں ہے بلکہ امکانی کوشش کرتے ہوئے اللہ پر بھروسہ رکھنے اور اس کو کارساز سمجھنے کا نام ہی توکل ہے وغیرہ۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ
کافر اپنے پیغمبروں سے بولے ہم تم کو اپنی زمین سے نکال دیں گے ورنہ ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ
فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۙ۝ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ
تب اُن کے رب نے اُن کے پاس وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ضرور غارت کریں گے اور اُن کے بعد ضرور اس زمین میں تم کو
مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ۝ وَاسْتَفْتَحُوْا
بسائیں گے یہ وعید ہر اُس شخص کے لئے ہے جو میرے حضور میں کھڑے ہونے سے ڈرے اور میری وعید کا خوف کرے اور پیغمبر ولنے
وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۙ۝ مِّنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ۙ (۷)
فتح کی دعا مانگی اور ہر سرکش ضدی ناکام ہو گیا (پھر) اُس کے پیچھے دوزخ بھی ہے اور اس کو زرد آب پلایا جائے گا

يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۖ

جس کو گھونٹ گھونٹ کرکے پئے گا اور گلے سے اُتار نہ اُترے گا اور ہر جگہ سے اس پر موت آئے گی مگر وہ مرے گا نہیں

وَمِنْ وَرَائِهِ عَذَابٌ غَلِيظٌ ۝

اور اُس کے پیچھے سخت عذاب ہوگا

تفسیر ظالم کافروں نے انبیاء کی تکذیب اور ایذا رسانی پر ہی صبر نہ کیا بلکہ اس سے بہت آگے بڑھ گئے۔ پیغمبروں نے ان کو غیر اللہ کی پرستش سے منع کیا تھا اور اللہ کی طرف آنے کی دعوت دی تھی۔ باطل پرستوں کو حق پرستوں سے ضد ہوتی ہے۔ کافروں کو بھی اہل حق سے ضد پڑ گئی۔ علاوہ انکار اور ایذا رسانی کے کہنے لگے ہم کو تم کیا نصیحت کرتے ہو۔ اپنی خیر مناؤ۔ یا تو ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ ورنہ جلا وطن کر دیں گے۔ اگرچہ پیغمبر کبھی مذہب کفر پر نہ تھے، مگر چونکہ خاندان کفر میں پرورش پائی تھی اور ان کی توحید پرستی کافروں سے مخفی تھی۔ کافر یہ خیال کرتے تھے کہ یہ لوگ بھی ہمارے دین پر ہیں۔ جب انبیاء نے درسِ توحید دیا تو سمجھے کہ یہ لوگ ہمارے مذہب سے پھر گئے ہیں۔ اسی لئے مذکورہ بالا قول کہا۔ خدا تعالیٰ نے پیغمبروں کی تسکین کے لئے وحی بھیجی کہ جس سرزمین سے یہ تم کو نکالنے کی دھمکی دیتے ہیں ہم ان ظالموں کو برباد کرکے تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو اسی سرزمین کا مالک بنا دیں گے، لیکن یہ جانشینی اور کامیابی اور امدادِ خداوندی اسی شخص کو حاصل ہوگی جو حدودِ الٰہی سے آگے نہ بڑھے بلکہ حدِ شرع سے تجاوز کرتا ہوا ڈرے اور حدودِ مقررہ سے تجاوز کرنے والے کے لئے جو وعید ہے اُس کا خوف کرے۔

غرض پیغمبروں نے جب دلائل و براہین تمام کر دیں اور حجت ختم ہوگئی اور کفار اس پر بھی نہ مانے تو بد دعا کی اور حق تعالیٰ سے کفار کے مقابلہ میں فتح و نصرت کے طلب گار ہوئے۔ حسبِ استدعا عذابِ الٰہی آیا تو سارے شریر و معاند کفار ہلاک کر دئے گئے۔ یا اِسْتَفْتَحُوا کی ضمیر کافروں کی طرف راجع ہوئی۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جب پیغمبروں نے کافروں کو خوف دلایا اگر ایمان نہ لائے تو عذابِ الٰہی نازل ہو جائے گا اور سب کے سب تباہ کر دیئے جاؤ گے اور مجسم شرارت و عناد تھے وہ اس کی دھمکی سے متاثر نہ ہوئے بلکہ انہوں نے فیصلہ کی درخواست کی کہ اچھا عذاب نازل کراؤ اسی پر فیصلہ ہے۔ انجام کار عذاب آگیا اور کفار کی حقانیت کا دعویٰ باطل ہو گیا (خازن) اس سے آگے اس سزا اور عذاب کا بیان ہے جس سے ہر کافر کو مرنے کے بعد دوچار ہونا پڑے گا اور پڑتا ہے۔

آیات کے آخری فقرہ کا یہ مطلب ہے کہ یوں تو دوزخ کا عذاب سب ہی سخت ہوگا، لیکن سخت ترین عذاب ایک اور ہوگا۔ وہ کون سا عذاب ہوگا؟ علماء تفسیر نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے کہ جن اعمال کو اپنے لئے آخرت میں سودمند سمجھا کرتے تھے اور مصائب برداشت کرکے ان اعمال کی پابندی رکھتے تھے جب وہی اعمال ان کے لئے مفید نہ ہوں گے بلکہ بجائے فائدہ کے وبالِ جان ہو جائیں گے۔ جن کی شفاعت حاصل کرنے کے لئے ان کی پرستش کیا کرتے تھے ان میں سے کوئی شفاعت نہ کرے گا بلکہ بیزاری کا اظہار کرے گا۔ نہ کسی پیر فقیر کی نذر نیاز کام آئے گی نہ عشاء ربانی کا کھانا نہ اشنان کرنا نہ صلیب کی پرستش نہ بتوں کی پوجا نہ مسیح کی الوہیت کا اقرار۔ غرض جن جن پر تکیہ تھا اور جس پر بھروسہ تھا سب رائیگاں جائے گا۔ اُس وقت اُن کی آتشِ حسرت بر افروختہ ہوگی جس میں ہمیشہ جلتے رہیں گے۔ اس کی تشریح آئندہ آیت میں کی گئی ہے۔

مقصود بیان آیات میں بظاہر گزشتہ اقوام کی سرکشی اور طغیان کا بیان ہے، مگر درحقیقت رسولِ پاک ﷺ کو آگاہ کرنا مقصود ہے کہ آپ کی قوم بھی گزشتہ کافروں سے کم نہیں ہے یہ بھی اُن کے نقشِ قدم پر چلے گی، طرح طرح سے تکلیفیں دے گی۔ فقط تکذیب رسالت اور لعن طعن پر اکتفا نہ کرے گی بلکہ جلا وطن بھی کرے گی، آپ کو ہجرت کرنی ہوگی، مگر انجام کار آپ ہی کو غلبہ ہوگا۔

ہم ان بدبختوں کو برباد کر دیں گے۔ ان کی پوری سرزمین پر آپ کا تسلط کر دیں گے۔ لہٰذا ان کی ایذا رسانی پر آپ کو صبر کرنا اور اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھنا چاہیئے اور اہلِ ایمان کو استقامت کی تلقین کے ساتھ نصیحت کرنی چاہیئے کہ وہ احکامِ شریعت کی خلاف ورزی اور حدودِ الٰہی سے تجاوز نہ کریں اور اللہ سے فتح و نصرت کی دعا کرتے رہیں وغیرہ۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ گزشتہ کفار نے اپنے پیغمبروں کو جلا وطن کرنے کی صرف دھمکی دی تھی، مگر جلا وطن کر نہیں سکتے تھے۔ ان کو خدا تعالیٰ نے یہ طاقت و توفیق نہ دی کہ پیغمبر کو وطن سے نکال دیں، لیکن قریش اور مکہ کے دوسرے کافروں کو یہ قوت عطا فرما دی کہ وہ حضور کو جلا وطن ہو جانے پر مجبور کر سکے اور سرکارِ عالی کو محبوب وطن چھوڑ دینا پڑا۔ باوجودیکہ دیگر انبیا کے مقابلے میں حضور کا فضل و شرف اور کرامت زیادہ تھی۔

اس شبہ کا حل یہ ہے کہ آیت لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ اور آیت كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ سے ثابت ہے کہ انجام کار انبیاء اور اہلِ ایمان ہی کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ گزشتہ انبیاء کی بعثت اور تبلیغ مقامی اور قومی تھی۔ اگر وہ جلا وطن ہو جاتے تو پھر تبلیغ کس کو کرتے اور پیامِ الٰہی کون قبول کرتا، اس لئے کافروں کو ایسی طاقت و توفیق نہ دی کہ وہ جلا وطن کر سکیں، لیکن حضور والا کی بعثت و تبلیغ عمومی تھی۔ اگرچہ تبلیغ کا آغاز قوم والوں سے کرنے کا حکم تھا، مگر امتِ دعوت کل جہاں کے رہنے والے تھے۔ ترکِ وطن کے بعد بھی حضور کی تبلیغ کے لئے میدان تھا۔ پیامِ ہدایت پر عمل کرنے کا ہر شخص مکلف تھا، اس لئے حضور نے ہجرت کی اور دوسری قوموں کو پیامِ ہدایت پہنچایا وغیرہ۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ِۨ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ

جن لوگوں نے اپنے رب کا انکار کیا مثالاً ان کے اعمال اس راکھ کی طرح ہیں جس پر آندھی کے دن تیز ہوا چلی

عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۝

ہو کافروں کو اپنے کئے ہوئے میں سے کچھ ہاتھ نہ آئے گا یہی دور کی گمراہی ہے

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ

(اے مخاطب) کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو تدبیر سے پیدا کیا ہے اگر وہ چاہے تو تم کو فنا کر دے

وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ وَّمَا ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝

اور دوسری نئی مخلوق لے آئے اللہ پر یہ کچھ مشکل نہیں ہے

تفسیر آیاتِ سابقہ کے مضمون کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے۔ بعض اہلِ کفر بھی اپنی نظر میں نیک کام کرتے ہیں اور معاملات میں بھی حسن سلوک کو کام میں لاتے ہیں، لیکن عبادت غیر اللہ کی کرتے ہیں۔ رات بھر دیوتاؤں کا نام جپتے ہیں۔ بتوں کو، ستاروں کو، صلیب کو اور عناصرِ عالم کو سجدے کرتے ہیں۔ مخلوق کے ساتھ کبھی اچھا سلوک بھی کرتے ہیں، دان دیتے ہیں، خدمتِ خلق کرتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، مسافر خانے بناتے ہیں، پیاسوں کے لئے کنوئیں کھدواتے ہیں، لیکن ان سب کے اندر رضائے مولا کے حصول کا خیال نہیں ہوتا، حسن نیت کو دخل نہیں ہوتا، آخرت کی زندگی پر ایمان نہیں ہوتا، اللہ کے سامنے جانے کا عقیدہ نہیں ہوتا، اس لئے آخرت میں سب کچھ رائیگاں جائے گا کوئی اچھا عمل بغیر ایمان اور اقرارِ رسالت کے کام نہ آئے گا۔ ہر نیک عمل کی جڑ ایمان اور توحید ہے۔ جب اللہ کی وحدانیت پر ایمان نہیں، احکامِ الٰہی کا اقرار نہیں، رسالت

کا اعتراف نہیں کیا تو ہر نیکی عبث ہے دنیا میں ضرور اس کا عوض ملتا ہے اور اللہ پاک روزی رزق میں برکت دیتا او رصحت، قوت، عزت، حکومت عطا کرتا ہے۔ مگر آخرت میں ان اعمال صالحہ کا کوئی اجر نہ ملے گا تمام نیکیاں برباد ہو جائیں گی۔ اس مضمون کو ایک مثال دیکر سمجھایا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ ایک سرسبز درخت ہے بار آور ہے، ثمر مند ہو، سایہ دار ہو، مگر جب وہ خشک ہو کر گر گیا اور آگ سے جل گیا تو راکھ کا ڈھیر بن گیا اور آندھی اس خاک کو چاروں طرف اڑا کر لے جاتی ہے کہیں اس کو بقا و ثبات نصیب نہیں ہوتی۔ جب تک درخت زندہ تھا، شاداب اور سرسبز تھا، سایہ دار اور بار آور تھا، اُس وقت تک آندھی کے جھونکوں کا مقابلہ کر رہا تھا اپنی جگہ پر قائم تھا۔ مخلوق کو اس سے فائدہ پہنچ رہا تھا اور اس کو بھی لوگوں سے نفع تھا۔ کوئی پانی اور کھاد دیتا تھا، کوئی تھالہ درست کرتا، لیکن خشک ہوجانے اور جل کر خاک کا ڈھیر بن جانے کے بعد اس میں طاقت نہیں رہتی کہ آندھی کا مقابلہ کر سکے۔ اس کی خاک ادھر ادھر اُڑتی پھرتی ہے۔ یہی حالت کافر کے نیک اعمال کی ہے۔ جب تک دنیا میں تھا ثمر دار تھا، سایہ فگن اور فیض رساں تھا، مخلوق خدا بھی اس کی عزت اور خدمت کرتی تھی۔ محتاج اور سائل ہو کر جاتے تھے ہر نیکی کا صلہ دنیا میں ہی مل رہا تھا۔ عذاب الٰہی بھی اس کی فیض رسانی کی وجہ سے رکا ہوا تھا۔ جب آنکھیں بند ہوئیں اور مٹی کا ڈھیر بن گئے تو ثمر داری بار آوری اور فیض رسانی بیکار گئی۔ عذاب الٰہی کی آندھی اس کی خاک کو جدھر چاہے گی اڑا کر لے جائے گی۔ تمام نیکیاں برباد ہو جائیں گی۔
نیکی برباد گناہ لازم لیس یہی پرلے درجے کی گمراہی ہے کہ کیا بھلے کو ہو گیا بُرا۔

اس سے آگے کافروں کو تہدید و وعید کرتا ہے اور باطل پرستوں کو لطیف تنبیہ فرماتا ہے کہ اللہ نے آسمان و زمین کو حکمت اور کمال صنعت کے ساتھ پیدا کیا۔ یعنی یہ نظر بندی نہیں جادو نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ خالق ارض و سما اللہ ہے پھر تم آغاز و انجام سے لاپرواہ ہو کر کیوں شرک کرتے ہو اور دنیوی زندگانی کے لہو ولعب پر فریفتہ ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اگر خدا چاہے تو سب کو فنا کر کے ایک نئی مخلوق پیدا کر دے جو وحدہ اور اسی کی اطاعت گزار ہو۔ خدا کے نزدیک یہ عمل کرنا کچھ دشوار نہیں ہے۔ جب خدا ایسا کرنے پر قادر ہے، تو پھر تم کیوں اس سے نہیں ڈرتے۔ اور کیوں اس کے پیام ہدایت کو نہیں مانتے۔

مقصود بیان

بغیر ایمان کے کوئی عبادت اور نیک عمل آخرت میں کام نہ آئے گا بلکہ برباد ہو جائے گا۔ اللہ نے عالم کا کوئی ذرہ بغیر حکمت و حقانیت کے پیدا نہیں کیا۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے باوجود ہماری نافرمانی کے چھوڑ رکھا ہے، ورنہ اگر وہ چاہے تو ہم سب کو گرفتار کر کے اس زمین پر کوئی نئی مخلوق بسا دے۔ آخری آیت بتا رہی ہے کہ اللہ کے تصرفات تمام عالم میں جاری اور ساری ہیں۔ کسی طرح کا انقلاب، تغیر اور تجدید اس کے لئے دشوار نہیں۔ آیات کا روئے سخن اگرچہ کافروں کی طرف ہے، مگر اہل بصیرت نے بتایا ہے کہ سے خطاب ہر صاحب عقل کو ہے کہ دیکھو اللہ نے جب کل عالم کی تخلیق حق کے ساتھ کی تو پھر تم کیوں حق سے روگردانی کرتے ہو۔ حق کو دیکھتے ہو پہچانتے کیوں نہیں۔ رویت ونظر سے معرفت کی طرف انتقال کیوں نہیں کرتے۔ اللہ کے فعل کا نور دیکھتے ہو، لیکن یہ فعل الٰہی جس صفت الٰہیہ سے پیدا ہوا ہے اس صفت کا نور کیوں نہیں دیکھتے اور پھر نور صفت سے نور ذات تک انتقال کیوں نہیں کرتے۔ تمہاری عقل کی آنکھیں روشن ہیں، ان آنکھوں سے اللہ کے فعل تخلیق کو دیکھ رہے ہو اب ذرا دل کی آنکھوں سے فعل تخلیق کے مرکز کو بھی دیکھو اور اللہ کی صفت تخلیق کا بھی مشاہدہ کرو اور پھر اس سے آگے بڑھ کر روح کی آنکھوں سے نور ذات کو بھی دیکھو اور تجلی قدس کا مشاہدہ کر کے اطمینان و سرور قلبی حاصل کرو وغیرہ۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ

اور سب لوگ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے پھر کمزور لوگ بڑائی والوں سے کہیں گے کہ ہم تو تمہارے تابع تھے تو کیا

أَنْتُمْ مُغْنُونَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۚ قَالُوا لَوْ هَدَانَا اللَّهُ لَهَدَيْنَاكُمْ

اب تم اللہ کے عذاب کو ہم سے کچھ ہٹا سکتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اگر اللہ ہم کو ہدایت دیتا تو ہم تم کو ہدایت کرتے

سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجَزِعْنَا أَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَحِيصٍ ع وَقَالَ الشَّيْطَانُ لَمَّا

اب ہمارے لئے برابر ہے خواہ بیقرار ہوں یا صبر کریں ہم کو کسی طرح چھٹکارا نہیں جب کام کا فیصلہ ہو چکے گا تو

قُضِيَ الْأَمْرُ إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ ۖ وَمَا كَانَ

شیطان کہے گا کہ اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا اور میری تم

لِيَ عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي ۖ فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا

پر کچھ زبردستی تو تھی نہیں ہاں میں نے تم کو بلایا تھا تم نے میرا کہا مان لیا اب مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے

أَنْفُسَكُمْ ۖ مَا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا أَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۖ إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا

آپ کو برا کہو میں تمہاری فرمانبرداری نہیں کر سکتا نہ تم میری فریاد کو پہنچ سکتے ہو اس سے پہلے جو تم نے مجھے

أَشْرَكْتُمُونِ مِنْ قَبْلُ ۗ إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ وَأُدْخِلَ

شریک بنایا تھا میں اس کو نہیں مانتا کیونکہ ظالموں کے لئے دردناک عذاب ہے اور جو لوگ

الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ

مومن اور نیکوکار ہوں گے ان کو جنتوں میں داخل کیا جائے گا جن کے اندر نہریں بہتی ہونگی اُن میں وہ

فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۖ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ○

بحکم پروردگار ہمیشہ رہیں گے اُن کی دعائے خیر وہاں سلام ہوگا

تفسیر ان آیات میں کفار کی اُس حسرت و یاس کا تذکرہ کیا ہے جو میدانِ حشر میں جمع ہونے یا دوزخ میں داخل ہونے کے بعد پیدا ہوگی۔
حاصل ارشاد یہ ہے کہ دنیا میں دو طبقوں کے کافر ہیں۔ پیشوا اور پیرو، رہنما اور متبع، امام اور مقلد، دولت مند، طاقت ور اور کمزور مفلس
متوسط اور کم طبقہ کا تابع ہے۔ پہلے گروہ نے دوسرے گروہ کو بھی گمراہ کر رکھا ہے اور ان دونوں کو گمراہ کرنے والا شیطان ہے۔ طرح طرح سے وہ وسوسے
پیدا کرتا اور قسم قسم سے لبھاتا ہے۔ دہی دلائل دماغ میں ٹھونس کر توحید رسالت اور قیامت کا انکار کراتا ہے۔ جب قیامت ہوگی اور حق و باطل کا
فیصلہ ہوگا اور کافروں کو مایوسی ہوگی تو کمزور طبقہ اپنے پیشواؤں سے کہے گا۔ ہم دنیا میں تمہارے تابع تھے جیسا تم کہتے تھے ہم کرتے تھے جس راہ پر تم ہم کو
چلنے کا حکم دیتے تھے ہم اُسی پر چلتے تھے۔ اب اگر تم ہماری مدد کر سکتے ہو تو کرو۔ عذاب الٰہی میں کچھ تخفیف ہی کرا دو۔ بڑے طبقے والے جواب دیں گے

ہمارا کچھ قصور نہیں۔ ہم نے دانستہ تم کو گمراہ نہیں کیا۔ جس راہ پر تم خود چلے تھے اسی راہ پر تم کو چلایا تھا، مگر ہم خود گمکردہ راہ تھے۔ اللہ تعالیٰ اگر ہم کو راہ راست پر چلنے کی توفیق دیتا تو ہم تم کو اسی راہ پر چلنے کا حکم دیتے، مگر اب کیا کیا جائے۔ ہر کوشش بے سود ہے۔ ہم صبر کریں یا نہ کریں عذاب الٰہی سے تو چھٹکارا ناممکن ہے۔ جب بڑا طبقہ کورا جواب دے گا تو دھلی بگڑی شیطان پر آئے گی اور ہر ایک اس کی نکوہش و سرزنش کرے گا کہ تو نے ہم سب کو تباہ کیا۔ اس وقت یہ پیرمغاں جواب دے گا۔ سنو! اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے جھوٹا وعدہ کیا تھا، لیکن میرا کام تھا فقط کہنا میں نے زبردستی تو کچھ کی نہ تھی۔ میں نے تم کو فقط ایک راستے پر چلنے کی دعوت دی تھی تم نے اپنی مرضی سے میرا کہنا مانا لہٰذا مجھے لعن طعن کرنا بے جا ہے۔ خود اپنے کو ملامت کرو کیوں تم نے میرا کہا مانا اور کیوں دعوتِ حق کو قبول نہ کیا۔ اب نہ میں تمہاری فریاد رسی کر سکتا ہوں اور نہ تم میری کچھ مدد کر سکتے ہو۔ تم نے دنیا میں مجھے اللہ کا شریک قرار دیا تھا اور میری پرستش کرتے تھے۔ میں اس سے منکر ہوں۔ یہ حال تو کافروں کا ہوگا۔ ان کے مقابلہ میں اہلِ ایمان نہایت عیش و آرام میں ہوں گے اور دوامی عزت و راحت ان کو بحکمِ الٰہی نصیب ہوگی۔

ایک شبہ بَرَزُوْا ماضی کا صیغہ ہے آیات میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ قیامت کے دن ہوگا پھر ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا۔

حل اس شبہ کے دو جواب ہیں (۱) مخلوق کے علم میں زمانہ کی تفصیل اور ماضی مضارع کا امتیاز ہے، مگر اللہ کا علم مقید بزمانہ نہیں اس کا علم اس وقت ازل و ابد دونوں کو محیط ہے۔ نہ وہاں ماضی ہے نہ مستقبل۔ جو چیز ہمارے علم کے لحاظ سے آئندہ ہونے والی ہے وہ اللہ کے علم میں ابھی موجود ہے بلکہ وہاں آئندہ اور ماضی کا کوئی امتیاز نہیں۔ لہٰذا واقعاتِ قیامت جو ہمارے علم کے اعتبار سے ہونے والے ہیں اللہ کے علم میں بالفعل موجود ہیں۔ یہ حال تو اللہ تعالیٰ کے عام علم کا ہے۔ ہاں اللہ کے علم کی ایک مخصوص قسم ہے جو مستقبل کے واقعات ظہور پذیر ہونے پر اسی وقت ہوتی ہے، مگر یہ قسم چونکہ صدورِ واقعات پر مبنی ہے اس لئے حادث ہے اور علم عام جو محیط کل ہے جس میں ماضی و مستقبل کا کوئی امتیاز نہیں ہے جو حاضر و غائب سب کو گھیرے ہوتے ہے وہ قدیم ہے۔ ازل و ابد دونوں سے خارج ہے (۲) چونکہ قیامت کے مذکورہ واقعات علمِ الٰہی میں موجود ہیں، اس لئے ناقابلِ تغیر ہیں۔ ان کا ظہور قیامت کے دن ضرور ہوگا اور عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ مستقبل کی جس چیز کا وقوع قطعی اور یقینی ہو اس کو بہ لفظ ماضی بیان کر دیتے ہیں، اس لئے آیت میں ماضی کا لفظ استعمال کیا گیا۔

مقصودِ بیان کافروں کی اس حسرت و یاس کی تصویر کشی جو قیامت کے دن ان کو ہوگی آیات دلالت کر رہی ہیں کہ کورانہ تقلید کرنے والے اور ناواقف جاہل جو کسی شیطان کے کہنے سے غلط راہ پر چلنے لگتے ہیں مجرم سے بری نہیں ہو سکتے۔ جس وقت اُن کے پیشوا جہنم میں جائیں گے تو وہ نہ بچیں گے، اس لئے آدمی کو خود حق ناحق اور صحیح و غلط کا امتیاز کرنا چاہیئے۔ فقط کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے کام نہیں چل سکتا۔ قیامت کے دن جس طرح ملائکہ سے انسان کلام کرے گا اُسی طرح شیطان سے بھی براہِ راست گفتگو کر سکے گا۔ شیطان کو بذاتِ خود کوئی اختیار نہیں نہ وہ کسی کو کسی کام پر مجبور کر سکتا ہے۔ اس کا کام صرف اغوا کرنا اور بہکانا ہے وغیرہ۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا

(اے محمد) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کیسی مثال بیان کی کہ پاکیزہ کلمہ اُس پاکیزہ درخت کی طرح ہے جس کی جڑ

ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ۝ تُؤْتِيٓ أُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ

مضبوط ہو اور شاخیں آسمان میں پھیلی ہوئی ہوں بحکمِ خدا ہر وقت پھل دیتا ہو اور اللہ

اللّٰهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ

لوگوں کے سامنے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ سوچیں اور ناپاک بات کی مثال اُس گندے درخت

خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ۝

کی طرح ہے کہ جس کو زمین کے اوپر ہی سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہو اور اس کو ٹھہراؤ نہ ہو

تفسیر گزشتہ آیات میں خدا تعالیٰ نے نیکوں اور بدوں کے احوال اور قیامت کے دن ہر فرقہ کی جو کیفیت ہوگی اس کو مفصل بیان فرمایا تھا ان آیات میں دونوں کے احوال کی مزید تشریح کے لئے محسوسات میں دو مثالیں بیان فرماتا ہے :۔

کلمۂ طیبہ سے مراد بحکم حدیث لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ ایک حدیث میں کلمۂ توحید و تکبیر کلمۂ تسبیح اور کلمۂ تحمید کو کلمۂ طیبہ قرار دیا گیا ہے۔ طیب درخت سے مراد کیا ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھجور کا درخت ہے۔ بعض احادیث سے انگور کا درخت ثابت ہوتا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ دنیا کے درختوں میں کوئی درخت ایسا موجود ہو یا نہ ہو بہرحال شجرۂ طیبہ وہ ہے جس میں مذکورہ چاروں اوصاف موجود ہوں۔

اسی طرح کلمۂ خبیثہ سے کلمۂ شرک مراد ہے اور شجرۂ خبیثہ سے تھوہر کا درخت یا کوئی اور درخت جس کے اندر مذکورہ صفت ہو مراد ہے۔

حاصل تمثیل یہ ہے کہ کلمۂ طیبہ اس درخت کی طرح ہے جس میں چار اوصاف ہوں۔ (۱) شکل صورت، لذت، خوشبو، نفع، سایہ اور پھول پھل کے لحاظ سے عمدہ ہو (۲) اس کی جڑ زمین کے اندر خوب جمی ہوئی ہو۔ سوختہ اور سراد پائیدار ہوں کہ آندھیوں کا بھی مقابلہ کر سکے —

(۳) اس کی شاخیں اور پتیاں خوب بلند اور پھیلی ہوئی ہوں (۴) اس میں پھل ہمیشہ آتے ہوں اور ہر وقت رہتے ہوں۔ کسی وقت خالی نہ رہتا ہو ایسا درخت بہترین درخت ہوتا ہے ایسے ہی درخت کی طرح کلمۂ طیبہ بھی ہوتا ہے اس کے اندر بھی چاروں اوصاف موجود ہیں (۱) اس کے اندر جو لذت و کیفیت ہے وہ اصحاب ذوق سے پوچھو دنیا کی بہترین مادی غذا میں وہ کیفیت نہیں ہو سکتا جو اس میں ہے۔ کیونکہ ہر مادی لذت چند منٹ کی ہوتی ہے۔ حلق سے اترتے ہی لذت معدوم ہو جاتی ہے مگر مطالعہ توحید و تحمید کرنے والوں کی روحوں کو جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ لامحدود اور ناقابلِ زوال ہوتی ہے۔ وہ استغراقی کیف اور صفاتِ باری تعالیٰ میں کھو جانے کا مزہ جو کلمۂ طیبہ پر غور کرنے والوں کو میسر ہوتا ہے دنیا بھر کے اصحاب کیف کو نصیب نہیں ہوتا۔ (۲) کلمۂ طیبہ کلمۂ حق ہے اور کلمۂ حق کی جڑیں مضبوط ہیں۔ یہ کلمۂ صداقت ہے اور صداقت ناقابلِ زوال۔ یہ کلمۂ نور ہے اور نور کی بنیاد نفوسِ قدسیہ میں ثبت ہوتی ہے۔ جس کو ہوا و ہوس کا کوئی جھونکا اور شیطانی وسوسوں کی کوئی آندھی اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتی۔ (۳) کلمۂ طیبہ کی شاخیں بہت بلند ہیں۔ عالمِ قدس تک اس کی شاخوں کی رسائی ہے۔ اعمالِ صالحہ اور اقوالِ ذاکرہ اس کی شاخیں ہیں اور ان شاخوں کو روزانہ صبح شام آسمانوں کے فرشتے اٹھا کر دربارِ الٰہی تک لے جاتے ہیں۔ ایمان و یقین اور حقیقت و معرفت تک پہنچا اس کی شاخیں ہیں جو ہوائے الٰہی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ الغرض کل جہان اسی پاک کلمہ کی شاخوں کے زیرِ سایہ ہے۔ (۴) اس میں ہر وقت پھل آتے رہتے ہیں۔ کلمۂ طیبہ کا ہر پھل ہر وقت دنیا میں بھی اچھا ملتا ہے اور آخرت میں بھی اچھا ملے گا۔ رزق میں برکت، عزت، دولت، حکومت اور عروج و ترقی اس کے مادی پھل ہیں۔ الہاماتِ نفسانیہ، مختلف مکاشفات، حقائقِ عالم کا علم، اسرارِ سربستہ کی معرفت اور انوارِ تجلی کا وقتاً فوقتاً ظہور اس کے روحانی پھل ہیں۔ پھر آخرت میں جنت میں داخل ہونا، وہاں کی لذتیں حاصل ہونا، نورِ الٰہی میں ڈوب جانا اور دیدارِ باری تعالیٰ کی دلکشی میں گم ہو جانا یہ اس کے اخروی پھل ہیں۔ نہ دنیا میں کسی وقت یہ شجر آوری سے خالی رہتا ہے نہ آخرت میں۔ کبھی اس کے پھل ختم نہ ہوں گے یہ کلمۂ طیبہ کی مثال تھی۔ رہا کلمۂ خبیثہ یعنی کلمۂ شرک تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بدشکل درخت ہو جس میں نہ زیادہ مغز، بڑی ہو نہ اچھے پھل ہوں نہ خوشبو ہو نہ اچھا مزہ ہو نہ اس کا سایہ ہو نہ کوئی اور فائدہ پھر اس کی جڑ بھی اوپر ہی رکھی ہو جمی ہوئی نہ ہو۔ ہوا کے کمزور جھونکے سے جڑ سے اکھڑ گیا ہے۔ یہی حالت کلمۂ شرک کی ہے۔ نہ اس سے دنیا میں کوئی فائدہ نہ دین میں۔ نہ اس کے پھلوں میں کوئی لذت نہ پتوں میں کوئی سایہ۔ کمزور اتنا ہے کہ ذرا سی مصیبت پڑی بس اس لئے ہر باطل معبود کو چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع کیا اور شرک کا پورا درخت جڑ سے زمین پر آ رہا

چونکہ اس کی جڑ ہی کو ثبات نہیں تو شاخیں کہاں سے آئیں گی۔ اس کی شاخوں کی کوئی حقیقت نہیں نہ مشرک کے اعمال کی بارگاہِ الٰہی تک پہنچ ہے۔ کیونکہ تمام اعمال بغیر اصل کے ہوتے ہیں۔

مقصودِ بیان کلمہ توحید اپنے ثمرات و نتائج کے لحاظ سے پاکیزہ بار آور درخت کی طرح ہے۔ جو شخص صحیح طور پر کلمۂ توحید پڑھتا اس کا اقرار کرتا اور دل سے تصدیق کرتا ہے اس پر ہر چیز کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ سربستہ اسرار اور حقائق معرفت کے پوشیدہ راز اس پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوا۔ کلمۂ شرک تمام معاصی و خبائث کی جڑ ہے۔ شرک کا عقیدہ رکھتے ہوئے کوئی نیکی مقبول نہیں ہو سکتی۔ ہر نیکی کی جڑ اعتقادِ توحید ہے۔ بغیر بیج کے شاخیں نہیں پیدا ہو سکتیں۔ شرک و معصیت کو پائیداری نہیں۔ توحید و عمل صالح ہی پائیدار ہے۔ قرآن پاک میں بیان مثل صرف سمجھانے اور غور کرنے کی تعلیم دینے کے لئے کیا گیا ہے تاکہ آدمی غیر محسوس کو محسوس کی شکلوں میں دیکھ کر صحیح طور پر سمجھ سکے۔ دغیرہ۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ

ایمان والوں کو دنیوی زندگانی میں بھی اور آخرت میں بھی اللہ پکی بات پر قائم رکھتا ہے اور

يُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۙ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ۝ ع

ظالموں کو گمراہ چھوڑ دیتا ہے اور جو چاہتا ہے کرتا ہے

تفسیر ان آیات کا حاصل مطلب یہ ہے کہ جب مومن پر دنیوی مصائب و آلام آتے ہیں اور ایسی تکالیف سے دوچار ہوتا پڑتا ہے جو ایمان کو ہلا دینے والی ہیں تو خدا تعالیٰ ہی اپنے فضل و کرم سے اس کو ایمان و اقرار توحید پر قائم رکھتا ہے اور قبر میں بھی منکر نکیر کے سوال کے وقت ایمان پر قائم رکھے گا۔ بشرطیکہ بندہ مومن ہو اور دنیا سے با ایمان گیا ہو۔ رہے کافر ناحق شناس سو ان کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔ ان کی مدد نہیں فرماتا۔ خدا تعالیٰ ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس ترجیحی سلوک کی کیا وجہ۔ باوجودیکہ مخلوق ہونے کے اعتبار سے کافر و مومن سب برابر ہیں تو اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ مختار ہے جیسی اس کی مشیت ہے ویسا کرتا ہے، اپنی مصلحت کو وہی خوب جانتا ہے۔

آخرت سے مراد بعض مفسرین کے نزدیک وقت حساب ہے، مگر یہ غلط ہے کیونکہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جس شخص سے حساب میں مواخذہ کیا گیا وہ ہلاک ہو گیا۔ اکثر مفسرین کے نزدیک قبر کے اندر منکر نکیر کے سوالات کے صحیح جوابات دینا مراد ہے۔ یہی صحیح ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے یہی تفسیر کی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضور نے بھی آخرت سے مراد قبر ہی قرار دی ہے۔ (ابن مردویہ) ام المومنین حضرت عائشہ فرماتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس امت کا امتحان قبروں میں ہوگا۔ میں ضعیف عورت ہوں میرا کیا حال ہوگا۔ حضور نے آیت يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ الخ تلاوت فرمائی (رواہ البزار) حضرت عثمان بن عفان کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام جب میت کو دفن کرنے سے فارغ ہو جاتے تو وہاں ٹھہر جاتے اور فرماتے اپنے بھائی کے لئے استغفار کرو اور اس کے لئے دعائے تثبیت کرو کیونکہ اس وقت اس سے سوال کیا جائے گا (رواہ ابو داؤد) حضرت براء بن عازب کی روایت ہے حضور اقدس نے ارشاد فرمایا جب مومن سے قبر میں سوال کیا جاتا ہے تو وہ شہادت دیتا ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ یہی مضمون ہے آیت يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا (رواہ البخاری والمسلم وغیر واحد من الائمۃ) ان تمام احادیث سے ثابت ہے کہ آخرت سے قبر مراد ہے۔

مقصودِ بیان جو لوگ دنیا میں اہل ایمان ہیں ان کے ثبات ایمان کے لئے اللہ ہی مدد فرماتا ہے۔ دنیوی مصائب اور قبر کی ہیبت ناک تکلیف کے وقت اللہ ہی اہل ایمان کو ایمان پر قائم رکھنے والا ہے۔ آیت وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ

سے اس طرف اشارہ ہے کہ چونکہ کافر حق ناشناس ہوتا ہے، اس لئے خدا الٰہی اس کو گم کردہ راہ چھوڑ دیتا ہے۔ آیات میں اس جانب بھی ایماء ہے کہ ایمان داروں کو اپنے ایمان پر غرہ نہ ہونا چاہیئے۔ معلوم نہیں امتحانِ دنیا اور احوالِ قبر کے وقت کیا پیش آئے بلکہ اللہ تعالیٰ سے ایمان پر ثابت رہنے کی دعا کرنی چاہیئے وغیرہ۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۝ جَهَنَّمَ

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے اللہ کی نعمت کے عوض ناشکری کی اور اپنی قوم کو تباہی خانہ یعنی جہنم میں اتار دیا جس

يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۝ وَجَعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا لِّيُضِلُّوا عَن سَبِيلِهِ ۗ قُلْ

کے اندر سب داخل ہوں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے　انھوں نے اللہ کے شریک قرار دیئے تاکہ لوگوں کو راہِ خدا سے گمراہ کر دیں　تم کہدو

تَمَتَّعُوا فَإِنَّ مَصِيرَكُمْ إِلَى النَّارِ ۝ قُل لِّعِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا يُقِيمُوا الصَّلَاةَ

کہ مزے اڑا لو　آخر کار تو جہنم کی طرف تم کو جانا ہی ہے　میرے ایماندار بندوں سے　کہہ دو　کہ پابندی سے　نماز پڑھیں

وَيُنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ

اور جو کچھ ہم نے　ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ پوشیدہ اور ظاہر راہِ خدا میں خرچ کریں قبل اس کے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ خرید و فروخت

وَلَا خِلَالٌ ۝

ہوگی　نہ دوستی

تفسیر ان آیات میں دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں کفار کی مذمت اور ان کی گمراہ کنی اور ہلاکت انگیزی کا بیان ہے اور دوسرے حصے میں مسلمانوں کو نماز کی پابندی رکھنے اور راہِ خدا میں خیرات کرنے کی ہدایت ہے۔ پہلے حصے کی شانِ نزول کے متعلق مختلف مضامین کی مختلف روایات آئی ہیں۔ ہم خلاصہ کے ساتھ چند روایات درج ذیل کرتے ہیں:-

عوفی نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیات جبلہ بن ایہم غسانی اور اس کے ساتھ والے عربوں کے متعلق نازل ہوئی تھیں جو بھاگ کر روم کو چلے گئے تھے اور عیسائی ہو گئے تھے۔ بخاری اور نسائی نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کفار قریش کے حق میں ان آیات کا نزول ہوا۔ ابن کثیر نے مؤخر الذکر روایت کو ترجیح دی ہے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ان آیات کا نزول اُن کفارِ قریش کے حق میں ہوا جو بدر کے دن لشکر چڑھا کر لائے تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ منافقین قریش مراد ہیں۔ تیسری روایت میں ہے کہ عبد اللہ بن الکواء نے کھڑے ہو کر آیت أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا الخ کے متعلق حضرت علیؓ سے دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا یہ لوگ مشرکین قریش تھے جن کے پاس اللہ کی طرف سے نعمتِ ایمان آئی، مگر انھوں نے اُس نعمت کو کفر سے بدل دیا اور اپنی قوم کو خانۂ ہلاکت دربلا میں ڈالا۔

مسلم مستوفی نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا سے قریش کے سب سے زیادہ سرکش دو گروہ مراد ہیں۔ بنو مغیرہ اور بنو اُمیہ۔ بنو مغیرہ نے تو بدر کے دن اپنی قوم کو مقامِ ہلاکت یعنی جہنم میں داخل کر دیا اور بنو اُمیہ نے احد کے روز اپنی قوم کو جہنم رسید

کیا۔ بدر کے روز (قریش کا سردار اعظم) ابوجہل تھا اور احد کے دن ابوسفیان (سدی) ابن ابی حاتم کی روایت میں ہے کہ بنی مغیرہ تو بدر کے روز ہلاک کر دیئے گئے۔ رہے بنو اُمیہ تو ان کو ایک خاص وقت تک باقی رکھا گیا۔ سفیان ثوری نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اَلَّذِیْنَ بَدَّلُوْا سے قریش کے دو فاجر ترین گروہ مراد ہیں۔ ایک بنی مغیرہ دوسرا بنی اُمیہ۔ بنی مغیرہ کے لئے تو بدر کے دن میں کافی ثابت ہوا۔ رہے بنی اُمیہ تو ان کو چند روزہ زندگانی عطا کی گئی۔ بہرحال سبب نزول کوئی خاص گروہ ہو، منشائے حکم عام ہے۔ معانی قرآن عموماً (باستثناء بعض) کسی وقت اور کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اگر وقت نزول مصداق موجود تھا تو اس کو بیان کر دیا جاتا ہے، مگر حکم کو عام رکھا جاتا ہے اور اگر اس وقت مصداق موجود نہ تھا تو آئندہ کے لئے عمومی حکم باقی رہتا ہے۔

مقصودِ بیان ایمان بھی اللہ کی ایک عظیم الشان نعمت ہے۔ یعنی انسان کا خدا پر کوئی واجب حق نہیں کہ اس کے عوض خدا تعالیٰ اس کو ایمان عطا کرے اور نہ کسی کے ایمان لانے کا خدا پر احسان ہو سکتا ہے بلکہ آدمی کو توفیق ایمان دینا محض اللہ کا کرم ہے۔ جو لوگ ایمان کو چھوڑ کر کفر کی طرف مائل ہوتے ہیں وہ احسان فراموش ہیں۔ کفرانِ نعمت کرتے ہیں۔ اللہ کے راستے سے بھٹکانا بڑا جرم ہے۔ صفاتِ الٰہیہ کے ساتھ کسی دوسرے کو متصف جاننا شرک ہے۔ اہل ایمان پر لازم ہے کہ اعتدال ارکان کے ساتھ صحیح طور پر نماز پڑھیں اور راہ خدا میں زکوٰۃ و صدقات دیتے رہیں۔ زکوٰۃ صدقات علانیہ بھی دیئے جا سکتے ہیں اور پوشیدہ طور پر بھی۔ علمائے حنفیہ کے نزدیک زکوٰۃ کو علانیہ ادا کرنا افضل ہے۔ اہل تحقیق کہتے ہیں کہ اگر نیت خالص ہو اور ریاکاری کا اندیشہ نہ ہو تو خفیہ اور علانیہ دونوں طرح سے دینا برابر ہے۔ نماز و زکوٰۃ کا حکم دینے سے اس طرف اشارہ ہے کہ فقط اعتقاد کی درستگی اور قلبی اعتقاد ہی کافی نہیں ہے بلکہ بدنی عبادت و ریاضت اور برادرانِ ملت کی پرورش و ہمدردی بھی مومن کے لئے لازم ہے۔ پس گمراہ ہیں وہ لوگ جو فرائض دینیہ سے اپنے کو مستثنیٰ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ اب ہم ایمان و یقین کے اس درجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ نماز روزہ کی ہم کو ضرورت نہیں رہی ہے۔ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ برادرانِ ملت کی خبر گیری اصحابِ استطاعت پر ہر حالت میں فرض ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ

اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور اوپر سے پانی برسایا پھر اس سے تمہارے

مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ

کھانے کے لئے پھل پیدا کئے اور کشتیوں کو تمہارا تابع بنایا تاکہ بحکم خدا دریا میں چلیں اور

سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ

نہروں کو تمہارے تابع کر دیا اور سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگا دیا جو چلتے رہتے ہیں اور رات و دن کو

الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۚ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ

تمہارے کام پر لگا دیا۔ اور جو کچھ تم نے مانگا کچھ نہ کچھ اس نے دیا اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو گے

لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۠

تو گن نہ سکو گے بلاشبہ انسان بڑا بے انصاف اور ناشکرا ہے

تفسیر اوپر کی آیات میں بیان کیا تھا کہ بعض حق ناشناس کافروں نے اللہ کی دی ہوئی نعمت کو ٹھکرا دیا اور اس کے عوض کفر کو اختیار کیا۔ ان آیات میں بتانا چاہیے کہ اللہ کی نعمت فقط ایک ہی نہیں بلکہ اتنی تعداد میں ہے کہ شمار کرو اگر گن نہ سکو۔ ایمان و توحید تو ایک روحانی نعمت ہے جو محسوس پرستوں کو بمشکل دکھائی دیتی ہے۔ خدا کی تو محسوس نعمتیں لا متناہی ہیں۔ مثلاً اس نے آسمانوں اور زمینوں کو تمہارے فائدہ کے لئے بنا دیا۔ بادلوں سے مینہ برسایا۔ بارش کے پانی سے تمہارے لئے طرح طرح کی چیزیں پیدا کیں جن میں سے کوئی کھانے اور پینے کے کام آتی ہے کوئی پہننے اوڑھنے اور بچھانے کے اور کوئی دیگر ضروریات ولوازم زندگی کے سرانجام دہی اور اسباب آرائش کی فراہمی کے لئے۔ پھر پانی پر سفر کرنے کے لئے کشتی جہاز وغیرہ بنانا سکھایا۔ ایسی تدبیریں بتائیں کہ کشتیاں پانی میں غرق نہ ہوں پھر نہروں کو تمہارے بس میں کر دیا۔ جدھر چاہتے ہو لے جاتے ہو۔ اُن سے طرح طرح کے کام لیتے ہو۔ آبپاشی کرتے ہو چکیاں چلاتے ہو۔ بجلی بنا کر اس سے بکثرت سامانِ ضرورت و معیشت فراہم کرتے ہو۔ پھر چاند سورج کو تمہارے فوائد کے لئے ایک خاص چال سے چلایا۔ اگر ان کی چال بگڑ جائے تو انتظام عالم بگڑ جائے۔ نہ پھلوں میں پختگی آئے نہ کھیتیاں پکیں نہ سمندروں میں مد و جزر ہو نہ عالم کو گرمی و خنکی میسر آئے نہ زمین کی رطوبتیں خشک ہوں بکثرت بیماریاں پھیل جائیں یا بارش بالکل نہ ہو وغیرہ۔ پھر رات اور دن کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔ رات اپنے وقت پر آتی ہے اور دن اپنے وقت پر۔ رات میں بھی تمہارے سامانِ زندگی کی فراہمی ہوتی ہے اور دن میں بھی کاروبارِ حیات کی تکمیل پھر یہ تو کھلی ہوئی نعمتیں ہیں۔ انہیں پر کیا حصر ہے۔ تم نے جو کچھ اپنی زبان یا حال سے مانگا اور جن چیزوں کی تمہاری بقائے زندگی کو ضرورت ہوئی وہ سب خدا نے تم کو عطا کیں۔ ہر آڑے وقت پر تمہاری مدد کی پھر محسوس نعمتوں کے علاوہ نیم محسوس اور غیر محسوس انعامات اس قدر ہیں کہ شمار کرو تو گن نہ سکو، لیکن آدمی بڑا ظالم، حق ناشناس اور ناشکرا ہے۔ اوّل تو نعمت دینے والے کو پہچانتا ہی نہیں، غافل ہے۔ دوسرے منعمِ حقیقی کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف جھکتا ہے انہیں کو نعمت دینے والا خیال کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اللہ نے عقل، علم، استعداد اور جمال و کمال عطا کیا، مگر کافروں نے عقل کو غباوت سے، علم کو جہالت سے، استعدادِ ایمان کو قبولِ شرک سے اور جمالِ روح کو گناہوں کی بدصورتی سے بدل لیا۔ اس سے بڑھ کر ناشکرا پن اور حق ناشناسی اور اپنے نفس پر ظلم اور کیا ہو سکتا ہے۔

مقصودِ بیان اللہ کی محض مخصوص نعمتوں کی صراحت اور غیر محسوس نعمتوں کی طرف بالاجمال اشارہ۔ اس بات کی تصریح کہ کافر انسان کافرِ نعمت اور حق ناشناس ہوتا ہے۔ دینے والے کو چھوڑ کر نہ دینے والے کی طرف جھکتا ہے۔ اہلِ باطن نے آیات کے ظاہری معنی کی حقانیت کے اعتراف کے باوجود بطور اشارہ کچھ باطنی معنی کا بھی استنباط کیا ہے۔ جن کو اہلِ بصیرت کی دعوتِ ذوق کے لئے ہم مجمل طور پر لکھتے ہیں۔

آسمانوں سے اشارہ ارواح کی طرف اور زمین سے اشارہ اجسام کی طرف ہے۔ بادل سے پانی برسانے کا یہ مطلب ہے کہ فیاضِ عالم نے اپنے فیضِ قدسی کے چھینٹے اس کائنات کو بھی عطا کئے جن سے انسان کی روحانی و عقلی پرورش کے لئے طرح طرح کی معرفت انگیز اور علم آموز غذائیں پیدا ہوتی ہیں۔ کشتیاں یعنی آدمی کی شہوانی اور غضبی قوتیں جو قوتِ عقلیہ کی سواریاں ہیں اس بحرِ ہستی میں بحکمِ الٰہی چل رہی ہیں۔ قوتِ عقلیہ ان پر سوار ہے اور اس بحرِ ہستی کو طے کر رہی ہیں۔ اسی بنا پر اہلِ اخلاق کہتے ہیں کہ عقل راکب اور یہ دونوں قوتیں مرکب ہیں۔ مرکب کو اتنا مطلق العنان بھی نہ چھوڑ دو کہ کہیں غار میں گر پڑے یا درخت سے ٹکرا جائے یا کھائی خندق میں پھنس جائے اور نہ اُن کو اتنا تنگ کر دو کہ مارے تمہارے راستہ ہی میں فنا کر دو اور پھر شہسوارِ عقل راستے میں سواری کے مرنے کی وجہ سے منزلِ مقصود پر نہ پہنچ سکے۔ نہروں سے مراد فکر و ذکر کی نہریں۔ انہیں نہروں سے معرفت و محبت کے چشمے اُبلتے ہیں اور پھر ان چشموں کے پانی سے حکمت و شوق اور صدق و اخلاص کی شادابی حاصل ہوتی ہے۔ شمس و قمر سے اشارہ ہے نورِ ایمان، نورِ معرفت، نورِ یقین، نورِ توحید، نورِ محبت و شوق اور نورِ ہدایت و توفیق کی طرف۔ یہ ایسے آفتاب و ماہتاب ہیں جن سے عالم انسانی کا ذرہ ذرہ جگمگانے لگتا ہے۔ مشاہدۂ ذات و صفات ان کی شعاعیں ہیں اور ارواح و عقول کے افق سے ان کا طلوع ہوتا ہے۔ رات و دن سے اشارہ ہے تاریکیِ نفس اور روشنیِ قلب کی طرف۔ اوّل محلِ امتحان ہے اور دوسرا مقامِ عرفان۔ قہرِ الٰہی رات ہے جو جہالت کے پردے میں انسان کو پوشیدہ کر دیتی ہے اور لطفِ الٰہی دن ہے جس سے ظہورِ معرفت ہوتا ہے۔ غضب عتاب پردۂ حجاب ہے

اور کشف نقاب روز روشن ہے جس سے روح پر جمالِ الٰہی کا پرتو پڑتا ہے۔ انسان ظالم اور کافر نعمت ہے۔ یعنی اللہ نے اس کو بحرِ توحید میں غرق کیا، لیکن جب ابھرا تو خودی کا دعویٰ کرنے لگا۔ انتہائی حق ناشناس ہے کہ قدیم سے حدوث کو نسبت دیتا ہے۔ قدم کو دپایا تو ظالم نے اپنی نادانی سے خودی کا جال بنایا۔ اس سے بڑھ کر کون ساظلم ہوگا کہ محل عبودیت میں ربوبیت کا دعویٰ کرتا ہے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِيمُ رَبِّ ٱجْعَلْ هَٰذَا ٱلْبَلَدَ ءَامِنًا وَٱجْنُبْنِى وَبَنِىَّ أَن نَّعْبُدَ

اور جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب اس شہر کو امن کی جگہ بنانا اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے

ٱلْأَصْنَامَ ۝ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ ٱلنَّاسِ ۖ فَمَن تَبِعَنِى فَإِنَّهُۥ

بچانا اے میرے رب ان بتوں نے بہتیرے آدمیوں کو گمراہ کردیا ہے جو شخص میری پیروی کرے گا

مِنِّى ۖ وَمَنْ عَصَانِى فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ رَّبَّنَآ إِنِّىٓ أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِى

وہ تو میرا ہے اور جو میرا کہنا نہ مانے گا تو تو غفور رحیم ہے اے میرے رب میں نے اپنی اولاد تیرے معزز گھر کے

بِوَادٍ غَيْرِ ذِى زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ ٱلْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ فَٱجْعَلْ

پاس بسائی ہے جہاں کھیتی نہیں ہے تاکہ وہ پابندی سے نماز پڑھیں لہٰذا تو

أَفْـِٔدَةً مِّنَ ٱلنَّاسِ تَهْوِىٓ إِلَيْهِمْ وَٱرْزُقْهُم مِّنَ ٱلثَّمَرَٰتِ لَعَلَّهُمْ

لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کردے ان کو میوے کھانے کو دے تاکہ یہ

يَشْكُرُونَ ۝ رَبَّنَآ إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِى وَمَا نُعْلِنُ ۗ وَمَا يَخْفَىٰ عَلَى

شکر کریں اے ہمارے رب ہم جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اس سے تو واقف ہے اور کوئی چیز

ٱللَّهِ مِن شَىْءٍ فِى ٱلْأَرْضِ وَلَا فِى ٱلسَّمَآءِ ۝ ٱلْحَمْدُ لِلَّهِ

زمین میں اور آسمان میں اللہ سے چھپی نہیں اُس اللہ کا شکر ہے

ٱلَّذِى وَهَبَ لِى عَلَى ٱلْكِبَرِ إِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ ۚ إِنَّ رَبِّى لَسَمِيعُ

جس نے بڑھاپے میں مجھے اسمٰعیل و اسحٰق عطا فرمائے بلاشک میرا رب دعا کو

ٱلدُّعَآءِ ۝ رَبِّ ٱجْعَلْنِى مُقِيمَ ٱلصَّلَوٰةِ وَمِن ذُرِّيَّتِى ۚ

سننے والا ہے اے میرے رب مجھے اور میری کچھ اولاد کو نماز کا پابند رکھ

رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ۝ رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِينَ

اے ہمارے رب میری دعا قبول کرنا اے ہمارے رب جس روز حساب برپا ہوگا مجھے اور میرے والدین کو

يَوْمَ يَقُومُ الْحِسَابُ ۝ع

اور ایمان والوں کو تو بخش دینا

ع ۱۸

تفسیر مشرکین مکہ مدعی تھے کہ ہم اپنے دادا ابراہیمؑ کے دین پر ہیں اور محمدؐ اپنے آباؤ اجداد کے مذہب سے پھر گئے ہیں ہم ان کا کہا کیوں مانیں اور کیوں ان کے بہکانے سے ملتِ ابراہیمی کو ترک کریں۔ خداوند تعالیٰ ان آیات میں حضرت ابراہیمؑ کی چند دعائیں نقل فرماتا ہے تاکہ مشرکوں کو معلوم ہوجائے کہ صرف ملتِ ابراہیمی پر چلنے کا مدعی ہونا کافی نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کا پیرو درحقیقت وہی شخص ہے جو ان کی تعلیم پر عمل کرے اور ان کے نقشِ قدم پر چلے اور چونکہ محمدؐ اصولِ ابراہیمی کے پیرو ہیں اس لئے وہی ملتِ ابراہیمی پر ہیں اور مشرکین اُن کے دین سے پھرے ہوئے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ جب حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ ہاجرہ کو مکہ کے بیابان میں چھوڑ کر چلے اور دل میں اہل و عیال کی مفارقت کا رنج تھا اُس وقت خانۂ کعبہ کے فرسودہ نشانات کے سامنے کھڑے ہوکر بارگاہِ الٰہی میں یہ دعا کی (ابن کثیر) بعض مفسرین کا قول ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی مدد سے کعبہ کی تعمیر کی اور آدمؑ کی قائم کردہ بنیادوں پر اس کی دیواروں کو اٹھایا اُس وقت یہ دعا کی تھی۔

سب سے پہلے آپ نے التجا کی (۱) پروردگار اس شہر کو مقامِ امن بنادے یعنی اس زمین کو آباد کردے اور یہاں قتل و غارت کو حرام کردے۔ چنانچہ مکہ آباد ہوا اور قتل و غارت یہاں تک کہ وحوش و طیور کا شکار اور موذی جانوروں کا قتل اور سبزہ و درخت کا قطع کرنا بھی حرم کے اندر ممنوع قرار پایا۔ حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے لے کر اب تک یہی ناقابلِ شکست قانون جاری ہے۔ دورِ جاہلیت میں بھی کسی نے اس قانون کو منسوخ نہیں کیا۔ بعض مفسرین نے مقامِ امن سے محفوظ مقام مُراد لیا ہے۔ یعنی ایسا مقام جس کو کوئی ظالم، جابر منہدم نہ کرسکے۔ چنانچہ عمارتِ کعبہ ایسی ہی محترم ہے کہ کوئی شخص آج تک اس کو منہدم نہ کرسکا۔ رسول اللہ سے پہلے ابرہہ شاہِ یمن نے مکہ پر لشکر کشی کی۔ ہاتھیوں کی ایک جماعت بھی ساتھ لایا تاکہ کعبہ کو ڈھادے، مگر غیبی طاقت نے اس کو برباد کردیا اور کعبہ محفوظ رہا۔ (۱) حضرت ابراہیمؑ کو قانونِ قدرت معلوم تھا کہ پھول کے ساتھ کانٹا اور خیر کے ساتھ شر کا وجود لازم ہے۔ ہدایت کے بعد گمراہی کا دور ضرور آتا ہے۔ کبھی صداقت کی روشنی باطل کے اندھیرے میں عارضی طور پر چھپ جاتی ہے، اس لئے دعا کی پروردگار مجھے اور میری اولاد کو شرک سے محفوظ رکھنا یعنی اولاد کو شرک سے محفوظ رکھنا۔ نسبی اولاد تو کل نسل ہوتی ہے، اس لئے آگے فرمایا میری آل اور میرا آدمی وہی ہے جو میرا پیرو ہو۔ جو میرا پیرو نہ ہو وہ میرا نہیں ہے۔ چونکہ حضرت ابراہیمؑ انتہائی رحیم تھے۔ اس لئے نافرمانوں کے متعلق بھی اظہارِ بیزاری صراحۃً نہیں کیا بلکہ فرمایا پروردگار! جو میرا نافرمان ہے تو اس کو معاف کرنے والا ہے (اہلِ سنت کا عقیدہ ہے اللہ کو اپنی مخلوق کا کامل اختیار رہے چاہے کافروں اور مشرکوں کو بخش دے، لیکن اُس نے فرمادیا ہے کہ میں مشرک، کافر اور منافق کو نہیں بخشوں گا) اس لئے ہم جانتے ہیں کہ وہ ان کو نہیں بخشے گا، مگر اس کی قدرت و اختیار ویسا ہی ہے اسی بنا پر خلیل اللہ نے خداتعالیٰ کے اصلی اوصاف یعنی غفور رحیم ہونے کا ذکر کیا اور یہ نہ فرمایا کہ تو نافرمان کو سزا دینا۔ (۳) سرزمینِ مکہ کے چاروں طرف دُور دُور تک چٹیل ریگستان، خشک پہاڑ اور بے آب و گیاہ میدان تھا۔ خلیل اللہ نے وہاں بحکمِ الٰہی حضرت اسمٰعیلؑ اور ان کی والدہ ہاجرہ کو چھوڑا تو باقتضائے بشریت دو خیال پیدا ہوئے اوّل تو یہ کہ یہاں دور تک کوئی آدمی نہیں ان کا دل گھبرائے گا، وحشت ہوگی۔ ان کے انسِ خاطر کا کیا سامان ہے۔ دوسرے یہ کہ اس لق و دق بیابان میں یہ کھائیں گے کیا۔ اس لئے دعا کی پروردگار! میں نے تیری عبادت اور کعبہ کو آباد رکھنے کے لئے اپنے بعض اہل و عیال کو یہاں بسا دیا ہے، مگر تیری

ان کی سرپرستی کرتا۔ کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور کھانے کے لئے ان کو پھل اور غلہ وغیرہ عطا فرمایا چنانچہ یہ دعا بھی قبول ہوئی۔
عرب کے تمام آدمی کھنچ کھنچ کر حج کرنے کے لئے کعبہ کو آنے لگے اور مکہ سے کچھ فاصلہ پر خدا تعالیٰ نے طائف کی زمین ایسی کر دی کہ وہاں ہر طرح کے پھل پیدا ہونے لگے اور کھیتیاں آنے لگے۔

ابن عباس، مجاہد اور سعید بن جبیر وغیرہ کا قول ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے کچھ آدمیوں کے دلوں کو مائل کرنے کی دعا کی تھی۔ اگر کچھ کا لفظ نہ کہتے تو مشرق مغرب کے تمام انسان یہاں تک کہ یہودی اور عیسائی بھی کعبہ کی طرف جھک پڑتے۔

اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے علم الٰہی کی ہمہ گیری بیان کر کے اُن انعامات الٰہی کا تذکرہ کیا جو خاص طور پر بغیر ظاہری اسباب کے خدا تعالیٰ نے ان کو عطا کئے تھے، اور آخر میں اپنی ذات اور اولاد کے لئے نماز کی پابندی کی دعا کی اور پھر اپنے اور اپنے والدین کے لئے مغفرت کی استدعا کی اور

ایک وہم حضرت ابراہیمؑ جلیل القدر پیغمبر اور رازدارِ شریعت تھے، اور آپ کا باپ آذر کافر تھا پھر کیوں کافر کے لئے دعائے مغفرت کی اور کیوں رشتۂ نسبی کو رشتۂ الٰہی پر ترجیح دی؟

وہم کا ازالہ (۱) طلب مغفرت کا مطلب یہ ہے کہ پروردگار میرے والدین کو اس قابل بنا دے کہ وہ تیری مغفرت کے اہل ہو سکیں۔ یعنی اُن کو مسلمان کر دے۔ (۲) اس وقت تک حضرت ابراہیمؑ کو قطعی طور پر معلوم نہ ہوا تھا کہ باپ ازلی کافر ہے۔ کبھی راہِ راست پر نہیں آ سکتا، اس لئے شفقتِ پدری کے پیش نظر دعائے مغفرت کی، لیکن جب معلوم ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن اور ازلی کافر ہے تو پھر اظہار تبری کیا اور کبھی دم نہ مارا۔

مقصود بیان حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا اثر ہے کہ آج تک مکہ میں حرم کے اندر قتل و غارت اور ہر قسم کا شکار یہاں تک درختوں کو کاٹنا چھانٹنا بھی ممنوع ہے۔ بت پرستی انسان کی گمراہی کا ظاہری سبب ہے۔ درحقیقت کسی نبی یا ولی کی اولاد اور آل وہ شخص ہے جو اس کا پیرو ہو۔ رشتۂ نسبی کوئی چیز نہیں۔ مکہ کے اندر حضرت ابراہیمؑ کے وقت میں کھیتی نہ ہوتی تھی۔ لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ سے اس طرف اشارہ ہے کہ نماز کی پابندی سے کوئی مدعی ایمان مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ خواہ وہ ایمان کی انتہائی چوٹی پر پہنچ گیا ہو۔ اس سے عبرت پکڑنا چاہیئے اُن جاہل صوفیوں کو اور اُن ضعیف الاعتقاد عوام کو جو بعض بے دین رندوں کو ولی اللہ یقین کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نماز ایمان کو پختہ کرنے اور یقین کو حاصل کرنے کے لئے پڑھی جاتی ہے۔ فلاں شخص کمال یقین کے درجہ پر پہنچ گیا ہے، اس لئے اس کو نماز روزہ کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے دونوں صاحبزادے اسمٰعیل و اسحاق پیرانہ سالی میں بغیر ظاہری اسباب کے پیدا ہوئے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا تعالیٰ بغیر ظاہری اسباب کے بھی ہر طرح قادر ہے، اور رحمت الٰہی سے کسی کو مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ خواہ اسباب پیش نظر ہوں یا نہ ہوں اور ڈرنا لازم ہے۔ اہل کی صلاح اور تقوی ضروری چیزیں ہیں۔ نیکوں کو اللہ ضرور نوازتا ہے۔ آیت رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ الخ دلالت کر رہی ہے کہ نیکی کی توفیق اور اس پر استقامت بھی محض اللہ کے حکم سے ہوتی ہے۔ بھلائی اور اس کی توفیق دونوں چیزیں انسانی اختیار سے خارج ہیں۔ اسی آیت میں حضرت ابراہیمؑ نے وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ فرمایا میری بعض اولاد کو بھی نماز کا پابند بنا دے۔ چونکہ آپ واقف تھے کہ کل نسل کا پابند نماز ہونا اور اللہ کا فرمانبردار بننا قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ مشیت الٰہی یوں ہی ہے کہ دنیا میں نہ کل آدمی نیک ہوں نہ بد۔ بلکہ کچھ فرمانبردار ہوں اور کچھ اصحاب معصیت ہوں یہ لازم ہے، اس لئے آپ نے بھی دعا میں اس قانون الٰہی کو پیش نظر رکھا اور بعض اولاد کے عبادت گزار ہونے کی دعا کی۔ آخری آیت بتا رہی ہے کہ دعا میں ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھنی ضروری ہے۔ سب سے پہلے انسان اپنی ذات کے لئے دعا کرے پھر ترتیب سے تعلق رکھنے والوں کے لئے پھر اہل ایمان کے لئے۔ حضرت ابراہیمؑ معصوم نبی تھے اور نبی کا معصوم ہونا لازم ہے پھر بھی آپ نے اپنے لئے دعائے مغفرت کی۔ اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ اول تو یہ کہ آدمی کتنا ہی کامل الایمان اور مقرب بارگاہ ہو اور کیسا ہی عالم السنہ اور مرسل ہو، مگر اس کو قہر الٰہی کا خوف رہنا چاہیئے۔ اپنے ایمان اور اعمال پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔ معلوم نہیں کیا ہو جائے۔ دوسرے اسی طرف بھی اشارہ ہے کہ کسی شخص کی مغفرت اس کے اعمال کی وجہ سے نہ ہوگی۔ اسی مضمون کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

نے ایک بار صحابہ سے فرمایا تھا کہ کوئی شخص اچھے اعمال کی بنا پر نہ بخشا جائے گا۔ یعنی کسی شخص کی نیکیاں جنت میں داخل ہونے کے لئے سبب اصلی اور علت موجبہ نہ ہوں گی۔ صحابہ نے عرض کیا حضور کیا آپ کا بھی یہی حال ہے؟ فرمایا ہاں میرا بھی یہی حال ہے۔ مگر اس وقت میں مغفور ہوں گا جب اللہ تعالیٰ کی رحمت مجھے ڈھانک لے گی۔ گویا اللہ تعالیٰ کی رحمت مغفرت کا اصل سبب ہے۔ اعمال اور ایمان آدمی کو فقط مغفرت کا اہل بنانے میں دخل رکھتے ہیں یعنی ان سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور اللہ کی خوشنودی انسان کو دوامی نجات اور فائز المرامی عطا کرتی ہے وغیرہ۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ۬ؕ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ

(اے مخاطب) ظالم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں اُن سے تو اللہ کو بے خبر نہ خیال کرنا بات صرف اتنی ہے کہ اللہ اُس دن

لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ۙ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ

تک اُن کو مہلت دیئے ہوئے ہے جس میں آنکھیں کھلی رہ جائیں گی اور سر جھکائے دوڑتے ہوں گے ان کی طرف پھر اُن کی نظر

اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ۚ وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ۞ وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ

نہ لوٹے گی اور حواس باختہ ہوا ہوں گے (اے محمد) لوگوں کو اُس دن سے ڈراؤ جس میں اُن پر عذاب آ پڑے گا

فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَ

تب ظالم کہیں گے اے ہمارے رب ہم کو تھوڑی سی مدت کی مہلت دے دے کہ ہم تیرا حکم مان لیں اور

نَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ ۞

پیغمبروں کا اتباع کر لیں (اُن کو جواب ملے گا) کیا تم قسمیں نہ کھایا کرتے تھے کہ ہم کو کسی طرح زوال نہیں۔

وَّسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا

حالانکہ تمہاری سکونت اُن لوگوں کے مکانوں میں تھی جنہوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا تھا اور تم پر کھل چکا تھا کہ ہم نے ان کے

بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ۞ وَقَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَعِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ ؕ

ساتھ کیا معاملہ کیا اور ہم نے تمہارے سامنے مثالیں بیان کر دی تھیں اُن لوگوں نے اپنا داؤں کیا مگر اُن کا داؤں خدا کے پاس موجود ہے

وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ۞

اگرچہ اُن کی تدبیر ایسی تھی جس سے پہاڑ بھی ٹل جائے۔

تفسیر یہ خطاب رسول پاک کو ہے اور بہت لرزہ انگیز خطاب ہے۔ ان آیات کا اصلی رخ ان لوگوں کی طرف ہے جو اگرچہ بالفعل کافر اور نافرمان ہیں، مگر اُن کا نور بصیرت بالکل بجھا نہیں ہے اُن کے لئے سعادت ازلی جاری ہو چکی ہے تاکہ ان آیات کو سن کر وہ ہوشیار

ہو جائیں ۔ ان کے ردنے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور دل پھیل جائیں اور جس طرح بھاگا ہوا غلام شام کو پھر آقا کی طرف ندامت کے ساتھ لوٹتا ہے اسی طرح
وہ بھی اللہ کی طرف رجوع کریں

آدمی کی آنکھوں پر ایک امتحانی پردہ پڑا ہوا ہے ۔ دنیا کی نعمتوں کے علاوہ اس کو آخرت کی کوئی بہبودی آنکھوں سے نہیں دکھتی ۔ کافروں کی
فراخ دستی اور ناز و نعمت کو دیکھ کر اہلِ نفاق گمان کرتے ہیں کہ اگر یہ لوگ حق پر نہ ہوتے اور مردودِ بارگاہ ہوتے تو یہ نعمتیں ان کو کیوں عطا کی جاتیں۔
کیوں ان کو مرفہ الحال، فارغ البال، عیش و عشرت سے ہمکنار اور جاہ و جلال بردوش چھوڑا جاتا ۔ اس شبہ کو زائل فرماتا ہے کہ اے نبوتِ ازلی سے
حصہ پانے والو یہ ہرگز گمان نہ کرو کہ ان بے دین حق ناشناس کافروں کی بداعمالیوں سے خدا واقف نہیں ہے ۔ وہ خوب جانتا ہے ان کی ہر حرکت
سے واقف ہے مگر اس نے خود ان کو ڈھیل دے رکھی ہے ۔ جیتے دم تک ان کو مہلت ہے ۔ مرنے کے بعد جب قبروں سے اٹھیں گے تو اس وقت
ہکا بکا آنکھیں پھاڑے تکتے رہ جائیں گے ۔ دل ٹھکانے سے نہ ہوں گے کلیجے منہ کو آئیں گے ۔ جب عذابِ الٰہی قیامت کے دن یا مرنے کے وقت
سامنے آئے گا تو اس وقت انتہائی حسرت سے دنیا میں واپس جانے اور پیغمبروں کی ہدایت پر چلنے کی آرزو کریں گے لیکن اس وقت کوئی آرزو سود مند
نہ ہوگی اور صاف جواب دے دیا جائے گا کہ دنیا میں تم تو قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ ہمارا یہ دنیوی عیش و نشاط ناقابلِ زوال ہے ۔ ہم کو آخرت
میں کبھی جانا ہی نہ ہوگا ۔ پھر تم جن لوگوں کی بستیوں میں رہتے تھے وہ قوت و تدبیر میں تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے جب ان پر تم سے پہلے تباہی آگئی اور
وہ نہ رہے تو تم نے کیوں نہ سمجھا کہ ہم بھی نہ رہیں گے اس کے علاوہ طرح طرح کی نظیریں اور مثالیں دے کر ہم نے تمہیں سمجھایا، مگر پھر بھی تم نہ سمجھے ۔

آیت وَاِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ کی تفسیر میں علماء کا اختلاف ہے ۔ علی بن طلحہ نے ابن عباس کا قول نیز قتادہ اور ضحاک
نے بیان کیا ۔ چونکہ زوالِ جبال سے مراد ہے پہاڑوں کا پھٹ جانا ۔ یعنی کلمۂ شرک ایسا سخت تھا کہ اس سے پہاڑ پھٹ جاتے تو تعجب نہ تھا ۔ گویا
ان کا مکر سراسر شرک تھا اور شرکِ الٰہی اس قدر نازیبا حرکت ہے کہ اس کو پہاڑ بھی برداشت نہیں کر سکتے ۔

حسن بصری نے کہا کہ ان کا مکر بے حقیقت تھا اس میں ایسی طاقت نہ تھی جس سے پہاڑ اپنی جگہ سے ہل جائیں ۔ یعنی صداقت و حقانیت مثل
پہاڑوں کے تھی جن پر ان کی مکاری سے کوئی اثر نہ پڑ سکتا تھا ۔

حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ نے کَانَ کی بجائے کَادَ پڑھا ہے یعنی ان کی مکاری اتنی قوی تھی
کہ اس کی وجہ سے پہاڑ اپنی جگہ سے ہل جاتے تو تعجب نہ تھا ۔ شیخ ابن جریر نے کَادَ نہیں پڑھا بلکہ کَانَ ہی پڑھا اور مطلب وہی بیان کیا جو حضرت
علیؓ نے فرمایا ہے

میمون بن مہران نے کہا کہ آیت وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا میں وعید ہے ظالم کے لئے اور تسکین ہے مظلوم کے لئے ۔ آخری

مقصودِ بیان آیات سے یہ مضمون مستنبط ہوتا ہے کہ سائنس اور طبیعیات کی مہارت سے کارخانۂ قدرت میں تبدیلی ناممکن ہے
خواہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہلا دیے جائیں مگر احاطۂ قدرت سے خارج ہونا محال ہے ۔ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ حق کے مقابلہ میں کوئی تدبیر
مکر خواہ کتنا ہی بڑا ہو مفید نہیں ہو سکتا ۔ یہ بھی ایماء ہے کہ صداقت مثل پہاڑ کے ہے جو کسی باطل تدبیر سے اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتی

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۴۷

(اے مخاطب) تو یہ نہ سمجھنا کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرنے والا ہے بلاشبہ اللہ زبردست اور انتقام لینے والا ہے

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ

جس روز کہ اس زمین کے بدلے دوسری زمین اور آسمانوں کے بدلے (دوسرے) آسمان ہوں گے اور خدائے واحد عالم کے سامنے

الْقَهَّارِ ۝ وَتَرَى الْمُجْرِمِينَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ ۝

(لیکن جو غالب ہے) اور اس روز مجرموں کو تم زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھو گے

سَرَابِيلُهُم مِّن قَطِرَانٍ وَتَغْشَىٰ وُجُوهَهُمُ النَّارُ ۝ لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ

اُن کے کرتے روغن بیٹر کے ہوں گے اور اُن کے چہروں کو آگ چھپائے ہوئے ہوگی (یہ بات اس لئے ہوگی کہ) ہر شخص

نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝ هَٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ

کو اس کے کئے کا بدلہ اللہ دے گا بلاشبہ اللہ جلد حساب لینے والا ہے لوگوں کو یہ صرف خبر کر دینی ہے اور

وَلِيُنذَرُوا بِهِ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَلِيَذَّكَّرَ أُولُو الْأَلْبَابِ ۝

(یہ مقصد بھی ہے کہ) اس سے اُن کو ڈرایا جائے اور اُن کو معلوم ہو جائے کہ اللہ ایک ہی ہے اور عقل والے نصیحت پکڑیں

تفسیر وجود قیامت پر چار شبہات کئے جا سکتے ہیں (۱) اللہ نے جو قیامت کے متعلق مختلف مقامات پر صراحت کی ہے کیا اس کے خلاف ہونا ممکن نہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ نیکی کی ترغیب دینے کے لئے خدا نے قیامت کی دھمکیاں دی ہوں اور واقع میں قیامت نہ ہو۔ اس کا جواب خدا تعالیٰ نے اس طرح دیا کہ اللہ نے اپنے پیغمبروں سے جو وعدہ فرمایا اس کا خلاف ناممکن ہے۔ اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا۔ اہل ایمان کو جنت میں داخل کرنے کا اور کافروں کو دوزخ میں بھیجنے کا وعدہ وہ کر چکا ہے اس کی خلاف ورزی ناممکن ہے۔ (۲) کیا اللہ ایسا بھی کر سکتا ہے کیا نیست سے ہست اور معدوم سے موجود کرنا ممکن ہے؟ اس کے جواب میں فرمایا اللہ غالب ہے وہ زبردست اور قاہر ہے ہر طرح سے انتقام لے سکتا ہے۔ نیست سے ہست کرنا اس کے لئے دشوار نہیں۔ وہ اس زمین اور اس آسمان کو قطعاً تبدیل کر دے گا۔ ان کے حالات کیفیات اور تمام اوصاف بدل دے گا بلکہ ان کی ذات بھی باقی نہ رہے گی۔ جس مادہ کے یہ اب بنے ہوئے ہیں وہ مادہ بھی باقی نہ رہے گا۔ صرف اللہ یکتا قہار باقی رہ جائے گا۔ اسی کے سامنے سب لوگ اپنی قبروں سے نکل کر آئیں گے اور ایک صاف ہموار میدان میں جمع ہوں گے۔ اس روز کافر مشرک اور منافق اپنی بداعمالیوں کی بیڑیوں میں جکڑے ہوئے اور گناہوں کا لباس پہنے حاضر ہوں گے۔ ان کے چہروں پر کفر و شرک کی آگ چھائی ہوئی ہوگی۔

اہل تفسیر نے کہا ہے کہ انسان کے ملکات رذیلہ اور بری خصلتیں قیامت کے دن اس کے ہاتھ پاؤں کی زنجیریں بن جائیں گی اور جس طرح انسان کے بدن کو لباس ڈھانکے رہتا ہے اسی طرح اس کی بداعمالیاں قیامت کے دن بدترین لباس کی شکل اختیار کر لیں گی اور وہ لباس بھی ایسا ہوگا جس میں آتش شعلہ قبول کرنے کی زیادہ قابلیت ہوگی۔

قطران ایک قسم کا سیاہ تیل بدبودار ہوتا ہے جو مٹی کے تیل کی طرح چشمے سے نکلتا ہے۔ بعض لوگ اس کو رال کہتے ہیں۔ قتادہ نے کہا قطران میں آگ بہت جلد لگ جاتی ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا پگھلائے ہوئے سخت ترین گرم تانبے کو قطران کہا جاتا ہے۔ عکرمہ، سعید اور حسن بصری کا بھی یہی قول ہے۔ ایک روایت میں قتادہ سے بھی یہی منقول ہے۔

تبدیل ارض و سما کی تحقیق صحیحین میں آیا ہے کہ قیامت کے دن ایک سفید صاف زمین پر لوگوں کو جمع کیا جائے گا۔ سہل بن سعد کی روایت میں ہے کہ جس زمین پر لوگوں کو جمع کیا جائے گا وہ میدہ کی روٹی کی طرح صاف ہوگی اس میں

(ٹیلہ وغیرہ) کا کوئی نشان نہ ہوگا۔ ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ اس زمین کے عوض دوسری زمین ہوگی جو چاندی کی طرح صاف سفید ہوگی نہ اُس پر خون بہایا گیا ہوگا نہ کوئی گناہ کیا گیا ہوگا۔ اتنی شفاف ہوگی کہ نظر اُس کے پار جائے گی اور پکارنے والے کی آواز سنائی دے گی۔ (روا؟ ابن جریر) حضرت زید کی روایت میں ہے کہ حضور اقدسؐ نے تبدیلِ ارض کے متعلق صحابہ سے فرمایا وہ زمین چاندی کی طرح صاف سفید ہوگی۔ اس کے بعد حضورؐ نے یہودی علماء کو طلب فرمایا اور ان سے تبدیلِ ارض کی کیفیت دریافت فرمائی۔ علمائے یہود نے کہا اس روز زمین میدہ کی روٹی کی طرح سفید ہوگی۔ (ابن جریر) حضرت علیؓ ابن عباسؓ انس بن مالک اور مجاہد سے بھی زمین کا چاندی کی طرح ہونا مروی ہے۔ ایک روایت میں تانبے کی زمین ہونا بھی مروی ہے۔ ابن مسعود کی ایک روایت میں آیا ہے کہ زمین و سمندر سب آگ کے ہوں گے۔ صحیحین میں حضرت ابوسعید کی مرفوع روایت ہے کہ زمین اس دن ایک روٹی ہوگی جس کو پروردگار اپنی قدرت سے لوٹ پوٹ کرے گا اور (جنت میں داخل ہونے سے قبل) اہلِ جنت کی مہمانی میں عطا فرمائے گا۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ آسمان سونے کے ہوں گے۔ ابن مسعود وغیرہ کی روایت ہے کہ آسمان باغوں کی طرح ہوں گے۔

صحیح یہ ہے کہ محشر کے اوقات وحالات مختلف ہیں۔ واقعی کیفیات بالکل مخفی ہیں۔ زمین کی ذاتی وصفاتی تبدیلیاں اس روز کئی بار ہوں گی نفخ صور اور قیام محشر کے اوقات میں زمین صاف سفید ہوگی نہ اُس میں کوئی بلندی پستی ہوگی نہ خون ریزی اور گناہ کا کوئی اثر ہوگا پھر جب مخلوق جہنم کے پل پر ہوگی تو کفار کے لئے زمین آگ اور تانبے کی ہوگی اور مومنوں کے لئے مثل روٹی کے۔ واللہ اعلم۔

(۳) تیسرا شبہ یہ ہو سکتا تھا کہ آخر قیامت ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس کا جواب دیا کہ قیامت کا ہونا ضروری ہے تاکہ لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا سزا مل سکے۔ یعنی اللہ کی عدالت کا مقتضا یہ ہے کہ انسان کو اس کے اچھے برے اعمال کا بدلہ ملے اور دنیا اس کے لئے کافی نہیں ہے۔ اوّل تو یہ دار عمل ہے۔ دار جزا کوئی دوسرا ہونا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ یہاں نہ سزا کامل ہے نہ جزا کامل کیونکہ دنیا کی ہر راحت میں کچھ نہ کچھ کی ضرور ملی جلی ہے اور ہر تکلیف میں راحت کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ضرور آمیختہ ہے۔ خالص راحت اور محض تکلیف کا یہاں نام نہیں، اس لئے کوئی اور جگہ فیصلے کی مقرر ہونی چاہیئے۔ وہی روزِ قیامت اور میدانِ حشر ہے۔

(۴) اس روز بے شمار مخلوق ہوگی حضرت آدم سے لے کر آخری دم تک کے انسان ہوں گے۔ سب کے حساب کتاب کے لئے غیر متناہی وقت اور زیادہ سے زیادہ مدت کی ضرورت ہے۔ قیامت کے ایک دن کے اندر سب کا حساب کتاب ہو کر فیصلہ کیسے ہو جائے گا؟ اس کے جواب میں فرمایا اللہ بہت جلد حساب لے لے گا۔ ایک وقت میں ہر شخص کا حساب ہو جائے گا۔

اس سے آگے عقائد و اعمال کی اصلاح کے متعلق چند تبلیغی کلمات فرما کر سورت کو ختم کر دیا۔

مقصودِ بیان اللہ کے وعدہ کا دروغ ہونا محال ہے۔ خدا اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ اس آیت سے امکانِ کذب کا مسئلہ جو ہندوستان میں جاہل علماء کا ذریعۂ معاش بنا ہوا ہے اور جس نے ہندوستان کے اندر شیرازۂ اسلام کو پارہ پارہ کر دیا ہے حل کر دیا۔ اللہ ہر طرح قادر اور صاحبِ انتقام ہے، مگر اس کے اندر جذبۂ انتقام نہیں۔ یہ نفس ونفسانیت کے خواص میں سے ہے۔ بلکہ اس کا انتقام عدالت پر مبنی ہے۔ انتقام کی غرض اور صورت یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے کئے کا اچھا برا پھل مل جائے اور کسی کی حق تلفی نہ ہو قیامت کے دن یہ زمین و آسمان نہ ہوں گے نہ قیامت میں زمین و آسمان کے یہ حالات وکیفیات ہوں گے۔ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ قرآن پاک صرف عرب ہی کے لئے مخصوص نہیں بلکہ عام انسان خواہ کہیں کے رہنے والے ہوں، اس کی ہر بات عمل کرنے کے مکلف ہیں وغیرہ۔

سُوْرَةُ الْحِجْرِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ تِسْعٌ وَتِسْعُوْنَ اٰيَةً وَسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ حجر مکہ میں نازل ہوئی اس میں ننانوے آیتیں ہیں اور چھ رکوع ہیں

یہ سورت بالاتفاق مکی ہے۔ ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ کا یہی قول ہے۔ قرطبی نے نقل کیا ہے۔ اس سورت میں ننانوے آیات، ۶۳۳ کلمات اور ۲۹۰۷ حروف ہیں۔ مدینہ منورہ اور ملک شام کے درمیان ایک وادی ہے جس کا نام حجر ہے۔ تبوک کو جاتے ہوئے حضور اقدسؐ مع لشکر کے ادھر سے گزرے تھے یہاں عہد قدیم میں ایک قوم آباد تھی جس کا نام حجر ہے۔ تبوک کو جاتے ہوئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مع لشکر کے ادھر سے گزرے تھے یہاں عہد قدیم میں ایک قوم آباد تھی جس کا نام ثمود تھا۔ اس قوم کے آدمی بہت قدآور ہوتے تھے اور پہاڑوں کے اندر پہاڑ کو تراش کر سکونت کے لئے مکان بناتے تھے۔ حضرت صالحؑ کو انہیں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا تھا چونکہ اس سورت میں حجر والوں کا تذکرہ ہے اس لئے سورت کا نام ہی حجر ہو گیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان اور بڑا رحم کرنے والا ہے

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝

یہ آیتیں　کتاب　اور روشن　قرآن　کی ہیں

تفسیر حضرت قتادہ اور بعض دیگر علماء کے نزدیک کتاب سے مراد گزشتہ آسمانی کتابیں ہیں۔ چونکہ قرآن مجید میں وہ تمام اصول و ضوابط موجود ہیں جو گزشتہ آسمانی کتابوں میں بیان کئے گئے تھے، اس لئے قرآن پاک کی آیات درحقیقت گزشتہ کتابوں کی آیات ہیں۔ کوئی جدید ضوابط نہیں۔ بعض اہل علم کا قول ہے کہ کتاب سے مراد بھی قرآن پاک ہی ہے اور قرآن مبین کا عطف تفسیری ہے، لیکن اکثر مفسرین قائل ہیں کہ کتاب سے ام الکتاب یعنی لوح محفوظ مراد ہے۔ قرآن کی آیات اور ترتیب لوح محفوظ کے مطابق ہے، اس لئے یہ آیات لوح محفوظ کی بھی آیات ہیں اور قرآن کی بھی۔ قرآن کے مبین ہونے کے دو معنی ہیں (۱) قرآن حق و باطل میں امتیاز کرنے والا، معاش و معاد اور اعمال و عقائد کے تمام ضروری قواعد و احکام واضح طور پر بیان کرنے والا ہے۔ سیدھا اور ٹیڑھا راستہ اس کے پڑھنے سے کھل جاتا ہے اس لئے یہ مبین ہے۔ (۲) قرآن میں انہیں قواعد و ضوابط کا بیان ہے جو گزشتہ الہامی کتابوں میں بیان کئے گئے تھے۔ قوانین فطرت کا بیان جو شریعت الہیہ کا اصل محور ہے اس میں کیا گیا ہے۔ مقصود آیت بالکل واضح ہے آغاز سورت میں صراحت کر دی کہ یہ آیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف کردہ نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جن اصول کا ان میں اظہار کیا گیا ہے وہ وہی اصول ہیں جو گزشتہ آسمانی کتابوں میں بیان کئے گئے تھے۔ اگر یہ آیات نائیدۂ دماغ ہوتیں تو گزشتہ کتابوں کے مطابق کیوں کر ہو سکتیں۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیانُ السُّبحانُ

کا

پارہ نمبر ۱۴

رُبَمَا

فاضلِ اجل حضرت مولانا سیّد عبد الدّائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں ۱۳۵۶ء سے باقساط ہر ماہ شائع ہوتی رہی ہے

ناظرینِ مولوی کے اصرار پر

مکتبہ دار الفرقان

پوسٹ بکس نمبر ۱۲۰۶، سوئیوالان ۱۵۶۵، نئی دہلی ۲

نے شائع کیا

چودھواں پارہ

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ ۝ ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا

کسی وقت کافر بہتیری آرزو کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے (اب تو) اُن کو رہنے دو کہ کھالیں

وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝ وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ

مزے اُٹھالیں اور اُمید اُن کو غافل بنائے رکھے عنقریب اُن کو معلوم ہوجائے گا اور ہم نے جو بستی بھی غارت کی تو

إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ ۝ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ۝

اُس کا لکھا مقرر تھا کوئی قوم اپنے مقررہ وقت سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے

تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے خلاف کفار برسرِ پیکار تھے۔ ہر وقت دینِ توحید کی مخالفت پر کمربستہ رہتے تھے اور چونکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی فوری مواخذہ نہ کیا جاتا تھا اس لئے اس مہلت پر وہ اور زیادہ مست ہو کر کہتے تھے کہ اگر تم لوگ حق پر ہو اور ہم ناحق پر ہیں تو ہم پر عذاب کیوں نہیں آتا۔ ان آیات میں کفار کے اس قول کا جواب دیا ہے اور جواب کے تین حصے کر دیئے ہیں۔ اول کافروں کے اس حسرت و اندوہ کا ذکر فرمایا جو عموماً مرنے کے وقت یا مرنے کے بعد وہ کیا کرتے ہیں۔ دوم وہ عیش و عشرت جس پر کور باطن گروہ پھولا نہیں سماتا اُس کی بے ثباتی دکھا کر نتیجۂ بد سے وعید و تہدید کی۔ سوم عذاب نازل نہ ہونے کی اصل وجہ آخر میں بیان فرمادی۔

حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ کفار کو خداداد عیش و عشرت پر مغرور ہو کر اطمینان سے نہ بیٹھ رہنا چاہیئے۔ یہ تمام آرام و آسائش اور کھانے پینے کے مزے چند روزہ ہیں۔ کچھ ہی مدت کے بعد نتیجہ سامنے آجائے گا۔ اور جب عذاب کی علامات سامنے آجائیں گی، خواہ مرنے کے وقت یا مرنے کے بعد، اُس وقت حسرت ہوگی کہ کاش ہم مسلمان ہو گئے ہوتے لیکن اس وقت کوئی حسرت مفید نہ ہوگی۔ رہی یہ بات کہ عذاب فوراً کیوں نازل نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر قوم پر جب اللہ کی طرف سے بربادی آتی ہے۔ ہر تباہی کا ایک مقررہ وقت لکھا ہوا پہلے سے موجود ہے اُس سے آگے پیچھے ہونا ناممکن ہے۔ تاخیرِ التوار سے عدمِ عذاب پر استدلال کرنا غلط ہے۔

ایک ضروری تحقیق کافروں کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔ یہ خواہش بقول ابن کثیر مرنے کے وقت جب علاماتِ عذاب سامنے آجاتی ہیں تب بھی ہر کافر کرتا ہے اور قیامت کے دن بھی جبکہ ادنیٰ ایمان رکھنے والے مسلمانوں کو دوزخ سے نجات دی جائے گی اور کافروں کو رہائی نہ ملے گی اس وقت بھی کفار کو یہی حسرت ہوگی۔ بیہقی نے بعث میں اور ابن مبارک نے زہد میں اور بعض دیگر اہلِ حدیث نے اسی مضمون کے مختلف اقوال اور مختلف احادیث نقل کی ہیں۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کلمۂ توحید پڑھنے والے لوگوں میں سے کچھ لوگ اپنے گناہوں کی سزا میں دوزخ میں داخل کئے جائیں گے۔ اہلِ شرک اُن سے کہیں گے۔ تم کو لا الٰہ الا اللہ نے بھی کچھ فائدہ نہ دیا؟ اس وقت اللہ پاک مشرکوں پر غضب فرمائے گا۔ اہلِ توحید کو نکال کر نہرِ حیات میں ڈالے گا۔ اُس وقت اہلِ کفر اسلام کی تمنا کریں گے (رواہ الطبرانی)۔ اسی روایت کی تائید میں ابن عباس اور انس بن مالک وغیرہ کی روایات بھی ہیں۔

پھر بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ کفار کی طرف سے اسلام کی جو تمنا کی جائے گی اُس کا انحصار کسی ایک حالت یا ایک وقت پر نہیں ہے بلکہ قیامت کے مختلف احوال ہوں گے۔ جب کافروں پر عذاب کی سختی ہوگی، کوئی صورت رہائی کی نظر نہ آئے گی اور وہ مسلمانوں کو آرام سے دیکھیں گے۔ اس وقت اُن کو یہی آرزو ہوگی۔ اسی لئے آیت کے آغاز میں لفظ رُبَمَا جو کثرت کے معنی پر دلالت کرتا ہے استعمال کیا گیا ہے۔

مقصودِ بیان کفار کی حسرتناک آرزو کا بیان، اس امر کی صراحت کہ دنیوی عیش و آرام اور ہر قسم کی ہوا بندی بے سود ہے۔ اس بات کی طرف اشارہ کہ عذاب کی تاخیر سے عدم عذاب پر استدلال نہ کرنا چاہیئے۔ اس امر کی طرف لطیف اشارہ کہ بے وقت حسرت و آرزو ہیچ ہے۔ علاماتِ عذاب ظاہر ہونے کے بعد ایمان لانا قابلِ قبول نہیں۔ وغیرہ

وَقَالُوا يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ ○ لَوْ مَا تَأْتِينَا

کافر کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جس پہ قرآن اتارا گیا ہے تو بلاشک دیوانہ ہے اگر تو سچا ہے تو ہمارے

بِالْمَلَائِكَةِ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ○ مَا نُنَزِّلُ الْمَلَائِكَةَ إِلَّا بِالْحَقِّ

پاس فرشتوں کو کیوں نہیں لے آتا حالانکہ ہمارا دستور نہیں کہ بغیر کام ٹھہرائے فرشتوں کو نازل کریں

وَمَا كَانُوا إِذًا مُّنظَرِينَ ○ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ○

اُس وقت پھر اُن کو مہلت نہ دی جائے گی بلاشبہ ہم ہی نے قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی یقیناً اُس کے نگہبان ہیں

تفسیر کفار کہ معاند اور جاہل معاند تھے۔ اُن کو رسولِ پاکؐ سے نہ فقط عناد تھا بلکہ عناد کے ساتھ وہ اپنی جہالت کا مظاہرہ بھی کرتے تھے۔ جو لوگ کسی قدر فہم رکھتے تھے وہ قرآن کی معجز عبارت کو سُن کر رسولِ پاکؐ کو شاعر، کاہن یا ساحر کہتے تھے۔ کیونکہ اُن کی کوتاہ نظر میں بشریت سے مافوق صرف تین طاقتیں تھیں۔ سحر یا کہانت یا شاعری۔ لیکن جو لوگ بالکل ہی کودن تھے اُن کو جب بلاغتِ قرآنی کا کوئی جواب نہ بن پڑتا تو وہ حضورؐ والا کو دیوانہ یا جن رسیدہ کہنے لگتے تھے اور پھر صرف اس جاہلانہ بیہودگی پر ہی اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ اپنی جہالت کو عالمانہ طرزِ مناظرہ سمجھتے ہوئے کہتے تھے کہ اگر سچے ہو تو اپنی تصدیق کے لئے یا ہم پر عذاب نازل کرنے کے لئے فرشتوں کو ہمارے سامنے لاؤ۔ اُس وقت ہم تمہارے قول کو سچ مانیں گے۔ اس بیہودگی کے جواب میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ فرشتوں کو تو ہم آخری فیصلہ کے لئے اُتارا کرتے ہیں (یعنی شہادت و تصدیق کے لئے فرشتے نہیں اُترا کرتے۔ کیونکہ اگر وہ کسی نبی کے قول کی تصدیق کریں گے اور شہادت دیں گے تو انسانی شکل میں رُونما ہو کر یا وہ انسانی شکل میں ظہور کرنے کے بعد معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ فرشتہ ہے یا انسان۔ لہٰذا تصدیقِ نبی کے لئے فرشتوں کا نزول بیکار ہے۔ رہا نزولِ عذاب کے لئے فرشتوں کا آنا تو ایسا ہوتا ہے مرنے کے وقت یا عذاب نازل کرنے کے لئے فرشتے اُترتے ہیں) مگر پھر راہِ راست پر آنے اور ایمان لانے کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ فرشتۂ عذاب یا ملک الموت کے نزول کے بعد کسی قول و فعل کی مہلت نہیں ہو سکتی۔

چونکہ کفار نے حضورؐ کو دیوانہ بھی کہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ قرآن گویا دیوانہ کی بڑ ہے۔ اس کے جواب میں فرماتا ہے قرآن دیوانہ کی بڑ نہیں، پیامِ نصیحت ہے بلکہ مجسم خیر و شر کا تذکرہ ہے۔ ہدایت و گمراہی کی پوری یادداشت ہے۔ واقعاتِ زندگی اور احوال مابعد الموت کا کچا چٹھا ہے اور پھر یہ تذکرہ بھی کسی انسانی دماغ کا خود ساختہ اور عقلِ بشری کا تراشیدہ نہیں بلکہ اللہ ہی کا نازل کردہ ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمیشہ کے لئے ہر قسم کے تغیر، تحریف اور تبدیل سے محفوظ ہے۔ زمانہ کا دستبرد اور قوموں کا انقلاب اس کی ایک آیت میں ترمیم نہیں کر سکتا۔ دیوانہ کی بڑ ایسی نہیں ہوا کرتی۔

مقصودِ بیان کفارِ مکہ کی جہالت و معاندت کا اظہار۔ اس بات کی طرف لطیف اشارہ کہ رسولِ پاک کو دیوانہ کہنے والے خود عقل کے کورے ہیں۔ اس امر کی صراحت کہ کسی نبی کی تصدیق کے لئے فرشتے نہیں اُترا کرتے ہیں بلکہ ہلاکت عامہ یا قبض روح کے لئے یا پیامِ الٰہی کو رسول تک پہنچانے کے لئے اُترا کرتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت کہ مقررہ موت یا عذاب نازل ہونے کے بعد پھر توبہ واستغفار کا موقع باقی نہیں رہتا۔ قرآن کے لئے لفظ ذکر کا استعمال بتا رہا ہے کہ کلامِ پاک موت وزندگی کا تذکرہ مکمل نصیحت اور اصلاح عقائد و اعمال کی پوری یادداشت ہے۔ آخر میں ایک زبردست پیشین گوئی ہے کہ قرآن کی کسی آیت میں قیامت تک کسی طرح کی تغیر ترمیم تبدیلی نہیں ہوسکتی اس سے فرقۂ شیعہ کے اُس قول کا بطلان ظاہر ہوتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ موجودہ قرآن مصحفِ عثمانی ہے اور حضرت عثمان نے اس میں بعض سورتیں کم کردی ہیں اس لئے یہ قرآن ناقص ہے۔ کچھ بیانات اور بھی ہیں جن کو مہدی لے کر آئیں گے۔ وغیرہ

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ شِیَعِ الْاَوَّلِیْنَ ○ وَمَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ

ہم اگلے گروہوں میں تم سے پہلے بھی پیغمبر بھیج چکے ہیں لیکن اُن کے پاس جو رسول آتا تھا

اِلَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ○ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ ○ لَا

وہ اُن کی ہنسی اُڑایا کرتے تھے اسی طرح ہم گنہگاروں کے دلوں میں مسخرا پن کرنے کو جگہ دیتے ہیں یہ

یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ ○ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَابًا مِّنَ

لوگ ایمان نہیں لائیں گے اگلوں کی رسم بھی (یوں ہی) ہوتی چلی آئی ہے اگر ہم اُن پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول

السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِیْهِ یَعْرُجُوْنَ ○ لَقَالُوْۤا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ

دیں اور یہ سارے دن اُس میں چڑھتے رہیں تب بھی یہی کہیں گے کہ ہو نہ ہو ہماری نظر بندی کردی گئی ہے

نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ○ ع

بلکہ ہم پر جادو کیا گیا ہے

تفسیر خدا تعالیٰ ان آیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتا اور کافروں کی کور باطنی کا اظہار فرماتا ہے۔

حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ فقط کفار ہی پر منحصر نہیں بلکہ گزشتہ اقوام کا بھی یہی دستور رہا ہے کہ جہاں کوئی نبی ادائے رسالت کے لئے ان کے پاس بھیجا گیا اور اُس نے نصیحت کرنی شروع کی۔ فوراً بدطینت کافر ان کا مذاق اُڑانے لگے اور چونکہ اُن کے دلوں کے اندر نورِ ایمان نہ تھا اور اعمال و اقوال میں صلاح و خیر نہ تھی۔ عقائد و اطوار دونوں تباہ ہو چکے تھے اس لئے استہزاءِ انبیاء کو وہ مجرمانہ فعل نہیں خیال کرتے تھے بلکہ اپنی بیہودہ حرکات کو بنظرِ استحسان دیکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ قانونِ قدرت سے دریافت کرو۔ آخری ثمرہ ہلاکت، بربادی اور تباہی کے سوا اور کچھ پیدا نہ ہوا۔ اس سے آگے پھر اصل مطلب کی طرف رجوع فرماتا ہے کہ کفارِ مکہ تو فقط فرشتوں کے نزول کے خواہشمند ہیں۔ نزولِ ملائکہ کیا اگر آسمان کا دروازہ بھی کھول دیا جائے اور فرشتے نہیں بلکہ یہ خود سیڑھی لگا کر چڑھ کر وہاں کی کل کیفیت کا معائنہ کریں تب بھی اس کشاکشِ نظر کو نظر بندی پر محمول کریں گے اور کہہ دیں گے ہم پر جادو کیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کی سرشت ہی ایمان و بصیرت سے خالی ہے۔

مقصودِ بیان اس امر کا اظہار کہ پہلی اُمتوں میں بھی پیغمبر آتے رہے اور اُن کا مذاق اُڑایا گیا۔ اس سے حضورؐ کو تسکین دی جاتی ہے کہ آپ بددل نہ ہوں۔ وغیرہ

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ۝ وَحَفِظْنَاهَا مِن كُلِّ

اور ہم نے آسمان میں کچھ برج بنائے ہیں اور دیکھنے والوں کے لئے اُن کو آراستہ کیا ہے اور ہر شیطان مردود سے

شَيْطَانٍ رَّجِيمٍ ۝ إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُّبِينٌ ۝

اُن کو محفوظ رکھا ہے ہاں جو چوری سے سُن بھاگتا ہے اُس کے پیچھے چمکتا ہوا انگارا لگتا ہے

وَالْأَرْضَ مَدَدْنَاهَا وَأَلْقَيْنَا فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ شَيْءٍ

اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑوں کے لنگر ڈالے اور اس پر ہر چیز مناسب

مَّوْزُونٍ ۝ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَن لَّسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ ۝

اُگائی اور تمہارے لئے نیز اُن کے لئے جن کو تم روزی نہیں دیتے اُس میں روزی کے سامان بنادیئے

وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ ۝

اور جتنی چیزیں ہیں ہمارے پاس سب کے خزانے ہیں اور ہم اُس کو مقررہ انداز سے پر اُتارتے ہیں

وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ فَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ وَمَا أَنتُمْ

اور ہم نے (ابر کو) بھر دینے والی ہوائیں بھیجیں پھر اوپر سے پانی اُتارا اور وہ پانی تم کو پلایا حالانکہ تم

لَهُ بِخَازِنِينَ ۝ وَإِنَّا لَنَحْنُ نُحْيِي وَنُمِيتُ وَنَحْنُ الْوَارِثُونَ ۝ وَلَقَدْ عَلِمْنَا

پانی کے خزانچی نہیں ہو ہم ہی جلاتے اور مارتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں اور بیشک ہم تمہارے

الْمُسْتَقْدِمِينَ مِنكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَأْخِرِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ

اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور پچھلوں کو بھی جانتے ہیں تمہارا پروردگار بلاشبہ

هُوَ يَحْشُرُهُمْ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ۝

اُن کو جمع کرے گا وہ یقیناً مصلحت بیں واقف کار ہے

تفسیر گزشتہ آیات میں مسئلہ نبوت کا اثبات فرمایا تھا۔ یہاں سے دلائلِ توحید کا بیان ہے۔ چونکہ نبوت کا ثبوت بغیر ثبوتِ توحید کے

نہیں ہو سکتا اور توحید کے ثبوت کے لئے علاوہ دلائلِ عقلی کے مشاہدۂ فطرت بھی شاہد ہے اس لئے ان آیات میں عقلی دلائل کو چھوڑ کر انہی واضح براہین کی طرف رجوع کیا ہے جن کا اقرار کرنے پر ہر محسوس پرست بھی مجبور ہے۔ کوتاہ نظر انسان اپنے کو بعض چیزوں کا خالق اور فاعل مختار سمجھتا ہے کیونکہ حقیقت و مجاز اور ملکیت و عاریت میں اس کو امتیاز نہیں ہوتا۔ لیکن کائناتِ الٰہیہ کی اکثر چیزیں ایسی ہیں جہاں ہر معاند بھی خاموش رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور اس کا دعوائے الوہیت جڑ سے اُکھڑ جاتا ہے۔ آیاتِ مذکورہ میں دلائلِ توحید کا بیان ترتیب وار کیا ہے۔ اول کائناتِ سماوی کا بیان، پھر زمین کی حالت کا اظہار۔ اس کے بعد زمین میں نباتات کا پیدا کرنا اور اسبابِ معیشت قائم کرنا۔ پھر نباتات کے پیدا ہونے کا اصل سبب یعنی پانی برسانا اور پانی برسنے کی تدبیر کرنا۔ پھر دنیا کے فنا ہونے کی صراحت اور اپنی قدرت کی ہمہ گیری کی وضاحت اور سب سے آخر میں عنصرِ انسانی کا تذکرہ یہ سب کچھ ایسی حکیمانہ عبارت اور معجزانہ طرزِ ادا کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ایک طرف بڑے بڑے پُر مغز علماء انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں اور دوسری طرف جاہل اور معاند مخاطب کو بھی سوائے تسلیم کے کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ہم ذیل میں ہر دلیل کو جدا جدا بیان کرتے ہیں :-

(ا) الف :- اللہ نے آسمانوں پر برج بنائے۔ برج سے مراد اینٹ پتھر اور مٹی چونے کے برج نہیں ہیں بلکہ سبعہ سیارہ کے منازلِ سیر مراد ہیں۔ سیوطی نے لکھا ہے کہ آسمان میں بارہ برج ہیں۔ حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو، حوت۔ ماہرین علومِ فلکیہ کا قول ہے کہ حمل، قوس اور اسد کی طبیعت آتشی ہے اور سنبلہ اور جدی کی طبیعت خاکی ہے۔ جوزا، دلو اور میزان کی طبیعت ہوائی ہے۔ سرطان، عقرب اور حوت کی طبیعت آبی ہے۔ پھر مجموعہ بروج کو اٹھائیس منازل پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر برج میں ۲½ منزل ہے۔ حمل و عقرب مریخ کا سیرگاہ ہے، ثور و میزان زہرہ کا، جوزا و سنبلہ عطارد کا، سرطان قمر کا، اسد شمس کا، قوس و حوت مشتری کا اور جدی و دلو زحل کا۔ پھر ہر برج کے تیس حصے ہیں۔ ہر حصہ کو درجہ کہتے ہیں۔ گویا بارہ بروج کے ۳۶۰ درجات ہوئے۔ آفتاب سال بھر میں ایک بار ان کا دورہ کرتا ہے اور قمر اٹھائیس دن میں دورہ پورا کرتا ہے۔ اب ذرا غور کرنے کا مقام ہے کہ آسمان کی طبیعت ایک ہے، صورتِ نوعیہ ایک ہے اور طبیعت بھی بسیط ہے۔ اس کے اندر ایسے مختلف الطبائع بروج کا پایا جانا اور جداگانہ تاثیرات کے سیاروں کا سیر کرنا اگر بقدرتِ الٰہی نہیں تو اور کس طرح ہے۔

ب :- اللہ نے آسمان کو ستاروں سے مزین کیا (ہکذا قال قتادہ و مجاہد) چونکہ آسمان کی طبیعت بسیط ہے اس لئے اس کی اصل شکل اور طبعی رنگ سادہ ہے۔ اللہ نے اس کی سادگی دور کرنے اور زینت پیدا کرنے کے لئے مختلف الاشکال اور مختلف الالوان ستاروں سے اس کو سجایا۔ کسی ستارہ کی روشنی سرد، کسی کی گرم، کسی کی شفاف، کسی کی سفید اور کسی کی سرخی و سبزی مائل بنائی ہے۔ بے انتہا الوان و اشکال کے قمقمے پیدا کئے۔ سادہ اور بسیط آسمان پر اس کی طبعی اقتضاء کے خلاف اس طرح ستاروں سے مزین کرنا قدرت کی آیاتِ باہرات میں سے ہے۔

ج :- اللہ نے آسمانوں کے اسرار کی حفاظت کے لئے بھی انتظام فرما دیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی صحیح روایت ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب آسمان پر بارگاہِ الٰہی سے کوئی حکم فرشتوں کو صادر ہوتا ہے تو کلامِ الٰہی کی ہیبت سے فرشتے اپنے پروں کو عاجزی سے ڈال دیتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد جب اُن کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو ایک دوسرے سے پوچھتا ہے۔ پروردگار نے کیا فرمایا؟ وہ جواب دیتا ہے جو کچھ فرمایا حق فرمایا۔ اسی حالت میں زنجیر کی کڑیوں کی طرح شیطانوں کی مسلسل قطار زمین سے آسمان تک لگی ہوتی ہے اور فرشتوں کے قول کی طرف کان لگائے ہوئے ہوتے سب سے اوپر والا شیطان اگر کچھ سن پاتا ہے تو اپنے سے نیچے والے کو بتا دیتا ہے اور وہ اپنے ماتحت کو یہاں تک کہ وہ خبر زمین تک آجاتی ہے اور آخری شیطان وہ بات کسی کاہن یا ساحر کو بتا دیتا ہے۔ کاہن اس کی ایک بات میں سو جھوٹ ملا کر لوگوں سے بیان کرتا ہے۔ جب کاہن کی بتائی ہوئی بات ہو جاتی ہے تو اس کے مرید و معتقد کہتے ہیں۔ دیکھو فلاں روز استاد نے یہ بات کہی تھی چنانچہ وہ ہو گئی۔ حالانکہ یہ بات وہی ہوتی ہے جو شیطان سن بھاگا تھا۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بات اُڑانے سے پہلے چوری سے سننے والے

شیطان پر دہکتا انگارہ پڑتا ہے اور وہ کچھ سننے سے قبل ہی بھاگ جاتا ہے یا کچھ سن کر بھاگتا ہے مگر اپنے ماتحت ساتھی کو بتانے سے قبل جل جاتا ہے۔ (رواہ البخاری)

خاص ہدایت

فلاسفہ کہتے ہیں کہ کائنات فضائی ہیں سے بعض کی پیدائش اجزاء بخاریہ سے ہوتی ہے اور بعض کی اجزائے دخانیہ سے۔ پھر ان میں سے بعض کے اندر اشتعال، شدتِ حرکت یا گرمی سے پیدا ہوتا ہے اور بعض کے اندر کرۂ نار کی لپٹ سے سوختہ ہو جانے کے سبب سے شریعتِ الٰہیہ چونکہ حقائقِ عالم نہیں بیان کرتی اس لئے اس نے کائناتِ فضائی کی ماہیت سے کوئی بحث نہیں کی، نہ ترکیبی اجزاء بتائے نہ تحلیلی۔ اس لئے ممکن ہے کہ ماہرینِ طبعیات کی تحقیقات صحیح ہو۔ قرآن کے پیشِ نظر صرف موجودات کے فوائد اور مصالح کا بیان ہے۔ چنانچہ اس آیت میں بھی شہاب کے ٹوٹ کر گرنے کا اندرونی سبب اور فائدہ اور علتِ غائی بیان فرمائی، حقیقت وماہیت کا کچھ اظہار نہ کیا بلکہ اہلِ علم کی تحقیقات کے لئے اس کو چھوڑ دیا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تحقیقاتِ فلاسفہ اور بیانِ قرآن میں کچھ اختلاف وتباین نہیں بلکہ شرع اور عقل میں سے ہر ایک کا مسلک جدا اور مقصودِ تحقیق علیحدہ ہے۔

بعض اشخاص کا خیال ہے کہ شہاب اُس ستارہ کو کہتے ہیں جو ٹوٹ کر گرتا ہے مگر یہ صرف عامیانہ تخیّل ہے۔ شہاب ستارہ نہیں، بلکہ انگارا ہے جو اجزائے دخانیہ کے اشتعال سے پیدا ہوتا ہے۔ اردو میں کوتاہ دامنی کی وجہ سے اس کے ترجمہ کے لئے کوئی ایک لفظ اب تک وضع نہیں کیا گیا اس لئے مجبوراً شہاب کا ترجمہ ٹوٹنے والا ستارہ کر لیا جاتا ہے۔

(۲) الف:۔ زمین کی اصلی شکل گول ہے لیکن خدا تعالیٰ نے اس کو پھیلایا اور اس قابل بنایا کہ اس پر مخلوق بس سکے۔ یہ بھی محض اللہ کی کارسازی ہے کسی کی صنعت وفعل کو اس میں دخل نہیں۔

ب:۔ ابتدائے پیدائش میں زمین غیر متمکن تھی ثبات اور غیر متزلزل نہ تھی۔ خدا تعالیٰ نے اُس پر پہاڑ کی میخیں قائم کیں یا یوں کہا جائے کہ پیدائشِ زمین کے بعد کثرتِ بارش کی وجہ سے او نچے ٹیلے پیدا ہو کر جم گئے اور انہیں کو پہاڑ کہا جاتا ہے۔ بہر حال زمین کے ثقل میں توازن پیدا ہوا اور تزلزل جاتا رہا۔

ج:۔ زمین یا پہاڑوں میں خدا تعالیٰ نے ہر چیز تناسب اور صحیح اندازہ کے ساتھ پیدا کی۔ ہزاروں اقسام کی جڑی بوٹیاں ہیں معدنیات ہیں۔ قیمتی پتھر ہیں۔ مختلف سبزیاں، بکثرت دوائیں ہیں لیکن اُن میں سے کوئی چیز غیر مفید اور اللہ کے علمی وزن سے خارج نہیں۔

د:۔ آدمیوں اور دیگر جانوروں کی زندگی بسر کرنے کا سامان خدا تعالیٰ نے زمین میں پیدا کیا۔ غلہ، پھل، پھول، روئی، اُون، گوشت، سبزی اور دیگر اسبابِ حیات مہیا فرمائے۔

(۳) جب انسان اور دیگر حیوانات کو خدا تعالیٰ نے اس زمین پر پیدا کیا تو اُن کو باقی رکھنے کے ذرائع بھی مہیا کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ طبعی رطوبت وحرارت جس پر جاندار کی زندگی موقوف ہے ہر وقت تحلیل پذیر ہے تو جب تک تحلیل شدہ اجزاء کا بدل فراہم نہ ہوگا زندگی کا باقی رہنا محال ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے ہر جاندار کی بقائے حیات کے لئے روزی کے سامان پیدا کئے اور جتنا حصہ جس حیوان کی معاش کے لئے ضروری تھا وہ اس کو عطا کیا۔ اگرچہ اس کے غیب کے خزانے لامحدود ہیں مگر بقدرِ ضرورت اور باندازۂ مناسب اس نے ہر چیز کی زندگی قائم رکھنے کے لئے اپنے غیبی خزانہ کا ایک حصہ نازل فرمایا۔ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ نے صرف تمہاری ہی نہیں بلکہ تمام جانوروں کی روزی کے سامان مہیا کر دیئے۔ دوسرا یہ کہ تمہاری روزی پیدا کی اور تمہارے ہی نفع کے لئے وہ جانور پیدا کئے جن کو تم روزی نہیں دیتے بلکہ روزی تو اللہ ہی دیتا ہے اور کام تمہارے آتے ہیں۔

مجاہد کا قول ہے کہ اس سے مُراد چوپائے ہیں۔ ابن جریر نے فرمایا اس میں باندیاں اور غلام بھی داخل ہیں۔ میرے نزدیک انسانوں کے علاوہ تمام جاندار اس میں شامل ہیں خواہ چوپائے ہوں یا دو پائے یا ہزار پائے، کیڑے، مکوڑے، پتنگے، تمام حشرات الارض آیت کے عموم میں داخل ہیں۔

(۴) اللہ ایسی ہوائیں چلاتا ہے جو سمندروں سے بخارات اٹھا کر اوپر لے جاتی اور سرد طبقہ میں پہنچاتی ہیں وہاں ان میں سردی لگتی ہے تو وہی بخارات پانی کی شکل اختیار کرکے نیچے ٹپکتے ہیں جس کو بارش کہا جاتا ہے۔ پس گویا ہوا ہی بادلوں کو پانی سے بار بردار اور بوجھل کر دیتی ہے یا پانی برسا کر درختوں کو پھل پھول سے بار بردار کر دیتی ہے۔ بارش کا یہ غیبی خزانہ انسان کی طاقت میں نہیں، نہ اس سرچشمۂ قدرت پر انسان قبضہ کر سکتا ہے۔ بارش کا کیا نتیجہ ہے؟ تو علاوہ ہر چیز کی روئیدگی اور سرسبزی کے بالکل کھلا ہوا فائدہ یہ ہے کہ اگر بارش نہ ہو تو پینے کے لئے پانی کہاں سے آئے۔ کنوئیں، تالاب اور نہریں خشک ہو جائیں اور انسان پیاسا مر جائے۔ پھر بارش بھی ہو مگر پانی محفوظ ہو پینے کے قابل نہ ہو تب بھی بقائے زندگی محال ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہوا کو بھیجتا ہے۔ وہ آسمان سے پانی اٹھاتی اور بار بردار ہوتی ہے ابر سحاب کی چال چلتی ہے۔ یہاں تک کہ جیسے دودھیاری اونٹنی کے دودھ کا سیلان ہوتا ہے اسی طرح سینہ برساتی ہے۔ ابن عباسؓ، ابراہیم نخعی اور قتادہ وغیرہ سے یہی قول مروی ہے۔ بظاہر اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی آسمان سے نازل ہوتا ہے مگر یہ مفہوم خلافِ واقعہ ہے۔ بات یہ ہے کہ دنیا میں جو چیز پیدا ہوتی ہے اُس کا حکم آسمان سے فرشتوں کی معرفت یا اس غیبی مخلوق کے ذریعہ سے اس دنیا میں جاری ہوتا ہے جو اس حکم پر خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور ہے۔ بارش کا نازل ہونا، ابر کا آنا، ہواؤں کا چلنا، سمندروں سے بخارات کا اٹھنا ہر ایک امرِ الٰہی ہے اور ہر چیز کا حکم فرشتوں کی معرفت آسمان سے جاری ہوتا ہے۔ شریعتِ اسلامیہ اسبابِ ظاہری کا انکار نہیں کرتی مگر اسباب کا مؤثر حکمِ الٰہی کو قرار دیتی ہے۔ اسی بنا پر ابن عباسؓ و ابن مسعودؓ وغیرہما نے فرمایا کہ ہوا آسمان سے پانی اُٹھا لاتی ہے۔

(۵) ہر چیز کا مادہ خدا تعالیٰ نے پیدا کیا پھر اس کو صورت عطا کی۔ صورت اور مادہ کے ملنے سے اس چیز کو زندگی ملی۔ کچھ زمانہ تک زندگی قائم رہی۔ پھر صورت کو مادہ سے جدا کیا اور بالآخر مادہ کو بھی فنا کر دیا۔ یہ سب اللہ ہی کی کارسازی ہے۔ انسانی تصرف اور صنعت کو اس میں دخل نہیں۔ کوئی عقلمند آج تک ایسا نہ کر سکا کہ کسی چیز کے مادہ کو بناتا یا موجودہ مادہ کو اس کی صورت پہناتا یا کسی مادہ کی اصلی صورت کو زائل کر سکتا ہے پھر جس طرح ہستی سے پہلے خدا مالک تھا ہستی کے بعد بھی خدا ہی مالک ہے گو چند روز کے لئے بظاہر عارضی دوسرے نظر آتے ہیں مگر حقیقی مالک متصرف خدا ہی ہے۔

(۶) انسان مر جاتا ہے فنا ہو جاتا ہے اس کے اجزائے اصلیہ پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ کچھ ذرات خاک میں، کچھ ہوا میں اور کچھ پانی میں مل جاتے ہیں لیکن چونکہ خدا تعالیٰ کو گزشتہ آئندہ سب کا علم ہے۔ اس کو ہر ایک کے اجزائے اصلیہ اور اُن کے مقامات معلوم ہیں اور اُن کو جمع کرنے کی اس کو قدرت بھی ہے، اس لئے قیامت کے دن سب کو اکٹھا کرے گا اور پھر از سرِ نو ترتیب دے کر زندہ انسان بنا دے گا۔ کیوں زندہ کرے گا؟ اس کی حکمت وہی خوب جانتا ہے۔

سبحان اللہ! کس ترتیب سے دلائلِ توحید الوہیت کو بیان فرمایا جس سے مبدا و معاد کے بڑے بڑے عظیم الشان مسائل حل ہو گئے۔ بیانِ توحید کے ضمن میں کائناتِ ارضی و سماوی کے تغیرات، تغیرات کی حقیقت و حکمت، موت و حیات کی کشمکش کی کیفیت اور آخر میں ضرورتِ معاد کی وضاحت ہو گئی۔

مقصودِ بیان بالائی اور زیریں اور درمیانی کائنات کی تخلیق، کیفیتِ تخلیق اور مصلحتِ تخلیق پر غور کرنے کی دعوتِ عامہ۔ آسمان، زمین، ہوا، پانی، پہاڑ، ابر، درخت، سبزہ، چرند، پرند، درند اور انسانوں کی پیدائش۔ بقا، فنا اور اعادہ کی مفصل کیفیت بیان فرمانے کے بعد اللہ کی قدرت و کارسازی کی ہمہ گیری، اس کی الوہیتِ کاملہ اور ربوبیتِ عامہ کا اظہار اور آخر میں حشرِ جسمانی کا عقلی اثبات، پھر لفظِ حکیم سے غرضِ معاد کی طرف لطیف اشارہ۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ۝ وَالْجَانَّ

اور ہم نے انسان کو خمیر کی ہوئی خشک مٹی سے بنایا اور اس سے

خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ مِن نَّارِ السَّمُومِ ۝ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ

پہلے جنات کو آگ کی لو سے بنایا اور (یاد کرو) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں

بَشَرًا مِّن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ۝ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن

ایک بشر کو خمیر کی ہوئی خشک مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں جب میں اس کو پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح

رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ ۝ إِلَّا إِبْلِيسَ

پھونک دوں تم اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑنا چنانچہ سب کے سب فرشتوں نے سجدہ کیا ابلیس نے

أَبَىٰ أَن يَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ ۝ قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا لَكَ أَلَّا تَكُونَ مَعَ السَّاجِدِينَ

سجدہ کرنے والوں کے ساتھ شامل ہونے سے انکار کر دیا اللہ نے فرمایا ابلیس تجھے کیا ہوا کہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا

قَالَ لَمْ أَكُن لِّأَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهُ مِن صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ ۝

بولا میں ایسا نہیں کہ اس بشر کو سجدہ کروں جس کو تو نے خمیر کی ہوئی خشک مٹی سے بنایا ہے

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ۝ وَإِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلَىٰ يَوْمِ الدِّينِ ۝

اللہ نے فرمایا تو یہاں سے نکل جا تو قطعی مردود ہے اور تجھ پر روز جزا تک لعنت

قَالَ رَبِّ فَأَنظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ۝

بولا پروردگار مجھے اس دن تک کی مہلت دے جس دن کہ مردوں کو جلا کر اٹھایا جائیگا فرمایا اچھا تجھے وقت مقررہ کے دن تک مہلت دی گئی

إِلَىٰ يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُومِ ۝ قَالَ رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي

(یعنی قیامت کے دن تک) بولا پروردگار چونکہ تو نے مجھے گمراہ کر دیا ہے انہیں ان سب کو زمین میں بہاریں

الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ۝

دکھاؤں گا اور سب کو بہکاؤں گا ہاں جو تیرے چنے ہوئے بندے ہیں (وہ نہیں بہکیں گے)

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ ○ إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ

اللہ نے فرمایا یہ مجھ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے واقعی جو میرے بندے ہیں اُن پر تیرا کچھ زور نہیں

إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِينَ ○ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ ○

ہاں جو گمراہ تیرے پیچھے ہولئے (اُن کو تو بہکا سکتا ہے) ان سب کا ٹھکانا دوزخ ہے

لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِنْهُمْ جُزْءٌ مَقْسُومٌ ○

جس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازہ (سے داخل ہونے) کیلئے ان کافروں کا الگ الگ حصہ مقرر ہے

تفسیر حضرت آدمؑ کی تخلیق کا قصہ اور فرشتوں کو سجدۂ آدم کا حکم اور شیطان کا انکار۔ ان تمام واقعات کا بیان کامل طور پر سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے اس لئے ان کے مطلب کا اعادہ ہم موجب طوالت سمجھتے ہیں۔ ہاں بعض آیات کے ذیل میں تحقیقی نکات بیان کرنے ضروری ہیں۔

(۱) حضرت آدمؑ کی ساخت میں اگرچہ ہوا، آگ اور پانی کے اجزاء بھی شامل تھے مگر چونکہ خاک کا حصہ زیادہ تھا اس لئے تعبیرِ قوم نے کا اصل مادہ خاک کو قرار دیا۔ قرآن پاک میں مختلف مواقع پر مختلف الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ کہیں تُرَاب (خاک)، کہیں طِین (کیچڑ)، کہیں حَمَاٍ مَّسْنُوْن (سڑی ہوئی کیچڑ) اور کہیں صَلْصَال (کھنکھناتی ہوئی پختہ مٹی) اور ایک جگہ صلصال کو فخار یعنی ٹھیکری سے بھی تشبیہ دی گئی ہے۔ ان تمام تعبیرات میں مابہ الاتحاد یہ بات ہے کہ حضرت آدم کو مٹی سے بنایا گیا، لیکن مٹی پر مختلف دَور گزرنے سے مختلف حالات طاری ہوتے رہے۔ شروع میں معمولی خاک تھی پھر پانی ملایا گیا تو کیچڑ بن گئی۔ پھر کچھ مدت پڑی رہی تو چیپ پیدا ہوگیا پھر زیادہ مدت گزرنے پر وہ سڑگئی اور آخر میں بالکل خشک صلصال بن گئی۔ پھر صلصال میں مزید پختگی پیدا ہوئی تو وہ فخار (ٹھیکری کی طرح) ہوگئی۔

(۲) جنات کی پیدائش کس چیز سے ہوئی؟ قرآن پاک میں اس کے لئے دو لفظ استعمال کئے گئے ہیں۔ نارِ سموم یعنی وہ آگ جو دھواں نہ ہونے کی وجہ سے گرم ہوا اور لُو کی طرح تھی۔ دوسرا لفظ مارج آیا ہے یعنی آگ کا بھڑکتا شعلہ۔ حاصل دونوں کا ایک ہی ہے کہ جنات کی تخلیق شفاف آگ سے ہوئی ہے۔ گویا فرشتے اور انسان کے درمیان جن کا درجہ ہے جن کی خلقت نہ انسان کی طرح کثیف مادہ سے ہوئی ہے نہ فرشتے کی طرح نورِ مجرد کے بلکہ بغیر دھوئیں کی آگ سے ہوئی ہے۔ چونکہ ہر چیز اپنی لطافت کی وجہ سے مختلف اشکال کو بآسانی قبول کرسکتی اور بسہولت ترک کرسکتی ہے۔ مثلاً پانی مٹی سے لطیف ہے، اس لئے جس برتن میں ڈالا جائے اس کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ پانی سے زیادہ لطیف ہوا اور ہوا سے زیادہ لطیف آگ ہے، اس لئے جس مخلوق کی تخلیق صاف شفاف آگ سے ہوئی اُس میں تغیرِ اشکال کی زیادہ قابلیت ہے اور چونکہ جنات کو قوتِ ارادی بھی عطا کی گئی ہے اس لئے وہ ہر شکل کو آسانی کے ساتھ اختیار کرلیتے ہیں اور پھر آسانی کے ساتھ اس کو چھوڑ بھی دیتے ہیں۔ بیضاوی نے صراحت کی ہے کہ بظاہر جنات کی تخلیق فقط آگ سے نہیں ہے بلکہ آگ کا جزء ان کی پیدائش میں غالب ہے جس طرح آدمی کے تخلیقی مادہ میں خاک کا عنصر غالب ہے اور چونکہ آگ کو آدمی نہیں دیکھ سکتا کیونکہ آگ ہر رنگ سے خالی ہے اسی لئے جنات بھی نظر نہیں آتے البتہ اس وقت دکھائی دے سکتے ہیں جب اپنی اصلی شکل چھوڑ کر کسی دوسری کثیف شکل میں رونما ہوں۔

جَانّ سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق جمہور مفسرین کا قول ہے کہ تمام جنات کے باپ کا نام جانّ ہے۔ جانّ کے معنی لغت میں چھپانے والے کے ہیں۔ چونکہ جنات نظر سے مخفی ہیں، اس لئے ان کو جانّ کہا جاتا ہے۔ قتادہ اور حسن بصری وغیرہما کے نزدیک جانّ اور ابلیس ایک ہی ہیں۔

جمہور کے قول کی بنا پر ملائکہ و جنات [illegible] کا فرد سرکش ہیں ان کو شیاطین کہا جاتا ہے جن کا سرچشمہ ابلیس ہے۔ بہرحال آیت سے اتنا ثابت ہے کہ نوعِ جن انسانوں کے علاوہ ایک مستقل خارجی مخلوق ہے جس کی تخلیق حضرت آدم کی پیدائش سے قبل ہوئی ہے اور جن کا قوامِ خلقت آدمی کے تخلیقی مادہ سے جدا ہے۔

رہے دیگر حیوانات تو ظاہر ہے کہ ہر ایک کی نوع جدا جدا ہے اور ہر نوع کا کوئی خاص مبدا ہوگا، لیکن ان کی پیدائش انسان سے پہلے ہوئی یا بعد کو؟ اس کی صراحت کسی عبارتِ قرآنی یا احادیثِ نبوی میں نہیں ہے۔

(۳۹) اللہ نے اپنی روح آدم میں پھونکی۔ شیخ ابو السعود نے بیان کیا کہ نفخِ روح ایک تمثیل ہے یعنی وہاں نہ پھونک تھی اور نہ کوئی ایسی چیز جس میں پھونکا جائے اور نہ روح پھونکنے کی چیز ہے۔ بلکہ خدا تعالیٰ نے ایک قابلِ حیات جسم میں زندگی پیدا کر کے اس کی تعبیر نفخِ روح سے کی۔ نیشاپوری نے لکھا ہے کہ من روحی میں روح کی نسبت اپنی طرف کرنا باجماعِ امت آدم کی عزت و بزرگی کے لئے ہے یعنی یہ بتانا مقصود ہے کہ میں نے آدم کو علاوہ اس خاکی پتلے کے ایک اور چیز بھی عطا کی ہے جو خصوصیت کے ساتھ میری ہے اور مجھ سے تعلق رکھتی ہے اور گروہِ ملائکہ یا امتِ جن کو وہ چیز نہیں عطا کی گئی۔ فرشتوں نے حضرت آدم کو سجدہ کیا۔ یہ سجدہ صرف رکوع کی حد تک تھا یا معروفی سجدہ، پھر تعظیمی سجدہ تھا یا سجدۂ عبادت یا سجدۂ تحیت؟ اور آدم میں شانِ الٰہی کا پرتو چمک رہا تھا اس وجہ سے فرشتوں نے سجدہ کیا یا آدم قبلہ بجود تھے اور مسجود لہٗ ذاتِ باری تعالیٰ؟ ان تمام مباحث کی تفصیل ہم سورۂ بقرہ میں کر چکے ہیں۔

(۴۰) جب ابلیس حقیقتِ امر کو نہ سمجھ سکا اور امرِ الٰہی کے مقابلے میں اپنی رائے کے گھوڑے دوڑانے شروع کئے اور حکم کو خلافِ عقل سمجھ کر آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ باوجودیکہ جو فضیلت باعتبارِ خلقت خدا تعالیٰ نے آدم کو دی تھی وہ نہ ابلیس کو میسر تھی نہ فرشتوں کو اور یہی نفخِ روح کی فضیلت باعثِ امرِ الٰہی تھی، مگر محسوس پرست ناواقف ابلیس حقیقتِ امر کے سمجھنے سے قاصر رہا اور باطن کو چھوڑ کر ظاہری قوامِ تخلیق کو وجہِ ترجیح قرار دینے لگا تو خدا تعالیٰ نے حکم دیا یہاں سے نکل جا تو مردودِ بارگاہ ہو گیا۔ کہاں سے نکلنے کا حکم ہوا؟ اس میں اختلاف ہے۔ بعض کا قول ہے کہ جنت سے نکلنے کا حکم ہوا۔ بعض کے نزدیک گروہِ ملائکہ سے، لیکن اکثر مفسرین کے نزدیک آسمان سے نکل جانے کا حکم ہوا۔ ابلیس چونکہ بڑا مکار تھا، اس لئے روزِ حشر تک زندہ رہنے کی استدعا کی۔ مطلب یہ تھا کہ اگر وقتِ حشر تک زندہ رکھنے کا خدا تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا تو پھر موت کبھی نہ آئے گی کیونکہ حشر کے بعد تو موت آ ہی نہیں سکتی۔ خدا تعالیٰ احکم الحاکمین ہے اس نے حشر تک تو مہلت نہ دی البتہ ابتدائے قیامت یعنی نفخۂ اول تک مہلت عطا فرما دی اور فرمایا اچھا تجھے وقتِ معلوم یعنی فنائے عالم کے دن تک مہلت ہے۔ شیطان اپنے گھمنڈ میں تھا کہ آدم کو مٹی سے بنایا گیا ہے لامحالہ اس کو زمین پر آباد کیا جائے گا۔ اس لئے قسم کھا کر بولا پروردگار! چونکہ تو نے مجھے آدم کی وجہ سے گمراہ کر کے مردودِ بارگاہ کر دیا ہے، اس لئے میں بھی اولادِ آدم کی نظر فریبی، دل کشی اور گمراہی کے سامان فراہم کرنے میں کمی نہ کروں گا اور سب کو بہکاؤں گا۔ ہاں تیرے مخلص بندے میری دسترس سے باہر ہوں گے۔ آثار میں آیا ہے کہ جب صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کا زمانہ تھا تو گروہِ شیاطین پریشان اور ناکام ہو کر ابلیس کے پاس واپس جا کر کہتے تھے کہ وہ لوگ تو عجیب حالت رکھتے ہیں۔ ہم ہر چند ان کو بہکانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ہم کو کچھ نہیں ملتا بلکہ الٹا ان کی طرف سے ہم کو مزید ضرر حاصل ہو جاتا ہے۔ ابلیس ان سے کہتا صبر کرو آئندہ ان کی مہار تمہارے قبضہ میں ہوگی۔ جب تابعین کا دور آیا تو ذریاتِ شیطانی نے ابلیس سے جا کر کہا یہ تو عجیب آدمی ہیں ہم انتہائی کوشش کے بعد ان سے کچھ پاتے ہیں، مگر وہ فوراً توبہ و استغفار کر کے گزشتہ کی تلافی کر لیتے ہیں۔ ابلیس نے جواب دیا صبر کرو عنقریب ایسے لوگ ہوں گے جن سے تم راضی ہو گے۔

(۴۱) شیطان کو جب راندۂ درگاہ بنا دیا گیا اور نفخۂ اولیٰ کے وقت تک اس کو زندگی دے دی گئی اور اس نے آدمیوں کو گمراہ کرنے کا بیڑا اٹھایا تو خدا تعالیٰ نے فرمایا تو گمراہ کسی کو نہیں کر سکتا۔ بات یہ ہے کہ جو راہ مستقیم ہے وہ بالکل ظاہر ہے میرے مخلص بندوں پر تیرا کچھ قابو نہ چلے گا۔ ہاں جو لوگ خود ہی تیری پیروی کریں گے وہ ضرور گمراہ ہوں گے۔ شیخ ابو السعود نے کہا کہ شیطان نے راہِ مستقیم پر بیٹھ کر لوگوں کو ہر طرف سے بہکانے کا دعویٰ کیا تھا پس ظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو رد فرما دیا کہ جو راہ میں نے لوگوں کے لئے مقرر فرما دی ہے وہ مستقیم ہے

جو اس پر چلے گا وہ تیرے خطرے سے بےخوف رہے گا۔ حدیث میں آیا ہے کہ راہِ مستقیم کے دائیں بائیں بکثرت شیطان کی راہیں ہیں۔

(۶) جہنم کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازہ میں داخل ہونے کے لئے آدمیوں کا ایک حصّہ مقرر ہے۔ ابن عباس، عکرمہ، ضحاک اور حضرت علیؓ کے نزدیک سات دروازوں سے مراد سات طبقات اور درکات ہیں۔ ابن جریر نے سات طبقات کو بترتیب ذیل بیان کیا جہنم، لظیٰ، حطمہ، سعیر، سقر، جحیم، ہاویہ۔ قتادہ نے قسم کھا کر کہا کہ کفر و شرک و معاصی کے مراتب مختلف ہیں۔ اسی بنا پر دوزخ میں ان کے منازل مختلف ہیں۔ بعض مفسرین نے بیان کیا کہ انسانی بدن کے اعضائے عاملہ سات ہیں۔ آنکھ، کان، زبان، پیٹ، فرج، ہاتھ، پاؤں۔ انہی سے انسان گناہ کرتا ہے۔ رہا دل تو دل سے اگر گناہ کی نیت کی، مگر عمل اس کے مطابق نہ کیا جائے تو کوئی مواخذہ نہیں، اس لئے کیفیت قلبی قابلِ اعتبار نہیں۔ ہر عضو سے گناہ کرنے کی سزا علیحدہ ہے لہٰذا سات اعضاء سے گناہ کرنے کی پاداش میں سات قسم کی سزائیں ہوئیں اور ہر سزا کا گھر جدا ہے۔ لہٰذا سات قید خانے ہوئے۔ البتہ اگر کسی کارِ خیر کی نیت کی اور اس کو عملی صورت میں نہ لایا تو از روئے حدیث اس کا بھی کسی قدر ثواب ملے گا، اس لئے جنت کے آٹھ دروازے ہونے ضروری ہیں۔

مقصودِ بیان جن کی تخلیق صاف شفاف آگ سے ہوئی ہے اور انسان کی تخلیق مٹی سے۔ پس وہ لوگ غلطی پر ہیں جو انسان کی شہوانی و غضبی قوتوں کو ہی شیطان اور جن قرار دیتے ہیں اور انسان کے علاوہ جن کو مختلف نوع نہیں یقین کرتے۔ ملائکہ کی پیدائش باجماعِ اُمت نورِ مجرد سے ہوئی اور جن کی تخلیق صاف شفاف آگ سے۔ اسی بنا پر یہ دونوں اپنی اصلی شکل میں عام آدمیوں کو دکھائی نہیں دے سکتے۔ اللہ نے ایسی مخلوق پیدا کرنی چاہی جو عام طور پر دکھائی دیں اس کا نام بشر رکھا یعنی وہ لوگ جو باہم مباشرت والے اور ظاہر ہوں۔ لفظ مِن رُّوحِی سے انسان کی عظمت پر دلالت کر رہا ہے۔ شیطان کا سجدہ سے انکار کرنا اور مردود ہونا بتا رہا ہے کہ امرِ الٰہی کی تعمیل لازم ہے۔ چون و چرا کرنا اور وجہ امر دریافت کرنا خلافِ دانش ہے۔ ہر چند کہ غیر اللہ کو سجدہ کرنا بظاہر خلافِ عقل تھا، مگر چونکہ امرِ الٰہی تھا اس لئے اس کی تعمیل واجب تھی، لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ امرِ الٰہی خلافِ عقل نہیں ہوا کرتا گو بظاہر سمجھ میں نہ آئے۔ آدم میں پرتوِ الٰہی منور کُن تھا اور روحِ ابدی جلوہ نما تھی لہٰذا حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ اس واقعہ سے ان خوش دماغ لوگوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے جو احکامِ الٰہیہ کو خلافِ عقل سمجھ کر بلند آہنگی اور سینہ زوری سے انکار کرتے ہیں اور ہر جگہ اپنی ناقص عقل کو جولانی دیتے ہیں ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ کوئی حکمِ الٰہی عقل کے خلاف نہیں ہوتا، مگر یہ ضروری نہیں کہ اس کی مصلحت ہر کس و ناکس سمجھ جائے۔ واقفانِ دین اور حاملانِ شرع ہی کسی قدر حکمِ الٰہی کی مصلحت بتا سکتے ہیں وہی راز دارِ حکمت ہیں، اس لئے جو حکم شرع اپنی عقل کے خلاف معلوم ہو اس کو ترک کر دینا خلافِ عقل ہے۔ آیات کا آخری حصّہ دلالت کر رہا ہے کہ اللہ کا راستہ سیدھا ہے یعنی جو قانون اپنے انبیاء کی معرفت خدا تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے وہی شاہ راہِ مستقیم ہے۔ اس کے علاوہ جو راستہ بھی اختیار کیا جائے گا وہ شیطان کا راستہ ہے۔ اس سے جاہل صوفیوں کو نصیحت حاصل کرنی چاہیئے جو احکامِ شریعت سے اپنے آپ کو مستثنیٰ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شریعت جدا ہے اور طریقت جدا۔ اگر ان کے قول پر طریقت کو شریعت سے جدا تسلیم کر لیا جائے اور دونوں کو متباین قرار دے دیا جائے تو طریقت یقیناً قابلِ ترک ہے کیونکہ شریعت تو راہِ مستقیم ہے اور راہِ مستقیم صرف ایک ہوتی ہے۔ لہٰذا طریقت ٹیڑھا راستہ ہے جو یقیناً شیطانی راستہ ہے وغیرہ۔

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ ۝

پرہیزگار لوگ بلاشبہ باغوں اور چشموں میں ہوں گے (ان سے کہا جائے گا) کہ امن و سلامتی کے ساتھ اندر داخل ہو

وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ ۝

اور ان کے سینوں میں باہم جو کشیدگیاں ہوں گی ہم ان کو دور کر کے بھائی بھائی بنا دیں گے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ تختوں پر بیٹھے ہوں گے

لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِينَ ○ نَبِّئْ عِبَادِيٓ

ان کو وہاں کوئی تکلیف نہ پہنچے گی۔ اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے میرے بندوں کو

اَنِّيٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ○

اطلاع دے دو کہ میں غفور رحیم ہوں اور میرا عذاب دردناک ہے

تفسیر گزشتہ دو رکوع میں ثبوت توحید کے مختلف براہین بیان کئے تھے اور اثبات توحید کے ضمن میں انسانوں کی ہدایت کے لئے آدم کی تخلیق اور شیطان کی سرکشی کا قصہ بیان فرماکر دارِ آخرت کی کیفیت ظاہر کر کے شیطان کی پیروی کرنے والوں کی پاداش کی صراحت کی تھی۔ سرکش اور نافرمانوں کی سزا کی صراحت کے بعد مناسب تھا کہ نیک اور فرماں بردار بندوں کی جزائے خیر کو بیان کر دیا جائے اس لئے یہاں سے اہلِ تقویٰ کے حسنِ عمل کے ثواب کی تصریح فرمائی۔

آیت وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ الخ کے شانِ نزول میں اختلاف ہے۔ سعید بن منصور نے اپنی تفسیر میں حضرت ابو امامہ باہلی کی روایت کردہ حدیث نقل کی ہے کہ جنت میں داخل ہونے سے قبل ہر مومن کے دل سے خدا تعالیٰ کینہ کو نکال ڈالے گا الخ۔ اس مضمون کی تائید حضرت ابو سعید خدری رض کی روایت سے ہوتی ہے کہ حضور گرامی ع نے فرمایا دوزخ سے رہائی پا کر اہلِ ایمان ایک پل پر روکے جائیں گے جو جنت و دوزخ کے درمیان ہوگا وہاں ان کے آپس کے ان حقوق کا انصاف کیا جائے گا جو دنیا میں ان کے درمیان تھے پھر جب وہ پاک ہو جائیں گے تو جنت میں داخل ہونے کا حکم ہوگا۔ ان دونوں روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ موردِ نزول خاص نہیں ہے۔

سفیان ثوری نے ابو صالح تابعی سے روایت کی کہ آیت مذکورہ میں جن لوگوں کو اِخْوَانًا کہا گیا ہے وہ گیارہ ہیں دس عشرہ مبشرہ اور گیارھویں عبداللہ بن مسعود رض۔ سفیان بن عیینہ نے باسنادِ خود حضرت علی رض کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت اہلِ بدر کے حق میں نازل ہوئی ہو سکتا ہے کہ آیت کا نزول اہلِ بدر کے حق میں ہو، مگر حکم بہرحال عام ہے۔ کوئی مومن آپس کا حق چکائے بغیر اور دلوں کا کینہ زائل ہونے سے قبل جنت میں نہ جائے گا۔ حضرت طلحہ رض، حضرت زبیر رض اور حضرت عثمان رض کے متعلق حضرت علی رض کے مختلف اقوال مروی ہیں۔ جن میں آپ نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ ہم ان بندوں میں داخل ہوں گے جن کے متعلق خدا تعالیٰ نے فرمایا۔ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ الخ گویا ان اقوال میں آپ نے موردِ نزول کی تعیین نہیں فرمائی اور اگر تعیین تسلیم بھی کر لی جائے تو عموم حکم کا انکار نہیں فرمایا اور اصول تفسیر کا ضابطہ ہے کہ اگر مورد خاص بھی ہو تب بھی عمومِ علت کے پیشِ نظر حکم میں عموم ہوتا ہے۔

اب ہم تفسیری مطلب بیان کرتے ہیں جب حقوق اللہ اور حقوق العباد کا فیصلہ ہو چکے گا تو وہ لوگ جو دنیا میں متقی تھے یعنی جو کفر و شرک سے بچے رہے تھے ان کو جنت میں داخل ہونے کا حکم ہوگا، لیکن ہر عظیم ترین لذت کو دو چیزیں مکدر کر دیتی ہیں ایک تو لذت و راحت کے ساتھ کسی اذیت، تکلیف مرض یا کسی اور ناگوار خاطر بات کا ظاہر ہونا۔ دوسرے زوال اور فنائے نعمت کا اندیشہ۔ خدا تعالیٰ نے پہلے اندیشہ کا ازالہ آیت لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ سے فرما دیا اور دوسرے خوف کو آیت وَمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ سے دور کر دیا۔ آخری آیت میں اللہ نے اپنی صفت رحمت و غضب کو ظاہر فرما کر گویا یہ بتا دیا کہ عذاب کی بھی مجھ میں کامل قدرت ہے، مگر میں غفور رحیم بھی ہوں بندوں سے علاوہ شرک کے چھوٹے بڑے گناہ ہو جاتے ہیں ان کو سزا دینے سے پہلے یا ناقص سزا دینے کے بعد معاف کر دوں گا۔

مقصودِ بیان دخولِ جنت کے لئے شرک سے بچنا ضروری ہے۔ لفظ متقین میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اہلِ ایمان کے دلوں میں سے وہ رنجشیں دور کر دی جائیں گی جو دنیاوی معاملات میں ان میں ہوئی ہوں گی۔ جنت اور جنتیوں کی ہمیشگی۔ اللہ کی صفت

غضب بھی کامل ہے اور صفت رحمت بھی، مگر رحمت کا پہلو قوی ہے کیونکہ عذاب تو بغیر جرم کے نہ ہوگا اور رحمت باوجود خطا کے بھی ہوگی یعنی گناہ معاف کر کے تو رحمت میں چھپا لیا جائے گا، مگر ایمان کو مٹا کر دوزخ میں نہ ڈالا جائے گا۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرٰهِيمَ ○ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلٰمًا

ان کو ابراہیم کے مہمانوں کا حال سناؤ کہ جب وہ ابراہیم کے گھر میں گئے تو سلام کیا

قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ○ قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيمٍ ○

ابراہیم نے کہا ہم تم سے خائف ہیں بولے تم خوف نہ کرو ہم تم کو ایک عالم فرزند کی بشارت دیتے ہیں

قَالَ أَبَشَّرْتُمُونِي عَلٰى أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُونَ ○ قَالُوا بَشَّرْنٰكَ

ابراہیم نے کہا بڑھاپا آنے کے بعد بھی کیا تم مجھے بشارت دیتے ہو اب کا ہے کی بشارت دیتے ہو مہمان بولے ہم نے تمہیں سچی

بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْقٰنِطِينَ ○ قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا

بشارت دی ہے تم ناامید مت ہو ابراہیم نے کہا پروردگار کی رحمت سے گمراہ ہی ناامید

الضَّالُّونَ ○ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ○ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلٰى

ہوتے ہیں ابراہیم نے کہا فرشتو! تم کو کیا مہم درپیش ہے؟ بولے ہم کو ایک مجرم قوم کی

قَوْمٍ مُجْرِمِينَ ○ إِلَّا آلَ لُوطٍ إِنَّا لَمُنَجُّوهُمْ أَجْمَعِينَ ○ إِلَّا امْرَأَتَهُ

طرف بھیجا گیا ہے باستثنا خاندان لوط کے لوط کے سارے گھر والوں کو سوائے اس کی بیوی کے ہم ضرور بچا لیں گے

قَدَّرْنَا إِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِينَ ○ فَلَمَّا جَاءَ آلَ لُوطٍ الْمُرْسَلُونَ ○ قَالَ

ہم نے لوط کی بیوی کو ضرور رہ جانے والوں میں سے مقرر کر دیا ہے غرض جب خاندان لوط والوں کے پاس فرشتے پہنچے تو لوط نے کہا

إِنَّكُمْ قَوْمٌ مُنْكَرُونَ ○ قَالُوا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوا فِيهِ يَمْتَرُونَ ○

تم لوگ اجنبی ہو فرشتے بولے ہم تمہارے پاس وہ عذاب لے کر آئے ہیں جس میں یہ لوگ شک کرتے تھے

وَأَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّا لَصٰدِقُونَ ○ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِنَ الَّيْلِ

اور تمہارے پاس سچا وعدہ لے کر آئے ہیں اور ہم یقینی سچے ہیں لہٰذا تم کچھ رات رہے سے اپنے لوگوں کو لے کر نکل جاؤ

وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ○

اور تم (خود) ان کے پیچھے چلو اور تم میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے اور جہاں تم کو حکم ملا ہے وہاں چلے جاؤ

وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ○ وَ

اور ہم نے لوط کے پاس وحی بھیجی کر صبح ہوتے ہوتے اُن کی جڑ کاٹ دی جائے گی اور

جَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا

شہر کے لوگ خوشیاں کرتے آئے لوط نے کہا میرے مہمان ہیں تم مجھے فضیحت

تَفْضَحُوْنِ ○ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ○ قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ○

نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو مجھے رُسوا نہ کرو وہ بولے کیا ہم نے تم کو دنیا بھر کی حمایت سے منع نہیں کر دیا ہے۔

قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ○ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ

لوط نے کہا یہ میری بیٹیاں موجود ہیں اگر تم کو کرنا ہے (تو ان سے نکاح کرلو) (اے محمد) قسم ہے تمہاری جان کی وہ لوگ اپنی مستی میں

يَعْمَهُوْنَ ○ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ○ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا

مدہوش تھے پھر اُن کو ایک ہولناک آواز نے روشنی ہوتے ہوتے پکڑ لیا اور ہم نے اس بستی کو زیر و زبر کر ڈالا

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ○ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ○

اور اُن پر کنکریلے پتھر برسائے اس میں تاڑ جانے والوں کے لیے نشانیاں ہیں

وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ○ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○

اور وہ بستی شارع عام کے کنارے پر واقع ہے یقیناً اس میں ایمان والوں کے لئے عبرت کی نشانی ہے

تفسیر اوپر کی آیات کے آخری حصوں میں بیان کیا گیا تھا کہ اللہ کی رحمت کا امیدوار اور اس کے غضب سے ترساں رہنا چاہیئے۔ یہ بھی یقین رکھنا چاہیئے کہ اللہ رحیم ہے اور اس پر بھی ایمان لازم ہے کہ اس کا عذاب سخت ہے۔ ان آیات میں حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کا قصہ بیان فرمایا ہے۔ فرشتے حضرت ابراہیم کے پاس آئے اور ان کو بڑھاپے سالی میں اولاد کی بشارت دی۔ ظاہری اسباب تولید منقطع ہو چکے تھے، مگر رحمتِ الٰہی کا دروازہ بند نہ ہوا تھا، اس لئے فیضانِ غیب ہوا اور حضرت اسحاق پیدا ہوئے، لیکن یہی فرشتے حضرت لوط کے پاس پہنچے اور ان کی قوم پر عذابِ الٰہی نازل کیا۔ رحمت اور عذاب کے نازل ہونے کا ذریعہ ایک ہے، مگر محل مختلف۔ حضرت ابراہیمؑ کی نیکی اور پرہیزگاری جاذبِ رحمت ثابت ہوئی اور قوم لوط کی سرکشی نافرمانی موجب تباہی بنی۔ یہ دونوں قصے پہلے بھی گزر چکے ہیں، مگر یہاں مکرر بیان

کرنے سے مسلمانوں کو درس عبرت دینا مقصود ہے کہ دیکھو متقی بندوں کو خدا تعالیٰ کس طرح اپنے فضل سے نوازتا ہے۔ اہل تقویٰ کو بھی خوف ہوتا ہے مگر اس خوف کا انجام فضل و بشارت ہے اور جو لوگ محض نڈر ہوتے ہیں ان کا انجام تباہی و بربادی ہے۔ ان آیات میں دونوں قصے مجمل بیان کئے گئے ہیں۔ دوسری آیات میں ان کی تفصیل آئی ہے۔ ہم قصے کی تکرار غیر مفید سمجھ کر قلم انداز کرتے ہیں۔ صرف آیات کی تفسیر توضیح اور ربط کے لئے ترتیب وار تشریح کرنی چاہتے ہیں۔

(۱) حضرت ابراہیمؑ بہت زیادہ مہمان نواز تھے۔ جنگل سے تلاش کر کے مہمانوں کو لاتے تھے۔ ایک روز خیمہ کے اندر فروکش تھے کہ بارہ نوخیز حسین لڑکے آ گئے حضرت نے ان کو ٹھہرایا۔ حسب دستور بچھڑا ذبح کیا اور اس کا گوشت تل کر مہمانوں کے لئے لائے۔ فرشتوں نے کھانے سے دست کشی کی۔ حضرت ابراہیمؑ کو ان سے خوف معلوم ہوا۔ مفسرین نے خوف کے دو سبب بیان کئے ہیں۔ اول یہ کہ اس زمانے میں دستور تھا کہ کوئی شخص اگر کسی سے دل میں دشمنی رکھتا تھا تو اس کے گھر کا کھانا نہ کھاتا تھا۔ لڑکوں نے جب حضرت ابراہیمؑ کا پیش کردہ کھانا نہ کھایا تو آپ کو اندیشہ ہوا کہ شاید یہ دشمن ہیں ضرر پہنچانا چاہتے ہیں، اس لئے میرے گھر کا کھانا نہیں کھاتے، مگر یہ وجہ کچھ کمزور ہے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ جلیل القدر پیغمبر تھے آپ ایقان و ایمان کے اس درجہ پر پہنچے ہوئے تھے کہ بہت سے پیغمبروں کی رسائی وہاں تک نہیں ہوئی اور مومن کامل سوائے خدا کے کسی سے نہیں ڈرتا پھر حضرت ابراہیمؑ کو کیوں خوف ہوا جو مرد کامل نمرود ایسے سفاک اور طاقتور بادشاہ سے نہ ڈرا ہو وہ معمولی لڑکوں کی ضرر رسانی سے ترساں ہو جائے۔ یہ امر ناقابل فہم ہے۔ دوسرا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب لڑکوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا تو حضرت ابراہیمؑ نے غور سے دیکھا اور غور کرنے کے بعد بنور فراست سمجھ گئے کہ یہ فرشتے ہیں عذاب نازل کرنے آئے ہیں۔ اس تخیل کے پیدا ہوتے ہی عذاب الٰہی سے ڈر گئے اور فرمایا ہم کو تم سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ فرشتوں نے تسلی کی اور کہا ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں آپ اندیشہ نہ کریں ہم آپ کو لڑکا پیدا ہونے کی خوشخبری دینے آئے ہیں۔ اس وقت آپ کو اطمینان حاصل ہوا، مگر ان لڑکوں نے چونکہ خود اپنی زبان سے بیان نہ کیا تھا، اس لئے ان کی ظاہری شکل دیکھ کر مزید اطمینان حاصل کرنے کے لئے آپ نے فرمایا میں تو بوڑھا ہو چکا اب اولاد کی بشارت کا کون موقعہ ہے۔ فرشتوں نے جواب دیا ہم نے بشارت تو آپ کو سچی اور واقعی دی ہے۔ اسباب ظاہری اور پیرانہ سالی کو دیکھ کر آپ رحمت الٰہی سے مایوس نہ ہوں۔ اس وقت حضرت ابراہیمؑ کو یقین ہوا کہ یہ فرشتے ہیں۔ فوراً بولے نہیں میں نا امید تو نہیں ہو سکتا۔ ناامیدی تو ان لوگوں کا شیوہ ہے جو حقیقت سے ناواقف ہوں یہ فرمانے کے بعد بھی آپ نے غور کیا کہ اگر فقط مجھے بشارت ہی دینی تھی تو خواب، الہام وحی وغیرہ اور ذرائع بھی ہو سکتے تھے اور اگر فرشتہ ہی کی معرفت خبر پہنچانی ضروری تھی تو ایک فرشتہ کافی تھا۔ یہ جماعت کیوں بھیجی گئی۔ جماعت کے آنے کا مقصد تو کچھ اور ہی ہے۔ تصورات کا یہ پورا سلسلہ قائم کرنے کے بعد فرمایا یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن اے پیغمبران الٰہی آخر اپنے آنے کی وجہ بھی تو بتاؤ؟ اس سوال پر فرشتوں نے اپنے آنے کی مفصل وجہ بیان کی۔

(۲) حضرت لوطؑ سدوم میں مقیم تھے۔ سدوم کے چاروں طرف اور قصبات و بلاد بھی تھے۔ سدوم میں ہی عذاب کے فرشتے آئے۔ حضرت لوطؑ اور آپ کی دو صاحبزادیاں محفوظ رہیں۔ اور ممکن ہے کہ چند افراد اور بھی بچ گئے ہوں جو ایمان لے آئے ہوں اور جن کو آل لوطؑ میں داخل فرمایا گیا ہو کیونکہ آل لوطؑ سے فقط لوطؑ کا گھر ہی مراد نہیں بلکہ وہ تمام اشخاص آل لوطؑ کے ذیل میں داخل ہیں جو حضرت لوطؑ کے پیرو تھے۔ یہاں سے حضرت لوطؑ اپنے ساتھیوں کو لے کر شب ہی شب حضرت ابراہیمؑ کے پاس پہنچ گئے یا مصر چلے گئے۔

(۳) اس جگہ قرآن پاک میں قصہ لوطؑ کو ترتیب واقعات کے ساتھ نہیں بیان کیا۔ واقعات کے بیان میں تقدیم تاخیر کر دی گئی ہے۔ خوبصورت نوعمر لڑکیوں کو مہمان دیکھ کر حضرت لوطؑ کو اپنی اور اپنے مہمانوں کی رسوائی کا اندیشہ ہونا ابتدائی واقعہ ہے۔ اس کے بعد قوم ظالموں کا شاداں اور فرحاں آنا اور مہمانوں پر دست درازی کی خواہش کرنا اور حضرت لوطؑ کا ان کو سمجھانا اور ان کا ترش جواب دینا اور پھر لوطؑ کا استمالت کرنا دوسرا واقعہ ہے۔ پھر حضرت لوطؑ کو تسلی دینا اور فرشتوں کی زبانی کل کیفیات کا ظاہر ہونا تیسرا واقعہ ہے۔ ان آیات میں تیسرے واقعہ کو دوسرے واقعہ سے مقدم کر دیا گیا ہے، مگر دوسرے مقامات پر اس کی تفصیل آئی ہے۔

(۴) حضرت لوطؑ نے اپنی لڑکیاں پیش کیں - یہ قوم کی لڑکیاں اپنی لڑکیاں قرار دے کر ان سے نکاح کر لینے کی ترغیب دی - یہ بات مفصل ہم دوسرے مقامات پر بیان کر چکے ہیں - مزید اعادہ کی ضرورت نہیں -

(۵) لَعَمْرُكَ إِنَّهُمْ لَفِي سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُونَ یعنی اے محمدؐ! مجھے تیری عمر یا تیری زندگی کی قسم قوم لوطؑ بہت زیادہ اپنے جوش، شہوت اور سرمستی و سرشاری میں اندھی تھی - قاضی عیاض نے صراحت کی ہے کہ صحابہ، تابعین، سلف صالحین اور ائمہ و علماء کا اجماع ہے کہ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے حیات محمدؐ کی قسم کھائی ہے - ابن الجوزاء نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ذاتِ محمدیؐ سے زیادہ اشرف و اکرم خدا تعالیٰ نے کسی اور کو پیدا نہیں کیا - میں نے نہیں سنا کہ سوائے محمدؐ کے اللہ نے کسی اور کی زندگی کی قسم کھائی ہو - بقولہ لَعَمْرُكَ الآیۃ شیخ سیوطی نے در منثور میں بھی اس روایت کو نقل کیا ہے - شیخ ابوبکر ابن العربی نے لکھا ہے مفسرین کا اجماع ہے کہ محمدؐ کی حیات کی قسم خدا تعالیٰ نے اپنے حبیب کی تشریف و تکریم اور اعزاز و مرتبت کے اظہار کے لئے کھائی ہے -

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

ابن کثیر ابن عربی اور دیگر علماء کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ میں حیاتِ محمدؐ کی قسم خدا تعالیٰ نے صرف اعزاز و تکریم کے لئے کھائی ہے، لیکن یہ قول بے ثبوت ہے کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ جس کی قسم کھائی جائے وہ معزز و مشرف ہی ہو - دیکھو قرآن میں انجیر، زیتون، عصر، چاشت اور رات و آفتاب وغیرہ کی قسمیں کھائی ہیں تو کیا ان سب کی عزت افزائی مقصود ہے یا یہ چیزیں اشرف الکائنات ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جن چیزوں کی قسم کھائی جاتی ہے ان کا مشرف و معزز ہونا ضروری ہے - جب تک قسم کھانے والے کی نظر میں کوئی چیز قابلِ عزت و کرامت نہ ہو کسی زبان میں اس کی قسم کوئی نہیں کھاتا (صورتِ استہزاء اس سے مستثنیٰ ہے) لیکن معزز و مکرم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اشرف الکائنات ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ اپنی نوع میں اشرف ہو - انجیر اور زیتون پھلوں میں عظمت کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں - عصر و چاشت اوقات میں ممتاز ہیں - سورج ہر قسم کی روشنی پیدا کرنے والی چیزوں سے زیادہ روشن ہے - اسی طرح رسول پاک محمدؐ تمام فرشتوں اور انسانوں میں بزرگ و برتر ہیں - حضورؐ سے زیادہ بارگاہِ الٰہی کا تقرب کسی کو حاصل نہیں ہوا -

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ - متوسمین سے مراد مجاہد کے نزدیک وہ اہلِ فراست ہیں جن کے دلوں کے اندر نورِ الٰہی چمکتا ہے اور اس نور کی روشنی میں وہ پوشیدہ واقعات کو دیکھتے ہیں - حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے حضور اقدس نے فرمایا کہ ... مومن کی فراست سے ڈرو وہ اللہ کے نور کی روشنی میں دیکھتا ہے - پھر حضورؐ نے یہی آیت تلاوت فرمائی - اخرجہ البخاری فی التاریخ والترمذی وابن مردویہ وغیرہم - قتادہ نے متوسمین کا ترجمہ اہلِ عبرت کیا ہے - بعض علماء نے غور و خوض کرنے والا وہ طبقہ مراد لیا ہے جو واقعات میں نظر و فکر کر کے صحیح استدلال قائم کر کے صحیح نتیجے پر پہنچتا ہے - حضرت انس بن مالک کی مرفوع روایت ہے کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو لوگوں کو توسم (علامات) سے پہچان لیتے ہیں - یہاں یہ نکتہ سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ نے متوسمین کے ساتھ آیات کا لفظ استعمال کیا اور مومنین کے ساتھ فقط لفظ آیت - بات یہ ہے کہ عام مومنین اگرچہ عبرت اندوز نظر اور ہدایت آگیں نورِ بصیرت رکھتے ہیں لیکن خاص اہلِ ایمان کو جو نورِ باطن عطا کیا گیا ہے وہاں عوام کی رسائی نہیں، اس لئے واقعاتِ عبرت اور نیرنگیائے قدرت کے اندر اسرارِ الٰہیہ کا انکشاف اور رموزِ مرتبہ کا ظہور متوسمین کے قلوب پر جتنا ہوتا ہے اتنا عام مومنوں پر نہیں ہوتا - اسی فرق کو پیشِ نظر رکھ کر فرمایا کہ واقعۂ لوطؑ و ابراہیمؑ کے اندر مومنین کے لئے اگرچہ نشانیٔ قدرت موجود ہے، لیکن اہلِ توسم کے لئے گوناگوں آیاتِ حکمت و دلالاتِ یقینی مضمر ہیں -

(۶) بِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ - قتادہ کے نزدیک مقیم کے معنی ہیں کشادہ اور واضح - مجاہد کے قول پر وہ راستہ مراد ہے جس پر علامات و نشانات قائم کر دیئے گئے ہوں - حافظ ابن کثیر نے فرمایا کہ مدینے سے شام کو جانے والے لوگوں کو راستے کے دائیں طرف کچھ اُلٹی ہوئی بستیاں ملتی ہیں یہی قوم لوطؑ کی بستیاں تھیں - میں کہتا ہوں کہ عرب کے شمال اور شام کے جنوب میں ایک جھیل ہے جس کا پانی شور ہے اس جھیل کو بحیرۂ مردار کہا جاتا ہے - اس کے کنارے سدوم اور عمورہ وغیرہ قوم لوطؑ کی بستیاں تھیں - انہیں آبادیوں پر عذابِ الٰہی نازل ہوا تھا -

مقصود بیان

انبیاء کے پاس کبھی فرشتے بشری شکل میں بھی آتے ہیں اور پیام الٰہی پہنچاتے ہیں ۔ لیکن بشری شکل میں نمودار ہونے کے بعد بھی خصوصیاتِ بشری سے پاک ہوتے ہیں ۔ انبیاء کو ہر وقت مکاشفہ نہیں ہوتا ۔ بعض اوقات جب انبیاء دنیوی تعلقات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اس وقت انکشافِ اسرار نہیں ہوتا ۔ چنانچہ فرشتے جب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کے پاس بصورتِ انسانی پہنچے تو پہلے یہ دونوں بزرگ اصل حقیقت کو نہ پہچان سکے ۔ اس کے باوجود ہر حالت میں اہلِ باطن کا نورِ فراست بہت روشن ہوتا ہے ۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے نورِ فراست سے اس قدر ضرور پہچان لیا کہ فرشتوں کے آنے کی غرض ضرور عذابِ الٰہی کا نزول ہے ۔ اس لئے آپ نے فرمایا ہم کو تم سے ڈر لگتا ہے اور بشارتِ اولاد کے بعد بھی فرمایا اصل بات بتاؤ آنے کی وجہ حقیقی کیا ہے ؟ اہلِ لفظ اگرچہ تمام واقعاتِ عالم کو حقیقتاً فاعلِ حقیقی کی قدرت بے ہمتا سے وابستہ سمجھتے ہیں اور کارسازِ حقیقی کو ہر تغیر و تصرف اور عمل کا مختار و قادر جانتے ہیں ۔ مگر عالمِ اسباب میں رہنے کی وجہ سے وہ کل واقعات قدرت کو اسباب کی زنجیروں سے جکڑا ہوا یقین رکھتے ہیں ۔ وہ جانتے ہیں کہ اگرچہ خدا سب کچھ کر سکتا ہے ، مگر ہر چیز کا اسی نے ایک سبب بھی بنا دیا ہے ۔ عموماً ہر نتیجہ کو اسباب سے وابستہ کیا ہے اسی بناء پر جب فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کو اولاد کی بشارت دی تو آپ نے ازراہِ تعجب (نہ ازراہِ انکار) اپنی پیرانہ سالی کو پیش کیا اور فرمایا میں بوڑھا ہو چکا اب کیا تم مجھے اولاد کی خوش خبری دیتے ہو ، لیکن اہلِ باطن کو چونکہ یہ بات دکھتی ہے کہ اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والا اور مبادی سے نتائج کو وابستہ کرنے والا اس بات پر بھی قادر ہے کہ بغیر سبب نتیجہ پیدا کر دے ۔ خصوصاً فرماں بردار بندوں کے لئے وہ اپنے عمومی ضابطہ کو کبھی توڑ دیتا ہے ۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا میں اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوں ۔ ناامید تو وہی لوگ ہوتے ہیں جو حقیقت سے ناآشنا ہوں یا ناواقفِ رموز ہوں ۔ رحمتِ بلاسبب کا انکار نہیں کر سکتا ۔ آیت فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ الخ بتا رہی ہے کہ اہل کا اطلاق بیوی بچوں پر تو ہوتا ہی ہے ، مگر دیگر پیروی کرنے والوں پر بھی ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ جب حضرت لوطؑ کو حکم ہوا کہ اس بستی سے نکل جاؤ اور آگے آگے اپنے اہل کو کر لو ان کے پیچھے خود چلو اور منہ پھیر کر پیچھے نہ دیکھو تو اس جگہ لفظ أَدْبَارَهُمْ میں جمع کی ضمیر استعمال کی ۔ حالانکہ حضرت لوطؑ کی صرف دو لڑکیاں تھیں لڑکا کوئی نہ تھا ۔ بیوی ساتھ نہ تھی ۔ دو لڑکیوں کی طرف جمع کی ضمیر راجع نہیں ہو سکتی ۔ معلوم ہوا کہ کچھ لوگ اور بھی تھے ۔ خواہ وہ خادم ہوں یا قوم کے بعض افراد جو حضرت لوطؑ پر ایمان لے آئے تھے ۔

لفظ وَاتَّبِعْ دلالت کر رہا ہے کہ امامِ قوم کے لئے لازم ہے کہ سب کو سمیٹ کر لے کر چلے تاکہ کوئی کمزور ، اپاہج ، بوڑھا ، بچہ ، بیمار وغیرہ رہ نہ جائے ۔ حضورِ اقدسؐ بھی جب لشکر کے ساتھ تشریف لے جاتے تو قلبِ لشکر میں نہ چلتے بلکہ دائیں بائیں کنارے پر چلتے تاکہ سب کی حالت کا معائنہ کرتے جائیں ۔ اس آیت کے ضمنی مفہوم سے عرب بخوبی آگاہ ہیں ہے ۔ شاہانِ عجم کے دستور پر جو قلب میں خود رہتے ہیں اور تمام ہمراہیوں کو اپنے جلوس میں چلاتے ہیں ۔

آیت وَلَا يَلْتَفِتْ مِنكُمْ الخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکمِ الٰہی کی تعمیل میں انسان کو ہمہ تن غرق ہو جانا چاہیے ۔ چون و چرا اور جگہ جگہ تانکنا خلافِ بندگی ہے ۔ جدھر کو جانے کا حکم ملا ادھر کو چل دے جو امر ہو اس کی تعمیل بلاتاخیر اور بلاتامل واجب ہے ۔ اس آیت سے ایک اشارہ اس طرف بھی ہے کہ نزولِ عذاب کی کیفیت دیکھنا اور منزلِ عذاب پر ٹھہرنا جائز ہے ۔ نزولِ عذاب کے دیکھنے سے یا طبیعت میں رقت پیدا ہوگی اور بعض افراد کی ہلاکت پر رحم آئے گا یا طبیعت خوش ہوگی ۔ بہرحال اعدائے الٰہی کی تباہی پر رحم کھانا یا نزولِ عذاب کو اپنے لئے باعثِ تفریح سمجھنا دونوں جائز نہیں ۔ آیت لَعَمْرُكَ الخ دو باتوں پر دلالت کر رہی ہے ۔ رسولِ پاکؐ کی عظمتِ شان اور اعزاز و تکریم بھی اس سے معلوم ہوتی ہے اور اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ جسمانی طاقت ، عیش و طرب ، دولت و مرتبت ، عزت و حکومت وغیرہ کا نشہ آدمی کو اندھا کر دیتا ہے ۔ اس کو بدمستی کے وقت نتیجہ کی اچھائی برائی نہیں سوجھتی ۔

ہدایتِ خاص

بعض اہلِ ظاہر کہتے ہیں کہ عذابِ الٰہی سلسلۂ اسباب سے خارج ہے جتنی اقوامِ پارینہ پر عذاب آیا وہ بغیر اسباب کے آیا ۔ مگر ان کا قول محض دعویٰ ہے اس پر کوئی دلیل نہیں ۔ اسباب دو قسم کے ہوتے ہیں ۔ ظاہر و پوشیدہ ۔ پوشیدہ اسبابِ ہلاکت تو کفر و معصیت اور تمرد و سرکشی اور ظاہری اسباب مختلف ذرائع مثلاً زلزلہ ، طوفانِ آب و باد ، کسی ظالم حکومت کی سفاکی ،

امراض عام وغیرہ۔ ہر قوم کا پوشیدہ اسباب کے تحت ہلاک و برباد ہونا تو ظاہری ہے، مگر ظاہری اسباب بھی ان کی تباہی کا ذریعہ ضرور بنے۔ خلاً قوم لوط کے کفر و معصیت کی وجہ سے خدا تعالیٰ نے ان پر مادی عذاب مسلط کیا۔ اُن فرشتوں کو مامور کیا گیا جو کائنات ارضی پر موکل تھے۔ موکل فرشتوں نے نزول عذاب کا انتظام کیا۔ شکم زمین کے اندر جو آتش گیر اور زہریلے مواد پیدا کرنے والی چیزیں تھیں ان کو بروئے کار لائے۔ زلزلہ آیا، زمین پھٹی، گڑگڑاہٹ پیدا ہوئی، پہاڑوں کے ٹکڑے اُڑ گئے، کل طبقہ اُلٹ گیا، پتھر جل جل کر کھنگر بن گئے پارہ پارہ ہو کر اُڑے، اُڑ کر گرے اور کل بستیاں تباہ ہو گئیں، لیکن جن لوگوں کی نجات مقصود تھی ان کو پہلے سے اطلاع دے دی گئی وہ بچ کر نکل گئے۔

وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَیْكَةِ لَظٰلِمِیْنَ ۙ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ

اور بے شک ایکہ کے رہنے والے بھی ظالم تھے ہم نے اُن سے بھی انتقام لیا یہ دونوں بستیاں کھلے شاہ عام

مُّبِیْنٍ ؕ۠ وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِیْنَ ۙ وَاٰتَیْنٰهُمْ اٰیٰتِنَا

پر واقع ہیں اور حجر والوں نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا تھا اور ہم نے اُن کو نشانیاں دی

فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ۙ وَكَانُوْا یَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا اٰمِنِیْنَ

تھیں مگر وہ اُن سے روگرداں رہے اور وہ بےخوفی سے پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے تھے

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ مُصْبِحِیْنَ ۙ فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ؕ

اُن کو بھی صبح ہوتے ہوتے ایک چنگھاڑ نے پکڑ لیا اور جو کچھ وہ کماتے تھے اُن کے بالکل کام نہ آیا

تفسیر گزشتہ آیات میں حضرت ابراہیمؑ و حضرت لوطؑ کا قصہ بیان فرمایا تھا تاکہ بصیرت افروز نگاہ رکھنے والے غور کریں کہ اللہ اپنے نیک بندوں کو بغیر ظاہری اسباب کے بھی نوازتا ہے اور تباہ کار سرکش کافر باوجود ظاہری اسباب نہ ہونے کے بھی تباہ کر دیئے جاتے ہیں۔ ان آیات میں حضرت شعیب اور حضرت صالح کی اقوام کا تذکرہ کر کے گزشتہ مقصود کی در پردہ تبلیغ فرمائی۔

ضحاک و قتادہ کہتے ہیں کہ ایکہ کے معنی ہیں گنجان گھنے درخت۔ باجماع مفسرین یہ حضرت شعیبؑ کی قوم تھی۔ ابن مردویہ اور ابن عساکر نے بروایت ابن عمرو مرفوعاً بیان کیا تھا کہ اہل مدین اور اصحاب الایکہ جدا جدا قومیں تھیں۔ دونوں کی ہدایت کے لئے حضرت شعیبؑ کو ہی نبی بنا کر بھیجا گیا تھا۔

اصحاب الایکہ اور اہل مدین دونوں ظالم تھے، مشرک بھی تھے، رہزنی بھی کرتے تھے اور ناپ تول میں بے ایمانی بھی کرتے تھے۔ حضرت شعیبؑ نے ان کو سمجھایا نہ مانا۔ سرکشی اور تکذیب کی تو عذاب نازل ہوا۔ سات روز سخت گرمی پڑی، دم گھٹنے لگے، جانیں لبوں پر آگئیں۔ آٹھویں روز ابر کا ایک ٹکڑا اٹھا لوگوں کو بارش کی امید ہوئی۔ بامید بارش جنگل کو چل دیئے۔ لیکن مینھ کی بجائے ابر سے آگ کے شعلے برسے، سب جل کر خاکستر ہو گئے۔ مدینہ سے شام کو جانے والی سڑک کے دائیں جانب تباہ کار قوم کے آثار دکھتے ہیں۔ اللہ نے یہ سزا ان کی بدکاری کی پاداش میں دی۔ اگرچہ خدا تعالےٰ جذبۂ انتقام سے پاک ہے۔ نفس و نفسانیات اور نفسانی قوتوں کا وہاں دخل نہیں، لیکن نزولِ عذاب چونکہ ظاہری بصورت انتقام ہوا تھا اس لئے مجازاً اس کے لئے اِنْتَقَمْنَا کا لفظ استعمال کیا گیا۔

اصحاب حجر سے مراد قوم ثمود ہے۔ عرب کو بحیثیت تاریخ و زمانہ تین دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اول دور عرب عاربہ جو عرب بائیدہ کہلاتا ہے۔ عرب

بائدہ کے مختلف قبائل تھے۔ عاد، ثمود، طسم، جدلیس، جرہم اولیٰ وغیرہ۔ اس دَور کے مفصل حالات نہ تورات میں ملتے ہیں نہ تاریخ میں۔ صرف عاد و ثمود کے مختصر احوال کہیں کہیں نظر آتے ہیں تو وہ بھی غیر مربوط۔ دوسرا دَور قحطانی عربوں کا تھا۔ قحطان کو تورات میں یقطان کہا گیا ہے۔ سام بن نوح کی اولاد میں سے ایک شخص عابر تھا۔ عابر کا بیٹا قحطان تھا۔ قحطان کی سکونت یمن میں تھی۔ یمن سے اس کی نسل پھیلی اور حجاز، تہامہ، شام، عراق وغیرہ میں منتشر ہوئی۔ قحطان ہی کی آخری شاخ میں جرہم ثانی کا قبیلہ تھا جو معاش کی جستجو میں وادیٔ مکہ میں پہنچے تھے۔ اسی خاندان کی لڑکی سے حضرت اسمٰعیل کی شادی ہوئی تھی۔ تیسرا دَور بنی اسمٰعیل کا ہے۔ اس دور کو عرب مستعربہ کا دَور کہا جاتا ہے۔ عرب مستعربہ کی نسل میں سے قریش تھے۔ اب ہم اصل مدعا پر آتے ہیں۔

قوم ثمود جو عرب بائدہ کی ایک شاخ تھی۔ غیر متمدن اور غیر ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے اس زمانے کی طرح اینٹ مٹی پتھر کے مکان بنا کر نہیں رہتی تھی بلکہ پہاڑوں میں غار کھود کر اور بھٹ بنا کر رہتی تھی۔ قد بھی ان کے بہت دراز تھے۔ بقول ابن جریر مدینہ اور شام کے درمیان وادیٔ حجر اور وادیٔ قرٰی میں ان کی سکونت رہتی تھی۔ خدا تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے حضرت صالح کو نبی بنا کر بھیجا۔ انھوں نے تکذیب کی اور معجزہ طلب کیا۔ اونٹنی بطور معجزہ پہاڑ سے پیدا ہوئی۔ مفصل قصہ ہم سورۂ اعراف میں لکھ چکے ہیں مکرر لکھنا موجبِ طوالت ہے۔ بالآخر عذابِ الٰہی آیا۔ اوّل ایک زلزلہ پیدا ہوا جس کو قرآن پاک میں ایک جگہ رَجْفَہ کہا گیا ہے۔ پھر سخت ترین چیخ اور دھماکہ پیدا ہوا سب مر گئے۔ قوم ثمود کے کچھ افراد مسلمان ہو گئے تھے انھوں نے اپنی بستی الگ بنائی تھی۔ ان کا کنواں بھی علیحدہ تھا۔ غزوۂ تبوک کو جاتے وقت جب حضور اقدس ﷺ کا گذر وادیٔ حجر کی طرف سے ہوا تو حضورؐ نے سر نیچا کر لیا اور سواری کو تیز کر دیا اور صحابہ سے فرمایا جو بستی عذابِ الٰہی سے ہلاک کر دی گئی ہے اس کی طرف مت جاؤ اور ادھر سے گزرو تو روتے ہوئے۔ اگر رونا نہ آئے خوفِ الٰہی سے روتی شکل بنالو تاکہ وہ عذاب جو ان پر آیا تھا کہیں تم پر نہ آجائے۔ قوم ثمود کے کنوؤں سے بعض صحابہ نے پانی بھر کر اس سے آٹا گوندھا اور ہانڈیاں پکائی تھیں۔ حضورؐ نے ہانڈیاں الٹوا دیں اور آٹا اونٹوں کو کھلوا دیا اور آگے بڑھ کر وہاں قیام کیا جہاں حضرت صالح اور ان کے ساتھی مومن رہتے تھے وہیں سے پانی بھرا اور استعمال کیا۔

مقصودِ بیان حق اللہ اور حق العباد دونوں کا تلف کرنا ظلم کہلاتا ہے۔ قوم شعیبؑ مشرک بھی تھی، رہزن بھی تھی اور ناپ تول میں بے ایمانی بھی کرتی تھی۔ انھیں تینوں وجوہ سے اس کو ظالم فرمایا۔ عذابِ الٰہی کو انتقام کہا جا سکتا ہے کہ فَانْتَقَمْنَا کے لفظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کا عذاب بلا وجہ نہیں آتا بلکہ اعمال کی پاداش ہوتی ہے۔ ایک پیغمبر کی تکذیب درحقیقت کل پیغمبروں کی تکذیب ہے، اس لئے قوم صالح کے متعلق فرمایا کہ اس نے پیغمبروں کی تکذیب کی باوجودیکہ اس نے صرف حضرت صالح کی تکذیب کی تھی۔ اللہ کی نشانیوں سے عبرت حاصل نہ کرنا اور آیاتِ قدرت پر غور و خوض نہ کرنا اور ان سے صحیح نتیجہ اخذ نہ کرنا ہی اعراض و روگردانی ہے۔ نشاناتِ قدرت کو آنکھوں سے دیکھنا کافی نہیں بلکہ نورِ بصیرت سے دیکھنا لازم ہے۔ قوم ثمود نے آیاتِ قدرت کو آنکھوں سے دیکھا، مگر نورِ بصیرت سے نہ دیکھا گویا روگردانی کی۔ اس میں مسلمانوں کے لئے دیدہ پیامِ ہدایت ہے کہ تم کو بھی اقوام کے عروج و زوال اور واقعاتِ عالم کو نظرِ عبرت کوش اور بصیرت افروز نگاہ سے دیکھنا اور غور کرنا چاہیئے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ السَّاعَةَ

ہم نے　آسمان و زمین　اور　ان کی　درمیانی چیزیں　مصلحت ہی سے　پیدا کی ہیں　اور کچھ شک نہیں کہ قیامت

لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ۝

آنے والی ہے　لہٰذا تم　ان سے بحُسنِ اسلوب　درگزر کرو　بلاشبہ تمہارا رب　پیدا کرنے والا　واقف کار ہے

تفسیر گزشتہ انبیاء اور ان کی اقوام کے احوال سن کر منکرانِ حق کے دماغوں میں تین طرح کے اوہام پیدا ہو سکتے تھے اور ہوتے ہی ہیں۔

(۱) یہ تو آسمان و زمین کے حوادث ہیں، اتفاقات ہیں، اقوام کا عروج و زوال زمانہ کا تابع ہے۔ ترقی کے بعد تنزل، شادابی کے بعد خشکی اور آبادی کے بعد بربادی اضطراری چیز ہے۔ اس میں نافرمانی اور فرماں برداری کو کچھ دخل نہیں۔ اس وہم کا ازالہ فرماتا ہے کہ حوادث و تغیرات کو اتفاق کہنا غلط ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق خلافِ مصلحت نہیں۔ اللہ نے ان کو بے کار نہیں پیدا کیا۔ ہر ایک کی پیدائش کے نتائج و مصالح ہیں۔ دنیا میں ہلاکت و بقاء، عروج و زوال، آبادی و بربادی مصلحت و حکمت کے تحت ہوتی ہے۔ قانونِ قدرت کے ذیل میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ ہر فعل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ اچھے فعل کا اچھا نتیجہ اور برے عمل کا برا نتیجہ۔

(۲) دوسرا شبہ یہ پیدا ہو سکتا تھا کہ اچھا اگر یہ سب یہ اعمال و افعال کا ہی نتیجہ ہے۔ دنیا کی تعمیر و تخریب اتفاقی نہیں بلکہ نیکی بدی اور نافرمانی و فرماں پذیری ہی کے تحت ہوتی ہے تو بس نتیجہ حاصل ہو چکا جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ ہر کام کا نتیجہ اسی زندگی میں مل گیا آئندہ زندگی کی ضرورت نہیں اور اگر آئندہ زندگی تسلیم بھی کر لی جائے تو وہ اسی دنیا میں ہوگی۔ مرنے کے بعد انسان اپنے اعمال کے مطابق دوسرا جنم لے گا اور یوں ہی تناسخ و آواگون کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس کا جواب دیتا ہے کہ دنیا نہ تو کامل طور پر محل ثواب و عذاب ہے اور نہ فقط دار العمل۔ نافرمانوں کی بربادی تو صرف عبرت حاصل کرانے کے لئے ہوتی ہے ورنہ جزا سزا کا تو ایک اور وقت معین ہے، اس لئے کہ عمل کا زمانہ ختم ہونے کے بعد نتیجہ کا دور آنا چاہیئے۔ دنیا کے اوقات عمل کے اوقات ہیں۔ ان میں کل اعمال کی جزا سزا خلافِ دانش ہے اس کے لئے تو ایک وقت ہونا چاہیئے اور وہ وقت ضرور آئے گا۔

(۳) کفار چونکہ عجلت پسند تھے۔ جزا سزا اور عذاب ثواب فوراً چاہتے تھے۔ اور جب فوری پاداش نہ ملتی تھی اور قیامت پر موقوف کو موقوف رکھا جاتا تھا تو قیامت کا مذاق اڑاتے تھے۔ کیسی قیامت کیسا دار آخرت یہ سب ڈھکوسلے ہیں، توہمات ہیں۔ بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ آدمی کی خاک ہو جائے خاک کے ذرات منتشر ہو جائیں اور پھر تمام ذرات کو جمع کر کے دوبارہ انسان کو بنا لیا جائے۔ ذرات کہاں کہاں گئے۔ پانی میں ملے ہواؤں میں اڑے۔ مٹی میں شامل ہوئے کس کو معلوم۔ کس کے پاس اس کا حساب ہے کون ان کو جمع کر سکتا ہے؟ اس کے جواب میں اولاً رسول پاک کو تسلی دیتا ہے کہ ان کی بیہودہ گوئی سے آپ چشم پوشی اور درگزر کریں۔ ایسے نادان احمقوں کی کسی بات کا اثر نہ لیں۔ خوش خلقی اور تحمل سے کام لیں۔ اس کے بعد اصل شبہ کو دفع فرماتا ہے کہ اللہ یقیناً خالق ہے وہ ہر طرح کی تخلیق کر سکتا ہے۔ اس کو ہر چیز کا علم ہے وہ خوب واقف ہے کہ ذراتِ خاکی کہاں کہاں ہیں۔ کس طرح ان کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ وہی سب کو جمع کرے گا۔ وہی دوبارہ پیدا کرے گا۔

آیت فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ کی تفسیر میں مجاہد وغیرہ وغیرہ ہمانے کہا کہ یہ حکم اس وقت تک کے لئے تھا جبکہ جہاد کا وجوب نہ ہوا تھا۔ عام علماء کہتے ہیں کہ آیت جہاد میں اور اس آیت میں کوئی تعارض ہی نہیں کیونکہ اس آیت میں رضائے الٰہی کے موافق خوش خلقی برتنے کا حکم دیا گیا ہے اور جہاد بھی رضائے الٰہی کی ایک شاخ ہے۔

مقصود بیان آیاتِ قدرت اور تغیراتِ ارضی و سماوی پر غور کرنے کی در پردہ دعوت۔ ان لوگوں کو جو عبرت کوش نظر اور نصیحت آگیں بصیرت رکھتے ہیں۔ قیامت کی حقانیت کی صراحت، اور حروف تاکیدی سے ضرورت قیامت کی طرف اشارہ۔ مناسب چشم پوشی اور موقع کے مطابق درگزر کرنے کا حکم وغیرہ۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِىْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝ لَا تَمُدَّنَّ

ہم نے تم کو	سبع مثانی	(سورۂ حمد)	اور	قرآن عظیم	عطا کیا	ہے	اور جن	چیزوں سے

عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ

ان لوگوں کو بہرہ مند کیا ہے تم ان پر اپنی نظر نہ ڈالو اور اُن کا غم نہ کرو اور اپنے بازو

جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ

مسلمانوں کے لئے جھکا دو اور کہہ دو کہ میں کھلے طور پر ڈرانے والا ہوں

تفسیر سبع مثانی اور قرآن عظیم سے کیا مراد ہے؟ علماء و صحابہ کا اس میں اختلاف ہے۔ ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، مجاہدؒ، سعید بن جبیر، ضحاک وغیرہم کا خیال ہے کہ سبع مثانی سے مراد ہے سات طویل سورتیں یعنی سورۂ بقرہ، آلِ عمران، نساء، انعام، مائدہ، اعراف، یونس اور قرآن عظیم سے مراد باقی قرآن یا قرآن سے پورا قرآن مراد ہے اور سبع مثانی سے سبع طوال اور یہ ساتوں سورتیں بھی قرآنِ عظیم کا جُز ہیں۔ شعبہ نے کہا چونکہ ان سورتوں میں فرائض، حدود، قصص اور احکام مکرر بیان فرمائے ہیں، اس لئے ان کو مثانی (مکرر) فرمایا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا ان سورتوں میں امثال، اخبار اور مضامین عبرت کو مکرر بیان فرمایا ہے۔ سفیان بن عیینہ کا قول ہے کہ بجائے یونس کے انفال و براءۃ ملاکر ایک سورۃ ہے۔ اس قول پر بقرہ، آلِ عمران، نساء، مائدہ، انعام، اعراف اور انفال و براءۃ یہ سات سورتیں ہوئیں۔ ابن عباسؓ نے فرمایا حضرت موسیٰ کو ان میں سے دو یا چھ سورتیں دی گئی تھیں، مگر ساتوں کا مجموعہ سوائے حضورؐ کے کسی اور پیغمبر کو نہیں عطا کیا گیا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ سبع مثانی سے مراد مذکورۂ بالا سات طویل سورتیں ہیں اور قرآن عظیم سے مراد بھی یہی سات سورتیں ہیں۔

حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، نخعی، عبداللہ بن عبید، ابن ابی ملیکہ، شہر بن حوشب، حسن بصری، قتادہ وغیرہم کا قول ہے اور ابن مسعودؓ و ابن عباسؓ سے بھی ایک روایت ہے کہ سبع مثانی سے مراد سورۂ فاتحہ ہے جس کی سات آیات ہیں۔ پہلی آیت بسم اللہ ہے اور قرآن عظیم سے بھی مراد یہی سورت ہے۔ حضرت ابوسعید بن معلیٰ کی روایت ہے کہ میں نماز پڑھ رہا تھا حضور اقدسؐ تشریف فرما ہوئے مجھے آواز دی میں نماز ختم کر کے خدمت میں حاضر ہوا۔ ارشاد فرمایا تو میرے پاس کیوں نہ آیا؟ میں نے نماز میں مشغول ہونا ظاہر کیا۔ فرمایا کیا خدا تعالیٰ نے نہیں فرما دیا ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ۔ پھر فرمایا مسجد سے میں جانے سے قبل تجھے ایک عظیم الشان سورۃ بتاؤں گا۔ بالآخر جب حضورؐ مسجد سے تشریف لے جانے لگے تو میں نے یاد دلائی۔ فرمایا (ہاں) الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ یہی سبع مثانی ہے اور قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا ام القرآن ہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے۔ (رواہ البخاری فی صحیحہ) ان دونوں روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ سبع مثانی سے مراد سورۂ فاتحہ ہے اور قرآن عظیم سے مراد باقی قرآن۔ لیکن چونکہ بقول حسن بصری و حسب تصریحات علمائے تفسیر سورۂ حمد پورے قرآن کا نچوڑ اور خلاصہ ہے اس قول پر تمام علماء کے اقوال میں مطابقت ہو جائے گی۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ ایک شبہ کیا جاتا ہے کہ یہ سورت (یعنی حجر) مکی ہے اور سبع مثانی سے اگر سات طویل سورتیں مراد لی جائیں تو ان میں سے اکثر مدنی ہیں اور سورۂ فاتحہ مراد لی جائے تو وہ بھی قوی روایت کے بموجب مدنی ہے پھر یہ کہاں تک صحیح ہے کہ جو سورتیں آئندہ نازل ہونے والی تھیں ان کے متعلق پیشتر ہی سے یہ کہہ دیا گیا کہ ہم نے تم کو عطا کر دیں۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ترتیب نزولی قابلِ اعتبار نہیں جیسا موقع ہوا اور جو ضرورت پیش آئی اسی کے مطابق آیات و احکام کا نزول ہوا۔ اصل میں قابلِ اعتبار لوحِ محفوظ یا علم الٰہی کی ترتیب ہے اور علم الٰہی میں سورۃ الحمد یا سبع طوال اس سورت سے مقدم تھیں اسی لئے ماضی کا صیغہ استعمال کیا گیا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اے مسلمانو! (خطاب اگرچہ رسول اللہ کو ہے، مگر روئے خطاب ہر مومن کی طرف ہے) تم کافروں کے جنت درجنت

مال کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔ ان سے ایسے مال کی تمنا نہ کرو کیونکہ ہم نے تم کو سرچشمۂ ہدایت اور مخزن تونگری دے دیا ہے۔ قرآن پاک اور خصوصاً قرآن کی وہ مخصوص سورتیں جن کو سبع مثانی کہا جاتا ہے تم کو عطا کی ہیں۔ کافروں کے تمام مال و منال سے قرآن کی ہدایات کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں ابن عباسؓ نے فرمایا اس آیت میں دوسرے کے مال پر نظر ڈالنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس آیت کی وجہ نزول حضرت ابو رافع نے اس طرح بیان کی ہے ایک روز حضور اقدس کے پاس کچھ مہمان آئے۔ حضور کے پاس ان کی میزبانی کے لئے کچھ نہ تھا مجھے حکم دیا کہ فلاں یہودی سے جا کر کہو کہ محمد رسول اللہ ﷺ تم سے آٹا قرض طلب کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ رجب کا چاند دیکھنے پر (قیمت) ادا کر دوں گا۔ میں نے یہودی سے جا کر کہا۔ اس نے جواب دیا جب تک کوئی چیز گرو نہ رکھو میں نہیں دے سکتا۔ میں نے واپس آکر خدمت گرامی میں جواب عرض کر دیا۔ ارشاد فرمایا ہاں یہ تو قطعی بات ہے کہ وہ خدا جو آسمان و زمین میں ہے میں اس کا امین ہوں۔ اگر وہ قرض دے دیتا تو میں (مقررہ وقت پر) ضرور ادا کرتا۔ اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی (رواہ ابن ابی حاتم باسنادہ)

اس کے بعد فرماتا ہے کہ ان کافروں کی تباہی کا غم نہ کرو بلکہ مسلمانوں سے ہمدردی، شفقت اور نرمی کرو یعنی اے نبی آپ کا کام سنانا، سمجھانا اور برے بھلے کی خبر دینا ہے۔ جو لوگ راہ راست پر آجائیں ان سے آپ ہمدردی کریں اور جو سرکشی کریں ان کا غم نہ کریں۔ تباہ ہوتے ہیں ہونے دیں آپ کو اس کی فکر نہ کرنی چاہیئے۔

مقصودِ بیان دنیا داروں کی کثرتِ مال کی کوئی پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔ ان کی دولت مندی، فراخ حالی، خوش عیش زندگی کو دیکھ کر لالچ اور آرزوؤں کو دل میں بھی نہ آنے دینا چاہیئے۔ روحانی سعادت اور قرآنی ہدایت مادی دولت و ثروت سے کہیں وزنی ہے۔

ہمدردی اور شفقت کا انحصار محض مسلمانوں سے ہونا چاہیئے۔ جو لوگ دشمنِ دین ہیں ان کی ہمدردی خلافِ شرع ہے وغیرہ۔

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ۝

جس طرح ہم نے اُن لوگوں پر (عذاب) نازل کیا تھا جنھوں نے (کتاب الٰہی کے) ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے

فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ فَاصْدَعْ

تو قسم ہے تمہارے رب کی ہم ضرور ان سب سے ان کے اعمال کی بازپرس کریں گے پس جو کچھ

الربع

بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۝

تم کو حکم دیا جا رہا ہے اُس کو کھول کر سنا دو اور مشرکوں سے اعراض کر لو تمہاری طرف سے ہم ان ہنسی اڑانے والوں کو کافی ہیں

الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَقَدْ نَعْلَمُ

جو اللہ کے ساتھ دوسرا معبود قرار دیتے رہتا اُن کو آگے معلوم ہو جائے گا ہم کو معلوم ہے کہ

اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ

اُن کی باتوں سے تمہارے دل میں کبیدگی پیدا ہوتی ہے سو تم اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرو اور سجدہ کرنیوالوں

السّٰجِدِيْنَ ۙ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿ع﴾

رکوع ۶

میں شامل ہوجاؤ اور وقتِ مرگ آنے تک اپنے رب کی عبادت کرو

تفسیر مُقْتَسِمِيْنَ سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس کے متعلق مختلف روایات اور متعدد اقوال ہیں :- (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کوئی بیرونی قافلہ مکہ میں آتا تو آپ شہر کے باہر تشریف لے جاکر اہلِ قافلہ سے ملتے، ان کو تبلیغ اسلام کرتے اور احکامِ الٰہی سناتے۔ ایک مرتبہ موسمِ حج میں مکہ کے بارہ کفار (ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، حارث بن قیس، اسود بن عبد یغوث، اسود بن عبد المطلب وغیرہ) نے باہم مشورہ کیا کہ مکہ کے بارہ راستے جدا جدا روک کر کھڑے ہو جاؤ۔ جو شخص بیرونی آئے اس کو اسلام کی طرف سے متنفر کرو۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ مختلف اشخاص راستوں کے دہانوں پر کھڑے ہو گئے جو شخص بیرونی ادھر سے آتا اس کو روکتے رسول اللہؐ کے پاس جانے سے منع کرتے۔ کوئی حضورؐ کو کاہن کہتا، کوئی کذاب، کوئی شاعر اور کوئی جادوگر۔ ولید بن مغیرہ سب کا سردار تھا۔ یہ کعبہ کے دروازہ پر جاکر بیٹھ گیا اور جو شخص آکر راستے والے شیطان کی گفتگو اس کے سامنے نقل کرتا تو یہ اس کی تصدیق کرتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اجنبی لوگ حضورؐ کے پاس جانے سے رک گئے اور مکہ کے کافروں نے سرکارِ عالیؐ کا مذاق اڑایا اور استہزاء کے طور پر قرآن کو بانٹنے لگے۔ کوئی کہتا مائدہ میں لوں گا عنکبوت تجھے دوں گا۔ کوئی کہتا آلِ عمران میری ہے بقرہ تیری ہے۔ انھیں لوگوں کے حق میں ان آیات کا نزول ہوا۔

(۲) ابن عباسؓ، مجاہد، حسن، ضحاک، عکرمہ، سعید بن جبیر اور بعض دیگر اکابر سے مروی ہے کہ مُقْتَسِمِيْنَ سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں جنھوں نے قرآن کے بعض حصوں کو مانا تھا اور بعض کو نہ مانا اور انکار کیا تھا گویا قرآن کے حصے بخرے کر لئے تھے یا قرآن سے انجیل و توراۃ مراد ہیں۔ علمائے اہلِ کتاب نے توراۃ و انجیل کے وہ احکام جو ان کے مطلب کے موافق تھے تسلیم کر لئے تھے، انھیں کو لوگوں پر ظاہر بھی کرتے تھے اور جو آیات خواہش کے خلاف تھیں ان کو چھپا لیتے یا بدل ڈالتے تھے یا مطلب اُلٹا بیان کرتے تھے۔ بہرحال کتبِ الٰہیہ کو انھوں نے پارہ پارہ کر دیا۔

اب ہم آیات کا تفسیری مطلب بیان کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے ان کافروں کے لئے ایسا ہی عذاب مقرر کیا ہے جیسا ان مقتسمین پر نازل کیا تھا جنھوں نے قرآن کو پارہ پارہ کر رکھا تھا یعنی جن مقتسمین نے قرآن کی سورتوں کو بطور استہزاء ٹکڑے کیا تھا اور عنکبوت، مائدہ، آلِ عمران، بقرہ وغیرہ کا مذاق اڑاتے تھے یا جن اہلِ کتاب نے اپنی مذہبی کتابوں کے بعض حصوں کو مانا اور بعض کو نہ مانا اور اس طرح ان کتابوں کا شیرازہ منتشر کر دیا اُن لوگوں کے لئے ہم نے عذاب نازل کیا۔ اسی طرح موجودہ کافروں میں سے ان لوگوں کو ہم دیکھ لیں گے جو تمہارا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس سے آگے ارشاد ہوتا ہے کہ ہم ان کے اعمال کی ان سے ضرور باز پرس کریں گے۔ انس بن مالکؓ کی روایت ہے حضورؐ نے آیت لَنَسْئَلَنَّهُمْ الخ کے متعلق فرمایا کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے متعلق باز پرس ہوگی۔ یعنی اعمال سے آیت میں توحید مراد ہے (رواہ الترمذی و ابن جریر و ابن ابی حاتم و ابن المنذر مرفوعاً و موقوفاً) ابن عمرؓ نے فرمایا کلمۂ توحید کی باز پرس سب سے ہوگی۔ ابن عباسؓ نے فرمایا ولید بن مغیرہ اور اس کے ساتھی جن کے حرکات و سکنات توحید کے منکر تھے اور دوسروں کو بھی انھوں نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے سے روکا تھا ان سے توحید کی باز پرس ہوگی۔ اگر آیت کو عمومی اقوال و احوال پر محمول کیا جائے تب بھی مطلب میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ اب حکمِ الٰہی کو علی الاعلان ظاہر کرو یعنی کسی سے ڈرنے اور جھجکنے کی ضرورت نہیں۔ وقت آگیا ہے کہ احکامِ الٰہی کی تبلیغ بر سرِ عام کرو۔ مشرکوں کا کچھ خیال مت کرو۔ ان کے استہزاء وغیرہ سے دل تنگ مت ہو۔ ابن عباسؓ کے قول سے ثابت ہے کہ اس آیت کے نزول سے قبل حضور اقدسؐ (موقع اور وقت کو دیکھ کر) چپکے چپکے تبلیغ فرمایا کرتے تھے۔ مصالحِ وقتی کے پیشِ نظر تبلیغ میں کمی بیشی فرماتے تھے۔ لیکن اس آیت کے نزول کے بعد حضورؐ اور حضور کے صحابہ علی الاعلان احکامِ الٰہی کا اظہار کرنے لگے۔ چونکہ ابتدا میں مسلمانوں کی حالت بہت ہی کمزور تھی اور تعداد بھی کالعدم تھی، اس لئے حضورِ عالاؐ کو اندیشہ تھا کہ اگر علی الاعلان توحید کا اظہار کیا گیا تو کفار میں سے عام لوگ مذاق اڑائیں گے اور مجموعی طاقت

کے ساتھ کمزور مسلمانوں کو دکھ پہنچائیں گے اور بعض بیچاروں میں اذیت کفار کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے، اس لئے حضور ﷺ چھپکے چھپکے تبلیغ کو ہی مناسب خیال فرماتے تھے اور علی الاعلان اظہار کے لئے وقت خاص اور حکم خاص کے منتظر تھے۔ چنانچہ جب حکم اظہار نازل کیا تو آپ نے علی رؤس الاشہاد تبلیغ شروع کر دی۔

اس سے آگے رسول پاک ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ تمہاری طرف سے ان ہنسی مذاق کرنے والوں کے لئے ہم کافی ہیں۔ عنقریب ان کو اپنی حرکات کے نتائج معلوم ہو جائیں گے یہ دنیوی و اخروی عذاب کی دھمکی ہے۔ چنانچہ یہ وعید پوری بھی ہوئی۔ اسود بن عبد یغوث استسقاء سے مرا۔ ولید بن مغیرہ کے ٹخنے کے پاس زخم کا نشان تھا وہ اچھا ہو کر پھر کھل گیا اور پھوٹ نکلا اور اسی تکلیف سے یہ مر گیا۔ عاص بن وائل کے تلوے میں کانٹا چبھ گیا اور اسی سے اس کا انتقال ہو گیا۔ حارث بن قیس کے پیٹ میں پیپ پڑ گئی اور وہ مر گیا (عروہ کی روایت میں حارث بن طلاطلہ ہے اور سعید بن جبیر کی روایت میں حارث بن غیطلہ اور عکرمہ کی روایت میں حارث بن قیس۔ درحقیقت حارث کے باپ کا نام قیس تھا اور ماں کا نام غیطلہ یا طلاطلہ تھا) اسود بن عبد المطلب یعنی ابو زمعہ اندھا ہو کر مرا۔ عام اہل تفسیر کا قول ہے کہ آیت مذکورہ میں یہی پانچوں سرداران کفر مراد ہیں، مگر شعبی نے سات کا تذکرہ کیا ہے۔

چونکہ کفار کے استہزاء اور پیام حق کا مذاق اڑانے سے حضور اقدس ﷺ دلگیر ہو جاتے تھے، اس لئے آگے بطور تسلی فرماتا ہے۔

ہم واقف ہیں کہ ان کے (استہزائیہ) اقوال سے تم دلگیر ہو جاتے ہو، مگر آپ کو کچھ فکر نہ کرنی چاہیئے بلکہ ان کے خیالات کو چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے وہ پاک پروردگار ہے اس کی پاکی پر نظر کرو گے تو یہ افکار دور ہو جائیں گے۔

یقین سے مراد باجماع مفسرین موت ہے۔ بخاری نے بروایت سالم بن عبد اللہ بن عمر بیان کیا کہ یقین موت ہے، مجاہد، حسن، قتادہ، عبد الرحمن بن زید وغیرہم کا بھی یہی قول ہے۔ بعض جاہل صوفیہ نے یقین سے مراد معرفت لی ہے یعنی جب تک معرفت حاصل نہ ہو عبادت کرو۔ معرفت کے حصول کے بعد عبادت کی ضرورت نہیں۔ گویا عارف باللہ فرائض سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے اور حصول معرفت کے بعد سب عبادت ساقط ہو جاتا ہے، مگر وہ انتہائی بے دینی اور جہالت ہے۔ اجماع مفسرین کے خلاف ہے۔ حصول عرفان کے بعد تو شوق و ذوق عبادت اور بڑھ جاتا ہے۔ فرائض کا ساقط ہونا تو بجائے خود رہا۔

مقصود بیان

کل احکام الٰہی کو سچا ماننا فرض ہے۔ بعض کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا کفر ہے۔ رسول پاک ﷺ کی توہین کرنی اور ہنسی اڑانی موجب عذاب ہے۔ آدمی کی اکثر طبیعت اس طور پر ہے کہ کلمہ حق کو سننا گوارا نہیں کرتا بلکہ اپنے خیالات، عقائد، رسم و رواج اور عادات و اطوار کو حق سمجھتا ہے۔ نیک اور سنجیدہ اقوال کی ہنسی اڑاتا ہے۔ عظیم الشان تبلیغ بھی ان کی زبان درازیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ لہٰذا موجودہ دور کے ان مسلمانوں پر بھی لازم ہے جو علم اصلاح بلند کر رہے ہیں اور قوم کی حالت درست کرنی چاہتے ہیں کہ جاہلوں کی شعر تحقیر نکتہ چینی و خوردہ گیری کی پرواہ نہ کریں بلکہ اصلاح کی کوشش کئے جائیں۔ آخری آیات سے واضح ہے کہ ہجوم افکار کے وقت عبادت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، اس سے سکون روح حاصل ہوتا ہے اور غموم و ہموم کی گھٹا چھٹ جاتی ہے۔ انسان جب تک زندہ ہے عبادت الٰہی واجب ہے اور اسی طریقے سے شریعت نے تعلیم دی ہے۔

سُوْرَةُ النَّحْلِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَةٌ وَّثَمَانٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّسِتَّةَ عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۂ نحل مکہ میں نازل ہوئی — اس میں ایک سو اٹھائیس آیتیں — اور سولہ رکوع ہیں

اس سورۃ کا نام سورۃ نعم بھی ہے کیونکہ اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ اس میں بکثرت ہے۔ آغاز میں ہی گوناگوں نعمتوں کا بیان کیا گیا ہے۔ اس میں سولہ رکوع۔ ۱۲۸ آیات۔ ۱۸۷۱ کلمات اور ۷۹۷ حروف ہیں۔

حسن بصری، عطاء، عکرمہ اور جابر کے قول کے مطابق یہ پوری سورت مکی ہے۔ ابن زبیر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آخر کی تین آیات یعنی وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ سے يَعْمَلُوْنَ تک مستثنیٰ کی ہیں اور صراحت کی ہے کہ یہ آیات کوہ احد سے واپسی کے وقت نازل ہوئیں۔ قتادہ نے پانچ آیات کا استثنا کیا ہے

یعنی آیت وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا اور ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا اور وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا سے آخر سورت تک۔ مقاتل نے ان پانچ کے ساتھ آیت مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ الخ اور ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً کو بھی مکی ہونے سے خارج کیا ہے۔ بعض لوگ پوری سورۃ کو مدنی کہتے ہیں۔ مگر یہ ضعیف قول ہے چونکہ شہد کی مکھی کا تذکرہ کر کے اللہ کی عظمت وکبریائی کو ثابت فرمایا ہے اس لئے اس سورت کا نام ہی سورۂ نحل ہوگیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ يُنَزِّلُ

اللہ کا حکم آپہنچا تم اس کی جلدی مت مچاؤ وہ پاک ہے اور اُن کی شرک انگیزیوں سے بالاتر ہے وہ اپنے

الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ اَنْذِرُوْۤا

بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے فرشتوں کو وحی دے کر بھیجتا ہے کہ (لوگوں کو) آگاہ کردو

اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝

کہ سوائے میرے کوئی معبود نہیں لہٰذا تم مجھ سے ڈرو

تفسیر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کفارِ مکہ کو بار بار عذابِ الٰہی اور روزِ قیامت سے ڈراتے تھے۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ عنقریب دنیا میں تم پر عذاب آنے والا ہے۔ علمبردارانِ کفر کو سچا یقین کیوں آنے لگا تھا۔ وہ کہتے محمد! تم جس عذابِ دنیا اور روزِ آخرت سے ہم کو ڈراتے ہو وہ کہاں ہے؟ ابھی تو نہیں آیا۔ اگر سچے ہو تو جلد سے جلد لاؤ ہم بھی دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ کافروں کا دوسرا قول یہ بھی تھا کہ اگر عذاب یا قیامت آ بھی گیا تو ہمارا کیا بگڑے گا ہمارے ہزاروں سفارشی ہیں بکثرت دیوتاؤں کی ہم پرستش کرتے ہیں، بھینٹ چڑھاتے ہیں، نذریں دیتے ہیں وہ ہم کو عذاب سے بچا لیں گے۔ ان کا تیسرا قول یہ بھی تھا کہ اگر بالفرض تم کو ہم سچا مان بھی لیں تو اس کی وجہ بتاؤ کہ فرشتے ہمارے پاس کیوں نہیں آتے ہم کو براہِ راست عذاب کی اطلاع کیوں نہیں دی جاتی۔ تم کو ہم پر کیا ترجیح ہے کہ تمہارے پاس فرشتے اللہ کا پیام لے کر آتے ہیں اور ہمارے پاس نہیں آتے؟ ان تینوں باتوں کا جواب مذکورہ آیات میں دیا گیا ہے۔

حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ عذابِ الٰہی گویا بہ عالمِ غیب میں آ چکا۔ خدا کا قطعی فیصلہ ہو چکا کہ تم پر عذاب آئے گا یعنی قیامت کا آنا اور تم پر عذاب ہونا اتنا یقینی اور قطعی ہے کہ اس کو گویا آیا ہوا سمجھو۔ یہ پہلے قول کا جواب ہوگیا۔ رہا دیوتاؤں کا سفارشی ہونا اور باطل معبودوں کا عذابِ الٰہی سے بچا لینا تو یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ اللہ اپنی الوہیت، ربوبیت، کمالِ قدرت اور ہمہ گیر طاقت میں ہر طرح کے شرک سے پاک ہے۔ اس کی ذات اور صفات کمالیہ میں اس کا کوئی شریک نہیں وہ تنہا مالک ہے اس کے کام میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔ یہ دوسری بات کا جواب ہوگیا۔ اب رہی تیسری بات، تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا ہر کس وناکس کے پاس اپنے فرشتے نہیں بھیجا کرتا ——— جن میں تبلیغ اور دعوتِ توحید کی قابلیت ہوتی ہے انہیں کے پاس فرشتے کلامِ الٰہی لے کر بحکمِ خدا آتے ہیں اور انہیں کو نبی بنایا جاتا ہے۔

تحقیق اَتٰى امرُ اللہ ماضی کا صیغہ ہے اور امر اللہ سے مراد ابنِ کثیر کے نزدیک روزِ قیامت ہے اور عام مفسرین کے نزدیک عذاب خواہ وہ دنیا کا ہو

دنیا میں ہو یا آخرت میں ۔ بہر حال، روز قیامت مراد ہو یا مطلقاً عذاب کوئی بھی نزول آیات کے وقت تک کافروں پر نہ آیا تھا پھر ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ روز قیامت یا عذاب الٰہی عالم غیب میں آچکا تھا اور اللہ کا قطعی فیصلہ ہو چکا تھا کہ ایسا ضرور ہوگا، اس لئے یقینی اور عنقریب ہونے والے امر کو بلفظ ماضی بلاغت آمیز طرز بیان کے ساتھ ظاہر کر دیا۔ چنانچہ کتب صحاح میں مروی ہے کہ جب یہ آیت اتری" حضور والا نے کلمہ کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو ملا کر فرمایا قیامت میرے ساتھ یوں متصل ہے ۔

ملائکہ سے مراد حضرت جبرئیلؑ ہیں ۔ عظمت جبرئیلؑ کا لحاظ کرتے ہوئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا۔ کذا قال ابن عباسؓ ۔

رُوح سے مراد وحی ہے وجہ یہ ہے کہ ہر جاندار کی زندگی روح سے ہے کسی شخص کی جسمانی بقا بغیر روح کے نہیں ہو سکتی ۔ اسی طرح عقلی، روحانی اور دماغی حواس انسان کو راہِ اعتدال صحیح طور پر نہیں بتا سکتے ۔ ہمیشہ علوم کسبیہ میں غلطیاں ہوتی ہیں ۔ آراء بشری کا اجماع بھی کامل ہدایت اور پورے اعتدال کا حامل نہیں ہوتا، اس لئے قانون الٰہی اور وحی خداوندی کی ضرورت تھی ۔ خدا چونکہ گزشتہ، موجودہ اور آئندہ کے تمام احوال سے واقف ہے وہ ہر قوم، ہر ملک اور ہر طبقہ و زمانے کی ضروریات کو جانتا ہے اس کو کامل علم ہے کہ کون عقیدہ و عمل نوع بشر کو تباہ کرنے والا ہے اور کون نجات دلانے والا ہے، اس لئے بغیر وحی الٰہی اور کتب سماوی کے دماغی تراشیدہ قوانین اور خود ساختہ ضوابط نجات کافی نہیں ہو سکتے ۔ وحی اور آسمانی کتاب ہی نجات و فلاح کی واحد کفیل ہے ۔ اسی سے ابدی زندگی حاصل ہوتی ہے وہی اس مادی کائنات کی جان اور نظام عالم کی روح ہے ۔ یہی سرچشمۂ حیات اور آفتاب جولان ہے ۔ جو لوگ وحی ربانی سے مستفید نہیں ہوتے وہ نہ صرف اندھیرے میں ہیں بلکہ مردہ ہیں ۔

مقصود بیان

آغازِ آیت میں لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ قیامت اتنی قریب ہے کہ اس کو آیا ہوا سمجھو ۔ یہ یقین رکھو کہ عنقریب وقت عمل فوت ہو جاتا ہے، اس لئے جو کچھ کرنا ہے کر لو ۔ پیام الٰہی اور آسمانی کتابیں عالم بشری کے لئے روح حیات اور سرچشمۂ زندگی ہیں ۔ اس کائنات کی بقا بغیر قوانین الٰہیہ کے ناممکن ہے ۔ لفظ یُنَزِّلُ سے اس طرف ایماء ہے کہ پیام الٰہی کا دفعتاً اور یک دم نازل ہو جانا کافی نہیں بلکہ ضروریات زمانہ اور حوائج طبقات کی چگونگی کا لحاظ کرتے ہوئے رفتہ رفتہ تدریجاً احکام خداوندی کا نازل ہونا ضروری ہے ۔ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ نبوت کسبی نہیں جو زہد و عبادت اور تقویٰ و ریاضت سے حاصل ہو جائے بلکہ محض عطیۂ الٰہی ہے ۔ اللہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اگر نبی میں عبودیت خصوصی کا ہونا ضروری ہے ۔ کسی بے دین مغرور مشرک کو نبوت نہیں ملا کرتی ۔ اَنْ اَنْذِرُوْٓا سے غرض نبوت کی طرف اشارہ کہ نبی کو بھیجنا اور احکام و قوانین کا نازل کرنا صرف دو مقاصد کے پیش نظر ہے ۔ عقیدہ کی اصلاح ہو جائے اور عمل درست ہو جائیں ۔ اللہ کی توحید کا عقیدہ لوگوں کے دلوں میں جم جائے اور وہ بد اعمالی چھوڑ کر خدا سے ڈرنے لگیں ۔ گویا انسان کی فطری اور عملی قوتوں کی اصلاح مقصد نبوت ہے ۔ مجموعۂ آیات کا مطلب یہ نکلا کہ اللہ ایک ہے، ہر طرح کے شرک سے پاک ہے، مختار کل ہے ۔ جس کو چاہتا ہے نبی بناتا ہے، مگر نبی میں عبودیت شرط ہے وہ اپنے بندوں پر اس قدر مہربان ہے کہ ان کے عقیدہ و عمل کی اصلاح کے لئے اس نے قوانین بھیجے ۔ کتابیں نازل کیں، فرشتوں کے ذریعہ سے ضوابط نافذ کئے اس پر بھی اگر کوئی گمراہ رہا تو نتیجہ برداشت کرنے کے لئے قیامت کا دن مقرر ہے جو بہت قریب ہے ۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو مصلحت سے پیدا کیا وہ ان کی شرک انگیزیوں سے برتر ہے اس نے انسان کو نطفہ

مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ○ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِیْهَا

سے پیدا کیا پھر یکایک کھلم کھلا جھگڑنے لگا اور اس نے چارپایوں کو پیدا کیا تمہارے لئے ان میں

دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَ

جڑاول کا سامان اور بہتیرے فائدے ہیں اور بعض کو کھاتے ہو اور جب شام کو جنگل سے اُن کو لاتے ہو اور چرانے کو لے جاتے ہو تو

حِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا

تمہارے لئے اُن سے رونق ہوتی ہے اور وہ ایسی بستیوں تک تمہارا سامان اُٹھا کر لے جاتے ہیں کہ جہاں تک تم بغیر جاں کاہی کے نہیں

بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ط اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ

پہنچ سکتے ہو واقعی تمہارا رب بڑا شفیق و مہربان ہے اور گھوڑے اور خچر اور گدھے بھی اُس نے تمہاری سواری

لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ط وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ

اور زیبائش کے لئے پیدا کئے اور وہ اُن چیزوں کو پیدا کرتا ہے جن سے تم ناواقف ہو اور اللہ تک کوئی راہ سیدھی پہنچتی ہے

وَمِنْهَا جَآئِرٌ ط وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ ع

اور کوئی راستہ ٹیڑھا بھی ہے اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت کر دیتا

تفسیر اوپر کی آیات میں بیان کیا گیا تھا کہ اللہ ہی ایک ہے وہی اپنی وحی اپنے انبیاء کے پاس بھیجتا ہے اور مقصدِ نبوت... دو چیزیں ہیں اعلان توحید اور اصلاحِ اعمال۔ ان آیات سے لے کر رکوع تک توحید کا اثبات فرماتا ہے جس کے ذیل میں ضرورتِ نبوت پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے۔ توحید کے دلائل کا بیان چند طور پر کیا گیا ہے اور ہر نوع ایک خاص طرز کی حامل ہے۔

(۱) اللہ نے آسمان اور زمین کو ٹھیک اندازہ پر پوری حکمت و قوت کے ساتھ بنایا۔ اُن کی ہیئت، صورت، کمیت، مزاج، خواص سب کچھ ویسے ہی رکھے جیسے ہونے چاہئیں تھے۔ پھر ان کو رائگاں نہیں بنایا۔ ان کی تخلیق کسی خاص مقصد کی مظہر ہے۔ طبقات سماوی وارضی کا تعدد اور ہر طبقہ کی جدا جدا کیفیت وخاصیت اپنے اندر مخصوص فوائد رکھتی ہے۔ کیا کوئی اور بھی ایسا ہے جس نے اس طرح کی کوئی اور چیز بنائی ہو یا اس کے بنانے میں دخل دیا ہو۔ جب اللہ کے سوا کوئی اور خالق نہیں تو لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ وحدہٗ لاشریک اور بے ہمتا ہے۔

(۲) اللہ نے انسان کو ایک بے مقدار ذلیل بوند سے بنایا۔ نطفہ تھا اس کا خون بنا خون کا لوتھڑا اور لوتھڑے کا جسم تیار ہوا۔ پھر جسم کے اندرونی و بیرونی اعضاء کی تشکیل ہوئی۔ ہر عضو کو اس کے مقام پر رکھا۔ ظاہری اور باطنی حواس پیدا کئے۔ عقل کی روشنی سے اس کے دماغ کو منور کیا اور روحِ حیات پھونک کر جیتا جاگتا انسان بنا ڈالا۔ پھر یہی لاعقل جاندار بے حس اور بے جان مادّے سے بنا ہوا انسان اپنی تخلیق اور کیفیتِ تخلیق کو بھول کر اللہ کی کارسازی، وحدانیت، ربوبیت یہاں تک کہ اس کی ہستی میں جھگڑنے لگا۔ کسی نے خدا کو مجبور محض جانا۔ کسی نے ایک کی بجائے متعدد معبود بنائے اور کسی نے یہاں تک رسائی کی کہ اللہ کے وجود کا ہی انکار کر دیا۔ کیا انسان کی مادّی اور علمی تخلیق، ایجاد اور ترقی اپنی زبانِ فطرت سے اللہ کی وحدانیت ہمہ گیر طاقت اور بے ہمتا ولاشریک ذات پر شہادت نہیں دے رہی ہے۔ کیا انسان کو بنانے والا، علم عطا کرنے والا اور علم میں ترقی دینے والا کوئی اور بھی ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو یہ جھگڑا کیوں ہے۔

مفسر معالم وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ اس آیت کا نزول ابی بن خلف کے حق میں ہوا جو قریش کا ایک بڑا سردار تھا اور جنگ احد میں حضور اقدس علیہ

کے دست مبارک کا ایک برچھا خفیف طور پر اس کے لگا تھا، لیکن اس خفیف زخم کی تکلیف سے لعین رابغ پہنچ کر اس کا انتقال ہو گیا۔
کہا کرتا تھا کہ جب ہڈیاں بوسیدہ اور فرسودہ و ریزہ ریزہ ہو گئیں تو پھر ان کو کون زندہ کر سکتا ہے۔ کرخی نے اس سبب نزول کا انکار کیا ہے
بعض اہل تفسیر نے دوسرے کفار کے متعلق آیت کا نزول بیان کیا ہے۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اگر روایتاً کسی خاص شخص کے حق میں نزول
ہو جائے تب بھی آیت کے عمومی حکم میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ جو شخص قدرت الٰہی کا انکار، وحدانیت و ربوبیت میں شبہ اور تخلیق
ثانی کے متعلق شک کرے گا وہ عموم حکم میں داخل ہو گا۔

(۳) اللہ نے بھیڑیں، بکریاں، گائیں اور اونٹ وغیرہ مویشی بنائے اور انسان کے لئے بنائے۔ مویشی کے چار فوائد تو ہر شخص جانتا ہے
مثلاً بھیڑ اور اونٹ وغیرہ کے اون سے سردی سے بچنے کے لئے لباس تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت منافع ہیں۔ ان کا دودھ پیا
جاتا ہے، گوشت کھایا جاتا ہے، یہ علاوہ کھانے کے دوسرے کاموں میں آتی ہے۔ پھر ایک نمایاں فائدہ یہ ہے کہ جس شخص کے پاس مویشی
بکثرت ہوتے ہیں تو اس کو خاص امتیاز اور عزت حاصل ہوتی ہے۔ صبح کو اس کے جانور جنگل کو چرنے جاتے ہیں شام کو واپس آتے ہیں۔ چرواہے ان کو
لاتے اور لے جاتے ہیں۔ مالک سرراہ اپنی چوپال میں بیٹھا دیکھتا ہوتا ہے اور خاص شان رکھتا ہے۔ (ہندوستان کے دیہات اور عرب کے بدوی
ملک میں مذکورہ منظر دیکھا جاتا ہے۔ البتہ شہروں کے اندر رہنے والے کثرت آبادی اور جگہ کی تنگی کی وجہ سے کثرت مویشی نہیں پال سکتے اور نہ مویشیوں کی کثرت
ان کے نزدیک کوئی قابل امتیاز خصوصیت ہے۔ نہ اس کو وہ دولت مندی اور سرمایہ داری کا مظاہرہ خیال کرتے ہیں، مگر دیہاتی اور غیر متمدن آبادیوں کے
رہنے والوں سے پوچھو جن کے رہنے کے لئے نہ فلک بوس کوٹھیاں ہیں نہ سفر کے لئے موٹر اور ہوائی جہاز نہ پیدا میری لوگوں کے بند کرنے کے لئے لوہے
کی الماریاں اور صندوق، لیکن اس کے باوجود چوپایوں کا گوشت کھانے، دودھ پینے اور ان کے اون سے گرم لباس بنائے جانے کا مہذب دنیا والے بھی
انکار نہیں کر سکتے) چوتھا فائدہ یہ ہے کہ مویشی باربرداری کے کام آتے ہیں۔ اونٹ وغیرہ کے ذریعہ سے آدمی اپنا اسباب تجارت یا سامان ضرورت
لاد کر ایسے ایسے مقامات پر پہنچ جاتا ہے جہاں پیادہ جانے اور سر پر بوجھ اٹھا کر لے جانے یا کسی اور ترکیب سے پہنچنے میں سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا
ہے۔ (اس زمانے میں اگرچہ موٹریں، بسیں اور لوڈنگ کاریں نکل آئی ہیں، مگر نرم اور ریتلی زمینوں میں اب بھی یہ زیادہ سود مند ثابت نہیں ہوتیں۔
وہاں اونٹ اور اس جیسے دوسرے جانور کی ہی ضرورت پڑتی ہے)

(۴) اللہ نے گھوڑے، گدھے، خچر بھی تمہارے فائدے کے لئے پیدا کئے۔ ان کے نمایاں فائدے دو ہیں۔ تمہاری سواری کے کام آتے ہیں۔
اور ان سے تمہاری شان و شوکت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ گھوڑوں اور خچروں سے تو اس زمانہ میں بھی دونوں فوائد وابستہ ہیں مگر گدھے پر سوار ہونے کا
رواج متروک ہو چکا ہے۔ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں ملک عرب میں شرفاء گدھوں کو بھی سواری کے کام میں لاتے تھے اور اس کو عار نہ سمجھتے تھے۔
ممکن ہے بعض ممالک میں اب بھی گدھے کی سواری کا رواج ہو۔ اگر اللہ ان جانوروں کو پیدا نہ کرتا یا پیدا کرتا اور سواری کے قابل جسمانی ساخت ان کو
نہ دیتا تو ظاہر ہے کہ یہ فوائد انسان کو حاصل نہ ہوتے۔ اس کے بعد اجمالاً اشارۃً ان جانوروں اور سواریوں کی طرف بھی کر دیا جن پر سوار ہونے کا اس
زمانے میں عرب میں رواج نہ تھا یا نزول قرآن کے وقت تک ان کی ایجاد ہی نہ ہوئی تھی۔ مثلاً ہاتھی، ریل، موٹر، ہوائی جہاز وغیرہ۔

مذکورہ بالا چاروں دلائل توحید کو ثابت کرنے کے لئے بیان کئے گئے ہیں لیکن فی الجملہ نبوت کا ثبوت بھی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جب خلاق عالم سوائے
خدا کے اور کوئی نہیں اور بقائے جسمانی میں بھی انسان اللہ ہی کا محتاج ہے بلکہ معمولی جسمانی آسائش کا سامان بھی اس کو اللہ ہی دیتا ہے اور اللہ ہی نے
دیا ہے تو کس قدر بعید از عقل و دور ہوتی ہے یہ بات کہ خدا تعالیٰ انسانی عقلوں کو مطلق العنان بنا کر اس کو بے مہار اور عملی قوتوں کو آزاد چھوڑ دیتا
انسان کی علمی و عملی اصلاح کے لئے قوانین نہ بناتا اور ضوابط نہ بھیجتا۔ اسی مطلب کی صراحت آئندہ آیت میں فرمائی کہ اللہ تک پہنچنے کے راستے مختلف
ہو سکتے ہیں، کوئی سیدھا کوئی ٹیڑھا۔ سیدھا راستہ اللہ تک بسہولت پہنچا دے گا۔ ٹیڑھا راستہ یا تو کبھی نہ پہنچائے گا یا پہنچائے گا تو اسی پیچ کے
بعد۔ جہاں خدا تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، پرورش کیا، اس کی بقا و آسائش کے سامان بنائے وہاں یہ بھی لازم تھا کہ اصل مقصد یعنی اپنی بارگاہ
قدس تک پہنچنے کا سیدھا راستہ بھی بتا دیتا اور یہ رہنمائی بغیر انبیاء کے ناممکن تھی، اس لئے نبوت، وحی اور احکام الٰہیہ کا نزول لازم قرار پایا۔ اب

رہی یہ بات کہ اللہ کو احکام نازل کرنے اور انبیاء کو مبعوث فرمانے کی کیا ضرورت تھی وہ سب کو بلا واسطہ ہدایت کر دیتا۔ کوئی گمراہ ہی نہ رہتا مگر انسانی اختیار کا مقتضاء یہ تھا کہ صرف رہنمائی کر دی جائے۔ راستہ پر چلنا نہ چلنا انسانی اختیار پر چھوڑ دیا۔

چند مسائل اللہ نے گھوڑے کو سواری کے لئے پیدا کیا ہے۔ علماء نے کہا کہ گھوڑوں کی دوڑ جائز ہے۔ اگر اس میں جوا نہ ہو۔ اگر تیسرا آدمی دو سواروں سے بطور انعام کہے کہ جو شخص آگے نکل جائے گا اس کو فلاں چیز انعام دوں گا تو یہ جائز ہے۔

گھوڑے باعث تجمل بھی ہیں۔ مگر قابل غرور نہیں نہ ان سے تفاخر جائز ہے۔ تام نمود اور نمائش کے لئے تو ہر قسم کی دولت اور اسباب دولت ناجائز ہے۔ اسی بنا پر صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جس نے فخر و نمائش کے لئے گھوڑے پالے تو وہ اس کے لئے وبال ہوں گے۔ زینت ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خدا نے ان کو آدمیوں کے باہم تفاخر کے لئے پیدا کیا ہے، اسی لئے فرمایا کہ گھوڑے گدھے خچر ہم نے اس لئے پیدا کئے کہ تم ان پر سوار ہو اور ہم نے ان کو زینت بنایا۔ یوں نہیں فرمایا کہ ان جانوروں کو ہم نے اس لئے پیدا کیا کہ تم باہم ان کو زینت کا سبب بناؤ۔ فطرتاً زینت ہونے اور زینت بنانے میں بڑا فرق ہے۔ ستھرائی صفائی پاکیزگی جائز ہے، مگر آرائش زیبائش غرور و تمکنت کے اظہار کے لئے حرام ہے۔ چونکہ گدھوں اور خچروں کے ساتھ خدا تعالیٰ نے گھوڑوں کا بھی ذکر فرمایا ہے اور خچر و گدھے کا گوشت بالاتفاق حرام ہے اس لئے ابو حنیفہؒ، مالکؒ، اوزاعی، مجاہد اور ابو عبیدہ وغیرہ نے گھوڑے کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے۔

ابن عباسؓ نے بھی فرمایا کہ مذکورۃ الصدر انعام تو کھانے کے لئے ہیں اور موخر الذکر جانور سواری کے لئے۔

ابو داؤد، نسائی و ابن ماجہ نے خالد بن ولید کی روایت بیان کی ہے کہ حضورؐ نے خیل، بغال اور حمیر کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے۔

مقصود بیان توحید کا صراحتاً اور نبوت و رسالت کا ضمناً ثبوت، عمومی اور خصوصی دلائل کی تفصیل، انعامات الٰہیہ کا تذکرہ اور اس بات کی طرف لطیف اشارہ کہ تخلیق عالم کی غرض محض ذات انسانی ہے۔ اس ضابطۂ قرآنی کی جانب بھی فی الجملہ اشارہ کہ مقصد قرآن یہ نہیں کہ عالم کی تحلیلی و ترکیبی حقیقت اور تشکیل اجزاء بیان کرے بلکہ اصل مقصد فزیکل ہے۔ قرآن لم اور ماہیت نہیں بیان کرتا بلکہ اس کے دلائل راقبہ ہوتے ہیں۔ یعنی کائنات کے فوائد و مصالح بیان کرتا ہے۔ اس بات کی طرف اشارہ کہ کائنات کے لئے بہت سی چیزیں پیدا کی ہیں اور آئندہ ایسی چیزیں پیدا کرے گا جو اس کے علم میں ہیں وغیرہ۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ

وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا جس میں سے کچھ تو تم پیتے ہو اور کچھ حصہ سے درخت پیدا ہوتے ہیں جن کو

تُسِيْمُوْنَ ۝ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ

تم چراتے ہو وہ پانی سے تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجوروں کے درخت اور انگور

وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَ

ہر قسم کے پھل پیدا کرتا ہے اس میں غور کرنے والی قوم کے لئے واقعی نشان قدرت ہے اسی

سَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ

نے رات کو اور دن کو سورج کو اور چاند کو تمہارے کام پر لگا دیا اور ستارے بھی اس کے حکم کے

بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۙ وَ مَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ

تابع ہیں اس میں نشانیاں قدرت ہیں واقعی سمجھدار قوم کے لئے اور جو کچھ تمہارے لئے زمین میں پیدا کیا

مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ ۝

اس کی رنگتیں مختلف ہیں اس میں بھی واقعی سوچنے والی قوم کے لئے نشانی قدرت ہے

تفسیر (۵) تخلیقِ انسانی وحیوانی سے الوہیت پر استدلال کرنے کے بعد نباتات سے استدلال فرماتا ہے۔ نباتات اور سبزہ کی پیدائش پانی سے ہوتی ہے اور پانی کے لئے برسات ہونی ضروری ہے کیونکہ برسات نہ ہو تو کنوئیں، نہریں، تالاب اور چشمے بھی خشک ہو جاتے ہیں۔ پانی آسمان سے آتا ہے یا ابر سے برستا ہے؟ طبعیات کے ماہر تو شق ثانی ہی کے قائل ہیں۔ ان کا قول ہے کہ دریاؤں سے بخارات اٹھ کر جب ہوا کے سرد طبقہ میں پہنچتے ہیں اور وہاں پہنچ کر سرد ہو جاتے ہیں تو پانی کی شکل اختیار کر کے نیچے ٹپکتے ہیں اس کو مینہ کہا جاتا ہے، لیکن قرآن مجید کی نظر مادی اسباب سے بلند ہے، اس لئے وہ مادی اسباب کا تو منکر نہیں، مگر ساتھ ہی سا تھ اصل سبب حکم الٰہی کو قرار دیتا ہے اور حکم الٰہی آسمان سے نازل ہوتا ہے، اس لئے شق اول کو اکثر مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ پانی سے چند فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اوّل تو انسان، حیوان، پرند چرند وغیرہ کے پینے کے کام آتا ہے۔ دوئم جانوروں کا چارہ بھی اسی سے پیدا ہوتا ہے۔ عام اہلِ لغت کے نزدیک شجر اس پودے کو کہتے ہیں جو بیل دار نہ ہو جس کی ڈنڈی ہو اور نجم اس پودے کو کہتے ہیں جس کی بیل زمین پر پھیلی ہوئی ہو ڈنڈی پر اس کا قیام نہ ہو، لیکن زجاج کا قول ہے کہ جو چیز زمین سے اُگے وہ سب شجر کہلاتی ہے۔ سوئم کھیتیاں بھی پانی ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ چہارم ہر قسم کے پھل مثلاً زیتون، کھجور اور انگور وغیرہ کی پیدائش بھی پانی ہی پر موقوف ہے۔ نظر و فکر اور غور وخوض کرنے والوں کے لئے اس سلسلۂ تنظیم میں قدرت والوہیت کے قوی ترین دلائل موجود ہیں۔ مقامِ بصیرت ہے کہ انسان وحیوان کے بدن کی اصل رطوبت چونکہ نقل وحرکت کی وجہ سے ہر وقت تحلیل ہوتی رہتی ہے، اس لئے اگر تحلیل شدہ رطوبت کا عوض اس کو نہ پہنچتا رہے تو چند روز میں فنا ہو جانا یقینی ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس کی بقا کے لئے سمندروں سے بخارات اٹھائے ان کا پانی بنا اور پانی ہر جگہ برسایا تاکہ جاندار مخلوق اس کو پیئے، پلائے اور زندہ رہ سکے۔ اگر خدا سمندروں سے بخارات نہ اٹھاتا تو ہر جگہ پانی کیسے پہنچتا۔ پھر فقط رطوبت طبیعیہ کی امداد ہی کافی نہ تھی بلکہ انسان کی طبعی حرارت چونکہ ہر وقت صرف ہو رہی ہے۔ اگر اس کو مددگار اور عوض نہ ملے تو چند ہی دن میں انسان ختم ہو جائے اس لئے ہر شخص کے لئے غذا کی فراہمی بھی ضروری تھی۔ غذا دو قسم کی ہے نباتی یا حیوانی۔ نباتی غذا میں ہر قسم کا غلہ، مختلف پھل، ہر طرح کی سبزی وغیرہ داخل ہے اور حیوانی غذا گوشت، دودھ، دہی، مکھن وغیرہ ہے۔ اللہ نے مینہ برسا کر ہر طرح کی سبزی پھل پھول غلہ وغیرہ پیدا کیا۔ جس کو براہ راست انسان نے اپنی غذا بنایا اور اسی سے حیوان کی بھی پرورش ہوئی، اور پھر حیوان سے انسان کی غذا بنی۔ یہ تمام اسباب انسان کی پرورش اور بقا کے لئے فراہم کئے، لیکن اس کو سمجھنے کے لئے بصیرت کوش دماغ کی ضرورت ہے۔

(۶) انسانی پرورش وبقا کے لئے فقط پانی ہی کافی نہ تھا۔ کیونکہ پانی سے اگرچہ سبزہ پیدا ہوتا اور سبزہ سے حیوانی وانسانی پرورش ہوتی ہے، مگر اوّل تو فقط پانی سبزہ کی پرورش کے لئے کافی نہیں کیونکہ پانی محض مرطوب عنصر ہے اور فقط رطوبت بغیر حرارت کے نشوونما نہیں کر سکتی۔ لامحالہ تخلیق، تربیت اور نشوونما کے لئے حرارت کی بھی ضرورت ہے اور حرارت پیدا ہوتی ہے آفتاب، ماہتاب اور دیگر ستاروں کی روشنی سے۔ گویا نباتی پرورش کے لئے جس طرح پانی ضروری ہے اسی طرح چاند سورج اور دوسرے ستاروں کا وجود بھی لازم ہے۔ اس کے علاوہ اگر مان بھی لیا جائے کہ سبزہ کی پیدائش صرف پانی سے ہو جاتی ہے اور چاند، سورج وغیرہ کی اس کے لئے ضرورت نہیں تب بھی انسان محض نباتی وحیوانی غذا سے زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے لئے کاروبار کی تکمیل، حرکت وسکون کی تنظیم، سردی کا حصول، تاریکی وروشنی کا تبادل، فصول کا انقلاب اور دیگر اسباب معیشت

کی فراہمی ضروری ہے۔ اس کے لئے خدا تعالیٰ نے بالائی مخلوق کو پیدا کیا۔ چاند سورج بنائے۔ تمام ستاروں کو انسانی کے کام پر لگا یا۔ یہ تمام دلائلِ قدرت ہیں، براہینِ الوہیت ہیں، آثارِ ربوبیت ہیں اور علاماتِ توحید ہیں، مگر انہی لوگوں کے لئے جن کو فہم و دانائی کا کوئی حصہ ملا ہے، جو عقل و بصیرت رکھتے ہیں، جو سوچتے سمجھتے اور غور و خوض کرتے ہیں۔

(۷) نباتات سے استدلال کرنے کے بعد اب معدنیات سے ثبوت الوہیت فرماتا ہے۔ اللہ نے انسان کے فائدے کے لئے زمین میں طرح طرح اور رنگ رنگ کی چیزیں پیدا کیں۔ ہر قسم کے پتھر، جواہر، سونا، چاندی، تانبہ، لوہا، کوئلہ، گندک اور گوناگوں دوائیاں زمین ہی سے نکالیں جن سے انسانی زندگی وابستہ ہے اور ہر چیز براہِ راست یا بالواسطہ آدمی کے کام آتی ہے۔ کوئی دوا ہے کوئی غذا کوئی سامانِ زینت و تموّل۔ مگر اس کو سمجھنے کے لئے روشن دماغ کی ضرورت ہے۔

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً

اس نے سمندر کو تابع حکم بنایا　تاکہ تم اس میں سے　تازہ گوشت کھاؤ　اور　زیور　نکالو

تَلْبَسُونَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ

جس کو تم پہنتے ہو　تم کشتیوں کو دیکھتے ہو　کہ پانی کو پھاڑتی　دریا میں چلی جاتی ہیں　مناسب ہے کہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو　اور شکر

تَشْكُرُونَ ○ وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا

ادا کرو　اس نے زمین میں پہاڑوں کو جما دیا　تاکہ زمین تم کو لے کر نہ جھکے　اور نہریں　اور راستے بنائے

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ○ وَعَلَامَاتٍ ۚ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ○ أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا

تاکہ تم کو راہ مل جائے　اور بہتیری نشانیاں بنائیں اور ستاروں سے بھی لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں　پس جو پیدا کرتا ہے کیا اس کی

يَخْلُقُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ○ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ

طرح ہو جائیگا جو پیدا نہیں کر سکتا کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے　اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو گے تو گن نہ سکو گے　بلاشبہ اللہ　غفور رحیم ہے

تفسیر (۸) اللہ کی الوہیت کاملہ اور وحدانیت بے ہمتا کے دلائل میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ اس نے انسانوں کے کام پر سمندروں کو لگا دیا۔ سمندر کس مادہ سے بنا، کیسے بنا، کب بنا؟ کسی کو اس کا علم نہیں۔ ہاں اتنا معلوم ہے کہ بنا اور زمین کے تین حصوں کو چھپائے ہوئے ہے۔ زمین کا چوتھائی حصہ پانی سے ابھرا ہوا ہے جس پر پہاڑ، ریگستان بیابان، جنگل اور انسان و حیوان کی بستی ہے۔ سمندر کا پانی کہیں آلاتِ پیمائش سے ناپا جا سکتا ہے اور کہیں بے انتہا ہے۔ عظیم الشان سمندروں کے اندر خدا تعالیٰ نے بکثرت جانور پیدا کئے جن میں قابل خصوصیت مچھلی ہے۔ مچھلی کا تازہ گوشت انسان کھاتا ہے۔ پھر سمندر ہی سے موتی، مونگا اور سیپ برآمد ہوتی ہے جس کو غیر مسلم مرد اور مسلمان عورتیں بطور زیور استعمال کرتی ہیں۔ مزید برآں سمندر میں کشتیاں اور جہاز چلتے ہیں۔ ایسے جلیل الشان پانی کو چیرتے چلے جاتے ہیں۔ جہاز پر سفر کرنے والے طلب معاش اور دیگر کاروبار کے لئے جدھر چاہتے ہیں جاتے ہیں۔ ہزاروں میل لمبے اور بیسیوں میل گہرے سمندر کو طے کر لیتے ہیں۔ ہزاروں ٹن وزنی جہاز کا بوجھ پانی اٹھاتا ہے اور انسان صحیح سلامت منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ اگر اللہ کا وجود نہیں یا اس کا کوئی اور شریک ہے تو اس کا بھی ایسا ہی عمل اور اسی طرح کی تخلیق ہونی چاہیئے۔

چند مسائل

لَحْمًا طَرِيًّا سے مراد مچھلی ہے۔ اسی بنا پر امام مالک نے فرمایا کہ اگر کسی نے گوشت کھانے کی قسم کھائی اور مچھلی کھالی تو قسم ٹوٹ گئی لیکن علمائے حنفیہ (شافعیہ کے اقوال) کے بموجب قسم نہ ٹوٹے گی کیونکہ قسم کا مدار کھانے والے کی نیت پر ہوتا ہے اور عموماً اہل عرف گوشت اس کو سمجھتے ہیں جس کی پیدائش خون سے ہوتی ہے۔ لہٰذا مچھلی گوشت نہیں۔

موتی، مونگا وغیرہ زیور میں داخل ہیں لہٰذا ان کی زکوٰۃ بھی لازم ہے اور مردوں کے لئے ان کو پہننا حرام ہے۔

لفظ تَلْبَسُوْنَهَا میں خطاب مردوں کو ہے کیونکہ جمع مذکر کا صیغہ ہے۔ اسی لئے شبہ ہوتا ہے کہ شاید موتی کا زیور پہننا مردوں کے لئے جائز ہے۔ لیکن یہ شبہ بے اصل ہے کیونکہ تَلْبَسُوْنَهَا میں افراد انسانی کو خطاب ہے جن میں عورتیں بھی داخل ہیں یا یہ مراد ہے کہ عورتیں پہنتی ہیں اور تمہارے لئے پہنتی ہیں۔

(۹) اللہ کی کیسی قدرت باہرہ ہے کہ زمین کو وزنی اور سخت بنانے کے لئے اس نے پہاڑوں کی میخیں قائم کیں جابجا دریا جاری فرمائے۔ پر چھتے میں راستے بنائے مسافروں کی آمد و رفت کے لئے۔ راستوں کی شناخت کی علامات مقرر فرمائیں پھر راستہ اور سمت معلوم کرنے کے لئے ستاروں کا طلوع و غروب اور مطلع و مغرب معین فرمایا۔ بیابان جنگلوں میں نہ سمت کا پتہ چلتا ہے نہ راستہ کا۔ بادیہ گرد ستاروں سے سمت کی شناخت کرتے ہیں۔ یہ تمام کی تمام اللہ کی نعمتیں ہیں۔

آخر میں فرماتا ہے کہ دیکھو اور غور کرو کہ جو خالق کل ہے کیا اس کی طرح کوئی چیز ہو سکتی ہے؟ قوت تخلیق نہ رکھنے والے خلاق بے ہمتا کے ساتھ الوہیت و ربوبیت میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اس کے بعد فرماتا ہے کہ فقط مذکورہ بالا نعمتیں ہی خدا کی دی ہوئی نہیں ہیں بلکہ اس کی نعمتیں تو حد حساب اور احاطۂ فہم سے بھی خارج ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

زمین پر پہاڑوں کی میخیں اللہ نے قائم کیں تاکہ پہاڑوں کے دباؤ سے نہ ہل سکے کیونکہ جس طرح خالی کشتی ادھر ادھر ہلا کرتی ہے اور جب اس میں کچھ بوجھ پتھر وغیرہ ڈال دیئے جاتے ہیں تو اس کا اضطراب جاتا رہتا ہے یہی حال زمین کا تھا پھر جب خدا نے پہاڑوں کا بوجھ ڈال دیا تو ہلنے سے رک گئی۔

اسی ظاہری مطلب پر چند اعتراض کئے جاتے ہیں (۱) جس طرح پانی اپنی جگہ پر میل طبعی کی وجہ سے ٹھہرا ہوا ہے تو زمین کو بدرجۂ اولیٰ اپنے طبعی حیز پر ٹھہرنا چاہئے کیونکہ زمین پانی سے زیادہ وزنی ہے۔ کشتی سے تشبیہ دینا غلط ہے۔ کشتی پانی پر ہوتی ہے۔ مگر زمین پانی پر نہیں پانی کے وسط میں ہے۔ (۲) اگر باوجود اس جسامت اور ثقل کے زمین کی طبیعت میں سکون نہ تھا تو پہاڑ بھی تو زمین ہی کے اجزاء ہیں۔ پہاڑوں کی طبیعت میں سکون کہاں سے آگیا۔ (۳) پھر یہ بھی ثابت کرنا ضروری ہے کہ پہاڑوں کی تخلیق زمین کے بعد ہوئی ہے۔ زمین لرزاں تھی۔ پہاڑوں کے قائم ہونے سے اس کا اضطراب دور ہو گیا۔ (۴) طبقات الارض کے ماہرین اور حقائق کائنات کا اس زمانے میں اس امر پر اجماع ہے کہ زمین حرکت کرتی ہے اور سرعت و تیزی کی وجہ سے اس کی حرکت محسوس نہیں ہوتی پھر یہ قرآنی صراحت کس طرح پر صحیح تسلیم کی جا سکتی ہے۔

ان سب اعتراضات کا جواب بالکل صاف ہے۔ درحقیقت آیت کی غلط تشریح سے یہ اعتراضات پیدا ہوئے ہیں۔ قرآن کا مطلب یہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ زمین کو ہلکا نہ بناتا تو اس کو دائرۂ حیز میں قرار نہ ہوتا بلکہ ادھر ادھر ہلتی جلتی اور اضطراب ہوتا، اس لئے خدا تعالیٰ نے بعض اجزاء اس کے اندر ایسے رکھے ہیں جن کے وزن اور ثقل کی وجہ سے زمین میں اضطراب نہیں ہو سکتا۔ انہی وزنی اجزاء کا نام پہاڑ ہے۔ گویا زمین کی ساخت ہوا کی ساخت کی طرح نہیں کہ ادھر ادھر حرکت کرتی۔ ہے بلکہ پانی سے زیادہ ثقل اس میں پیدا کیا۔ اس تقریر سے علاوہ مذکورۃ الصدر تینوں اعتراضات کے حل ہونے کے چوتھا اعتراض بھی رفع ہو گیا۔ کیونکہ دور حاضر کے ماہرین زمین کے اندرونی اور مکانی حرکت کے تو قائل ہی نہیں وہ نہ زمین میں اضطراب تسلیم کرتے ہیں ان کا یہ نظریہ ہرگز نہیں کہ زمین اپنا دائرہ اور حیز چھوڑ کر انتقال مکانی کرتی ہے بلکہ وہ زمین میں دوری حرکت مانتے ہیں اور دوری حرکت اضطرابی حرکت نہیں کہلاتی اور نہ اس سے سطح پر رہنے والے مضطرب الحرکات ہو سکتے ہیں۔

مقصود بیان

پانی کے مختلف فوائد کا بیان۔ ایک قسم کے پانی سے مختلف اقسام کے پھل پھول اور رنگارنگ کی سبزیاں پیدا ہونے کا تذکرہ فرما کر اپنی الوہیت اور قدرت کاملہ پر واضح استدلال اور غور و خوض کی دعوت۔ کائنات سماوی کو انسانی فائدہ کیلئے

پیدا کیا گیا ہے۔ بِاَمْرِہٖ کے لفظ سے اس طرف لطیف اشارہ ہے کہ آبائے علویہ اور مخلوقات سماویہ میں از خود کوئی تاثیر نہیں نہ ان کی تنظیم رفتار طبعی اور اتفاقی ہے بلکہ سب کے سب حکم الٰہی کے تابع ہیں۔ موربنات وغیرہ کا اگرچہ مادہ ایک ہے، مگر نوعیت اور رنگ میں اختلاف ہے۔ اس کے اندر عقلاء کیلئے درس بصیرت ہے۔ سمندر بھی انسان کے فائدے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ بحری سفر کی صراحۃً اجازت بلکہ ضمناً تبلیغ۔ تجارت اور کسب معاش کی فی الجملہ ہدایت۔ آخر میں وحدانیت اور الوہیت کے ثبوت کی وضاحت اور معیار الوہیت کا تذکرہ۔ یعنی جو خالق و موجد ہے اسی کو معبود الٰہی ہونا چاہیئے۔ جو خالق نہیں وہ قابل الوہیت نہیں۔ سب سے آخر میں اس بات کی تصریح کہ اللہ کی نعمتیں ناقابل حصر اور خارج از حساب ہیں اور چونکہ ہر نعمت کا شکریہ عقلاً واجب ہے، اس لئے غیر متناہی اور نامحدود شکر یہ ضروری ہے، مگر اللہ غفور رحیم ہے اس نے ناقابل برداشت امر کی ادائیگی کا حکم نہیں دیا بلکہ خارج از وسعت امور سے درگذر فرمایا ہے۔

آیت اَفَمَنْ یَّخْلُقُ کَمَنْ لَّا یَخْلُقُ میں غیر اللہ کے مستحق عبادت نہ ہونے کی تین دلائل کا بیان ہے اوّل تو یہ کہ معبود کو خالق ہوشیار ہونا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ غیر اللہ خود ہی مخلوق ہے خالق نہیں۔ پس سوائے اللہ تعالیٰ کے جس نے سب کو پیدا کیا کوئی مستحق عبادت نہیں ہو سکتا۔ دوسرے جن کی کافروں نے پرستش شروع کر دی وہ سب بےجان ہیں خواہ جاندار ہونے کی ان میں قابلیت ہی نہیں اور نہ کبھی وہ جاندار رہتے۔ جس طرح بُت خواہ بالفعل بےجان ہیں اور پہلے جان دار تھے جیسے گزشتہ بزرگ و اولیا خواہ بالفعل زندہ ہوں اور آئندہ وفات پانے والے ہوں۔ جیسے فرشتے جنات وغیرہ۔ بہرحال جو موت و فنا سے متصف ہو وہ معبود کیونکر ہو سکتا ہے۔ تیسرے یہ کہ معبود کو علم کلی و جزئی رکھتے ہوئے ہر شے پر قادر ہونا چاہیئے اور سوائے خدا کے کسی کو بھی معلوم نہیں کہ یہ خود مردہ ہونے کے بعد کس وقت زندہ کئے جائیں گے۔ پس ان کے محشور ہونے سے ان کا قادر نہ ہونا معلوم ہوا اور قیامت کا وقت معلوم نہ ہونے سے علم کا نقصان ثابت ہوا اور یہ استحقاق معبودیت کے منافی ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ۝ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ

اور اللہ واقف ہے تمہارے ظاہر و باطن سے اور اللہ کو چھوڑ کر کافر جن کی عبادت کرتے ہیں

لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ۝ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ وَمَا يَشْعُرُونَ

وہ کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ خود مخلوق ہیں بے جان مُردے ہیں اُن کو خبر نہیں

أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ۝ إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَاحِدٌ فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ

کہ کب ان کو اٹھایا جائے گا تمہارا معبود ایک معبود ہے اور جن لوگوں کو آخرت کا یقین نہیں اُن کے

قُلُوبُهُمْ مُنْكِرَةٌ وَهُمْ مُسْتَكْبِرُونَ ۝ لَا جَرَمَ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ

دل انکاری ہیں اور وہ مغرور ہیں کوئی شک نہیں کہ اللہ ان کے ظاہر و باطن سے

وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ ۝

واقف ہے وہ مغروروں کو پسند نہیں کرتا

تفسیر گزشتہ آیات میں اللہ کی الوہیت، توحید پر آثار قدرت کو پیش کر کے استدلال کرنے کے بعد تخلیق و عدم تخلیق کو معیار الوہیت قرار

دیا تھا۔ ان آیات میں گزشتہ معیار کی کسی قدر تشریح کرنے کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کے مستحق عبادت نہ ہونے کی مزید دو دلیلیں بیان فرماتا ہے۔

گزشتہ معیار کی تشریح تو اس طرح فرمائی کہ معبود کو خالق اشیاء ہونا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ غیر اللہ خود مخلوق ہے۔ خالق ہونا تو درکنار وہ خود دائرۂ مخلوقیت سے نہیں نکل سکتا، اس لئے سوائے اس ذاتِ مقدس کے جس نے سب کو پیدا کیا کوئی مستحق عبادت نہیں ہو سکتا۔

استحقاقِ الوہیت کی مزید دو دلیلوں میں سے پہلی دلیل یہ بیان فرمائی کہ جن باطل اور غیر مستحق معبودوں کی کافروں نے پرستش شروع کر دی ہے وہ سب بے جان ہیں خواہ دائماً بے جان ہیں جیسے پتھر کی مورتیاں، درخت، پانی وغیرہ یا بالفعل بے جان ہیں جیسے گزشتہ سردارانِ قوم، اولیاء، بزرگانِ سلف وغیرہم یا آئندہ مر کر بے جان ہونے والے ہیں جیسے جنات اور فرشتے۔ بہرحال جو چیز موت و فنا سے کسی وقت متصف ہو وہ معبود کس طرح ہو سکتا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ معبود وہی ہوگا جو عالم کامل ہو اس کے علم سے کوئی کلی یا جزئی خارج نہ ہو اور ان تمام فرضی معبودوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ دوبارہ حشر کب ہوگا۔ ہاں اللہ ہر ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ پس ان کا محشور ہونا اور مر کر دوبارہ پیدا ہونا ان کے قادر نہ ہونے کی دلیل ہے اور قیامت سے ناواقف ہونا جہالت پر دلالت کر رہا ہے۔ لہٰذا عاجز اور جاہل کسی طرح معبودیت اور الوہیت کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ اس مکمل بیان کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ ایک ہی ہے۔

عموماً کفار مکہ ان دلائل عاقلانہ کو سن کر لاجواب ہو جاتے اور دل میں صحیح سمجھتے تھے مگر قومی رسم و رواج، آباؤ اجداد کی تقلید، فطری جہالت اور خاندانی تعصب حضور والا کا حکم ماننے سے روکتا تھا۔ خصوصاً قریش کے دلوں میں تو سخت ترین تکبر بیٹھا ہوا تھا۔ بنی ہاشم اور بنی امیہ کی خاندانی کدورتیں، شرف و فضل میں تقدیم، مقابلہ ہر ایک کا بجائے خود فوقیت و سرداری کا دعویٰ اور پھر اس پر کورانہ تقلید اور رسم پرستی۔ ان تمام اسباب نے ان کے سر کو غرور سے جھکنے نہ دیا۔ محض نفسانیت اور ہٹ دھرمی کی بنا پر کہتے تھے۔ ارے اس رسول نے تو تمام دیوتاؤں کی بجائے ایک اللہ کو ٹھہرا کر رکھا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہماری ہڈیاں مرنے کے بعد ریزہ ریزہ ہو جائیں اور پھر از سر نو مکمل ہو کر ہم پیدا کر دیئے جائیں۔ اسی کے متعلق خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا منکرین قیامت کے دل منکر ہیں اور اس انکار کی وجہ کوئی عقلی یا نقلی نہیں ہے نہ اس کے پاس کوئی دلیل اور ثبوت ہے صرف نفسانیت اور تکبر اس کا باعث ہے۔

تفسیری اختلاف وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ کی تفسیر مختلف طور پر کی گئی ہے۔ عام مفسرین کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ بتوں کو معلوم نہیں کہ قیامت کب ہوگی۔ بیضاوی نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ بتوں کو معلوم نہیں کہ ہمارا حشر کب ہوگا۔ اس قول کی بنا پر متفرع ہوتا ہے کہ بتوں کا بھی حشر ہوگا۔

آیت اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اسی مطلب کی مؤید ہے۔ احادیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ بتوں کو معلوم نہیں کہ ان کی پرستش کرنے والوں کا حشر کب ہوگا۔

بعض مفسرین کا قول ہے کہ هُمْ يُخْلَقُوْنَ پر کلام ختم ہو گیا اور اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ سے بتوں کی نہیں بلکہ بت پرستوں کی حالت کا اظہار مقصود ہے کہ مورتیوں کی پوجا کرنے والے اگرچہ ظاہر میں زندہ دکھائی دیتے ہیں، مگر جسمانی زندگی کے علاوہ روحانی زندگی ان کو نصیب نہیں۔ ان کی روحیں اور دل اور عقلیں مردہ ہیں ان کو حشر و بعث کا یقین نہیں۔

مقصود بیان تخلیق، علم کامل اور حیات حقیقی معیار الوہیت ہے جو خالق نہ ہو یا جاہل ہو حقیقی زندگی اس کو حاصل نہ ہو معبود ہونے کا استحقاق نہیں رکھتا۔

فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ سے اس امر کی صراحت کرنی مقصود ہے کہ غرور نفس اور رسم پرستی انکار کا اصل باعث ہے۔ آخر میں اللہ کے عالم کل ہونے کی وضاحت فرما دی جس سے فلاسفۂ یونان اور بعض ان فرقہائے اسلام کی تردید ہوتی ہے جو قائل ہیں کہ اللہ کو کلیات کا تو علم کامل ہے اور جزئیاتِ مادیہ کا علم تفصیلی نہیں بلکہ من حیث الکل ہے۔ آخری آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ غرور کسی طرح کا ہو مذہبی عقائد و اعمال میں ہو یا دنیوی مشاغل و معاملات میں بہرحال اللہ کو پسند نہیں وغیرہ۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُم مَّاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝ لِيَحْمِلُوا

جب اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا؟ تو کہتے ہیں اگلوں کی کہانیاں ہیں اس کا نتیجہ یہ

أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۙ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ

ہے کہ قیامت کے دن یہ اپنے گناہوں کا پورا بوجھ اور کچھ بار اُن لوگوں کا بھی اُٹھائیں گے جن کو بلا تحقیق گمراہ کرتے رہے

أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ ع

یاد رکھو کہ جس بوجھ کو یہ اُٹھائیں گے وہ بہت بُرا ہے

تفسیر جب ناواقف انجان مسافر موسم حج میں مکہ آکر کفار مکہ سے بغرضِ تحقیق دریافت کرتے کہ محمدؐ جو مدعی نبوت ہیں اور قرآن کو کلام الٰہی بتاتے ہیں، اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ تو ولید بن مغیرہ یا نضر بن حارث یا ان کا کوئی چیلہ جواب دیا کرتا کہ اس میں تو گزشتہ اقوام و اشخاص کی داستانیں ہیں اس میں اور رکھا کیا ہے کہ ہم اسے خدا کا نازل کردہ احکام تسلیم کریں۔ ایسے قصے تو اور بہت موجود ہیں۔ بات یہ تھی کہ نضر بن حارث بغرضِ تجارت ایران اور بابل وغیرہ کو جایا کرتا تھا اور وہاں سے رستم و اسفندیار کی پرانی داستانیں آکر عرب کو سناتا تھا اور خیال کرتا تھا کہ میری داستان قرآن سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اسی سوال و جواب کو آیت میں بیان کیا ہے۔

بعض مفسرین نے قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ قرآن درحقیقت گزشتہ مذاہب کی نقل ہے۔ پچھلے زمانے کے لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ محمدؐ نے بھی ان کی دیکھا دیکھی نقل شروع کر دی۔ ہم افسانۂ ماضی کی نقل کو کلام اللہ کس طرح مان سکتے ہیں۔

آیت لِيَحْمِلُوا الخ میں اس سزا کا بیان ہے جو قیامت کے دن کفار کو برداشت کرنی ہوگی۔ چونکہ کفارِ مکہ خود بھی گمراہ تھے، اور آنے والے مسافروں کو بھی اسلام سے روکتے تھے، اس لئے ضلال و اضلال گمراہی اور گمراہ کن دونوں جرموں کے مرتکب تھے اور دونوں کا وبال ان کو برداشت کرنا ہوگا، لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ جب کفار مکہ یا کوئی گمراہ کرنے والا گمراہ ہونے والے کا وبال برداشت کرے گا تو عامل گمراہ ہونے بری ہو جائے گا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ بلکہ گمراہ کرنے والوں کی دوہری سزا کا اظہار مقصود ہے کہ ایک تو خود گمراہ ہونے کا وبال ان پر ہوگا دوسرا گمراہ کرنے کا اور ان لوگوں کے فعل کا نتیجہ جو بہکانے سے گمراہ ہوئے وہ اپنی سزا خود برداشت کریں گے۔ ان کا بار کوئی دور نہیں کر سکتا۔ دوسری آیت میں صاف صراحت ہے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ۔ یعنی کوئی شخص کسی کا بار اپنے اوپر اٹھا کر اس کو بری نہیں کر سکتا۔ صحیح حدیث میں آیا ہے حضور والا نے ارشاد فرمایا جس شخص نے دعوتِ ہدایت دی اس کو پیروی کرنے والوں کا بھی اجر ملے گا، مگر پیروی کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی اور جس نے دعوتِ گمراہی دی تو اس پر اپنا عذاب ہوگا۔ ان لوگوں کا بھی عذاب ہوگا جنھوں نے اس کی پیروی کی، مگر پیروی کرنے والوں کے عذاب میں کچھ تخفیف نہ ہوگی۔ دوسری حدیث میں ہے جس نے گمراہی کا طریقہ نکالا اس پر اپنا وبال بھی ہوگا اور ان لوگوں کے گناہ کا وبال بھی ہوگا جو اس طریقہ پر چلنے والے ہیں، لیکن اس راہ پر چلنے والوں کے مقررہ عذاب میں بھی اس سے کچھ کمی نہ ہوگی۔

يُضِلُّونَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ کا مطلب کشاف و بیضاوی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ جو لوگ ناواقف اور انجان ہیں اور اپنے گمراہ ہونے کا بھی ان کو علم نہیں ان کو یہ گمراہ کرتے ہیں۔ اس تقریر پر بِغَيْرِ عِلْمٍ کا تعلق ضمیر مفعول یعنی هُمْ سے ہے۔ میرے نزدیک مناسب مطلب یہ ہے کہ بِغَيْرِ عِلْمٍ کو فاعل کی ضمیر سے حال قرار دیا جائے یعنی گمراہ کرنے والے کافر انجان مسافروں کو بلا دلیل اور بغیر کسی نقلی ثبوت کے گمراہ کرتے ہیں۔ اسلام سے روکنے اور رسول اللہؐ کی تکذیب کرنے کی کوئی عقلی یا شرعی دلیل ان کے پاس نہیں۔ خواہ مخواہ اپنی جہالت و نادانی سے مسافروں کو بہکاتے ہیں۔

مقصودِ بیان

ان کافروں کی کور باطنی کا بیان جن کا نورِ فطرت بجھ چکا تھا اور قرآن کے بیان کردہ قصص میں جو خزائنِ ہدایت پوشیدہ ہیں ان کو وہ نظر نہ آتے تھے۔ ان کے نزدیک پارینہ غلط حکایات اور قرآنی تصریحات میں کوئی فرق نہ تھا۔ اس آیت سے در پردہ ان مسلمانوں کو تنبیہ ملنی چاہیئے جو قرآن پاک کے اندر موسیٰ، عیسیٰ، ابراہیم اور دیگر انبیاء کے قصّے مکرر پڑھ کر نہایت آسانی سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ بار بار ایک ہی قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ قرآن کیا کوئی داستان کی کتاب ہے۔ درحقیقت یہ ان کی کوتاہ فہمی ہے قرآن داستان نہیں پیامِ ہدایت ہے۔ ہر جگہ جو قصہ بیان کیا گیا ہے اور جتنا بیان کیا گیا ہے اتنا بیان کرنا ضروری تھا۔ بیانِ قصہ سے ترہیب و ترغیب، نیکوں اور بدوں کے نتائج کا اظہار، قانونِ قدرت کی تصریح، مطالعۂ تاریخ سے اخذِ نتیجہ کا حکم اور بعض دوسرے اسباقِ ہدایت کا درس مقصود ہوتا ہے۔ آیات کے آخر حصہ میں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ جس طرح گمراہی بری چیز ہے اسی طرح گمراہ کرنا بھی برا فعل ہے۔ گمراہ کرنے والوں پر گمراہ ہونے والوں کے جرم کا وبال بھی ہوتا ہے۔ اَلَا سَآءَ مَا یَزِرُوْنَ سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ گمراہ کرنے والوں کو گمراہ ہونے والوں سے کہیں زیادہ سزا اٹھانی اور عذاب بھگتنا ہوگا۔ کیوں کہ ان کے گمراہ کرنے سے جتنے لوگ گمراہ ہوں گے ان سب کا وبال ان کو بھگتنا پڑے گا۔ اپنے گمراہ ہونے کا وبال اس کے علاوہ ہوگا۔

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ

ان سے پہلے لوگ بھی دغا بازی کر چکے ہیں مگر اللہ نے اُن کی عمارتوں کو جڑ سے آ لیا

فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ

اور اوپر سے اُن پر چھت گر پڑی اور ایسی طرف سے اُن پر عذاب آیا کہ اُن کو

لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ

خبر بھی نہ تھی پھر قیامت کے دن ان کو رسوا کرے گا اور فرمائے گا میرے وہ شریک کہاں ہیں

الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ

جن کے بارے میں تم (مسلمانوں سے) جھگڑتے تھے جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا وہ کہیں گے کہ آج

الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْۗءَ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۝

رسوائی اور خرابی کافروں پر ہے

تفسیر

کفارِ مکہ کو اپنی خاندانی وجاہت، قومی عزت، جسمانی طاقت، قبائلی قوت اور مالی کثرت پر غرور تھا۔ اللہ کے رسول کے احکام کو وہ پائے استحقار سے ٹھکراتے تھے اور اپنی جہالت میں مست تھے اور چونکہ بمصلحت عذاب میں تاخیر تھی، اس لئے ان کی سرکشی و طغیان میں مزید اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا اور عذابِ الٰہی کی گرفت سے وہ اپنے آپ کو خارج سمجھنے لگے تھے۔ ان آیات میں کافروں کے غرور کا ازالہ اور تاخیرِ عذاب کی وجہ سے نڈر ہو کر بے خوف رہنے پر تنبیہ مقصود ہے۔

ابن کثیر نے بروایت عوفی از ابن عباس اور ابن ابی حاتم نے بروایت مجاہد از ابن عباسؓ بیان کیا ہے اور اکثر مفسرین نے اس کی تائید بھی کی ہے کہ اس آیت میں نمرود اور اس کے ساتھی مراد ہیں۔ جنہوں نے ڈھائی ہزار گز اونچا منارا بنایا تھا کہ ربّ السموات سے جنگ کر سکیں

اور منارہ پر چڑھ کر آسمان کی طرف تیر پھینکتے تھے، مگر انجام کیا ہوا بنا بنایا گھر جڑ سے زمین پر آ رہا۔ تمام فوج والے وہیں دب کر مر گئے۔ جس جگہ کو امن و امان کا مقام سمجھا تھا وہی ان کی ہلاکت و بربادی کا ذریعہ بنا۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ منارہ طوفانِ نوح کے بہت بعد شہر بابل میں بحکم نمرود بنایا گیا تھا، مگر وہ منارہ بخت نصر کی فوج پر گرا اور فوج دب گئی۔ یہ قول خلاف سیاق قرآنی ہے۔

اہلِ تحقیق کا قول ہے کہ آیت کا ظاہری ترجمہ مراد نہیں ہے بلکہ یہ محاورہ کی بات ہے کسی شخص کا منصوبہ اگر پورا نہ ہو سکے اور اس کی اسکیم برباد ہو جائے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس کا چنا چنایا گھر گر پڑا۔ نمرود اور قوم نمرود نے بھی حضرت ابراہیمؑ کے مقابلے کی کافی تیاریاں کیں لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی جو اسکیم بنا تا وہ الٹی اس کو نقصان پہنچاتی۔ بالآخر ان کی کوئی مکاری پیش نہ گئی۔ عظیم الشان سلطنت، جلیل المرتبہ تمدن اور رفیع الدرجہ تہذیب تباہ ہو گئی۔ گویا بنا بنایا گھر گر گیا۔ کشاف و بیضاوی نے اسی مطلب کو پسند کیا ہے

ایک نکتہ اللہ تعالیٰ نے لفظ لَا یَشْعُرُوْنَ سے عجیب نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شعور نام ہے حواس سے ادراک کرنے کا احساس اور شعور ایک ہی چیز ہے، لیکن علم کا درجہ بلند ہے۔ شرعی اصطلاح میں علم و یقین مترادف الفاظ ہیں گویا جہاں شعور کی حد ختم ہو جاتی ہے وہاں علم کی حد شروع ہوتی ہے۔ جہاں حواسِ باطنہ کی رسائی نہیں ہوتی وہاں عقل سے کام لیا جاتا ہے۔ دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی چیزوں کا ادراک حواس کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ ان کے احساس کو شعور کہا جاتا ہے، لیکن جو چیز ان پانچوں اقسام سے خارج ہو وہاں حواس کام نہیں دیتے عقل کام دیتی ہے۔ قوم نمرود کی علمی قوت اور نظری طاقت تو یقیناً آفت رسیدہ تھی، اس لئے ان کو اپنے عقائد و اعمال کی خرابی کا ادراک ہو نہیں سکتا تھا اور اس کے عذاب کو وہ جان بھی نہ سکتے تھے جو حواس کی رسائی سے باہر تھا، مگر جہاں حواس کی رسائی تھی اس کو بھی وہ نہیں سمجھتے تھے۔ گویا غفلت کا پردہ نہ فقط ان کی عقل پر پڑا ہوا تھا بلکہ حواس بھی ماؤف تھے۔ محسوس عذاب بھی ان کو نہ سوجھتے تھے۔ یا یہ مطلب ہے کہ عذاب الٰہی ایسے طریقے سے ان پر آیا جو محسوسات سے خارج تھا صرف نظری اور عقلی قوت سے سمجھا جا سکتا تھا اور چونکہ وہ کور باطن تھے محض مادی حواس رکھتے تھے، اس لئے وہ طریقۂ عذاب کو نہ سمجھ سکتے تھے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ گزشتہ مغرور کافروں کو باوجود ان کی انتہائی طاقت اور بیش از بیش مکاری کے خدا تعالیٰ نے دنیا میں برباد کیا اور قیامت کے دن بھی ان کو رسوائی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ بطور توبیخ و تذلیل خدا تعالیٰ ان سے فرمائے گا آج وہ کہاں ہیں جن کو دنیا میں تم نے الوہیت و ربوبیت کا شریک سمجھ رکھا تھا اور اہلِ صلاح سے تم ان کے مناظرات اور جھگڑے کیا کرتے تھے۔ آج ان کو اپنی مدد کے لئے بلاؤ۔ ایک تو خدا کی طرف سے ان کی یہ تذلیل ہوگی اس پر مزید یہ کہ بطور طعن و تشنیع کے اہلِ علم یعنی انبیاء، اولیاء، علماء، عام مومنین اور ملائکہ ان سے کہیں گے آج عذاب و رسوائی ان کافروں کے لئے مخصوص ہے گویا ایک تو واقعی عذاب اور ذلت ہوگی اس پر طرہ یہ کہ جن مومنوں کو وہ دنیا میں ذلیل سمجھتے تھے اس روز وہی اہلِ ایمان ان پر طعن کریں گے۔ عذاب کی تکالیف اور طعن کی ذلت و رسوائی ان کو برداشت کرنی پڑے گی۔

مقصود بیان تمرد و سرکشی باعثِ تباہی ہے۔ تاخیر عذاب سے بے باک بن جانا نہ چاہیئے۔ طاقت میں بدمست ہو کر انسان اپنے حواس بھی کھو بیٹھتا ہے پھر محسوس نتیجۂ بد بھی اس کو سوجھائی نہیں دیتا۔ قیامت کے دن اہلِ ایمان کافروں کے خلاف شہادت دیں گے وغیرہ

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ
جن کی روحیں فرشتوں نے ایسی حالت میں قبض کی تھیں کہ وہ خود اپنے حق میں ستم کر رہے تھے اس وقت وہ صلح کا پیغام ڈالیں گے کہ ہم تو کچھ

مِنْ سُوْٓءٍ ۭ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ
برائی نہ کرتے تھے ہاں ہاں اللہ تمہارے کرتوت سے خوب واقف ہے اب جہنم کے دروازوں میں

جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ○

داخل ہو جن کے اندر ہمیشہ ہمیشہ رہو گے　وہ غرور کرنے　والوں کا　بُرا ٹھکانا　ہے

تفسیر یہ آیات سابق سے مربوط ہیں یعنی قیامت کے دن رسوائی اور ذلت ان مغرور کافروں کی ہو گی جو مرتے دم تک کفر پر جمے رہے۔ آثار موت ظاہر ہونے سے پہلے جتنا وقت گذرا شرک وکفر پر گذرا، لیکن مرنے کے بعد ان کو کچھ بن نہ پڑے گا جس شرک کا دنیا میں جوش خروش سے اقرار کرتے تھے اس سے صاف مکر جائیں گے اور نہ فقط شرک سے انکار کریں گے بلکہ ہر بدی کے اعتراف سے گریز کریں گے مگر یہ انکار فضول ہو گا۔ ملائکہ شہادت دیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔ اللہ تمہاری بداعمالی سے خوب واقف ہے۔ پھر جہنم کے اندر مختلف دروازوں سے داخل ہونے کا حکم ہو گا اور ہر ایک چھوٹا بڑا مغرور کافر اپنے کفر وتکبر کی حیثیت کے موافق دوزخ کے جدا جدا طبقوں میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جائے گا۔

نوٹ:۔ بعض علماء کا قول ہے کہ قیامت کے دن کوئی شخص جھوٹ نہ بول سکے گا خواہ کافر ہو یا مومن۔ بدکار یا نیکوکار　اس قول پر آیت میں تاویل کرنی ہو گی اور کفار کے انکار کو صحیح قرار دیتے ہوئے اس طرح کہا جائے گا کہ کافروں کا کفر اگرچہ واقعی ہے، مگر ان کو اپنی بداعمالی کا یقین نہیں اور نہ وہ اپنے مسلک کو خلافِ حق سمجھتے ہیں، اس لئے قیامت کے دن بھی ان کا انکار ان کے خیال واعتقاد کے بموجب صحیح ہو گا۔

مقصودِ بیان قبض روح کے وقت تک شرک وکفر پر قائم رہنا نجات سے محروم کر دیتا ہے۔ دریں وہ اس سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ جو لوگ مرنے یا آثار موت ظاہر ہونے سے پہلے توبہ کر لیں تو ان کی توبہ قابل قبول ہے وغیرہ۔

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوْا خَيْرًا ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ

اور (جب) پرہیزگاروں سے　پوچھا جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے کیا نازل کیا؟ تو وہ کہتے ہیں اچھی چیز (نازل کی) جن لوگوں نے دنیا میں

هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۭ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ (۳۰)

بھلائی کی　اُن کے لئے　بھلائی ہے　اور دارِ آخرت　تو بہت ہی　بہتر ہے　اور پرہیزگاروں کا　واقعی اچھا　گھر ہے

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ ۭ

یعنی دوامی جنتیں ہیں　جن کے اندر وہ داخل ہوں گے　اُن میں نہریں　جاری ہیں　جو کچھ وہ چاہیں گے اُن کو　وہاں　ملے گا

كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ

اللہ اُن پرہیزگاروں کو ایسا ہی بدلہ دیتا ہے　جن کی روحیں فرشتے　ایسی حالت　میں قبض　کرتے ہیں کہ وہ پاک وصاف ہوتے ہیں

يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

فرشتے ان سے کہتے ہیں السلام علیکم　اپنے (نیک) اعمال کے صلے میں　جنت میں　داخل　ہو

تفسیر گزشتہ آیات میں کافروں اور منکروں کا احمقانہ قول، جاہلانہ عقائد اور بداعمالی بیانات کو ذکر کر کے ان کے نتائج بد کو بیان فرمایا تھا۔

چونکہ ہدایت و تبلیغ کی تکمیل صرف تنبیہ اور ترہیب سے نہیں ہوتی بلکہ ترغیب و تبشیر بھی لازم ہے، اس لئے ان آیات میں باایمان نیکوکار مسلمانوں کے اجر کو بیان فرماتا ہے جو مرتے مرتے تک مومن رہتے ہیں۔ قبض روح کے وقت ان کے دل کفر و شرک کی آلائشوں سے پاک صاف دنیوی میل کچیل سے ستھرے اور شوق دیدار الٰہی سے مخمور ہوتے ہیں۔ ان کے ثواب کے تین درجات ہیں اوّل تو دنیا میں ہی ان کو عوض ملتا ہے۔ عزت، حکومت، تسلط، فراخ دستی، خوش حالی، دشمنوں پر فتحیابی وغیرہ۔ غرض ہر قسم کی بھلائی ان کو نصیب ہوتی ہے۔ دوئم قبض روح کے وقت اللہ کے مقرب فرشتے ان کو خوش آمدید کہتے ہیں، خوش خلقی اور تہذیب کے ساتھ ان کی موانست کرتے ہیں اور دعائے سلامتی دیتے ہیں۔ سوئم دوامی رغبت حاصل ہوتی ہے جس کے اندر ان کی تمام خواہشات کی تکمیل کی جاتی ہے۔ لباس، طعام، سکونت، صنفی لوازم اور دیگر محسوس خواہشات تو پوری ہی کی جاتی ہیں ان کے علاوہ بھی جو کچھ چاہیئے ان کو دیا جاتا ہے، لیکن اجر الٰہی حاصل کرنے کے لئے تقویٰ کی ضرورت ہے۔ متقیوں کو یہ نعمتیں نصیب ہوتی ہیں جس قدر تقویٰ ہوگا اسی قدر اجر ملے گا۔ شرک و کفر سے تقویٰ، کبیرہ گناہوں سے تقویٰ، ہر اس چیز سے تقویٰ جو یاد الٰہی سے غافل کرنے والی ہے۔ پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر غیر اللہ کے خیال سے تقویٰ اور ذات الٰہی یا صفات خداوندی میں کامل استغراق اور اپنی ہستی کو بھی فراموش کر دینا۔ یہ تمام مراتب تقویٰ ہیں آدمی جس مرتبہ میں ہوگا ویسا ہی اس کو اجر ملے گا۔ مُتَّقِيْنَ کا لفظ عام ہے یہ تمام مراتب کو شامل ہے۔

تشریح احکام

اَحْسَنُوْا قتادہؒ نے اس کی تفسیر میں فرمایا مُحْسِنِیْن وہ لوگ ہیں جو اللہ کو اللہ کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو مانتے ہیں۔ خود اطاعت کرتے ہیں اور دوسروں کو اطاعت الٰہی پر آمادہ کرتے ہیں۔ ایک صحیح حدیث میں احسان کی تفسیر حضورؐ نے خود فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا احسان (کا درجہ) یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اگر یہ مرتبہ حاصل نہ ہو تو کم از کم اتنا ہونا چاہیئے کہ تم کو یہ یقین ہو کہ اللہ تم کو دیکھ رہا ہے۔

سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ اس کی تفسیر میں کرخیؒ نے فرمایا کہ متقی مومنوں کو فرشتے بشارت دیتے ہیں کہ اس کے بعد کوئی ناگوار خاطر امر تمہارے سامنے نہ آئے گا۔ سیوطیؒ نے درمنثور میں امام مالک، ابن جریر اور بیہقی وغیرہم کی روایت کردہ ایک حدیث بیان کی ہے کہ جب کوئی مومن بندہ مرنے لگتا ہے تو فرشتہ اس سے کہتا ہے اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا وَلِيَّ اللّٰهِ یا اللہ سلام بھیجتا ہے

مقصود بیان

اہل ایمان پر لازم ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے احکام کو اچھا اور مفید ہی کہیں۔ اس آیت سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ اس تعلیم یافتہ گروہ باطن طبقہ کو جو دماغی روشنی کا مدعی ہے اور شریعت کے بعض منصوص احکام کو عملاً منسوخ مانتا ہے، اور کہتا ہے ہاں یہ رسول اللہ ؐ کے دور میں ضرور مناسب اور اچھے لگتے تھے، مگر اس روشنی کے زمانے میں اس قسم کے قوانین وحشیانہ ہیں۔ زنا کی شرعی سزا، قتل عمد کا قصاص، قربانی، سود اور بعض دیگر احکام اس کی نظر میں قابل استہزاء اور ضرر رساں ہیں۔ لفظ حَسَنَةٌ دلالت کر رہا ہے کہ جو لوگ خدا سے رشتہ جوڑ لیتے ہیں ان کو خدا تعالیٰ دنیا میں بھی ہر قسم کی خوبی اور بھلائی عطا فرماتا ہے۔ حکومت، عیش، خوشحالی، کامرانی، فتحیابی اور عمومی عزت نصیب ہوتی ہے۔ مَا يَشَآءُوْنَ کے لفظ سے ثابت ہوتا ہے کہ جنت میں ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ بات یہ ہے کہ انسانی تخیل میں عموماً جو نعمتیں آسکتی تھیں وہ قرآن نے مجمل طور پر بیان کر دیں۔ اچھا کھانا، اچھا لباس، اعلیٰ مسکن، بہترین طعام، صنفی اقتضائیات کو پورا کرنے کے اعلیٰ ذرائع۔ لیکن خواہشات کا تنوع اور مرغوبات کی رنگا رنگی کسی تفصیلی حصر سے مانع تھی۔ ہر شخص اور ہر قوم کا مرغوب طبع جدا ہے۔ ہر ایک کی تفصیل ناممکن ہے، اس لئے مجمل طور پر فرما دیا کہ جو خواہش ہوگی پوری کی جائے گی۔ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ سے ضابطۂ الٰہیہ کا بیان مقصود ہے کہ قانون قدرت اور عادت الٰہیہ ہی اس طور پر جاری ہے کہ اہل تقویٰ کو نوازا جاتا ہے۔ اگرچہ نیک اعمال موجب مغفرت نہیں۔ مغفرت محض مشیت الٰہیہ پر موقوف ہے، لیکن اس کی مشیت کا قانون یہی ہے کہ بندوں ہی کی مغفرت کی جاتی ہے اور بدکار کافر جنت سے محروم رہتے ہیں۔ اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ گزشتہ زندگی کیسی ہی گذری ہو مرنے کے وقت کا اعتبار ہے۔ خاتمہ کی حالت قابل توجہ ہے۔ آثار موت ظاہر ہونے سے پہلے جو شخص مومن رہا وہ مومن ہے۔ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ سے باشارۃ النص یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شریعت اسلامی میں باہم ملاقات کے وقت انہیں الفاظ سے سلام ہونا چاہیئے وغیرہ

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ كَذٰلِكَ

کیا یہ کافر اسی بات کے منتظر ہیں کہ اُن پر فرشتے آ موجود ہوں یا تمہارے رب کا عذاب آ پہنچے اسی طرح

فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

ان کے اگلوں نے بھی کیا تھا ان پر اللہ نے ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم

يَظْلِمُوْنَ ۝ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ

کرتے تھے اس کے بعد اُن کے اعمال کی بُرائیاں انکو پہنچ گئیں اور جس عذاب کی وہ ہنسی اُڑاتے تھے وہی اُن پر اُلٹ پڑا

تفسیر مکّے کے کافر ہٹ کرکے بیٹھے حضورِ اقدسؐ نے اپنی صداقت کے ثبوت میں جو معجزات ظاہر فرمائے ان کی تصدیق نہ کی۔ توحید اور رسل کا جو حکم دیا اس کو نہ مانا اور بالآخر تین شبہات وارد کئے۔ پہلا شبہ تو یہ تھا کہ فرشتے تمہارے پاس کیوں آتے ہیں؟ ہمیں کیا معلوم کہ سچے ہو یا جھوٹے۔ جو فرشتے تمہارے پاس آتے ہیں ہمارے پاس کیوں نہیں آتے اور ہم سے تمہاری سچائی نہیں بیان کرتے؟ اس شبہ کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے باقی دونوں شبہات کی تفصیل اور ان کے جواب آئندہ آیات میں آ رہے ہیں۔

حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ کافروں کو دو باتوں میں سے ایک کا انتظار ہے یا تو اللہ کے فرشتے ان کے پاس پہنچیں یا عذابِ الٰہی آ جائے، مگر یہ بات کوئی نئی نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی کفار و مشرکین کا یہی خیال تھا۔ آخرکار اپنی بداعملی کا نتیجۂ بد ان کو بھگتنا پڑا۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ملائکہ سے موت کے فرشتے مراد ہیں یعنی کافروں کی طبیعتیں حیلہ جو اور بہانہ طلب واقع ہوئی ہیں۔ جب تک ظاہری طور پر کھلم کھلا کوئی مجبور کن امر ان پر نہ مسلط ہو جائے اس وقت تک یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ تاخیرِ عذاب اور زندگی کی مہلت کی ان کو قدر نہیں بلکہ موت کے فرشتے آسمان کے پاس پہنچ جائیں اور ان کی جانیں قبض کرنے لگیں یا کسی اور طرح سے عذابِ الٰہی ان پر آ جائے تو مانیں گے۔ بس ایسے وقت کا ان کو انتظار ہے، لیکن ایسے وقت کا انتظار لاحاصل ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

آیت کی مؤخر الذکر تشریح پر ایک شبہ یہ وارد ہوتا ہے کہ کافروں کو نہ تو اپنے مرنے کا انتظار تھا نہ عذابِ الٰہی کے نزول کا۔ انتظار کسی قابلِ شوق چیز کا ہوتا ہے۔ ان کو اپنی ہلاکت کا شوق نہ تھا پھر هَلْ يَنْظُرُوْنَ کے ظاہری معنی کس طرح صحیح ہو سکتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ وہ نزولِ عذاب کا تقاضا کرتے تھے تو یہ استہزاء تھا ان کو عذاب کا یقین ہی نہ تھا۔

اس شبہ کا ازالہ قواعدِ بلاغت کے پیشِ نظر کیا گیا ہے۔ اہلِ زبان کا قاعدہ ہے کہ اگر کسی اقرار یا انکار کے آثار ظاہر ہوں اور وہ تمام علامات مخاطب میں پائی جائیں جن کی بنا پر اقرار یا انکار ہو سکتا ہے تو باوجود یکہ مخاطب مقر یا منکر نہیں ہوتا مگر آثار و علامات کے اقتضاء کے ماتحت اس کو مقر یا منکر قرار دیتے ہوئے اس طرح اس سے کلام کیا جاتا ہے جیسے کسی مقر یا منکر سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ قرآن پاک کی صداقت میں تمام کافروں کو گونا گوں شبہات اور شکوک ہوتے ہیں، لیکن کافروں کی ہی فطرت میں ایسے دلائل و براہین موجود ہیں کہ اگر وہ ذرا غور سے کام لیں تو تمام شکوک زائل ہو جائیں، اس لئے کافروں کے شکوک کو ہیچ سمجھتے ہوئے سورۂ بقر کے آغاز میں فرمایا لَا رَیْبَ فِیْهِ یعنی قرآن میں کوئی شک نہیں۔ یا اگر کوئی شخص اپنے دشمنوں میں بغیر ہتھیار کے خالی ہاتھ جائے تو کوئی شخص اس سے کہے بھائی وہاں تمہارے بہت دشمن ہیں دیکھو اس شخص نے دشمنوں کا کوئی انکار نہ کیا تھا مگر خالی ہاتھ دشمنوں میں جانا دلالت کر رہا تھا کہ اس کو وجودِ اعداء سے انکار ہے، اس لئے اس کو تنبیہ کی گئی۔ یہی صورت یہاں بھی ہے۔ کافروں کو موت اور نزولِ عذاب کا انتظار تو نہ تھا، لیکن باوجود کثرتِ معجزات اور وضوحِ دلائل کے ایمان نہ لانا اور ٹال مٹول کرنا دلا-

...ر رہا تھا کہ ان کو کسی مجبور کن طاقت کی زبردستی کار فرمائی کا انتظار ہے۔ موت کا وقت آنے کے منتظر ہیں یا نزولِ عذاب کے طلب گار۔ ان کے حالات بتا رہے ہیں کہ گویا ان کو ایمان اور عملِ خیر کی ضرورت نہیں۔ ان کی نظر میں ضرورت کا وقت اگر ہو سکتا ہے تو موت کا یا نزولِ عذاب کا۔

مقصودِ بیان قانونِ قدرت اور ضابطۂ الٰہیہ ہے کہ عذابِ آخرت کے علاوہ دنیوی بربادی و تباہی بھی انسانی اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے بد اعمالی کا وبال دنیا میں ہی برداشت کرنا ہوتا ہے۔ خدا ظالم نہیں کسی کی حق تلفی نہیں کرتا بلکہ آدمیوں کی بداعمالیاں عذاب کی صورت میں اس کو خود گھیر لیتی ہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا عَبَدْنَا مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ

مشرک کہتے ہیں کہ اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اُس کے سوا کسی چیز کی پرستش نہ

نَّحْنُ وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ فَعَلَ

کرتے اور نہ اُس کے بدون حکم ہم کسی چیز کو حرام کہتے اُن سے پہلے لوگوں نے

الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ○ وَلَقَدْ

ایسا ہی کیا تھا پس رسولوں پر سوائے کھول کر پیام پہنچا دینے کے اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے ہم ہر قوم

بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۖ

میں ایک رسول بھیج کر (یہ کہلا چکے ہیں) کہ اللہ کی عبادت کرو اور بتوں سے بچو

فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللَّهُ وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلَالَةُ ۚ فَسِيرُوا

تو ان میں سے بعض کو اللہ نے ہدایت دی اور بعض پر گمراہی ثابت ہو گئی ذرا ملک

فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ○ إِن تَحْرِصْ

میں چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا (اے محمد) اگر ان کو

عَلَىٰ هُدَاهُمْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَن يُضِلُّ ۖ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ○

ہدایت پر لانے کی حرص کرو تب بھی اللہ جس کو گمراہ چھوڑ دیتا ہے اس کو ہدایت نہیں کرتا اور نہ اُن کا کوئی مددگار ہے

تفسیر اہلِ شرک اپنی حقانیت اور رسول پاک ﷺ کی نبوت سے انکار کے لئے مذکورہ بالا شبہ کے علاوہ دو شبہات اور بھی وارد کرتے تھے، لیکن دونوں شبہات کا استنباط ایک ہی دلیل سے تھا۔ نہایت پُر زور طریقہ سے بطور استہزاء (بر قول امام رازی) کہا کرتے تھے کہ یہ امر تم کو تسلیم ہے کہ خدا کی مشیت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا، اس لئے ظاہر ہے کہ ہم حق پر ہیں۔ کیونکہ اگر خدا چاہتا تو ہم اور ہمارے اسلاف کبھی بُت پرستی نہ کرتے اور نہ ان امور کو حلال قرار دیتے۔ اگر ہمارا مسلک حق اور خدا کی مرضی کے موافق نہ ہوتا تو چونکہ وہ مختارِ کل اور مالک ہے۔ اس لئے یہ افعال ہم سے صادر ہی نہ ہونے دیتا۔ پس جب ہم

اس کے ارادہ و اختیار سے ایک کام کر رہے ہیں تو اس کو خدا کی ناراضگی کا سبب بتانا غلط ہے۔ اس کے علاوہ اگر خدا چاہتا تو بغیر رسول کے بھیجے ہوئے ہم کو راہ یاب کر دیتا اور ہم نیکوکار ہو جاتے تب پیغمبر کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ان دونوں شبہات کا جواب ظاہر ہے۔ پہلی صورت میں بندۂ عاجز و کم عقل کا اپنے مربی و قادر خدا کے افعال پر اعتراض لازم آتا ہے پھر ارادۂ خداوندی اور رضائے خداوندی میں فرق نہ کرنا اس شبہ کا اصل منشاء ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں اعمال و افعال گوناگوں ہو رہے ہیں۔ پس یہ تو ممکن ہے کہ دو مختلف کام ایک ارادہ سے ہوں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ دو متضاد کاموں پر بھی رضا ہو جائے۔ مزید برآں اگر خدا اپنی مرضی پر لوگوں کو مجبور کرتا اور خلافِ مرضی کوئی فعل نہ ہونے دیتا تو انسانی اختیار سلب ہو جاتا۔ امتحان ختم ہو جاتا۔ نیک و بد، خیر و شر اور حق و باطل کی تمیز اٹھ جاتی اور چونکہ کفار کا مقصود اس کلام سے حق تعالیٰ کی مشیت کا عموم ثابت کرنا نہ تھا بلکہ نبوت کا انکار اور پیغمبروں کا استہزاء کر کے ان کی دل آزاری اور اپنی آزاد روی پر کٹ حجتی کے ساتھ قائم رہنا تھا، اس لئے اس شبہ کے جواب کی طرف اشارہ کر دیا اور ضرورتِ نبوت کی صراحت فرما دی۔ حاصل جواب یہ ہے کہ انسان مجبور نہیں مختار ہے اور اس کو فرضِ تکلیف پر قائم رکھنا ہے، اس لئے پیغمبروں کا ہونا ضروری ہے تاکہ اللہ کے احکام اور اس کی معرفت بندوں تک پہنچ سکیں۔ انبیاء کا کام یہ ہے کہ جو حکم خدا کی طرف سے ان کے پاس آئے عام لوگوں تک ان کو پہنچا دیں۔ چنانچہ ہر قوم میں خدا نے پیغمبر بھیجا اور حکم دے دیا کہ توحید پر قائم رہو بت پرستی چھوڑ دو۔ اب جس کی قسمت میں ہدایت تھی وہ راہ یاب ہو گیا اور جس پر گمراہی کی مہر لگ چکی تھی وہ گمراہ رہا۔

خلاصہ یہ کہ اگر مشرکین کی مراد یہ ہے کہ خدا نے شرک کو مشروع کر دیا ہے تو یہ غلط ہے۔ باجماع انبیاء و رسل اس نے شرک کی سخت ممانعت فرما دی ہے اور اگر مراد یہ ہے کہ اللہ نے اپنی مشیت سے ہر چیز کو پیدا کیا ہے تو یہ صحیح ہے، لیکن اس سے کافروں کا مطلب نہیں نکلتا کیونکہ شرک اور بد اعمالی کا نتیجہ بھی اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔ دوزخ بھی اسی نے بنائی ہے۔ خلق اور رضا میں فرق ہے۔ تخلیق سے شرعی ممانعت نہ ہونے پر استدلال کرنا غلط ہے۔ تکذیب انبیاء کرنے والوں کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ ملک شام اور اطراف عالم میں چل پھر کر دیکھ لو۔

آخر میں اپنے نبی کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ آپ کتنی ہی سعی و کوشش اور رغبت خاطر سے ان کو راہ پر لانا چاہیں، مگر بے کار ہے۔ اللہ کے علم میں جس کی گمراہی موجود ہے وہ راہ پر نہیں آ سکتا۔ ازلی گمراہوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

مقصودِ بیان مشرکین کے شبہات کا ازالہ۔ ضرورت نبوت پر استدلال غرض رسالت کی صراحت۔ مشیت و رضا کے فرق کی طرف اشارہ۔ اس امر کی تصریح کہ ہر قوم میں ایک نبی آ چکا ہے۔ ضابطۂ رسالت کوئی جدید نہیں۔ اس بات کی وضاحت کہ تمام انبیاء ایک ہی مقصد کے حامل تھے۔ ہدایت و گمراہی اللہ کے اختیار میں ہے۔ نبی مختارِ کل نہیں ہوتا اور نہ کافر کو زبردستی مومن بنانا نبی کی قدرت میں ہے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ

اور وہ اللہ کی بہت سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ جو مر جائے گا اللہ اس کو نہیں اٹھائے گا ہاں ضرور اٹھائے گا اس پر یہ وعدہ

حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ

لازم ہے مگر بہتیرے آدمی ناواقف ہیں (اٹھانے کی غرض یہ ہے کہ) لوگوں پر وہ بات ظاہر کر دے جس میں وہ اختلاف

فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ۝ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ

کرتے تھے اور کافروں کو معلوم ہو جائے کہ واقعی وہ جھوٹے تھے جب ہم کسی چیز (کو پیدا کرنے) کا ارادہ

إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ع

کرتے ہیں　تو بس کہہ دیتے ہیں　ہو جا　وہ ہو جاتی ہے

تفسیر قریش کا قاعدہ تھا کہ اکثر باتوں پر اپنے آباؤ اجداد یا اولاد یا بتوں کی قسمیں کھایا کرتے تھے، لیکن اگر کوئی سخت قسم کھانی ہوتی تو اللہ کی قسم کھاتے اور اللہ کو شاہد بنا کر کہتے کہ مُردے دوبارہ زندہ نہ ہوں گے۔ انکار حشر کی کوئی وجہ سوائے گمان و قیاس کے ان کے پاس نہ تھی۔ ان کو بوسیدہ اور فرسودہ ہڈیوں کا زندہ ہو کر اٹھنا تعجب انگیز معلوم ہوتا تھا۔ ابوالعالیہ کی روایت میں ہے کہ کسی مسلمان کا کسی قریشی کافر پر کچھ روپیہ قرض تھا مسلمان نے مطالبہ کیا۔ کافر نے انکار کیا۔ گفتگو کا رد و بدل ہوا مسلمان نے دوران گفتگو میں کہا مجھے بروز قیامت خدا سے ایسی ایسی امیدیں ہیں۔ کافر نے کہا کیا تجھے خیال ہے کہ گل سڑ جانے کے بعد تو پھر زندہ ہو جائے گا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ صحیحین میں اتنا زائد ہے کہ اس کافر نے کہا اچھا جب میں دوبارہ زندہ کیا جاؤں (اور لامحالہ میرے پاس وہاں میرا مال تو ہوگا) اس وقت تیرا قرضہ ادا کر دوں گا۔ اسی پر ان آیات کا نزول ہوا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ انکار قیامت بے بنیاد ہے۔ وجود قیامت کا مقتضی موجود ہے اور کوئی عقلی استحالہ بھی نہیں۔ ہم نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ ریزہ ریزہ ہڈیوں کو جمع کر کے دوبارہ زندہ کریں گے۔ وجود قیامت کا فائدہ یہ ہے کہ دنیا میں اکثر باتوں کا اکثر لوگوں کو شبہ رہتا ہے۔ بکثرت آدمی کسی قابل وثوق نتیجہ پر نہیں پہنچتے اور باہم اختلاف کرتے ہیں۔ کوئی اللہ کو مانتا ہے کوئی نہیں مانتا۔ اگرچہ دلائل و معجزات اور عقل سلیم کی شہادت سے یہاں سب کچھ فیصلہ ہو گیا، مگر پھر بھی بہت لوگ عناداً نہیں مانتے اور نخوت و تکبر سے اپنا عقیدہ اور خیال نہیں چھوڑتے، اس لئے دوسرے جہان کا ہونا ضروری ہے تاکہ جھگڑا ہے چکا کر سچ اور جھوٹ جدا کر کے دکھایا جائے۔ اور سزا جزا دے کر حق و باطل کو قطعیت بنا دیا جائے۔ رہا یہ شبہ کہ ریزہ ریزہ ہڈیاں کس طرح جمع کی جائیں گی اور کس طرح ان کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا؟ تو اللہ کے لئے یہ بات کچھ دشوار نہیں۔ اس کو کسی چیز کے پیدا کرنے کے لئے مادّہ کی ضرورت نہیں اور جب مادہ موجود ہو تو اس کی پراگندگی دور کر کے جمع کر لینا اور اس میں جان ڈال دینا کچھ بھی مشکل ہی نہیں۔ تخلیق اشیاء کے لئے محض اس کا ارادہ اور مشیت کافی ہے۔ جہاں کسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا وہ چیز پیدا ہو گئی۔ لہٰذا قیامت کے وقوع سے جب کوئی مانع نہیں اور مقتضی موجود ہے تو پھر اس کا کیوں وقوع نہ ہو۔

مقصود بیان وعدۂ الٰہی میں تکذیب نہیں ہو سکتی۔ حشر جسمانی حق ہے۔ حشر جسمانی کے مقتضی کا بیان۔ اللہ کو تخلیق اشیاء کے لئے کسی مادے اور مدت کی ضرورت نہیں۔ اس حکم کی تاثیر بغیر مادہ کے ہوتی ہے اور زمانی نہیں بلکہ آنی ہوتی ہے۔ فقط اس کا ارادہ اور فعلی مشیت ہی تخلیق کے لئے کافی ہے۔

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً

جن لوگوں نے مظلوم ہونے کے بعد گھر چھوڑے　ہم ضرور　اُن کو　دُنیا میں　اچھا ٹھکانا　دیں گے

وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝

اور آخرت کا ثواب تو بہت ہی بڑا ہے کاش وہ جانتے ہوتے (یہ وہی لوگ ہیں) جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں

تفسیر ان آیات کے سبب نزول میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ ابن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چھ راسخ الایمان صحابہ کے حق میں نازل ہوئی ہے جن کو کفار قریش غلام سمجھ کر تکالیف دیا کرتے تھے۔ ان میں خباب، بلال، صہیب اور عمار بھی تھے۔ ان لوگوں نے تنگ آ کر مدینے

کو ہجرت کی تھی۔

بعض علماء کا قول ہے کہ ابوجندل بن سہیلؓ وغیرہ کے حق میں آیت کا نزول ہوا جن کے باپ اور خاندان والے کافر تھے اور مرتد بنانے کے لئے طرح طرح سے ان کو تکلیفیں دیتے تھے، مگر انہوں نے تمام مصائب برداشت کئے۔ قوی قول یہ ہے کہ آیت کا نزول ان اشخاص کے حق میں ہوا جنہوں نے ملک حبش کو ہجرت کی تھی، اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے وطن چھوڑا، اہل و عیال کو خیرباد کہا، مال و جائیداد سے دست بردار ہوئے، سفر کی صعوبت اٹھائی اور حق سے منہ نہ موڑا۔ یہ کل اسی یا بیاسی آدمی تھے۔ جن میں حضرت عثمانؓ آپ کی بیوی یعنی صاحبزادی حضرت رقیہ اور حضرت جعفر بن ابی طالب وغیرہ بھی تھے۔ توضیح مقام یہ ہے کہ ہجرت کے معنی ہیں چھوڑ دینا۔ شریعت میں اسی سے مراد ہوتی ہے۔ اپنے اہل و عیال مال و منال اور گھر بار چھوڑ کر ایسے مقام پر چلا جانا جہاں اسلام کے احکام بخوبی آسانی کے ساتھ بلا روک ٹوک انجام دیے جا سکیں۔ حضور اقدس ﷺ کے ابتدائی زمانے میں کفرستان تھا۔ احکام اسلامیہ پر عمل کرنے کی آزادی تھی۔ طرح طرح سے مسلمان ستائے جاتے تھے، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے کچھ مسلمانوں کو حکم دیا کہ حبش کو چلے جاؤ وہاں کا بادشاہ نجاشی تم کو پناہ دے گا۔ چنانچہ مسلمانوں کی جماعت مکہ چھوڑ کر چلی گئی۔ پھر روز بروز مصائب و تکالیف اور کافروں کی طرف سے ایذا رسانی میں اضافہ ہوتا گیا تو حضور اقدس ﷺ نے مدینہ کو ہجرت کر جانے کی اجازت دی اور خود بھی ایک روز حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر راہِ خدا میں اٹھ کھڑے ہوئے اور تمام مال و متاع اور گھر بار چھوڑ کر مدینہ کو تشریف لے گئے اور مدینہ پہنچ کر اعلانِ عام فرما دیا کہ جہاں کہیں جو مسلمان ہو اور اس کے بس میں ہو تو مدینہ کو چلا آئے۔ فتح مکہ کے پہلے پہلے یہ حکم جاری رہا، لیکن جب مکہ فتح ہو گیا اور مسلمانوں کی حکومت وہاں ہو گئی اور اسلامی قوانین پر عمل کرنے میں مزاحمت کا خطرہ نہ رہا تو حضور ﷺ نے فرما دیا لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ یعنی فتح مکہ کے بعد اب ہجرت کا وجوب نہ رہا البتہ جہاد کا حکم باقی رہا، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہجرت کا حکم منسوخ ہو گیا۔ ہاں صرف مدینہ کو ہجرت کرنے کا وجوب جاتا رہا۔ باقی ہجرت بدستور باقی ہے۔ جہاں فرائض و واجبات میں مزاحمت ہوتی ہو، حکومت وقت یا برادرانِ وطن اسلامی قوانین پر عمل کرنے سے روکتے ہوں اور مسلمانوں کا جان و مال محفوظ نہ ہو اور دفع کی طاقت بھی نہ ہو وہاں سے ہجرت کر جانا اور کہیں دوسری امن کی جگہ جا کر رہنا ضروری ہے۔ آیت میں بھی کوئی تخصیص نہیں مورد اگرچہ مخصوص ہے سببِ نزول بھی خاص ہے، مگر حکم عام ہے۔

آیت میں ہجرت کی دو شرطیں بیان فرمائیں (۱) راہِ خدا میں ہجرت ہو۔ ہجرت سے مقصود محض رضائے الٰہی کا حصول ہو۔ کوئی دنیوی طمع دامن گیر نہ ہو۔ صحیحین کی مصرح حدیث ہے۔ اَلْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ الخ یعنی اعمال کا مدار نیتوں پر ہے۔ جو شخص اللہ و رسول کے لئے ہجرت کرتا ہے تو اس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہو گی اور جو شخص مال کے حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے کرتا ہے تو اس کی جو نیت ہو گی اسی کی طرف اس کی ہجرت ہو گی۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ مظلوم ہونے کے بعد اس کی ہجرت ہو۔ ظلم کا لفظ عام ہے جسمانی ہو یا مالی یا مذہبی یا اور کسی طرح کا۔ بہرحال کافروں کی طرف سے جس پر ظلم ہوتا ہو۔ انہی دونوں شرطوں کی طرف لفظ صَبَرُوْا اور يَتَوَكَّلُوْنَ سے اشارہ فرمایا کہ جب کفار کا ظلم انتہا کو پہنچ جائے اور صبر کرتے کرتے آدمی تنگ آ جائے تو ہجرت کرنے کا ارادہ کرے پھر ہجرت کرنے کے وقت خالص دل سے اللہ پر بھروسہ ہو۔ اسی کی خوشنودی پیش نظر ہو گویا اَلَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ تشریح ہے۔ وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا کی۔

مہاجرین مخلصین کے لئے دو طرح کا اجر بیان فرمایا، دنیوی اور اخروی۔ ظاہر ہے کہ جب انسان عیش و آرام، سکون و چین، گھر بار اور اہل کو ترک کر کے وادیٔ صعوبت میں قدم رکھتا ہے تو اس کے دل میں فطری طور پر باقتضائے بشری خطرہ ہونا چاہیئے کہ خدا جانے اب میں جہاں جا رہا ہوں وہاں مجھ کو ٹھکانا ملے گا یا نہیں۔ کن کن مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ پھر یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں میری یہ محنت برباد نہ جائے، اس لئے دونوں خطرات کا دفع کرنا ضروری تھا۔ پہلے خطرہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا ہم دنیا میں ان کو حیران و سرگرداں نہ رہنے دیں گے بلکہ اچھی طرح ان کو ٹھکانا دیں گے۔ ہر طرح کی عافیت و بھلائی عطا کریں گے۔ دوسرے توہم کے ازالہ کے لئے فرمایا آخرت کا اجر بہتر ہے۔ حیاتِ جاودانی، سرورِ ابدی اور نعمتِ غیر فانی ان کو ملے گی۔

میں کہتا ہوں کہ ہجرت تین قسم کی ہوتی ہے (۱) ہجرت متعارف جس کا بیان سطور بالا میں ہو گیا۔ (۲) ان باتوں کو ترک کر دینا جو شرعاً ممنوع ہیں۔ حدیث صحیح میں وارد ہے صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ مہاجر کون شخص ہوتا ہے؟ فرمایا جو شخص ہر اس بات کو چھوڑ دے جس کی ممانعت اللہ نے فرمائی ہے وہ مہاجر ہے۔ یہ ہجرت پہلی قسم سے زیادہ عام ہے۔ دار الاسلام میں اپنے گھر بیٹھ کر بھی اس ہجرت کا ثواب پا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ممنوعات کو ترک

کر دے۔ (۳) آدمی اللہ کے سوا کسی غیر کا طالب ہی نہ ہو اور سوا اللہ کے ارادے کے کسی دوسرے کی مشیت پر نہ چلے۔ یہاں تک کہ اپنے نفس کی خواہش بلکہ اس کی الفت بھی ترک کر دے۔ یہ قسم بلند مرتبہ رکھنے والے اہلِ تقویٰ کے ساتھ مخصوص ہے جو آخرت کی لذت و عیش کی آرزو میں دنیا کی تمام مرغوبات چھوڑ دیتے ہیں۔ خواہ وہ مرغوبات شرعاً حرام ہوں یا حلال۔ شریعت نے اگرچہ جائز لذت کے حصول کی اجازت دے دی ہے، مگر وہ نفسانی خواہشات سے صرف آخرت کی تمنا میں کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ حدیث اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ الخ میں اسی قسم کی طرف اشارہ ہے۔ لفظ هَاجَرُوْا فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ تمام اقسام کو شامل ہے خواہ ہجرت فی سبیل اللہ ہو یا فی حب اللہ یا فی دین اللہ یا فی صفات اللہ یا فی ذات اللہ یا فی امر اللہ۔

مقصودِ بیان ترک ممنوعات کی طرف لطیف ایماء۔ لفظ فی سبیل اللہ سے ہجرت کی نیت محض اللہ کے واسطے کرنے کی ہدایت۔ لفظ صَبَرُوْا سے اس بات کی طرف اشارہ کہ دین پر استقامت اور تمام مصائب کی برداشت اجر جزیل کے حصول کا موجب ہے۔ نیز اس سے یہ امر بھی مترشح ہوتا ہے کہ ممنوعات سے نفس کو روکنا اور اوامر پر پابند رکھنا مومنین مخلصین کا شعار ہونا چاہیئے۔ عَلٰی رَبِّهِمْ الخ کے الفاظ ہدایت کر رہے ہیں کہ اللہ سے بدگمانی نہ کرنی چاہیئے اور کسی تکلیف کا اندیشہ نہ پیدا کرنا چاہیئے۔ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جو لوگ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے صعوبتیں برداشت کرتے ہیں، خدا تعالیٰ دنیا میں بھی ان کو عافیت، سکون، راحت، عزت وغیرہ عطا فرماتا ہے اور ہر طرح کی بھلائی عنایت کرتا ہے۔ جو ان کی صعوبتیں برداشت کرنے کا بدلہ ہوتا ہے وغیرہ۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ فَسْــَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ

تم سے پہلے بھی ہم نے آدمی بھیجے تھے جن کے پاس ہم وحی بھیجا کرتے تھے اگر تم نہیں جانتے تو اہل کتاب سے

لَا تَعْلَمُوْنَ ۙ بِالْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ؕ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ

پوچھ دیکھو (ہم نے اُن کو) دلیلیں اور کتابیں دے کر بھیجا اور ہم نے تم پر قرآن اُتارا تاکہ لوگوں سے وہ احکام بیان کرو جو

مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ۝

اُن پر نازل کئے گئے ہیں شاید وہ دھیان کریں

تفسیر ابن کثیر نے بروایت ضحاک از ابن عباس بیان کیا ہے جب حضورؐ کی نبوت کا اعلان ہوا تو کفار عرب نے انکار کیا۔ ان کو اپنی جہالت کے سبب نبوت اور بشریت میں منافات نظر آتی تھی۔ اسی بنا پر قریش نے کہا تھا اللہ کی شان اس سے برتر و اعلیٰ ہے کہ کسی آدمی کو اپنا پیغمبر بنا کر بھیجے۔ اگر اس کو رسول بھیجنا ہوتا تو کم از کم کسی فرشتے کو رسول بناتا۔ گویا حضور اقدسؐ کی نبوت ہی کا انکار انھوں نے کیا بلکہ انسان کے نبی ہونے کو ہی خلافِ درایت سمجھا۔ چونکہ یہ بات کفار کی کج فہمی پر مبنی تھی، اس لئے ان کے خیال کی تردید میں اس آیت کا نزول ہوا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ آدمیوں کے واسطے پیغمبر بھی آدمی ہی ہونے چاہئیں۔ زائد سے زائد یہ کہ کامل عقل والے ہونے ضرور ہیں۔ تو خدا تعالیٰ نے اب تک کسی فرشتے وغیرہ کو آدمی کی ہدایت کے لئے نہیں بھیجا، آدمیوں کو ہی نبی بنایا اور آدمیوں میں سے بھی صرف مردوں کو (یعنی عورتیں بہ نسبت مردوں کے کم عقل ہوتی ہیں، اس لئے عورتوں کو بھی نبی نہیں بنایا) اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر قرآن اور قول رسول کا تم کو یقین نہیں تو دوسرے اہل کتاب سے دریافت کرلو۔ سب کے سب تو جھوٹ نہیں بولیں گے۔ آدمی کا نبی ہونا تو ان کو بھی مسلم ہے۔ جب تمام اہل مذاہب کا اس پر اتفاق ہے تو پھر تم کیوں رسولِ خدا کی تکذیب کرتے ہو۔ جس طرح ہم نے دوسرے انبیاء کو اپنی کتابیں اور معجزات دیکر بھیجا تھا اسی طرح محمدؐ پر قرآن نازل فرمایا کیونکہ احکام کلیہ اور قوانین الٰہیہ کی تشریح و تفصیل تو ضروری تھی اور یہ ممکن نہ تھا کہ ہر شخص کے پاس علیحدہ علیحدہ پیام بھیجا جاتا لا محالہ نبیؐ کے پاس ایک یادداشت یعنی

بِمُعۡجِزِیۡنَ ۙ﴿۴۶﴾ اَوۡ یَاۡخُذَہُمۡ عَلٰی تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّکُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۴۷﴾

نہ چل سکے گا یا ڈرا کر اُن کو دھر پکڑے گا تمہارا رب واقعی بڑا شفیق و مہربان ہے

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ الۡیَمِیۡنِ

کیا انہوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کی طرف نہیں دیکھا کہ اس کے سائے دائیں بائیں سے اللہ کو سجدہ

وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ وَ ہُمۡ دٰخِرُوۡنَ ﴿۴۸﴾ وَ لِلّٰہِ یَسۡجُدُ مَا فِی

کرتے ہوئے ڈھلتے ہیں اور وہ عاجزی کرنے والے ہوتے ہیں جو جاندار آسمانوں میں اور زمین

السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ مِنۡ دَآبَّۃٍ وَّ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ ہُمۡ لَا

میں ہے وہ نیز فرشتے اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور سرکشی

یَسۡتَکۡبِرُوۡنَ ﴿۴۹﴾ یَخَافُوۡنَ رَبَّہُمۡ مِّنۡ فَوۡقِہِمۡ وَ یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ ﴿۵۰﴾ ۩

نہیں کرتے اپنے اُس رب سے ڈرتے ہیں جو اُن کے اوپر غالب ہے اور جو حکم اُن کو دیا جاتا ہے اُس کی تعمیل کرتے ہیں

تفسیر اسلام کے خلاف مکروفریب کرنے والے اپنی تدبیروں کو کارگر سمجھنے لگے اور اسلام کو مٹانے کے لئے ان تھک کوشش کرنے والے ہر وقت اپنی خلاف جیل سازیوں میں پھنک رہے اور نتائج کی طرف سے غافل ہو کر اپنی دماغ آرائیوں کو الٰہی طاقت کے مقابلے میں برسر کار لاتے تھے۔ ایسے گمراہ مغرور افراد کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ کیا ان کو چار باتوں میں سے کسی کا خطرہ نہ رہا۔ کیا ان چاروں خطرات و مہلکات سے بچنے کی طاقت ہے۔ (۱) ہو سکتا ہے کہ اللہ ان کو زمین میں دھنسا دے، زمین پھٹ جائے، اُلٹ جائے اور وہ نیچے دب جائیں اندر گھس جائیں۔ گزشتہ تاریخ دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ کثرت افراد خدا کے اس عذاب میں ماخوذ ہوئے ہیں۔ (۲) یا کوئی ناگہانی عذاب غیر محسوس طور پر آجائے اور ایسی جگہ سے آجائے جس کی خبر بھی نہ ہو مثلاً آسمان سے انگارے اور چنگاریاں برسنے لگیں یا اولے اور بڑے بڑے گولے اوپر گریں یا تند آندھی یا طوفانِ بارش آجائے جس سے سرکش تباہ و برباد ہو جائیں۔ مختلف اقوام انہیں عذابوں سے برباد ہو چکی ہیں۔ پھر یہ کیوں مطمئن اور بے باک ہیں۔ (۳) یا حالتِ سفر میں خدا تعالیٰ ان کو ہلاک اور مبتلائے عذاب کر دے۔ کیونکہ جو وطن میں ہلاک ہو سکتا ہے وہ سفر میں بھی ہلاک ہو سکتا ہے۔ وطن میں دوست، احباب، اعزہ، اقارب اور تمام ہمدرد جمع ہوتے ہیں دیکھ بھال اور خدمت کر سکتے ہیں۔ مگر پردیس میں کوئی غم گسار نہیں ہوتا۔ سفر کی موت سخت ہوتی ہے۔ تَقَلُّب کے معنی ہیں انقلاب۔ تبدیل، تغیر۔ وضع حالت اور شکل کا بدلنا، آمد و رفت کرنا، تدبیروں کا مختلف ہونا کروٹ بدلنا وغیرہ۔ اہلِ تفسیر نے آیت کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حصول معاش کے لئے جو سفر کیا جاتا تھا اور کیا جاتا ہے تقلب سے مراد ہے۔ سدی وغیرہ نے مطلق سفر مراد لیا ہے۔ مجاہد، ضحاک اور قتادہ وغیرہم نے فرمایا کہ رات دن کا انقلاب مراد ہے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اسباب عیش اور سامانِ راحت کی تبدیلی مراد ہے۔ بعض کا خیال ہے سوتے میں کروٹیں لینی مراد ہیں۔ جبکہ آدمی نہایت چین و سکون کی حالت میں ہوتا ہے۔ آیت کا خلاصہ مطلب یہ نکلا کہ رات دن کا انقلاب ہوتا یا حصول معاش کے لئے ملک ملک کا سفر اور عیش کی دنیا میں آمد و رفت ہو یا سکون کی حالت میں خواب راحت ہو۔ اطمینان و چین کے ساتھ طرح طرح کی تدبیریں سوچنے میں انہماک ہو۔ بہرحال خدا تعالیٰ ہر وقت ان کی گرفت کر سکتا ہے۔ اس کے قابو سے کوئی بھی کسی وقت باہر نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بھلا کیوں بھول گئے وہ کون سی طاقت ہے جو اللہ کی گرفت سے بچا سکے گی۔

(۴) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ ناگہانی بلا نازل نہ کرے بلکہ پہلے علامات و آثار نمایاں ہوں۔ مرنے سے پہلے لوگوں میں بے چینی خوف و ہراس پیدا ہو پھر رفتہ
رفتہ سب کو ہلاک کر دے۔ جیسا قحط پڑ جائے، وبا پھیل جائے۔ دشمنوں کا تسلط آہستہ آہستہ قائم ہو جائے اور اس طرح تدریجاً معتوب قوم ہلاک ہو جائے۔
ابن کثیر کے نزدیک تخوّف کے معنی ہیں ڈرانا یعنی خدا یہ بھی کر سکتا ہے کہ مختلف اسباب ہلاکت طاری فرما کر اول ڈرائے اور ڈرانے کے بعد سب کو ہلاک
کر دے۔ چنانچہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اگر میں چاہوں تو ایسی گرفت کروں کہ ایک کی موت سے دوسرا خائف ہو جائے۔ مجاہد، ضحاک
قتادہ وغیرہم سے اسی طرح مروی ہے۔ عام مفسرین نے تخوّف کے معنی تنقّص کے بیان کئے ہیں یعنی رفتہ رفتہ جان و مال کی کمی کرنا اور آہستہ آہستہ سب کو ہلاک کر
بیضاوی نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ بر سرِ منبر حضرت عمرؓ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور حاضرین سے تفسیر دریافت کی۔ سب خاموش رہے، مگر ہذیل کا
ایک بوڑھا آدمی بولا کہ ہماری زبان میں تخوف کے معنی تنقص کے ہیں۔ الغرض خدا تعالیٰ ارضی و سماوی اور فضائی آفتوں میں مبتلا کر کے ناگہانی ہلاک کر سکتا ہے اور
یہ بھی ممکن ہے کہ آثار و علامات نمودار کرنے کے بعد آہستہ آہستہ ہلاک و برباد کر دے، مگر اپنی مہربانی اور کرم سے ایسا نہیں کرتا اور نہ قدرت اس کو ہر طرح حاصل
ہے۔ اس سے آگے اپنی قدرت کاملہ اور جبروت باہرہ کے آثار بیان فرما کر تمام موجودات و کائنات کا فرمان پذیر اور مطیع حکم ہونا بیان فرماتا ہے کہ
دیکھو مخلوق میں دو طرح کی چیزیں ہیں۔ اصل اور سایہ پھر اصل اشیا میں دو نوعیت رکھنے والی مخلوق ہے کچھ انسان سے نیچے درجے کی کچھ اوپر کے درجے کی۔ تمام
وہ حیوانات جو جان رکھتے ہیں اور زمین پر متحرک ہیں اور تمام وہ فرشتے جو انسان سے بالاتر ہیں سب کے سب اللہ کے حکم کے مسخر ہیں کوئی سرکشی نہیں کر سکتا
سب ہی خدا کے سامنے سربسجود ہیں۔

تحقیق

زہری کا قول ہے کہ تَفَيُّؤُ الظِّلٰلِ آخر دن کے سایہ کے ڈھلنے کو کہتے ہیں، لیکن یہاں عام مفہوم مراد ہے۔ موسم گرمی سردی آفتاب کے
آفتاب کے طلوع و زوال، خط استواء کے قرب و بعد، اختلافِ مطلع و مغرب کی وجہ سے صبح و شام کے تفاوت کے سبب سایہ کبھی
دائیں اور کبھی بائیں جانب پڑتا ہے اور گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔
سجدہ سے کیا مراد ہے؟ فرشتوں کا سجدہ کرنا تو بالکل بدیہی بات ہے۔ حقیقی سجدہ فرماں پذیری مسخر حکم ہونا اور اطاعت امر سب کچھ فرشتوں
میں موجود ہے۔ رہا دیگر اشیا کا سجدہ کرنا تو ظاہر ہے کہ حقیقی معنی مراد نہیں۔ زجاج نے کہا کہ ہر چیز کی پیدائش اطاعتِ الٰہی پر ہے یہی اس کا سجدہ ہے۔ مجاہد
نے کہا جب سورج جھکتا ہے تو ہر چیز اللہ کو سجدہ کرتی ہے (یعنی اس کا سایہ پڑتا ہے اور سایہ پڑنا ہی ہر چیز کا سجدہ ہے) قتادہ ضحاک وغیرہ سے بھی یہی
مروی ہے۔ مجاہد نے دوسری روایت میں صراحت کر دی ہے کہ ہر چیز کا سجدہ اس کا سایہ ہے۔ ابو غالب شیبانی نے کہا کہ سمندر کی موجیں اس کی تسبیح
و صلوٰۃ ہے۔ میرے نزدیک زجاج کا قول قوی ہے۔ ہر چیز اللہ کے حکم کی مطیع ہے ہر شے اپنی پیدائش اور نظم خاص پر چلنے کے لحاظ سے قانونِ الٰہی سے
سرتابی نہیں کر سکتی۔ سرتابی نہ کرنا، قانونِ الٰہی پر چلنا اور نظامِ قدرت کا تابع ہونا اسی کو سجدہ سے تعبیر فرمایا ہے۔

مقصودِ بیان

سرکش کافروں اور نافرمان مسلمانوں کو اپنی ہمہ گیر طاقت اور محیط کل قدرت سے ڈرا کر راہ راست پر چلنے کی ضمنی تبلیغ۔
اس امر کی صراحت کہ خدا تعالیٰ کی گرفت سے کوئی چیز خارج نہیں، مگر اس نے اپنی مہربانی کی وجہ سے آزاد چھوڑ دیا ہے
تمام مخلوق کا سجدہ ریز اور مطیع حکم ہونا بیان فرما کر دریرہ دہ اس بات اور اس امر پر تنبیہ کہ غافل انسان اپنے کو طاقتور اور ذی فہم سمجھتا ہے اور خدا سے
سرکشی کرتا ہے حالانکہ اس کی سرشت بھی عام قانونِ قدرت کے لحاظ سے خدا تعالیٰ کے حکم کی مسخر اور فرماں پذیر ہے۔ گویا انسان کی خدا سے سرکشی اپنی فطرت
سے سرکشی ہے وغیرہ۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ

اللہ نے فرمایا	کہ دو معبود	قرار	نہ دو	معبود تو	وہی ایک معبود ہے	مجھ ہی

فَارْهَبُونِ ۝ وَلَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ؕ

سے ڈرو جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے اسی کا ہے اور ہمیشہ عبادت اسی کو سزاوار ہے

أَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ۝ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ

کیا اللہ کے سوا اور کسی سے ڈرتے ہو حالانکہ تمہارے پاس جو بھی نعمت ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے پھر تم کو جب کوئی تکلیف پہنچتی

الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْئَرُوْنَ ۝ ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ إِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ

ہے تو اسی سے فریاد کرتے ہو اور جب وہ تمہاری تکلیف دور کر دیتا ہے تو تم میں سے ایک گروہ اپنے رب کا شریک قرار

بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۝ لِيَكْفُرُوْا بِمَا آتَيْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝

دینے لگتا ہے تاکہ ہماری دی ہوئی نعمت کی ناشکری کرے تو اب مزے اڑا لو آئندہ معلوم ہو جائے گا

تفسیر مذکورہ بالا آیات میں خدا تعالیٰ نے اپنی توحید الوہیت و ربوبیت کو دلائل فطرت سے ثابت کیا تھا اور فرمایا تھا کہ ہر چیز اپنی فطرت کے لحاظ سے مطیع حکم الٰہی ہے۔ دلائل فطرت کو سمجھنا فکر و نظر اور غور و خوض پر موقوف ہے۔ جو لوگ اصحاب مشاہدہ ہیں اور جن میں اللہ نے فطری طاقت امانت رکھی ہے وہ لوگ سوچ سمجھ کر حقیقت تک پہنچ سکتے ہیں اور مصنوعات سے صانع پر استدلال کر سکتے ہیں، لیکن جو نور عقل سے کورے ہیں جن کو خود راہ حق تلاش کر کے حقیقت تک رسائی کرنے کی قوت نہیں۔ ان کی ہدایت کے لئے انبیائے مرسلین، مبلغین، واعظین اور مختلف پیامبر دنیا میں آئے۔ اللہ کی کتابیں اور فرمان لائے۔ طرح طرح سے سمجھایا اور حق و باطل میں فرق کر دکھایا۔ گزشتہ آیات میں چونکہ دلائل فطرت پر غور کرنے کی ہدایت فرمائی تھی ان آیات میں اپنا وہ حکم نقل فرماتا ہے جو مختلف انبیاء کی زبانی بندوں تک اس نے بھیجا تھا تاکہ عاقل و بے وقوف ارباب بصیرت اور کوتاہ فہم کوئی فرقہ بھی راہ یاب ہونے سے محروم نہ رہ جائے۔ اصحاب دانش مطالعہ فطرت کرنے کے بعد حقیقت پر پہنچ جائیں اور کم سمجھ لوگ نقلی احکام و ہدایت سے فائدہ اٹھا کر توحید کے قائل ہو جائیں۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ ہم نے پیغمبروں کی معرفت اور اپنی کتابوں کی وساطت سے خالص توحید کا پیام دنیا والوں تک بھیج دیا۔ خفیف شرک کرنے کی بھی ممانعت کر دی اور توحید الوہیت و ربوبیت کا حصر اپنی ذات کے لئے قرار دیا لہٰذا عقائد اعمال اور اقوال میں شرک سے پرہیز کرنا اور بصورت خلاف ورزی عذاب سے ڈرانا اور اللہ کی ناراضی سے خوف کرنا ہر شخص پر فرض ہے۔ اس کے بعد توحید الوہیت کی کھلی ہوئی دو دلیلیں بیان فرماتا ہے جن سے غیر اللہ کی الوہیت کی نفی اور وحدانیت الٰہی کا ثبوت ہوتا ہے۔ پہلی دلیل تو یہ ہے کہ اللہ وہی ہو سکتا ہے جو دنیا کی ہر چیز کا خالق مالک اور مطلق حکمراں ہو، اس کے قبضے اور تصرف سے کوئی شے باہر نہ ہو، ہر چیز دوامی طور پر اس کی فرماں پذیر اور مطیع حکم ہو اور جو چیز مخلوق ہو خالق نہ ہو مملوک ہو مالک نہ ہو، محکوم ہو حاکم نہ ہو، مطیع حکم ہو مطاع نہ ہو وہ کسی طرح الوہیت کا استحقاق نہیں رکھتی۔ چونکہ زمین و آسمان کی ہر چیز کا مالک، خالق، حاکم اور متصرف خدا ہی ہے۔ ہر چیز اس کی مخلوق، مملوک، محکوم اور مطیع امر ہے لہٰذا اس کے سوا کوئی بھی الوہیت کا مستحق نہیں۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ الوہیت و معبودیت کا حق اسی کو پہنچتا ہے جس کے ہاتھ میں نفع یا نقصان پہنچانے کی طاقت ہو عابد کو کچھ دے سکے۔ اس کی مصیبت دفع کر سکے اور ضرر پہنچا سکے اور چونکہ ہر چیز خدا دیتا ہے وہی تکلیف دفع کرتا ہے سخت مصائب میں بلا ساختہ تم اس کی طرف رجوع کرتے ہو پھر شرک کرنا اور دوسروں کو معبود بنانا سراسر حماقت اور موجب وبال ہے۔ چند

روزہ مزے اڑا کر مرنے کے بعد اس کا عذاب بھگتو گے۔

مقصود بیان کوتاہ فہم اور بے بصیرت طبقہ کے لئے توحید کی نقلی دلیل کا اظہار پھر توحید کا بدیہی اور واضح ثبوت اور ضمنی طور پر امر کی ہدایت کہ نفع نقصان پہنچانے کی طاقت صرف خدا ہی کو ہے، اس لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ غیر اللہ سے نہ طمع رکھے نہ خوف بلکہ مرکز بیم ورجا ذات الٰہی کو ہی قرار دے وغیرہ۔

وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۗ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ

وہ ہماری دی ہوئی روزی میں جاہل معبودوں کا ایک حصہ مقرر کرتے ہیں خدا کی قسم تم سے اس افترا بندی کی ضرور

تَفْتَرُونَ ۝ وَيَجْعَلُونَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُونَ ۝ وَاِذَا

باز پرس ہوگی یہ اللہ کے لئے بیٹیاں قرار دیتے ہیں اور اپنے لئے وہ چیز قرار دیتے ہیں جس کی ان کو رغبت ہے حالانکہ

بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ

اللہ پاک ہے جب اُن میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اُس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ غم سے گھٹنے لگتا ہے بڑی بشارت کی جاے

الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ

لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (سوچتا ہے) کہ ذلت قبول کرکے اُس کو رہنے دے یا مٹی میں دبا دے

اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ

سن لو یہ بہت برا حکم کرتے ہیں جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اُن کی بُری حالت ہے اور اللہ کے لئے

الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا

صفت اعلیٰ ہے وہی غالب مصلحت بین ہے اگر اللہ لوگوں کے ظلم پر اُن کی پکڑ کرے تو زمین پر کسی

تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَاۗبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَاۗءَ اَجَلُهُمْ

جاندار کو نہ چھوڑے لیکن ایک وقت مقرر تک اُن کو مہلت دیتا ہے جب اُن کا وقت مقرر

لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ

آ پہنچا تو گھڑی بھر نہ پیچھے ہٹ سکیں گے نہ آگے بڑھ سکیں گے اللہ کے لئے وہ چیز تجویز کرتے ہیں جس کو خود پسند نہیں کرتے اور اُن کی

اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۭ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ۝

زبانیں دروغ بافی کرتی ہیں کہ ہمارے لئے بھلائی ہے بلا شک ان کے لئے آگ ہے اور وہ پیش رو ہیں

تفسیر

مشرکین عرب مختلف دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتے تھے۔ انھوں نے ہر ایک کا فرضی نام بھی رکھ چھوڑا تھا اور کارخانۂ قدرت میں دخل دینے کی ایک مخصوص نوعیت بھی ہر ایک کے لئے جدا جدا مقرر کر رکھی تھی۔ کسی کو بارش کی دیوی کہتے، کسی کو کھیتی کا دیوتا، کسی کو روشنی کا مالک اور کسی کو حسن و جمال کی مالکہ، لیکن ان فرضی معبودوں کی اصل حقیقت سے وہ قطعاً ناواقف تھے ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ فرضی نام جن کو باپ دادا سے سنتے چلے آئے ہیں کیا ان کی کچھ حقیقت بھی تھی اور ان کا واقعی اقتدار بھی کچھ ہے یا نہیں اور ہے تو کس طرح ہے انھیں فرضی معبودوں کے نام پر بھینٹ چڑھاتے اور نذر و نیاز ان کے سامنے پیش کرتے۔ مال و اولاد اور کھیتوں میں ان کے حصے مقرر کرتے، کوئی جانور یا کوئی بیٹا ان کے نام سے نامزد کر دیتے۔ ان کے نام پر سانڈ چھوڑ دیتے۔ جو خزاعہ اور بنو کنانہ کا دوسرا عقیدہ یہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں جو مختلف کاموں پر مقرر ہیں۔ ان غیر مرئی دیویوں کو کارخانۂ قدرت میں دخل ہے جو کچھ چاہتی ہیں کرتی ہیں۔ یونان کا علم الاصنام بھی اسی خرافات سے بھرا ہوا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ وہ مختلف ستاروں کو مختلف تصرفات و انتظامات کی دیویاں قرار دیتے تھے اور عرب کے مشرک وہی اقتدار فرشتوں کا تسلیم کرتے تھے اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ہندوستان کی کالی دیوی، موہنی دیوی اور سبز پری کا عقیدہ بھی اسی خرافات پر مبنی ہے۔ کافروں کا تیسرا قول یہ بھی تھا کہ اول تو مرنے کے بعد دوبارہ زندگی نہ ہوگی اور ہوئی بھی تو ہم کو اللہ کے ہاں بڑا رتبہ ملے گا۔ ہمارے ہزاروں معبود ہمارے سفارشی ہوں گے۔ ان تینوں بیہودہ اقوال کی تردید میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

پہلے قول کا ابطال دو طرح فرمایا۔ برہانی اور تنبیہی۔ برہانی ابطال تو یہ ہے کہ جن چیزوں کی حقیقت کا علم نہیں ان کے اقتدار سے واقفیت نہیں۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ آیا اُن کا وجود واقعی تھا یا فرضی نام ہیں نہ اس کا علم کہ یہ معبود ہیں کس نوع کے۔ مزید برآں روزی رزق یا اور کسی قسم کی چیز ان کی دی ہوئی نہیں ہر چیز خدا نے دی۔ پرانی مجہول الحقیقت نامعلوم الکیفیت اور غیر شناختہ وجود والے فرضی ناموں کے لئے کھیتی، مویشی اور مال و اولاد میں حصہ مقرر کرنا اور ان کے ناموں کی بھینٹ چڑھانا سراسر حماقت ہے۔ تنبیہی بازداشت اس طرح فرمائی کہ غیر اللہ کا حصہ خداداد نعمتوں میں مقرر کرنا اور اس کا عقیدہ رکھنا محض افتراء اور دروغ ہے جس کی بازپرس یقینی اور لازمی ہے۔

وَيَجْعَلُونَ لِلّٰهِ سے دوسرے عقیدے کی تردید فرمائی۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں قرار دینے والے مشرکوں کی عجیب حالت ہے۔ اگر اپنی بیٹی پیدا ہونے کی خبر سن پاتے ہیں تو رنج کے مارے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے اور دل ہی دل میں گھٹتے ہیں۔ عار اور ناخوشی کے سبب لوگوں سے چھپے چھپے پھرتے، دل میں پیچ و تاب کھا کر منصوبے باندھتے ہیں کہ اب کیا کریں یا تو عار و ذلت برداشت کریں یعنی آئندہ دوسروں کو اپنا داماد بنائیں اور دوسروں کے سامنے نگاہ نیچی کرنی پڑے یا بیٹی کو زندہ دفن کر دیں۔ غرض اپنے لئے تو بیٹی ہونے کے نام سے اتنی ذلت کا احساس اور دل تنگی کا اظہار کرتے ہیں اور اللہ کے لئے ایسے فراخ دل واقع ہوئے ہیں کہ فرشتوں کو اس کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔ سبحان اللہ کیسی حماقت در حماقت ہے۔ اول تو پاک پروردگار کے لئے اولاد کی تجویز انتہائی بے عقلی، گستاخی اور کفر ہے۔ اولاد کی ضرورت اس کو ہوتی ہے جو اپنی ذات سے ناقص اور حوادث و محتاج ہوتا ہے۔ اللہ تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے پھر اس کو اولاد کی کیا ضرورت۔ پھر فرشتوں کو مؤنث اعتقاد کرنا مزید مہمل عقیدہ ہے۔ پھر ان کو بیٹیاں قرار دینا اہمال در اہمال ہے۔ کیا خدا تعالیٰ ان مجبور ذلیل کافروں سے بھی زیادہ کمزور ہے۔

اس سے آگے تیسرے قول کی تردید سے پہلے فرماتا ہے کہ جن لوگوں کا آخرت پر ایمان نہیں ان کی حالت بہت ہی بری ہے۔ اُن کو اگر تشبیہ دی جائے مشبہ بہ کا بدترین ہونا ضروری ہے، اور وجہ تشبیہ بھی بدترین ہونی لازم ہے۔ نتیجہ یہ کہ کافر منکر قیامت کے اقوال اور اعمال خبیث ترین ہیں۔ البتہ خدا تعالیٰ کے اوصاف جمیلہ اور صفات کمالیہ ہیں۔

ابن عباس رضؓ نے وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى کی تفسیر میں فرمایا کہ کوئی چیز اس کی مثل نہیں۔ ابن عباس رضؓ کی مراد یہ ہے کہ عدیم المثال ہونا ہی اللہ کی اعلیٰ مثل اور اکمل صفت ہے۔ یہ شبہ ہرگز نہ کرنا چاہیئے کہ کوئی چیز اللہ کی مثال ہو سکتی ہے۔ وہ ہر بری بھلی مثال سے پاک ہے۔

یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہو سکتا تھا کہ جب شرک و کفر ایسی مکروہ چیزیں ہیں اور مشرکوں سے خدا کو انتہائی نفرت و بغض ہے تو پھر ان کے وجود سے صفحۂ ہستی کو کیوں پاک نہیں کر دیتا۔ کیوں کافروں کو فنا کر کے ان کی جگہ نیکوں کو آباد نہیں فرماتا؟ اس شبہ کے ازالہ کے لئے فرماتا ہے کہ اگر کفار و مشرکین کے شرک پر حق تعالیٰ فوراً دنیا میں گرفت فرمائے تو ساری دنیا ہلاک ہو جائے کوئی جان دار باقی نہ رہے کیوں کہ ظالم و نافرمان تو اپنی معصیت و بدکرداری کی وجہ سے ہلاک ہو جائیں اور نیک بندے اس وجہ سے مر جائیں کہ دنیا دارِ امتحان ہے۔ شر نہ ہو تو خیر کی شناخت کیسے ہو۔ تاریکی معدوم ہو جائے تو نور سے کیا فائدہ۔ دنیا کو پیدا کرنے سے مقصود تو مجموعہ کی آبادی ہے۔ کفر و اسلام اور معصیت و فرماں برداری کا جوڑ ہے اور چونکہ دوسری مخلوق انسان کے فائدے کے لئے بنائی گئی ہے، اس لئے انسان کو فنا کرنے کی صورت میں باقی کا وجود بیکار ہے۔ لامحالہ اگر کافروں اور بدکاروں کی گرفت فوراً کر لی جائے تو عالم تہ و بالا اور درہم برہم ہو جائے، الحمد للہ کا فضل ہے کہ وہ فوراً گرفت نہیں کرتا وقت موت تک مہلت دیتا رہتا ہے تاکہ توبہ کی گنجائش باقی رہے۔ ہاں جب وقت مقرر آ جائے گا تو تقدیم و تاخیر نہ ہوگی۔

ایک وہم اور اُس کا ازالہ

خدا تعالیٰ عادل ہے ظالم نہیں اور یہ بھی یقینی ہے کہ کچھ لوگ نیک ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک کے کرتوت کا وبال دوسرے پر نہیں پڑ سکتا پھر اس قول کے کیا معنی ہو سکتے ہیں کہ اگر خدا تعالیٰ لوگوں کی گرفت ان کے ظلم کی وجہ سے فوری فرماتا تو روئے زمین پر کسی جان دار کو باقی نہ چھوڑتا۔ کیا غیر مجرموں کو بھی مجرموں کے ساتھ ہلاک کر دیتا کیا یہ انصاف کے خلاف نہیں ہے؟

اس شبہ کا ازالہ تین طرح کیا گیا ہے۔ اول شق وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ کسی بندے سے کما حقہٗ عبادت ہو ہی نہیں سکتی۔ تمام عمر ذکر و فکر اور شکر و عبادت میں صرف کر دی جائے، مگر اللہ کی نعمتیں اس قدر ہیں کہ ان کا شکر بھی کافی طور پر ادا نہیں ہو سکتا ہر منٹ میں تندرست جوان آدمی پچھتر مرتبہ سانس لیتا ہے۔ ہر سانس اللہ کی دی ہوئی ایک نعمت ہے اور ہر نعمت کا شکر ادا کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا ہر منٹ میں پچھتر مرتبہ شکر ادا کرنا لازم ہے، لیکن کوئی انسان ایسا نہیں کر سکتا۔ نتیجہ بالکل صاف ہے کہ کسی بندے سے کما حقہٗ عبادت ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے سب مجرم ہوئے کوئی معصوم نہ ہوا۔ زائد سے زائد یہ کہ بالارادہ مرتکب معصیت بعض آدمی نہیں ہوتے، لیکن اس سے واقعی جرم کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ اگر مجرموں کے جرموں کا مواخذہ فوری ہو جائے تو کثرت اشرار کے ساتھ بعض نیک آدمی بھی ہلاک ہو جائیں گے مگر دونوں گروہوں کی ہلاکت میں مآل کے اعتبار سے فرق ہے۔ ظالم گروہ کے لئے تو عذاب و نکال ہے اور نیک طبقے کے لئے رحمت و ثواب کا سبب ہے۔ اول گروہ کو ہلاک کرنے کے بعد دوزخ میں بھیجا جائے گا اور دوسرے گروہ کو جنت میں مزید اجر عطا ہوگا۔ مختلف صحیح احادیث میں بھی اسی مضمون کی تائید وارد ہوئی ہے۔ تیسرے قول کی تردید خدا تعالیٰ نے آیت لَا جَرَمَ الخ سے فرما دی۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ کفار باوجود شرک کرنے کے اپنی ہٹ دھرمی کے سبب زبان سے یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ اگر آخرت کوئی چیز ہے تو ہمارے لئے وہاں بھی ہر طرح کی خوش حالی ہوگی۔ یہ اُن کی خام خیالی ہے۔ یہ لوگ دوزخیوں کے پیش رو بن کر آگے چلیں گے اور سب سے پہلے دوزخ میں پڑیں گے اور نہ فقط داخل ہوں گے بلکہ وہاں چھوڑ دیے جائیں گے۔

مقصودِ بیان

کفار مکہ کے عقائد ثلثہ کی پُر زور تردید۔ اول آیت سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا اور کسی کے نام کی نذر و نیاز، بھینٹ، قربانی، کوئی جانور چھوڑنا وغیرہ وغیرہ سب کچھ حرام ہے اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ اُس کمزور عقیدہ کے مسلم طبقہ کو جو شیخ سدو کا بکرا۔ میراجی کے کونڈے، کالے پہلوان کے گلگلے اور بعض دوسری شرک آمیز حرکتیں کرتا ہے کسی شے کو غیر اللہ کے نام پر نامزد کرنا حرام اور شرک ہے بلکہ اسی شے کو بھی حرام بنا دیتا ہے۔ ہاں اگر کوئی چیز اللہ کے نام کی کر دی جائے۔ فاتحہ نذر نیاز خدا کے واسطے کی جائے تو اس کا ثواب خواہ اپنے لئے مخصوص کر لے یا کسی دوسرے زندہ فرد کو بخش دے یہ فعل جائز ہے۔ لفظ سُبْحٰنَهٗ سے اس طرف اشارہ ہے کہ اولاد ہونا احتیاج و حدوث پر دلالت کرتا ہے اور خدا تعالیٰ ہر احتیاج و حدوث سے پاک ہے۔ اَفَرَءَیْتُمْ بِی التُّرَابِ سے عرب کے اس جاہلانہ دستور کی طرف اشارہ ہے جس کا رواج اسلام سے قبل بعض جاہل قبائل میں تھا کہ اگر لڑکی پیدا ہوتی

تو اس کو زندہ دفن کر دیتے اور یہ خیال کرتے کہ اگر یہ جوان ہو گئی تو اس کی کہیں شادی کرنی ہو گی اور دوسرا شخص ہمارا داماد بنے گا اور ہم کو عار و ذلت اٹھانی پڑے گی۔ آیت وَلَوْ يُؤَاخِذُ الخ صاف دلالت کر رہی ہے کہ انسان ضعیف البنیان کی حالت پر خدا تعالیٰ بہت مہربان ہے۔ اس کے اعمال کا تقاضا تو یہی تھا کہ اس کو تباہ کر دیا جاتا اور اس کے ناپاک وجود سے زمین کو صاف کر دیا جاتا، مگر مصلحتِ الٰہی اور حکمتِ ربانی نے وقت موت تک مہلت دے رکھی ہے۔ آیت فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ الخ سے ثابت ہوتا ہے کہ اقوام و افراد کی موت کا وقت کسی طرح ٹالے نہیں ٹل سکتا۔ کوئی طاقت زوال و ہلاکت کو روک نہیں سکتی۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ

(اے محمدؐ) خدا کی قسم تم سے پہلے بھی ہم نے امتوں کے پاس پیغمبر بھیجے مگر شیطان نے اُن کے اعمال اُن کو آراستہ کر دکھائے

فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا

سو وہی آج ان کا رفیق ہے اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے ہم نے تم پر کتاب صرف اس لئے اُتاری ہے کہ اُن کے سامنے

لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

وہ باتیں بیان کر دو جن میں یہ اختلاف کر رہے ہیں اور ایماندار قوم کے لئے وہ (کتاب) ہدایت و رحمت ہے

تفسیر اثبات توحید سے قبل بیان فرمایا تھا کہ ہم نے گزشتہ زمانے میں بھی آدمیوں کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا۔ فرشتوں کو نبی نہیں بنایا تھا۔ پیغمبروں کا کیا کام تھا؟ تبلیغ توحید، اشاعتِ عدل اور اصلاحِ خلق۔ گویا قانونِ نبوت قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ نبوت کوئی نئی چیز نہیں۔ اسی مضمون کی تائید ان آیات میں فرمائی ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اے محمدؐ! آپ سے پہلے بھی اقوام و امم کی ہدایت کے لئے ہم نے انبیاء بھیجے۔ خیر و شر، نیک و بد اور حق و باطل کی انہوں نے تفریق کی، مگر جو لوگ شیطانی پھندوں میں گرفتار تھے وہ باغوائے شیطانی اپنے (غلط اور باطل) اعمال کو حق سمجھتے رہے اور ہدایت یاب نہ ہوئے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ گمراہ کرنے والا اور گمراہ ہونے والے دونوں سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ بعثت محمدی کے زمانے میں بھی شیطان نے لوگوں کو گمراہ کیا۔ ان کی بداعمالیاں ان کی نظر میں قابل استحسان قرار دیں۔ کفار مکہ اپنے ہر عمل و فعل کو اچھا سمجھنے لگے۔ انجام کار شیطانوں کی زیر سرپرستی آ گئے اور مآل میں دونوں عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ اس کے بعد فرمایا کہ قرآن پاک کو نازل کرنے کے دو مقصد ہیں ایک مقصد عام ہے دوسرے مقصد سے بہرہ ور صرف اہل ایمان ہی ہیں۔ دنیا میں عام طور پر طبائع افکار، خیالات اور دماغ جدا جدا ہیں۔ ایک شخص ایک بات کو حق کہتا ہے دوسرا اسی کو ناحق بتاتا ہے۔ ایک فعل یا ایک عقیدہ ایک کی نظر میں صحیح ہے دوسرے کی نظر میں وہی فعل و عقیدہ غلط ہے۔ اسی طرح کا اختلاف اور تضاد ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے، اس لئے حق و باطل، خیر و شر، حسن و قبح اور صحیح و غلط کا فیصلہ کرنے کے لئے بیان الٰہی اور قانونِ خداوندی کی ضرورت ہوئی۔ جب عقل انسانی بالاتفاق صحیح نتیجے پر پہنچنے سے قاصر ہے تو کتاب الٰہی کا فیصلہ لازم ہے، لیکن کتاب الٰہی جزئی اور انفرادی واقعات کو تفصیلاً تو بیان نہیں کر سکتی۔ واقعات غیر محدود ہیں، تفصیلی مسائل غیر متناہی ہیں، اس لئے اجمالاً قانون کی شکل میں اس نے صراحت کر دی۔ اس قانون کا انطباق اجمالی کی تشریح اور ابہام کی توضیح رسول کا کام ہے۔ رسول نے کتاب الٰہی کے ذریعہ حق کو باطل سے، خیر کو شر سے اور صحیح کو غلط سے جدا کر دیا اور دوامی طور پر معقول و افکار کے اختلافات کی بیخ کنی کر دی۔ یہ مقصد تو عمومی تھا رہا خصوصی مقصد تو ظاہر ہے کہ جو کور باطن بطینت اور تیرہ درون ہیں وہ کیوں قرآنی فیصلے کو صحیح سمجھیں گے۔ ان کی عقل سلیم نہیں، دانش و فہم میں روشنی نہیں پھر کس طرح

ان کو آفتاب ہدایت کی روشنی نظر آسکتی ہے۔ فائدہ اٹھانے والا گروہ صرف اہلِ ایمان کا ہے۔ راہ راست پر آنے والے، قوانین الٰہیہ پر کار بند رہنے والے اور ضوابطِ شریعت پر چلنے والے مومنین ہیں، اس لئے کتابِ الٰہی انہیں کے لئے مجسم ہدایت اور پیکرِ رحمت ثابت ہوگی۔

مقصودِ بیان عمومی نبوت کا اظہار اور ضابطۂ الٰہیہ کی توضیح، شیطان کی طرف تزئین کی نسبت جس سے ثابت ہوتا ہے کہ شیطان سبب گمراہی ہے، اغوا کرنا شیطان کا کام ہے اگرچہ خالق سب کا خدا ہی ہے۔ اس بات کی طرف اشارہ کہ جو لوگ شیطان کے جال میں پھنس جاتے ہیں وہ باغوائے شیطانی اپنی بداعمالیوں کو بھی اچھا سمجھنے لگتے ہیں۔ خیر و شر کا امتیاز کرنے والی قوت ان کی مفقود ہو جاتی ہے اور نورِ فطرت بجھ جاتا ہے۔ آخر میں اس امر کی صراحت کہ کتابِ الٰہی کا نزول ضروری تھا، مگر کتاب کی توضیح تشریح اور تفصیل کرنے کے لئے رسول کا ہونا بھی ضروری ہے، اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ فرمانِ رسول کتابِ الٰہی کے مخالف نہیں ہو سکتا یہ ہماری عقل کا قصور ہے کہ ہم بعض احادیث کو قرآن کے خلاف سمجھتے ہیں ورنہ صراحتِ قرآنی اور فرمانِ رسول دونوں ایک ہی ہیں صرف اجمال و تفصیل اور ابہام و توضیح کا فرق ہے۔ آخر میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ کتابِ الٰہی سے فائدہ اٹھانے والے صرف اہلِ ایمان ہی ہیں کیونکہ وہی قوانین شرع پر چلنے والے ہیں۔ لامحالہ انہیں کو رحمتِ الٰہی اپنے آغوش میں لے لے گی وغیرہ۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ

اللہ ہی اوپر سے پانی برساتا ہے اور زمین کے خشک ہونے کے بعد اس کو پانی سے تروتازہ کرتا ہے سننے والوں کے لئے

لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۠ع وَاِنَّ لَكُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا

ع ۵ ۱۴

اس میں یقیناً نشانِ قدرت ہے اور چوپایوں میں بھی تم کو غور در کار ہے اُن کے پیٹوں کے

فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ وَ

اندر سے گوبر اور خون کے درمیان سے نکال کر ہم تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لئے خوشگوار ہوتا ہے اور

مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا

کھجوروں اور انگوروں سے شراب بناتے ہو اور نیز وہ عمدہ روزی ہے

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ

اس میں بھی سمجھدار قوم کے لئے نشانیاں ہیں تمہارے رب نے شہد کی مکھیوں کے دل میں ڈالا کہ پہاڑوں

مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۙ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ

میں اور درختوں میں اور اُن اونچی عمارتوں میں جو لوگ بناتے ہیں گھر بنالو پھر ہر طرح کے پھلوں سے (عرق) چوس کر

فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ

اپنے رب کے صاف راستوں پر چلو شہد کی مکھیوں کے پیٹ میں سے مختلف رنگوں کے پینے کی چیز نکلتی ہے

فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

جس میں لوگوں کے لئے شفا ہے اس میں غور کرنے والی قوم کے لئے نشانِ قدرت ہے

تفسیر قرآن پاک کا قاعدہ ہے کہ مصنوعات سے صانع پر، مخلوقات سے خالق پر اور آثار سے مؤثر پر استدلال کرتا ہے۔ نیرنگیٔ عالم دکھا کر تغیرات کے اصل سبب کا پتہ دیتا ہے۔ طبعیات کے حالات اور کیفیات کا اظہار کر کے یا تو الٰہیات کے دو اہم ترین مسائل یعنی معاد اور نبوت پر روشنی ڈالتا ہے یا اصلاح عقائد اور اعمال کی تعلیم دیتا ہے۔ کتاب اللہ کے یہی پانچ اصول ہیں۔ توحید، رسالت، قیامت، اصلاح، درستگی اعمال و اقوال۔ قرآن میں گزشتہ اقوام اور ان کے انبیاء کے قصے، آئندہ واقعات کی تشریحات اور تمام مسائل طبعیہ کے بیان کی اصل غرض یہی اصول پنجگانہ ہیں۔ آیات مذکورہ میں بھی اپنی قدرت قاہرہ اور حشر جسمانی پر چار چیزوں کی تخلیق کو پیش کر کے استدلال کیا ہے۔

(۱) زمین خشک ہوتی ہے جس کو مُردہ کہا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ اوپر سے مینہ برساتا ہے، زمین فیضانِ سماوی کو قبول کرتی ہے، مُردہ سے زندہ ہو جاتی ہے۔ مختلف سبزیاں، بوٹیاں، درخت، پھل پھول اس پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ گوش ہوش رکھنے والوں کے لئے زمین کی موت و زندگی کے اندر قدرتِ الٰہیہ اور حشر جسمانی کے نشانات مخفی ہیں۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ ایک سال زمین برسات میں ہری بھری ہوتی ہے۔ سیکڑوں سبزیاں اور بوٹیاں لہلہاتی ہیں، درختوں میں پھل پھول آتے ہیں پھر موسم خزاں میں سب خشک ہو کر نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ دوسرے سال برسات میں پھر وہی زندگی زمین کو عطا ہوتی ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ یہ زمین ان کا کھیت ہے۔ قدرت نے انسانی پودے اس کھیت میں بوئے ہیں۔ ان پودوں کے نشو و نما اور زندگی کا زمانہ بجائے ایک سال کے ایک منٹ سے لے کر سیکڑوں برس تک ہے۔ کوئی شخص پیدا ہونے کے بعد تھوڑی دیر زندہ رہتا ہے پھر اس پر موت کی خزاں آجاتی ہے۔ ہر پودہ اپنے مقررہ وقت پر سوکھ جاتا ہے۔ لیکن جب دوسری فصل آئے گی اور دوبارہ زندگی کا زمانہ آئے گا تو پھر از سر نو تمام پودے لہلہانے لگیں گے۔

آیت کے مضمون سے تقریر اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ جس طرح آسمان سے بارش نازل ہو کر زمین کو زندگی عطا کرتی ہے اسی طرح قرآن پاک بھی فیض روحانی ہے جو مومنوں کے دلوں پر برستا ہے، ان کو زندگی عطا کرتا ہے، ہدایت و رحمت کے گل بوٹے اور پھل دار درخت اُن میں پیدا ہوتے ہیں۔

(۲) خدا تعالیٰ نے چوپائے پیدا کئے۔ بھیڑ، بکری، گائے، بھینس، اُونٹنی وغیرہ غذا کھاتی ہیں۔ غذا پیٹ کے اندر پہنچ کر ہضم ہوتی ہے ہضم ہو کر عمدہ جوہر الگ اور فضلہ الگ ہو جاتا ہے۔ جو غذا کھاتے ہیں اس میں اچھے اور برے دونوں حصے مخلوط ہوتے ہیں مگر پیٹ میں پہنچ کر دونوں حصے جدا جدا ہو جاتے ہیں۔ عمدہ جوہر سے خون جو زندگی کا اصل سبب ہے بنتا ہے اور خون رگوں میں دوڑ کر تھنوں میں آتا ہے یہاں آکر اس کا رنگ سفید ہو جاتا ہے اسی کو دودھ کہا جاتا ہے جو نہایت خوش مزہ اور خوشگوار ہوتا ہے۔ اب ذرا غور کا مقام ہے کہ غذا کے اندر عمدہ جوہر یعنی خون اور برا حصہ یعنی فضلہ دونوں مخلوط تھے۔ خدا تعالیٰ نے اس مخلوط غذا سے پیٹ کے اندر کس طرح خالص خوشگوار دودھ کو علیحدہ کر کے پستانوں میں پہنچا کر انسانوں کو پلایا۔ انسانی حشر کی بھی یہی صورت ہے۔ آدمی مر کر مٹی میں مل جاتا ہے۔ اس کی خاک ہوا میں اُڑ جاتی ہے یا دریا میں بہہ جاتی ہے، مگر جو خدا گوبر اور غذائی جوہر کے مخلوط قوام سے خالص دودھ کو علیحدہ کرتا ہے وہی انسان کی خاک کو دریا، ہوا اور زمین سے چھانٹ کر علیحدہ کر کے دوبارہ زندگی عطا کرے گا اور جس طرح وہ مختلف رنگ کی گھاس پات، غلہ، بھوسہ، گوشت اور پھل سے دودھ بناتا اور اس کو سفید شکل اور خوشگوار مزہ عنایت کرتا ہے اسی طرح وہ انسانی خاک کو بشری شکل احساس کرنے کی قوت اور ادراک کرنے کی سمجھ بھی دوبارہ عطا کرے گا۔

(۳) اللہ نے طرح طرح کے پھل، درخت پیدا کئے جن میں سے نہایت لطیف، خوش مزہ اور مرغوب طائف انگور اور کھجوریں ہیں۔ یہ پھل زمین

کھاد پانی اور ہوا سے پیدا ہوتے ہیں ان میں سے کچھ تو ویسے ہی کھالئے جاتے ہیں اور کچھ شراب شربت اور دوسری چیزیں بنانے کے کام آتے ہیں۔ غور کرو کہ ان کا مادہ، شکل، رنگ، خاصیت، مزہ، قوام، مقدار اور کیفیت اصل میں کیا تھی اور پھر خدا تعالیٰ نے اس کو کیا بنا دیا نہ اصلی شکل رہی نہ وہ رنگ و بو نہ وہ خاصیت و کیفیت نہ وہ ذائقہ نہ وہ قوام، ناپاک سے پاک، بدمزہ سے خوش مزہ اور بدرنگ سے خوش رنگ بنایا۔ کھاد پانی ہوا سے خوشگوار شربت اور بہترین غذا تیار کی۔ سمجھدار انسان اس سے اصل نتیجہ تک پہنچ سکتے ہیں عقل والے ہی حقیقت دریافت کر سکتے ہیں یعنی جب اتنے اہم تغیرات اور نادر ترین انقلابات خدا تعالیٰ کرتا رہتا ہے تو کیا انسانی مادہ سے دوبارہ انسان کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ کیا کھاد، پانی اور ہوا کو انگور کی شکل مزہ اور رنگت و خاصیت عطا کرنے سے انسانی مادے کو دوبارہ انسانی شکل عطا کرنا زیادہ دشوار ہے؟

عام مفسرین کے نزدیک سَکَرٌ بمعنی مسکر (نشہ آور) ہے اور چونکہ نشہ آور چیز حرام ہے اور خدا تعالیٰ نے بطور انعام و احسان اس جگہ تذکرہ فرمایا ہے اور حرام چیز کو بطور احسان و انعام ذکر نہیں کیا جا سکتا، اس لئے امام اعظم کے نزدیک آیت میں سَکَرٌ سے مراد نبیذ ہے۔ نبیذ اس عرقِ انگور یا شربت کھجور کو کہتے ہیں جس کو جوش دے کر دو حصے خشک کر دیتے جاتے ہیں اور ایک حصہ باقی رہتا ہے اس میں نشہ نہیں ہوتا۔ گویا یہ ایک طرح کا پُرکیف شربت ہوتا ہے۔ عام مفسرین کہتے ہیں کہ سَکَرٌ سے مراد شراب ہی ہے۔ آیت مکی ہے اور خطاب قریش مکہ کو ہے اور مکہ میں شراب حرام نہ ہوئی تھی مدینہ میں پہنچ کر حرام ہوئی۔ آیت کے نزول کے وقت تک بلکہ مدینہ پہنچنے اور شراب حرام ہونے کے وقت تک شراب کو دودھ کی طرح لطیف اور عمدہ غذا سمجھا جاتا تھا، اس لئے خدا تعالیٰ نے اس آیت میں دودھ کے تذکرے کے بعد شراب کا تذکرہ بطور انعام و احسان فرمایا۔ (ل) جب مدینہ میں پہنچ کر شراب حرام کر دی گئی تو اس وقت اس آیت کا جواز ی حکم منسوخ ہو گیا۔

ابو عبیدہ جو امام لغت ہیں کہتے ہیں کہ سَکَرٌ کے معنی طُعْم یعنی کھانے کی چیز۔ ابن جریر نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ سَکَرٌ سے مراد نشہ آور چیز نہیں بلکہ وہ چیز ہے جس کو بطور طعام استعمال کیا جاتا ہو۔ اس تشریح کی بنا پر سَکَرٌ اور رزق حَسَن دونوں لفظوں سے ایک ہی معنی مراد ہوگا، فرق صرف عموم و خصوص کا ہوگا۔ سکر عام اور رزق حسن خاص۔

(۴) پینے کی چیزیں عموماً چار ہی ہیں۔ پانی، دودھ، شربت اور شہد۔ اوّل الذکر تینوں چیزوں کا تذکرہ ہو چکا۔ چوتھی چیز سے یہاں استدلال کیا جاتا ہے۔ شہد جہاں کی مکھی سے پیدا ہوتا ہے۔ جہاں کی مکھی مختلف پھولوں سے رس چوس کر ہضم کرتی ہے۔ اس کے معدے میں یہی رس ہضم ہو کر شہد کی شکل میں خارج ہوتا ہے۔ اب ذرا اللہ کی قدرت پر غور کرنا چاہئے سب سے پہلے اس نے شہد کی مکھی کو فطری طور پر یہ بات تعلیم کی کہ وہ پہاڑوں میں، درختوں میں، اونچے مکانوں میں، چھتوں میں اور دوسرے بلند مقاموں میں اپنا گھر بنائے تاکہ زمین سے جو بخارات اور ردّی فاضلات خارج ہوتے رہتے ہیں وہ شہد کو خراب نہ کر سکیں پھر گھر بھی بنائے تو کیسے خوبصورت اور ہندسی پیمانے کے موافق کہ کوئی بڑے سے بڑا انجینیئر بھی ان کی پیمائش میں فرق ثابت نہیں کر سکتا۔ شہد کی مکھیوں کی تمام گھریاں مسدس شکل کی ہوتی ہیں۔ ہر ضلع دوسرے کے برابر ہوتا۔ اگر مدور یا مربع ہوتا تو جگہ خالی رہ جاتی۔ پھر ہر قسم کے پھلوں اور پھولوں سے رس چوسنے کی تعلیم دی گئی۔ جانے غور ہے کہ پھل مختلف خاصیات اور مختلف رنگ اور مختلف مزے کے ہوتے ہیں۔ خوشگوار، ناگوار، شیریں، تلخ، سرخ، سبز، زرد، سفید وغیرہ، لیکن شہد کی مکھی خوشگوار پھلوں کا شیریں عرق ہی چوستی ہے اور شہد کا رنگ جو مقرر ہے وہی ہوتا ہے اس میں تفاوت نہیں ہوتا۔ اس کے بعد چھتے کے اندر آنے جانے کے جو راستے مقرر ہیں انہیں سے داخل ہونے اور نکلنے کا القاء ہوا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جو راستہ اندر داخل ہونے کا ہے اسی سے مکھی باہر آئے یا نکلنے کے راستے سے اندر داخل ہو۔ بعض علماء نے ذُلُلاً کا یہ مطلب بیان کیا کہ سوراخوں کے اندر داخل ہونا اور ان سے نکلنا اللہ ہی نے بتایا یعنی سمٹ کر پر سمیٹ کر داخل اور خارج ہونا سکھایا۔ بعض نے یہ معنی بیان کئے کہ اللہ نے مکھیوں کو اپنے فرماں روا اور حاکم کا مطیع ہونا سکھایا۔ شہد کی مکھیوں کا ایک سردار ہوتا ہے جس کو عربی میں یعسوب کہتے ہیں یہ قد اور دانش کے اعتبار سے سب میں بڑا ہوتا ہے کچھ مکھیاں بطور خادم چھتے کے دروازوں پر مقرر ہوتی ہیں جو داخل ہونے والی ہر مکھی کو سونگھ کر اندر گھسنے دیتی ہیں۔ اگر کسی گندی چیز پر بیٹھ کر مکھی رس چوس کر آتی ہے تو اس کو مار کر نکال دیتی ہے اندر داخل نہیں ہونے دیتیں۔ یہ سب کچھ القائے فطری اور الہام کے ماتحت ہوتا ہے۔ ان تمام تیاریوں کے بعد شہد بنتا ہے۔ شہد کا رنگ مختلف ہوتا

ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ اختلافِ سِن اور اختلافِ فصل سے شہد کے رنگ میں اختلاف ہوجاتا ہے۔ خفاجی کا قول ہے کہ نوجوان مکھی سے سفید اور کامل جوان سے زرد اور بوڑھی سے سرخ شہد پیدا ہوتا ہے۔ بعض لوگ اختلافِ غذا کو بھی شہد کے رنگ کے اختلاف کا سبب خیال کرتے ہیں۔ نظر و فکر کے قابل یہ امر ہے کہ جس خدا نے لایعقل مکھیوں کو اس قدر تعلیم دے کر ہزاروں تغیرات و انقلابات کے شہد تیار کرنا سکھایا اور پھلوں پھولوں کے عرق کو شہد کی مکھیوں کے معدے میں پہنچا کر ایک شیریں اور لطیف جوہر بنایا کیا وہ انسان کی خاک کو دوبارہ انسانی شکل نہیں دے سکتا؟

آخری آیت یعنی فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ کی تفسیر میں علماء نے اختلاف کیا ہے۔ مجاہد، افراء اور ابن کیسان کے نزدیک قرآن پاک کی طرف ضمیر راجع ہے یعنی قرآن امراض روحانی کے لئے شفا ہے، لیکن جمہور مفسرین کا قول ہے کہ اگرچہ قرآن شفائے کامل ہے، مگر اس موقعہ پر ضمیر کو قرآن کی طرف راجع کرنا سیاق عبارت کے خلاف ہے۔ لہٰذا شہد ہی کی طرف ضمیر راجع ہے۔ اس کی تائید میں بکثرت احادیث بھی وارد ہیں۔ بخاری نے بروایت ابن عباس رضؓ حضورؐ کا فرمان نقل کیا ہے جس میں شہد کو شفا قرار دیا ہے۔ بخاری میں بروایت جابر بن عبداللہ رضؓ جو حدیث شہد کے متعلق وارد ہوئی ہے اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، لیکن محل نزاع یہ امر رہتا ہے کہ کیا شہد سے تمام امراض کو شفا حاصل ہوجاتی ہے یا بعض کو؟ قرآن و احادیث میں چونکہ کوئی قید وارد نہیں ہوئی، اس لئے بعض علماء نے ہر قسم کے مرض کی دوا شہد کو قرار دیا، لیکن یہ بھی صراحت کردی کہ ترکیب استعمال صحیح طور پر معلوم نہ ہونے کی وجہ سے فائدہ ظاہر نہیں ہوتا اور بعض امراض شہد سے ترقی کرجاتے ہیں۔ اگر طریقۂ استعمال اور مقدار صحیح معلوم ہو تو ہر مرض شہد سے دور ہوجاتا ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ شہد صرف بلغمی امراض ہی میں مفید ہے، صفراوی یا دموی امراض کا ازالہ اس سے نہیں ہوتا۔ احادیث میں کل امراض کے لئے شفا ہونے کا تذکرہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

مقصودِ بیان إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح پانی کو آسمان سے برسا کر زمین کی زندگی کا سبب بنایا۔ اسی طرح قرآن پاک کو آسمان سے نازل فرما کر جاہل مردہ دلوں کی زندگی کا ذریعہ قرار دیا تاکہ دل کے کانوں سے سننے والے زندہ ہوجائیں، لیکن جس طرح پتھریلی زمین پانی جذب نہیں کرتی پانی کا ریلا ادھر سے آتا ہے اُدھر بہہ جاتا ہے اسی طرح کور باطن غافل دل والے قرآن سے کوئی اثر نہیں لیتے اور جس طرح گندہ اور بُودار زمینوں میں پانی برسنے سے مزید تعفن پھیلتا ہے اسی طرح بد باطن کج فہم اور عنادی طبیعت والوں کے دلوں میں قرآن کے سننے سے مزید گمراہی و بدکاری کی عقد بڑھتی ہے۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ میں اس طرف ایماء ہے کہ انگور اور کھجور کا عرق لذیذ غذا اور مفید شربت ہے، مگر جب اس میں سڑاند پیدا ہوجائے اور نشہ آور ہوجائے تو یہی عقل کو زائل بھی کردیتا ہے۔ اسی طرح قرآنی ہدایات ہیں۔ اگر صحیح طور پر عقل سلیم کے ساتھ ان پر عمل کیا جائے، تاویلیں اور تحریفیں چھوڑ کر دماغ آرائی اور خوردہ ریزی کو ترک کرکے صاف صاف قوانین پر عمل کیا جائے تو دینی اور دنیوی سعادت حاصل ہوتی ہے، لیکن اگر علمی زور میں آکر حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنادیا، آیاتِ قرآنی میں لفظی یا معنوی تحریف کردی، اصل سے ہٹ کر کج راہی اختیار کی تو دنیا اور دین کی تباہی لازم ہے۔ لفظ يَعْقِلُونَ میں شاید اس طرف بھی خفیف ترین اشارہ ہے کہ شراب عقل کو زائل کرنے والی چیز ہے اور اہلِ اسلام کے لئے اس کا استعمال زیبا نہیں۔ لفظ اَوْحٰی بتا رہا ہے کہ شرعاً وحی کا استعمال صرف انبیاء کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسری مخلوق کے لئے بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔ اگرچہ انبیاء کو چھوڑ کر دوسرے انسانوں یا جانوروں کو جو وحی ہوتی ہے وہ قولی نہیں ہوتی بلکہ الہامی یا فطری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ انبیاء کے سوا اور انسانوں یا جانوروں کے پاس وحی فرشتے کے ذریعہ سے نہیں آتی براہ راست الہام یا القاء ہوتا ہے۔ انبیاء کو الہام و القاء بھی ہوتا ہے اور فرشتوں کی وساطت سے پیام بھی آتا ہے لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ سے غور و خوض کی دعوت دینی مقصود ہے اور یہ ہدایت کرنی ہے کہ خدا تعالیٰ بندوں کی پرورش و بقاء کے سامان کس قدر طویل اسباب کی فراہمی کے بعد مہیا فرماتا ہے۔ عالم طبعیات میں غور کرنا اور اس سے نتائج اخذ کرنا اور پھر قدرت الٰہیہ پر استدلال کرنا اور حشر اجساد کو دنیوی تغیرات و انقلابات پر قیاس کرنا اہلِ ایمان کا شیوہ ہونا چاہیئے۔ عالم فکر کو بصیرت و تدبر سے کام لے کر تخلیقی قوتوں کو اخروی زندگی کے ثبوت میں پیش کرنا چاہیئے۔ تفکر، عقل اور سمع سے اس طرف اشارہ ہے کہ عقل کا کام غور کرنا ہے، مگر خالی غور و فکر کافی نہیں بلکہ احکام الٰہی کو سننا اور ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ

اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا وہی تم کو موت دیتا ہے پھر تم میں سے بعض آدمی نکمی عمر تک پہنچ جاتے ہیں تاکہ جان بوجھ چکنے کے بعد کچھ

عِلْمٍ شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ۧ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ

نہ جان سکے بلاشبہ اللہ جاننے والا قادر ہے اور اللہ ہی نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر روزی میں زیادتی عطا کی ہے

فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَاۗدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰي مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ ۭ

تو جن لوگوں کو روزی میں برتری عطا کی گئی ہے وہ اپنی روزی میں اُن کے برابر غلاموں کو دینے والے نہیں تاکہ وہ روزی میں ان کے برابر نہ ہوجائیں

اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ

کیا یہ لوگ اللہ کی نعمت کے منکر ہیں اللہ نے تم ہی میں سے تمہارے لئے بیبیاں بنائیں اور تمہاری بیبیوں سے

مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ

تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور پاک چیزیں تمہیں کھانے کو دیں تو کیا یہ لوگ باطل کو مانتے ہیں

وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ۝ۙ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ

اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو آسمان و زمین میں

رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَـيْـــًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ۚ

سے کچھ بھی اُن کو روزی دینے کا اختیار نہیں رکھتیں اور نہ اُن میں طاقت ہے

تفسیر

ان آیات میں مندرجہ ذیل مضامین کا بیان ہے۔ تخلیق انسانی، موت، تغیرات جسمانی و دماغی، تفاوت معاش اور اس کی حکمت، اہل و عیال اور عمدہ روزی۔ ان مضامین کے بیان سے دو نتائج کا اظہار مقصود ہے۔ اول اللہ کے احسانات و انعامات کا تذکرہ کرکے توحید ربوبیت کی صراحت اور اس کی قدرت قاہرہ کو بیان کرکے توحید الوہیت کا اثبات۔ دوم تصرفات کاملہ اور محیط کل علم و حکمت کی وضاحت کرکے حشر جسمانی کا مدلل ثبوت ہم ترتیب وار مختصر تفسیر کرتے ہیں۔

(۱) اللہ نے سب کو پیدا کیا۔ کس چیز سے پیدا کیا؟ کیسے پیدا کیا؟ کتنے تغیرات اور استحالات ہوئے؟ انسان کہاں سے آیا کیسے آیا اور شکم مادر کے اندر کس قدر مدارج ترقی طے کرکے عالم شہود میں آیا؟ اس پر غور کرنے سے خدا کی عظیم الشان قدرت اور بے مثال حکمت کا ادنیٰ پرتو دکھائی دیتا ہے طبیعت اور مادہ کا بے شعور ہونا اور پھر اس پر شعوری کیفیات کا طاری ہونا اللہ کی ہمہ گیر طاقت کا اظہار ہے۔

(۲) جب انسان مدارج زندگی طے کر چکتا ہے اور طبعی قوتوں میں اضمحلال آجاتا ہے۔ طبعی موت طاری ہوجاتی ہے اور کبھی اس کے خلاف بھی چھوٹے بچے، نوجوان، کامل جوان اور میانہ عمر کے آدمی بھی مر جاتے ہیں۔ کیسے مرتے ہیں؟ کیوں مرتے ہیں؟ موت کا کیا مفہوم ہے؟ کوئی آج تک اس کو حل نہ

کرسکا۔ پھر موت سے بچنے کی کیا تدبیر ہے، موت کے فرشتے کو کیسے روکا جا سکتا ہے؟ کوئی دانشمند اور فلاسفر اس کو نہ بتا سکا۔ اس سے بھی اللہ کی محیط کل عظمت اور پُرجبروت قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔

(۳) بعض آدمی بہت بوڑھے ہو جاتے ہیں، حواس میں اختلال پیدا ہو جاتا ہے، وسواس بڑھ جاتے ہیں، تندرستی اور جوانی کے زمانے میں جو علمی ذخیرہ دماغ میں جمع کیا تھا سب فنا ہو جاتا ہے، اچھا خاصا انسان انتہائی عمر تک ترقی کرنے کے بعد پھر بچہ بن جاتا ہے۔ کس نے علمی ترقی دی؟ کیسے دی؟ پھر کیسے سلب کرلی؟ یہ سب مظاہر قدرت اور نیرنگیہائے فطرت ہیں۔ لب کشائی اور دماغ کی رسائی کی گنجائش نہیں۔ نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اہل علم نے انسانی عمر کے چار حصے کئے ہیں۔ پہلا حصہ ۳۳ برس تک ہے یہ سن نمو اور جسمانی ترقی کا ہوتا ہے پھر ۳۳ سے ۴۰ برس تک وقوف کا سن ہے اس میں نہ ترقی ہوتی ہے نہ تنزل، مگر عقل کامل ہو جاتی ہے۔ ۴۰ سے ۶۰ تک کہولت کا زمانہ ہے اس میں انحطاط اور قوت کا زوال ہونے لگتا ہے، مگر آہستہ آہستہ۔ افعال جسمانی و دماغی سے انسان مجبور نہیں ہوتا۔ چوتھا حصہ ۶۰ سے اوپر کا ہے جو ارذل العمر ہے۔

ابن کثیر اور مفسر معالم نے حضرت علی رضؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ارذل العمر سے مراد پچھتر سال کی عمر ہے۔ قتادہ سے نوے برس مروی ہیں۔ میرے نزدیک سال اور مدت کی تعیین نہ کرنا اولیٰ ہے۔ کیونکہ صحت، مرض، اعضا کی ساخت اور جسم کی طاقت و کمزوری کی تفاوت سے بڑھاپا مقدم و مؤخر ہوتا رہتا ہے۔ کوئی ساٹھ برس میں پیر فرتوت ہو جاتا ہے، کسی کی قوت نوے برس تک قائم رہتی ہے لہٰذا ارذل العمر سے عمر کا وہ حصہ مراد ہے جس میں انسان کی دماغی و جسمانی قوتیں جواب دے دیتی ہیں۔ حواس میں اختلال، قوت حافظہ پر نسیان کا تسلط اور قوت واہمہ میں وسواس پیدا ہو جاتا ہے یہ انسانی عمر کا سب سے ناکارہ حصہ ہے۔ مختلف احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور اقدسؐ نے ہرم (انتہائی پیرانہ سالی) اور ارذل العمر سے اللہ کی پناہ مانگی ہے۔ صحیح بخاری وغیرہ کتب صحاح میں اس قسم کی احادیث مروی ہیں۔

(۴) وَاللّٰہُ فَضَّلَ الخ۔ اس آیت کی تفسیر مفسرین نے دو طرح کی ہے۔ ابن عباس اور مجاہد وغیرہ سے اس طرح مروی ہے کہ اللہ نے دنیا کا انتظام اختلاف احوال پر مبنی کیا ہے۔ کسی کو امیر بنایا کسی کو غریب، کسی کو آقا کسی کو غلام اور عام طور پر اہل کفر اس بات کو گوارہ نہیں کرتے کہ اپنے کھانے پہننے میں اپنے غلاموں اور زیردستوں کو برابر کا شریک کرلیں۔ ان کو خود اپنے مرتبہ کا خیال اور اپنی بڑائی کا لحاظ رہتا ہے، اس لئے خدا تعالیٰ بطور الزام مشرکوں سے فرماتا ہے کہ جب مالک و مملوک میں تمہارے نزدیک بھی مساوات ممکن نہیں اور تم خود اس کو گوارا نہیں کرتے تو پھر بھلا اللہ کے زیر دست بندوں کو اس کا شریک کس قاعدہ سے قرار دیتے ہو؟ یہ تو اللہ کے احسان کا امر بھی انکار ہے کہ روزی تو دے خدا اور اس کے ساتھ برابر کا حق دار سمجھو دوسروں کو۔ عام جمہور مفسرین نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ اللہ نے دولت و مال میں کمی بیشی رکھی ہے کسی کو مال زیادہ کسی کو کم۔ مالک ہو یا مملوک ہر ایک اپنے مقدر کا بحکم الٰہی کھاتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ جس کو زیادہ دیا گیا ہے وہ اپنے مقدر کا رزق دوسرے کو دے دے۔ مخلوق ہونے اور مرزوق ہونے میں دونوں برابر ہیں، لیکن اس کے باوجود اللہ کے احسان کا شکر نہیں کرتے۔ اس مطلب کی تائید حضرت عمر بن خطابؓ کے اس خط سے ہوتی ہے جس میں آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو یہ الفاظ لکھے تھے تم اپنے رزق پر قناعت رکھنا۔ اللہ نے دنیا میں بعض کو بعض پر رزق میں زیادتی اس لئے دی ہے کہ آزمائش ہو جائے۔ جس کو رزق زائد دیا ہے اس کا امتحان مقصود ہے کہ وہ اللہ کا شکر اور اللہ کے حقوق ادا کرتا ہے یا نہیں (رواہ ابن کثیر عن ابن ابی حاتم عن حسن البصری)

(۵) اللہ کے احسانات علاوہ تخلیق نشو و نما اور ترقی جسمانی و روحانی کے اور بہت ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اقتضائے جنسی کی تکمیل، قلبی سکون کے حصول، خانہ داری کے انتظام، مال کی حفاظت، اور بچوں کی نگہداشت۔ غرض یہ کہ تمہارے بہت سے فائدوں کے لئے خدا تعالیٰ نے تم کو بیویاں عطا کیں۔ اگر عورت نہ ہوتی تو مرد کا وجود کیسے ہوتا، قلبی اُنس کیسے حاصل ہوتا اور دیگر اندرونی فوائد کیسے حاصل ہوتے۔ پھر غیر مانوس اور اجنبی نوع کی بیویاں نہیں دیں بلکہ انسانی نوع کی تمہاری ہی شناسا جنس میں سے عطا کیں تاکہ موانست کامل طور پر حاصل ہو جائے پھر بیویاں دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بیٹے، پوتے اور نواسے بھی دیئے تاکہ آڑے وقت میں وہ تمہارے کام آسکیں۔ حَفَدَۃٌ کے لغوی معنی ہیں خدام کیونکہ حفد کے معنی ہیں خدمت کرنا۔ ابن عباس، عکرمہ، حسن بصری، ضحاک، ابن زید اور سعید بن جبیر کے نزدیک حفدہ سے مراد پوتے نواسے ہیں۔ ابن عباس

کا ایک قول یہ بھی ہے کہ حفدہ میں صلبی بیٹے بھی داخل ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک نواسے اور نواسیاں بھی اس میں داخل ہیں۔

ابن مسعود، مسروق، ابوالضحیٰ، ابراہیم نخعی، مجاہد اور قرطبی کے نزدیک حفدہ سے مراد ہیں داماد اور خسر۔ صحیح اور قوی قول یہ ہے کہ حفدہ سے لغوی معنی یعنی خدام مراد ہیں۔ خواہ بیٹے بیٹیاں ہوں یا پوتے پوتیاں یا نواسے نواسیاں یا داماد و خسر یا دیگر خدام و غلام۔

(۶) بقائے حیات کے لئے رزق ضروری تھا۔ رزق دو طرح کا ہو سکتا ہے: پاک اور ناپاک۔ پاک رزق کی بھی دو قسمیں ہیں حرام اور حلال۔ مثلاً سنکھیا پاک ہے مگر حرام ہے۔ مٹی پاک ہے مگر اس کا کھانا ناجائز ہے۔ خدا تعالیٰ نے بقائے حیات پاک رزق میں سے مخصوص قسم یعنی حلال چیزیں عطا فرمائیں۔

اللہ کے یہ تمام احسانات ہیں کیا ان کے ہوتے ہوئے دوسروں کو اس کی ربوبیت میں شریک کرنا جائز ہے، غلط بات کا یقین کرنا مثلاً یہ کہنا کہ فلاں بزرگ یا دیوتا نے ہم کو بیٹا بیٹی یا مال عطا کیا اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرنا یعنی اللہ کی دی ہوئی نعمت کو غیروں کی طرف منسوب کرنا ظلم اور ناحق شناسی نہیں تو اور کیا ہے۔ بھلا ایسی بے کس بے بس چیزوں کی قولی اور عملی پرستش کرنی جن میں نہ خود کچھ طاقت ہے نہ دوسرے کو وہ کچھ دے سکتے ہیں حماقت و باطل پرستی نہیں تو اس کو اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

مقصودِ بیان

تخلیق، حیات اور ممات تینوں خدا کے قبضہ میں ہیں۔ اس بات کو ظاہر کرنے سے یہ مقصود ہے کہ طاقتِ الٰہی محیطِ کل ہے۔ اُس کے تصرف و اختیار سے کوئی چیز خارج نہیں۔ رزق کی کمی بیشی کی صراحت کرنے سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ انتظامِ عالم تفاوتِ معاش پر مبنی ہے، رزق و مال کی مساوات سے نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا نہ کوئی خادم رہے گا نہ مخدوم نہ آقا نہ نوکر، پیشوں کا اختلاف باقی رہے گا نہ کوئی محنت کرے گا، اس لئے تنظیمِ عالم کی بقا کے لئے تفاوتِ رزق ضروری ہے۔ ہاں یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ استحقاقِ لذت سب کو برابر ہے، کسی کو اپنے خادم یا غلام سے اچھا کھانے یا پہننے کا حق نہیں ہے املاک اور تصرفات میں اگرچہ تفاوت اور کمی بیشی ہے، مگر فوائد حاصل کرنے کا سب کو برابر حق ہے۔ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ سے اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے۔ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ کے لفظ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ بیوی کا سب سے بڑا فائدہ بقائے نسل ہے۔ دیگر فوائد تابع ہیں اصل غرض اولاد ہے۔ مِنَ الطَّيِّبَاتِ میں لفظ مِنْ جو بعضیت پر دلالت کر رہا ہے یہ ظاہر کر رہا ہے کہ تمام پاکیزہ چیزیں حلال نہیں ہیں بلکہ بعض حلال ہیں اور بعض حرام

آیت کا آخر حصہ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ الخ ظاہر کر رہا ہے کہ خداداد نعمت کو غیر کی طرف منسوب کرنا کفر ہے وغیرہ۔

فَلَا تَضْرِبُوا لِلَّهِ الْأَمْثَالَ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا

سو تم اللہ کی مثالیں نہ گھڑو بلاشبہ اللہ تو جانتا ہے اور تم ناواقف ہو اللہ نے ایک مثال بیان کی ہے

عَبْدًا مَمْلُوكًا لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَمَنْ رَزَقْنَاهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ

کہ ایک تو غلام ہے جو پرائے بس میں ہے کسی چیز کا اس کو اختیار نہیں اور (دوسرا) وہ شخص ہے جس کو ہم نے اپنی طرف سے عمدہ روزی عطا کی ہے وہ اس میں سے چھپے

سِرًّا وَجَهْرًا ۖ هَلْ يَسْتَوُونَ ۚ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَضَرَبَ

کھلے خرچ کرتا ہے کیا یہ برابر ہو سکتے ہیں ہر تعریف اللہ کو زیبا ہے بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر بے علم ہیں اللہ نے ایک

اللَّهُ مَثَلًا رَجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَىٰ مَوْلَاهُ أَيْنَمَا

(اور) مثال بیان فرمائی ہے دو آدمی ہیں ایک تو گونگا ہے کچھ نہیں کر سکتا اور اپنے آقا پر بار ہے آقا جہاں اس کو

يُوَجِّهْهُ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ ۖ هَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَنْ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿٧٦﴾

بھیجتا ہے کچھ بہتری کر کے نہیں لاتا کیا یہ اور وہ شخص برابر ہو سکتا ہے جو انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے اور وہ خود بھی سیدھے راستے پر ہے

تفسیر اہلِ شرک غیر اللہ کی پرستش، اغراض دیوتاؤں سے منتیں اور مرادیں مانگنے کے ثبوت میں شیطانی، قیاسی اور طاغوتی وسواس سے کام لیتے اور عوام کو اپنا ہم نوا بنانے کے لئے اپنے مطلب کی ایک مثال گھڑ کر کہا کرتے تھے کہ اللہ کی مثال ایسی ہے جیسے دنیوی بادشاہ۔ بادشاہ تک ہر کس و ناکس کی رسائی نہیں ہوتی اور نہ اس سے براہ راست ہر شخص اپنی حاجت طلب کر سکتا ہے۔ اس لئے بادشاہ اپنے نائب اور عمالِ حکومت مقرر کر دیتا ہے اور بہت کچھ اختیارات ان کو دے دیتا ہے تاکہ عام رعایا ان کی طرف اپنی حاجات و ضروریات کو پورا کرنے کے لئے رجوع کرے اور وہ عطا کردہ اختیارات سے یا تو خود رعایا کی حاجت پوری کر دیں یا بادشاہ تک عرض پہنچا دیں پھر حاکم کے پیشکاروں کو حاکم کی مرضی میں اور وزیروں کو بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخل ہوتا ہے وہ جس کی عرضی چاہتے ہیں منظور کرا دیتے ہیں، اس لئے ان کو راضی رکھنا بادشاہ کی رضامندی سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ خدا تعالیٰ کی عظمت شان تو دنیا کے تمام بادشاہوں سے بڑھ چڑھ کر ہے پھر ہماری وہاں تک رسائی تو قطعاً ناممکن ہے۔ ہمارے بزرگ اور دیوتا کارخانۂ قدرت کے اہل کار ہیں ان کو خدا تعالیٰ نے کافی اختیارات دے رکھے ہیں اور جن باتوں کا ان کو اختیار ہے اس میں سفارش کر سکتے ہیں اور منظور بھی کرا سکتے ہیں کیونکہ بارگاہِ خداوندی میں ان کی کامل رسائی ہے، اس لئے ان کی خوشنودی حاصل کرنی اور عبادت کرنی ان سے مرادیں مانگنی بہت زیادہ اہم فرض ہیں۔ یہ عقیدہ اور مثال چونکہ بالکل لغو تھا۔ خالق کو مخلوق پر، قادر کو مجبور پر اور عالمِ کل کو جاہل پر قیاس کرنا صراحۃً باطل ہے۔ بادشاہ اپنی مجبوری اور کمزوری اور محیطِ کل علم نہ ہونے کی وجہ سے وزراء اور نوابوں کا دستِ نگر ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ قادرِ مطلق اور عالمِ کل ہے اس کو اس سلسلۂ نیابت کی کیا ضرورت ہے، اس لئے اس قول کی تردید میں یہ آیت نازل فرمائی۔

حاصلِ ارشاد حسبِ تفسیر قتادہ یہ ہے کہ اللہ صمد، لم یلد، ولم یولد ہے اس کی مثال ناممکن ہے جس چیز سے تم اس کو تشبیہ دیتے ہو وہ کامل طور پر تمہاری مثل بھی نہیں ہے بلکہ تصویرِ خیالی ہے جو تمہارے دماغ کی پیداوار ہے وہ اللہ کی مثل کس طرح ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اللہ کی مشابہت و مماثلت کا خیال بھی مت کرو اس سے آگے فرماتا ہے کہ اللہ اپنی عظمت، شان اور بے مثال ہونے کو جانتا ہے، تم اس کی حقیقت، واقعی حالت اور حقیقی صفات سے ناواقف ہو۔ لہٰذا ناواقفیت وجہالت کے ہوتے ہوئے تشبیہ و تمثیل دینا قطعاً ناجائز ہے۔ اس کے بعد دو مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اللہ کے آگے تمام مخلوق عاجز اور بے بس ہے۔ اس کے حکم کے بغیر کوئی ذرّہ حرکت نہیں کر سکتا۔ مشرکین دو طرح کے تھے ایک گروہ تو وہ تھا جو اپنے دیوتاؤں، نیلین شیطانوں، ایو شبیہ روحوں اور گزشتہ خیالی بزرگوں کی پرستش کرتا تھا۔ دوسرا گروہ تھا جو بے جان بتوں اور درختوں اور پتھروں کو پوجا کرتا تھا۔ اول گروہ کے معبودوں کی مثال اول تمثیل میں ظاہر فرمائی اور دوسرے گروہ کے معبودوں کی بے کسی کی تصویر کشی دوسری تمثیل میں کی۔ پہلی تمثیل کا حاصل یہ ہے کہ فرض کرو دو شخص ہیں ایک تو غلام ہے اور غلام بھی وہ مملوک ہے مختار نہیں۔ کاروبار تجارت کی آقا کی طرف سے اس کو اجازت نہیں نہ مدبر ہے نہ مکاتب۔ مزید براں وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ خانہ داری، لین دین یا تجارت کے کاروبار کا اس کو ڈھب بھی نہیں ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جو خود مختار، صاحبِ قدرت، مبصر و تجربہ کار ہوشیار ہے، مال دار بھی ہے اپنے مال میں ہر طرح تصرف بھی کر سکتا ہے جس کو جتنا چاہتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے دیتا ہے کوئی اس سے باز پرس کرنے والا نہیں، یہ دونوں شخص قدرت و احتیاج میں برابر نہیں ہو سکتے۔ اول محتاج ہے دوسرا قادر مختار۔ اول دوسرے کا دستِ نگر ہے دوسرا اول کا سرپرست۔ یہ تو انسانوں میں نمایاں تفاوت نظر آ رہا ہے پھر وہ بے کس و بے بس مخلوق جو ذات و سرشت کے لحاظ سے محتاج و حادث ہے جس کے پاس خود کوئی چیز نہیں نہ اس کو موجوداتِ عالم میں کسی قسم کے تصرفات کرنے کا اختیار ہے نہ اپنی ذات و حالات پر اس کو کوئی قدرت ہے تم اس کو اس قادر مختار خدا کا ہم پلہ قرار دیتے ہو غافل ذی اختیار ہے جس کے قبضہ میں سب کچھ ہے جس کو جتنا چاہے دے نہ چاہے نہ دے کس قدر حماقت ہے۔ غرض یہ کہ محسوسات میں اگر دیکھا جائے تو باہم تفاوت عظیم ہے باوجودیکہ دونوں مخلوق ہیں فرق اعتباری ہے تو

پھر خالق و مخلوق کیسے برابر ہو سکتے ہیں جن کا تفاوت ذاتی اور حقیقی ہے۔ اس کے بعد فرماتا ہے الحمدللہ کہ یہ اتنی بدیہی اور کھلی ہوئی توضیح ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، مگر اس وضاحت کے باوجود اکثر مشرکین اس قدر جاہل واقع ہوئے ہیں کہ اکثر کو اس نمایاں تفاوت کا پتہ نہیں۔

دوسری تمثیل کا خلاصہ یہ ہے کہ دو شخص ہیں ایک گونگا نکما ہے جس کام کو بھیجو بگاڑ کر آتا ہے کوئی کام ٹھیک کر ہی نہیں سکتا۔ دوسرا شخص وہ ہے جو دانشمند، سمجھ دار اور ہوشیار ہے۔ خود بھی سیدھی چال چلتا ہے اور دوسروں کو بھی صحیح اعتدال کی راہ پر چلنے کا مشورہ دیتا ہے۔ ان دونوں میں مساوات کس طرح ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مورتیاں، پتھر، درخت اور تمام بے جان چیزیں جن کی پرستش کفار کرتے ہیں وہ گونگے شخص کی طرح ہیں جو کچھ کر ہی نہیں سکتے اور مؤخر الذکر شخص سے مراد خدائے قادر و حکیم ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

یہاں ایک شبہ کیا جاتا ہے کہ ابھی آیت فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ میں خدا تعالیٰ نے اللہ کی تمثیل و تشبیہ کی ممانعت فرمائی ہے اور پھر خود ہی اپنی تمثیل کے لئے دو مثالیں بیان فرما دیں۔ بظاہر دونوں میں تناقض نظر آتا ہے اس کے علاوہ دونوں تمثیلیں بھی ناقص معلوم ہوتی ہیں۔ کافروں کے دیوتاؤں اور باطل معبودوں کو اگر بے کس بے بس غلام یا گونگے ناکارہ عمل شخص سے تشبیہ دی جائے تو خیر شاید تاویل کے بعد تشبیہ کامل ہو جائے، لیکن خدائے قادر و قیوم کو جو واجب قدیم، فاعل مختار اور خلاق کل ہے کسی انسان سے تشبیہ دینی خواہ وہ انسان کیسا ہی ہو مالدار، خود مختار اور مطلق العنان ہو باری تعالیٰ کی توہین ہے۔ کفار مکہ اللہ کو بادشاہ سے تشبیہ دیتے تھے تو اس کی تردید میں آیت نازل ہوئی۔ یہاں معمولی خود مختار مالدار انسان سے تشبیہ دی گئی تو جائز سمجھی جاتی ہے یہ کیا معمہ ہے؟ ....

شبہ کی اول شق کا ازالہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ کفار مکہ کا مقصود تمثیل سے یہ تھا کہ خدا کو محتاج ثابت کریں جس طرح بادشاہ اپنے عمال اور کارندوں کا محتاج ہوتا ہے، اسی طرح وہ اللہ کو بھی محتاج ثابت کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ وجہ شبہ (احتیاج) مشبہ میں موجود نہ تھی، اس لئے تشبیہ و تمثیل ممکن ہی نہ تھی۔ اگر وہ عظمتِ الٰہی کو ثابت کرنے کے لئے تمثیل دیتے تو کوئی حرج نہ تھا، مگر ان کا مقصود تو اظہار عظمتِ الٰہی سے یہ تھا کہ اپنے بزرگوں، دیوتاؤں اور معبودوں کو کارخانۂ قدرت کے دخیل کار قرار دیں۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے اللہ کو دنیوی بادشاہوں سے تشبیہ دی تھی۔

دوسری شق کا جواب یہ ہے کہ قواعد، بلاغت اور اصول عقل کی رو سے مشبہ اور مشبہ بہ میں فی الجملہ وجہ شبہ کا اشتراک کافی ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ تمام اوصاف و حالات و لوازم میں اشتراک ہو۔ مثلاً آدمی کو شیر سے تشبیہ دی جاتی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ شیر کی کامل شجاعت اس آدمی میں موجود ہو یا شیر کا منہ گول، گردن پر بڑے بڑے بال، چار پنجے اور ٹیڑھی دم ہوتی ہے تو اس آدمی کی بھی بالکل یہی حالت ہو بلکہ اگر اس میں شجاعت و دلیری کا نمایاں حصہ موجود ہے تو اس کو شیر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ یہی حالت مذکورۂ بالا دونوں مثالوں کی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خدا خالق ہے اور انسان مخلوق۔ جس اختیار اور تصرف کا خدا مالک ہے وہ بندوں میں قطعی نہیں پایا جا سکتا۔ پھر اس کی قدرت بھی کامل ہے اور بندوں کی قدرت ناقص، لیکن اس فرق کے باوجود وجہ شبہ صرف قدرت و عجز ہے۔ دکھانا یہ مقصود ہے کہ بعض انسان صاحب اختیار، متصرف، مالک اور صاحب قدرت ہوتے ہیں ان کی رائے اور سمجھ درست ہوتی ہے خود بھی سیدھے راستے پر چلتے ہیں دوسروں کو بھی راہ حق پر چلنے کا مشورہ دیتے ہیں اور کچھ آدمی بالکل ان کے برعکس ہوتے ہیں۔ مؤخر الذکر طبقہ مجبور، بے کس، غیر مہتدی اور گمراہ ہوتا ہے اور اول گروہ ہادی، مہتدی اور صاحب تصرف ہوتا ہے۔ بس یہی حالت فی الجملہ معبود حق اور باطل معبودوں کی سمجھ لینی چاہیئے۔ معبود برحق فاعل مختار اور قادر مطلق العنان ہے۔ خود بھی راہ حق پر ہے اور دوسروں کو سیدھے راستے پر چلنے کی ہدایت فرماتا ہے۔ رہے باطل معبود تو وہ نہ خود مختار ہیں نہ قادر نہ خود سیدھے راستے پر ہیں نہ دوسروں کو سیدھا راستہ بتا سکتے ہیں۔

آیات مذکورہ کی تشریح ہم نے مجاہد کی تفسیر کے مطابق کی ہے، لیکن ابن کثیر نے بروایت عوفی از ابن عباس جو تفسیر نقل کی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں تمثیلیں حق و باطل معبودوں کی قدرت و کمزوری ظاہر کرنے کے لئے نہیں ہیں بلکہ ان میں کافر و مومن کی حالت کا بیان ہے۔ قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ ابن جریر نے بھی اسی تفسیر کو پسند کیا ہے۔

عطاء خراسانی کا قول ہے کہ تمثیل اول میں ابوجہل اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حالت کا بیان ہے۔ ابوجہل کو مملوک غلام ممنوع التجارت سے تشبیہ دی ہے اور حضرت ابوبکر کو خود مختار، متصرف کل امیر سے اور دوم تمثیل میں اسید بن ابی العیص اور حضرت عثمان کی حالت کا اظہار ہے۔ اسید حضرت عثمانؓ کا غلام تھا اور گونگا تھا کوئی کام ٹھیک نہ کرتا تھا اور حضرت عثمان کو صدقات و خیرات سے روکتا تھا۔ ابن جریر نے بروایت ابن عباسؓ اسی کی صراحت کی ہے۔

مقصود بیان اللہ کی ذات و صفات کے ساتھ ایسی تمثیل و تشبیہ دینے کی ممانعت۔ جس سے ذات مقدس میں کوئی عیب یا نقصان لازم آتا ہو اس امر کی صراحت کہ قادر و عاجز، احمق و دانا برابر نہیں ہو سکتے۔ در پردہ اس بات کی طرف ایماء کہ کفار جن معبودوں کو پکارتے ہیں، بھینٹ چڑھاتے ہیں، نذر نیاز مانتے ہیں اور بعض چیزوں کا ان کو مختار جانتے ہیں یہ بالکل لغو اور بے بنیاد عقیدہ ہے۔ غیر اللہ سے استمداد کسی طرح جائز نہیں وغیرہ۔

وَلِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ

آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی باتوں کا اللہ ہی کو علم ہے اور قیامت کا معاملہ تو پلک جھپکنے کی طرح بلکہ

هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝

اس سے بھی زیادہ قریب ہے بلاشبہ اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

تفسیر گزشتہ دونوں مثالوں میں کافروں کے معبودوں کی کمزوری اور عاجزی ظاہر فرما کر اپنی الوہیت و وحدانیت کو ظاہر فرمایا تھا۔ ان آیات میں ہی الوہیت کی ایک اور خصوصیت بیان فرماتا ہے وہ یہ کہ اللہ ہی کو ان تمام چیزوں کا علم ہے جن کی واقفیت مخلوق کو نہیں۔ منجملہ غیبی چیزوں کے روز قیامت بھی ہے۔ قیامت کب ہوگی، کیسے ہوگی؟ اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ ہاں اتنی بات اس نے بتا دی کہ قیامت بہت جلد آئے گی۔ بس ایسا سمجھو جیسے پلک جھپکائی اور آئی یا اس سے بھی زیادہ قریب سمجھ لو۔ ایام و اوقات کی تعیین کا مدار آفتاب یا زمین کے دورہ پر ہے اور چونکہ حرکت شمس یا دورہ زمین کی ایک خاص حد مقرر ہے، اختتام دنیا پر ان کا دورہ ختم ہو جائے گا۔ پھر حشر جسمانی کے بعد کتنا زمانہ ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں۔ اس کے مقابلے میں انتہا پذیر چیز کا درجہ اور مقدار بہت ہی کم ہوتا ہے، اس لئے ایام دنیا کے اختتام کو پلک جھپکنے سے تعبیر کیا۔ دراصل تعیین مقدار مقصود نہیں بلکہ اوقات دنیا کی اوقات مابعد القیامت کے مقابلے میں قلت و کمزوری ظاہر کرنی مقصود ہے۔

زجاج وغیرہ مفسرین نے مطلب یہ بیان کیا ہے کہ آیت میں کمال قدرت کا اظہار مقصود ہے۔ اختتام دنیا کا وہ ہولناک دن جس کی خطرناکی معمولی توہم پرستوں کے دماغوں کی رسائی سے بھی خارج ہے اللہ کے نزدیک کچھ مشکل نہیں جب قیامت کا مقرر وقت آ جائے گا تو پھر اتنی بھی دیر نہ لگے گی جتنی پلک جھپکنے میں لگتی ہے۔ خدا ہر طرح قادر ہے وہ لمحہ بھر میں عالم کو درہم برہم کر دے گا۔ میرے نزدیک یہی مطلب صحیح ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ گویا آیت میں قیامت کے قرب و بعد کے بیان سے کوئی بحث نہیں بلکہ اللہ کی قدرت کاملہ کا اظہار مقصود ہے۔ علم غیب اور قدرت کاملہ دونوں اللہ کی خصوصیات ہیں۔ کافروں کے باطل معبود نہ تو علم رکھتے ہیں نہ قدرت اسی لئے ان کو استحقاق الوہیت نہیں۔

غیب کا مفہوم کیا ہے؟ علم کے مراتب و درجات مختلف ہیں بعض آدمی اس قدر کور دانش ہوتے ہیں کہ ان کو محسوس چیزوں کا بھی علم نہیں ہوتا۔ بعض کو محسوسات ظاہری کا علم ہوتا ہے، مگر غور اور تدبر سے وہ کورے ہوتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ احساس تخیل اور توہم تینوں مدارج طے کر کے تعقل کی حد میں داخل ہوتے ہیں۔ اشیائے طبعیہ کی حقیقت خاصیت اور کیفیت پر غور کر کے طرح طرح کی تدبیریں اور مفید خلائق چیزیں ایجاد کرتے ہیں۔ طبیعاتی گتھیاں سلجھاتے ہیں، مادیات میں انقلاب رد و بدل اور تغیرات پیدا

کر کے ایسی چیزیں بر سر کار لاتے ہیں کہ دنیا محوِ حیرت رہ جاتی ہے، لیکن ان کی نظر مادیات پر محصور ہوتی ہے۔ فوق الطبیعیات تک ان کے ادراک کی رسائی نہیں ہوتی۔ اس سے آگے بڑھ کر کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی نظر مادیات سے اوپر پہنچ جاتی ہے۔ مادیات کے تمام تغیرات کو وہ ایک زبردست قاہر قوت کے تابع سمجھتے ہیں۔ اسباب کو سبب کے زیر اثر جانتے ہیں، لیکن ان سے بھی اوپر کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی عقل بالملکہ انتہائی روشن ہوتی ہے، قوت قدسیہ ان کی روحوں پر پرتو ڈالتی ہے، مادیات و سببیات کے اندرونی تصرفات ان کو آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ حقائق غیب کی الجھی ہوئی گتھیاں ان کی علمی قوت سے سلجھ جاتی ہیں۔ عالم قدس کی غیبی مخلوق سے ان کی گفتگو ہوتی ہے، مادی حواس اور بدنی تعلقات سے تھوڑی دیر کے لئے علیحدہ ہو کر اس روشنی کو حاصل کر لیتے ہیں، جو مادیات و روحانیات کے ذرہ ذرہ پر پرتو فگن ہے، لیکن ہر وقت ان کی ایک حالت نہیں ہوتی۔ کبھی معمولی انسانوں کی طرح وہ حواس کی دنیا میں رہتے ہیں اور کبھی ماوراء الحواس پہنچ جاتے ہیں ؎

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

اس حد پر پہنچ کر مخلوق کے علم کی انتہا ہے۔ یہ آخری سرحد ہے جہاں تک انسانی ادراک کی رسائی ہوتی ہے، لیکن حقیقت ہنوز سربستہ رہتی ہے اسرار حقیقیہ ابھی تک پردۂ خفا میں رہتے ہیں۔ راز درون پردہ کی اطلاع اس طبقہ کو بھی نہیں ہوتی۔ بالآخر اقرار کرنا پڑتا ہے مَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ۔ حدیث صحیح میں آتا ہے کہ تمام مخلوق کے علم کی نسبت علم الٰہی سے ایسی ہے جیسے کوئی شخص سمندر میں سوئی ڈبو کر نکالے اور سوئی کے ناکہ پر کچھ نمی رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ سوئی کے ناکہ پر جو نمی ہوگی، سمندر کے مقابلے میں اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ کہاں بحر ناپیدا کنار کہاں بے مقدار سوئی کے ناکہ کی غیر محسوس نمی۔ اسی طرح علم الٰہی کے مقابلے میں تمام خلائق کا علم بے مقدار اور ناقابل توازن ہے۔

مذکورہ بالا عبارت میں علم کے جتنے مراتب اور ظہور کے جتنے درجات بیان کئے گئے ان پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر اوپر والا طبقہ نیچے والے طبقے سے زیادہ عالم ہوتا ہے اس کو وہ علم ہوتا ہے جو زیریں طبقہ والے کی نظر سے غائب اور مخفی ہوتا ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر شخص عالم الغیب ہے یعنی اس کو وہ علم ہے جو نیچے والے طبقے کی دماغی رسائی سے خارج ہے اور چونکہ مخلوقات اور کائنات ارضی و سماوی میں سب سے زیادہ روشن حضور اقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی، اس لئے سب سے بڑھ کر آپ کو علم بھی تھا۔ دوزخ، جنت، ملائکہ، ارواح غیب اور صفات الٰہی کے بعض خاص جلوے حضور نے اپنی آنکھوں سے دیکھے، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ حقائق و اسرار جو تمام مخلوق کی نظر سے غائب تھے حضور کی قدسیہ قوت پر ان کا انکشاف تھا اور آپ عالم الغیب تھے، مگر پھر بھی مخلوق کا علم انتہائی چوٹی پر پہنچنے کے بعد اسرار سربستہ کے انکشاف سے قاصر ہے۔ وہ سربستہ خزانے جو ذات الٰہی کے ساتھ مخصوص ہیں ان کا علم حضورؐ کو بھی نہ تھا۔ غیب کے اندر اتنا ہی راز مخفی تھے جہاں تک حضورؐ کے ادراک کی رسائی بھی نہیں ہوئی۔ اس بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ عالم الغیب نہ تھے بلکہ عالم الغیب محض ذاتِ الٰہی ہے جس کے رازوں کو کوئی نہیں جان سکتا۔ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِمَا وَرَاءَہٗ۔ اسی مرتبہ پر پہنچ کر بڑے سے بڑا عالم عجز کا اعتراف کرتا ہے اور اسی درجہ میں داخل ہو کر عارفین کاملین یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ۔ قابل مدح وصف سے متصف ہوتے ہیں۔

روز قیامت کی تعیین اور اس کے مقرر وقت کا واقعی علم سوائے خدا کے کسی کو بھی نہیں۔ حدیث جبرئیل میں (بروایت بخاری و مسلم) اس کی صراحت موجود ہے کہ جبرئیل نے بشکل بشری آکر حضور اقدسؐ سے قیامت کا صحیح وقت اور مقررہ مدت دریافت کی تو حضورؐ نے قیامت کے آثار و علامات تو بتا دیئے، مگر معین وقت نہ بتایا اپنی لاعلمی ظاہر کی اور فرمایا اس کا علم سائل سے زیادہ مجھے نہیں یعنی جس طرح تم کو قیامت کی تعیین کا علم نہیں اسی طرح میں بھی ناواقف ہوں۔

مقصودِ بیان اس بات کی صراحت کہ غیب کا علم اللہ ہی کو ہے۔ یعنی مخلوق کا علم محدود ہے۔ غیبی سربستہ اسرار تک ان کی رسائی نہیں۔ اس امر کی توضیح کہ عالم کو درہم برہم کرنا اور قیامت کو بپا کرنا اللہ کے نزدیک کچھ بھی مشکل نہیں۔ لمحہ بھر میں وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ

اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے ایسی حالت میں نکالا کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے اور تمہارے کان

وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ

آنکھیں اور دل بنائے تاکہ تم شکر کرو کیا انھوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا جو فضا کی ہوا میں

جَوِّ السَّمَآءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ وَاللّٰهُ

مسخر ہیں اُن کو اللہ ہی تو روکتا ہے بلاشبہ ایمانداروں کے لئے اس میں نشانِ قدرت ہے اللہ نے

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا

تمہارے لئے تمہارے گھروں میں رہنے کی جگہ بنائی اور چوپایوں کی کھالوں سے بھی تمہارے لئے گھر بنائے جو سفر و حضر کے

يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا

زمانے میں تم کو ہلکے معلوم ہوتے ہیں اور چوپایوں کے اُون اور رُوئیں اور بالوں سے سامانِ رہائش اور برتنے

وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ○ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ

کی چیزیں ایک وقتِ خاص تک بنائیں اللہ نے تمہارے فائدہ کے لئے اپنی مخلوقات کے سائے بنائے اور تمہارے لئے پہاڑوں میں

الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ

چھپنے کی جگہ بنائی اور تمہارے لئے ایسے کرتے بھی بنائے جو گرمی سے تم کو بچاتے ہیں اور ایسے کرتے بھی بنائے جو لڑائی میں تم

كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ○ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ

کو بچاتے ہیں اسی طرح اللہ اپنی نعمت تم کو پوری پوری دیتا ہے تاکہ تم اطاعت کرو (اے نبی) اب بھی اگر یہ روگردانی کریں تو (پرواہ نہ کرو)

الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿ع﴾

ع ۱۱ / ۱۷

تمہارے ذمہ صرف پیام واضح پہنچا دینا ہے یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کو پہچاننے کے بعد انکار کرتے ہیں ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں

تفسیر اوپر کی آیات میں الوہیت و وحدانیت کے ثبوت میں اپنے دو خصوصی اوصاف کا تذکرہ فرمایا تھا۔ علم اور قدرت۔ ان آیات میں تیسری خصوصی صفت کو بیان فرمایا ہے جس سے احاطۂ قدرت اور ہمہ گیر تسلط کا اظہار تو ہوتا ہی ہے، مگر ساتھ ساتھ انعام و احسان کے عموم کی دلیل میں یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ مخلوق میں سے کوئی ایک بذاتِ خود بے نیاز نہیں ہے۔ ہر ایک اپنے وجود و بقا کے وجود و آرام و آسائش کے اسباب

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ

اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے ایسی حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے اور تمہارے کان

وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ

آنکھیں اور دل بنائے تاکہ تم شکر کرو کیا انھوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا جو فضا کی ہوا میں

جَوِّ السَّمَاۗءِ ۭ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ

مسخر ہیں ان کو اللہ ہی تو روکتا ہے بلاشبہ ایمانداروں کے لئے اس میں نشان قدرت ہیں اللہ نے

جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا

تمہارے لئے تمہارے گھروں میں رہنے کی جگہ بنائی اور چوپایوں کی کھالوں سے بھی تمہارے لئے گھر بنائے جو سفر و حضر کے

يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا

زمانے میں تم کو ہلکے معلوم ہوتے ہیں اور چوپایوں کے اُون اور رُوئیں اور بالوں سے سامان رہائش اور برتنے

وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ

کی چیزیں ایک وقت خاص تک بنائیں اللہ نے تمہارے فائدہ کے لئے اپنی مخلوقات کے سائے بنائے اور تمہارے لئے پہاڑوں میں

الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ

چھپنے کی جگہ بنائی اور تمہارے لئے ایسے کرتے بھی بنائے جو گرمی سے تم کو بچاتے ہیں اور ایسے کرتے بھی بنائے جو لڑائی میں تم

كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ

کو بچاتے ہیں اسی طرح اللہ اپنی نعمت تم کو پوری پوری دیتا ہے تاکہ تم اطاعت کرو (اے نبی) اب بھی اگر وہ روگردانی کریں تو (پرواہ نہ کرو)

الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (ع)

تمہارے ذمہ صرف پیام واضح پہنچا دینا ہو یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کو پہچاننے کے بعد انکار کرتے ہیں ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں

تفسیر اوپر کی آیات میں الوہیت و وحدانیت کے ثبوت میں اپنے دو خصوصی اوصاف کا تذکرہ فرمایا تھا۔ علم اور قدرت ۔ ان آیات میں تیسری خصوصی صفت کا بیان فرماتا ہے جس سے احاطۂ قدرت اور ہمہ گیر تسخیر کا مشاہدہ تو ہوتا ہی ہے ، مگر ساتھ ساتھ انعام و احسان کے عموم کے ذیل میں یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ مخلوق میں سے کوئی بھی بذاتِ خود بے نیاز نہیں ہے ۔ ہر ایک اپنے وجود و بقا کے وجود اور آرام و آسائش کے اسباب

فراہم کرتے میں اللہ کا محتاج ہے۔ ہم نمبروار تفسیر کرتے ہیں۔

آدمی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ آنکھیں بند ہوتی ہیں، کانوں میں سنوائی کی طاقت نہیں ہوتی سمجھ اور دانش مفقود ہوتی ہے کچھ دیکھ سکتا ہے نہ سن سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے۔ گویا علم کے تینوں ذرائع معدوم ہوتے ہیں۔ ہم اس بحث پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالنی چاہتے ہیں۔

بیکن ایک مشہور یورپین منطقی گزرا ہے اس نے علم کی تعریف میں ایک نظریہ پیش کیا ہے جس کا نام استقرار ہے۔ اس نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر چیز کا یقین دیکھنے سننے اور عقل کی شہادت دینے سے حاصل ہو وہی علم ہے اس کے علاوہ سب جہل و اوہام ہیں۔

قرآن نے بھی انہی تینوں چیزوں کو ذریعہ علم قرار دیا۔ حضور اقدس کو خطاب کرتے ہوئے صاف طور پر فرما دیا۔ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا۔ کان آنکھ اور قلب سلیم سے کام نہ لینا ایسی بُری غلطی ... اللہ اس سے جو غیر کو اوہام و قیاسیات اور فضول ولچر باتوں کا مجموعہ بنا دیتی ہے۔ فُؤاد کا عام مفہوم عربی زبان میں قلب ہے اور عرب کی اصطلاح میں دل ہی فہم و ادراک کا منبع ہے اور اسی کے ذریعہ سے سب تعقل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے فُؤاد کا صحیح ترجمہ قلب سلیم ہی ہو سکتا ہے جس میں ذہن بھی داخل ہے۔ اب ہم اس آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

آیت کا حاصل مطلب یہ ہے کہ وقت پیدائش تم بالکل جاہل تھے تمہارے پاس کوئی ذریعہ علم بالکل صحیح طور پر نہ تھا پھر خدا تعالیٰ نے تم کو علم کے ذرائع عطا کئے۔ کان سننے کے، آنکھیں دیکھنے کے لئے اور دل سمجھنے کے لئے دیئے تاکہ تم اس کی اس امتیازی بخشش کا شکریہ ادا کرو۔ یہ انعامات ایسے ہیں جو تم کو دیگر حیوانات سے ممتاز کر دیتے ہیں۔ انسان کے صحیح فرائض ادا نہ کروگے تو تمہارا شمار بھی اسفل السافلین میں ہوگا۔ ابن کثیر نے اَفْئِدَۃ کا ترجمہ دماغ اور عقل کیا ہے۔

(۲) دیکھنے اور سمجھنے کی بات ہے کہ پرندے ایسے ہی گوشت پوست اور ہڈیوں سے بنے ہوئے ہیں جن سے آدمی اور دوسرے جانور بنے ہیں زمین ان سب کا مرکز ثقل ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ دیگر حیوانوں کی طرح یہ بھی زمین سے اوپر نہ اڑ سکتے اور ثقل کی وجہ سے نیچے گر پڑتے مگر خدا کی قدرت ہے کہ پرندے وسط ہوا میں معلق اڑتے پھرتے ہیں۔ اللہ نے ہوا کو ان کا مسخر بنا دیا ہے۔ اہل بصیرت کے لئے اس میں اللہ کی قدرت کاملہ کی نشانیاں موجود ہیں۔ یوں تو ہر شخص پرندوں کو اڑتا دیکھتا ہے، مگر جن لوگوں کو نور فطرت نصیب ہوا ہے وہ مادیات سے بالاتر مسبب الاسباب کو دیکھ کر ذات وصفات میں اللہ کو واحد لاشریک ہونا یقین کرتے ہیں۔

(۳) اللہ نے انسان کو فقط پیدا ہی نہیں کیا بلکہ ذرائع علم بھی عطا کئے اور نہ فقط علم و یقین کے ذرائع عطا کئے بلکہ مادی زندگی کو باقی رکھنے اور آسائش کے ساتھ گذارنے کے اسباب بھی فراہم کر دیئے۔ مثلاً مستقل رہنے کے لئے مکانات، سفر حضر کے لئے ڈیرے خیمے جن کو ساتھ لے کر جانا سہل ہوتا ہے بھیڑوں۔ اونٹوں اور بکریوں کے بالوں سے تیار کیا ہوا سامان، گرمی سے محفوظ رکھنے کے لئے لباس، لڑائی میں کام آنے والی زرہ، درخت، پہاڑ اور دوسری سایہ دار چیزیں جن کے سائے میں آرام ملتا ہے۔ بڑے بڑے پہاڑ جن کے غاروں کے اندر چھپ کر دشمنوں سے بچاؤ ہوتا ہے۔ یہ تمام نعمتیں پوری پوری اللہ نے عطا کیں تاکہ سرکش انسان اللہ کے احسانات و انعامات کو دیکھ کر اس کے سامنے جھک جائے اور جس خدا نے اس کی حفاظت اور آسائش کے لئے ایسا سر و سامان مہیا فرمایا ہے اس کے سامنے سر نیاز رکھ دے۔

اسلام کا مفہوم

اسلام کے لغوی معنی متعدد ہیں ہر کسی کو اپنا کام سپرد کر دینا، طالب صلح ہونا، کسی امر یا خصوصیت کو چھوڑ دینا۔ اِسلام لفظ سلم سے مشتق ہے۔ سِلم کے معنی ہیں عافیت کی زندگی بسر کرنا، باہمی محبت اور صلح سے رہنا، عزت و تکریم اور رحمت و اخلاق کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ پیش آنا (لسان العرب) اِسْلَام کے معنی خاص اطاعت کے بھی ہیں۔ حکم حاکم پر کاربند ہونا، اس کی منع کردہ باتوں کا باز رہنا اور حاکم پر کوئی اعتراض نہ کرنا یہی اِسْلَام کا مفہوم ہے (اقرب الموارد و مجمع البحار) اِسْلَام کا اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ بندہ احکام خدا کا ظاہراً و باطنی طور فرماں بردار اور مطیع ہو جائے، اپنا رخ خالص خدا کی طرف کر لے، تن من دھن کی پرواہ نہ کرے اور سب کو خوشنودی خدا کے حصول کے لئے قربان کرنے کو تیار ہو جائے۔ یہی معنی آیت میں مراد ہیں۔

اس سے آگے خدا تعالیٰ اپنے رسول کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اگر ان نعمتوں اور احسانوں کو دیکھتے ہوئے بھی یہ کافر نہ مانیں (آپ کو

پرواہ نہ کریں۔ آپ کا کام فقط یہ ہے کہ حکمِ الٰہی کو صاف صاف کھول کر پہنچا دیں۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ یہ تمام انعامات اللہ کی طرف سے ہیں مگر الوہیت و معبودیت میں دوسروں کو اللہ کا شریک قرار دے کر گویا اللہ کی ربوبیت کا بھی عملی انکار کر رہے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے بروایت مجاہد بیان کیا ہے کہ ایک دیہاتی حضور اقدس ؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سرکارِ عالی نے اُس کو ایمان کی ترغیب دی، اللہ کے احسان جتلائے اور وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ سے سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمْ بَاْسَکُمْ تک ایک ایک آیت پڑھ کر سنائی۔ دیہاتی تمام احسانات کا اقرار کرتا گیا، لیکن جب حضور لَعَلَّکُمْ تُسْلِمُوْنَ پر پہنچے تو وہ منہ موڑ کر چلتا بنا۔ اُس وقت یَعْرِفُوْنَ سے اَلْمُنْکِرُوْنَ تک یہ آیت نازل ہوئی۔

مقصودِ بیان آغازِ آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کی فقط تخلیق ہی نہیں کی بلکہ اس کو روحانی زندگی بھی عطا کی، کیونکہ روح کی زندگی علم پر موقوف ہے اور حصولِ علم کے صرف تین ذرائع ہیں۔ آنکھ، کان اور دل۔ گویا درپردہ اس طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ ان تینوں اعضا کو صحیح طور پر کام میں نہیں لاتے وہ درحقیقت مردہ ہیں۔ لفظ لَعَلَّکُمْ تُسْلِمُوْنَ دلالت کر رہا ہے اس امر پر کہ دنیا کی ہر شے اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ انسان اس سے جائز فوائد اٹھا کر اپنی ہستی کو اللہ کے سپرد کر دے اپنی مرضی اور ارادے کو اسی کی مرضی میں، اپنی خواہشات کو اسی کی مشیت میں اور اپنی ذات کو اُس کی صفات میں فنا کر دے۔

تنبیہ متمدن شہروں اور ترقی یافتہ بستیوں میں رہنے والے شاید ان آیات کو پڑھنے کے بعد خیال کریں کہ پہاڑوں اور غاروں میں چھپنے کے مقامات اور سفری ڈیرے خیمے کون سی عظیم الشان چیزیں تھیں جن کا تذکرہ خدا تعالیٰ نے ان آیات میں بطور احسان و انعام کیا ہے۔ بھیڑ بکری اور بکری کے بالوں سے بنے ہوئے کپڑے اپنے اندر کون سی اہمیت رکھتے تھے جن کا بیان صراحۃً اس زور کے ساتھ کیا گیا۔ اگر احسانات کا تذکرہ ہی مقصود تھا تو فلک بوس مرمریں کوٹھیاں رہنے کے لئے، زربفت، کمخواب اور خالص سلکی کپڑے پہننے کے لئے، زمین دوز شاندار قلعے دشمن سے بچنے کے لئے وغیرہ وغیرہ کیا مذکورہ چیزوں کے مقابلہ میں حقیر تھیں جن کا تذکرہ بالکل نہیں کیا گیا، لیکن ان معترضوں کو غور کرنا چاہیئے کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں ان چیزوں کی ایجاد نہیں ہوئی تھی۔ دنیا نے زیادہ منازلِ ترقی طے نہیں کئے تھے اس کے علاوہ مخاطب عرب تھے اور عرب جاہل ترین وحشی قوم تھی۔ تمدن کی ان کو ہوا بھی نہ لگی تھی، خانہ بدوشی کی زندگی گذارتے تھے، قیام کے ساتھ مستقل سکونت سے واقف نہ تھے۔ شاندار کوٹھیاں، قلعے، موٹریں، ہوائی جہاز، زربفت، اطلس، کمخواب وغیرہ انہوں نے نہ دیکھے تھے، انہی کے مناسب حال جن نعمتوں کا تذکرہ موزوں تھا خدا تعالیٰ نے کر دیا کیونکہ ارذل درجہ کی چیزیں بقائے زندگی اور آرام و عیش کے اسباب فراہم کرنے میں جب کامل طور پر دخیل ہیں تو اعلیٰ درجہ کی چیزیں بطریقِ افضل سکون بخش، راحت رساں اور مفید عام ہوں گی۔ پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ خدا تعالیٰ نے ابتدائی اسباب تمدن کا تذکرہ کیا ہے بلند ترین ذرائع راحت کا تو حصر نہیں کیا جا سکتا۔ ہر زمانے میں سامان عیش بیش از بیش ہوتا چلا جا رہا ہے۔ قرآن صرف اصول ذکر کرتا ہے شاخوں سے بحث نہیں کرتا۔ لباس، مسکن، سایہ، دشمن سے حفاظت یہ چاروں چیزیں خدا کے چھوڑے ہوئے اصول ہدایت ہیں، انہی پر ابتدائی سادہ زندگی موقوف ہے لہٰذا انہی چیزوں کو عرب قوم کے سامنے بطور احسان و انعام پیش کیا گیا۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَلَا هُمْ

جس دن ہر ایک اُمت میں سے ہم ایک گواہ لاکر کھڑا کر دیں گے اس وقت کافروں کو نہ (بات کرنے کی) اجازت دی جائے گی اور نہ اُن سے

يُسْتَعْتَبُونَ ○ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ

توبہ مانگی جائے گی اور جب ظالم عذاب کو دیکھ لیں گے تو پھر نہ عذاب میں اُن پر ہلکی ہوگی نہ اُن کو

يُنظَرُونَ ۝ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا

مہلت دی جائے گی جب مشرک اپنے (اختراعی) شریکوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے پروردگار یہی ہمارے وہ شریک ہیں

الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُو مِن دُونِكَ ۖ فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ ۝

جن کی پرستش ہم تجھے چھوڑ کر کیا کرتے تھے تب وہ شریک اُن سے کہیں گے کہ تم قطعی جھوٹے ہو

وَأَلْقَوْا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَمَ ۖ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ الَّذِينَ كَفَرُوا

اُس روز اللہ کے سامنے اطاعت کو پیش کریں گے اور جو کچھ وہ افتراء بندی کرتے تھے سب گئی گزری ہو جائے گی جن لوگوں نے کفر

وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ ۝

کیا اور راہِ خدا سے روکا چونکہ وہ فساد کیا کرتے تھے اِس پاداش میں ہم اُن کے لئے عذاب پر عذاب بڑھائیں گے۔

تفسیر قرآن پاک کا دستور ہے کہ طریقِ خطاب میں تبلیغ و موعظت کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں فرماتا۔ ہر طریقہ سے توحید و رسالت کے اقرار کی طرف مائل کرتا، کارِ خیر کا حکم دیتا اور ارتکابِ معصیت سے روکتا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر بھی اثبات توحید امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے شروع میں برہانی طریقہ اختیار کیا۔ عقلی اور نقلی دلائل کو بیان کیا پھر امتنانی طرز اختیار کیا۔ مختلف احسانات و انعامات کا تذکرہ کر کے توحید کی طرف مائل اور قلبی و لسانی شکر گزاری پر آمادہ کیا۔ اب آخر میں تنبیہ و وعید، ترہیب و توبیخ کا رنگ اختیار کر کے اتمامِ تبلیغ فرماتا ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر امتِ دعوت کے مقابلہ میں شہادت دینے کے لئے اُسی امت کے نبی یا جانشین نبی کو پیش کیا جائے گا۔ اگرچہ اللہ کو ضرورت نہیں کہ کوئی شہادت پیش کرے، مگر چونکہ وہ ارحم الراحمین ہے ظالم نہیں، اتمام حجت کے لئے انبیاء اور خلیفۂ انبیاء کی شہادت پیش فرمائے گا۔ انبیاء کہیں گے کہ ہم نے ان کو تیرا حکم پہنچا دیا، مگر انھوں نے نہ مانا شرک و معصیت میں مبتلا رہے۔ اس وقت کافروں کو کسی بات کی اجازت نہ دی جائے گی۔ خطیب وغیرہ نے تفسیر میں لکھا ہے کہ کافروں کو زیادہ یا دہ گوئی کی یا دنیا میں واپس جا کر عمل خیر کرنے کی یا گواہوں سے جرح کرنے کی یا جھوٹا عذر پیش کر سکنے کی اجازت نہ دی جائے گی اور جب وہ دنیا میں واپس جانے کی درخواست کریں گے تو یہ درخواست بھی قبول نہ ہوگی اور جب میدانِ حشر میں جا کر کھڑے کئے جائیں گے اور عذاب الٰہی سامنے نمودار ہوگا اس وقت مایوس ہو کر وہ خواہشیں کریں گے، کچھ مہلت کے طالب ہوں گے تاکہ نیکی کر کے رہائی پا سکیں اور بدرجۂ مجبوری تخفیف عذاب کے آرزومند ہوں گے، مگر دونوں میں سے ایک خواہش بھی پوری نہ کی جائے گی۔ جب کوئی چارۂ کار نہ رہے گا تو جن معبودوں کی پرستش کرتے تھے اور جن کو اللہ کی الوہیت و ربوبیت میں شریک بنا رکھا تھا ان کو سامنے دیکھ کر کہیں گے پروردگار اصل گمراہ کرنے والے یہ ہیں تجھے چھوڑ کر ہم ان کو پکارتے تھے۔ بقول ابو مسلم اصفہانی مشرکین اس قول سے اپنے عذاب کو ان معبودوں پر ڈالنا چاہیں گے جن کو شریکِ الوہیت بنا رکھا تھا، لیکن وہ لوگ مشرکوں کے قول کو رد کر دیں گے اور اپنی براءت کا اظہار کریں گے۔ احادیث میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ وغیرہ انبیاء و اولیاء جن کو اہلِ شرک اللہ کی الوہیت کا شریک قرار دیتے ہیں۔ قیامت کے دن وہ ان سے بیزار ہوں گے کوئی ساتھی نہ ہوگا بالآخر جب کوئی رہائی کی شکل نہ رہے گی تو بارگاہِ خداوندی میں سر ڈال دیں گے اور دوزخ میں ہمیشہ کے لئے بھیج دیئے جائیں گے۔ یہ تو ان لوگوں کی حالت کا تذکرہ تھا جو خود گمراہ اور مشرک تھے، لیکن وہ لوگ جو گمراہ بھی تھے اور گمراہ کُن بھی۔ خود بھی کافر تھے اور دوسروں کو بھی راہِ حق سے روکتے تھے اور کفر پر آمادہ کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کو دگنی سزا ملے گی ایک تو گمراہ ہونے کی دوسرے گمراہ کرنے کی۔

مقصودِ بیان کفر و شرک سے تنبیہی لہجہ میں باز داشت۔ اس امر کی صراحت کہ قیامت کے دن کافروں کو کوئی سفارشی نہ ملے گا۔ وہ انبیاء اولیاء، یا شیاطین وارواح خبیثہ جن کی پرستش کفار دنیا میں کرتے ہیں، قیامت کے دن ان سے بے تعلقی کا اظہار کریں گے۔ دنیا میں واپس جانے کی مہلت بھی نہ ملے گی۔ قیامت کے دن نیکی کرنے کی اجازت بھی نہ ہوگی۔ اللہ کے گواہوں کی شہادت رد کرنے اور ان پر جرح کرنے کا اذن بھی نہ ہوگا۔ آیت زِدْنٰهُمْ الخ سے ابن کثیر نے استخراج کیا ہے کہ قیامت کے دن کافروں کے عذاب کے بھی درجات ہوں گے۔ سب کافروں کو ایک ہی طرح کا عذاب نہ ہوگا کسی کا عذاب سخت ترین ہوگا کسی کا اس سے کم اور کسی کا اس سے کم۔ اس سے یہ بات مترشح ہوئی کہ کفار فقط ایمان ہی کے مکلف نہیں بلکہ عمل صالح کے بھی مکلف ہیں۔ بدکار کافروں کا عذاب نیکوکار کافروں سے زائد ہوگا۔ اگرچہ کافروں کی نیکیاں مستوجب ثواب نہ ہوں گی مگر یہ ضرور ہے کہ بدکار کافروں سے نیکوکار کافر پھر بھی کسی قدر کم سزایاب ہوں گے۔ آیت کا آخری حصہ بتا رہا ہے کہ خدا تعالیٰ عادل ہے ظالم نہیں۔ کافروں کے حق میں بھی وہ ظلم نہیں کرے گا بلکہ انہی کو اعمال کا خمیازہ خود برداشت کرنا ہوگا ورنہ خدا جذبۂ انتقام سے پاک ہے وغیرہ۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِىْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى

جس روز ہر گروہ میں سے ایک گواہ انہی میں کا ان کے خلاف ہم لا کر کھڑا کر دیں گے اور (اے محمد) تم کو ان سب پر گواہ بنا کر پیش کریں گے

هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَىْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿ع﴾

(تو وہ وقت عجیب ہولناک ہوگا) ہم نے تم پر کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کی وضاحت ہے اور وہ مسلمانوں کے لئے ہدایت و رحمت و بشارت ہے

تفسیر جب ہر امت کا نبی اور جانشین اپنی امت کے کافروں کے کفر پر شہادت دے گا اور اپنے فریضۂ تبلیغ کو ادا کرنے کا اظہار کر دے گا تو کافر منکر ہو جائیں گے اور کہیں گے یہ غلط کہتے ہیں ہم کو انھوں نے تیرا حکم نہیں پہنچایا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء کی تصدیق اور کافروں کی تکذیب فرمائیں گے۔ دوسری آیت میں اس طرح آیا ہے کہ انبیاء کی تصدیق امتِ محمدیہ کے نیک آدمی کریں گے۔ کیوں کہ قرآن پاک کی صراحت سے ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ مختلف انبیاء نے اپنی اپنی امتوں کو دعوتِ توحید دی تھی اور پھر امتِ محمدیہ کی تصدیق خود حضور اقدس ﷺ بہ نفسِ نفیس فرمائیں گے۔ دونوں آیات میں کوئی تعارض نہیں، صرف اتنی بات ہے کہ اس آیت میں امتِ محمدیہ کی تصدیق کا ذکر نہیں کیا اور چونکہ حضور اقدس ﷺ کی تصدیق کا فائدہ انبیاء کو ہی پہنچتا ہے، اس لئے امتِ محمدیہ کا درمیانی تذکرہ ساقط کر کے اس طرح فرما دیا کہ انبیاء کی تصدیق محمد ﷺ کریں گے۔ اس سے آگے قرآن پاک کے چار خصوصی اوصاف بیان فرمائے۔ قرآن میں ہر چیز کا ضروری بیان موجود ہے۔ قرآن مسلمانوں کے لئے ہدایت اور رحمت و بشارت ہے۔ قرآن میں ہر ضروری چیز کا بیان ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ بعض اہل تفسیر کہتے ہیں اس سے دنیوی مسائل مراد نہیں بلکہ دینی احکام مراد ہیں۔ قرآن میں تمام دینی احکام یا اُن کے ضوابط موجود ہیں۔ کچھ احکام قرآن نے بیان کر دیئے اور کچھ مسائل رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ضوابط قرآنی کو سامنے رکھ کر بیان فرما دیئے اور جو ان سے بھی باقی رہے وہ مجتہدین و ائمہ نے ظاہر فرما دیئے، لیکن چونکہ سب مسائل کا استنباط قرآن کے بیان کردہ ضوابط و قوانین سے ہی ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ قرآن میں ہر مسئلے کا بیان ہے۔ مجتہد کا قیاس بھی اختراعی نہیں ہوتا بلکہ اصول قرآنی کے ماتحت ہوتا ہے۔

کرخی نے فرمایا ہر چیز کا بیان قرآن میں اس طرح ہے کہ یا تو خود قرآن میں مذکور ہے یا حدیث پر حوالہ ہے کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ یعنی خود قرآن نے ہی فرما دیا کہ رسول جس بات کو کرنے کا تم کو حکم دیں اس کو کرو اور جس کام سے منع کریں اس کو مت کرو۔ اس بنا پر بنصِ قرآنی رسول کے قول و عمل سے استدلال بھی قرآن ہی کا حکم ہے اور یا اجماعِ امت پر حوالہ ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ۔ یعنی خود قرآن نے فرما دیا کہ جو شخص جماعتِ اسلامیہ کے راستے کو

جو رزق اسی سے ملنے پر بھی جو ہم پر ہوگی اصنام کر دو وہ ان کو لنگاویں گے (۱) دوزخ میں ڈال دیں گے اس سے ثابت ہوا کہ بعض (آل) عمرہ نے سے استدلال ہی قرآن کا ہی حکم ہے اور یا قیاس پر حوالہ ہے لیکن قیاس وہی صحیح ہوگا جو اصول ثلاثہ سے مستنبط ہو۔ یہ تفسیر تو اس صورت میں ہے جب تبیانا لکل شئی میں عموم دینی ضروری مسئلہ کی مراد لی جائے، لیکن ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ قرآن میں ہر چیز کا صاف بیان موجود ہے، مگر ہم اس سے قاصر ہیں۔ دوسری روایت میں فرمایا جو کوئی علم چاہے قرآن میں تلاش کرے اس میں گزشتہ اور آئندہ سب کا علم ہے۔ ابن کثیر نے ابن مسعود کا قول نقل کیا ہے کہ قرآن میں ہر چیز اور ہر علم کا بیان کیا گیا ہے۔ ان اقوال سے صاف ظاہر ہے کہ ابن مسعود کے نزدیک ہر دنیوی اور دینی مسئلہ کی وضاحت قرآن میں موجود ہے۔ مگر یہ ہماری عقلی استعداد کا قصور ہے کہ ہم دنیا کے بکثرت مسائل قرآن سے سمجھ نہیں سکتے۔ میرے نزدیک ابن مسعود کی تشریح ہی زیادہ قوی ہے۔

اس سے آگے کتاب اللہ کی تین صفات کا بیان ہے۔ مسلمانوں کے لئے قرآن ہدایت نامہ ہے۔ اگرچہ قرآنی ہدایات عام ہیں، لیکن چونکہ اس سے فائدہ اٹھانے والے صرف مسلمان ہی ہیں، اس لئے انہی کے لئے مخصوص ہدایت نامہ ہے اور یہ بالکل ظاہر بات ہے کہ جب مسلمان قرآنی ہدایات پر چلیں گے تو رحمت الٰہی ان پر چھا جائیگی۔ دنیا اور دین کی سختیاں ان سے دور ہو جائیں گی اور جب ہدایتِ قرآنی پر چلنے سے ہدایتِ الٰہی کا حصول ہو گیا تو ظاہر ہے کہ قرآن دوامی نجات کی بشارت بھی ضرور ہوگا۔

چند مسائل استنباطی

(۱) قاضی کا کمال عدل یہ ہے کہ اگر مدعا علیہ گواہ طلب کرے اور قاضی کو صحیح واقعہ معلوم بھی ہو۔ یہاں تک کہ اس کے سامنے گزرا ہو تب بھی فریق ثانی سے گواہ طلب کرے (۲) گواہ کی تعدیل کرنے والا یعنی یہ ظاہر کرنے والا کہ گواہ ثقہ اور قابل اعتبار ہیں اگر ایک ہی ہو تو کافی ہے۔ (۳) تعدیل بھی ایک طرح کی گواہی ہے۔ (۴) گواہ بغیر معائنہ کے بھی ہے بشرطیکہ ایسے ذرائع سے علم ہوا ہو واقعہ کے یقین کو معائنہ کی حد تک پہنچا دیں۔ (۵) شہادت علی الشہادت یعنی گواہ کی گواہی پر گواہی دینی صحیح ہے۔ (۶) حکم کو چاہیئے کہ فیصلے کے وقت فریقین میں سے کسی کی رعایت نہ کرے اگرچہ ایک انتہائی عالی مرتبہ اور دوسرا بہت ہی ذلیل پست درجہ کا ہو (۷) قاضی محض اپنے علم پر فیصلہ نہ کرے۔

مقصودِ بیان

تمام انبیاء بروز قیامت اپنی اپنی امت کے کافروں کے خلاف شہادت دیں گے اور انبیاء کی تصدیق ہمارے سرور کائنات علیہ التحیات فرمائیں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تنہا بلا شرکت غیرے جس شرف و فضل کے مالک ہیں وہ بارگاہ الٰہی میں کسی کو حاصل نہیں۔ آپ شفیع المذنبین ہونے کے علاوہ انبیاء کے لئے بھی رحمت ہیں۔ قیامت کے دن سخت آڑے وقت میں حضورؐ کی شہادت کی بنا پر انبیاء کو خلاصی ملے گی۔ قرآن پاک میں ہر چیز اور ہر ضروری مسئلے کی وضاحت موجود ہے خواہ مسئلہ دینی ہو یا دنیوی۔ قرآن پاک ایک دستور العمل اور ہدایت نامہ ہے جو اس پر چلے گا وہ دوامی نجات کا مستحق ہوگا وغیرہ۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ

اللہ حکم دیتا ہے انصاف کرنے کا بھلائی کرنے کا اور قرابتداروں کو دینے کا اور منع فرماتا ہے بے حیائی

الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○

کی باتوں سے نا شائستہ حرکت سے اور فساد کرنے سے تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو

تفسیر

امام احمد نے بروایت ابن عباسؓ آیت کی شان نزول اس طرح بیان کی ہے کہ ایک روز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کاشانۂ نبوت کے سامنے میں بیٹھے تھے اور عثمان بن مظعونؓ آگذرے۔ حضورؐ نے فرمایا عثمان کیا یہاں نہ بیٹھو گے؟ عثمان نے جواب

کہا بہت اچھا۔ یہ کہہ کر عثمان آکر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد حضور والا نے آہستہ آہستہ آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور بار بار نظر جمائے رہے پھر نیچے کی طرف آہستہ آہستہ جھکاتے لائے اور دائیں جانب زمین پر لا کر نگاہ ٹھہرا دی اور ایک خاص حالت طاری ہو گئی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کچھ سن رہے ہیں تھوڑی دیر کے بعد وہ حالت جاتی رہی اور دوبارہ نظر اٹھانی شروع کی آسمان تک ٹھیک پہنچانے کے بعد عثمان کی طرف توجہ فرمائی اور باتیں کرنے لگے۔ عثمان نے عرض کیا آج میں نے آپ کی ایسی حالت دیکھی جو اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ فرمایا ہاں میرے پاس میرے رب کا فرستادہ آیا تھا۔ عثمان نے پوچھا کیا پیغام لایا؟ حضورؐ نے یہ پوری آیت تلاوت فرمائی۔ عثمان پر رقت ہوئی۔ فوراً نورِ ایمان دل میں متمکن ہو گیا اور مسلمان ہو گئے۔ ابن کثیر نے اس روایت کو متصل الاسناد وجید اور حسن کہا ہے۔

ولید بن مغیرہ جو سخت ترین کافر تھا اس آیت کو سن کر متحیر ہو گیا اور بولا میرے بھتیجے محمدؐ! اسے پھر پڑھو اس میں تو ایسی لذت ہے کہ دل میں بیٹھی جا رہی ہے اور یقینی دل ربا ہے کہ یہ بشر کا کلام نہیں۔ حافظ ابو العلی موصلی نے کتاب معرفۃ الصحابہ میں بیان کیا ہے کہ بعثتِ اقدس کی خبر جب اکثم بن صیفی کو پہنچی تو اس نے خدمتِ گرامی میں حاضر ہونے کا ارادہ کیا۔ یہ شخص مشہور سردارِ قوم دانشمند اور بڑا حکیم دانا تھا۔ قوم نے کہا آپ ہرگز ایسا ارادہ نہ کریں یہ آپ کی توہین ہے۔ آپ تمام اکابر کے سردار ہیں۔ اکثم نے کہا اچھا تو میری طرف سے کوئی شخص میرا پیام لے کر وہاں جائے۔ فوراً دو آدمی اٹھ کھڑے ہوئے اور خدمت والا میں حاضر ہو کر عرض کیا ہم اکثم کے ایلچی ہیں۔ اکثم نے دریافت کیا ہے کہ آپ کون ہیں اور آپ کے پاس کیا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا میرے متعلق دریافت کرتے ہو تو میں محمد بن عبد اللہ ہوں اور رہا یہ کہ میرے پاس کیا ہے تو میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ پھر حضورؐ نے یہ پوری آیت تلاوت فرما دی۔ قاصدوں نے مکرر پڑھنے کی التجا کی تو آپ نے کئی بار پڑھ دی۔ قاصدوں نے یاد کر لی اور واپس جا کر اکثم سے کہا ہم نے ان کا نسب دریافت کیا تو انہوں نے کسی بڑائی کا اظہار نہیں کیا، مگر یہ واقعہ ہے کہ ان کا نسب قریش میں سب سے زیادہ شریف اور پاکیزہ ہے۔ پھر انہوں نے ہم کو چند کلمات سنائے جو ہم نے یاد کر لئے۔ یہ کہہ کر آیت مذکورہ اکثم کو سنائی۔ اکثم نے کہا میں سمجھ گیا وہ مکارمِ اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور برے خصائل سے منع کرتے ہیں لہٰذا تم اس کی پیروی میں پیش قدمی کر کے سر بن جاؤ، مخالفت کر کے دُم نہ بنو۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں خیر و شر کے بیان میں یہ آیت سب سے زیادہ جامع ہے (کذافی المعالم) ابن مسعود کا بھی یہی قول ہے (رواہ الحاکم فی المستدرک)

حاصلِ تفسیر یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس بلیغ آیت میں تین کام کرنے اور تین کام نہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ ہم ترتیب وار تفصیل کرتے ہیں۔

(۱) عدل۔ عدل کسے کہتے ہیں؟ عام طور پر عدل کا ترجمہ انصاف کیا جاتا ہے۔ تفسیر میں اختلاف ہے۔ ابن عباس کا قول ہے کہ عدل سے مراد کلمۂ توحید کا دل سے اعتراف اور زبان سے اقرار۔ بعض کا قول ہے کہ عدل نام ہے ادائے فرائض کا۔ سفیان بن عیینہ کہتے ہیں اس مقام پر عدل سے مراد یہ ہے کہ جو کام اللہ کے واسطے کیا جائے اس میں ظاہر و باطن یکساں ہوں۔ میں کہتا ہوں اخلاق کی اعلیٰ ترین صنف کا نام عدل ہے۔ انسان کو خدا تعالیٰ نے تین قوتیں عطا کی ہیں ایک قوتِ شہوانیہ یا بہیمیہ ہے جس کے ذریعہ سے انسان کھانے پینے پہننے تعلقاتِ صنفی قائم کرنے مال جمع کرنے اور اسی قسم کے دوسرے مرغوبات کے حصول کی خواہش کرتا ہے۔ قوتِ شہوانیہ کے تین درجے ہیں۔ افراط: حد سے زیادتی مثلاً حرام حلال کا امتیاز اٹھ جانا، ضرورت سے زائد مال کی ہوس کرنا، مطلق العنان شہوت پرست ہو جانا۔ تفریط: قوت کو بالکل مردہ کر دینا، بقائے بدنی کے لئے جتنے کھانے پینے اور پہننے کی شرعی ضرورت ہے اس کو بھی ترک کر دینا، تعلقِ صنفی اگرچہ حلال ہو اور قدرت بھی ہو مگر منقطع کر دینا، ترکِ دنیا کر کے جل باسی اور سنیاسی بن جانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ دونوں درجے مذموم ہیں۔ اگر منزلِ مقصود تک پہنچنا غرض ہو تو جس طرح گھوڑے کو بلا لگام سرپٹ چھوڑ دینا اس لئے برا ہے کہ وہ کسی خندق میں گر جائے یا کسی درخت سے ٹکرائے یا دریا میں کود جائے یا پہاڑ سے لڑھک جائے۔ اسی طرح راستہ میں گھوڑے کو ذبح کر دینا اور لق و دق بیابان اور دشوار گزار راستہ میں پیادہ پا ہو جانا بھی ممنوع ہے۔ نہ پہلی صورت میں منزل تک پہنچ سکتی ہے نہ دوسری صورت سے فائز المرام ہونا نصیب ہو سکتا ہے۔ ان دونوں کا درمیانی درجہ یہ ہے۔ گھوڑے کو قابو میں رکھنا، مناسب دانہ گھاس دینا، وقت پر چلانا، وقت پر اتارنا۔ باقاعدہ سواری لینا اس طریقہ سے منزل پر آدمی پہنچ سکتا ہے۔ قوتِ شہوانیہ کے درمیانی درجہ کا نام عفت ہے۔ قربِ الٰہی تک پہنچنا اور نجاتِ ابدی حاصل کرنا انسان کا اصل مقصد ہونا چاہئے

اس مقصد کے حصول کے لئے بقائے نوعی وشخصی ضروری ہے ۔ اگر قوتِ شہوانیہ کو اعتدال سے خود مختار کر دیا جائے اور حرام حلال کا فرق اٹھا دیا جائے، چوری اور جائز کمائی میں کوئی امتیاز نہ سمجھا جائے، اپنی بیوی اور اجنبی عورت میں کوئی تفاوت نہ قائم رکھا جائے تو مقصد مقلوب ہو جاتی ہے اور آدمی اچھا خاصہ چوپایہ بلکہ اس سے بھی بدتر ہو جاتا ہے اور اگر اس قوت کو بالکل مردہ کر دیا جائے، جائز اور حلال چیزوں سے بھی ضروری فائدہ اٹھانا ترک کر دیا جائے تو بدنی قوام کمزور ہوتے ہوتے فنا ہو جاتا ہے ۔ حصول خیر اور اعمال صالحہ کی تمام قوت ضائع ہو جاتی ہے اور انجام کار خسران نصیب ہوتا ہے ۔

دوسری قوت غضبی یا سبعی ہے ۔ اس کا کام ہے عزت کا حصول جاہ کی طلب، حکومت وتسلط کی خواہش، اپنے نفس اہل وعیال اقارب احباب اور قوم کی دشمنوں سے حفاظت، میدان کارزار میں دلیرانہ مقابلہ کر کے دشمنوں کو مغلوب کر کے بہادری اور نیک نامی کا مظاہرہ وغیرہ وغیرہ ۔ اس قوت کے بھی تین درجات ہیں (١) قوت کو بے باک بے روک ٹوک بغیر کسی بندش کے خود مختار چھوڑ دینا، محل اور بے محل کا خیال نہ رکھنا، موقعہ بے موقعہ غصہ آ جانا، بات بات پر قتل کرنا، سفاک خون ریز بن جانا، ناجائز حکومت وتسلط کی خواہش کرنا، بے قصور بندگانِ خدا کو ستانا، بے دریغ ظلم کرنا وغیرہ ۔ یہ پہلو افراط کا ہے اور سخت مذموم ہے ۔ اس سے آدمی آدمیت سے خارج ہو کر درندہ بن جاتا ہے، دنیا میں تباہی پھیلاتا ہے، امن عالم کو برباد کر دیتا ہے، فوق کی عالمیت کھو دیتا ہے اور نظام عالم کو درہم برہم کر ڈالنے کی انتہائی کوشش کرتا ہے ۔ (٢) اس قوت کو بالکل ساقط کر دینا، جائز وضروری مواقع پر بھی حمیت سے کام نہ لینا، اتنا عافیت طلب ہو جانا کہ دشمن ملک کو برباد کر دیں، قوم کو تباہ کر دیں، اعزا واحباب اور اہل وعیال کی آبرو ریزی کریں، مگر دل میں حمیت پیدا نہ ہو، باوجود قوتِ مدافعت کے گوشہ گیر اور عزلت نشین ہو جائے، غارت گر مال ومتاع لوٹ لیں، گھر بار تباہ کر دیں مگر بیٹھا دیکھتا رہے، باطل کے خلاف آواز نہ اٹھائے، ناحق کے سامنے سر تسلیم خم کر دے ۔ یہ درجہ انتہائی بزدلی، بے غیرتی اور نامردی کا ہے ۔ اس درجہ میں پہنچ کر آدمی بالکل عضو معطل بن جاتا ہے، اس کا وجود اپنے اور اپنی قوم کے لئے بالکل ناکارہ ہوتا ہے وہ کوئی کام فائدہ رساں نہیں کر سکتا ۔ لیکن دونوں درجوں کے درمیان ایک اعتدالی درجہ بھی ہے جس میں رہ کر آدمی اپنے ملک، وطن، قوم اور اہل وعیال کو سفاک غارت گروں کے پنجے سے محفوظ اور بے رحم اغیار کے دست برد سے مامون رکھتا ہے، حصول مرتبہ کی ضروری کوشش کرتا ہے، عزت ونیک نامی حاصل کرتا ہے، خلق خدا کی خدمت کرتا ہے، مظلوموں کا انصاف ظالموں سے دلاتا ہے، بیکسوں، یتیموں، ناداروں اور بے زبان پبلک کی حمایت کرتا ہے، بڑی بڑی ظالم حکومتوں سے ٹکرا کر ان کو پاش پاش کر دیتا ہے ۔ اس درمیانی درجہ کا نام شجاعت ہے ۔

تیسری قوت عقلی یا ملکی ہے، اس کا کام ہے سوچنا سمجھنا، علوم ومعارف حاصل کرنا، حقائق عالم میں غور کر کے صحیح نتائج پر پہنچنا، طرح طرح کی ایجادیں کر کے خلق خدا کو فائدہ پہنچانا، طبعیات مابعد الطبعیات الٰہیات خصوصاً اللہ کی ذات صفات، انبیاء کی رسالت، حشر بعد الممات اور ملائکہ وغیرہ کے متعلق صحیح عقائد قائم کرنا وغیرہ وغیرہ ۔ اس قوت کے بھی تین پہلو ہیں ۔ اول پہلو افراط کا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان سب سے بڑا مکار، دھوکہ باز، فریبی، جعلساز، شعبدہ باز بن جاتا ہے، عقائد حقہ کا مذاق اڑاتا ہے، اس کی نظر مادیات پر مقصور ہو جاتی ہے، مادیات سے اوپر کی چیزوں کو وہ دھوکا اور جھوٹا توہم خیال کرتا ہے، ایسی ایسی اسکیمیں بناتا ہے جس سے خلق خدا کو نقصان پہنچائے امن عالم کو تباہ کر دے مستحقین کو ان کے حق سے اپنے علمی زور کی بنا پر محروم کر دے، حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دے ۔ یہ پہلو سخت مذموم ہے ۔ دوسرا پہلو تفریط ہے ۔ اس مرتبہ میں پہنچ کر آدمی حصول معارف کی کوشش نہیں کرتا، اس کی قوتِ علمیہ کا چراغ بجھ جاتا ہے، دل کی روشنی مٹ جاتی ہے، بصیرت معدوم ہو جاتی ہے ۔ گوش ہوش اور چشم حواس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں، غفلت اور جہالت کی مہر دماغ پر لگ جاتی ہے، کند ذہن ہو جاتا ہے، مآل اور نتیجہ کی طرف ادنیٰ توجہ بھی نہیں کرتا، وہ کبھی اپنے ذہن کو اللہ کی ذات صفات اور حقائق عالم کے صحیح نتائج پر پہنچنے کی تکلیف ہی نہیں دیتا ۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۔

ان دونوں درجوں کے درمیان تیسرا درجہ اعتدال کا ہے ۔ اس مرتبے میں آدمی کے عقائد صحیح، بصیرت روشن اور دماغ پر نور ہوتا ہے ۔ مبدء فیاض سے خصوصی تعلق ہوتا ہے، روح میں جلاء اور ذہن تیز ہوتی ہے اور مراقبہ اور نظر وفکر سے کام لیتا رہتا ہے اس مرتبہ کا نام حکمت ودانش ہے ۔

اب اگر مذکورہ بالا تینوں قوتوں میں اعتدال قائم رکھا جائے، قوتِ شہوانیہ عفت کے دائرہ کے اندر ہو، قوتِ غضبیہ شجاعت کی حامل ہو اور قوتِ عقلیہ کا شعار حکمت و دانش ہو تو تینوں کے مجموعہ سے ایک چوتھی صفت پیدا ہوتی ہے جس کو عدالت یا عدل کہا جاتا ہے۔ عدالت کا ترجمہ جن لوگوں نے انصاف کیا ہے نہ نہایت بلیغ ترجمہ ہے۔ ہر قوت کے افراط و تفریط کے درمیانی درجہ کا نام انصاف ہے، اسی لئے اللہ نے عدل کا حکم دیا تاکہ عدالت کے ذریعہ کمزور انسان قربِ الٰہی تک پہنچ جائے اور سعادتِ ابدی حاصل کرلے۔ عدالت کے سب سے بڑے علمبردار حضور گرامی علیہ التحیات والتسلیم تھے۔ کتب صحاح میں مذکور ہے کہ مال غنیمت کی تقسیم کے وقت کسی منافق نے کہا محمد! انصاف کرو حق تلفی نہ کرو۔ حضورؐ نے فرمایا اگر میں عدل نہ کروں تو اور کون عدل کرسکتا ہے۔ مجھ سے زیادہ عدل کا حقدار اور کون ہوسکتا ہے۔

(۲) اِحْسَانُ یا احسان کے تفسیری معنی میں بھی اختلاف ہے۔ ابن عباسؓ کے نزدیک ادائے فرض و واجبات کا نام احسان ہے۔ بعض کے نزدیک صرف ادائے نوافل کا نام احسان ہے۔ بعض کے نزدیک احسان کی تفسیر اخلاص ہے، لیکن ان سب سے زیادہ قوی تفسیر وہ ہے جو صحیح حدیث میں آئی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت (اس یقین اور ادب کے ساتھ) کرو کہ گویا اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ مرتبہ نصیب نہ ہو تو کم از کم اتنا خیال رکھو کہ خدا تم کو دیکھ رہا ہے۔ یہ تو عبادات میں احسان کرنے کے معنی ہیں اور معاملات میں احسان یہ ہے کہ اپنے حقوق اور انتقام سے دست کش ہو جائے۔ غیر کو استحقاق سے زائد نفع پہنچائے۔ حدیث میں آیا ہے جو تجھے گالی دے تو اس کو دعا دے جو تجھ سے رشتہ توڑے تو اس سے محبت جوڑ۔

(۳) قرابتدار کو اُس کا حق دینا۔ یہ لفظ بہت عام ہے۔ کیا چیز دی جائے؟ کب دی جائے؟ بطریق وجوب دی جائے یا بطریق استحباب؟ کس کو دی جائے؟ ہر مفہوم اس میں داخل ہے۔ جتنا رشتہ داری میں قرب ہوتا ہی اس کی پاس داری ضروری ہے۔ اگر کسی کو نان نفقہ کی ضرورت ہے تو اس کی ضرورت پوری کی جائے۔ اگر وہ قرض دار ہے اور ادائے قرض سے مجبور ہو تو اس کا قرض ادا کیا جائے۔ اگر کچھ بھی ممکن نہ ہو تو میل ملت خندہ پیشانی سے گفتگو، مساوات کا برتاؤ اور وقت پر ہمدردی ہی کی جائے۔ اقارب میں باہم ہدیئے تحفے بھیجنے کی رسم بھی اسی ذیل میں داخل ہے۔ بہر حال وہ چیز جو ازدیادِ محبت کا باعث ہو سب کنبہ پروری کے دائرہ کے اندر داخل ہے

(۴) و (۵) فَحْشَآء اور مُنْکَر۔ فحشاء ہر اس بدی اور معصیت کو کہتے ہیں جو پوشیدہ نہ رہے بالکل ظاہر ہو جائے اور منکر وہ معصیت ہے جو پوشیدہ رہ جائے اس کا اظہار نہ ہو بعض کے نزدیک قوتِ شہوانیہ کے گناہوں اور خرابیوں کا نام فحش ہے اور قوتِ غضبیہ کے گناہوں کا نام منکر ہے۔

(۶) بَغْی بھی ممنوع ہے یہ ایک عام لفظ ہے جو عدل کے مقابل ہے۔ کسی نے اس کا ترجمہ تکبر، کسی نے کینہ، کسی نے ظلم اور کسی نے تجاوز عن الحد کیا ہے۔ آخری ترجمہ مفہوم سے زیادہ قریب ہے کیونکہ قوتِ شہوانیہ اور قوتِ غضبیہ کے درمیانی درجہ کو چھوڑ کر باقی افراط و تفریط کے دونوں کناروں کا نام بغی ہے۔ حدِ شرع سے بڑھ کر قوتِ شہوانیہ و غضبیہ کو مطلق العنان چھوڑ دینا بھی بغی ہے۔ خلاصہ یہ کہ عدل جس طرح تمام نیکیوں کو شامل ہے اسی طرح بغی میں تمام برائیاں اور گناہ داخل ہیں

مقصودِ بیان اسلام نہایت پاکیزہ صاف ستھرا مذہب ہے، اس کے احکام فطرت کے مطابق، امن عالم کے کفیل اور فساد و تباہی کی بیخ کنی کرنے والے ہیں۔ اہلِ نظر کے لئے یہ آیت خزانۂ حکمت ہے۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ
اور جب باہم معاہدہ کرو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد نہ توڑو کیونکہ تم

جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ○ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ

اللہ کو اپنا ضامن مقرر کر چکے ہوتے ہو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ بلاشبہ اس کو جانتا ہے اور تم اس عورت کی طرح نہ ہو جو

نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ۭ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ

اپنا کاتا ہوا سوت مضبوط بٹنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی ہے کیا تم اپنی قسموں کو باہم فساد کا سبب بناتے ہو

اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ

تاکہ ایک گروہ دوسرے سے بڑھ جائے اس سے بس اللہ تمہاری آزمائش کرتا ہے اور قیامت کے دن تمہارے

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ○

سامنے وہ باتیں ضرور کھول دے گا جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے

تفسیر ایک جماعت نے مکہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان پر قائم رہنے کا قول قرار کیا تھا اور قسمیں کھائی تھیں، لیکن جب ظاہری طور پر قریش کا غلبہ اور مسلمانوں کا ضعف دیکھا تو جو لوگ ضعیف الایمان تھے ان کے دلوں میں شیطان نے وسوسے ڈالے اور عہد توڑ کر گمراہ کرنا چاہا ان کو طریق وفا پر ثابت قدم رکھنے کے متعلق یہ ہدایت آمیز حکم نازل ہوا۔ اس سے عمومی طور پر معاہدہ اور قسم کے پورا کرنے کی تعلیم بھی ثابت ہوتی ہے۔ مورد اگرچہ مخصوص ہے، لیکن حکم میں ہر معاہدہ اور مخالفہ کی پابندی رکھنے کا عموم ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جب تم نے کسی عہد کو پورا اپنے ذمہ لیا ہے تو اس کو پورا کرو۔ خصوصاً جب کہ اللہ کا نام لے کر قسم بھی کھائی اور اس طرح اس عہد کو مستحکم کر لیا اور خدا کو گواہ اور ضامن بھی بنا لیا تو پھر بدعہدی میں اپنی بے اعتباری کے علاوہ حق تعالیٰ کے نام کی بے ادبی بھی ہر اور دوسرا مادۂ فساد بھی ہے۔ تم اس بے وقوف عورت کی طرح نہ بن جاؤ جو سوت کات کر پھر اس کو کھول ڈالتی ہے اور اپنی ساری محنت برباد کر دیتی ہے۔ عبداللہ بن کثیر اور سدی نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کیا ہے کہ مکہ میں ایک مشہور بے وقوف عورت رہتی تھی جس کا نام ریطہ بنت سعد بن تیم تھا۔ اس کا دستور تھا کہ صبح سے دوپہر تک خود بھی سوت کاتتی اور اپنی باندیوں سے بھی کتواتی اور دوپہر کے بعد کاتے ہوئے سوت کو پھر کھلوا ڈالتی اور دوپہر تک کی محنت برباد کر دیتی۔ مجاہد، قتادہ اور ابن زید کا قول ہے کہ اس سے مراد عہد شکن شخص کی مثال بیان کرنا ہے گویا عہد شکن آدمی اس عورت کی طرح ہے جو سوت کات کر پھر اس کو کھول ڈالے کوئی خاص عورت مراد نہیں ہے۔ ابن کثیر نے کہا یہی ارجح ہے خواہ مکہ میں کوئی ایسی بے وقوف عورت ہو یا نہ ہو بہرحال مراد تمثیلی ہے۔ کرخی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

اس سے آگے ارشاد ہوتا ہے کہ باہمی اصلاح کی بجائے تم قسموں کے ذریعہ آپس میں فساد پھیلانا چاہتے ہو یعنی قسمیں کھانے سے تمہاری مراد عہد کا استحکام نہیں ہوتا بلکہ یہ مقصود ہوتا ہے کہ تمہاری قسموں سے مطمئن ہو کر دوسرا آدمی دھوکہ کھا جائے۔ تمہاری عہد شکنی کا اصل منبع یہ ہے کہ تعداد اور جاہ و مال میں کفار تم سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں اور مسلمان فقر و افلاس میں مبتلا ہیں، لیکن یہ یاد رکھو کہ یہ تمہاری آزمائش ہے۔ تمہارے ایمان و استقلال کی منزل کو اللہ آزمانا چاہتا ہے۔ مجاہد کی روایت ہے کہ ایام جاہلیت میں قریش کا دستور تھا کہ جب اپنے معاہدین و حلیفوں کی قلت و کمزوری دیکھتے اور دشمنوں کی کثرت و قوت نظر آتی تو اپنے ہم عہد لوگوں سے عہد توڑ کر دشمنوں سے مل جاتے۔ اس آیت میں اس کی ممانعت ہے۔ میں کہتا ہوں ایام جاہلیت میں قریش عہد و امانت کے بہت پابند تھے، حلیفوں سے بدعہدی کرنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ اُحد میں

خود فرمادیا تھا کہ قریش عہد و امانت کے آدمی ہیں، لیکن جب کفر پر اصرار اور اسلام کی مخالفت پر قریش نے کمر باندھی تو ان کے اخلاق گر گئے۔ شاید مجاہد کی مراد اسی زمانے کی حالت ہو ورنہ قریش بدعہدی سے محفوظ تھے، اس لئے آیت کا اصل منشا ان مسلمانوں کو عہد بیعت پر ثابت قدم رہنے کی تاکید کرنی ہے جو کفار کی کثرت و دولت دیکھ کر اپنی ایمانی کمزوری کی وجہ سے اسلام سے انحراف کرنے کا وسوسہ دل میں لاتے تھے۔

مقصودِ بیان آیت میں ہر عہد کی پابندی خصوصاً عہد بیعت کی حفاظت کی ہدایت ہے۔ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ معاہدات کی خلاف ورزی کرنے سے دنیا میں امن نہیں فساد پھیلتا ہے۔ اس مضمون کی بھی صراحت ہے کہ کفار کی شوکت و کثرت اور جاہ و مال کی زیادتی مسلمانوں کی آزمائش کے لئے ہے کہ کون ایمان پر پختہ رہتا ہے اور کون حریف کی ظاہری طاقت کو دیکھ کر مرعوب ہوتا اور مسلمانوں کی طرف سے ٹوٹ جاتا ہے وغیرہ۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ

اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک اُمت بنا دیتا مگر بات یہ ہے کہ جس کو چاہتا ہے وہ گمراہ چھوڑ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے

يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ

ہدایت کرتا ہے اور تمہارے اعمال کی تم سے بازپرس ہو گی اور اپنی قسموں کو باہمی دھوکے کا ذریعہ نہ بناؤ ورنہ تمہارا قدم جم جانے

فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ

کے بعد پھسل جائے گا اور چونکہ تم نے راہِ خدا سے روکا تھا اس لئے عذاب کا مزہ چکھو گے اور تمہیں

عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ

سخت عذاب ہو گا اللہ کے قرار کے عوض حقیر مول نہ حاصل کرو کیونکہ جو چیز اللہ کے پاس ہے وہی

لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ

تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ فنا ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا جن لوگوں نے صبر کیا ہم

صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ

اُن کو اُن کا ثواب اُن کے بہترین اعمال کے صلہ میں ضرور عطا کریں گے جس نے بحالتِ ایمان کوئی نیک کام کیا خواہ وہ مرد ہو یا

مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

عورت ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور اُن کے بہترین اعمال کے صلہ میں اُن کو اجر عطا کریں گے۔

تفسیر دنیا میں مختلف عقائد، مختلف مذاہب اور مختلف اعمال کے آدمی ہیں۔ ہر شخص اپنے عقیدے کو حق اور دوسرے کو باطل جانتا ہے۔ لیکن واقع میں نہ سب حق پر ہیں نہ سب باطل پر، حق و باطل کا ساتھ ساتھ رہنا اور خیر و شر کا دوش بدوش چلنا قانونِ الٰہی کے مطابق ہے

اگر دنیا میں سب حق پر ہو جائیں اور شر کا وجود عالم سے مٹ جائے تو نظم دنیا درہم برہم ہو جائے، اچھائی برائی کا امتیاز نہ رہے، آدمی مرفوع القلم ہو جائے، دنیا دار امتحان نہ رہے، انسانی ارادہ مختارانہ رہے مجبور ہو جائے اور پھر قیامت کے دن کسی سے بازپرس نہ ہو سکے، اسی لئے آیاتِ مذکورہ میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو سب کو ایک گروہ کر دیتا، سب کا عقیدہ اور مذہب ایک ہو جاتا، مگر حق و باطل کا یہ اختلاف بھی اللہ کی طرف سے ہے گمراہی اور ہدایت تو اسی کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہتا ہے وہ ہدایت کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ چھوڑ دیتا ہے۔ ہدایت وگمراہی کو اختیار کرنا آدمی کا کام ہے۔ اسی لئے قیامت کے دن سب سے بازپرس ہوگی۔

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض قبائل پُرفریب بیعت کرتے تھے ان کے دلوں میں ایمان نہ ہوتا تھا، زبان سے تو اقرار کر لیتے تھے، مگر دل میں دغا ہوتی تھی۔ ان کی تہدید کے لئے مکرر تہدید آمیز حکم دیا کہ دیکھو اگر قدم جمانے کے بعد تم لغزش کھاؤ گے اور عہد وپیمان توڑ دو گے اور اسلام سے انحراف کرو گے تو تم پر آخرت میں جو سخت عذاب ہوگا وہ تو ہوگا دنیا میں بھی اپنے کئے کا خمیازہ بھگتو گے۔ تمہارے دیکھا دیکھی دوسرے بھی بیعت شکنی کریں گے اور تم سے بدعہدی سیکھ کر اوروں کو بھی عہد شکنی کی جرأت ہوگی۔ اس لئے گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے کا وبال تم پر ہوگا۔

یہ وعید پوری ہوئی۔ جن کفار نے حضورؐ کے ساتھ دغا کی تھی وہ بُری موت مرے اور اُن کا عبرت خیز انجام ہوا۔

قریش کمزور ایمان رکھنے والے مسلمانوں کو لالچ دیتے اور کہتے تھے کہ اگر پھر ہمارا دین قبول کر لو گے تو ہم تم کو امیر بنا دیں گے۔ ان مسلمانوں کے دلوں میں چونکہ ایمان کو خود ہی ضعف تھا اس پر لالچ مزید ہوا پھر کفارِ مکہ کی ایذا رسانی سے یہ تنگ آ گئے تھے، اس لئے ایمان میں تزلزل پیدا ہونے لگا اس پر وَلَا تَشۡتَرُوۡا سے آخر تک آیات کا نزول ہوا جن میں عہدِ الٰہی کو دنیوی مال کے عوض فروخت کرنے اور معاہدۂ بیعت کی خلاف ورزی کرنے کی ممانعت فرمادی اور جذبۂ طمع کی بیخ کنی اس طرح فرمادی کہ دنیوی عیش اگرچہ بیش از بیش ہو، مگر فنا پذیر ہے آخر نہ رہے گا۔ انسان دنیا سے خالی ہاتھ جاتا ہے دنیا بے ثبات ہے، البتہ آخرت کا ثواب دوامی ہے اس کو فنا نہیں۔ رہا شدائد و مصائب کا ہجوم تو آخرت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے اس کو برداشت کرنا، جان ومال کا نقصان اٹھانا اور ہر سختی پر صبر کرنا نیکوکاروں کا شیوہ ہے، اس لئے صبر سے کام لے کر ایمان پر پختہ رہنا چاہیئے۔

اس کے بعد مَنۡ عَمِلَ الخ سے عام عادلانہ ضابطہ بیان فرماتا ہے کہ مرد ہو یا عورت ہر ایک کو بشرطِ ایمان ہم خوشگوار پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور نیک اعمال کی بہترین جزا دیں گے۔ حیٰوۃ طیبہ سے کیا مراد ہے؟ اس کی تعیین میں صحابہ وتابعین کا اختلاف ہے۔ ابن عباسؓ، سعید بن جبیرؒ، ضحاک اور عطاء خراسانی کا قول ہے کہ دنیا میں رزق حلال نصیب ہونا اور آخرت میں اعمالِ صالحہ کی عمدہ جزا پانا حیاتِ طیبہ ہے۔ حضرت علیؓ، حسن بصری، عکرمہ اور وہب بن منبہ کا قول ہے کہ قناعت سے بسر کرنا حیاتِ طیبہ ہے۔ کیونکہ دولت کی فراوانی اگر موجب قناعت نہیں تو سکونِ روح میسر نہ ہوگا اور طلبِ جاہ ومال میں دل بے چین رہے گا اور کسی نعمت کا مزہ نصیب نہ ہوگا۔ امام جعفر صادق کا قول ہے کہ اطاعتِ الٰہی میں عمر بسر کرنا حیاتِ طیبہ ہے۔ مجاہد وقتادہ کہتے ہیں کہ جنت کے علاوہ کہیں خوشگوار زندگی نہیں مل سکتی۔ سہل تستری کہتے ہیں کہ اپنی جملہ تدابیر کو خدا کے سپرد کر کے راحت سے گزارنا حیاتِ طیبہ ہے۔ شیخ ابن کثیر کا قول ہے کہ ان سب کے مجموعہ کا نام پاکیزہ زندگی ہے۔ عبداللہ بن عمرو کی حدیث میں آیا ہے حضورؐ نے ارشاد فرمایا جو مسلمان ہو گیا اور بقدرِ ضرورت اس کو رزق مل گیا اور اللہ نے اس کو قناعت عطا فرمادی وہ کامیاب ہو گیا (رواہ الترمذی والمسلم والنسائی)

میرے نزدیک دنیوی حیاتِ طیبہ کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ دشمنوں سے امن ہو، عزت وشوکت کے ساتھ زندگی گزرے، کسی کافر کا محکوم نہ ہو، بقدرِ ضرورت رزق میسر ہو، دل میں قناعت ہو اور عمر اطاعتِ الٰہی میں بسر ہو، اس سے بڑھ کر دنیا میں حیاتِ طیبہ نہیں ہو سکتی اور آخرت کی حیاتِ طیبہ تو دوامی نجات ہی ہے۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ

کیا خدا ظالم ہے کہ اس نے اہلِ ایمان کے اجر کا تو وعدہ کیا اور غیر مسلموں کی نیکیوں کے ثواب کا کوئی تذکرہ نہ فرمایا۔ باوجودیکہ کفار بھی صدقات، خیرات، حسنِ معاملات، وفائے عہد، سچائی، خوش خلقی وغیرہ

وغیرہ نیکیاں کرتے ہیں کیا ان کی نیکیاں بے کار ہیں ؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ کفار کو آخرت کا تو یقین ہی نہیں یا تو اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کے قائل ہی نہیں یا قائل ہیں تو وہ بھی اسی دنیا میں دوبارہ آنے اور آواگون کے چکر میں پھنسنے کے۔ اور اگر روز قیامت کے قائل بھی ہیں تو ان عقائد کے ساتھ جو کسی عقل و نقل سے ثابت نہیں، اس لئے آخرت کے اجر سے وہ قطعاً محروم ہیں۔ رہا نیکیوں کا صلہ تو وہ دنیا میں ہی ان کو مل جاتا ہے اور اس طرح قانونِ فطرت کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ اسی مضمون کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو امام احمد نے بروایت انس بن مالک رضؓ نقل کی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ اہلِ ایمان کی حق تلفی نہیں فرماتا۔ اُن کی نیکی کا عوض دنیا میں دیتا ہے اور آخرت میں بھی عطا فرمائے گا۔ باقی کافروں کی نیکیوں کا عوض دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے۔ آخرت میں کافروں کی کوئی نیکی ہی نہ ہوگی کہ اس کا عوض ملے (رواہ مسلم فی صحیحہ)

مقصود بیان

اختلاف مذاہب بھی مشیتِ الٰہی کے تحت ہے۔ گمراہی اور ہدایت اللہ کے قبضہ میں ہیں، لیکن انسان کو بھی مختار بنایا گیا ہے اسی وجہ سے اعمال کی باز پرس ہوگی۔ پُرفریب قسمیں کھانا اور قسمیں کھانے کے بعد عہد شکنی کرنا ممنوع ہے۔ گمراہ کرنے والے پر گمراہی اور گمراہ کنی دونوں کا وبال پڑتا ہے۔ اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ بدی کی بنیاد ڈالنے والا ان تمام خرابیوں کا ذمہ دار ہے جو بدی کے پھیلنے سے پیدا ہوتی ہوں۔ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی ہر بڑی نعمت ہیچ اور متاعِ بے مقدار ہے۔ دنیوی فائدہ کے لئے اگرچہ وہ فائدہ کتنا ہی عظیم الشان ہو عہد سے پھر جانا حرام ہے۔ مصائب پر صبر کر کے ایمان کو مستحکم رکھنے والے اجرِ عظیم کے مستحق ہیں۔ اس میں مسلمانوں کو تلقین ہے کہ اسلام کے راستہ میں کیسی ہی تکلیفیں اٹھانی پڑیں، مگر ان کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔ انتہائی جرأت سے سب کو برداشت کرنا چاہیئے وغیرہ۔

مسائلِ قسم کی ضروری تنقیح

یہ بات بالاجماع ثابت ہے کہ قسم اگرچہ سچی ہو، مگر بکثرت قسمیں کھانے کا عادی ہونا ممنوع ہے۔ اہل ضرورت کے وقت قسم کھانی جائز ہے۔ قسمیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ کسی کارِ خیر کا انجام دینے، نیکی کرنے اور مخلوق خدا میں اصلاح کرانے کے لئے۔ دوسری وہ قسم جو ارتکاب معصیت اور کسی کار بد کرنے کے متعلق ہو۔ اول صورت بہر حال جائز ہے۔ اگر کسی مسلمان کی سرپرستی زید کے ذمہ ہے، نان و نفقہ کا یہی کفیل تھا، مگر کسی وجہ سے قسم کھا بیٹھا کہ اب میں اس کی سرپرستی نہ کروں گا تو قسم توڑ کر اس کی سرپرستی کرنی چاہیئے۔ یا دو مسلمانوں میں جھگڑا تھا اس نے جھوٹی قسم کھا کر باہم صفائی کرا دی تو جائز ہے کوئی گناہ نہ ہوگا البتہ کفارہ دینا لازم ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے جب مسطح کی کفالت و سرپرستی اٹھا لینے کی قسم کھائی تو پھر بامر نبوی قسم توڑ کر کفارہ دے دیا اور مسطح کا نان نفقہ بدستور جاری رکھا۔ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر کسی نے کسی بات کی قسم کھالی مگر دوسری بات جس کے ارتکاب سے قسم ٹوٹتی ہے پہلی سے بہتر ہے تو اس قسم کا کفارہ دے کر ثانی بات اختیار کرنی چاہیئے۔ انتہیٰ۔

بات یہ ہے کہ نیکی کی حفاظت اور قسم کی مشروع نگہداشت یہی ہے۔ اگر گناہ کے کام پر اڑا رہے اور قسم کے پیچھے پڑا رہے تو یہ فعل حرام پر استمرار ہے جو کسی طرح جائز نہیں۔ لہٰذا فعلِ حرام کو ترک کر کے قسم کا کفارہ دے دینا ہی مشروع ہے۔ رہی دوسری قسم تو اس کی خلاف ورزی کسی طرح جائز نہیں مثلاً کسی نے قسم کھائی کہ میں کبھی پرایا مال نہ کھاؤں گا اب اگر کھالے گا تو گناہ گار ہوگا۔ پرایا مال کھانا ویسے ہی ناجائز تھا اور جب قسم کھا کر عہد کر لیا تو مزید استحکام ہو گیا۔ اسی طرح اگر کسی نے کار خیر کرنے پر قسم کھائی مثلاً یہ کہا کہ میں والدین کے لئے روزانہ ایک بار استغفار کروں گا اور کسی دن بھول گیا تو کفارہ لازم ہوگا اور اگر قصداً ترک کیا تو گناہ گار ہوگا۔ مفصل بحث فقہ کی کتابوں میں پڑھنی چاہیئے۔

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ○ إِنَّهُ لَيْسَ

(اے محمدؐ) جب تم قرآن پڑھو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو کیونکہ شیطان

لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ

اُس کا زور اُن لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان لائے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں اُس کا زور تو صرف اُن لوگوں

عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ۝ ع

پر ہے جو اس سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن لوگوں پر ہے جو اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں

تفسیر اس آیت کا تعلق پہلی آیات سے ہے۔ کس حکم سے ہے؟ اس کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے متصل آیت میں نیک کام کرنے کی ترغیب دی تھی نیز فرمایا تھا کہ قرآن کی تلاوت نیکیوں کا سرچشمہ ہے پھر تلاوتِ قرآن کے وقت شیطان اپنی تمام طاغوتی طاقتوں کو ساتھ لے کر اغوا کرتا اور وسوسے ڈالتا ہے، اس لئے اس آیت میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگنے کا حکم دیا۔ اکثر اہلِ تفسیر کی رائے ہے کہ چند آیات سے پہلے فرمایا تھا۔ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ یعنی ہم نے قرآن نازل کیا الخ۔ تو ظاہر ہے کہ قرآن کے دو ہی فائدے ہیں یا تو نماز اور بیرونِ نماز میں حصولِ برکت کے لئے تلاوت کی جائے یا احکامِ شرعیہ معلوم کرنے کے لئے پڑھا جائے لامحالہ پڑھنا ضروری ہے اور تلاوتِ قرآن سے شیطان کو دکھ پہنچتا ہے کیونکہ قرآن ہی تمام قوانینِ اسلام اور ہر فلاح و بہبود کا سرچشمہ ہے، اس لئے شیطان اپنی پوری طاقت کے ساتھ قرآن پڑھنے والے کو بہکاتا ہے اسی بنا پر تعوذ کا حکم دیا۔ میرے نزدیک ثانی شق بہتر ہے۔ اگرچہ الفاظ سے اعتبار کے بُعد ہے، مگر معنی کا ارتباط قوی ہے۔

اس آیت میں اگرچہ خطاب حضور اقدسؐ کو ہے، مگر مرادِ خطاب تمام اُمت ہے کیونکہ رسول پاکؐ تو محفوظ من اللہ تھے شیطان آپ کے پاس بھی نہ آسکتا تھا، اس لئے مقصودِ خطاب تمام اہلِ اسلام ہیں۔ جب حضور اقدسؐ کو خطاب کرتے ہوئے خداتعالیٰ نے شیطان سے بچ کر اللہ کی پناہ میں آنے کا حکم دیا باوجودیکہ حضورؐ کو اغوائے شیطانی کا اندیشہ بھی نہ تھا تو پھر عام مسلمان جو معصوم اور محفوظ من اللہ نہیں ہیں ضرور شیطان سے بچاؤ کی تدبیر کرلینے کے مکلف ہیں۔ اسی نکتہ کو پیشِ نظر رکھ کر عام طور پر قرآن پاک میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کیا گیا اگرچہ روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے۔

شیطان کیا چیز ہے اور اُس سے شرع میں کیا مُراد ہے؟

باجماع مفسرین و صحابۂ کرام شیطان ابلیس کو کہا گیا۔ ابلیس قوم جن سے ایک فرد یا ابوالجن کا نام ہے۔ حضرت آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے مردودِ بارگاہ ہوا اسی وقت سے اولادِ آدمؑ کو اس سے دشمنی ہوگئی، لیکن یاد رہے کہ ابلیس کے علاوہ اور بھی بہت سے شیطان ہیں۔ (۱) وہ آدمی بھی شیطان ہے جو دوسروں کو گمراہ ہونے کی ترغیب دیتا ہے یا زبردستی گمراہ کرتا ہے۔ (۲) انسان کے اندر جو تینوں قوتیں خداتعالیٰ نے امانت رکھی ہیں اور جن کا بیان آیت اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ کے ذیل میں گزر چکا ہے وہ بھی شیطان ہیں اگر راہِ اعتدال سے ہٹ کر افراط و تفریط کی طرف مائل ہو جائیں۔ اس کی تائید مختلف احادیث سے ہوتی ہے۔ قوتِ غضبیہ کے جوش کو حضورؐ نے شیطان فرمایا تھا اور اعوذ باللہ پڑھنے کو اس کے دفع کرنے کا علاج بتایا تھا۔

اعوذ پڑھنے کا حکم مستحب ہے یا واجب؟

عطاء خراسانی کے نزدیک حکم وجوبی ہے۔ ابن کثیرؒ نے مستحب ہونا لکھا ہے۔ ابن جریر نے استحباب پر اجماع ہونے کا دعویٰ کیا ہے، مگر یہ امام ابن جریر کا تسامح ہے کیونکہ شیطان سے بچاؤ کرنے کے لئے اللہ کی پناہ میں آنا تو واجب کیا فرض ہے اس کے بغیر کوئی مسلمان ہی نہیں ہو سکتا جس قدر یہ جذبہ کمزور ہوگا اسی قدر ایمان میں ضعف ہوگا۔ اجتناب عن الشیطان مسلمان کا اصل مذہب ہے۔ رہی یہ بات کہ شرعی الفاظ زبان سے نکالنا بھی واجب ہیں یا نہیں؟ تو ظاہر ہے کہ زبان سے نکالنا لازم نہیں۔ اصل چیز رجوعِ قلب ہے جس طرح نماز کی نیت کے الفاظ زبان سے کہنا واجب نہیں مسنون یا

مستحب ہیں۔ اسی طرح زبان سے تعوذ کے عرفی الفاظ کہنا ضروری نہیں نہ علماء اس کے وجوب کے قائل ہیں۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ نزاع صرف لفظی ہے۔ بلا اختلاف دل سے اللہ کی طرف رجوع کرنا لازم ہے اور الفاظ ادا کرنے مستحب ہیں۔

اعوذ کس وقت پڑھی جائے؟

آیت کا ظاہری ترجمہ یہ ہے کہ جب تم قرآن پڑھو تو استعاذہ کرو۔ یعنی قرآن کی تلاوت کر چکو تو بعد کو اعوذ پڑھ لیا کرو۔ اس ظاہری مطلب پر خیال کرتے ہوئے ابو ہریرہ، امام مالک، داؤد ظاہری، حمزہ، ابو حاتم، سیستانی، محمد بن سیرین اور ابراہیم نخعی وغیرہ نے فرمایا کہ قرأت ختم کرنے کے بعد اعوذ پڑھنی چاہئے (صرح به النووی فی شرح المهذب) لیکن زجاج کا قول ہے کہ قرأت سے مراد ارادہ قرأت ہے اور یہی عربی زبان کا بلکہ ہر زبان کا محاورہ ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے إِذَا أَكَلْتَ فَقُلْ بِسْمِ اللهِ یعنی جب کھانا چاہو تو بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔ یا قرآن میں آیا ہے إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ الخ یعنی جب نماز پڑھنی چاہو تو وضو کر لیا کرو۔ ظاہر ہے کہ نماز سے قبل وضو مشروع ہے نہ کہ نماز کے بعد۔ یہی قول جمہور کا ہے اور روایت و دانش کے مطابق ہے۔

کیا ہر رکعت کے شروع میں تعوذ پڑھی جائے یا فقط ابتدائے نماز میں ایک مرتبہ پڑھ لینا کافی ہے؟

اوّل مذہب امام شافعیؒ کا ہے۔ شافعیؒ کا قول ہے کہ ہر رکعت مستقل قرأت ہے، اس لئے ہر رکعت میں جب قرآن پڑھا جائے تو اعوذ کہنا چاہیئے۔ دوئم قول امام اعظمؒ کا ہے۔ امام اعظم کے نزدیک تمام رکعات کا مجموعہ ایک ہی قرأت ہے متعدد قرأتیں نہیں ہیں، اس لئے پہلی رکعت میں قرأت پڑھتے وقت ایک مرتبہ اعوذ پڑھ لینا کافی ہے۔ پھر شافعی کے نزدیک امام اور مقتدی دونوں کو اعوذ پڑھنا چاہیئے، مگر امام اعظمؒ کے نزدیک چونکہ امام کی قرأت مقتدی کی قرأت کے قائم مقام ہے، اس لئے امام کی تعوذ کافی ہے۔

چونکہ آیت میں انتہائی زور کے ساتھ شیطان سے بچ کر اللہ کی پناہ میں داخل ہونے اور اعوذ پڑھنے کا حکم دیا تھا، اس لئے شبہ ہوتا تھا کہ شیطان بھی کوئی ایسی عظیم الشان ہستی ہے جو نعوذ باللہ خدا کی حریف اور مد مقابل ہو سکتی ہے۔ اس وہم کو دور کرنے کے لئے شیطان کی طاقت کی کیفیت اور مقدار بیان فرما دی اور ظاہر فرما دیا کہ شیطان کا زور ایک قسم کے آدمیوں پر ہرگز نہیں چل سکتا اور ایک قسم کے آدمی شیطان کے پنجہ میں گرفتار ہوتے ہیں۔ شیطان پر غالب رہنے والا گروہ تو وہ ہے جو ایماندار ہو اور محض اللہ ہی پر بھروسہ رکھتا ہو اور مغلوب گروہ وہ ہے جو شیطان کا رفیق ہو اور شیطان کو الوہیت و ربوبیت میں اللہ کا شریک جانتا ہو۔ ہم ذیل میں اس مطلب کی تشریح کرتے ہیں۔

ہر انسان کو دنیا میں دو ضرورتیں ہر وقت رہتی ہیں۔ زندگی کے آخر لمحہ تک ان دونوں باتوں سے چھٹکارا نصیب نہیں ہو سکتا۔ (۱) اپنی بقائے حیات یعنی مادی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے ضروری غذا، لباس اور ہوا، پانی وغیرہ کی فراہمی ضروری ہے۔ ترک غذا کے بعد کوئی شخص زندہ نہیں رہ سکتا، ہوا کے بغیر سانس نہیں لے سکتا، پانی کے بغیر بدن میں رطوبت اور تری باقی نہیں رہ سکتی، لباس یا کسی قسم کے ستر کے بغیر سردی گرمی سے بچاؤ نہیں ہو سکتا۔ تمام عمر انسان انہی کی جستجو اور فراہمی میں لگا رہتا ہے۔ اللہ کے جو نیک بندے ہیں اور نفسانی ہوس سے خالی ہیں وہ ضروری مقدار پر قناعت کرتے ہیں اور حرص کی چشم آز ہر وقت کھلی ہوئی ہے وہ کسی مقدار پر اکتفا نہیں کرتے۔ بہرحال ضروریات زندگی کی طلب سے کوئی نیک و بد خالی نہیں، لیکن طلب میں فرق ہے۔ بلند نظر اور روشن بصیرت رکھنے والا اسباب معیشت کو فراہم کرتا ہے اگر کسی سبب کو کارساز نہیں جانتا۔ زراعت، تجارت، صنعت و حرفت، جنگ جملہ سب کاموں میں مشغول رہتا ہے، مگر کسی پیشہ یا کسی شخص یا کسی اندرونی و بیرونی کوشش کو رزاق حقیقی نہیں جانتا۔ اس کی نظر ماديات اور اسباب کے سلسلہ سے آگے بڑھ کر ایک غیبی طاقت اور ہمہ گیر قوت پر جا کر ٹھہرتی ہے۔ وہ مسبب الاسباب اللہ ہی کو جانتا ہے۔ ابر سے پانی برستا ہے۔ وہ دیکھتا ہے، زمین سے سبزہ اگتا ہے وہ جانتا ہے ہل جوتنے سے زمین نرم ہو کر تخم پذیری اور روئیدگی کے قابل ہو جاتی ہے، وہ اس کو مانتا ہے، محنت کرنے سے مزدوری ملتی ہے اس کو اس کا یقین ہے، لیکن ان میں سے کسی کو وہ فاعل حقیقی اور مؤثر خود مختار نہیں مانتا۔ تمام طاقتوں اور قوتوں کا موجد، خالق اور خود مختار مؤثر ذات باری کو سمجھتا ہے۔ لیکن اس عقیدہ کے خلاف دوسرا طبقہ بھی ہے جس کی نظر لیت ہے۔ اس کی نگاہ اسباب کے پار نہیں جاتی وہ ظاہری ذرائع ہی کو حقیقی مؤثر سمجھتا ہے۔ مثلاً لیت سے ابر کی پیدائش مانتا ہو۔

اور اس طرح جانتا ہے کہ بخارات ہی ابر کے خالق ہیں، ستاروں کی تاثیر انقلاب فصول پر پڑتی ہے اور اس طرح پڑتی ہے کہ ستاروں کی رفتار کسی بالادست مؤثر سے قطعاً بے نیاز ہے۔ اس کی روزی، کھیتی، بیوپار یا ملازمت وغیرہ پر موقوف ہوتی ہے اور ایسی موقوف ہوتی ہے کہ معاش کی ظاہری تباہی دیکھ کر وہ قطعاً مایوس ہو جاتا ہے اور اپنی بربادی و نامرادی کا یقین کر لیتا ہے۔

(۲) دشمنوں سے حفاظت کے بغیر اور موذی جانوروں سے بچنے کی تدبیر کے بغیر کوئی شخص زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہر شخص اپنی بدنی حفاظت میں سرگرم بلکہ دفعِ مضرت اور مقابلۂ اعداء پر ہر فرد فطرتاً اور طبعاً مجبور ہے۔ بیرونی ایذا رساں طاقتوں کا مقابلہ انسانی طبیعت خود بخود کرتی ہے۔ اگر کوئی شخص تلوار مارنے کے لئے اٹھائے تو جس شخص پر اٹھائے اس کا ہاتھ سر کو بچانے کے لئے خواہ مخواہ بلا ارادہ اوپر کو اٹھ جاتا ہے۔ بہرحال دشمنوں سے اپنے جان، مال، قوم، وطن اور ملک کی حفاظت کی تدبیر کرنی فطرت کا اقتضاء ہے۔ اس فطری مقتضا کو پورا کرنے کے متعلق دو قسم کے آدمیوں کے دو ہی طرح کے عقائد ہیں، دانشمند اور بلند حوصلہ انسان تو تلوار کو مارنے اور دشمن کو دفع کرنے کا آلہ سمجھتا ہے۔ ہمدردوں اور بہی خواہوں کی کثرت کو بظاہر نظر دفعِ اعداء کے لئے مفید سمجھتا ہے۔ دولت مندی اور بدنی صحت و قوت کو دشمنوں سے مقابلہ کرنے کا ہتھیار جانتا ہے۔ عقل و نظر اور خوش تدبیری کو حق و باطل میں فرق کرنے کا ذریعہ یقین کرتا ہے، لیکن بایں ہمہ وہ ان میں سے کسی کو فاعل حقیقی اور محافظ مطلق تسلیم نہیں کرتا۔ کارساز و مددگار، منعم و مؤثر محض ذاتِ الٰہی کو جانتا ہے، لیکن کور دانش، کوتاہ فہم اور پست دماغ کا آدمی تمام اسباب کو حقیقی مسبب جانتا ہے۔ اس کو اپنے مال اولاد اور اقارب و احباب کی کثرت پر بھروسہ اور غرور ہوتا ہے۔ خلوصِ نسب اور شرفِ آبائی پر فخر ہوتا ہے، جسمانی تندرستی اور صحت پر ناز ہوتا ہے۔ ظاہری جاہ و جلال اور شوکت و سطوت پر کامل اعتماد و وثوق ہوتا ہے، وہ اپنے ظاہری سرپرستوں اور حاکموں کو حقیقی معین و مددگار جانتا ہے بلکہ اس طبقہ میں سے بعض ذلیل ترین فہم رکھنے والے تو فرضی معبودوں اور خیالی دیوتاؤں کو اپنا پشت پناہ اور قوتِ بازو سمجھتے ہیں۔

دونوں قسم کے آدمیوں میں سے اول الذکر گروہ تو اہل ایمان کا ہے جن کو اللہ کے سوا کسی سے حقیقی طمع و امید ہوتی ہے نہ سوائے خدا کے کسی سے ضرر کا اندیشہ۔ وہ ہر امید و خوف کے وقت اللہ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں اور ظاہری اسباب کی فراہمی میں مشغول رہتے ہوئے بھی اعتماد، اعانت اور توکل اللہ ہی پر ہوتا ہے اور دونوں قسموں میں سے مؤخر الذکر گروہ کے دماغ میں اللہ کا کوئی خیال و مفہوم نہیں ہوتا۔ وہ ظاہری بادشاہوں اور حاکموں اور سرپرستوں کو اصل کرتا دھرتا جانتے ہیں۔ اپنی کوشش کو حقیقی مؤثر سمجھتے ہیں بلکہ فرضی دیوتاؤں کو اپنا مددگار خیال کرتے ہیں۔ یہی شیطان کی دوستی اور الوہیت و ربوبیت میں اللہ کے ساتھ غیر کو شریک کرنے کا مفہوم ہے۔

مقصودِ بیان درپردہ تلاوتِ قرآن کی ہدایت اور اس امر کی صراحت کہ تلاوتِ قرآن سے پہلے تعوذ ذکر کرنا لازم ہے۔ اس بات کا ناقابلِ فسخ حکم کہ شیطان سے بچاؤ کے لئے اللہ کی پناہ میں آنا ضروری ہے۔ گفتار، رفتار، اطوار، عبادات، معاملات، غرض زندگی کے ہر شعبہ میں بلکہ موت اور مابعد الموت کے اوقات میں بھی اللہ اور فقط اللہ پر بھروسہ رکھنے کی ضمنی ہدایت اور اس امر کی تصریح کہ جو اللہ کا ہو جاتا ہے یعنی اپنی خواہش، ارادہ اور ذات کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے اس پر شیطان کا قابو نہیں چلتا۔ یعنی اس کا قول و عمل پاک اور لوجہ اللہ ہوتا ہے، اس کی ہر نقل و حرکت بامرِ الٰہی ہوتی ہے اور جو لوگ غیر اللہ پر نظر رکھتے ہیں ہیم و رجا کا محور اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو بناتے ہیں وہ شیطان کے دوست ہوتے ہیں اور شیطان کا انہی پر تسلط ہوتا ہے۔

ضمنی طور پر اس امر کی تلقین مسلمانوں کو کرنی مقصود ہے کہ غیر اللہ کا رشتہ توڑ کر بیرونی اعتماد و بھروسہ چھوڑ کر صرف اللہ ہی سے تعلق جوڑو اور اسی سے امید و خوف رکھو۔ ہر راحت و نعمت کے اسی سے طلب گار رہو اور ہر مصیبت کو دفع کرنے کے لئے اسی کو پکارو وغیرہ۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ

جب ہم ایک آیت کی بجائے دوسری آیت کو بدلتے ہیں تو کافر کہتے ہیں کہ (محمد) تو تو نرے مفتری ہیں حالانکہ اللہ جو کچھ اتارتا ہے اس کو خوب جانتا ہے

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ

بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر بے علم ہیں کہہ دو کہ اس کو تمہارے پروردگار کے حکم سے جبرئیل نے سچائی کے ساتھ نازل کیا ہے

لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ

تاکہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے اور یہ مسلمانوں کے لئے ہدایت و بشارت ہے ہم جانتے ہیں کہ وہ

يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا

کہتے ہیں ان کو تو آدمی سکھا دیا کرتا ہے حالانکہ جس شخص کی طرف منسوب کرتے ہیں اُن کی زبان تو عجمی ہے اللہ یہ

لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ

خالص عربی زبان ہے بات یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیتوں کو نہیں مانتے اُن کو اللہ ہدایت

اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ

نہیں دیتا اور اُن کے لئے دردناک عذاب مخصوص ہے دروغ بندی تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جن کا اللہ کی آیتوں پر

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ۝

ایمان نہیں ہوتا اور وہی جھوٹے ہوتے ہیں

تفسیر اللہ علیم و حکیم ہے وہ اپنی مخلوق اور اپنے احکام کے مصالح سے بخوبی واقف ہے۔ عرب کی قوم جاہل اور سرکش تھی۔ کتاب اللہ کے احکام تو کیا کسی دنیوی حاکم کے زیر اثر بھی نہیں رہے تھے اور نہ کسی بادشاہ کی اطاعت کے خوگر تھے، لیکن مقدر ہو چکا تھا کہ چشمۂ رحمت مکہ کی بے آب و گیاہ زمین سے اُبلے اور پھیل کر اطرافِ عالم کو سیراب کر دے۔ چنانچہ آفتاب ہدایت چمکا اس کی ابتدائی کرنیں مکہ پر پڑیں، احکام الٰہی نازل ہونے شروع ہوئے، لیکن سرکش جاہل قوم کے دیرینہ رسم و رواج اور موروثی خصائل بد کو ترک کرنا آسان کام نہ تھا۔ کوئی استاد اگر اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتا ہے تو ان کی عمر استعداد اور ذہانت و محنت کے مطابق دیتا ہے۔ ہر لڑکے کی عمر و استعداد و ذہانت کے موافق اس کی تعلیم بدلتا جاتا ہے۔ ابتدا میں جو تعلیم دیتا ہے وہ دس پانچ سال کے بعد مفید نہیں رہتی۔ اسی طرح طبیب جب مریض کا علاج شروع کرتا ہے تو اس کے مرض کی نوعیت، درجۂ مریض کی جسمانی قوت، مزاج، عمر وغیرہ سب کا لحاظ رکھتا ہے اور وقتاً فوقتاً دوا اور علاج بدلتا رہتا ہے۔ یہ تو ایک لڑکے یا ایک مریض کا انفرادی معاملہ ہے، لیکن جہاں قواعد کلیہ اور ضوابط عامہ بنانا ہوں، پوری قوم بلکہ تمام ملک بلکہ کل دنیا کے مریضوں کا علاج ایک ہی نسخہ سے کرنا ہو اور کل دنیا کے نونہالوں کو ایک ہی سبق دے کر عالم بنانا ہو وہاں درس و علاج میں تبدیل و تغیر لازم ترین ہے۔ خدا تعالیٰ چونکہ علیم و حکیم ہے اس لئے اسلام کے ابتدائی دور میں جن قوانین و احکام کا اجرا مناسب سمجھا کر دیا۔ پھر جب قوم کی حالت کسی قدر سدھر گئی تو انہی قوانین میں قدرے ترمیم کر دی خواہ ان کو مشکل بنا دیا یا پہلے سے آسان کر دیا۔ جیسا حکمت کا مقتضا تھا ویسا کیا۔ مثلاً آغاز اسلام میں کھانے پینے اور ذاتی ضروریات سے جو کھانا، کپڑا، مال نقد وغیرہ باقی رہتا اس کو اپنے پاس رکھنا ناجائز سمجھا اور کل مال کو امدادِ اہل اسلام میں صرف کرنا واجب تھا، لیکن جب اسلام ترقی

کرتا گیا۔ مسلمانوں کی اجتماعی حالت پہلے سے کسی قدر درست ہو گئی۔ زیادہ مالی دشواری بھی نہ رہی۔ اس وقت حکم میں آسانی کر دی گئی۔ بجائے کل مال صدقہ کرنے کے کل مال کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ کی شکل میں ادا کرنا لازم قرار پایا۔ اس کے علاوہ حرمتِ شراب کا مسئلہ ہے۔ چونکہ پوری قوم شراب خوار تھی اور نشہ کا ایک دم ترک کر دینا آسان نہ تھا، اس لئے اس کی حرمت میں تدریج کا لحاظ رکھا گیا۔ شروع میں مذمت اور تنفر کے مضامین نازل ہوئے پھر شراب پی کر نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت ہوئی اور رفتہ رفتہ قطعی طور پر ہمیشہ کے لئے حرام کر دی گئی۔

اس ترمیم و تنسیخ کو دیکھ کر کفارِ مکہ نے بطور طعن کہنا شروع کیا کہ محمدؐ تمسخر کرتے ہیں۔ آج ایک کام کرنے کو کہتے ہیں اور کل اس کی ممانعت کر دیتے ہیں۔ جو چاہتے ہیں از خود بنا کر لا کر سنا دیتے ہیں، اور خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ کافروں کے اس قول کی تردید میں خدا تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ آیات کے احکام میں نسخ و ترمیم دیکھ کر کافر کہتے ہیں کہ محمد! تم خود بنا کر لاتے ہو اور منسوب کر دیتے ہو خدا کی طرف۔ ان کا یہ قول غلط ہے۔ اللہ اپنے نازل کردہ احکام کی مصالح کو بخوبی جانتا ہے یہ لوگ کیا جانیں۔ درحقیقت اس اللہ کی طرف سے جو مربی ہے۔ جبرئیل اس قرآن کو صحیح طور پر حقانیت کے ساتھ لائے ہیں۔ اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہے نہ کذب و افترا کو دخل ہے۔ رہا نسخ کا فائدہ تو منجملہ دیگر فوائد کے کھلا ہوا فائدہ یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں نورِ ایمان متمکن ہے اُن کا ایمان اور قوانینِ شریعت کی پابندی اس ترمیم و تنسیخ کی وجہ سے پختہ اور راسخ ہو جاتی ہے۔ اگر ایک دم احکام نازل کر دیئے جاتے تو ممکن تھا ان کے ایمان میں تنزل پیدا ہو جاتا۔ کیونکہ اُن سے آبائی رسم و رواج کے خلاف فوری احکام کی یک دم تکمیل نہ ہو سکتی تھی۔ پھر یہ بھی مقصود تھا کہ قرآن سے لوگوں کو ہدایت ہو اور ہدایت بغیر تدریجی ترمیم و تنسیخ کے ممکن نہ تھی۔ طبائع اور عادات کے خلاف یک دم حکم سن کر ممکن تھا لوگ متنفر ہو جائیں اور بجائے ہدایت کے گمراہی پر پڑ جائیں۔ تیسرے یہ بھی غرض تھی کہ وہ لوگ جو واقعی مسلم ہیں جنہوں نے اپنی جان، مال یہاں تک خواہشاتِ نفس کو اللہ کے حکم کے تابع بنا دیا ہے ان کو دوامی نجات کی خوش خبری بھی پہنچ جائے۔ اگر نسخ نہ ہوتا تو ان کا مسلمِ مخلص ہونا کیسے ظاہر ہوتا، یہ کیسے واضح ہوتا کہ وہ اللہ کے حکم کو ہر وقت ماننے والے ہیں، لیکن اس فائدہ کو سمجھنے کے لئے نورِ ایمان اور ضیائے اسلام کی دل میں ضرورت ہے۔ جس کے دل میں زنگ اور کدورت بھری ہوئی ہے اور روح میں کفر بیٹھا ہوا ہے اس کو یہ فائدہ کیسے سمجھ میں آسکتا ہے۔

اس سے آگے وَلَقَدْ نَعْلَمُ الخ سے ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ مکہ میں بعض رومی اور فارسی غلام بھی تھے جن کو صاف طور پر فصیح عربی میں بات چیت کرنی بھی نہ آتی تھی البتہ عیسائی اور مجوسی مذہب سے ان کو کسی قدر واقفیت ضرور تھی۔ خواہ سن سنا کر یا کتابیں پڑھ کر۔ مکہ کے جاہلوں میں وہی عالم سمجھے جاتے تھے۔ اندھوں میں کانا راجہ۔ یہ غلام کبھی کبھی حضورِ اقدسؐ کی خدمت میں حاضر ہو جایا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اُن کے پاس گاہے گاہے تبلیغ کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ قریش کو جب نکتہ چینی کا کوئی اور موقع نہ ملا اور قرآن کے اعجاز کے مقابلہ میں لاجواب ہوئے تو کہنے لگے یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ فلاں غلام محمدؐ کو سکھا جاتا ہے اور پھر یہ خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔

ابنِ کثیر نے بروایت عکرمہ و قتادہ کا قول بیان کیا ہے کہ اس متہم غلام کا نام یعیش تھا۔ ابنِ جریر نے بروایت ابنِ عباسؓ بلعام آہنگر کہا ہے۔ بعض مفسرین نے ابو الیسرہ نصرانی نام بتایا ہے۔ کسی نے عداس کہا ہے۔

بعض کا قول ہے کہ دو غلام تھے جو تلواریں بنانے کا پیشہ کرتے تھے ایک کا نام جبر اور دوسرے کا نام یسار تھا۔

زہری نے بروایت سعید بن مسیب ذکر کیا ہے کہ ایک مشرک مسلمان ہو کر کاتبِ وحی مقرر ہوا، لیکن کچھ مدت کے بعد مرتد ہو کر بیہودہ بکنے لگا۔ یہیں سے کفارِ قریش نے بھی طعنہ زنی شروع کر دی۔

بعض اہلِ روایت کہتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسی کی طرف تصنیفِ قرآن کو کفار منسوب کرتے تھے۔

شیخ نحاس نے کہا کہ یہ اقوال باہم متناقض نظر آتے ہیں، مگر واقعی میں کوئی تناقض نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے متفرق اشخاص نے مختلف غلاموں کی طرف تالیفِ قرآن کو منسوب کیا ہو اور کفار میں خود کسی خاص شخص پر اتفاقِ رائے نہ ہو۔

میرے نزدیک ابن نحاس کا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ کفار مکہ تعلیم یافتہ نہ تھے۔ قول کے صدق و کذب اور تحقیق و تنقیح سے ان کو سروکار نہ تھا۔ جو منہ پر آیا کہہ دیا۔ شروع میں بقول زہری اس مرتد نے اتہام لگایا جو کاتب وحی مقرر ہو گیا تھا پھر جس کو خبر پہنچ گئی اُس نے اپنی رائے کے مطابق نام تجویز کر لیا۔

اس قول کی تردید میں خداتعالیٰ فرماتا ہے کہ جس شخص کی طرف یہ لوگ قرآن کو منسوب کرتے ہیں اس کی اصلی زبان تو عجمی ہے عربی سے وہ صحیح طور پر واقف بھی نہیں اور قرآن کی زبان فصیح عربی ہے۔ ناواقف آدمی جو خود زبان پر قدرت نہیں رکھتا وہ کس طرح ایسا بلیغ کلام بنا سکتا ہے، مگر جن لوگوں کے دلوں میں جوہر ایمان نہ ہو جو صداقت وحقانیت کی کھلی ہوئی نشانیاں دیکھ کر بھی سچ نہ جانتے ہوں اور اپنی کٹ حجتی پر قائم ہوں ان کو اللہ ہدایت نہیں فرماتا۔

قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی ایک دلیل تو یہ بیان کی تھی کہ قرآن کی زبان فصیح عربی ہے اور جن لوگوں کی طرف قرآن کو منسوب کیا جاتا ہے، اُن کی زبان عجمی ہے۔ دوسری دلیل ذرا اس سے باریک بیان فرماتا ہے:-

اِنَّمَا يَفْتَرِى الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۔ الخ۔ بہتان تراشی اور دروغ بافی تو وہ لوگ کرتے ہیں جن کا آیات الٰہی پر ایمان نہیں ہوتا یعنی جو اللہ کی الوہیت و ربوبیت کے قائل نہیں ہوتے اور جو احکام الٰہی سے سرتابی کرتے ہیں اور آدمیوں سے باہمی معاملات میں جھوٹ بولتے، دغا فریب کرتے اور بدسلوکی سے پیش آتے ہیں اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے کبھی جھوٹ نہیں بولا کبھی کی امانت میں خیانت نہیں کی، کسی سے فریب نہیں کیا۔ یہاں تک کہ قوم کی طرف سے صادق امین کے معزز لقب سے مشہور ہوئے تو پھر خدا پر وہ بہتان کیسے باندھ سکتے ہیں، جو کلام اللہ نے نازل نہیں کیا اس کو کلام الٰہی کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کمزور تریں جھوٹ نہ بولنے والا ایسی عظیم الشان دروغ بافی کس طرح کر سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ کفار خود جھوٹے ہیں جو صادق امین کو مفتری و کذاب خیال کرتے ہیں۔

مقصود بیان نسخ احکام کا جواز اور نسخ حکمت کی طرف ضمنی اشارہ۔ نسخ کے فوائد ثلاثہ کی صراحت، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور قرآن کے کلام اللہ ہونے کی واضح اور دقیق دو دلیلوں کا بیان۔ اس بات کی ضمنی صراحت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیوی معاملات میں کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اس بات کی تنقیص کہ جو لوگ خود ایمان لانا چاہتے ہیں اور ہٹ دھرمی پر قائم رہیں وہ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتے۔ لفظ نَزَّلَہٗ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن پاک یکدم نازل نہیں ہوا بلکہ تھوڑا تھوڑا حسب موقعہ اور اقتضائے مصلحت کے مطابق نازل ہوتا رہا۔ یعنی اگر ایک دم کل نازل ہو جاتا تو نسخ کی گنجائش نہ رہتی۔ رفتہ رفتہ نازل کرنے سے مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کو پختہ کرنا مقصود ہے وغیرہ۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ

جو لوگ ایمان لانے کے بعد اللہ کا انکار کریں باستثناء اُن لوگوں کے جن کو مجبور کیا گیا ہو مگر اُن کا دل ایمان پر

بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ

برقرار ہو ہاں جو لوگ دل کھول کر کافر ہوئے تو اُن پر اللہ کا غضب

اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا

ہے اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں

عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ

عزیز رکھا اور اللہ کافر قوم کو ہدایت نہیں دیتا یہی وہ لوگ ہیں جن

طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝

کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے اور یہی لوگ غافل ہیں

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

بلاشبہ آخرت میں یہی نقصان اٹھائیں گے

تفسیر ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو صحابہ سے فرمایا چلو میرے ساتھ ہجرت کرو جس میں طاقت ہو وہ آخر رات تک ٹھہرا رہے اور طاقت تو توقف نہ ہو تو شروع رات ہی میں چل دے، لیکن جس وقت تم کو معلوم ہو کہ میں کہیں مستقل طور پر مقیم ہو گیا تو میرے پاس چلے آنا۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ چھوڑا کچھ مسلمان منتشر ہوئے۔ کفار کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے عمار بن یاسر، خباب، یاسر اور ان کی بیوی سمیہؓ اور ابو فکیہہ وغیرہم کو گرفتار کیا۔ ابوجہل نے ان غریبوں کو سخت ایذائیں پہنچانی شروع کیں۔ حضرت بلالؓ کو دھوپ میں گرم ریت پر لٹاتا، لوہے کی گرم تپتی ہوئی زرہ اس پر رکھ دیتا اور کہتا اب کہو خدا ایک ہے یا دو؟ لیکن خدا کا راسخ الایمان بندہ پہاڑوں سے زیادہ پائیدار ایمان رکھنے والا بندہ زبان سے اَحَدٌ اَحَدٌ کی صدا ہی نکالتا۔ حضرت خباب کو باندھ کر کانٹوں میں گھسیٹا جاتا، حضرت عمار کو طرح طرح کی ایذائیں دی جاتیں۔ یہاں تک کہ آپ کے والد یاسر اور والدہ سمیہ کو تو انتہائی بے رحمی و بے دردی سے شہید ہی کر دیا، مگر ان اللہ کے بندوں نے اُف نہ کی۔ حضرت عمار کمزور اور بہت ضعیف تھے۔ ایمان اگرچہ پہاڑوں سے بھی زیادہ پختہ تھا، مگر بدنی ضعف سے مجبور تھے آپ سے تکالیف و شدائد کی برداشت نہ ہو سکی مجبور ہو کر کلمۂ کفر زبان سے نکال دیا۔ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ نازیبا الفاظ بادلِ ناخواستہ زبان سے نکالے تھے اور بتوں کی تعریف کی تھی۔ بہرحال موقع پا کر جب مکہ چھوڑا اور خدمتِ گرامی میں حاضر ہوئے تو ہر ایک نے اپنا اپنا واقعہ عرض کیا ادھر لوگوں نے عمار کے متعلق بری رائے قائم کی اور کافر ہو جانے کا چرچا کرنے لگے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عمار سے پوچھا۔ اس وقت (کلمۂ کفر زبان سے کہنے کے وقت) تیرے دل کی کیا حالت تھی؟ عمار نے عرض کیا ایمان پر مطمئن تھا۔ فرمایا عمار از سر تا پا نور ایمان سے منور ہے، اس کے گوشت پوست میں اسلام سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس وقت عمار رو رہے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تسلی دے کر خود دستِ مبارک سے آنکھوں سے آنسو پونچھے اور فرمایا کوئی حرج نہیں۔ اگر پھر ایسا اتفاق ہو تو پھر تقیہ کیجیو۔ اللہ کی دی ہوئی اجازت ہے ایسے جان جوکھوں کے موقع پر تقیہ کرنا جائز ہے۔ عمار کے اطمینان کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔

چند مسائل ائمہ حنفیہ کے نزدیک ایمان قلب کا فعل ہے۔ قَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ اس قول کی واضح دلیل ہے۔ رہا زبان سے اقرار اور اعضائے جسمانی سے اسلام کے مطابق عمل تو وہ صرف اس لئے ہے کہ اس کے ساتھ مسلمانوں کا برتاؤ کیا جائے جزیہ ادا کرنا نہ پڑے، مسلمہ عورت سے نکاح صحیح ہو، اس کے جنازے کی نماز پڑھی جائے، وغیرہ وغیرہ۔ گویا جو شخص دل سے ضروریاتِ اسلام کا یقین رکھتا ہے اور زبان سے اقرار نہیں کرتا وہ عند اللہ مؤمن ہو گا۔ اگرچہ بظاہر شرع میں اس پر اسلام کے احکام جاری نہ ہوں گے۔

مگر یہ مسئلہ ذرا تفصیل طلب ہے۔ ایمان اگرچہ قلبی تصدیق کا نام ہے، مگر زبان سے اقرار اور اعضاء سے ایمان کے موافق عمل کرنا ضروری شرائط میں سے ہے۔ اگر کوئی شخص بغیر جانی خطرے کے زبان سے اقرار نہیں کرتا یا اعضائے جسمانی سے اسلام کے خلاف عمل کرتا ہے تو خواہ اس کے دل کی کیفیت

کچھ بھی ہو وہ مرتد ہوگا۔ ہاں اگر جان جانے کا اندیشہ بلکہ یقین ہو اور اس وقت زبان سے کلمۂ کفر نکال بیٹھے تو جائز ہے مرتد نہ ہوگا بشرطیکہ وہ اپنی نیت کی صحت کا اظہار کرے۔

کس قسم کی مجبوری واکراہ میں تقیہ کرنا جائز ہے

خطرہ ڈو طرح کا ہوتا ہے۔ کوئی عضو کاٹنے اور جان جانے کا۔ یا مال ضائع ہونے اور جسمانی تکالیف وشدائد میں مبتلا ہونے کا صحیح قول یہ ہے کہ اگر جان جانے کا یقین ہو اور ڈرانے دھمکانے والے میں جان لینے کی قدرت بھی ہو خواہ صاحب تسلط حاکم ہو یا کوئی اور بہرحال ایسے آڑے وقت میں ظاہری طور پر زبان سے کلمۂ کفر نکالنا اور احکام اسلامیہ کے خلاف کسی عمل کا اظہار کرنا جائز ہے، لیکن اگر ضروریاتِ اسلام کا اعتراف قائم رکھنے سے مال کے برباد ہونے کا یقین ہو یا قید ہو جانے، کوڑے پڑنے اور دوسری جسمانی تکالیف اٹھانے کا اندیشہ ہو تو کسی طرح زبان سے بھی کلمۂ کفر کہنا جائز نہیں۔ حسن بصری، شافعی، اوزاعی اور سحنون وغیرہم کا قول ہے کہ تلفِ جان کے خطرہ کے وقت زبان سے کلمۂ کفر کہنے کی اجازت ہے، مگر فعل کفر جائز نہیں۔ مثلاً اگر کوئی کافر بتوں کو سجدہ کرائے ورنہ مار ڈالنے کی دھمکی دے تو اگرچہ قتل ہو جانے کا یقین ہو، مگر بتوں کو سجدہ کرنا جائز نہیں۔ جمہور کا قول وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دیا اور اسی پر فتویٰ ہے۔

ایک ضروری نکتہ

خطرۂ جان کے وقت کلمۂ کفر کا زبان پر لانا اگرچہ جائز ہے، مگر اولیٰ وافضل یہ ہے کہ تکالیف پر صبر کرے اور جان دے دے۔ کیونکہ کلمۂ کفر کا جواز استحباب یا وجوب کو نہیں چاہتا۔ پختہ ایمان رکھنے والے صابر، صحابہ وتابعین نے ایمان قائم رکھا۔ اقرار توحید پر جمے رہے۔ ضروریاتِ دین کا اعتراف برقرار رکھا اور جان دے دی۔ حضرت یاسر، حضرت سمیہؓ اور بعض دیگر اہلِ مشاہدہ راہِ خدا میں کافروں کے ہاتھوں سے شہید ہو گئے، مگر جان بچانے کے لئے کوئی لفظ خلافِ دین زبان سے نہ نکالا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

اب ہم آیت کے تفسیری مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ عام دستور ہے کہ انسان جب احکام الٰہی سے سرکشی کرتا ہے تو اس کے دل میں قدرے زنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر گناہ کرنے کے بعد توبہ کر لی تو یہ زنگ دور ہو کر نور ایمان پھر چمکنے لگتا ہے اور توبہ نہ کی، گناہوں پر استمرار رکھا تو دل پر گناہوں کی گھٹا چھا جاتی ہے، لیکن چونکہ ابھی تک یہ گناہ ومعصیت کو اچھا نہیں سمجھا کرتا ہے، اگر برا سمجھ کر، استمرار علی المعاصی رکھتا ہے، مگر گناہ کو گناہ جانتے ہوئے۔ ایسی حالت میں اصلاح ودرستگی کی امید باقی ہوتی ہے۔ اگر توبہ کر لے گا تو معصیت کی گھٹا چھٹ جائے گی اور آفتابِ ایمان پھر چمکنے لگے گا، لیکن اس سے آگے بڑھ کر جب ہار روک ٹوک گناہ کرنے لگے، گناہ کو گناہ نہ جانے، حرام حلال کا امتیاز اس کے عقیدے سے زائل ہو جائے، عقائد کفر کے لئے اس کا سینہ کھل جائے اور عقائد اسلامیہ سے اس کے دل میں تنگی پیدا ہوتی ہو اور وہ دل سے نور ایمان سے نفرت کرنے لگے تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ اس کے پیشِ نظر حشر نشر، عذاب ثواب، حساب کتاب کچھ نہیں ہوتا۔ دنیوی زندگانی ہی اس کو زندگی نظر آتی ہے۔ آخرت کی زندگی مضحکہ خیز تخیل معلوم ہوتا ہے۔ ایسے آدمی کے دل میں سوچنے سمجھنے کی قوت نہیں رہتی۔ نورِ بصیرت معدوم اور مادۂ اصلاح پذیری مفقود ہو جاتا ہے۔ کانوں سے حق بات نہیں سنائی دیتی، آنکھوں سے صداقت نہیں دکھائی دیتی۔ یہ غفلت کا درجہ ہے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ علم نام ہے دل سے سمجھنے، آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کا۔ جب گوش ہوش بند ہو گئے، آنکھوں پر جہالت کا پردہ پڑ گیا اور دل میں دانش وفقاہت نہ رہی تو اچھا خاصا انسان حیوان مطلق ہو گیا۔ ایسے وقت میں توبہ کی امید بھی ساقط ہو جاتی ہے اور بالآخر غضب الٰہی میں مبتلا ہو کر ایسا آدمی دوامی خسارہ اٹھاتا ہے۔ اسی مطلب کی طرف آیات میں اشارات ہیں۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جو لوگ (اللہ رسول پر) ایمان لانے کے بعد اللہ (رسول) کے ساتھ کفر کریں (یعنی مرتد ہو جائیں) بجز اس (ایماندار) شخص کے کہ جس پر جبر کیا جائے اور (زبردستی اس کی زبان سے کلمۂ کفر نکلوایا جائے اور وہ کفر کا کلمہ تو اپنی زبان سے نکال لے لیکن) اس کا دل نور ایمان سے منور اور حلاوتِ) ایمان سے (پرسکون اور) مطمئن ہو (یعنی اس کے اعتقاد میں کسی قسم کی خرابی نہ آئی ہو تو وہ سزا سے بری ہے) لیکن جو جی کھول کر کفر کرے (اور دل سے بھی کفر کو پسند کرتا ہو) تو ان (سب لوگوں) پر اللہ کا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا (سخت) عذاب (تجویز کیا گیا) ہے۔

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمُ الآیۃ (اور) یہ (عذاب انھیں) اس وجہ سے (دیا جائے گا) کہ انھوں نے آخرت (کی ابدی زندگی) کے مقابلے میں دنیا کی (فانی) زندگی کو پسند کیا اور دنیا کے عیش و آرام میں مبتلا ہو کر آخرت کی کچھ پرواہ نہ کی۔ یعنی جو دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے اور کفر کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں تو) اللہ تعالیٰ (ایسے) کافروں کو (توفیق) ہدایت نہیں عطا فرماتا (اور وہ ضلالت و گمراہی کے گڑھے میں گر کر مستحق عذاب قرار پاتے ہیں)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ الآیۃ۔ یہی ہیں وہ لوگ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اور ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر مہر لگا دی جس کی وجہ سے نہ وہ حق بات کو سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں اور یہی ہیں وہ لوگ جو اپنے انجام بد سے بالکل غافل ہیں۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ اصل بات یہ ہے کہ آخرت میں بھی (عظیم الشان) نقصان اٹھانے والے یہی لوگ ہیں۔

مقصودِ بیان جان تلف ہونے کے یقین کے وقت کلمۂ کفر کو زبان پر لانے کی اجازت بشرطیکہ دل میں ایمان جما ہوا اور کفریہ لفظ کہنے کے وقت اطمینان و یقین راسخ ہو۔ اسلام سے مرتد ہونے والے اور اسلام کے دائرہ میں داخل نہ ہونے والے لایعقل حیوان ہیں نہ سمجھنے کے لئے ان کے پاس دل ہیں نہ پیامِ حق سننے کے لئے کان نہ صداقت کو دیکھنے کیلئے آنکھیں۔ اس سے مسلمانوں کو دراصل تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ اہلِ ارتداد اور کفار کی حالت کو دیکھ کر عبرت پکڑیں اور سمجھیں کہ اسلام اور ضروریاتِ اسلام سے متنفر کرنے والے بے عقل جانوروں کی طرح ہو کر غضبِ الٰہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ دقیق ترین اشارہ اس طرف بھی ہے کہ مسلمانوں کا مرکزِ توجہ صرف آخرت ہونی چاہیے۔ دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینا مسلمان کا شیوہ نہیں وغیرہ۔

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا

جن لوگوں نے ایذا پانے کے بعد ہجرت کی پھر جہاد کیا اور صبر کیا

إِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ يَوْمَ تَأْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ

تو ان اعمال کے بعد تمہارا رب ان کے لئے ضرور بخشنے والا مہربان ہے جس روز کہ ہر شخص اپنی طرف سے جھگڑتا ہوا

ع ۲۰

عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

آئے گا اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا

تفسیر عام اہلِ تفسیر کا خیال ہے کہ یہ آیات گزشتہ آیات کی تتمہ ہیں۔ جن لوگوں کا ان آیات میں تذکرہ ہے، ان سے مراد صہیب، عمار بن یاسر، بلال، عامر بن فہیرہ، ابو فکیہہ اور وہ فقرائے صحابہ ہیں جن کو کفارِ مکہ سخت ایذائیں دیتے تھے اور موقعہ پا کر یہ لوگ مع اہل و عیال ہجرت کر کے مدینہ آگئے، جہادوں میں شریک ہوئے اور ہر مصیبت پر صبر کیا، لیکن صحیح یہ ہے کہ ان آیات کا نزول ابو جندل بن سہیل، ولید بن ولید، سلمہ بن ہشام، عبداللہ بن ابی اسید اور ابو جہل کے رضاعی بھائی عیاش بن ربیعہ وغیرہم کے متعلق ہوا۔ جب کفارِ مکہ کو ان حضرات کے اسلام کی اطلاع ہوئی تو کمبختوں نے ان بیچاروں کو سخت تکلیفیں دینی شروع کیں۔ مجبوراً ان غریبوں کو کفار کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے صورۃً ان کی موافقت کرنی پڑی۔ کچھ دنوں کے بعد مطمئن ہو گئے اور موقع ہاتھ لگا تو مکہ چھوڑ دیا، ہجرت کر کے مدینہ میں آگئے پھر مختلف جہادوں میں شریک ہوئے اور مصائب و تکالیف میں نہایت پختگی سے ثابت قدم رہے۔ گزشتہ آیات میں جن لوگوں کا بیان تھا وہ کسی شرعی جرم کے مرتکب نہ ہوئے تھے وقتی بات تھی جان بچانے کے لئے ان میں سے کسی شخص نے زبان سے کلمۂ کفر کہہ دیا اور دل میں ایمان کو قائم رکھا، لیکن جن لوگوں کا تذکرہ ان آیات میں ہے وہ شرعاً مجرم تھے۔ دل میں ایمان اگرچہ ان کے بھی راسخ تھا، مگر کچھ دنوں تک بظاہر کفار کے ساتھ انھوں نے موافقت رکھی تھی۔ گویا پہلے گروہ کا تقیہ

بہت قلیل مدت کے لئے تھا اور فقط جان بچانے کے لئے تھا اور اس گروہ کا تقیہ زیادہ مدت تک رہا اور نہ فقط جان محفوظ رکھنے کے لئے تھا بلکہ اہل و عیال اور مال کی حفاظت کے لئے بھی تھا اور چونکہ تلف جان کے خطرہ کے علاوہ دیگر مصائب سے بچنے کے لئے کفار کی موافقت جائز نہیں، اس لئے اس گروہ اور اس گروہ کی حالت میں بڑا فرق تھا۔ اسی فرق کو ظاہر کرنے کے لئے لفظ ثُمَّ کا استعمال فرمایا اور گزشتہ غلطی کو معاف کرنے کا اعلان کردیا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جن لوگوں کو سخت شدائد و تکالیف اٹھانی پڑیں اور تکالیف سے تنگ آکر انھوں نے ترک وطن کیا اور پھر راہِ خدا میں جہاد کیا اور اسلام کا بول بالا کرنے کی کوشش میں جو مصائب نمودار ہوئیں سب پر صبر کیا تو اللہ غفور رحیم ہے ان کی غلطی کو اللہ معاف کردے گا۔

اس کے بعد فرماتا ہے۔ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا۔ الخ پھر اے رسول تمہارا پروردگار ان لوگوں کے لئے جنہوں نے طرح طرح کی مصیبتوں اور آئے دن کے فتنوں میں مبتلا ہونے کے بعد ہجرت کی اور پھر اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور باوجود ہر قسم کی تکالیف کے مسلک حق یعنی دین اسلام پر ثابت قدم رہے اور کفر کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ لاریب تمہارا پروردگار ان آزمائشوں کے بعد ان لوگوں کے لئے جو ان میں پورے اترے بہت بخشش کرنے والا اور نہایت مہربان ہے وہ اپنی مہربانی سے ان کے تمام سابقہ گناہ جو حالتِ کفر میں انھوں نے کئے معاف بخش دے گا اور قیامت کے دن ان کے اعمالِ صالحہ کے بدلے بڑے مرتبے دے گا۔

فتنہ، جہاد، ہجرت اور صبر کی ضروری تنقیح

فتنہ کے ہزاروں اقسام ہیں۔ سب سے بڑھ کر فتنہ یہ ہے کہ کفرستان میں سکونت ہو جہاں فرائض اسلام ادا کرنے کی اجازت نہ ہو یا رزق حلال نہ ملے اور ملے تو بغیر ارتکاب معصیت کے نہ ملے۔ اس سے نیچے درجہ میں فتنہ کی سیکڑوں صورتیں ہیں۔ مثلاً اولاد زیادہ اور آمدنی کم ہو، معاش کا دروازہ تنگ ہو جسمانی امراض میں مبتلا ہو، مال و اولاد کی ہلاکت تکلیف دہ ہو، نیک کام کرنے اور بُرا کام نہ کرنے کی تبلیغ نہ کرسکے وغیرہ وغیرہ۔

جہاد کی دو قسمیں ہیں (۱) اس نیت سے کفار سے لڑنا تاکہ توحید الٰہی کی اشاعت ہو، فساد کی بیخ کنی ہو، دنیا میں عام امن پھیل جائے، کوئی کسی پر ظلم نہ کرسکے اور مخلوق الٰہی چین سے زندگی بسر کرے۔ (۲) اللہ کی فرماں برداری میں اپنے نفس سے جنگ کرنا، خواہشات کو قربان کردینا، ہر کام اللہ کے واسطے کرنا، رضائے مولا کے حصول کے لئے اپنے ارادے کو فنا کردینا اور تسلیم کے درجہ میں پہنچ کر اپنی ذات کو معدوم کردینا یہی جہاد اکبر ہے۔

ہجرت کی بھی دو قسمیں ہیں (۱) دار الکفر سے دار الاسلام میں اس ارادے سے جانا کہ وہاں فرائض الٰہیہ کو آزادی کے ساتھ ادا کیا جائے۔ خواہ مکہ سے مدینہ کو ہجرت ہو یا کسی اور کفرستان سے اسلامی ملک میں۔ حدیث میں آیا ہے۔ انا بریٌ من مسلم بین ظهرانی المشرکین یعنی جو مسلمان کافروں میں رہتا ہو حضورؐ نے فرمایا میں اس سے بیزار ہوں۔ (رواہ الطبرانی)

(۲) تمام ممنوعات و مکروہات کو چھوڑ دینا۔ یہاں تک کہ اپنی انانیت و مرضی کو بھی ترک کردینا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کون سی ہجرت افضل ہے؟ فرمایا ان تهجر ما کرہ ربك یعنی جو بات تیرے پروردگار کو ناگوار معلوم ہو اس کو ترک کردینا بہترین ہجرت ہے۔ دریافت کیا گیا کہ حضور مہاجر کون ہے؟ فرمایا من هجر ما نهی الله عنه یعنی جس نے ممنوعاتِ الٰہی کو ترک کردیا وہی مہاجر ہے۔ اس قسم کی ہجرت میں انتقال مکانی کی ضرورت نہیں ہر جگہ اور ہر وقت کوشش کرنے والے کو یہ ہجرت نصیب ہوسکتی ہے۔

صبر کے بھی دو معنی ہیں (۱) ان شدائد و مصائب کو بخوشی برداشت کرنا جو راہِ خدا میں پیش آئیں (۲) ان حدود پر اپنے نفس کو روکنا جہاں اس نے رکنے کی ہدایت فرمائی ہے گویا حد شریعت سے تجاوز نہ کرنے کا نام صبر ہے خواہ نفس کو کتنی ہی تکلیف ہو۔ یہ صبر پہلے صبر سے زیادہ عام اور اہم ہے۔

آیت میں جہاد، ہجرت اور صبر کی کوئی خاص قسم بیان نہیں فرمائی، اس لئے ہر قسم اس کے ذیل میں داخل ہے۔

اس سے آگے فرماتا ہے کہ مجاہدین مہاجرین کی غلطی اللہ ضرور معاف فرمانے والا ہے اور معافی کا ثمرہ ان کو ایسے دن ملے گا جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا سب اپنے اپنے نفس کی فکر میں ہوں گے یا یہ مطلب کہ ہر شخص پر اس کے ہاتھ پاؤں گواہ ہوں گے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آخر آدمی اپنے اعضاء سے کہے گا کمبخت تمہاری طرف سے تو میں جھگڑتا تھا اور تم میرے خلاف گواہی دیتے ہو۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ خدا تعالیٰ عادل ہے ظلم نہیں کرتا، مگر کسی کے قصور کو معاف کر دینا بھی تو ظلم ہے۔ اس سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے مجرم کے جرم سے درگزر کرنا نیکوں کی حق تلفی کے مرادف ہے۔ اس شبہ کو دفع کرنے کے لئے فرماتا ہے کہ کسی کی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ جرم سے زیادہ عذاب بڑھایا نہ جائے گا۔ اسی طرح نیکی کا ثواب کم نہ کیا جائے گا۔ مادی رعایتیں درجہ نیکی بدی کے عوض عذاب معاف کر دینا تو کسی کی حق تلفی نہیں بلکہ اللہ کی رحمت ہے۔

مقصودِ بیان عموماً مصائب کی برداشت ہجرت، جہاد، صبر کی ترغیب۔ ان ضعفائے اسلام کی فی الجملہ مدح جنہوں نے اپنے ایمان کو محفوظ رکھنے اور توحید کو پھیلانے کے لئے گھر بار، وطن، ملک، خاندان سب کو ترک کیا۔ یہاں تک کہ اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑا۔ تن من دھن سے کوشش کی اور حدود شریعت کی پابندی اختیار کی۔ ضمنی طور پر اس امر کی طرف اشارہ کہ مسلمانوں پر جو مصائب آتے ہیں وہ محض اللہ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے، اس لئے ان کو خوشی برداشت کرنا اور دین اسلام پر ثابت قدم رہنا چاہیے وغیرہ

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا

اللہ نے　ایک مثال　بیان فرمائی ہے　ایک　بستی تھی　جو امن چین　میں تھی　اُس کا رزق　اُس کے پاس

رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ

بافراغت　ہر جگہ سے　چلا آتا تھا　لیکن اُس نے　اللہ کی نعمتوں　کی ناشکری کی　تو اُس کے　کرتوت کی وجہ سے اللہ

الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ

نے اُس کو بھوک　اور خوف کا　لباس چکھایا　اُن کے پاس　ایک پیغمبر　انہی میں　کا آیا

فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝

مگر انہوں نے　اس کو جھٹلایا　تو عذاب نے اُن کو آ کر　پکڑ لیا　کیونکہ وہ　ظالم　تھے

تفسیر قَرْيَةً سے کون سا قریہ مراد ہے؟ اس کے متعلق مفسرین کا اختلاف ہے۔ بیضاوی، قرطبی، زمخشری وغیرہ کے نزدیک کوئی خاص قریہ مراد نہیں ہے جس قریہ کے اوصاف ایسے ہوں جو آیت مذکورہ میں بیان کئے گئے ہیں، اس پر مثل کا انطباق ہو سکتا ہے۔

ابن عباس اور عوفی کے نزدیک مکہ مراد ہے اور اہلِ مکہ کے حق میں ہی آیت کا نزول ہوا ہے۔ دراصل اختلاف اس بات میں ہے کہ یہ آیت مدنی ہے یا مکی۔ جو لوگ مدنی ہونے کے قائل ہیں اُن کے نزدیک قریہ سے مراد مکہ ہے اور اہلِ مدینہ کو مکہ والوں کا قصہ سنا کر ہدایت کی گئی ہے کہ تم ان کی طرح نہ ہو جانا اور جن لوگوں کے نزدیک آیت مکی ہے ان کے نزدیک قریہ سے مراد مکہ نہیں بلکہ بطور تمثیل اہل مکہ کو تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ اگر تمہاری بھی یہی حالت رہی تو جس طرح گزشتہ ممالک کو ان کی ناشکری اور تکذیب کی وجہ سے ہلاک کر دیا اسی طرح تم کو بھی برباد کر دیا جائے گا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ گزشتہ زمانہ میں بعض بستیاں ایسی تھیں کہ ان کے رہنے والوں کو اطمینان و چین کے ساتھ بافراغت ہر طرف سے آسائش کی روزی ملتی تھی، لیکن جب انھوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی، اس کی ربوبیت میں دوسروں کو شریک بنایا اور جو نبی ان کی ہدایت پر مامور ہوئے ان کی تکذیب کی تو خدا تعالیٰ نے ان کو برباد کر دیا۔ دشمن کا خوف اور فقر و فاقہ کی تکلیف ہر وقت چاروں طرف سے ان کو محیط ہو گئی۔ ایسا حال بہتیری بستیوں کا ہے، مگر یہاں اہل مکہ پر اس حالت کا انطباق ہوتا ہے۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک اہلِ مکہ بافراغت زندگی بسر کرتے تھے۔ عام ملک عرب میں تجارت کمیاب تھی، مگر مکہ والے بڑے بڑے تاجر تھے۔ ملک میں عمومی طور پر امن مفقود تھا۔ ہر وقت خوں ریزی ہوتی تھی، مگر مکہ والے اس سے بے خوف تھے، لیکن انھوں نے الوہیت و ربوبیت میں دوسرے باطل معبودوں اور جھوٹے دیوتاؤں کو شریک کیا تو ان کی ہدایت کے لئے خدا تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا مگر انھوں نے ایک نہ سُنی، حضورؐ کی نبوت کی تکذیب کی، بالآخر قحط سالی کی سخت بلائیں پڑ رہے سات برس تک مبتلا رہے اور چونکہ روز بروز اسلام کا غلبہ نظر آرہا تھا، اس لئے ہر وقت مسلمانوں کا خوف سینے پر سوار رہتا تھا۔

مقصودِ بیان خدا تعالیٰ ظالم نہیں رحیم ہے۔ بندوں کو باوجود معصیت کے فارغ البالی کے ساتھ نعمت عطا فرماتا ہے، لیکن جب مخلوق احسان کا بدلہ ناشکری سے کرتی ہے تو اس سے نعمت چھین لی جاتی ہے۔ اس قانون میں مسلمانوں کو درپردہ تنبیہ ہے کہ عنقریب خدا تعالیٰ تم کو اپنی نعمتوں سے سرفراز فرمائے گا۔ تمہارا فرض ہے کہ شکر ادا کرو۔ اگر ناشکری کرو گے تو ہر نعمت تم سے چھین لی جائے گی اور فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا مسلمانوں کو انتہائی ترقی ملی پھر ناشکری اور باہم جنگ و جدال اور فساد کی وجہ سے چھین لی گئی۔ اب دنیا میں سب سے زیادہ مفلس قوم مسلمان ہے اور سب سے زیادہ دشمنوں کا خطرہ بھی انھیں کو ہے۔

فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ

تم خداداد رزق میں سے حلال پاک کھاؤ اور اگر تم اُسی کی عبادت کرتے ہو تو اللہ کا

اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ

شکر کرو اللہ نے تم پر صرف مُردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور وہ چیز

وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ

جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو حرام کیا ہے مگر ہاں جو شخص مجبور ہو مگر نہ عدول حکمی کرنے والا ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اللہ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ

غفور رحیم ہے تم لوگ اپنی زبانوں کی دروغ بافی سے یہ بات نہ کہو کہ یہ حلال ہے

وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ

اور یہ حرام ہے کہ تم اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہو جو لوگ اللہ پر دروغ بندی کرتے ہیں

الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۭ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

اُن کا بھلا نہیں ہوتا تھوڑا سا فائدہ ہوتا ہے مگر اُن کے لئے دردناک عذاب ہے

تفسیر اوپر کی آیات میں کفار کو نعمت دینا پھر ان کی ناشکری کرنا اور ناشکری کے سبب نعمت کا زائل ہونا بیان فرمایا تھا۔ ان آیات میں امتِ محمدیہ کو خطاب کر کے بطور احسان، اپنی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتا ہے، مگر چار باتوں کی خاص ہدایت فرماتا ہے:۔

(۱) مشتربے مہار نہ بن جاؤ کہ حرام حلال کا امتیاز اٹھا دو اور جو سامنے آجائے کھا جاؤ یہ افراط ہے۔
(۲) اپنی طرف سے تحلیل و تحریم نہ کرو۔ ایسا ہرگز نہ کرو کہ خود ساختہ تحریم و تحلیل کو خدا کی طرف غلط منسوب کر کے لوگوں کو دھوکہ دو۔
(۳) اللہ کی نعمتوں کو کھاؤ پیو مگر شکر بھی ساتھ ساتھ کرو۔ یعنی دوسرے کو رب نہ جانو۔ ربوبیت میں کسی دوسرے کو اللہ کا شریک نہ کرو۔ اللہ کے سوا کسی غیر کے نام پر نہ تو جانور کو ذبح کرو نہ کسی جانور کو نامزد کرو۔ یہ سب ناشکری کے اقسام ہیں۔
(۴) خدا نے جن جانوروں کو حرام کر دیا ہے ان کو نہ کھاؤ۔ ہم ذیل میں کسی قدر تفصیل کرنا چاہتے ہیں:۔
دنیا میں دو قسم کی چیزیں ہیں مضر اور مفید۔ مثلاً گائے کا گوشت، بکری کا گوشت، سور کا گوشت۔ سور کا گوشت غیر مفید ہے، گائے کا گوشت مفید ہے اور بکری کا گوشت اس سے زیادہ مفید ہے۔ بکری کے گوشت میں ۷۲ فی صدی مائیت ہے اور روغنی اور تعمیری اجزا ہیں۔ گائے کے گوشت میں ۷۴ فی صدی مائیت اور باقی روغنی حصہ ہے۔ سور کے گوشت میں ۴۲ فی صدی مائیت اور ۶ فی صدی روغن ہے۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں جو چوتھے درجہ میں گرم یا سرد یا تر یا خشک ہیں وہ سب عموماً صحت کو تباہ کرنے والی ہیں۔ سنکھیا وغیرہ اسی قسم کی چیزوں میں داخل ہے۔ شریعت اسلامیہ میں تمام غیر مفید چیزوں کا کھانا حرام کر دیا گیا ہے:۔
پھر حلال چیزوں میں بھی دو قسمیں تھیں ایک تو وہ جو واقعی حلال ہیں، مگر کسی خارجی وجہ سے ان میں حرمت پیدا کر دی گئی ہو۔ مثلاً گائے کا گوشت حلال ہے، مگر غیر اللہ کے نام پر اگر کوئی گائے ذبح کی جائے تو اس کا گوشت حرام ہے۔
دوسری قسم وہ ہے جو فی الواقع بھی حلال ہو اور خارجی حرمت سے بھی پاک ہو۔ سیال یا بستہ خون حرام ہے۔ اس سے جسمانی ضرر پیدا ہوتے ہیں مردار میں سمیت ہوتی ہے۔ خون اندر بند ہو کر زہر پھیلا دیتا ہے، رگوں سے خارج نہیں ہوتا، اس لئے حرام ہے۔ شراب خانہ خراب کے نقصانات تو اب بالکل نمایاں ہو کر چلے جاتے ہیں۔ علاوہ ہوش حواس کی بربادی کے جگر کی خرابی پھیپھڑوں کی تباہی، خون کا انتراق، ڈلیونیا، صرع سکتہ اور نسل سے محرومی۔ یہ تمام نتائج اس متعفن عرق کے ہیں۔ غیر اللہ کا نام جس جانور پر پکارا جائے اور اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے نام پر نامزد کر دیا جائے تو خارجی حرمت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر ان چیزوں کو شریعت نے حرام کر دیا جو لوگ کوتاہ فہم ہیں وہ تعجب کرتے ہیں کہ اسلام جو عقل کے مطابق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اس میں بعض چیزوں کو حلال اور بعض حرام کیوں کر دیا ہے؟ درحقیقت یہ ان کی کم فہمی ہے۔ اگر کیمیکل تحلیل کی جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ جن چیزوں کی اسلام کے نزدیک واقعی حرمت ہے وہ انسانی صحت کو نقصان پہنچانے والی ہیں۔ اب ہم آیات کا تجزیہ کر کے تشریح کرتے ہیں:۔
فَكُلُوا میں خطاب کس کو ہے؟ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو ہی ہے۔ کیونکہ احکام شرعیہ کو ماننے کے مکلف مسلمان ہی ہیں۔ وہ کفار جو سرے سے ایمان ہی نہیں رکھتے ان کو احکام اسلامی پر مکلف کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ کفار کو خطاب ہے کیونکہ مسلمان اپنی طرف سے تحریم و تحلیل نہیں کرتے تھے بلکہ کفارِ عرب کرتے تھے۔ سائبہ اور بحیرہ وغیرہ جانور بنا کر وہی چھوڑتے تھے۔
حَلٰلًا طَيِّبًا میں طیبًا کی قید کی کیا ضرورت تھی اور طیب و غیر طیب کی کیا تشریح ہے؟ اس کو سمجھنے کے لئے احادیث کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ مختصر یہ کہ ناپاکی اور گندگی دو قسم کی ہوتی ہے جسمانی اور روحانی۔ جسمانی ناپاکی تو یہ کہ وہ چیز گندی ہو، شستہ طبیعت رکھنے والے اس سے نفرت کرتے ہوں۔ مثلاً خون لہو، پیشاب، سور کا گوشت، ہر قسم کے درندے، پنجوں اور چنگل سے شکار کرنے والے پرندے، زمین کے کیڑے مکوڑے وغیرہ۔ بہرحال جسمانی نجاست رکھنے والی چیزوں کو کھانے سے چونکہ اخلاق، عادات اور صحتِ جسمانی پر برا اثر پڑتا ہے، اس لئے ان کو کھانا حرام کر دیا گیا۔ روحانی نجاست کے یہ معنی ہیں کہ بظاہر تو اس میں ناپاکی کا کوئی اثر نہ ہو، مگر اندرونی اور باطنی طور پر اہل عقل کے نزدیک وہ روح کو تاریک کر دینے والی ہو۔ مثلاً وہ چیزیں یا جانور جن کو غیر اللہ کے نام پر چھوڑا یا ذبح کیا گیا ہو۔ طیبًا کی قید لے ہر قسم کی جسمانی نجاست رکھنے والی چیزوں کو کھانے کی ممانعت کر دی۔
وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ کی تشریح کے متعلق اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے۔ عام اہل قرآن کہتے ہیں کہ جن جانوروں کو ذبح کرنے کے وقت خدا کے

علاوہ کسی اور کا نام لیا گیا ہو یعنی خدا کے سوا کسی دوسرے کے نام پر ذبح کیا ہو اس کی حرمت کی صراحت اس آیت میں ہے ، لیکن ہمارے شیخ الشیوخ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے تفسیر عزیزی میں اس کا مفہوم مطلق لکھا ہے ۔ یعنی جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو خواہ ذبح کے وقت لیا گیا یا ذبح سے پہلے کسی کے نام پر نامزد کیا گیا ہو ۔ میرے نزدیک یہی تفسیر صحیح ہے کیونکہ کوئی آیت یا حدیث تخصیص کرنے والی موجود نہیں ۔ پھر اہلال (پکارنا) سے ذبح کے وقت اہلال مراد لینا نسخ آیت ہے جو اپنی رائے سے جائز نہیں ۔ بلکہ اگر شاہ صاحب کے بیان کردہ مطلب سے بھی زیادہ عموم لیا جائے تو اور بھی مناسب ہے ۔ یعنی ہر وہ چیز جس پر اللہ کے سوا اور کسی کا نام لیا گیا ہو اور خدا کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے نام پر نامزد کر دیا گیا ہو اس کا کھانا اور استعمال کرنا قطعی حرام ہے ۔ مثلاً مدار صاحب کا بکرا ، خواجہ صاحب کے کونڈے ، اگسی شیطان ، خبیث یا بت پر چڑھائے ہوئے نذرانے ، قبروں پر چڑھائے ہوئے مانڈے وغیرہ سب کھانا اور استعمال کرنا حرام ہے ۔

چند فقہی مسائل

(۱) ذبح کے وقت اللہ کے نام کے ساتھ دوسرے کا نام ملا دیا جائے تو ذبیحہ حرام ہے ۔

(۲) نظام نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں اس بات پر اجماع علماء نقل کیا ہے کہ جو شخص اپنے ذبیحہ سے اللہ کے سوا دوسرے کا تقرب حاصل کرنا چاہے وہ مرتد ہو جائے گا اور اس کا ذبیحہ حرام ہو جائے گا ۔ حدیث میں آیا ہے ملعون ہے وہ شخص جس نے اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا ۔

(۳) اگر کسی جانور کو غیر اللہ کے نام پر نامزد کیا ، مگر پھر ذبح سے پہلے توبہ کر لی اور اللہ کے نام پر اس کو ذبح کر دیا تو ذبیحہ حلال ہے ۔

مقصود بیان

رَزَقَكُمُ اللّٰهُ کے ساتھ حَلٰلًا طَيِّبًا کا لفظ بتا رہا ہے کہ جو حرام ہے وہ بھی رزق ہے ورنہ حلال کی قید بے کار ہے ۔ اس سے فرقہ معتزلہ کے اس قول کی تردید نکلتی ہے جس میں انھوں نے حرام ہونے کو رزق سے خارج کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ نے حلال ہی کو رزق بنایا ہے ۔ تفصیل کے واسطے علم کلام کی کتابوں میں دیکھو ۔ لفظ اِنَّمَا حصر پر دلالت کرتا ہے یعنی حرام یہی چار چیزیں ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کے سوا اور سب چیزیں حلال ہیں ۔ کیونکہ حصر حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے یعنی ان چیزوں میں سے جن کو اہل عرب حلال اور پاک خیال کرتے تھے یہ چار چیزیں حرام ہیں ۔ رہے دوسرے ممنوعات مثلاً چوری ، زنا ، رشوت ، خیانت ، غبن وغیرہ اور درندے یا شکاری پرندے ان کی حرمت قرآن پاک کی دوسری آیات اور احادیث سے ثابت ہے ۔

آیت فَمَنِ اضْطُرَّ الخ دلالت کر رہی ہے کہ اگر بھوک سے ہلاکت یا سخت بیمار پڑ جانے کا اندیشہ ہو یا کوئی اور سخت ترین مجبوری ہو تو بقدر بقائے زندگی حرام چیز کا کھا لینا جائز ہے ، لیکن ضرورت زندگی یا اندیشہ مرض کی حاجت سے آگے بڑھنا اور اس سے زیادہ کھانا کسی طرح جائز نہیں ۔ آیت وَلَا تَقُوْلُوْا میں صراحت ہے کہ انسان بغیر امر الٰہی اپنی طرف سے حلال و حرام کرنے کا مجاز نہیں ۔ تحریم و تحلیل اللہ کا فعل ہے ۔ اس میں ان جاہل مدعیان تصوف کے لئے عبرت ہے جو خود بخود بعض چیزوں کو اپنے اور اپنے مریدوں کے لئے حرام قرار دیتے ہیں ان کو خوب سمجھ رکھنا چاہئے کہ یہ سراسر حکم قرآنی کے خلاف بلکہ کفر ہے ۔ تحریم و تحلیل کا حق صرف شارع کو ہے ۔ شارع کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا ۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ

یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کر دی تھیں جو تم کو پہلے بتا چکے

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○ ثُمَّ اِنَّ

ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے جن لوگوں نے

رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُوا السُّوٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوا مِنۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ

نادانستہ　گناہ کیا　پھر اس کے بعد توبہ کرلی　اور حالت درست

اَصْلَحُوٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنۢ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

کرلی　تو ان باتوں کے بعد تمہارا رب ضرور بخشنے والا مہربان ہے

ع ۱۵ / ۲۱

تفسیر آیاتِ مذکورہ میں ان چیزوں کی تفصیل تھی جن کو کھانا امتِ اسلامیہ کے لئے حرام کردیا گیا ہے۔ خیال ہو سکتا تھا کہ حرمت کی علت ہے نجاست اور نجاست یا جسمانی ہوتی ہے یا روحانی۔ جن چیزوں میں نجاست جسمانی یا روحانی تھی خدا تعالیٰ نے ان کو حرام کردیا۔ لیکن گزشتہ اقوام کے لئے بعض ایسی چیزیں حرام کردی گئی تھیں جو مسلمانوں کے لئے حرام نہیں کی گئیں۔ مثلاً یہودیوں پر کھُر والے جانور اور گائے بکری کی چربی حرام تھی۔ ظاہر ہے کہ تحریم کی علت یا تو نجاست نہیں یا بعض اور گندی چیزیں بھی مسلمانوں کے لئے حلال کردی گئی ہیں۔ اس شبہ کا ازالہ ان آیات میں فرمایا ہے:-

حاصل ارشاد یہ ہے کہ تحریم تین قسم کی ہے قسم اول تو ان چیزوں کی تحریم ہے جو نجس اور معضرت رساں ہیں۔ صحت جسمانی، اخلاق یا عقائد کو تباہ کرنے والی ہیں۔ قسم دوم وہ عارضی تحریم ہے جو گھنٹہ بھر یا دن تک جاری رہتی ہے اور مقررہ وقت کے بعد پھر اصل علت آجاتی ہے۔ اس تحریم کی علت نجاست نہیں۔ بلکہ یہ ایک قسم کی ریاضت اور ورزش ہوتی ہے۔ چند گھنٹوں تک نفس کے زور کو توڑنا مقصود ہوتا ہے۔ انسانی خواہشات کو کمزور کرکے روحانی قوت پیدا کرنے کی غرض ہوتی ہے۔ مثلاً فرض روزہ کی حالت میں ہر قسم کا کھانا پینا حرام ہے تاکہ دن بھر نفس اپنی خواہشات اور مرغوبات کو ترک کردے اور مادی قوتوں کی حد سے بڑھی ہوئی سرکشی ٹوٹ جائے۔ قسم سوئم وہ تحریم ہے کہ معصیت اور سرکشی کی سزا میں خدا تعالیٰ بعض چیزوں کو کھانے یا استعمال کرنے سے منع فرمادے۔ اس تحریم کی علت بھی نجاست نہیں ہوتی بلکہ اقوام یا افراد کی سرتابی اور حدود شرعیہ سے طغیان سخت حکم نازل ہونے کا باعث ہوتا ہے۔ پہلی دونوں قسمیں امتِ اسلامیہ کے لئے ہیں۔ اللہ نے اپنی مہربانی سے ہر معضرت رساں ناپاک چیز سے ان کو روک دیا، اور روحانی ریاضت کے لئے ایک ماہ کے روزے مقرر فرمادیے۔ تحریم کی آخری قسم یہودیوں کے لئے تھی۔ یہودیوں نے جب احکامِ الٰہی سے انتہائی سرکشی کی کتاب الٰہی اور فرمانِ نبوی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی جہالت و بربریت کے اقتضاء کے موافق عمل کرتے رہے تو خدا تعالیٰ نے اپنی بعض نعمتوں سے ان کو حکماً محروم کردیا اور سزا دینے کے لئے بعض حلال چیزیں ان پر حرام کردیں۔ اس قسم کے محرمات کی تفصیل سورۂ انعام میں گزر چکی ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ یہودیوں پر جو چیزیں حرام کردی گئی تھیں ان کا ذکر سورۂ انعام میں ہم کرچکے ہیں۔ یہودیوں کے لئے ان چیزوں کی حرمت بطور سزا کے تھی چونکہ انھوں نے کفرانِ نعمت کیا تھا۔ احکامِ الٰہی کے مقابلے میں خودرائی اور سرکشی کرتے تھے، اس لئے ہم نے بھی ان کی تکلیف بڑھادی۔ یہ اضافہ تکلیف ہماری طرف سے ظلم نہ تھا بلکہ ان کے کرتوت کی پاداش تھی۔

یہاں ایک وہم پیدا ہوسکتا تھا کہ جب یہودیوں کی سرکشی و معصیت سے خدا تعالیٰ نے درگزر نہ فرمائی اور دنیا ہی میں ان پر سختی کردی تو پھر مسلمان گنہگاروں کو یقیناً معافی سے مایوس ہوجانا چاہیئے۔ ان کے گناہوں کی پاداش ملنی بھی یقینی ہے۔

اس شبہ کے ازالہ کے لئے ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ سے رَّحِيمٌ تک پوری آیت نازل فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ نادانستہ گناہ کر بیٹھیں اور پھر سچے دل سے توبہ کرلیں اور اخلاص سے توبہ کرنے کی علامت یہ ہے کہ دوبارہ وہ گناہ نہ کریں بلکہ اعمال درست کرلیں تو خدا چونکہ غفور رحیم ہے اس لئے ان کی توبہ قبول فرمائے گا اور مواخذہ نہ کرے گا۔

آیت مذکورہ میں تین امور قابلِ تنقیح ہیں (۱) نادانی سے کئے ہوئے گناہ کی توبہ قبول ہوسکتی ہے۔ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص قصداً گناہ کرے تو اس کی توبہ ناقابل قبول ہے۔ حالانکہ آیت وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ الخ صاف بتارہی ہے کہ اگر کسی نے جان کر بھی برائی کی ہے اور مرنے سے پہلے

توبہ کرلی تو وہ بھی مقبول ہے۔ جمہور علماء کا اتفاق بھی اسی امر پر ہے کہ گناہ قصداً ہو یا بلا قصد ہر ایک کی سچی توبہ مقبول ہوتی ہے۔
اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ہر طرح کا گناہ سچی توبہ کے بعد معاف ہو جاتا ہے اور آیت کا مطلب بھی یہی ہے کیونکہ کوئی گناہ بغیر نادانی کے نہیں ہوتا۔ گناہ کرنا بھی نادان کا کام ہے۔ عقلمند عقل رکھتے ہوئے گناہ نہیں کرسکتا۔ جو علماء گناہ کرتے ہیں گناہ کا ارتکاب کرتے وقت ان کی عقل و علم پر غفلت و جہالت کے پردے پڑ جاتے ہیں۔ بظاہر دنیا ان کو عالم جانتی ہے، مگر وقت عمل میں وہ جاہل ہوتے ہیں، اس لئے قصداً اور غیر قصداً کا سوال ہی آیت سے پیدا نہیں۔ شیخ الشیوخ حضرت سہل نے نکات قرآنی کے ذیل میں اسی مطلب کی صراحت کی ہے۔

(۲) لغت میں توبہ کے معنی ہیں رجوع کرنا اور لوٹنا۔ بندہ اگر اپنے گناہ سے لوٹ جائے اور رجوع کرلے تو اس کو تائب کہا جاتا ہے۔ اللہ اگر ناراضی سے رضامندی کی طرف اور عذاب سے ثواب کی جانب رجوع فرماتے تو اس کو توّاب کہتے ہیں۔ توبہ کا اظہار قول و فعل سے ہوتا ہے، مگر وہ اصل دل سے توبہ ہوتی ہے گویا دل سے گناہ نہ کرنے کا عہد کیا جائے اور اعمال و اقوال سے اس کا مظاہرہ کیا جائے تو ایسے شخص کو تائب کہا جاتا ہے کبھی اظہار کا موقعہ نہیں ملتا۔ مثلاً دل سے توبہ کرنے کے بعد ناگہانی طور پر فوراً کوئی شخص مرجائے تو اگرچہ اس کو اپنی توبہ کے ظاہر کرنے کا وقت نہ ملا، مگر عند اللہ وہ تائب قرار پائے گا۔

(۳) توبہ کے بعد اصلاح عمل بشرط قدرت ضروری ہے۔ توبہ کرنے والے کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنی حالت کی اصلاح کرلے۔ اگر کفر سے توبہ کی ہے تو پھر اس گناہ کا ارتکاب نہ کرے، اصلاح کا باب بہت وسیع ہے۔ قول فعل اعتقاد ہر ایک کی اصلاح کو یہ لفظ شامل ہے۔ عبادات ہوں یا معاملات، حقوق الٰہی ہوں یا حقوق عباد ہوں یا اپنے نفس کے حقوق سب کے اندر اصلاحی جذبہ کارفرما ہونا چاہیئے۔

مقصود بیان یہودیوں پر بعض چیزوں کی حرمت بطور سزا کے تھی۔ گناہ کرنا نادانوں کا کام ہے۔ ہر قسم کا گناہ توبہ کے بعد معاف ہوسکتا ہے۔
آیت میں توبہ و اصلاح کی ترغیب صراحۃً ہے اور اس کا ضمنی تذکرہ ہے کہ اسلام اصلاحی مذہب ہے۔ ہر قسم کی اصلاح کو پسند کرتا ہے۔ امن عالم کو تباہ کرنے والی اور دنیا میں فساد کرنے والی باتوں سے روکتا ہے وغیرہ۔

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِیْفًا ؕ وَ لَمْ یَكُ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۲۰﴾

بیشک ابراہیم　پیشوا　اللہ کے فرماں بردار　اور حق کے طرفدار تھے　مشرکین میں　سے　نہ تھے

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَ هَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۲۱﴾ وَ اٰتَیْنٰهُ

اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے　اللہ نے ان کو انتخاب کرلیا تھا　اور سیدھی　راہ پر　چلایا تھا　ہم نے اُن کو

فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً ؕ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۲۲﴾ ثُمَّ اَوْحَیْنَاۤ

دنیا میں　بہتری　عطا کی تھی　اور آخرت میں تو　بلاشک　وہ اچھے　لوگوں میں　سے ہوں گے　(اے محمدؐ) پھر ہم نے

اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۲۳﴾

تمہارے پاس　وحی بھیجی　کہ ابراہیم کے دین پر چلو جو ایک کے ہو رہے تھے　اور　مشرکوں میں　سے　نہ　تھے

تفسیر: کفار مکہ اگرچہ بت پرست مشرک تھے، لیکن کعبہ کو مانتے تھے اور چونکہ کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ نے کی تھی، اس لئے حضرت ابراہیمؑ

کو بھی اپنا پیشوا جانتے تھے اور مدعی تھے کہ ہم ابراہیم علیہ السلام کے پیرو ہیں۔ اس دعوے کی تغلیط و تکذیب کے لئے ان آیات کا نزول ہوا کہ بے شبہ ابراہیمؑ لوگوں کے امام و پیشوا تھے اور اپنے اللہ کے سچے فرماں بردار تھے اور سب بتوں سے کنارہ کشی اختیار کر کے ہمہ تن اللہ ہی کی طرف مائل ہو گئے تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔ اور نیز وہ اس کی نعمتوں کے شکرگزار تھے) لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کو برگزیدہ کیا اور دین کا سیدھا راستہ ان کو بتایا اور ہم نے دنیا میں بھی ان کو خیر و برکت مرحمت فرمائی تھی اور بے شبہ وہ آخرت میں بھی ہمارے نیک اور بڑے مرتبہ والے بندوں میں سے ہوں گے پھر ابراہیمؑ کے بعد جب ہم نے تم کو نبی بنا کر بھیجا تو ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ تم مذہب ابراہیم کی پیروی کرو جو سب بتوں سے منہ موڑ کر خدائے واحد کی طرف مائل ہو گئے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔

اُمت کے معنی کی تنقیح

امت کے معنی میں اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ عربی زبان والے عالم کو امت کہتے ہیں اور جس شخص میں تمام خوبیاں جمع ہوں اس کو بھی امت کہا جاتا ہے۔ واحدی کا قول ہے یہاں امت کے معنی ہیں معلمِ خیر۔ ابن کثیر کا بھی یہی قول ہے۔ ابن مسعود نے وضاحت فرما دی کہ معاذ بن جبلؓ امت یعنی معلم خیر تھے (رواہ الشعبی) ابن عمر نے فرمایا امت کے معنی معلم دین کے ہیں۔ قتادہ کا قول ہے کہ امت کے معنی امام، ہادی۔ مجاہد کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ ہی ابتدائی عہد میں تمام مشرکوں کے مقابلہ میں موحد تھے، اس لئے ان کو ایک گروہ قرار دیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی معنی کے تحت فرمایا تھا کہ زید بن عمرو بن نفیل کو اللہ تعالیٰ تنہا بجائے ایک اُمت کے (قیامت کے دن) اٹھائے گا (کیونکہ زید اپنے زمانے میں تنہا موحد تھے)

خدا تعالیٰ نے ان آیات میں حضرت ابراہیمؑ کے آٹھ خصوصی اوصاف بیان فرمائے۔ ہم آٹھوں اوصاف کی تشریح ذیل میں کرتے ہیں۔ جب خدا تعالیٰ کسی کو حق و باطل کی قوتِ امتیاز عطا فرما کر سیدھا راستہ بتا دیتا ہے اور وہ کج روی چھوڑ کر راہِ مستقیم پر پڑ جاتا ہے تو اس زمانے کے تمام انسانوں سے آگے بڑھ کر سب سے اونچی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ اس زمانے کے تمام انسانوں میں سے خدا تعالیٰ اس کو چن لیتا ہے اور انتخاب فرما کر اس کی چشمِ بصیرت میں روشنی عطا کر دیتا ہے۔ اس وقت اس کو خیر و شر اور حق و باطل کی تفصیل کا علم ہو جاتا ہے اس کو نظر آتا ہے کہ کل عالم ایک نظام، ایک قانون اور ایک خود مختار صاحبِ علم و ارادہ کارساز بے نیاز کے زیرِ اثر چل رہا ہے۔ ہر چیز اس کی مسخر ہے اور کسی شے کا وجود بغیر حکمت و مصلحت کے نہیں۔ انعاماتِ روحانی اور فیوضِ جسمانی کی بارش اسی ابر ریزاں سے ہوتی ہے۔ تخلیق کائنات کا اصلی باعث وجودِ انسانی ہے۔ اسی کے لئے کارساز حقیقی نے ہر چیز پیدا کی ہے۔ اسی مرتبہ پر پہنچ کر وہ ہمہ تن شکرگزار بن جاتا ہے۔ ہاتھ، پاؤں، اعضائے جسمانی، قوتِ گویائی، تصوراتِ دماغی اور تصدیقاتِ قلبی کو واحدِ مطلق کی نعمتوں کی شکرگزاری میں ہر وقت لگا دیتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر اللہ سے اس کا باطنی تعلق ٹوٹ کر ایک معبود سے رشتہ جُڑ جاتا ہے۔ وہ ہر باطل سے رُخ پھیر کر فقط واحد قہار کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اس کے ہر حکم کا تابع اور ہر ایماء و اشارہ کی تعمیل کرنے والا بن جاتا ہے۔ اس کی رگ رگ اور بال بال ہمہ تن فرماں پذیر بن کر قوتِ مجسم ہو جاتی ہے۔ اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ تمام خصائلِ حمیدہ، شمائلِ پسندیدہ اس کے اندر جمع ہو جاتے ہیں۔ خود بھی چونکہ ہدایت پر ہوتا ہے، اس لئے دوسروں کو بھی روشن راستہ بتاتا ہے۔ ہر نیکی کی تعلیم دیتا ہے۔ شرائع الٰہیہ کا درس دے کر کل دنیا کا امام ہو جاتا ہے۔

ہماری اس تقریر سے تمام اوصاف مذکورہ کا باہم ارتباط ہو گیا۔ ہر پہلی صفت پچھلی صفت کا نتیجہ ہے۔ اس سے آگے حضرت ابراہیمؑ کا اجرِ دنیوی اور ثوابِ اخروی کی صراحت کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ اے محمد! ہم نے تم کو بھی ابراہیم کی پیروی کرنے کا حکم دیا، لیکن انبیاء کے لئے چونکہ دوسرے کی تقلید حرام تھی، اس لئے صاف فرما دیا کہ ابراہیم کی پیروی کرو یعنی جس طرح غیر اللہ کو چھوڑ کر ہر باطل سے منہ موڑ کر خدا کی طرف ہو گئے تھے اسی طرح تم بھی ہر غیر کے خیال کو ترک کر کے معبودِ حقیقی سے تعلق جوڑ لو۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ کفارِ مکہ کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ ہم ابراہیمؑ کے پیرو ہیں کیونکہ پیروی کا ثبوت عمل سے ہوتا ہے، قول سے ہوتا ہے، عقیدہ سے ہوتا ہے ان کا نہ عقیدہ ابراہیمؑ کے عقیدے کی طرح ہے نہ قول و فعل میں مشابہت ہے پھر فقط دعویٰ ہی دعویٰ کرنا محض غلط ہے۔ ہاں ملتِ اسلامیہ کی تعلیم ضرور شریعتِ ابراہیمی کی طرح ہے۔ شریعت غراء انہیں عقائد اور انہیں اصول اعمال کی ہدایت کرتی ہے جو ابراہیمؑ کا شعار تھے۔

مقصودِ بیان کفارِ مکہ کے خیال کی تردید۔ حضرت ابراہیمؑ کے آٹھ اوصاف کا بیان۔ اس امر کی صراحت کہ شریعت اسلامیہ اصول اعتقاد میں ملتِ ابراہیمیہ کے موافق ہے۔ اس بات کی طرف ضمنی اشارہ کہ اتباع کے معنی ہیں عقائد و اعمال میں اتحاد و یکانگت۔ آیات میں تلمیح ہے اس امر کی جانب کہ ناحق سے روگردانی کر کے حق کی طرف مائل ہونے سے دنیوی اجر کے علاوہ دنیا میں بھی ہر قسم کی بھلائی نصیب ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر مسلمانوں کو دنیوی کامرانی و خوشحالی حاصل کرنی ہے تو ان کو دنیا کے تمام باطل سہاروں کو چھوڑ کر اللہ کی طرف جھک جانا چاہئے وغیرہ۔

إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَإِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ

ہفتہ کے دن کی عظمت تو صرف اُن لوگوں پر لازم کی گئی تھی جنھوں نے اختلاف کیا تھا قیامت کے دن تمہارا رب اُن کے باہم اُس

يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ○

بات کا فیصلہ کر دے گا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے

تفسیر جب مسلمانوں نے دعویٰ کیا کہ ہمارا مذہب ملتِ ابراہیمی کے موافق ہے اور ہم ابراہیمؑ کو اپنا پیشوا مانتے ہیں تو یہودیوں نے اعتراض کیا آپ لوگ طریقۂ ابراہیمی سے علیحدہ ہیں کیونکہ ابراہیمؑ کی شریعت میں ہفتہ کا دن قابلِ عظمت مانا جاتا تھا۔ آپ نے سنیچر کی عظمت کو ترک کر کے جمعہ کا دن مقرر کیا۔ اس اعتراض کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یوم السبت کی تعظیم کی ضروری مختصر تنقیح کر دی جائے۔ شریعتِ موسوی میں جمعہ کا دن قابلِ عظمت قرار دیا گیا تھا اور اس دن کو مخصوص عبادت کا دن مقرر کیا گیا تھا، لیکن یہودیوں نے اس مسئلہ میں باہم جھگڑا کیا اور سوائے چند افراد کے سب نے کہا ہم تو سنیچر کے دن کی تعظیم کریں گے جس میں حق تعالیٰ مخلوق کو پیدا کر کے فارغ ہوا۔ اس درخواست پر ہفتہ کی تعظیم لازم کر دی گئی (رواہ مجاہد) لیکن مدت کے بعد جب حضرت عیسیٰؑ کا دور آیا تو عیسائیوں نے باوجود پوری بائیبل (توریت و انجیل) پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنے کے یوم السبت کی تعظیم سے انکار کر دیا اور اپنی عبادت خصوصی کے لئے تعطیل کا دن اتوار کو قرار دیا پھر شریعتِ اسلامیہ کا دور آیا بائیبل کے احکام منسوخ ہو گئے۔ ہفتہ کی عظمت بھی مفقود ہوئی۔ یوم عظمت و عبادت جمعہ کو مقرر کیا گیا۔ ابو ہریرہؓ کی روایت ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہم دنیا میں سب کے بعد ہیں۔ آخرت میں سب سے آگے ہوں گے ان کو آسمانی کتاب ہم سے پہلے ملی ہم کو ان کے بعد ملی، جمعہ کے دن کی تعظیم اہلِ کتاب پر لازم کی گئی۔ انھوں نے اس کے متعلق اختلاف کیا اور یہ دن نہ پایا، مگر اللہ نے ہم کو روزِ جمعہ کی تعظیم کی ہدایت فرما دی۔ اب سب لوگ اس معاملے میں ہمارے بعد ہیں۔ یہودیوں کی عظمت کا دن جمعہ سے دوسرے روز ہے اور عیسائیوں کا دن تیسرے روز یعنی جمعہ سنیچر اور سنیچر کے بعد اتوار۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ تعظیم سبت کا مسئلہ ملتِ موسویہ کا مسئلہ ہے شریعت ابراہیمی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ابراہیمؑ کا زمانہ جو موسیٰؑ کے زمانے سے تقریباً پانچ سو برس پہلے تھا اس میں یہ تعظیم نہ تھی، اس لئے یہ دعویٰ کرنا کسی طرح صحیح نہیں کہ یوم السبت کی تعظیم کا قانون ملتِ ابراہیمی میں تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یوم السبت کا حکم تو باہمی اختلاف و نزاع کی وجہ سے دیا گیا تھا۔ جب روزِ جمعہ کی عظمت سے لوگوں نے انکار کر دیا اور تعظیم سبت کی درخواست کی تو خدا تعالیٰ نے تعظیم شنبہ ان پر واجب کر دی، اور یہ اختلاف و نزاع موسیٰؑ کے زمانہ میں ہوا نہ کہ ابراہیمؑ کے زمانے میں، اس لئے اس کو ملتِ ابراہیمی کا مسئلہ قرار دینا غلط ہے۔

ضروری تحقیق مقام یہ ہے کہ انسان کی جسمانی زندگی مشاغل دنیوی پر اور روحانی زندگی عبادت و معرفت پر موقوف ہے جس طرح حصول

معاش کے لئے روزانہ تگ و دو کرنی ضروری ہے اسی طرح روحانی زندگی حاصل کرنے کے لئے عبادت و مراقبہ اور خلوت و مشاہدہ لازم ہے لیکن روزانہ کے کاروبار اور مصروفیت کے ہوتے ہوئے سکون روح اور عبادت و معرفت کی طرف کامل یکسوئی کے ساتھ کرنی ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس کے علاوہ ہر وقت کی ترقی نفس اپنی جگہ پر چھوڑ کر روزانہ کچھ وقت اور مقدار نہ سہی تو ہفتہ میں کوئی روز تعطیل و تسکین دماغ کے لئے مقرر کرنا لازم ہے۔ حکیم علیم نے انہی فوائد کو پیش نظر رکھ کر ہر زمانہ میں اسی زمانہ کے احوال کے موافق ایک روز تعطیل اور عبادت کا مقرر فرما دیا تاکہ مخلوق بشری کو ایک روز کے لئے جسمانی کوفت اور دماغی تعب سے نجات مل جائے تسکین روح اور اطمینان دل میسر ہو اور تمام کاروبار سے یکسو ہو کر ہر بندہ اپنے خالق کی عبادت اور اس کی تجلیات کے مطالعہ میں مستغرق ہو جائے۔ آغاز بشریت سے لے کر دور ابراہیمی بلکہ عہد موسوی تک جمعہ کو یوم السبت قرار دیا۔ بنی اسرائیل نے اس حکم سے سرتابی کی اور مصالح الٰہی کے مقابلے میں قیاس آرائی اور دلائل عقلی سے کام لینا شروع کیا۔ بالآخر روز شنبہ ان کی تعطیل و عبادت کا دن قرار پایا۔ عیسائیوں نے اس میں بھی ترمیم کر لی اور سنیچر کی بجائے اتوار کا تقرر کر لیا جب دور اسلامی آیا اور اسلام نے سنت ابراہیمی کو زندہ کرنے کا دعویٰ کیا تو عیسائی یہودیوں کو چھوڑ کر ملت ابراہیمی کے موافق روز جمعہ کو یوم الاجتماع قرار دیا اور خصوصی عبادت [illegible] کو مخصوص کر دیا۔

خلاصہ ارشاد یہ ہے کہ ہفتہ [illegible] یہودیوں کے لئے مقرر ہوا تھا، مگر یہودیوں نے اس کے متعلق باہم اختلاف کیا یعنی اس کی تعظیم بجا نہ لائے۔ بعض نے اس کی بے حرمتی کی۔ جو [illegible] اس دن کرنے کی ممانعت کی گئی تھی ان کا ارتکاب کیا۔

بعض علماء نے إِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ روز سبت کا وبال و عذاب ان لوگوں پر مسلط کیا گیا جنہوں نے اس کی بے حرمتی کی تھی۔ یہ ترجمہ قصہ طلب ہے۔ بات یہ ہوئی تھی کہ جب شنبہ کے دن کاروبار کرنے کی ممانعت ہو گئی۔ اللہ کی طرف سے اس طور پر آزمائش کی گئی کہ سنیچر کے روز دریا کے پانی میں طغیانی ہو جاتی، تمام مچھلیاں سطح پر آ جاتیں۔ یہودی منہ میں پانی بھر لاتے مگر سنیچر کا احترام کرتے ہوئے مچھلیاں شکار نہ کرتے۔ چند ہی روز کے بعد انہوں نے دریا کے کنارے کے قریب بڑے بڑے گڑھے کھود لے اور دریا کے کنارے نالیاں نکال کر گڑھوں تک لائے مگر نالیوں کی سطح اونچی رکھی تاکہ طغیانی کے وقت جب مچھلیاں ابھریں تو بہتی ہوئی نالیوں کے ذریعہ گڑھوں میں آ کر گر جائیں اور جب پانی ہٹے تو مچھلیاں گڑھوں کے اندر پانی میں پڑی رہیں واپس نالیوں میں نہ جا سکیں۔ غرض سنیچر کے روز پانی میں جوش آیا۔ اسکیم کے مطابق مچھلیاں گڑھوں میں آ گریں اور واپس نہ جا سکیں۔ اتوار کے دن یہودیوں نے سب مچھلیوں کو شکار کر لیا۔ اس شیطانی فریب سازی پر عذاب الٰہی میں ماخوذ ہوئے۔

مقصودِ بیان یہودیوں سے قبل ہفتہ کا دن عبادت وغیرہ کے لئے مخصوص نہ کیا گیا تھا۔ یہودیوں نے ہفتہ کے حکم الٰہی کے خلاف دنیوی کاروبار کئے اور مستحق عذاب بنے۔

ان آیات میں عموماً اہل شرک اور خصوصاً یہودیوں کے اعتراض کا جواب ہے وغیرہ۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ

اپنے پروردگار کی راہ کی طرف دانائی اور خوش اسلوب وعظ کے ساتھ بلاؤ اور بہتر طریقہ سے

بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ

ان سے بحث کرو تمہارا رب بلاشبہ اس کو خوب جانتا ہے جو اللہ کی راہ سے بھٹک گیا اور راہ پر چلنے

وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝

اور وہی خوب جانتا ہے راہ پانے والوں کو

تفسیر دنیا میں دماغی تفاوت اور فہم و ذکا کے اختلاف کی بنا پر تین قسم کے انسان ہیں۔ (۱) دانشمند اور حکماء جن کا مقصود مکابرہ یا مجادلہ نہیں ہوتا بلکہ وہ حقیقت واقعہ کا انکشاف قطعی یقینی اور ناقابل شک دلائل کی روشنی میں چاہتے ہیں۔ براہین یقینی جو جزم واقعی پیدا کر سکیں اور جن پر کسی قسم کا شبہ طاری نہ ہو سکے اُن کے مفید ہوتی ہیں۔ (۲) درمیانی طبقہ کے سمجھدار آدمی جو الزامی جواب کو نہیں چاہتے، مگر استقرائی دلائل کے خواستگار ہوتے ہیں ان کو ایسے براہین کی ضرورت ہوتی ہے جو خاموش کن ہوں اور ان کی تسلی کر دیں۔ اول طبقہ کے دماغ روشن ارواح منور اور فطرت سلیم ہوتی ہے۔ دوسرا طبقہ نورانیت کے ایک حصہ کا حامل ہوتا ہے، مگر زیادہ روشنی کا طالب نہیں ہوتا نہ محض عقلی دلائل سے اس کی سیری ہو سکتی ہے۔ (۳) وہ کج فہم سطحی نظر رکھنے والے آدمی ہیں جن کے دماغ بالکل تاریک ہوتے ہیں، کٹ حجتی جن کا شعار ہوتی ہے۔ تسکین قلب کے خواستگار نہیں ہوتے نہ کسی طرح ان کو اطمینان دلایا جا سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ وقتی طور پر انہی کے مسلمات کو پیش کر کے ان کو بند کر دیا جائے۔ اور کوئی ذریعہ ان سے مناظرہ کرنے کا نہیں۔

انسانی افراد کے ان تینوں درجات کا لحاظ کرتے ہوئے خدا تعالیٰ نے ان آیات میں اپنے رسول کو راہِ مستقیم کی دعوت دینے کا امر فرمایا۔ پہلے طبقہ سے مناظرہ کرنے کے متعلق فرمایا حکمت کے ساتھ ان کو راہِ مستقیم پر آنے کی دعوت دو یعنی ناقابل شکست محکم طریقۂ مناظرہ اختیار کرو۔ ایسے اصول و قوانین کلیہ پیش کرو جو دارین کے فوائد صحیحہ کو جامع ہوں اور ایسے دلائل قطعیہ بیان کرو جو یقینیات پر مبنی ہوں۔ دوسرے طبقہ کو ہدایت کرنے کے متعلق فرمایا ان کو دعوت دیتے وقت موعظۂ حسنہ اختیار کرو یعنی نہ تو اس قدر بلند اور دقیق دلائل قطعیہ بیان کرو جو ان کے فہم سے بالاتر ہوں اور ان کے دماغ وہاں تک نہ پہنچ سکیں نہ جدالی شکل اختیار کرو بلکہ مناسب حال حسب موقع ان کی فہمائش کے لئے جو طریقہ موزوں ہو اسی پر کاربند ہو۔ رہا تیسرا طبقہ جو عنادی اور جھگڑالو ہوتا ہے اس کی ہدایت کے لئے فرمایا ان سے مناظرہ جدالی شکل میں کرو، مگر جدالی طریقہ سے وہ مجادلہ مراد نہیں جو اہل مناظرہ کی اصطلاح ہے بلکہ ایسا طریقہ مراد ہے جو فریق ثانی کے مسلمات پر مبنی ہو جس سے اس کی کٹ حجتی کٹ جائے جو بالکل نمایاں، واضح اور خاموش کن ہو۔ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ سے اسی طرف اشارہ ہے۔ تیسرے درجہ کے لوگوں کی عموماً انتاد مزاج اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ باوجود الزام کھانے اور لاجواب ہو جانے کے پھر بھی اپنے قول پر اڑے رہیں۔ حریف کچھ بھی کہے، مگر یہ ایک نہ مانیں اور برابر بک بک کئے جائیں، اس لئے اپنے رسول کو تسلی دینے کے لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ الخ یعنی آپ اس کی کچھ فکر نہ کریں کہ یہ لوگ کیوں راہِ راست پر نہیں آتے۔ باوجود لاجواب ہونے کے کیوں اپنے موروثی عقائد اور آبائی رسم و رواج نہیں چھوڑتے کیونکہ ہدایت و گمراہی تو خدا کے اختیار میں ہے اس کو ہر ایک کی فطری استعداد اور ازلی قابلیت معلوم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کج راہ اور کون راہِ مستقیم پر چلنے والا ہے۔

مقصود بیان مناظرہ کے تینوں طریقوں کا اظہار افراد انسانی کے دماغی تفاوت کی طرف لطیف اشارہ ہے۔ اس بات کی صراحت کر دی گئی کہ وعظ میں مناسب موقع حسن ہونا ضروری ہے۔ جس بات کی ضرورت ہو اسی کو باقتضائے وقت کہنا چاہیئے۔ پھر جدال آمیز مناظرہ میں بھی جاہلانہ روش نہ اختیار کرنی چاہیئے بلکہ وہ طرز اختیار کرنا چاہیئے جو موزوں ترین ہو۔ رہی ہدایت و گمراہی سو وہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ دلائل سے کسی کو ہدایت نہیں کی جا سکتی۔ فرض تبلیغ ادا ہو جاتا ہے وغیرہ۔

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ ۖ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ

اگر تم لوگ بدلہ لینے لگو تو جتنی تم کو ایذا دی گئی ہے اسی قدر بدلہ لو اور اگر صبر کرو تو صابروں کے

خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ ۝ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ

لئے بہتر ہے (اے محمدؐ!) تم صبر کرو اور تمہارا صبر کرنا اللہ ہی کی توفیق سے ہے ان کا غم نہ کرو

وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۝ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا

اور ان کی چال بازیوں سے تنگ دل نہ ہو بیشک اللہ اُن لوگوں کا حامی ہے جو پرہیزگار ہیں

وَّالَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ۝ ع

اور ان لوگوں کا حامی ہے جو نیکوکار ہیں

تفسیر جنگ احد میں چونسٹھ انصار اور چھ مہاجرین میں سید الشہداء حضرت امیر حمزہ بھی تھے شہید ہوئے اور (بجز حضرت حنظلہ کے جن کا باپ ابو عامر ابو سفیان کے ساتھ تھا) سب شہداء کے ساتھ کفار قریش نے وحشیانہ برتاؤ کیا، لاشوں کے پیٹ چاک کئے، کلیجے نکال کر چبائے، اعضائے جسمانی قطع کئے، ناک کان کاٹے۔ حضرت حمزہ کے ساتھ بھی یہی نازیبا حرکت کی۔ ناک کاٹ کر ایسا بنا دیا کہ بمشکل پہچانے گئے۔ یہ حالت دیکھ کر انصار نے کہا کہ اگر اللہ ہم کو قریش پر فتح عطا فرمائے گا تو ہم بھی ایسی ہی کثرت دکھائیں گے، لیکن فتح مکہ کا دن ہوا تو خدا تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔ نزول آیات کے بعد حضور گرامیؐ نے فرمایا ہم صبر کریں گے بدلہ نہ لیں گے۔ تم سب لوگ (قتل کرنے سے) باز رہو۔ سوائے چار اشخاص کے یعنی چار آدمی بتا دئے کہ ان کو قتل کرو۔ باقی سے تعرض نہ کرو۔ رواہ ابی بن کعب (ترمذی، نسائی، ابن حبان، طبرانی، بیہقی ورواہ الحاکم ایضاً وقال صحیح الاسناد وحسنہ الترمذی) اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آیات بالا کا نزول فتح مکہ کے دن ہوا۔

حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ جب حمزہ شہید ہو گئے تو حضور اقدس صلعم ان کی شہادت گاہ پر تشریف لائے اور انتہائی الم انگیز منظر دیکھا کیونکہ حضرت حمزہ کو کافروں نے مثلہ کر دیا تھا۔ ارشاد فرمایا اللہ تم پر رحمت نازل فرمائے میری دانست میں تم بڑے نیکوکار اور کنبہ پرور تھے۔ اگر پسماندگان کے لئے غم آفرین ہونے کا خیال نہ ہوتا تو میں تم کو یوں ہی چھوڑ دیتا کہ اللہ تعالیٰ تمہارا حشر درندوں کی متعدد ارواح سے فرماتا پھر فرمایا واللہ میں تمہارے عوض ستر مشرکوں کو مثلہ کروں گا اس پر جبرئیلؑ نازل ہوئے اور سورۂ نحل کی آخری آیت لائے۔ اس وقت حضورؐ وہیں کھڑے تھے آپ نے صبر اختیار فرمایا اور اپنی قسم کا کفارہ دے دیا (رواہ الطبرانی والبیہقی وغیرہم وقال الحاکم صحیح الاسناد ورواہ ابن عباس مرفوعاً نقلہ الطبرانی وابن المنذر) اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ احد کے دن آیات مذکورہ نازل ہوئیں۔ شعبی اور ابن جریج کے نزدیک بھی احد ہی کے دن نزول ہوا۔ عطاء بن سائب کی مرسل روایت ہے کہ سورۂ نحل بلاوقتین آخری آیات کے مکہ میں نازل ہوئی۔ آخری تین آیات مدینہ میں نازل ہوئیں۔ اس قول سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ احد میں ہی ان آیات کا نزول ہوا فتح مکہ کے روز نہ ہوا واللہ اعلم

حاصل ارشاد یہ ہے کہ مسلمانو! اگر تم کو بدلہ ہی لینا ہے تو جتنا ظلم کیا گیا ہو اتنی ہی تم سزا دے لو (یہ عام قانون ہے جو تمام اہل اسلام کیلئے

دستیاب ہے) لیکن اگر صبر کرو اور انتقام نہ لو تو بہت بہتر ہے۔ صبر کرنے والوں کا نتیجہ اچھا ہوتا ہے۔

تحقیقِ مقام

آیت اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ الخ کے ذیل میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ قوت شہوانیہ اور قوت غضبیہ اور قوت عقلیہ کے اعتدالی درجہ کا نام عدل ہے۔ اسی عدل کو صبر کہا جاتا ہے۔ در حقیقت صبر نام ہے نفس کی قوتوں کو زیادتی اور کمی سے روک کر درمیانی درجہ پر ٹھہرانے کا۔ مثلاً کسی کا جذبۂ انتقام برافروختہ ہو اور وہ انتہائی جوش میں اگر حدِ اعتدال سے آگے بڑھ جائے یا کسی کا جذبۂ حمیت و غیرت بالکل مُردہ ہو جائے، ضروری مدافعت و حفاظت کے وقت بھی اس میں جرأت نہ پیدا ہو۔ اسی طرح قوتِ شہوانیہ کے دونوں پہلو یعنی حرام حلال اور جائز اور ناجائز کا امتیاز اٹھ جانا اور نفس کا مطلق العنان ہو جانا یا شہوانیات اور مقتضائیات جبلی و نوعی کا مردہ و افسردہ ہو جانا یہ تمام کی تمام بے صبری کی شاخیں ہیں۔ قوت عقلیہ کے دونوں رخ اسی بے صبری کے مظاہر ہیں۔ ان تینوں قوتوں کا درمیانی درجہ ملحوظ صبر ہے۔ مگر یہ بہت مشکل درجہ ہے۔ اسی لئے مساوی انتقام کی اجازت کے ساتھ صبر کرنے والوں کے صبر کی فضیلت و برتری بھی ظاہر فرما دی اور خصوصیت کے ساتھ اپنے نبی کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے یہ بھی فرما دیا کہ خدا کے بھروسہ پر یقین رکھتے ہوئے اور اس کی امداد کو مرکز توجہ بناتے ہوئے صبر کیجیے۔ بات یہ ہے کہ انبیاء کے علاوہ اور لوگ فطرتاً معصوم و عادل نہیں ہوتے، اس لئے صحابہ کرام اور عام اہل اسلام کو انتقام کی اجازت مرحمت فرما دی مگر صبر کو بہر حال افضل قرار دیا۔ گویا نفسانی جذبہ کی ایک مخصوص حد تک تکمیل عام لوگوں کے لئے جائز کر دی، مگر رسول گرامی چونکہ جذبات نفس سے آزاد تھے اور فطرۃً ان کی مادی قوتیں عقل سے مغلوب تھیں، اس لئے اپنے نفس کا انتقام لینا تو کسی طرح حضورؐ کے لئے جائز نہیں تھا۔ ہاں اللہ کے قوانین و شرائع کو نافذ کرنے کے لئے انتہائی کوشش کرنی اور لڑائیاں لڑنی ضروری تھیں، مگر شرط یہ تھی کہ ان تمام سرگرمیوں میں نفس و نفسانیات کا شائبہ نہ ہو اسی لئے فرمایا کہ اے نبی آپ کے صبر کا مرکز محض ذاتِ الٰہی ہونی چاہیئے۔ رہا حضرت حمزہ اور دیگر شہدائے احد کا فطری غم اور بشری رنج اور کفار کی تعدی، سرکشی اور طاغوتی اسکیموں کا طبعی اثر تو اس کے ازالہ کے لئے بطور تسلی فرما دیا کہ تقویٰ اور احسان اللہ کی مدد کو جذب کرتا ہے۔ اللہ کی اعانت انہی لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو متقی اور اہلِ احسان ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ کفار کی کوئی شیطانی اسکیم اور فریب کاری تم کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ جو لوگ متقی و محسن ہوتے ہیں ان کا خدا حامی ہوتا ہے۔

تقویٰ اور احسان کا مفہوم

تقویٰ کے مختلف مدارج ہیں۔ شرک سے تقویٰ، اللہ کی نافرمانی سے تقویٰ، ظلم و زیادتی سے تقویٰ، کسی کی حق تلفی سے تقویٰ۔ تقویٰ کا آخر مرتبہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا ہر چیز سے خوف و امید ترک کر دی جائے (مرکز بیم و رجا اللہ ہی کو یقین کیا جائے) گویا تقویٰ کا مفہوم منفی اور سلبی ہے، لیکن ہر سلب کے لئے ایجاب اور ہر نفی کے لئے اثبات ضروری ہے، اسی طرح تقویٰ کے لئے احسان بھی لازم ہے۔ احسان کا مفہوم ثبوتی ہے۔ غیر اللہ کو چھوڑنا تقویٰ ہے اور اللہ سے مخصوص رشتہ جوڑنا احسان ہے۔ ظلم، حق تلفی، فساد، تباہی، کفر و شرک وغیرہ کو ترک کرنا تقویٰ ہے تو عدل و انصاف، امن، اصلاح، توحید اور اسلام کو پھیلانا احسان ہے۔ الغرض آیت کا یہ آخری حصہ اپنے اندر ہزاروں خزائن معرفت اور پر حکمت ذخائر ایمان رکھتا ہے، اسی لئے اپنے نبی کو کفار کی تعدی، فریب سازی اور مکاری کے باوجود صبر کرنے اور اللہ پر بھروسہ رکھنے کا حکم فرمایا۔

مقصودِ بیان

بقدر جرم سزا دینے اور بدلہ لینے کی اجازت اور فضیلتِ صبر کی صراحت۔ اس بات کی طرف اشارہ کہ انسان نفسانی جذبات کے ہاتھوں مجبور ہے، اس لئے بقدر جائز انتقام لے سکتا ہے، لیکن فضیلت رکھتے ہیں وہ لوگ جو نفسانی جذبات کی باگ عقل کے ہاتھوں میں دے دیں اور مبارک ہیں وہ ہستیاں جو نفسانی انتقام کی بجائے درگزر اور عفو سے کام لیں۔ نعقلاً اِلَّا بِاللّٰهِ سے یہ بات بتانی مقصود ہے کہ صبر کو بطور عادت اختیار کرنا موجب فضیلت نہیں اس سے نفس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اللہ پر اعتماد رکھتے ہوئے صبر کرنا باعثِ ثواب و قابل استحسان ہے۔ وَلَا تَحْزَنْ سے اپنے رسول کو تسلی دی ہے اور اس کے بعد کافروں کی شیطانی اسکیموں سے اندیشہ نہ

کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔ آخر آیت میں ایمان کے دونوں کناروں یعنی نفی و اثبات پر روشنی ڈالی ہے۔ تقویٰ اور احسان کو غیر معینہ شکل میں بطور عموم بیان کرنے سے یہ مقصود ہے کہ ہر برائی سے اجتناب اور ہر نیکی کو اختیار کرنا مسلمان کا ضروری شعار ہونا چاہیئے۔ برائی عقیدہ کی ہو یا قول کی یا عمل کی، بہرحال واجب الترک ہے اور نیکی ہر قسم کی عقائد کی ہو یا عبادات کی یا معاملات کی بہرحال واجب العمل ہے۔ اس میں اہل بصیرت کے لئے معرفت و حکمت کے بیش بہا جواہر مخفی ہیں۔ اللہ دماغ میں جتنی روشنی عطا کرے اتنا ہی پراسرار حقائق کا انکشاف ہوتا جائے گا۔ نہ تقویٰ کا کہیں حصر ہے نہ احسان کی کوئی حد۔

یہ آیت تازیانۂ عبرت ہے ان بے دین پادریوں اور آریوں کے لئے جو آئے دن طرح طرح کے الزام اسلام پر لگاتے ہیں کوئی اسلام کو حریت کش قانون کہتا ہے، کوئی سفاکی و ظلم کا دیوتا قرار دیتا ہے۔ ان کو اس آیت پر غور کرنا چاہیئے کہ اسلام کیسا بلند حوصلہ اور وسیع النظر مذہب ہے اور اسلام کی خصوصی تعلیم کیا ہے وغیرہ۔

(مطبوعہ: جواہر پریس دہلی)

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ

تفسیر

بیانُ السُّبحان

کا

پارہ نمبر ۱۵

سُبْحٰنَ الَّذِیْ

فاضلِ اجل حضرت مولانا سید عبدالدائم جلالی

بصورت پارہ
مکتبہ دارالفرقان
پوسٹ بکس ۱۲۰۰۶، سوئیوان ۱۵۶۵ نئی دہلی ۶
نے شائع کیا

پندرھواں پارہ

سُوْرَۃُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ مِائَۃٌ وَّاَحَدَ عَشَرَۃَ اٰیَۃً وَّاثْنَا عَشَرَ رُکُوْعًا

سورۂ بنی اسرائیل مکہ میں نازل ہوئی اس میں ایک سو گیارہ آیتیں اور بارہ رکوع ہیں

اس کا نام سورۂ بنی اسرائیل سورۂ سبحان اور سورۂ معراج ہے۔ اس میں ایک سو گیارہ آیات ۱۵۸۲ کلمات اور ۶۷۱۰ حروف ہیں۔ ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ کی روایت کے بموجب یہ سورۃ مکی ہے صرف تین آیات مدنی ہیں۔ ایک وَاِنْ کَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَکَ الخ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب قبائل ثقیف کے مندوبین آئے تھے۔ دوسری رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ الخ اور تیسری اِنَّ رَبَّکَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ الخ۔ مقاتل نے آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِہٖٓ الخ کو بھی مزید مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ بعض علماء نے آٹھ آیات کو غیر مکی کہا ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضور اقدسؐ ہر رات سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ زمر پڑھتے تھے (رواہ احمد) ذکرہ الحافظ ابن کثیر۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم کرنے والا ہے

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی

پاک ذات ہے جو اپنے بندے کو رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کو لے گیا

الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ۭ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ۝

جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں نازل فرمائی تھیں تاکہ ہم اس (بندے) کو اپنی قدرت کے نشان دکھائیں بلاشبہ وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

تفسیر ان آیات میں معراج کا مختصر تذکرہ ہے۔ باقی بیان سورۂ نجم میں مذکور ہے۔ یہاں صرف اتنا ظاہر فرمایا کہ رسول پاکؐ کو بیت الحرام سے بیت المقدس تک رات کے قلیل حصہ میں خدا تعالیٰ اپنی قدرت کے عجیب و غریب کرشمے دکھانے کے لئے لے گیا مسجد اقصیٰ کے آس پاس جس میں طرح طرح کی برکات نازل ہے یعنی دنیوی برکات بھی ہیں۔ سرسبزی شادابی، ہر قسم کے پھل اور فوائد پیدا ہوتے ہیں اور روحانی برکات بھی ہیں۔ سینکڑوں انبیاء اولیاء کے مزارات ہیں جن پر ہر وقت رحمت الٰہی برستی رہتی ہے۔

تجزیہ عبد سے مراد باجماع فقہائے اسلام حضور اقدسؐ کی ذات گرامی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف انتساب اس لئے فرمایا ہے تاکہ حضورؐ کی عظمت و احترام میں ایسا غیر معمولی اضافہ ہو جائے جو کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔ علماء نے صراحت کی ہے کہ خدا تعالیٰ الوہیت و ربوبیت میں وحدہٗ لاشریک ہے اور رسول پاکؐ عبدیت کاملہ میں بے نظیر و بے ہمتا ہیں جس طرح اللہ کے لئے الوہیت و ربوبیت خصوصی اوصاف ہیں اسی طرح رسول پاکؐ کے لئے کمالِ عبدیت مایۂ ناز ہے۔ کسی انسان کا اس سے بڑھ کر کوئی کمال ہو نہیں سکتا کہ وہ عبدیت کی انتہائی بلندی پر پہنچا ہوا ہو۔

مسجد حرام سے مراد صرف خانہ کعبہ ہی نہیں بلکہ آس پاس کے مقامات جس میں حجر یعنی حطیم بھی داخل ہے۔ سب اس میں شامل ہے۔ گویا پورے حرم

محترم کا نام مسجد حرام ہے۔

مسجد اقصٰی یعنی بیت المقدس یہ انبیاء کا قبلہ ہے۔ یہ مسجد جس کو اہل کتاب ہیکل (عبادت خانہ یا خانقاہ) کہتے ہیں۔ ملک فلسطین کے شہر یروشلم میں واقع ہے۔ اس کی تعمیر اول بار بروایت صحیح حضرت آدمؑ نے کعبہ کی تعمیر سے چالیس سال کے بعد کی (مواہب لدنیہ) پھر اس کی تجدید کسی قدر حضرت داؤد نے اور ان کے بعد تکمیل حضرت سلیمانؑ نے کی۔ حضرت سلیمان کی تعمیر کا زمانہ حضرت موسیٰ سے تخمیناً پانچ سو برس بعد ہے۔ بنی اسرائیل کی شرارت و بدکاری سے اس پر متعدد مرتبہ مصیبات آئے۔ گرادی گئی، جلا دی گئی، مسمار کر دی گئی، کل سامان لوٹ لیا گیا۔ حضور اقدسؐ کے زمانے میں شہنشاہ روم کی گرائی ہوئی مسجد کا ایک ڈھیر پڑا تھا کوئی تعمیر مسجد موجود نہ تھی، لیکن مسجد درحقیقت اس جگہ کا نام ہے عمارت کا نہیں، عمارت بتقدیر بنی ہے مسجد نہیں بدلتی۔ گری ہوئی مسجد کے آس پاس عیسائیوں نے کچھ مذہبی عمارات بنائی تھیں۔ حضورؐ کے زمانہ میں ان کو بھی بیت المقدس اور مسجد اقصٰی کہتے تھے۔ مسجد اقصٰی اور مسجد حرام کی مکمل تفصیل ہم آیاتِ مذکورہ کی تفسیر کے بعد مستقل بیان کریں گے۔

مِنْ اٰيٰتِنَا میں آیات سے کون سی آیات مراد ہیں؟ آیاتِ قدرت دو طرح کی ہیں۔ شہودی اور غیبی۔ دونوں قسم کی نشانیاں خدا تعالیٰ نے شبِ معراج میں اپنے رسول کو دکھائیں۔ آن کی آن میں مکہ سے بیت المقدس لے جانا، تمام فضا اور کائنات کی سیر کرانا اور ہر چیز کو مادی آنکھوں سے دکھانا اور جسمانی کانوں سے مختلف مخلوق کی گفتگو سنوانا یہ سب کا سب قدرت کا شہودی کرشمہ ہے۔ پھر انبیاء سے ملاقات، ملائکہ، جنت و دوزخ اور دوسری غیبی مخلوق کا مشاہدہ اور رب سے مکالمہ ذاتِ بسیط کے جمال و جلال کا مشاہدہ اور غیر مادی نور کا کشف، خاص اسرار کی اطلاع، روحانی و جسمانی قیود سے آزاد کرکے اپنا قرب عطا کرنا، نورِ بصیرت سے ہر چیز دکھانا اور گوشِ ہوش سے غیبی پیغامات اور پوشیدہ نداؤں کا سنوانا یہ تمام کا تمام قدرتِ الٰہی کا غیبی کرشمہ ہے۔ حضور اقدسؐ نے شبِ معراج میں ہر قسم کے نشانِ قدرت کو ملاحظہ فرمایا، سمجھا، غور کیا اور انجام کار نتیجہ اخذ کرکے انسانی کائنات کو روحانی چشمۂ فیض سے سیراب و شاداب فرمایا۔

تحقیقی نکتہ معراج کے واقعہ کو خدا تعالیٰ نے لفظ سُبْحٰنَ سے شروع فرمایا اور اس موقعہ پر اپنے رسولؐ کے واسطے لفظ عَبْد ذکر کیا۔ بظاہر ایسے عظیم الشان غیر معمولی بلکہ ناقابلِ نظیر واقعہ کا آغاز ان الفاظ سے نہ ہونا چاہیے تھا۔ عظمت قصہ کا لحاظ کرتے ہوئے بجائے لفظ سُبْحٰنَ کے لفظ قَادِر، قَدِیْر، یا اسی قسم کا کوئی اور لفظ ہونا ضروری تھا تاکہ اللہ کی غیر معمولی قدرت اور ہمہ گیر قوت کا اظہار ہوسکتا اور یہ معلوم ہوتا کہ جسم مادی کے ساتھ کسی انسان کو آن کی آن میں عرش تک بلانا اور کائناتِ غیبی و شہودی کی سیر کرانا اللہ کی قدرت باہرہ پر دلالت کرتا ہے۔ پھر جس کو سیر کرائی اس کا کوئی معزز لقب یا پیارا نام مثلاً خلیل حبیب وغیرہ ذکر کیا جاتا تاکہ نام یا لقب کے ذکر کرنے ہی سے معراج کی علت پر کسی قدر روشنی پڑ جاتی اور نعمتِ معراج سے حضور کو سرفراز کرنے کی وجہ سمجھ میں آجاتی اور سمجھنے والے سمجھ جاتے کہ چونکہ حضور اقدسؐ خدا تعالیٰ کے خاص دوست اور حبیبِ اکرم تھے، اسی لئے یہ خصوصی نعمت عطا کی گئی۔ یہ شبہات سطحی نظر رکھنے والوں کے دماغوں میں پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن لفظ سُبْحٰنَ عَبْد کے اندر جو خاص نکتہ اس فقیر جاہل کو مخفی نظر آتا ہے اور جس کو کسی مفسر نے بیان نہیں کیا اس سے ان شبہات کا قطعی ازالہ ہو جاتا ہے اور لفظ سبحان و عبد کو اختیار کرنے کی اصل وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ واقعۂ معراج اپنے اندر وہ اہمیت و عظمت رکھتا ہے اور اس شرف اور فضل کا حامل ہے جو سوائے رسول پاکؐ کے کسی مقرب فرشتہ کو میسر آیا نہ کسی برگزیدہ انسان کو۔ ایسے مقامات قرب میں پہنچا جس کی کیفیت کا تصور انسانی دماغ کی قدرت سے خارج ہے، قرب کے ساتھ کیا تھا؟ فاصلہ قوسین کی کیا کیفیت تھی؟ مخصوص وحی کون سی تھی؟ جلوۂ ذات دیکھا یا جلوۂ صفات یہ تمام چیزیں ناقابلِ بیان ہیں، لیکن حضور اقدسؐ کو ہر حال سرفراز فرمایا گیا۔ حضرت موسیٰؑ کو جلوہ دکھانے سے انکار کر دیا۔ حضرت ابراہیمؑ کو آفاق و فضا کی نشانیاں دکھائیں، مگر براہِ راست کوئی چمکارا نہ دکھایا۔ حضرت عیسیٰؑ کو باوجود روح اللہ کے خطاب عطا فرمانے اور غیبی طاقت مرحمت کرنے کے بلاواسطہ جلوہ دکھانے سے محروم رکھا، لیکن حضور اقدسؐ کو دکھانے کی ہر چیز دکھائی اور بلاکیف و کم نورِ الوہیت ضیاء افگن ہوا۔ اس واقعہ کو پڑھ کر غور کرنے کے بعد اغلب تھا بلکہ اغلب کیا ایسا ہوا بھی کہ امت مسلمہ کے بہت سے افراد گمراہ ہو گئے۔ کفار تو تکذیب و انکار سے تباہ ہو ہی گئے تھے، مگر اہلِ اسلام سے بہت سے افراد غلو و افراط تک پہنچ کر تباہ ہوئے۔ حضرت عیسیٰؑ کے اندر کوئی نمایاں جلوۂ الوہیت نہ تھا۔ صرف مُردہ کو زندہ کرنا، ابرص کو اچھا کرنا، کھائی ہوئی چیزیں بتا دینا، غیر خوارگی کی حالت میں بہم کر دینا

وغیرہ خارق عادت معجزات آپ سے ظاہر ہوئے جن کو دیکھ کر پیروی کرنے والوں نے اتنا غلو کیا کہ آپ کو مظہر الوہیت قرار دے لیا بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ابن اللہ کہنے لگے۔ پھر رسول گرامی کو تو معراج کے اندر وہ قرب عطا کیا گیا اور بلا واسطہ نور کے ستر ہزار حجابوں کے اندر سے ایسی ضیا پاشی کی گئی جس کو برداشت کرنا طور کی استعداد سے برتر تھا۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ کا یہ مرتبہ دیکھ کر بہت سے لوگوں کو حضور کے اندر ظہور الوہیت و ربوبیت کا پرتو نظر آتا بعید از عقل نہ تھا ہو سکتا تھا کہ کچھ لوگ حضور کے اندر الوہیت کا حلول خیال کرنے لگیں یا مخلوق کے درجہ سے آگے بڑھا کر خالق کے ساتھ ملا دیں اور عبدیت کی حدود سے خارج سمجھ کر معبود ماننے لگیں۔ ان خیالات کی تردید یا استیصال اور ممانعت حضور اقدس نے بلفظ زبان مبارک سے و عمل اقدس سے فرما دی۔ صاف فرما دیا کہ خدا یہودیوں اور عیسائیوں پر لعنت کرے جنہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔ خدا تعالیٰ نے بھی آغاز قصہ میں ہی پیش آنے والی تہمت کو دور کرنے کے لیے فرما دیا کہ اللہ تمام عیوب و نقائص یعنی احتیاج حدوث لوازم احتیاج و حدوث اور ہر اس چیز سے پاک ہے جس سے اس کی تنقیص لازم آتی ہو۔ زمان و زمانیات، مکان و مکانیات، عوارض جسمانی اور دیگر اقتضائیات نفسانی سے منزہ و مبرا ہے۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ رسول کو معراج عطا فرمانے میں اس کی کوئی خاص غرض مخفی تھی یا وہ رسول کا محتاج تھا یا اس کو اپنے رسول سے وہ اُنس تھا جو انسان کو انسان سے اور مخلوق کو مخلوق سے ہوتا ہے۔ اللہ ان تمام عیوب سے پاک ہے۔ رسول بھی باوجود حصول معراج کے اس کے بندے ہیں۔ عطائے معراج سے ان کی عبدیت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ عبدیت سے بڑھ کر معبودیت کے حدود میں داخلہ ممکن نہیں۔ لہٰذا معراج کے واقعہ کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص رسول کو مظہر الوہیت نہ قرار دے نہ حلول الٰہی کا قائل ہو۔ بلکہ بندہ اور کامل بندگی کی انتہائی چوٹی پر پہنچا ہوا بندہ یقین کرے۔

معراج کب ہوئی؟

سدی کا قول ہے کہ ہجرت سے ایک سال چار ماہ پہلے معراج ہوئی۔ عمرو بن العاص کی روایت ہے کہ ۱۷ ربیع الاول کو ہجرت سے ایک سال پہلے ہوئی۔ عروہ بن زبیر اور زہری کی روایت سے ثابت ہے کہ ہجرت سے ایک سال قبل ۲۷ رجب کو ہوئی۔ ابن عبد البر کا قول ہے کہ ہجرت سے پانچ برس پیشتر کا یہ واقعہ ہے۔ جمہور کے نزدیک زہری کا قول زیادہ قابل وثوق اور صحیح ہے۔

معراج کہاں سے ہوئی اور روحانی ہوئی یا جسمانی؟

حافظ الحدیث ابو الخطاب عمر بن دحیہ نے کتاب التنویر فی مولد السراج المنیر میں حدیث معراج کی تحقیق کرنے کے بعد لکھا ہے کہ معراج کے متعلق احادیث بکثرت وارد ہیں اور باعتبار مفہوم کے حد تواتر کو پہنچ گئی ہیں۔ حضرت علی رض، ابن مسعود، ابوذر رض، مالک بن صعصعہ رض، ابو ہریرہ، ولید ابن عباس رض، بریدہ رض، شداد بن اوس، ابی بن کعب، عبد الرحمن بن قرظہ، ابو حبہ انصاری رض، ابو لیلیٰ انصاری رض، ابو ہریرہ، جابر رض، حذیفہ رض، ابی ایوب انصاری رض، ابو امامہ، سمرہ بن جندب رض، ابو الحمراء رض، صہیب رومی رض، ام ہانی رض، ام المومنین عائشہ رض، اسماء بنت ابی بکر رض رضوان اللہ علیہم اجمعین سے احادیث معراج مروی ہیں بعض طویل ہیں اور بعض مختصر۔

کتب احادیث مثلاً بخاری، مسلم، نسائی، ابو داؤد، مشکوٰۃ، بیہقی، مسند حاکم وغیرہ میں بکثرت احادیث معراج مختلف اسنادوں سے روایت کی گئی ہیں۔ اہل اسلام کا سلف سے خلف تک واقعہ معراج پر اجماع ہے، لیکن ام المومنین حضرت عائشہ رض اور معاویہ رض سے بعض احادیث مروی ہیں جن میں واقعہ معراج سے انکار کیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کو معراج سے چند مرتبہ سرفراز فرمایا گیا ہے۔ متعدد مرتبہ روحانی معراج ہوئی اور ایک مرتبہ جسمانی طور پر مادہ و روح دونوں کے ساتھ آسمانوں کی، جنت دوزخ کی، عرش کرسی کی اور تمام عالم غیب کی سیر کرا کے مقام قرب میں بلایا گیا۔ اگر حضرت عائشہ اور معاویہ کی احادیث من حیث الروایہ صحیح ثابت ہو جائیں تو ہو سکتا ہے کہ ان حضرات نے جس روز کا واقعہ بیان کیا ہے وہ جسمانی نہ ہو صرف روحانی ہو اور اس کے بعد کسی روز جسمانی معراج ہوئی ہو۔ مقام قرب تک پہنچانا اور مادی آنکھوں کو انوار سے بہرہ ور بنا کر کل غیبی عالم کی سیر کرانا معمولی بات نہیں، اس لیے نیم خوابی یا خواب کی حالت میں پہلے سے خدا تعالیٰ نے روح مبارک کو عادی بنانے کے لیے معراج عطا فرمائی اور جب روح مانوس ہو گئی تو اس وقت جسمانی معراج عطا ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف احادیث میں معراج کی مختلف کیفیت منقول ہے کیونکہ واقعات متعدد ہیں۔ ہر واقعہ مستقل علیحدہ جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، اور گوناگوں مختلف کیفیات کا حامل ہے۔ ہاں پنجگانہ نماز کی فرضیت اور پچاس وقت کی نماز تخفیف کر کے پانچ وقت کی قائم کرنا اور حضرت موسیٰ سے گفتگو کا رد و بدل اور بارگاہ الٰہی میں متعدد مرتبہ حاضری اور درخواست اور مقام قاب قوسین تک پہنچنا اور وحی مخصوص سے سرفراز ہونا

یہ تمام سرگذشت معراج جسمانی کی ہے۔ بیت حرام سے مسجد اقصیٰ تک مع جسم کے جانا تو انہی آیات سے ثابت ہے۔ لفظ عَبْدِہٖ دلالت کر رہا ہے کہ بیت المقدس تک حضورؐ مع جسم کے تشریف لے گئے۔ کیونکہ عبد نام ہے روح مع جسم کا نہ کہ فقط روح کا۔ ابن عباسؓ نے آیت وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ الخ کی تفسیر میں کہا کہ رؤیا سے مراد خواب نہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھنا مراد ہے۔ پھر اگر یہ واقعہ خواب ہی ہوتا تو کفار اس کے منکر نہ ہوتے۔ خواب میں نیک لوگوں کو ایسے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں اور حضرت ابوبکرؓ کو صدیق کا امتیازی لقب ملنے کی کوئی وجہ نہ تھی کسی خواب کی تصدیق پر یہ لقب ملنا کیا معنی رکھتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معراج کے متعلق بعض احادیث ہم اختصار کرنے کے بعد یہاں لکھ دیں تاکہ احادیث وارده کا باہمی اشتباہ دور ہو جائے۔

امام احمدؒ اور مسلمؒ نے بروایت انسؓ بیان کیا کہ سفید براق پر سوار ہو کر حضورؐ والا بیت المقدس تشریف لے گئے۔ پہنچ کر براق کو اس حلقہ سے باندھا جس سے دیگر انبیاء اپنے جانوروں کو باندھا کرتے تھے پھر اندر داخل ہو کر دو رکعت نماز پڑھی۔ باہر تشریف لائے۔ جبرئیلؑ نے دو پیالے پیش کئے ایک میں دودھ تھا دوسرے میں شراب تھی۔ حضورؐ نے دودھ کو پسند کیا۔ جبرئیلؑ نے کہا آپ نے فطرت کو پا لیا۔ پھر آسمانوں پر حضورؐ کو چڑھا لیا۔ پہلے آسمان پر آدمؑ دوسرے پر یحییٰؑ اور عیسیٰؑ تیسرے پر یوسفؑ چوتھے پر ادریسؑ، پانچویں پر ہارونؑ۔ چھٹے پر موسیٰؑ اور ساتویں پر ابراہیمؑ سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد سدرۃ المنتہیٰ پر عروج ہوا۔ سدرۃ المنتہیٰ کو نور الٰہی نے جس طرح ڈھانکنا تھا ڈھانک لیا اور حضورؐ کو جو کچھ وحی فرمانی تھی فرمائی اور شبانہ روز میں پچاس نمازیں فرض کیں۔ حضورؐ واپس آئے موسیٰؑ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کیفیت دریافت کی حضورؐ نے بتا دی۔ موسیٰؑ نے کہا واپس جا کر تخفیف کی درخواست کیجئے آپ کی امت اس کو برداشت نہیں کر سکتی (بار بار مرتبہ آمد و رفت کے بعد پانچ نمازیں رہ گئیں اور اللہ نے فرمایا محمد! یہ پانچ نمازیں شبانہ روز کی ہیں ہر نماز دس کے عوض ہے گویا پچاس ہو گئیں۔ الی آخر الحدیث مختصراً) یہ جسمانی معراج کا واقعہ ہے۔

بیہقی نے بروایت محمد بن عمیر بن عطارد بیان کیا ہے کہ حضور اقدسؐ صحابۂ کرام کے حلقہ میں تشریف فرما تھے جبرئیلؑ آئے اور ایک درخت تک لے گئے وہاں پرندوں کے آشیانوں کے دو جھولے لٹک رہے تھے ایک میں حضورؐ بیٹھے اور ایک میں جبرئیلؑ۔ جھولے اوپر اٹھ کر افق تک پہنچے پھر نور کی طرف اترے جبرئیلؑ بے ہوش ہو گئے پھر اللہ نے وحی فرمائی "نبی بادشاہ یا نبی عبد" (یعنی نبوت مع بادشاہت چاہیئے یا نبوت مع عبدیت) جبرئیلؑ نے حضورؐ کو اشارہ کر کے کہا تواضع اختیار کیجئے، اس لئے حضور والا نے عرض کیا پروردگار بادشاہت نہیں بلکہ عبدیت کا خواستگار ہوں۔ انتہا مختصراً (غالباً یہ واقعہ خواب یا روحانی سیر کا ہے)

ابن جریر نے بروایت انسؓ بیان کیا کہ رسول اللہؐ براق پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ راستے کے کنارے پر ایک بڑھیا کو دیکھا پوچھا جبرئیلؑ یہ کون ہے؟ جبرئیلؑ نے کہا چلے چلئے۔ آگے بڑھے دیکھا کہ راستہ سے ہٹا ہوا کوئی آپ کو بلا رہا ہے۔ اور آگے بڑھے۔ ندا آئی۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا أَوَّلُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا آخِرُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا حَاشِرُ۔ جبرئیلؑ نے کہا سلام کا جواب دیجئے۔ آپ نے جواب دیا۔ اس سے آگے دوبارہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ پھر بیت المقدس پہنچ کر تین پیالے پیش کئے گئے۔ پانی کا۔ شراب کا۔ دودھ کا۔ حضورؐ نے دودھ کا پیالہ لیا۔ جبرئیلؑ نے کہا آپ نے فطرت پائی۔ اگر پانی لے لیتے تو امت غرق ہو جاتی اور شراب لے لیتے تو امت بے عقل ہو کر گمراہ ہو جاتی۔ پھر تمام انبیاء سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے سب کی امامت کی۔ جبرئیلؑ نے کہا وہ بڑھیا جو سرِ راہ ملی تھی وہ دنیا ہے دنیا کی عمر اتنی ہی باقی رہ گئی ہے جتنی اس بڑھیا کی، اور سرِ راہ کھڑا ہوا جو آپ کو بلا رہا تھا وہ ابلیس تھا۔ چاہتا تھا کہ آپ اس کی طرف جھکیں اور جن لوگوں نے آپ کو سلام کیا تھا وہ ابراہیمؑ و موسیٰؑ و عیسیٰؑ تھے (و قد رواہ البیہقی دلائل النبوۃ)

امام نسائی نے دوسرے طریق سے بروایت انسؓ بیان کیا کہ براق پر سوار ہو کر جب حضورؐ روانہ ہوئے تو ایک جگہ پہنچ کر جبرئیلؑ نے کہا یہاں اتر کر نماز پڑھئے حضورؐ نے اتر کر نماز پڑھی۔ جبرئیلؑ نے کہا یہ مقام طیبہ ہے جہاں آپ ہجرت کر کے آئیں گے۔ پھر روانہ ہو کر ایک اور جگہ پہنچے۔ جبرئیلؑ نے اتر کر نماز پڑھنے کو کہا اور بتایا یہ مقام طور سینا ہے جہاں موسیٰؑ سے اللہ نے کلام کیا تھا۔ اس کے بعد ایک اور مقام پر پہنچے جبرئیلؑ نے اتر کر نماز پڑھنے کو کہا اور کہا یہ بیت لحم ہے جہاں عیسیٰؑ پیدا ہوئے تھے۔ اس کے بعد بیت المقدس میں داخل ہوئے اور سب قول جبرئیلؑ حضورؐ نے تمام انبیاء کی امامت کی اور پھر آسمانوں پر عروج ہوا۔ ابو حاتم نے اسی روایت میں بمقام بیت المقدس حوروں کا سامنے آنا اور سلام۔ امام کرنا بھی ذکر کیا ہے۔ اسی روایت کے آخر میں ہے کہ صبح کو جب معراج کا تذکرہ کیا تو کفار کے دوڑ کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور بولے تمہارا ساتھی کہتا ہے آج رات میں ایک ماہ کی مسافت طے کر آیا۔ صدیق اکبرؓ نے فرمایا کیا انہوں نے یہ ارشاد

یہ تمام سرگذشت معراج جسمانی کی ہے۔ بیت حرام سے مسجد اقصیٰ تک مع جسم کے جانا تو انہی آیات سے ثابت ہے۔ لفظ عَبْدِہٖ دلالت کر رہا ہے کہ بیت المقدس تک حضورؐ مع جسم کے تشریف لے گئے، کیونکہ عبد نام ہے روح مع جسم کا نہ کہ فقط روح کا۔ ابن عباسؓ نے آیت وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِیْ اَرَيْنٰكَ الخ کی تفسیر میں کہا کہ رؤیا سے مراد خواب نہیں بلکہ آنکھوں سے دیکھنا مراد ہے۔ پھر اگر یہ واقعہ خواب ہی ہوتا تو کفار اس کے منکر نہ ہوتے۔ خواب میں نیک لوگوں کو ایسے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں اور حضرت ابوبکرؓ کو صدیق کا امتیازی لقب ملنے کی کوئی وجہ نہ تھی کسی خواب کی تصدیق کا لقب ملنا کیا معنی رکھتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معراج کے متعلق بعض احادیث ہم اختصار کرنے کے بعد یہاں لکھ دیں تاکہ احادیث واردہ کا باہمی اشتباہ دور ہو جائے۔

امام احمد اور مسلم نے بروایت انسؓ بیان کیا کہ سفید براق پر سوار ہو کر حضور والا بیت المقدس تشریف لے گئے۔ پہنچ کر براق کو اس حلقہ سے باندھا جس سے دیگر انبیاء اپنے جانوروں کو باندھا کرتے تھے پھر اندر داخل ہو کر دو رکعت نماز پڑھی۔ باہر تشریف لائے۔ جبرئیل نے دو پیالے پیش کئے ایک میں دودھ تھا دوسرے میں شراب تھی۔ حضورؐ نے دودھ کو پسند کیا۔ جبرئیل نے کہا آپ نے فطرت کو پا لیا پھر آسمانوں پر حضورؐ کو چڑھایا۔ پہلے آسمان پر آدمؑ دوسرے پر یحییٰؑ اور عیسیٰؑ۔ تیسرے پر یوسفؑ۔ چوتھے پر ادریسؑ، پانچویں پر ہارونؑ۔ چھٹے پر موسیٰؑ اور ساتویں پر ابراہیمؑ سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد سدرۃ المنتہیٰ پر عروج ہوا۔ سدرۃ المنتہیٰ کو نور الٰہی نے جس طرح ڈھانکنا تھا ڈھانک لیا اور حضورؐ کو جو کچھ وحی فرمانی تھی فرمائی اور شبانہ روز میں پچاس نمازیں فرض کیں۔ حضورؐ واپس آئے موسیٰؑ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کیفیت دریافت کی حضورؐ نے بتا دی۔ موسیٰؑ نے کہا واپس جا کر تخفیف کی درخواست کیجئے آپ کی امت اس کو برداشت نہیں کر سکتی (پانچ مرتبہ آمد و رفت کے بعد پانچ نمازیں رہ گئیں اور اللہ نے فرمایا محمد! یہ پانچ نمازیں شبانہ روز کی ہیں ہر نماز دس کے عوض ہے گویا پچاس ہو گئیں۔ الیٰ آخر الحدیث ملخصاً) یہ جسمانی معراج کا واقعہ ہے۔

بیہقی نے بروایت محمد بن عمیر عطارد بیان کیا ہے کہ حضور اقدسؐ صحابۂ کرام کے حلقہ میں تشریف فرما تھے جبرئیل آئے اور ایک درخت تک لے گئے وہاں پرندوں کے آشیانوں کے دو جھولے لٹک رہے تھے ایک میں حضورؐ بیٹھے اور ایک میں جبرئیل۔ جھولے اوپر اٹھ کر افق تک پہنچے پھر نور کی طرف اترے جبرئیل بے ہوش ہو گئے پھر اللہ نے وحی فرمائی "نبی بادشاہ یا نبی عبد" (یعنی نبوت مع بادشاہت چاہیئے یا نبوت مع عبدیت) جبرئیل نے حضورؐ کو اشارہ کر کے کہا تواضع اختیار کیجئے، اس لئے حضور والا نے عرض کیا پروردگار بادشاہت نہیں بلکہ عبدیت کا خواستگار ہوں۔ انتہیٰ ملخصاً (غالباً یہ واقعہ خواب یا روحانی سیر کا ہے)

ابن جریر نے بروایت انسؓ بیان کیا کہ رسول اللہؐ براق پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ راستہ کے کنارے پر ایک بڑھیا کو دیکھا پوچھا جبرئیل یہ کون ہے؟ جبرئیل نے کہا چلے چلئے۔ آگے بڑھے دیکھا کہ راستہ سے ہٹا ہوا کوئی آپ کو بلا رہا ہے۔ اور آگے بڑھے۔ ندا آئی۔ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اَوَّلُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا اٰخِرُ، اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا حَاشِرُ۔ جبرئیل نے کہا سلام کا جواب دیجئے۔ آپ نے جواب دیا۔ اس سے آگے دوبارہ ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ پھر بیت المقدس پہنچ کر تین پیالے پیش کئے گئے۔ پانی کا۔ شراب کا۔ دودھ کا۔ حضورؐ نے دودھ کا پیالہ لیا۔ جبرئیل نے کہا آپ نے فطرت پائی۔ اگر پانی لے لیتے تو امت غرق ہو جاتی اور شراب لے لیتے تو امت بے عقل ہو کر گمراہ ہو جاتی۔ پھر تمام انبیاء سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے سب کی امامت کی۔ جبرئیل نے کہا وہ بڑھیا جو سر راہ ملی تھی وہ دنیا ہے دنیا کی عمر اتنی ہی باقی رہ گئی ہے جتنی اس بڑھیا کی، اور سر راہ کھڑا ہوا جو آپ کو بلا رہا تھا وہ ابلیس تھا۔ چاہتا تھا کہ آپ اس کی طرف جھکیں اور جن لوگوں نے آپ کو سلام کیا تھا وہ ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ تھے (وقد رواہ البیہقی دلائل النبوۃ)

امام نسائی نے دوسرے طریق سے بروایت انسؓ بیان کیا کہ براق پر سوار ہو کر جب حضورؐ روانہ ہوئے تو ایک جگہ پہنچ کر جبرئیل نے کہا یہاں اتر کر نماز پڑھئے۔ حضورؐ نے اتر کر نماز پڑھی۔ جبرئیل نے کہا یہ مقام طیبہ ہے جہاں آپ ہجرت کر کے آئیں گے۔ پھر روانہ ہو کر ایک اور جگہ پہنچے۔ جبرئیل نے اتر کر نماز پڑھنے کو کہا اور بتایا یہ مقام طور سینا ہے جہاں موسیٰ سے اللہ نے کلام کیا تھا۔ اس کے بعد ایک اور مقام پر پہنچے جبرئیل نے اتر کر نماز پڑھنے کو کہا اور کہا یہ بیت لحم ہے جہاں عیسیٰ پیدا ہوئے تھے۔ اس کے بعد بیت المقدس میں داخل ہوئے اور سب قبل جبرئیل حضورؐ نے تمام انبیاء کی امامت کی اور پھر آسمان پر عروج ہوا۔ ابو حاتم نے اسی روایت میں بمقام بیت المقدس حوروں کا سامنے آنا اور سلام کرنا بھی ذکر کیا ہے۔ اس روایت کے آخر میں ہے کہ صبح کو جب معراج کا تذکرہ کیا تو کفار دوڑ کر حضرت ابوبکر کے پاس گئے اور بولے تمہارا ساتھی کہتا ہے آج رات میں ایک ماہ کی مسافت طے کر آیا۔ صدیق اکبرؓ نے فرمایا کیا انہوں نے یہ ارشاد

فرمایا۔ اگر ایسا فرمایا تو سچ فرمایا۔ ہم تو اس سے بھی عجیب ترین چیزوں کی تصدیق کر چکے ہیں۔ ہم تو آسمانی خبروں کا ان کے پاس آنا بھی سچ جانتے ہیں۔ اس کے بعد مشرکوں نے اپنے قافلے کی حالت دریافت کی۔ حضورؐ نے کیفیت بیان کی اور فرمایا قافلے کا ایک اونٹ بدک کر بھاگا اس پر سپید و سیاہ دو گونیں تھیں۔ وہ اونٹ چکرا کر گر پڑا اور گردن ٹوٹ گئی۔ جب قافلہ واپس آیا تو اس نے وہی واقعہ بیان کیا جو حضورؐ نے فرمایا تھا۔ امام احمد نے بروایت جابر بن عبداللہ بیان کیا کہ جب میں رات ہی رات بیت المقدس کو گیا تو صبح کو قریش نے میری تکذیب کی (اور نشانات دریافت کئے) میں مقام حجر میں جا کر کھڑا ہوا اور اللہ نے بیت المقدس میری نظروں کے سامنے منکشف کر دیا چنانچہ دیکھ دیکھ کر میں نے ایک ایک بات بیان کرنی شروع کر دی (رواہ البخاری و مسلم)

صحیحین میں ثقہ ترین سلسلہ اسناد کے ساتھ حدیث معراج بروایت انس بن مالک و مالک بن صعصعہ اس طرح مذکور ہے۔ حضورؐ نے فرمایا میں حطیم میں تھا کہ کوئی شخص میرے پاس آیا اور مجھے لے گیا۔ لے جا کر میرا سینہ چاک کر کے دل نکالا۔ پھر سونے کی ایک طشت میں جو ایمان و حکمت سے پُر تھا میرا دل دھویا اور سینے میں رکھ کر اصلی حالت کی طرح کر دیا۔ اس کے بعد ایک سفید چوپایہ جو گدھے سے بڑا اور خچر سے چھوٹا تھا میرے پاس لایا گیا میں اس پر سوار ہو گیا۔ جبرئیل مجھے لے چلے۔ آسمان دنیا تک پہنچے۔ دروازہ کھلوانا چاہا۔ دریافت کیا گیا کون ہے؟ جواب ملا جبرئیل۔ دریافت کیا گیا ساتھ کون ہے؟ جواب ملا محمد دریافت کیا گیا ان کے لینے کو تمہیں بھیجا گیا تھا؟ جواب ملا ہاں۔ دروازہ کھول دیا گیا اور مرحبا مبارک خوش آمدید کہا گیا۔ حضورؐ نے فرمایا پہلے آسمان پر میں نے آدم کو دیکھا۔ جبرئیل نے کہا یہ آپ کے باپ آدم ہیں ان کو سلام کیجئے میں نے سلام کیا اور آدم نے جواب دیا اور کہا مرحبا فرزند صالح و نبی صالح۔

اسی طرح ساتوں آسمانوں پر جانے کا تذکرہ ہے دوسرے آسمان پر یحییٰ و عیسیٰ، تیسرے آسمان میں یوسف۔ چوتھے میں ادریس، پانچویں میں ہارون چھٹے میں موسیٰ اور ساتویں میں ابراہیم سے ملاقات ہوئی۔ پھر سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچے۔ جہاں سے چار نہریں جاری ہیں۔ دو باطنی دو ظاہری۔ باطنی نہریں تو جنت میں ہیں اور ظاہری نہریں نیل و فرات ہیں۔ اس کے بعد بیت المعمور کا سامنے آنا، شہد، شراب اور دودھ کا تین پیالوں میں پیش کیا جانا اور حضورؐ کا دودھ کو پی لینا اور جبرئیل کا یہ کہنا کہ یہی فطرت ہے جس پر آپ اور آپ کی اُمت ہے کا قصہ مذکور ہے۔ پھر پچاس نمازوں کا فرض ہونا اور حضرت موسیٰ کی استدعا پر پانچ مرتبہ بارگاہ الٰہی میں حاضر ہو کر درخواست تخفیف کرنا اور پانچ نمازوں کا باقی رہ جانا مذکور ہے (رواہ البخاری و مسلم من حدیث قتادہ ایضاً) ہم نے یہ حدیث تلخیص و اختصار کے ساتھ مسند امام احمد سے نقل کی ہے۔ خود صحیحین سے اقتباس نہیں کیا۔ حضرت ابوذر کی روایت (منقول بخاری) میں اتنی بات زائد ہے کہ پہلے آسمان میں حضرت آدم دائیں طرف دیکھ کر ہنس دیتے تھے اور بائیں طرف دیکھ کر رو دیتے تھے۔ جبرئیل نے کہا یہ سب ان کی اولاد کی روحیں ہیں دائیں طرف والے جنتی اور بائیں طرف والے دوزخی ہیں۔

زہری نے ابن عباس اور ابوحبہ انصاری کی روایت سے نقل کیا ہے جس میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ پھر حضورؐ ایسے مقام پر پہنچے جہاں قلموں کے لکھنے کی آواز آتی تھی۔ ابن حزم اور انس کی حدیث (منقول زہری) سے ثابت ہے کہ حضرت جنت میں تشریف لے گئے جہاں موتیوں کے قبے اور مشک کی مٹی تھی۔ امام احمد و مسلم کی روایات (در بارۂ دیدار الٰہی) سے ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا میں نے ایک نور دیکھا۔ بیہقی نے باسناد خود حضرت ابوسعید خدریؓ کی ایک روایت بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور اقدسؐ مسجد حرام میں سو رہے تھے کسی نے آکر جگایا آنکھ کھلی تو کوئی نظر نہ آیا۔ حضورؐ مسجد سے باہر تشریف لائے۔ ایک چوپایہ (براق) کھڑا تھا جس پر انبیائے سابقین سوار ہوا کرتے تھے اور حدِ نظر تک اس کا قدم پڑتا تھا۔ حضورؐ اس پر سوار ہو گئے۔ راستہ میں دائیں طرف سے کسی نے تین مرتبہ پکار کر کہا محمد! میری طرف دیکھو۔ میں کچھ دریافت کرتا ہوں۔ حضورؐ نے جواب نہ دیا بغیر توقف کے چلے گئے۔ پھر بائیں طرف سے کسی نے تین مرتبہ پکار کر کہا محمد ادھر دیکھو حضورؐ نے کوئی جواب نہ دیا نہ ٹھہرے۔ آگے بڑھ کر ایک حسین عورت دیکھی جو آراستہ پیراستہ اور ہاتھ کھولے کھڑی تھی اس نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا، مگر حضورؐ نے التفات نہ کیا۔ بالآخر بیت المقدس پہنچے۔ دودھ اور شراب دو پیالے پیش کئے گئے۔ حضورؐ نے دودھ پی لیا۔ جبرئیل نے کہا آپ نے فطرت کو پا لیا۔ حضورؐ نے فرمایا اللہ اکبر اللہ اکبر۔ جبرئیل نے کہا دائیں طرف سے پکارنے والا وہ شیطان تھا جس نے یہود کو گمراہ کر دیا۔ اگر آپ جواب دیتے یا وہاں ٹھہر جاتے تو آپ کی اُمت یہودی ہو جاتی اور بائیں طرف سے پکارنے والا وہ شیطان تھا جس نے نصاریٰ کو گمراہ کیا۔ اگر آپ اس کی بات مان لیتے تو آپ کی امت نصاریٰ کی طرح ہو جاتی اور وہ عورت دنیا تھی۔ اگر آپ اس کی طرف التفات کرتے تو آپ کی اُمت دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتی۔ اس کے بعد بیت المقدس میں داخل ہو کر حضورؐ نے مع جبرئیل کے دو رکعت نماز پڑھی پھر وہ سیڑھی لائی گئی

جس کے ذریعہ سے اولادِ آدم کی روحوں کو عروج ہوتا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا مُردہ اپنی آنکھیں پھاڑ کے آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا تھا وہ اس سیڑھی کو دیکھ کر اس کو تعجب ہوتا ہے۔ غرض حضور ﷺ مع جبرئیل کے اوپر چڑھے۔ اسمٰعیل نامی فرشتے سے ملاقات ہوئی جس کے ساتھ ستر ہزار فرشتے تھے اور ہر فرشتے کے ساتھ ایک لاکھ فرشتوں کی فوج تھی۔ پہلے آسمان پر پہنچے۔ حضرت آدم کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا۔ آدم کے سامنے ان کی اولاد کی روحیں پیش کی جاتی تھیں۔ اہلِ ایمان کی روح کے متعلق کہا جاتا ہے یہ پاک روح اور پاک جان ہے اس کو علّیین میں رکھو۔ اور فاجر و بدکار روح کے متعلق کہا جاتا ہے یہ ناپاک روح اور ناپاک جان ہے اس کو سجّین میں رکھو۔ اس سے آگے بڑھ کر کچھ خوان نظر آئے جن پر گوشت رکھا تھا، مگر ان کے پاس کوئی نہ تھا اور اس سے آگے کچھ خوان اور بدبودار سڑا ہوا گوشت رکھا تھا جس کو کچھ آدمی کھا رہے تھے۔ جبرئیل نے کہا آپ کی امت کے یہ وہ آدمی ہیں جو حلال روزی کو چھوڑ کر حرام کھاتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ نظر آئے جن کے منہ میں سڑا ہوا گوشت ڈالا جا رہا تھا اور گوشت پیٹ میں ٹھہرتا نہ تھا نیچے سے نکل جاتا تھا۔ جبرئیل نے کہا یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال ناحق کھاتے تھے یہ آگ کھاتے ہیں اور عنقریب دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ غرض اسی قسم کے دوسرے عذابوں کا ملاحظہ کرتے ہوئے دوسرے آسمان پر پہنچے اور ہوتے ہوئے بیت المعمور تک پہنچے۔ بیت المعمور میں داخل ہو کر نماز پڑھی پھر باہر نکل کر سدرۃ المنتہیٰ تک عروج ہوا۔ سدرۃ المنتہیٰ سے نہر سلسبیل نکلی ہے اور سلسبیل سے دو نہریں اور نکلی ہیں۔ ایک کا نام کوثر ہے اور دوسری کا نام رحمت۔ حضورؐ نے اس میں غسل کیا۔ تمام گزشتہ آئندہ گناہ معاف کر دیئے گئے پھر جنت تشریف لے گئے۔ ایک جوان باندی سامنے آئی۔ دریافت فرمایا تو کس کی باندی ہے؟ عرض کیا زید بن حارثہ کی۔ اس کے بعد جنت کی تمام نعمتیں ملاحظہ فرمائیں پھر دوزخ کی سیر کی اور اس کے بعد سدرۃ المنتہیٰ تک عروج ہوا۔ ایک فرشتہ اترا، پچاس نمازیں فرض ہوئیں۔ اس سے آگے موسیٰ کے پاس واپس آنے اور نمازوں میں تخفیف ہونے کا تذکرہ ہے۔ اس روایت کے آخر میں ہے کہ صبح کو جب مکہ والوں سے معراج کا تذکرہ کیا تو ابوجہل نے بطور طعن کہا کہ محمدؐ گمان کرتے ہیں کہ رات ہی رات میں بیت المقدس ہو آئے۔ حالانکہ آمد و رفت کا دو مہینے کا راستہ ہے۔ اس سے پہلے حضورؐ نے واپسی کے قافلے کی کیفیت بیان کی اور اس کے سامان کی تفصیل اور قافلے کا مقام قیام بیان فرمایا۔ ابوجہل بولا اب یہ تو بہت نشانیاں بتلا رہے ہیں۔ تب بعض نے کہا میں بیت المقدس کی عمارت اور نقشہ سے خوب واقف ہوں مجھے اس کے نشانات بتاؤ۔ حضورؐ نے فرمایا میرے سامنے بیت المقدس کا انکشاف کر دیا گیا اور دیکھ دیکھ کر میں نے اس کی عمارت، ہیئت، نقشہ، بناوٹ سب بیان کیا۔ وہ شخص بولا تم نے سچ کہا (رواہ ابن جریر و ابن ابی حاتم والبیہقی)۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ شبِ اسراء میں حضورؐ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے۔ سدرۃ المنتہیٰ چھٹے آسمان میں ہے۔ پانچ نمازیں مقرر کر دی گئیں اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات عطا کی گئیں اور امتِ محمدیہ کے لئے بغیر شرک کے کبیرہ گناہوں کی معافی کا حکم ہوا (رواہ البیہقی وفی روایۃ مسلم نحوہ)۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ جب حضور ﷺ کو مسجد اقصیٰ کی سیر کرائی گئی تو صبح کو حضورؐ نے سیر کا حال لوگوں سے بیان فرمایا۔ بہت سی تصدیق کرنے والے (ظاہری) مسلمان مرتد ہو گئے اور صدیق اکبرؓ کے پاس جا کر حضورؐ کا بیان نقل کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا انہوں نے ایسا فرمایا ہے؟ بولے ہاں ہاں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اگر حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے تو سچ فرمایا۔ ہم تو اس بات کا بھی یقین رکھتے ہیں کہ حضورؐ کے پاس صبح شام کو آسمان سے خبر آتی ہے (رواہ البیہقی باسناد الحاکم)۔

تابعین کی ایک جماعت نے بروایت ابن مسعودؓ و ابن عباسؓ و سیدنا علی بن ابی طالبؓ بیان کیا ہے کہ عشاء کے بعد حضرت ام ہانی کے مکان میں حضورؐ استراحت فرما رہے تھے وہیں سے معراج ہوئی۔ حضرت ام ہانی نے خود بھی فرمایا ہے کہ حضور ﷺ عشاء کی نماز پڑھ کر میرے ہی گھر سو گئے اور ہم لوگ بھی سو رہے پھر فجر سے پہلے واپس تشریف لائے اور فجر کی نماز ہمارے ساتھ پڑھی اور نمازِ فجر کے بعد واقعہ بیان فرمایا۔ اس سے آگے ام ہانی نے پورا واقعہ قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔

تنبیہ گزشتہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے بلکہ آیت قرآنی میں بھی صراحت ہے کہ مسجد حرام سے جس کے اندر حطیم زمزم بھی شامل ہے حضورؐ روانہ ہو کر بیت المقدس پہنچے، مگر ام ہانی کی روایت سے ثابت ہے کہ ان کے مکان سے معراج ہوئی۔ دونوں میں مطابقت اس طرح ہو سکتی ہے کہ عشاء کی نماز پڑھ کر حضرت ام ہانی کے مکان میں استراحت فرما ہوئے پھر فرشتے لینے کو آئے تو مسجد حرام میں تشریف لے گئے۔ قلب دھویا گیا اور وہاں سے

مسجد اقصیٰ کی جانب تشریف لے گئے۔

یہ امر بھی جان لینا ضروری ہے کہ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور پھر مسجد اقصیٰ سے عرش عظیم تک معراج جاگتے میں ہوئی۔ روحانی یا خوابی معراج بھی ممکن ہے ہوئی ہو جیسا کہ بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے اور اسی پر اجماع اہلِ سنت ہے۔

ایک شبہ رسول اللہؐ کے زمانے میں ہیکل سلیمانی موجود نہ تھی۔ بخت نصر نے اس کو برباد کر دیا تھا دوبارہ تعمیر ہوئی تو شاہ انطاکیہ نے گرا دیا۔ پھر تعمیر ہوئی تو ٹیٹس قیصر روم نے تباہ کر کے جڑیں بھی کھود ڈالیں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کے دور تک کوئی تعمیر نہ ہوئی۔ مسئلہ سوال یہ ہے کہ جب مسجد اقصیٰ موجود نہ تھی تو رسول اللہؐ کا وہاں جانا، اندر داخل ہونا، سیر کرنا، انبیاء کی امامت کرنا، اہلِ مکہ کو ان کے سوال پر پورا نقشہ بتانا یہ کیونکر ممکن ہے۔

ازالہ رسول اللہؐ کے زمانے میں مسجد اقصیٰ کی عمارت ضرور موجود نہ تھی۔ مسجد کی جگہ اجاڑ پڑی تھی، لیکن مسجد نام عمارت کا نہیں بلکہ اس جگہ کا ہے خواہ عمارت ہو نہ ہو۔ دیواروں یا گنبدوں کو مسجد کہنا مجازاً ہے۔ حقیقتاً عبادت گاہ وہ زمین ہوتی ہے جو عام طور پر عبادت کے لئے مقرر کر لی جائے۔ حضرت سلیمان نے جو جگہ عبادت کے لئے مقرر کی تھی اور جس پر عمارت بنائی گئی تھی وہ جگہ موجود تھی۔ مادی آنکھیں رکھنے والوں کو اس جگہ کوڑا کرکٹ نظر آتا تھا لیکن اہلِ بصیرت کے لئے وہ جگہ مرکز نور، سورۂ برکات اور منزلِ رحمت تھی، اسی جگہ کی سیر کرانے کے لئے حضورؐ کو لے جایا گیا۔ بالفعل بتانا تو اسلامی اور عیسائی تاریخوں سے ثابت ہے کہ انہدام مسجد کے بعد کچھ عیسائیوں نے اس کے آس پاس مکان بنا لئے تھے جن کو خود عیسائی اور عوام بیت المقدس کہتے تھے۔ قریش مکہ بھی بسلسلۂ تجارت بار بار وہاں گئے اور انہی مکانات کو دیکھا تھا اور عوام کے قول کے موافق انہی مکانات کو بیت المقدس جانتے تھے۔ انہی کے متعلق استفسار کیا تھا۔ شبِ اسریٰ میں چونکہ حضورؐ مسجد اقصیٰ میں تشریف لے گئے تھے۔ آس پاس کے مکانات کچھ باعثِ کشش یا مقام برکت نہ تھے اس لئے ان کی طرف بھی التفات نہ فرمائی، لیکن جب اہلِ مکہ نے بطور آزمائش ان مکانات کا نقشہ اور پہاڑ سے فاصلہ کی مقدار دریافت کی تو انکشاف باطنی کے ذریعہ تمام مکانات اصل شکل میں حضورؐ کے سامنے آگئے جن کو دیکھ دیکھ کر آپ نے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ بتا دیا، مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ بیت المقدس کی عمارت کو فرشتے اس کی جگہ سے اٹھا کر حرم میں لے آئے تھے بلکہ بات یہ تھی کہ جس شخص کی مادی کثافت پر نور روحانیت غالب ہوتا ہے اور جس کی عقل بالملکہ قوتِ قدسیہ کی حد تک پہنچ جاتی ہے، اس کے نور باطن کو مادی حجابات نہیں روک سکتے۔ اس کو پس پشت کی چیزیں بھی ویسی ہی نظر آتی ہیں جیسے سامنے کی۔ ہاں تخیل کو یکسو کر کے کسی قدر التفات باطنی کی ضرورت پڑتی ہے۔ حضورِ والا کا تخیل اہلِ مکہ کے سوال کے وقت یکسو نہ تھا۔ جب حرم پاک میں جا کر کھڑے ہوئے تو التفات باطنی فرمایا۔ فوراً درمیانی حجابات سامنے سے اٹھ گئے اور العین مادی آنکھوں سے بیت المقدس کی عمارت کو اس کی جگہ پر موجود ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔

دوسرا شبہ جسم عنصری کثیف ہے اس کی تخلیق مادہ عناصر سے ہوئی، یہ آسمانوں پر نہیں جا سکتا نہ ارواح مجردہ سے بات چیت کر سکتا ہے نہ نورِ مطلق کا قرب اس کو حاصل ہو سکتا ہے نہ جلوہ الٰہی دیکھ سکتا ہے۔

ازالہ بے شک جسم عنصری کثیف ہے۔ اس کی تخلیق مادۂ عناصر سے ہوئی ہے، لیکن کبھی یہی تخلیقِ عنصری نہایت لطیف ہو جاتی ہے اور ایسی شفاف بن جاتی ہے کہ کوئی چیز اس کو روک نہیں سکتی۔ مثلاً قوتِ بینائی کا مرکز دماغ کے اندر عظم وتدی کا بالائی حصہ ہے۔ اس نور کی تخلیق عنصری مادہ سے ہوئی ہے، لیکن لطافت کی وجہ سے اس میں آسمان تک ایک دم پہنچنے کی طاقت ہے یا انسان کی دماغی اور ادراکی قوتیں ہیں، احساس ہے، توہم ہے، تخیل ہے، تحفظ و تذکر ہے یہ تمام قوتیں مادی اور مادے کی پیداوار ہیں۔ روح مجرد کی ذات میں داخل نہیں بلکہ اس کے خدام اور آلۂ کار ہیں، لیکن ان کی رسائی عرش بریں تک ہے۔ روح ان ہر طرح کا کام لیتی ہے ترہیں آسمان اور بروں تک ملبا چکر دیتی ہے۔ جب ہم سوسائٹی میں وہی رات اس قسم کا مشاہدہ کرتے ہیں پھر رسول پاکؐ اگر بجسم عنصری آسمانوں پر تشریف لے گئے تو کون سی ناقابل تسلیم بات ہوئی۔ روح مبارک اس قدر روشن اور مطہر تھی کہ اس نے جسم گرامی لطیف بنا کر عالم بالا کی سیر نہ بلکہ خود سیر کی اور جسم کو بطور آلہ استعمال کیا۔ جس طرح دیکھنا، سونگھنا، چکھنا، سننا، احساس، توہم کرنا اور ہر قسم کا جزئی مادی ادراک کرنا بھی روح کا کام ہے، مگر دماغی حواس کے ذریعہ اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسی طرح روح مبارک نے جلوۂ الٰہی دیکھا۔ نورِ مجرد کے قرب میں پہنچی، ارواح اور ملائکہ سے گفتگو کی۔ جنت و دوزخ کی سیر کی اور یہ سب کچھ جسم عنصری کے پردہ کی آڑ میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سیر کے لئے کسی طویل زمانہ اور دور دراز وقت کی ضرورت نہ ہوئی۔ صرف چند منٹ یا چند

لمحات تمام مراحل طے کرنے کے لئے کافی تھے۔ نور نظر یا احساس تخیل کی طرح حضور والا کے بدن مبارک کی رسائی کسی وقت طویل کی محتاج نہیں۔

مسجد اقصیٰ مسجد اقصیٰ تک جانے کا تذکرہ آیت مذکور میں آیا ہے اس سے آگے چند آیات میں شہر یروشلم پر دوبارہ حملہ کرنے اور اسرائیلیوں کو تباہ کرنے کا بھی بیان کیا گیا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فلسطین کی تاریخ کا مختصر جامع تذکرہ کر دیا جائے تاکہ آیات قرآنی کو تاریخ کی روشنی میں سمجھنے کا صحیح موقع مل جائے۔ ہم نے مندرجہ ذیل اقوال وکتب سے اس مضمون کو فراہم کرنے میں مدد لی ہے۔ بائیبل کے انگریزی، عربی اور اردو تراجم، مورخ یوسف کی تصریحات، جغرافیہ فرہاد، الکتاب کے مقامات المعروف، لغت ، وارن کا سفر نامہ ۱۸۷۱ء ابن الکلبی اور یاقوت کے اقوال، تاریخ فرشتہ، رومن تفسیر اسکاٹ ہندی تاریخ کلیسا، مفتاح التواریخ، تاریخ الامم المتقدمی، سیر الاسلام، ابو الفداء، واقدی وغیرہ اور خصوصیت کے ساتھ علامہ حقانی کی تاریخ بیت المقدس، مسجد اقصیٰ، بیت المقدس، بیت المقدس اور ہیکل یہ چاروں نام ایک ہی عبادت خانے کے ہیں۔

یہ عبادت خانہ جیروسلم یا شہر شلیم میں واقع ہے۔ جیروسلم ملک فلسطین کا ایک شہر ہے۔ تاریخ میں ملک فلسطین (پیلیسٹائن) کا نام ملک یہودیہ، یہودا اور ارض مقدس کنعان بھی آتا ہے۔ پورے ملک فلسطین کو کنعان کہا جاتا ہے اور ملک شام کے اس حصہ کا یہ بھی نام ہے جس میں حضرت یعقوب کا مسکن سیلون نامی واقع تھا سیلون سمل ور نابلس کے درمیان ایک گاؤں تھا جہاں حضرت یعقوبؑ کی سکونت تھی اور حضرت یوسفؑ کو جس کنوئیں میں ڈالا گیا تھا وہ یہیں تھا۔

فلسطین کی جغرافیائی حدود شمال میں ملک سوریا یعنی شام اور مغرب میں شمالی حصہ تک بحیرۂ روم واقع ہے۔ بحیرۂ روم کے کنارے پر مقامات شہر آباد ہیں۔ طرابلس، عسرہ، یافہ، صیدا، عقلون، عکہ، صور، بیروت، لاذقیہ، قیصاریہ، یقرون، غازہ وغیرہ۔ جنوب میں ملک عرب کے شمالی حصے ہیں اور شرق میں نہر یردن یا اردن اور بحر المیط یا بحیرۂ لوط واقع ہے۔

فلسطین کا طول سوریا سے لے کر عمالقہ کی سرزمین تک چالیس کوس ہے۔ قدیم زمانہ میں اس ملک پر نینوی اور بابل کے بادشاہوں کی حکومت تھی۔

حضرت ابراہیم بھی بابل کی سکونت ترک کر کے فلسطین میں آرہے تھے۔

فلسطین کے پہاڑ فلسطین میں شمالی سمت سے کوہستان کے سلسلے چلتے ہیں۔ جہاں سے یہ سلسلے جنوب ومغرب کی طرف جاتے ہیں اس جگہ کا نام لبنان ہے۔ مغربی سلسلہ شہر صور سے دو میل شمال کی طرف بحیرۂ روم کے کنارے پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرے سلسلے کی دو شاخیں ہو کر جنوب کی طرف چلتی ہیں۔ مشرقی سلسلہ کا نام ایک موقعہ پر کوہ حرمون ہے۔ یہ سلسلہ دریائے جلیل کے قریب کوہ لبن کہلاتا ہے اور یردن ندی کے قریب پہنچ کر اس کا نام کوہ جلعاد ہے اس سے آگے بڑھ کر کوہ ابریم کہا جاتا ہے سیہد یا فوں کی زمین کے پاس کوہ شعیر کہلاتا ہے۔ کوہ شعیر کی ایک چوٹی کا نام کوہ حور ہے۔ یہ حضرت ہارون کا مدفن ہے۔ اسی طرح مغربی سلسلہ جلیل دریا کے پاس پہنچ کر کوہ بتور اور آگے بڑھ کر کوہ کرمل کہلاتا ہے۔ کوہ بتور کے وسط سے یزرعیل تک وادی یزرعیل کہلاتی ہے۔ اس سے آگے جنوب کی طرف چل کر اسرائیل یا افرائیم بن یوسف کے پہاڑ کہلاتے ہیں جن میں سے ایک کا نام جرزیم بھی ہے۔ کوہ جرزیم کی چوٹی پر اسرائیلیوں کے مقابلے میں سامریوں نے ایک اور عبادت خانہ بنایا تھا۔ اسی سلسلے میں کوہ موریہ بھی ہے۔ حضرت سلیمان نے جس پر مسجد اقصیٰ کی تعمیر کی تھی۔ کوہ صیہون بھی اسی سلسلے میں ہے۔

شہر یروشلم چار پہاڑوں پر واقع ہے۔ موریہ، صیہون، اکرا، بزیتہا۔ قدیم زمانہ میں یہاں اموری قوم کی آبادی تھی، اسی لئے چاروں پہاڑوں کو موریہ کہا جاتا ہے۔ اموری قوم کے ایک بادشاہ کا نام صیہون تھا جس کے نام پر کوہ صیہون نامزد ہوا۔

یروشلم کا فاصلہ بحیرۂ روم سے ۳۲ میل، یردن سے ۱۸ میل، شہر جبرون سے ۲۰ میل، سامرہ ۳۶ میل، دمشق سے ۱۲۱ میل، بغداد سے ۴۵۰ میل، نابلس سے ۳۰ میل، یافہ سے ۲۶ میل، ناصرہ سے ۷۰ میل، مصر سے ۲۶۰ میل، کوہ طور سے ۲۰۰ میل، مدینہ منورہ سے ۶۰۰ میل، شہر ادوسبا یا بیر سبع ۱۶ میل، مکفیلہ کے غار سے ۲۰ میل اور بیت اللحم یعنی مولد مسیح سے ۵ میل ہے۔

یروشلم کے قریب شرقی جانب کوہ زیتون ہے۔ یہ عبادت گاہ مسیح تھا۔ یہیں سے مسیح کو گرفتار کیا گیا تھا۔

جب بنی اسرائیل ملک مصر سے کوچ کر کے کنعان میں آکر آباد ہوئے اسی وقت سے شہر یروشلم آباد ہے۔ بعض عیسائیوں کی کتابوں میں یروشلم کے بانی

کا نام ملک صدق لکھا ہے۔ ملک صدق کا تذکرہ کتاب پیدائش باب ۱۴ ورس ۱۸ میں اس طرح آیا ہے کہ ملک صدق سالم کا بادشاہ تھا آباد ہونے سے ایک سو برس کے بعد اس پر یبوسیوں کا قبضہ ہوا۔ یبوسیوں نے کوہ صیہون پر ایک قلعہ بھی تعمیر کیا۔ شہر کا نام پہلے سالم تھا اب یابوس ہوگیا اور دونوں کو مرکب کرنے سے یبوسلم بنا جو بگڑ کر یروشلم ہوگیا۔ حملہ یشوع کے بعد سے داؤد کے زمانہ تک یہودی اور یبوسی مل کر یروشلم میں رہتے تھے۔ داؤد اور سلیمان کے زمانہ میں اس شہر کو تخت گاہ ہونے کی وجہ سے بہت ترقی ہوئی۔ اگرچہ اس مقام کا تبرک و تصدق پہلے ہی سے متواتر چلا آتا تھا۔ یروشلم میں بقول اہل کتاب جس جگہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کو قربانی کے لئے پیش کیا اور حضرت یعقوبؑ نے خواب میں خداتعالیٰ سے جس جگہ باتیں کیں اور بیت ایل نام رکھا اسی جگہ حضرت سلیمان نے ہیکل تعمیر کی۔ یہی ہیکل مسجد اقصیٰ کے نام سے عرب میں مشہور ہوئی۔ اس کے قرب و جوار میں ہزاروں انبیاء کی قبریں ہیں۔ اسی شہر اور اسی مسجد پر متعدد بار انقلاب آئے۔ بربادی، آبادی اور انہدام و تعمیر سے کئی دفعہ دوچار ہونا پڑا۔

مسجد صخرہ

یروشلم میں سب سے مقدس اور متبرک مقام وہ مسجد ہے جس کو حضرت عمرؓ نے تعمیر کرایا تھا یہ مسجد صخرہ کے نام سے مشہور ہے۔ جس وقت عمر فاروق اعظم کے دور خلافت میں مسلمانوں نے یروشلم کا محاصرہ کیا اور کفار محصور ہو گئے تو عیسائیوں کے سب سے بڑے پادری نے شہر کو سپرد کرنے کی یہ شرط پیش کی کہ اگر عمر خود آکر شرائط صلح پر دستخط کریں گے تو ہم شہر پناہ کا دروازہ کھول دیں گے۔ چنانچہ خلیفۂ اسلام خود تشریف لائے۔ تکمیل معاہدہ کے بعد شہر پر قبضہ ہوا اور مسجد تعمیر کرنے کے ارادے سے فاروق اعظمؓ نے اسی بطریق سے بہترین جگہ دریافت کی جس سے عیسائیوں اور یہودیوں کی بھی دل آزاری نہ ہو۔ بطریق مذہبی صحیفوں کا عالم تھا اور تصریحات سلف کے تحت اس کا اعتقاد تھا کہ مسجد اقصیٰ یا ہیکل سلیمانی جس جگہ بنی ہوئی تھی اور مسیح کی پیش گوئی کے موافق وہ برباد ہوگئی وہ بر قول مسیح کے آباد نہ ہوگی۔ ہاں جو قوم خدا کی منظور نظر اور برگزیدہ ہوگی وہ اس جگہ کو آباد کرلے گی۔ چونکہ پادری کو اسلام کی حقانیت کا یقین نہ تھا، اس لئے اس نے اپنی عیاری کو چھپا کر حضرت عمر کو وہی مقام مسجد تعمیر کرنے کے لئے بتا دیا جہاں ہیکل سلیمانی کی کسی زمانے میں تعمیر تھی۔ پادری نے تو چالاکی سے کام لیا تھا، مگر خداتعالیٰ کو پادری کی چالاکی کے ذریعہ مقام مقدس میں مقدس مسجد تعمیر کرانی تھی۔ حضرت عمر نے متبرک عمارت کی وہیں بنیاد ڈال دی۔ اس مسجد کے اندر ایک بہت بڑا سنگ مرمر کا تختہ یا چبوترہ ہے جو سطح سے بارہ چودہ فٹ اونچا ۲۵۰ فٹ مربع ہے۔ اسی پتھر کی وجہ سے اس مسجد کو صخرہ کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بڑا پتھر بھی ہے جس کی نسبت مشہور ہے کہ حضور اقدسؐ اس سے سہارا لگا کر بیٹھتے تھے۔ مسجد کے چاروں طرف موذن فراش امام اور دیگر خدام مسجد کے لئے حجرے بنے ہوئے ہیں۔ مسجد کی موجودہ عمارت حضرت عمرؓ کے وقت کی نہیں ہے بلکہ سلاطین بنی اُمیہ نے اس کو ازسرنو تعمیر کیا اور پھر سلطان سلیمان عثمانی نے اس کو بنایا جو اس وقت موجود ہے۔ نوّے برس تک اس مسجد پر عیسائیوں کا قبضہ رہ چکا ہے، لیکن سلطان صلاح الدین کے بعد سے پھر مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی تھی پھر ۱۹۱۸ء سے برطانیہ کا اس پر قبضہ ہے اور خدا جانے کب تک رہے گا۔

قدیم تعمیر

حضرت موسیٰ تمام اسرائیلیوں کو مصر سے لے کر بحکم الٰہی نکلے اور بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کی وجہ سے قادس اور شمالی عرب کے ریگستان میں سب کو لے کر حیران سرگرداں چالیس سال پھرتے رہے۔ میدان تیہ میں ہی بیس برس سے زیادہ عمر والے اسرائیلیوں کا انتقال ہوگیا۔ خود حضرت موسیٰ اور ہارون بھی راہی بقا ہوگئے اور آپ کے قائم مقام یوشع بن نون ہوئے تو جناب یوشع نے میدان تیہ سے نکل کر ملک فلسطین فتح کیا۔ کنعان کے وارث بنے اسرائیلیوں کو سلطنت ملی۔ یہ حکومت ساؤل یعنی طالوت کے زمانے تک رہی۔ پھر ساؤل کے بعد مسیح سے (بقول مورخ یوسفس) ۵۱۵ برس پیشتر حضرت داؤد پیغمبر اور بادشاہ ہوتے۔ آپ نے یبوسیوں کو مغلوب کر کے کنعان سے نکالا اور ازسرنو یروشلم کو آباد کیا۔ میدان تیہ میں حضرت موسیٰ کو ایک خیمہ بنانے کا حکم دیا تھا۔ جس کو خیمہ عبادت کہا جاتا تھا کیونکہ اس وقت کوئی مستقل عبادت خانہ نہ تھا نہ ریگستان میں اینٹ مٹی پتھر کی کوئی عمارت بنائی جا سکتی تھی۔ حسب الحکم حضرت موسیٰ نے خیمہ عبادت تیار کیا اور جہاں جاتے خیمہ کو ساتھ لے جاتے۔ جس جگہ قیام ہوتا وہیں نصب کر دیتے۔ حضرت موسیٰ سے لے کر حضرت داؤد تک یہی خیمہ عبادت مع بنی اسرائیل تھا۔ حضرت داؤد نے لا کر اس خیمہ کو شہر یروشلم میں کوہ صیہون پر بمقام بیت ایل نصب کیا اور اس کے اندر پتھر بھی گاڑ دیا اور اس جگہ پختہ عمارت بنانے کا ارادہ کیا، مگر جنگ و جدال سے اتنی فرصت نہ ملی کہ ارادہ پورا کر سکتے، صرف سامان فراہم کر لیا اور وفات کے وقت حضرت سلیمان کو تعمیر مسجد کی وصیت کر دی۔ کل موجودہ سامان بھی دیا اور نقشہ بھی بنا دیا۔ حضرت سلیمان نے تخت نشینی سے چار برس دو ماہ بعد حیرام کاریگر ساکن صور یا کی نگرانی میں لاکھوں مزدوروں معماروں سے کام شروع کرایا اور ساڑھے سات سال کے بعد جب عمارت تیار ہوگئی تو بنی اسرائیل کو دور دراز مسافتوں سے جمع کر کے عظیم الشان ضیافت کی۔ صندوق

شہادت یعنی تابوت سکینہ اندر رکھا جب کاہن لوگ ہر چیز کو ترتیب سے رکھنے کے بعد مسجد سے باہر آئے تو حضرت سلیمان نے سر بسجود ہو کر مناجات کی کہ بار الٰہا تو زمین و آسمان اور بحر و بر میں کہیں سما نہیں سکتا ! علاوہ ازیں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ اس مکان میں جب تیرے بندے عبادت کرنے آئیں اور دعا مانگیں تو ان سب کی دعا اور بندگی قبول فرما اور ان کی حاجتیں پوری کر۔ اگرچہ تو تمام بندوں کی حفاظت کرتا ہے اگر یہ تجھ سے ڈرتے ہیں ان کا اللہ یا وہ نگہبان اور بڑا مہربان ہے، اس دعا کے بعد بے شمار قربانی کے جانور ذبح کئے پھر تمام اللہ لوگوں کو رخصت کیا اور تمام لوگ خوشی خوشی اپنے وطن اور اپنے گھر کو چلے گئے۔ بقول مورخ یوسفس یہ واقعہ خروج موسیٰ از مصر کے ۵۹۲ برس بعد کا ہے گویا طوفان نوح سے ۱۴۴۰ سال بعد تعمیر مسجد اقصیٰ ہوئی۔

بنی اسرائیل کی حکومت

چالیس سال سلطنت کرنے کے بعد حضرت سلیمان کا انتقال ہو گیا۔ آپ کا بیٹا رحبعام جانشین ہوا۔ رحبعام کی بے دینی اور بد چلنی کی وجہ سے اسرائیلیوں کے دس فرقے اس کی حکومت سے خارج ہو گئے صرف دو فرقے رہ گئے دس فرقوں نے اپنا سردار یربعام کو بنایا۔ کچھ مدت کے بعد سیساق شاہ مصر نے بڑا لشکر لے کر یروشلم کو تباہ کر دیا۔ لیکن شہر کو منہدم نہیں کیا نہ ہیکل کو برباد کیا۔ صرف چاندی سونے کا وہ سامان جو ہیکل میں موجود تھا لوٹ کر لے گیا۔ رحبعام کے بعد چار سو برس تک بنی اسرائیل کی سلطنت میں متواتر کمزوریاں پیدا ہوتی رہیں۔ بعض بادشاہ بت پرست بھی ہوئے ہیکل کی حالت خراب خستہ رہی۔ توریت اور صندوق شہادت بھی ضائع ہو گیا۔ بالآخر یوسیا حکمراں ہو گیا۔ اس نے ہیکل کی مرمت کی اس زمانے میں شاہ مصر نیکو ثانی نے ملک آسور پر چڑھائی کی۔ اس کا ایک صوبہ مشہور بادشاہ بخت نصر کا باپ نبوپولاسر شاہ بابل بھی تھا۔ یوسیا کا ملک چونکہ بیچ میں حائل تھا اس لئے اس نے فرعون کے لشکر کو روکا جنگ ہوئی یوسیاہ مارا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا یہوآخز حکمراں ہوا۔ یہوآخز کی حکومت کے تیسرے ہی مہینے شاہ مصر نے پھر یروشلم پر حملہ کیا اور یہوآخز کو گرفتار کر کے لے گیا پھر یوسیاہ کا دوسرا بیٹا آل یقیم بادشاہ ہوا اور مصر کا باج گزار بن گیا۔ چند سال کے بعد بخت نصر شاہ بابل نے یروشلم پر لشکر کشی کی اور آل یقیم کو باج گزار بنا کر بہت سے شرفاء کو قیدی بنا کر لے گیا جن میں حضرت دانیال پیغمبر بھی تھے۔ گیارہ سال کے بعد فرعون مصر کے اشارے سے سریانی، موآبی اور عمونی قبائل نے یروشلم پر چڑھائی کر کے آل یقیم کو قتل کر دیا۔ اس کے قتل ہونے کے بعد اس کا بیٹا یکونیاہ تخت نشین ہوا۔ چند ماہ کے بعد بخت نصر نے پھر چڑھائی کی یروشلم کو فتح کیا، لوٹا، ہیکل کو تباہ کیا۔ بادشاہ سمیت ہزاروں سرداروں اور کاریگروں کو قید کر کے لے گیا اور بجائے یکونیاہ کے شاہی خاندان کے ایک شخص صدقیاہ کو حکومت دے گیا۔ صدقیاہ نو سال تک حکمراں رہا۔ نویں سال یہ شاہ مصر سے مل گیا اور شاہ بابل کی باجگذاری سے انکار کر دیا۔ دو سال کے بعد بخت نصر نے پھر یروشلم پر لشکر جرار کو چڑھایا۔ صدقیاہ میں مقابلے کی تاب نہ تھی، بھاگا اور شہر ربلہ میں گرفتار ہو گیا۔ بخت نصر کے سپہ سالار نے شہر کو اور ہیکل کو لوٹا، لوٹ کر مسمار کیا، مسمار کر کے آگ لگا دی۔ کل ہیکل اور شہر کے بہت مکانات سوختہ ہو گئے یہ واقعہ ۵۸۶ قبل مسیح کا ہے۔ صدقیاہ نے حضرت یرمیاہ کو قید کر دیا تھا۔ اہل بابل نے آپ کو رہا کر کے اعزاز کے ساتھ رخصت کیا۔ سو سال تک مردہ رہنے کے بعد زندہ ہو جانے کا وہ قصہ جو قرآن پاک میں مذکور ہے غالباً یرمیاہ کا ہی ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین اس کو عزیر کا واقعہ کہتے ہیں، مگر تاریخ کی روشنی میں واقعات کے مطالعات کرنے والے اس کو یرمیاہ کا ہی واقعہ کہتے ہیں۔ بعض عیسائی اور یہودی مورخ اس قصہ کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یرمیاہ کا انتقال مصر میں ہوا۔ یروشلم وہ واپس ہی نہ آئے۔

یروشلم اور ہیکل کی سب سے پہلی عظیم الشان تباہی بخت نصر کے ہی ہاتھوں ہوئی اور یہ سب وبال بنی اسرائیل کی تباہ کاری، فساد ظلم اور شرک کی وجہ سے آیا۔

کچھ اوپر ستر سال یہودی بابل میں رہے۔ تخمیناً ۵۳۸ قبل مسیح قم کیسر (کیرش) شاہ ایران نے سلطنت بابل کا خاتمہ کیا اور ۴۲ ہزار یہودیوں کو یروشلم بھیجا۔ باقی یہودی بابل ہی میں رہے۔ حضرت حزقیل اور دانیال کا انتقال بابل ہی میں ہوا۔ واپس آنے والے یہودیوں نے ہیکل کی دوبارہ تعمیر کی جو دس بارہ سال میں پوری ہوئی۔ فرقہ سامری نے بھی یہودیوں کے ساتھ تعمیر ہیکل میں حصہ لینا چاہا، مگر یہودیوں نے انکار کر دیا۔ سامری فرقہ درحقیقت یہودی النسل تھا۔ آسور کا بادشاہ ۷۲۱ قبل مسیح میں گرفتار کر کے لے گیا۔ وہاں پہنچ کر یہ مخلوط النسل ہو گئے۔ واپس آئے تو انھوں نے یربعام کی زیر سرکردگی اپنی حکومت جدا قائم کر لی اور یہودیوں نے تعمیر ہیکل بنالی۔ تعمیر ہیکل میں جب ان کو شریک نہ کیا تو کوہ جرزیم پر انھوں نے جدا ہیکل بنالی۔ تعمیر ہیکل کے قدیم مہتمم یوشع بن صدق اور زروبابل بن سلتائیل تھے اور مذہبی پیشوا حضرت حجی اور حضرت زکریا بن عیدو تھے۔ حضرت عزیر نے ہیکل کو کامل کیا جسے عزرا کہتے ہیں۔ حجی اور زکریا پیغمبروں کی مدد سے اپنی بادشاہت حکومت قائم کی اور بنی اسرائیل کو دنیوی آسائش، مذہبی آزادی اور عزت و شوکت نصیب ہوئی۔ دارا سے لے کر سکندر فلپس کے زمانہ یعنی ۳۳۲ قبل مسیح تک بنی اسرائیل

خوب چلتی رہے۔ سکندر کی وفات کے بعد اس کا ملک چار سرداروں پر تقسیم ہوا سلوکس کو ایران و بابل اور چند مشرقی صوبے ملے۔ کاسنس سانڈر کو مقدونیہ اور اس کے مضافات۔ اینٹوکس کو شام اور ایشیا کوچک کا اکثر حصہ ملا اور ٹالمی ابن لاگس نے مصر ملک یہود دبا لیا اور یروشلم پر قبضہ کیا۔ کچھ زمانے کے بعد شاہ مصر نے بہتر یہودی علماء کو جمع کر کے یہودی مذہبی کتابوں کا عبرانی سے یونانی زبان میں ترجمہ کرایا۔ یہ ترجمہ سنہ ۲۸۰ ق م بمقام اسکندریہ ہوا۔

انٹیوکس بانی انطاکیہ کے جانشینوں اور ٹالمی شاہ مصر کے جانشینوں میں ہمیشہ جنگ رہتی تھی۔ یہودی ہمیشہ مفت میں پستے تھے۔ سنہ ۲۱۷ ق م میں انٹیوکس نے ٹالمی سے یروشلم چھین لیا تھا، مگر سنہ ۲۰۳ ق م میں پھر ٹالمی نے واپس لے لیا اور سنہ ۱۹۵ ق م تک شاہان مصر ہی کے قبضہ میں رہا۔ پھر ٹالمی خاندان کے ہاتھ میں پہنچ گیا۔ سنہ ۱۷۰ ق م میں یسون کاہن کی بغاوت کی وجہ سے انٹیوکس چہارم نے یروشلم پر حملہ کر دیا۔ چالیس ہزار یہودیوں کو قتل اور چالیس ہزار کو قید کیا اور ہیکل کو خوب لوٹا۔ لیکن ایک سال بعد یہودی پھر شاہ مصر کے طرفدار ہو گئے۔ شاہ انطاکیہ نے فوج بھیج کر دوبارہ یروشلم کو تباہ کرایا اور اپنے نائب اپنیوس کو حکم دے دیا کہ جو یہودی قدیم یونانی بت پرستی کو قبول نہ کرے اس کو قتل کر دو۔ ہزاروں بندگان خدا قتل ہوئے۔ ہیکل بت خانہ بن گیا۔ کتب یہود جلا دی گئیں۔ اسمونی خاندان کا ایک بوڑھا کاہن متاتیس تھا یہ اپنا دین بچانے کے لئے بیٹوں سمیت بھاگ کر شہر مودین میں آ رہا۔ شاہی آدمیوں نے تعاقب کیا۔ بوڑھے کاہن نے یہودیوں کو جمع کر کے مقابلہ کیا اور شاہی آدمیوں کو مار بھگا دیا۔ پھر بتوں کو توڑا، بت پرستوں کو قتل کیا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۶۷ ق م کا ہے۔ کاہن کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا یہوداہ جس کا لقب مقابیس تھا جانشین ہوا۔ مقابیس نے یروشلم پر قبضہ کر کے شہر کی مرمت کی اور ہیکل کو مورتیوں سے صاف کیا۔ اس زمانے میں روما کی سلطنت بہت عروج پر تھی۔ مقابیس نے حکومت روما سے معاہدہ کیا۔ ادھر انٹیوکس کے گورنر ڈیمٹریوس نے یروشلم پر حملہ کیا اور مقابلہ کرنے کے بعد سنہ ۱۶۰ ق م میں مقابیس مارا گیا اس کے بعد اس کا بھائی یونتان قائم مقام ہوا۔ یونتان شہر بطولیمس میں سوریا کے بادشاہ کے ہاتھ سے مارا گیا تو اس کا بھائی شمعون سنہ ۱۴۳ ق م میں جانشین ہوا۔ پھر شمعون کا بیٹا یوحنا حاکم ہوا۔ اس نے ملک یہودیہ کے چند صوبوں پر قبضہ کر لیا۔ سامریوں نے ہیکل کو غارت کیا۔ رومیوں نے از سر نو معاہدہ کیا۔ پھر اس کا بیٹا ارسطوبولس سنہ ۱۰۷ ق م میں حاکم ہوا۔ اس نے بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ پھر اس کا بیٹا سکندر جنیوس بادشاہ ہوا اور سنہ ۷۹ ق م میں جنیوس کا انتقال ہوا۔ سکندر کے انتقال کے بعد یہودیوں کی باہمی نا چاقی کی وجہ سے شاہ روم نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ جولیس قیصر روم نے اینٹی پیٹر کو ملک یہود کا نواب مقرر کر دیا۔ سنہ ۴۳ ق م میں اینٹی پیٹر مر گیا تو اس کا بیٹا ہیروڈیس حاکم ہوا، لیکن یہودیوں نے اس کی مخالفت کی۔ مجبور ہو کر یہ شاہ روم کے پاس بھاگ گیا، شاہ روم نے فوج دے کر اس کو دوبارہ بھیجا تین برس جنگ رہی بالآخر ہیروڈیس نے یروشلم فتح کر لیا اور ۳۵ برس حکومت کی۔ اس نے اپنی پالیسی بدل دی، یہودیوں کو ملانے کی کوشش کی، ہیکل کو از سر نو نہایت خوبصورت تعمیر کیا۔ مسیح کے عہد میں یہی ہیکل تھی۔ اس کے بعد ہیروڈیس دوم حاکم ہوا۔ اس نے حضرت یوحنا یعنی حضرت یحییٰ کو قتل کرایا۔ مسیح اپنی والدہ کو لے کر اس کے خوف سے مصر چلے گئے۔ ہیروڈیس دوم کا نام ارکلاوس تھا۔ قیصر روم اگسٹس نے اس کو بے دخل کر کے ملک فرانس کو بھیج دیا تھا۔ مسیح کا خروج اسی زمانے میں ہوا۔ یہودیوں نے مسیح کی سخت مخالفت کی۔ مسیح نے آنے والی آسمانی بلا سے ڈرایا، مگر یہودیوں کو یقین نہ آیا اور عناد اور بڑھ گیا۔ اسی دوران میں یہودیوں کو اپنی ذلت اور غیر ملکی تسلط کا احساس ہوا۔ لیڈروں نے لیکچر دیئے، کاہنوں نے بغاوت پر آمادہ کیا۔ آخر کار یہودی کھلم کھلا شاہ روم سے باغی ہو گئے اور رومی لشکر کو نکال کر یروشلم پر عارضی قبضہ کر لیا۔ سیاسٹن رومی سردار نے آ کر یروشلم کا پھر محاصرہ کر لیا۔ حصار نے طول پکڑا۔ یہودیوں نے اطاعت اختیار نہ کی۔ اس عرصہ میں طیطریس قیصر روم بن گیا۔ اس نے اپنے بیٹے ٹیٹس کو فیلڈ مارشل کر کے بھیجا۔ ٹیٹس آیا، زبردستی حصار توڑ کر شہر میں داخل ہوا، قتل عام شروع کر دیا، شہر میں آگ لگا دی۔ ہیکل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ الغرض گیارہ لاکھ یہودی قتل ہوئے۔ ایک لاکھ گرفتار کر کے قیدی بنائے گئے۔ یہ واقعہ سنہ ۷۰ء کا ہے۔ بخت نصر کی غارت گری کے بعد یہ دوسری عظیم الشان تباہی تھی جس نے یہودیوں کو ایسا تباہ کیا کہ پھر کبھی سر نہ اٹھا سکے۔

سنہ ۱۳۴ء میں آدریان قیصر روم نے یہودیوں پر سخت تشدد کیا اور رسم ختنہ موقوف کرا دی۔ یروشلم اور ہیکل پر دوبارہ ہل چلوا دیا اور شہر یروشلم کا نام ایلیہ رکھا۔ سنہ ۱۳۸ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد تخمیناً سنہ ۶۲۴ء تک ہیکل برابر اجاڑ پڑا رہا۔ کسی بادشاہ نے اس کی تعمیر نہ کی۔ البتہ بنیادوں کے کچھ نشان باقی تھے۔

سنہ ۶۳۵ء میں حضرت ابوعبیدہ نے اس کا محاصرہ کیا۔ موسم سرما کے چار ماہ کامل محاصرہ جاری رہا۔ انجام کار تنگ آ کر پادری سوفرونیس

نے شرائط صلح کو تسلیم کر لیا۔ پادری کی استدعا کے موافق حضرت عمر فاروق خود بیت المقدس تشریف لائے۔ شرائط صلح کی تکمیل ہوئی۔ شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا خلیفۂ اسلام کے حکم اور پادری کے مشورہ سے ہیکل سلیمانی کی جگہ مسجد صخرہ تعمیر ہوئی۔ خلافت راشدہ کے بعد بنی امیہ کا اور پھر عباسیہ کا یہاں قبضہ رہا۔ پھر فتنہ خلفائے مصر کے قبضہ میں یہ ملک چلا گیا۔ اسی طرح چند مرتبہ ردو بدل ہوا۔ کبھی ملوک عباسیہ کے زیر حکم جو سلطان سلجوق تھے ان کا یروشلم پر قبضہ ہو جاتا۔ کبھی پھر شاہان مصر کے قبضہ میں چلا جاتا۔

۱۰۹۹ء میں گاڈفری کمانڈر ان چیف نے ستر ہزار مسلمانوں کو شہید کر کے یروشلم فتح کیا اور نوے برس عیسائی بادشاہوں کا اس پر قبضہ رہا۔ اس دوران میں مسجد صخرہ مسجد نہ رہی بلکہ گرجا بنا دیا گیا۔ ۵۸۱ھ میں سلطان صلاح الدین یوسف بن ایوب نے پھر تمام ملک پر قبضہ کر کے عیسائیوں کو نکال دیا اور مسجد کو قدیم طرز پر تعمیر کیا۔ صلاح الدین کے بعد ہنری ششم، فریڈرک دوئم، لوئیس نہم شاہ فرانس ایڈورڈ اوّل شاہ انگلینڈ اور بعض دوسرے فرنگی بادشاہوں نے مختلف اوقات میں ارض مقدس پر متعدد حملے کئے، لیکن فتح نہ کر سکے اور ۱۹۱۵ء تک برابر مسلمانوں کا قبضہ رہا۔ ۱۹۱۵ء میں اہل فلسطین سے برطانیہ نے خفیہ معاہدہ کیا اور آزادی کامل کا لالچ دے کر عربوں کو سلطان ترکی کے خلاف ابھارا۔ انجام کار اہل فلسطین دھوکہ میں آ گئے۔ سلطان کے خلاف بغاوت کر دی۔ انگریز سے مل گئے اور اب تک انگریز کے محکوم ہیں۔ جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد برطانیہ کو پہلا معاہدہ یاد دلایا، مگر شاطر برطانیہ نے معاہدہ کو نقش بر آب سے زیادہ وقعت نہ دی۔ عربوں کو جب اس دھوکہ کا علم ہوا تو انہوں نے آزادی کی خود کوشش شروع کر دی۔ ادھر برطانیہ نے یہودیوں سے کروڑوں روپے لے کر یہ وعدہ کر لیا تھا کہ ہم فلسطین میں تمہاری سلطنت قائم کرا دیں گے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۰ء سے برابر یہودیوں کی آبادی فلسطین میں بڑھائی جا رہی ہے۔ ستر ہزار یہودیوں کی بجائے اب چار لاکھ تک فلسطین میں یہودیوں کی تعداد پہنچ گئی ہے۔ ہزارہا عرب آتشیں اسلحہ، گیس اور پھانسی کی نذر ہو گئے، مگر اپنے مطالبات پر قائم ہیں۔ اسی دوران میں مختلف کمیشن بھی مقرر ہوئے جن کا عربوں نے بائیکاٹ کیا۔ اب لندن میں کانفرنس ہو رہی ہے خدا جانے کیا نتیجہ نکلے۔ بظاہر برطانیہ کے انتداب کا نظر آ رہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

وَاٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ

ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اس کتاب کو بنی اسرائیل کے لئے ہدایت بنایا (اور یہ کہہ دیا کہ) میرے سوا کسی کو کارساز

وَكِيْلًا ۝ ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ۝ وَقَضَيْنَآ

نہ بنانا اے اُن لوگوں کی نسل جن کو نوح کے ساتھ ہم نے سوار کیا تھا بلاشبہ وہ ہمارا شکر گزار بندہ تھا اور کتاب میں

اِلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِی الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا

بنی اسرائیل کو صاف کہہ سنایا تھا کہ تم ملک میں دوبار فساد کرو گے اور ضرور بڑی زیادتی

كَبِيْرًا ۝ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ

کرو گے جب پہلی کا وعدہ آئے گا تو ہم اپنے کچھ بڑے جنگجو بندے تم پر مسلط کر دیں گے اور وہ گھروں کے اندر

فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ ۭ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝ ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ

گھس پڑیں گے اور یہ وعدہ پورا ہوتا ہے پھر ہم تمہیں اُن پر غلبہ دیں گے اور

أَمْدَدْنَاكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا ۝ إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ

مال و اولاد میں　تم کو ترقی دیں گے　اور تمہاری　جماعت زیادہ　کر دیں گے　اگر تم نیکی کرو گے　تو اپنی　ہی

لِأَنفُسِكُمْ ۖ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ

جانوں کے لئے کرو گے　اور اگر برائی کرو گے تو وہ اپنی جانوں کے لئے　پھر جب دوسری مرتبہ والا وعدہ آجائے گا تو تمہاری صورتیں بگاڑ دے گا

وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا ۝ عَسَىٰ

اور وہ لوگ پہلی مرتبہ کی طرح　مسجد میں　داخل ہو جائیں گے　اور جن پر وہ قابو پائیں گے　خوب برباد کر دیں گے　(پھر) امید ہے

رَبُّكُمْ أَن يَرْحَمَكُمْ ۚ وَإِنْ عُدتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا ۝

وقف لازم

کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے　اور اگر تم پھر (فساد) کرو گے تو ہم بھی پھر (تباہ) کریں گے　اور کافروں کے لئے　ہم نے جہنم کو قید خانہ بنایا ہے

تفسیر

گزشتہ آیات میں معراج کا کسی قدر مجمل بیان تھا۔ معراج کے دوران میں حضرت موسیٰ کی ملاقات کو خاص دخل تھا۔ آپ ہی کی استدعا سے حضور اقدس نے چند بار تعداد نماز میں تخفیف کی درخواست بارگاہ الٰہی میں کی تھی۔

اس کے علاوہ حضرت موسیٰ کو حکم ہوا تھا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر ارض شام یعنی بیت المقدس میں جاؤ۔ ادھر شب اسراء میں حضور نے بیت المقدس کی سیاحت فرمائی۔ دونوں بزرگوں کو بیت المقدس پہنچنے کا حکم ہوا، لیکن سیاحت کی نوعیت غرض اور نتیجہ میں فرق ہے۔ حضرت موسیٰؑ قوم کی نافرمانی اور سرکشی کی وجہ سے وادی تیہ میں ماخوذ رہے اور حضور والا بیت المقدس کی سیر کے بعد عرش بریں تک تشریف لے گئے۔

مزید برآں حضرت موسیٰ کو ہمارے رسول پاکؐ سے یہ مناسبت تھی کہ حضورؐ کو تو معراج میں دیدار لوزی سے سرفراز فرمایا گیا اور حضرت موسیٰؑ کو بالواسطہ تجلی برداشت کرنے سے محروم رکھا۔ دونوں عنایتوں میں بڑا فرق ہے۔

پھر گزشتہ عروج و زوال دکھا کر یہودیوں کو تنبیہ کرنی بھی مقصود ہے کہ اب بھی موقعہ ہے کہ اگر نبی آخر الزماں کی سچے دل سے پیروی کرو گے اور احکام قرآنی سے سرتابی نہ کرو گے تو سہ بارہ ترقی، کامرانی، عزت، حکومت اور فراخ حالی تمہاری حلیف اور ہم کنار رہو گی اور سرکشی کرو گے تو پہلے سے زیادہ ذلت اور بربادی سے ہمیشہ کیلئے دوچار ہونا پڑے گا۔

انہی مناسبات کے تحت معراج کے تذکرہ کے بعد حضرت موسیٰؑ کو توریت دینے، بنی اسرائیل کو نصیحت کرنے اور پھر اسرائیلیوں کے عروج و زوال پانے کا حال ان آیات میں بیان فرمایا ہے۔ ہم آیات کے تفسیری نوٹ لکھنے کے بعد حاصل ارشاد بیان کریں گے۔

(۱) ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ بقاعی نے کہا کہ نوح کے ساتھ کشتی میں اگرچہ غیر آدمی بھی تھے، مگر طوفان اترنے کے بعد جب کشتی سے اترے تو کچھ ہی مدت میں سب مر گئے، ان کی نسل بھی باقی نہ رہی۔ البتہ حضرت نوح کے بیٹے حام، سام اور یافث باقی رہے اور انہی کی نسل عالم میں پھیلی، اس لئے آیت مذکورہ میں حضرت نوح کی اولاد ہی مراد ہے۔ (کذا قال قتادہ)

سرزمین بابل و نینوا کے رہنے والے حضرت نوح کی تکذیب و نافرمانی کی وجہ سے غرقاب کر دیئے گئے، اور جو لوگ فرمان پذیر نیکوکار تھے وہی باقی رہے پھر نجات یافتہ لوگوں میں سے بھی حضرت نوح کا درجہ سب میں ممتاز تھا۔ آپ سرگروہ موحدین تھے، اس لئے آپ کی نسل میں برکت ہوئی۔ حضرت نوح کی ایک خصوصی صفت یہ تھی کہ خدا تعالیٰ کی ہزارہا نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے کے علاوہ طوفان سے نجات پانے کا بہت زیادہ شکریہ ادا کرتے

تھے۔ عبدیت اور ادائے شکر میں آپ کو کمال حاصل تھا، اس لئے عبداً شکوراً فرمایا۔ لیکن طبرانی نے بروایت سعد بن مسعود ثقفی حضرت نوح کو عبداً شکوراً کہنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ آپ ہر خورد و نوش کے وقت التزام کے ساتھ شکر الٰہی بجا لاتے تھے۔ میرے نزدیک اوّل وجہ بہتر ہے) آیت میں بنی اسرائیل کو ہم ایمان نوح کی اولاد قرار دیتے ہوئے توحید خالص کا حکم دینا اس مقصد کو ظاہر کر رہا ہے کہ دیکھو اگر تم بھی خالص موحد بن جاؤ گے، بُت پرستی چھوڑ کر اللہ کے ہو جاؤ گے۔ ہر راحت و رنج اور دکھ سکھ میں اسی پر بھروسہ رکھو گے اور جو نعمتیں اللہ نے تم کو دی ہیں ان کا شکریہ ادا کرو گے تو جس طرح اللہ نے نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو مصیبت عظیم سے نجات دی وہی تم کو ہر بالا دست قوت سے محفوظ رکھے گا اور اگر سرکشی کرو گے تو جس طرح نوح کے مخالفین کو غرق کیا ویسے ہی تمہارا تختہ تاراج کر دے گا۔

(۲) وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ۔ ابن عباس و قتادہ کا قول ہے کہ کتاب سے مراد لوح محفوظ ہے اور الیٰ بمعنی علیٰ ہے۔ یعنی بنی اسرائیل کا مدوجزر ہم نے دفتر قضاء و قدر میں لکھ دیا تھا (معالم) عام اہل تفسیر کا خیال ہے کہ الْكِتَابِ سے توریت مراد ہے۔ جس طرح حضور اقدسؐ نے احادیث شریفہ میں اور خدا تعالیٰ نے قرآن پاک میں آئندہ زمانے میں پیدا ہونے والے واقعات کی اطلاع پہلے سے دے دی تھی اور اسی اطلاع کے موافق واقعات ظہور پذیر ہوئے اور ہو رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوں گے۔ اسی طرح بنی اسرائیل کے انقلاب کی خبر خدا تعالیٰ نے توریت میں بیان کر دی تھی جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ مفسر معالم نے محمد بن اسحاق کی طرف منسوب کرتے ہوئے الْكِتَابِ سے عام الہامی کتب اور آسمانی صحیفے مراد لئے ہیں، توریت کی تخصیص نہیں کی۔ چنانچہ حضرت شعیا، حضرت ارمیا، حضرت یوئیل، حضرت موسیع، حضرت حزقیل، حضرت دانیال، حضرت حبقوق، حضرت میکیاہ، حضرت عاموس، اور بعض دیگر اسرائیلی پیغمبروں کے ملفوظات باوجود تحریف و تبدیل کے اب تک بنی اسرائیل کے تباہ ہونے پر دلالت کر رہے ہیں۔ جو حضرات انبیاء نے مختلف اوقات میں قدسی زبانوں سے ظاہر فرمائے تھے۔ ہم بطور مثال شعیا اور ارمیا کے چند ملفوظات نقل کرتے ہیں۔ جن کو امام محی السنۃ نے محمد بن اسحاق کی روایت سے اخذ کر کے لکھا ہے۔ بنی اسرائیل میں جب فسق و فجور اور گناہوں کی اشاعت ہوئی اور خدا تعالیٰ کی چشم پوشی کے باوجود وہ باز نہ آئے تو خدا تعالیٰ نے ان کی گرفت فرمائی۔ صدقیہ بادشاہ ہوا (یہ صدقیہ وہ بادشاہ نہیں جس کا نام عیسائی کتابوں میں صدقیاہ لکھا ہے۔ اور جس کو بخت نصر نے اپنا باجگذار بنا رکھا تھا اور شعیا بن امصیا نبی ہوئے۔ صدقیاہ کے زمانے میں بابل کا بادشاہ سنحاریب بے تعداد فوج لے کر بیت المقدس کی طرف متوجہ ہوا۔ (سنحاریب بخت نصر کا دادا تھا) بخت نصر کا باپ نبو پلزا اور نبو پلزا کا باپ سنحاریب تھا۔ صدقیاہ نے شعیاؑ سے استمداد کی۔ شعیاؑ نے فرمایا اے بادشاہ تیرا آخری وقت قریب آگیا۔ اب مناسب ہے کہ اپنے خاندان میں سے کسی کو اپنا جانشین مقرر کر دے۔ صدقیہ نے خلوص کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں زاری کی۔ اللہ نے اس پر رحم فرمایا شعیاؑ نے آکر قبول دعا کی بشارت دیتے ہوئے کہا ابھی تیری عمر پندرہ برس باقی ہے اور یہ بھی فرمایا صبح کو تیرے دشمن مر جائیں گے صرف سنحاریب مع پانچ آدمیوں کے زندہ رہے گا۔ چنانچہ رات ہی رات میں جو فوج محاصرہ کئے پڑی تھی سب کے سب یکدم کسی ناگہانی مرض الموت میں گرفتار ہو کر مر گئی۔ سنحاریب اور اس کے پانچ ساتھی باقی رہے۔ صدقیہ نے صبح کو ان کو گرفتار کرالیا۔ سخت ترین ذلت کا برتاؤ کیا بالآخر حضرت شعیاؑ کے حکم سے زندہ چھوڑ دیا۔ تاکہ بابل واپس جاکر بنی اسرائیل کی صداقت و حقانیت کا چرچا پھیلائیں اور سطوت الٰہی سے کفار مرعوب ہوں۔ سنحاریب چھ سات برس اور زندہ رہا، لیکن پھر کبھی یروشلم پر حملہ کرنے کا ارادہ نہ کیا۔ ادھر بنی اسرائیل میں روز بروز گناہوں کی کثرت ہونے لگی۔ ملک کا انتظام برباد ہو گیا۔ آپس میں کشت و خون کرنے لگے۔ شعیاؑ نے ہر چند سمجھایا مگر کسی نے نصیحت نہ سنی۔ ایک روز جلال میں آکر حضرت شعیاؑ نے لیکچر دیا جس میں فرمایا اے آسمان سن لے اور کون ادھر متوجہ کر۔ اللہ بنی اسرائیل کی حالت بیان کرنی چاہتا ہے۔ بنی اسرائیل کو اس نے اپنی نعمتوں سے پرورش کیا، اپنے واسطے مخصوص کر لیا، دوسروں سے زیادہ فضل ان کو عطا کیا وہ بکریوں کے اس ریوڑ کی طرح پھر نے تھے جس کا کوئی چرواہا نہ ہو اللہ نے اس پراگندہ ریوڑ کو وہ راہ گم کردہ گلہ کو جمع کیا، شکستہ بیمار کا علاج کیا، دُبلے کو موٹا کیا اور فربہ کو محفوظ رکھا۔ جب خدا نے ایسا کیا تو یہ اترا گئے، ایک دوسرے کو سینگ مارنے اور خون بہانے لگے۔ یہاں تک کہ ان میں کوئی ایسی سالم ہڈی نہ رہی کہ دوسری شکستہ ہڈی کو اس سے جوڑ کر باندھ دیا جائے۔ پس بربادی ہے اس گروہ بدکار کی۔ اس کو نہیں معلوم کہ کب ان کی تباہی کا وقت آئے گا۔ اونٹ کو جب وطن یاد آتا ہے تو واپسی کا مشتاق ہوتا ہے۔ گدھے کو جب چراگاہ یاد آتی ہے جہاں پیٹ بھرا تھا تو لوٹ آتا ہے، بیل کو جب کھیت یاد آتا ہے جہاں کھا کھا کر موٹا ہوا تھا تو ادھر رجوع کرتا ہے،

لیکن اس قوم کو یاد نہیں کہ کہاں سے اس کی ترقی کا زمانہ آیا تھا۔ باوجودیکہ یہ لوگ بیل گدھے اور اونٹ نہیں ہیں ارباب عقل ہیں۔ دیکھو آغاز تخلیق میں زمین مُردہ تھی، اس پر آبادی نہ تھی اللہ نے زمین کو آباد کیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی زمین اجاڑ ہو۔ حکیم نے ایک باغ لگایا، چہار دیواری بنائی، اندر مکانات کی تعمیر کی، نہریں نکالیں، زیتون، انار، انگور، کھجور وغیرہ کے درخت لگائے، ایک باغبان نگہبانی کے لئے مقرر کیا، جب باغ کی سبزی اور تیاری کا وقت آیا تو لوگوں نے باہم مشورہ کیا کہ باغ کی زمین خشک ہوگئی ہے اس لئے دیواروں کو منہدم کردو، نہروں کو پاٹ دو، درختوں کو اکھاڑ دو، سبزی کو جلا دو تاکہ زمین پہلی جیسی تھی ویسی ہی ہو جائے۔ پس تم خوب سمجھ لو چہار دیواری دین الٰہی ہے، قصر اس کی شریعت ہے، نہر اس کی کتاب ہے، نگران باغ اس کا پیغمبر ہے اور پودے اس کے خود تم لوگ ہو اور پودوں کے پھل تمہارے اعمال ہیں۔ اللہ نے تمہارے ہی اعمال کے موافق فیصلہ کیا ہے۔ تم گائے بکری ذبح کر کے تقرب الٰہی چاہتے ہو ناحق خوں ریزی ترک کر کے اور متقی بن کر کیوں قرب الٰہی کے خواستگار نہیں ہوتے، اللہ نے ناحق قتل کرنے کو حرام کر دیا ہے۔ پھر کیوں تمہارے ہاتھ اور کپڑے خونِ ناحق سے سُرخ ہو رہے ہیں۔ تم مسجدیں بنا کر ان کے اندر صفائی کرتے ہو، لیکن اپنے دلوں کو ناپاک کرتے اور میل کچیل سے بھرتے ہو۔ تم مسجدوں کو آراستہ پیراستہ کرتے ہو، مگر اپنی عقل و اخلاق کو ویران کرتے ہو۔ اللہ کو ایسے گھروں کی کیا ضرورت ہے وہ کہیں رہتا نہیں ہے۔ مسجدوں کی آرائش کی اس کو کیا ضرورت ہے، وہ کبھی وہاں جاتا نہیں ہے۔ مسجدوں کو بنانے کا حکم تو صرف اس لئے دیا تھا کہ اللہ کی یاد دہانی کی جائے، پاکی بیان کی جائے۔ تم لوگ کہتے ہو کہ ہم روزے رکھتے ہیں، مگر وہ قبول نہیں ہوتے، نمازیں پڑھتے ہیں، مگر ان سے دلوں میں نور نہیں پیدا ہوتا، صدقہ دیتے ہیں، مگر اس سے پاکیزگی حاصل نہیں ہوتی، ہم کبوتر کی طرح نرم و حزیں آواز سے دعا کرتے ہیں اور بھیڑیوں کی آواز سے گریہ وزاری کرتے ہیں، مگر ہماری دعا قبول نہیں ہوتی۔ اللہ فرماتا ہے کہ ان کی دعا قبول کرنے سے مجھے کون چیز روکتی ہے کیا میں سب سے بہتر سننے والا نہیں ہوں کیا سب سے زیادہ دیکھنے والا نہیں ہوں۔ کیا مجیب الدعوات اور ارحم الراحمین نہیں ہوں، لیکن ان کے روزے کیسے قبول ہوں۔ وہ جھوٹی باتوں کا لباس اپنے روزوں کو پہناتے ہیں اور حرام روزی کھاتے ہیں۔ ان کی نمازیں کیوں کر نور آفریں ہوں ان کے دل تو ایسے لوگوں کی طرف مائل ہیں جو مجھ سے لڑتے اور میری حرمات کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ان کے صدقات سے کس طرح پاکیزگی حاصل ہو، غیروں کے مال پر دست درازی کر کے تو یہ صدقہ دیتے ہیں، ان کی دعائیں کیسے قبول ہوں۔ یہ تو خالی زبانوں سے دعائیں کرتے ہیں ان کا کردار گفتار سے بہت دُور ہے۔ دعا تو اسی کی قبول ہوتی ہے جس کا دل پگھل جائے۔

میں تو اسی کی سنتا ہوں جو عاجز، مسکین اور پرہیزگار ہو۔ میں نے آسمان و زمین کی تخلیق کے دن یہ حکم محکم جاری کر دیا ہے کہ نبوت کو بکریوں میں، بادشاہت کو چرواہوں میں، عزت کو ذلیلوں میں، قوت کو ضعیفوں میں، تونگری کو فقیروں میں، علم کو جاہلوں میں اور حکمت کو بے پڑھے لکھے لوگوں میں قائم کروں گا۔ اے شعیاہ تو ان سے دریافت کر کہ یہ کب ہوگا اور اس کے مددگار کون ہوں گے؟ تو ان سے کہہ دے کہ اس حکم کے واسطے ایک اُمّی نبی پیدا کروں گا جو نابینا اور گمراہ نہ ہوگا اس کی زبان سخت اور دل بداخلاق نہ ہوگا وہ بازاروں میں چیختا چلّاتا نہ پھرے گا نہ فحش بکواس کرے گا۔ اس کو ہر جمال و ہر کمال سے آراستہ کروں گا۔ ہر عمدہ خصلت عطا کروں گا۔ وقار اس کا لباس نیکی شعار، تقویٰ اس کے قلبی خطرات، دانش و حکمت اس کی سمجھ، صدق و وفا اس کی طبیعت، عفو و خیر کی نمائش اس کی عادت، عدل اس کی سیرت، حق اس کی شریعت، ہدایت اس کی خصوصیت، اسلام اس کی ملت اور احمد اس کا دین ہوگا۔ احمد سے اس کا نام ہوگا۔ میں اس کی ضلالت کے بعد ہدایت، جہالت کے بعد علم، گمنامی کے بعد نیک نامی، مجہول الذکر ہونے کے بعد شہرت، قلت کے بعد کثرت اور مفلسی کے بعد تونگری عطا کروں گا۔ میں اسی کے ذریعہ سے پراگندہ انسانوں میں جمعیت اور پھوٹ پڑے ہوئے دلوں میں الفت پیدا کروں گا۔ اس کی امت کو خیر الامم کروں گا۔ وہ نیک کاموں کا حکم دیں گے۔ وہ برے کاموں سے منع کریں گے۔ ان کا مجھ پر یقین و ایمان ہوگا۔ کھڑے بیٹھے رکوع و سجود کریں گے۔ میری راہ میں صف باندھ کر جہاد کریں گے۔ میری رضامندی حاصل کرنے کے لئے اپنے گھر بار اور مال اولاد چھوڑ کر نکل جائیں گے۔ میں اپنی تکبیر، توحید، تسبیح، تہلیل، تحمید اور تمجید ان کو الہام کروں گا۔ وہ بڑے بڑے بادشاہوں کے روبرو میری پاکی اور بزرگی بیان کریں گے۔ میرے لئے وہ اپنے خون کی قربانیاں پیش کریں گے۔ ان کی انجیلیں ان کے سینوں میں ہوں گی۔ راتوں کو وہ راہب ہو کر میری عبادت کریں گے اور دن میں شیروں کی طرح میری راہ میں جانبازی کریں گے۔ یہ سب میرا فضل ہے، میں جس کو چاہتا ہوں عطا کرتا ہوں۔ حضرت شعیاہ وعظ سے فارغ ہوئے تو بنی اسرائیل نے چاروں طرف سے یورش کر کے ان کو قتل کر دیا۔

کچھ مدت کے بعد بنی اسرائیل کا بادشاہ بن اموص ہوا۔ اس زمانے میں آرمیاہ (یرمیاہ) بن خانیاہ پیغمبر تھے۔ حضرت ارمیا نے بنی اسرائیل کی سرکشی، عصیاں شعاری، اور نافرمانی دیکھ کر ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس کے آخر میں کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے اپنی عزت کی قسم کھائی ہے کہ بنی اسرائیل پر ایسا سخت فتنہ مسلط کروں گا جس میں دانشمند آدمی بھی حواس باختہ ہو جائیں گے۔ ایسے سنگ دل آدمی کو ان پر مسلط کروں گا جو مجسم ہیبت ہوگا، جس کے سینے سے رحم نکال لیا گیا ہوگا اور جس کے پیچھے ایسا جرار لشکر ہوگا جو شب تاریک کی طرح چھا جائے گا۔ میں بنی اسرائیل کو ہلاک کرنا چاہتا ہوں۔ یافث کو ان پر مسلط کروں گا (اہل بابل یافث کی اولاد تھے، اس لئے یافث سے اشارہ بخت نصر کی جانب ہے۔ مبینہ) چنانچہ چند ہی روز کے بعد بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کیا، ہیکل کی اینٹ سے اینٹ بجادی، ملک شام کو روند ڈالا۔ تقریباً ستر ہزار یہودیوں کو قتل کیا، لاکھوں کو قید کیا، دانیال، حنانیا، عزازیا، اور میشائیل کو بھی گرفتار کر کے لے گیا۔ یہ چاروں انبیا زادے تھے۔ عیسائی کتابوں میں حضرت یرمیاہ کے عہد نبوت میں جو بادشاہ تھا اس کا نام صدقیاہ لکھا ہے لیکن محمد بن اسحاق نے ناشیہ بن اموص تحریر کیا ہے (واللہ اعلم) یہ واقعہ حضرت یحییٰ کی شہادت سے ۴۶۱ سال پہلے کا ہے۔ اہل کتاب نے ۵۸۶ قبل مسیح کا لکھا ہے۔ پھر تقریباً ستر سال کے بعد ایرانیوں کے ہاتھوں اہل بابل کی سلطنت تباہ ہوئی تو بنی اسرائیل کے دن پھرے۔ حضرت عزیر نے توریت لکھوائی۔

(۳) لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ سے مراد سیوطی، بغاعی اور دیگر اہل تفسیر کے نزدیک سرزمین شام ہے۔ بیضاوی نے مصر مراد لیا ہے، مگر تاریخی نقطہ نظر سے بیضاوی کا قول غلط ہے۔ ملک مصر میں بنی اسرائیل کو کبھی عروج و زوال سے دوچار ہونا نہیں پڑا۔

(۴) مَرَّتَيْنِ دو مرتبہ تباہی پھیلانے سے کیا مراد ہے؟ اہل تفسیر نے یہاں مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔ تفسیر معالم میں قتادہ کا قول یہ نقل کیا ہے کہ توریت کی مخالفت اور ممنوعات کا ارتکاب فساد اول ہے اور قتل یحییٰ فساد دوم ہے۔ ابن کثیر نے قتادہ کی تفسیر اس طرح نقل کی ہے۔ فساد اول یہ تھا کہ بنی اسرائیل پر جالوت مسلط ہوا پھر کچھ مدت کے بعد اللہ نے رحم فرما کر حضرت داؤد کے ہاتھ سے جالوت کو قتل کرایا اور بنی اسرائیل کو عروج ہوا اور سرکشی روز افزوں ہوئی تو بخت نصر کو مسلط کیا جس نے یروشلم کو برباد، ہیکل کو تباہ اور اسرائیلیوں کا تختہ تاراج کر دیا۔ زمخشری نے کشاف میں بیان کیا کہ پہلا فساد قتل زکریا جس میں مبتلا تھا اور دوسرا قتل یحییٰ اور قصد قتل عیسیٰ تھا۔ بیضاوی کا قول ہے احکام توریت کی مخالفت، اور شعیا یا ارمیا کا قتل پہلا فساد تھا۔ اور زکریا و یحییٰ کا قتل اور عیسیٰ کے قتل کی تیاری دوسرا فساد تھا۔ محمد بن اسحاق نے کہا کہ ارتکاب محارم اور قتل شعیا پہلا فساد تھا اور یحییٰ کا قتل اور عیسیٰ کے قتل کا قصد دوسرا فساد تھا۔

میں کہتا ہوں کہ قرآن اس تفصیل سے خاموش ہے اور احادیث صحیحہ میں بھی کوئی مفصل بیان موجود نہیں، اس لئے اپنی طرف سے تفسیر کرنی تفسیر بالرائے ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابیں تمام رطب و یابس سے پُر ہیں۔ صحیح یا غلط کا امتیاز ناممکن ہے، اس لئے مجمل ہی چھوڑنا بہتر ہے۔
دونوں مرتبہ کے فساد کی سزاؤں کی تعیین میں بھی اختلاف ہے۔ اول سزا جالوت کے ہاتھوں ملی اور دوسری سزا بخت نصر کے ہاتھوں سے یا انطوکس شاہ انطاکیہ کی حملہ آوری کی شکل میں۔ میرے نزدیک اختلاف اقوال کو چھوڑتے ہوئے سب سے قوی قول یہ ہے کہ پہلی مرتبہ بخت نصر نے اسرائیلیوں کو تباہ کیا اور دوسری مرتبہ طیطس شاہ روم نے عیسائیوں کی کتابیں اور اہل اسلام کے تفسیری اقوال اسی کو قابل ترجیح قرار دیتے ہیں۔
حاصل ارشاد یہ ہے کہ انبیا نے بنی اسرائیل کے مختلف صحیفوں اور کتابوں میں خدا تعالیٰ نے پہلے سے بصراحت فرما دی تھی کہ بنی اسرائیل ملک شام یا ارض فلسطین میں دو مرتبہ کفر و شرک، عصیاں شعاری اور قتل انبیا وغیرہ کی تباہ کاری پھیلائیں گے اور حد سے بڑھ کر زیادتی کریں گے۔ پہلی مرتبہ کے فساد کی پاداش میں خدا تعالیٰ ان پر ایسی قہار جنگجو قوم کو مسلط فرمائے گا جو ان کی بستیوں میں گھس کر ان کو تباہ کریں گے۔ پھر کچھ مدت کے بعد بنی اسرائیل کے دن پھیر دیں گے۔ مال و دولت کی وسعت، اولاد کی کثرت اور جتھے کی فراوانی نصیب ہوگی۔ نیکی کا بدلا اللہ نیک دے گا اور بدی کا نتیجہ الٰہی خود آدمی کو ہوگا۔ جب بنی اسرائیل کی سرکشی دوبارہ حد سے بڑھ جائے گی تو خدا تعالیٰ دوسری جابر قوم مسلط فرما دے گا جو اسرائیلیوں کے چہرے بگاڑ دے گی اور جس جگہ اس کا تسلط ہوگا اس کو کامل طور پر تباہ کر کے چھوڑے گی۔ اس کے بعد اگر بنی اسرائیل نے اپنی حرکات سے توبہ کرلی۔ انبیا، خصوصاً نبی آخر الزماں کی مخالفت ترک کردی تو پھر امید ہوتی ہے کہ خدا درگذر اور ان پر رحم فرمائے اور دولت پارینہ پھر ان کو نصیب ہو جائے۔ لیکن اگر انھوں نے سرکشی نہ چھوڑی، احکام الٰہی کی خلاف ورزی جاری رکھی اور موروثی تکذیب انبیاء کی طرف رجوع کیا، نبی پر ایمان نہ لائے تو خدا تعالیٰ بھی سابق کی طرح دنیوی انتقام کی طرف رجوع فرمائے گا

آخرت میں توان کاٹھکانہ جہنم ہوگا مگر دنیا میں بھی ان کو ذلت نصیب ہوگی۔ قرآن پاک کی یہ پیشین گوئی جو فتح بیت المقدس سے بھی بہت پہلے کی ہے حرف بحرف پوری ہوئی۔ یہودیوں نے حضور اقدس کی نبوت کا انکار کیا، اپنی سابقہ عادت کو نہ چھوڑا، قرآن کو نہ مانا اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ بالکل ظاہر ہے کہ آج تک فلسطین کیا دنیا کے کسی حصہ کی حکومت ان کے ہاتھ نہ آئی۔ باوجودیکہ دنیا کی تمام قوموں سے زیادہ یہ لوگ دولت مند ہیں۔ اکثر بڑی بڑی سلطنتیں ان کی مقروض ہیں خصوصاً امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی ساکھ تو یہودیوں کے بل بوتے پر قائم ہے۔ تعلیم کی بھی ان میں کثرت ہے۔ کوئی یہودی جاہل نہیں، مگر عذاب الٰہی اس پر مسلط ہوتا ہے۔ حکومت و شوکت ان کو نصیب نہیں۔ استعمار کا دیوتا فلسطین میں ان کو برسر اقتدار لانا چاہتا ہے۔ گیس، طیارے، بم، توپیں اور ٹینک تمام آلات حرب و ضرب عربوں کو کچلنے کے لئے برسر عمل ہیں، لیکن ابھی تک یہودیوں کی حکومت قائم ہونے کے آثار پیدا نہیں ہوئے اور قرآنی صراحت کے بموجب قیامت تک ان کو ذلت و حقارت برداشت کرنی ہوگی۔

مقصودِ بیان

توراۃ کے قوانین صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے تھے اور حضرت موسیٰ کی شریعت صرف اسرائیلی تھی۔ عام طور پر تبلیغی نہ تھی۔ بنی اسرائیل انہی لوگوں کی اولاد ہیں جو حضرت نوح کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر غرق ہونے سے بچے تھے۔ اس سے آگے قصہ کی تفصیل سے مسلمانوں کو در پردہ ہدایت کرنی مقصود ہے کہ نبی کی پیروی کرنی، شریعت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنا، احکام الٰہیہ کی تعمیل کرنی اور حدود شریعت پر قائم رہنا ہی حکمرانی، عزت اور سطوت کا سبب ہے۔ جو مسلمان شریعت کو پس پشت ڈال کر احکام خدا وندی کی مخالفت کرے اور نبی کی تعلیم سے روگردانی اختیار کر کے عروج و ترقی حاصل کرنا چاہیں گے ان کو ہرگز میسر نہ ہوگی۔ مقصد یہ ہے کہ تم بھی نبی کی فرمان پذیری کرو، قرآن کو دستور العمل بناؤ۔ شریعت پر چلو، خدا تم کو دنیا میں بھی کامیاب، بامراد اور معزز کرے گا۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو مصیبت، فلاکت، ذلت اور تباہی میں گرفتار ہوگے اور یہ کل کی کل تمہاری خود آوردہ مصیبت ہوگی۔ قانون قدرت اٹل ہے۔ اگر کوئی بھلائی کرے گا تو اپنے لئے کرے گا اور برائی کرے گا تب بھی اپنے لئے کرے گا۔ بنی اسرائیل کے متعلق قرآن نے جو یہ صراحت فرمائی ہے اس میں قرآن کی صداقت، رسول پاک کی حقانیت، مسلمانوں کے مؤید من اللہ ہونے کی واضح دلیل ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰۤاُولِی الْاَبْصَارِ

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ

بیشک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بہت سیدھی ہے اور ان مسلمانوں کو جو نیکوکار ہیں اس بات کی بشارت دیتا ہے

اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِیْرًا ۝ وَّ اَنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝ ع ۱

کہ تمہارے لئے بڑا اجر ہے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے لئے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے

تفسیر

اس آیت میں گزشتہ پیشین گوئی کا اصل نتیجہ مذکور ہے۔ اسرائیلیوں کی حالت کا مد و جزر اور عروج و زوال کا نقشہ، گزشتہ آسمانی صحیفوں اور کتابوں کی پیشین گوئیوں کی طرف منسوب کرتے ہوئے جہاں کھینچا تھا وہاں ترقی و تنزل اور علو و تسفل کا ذیلی طور پر ایک عام ضابطہ بھی بیان فرمایا تھا اور صراحت فرمائی تھی کہ اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا یعنی اگر عبادات، معاملات، عقائد، کردار، گفتار اور اطوار میں تم بھلائی کرو گے، اعتدال و میانہ روی سے کام لوگے، افراط و تفریط سے ہٹ کر درجۂ توسط میں رہو گے تو اس بھلائی کا فائدہ دنیا و دین میں تم کو ہی پہنچے گا۔ اگر برائی کرو گے کردار و گفتار میں عدل کو چھوڑ دو گے، عبادت و عقائد کی اصلاح نہ کرو گے تو اس کا وبال خود ہی تم کو برداشت کرنا ہوگا۔ یہ تھا عام ضابطۂ قدرت کا ہمہ گیر قانون۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر راہ مستقیم اور درجۂ عدل کی تلاش ہے اور دنیا و دین کی فلاح پیش نظر ہے تو قرآن کی طرف آؤ۔ یہ تم کو زندگی بسر کرنے کا سیدھا راستہ اور مابعد زندگی کی نجات کا صحیح طریقہ بتائے گا۔ اس کی تعلیم کے دو جزو ہیں۔ عقائد کی اصلاح اور اعمال کی درستگی۔ جو لوگ صحیح ایمان رکھتے ہوئے اعمال صالحہ کرتے ہیں ان کو قرآن اجر عظیم کی بشارت دیتا ہے۔ یہ اجر عام ہے دنیا میں بھی ان کو ملے گا اور آخرت میں بھی۔ زندگی میں بھی بامراد باعزت اور کامیاب رہیں گے اور آخرت میں سعادت ابدی حاصل ہوگی اور جو لوگ

آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کو حساب کتاب، عذاب ثواب اور حشر و نشر کا یقین ہی نہیں، وہ دوسری زندگی کے قائل ہی نہیں تو لامحالہ جو عقیدہ و خیال ان کا دل چاہے گا اسی کو قائم رکھیں گے، ہوا و ہوس کی پرستش کریں گے، ان کے عقائد و اعمال تباہ ہوں گے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہے کہ دنیا و دین میں ذلت کی مار ان پر پڑے گی۔

مقصودِ بیان اس امر کی صراحت کہ قرآن کا بتایا ہوا راستہ عدل کا راستہ ہے یعنی انسانی عقل وہمیات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے چونکہ خالی نہیں رہ سکتی، اس لئے صرف عقل بغیر وحی کے راہِ مستقیم نہیں تلاش کر سکتی۔ لامحالہ وحی ربانی قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہئے تاکہ صحیح طریقہ نجات معلوم ہو جائے۔ قرآن کا بتایا ہوا طریقہ بس عقائد و اعمال کی اصلاح ہے۔ جو اہلِ ایمان اعمال کی اصلاح کریں وہ کامیاب ہوں گے اور اس کے خلاف کرنے والے خلاف نتیجہ اٹھائیں گے۔ باوجود اس کو بغرض تخصیص آخرت کے بیان کرنا اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ جن لوگوں کے اعمال و عقائد صحیح ہیں ان کو دینی اجر کے علاوہ دنیا میں بھی نتیجہ خیر حاصل ہوتا ہے۔ لا یؤمنون بالآخرۃ سے اس طرف اشارہ ہے کہ آخرت پر ایمان رکھنا ہر نیکی اور بھلائی کی جڑ ہے۔ چونکہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کو چونکہ کسی ثواب اور نیک عوض کی امید نہیں ہوتی، اس لئے نیک عمل کی ان کو تلاش ہی نہیں جو دل چاہتا ہے کرتے ہیں اور ہوا و ہوس کے بندے ہوتے ہیں وغیرہ۔

وَيَدْعُ الْإِنسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنسَانُ عَجُولًا ۝ وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ

اور انسان جس طرح بھلائی کی دعا مانگتا ہے اسی طرح برائی کی دعا مانگنے لگتا ہے اور انسان بڑا جلد باز ہے ہم نے رات و

وَالنَّهَارَ آيَتَيْنِ ۖ فَمَحَوْنَا آيَةَ اللَّيْلِ وَجَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوا فَضْلًا

دن کو قدرت کے دو نمونے بنایا پھر رات کی نشانی کو تو بے نور کر دیا اور دن کی نشانی کو روشن کر دیا تاکہ تم اپنے رب کا فضل

مِّن رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوا عَدَدَ السِّنِينَ وَالْحِسَابَ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ تَفْصِيلًا ۝

تلاش کرو اور برسوں کی گنتی اور حساب جان لو اور ہر ضرورت کی چیز کو ہم نے خوب تفصیل سے بیان کر دیا ہے

تفسیر مفسر سراج نے کہا اس آیت کے نزول کا تعلق خود حضور اقدس ﷺ کی ذات سے ہے۔ قصہ یہ ہوا کہ کسی قیدی کو حضور اقدس ﷺ نے ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے سپرد کیا۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے اس کی مشکیں بندھوا دیں۔ رات میں دردناک آواز میں اس قیدی نے رونا شروع کیا۔ ام المومنین کو رحم آگیا۔ آپ نے اس کی مشکیں کھلوا دیں، وہ فرار ہو گیا۔ صبح کو حضور ﷺ نے طلب فرمایا۔ سودہ رضی اللہ عنہا نے واقعہ عرض کیا۔ حضور ﷺ نے بددعا دی کہ الٰہی اس عورت کا ہاتھ کاٹ دے۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور یقین ہو گیا کہ اب ہاتھ کاٹا جائے گا۔ حضور والا ﷺ کا غصہ فرو ہوا تو اپنی بددعا پر پشیمانی ہوئی اور دعا کی الٰہی میں بندہ بشر ہوں جیسے اور لوگوں کو غصہ آتا ہے مجھے بھی آتا ہے۔ میں جس کے حق میں بددعا کروں تو میری بددعا کو اس کے حق میں رحمت فرما دے۔ مفسر سراج نے اس حدیث کا ماخذ نہیں لکھا، اس لئے قابلِ وثوق نہیں بلکہ صاحبِ مشکوٰۃ نے حضور ﷺ کی آخری دعا کو ایک یتیمہ کے متعلق لکھا ہے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ نزول آیت نضر بن حارث کے متعلق ہوا۔ جس نے کہا تھا۔ اللّٰهُمَّ إِن كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِندِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ اسی نضر نے جنگِ بدر کے روز دعا کی تھی کہ الٰہی دونوں گروہوں میں سے اس کو فتح عنایت کر جو بہتر ہو۔ چنانچہ بدر میں یہ اپنے ساتھیوں سمیت مارا گیا۔ بہرحال شانِ نزول کچھ بھی ہو گزشتہ آیات سے وجہ ارتباط یہ ہے کہ سابق میں نیکو کار اہلِ ایمان اور بدکار کافروں کی جزا سزا کا بیان تھا اور ظاہر ہے کہ دینی سزا جزا کے علاوہ دنیوی سزا جزا میں بھی مصلحت الٰہی کبھی تاخیر ہو جاتی ہے، مگر انسان فوراً نتیجہ کا خواستگار ہوتا ہے وہ نہیں سمجھتا کہ تاخیر میں کیا حکمت ہے۔ اسی مضمون کا بیان آیت میں ہے یا یوں کہا جائے کہ بھلائی کی دعا تو انسان کرتا ہی ہے اور اس کے نتیجہ کا فوری طالب ہوتا ہی ہے۔ کبھی شدتِ مرض، کثرت افکار اور فراوانی

معائب سے تنگ آکر اپنے لئے بددعا کرنے لگتا ہے۔ کہتا ہے الٰہی موت جلد بھیج دے۔ اگر میں مرجاتا تو اس سے بہتر تھا۔ اس کو معائب و تکالیف کی حکمت سے واقفیت نہیں ہوتی، اس لئے جو منہ پر آجاتا ہے کہہ دیتا ہے یہ اس کی کوتاہ اندیشی اور فطری جلد بازی ہوتی ہے۔

یا اس طرح کہا جائے کہ کبھی آدمی بعض چیزوں کی دعا کرتا ہے اور ان کے لئے مفید سمجھ کر ہٹ کرتا ہے اور جم جاتا ہے، اگر حقیقت میں وہ چیزیں اس کیلئے مضرت رساں ہوتی ہیں، لیکن آدمی بغیر غور و تامل کے جلد بازی کر کے ان کو چاہتا ہے۔

اس سے آگے رات دن کا انقلاب دکھا کر خدا تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ قانونِ فطرت کے مطابق تاریکی کے بعد نور اور روشنی کے بعد اندھیرا آتا ہے۔ یعنی دکھ کے بعد سکھ اور راحت کے بعد رنج آنا ضابطۂ قدرت کے موافق ہے۔ اندھیرے سے تنگ آکر روشنی کی طلب کرنا اور روشنی سے اکتا کر تاریکی کا خواستگار بننا خلافِ فطرت ہے۔ اسی طرح اہلِ ایمان کے لئے لازم ہے کہ ہر دکھ میں صابر اور ہر سکھ میں شاکر رہیں، جلد بازی نہ کریں۔ جس طرح رات دن کا انقلاب فطری ہے اسی طرح راحت و رنج کا تواقب بھی فطری ہے۔ خدا تعالیٰ رات کی تاریکی مٹا کر دن روشن کرتا ہے۔ اس دنیا کی زندگی کو بھی رات کی تاریکی سمجھو۔ جب اُفقِ قیامت پر آفتابِ قیامت طلوع ہوگا تو دن نکلے گا اور ہر شخص کا کیا کرایا دن کی روشنی یعنی روز قیامت میں سامنے آئے گا۔

آخری آیت میں دن کے دو عظیم الشان فائدے ظاہر فرمائے یعنی کسبِ معاش اور حسابِ اوقات۔ یہ تو نمایاں اور واضح فائدے ہیں ورنہ ہر چیز کے اندر حکمتِ الٰہیہ کا تفصیلی دفتر موجود ہے۔ اللہ کی خلاقی، اس کی قدرت کی ہمہ گیری اور علم و ارادہ کا احاطہ ہر چیز پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ ہر ورقے دفتریست زمعرفتِ کردگار۔

مقصودِ بیان

انسان کی عجلت پسندی کی صراحت۔ شبانہ روز کا انقلاب بیان کر کے انسانی حالت کے انقلاب کی طرف اشارہ۔ لفظ مَحَوْنَا اور مُبْصِرَةً سے اس طرف ایما کہ قیامت کے دن روشنی ہوگی۔ ابھی تو دنیا رات کی تاریکی میں ہر شخص خواہ وہ راحت میں ہو یا تکلیف میں، سکون کی نیند سو رہا ہے طلوعِ آفتابِ قیامت پر یہ تاریکی دور ہوگی اور پھر دن کی روشنی میں تمام اعمال نمایاں ہوں گے۔ لِتَبْتَغُوا میں اس بات کی طرف صراحت ہے کہ اگر دن نہ ہوتا تو کسبِ معاش میں بڑی دشواری ہوتی، زراعت اور تجارت اور دیگر ذرائع معاش کی تکمیل کس طرح ہوتی۔ گویا در پردہ یہ ہدایت کرنی مقصود ہے کہ کسبِ معاش ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنَاهُ میں لطیف تلمیح ہے اس جانب کہ خدا تعالیٰ نے ہر چیز میں اپنی ربوبیت و الوہیت کے تفصیلی دفتر کھول دیئے ہیں، مگر چشمِ بینا اور ذہنِ رسا کی ضرورت ہے وغیرہ۔

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ ۖ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا يَلْقَاهُ

اور ہر انسان کے اعمال نامے ہم نے اُس کے گلے میں لگا دیئے اور قیامت کے دن ہم اُس کے سامنے کتاب نکالیں گے جس کو وہ

مَنشُورًا ۝ اقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ۝ مَّنِ اهْتَدَىٰ

کھلا ہوا پائیں گے (پھر کہیں گے) اپنی کتاب پڑھ آج تیری ذات ہی تیرا حساب لینے کو کافی ہے جو شخص ہدایت

فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ

حاصل کرے تو وہ اپنے لئے ہدایت حاصل کرے گا اور جو شخص گمراہ ہو تو اس کی گمراہی اُسی کو ضرر پہنچائے گی اور کوئی شخص

وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۗ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا

کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا اور ہم عذاب نہیں دیا کرتے جب تک کہ رسول نہ بھیج دیں

تفسیر ان آیات میں چار مسائل کا بیان ہے (۱) تقدیر کی ہمہ گیری (۲) قیامت کے دن حساب کتاب کا لزوم (۳) ہر شخص کا اپنے اعمال کی پاداش کو برداشت کرنا اور دوسرے کی تکلیف کو نہ بٹانا (۴) ضرورت رسول ہم ہر ایک کی تفصیل ذیل میں کرتے ہیں۔

(۱) وَكُلَّ إِنسَانٍ عرب کا مروجہ عقیدہ تھا کہ پرندوں کو اڑانے سے شگون لیا کرتے تھے۔ دائیں طرف سے پرندہ اڑتا تو اچھا سمجھتے اور بائیں طرف سے اڑتا تو منحوس جانتے۔ پھر محاورہ کی توسیع ہوئی تو مجازاً ہر خیر و شر کو طائر کہنے لگے۔ آیت میں یہی مجازی معنی مراد ہیں (مقاتل و کلبی) ابن عباسؓ نے طائر کی تفسیر عمل سے کی ہے۔ حسن بصری نے سعادت و نحوست سے تعبیر کی ہے مجاہد نے ہر بچے کی سعادت و شقاوت کی صراحت کی ہے۔ مطلب سب کا ایک ہی ہے۔ رہا گردن میں طائر کا چپٹا ہونا تو امام رازی نے اس کے متعلق فرمایا کہ اللہ نے جب مخلوق کو پیدا کیا تو عقل و حزم، علم و جہل، عمر و رزق، سعادت و شقاوت کا ایک حصہ اس کے لئے مخصوص فرما دیا اسی کا نام تقدیر ہے۔ ممکن نہیں کہ آدمی اس مقدرہ سے تجاوز کرے۔ گویا علم الٰہی میں جو کچھ ہے وہ ایک پرندہ ہے جو اڑ کر لازمی طور پر ہر شخص کے ساتھ چسپاں ہوگا۔ حدیث جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ الخ میں اسی طرف اشارہ ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ گردن سے چسپاں ہونے کا ذکر اس لئے فرمایا کہ بیرونی اعضاء میں گردن ایسا عضو ہے جس پر مدار زندگی ہے۔ جو چیز گردن میں پڑی ہو اس سے چھٹکارا نہیں ہوتا۔ ابن جریر نے بروایت جابر بیان کیا ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا لَا عَدْوَى وَلَا طِيَرَةَ وَكُلُّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَائِرَهُ فِي عُنُقِهِ یعنی تعدیہ امراض ہونا اور پرندوں کے اڑنے سے شگون لینا بھی بے حقیقت چیز ہے۔ تقدیر الٰہی میں ہر شخص کے لئے جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔

(۲) قیامت کے دن ہر شخص کو اس کا نامۂ اعمال لکھا ہوا ملے گا جس پر اس کے اپنے اعضاء شہادت دیں گے۔ یعنی قیامت کے دن ہر شخص کا کیا کرایا سامنے آئے گا۔ کراماً کاتبین کی تحریر اس کے ہاتھ میں ہوگی۔ اگر سعید ہے تو اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں اور شقی ہے تو بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ تمام عمر کے اعمال اوّل سے آخر تک اس میں درج ہوں گے۔ حسن بصری نے فرمایا اے ابن آدم تیرا اعمال نامہ کھلا ہوا ہے۔ تیرے اعمال لکھنے کے لئے دو فرشتے مقرر ہیں۔ ایک دائیں طرف دوسرا بائیں طرف۔ دائیں طرف والا تیری نیکیاں قلم بند کرتا ہے اور بائیں جانب والا بدیاں محفوظ رکھتا ہے۔ اب تیرا جی چاہے کم یا زیادہ۔ مرے گا تو تیرا اعمال نامہ طے کر کے تیری گردن میں ڈال کر قبر میں رکھ دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ قیامت کے دن نکال کر کھولا جائے گا اور حکم ہوگا اس کو پڑھ۔ پس واللہ اس نے عدل کیا جس نے خود تجھے تیرے اعمال کا محاسب بنا دیا۔ امام احمد نے بروایت عقبہ بن عامر بیان کیا کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا آدمی کے ہر روزہ عمل پر مہر کر دی جاتی ہے۔ مفسر سراج نے سدی کا قول بیان کیا ہے کہ کافر پر ہر طرح اتمام حجت کر دی جائے گی، یہاں تک کہ وہ اپنے نفس پر خود محاسب ہوگا۔ گویا سدی کے نزدیک صرف کفار خود اپنے محاسب ہوں گے۔ بات یہ ہے کہ جب نامۂ اعمال کھلا ہوا سامنے آئے گا تو ممکن ہے بعض گستاخ کہنے لگیں یہ تحریر ہماری نہیں۔ ہم نے یہ اعمال نہیں کئے، فرشتوں نے غلط درج کر دیئے ہیں، اس لئے فرما دیا کہ اپنے اعمال نامہ کا شاہد ہر شخص خود ہی ہوگا۔ کسی کو انکار کی مجال نہ ہوگی۔ یہاں دو باتیں تحقیق طلب ہیں۔ اول تو یہ کہ نامۂ اعمال میں اندراج کس طرح ہو سکتا ہے۔ نامۂ اعمال کاغذ کا ہے، کپڑے کا ہے، تانبے یا لوہے یا پیتل وغیرہ کے پترے ہیں۔ بہر حال وہ کیا شے ہے جس پر اعمال لکھے جاتے ہیں اور قیامت کے دن ہر پڑھا بے پڑھا اس کو پڑھ لے گا۔ دوسری بات یہ کہ آدمی کے اعضاء کس قسم کی شہادت دیں گے۔ نطق کا کام صرف زبان کا ہے دیگر اعضاء کس طرح ناطق ہوں گے۔

دونوں مباحث کی تحقیق ہم قدیم و جدید انکشافات کے پیش نظر کرتے ہیں۔ علمائے طبعیات کا بالاتفاق نظریہ ہے کہ آدمی کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اور ہاتھ پاؤں یعنی اعضائے جسمانی کی کسی ہوئی ہر حرکت فنا نہیں ہو جاتی۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ زبان سے بات نکلی اور فنا ہو گئی یا اعضاء سے کوئی کام کیا اور معدوم ہو گیا۔ بلکہ اس کے نقوش ایتھر میں موجود رہتے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ ہوا کی لہریں ہر آواز کیفیت آواز نوعیت آواز کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ اسی طرح ہر جسمانی حرکت کا عکس فضا میں باقی رہتا ہے اور یہ ممکن ہے کہ ہوا کی لہروں کے اندر جو آواز یا حرکت جسمانی کا نقش موجود ہے۔ اس کو پھر اصلی کیفیت اور واقعی شکل میں پیش کر دیا جائے۔ فضا کی کہربائی لہروں کے نقوش کی عکس ریزی کرنے والے آلات برآمد ہو چکے ہیں۔ اہل عقل نے دنیا کو محسوس کرا دیا ہے کہ ایتھر کے اندر صوتی یا فعلی بعینہ موجود رہتی ہے اور ہر طرف اس کو منتقل کیا جا سکتا ہے۔ آج کل گھر گھر ریڈیو موجود ہے دنیا کے ہر حصہ کے رہنے والوں کی آواز جو ہوائی لہروں میں موجود رہتی ہے ہر جگہ پہنچائی جا سکتی ہے۔ جب طبعیات کے ماہرین کی تحقیقات اس حد تک پہنچ چکی ہے تو پھر نامۂ اعمال میں اقوال و افعال کا اندراج کس طرح قابل انکار ہو سکتا ہے۔ ہم سمجھانے کے لئے کہہ سکتے ہیں کہ ایتھر کی لہریں ہی اعمال نامے ہیں جو محفوظ رہتے ہیں۔ قیامت کے دن حساب کے وقت

اس کو مکمل کر کے پیش کر دیا جائے گا۔ جن کے اندر ہر لمحہ اور ہر سیکنڈ کی نقل و حرکت اور سکون و کلام درج ہوگا۔ اللہ کے غیبی فرشتے غیبی قدرت کے ساتھ انہی لہروں میں ہر شخص کے گفتار کردار اور رفتار کو مدرج کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت چونکہ نظروں کے سامنے گزشتہ افعال و اقوال کے نقوش نہیں، اس لئے نامہائے اعمال گویا لپٹے ہوئے ہیں۔ جب دنیا کی یہ تاریک رات ختم ہوگی اور صبح قیامت کو افق انقلاب پر آفتاب انکشاف طلوع ہوگا اس وقت ہر شخص اپنی مادی نظر سے نقوش ذہنی کا مشاہدہ کرے گا اور ہر پڑھا بے پڑھا آدمی آنکھوں سے دیکھ کر پڑھ لے گا اور چونکہ اس کے اعمال کا عکس یا اسی کے اصل اعمال ہوں گے، اس لئے انکار بھی نہ کر سکے گا۔ اس کے اعضا اعضا کی ساخت، اعضا کی ہیئت اور اعضا کے حرکات و سکنات خود مطابق اصل ہونے کے شاہد ہوں گے۔ اگر ذرہ برابر نیکی کی ہوگی تو وہ بھی سامنے آجائے گی اور بال برابر بدی ہوگی تو وہ بھی چھپی نہ رہے گی۔ غیبی کائنات جس کی تعبیر شریعت کی زبان میں موکل فرشتوں کے الفاظ سے کی جاتی ہے اس کے تمام اعمال کی حامل و کاتب ہوگی۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۃ قاف میں فرمایا ہے اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝

(۲) مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ الخ۔ اس آیت کا سبب نزول چند واقعات کو قرار دیا جاتا ہے۔ ولید بن مغیرہ کفار مکہ سے کہا کرتا تھا کہ تم بے کھٹکے میرے کہنے پر چلو اور میرا اتباع کئے جاؤ! اطمینان رکھو تم سب کے گناہ میں اٹھالوں گا۔ اس آیت میں ولید کے قول کی تردید فرمادی کہ کوئی کسی کا گناہ نہیں اٹھا سکتا۔ اپنی اپنی کرنی اور اپنی اپنی بھرنی۔ ایک مرتبہ حضرت خدیجہؓ نے حضور اقدسؐ سے مشرکوں کے ان نابالغ بچوں کا حکم دریافت کیا جو قبل از بلوغ مرجائیں۔ حضورؐ نے اپنے قیاس و اجتہاد سے فرمایا بچے اپنے باپ کے حکم میں ہیں یعنی ان کے باپ جس طرح کے حال میں ہوں گے اسی حال میں وہ خود ہوں گے۔ پھر دوسری بار اجتہاد سے فرمایا۔ اللہ کے علم میں ان کے جیسے اعمال تھے اس کے مطابق معاملہ ہوگا۔ تیسری مرتبہ اسلام کے احکام کے وقت جب اولاد مشرکین کا حکم دریافت کیا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی اور بذریعہ وحی حکم کی واقعیت ظاہر کی گئی کہ ناسمجھ اولاد پر عذاب نہیں ہوگا۔ بلا عمل سزا دینا رحمت الٰہیہ سے بعید ہے۔ دوسرے کے کئے پر بچوں کی پکڑ نہ ہوگی۔

تحقیق مقام دوسرے کے گناہ اٹھانے کی دو صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کو اپنے اختیار سے خود اٹھا لے۔ دوسری یہ کہ کسی شخص سے بحکم الٰہی دوسرے کے گناہ اٹھوائے جائیں۔ پہلی صورت قطعاً ناممکن ہے اسی کا بیان آیت کریمہ میں ہے۔ دوسری صورت کی بھی دو شقیں ہیں۔ اول یہ کہ کسی کا گناہ دوسرے پر ڈالا جائے اور اس ... سے بحکم الٰہی اٹھوایا جائے اور پہلے آدمی کو اس گناہ سے آزاد کر دیا جائے یا اس کی سزا میں تخفیف کر دی جائے۔ دوسری شق یہ ہے کہ گناہ کرنے والے کے گناہ میں کسی قسم کی کمی نہ ہو نہ اس کی سزا میں تخفیف ہو بلکہ دوسرے شخص پر بھی اس کے گناہ کا وبال پڑے۔ یہ دونوں شقیں صحیح ہیں۔ پہلی شق کے متعلق صحیح حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن ظالم کی نیکیاں مظلوم کو بقدر ظلم کے دیدی جائیں گی اور اگر ظالم کی نیکیاں نہ ہوں گی یا بقدر کفایت نہ ہوں گی تو بقدر ظلم مظلوم کے گناہوں کا حصہ لے کر ظالم پر ڈالا جائے گا۔ حاصل یہ کہ ظالم مظلوم کے گناہوں کو اٹھائے گا، مگر بحکم الٰہی۔ دوسری شق کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ جس شخص نے کوئی نیک طریقہ جاری کیا تو اس کو اس طریقہ پر چلنے کا بھی ثواب ملے گا اور قیامت تک جو لوگ اس طریقہ پر چلیں گے ان کا ثواب ملے گا، مگر ان چلنے والوں کے ثواب میں اس سے کوئی کمی نہ آئے گی اور جس نے کوئی برا طریقہ قائم کیا تو اس پر خود بے راہ چلنے کا بھی عذاب ہوگا اور ان لوگوں کی گمراہی کا وبال بھی ہوگا جو قیامت تک اس راہ پر چلیں گے، مگر اس سے ان غلط لوگوں کے عذاب میں کوئی کمی نہ ہو جائے گی۔ حاصل یہ ہے کہ صحیح طریقہ قائم کرنے والوں کو دوہرا ثواب ملے گا، ہدایت یابی کا اور دوسروں کے لئے راہ ہدایت جاری کرنے کا۔ اور طریقہ معصیت قائم کرنے والوں پر دوہرا عذاب ہوگا اپنی گمراہی کا اور دوسروں کے لئے گمراہ کن راستہ قائم کرنے کا۔ اسی مضمون کی صراحت آیت وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ میں فرمائی ہے۔

حضرت عائشہؓ کی تشریح حضرت عمرؓ کی روایت کردہ حدیث سے ثابت ہے کہ پسماندگان کے رونے پیٹنے سے اور واویلا کرنے سے مردے پر عذاب ہوتا ہے، لیکن حضرت عائشہؓ نے آیت وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى کو پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ مردہ پر پسماندگان کے نوحہ و بکا سے عذاب نہیں ہوتا۔ ام المومنین سے حضرت عمرؓ کی روایت کردہ حدیث بیان کی گئی تو فرمایا اللہ عمرؓ پر رحم فرمائے انہوں نے غلط روایت تو نہیں بیان کی، مگر بات یہ ہے کہ ایک یہودن مر گئی تھی، پسماندگان اس پر رو پیٹ رہے تھے۔ حضور اقدسؐ کا ادھر سے گزر ہوا! ارشاد فرمایا یہ لوگ یہاں رو رہے ہیں اور

اس پر قبر میں عذاب ہو رہا ہے۔ (ام المومنین رضی اللہ عنہا کے جواب کا حاصل یہ نکلا کہ یہ حدیث حضور اقدس ﷺ نے یہودن کے متعلق فرمائی تھی جس کا اختصار یہ تھا کہ یہودن کا انتقال چونکہ کفر کی حالت میں ہوا ہے، اس لئے اس پر قبر میں عذاب ہو رہا ہے اور یہ لوگ اس پر واویلا کر رہے ہیں۔ حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس عورت پر پسماندگان کے نوحہ وبکا کی وجہ سے عذاب ہو رہا تھا) اہلِ سنت نے دونوں حدیثوں میں تعارض دور کرنے کے لئے توفیقی صورت اس طرح بیان کی ہے کہ اگر مردہ اپنی زندگی میں میت پر نوحہ کرتا ہو یا نوحہ کرنے کو اچھا جانتا ہو اور مرتے وقت پسماندگان کو نہ کرنے کی ہدایت نہ کرے تو اس پر وارثوں کے نوحہ کرنے سے عذاب ہوگا۔ یعنی وہ اپنے کئے کی پاداش برداشت کرے گا۔ یہ مطلب نہیں کہ وارثوں کے فعل کا گناہ اس پر ڈالا جائے گا بلکہ وہ اپنے ہی فعل پر ماخوذ ہوگا کہ اس نے نوحہ کرنے کا طریقہ جاری کیا یا زندگی میں نوحہ کو پسند کیا یا وصیت کی یا باوجود قدرت کے نوحہ کرنے سے نہ روکا۔ حضرت عمرؓ کی روایت کردہ حدیث کا بھی یہی مطلب ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو انکار فرمایا وہ بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ میت پر ورثاء کے فعل کا عذاب نہ ہوگا واللہ اعلم (ہکذا حققہ الامام البخاری)

(۴) اللہ کا قانون نہیں کہ بغیر نبی بھیجے لوگوں کو عذاب دے۔ تحقیق مبحث یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو ہوش وحواس دئے یعنی ظاہری حواس کے ذریعہ سے وہ آواز سنتا اور آواز کی کیفیت اور نوعیت دریافت کرتا ہے، خوشبو بدبو کا امتیاز کرتا ہے، شیریں، تلخ، خوش مزہ اور بدمزہ کا احساس کرتا ہے، سرد گرم، چکنا اور کھردرا معلوم کرتا ہے، مختلف اشکال، الوان اور مقادیر کو دیکھتا ہے پھر اس سے آگے بڑھ کر مختلف صورتوں، آوازوں اور کیفیتوں کا مدرک دماغ کے اندر اور موجود ہے جس کے اندر تمام بیرونی تصویریں جاتی ہیں۔ ان تصویروں کے اندر جو اندرونی معانی پوشیدہ ہیں ان کے احساس کے لئے ایک مزید قوت ہے۔ مثلاً زید اور شیر کی صورت آنکھوں سے دکھائی جاتی ہے اور یہ تصویر آنکھوں کے ذریعہ پہنچ کر دماغ کے اندر حسِ مشترک کی قوت میں منقش ہو جاتی ہے، لیکن زید دوست ہے اور شیر دشمن ہے۔ زید کی طرف بڑھنا اور شیر سے بھاگنا چاہیئے۔ یہ کام ایک اور قوت کا ہے جس کو واہمہ کہا جاتا ہے۔ حسِ مشترک واہمہ کے علاوہ ان کے مزید مددگار اور خزانچی بھی ہیں جو صورت دیکھی ہے کل اگر وہی سامنے آجائے تو دماغ بتا دیتا ہے کہ یہ وہی کل والی صورت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آج جب صورت سامنے آئی اور اس کی تصویر حسِ مشترک میں پہنچی تو حسِ مشترک نے اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ گزشتہ تمام تصویریں سامنے لاؤ۔ فوراً تمام تصویریں سامنے آگئیں۔ جس تصویر سے حالیہ تصویر کی مطابقت ہوئی فوراً سمجھ لیا کہ یہ وہی تصویر ہے اور اس کا نام زید ہے۔ اسی طرح دوستی دشمنی بلکہ معانی کو جمع رکھنے والا خزانہ بھی موجود ہے۔ جو مضمون آج سمجھا آٹھ روز کے بعد بھی وہ یاد رہتا ہے۔ یہ کام اسی خزانے کا ہے۔ حسِ مشترک کے خزانے کا نام خیال واہمہ کے خزانے کا نام حافظہ ہے۔ پھر ایک پانچویں قوت اور بھی ہے جو بن دیکھی اور بغیر سمجھی چیزیں دماغ میں بیداری یا خواب کی حالت میں لاتی ہے اس کو متصرفہ کہتے ہیں۔ اللہ نے یہ تمام قوتیں حق و باطل اور اچھائی برائی میں امتیاز کرنے کے لئے عطا فرمائی ہیں، لیکن ان سب سے بالاتر ایک اور نورانی قوت عطا فرمائی ہے جس کو عقل کہا جاتا ہے۔ علوم کلیہ صحیح یا غلط اعتقاد، حشر نشر، جنت، دوزخ، ملائکہ، آسمان زمین کی تحقیقات، اللہ کی ذات وصفات کا علم، غرض طبعیات، فلکیات، عنصریات اور الٰہیات کے مباحث کو سمجھنا اس کا کام ہے۔ یہی قوت کبھی حواس کی وساطت سے اور کبھی بلاواسطہ تمدنی قوانین بناتی ہے، معاشرت کے اصول وضع کرتی ہے، زندگی بسر کرنے کے ضوابط سکھاتی ہے، فساد کی بیخ کنی کرنے اور عدالت عامہ کو پھیلانے کے قواعد قائم کرتی ہے، لیکن سطحِ زمین کے رہنے والوں کے دماغ مختلف ہیں، حواس جدا جدا ہیں، عقلیں متباین ہیں۔ زید کے نزدیک جو چیز حق ہے بکر کے نزدیک وہ چیز باطل ہے۔ بعض عقلاء شراب کو مفید اور بعض مضر بتلاتے ہیں۔ تحقیقات دماغی کی کوئی حد نہیں۔ صحت وغلطی کا کوئی معیار نہیں بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک وقت ایک بات کو صحیح جانتا ہے۔ دوسرے وقت جب اس کے دماغ میں اس کے خلاف دلائل آتے ہیں تو اسی بات کو غلط سمجھنے لگتا ہے۔ کل دنیا والوں کی عقلوں کا کسی خاص مرکز پر جمع ہو جانا ناممکن تھا بلکہ انسان کے مختلف احوال کا ہموار و یکساں ہونا بھی قطعاً محال تھا، اس لئے خدا تعالیٰ نے باہمی عقول کا تفرقہ مٹانے، قانونِ عدالت جاری کرنے، عقائد صحیحہ اور اعمال حقہ کی تعلیم دینے اور دنیا والوں کو تباہی سے بچا کر نجات کے راستہ پر چلانے کے لئے انبیائے کرام کو مبعوث فرمایا۔ عقلی ادراک میں غلطی ہو سکتی تھی، افکار وخیالات غلط ہو سکتے تھے، انسانی دانش میں کجروی کا امکان تھا، مگر انبیاء چونکہ قوت قدسیہ کے مالک ہوتے ہیں، براہ راست اللہ کی طرف سے ان کے پاس کتابیں، صحیفے اور پیغامات آتے ہیں، پھر ان کی عقلیں بھی دنیا کے تمام فلاسفروں کی عقلوں سے تیز ہوتی ہیں، اس لئے ان کے بتائے ہوئے قوانین اور قائم کئے ہوئے ضوابط میں غلطی کا احتمال نہیں ہو سکتا۔ اتنی واضح صداقت اور روشن صداقت کے باوجود جو لوگ انکار کرتے ہیں وہ ضرور مستحق عذاب ہوتے ہیں۔ آفتاب کے وجود کا منکر ضرور اندھا کہلاتا ہے۔ اسی مضمون کی طرف آیت مذکورہ میں اشارہ فرمایا کہ جب تک ہم رسول کو نہ مبعوث کر دیں کسی کو عذاب نہیں دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ

انبیاء کی تبلیغ میں ضرورت زمانہ اور ماحول کے اختلاف کی بنا پر اگرچہ جزئیہ کا اختلاف نظر آتا ہے، مگر اصول دعوت سب کے ایک ہی ہیں۔ عمل یا اعتقاد کے نظریات میں اختلاف نہیں، اور یہی سبب ہے کہ ایک نبی کا انکار درحقیقت کل انبیاء کا انکار ہے اور یہی راز ہے کہ دور نبوت میں نبی کی بعثت کا علم ہوتے ہوئے اور نبی کی لائی ہوئی صحیح کتاب موجود ہوتے ہوئے کسی شخص کا عقلی ایمان معتبر نہیں۔

کیا ہر شخص کا نبی کو دیکھنا یا اس کی لائی ہوئی کتاب یا پیش کردہ تعلیم کا مل طور پر براہ راست واقف ہونا ایمان کے لئے ضروری ہے؟

یہ ایک زبردست اختلافی مبحث ہے جس کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ ایمان و اسلام کے لئے یہ امر ضروری نہیں کہ نبی یا مرکز ہر شخص سے جا کر خود کہے یا دعوت نامہ بھیجے بلکہ جس شخص کو بعثت نبی کی خبر پہنچ جائے خواہ اس کی تعلیم کا تفصیلی علم ہو یا نہ ہو بہرحال وہ ایمان لانے پر مکلف ہے۔ نبی کا ہر گاؤں اور ہر قصبہ میں پہنچنا بھی ضروری نہیں، بلکہ مقامی انبیاء کا اس مخصوص ملک میں تبلیغ کرنا اور عمومی نبی کا دعوت عام دینا ضروری ہے۔ خواہ وہ اپنی جگہ سے کہیں ہل کر بھی نہ جائے۔ فرض صرف تبلیغ عمومی ہے۔ لوگوں تک پہنچا دینا ہے خواہ کسی طور پر ہو۔

مقصود بیان قضاء و قدر کی گرفت ہمہ گیر ہے۔ ہر شخص کی نیکی بدی سعادت شقاوت اس کے لئے لازم کردی گئی ہے جس کی خلاف ورزی کوئی نہیں کرسکتا۔ قیامت کے دن حساب کتاب اور نامۂ اعمال کی پیشی ضرور ہوگی۔ ہر شخص اپنا نامۂ اعمال پڑھ سکے گا اور کسی کو کراماً کاتبین کی تحریر سے انکار کی مجال نہ ہوگی۔ کوئی شخص کسی کا گناہ برداشت نہیں کرسکتا یعنی اپنے اوپر کسی کا گناہ نہیں لے سکتا۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔

اول تو یہ کہ اسقاط کا جو مروجہ طریقہ ہے وہ قطعاً غلط ہے۔ اس ملک میں عام دستور ہے کہ میت کے سرہانے کھڑے ہو کر کوئی ملا فقیر باواز بلند اقرار کرتا ہے کہ اس میت سے ادائے فرض و واجبات میں تساہل ہوا ہے یا اس نے فریضۂ خداوندی ترک کیا ہے اس کے عوض میں یہ قرآن شریف یا چند روپیہ یا اور کوئی جنس قبول کرکے اقرار کرتا ہوں کہ اس کے گناہ میں نے اوپر لئے۔ یہ صورت قطعاً خلاف نص ہے۔ بعض ممالک میں یہ آخری فقرہ نہیں کہا جاتا لیکن دینے اور لینے والے کا مقصد یہی ہوتا ہے۔ بہرحال اس فعل کی حرمت صراحتہً ہے

(۲) بعض لوگ اس آیت سے ایصال ثواب اور شفاعت انبیاء و اولیا کا انکار مستنبط کرتے ہیں، مگر یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ کیونکہ ہم نے بیان کر دیا ہے کہ آیت مذکورہ کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے اوپر کسی کا گناہ خود نہیں اٹھا سکتا۔ یہ معنی ہرگز نہیں کہ کوئی کسی کا قصور بھی معاف نہیں کرا سکتا۔ ورنہ دعائے مغفرت کا جواز جو اجماعی چیز ہے اور آیات قرآنیہ نیز احادیث صحیحہ سے ثابت ہے قطعاً غیر صحیح ہو جائے گا۔

آخری آیت دلالت کر رہی ہے کہ نبی کا ہونا اتمام حجت کے لئے ضروری ہے۔ قانون کا اجرا بغیر نبی کے ناممکن ہے۔ بعثت انبیاء کے بغیر کوئی قوم یا شخص ماخوذ نہیں۔ اشیا اور افعال و عقائد کا اچھا برا ہونا اگرچہ عقل سلیم سے سمجھا جا سکتا ہے، لیکن وجوب شرعی اسی وقت ہوتا ہے جب شریعت نے حکم دیا ہو۔ یہاں سے ایک مسئلہ یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ جس شخص کو نبی کی دعوت نہ پہنچی ہو وہ ماخوذ نہیں۔ ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ ناسمجھ بچے یا دیوانے یا مخبوط الحواس بوڑھے بھی ماخوذ نہیں۔ کیونکہ ان کی سمجھ ہی درست نہیں کہ پیام رسول یا بعثت نبی کا ان کو علم ہو سکے، مگر مخبوط الحواس بوڑھوں کی سابقہ حالت کا اعتبار ضروری ہے۔ سلامتی حواس کے زمانے میں ایمان و کفر کی جو حالت ان کی تھی وہی ان کی نجات یا عدم نجات کی کفیل ہوگی۔

نوٹ: علما نے مشرکوں کے بچوں کے متعلق بڑے اختلافات کئے ہیں۔ یہاں تفصیل موجب تطویل ہے۔ آیت سے ضمنی طور پر جو حکم مترشح ہو سکتا ہے وہ ہم نے لکھ دیا وغیرہ۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا

اور جب ہم کسی بستی کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس جگہ نافرمانی کرتے ہیں تو پھر

الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝ وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْۢ بَعْدِ نُوْحٍ ؕ

حجت تمام ہو جاتی ہے اور ہم اس بستی کو بالکل تباہ کر دیتے ہیں　نوح کے بعد ہم نے　کتنی ہی امتوں کو　ہلاک　کر دیا

وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ۝

اور تمہارا　رب اپنے　بندوں کے گناہوں سے　باخبر ہے اور دیکھنے کے لئے کافی ہے

تفسیر اَمَرْنَا کے تین معانی مفسرین نے بیان کئے ہیں: (۱) مفعول محذوف ہے یعنی ہم دولت مندوں کو ایمان اور عمل صالح کا حکم دیتے ہیں، مگر جب وہ سرکشی کرتے اور حدود طاعت سے قدم باہر رکھتے ہیں۔

(۲) جس بستی کو ویران کرنا مقصود ہوتا ہے تو وہاں کے امیروں اور دولتمندوں کو ہم غریبوں پر مسلط کرتے ہیں۔ امراء اور بالا دست طبقہ عیاشی، بدکاری اور ظلم و ستم کرنے لگتا ہے۔ ابوالعالیہ، مجاہد، ربیع ابن انس اور علی بن ابی طلحہ نے یہی تفسیر کی ہے۔ ایک روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔

(۳) جس بستی کو ویران کرنا مقصود ہوتا ہے تو ہم وہاں دولت مندوں کی کثرت کر دیتے ہیں۔ غریب کم ہو جاتے ہیں۔ عکرمہ، حسن بصری، قتادہ، ضحاک اور زہری وغیرہ نے یہی تفسیر بیان کی ہے۔

حاصل ارشاد سبحق و لاحق یہ ہے۔ ہم بغیر رسول بھیجے کسی کو عذاب نہیں دیتے یعنی ہمارا قانون اور معمول ہے کہ جب تک اتمام حجت نہ کریں اور رسول بھیج کر اپنے احکام مخلوق کو نہ پہنچا دیں اس وقت تک کسی کو سزا نہیں دیتے۔ ہاں اتمام حجت کے بعد اگر کوئی نہ مانے تو ہلاکت و عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ضرور نہیں کہ دنیا میں اس پر عذاب نازل ..... ہی کریں۔ اکثر تو ڈھیل ہی دیئے جاتے ہیں تاکہ توبہ کی گنجائش باقی رہے، لیکن اس پر بھی اگر کوئی باز نہیں آتا اور کفر و عصیاں اس کی ہلاکت کا متقاضی ہوتا ہے تو اس بستی کے خوش عیش امراء اور رؤسا کو ایمان و اطاعت کا حکم دیتے ہیں، لیکن جب وہ اپنی گندہ طبیعت کے سبب شرارت مچاتے ہیں اور ان کا فسق و فجور خوب کھل جاتا ہے تب دوسری حجت پوری ..... ہو جاتی ہے اور تباہی نازل ہوتی ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ جب کسی بستی والوں کا ان کی معصیت کے سبب ہم کو ہلاک کرنا مقصود ہوتا ہے تو ہم دولتمند طبقہ کو اس پر مسلط کر دیتے ہیں۔ دولتمند کی بدچلنی اور عیش پرستی دیکھ کر عوام بھی ان کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ جب امیر بدعمل و بداخلاق گمراہ و بدچلن ہو چکتے ہیں تو عذاب نازل ہوتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ جب کسی آبادی کی تباہی کا وقت اس کی بدرفتاری کی وجہ سے آتا ہے تو ہم وہاں کے امراء رؤساء کو ڈھیل دیتے ہیں اور مال و منال، نسل و اولاد اور عیش و آرام کے سامان کی فراوانی عطا کرتے ہیں، اس تموّل و خوشحالی پر مغرور ہو کر وہ بستی کی خرابی میں مدہوش ہو جاتے ہیں تب حجت پوری ہو جاتی ہے اور عذاب نازل ہوتا ہے۔

اس سے آگے فرماتا ہے نوح (آدم ثانی) کے بعد بھی ہم نے کتنی کثیر قوم کو تباہ کر دیا (عاد، ثمود، اصحاب الرس، عاد اول، ثمود وغیرہ) یہ سب ان کے کرتوت کی پاداش تھی کیونکہ اشخاص و اقوام کا کوئی قصور اللہ سے چھپا نہیں رہ سکتا۔ اس کو ہر بندے کے گناہ کی اطلاع ہے اور ہر شخص کے قصور کو وہ خود دیکھتا ہے۔

مقصود بیان کسی بستی کے امراء کی عیش پرستی اور بدچلنی وہاں کے باشندوں کی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ اللہ ہر صورت ڈھیل دیتا رہتا ہے، لیکن جب سرکش انسان باز نہیں آتا تو آخر کار تباہ کر دیا جاتا ہے۔ اقوام عالم کی تباہی کا تذکرہ قرآن کا فرمانا کہ تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ اگر تم بھی سرکشی جاری رکھو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو بھی صفحۂ وجود سے نابود کر دے گا۔ آیات ہی دور حاضر کے مسلمانوں کے لئے بھی تازیانۂ عبرت ہے جن کے امراء کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ بدچلنی، بدمعاشی، عیاشی، تباہ کاری جن کا شعار بن گئی ہے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں پر ہر طرف سے مار پڑ رہی ہے۔ خصوصاً ہندوستان کے رؤسا کی حالت تو ناقابل بیان ہے۔ ننانوے فی صدی امراء بادۂ غفلت و عیش پرستی میں سرشار ہیں۔ پبلک کی گاڑھی کمائی کو اپنے عیش کے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ

جو شخص دنیا چاہتا ہے ہم اُس کو دنیا ہی میں جو کچھ چاہتے اور جس کو چاہیں دے دیتے ہیں پھر اُس کے لئے جہنم مقرر کر دیا

يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا ○ وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ

جس میں وہ بُرے حال سے مردود ہو کر داخل ہوگا اور جو آخرت کے خواہاں ہوتے ہیں اور اس کے لئے بحالت اسلام سعی کرتے

مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا ○ كُلًّا نُمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ

ہیں ان کی کوشش مقبول ہوتی ہے ہر ایک کو ہم تمہارے پروردگار کی بخشش میں سے دیتے ہیں

رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا ○ انْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ

ان کو بھی اور اُن کو بھی اور تمہارے پروردگار کی دین بند نہیں ہے دیکھو ہم نے ایک کو دوسرے پر کیسی برتری دی

بَعْضٍ ۚ وَلَلْآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا ○

اور بیشک آخرت باعتبار مراتب کے اور باعتبار بزرگی دینے کے بہت بڑی ہے

تفسیر اوپر کی آیات میں بیان تھا کہ رسول کو مبعوث کرنے اور پیام ہدایت بھیجنے کے بعد بھی ہم ڈھیل دیتے رہتے ہیں۔ جب احوال تباہی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر ہم تباہ کرتے ہیں۔ اس کلام سے بظاہر ظلم کا احتمال مترشح ہوتا تھا۔ بہت سے لوگ اپنی عقل سے سمجھ کر اچھے کام کرتے ہیں، لیکن رسول پر ایمان نہیں لاتے ان کو غارت کرنا خلافِ انصاف ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو مومن کامل ہونے کے باوجود ذیلی طور پر کافروں کے گروہ کے ساتھ ہلاک کر دیے جاتے ہیں یہ بھی شعارِ عدل نہیں۔ پھر یہ بھی شبہ ہوتا تھا کہ دنیا میں کفار ہی بہت پھولتے پھلتے ہیں۔ نافرمان گروہ ہی فراخ حالی، فارغ البالی اور ترقی و عروج سے ہمکنار ہوتا ہے اور نیک بندے عموماً مفلس و فلاکت زدہ رہتے ہیں۔ یہ بھی شانِ عدالت سے بعید ہے۔ ان تمام رکیک شبہات کا ازالہ مذکورہ آیات میں فرما دیا۔

دنیا میں دو طرح کے آدمی ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہے جس کا آخرت پر ایمان نہیں یا تو وہ زبان سے صرف اقرار کرتا ہے یا زبان سے منکر بھی ہے۔ اس کے پیشِ نظر صرف دنیا ہے اور دنیا ہی کے فوائد کا وہ طلب گار ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس کا اصل مطمح نظر دارِ آخرت ہے۔ اس کی نظر میں دنیا بے مقدار ہے۔ دنیوی عیش و آرام اس کو حاصل ہو یا نہ ہو دونوں اس کی نظر میں برابر ہیں وہ صرف آخرت کا خواستگار ہے۔ اول گروہ میں دو قسمیں ہیں ایک تو وہ جو دوسروں پر ظلم و ستم کرتا، جور و تعدی سے کام لیتا اور اپنے ذاتی فوائد کو حاصل کرنے کے لئے کسی قسم کی سفاکی سے دریغ نہیں کرتا۔ اپنی ایک اینٹ کے لئے دوسروں کے مکانوں کو برباد کر دیتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جو ذاتی منافع کا تو خواہش مند ہے مگر دوسروں کو بھی ضرر پہنچانا نہیں چاہتا۔ مخلوقِ خدا کو برباد کرنے کا روادار نہیں۔ معاملات میں ظلم و ستم نہیں کرتا، وہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے انصاف سے کام لیتا ہے۔ اول گروہ کی اول الذکر شق تو کسی طرح دنیا میں سرسبز و بامراد نہیں ہو سکتی۔ خوشحالی و آسائش اس کو نہیں مل سکتی۔ بظاہر چند روزہ رفاہیت بھی اس کی قائم نہیں رہ سکتی۔ موخر الذکر شق میں سے جس کو اور جتنا چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آدمی جتنا طلب کرے وہ سب مل جائے یا ہر شخص کی خواہش پوری کر دی جائے۔ دینا نہ دینا خدا کے اختیار میں ہے۔ بہت سے دین فروش دنیا کے طلب گار ایسے ہیں جو کفر و معصیت اور شرک و نافرمانی کو ذریعۂ معاش قرار دے لیتے ہیں۔ مگر ان کی روزی پوری نہیں ملتی ہمیشہ فلاکت زدہ رہتے ہیں اور بہت سے خواستگارانِ دنیا باوجود کفر و عصیان کے خوش نصیبی سے گزر اوقات کرتے ہیں۔ اللہ کی دین ہے جس کو جتنا چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ کفر و عصیان موجب امن و رفاہیت

نہیں نہ باعث انقطاع معاش ہے۔ اللہ کے دسترخوان پر صلائے عام ہے۔ دشمن دوست کو حسب مقدار دیتا ہے۔ گو طالبان دنیا کا آخری نتیجہ خراب ہے۔ منکرِ آخرت
انجام کار ذلیل و خوار ہو کر جہنم میں جائے گا۔ رہا وہ گروہ جس کا اصل مقصد نظر دار آخرت ہے اور نیت صحیح ہے اس کو نجات ابدی اور سعادت سرمدی حاصل ہوگی مگر
تین شرطیں ہیں۔

(۱) آخرت کی کوشش کی جائے یعنی عبادت و معاملات میں حسن سلوک اختیار کیا جائے۔ فرائض ادا کئے جائیں۔ ہر خیر پر عمل اور شر سے اجتناب کیا جائے۔
(۲) حصول آخرت کی مناسب کوشش کی جائے۔ بے جا، بے محل اور کج روی کے ساتھ کوشش کرنی ناقابل اعتبار ہے۔ رسول پاکؐ نے زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ
بتا دیا ہے، عبادت و معاملات کے جو قوانین سکھا دیئے ہیں ان کی پابندی کی جائے۔ خود رائی اور کورانہ تقلید کو ترک کر دیا جائے۔ بہت سے لوگ ہیں جو سعادتِ
ابدی کے خواستگار ہیں، مگر اس کے حصول کی کوشش نہیں کرتے اور بہت سے لوگ ہیں جو کوشش کرتے ہیں۔ زہد و ریاضت مجاہدہ کرتے ہیں کوئی سنیاسی کا بنباسی
بن کر ہاتھ پیر ان خشک کر لیتا ہے۔ بدن پر خاک مل کر دھونی رما کر مجسم بت بن جاتا ہے۔ کوئی گنگا کے کنارے رہتا ہے اور اس کو باعث ثواب جانتا ہے۔ بعض
لوگ قربتِ الٰہی کے خواستگار تو ہوتے ہیں، مگر اپنی جہالت سے گمراہی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ ستاروں کو مظہر نور سمجھ کر اور عناصر میں آگ کو جلوہ گاہ و تجلی قرار
دے کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔ انہی کو قبلۂ سجود بناتے ہیں یا فرشتوں کی پوجا کرتے ہیں اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ملائکہ مقربین بارگاہ ہیں ان کو خوش کرنا سب سے
اوّل لازم ہے۔ بعض لوگ شفاعت کی اُمید پر اولیاء و انبیاء کی قبروں پر اور ان کی مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں۔ ان کے سامنے ڈنڈوت اور سجدے کرتے ہیں
بعض لوگ ان کے نام پر قربانیاں کرتے، بھینٹ چڑھاتے یہاں تک کہ بعض اوقات تو زخمی ہو جاتے ہیں۔ عبادت اور ریاضت کے یہ تمام طریقے مذموم اور ناقابل
قبول بلکہ موجب مواخذہ ہیں۔ ان طریقوں پر چلنے کو حصولِ آخرت کی مناسب کوشش نہیں کہا جا سکتا۔ (۳) صحیح نیت اور صحیح عمل کے ساتھ صحیح ایمان بھی ضرور
ہے۔ غلط ایمان مثل عدم ایمان ہے۔ اللہ کی ذات صفات ملائکہ انبیاء، جنت دوزخ، حشر نشر، حساب کتاب وغیرہ پر صحیح عقیدہ مدار نجات ہے۔ اس کے بغیر کوئی عمل معتبر نہیں۔
ایمان ثابت، نیت صادق اور عمل صحیح یہ تمام امور طلب گار آخرت کے لئے لازم ہیں۔ جب تینوں امور کی تکمیل کر لی جائے تو کوشش بار آور ہوگی۔ خدا تعالیٰ قبول فرمائیگا
اور جزائے خیر عطا کرے گا۔ غرض یہ کہ کوئی دنیا کا طالب ہو یا آخرت کا خواستگار خدا تعالیٰ کسی کی طلب ضائع نہیں فرماتا۔ خواستگارانِ دنیا اور طلب گاران آخرت
کوئی گروہ حصے سے پروردگار کے محروم نہیں رہتا۔ ہر ایک کو حسب مشیت الٰہی ملتا ہے۔ کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ مقام غور ہے کہ حسن، صحت، عمر، حکومت، علم اور دولت
کے اعتبار سے دنیا میں ایک کو دوسرے پر برتری حاصل ہے۔ کوئی حاکم ہے، کوئی محکوم، کوئی مالدار، کوئی فقیر، کوئی تندرست، کوئی بیمار، کوئی کفر و معصیت کے باوجود
خوش عیش و کامران ہے۔ کوئی ایمان و عمل صالح کے باوجود تنگ دست۔ بات یہ ہے کہ دنیا کی برتری معیارِ فضیلت نہیں۔ مومن کو دنیا میں خوش عیشی نصیب ہو جائے
تو بہتر ہے نہ میسر ہو تو باعث تکلیف نہیں۔ معیارِ فضیلت آخرت کی نجات ہے۔ دنیا کے مقابلے میں آخرت کو بدرجہا فضیلت حاصل ہے۔ آثار میں آتا ہے کہ ایک
مرتبہ فاروق اعظمؓ کے دروازے پر بہت سے لوگ حاضر ہو کر باریابی کے خواستگار ہوئے۔ سردارانِ قریش بھی تھے اور بعض مفلس مفلوک الحال مخلص مسلمان
بھی تھے۔ حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے حضرت بلالؓ و حضرت صہیبؓ کو داخلے کی اجازت دی۔ ابو سفیان کو ناگوار گزرا۔ سہیل بن عمرو بولے ناگواری کی کوئی
وجہ نہیں۔ ہم کو جو کچھ ملا انہی (صہیب و بلال) کے طفیل میں ملا۔ یہ لوگ داعی تھے اور ہم کو انہوں نے ہی (اسلام کی) دعوت دی تھی۔ ان کا مرتبہ بہرحال ہم
سے زائد ہے۔ گویا صہیب نے دنیوی برتری کو بے مقدار سمجھتے ہوئے فضیلت اُخروی کو معیار ترجیح قرار دیا اور حضرت عمرؓ کے پیش نظر بھی یہی بات تھی۔

مقصود بیان

خدا تعالیٰ کسی کی حق تلفی نہیں فرماتا۔ جو دنیا کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اس کو حسب مشیت عطا فرماتا ہے، مگر
طالب دنیا کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ انجام کار جہنم میں جائے گا۔ اس میں پر زور تنبیہ ہے ان دین فروش مسلمانوں
کو جو بظاہر مسلمان ہیں، مگر آخرت کو چھوڑ کر دنیا کے طالب بن گئے ہیں جن کے پیش نظر محض دنیوی عیش و کامرانی ہے۔ آیت مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ الخ صراحتہً
دلالت کر رہی ہے کہ صرف ارادہ اور نیت مفید نہیں جب تک ایمان خالص کے ساتھ صحیح طریقہ پر کوشش نہ کی جائے اخروی کامرانی نصیب نہیں ہو سکتی۔
ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہنا یا طریق رسول اللہؐ سے ہٹ کر ہندی یا ایرانی تصوف کے جال میں پھنس کر غلط طریقہ سے عبادت و ریاضت کرنا قطعاً
بے سود ہے۔ لفظ مَسْعِیًّا میں ہندوستان کے جاہل صوفیوں کے لئے درس عبرت ہے جنہوں نے شریعت و طریقت کو جدا جدا قرار دے کر رسول اللہؐ کے طریقہ
کے خلاف خانہ زاد طریقۂ تصوف جاری کر رکھا ہے۔ کہیں قوالیوں کے ترانوں کو معراج قرب سمجھا جاتا ہے کہیں قدم بوسی کو سرمایۂ آداب الشیخ قرار دیا گیا

ہے۔ کبھی بے محل سجدہ ریزیاں ہیں اور کبھی قبور مشائخ پر حال قربانیاں غرض چاروں طرف سے شعائر الٰہیہ کی گمراہیوں کی ایک ۔۔۔ غرض نظر ہی غلط ہی
ہے جو شریعت الٰہیہ کے چراغ کو بجھانا چاہتے ہیں۔ يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ الخ۔ آخری آیت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ مال و دولت
صحت و بیماری، حکومت و محکومی، قوت و ضعف کو تفاضلت اگرچہ دنیا میں عام ہے مگر یہ معیار برتری نہیں۔ معیار فضیلت صرف اُخروی سعادت ہے۔ یعنی
مومن مخلص اور متقی نیکوکار خواہ کسی قوم کا ہو، کیسا ہی مفلس و خستہ حال ہو کتنا ہی بیمار اور کمزور ہو اور کتنا ہی بدصورت و کریہ المنظر ہو اس کو ذلیل نہ سمجھنا
چاہیئے۔ خدا کے ہاں جو برتری و کرامت اس کو نصیب ہے وہ بڑے سے بڑے سرکش جبار بادشاہ کو حاصل نہیں۔ کاش وہ بے خبر کہ مسلمان اس قانون کو معیار
فضیلت قرار دے لیں اور اے کاش قرن اوّل کی طرح ایمان و عمل صالح کو کرامت و عزت کا ذریعہ سمجھ لیں اور تفوق کو ہیچ جاننے لگیں۔

ع ۳

لَا تَجْعَلْ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَخْذُولًا ۝ وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا

(اے مخاطب) اللہ کے ساتھ دوسرے کو معبود نہ قرار دے ورنہ بُرے حال بے بس ہو کر بیٹھ رہے گا اور تیرے رب نے حکم دے دیا ہے کہ

تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا

سوائے اس کے اور کسی کی پرستش نہ کرو اور ماں باپ سے اچھا سلوک کرو اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو

أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۝ وَاخْفِضْ

پہنچ جائیں تو اُن کو ہُوں بھی نہ کہو اور نہ اُن کو جھڑکو اور ان سے ادب کی بات کرو اور اُن کے

لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا ۝

سامنے شفقت سے عاجزی کے بازو بچھا دو اور کہو اے پروردگار جس طرح انہوں نے مجھے چھوٹے سے پالا تو بھی اُن پر مہربانی فرما

رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ ۚ إِنْ تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ

تمہارا رب تمہارے دلوں کی باتیں خوب جانتا ہے اگر تم نیک رہوگے تو وہ (اپنی طرف) رجوع کرنے والوں کو بخشنے

غَفُورًا ۝ وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ

والا ہے اور قرابت دار کو اُس کا حق دو اور محتاج و مسافر کو بھی دو اور بیہودہ بے موقع خرچ

تَبْذِيرًا ۝ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ

نہ کرو بیشک بے موقع اُڑانے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی

كَفُورًا ۝ وَإِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِنْ رَبِّكَ تَرْجُوهَا فَقُلْ لَهُمْ

ناشکرا ہے اور اگر تم اپنے رب کے فضل کے انتظار میں جس کی تم کو امید لگی اعراض بھی کرو تو اُن سے نرمی

قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۝ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ

کی بات کہہ دو اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے جکڑا ہوا نہ رکھو اور نہ اُس کو بالکل کھول دو ورنہ الزام

مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ۝

اُٹھا کر حسرت زدہ بیٹھ رہوگے تحقیق تمہارا رب جس کا چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے اور (جس کا چاہتا ہے) تنگ کرتا ہے بلاشبہ اپنے بندوں کو جانتا اور دیکھتا ہے

تفسیر سابق آیات میں آخرت کو مرکز نظر بنانے کی ترغیب دی تھی اور صراحت فرما دی تھی کہ طالب آخرت کے لئے شریعت الٰہیہ کے مطابق ایمان واخلاص کے ساتھ کوشش کرنی لازم ہے۔ یہاں سے عقائد واعمال کا وہ دستور العمل بیان کرنا چاہتا ہے جس پر کاربند ہو کر ہر شخص کو دوامی سعادت حاصل ہو سکتی ہے۔ دستور زندگی کی مختلف دفعات ہیں۔ بعض کا تعلق عقائد سے ہے، بعض کا افعال واقوال سے، بعض کا اللہ کی ذات وصفات سے اور بعض کا بندگان خدا کے ساتھ اچھا یا برا سلوک کرنے سے۔ پھر مخلوق میں کچھ اقارب ہیں کچھ غیر اقارب ہیں۔ بعض قریب ترین تعلق رکھنے والے ہیں اور بعض کا سلسلہ کسی قدر بعید ہے۔ غرض تفاوت کے درجہ کے اعتبار سے حقوق میں بھی تفاوت ہے۔ سب کی تفصیل یہاں سے خدا تعالیٰ فرمانا چاہتا ہے۔ ہم بھی تفسیری نوٹ کے ساتھ نمبروار تذکرہ کرتے ہیں۔

(۱) اللہ کی الوہیت وربوبیت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے یعنی اپنا حاجت روا خالق مربی اور مختار کل وجز سوائے خدا کے کسی کو نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف دوڑنے سے سوائے رسوائی اور ذلت کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ کوئی نفع وضرر کا مالک نہیں، اس لئے دوسروں کو کارساز سمجھنا بے سود ہے اور نہ صرف بے سود ہے بلکہ دنیا ودین میں حصول ذم کا باعث اور ذلت کا موجب۔ ابن کثیر نے بروایت عبد اللہ بن مسعود بیان کیا کہ حضور اقدس ؐ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے اپنے فاقہ کے انسداد کے لئے آدمیوں کی طرف رجوع کیا اس کے فاقے کا انسداد نہ ہوگا اور جس نے اللہ سے التجا کی تو اس کو تونگری حاصل ہو جاتی ہے خواہ فوراً یا بوقت مناسب پر۔ (رواہ احمد ابوداؤد والترمذی وقال حسن صحیح غریب) غرض اللہ کا یہ قطعی ناقابل نسخ وترمیم حکم ہے کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کی جائے۔

(۲) ایجاد وتربیت میں (ظاہر پر نظر کرتے ہوئے) چونکہ والدین کا درجہ سب مخلوق میں اوّل ہے، اس لئے ہر قسم کی نیکی اور حسن سلوک ماں باپ سے کیا جائے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو گئے ہوں تو ایسی حالت میں ان سے نہایت نرمی، شیرینی اور خوش خلقی کی گفتگو کی جائے زبان یا ہاتھ پاؤں سے ان کی شان میں کوئی بدتہذیبی اور سختی کا مظاہرہ نہ کیا جائے بلکہ ان کے سابقہ حقوق تربیت کو یاد کر کے ان کے لئے دعائے رحمت ومغفرت کی جائے۔ والدین اپنی اولاد کو انتہائی مہربانی وشفقت سے پرورش کرتے ہیں، اس کا تقاضہ ہے ان پر شفقت ومہربانی کی جائے۔ ہر طرح ان کی دستگیری اور امداد کی جائے اور فقط اس شفقت وخبرگیری پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ان کے لئے اللہ سے بھی دعائے رحمت کی جائے۔ والدین سے نیک برتاؤ کرنے کے متعلق بکثرت احادیث صحیحہ موجود ہیں۔ ہم مختصر طور پر چند فرمودات گرامی نقل کرتے ہیں۔

امام احمد ومسلم نے بروایت ابوہریرہ رضؓ بیان کیا کہ حضور اقدس ؐ نے ارشاد فرمایا ذلیل ہو، پھر ذلیل ہو وہ شخص جس نے ماں باپ کو یا دونوں میں ایک کو پایا اور پھر جنت میں داخل نہ ہوا (یعنی والدین کی اطاعت نہ کی)

ایک صحابی نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ؐ میں نے جہاد کا ارادہ کیا ہے۔ حضور ؐ کی خدمت میں مشورہ کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ ارشاد فرمایا کیا تیری ماں ہے؟ عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا اس کی خدمت اپنے اوپر لازم کر لے۔ جنت اس کے قدموں کے پاس ہے۔ پھر متفرق مجالس میں حضور ؐ نے دوبارہ سہ بارہ یہی ارشاد فرمایا۔ (رواہ النسائی وابن ماجہ)

ابوہریرہ رضؓ کی روایت ہے ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا تیری ماں۔ پھر تیری

ماں پھر تیرا باپ پھر تیرا باپ پھر درجہ بدرجہ جو تجھ سے زیادہ قرابت والا ہو (ذکرہ صاحب المعالم والسراج)

حضورؐ نے فرمایا رضائے الٰہی والدین کی رضامندی میں ہے اور اللہ کی ناراضگی والدین کی ناخوشی میں ہے۔ (رواہ الترمذی)

ابو درداء کی روایت ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا باپ جنت (میں داخل ہونے) کا درمیانی دروازہ ہے اب اس کی نگہداشت رکھ یا ضائع کر دے۔

اس سے آگے رَبُّكُمْ أَعْلَمُ الآیہ میں فرمایا ہے کہ خدا تعالیٰ تمہاری نیتوں اور ارادوں سے خوب واقف ہے۔ یعنی اگر والدین سے نیک برتاؤ کرنے کی تمہاری نیت ہوگی اور عمل میں نادانستہ کوتاہی ہو جائے گی تو خدا تعالیٰ اس کو معاف فرما دے گا۔ اللہ سے استغفار کروگے اور واقعی صلاح و نیکوکاری تمہارے اندر ہوگی تو اللہ بخش دے گا۔ اَوَّابِیْنَ کے مرادی معنی میں علمائے تفسیر کا اختلاف ہے۔ اوابین کے معنی ہیں اطاعت گزار اہل صلوٰۃ (قتادہ) اللہ کی پاکی بیان کرنے والے اور زوال پذیر نیکوکار (ابن عباسؓ) گناہوں سے توبہ کرنے والے اور دوبارہ مبتلا ہو جائیں تو پھر توبہ کرنے والے (سعید بن مسیب) نیکی کی طرف رجوع کرنے والے (عطاء بن یسار، سعید بن جبیر، مجاہد) خلوت میں اپنے گناہوں کو یاد کر کے استغفار کرنے والے، معصیت سے طاعت کی طرف اور مکروہات الٰہیہ سے مرضیات الٰہیہ کی طرف رجوع کرنے والے اوابین ہیں (ہکذا قال ابن جریر)

نوٹ:۔ یاد رہے کہ والدین کی اطاعت اگرچہ واجب ہے، لیکن اللہ کا حکم والدین کے حکم سے مقدم ہے۔ ارتکاب محرمات یا ترکِ واجبات کے متعلق والدین کا کوئی حکم قابلِ پذیرائی نہیں (علیہ الجمہور)

(۳) ماں اور باپ کی طرف سے جو اہل قرابت ہوں ان کو دیا جائے یعنی اقرباء کے حقوق ادا کئے جائیں۔ کنبہ پروری کی شکل میں ہوں یا محبت و ملاقات کی شکل میں۔ سب اہلِ قرابت بھی ایک طرح نہیں ہیں کسی کا حق مقدم ہے کسی کا مؤخر۔ جیسا جس کا رشتہ ہو ویسا ہی کم و بیش اس کے ساتھ مالی، زبانی، جسمانی اور موافقانہ ہمدردی کا سلوک کیا جائے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مال دار پر محتاج رشتہ داروں کا نفقہ واجب ہے۔ امام شافعی کے نزدیک صرف والدین کا نفقہ اولاد پر واجب ہے بشرطیکہ وہ ضرورت مند ہوں اور باقی رشتہ داروں کا نفقہ واجب نہیں ہے مستحب ہے۔

(۴) عام مسکین خواہ قرابت دار ہوں یا نہ ہوں مالی اور جسمانی اور زبانی ہمدردی کے مستحق ہیں۔ سب کو حسب ضرورت بقدر امکان دیا جائے۔ اگر اہلِ قرابت مسکین ہوں تو ان کا حق اور بھی مقدم ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ مسکین پر صدقہ کرنا ایک صدقہ ہے اور قرابت دار محتاج کو دینا کنبہ پروری بھی ہے اور صدقہ بھی۔

(۵) مسافروں کو دیا جائے وہ پردیسی غریب الوطن جو اہل و عیال اور اعزا و احباب سے دور ہوں ضرور ہمدردی کے مستحق ہیں۔ اترنے کو مناسب جگہ دینا، مہمانی کرنا، حسب ضرورت بقدر امکان لباس اور نقد رقم دینا، خوش خلقی سے پیش آنا واجب ہے۔ مسافر سے ضرورت مند پردیسی مراد ہے جو حالتِ سفر میں نادار ہو خواہ اس کے مکان پر کتنی ہی دولت موجود ہو۔ ابن ماجہ کی حدیث میں آیا ہے کہ سائل کا حق ہے کہ اگر وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے (وجہ یہ ہے کہ گھوڑا شاید اس کی سفری ضروریات میں سے ہو)

(۶) مال کو فضول برباد نہ کیا جائے۔ لغویات اور بیہودہ کاموں میں صرف نہ کیا جائے اور ضروری کاموں میں خرچ کرنے کے وقت بھی مقدارِ ضرورت اور اعتدال کو محفوظ رکھا جائے۔ کیونکہ مال کو فضول برباد کرنے والے شیطانوں کے ساتھی ان سے مشابہت رکھنے والے ہیں۔ بے ضرورت مکان بنانا، اسباب خریدنا، بیاہ شادی دعوت مہمانی میں اعتدال سے بڑھنا، ناچ رنگ، سینما، آتش بازی اور رسمیت کے سوئم، چہلم میں جھوٹی نمائش کے لئے روپیہ برباد کرنا سب تبذیر کے اقسام ہیں۔ ابن کثیر نے ابن مسعود ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ راہ حق کے خلاف مال خرچ کرنا تبذیر ہے۔ مجاہد نے کہا کہ اگر کوئی راہ حق میں اپنا مال خرچ کر دے تو وہ مبذر نہیں ہے اور اگر کسی نے سیر بھر گیہوں راہ حق کے خلاف خرچ کیں تو وہ مبذر ہے۔ قتادہ نے کہا اللہ کی نافرمانی میں مال خرچ کرنا تبذیر ہے۔ بعض علماء نے صراحت کی ہے کہ آیت مذکورہ میں کفار کے طریق صرف کی تردید ہے۔ عرب کا دستور تھا کہ لوٹ مار کر کے مال جمع کرتے تھے اور پھر جھوٹے فخر اور شیخی کے لئے اس کو خرچ کرتے تھے۔ خصوصاً مشرکین قریش تو لوگوں کو راہ حق سے روکنے اور اسلام کو کمزور کرنے اور اعدائے اسلام کو مدد دینے میں روپیہ برباد کرتے۔ ان سب کی تردید آیت مذکورہ میں فرمائی گئی۔

اس سے آگے ارشاد ہوتا ہے کہ اگر سائل کے سوال کے وقت کچھ موجود نہ ہو اور دل میں یہ خیال ہو کہ اگر خدا تعالیٰ مجھے مال عنایت فرمائے گا تو میں بھی سائل

کو دوں گا۔ ایسی حالت میں مناسب یہ ہے کہ سائل کو تسلی اور دعا دی جائے اور آمد مال پر دینے کا وعدہ کر لیا جائے (کذا قال مجاہد وعکرمہ وسعید بن جبیر حسن البصری وقتادہ وغیرہم)

اس حکم کا نزول چند نادار صحابہ کے متعلق ہوا۔ بلال، صہیب، سالم، مہجع اور خباب وغیرہ رضی اللہ عنہم حضور سے سوال کرتے۔ حضورؐ کے پاس جو کچھ موجود ہوتا ان کو دے دیا کرتے کبھی ایسا بھی اتفاق ہوتا کہ حضورؐ کے پاس جو کچھ موجود ہوتا ان کو دے دیا کرتے اور ان میں سے کوئی صاحب کسی چیز کے خواہاں ہوتے تو حضرت شرم کے سبب منہ پھیر لیتے اور خاموش ہو جاتے اس انتظار میں کچھ جواب نہ دیتے کہ کچھ آ جائے تو ان کو دے دوں۔ اس وقت اس آیت کا نزول ہوا۔ (کذا فی المعالم)

(۷) دینے کے وقت نہ اتنا ہاتھ روک لیا جائے کہ گویا گردن سے بندھا ہوا ہے دینے کے لئے پھیلتا ہی نہیں اور نہ بالکل پھیلا دیا جائے ورنہ اول صورت میں لوگ تیری بھلائی سے ناامید ہو کر ملامت کریں گے اور دوسری صورت میں تھک کر کمزور ہو کر بیٹھ رہے گا (کذا فسرہ ابن عباس والحسن وقتادہ وابن جریج وابن زید وغیرہم)

صاحب کشاف اور بیضاوی اور امام رازی نے ذکر کیا ہے کہ حضور اقدسؐ بہت زیادہ سخی تھے۔ ایک عورت نے جس کی سوکن ایک یہودن تھی یہ بات جتلانے کے لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ سے زیادہ سخی ہیں، اپنے لڑکے کو خدمت گرامیؐ میں بھیجا اور یہ درخواست کی کہ ایک کرتہ پہننے کیلئے مجھے عنایت فرما دیجئے۔ ماں کی عرض داشت بچہ نے خدمت گرامی میں پیش کی۔ حضورؐ کے پاس اس وقت سوائے اس کرتہ کے جو پہنے ہوئے تھے اور کرتہ نہ تھا مجبوراً فرما دیا پھر کسی وقت آنا۔ ماں نے بچہ کو دوبارہ بھیجا جسم مبارک سے ہی کا کرتہ دے دیجئے۔ حضورؐ کو سوال رد کرتے شرم آئی اور گھر میں داخل ہو کر قمیص مبارک اتار کر بھجوا دیا۔ جب نماز کا وقت آیا اور بلال نے اذان دی تو حضورؐ باہر تشریف نہ لائے۔ انتظار کے بعد صحابہ کو تشویش ہوئی اور جا کر دیکھا تو بدن مبارک عریاں پایا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ شیخ ولی الدین عراقی اور ابن حجر نے اس حدیث کی اسناد سے ناواقفیت ظاہر کی ہے صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا بخیل اور سخی کی مثال ایسی ہے جیسے دو شخص گردن سے سینے تک لوہے کی زرہ پہنے ہوئے۔ پس سخی جب خرچ کرنا چاہتا ہے تو وہ زرہ اتنی کشادہ ہو جاتی ہے کہ انگلیوں کے پور دُور تک ڈھانک لیتی ہے اور بخیل جب کچھ خرچ کرنا چاہتا ہے تو زرہ کی ہر کڑی اپنی جگہ ایسی چمٹ جاتی ہے کہ وہ اس کو کشادہ کرنا چاہتا ہے مگر وہ نہیں کھلتی۔ صحیحین میں مروی ہے کہ حضرت اسماء بنت صدیق اکبرؓ سے حضور اقدسؐ نے (دونوں ہاتھوں کا لپ بنا کر اشارہ کرتے ہوئے) اشارہ فرمایا اللہ نے مجھ سے فرما دیا ہے خرچ کرو تم کو دیا جائے گا۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے حضور اقدسؐ نے فرمایا ہر روز صبح کو آسمان سے دو فرشتے اترتے ہیں ایک کہتا ہے الٰہی خرچ کرنے والے کو اور دے دوسرا کہتا ہے بخیل کا مال تلف کر دے۔ صحیح مسلم میں بروایت ابوہریرہؓ مذکور ہے حضورؐ نے فرمایا صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا اور خرچ کرنے سے عزت میں اضافہ ہوتا ہے اور جو اللہ کے واسطے عاجزی کرتا ہے اللہ اس کو سربلند فرماتا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کی مرفوع روایت ہے لوگو بخل سے بچو اس نے گزشتہ قوموں کو ہلاک کر دیا۔ (شیطان نے) ان کو بخل کرنے کا حکم دیا تو انھوں نے بخل کیا۔ قطع رحم کا حکم دیا تو انھوں نے قطع رحم کیا۔ فسق و فجور کا ان کو حکم دیا تو انھوں نے گناہ کئے۔ امام احمد نے عبداللہ بن مسعودؓ کی مرفوع روایت بیان کی ہے کہ جو شخص خرچ کرنے میں درمیانی چال چلتا ہے وہ کبھی مفلس نہیں ہوتا۔

اس سے آگے خدا تعالیٰ کل مال نہ دینے کی علت بیان فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ جس کو چاہتا ہے تنگ دست بناتا ہے وہ اپنے بندوں کی حالت اور مصالح سے بخوبی واقف ہے (یعنی اگر تم اپنا مال سب کا سب بھی دے ڈالو گے تو کل ناداروں کی ناداری دور نہیں کر سکتے۔ غنی اور فقیر بہرحال قائم رہیں گے اور تم خواہ مخواہ محتاج ہو جاؤ گے اور دوسروں کے دست نگر بن کر خود تکلیف اٹھاؤ گے اور مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ

اور اپنی اولاد کو افلاس کے خوف سے قتل نہ کرو ہم تم کو اور ان کو رزق دیتے ہیں ان کا مار ڈالنا

خِطْاً كَبِيرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰىٓ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ وَلَا

بڑا جرم ہے اور زنا کے پاس بھی نہ جاؤ وہ بے حیائی ہے اور بُری بات ہے اور

تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا

جس شخص کے قتل کو اللہ نے حرام کر دیا ہے اس کو ناحق قتل نہ کرو جو شخص ظلماً مارا جائے اُس کے وارث کو ہم نے

لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّى الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا

قوت عطا کی ہے تو وہ قتل میں زیادتی نہ کرے بلاشبہ اس کی مدد کی جائے گی اور یتیم کے مال

مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ

کے پاس بھی نہ جاؤ، مگر اُسی طریقہ سے جو (اس کے لئے) بہتر ہو، یہاں تک کہ وہ جوانی کو پہنچ جائے اور وعدہ کو پورا کرو

اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ

بلاشبہ وعدہ کی باز پرس ہو گی اور جب ناپو پیمانہ بھر کر دو اور سیدھی ترازو سے

الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ

تولو یہ بہتر ہے اور اس کا انجام اچھا ہے اور جس بات کا تم کو علم نہ ہو اس کے درپے نہ

عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝ وَلَا

ہو یقیناً کان آنکھ اور دل سب سے پوچھ گچھ ہو گی اور

تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝

زمین میں اکڑ کر نہ چل کیونکہ تم ہرگز زمین کو نہیں پھاڑ سکتے اور نہ طول میں پہاڑوں کو پہنچ سکتے ہو

كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ

ان سب باتوں کی بُرائی تمہارے رب کے ہاں ناپسند ہے یہ باتیں منجملہ اس دانائی کے ہیں جو تمہارے پروردگار نے

الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝

تمہارے پاس بھیجی ہے اے مخاطب! اللہ کے ساتھ دوسرا معبود نہ مقرر کر ورنہ الزام اٹھا کر مردود ہو کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

تفسیر

(۸) عرب کے بعض قبائل میں دستور تھا کہ اپنی لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیتے تھے۔ اس کے دو سبب تھے۔ پہلا سبب تو ہمہ گیر افلاس تھا۔ عرب میں تجارت کے ذرائع محدود، زراعت کی کمی اور صنعت کا تقریباً فقدان تھا۔ عموماً مویشی کی پرورش یا غارت گری اور رہزنی وجہ معاش تھی اور ظاہر ہے کہ ان ذرائع معاش میں کیا وسعت ہو سکتی تھی، اس لئے کھانے پینے کی عموماً تکلیف رہتی تھی۔ نرینہ اولاد سے چونکہ غارت گری وغیرہ کی امید ہو سکتی تھی، اس لئے لڑکوں کی پرورش و کفالت تو عرب کے جاہل بخوشی گوارا کر لیتے تھے، مگر لڑکیاں اس کام کی نہیں ہو سکتی تھیں وہ تو محض گردن کا بار بنتی تھیں، اس لئے ان کی کفالت و پرورش کو ناقابل برداشت مصیبت جانتے تھے اور اس مصیبت کو دور کرنے کی انھوں نے صرف یہ تدبیر نکالی تھی کہ پیدا ہوتے ہی لڑکی کو قتل کر دیتے تھے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ عرب فطرتاً عادتاً نیز ماحول کے اعتبار سے جاہل تھے کسی کو داماد بنانا ملک کے لئے عار کا سبب تھا۔ خصوصاً افلاس کی حالت میں تو کوئی خاندانی وجاہت رکھنے والا ان کی طرف رُخ بھی نہ کرتا تھا۔ غریب کا داماد ہونا کوئی پسند نہیں کرتا۔ غیر کفو میں دینے سے ان کی آبرو ریزی ہوتی تھی۔ اس عار کو زائل کرنے کے لئے وہ لڑکیوں کو بھی مار ڈالتے تھے۔ قرآن پاک نے اس آیت میں اس فعل شنیع کی ممانعت فرمادی اور چونکہ اس فعل کے دو سبب تھے، اس لئے دونوں اسباب کا ازالہ فرمادیا۔ ایک کا بطور فہمائش اور دوسرے کا بطور تنبیہ۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ یعنی وہ تمہاری اولاد ہے، تمہارا خون ہے، تمہارا پارۂ جگر ہے۔ جزئیت، شفقت و ترحم کی مقتضی ہے۔ ایسی سنگ دلی کی علامت ہے۔ ایسی سنگ دلی مت اختیار کرو۔ نہ افلاس کا خوف تو تم خود اپنے رزاق نہیں ہو، اولاد کی کیا فکر کرتے ہو۔ اللہ تمہاری روزی کا بھی کفیل ہے اور تمہاری اولاد کے رزق کا بھی۔ یہ فکر تو خدا کو ہونی چاہئے۔ رزق رسانی تمہارے ذمہ نہیں ہے اور اگر بخوف عار قتل کرتے ہو تو یاد رکھو کہ قتل اولاد زبردست گناہ ہے۔ اس کا مواخذہ بہت سخت ہے۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضؓ کی روایت مذکور ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ سب سے بڑا کونسا گناہ ہے؟ فرمایا اللہ کا ہمسر قرار دینا با وجودیکہ اللہ ہی نے تجھے پیدا کیا ہے۔ میں نے عرض کیا اس کے بعد؟ فرمایا اولاد کو قتل کرنا اس کے خیال کے ماتحت وہ تیرے ساتھ رزق میں شریک ہو جائے گی۔ الخ

(۹) عرب میں زنا کی بہت کثرت تھی۔ اگرچہ زنا، زنا کے نام سے بکثرت نہ تھی مگر نکاح کی شکل میں زنا کی کثرت تھی۔ نکاح کی مختلف صورتیں تھیں اور مختلف نام تھے۔ نکاح بغایا، نکاح مقت، نکاح استبضاع وغیرہ۔ ان تمام صورتوں میں صرف ایک قسم (جس کا رواج آج کل بھی ہے یعنی زوجین کا ولیاء کا باہم معاملہ کرنے کے بعد اپنی اولاد یا رشتہ کا عقد کرا دینا) جائز نکاح کی تھی باقی تمام کی تمام زنا کی شاخیں تھیں۔ زنا سے چونکہ باہم عداوتیں، نزاع، جدال، اضاعت نسب اور اتلاف حقوق مرتب ہوتا ہے، اس لئے سختی کے ساتھ ممانعت فرمادی اور دواعی زنا کے پاس جانے کی باز داشت فرمادی۔

نامحرم عورتوں سے تخلیہ کرنا، ان سے جنسی مذاق کرنا، رسم ملاقات بڑھانا، لگاوٹ کی باتیں کرنا، عاشقانہ اشعار سنانا، نامحرم کو گھور گھور کر دیکھنا، ناچ رنگ کے جلسوں میں شرکت کرنا یہ سب دواعی زنا ہیں۔ ان میں سے کسی کے پاس تک جانا جائز نہیں۔ زنا میں دو خرابیاں ہیں۔ اخلاق کی خرابی جس کو لفظ فاحشہ سے تعبیر فرمایا اور نظام عالم کی بربادی جس کو سَآءَ سَبِیْلًا فرمایا۔ اگر زید عمرو کی بہو بیٹیوں پر نظر ڈالتا ہے تو لا محالہ کوئی اور اس کی بہو بیٹیوں کو تکے گا اور جب اس کو اپنے ناموس میں دوسرے کا مخل انداز ہونا گوارا نہیں تو دوسروں کے ناموس میں اس کا مخل انداز ہونا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔

امام احمد نے بروایت ابو امامہ باہلی صحابی ذکر کیا ہے کہ ایک نوجوان شخص نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ مجھے زنا کی اجازت دے دیجئے۔ حاضرین اس کی طرف متوجہ ہوئے اور جھڑکنے لگے۔ حضورؐ نے فرمایا میرے پاس آجاؤ۔ وہ شخص قریب پہنچ گیا۔ فرمایا بیٹھ جاؤ۔ وہ بیٹھ گیا۔ فرمایا کیا تم اپنی ماں کے واسطے اس فعل کو پسند کرتے ہو۔ عرض کیا ہرگز نہیں۔ فرمایا اسی طرح اور لوگ بھی اپنی ماؤں کے لئے اس کو گوارا نہیں کرتے۔ پھر فرمایا کیا تم اپنی بیٹی کے لئے اس کو پسند کرتے ہو۔ عرض کیا ہرگز نہیں۔ فرمایا اسی طرح اور لوگ بھی اپنی بیٹیوں کے حق میں اس کو پسند نہیں کرتے۔ پھر فرمایا کیا تم اپنی پھوپھیوں کے لئے اس کو پسند کرتے ہو۔ سائل نے انکار کیا۔ فرمایا اسی طرح اور لوگوں کی حالت ہے۔ پھر فرمایا کیا تم اپنی خالہ کے لئے یہ فعل اچھا سمجھتے ہو۔ سائل نے انکار کیا۔ پھر حضورؐ نے فرمایا دوسروں کی بھی یہی حالت ہے۔ اس کے بعد حضورؐ نے اس نوجوان پر دست مبارک رکھ کر دعا کی۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ ذَنْبَهٗ وَطَهِّرْ قَلْبَهٗ وَحَصِّنْ فَرْجَهٗ الٰہی اس کا گناہ معاف فرمادے اس کے دل کو پاک کر دے اور اس کی شرمگاہ کی حفاظت فرما۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد وہ نوجوان کسی طرف توجہ ہی نہیں کرتا تھا۔ (انتہیٰ ملخصاً)

ہیثم بن مالک صحابی کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا شرک کے بعد اللہ کے نزدیک کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کہ آدمی اپنا نطفہ ایسے رحم میں ڈالے جو اس کے

واسطے حلال نہیں۔

(۱۰) عرب میں قتل و غارت گری کا عمومی رواج تھا۔ اس کو اکثر لوگ نہ فقط مستحسن سمجھتے تھے بلکہ اس پر فخر کرتے تھے۔ بادۂ مستی سے سرشار ہو کر فخریہ قصیدے لکھتے تھے۔ عرب کی شاعری کا بیشتر حصہ اس جاہلانہ تفاخر سے بھرا پڑا ہے پھر ایک کے عوض ایک ہی کو قتل نہ کرتے تھے بلکہ قاتل کے خاندان اور اطراف دار حلیفوں کی جڑ بنیاد کھود ڈالتے تھے۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے ان دونوں ناشائستہ حرکتوں کی ممانعت فرما دی۔ ناحق قتل کرنا حرام قرار دیا۔ اولیاء مقتول کو (بشرط حکم عدالت) قاتل سے انتقام لینے کی اجازت دی اگر زیادتی کرنے سے منع فرما دیا۔ جان کا بدلہ جان جوازی قانون ہے، اگر طریق قتل کی الم انگیز اختراع یا اطراف داران قاتل کا قتل کسی طرح جائز نہیں حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا جو مسلمان اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا قائل ہے اس کا خون سوائے تین باتوں کے اور کسی طرح جائز نہیں۔ (۱) جان کے بدلے جان (۲) جورو والے مرد یا شوہر دار عورت کی زنا۔ (۳) دین کو چھوڑ دینا اور جماعت سے علیٰحدہ ہو جانا (صحیحین) صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جب دو مسلمان تلوار لے کر مقابلہ کرتے ہیں تو قاتل مقتول دونوں جہنمی ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ قاتل کا جہنمی ہونا تو خیر تھا۔ مقتول کا کیا قصور ہے۔ فرمایا وہ بھی اپنے مقابل کو قتل کرنے کا خواہشمند تھا۔ قتل کے مفصل احکام فقہ کی کتابوں میں پڑھو۔

اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا کا تفسیری مطلب دو طرح بیان کیا گیا ہے۔ اوّل تو یہ کہ اولیائے مقتول کو قصاص میں حد سے تجاوز نہ کرنا چاہئے کیوں کہ شرعاً ان کو نصرت دی گئی ہے۔ جماعت اسلام اور حاکم وقت ان کا طرف دار ہے۔ مقتول کا مواخذہ واجب ہے۔ پھر ان کو یہ بھی اختیار ہے کہ قصاص لیں یا خون بہا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ قاتل منصور ہے یعنی دستوری قصاص سے بڑھ کر اس پر زیادتی کرنی ناجائز ہے۔

(۱۱) عرب میں یتیموں کا مال اڑانے کا بھی رواج تھا۔ یتیم بچے جس کی زیر نگرانی رہتے وہ ان کے مال خوب خورد برد کرتا۔ اس آیت میں اس فعل کی پُرزور ممانعت فرما دی، لیکن یتیموں کی کفالت، ان کے مال کی نگرانی اور درستگی بھی لازم تھی اور اس کی تکمیل بغیر اس کے ہو نہیں سکتی تھی کہ یتیم کے مال میں کچھ حصہ جائز ضرورتوں میں بقدر ضرورت صرف کیا جائے، اس لئے فرما دیا اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ مال یتیم کو صرف کرنے کے دو طریقے ہی احسن ہو سکتے ہیں۔ (۱) یتیم کے مال میں بیٹھی کی تدبیر کرے۔ کسی سود مند تجارت میں اس کو لگا دے۔ خود اس کے روپے کا ردّ و بدل کرے، مگر محض ہمدردی کے لئے۔ خود کوئی اجرت نہ لے۔ یتیم اور اس کے مال کا سرپرست بقدر خدمت بشرط احتیاج یتیم کے مال میں سے لے لے اور یہ نیت رکھے کہ جب خدا تعالیٰ مجھے فراخ دستی دے گا تو میں صرف شدہ حصہ واپس کر دوں گا۔ اب اگر کبھی اس کو مرفہ الحالی نصیب ہو جائے تو یتیم کے مال کا صرف شدہ حصہ واپس کر دے اور فراخ دستی نہ میسر ہو تو کچھ مواخذہ نہیں، مگر اس میں اپنی احتیاج اور یتیم کی خدمت کا لحاظ ضروری ہے۔ یہ کسی طرح جائز نہیں کہ حق خدمت دس روپے ماہوار ہوتا ہے اور لے لے بیس روپے ماہوار۔

ایک بار حضور اقدسؐ نے انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی کو جوڑ کر دکھاتے ہوئے فرمایا میں اور یتیم کا نگراں اس طرح جنت میں متصل ہوں گے (بخاری) صحیح مسلم میں ہے کہ حضور اقدسؐ نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا تھا ابوذرؓ میں تم کو کمزور دیکھتا ہوں اور جو بات اپنے لئے پسند کرتا ہوں وہی تمہارے لئے پسند کرتا ہوں۔ تم دو آدمیوں کے درمیان حاکم مت بننا (یعنی حکومت مت قبول کرنا) اور یتیم کے مال کے متولی نہ ہونا۔

یتیم کے مال کی نگرانی اور اس کی سرپرستی اس وقت تک ضرور ہے جب تک وہ جوان ہو جائے اور شرعاً محجو التصرف نہ ہو۔

(۱۲) عہد کی پابندی کا عرب میں عام دستور تھا۔ مخالفات اور معاہدات کو بہت وزنی سمجھا جاتا تھا لیکن کبھی اتفاق سے عہد شکنی بھی کر جاتے تھے۔ عہد شکنی اور وعدہ خلافی کی ممانعت میں یہ آیت نازل ہوئی۔ عہد دو قسم کا ہوتا ہے۔ شریعت کے موافق عہد کی پابندی لازم ہے۔ بصورت خلاف ورزی قیامت کے دن باز پرس ہو گی اور شریعت کے خلاف عہد کرنے کی شکست ضروری ہے۔ کفارہ ادا کر دے۔ اگر عہد بقسم ہو اور اگر بغیر قسم کے ہو تو کفارہ بھی ضروری نہیں۔

(۱۳) ناپ تول میں کمی بیشی نہ کرنا اور ٹھیک ناپنا تولنا لازم ہے۔ کفار عرب اول تو تجارت پیشہ ہی بہت کم تھے اور تھے بھی تو بے ایمانی کرتے تھے۔ زیادہ لیتے کم دیتے، ڈنڈی مارتے۔ اس کی ممانعت اس آیت میں کر دی گئی اور فرما دیا کہ صحیح ناپنے تولنے سے بہتری حاصل ہوتی ہے اور اس کا انجام بھی اچھا ہے۔ یعنی آدمی کو دنیا میں بھی نیک نامی اور تجارتی فروغ اور مالی برکت حاصل ہوتی ہے اور آخرت میں بھی روسیاہی سے بچ جائے گا۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا جو شخص محض اللہ کے خوف سے اس حرام روزی کو چھوڑ دیتا ہے جس پر اس کو قابو حاصل ہو گیا تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض آخرت سے پہلے ہی دنیا میں وہ چیز دے دیتا ہے جو اس کے لئے بہتر ہوتی ہے۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ بازاروں میں غلاموں کو ناپ کرتے دیکھ کر حضورؐ نے فرمایا اے گروہ موالی تم نے اپنے ذمہ وہ کام لیا

ہے جس کے سبب اگلے لوگ ہلاک کیے گئے۔

(۱۴) علم یقینی کے حصول کے صرف تین ذرائع ہیں۔ آنکھوں سے دیکھنا، کانوں سے آواز سننا اور دماغ سے سمجھنا۔ ان ذرائع کے علاوہ حصول یقینی کا کوئی چوتھا درجہ نہیں۔ عام طور پر لوگ وہمیات خیالات اور قیاسات کے گرویدہ ہیں۔ تخیل و توہم پر یقین کر کے خود بھی تباہ ہوتے ہیں اور نظم عالم کو بھی تباہ کرتے ہیں اور اس کا نام ذکاوت حس اور دانشمندی رکھتے ہیں۔ حالاں کہ یہ سوائے دھوکہ اور مکاری کے کچھ نہیں ہوتا۔ آیت میں بن دیکھی، ان سنی اور نا سمجھی ہوئی بات کو کہنے اور اس کے پیچھے پڑنے سے ممانعت فرمائی گئی ہے۔ علمائے تفسیر نے **تَقْفُ** کے معنی مختلف طور پر کئے ہیں۔ علی بن ابی طلحہ نے ترجمہ کیا نہ کہو۔ قتادہ نے کہا جو بات سنی نہ ہو اس کے متعلق یہ نہ کہو کہ میں نے سنی اور جو بات دیکھی نہ ہو اس کی واقفیت کا اظہار نہ کرو۔ ابن عباس کا قول بروایت عوفی یہ ہے کہ کسی پر ایسی بات نہ جوڑو جس کا تجھے علم نہ ہو۔ محمد بن حنفیہ نے کہا جھوٹی گواہی مت دے۔ امام رازی نے آخری فیصلہ اس طرح کیا کہ آیت میں عام ضابطہ کا بیان ہے جس کے تحت تمام انواع مندرج ہیں۔ جیسے جھوٹی گواہی دینی وغیرہ۔ تفسیر سراج میں ہے اس چیز کی پیروی نہ کر جس کا تجھے علم نہ ہو۔

ایک شبہ آیت سے قیاس فقہی کی ممانعت ظاہر ہو رہی ہے۔ کیونکہ قیاس بالاجماع مفید یقین نہیں۔ اسی طرح احادیث آحاد بھی ظنی ہیں۔ پھر کس طرح قیاس اور خبر احاد پر عمل کیا جا سکتا ہے؟

ازالہ ہر قیاس ظنی نہیں۔ جس قیاس کی علت منصوص ہوتی ہے وہ قطعی ہوتا ہے۔ اخبار احاد پر اعتقادیات کی بنا نہیں نہ ان پر عمل کرنا واجب ہے بلکہ اسناد کے ظنی ہونے کا اعتبار کرتے ہوئے ان پر عمل بطور ظن غالب کرنا ضروری ہے۔ بعض علماء نے آیت کو مخصوص البعض قرار دیا ہے۔

(۱۵) عرب میں تعلیم و تہذیب کا فقدان تھا۔ جہالت اور بربریت کا دور تھا۔ اسی بنا پر جسمانی قوت، جتھے کی کثرت، خلوص نسب آبائی شرف مجد اور جاہلانہ شجاعت پر لوگ فخر کیا کرتے تھے۔ فخر کا مظاہرہ صرف زبانی ہی نہ ہوتا تھا بلکہ طور طریق اور چال ڈھال میں بھی اس کے آثار نمایاں ہوتے تھے۔ جس کو دیکھو بزعم خود شیر بنا پھرتا ہے اور اکڑتا چلتا ہے۔ اس خود پسندی اور اکڑفوں کو دور کرنے کا حکم اس آیت میں مدلل طور پر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ آدمی کیسا ہی اکڑ کر چلے اور کتنا ہی طاقتور ہو اللہ کی غیبی طاقت رکھنے والی کائنات پر غالب نہیں آ سکتا نہ زمین کو اپنے قدموں اور پاؤں سے پھاڑ کر اندر گھس سکتا ہے نہ تن کر چلنے سے پہاڑوں کی چوٹی پر چڑھ سکتا ہے۔ پھر اکڑ کر چلنے سے کیا فائدہ ہے۔

حدیث صحیح ہے کہ حضور اقدس صلعم نے ارشاد فرمایا جب میری امت والے اکڑ کر چلیں گے اور فارس و روم کے شہزادے ان کی خدمت کریں گے اس وقت اللہ شریروں کو نیکوں پر مسلط فرمائے گا۔ امام محی السنہ نے امام ترمذی کی اسناد سے بیان کیا ہے کہ حضور والا چلتے تو ایسے جھکتے ہوئے چلتے گویا کسی اونچائی سے اتر رہے ہیں۔ کل احکام میں مندرجۂ ذیل احکام بیان فرمائے۔ شرک مت کرو، اللہ ہی کی پرستش کرو، والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو، زبان یا ہاتھ پاؤں یا اشارت و کنایات سے کوئی بدتہذیبی یا دکھ پہنچانے کا کام مت کرو بلکہ انتہائی شفقت و نرمی کا برتاؤ ان سے کرو۔ ان کے لیے دعائے رحمت کرو۔ رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں کے حقوق ادا کرو۔ اگر کچھ دینے کو نہ ہو تو اہل حاجت کو نرم جواب دو۔ ترش روئی کا اظہار نہ کرو۔ نہ زیادہ کنجوسی کرو۔ نہ مال کو برباد کرو بلکہ میانہ روی اختیار کرو۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ ناحق کسی کی خوں ریزی نہ کرو۔ قصاص لینے کا ولیٔ مقتول کو حق ہے، مگر بقدر جرم زیادتی کرنے کا حق نہیں۔ عہد و پیمان کو پورا کرو۔ ناپ تول میں کمی بیشی نہ کرو۔ جس بات کا علم نہ ہو اس کو زبان سے مت نکالو اور خواہ مخواہ کے تجسس میں بھی مت پڑو۔ اترا کر مت چلو۔ یہ ہیں فلسفۂ معاشرت و مدنیت و اخلاق کے زریں اصول جن کا سنگ بنیاد اقرار توحید ہے۔

نوٹ! ان تمام آیات میں خطاب رسول پاک صلعم کو ہے، مگر روئے خطاب افراد امت کی طرف ہے۔ کیوں کہ حضور والا تو ان افعال شنیعہ سے پاک تھے۔ حضور والا کو خطاب کرنے میں یہ رمز ہے کہ خدا تعالیٰ کو ان جرائم سے اتنی نفرت ہے کہ اگر یہ افعال رسول سے بھی سرزد ہوں تب بھی مذموم ہیں۔ رسول پاک کی جلالت شان و عظمت مرتبہ بھی ان کو مستحسن نہیں بنا سکتی دوسروں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

مقصود بیان جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو پکارتے ہیں ان کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ اللہ کے سوا کوئی کارساز نہیں۔ تربیت و پرورش بہت بڑا احسان ہے اسی نے والدین کو مستحق اکرام و احسان کر دیا۔ گویا ضمنی طور پر اس طرف اشارہ ہے کہ اگر والدین کے علاوہ کوئی اور پرورش کرے تو اس سے بھی اچھا برتاؤ کرنا ضروری ہے۔ اس جانب بھی لطیف ایما ہے کہ کمزوروں پر زیادتی کرنی اصحاب دانش کا شیوہ نہیں۔ آدمی کا وقت ایک طرح

نہیں رہتا کبھی اولاد ماں باپ کی دست نگر ہوتی ہے تو کبھی والدین اولاد کی مدد کے محتاج ہوتے ہیں آیت رَبُّكُمْ أَعْلَمُ الخ بتا رہی ہے کہ ماں باپ سے ظاہری اور نمائشی کا برتاؤ نہ کرنا چاہیئے بلکہ دل سے ان کی ہمدردی اور خدمت کرنی چاہیئے۔ راہِ خیر میں بخل کرنا اور اسراف کرنا دونوں ممنوع ہیں۔ مال کو برباد کرنا سخت جرم ہے۔ سائل سے نرم گفتگو کرنی ضروری ہے۔ دنیا میں معاش کی تنگی و وسعت کا تفاوت بمصلحت الٰہی ہے۔ اعتدال ناممکن ہے۔ اولیاء مقتول تعدی نہیں کر سکتے۔ صرف سادہ طور پر اصل قاتل سے قصاص لینے کا ان کو حق ہے۔ یتیموں کی سرپرستی اس وقت تک رکھی جائے جب تک وہ سن بلوغ کو پہنچ جائیں اور اپنے مال میں صحیح تصرف کرنے کی ان میں سمجھ پیدا ہو جائے۔ ایفاء وعدہ ضروری چیز ہے۔ علم الیقین کے حصول کے صرف تین ذرائع ہیں۔ آنکھ کان اور عقل ان کے علاوہ توہم ہے جو واجب الترک ہے وغیرہ۔

أَفَأَصْفَاكُمْ رَبُّكُم بِالْبَنِينَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِنَاثًا ۚ إِنَّكُمْ لَتَقُولُونَ قَوْلًا

(مشرکو) کیا تمہارے پروردگار نے تم کو بیٹوں کے لئے خاص کر دیا اور خود (اپنے لئے) فرشتوں میں سے بیٹیاں بنالیں تم بڑی سخت بات کہتے

عَظِيمًا ۞ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِيَذَّكَّرُوا وَمَا يَزِيدُهُمْ إِلَّا نُفُورًا ۞

ع ۴

ہو ہم نے اس قرآن میں ہر طرح سے سمجھایا تاکہ وہ نصیحت قبول کریں مگر اُن کی نفرت ہی بڑھتی ہے

قُل لَّوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَّابْتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا ۞

کہہ دو کہ اگر اللہ کے ساتھ چند معبود ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو وہ مالک عرش تک (مخالفت کی) راہ ڈھونڈ نکالتے

سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا ۞ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالْأَرْضُ

وہ پاک ہے اور ان کی باتوں سے بہت بالاتر ہے ساتوں آسمان اور زمین اور جو کوئی اُن میں ہے

وَمَن فِيهِنَّ ۚ وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ ۗ

اُن کی پاکی بیان کرتا ہے اور کوئی چیز نہیں کہ اُس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو مگر تم اُن کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو

إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ۞

بیشک اللہ بُردبار اور غفور ہے

تفسیر شریعتِ قرآنیہ کا سنگِ بنیاد توحید ہے۔ تمام عبادات، اعمال، اخلاق توحید ہی کی شاخیں ہیں۔ گزشتہ آیات کے آغاز و اختتام پر توحید کا اعلان فرمایا تھا۔ ان آیات میں گزشتہ اثبات تین طور پر فرمایا۔ مشرکین کے تین گروہ تھے۔ ایک بے وقوف جاہل، نظر و فکر کی قوتوں سے محروم۔ دوسرا اصلی نظر رکھنے والا، وہمیات کو عقلیات سمجھنے والا اور تیسرا کسی قدر گہری نظر رکھنے والا فلسفۂ طبیعات و مادیات کا دعویٰ کرنے والا اور اپنی عقلوں کو حقیقت طلب اور روشن ادراک کا مالک سمجھنے والا۔ اول گروہ کا عقیدہ تھا کہ تمام ملائکہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اس کی معاون اور شریک الوہیت ہیں۔ اس لئے ان کی پرستش اللہ کی خوشنودی کا سبب ہے۔ دوسرے گروہ کا عقیدہ تھا کہ بہت سے غیبی معبود اللہ کے ساتھ الوہیت میں شریک ہیں۔ عناصر اربعہ کے دیوتا الگ الگ ہیں۔ سورج بھی دیوتا ہے چاند بھی دیوتا ہے عزیٰ ہزار شقیٰ دیوتا ہیں۔ زہرہ، مشتری، لات عزیٰ، مناۃ وغیرہ یہ سب دیویاں ہیں اور سب قابل پرستش۔ کسی کی مورتی اس گروہ نے فرضی طور پر بنالی

تھی اور کسی کی غائبانہ پرستش کرتے تھے ۔ تیسرا گروہ کہتا تھا کہ انتظام عالم خود آباد ہے۔ خود آورد نہیں ۔ ترتیب ارتقائی ہمیشہ سے چلی آئی ہے اور ہمیشہ چلتی رہے گی۔ چھوٹی قوت بڑی قوت کو مغلوب کر لیتی ہے ۔ تنازع البقا کا سلسلہ جاری ہے۔ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو کھا لیتی ہے ۔ چھوٹی سبزیوں کو دبا کر مٹا کر فنا کر کے طاقتور درخت ابھر آتا ہے ۔ سبزی کو جانور کھاتا ہے جانور کو انسان اپنی غذا بنا لیتا ہے پھر انسان کی قوت کمزور ہو جاتی ہے ، اعضاء فرسودہ ہو جاتے ہیں اور خارجی اور داخلی جراثیم اپنی اجتماعی قوت سے اس کو فنا کر دیتے ہیں ۔ خدا کی ہستی ایک وہم ہے ، وحدت و کثرت دماغ کی اختراع ہے ۔ کیسا خدا کہاں کا خدا یہ سلسلۂ انواع قدیم ہے ۔ قدیم کو کسی کی کیا ضرورت وغیرہ وغیرہ ۔ یہ وہی خرافات ہیں فلسفہ وحکمت گروہ کا عقیدہ تھا اور اب بھی ہے ۔ آیات مذکورہ میں خدا تعالیٰ نے ان تینوں گروہوں کے عقائد کی حسب درجہ تردید فرمائی ہے ۔

اول الذکر کے متعلق فرمایا تم کو خدا نے بیٹے دیے اور اپنے لئے بیٹیاں پسند کیں ۔ یہ کہاں کی دانشمندی ہے ۔ محض بہتان اور افترا نہیں تو کیا ہے یعنی ہر مادہ علم وجسم کے اعتبار سے بہ نسبت نر کے کمزور ہوتی ہے اور ہر اولاد اپنے والد کی جانشین ہوتی ہے تاکہ سلسلۂ نوعی ختم نہ ہو جائے تو غور کرنے کا مقام ۔ ہم کہ خدا محتاج نہیں اس کو کسی کی مدد کی کیا ضرورت ۔ پھر بفرض محال اگر وہ اپنے لئے اولاد کو پسند کرتا بھی تو نرینہ اولاد کو پسند کرتا ۔ مادین سے اس کو کیا فائدہ ۔ انسان تو اپنے لئے لڑکوں کو پسند کرے اور خدا کی بیٹیاں ہوں یہ تنقیص در تنقیص ہے ۔ قرآن تو نہایت وضاحت کے ساتھ کھول کھول کر بیان کرتا ہے ، مگر کافروں کی نفرت میں مزید اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے ۔ آفتاب کی روشنی اور ابر رحمت کے فیضان سے گھورے سے مزید عفونت پھیلتی ہے ۔

متوسط گروہ کے عقیدے کی تردید کے لئے فرمایا کہ اگر اللہ کے شریک اور بھی چند خدا ہوتے تو ظاہر ہے کہ خدا سے ان کی ان بن ہوتی اور وہ مقابلہ کے لئے اس عرش تک چڑھ جاتے جو صاحب العرش ہے ۔ یعنی اگر دو خدا ہوتے تو دونوں کا باہم اتفاق تو ممکن ہی نہ تھا کیونکہ دوسرے سے اتفاق واتحاد وہی کرتا ہے جو محتاج ہوتا ہے ۔ اتفاق علامت احتیاج ہے اور احتیاج خدائی کے منافی ہے ۔ لامحالہ دونوں میں ان بن ہوتی ۔ ہر ایک کو نفع نقصان پہنچانے کی قدرت ہوتی اور ہر ایک اپنی مرضی میں مختار ہوتا ایک کی مرضی دوسرے کی مرضی کے موافق کبھی نہ ہو سکتی ۔ نظم عالم درہم برہم ہو جاتا اور رفتار دنیا منقلب ہو جاتی ۔ بالآخر پھر بھی ایک ہی رہتا جو صاحب العرش ہوتا یعنی سب سے بڑی قدرت اس کو ہوتی ۔ نظام عالم کی درستگی اور کائنات کے سلسلے کی ہمواری بتا رہی ہے کہ دو خدا کا ہونا محال ہے ۔

مؤخر الذکر گروہ کے دہریات کے ازالہ کے لئے فرماتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز اللہ کی پاکی بیان کرتی ہے ۔ یعنی کائنات سماوی وموجودات ارضی میں سے ہر چیز ایک خاص نظم رکھتی ہے اور ایک خاص قانون انتظام پر چل رہی ہے ۔ اس ضابطۂ قدرت پر چلنا ہی اللہ کی پاکی بیان کرنا ہے ۔ مثلاً سب سے نیچے کے درجہ میں عناصر ہیں ۔ عناصر کے اندر تخلیقی قوت موجود ہے ۔ باوجود اتحاد مادہ کی سب کی قوت جدا جدا ہے ۔ نوعیت ، کیفیت ، مقدار اور صورت و خاصیت میں کھلا ہوا امتیاز ہے ۔ جب تک ہوا ہوا رہے گی اپنی خاصیت ، صورت ، کیفیت اور نوعیت نہیں چھوڑ سکتی ۔ جب ہوائیت چھوڑ دے گی مائیت یا ناریت میں تبدیلی ہو جائے گی تو خواص میں بھی تبادل ہو جائے گا ، لیکن باایں ہمہ عنصری طاقت سے کوئی بھی آگے نہیں بڑھ سکتا ۔ پھر انہی عناصر کی ترکیب اول یا ثانی یا ثالث وغیرہ سے ابتدائی جمادات کی تخلیق ہوتی ہے ۔ مثلاً چونہ بنتا ہے ، چونہ کے اجزاء کو جوڑ کر استوار رکھنے والی قوت چونہ میں موجود ہے ، مگر کمزور ہے ۔ ذرا پانی میں ڈالا اور اجزاء منتشر ہو گئے ۔ لیکن جب یہ قوت زیادہ قوی ہو جاتی ہے تو مختلف پتھروں کی شکل میں مظاہرہ کرتی ہے ۔ پتھر کے اندر ترکیب اجزاء کو محفوظ رکھنے والی قوت اتنی قوی ہے کہ اس کے اجزاء کو منتشر کرنے کے لئے تحلیل کیمیاوی کی ضرورت پڑتی ہے ، لیکن پتھر بھی اپنی خاص حد پر رکا ہوا ہے ۔ ممکن نہیں کہ حجریت کے دائرہ سے آگے بڑھ جائے اور نباتات کی حد میں داخل ہو جائے ۔ جمادات سے اوپر نباتات کا ابتدائی درجہ ہے ۔ مثلاً کھمبی کا پودہ ہے جس کے اندر قوت حافظ ترکیب بھی موجود ہے اور ساتھ ہی ساتھ قوت نمو بھی ہے ، مگر بہت کمزور پھر نباتات کی درجہ بدرجہ حسب مراتب ترقی ہو کر انتہائی درجہ آتا ہے جہاں قوت نمو اس حد تک نظر آتی ہے کہ گویا اس میں حس موجود ہے ۔ مثلاً کدو یا چھوئی موئی کا درخت ہے جس کے اندر احساس موجود ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے ، لیکن یاد رکھو کہ سلسلۂ نباتات اپنی ابتدائی اور انتہائی حدوں کے اندر گھرا ہوا ہے نہ زیادہ نیچے اتر کر جمادی حد میں داخل ہو سکتا ہے نہ زیادہ اوپر آ کر حیوانی دائرہ کے اندر اس کا دخل ممکن ہے ۔ اس سے اوپر کائنات حیوانی کا آغاز ہوتا ہے ۔ خراطین کی شکل میں سب سے پہلا جاندار نظر آتا ہے جس کے اندر قوت حافظ ترکیب موجود ہے ، قوت نمو بھی ہے اور کسی حد تک حس بھی ہے ۔ پھر اس سے آگے قوت بہ نوبت ارتقاء کرتے ہوئے حیوانات کی اعلیٰ چوٹی نظر آتی ہے جس کی مثال کے لئے بندر ، بجو یا بن مانس کو پیش کیا جا سکتا ہے ان جانوروں میں اس قدر تیز حس ہوتی ہے کہ ذہنی انسان ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے ، لیکن

یاد رکھو کہ ان میں سے کوئی بھی اپنی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پھر انسان کا مرتبہ آتا ہے جس کو تمام جمادی نباتی اور حیوانی کمالات ملے ہیں اور ان کے ساتھ ہی نفس ناطقہ یا عقل جزئی بھی موجود ہے جو معارف وعلوم حاصل کرتی ہے۔ یہاں پہنچ کر مادیت کی حد ختم ہو جاتی ہے اور اس سے او پر وہ کائنات ہے جس کی تخلیق نور مجرد سے ہوئی ہے پس ابتدائی عناصر سے لے کر نور مجرد تک سب ایک قانون، ایک ضابطہ اور ایک قاعدہ کے تحت عمل کر رہے ہیں۔ ممکن نہیں کہ دوسری نوع یا دوسری جنس کے حقوق پر دست درازی کر سکیں۔ ان کی فطرت حدود فطرت اور ضابطۂ فطرت چلا چلا کر عملی طور پر شہادت دے رہی ہے کہ اس ضابطہ کو جاری کرنے والا ایک قانون میں مختلف انواع و اجناس کو منسلک کرنے والا وحدہٗ لاشریک ہے اور ہر حمد کا مستحق ہے، تمام نقائص وعیوب سے پاک ہے، اس کی کوئی ہیئت نہیں، صورت نہیں، مقدار نہیں، مکان نہیں، کیفیت نہیں، رنگ نہیں، بو نہیں محیط کل ہے، قادر مطلق ہے، خلاق کائنات ہے، ربوبیت والوہیت میں یگانہ و بے ہمتا ہے، مگر اس کی وحدت عددی نہیں۔ سلسلۂ حساب سے بالاتر ہے۔ یہ ہے تسبیح کائنات کی اصلی مراد جس کے متعلق فرمایا کہ ان کی تسبیح تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ورنہ ہر چیز خداتعالیٰ کی پاکی بیان کرتی ہے۔ ہمارے نزدیک تسبیح سے جو مراد تھی وہ ہم لکھ چکے اب دوسروں کے چند اقوال نقل کرتے ہیں۔

تفسیر معالم میں محی السنہ نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ہر زندہ چیز تسبیح پڑھتی ہے (یعنی جو چیز زندہ نہیں وہ تسبیح نہیں پڑھتی) لیکن یاد رہے کہ ہر چیز زندہ ہے، اس لئے ہر چیز خدا کی پاکی بیان کرتی ہے۔ غالباً ابن عباس کی یہی مراد ہے۔ قتادہ نے کہا ہر چیز سے حیوانات ونباتات مراد ہیں۔ عکرمہ نے کہا درخت تسبیح کرتا ہے اور ستون تسبیح نہیں کرتا۔ مقدام بن معدیکرب کا قول ہے کہ خاک تسبیح پڑھتی ہے جب تک بھگوئی نہ جائے اور پتیاں تسبیح پڑھتی ہیں جب تک درخت پر لگی ہوں اور کپڑا تسبیح پڑھتا ہے جب تک نیا ہو میلا ہو کر تسبیح چھوڑ دیتا ہے۔ ابراہیم نخعی کا قول ہے کہ ہر چیز خواہ جاندار ہو یا بے جان اللہ کی تسبیح پڑھتی ہے۔ یہاں تک کہ دروازے کے کیواڑ اور چھت کی کڑیاں بھی۔ یہی قول مجاہد کا ہے۔ ابراہیم نخعی اور مجاہد کے قول کے علاوہ تمام اقوال ظاہر آیت کے خلاف ہیں۔ آیت میں جان دار، بے جان، سبز، خشک، رواں، غیر رواں اور صاف و میلے کی تفصیل و تخصیص نہیں ہے۔ یہ صرف قیاسی تخصیص ہے جو کسی طرح جائز نہیں۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ اللہ کی پاکی اور حمد تو ہر چیز بیان کرتی ہے، مگر ذی روح کی تسبیح مقالی اور غیر ذی روح کی تسبیح حالی ہوتی ہے۔ غیر ذی روح کی تسبیح (بغیر کسی خاص معجزہ یا کرامت کے) عادۃً لوگ نہیں سمجھتے۔ حضرت داؤد کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کا تسبیح پڑھنا یا حضور اقدس ﷺ کے دست مبارک میں کنکریوں کا سبحان اللہ کہنا یا حضورؐ کے سامنے کھانے کا حمد الٰہی بیان کرنا محض معجزہ تھا جس میں عمومی عادت کو قطعاً دخل نہیں۔

مقصود بیان شرک کی پُر زور تردید۔ الزامی اور برہانی دلائل کا بیان۔ اس امر کی صراحت کہ ہر چیز اللہ کی پاکی اور حمد بیان کرتی ہے، مگر انسان اس کی تسبیح نہیں سمجھتا۔ اس بات کی تفصیل کہ مشرک کو دنیا ہی میں تباہ وہلاک کر دیا جائے، مگر اللہ کا حلم اس سے مانع آتا ہے وغیرہ۔

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا

(اے محمدؐ) جب تم قرآن پڑھتے ہو تو تمہارے اور اُن لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں ہم ایک پوشیدہ پردہ ڈال

مَّسْتُوْرًا ۝ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِذَا

دیتے ہیں اور اُن کے دلوں پر قرآن کے سمجھنے سے پردے ڈال دیتے ہیں اور کانوں میں گرانی کر دیتے ہیں اور جب

ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۝ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا

قرآن میں تم اپنے یگانہ پروردگار کا ذکر کرتے ہو تو یہ لوگ نفرت کرتے ہوئے پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہیں ہم خوب جانتے ہیں جس

يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ

نیت سے وہ سنتے ہیں جس وقت وہ تمہاری طرف کان لگاتے ہیں اور جب وہ باہم سرگوشیاں کرتے ہیں اور جب ظالم کہتے ہیں کہ تم تو صرف ایک

الربع

اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا ۞ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ ضَرَبُوۡا لَكَ الۡاَمۡثَالَ فَضَلُّوۡا فَلَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ سَبِيۡلًا

سحر زدہ شخص کے کہنے پر چلتے ہو۔ دیکھو تمہارے لئے یہ کیسی مثالیں بیان کرتے ہیں۔ یہ لوگ گمراہ ہو گئے۔ اب رستہ نہیں پا سکتے۔

تفسیر

آیاتِ مذکورہ کا سبب نزول نَحۡنُ اَعۡلَمُ تک علیحدہ ہے اور نَحۡنُ اَعۡلَمُ سے سَبِیۡلًا تک جدا ہے، اس لئے ہم بھی دو حصے کر کے جدا جدا شانِ نزول بیان کر کے تفسیری مطلب لکھتے ہیں۔

حافظ ابو یعلیٰ موصلی نے بروایت اسماء بنت صدیق اکبرؓ بیان کیا کہ جب سورۃ تَبَّتۡ يَدَاۤ نازل ہو گئی تو ابو لہب کی بیوی ام جمیل جو کانی بھی تھی بڑبڑاتی ہوئی آئی اور کہنے لگی مذمم (یعنی محمد) ہمارے پاس آیا۔ ہم نے اس کا دین نکال پھینکا اور اس کی بات نہ مانی۔ اس جگہ حضور اقدس ﷺ بھی تشریف فرما تھے اور حضور ﷺ کے یارِ غار حضرت ابو بکرؓ بھی موجود تھے۔ صدیق اکبرؓ نے کہا یا رسول اللہ! یہ مُردار آ رہی ہے کہیں آپ کو نہ دیکھ پائے (اس وقت ام جمیل کے ہاتھ میں پتھر تھا، صدیق اکبرؓ کو خطرہ ہوا کہ کہیں گستاخی کر کے پتھر نہ پھینک مارے) حضور ﷺ نے فرمایا مجھے یہ نہ دیکھ سکے گی۔ اُس وقت حضور ﷺ نے یہ آیت حِجَابًا مَّسۡتُوۡرًا تک پڑھی اور کچھ بھی پڑھا۔ ام جمیل آئی، مگر حضور والا ﷺ کو نہ دیکھ سکی۔ صدیق اکبرؓ سے بولی ابو بکر! مجھے اطلاع ملی ہے کہ تمہارے ساتھی نے میری ہجو کی ہے۔ صدیق اکبرؓ نے کہا واللہ وہ شاعر نہیں ہیں کہ تیری ہجو کی ہو۔ ام جمیل یہ الفاظ کہتی ہوئی واپس چلی گئی کہ قریش کا قبیلہ جانتا ہے میں اُن کے سردار کی بیٹی ہوں۔ امام سیوطی نے فرمایا کہ آیت کا نزول ہر ایسے شخص کے حق میں ہے جس نے حضور اقدس ﷺ سے فریب کرنے کا ارادہ کیا ہو۔ گویا سیوطی کے نزدیک مورد خاص نہیں ہے۔ مورد کی خصوصیت حکم کے عموم سے انکار نہیں کرتی۔

شانِ نزول کا لحاظ کرتے ہوئے آیات کا مطلب بالکل واضح ہے، لیکن اکثر علمائے تفسیر کے نزدیک چونکہ سببِ نزول کی تعیین نہیں کی جا سکتی، اس لئے آیت کے حقیقی معنی اور ہیں۔ کفار کی آنکھیں بھی تھیں، کان بھی تھے، دل و دماغ بھی وہ رکھتے تھے، آنکھوں سے دیکھتے، کانوں سے سنتے اور دل سے سمجھتے بھی تھے، مگر اُن کی بصیرت کی آنکھیں اندھی تھیں، گوشِ ہوش بہرے تھے اور دل کی روشنی معدوم تھی۔ حقیقت ان کو نظر نہ آتی تھی، حقانیت کی آواز سنائی نہ دیتی تھی، صداقت کی بات نہ سمجھتے تھے، غور و فکر کی قوتیں مردہ ہو چکی تھیں، دلوں پر پردے پڑ چکے تھے، مگر ظاہری آنکھوں سے دیکھنے والوں کو وہ پردے نظر نہ آتے تھے۔ حقیقت شناس نظریں ان کو دیکھ سکتی تھیں۔ حضور اقدس ﷺ جب قرآن پاک کی آیات تلاوت فرماتے تو آیات کی صداقت کا ان کو یقین نہ آتا۔ مسائلِ شریعت کی حقانیت اُن کی سمجھ میں نہ آتی اور توحیدِ الٰہی کا اعلان سن کر پیٹھ پھیر کر بھاگتے اور نفرت کا اظہار کرتے۔ آخرت پر ان کا پہلے سے ایمان نہ تھا، اس لئے کیفیتِ آخرت کا بیان ان کو مذاق معلوم ہوتا۔ سچ ہے انسان پر جب گمراہی اور بدبختی سوار ہو جاتی ہے تو اس کے حواس ماؤف ہو جاتے ہیں، دل و دماغ درست نہیں رہتا، عقل سے سمجھنے کی طاقت زائل ہو جاتی ہے اور کھلا ہوا پیامِ حق بھی وہ سمجھنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ اس کی گمراہی اس کے حواس اور قلب کے لئے حجاب ہو جاتی ہے۔

اس سے آگے نَحۡنُ اَعۡلَمُ الخ کی شانِ نزول محمد بن اسحاق نے کتاب سیرت میں بروایت محمد بن مسلم بن شہاب زہری اس طرح لکھی ہے کہ حضور والا ﷺ رات کو قرآن پاک کاشانۂ نبوت کے اندر پڑھا کرتے تھے چونکہ قرآن کی بلاغت و حلاوت کا تو کفار بھی انکار نہ کر سکتے تھے اور احکام سے قطع نظر کرتے ہوئے بندشِ کلام اور حلاوتِ عبادت کی طرف مشرکوں کے دل بھی کھنچتے تھے، اس لئے ایک رات ابو سفیان اور ابو جہل اور اخنس جدا جدا گھر سے نکلے تا کہ کسی مخفی مقام پر بیٹھ کر قرآن سن سکیں۔ ہر شخص خفیہ نکلا تھا۔ کسی کو دوسرے کا علم نہ تھا۔ مختلف مقامات پر چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب تلاوت ختم ہوئی تو واپس چلے گئے۔ صبح کو جب باہم ملاقات ہوئی تو ایک نے دوسرے سے کیفیتِ شب ظاہر کی چونکہ مجرم سب تھے، اس لئے کسی دوسرے کو ملامت تو نہ کی، مگر باہم مل کر یہ عہد کیا کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا کہیں کسی بے وقوف نے دیکھ پایا تو اس کو اسلام کی طرف مزید میلانِ خاطر پیدا ہو گا، لیکن جب دوسری رات آئی تو کوئی شخص اپنی جگہ صبر نہ کر سکا ہر ایک گھر سے نکل کھڑا ہوا، مخفی مقامات میں بیٹھ کر رات بھر قرآن سنا۔ صبح ہوئی اور باہم اطلاع ملی تو پیمانِ دوشنبہ کی طرح مزید وعدہ کیا کہ اب ایسا نہ کریں گے، لیکن تیسری شب کو بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ صبح کو اخنس اپنی لاٹھی لے کر پہلے ابو سفیان کے پاس پہنچا اور بولا ابو حنظلہ تم نے محمد ﷺ سے قرآن سنا مجھے اس کے متعلق اپنی رائے بتا دو۔ ابو سفیان نے کہا ابو ثعلبہ واللہ میں نے بہت سی باتیں سنی ہیں کچھ باتیں تو میں سمجھ گیا معنی بھی سمجھا اور مراد بھی، مگر کچھ باتوں کے نہ معنی سمجھ میں آئے اور

نہ مراد جان سکا۔ اخنس نے کہا ابو حنظلہ میری بھی یہی حالت ہے۔ یہاں سے چل کر اخنس ابوجہل کے پاس پہنچا اور جو سوال ابو سفیان سے کیا تھا وہی ابوجہل سے کیا۔ ابوجہل نے کہا جو کلام میں نے سنا وہ تم نے بھی سنا۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ عبد مناف کی اولاد سے ہمارا تنازع اور مقابلہ سیادت و شرافت میں پہلے سے چلا آتا تھا۔ اگر انھوں نے (مسافروں کو) کھانا کھلایا تو ہم نے بھی کھلایا۔ انھوں نے مسافروں کو سواری دی تو ہم نے بھی دی۔ انھوں نے غریبوں کو مال تقسیم کیا تو ہم نے بھی بانٹا۔ یہاں تک کہ ہم دونوں (گروہوں) کی حالت ایسی ہوگئی جیسے دوڑ کے گھوڑے ہیں یا گاڑی کھینچنے کے دو جانور ہوتے ہیں۔ آخر کار انھوں نے دعویٰ کیا، ہم میں ایک نبی ہے جس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے۔ اب ہم یہ بات کہاں سے لائیں اور ہم کو کہاں سے ملے۔ واللہ میں تو کبھی ایمان نہ لاؤں گا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ رسول اللہ کی طرف رخ کرکے جب کفار قرآن سنتے ہیں تو ان کے سننے کا اصل سبب خدا خوب جانتا ہے۔ درحقیقت وہ اس بات کا باہم مل کر مشورہ کرتے ہیں کہ کس طرح قرآن کے اثر سے لوگوں کو بچائیں اور کس طرح ملت ابراہیم کے میلان کو دور کریں۔ مشورہ کے بعد ظالم کہتے ہیں کہ یہ تو خود سحر زدہ آدمی ہے اس کی بات کا کیا اعتبار، کیوں احمق بنتے ہو۔ خطیب نے ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ سرکار عالی نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ کھانا تیار کرکے سرداران قریش کو بلاؤ۔ کھانا تیار ہوا۔ قریش آ گئے تو حضورؐ نے ان کو قرآن سنایا، توحید کی طرف بلایا اور فرمایا لا الٰہ الا اللہ کہو تاکہ عرب تمہاری تقلید کریں اور عجم تمہارے دین پر آئیں۔ قریش نے انکار کیا اور قرآن سن کر بولے یہ تو خود جادو زدہ ہیں سحر زدہ کی کیا پیروی کریں گے۔

اللہ فرماتا ہے دیکھو کافروں نے آپ کے لئے کیسے تمثیلی نام تجویز کر رکھے ہیں (کوئی کاہن کہتا ہے، کوئی شاعر اور کوئی جادوگر) ان کو راہ حق نہیں مل سکتی

مقصود بیان

جن کے کان حق شنو نہیں اور دل کا نور بصیرت افسردہ ہے ان کو کوئی پیغام صداقت وحقانیت فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اُن کے دلوں پر گمراہی کے پوشیدہ پردے پڑ جاتے ہیں اور کانوں میں ضلالت کا بہرا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ آخری آیات دلالت کر رہی ہیں کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو تخفیف و توہین کی نظر سے دیکھنے والے راہ ہدایت سے محروم ہوتے ہیں وغیرہ۔

وَقَالُوٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ

کہتے ہیں کہ جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا یقیناً ہم نئے سرے سے پیدا کرکے اٹھائے جائیں گے (اے نبی) کہہ دو کہ تم پتھر ہو جاؤ یا

حَدِيْدًا ۝ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ

لوہا یا کوئی ایسی مخلوق جو تمہارے دلوں میں بڑی ہو اس پر وہ کہیں گے کہ ہم کو دوبارہ کون زندہ کرے گا (اے محمد) کہہ دو وہی جس نے پہلی مرتبہ

اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ

تم کو پیدا کیا ہے تو یہ لوگ تمہارے سامنے سر مٹکانے لگیں گے اور کہیں گے اچھا یہ کب ہوگا؟ کہہ دو کہ کیا عجب ہے نزدیک ہی

قَرِيْبًا ۝ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ ع

آپہنچا ہو۔ جس دن خدا تم کو بلائے گا تو تم اس کی تعریف کرتے ہوئے تعمیل کرو گے اور خیال کرو گے کہ تم صرف تھوڑی مدت رہے

ع ۵

تفسیر

کفار کہ قیامت کے منکر تھے ان کو اچنبھا معلوم ہوتا تھا کہ انسان مرکر دوبارہ زندہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ثبوت قیامت میں ان کو دو شبہات تھے۔ (۱) انسان کی تخلیق عناصر کی ترکیب سے ہوئی ہے اور ترکیب بھی چوتھے یا پانچویں درجہ کی۔ عناصر کے اختلاط سے سبزہ اور خوراک اور اناج کی پیداوار ہوتی ہے۔ ان چیزوں کو انسان کھاتا ہے۔ دیگر حیوانات بھی کھاتے ہیں۔ حیوانات کا دودھ، گھی، گوشت وغیرہ اسی غذا سے بنتا ہے پھر حیوانی پیداوار کو انسان کھاتا ہے۔ اس نباتی اور حیوانی غذا سے انسان کا بدنی قوام بنتا ہے اور قوام بدنی کی درستی کے بعد نوعی سلسلہ جاری ہوتا ہے پھر نوعی سلسلہ کا ابقا بھی

شخصی قوام پر موقوف ہے اور شخصی قوام کی بقا غذا کی رہین ہے۔ غرض انسان کی پیدائش، تربیت، پیدائش اور بقا سب منت کش عناصر ہے۔ تو جب انسان مرکر ریزہ ریزہ ہوگیا یعنی اصلی عناصر میں تبدیل ہوگیا پھر کس طرح ممکن ہے کہ دوبارہ زندہ ہوجائے۔ عناصر کی ترکیب سے غذا کی فراہمی اور غذا کی فراہمی سے قوام بدن کی درستگی دوبارہ کیسے ہوجائے گی۔

(۲) خدا جانے کب سے عالم کا سلسلہ چلا آتا ہے اور کب تک باقی رہے گا۔ آئندہ کو اگر گزشتہ پر قیاس کیا جائے تو عقیدۂ قیامت محض وہمی بات ہے۔ قیامت کا وقت کب آئے گا؟ کب سلسلۂ عالم آخری کڑی پر پہنچے گا؟ یہ تو ہمات تھے جو کفار مکہ کو اقرار قیامت سے روکتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے ان آیات میں دونوں شبہات کا ازالہ فرمایا ہے۔ پہلے شبہ کا جواب اس طرح دیا کہ جب خدا تعالیٰ نے انسان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا عناصر بھی موجود نہ تھے۔ عناصر کا مرکب اصلی و مرکب ثانوی بھی موجود نہ تھا۔ غرض کچھ نہ تھا۔ جب اس نے ایجاد کی اور نیست سے ہست کیا تو کیا وہ دوبارہ تخلیق نہیں کرسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تم مرکر پتھر یا لوہا بن جاؤ کوئی ایسی چیز ہوجاؤ جس کا انقلاب تمہاری نظر میں ناممکن ہو تب بھی خدا دوبارہ ضرور پیدا کرے گا۔ یعنی عناصر سے تو انسان بنا ہی ہے تحلیل کے بعد اصل عناصر کی شکل اختیار کرنا اور پھر عنصری شکل سے انسان بن جانا تو زیادہ مشکل نہیں ایسا تو ہو ہی جائے گا۔ بلکہ اگر مرکر کوئی دوسری نوعی شکل اختیار کرلوگے اور نوع بھی وہ جو تمہارے نزدیک بالکل غیر ذی روح اور ناقابل حیات ہے مثلاً پتھر لوہا وغیرہ تب بھی (نوعی انقلاب کرنے کے بعد) خدا تعالیٰ دوبارہ تم کو زندہ کردے گا۔ رہا دوسرا شبہ کہ قیامت کب ہوگی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب تم عاجز ہوکر اللہ کی تسبیح و تحمید کرتے ہوئے بارگاہِ الٰہی کی طرف دوڑو گے اور سمجھوگے کہ دنیا میں یا قبر میں ہم بہت ہی کم ٹھہرے تھے اس وقت قیامت ہوگی۔ مطلب یہ کہ اس وقت تو انسان خود مختار ہے مجبور نہیں۔ یہ دار عمل ہے دار جزا نہیں۔ جب خدا تعالیٰ انسانی اختیارات کو سلب کرلے گا اور ہر منکر و مقر اقرار و اعتراف و اقرار پر مجبور ہوکر اپنا ملجاء و ماویٰ اللہ ہی کو سمجھے گا اور دنیوی زندگی اس کو بہت ہی قلیل نظر آئے گی وہ وقت قیامت کا ہوگا۔ یہ تو روزِ قیامت کی کیفیت کا بیان ہوا۔ رہا تعین کا سوال تو تعیین ناممکن ہے۔ کیوں کہ خدا تعالیٰ مختارِ مطلق ہے مجبور نہیں۔ جب وہ چاہے گا تم کو قبروں سے بلائے گا اس کا اس کو اختیار ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ قیامت قریب ہے۔

خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ کی تفسیر میں ابن عباس، سعید بن جبیر، ابوصالح، حسن، ضحاک اور امام مالک وغیرہ نے فرمایا کہ اس سے مراد موت ہے یعنی اگر تم لوہا پتھر بن جاؤ یا اس سے بھی آگے بڑھ کر موت مجسم ہوجاؤ تب بھی خدا تعالیٰ دوبارہ زندہ کرے گا۔

مقصودِ بیان

حشر جسمانی حق ہے۔ خلاق اوّل کے لئے تخلیق ثانی دشوار نہیں۔ خدا تعالیٰ انواع میں بھی انقلاب کرسکتا ہے۔ اس سے فلاسفۂ یونان کے اس نظریہ کا ابطال ہوگیا جس کا مدعا یہ ہے کہ انواع میں باہم انقلاب و تبادل ناممکن ہے۔ قیامت کا معین وقت نہیں بتایا جاسکتا۔ ہاں اتنا کہا جاسکتا ہے کہ عنقریب قیامت ہوگی۔ قیامت نام ہے صرف اتنی بات کا کہ اللہ تمام مُردوں کو قبروں سے طلب فرمائے گا اور سب لوگ فوراً خوف زدہ ہوکر حمد الٰہی پڑھتے ہوئے میدان میں جمع ہوجائیں گے۔ قیامت کے دن دنیوی زندگی اور قیام قبر کا وقت بھی کم معلوم ہوگا۔ کم کی کوئی مقدار آیت میں نہیں بیان فرمائی۔ البتہ قَلِيلًا کی تنوین تحقیر و تقلیل کے لئے ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت ہی کم مقدار معلوم ہوگی۔ آیات میں مسلمانوں کو فی الجملہ تنبیہ ہے اس بات کی کہ قیامت کو دور نہ سمجھو معلوم نہیں کب ہوجائے۔ خدا کے نزدیک اس عالم کو تباہ کرنا کچھ دشوار نہیں۔ بس اس کی ایک طلب تمام امور کو طے کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ قیامت کے دن تو چار و ناچار اللہ کی الوہیت و وحدانیت کا اقرار اور حمد الٰہی کا قول کرنا پڑے گا پھر کیا وجہ ہے کہ تم دنیا کو قید خانہ سمجھتے ہوئے دعوتِ الٰہیہ پر لبیک کہتے ہوئے اور حمد الٰہی کرتے ہوئے خدا کی طرف نہیں دوڑتے لیکن آہ جس نے اللہ کی آواز کو سن لیا وہ ندا کی طرف دوڑا اور جو آغازِ دعوت سے محروم رہا وہ کیا لبیک کہے گا۔

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ

اور کہہ دے میرے بندوں سے کہ کہیں وہ بات جو بہت اچھی ہو بیشک شیطان وسوسہ ڈالتا ہے لوگوں کے درمیان یقیناً

الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۭ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ

بیشیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے تمہارا پروردگار تم کو خوب جانتا ہے اگر چاہے تم پر رحم فرمائے

اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ۭ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۝ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي

یا اگر چاہے تم کو سزا دے (اے محمدؐ) ہم نے تم کو اُن کا نگراں بنا کر نہیں بھیجا ہے اور تمہارا پروردگار خوب واقف ہے اُن سے جو

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰي بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝

آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں اور بیشک ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور داؤد کو ہم نے زبور دی تھی

تفسیر محققین اہلِ تفسیر کے نزدیک یَقُوْلُوْا کا فاعل عِبَادِیْ ہے اور عِبَادْ سے مراد صرف مؤمنین ہیں۔ عِبَادِیْ سے اہلِ ایمان مراد ہیں۔ اس پر اتفاق کرتے ہوئے آیات کی تفسیر میں تین قول ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ مسلمانوں کو اللہ نے حکم دیا کہ کافروں سے اچھی بات کہیں اور نرم کلامی سے پیش آئیں۔ خازن اور معالم نے بروایت کلبی بیان کیا ہے کہ جب مشرکوں نے مسلمانوں پر چاروں طرف سے یورش کی اور مسلمان سخت ترین ایذائیں اٹھاتے اٹھاتے تنگ آگئے تو خدمتِ گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا حضورؐ اب ہم کو بھی کافروں سے مقابلے کی اجازت دیجئے ہم بھی منہ توڑ کر جواب دینا چاہتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا مجھے ابھی تک جہاد کا حکم نہیں ہوا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو حکم ملا کہ کافروں سے نرمی کرو گفتگو میں سختی نہ کرو۔ کافروں کی جہالت و حماقت پر نہ جاؤ۔ ان کی باتوں کا بدلہ دو گے تو سب و شتم درشتی کلام اور اشتعال کے سبب شیطانی فساد اور جھگڑے پڑیں گے۔ اگر کافروں میں سے کوئی راہِ راست پر آنے کا ارادہ رکھتا بھی ہوگا تو ضد کر کے گمراہی پر جم جائے گا اور ہدایت و گمراہی چونکہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس لئے سختی کے برتاؤ سے کوئی فائدہ بھی نہیں۔ بعض علمائے روایت کا قول ہے کہ آیت کا نزول حضرت عمرؓ کے حق میں ہوا۔ آپ کو کسی کافر نے برا کہا جس پر عفو و درگزر کا حکم نازل ہوا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ باہم نرم الفاظ اور نرم لہجہ میں گفتگو کریں، پاکیزہ الفاظ بولیں اور درشت کلام نہ بولیں کیونکہ شیطان مفسد موجود ہے۔ کہیں الفاظ کی ناگواری کی وجہ سے شیطان ایک دوسرے کو بھڑکا کر مزید فتنہ و فساد نہ پیدا کرا دے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ یَقُوْلُوا میں فقط قول ہی مراد نہیں بلکہ عمل بھی مراد ہے یعنی مسلمانوں پر لازم ہے کہ باہمی مکالمات و معاملات میں طریقۂ حسن اختیار کریں۔ ایسی کوئی حرکت نہ کریں جس سے دوسرے کو ناگواری پیدا ہو۔ امام احمد نے بروایت حضرت ابوہریرہ رضؓ بیان کیا ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا تم میں سے کوئی اپنے بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کرے کیوں کہ اس کو نہیں معلوم کہ شاید شیطان ہتھیار کو اس کے ہاتھ سے گرا دے (یعنی وہ مسلمان کو قتل کرنے کی وجہ سے) دوزخ کے گڑھے میں جا گرے۔ حضور اقدسؐ نے فرمایا ہے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر ظلم کرے نہ اس کو بے مدد چھوڑے پھر حضورؐ نے سینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تقویٰ یہ ہوتا ہے جن دو شخصوں نے اللہ کے واسطے محبت کی پھر (کسی وجہ سے) جدائی ہوگئی اور دونوں میں سے کسی نے دوسرے کا راز ظاہر کر دیا تو ظاہر کرنے والا بدتر ہے۔ ظاہر کرنے والا بدتر ہے ظاہر کرنے والا بدتر ہے (رواہ احمد)

حاصل ارشاد مؤخر الذکر دونوں صورتوں میں یہ ہے کہ رسول اللہؐ کا کام صرف تبلیغ کرنا ہے۔ مسلمانوں اور کافروں کی ہدایت کا ذمہ آپ پر نہیں ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ باہم اچھا سلوک رکھیں، کوئی کسی کو برا نہ کہے کیونکہ معلوم نہیں کون ناجی ہے اور کون ناری۔ اللہ ہی کو حالات کا پورا علم ہے۔ وہ چاہے گا رحم فرمائے گا وہ چاہے گا عذاب دے گا۔ شیطان انسان کا دشمن موجود ہے آپس کی بدسلوکی سے اس کو فساد کرانے کا موقع مل جائے گا۔

اس سے آگے وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ الخ میں یہ بتانا مقصود ہے کہ نبوت کا استحقاق کسی مادی طاقت کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ آسمان و زمین میں رہنے والوں کی فطری صلاحیت و استعداد کی بنا پر یہ فیضان ہوتا ہے اور اس صلاحیت کا علم خدا تعالیٰ کو بخوبی ہے وہ جیسی اور جس میں قابلیت

دیکھتا ہے دیا ہوا فیض اس کو پہنچتا ہے۔ اس کی استعداد و قابلیت کے اختلاف کی بنا پر انبیاء میں تعداد و فرق مراتب ہے، کوئی کسی درجہ کا ہے، کوئی کسی درجہ کا کسی کو سلطنت اور بادشاہت، دونوں عطا ہوئی ہیں۔ دیکھو داؤدؑ کو اللہ نے اپنی کتاب زبور عطا فرمائی تو اس کو پڑھو کہ زمین کے وارث وہی سب لوگ ہوں گے جو اہل اور قابل ہوں گے۔

آیت کی شانِ نزول بعض اہلِ تفسیر نے اس طرح بیان کی ہے کہ جس زمانے میں حضور اقدسؐ کے پند و مواعظ کا چرچا مکہ کے گھر گھر میں ہو رہا تھا، یہودیوں کے بہکانے سے کفارِ مکہ نے مسلمانوں سے کہنا شروع کیا کہ خدا نے لوگوں کی ہدایت کے لئے ابوطالب کے یتیم بچے کو ہی انتخاب کیا اور اس کے ساتھ ننگے بھوکے لوگوں کو لگا دیا ان میں ہم سے زیادہ کون سی فضیلت تھی جو ان پر کتاب اتاری اور نبی بنایا۔ اس واہی گفتگو کے جواب میں آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔

حضرت داؤدؑ کو زبور دینے کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیوں کیا؟ کتابیں تو اور پیغمبروں کو بھی عطا ہوئی تھیں

حضرت داؤدؑ کی خصوصیت ذکر کے تین اسباب ہیں (۱) اہلِ عرب پڑھے لکھے نہ تھے نظر و فکر سے بھی کورے تھے۔ کتاب و علم سے تقریباً محروم تھے۔ علمی باتیں یہودیوں سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ اہلِ کتاب پر ان کا کافی اعتماد تھا۔ یہودی ہمیشہ سے فتنہ انگیز اور دسیسہ کار واقع ہوئے ہیں۔ کفارِ مکہ سے کہا کرتے تھے کہ موسیٰ کے بعد کوئی نبی نہیں آیا نہ آ سکتا ہے اور توریت کے بعد دوسری کتاب بھی نہیں آ سکتی۔ نبوتِ عیسیٰ اور انجیل کے الہامی کتاب ہونے کے بھی یہ لوگ قائل نہ تھے۔ مگر داؤدؑ کو نبی مانتے اور زبور کو کتابِ الٰہی جانتے تھے۔ اس لئے خدا نے عیسیٰ اور انجیل کا تذکرہ چھوڑ کر انہی کے مسلمہ عقیدے کو پیش کرتے ہوئے الزامی جواب دینے کے لئے حضرت داؤدؑ اور زبور کا تذکرہ فرمایا (۲) آیت میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ فطری صلاحیت کی بنا پر نبوت کا فیضان ہوتا ہے جسمانی طاقت، مال کی کثرت اور اولاد کی فراوانی اور خاندان کی نجابت سے اس فیضان کے حصول کا استحقاق نہیں پیدا ہوتا۔ چونکہ یہی بات زبور میں مذکور تھی، اس لئے دعوے کی تائید میں زبور، داؤدؑ کا تذکرہ فرمایا۔ (۳) کفار کے پیشِ نظر یہ بات تھی کہ عزت کا استحقاق مال کی کثرت اور دنیوی عزت، و حکومت سے پیدا ہوتا ہے۔ معیارِ فضیلت صرف دنیوی تفوق ہے۔ اس نظریہ کو رد کرنے کے لئے فرمایا کہ دیکھو داؤدؑ کو ہم نے زبور عطا فرمائی تھی یہی ان کے شرف و عظمت کا سبب تھا۔ اگرچہ وہ دنیوی بادشاہ بھی تھے مگر حکومت و شاہی ان کے لئے موجبِ فضیلت نہ تھی۔

ایک سوال رسولِ پاکؐ نے فرمایا ہے کہ انبیاء میں ایک کو دوسرے پر فضیلت نہ دو۔ لیکن قرآن کی آیت بصراحت ناطق ہے کہ انبیاء کے مراتب میں خدا نے فرق رکھا ہے۔ اسی بنا پر اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے کہ اشرف الرسل حضور اقدسؐ ہیں۔ پھر دیگر عظیم الشان انبیاء نوحؑ ابراہیمؑ موسیٰؑ عیسیٰؑ کا درجہ ہے۔

جواب حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نفسانی خواہش اور ذاتی و قومی تعصب کی بنا پر بغیر تفصیل شرعی کے انبیاء میں سے کسی کو کسی پر فضیلت نہ دو کیونکہ کسی شخص کے کہنے اور حمایت کرنے سے کوئی نبی افضل نہیں ہو سکتا نہ کسی نبی کا مرتبہ کم ہو سکتا ہے یہ تو خدا داد اعزاز ہے۔ انبیاء میں باہم واقعی تفاضل تو اس آیت کے علاوہ دوسری آیات سے بھی ثابت ہے (ابن کثیر) مصنف فتح البیان نے تفاضلِ انبیاء کا انکار حدیثِ مذکورہ کی بنا پر کیا ہے، مگر ہم نے حدیث کا مطلب بیان کر دیا جس سے مصنف مذکور کے قول کا رد کافی طور پر ہو گیا اور جمہورِ اسلام کے عقیدے کا ثبوت آیات کی روشنی میں تو بالکل واضح ہے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

مقصودِ بیان مسلمانوں کو باہم سلوک اور نرمی گفتار رکھنے کا حکم اور کافروں سے بھی رواداری کرنے کا امر۔ نبوت کا استحقاق فطری صلاحیت کی بنا پر ہوتا ہے کسب کو اس میں دخل نہیں بلا واسطہ عطیۂ الٰہی ہے۔ انبیاء میں باہم تفاضل تھا کسی کا مرتبہ کم اور کسی کا زیادہ۔ حضرت داؤدؑ پر زبور نازل ہوئی تھی۔ زبور علاوہ توریت کے ایک مستقل کتاب تھی۔ (اگرچہ زبور کے احکام تاکیدی تھے تاسیسی نہ تھے) رسولِ پاکؐ امت کی فرماں برداری کے ذمہ دار نہیں۔ آپ کا کام صرف پیام پہنچانا اور ہدایت کرنا تھا۔ ماننا نہ ماننا امت کا کام ہے وغیرہ۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا

کہہ دو کہ انہیں کو پکارو جنہیں تم اللہ کو چھوڑ کر اللہ کا شریک سمجھتے ہو وہ تمہاری تکالیف دور کرنے کا نہ اختیار رکھتے ہیں

تَحْوِيْلًا ۞ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ

اور نہ بدلنے کا جن کی یہ کافر پرستش کرتے ہیں وہ خود اپنے رب تک پہنچنے کا وسیلہ تلاش کرتے ہیں کہ ان میں سے کون

وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۞

زیادہ مقرب ہو اور اس کی رحمت کے اُمیدوار ہیں اور اُس کے عذاب سے ڈرتے ہیں تمہارے رب کا عذاب واقعی ڈرنے کی چیز ہے

تفسیر تفسیر معالم میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ مشرکین سخت قحط میں مبتلا ہو ئے یہاں تک کہ کتے مار کھائے۔ ہر چند اپنے معبودوں سے فریاد کی کچھ کارگر نہ ہوئی۔ بالآخر حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کی اس وقت آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ ابن کثیر نے بروایت عوفی از ابن عباسؓ بیان کیا کہ اہل شرک میں سے بعض ملائکہ کی الوہیت کے اور بعض عزیر کی الوہیت کے قائل تھے۔ لہٰذا اَلَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ سے ملائکہ اور عزیز اور مسیح ہی مراد ہیں۔

بخاری نے حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول نقل کیا ہے کہ کچھ لوگ جنّات کی پرستش کرتے تھے۔ کچھ مدت بعد وہ جنّات تو مسلمان ہو گئے اور پرستاران جن بدستور باطل پرستی میں مشغول رہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن جریر نے ابن مسعود کے قول کو ترجیح دی ہے اور باعتبار روایت یہی قوی بھی ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جن معبودوں کو تم نے بزعم خود معبود سمجھ رکھا ہے، مصیبت کے وقت ان کو پکار کر دیکھو تم کو خود معلوم ہو جائے گا کہ وہ تمہاری مصیبت دور نہیں کر سکتے بلکہ ٹال بھی نہیں سکتے۔ وہ بیچارے خود تو قرب الٰہی کے خواستگار ہیں اور اس کے لئے وسائل (اعمال صالحہ) ابن کثیرؒ تلاش کرتے ہیں۔ خود معبود ہونا یا تمہاری شفاعت کرنا تو درکنار رہا۔ وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتے اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں کیونکہ عذاب الٰہی واقعی خوف ناک ہے اور واجب الاجتناب چیز ہے تو جب ان کی یہ کیفیت ہے کہ مجبور محض ہیں، خدا کے محتاج ہیں اور خود اپنی نجات سے مطمئن نہیں تو پھر وہ تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں بلکہ وہ تم سے خوش ہی کیسے ہو سکتے ہیں۔ تمہارے افعال و عقائد تو ان کی دشمنی کا سبب ہیں بعض علماء نے وسیلہ سے اعمال صالحہ نہیں مراد لئے بلکہ مقربین بارگاہ مراد لئے ہیں مطلب یہ ہے کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ تو خود اپنی نجات کا وسیلہ بنانے کے لئے کسی مقرب ترین بندہ کے خواستگار ہیں پھر تمہاری مدد کیا کر سکتے ہیں۔

مقصود بیان نفی شرک کی الزامی دلیل کا بیان۔ اس بات کی ضمنی صراحت کہ معبود کو مختار اور دوسروں کی تکلیف دور کرنے پر قادر ہونا چاہیئے۔ ذیلی طور پر اس امر کی طرف اشارہ کہ بارگاہ الٰہی تک پہنچنے کے لئے وسیلہ کی ضرورت ہے۔ وسیلہ خواہ عمل صالح ہو یا کوئی خدا کا مقرب بندہ۔ آخری آیات میں صراحت ہے کہ اللہ کے نیک بندے دو صفات سے متصف ہوتے ہیں ان کو رحمت کی امید اور عذاب کا خوف لگا رہتا ہے اور اپنے نیک اعمال پر بھروسہ نہیں رکھتے وغیرہ

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ

کوئی بستی ایسی نہیں جس کو قیامت سے پہلے ہم تباہ نہ کردیں یا سخت عذاب نہ دیں

كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝ وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ

یہ بات لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے اور نشانیاں بھیجنے سے ہم کو سوائے اس کے کوئی وجہ مانع نہ ہوئی کہ اگلے

بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا

لوگوں نے اُن کو جھٹلایا اور ہم نے ثمود کو اونٹنی بطور نشانی کے دی تھی مگر انہوں نے اس پر ظلم کیا اور ہم محض ڈرانے کو نشانیاں بھیجا کرتے ہیں

تفسیر حافظ ابو یعلیٰ موصلی نے بروایت حضرت زبیر بن عوام بیان کیا کہ جب اپنا رب کو تبلیغ کرنے کا حکم ہوا تو حضور اقدس ﷺ نے کوہ ابو قبیس پر چڑھ کر آواز دی اے آلِ عبد مناف میں تم کو ڈراتا ہوں۔ قریش فوراً جمع ہوگئے (اس خیال سے کہ شاید پہاڑ کی دوسری طرف کوئی دشمن چڑھ آیا جو مکہ کو لوٹنا چاہتا ہے) حضور اقدس ﷺ نے ان کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا۔ کفار قریش بولے کہ تم نبی ہو تمہارے پاس وحی آتی ہے۔ سلیمان پیغمبر کے تابع تو ہوا تھی اور پہاڑ بھی مسخر تھے۔ موسیٰ کے زیرِ حکم سمندر ہوگیا تھا۔ عیسیٰ مُردے کو زندہ کر دیتے تھے۔ تم بھی نبی ہو تو اللہ سے دعا کرو کہ یہ پہاڑی سامنے سے ہٹ جائے اور نہریں جاری ہو جائیں تاکہ ہم کھیت تیار کر کے اس میں کھیتی کریں یا یہ دعا کرو کہ اللہ ہمارے مُردوں کو زندہ کر دے کہ ہم ان سے باتیں کریں اور وہ تمہارا نبی ہونا ہم کو بتا دیں۔ اگر یہ بھی نہیں تو یہ ہی دعا کرو کہ اللہ اس پہاڑی کو جس پر تم کھڑے ہو سونے کا کر دے تاکہ اس کے ٹکڑے کر کے ہم اپنے کام میں لائیں اور گرمی کے سفر کی راحت مل جائے۔ حضرت زبیر نے فرمایا ہم ابھی حضور کے پاس ہی تھے کہ وحی نازل ہوئی جب اثر وحی ختم ہوگیا تو حضور نے فرمایا قسم ہے خدا کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم نے جو کچھ مانگا اللہ نے مجھے دے دیا۔ اگر میں چاہوں تو ہو جائے، لیکن اللہ نے مجھے دو باتوں کا اختیار دیا ہے یا تو تم بابِ رحمت سے داخل ہو جاؤ۔ لہٰذا جو کرو ان میں کے گا وہ مومن ہو جائیگا، مگر درِ رحمت نہ پاؤ گے اور کوئی مسلمان نہ ہوگا۔ میں نے دونوں میں سے بابِ رحمت کو اختیار کر لیا۔ لہٰذا تم میں سے بعض لوگ ایمان لے آئیں گے۔ مجھے میرے رب نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ تمہاری خواہش کے مطابق اگر کام ہو گیا اور پھر تم کافر رہے تو تم پر ایسا سخت عذاب آئے گا جو دنیا میں کسی پر نہ آیا ہوگا۔ اس وقت آیت وَمَا مَنَعَنَا الخ نازل ہوئی۔ اس روایت کو قدرے تغیر الفاظ و اختصار کے ساتھ ابن عباس وغیرہ صحابہ کی وساطت سے دیگر ائمہ حدیث نے بھی بیان کیا ہے۔

اوپر کی آیات میں حق تعالیٰ نے اہلِ حق کی حالت بیان فرمائی تھی کہ وہ امید و بیم کے درمیان ہوتے ہیں۔ اب ان معاند کافروں کی حالت بیان فرمائی جن کی قسمت میں آغاز سے ہی خدا نے کفر لکھ دیا ہے اور لوحِ محفوظ میں ان کی تباہی لکھی جا چکی ہے۔

حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ قیامت سے پہلے ہر بستی کو خدا تعالیٰ یا تو ان کے اعمال کی پاداش میں صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا یا باقی رکھے گا تو کم از کم سخت عذاب مسلط فرمائے گا۔ طرح طرح کے مصائب و آفات میں وہ مبتلا ہوں گے، یہ لوحِ محفوظ کا قطعی حکم ہے (لہٰذا اہلِ مکہ کو بھی ہوشیار رہنا چاہیئے کہ ان کو بالکل تباہ کر دیا جائے اور ہلاک نہ کیا گیا تو سخت مصائب ان پر نازل ہوں گی۔ چنانچہ سخت ترین قحط میں اہلِ مکہ مبتلا ہوئے) رہا فرمائشی معجزات کا پورا کرنا تو ہم ان کو پورا کر سکتے ہیں، مگر وجہ مانع صرف یہ ہے کہ انبیائے سابقین سے بھی ان کی امت کے کافروں نے ایسے ہی معجزات طلب کئے تھے اور جب ان کی خواہش پوری کر دی گئی (مثلاً ثمود نے صالح سے فرمائش کی کہ پہاڑ سے غیبی اونٹنی پیدا کر دو اور اونٹنی پیدا کر دی گئی) تو پھر بھی انہوں نے کفر نہ چھوڑا چنانچہ اونٹنی کو ستایا، بالآخر ہم نے ان قوموں کو ہلاک کر دیا۔ اب اگر یہ بھی فرمائشیں پوری ہونے کے بعد بدستور کفر کئے جائیں گے تو ان کو بھی تباہ کر دیا جائے گا اور رسول اللہ ﷺ کا پاس خاطر کرتے ہوئے ان کو تباہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کا ظہور تو صرف ڈرانے کے لئے ہوتا ہے، فرمائشیں پوری کر کے خوش کرنے کے لئے نہیں ہوتا۔

مقصودِ بیان دنیا کی ہر بستی قیامت سے پہلے اجاڑ ہو جائے گی یا کم از کم مختلف مصائب و حوادث میں گرفتار ضرور ہوگی۔ لوحِ محفوظ کا لکھا ضرور پورا ہوگا۔ فرمائشی معجزات ظاہر نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کو منظور نہیں کہ عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو کر علاج…

امت تباہ ہو۔ کیونکہ ظہورِ معجزات مطلوبہ کے بعد کفر کرنے کی پاداش سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں۔ آیاتِ الٰہیہ کا جو مختلف حوادث ومصائب (قحط، فتنۂ عامہ، جابر حکومت کا تسلط، زلزلہ وغیرہ) کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں ان کا منشاء یہ ہے کہ لوگ ڈر کر اللہ کی طرف رجوع کریں۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو اس آیت سے سبق لینا چاہیے آیاتِ الٰہیہ کا بکثرت ظہور ہو گیا اور ہو رہا ہے۔ آسمانوں سے جو بلی گرتی ہے وہ مسلمانوں پر گرتی ہے۔ کاش یہ خوالی طرف دوڑیں اور خلافِ شرع احکام سے توبہ کر کے قرآن کے حکم پر چلیں مگر آہ یہ امید موہوم ہے۔ مسلمانوں کی حالت امید اصلاح سے کہیں زیادہ خراب ہو چکی ہے۔ واللہ الہادی وہو المعین۔

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۭ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً

(اے نبی) جب ہم نے تم سے کہا تھا کہ تمہارا رب لوگوں کو گھیرے ہوئے ہے (اس کو یاد کرو) اور جو خواب ہم نے تم کو دکھلایا تھا وہ محض لوگوں کی آزمائش کے لئے

لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۧ

بنایا تھا (اسی طرح) وہ درخت جس کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے (آزمائش کے لئے تھا) ہم اُن کو ڈراتے ہیں تو اُن کی شرارت میں اضافہ ہی ہوتی ہے

ابن عباس، مجاہد، سعید بن جبیر، حسن بصری، مسروق، ابراہیم نخعی، قتادہ، عبدالرحمٰن بن زید اور اکثر علمائے تفسیر کے نزدیک رُؤیا سے مراد سیرِ معراج ہے۔ ابن عباس نے فرمایا رُؤیا سے مراد خواب نہیں بلکہ مشاہدۂ چشم ہے۔ گویا رُؤیا بمعنی رویت بصر ہے۔ شجرۂ ملعونہ سے مراد زقوم کا درخت ہے۔ شبِ معراج میں حضور ؐ نے ملاحظہ فرمایا کہ زقوم کا درخت جہنم کی جڑ سے اُگتا ہے (کذا قال ابن عباس والمسروق والحسن) جب مشرکین مکہ کی خواہش کے مطابق اظہارِ معجزات سے صاف انکار کر دیا گیا تو وہ اور بھی دلیر ہو گئے اور کہنے لگے اب تو ہم تمہاری نبوت مان ہی نہیں سکتے۔ چاروں طرف سے لے دے شروع کر دی اور ہر طرف سے یورش ہونے لگی اور طے کر لیا کہ رسول اللہ ؐ کو دھتا نہ کہنے دیں گے۔ حضورِ والا کو با قتضائے بشری کبیدگی خاطر ہوئی۔ اس کبیدگی کو دور کرنے اور تسلی دینے کے لئے آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔

حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ جب ہم آپ سے کہہ چکے ہیں کہ کوئی شخص اللہ کے قابو سے باہر نہیں، قدرتِ الٰہی سب کو محیط ہے، کوئی شخص ضرر پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتا تو آپ کو کسی سے خوف نہ کرنا چاہیئے۔ فرضِ تبلیغ ادا کئے جاؤ، بے خوف ہو کر اللہ کے احکام بیان کرو کچھ اندیشہ نہ کرو۔

جب حضورؐ کو معراج ہوئی اور صبح کو لوگوں کو اس کا علم ہوا تو بدباطن کفار مذاق اڑانے لگے اور بولے ایک رات میں بیت المقدس کو آنے جانے کا دعویٰ کس قدر جھوٹ ہے۔ جب معجزاتِ مطلوبہ کا اظہار نہ کر سکے تو لگے باتیں بنانے۔ واقعۂ معراج کو سُن کر بعض ضعیف الایمان مسلمان بھی اسلام سے پھر گئے۔ لیکن جو سعید روحیں رکھتے تھے جن کے ایمان پختہ تھے انہوں نے تصدیق کی اور ایمان پر نہ فقط یہ کہ ثابت قدم رہے بلکہ ان کے ایمان میں مزید استحکام واضافہ ہوا۔ غرض معراج کا واقعہ کھرے، کھوٹے کو جانچنے کے لئے ایک کسوٹی بن گیا جس پر مومن وغیر مومن کی حالت صحیح طور پر کھل گئی (فتنہ کے معنی ہیں آگ میں سونے کو ڈال کر تپانا تا کہ میل دور ہو جائے اور اصل کندن نکل آئے۔ یہی صورت واقعۂ معراج کی ہوئی۔ واقعہ معراج کی آگ میں سبھوں کے ایمان گرے، کوئی تو صاف ہونے کے بعد کندن کی طرح چمکا اور جو اصلاً خبیث تھا وہ سیاہ ہو گیا۔ معراج میں حضورِ والا نے درخت زقوم کو دوزخ کے اندر بھی دیکھا تھا۔ منجملہ کیفیت معراج کے یہ واقعہ جب بیان فرمایا تو ابوجہل ایسے خبیث النفس آدمی مذاق اڑانے لگے اور بولے کہیں درخت بھی آگ میں رہ سکتے ہیں؟ کہاں درخت کی سبزی اور کہاں آگ کی خشکی اور گرمی۔ بیوقوفوں کو اتنا بھی معلوم نہ ہو سکا کہ نباتات تو بجائے خود رہے بعض حیوانات آگ میں ہی پیدا ہوتے ہیں، آگ ہی میں پرورش پاتے اور آگ میں ہی رہتے ہیں۔ مثلاً سمندر جانور آگ ہی میں رہتا ہے زقوم کا درخت تو بالکل گرم خشک مزاج رکھتا ہے اس کی گرمی خشکی تیسرے یا چوتھے درجہ کی ہے اس کا مزاج کے مناسب ہے، اس لئے آگ میں رہنا عقل کے خلاف نہیں۔ اس کے علاوہ دوزخ کی آگ کو دنیا کی آگ پر اور دوزخ کے زقوم پر دنیا کے زقوم کو قیاس کرنا بھی لغو ہے۔ دوزخ اور دوزخ کی پیداوار کی خاصیت، نوعیت

اور کیفیت ناقابل بیان ہے۔ جہاں ناقابلِ تصور اور ناممکن التحمل عذاب کی کیفیت سمجھانی ہوتی ہے تو تمثیل دیکر سمجھائی جاتی ہے۔ عناصر میں سب سے زیادہ گرم آگ ہے اور درختوں میں سب سے زیادہ ناقابل اکل درخت زقوم ہے، اس لئے آگ اور زقوم کا تذکرہ بطور تمثیل ہے۔ معلوم نہیں کہ دوزخ کی آگ اور دوزخ کی زقوم کی کیا کیفیت ہوگی، مگر کور باطن کافروں کی سمجھ میں یہ بات کس طرح آنے والی تھی وہ خوف گیرا ور عجیب ہیں تھے، اس لئے زقوم کا لفظ سنتے ہی اپنی کج فہمی سے پھانس کا بانس بنا لیا اور لگے اعتراض کرنے۔

ایک شبہ آیت میں شجرہ سے اگر زقوم مراد ہے تو اس کو ملعونہ کیوں کہا گیا؟ قرآن میں تو کسی جگہ اس پر لعنت نہیں کی گئی اور درخت کے ملعون ہونے کے معنی ہی کیا ہو سکتے ہیں؟

ازالہ (۱) درخت پر لعنت کے کوئی معنی نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ایسے خبیث درخت کو کھانے والے ملعون ہیں۔ (۲) عرب ہر مضر رساں کھانے کو ملعون کہتے ہیں۔ درخت زقوم بھی کامل مضر ہے، اس لئے اس کو ملعون کہا گیا (۳) لغت میں لعن کے معنی ہیں دور کرنا۔ درخت زقوم بھی چونکہ اچھے صفات و خواص سے بہت دور ہے کھایا جائے تو آنتیں کاٹ دے، منہ میں چبائے تو ڈال دے، بھوک کو فائدہ نہ پہنچائے، اس لئے اس کو ملعون کہا گیا۔

خلاصہ ارشاد یہ ہے کہ کافروں کی یورش سے آپ خوف زدہ نہ ہوں یہ ہماری گرفت اور قابو سے باہر نہیں، یہ آپ کو ضرر نہ پہنچا سکیں گے۔ رہی واقعات معراج کی تکذیب تو اس سے بھی کبیدہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں۔ واقعات معراج کو ہم نے جانچنے اور پرکھنے کا معیار بنایا ہے۔ کھرے کھوٹے کی کیفیت تصدیق و تکذیب سے کھل جاتی ہے۔ جو کھوٹے ہیں ان کو جتنا عذاب سے ڈرایا جاتا ہے اتنا ہی ان کی سرکشی و نافرمانی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ڈرانے کا منشا تو یہ تھا کہ ناشائستہ حرکات سے باز آجاتے، مگر اللہ کے احاطہ قدرت سے باہر کس طرح ہو سکتے ہیں۔

مقصود بیان کوئی شخص اللہ کے قابو سے باہر نہیں۔ اللہ کی طرف سے امتحان بہت سخت ہوتا ہے۔ شریعت کے وہ مسائل اور رسول پاک کے وہ فرمان جو بظاہر عقل کے خلاف معلوم ہوتے ہیں (اگرچہ واقع میں عقل کے خلاف نہیں) وہ محض آزمائشی ہیں۔ یہ جانچنا مقصود ہے کہ کون نبی کی عصمت اور فطری صداقت پر ایمان لاتا ہے، اور کون اپنی رائے کو دخل دے کر انکار کرتا ہے۔ اس سے عبرت حاصل کرنی چاہئے ان مسلمانوں کو جو اصول قرآنی اور فرامین رسول کو اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اگر ان کی رائے کے مطابق ہوئے تو مان لیا اور مخالف ہوئے تو ٹھکرا دیے۔ اس کا نام انھوں نے مسائل اسلام کی عقل سے مطابقت رکھا ہے۔ حالانکہ ذرا کھیا اور ان کی رائے کیا۔ اوّل تو سونا تولنے کے کانٹے میں پہاڑ نہیں تولا جا سکتا۔ انسانی کثیف دانش (اصول اسلامیہ کی تہ تک نہیں پہنچ سکتی اور پہنچنا ممکن بھی ہے تو عقل سلیم کا مزکیہ ہر ذہنی تخیل کو معقولات وحقائق کے مرتبہ پر پہنچانے والا۔ ہر شخص کی عقل و سمجھ سے کس طرح پاک ہو سکتی ہے۔ فن طب کی مہارت کے بغیر اصول طب کو ہر بازاری آدمی کیسے سمجھ سکتا ہے انجینیری کے نظریات تک کیا جان سکتا ہے۔ عقل سلیم صرف نبی یا علمائے حق کی ہوتی ہے وہ ہی اصول شریعت کے حقائق سمجھتے ہیں اور کامل ایمان رکھتے ہیں۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْ

جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے اوروں نے سجدہ کیا وہ بولا کیا میں اس شخص کو سجدہ کروں جس کو تو نے

طِيْنًا ۝ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۡ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَ

مٹی سے بنایا (پھر) کہنے لگا بھلا دیکھ تو یہ وہی شخص ہے جو تو نے مجھ پر بزرگی عطا کی ہے اگر تو مجھ کو روز قیامت تک مہلت دے تو سوائے چند

لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّ

لوگوں کے میں اس کی اولاد کو پامال کر ڈالوں گا اللہ نے فرمایا چلا جا ان میں سے جو تیرے کہنے پر چلے گا تو تم سب کی

جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ۝ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ

پوری پوری سزا جہنم ہوگی اور اُن میں جس پر تیرا قابو چلے تو اس کو اپنی آواز سے بہکالے اور اُن پہ

عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ

اپنے سوار و پیادے کھینچ لا اور اُن کی مال و اولاد میں ساجھا کرلے اور اُن کو وعدہ دے اور شیطان

الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ اِنَّ عِبَادِىْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۚ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝

اُن سے دغابازی ہی کا وعدہ کرتا ہے میرے بندوں پر تیرا قابو نہیں اور تمہارا رب ہی ذمہ داری کے لئے کافی ہے

تفسیر

حضرت آدم کی تخلیق اور ابلیس کے انکار سجود کا قصہ قرآن پاک میں سات جگہ مذکور ہے۔ بقرہ، اعراف، حجر، بنی اسرائیل، کہف، طٰہٰ، صٓ۔ ان تمام سورتوں میں مختلف مقاصد کے تحت جداگانہ پیرایۂ بیان کے ساتھ واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے، کہیں مختصر کہیں مفصل۔ الفاظ میں حسب اختلاف موقع قدرے تغیر ہے۔ قصہ کا خلاصہ ذکر کرنا بے سود ہے۔ خصوصیات مقامی کو ہم ترتیب وار ذکر کرتے ہیں۔

اِلَّا قَلِيْلًا۔ انبیاء، شہداء، صالحین، اور کامل اہلِ ایمان ہمیشہ طاغوتی گروہ سے تعداد میں کم رہے ہیں اور کم رہیں گے اور شیطان کو اس بات کا علم تھا کہ آدم کی فطرت میں خدا تعالیٰ نے تین قوتیں ودیعت رکھی ہیں۔ ایک روحانی دو مادی۔ پھر تینوں قوتوں کے دونوں پہلو یعنی افراط و تفریط گمراہی کے پہلو ہیں۔ صرف اعتدال کا راستہ صلاح و عافیت کا ہے، اس لئے اس نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ قلیل تعداد تو ضرور میرے دائرۂ اقتدار سے خارج رہے گی مگر اکثر کو میں گمراہ کر دوں گا۔

اِذْهَبْ خدا تعالیٰ نے ابلیس کو اجازت دے دی۔ اِذْهَبْ امر کا صیغہ ہے۔ عربی زبان میں امر کے صیغہ کا استعمال مختلف مواقع پر ہوتا ہے۔ کہیں امر وجوب کے لئے آتا ہے، کہیں اجازت اور اباحت کے لئے، کہیں تہدید اور تنبیہ کے لئے وغیرہ۔ یہاں اجازت تہدید ہی کے لئے ہے۔

بِصَوْتِكَ شیطان کی آواز کیا ہے۔ مجاہد کا قول ہے جس قدر شہوت انگیز آوازیں نغمے اور ترانے ہیں، نامحرم عورتوں کے زیور کی جھنکار، سریلے باجے اور لہو آگیں مزامیر سب شیطانی آوازیں ہیں۔

ابن عباسؓ اور قتادہ نے فرمایا جو شخص اللہ کی نافرمانی کی طرف دعوت دے وہ شیطانی داعی ہے۔ گویا ابن عباس کے نزدیک صرف اندرونی خطرات اور وسوسے ہی شیطانی آوازیں نہیں بلکہ آدمیوں کے حلق سے بھی شیطان کی آواز نکلتی ہے ہر گمراہی کی دعوت شیطانی دعوت ہے۔ شیخ ابن جریر نے اسی توجیہ کو پسند کیا ہے۔

بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ ابن عباسؓ نے فرمایا جو شخص اللہ کی نافرمانی کی طرف چلے خواہ سوار یا پیادہ، وہ شیطانی سواروں اور پیادوں میں سے ہے (معالم و سراج بروایت ابوالعالیہ) بعض احادیث سے ثابت ہے کہ شیطان کا بھی لشکر ہے۔ اس تقدیر پر احتمال ہے کہ شیطانی ذریات کے سوار اور پیادے واقعی مراد ہوں۔ امام رازی نے فرمایا یہ کلام بطور ضرب المثل ہے، حقیقی لشکر مراد نہیں یعنی اپنے تمام اسباب کو اور سامانِ اغوا کو لے کر اولادِ آدم پر حملہ کرنا۔ زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ یہ کلام بطور تمثیل ہے۔ اگر کسی بادشاہ یا سپہ سالار کو کسی بستی پر حملہ کرنا ہوتا ہے تو اس کا انتہائی حملہ یہی ہوتا ہے کہ اپنی تمام فوج اور کل طاقت کو لے کر یورش کر دے اور حریف کو سخت ترین آوازوں سے ڈرائے دھمکائے۔ خدا تعالیٰ نے بھی ابلیس کو آواز دے دی کہ اپنی کل طاغوتی طاقتوں کو لے کر حملہ آور ہو، کوئی کمی نہ رکھ چھوڑے۔

فِى الْاَمْوَالِ۔ ابن عباس و مجاہد نے فرمایا گناہ کے کاموں میں مال کو صرف کرنا شرکت شیطانی ہے۔ عطاء خراسانی کا قول ہے سود شرکت شیطانی ہے۔

كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهِ تَبِيعًا ۝ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي

اپنی طرف سے | ہم پر | کوئی دعوی کرنے والا | بھی نہ ملے گا | ہم نے اولادِ آدم کو | عزت دی | اور خشکی وتری میں اُن

الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۝ ع

کو سواری دی | اور پاکیزہ چیزیں | اُن کو عطا کیں | اور اپنی | پیدا کی ہوئی | کثیر مخلوق پر | اُن کو | فضیلت دی

تفسیر اول دلائل توحید اور ابطال شرک کا بیان تھا۔ درمیان میں کچھ اور ہدایت آمیز باتیں تھیں۔ اب پھر وہی قدرت قاہرہ اور توحید حقیقی کا استدلال بیان کیا جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی قدرت کی ہمہ گیری اور انسان کی کفر شعاری اور غفلت کوشی کا بیان ہے۔

گزشتہ آیت میں بتایا تھا کہ درحقیقت اللہ ہی کارساز اور تمام امور کا کفیل اور جملہ مہمات کا انجام دینے والا ہے۔ باقی تمام اسباب اور ذرائع حیلے بہانے ہیں۔ کسی کو کارخانۂ قدرت میں دخل نہیں۔ اللہ کی کارسازی اور ہمہ گیر قدرت کے ثبوت کے لئے بطور تمثیل ان آیات میں بیان فرماتا ہے کہ انسان طلب معاش، تجارت، سیاحت، ملکی فتوحات یا دوسرے کاروبار یا مختلف اغراض کے لئے سفر کرتا اور کشتی میں سوار ہو کر دریا میں پہنچتا ہے اور حسب اتفاق سمندر میں پہنچنے کے بعد جو انہیں طلاطم، موجوں میں رست خیز اور پانی میں طوفان آتا ہے، ہوا مخالف چلتی ہے۔ ایسی حالت میں جس وقت سطح سمندر میں کشتیاں اور جہاز رواں ہوتے ہیں اس وقت وہ خدا کو بھولے ہوئے ہوتا ہے خدا کی قدرت یاد نہیں آتی۔ وہ نہیں سمجھتا کہ کشتی باوجود وزنی اور بوجھل ہونے کے تہ آب ہو کر غرق کیوں نہیں ہو جاتی، لیکن جب مصیبت کا وقت آتا ہے، ظاہری اسباب جان بری کے نظر نہیں آتے، کوئی تدبیر سوجھائی نہیں دیتی، ہر طرف سے مایوسی ہی مایوسی نظر آتی ہے اور ہلاکت آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے، نجات کا راستہ نظر نہیں آتا، اُس وقت تمام دیوتاؤں، پیروں، بتوں اور باطل معبودوں کو چھوڑ کر اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے، گڑگڑاتا ہے، آہ وزاری کرتا ہے اور اللہ ہی کو پکارتا ہے۔ کیسا غافل انسان ہے۔ خیر خدا خدا کر کے جہاز کنارے لگتا ہے، ساحل مراد پر پہنچتا ہے تو پھر انسان خواب غفلت میں سرشار ہوتا ہے، اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف دوڑتا ہے۔ خدا تعالیٰ انسان کی جہالت اور غفلت پر تنبیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ دریا سے نجات پانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خدا کی گرفت سے بھی آزادی مل جاتی ہے۔ کیا خدا دریا سے نجات دینے کے بعد خشکی میں زمین کے اندر نہیں دھنسا سکتا یا ہوا کا زبردست طوفان بھیج کر آسمان سے پتھراؤ برسا کر تباہ نہیں کر سکتا یا سمندر میں دوبارہ لے جا کر ہوا کا طوفان بھیج کر ہلاک نہیں کر سکتا۔ خدا کے نزدیک ان میں سے کون بات دشوار ہے اور کون اس کے مقابلے میں دعوی کر سکتا ہے۔

صحیح روایت ہے کہ فتح مکہ کے روز جب عکرمہ بن ابی جہل اپنی جان بچانے کے لئے بھاگے اور جہاز پر سوار ہو کر حبشہ میں جانا چاہا تو راستہ میں طوفان آیا۔ موجوں کا تلاطم، پانی کی طغیانی، رات کی تاریکی اور ہوا کا زور جہاز کو ڈگمگانے لگا۔ جب نجات کی کوئی سبیل نہ رہی تو جہاز کے کپتان نے مسافروں کو حکم دیا کہ یہ وقت محض دعا کا ہے، دنیوی خیالات دلوں سے نکال دو اور اللہ کے سامنے سربسجود ہو کر گڑگڑاؤ۔ مسافروں نے انتہائی عاجزی سے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی۔ بحکم خدا طوفان تھما اور جہاز صحیح سالم منزل مراد پر پہنچ گیا۔ عکرمہ فرماتے ہیں میں نے اپنے دل میں غور کیا کہ اگر سمندر میں سوار اللہ کے اور کوئی مدد نہیں کر سکتا تو سمندر سے باہر بھی وہی کارساز ہے اس کے سوا کوئی حامی نہیں، اس لئے اب اگر میں عافیت کے ساتھ مکہ پہنچ گیا تو اپنا ہاتھ رسول پاکؐ کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ چنانچہ جب میں واپس آیا تو سید عالم حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور مسلمان ہو گیا (تفسیر ابن کثیر)

ایک شبہ:۔ کیا ہر انسان ناشکرا ہوتا ہے؟

ازالہ:۔ نہیں۔ ہر انسان ناشکرا نہیں ہوتا۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ عورت سے مرد قوی ہوتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ ہر عورت سے ہر مرد قوی ہو۔ بہت سی عورتیں بہت سے مردوں سے قوی ہوتی ہیں۔ اس طرح عمومی طور پر انسان ناشکرا ہوتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر انسان ناشکرا ہو۔ جس کو خدا محفوظ و معصوم رکھتا ہے وہ شکرگزار مومن ہوتا ہے۔

اس سے آگے ان چار انعامات کا تذکرہ فرماتا ہے جو اولادِ آدم کو خصوصیت کے ساتھ عطا ہوئے ہیں۔ اللہ نے آدمی کو جسم، علم، عقل، صورت، اعضاء، ساخت، ذرائع حصولِ معاش اور رہنے سہنے کے طریقوں کے اعتبار سے عزت عطا فرمائی۔ یہ عزت نہ فرشتوں کو حاصل ہے نہ کسی اور مخلوق کو۔ (۲) خشکی اور سمندر میں سفر کرنے کے لئے سواریاں عطا فرمائیں، خشکی میں اس کے مناسب اور پانی میں اس کے لائق جدا جدا قسم کی سواری دی، گھوڑا، ہاتھی، اونٹ، ریل گاڑی، موٹر، کشتی، ناؤ، دخانی اور ہوائی جہاز وغیرہ سب اسی کے انعامات ہیں۔ (۳) جو عمدہ عمدہ غذائیں، دوائیں، فواکہ، غلے، دودھ، دہی، مکھن، پنیر، گھی اور زمین کی مختلف پیداوار انسان کے لئے عطا فرمائی وہ کسی مخلوق کو نہیں دی۔ (۴) عناصر سے لے کر ملائکہ تک جو ترتیب انواع و اجناس ہے باعتبار نوع کے سب پر انسان کو فضیلت عطا کی، لیکن افراد کے اعتبار سے مخلوق کے بیشتر حصہ سے زیادہ انسان کو مکرم بنایا۔ جمادات میں قوت نمو نہیں۔ انسان کو قوت نامیہ عطا ہوئی۔ نباتات میں نمو ہے، مگر حس نہیں۔ انسان میں قوت حس بھی کامل طور پر ہے۔ حیوانوں میں حس ہے، مگر دانش و فکر کی قوت نہیں۔ انسان میں عقل بھی ہے۔ رہے ملائکہ تو ان کے عام گروہ سے نوع انسان کے بعض افراد یعنی انبیاء، اولیاء اور صلحاء افضل ہیں۔ اگرچہ عام آدمی کو فرشتوں پر شرف حاصل نہیں، اس لئے فرمایا کہ ہم نے بہت سی مخلوق پر انسان کو فضیلت عطا کی۔

مقصودِ بیان صنائع قدرت اور بدائع حکمت کو پیش کر کے الوہیت و وحدانیت پر استدلال۔ اس بات کی طرف ضمنی اشارہ کہ سفر خصوصاً بحری سفر حصول معاش کا ذریعہ ہے۔ اس امر کا اظہار کہ سخت مصیبت اور لاعلاج تکلیف کے وقت انسان اپنی فطرت اول پر آجاتا ہے اور اضطراری طور پر خدا کو پکارتا ہے، لیکن جب اضطرار دور ہو جاتا ہے اور ہوش و حواس اختیار کے دائرہ کے اندر آجاتے ہیں تو پھر شیطانی جال میں پھنس کر خدا کو بھول جاتا ہے اور عقل پر غفلت کے پردے پڑ جاتے ہیں۔ گویا ان آیات میں یہ تعلیم دینی مقصود ہے کہ دانشمند انسان وہ ہے جو دکھ سکھ دونوں میں خدا کو یاد کرے۔ دکھ میں یاد کرنا اور سکھ میں بھول جانا عقل کے خلاف ہے۔ انعامات چہارگانہ کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی طرف ایما کہ خدا تعالیٰ انسان پر بہت زیادہ مہربان ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ براہ راست انسان کا علاقہ اس سے رہے، مگر انسان خود انسانیت کبریٰ کی تذلیل کرتا اور خدا کو چھوڑ کر اپنے سے کم درجہ والی مخلوق کو معبود بناتا پھرتا ہے۔ علیٰ کثیر کا نقطہ بتا رہا ہے کہ عام انسانوں کو تمام مخلوق پر فضیلت عطا نہیں کی گئی، بلکہ بیشتر کائنات پر شرف عطا ہوا ہے وغیرہ۔

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ ۖ فَمَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَأُولَٰئِكَ يَقْرَءُونَ كِتَابَهُمْ

جس روز ہم سب لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے اُس روز جن لوگوں کے دائیں ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے گا وہ لوگ اپنے اعمال نامے کو

وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝ وَمَن كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ وَأَضَلُّ سَبِيلًا ۝

پڑھیں گے اور تاگے برابر ان کی حق تلفی نہ ہوگی اور جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا اور گم کردہ راہ ہوگا۔

جس کی پیروی کی جائے اس کو امام کہتے ہیں جیسے اُمت کا امام ہے۔ بادشاہ رعیت کا امام ہے۔ وہ کتاب جس پر کوئی قوم عمل کرے وہ اس قوم کی امام ہے۔ نماز پڑھانے والا نمازیوں کا امام ہے۔ مذہبی لیڈر اپنے مذہب والوں کا امام ہے۔ انسان کا دلی ارادہ جو کسی اچھے برے کام کا محرک ہو وہ بھی امام ہے۔ اسی طرح ہر بدکاری کا امام ہوتا ہے۔ آیت میں امام سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں:۔

(۱) امام اُم کی جمع ہے۔ قیامت کے دن ہر شخص کو اس کی ماں کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا۔ یہ قول محمد بن کعب قرظی کی طرف منسوب ہے۔ ابن عادل نے کہا امام اُم کی جمع نہیں ہے زمخشری نے تردید کی تائید کی ہے۔ (۲) امام سے مراد صاحب مذہب ہے یعنی ہر شخص کو اس عالم کا نام لے کر پکارا جائے گا جس کی وہ پیروی کرتا تھا۔ مثلاً کہا جائے گا فلاں عالم کے پیرو کہاں ہیں بلاؤ۔ اس قول کو ابو عبیدہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ ہم قرطبی کا بھی یہی مسلک ہے۔ (۳) ابن عباس کا قول ہے کہ امام سے مراد ہے ہدایت و گمراہی کا پیشوا۔ مثلاً کہا جائے گا اے اُمتِ محمد، اے اُمتِ فرعون۔ (۴) امام سے مراد معبود ہے۔ (۵) امام سے ہر زمانہ کا امام مراد ہے خواہ وہ نبی ہو یا جانشین نبی۔ اس قول کی نسبت حضرت علی کی طرف کی گئی ہے۔ (۶) ابو ہریرہ، مجاہد اور قتادہ وغیرہم کا قول ہے

کہ امام سے مراد اس دور کا نبی ہے ۔ ہر شخص اور ہر قوم کو اس کے نبی کا نام لے کر پکارا جائے گا مثلاً کہا جائے گا اے اُمتِ عیسٰی اے اُمتِ موسٰی اے امتِ محمدؐ ۔ یہ وہ لوگ جو نبی کے منکر اور شیطان کے پیرو تھے ان کو منکرین نبی کے گروہ میں شامل کر کے پکارا جائے گا مثلاً کہا جائے گا اے منکرین محمدؐ ، اے منکرین موسٰی ۔ یا یوں کہا جائے کہ امت سے مراد ہے امت دعوت نہ کہ امتِ اجابت ، اس لئے ہر امت کو خواہ وہ کافر ہو یا مؤمن اُسی دور کے نبی کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا ۔ (۷) ابن زید کا قول ہے ہر آسمانی کتاب امام ہے ۔ قیامت کے دن پکارا جائے گا اے اہلِ تورات ۔ اے اہلِ انجیل ۔ اے اہلِ قرآن ۔ یہی قول ضحاک کا ہے (۸) امام سے مراد نامۂ اعمال ہے ۔ ابو العالیہ اور حسن بصری کا بھی یہی قول ہے ۔ ایک روایت میں ابن عباس اور ضحاک کے نزدیک بھی یہی مراد ہے ۔ یعنی ہر شخص اس کے اعمال نامے سمیت بلایا جائے گا ۔ ابن جریر نے ساتویں قول کو اور ابن کثیر نے آٹھویں قول کو اختیار کیا ہے ۔ ازجح نمبر ششم ہے ۔

نامہائے اعمال تو تمام آدمی پڑھیں گے ۔ دائیں ہاتھ میں لینے والے بھی اور بائیں میں لینے والے بھی ، مگر بائیں ہاتھ میں لینے والوں کا نامۂ اعمال چونکہ بدکاریوں سے پُر ہوگا ، اس لئے وہ بادلِ ناخواستہ پڑھیں گے اور دائیں ہاتھ میں لینے والے خوشی خوشی پڑھیں گے اور خوشی سے پڑھنا ہی درحقیقت پڑھنا ہے ، اسی لئے پڑھنے کے لئے دائیں ہاتھ میں لینے والوں کا خصوصیت کے ساتھ فرمایا ۔

اس سے آگے فرماتا ہے کہ دنیا میں جو اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا ۔ یعنی آثارِ قدرت ، براہین وحدانیت ، دلائل الوہیت اور شواہدِ ربوبیت جس کو دنیا میں نہیں سوجھتے ، تغیرات عالم ، نظام فطرت ، اور قوانین طبیعت سے جو شخص اللہ کی الوہیت و توحید پر استدلال نہیں کر سکتا اور کھلی ہوئی راہِ حق کو چھوڑ کر اندھا دھند گمراہی کے غاروں میں گرتا ہے اس کو آخرت میں راہ جنت نہ دکھائی دے گی ۔ خوشی اور حیاتِ ابدی کا منہ نہ دیکھ سکے گا

ابن عباسؓ نے آخرت میں اندھا ہونے کا یہ مطلب بیان کیا کہ وہ آخرت کو نہ دیکھ سکے گا ۔ چنانچہ آیت مذکورہ کا جب مطلب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا اس سے پہلے کی آیت پڑھو ۔ سائل نے رَبُّكُمُ الَّذِي سے پوری آیت پڑھی فرمایا آیات کو معائنہ کرنے کے بعد جو شخص (عقل کا) اندھا رہا وہ آخرت کی طرف سے بھی اندھا ہوگا کیونکہ آخرت کا تو ابھی معائنہ بھی نہیں کیا ۔ اگر یہ روایت صحت کی حد کو پہنچ جائے تو اس تفسیر کو فوائد آیات میں شمار کرنا اولیٰ ہے اصل تفسیری مطلب وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا

مقصود بیان قیامت کے دن نامہائے اعمال کا تقسیم ہونا حق ہے ۔ بعض لوگوں کو دائیں ہاتھ میں اور بعض لوگوں کو بائیں ہاتھ میں لینا ہوں گے دائیں ہاتھ میں لینے والے خوش ہوں گے ۔ دنیا میں جس کی عقل نابینا ہو وہ اندھا ہے ۔ کور دماغ کور چشم سے بدتر ہے روحانیت کی آنکھ بدن کی آنکھ سے افضل ہے ، اس لئے جس کی چشم بصیرت کور ہو گئی وہ آخرت میں نور سعادت کو دیکھنے سے محروم رہے گا وغیرہ

وَإِن كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ ۖ وَإِذًا لَّا

ان لوگوں کی قریبی کوشش تھی کہ تم کو اس قرآن سے بہکا دیں جو ہم نے تم کو بھیجا ہے تاکہ اُس کو چھوڑ کر تم ہم پر دروغ بندی کر دو اس وقت وہ تم کو اپنا

تَّخَذُوكَ خَلِيلًا ﴿٧٣﴾ وَلَوْلَا أَن ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا ﴿٧٤﴾ إِذًا

دوست بنا لیتے اور اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ تم کچھ اُن کی طرف مائل ہو جاتے اُس

لَّأَذَقْنَاكَ ضِعْفَ الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيرًا ﴿٧٥﴾ وَإِن

وقت یقیناً ہم تم کو زندگی کا دگنا عذاب اور موت کا دگنا عذاب چکھاتے پھر تم کو ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار نہ ملتا یہ لوگ

كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا ۖ وَإِذًا لَّا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٧٦﴾

(مدینہ کی) سرزمین سے تم کو گھبرا کر نکالنے ہی لگے تھے مگر اُس وقت وہ بھی تمہارے پیچھے کم مدت ہی رہنے پاتے

سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا ○ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ

تم سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے اُن کا یہی قاعدہ رہا اور تم ہمارے قاعدہ میں تغیر نہ پاؤ گے آفتاب کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے

الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ○ وَمِنَ

تک پابندی سے نماز پڑھا کرو اور فجر کی نماز پڑھو بیشک فجر کی نماز کے وقت فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور کچھ رات

الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ○ وَقُلْ رَّبِّ

میں تہجد پڑھا کرو یہ زیادتی خاص تمہارے لئے ہے عنقریب تمہارا پروردگار تم کو مقام محمود میں کھڑا کرے گا اور کہو میرے پروردگار

اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ○

مجھے اچھی طرح داخل کر اور اچھی طرح نکال اور اپنے پاس سے مجھے ایک مدد دینے والی قوت عنایت فرما

تفسیر

عطاء خراسانی نے بروایت ابن عباس بیان کیا کہ قبائل ثقیف کا ڈیپوٹیشن حاضر خدمت ہوا۔ ہم حضرت سے بیعت کرنے حاضر ہوئے ہیں، لیکن تین شرطیں ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ ہمارے لئے نماز سے رکوع ساقط کر دیا جائے۔ نماز میں ہم کو جھکنا نہ پڑے۔ دوسری شرط یہ کہ ہمارے بتوں کو کوئی اور نہ توڑے ہم خود ہی توڑ دیں گے۔ تیسری شرط یہ کہ ہمارے لات وعزّیٰ ایک سال باقی رکھے جائیں۔ ان کو ایک سال کے بعد ہم توڑیں گے، لیکن دوران سال میں ہم ان کی پرستش نہیں کریں گے۔ حضورؐ نے اول اور آخر شرط سے انکار کر دیا اور درمیانی شرط کو مان لیا۔ ایک روایت میں چوتھی شرط بھی مذکور ہے۔ وفد ثقیف نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ مکہ کی طرح ہماری وادی کو بھی حرم بنا دیں۔ ہماری وادی کے تمام چرند پرند اور درخت محفوظ قرار دیئے جائیں۔ حضورؐ نے اس سے بھی انکار کر دیا وہ زیادہ بک بک سے تنگ آ کر خاموش ہو رہے۔ اہل ثقیف سمجھے کہ شاید حضور ہمارے مطالبات پر غور کر رہے ہیں اس لئے مزید خوشامد آمیز باتیں کرنے لگے۔ بالآخر حضرت عمرؓ نے ڈانٹ کر سب کو خاموش کیا اور آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔ (معالم وسراج)

سعید بن جبیر کی روایت ہے کہ کفار قریش نے حضور اقدس کو حجر اسود کے چھونے سے روک دیا اور بولے جب تک ہمارے بتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ گے ہم سنگ اسود کو نہ چھونے دیں گے۔ ممکن تھا کہ حضور کے دل میں خیال پیدا ہو جاتا کہ بتوں کے چھونے میں کیا حرج ہے، حجر اسود کو بوسہ دینے کا موقع ملے گا، اس لئے آیت میں ممانعت کا حکم نازل فرمایا۔

ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ابوجہل، اُمیہ بن خلف اور بعض دوسرے سرداران قریش نے خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا اگر آپ ہمارے بتوں کو صرف ہاتھ لگا دیں گے تو آپ کے مذہب میں ہم داخل ہو جائیں گے۔ حضور نے نرمی سے ان کو سمجھانا شروع کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ کذا روی عن جابر بن عبداللہؓ۔

جبیر بن نفیرؓ کی روایت ہے کہ قریش نے خدمت اقدس میں عرض کیا اگر آپ کو ہمارے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے تو ان رذیل غلاموں کو اپنے پاس سے الگ کر دو تاکہ ہم لوگ آپ کے پاس آ سکیں۔ حضور اقدسؐ مشورہ کے بعد کچھ مائل ہو گئے تھے کہ آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔

یہ تمام مذکورہ واقعات آیت کے نزول کے اسباب ہیں چونکہ نبی کا دینی فعل وحی کے بغیر نہیں ہوتا، اس لئے اگر حضور اقدسؐ کفار کی خواہش پوری کر دیتے تو لوگ حضور کے اس فعل کو خدا کا فعل سمجھتے اور واقع میں یہ غلط انتساب ہوتا جس کو قرآنی الفاظ میں افتراء کہا گیا ہے۔

یاد رہے کہ آیت میں کافروں کی مکاری اور چال کی قوت بیان کرنا مقصود ہے۔ حضور کا میلان طبع ظاہر کرنا مقصود نہیں۔

حاصل اس ارشاد (وَاِنْ كَادُوْا سے نَصِيْرًا تک) یہ ہے کہ کافروں کی مکاری اس قدر زبردست تھی کہ اگر آپ وحی قرآن کو چھوڑ کر اس پر عمل کر لیتے تو

دونوں جہان کی سعادت کھو بیٹھتے، مگر تائیدِ الٰہی اور عصمتِ نبوی نے آپ کی دستگیری کی اور ان کی چالاکیوں کی طرف مائل بھی نہ ہونے دیا ورنہ قوت بشری کو دیکھو کر میلان طبع ہو جانا دشوار نہ تھا۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ سے تَحْوِيْلًا تک۔

جب یہودیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ میں رہنا ناگوار گزرا تو بولے محمد! اکثر نبی ملک شام میں آئے ہیں۔ اگر تم بھی انبیاء کی اس مقدس سرزمین میں جا بسو تو ہم تم کو سچا نبی مان لیں۔ حضور کو یہودیوں کے کہنے کا کچھ خیال پیدا ہوا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور کچھ ہی دنوں کے بعد یہودیوں کا خاندان قریظہ مقتول اور دوسرا خاندان نضیر جلاوطن ہوا۔

باعتبار اصول روایت اس قصہ کی اسناد میں ابن کثیر نے شبہات وارد کئے ہیں۔ اگر روایت صحیح مان لی جائے اور درایت کو بھی دخل دیا جائے تب یہ آیت مدنی ہوگی مکی نہ ہوگی۔ حالانکہ پوری سورت مکی ہے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ کفار مکہ نے دار الندوہ میں جمع ہو کر حضور اقدس کو مکہ سے جبراً نکالنے کا مشورہ کیا تھا۔ بعض نے لکھا ہے کہ جملہ مشرکین عرب مراد ہیں جو حضور کو اس غرض سے سخت تکالیف اور ایذائیں دیتے تھے کہ کسی طرح آپ دل برداشتہ ہو کر ملک عرب کو چھوڑ دیں اور کہیں دوسرے ملک میں جا بسیں ورنہ کم سے کم مکہ ضرور چھوڑ دیں، مگر آپ استقلال کے ساتھ جمے رہے۔ آخر ہجرت کا حکم ہوا اور با امن و اطمینان آپ نے مدینہ کو مسکن بنایا۔ دوسرے سال جنگ بدر کا واقعہ ہوا اور حضور کو مکہ سے نکالنے کا مشورہ کرنے والے سرداران کفر جنگ میں مارے گئے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ یہود یا کفار مکہ آپ کو وطن (مکہ یا مدینہ) کی سرزمین سے نکال دینا چاہتے تھے۔ اگر وہ ایسا کر بیٹھتے تو ان کو بھی وطن میں زیادہ رہنا نصیب نہ ہوتا۔ کیونکہ گزشتہ پیغمبروں کے متعلق بھی خدا تعالیٰ کا یہی دستور العمل رہا ہے یعنی جب کافروں نے پیغمبر وقت کو ایذائیں دیکر جلاوطن کیا تو ان کو بھی چین سے رہنا نصیب نہ ہوا اور پیغمبر کے جانے کے بعد عذاب میں مبتلا ہوئے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ سے سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا تک۔

گزشتہ آیات میں عقائد معاد، تبرت اور مختلف معاشرتی اخلاقی اور تمدنی احکام کو تفصیل سے بیان فرمایا تھا۔ صرف عبادات کی توضیح کرنی باقی تھی۔ عبادات میں سب سے زیادہ اہم نماز ہے اسی کو عماد دین کہا گیا ہے، اس لئے نماز کی فرضیت کسی قدر تفصیل کے ساتھ ان آیات میں بیان فرمائی۔ اس کے علاوہ آیت مذکورہ بالا میں رسول اللہ کو خارج البلد کرنے کا ناپاک ارادہ اور اجتماعی مشورہ ظاہر فرمایا تھا۔ قومی دشمنوں کا جتھا اور پھر یہ ہے جتھے کا ایذا رسانی پر اجتماع یقیناً ہر شخص کیلئے باعث خطرہ ہو سکتا ہے۔ حضور اقدس بھی فطرت بشری سے خالی نہ تھے، اس لئے ممکن تھا کہ کفار کی یورش سے آپ کو اندیشہ پیدا ہو جاتا اور دل میں کچھ گھبراہٹ ہوتی بنا بریں نماز کا حکم دیا۔ کیونکہ نماز ہر خوف و ہراس کو دور کر دیتی ہے۔ مناجات الٰہی سے تمام طاغوتی طاقتوں کا ڈر زائل ہو جاتا ہے۔ تشویش دماغی دور ہو کر روح میں سکون اور دل میں اطمینان پیدا ہو جاتا ہے، تمام اسباب سے نظر ہٹ کر ذات مسبب پر جم جاتی ہے۔ اسی لئے صحیح الاسناد حدیث میں آیا ہے کہ جب کوئی دشوار کام پیش آجاتا تو حضور والا نماز کی طرف رجوع فرماتے۔ ہم آیات کا تفسیری مطلب بیان کرنے سے تحلیل اجزا کر کے ہر جز کی تنقیح کرتے ہیں تاکہ تفسیر معنی کے سمجھنے میں سہولت ہو۔

(۱) اَقِمِ الصَّلٰوةَ یہ حکم وجوبی ہے۔ باجماع مفسرین اس سے نماز پنجگانہ مراد ہے۔ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا ہمارے اور مشرکوں کے درمیان (یعنی کھلی ہوئی حد فاصل) نماز ہے۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جس نے قصداً نماز ترک کی وہ کافر ہو گیا۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ کفر تنبیہی ہے یعنی کفر سے قریب ہو گیا اور امام شافعی کے نزدیک کفر حقیقی ہے۔ قصداً ترک صلوٰۃ سے آدمی مرتد واجب القتل ہو جاتا ہے۔

(۲) لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ۔ دُلُوْك کے لغوی معنی ہیں ہٹ جانا، ٹل جانا، وقت زوال اور وقت غروب کے آفتاب کو عرب دالک کہتے ہیں (لقول ازہری) اس لئے کہ ان دونوں وقتوں میں آفتاب ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف ٹل جاتا ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ دلوک شمس کا وہ وقت ہے جب آفتاب غروب ہو جائے یا زرد پڑ جائے یا ایک طرف کو جھک جائے یا ٹھیک خط نصف النہار سے اتر جائے۔ لغوی معنی کے اختلاف کی وجہ سے تفسیری مراد میں بھی تابعین و صحابہ کا اختلاف ہے۔ ابن مسعود، نخعی، مقاتل، سدی، مجاہد اور ابن زید وغیرہ کے نزدیک آیت میں دلوک سے مراد غروب آفتاب ہے۔ واحدی نے بسیط میں حضرت علیؓ کی طرف بھی اس قول کو منسوب کیا ہے، لیکن ابن عباس، ابن عمرؓ، جابر بن عبداللہؓ، ابو برزہ اسلمی صحابیؓ اور دیگر اکابر تابعین و علماء کا قول ہے کہ دلوک سے وقت زوال مراد ہے۔ جمہور کا بھی یہی مسلک ہے ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ایک روایت میں ابن مسعود، ضحاک اور مجاہد کا بھی یہی قول منقول ہے۔ اس قول کا استشہاد دو حدیثوں سے کیا جاتا ہے۔ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا تھا۔ امانی جبرئیل

لدلوک الشمس حین زالت فصلی بی الظہر۔ جبرئیل دلوک آفتاب یعنی زوال کے وقت میرے پاس آئے اور مجھے ظہر کی نماز پڑھائی۔ ظاہر ہے کہ ظہر کی نماز غروب آفتاب کے وقت نہیں ہوتی۔ پھر حضور ؐ نے دلوک کی تشریح زوال سے خود ہی فرمادی۔ دوسری حدیث حضرت جابرؓ سے مروی ہے جابرؓ فرماتے ہیں میں نے رسول پاک ؐ اور صحابہ کی دعوت کی۔ حضور ؐ کھانے سے فارغ ہوکر زوال آفتاب کے وقت میرے گھر سے چلے اور باہر نکل کر آ کر فرمایا دلوک زوال آفتاب کے دلوک کا وقت ہے۔ جمہور کے مسلک پر زوال آفتاب سے رات کی تاریکی چھا جانے تک چار نمازوں کا حکم ہوا۔ ظہر، عصر، مغرب، عشاء۔ ابن عادل اور امام رازی نے اس کی صراحت کردی ہے۔

(۳) وَقُرْآنَ الْفَجْرِ اس سے صبح کی نماز مراد ہے، عشاء اور فجر کی نماز میں نیز مغرب اور ظہر کی نماز میں چونکہ کافی فصل ہوتا ہے۔ پھر فجر کی نماز میں جو ذہنیت، ہیبت اور استقبال حالت کے مہتم بالشان تاثرات ہوتے ہیں، اسی لئے نماز صبح کو مستقل طور پر بیان فرمایا۔ اس طرح سے پانچوں نمازوں کا حکم ہوگیا جس پر سنت متواترہ سے عمل درآمد ہو رہا ہے۔ عقلی طور پر بھی پنجگانہ فرائض کا ثبوت مکمل ہو سکتا ہے جو تفصیل طلب ہے۔ مختصر یہ کہ اگرچہ ہر آن و ہر سیکنڈ عالم میں تغیر اور انقلاب ہوتا رہتا ہے، کوئی لمحہ تبدیل حالات و کیفیات سے خالی نہیں، لیکن نمایاں اور محسوس تغیر صرف پانچ ہی وقت ہوتا ہے جس کو ہر عامی اور بے پڑھا لکھا آدمی بھی جانتا اور محسوس کرتا ہے۔ ایک تو زوال آفتاب کے وقت جب آفتاب اپنا انتہائی عروج ختم کر چکتا ہے۔ دوسرا اس وقت جب آفتاب کی تمازت و حدت میں نمایاں کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ تیسرا اس وقت جب آفتاب غروب ہو جاتا ہے اور رات کی تاریکی مشرق سے پھیلنے لگتی ہے۔ چوتھا اس وقت جب رات کی تاریکی تمام عالم پر کافی طور پر مسلط ہو جاتی ہے اور سکون جسمانی و روحانی کا کافی وقت آجاتا ہے۔ پانچواں اس وقت جب آفتاب کی آمد کی ہراول فوج یعنی صبح صادق کی روشنی اُفق پر نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ پانچوں اوقات واضح تغیرات کے ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان اوقات میں عبادتِ الٰہی (بطور سنت متواترہ) فرض ہے۔

(۴) اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا۔ شہود وہ شئی اور وہ آدمی جس کے پاس لوگ جمع ہوں۔ صبح کی نماز میں دن اور رات کے فرشتے جمع ہوتے ہیں۔ رات کے فرشتے جو انسان کے اعمال کے نگراں اور اس کے محافظ ہیں جاتے ہیں اور دن کے آتے ہیں یا یوں کہا جائے کہ جماعت فجر کے حاضرین کے متعلق اللہ کے پاس جا کر فرشتے شہادت دیتے ہیں۔ دونوں مطلب کی تائید احادیث صحیحہ سے ہوتی ہے۔

حافظ ابن کثیر نے ابن مسعودؓ و ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت بیان کی ہے کہ نماز فجر میں رات و دن کے ملائکہ حاضر ہوتے ہیں۔

بخاری نے مرفوعاً بیان کیا کہ جماعت کی نماز انفرادی نماز سے پچیس درجہ افضل ہے اور فجر کی نماز میں شب و روز کے ملائکہ جمع ہوتے ہیں۔ اگر اس کا ثبوت چاہتے ہو تو قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا پڑھو۔ یہ آخری فقرہ حضرت ابوہریرہؓ کا ہے۔

احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، حاکم، بیہقی اور ابن مردویہ وغیرہ نے اسی مضمون کی مرفوع حدیث نقل کی ہے۔

صحیحین میں ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث ہے کہ رات و دن کے ملائکہ علی التعاقب آتے ہیں۔ نماز فجر اور نماز عصر میں دونوں گروہوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ رات والے فرشتے جب صعود کرتے ہیں تو خدا تعالیٰ باوجود کامل طور پر جاننے کے فرشتوں سے دریافت کرتا ہے کہ میرے بندوں کو تم نے کس حال پر چھوڑا؟ وہ عرض کرتے ہیں پروردگار! جب ہم ان کے پاس گئے تھے اس وقت بھی نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم نے ان کو چھوڑا تب بھی وہ نماز میں تھے۔ اس حدیث سے دونوں باتیں معلوم ہوئیں۔ اول یہ کہ نماز فجر میں شب و روز کے ملائکہ جمع ہوتے ہیں۔ دوئم یہ کہ رات کے فرشتے بارگاہِ الٰہی میں جا کر حاضرین صلوٰۃ فجر کے متعلق شہادت دیتے ہیں۔ گویا شہود کے دونوں معنی صحیح ہوگئے۔

(۵) وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ۔ ابوعبیدہ اور ابن الاعرابی نے کہا ہجود لغات اضداد میں سے ہے۔ اس کے معنی خواب کے ہیں، لیکن باب تفعل میں لاکر ترک خواب کے معنی ہو جاتے ہیں۔ جیسے اِثم گناہ کرنا اور تأثم گناہ کو ترک کرنا۔ اسی طرح ہجود سونا اور تہجد خواب کو ترک کرنا۔ نماز تہجد کے لئے شروع رات میں سونا ضروری ہے۔ سو کر اُٹھنے کے بعد نماز تہجد ہوتی ہے۔ یہ قول مجاہد، علقمہ اور اسود کا ہے۔ واحدی نے کہا رات کو نفل نماز پڑھنا (یعنی سو کر اُٹھنے کے بعد ہو یا رات بھر نہ سوئے) تہجد ہے۔ باتفاق جمہور علماء نماز تہجد کا وقت آدھی رات کے بعد سے صبح صادق تک ہوتا ہے۔ خواہ ابتدائی نصف میں سو جائے یا نہ سوئے۔ رسول پاک ؐ تہجد کی نماز ہمیشہ پڑھتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کے قول سے ثابت ہے کہ رمضان و غیر رمضان میں حضور ؐ کی تہجد کی نماز گیارہ رکعت سے زائد نہ ہوتی

تھی ۔ چار چار نفلوں کی نیت باندھتے تھے اور تین وتر پڑھتے تھے دو دو رکعت کی نیت باندھنا بھی بعض احادیث صحیحہ سے ثبوت ملتا ہے ۔ زید بن خالد الجہنی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور تیرہ رکعت پڑھتے تھے

(۶) نَافِلَةً لَّكَ کیا نماز تہجد واجب تھی؟ اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے ۔ صحیح فیصلہ یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں (سورہ مزمل کی صراحت کے بموجب سب پر تہجد کی نماز واجب تھی تو نَافِلَةً لَّكَ کا کیا مطلب ہے؟ اس کی توضیح اس طرح کی گئی ہے کہ نافلہ سے نفل اصطلاحی مراد نہیں بلکہ نافلہ کا ترجمہ ہے زائد ۔ یعنی تہجد کی نماز فرائض پنجگانہ پر زائد ہے ۔ خواہ یہ زیادتی بطور استحباب ہو یا بطور وجوب ۔ حضور اقدس ﷺ کے لئے یہ زیادتی بطور وجوب تھی اور عام امت کے لئے بطور نفل ۔ ابن عباس ، عام شوافع واحناف اور ابن جریر وغیرہ کا یہی قول ہے ۔ صحیح مسلم ، سنن بیہقی اور طبرانی کی معجم کی اوسط روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے اس وقت ترجمہ یہ ہوگا کہ آپ تہجد کی نماز پڑھیں ۔ تہجد کی نماز بطور وجوب مزید مقرر کی گئی ہے ۔ لیکن واحدی اور مجاہد وغیرہ کا قول ہے کہ تہجد کی نماز حضور ﷺ کے لئے بھی نفل ہی تھی ۔ وجوب جس طرح تمام امت سے ساقط ہو گیا اسی طرح حضور ﷺ سے بھی ساقط ہو گیا ۔ مسند امام احمد میں ابی امامہ باہلی کی روایت کی جو روایت موجود ہے اس سے اس کی تائید ہوتی ہے ۔ رہی یہ بات کہ جب رسول پاک ﷺ کے لئے بھی تہجد کی نماز نفل تھی تو پھر تخصیص کی کیا وجہ؟ اس کی توجیہ واحدی نے اس طرح کی ہے کہ تہجد کی نماز سے حضور ﷺ کے مراتب کی بلندی اور زیادتی مقصود تھی ۔ گناہوں کی معافی کے لئے تہجد کے نوافل نہ تھے ۔ کیونکہ حضور ﷺ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف فرما دئے گئے تھے ۔ اسی لئے جب کثرت قیام شبینہ کی وجہ سے حضور ﷺ کے قدموں پر ورم آگیا اور صحابہ نے عرض کیا حضور ﷺ کیوں اس قدر ریاضت کرتے ہیں ۔ آپ کے تو اگلے پچھلے سب گناہ خدا تعالیٰ نے معاف کر دئے ہیں تو حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ قیام شب مجھ پر واجب ہے ۔ بلکہ فرمایا (میں اس بات کا شکر ادا کرنا چاہتا ہوں) کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں ۔ ہاں امت کے لئے تہجد کی نماز اگرچہ نفل ہے ، مگر گناہوں کی معافی کا سبب ہے ۔ اس سے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے ۔ صرف حضور ﷺ کے لئے یہ نماز خصوصیت کے ساتھ زائد تھی یعنی کفارۂ ذنوب کا سبب نہ تھی بلکہ رفع درجات اور ازدیاد مراتب کا ذریعہ تھی اور ہمارے لئے زائد نہیں یعنی گناہوں کی معافی کا ذریعہ ہے

(۷) مقامِ محمود ۔ پسندیدہ مقام یعنی مقام شفاعت یا وہ مقام جہاں حضور ﷺ کو قیامت کے دن لواء الحمد عطا کیا جائے گا ۔ ابن کثیر نے حضور والا ﷺ کی گیارہ خصوصیات ذکر کی ہیں جو قیامت کے دن بامر الٰہی سرکار عالی ﷺ کو عطا کیا جائے گا...... ابن کثیر نے حضور والا ﷺ کی گیارہ خصوصیات ذکر کی ہیں جو قیامت کے دن بامر الٰہی سرکار عالی ﷺ کو عطا کی جائیں گی ۔ (۱) سب سے پہلے زمین سے حضور ﷺ ہی برآمد ہوں گے ۔ (۲) میدان محشر میں سوار ہو کر چلیں گے (۳) آپ کے دست مبارک میں لواء الحمد ہوگا اور تمام انبیاء زیر سایہ ہوں گے ۔ (۴) حوض کوثر کا اختیار آپ ہی کو ہوگا ۔ (۵) شفاعت کبریٰ کا حق آپ ہی کو ہوگا (۶) آپ ایسے لوگوں کی شفاعت کریں گے جن کو دوزخ میں لے جانے کا حکم ہو چکا ہوگا اور حضور ﷺ کی شفاعت سے ان کو دوزخ سے واپس کر دیا جائے گا ۔ (۷) ہر نبی کی امت سے پہلے آپ کی امت کا فیصلہ ہوگا (۸) سب سے پہلے پل صراط پر آپ ہی عبور کریں گے ۔ (۹) جنت میں سب سے پہلے آپ ہی داخل ہوں گے ۔ (۱۰) مقام وسیلہ آپ ہی کو عطا ہوگا ۔ (۱۱) سب امتوں سے پہلے آپ ہی کی امت جنت میں داخل ہوگی ۔

اس آیت میں صرف مقام محمود کا تذکرہ ہے جس کے متعلق کتب احادیث میں صحیح الاسناد روایات بکثرت موجود ہیں ۔ اختلاف الفاظ کو چھوڑتے ہوئے ہم خلاصہ لکھتے ہیں ۔ قیامت کی سختی ، ہولناکی اور شدت تکالیف سے گھبرا کر لوگ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر تمام بڑے بڑے انبیاء کے پاس جائیں گے اور امداد کے خواستگار ہوں گے ۔ مگر ہر شخص نفسی نفسی کہتا ہوا اعانت سے انکار کرے گا اور اپنی کمزوری کو بطور معذرت پیش کرے گا ۔ بالآخر حضور اقدس کی خدمت میں حاضر ہو کر التجا کریں گے ۔ حضور والا ﷺ بیکسوں کے حامی اور مصیبت زدوں کے دستگیر ہیں درخواست قبول کرلیں گے اور فرمائیں گے ہاں الحمد للہ آج یہ میرا ہی کام ہے ۔ اس کے بعد سر بسجود ہو کر دیر تک اللہ کی حمد و ثنا ان گنہگاروں کے لئے دعا کرتے رہیں گے ۔ حکم ہوگا محمد ﷺ سر اٹھاؤ کہو آج تمہارا کہا سنا جائے گا ۔ شفاعت کرو تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی ۔ مانگو ۔ جو مانگو گے تم کو دیا جائے گا ۔ حضور ﷺ گنہگاروں کی معافی کی التجا کریں گے ۔ گنہگاروں کی ایک مقررہ تعداد کو دوزخ سے رہائی مل جائے گی ۔ دوبارہ میں گر کر مزید درخواست کریں گے ۔ پھر ایک مقررہ تعداد دوزخ سے خلاصی پائے گی ۔ تیسری بار پھر سر بسجود ہو کر التجا کریں گے تو سوائے کفار ومشرکین کے سب کو دوزخ سے نکال لیا جائے گا ۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ پانچوں وقت کی نماز پابندی سے اعتدال ارکان کے ساتھ پڑھو ۔ خاص کر فجر کی نماز تو بہت اہم ہے ۔ کیونکہ فجر کی نماز میں شبانہ روز کے فرشتوں کا اجتماع ہوتا ہے فجر کی نماز کے علاوہ باقی چار نمازوں کے اوقات زوال آفتاب سے لے کر رات کی تاریکی چھا جانے کے وقت تک ہیں اور رات کے کچھ حصہ میں تہجد کی نماز پڑھا کرو یہ نماز تمہارے لئے زائد ہے ۔ اس زیادتی کی وجہ یہ ہے کہ عنقریب مقام محمود میں تم کو (شفاعت کرنے کے لئے) کھڑا کیا جائے گا اور

اس مقام کے حصول کے لئے نشاط سازگار ضروری ہے۔

سکون روحانی اور اطمینان قلبی کے حصول کی تدبیر جب بتا چکا تو اس سے اُس امر مقرر کے متعلق دعا کرنے کی تلقین جو کفار کی قوت سے نہیں بلکہ اسلامی مصالح کے پیش نظر ہونا ضروری تھا۔ بہ مشیت الٰہی مکہ چھوڑنا اور مدینہ میں سکونت رکھنا ضروری تھا۔ اسلام کی ترقی اور اشاعت بظاہر اسباب اسی پر موقوف تھی۔ مکہ وسط حجاز میں تھا۔ جزیرۂ عرب کے باہر کہیں بیٹھ کر تبلیغ اسلام کرنی دشواری سے خالی نہ تھی۔ مدینہ شام سے کسی قدر قریب تھا۔ یہاں سے وفود روانہ کرنا اور اشاعت اسلام کو تا رسنا سہل کرنا۔ اس لئے بہ نسبت مکہ کے مدینہ کی سکونت قابل ترجیح تھی، لیکن ترک وطن بھی آسان کام نہیں۔ بہت سے لوگ ترک وطن کرتے ہیں، لیکن کہیں حصول مال کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، کہیں حکومت و تسلط کا عاطفہ برسرکار آتا ہے، کہیں انتقام کا داعیہ ہیجان انگیز ہوتا ہے اور یہ سب نفسانی جذبات ہوتے ہیں جو پیغمبر کے لئے کسی طرح زیبا نہیں۔ نبی کی زندگی تو دعوت حق کے لئے وقف ہونی ضروری ہے۔ دنیوی اغراض جو مقاصد ہیں اس کا مطمح نظر بہت بلند ہونا لازم ہے اس لئے سچائی کے ساتھ ترک وطن کی دعا کرنے کی تعلیم دی۔ پھر جہاں جانا تھا وہاں کے لوگ چشم براہ بیٹھے ہوئے تھے، بچہ بچہ مشتاق قدوم تھا، عورتیں اپنی آنکھوں کو فرش راہ بنانے کے لئے تیار تھیں، بہادروں کی کافی جماعت حمایت پر آمادہ تھی، معاہدہ ہو چکا تھا، اس لئے ممکن تھا کہ کفار مکہ کی ظالمانہ یورش اور بے رحمانہ برتاؤ سے رہائی کے وقت مدینہ والوں کی شفقت و حمایت کا انسانی تخیل پیدا ہوتا اور حضور والا باقتضائے بشری ظاہری اسباب کی سازگاری پر بھروسہ کرنے کا تصور قائم کر لیتے۔ اس سے مدینہ میں خلوص نیت اور سچائی کے ساتھ داخل ہونے کی دعا کی تلقین فرمائی اور ارشاد دیا قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ الخ۔ پھر مدینہ کی سرحدیں ان تمام سلطنتوں کی حدود سے ملتی تھیں جو اس زمانے میں مشرق و مغرب کی سب سے زیادہ پُر جلال و باجبروت سلطنتیں تھیں یعنی حکومت ایران اور دولت روم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ میں رکاوٹ پیدا کرنا اور مانع آنا ان حکومتوں کی طرف سے یقینی امر تھا۔ اسلام کا سیلاب مدینہ میں رکنے والا نہ تھا، اس کا بہاؤ فارس و روم کی طرف بھی ہونا لازم تھا، مگر ان ممالک کی شہ سواروں سے بند بھی ایسے سخت باندھ رکھے تھے کہ کوہ افگن طوفان بھی ان کو نہ توڑ سکتا تھا، اس لئے قوت و شوکت اور غیبی امداد کے حصول کے لئے دعا کرنے کا بھی حکم دیا اور فرمایا۔ وَاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۝

مقصود بیان

اللہ کی طرف کسی چیز کا غلط انتساب افتراء ہے خواہ دعویٰ نبی ہی کرے۔ نبی کو ہر وقت تائید غیبی حاصل ہوتی ہے اسی وجہ سے وہ معصوم ہوتا ہے ورنہ باتقاضائے بشریت گمراہی کی طرف میلان ہو جانا ناممکن نہیں ہے۔ اگر خدا کی مدد و رہنمائی نہ ہو تو اس پر دنیا و دین میں دوہرا عذاب ہوگا۔ کفار مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خارج البلد کرنے کی ہر امکانی کوشش کی تھی، مگر وقت مقررہ سے پہلے کچھ نہ کر سکے جب اسلامی ضروریات کے پیش نظر مشیت الٰہی ہوئی تو حضور نے ترک وطن کیا کافروں کے خوف سے نہیں کیا۔ پیغمبر کو وطن سے نکالنے والے کبھی سرسبز نہ ہوئے چنانچہ وہ کفار جو دارالندوہ میں جمع ہو کر رسول پاک کو نکالنے کا مشورہ کر رہے تھے تھوڑی مدت میں سب کے سب ہلاک ہو گئے۔ آخری آیت بتا رہی ہے کہ قانون قدرت اور ضابطۂ الٰہی میں کبھی شخصی یا قومی ترمیم و تغیر نہیں ہوتی۔ اس صراحت سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ وہ جھوٹے مدعیان تصوف جو بعض چیزوں کو اپنے لئے خصوصیت کے ساتھ جائز بنا لیتے ہیں غلطی پر ہیں۔ قرآن نے جس چیز کو حلال کر دیا وہ ہمیشہ کے لئے سب کے واسطے حلال ہے اور جس چیز کو حرام کر دیا وہ ہمیشہ سب کے لئے حرام ہے۔ خصوصیات امرا اور اس میں دخل نہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ نبی کی ذات کے لئے کچھ مخصوص احکام ہوں جن کا خصوصی حکم وحی کے ذریعہ پیغمبر کو دیا گیا ہو مثلاً حضرت ابراہیم کو ذبح اسمٰعیل کا حکم دیا گیا یا رسول اللہ کے لئے نو بیویاں اجتماعی صورت میں حلال کر دی گئیں یا مال صدقہ کا کھانا حضور کے لئے حرام کر دیا گیا یا تہجد کی نماز فرض کر دی گئی وغیرہ

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ

تم کہدو کہ حق آگیا اور باطل نابود ہوگیا بے شک باطل نابود ہونے والا ہی تھا ہم قرآن کی وہ آیتیں نازل کرتے ہیں

مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ۝

جو ایمانداروں کے لئے شفاء اور رحمت ہے اور ظالموں کے نقصان میں تو اور اضافہ ہی ہوتا ہے

نہ کبھی امداد پر ہو۔ نہ ہر اسباب کو مؤثر جانے اگر نا کارہ بھی نہ سمجھے بلکہ اللہ سے سارے غیر مادی اسباب اعانت کی دعا کرتا ہے۔ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا الخ وصاف بتا رہے ہیں کہ حق پر باطل غالب نہیں آ سکتا، انجام کار حق کو فتح اور باطل کو شکست ہوتی ہے (لیکن ہر کام وقت پر ہوتا ہے، باطل کے عارضی غلبہ کو دیکھ کر کسی کو مایوس نہ ہونا چاہیے۔ دائم) قرآن پاک روحانی وجسمانی امراض کے لئے شفا ہے۔ اگر ایمان واعتقاد شرط ہے کفار کو تو اس سے بجائے نفع کے نقصان ہوتا ہے۔ ان کے عناد کا جذبہ تو اور مشتعل ہو کر ان کی بربادی کا باعث بنتا ہے وغیرہ۔

وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ ۖ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوسًا

اور جب انسان کو ہم نعمت دیتے ہیں تو وہ اعراض کرنے لگتا ہے اور پہلو بدل لیتا ہے اور جب اس پر مصیبت آتی ہے تو نا امید ہو جاتا ہے

قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ سَبِيلًا ع

کہہ دے کہ ہر شخص اپنے طریقہ پر عمل کرتا ہے تمہارا رب خوب واقف ہے کہ کون زیادہ سیدھے راستہ پر ہے

تفسیر شاکلہ کا ترجمہ مختلف علماء نے مختلف طور پر کیا ہے۔ ابن عباسؓ نے ناحیہ، قتادہ اور حسن بصری نے نیت، مجاہد نے جبلت وطبیعت ابن زید نے دین اور زمخشری نے مذہب سے لفظ شاکلہ کی تفسیر کی ہے۔ بخاری نے کتاب التفسیر میں مجاہد کے قول کی تائید کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہی ہے۔ اگرچہ مفہوم سب کا قریب قریب ہے

آیت کا حاصل یہ ہے کہ انسان کی طبعی حالت یہ ہے کہ عیش کے وقت مغرور ہو کر خوف خدا کو دل سے نکال دیتا ہے۔ اس کو خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ مال چند روزہ ہے جس خدا نے یہ آسائش وآسودگی دی ہے وہ بہت جلد اس کو لے بھی سکتا ہے اور اگر مصیبت آتی ہے تو بجائے خدا کی طرف رجوع کرنے کے نا امید ہو جاتا ہے سمجھتا ہے کہ اب یہ تکلیف رفع نہ ہو گی۔ غرض یہ کہ علاوہ خدا کو متصرف نہیں اور اعیانی برائی پر قادر نہیں جانتا۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے محمد ان سے کہہ دو کہ ہر شخص اپنے طریقہ پر چل رہا ہے جو طریقہ جس کی جبلت وطبیعت میں مقرر ہو چکا ہے اس کے مطابق عمل کرتا ہے۔ راہ حق ناحق اور صحیح وغلط ہونا تو اس کا علم اللہ کو ہی ہے۔ بدکار اور نیکوکار کو وہ خوب جانتا ہے یعنی ہر ایک کو اس کے اعمال کے موافق جزا سزا دے گا

ایک شبہ اگر ہر شخص اپنی جبلت کے موافق عمل کرتا ہے اچھا یا برا تو چونکہ سرشت کا بدلنا ناممکن ہے اس لئے تعلیم وتہذیب اور تربیت بالکل بے سود ہے۔ انسان کو مطلق العنان چھوڑ دیا ہے۔

ازالہ تعلیم ضروری ہے بے سود نہیں کیونکہ بہت سے لوگ خراب صحبت یا اور کسی بیرونی اثر کی وجہ سے بدکاری کو لے لگتے ہیں۔ لیکن ان کی طبیعت میں نیکی اور سرشت میں خیر ہوتی ہے۔ اس لئے جس وقت ان کو صحیح تعلیم مل جاتی ہے تو فوراً بدکاری چھوڑ دیتے ہیں۔ ہاں یہ ممکن نہیں کہ سرشت میں بدی ہو اور تعلیم سے نیک بن جائے۔

مقصود بیان انسان کی عمومی حالت کا بیان اور اس امر کی صراحت کہ عام طور پر آدمی کا بھروسہ ظاہری مال ومتاع پر ہوتا ہے۔ خدا کی قدرت پر اس کو تکیہ نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے عیش میں مغرور ہو کے غم اور مصیبت میں نا امید ہو جاتا ہے۔ آیت میں اہل ایمان کی مدح اور اہل کفر وشرک کی مذمت ہے۔ سب لوگوں کی سرشت میں نہ خیر داخل ہے نہ شر۔ بلکہ بعض لوگوں کی تخلیق خیر پر ہے اور بعض کی شر پر۔ یہاں سے علمائے احناف کا وہ نزاعی مسئلہ کامل طور پر حل ہو گیا جس میں انسان کو باعتبار فطرت وخلقت کے اچھا یا برا کہا گیا ہے۔ آیت میں ادھر پر دو صراحت ہے کہ کوئی شخص مقدر کے خلاف نہیں کر سکتا۔ جیسا تقدیر فطری میں لکھ دیا گیا ہے ویسا ہی وہ عمل کرتا ہے وغیرہ

نوٹ:۔ قدیم ارباب حکمت کی تحقیقات کے بموجب انسانی اخلاق اس کے مزاج کے تابع ہیں۔ جیسا جسمانی مزاج ہو گا ویسے ہی اخلاق ہوں گے کسی کا مزاج صفراوی ہے تو وہی افعال واعمال اس سے سرزد ہوں گے اور وہی اس کی افتاد طبع ہو گی جو گرمی اور خشکی کا تقاضہ ہے اور اگر کسی کا مزاج بلغمی ہے

اس سے اُنہی اخلاق کا صدور ہوگا جو سرد ی اور تری کے زیر اثر ہوں گے اور چونکہ فطری مزاج کا بدل جانا ناممکن ہے، اس لئے حکماء کے نزدیک اخلاق بھی قابل تبدیل نہیں فطری اخلاق کے ناقابل تبدیل ہونے کی شریعت اسلامیہ بھی قائل ہے، لیکن وہ فطری اخلاق کو بدنی مزاج کے تابع نہیں قرار دیتی بلکہ روحانی صداقت و شقاوت کے زیر اثر جانتی ہے۔ آیت مذکورہ سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ امام احمد نے بسند منقطع حضرت ابو الدرداء کی ایک روایت پیش کی ہے کہ حضور والا نے فرمایا اگر تم یہ سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا تو مان لینا۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے، لیکن اگر یہ سنو کہ کوئی شخص اپنی سرشت سے ہٹ گیا تو تسلیم نہ کرنا کیونکہ عنقریب وہ پھر اپنی اصلی جبلت کی طرف لوٹ جائے گا۔

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ ۖ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَآ أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۝ وَلَئِن شِئْنَا

لوگ تم سے روح کی حقیقت دریافت کرتے ہیں تم کہہ دو کہ روح میرے رب کے امر سے ہے (یعنی تعلق الٰہی کا نام ہے) اور تم کو تھوڑا سا ہی علم دیا گیا ہے اگر ہم چاہیں تو

لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيٓ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهِۦ عَلَيْنَا وَكِيلًا ۝ إِلَّا رَحْمَةً مِّن

اس قرآن کو تمہارے پاس سے لے جائیں جو وحی کے ذریعہ سے تم کو بھیجا ہے پھر تم کو اُس کے لانے کے لئے ہمارے خلاف کوئی کارساز نہ ملے گا مگر یہ تمہارے رب کی مہربانی

رَّبِّكَ ۚ إِنَّ فَضْلَهُۥ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيرًا ۝ قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰٓ

ہے بلاشبہ اُس کا تم پر بڑا فضل ہے کہہ دو کہ اگر انسان و جنات اس قرآن کی طرح (کتاب) لانے پر جمع

أَن يَأْتُوا۟ بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْءَانِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِۦ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ۝

ہو جائیں تب بھی اس کی طرح نہ لاسکیں گے اگرچہ اُن میں سے ایک دوسرے کا مددگار ہو جائے

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْءَانِ مِن كُلِّ مَثَلٍ فَأَبَىٰٓ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا ۝

ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے طرح طرح سے ہر (طرح کی) مثال بیان کر دی مگر اکثر آدمی کفر کئے بغیر نہ رہے

تفسیر تفسیر مطالب سے قبل تین امور بحث طلب ہیں (۱) آیت کا سبب نزول کیا ہے؟ (۲) سوال روح کی حقیقت کے متعلق تھا یا کیفیت دخول کے متعلق؟ روح اور علم قلیل سے کیا مراد ہے؟

(۱) تفسیر سراج و معالم میں بروایت ابن عباس بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار چند قریشیوں نے جمع ہو کر کہا محمد ہم لوگوں میں پیدا ہوئے اور یہیں جوان ہوئے۔ ہمیشہ صادق و امین رہے۔ ہم نے دروغ و خیانت کا الزام کبھی ان پر نہیں لگایا، لیکن اب انہوں نے یہ دعویٰ کیا ہے، اس لئے کچھ لوگوں کو یہودیوں کے پاس بھیج کر دریافت کرنا مناسب ہے، وہ اہل کتاب ہیں شاید کچھ بتا سکیں۔ باتفاق رائے کچھ آدمی مدینہ گئے اور یہودیوں سے کیفیت واقعہ دریافت کی توریت کے حامل بولے اُن سے تین باتیں دریافت کرو۔ اگر تینوں کا جواب دے دیں تو سمجھ لیں نبی نہیں ہیں اور اگر کسی کا جواب نہ دیں تب بھی نبی نہ ماننا چاہیے۔ ہاں دو باتیں بتا دیں تو نبی ہیں۔ اول یہ پوچھو کہ گزشتہ زمانہ میں چند جوان گم ہو گئے تھے اور ان کا واقعہ بڑا عظیم الشان ہوا وہ کون لوگ تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ کون شخص تھا جو سرحد مشرق و مغرب تک پہنچا تھا؟ تیسری بات یہ کہ روح کیا چیز ہے؟ یہودیوں کے مشورہ کے موافق قریش نے حضور والا سے تینوں سوال کئے۔ آپ نے فرمایا کل جواب دوں گا۔ چونکہ انشاء اللہ نہ فرمایا تھا، اس لئے وحی میں تاخیر ہو گئی بقول مجاہد ۱۲ روز تک اور بقول بعض پندرہ یا انیس روز تک، وحی نہ آئی۔ اہل مکہ کا تقاضا ہوا۔ حضور غمگین ہوئے تو جبرئیل آیت وَلَا تَقُولَنَّ لِشَاىْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا إِلَّا أَن

ان شاء اللہ وغیرہ کہہ دے اور اس کے بعد تینوں سوالات کا جواب دیا گیا۔ ایک کا جواب آیت أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ میں دیا گیا۔ دوسرے کا جواب آیت وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ الخ میں نازل ہوا اور تیسرے سوال کا مبہم جواب وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ الخ میں دیا گیا۔ اس روایت کے مضمون کی تائید بعض دوسری روایات سے بھی ہوتی ہے۔ اس روایت کے بموجب آیت مکی ہے۔ کیونکہ رہنے والوں ہی سے سوال کرنے والے بھی اہل مکہ ہی تھے اگرچہ ان کے معلم یہودی تھے۔ لیکن بخاری و مسلم نے بموجب نزول روایت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کیا ہے اس کا تعلق ہے۔ اس کی تائید امام احمد کی نقل کردہ حدیث سے بھی ہوتی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک روز حضور والا مدینہ سے باہر جا رہے تھے۔ دست مبارک میں کھجور کی چھڑی تھی۔ ابن مسعودؓ ہمرکاب تھے۔ کچھ یہودیوں کی طرف سے گزر ہوا یہودیوں نے آپس میں کہا اس شخص سے روح کے متعلق سوال کرو۔ بعض نے منع کیا۔ بعض نے اصرار کیا۔ بالآخر حضور سے دریافت کر ہی بیٹھے۔ وحی کا نزول ہوا اور آیت وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ تلاوت فرمادی۔ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ مدنی ہے ابن کثیر نے ظاہر سیاق کا لحاظ کرتے ہوئے مکی ہی قرار دیا ہے۔ لیکن اہل تحقیق کے دونوں میں توفیق اس طرح کی ہے کہ آیت کا نزول تو مکہ میں قریش کے جواب میں ہوا اور مکہ میں ہی نازل ہوئی۔ لیکن جب مدینہ میں یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کی آزمائش کے لئے روح کی بابت استفسار کیا تو حضورؐ نے وحی کا انتظار کرنے کے بعد وہی آیت فرمادی جو مکہ میں کفار قریش کو جواب دینے کے وقت نازل ہوئی تھی۔ اس توفیقی مضمون کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ابن مسعودؓ نے یہ نہیں فرمایا کہ اس وقت مدینہ میں یہ آیت بذریعہ وحی نازل ہوئی بلکہ یہ الفاظ فرمائے کہ وحی کے بعد حضورؐ نے آیت وَيَسْأَلُونَكَ الخ فرمادی۔ گویا نزول آیت تو پہلے ہوچکا تھا مگر یہودیوں کے جواب کے وقت بھی حکم الٰہی حضورؐ نے گزشتہ آیت فرمادی۔

(۲) سوال حقیقت روح کا تھا یا عوارض کا؟ عام علماء تفسیر کا اجماعی قول ہے کہ یہودیوں نے روح کی حقیقت اور ماہیت دریافت کی تھی (کیونکہ یہودی اہل توریت تھے اور توریت میں روح کی حقیقت ظاہر نہیں کی گئی ہے۔ البتہ حکماء قدیم نے اس کے متعلق وہاں تک تو انتہائی بحث کی ہے۔ یہودیوں کو آزمائش کرنی چاہتے تھے کہ دیکھیں حقیقت روح پر محمد کوئی رائے زنی کرتے ہیں؟ اگر کریں تو سمجھ لیں نبی نہیں۔ جب توریت خاموش ہے تو پھر یہ کس طرح بیان کر سکتے ہیں (اور بعض نبی ہونے کے امکان ہیں) مختلف آثار و اخبار سے اس قول کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن ابن کثیر نے بروایت عوفی ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ یہودیوں نے حضور اقدسؐ سے دریافت کیا کہ ہم کو روح کی بابت جواب دو۔ اور یہ بھی بتاؤ کہ روح جو جسم کے اندر ہے کیا اس پر بھی عذاب ہوگا؟ اس قول سے ثابت ہوتا ہے کہ روح کی حقیقت اور بعض عوارض کے متعلق بھی سوال تھا۔ میرے نزدیک قابل ترجیح پہلی صورت ہے۔

(۳) علم قلیل سے کیا مراد ہے؟ محمد بن اسحاق نے بروایت عطاء بن یسار بیان کیا ہے کہ آیت وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا مکہ میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد جب حضورؐ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو علمائے یہود نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ اب وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا پڑھتے ہیں۔ کیا اس سے مراد صرف آپ کی اپنی قوم ہے؟ حضورؐ نے فرمایا آیت (کا صیغہ خطاب) سب کو شامل ہے۔ یہودی بولے آپ کو خود تسلیم ہے کہ ہم کو توریت دی گئی ہے جس کے اندر ہر چیز کا کھلا بیان موجود ہے۔ حضورؐ نے فرمایا علم الٰہی کے مقابلے میں یہ قلیل ہے۔ اللہ نے تم کو اسی قدر علم دیا ہے کہ اگر تم اس پر عمل کرو تو تم کو نفع ہو۔ حاصل روایت یہ نکلا کہ علم قلیل کیا ہے اور امر رب سے کیا مراد ہے؟ تو اس کے متعلق دنیا کے نکتہ دانشمندوں نے دماغ سوزی کی ہے۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ روح نام ہے خون کی لطیف بھاپ کا جس کے زور سے بدن دار کی کل چل رہی ہے۔ جب یہ بھاپ نہیں ہوتی تو سب کام بگڑ جاتے ہیں پھر مرنے کے بعد کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا بعد الموت نہ عذاب ہے نہ ثواب۔ یہ خیال اہل طبیعت اور دہریہ کا ہے۔ اطباء کا بیشتر گروہ بھی اسی کی طرف مائل ہے۔ روح کو لطیف بھاپ کہنا اپنی جگہ ضرور صحیح ہے مگر یہ نفس طبعی ہے جس کی تین قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ طبعی حیوانی، نفسانی۔ یہ روح طبعی مزدور کا پیشہ ہے۔ مرنے کے بعد کوئی چیز باقی نہیں رہتا۔ لیکن اس روح کے علاوہ بھی ایک اور روح ہے جو مرنے کے بعد ایک نورانی پیکر میں رہتی ہے جس کو پچھلی باتیں سب یاد رہتی ہیں۔ جو رنج و راحت بھی پاتی ہے جس پر عذاب و ثواب بھی ہوتا ہے۔ گزشتہ حکمائے یونان کا بھی یہی خیال تھا اور دور حاضر کے بعض فلاسفر بھی اسی کے قائل ہونے لگے ہیں۔ مادی عالم کے علاوہ ایک روحانی عالم کا ہونا بھی ان کو تسلیم ہوگیا ہے۔ ہندوؤں کا ایک گروہ اس روح کو قدیم اور غیر فانی مانتا ہے، افلاطون کے پیرو اور عام آریہ تناسخ کے قائل ہیں۔ آواگون ان کے نزدیک حق مسئلہ ہے، روح ایک بدن کو چھوڑ کر سزا و جزا بھگتنے کے لئے دوسرے مادی جسم میں اسی عالم میں اترتی ہے اور میدان عنصری میں پکڑ کر لاتی پھرتی ہے۔ یہ اسی وقت تک رہے گا جب تک روح میں نکل

صفائی نہ ہو جائے۔ جب مادّی کثافت بالکل نہ رہے گی اس وقت ہر روح قرب الٰہی میں پہنچ جائے گی۔ شریعت اسلامیہ تناسخ کی قائل نہیں۔ دوبارہ مادی پیکر میں آنے کو غلط قرار دیتی ہے، جزا سزا کا ایک خاص دن اس کے نزدیک مقرر ہے۔ بالبرزخی جسم اچھا یا برا ہو روح کو ملتا ہے جو مادی عنصری نہیں ہوتا بلکہ تمثالی ہوتا ہے پھر قیامت کے دن ضرور مادی جسم ملے گا۔

میں کہتا ہوں کہ روح نام ہے حقیقت اللہ کے پر تو اور جلوہ کا جو مادیت سے پاک اور مخلوقی صفت سے مقدس ہے۔ عالم دو ہیں۔ عالم خلق اور عالم امر عالم خلق یہی مادی عالم ہے جو محسوس، مبصر اور ضیا بصر ہے۔ دوسرا عالم وہ ہے جس کو عالم امر کہا جاتا ہے یہ غیر مادی ہے۔ اس کو عالم قدس کہنا زیادہ مناسب ہے۔ ملائکہ بھی اسی کے افراد ہیں، ارواح کا تعلق بھی اسی عالم سے ہے۔ فرشتوں کی طرح روح بھی نور مجسم ہے۔ روح کا تعلق بدن سے ہوتا ہے۔ آثار روح بدن پر جلوہ فگن ہوتے ہیں، لیکن جسم میں روح کا حلول نہیں ہوتا ورنہ بدن کو کاٹنے اور جلا ڈالنے سے روح کا کٹنا اور جلنا ضروری ہو جائے گا۔ جس طرح آفتاب کی روشنی پر تو فگن ہوتی ہے اسی طرح روح جلوہ انداز ہے۔ جس طرح پاور ہاؤس سے بجلی کے اثرات نکل کر مختلف مشینوں کو چلاتے ہیں اسی طرح روح کائنات (ذات باری کے آثار یعنی ارواح جزئیہ پیدا ہو کر زید، عمر، بکر، خالد وغیرہ کی جسمانی مشینوں کو حرکت دیتی ہے۔ جب تک روح کائنات کے فیض یعنی ارواح جزئیہ) کا اجسام کی مشینوں سے تعلق رہتا ہے ان اجسام کو زندہ کہا جاتا ہے۔ جب یہ تعلق منقطع ہو جاتا ہے جسم مردہ ہو جاتا ہے۔ ماہیت روح کا انکشاف نہیں ہو سکتا وہ ظاہری اور باطنی حواس کے ادراک سے خارج ہے، اس لئے صرف اتنا فرما دیا کہ روح عالم امر کی ایک چیز ہے یعنی مادی اور عنصری نہیں بلکہ غیر مادی ہے، نور مجسم ہے۔ جس کا نہایت قلیل علم انسان کو عطا کیا ہے۔ اس دائرے سے نکل کر آگے قدم رکھنا انسان کی قابلیت سے بالاتر ہے واللہ اعلم۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ یہ لوگ آپ سے روح کی حقیقت دریافت کرتے ہیں۔ ان کو جواب دے دو کہ روح کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں، انسان کو علم الٰہی کے مقابلے میں علم کا قلیل حصہ عطا ہوا ہے، اس لئے فقط اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ روح عالم امر کی ایک چیز ہے۔ کیا ہے، کیسی ہے؟ یہ کوئی نہیں سمجھ سکتا اور کون سمجھ سکتا ہے اس سے آگے فرماتا ہے کہ قرآن پاک اللہ کی رحمت ہے۔ اللہ کا فضل عظیم تمہارے شامل حال ہے، اس لئے اس نے قرآن عطا فرمایا۔ انسانوں کی ناشکری تو اس کی مقتضی تھی کہ ان کو پیام ہدایت نہ دیا جاتا بلکہ بھیجا ہوا قرآن واپس لے لیا جاتا، مگر اللہ کا کرم اس کا مقتضی نہ تھا، اس لئے اس نے پیام ہدایت صادر فرمایا اور جاری رکھا۔ چھوڑ کر روح کی حقیقت دریافت کرنا بے سود ہے۔ احکام قرآنی اور تعلیم ربانی قابل عمل اور واجب العمل ہے۔ یہ دستور کار عمل ہے۔ عملی زندگی کو سنوارنے کی ضرورت ہے حقیقت روح کو پانے کے لئے وہم کے گھوڑے دوڑانے مفید نہیں، سلام بن مشکم اور اس کے ساتھ کچھ یہودیوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ہمارا قبلہ مسلمانوں نے ترک کر دیا اور توریت کو چھوڑ کر قرآن کی طرف رجوع کیا۔ حالانکہ قرآن توریت کے برابر نہیں۔ پھر ہم کس طرح اتباع کر سکتے ہیں (ابن اسحٰق وابن جریر بروایت ابن عباس) اس کے جواب میں فرما دیا کہ تم قرآن کو حقیر سمجھتے ہو۔ حالانکہ اگر جن وانس بھی باہم مل کر قرآن کی طرح کوئی ہدایت آفریں دستور اسی فصاحت وبلاغت کے ساتھ بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے۔ اگرچہ ہر شخص دوسرے کی انتہائی مدد کرے۔

بعض مفسرین قائل ہیں کہ یہ آیت نضر بن حارث کے قول کی تردید میں نازل ہوئی جو یہ کہا کرتا تھا کہ اگر میں چاہوں تو اس جیسی کتاب بنا لوں۔

مقصود بیان

حقیقت روح کا کسی کو علم نہیں صرف اتنا معلوم ہے کہ اس عالم کی ایک چیز ہے جس کو عالم امر (یعنی عالم قدس مجرد عن المادہ) کہا جاتا ہے۔ آیت اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا بتا رہی ہے کہ خدا تعالیٰ کا فضل وکرم رسول پاک کے شامل حال تھا اور خصوصی فضل تھا۔ انسانوں کی سرکشی اور بدسگالی تو اس کی مقتضی تھی کہ ان کو قرآن جیسا پیام ہدایت نہ دیا جاتا مگر حضور اقدس فداہ ابی وامی کے تصدق میں یہ کلام ہدایت آفریں عام کر دیا گیا۔ جس کی مثل دنیا کی کوئی طاقت نہیں بنا سکتی وغیرہ۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ

کہنے لگے ہم تمہارا ہرگز یقین نہ کریں گے تا وقتیکہ تم زمین سے ہمارے لئے کوئی چشمہ نہ بہا نکالو یا تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں

مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ﴿٩١﴾ أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا

کا کوئی باغ نہ ہو جس کے اندر تم نہریں بہا دو یا تم ہم پر آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرا دو

كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ﴿٩٢﴾ أَوْ يَكُونَ لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ

یا اللہ کو اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لے آؤ یا تمہارے لئے کوئی طلائی گھر نہ ہو یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ

ع ۱۰

وَلَن نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ﴿٩٣﴾

اور ہم تمہارے چڑھنے کا بھی یقین ہرگز نہ کریں گے تاوقتیکہ تم ہم پر کوئی کتاب اتار کر نہ لاؤ جس کو ہم پڑھیں تم کہو سبحان اللہ میں تو صرف ایک انسان اور پیغمبر ہوں

تفسیر ابن جریر نے بروایت ابن عباس اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ایک روز مغرب کے بعد کعبہ کے پیچھے سرداران قریش جمع ہوئے جن میں عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوسفیان، ابوالبختری، اسود بن مطلب، زمعہ بن اسود، ولید بن مغیرہ، ابوجہل بن ہشام، عبداللہ بن اُمیہ، اُمیہ بن خلف، عاص بن وائل، نبیہ بن حجاج اور منبہ بن حجاج بھی تھے۔ سب نے جمع ہو کر مشورہ کیا کہ محمدؐ کو بلاؤ اور مباحثہ و مکالمہ ختم کر کے اپنی طرف سے اتمام حجت کر دو تاکہ معجزہ قرآن کی دعوت سے جو بے چینی ہماری قوم میں ظاہر ہو گئی ہے وہ اس بہانے سے دور ہو جائے اور کمزوری کا دھبہ دُھل جائے۔ غرض باتفاق آراء حضورؐ کو بلایا۔ حضورؐ خیال تھا کہ قوم کی ہدایت کیلئے حیثیت ہوئی ہے۔ فوراً بغیر پس و پیش کے اُٹھ کھڑے ہوئے، مقام مقررہ پر پہنچے اور جا کر بیٹھ گئے۔ سرداران قریش نے گفتگو شروع کی، کہنے لگے محمدؐ! ہم نے اپنی طرف سے اتمام حجت کے لئے تم کو بلایا ہے۔ خدا کی قسم جو معاملہ تم نے اپنی قوم کے خلاف کیا وہ کسی عرب نے آج تک نہیں کیا۔ تم نے اپنے آباؤ اجداد کو بُرا کہا، اُن کے دین میں عیب نکالے، ان کے معبودوں کی بدگوئی کی، اُن کو بے وقوف بنایا، جماعت میں پھوٹ ڈال دی، کوئی بُری بات ایسی نہ رہی جو تم نے نہ پھیلائی ہو۔ اب تمہارا کوئی مطلب نہیں رہا۔ اگر تم نبوت کا دعویٰ کرنے سے مال جمع کرنا چاہتے ہو تو ہم بخوشی تمہارے لئے اتنا مال جمع کرنے کو تیار ہیں کہ تم سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ اور عزت و شرف کے خواستگار ہو تو ہم تم کو اپنا سردار بنائے لیتے ہیں اور بادشاہت کے طلبگار ہو تو ہم اپنا حاکم بنانے پر آمادہ ہیں، مگر ان حرکتوں کو چھوڑ دو اور اگر تم پر کسی آسیب کا اثر ہو تو (جیسا اکثر ہو جاتا ہے) ہم اپنی دولت صرف کر کے معالج کو تلاش کرتے ہیں جو تمہارا علاج کافی طور پر کرے۔ حضورؐ نے فرمایا مجھے نہ مال کی طلب ہے نہ سیادت کی خواہش نہ بادشاہت کی جستجو۔ مجھے تو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے اور کتاب نازل فرمائی ہے اور بشیر و نذیر ہونے کا حکم دیا ہے۔ میں نے اللہ کا پیغام تم کو پہنچا دیا اور تمہاری بہی خواہی کی، قبول کرو گے تو دین و دنیا میں کامیاب رہو گے، رد کرو گے تو میں اللہ کے حکم پر صبر کروں گا یہاں تک کہ وہی جو چاہے گا فیصلہ کر دے گا۔ رؤسائے قریش بولے محمدؐ! تم ہماری بات نہیں مانتے تو ایک بات پر عمل کرو۔ تم کو معلوم ہے کہ ہم بہت زیادہ پریشان حال، نادار اور قلیل المعاش ہیں تم اپنے رب سے درخواست کر کے اتنا ہی کرا دو کہ ہمارے سامنے کے یہ پہاڑ ہٹ جائیں۔ وسعت پیدا ہو جائے، عراق و شام کی طرح یہاں بھی نہریں جاری ہو جائیں اور ہمارے آباؤ اجداد جو مر چکے ہیں وہ پھر زندہ ہو کر آ جائیں۔ خصوصاً قریش کا مورث اعلیٰ قصی بن کلاب جو بہت سچا آدمی تھا زندہ ہو جائے، ہم تمہارا سچ جھوٹ اس سے دریافت کریں گے۔ اگر اس نے تمہاری تصدیق کی تو ہم تم کو سچا رسول مان لیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا مجھے اس لئے نہیں بھیجا گیا ہے کہ میں ایسا کر سکتا ہوں۔ مجھے تو وہی چیز ملی ہے جو میں نے تم کو پہنچا دی۔ مان لو گے تو دین و دنیا میں اجر ملے گا نہ مانو گے تو میں صبر کروں گا۔ اللہ میرا تمہارا فیصلہ کر دے گا۔ قریش بولے اچھا اگر ایسا نہیں کرتے تو اتنا ضرور کر دو کہ ایک فرشتہ تمہارے ساتھ آ کر تمہاری تصدیق کرے اور ہم سے گفتگو کرنے میں تمہاری نمائندگی کرے۔ حضورؐ نے اس کا جواب بھی پہلے کی طرح دیا۔ قریش بولے ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری طرح تم بھی طلب معاش میں سرگرداں ہو، بازاروں میں گھومتے ہو اللہ سے اتنا ہی کرا لو کہ تمہارے لئے باغ جن میں نہریں جاری ہوں اور کوئی غیبی خزانہ اور سونے کے مکان مہیا ہو جائیں۔ اگر ایسا ہو جائے گا تو ہم پہچان لیں گے کہ اللہ کے نزدیک تم کو ہم پر فضیلت حاصل ہے اور اس نے تم کو رسول بنایا ہے۔ حضورؐ نے اس سوال کا جواب بھی گزشتہ کی طرح دیا۔ قریش نے کہا کہ تم کہا کرتے ہو کہ اگر اللہ

چلو تو دم بھر میں آسمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے تو آسمان کا کوئی ٹکڑا ہی ہم پر گرا دو بغیر اس کے ہم ایمان نہیں لائیں گے۔ حضورؐ نے فرمایا یہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ اگر وہ چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔ کہنے لگے محمد! کیا تمہارے رب کو معلوم نہ تھا کہ ہم تم سے ایسے سوالات کریں گے پھر اس نے تم کو پہلے سے ان کے جوابات کیوں نہ بتا دیئے۔ ہم کو اطلاع ملی ہے کہ تم کو یہ باتیں (قرآنی آیات) یمامہ کا ایک باشندہ سکھا دیتا ہے جس کو رحمان الیمامہ کہتے ہیں۔ واللہ ہم کبھی رحمان کو نہیں مانیں گے۔ ایک شخص بولا ہم تو ملائکہ کی پرستش کرتے ہیں وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ دوسرا بولا ہم کو تمہاری بات کا اس وقت تک یقین نہیں جب تک فرشتوں کو اور خدا کو ہمارے روبرو لا کر نہ کھڑا کر دو گے۔ غرض حضورؐ والا یہ بیہودہ باتیں سن کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضورؐ کی پھوپھی عاتکہ کا بیٹا عبداللہ بن ابی امیہ بھی ساتھ ہو لیا اور راستہ میں کہنے لگا محمد تمہاری قوم نے جو کچھ تم سے کہا تم نے نہ مانا اب جس وقت تک میرے سامنے تم آسمان تک سیڑھی بنا کر اس پر نہ چڑھ جاؤ گے اور وہاں سے چار فرشتے اپنے ساتھ گواہ اور ایک کتاب جس میں تمہاری تصدیق ہو نہ لاؤ گے میں تمہاری اس شعبدہ بازی کو نہ مانوں گا۔ حضورِ اقدسؐ رنجیدہ ہو کر واپس تشریف لے آئے اور آیات مذکورہ کا نزول ہوا۔

حاصل ارشاد بالکل ظاہر ہے۔ حضورؐ کو حکم دے دیا گیا کہ ان سے کہہ دو میں نے رسالت کا دعویٰ کیا ہے اور انسان ہی ہوں (یعنی فرشتہ یا خدا نہیں ہوں) اور قدرت کا مجھے دعویٰ نہیں نہ غیبی طاقتیں اور مشیتِ الٰہی میرے اختیار میں ہے اور رسالت کے لئے فرمائشوں کا پورا کرنا ضروری نہیں

مقصودِ بیان فرمائشی معجزات کا ظہور نہیں نہ رسالت کے لئے فرمائشی معجزات کی تکمیل لازم ہے۔ رسول انسان ہوتا ہے اور انسان ایسی جبح انسان اُس کے تصرف میں غیبی طاقتیں اور اللہ کی قدرت کے کل خزانے نہیں ہوتے وہ مشیت الٰہی کا تابع ہوتا ہے۔

اس صراحت سے عبرت حاصل کرنا چاہیئے اُس کور بصیرت طبقہ کو جو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو فوق البشریت ہستی خیال کرتا اور کل الٰہی طاقتوں اور خزانوں کا خود مختار مالک یقین کرتا ہے۔ قرآنی صراحت بالکل اس کے خلاف ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا

جب لوگوں کے پاس ہدایت آچکی تو اُن کو ایمان لانے سے سوائے اس کے کوئی یہ کہنے لگے کیا اللہ نے آدمی کو رسول بنا کر بھیجا

رَسُولًا ۝ قُلْ لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِنَ السَّمَاءِ

ہے کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے رہتے بستے ہوتے تو ہم اُن پر ضرور فرشتے کو رسول بنا کر

مَلَكًا رَسُولًا ۝ قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ۝

اُتارتے کہہ دو کہ میرے تمہارے درمیان اللہ گواہی کے لئے کافی ہے وہ اپنے بندوں کے حال سے بخوبی خبردار ہے اور بینا ہے

تفسیر کفار مکہ اول تو ضرورتِ نبوت ہی کے قائل نہ تھے۔ رسولِ پاک کی رسالت اور نبی کی نبوت ہی کو لغو سمجھتے تھے، لیکن جب حضورِ اقدسؐ نے براہین قاطعہ سے رسالت کی ضرورت ثابت کی اور کفار لاجواب ہوئے تو حضورؐ کی مخصوص نبوت پر اعتراض کرنے لگے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر نبی کا ہونا ہی ضروری ہے تو انسان نبی کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کھاتا پیتا ہے، چلتا پھرتا ہے، نکاح کرتا ہے، آدمیت کے لوازم و عوارض جس میں موجود ہوں اس کا خدا سے ایسا خاص تعلق کیسے پیدا ہو سکتا ہے اگر نسلِ انسانی کو ہدایت کرنی ضروری تھی تو کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجا ہوتا جو کثافت مادہ سے پاک ہوتا، جسمانی لوازم و خواص کی آلائش اُس میں نہ ہوتی۔ خالص نور ہوتا اور دوسروں کے لئے شمع ہدایت بنتا۔ اس شبہ کے استحکام پر بڑے بڑے علمبردارانِ دانش کو ناز تھا۔ خدا تعالیٰ نے اس کے جواب میں آیاتِ مذکورہ نازل فرمائیں۔ جن کا حاصل مضمون یہ ہے کہ ہادی کو نمونۂ عمل اور ہم نوع ہونا چاہیئے۔ غیر نوع کے رسول سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے، اس سے کسی کو کیا اُنس اور میل ہو سکتا ہے۔ زمین پر انسانوں کی بستی ہے۔ انسانی قوتوں کی افراط و تفریط اور بیجا استعمال میں بہت سے لوگ مبتلا ہیں ان کی اصلاح کے لئے بھی آدمی کا مامور ہونا

ضروری ہے جس کے اندر آدمیت کی پوری قوتیں موجود ہوں جو غیر نوع کا فرد ہونے کی وجہ سے اجنبی اور غیر مانوس نہ ہو اور خود نمونۂ عمل بن کر دوسروں کو عملاً ہدایت کر سکے۔ اگر سطح زمین پر فرشتوں کی آبادی ہوتی تو یقیناً ان کی اصلاح و ہدایت کے لئے فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجا جاتا۔ یہ قول اس قدر بیّن اور واضح ہے کہ اللہ ہی کی شہادت اس کے لئے کافی ہے۔ مزید عقلی اور قیاسی دلائل کی ضرورت نہیں۔

مقصودِ بیان

کج فہم اور کور بصیرت لوگوں کی دماغی و فکر گونی کا اظہار اور اس امر کی صراحت کہ آدمی کا رسول ہونا گو نافہم لوگوں کے نزدیک انکار آفریں بات ہے۔ آدمی کے نبی ہونے کی ضرورت کا بیان اور فی الجملہ اس بات کی تصریح کہ ہادی کو مہتدی کا ہم نوع ہونا لازم ہے تاکہ افادہ و استفادہ کامل طور پر ہو سکے۔ اس بات کی وضاحت کہ سچے نبی کی سچائی پر شہادت دینے والا آخر خود باری تعالیٰ ہوتا ہے۔ آیت اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا دلالت کر رہی ہے کہ خدا تعالیٰ بندوں کی ہر حالت اور ہر جزئی کیفیت سے باخبر ہے اور اس کا باخبر ہونا کسی اطلاع پر موقوف نہیں بلکہ وہ بذاتِ خود بصیر ہے یعنی اس کا علم حضوری ہے حصولی نہیں اور حضوری علم میں بھی ایک خاص نوعِ علم یعنی بصارت کا مالک ہے وغیرہ۔

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۚ وَنَحْشُرُهُمْ

جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے - اور جس کو وہ گمراہ چھوڑ دے تو پھر اُس کے سوا تم کو اُن کا کوئی مددگار نہ ملے گا قیامت کے دن ہم اُن

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۚ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ

کو اوندھے منہ اندھا گونگا اور بہرا اُٹھائیں گے اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے جب اُس کی آگ بجھنے لگے گی تو ہم اُن پر

سَعِيْرًا ۝ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا

مزید بھڑکا دیں گے یہ سزا اُس پاداش میں ہے کہ انھوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا تھا اور کہا تھا کہ جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ بن جائیں گے تو کیا

لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

پھر بھی نئے سرے یقینی طور پر زندہ کر کے اُٹھائے جائیں گے کیا انھوں نے دیکھا نہیں کہ جس اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا وہ اُن جیسے (انسانوں کے)

قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۚ فَاَبَى الظّٰلِمُوْنَ اِلَّا كُفُوْرًا ۝

پیدا کرنے پر قادر ہے اُس نے اُن کی ایک میعاد مقرر کر رکھی ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے مگر ظالم اُس کا انکار کیے بغیر نہ رہے

تفسیر

رسول پاک کی رسالت پر کفار کو جو شبہ تھا خدا تعالیٰ نے گزشتہ آیات میں اس کو دور کر دیا اور اپنے نبی کی صداقت کی خود شہادت دی۔ اس پر اعتراض ہو سکتا تھا کہ جس شخص کا خدا سے ایسا گہرا تعلق ہو کہ فرشتے اس کے پاس آتے ہوں، وحی نازل ہوتی ہو، خدا نے خود اس کی صداقت کی شہادت دی ہو تو پھر اس کو تبلیغ و ہدایت اور پیام رسانی کی کیا ضرورت ہے وہ کیوں ایک دم اہلِ انکار کو اپنی غیبی قوت سے راہ راست پر نہیں لے آتا اور کیوں سب کو ایمان کامل و عمل صالح پر مجبور نہیں کرتا۔ اس اعتراض کو دفع کرنے کے لئے فرماتا ہے کہ :-

ہدایت و گمراہی تو اللہ کے اختیار میں ہے خدا ہی راہ راست پر لاتا ہے اور وہی گمراہ چھوڑ دیتا ہے۔ یعنی نبی یا کسی اور مخلوق کو انسان کے فطری اختیار اور جبلی ارادے کو سلب کرنے کی طاقت نہیں۔ ارادہ اور عزم میں تبدیلی محض خدا ہی پیدا کر سکتا ہے۔ جس کے ارادے کو خیر و صداقت کی طرف خدا مائل کر دیتا ہے اس کے ارادے کو کوئی دوسری طاقت کج راہ نہیں بنا سکتی اور جس کی خواہش بد بینش کو خدا راہِ راست سے بھٹکا چھوڑ دیتا ہے اس کو سیدھے راستے پر ڈالنے والا

کوئی نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کج راہی و بے راہ روی کا نتیجہ قیامت کے دن یہ نکلے گا کہ جس طرح دنیا میں ٹیڑھی چال اختیار کی تھی اسی طرح آخرت میں اُلٹی چال سے یعنی مُنہ کے بل دوزخ کی طرف جانا ہوگا اور قبروں سے اُٹھنے کے وقت تو ایسی حیرت طاری ہوگی کہ ظاہری حواس بھی گم ہو جائیں گے نہ آنکھوں سے کچھ دیکھے گا نہ کانوں سے کچھ سنائی دے گا نہ زبان میں (حلق کی خشکی کی وجہ سے) گویائی کی طاقت ہوگی۔

ترمذی کی ایک صحیح حدیث میں آیا ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن لوگ تین طرح سے چلیں گے۔ پا پیادہ[۱]، سوار ہو کر[۲] اور مُنہ کے بل[۳]۔ حاضرین میں سے کسی نے عرض کیا حضور مُنہ کے بل کیسے چلیں گے؟ فرمایا جس نے پاؤں کے بل چلایا کیا وہ مُنہ کے بل نہیں چلا سکتا۔

نوٹ:- ہم نے جو تفسیری مطلب بیان کیا ہے اس سے واضح ہے کہ مُنہ کے بل چلنے اور اندھا گونگا بہرا ہونے سے حقیقی معنی ہی مراد ہیں۔ اگرچہ دوزخ کا عذاب دیکھ کر کفار اندھے، بہرے اور گونگے نہ رہیں گے جیسا کہ دوسری آیات اور مختلف احادیث سے ثابت ہے، مگر اس آیت میں حشر کی ابتدائی حالت کا اظہار ہے۔ قبروں سے نکل کر میدان حشر میں پہنچیں گے تو اس قدر حیرت ہوگی کہ ظاہری حواس بیکار ہو جائیں گے، لیکن ابن عباس نے ان چاروں الفاظ کو مجازی معنی پر محمول کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مُنہ کے بل چلنے سے مراد ہے ذلیل ہو کر چلنا اور اندھا گونگا بہرا ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جس طرح حقانیت و صداقت ان کو نظر نہ آتی تھی اسی طرح حق پرستی کا ثواب قیامت کے دن ان کو دکھائی نہ دے گا اور کوئی مسرت آفریں بات ان کی نظروں کے سامنے نہ آئے گی اور جس طرح دنیا میں حق کی طرف سے اُن کے کان بہرے تھے اسی طرح قیامت میں کوئی بشارت آگیں خبر نہ سنیں گے اور جس طرح دنیا میں نطق صداقت سے ان کی زبانیں گونگی تھیں۔ اسی طرح قیامت کے دن اپنی برأت و نجات کے لئے کوئی اثر انداز حجت نہ پیش کر سکیں گے۔ عطاء نے فرمایا کفار قیامت کے دن اندھے ہوں گے یعنی اس نور نظر سے محروم ہوں گے جو اولیاء اللہ کو مرحمت ہوگا اور بہرے ہوں گے یعنی ان کا پُر رحمت کلام اور فرشتوں کا شفقت آگیں خطاب ان کو سنائی نہ دے گا اور گونگے ہوں گے یعنی اللہ کی حمد و ثنا نہ کر سکیں گے۔

اس سے آگے دوامی عذاب کی دو وجوہ بیان فرماتا ہے۔ اوّل یہ کہ اللہ کی وحدانیت، الوہیت اور رسول کی صداقت کی کھلی نشانیوں کا کفار نے انکار کیا، قرآنی احکام کو نہ مانا اور باوجودیکہ خدا نے عمر بھر ڈھیل چھوڑے رکھی، مگر پھر بھی ان کو ہوش نہ آیا۔ برابر انکار آیات کرتے رہے۔ اس کی سزا یہی ہے کہ دوزخ میں ہمیشہ کے لئے داخل ہوں اور عذاب میں کبھی تخفیف نہ ہو۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ حشر جسمانی کے منکر تھے۔ بعث بعد الموت ان کے نزدیک غلط عقیدہ تھا اور فقط انکار ہی نہیں بلکہ حشر کے محال ہونے پر دلیل بھی قائم کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہڈیاں جب ریزہ ریزہ اور بوسیدہ ہو گئیں تو پھر از سر نو ان کو کون پیدا کر سکتا ہے اور کس طرح تخلیقِ جدید ہو سکتی ہے۔ ان بے وقوفوں کو اتنی سمجھ بھی نہیں کہ جس خدا نے ایسے عظیم الشان آسمان و زمین کو نیست سے ہست کیا تو کیا ان کو اول حالت و کیفیت پر نہیں پیدا کر سکتا۔ یعنی جب مادہ بھی نہ تھا تو مادہ کو پیدا کر کے جسمانی صورت اس کو پہنائی اور نوعی صورت عطا کی۔ دوبارہ زندہ کرنے میں تو تخلیق مادہ کی ضرورت بھی نہیں صرف نئی صورت پہنانا ہے اور صرف تخلیق صورت کچھ دشوار نہیں۔ صورت میں تجدید و تغیر تو ہر وقت اور ہر آن ہوتی ہے اور جب تک میعاد زندگی ہے یوں ہی تخلیق و تجدید ہوتی رہے گی۔ یہ حقیقت بالکل ناقابل انکار ہے، مگر جو لوگ خود اپنے کو تباہ کر رہے ہیں وہ تو انکار ہی کریں گے۔ واضح ثبوت بھی اُن کو نظر نہ آئے گا۔

مقصودِ بیان ہدایت و گمراہی خدا کے اختیار میں ہے یعنی رسول اللہ کا اگرچہ خدا سے خاص الخاص تعلق ہے، مگر راہ یاب اور ہدایت یافتہ بنانا رسول پاکؐ کے اختیار سے خارج ہے۔ قیامت کے دن کفار سر کے بل چلیں گے اور آغاز حشر میں انتہائی حیرت کی وجہ سے اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے۔ کفار ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ کُلَّمَا خَبَتْ کا لفظ بتا رہا ہے کہ دوزخ کی آنچ ہر وقت ایک طرح نہ رہے گی۔ کبھی کم ہوگی کبھی زیادہ۔ ہاں جس وقت کم ہوگی تو خدا تعالیٰ اس میں اضافہ فرما دے گا ہر شخص کی میعاد زندگی بلکہ کل عالم کی مدت بقا مقرر ہے۔ آسمان و زمین کی تخلیق دلالت کر رہی ہے کہ انسان کا دوبارہ پیدا کرنا دشوار نہیں وغیرہ۔

قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ؕ وَكَانَ

کہہ دو کہ اگر میرے پروردگار کی رحمت کے خزانے تمہارے اختیار میں ہوتے تب بھی خرچ ہو جانے کے ڈر سے تم ضرور بخل کرتے انسان

ع ۱۱

الْإِنسَانُ قَتُورًا ۝ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ فَاسْأَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِذْ

بڑا تنگ دل ہے ہم نے موسیٰ کو نو کھلی نشانیاں دی تھیں بنی اسرائیل سے پوچھ دیکھو جب

جَاءَهُمْ فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ إِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا مُوسَىٰ مَسْحُورًا ۝ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا

موسیٰ اُن کے پاس آئے تو فرعون نے اُن سے کہا موسیٰ میرے گمان میں تم فریفتہ سحر زدہ ہو موسیٰ نے کہا تجھے معلوم ہے کہ

أَنزَلَ هَٰؤُلَاءِ إِلَّا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ بَصَائِرَ وَإِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا فِرْعَوْنُ مَثْبُورًا ۝

یہ معجزات آسمان و زمین کے رب نے ہی نشانیاں بنا کر اُتارے ہیں میرا خیال ہے کہ فرعون تو تباہ ہو جائے گا

فَأَرَادَ أَن يَسْتَفِزَّهُم مِّنَ الْأَرْضِ فَأَغْرَقْنَاهُ وَمَن مَّعَهُ جَمِيعًا ۝ وَقُلْنَا مِن

فرعون نے چاہا کہ بنی اسرائیل کو اُس سرزمین سے نکال دے مگر ہم نے اُس کو اور اُس کے سب ساتھیوں کو ڈبو دیا اور اُس کے

بَعْدِهِ لِبَنِي إِسْرَائِيلَ اسْكُنُوا الْأَرْضَ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا ۝

بعد بنی اسرائیل سے کہا کہ زمین میں رہو جب آخرت کا وعدہ آئے گا تو ہم تم کو سمیٹ کر لے آئیں گے

تفسیر

ان آیات میں تین مسائل کا حل کیا ہے۔ الوہیت[1]، نبوت[2] اور حشر آخرت[3]۔ گزشتہ آیات میں آسمان و زمین کی تخلیق سے بعثت آخرت پر استدلال کیا تھا فی الجملہ اس کی تائید ان آیات سے ہوتی ہے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ انسان اپنی بناوٹ، سرشت اور طبیعت کے اعتبار سے بخل پسند واقع ہوا ہے۔ داگرچہ بعض لوگ طبعاً فیاض بھی ہوتے ہیں، مگر آدمی کی عمومی حالت بخل پرستی پر مبنی ہے۔ اس فطری کنجوسی کو بعض لوگ ناجائز طور پر مآل اندیشی اور انجام بینی کہتے ہیں) اگر اللہ کی رحمت کے مادی اور روحانی، مالی اور علمی خزانے انسان کے بس میں ہوتے، تو وہ با تقاضائے فطرت خدا داد خزانوں میں سے صرف کرتا اور دوسروں کو دینا بند کر دیتا اور جان تک مکھی چوس اپنی طبیعت کو روکتا اور خیال کرتا کہ شاید اس فیاضی کے سبب مجھے افلاس و ناداری سے دوچار ہو جانا پڑ جائے۔ یعنی اگر خدا تعالیٰ آدمی کے قبضہ میں اپنے مادی اور مالی خزانے کی کنجیاں دے دیتا تو باندیشہ فقر وہ مال کسی کو نہ دیتا۔ اگر تخلیق و ایجاد کی غیبی قوتیں اُس کو مل جاتیں اور مخلوق کے پیدا کرنے پر اس کو اختیار رہتا تو وہ پیدا کرنے میں کنجوسی سے کام لیتا اور یہ خطرہ کرتا کہ کہیں پیدا کرتے کرتے تخلیقی خزانہ ختم نہ ہو جائے۔ اگر نبوت، کرامت اور معرفت کا ذخیرہ اس کو عطا کر دیا جاتا تو کسی کو نبی بنانے اور علم عطا کرنے میں اس کو پس و پیش ہوتا۔ پھر اگر حشر آخرت اور ثواب عاقبت پر کہیں اس کا تصرف ہو جاتا تو وہ دوبارہ کسی کو پیدا کرتے کرتے ڈرتا کہ کہیں ثواب و اجر کا اسٹاک ختم نہ ہو جائے۔ غرض بخل پسند انسان ہمیشہ حیران و حیلہ و لیت و لعل میں رہتا۔ فیاضی اور فراخ حوصلگی سے کام نہ لیتا اور اللہ کے بے پایاں خزائن کا مالک ہوتے ہوئے بھی اس کو فقر و افلاس کا اندیشہ لگا رہتا۔ لیکن اللہ فیاض ہے اس کے خزائن رحمت میں کوئی کمی نہیں۔ سرکش کافروں اور جفا کار نافرمانوں کو بھی وہ فراخی کے ساتھ تمام سامان عیش عطا کرتا ہے۔ زمین آسمان کائنات سماوی و ارضی اور کل موجودات اس کی فیاضی کا اظہار کر رہی ہیں۔ اس نے اپنی ذاتی فیاضی سے بغیر کسی ذاتی غرض کے عالم کو بنایا، زمین پر انسان کو بسایا، اس کی بقائے زندگی کے کل سامان فراہم فرمائے پھر روحانی سعادت اور ابدی نجات دینے کے لئے قوانین و ضوابط نازل فرمائے۔ آسمانی صحیفے اور انبیاء بھیجے۔

دیکھو فرعون اور اس کی سرکش قوم کو ہم نے کتنا عروج دیا۔ مادی خزانوں کے دروازے ان کے لئے کھول دیئے پھر اس کا فیض اسی حد پر بند نہ ہو گیا بلکہ اہل کفر کی ہلاکت کر کے اور بنی اسرائیل کو کافروں کے پنجہ سے رہا کر کے باعزت زندگی بسر کرنے کے لئے اس نے موسیٰؑ کو مبعوث فرمایا اور حق و باطل کا امتیاز ظاہر کرنے کے لئے ان کو کھلی ہوئی نو نشانیاں عطا کیں۔ موسیٰؑ نے وہ نشانیاں پیش کیں، فرعون نے انکار کیا، وہ کور بصیرت تھا، بصیرت انگیز آیات سے بھی اس کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم   چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

بجائے اقرارِ حق کے موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کے استیصال کی فکر میں ہو گیا بالآخر خدا نے فرعون کو غارت کیا۔ بنی اسرائیل کو ارضِ مصر کا مالک کیا اور نہ فقط ارضِ مصر بلکہ ملک شام بھی سکونت کے لئے اُن کو دے دیا اور صاف طور پر کہہ دیا کہ (دنیا کے کسی حصہ میں تم رہو کتنے ہی منتشر اور پراگندہ ہو مگر) قیامت آئے گی تو تم سب کو سمیٹ کر بلا لیا جائے گا۔

آیات مذکورہ میں چند امور بحث طلب ہیں۔ نو آیات سے کون سی نو آیات مراد ہیں؟ احکام مراد ہیں یا معجزات؟ بعض علماء تفسیر کا خیال ہے کہ نو احکام مراد ہیں۔ اس قول کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس کو امام احمد نے باسناد عبداللہ بن سلمہ حضرت صفوان بن عسال صحابی سے نقل کیا ہے جس میں کہتے ہیں کہ دو یہودیوں نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ سے کون سی نشانیاں مراد ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا نو آیات یہ تھیں:۔ (۱) شرک مت کرو (۲) چوری نہ کرو (۳) زنا سے بچو (۴) کسی کو ناحق قتل نہ کرو (۵) جادو مت کرو (۶) سود مت کھاؤ (۷) کسی بے گناہ کو سزا دلوانے حاکم کے پاس مت لیجاؤ۔ (۸) کسی پاک دامن بی بی پر زنا کی تہمت مت لگاؤ (۹) جہاد میں دشمن سے نہ بھاگو اور تمہارے لئے خصوصیت کے ساتھ دسویں بات یہ تھی کہ سنیچر کے دن کی عظمت قائم رکھو الخ۔ رواہ ابن جریر فی تفسیرہ وابن ماجہ والنسائی وقد رواہ الترمذی وقال حسن صحیح۔

ناقدین نے چونکہ عبداللہ بن سلمہ کو ضعیف الحافظہ کہا ہے اس لئے شیخ ابن کثیر نے اس روایت پر اعتماد نہیں کیا اور روایت کی کمزوری کے علاوہ روایت کے خلاف بھی اس کو قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہ احکام تو وہی ہیں جن کو وصایا توریت کہا جاتا ہے اور جن کی تعلیم حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو دی تھی۔ فرعون کے مقابلے میں ان احکام کو پیش کرنے سے حضرت موسیٰؑ کی نبوت ثابت نہیں ہو سکتی تھی، اس لئے آیات سے مراد معجزات ہیں۔ ابن عباس اور حسن بصری وغیرہ نے بعض معجزات کی تعیین میں اختلاف کیا ہے۔ صحیح یہ کہ مندرجۂ ذیل معجزات مراد ہیں۔ عصا کا سانپ بن جانا اور جادوگروں کی تمام رسیوں کو نگل جانا، ہاتھ کے چھالوں کا اس قدر روشن ہو جانا کہ دیکھنے والوں کی نگاہ نہ ٹھہر سکتی تھی، زبان کی گرہ کھول کر لکنت دور کر دینا، سمندر کا پھٹ جانا اور بنی اسرائیل کے گذرنے کے لئے خشک راستے بن جانا، طوفان، بارش، ٹڈیاں، جوئیں، مینڈک اور آخر میں قبطیوں کے لئے ہر قسم کے پانی کا خون بن جانا۔

(۲) اسْكُنُوا الْاَرْضَ۔ ارض سے کون سی زمین مراد ہے؟ وہ جو اہل تاریخ قائل ہیں کہ فرعون کے غرق ہونے کے بعد حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر مصر پہنچے یا یہ کہ بنی اسرائیل سب کے سب مصر سے چلے نہیں آئے بلکہ کچھ وہیں رہ گئے تھے تو ان کے نزدیک مصر کا ملک مراد ہے، لیکن اہل تفسیر نے سرزمین شام مراد لی ہے کیونکہ تاریخ صحیح طور پر اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ بنی اسرائیل سب کے سب مصر چلے آئے تھے اور حضرت موسیٰ دوبارہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر واپس نہیں گئے۔

(۳) وَعْدُ الْاٰخِرَةِ۔ بعض مفسرین کہتے ہیں اس سے دوسرا وعدہ مراد ہے جس کا ذکر اول صورۃ میں تھا کہ تم دوبارہ سرکشی کرو گے اور دوبارہ تم پر آفت آئے گی۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ بربادی کے بعد ہم تم کو پھر ایک جگہ جمع کریں گے۔ چنانچہ بابل کی اسیری کے بعد پھر بنی اسرائیل مجتمع ہوئے اور پھر دوبارہ برباد ہوئے۔ اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ یہ کلام مسئلہ حشر کے متعلق ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ جب حیات ثانیہ کا وقت آئے گا تو تمام اگلے پچھلے لوگوں کو ہم سمیٹ کر جمع کر لیں گے۔

یہاں حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ نقل کرنے سے الوہیت، نبوت عامہ، اور حشر جسمانی کے اظہار و ثبوت کے علاوہ یہ بات بھی بیان کرنی مقصود ہے کہ محمدؐ کوئی نئے نبی نہیں ہیں کہ ان کی نبوت کو تسلیم کرنے میں تم کو پس و پیش ہو۔ ان سے پہلے موسیٰ جیسے جلیل القدر نبی بھی آ چکے ہیں اور جس طرح تم ان سے معجزات کے طلب گار ہو اسی طرح اہل مصر نے موسیٰ سے معجزات طلب کئے تھے، مگر تمہاری درخواست معجزات محض عناد و سرکشی پر مبنی ہے، اگر حق جوئی کے لئے ہوتی تو جس طرح موسیٰ کے ہاتھ پر معجزات کا ظہور ہوا تھا ویسا ہی تمہاری خواہشات کے مطابق محمدؐ کے ہاتھ سے معجزات ظاہر ہو جاتے۔ پھر تم جو محمدؐ کا مقابلہ کرتے ہو یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ فرعون اور اس کے ساتھیوں نے بھی موسیٰ کا مقابلہ کیا تھا مگر انجام کار سب غرق ہو گئے اور بنی اسرائیل کو ان کی سرزمین کی حکومت عطا کی گئی۔ اس طرح تم کو بھی غارت کر دیا جائے گا اور مسلمانوں کو تمہاری بستیوں کی حکومت دے دی جائے گی اور جس طرح فرعونیوں سے چشمۂ نبوت بند نہ ہو سکا اسی طرح تم محمدؐ کی نبوت کو روک نہیں سکتے۔

چونکہ حضرت موسیٰ کو حضور اقدسؐ سے کامل مشابہت تھی جیسا کہ خود حضرت موسیٰؑ نے پیشین گوئی کر دی تھی (دیکھو توراۃ سفر استثنا باب ۱۸) اس لئے حضور اقدسؐ کی نبوت کو ثابت کرنے اور کافروں کو غارت کرنے کی تنبیہ کر لینے کے لئے حضرت موسیٰ اور فرعون کا قصہ بیان فرمایا۔ اس کے علاوہ اہل مکہ یہودیوں کو

اہل علم اور آسمانی کتاب کا حامل سمجھتے تھے اور انہی کے مشورہ کو مذہبی اخلاقی مسئلہ کا حل جانتے تھے، اس لئے علی الاعلان فرما دیا کہ بنی اسرائیل سے اس قول کی صداقت معلوم کر دیکھو۔ فَسْئَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ میں خطاب اگرچہ رسول اللہ کو ہے، مگر روئے خطاب ان لوگوں کی طرف ہے جن کو قرآن پاک کی صداقت اور حضور کی نبوت میں شک واقع ہو۔

مقصودِ بیان

انسان فطرۃً پست حوصلہ اور ضعیف الاعتقاد واقع ہوا ہے۔ خزائن بے پایاں کا مالک ہوتے ہوئے بھی اس کو افلاس و فقر کا اندیشہ رہنا مقتضائے فطرت ہے۔ حضرت موسیٰ کو حضور سے کسی قدر مشابہت تھی۔ آیات میں حضور اقدس کے غلبہ اور مسلمانوں کی دائمی کامیابی کی ندبیر وہ بشارت دینی مقصود ہے اور فتح مکہ کی طرف لطیف اشارہ ہے۔ کور بصیرت لوگوں کو پیام حق واہی تباہی معلوم ہوتا ہے اور علمبردار صداقت کو وہ سحر زدہ (یا مجنون) خیال کرتے ہیں جیسا کہ فرعون نے حضرت موسیٰ کو کہا۔ اگر کفر و عصیان کی تمام علامات موجود ہوں اور راہ راست پر آنے کی اُمید نہ ہو تو اس کو ملعون یا اسی قسم کے دوسرے الفاظ اپنے خیال کے مطابق کہنا درست ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کی ہدایت سے نا اُمید ہو کر فرمایا فَاَرَادَ الخ۔ یہ دکھانا منظور ہے کہ دنیوی جاہ و جلال کو خاک میں ملا کر انجام کار ان کو تباہ کر دیتا ہے۔ آیت اُسْکُنُوا الْاَرْضَ بتا رہی ہے کہ حاملان صلاح اور نیکوکار بندے تباہ کاروں کے لئے جانشین کئے جاتے ہیں۔ بدکاروں کی حکومت و شوکت چھین کر ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو امن عالم کے لئے زیادہ مفید اور مفاد عام کے لئے زیادہ موزوں ہوتے ہیں وغیرہ۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۝ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ

اور سچائی کے ساتھ ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور وہ برحق اترا ہے اور تم کو صرف خوشخبری اور ڈرانے کے لئے بھیجا ہے اور قرآن کو ہم نے بہ تفریق اتارا

عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُکْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا ۝ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ

تاکہ تم لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سناؤ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کو رفتہ رفتہ اتارا۔ کہہ دو کہ تم قرآن کو مانو یا نہ مانو جن لوگوں کو اس

اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَّیَقُوْلُوْنَ سُبْحٰ

سے پہلے علم عطا کیا گیا ہے اُن کے سامنے جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ واقعی ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارا رب پاک

رَبِّنَآ اِنْ کَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝ وَیَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْکُوْنَ وَیَزِیْدُهُمْ

ہمارے رب کا وعدہ ضرور پورا ہونا ہے وہ ٹھوڑیوں کے بل روتے ہوئے گر پڑتے ہیں اور قرآن سے اُن کی رقت

خُشُوْعًا ۝ السجدۃ

قلب بڑھ جاتی ہے

تفسیر کفار مکہ قرآن پاک کی سلاست، بلاغت اور جامعیت سے جب مبہوت ہوئے اور کوئی جواب نہ بن پڑا تو مختلف لوگوں نے مختلف باتیں کہنی شروع کیں۔ کسی نے کہا یمامہ کا رہنے والا رحمان نامی شخص سکھا دیتا ہے۔ کسی نے کہا عجمی غلام جو لوہاری کا کام کرتا ہے وہ تلقین کرتا ہے، کوئی بولا محمد کاہن ہیں۔ کوئی شیطان یا جن یا ہمزاد تابع ہے وہ آکر تعلیم دیتا ہے، کسی نے کہا اس کی محمد ساحر ہیں جادو کے زور سے ایسا کلام بنا لیتے ہیں۔ ان سب تراشیدہ خرافات کی تردید کے لئے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن کو حق کے ساتھ ہم نے نازل کیا اور حق کا حامل ہو کر وہ نازل ہوا یعنی اس کو نازل کرنے والے ہم ہی ہیں۔ نہ کسی شیطان

باجن کو اس میں دخل نہ کسی انسان کی ساخت کو۔ بہر حکمت حقہ اور مصلحت نافعہ کے تحت ہم نے اس کو اتارا ہے۔ جیسی ہماری علت غائی ویسے ہی نازل کیا۔ کسی کی خواہش وفرمائش کے زیر اثر نہیں اُتارا اور اُتارا بھی کس کی معرفت اور کس پر؟ ایسے فرشتے کی معرفت جو غلطی نسیان اور خود سازی سے پاک ہے مجسم حق ہے اور رسول ایسے پر جو دروغ بافی، غلط بیانی اور اختراع دماغی سے بالاتر ہے مجسم حق ہے۔ پھر قرآن میں عقائد، احکام، واقعات، قصص اور پیشین گوئیوں کو لے کر نازل ہوا وہ سب حق ہیں۔ ایسی صورت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ رسول کا کام صرف تبلیغ ہے خواہ بصورت ترغیب ہو یا بشکل ترہیب۔ رسول کو صرف اس لئے بھیجا کہ نیکو کار باعمل بندوں کو نجات ابدی اور سعادت سرمدی کی بشارت دیں اور نافرمان بدکار کافروں کو ابدی ہلاکت سے ڈرائیں یعنی قرآن کی ساخت میں رسول کی قوت فکریہ، بلاغت بشریہ اور اقتضائیات انسانیہ کو دخل نہیں صرف تبشیر و تنذیر اُن کا کام ہے۔

قرآن کی صداقت میں کفار مکہ کو ایک شبہ اور بھی تھا جس کو اس زمانہ میں بڑے بڑے آریہ مہاشے اور لاٹ پادری پوپ بڑے زور شور کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ قرآن عمومی طور پر یک دم کیوں نہ نازل ہوا، تھوڑا تھوڑا حسب موقعہ کیوں اُترا ــــــــ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول پاک ؐ نے بہیسا رتت تھا اور جو واقعہ پیش آیا اُسی کے مطابق چند آیتیں اپنی طرف سے بنالیں۔ اگر توراۃ کی طرح لکھا لکھایا یک دم نازل ہوتا تو یہ شبہ نہ پیدا ہو سکتا تھا۔ اس کے جواب کے لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تدریجاً نزول کی وجہ محض تبلیغ ہے۔ لوگوں کے سامنے تھوڑا تھوڑا پڑھنے میں سہولت ہوتی ہے۔ یعنی اگر یک دم نازل ہوتا تو اصل فائدہ سمجھنا اور عمل کرنا دشوار ہو جاتا۔ عرب کے صحرائی نہ پڑھے نہ لکھے، کوتاہ فہم، اہل دانش اور ارباب علم کی صحبت سے محروم، ہمیشہ سے قدامت پرستی اور آبائی رسم ورواج کے شیدائی وہ پوری کتاب کو ایک دم کیسے سمجھتے اور کیسے عمل کرتے۔ ایک حکم کے نازل کرنے میں سمجھنا اور عمل کرنا سہل ہو گیا، رفتہ رفتہ بری عادتیں چھوٹ گئیں، آہستہ آہستہ غلط عقائد زائل ہو گئے۔ ایک دم نزول سے دفعی انقلاب و ہیجان ہو جاتا جس پر کوئی بھی آمادہ نہ ہوتا۔ اللہ کی یہی مصلحت وحکمت اور شفقت علی العباد تھی جو تدریجاً نزول کا باعث ہوئی۔

اس سے آگے فرماتا ہے اب تم قرآن کو سچا مانو یا نہ مانو تم کو اختیار ہے یعنی خدا اور اس کے رسول کی کوئی غرض نہیں ہے کہ تم ایمان لاؤ گے تو خدا رسول کو فائدہ پہنچے گا۔ انکار کرو گے تو ان کا نقصان ہو جائے گا۔ اللہ کی شفقت علی العباد مقتضی تھی کہ اپنا ہدایت نامہ آہستہ آہستہ انسانی حالات کے مطابق نازل فرما دے۔ اس نے نازل فرما دیا۔ رسول کا کام تھا ہدایت نامہ کو پہنچانا، پڑھ کر سنانا، مطلب سمجھانا، فرمانبرداروں کو خوشخبری دینا اور نافرمانوں کو ڈرانا۔ یہ کام بھی پورا ہو گیا۔ ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ نفع نقصان تمہارا ہے۔ مانو نہ مانو تمہیں اختیار ہے۔

اس سے آگے عمومی ترغیب اسلام کے لئے ان اہل کتاب کی تعریف بیانی فرمائی ہے۔ جو قرآنی آیات سُن کر اللہ کے وعدوں کی تصدیق کرتے اور انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کلام ربانی سے ان کے دلوں میں ایسی قوت پیدا ہوتی ہے کہ اللہ کی رحمت، اپنے گناہ اور قرآن کی شیریں بیانی دیکھ کر روتے ہیں۔ آیت میں اگرچہ عام اہل کتاب کے متعلق صراحت ہے کسی خاص فرد یا قبیلہ کی تخصیص نہیں، لیکن چونکہ تمام اہل کتاب کی یہ حالت نہیں۔ لاکھوں عیسائی اور یہودی قرآن سُن کر کوئی اثر نہ لیتے تھے، رقت طاری ہونا اور گریہ وزاری کرنا تو بجائے خود رہا، اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مخصوص لوگوں کی حالت کا اظہار مقصود ہے۔ اہل تفسیر نے صراحت کی ہے کہ آیت میں حضرت نجاشی شاہ حبش اور ان کے بعض مومن ساتھیوں کی حالت کا اظہار فرمایا ہے جن کو حضرت جعفر نے جب سورۂ مریم کی کچھ آیات سنائیں تو ان کے دل نرم پڑ گئے آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بلا اختیار سجدہ میں گر پڑے۔

بعض علمائے تفسیر کا خیال ہے کہ آیت کا نزول زید بن عمرو بن نفیل، سلمان فارسی اور ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہم کے متعلق ہوا جو کتب سابقہ کی تصریحات کے سبب نبی آخر الزماں کے منتظر تھے اور حبیب حضور کے مبعوث ہونے کی خبر ان کو ملی تو بے اختیار کھنچ کر آ گئے اور کلام الٰہی کو سن کر رونے لگے۔ یا یوں کہا جائے کہ کوئی خاص شخص مراد نہیں اور نہ عام اہل کتاب مراد ہیں بلکہ اہل کتاب میں سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی روحانیت میں ازل سے علم ادراک اور معرفت کے جواہر پوشیدہ تھے۔ جن کی روحوں میں آیات الٰہیہ کو سنتے ہی قدرت کا جوش پیدا ہو جاتا ہے اور فوراً سجدے میں گر کر اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور آیات تبشیر و تنذیر سن کر کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار کے تمام وعدے وعید سچے ہیں۔

نوٹ: یہ آیت وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا کی تلاوت کے وقت علماء کے نزدیک سجدہ کرنا واجب ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضؓ کی صحیح روایت ہے کہ حضور والا نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ کے خوف سے رویا وہ جہنم میں داخل نہ ہوگا۔ جس طرح دوہا ہوا دودھ تھنوں میں واپس نہیں جا سکتا اسی طرح اللہ کے خوف سے رونے والا جہنم میں

نہیں جا سکتا۔

ابن عباسؓ کی روایت ہے حضورؐ نے فرمایا جو آنکھ اللہ کے خوف سے روئے اور جو آنکھ جہاد میں رات کو لشکر اسلام کی نگہبانی کرے۔ اس کو آگ نہ چھوئے گی۔ (رواہ الترمذی)

مقصود بیان

قرآن مع الفاظ و معانی کے اللہ نے نازل فرمایا اس کے نزول میں غلطی یا نسیان کا احتمال ہے بلکہ کلام برحق، نازل کرنے والا برحق، جو لایا وہ برحق جس پر اترا وہ برحق۔ رسول اللہ کے تصرف و اقتضاء یات کو قرآن میں دخل نہیں۔ رسول کا کام صرف تبلیغ ہے۔ ماننا نہ ماننا اُمت کا کام ہے۔ کسی کے ماننے نہ ماننے سے رسول پاکؐ کے فرض تبلیغ کی ادائیگی میں کمی بیشی یا نفع نقصان پیدا نہیں ہو جاتا۔ قرآن کو تدریجاً نازل کرنے کی حکمت صرف یہ ہے کہ امت کو یاد کرنے، یاد رکھنے، سمجھنے اور عمل کرنے میں سہولت ہو۔ اللہ کے خوف سے رونا، سجدہ میں گر کر گریہ وزاری کرنا، اللہ کے وعدوں کو سچا جاننا، ان کی سچائی کا اقرار کرنا اور اللہ کی پاکی بیان کرنا قابل مدح عمل ہے۔ سعیدانِ ازلی کا عجز و انکسار اور تضرع و خشوع آیات قرآنی کو سن کر بڑھتا ہے یعنی جو لوگ ازلی کم نصیب ہیں ان کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ نفع انھیں لوگوں کو ہوتا ہے جو روز ازل سے خوش نصیب ہیں وغیرہ۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ

کہہ دو کہ تم اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو پکارو جس نام سے پکاروگے اُس کے اچھے اچھے نام ہیں (اے محمد)

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ وَقُلِ

تم اپنی نماز نہ بہت چلا کر پڑھو نہ بہت چپکے چپکے بلکہ اس کا درمیانی طریقہ اختیار کرو اور کہہ دو کہ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ

ہر تعریف اُسی اللہ کو زیبا ہے جو نہ اولاد رکھتا ہے نہ سلطنت میں اس کا کوئی شریک ہے نہ کمزوری

يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝ ع

کے سبب اس کا کوئی مددگار ہے اور اس کی خوب بڑائی بیان کرو

۱۲ ع ۱۱ ۱۲

تفسیر

ابن عباس اور مکحول کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں یَا اَللّٰهُ یَا رَحْمٰنُ کہا کرتے تھے۔ ایک مشرک نے سنا تو کہا محمدؐ ہم کو تو دو معبودوں کو پکارنے سے منع کرتے ہیں اور خود دو کو پکارتے ہیں۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ (ذکرہ ابن جریر فی تفسیرہ و محی السنۃ فی المعالم و صاحب السراج) سراج و معالم میں اس مشرک کا نام ابوجہل بیان کیا گیا ہے۔ حضرت عائشہ کی روایت میں ہے کہ حضور والاؐ دعا کرتے وقت یَا اَللّٰهُ یَا رَحْمٰنُ کہا کرتے تھے الخ۔ اس شان نزول کی بنا پر آیت مکی ہوگی، لیکن بعض مفسرین نے بروایت ابن عباس لکھا ہے کہ قرآن پاک میں اَلرَّحْمٰنُ کا لفظ بہت کم آیا تھا اور توریت میں بکثرت موجود تھا۔ اہل کتاب میں جب بعض لوگ مثلاً عبداللہ بن سلام اور ابن یامین وغیرہ مسلمان ہو گئے تو انھوں نے دعا کے وقت لفظ رَحْمٰن استعمال کرنے کی خواہش کی اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ اس روایت کی بنا پر آیت مدنی ہوگی۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ دعا میں لفظ اَللّٰہ استعمال کرو یا رَحْمٰن کا لفظ کہہ کر خدا کو پکارو دونوں جائز ہیں نہ لفظ اللہ بُرا ہے نہ رَحْمٰن بُرا ہے بلکہ انہی دو پر حصر نہیں۔ اللہ کے اور بھی بہت نام ہیں جو سب اچھے اچھے ہیں۔ ترمذی نے خدا تعالیٰ کے ننانوے نام ذکر کیے ہیں۔

اللّٰہ　الرَّحْمٰن　الرَّحِیم　المَلِک　القُدُّوس　السَّلَام　المُؤمِن　المُہَیْمِن　العَزِیز

اور قرآن میں بھی جا بجا تذکرہ فرما دیا وراں اسمائے صفات کے ساتھ بھی خدا کو پکارنے کا جواز ظاہر فرما دیا اور صاف طور پر فرما دیا کہ اللہ کے جتنے نام ہیں وہ سب اچھے اچھے ہیں۔ خصوصاً لفظ رحمٰن جو رحمت کی کثرت اور قوت پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ کے صفاتی ناموں میں مخلوق کے استعمال کے لئے سب سے مناسب اور موزوں نام ہے۔ صفت رحمت کی ہی مخلوق محتاج ہے اور یہی صفت ان تمام اوصاف کو جامع ہے جن کی احتیاج مخلوق کو ہے، مگر جاہل کور بصیرت اس حقیقت سے واقف نہ تھے، اس لئے لفظ رحمٰن سن کر اعتراض کرنے لگے۔

اس سے آگے وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ الخ میں نماز کو بہت زیادہ چلا کر اور بہت چپکے چپکے پڑھنے کی ممانعت فرما دی اور درمیانی آواز سے پڑھنے کا حکم دیا۔ آیت کے سبب نزول، مقام نزول اور مراد نزول میں اختلاف ہے۔ ترمذی نے بروایت ابن عباسؓ بیان کیا کہ حضورؐ مکہ میں پوشیدہ رہتے تھے مگر جب صحابہ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے تو قرآن کو بلند آواز سے پڑھتے تھے جس کو سن کر کفارِ مکہ قرآن کو، قرآن کے بھیجنے والے کو اور حضورؐ کو گالیاں دیتے تھے۔ روایت بخاری میں بھی موجود ہے۔ محمد بن اسحاق نے باسنادِ عکرمہ ابن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ جب حضور اقدسؐ نماز میں قرآن بلند آواز سے پڑھتے تھے تو کفار کو چونکہ قرآن کے سننے سے نفرت تھی، اس لئے وہ اِدھر اُدھر منتشر ہو جاتے اور اگر کوئی شخص حضورؐ کی زبانِ مبارک سے قرآن کا وہ حصہ سننا چاہتا جو آپ نماز میں پڑھتے تھے تو مشرکوں کے خوف سے چوری چھپے سے سن لیتا۔ اگر کوئی کافر سامنے پڑ جاتا تو اس کے خوف سے بیچارہ یوں ہی چلا جاتا، قرآن نہ سن سکتا۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

ان دونوں اسباب نزول سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول مکہ میں ہوا اور صلاۃ سے مراد ہی نماز ہے اور جہر و اخفاء کی ممانعت نماز کی قرأت میں ہی ہے۔ عکرمہ، حسن بصری اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے اس کی تائید ابن جریر کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو باسناد محمد بن سیرین بیان کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ قرأتِ نماز میں آواز بہت پست رکھتے تھے اور حضرت عمرؓ بہت چلا کر پڑھتے۔ حضرت ابوبکرؓ سے پست آواز سے پڑھنے کا سبب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا میں اللہ سے مناجات (خطاب) کرتا ہوں اور وہ میری حاجت کو جانتا ہے، اس لئے چلا کر پڑھنے کی کیا ضرورت۔ حضرت عمرؓ سے چلا کر پڑھنے کا سبب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا میں شیطان کو بھگاتا اور اونگھنے کو جگاتا ہوں۔ اس کے بعد جب آیت وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ الخ نازل ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ سے حضورؐ نے فرمایا آواز کچھ اونچی رکھا کرو اور حضرت عمرؓ سے فرمایا تم آواز کو کسی قدر نیچی رکھا کرو۔ آیت کے مکی ہونے پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ مکہ میں تو فرائض مقرر بھی نہ ہوئے تھے۔ ہاں ہجرت سے ایک سال پہلے معراج میں تعین تعداد ہوئی تھی۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے مفسرین نے جواب دیا ہے کہ رات کی نماز پہلے سے مقرر تھی اور مذکورۂ بالا کیفیت تہجد ہی کی نماز کی تھی۔

اول الذکر شان نزول کے موافق آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ نماز میں قرأت نہ اتنی بلند آواز سے کیا کرو کہ مشرکوں کو بدگمانی کا موقع مل سکے نہ اتنی پست آواز سے پڑھا کرو کہ ساتھیوں کو بھی نہ سنائی دے بلکہ درمیانی طریقہ اختیار کرو۔ ابن عباسؓ نے فرمایا یہ حکم مکہ میں تھا اور ہجرت کے بعد ساقط ہو گیا اور ہر طرح پڑھنے کی اجازت ہو گئی۔

مؤخر شان نزول کے لحاظ سے مطلب اس طرح ہوگا کہ تلاوتِ قرآن چلا کر نہ کیا کرو تاکہ مشرک منتشر نہ ہو جائیں اور اتنا چپکے سے بھی نہ پڑھا کرو کہ چوری چھپے سے سننے والے بھی نہ سن سکیں۔

بخاری کی ایک روایت میں آیا ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول دعا کے متعلق ہے (گویا صلاۃ سے دعا مراد ہے) ابن جریر نے بروایت عکرمہ ابن عباسؓ بھی یہی قول نقل کیا ہے۔ مؤطا میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے بھی یہی ثابت ہے۔ مجاہد، سعید بن جبیر، ابو عیاض، مکحول اور عروہ بن زبیر سے بھی یہی قول مروی ہے۔ حافظ ابن حجر نے کہا دونوں قولوں میں اختلاف نہیں ہے کیونکہ دعا سے وہی دعا مراد ہے جو نماز کے اندر ہوتی ہے۔ ابن مردویہ نے اس کی تائید میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت بھی نقل کی ہے۔

ابن جریر نے باسناد خود حضرت عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول تشہد کے بارے میں ہے۔ محمد بن سیرین سے بھی یہی قول منقول ہے۔ اس قول میں اور مذکورہ دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں کیونکہ تشہد نماز میں ہی پڑھا جاتا ہے۔

ابن عباسؓ کا ایک قول بروایت علی بن ابی طلحہ مروی ہے کہ آیت مذکورہ کا مطلب یہ ہے کہ نماز کو ظاہر کرنے کے لئے بھی نہ پڑھو اور لوگوں کے خوف

بھی مت کرو۔ حسن بصری سے یہ مطلب مروی ہے کہ ظاہر میں نماز کو بناوٹ کے ساتھ نہ پڑھو

اور لوگوں کے خوف سے ترک بھی مت کرو۔ حسن بصری سے یہ مطلب مروی ہے کہ ظاہر میں نماز کو بناوٹ کے ساتھ نہ پڑھو اور نہ باطن میں اس کو خراب کرو۔ عوف و قتادہ سے بھی یہی قول مروی ہے۔ عبدالرحمن بن زید نے کہا کہ اہل کتاب نماز چپکے چپکے پڑھتے تھے، لیکن ان کا پادری جب کوئی لفظ چلّا کر کہتا تو سب یک آواز ہو کر زور سے اُسی لفظ کا اعادہ کرتے۔ اللہ نے آیت مذکورہ میں مسلمانوں کو پادری کی طرح چلّانے سے منع کیا اور پادری کی اقتدا کرنے والوں کی طرح چپکے چپکے پڑھنے کی بھی ممانعت کر دی۔

مولف الذکر تینوں اقوال مرجوح ہیں۔ راجح وہی مطلب اور سبب نزول ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دیا۔ جب توحید، الوہیت، نبوت، حشر نشر وغیرہ کی تفصیل ختم کر دی تو سورت کے آخر میں وحدانیت کاملہ کے اظہار کے لئے یہودیوں، عیسائیوں، عرب کے مشرکوں اور مجوسیوں کے شرک آگیں عقیدہ کی بھی تردید فرماتا ہے تاکہ اسلامی توحید اور غیر اسلامی توحید میں فرق نمایاں ہو جائے۔ یہودی اور عیسائی بھی زبان سے اللہ کو ایک کہتے ہیں، مگر عزیر یا مسیح کو اللہ کا بیٹا قرار دے کر شرک کے غار میں گر پڑتے ہیں۔ اسی طرح عرب کے بعض قبائل زبان سے قائل توحید تھے، مگر ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ تمام عرب خدا کو مالک الملک اور مختار کل جانتے تھے، مگر یہ بھی کہتے تھے کہ الوہیت و معبودیت میں اس کے کچھ شریک ہیں، لیکن وہ اللہ کے زیر فرمان ہیں چنانچہ طواف کے وقت عموماً کہا کرتے تھے لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهٗ وَمَا مَلَكَ۔ فرقہ صابیہ اور فرقہ مجوس کا عقیدہ تھا کہ اگر اللہ کے مددگار نہ ہوتے تو وہ عاجز ہو جاتا۔ چونکہ یہ تمام عقائد شرک آمیز تھے، اس لئے قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سے آخر تک ان سب کی تردید فرما دی اور ظاہر کر دیا کہ خدا کی نہ کوئی اولاد ہے نہ کوئی شریک ہے نہ اس کو کسی مددگار کی ضرورت ہے۔ مسند احمد میں بروایت معاذ جہنی منقول ہے حضورؐ نے فرمایا قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سے وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا تک آیۃ التعریفات (ہر قسم کا رنج و غم دفع کرنے کے لئے مفید ہے) بنی ہاشم میں جب کوئی لڑکا صاف بولنے لگتا تو حضورؐ اس کو یہ آیت لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا تک سکھا دیتے تھے (رواہ عبدالرزاق فی مصنفہ) ابن جریر نے بیان کیا کہ اپنے آدمیوں میں سے ہر چھوٹے بڑے کو پوری آیت تعلیم دیتے تھے۔

مقصودِ بیان

اللہ کے نام ذاتی بھی ہیں اور صفاتی بھی۔ ذاتی و صفاتی دونوں قسم کے نام لے کر دعا کرنی جائز ہے۔ نماز کو درمیانی آواز سے پڑھنا چاہیئے نہ اتنی اونچی آواز کرنی چاہیئے کہ تمام میں شور مچ جائے نہ اتنی پست آواز سے پڑھی جائے کہ قریب کے مقتدی بھی نہ سن سکیں۔ خدا محتاج نہیں کہ اس کو اولاد کی ضرورت ہو، مجبور نہیں کہ شریک کا دست نگر ہو، عاجز نہیں کہ مددگار کا حاجت مند ہو بلکہ سب سے بالا، اعلیٰ اور والی ہے اور ہر قسم کی ستائش کا مستحق ہے وغیرہ۔

سُوْرَةُ الْكَهْفِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَّعَشْرُ اٰيَاتٍ وَّفِيْهَا اِثْنَا عَشَرَ رُكُوْعًا

سورہ کہف مکہ میں نازل ہوئی اس میں ایک سو دس آیتیں اور بارہ رکوع ہیں

قرطبی، ابن عباس، ابن زبیر بلکہ اکثر مفسرین کے نزدیک یہ سورت پوری کی پوری مکی ہے۔ کوئی آیت مستثنیٰ نہیں، لیکن بعض علماء نے آغاز سے صَعِيْدًا جُرُزًا تک چند آیات کو مدنی قرار دیا ہے۔ حسب تصریح ابن کثیر اوّل قول اصح ہے۔

اس سورت میں ۱۲ رکوع ۱۲۰ آیات ۱۴۸ یا ۱۵۷۷ کلمات اور ۶۶۲۰ یا ۶۳۶۰ حروف ہیں۔ اس سورت کے خواص و فضائل احادیث میں بکثرت مروی ہیں۔ صحیحین میں حضرت براء بن عازب کی روایت ہے کہ ایک رات ایک صحابی (اُسید بن حضیر) اپنے گھر میں سورۂ کہف پڑھ رہے تھے۔ ایک گھوڑا بھی قریب ہی بندھا تھا۔ سورۂ کہف پڑھنے کے دوران میں گھوڑا بدکنے لگا۔ صحابی نے منہ اٹھا کر دیکھا تو ایک نور بصورت ابر سایہ افگن نظر آیا۔ صبح کو قصہ شبینہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اس کو پڑھا کرو۔ یہ سکینہ (نور اطمینان) تھا جو پڑھنے سے نازل ہوا تھا۔

امام احمد نے بروایت ابو الدرداءؓ بیان کیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیتیں حفظ کیں

وہ فتنۂ دجال سے محفوظ رہا (وقدرواہ مسلم فی صحیحہ وابوداؤد والنسائی) ترمذی کی روایت میں تین آیات کا ذکر ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ

ہر تعریف اسی اللہ کو زیبا ہے جس نے اپنے بندہ پر کتاب نازل کی اور اس میں کچھ بھی کجی نہ رکھی بلکہ مستقیم بنایا تاکہ اللہ کی طرف

بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ

والے سخت عذاب سے ڈرائے اور اُن مسلمانوں کو جو نیک کام کرتے ہیں اس بات کی بشارت دے کہ اُن کے

اَجْرًا حَسَنًا ۝ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝ مَا لَهُمْ

لئے اچھا اجر ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے اُن کو ڈرائے اس کا

بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآىِٕهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝

نہ اُن کو کچھ علم ہے نہ اُن کے باپ دادا کو بڑی ہی سخت بات اُن کے منہ سے نکلتی ہے یہ لوگ بڑا جھوٹ بکتے ہیں

تفسیر

انسان پر اللہ کے غیر محدود احسانات ہیں۔ خدا تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار ناممکن ہے۔ مادی جسمانی نعمتیں لاکھوں ہیں۔ ہوش حواس شعور اور عقل اسی کا عطیہ ہے۔ شعور اور عقل کا کام ہے بُرے بھلے اور صحیح غلط میں امتیاز کرنا، لیکن تصرفات عقل و وہم کی آمیزش سے پاک نہیں ہوتے۔ کبھی اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا۔ خیر کو شر اور شر کو خیر آدمی سمجھنے لگتا ہے۔ مادی زندگی میں ہی اس کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ معاشرت، اخلاق، تمدن، سیاست غرض زندگی کے ہر شعبے کے قوانین و ضوابط کی ترتیب و تاسیس دماغ ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے، لیکن ان قوانین کی واقعی تصحیح و تغلیط آسان کام نہیں۔ ایک شخص ایک قانون کو واجب العمل اور مفید سمجھتا ہے۔ دوسرا شخص اسی قانون کو واجب الترک اور مضر جانتا ہے۔ قوموں کے رسم و رواج جدا جدا ہیں۔ دماغی استعداد الگ الگ ہے۔ سوچنے کی قوتیں مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز پر بھی انسانی افکار و خیالات کا اتفاق نہیں ہو سکا، اس لئے صحیح غلط کو پہچاننے کا معیار ہر شخص کی عقل کو تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں اس عقل کو معیار تمیز قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو کدورتِ وہم سے پاک، ہوا و ہوس کی آمیزش سے صاف، قومی ملکی، خاندانی اور شخصی اغراض و رسوم سے منزہ ہو اور اس کا واقعی نور اس زمانے کے تمام اہلِ دانش کی دماغی روشنیوں سے زائد اور سب کے تخیلات افکار پر غالب ہو۔ ایسی عقل سوا انبیاء و مرسلین کے اور کسی کی ہو نہیں سکتی۔ انبیاء کی قوت تمیزیہ اور دانش مکمل نور ہی نور ہوتی ہے۔ ہر وقت مبدءِ فیاض سے ان کے حواس، وجدانیات اور عقول پر قدسی فیضان ہوتا رہتا ہے۔ اسی فیضان کو شریعت کے طرف میں وحی، الہام اور القاء کہا جاتا ہے۔ چونکہ نبی کی دانش از سر تا پا نور ہی نور ہوتی ہے، اس لئے اخذ فیضان میں بھی کبھی غلطی نہیں کرتی اور دوسرے انسانوں کی طرح ترتیب، افکار اور تاسیس قوانین میں راستی سے نہیں ہٹتی۔ مبدءِ فیاض اور بارگاہِ قدس سے جو فیضان تدریجاً ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ جو قوانین، ضوابط اور احکام وحی کے ذریعہ سے آتے ہیں اُن کے مجموعہ کو آسمانی کتاب اور الہامی ہدایت نامہ کہا جاتا ہے۔ یہ ضوابط و قواعد دماغی اختراع و ایجاد کے منت کش نہیں ہوتے بلکہ غیبی فیضان کا نتیجہ ہوتے ہیں، اس لئے ہر غلطی سے پاک ہوتے ہیں، اُن میں کجی اور افراط و تفریط نہیں ہوتی، کسی طرف جھکاؤ نہیں ہوتا بلکہ حق سے باطل کی طرف میلان

سے احتمال ہی نہیں ہو سکتا۔

اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں سب سے بلند مرتبہ اس مجموعۂ قوانین کا ہے جو نبی کی وساطت سے مخلوق تک پہنچتا ہے۔ اگر یہ کتاب الٰہی نہ ہوتی تو انسانی آبادی اپنے افکار و خیالات کے اختلافات، پراگندگی اور تفرق کی وجہ سے کبھی ایک نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی اور ہمیشہ کے لئے اندھوں کی طرح اِدھر اُدھر تباہی کے غاروں میں گرتی رہتی۔ باوجود تلاشِ حق کے اس کو خالص صداقت سے ہمکنار ہونا کبھی نصیب نہ ہوتا اور پریشانی دماغ رکھنے والا بھولا انسان کبھی سیدھے راستے نہ چل سکتا۔ کیونکہ راہِ راست کا تعین ہی نہ ہو سکتا۔

وجوہ مذکورۂ بالا کی بنا پر سورۂ کہف کا آغاز حمدِ الٰہی سے کیا اور استحقاقِ حمد کا سبب اُس نعمت کاملہ کو قرار دیا جو تمام نعمتوں سے بالاتر ہے یعنی رسول پاکؐ پر اُس کتابِ مقدس کا نازل ہونا جو ہر غلطی، کجی، افراط و تفریط اور مادی طبعی رجحانات و میلانات سے پاک ہے، عطایائے الٰہیہ میں سب سے بڑی نعمت ہے۔ یہ احسان اس قابل ہے کہ بطریقِ وجوب اللہ کی حمد کی جائے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ مستحق حمد ہے وہ اللہ کہ جس نے مخصوص بندے پر ایک کتاب نازل فرمائی جو ہر غلطی سے پاک ہے۔ اس میں کسی قسم کی کوئی کجی اور جھکاؤ نہیں ہے۔ وہ انسانوں کے لئے ایک مکمل، ناقابلِ ترمیم دستور العمل اور ہدایت نامہ ہے۔ جس خاص بندہ پر خدا نے اپنی کتاب اتاری اُس کو حکم دیا کہ کتاب کے بیان کردہ نظریات، عقائد اور مسائل کو جو لوگ سچا جانیں اور اچھا کام کریں اُن کو دوامی نجات اور ابدی راحت کی بشارت دے دو اور جو لوگ راہِ توحید سے ہٹ کر شرک کے غاروں میں گر رہے ہیں خصوصاً وہ کثیر گروہ جو خدا کو صاحبِ اولاد یعنی عاجز، کمزور اور مددگار کا محتاج جانتا ہے اُن سے کہہ دو کہ تم کو عالمِ غیب کی باتوں کا کوئی علم نہیں۔ تم اور تمہارے اسلاف اپنی نادانی اور جہالت کے سبب ایسی بات مُنہ سے نکالتے ہو جو محض افترا اور خالص بہتان ہے۔

مقصودِ بیان

ہر طرح کی ستائش و حمد اللہ کو سزاوار ہے۔ کتاب الٰہی سب سے بڑی نعمت ہے۔ قرآن پاک ہر غلطی اور کجی سے پاک ہے۔ اس میں افراط و تفریط نہیں یہ راہِ اعتدال کی تعلیم دیتا ہے۔ رسول پاکؐ کا کام صرف یہ ہے کہ اہلِ حق کو دوامی نجات کی بشارت دیں اور اہلِ شرک کو ابدی عذاب سے ڈرائیں یعنی نبی کا فریضہ محض تبلیغ احکام ہے۔ اللہ ہر شرک سے پاک ہے خصوصاً کدورتِ اولاد سے تو بالکل ہی منزّہ ہے کسی کو خدا کی اولاد قرار دینا محض جہالت اور نادانی ہے۔ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ میں ایک زبردست زد ہے اُن کافروں پر جو خدا کو صاحبِ اولاد کہتے ہیں وہ یہ کہ عقیدہ کی بنا علم و یقین پر ہونی چاہئے، لیکن یہ لوگ کورے جاہل ہیں۔ صرف اسلاف کی تقلید سے انھوں نے اپنا یہ عقیدہ قائم کر رکھا ہے، مگر وہ بھی اسلاف جو نادان تھے اُن کے عقیدہ کی بنا بھی علم پر نہ تھی۔ حالانکہ عقائد کا مدار حقائقِ علمیہ پر ہونا چاہئے۔ تقلیدِ آباء سے تعمیرِ عقائد نہیں ہو سکتی اور چونکہ ان کے عقائد کی تعمیر تقلیدِ اسلاف پر ہے، اس لئے بالکل نادان ہیں۔

سورۂ کہف کا سببِ نزول

آیت قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ کے ذیل میں ہم اصحابِ کہف کے قصہ کو بیان کرنے کا سبب کسی قدر لکھ آئے ہیں۔ اس جگہ کسی قدر مفصل لکھنا ضروری ہے۔

محمد بن اسحاق نے بطریق عکرمہ ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قریش نے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو مدینہ کے یہودی عالموں کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے حالات دریافت کرنے بھیجا کیونکہ قریش مکہ اہلِ کتاب کو ہی خازنِ علم سمجھتے تھے۔ نمائندوں نے جا کر یہودیوں سے حضور اقدسؐ کے متعلق دریافت کیا علمائے یہود نے ان نمائندوں کو تین سوال تلقین کئے۔ ایک سوال روح کے متعلق تھا۔ دوسرا ذوالقرنین کے متعلق۔ تیسرا اصحابِ کہف کے متعلق۔ قاصد واپس آئے۔ قریش کو یہودیوں کا قول بتایا۔ قریش نے حضور اقدسؐ سے تینوں سوالات کئے۔ آپ نے دوسرے روز بتانے کا وعدہ کیا۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انشاء اللہ نہیں کہا تھا، اس لئے پندرہ روز (یا چالیس روز) وحی نہ آئی۔ حضورؐ بہت کبیدہ خاطر ہوئے۔ قریش کا سخت تقاضہ ہوا۔ بالآخر وحی آئی۔ سوال روح کے متعلق تو جواب قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ الخ۔ ذوالقرنین کے متعلق استفسار کا جواب آیت وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَيْنِ الخ میں دے دیا گیا اور اصحابِ کہف کی تفصیل اس سورت میں کر دی گئی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو انشاء اللہ کہنے کا حکم بھی آیت وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ الخ میں دے دیا گیا۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا ○

سو شاید آپ ان کے پیچھے اگر وہ اس کلام پر ایمان نہ لائے تو افسوس کر کے اپنی جان دے دو گے

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ○ وَإِنَّا

بے شک جو کچھ زمین پر ہے ہم نے اس کو زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ آزمائش کر لیں کہ کون سب سے اچھے کام کرتا ہے اور

لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا ○

جو کچھ اس پر ہے ہم بلاشبہ اس کو چٹیل میدان کر دیں گے

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم کے لئے رحمت بن کر آئے تھے۔ چشمۂ فیض کل دنیا کی سیرابی کے لئے جاری تھا۔ آفتاب نبوت کی کرنیں کائنات کے ذرے ذرے پر پڑ رہی تھیں، لیکن از لی بدبختوں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا۔ حضور والا نے اپنا فرض ادا کیا۔ ایمان و اطاعت پر جنت کی بشارت اور کفر و سرکشی پر دوزخ کی دھمکی دی۔ لیکن سرداران کفر اپنی کفر طرازیوں سے باز نہ آئے۔ حضور کو اقارب کے جہنم میں جانے کا جو کچھ صدمہ ہوتا وہ تو ہوتا ہی، مگر عام لوگوں کا عذاب میں دھکیلا جانا بھی گوارا نہ تھا۔ تکذیب اور سرکشی کرتے تھے تو دشمن، مگر رنج اور تکلیف ہوتی تھی حضور کو اور ایسی تکلیف ہوتی تھی کہ دنیا میں کسی کو اپنی ذات کے نقصان کی بھی اتنی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ ہر وقت اعداء کی ابدی ہلاکت کا رنج گھیرے رہتا تھا۔ چنانچہ ایک بار یک زبان ہو کر عتبہ، شیبہ، ابوجہل، نضر بن حارث، امیہ بن خلف، عاص بن وائل، اسود بن مطلب اور ابوالبختری وغیرہ نے حضور کی تکذیب کی اور قرآن کا انکار کیا اور حضور کو ان کے حسرتناک انجام سے سخت اندوہ ہوا۔ اعداء دین کی ہلاکت و بربادی پر رسول پاک کا اس قدر ناخوش رحمۃ للعالمین کو گوارا نہ ہوا اور آیات مذکورہ نازل ہوئیں۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ آپ کافروں کے کفر کا زیادہ غم نہ کیجئے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ غم نصیب دشمناں آپ کی جان کو نقصان پہنچائیں۔ دنیا تو آزمائش کی جگہ ہے اس میں کافر اور مومن سب ہی پیدا ہوتے اور رہتے ہیں۔ اس عالم کو ہم نے ہر طرح کی پھلواری سے اسی لئے سجا رکھا ہے کہ جانچ لیں کہ کون اس کی ہریالی پر مٹک کر آخرت سے غافل ہوتا ہے اور کون اس سرسبز باغ میں سامانِ آخرت فراہم کرتا ہے۔ آخر کار ایک دن ہم سب کو نیست و نابود کر کے اس زمین کو چٹیل میدان بنا دیں گے جس میں پتہ تک بھی نہ ہوگا اور اس وقت سب کو ان کے اعمال کی جزا سزا دیں گے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا دنیا شیریں خوش گوار سبز و زار ہے اور یا اللہ تعالیٰ اس میں تم کو خلیفہ کرنے والا ہے کہ تم کیسے عمل کرو گے۔ پس تم دنیا سے پرہیز کرنا خصوصاً عورتوں (کی دنیا) سے کیونکہ بنی اسرائیل میں پہلا فتنہ عورتوں سے پھیلا تھا (رواہ مسلم)

اختلافی نوٹ

ابن کثیر نے زینت سے مراد عام لی ہے اور صراحت کی ہے کہ زمین کی زینت جمادات، نباتات اور تمام حیوانات ہیں۔ خواہ انسان ہوں یا دوسرے جانور۔ بعض مفسرین کے نزدیک صرف آدمی مراد ہیں۔ یہی زمین کی زینت ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ علماء، صلحاء اور اہل خدا مراد ہیں۔ یہی زمین کی زینت ہیں۔ سعید بن جبیر اور حسن بصری کا بھی یہی قول مروی ہے۔ امام رازی نے فرمایا جس طرح آسمان کی زینت ستارے ہیں اسی طرح زمین کی زینت ہر وہ چیز ہے جس سے روئے زمین پر خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔ ابن کثیر اور امام رازی کے اقوال قریب المفہوم ہیں اور یہی مطلب لینا اولیٰ ہے۔

تفسیری احتمال

اعمال بد اور نیکو کار لوگوں کے دلوں میں اکثر ایک شبہ پیدا ہوتا ہے اور آج کل تو سطحی نظر رکھنے والے اس شبہ کا شکار ہو کر حقانیت اور صداقت سے پہلو تہی کرنے لگے ہیں۔ وہ یہ کہ جو لوگ قیامت کے قائل ہیں نہ عذاب و ثواب کے نہ جنت دوزخ کے بلکہ خدا کے بھی منکر ہیں جو کہ واجب الوجود کی ہستی کا اقرار کرتے بھی ہیں تو صراحۃً شرک بھی کرتے ہیں۔ کوئی مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دیتا ہے اور صلیب کے آگے سجدہ ریز ہوا کرتا

ہے۔ کوئی فرضی دیوتاؤں کی فرضی مورتیوں کے سامنے ڈنڈوت کرتا ہے، کوئی آفتاب اور ستاروں کے آگے سربسجود ہوتا ہے۔ باوجود اس سرکشی اور نافرمانی کے یہ لوگ خوش عیش، خوش نصیب اور خوش حال ہیں۔ دولت، حشمت، حکومت، عزت، سلطنت سب کچھ ان کا ہے۔ بدھ مت کا شیفتہ، ہندو ازم کا علمبردار اور صنیب کے حامل سب ہی مسرت و خوشحالی سے ہم کنار ہیں، لیکن تباہ کار خستہ حال اور مصیبت زدہ ہیں تو مسلمان۔ وہ مسلمان جو توحید کے علمبردار، دین الہٰی کے پرستار اور شریعت غراء کے خدمت گار ہیں۔ ان کی خدا پرستی ان کو تباہ کئے ہوئے ہے۔ "برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر" پھر مسلمانوں میں بھی وہ طبقہ خوش حال ہے جو خدا کا باغی، رسول سے سرکشی کرنے والا، نماز روزہ کو جہالت کا تمغہ سمجھنے والا، جنت دوزخ اور عذاب ثواب کا مذاق اڑانے والا ہے اور علانیہ شراب خوار، بدکردار، زناکار، مکار دغا باز، جعل ساز، منافق اور ڈپلومیٹ ہے۔ کیا خدا کو نیک طینت، فرماں بردار اور خوش اطوار مسلمانوں سے دشمنی ہے یا کلمۂ توحید زبان سے نکالنا خدا کی دشمنی کا سبب ہے۔ غیروں سے یگانگت اور اپنوں سے بیگانگی، دوستوں سے جفاکاری اور دشمنوں سے رازداری یہ کہاں کا شیوۂ انصاف ہے۔ غرض اسی قسم کے شبہات عام کیا اچھے اچھے تعلیم یافتہ دماغ دار لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اور جس سے ہوشیار مسلمان بھی گمراہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے ایمان داروں کو تسلی دینے کے لئے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ روئے زمین کی کل بہار چند روزہ ہے۔ یہ تمام آراستگی اور سجاوٹ فانی ہے۔ فانی کا اعتبار ہی کیا یعنی یہ وجہ امتیاز اور سبب تفاخر نہیں ہو سکتی نہ یہ دوستی دشمنی اور عزت و ذلت کا معیار قرار پا سکتی ہے۔ اس سے مقصد صرف یہ ہے کہ اچھوں بروں کی آزمائش ہو جائے۔ نیکوکاروں اور بدکاروں کی تفصیل اور ان کا باہم امتیاز ہو جائے۔ عزت و ذلت کا معیار تو آخرت ہے۔

اصحابِ کہف کا قصّہ

آیات کی تفسیر کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب کہف کا مختصر قصہ لکھ دیا جائے جو محمد بن اسحاق بن یسار، ابن کثیر، گبن، ولیم میور وغیرہ مورخین اسلام و جرچ کی تصریحات سے ثابت ہے۔

شہر افسوس یا اُفسس جس کو عربی میں طرطوس کہتے ہیں۔ ایشیائے کوچک کا ایک شہر ہے۔ اس میں ارتمیس دیوی کا ایک مندر تھا جس کا شمار عجائبات عالم میں ہوتا تھا۔ سکندر رومی کی شب ولادت میں کسی شخص نے اس کو جلا دیا تھا۔ کچھ مدت کے بعد پھر اس کی تعمیر کی گئی۔ اس شہر سے تین میل کے فاصلے پر وہ پہاڑ ہے جس کے غار میں اصحاب کہف غائب ہوئے تھے۔ یہ غار کئی میل لمبا ہے۔ اس کی کئی شاخیں اور ہیبت ناک درّے ہیں۔

شاہان روم کا پایۂ تخت ملک اٹلی میں شہر روم تھا۔ فیلپوس کے عہد کے بعد ۲۴۹ء میں ڈسیشس یعنی دقیانوس بادشاہ ہوا۔ اس زمانے کے قیاصرۂ روم عموماً بت پرست تھے۔ عام بت پرستی کا رواج تھا۔ خصوصاً جوپٹر کی عبادت تو فرضِ قطعی تھی۔ جو کوئی انکار کرتا اس کو طرح طرح کے عذاب دے کر قتل کیا جاتا تھا۔ اصحاب کہف کی فرار کا واقعہ ۲۴۹ء میں ہوا۔ تین سو برس یہ خواب کی حالت میں رہے۔ ۵۴۹ء میں یعنی رسول پاکؐ کی ولادت مبارکہ سے تقریباً ۲۰ سال پہلے بید روس قیصر روم ہوا۔ یہ دین دار بادشاہ تھا۔ اسی کے زمانہ میں اصحاب کہف کے غار کے دہانے پر کتبہ لگایا گیا تھا۔

حشو و زوائد حذف کرنے کے بعد ہم اب اصل قصہ لکھتے ہیں۔ دقیانوس شاہ روم اگرچہ نصرانی مذہب رکھتا تھا، مگر حضرت کے دور کو ڈھائی سو برس کا عرصہ گزر چکا تھا اور دین عیسوی بگڑ بگڑ کر کچھ سے کچھ ہو گیا تھا۔ توحید کی بجائے بت پرستی کا عام رواج تھا۔ بادشاہ بھی بت پرستی کی طرف جھک گیا تھا اور چونکہ طبعاً ظالم و جفاکار تھا، اس لئے رعایا کو بت پرستی پر مجبور کرتا تھا۔ بتوں کے ناموں پر بھینٹ چڑھواتا تھا اور جو انکار کرتا تھا اس کو قسم قسم کی تکلیفیں دے کر قتل کروا دیتا تھا۔ کسی کو آگ میں جلوا دیتا تھا۔ یہ سفاک ظالم بادشاہ شہر شہر گشت لگاتا، سیکڑوں کو بت پرست بناتا اور ہزاروں اہلِ توحید کو تہ تیغ کرتا ہوا شہر افسوس یعنی طرطوس میں بھی آ نکلا۔ اہلِ ایمان اپنا دین بچانے کے لئے شہر سے بھاگے اور سرکاری سپاہیوں نے گرفتار کرنا شروع کیا۔ کوئی مارا گیا، کسی نے توحید سے بیزاری کا اعلان کیا اور بادشاہ کے حکم سے بت پرستی اختیار کر لی۔ امرائے شہر کے چند لڑکے جو نوجوان تھے اور جن کے دلوں میں نورِ ایمان پیوست ہو چکا تھا اور جو عام قوم اور حاکم وقت کی حالت دیکھ کر تنگ آ گئے تھے۔ اپنے اپنے گھروں سے انفرادی طور پر نکلے اور ہر شخص اپنی جان اور دین بچانے کے لئے اعزا و اقارب، مال و منال اور گھر بار چھوڑ کر چل دیا۔ اور ایک جگہ پناہ لینے کے لئے بیٹھ گیا۔ حسن اتفاق دوسرا تیسرا جو تھا غرض ہر ایک اسی خیال کے تحت گھر سے نکلا اور جہاں پہلا نوجوان آ کر بیٹھا تھا وہیں سب جمع ہو گئے اور سب نے ڈرتے ڈرتے اپنا حال دوسرے سے کہا۔ ادھر سرکاری آدمی تلاش میں تھے۔ سراغ لگاتے لگاتے سب کو گرفتار کر کے دقیانوس کے سامنے لے گئے۔ دقیانوس نے بت پرستی کی ترغیب دی۔ یکسلمینا جو سب سے بڑے تھے آگے بڑھے اور بولے ہم مالک زمین و آسمان کو چھوڑ کر کسی کی پرستش نہیں کر سکتے۔ ہم سے کفر و شرک کی امید نہ رکھو۔ ہم ہر دکھ سکھ سہنے کے لئے تیار ہیں۔ ساتھیوں نے بھی اس قول کی تائید کی اور توحید پر اتفاق ظاہر کیا۔

بادشاہ محمد ان کی یہ جرأت دیکھ کر امیرانہ لباس اتروالیا اور بولا تمہاری نوجوانی اور حُسن پر ترس آتا ہے، اس لئے چند روز کی مہلت دیتا ہوں تاکہ ہوش وحواس درست ہو جائیں اور عقل ٹھکانے پر آجائے۔ چنانچہ ان علمبرداران توحید کو چند روز کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ بادشاہ خود شہر افسوس سے چلا گیا۔ انھوں نے باہم مشورہ کیا کہ بادشاہ کی واپسی پر وہی فتنہ ہوگا۔ جب گھر بار اور قوم کو چھوڑا ہے اور بُت پرستی سے روگردانی کی ہے تو بہتر ہے کہ یہاں سے نکل چلو اور کسی غار میں چھپ رہو۔ مشورہ کے بعد بچے اپنے اپنے گھروں سے کچھ نقد سامان ساتھ لیا اور شہر سے تین میل کے فاصلے پر کوہ بنجلوس میں ایک بڑے غار کے اندر جا چھپے۔ وہاں سجدے میں گر پڑے۔ حق تعالیٰ سے زاری کی، خدا تعالیٰ نے ان کی بے چینی اور تشویش رفع کرنے کے لئے اُن کے دماغوں پر ایسا نیند کا پردہ ڈالا کہ سب سو گئے۔ دقیانوس واپس آیا ہر طرف تلاش کرایا کہیں پتہ نہ چلا۔ اصحاب کہف کے جاتے وقت ایک کُتّا بھی ساتھ ہو لیا تھا جو شکار یا کسی دوسری جائز مصلحت کے لئے تھا وہ غار کی دہلیز پر بیٹھ گیا اور خواب و بیداری میں اس کا حال بھی اُنہی جیسا ہوا۔ تین صدیاں یوں ہی گزر گئیں۔ تخت روم پر کئی بادشاہ بدلے۔ ملکی رسوم و رواج میں تغیر عظیم پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ ایک نیک دیندار عیسائی بادشاہ جس کا نام بیدروس تھا والی ملک ہوا (ابن کثیر، مفسر سراج اور محی السنہ نے تندوسیس نام لکھا ہے اور حیات الحیوان نے تاودسیوس بتایا ہے اور لوگوں کو ایمان کی طرف بُلایا۔ چونکہ مذہبی تحریف و تغیر کو صدیاں ہو چکی تھیں، اس لئے بہت سے لوگ اصلاح پر نہ آئے۔ بدستور کفر و شرک پر قائم رہے اور آبائی مذہب نہ چھوڑا۔ بالآخر بادشاہ نے دعا کی کہ پروردگار کوئی ایسی علامت ظاہر فرما جس سے لوگوں کو مرکر دوبارہ پیدا ہونے کا یقین آجائے۔ دعا قبول ہوئی اور قمری حساب سے پورے تین سو نو برس کے بعد یعنی ۵۴۹ء میں اصحاب کہف کی آنکھ کھلی جس وقت غار میں سوئے تھے اس وقت آفتاب قریب غروب تھا اور بیداری کا بھی قریب قریب وہی وقت تھا اور پھر نیند بھر سو بھی لئے تھے، اس لئے باہم کہنے لگے کہ تقریباً پورے دن ہم سوئے ہوں گے۔ اور چونکہ بھوک کی بھی خواہش تھی پھر یہ بھی فکر تھا کہ خدا جانے ہمارے بھاگنے کے بعد کیا فیصلہ ہو، اس لئے تملیخا کو بھیجا گیا تاکہ سرکاری آدمیوں کی نظروں سے بچتے بچاتے اپنی خوش تدبیری کے ساتھ شہر میں جائیں اور تحقیق کر کے کھانا لائیں کہ کہیں حرام ذبیحہ تو نہیں ہے۔ تملیخا دقیانوسی سکّے لے کر شہر کے دروازہ پر پہنچے تو شہر کا درو لقہ بدلا ہوا نظر آیا۔ اندر داخل ہوئے تو دیکھا نہ وہ بازار ہے نہ وہ شہر ہے نہ وہ آدمی ہیں نہ قدیم عمارتیں ہیں نہ وہ طرز معاشرت ہے۔ یا تو کوئی بھی کا نام لیوا نہ تھا یا اب بہتیرے آدمی نمازیں پڑھتے اور صورت شباہت سے نیکو کار نظر آتے ہیں۔ یہ تغیر دیکھ کر حیران ہو کر ایک ایک کا مُنہ تکنے لگے شہر کا نام پوچھا تو افسوس معلوم ہوا۔ غرض اسی حیرانی میں ایک دوکان سے سودا خریدنے کے لئے سکّہ نکالا۔ دوکان دار پُرانا سکّہ دیکھ کر حیران اور متعجب ہوا اور شبہ ہوا کہ ان کو کہیں گڑھا ہوا دفینہ ملا ہے۔ شدہ شدہ چاروں طرف سے آدمی جمع ہونے لگے۔ عوام تو جانوروں کی خاصیت رکھتے ہی ہیں، بھیڑ ہو گئی۔ حاکم وقت سے بھی کسی نے تذکرہ کر دیا۔ بیدروس نے طلب کیا۔ انھوں نے جا کر پورا واقعہ کہہ دیا۔ آخر سب غار تک آئے اور تملیخا غار میں داخل ہو کر غائب ہو گئے۔ خدا جانے دوبارہ سو گئے یا وفات پا گئے۔ بادشاہ نے پتھر یا سیسے کی لوح کا کتبہ غار کے دہانے پر لگوا دیا۔

اب ہم آیات کی تفسیر کی طرف رجوع کرتے ہیں اور بقیہ مضامین ہر آیت کے تحت میں بیان کریں گے جو اپنے اپنے موقع اور محل پر ظاہر ہوں گے۔

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝ إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ

(اے محمد) کیا تم نے سمجھا بھی ہے کہ اصحاب کہف و رقیم والے ہماری نشانیوں میں سے عجیب چیز تھے جب چند جوان

إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ۝ فَضَرَبْنَا

اُس غار میں جا بیٹھے اور بولے اے ہمارے رب ہم کو اپنے پاس سے رحمت عطا فرمانا اور ہم کو ہمارے کام میں کامیابی کی راہ یابی مرحمت کر پس ہم نے کئی

عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصٰى لِمَا

برس تک غار کے اندر اُن کے کانوں پر (نیند کا) پردہ ڈالے رکھا پھر اُن کو اُٹھایا تاکہ صاف معلوم ہو کہ دونوں گروہوں میں سے ٹھہرنے کی مدت کس نے

لَبِثُوْٓا اَمَدًا

خوب یاد رکھی

تفسیر یہودیوں نے کفارِ مکہ کو جو تین سوال تلقین کئے تھے وہ ان کی نظر میں نہایت عجیب تھے۔ کسی شخص کا مشرق سے مغرب تک سفر کرنا اس زمانے میں عجیب ترین بات تھی۔ روح کی حقیقت کے متعلق سوال بھی کچھ کم عظمت نہیں رکھتا۔ پھر سب سے بالا اصحابِ کہف کا واقعہ تھا۔ تین سو برس تک آدمی کا سوتا رہنا کس قدر تعجب خیز اور حیرت آفریں امر تھا۔ یہودی تو پھر اہلِ کتاب تھے اور علم و معرفت کا دعویٰ رکھتے تھے۔ جب مذکورہ تینوں امور ان کی نظر میں تعجب انگیز تھے تو مکہ کے کافر جو کہ علم و معرفت کی ہوا بھی نہ لگی تھی واقعاتِ عالم سے قطعاً نابلد تھے، تاریخ سے کوئی بہرہ ان کو نہ ملا تھا اُن کو کیوں تعجب نہ ہوتا۔ حالانکہ اصحابِ کہف سے کہیں زیادہ تعجب انگیز ہزارہا علاماتِ قدرت موجود ہیں۔ تخلیقِ کائنات ذرہ سے لے کر آفتاب تک اپنے اندر حیرت و تعجب کے بے پایاں ذخائر رکھتی ہے۔ چشم بصیرت کی ضرورت ہے، دیدۂ بینا لازم ہے، اس لئے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ کہف و رقیم والوں کا قصہ تم کو عجیب معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ دوسری علاماتِ قدرت اور نشانہائے فطرت کے مقابلے میں اس قصہ میں کوئی اچنبھا نہیں ہے۔

حَسِبْتَ میں خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے، لیکن سائل رسول اللہ ﷺ نہ تھے نہ حضور ﷺ کو اصحابِ کہف کے قصہ سے کوئی تعجب تھا۔ آپ کو اس سے کہیں زیادہ حیرت آفریں مناظرِ قدرت ہر وقت دکھائے جاتے تھے، اسی لئے مفسرین نے کہا کہ روئے خطاب سوال کرنے والوں کی طرف ہے۔ سائلوں میں ہر شخص کو مخاطب کر کے جواب دینا دشوار تھا، اس لئے کافروں پر تعریض کرتے ہوئے حضور ﷺ کو خطاب فرمایا۔ اُردو میں بھی یہ محاورہ بکثرت مستعمل ہے۔ کَہْف بڑے غاروں کو کہتے ہیں۔ ابن کثیر نے اس کی صراحت کی ہے۔ حیات الحیوان میں کہف کا نام حزم لکھا ہے۔ عطیہ، قتادہ، عوفی اور ابن عباس کا قول ہے کہ رقیم اصحاب کہف کے مکانات کا نام ہے۔ ابن عباس کی ایک روایت ہے کہ کعب کے نزدیک رقیم اس قریہ کا نام ہے جہاں اصحابِ کہف رہتے تھے۔ ابن جریج کی روایت میں رقیم اس پہاڑ کا نام ظاہر کیا گیا ہے جس میں غار تھا۔ ابن عباسؓ کی دوسری روایت میں ہے کہ پہاڑ کا نام بنجلوس تھا۔ شعیب جبائی نے بھی پہاڑ کا نام بنجلوس ہی لکھا ہے۔ لیکن حیات الحیوان میں بنجلوس لکھا ہے۔ ابن عباس کا قول بطریق علی بن ابی طلحہ یہ ہے کہ رقیم کے معنی ہیں "کتبہ" سعید بن جبیر نے کہا رقیم پتھر کی ایک لوح تھی جس پر اصحابِ کہف کا حال لکھ کر غار پر لگا تھا۔ عبدالرحمٰن بن زید کا بھی یہی قول ہے۔ ابن کثیر اور ابن جریر نے بھی اسی قول کو پسند کیا ہے۔ مفسر سراج نے لکھا ہے کہ رقیم سیسہ کی لوح تھی جس پر اصحاب کہف کا حال لکھا تھا۔ محی السنہ نے تفسیر معالم میں اسی قول کو ترجیح دی ہے۔

تفسیر سراج میں یہ بھی لکھا ہے کہ اصحابِ رقیم ایک اور قوم تھی، مگر یہ قطعاً غلط ہے۔ سببِ نزول اور بیانِ قرآنی اس کے منافی ہے۔ نہ کفار نے اصحابِ کہف کے علاوہ اور کسی قوم کی حالت دریافت کی تھی نہ قرآن نے ان کی تفصیل بیان کی۔

اس سے آگے اصحاب کہف کا قصہ مجمل طور پر بیان کیا گیا ہے۔ شاہ دقیانوس کے ظلم سے تنگ آکر اپنا دین و ایمان بچانے کے لئے چند نوجوان بھاگ کھڑے ہوئے (یہ نوجوان طرطوس یا افسوس یا اُفسس کے رہنے والے تھے) فرہاد مرزا نے اپنے جغرافیہ کے صفحہ ۳۲۴ پر لکھا ہے کہ ایشیائے کوچک کے مغربی سمت میں ازمیر سے جنوبی جانب تقریباً ۳۷ میل کے فاصلے پر شہر اُفسس واقع تھا۔ اُفسس کو اِس زمانے میں ایاز لوگ کہتے ہیں۔ لاڈ ولیم میور نے تاریخ کلیسا کے چھٹے باب میں صفحہ ۴۴۲ پر لکھا ہے کہ اُفسس کے رہنے والے سات جوان ڈیشیش کے ظلم کی سختی سے تنگ آکر شہر چھوڑ کر باہر ہی کسی غار میں چھپے تھے اور وہاں دو سو برس تک سوتے رہے [1]۔ (الخ) اور بارگاہِ الٰہی میں دعا کی کہ پروردگارا اپنی طرف سے ہم پر رحمت نازل فرما اور

---

[1] ولیم میور نے مدتِ خواب دو برس لکھی ہے۔ یہ اس کی تاریخ دانی کا قصور ہے۔ اس مصنف نے بیانِ قرآنی کو مبالغہ آمیز کہا ہے۔ حالانکہ تعصب کی عینک اگر اتار کر دیکھا جائے تو مصنف مذکور کا بیان غلط ہے کیونکہ سنہ ۲۴۹ء میں دقیانوس شاہ اٹلی تھا اور اسی کے زمانے کا یہ واقعہ ہے۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

كَذِبًا ۞ وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ

جب تم ان (کافروں) سے اور اُن چیزوں سے جن کی اللہ کے علاوہ یہ عبادت کرتے ہیں الگ ہوگئے تو اب غار میں چل کر بیٹھو ہو تاکہ تم پر　کی ہو

رَبُّكُمْ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِنْ أَمْرِكُمْ مِرْفَقًا ۝

تمہارا رب　اپنی رحمت کشادہ کردے　اور تمہارے کام　میں آرام کا سامان مہیا کردے

تفسیر مجمل قصہ بیان کرنے کے بعد یہاں سے تفصیل شروع فرمائی۔ بادشاہ دقیانوس کا شہر افسوس میں داخل ہونا، بُت پرستی پھیلانا، اہلِ ایمان کو سخت تکلیفیں دے کر قتل کرنا۔ ان تمام واقعات کو قرآن نے نہیں بیان فرمایا، اس کے بعد کا قصہ ظاہر کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اصحاب کہف چند نوجوان تھے (مجاہد نے کہا یہ خبر ملی ہے کہ ان میں سے بعض کے کانوں میں بالے پڑے ہوئے تھے۔ بعض مفسرین نے کہا کہ وہ سب امیرزادے تھے بلکہ ایک تو وزیر کا بیٹا تھا) پروردگار پر سب کا ایمان تھا۔ جب وہ دل سے مومن ہوچکے تھے تو اللہ نے ان کو مزید ہدایت اور ایمان پر استقلال عطا فرمایا (بادشاہ نے ان کو گرفتار کرایا۔ حاضر دربار ہوئے تو بادشاہ نے بُت پرستی کی ترغیب دی۔ انہوں نے جواب میں) کہا ہمارا رب وہ ہے جو آسمان اور زمین کا موجد مربی اور باقی رکھنے والا ہے۔ اس کو چھوڑ کر ہم کسی کو معبود نہیں بنا سکتے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اکثر مفسرین کا اس امر پر اجماع ہے کہ اصحاب کہف امیرزادے تھے۔ اُن کی قوم کا دستور تھا کہ سال میں ایک مرتبہ تیوہار کے دن شہر کے باہر میلہ لگاتے، اپنے اپنے بتوں کی پوجا کرتے اور ان کے نام بھینٹ چڑھاتے تھے۔ جب دستور میلہ ہوا۔ اصحابِ کہف بھی میلہ میں شریک ہوتے اور قوم کو بُت پرستی میں مبتلا دیکھا۔ یہ لوگ مختلف خاندانوں کے افراد تھے اور باہم شناسا نہ تھے، لیکن ہر ایک بجائے خود بُت پرستی سے متنفر تھا۔ جب ہر ایک نے اپنے خاندان کو مورتی کی پوجا کرتے دیکھا تو خاندان والوں سے علیحدہ ہوگیا اور ایک درخت کے نیچے جاکر بیٹھ گیا۔ حُسنِ اتفاق بحکم الٰہی دوسرا شخص بھی اپنے بُت پرست خاندان سے علیحدہ ہوکر اسی درخت کے نیچے آبیٹھا۔ اسی طرح سب لوگ توحید کو دل میں چھپائے اور بُت پرستی کے خلاف اپنے سینے کے اندر جذبہ لئے ایک ہی درخت کے زیرِ سایہ اکٹھے ہوگئے، لیکن ہر ایک اپنے عقیدہ اور خیال کو دوسرے سے چھپائے ہوئے تھا۔ بالآخر ایک شخص بولا بھائیو! کوئی خاص سبب ضرور ہے کہ تم لوگ اپنے خاندانوں سے جدا ہوکر یہاں آکر بیٹھے ہو۔ مناسب ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو رازدار سمجھتے ہوئے اپنے اندرونی خیالات کا اظہار کردو۔ ایک شخص نے کھڑے ہوکر جواب دیا بھائیو! میں نے اپنی قوم کو پتھروں کے سامنے سر جھکاتے ہوئے دیکھا مجھے یہ امر باطل معلوم ہوا۔ عبادت کے لائق تو وہی ہے جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔ اس شخص کی جرأت دیکھ کر ہر ایک نے اپنا ایمان ظاہر کردیا اور سب متفق الرائے ہوگئے اور ایک عبادت خانہ تعمیر کرلیا۔ کچھ زمانے کے بعد اس واقعہ کی اطلاع بادشاہ کو ہوئی، اُس نے بُلایا۔ یہ لوگ سرِ دربار پہنچے اور نہایت بے باکی سے اظہارِ حقانیت کیا اور اپنے خاندانوں کے عقائد کی تردید کرتے ہوئے بولے اگر یہ لوگ حق پر ہیں تو کیوں اپنے عقیدہ کا واضح ثبوت نہیں پیش کرتے۔ (کیا خدا نے ان کو مورتی کی پرستش کا حکم دیا ہے یا یہ خود ساختہ کارروائی ہے۔ خود ساختہ عقیدہ تو بے بنیاد اور باطل ہے اور اگر اللہ کی طرف یہ اپنے عقیدہ اور عمل کو منسوب کرتے ہیں تو محض بہتان ہے) اور خدا پر بہتان تراشی سے بڑھ کر اور کیا ناحق شناسی کی بات ہوسکتی ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ (اہلِ توحید کا) یہ جواب سن دقیانوس نے ان کو ڈرایا دھمکایا۔ امیرانہ لباس اتروالیا اور سوچنے سمجھنے کیلئے کچھ زمانے کی مہلت دی۔ یہ لوگ چلے آئے اور ایک جگہ بیٹھ کر بولے بھائیو! جب تم لوگ بُت پرست قوم اور ان کی بُت پرستی سے کنارہ کش ہوگئے ہو تو چلو کسی غار میں پناہ گزیں ہوجائیں۔ یقین کامل ہے کہ خدا تعالیٰ وہاں تم پر مصیبت نہ ڈالے گا اور کارسازی فرمائے گا۔ چونکہ اصحابِ کہف کو اللہ پر پورا ایمان تھا اس لئے یقین کے ساتھ عافیت و نجات پاجانے کا انہوں نے اظہار کیا۔

مقصودِ بیان آیت نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُمْ صاف دلالت کررہی ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کا تذکرہ کرنا اہلِ ایمان کا شیوہ ہے مگر تذکرہ کو سچائی اور تحقیق کے ساتھ بیان کرنا لازم ہے۔ افراط و تفریط اور جھوٹا مبالغہ کسی طرح جائز نہیں۔ آیت....

زدنٰہم ہُدًی بتا رہی ہے کہ جو لوگ راہ خدا کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور پروردگار پر ایمان رکھتے ہیں اللہ ان کو ہدایت اور مزید ہدایت عطا کرتا اور ہدایت پر ثابت قدم رکھتا ہے۔ اس آیت سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگرچہ نفس ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ مگر ایمان کی شاخوں میں زیادتی ہو سکتی ہے۔ اطمینان قلب، دل میں استقامت، ایمان پر ثبات۔ یہ تمام امور نفس ایمان سے زائد ہیں جو رفتہ رفتہ حاصل ہوتے ہیں۔ اس آیت سے امام بخاری اور بعض دیگر ائمہ نے استدلال کیا ہے کہ ایمان میں زیادتی کمی ہوتی ہے، مگر صحیح وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا اور اسی پر آیت دلالت کرتی ہے۔ امام بخاری وغیرہ کا استدلال صحیح نہیں بلکہ امام ابو حنیفہؒ کا مسلک صحیح ہے کہ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ فرعی زیادتی اور نقصان ممکن ہے۔ آیت اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا سے یہ سبق تعلیم دے رہی ہے کہ انسان کو اظہار حقانیت و اعلانِ صداقت میں بے باک ہونا چاہئے کسی جبر و طاقت سے مرعوب نہ ہونا چاہیئے۔ لَوْلَا یَاْتُوْنَ الخ سے یہ بات واضح ہے کہ شرک اور غیر اللہ کی پرستش کا کوئی واضح ثبوت ممکن نہیں اور جس بات کا ثبوت نہ ہو وہ واجب الترک ہے۔ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی الخ سے یہ تلقین کرنی مقصود ہے کہ اپنی طرف سے شرعی مسائل اعتقاد کا فیصلہ کرنا اور اس فیصلہ کو بغیر کسی ثبوت کے اللہ کی طرف منسوب کرنا انتہائی ناحق شناسی ہے۔ آیت یَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ سے اس طرف اشارہ ہے کہ ایمان نے کمال اور انتہائی یقین کے وقت اللہ پر پورا بھروسہ رکھنا اور نجات و عافیت کا قطعی اعلان کرنا صحیح ہے۔ اللہ اپنے خاص بندوں کو تباہ نہیں ہونے دیتا۔

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ

اے مخاطب جب آفتاب نکلتا تو اُن کے غار سے دائیں طرف کو بچ کر نکلتا نظر آتا اور جب ڈوبتا تو اُن سے بائیں

ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ

جانب کترا جاتا اور وہ غار کی کشادہ جگہ میں تھے یہ اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے جسے اللہ ہدایت دے وہی ہدایت

الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ۧ وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ

یافتہ ہے اور جسے وہ گمراہ چھوڑ دے تم کو اس کا کوئی رفیق، ولی نہ ملے گا (اے مخاطب) تو اصحاب کہف کو بیدار خیال کرے گا حالانکہ

رُقُوْدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ

سوتے تھے ہم اُن کو دائیں بائیں کروٹ دلا دیتے تھے اُن کا کتا دونوں ہاتھ پھیلائے غار کے دہانے پر

بِالْوَصِيْدِ ؕ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ۝

موجود تھا اے مخاطب اگر تو اُن کو جھانک کر دیکھتا تو ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلتا اور اُن کی طرف سے تیرے اندر دہشت سما جاتی

تفسیر لفظ تَرَی۔ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ تک میں صرف یہ مطلب بیان فرمایا ہے کہ اصحاب کہف ایسی جگہ غار کے اندر سوئے ہیں کہ طلوع آفتاب کے وقت یعنی زوال سے قبل دھوپ ان کے دائیں طرف سے ہو کر گزر جاتی ہے اور زوال کے بعد پچھلے پہر بائیں طرف رہتی ہے ان کی طرف دھوپ نہیں آتی۔ ابن کثیر نے فرمایا غار شمال رویہ ہے۔ لیکن مکان کا رخ کسی طرف ہو اتنے زمانے تک بغیر تغیر اور تعفن کے انسانی بدن کا بقاء ضرور کرشمہ قدرت پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ یہ یعنی ان کا بقاء بڑی بات قدرت میں ہے۔ زجاج نے کہا کہ غار کا رُخ شمال کی طرف ہو آیت سے نہیں معلوم ہوتا نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی سایہ کے نیچے ہیں جس کی وجہ سے ان پر دھوپ نہیں آتی بلکہ فِیْ فَجْوَۃٍ مِّنْہُ کا لفظ تو صاف بتا رہا ہے

کہ وہ کھلے میدان یا صاف جگہ میں ہیں جہاں کسی چیز کا سایہ نہیں، لیکن خدا تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے اُن پر دھوپ نہیں آنے دیتا۔ اسی کرشمۂ قدرت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے فرمایا کہ یہ باوجود کھلے میدان میں سونے کے دھوپ کا ان پر نہ آنا اور عروج و زوال کے وقت آفتاب کا کترا جانا اللہ کے نشانہائے قدرت میں سے ایک نشانی ہے، لیکن چونکہ ظاہری نظر رکھنے والے کور بصیرت انسان جو قیاس تراشیوں کو اعلیٰ ترین حجت سمجھتے ہیں کبھی اس امر کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے کہ ایک چیز کھلے میدان میں پڑی ہو اور اس پر دھوپ نہ آئے اور بغیر تغیر کے صدہا سال باقی رہے، اس لئے ایسے گمراہ فرقہ کو تنبیہ کرنے کے لئے فرمایا کہ جس کو خدا ہدایت فرماتا ہے درحقیقت وہی ہدایت یافتہ ہے اور جس کو وہ گمراہ چھوڑ دے اس کو کوئی ہدایت نہیں کر سکتا۔ یعنی اپنی قیاس تراشیوں اور دماغی جولانیوں سے ہدایت یافتہ نہیں ہو سکتا عقل انسانی راہ حقیقت پانے سے قاصر ہے۔ بشری دانش ظاہری اسباب کی جستجو میں لگی رہتی ہے۔ باطنی اسباب اس کو نظر نہیں آتے، اسی لئے راہ حقیقت نہیں پاتی۔ اس سے آگے اصحاب کہف کے خوابیدہ ہونے کی صراحت فرمائی۔ چونکہ ان کی آنکھیں بیدار آدمیوں کی آنکھوں کی طرح کھلی ہوئی ہیں جن کو دیکھ کر بیدار ہونے کا شبہ ہوتا تھا، اس لئے وضاحت فرمادی کہ واقع میں وہ خوابیدہ ہیں اگرچہ دیکھنے والے ان کو بیدار سمجھیں۔ اس سے آگے سطحی عقل اور کوتاہ رس قیاس رکھنے والوں کی تسلی اور اطمینان خاطر کے لئے فرماتا ہے کہ ہم دائیں بائیں ان کو کروٹیں دلاتے ہیں (جن سے ان کی بدنی حالت خراب نہیں ہونے پاتی اور ان کی کروٹوں پر ہوا لگتی رہتی ہے) یہ صرف ظاہر بین نظر رکھنے والوں کے شبہات کو دور کرنے کے لئے فرمایا ورنہ خدا تعالیٰ بغیر کروٹ دلائے بھی اصلی حالت پر قائم رکھ سکتا ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ بعض سلف سے مروی ہے کہ سال میں دو مرتبہ ان کو کروٹ دلائی جاتی تھی سراج و معالم میں بروایت ابوہریرہؓ اسی کی صراحت ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ نو برس میں ایک کروٹ اور نو برس میں دوسری کروٹ لیتے تھے بعض مفسرین نے صرف سال بھر میں عاشوراء کے دن کروٹ بدلنا ظاہر کیا ہے (میرے نزدیک یہ تمام روایات صوفیوں کی کتابوں کی ہیں صحیح وہی ہے جو امام رازی نے فرمایا کہ کروٹوں کی تعیین اور تقدیر میں عقل کو دخل نہیں اور قرآن میں اللہ نے اس کا کوئی اندازہ نہیں بتایا نہ حضور اقدسؐ نے احادیث میں اس کے متعلق کچھ فرمایا لہٰذا تعیین لغو ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ اسی حالت میں اُن کا کتا بازو پھیلائے غار کی دہلیز پر پڑا ہے اور یہ مجموعی حالت کچھ ایسی وحشت آفرین اور ہیبت ناک ہے کہ ہر وہ شخص جو اُن کو جھانک کر دیکھے ڈر کے مارے مُنہ پھیر کر بھاگنے پر مجبور ہو جائے: آنکھیں کھلی ہوئی، ناخن بڑھے ہوئے، سر اور داڑھی کے بال لمبے لمبے، تنگ اور تاریک مکان وہ بھی پہاڑ کا غار۔ یہ اسباب عجیب ہیبت خیز ہیں۔

اِطَّلَعْتَ اور وَلَّیْتَ کے صیغے خطاب کے ہیں اور رسول پاکؐ مخاطب ہیں، مگر روئے خطاب ہر شخص کی طرف عمومی ہے حضورؐ کی ذات مخصوص نہیں۔ یہ طرز ادا صرف محاورہ ہے، اس لئے غیر مسلم متعصب فرقہ کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ رسول اسلامی نعوذ باللہ ڈرپوک اور بزدل تھے کہ اصحاب کہف کو ڈر کے مارے دیکھنے کی بھی ہمت نہیں رکھتے تھے کیونکہ روئے خطاب حضورؐ کی طرف نہیں ہے۔

ابن کثیر نے فرمایا کہ کتا ان کے ساتھ شکار کا تھا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ بادشاہ کے باورچی کا تھا کسی نے چرواہے کا کتا بیان کیا ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو اتنا آیت سے ثابت ہے کہ ایک کتا ضرور تھا۔ ابن عساکر نے حسن بصری کا قول بیان کیا ہے کہ اس کتے کا نام قطمیر تھا مجاہد نے قطمور نام بتایا ہے۔

مقصود بیان

اللہ اپنے بعض نیک بندوں کی جسمانی ساخت کو کبھی خراب نہیں دیتا۔ چنانچہ اصحاب کہف کے اجسام ہر طرح سے محفوظ ہیں۔ اللہ کی قدرت کے کرشمے غیر محدود ہیں عقل بشری کی رسائی وہاں تک نہیں۔

آیت مَن یَھدِ اللہُ فَھُوَ الْمُھْتَدِ میں اس طرف ترغیب ہے کہ قول الٰہی میں جس بات کی صراحت آگئی ہو وہ عقل میں آئے یا نہ آئے اس پر یقین رکھنا ایمان دار پر لازم ہے۔

آخر میں اصحاب کہف کے منظر کا ہیبت ناک ہونا ظاہر فرمایا ہے وغیرہ۔

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا

اسی طرح ہم نے اُن کو جگا اُٹھایا تاکہ وہ باہم پوچھ گچھ کریں اُن میں سے ایک نے کہا تم کتنی دیر ٹھہرے ہو گے؟ بولے ایک دن یا ایک دن

اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى

سے کچھ کم ٹھہرے ہوں گے (پھر) کہنے لگے تمہارا پروردگار ہی خوب جانتا ہے کہ تم کتنے ٹھہرے ہوگے اچھا اب یہ سکہ دے کر کسی کو شہر میں

الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا

بھیجو اور وہ سب سے عمدہ کھانا لے کر تمہارے کھانے کو کچھ لے آئے مگر اُس کو تدبیر سے جانا چاہیئے کسی

يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ۝ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ

کو تمہاری خبر نہ ہونے دے کیونکہ اگران لوگوں کو تمہاری اطلاع ہو جائے گی اور اُن کا تم پر قابو چل جائے گا تو وہ تم کو پتھروں سے مار ڈالیں گے یا اپنے

مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْۤا اِذًا اَبَدًا ۝ وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْۤا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ

مذہب میں لوٹا لیں گے اور اس وقت تمہارا بھلا نہ ہوگا ہم نے اسی طرح لوگوں کو اُن پر مطلع کر دیا تاکہ اُن کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کا

حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ

وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کوئی شک نہیں ہے جب وہ لوگ آپس میں اپنے معاملے میں جھگڑ رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اصحاب کہف

بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰۤى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ۝

کے غار پر ایک عمارت بنا دو اُن کا رب اُن کے حال سے خوب واقف ہے جو لوگ اپنی بات میں غالب آئے وہ بولے کہ ہم اُن پر ایک مسجد بنائیں گے

تفسیر اصحاب کہف کے خواب کو جب تین سو برس گزر گئے اور بیدروس بادشاہ کا دور آیا تو بیدروس نے شرک کو مٹانے اور توحید کو پھیلانے کی کوشش کی۔ عذاب حشر سے لوگوں کو ڈرایا۔ سینکڑوں برس کے موروثی عقائد یک دم کیسے بدل سکتے تھے لوگ بت پرستی کی طرف مائل تھے، اور دوبارہ زندہ ہونے کا ان کو کسی طرح یقین نہ آتا تھا۔ مومن طبقہ ہر چند ان کو سمجھاتا، مگر ان کے شبہات زائل نہ ہوتے تھے۔ بالآخر بادشاہ نے اللہ سے دعا کی کہ مرنے کے بعد زندہ ہونے کی کوئی شافی دلیل غیب سے ظاہر فرما دے۔ اللہ نے دعا قبول فرمائی حسن اتفاق کسی نے غار کی دیوار کو مکان بنانے کے لئے گرا دیا اور غار کا منہ کھل گیا۔ ادھر دیوار گری اُدھر خدا نے سونے والوں کو بیدار کر دیا۔ آیات مذکورہ میں خدا تعالیٰ نے تین مطالب ظاہر فرمائے ہیں۔

(۱) جس طرح خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اصحاب کہف کو مدتِ دراز تک بغیر کسی تغیر کے محفوظ رکھا اسی طرح کمالِ قدرت کے اظہار کے لئے ان کو بیدار کیا۔ بیدار ہونے کے بعد انھوں نے پوچھنا شروع کیا یہاں سوئے ہوئے کتنا وقت ہوا۔ دوسروں نے جواب دیا ایک دن یا کچھ کم۔ سونے والے کو تخمینی مدت معلوم ہوا کرتی ہے۔ غار کے اندر صبح کے وقت (یا قریب غروب) داخل ہوئے تھے۔ بیدار ہوئے تو پچھلا

پہر تھا، اس لئے ایک دن کا تخمینہ قائم کیا، لیکن جب سر کے بال اور ناخن بڑھے دیکھے تو زیادہ مدّت کا اندازہ کیا اور بولے خدا ہی خوب جانتا ہے کہ ہم کتنا سوئے۔ اس وقت تک بھی سینکڑوں برس سونے کا ان کو علم نہ تھا اور یہی سمجھ رہے تھے کہ دقیانوس شہر میں واپس آگیا ہوگا۔ ہماری تلاش میں سپاہی آدمی گھوم رہے ہوں گے، لیکن بھوک پیاس بھی معلوم ہو رہی تھی۔ کھانے پینے کا سامان موجود نہ تھا، اس لئے دقیانوسی سکہ دے کر ایک آدمی (تملیخا) کو بھیجا اور تاکید کر دی کہ خوش تدبیری سے چھپتے چھپاتے جانا اور دانشمندی سے کھانے پینے کا حلال سامان خرید کرنا ایسا نہ ہو کسی کو شک ہو معلوم ہو جائے اور شاہی آدمی ہم کو پکڑ لیں کیونکہ گرفتار کرنے کے بعد یا تو ہم کو بُت پرستی اختیار کرنے پر مجبور کریں گے یا مار ڈالیں گے۔ (اول الذکر صورت میں آخرت تباہ ہو گی اور مؤخر الذکر شکل میں زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے) بہرحال اطلاع کے بعد خرابی ہی خرابی ہے کوئی فلاح کی صورت نظر نہ آئے گی۔

اس کے بعد کا قصہ یعنی تملیخا کا شہر کو جانا، شہر کی عمارت، طرزِ معاشرت، بازار، مذہبی کیفیت کا متغیر نظر آنا، دوکان پر سکہ دینا، دقیانوسی سکہ دیکھ کر لوگوں کا تعجب کرنا، شدہ شدہ حاکمِ وقت تک اطلاع پہنچنا، تملیخا کا حاضرِ دربار ہونا اور واقعہ بیان کرنا اور پھر لوگوں کو اپنے ساتھ لانا، یہ تمام واقعہ آیات میں مذکور نہیں ہے۔ کتبِ تفسیر میں مفصل مذکور ہے۔

(۲) قرآنِ پاک قصص و روایات کی کتاب نہیں۔ اس کا مقصد تاریخی افسانے اور کہانیاں بیان کرنا نہیں ہے۔ جتنے قصے اس میں مذکور ہیں سب کی غرض ہدایت و اصلاح ہے۔ کہیں اعمال کی درستگی اور کہیں عقائد کی راستی پیشِ نظر ہوتی ہے۔ اصحابِ کہف کو تین سو برس تک خواب میں رکھنا اور پھر بیدار کرنا اور ان کا قصہ بیان کرنا اس سے مقصود بھی یہی ہے کہ عقیدہ کی درستگی ہو جائے۔ بیدروس کے زمانے میں جو لوگ حیوٰۃ بعد الممات کے منکر تھے ان کی آنکھیں کھل جائیں اور یقین ہو جائے کہ جب خدا تین سو برس کے بعد بھی خواب سے اٹھا سکتا ہے تو مرنے کے بعد زندہ کر کے اٹھانا کون مشکل کام ہے۔ موت اور خواب دونوں باہم مشابہ ہیں۔ اَلنَّوْمُ اَخُو الْمَوْتِ مشہور مقولہ ہے۔ حواس کا تعطل اور بیرونی زندگی کا فقدان دونوں میں ہوتا ہے۔ روحِ سیلانی دونوں میں بدن سے خارج ہو جاتی ہے۔ فرق رہتا ہے تو صرف روحِ حیات بخش کے تعلق و عدمِ تعلق کا۔ پھر رسولِ پاکؐ کے زمانے میں اس قصہ کو قرآن میں بیان کرنا بھی اسی نقطۂ نظر کے تحت تھا کہ کفار کو وجودِ قیامت کا یقین ہو جائے۔

(۳) بادشاہِ وقت مع اسٹاف کے تملیخا کے ساتھ غار پر پہنچا اور اندر داخل ہوا یا نہ ہوا بہرحال تملیخا اپنے ساتھیوں سے جا ملے اور اصحابِ کہف غائب ہو گئے خواہ وفات پا گئے یا دوبارہ سو گئے تو اس وقت غار کا منہ بند کرنے کے متعلق لوگوں میں اختلاف ہوا۔ بہ اتفاق رائے یہ بات طے ہوئی کہ اصحابِ کہف کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ اللہ ان کی حالت سے بخوبی واقف ہے، لیکن یادگار کے طور پر کوئی نشانی یا علامت قائم کر دی جائے۔ یعنی غار کے منہ پر کوئی عمارت بنا دی جائے تاکہ دروازہ بھی بند ہو جائے اور یادگار بھی قائم رہے۔ اس کے بعد عمارت کی نوعیت میں اختلاف ہوا کہ کس قسم کی عمارت بنائی جائے۔ ہر گروہ نے اپنی رائے ظاہر کی۔ شاہی اسٹاف چونکہ طاقتور اور حکمران تھا، اس لئے اس نے تجویز کیا کہ یہاں ایک عبادت خانہ بنا دو تاکہ لوگ یہاں نمازیں پڑھیں اور برکت نازل ہو۔ بعض علماء نے کہا کہ باہمی نزاع اس بات میں تھا کہ قیامت کے دن انسان کا حشر کس طرح ہوگا۔ کوئی صرف حشرِ ارواح کا قائل تھا، کوئی ارواح مع ابدان کی بعثت کا عقیدہ رکھتا تھا یا یہ مراد ہے کہ جب وہ غار میں دوبارہ غائب ہو گئے تو لوگوں میں اختلاف ہوا کسی نے کہا دوبارہ سو گئے کسی نے کہا وفات پا گئے۔

مقصودِ بیان

اللہ کو قدرت ہے کہ صدہا سال کی مدت پلک جھپکانے میں ختم کر دے اور معلوم بھی نہ ہو کہ کتنی مدت گزری۔ اس میں لطیف ایماء ہے اس طرف کہ اللہ کے نیک بندوں کو مرنے کے بعد سے لے کر قیامت تک کی مدت بہت ہی قلیل معلوم ہوگی۔ قیامت کے دن اٹھنے کے بعد ان کو اپنے خواب کی مدت برسوں یا مہینوں کی نہیں بلکہ چند ساعت کی برابر نظر آئے گی۔ آیت فَلْيَنْظُرْ دلالت کر رہی ہے کہ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ جب انسان مادّی زندگی میں آئے تو اس کو معاش کی فراہمی ضروری ہے۔ خواہ تقویٰ اور ایمان کی انتہائی چوٹی پر پہنچا ہو، لیکن رزقِ حلال کی طلب چاہیئے۔ حرام کا ترک لازم ہے۔ وَلْيَتَلَطَّفْ کا لفظ تعلیم دے رہا ہے کہ اگرچہ نیک بندوں کی حفاظت کا سامان غیب سے ہو جاتا ہے مگر ظاہری تدبیر ضرور اختیار کرنی چاہیئے۔ خود آگ میں کودنا اور تقدیر پر اندھا بھروسہ رکھنا کسی طرح جائز نہیں۔ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ الخ سے

یہ بتانا مقصود ہے کہ کفار پر لازم ہے کہ حیات بعد الممات کو جاگنے پر قیاس کریں۔ جس طرح سونے کے بعد جاگ اٹھنا القدرت الٰہیہ ہوتا ہے اسی طرح قیامت کے دن از سرِ نو زندگی عطا فرما کر اٹھایا جائے گا۔ ایک دقیق اشارہ اس جانب ہے کہ اللہ عادی افعال کے خلاف بھی کر سکتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی فعل بغیر کسی خاص نتیجہ کے نہیں ہوتا اور نتیجہ صرف اصلاح عبادت ہوتا ہے۔ آیت اِذْ یَتَنَازَعُوْنَ اس مفہوم پر دلالت کر رہی ہے کہ نیک لوگوں کی یادگاریں قائم کرنے کا رواج پہلے ہی سے ہے، لیکن جو اللہ کے خاص بندے ہیں وہ عام یادگار دل کو چھوڑ کر ایسی یادگار رہنا تے ہیں جس سے علاوہ اثر قائم ہونے کے زندوں کے واسطے بھی فائدہ ہو اور رحمتِ الٰہیہ کا نزول ہر وقت ہوتا رہے وغیرہ۔

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا

لوگ کہتے ہیں کہ وہ تین ہیں چوتھا کتا ہے اور (بعض) کہ وہ پانچ ہیں چھٹا کتا ہے یہ سب بے دیکھے تیر

بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا

چلاتے ہیں اور بعض کہتے ہیں وہ سات ہیں آٹھواں کتا ہے (اے محمد) تم کہہ دو میرا رب ان کی تعداد سے بخوبی

يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ ۗ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَدًا

واقف ہے تھوڑے ہی آدمی اُن کو جانتے ہیں تم اُن کے بارے میں صرف سرسری گفتگو کرو اور اُن کے بارے میں اُن لوگوں میں سے کسی سے کچھ

تفسیر اصحاب کہف کا ضروری قصہ بیان کرنے کے بعد ان کی تعداد کی صحت کی طرف ایما فرماتا ہے۔ اہلِ کتاب میں ان کی تعداد کے متعلق پہلے سے اختلاف چلا آتا تھا۔ نجران کے عیسائی قائل تھے کہ اصحاب کہف تین تھے۔ یہودی نیز عرب کے بعض نصاریٰ چھ ہونے کے قائل تھے اور بعض (عیسائی) سات ہونے کے بھی قائل تھے۔ پہلے دونوں قولوں کے متعلق خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یہ سب بے تکی باتیں اور چھپی تیر اندازیاں ہیں لہٰذا ناقابلِ اعتبار ہے۔ لیکن تیسرے قول کے متعلق رَجْمًا بِالْغَيْبِ نہیں فرمایا اسی لئے اہلِ اسلام اس کے قائل ہیں اور چونکہ اصحاب کہف کی تعداد کی صحیح تعداد کا علم مخصوصات الٰہیہ میں سے نہ تھا۔ خدا تعالیٰ نے خود فرما دیا کہ ان کی تعداد کو کم لوگ جانتے ہیں۔ اسی لئے ابن عباسؓ نے فرمایا میں بھی ان قلیل اہلِ علم میں سے ہوں اُن کی تعداد سات تھی۔ عکرمہ۔ قتادہ، عطا، خراسانی وغیرہ نے ابن عباسؓ کا یہی قول نقل کیا ہے۔ حضرت علیؓ نے بھی سات ہی کی صراحت فرمائی ہے۔ لارڈ ولیم میور نے بھی اپنی کتاب تاریخ کلیسیا کے صفحہ ۲۴۶ پر اصحاب کہف کی تعداد سات ہی لکھی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے عیسائی بھی اہلِ اسلام کی تحقیقات کو حق سمجھتے تھے۔ رہی یہ بات کہ نام کیا کیا تھے تو حضرت علیؓ نے ان کے اسماء یہ بتائے ہیں تملیخا، مکلمینا شلیمیں۔ یہ تینوں بادشاہ کے دائیں طرف والے تھے۔ مرنوش، برنوش، شاذنوش یہ تینوں بادشاہ کے بائیں طرف والے تھے اور ساتواں ایک چرواہا تھا (جس کا نام کشفططوش تھا) بیضاوی، خطیب نے بحوالہ ابن عباسؓ یہ نام بتائے مکسلمینیا، تملیخا، مرطونس، بینونس، ذونواس، کفشططونس، مسلمینیا۔ امام رازی نے بجائے تملیخا کے یملیخا لکھا ہے اور باقی اسماء وہی ہیں جو بیضاوی نے لکھے ہیں۔ تفسیر خازن میں یہ نام ہیں، تملیخا، مکسلمینا، مرطونش، بینونس، سارمینونس، ذونواس اور ساتواں کشفیططونس۔ کتے کا نام قطمیر یا قطمورا تھا۔

اس سے آگے فرماتا ہے کہ اصحاب کہف کے متعلق اہلِ کتاب سے دریافت نہ کرو اور نہ ان سے ان کی بابت زیادہ جھگڑا کرو یہ صرف تاریخی قصہ ہے شرعی عقیدہ نہیں ہے۔ اگر اہلِ کتاب جھوٹ کہتے ہیں تو کہنے دو زیادہ جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔

مقصودِ بیان آخری آیت یعنی سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ دلالت کر رہی ہے کہ یہی تعداد ٹھیک ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق رَجْمًا بِالْغَيْبِ نہیں فرمایا اِلَّا قَلِيلٌ کا لفظ بتا رہا ہے کہ بعض خاص آدمیوں کو بھی ان کی صحیح تعداد معلوم ہے۔ جو مسائل شرعی نہ

ہوں جن سے اصلاحِ عقیدہ اور درستگیِ اعمال وابستہ نہ ہو اُن میں جھگڑا کرنا نازیبا ہے۔ ممکن ہے کہ فریقِ مخالف کوئی بات صحیح کہتا ہو اور تصدیق کر دی جائے لیکن اس سے تاریخی اور علمی مباحث کی تحقیق کی ممانعت مستنبط نہیں ہوتی، اس کی ہر وقت اجازت ہے۔ حکم مذکور صرف اصحابِ کہف کی تعداد کے متعلق ہے۔ اہلِ کتاب اس کو علمی اور مذہبی مسئلہ سمجھے ہوئے تھے اور کوئی اعجوبۂ روزگار داستان جانتے تھے۔ واقعہ کی تعجب انگیزی کو کم کرنے کے لئے جھگڑا کرنے کی ممانعت فرما دی۔ تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ تعداد یا نوعیت قصہ میں اختلاف کوئی مہتم بالشان امر نہیں جس میں مشغول رہ کر خواہ مخواہ وقت ضائع کیا جائے وغیرہ۔

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ۝ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ ۚ وَاذْكُر رَّبَّكَ إِذَا

اور بغیر انشاء اللہ کہے کسی کام کے متعلق یہ نہ کہو کریں کل اس کو کردوں گا اور اگر (انشاء اللہ کہنا) بھول جاؤ تو جب (خیال آجائے) اللہ کو یاد

نَسِيتَ وَقُلْ عَسَىٰ أَن يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَٰذَا رَشَدًا ۝ وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ

کرلیا کرو اور کہہ دو کہ امید ہے میرا رب اس سے زیادہ بھلائی کی مجھے ہدایت کردے اصحاب کہف اپنے غار میں

ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا ۝ قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا ۖ لَهُ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ

نو اوپر تین سو سال رہے تم کہہ دو اللہ ہی خوب واقف ہے کتنے رہے اُسی کو آسمانوں کا اور

وَالْأَرْضِ ۖ أَبْصِرْ بِهِ وَأَسْمِعْ ۚ مَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ۝

زمین کا علم غیب ہے وہ کیسا کچھ دیکھنے والا اور کیسا ہی اچھا سننے والا ہے اُس کے سوا ان لوگوں کا کوئی کارساز نہیں وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا

تفسیر

کفارِ مکہ نے حضورِ اقدسؐ سے جب روح اور ذوالقرنین اور اصحاب کہف کا حال دریافت کیا تو آپ نے فرمایا میں کل بتاؤں گا۔ انشاء اللہ نہیں فرمایا۔ اس پر بارہ یا پندرہ یا چالیس روز وحی نہ آئی۔ حضورؐ کو بے چینی ہوئی تب یہ آیت نازل ہوئی کہ کسی کام کے کرنے کا وعدہ بغیر انشاء اللہ کہے مت کیا کرو۔ یہ حکم عمومی ہے۔ ہر مسلمان کو اس کی تعمیل کرنی چاہیئے۔

بعض مفسرین نے آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ بغیر اجازتِ الٰہی کے کسی کام کو کرنے کا وعدہ نہ کیا کرو۔ اس صورت میں حکم عام نہ ہوگا بلکہ رسول پاکؐ کے لیے مخصوص حکم مانا جائے گا۔ کیونکہ وحیِ الٰہی رسول اللہ کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں آتی، پھر اجازتِ الٰہی کس طرح معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہدایت فرماتا ہے کہ اگر انشاء اللہ کہنا بھول جاؤ تو جس وقت یاد آجائے کہہ لیا کرو۔ شافعیؒ نے یہاں سے یہ بات نکالی ہے کہ اگر کسی بات کی قسم کھالی اور عرصہ کے بعد انشاء اللہ کہہ لیا اور پھر قسم کے خلاف کیا تو قسم شکن نہ مانا جائے گا، مگر عام اہلِ فقہ کہتے ہیں کہ اگر قسم کے ساتھ ملا کر انشاء اللہ کہے گا تو قابلِ اعتبار رہے۔ قسم کی خلاف ورزی سے حانث نہ ہوگا اور فوراً ملا کر نہیں کہا ہے تو حانث ہوگا۔

اصحاب کہف کا مفصل قصہ سُن کر کفارِ مکہ کو تعجب ہوا تھا تو ان کا تعجب دور کرنے کے لئے فرماتا ہے کہ اے نبی تم ان سے کہہ دو کہ مجھے تو اس سے بھی بہتر اور زیادہ ہدایت آفریں چیزوں کی امید اللہ کی طرف سے ہے۔ یعنی قیامت، حشر، نشر، جنت، دوزخ، ملائکہ، گزشتہ انبیاء کے حالات، اللہ کی ذات و صفات کا علم اور آیاتِ قدرت کی بصیرت افروز تحقیقات اصحاب کہف کے قصہ سے کہیں زیادہ ہدایت آفریں ہے۔

اس سے آگے اصحاب کہف کی مدتِ خواب تین سو نو برس ظاہر فرما کر مختلف فیہ مسئلہ کا فیصلہ کر دیا اور اپنے فیصلے کو قابل الوثوق اور واجب الیقین ثابت کرنے کے لیے فرمایا کہ چونکہ آسمان و زمین کا مخفی علم سوا خدا کے اور کوئی نہیں جانتا اور وہ اپنی علمی خصوصیات میں کسی کو شریک کرنا بھی پسند نہیں

کرتا۔ اس لئے اصحاب کہف کے متعلق اس کا جو فیصلہ ہے وہی صحیح ہے۔ اسی کو ان کی مدتِ خواب کا صحیح علم ہو سکتا ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ تین سو نو برس کی مدت جو خدا تعالیٰ نے بیان فرمائی وہ بطور حکایت بیان فرمائی۔ گویا یہ کہنا مقصود ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ تین سو نو برس سوتے رہے اپنا فیصلہ ظاہر کرنا مقصود نہیں، اسی لئے فرمادیا کہ ان کی مدتِ خواب کا خدا ہی کو پورا علم ہے، وہی دانا بینا ہے، اس کے سوا کوئی کارساز نہیں۔

مقصود بیان

بغیر انشاء اللہ کہے کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کا وعدہ کرنا جائز نہیں۔ اگر وعدہ کرتے وقت انشاء اللہ کہنا بھول جائے تو جس وقت یاد آجائے بطور تبرک کہہ لیا کرے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس سے وعدے میں کمزوری پیدا ہوجاتی ہے اور وعدہ کی خلاف ورزی کرنے سے اس صورت میں حانث نہ ہوگا کیونکہ بعد از وقت انشاء اللہ کہنا صرف موجب تبرک ہے۔ اصل وعدے پر اثر انداز نہیں۔ عَسٰۤى اَنْ یَّهْدِیَنِ الخ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کا مطالعہ، توحید، شہود کی خبریں، حشرونشر کے احوال، ذات وصفات کے عقائد کی تعلیم، اصحاب کہف کے قصہ سے زیادہ ہدایت آگیں اور بصیرت افروز ہے۔

وَاتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ

اُن کو اپنے پروردگار کی کتاب جو وحی کے ذریعہ سے تمہارے پاس بھیجی گئی ہے پڑھ کر سناؤ۔ اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے اور تم کو اس کے سوا کوئی جائے پناہ

مُلْتَحَدًا ۝ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ

نہیں ملے گی (اے نبی) اپنی ذات کو اُن لوگوں کے ساتھ روکے رکھو جو صبح شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اُس کی خوشنودی چاہتے ہیں

وَلَا تَعْدُ عَیْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا

تمہاری نظر اُن کی طرف سے نہ پھرے کہ تم دنیوی زندگی کی آرائش کی خواہش کرنے لگو اور اس شخص کا کہنا ماننا جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد کی طرف سے غافل

وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ

کر دیا ہے اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے لگ رہا ہے اور اس کا کام حد سے گزر گیا ہے اور کہہ دو کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے آگیا اب جو چاہے مانے جو چاہے

شَآءَ فَلْیَكْفُرْ ۚ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۚ وَاِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا

نہ مانے ہم نے ظالموں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں اُن کو گھیر لیں گی اور اگر وہ فریاد کریں گے تو فریاد رسی ایسے پانی سے کی

بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ یَشْوِی الْوُجُوْهَ ۚ بِئْسَ الشَّرَابُ ۚ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

جائے گی جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا جو چہروں کو جھلس دے گا کیا برا پانی ہے اور دوزخ کیسی بری جگہ ہے جو لوگ ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ

نیک اعمال کئے تو ہم نیکوکاروں کے ثواب کو برباد نہیں کرتے ایسے لوگوں کے لئے دوامی جنتیں ہیں جن کے اندر نہریں

مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِنْ سُندُسٍ

بہتی ہوں گی　اہلِ جنت کو　جنت کے اندر　سونے کے کنگن　پہنائے جائیں گے　اور ریشم و اطلس　کے سبز کپڑے　وہ پہنیں گے

وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۚ نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۝ ع ۱۲

وہاں　مسہریوں　پر تکیہ لگائے　بیٹھے ہوں گے　کیا اچھا　ثواب ہوگا　اور جنت آرام　کی اچھی　جگہ ہے

تفسیر ان آیات میں خدا تعالیٰ نے چند احکام نازل فرمائے ہیں۔ (۱) تبلیغی وحی کا التزام اور عدم تحریفِ قرآن کی صراحت (۲) مخلص ایمان دار نیکوکاروں کے ساتھ رہنے کا حکم اور ان کی طرف سے روگردانی کی ممانعت (۳) بد سرشت، دل کے اندھے نفس پرست کافروں کا کہنا ماننے سے باز داشت (۴) ایمان یا کفر کو اختیار کرنے کا اعلان (۵) کافروں اور مومنوں کی جزا سزا کا بیان۔

تفسیری مطلب بیان کرنے سے قبل ہم آیات کا سبب نزول لکھتے ہیں۔ بیہقی نے بروایت سلمان فارسی بیان کیا کہ حضور اقدس کو بعض اسلامی اغراض کے تحت عیینہ بن حصین فزاری، اقرع بن حابس اور عباس بن مرداس وغیرہ سرداروں کی تالیف قلوب اور خاطر داری منظور تھی۔ سردارانِ مذکور نے ایک روز حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا۔ کیا اچھا ہو کہ آپ صدر مجلس میں بیٹھیں اور ان لوگوں سے جن کے کپڑوں میں بدبو آتی ہے اور بالوں میں خاک اڑتی ہے الگ ہو جائیں۔ اگر آپ ایسا کرلیں گے تو ہم آپ کے پاس آکر بیٹھیں گے، باتیں کریں گے اور قرآنی احکام اخذ کریں گے۔ اس وقت اُتْلُ مَا اُوْحِیَ سے آخر تک آیات کا نزول ہوا۔ کفار نے ابوذر اور سلمان جیسے غریب مسلمین سے اظہار تنفر کیا تھا اور ان کی غریبانہ معاشرت کو مکروہ جانتے ہوئے حضور سے الگ رکھنے کی مذکورہ درخواست کی تھی۔ ابو الشیخ نے اس روایت میں اتنا اور بیان کیا ہے کہ نزول آیات کے بعد حضور والا ان لوگوں کی تلاش میں نکلے جن کے ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ کاشانہ نبوت سے باہر آکر ملاحظہ فرمایا کہ کچھ لوگ مسجد کے اندر ذکر الٰہی میں مشغول ہیں۔ ارشاد فرمایا الحمد للہ کہ میرے انتقال سے قبل خدا تعالیٰ نے ایسے آدمی فراہم کر دیے جن کے ساتھ مجھے بیٹھنے کا حکم دیا۔ میری زندگی اور موت تمہارے ساتھ ہے۔

اگر اس سبب نزول کو صحیح مان لیا جائے تو آیت کو مستثنیٰ کرنا پڑے گا کیونکہ یہ واقعہ مدینہ کا ہے اور سورت مکی ہے۔

ابن کثیر نے آیات کو مکی کہا ہے اور سبب نزول میں بیان کیا ہے کہ اشرافِ قریش نے حضور اقدس سے عرض کیا تھا کہ ہمارے ساتھ تنہا آکر بیٹھا کیجئے۔ بلال، عمار، صہیب، خباب اور ابن مسعود جیسے ذلیل لوگوں کو مجلس میں شریک ہونے کی اجازت نہ دیجئے۔ بلکہ ان کے لئے کوئی علیحدہ جلسہ کیجئے۔ اس پر خدا تعالیٰ نے آیت وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ الخ نازل فرمائی جس کا مفاد یہ تھا کہ کمزور نیکوکار، عبادت گزار مسلمانوں کو مجلس سے خارج نہ کرو اور اسی قصہ کے متعلق آیت وَاصْبِرْ نَفْسَكَ الخ نازل فرمائی جس میں عبادت گزار اطاعت شعار مخلص مسلمانوں کے ساتھ بیٹھنے کا حکم دیا۔ ہمارے نزدیک موخر الذکر سبب نزول ارجح ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اللہ کی کتاب میں جو حکم نازل ہوا وہ واجب الاتباع اور لازم الابلاغ ہے۔ کسی کے کہنے سننے اور خواہش کرنے سے اس کے احکام منسوخ نہیں ہو سکتے نہ بدلے جا سکتے ہیں (کلمات نہیں بدل سکتے)۔ ہاں اللہ خود بمصلحت و مشیت نسخ کرتا ہے۔ اس کے سوا کوئی منسوخ نہیں کر سکتا نہ بدل سکتا ہے۔ لہٰذا آپ اس کے کل احکام بلا تغیر کسی رعایت و مداہنت کے امت کو سنا دیجئے اور ان ذاکر شاغل کامل مومنوں کے ساتھ رہو جو ذاتِ الٰہی کے طالب ہیں ان سے روگردانی نہ کرو اور دولتمند غافل القلب نفس پرست کافروں کی طرف میلان خاطر نہ کرو کیونکہ دنیوی جمال و کمال سے اسلام کی رونق نہیں بلکہ عام اعلان کر دو کہ دین حق اللہ کی طرف سے آگیا جس کا دل چاہے مانے نہ دل چاہے نہ مانے کسی کی رعایت نہیں کی جا سکتی نہ کسی پر جبر ہے، نیکوکار مومنوں کو اجر عظیم ملے گا اور بدکار کافروں کو ابدی ہلاکت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

اب ہم تفسیر اجزاء کرتے ہیں :۔ (۱) رسول پاکؐ اگرچہ احکام قرآنی پر پورا پورا عمل کرتے تھے، لیکن کافر سرداروں کے مسلمان ہونے کی خواہش حضورؐ کو بہت زیادہ تھی، اس لئے ان کی بعض درخواستوں کی تکمیل کا خیال حضور کے دل میں پیدا ہو گیا تھا، چونکہ ان کی درخواست قبول کرنے میں احکام الٰہی کی تبلیغ میں کوتاہی کا اندیشہ تھا، اس لئے واضح طور پر فرما دیا کہ اللہ کی کتاب کا ہر حکم لوگوں تک پہنچاؤ، پڑھ کر سناؤ، اس کے احکام کو کوئی بدل نہیں سکتا۔

یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ احکام الٰہی کی تبدیلی تو باجماع اہلِ سنت ہوئی ہے۔ کتنے ہی احکام کو قرآن نے خود منسوخ کر دیا۔ پھر نہ بدل سکنے کیا معنی؟

اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا گیا ہے کہ بہ سیاقِ آیات مبدّل سے ناسخ مراد نہیں۔ نسخ تو احکام میں ہوا ہے، مگر نسخ کرنے والا بھی تو خدا ہی ہے۔ نسخ بھی ایک حکم الٰہی ہے۔ آیت کا مقصد یہ ہے کہ کسی کی خواہش اور رواداری سے احکام کو نہیں بدلا جا سکتا اور اللہ کے سوا کوئی اور بدل سکنے کی قوت نہیں رکھتا۔

(۲) صبح شام ذکر کرنے سے مراد یا تو ہمہ وقت یادِ الٰہی کرنا ہے۔ دن کا آغاز صبح سے اور رات کا آغاز شام سے ہوتا ہے اور یہی دو وقت فرشتوں کے تبادلہ کے ہیں۔ اسی لئے غداة و عشی بول کر تمام اوقات مراد لئے ہیں۔ یا فجر و مغرب کی نمازیں مراد ہیں۔ ابن عباس اور ابن عمر کے نزدیک پنجگانہ نمازیں مراد ہیں۔ غداة سے اشارہ دن کی تینوں نمازوں کی طرف اور عشی سے رات کی دونوں نمازوں کی طرف ہے

(۳) حضور اولاً اول سے تو کبھی دنیوی مال و متاع کی طرف راغب تھے نہیں نہ دنیوی شان و شکوہ آپ کے خیالات کو اپنی طرف جذب کر سکتا تھا بلکہ عمومی ہدایت کی حضورؐ کو انتہائی رغبت تھی، اس لئے جہاں تک ممکن ہوتا آپ لوگوں کو مسلمان کرنے کی تدبیریں کرتے اور ان کے سامنے آسانی سے آسان طریقے پیش کرتے، لیکن جن لوگوں کی سرشت بگڑی ہوئی تھی، جن کے دلوں پر غفلت و جہالت کے پردے پڑے تھے، جن کی مادی قوتیں روحانی قوت پر کامل تسلط رکھتی تھیں، جو شاہراہ حق کو چھوڑ کر نفسانی خواہشات کی پگڈنڈیوں پر گامزن تھے اُن سے اسلام کی اُمید ہی نہیں ہو سکتی۔ ان کا راہِ راست پر آنا ہی ناممکن تھا اس لئے صاف طور پر حکم دے دیا کہ ایسے بدطینت کافروں کی رعایت مت کرو اور ان کی کسی درخواست کو قبول نہ کرو۔ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ بعض مفسرین کے نزدیک اُمیہ بن خلف اور بعض کے نزدیک عیینہ بن حصن فزاری کی طرف اشارہ ہے۔

(۴) اللہ نے انسان کو خود مختار پیدا کیا ہے مجبور نہیں کیا۔ انسان کو اگرچہ تخلیق و ایجاد پر قدرت عطا نہیں کی، مگر ارتکاب و کسب کا اختیار ضرور دیا ہے۔ خیر و شر، حسن و قبح اور ہدایت و ضلالت کا پسند کرنا انسان کا کام ہے۔ اسی لئے صاف اعلان کر دیا کہ کتابِ حق کے نزول اور رسولِ برحق کی بعثت کے بعد عام اجازت ہے۔ جس کا دل چاہے ایمان لائے اور جس کا دل چاہے کافر رہے نہ تو کسی پر جبر ہے نہ کسی کی مرضی و مشیت کو احکام کی تنسیخ و ترمیم اور تغیر میں دخل ہے۔

(۵) انسان کو خدا تعالیٰ نے تین قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ روحانیہ، شہوانیہ و غضبیہ۔ تینوں قوتوں کا مطمح نظر جدا جدا ہے ہر ایک کا مقصد علیحدہ ہے ایک کی جو غایت ہے دوسری قوت کے لئے وہ باعثِ کیف و لذت نہیں۔ روحانی سعادت کا احساس انسان کی مادی قوتیں نہیں کر سکتیں اور مادی خواہشات کی تکمیل سے روحِ مجرد کو لذت حاصل نہیں ہو سکتی۔ انسان کی دوبارہ زندگی باوجود جسمانی ہونے کے خدا جانے کس کیفیت و حالت کی حامل ہو گی اور یہ بھی نہیں معلوم کہ کن قوتوں سے انسان کے بدن کی ترکیب ہو گی۔ آخرت کی جو نعمتیں یا سزائیں ہوں گی اُن کی پوری کیفیت، کمیت، حالت اور عوارض کا علم نہیں ہو سکتا۔ جو چیز آنکھ سے دیکھی نہ ہو، کان سے سُنی نہ ہو، ناک سے سونگھی نہ ہو، ہاتھ سے چھوئی نہ ہو، زبان سے چکھی نہ ہو اور دماغ میں کبھی تصور نہ آیا ہو اس کی حالت کا بیان کسی طرح ممکن نہیں ہے اور بیان بھی اگر ممکن ہو تو انسانی تخیل و ادراک کی وہاں رسائی کس طرح ہو۔ غیر محسوس اور غیر مدرک کیفیت کس طرح سمجھ میں آسکے۔ اگر سمجھانے کی کوئی صورت ممکن ہے تو صرف یہ ہے کہ ان مقدس نعمتوں اور خارج از تصور عذابوں کے نام وہی رکھ دیئے جائیں جن کو انسان اپنے ماحول میں دیکھنے، سننے اور سمجھنے کا عادی ہے واقع میں اگرچہ آخرت کی جزا سزا ایسی نہ ہو گی جیسی ہم دنیا میں دیکھنے اور سننے کے عادی ہیں، مگر اس کو سمجھنے کی بس صرف یہی صورت ہے کہ اس کا نام، کیفیت اور حالت اسی تلفظ و تخیل و تعبیر کے ماتحت ظاہر کیا جائے جس کے ہم خوگر ہیں، اس لئے خدا تعالیٰ نے اجر آخرت اور عذاب عاقبت کی تعبیر انہیں الفاظ میں کی جن کو سننے کے ہم عادی تھے۔ ہم بہترین غذا، بہترین شربت، اعلیٰ ترین مکان، اعلیٰ ترین لباس، فرمانبردار دلکش خادم، کامیاب ترین خود مختار حکومت اور صنفی تعلقات کی تکمیل کے لئے حسین ترین عورتوں کے طلب گار ہیں۔

یہ تمام شہوانی اور غضبی قوتوں کے اقتضائیات ہیں، لیکن کیف روحانی اور لذت علمی اس سے جدا چیز ہے۔ اسی طرح جسمانی تکالیف کے تمام اسباب آگ، سانپ، بچھو وغیرہ۔ بدترین، متعفن، نجس، بدمزہ اور غیر مفید غذائیں۔ ہیبت ناک، بدہیبت، قوی ہیکل، خبیث الطبع عذاب دینے والے یہ سب چیزیں مادی قوتوں کے کمزوراتیں میں سے ہیں اور عقلی عذاب، جہالت، غفلت اور قرب الٰہی سے دوری ہے۔ خدا تعالیٰ نے ان آیات میں اور دوسرے مختلف مقامات پر آخرت کی جزا سزا کو ہمارے مانوس الفاظ میں بیان فرما دیا اور ہمارے ماحول کے پیشِ نظر ترہیب و ترغیب دے کر عقیدہ و عمل کی اصلاح فرمائی۔ یہی حقیقت ہے جو ہر جگہ جنت و دوزخ کے ذکر میں کارفرما ہے اور یہی مقصد ہے جس کے اظہار کے لئے ہمارا ماحول پیرایۂ بیان میں جابجا اختیار فرمایا ہے۔

مقصودِ بیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تبلیغ احکام کا وجوب۔ اس امر کی صراحت کہ احکام الٰہی کسی کی خواہش سے بدلے نہیں جا سکتے۔ نیکوکار، عبادت گزار بندوں کی صحبت میں رہنے کی ہدایت۔ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ سے اس بات کی طرف لطیف ایما کہ مسلمان ہو رضائے مولا کی جستجو لازم ہے۔ وہ لوگ جو رضائے الٰہی کے طالب ہوں خواہ ظاہری حالت ان کی کتنی ہی خستہ ہو، مگر قابلِ عظمت ہیں۔ لہو ولعب میں منہمک رہ کر یادِ خدا سے غافل رہنے والے نفس پرست خواہ کتنے ہی دولت مند، باوجاہت اور پرشکوہ ہوں، مگر ناقابلِ صحبت اور ممنوع المعاشرت ہیں۔ اسلام پر مجبور کرنا یا کسی بڑے آدمی کے خیال سے مومن فقراء کی طرف سے رُوگردانی کرنا جائز نہیں وغیرہ۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ

اُن کے سامنے　ایک مثال بیان کرو　دو آدمی ہیں　ایک کے تو　انگوروں کے دو باغ ہیں　جن کے گرداگرد　کھجوروں کا باڑھ　ہم نے لگا دیا ہے

وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا ۙ وَّفَجَّرْنَا

اور دونوں باغوں کے درمیان کھیتی لگا دی ہے　اور دونوں باغ میووں سے لدے ہوئے ہیں　میوے میں کوئی کمی نہیں　اور دونوں کے درمیان ہم نے نہر بھی

خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۝ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا

جاری کر دی ہے　اور باغ والے کو بہتیرے پھل ملتے ہیں (ایک روز) دورانِ گفتگو میں　اُس نے اپنے ساتھی سے کہا　میں تجھ سے زیادہ مالدار　اور جتھے میں

وَّأَعَزُّ نَفَرًا ۝ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَا أَظُنُّ أَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖ أَبَدًا ۝

غالب ہوں　اس ناحق کوشی کی حالت میں　وہ اپنے باغ میں گیا　تو بولا　میرا گمان نہیں　کہ یہ　کبھی　فنا ہو

وَّمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ إِلٰى رَبِّيْ لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝ قَالَ

اور مجھ یہ بھی خیال نہیں کہ قیامت برپا ہوگی　اور اگر مجھے اپنے رب کے پاس لوٹ کر جانا بھی پڑا　تو اس باغ سے بہتر وہاں پاؤں گا　اُس کے

لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ أَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ

ساتھی نے اُس کو جواب دیتے ہوئے کہا　کیا تو اُس خدا کا منکر ہو گیا جس نے تجھے مٹی سے　بنایا　پھر نطفہ سے　پھر تجھے　پورا آدمی

رَجُلًا ۝ لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝ وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاۗءَ اللّٰهُ

بتا دیا لیکن میں تو عقیدہ رکھتا ہوں کہ اللہ میرا رب ہے میں اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں کرتا اور جب تو اپنے باغ میں آیا تھا تو تو نے ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ

لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ۝ فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ

کیوں نہیں کہا اگر تو مجھے دیکھتا ہے کہ تجھ سے مال و اولاد میں کم ہوں تو کیا عجب ہے کہ میرا رب مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا

جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاۗءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ۝ اَوْ يُصْبِحَ مَاۗؤُهَا غَوْرًا

کر دے اور تیرے باغ پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس کی وجہ سے وہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائے یا اس کا پانی خشک ہو جائے

فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا ۝ وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰي مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِىَ

پھر تو اس کو کسی طرح طلب بھی نہ کر سکے غرض اس کے پھل (آفت میں) گھیر لئے گئے تو وہ اس لاگت پر ہاتھ ملنے لگا جو اس نے باغ میں لگائی تھی اور باغ

خَاوِيَةٌ عَلٰي عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ

اپنی ٹٹیوں پر گر پڑا اور وہ شخص کہنے لگا کاش میں اپنے رب کا کسی کو شریک نہ بناتا اس کی کوئی جماعت ایسی نہ ہوئی

يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ۝ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ۝

جو اللہ کے سوا اس کی مدد کرتی اور نہ وہ خود انتقام لے سکا اس وقت سب اختیار خدائے برحق ہی کو ہے وہ بہترین ثواب اور بدلا دینے والا ہے

تفسیر ابن کثیر، بیضاوی، محی السنہ اور مفسر سراج وغیرہم نے لکھا ہے کہ گزشتہ آیات میں ان مشرکوں کی حالت کا بیان تھا جو مال کی وسعت، اولاد کی کثرت اور دنیوی عزت و شوکت پر نازاں تھے، مالی فراخی کو سرمایۂ افتخار جانتے اور جسمانی عیش و راحت کو لازوال سمجھتے تھے۔ فقرائے صحابہ افلاس کے سبب ان کی نظروں میں حقیر اور قابلِ نفرت تھے۔ بے بس بے کس مخلص مومن ان کے نزدیک ذلیل تھے، لیکن انجام کار مغرور متکبر طبقہ تباہ ہوا۔ سب عیش و آرام اور دولت و ثروت خاک میں مل گئی۔ دنیا بھی برباد ہوئی اور دین بھی گیا۔ رو سیاہی نصیب ہوئی اور وہ طبقہ جو مالدار کافروں کی نظروں میں ذلیل و حقیر تھا اس کو خدا تعالیٰ نے دنیوی عروج اور دینی فلاح عطا فرمائی۔ دنیا میں بھی عزت، شوکت، حکومت اور دولت مرحمت کی اور اجرِ آخرت بھی عنایت کیا۔ ان دونوں گروہوں کی تمثیل کے لئے دو آدمیوں کا قصہ بیان فرمایا۔ یہ دو آدمی صرف فرضی تھے جن کا تذکرہ محض تشبیہ و تمثیل کے لئے کیا گیا یا واقعی ایسے صفات کے دو شخص تھے؟ اس کے متعلق اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ جن دو شخصوں کی حالت سے تشبیہ دی ہے ان میں سے ایک ابو سلمہ عبد اللہ بن عبد الاسد بن یا لیل تھے اور دوسرا ان کا بھائی اسود بن عبد الاسد تھا۔ بعض مفسرین نے بحوالہ ابن عباسؓ بیان کیا کہ یہ دو اسرائیلیوں کی مثال ہے۔ جن میں سے ایک کا نام یہودا (اور بقول مقاتل تلیخا) تھا۔ دوسرے کا نام قرطوس یا فرطوس (اور بقول وہب قطفیر تھا) اول الذکر مومن اور موخر الذکر کافر تھا۔ عطائے خراسانی نے دونوں کا قصہ اس طرح بیان کیا ہے کہ دونوں بھائی اور باہم شریک تھے۔ دونوں کے پاس چار چار ہزار دینار تھے۔ فرطوس نے ایک ہزار میں زمین خریدی۔ ایک ہزار خرچ کر کے باغ لگایا۔ ایک ہزار خرچ کر کے شاندار نکاح کیا اور ایک ہزار سے باندی غلام اور ریشم و تنعم کا سامان فراہم کیا۔ یہودا جب اپنے

ساتھی کو خرچ کرتے دیکھتے تو خود بھی اسی قدر خیرات کرتے اور یہ کہہ کر فقراء و مساکین کو تقسیم کر دیتے کہ الٰہی میرے رفیق نے دنیاوی زمین خریدی تھی میں تجھ سے بہشت کی زمین خریدتا ہوں۔ میرے ساتھی نے باغ لگایا ہے میں تجھ سے جنت چاہتا ہوں۔ میرے شریک نے دنیا کی عورت سے شادی کی ہے میں تجھ سے حورِ بہشتی کا طلب گار ہوں۔ میرے بھائی نے ناپائیدار خدم و حشم اور فانی اسباب معیشت خرید لیا ہے میں تجھ سے لازوال ابدی نعمتوں کا خواستگار ہوں۔ اس کے بعد یہودا کو فرطوس اپنا باغ دکھانے ایک روز لے گیا جس کا مفصل قصہ آیات میں مذکور ہے۔

اس قصہ میں مسلمانوں کو تسلی دینی مقصود ہے کہ ناداری کا غم نہ کریں اور کافروں کو تنبیہ کرنی غرض ہے کہ دنیوی جاہ و حشم اور عیش و نعم پر مغرور نہ ہوں یہ ناپائیدار چیزیں ہیں۔ اب ہم آیات کا تجزیہ کر کے جدا جدا تشریح کرتے ہیں۔

وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کسی درخت میں کمی نہیں ہوتی۔ بعض مفسرین نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ باغ کے پھلوں میں کسی سال کمی نہ ہوتی تھی۔ گویا دوسرے باغوں میں اس کو یہ ترجیح تھی کہ معمولی باغ میں ایک سال پھل زیادہ اور دوسرے سال کم آتے ہیں۔ مگر اس باغ میں پھل ہر سال بکثرت آتے تھے۔ ابن عباسؓ کا بیان کردہ مطلب زیادہ مناسب ہے۔

وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ابن عباسؓ، مجاہد اور قتادہ کے نزدیک ثمر سے مال مراد ہے یعنی باغوں کے علاوہ اس کے پاس بہت سا مال بھی تھا بعض کثیر اور بعض دیگر نے ثمر سے پھل ہی مراد لئے ہیں۔ یہی اظہر ہے۔

اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا یہ بات اس نے اظہارِ واقعہ کے لئے نہیں بلکہ غرور و تکبر کرتے ہوئے کہی تھی۔

قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ۔ یعنی مومن نے جب اپنے ساتھی کو غرور کرنے سے روکا اور فرمایا کہ کہیں تیرا کفر و غرور ان باتوں کو برباد نہ کر دے تو اس نے باغ میں لے جا کر لدے ہوئے درخت، لبریز نہریں، شاداب سبزہ اور پُر بہار منظر دکھایا اور بولا یہ سب تمہارے خیالات ہیں۔ میرے خیال میں یہ کبھی برباد نہیں ہو سکتا۔ تمام اسباب موجود ہیں اب اس کو برباد کرنے والا کون؟ ایک تم ہو کہ خدا کا نام لے کر برباد ہونے اور جنت کی موہوم آس لگائے بیٹھے ہو۔ کیسی قیامت اور کیسا حشر۔ مجھے تو قیامت آنے کا گمان بھی نہیں۔ اس کے بعد اپنے ساتھی کا مذاق اڑاتے ہوئے بطور تضحیک کے بولا اچھا اگر قیامت آ بھی گئی اور تمہارے اعتقاد کے موافق مجھے رب کے سامنے جانا بھی پڑا تو مجھے وہاں بھی اس سے بہتر ملے گا۔ یہ الفاظ ساتھی پر تعریض کرتے ہوئے کہے اور آخرت پر دنیا کو قیاس کرتے ہوئے بولا کہ تمہاری حالت آخرت میں بھی خستہ ہوگی۔ جب خدا نے دنیا میں تم کو کچھ نہ دیا تو آخرت میں کیا دے گا اور جس طرح دنیا میں خوشحالی فارغ البالی ہوں آخرت میں بھی راحت و چین سے ہوں گا۔

اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ الخ ۔ یعنی مومن نے اس کافر کو سمجھایا کہ کمبخت تو ظاہری اسباب پر ایسا پھولا نہیں سماتا اور خدا کا منکر ہو گیا۔ تجھے مٹی سے پیدا کرنے والا کون ہے؟ غذا فراہم کر کے نطفہ بنانا اور نطفہ سے مکمل انسان تیار کرنا کس کا کام ہے؟ ذرا اپنی ابتدا تو دیکھ تجھے کس بات پر غرور ہے اور کیوں قیامت کا انکار ہے۔ تیری تخلیق ذلیل نطفہ سے ہوئی۔ پھر کون سی قابلِ فخر بات ہے۔ پھر جس طرح خدا نے تجھے پہلی مرتبہ پیدا کیا وہی دوبارہ پیدا کر سکتا ہے۔

وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ الخ ۔ کافر نے مومن کو باغ کی شادابی، پھلوں کی فراوانی اور درختوں کی کثرت دکھائی تھی اور مادی اسباب پر نظر رکھتے ہوئے خدا سے منہ موڑ لیا تھا۔ مومن نے اس کو تنبیہ کرنے کے لئے کہا تھا تو خدا کو کیوں بھول گیا ہے کیا تجھے نہیں معلوم کہ قوت کا مالک صرف اللہ ہے وہی جو چاہتا ہے ہوتا ہے۔ اس کی مشیت کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا۔ ان ظاہری اسباب میں کچھ بھی تاثیر نہیں سب حکم الٰہی کے تابع ہے۔

حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے فرمایا مجھے حضور اقدسؐ نے چند الفاظ سکھائے تھے جن کو ہر سختی اور مصیبت کے وقت میں کہتی ہوں۔ وہ الفاظ یہ ہیں

اَللّٰهُ اَللّٰهُ رَبِّيْ لَآ اُشْرِكُ بِهٖ شَيْـًٔا ۔ (رواہ ابن ابی حاتم)

مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کی فضیلت میں بکثرت احادیث اور آثار صحابہ و تابعین موجود ہیں۔ جن کو نقل کرنا موجب طوالت ہے۔ اس کے بعد مومن نے کافر سے کہا تو میری ناداری اور اولاد کی کمی پر طعن کرتا اور اپنے مال و اولاد کی کثرت پر ناز کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خدا مجھے اس سے بہتر عطا فرما دے اور تیرے اوپر طوفان باد و باراں اور برق لرزاں بھیج کر ایک دم میں تیرے باغ کو برباد کر دے یا پانی بالکل سوکھ جائے اور

یہ تمام شادابی جاتی رہے۔ غرض یہ کہ آسمان وزمین کے تمام اسباب و حوادث اللہ کے قبضہ میں ہیں وہ جس طرح چاہے ان میں تصرف کر سکتا ہے۔

وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۔ یعنی آخر وقت کافر نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور قدرت قاہرہ کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے شرک پر ندامت ظاہر کی، مگر خالص دل سے نہیں بلکہ مال تلف ہونے کی خاطر اس کو اسلام کی رغبت نہ ہوئی بلکہ املاک دنیاوی کی حفاظت کا ذریعہ وہ اسلام کو سمجھا اس لئے بمجبوری با دلِ ناخواستہ اللہ کی قدرت کا اعتراف کیا، مگر ایسا اسلام قابلِ قبول نہیں۔

ایک شبہ مذکورہ آیات سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شرک و کفر کی نحوست سے مال کی بربادی اور حوادث کا سیلاب آتا ہے اور اسلام سے مال کی کثرت اور دولت کی فراوانی حاصل ہوتی ہے۔ حالانکہ مشاہدہ اور تجربہ بالکل اس کے خلاف ہے۔ مومنوں پر بلائیں مسلط ہوتی ہیں اور کافر مزے اڑاتے ہیں۔ اہلِ ایمان نادار اور مفلس ہیں اور حاملانِ کفر و عصیان فارغ البال خوشحال ارباب مال۔ قرآن پاک میں صاف طور پر آیا ہے کہ وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ یعنی اگر سب لوگوں کے کافر ہو جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم کافروں کے مکانوں کی چھتیں چاندی کی کر دیتے۔ مقصد کہ ان کو اتنا دیتے کہ وہ چاندی کے مکان بنا لیتے۔ حدیث صحیح میں آتا ہے کہ انبیاء سے لے کر معمولی اہلِ ایمان تک سب لوگ حسبِ مراتب مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں۔

جواب مال کو تباہ کرنے والا اور دولت کو برباد کرنے والا غرور ہے۔ خدا تعالیٰ نے کافر کو اس کے غرور کے عوض برباد کر دیا۔ تمام عمر اس نے مال جمع کرنے میں صرف کی اور آخرت سے روگرداں رہا، مگر خدا تعالیٰ اس کو ڈھیل دیتا رہا۔ بالآخر جب اس کے پُر نخوت سر میں غرور بھر گیا تو اس کو تباہ کر دیا۔ اب اس نے اپنے مددگاروں اور حمایت کرنے والوں کی جستجو کی۔ جن باطل معبودوں کی پرستش کرتا تھا ان کی طرف دست استمداد پھیلایا، مگر جب چاروں طرف سے مایوسی اور ناکامی نے گھیر لیا تو اس نے خیال کیا کہ یہ تمام نحوست شرک کی وجہ سے آئی ہے، اس لئے آخر میں خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کیا۔ واقع میں یہ اس کے شرک کی سزا نہ تھی بلکہ خدا سے استغناء اور غرور کی پاداش تھی وہ اپنی نعمت کو لازوال سمجھے بیٹھا تھا۔ بالآخر تباہ ہوا۔

مقصودِ بیان دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی بقا کی تصویر کشی، مسلمانوں کو صبر کی تلقین کہ اپنی ناداری اور محتاجی کا اندوہ اور کافروں کی دولت مندی و راحت کی تمنا نہ کریں۔ معیارِ فضیلت تمول و افلاس نہیں بلکہ خدا پرستی اور خدا ترسی ہے۔ غرور اور تکبر سے دولت برباد ہو جاتی ہے۔ مادی اسباب کو کارساز سمجھنا اور ان پر بھروسہ کر بیٹھنا حماقت ہے۔ دولت کی فراوانی، اولاد کی کثرت، طاقت اور جانب نظر صورت دیکھ کر بلکہ ہر چیز کا مشاہدہ کرنے کے بعد مَاشَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کہنے اور اس کے مفہوم کا یقین رکھنے کی ضرورت ہے۔ ہدایت يُرْسِلَ اور فَتُصْبِحَ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ زمین اور آسمان کے کل معمولی اور غیر معمولی حوادث اور تمام غیبی اسباب اللہ کے دست میں ہیں۔ اللہ ایک ساعت میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے مگر ظاہرِ انقلاب کا باعث آدمی کی حالت کا تغیر ہوتا ہے۔ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ الخ سے معلوم ہوا کہ جب چاروں طرف سے انسان کو مایوسی و ناکامی اور تباہی گھیر لیتی ہے تو وہ آخر میں خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ظاہری اسباب اور سروسامان جب تک اس کے پاس فراہم رہتا ہے اس وقت تک اس کو خدا کی یاد نہیں آتی۔ جب آخری بربادی کا وقت آتا ہے تو پھر تصویرِ حسرت بن کر وہ خدا کی طرف دوڑتا ہے، لیکن اس وقت بھی بدطینت ضعیف العقیدہ لوگ دنیوی اغراض کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ آخرت کی نجات اب بھی مقصود نہیں ہوتی۔ پورے قصہ سے قیامت کی حقانیت ثابت کرنی مقصود ہے کہ جس طرح ایک دم میں خدا تعالیٰ روزمرہ عالم میں انقلاب کرتا رہتا ہے کائنات ارضی میں دفعی اور تدریجی تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ایک دن کل عالم کو برباد کر کے از سرِ نو پیدا کر دے گا اور اس کون و فساد کے وقت اس کے سوا کوئی کارساز نہیں وغیرہ۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ

ان سے دنیا کی زندگی کی مثال بیان کرو مثلاً پانی کو ہم نے آسمان سے برسایا اس کے سبب سے زمین کی روئیدگی گنجان ہو گئی

فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝ الْمَالُ وَالْبَنُونَ

پھر آخر کار چورا ہو گیا جس کو ہوائیں اڑائے پھرتی ہیں　اور اللہ　سب کچھ　کر سکتا ہے　مال اور اولاد　دنیوی　زندگانی

زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا ۝

کی زینت ہے　اور باقی رہنے والی　نیکیاں تمہارے رب　کے ہاں ثواب میں بھی بہتر ہیں　اور توقع کے اعتبار سے بھی بہتر ہیں

تفسیر

ان آیات میں خدا تعالیٰ نے دنیوی عیش و طرب کی ناپائیداری کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ غیر محسوس قیامت کو محسوس پیرایۂ بیان میں ثابت کیا ہے اور اعمالِ صالحہ کی بلیغ ترغیب دی ہے۔ انسانی زندگی اور موت کو سبزہ کی پیداوار اور بربادی سے تشبیہ چند سورتوں میں دی گئی ہے لیکن طرز ادا جدا جدا ہے اور مفہوم میں بھی کچھ بیشی ہے۔ سورۂ یونس میں، سورۂ زمر میں، سورۂ حدید میں اور اس سورت میں چاروں مقامات پر آسمانی پانی کی پیداوار سے انسانی زندگی کو تمثیل دے کر اسی دنیا کے مال و منال، حسن و رعنائی، صحت، طاقت، حکومت و عزت، اولاد اور جتھے کی فنا پذیری دکھائی ہے۔

حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ جس طرح اوپر سے پانی برستا ہے زمین اپنی استعداد اور قابلیت کے موافق اس کو چوس لیتی ہے۔ پانی سے لہلہاتا سبزہ اور ہری بھری کھیتیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کوئی پودا چھوٹا کوئی بڑا کوئی پھل دار کوئی خالی رہتا ہے۔ پھر جب مقررہ میعادِ زندگی ختم ہو جاتی ہے تو خشک ہو کر ریزہ ریزہ بن کر بھوسہ بن جاتا ہے جس کو ہوا اِدھر اُدھر اڑاتی پھرتی ہے نہ اس میں گزشتہ شادابی رہتی ہے نہ وہ قوتِ نمو اور سبزی نہ پھل نہ پھول۔ یہی طرح انسان کی حالت ہے۔ غیبی فیضان سے رحم مادر کی زمین میں اس کا تخم بویا جاتا ہے۔ وقت خاص پر پیدا ہوتا ہے، رفتہ رفتہ بڑھتا، ترقی کرتا اور جوان ہوتا ہے۔ جوانی، رعنائی، حسن، طاقت، صحت، دولت، عزت سب ہی کچھ حاصل ہوتا ہے۔ پر نخوت سر میں غرور بھر جاتا ہے، اپنی شان و شوکت پر خود ریجھنے لگتا ہے، ناز و تبختر سے چلتا ہے، لیکن چند روز کے بعد بڑھاپا آتا ہے بُرا آیا آتا ہے، وہ حسن و جمال کافور ہو جاتا ہے، جسمانی توازن اور طاقت معدوم ہو جاتی ہے، کچھ مدت کے بعد مر کر خاک کے ساتھ خاک ہو جاتا ہے۔ بدن نازک کا ذرہ ذرہ ہوا میں اڑتا پھرتا ہے۔ یہی حالت اس مال و منال اور اولاد کی ہوتی ہے جس پر زندگی میں بھروسہ تھا اور جس کو باعثِ صد ناز سمجھ رکھا تھا۔ چند روز میں سارا شاداب باغ اجاڑ ہو جاتا ہے، پھول بہار فنا کے ہاتھوں برباد ہو جاتی ہے۔ ہاں اگر کوئی چیز باقی رہنے والی اور کام آنے والی ہے تو وہ اعمالِ صالحہ ہیں۔ انہیں کی وجہ سے فرحتِ دائمی کا سامان حاصل ہوتا ہے اور انہیں پر کچھ اعتماد و بھروسہ ہو سکتا ہے۔

باقیات صالحات کی تفسیر و تعیین میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ امام احمد اور طبرانی نے مختلف الاسناد احادیث بیان کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور رسالت نے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ کو باقیات صالحات قرار دیا۔ حضرت عثمان نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔ ابن عباس کا قول ایک روایت میں یہ ہے کہ پنجگانہ نمازیں باقیات صالحات ہیں۔ دوسری روایات میں لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ اور اَللّٰهُ أَكْبَرُ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اور تَبَارَكَ اللّٰهُ اور لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ اور أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ اور صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ اور روزہ اور حج اور صدقہ خیرات اور غلاموں کو آزاد کرنا اور راہِ خدا میں جہاد کرنا اور کعبہ پوری کرنا بلکہ تمام نیک اعمال باقیات صالحات ہیں۔ نیک اعمال ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ ابن جریر اور مفسر سراج وغیرہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ ہمارے نزدیک بھی کسی خاص نیک عمل پر محصور کر دینا ٹھیک نہیں ہے۔ مختلف احادیث اور اقوال صحابہ و تابعین میں باقیات صالحات کی جو تفسیر کی گئی ہے وہ بطور تمثیل ہے حصر مقصود نہیں ہے۔

مقصود بیان

بارش کی وجہ سے زمین کے سبزہ کی روئیدگی، نمو، ترقی اور بالآخر فنا ہو کر ہوا میں اڑتے پھرنے سے انسانی زندگی، نشو و نما، جوانی، پیری اور موت کو تشبیہ دیکر دنیا اور سامانِ دنیا کی ناپائیداری کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ مال و اولاد کے فنا پذیر ہونے کا

عکاسی اور اس بات پر ضمنا تنبیہ کہ آخرت میں دنیوی سامان ساتھ نہ جائے گا۔ وہاں یہ ذخیرہ کام نہ آئے گا۔ ساتھ جانے والی چیز اعمال صالحہ ہیں۔

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً ۙ وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا ۚ

جس دن ہم پہاڑوں کو چلائیں گے اور زمین تم کو صاف نظر آئے گی اور اُن کو جمع کریں گے اُن میں سے کسی کو نہ چھوڑیں گے

وَعُرِضُوا عَلَىٰ رَبِّكَ صَفًّا لَّقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ بَلْ زَعَمْتُمْ أَلَّن نَّجْعَلَ

اور تمہارے رب کے سامنے صف بستہ پیش کئے جائیں گے (اور تم کہیں گے کہ) جس طرح ہم نے تم کو اوّل بار پیدا کیا تھا ویسے ہی تم آپہنچے بلکہ تمہارا تو یہ خیال تھا کہ ہم

لَكُم مَّوْعِدًا ۝ وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ

ہرگز تمہارے میعاد مقرر نہ کریں گے اور نامۂ اعمال رکھ دیا جائے گا اور تم دیکھو گے کہ مجرم اُس مضمون سے ڈرتے ہوں گے جو اُس کے اندر ہوں گے اور کہیں گے

يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۚ وَوَجَدُوا

ہائے افسوس یہ کتاب کیسی ہے چھوٹا بڑا گناہ اس سے بچا نہیں سب پر حاوی ہے جو کچھ

مَا عَمِلُوا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا ۝

ع ۵ / ۱۸

اُنھوں نے کیا ہوگا سامنے موجود پائیں گے اور تمہارا رب کسی کی حق تلفی نہ کرے گا

تفسیر مختلف اقناعی اور قطعی دلائل سے جب وجود قیامت کا ثبوت کر دیا تو اب کیفیت قیامت بیان کرتا ہے اور قیامت کے واقعی ہولناک منظر کی تصویر کھینچ کر ضمناً باقیات صالحات کی ترغیب دیتا ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ قیامت کے دن پہاڑ (روئی کے گالوں کی طرح) اُڑتے پھریں گے۔ زمین پر کوئی درخت کوئی مکان، کوئی چھت، کوئی سایہ اور کوئی بلندی پستی نہ ہوگی، صاف چٹیل میدان ہوگا۔ (تمام زمین آئینہ کی طرح صاف شفاف ہوگی) تمام انسان قبروں سے اُٹھ کر صف بستہ ہو کر خدا کے سامنے لائے جائیں گے۔ جس طرح آدمی دنیا میں بےکس و بےبس نادار خالی ہاتھ ننگے بدن غیر مختون آئے تھے ایسے ہی قیامت کے دن ننگے برہنہ اور محتاج ہو کر میدان حشر میں جمع ہوں گے نہ وہاں دولت و مال ساتھ ہوگا نہ حشمت و جاہ نہ نوکر نہ چاکر۔ تن تنہا بےیار و مددگار ہر شخص اپنی دُھن میں مست ہوگا۔ نامۂ اعمال تقسیم ہوں گے، مجرم ڈرتے ڈرتے ان کو پڑھیں گے۔ دنیا کی کل کارگزاریاں، اچھل صابنیاں، ریاکاریاں، ظلم و ستم، حق تلفیاں غرض ہر چھوٹی بڑی حرکت اُن میں مندرج نظر آئے گی۔ حیرت سے کہیں گے ارے یہ کیا ہوا۔ یہ تو ہماری زندگی کا پورا فوٹو ہے۔ کوئی فعل و حرکت ایسی نہیں جو اس میں مذکور نہ ہو، لیکن یہ تمام روئیداد انسانی زندگی کی ہوگی۔ جیسا کوئی بوئے گا ویسا کاٹے گا، اللہ کسی کی حق تلفی نہ فرمائے گا۔

طبرانی نے بروایت سعد بن عبادہ بیان کیا ہے کہ غزوۂ حنین سے فارغ ہونے کے بعد تمام اسلامی لشکر ایک خشک میدان میں فروکش ہوا حضور نے لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا جس کسی کے ہاتھ جو لکڑی لگے خواہ چھوٹی ہو یا بڑی یہاں لا کر جمع کر دے۔ تھوڑی دیر میں لکڑیوں کا انبار ہو گیا حضورؐ نے ارشاد فرمایا جس طرح تم نے ان لکڑیوں کو جمع کیا ہے اسی طرح آدمی پر اُس کے گناہ جمع ہو جاتے ہیں، اس لئے اللہ سے ڈرو اور چھوٹا بڑا کوئی گناہ نہ کرو ہر گناہ کا شمار ہوتا ہے۔

ابو القاسم عبد الرحمٰن بن منذر نے کتاب التوحید میں بروایت معاذ بن جبلؓ بیان کیا کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن خدا تعالیٰ بلند

آواز ہے جس میں کوئی خوف و دہشت نہ ہوگی بلا دے گا۔ یَا عِبَادِیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ وَاَسْرَعُ الْحَاسِبِیْنَ ۔
اے میرے (مومن) بندو! آج تم کو خوف و غم نہ ہوگا، اپنی حجت پیش کرو اور سہولت کے ساتھ جواب دو۔ تم سے حساب کیا جائے گا اے میرے فرشتو!
میرے بندوں کو پنجوں کے بل حساب کے لئے کھڑا کر دو۔ قرطبی نے کتاب تذکرہ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث آیت مذکورہ کی واضح تفسیر ہے۔
ابن کثیر نے صحیحین کی ایک حدیث ذکر کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر غدار کا جھنڈا اس کے پیچھے ہوگا۔ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرے گا، درگزر فرمائے گا، بخشش کرے گا، رحم کرے گا اور بمقتضائے عدل و حکمت جس کو چاہے گا اس کے گناہ کے موافق عذاب دے گا۔ جہنم کو کافروں اور مسلمان گنہگاروں سے بھر دے گا۔ پھر گنہگار مسلمانوں کو وہاں سے نکال لے گا اور کافروں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے گا۔

مقصود بیان

قیامت کے دن پہاڑ اُڑ اُڑے پھریں گے۔ زمین پر کوئی بلندی پستی، وادی، ٹیلہ، سایہ، درخت وغیرہ نہ ہوگا۔ صاف ہموار چٹیل میدان ہوگا۔ سب لوگ قبروں سے محشور ہوں گے۔ اللہ کے سامنے صف بستہ پیش کئے جائیں گے۔ برہنہ سر برہنہ پا، برہنہ بدن، غیر مختون، تن تنہا خالی ہاتھ ہوں گے۔ نامہائے اعمال میں ہر چھوٹی بڑی حرکت اور کل دنیوی اقوال و اعمال درج ہوں گے اللہ کسی کی حق تلفی نہیں فرمائے گا
پوری آیات سے مقصود قیامت کی مفصل کیفیت بیان کرنی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم کا انقلاب مادی ہوگا فقط روحانی انقلاب کا قول غلط ہے۔ حشر، نشر، عذاب، ثواب، حساب کتاب سب مادی صورتوں میں ہونا قطعی ہے۔ زمین کس چیز کی ہوگی؟ یہ خدا جانے۔ ہاں ہوگی ضرور اور ہموار ہوگی۔ کہیں سے اونچی نیچی نہ ہوگی۔ سطح ہموار ہوگی وغیرہ۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ

جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا ابلیس جنات میں سے تھا اس لئے اپنے رب کی نافرمانی کی

رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝

تو کیا تم اس کو اور اس کی نسل کو مجھے چھوڑ کر دوست بناتے ہو حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں ظالموں کے لئے بُرا بدل ہے

مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ

شیاطین کو میں نے نہ آسمان و زمین کی پیدائش کے وقت بلایا تھا اور نہ خود اُن کے پیدا کرنے کے وقت اور نہ میں ایسا تھا کہ گمراہ کرنے والوں کو

عَضُدًا ۝ وَيَوْمَ يَقُوْلُ نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَ

بازو بناتا اور جس روز اللہ فرمائے گا کہ میرے ان شریکوں کو بلاؤ جن کو تم شریک سمجھتے تھے چنانچہ وہ اُن کو پکاریں گے مگر وہ جواب نہ دیں گے اور ہم

جَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ۝ وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ۝ ع

اُن کے درمیان ایک سامانِ ہلاکت حائل کر دیں گے اور مجرم آگ کو دیکھیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ ہم گرنے والے ہیں اور اُس سے بھاگنے کی کوئی راہ اُن کو نہ ملے گی

تفسیر ۵۰

کفار مکہ غریب مسلمانوں کو ان کی ناداری کی وجہ سے ذلیل جانتے تھے اور دولت مندی کے نشہ میں چور ہو کر اپنے کو اعلیٰ اور افضل جانتے تھے۔ باوجودیکہ غریب و امیر اور دولت مند و فقیر کی تخلیق ایک ہی مادہ سے ہوئی۔ ایک ہی طرح کے اعضائے جسمانی ملے۔ فرق صرف

تموّل و افلاس کا ہے اور یہ معیارِ فضیلت نہیں، مگر کافروں کے لئے مال ہی مایۂ صد غرور تھا۔ ابلیس بھی حضرت آدم کے مقابلے میں غرور کے ساتھ سرکشی کر چکا ہے اور اپنے افضل ہونے کے ثبوت میں سرشتی اختلاف اور تخلیقی نورانیت کو پیش کر چکا ہے۔ کافروں کا غرور بھی شیطانی غرور کا عکس تھا بلکہ اس سے بدتر تھا۔ اس کی تخلیق تو نورانی مادہ سے ہوئی بھی تھی، مگر یہاں تو مادہ تخلیق اور کیفیت پیدائش میں کوئی فرق بھی نہیں ہے۔ نخوت و غرور کے انسانی بت کو توڑنے کے لئے خدا تعالیٰ نے آیاتِ مذکورہ نازل فرمائیں۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اے بنی آدم ابلیس تمہارا قطعی دشمن ہے۔ تمہارے باپ آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر چکا ہے اور اپنے کو تخلیقی اعتبار سے افضل سمجھ چکا ہے پھر تم اس کی پیروی کیوں کرتے ہو اور کیوں باہم تفاخر کر کے شیطان کے نقشِ قدم پر چلتے ہو۔

اس سے آگے مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے برہانی طور پر الوہیت وحدانی کا اثبات اور شرک کی بیخ کنی فرمائی ہے۔ انسان کو گمراہ کرنے والی بیسیوں چیزیں ہیں جن میں کچھ اندرونی ہیں کچھ بیرونی۔ بیرونی اسبابِ گمراہی ہیں جیسے مال و اولاد، طلبِ عزت و جاہ، اعاظمِ کل کی جستجو، نسبی تفاخر وغیرہ ہیں۔ اس کا بیان پہلے ہو چکا۔ اندرونی سامانِ ضلالت کی گوناگوں شاخیں ہیں، بُری اسکیمیں، بُرے خیالات، ضرر رساں خطرات، باطل توہمات، خود پنداری، غرورِ نفس، رعونت خاطر وغیرہ۔ یہ سب سرمایۂ ضلالت ہے۔ ان تمام گمراہیوں کا اصل محرک ابلیس اور اس کی ذریت ہے۔ شیطان انسان کے خون کے ساتھ تمام رگوں میں دوران کرتا ہے اور ہر طرح آدمی کو بہکاتا ہے۔ ضرر رساں خطرات، باطل توہمات اور بیجا رعونت خاطر کے زیر اثر انسان انبیاء، اولیاء اور مبلغانِ حق سے روگردانی کرتا اور ان کے مقابلے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ مفروضہ دیوتاؤں کی پرستش کرتا اور جبروتی شیطانی طاقتوں کو اپنا حقیقی کارساز عملاً جانتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ تخلیقِ عالم کے وقت یہ بت اور مفروضہ دیوتا کہاں تھے۔ یہ بھی ہماری تخلیق سے بے نیاز نہیں۔ ان کا وجود خود ہمارا ممنونِ کرم ہے پھر ان کو استحقاقِ الوہیت کس طرح پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ جب خدا تعالیٰ انسان کو پیدا کرتا ہے اور اس کی پیدائش کے اسباب مہیا فرماتا ہے اس وقت یہ مفروضہ کارساز کہاں ہوتے ہیں۔ کیا انسانی تخلیق میں ان کو دخل ہے۔ کیا خدا ان سے مدد لیتا ہے۔ جب کل عالم کو بغیر ان کی مدد کے خدا نے پیدا کیا اور خود ان کی پیدائش بھی خدا ہی کی ممنون ہے تو کس قدر ظلم ہے کہ بڑھنے اور جوان ہونے کے بعد آدمی اپنے حقیقی خلاق و معبود کو چھوڑ کر ابلیس اور اس کی ذریت کو پکارتا ہے۔ مزید بریں آخرت میں جب کافروں اور مشرکوں کی حالت تباہ ہوگی اور وہ عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوں گے اس وقت بھی یہ مفروضہ معبود ان کی کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔ بارگاہِ الٰہی سے حکم ہوگا کہ آج اپنے معبودوں کو مدد کے لئے پکارو۔ ہلاکت نصیب گروہ پکارے گا مگر گمراہ کن شیطانوں کی طرف سے کوئی جواب نہ ملے گا، وہ خود مجبور ہوں گے، مدد کرنے پر قادر ہی نہ ہوں گے۔

تحلیلِ اجزاء

كَانَ مِنَ الْجِنِّ۔ ابن کثیر نے کہا کہ ابلیس کے اصل مادہ میں خباثت تھی۔ اس کی تخلیق بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں سے ہوئی تھی۔ صحیح مسلم میں بروایت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ مروی ہے حضور اقدسؐ نے فرمایا ملائکہ کو نور سے پیدا کیا گیا، ابلیس کو مشتعل آگ سے اور آدم کو اس طریقہ سے جو قرآن میں بتا دیا گیا ہے، لیکن چونکہ ابلیس افعال و اعمال کے اعتبار سے گروہ ملائکہ میں داخل ہو گیا تھا، اس لئے ملائکہ کے خطاب میں وہ بھی داخل تھا۔ حسن بصری نے فرمایا ابلیس کبھی ملائکہ میں سے نہ تھا بلکہ وہ جنات کی اصل ہے جیسے آدم انسان کی اصل تھے (رواہ ابن جریر) حسن بصری سے یہ قول بھی مروی ہے کہ بُرا کرے، اللہ ان لوگوں کو جو گمان کرتے ہیں کہ ابلیس ملائکہ میں سے تھا۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے فرمایا كَانَ مِنَ الْجِنِّ

ابن عباسؓ کے بعض اقوال میں آتا ہے کہ ابلیس ملائکہ میں سے تھا۔ ہم ان روایات کو مختصر طور پر نقل کر کے روایتاً اور درایتاً تنقید کرتے ہیں تاکہ واضح ہو کہ ابلیس جنس ملائکہ سے تھا یا نہ تھا۔

ابن کثیر نے بروایت ضحاک ابن عباس کا قول نقل کیا ہے ابلیس ملائکہ کے ان قبائل میں سے تھا جن کو جن کہا جاتا ہے اور ان کی پیدائش نارِ سموم سے ہوئی ہے۔ وہ ملائکہ میں رہتا تھا اس کا نام عزازیل تھا وہ جنت کے خازنوں میں سے تھا۔ ملائکہ کی پیدائش نور سے ہوئی ہے۔ ہاں ابلیس کے قبیلہ کی پیدائش نور سے نہیں ہوئی۔ قرآن میں جو جنات کا تذکرہ ہے ان کی پیدائش مشتعل آگ کے شعلوں سے ہوئی ہے۔ اس روایت میں صراحت ہے کہ ملائکہ اور جنات کے اصل مادۂ تخلیق میں اختلاف ہے۔ ابلیس ملائکہ میں رہتا تھا ان کی جنس میں سے نہ تھا۔

دوسری روایت میں ہے ابلیس اپنے قبیلہ کے اعتبار سے بزرگ ترین ملائکہ میں سے تھا اور جنت کا خازن تھا۔ اس روایت کا مطلب

صرف یہ ہے کہ ابلیس کو ملائکہ میں ایک خاص شرف حاصل تھا۔ یہ نہیں ثابت ہوتا کہ ابلیس اور ملائکہ کا مادۂ تخلیق ایک ہی تھا۔

ابن جریر نے بروایت سعید بن مسیب ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ ابلیس ملائکۂ دنیا کا سردار تھا۔ اس روایت سے بھی اصلاً اتحاد نہیں ثابت ہوتا۔

ابن اسحاق نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صدورِ معصیت سے پہلے ابلیس ملائکہ میں سے تھا۔ اس کا نام عزازیل تھا۔ ملائکہ میں سب سے بڑھ کر عالم و عابد تھا۔ وہ اس قبیلہ میں سے تھا جس کو جن کہتے ہیں۔ اس روایت کا آخری نقرہ کل روایت کے مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔ ابن کثیر نے اس کے متعلق بہت سے آثارِ سلف نقل کئے ہیں۔ جن میں سے بیشتر اسرائیلیات سے ماخوذ ہیں۔ اسرائیلی روایات کو ہم درخورِ اعتبار نہ جانتے ہوئے ترک کرتے ہیں۔

کل بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ ابلیس اصل کے اعتبار سے ناری ہے اور فرشتے نوری ہیں۔ مادۂ تخلیق میں دونوں مختلف ہیں۔ ابلیس جن کے قبیلے میں سے تھا۔ جن کا قبیلہ کثرتِ عبادت اور زہد و ریاضت کی وجہ سے گروہ ملائکہ میں داخل تھا۔ اگرچہ اصلاً جدا تھا۔

وَذُرِّيَّتَهٗ۔ ذریت سے بعض مفسرین نے نسل مراد لی ہے۔ اسی بنا پر قتادہ نے کہا کہ آدمیوں کی طرح شیاطین کی بھی اولاد ہوتی ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ لاقیس، ولہان، ہفاف، مرۃ، زلنبور اور مطروس شیطان کی ذریات میں سے ہیں اور مختلف خدمات پر مامور ہیں۔ صحیح مسلم میں عثمان بن ابی العاص کی روایت سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے ایک شیطان کا نام خنزب بتایا تھا۔ صحیح مسلم بروایت جابر بن عبد اللہ مرفوع حدیث ہے کہ ابلیس اپنا تخت پانی پر رکھتا اور اپنی جماعتوں کو آدمیوں کے اغوا کے لئے مامور کرتا ہے۔ میرے نزدیک آیت میں ذریت سے عام معنی مراد لینا زیادہ مناسب ہے۔ شہوانی اور غضبی قوتوں کا بے جا ہیجان، بدسرشت اور گمراہ انسانوں کا اغوا، انسان نما شیطانوں کا بھلے آدمیوں کو کفر و معصیت کی ترغیب دینا، دل میں خلافِ حق خطرات کا ورود، مضرت رساں منصوبے یہ سب شیطانی اثرات ہیں۔ شیطان کی ذریت میں جس طرح خبیث جنات داخل ہیں ویسے ہی بدطینت خبیث الطبع گمراہ کن انسان بھی داخل ہیں بلکہ خود انسان کی مادی قوتیں اگر افراط و تفریط کی طرف مائل ہوں تو ان کو بھی شیطانی ذریت کہنا چاہیئے۔

بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا موبق کے معنی ہیں مقامِ ہلاکت (ابن عباس، قتادہ) ابن عمر نے فرمایا موبق ایک گہری وادی کا نام ہے جو اہلِ ہدایت و اہلِ ضلالت کے درمیان قیامت کے دن حائل ہوگی۔ ایک روایت میں قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ انس بن مالکؓ نے فرمایا موبق جہنم کی ایک وادی ہے جس میں لہو بھرا ہوا ہے (رواہ ابن جریر)۔ حسن بصری نے فرمایا موبق بمعنی عداوت ہے یعنی اہلِ جنت و اہلِ دوزخ کے درمیان عداوت حائل ہوگی۔

مقصودِ بیان شیطان اور ذریاتِ شیطان کی پیروی سے باز داشت۔ ابلیس کے جن ہونے کی صراحت، توحیدِ الوہیت کی قطعی برہان اس امر کی صراحت کہ خدا تعالیٰ محتاج نہیں، اس کو تخلیقِ عالم میں کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ قیامت کے دن اہلِ حق اور اہلِ ضلال ایک دوسرے سے جدا ہوں گے، کوئی کسی کا خبر گیر نہ ہوگا وغیرہ۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ۝ وَمَا

ہم نے لوگوں کے لئے اس قرآن میں طرح طرح سے ہر مضمون بیان کیا مگر انسان سب سے زیادہ جھگڑالو ہے۔ جب

مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَاۗءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ

لوگوں کے پاس ہدایت آچکی تو پھر اپنے رب سے دعائے مغفرت کرنے اور ایمان لانے سے سوائے اس کے اور کوئی مانع نہ رہا کہ ان کو پہلے لوگوں کی ایسی حالت پیش

الْأَوَّلِينَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ۝ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۚ وَيُجَادِلُ

آئے یا سامنے سے عذاب آ کھڑا ہو　ہم جو رسول بھیجتے ہیں　تو صرف خوش خبری سُنانے اور ڈرانے کے لئے مگر کافر

الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ ۖ وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَمَا أُنذِرُوا هُزُوًا ۝ وَمَنْ أَظْلَمُ

ناحق پر جھگڑا کرتے ہیں　تاکہ حق کو جھٹلا دکھاویں　اور میری آیات کو اور اُس عذاب کو جس سے اُن کو ڈرایا گیا ہے مذاق بنا لیتے ہیں اُس

مِمَّن ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ ۚ إِنَّا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً

شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس کو پروردگار کی نشانیوں سے نصیحت کی گئی مگر اُس سے مُنہ پھیر لیا اور اپنے گزشتہ کرتوت بھول گیا ہم نے قرآن کو سمجھنے سے اُن کے دلوں پر پردے

أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۖ وَإِن تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ فَلَن يَهْتَدُوا إِذًا أَبَدًا ۝

اور کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے　اگر تم ان کو ہدایت کی دعوت دو گے　تو یہ کبھی ایسی صورت میں ہدایت پر نہ آئیں گے

وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ لَوْ يُؤَاخِذُهُم بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ

تمہارا رب بخشنے والا اور مہربانی والا ہے　اگر اُن کو اُن کے کئے پر پکڑتا　تو اُن پر جلدی عذاب نازل کر دیتا

بَل لَّهُم مَّوْعِدٌ لَّن يَجِدُوا مِن دُونِهِ مَوْئِلًا ۝ وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْنَاهُمْ

مگر اُن کے لئے ایک میعاد مقرر ہے جس سے ورے اُن کو کہیں پناہ کی جگہ نہیں مل سکتی　یہ بستیاں ہیں کہ جب انھوں نے ظلم کیا　تو ہم نے

لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِم مَّوْعِدًا ۝ ع

ع ۶ / ۲۰

ان کو برباد کر دیا اور اُن کے ہلاک ہونے کی ایک میعاد مقرر کر دی تھی

تفسیر کسی مدعا کی صداقت وحقانیت ثابت کرنے کے دو طریقے ہیں عقلی اور مادی۔ عقلی طریقہ تو یہ ہے کہ مدعا کے ثبوت کے لئے ایسے دلائل بیان کئے جائیں اور ایسی براہین پیش کی جائیں جو محض عقلی ہوں، محسوس خارجی وجدانیات سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ طریقۂ دلیل نفی واثبات میں محصور ہو اور عقلی احتمال نہ پیدا ہو سکتا ہو۔ مثلاً اللہ ایک ہے کیونکہ اگر ایک سے زائد خدا ہوں گے تو انتظام عالم درست نہیں رہ سکتا۔ اس قسم کے دلائل قرآن پاک میں بہت کم ہیں۔ کیونکہ عقل صرف سے کام لینے والے اور دانش محض سے کسی بات پر غور کرنے والے بہت کم ہیں۔ عقلی دلیل عوام کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ متوسط دماغ رکھنے والا طبقہ بھی اس سے کافی طور پر بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا۔ رہے حکماء اور فلاسفر تو ان کی تعداد ہر قوم میں چند سے زائد نہیں۔ قرآن پاک عمومی ہدایت نامہ ہے۔ اس کے پیش نظر اصلاح انسانی ہے۔ یہ فقط حکماء اور دانشمندوں کے لئے قانونی کتاب نہیں بلکہ تمام اقوام وافراد کے لئے مکمل دستور ہدایت ہے، اس لئے بغیر واسطہ وجدانیات کی وساطت کے دانش محض سے کام لینے کی دعوت قرآن نے بہت کم دی ہے۔ رہا مادی طریقہ وہ قرآن میں بکثرت مستعمل ہے۔ نظیر کا نظیر پر قیاس تمثیل اور استقراء ہر طرح سے پیام ہدایت قرآن نے دیا ہے۔ گزشتہ اقوام کی نافرمانیاں دکھا کر ان کی تباہی کی تصویر بھی کھینچی ہے تاکہ سرکشان اسلام کو عبرت ہو۔ تخلیق عالم اور تغیر کائنات دکھا کر حیات بعد الممات پر بھی استدلال کیا ہے۔ موجودات کی نیرنگی

اور فضا کا کون و فساد ظاہر کر کے قدرت کے محیط کل ہونے پر استشہاد بھی کیا ہے تاکہ بصیرت آفریں ہوش رکھنے والے تمام مادی طاقتوں سے منہ موڑ کر ظاہری اسباب قوت پر بھروسہ چھوڑ کر واحد بے ہمتا کی غیبی قدرت کے سامنے سربسجود ہو جائیں، لیکن تاریک دماغ اور کوتاہ ذہنیت والا انسان حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھانا نہیں چاہتا۔ وہمیات کو عقلیات کے ساتھ خلط ملط کر لیتا ہے۔ سفسطہ اور فلسفہ میں فرق نہیں کرتا۔ تمثیل و تنظیر کی تہ تک نہیں پہنچتا۔ نظر و فکر کو چھوڑ کر مکابرہ اور مجادلہ پر اتر آتا ہے۔ کبھی اللہ کی توحید، انبیاء کی نبوت اور دیگر اعتقادیات حقہ میں جھگڑا کرتا ہے۔ کبھی معاشرت، مدنیت اور دیانت کے مسائل صادقہ کا مقابلہ کرتا ہے۔ کبھی تہذیب، ادب اور استحسان کے مباحث پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ غرض معصوم انسان کو چھوڑ کر عموماً انسان کی طبیعت جھگڑالو واقع ہوئی ہے۔ اسی مضمون کا بیان خدا تعالیٰ نے وَلَقَدْ صَرَّفْنَا سے جَدَلًا تک فرمایا ہے۔ امام احمد نے مسند میں ایک حدیث نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک روز حضور اقدسؐ سیدہ خاتون کے گھر تشریف لائے اور فرمایا تم دونوں (حضرت علیؓ اور سیدہؓ) نماز نہیں پڑھتے (یعنی رات کو نوافل و تہجد سے کیوں غافل رہتے ہو؟) حضرت علیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہماری جانیں اللہ کے قبضہ میں ہیں وہی جب اٹھانا چاہتا ہے اٹھا دیتا ہے یہ سن کر حضور والاؐ واپس ہوئے اور واپسی کے وقت رانوں پر ہاتھ مار کر فرمانے لگے وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا۔ صحیحین میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ آیت مذکورہ میں اَلْاِنْسَان سے مراد نضر بن حارث یا ابی بن خلف جمحی ہے اگر روایتاً یہ قول صحیح بھی ہو تب بھی حکم آیت محصور و مخصوص نہیں بلکہ عمومی انسان مراد ہے۔

کوتاہ اندیش اور قاصر الفہم آدمی اپنی ظلمت دماغی کی وجہ سے کتاب الٰہی اور رسول برحق کی تعلیم سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ بے بصیرتی کے سبب فطری اسباب ہدایت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں اور جب تنبیہ کرنے کے لئے واضح طور پر اللہ کا رسول اور اس کی کتاب ہدایت کی دعوت دیتے اور گزشتہ عقائد و اعمال سے توبہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں تو بجائے تصدیق و استغفار کے پیام حق اور پیغمبر حق کا مذاق اڑاتے ہیں، آیاتِ الٰہیہ کا انکار کرتے اور قوانین اصلاحیہ پر طعنے کستے ہیں، ان کے دلوں پر جہالت و بربریت کے پردے پڑے ہوتے ہیں، گوش ہوش بند ہوتے ہیں، روحانیت و دانش کا نور ہوا و ہوس کی مادی ظلمتوں میں گم ہوتا ہے، اپنے اعمال و اقوال کی خرابی ان کو نہیں سوجھتی وہ حق کو باطل اور باطل کو حق جانتے ہیں بلکہ حق کو مغلوب کرنے کے لئے طرح طرح کے شبہات پیش کرتے ہیں۔ ناپاک توہمات سے پاک روحانیت اور مقدس عقلیات کو چھپانا چاہتے ہیں۔ ان کی دماغی افتاد، طرز تقریر اور طریقہ عمل صاف طور پر بتاتا ہے کہ برہان و حجت اور دلیل و ثبوت سے راہ پر نہیں آسکتے۔ ہر طرح کی صداقت اور حقانیت ان کی کج رفتاری اور کج فہمی کو نہیں بدل سکتی۔ اپنی بے وقوفی کی وجہ سے درخواست کرتے ہیں کہ جس طرح گزشتہ اقوام پر نزول عذاب کی خبریں ہم کو دی جاتی ہیں ویسا ہی عذاب ہم پر نازل کرا دو یا عذابِ قیامت ہمارے سامنے لا دو یا کوئی تباہ کن مصیبت ہم پر گرا دو یا آسمان سے پتھر برسا دو۔ ان کو نہیں معلوم کہ انبیاء کا کام تباہی پھیلانا نہیں، وہ تو فقط تبلیغ احکام کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ نیکوں کو نجات کی بشارت اور بدکاروں کو تباہی کا خوف دلاتے ہیں۔ رہی بربادی تباہی اور عذاب تو اس کا ایک وقت مقرر ہے معین وقت سے پہلے نزولِ عذاب نہیں ہو سکتا جن کے پاس چشم بینا ہو وہ دیکھیں کہ حجاز کے قریب مدینہ سے شام کو جانے کے راستہ میں کتنی ہی بستیاں تھیں جن کی ستمگاری اور حق ناشناسی کی پاداش میں خدا تعالیٰ نے ان کو برباد کر دیا، مگر قبل از وقت برباد نہیں کیا، دفعتہً جرم کی سزا نہیں دی بلکہ وقتِ مقررہ پر گرفت کی۔ یہ محض اللہ کی رحمتِ عامہ اور شفقت تامہ ہے کہ فوراً گرفت نہیں فرماتا۔ انسان کی بدکاریاں اور ستمگاریاں تو مقتضی فوری نزولِ عذاب کی موجب ہیں۔ انہی تمام مضامین کو وَمَا مَنَعَ النَّاسَ سے لِمَهْلِكِهِم مَّوْعِدًا تک بیان فرمایا ہے۔ مفسرین نے صراحت کی ہے کہ آخری آیات میں قریش کو نزولِ عذاب کی دھمکی ہے اور اس بات پر تنبیہ ہے کہ تمہاری سرکشی ایک دن رنگ لائے گی۔ تمہاری بربادی کا وقت مقرر ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بدر اور دیگر لڑائیوں میں جن کی ہلاکت کا وقت آ گیا وہ ہلاک ہو گئے۔ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ جنگ بدر ختم ہونے کے بعد حضور اقدسؐ تین روز وہیں فروکش رہے۔ تیسرے روز اس گڑھے کے قریب تشریف لے گئے جہاں ابوجہل وغیرہ کی لاشیں ڈالی گئی تھیں اور فرمایا ہمارے رب نے ہم سے جو وعدہ فرمایا تھا وہ تو ہم نے پا لیا کیا تم نے بھی وہ (عذاب) پا لیا جو پروردگار نے تم سے وعدہ فرمایا تھا۔

مقصود بیان اس امر کی صراحت کہ قرآن نے طریق نصائح میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہر مناسب طرز سے پیام ہدایت سنایا۔ نظر و فکر کی دعوت دی، تمثیل و استقراء سے کام لیا، مگر انسان کی طبعی کٹ حجتی قبول حق سے مانع رہی۔ اس بات پر نہ صرف بلکہ انبیاء

کا کام نجات کی بشارت اور عذاب کا خوف دلانا ہے۔ یعنی انبیاء دنیا میں تباہی پھیلانے اور برباد کرنے کے لئے نہیں بھیجے جاتے بلکہ ان کی بعثت تو رحمت الٰہی ہے۔ البتہ انسان کی بدکاریاں، نافرمانیاں اور سرکشیاں موجب بربادی ہیں، لیکن یاد رکھو کہ کسی کی بربادی مقرر وقت سے پہلے نہیں ہو سکتی۔ اللہ کی آیات کا مذاق اُڑانا کفر ہے۔ آیت اِنَّا جَعَلْنَا بتا رہی ہے کہ سعادت و شقاوت اور ہدایت و ضلالت ازلی چیز ہے۔ اللہ ہی توفیق ہدایت دیتا ہے اور وہی سلب بھی کر لیتا ہے وغیرہ۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّىٰ أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا ۝ فَلَمَّا بَلَغَا

جب موسیٰ نے اپنے آدمی سے کہا میں برابر چلتا رہوں گا تا وقتیکہ دونوں سمندروں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں یا سالہا سال (یونہی) چلتا رہوں چنانچہ جب

مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ۝ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ آتِنَا

دونوں سنگم پر پہنچ گئے تو اپنی مچھلی کو بھول گئے مچھلی نے سمندر میں سرنگ کی طرح اپنی راہ بنالی پھر جب دونوں وہاں سے آگے بڑھ گئے تو موسیٰ نے اپنے

غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَٰذَا نَصَبًا ۝ قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ

آدمی سے کہا ہمیں ہمارا ناشتہ دو اس سفر سے ہم نے تکلیف پائی جوان نے کہا آپ کو معلوم ہے کہ

أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ

جب ہم اس پتھر کے پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی بھول گیا اور اس کا تذکرہ کرنے سے مجھے شیطان ہی نے

أَنْ أَذْكُرَهُ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا ۝ قَالَ ذَٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۚ

بھلا دیا مچھلی نے سمندر کے اندر عجب طرح سے اپنی راہ لی موسیٰ نے کہا اسی کی تو ہم کو تلاش تھی

فَارْتَدَّا عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا ۝

چنانچہ دونوں کھوج لگاتے قدموں کے نشان پر اُلٹے پھرے

تفسیر ابن کثیر نے حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے قصہ کے متعلق مختلف احادیث نقل کی ہیں۔ بخاری اور بعض دیگر ائمہ نے بھی متعدد حدیثیں بیان کی ہیں۔ ہم سب کا مختصر خلاصہ مشترک الفاظ کو نظر انداز کرتے ہوئے لکھتے ہیں تاکہ بیانِ قرآنی کی وضاحت ہو جائے۔ موسیٰؑ نے برسر منبر ایک روز وعظ فرمایا۔ حاضرین کے دلوں پر اثر ہوا، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، رقت طاری ہو گئی۔ وعظ کے بعد ایک شخص نے دریافت کیا یا نبی اللہ! کیا آپ سے بڑا عالم بھی اس وقت کوئی اور موجود ہے؟ حضرت موسیٰؑ نے کہا نہیں۔ یہ بات واقع میں اگرچہ صحیح تھی کیونکہ آپ جلیل القدر پیغمبر تھے اور ان تمام امور کے سب سے زیادہ عالم تھے جو تقرب الٰہی کے حصول کا سبب تھے، لیکن لفظ چونکہ مطلق تھا، اس لئے احتیاط کی تعلیم دینے کے لئے تنبیہ کی گئی اور وحی ہوئی موسیٰ تم سے بھی زیادہ عالم ہمارا ایک اور بندہ ہے۔ عرض کیا پروردگار! میں اس سے ملنا چاہتا ہوں وہ کہاں ملے گا؟ حکم ہوا دونوں دریاؤں کے سنگم کے پاس سے ملاقات ہو گی جہاں مچھلی گم ہو جائے گی۔ حضرت موسیٰ نے اپنے شاگرد خاص یوشع بن نون بن فرائیم بن یوسف بن یعقوب کو ساتھ لیا۔ ایک تلی ہوئی نمکین مچھلی اور کچھ خورد و نوش کا دوسرا سامان بھی لیا اور چل دیئے۔ چلتے چلتے ایک

آپ دوپہر پہنچ کر درخت کے سائے کے نیچے ایک پتھر کے پاس قیام کیا۔ موسیٰ تو سو گئے اور یوشع دریا سے وضو کرنے لگے۔ یکایک مچھلی زندہ ہو کر تڑپ کر زنبیل سے نکلی اور دریا میں جا گری۔ دریا کے اندر مچھلی کے داخل ہونے سے ایک طاق سا بن گیا۔ پانی ادھر ادھر سے ہٹ گیا۔ یوشع کو تعجب ہوا۔ خیال کیا موسیٰ بیدار ہوں گے تو یہ واقعہ کہہ دوں گا، لیکن بھول گئے۔ نیک بندوں پر اگرچہ شیطان کا دسترس نہیں ہوتا۔ مگر کبھی دشمن سے بھی خدا تعالیٰ دوست کا کام نکلواتا ہے۔ نسیان شیطانی کا یوشع پر تسلط ہونا باعث حکمت تھا، اس کا نتیجہ اچھا تھا۔ موسیٰ کے لئے ازدیاد مراتب اس بہانے سے مقدر ہو چکا تھا، اس لئے یوشع کو یاد نہیں رہا۔ غرض بیدار ہونے کے بعد موسیٰ آگے چلے۔ راہ حق میں جتنی بھی کوشش کی جائے اہل مجاہدہ کو اس سے تکان نہیں ہوتی اور وصول حق کے بعد معمولی کوشش بھی تکان کا باعث ہوتی ہے۔ موسیٰ منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے شبانہ روز کی مسافت طے کرنے سے بھی نہ تھکے تھے، لیکن جونہی سنگم سے آگے بڑھے دوپہر چلنے سے ہی تھک گئے۔ یوشع سے کہا اب ہم تھک گئے کھانا لاؤ۔ اس وقت یوشع کو مچھلی کا دریا میں داخل ہونا یاد آیا اور گزشتہ واقعہ عرض کیا۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا اسی کی تو ہم کو تلاش تھی۔ فوراً پچھلے قدم واپس ہوئے۔ سنگم پر پہنچے تو ایک شخص سفید چادر اوڑھے سبزہ پر بیٹھا ملا موسیٰ نے سلام کیا۔ خضر نے کہا اس سرزمین میں سلام کا رواج نہیں۔ تم کون ہو؟ موسیٰ نے کہا میرا نام موسیٰ ہے۔ خضر نے کہا بنی اسرائیل کا موسیٰ؟ جواب دیا جی ہاں۔ خضر نے کہا تمہارے آنے کا کیا سبب؟ موسیٰ نے جواب دیا خدا تعالیٰ نے جن علوم و معارف کے مخفی خزانے آپ کے لئے کھولے ہیں اُن میں سے کچھ آپ مجھے سکھا دیجئے۔ خضر نے کہا موسیٰ جو علم خدا تعالیٰ نے تم کو دیا ہے میں اُس سے ناواقف ہوں اور جو علم مجھے عنایت فرمایا ہے تم اس سے ناواقف ہو۔ نہ تمہارا علم میرے لئے مناسب ہے نہ میرا علم تمہارے لئے سزاوار ہے۔ میرے ساتھ رہنے میں تم کو برداشت نہ رہے گی، خاموش نہ رہ سکو گے۔ موسیٰ نے کہا میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا، خاموش رہوں گا، کسی بات پر چون و چرا نہ کروں گا۔ خضر نے کہا اچھا۔ غرض دریا کے کنارے دونوں چل دیئے۔ کنارے پر ایک کشتی ملی۔ کشتی والے خضر کو پہچانتے تھے۔ فوراً بغیر کرایہ کے سوار کر لیا۔ کشتی نئی تھی اور دس غریبوں کی ملکیت تھی۔ سوار ہونے کے بعد بیچ راہ میں خضر نے کشتی کا ایک تختہ توڑ ڈالا اور شگاف میں ایک میخ لگا دی تاکہ پانی اندر نہ آ سکے۔ موسیٰ کو خضر کا یہ فعل خلاف شرع معلوم ہوا اور گزشتہ وعدہ بھول گئے۔ فوراً بول اُٹھے یہ تم نے کیا کیا؟ کشتی والوں کو غرق کرنا چاہتے ہو؟ خضر نے جواب دیا موسیٰ! میں نے تم سے پہلے ہی نہ کہا تھا کہ تم سے ضبط نہ ہو سکے گا۔ موسیٰ نے معذرت کی۔ اتنے میں ایک چڑیا آ کر کشتی کے کنارے پر بیٹھی اور سمندر میں چونچ ڈال کر پانی کا قطرہ اُس نے لیا۔ خضر نے کہا موسیٰ میرا اور تمہارا علم علم الٰہی کے مقابلے میں ایسا ہے جیسا اس چڑیا نے چونچ میں سمندر سے ایک قطرہ لے لیا۔ کنارہ پر پہنچ کر کشتی سے اتر کے آگے چل دیئے۔ راستہ میں ایک نوجوان لڑکا ملا۔ خضر نے اس کو پکڑ کر ذبح کر ڈالا اور گردن مروڑ کر توڑ دی۔ بظاہر یہ فعل بہت سخت تھا۔ موسیٰ کو ضبط کا یارا نہ رہا۔ بولے معصوم جوان کو تم نے کیوں قتل کیا یہ تو بہت بُری حرکت کی۔ خضر نے گزشتہ وعدہ یاد دلایا۔ موسیٰ نے معذرت کی۔ پھر آگے چل دیئے۔ ایک گاؤں میں پہنچے بستی والوں سے کھانا مانگا کسی نے کھانا نہ دیا۔ یہ بات موسیٰ کو ناگوار ہوئی۔ [illegible] کہ وہاں ایک دیوار قریب الانہدام تھی۔ ایک طرف کو جھکی کھڑی تھی۔ خضر نے ہاتھ سے اس کو سیدھا کیا دیوار سیدھی ہو گئی۔ موسیٰ کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ فوراً سبب دریافت کیا اور کہا بستی والوں نے تو ہم کو کھانا بھی نہ دیا اور تم نے بلا اُجرت ان کی دیوار درست کر دی۔ اس کی کیا وجہ؟ خضر بولے اب معذرت کی انتہا ہو گئی میرا تمہارا ساتھ نہ ہو گا اور ہر واقعہ کی تفصیل سنو اور علیحدہ ہو جاؤ۔ اس کے بعد پوری تفصیل بیان کی جو آیات قرآنی میں مذکور ہے۔ تحلیل اجزاء کے ذیل میں ہم تشریح کریں گے۔

اہل مکہ کو غریب صحابیوں کے ساتھ بیٹھنا عار آتی تھی وہ اپنی مایہ پرستی میں مغرور تھے، اس لئے ذوالقرنین اور اصحاب کہف کے قصہ کے ساتھ ساتھ خدا تعالیٰ نے موسیٰ و خضر کا قصہ بیان فرمایا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ علم حق کی طلب بہت دشوار ہے۔ بہت کچھ خود پنداری اور عزت نفس کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔ موسیٰ جیسے جلیل القدر نبی کو دیکھو! ایسے علم کے سیکھنے میں جو ان کے لئے زیادہ ضروری بھی نہ تھا کس قدر صعوبت سفر برداشت کی اور اپنے سے کم مرتبہ والے آدمی [illegible] اور اپنی جہالت کو دیکھ کر علم لدنی سیکھنے اور خضر کو شریک تعلیم بنانے ہوئے نہیں ذلت محسوس ہوتی ہے؟ تمہارا پندار نفس اس کو گوارا نہیں کرتا [illegible]۔

تحلیل اجزاء

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ — موسیٰ سے مراد موسیٰ بن عمران ہیں جو اولاد یعقوب [illegible] بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے نبی بنا کر بھیجے گئے [illegible] کہ یہ موسیٰ بن عمران کا قصہ نہیں

بلکہ موسیٰ بن میشا بن یوسف بن یعقوب کا قصہ ہے۔ ابن عباس کو جب نوفل بکالی (واعظ کوفہ) کا قول معلوم ہوا تو فرمایا وہ دشمن خدا جھوٹا ہے مجھ سے ابی بن کعب نے حدیث بیان کی کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ موسیٰ جب بنی اسرائیل کے سامنے تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو الخ فقال نے کہا کہ قرآن میں موسیٰ کا لفظ آیا ہے اس سے مراد موسیٰ بن عمران پیغمبر بنی اسرائیل ہی ہیں۔ اگر یہاں کسی دوسرے موسیٰ کا تذکرہ ہوتا تو کوئی امتیازی نشان ضرور پیش کیا جاتا۔

لِفَتٰىهُ۔ فتیٰ سے مراد یوشع بن نون بن افرائیم بن یوسف ہیں جو اس زمانے میں حضرت موسیٰ کے خاص شاگرد اور خلیفہ تھے اور موسیٰ کی وفات کے بعد نبوت سے سرفراز ہوئے۔

مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ دو دریاؤں کا سنگم۔ دو دریاؤں سے مراد بحر روم اور بحر فارس ہیں (قتادہ) ان کا جائے اتصال محمد بن کعب نے انتہائے مغرب میں طنجہ کے قریب بتایا تھا اور ابی بن کعب نے تخصیص مقام نہیں کی۔ صرف افریقہ میں سنگم ہونا ظاہر کیا ہے۔ بعض لوگ قائل ہیں کہ مقام رشید یا دمیاط پر نیل اور بحر شور کا مقام اتصال مراد ہے۔ اہل تحقیق کا قول ہے کہ بحرین سے مراد بحر قلزم کی وہ دو شاخیں ہیں جو شمالی جانب میں دور تک جاکر دو شاخیں بن گئی ہیں۔ انہی دو شاخوں کے درمیان کوہ سینا اور حورب اور وہ مقامات واقع ہیں جہاں صدہا سال تک بنی اسرائیل کی سکونت رہی۔ جغرافیہ قرآن کے صفحہ ۲۳۵ پر ہے کہ اکثر مفسرین کے نزدیک مجمع البحرین سے مراد وہ جگہ ہے جہاں بحر عمان اور بحر ہند کا اتصال ہوا ہے، مگر یہ غلط ہے۔ موسیٰؑ کا عبور کبھی اس طرف نہیں ہوا بلکہ جس جگہ خلیج عقبہ اور خلیج سویز کا اتصال ہوا ہے وہی مقام مراد ہے۔ عقبہ کا قدیم نام ایلہ ہے الخ۔

حُقُبًا۔ ایک حقب ایک سال (ابن جریر) اسی سال (ابن عمرؓ) ستر سال (مجاہد) زمانہ طویل (ابن عباس و قتادہ نیز وغیرہ) اسی اس کے قول کو مفسرین نے ترجیح دی ہے۔

نَسِيَا حُوْتَهُمَا۔ اصل نسیان تو یوشع سے ہوا تھا۔ یوشع ہی ہوتے تھے انہی کے پاس کھانا تھا جس میں مچھلی تھی، مگر نسیان کی نسبت دونوں کی طرف سے یہ مقصد ہے کہ یوشع نے تو مچھلی کا واقعہ ذکر کرنا فراموش کر دیا اور حضرت موسیٰ نے یوشع کو کھانا ساتھ لینا یاد نہ دلایا جس کے اندر مچھلی بھی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں مچھلی کو بھول گئے۔

فِى الْبَحْرِ سَرَبًا۔ ابن جریر نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ مچھلی کی گزرگاہ پانی میں بن گئی گویا پانی بستہ ہو کر پتھر کی طرح ہو گیا (اور بیچ میں خالی راستہ رہ گیا) ابن اسحاق نے ایک حدیث بیان کی ہے کہ مچھلی کی رفتار سے پانی کے اندر روشن دان بن گیا تھا۔ یہاں تک کہ موسیٰ نے واپس آکر اس کو دیکھا اور پہچانا۔ یہ سرنگ دور تک چلا گیا تھا بعض روایات میں آتا ہے کہ ایک جزیرہ تک اس کی انتہا تھی۔ اسی کے نشان پر موسیٰ وہاں پہنچے اور خضر سے ملاقات ہوئی۔

وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ۔ وسوسہ شیطانی سے فراموشی پیدا ہوتی ہے، مگر دو قسم کی ہوتی ہے۔ مضر اور مفید۔ مضر فراموشی کی بنا معصیت پر ہوتی ہے۔ اس سے نیکوکار بندوں کے مراتب میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر یوشع کو مچھلی کا واقعہ فراموش نہ ہوتا تو پانی کے اندر ایک شبانہ روز سرنگ کا برقرار رہنا اور مشاہدہ خدمت کرنا دونوں صاحبوں کو کیسے میسر آتا اور یہ بات کیسے معلوم ہوتی کہ راہ حق میں جتنی بھی کوشش کی جائے اس سے تکان اور کوفت نہیں پیدا ہوتی، لیکن اگر حق سے تجاوز کر لیا جائے تو علاوہ فوت مقصود کے جسمانی مشقت و تکان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

مقصودِ بیان

لِفَتٰىهُ کے لفظ سے یہ تعلیم دینی مقصود ہے کہ اپنے شاگرد یا مرید یا خادم وغیرہ کو توہین آمیز لقب سے یاد نہ کرنا چاہئے بلکہ مہذب الفاظ کہنا چاہئے۔ لَآ اَبْرَحُ کا لفظ دلالت کر رہا ہے کہ حکم الٰہی کی تعمیل کا ناقابل فسخ ارادہ کرنا ضروری ہے۔ اہل ایمان کا یہی شیوہ ہے۔

نَسِيَا حُوْتَهُمَا سے واضح ہے کہ فراموشی انبیاء کو بھی ہوتی ہے، مگر ایسے نسیان کا نتیجہ مزید برکت و رحمت کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ سَرَبًا کا لفظ بتا رہا ہے کہ پانی کے اندر سرنگ بن گیا تھا یعنی ادھر ادھر پانی رک کر بیچ میں محراب نما خلا ہو گیا تھا۔ مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا سے اس طرف اشارہ ہے کہ نبی ہو یا ولی جو بھی منزل حق سے آگے بڑھتا ہے اس کو تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ البتہ وصول حق کی کوشش تعب انگیز نہیں ہوتی۔ اِلَّا الشَّيْطٰنُ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ نسیان پیدا کرنے سے جو نتیجہ بد نکالنا چاہتا ہے نیک بندوں کے نسیان سے وہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ فَارْتَدَّا سے یہ تلقین کرنی غرض ہے کہ صداقت و حقانیت کا علم جس وقت بھی ہو فوراً اس کی طرف توجہ کرنی لازم ہے۔ جو وقت غلطی سے فوت ہو گیا ہو اس کا اس کا تدارک ضروری ہے۔ پوری آیات کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ کی قدرت کامل طور پر محیط ہے وہ مردہ کو زندہ کر سکتا ہے، انواع میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے، حقائق اور امور بدل سکتا ہے۔ عناصر ہوں یا مرکبات سب اس کے فرماں پذیر ہیں۔ وہ پانی میں پتھر کی طرح سرنگ بغیر ظاہری اسباب کے بنا سکتا ہے۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا ۝ قَالَ لَهُ

اور اُن کو ہمارا ایک بندہ ملا جس کو ہم نے اپنے پاس سے رحمت و عنایت کی تھی اور اپنی طرف سے خاص علم سکھایا تھا موسیٰ نے اس سے

مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ۝ قَالَ إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ

کہا میں تمہارے ساتھ اس شرط پر رہ سکتا ہوں کہ جو کچھ تم کو سکھایا گیا ہے اس میں سے کچھ حکمت تم مجھے بھی سکھا دو۔ اُس نے کہا تم میرے ساتھ صبر نہیں

صَبْرًا ۝ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ۝ قَالَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا

کر سکتے اور جس کے سمجھنے پر تم قادر نہیں ہوئے اُس پر صبر کیسے کر سکتے ہو موسیٰ نے کہا ان شاء اللہ تم مجھے صابر پاؤ گے میں تمہارے

وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا ۝ قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَن شَيْءٍ حَتَّىٰ أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا

کسی امر کے خلاف نہیں کروں گا اُس نے کہا اچھا اگر تم میرے ساتھ ہوتے ہو تو کوئی چیز مجھ سے نہ پوچھنا تا وقتیکہ میں خود اُس کا ذکر تم سے نہ شروع کر دوں

۹ ع ۱۱ ۲۱

تفسیر

یعنی موسیٰ اور یوشع دونوں نے اللہ کے ایک عظیم الشان رفیع المرتبہ بندہ کو پایا۔ علمائے اسلام کے نزدیک یہ خضر تھے۔ احادیث صحیحہ میں اس کا ثبوت موجود ہے۔ خضر کا نام ابن قتیبہ نے معارف میں بلیا بن ملکان بن قالغ بن عابر بن شالخ لکھا ہے۔ قرآن و احادیث میں ان کا مولد، زمانہ، وطن اور نسب کسی جگہ مذکور نہیں۔ بعض تابعین کا قول ہے کہ وہ نوح کی نسل سے تھے اور کنیت ابو العباس تھی۔ ابن عباس کی ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت آدمؑ کے صلبی بیٹے تھے۔ بخاری نے بروایت ابو ہریرہؓ بیان کیا ہے کہ خضر خشک زمین پر بیٹھے تھے اور وہ ہری بھری ہو گئی تھی۔ مجاہد کا قول ہے کہ خضر جس جگہ نماز پڑھتے تھے وہ جگہ سبز اور ہریالی ہو جاتی تھی اس لئے ان کو خضر کہا جاتا ہے

بعض مفسرین کا قول ہے کہ اہل کتاب جس بادشاہ کو ملک صدق کہتے ہیں جو سلیم کا بادشاہ تھا اور جس نے حضرت ابراہیم کو دعا دی تھی اور جس کو حضرت ابراہیمؑ نے عشر دیا تھا وہی خضر ہے

جس کا نہ کوئی باپ تھا نہ ماں نہ اس کی زندگی کا آغاز و اختتام معلوم۔

خضر زندہ ہیں یا نہیں؟

اکثر علماء قائل ہیں کہ خضر زندہ ہیں لیکن شیخ ابن تیمیہ نے کتاب الرد علی المنطقیین میں اس پر مفصل تبصرہ کیا ہے جس کا خلاصہ ہم نقل کرتے ہیں۔ شیخ نے لکھا ہے کہ بعض بے دین صوفی گمان کرتے ہیں کہ ارسطو ہی کا نام خضر ہے یہ قول قطعاً غلط ہے۔ خضر کا انتقال ارسطو سے بہت پہلے ہو چکا۔ اکثر عوام اور بعض نیکو کار زاہد عابد مسلمان جو حیات خضر کے قائل ہیں اور بہت سے یہودی اور عیسائی بھی اس کے مقر ہیں۔ یہ سب بالکل واضح غلطی پر ہیں۔ درحقیقت چند وجوہ ہیں جن کی بنا پر لوگ خضر کو زندہ سمجھنے لگے ہیں۔

(۱) کسی جنگل بیابان یا سنسان دریا کے کنارے کسی شخص کو کوئی زاہد نما متبرک شکل والا آدمی مل جاتا ہے اور رہنمائی کر دیتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں خضر ہوں۔ حالانکہ وہ شیطان ہوتا ہے جو اس غریب کا عقیدہ خراب کرنے کے لئے متبرک مقدس درویش کا جامہ پہن لیتا ہے۔ شہر دمشق کے باہر جہاں ہم نے یہ کتاب لکھی ہے ایک شخص نے دو پہاڑوں کے درمیان ایک آدمی کو دیکھا جس کا سر پہاڑ کی چوٹی تک تھا اور ضخامت اتنی تھی کہ اس سے پورا درہ بھر گیا تھا۔ اس نے دعویٰ بھی کیا تھا کہ میں خضر ہوں، میں نقیب الاولیاء ہوں اور تو ولی اللہ ہے۔ اتفاق سے یہ شخص بہاکر ال کہیں ایک میل کے فاصلہ پر سوال آیا تھا۔ اس انسان نما شیطان نے اللہ تعالیٰ کا قدرت دعا کر اس کا کدال بھی لاکر دے دیا۔ بس اس شخص کو یقین ہو گیا کہ واقعی میں ولی ہوں اور یہ خضر ہے

(۲) انسان کی قوت تصور اتنی قوی ہو جاتی ہے کہ محض تخیلی چیز کو موجود خارجی کا جامہ پہنا کر سامنے لاکر کھڑا کر دیتی ہے اور ذہنی وجود خارجی وجود معلوم

ہونے لگتا ہے۔

(۳) کوئی جن بشکل آدمی سامنے آگیا اور گمراہ کرنے کے لئے خضر ہونے کا دعویٰ کرنے لگا اور بظاہر راستہ بتا دیا۔

(۴) کسی غیر معروف سنسان مقام میں کوئی آدمی مل گیا اور اس نے خیال کر لیا کہ ایسے ویران مقام میں آدمی کا کیا کام۔ ہو نہ ہو یہ خضر ہے۔ پھر اگر اس شخص نے خضر ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا تو بس سونے پر سہاگہ ہو گیا۔

غرض بھولے انسان ہر طرح دھوکہ کھاتے ہیں۔ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ صحابہ کا علم و ایمان تمام خلائق سے زیادہ قوی اور کامل تھا۔ اس کے باوجود کوئی ایسی صحیح روایت موجود نہیں جس سے کسی صحابی کا خضر کو دیکھنا اور ملاقات کرنا ثابت ہو۔ بات یہ تھی کہ ان کے ایمان پختہ تھے۔ صحبت رسول اللہ ﷺ نے ان کو کندن بنا دیا تھا۔ وہ شیطانی فریب سے اپنا عقیدہ خراب نہیں کر سکتے تھے۔ اسی وجہ سے شیطان کا داؤ ان پر نہ چلتا تھا۔

پھر سب سے زیادہ محکم دلیل وفات خضر کی یہ ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو ان پر فرض تھا کہ رسول پاک ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر ایمان لاتے اور حضور ﷺ کے ہمرکاب ہو کر غزوات میں شرکت کرتے کیونکہ کلام پاک میں صاف صراحت ہے کہ رسول پاک ﷺ پر ایمان لانے اور حضور ﷺ کی مدد کرنے کا عہد خدا تعالیٰ نے تمام انبیاء سے لیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے۔ وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ ۔ الخ۔ جب یہ صراحت قرآنی موجود ہے تو پھر خضر نے کیوں ایمان نہ لائے اور کیوں ہمرکاب ہو کر جہادوں میں شرکت نہیں کی؟ اور اگر ایسا ہوا ہے تو وہ کون سی روایت ہے جس سے اس کا ثبوت ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ بقائے خضر کا تذکرہ افسانے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا یہ شیخ کی رائے کا خلاصہ ہم نے درج کر دیا۔

ابن عباس نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ خضر کی وفات جمہور کا اتفاقی مسئلہ ہے۔ ابن ابی الفضل المرسی، ابن المنادی، ابراہیم حربی، ابوطاہر لبغدادی، ابو یعلیٰ حنبلی، ابوالفضل بن ناصر دمشقی، قاضی ابوبکر بن العربی، ابوبکر بن نقاش اور ابن جوزی وغیرہ کے قول میں انتقال خضر کی صراحت ہے۔ ابوالحسین ابن المنادی کہتے ہیں۔ اکثر بے وقوف لوگ حیات خضر کے متعلق مرفوع روایات دیکھ کر دھوکہ کھاتے ہیں، حالانکہ اس کے متعلق جتنی مرفوع الاسناد روایات نقل کی جاتی ہیں سب کی اسنادیں کمزور اور ناقابل اعتبار ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی روایات پر تو قطعاً اعتماد کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اسلام میں حیات خضر کا قول اسرائیلیات کا ممنون کرم ہے۔

شیخ ابن حجر عسقلانی نے کتاب الاصابہ فی احوال الصحابہ میں احوال خضر کو مستقل باب میں بیان کیا ہے۔ ہر روایت کی اسناد پر جرح و تعدیل کی ہے اور آخر میں اسی جانب میلان کیا ہے کہ حیات خضر ثابت نہیں۔

لیکن مذکورہ علماء کے خلاف امام نووی اور شیخ ابن صلاح نے تصریحات کی ہیں۔ امام نووی نے تہذیب میں بیان کیا ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک خضر زندہ ہیں۔ عام صوفیہ اور اہل صلاح کا اس پر اتفاق ہے۔ ان لوگوں نے خضر کو دیکھنے، ان سے ملنے اور گفتگو کرنے اور مقامات مقدسہ میں ان کے پائے جانے کی اس قدر کثرت سے حکایات ذکر کی ہیں جن کا شمار دشوار ہے۔ شیخ ابن صلاح نے صراحت کی کہ خضر زندہ ہیں۔ جمہور علماء اور عام اہل صلاح کا اس پر اجماع ہے۔ صرف بعض محدثین نے بطور شذوذ انکار کیا ہے۔ واللہ اعلم و علمہ اتم۔

تحلیل اجزاء

رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا۔ ابن عباس ؓ کے نزدیک رحمۃ سے مراد نبوت ہے روایت ہے۔ اس قول پر خضر کا نبی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک ولایت مراد ہے۔ اسی بنا پر عام جمہور کا قول خضر کی نبوت کے خلاف ہے۔

مِن لَّدُنَّا عِلْمًا۔ علم لدنی سے مراد وہ علم ہے جو تعلیم و تعلم اور فرشتہ و وحی کی وساطت کے بغیر براہ راست خدا تعالیٰ کی طرف سے دل میں القا ہوا ہو۔ غیب کے پردے آنکھوں کے سامنے سے اٹھ گئے ہوں، نتائج و انجام کا نظر سے مشاہدہ ہو۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ جب آدمی زہد و ریاضت اور مجاہدہ میں زیادہ مشغول کرتا ہے۔ نفس کے تعلقات ختم کر کے اخلاق رذیلہ سے اندرون و بیرون کو پاک صاف کرتا اور اخلاق حمیدہ کے زیور سے آراستہ کرتا ہے، شریعت غرا کی کامل پابندی رکھتا اور ظاہری و باطنی طور پر اوامر و نواہی پر عمل کرتا ہے تو نفس کی حسی اور خیالی قوتیں ضعیف ہو جاتی ہیں اور عقلی قوتوں میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔ جوہر عقل انوار الٰہیہ سے روشن ہو جاتا ہے اور عالم قدس سے لمعات پر توافگن ہوتے

ہیں۔ اس وقت معارف کا دروازہ کھل جاتا ہے اور حقائق کونیہ کا انجلا بغیر کسی واسطہ کے ہونے لگتا ہے یہ علم لدنی کا ہی درجہ ہے۔ تمام انبیاء کو حسب تفاوت درجہ کائنات کا شہودی علم ہوتا ہے، لیکن انبیاء کی اصل غرض اصلاحِ خلق ہوتی ہے۔ اُن کے آئینۂ باطن پر اگرچہ انوار و معارف کی عکس ریزی ہوتی ہے لیکن ہر وقت مطالعۂ علوم میں غرق رہنا ان کے مقاصد کے منافی ہوتا ہے، اس لئے ہمہ وقت وہ مشاہدۂ کائنات میں مستغرق نہیں رہتے۔ ہاں بعض وقت جب کہ اصلاح و ہدایت اور ارشاد و وعظ کے جھگڑوں سے دماغ کو صاف کر کے عالمِ قدس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یا اضطراری طور پر توجہ ہو جاتی ہے تو عالمِ غیب کی تصویریں سامنے آجاتی ہیں اور صدہا سال کے بعد آنے والے واقعات بروزی طور پر ان کی نظروں کے سامنے آجاتے ہیں اور وہ پیشین گوئیاں کرتے، پوشیدہ پوشیدہ خبریں بتاتے اور احوال کونیہ کے متعلق ریمارکس کرتے ہیں۔ حضرت خضر پر بھی ملکیت اور روحانیت غالب تھی۔ قوی وخیالی قوتیں کمزور پڑ گئی تھیں، علائقِ نفس کم ہو گئے تھے، انوارِ الٰہیہ کا ہر وقت فیضان تھا، لمعاتِ قدس پر تو افگن تھے اور چونکہ ان کی غرض اصلاحِ خلق نہ ہدایتِ اُمت نہ تھی، اس لئے وہ انتہائی روحانیت کے سبب رجال الغیب میں داخل ہو کر گویا ملائکہ میں شامل ہو گئے تھے اور جتنا حکم خداوندی ہوتا اتنا کام بادراکِ روحانی انجام دیتے تھے، اس لئے خضر نے حضرت سے کہا تھا کہ تم کو جو علم دیا ہے وہ مجھے نہیں دیا اور جو حصۂ معارف مجھے عطا ہوا ہے وہ تم کو نہیں ملا۔ امتِ محمدیہ میں بھی ہر زمانے میں ابدال، اقطاب، اوتاد اور ایسے رجال الغیب موجود رہتے ہیں جن کی روحوں پر بتفاوتِ درجہ فیضانِ قدسی ہوتا رہتا ہے۔ بیسیوں صحابہ کے واقعاتِ کرامت اور دورِ صحابہ کے بعد ہزاروں اولیاء کے تصرفاتِ باطنی تذکرے پیش پا افتادہ حقیقت ہیں جو کسی طرح قابلِ انکار نہیں۔ لیکن یاد رہے جاہل صوفیوں کا شریعت و طریقت میں تفرقہ کرنا دائرۂ شریعت سے اپنے کو خارج سمجھنا، اوامر و نواہی اور فرائضِ الٰہیہ کا اپنے کو مکلف قرار نہ دینا سراسر جہالت اور بے دینی ہے۔ یہی شریعت ہے جو معراجِ روحانیت ہے، اس کی پابندی کے بغیر نہ کسی ولی اور قطب کو کچھ ملا نہ کوئی نبی ان قیود سے آزاد تھا۔ عالمِ غیب کا کوئی مختار نہیں۔ اللہ کے نیک بندے منہیات کے مرتکب نہیں ہوتے۔ ان کی قیود تو اور بھی سخت ہوتی ہیں، جن سختیوں کے وہ مکلف ہوتے ہیں عوام قطعاً ان سے آزاد ہوتے ہیں۔ وہ ہر وقت ملاحظۂ اقدس اور مشاہدۂ حق پر مکلف ہوتے ہیں، عوام کا استغراق نماز کے اندر چند منٹ کے لئے ہوتا ہے، مگر ان کا انہماک ہر آن ہوتا ہے۔ ایسے مقدس لوگ بھلا شریعتِ غرا کی مخالفت کس طرح کر سکتے ہیں اور کس طرح حضور اقدس ﷺ کے بتائے ہوئے راستہ سے قدم باہر رکھ سکتے ہیں۔ قیودِ شریعت سے آزاد سمجھنا قطعاً فریبِ نفس اور جہالت ہے۔ حرام حرام ہے اور حلال حلال۔ شارع کے بتائے ہوئے حرام و حلال کو کوئی نہیں بدل سکتا ؎

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا۔ بعض گمراہوں نے اس آیت سے استخراج کیا ہے کہ ولی کا مرتبہ نبی سے بڑا ہوتا ہے ورنہ حضرت موسیٰ خضر سے ایسی عاجزانہ التجا اور عطائے علم کی درخواست نہ کرتے۔ یہ قول سراسر جہالت پر مبنی ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ نبی کا کام اصلاح و ہدایت ہے وہ ہر وقت بارگاہِ قدس کے مطالعہ میں منہمک نہیں رہ سکتا ورنہ اصل مقصد کی تحصیل ناممکن ہو جائے گی، لیکن علم کے دروازے اس کی روح پر بھی کھلے ہوتے ہیں، معرفت کا کوئی دروازہ بند نہیں ہوتا۔ صرف یکسوئی اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ عالمِ غیب کی طرف توجہ کرنے کے مختلف ذرائع ہوتے ہیں۔ کبھی نفس خود خارجی علائق کو چھوڑ کر عالمِ بالا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ کبھی کسی خفیف تنبیہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ عالمِ کل تو سوا خدا کے کوئی بھی نہیں۔ انبیاء بھی ہر طرح کے علم سے واقف نہیں۔ اولیاء اگرچہ انبیاء کے شاگرد اور خوشہ چیں ہوتے ہیں، مگر کسی خاص نوع علم کی خصوصیت کبھی ان کو حاصل ہو جاتی ہے اور انبیاء اس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ کبھی شاگرد کے ذہن میں وہ علمی نکتہ آجاتا ہے جس سے استاد کا دماغ خالی ہوتا ہے، لیکن اس سے مفضول فاضل نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں حضرت موسیٰ تو حضرت خضر کے ساتھ رہ کر ان کی نوعیتِ علم کا تجربہ کرنا چاہتے تھے۔ عالمِ باطن کی سیر کرنی مقصود نہ تھی وہ خود صاحبِ باطن تھے۔ ان کو مشاہدۂ غیب پر ایمان تھا، مگر ہر وقت ملاحظۂ قدس میں مشغول رہنا اور تعلقاتِ دنیا توڑ کر گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر ارشاد و ہدایت کا کام چھوڑ کر فقط بارگاہ قدس سے رشتہ جوڑنا ان کے بس میں نہ تھا۔ اس کی ان کو اجازت نہ تھی، اسی لئے جب حضرت خضر نے تیسری مرتبہ کے سوال پر فراق کا اعلان کیا تو حضرت موسیٰ نے کوئی عذر پیش نہیں کیا اور سمجھ لیا کہ خضر کا علم میرے کسی کام کا نہیں، نہ میرے مقصد سے اس کو تعلق ہے۔ تجربہ کرنا اور نوعیت معلوم کرنا تھی سو یہ کام پورا ہو گیا۔ مزید ساتھ رہنے سے ارشاد و ہدایت کے کام میں کمزوری پیدا ہو گی۔

مقصودِ بیان

اللہ کے کچھ بندے اس زمین پر ایسے بھی ہیں۔ جن کے متعلق ظاہری اصلاح و ہدایت کے علاوہ عالمِ غیب کے بعض تصرفات بھی ہیں، انتظامِ عالم کی کچھ خدمت اُن کے سپرد کردی گئی ہے اور بغیر تعلیم و تعلّم اور کسب و اکتساب کے ان کی روحوں پر عالمِ غیب سے فیضان ہوتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے بعض حقائقِ کونیہ کا کشف ان کی روحوں پر ہو جاتا ہے اور اسی غیبی کشف کے مطابق وہ اس دنیا کے نظم و نسق میں بامرِ الٰہی دخل دیتے ہیں۔ زجاج نے کہا اس قصہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کتنا ہی بڑا عالم ہو، مگر طلبِ علم نہ چھوڑنا چاہیئے۔ حضرت موسیٰ نے باوجود جلیل القدر نبی ہونے کے مزید علم کی طلب کی اور یہ جائز ہے کہ کوئی عالم اپنے کو سب سے بڑا عالم جانے۔ امام بخاری نے حضرت موسیٰ کے سفر سے استخراج کیا کہ طلبِ علم کے لئے سفر کرنا سنتِ انبیاء ہے۔ حضرت موسیٰ نے جو خضر سے درخواستِ علم کی، اس سے چند امور پر روشنی پڑتی ہے۔ فاضل اپنے علم کو بڑھانے کے لئے مفضول سے بعض باتیں دریافت کر سکتا ہے بلکہ دریافت کرنا مناسب ہے۔ متعلم پر لازم ہے کہ اپنے کو معلم کا تابع بنا دے مرید مرشد کا کامل طور پر فرماں بردار ہو جائے۔ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ، کا لفظ بتا رہا ہے کہ سائل کو مسئول عنہ کے علم اور اپنی ناواقفیت کا اعتراف کرنا ضروری ہے۔ استاد کو جاہل جانتے ہوئے اس سے دریافت کرنا حماقت ہے۔ مِمَّا عُلِّمْتَ سے یہ تعلیم دینی مقصود ہے کہ شاگرد اپنے استاد کے برابر ہونے کی درخواست نہ کرے بلکہ اس کے علمی خزانے سے کچھ جواہر حاصل کرنے کی درخواست کرے۔ رُشْدًا کا لفظ بتا رہا ہے کہ علم کی طلب ہدایت حاصل کرنے کے لئے کی جائے۔ آیت وَلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا صاف تلقین کر رہی ہے کہ شاگرد استاد کی فرماں پذیری کا صاف طور پر اقرار کرے اور نہایت عاجزی اور تواضع سے اس سے گفتگو کرے، لیکن حضرت خضر کا فَلَا تَسْئَلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ کہنا دلالت کر رہا ہے کہ اگر کسی وقت مناسب طور پر تہذیب کے ساتھ استاد سخت لہجہ اختیار کرلے تو کوئی حرج نہیں ہے وغیرہ۔

فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ خَرَقَهَا ۭ قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا ۚ لَقَدْ

چنانچہ دونوں چل دیئے یہاں تک کہ جب کشتی میں سوار ہوگئے تو اس آدمی نے کشتی کو پھاڑ ڈالا موسیٰ نے کہا تم نے کشتی والوں کو ڈبونے کے لئے کیا اس کشتی کو پھاڑ دیا تم نے

جِئْتَ شَيْـــًٔـا اِمْرًا ۝ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِيْ

نے بڑی انوکھی حرکت کی اس شخص نے کہا کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ میرے ساتھ تم صبر نہ کر سکو گے موسیٰ نے کہا مجھ بھول گیا اس

بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِيْ مِنْ اَمْرِيْ عُسْرًا ۝ فَانْطَلَقَا ۫ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ

پے میری گرفت نہ کرو اور مجھ پر میرے کام میں سنگی نہ کرو پھر دونوں چل دیئے یہاں تک کہ جب ایک لڑکے سے ملے تو اس آدمی نے لڑکے

قَالَ اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ ۭ لَقَدْ جِئْتَ شَيْـــًٔـا نُّكْرًا ۝

کو مار ڈالا موسیٰ نے کہا کیا تم نے معصوم جان کو مفت میں قتل کر ڈالا تم نے یقیناً یہ بُری بات کی

تفسیر

ان آیات میں دو امر کا بیان ہے۔ خضر کا کشتی کو پھاڑنا اور دوم جان کو قتل کرنا۔ دونوں باتوں کے متعلق حضرت موسیٰ نے وجہ دریافت کی۔ پہلی صورت میں مال کا نقصان تھا وہ بھی غریبوں کے مال کا۔ حضرت موسیٰ کی نظر توریت پر تھی جس میں کسی کے مال کو بغیر استحقاق کے تلف کرنے کی ممانعت تھی۔ حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی دیکھ کر ان کو اپنا وعدہ یاد نہیں رہا فوراً سبب دریافت کر بیٹھے۔ حضرت خضر کے جواب پر سہو کا عذر پیش کیا اور فوراً خاموش رہے۔ دوسری صورت میں جان کا نقصان ہوا وہ بھی قتل عمداً اور وہ بھی معصوم و بے گناہ کا جو مرفوع القلم اور ناقابلِ مواخذہ ہے۔ چونکہ واقعہ بہت شدید تھا اور صراحۃً شریعت کی خلاف ورزی تھی جس کی تلافی بھی ناممکن تھی، اس لئے ضبط کا یارا نہ رہا اور بے اختیار دریافت کر بیٹھے۔

تحلیل اجزاء

فَانْطَلَقَا۔ حضرت موسیٰ اور خضر کنارے کنارے چل دیئے۔ قشیری نے لکھا ہے کہ آیت میں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضر کی ملاقات کے بعد حضرت موسیٰ نے یوشع کو واپس کر دیا تھا کشتی میں ساتھ نہ لیا تھا۔ ابوالعباس کا قول ہے کہ متبوع کا ذکر کرنے کے بعد تابع کے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ امام کا ذکر مقتدی کے ذکر سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یوشع کا ذکر نہیں کیا ورنہ یوشع پورے سفر میں ساتھ تھے۔

شَيْئًا إِمْرًا۔ یعنی تم نے بڑی سخت حرکت کی تم آفت برپا کرنی چاہتے ہو۔ ایک تو احسان کا بدلا بدی سے دے رہے ہو کشتی والوں نے بغیر کرائے سوار کر لیا تم نے ان کا نقصان کر دیا پھر سب سے بڑھ کر کشتی والوں کی جانوں کا خطرہ ہے۔ کشتی کے اندر پانی بھر جائے گا تو سب ڈوب جائیں گے۔

حَتَّىٰ إِذَا لَقِيَا غُلَامًا۔ سیر کی بعض کتابوں میں اس لڑکے کا نام جیسور لکھا ہے۔ حسن بصری کا قول ہے وہ بچہ نہ تھا جوان تھا اور رہزنی کیا کرتا تھا۔ نوعمر ہونے کی وجہ سے اس کو غلام کہا۔ کلبی کا قول ہے وہ جوان تھا، قزاق تھا۔ رہزنی کر کے مال اپنے ماں باپ کے پاس لایا کرتا تھا ضحاک سے مروی ہے کہ وہ لڑکا تھا، مگر شرارتِ طبع کے سبب فساد پھیلاتا پھرتا تھا جس سے اس کے نیک والدین اذیت پاتے تھے۔ ابن جریر نے ابی بن کعب کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ جس طفل کو خضر نے قتل کیا تھا وہ پیدائشی کافر تھا۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ قرآن ان تمام باتوں سے خاموش ہے۔ آیت میں کوئی تذکرہ نہیں کہ وہ بچہ تھا یا جوان، مسلمان تھا یا کافر، تنہا ملا تھا یا لڑکوں کی جماعت کے ساتھ، مگر غلام کا اطلاق عموماً بچے پر آتا ہے۔ اگرچہ نوجوان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

نَفْسًا زَكِيَّةً۔ زکیہ سے مراد یا تو نابالغ ہے جو شرعاً مرفوع القلم اور ناقابل مواخذہ ہے یا صاف ستھرا مراد ہے۔

مقصودِ بیان

شریعت کی ظاہری مخالفت دیکھتے ہوئے اہلِ ایمان کا فرض ہے کہ اظہارِ نفرت اور بازپرس کریں۔ جس طرح حضرت موسیٰ نے حضرت خضر سے کی۔ آیات سے یہ امر بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ اہلِ باطن بھی شرعی احکام کے من کل الوجوہ مکلف ہوتے ہیں، لیکن چونکہ وہ حقیقت شناس ہوتے ہیں اور ان کی نظروں کے سامنے سے تمام حجابات اُٹھے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے ظاہر بین طبقہ کو ان کے بعض افعال خلافِ شرع محسوس ہوتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان کی کوئی حرکت خلافِ شرع نہیں ہوتی وہ ہر کام بامرِ الٰہی کرتے ہیں اور ان کے ہر فعل میں ایک خاص مصلحت ہوتی ہے۔ تاہم اہلِ فتویٰ پر ان کی روک ٹوک لازم ہے ورنہ نظامِ شریعت مختل ہو جائے گا اور ہر فریبی مکار حقیقت شناس ہونے کا دعویٰ کر کے کھُلم کھُلا شریعت کی خلاف ورزی کرے گا، لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ ظاہری طور پر شریعت کی مخالفت بصورتِ خاص جائز ہوتی ہے اور وہ صورت خاص صرف امرِ الٰہی ہے۔ جس کے پاس براہ راست اللہ کا حکم آتا ہو اور کسی مصلحت کے تحت میں کوئی ایسا فعل کرنے کا حکم دیا گیا ہو جو ظاہراً شریعت کے خلاف معلوم ہوتا ہے تو اس علم کی تعمیل واجب ہے جس طرح حضرت خضر نے کیا۔ آیت إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا دلالت کر رہی ہے کہ اصحابِ ہدایت و ارشاد امرِ الٰہی کے خلاف کسی فعل کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتے۔

نوٹ

عام طبقہ میں مشہور ہے کہ خضر سکندر کے ساتھ بحرِ ظلمات میں گئے تھے۔ خود آبِ حیات پی لیا اور دوامی زندگی حاصل کر لی اور سکندر کو راستہ نہ ملا وہ غریب محروم رہا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ خضر دریاؤں پر مقرر ہیں۔ کنوؤں، تالابوں، چشموں اور دریاؤں کا کاروبار خواجہ خضر ہی سے متعلق ہے۔ اسی بنا پر خضر کے نام کے چراغ کنوؤں پر جلائے جاتے ہیں، دلیہ چڑھایا جاتا ہے، منتیں مانی جاتی ہیں۔ یہ تمام خرافات ہیں، اس کی کوئی اصل نہیں۔ بلکہ بعض اعمال تو شرک کی حد تک پہنچا دیتے ہیں۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیانُ السُّبحان

کا

پارہ نمبر ۱۶

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ

فاضلِ اجل حضرت علّامہ مولانا سید عبد الدائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں ۱۳۵۶ھ سے باقساط شائع ہو رہی ہے

عطاء الرحمٰن صدیقی مالک وسیم بک ڈپو دیوبند،

محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند یو۔پی

سولھواں ۱۶ پارہ

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ

اس شخص نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ رہ کر ہرگز ہرگز صبر نہ کر سکو گے موسیٰ نے کہا اس کے بعد اگر میں

عَنْ شَيْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ۝ فَانْطَلَقَا

تم سے کچھ دریافت کروں تو مجھ کو ساتھ نہ رکھنا تم میری طرف سے معذور ہو چکے پھر دونوں چل دیئے

حَتّٰٓى اِذَآ اَتَيَآ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا

یہاں تک کہ جب ایک بستی والوں کے پاس پہنچے تو اُن سے انھوں نے کھانا مانگا انھوں نے اس کی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا ان کو وہاں ایک دیوار

جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ۝ قَالَ هٰذَا

ملی جو گرا چاہتی تھی اُس شخص نے دیوار کو سیدھا کر دیا موسیٰ نے کہا اگر تم چاہتے تو اس کی اُجرت لے لیتے اُس شخص نے کہا اب

فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝

میرے تمہارے درمیان جدائی ہے جن باتوں پر تم سے صبر نہ ہو سکا میں اُن کی حقیقت تم کو بتلائے دیتا ہوں

تفسیر ان آیات میں حضرت موسیٰ کا تیسری مرتبہ سوال کرنا اور خضر کا جواب دینا اور پھر اعلانِ فراق کرنا مذکور ہے۔ پہلی صورت میں مال کا نقصان تھا اور جانوں کے ضائع ہونے کا صرف خطرہ تھا۔ دوسری صورت میں صراحۃً قتلِ نفس تھا۔ بہرحال یہ دونوں جرم ایسے تھے جن سے عام تباہی پھیلنے کا اندیشہ تھا، لیکن بداخلاقوں کے ساتھ احسان اور سلوک کرنے سے ان کی بدخلقی میں اضافہ ہوتا ہے اور اس سے کثیر جماعت کی بربادی لازم آتی ہے۔ اسی لئے حضرت موسیٰ سے پھر ضبط نہ ہو سکا، مگر اس سے قبل عذر کی انتہا ہو چکی تھی اور خود ہی کہہ دیا تھا کہ اگر اب کی مرتبہ میں خاموش نہ رہوں تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں، اس لئے خضر نے جب اعلانِ فراق کیا تو موسیٰ کو ماننا پڑا۔ یہاں بعض بد اندیش حضرت موسیٰ پر وعدہ خلافی کا الزام لگاتے ہیں، مگر یہ غلط ہے۔ کیوں کہ حضرت موسیٰ نے ضبط کرنے اور سوال نہ کرنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ معنیً مشروط تھا۔ اُس امر کے خلافِ شرع نہ ہونے پر، اس لئے کھُلم کھُلا جس امر کو گناہ سمجھا اُس پر سکوت نہ ہو سکا اور بے اختیار اُس کا قبح بیان کرنے پر مجبور ہوئے۔ بلکہ تیسرا سوال حضرت موسیٰ کی طرف سے اعتراضیہ نہ تھا، صرف ایک مشورہ تھا کہ اُجرت لینی بظاہر حالت مناسب تھی۔ اگر آپ چاہتے تو کچھ اُجرت لے لیتے، مگر خضر نے مطلق سوال کی ممانعت کر دی تھی، اس لئے مشورہ کو بھی انھوں نے مزاحمت سمجھا۔ ادھر حضرت موسیٰ بھی پے در پے تین واقعات صورۃً خلافِ شرع دیکھ کر سمجھ ہی چکے تھے کہ میرا خضر کے ساتھ رہنا دشوار ہے پھر علوم خضر سے موسیٰ کو کوئی ضروری فائدہ بھی نہ تھا ارشاد و ہدایت کے لئے معرفتِ خضر کار آمد نہ تھی، اس لئے فراق پر راضی ہو گئے۔

تحلیل اجزاء قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ — مفسر معالم نے بیان کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ خضر سے سوال کرنا چاہتے، یوشع عرض کرتے یا نبی اللہ!

اپنا وعدہ یاد کیجئے جس کے آپ پابند ہیں۔ مفسر سراج کی یہ صراحت اس وقت صحیح مانی جا سکتی ہے جب یوشع کو پورے سفر میں ساتھ تسلیم کر لیا جائے ملاحظہ نوٹ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔

ابوداؤد، نسائی، ترمذی، حاکم اور ابن جریر نے صحیح اسناد کے ساتھ حضرت ابی بن کعب کی روایت نقل کی ہے کہ حضور اقدس جب کسی کا تذکرہ کر کے اس کے لئے دعا کرنی چاہتے تو دعا کا آغاز اپنی ذات سے کرتے۔ ایک روز فرمایا خدا ہم پر اور موسیٰ پر رحم فرمائے۔ اگر وہ کچھ تاخیر کرتے تو عجیب باتیں دیکھتے لیکن انہوں نے صاف کہہ دیا کہ اب کی مرتبہ اگر سوال کروں تو مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا۔

اَهْلَ قَرْيَةٍ ابن جریر نے بحوالۂ ابن سیرین اس گاؤں کا نام ایلہ (عقبہ) لکھا ہے۔

اِسْتَطْعَمَا اَهْلَهَا ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ سوال کرنا تو بزرگوں کی عادت نہیں پھر ایک وقت کھانا نہ ملنے سے موسیٰ اور خضر نے کیوں سوال کیا؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حق مہمانی وصول کرنا اس سوال کے ذیل میں نہیں آتا جو ممنوع ہے۔ میرے نزدیک صحیح جواب یہ ہے کہ وہاں سوال کرنا مقصود ہی نہ تھا۔ اصل سوال حضرت خضر نے کیا۔ موسیٰ ساتھ تھے اور تابع تھے، اس لئے وہ بھی گویا سوال میں شریک تھے اور حضرت خضر کا مقصود کھانا طلب کرنا اور پیٹ بھرنا نہ تھا بلکہ موسیٰ کو عجائب قدرت دکھانا اور یہ بات جتانی مقصود تھی کہ اہل حقیقت دشمنوں سے بھی ویسا سلوک کرتے ہیں جو دوستوں سے کرنا چاہیئے۔ وہ حکم الٰہی کے تابع ہوتے ہیں اور عطیۂ الٰہی دشمن سے بھی روکا نہیں جا سکتا۔ ؏ بریں خوان یغما چہ دشمن چہ دوست ۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰ کا سوال کا مشورہ بھی حضرت خضر کو ناگوار گزرا کیونکہ حضرت موسیٰ طلب طعام کو شکم پری کا ذریعہ سمجھے ہوئے تھے اسی لئے فوراً بول اُٹھے کہ شکم پری کی شکل آسانی کے ساتھ ہو سکتی کہ آپ دیوار درست کر کے اجرت لے لیتے اور خضر کے پیش نظر یہ مقصد ہی نہ تھا۔ طلب طعام تو ذیلی چیز تھی اصل مقصد یتیموں کے حق کی حفاظت تھی۔

مقصودِ بیان کشتی کا تختہ توڑ کر ظالم بادشاہ کے ہاتھ سے بچا دینا اس بات کی تعلیم ہے کہ ظاہری نقصان پر بے صبر نہ ہونا چاہیئے۔ خداوند عالم بھلائی کرتا ہے تھوڑی مصیبت بڑی مصیبت کو اکثر رفع کر دیتی ہے۔ یہ تلقین کرنی بھی غرض ہے کہ اللہ کے نیک بندے پوشیدہ ہیں ہر غریب کو خستہ حال نہ سمجھنا چاہیئے ؎

خاکساران جہاں را بحقارت منگر   تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

ممکن ہے کہ عام فقراء میں کوئی اہل اللہ ہو۔ اس لئے غریبوں سے حتی الامکان نیک سلوک کرنا چاہیئے۔ تاکہ آسمانی بلاؤں سے اُن کی دعاؤں کی وجہ سے بچاؤ ہو سکے نیک آدمی پر صدمہ آنا کسی مصلحت الٰہیہ کی دلیل ہے جیسا کہ اس بدبخت لڑکے کو قتل کرنے سے اُس کے والدین کو صدمہ پہنچا، مگر واقع میں وہ صدمہ ان کے لئے مفید تھا نیک آدمی کے مرنے کی نسل میں برکت قائم رہتی ہے۔ کسی کی نیکی اور خلوص کا اثر پشتوں تک باقی رہتا ہے۔ طلب حق میں اگرچہ جلدی کرنی مناسب ہے، مگر کشف حقیقت کا انتظار بھی سکون کے ساتھ ضروری ہے۔ ورنہ زیادہ جلدی کرنے میں انوار و علوم سے محروم رہنے کا اندیشہ ہے۔

حضرت موسیٰ نے جلد سوال کر لے اور انتظار نہ کرنے کی وجہ سے بہت سے حقائق کے انکشاف کو کھو دیا۔ اِسْتَطْعَمَا اَهْلَهَا دلالت کر رہا ہے کہ اہل اللہ کا بھی سوال کرنا کسی مصلحت پر مبنی ہوتا ہے، شکم پری مقصود نہیں ہوتی۔ فَاَقَامَهٗ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل باطل دشمنوں کے سلوک کی پرواہ نہیں کرتے اور جہاں تک حکم الٰہی ہوتا ہے ان کو بھی فائدہ پہنچاتے ہیں۔

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ

کشتی تو | چند محتاجوں کی | تھی | جو سمندر میں محنت | کیا کرتے تھے | میں نے اس کو عیبدار کرنا چاہا | کیونکہ اُن کے پرے ایک

مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ۝ وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَا

بادشاہ تھا جو | ہر (اچھی) کشتی کو | چھین لیتا تھا | رہا لڑکا | تو اُس کے ماں باپ ایماندار تھے | ہم کو اندیشہ ہوا | کہ کہیں

أَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۝ فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ

سرکشی اور کفر سے اُن کو عاجز نہ کردے اس لئے ہم نے چاہا کہ ان کا رب اس کے عوض ان کو کوئی (اور ہی اولاد) عطا کردے جو پاکیزگی میں اس سے

رُحْمًا ۝ وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِى الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ

بہتر اور محبت میں اُس سے بڑھ کر ہو باقی وہ دیوار اُس شہر میں دو یتیم لڑکوں کی تھی اس کے نیچے اُن کا دفینہ تھا اور

كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ

ان کا باپ نیک آدمی تھا اس لئے تمہارے رب کی مشیت ہوئی کہ یہ جوانی کو پہنچ کر اپنا خزانہ نکال لیں یہ بات تمہارے رب

رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِىْ ۚ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝

کی رحمت سے ہوئی میں نے اپنی رائے سے اس کو نہیں کیا اُن باتوں کی حقیقت ہے جن پر تم سے صبر نہ ہو سکا

تفسیر

ان آیات میں مذکورہ بالا تینوں افعال کی اصل غرض بتائی گئی ہے۔ بظاہر وہ افعال خلاف شرع معلوم ہوتے تھے، مگر باطن میں حکم الٰہی کے مطابق تھے اور حکم الٰہی کی تعمیل ہی عین شریعت ہے، لیکن حکم الٰہی کا علم بغیر وحی یا الہام ربانی کے نہیں ہو سکتا۔ معالم و سراج میں مذکور ہے کہ کشتی دس غریب بھائیوں کی تھی جن میں پانچ اپاہج تھے اور پانچ کشتی کو کرایہ پر چلاتے تھے۔ سب کی روزی کشتی کے کرایہ سے وابستہ تھی۔ کشتی کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور مال نہ تھا۔ چونکہ سمندر کے دوسرے کنارے پر ایک ظالم بادشاہ کی حد تھی جو تمام سالم کشتیوں کو زبردستی لے لیا کرتا تھا، اس لئے کشتی کو توڑ دینا ہی مناسب تھا تاکہ اس ظالم کی غاصبانہ نظر سے محفوظ رہ سکے۔ شعیب جبائیؒ نے اس بادشاہ کا نام ہدد بن بدد بتایا ہے۔ سعید بن جبیر کے علاوہ اور تمام رواۃ نے ابن عباس کا بھی یہی قول نقل کیا ہے۔ بیضاوی نے منوار بن جلندی اور ابن اسحاق نے سوار بن جلندی لکھا ہے۔ بعض اقوال میں جلندی ہی کا قصہ ظاہر کیا ہے۔ ابن کثیر نے شعیب جبائی کے قول کو ترجیح دی ہے اور صراحت کی ہے کہ تورات میں جن بادشاہوں کے نام آئے ہیں اُن میں عیص بن اسحاق کی نسل میں اسی بادشاہ کا تذکرہ آیا ہے۔

تحلیل اجزاء

اَمَّا الْغُلٰمُ ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے کہ اس لڑکے کا نام جیسور تھا۔ چونکہ جیسور خوبصورت اور تندرست تھا، اس لئے والدین کو اس سے خصوصیت کے ساتھ زیادہ محبت تھی، مگر وہ کمبخت پیدائشی کافر تھا، جس کا علم الہام یا وحی کے ذریعہ سے خضر کو ہو گیا تھا اور یہ اندیشہ تھا کہ کہیں محبت قلبی سے مجبور ہو کر والدین اس کا ساتھ بے دینی کے معاملات میں نہ دینے لگیں، اس لئے حکم الٰہی ہوا کہ اس کو قتل کر دو۔ اس کے عوض ان کو نیک اور مشفق اولاد عطا کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بقول بخاری اور کلبی داؤد بن عاصم ایک صالحہ عفیفہ لڑکی پیدا ہوئی۔ جس سے ایک نبی نے نکاح کیا اور پھر اس سے ایک نبی کی پیدائش ہوئی۔

لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ۔ مفسر سراج نے دونوں یتیموں کے نام صریم اور صرم لکھے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ دیوار یتیم بچوں کی تھی، اس لئے سیدھا کرنے کی اجرت لینی تو کسی طرح مناسب ہی نہ تھی۔ بداخلاقی کی اہل قریہ نے اس کا انتقام لیا جائے یتیم بچوں سے۔ یہ کسی طرح جائز نہیں۔

كَنْزٌ لَّهُمَا امام بخاری نے تاریخ میں ترمذی نے جامع میں اور حاکم نے مستدرک میں ابو درداء کی روایت سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ کنز سے مراد سونا چاندی ہے۔ یعنی دیوار کے نیچے سونا چاندی دفن تھا۔ سعید بن جبیر کا قول ہے کہ کنز سے مراد صحیفے ہیں (رواہ الحاکم وصححہ)، ابن عباس کا قول ہے کہ ایک طلائی لوح تھی جس میں چند عبرت انگیز نصائح منقوش تھیں۔ محی السنہ نے معالم میں لکھا ہے کہ اکثر کا یہی قول ہے اور حدیث مرفوع

میں بھی اس کی صراحت آئی ہے۔

وَكَانَ أَبُوهُمَا۔ تفسیر سراج میں اس شخص کا نام کاشح لکھا ہے۔ ابن کثیر نے کہا یہ شخص جس کا قرآن میں تذکرہ ہے اور جس نے کنز دفن کیا تھا، ان کا صلبی باپ نہ تھا بلکہ ساتویں پشت میں تھا۔ گویا یہ دادا کا پردادا تھا اور کپڑا بنا کرتا تھا۔ ابن کثیر کی صراحت بظاہر سیاق آیت کے خلاف معلوم ہوتی ہے واللہ اعلم۔

مَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي۔ یعنی آپ کو جو میرے افعال خلاف شرع بظاہر نظر آرہے تھے میں نے یہ کام خود اپنے قیاس اور ارادے سے نہیں کئے بلکہ اللہ کا حکم ہی یوں تھا۔

مقصود بیان کشتی کرایہ پر چلانا جائز ہے۔ اللہ کے خاص بندوں کے کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتے۔ اگرچہ بظاہر شرع کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ مگر حقیقتاً شرع کے موافق ہوتے ہیں۔ اگر اولاد کو صحیح تربیت نہ دی جائے تو اس کی بدعملی کا وبال والدین پر بھی پڑ سکتا ہے۔ خاص کر ایسی صورت میں جب کہ محبت و شفقت سے مجبور ہو کر ماں باپ بے دینی کے معاملات میں اولاد کا ساتھ دیں۔ کسی شخص کا ذکر کسی نیک مصلحت کے ماتحت قتل کر دینا مخصوص صرف انبیاء میں سے ہے جن کے پاس وحی آتی ہے یا اس شخص کو اس کا علم ہے جس کو علم لدنی حاصل ہو ہر شخص کو اس کا علم نہیں ہے۔ ابن عباس نے نجدہ خارجی کو یہی جواب دیا تھا۔ یتیموں کا کام بلا اجرت کرنا مستحب ہے۔ ماں باپ کی نیکی سے اولاد کو برکت حاصل ہوتی ہے، مگر یہ عمومی قاعدہ نہیں بلکہ مشیتِ الٰہی کے تابع ہے وغیرہ۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُمْ مِنْهُ ذِكْرًا ۝ إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي

(اے محمد) لوگ تم سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں تم کہہ دو میں تمہارے سامنے اس کا کچھ تذکرہ کرتا ہوں ہم نے اس کو زمین میں قوت

الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝ فَأَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ

عطا کی تھی اور ہر طرح کا سامان دیا تھا پس وہ ایک سمت پر چلا یہاں تک کہ جب غروب آفتاب کے موقع

الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِي عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۗ قُلْنَا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ

پر پہنچا تو اس نے آفتاب کو دلدل کے چشمہ میں ڈوبتا ہوا پایا اور وہاں ایک قوم بھی تھی ہم نے کہا ذوالقرنین

إِمَّا أَنْ تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَنْ تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ۝ قَالَ أَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ

ان کو سزا دو یا ان کے بارے میں حسن سلوک اختیار کرو وہ بولا جو شخص ظلم کرے گا اس کو تو ہم سزا دیں گے

ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُكْرًا ۝ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً

پھر لوٹ کر اس کو اپنے رب کے پاس جانا پڑے گا اور وہ اس کو سخت سزا دے گا اور جو شخص ایمان لائے گا اور نیک کام کرے گا تو اس کو اچھا بدلہ

الْحُسْنَىٰ ۖ وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ۝ ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ

ملے گا اور عنقریب ہم اس کو اپنے معاملے میں سہولت دیں گے پھر اس کے بعد ذوالقرنین ایک اور راہ پر چلا یہاں تک کہ جب طلوع آفتاب کے

الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝ كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ

پر پہنچا تو اس کو ایسی قوم پر طلوع ہوتے پایا کہ ہم نے اُن کے لئے آفتاب سے کوئی آڑ نہیں بنائی تھی (ذوالقرنین کا قصہ) اسی طرح ہے اور ہم کو

اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ

پوری خبر ہے جو کچھ ذوالقرنین کے پاس تھا اس کے بعد ذوالقرنین ایک اور راہ چلا یہاں تک کہ جب دو پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو اُن سے ورے

دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ۝ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ

ایک قوم کو پایا جو قریب قریب بات نہیں سمجھتے تھے انھوں نے کہا ذوالقرنین یاجوج ماجوج

مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝

ملک میں فساد مچاتے ہیں تو کیا ہم آپ کے لئے کچھ مال مہیا کردیں بشرطیکہ آپ ہمارے اور اُن کے درمیان روک کردیں

قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝ ۙ اٰتُوْنِىْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ۭ

ذوالقرنین نے کہا میرے رب نے جو کچھ مجھے مقدور دے رکھا ہے وہی بہتر ہے لہٰذا تم قوت سے میری مدد کرو میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط بندش کردوں گا مجھ کو لوہے

حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِىْٓ اُفْرِغْ

کے تختے لا دو یہاں تک کہ جب ذوالقرنین نے دونوں پہاڑوں کے درمیان (تختوں کو) برابر کردیا تو کہا اس کو دھونکو یہاں تک کہ جب اس کو (بالکل) انگارہ کردیا تو کہا میرے پاس لے آؤ

عَلَيْهِ قِطْرًا ۝ ۭ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ

میں اس پر پگھلا ہوا تانبہ ڈال دوں اس کے بعد یاجوج ماجوج اُس پر نہ چڑھ سکیں گے اور نہ اس میں نقب لگا سکیں گے ذوالقرنین نے کہا یہ میرے رب کی

مِّنْ رَّبِّىْ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ رَبِّىْ جَعَلَهٗ دَكَّاۗءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّىْ حَقًّا ۝ ۭ

مہربانی ہے لیکن جب میرے رب کا وعدہ آجائے گا تو وہ اُسے ریزہ ریزہ کردے گا اور میرے رب کا وعدہ سچا ہے

تفسیر ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ قریش کو یہودیوں کے ذخیرۂ علم پر کافی اعتماد تھا وہ فقط صیہونیوں ہی کو حامل علوم جانتے تھے۔ رسول پاکؐ کی حالت معلوم کرنے کے لئے انہوں نے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کو یہودیوں کے پاس مدینہ بھیجا تھا اور یہودیوں نے حضور اقدسؐ کی تصدیق و تکذیب کے لئے تین سوالات قریش کو تلقین کئے تھے۔ ایک روح کے متعلق، دوسرا اصحاب کہف کے متعلق اور تیسرا ذوالقرنین کے متعلق۔ قریش نے حسب ہدایت یہود حضور والاؐ سے تینوں مسائل دریافت کئے۔ دو کا جواب تو پہلے گزر چکا۔ یہاں سے ذوالقرنین کے احوال کی تفصیل ہے۔ قرآن پاک داستانوں اور افسانوں کی کتاب نہیں۔ نہ تاریخ کی تالیف ہے، اس لئے حکایات و قصص کو مکمل تفصیل کے ساتھ کہیں بیان نہیں کیا۔ البتہ جس قدر حصہ وعظ و ہدایت اور اصلاح خلق سے تعلق رکھتا ہے اور جو بات عبرت آفرین نصیحت آمیز ہوتی ہے اُس کو حسب موقع بیان کردیا ہے یہودی

ذوالقرنین کا نام اور بعض احوال جانتے تھے۔ اُن کو اس کے قصہ سے واقفیت تھی خواہ ان کی مذہبی کتب میں ہو یا نہ ہو بہرحال سینہ بسینہ یا بطریق سفینہ یہ قصہ منقول ضرور تھا اور منقول بھی تھا تو اس طرح کہ کوئی دوسرے مذہب والا اس سے واقف نہ تھا بلکہ مجمل اور مبہم الفاظ میں تھا۔ لہذا رسول پاکؐ کی آزمائش کے لئے وہ اس کے متعلق استفسار نہ کرتے۔ قرآن مجید نے ذوالقرنین کی بابت صرف اتنا بتایا کہ وہ پُر شوکت، صاحب سطوت، نیکوکار، موحد، خدا پرست شخص تھا۔ ہر قسم کا دنیوی ساز و سامان اس کے پاس تھا۔ اس نے تین سفر بھی کئے تھے۔ ایک مشرق کی طرف جہاں ایسی قوم آباد تھی جن کے سروں پر آفتاب بغیر کسی حجاب کے طلوع ہوتا تھا۔ دوسرا مغرب کی طرف جہاں گدلے پانی میں سورج غروب ہوتا نظر آتا تھا تیسرا کسی اور سمت جہاں کے باشندے ذوالقرنین کی بولی مشکل سے سمجھتے تھے۔ اُنہیں لوگوں نے یاجوج ماجوج کی غارت گری سے بچنے کے لئے لوہے کی ایک دیوار پگھلا ہوا تانبا یا سیسہ ڈال کر قائم کر دی اور اس طرح وہ قوم یاجوج ماجوج کی غارت گری سے محفوظ ہو گئی۔ بس اتنا قصہ قرآن نے بیان کیا ہے لیکن یہ بات کہ ذوالقرنین کون تھا؟ کہاں کا باشندہ تھا؟ کس زمانے میں تھا؟ اُس کو ذوالقرنین کیوں کہتے ہیں؟ ذوالقرنین کے سفر کا آغاز و انتہا کی حدود کون سی تھیں؟ دیوار کہاں بنائی؟ بنانے کی درخواست کرنے والی کون قوم تھی؟ یاجوج ماجوج کس قوم کا نام ہے؟ یہ کہاں رہتی تھی؟ اب بھی ہے یا نہیں؟ اس کے احوال کیا ہیں؟ ان تمام امور کی طرف سے قرآن خاموش ہے یہ کام تاریخ کا ہے۔ علمائے اسلام نے غیر اقوام کی تاریخی کتابیں قدیم و جدید جغرافئے، اہلِ کتاب کے مذہبی و سائیر اور کتب قدیم کی شرحیں سب کا بہت احاطہ کے ساتھ مطالعہ کیا اور چھان بین کرنے کے بعد کچھ علمی تاریخی مواد استخراج کیا ہے۔ پھر بھی اہلِ تحقیق میں اختلافِ آراء اور تفرقِ اقوال قائم رہا اس کی وجہ محض یہ ہے کہ قرآن اور حدیث کے بیان کردہ واقعات کے علاوہ مزید تفصیل کا ماخذ اہلِ کتاب کے اقوال، کتابیں، موجودہ دور کے حجری اکتشافات، آثارِ قدیمہ اور کتبات ہیں۔ ان میں باہم خود تضاد اور تخالف ہے، اس لئے کسی اتفاقی صحیح نتیجہ پر پہنچنا ناممکن ہے۔ ہم مختلف اقوال نقل کر کے جو محقق صحیح قول ہوگا اس کو پیش کریں گے۔ محقق دہلوی مولوی عبدالحق حقانی نے گزشتہ اور حال کی متعدد کتابوں کی ورق گردانی اور سطر شماری کر کے ذوالقرنین کے متعلق بہترین تحقیقات کی ہے۔ موجودہ تفاسیر میں اس سے بہتر تحقیقاتی نوٹ اور تنقید و تبصرہ ہماری نظر سے نہیں گزرا، اس لئے ہمارے اس مضمون کے زیادہ حصہ کا سرچشمہ علامہ مذکور کی تحقیقات ہے۔ ہاں جہاں ہم کو مولانا کی تصریحات سے اختلاف ہے یا جن کتابوں سے مولانا نے اپنے مضمون کا اقتباس کیا ہے اُن کتابوں کے علاوہ دوسری کتب میں ہم کو کوئی نئی بات ملی ہے اس کو ہم نے تنقیح کے بعد لکھ دیا ہے اور زائد کو حذف کر دیا ہے۔

ذوالقرنین کون تھا، کب تھا، کس ملک کا تھا، اس کی بنائی ہوئی دیوار کہاں تھی؟

دنیا کی تاریخ میں جو دیواریں مذکور ہیں جن میں سے بعض اب بھی موجود ہیں۔ اُن کی تحقیق اور ان کے بنانے والوں کی تعیین کرنے کے بعد آسانی کے ساتھ معلوم ہو سکتا ہے کہ ذوالقرنین کون تھا؟

(۱) ابن خلدون اپنے مقدمہ کے صفحہ ۵۱ پر لکھتا ہے کہ اس اقلیم کے نویں حصہ کے ایک گوشہ میں بلاد خنشاخ واقع ہیں۔ کوہ قوقیا (غالباً کوہ الطائی) جب بحر محیط کے پاس سے ہو کر شمال کی طرف مڑ گیا ہے تو بلاد خنشاخ یعنی قفچاق میں سے ہو کر گزرتا ہے اور اقلیم ششم کے نویں حصہ تک نکل جاتا ہے۔ اسی جگہ اس کے وسط میں یاجوج ماجوج والی دیوار ہے اور اس حصہ کے شرقی کنارے میں یاجوج ماجوج کا ملک ہے۔ اس کا محل وقوع کوہ قوقیا کے پرے سمندر کے رخ پر ہے اور شکل مستطیل ہے۔ انتہی۔

کوہ الطائی کے موڑ پر ایک جگہ وہ دیوار ہے جس کا ذکر ابن خلدون نے کیا ہے اور اس پہاڑ کے پرے منچوریا اور منگولیا کی قومیں ہیں جن کو یاجوج ماجوج کہتے ہیں۔ یہ لوگ سخت خونخوار وحشی اور سفاک تھے۔ ان کا پیشہ شکار تھا۔ مورخین اسلام مذکورہ بالا دیوار کو سدِ یاجوج کہتے ہیں۔ اس کی تحقیق خلفائے عباسیہ کے عہد میں کی گئی تھی۔ چنانچہ ابو ریحان بیرونی (سندھی) اپنی کتاب آثارِ باقیہ مطبوعہ جرمنی ۱۸۷۸ء کے صفحہ ۴۱ میں لکھتے ہیں کہ اس دیوار کا قرآن نے کوئی موقع محل نہیں بتایا کہ کس جگہ ہے۔ ان کتب تاریخ و جغرافیہ میں مذکور ہے کہ یاجوج ترکوں میں ایک قوم کا نام ہے جو اقلیم پنجم و ششم کے مشرق میں رہتے ہیں اور ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ والی آذربیجان نے جب اس ملک کو فتح کیا تو کسی کو اس دیوار کو دیکھنے کو بھیجا جو بحیرہ خزر کی راہ سے دیکھنے گیا اور دیکھ کر آیا اور ابن خرداذبہ نے نقل کیا ہے کہ خلیفہ معتصم نے خواب میں اس دیوار کو ٹوٹا ہوا دیکھا تب اس کی تحقیق

کرکے پچاس آدمیوں کو بھیجا۔ یہ لوگ باب الابواب اور لان اور خزر کی راہ سے گئے اور واپس آکر بیان کیا کہ ایک مستحکم دیوار ہے جو لوہے کی اینٹوں سے بنائی گئی ہے، بہت اونچی اور مضبوط ہے۔ اس میں ایک دروازہ بھی ہے جس پر قفل لگا ہوا ہے۔ یہ جماعت واپسی میں سمرقند میں آکر نکلی تھی۔ کتاب احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم ۲ میں اس قصہ کو بڑی تفصیل سے نقل کیا ہے، مگر معتصم کی جگہ واثق باللہ عباسی کا معاملہ بتایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ واثق نے اس جماعت کا افسر محمد بن موسیٰ خوارزمی نجومی کو بنایا تھا اور سامان سفر بہت دیا تھا اور بادشاہوں کے نام خطوط بھی لکھ دیئے تھے۔ یہ جماعت بلاد طرخان سے ہوکر اس مقام پر پہنچی جہاں دیوار ہے اور واپس آکر بیان کیا کہ دو پہاڑوں کے درمیان ڈیڑھ سو گز کی ایک گھاٹی ہے۔ دونوں پہاڑوں کے درمیان ایک مضبوط دیوار ہے جس کی صورت یہ ہے کہ دونوں طرف سے دو پائے ہیں جن کا عرض پندرہ گز ہے۔ لوہے کی اینٹوں سے ان کو بنایا گیا ہے اور پگھلے ہوئے تانبے سے اینٹوں کی درزیں بند کی گئی ہیں۔ دونوں پایوں کے درمیان ایک مستحکم دروازہ آہنی کواڑوں کا لگا ہے اور بند ہے۔

ابوالقاسم بن حوقل نے کتاب المالک والمسالک کے صفحہ ۳۹۹ پر مذکورہ بالا باب الحدید کا ترمذ سے فاصلہ آٹھ منزل ظاہر کیا ہے۔ اسی طرح کہ ترمذ سے قراجون ایک منزل۔ یہاں سے میان کا ایک منزل۔ یہاں سے مایمرغ ایک منزل۔ یہاں سے نسف ایک منزل۔ یہاں سے سونج ایک منزل یہاں سے گندک ایک منزل اور گندک سے باب الحدید ایک منزل۔ تاریخ تیموری میں شاہ تیمور کا ایک جنگ میں باب الحدید تک پہنچنا مذکور ہے۔ دوسرے سیاحوں نے بھی اس دربند کا معائنہ کیا ہے اور موجودہ نقشہ سے بھی ظاہر ہے کہ جبل التائی منچوریا اور منگولیا میں حائل ہے اور انہی حدود میں اس کا ایک موڑ ہے۔ اسی پہاڑ کے درمیان ایک درہ کشادہ تھا جس کو کسی بادشاہ ذوالقرنین نے بند کیا اور اب تک یہ دربند موجود ہے۔

(۲) دوسری دیوار ایک نہایت مضبوط تعمیر ہے جو غیر قوموں کو روکنے کے لئے آذربیجان کے سرے پر بحیرۂ طبرستان کے کنارے کوہ قبق کے گھاٹ بند کرنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ مراصد الاطلاع کے صفحہ ۱۱۱ پر ہے کہ باب الابواب یعنی دربند بحر خزر پر ایک شہر ہے۔ اس کو باب الابواب اس لئے کہتے ہیں کہ یہاں کوہ قبق کی بہت سی گھاٹیاں ہیں، جہاں سے بہت سے قلعے ہیں۔ یہاں ایک دیوار ہے جو پتھر اور سیسہ سے بنائی گئی جس کی بلندی تین سو گز اور جس میں لوہے کے دروازے ہیں۔ اس کو نوشیروان نے اس لئے بنا لیا تھا کہ قوم خزر اس کے ملک میں آکر ہمدان اور موصل تک غارتگری کرتی تھی۔ ان کو روکنے کے لئے یہ دیوار بنائی تھی۔ کتاب البلدان کا مصنف ابن الفقیہ اس دیوار کا کئی جگہ تذکرہ کرتا ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے خزر کے روکنے کے لئے پتھر اور سیسہ کی ایک دیوار نوشیروان نے بنائی جس کا عرض تین سو گز ہے جس کو پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچا دیا اور ایک سرا دریا میں ملا دیا۔ اس کی لمبائی سات فرسخ ہے۔ ہر ایک فرسخ پر ایک آہنی دروازہ لگا ہے۔ یہ دیوار تراشے ہوئے مربع پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ ہر پتھر میں سوراخ کرکے لوہے کی سلاخ کے ذریعہ دوسرے پتھر سے جڑ دیا ہے۔ ساں میں سے ایک ایک پتھر ایسا بڑا ہے کہ پچاس آدمی بھی اس کو اکھاڑ نہیں سکتے۔ یہ دیوار اوپر جاکر اتنی چوڑی ہے کہ بیس سوار بغیر مزاحمت کے چل سکتے ہیں۔ اسی کتاب میں یہاں کے قلعوں کو قباد اکبر کی تعمیر بتایا ہے۔ یہ دیوار اب تک قائم ہے۔ ابن الفقیہ کی مراد نوشیرواں سے غالباً شاہ ایران ہے۔ خواہ کیخسرو ہو یا کیقباد یا کوئی دوسرا عظیم الشان بادشاہ جس نے بڑی بڑی مستحکم عمارتیں بنائی تھیں۔

(۳) گزشتہ زمانوں میں منچوریا اور منگولیا کے اہل شمالی چین پر تاخت و تاراج کیا کرتے تھے جن کو روکنے کے لئے چی وانگٹی شاہ چین نے مسیح سے تخمیناً ۲۲۵ برس پیشتر ایک دیوار بنائی جس کی لمبائی کا اندازہ بارہ سو میل پندرہ سو میل تک کیا گیا ہے۔ یہ دیوار اب بھی موجود ہے۔ اس کو دیوار چین کہتے ہیں۔

(۴) تبت کے شمالی پہاڑوں میں ایک دیوار بمقام راست بنائی گئی ہے۔ مصنف نزہۃ المشتاق لکھتا ہے کہ شہر راست دو پہاڑوں کے درمیان ہے اور خراسان کے انتہائی کنارہ سے پرے ہے۔ یہاں ایک راستہ ہے جہاں سے ترک دھاوا کیا کرتے تھے۔ اس راستہ کو فضل بن یحییٰ برمکی نے دروازہ لگا کر بند کر دیا۔

(۵) بحر شامی یا بحر روم کا مشرقی کنارہ جو شام سے ملا ہوا ہے۔ اس میں چند جزائر ہیں جو ایشیا کوچک سے متصل ہیں۔ ان میں سے ایک جزیرے کا نام روڈس اور دوسرے کا نام پولیس ہے۔ اس مجموعۃ الجزائر کو ہزار میل کے قدم سے دریا گھیرے ہوئے ہے۔ صرف ایک طرف چھ میل چوڑا خشکی کا راستہ تھا، کسی شاہ روم نے دیوار بنا کر اس کو بھی بند کر دیا۔ مصنف نزہۃ المشتاق نے اس کی صراحت کی ہے۔

اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ ذوالقرنین کی بنائی ہوئی کون سی دیوار ہے اور ذوالقرنین سے کون سا بادشاہ مراد ہے۔ پانچویں اور چوتھی دیوار تو بنائی ہوئی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ پانچویں دیوار تو پہاڑوں کے درمیان واقع ہی نہیں ہے بلکہ دریاؤں کے درمیان ہے اور چوتھی دیوار اسلامی دور کی بنی

ہوئی ہے۔ نزول قرآن کے وقت موجود نہ تھی۔

تیسری دیوار بھی مراد نہیں ہو سکتی۔ اس کی چند دلائل ہیں۔ (۱) دیوار چین کا بانی چی وانگٹی شاہ چین ہے اور بحث طلب دیوار کا بانی ذوالقرنین (۲) دیوار چین دو پہاڑوں کے درمیان واقع نہیں بلکہ پندرہ سو میل لمبی ہے دریاؤں سے بھی گزری ہے اور پہاڑوں پر سے بھی اور میدانوں میں سے بھی اور تعیین طلب دیوار کا دو پہاڑوں کے درمیان واقع ہونا ضروری ہے۔ (۳) چی وانگٹی نے کبھی مشرق مغرب اور شمال کا سفر نہیں کیا۔ تاریخ چین میں کہیں اس کا تذکرہ نہیں۔ حالانکہ دیوار معہود کے بانی کا سفر کرنا مسلم الثبوت ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغرب کی جانب بڑھا اور وہاں تک اس بادشاہ نے فتوحات کیں، لیکن شرقی اور شمالی سفر اب بھی پردۂ گمنامی میں رہے گا۔ (۴) اہل عرب اور اہل شام کا تعلق چین سے کبھی نہیں ہوا۔ پھر نزول قرآن سے پہلے ان کو دیوار چین کا تذکرہ کیسے معلوم ہوا اور چی وانگٹی سے ان کا کیا سروکار رہا۔

یہ ہیں مختصر وجوہ جن کی بنا پر دیوار معہود دیوار چین نہیں ہو سکتی اور نہ ذوالقرنین کو چی وانگٹی قرار دیا جا سکتا ہے۔ صرف اول و دوئم دیواریں باقی رہیں۔ انہیں کو مراد لیا جا سکتا ہے۔

حسب صراحت سابق دیوار دوئم کا بانی کوئی ایرانی بادشاہ تھا جس نے بحیرۂ طبرستان کے کنارہ قوم خزر کے غارتگروں کو روکنے کے لئے آذربیجان اور ارمینیہ کے درمیان یہ دیوار بنائی تھی اس بنا پر ذوالقرنین ایرانی بادشاہ کا لقب قرار پائے گا۔

ابو السعود اور ابو الفدا نے ذوالقرنین فریدون کو قرار دیا ہے، لیکن اگر ذوالقرنین شاہ فارس ہی کو کہا جائے تو اغلب یہ ہے کہ وہ دارا ہوگا جس کو سکندر بن فیلقوس یونانی نے شکست دی تھی۔ اس کی تائید کتاب دانیال کے آٹھویں باب سے ملتی ہے۔ کتاب مذکور کے آٹھویں باب میں لکھا ہے کہ :-

شاہ بیلشفر (ولد بخت نصر) کی سلطنت کے تیسرے سال مجھ دانیال کو ایک خواب نظر آیا۔ جس وقت میں نے خواب دیکھا ایسا معلوم ہوا کہ میں سوسن[1] کے قصر میں تھا جو صوبۂ عیلام میں ہے۔ میں نے عالم رؤیا میں دیکھا کہ میں اولائی کے ندی کے کنارہ پر ہوں۔ آنکھیں اٹھا کے نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے سامنے ایک مینڈھا کھڑا ہے جس کے دو سینگ تھے اور وہ جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ بہت بڑا ہو گیا۔ اس کے دونوں سینگ اونچے تھے، لیکن ایک دوسرے سے بڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مینڈھا مغرب اور شمال اور جنوب کی طرف سینگ مارتا پھرتا تھا۔ یہاں تک کہ کوئی جانور اس کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ پچھم کی طرف سے ایک بکرا آیا اور تمام روئے زمین پر ایسا پھرا کہ کوئی حصہ نہ چھوٹا اس بکرے کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک عجیب طرح کا سینگ تھا وہ اس دو سینگوں والے مینڈھے پر بڑے زور سے دوڑ پڑا، اس کو مارا اور اس کے دونوں سینگ توڑ ڈالے اور اس کو زمین پر دے مارا اور کوئی اس کو نہ چھڑا سکا۔ پھر وہ بکرا بہت بڑا ہوا اور جب پُر زور ہوا تو اس کا سینگ ٹوٹ گیا اور اس کی جگہ دوسرے چار سینگ نکلے۔ جب میں (دانیال) یہ خواب دیکھ چکا تو اس کی تعبیر کی فکر میں تھا پھر میں نے اپنے سامنے ایک شخص کو کھڑا دیکھا اور آواز آئی جبرئیل! اس کو خواب کے معنی سمجھا دے۔ اس نے میرے پاس آکر کہا اے آدم زاد سمجھ۔ اس خواب کا وقوع آخر زمانے میں ہوگا۔ وہ مینڈھا جس کے دو سینگ تھے وہ مادہ اور فارس کا بادشاہ ہے اور وہ بکرا یونان کا بادشاہ اور اس کے چار سینگ چار بادشاہ ہیں جو اس قوم میں قائم ہوں گے۔ انتہی۔

دانیال کے خواب کی بنا پر ذوالقرنین (دو سینگوں والا) فارس کے بادشاہوں میں سے کوئی بادشاہ ہے۔ قباد وغیرہ اور ایک سینگ

---

[1] یہ شہر شوشتر کا قدیم نام ہے۔ شاہان کیانیہ کا دار السلطنت رہ چکا ہے۔ حضرت دانیال کے زمانے میں جو دارا تھا اور جس نے شہر بابل سے بخت نصر کلدانی کا خاتمہ کیا اور جس کے ہاں حضرت دانیال مامور ہو گئے تھے اس کا پایۂ تخت یہی شہر تھا۔ حضرت دانیال بخت نصر کی قید میں بابل بھیج دیا تھا۔ پھر بخت نصر کے بیٹے بیلشفر کے دربار میں آپ کو بڑی عزت دی گئی تھی۔ انہی کے زمانے میں بابل کی سلطنت کا خاتمہ ہو کر شاہان ایران کا غلبہ ہوا اور اسی کو دو سینگ کا مینڈھا حضرت دانیال نے خواب میں دیکھا تھا۔ (از حقانی)

والا بکرا سکندر بن فیلقوس یونانی مقدونی ہے جس نے اس دو سینگ والے مینڈھے (دارا شاہ ایران) کو مغلوب کیا اور اس کی سلطنت چھین لی۔ پھر سکندر کے بعد اس کا ملک اس کے چار سرداروں پر تقسیم ہوا اور یہ چاروں ایک ایک حصہ ملک کے بادشاہ ہوئے۔ یہ واقعہ حضرت دانیال سے کئی سو برس بعد کا ہوا۔ دانیال کا مذکورہ خواب کتاب دانیال میں یہود کا ایک معمہ چلا آتا تھا جس کی تعبیر وہی جانتے تھے، اس لئے انہوں نے رسول پاکؐ کے امتحان کے لئے قریش کو تلقین کی کہ ذوالقرنین کی حالت دریافت کریں۔ قوم غرز والے یاجوج ماجوج کی اولاد سے تھے اور مملکت فارس میں آکر فساد برپا کرتے تھے، اس لئے شاہ ایران نے آذربیجان اور ارمینیہ کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنوا دی تھی۔ دارا کا ہر سہ اطراف میں سفر اور تسلط تاریخی واقعات پر مبنی ہے۔ بابل کا تخت اُلٹنا، آرمینیہ کو مسخر کرنا، افغانستان تک تسلط یہ سب کچھ دارا کے کارنامے ہیں، لیکن صرف ایک شبہ رہ جاتا ہے جس سے دارا کے ذوالقرنین ہونے کی تغلیط کی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ آذربیجان یا آرمینیہ یا کوہ قوق یا بحیرۂ طبرستان کے باشندے ایسے نہ تھے جو بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔ یہ سچ ہے کہ ان کی زبان اور تھی۔ دارا کی طرح فارسی زبان نہ بولتے تھے، لیکن تعلیم یافتہ طبقہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں ہوتا ہے۔ آذربیجان کے باشندے ایسے وحشی اور بربری نہ تھے جن میں کوئی فرد انسان نہ ہو اور بات ہی نہ سمجھتے ہوں۔ اس کے علاوہ ذوالقرنین کے متعلق آیات واضح طور پر ناطق ہیں کہ وہ موحد خدا پرست تھا۔ خدا کا خاص بندہ (ولی یا نبی) تھا۔ حالانکہ دارا موحد نہ تھا آتش پرست تھا۔ ان قوی شبہات کی بنا پر ہم کو بیضاوی وغیرہ علمائے اسلام کی رائے سے اختلاف ہے۔ دربند والی دیوار معہود ہم باب الابواب کی دیوار کو قرار نہیں دے سکتے۔ اب صرف اوّل دیوار باقی رہتی ہے یہی وہ دیوار ہے جس کا قرآن میں تذکرہ ہے۔ اس دیوار کا بانی کون تھا؟ یقیناً فغفور چین نہیں، سکندر یونانی نہیں، شاہِ ایران نہیں بلکہ کوئی ...... بادشاہ ہے۔ جس کا لقب ذوالقرنین تھا۔ اسی بادشاہ نے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے جبل التائی کا یہ درہ بند کیا تھا جس کو سدِ ذوالقرنین کہتے ہیں اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ شاہانِ مصر پر بھی عمل داری کر چکے ہیں جو کہ عمالقوں کی حکومت کے نام سے تاریخ مشہور ہے۔ شاہانِ یمن کے آثارِ قدیمہ اُن کی عظمت کی گواہی دے رہے ہیں۔ پھر کیا تعجب ہے کہ مشرق و شمال میں بھی ان کے فتوحات ہوئے ہوں۔ ذوالقرنین کوئی عربی بادشاہ تھا۔ اس خیال کا ثبوت اس سے بھی ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں یمن کے اکثر بادشاہوں کے ناموں میں لفظ ذو داخل تھا۔ جیسا ذو نواس، ذوالنون، ذورعین ذوجدن، ذویزن وغیرہ۔ اسی طرح قوی خیال ہے کہ ذوالقرنین بھی عربی ہے اور یمن کا بادشاہ، لیکن یمن کے کس بادشاہ کا لقب ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ ابوریحان بیرونی کا قول ہے کہ اس کا نام ابوکرب بن عیر بن افریقس حمیری تھا۔ اسعد یمنی حمیری اسی بادشاہ کا تذکرہ بطور فخر کرتا ہے ؎

قَدْ كَانَ ذُوالْقَرْنَيْنِ مِنَّا مُسْلِمًا   مَلِكًا عَلَا فِى الْاَرْضِ غَيْرَ مُعَبَّدٍ
بَلَغَ الْمَشَارِقَ وَالْمَغَارِبَ يَبْتَغِىْ   اَسْبَابَ اَمْرٍ مِّنْ كَرِيْمٍ سَيِّدٍ

مقریزی نے اس کا نام شمر بن عمرو بن افریقس لکھا ہے۔ ابوالفدا نے اپنی تاریخ کی چوتھی فصل میں لکھا ہے کہ یمن کا سب سے پہلا بادشاہ قحطان بن عابر ہوا پھر اس کا بیٹا یشجب یعنی سبا ہوا، پھر اس کا بیٹا حمیر، پھر اس کا بیٹا وائل پھر اس کا بیٹا سکسک پھر یعفر پھر حمیر کے خاندان میں سے ذوالرائش ہوا، پھر یعفر کا بیٹا نعمان پھر اس کا بیٹا اشمخ ہوا۔ اس کے بعد شداد بن عاد بن الملطاط بن سبا، بادشاہ ہوا پھر اس کا بیٹا حارث حارث رائش ہوا۔ یہی تبع اوّل ہے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ذوالمنار ابرہہ بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا افریقس پھر ذوالاذعار، پھر شرحبیل پھر ہدہاد پھر ملکہ بلقیس۔

ہم ابن اثیر نویری اور مسعودی کے اقوال نقل کرتے ہیں جن میں ابوالفداء کے قول سے قدرے اختلاف ہے پھر آخر میں اپنی رائے ظاہر کریں گے کہ نعمان یمنی کے کس بادشاہ کا لقب ہو سکتا ہے۔ یمن کا سب سے پہلا بادشاہ قحطان (جس کو توراۃ میں یقطان کہا گیا ہے) بن عامر بن شالح بن ارفخشد بن سام بن نوح ہوا۔ اس کی حکومت ۳۰۳۰ء قبل المسیح میں تھی۔ پھر یعرب بن قحطان ہوا اسی کا لقب یمن تھا۔ یعرب کے بعد یشجب بن یعرب ہوا۔ اس کے بعد عبدالشمس ہوا۔ اسی کا لقب سبا تھا۔ مارب کا بند اسی نے بندھوایا تھا پھر حمیر کی حکومت ہوئی اس کا لقب عرنجج تھا (۲۷۰۰ء قبل مسیح) پھر حمیر کا بیٹا وائل ہوا۔ پھر مدت دراز کے بعد حکومت منتقل ہوتے ہوتے شداد کے ہاتھ میں آئی پھر لقمان۔ المثوکی کا زمانہ آیا اور آخر میں حارث رائش یعنی تبع اوّل بادشاہ ہوا (الحمزۃ الاصفہانی) تبع اوّل کے بعد ابرہہ ذوالمنار ہوا۔ پھر ۲۲۰۰ قبل مسیح میں افریقس ہوا یہی شخص سرزمین کنعان سے بربرہ قبائل کو افریقہ لے گیا اور وہاں لے جاکر آباد کیا۔ مغرب کو فتح کیا اور چونکہ وہاں کے باشندوں کی بولی سمجھ میں نہ آتی تھی، اس لئے کہنے لگا یہ کیسی بربر کرتے ہیں۔ اسی لفظ سے وہاں کے رہنے

والوں کو بربر کہنے لگے۔

افریقس کے بعد عمر ذوالاذعار ہوا۔ پھر ۶۹۵ قبل مسیح میں شرحبیل اور اس کے بعد ہد ہاد حکمران ہوئے پھر ہد ہاد کی بیٹی بلقیس ملکۂ یمن ہوئی۔ بلقیس کے بعد شاہ ناشر النعم حکمراں ہوا۔ یہ مغربی جانب فتح کرتا ہوا ریگستان میں گھس گیا تھا اور وادیٔ رمل کے کنارے تانبے کا ایک بت نصب کیا تھا جس کے سینے پر خط مسند میں لکھا تھا "اس سے آگے کوئی نہ جائے ورنہ ہلاک ہو جائے گا"۔ ناشر کے بعد شمر مرعش بادشاہ ہوا۔ یہی آخری تبع کہلاتا ہے۔ یہ ۵۰۰ قبل مسیح میں تھا۔ اسی نے عراق فارس اور خراسان کے ممالک کو روند ڈالا تھا اور جیحون کے پار شہر سغد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ فارس والوں نے سغد کی بربادی کے متعلق کہا شمر کند یعنی شمر نے اس کو برباد کر دیا۔ اہل عرب نے لفظ شمر کند کو بگاڑ کر سمرقند کر لیا۔ ملک فارس پر اس نے دوبارہ چڑھائی کی تھی اور ملک چین پر بھی لشکر کشی کی تھی۔ قبائل بنی قریظہ کے بعض علماء کی ترغیب سے یہ یہودی ہو گیا تھا اور یہودی مذہب بھی اس وقت مذہب توحید تھا۔ اسی کی کنیت ابوکرب تھی۔ تسخیر چین کے دوران میں ہی اس کا انتقال ہوا (ابن اثیر و مسعودی)

میرے نزدیک شمر مرعش ہی کا لقب ذوالقرنین تھا۔ اسی نے مختلف اطراف میں سفر کیے تھے۔ ممالک کو تسخیر کیا تھا۔ انتہائے شرق تک گیا تھا۔ موحد اور خدا پرست بھی تھا، اسی لیے جبل الطائی کا دربند بنایا تھا جس کی تحقیقات کرنے والے واثق باللہ عباسی کے زمانے میں سمرقند میں واپس آکر ملے تھے۔ اسی دربند سے تاتاری اور چینی تاتار کے لوگ اس پار نہ آسکتے تھے۔ مولانا حقانی نے اس جگہ غلطی کی کہ ابوکرب کو حمیر یا عمرو بن افریقس کا بیٹا قرار دیا اور ابوالفدا نے بھی غلطی کی کہ تبع اذل کے بیٹے صعب یا مصعب کو ذوالقرنین کہا۔ ذوالقرنین موحد اعظم دربند بنانے والا ملکۂ بلقیس کا پوتا اور ناشر کا شمر تھا۔ اسی کی کنیت ابوکرب تھی جس کا سنہ وفات معلوم نہیں۔ البتہ دور حکومت ۵۰۰ قبل مسیح میں تھا۔ چونکہ موحد یہودی تھا اس لیے یہودیوں کو اس سے خاص تعلق تھا اور یہودی اس کو مایۂ ناز سمجھتے تھے۔ ابو ریحان بیرونی اور مفسر سراج نے تمام تو صحیح بتایا اور ولدیت بتانے میں ان سے بھی غلطی ہوئی۔ ابوکرب یا شمر حمیر یا عمر کا بیٹا نہ تھا بلکہ ناشر کا بیٹا تھا۔ والعلم عند اللہ۔

سہیل رازی، ابومسعود اور ابن کثیر نے لکھا ہے کہ سکندر دو گزرے ہیں ایک سکندر بن فیلقوس یونانی جس کا وزیر ارسطو تھا یہ کافر تھا اس نے کوئی دیوار نہیں بنائی۔ اس کا زمانہ مسیح سے تقریباً تین سو برس پیشتر تھا۔ دوسرا سکندر وہ تھا جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں تھا اور جس نے آپ کے ساتھ حل کر کعبہ کا طواف کیا تھا۔ (شاید اس وجہ سے مراد بادشاہ حورابی ہے) یہ سکندر موحد خدا پرست تھا اور یہی ذوالقرنین تھا۔ ابن کثیر اور رازی وغیرہ نے جو بیان کیا ہے وہ محتاج دلیل ہے۔ احادیث یا تاریخ میں کوئی ایسی صراحت نہیں کہ جس سے کسی سکندر کا حضرت ابراہیم کا معاصر ہونا ثابت ہو اور پھر اس سکندر کا ذوالقرنین لقب بھی ہو اور اس نے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ طواف بھی کیا ہو۔ صحیح وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دیا۔

ذوالقرنین کی وجہ تسمیہ

مفسر سراج نے ذوالقرنین کہنے کی مختلف وجوہ لکھی ہیں۔ ہر ایک بجائے خود مناسب توجیہ ہے (۱) اس کے تاج پر دو کلغیاں تھیں۔ دوسرے بادشاہوں کے تاج پر ایک کلغی ہوتی ہے (۲) اس کے دو گیسو تھے (۳) وہ زمین کے دونوں سمت یعنی شرق و غرب کو دیکھ چکا تھا (۴) اللہ نے نور و ظلمت دونوں کو اس کے لیے مسخر کر دیا تھا۔ تاریکی بھی اس کی فتوحات سے مانع نہ تھی۔ (۵) اس نے دونوں زمانے پائے، ایک فتوحات کا زمانہ، دوسرا حکومت و انتظام کا زمانہ (۶) حضرت دانیال نے خواب میں اس کو دو سینگوں والا مینڈھا دیکھا تھا۔

کیا ذوالقرنین پیغمبر تھا؟

علمائے اسلام کا اس میں اختلاف ہے۔ تفسیر سراج میں حضرت علیؓ کا جو قول درج ہے اس میں نبوت کا صاف انکار ہے۔ صرف مرد صالح ہونے کی صراحت ہے۔ حضرت علیؓ نے یہ بھی فرمایا کہ تم میں بھی ذوالقرنین کی طرح موجود ہیں۔ بعض علماء نبوت کے قائل ہیں۔ آخری فیصلہ معلوم نہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے۔ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا معلوم نہیں کہ تبع نبی تھا یا نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ ذوالقرنین نبی تھا یا نہ تھا مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ گنہگاروں کو (دنیا میں) جو سزا دی جاتی ہے وہ ان کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے یا نہیں۔ (رواہ عبد الرزاق فی المسند و ابن المنذر فی التفسیر و الحاکم فی المستدرک و قال انہ صحیح الاسناد)

یاجوج ماجوج کون قوم تھی اور اب بھی ہے یا نہیں؟

باتفاق اہل تحقیق یہ دونوں عجمی نام ہیں۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک یاجوج ماجوج دونوں ترکوں کے قبیلے ہیں۔ بعض کے نزدیک یاجوج ترکوں کی ایک قوم ہے اور ماجوج جیل اور دیلم کی۔ بیضاوی اور ابوالسعود وغیرہم نے دونوں کو یافث بن نوح کی نسل سے لکھا ہے۔ مطلب ایک ہی ہے۔ امام رازی کا قول بھی اس کے خلاف نہیں۔ مصنف کتاب المسالک والممالک نے اپنی کتاب میں چین کا حال بیان کر کے لکھا ہے کہ چین سے متصل بحرِ اعظم کے کنارے کنارے یاجوج ماجوج قوم ہے۔ گویا جبل الطائی کے پرے منچوریا، منگولیا اور کوریا چین سے متصل دریا کی حد تک سب یاجوج ماجوج کی بستیاں ہیں۔ انہی کو روکنے کے لئے چینی واکنگی نے دیوارِ چین بنائی تھی اور باب الابواب میں ذوالقرنین نے جو دہ بند بنایا اس کی غرض بھی اس کو روک دینا تھی۔ مصنف مذکور نے دوسری جگہ لکھا ہے

قدیم جغرافیہ دانوں کی صراحت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج منچوریا اور منگولیا کے لوگ ہیں۔ جغرافیہ "جام جم" میں میرزا فرہاد نے بھی یہی لکھا ہے۔ اسی تقدیر پر منگول اور من جیو اجو چینی تاتار کے باشندے ہیں انہیں کو اگلے زمانے میں یاجوج ماجوج کہتے تھے اور یاجوج ماجوج کے لفظ کو منگول دمن جیو اکر لیا گیا۔ توریت کتاب پیدائش کے دسویں باب میں ہے کہ یافث کے سات بیٹے تھے۔ جمر[1]، ماجوج[2]، مادی[3]، یونان[4]، توبل[5]، مسک[6]، تیراس[7]۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ لفظ ماجوج ماکوک کا معرب ہے اور ماکوک کا اصل عبرانی ماغوغ ہے یہ بات قرین عقل ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گاگ میگاگ کو یاجوج ماجوج بنایا ہے۔ یہ بھی صحیح معلوم ہوتا ہے، مگر زیادہ صحیح یہ ہے کہ گاگ میگاگ کو یاجوج ماجوج بنایا ہو۔ فقط کاف کو جیم سے اہل عرب نے بدل لیا ہو اور پھر جوج کی بجائے یاجوج استعمال کیا ہو۔ اس تقدیر پر یہ دونوں معرب ہوں گے۔

کتاب حزقیل ۳۸ باب میں آیا ہے "خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا۔ اس نے کہا اے آدم زاد تو جوج کی سرزمین کا ہے اور روش (یعنی روس) اور مسک اور توبل کا سردار ہے۔" ان الفاظ میں جوج کو یاجوج کی سرزمین کا رہنے والا اور روس اور مسک اور توبل قوموں کا سردار کہا۔ بظاہر یاجوج اس ملک اور اس قوم کو کہا جو یاجوج بنی یافث بن نوح کی اولاد سے ہیں اور جو ان ہی بلاد شمالیہ میں رہتے ہیں جن کو آج کل تاتار اور چینی تاتار اور ترکستان کہتے ہیں اور انہی کی نسل سے یہ ملک آباد ہیں اور جوج یعنی یاجوج ان میں سے کسی خاص فرقے کا نام تھا جو روس و توبال و مسک قوموں کا ان دنوں حاکم ہوگا۔

یاجوج ماجوج کا خروج کب ہوگا؟

ترمذی میں ایک صحیح روایت ہے کہ حضور اقدس[ؐ] نے ارشاد فرمایا قیامت بپا نہ ہوگی اس وقت تک جب تک تم (اے مسلمانو!) ایک ایسی قوم سے نہ لڑو گے جن کی جوتیاں بالوں کی ہوں گی اور چہرے ڈھالوں جیسے (چوڑے چپٹے) ہوں گے۔ یعنی قیامت سے پیشتر تم کو ایسی قوم سے لڑنے کا اتفاق ضرور ہوگا۔ اس قوم سے مراد ترک اور تاتاری لوگ ہیں۔ اختتام دور عباسیہ پر ان لوگوں سے مسلمانوں کی جنگ ہو چکی۔ چنگیز خاں اور ہلاکو خان کی فوجیں دربند توڑ کر نکل آئیں اور ایسی خوں ریز لڑائیاں ہوئیں جو اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ جو لوگ چنگیز خاں کے ساتھیوں کو یاجوج ماجوج کہتے ہیں ان کے نزدیک تو یاجوج ماجوج کا خروج ہو چکا، لیکن جو لوگ ابھی منتظر ہیں وہ آئندہ تاتاری اور ترکستانی نسلوں کا تسلط دیکھنے کے آرزومند ہیں۔ احادیث میں کسی خاص زمانے کی صراحت نہیں۔ صرف قیامت کے قرب میں خروج یاجوج ماجوج کی تصریح ہے اور قرب قیامت بڑی طویل چیز ہے۔ چنگیز خاں کا زمانہ حضور اقدس[ؐ] کے زمانے کی بہ نسبت قیامت سے زیادہ قریب تھا۔ رہے یاجوج ماجوج کے متعلق افسانے اور عجائبات جن کو اہل کتاب سے لے کر خوش اعتقاد مسلمانوں تک نے مشہور کر رکھا ہے اور قرآن مجید سے چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے وہ قابل اعتبار نہیں۔ مثلاً ان میں سے کسی کے کان اتنے لمبے ہوں کہ ایک کان بچھا کر سوئے گا اور ایک کان اوڑھے گا۔ یا کسی کا قد سو گز اور کسی کا بالشت برابر ہوگا، یہ سب افسانے ہیں جو احادیث اس کے متعلق روایت کی جاتی ہیں وہ ضعیف الاسناد ہیں۔

تحلیل اجزاء و تفسیری مطالب

سَاَتۡلُوۡا عَلَیۡكُمۡ مِّنۡهُ ذِكۡرًا ۔ یعنی ذوالقرنین کی مفصل حالت نہیں بلکہ کچھ احوال ہم بیان کرتے ہیں۔ جتنا حصہ ارشاد و ہدایت کے لئے ضروری ہے اتنا بیان کر دیں گے۔

اِنَّا مَكَّنَّا ۔ یعنی ہم نے اس کو حکومت، عزت، طاقت، فوج وغیرہ مختلف قسم کی قوتیں عطا کی تھیں، مقصد یہ کہ وہ بادشاہ تھا۔

وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا۔ ابن عباس، مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، سدی، قتادہ اور ضحاک وغیرہم کے نزدیک سبب سے مراد علم ہے۔ ایک روایت میں قتادہ کے نزدیک زمین کی منازل اور نشانیاں مراد ہیں۔ عبدالرحمٰن بن زید کے نزدیک زبانوں کی تعلیم مراد ہے۔ ذوالقرنین ہر ملک اور ہر قوم کی زبان جانتا تھا۔ ہر ملک کی زبان میں وہاں کے باشندوں کو توحید کی طرف مائل کرتا۔ اگر سرکشی کرتے تو پھر جنگ کرتا۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ قوت اور سازوسامان مراد لیا جائے۔ قوت علم کی ہو یا ہتھیاروں کی یا معدے کی یا تسلط عام کی۔ بہرحال خدا تعالیٰ نے اس زمانے کے موافق تمام مادی اعلیٰ اسباب ذوالقرنین کے لئے فراہم کر دیئے تھے۔ وہ جدھر کا رخ کرتا ضروریات سفر سے پہلے تیار کر لیتا۔

حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ۔ الخ۔ ابن کثیر، امام رازی اور اکثر اہل تحقیق کے نزدیک مغرب الشمس کے یہ معنی نہیں کہ آفتاب غروب ہونے کی زمین پر کوئی جگہ ہے اور وہاں سیاہ دلدل کا کوئی چشمہ ہے جہاں آفتاب غروب ہوا کرتا ہے۔ کیوں کہ آفتاب غروب ہوتا ہی نہیں ہے۔ زمین گول ہے۔ آفتاب کی حرکت اور زمین کا دور طلوع و غروب دکھاتا ہے۔ بلکہ اس کلام کی بنا محض عرف عام پر ہے۔ اردو میں بولا جاتا ہے کہ فلاں عمارت آسمان سے باتیں کر رہی ہے یعنی بہت بلند ہے۔ برطانیہ کی سلطنت اتنی بڑی ہے کہ اسی کی سلطنت میں آفتاب کا طلوع غروب ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ بہت لمبی چوڑی ہے۔ مغرب الشمس اور مَطْلِعَ الشَّمْسِ سے بھی یہی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین مغرب کی جانب بہت دور تک پہنچا جہاں بجز سمندر کے اور کوئی آبادی نہ تھی تو آفتاب اس کو پانی میں ڈوبتا ہوا معلوم ہوا۔ جن لوگوں نے جہاز پر سفر کیا ہے یا جن کے غربی جانب سمندر ہے وہ ہر روز اس بات کا معائنہ کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے مغرب کی حد کی تعیین نہیں کی نہ یہ بتایا کہ وہاں ذوالقرنین کو کون قوم ملی۔ اس کی تحقیق کے لئے جغرافیہ اور تاریخ کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ عرب کے مغرب جنوب اور کسی قدر شمال میں بحر قلزم ہے تو ظاہر ہے کہ عرب کا غربی کنارہ مراد نہیں۔ کیونکہ عرب کی جانب بحر قلزم کچھ زیادہ دور نہیں۔ لامحالہ قلزم کو عبور کر کے ملک مصر اور بربر کو طے کرتے ہوئے بحر اعظم تک پہنچنا مراد لیا جائے گا۔ اگر یہ کہا جائے اور تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ذوالقرنین نے کل دنیا کا سفر کر لیا تھا تو مطلب کی توضیح اس طرح کی جائے گی کہ زمین چونکہ گول ہے، اس لئے وسط دائرہ تک پہنچ کر آدمی کا رخ یقیناً اُلٹا ہو جائے گا۔ چلنے والے کا رخ جب تک آفتاب کی طرف رہے گا اس کو سورج سامنے نظر آئے گا اور جب وسط پر پہنچ کر وہ مڑے گا تو پہلے کے بالکل خلاف رُخ ہو جائے گا۔ پس گویا مغرب تک پہنچ گیا۔

کعب احبار نے معاویہ سے کہا تھا توریت میں لکھا ہے کہ سورج پانی مٹی (دلدل) میں غروب ہوتا ہے۔ اسی کے متعلق تبع حمیری نے دو شعر بھی کہے ہیں ایک جاہلی حمیری یمنی شاعر کا قول ہے جس کو ہم ذوالقرنین کے احوال میں نقل کر بھی آئے ہیں۔ لیکن کعب احبار نے اس کو قدرے ترمیم کے ساتھ تبع کی طرف منسوب کیا۔ عربی لٹریچر کے ماہرین اس کو اسعد حمیری یمنی کا قول بتاتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے ؎

بَلَغَ الْمَشَارِقَ وَالْمَغَارِبَ يَبْتَغِيْ ۔۔۔ اَسْبَابَ اَمْرٍ مِنْ حَكِيْمٍ مُرْشِدٍ
فَرَاٰى مَغَارَ الشَّمْسِ عِنْدَ غُرُوْبِهَا ۔۔۔ فِيْ عَيْنٍ ذِيْ خُلُبٍ وَثَاطٍ حَرْمَدٍ

ابن عباس نے پوچھا خلب کے کیا معنی؟ ابن حاضر نے کہا حمیری محاورہ میں خلب گیلی مٹی کو کہتے ہیں۔ ابن عباس نے ثاط کے معنی دریافت کئے تو جواب دیا "دلدل" کہا اور حرمد کے معنی "سیاہ" بتائے۔

خلاصہ یہ کہ ذوالقرنین کو ایسا معلوم ہوا کہ سیاہ دلدل کے چشمہ میں سورج غروب ہو رہا ہے۔ چونکہ واقع میں سورج دلدل میں غروب نہیں ہوتا اس لئے وَجَدَهَا کا لفظ استعمال کیا۔

حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ الخ۔ مطلع الشمس کے بھی وہی مجازی استعمالی معنی مراد ہیں جو مغرب الشمس کے تحت میں ہم بیان کر آئے ہیں۔ گویا ذوالقرنین بجانب مشرق ایسی جگہ پہنچا جہاں سے آگے اور کوئی آبادی اور جانا نہ تھا صرف پانی ہی پانی تھا۔ چونکہ پہاڑ وغیرہ کی کوئی آڑ نہ تھی اس لئے سورج کو روکنے والی کوئی چیز نہ تھی۔ یہ کون سی جگہ ہے؟ قرآن نے کچھ بیان نہیں کیا۔ غالباً چین کا آخری حصہ ہوگا۔ جس سے آگے سمندر کے سوا اور کوئی ملک ہے نظر پایا۔ بعض مفسرین نے یہ مطلب بیان کیا کہ وہ لوگ برہنہ رہتے تھے۔ سوائے دھوپ کے ان کا کوئی لباس ہی نہ تھا۔ بعض نے یہ توجیہ کی ہے کہ مکان بنا کر نہ رہتے تھے۔ خواہ اس وجہ سے کثرت بارش اور زلزلوں کی وجہ سے مکان باقی نہ رہ سکتا تھا یا مکان بنا کر رہنا ہی نہ جانتے تھے یا دن اتنا زیادہ لمبا تھا جس کی وجہ سے مکان میں نہ رہ سکتے تھے۔ غرض یہ کہ وحشی تھے۔ میرے نزدیک یہ مطلب نہایت عمدہ ہے۔ کلام کی بنا مجازی معنی پر ہوگی اور مجازی معنی بعید از قیاس نہ ہوں گے۔ دنیا کی بہت سی

وحشی قومیں برہنہ رہتی تھیں، امریکہ، آسٹریلیا، افریقہ اور برہما کے بعض پہاڑی علاقے بلکہ افریقہ کے بعض حصوں میں تو اب تک وحشی انسان رہتے ہیں جو لباس پہننا ہی نہیں جانتے۔

حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ بَیْنَ السَّدَّیْنِ الخ۔ یہ تاتار کا پہاڑ ہے جس کا نام التائی ہے۔ یہ پہاڑ تاتار اور چینی تاتار کے درمیان سے ہو کر گزرا ہے اور منگولیا اور منچوریا کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ پھر اس کی ایک شاخ مغرب کی جانب سیکڑوں کوس تک تاتار کو جنوبی و شمالی حصوں میں تقسیم کرتی چلی گئی ہے اور ایک شاخ مشرق و شمال کو ہوتی ہوئی سائبریا کو گھیرتی ہوئی بحرِ اعظم تک جاتی ہے۔ اسی پہاڑ میں ایک درّہ تھا جس کے اندر سے گزر کر چینی تاتار کے باشندے تاتاریوں کو تاخت و تاراج کرتے تھے اور تاتاریوں کی درخواست پر ذوالقرنین نے وہ دہانہ بند کر دیا۔ اس آیت سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ ذوالقرنین ان کی گفتگو نہیں سمجھتا تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ غیر قوموں کا کلام مکمل طور پر نہیں سمجھتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ قرائن اشارات یا ترجمان کے ذریعہ سے سمجھ لیتے ہوں۔

اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ۔ ذوالقرنین نے لوہے کے تختے طلب کئے ان کی دیوار بنا کر اوپر سے پگھلا ہوا تانبہ یا رانگ ڈال دیا جس سے جوڑ سے جوڑ مل گیا اور دیوار ڈھلی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ بعض مفسرین نے عمومی معنی مراد لئے ہیں کہ لوہے کے ٹکڑوں سے وہ دیوار چنی تھی یا پتھروں سے لوہے کی اینٹیں میخیں لگائی تھیں۔ بہر طور دیوار چن کر دونوں پہاڑوں کے سرے تک لے گئے۔ انتہیٰ۔

میرے نزدیک مفسر مذکور کی صراحت غلط ہے۔ دیوار ضرور لوہے کے تختوں سے ہی چُنی تھی۔ اگر پتھروں سے چُنی کر لوہے کی سلاخوں سے جڑی جاتی تو پگھلا تانبہ یا رانگ اوپر سے ڈال کر آگ لگانا قطعاً غلط ہو جائے گا۔ پتھر کی دیوار پر پگھلا ہوا تانبہ ڈالنا اور آگ لگانا کچھ مفید نہیں ہے۔ اس لئے پختگی نہیں پیدا ہو سکتی نہ عادتاً ایسا کیا جاتا ہے۔ ہاں لوہے کے تختوں کی دیوار چن کر اوپر سے پگھلا ہوا تانبہ یا رانگ ڈالنے سے مکمل دیوار لوہے کی ہو سکتی ہے۔ جوڑ سے جوڑ مل سکتا ہے اور سب درزیں مل کر پوری دیوار یک ذات ہو سکتی ہے۔

فَمَا اسْطَاعُوْۤا۔ یعنی اس کی بلندی کی وجہ سے نہ تو چینی تاتار کے باشندے اس کے اوپر چڑھ سکتے تھے اور نہ اس کی پختگی کی وجہ سے اس میں سوراخ کر سکتے تھے۔ آیت میں اس بات کی کوئی صراحت نہیں کہ وہ دوسرے راستوں سے بھی نہیں آ سکتے تھے اور کوئی دوسرا راستہ ہی نہ تھا۔ ہاں بقرائن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ان کو کسی دوسرے راستے کی اطلاع نہ تھی اور نہ کسی دوسرے ذریعہ سے پہاڑوں کے پار آنا اُن کے علم میں تھا۔

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ۔ عام مفسرین وعدۂ رب سے وہ زمانہ مراد لیتے ہیں جو حضرت عیسٰی کے نزول اور قتلِ دجال کے بعد ہوگا۔ ایسے وقت میں یاجوج ماجوج دیوار توڑ کر خروج کریں گے اور حضرت عیسیٰ مسلمانوں کو ساتھ لے کر ملک شام میں کسی پہاڑی پر محصور ہو جائیں گے۔ بعض اہلِ تفسیر کے نزدیک وعدۂ رب سے چنگیز خانی فتنہ مراد ہے۔ بعض احادیث میں آیا ہے کہ قتلِ دجال کے بعد یاجوج ماجوج دیوار توڑ کر درّہ سے خروج کریں گے۔ بحیرۂ طبریہ کا پانی پی جائیں گے، ملک میں فساد برپا کریں گے، ملک شام پر حملہ آور ہوں گے پھر خدا تعالیٰ کی ایک بلائے آسمانی سے سب ہلاک ہو جائیں گے۔

مضمون احادیث کی تائید کتاب حزقیل کی ۳۸۔ ۳۹ فصل سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ یاجوج ماجوج شمال کی طرف سے بے شمار تعداد کے ساتھ حملہ آور ہوں گے۔ (شام کے ملک پر) اور لوگوں کو مغلوب و مقتول کریں گے پھر کہیں گے زمین والوں کو تو ہم نے ہلاک کر دیا اب آسمان والوں کو بھی زیر کرنا چاہیئے۔ اس لئے آسمان کی طرف تیر پھینکیں گے اور وہ ان کے گمان کو صحیح کرنے کے لئے خون آلود کر کے گرائے جائیں گے۔ آخر خدا کی بھیجی ہوئی بلا سے یہ لوگ سب ہلاک ہوں گے۔ شاید تیروں سے مراد آلاتِ حرب ہوں یا واقعی تیر ہوں کیونکہ یاجوج ماجوج وحشی قومیں ہوں گی۔ قدیم زمانے کے آلاتِ حرب ہی اُن کے پاس ہوں گے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مقصودِ بیان

مِّنْهُ ذِكْرًا سے یہ بتانا مقصود ہے کہ کسی شخص کا مکمل قصہ بتانا کتابِ الٰہی کے اصل مقصد کے خلاف ہے۔ ہاں قصہ کے جتنے حصہ کا تعلق ارشاد و ہدایت سے ہے اتنا حصہ بیان کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ ذوالقرنین کی زندگی کا اتنا حصہ بیان کیا جاتا ہے جس سے بصیرت رکھنے والے عبرت اندوز اور موعظت گیر ہوں۔

اِنَّا مَكَّنَّا الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین کو اس کے زمانے کے موافق تمام مادی اور غیر مادی اسباب کامیابی عطا فرمائے گئے تھے۔

وَجَدَهَا کے لفظ سے صاف ظاہر ہے کہ آفتاب واقعی چشمے میں غروب نہیں ہوتا بلکہ ساحل پر کھڑے ہو کر دیکھنے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آفتاب چشمے میں غروب ہو رہا ہے۔

اَمَّا مَنْ ظَلَمَ الخ اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ ظلم کی سزا دینی ضروری ہے۔ ظالم سے درگزر کرنی ممنوع ہے اور نیکوکار خوش اعمال لوگوں کو دنیا و دین میں آسانی اور سہولت میسر آتی ہے۔

اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ۔ یاجوج اور ماجوج کے درمیان واؤ حرف عطف کا آنا دلالت کر رہا ہے کہ یاجوج اور ماجوج جدا جدا قومیں ہیں ایک ہی قوم کے دو نام نہیں ہیں۔

اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ کا صحیح اور راجح مطلب تو ہم تفسیری تحلیل کے ذیل میں لکھ آئے ہیں۔ بعض لوگوں نے ایک تخمینی مطلب اس طرح لکھا ہے کہ دیوار سے مراد حقیقی دیوار نہیں اور نہ یاجوج کسی خاص قوم کا نام ہے بلکہ مغربی اقوام مراد ہیں۔ مشرقی قوموں پر مغرب کے رہنے والے تاخت کیا کرتے تھے۔ مشرقیوں کے پاس آلاتِ مدافعت نہیں تھے۔ ذوالقرنین سے جب چین و تاتار کے رہنے والوں نے اپنی بے بسی اور اہلِ مغرب کی دراز دستیوں کی شکایت کی تو اُس نے لوہے کو ڈھال کر توپیں اور دوسرے آلاتِ حرب بنانا سکھائے جن کو تیار کر کے اہلِ مشرق نے مدافعت شروع کر دی۔ اس وقت سے اب تک مشرقی ممالک بھی اہلِ مغرب کی تاخت سے محفوظ ہو گئے۔ گویا سد سے مراد ہیں آلاتِ مدافعت اور صدفین سے مراد ہیں مشرق و مغرب اور آگ مشتعل کر کے پگھلانا، تانبہ یا سیسہ ڈال کر دیوار بنانے سے مراد ہے تمام حربی طاقت کا مغلوب ہو جانا۔"

میرے نزدیک یہ خیال بلا ثبوت ہے اور محض تاویل زائغ ہے۔ قرآن و احادیث اور انبیائے سابقین کی تصریحات کے خلاف ہے۔ ذوالقرنین کا پورا واقعہ اپنے اندر گوناگوں مواد بصیرت و موعظت رکھتا ہے۔ اس قدر عظیم الشان طاقت اور ہمہ گیر تسلط رکھتے ہوئے ذوالقرنین کا خدا کی طرف رجوع کرنا دلالت کر رہا ہے کہ خدا کی قدرت محیط کل ہے۔ انسان کی طاقت اور اقتدار کتنا ہی زائد ہو جائے اور شوکت و سطوت کتنی ہی بڑھ جائے مگر وہ خلاق مطلق سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ نیز اس طرف بھی اشارہ ہے کہ خدا پرست موحد کو اللہ بھی فلاح دارین عطا فرماتا ہے۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۝

اور اس روز ہم یاجوج و ماجوج کو چھوڑ دیں گے کہ ایک میں ایک گڈ مڈ ہو جائے گا اور صور پھونکا جائے گا پھر ہم سب کو بالکل جمع کر لیں گے

وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا ۝ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ

اور اس روز اُن کافروں کے سامنے ہم دوزخ کو پیش کریں گے جن کی آنکھیں ہماری یاد سے پردے میں

غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ۝ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا

تھیں اور وہ سُن بھی نہ سکتے تھے تو کیا کافروں نے گمان کیا ہے

اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ

کہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو کارساز بنا لیں ہم نے جہنم کو کافروں کی دعوت کے لئے تیار کر رکھا

ع ۱۹
۲

نُزُلًا ۝ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ

ہے (اے نبی) کہہ دو کیا میں تم کو بتاؤں کہ اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے کون ہونگے؟ وہی لوگ ہوں گے جن کی کوشش دنیوی

الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ

زندگی میں رائیگاں گئی مگر وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی آیتوں اور

رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ۝ ذٰلِكَ

اُس سے ملنے کا انکار کیا لہٰذا اُن کے اعمال اکارت گئے قیامت کے دن ہم اُن کی کچھ قدر نہ کریں گے چونکہ انھوں

جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

نے کفر کیا اور میری آیتوں اور میرے پیغمبروں کا مذاق بنایا اس لئے اُن کی سزا جہنم ہے جو لوگ ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا

اور نیک کام کئے اُن کی مہمانی کے لئے فردوس کے باغات ہیں جن کے اندر وہ ہمیشہ رہیں گے وہاں سے ہٹنا نہ چاہیں گے

تفسیر اکثر مفسرین کے نزدیک آیت کا ابتدائی حصہ یاجوج ماجوج کے قصہ کا تتمہ ہے اور نُفِخَ فِی الصُّوْرِ سے احوال قیامت کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذوالقرنین کی دیوار مدت دراز تک قائم رہے گی۔ پھر جب خدا تعالیٰ کا حکم ہوگا اور قیامت آنے کو ہوگی (اور دجال کا خروج ہو جائے گا اور مسیح دجال کو قتل کر دیں گے) تو وقت موعود مذکور پر یاجوج ماجوج دیوار توڑ کر میدانوں میں نکلیں گے۔ وہ لوگ دھکا کرتے، گرتے پڑتے، ٹڈی دل کی طرح اُمڈ سے چلے آئیں گے اور ملک شام میں فساد برپا کریں گے۔ (اس کے بعد قیامت بپا ہوگی۔ پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا۔ تمام زندہ انسان مر جائیں گے۔ دنیا نیست و نابود ہو جائے گی) پھر دوبارہ نفخ صور ہوگا تو خدا تعالیٰ سب لوگوں کو میدانِ حشر میں جمع کر دے گا۔ الخ۔

بعض مفسرین کے نزدیک بَعْضَهُمْ کی ضمیر یاجوج ماجوج کی طرف راجع نہیں اور نہ یہ ذوالقرنین کے قصہ کا تتمہ ہے۔ قصہ مذکور حَقًّا پر ختم ہوگیا۔ یہاں سے احوال قیامت بیان کرنا مقصود ہے اور بَعْضَهُمْ کی ضمیر عام جن و انس کی طرف راجع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام جن و انس آپس میں قیامت کے شروع ہونے کے وقت مخلوط ہو جائیں گے۔ ہر گروہ دوسرے پر اُمڈا چلا آئے گا۔ اتنے میں صور پھونکا جائے گا اور سب نیست و نابود ہو جائیں گے۔ پھر دوبارہ صور پھونکنے پر سب کے سب زندہ ہو کر میدانِ قیامت میں جمع ہوں گے۔ اول الذکر مطلب پر نفخ صور سے دوسری مرتبہ صور پھونکنا مراد ہے اور مؤخر الذکر تقدیر پر نفخۂ اوّل مراد ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک یَوْمَئِذٍ سے وہ دن مراد ہے جب دیوار بنائی گئی تھی اور تَرَكْنَا سے واقعہ کو بیان کرنا مقصود ہے۔ ان کے نزدیک معنی یہ ہوں گے کہ جس روز دیوار بن گئی اور یاجوج ماجوج کا راستہ بند ہو گیا تو وہ باہر آنے کے لئے ایک دوسرے پر گرتے ہوئے اژدحام کرتے رہ گئے۔ ہر شخص دیوار کی طرف آنے کے لئے دوسرے پر گرا پڑتا تھا۔ اس کے بعد نفخ فی الصور سے احوال قیامت کا بیان ہے۔ یہ مطلب کمزور ہے اور سیاق آیات کے خلاف ہے۔ اس سے آگے خدا تعالیٰ تین گروہوں کے احوال اُخروی بیان کرتا ہے۔ (۱) وہ گروہ جس کو قدرت کی نشانیاں خود دکھائی نہیں دیتیں، دلائل الوہیت کا ادراک اور احساس اپنی قوت فکریہ اور بصیرت سے نہیں کر سکتا۔ ہزاروں حوادث انقلابات اور عالم کون و فساد کے تغیرات اس کی نظروں کے سامنے آتے ہیں مگر اس کی آنکھوں پر پردے پڑے رہتے ہیں۔ اُس کو کائنات کے حرکت و سکون میں واضحہ

ہستا کی الوہیت و ربوبیت کا جلوہ نظر نہیں آتا۔ پھر فقط وہ آنکھوں ہی کا نابینا نہیں بلکہ غیب کا منادی اور توحید کا پکارنے والا اس کو پکار کر دعوتِ حق دیتا ہے تو اس کو آواز سنائی نہیں دیتی۔ اللہ کا پیام رساں سچائی کی طرف اس کو بلاتا ہے، مگر اس کے گوش میں گھسنے کی طاقت ہی نہیں۔ اللہ کے وہ مخصوص بندے جن کا سرمایۂ افتخار و اعزاز محض بندگی ہے اُن کی وہ پرستش کرتا ہے اور اُس خدائے واحد کو جو معبودِ کُل ہے چھوڑتا ہے اور خالق کے مقابلے میں مخلوق کو اپنا حمائتی سمجھتا ہے۔ اس گروہ کی سزا دوامی جہنم ہے۔ عذابِ الٰہی سے کوئی اس کو بچا نہیں سکتا۔

(۲) دوسرا وہ گروہ ہے جو آیاتِ قدرت کو دل لگی کی چیز سمجھتا ہے، اللہ کے پیغمبروں کا مذاق اُڑاتا ہے (کاہن، شاعر، مجنون اور ساحر کہتا ہے) اپنے بزرگوں کے عقائد، اعمال و اقوال کو حق سمجھتا ہے۔ بظاہر صدقہ خیرات بھی دیتا ہے، غریبوں کی سرپرستی بھی کرتا ہے، لیکن تمام کارہائے خیر سے اس کا مقصود نیک نامی، شہرت، جاہِ شخصی اور خاندانی وجاہت کی طلب ہوتی ہے۔ اس کا ایمان آخرت پر نہیں، اس لئے اس کو اخروی ثواب کی اُمید نہیں۔ جو کچھ ہے وہ دنیا ہے۔ دنیا ہی کے حصول کے لئے وہ سب کچھ کرتا ہے۔ اس گروہ کے تمام اعمالِ خیر بے سود ہیں۔ قیامت کے دن کسی نیکی کا اجر نہ ملے گا۔ جو نیکی لوجہ اللہ نہ ہو وہ نیکی نہیں بلکہ حصولِ دنیا کا ایک ذریعہ ہے۔ لہٰذا ایسی نیکی قابلِ قبول نہیں۔ قیامت کے دن تمام کیا کرایا برباد جائے گا اور دوامی جہنم سے دوچار ہونا پڑے گا۔

(۳) تیسرا گروہ وہ ہے جو معتقداتِ شرع پر ایمان رکھتا ہے۔ جن چیزوں کو ماننا شرعاً ضروری ہے اُن کو مانتا ہے۔ تعلیم رسولؐ کے موافق اس کے عقائد صحیح ہیں، ہر نیکی اور اچھائی پر اس کا عمل ہے۔ اس گروہ کی جزا جنت ہے۔ اس کا ثواب لازوال ہے۔ قیامت کے بعد ہمیشہ کے لئے اس کو عیش ملتا رہے گا۔

تحلیل اجزاء اور تفسیری مطلب

فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا یعنی حساب کے لئے سب کو جمع کیا جائے گا۔ اس مطلب کی تائید دوسری آیت سے ہوتی ہے۔ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰی مِیْقَاتِ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ۔ مفسر سراج نے کہا شاید یہ مطلب ہو کہ پہلی مرتبہ صور پھونکنے سے تمام خلائق مر جائے گی۔ گوشت پوست رگ پٹھے ہڈیاں سب خاک ہو جائیں گی۔ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو از سرِ نو منتشر ذرات جمع ہو کر پیدائش ہوگی۔ گویا جمع سے مراد ہے منتشر اجزا کا جمع کر کے از سرِ نو پیدا کرنا۔

وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ یعنی کافروں کے سامنے دوزخ نمایاں ہوگی یا داخل ہونے سے پہلے اُسی کی ہیبت اور ہول انگیزی کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ صحیح مسلم میں ابن مسعود کی مرفوع روایت ہے کہ دوزخ کی ستر ہزار باگیں ہوں گی اور ہر باگ کو ستر ہزار فرشتے کھینچیں گے۔

اَلَّذِیْنَ کَانَتْ اَعْیُنُهُمْ۔ یہ کافروں کے جہنم میں داخل ہونے کی علت کا دن ہے یعنی اللہ نے تمام کائنات میں قدرت کی جو نشانیاں پیدا کی ہیں اور خود انسان کے اندر وحدانیت کے جو شواہد موجود کئے ہیں، نیز قرآن پاک میں جو آیاتِ ہدایت مذکور ہیں ان سب کو سطحی نظر سے کفار دیکھتے تھے۔ غور و خوض کر کے اصل مغز تک نہیں پہنچے اور جب قدرت کا فیبی منادی اور حق کا داعی یعنی رسول اقدسؐ اور مومن مخلص ان کو حق کی دعوت دیتے تھے تو گوشِ ہوش سے نہیں سنتے تھے۔ غرض یہ کہ عقل و فہم سے بالکل بے بہرہ تھے۔ اسی بنا پر مجاہد نے لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ کا ترجمہ لَا یَعْقِلُوْنَ کیا ہے۔

اَنْ یَّتَّخِذُوْا عِبَادِیْ یعنی اللہ کے بندوں کو اللہ کے مقابلے میں خاص بنانے کے لئے پرستش کرنا بالکل حماقت ہے۔ جب وہ بندے ہیں اور بندگی ہی ان کی عزت کا سبب ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ معبود ہونے پر راضی ہوں اور بالفرض اگر وہ راضی بھی ہوں تو اللہ کے مقابلے میں حمایت کیسے کر سکتے ہیں۔ عابد و معبود اور مخلوق و خالق کا مقابلہ کیسے ممکن ہے۔

اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْکٰفِرِیْنَ نُزُلًا۔ ہر شخص کی مہمانی اس کے احوال کے مناسب ہوتی ہے۔ کافروں کے عقائد، اعمال، اقوال، غرض زندگی کا ہر کارنامہ چونکہ عذاب اور سزا کا موجب تھا، اس لئے ان کی جو ضیافت و مہمانی ہوگی وہ بھی اُنہی کے لائق ہوگی۔

بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا۔ اہلِ کفر اپنے معبودوں کی عبادت میں کوشش کرتے ہیں، ان کو ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں۔ اپنے مذہب کی طرفداری میں جان و مال صرف کرتے ہیں، حق کو مٹانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں اور اس کو فلاحِ اُخروی کا سبب جانتے ہیں، لیکن واقع میں ان

کی یہ تمام کوششیں بے سود ہیں۔ خلاف حق روپیہ صرف کرنا اور ہر قسم کی سعی کرنی موجب خسران ہے۔ باطنی نجاست کو دور کرنے سینکڑوں ہزار دن روپیہ صرف کر کے گنگا اشنان کو جانا، مورتیوں کے سامنے جانی اور مالی بھینٹ چڑھانا، ہاتھ پاؤں خشک کر کے سادھو بن جانا کوئی کام سود مند نہیں۔ باطل رسوم اور بے بنیاد رواج پر کاربند ہونا اور اس کی پابندی کے لئے مصائب برداشت کرنا، دنیوی رسوم کو احکام الٰہی سمجھنا اور طاغوتی رواجوں کو عبادت جاننا بجائے مفید ہونے کے آخرت میں ضرر رساں ہوگا۔

ابن عباس اور سعد بن ابی وقاص کا قول ہے کہ اَلْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا سے یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ مجاہد کا بھی یہی قول ہے۔ فتح البیان میں مذکور ہے کہ حضرت علیؓ کے نزدیک تارک الدنیا راہب مراد ہیں، لیکن صحیح یہ ہے کہ ان بزرگوں نے صرف تمثیل کے لئے یہود و نصاریٰ وغیرہ کا ذکر کیا حصر مقصود نہیں، مجوسی ہوں یا ہندو، یہودی ہوں یا مسیحی، خوارج ہوں یا روافض کوئی فرقہ ہو بلکہ اہل سنت میں سے وہ لوگ جو رسوم و بدعات کو مستحب اور سنت سمجھتے ہیں سب کو آیت کا حکم شامل ہے۔ ہر شخص اور ہر فرقہ جو جہل مرکب میں مبتلا ہو، اچھے کو برا اور برے کو اچھا سمجھتا ہو وہ فاسد الاعمال ہے۔

بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ ۔ آیت کا لفظ عام ہے۔ حوادث و انقلابات زمانہ اور فصول کے تغیرات، اقوام و ممالک کا مد و جزر، سلطنتوں کا عروج و زوال قرآن پاک کی آیات، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات یہ تمام نشانہائے قدرت ہیں۔

وَلِقَائِهٖ لقاء، سے مراد ہے اللہ کے سامنے جانا، اس سے ملنا، حساب کے لئے پیش ہونا خواہ مجرمانہ حالت میں یا اعزاز و اکرام کے ساتھ ہو۔ بعض لوگوں نے لقاء سے دیدار مراد لیا ہے۔ اس تقدیر پر معتزلہ کے عقیدہ کی غلطی پر نص ہوگی جو دیدار الٰہی کو قیامت کے دن بھی محال جانتے ہیں۔

فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا ۔ وزن قائم نہ ہونے سے مراد ذلت و حقارت ہے۔ یعنی کافروں کے اعمال بہت ہی حقیر و ذلیل ہوں گے اللہ کے نزدیک ان کا کوئی وزن ہی نہ ہوگا۔ امام بخاری نے بروایت حضرت ابوہریرہ مرفوعاً بیان کیا ہے کہ بعض موٹے تازے لمبے چوڑے آدمیوں کو قیامت کے دن لایا جائے گا، مگر اللہ کے نزدیک ان کا وزن مچھر کی برابر بھی نہ ہوگا۔ حضورؐ نے یہ حدیث ارشاد فرمانے کے بعد یہی آیت تلاوت فرمائی (وقدروا کالم فی صحیح) بعض لوگوں نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ کفار کے اعمال کا وزن تو ہوگا مگر ان کے اعمال میں ثقل نہ ہوگا۔ قیامت کے میزان عدل فقط اہل ایمان کے اعمال حسنہ و سیئہ معلوم کرنے کے لئے نہیں ہوگی بلکہ کافروں کے اعمال بھی تولے جائیں گے۔ حضرت ابوسعید خدری نے فرمایا قیامت کے دن بعض لوگوں کے اعمال سامنے لائے جائیں گے جو حجاز کے پہاڑوں سے بھی زیادہ بھاری ہوں گے مگر وزن کشی کے وقت ان کا کچھ وزن نہ ہوگا (کذا فی السراج)

جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ ۔ ابن جریر نے کہا کہ مجاہد کے نزدیک فردوس رومی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی باغ کے ہیں۔ عکرمہ کے قول کے موافق حبشی زبان کا لفظ ہے۔ کعب، ضحاک اور سدی نے کہا فردوس اس باغ کو کہتے ہیں جس میں انگور کی بیلیں ہوں۔ حضرت ابو امامہ باہلی نے صرف جنت ترجمہ کیا ہے۔ قتادہ نے کہا وسط جنت کو فردوس کہتے ہیں۔ بہرحال فردوس کا لفظ رومی ہو یا حبشی نزول قرآن کے وقت عربی میں مستعمل تھا اور اہل طائف اس کو استعمال کرتے تھے۔ گویا منتقل یا معرب بن گیا تھا۔

لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ۔ یعنی اہل جنت کا وہاں عیش و آرام دیکھ کر ایسے مانوس ہو جائیں گے کہ تبدیلی حالت کی ان کی خواہش ہی نہ ہوگی۔ آدمی کی طبعی خاصیت ہے کہ دوامی آسائش سے بھی گھبرا جاتا ہے۔ لذیذ کھانا، بیش بہا لباس اور راحت بخش مسکن سے بھی ترنگی طبیعت کی وجہ سے کچھ دیر کے لئے تغیر کا خواستگار ہو جاتا ہے۔ مگر اہل جنت کی یہ حالت نہ ہوگی وہ اسی حالت میں ہمیشہ خوش رہیں گے۔

مقصود بیان
قیامت کا منظر بہت ہولناک ہوگا۔ جن و انس باہم گڈمڈ اور مخلوط ہوں گے۔ کسی کو کسی کا خیال نہ ہوگا۔ صور پھونکنے کے ساتھ ہی منتشر ذرات جمع ہو کر تخلیق ثانی ہو جائے گی۔ تخلیق جہنم اصل میں کافروں کے لئے ہوتی ہے (اگرچہ عارضی مدت کے لئے اس میں گنہگار مسلمان بھی داخل ہوں گے) چشم بینا اور گوش ہوش علم کے ذرائع ہیں۔ جب یہ دونوں ذرائع معطل ہو جاتے ہیں تو دل سے نور اور ادراک زائل ہو جاتا ہے اور آدمی ایقان و ایمان سے محروم رہ جاتا ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو حاجت روا، دیوتا اور معبود بنانا شرک ہے۔ جہل مرکب بری بلا ہے۔ بری بات کو اچھا جان کر کرنا سخت ترین جرم ہے۔ ریاکاری، جاہ طلبی، شہرت پسندی اور تحصیل وجاہت کے لئے نیک کام کرنا مفید نہ ہوگا۔

سب کیا کرایا برباد ہو جائے گا۔ اللہ کے سامنے جانا اور اس سے ملنا حق ہے۔ احکام شریعت اور انبیاء کا مذاق اڑانا کفر ہے۔ جنت کی نعمتوں سے کبھی نفرت پیدا نہ ہوگی۔ فردوس کسی ایک جنت کا نام نہیں بلکہ مختلف باغات کے مجموعہ کا نام ہے۔

خلاصہ یہ کہ کفر و شرک سے ترہیب، دوزخ کی ہولناکی کی تصویر کشی کو آیات مذکورہ میں اظہار کیا گیا ہے اور آخر میں نیکوکار اطاعت شعار اہل ایمان کی جزائے خیر کا بیان ہے وغیرہ۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ

(اے نبی) کہہ دو کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کو سمندر روشنائی بن جائے تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے قبل سمندر ختم

رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ

ہو جائے گو اگر ہم اس کی مثل ہم ایک سمندر اور زیادہ کر دیں کہہ دو کہ میں تو تمہاری طرح صرف انسان ہی ہوں (ہاں) میرے پاس وحی کی گئی

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا

کہ تمہارا رب معبود یکتا معبود ہے لہٰذا جو شخص اپنے رب سے ملنے کی امید رکھتا ہو وہ نیک کام کرے

وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ ع

اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے

تفسیر جب یہودیوں کو معلوم ہوا کہ روح کی حقیقت کامل طور پر رسول پاک ؐ نے ظاہر نہیں کی اور آیت يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا میں صراحت کر دی گئی کہ تم کو علم کا تھوڑا حصہ ملا ہے تو یہودی کہنے لگے واہ ہمیں توریت ملی ہے جس کے اندر ہر چیز کا بیان و صراحت کے ساتھ ہے۔ جب ہم کو توریت مل گئی تو ہر چیز کا علم مل گیا۔ اس وقت آیت مذکورہ نازل ہوئی (معالم)

اللہ کی صفات تین قسم کی ہیں۔ صفات ذاتیہ، صفات فعلیہ اضافیہ، صفات فعلیہ غیر اضافیہ۔ صفات ذاتیہ اور صفات فعلیہ غیر اضافیہ کا سمجھنا اور ان کی حقیقت کا ادراک کرنا انسانی طاقت سے خارج ہے۔ اللہ کا وجود، اس کی حیات، علم، حکمت، بقا وغیرہ کا کون کما حقہ ادراک کر سکتا ہے۔ جو مفہوم انسان کے دماغ میں آتا ہے وہ محدود ہے۔ متناہی ہے حادث ہے محصور ہے اور صفات الٰہیہ غیر محصور غیر محدود غیر متناہی اور قدیم ہیں۔ رہے اوصاف فعلیہ اضافیہ تو یہ وہی صفات ہیں جن کو فضائل کہا جاتا ہے۔ یہی فیضان الٰہی ہے جس کے دامن سے عالم خلق وامر کا ذرہ ذرہ وابستہ ہے۔ معانی ہوں یا اعیان، حقائق ہوں یا ارواح سب فیضان ازلی کے منت کش ہیں ایک ایک ذرہ پر جو احسان الٰہی ہے اس کو کون شمار کر سکتا ہے۔ کسی میں طاقت ہے کہ قلبی الہام، اندرونی خطاب اور باطنی انعام کا احاطہ کر سکے۔ اگر بالفرض کل سمندروں کو روشنائی بنا لی جائے بلکہ اس سے بھی زیادہ چند در چند حصے پانی کو روشنائی کی شکل میں تبدیل کر کے اس سے اللہ کے احسانات انعامات، آیات قدرت اور نشانہائے ربوبیت کو لکھا جائے تو سمندر خشک ہو جائیں، کل پانی ختم ہو جائے، مگر کلمات الٰہیہ کے بحر ناپید کنار کی انتہا نہ ملے۔ آخر سمندر بھی اسی کے فیض کے مرہون منت ہیں۔ ہر قطرہ کا وجود بقائے تغیر، انقلاب ہیئت، رنگ، کیفیت، مزہ، بو وغیرہ دست قدرت کی کرشمہ سازی اور صناعی کا آئینہ دار ہے۔ پھر کون سا دریا ایسا ہو سکتا ہے جس کی روشنائی سے اس کی ہستی اور اجزائے ہستی کے انعامات کو لکھا جائے۔ دوسری کائنات کا احاطہ تو بجائے خود رہا۔ سچ فرمایا ہے وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ

مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ سَبۡعَةُ اَبۡحُرٍ مَّا نَفِدَتۡ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۔۔۔۔۔۔۔ اسی مضمون کو لَوۡ كَانَ الۡبَحۡرُ مِدَادًا لِّـكَلِمٰتِ رَبِّىۡ ۔۔۔۔ الخ تک فرمایا ہے ۔ اس سے آگے نبوت کی حقیقت ، توحید الوہیت کی ماہیت اور عدم شرک فی العبادت کی وضاحت فرمائی ہے ۔ ہم تفصیل کے ساتھ توضیح کرتے ہیں ۔

رسول پاکؐ نے ہدایت عامہ کے لئے قرآن مجید پیش کیا ۔ قرآن کامل کا مقصد صرف ایک ہے ۔ یعنی عقائد اعمال کی اصلاح اور سعادت دارین کا حصول ، مگر ایک مقصد کو تنوع بیان کے اعتبار سے تین شاخوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔

(۱) عقائد و اعمال کی اصلاح کے لئے ان ضوابط عامہ اور قواعد کلیہ کا بیان جن پر کاربند ہو کر آدمی فائز المرام ہو سکتا ہے اور جن کی تکمیل کے بغیر نجاتِ ابدی ناممکن ہے ۔ اس کے ذیل میں مبدء و معاد ، اللہ کی صفات و ذات ، ملائکہ ، انبیاء اور کتب سماویہ کے متعلق تفصیل ایمان معاشرت ، مدنیت ، اخلاق ، سیاست وغیرہ کے کلیات پر عمل اور تمام عبادات و معاملات داخل ہیں ۔ یہ کلیات و اصول وہ ہیں جو ازل سے ابد تک ہر قوم ، ہر ملک اور ہر شخص کے لئے یکساں مفید ہیں ۔ بادشاہ ہو یا فقیر ، عالم ہو یا جاہل ، وحشی بربری حیوان ہو یا مہذب انسان ، جنگلی ہو یا شہری ، بدوی ہو یا حضری کوئی ان اصول کی فرضیت سے مستثنیٰ نہیں اور ان قواعد کی اصلاحی حیثیت اور افادی حقیقت سب کے لئے ایک طرح کی ہے ۔ ذکی الدماغ حکماء اور فلاسفروں کے قائم کئے ہوئے قوانین اصلاح بدل جائیں ، جمہوریتوں اور جمہوریوں کے نافذ کئے ہوئے اصول و فیصلے ٹل جائیں ، سلطنتوں اور حکومتوں کے ضوابط غیر مفید اور ناکارہ ہونے کی وجہ سے منسوخ کر دئے جائیں ، مگر یہ قوانین الٰہیہ ناقابلِ نسخ اور ناقابلِ ترمیم ہیں ۔ سطح زمین پر رہنے والے ازل سے ابد تک ان میں تغیر نہیں پیدا کر سکتے ۔ آسمانی اور فضائی مخلوق ان کی تنسیخ نہیں کر سکتی ، اس لئے کہ یہ انسانی دماغ کی اختراع نہیں ۔ جمہوری مشوروں کے ممنونِ کرم نہیں ۔ فلاسفروں کے غور و خوض اور ریفارمروں کے تامل ذہنی کا نتیجہ نہیں ۔

(۲) قرآن نے اُن واقعات پر بھی روشنی ڈالی ہے جو دنیا کی تاریخ میں مٹے ہوئے تھے ۔ نسلِ انسانی میں ان کی تحقیقات کی جد و جہد اُٹھ چکی تھی ، ہر گروہ جدا انکشاف کا مدعی تھا اور ہر مورخ اپنی تنقیح کو صحیح سمجھے بیٹھا تھا ۔ مثلاً ذوالقرنین کا قصہ ، اصحاب کہف کا واقعہ ، اقوام امم کی تفصیل حالت ، فراعنۂ مصر اور نمارد ۂ بابل کی سرگذشت وغیرہ ۔ قرآن نے جتنا تحقیقی مادہ پیش کیا ، اہل نظر انتہائی تحقیق کے بعد بالاتفاق اُسی نتیجہ پر پہنچے ۔ کہیں سر مو تفاوت نظر نہیں آتا ۔ بعض وہ اسرار تھے جن کو بلا شرکتِ غیرے جاننے کے مدعی اہلِ کتاب تھے ۔ قرآن نے ان پر بھی بصیرت افروز روشنی ڈالی اور کما حقہٗ ان کا انکشاف کیا ۔

(۳) نزولِ قرآن کے بعد سے قیامت تک جو واقعات پیش ہونے والے تھے ان میں سے بہتوں کے متعلق قرآن نے قبل از وقت اطلاع کر دی ۔ واقعات اور پیشین گوئیوں میں بعض کا ظہور حضور اقدسؐ کے زمانے میں ہو گیا ۔ بعض کا وقوع بعد میں ہوا ۔ بعض کا انتظار ہے جو یقینی ظہور پذیر ہوں گے ۔

روشن نظر رکھنے والے جب قرآن کے ان تینوں مباحث پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں اور پھر اس بات پر بھی غور کرتے ہیں کہ قرآن پاک کو پیش کرنے والے حضور اقدسؐ ہیں جو رسمی تعلیم و تعلم سے ناآشنا ، روایتی نوشت و خواند سے بے بہرہ اور علمائے عالم کی صحبت سے بے نیاز تھے تو اُن کو حضور اقدسؐ کی ذات میں الوہیت کا پرتو نظر آتا ہے ۔ وہ آئینۂ نبوت کو نورِ الٰہی کا جلوہ کش نہیں سمجھتے بلکہ الوہیت کا مظہر حلول قرار دینے کی طرف مائل ہو جاتے ہیں ۔ مسلمانوں میں بہت سے لوگ اس گمراہی کے غار میں گر بھی پڑے ۔ کچھ مبالغہ و افراط کے جال میں گرفتار ہو گئے (حالانکہ اسی گمراہی کی بیخ کنی کرنے کے لئے اسلام آیا تھا) اس لئے قرآن پاک نے صاف اعلان کر دیا کہ رسول پاکؐ انسانی کدورت سے پاک نہیں ۔ کھانا ، پینا ، چلنا پھرنا ، سونا جاگنا ، نکاح کرنا ، صاحبِ اولاد ہونا ، لباس پہننا بہرحال مادہ اور مادیات کا جو اقتضا ہے اُس سے رسول اقدسؐ منزہ نہیں ۔ خواص بشری ان کے اندر بھی ویسا ہی موجود ہیں جو دوسرے انسانوں میں ہیں ۔ ہاں ان کو ایک مخصوص امتیاز حاصل ہے وہ یہ کہ دوسروں کے پاس اللہ کی طرف سے تبلیغ وحی نہیں آتی اور رسول اللہ کے پاس وحی آتی ہے ، علمی طریق آتی ہیں اور یہ پیام موصول ہوتا ہے کہ اللہ الوہیت و معبودیت میں یکتا و بے ہمتا ہے ۔ خلوص کے ساتھ لوجہ اللہ اچھے کام کرنا قربِ الٰہی تک پہنچاتا ہے ۔ شرک فی العبادت حرام ہے ۔ پس یہ امتیاز ہے

رسول اقدسؐ اور دوسرے انسانوں میں اور یہ خصوصی شرف ہے جو حضور والا کو حاصل تھا۔ گویا آئینہ نبوت نورِ الٰہی کا جلوہ کش اور مخلوق پر پرتو انداز ہے۔ یہی وہ درمیانی زینہ ہے جس کے بغیر قرب الٰہی کی سطح تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جندب بن زہیر عامری نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں عمل تو لوجہ اللہ کرتا ہوں، لیکن کسی کو اس کی اطلاع ہوتی ہے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اللہ ایسے عمل کو قبول نہیں کرتا جس میں کوئی دوسرا شریک ہو جائے۔ اسی وقت حضورؐ کے قول کی تصدیق میں فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا سے اختتام سورۃ تک آیۃ نازل ہوئی۔

تحلیل اجزاء

طبرانی نے بروایت معاویہ بن ابو سفیان بیان کیا ہے کہ سب سے آخر میں یہ آیت نازل ہوئی قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ الخ۔ بظاہر یہ قول غلط ہے۔ کیونکہ صحیح اسناد سے ثابت ہے کہ سب سے آخری آیت وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ الخ ہے۔ اس لئے راوی کا مطلب یا یہ ہے کہ سورۂ کہف میں سب سے آخری آیت یہی ہے یا یہ مراد ہے کہ اعلانِ نبوت کے متعلق یہ سب سے آخری آیت ہے۔

آیت مذکورہ میں مماثلت ومشابہت انسانی مراد ہے۔ حوائج ضروریہ اور ضروریات بشریہ میں مساوات ظاہر کرنی مقصود ہے اور الوہیت کے شبہ کو رفع کرنا غرض ہے۔ اس سے کمالات نبوت کی نفی اور حضور پاکؐ کی عظمت شان کا سلب لازم نہیں آتا نہ اور کسی قسم کی تنقیص وتوہین مترشح ہوتی ہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا۔ رجاء کے دو معنی ہیں۔ خوف اور امید۔ آیت میں دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ اللہ کے عذاب کا خوف اور رحمت کی امید جس شخص کو ہوگی وہ لوجہ اللہ عمل صالح کرے گا۔

وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا۔ اس میں صرف شرک ہی کی نفی نہیں بلکہ ریاکاری کی بھی ہے۔ کیونکہ ریاکار جب غیر کے دکھلانے اور سنانے کو عبادت کرتا ہے تو گویا اس نے غیر اللہ کی یا غیر اللہ کے لئے عبادت کی اور غیر خدا کو شریک فی العبادت کیا۔ یہی شرک خفی ہے۔

ابو سعید بن ابی فضالہ صحابی راوی ہیں کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا جب قیامت کے دن اللہ اگلے پچھلوں کو جمع کرے گا تو ندا ہوگی کہ اگر کسی شخص نے کوئی ایسا عمل جو محض اللہ کے لئے ہونا چاہیئے کسی اور کو شریک کر کے کیا ہو تو اس عمل کا ثواب بھی وہ اسی غیر سے طلب کرلے۔ اللہ شرکاء سے بے نیاز ہے (رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ والبیہقی)

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! آدمی اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے، مگر اس کو مال کا لالچ ہوتا ہے۔ فرمایا اس کے لئے کوئی ثواب نہیں۔ لوگوں پر یہ حکم شاق گزرا۔ واپس آکر اس شخص نے دوبارہ دریافت کیا۔ حضورؐ نے پھر وہی قول فرمایا (رواہ البیہقی الحاکم وصححہ)

حضرت شداد بن اوسؓ کی روایت ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے دکھانے کی نیت سے نماز پڑھی اس نے شرک کیا جس نے دکھلانے کی نیت سے روزہ رکھا اس نے شرک کیا۔ جس نے دکھانے کی نیت سے خیرات کی اس نے شرک کیا۔ پھر حضورؐ نے آیت مذکورہ پڑھی (رواہ احمد والطبرانی والحاکم والبیہقی)

شداد بن اوس کی روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میرے نزدیک دجال سے زیادہ خوفناک شرک خفی ہے وہ یہ کہ کسی کو دکھانے کے لئے آدمی نماز پڑھنے کھڑا ہو (رواہ احمد الحاکم وصححہ والبیہقی)

عبد اللہ بن قیس خزاعی کی روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص دکھانے اور سنانے کو (نماز میں) کھڑا ہو وہ اس وقت تک غضبِ الٰہی میں رہے گا جب تک بیٹھ نہ جائے یعنی دکھاوٹ کی نماز موجب رحمت ہونے کی بجائے باعث غضب ہے (رواہ ابن کثیر)

الحاصل آیت میں شرک جلی اور شرک خفی دونوں کی ممانعت ہے۔ احادیث میں ریاکاری کو شرک خفی کہا گیا ہے۔

مقصودِ بیان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بشر ہونے کی صراحت اور در پردہ آپ کی الوہیت کی نفی۔ حضورؐ کی خصوصی عظمت شان کا بیان۔

شرک جلی اور شرک خفی کی پرزور ممانعت، غیر خدا کے لئے عبادت کرنے سے باز داشت۔ الغرض توحید، نبوت اور عدم شرک کے مضامین پر سورت کا اختتام

سُوْرَةُ مَرْيَمَ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ ثَمَانٌ وَّتِسْعُوْنَ اٰيَةً وَّسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورہ مریم مکہ میں نازل ہوئی اس میں اٹھانوے آیتیں اور چھ رکوع ہیں

اس سورت کے آغاز کے قریب ہی حضرت عیسیٰ کی ولادت اور حضرت مریم کے واقعہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس لئے اس کا نام مریم رکھ گیا۔

اس سورت میں سات سو باسٹھ کلمات اور تین ہزار آٹھ سو دو یا تین ہزار نو سو چھیاسی حروف ہیں اور اٹھانوے آیات ہیں۔

ابن عباسؓ، عبد اللہ بن زبیرؓ اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کی روایات سے ثابت ہے کہ پوری سورت مکی ہے۔ بیضاوی نے آیت سجدہ کو مدنی قرار دیا ہے۔ شیخ جلال محلی نے آیت سجدہ کے ساتھ آیت فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ آخر کو بھی مدنی کہا ہے۔

حضرت مریم کا (بقول ابن کثیر) قرآن میں ۳۰ تیس جگہ نام آیا ہے۔ سوائے مریم کے اور کسی عورت کا نام قرآن میں نہیں آیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

اس سورت میں چند انبیاء اور صلحاء کا تذکرہ ہے جس کو پڑھنے سے قلبی لامحدود قدرت کی ہمہ گیریاں اور کرشمہ سازیاں معلوم ہوتی ہیں۔ نیک لوگوں پر عنایت و نوازش اور بدشعاروں پر نزول عذاب کی کیفیت معلوم ہو کر ایمان و عمل صالح کی رغبت اور کفر و عصیاں سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔

كٓهٰيٰعٓصٓ ۝ ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝

یہ تذکرہ ہے تمہارے پروردگار کی مہربانی کرنے کا اپنے بندے زکریا پر جب اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ

بولا اے میرے رب میری ہڈیاں کمزور پڑ گئیں اور سر بڑھاپے سے سفید ہو گیا اور اے میرے رب میں تجھ سے مانگنے میں

رَبِّ شَقِيًّا ۝ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ

کبھی محروم نہیں رہا مجھے اپنے بعد اپنے بھائی بندوں کا اندیشہ ہے اور میری بیوی بانجھ ہے لہٰذا تو اپنی طرف

مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝

سے ایک ولیث عطا فرما جو میرا اور خاندان یعقوب کا وارث ہو اور اے پروردگار! اس کو پسندیدہ بنا

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝ قَالَ رَبِّ

اے زکریا ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ ہوگا ہم نے اس سے پہلے اس نام کا کوئی نہیں پیدا کیا زکریا نے کہا

أَنّٰى يَكُونُ لِي غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ○ قَالَ كَذٰلِكَ

اے میرے رب میرے لڑکا کیسے ہوسکتا ہے میری بیوی تو بانجھ ہے اور میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ گیا ہوں (فرشتے نے کہا) ایسا ہی ہوگا

قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ○ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ

تمہارے پروردگار نے فرمادیا ہے کہ یہ کام ہم پر آسان ہے میں نے اس سے پہلے بھی تو پیدا کیا حالانکہ تو کچھ بھی نہ تھا زکریا نے کہا پروردگار میرے

لِّيْ اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ○ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ

لئے کوئی علامت مقرر کردے فرمایا تیری علامت یہ ہے کہ تین رات دن بھلے چنگے ہونے کے باوجود لوگوں سے بات نہ کرسکے گا اس کے بعد حجرے سے نکل کر اپنی قوم کے

الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ○

پاس آیا اور اشارہ سے اُن سے کہہ دیا کہ صبح وشام اُس کی پاکی بیان کرتے جاؤ

تفسیر حضرت زکریا ابن آذر بن مسلم ایک اسرائیلی نبی تھے۔ نجاری کا پیشہ کیا کرتے تھے۔ اپنے زمانے میں تمام بنی اسرائیل کے پیشوا اور بیت المقدس کے متولی تھے۔ آپ کے زمانے میں یہودی برسرِ حکومت نہ تھے بلکہ سلطنت روم کے محکوم تھے۔ حکومت روم کی طرف سے ایک گورنر یروشلم میں رہتا تھا جس کا خاندانی لقب ہیرودوس تھا۔ ہیرودوس کے زمانے میں ہی بیت المقدس کی ازسرنو تعمیر ہوئی تھی۔ حضرت زکریا کی بیوی کا نام الیشبات تھا۔ بعض مفسرین نے اشاع عنت فاقوذ بن ہیل لکھا ہے۔ اشاع حضرت مریم کی والدہ حنہ کی بہن تھی۔ اس صورت میں حضرت یحییٰ حضرت مریم کے خالہ زاد بھائی ہوئے۔ مگر قتیبی نے ذکر کیا ہے کہ اشاع عمران کی بیٹی تھی اور مریم کے والد کا نام بھی عمران تھا۔ اس صورت میں حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ خالہ زاد بھائی ہوئے۔ یہی صحیح بھی ہے۔ صحیح حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت زکریا کی عمر جب ۱۲۰ سال کی ہوگئی تو لاولد ہونے کی وجہ سے آپ کو اندیشہ ہوا کہ قوم کی حالت ویسی ہی ابتر ہو رہی ہے۔ بڑی مشکل سے کچھ تنظیم ہوئی ہے میرے بعد قوم کا کیا حال ہوگا۔ عزیزوں اور رشتہ داروں میں کسی کے اندر امامت کی صلاحیت نہیں۔ اگر کوئی خود غرض دنیا پرست امام ہوگیا تو اسرائیلیوں کی حالت اور تباہ ہوجائے گی۔ انتہائی فکر کے بعد جب عالم اسباب میں کوئی ساز وسامان درست ہونے کی اُمید نہ رہی تو ایک رات کو بارگاہِ الٰہی میں مناجات ودعا کی اور کل دنیا سے الگ ہو کر پروردگار سے عرض کیا کہ الٰہی کبھی تو نے مجھے محروم نہیں کیا میری التجا کو پورا کیا، پروردگار اب میں بوڑھا ہوگیا، سر سفید ہوگیا، قوت نے جواب دے دیا۔ مجھے اعزاء واقارب کی طرف سے اندیشہ ہے کہ یہ لوگ انتظام ملت درست نہ رکھ سکیں گے۔ میرے کوئی اولاد نہیں اور ظاہری حالت دیکھتے ہوئے اولاد کی اُمید نہیں۔ بیوی بانجھ ہے۔ میں بوڑھا ہوں۔ تو اپنے کرم سے مجھے ایک فرزند عطا فرما جو میری امامت ونبوت کا وارث ہو اور نسل یعقوب سے سلسلۂ علم منقطع نہ ہو۔ فرشتہ نے اللہ کی طرف سے بشارت دی کہ تمہاری دعا قبول ہوئی۔ خدا تعالیٰ تم کو ایک فرزند عطا کرے گا۔ حضرت زکریا کو فرزند سُن کر تعجب ہوا کہ خدا جانے میں جوان ہوجاؤں گا یا دوسرا نکاح کرنے کا حکم ہوگا یا بڑا توسط بوڑھے باپ اور ناقابل حمل ماں کے بطن سے بچہ پیدا ہوگا؟ جواب ملا تعجب کی کوئی بات نہیں تغیر کچھ نہ کیا جائے گا یونہی بچہ پیدا ہوگا۔ نیست سے ہست کرنے کی مثال ہو چکی ہے۔ تم خود پہلے معدوم تھے۔ خدا نے تم کو بنایا۔ خالق اسباب کو بلا سبب کسی شے کا موجود کرنا کون مشکل کام ہے۔ حضرت زکریا نے استقرارِ حمل کی علامت دریافت کی۔ فرشتہ نے بحکم الٰہی جواب دیا۔ علامت یہ ہے کہ تم تین شبانہ روز کسی سے بات نہ کر سکو گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ چونکہ نماز کی امامت حضرت زکریا کرتے تھے، اس لئے جب قوم والے نماز کے لئے جمع ہوئے اپنے عبادت خانہ سے برآمد ہوئے۔ طاقت گویائی نہ تھی۔ اشارہ سے کہا تم لوگ صبح شام نمازیں پڑھتے جاؤ

میرا انتظار کرو۔ دعوتی نبوت میں گزرنے کے بعد یحییٰ پیدا ہوئے۔ بچپن کو بچپن ہی سے دانائی رقت قلب، طہارت نفس، پرہیزگاری، والدین کی فرماں پذیری اور نیکوکاری عطا کی گئی تھی۔

تحلیل اجزاء

کٓهٰیٰعٓصٓ۔ تمام حروف مقطعات متشابہات میں داخل ہیں۔ جن کا مغز اور اصل مفہوم سوا خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ ہاں تفسیری احتمالات علماء نے بیان کئے ہیں۔ کٓهٰیٰعٓصٓ کے متعلق ابن عباسؓ نے فرمایا کہ کاف سے کبیر، ہا سے ہادی، یا سے امین، عین سے عزیز اور صاد سے صادق کی طرف اشارہ ہے۔ ابن مسعود اور بعض دوسرے صحابہ کا قول ہے کہ ہجار ہیں اور ہر حروف سے ایک اسم کی طرف اشارہ ہے۔ کاف سے ملک۔ ہا سے اللہ۔ عین و یا سے عزیز اور صاد سے مصور مراد ہے۔ گویا کٓهٰیٰعٓصٓ کا مجموعہ ہوا

ام ہانی کی روایت ہے کہ کٓهٰیٰعٓصٓ کافی، ہادی، عالم، الصادق کا مخفف ہے۔ ایک روایت میں ابن عباس کا قول ہے کہ تمام حروف مقطعات اسمائے الٰہی ہیں۔ قتادہ کا قول ہے اسمائے قرآن ہیں۔ کلبی نے کہا یہ اللہ کی ثناء ہے۔ ام المومنین صدیقہؓ فرماتی تھیں کہ متشابہات کے پیچھے پڑنے والے کو سزا دی گئی تھی، اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم بھی جلالین اور سراج کا اتباع کرتے ہوئے کہہ دیں کہ اللہ اعلم بمرادہٖ۔

وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ۔ اعضاء اجزائے انسانی میں ہڈیاں سب سے مضبوط اور سخت ہیں۔ انتہائی کمزوری یہی ہوسکتی ہے کہ ہڈیاں بھی کمزور پڑجائیں۔ عضلات، شرائین، وریدیں، اوتار اعصاب کا ضعف تو عام طور پر ہوجاتا ہے، مگر آخری عمر میں انتہائی کمزوری کے وقت ہڈیاں بھی کمزور ہوجاتی ہیں۔ حضرت زکریا کا اپنی بیش از بیش کمزوری کا اظہار کرنا مقصود تھا، اس لئے ہڈیوں کا ضعف ظاہر کیا۔

خِفْتُ الْمَوَالِيَ۔ موالی سے مراد عام اعزا و اقارب اور رشتہ دار ہیں۔ خواہ عصبات ہوں یا ذوی الفروض یا ذوی الارحام۔ حضرت زکریا کو اندیشہ تھا کہ میرے بعد قوم کی حالت تباہ ہوجائے گی۔ تمام خاندان میں سے کسی میں امامت کی قابلیت نہیں۔ خود غرضی اور خود پستی کی وجہ سے کوئی قوم کی اصلاح نہ کر سکے گا۔

يَرِثُنِيْ۔ میراث سے مراد مالی میراث نہیں۔ احادیث سے ثابت ہے کہ انبیاء کے مال کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ زکریا نبی تھے اور کسی نبی کے لئے آئندہ مال کی فکر کرنا سزاوار نہیں۔ کوئی پیغمبر مالی میراث کا اہتمام نہیں کرسکتا۔ پھر مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ کا لفظ تو صاف دلالت کرتا ہے کہ میراث سے مراد امامت و نبوت ہے کیونکہ ان الفاظ سے اس وعدہ کو ظاہر کرنا مقصود تھا جو خدا تعالیٰ نے کیا تھا کہ ہم اپنی نعمت (نبوت) کامل طور پر اولادِ یعقوب کو دیں گے۔

اِسْمُهٗ يَحْيٰى۔ یحییٰ عربی نام ہے اصلی نام یوحنا ہے یا بالعکس۔

مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا۔ یعنی بنی اسرائیل میں اس سے پہلے کسی کا یہ نام نہیں ہوا۔ یہ قول قتادہ، ابن جریج اور ابن زید کا ہے۔ ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ ابن کثیر نے بروایت مجاہد و علی بن ابی طلحہ ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ سَمِيًّا سے مراد ہم نام نہیں بلکہ مثل اور مشابہ مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے یحییٰ کی طرح اس سے پہلے کسی کو نہیں پیدا کیا۔ اگرچہ یحییٰ سے پہلے بڑے جلیل القدر انبیاء گزر چکے ہیں، مگر اس شان سے مایوس الاولاد ماں باپ سے پیدا ہونا اور بچپن ہی سے حلیم، طاہر النفس، متقی، نیکوکار اور باورع ہونا ان صفات کا مجموعہ کوئی نبی نہیں گزرا۔ مرتبہ کی عظمت دوسری چیز ہے اور مخصوص احوال کا مجموعہ ہونا علیحدہ بات ہے۔

رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ۔ حضرت زکریا کو قدرتِ الٰہی میں کوئی شک نہ تھا وہ الٰہی طاقت کی ہمہ گیری پر حق الیقین رکھتے تھے۔ تعجب تھا تو نوعیت ولادت سے تھا کہ خدا جانے لڑکا کس طرح ہوگا۔ میں شیخ فانی، میری بیوی مایوس الولد ناقابل حمل۔ معلوم نہیں ہم دوبارہ جوان بنائے جائیں گے اور میری بیوی عقیم نہ رہے گی یا دوسرا نکاح کرنے کا حکم ہوگا یا یونہی بغیر قربت نفی، ور تعلقات ازدواجی کے لڑکا ہوجائے گا۔

قَالَ كَذٰلِكَ۔ یہ فرشتہ کا قول ہے۔

وَلَمْ تَكُ شَيْئًا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وسائل و اسباب پر عمل کرنا مقتضائے عبودیت ہے لیکن جہاں بغیر ظاہری اسباب کے کسی چیز کے حصول کا حکم ہو وہاں انکار کرنا جہالت ہے۔

رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً۔ حضرت زکریا نے یا تو استقرارِ حمل کی نشانی کی درخواست کی تھی جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں یا مزید اطمینانِ قلب کے لئے یہ التجا کی تھی۔

اہلِ تحقیق نے بیان کیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سے حضرت یحییٰؑ چھ ماہ بڑے تھے۔

ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا۔ ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، قتادہ، وہب، سدی، زید بن اسلم وغیرہ نے کہا کہ زکریا تین شبانہ روز بغیر کسی مرض کے بات نہ کر سکے۔ البتہ نماز اور تسبیح وغیرہ پڑھتے رہے۔ دعا و استغفار سے ان کی زبان گونگی نہ تھی۔

مِنَ الْمِحْرَابِ۔ محراب سے مراد مسجد ہے۔ بنی اسرائیل صرف مساجد میں نماز پڑھ سکتے تھے اور جگہ نماز پڑھنی جائز نہ تھی۔

فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ۔ یعنی اشارہ کر دیا (وہب و قتادہ) یا زمین پر لکھ دیا۔ یہ قول مجاہد و سدی کا ہے۔

مقصودِ بیان

نیک بخت خوش اعمال مومن لڑکا اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ کے لفظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو اللہ کا خاص بندہ ہوتا ہے اور اسباب دنیا سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کی کارسازی خدا تعالیٰ فرماتا ہے اور اس کے سوال کو رد نہیں کرتا۔ نِدَآءً خَفِيًّا کے لفظ سے یہ تعلیم دینی مقصود ہے کہ خدا تعالیٰ حاضر ناظر ہے اس سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ بندہ کو چاہیئے کہ انتہائی سچے دل سے زاری اور عاجزی کے ساتھ اللہ سے دعا کرے۔ وَهَنَ الْعَظْمُ الخ سے یہ تلقین کرنی مقصود ہے کہ دعا کے وقت سب سے پہلے بندہ پر لازم ہے کہ اللہ کی ربوبیت کا اقرار کرے۔ پھر اپنی کمزوری، بے بسی، اسباب کا منقطع ہو جانا اور ظاہری ساز و سامان کا مفقود ہونا ظاہر کرے۔ آخر میں اپنا مطلب کہے۔ خِفْتُ الْمَوَالِيَ سے یہ امر ظاہر کرنا مطلوب ہے کہ احکام الٰہی کی شکست، گناہ کی اشاعت، شریعت کی نافرمانی اور فسادِ عالم کا خوف ہو تو اگرچہ تدبیر کرنی ضروری ہے مگر اللہ سے دعا کرنی لازم ہے۔ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا۔ اس طرف اشارہ ہے کہ اگر اللہ سے اولاد کی تمنا کی جائے تو اولاد صالح کی کی جائے۔ اِنَّا نُبَشِّرُكَ نے اس طرف ایماء ہے کہ اللہ اپنے مخلص بندوں کی دستگیری ضرور فرماتا ہے۔ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ انبیاء کی ظاہری نظر بھی قدرت کے پیدا کئے ہوئے اسباب پر ہوتی ہے اور نظام فطرت کی کڑیاں وہ بھی ایک دوسرے سے وابستہ جانتے ہیں۔ اگرچہ مؤثر حقیقی وہ سوائے اللہ کے کسی کو نہیں جانتے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ آدمی کو اسباب کا فراہم کرنا اور قدرت کے فراہم کئے ساز و سامان کو درست کرنے کی کوشش کرنا ضرور چاہیئے، لیکن اس کے باوجود اسباب پر تکیہ اور بھروسہ کرنا جائز نہیں ہے۔ وَقَدْ خَلَقْتُكَ سے یہ بات ظاہر کرنی مقصود ہے کہ خدا اسباب کا محتاج نہیں نہ اسباب مؤثر ہیں نہ خدا مجبور ہے۔ وہ ان ظاہری اسباب کے علاوہ بھی باطنی اسباب پیدا کر کے کارسازی کر سکتا ہے۔ اسباب اس کی مشیت کے تابع ہیں مشیت اسباب کی پابند نہیں۔ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ یہ ہدایت کرنی مقصود ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آدمی کو وعظ و نصیحت اور اصلاح خلق کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر ہاتھ پاؤں سے ممکن نہ ہو تو زبان سے کرے اور زبان سے ممکن نہ ہو تو تحریر یا اشارات سے ہی کرے۔

پوری آیات کا اجمالی مقصود ہے کہ جب ظاہری اسباب مفقود ہو جائیں، کوئی سہارا نہ رہے، ہر طرف سے امید منقطع ہو جائے، کوئی کارساز اور سرپرست نظر نہ آئے تب بھی آدمی کو اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا چاہیئے۔ وہ کارساز حقیقی ہے اس سے زاری اور عاجزی کے ساتھ اگر سوال کیا جاتا ہے تو وہ سوال رد نہیں کرتا، مگر نیت بخیر ہونی ضروری ہے۔

نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے دعا کرنی بے سود ہے وغیرہ۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۙ○ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ؕ

اے یحییٰ کتاب کو مضبوطی سے پکڑ لے لڑکپن ہی سے یحییٰ کو ہم نے دانائی اور اپنی طرف سے رقتِ قلب اور طہارتِ نفس عطا کی تھی

وَكَانَ تَقِيًّا ۙ○ وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ○ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ

اور وہ پرہیزگار اور اپنے والدین کا فرماں بردار تھا سرکش نافرمان نہ تھا اس پر سلامتی پیدائش کے دن

وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾

اور مرنے کے دن اور اس دن جبکہ زندہ کر کے اس کو اٹھایا جائے گا

تفسیر خدا تعالیٰ نے انسان کو دو قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ عاقلہ اور عاملہ۔ ہر قوت کی شاخیں احاطۂ شمار سے خارج ہیں، لیکن مآل سب کا خیر و شر کی طرف ہوتا ہے۔ علم خیر اور علم شر، عملی خیر اور عملی شر۔ خدا تعالیٰ کے جو خاص بندے ہیں ان کی علمی اور عملی قوتیں خیر کی جانب متوجہ ہوتی ہیں اور بدکردار اشرار کی تمام طاقتیں شر کی طرف راغب رہتی ہیں۔ حضرت یحییٰ ذی وقار انبیاء میں سے تھے، اس لئے آپ کی علمیہ وعملیہ قوتیں شر سے خالی اور خیر سے معمور تھیں۔ آیاتِ مذکورہ میں خدا تعالیٰ نے آپ کے چھ صفات بیان فرمائے۔ ایک کا تعلق قوت علمیہ سے ہے اور پانچ کا تعلق قوت عملیہ سے ہے۔ جب انسان کی عقل شہوانی اور غضبی قوتوں سے مغلوب نہ ہو بلکہ سب پر حاکم ہو اور عقائد صحیح ہوں، افکار و خیالات درست ہوں، شیطانی علوم دماغ پر مسلط نہ ہوں، تمام نفسانی وسوسوں اور اوہام سے ذہن پاک ہو تو ایسا شخص صاحبِ حکمت کہلاتا ہے۔ اللہ نے ایامِ طفولیت ہی سے حضرت یحییٰ کو صاحبِ حکمت بنایا تھا۔ آپ کی دانش و فکر روشن تھی، بے ہودہ اور لغو اوہام سے پاک تھی، عقائد صحیح تھے، حق و باطل میں امتیاز کرنے کی واضح قوت تھی اور اللہ کے اوامر و نواہی (توریت وغیرہ) کا کامل علم آپ کو تھا۔ اس وصف کو خدا تعالیٰ نے وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ میں بیان فرمایا۔ جب انسانوں کی قوت غضبی حد اعتدال سے آگے بڑھ جاتی ہے تو خود پنداری، رعونت نفس اور غرور و تکبر پیدا ہو جاتا ہے وہ اپنی مثل کسی کو نہیں جانتا۔ اس کا نفس طاغوتی کل دنیا کو اپنے مقابلے میں ذلیل و حقیر سمجھتا ہے، جا و بیجا ظلم کرتا ہے، عام مخلوق خدا پر جور و ستم کرتا اور کسی کا اپنے نفس پر کوئی حق نہیں جانتا ہے۔ جن لوگوں میں یہ شیطانی خصلت بہت ہی قوی ہو جاتی ہے تو وہ والدین کا حق بھی ادا نہیں کرتے۔ ان کو بھی پائے استحقار سے ٹھکراتے ہیں، ان کے ساتھ نیکی کی جگہ بدی اور حسنِ سلوک کی بجائے ظلم و تعدی کرتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر آدمی آدمی نہیں رہتا۔ مالک کے فطری قوانین سے بھی سرکشی کرتا ہے۔ اللہ کے کسی حکم کو نہیں مانتا۔ اس کے نزدیک خدا کی ہستی یا تو موہومی چیز ہوتی ہے یا موجود بھی جانتا ہے تو خدا کو اپنے سے کمزور اور بے بس، اس کی خودی خودی کے درجہ سے بڑھ کر خدائی کی مدعی ہو جاتی ہے۔ پھر خدا کی فرماں پذیری اس کو کس طرح گوارا ہو سکتی ہے، لیکن اگر آدمی کی غضبی قوت اعتدال سے گری ہوئی ہو طبعی قوت مدافعت بہت ہی کمزور ہو تو اس سے بزدلی پیدا ہوتی ہے۔ ہاں اگر افراط و تفریط دونوں نہ ہوں تو مخلوق خدا پر شفقت پیدا ہوتی ہے۔ رقتِ قلب اور رحمت کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ وہ اپنے عزیزوں دوستوں اور غیروں کے ساتھ نرمی کرتا ہے، خوش خلقی برتتا ہے، ہر شخص کی ہمدردی کرتا ہے۔ حضرت یحییٰ میں قوت غضبی کے افراط کے تینوں درجے نہ تھے۔ نہ تو آپ مغرور اور خود پندار تھے نہ والدین کے ساتھ بدسلوکی کرتے تھے نہ خدا کے نافرمان تھے۔ ان تینوں اوصاف کا اظہار خدا تعالیٰ نے وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا میں فرما دیا۔ نفی جبر نے عدم غرور اور جود عمومی کے سلب کو ظاہر فرمایا۔ نفی عصیان سے اللہ کی فرماں پذیری کی صراحت کی اور بَرًّا بِوَالِدَيْهِ سے والدین کے ساتھ نیکوکار ہونے کا بیان فرمایا۔ رہا قوت غضبیہ کی تفریط کا پہلو تو اس کی نفی لفظ حَنَانًا سے فرما دی۔ باقی رہا قوت شہوانیہ کا اعتدال تو اس کا اظہار لفظ زَكٰوةً سے کر دیا۔ یعنی حضرت یحییٰ کا نفس طاہر تھا۔ پرایا مال کھانا، شیطانی حرکات جنسی کی طرف میلانِ خاطر ہونا اور شتر بے مہار کی طرح مطلق العنان ہو جانا یہ تمام خرابیاں حضرت یحییٰ میں نہ تھیں۔ الغرض یحییٰ کی غضبیہ اور شہوانی قوتیں معتدل تھیں۔ جبلی اور طبعی طور پر آپ ہر بدی سے متنفر اور نیکی کی طرف راغب تھے۔ اس خلاصۂ وصف کا اظہار خدا تعالیٰ نے لفظ تَقِيًّا سے فرما دیا۔ جب علمی و عملی قوتوں میں طفولیت ہی سے اعتدال تھا تو اب ذی شعور ہونے اور جوانی کی عمر کو پہنچنے کے انتظار کی ضرورت نہ تھی، اس لئے بچپن ہی میں توریت کے احکام پر کاربند ہونے کا حکم دے دیا۔

تحلیلِ اجزاء

خُذِ الْكِتٰبَ جلال محلی کا قول ہے کہ دو برس کی عمر ہونے پر حضرت یحییٰ کو توریت پر عمل کرنے کا حکم ہوا تھا۔

وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ حکم سے مراد ابن عباس کے نزدیک نبوت، مجاہد کے نزدیک فہم و دانش، مالک بن دینار کے نزدیک لب یعنی حقیقی عقل اور عام مفسرین کے نزدیک فہم توریت ہے۔ ابن کثیر نے ان سب معانی کے مجموعہ کی صراحت کی ہے۔ ہمارے نزدیک حکم سے حکمت مراد ہے۔

خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ جلال محلی نے باتباع محی السنۃ لکھا ہے کہ نبوت ملنے کے وقت یحییٰ کی عمر تین سال کی تھی۔ مفسر
عبس کی صراحت ہم اوپر کر آئے ہیں۔
فتح البیان نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس وقت یحییٰ کی عمر سات برس کی تھی۔ ابن عباسؓ کی مرفوع روایت ہے کہ بچوں نے یحییٰ سے کھیلنے کے لئے کہا۔
آپ نے جواب دیا ہم کھیل کے لئے نہیں پیدا کئے گئے۔ چلو نماز پڑھیں۔ اسی کی طرف اللہ نے اٰتَیۡنٰہُ الۡحُکۡمَ صَبِیًّا میں ارشاد فرمایا (رواہ الحاکم فی تاریخہ)
وَحَنَانًا۔ علی بن ابی طلحہ، عکرمہ، قتادہ، الضحاک، مجاہد، ابن زید، عطاء خراسانی وغیرہم کے نزدیک حَنَانًا کا ترجمہ ہے رحمت، شفقت، نرم دلی،
محبت۔ ابن اعرابی نے حنان کے لغوی معنی عطوفت، رزق اور برکت کے لکھے ہیں۔ خطیب نے ہیبت، وقار، رحمت، رزق، برکت وغیرہ ترجمہ کیا ہے۔
رحمت من جانب اللہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ حضرت یحییٰ کے دل میں بندگان خدا کی ہمدردی اور شفقت خدا داد تھی۔ وہ طبعی طور پر خواہشمند رہتے تھے کہ کوئی شخص کفر
وگناہ نہ کرے۔ ابن عباسؓ نے یہی مطلب بیان کیا ہے۔ بعض مفسرین نے مِنۡ لَّدُنَّا کا حکم اور حنانا دونوں سے بیان کیا ہے یعنی اللہ نے حضرت یحییٰ کو نبوت
کا علم اور شفقت قلبی از جانب خود بغیر کسی تعلیم وتعلم کے عطا فرمائی تھی۔ (یہ مطلب اس صورت میں ہوگا جب کہ حکم سے مراد علم توریت لیا جائے)
زَکٰوۃً یعنی ہر گناہ سے پاکی یہاں تک کہ گناہ کی طرف میلان خاطر کا بھی عدم تھا۔ حضرت انسؓ نے یہی مطلب بیان کیا ہے (مسند احمد) ابن عباسؓ نے
بیان فرمایا گناہ کی آلائش سے پاک ہونا زکوٰۃ ہے۔ قتادہ، ضحاک اور ابن جریج نے زکوٰۃ کا ترجمہ عمل صالح کیا ہے۔
وَلَمۡ یَکُنۡ جَبَّارًا۔ جبر کے معنی ہیں اپنے نفس کو سب سے بڑا جاننا اور دوسروں کو ذلیل سمجھنا۔ احادیث میں تکبر کی بہت زیادہ مذمت آئی ہے کہیں
فرمایا تکبر کرنے والے قیامت کے دن چیونٹیوں کی طرح پیروں سے روندے جائیں گے۔ کسی جگہ فرمایا جس کے دل میں رائی کے دانے کی برابر تکبر ہوگا وہ جنت
میں نہ جائے گا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ جبر نہ ہونے سے کوئی خاص مدح نہیں پیدا ہوتی۔ کیونکہ عدم جبر کا مفہوم سلبی ہے اور سلب صفت کسی صفت کا نام نہیں۔

جواب یہ ہے کہ جبر وتواضع میں تقابل عدم ملکہ یا نفی وایجاب ہے۔ ایک کے عدم سے دوسرے کا وجود لازم ہے۔ جس طرح علم کی نفی سے جہالت اور جہل
کی نفی سے علم لازم ہے۔ اسی طرح جبر کی نفی سے تواضع ضروری ہے اور مقصود تواضع ہی کا ثبوت ہے۔ رہی یہ بات کہ پھر لفظاً متواضع ہی کیوں نہ استعمال کیا جس
سے مطابقۃً تواضع کا ثبوت ہو جاتا۔ تواضع کے مفہوم کو التزاماً ثابت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کو سمجھنے کے لئے اوّل یہ جان لینا ضروری ہے کہ جن دو صفتوں میں تقابل
تضاد یا نفی واثبات یا عدم ملکہ ہوتا ہے ان دونوں میں ایک حالت میں اجتماع حقیقی تو قطعاً محال ہوتا ہے۔ سیاہی ہوگی تو سفیدی نہ ہوگی۔ وجود ہوگا تو عدم نہ
ہوگا۔ آنکھیں روشن ہوں گی تو اندھا نہ ہوگا۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک صفت بہت زیادہ قوی ہوتی ہے اور دوسری صفت بہت زیادہ کمزور اور اتنی
کمزور کہ اس کی طرف التفات بھی نہیں کیا جاتا۔ مثلاً سفیدی میں اگر برائے نام سیاہی ملی ہوئی ہو جو غیر محسوس ہو تو اس کو سفیدی ہی کہا جاتا ہے۔ سیاہی کا اعتبار
نہیں کیا جاتا۔ قوت وضعف کا ایسا اجتماع ممکن ہے، لیکن خدا تعالیٰ کو یہ مقصود تھا کہ جبر وتکبر کی کامل نفی کر دی جائے۔ اب اگر متواضع کا لفظ استعمال کیا
جاتا تو یہ وہم باقی رہ جاتا کہ ممکن ہے تکبر کا بھی کوئی شائبہ ہو جس کو ناقابل اعتبار سمجھا گیا ہو۔ لیکن جب عدم تکبر کی صراحت کر دی تو کمال تواضع کا اثبات
ہو گیا۔

ایک اور شبہ جَبَّارًا مبالغہ کا صیغہ ہے اور مبالغہ کی نفی سے اصل صفت کی نفی نہیں ہو سکتی، اس لئے ہو سکتا ہے کہ حضرت یحییٰ جبار نہ ہوں صرف جابر ہوں۔ جبر کا سلب لازم نہیں۔

ازالہ۔ مبالغہ کی نفی کی دو صورتیں ہیں (۱) وصف زائد کی نفی اور اصل صفت کا ابقاء (۲) کامل طور پر اس صفت کی نفی۔ مثلاً اِنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ
بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ میں ظلم کامل کی نفی ہے۔ ایسا نہیں کہ ظَلَّام (بڑا ظالم ہونے) کی نفی ہو اور ظالم ہونے کی نفی نہ ہو۔ یہی صورت آیت مذکورہ میں ہے۔
گویا مبالغہ کی نفی کرنے سے ہر فرد کی نفی ہو جاتی ہے جبر کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہتا۔

وَسَلٰمٌ عَلَیۡہِ الخ۔ آدمی جس وقت پیدا ہوتا ہے تو بالکل بے شعور اور جاہل ہوتا ہے۔ دنیا کی بدیہی اور ظاہر ترین اشیاء کا علم بھی اس کو
نہیں ہوتا۔ کچھ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے نہ کسی چیز کی حس رکھتا ہے۔ رفتہ رفتہ بدیہیات کا علم ہوتا ہے۔ پھر نظریات وفکریات کو جانتا ہے پھر بڑھے ربط

حکیم، فلاسفر اور خدا جانے کیا کیا ہوتا ہے۔ درجۂ جہالت سے نکل کو عقل ہیولانی کے مرتبہ میں آتا ہے پھر عقل ہیولانی سے آگے بڑھ کر عقل بالملکہ عقل بالفعل عقل مستفاد وغیرہ کے درجات طے کرتا ہے۔ لیکن جب سانس کا آخری دورا بدن سے نکلتا ہے اس وقت پھر ہوش حواس معطل، عقل ناکارہ اور فہم و دانش تاریک ہو جاتے ہیں۔ جیسا پیدا ہوا تھا ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ وہ آغاز تھا یہ انجام ہوتا ہے۔ درمیانی درجات حسب اختلاف عمر، علم، ارادہ، اختیار کے درجات ہیں۔ ابتدائی اور آخری درجات جہالت اور اضطرار کے ہیں۔ ان دونوں وقتوں میں آدمی مضطر ہوتا ہے۔ اور اللہ کی رحمت کا مجسم احتیاج طور پر محتاج۔ پھر (اہل اسلام کے عقیدہ کے موافق قطعی طور پر) محض مجبوری کا ایک وقت اور بھی آئے گا جس میں کوئی اختیار و ارادہ کام نہ دے گا۔ وہ آخری حیات کا دور ہے۔ قیامت کے دن جب دوبارہ تخلیق ہو گی اس وقت بھی آدمی بالکل ناچار اور مجبور ہو گا۔ آیت مذکورہ میں ان تینوں اوقات میں نزول رحمت کی صراحت حضرت یحییٰ کے متعلق فرمائی ہے۔ شیخ ابن عیینہ نے اسی بنا پر فرمایا ہے کہ خلق کو وحشت تین موقعوں پر ہوتی ہے۔ ایک پیدائش کے دن جبکہ آدمی اصل مقام کو چھوڑ کر دوسرے مکان میں آتا ہے اور نئے لوگوں کو دیکھتا ہے۔ دوسرے مرنے کے دن جبکہ نامانوس مخلوق سامنے آتی ہے۔ تیسرے حشر کے دن۔ خدا تعالیٰ نے ان تینوں مواقع پر حضرت یحییٰ کو سلام (امان) سے مشرف فرمایا (رواہ ابن جریر)

مقصود بیان احکام شرعیہ پر عمل کرنا اگرچہ بلوغ کے بعد واجب ہوتا ہے، لیکن بعض مخصوص بندے ایسے بھی ہیں جن کو آغاز عمر ہی سے احکام الٰہیہ کی تعمیل کا پابند کر دیا جاتا ہے۔ جیسے حضرت یحییٰ کو شروع ہی سے توریت پر مکلف کر دیا گیا تھا۔ حُکْم سے مراد اگر حکمت یا عقل یا دانش و فہم یا علم توریت ہو تو ظاہر ہے کہ بعض نیک بندے آغاز عمر ہی سے بقدرت الٰہیہ فہیم، عقیل، دانشمند، ذی شعور اور حکیم ہوتے ہیں۔ گویا حکمت و دانش کا حصر عمر پر نہیں بلکہ عطائے الٰہی پر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض بچے بھی حقائق کونیہ، احکام قطریہ اور نوامیس الٰہیہ سے واقف ہو سکتے ہیں اور اگر حُکْم سے مراد نبوت ہو تو حضرت یحییٰ کا سہ سالہ یا ہفت سالہ عمر میں نبی ہونا ثابت ہو گا اور در پردہ یہ بات بھی مترشح ہو گی کہ بعض لوگ ذی شعور اور بالغ ہونے سے پہلے ہی بانعام الٰہی ولی ہو سکتے ہیں۔ بلکہ بچے کا نبی ہونا بھی واقع ہے۔ آیات مذکورہ میں حضرت یحییٰ کے چند اوصاف کا صراحۃً تذکرہ ہے اور ضمناً ہدایت ہے احکام الٰہیہ پر عمل کرنے کی، علوم شرعیہ اور معارف کتبیہ حاصل کرنے کی، مخلوق خدا کے ساتھ رقت، شفقت اور محبت کا برتاؤ کرنے کی، آلائش گناہ اور کدورت مادیہ سے پاک رہنے کی، اللہ کے سوا تمام مخلوق سے منہ موڑ کر خالص خدا کا ہو جانے کی، والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے اور ہر قسم کا تکبر و جبر، رعونت اور فرعونیت و سرکشی کو دل سے نکال دینے کی۔ آخری آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو نیکوکار، خوش اطوار، صحیح گفتار اور اللہ کا فرماں بردار ہو جاتا ہے اللہ تمام آڑے وقتوں میں اس کی کارسازی اور دستگیری فرماتا ہے۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب آدمی کا کوئی علم و ارادہ، کوئی اختیار و اقتدار سود مند نہیں ہوتا وغیرہ۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ

(اے نبی) کتاب میں مریم کا ذکر کرو جس وقت وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ پورب رُخ کے مکان میں جا بیٹھی اور ایک پردہ کی آڑ کر لی

حِجَابًا ۫ فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ إِنِّيْٓ أَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ

اور ہم نے اس کے پاس جبرئیل کو بھیجا اور وہ مکمل آدمی کی شکل میں ہو کر اس کے سامنے گیا مریم نے کہا اگر تو پرہیزگار ہے تو تجھ سے

مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ إِنَّمَآ أَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝ قَالَتْ

اللہ کی پناہ چاہتی ہوں جبرئیل نے کہا میں تیرے رب کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں تجھے ایک پاکیزہ لڑکا بخشنے آیا ہوں مریم نے کہا

الربع

أَنّٰى يَكُونُ لِي غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَّلَمْ أَكُ بَغِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ

میرے لڑکا کس طرح ہوگا مجھے تو کسی مرد نے چھوا بھی نہیں اور نہ میں بدکار ہوں فرشتہ بولا اسی طرح تیرے رب نے فرمایا

هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝ فَحَمَلَتْهُ

ہے کہ یہ مجھ پر آسان ہے اور ہم اس لڑکے کو لوگوں کے لئے نشانی قدرت بنائیں اور اپنی رحمت قرار دیں اور یہ امر طے شدہ ہے الغرض مریم

فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا ۝ فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ

کو لڑکے کا حمل ہو تو وہ اس کو لے کر الگ دور جا بیٹھی اور درد زہ اس کو ایک کھجور کے درخت کی جڑ میں لے گیا بولی کاش

يٰلَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۝ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَا أَلَّا تَحْزَنِي

میں اس سے پہلے مر گئی ہوتی اور بھولی بسری ہو گئی ہوتی پائین سے فرشتے نے ندا دی کہ رنجیدہ مت ہو

قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝ وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا

تیرے رب نے تیرے پائین ایک چشمہ بنا دیا ہے اور اس کھجور کی جڑ کو اپنی طرف ہلا پکی پکائی کھجوریں تیرے اوپر

جَنِيًّا ۝ فَكُلِي وَاشْرَبِي وَقَرِّي عَيْنًا ۚ فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا ۙ فَقُولِي إِنِّي نَذَرْتُ

گریں گی لہٰذا کھا اور پی اور آنکھ ٹھنڈی کر اور اگر کوئی آدمی تجھے نظر پڑے تو اشارہ سے کہہ دینا کہ میں نے رحمٰن کی

لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا ۝ فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ ۖ قَالُوا يٰمَرْيَمُ

منت مانی روزہ رکھنے کی ہے سو آج کسی آدمی سے بات ہرگز نہیں کروں گی پس مریم اس لڑکے کو گود میں اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئی قوم والے بولے

لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ۝ يٰأُخْتَ هٰرُونَ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ أُمُّكِ

مریم تو نے بڑے غضب کا کام کیا اے ہارون کی بہن تیرا باپ برا آدمی نہ تھا اور نہ تیری ماں بدکار

بَغِيًّا ۝ فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ ۖ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ

تھی مریم نے بچہ کی طرف اشارہ کیا وہ لوگ بولے ہم لوگ بچہ سے کیونکر بات کریں بچہ

إِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ ۖ آتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا ۝ وَّجَعَلَنِي مُبٰرَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ

بول اٹھا میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا اور مجھے بابرکت بنایا میں جہاں کہیں ہوں اس نے

وَّاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۝ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِیْ ۡ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا

اور تابقائے حیات اُس نے مجھے نماز زکوٰۃ کا حکم دیا اور اپنی والدہ کا مجھے تابعدار بنایا اور مجھے سرکش بدبخت نہیں

شَقِیًّا ۝ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ۝

کیا ہے اور مجھ پر سلام ہے جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں گا اور جس زندہ کر کے اُٹھایا جاؤں گا

تفسیر تخلیق انسانی چار طور پر ہوئی ہے اور ہر ایک میں قدرت الٰہی کا واضح نشان موجود ہے۔ (۱) مرد عورت کے اختلاط سے۔ (۲) بغیر ماں باپ کے جس طرح حضرت آدم کی پیدائش ہوئی۔ (۳) بغیر ماں کے جس طرح حضرت حوا کی تخلیق ہوئی۔ (۴) بغیر باپ کے جس طرح حضرت عیسٰی پیدا ہوئے۔ گزشتہ قصہ حضرت یحیٰی کی پیدائش کا تھا، اس میں بھی اللہ کی قدرت کی نشانیاں موجود تھیں۔ ناقابل اولاد بوڑھے ماں باپ کے بچہ کا پیدا ہو جانا اللہ کی ہمہ گیر قدرت کا پتہ دیتا ہے۔ مگر حضرت عیسٰی کی پیدائش تو اپنے اندر گوناگوں عجوبہ زائیاں رکھتا ہے۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ حضرت زکریا برائے خطیب حضرت مریم کے بہنوئی تھے اور صحیح بھی یہی ہے۔ حضور اقدسؐ نے حدیث معراج کے ذیل میں فرمایا تھا کہ یحیٰی و عیسٰی خالہ زاد بھائی تھے، اس لئے مفسر حقانی اور بعض دوسرے اہل تاریخ نے جو زکریا کو مریم کا خالو قرار دیا ہے وہ قطعاً غلط ہے۔ مریم کی والدہ کا نام حنّہ اور باپ کا نام عمران تھا۔ حضرت موسٰی و ہارون کے والد کا نام بھی عمران ہی تھا۔ اسی بنا پر بعض لوگوں کو دھوکہ ہو گیا کہ انہوں نے مریم کو ہارون کی حقیقی بہن قرار دیتے ہوئے آیت یَآ اُخْتَ ھٰرُوْنَ کو حقیقی معنوں پر محمول کیا ہے، لیکن واقع میں مریم و ہارون کے زمانے میں سیکڑوں برس کا فصل ہے۔ ان کے والد عمران وہ نہیں جو ہارون کے والد تھے۔ آیات مذکورہ کے متعلق تحقیقی نوٹس ہم تکمیل اجزا کے ذیل میں بیان کریں گے۔ سب سے پہلے واقعہ کا خلاصہ لکھ دینا مناسب ہے۔

مریم کی والدہ حنّہ نے نذر مانی تھی کہ پروردگارا! اگر میرے اولاد ہوگی تو میں بیت المقدس کی خدمت کے لئے اس کو وقف کر دوں گی۔ مسیح کے دور سے پہلے یہودیوں میں دستور تھا کہ خانۂ خدا کی عبادت کے لئے اپنی اولاد کو وقف کر دیتے تھے۔ پھر اس کی معاشرتی زندگی ختم ہو جاتی تھی۔ شبانہ روز عبادت، یادِ الٰہی اور عبادت خانہ کی خدمت کے علاوہ اس کو کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ حضرت سموائل کو بھی ان کی والدہ نے بطور نذر وقف کیا تھا۔ اسی دستور کے مطابق حنّہ نے اپنے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچہ کو وقف کیا۔ جب وضع حمل کا وقت آیا تو لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکی چڑھانے کا دستور نہ تھا اس لئے حنّہ دل شکستہ ہوئیں۔ نذر مان چکی تھی، اس لئے حضرت مریم کو اپنے داماد (یا بقول بعضے بہنوئی) کے سپرد کر دیا جن کا نام زکریا تھا اور بیت المقدس کے متولی اور امام تھے۔ ایام طفولیت سے ہی کچھ عجیب واقعات مریم سے ظہور پذیر ہوتے تھے۔ ایک بار غیر فصلی میوے اُن کے پاس رکھے تھے۔ زکریا نے دریافت کیا تو مریم نے جواب دیا مجھے میرے پروردگار نے یہ پھل بھیجے ہیں۔ غرض زہد و تقویٰ عبادت اور رہبانیت کے حضرت مریم کی عمر تیرہ سال کی ہوئی۔ ایک روز کسی ضرورت سے بیت المقدس کے شرقی حصہ میں سب سے علیحدہ ہو کر گئیں اور ایک پردہ ڈال کر اپنی ضرورت میں مصروف ہوئیں (غالباً غسل کرنے کے لئے ایک گوشہ میں مشرقی جانب پردہ ڈالا ہوگا) فوراً ایک حسین نوجوان جو درحقیقت فرشتہ تھا رونما ہوا۔ مریم کو اپنی دری کا اندیشہ ہوا اور نوجوان کو اپنے سامنے دیکھ کر اپنے بچاؤ کے لئے بولیں میں تجھے خدا کا واسطہ دیتی ہوں اگر تو خدا ترس ہے تو ہٹ جا۔ نوجوان بولا میں آدمی نہیں اللہ کا فرشتہ ہوں اور بحکم الٰہی تجھے پاکیزہ اطوار والا فرزند دینے آیا ہوں۔ مریم کو تعجب ہوا۔ بولیں میرے لڑکا کس طرح ہو سکتا ہے نہ اب تک کسی سے میرا ازدواجی تعلق ہوا نہ میں حرام کار ہوں۔ فرشتہ نے کہا خدا کا حکم یونہی ہے وہ اسی طرح اپنی قدرت سے پیدا کر سکتا ہے۔ غرض مریم بشاراتِ ایزدی حاملہ ہو گئیں۔ آثار حمل نمودار ہوئے تو بنی اسرائیل کی بدگوئی کا خوف ہوا، اس لئے سب سے یکسوئی اختیار کر لی اور کہیں دور تنہا مکان میں گوشہ گیر ہو گئیں۔ مدت حمل پوری ہوئی۔ وضع حمل کا وقت آیا۔ نہ پانی تھا نہ دانہ، نہ مونس نہ غمخوار، تنہائی، بیکسی اور بے بسی۔ ادھر درد کی شدت ہوئی، یا تقاضائے بشری گھبرا اُٹھیں۔ بولیں کاش میں اس دن سے پہلے مر جاتی

اور میرا نام نشان بھی نہ رہتا۔ عیسیٰ پیدا ہو گئے۔ پائیں کی جانب سے فرشتہ نے آواز دے کر کہا آزردہ خاطر نہ ہو۔ مصیبت کے وقت خدا اپنے نیک بندوں کی مدد کرتا ہے۔ دیکھو تمہارے پائیں خدا نے چشمہ جاری کر دیا ہے۔ (اس کا پانی پیو) اس خاطر اور ٹھنڈک کے لئے بچہ موجود ہے۔ (کھانے کی ضرورت ہو تو یہ کھجور کا خشک درخت جس میں شاخیں بھی نہیں ہیں تم کو تر و تازہ پھل دے گا، اس کو پکڑ کر ذرا ہلاؤ۔ (رہا بدنامی کا اندیشہ) تو جب تمہارے سامنے کوئی آئے اور لڑکے کی بابت دریافت کرے تو تم اشارہ سے کہہ دینا کہ میں نے آج روزہ رکھا ہے کسی سے بات نہیں کروں گی لڑکے سے دریافت کر لو۔ پیام غیبی سن کر مریم کو تسکین ہوئی۔ چند روز کے بعد یہودی دستور کے موافق لڑکے کو ختنہ کے لئے بیت المقدس لائیں۔ بچہ کو دیکھ کر ہنگامہ بپا ہو گیا۔ ہر طرف سے طعن و تشنیع کی بوچھار شروع ہو گئی۔ لوگوں نے دریافت کیا مریم یہ بچہ کہاں سے لائی۔ تیرے ماں باپ بدکار نہ تھے اور تو بھی آوارہ نہ تھی۔ زہد و پرہیزگاری میں تو تیرا درجہ ہارون کی طرح تھا اب یہ کیا ہو گیا؟ مریم نے مسیح کی طرف اشارہ کیا کہ خود اس سے دریافت کر لو۔ لوگوں نے کہا ہم اس بچہ سے کیا بات کریں یہ گفتگو کے قابل ہی کب ہے۔ اتنے میں مسیح بول اٹھے میں اللہ کا بندہ ہوں (یہ اس لئے کہا کہ بغیر باپ کے پیدا ہونے اور شیر خوارگی میں بولنے سے لوگ کہیں خدا کا بیٹا نہ سمجھ لیں) مجھے اللہ نے کتاب دی ہے، نبی بنایا ہے، برکت عطا فرمائی ہے، نماز اور طہارت نفس کا حکم دیا ہے، والدہ کا فرمانبردار کیا ہے۔ یوم ولادت، یوم وفات اور یوم حشر میں وہی میرا کرم فرما اور مہربان ہے۔ کتاب و نبوت اور احکام شرعیہ کی تعمیل کا حکم اگرچہ بچپن میں حضرت عیسیٰ کو نہیں ملا بلکہ تیس سال کی عمر میں نبوت و کتاب ملی اور اسی وقت تعمیل احکام فرض ہوئی، مگر بطور معجزہ اپنی والدہ کی پاک دامنی ظاہر کرنے کے لئے بحکم الٰہی آپ نے یہ تمام باتیں ظاہر فرمائیں۔ کیونکہ ایسی باتیں قطعی طور پر ہونے والی تھیں۔ بچہ کا مہذب، پر حکمت اور فصیح کلام سن کر سب لوگوں کو حیرت ہو گئی۔ زنا کی تہمت تو مریم کے سر سے گئی، مگر طبیعتیں چونکہ محسوس پرست تھیں اس لئے بجائے اس کے کہ غیبی قدرت کا اقرار کرتے اور اللہ کی ہمہ گیر طاقت کا اعتراف کرتے موحد حقیقی بن جاتے لگے تاویلیں کرنے۔ کسی نے مسیح کو خدا کا بیٹا کہا کسی نے خدا، کسی نے مسیح کی ماں کو بھی خدا کی بیوی کہہ دیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

کلام مسیح کے وقت تو تمام یہودی متفق الرائے ہو کر مریم کو پاک دامن کہنے لگے تھے، لیکن جب بنی اسرائیل کے دو فرقے ہو گئے نصاریٰ اور یہود، تو یہودیوں نے تعصب کا پردہ آنکھوں پر ڈال کر عفیفہ معصومہ کو زانیہ کہنا شروع کر دیا اور مریم کے چچا زاد بھائی کا نطفہ قرار دیا جو مریم کا منگیتر تھا، اس شخص کا نام یوسف تھا اور حضرت مریم کے ساتھ عبادت خانہ میں رہا کرتا تھا۔ یہ بیچارا بھی بڑا نیک اور عابد زاہد تھا۔ تولد مسیح کے بعد حضرت مریم کی نسبت اس سے ہوئی تھی یہود کے خوف سے جب حضرت مریم ترک وطن پر مجبور ہوئیں اور بچے کو لے کر مصر گئیں تو یہی یوسف ساتھ تھا۔ جب مسیح کی عمر بارہ سال کی ہوئی اور یوسف کا بھی انتقال ہو گیا تو مریم بچہ کو لے کر مصر سے واپس آ کر ناصرہ گاؤں میں رہنے لگیں۔ کچھ زمانہ کے بعد بیت المقدس چلی آئیں۔ عیسیٰ نے وعظ و پند شروع کی۔ یہودیوں نے گورنر روم کو ہم نوا بنا کر قتل مسیح کی سازش کی۔ عیسیٰ کو آسمان پر جسد خاکی کے ساتھ اٹھا لیا گیا۔

تحلیل اجزاء اور تفسیری مطلب

مَكَانًا شَرْقِيًّا۔ مفسر سراج نے بیان کیا کہ اھل سے مراد خالہ ہے، مگر یہ غلط ہے کیونکہ ہم نے بیان کر دیا کہ زکریا مریم کے خالو نہ تھے بلکہ بہنوئی تھے۔ واللہ اعلم۔ ابن کثیر، خطیب وغیرہ نے بیان کیا کہ بیت المقدس کا شرقی حصہ مراد ہے۔ جلال محلی نے مکان کا مسکونہ مشرقی حصہ مراد لیا ہے۔ نوف بکالی نے عبادت خانہ کا شرقی حصہ بیان کیا ہے۔ بعض لوگوں نے خیال کیا کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت بیت اللحم میں ہوئی تھی، اس لئے مکان شرقی سے بیت اللحم مراد ہے، مگر یہ غلط ہے کیوں کہ بیت اللحم کو مریم اس وقت گئی تھیں جبکہ آثار حمل ظاہر ہو گئے تھے۔ تنہا مکان میں مریم نے سب سے الگ ایک اوٹ بنا لی۔ نوف بکالی کے قول کے موافق عبادت کے لئے تنہائی اختیار کی تھی۔ خطیب نے کہا غسل کرنے کو بیٹھی تھیں کیونکہ آپ کا قاعدہ تھا کہ ناپاکی کے ایام میں مسجد مقدس کے باہر چلی جاتی تھیں۔

رُوحَنَا روح سے مراد جبرئیل ہیں۔ مجاہد، قتادہ، ضحاک، ابن جریج، وہب اسدی وغیرہم کا یہی قول ہے، ممکن ہے جبرئیل کے علاوہ کوئی اور فرشتہ ہو۔

إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا۔ یہاں یہ شبہ کرنا چاہئے کہ نو وارد ہونے والا نوجوان جو متقی اور خدا ترس ہوتا تو خود ہی بدی کا ارادہ نہ کرتا پھر خدا کی پناہ مانگنے کا کیا مطلب۔ پناہ تو بدکردار کی بدی سے مانگنی مناسب تھی اور بجائے تقیًّا کہنے کے شقیًّا کہنا چاہئے تھا۔

یہ شبہ قطعاً بے بنیاد ہے کیونکہ حضرت مریم جانتی تھیں کہ جو شخص پرہیزگار ہو گا وہ پناہ الٰہی سے ڈرے گا (اور اس سے باز رہے گا) تو مطلب ہو گا۔ گویا مریم نے اپنے بچاؤ کی ...

سوتیں نکالیں اور شخص حاضر کو بدخلقی سے ادا رہنے کی دو طرح سے تلقین کی۔ اول تو خدا کی پناہ سے اپنی ذات کو وابستہ کیا اور یہ ظاہر کیا کہ اللہ کی پناہ میں دست اندازی زیبا نہیں۔ دوسرے اُس شخص کو پرہیزگار بننے کی ہدایت کی۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ اس زمانے میں کوئی مشہور بدکردار تھا جس کا نام تقی تھا، مگر یہ بالکل بے ثبوت قول ہے۔

لَمْ اَكُ بَغِيًّا۔ بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ جب مرد کے چھونے (یعنی مقاربت کرنے) سے انکار کر دیا تھا تو پھر زناکاری سے براءت کی کیا ضرورت تھی؟ اس شبہ کا ازالہ یہ ہے کہ مَسّ کا اطلاق اگرچہ زنا اور نکاح دونوں پر ہوتا ہے، مگر سیاق عبارت کے قرینہ کا لحاظ کرتے ہوئے قربت ازدواجی مراد ہے۔ قربت شوہر کی نفی لَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ سے ہوگئی اور زنا کی نفی لَمْ اَكُ بَغِيًّا سے۔

وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ۔ اللہ کی قدرت لامحدود ہے۔ کل کائنات اس کی قدرت و حکمت کا بیّن ثبوت ہے۔ منجملہ دیگر آیات کے ایک تخلیق انسانی بھی ہے، اور انسانی پیدائش کی اعجوبہ ترین صورت حضرت آدمؑ کی تخلیق تھی جو بغیر کسی نطفہ اور تخم کے تھی۔ لیکن حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بھی کچھ کم تعجب خیز نہیں۔ بطن دوشیزہ سے بغیر باپ کے انسان کا پیدا ہونا تاریخ دنیا میں عدیم النظیر ہے۔ اس کی صراحت آیت مذکورہ میں فرمائی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آیت سے مراد آیت ہدایت لی جائے۔ یہودیوں کی گمراہی، تیرہ باطنی، فساد انگیزی، تباہ کاری اور فسق و فجور کی کوئی انتہا نہ رہی تھی جو نبی خدا تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہو کر پیام ہدایت دیتا اور وعظ و نصیحت کرتا، یہودی اس کی تکذیب کرتے، اس کی نصیحت نہ سنتے۔ بلکہ بعض اوقات تو ازلی بدبختوں نے اللہ کے معصوم نبیوں کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ حضرت زکریا کو پارہ پارہ کیا۔ حضرت یحییٰؑ کو تہ تیغ کیا۔ اس لئے ہدایت عامہ کیلئے کسی ایسے جلیل القدر نبی کی ضرورت تھی جس کو معجزات عظیمہ کے علاوہ اور بھی کوئی برہان عطا کی گئی ہو۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کو جو کچھ معجزات باہرہ مرحمت کئے گئے وہ تو مشہور ہی ہیں۔ معجزات کے علاوہ آپ کی ماں کا معصومہ ہونا اور بکر عفیفہ کے بطن سے آپ کا عجیب ترین بے مثال طریقہ سے پیدا ہونا سب سے بڑا پیام ہدایت اور شان موعظت تھا۔

اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ۔ جب حمل کو نو یا آٹھ ماہ گزر گئے اور بنی اسرائیل میں اس کا چرچا ہونے لگا تو حضرت مریم بدنامی کے خوف سے بیت المقدس سے نکل کر مصر کو جانے کے ارادہ سے چل دیں۔ راستہ میں دردِ زہ ہونے لگا۔ فوراً کھجور کے ایک خشک درخت کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔ درخت کی شاخیں بھی نہ تھیں بالکل سوکھا تھا اور اس کے پاس کوئی دوسرا درخت بھی نہ تھا۔ سرد ممالک میں درخت کھجور بہت کم یاب ہے۔ یروشلم میں بھی کھجور کے درخت نہ تھے۔ مشہور یہ ہے کہ کھجور کے درخت میں نر و مادہ ہوتے ہیں۔ دونوں کے اتصال کے بغیر پھل نہیں آتا۔ اب تو فلسفہ طبعیات نے ثابت کر دیا ہے کہ کسی درخت پر بغیر نر و مادہ کے اتصال کے پھل نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ کو اپنی قدرت ظاہر کرنی اور مریم کو تسکین دینی مقصود تھی کہ دیکھ بغیر قربت مرد کے اللہ تعالیٰ نے تیرے ہی بطن سے بچہ پیدا نہیں کیا بلکہ اس درخت سے تر و تازہ پھل بھی بغیر کسی تخم اور بغیر کسی مدت پختگی کے تیرے اوپر سر سامنے۔ یہ درخت کہاں تھا؟ محل وقوع میں علماء کا اختلاف ہے۔ سدی کا قول ہے کہ بیت المقدس کے شرقی محراب کے پاس تھا۔ وہب بن منبہ نے کہا مریم بدنامی کے اندیشہ سے مصر کی طرف بھاگ گئی تھیں مصر و شام کے راستہ پر بیت المقدس سے آٹھ میل کے فاصلے پر ایک قریہ بیت اللحم نام کا تھا۔ وہاں پہنچ کر دردِ زہ شروع ہوا اور کھجور کے ایک درخت کے نیچے قیام کیا۔ ابن کثیر کے نزدیک وہب کا قول صحیح ہے۔ کیونکہ احادیث معراج میں نسائی کی روایت جس کے راوی حضرت انسؓ ہیں اور بیہقی کی روایت جس کے راوی شداد بن اوسؓ ہیں اس قول کی تائید کرتی ہے۔ ابوحیان کی کتاب البحر سے مؤلف فتح البیان نے جو قول نقل کیا ہے وہ بھی اسی کا مؤید ہے۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ۔ ندا دینے والے جبرئیل تھے۔ سعید بن جبیر، ضحاک، قتادہ، عمرو بن میمون اور سدی کا یہی قول ہے۔ بعض کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ نے خود آواز دی تھی۔ یہ قول حسن بصری کا مفسر سراج نے ظاہر کیا ہے۔ سعید بن جبیر بھی بر قول مفسر سراج اسی کے قائل ہیں۔ پہلی روایت ابن کثیر کی تھی اور دوسری صحیح بھی ہے۔ کیونکہ بروایت صحیحہ حضرت عیسیٰؑ نے سب سے پہلی مرتبہ اس وقت کلام کیا جب قوم نے مریم کو طعن و تشنیع شروع کی اور حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کیا۔

تَحْتَكِ سَرِيًّا۔ سری کے معنی ہیں چھوٹی نہر۔ حضرت براء بن عازبؓ اور حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول ہے۔ اکثر مفسرین نے یہی ترجمہ کیا ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ سَرِیّ اصل میں کس زبان کا لفظ ہے؟ مجاہد و ضحاک نے اس لفظ کو سریانی کہا ہے۔ سعید بن جبیر نے نبطی بر قتادہ نے عربی مجازی

حسن بصری، ربیع بن انس، محمد بن عباد بن جعفر اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم نے سری سے مراد حضرت عیسیٰ کی ذات لی ہے۔ کیونکہ عربی زبان میں سری کے معنی شریف سردار، عظیم المرتبہ رفیع القدر کے بھی ہیں۔

فَقُولِیْٓ قول سے مراد اشارہ ہے۔ بظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام طہارت تک مریم وہیں رہیں۔ صَوْمًا سے مراد خاموشی ہے حضرت انسؓ، حضرت ابن عباسؓ اور ضحاک نے یہی بیان کیا ہے یعنی مریم کا روزہ نہ تھا۔ صرف خاموش رہنے کی نذر ماننے کا حکم تھا۔ سدی، قتادہ اور ابن زید وغیرہ کا قول ہے صوم سے مراد ہے روزہ مع سکوت۔ کیونکہ شریعت موسوی میں نذر کا روزہ عموماً اسی طرح رکھا جاتا تھا۔ کھانے پینے اور صنفی تعلقات کو ترک کرنے کے ساتھ خاموش رہنا بھی ضروری تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک شخص کو روزہ کی حالت میں سکوت ترک کرنے کا حکم دیا اور حضرت مریم کے متعلق فرمایا وہ ایک عورت تھی اس کو معلوم تھا کہ میں کچھ بھی کہوں، مگر کوئی یقین نہ کرے گا کہ بچہ بغیر باپ کے پیدا ہوا ہے، اس لئے اس کو نذر سکوت کا حکم دے دیا گیا تھا تاکہ اگر کوئی اس سے دریافت کرے تو عذر ہو جائے۔ (رواہ ابن حمید و ابن ابی حاتم)

نوٹ:۔ شریعت اسلامیہ میں خاموش رہنے کی نذر ماننی ممنوع ہے۔ خواہ روزہ ہو یا نہ ہو۔ ابن مسعودؓ اور صدیق اکبرؓ نے یہی حکم دیا تھا۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ وضع حمل کے دن ہی مریم عیسیٰ کو لے کر بیت المقدس آگئیں۔ ابن کثیر کا بظاہر یہی قول ہے۔ لیکن ابن عباس کا قول مروی ہے کہ ایام نفاس کے بعد لائی تھیں۔ ابن کثیر نے نوف بکالی کی روایت بیان کی ہے کہ جب مریم بہ اندیشۂ بدنامی ایک ظلم کو چھوڑ کر نکلیں تو چونکہ مریم کا خاندان شرافت و نبوت کا مرکز تھا، اس لئے قوم والے تلاش میں نکلے۔ ایک روز راستہ میں ایک چرواہے سے دریافت کیا۔ چرواہے نے کہا اور تو مجھے معلوم نہیں۔ ہاں آج رات میری گایوں نے ایسی حرکت کی جو کبھی نہ کی تھی۔ تفصیل دریافت کرنے پر چرواہے نے کہا میں نے اس وادی میں ایک روشنی بلند ہوتے دیکھی اور وادی کی طرف رخ کر کے میری گائیوں نے سجدہ کیا۔ قوم والے وادی کی طرف چلے۔ مریم نے جب لوگوں کو آتے دیکھا اور بچے کو گود میں لے کر آئیں تو قوم نے تشنیع شروع کر دی۔

يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ۔ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ ہارون بن عمران جو حضرت موسیٰ کے بھائی تھے مریم ان کی بہن نہ تھیں پھر ان کو ہارون کی بہن کیوں کہا گیا؟ اس کی چار وجوہ ہیں (۱) اسرائیلیوں میں کوئی شخص ہارون نام کا تھا جو بہت ہی بدکار تھا۔ مریم کو غیرت دلانے کے لئے ہارون کی بہن کہہ کر خطاب کیا۔ مطلب یہ ہے کہ تو بدکاری میں ہارون کی بہن ہے۔

(۲) ہارون نامی کوئی شخص نیک پرہیزگار باورع تھا۔ مریم کی نیکی اور پرہیزگاری بھی مشہور تھی، اس لئے نیکی میں ہارون کی بہن قرار دیا۔ یہ دونوں احتمالات کمزور اور بے ثبوت ہیں۔

(۳) اُخت کا لفظ نسبت کو ظاہر کر رہا ہے۔ مریم درحقیقت ہارون برادر موسیٰ کی نسل سے تھیں۔ اس صورت میں يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ کا مطلب ہوگا اے نسلِ ہارون کی عورت۔ جس طرح تمیمی عورت کو يَا اُخْتَ تَمِيْمٍ اور ہمدانی عورت کو يَا اُخْتَ هَمْدَانَ کہا جاتا ہے۔ لغوی مناسبت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ تاویل بجا ہے۔

(۴) مریم کا ایک علاتی بھائی تھا جس کا نام ہارون تھا۔ یہ بہت نیک اور پرہیزگار تھا۔ اسی کی طرف مریم کی نسبت کی گئی۔ امام رازی نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے۔ کیونکہ حقیقت پر محمول کرنا مجازی معنی مراد لینے سے اولیٰ ہے۔ امام احمد کی روایت کردہ حدیث سے بھی اس کی کسی قدر تائید ہوتی ہے۔ مغیرہ بن شعبہ کا بیان ہے کہ حضور اقدسؐ نے مجھے نجران (یمن) کے عیسائیوں کے پاس بھیجا۔ وہاں عیسائیوں نے مجھ سے دریافت کیا تم قرآن میں يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ کس طرح پڑھتے ہو۔ موسیٰ کا زمانہ تو عیسیٰ سے بہت پہلے تھا۔ میں نے واپس آکر حضور اقدسؐ سے اس کا تذکرہ کیا۔ ارشاد فرمایا تو نے کیوں نہ کہہ دیا کہ لوگ انبیاء اور صلحا کے ناموں پر اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں۔ (وقد رواہ مسلم والترمذی وقال حسن صحیح والنسائی وغیرہم) اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ ہارون سے ہارون پیغمبر مراد نہیں بلکہ مریم کا کوئی بھائی ہارون نامی تھا۔

فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا۔ نقل ہے بیت المقدس لا کر جب صخرہ پر حضرت مریم نے بچہ رکھ دیا تو وہ پتھر خود بخود نیچے جھک گیا اور گہوارہ کی طرح ہو گیا۔ پس

وقت لوگوں نے مذکورہ الفاظ کہے، لیکن اکثر مفسرین کا قول ہے کہ وہ مذکورہ بالا فقرہ محض محاورہ ہے۔ جو بچہ بہت ہی چھوٹا ہو اس کو گہوارہ کا بچہ کہا جاتا ہے۔ گویا ان کا یہ مقصد تھا کہ بچہ تو اتنا چھوٹا ہے کہ گہوارہ میں رہنے کے قابل ہے اس سے ہم کیا بات کریں۔

اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ۔ کتاب سے مراد ابومسلم و بیضاوی کے نزدیک انجیل ہے۔ حسن بصری کے نزدیک توریت ہے۔ بقاعی نے توریت، انجیل، زبور وغیرہ تمام صحیفوں کو مراد لیا ہے۔ بظاہر توریت و انجیل کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا۔ عام طور پر مشہور ہے اور غیر مذاہب کی کتابوں سے بھی ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ کو تیس سال کی عمر میں نبوت ملی تھی اور نبوت ملنے کے بعد تین سال اس زمین پر اور رہے۔ صاحب مواہب لدنیہ نے اس قول کی تغلیط کی ہے اور صراحت کی ہے کہ چالیس سال کی عمر سے پہلے کسی کو نبوت نہیں ملی۔ میرے نزدیک پہلا قول صحیح ہے۔

وَجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا۔ مبارک کی تفسیر مختلف طور پر کی گئی ہے۔ مفسر سراج وغیرہ نے صاحب برکت ترجمہ کیا ہے۔ مؤلف فتح البیان نے حضرت ابوہریرہ کی مرفوع روایت ہے کہ مبارک کے معنی ہیں لوگوں کو بہت زیادہ فائدہ پہنچانے والا (رواہ الاسمٰعیلی فی معجمہ وابونعیم فی الحلیہ) ایک حدیث مرفوع میں معلم ادب فرمایا ہے۔

مقصود بیان

حضرت مریم نے جب اپنی کسی ضرورت یا عبادت کے لئے گوشۂ تنہائی اختیار کیا تو حضرت جبرئیل بشکل بشری ان کے پاس آئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نزول جبرئیل فقط انبیاء کے لئے ہی مخصوص نہیں بلکہ خدا تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو پیام ہدایت پہنچانے کے لئے یا اپنے مخصوص انعام سے سرفراز کرنے کے لئے جبرئیل کو بھیج دیتا ہے۔ گویا روح امین سے تعلق فقط انبیاء ہی کا نہیں ہوتا بلکہ اولیائے کرام اور مخلصان ذوی الاعتصام کا بھی ہوتا ہے، لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ پیام ہدایت کی تبلیغ، کتابوں اور صحیفوں کا نزول، اُمّت کو ایمان و نیکوکاری کی دعوت عامہ یہ کام صرف انبیاء کا ہے۔ صرف انبیاء کے پاس اس قسم کے احکام لے کر جبرئیل نازل ہوتے ہیں۔ حضرت مریم نے اپنے سامنے اجنبی نوجوان کو دیکھ کر اللہ کی پناہ مانگی۔ اس امر سے یہ تعلیم دینی مقصود ہے کہ کسی مصیبت یا ناگوار امر کے وقت خدا کی طرف رجوع کرنا اور اس سے پناہ جوئی کرنی لازم ہے۔ جب حضرت جبرئیل نے مریم کو فرزند کی بشارت دی تو ان کو تعجب ہوا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آدمی کتنا ہی پختہ مومن ہو اللہ کی قدرت کی ہمہ گیری پر اس کا ایمان بھی ہو، مگر وہ قانون فطرت اور ظاہری نظام کائنات کے مشاہدہ کا عادی ہے اور خلاف مشاہدہ ہر امر سے اس کو تعجب ہوتا ہے لیکن یہ ایمان کی کمزوری کی علامت نہیں۔ کیونکہ ایمان کے چار درجات ہیں۔ اوّل درجہ ایمان استدلالی کا ہے۔ دوسرا درجہ ایمان بالغیب کا ہے جس کو علم الیقین کہا جاتا ہے۔ تیسرا درجہ ایمان بالمعائنہ کا ہے جس کو عین الیقین کہا جاتا ہے۔ چوتھا درجہ ایمان ذوقی کا ہے جس کو حق الیقین کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ اگر ہم کو دلائل اور ذہنی افکار کے اعتبار سے یقین ہو جائے کہ دروازہ کے باہر پانی ہے اور واقع میں وہاں پانی بھی ہو تو یہ یقین استدلالی ہے، لیکن اس سے آگے بڑھ کر اگر کوئی سچا خبر دینے والا ثقہ آدمی آ کر اطلاع دے کہ دروازہ کے باہر پانی موجود ہے اور اس کے کہنے کا یقین بھی آ جائے تو یہ ایمان بالغیب اور علم الیقین کا درجہ ہے۔ اس کے بعد اگر دروازہ پر جا کر خود اپنی آنکھوں سے پانی کو دیکھ لیا تو ایمان بالمعائنہ اور عین الیقین ہے، لیکن اگر اس کے بعد خود جا کر کچھ پانی پی لیا تو ایمان ذوقی اور حق الیقین ہے۔ یہی حالت اہل ایمان کی ہے کہ کوئی اوّل درجہ میں ہے، کوئی دوسرے میں، کوئی تیسرے میں، اور کوئی چوتھے میں درجہ بدرجہ ترقی ہوتی ہے۔ مریم کا ایمان بالغیب تھا وہ عین الیقین کی طالب تھیں۔ خدا تعالیٰ کو منظور تھا کہ مریم کو درجۂ ایمان کی ترقی حاصل ہو اور عام لوگ بھی ایمان بالغیب حاصل کر سکیں۔ اس لئے اٰیَۃً لِّلنَّاسِ فرمایا۔ حضرت مریم نے درد کی شدت سے بیتاب ہو کر یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ الخ کہا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی کہ ہر انسان اقتضائے بشریت سے مجبور ہے۔ مصائب و تکالیف کا احساس ہر ایک کو ہوتا ہے اور احساس حوادث سے وہ کچھ دیر کے لئے سراسیمہ بھی ہو جاتا ہے۔ مریم کی تسکین آسائش اور دفع تکلیف کے لئے خدا تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کو بھیجا، چشمہ جاری کیا اور خشک بے برگ و شاخ درخت کو بار آور کیا اور پھل بھی ایسے کہ ان کو پکنے کا ضرورت نہ تھی پکے تھے، تر و تازہ تھے، لذیذ اور شیریں تھے۔ ان واقعات کے اظہار سے مقصود یہ ہے کہ اللہ اپنے فرماں بردار بندوں کی ہر وقت کارسازی فرماتا ہے اور مصیبت کے وقت غیبی فرشتے بھیج کر امداد کرتا ہے۔ اہل قرب کو نظم عام کے خلاف مخصوص عنایات سے بھی سرفراز

کرتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے مریم کو درخت کے ہلانے کا حکم دیا تھا۔ حالانکہ بچپن میں جنت کے پھل بغیر کسی کاوش اور محنت کے عطا فرمائے تھے۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اگر خدا سے قلبی تعلق نہ رکھا جائے اور دل کو ماسوا کی محبت سے پاک کر دیا جائے تو براہِ راست بغیر کسی محنت کے اور بلا کسی جنبش کے آدمی عنایت الٰہی سے سرفراز ہوتا ہے جس طرح ایام طفولیت میں حضرت مریم سرفراز ہوئیں اور اگر آدمی کے دل کو کسی غیر سے ادنیٰ درجہ کا تعلق بھی پیدا ہو گیا تو اگرچہ یہ تعلق الٰہی کے مقابلے میں اس کی کوئی اہمیت نہیں، مگر اس وقت اللہ کی طرف سے نوازش قدرے محنت برداشت کرنے کے بعد ہوتی ہے۔ جس طرح مریم کا تعلق اپنے بچے سے جب کسی قدر ہو گیا تو دنیوی پھل بھی بغیر ہاتھ ہلائے نہ ملے۔ گویا مریم کو درخت ہلانے کا حکم دے کر اہل اسلام کو یہ تعلیم دینی غرض ہے کہ دل کے اندر غیر خدا کی محبت نہ رکھو اور یگانہ و بے مثل اولاد سے بھی دل کا تعلق منقطع کر لو۔ حضرت مریم کو خدا تعالیٰ نے روزہ میں خاموش رہنے کا حکم فرمایا تھا، اس کے اندر ایک خاص راز ہے۔ روزہ نام ہے تمام اعضاء کی خواہشات کو مقررہ مدت کے لئے ترک کرنے کا۔ کھانا پینا اور صنفی تعلقات کا ترک کرنا معمولی روزہ ہے۔ ہاتھ پاؤں اور زبان و قلب کے گناہ کو ترک کر دینا خواص کا روزہ ہے لیکن خواص میں سے جو بلند درجہ رکھتے ہیں ان کا روزہ اور بھی سخت ہے۔ اللہ کے سوا ہر خیال کو دل سے نکال دینا، یادِ الٰہی کے علاوہ ہر کلام سے زبان کو خاموش رکھنا، عبادات و ادائے فرائض کے بغیر اعضائے جسمانی کی کوئی حرکت نہ کرنا یہ مخصوص ترین روزہ ہے۔ گذشتہ شرائع کے احکامات سخت تھے خصوصاً شریعتِ موسوی کی گرفت تو بہت ہی شدید تھی، اس لئے روزہ کی نوعیت بھی سختی میں انتہائی تھی۔ امت محمدیہ کو شریعت عادلہ ملی ہے، اس لئے روزہ کی شدائد میں بھی تخفیف کر دی گئی۔ تاہم دل میں ہر وقت یادِ الٰہی رکھنا، زبان کو ذکرِ الٰہی سے پر ذوق رکھنا، اعضائے جسمانی کو شریعت کے مطابق حرکات و سکنات میں مشغول رکھنا اسلامی روزہ میں ضروری ہے۔ شرطِ سکوت ساقط کر دی گئی تو حضرت مریم کے روزہ کا تذکرہ کر لے سے اسی طرف لطیف ایماء ہے کہ شریعت اسلامیہ شریعت موسویہ سے آسان ہے۔ فَأَتَتْ کا لفظ بتا رہا ہے کہ مریم خود اپنے بچہ کو لے کر آئی تھیں قوم والے جا کر نہیں لائے تھے۔ الفاظ کے اندر لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ وہ عیسیٰ جو مریم کے بطن سے پیدا ہوا اور پیدائش کے بعد اتنا مجبور تھا کہ خود چل پھر نہ سکتا تھا، ماں گود میں اٹھائے پھرتی تھی۔ ایسا مجبور و بے بس آدمی کس طرح مستحقِ الوہیت ہو سکتا ہے۔ قَالُوا كَيْفَ سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ ظاہر پرست طبقہ کور باطن اور نابینا البصیرت رکھتا ہے، اس کی نظر ظاہری اسباب، عادات اور رسم و رواج پر ہوتی ہے وہ نہیں جانتا کہ غیبی قدرت کس قدر ہمہ گیر ہے جس کے دائرہ تسخیر میں محسوس، غیر محسوس اور نیم محسوس اسباب کی تمام قوتیں داخل ہیں۔ قَالَ إِنِّي سے یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ کائنات و مخلوقات میں سے کوئی فرد خواہ وہ کتنا ہی جلیل القدر ہو، یہاں تک عظیم الشان نبی ہو بہرحال اللہ کی بندگی سے انکار نہیں کر سکتا۔ عبدیت اس کے لئے مایۂ افتخار ہے بلکہ تمام محاسن صفات سے مقدم و افضل بندہ کا بندہ ہونا ہے۔ ان آیات سے یہ امر بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض مخصوص ہستیوں کو آئندہ واقعات کا علم منجانب اللہ ہو جاتا ہے جس طرح حضرت عیسیٰ کو اپنے نبی ہونے اور کتاب ملنے کا ہو گیا۔ اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ مادی دنیا کا اقتدار، زندگی اور عمر کا چھوٹا بڑا ہونا روحانیات کے عالم میں کچھ زیادہ مؤثر نہیں ہے۔ اللہ کے مقرب ترین بندوں کا علم مادی حواس اور جسمانی ادراکی قوتوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ ان کا تعلق عالمِ قدس سے ہوتا ہے جہاں سے ان پر علمی فیضان ہوتا ہے خواہ ان کی عمر مادی آنکھیں رکھنے والوں کی نظر میں بہت ہی کم ہو۔ ان ہی آیات میں حضرت عیسیٰ کو جن باتوں کا مکلف و مامور ہونے کی خبر دی ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقرار توحید، اعترافِ عبودیت، ایصالِ خیر، ادائے صلوٰۃ و زکوٰۃ، حسنِ سلوک اور نیکوکاری سے کوئی شخص تمام زندگی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ کتنا ہی بڑا آدمی ہو، کیسا ہی عارف باللہ، خدا رسیدہ اور مقرب درگاہ خداوندی ہو فرائض شرعیہ سے مستثنیٰ نہیں قرار پا سکتا، لیکن ادائے فرائض کے باوجود زندگی، موت اور حشر میں ہر شخص رحمتِ الٰہی اور امدادِ خداوندی کا محتاج ہے وغیرہ۔

ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ۝

یہ عیسیٰ ابن مریم کا سچا قصہ ہے جس کے بارے میں یہ لوگ جھگڑا کرتے ہیں

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا

اللہ کی شان نہیں کہ اولاد رکھے وہ پاک ہے جب وہ کوئی کام ٹھان لیتا ہے تو اس سے

يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ ○ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا

صرف وہ یہ کہتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے اور (عیسیٰ بن مریم کا قول تھا کہ) اللہ میرا اور تمہارا رب ہے اس کی عبادت کرو یہ سیدھا

صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ○ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ

راستہ ہے مگر فرقے آپس میں اختلاف کرنے لگے پس کافروں کے لئے

كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ○ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ

ایک بڑے دن کے آنے سے خرابی ہے کیا کچھ سنتے اور دیکھتے ہوں گے جس دن ہمارے سامنے حاضر ہونگے لیکن یہ

الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ

ظالم آج کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں (اے نبی) تم انہیں پشیمانی کے دن سے ڈراؤ جب کام کا فیصلہ کر دیا جائیگا یہ لوگ غفلت

غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ع

میں ہیں اسی سبب سے ایمان نہیں لاتے ہم ہی زمین کے اور زمین کے اوپر رہنے والوں کے وارث ہونگے اور ہماری ہی طرف سب کو لوٹ کر آنا ہوگا

تفسیر عیسائی مسیح کو درجۂ نبوت سے بلند اور عبدیت و انسانیت سے بالاتر جانتے ہیں۔ کوئی فرقہ خدا کا بیٹا کہتا ہے کوئی خدا۔ یہودی مسیح کو تخم انسانی کی پیداوار اور ناجائز طریقہ تولید کا نتیجہ جانتے ہیں۔ یہ دونوں گروہ افراط و تفریط اور مبالغہ و تنقیص میں مبتلا ہو کر گمراہ ہو گئے۔ اصل تولید، طریقۂ پیدائش غرض ولادت اور صحیح واقعۂ حیات قرآن پاک نے بیان کر دیا جس سے گمراہ قوموں کی تکذیب اور اللہ کی تقدیس و تنزیہ کی مکمل وضاحت ہو گئی۔

آیات مسطورۂ بالا میں خدا تعالیٰ نے چند امور بیان فرمائے ہیں:۔

(۱) مسیح کے واقعۂ ولادت، کا صحیح نتیجہ اور اس پر ریمارک۔

(۲) اللہ کے واحد لاشریک اور لم یلد ہونے کی عقلی دلیل جس سے مسیح کے اللہ اور ابن اللہ ہونے کی تردید ہو جاتی ہے۔

(۳) مسیح کے اقرار عبدیت کا اظہار اور انہی کے قول سے اللہ کی ربوبیت عامہ کی وضاحت۔

(۴) مسیح کے بعد عیسائی فرقوں کا عقائد میں اختلاف اور مسیح کے متعلق تمام گروہوں کا باہم تفرقہ۔

(۵) حقانیت قیامت کی صراحت اور عقیدۂ اسلام کی مخالفت کرنے والوں کا حسرت ناک انجام۔ ہم ہر نمبر کی توضیح ذیل میں کرتے ہیں۔

۱۔ یہودی کہتے تھے کہ (العیاذ باللہ) عیسیٰ یوسف نجار کے بیٹے تھے اور ناجائز تولید کا نتیجہ تھے۔ گہوارہ میں مسیح نے جو کلام کیا وہ جادو کا اثر تھا۔ نصاریٰ کا قول تھا کہ مسیح خدا کے بیٹے تھے نبی نہ تھے یا خدا نے ان کے اندر حلول کر لیا تھا۔ بہرحال یہود و نصاریٰ کے یہ جھگڑے مدت سے چلے آتے تھے۔ قرآن نے اس کا ناطق فیصلہ کر دیا اور صاف اعلان کر دیا کہ بس یہی عیسیٰ ابن مریم کی حقیقت ہے جس کے متعلق بنی اسرائیل میں جھگڑے چلے آتے ہیں۔

ابن مریم کہنے سے یہ صراحت کرنی فرض ہے کہ عیسیٰ کا کوئی باپ نہ تھا نہ یوسف نجار نہ کوئی اور آدمی نہ فرشتہ نہ جن نہ خدا۔ آپ بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔

۲ے اللہ کمزور نہیں، عاجز نہیں، فانی نہیں، تغیر پذیر نہیں، حادث نہیں پھر اس کو ولد کی کیا ضرورت۔ معبود برحق، خلاق کائنات، مسجود حقیقی اور رب کل کا اولاد کس طرح زیبا ہے۔ اس کی قدرت غیر متناہی ہے، ہمہ گیر ہے، محیط کل ہے، وہ تخلیق کائنات میں کوئی سبب اور مادہ کا محتاج نہیں اس کی قدرت کے لئے سلسلۂ توالد کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا مسیح اس کا بیٹا نہیں ہو سکتا بلکہ وہ مسیح کا خالق ہے اور بغیر باپ کے خالق ہے۔

۳ے مسیح نے خود کہا تھا اور تمام اسرائیلیوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ اللہ میرا تمہارا سب کا رب ہے۔ لہٰذا اسی کی پرستش کرو۔ مجھے معبود نہ جانو، راہِ توحید ہی سیدھا راستہ ہے۔ اس کے علاوہ تمام گمراہیاں ہیں۔ انجیلوں میں مختلف الفاظ آتے ہیں جن سے مسیح کے ابن اللہ ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ مسیح نے اللہ کو اب کہا تھا۔ عیسائیوں نے اب سے باپ سمجھ لیا۔ حالانکہ عیسیٰ کی مراد رب کہنا تھا۔ اب کا ترجمہ رب بھی ہے۔ مگر عقل کی کجروی کا ٹھکانا نہیں۔ گمراہ گروہ والے اللہ کو مسیح کا رب سمجھنے لگے۔ حالانکہ مسیح نے اللہ کو فقط اپنا ہی اب نہیں کہا تھا بلکہ سب کا اب کہا تھا۔ پھر اگر اب کا ترجمہ باپ کیا جائے تو لازم آئے گا کہ اللہ فقط مسیح کا ہی باپ نہیں بلکہ تمام اسرائیلیوں کا بھی باپ ہے اور اس کا قائل دنیا کا کوئی صاحب ہوش نہیں۔

۴ے جب مسیح آسمان پر تشریف لے گئے اور یہودیوں کا جذبۂ انتقام پورا نہ ہو سکا تو مسیح کے پیروؤں میں خود پھوٹ پڑ گئی، عقائد میں اختلاف ہو گیا۔ شیخ ابن کثیر نے بیان کیا ہے کہ عمرو بن میمون، ابن جریج اور قتادہ وغیرہم علماء کا قول ہے کہ بنی اسرائیل کے چار ہزار عالم جمع ہوئے اور چار ہزار میں سے چار عالموں کا انتخاب کیا گیا۔ ان چاروں میں سے ہر عالم کا عقیدہ دوسرے سے جدا تھا۔ ایک کا قول تھا کہ مسیح خدا تھا جو زمین پر اترا جس کو چاہا زندہ کیا اور جس کو چاہا موت دی پھر آسمان پر چڑھ گیا۔ اس فرقہ کا نام یعقوبیہ ہے۔ دوسرے گروہ نے کہا یہ خدا نہ تھا بلکہ خدا کا بیٹا تھا۔ یہ فرقہ نسطوریہ کہلاتا ہے۔ تیسرے گروہ نے کہا مسیح محض خدا نہ تھا نہ خدا کا بیٹا تھا بلکہ تین اقانیم کے مجموعہ کا نام خدا ہے۔ تین خداؤں میں سے ایک مسیح تھا۔ یہ فرقہ ملکانیہ یا اسرائیلیہ کے نام سے موسوم ہوا۔ چوتھا گروہ اہلِ حق کا تھا جو مسیح کو اللہ کا بندہ اور رسول اور کلمۃ اللہ اور روح اللہ کہتا تھا۔ چاروں گروہوں میں خوب مناظرات ہوئے۔ مناظرہ سے مکابرہ، مکابرہ سے مجادلہ، مجادلہ سے مضاربہ اور مضاربہ سے مقاتلہ تک نوبت پہنچی۔ بالآخر اہلِ حق شکست کھا کر پہاڑوں میں بھاگ گئے اور اہلِ باطل برسرِ اقتدار آئے۔ ابن کثیر نے بیان کیا کہ شاہ قسطنطین کے دربار میں دو ہزار ایک سو عشر عالموں کا اجتماع ہوا۔ ہر گروہ نے اپنے عقیدہ کو ثابت کرنے کے لئے پرزور دلائل کو پیش کیا، لیکن کسی بات پر اتفاق نہ ہو سکا۔ سب سے بڑا گروہ ۳۱۸ علماء کا تھا جو مسیح کو خدا کا بیٹا کہتا تھا۔ قسطنطین نے اسی گروہ کے عقیدہ کو قبول کیا۔ ایک محضر نامہ تیار کیا۔ تمام علماء کے دستخط اس پر کرائے۔ کسی نے خوشی دستخط کئے کسی نے بجبر۔ جس نے انکار کیا اس کو قتل کر دیا گیا یا اس نے راہِ فرار اختیار کی۔ اس گروہ نے دینِ مسیح کو برباد کر ڈالا۔ طرح طرح کی بدعتیں نکالیں۔ شام، روم اور جزائر میں بارہ ہزار سے زائد گرجا بنائے۔ وہ مقام جہاں بزعم یہود مسیح کو صلیب دی گئی متبرک قرار پایا اور قسطنطین کی ماں ہیلانہ نے وہاں ایک گنبد بنوا دیا۔

۵ے مسیح کے متعلق افراط و تفریط کرنے والے سب کے سب کافر ہیں۔ اُن کو حق کی روشنی نظر نہیں آتی و صداقت کی آواز سنائی نہیں دیتی ان کے باطن کی آنکھیں اندھی ہیں اور گوش ہوش بہرے ہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے قیامت کے دن جب ان کو سامنے بلایا جائے گا۔ میدانِ حشر میں آنا ہوگا، اُس وقت ان پر عظیم الشان مصیبت آئے گی، آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی، صداقت کی آواز خوب سنائی دے گی، لیکن دنیا میں ان کو نہ کچھ سوجھائی دیتا ہے نہ سنائی، راہِ اعتدال سے ہٹ کر ادھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے ہیں، قیامت کا دن ان کے لئے حسرت آفریں ہوگا کیونکہ ہر معاملے کا فیصلہ ہوگا، ہر عمل کا نتیجہ سامنے آئے گا۔ یہاں تو دلوں پر پردے پڑے ہیں، غافل ہیں، آخرت کا یقین نہیں، مگر مرنے کے بعد ہی جب دوسرے عالم میں پہنچیں گے تو وہاں دنیا کی کوئی طاقت، دولت، صحت، عزت، حکومت اور شرکت کام نہ آئے گی نہ کوئی یار ہوگا نہ مددگار نہ چھپ سکیں گے پھر زمین پر قبضہ ہوگا۔ کل زمین اور اہلِ زمین براہِ راست خدا کے زیر تسلط ہوں گے، جہاں سے چلے تھے وہیں لوٹ کر جانا ہوگا۔ آغاز کی طرف انجام کی واپسی ہوگی۔

مقصودِ بیان: مسیح کے متعلق افراط و تفریط کرنے والے گمراہ ہیں۔ حق فیصلہ وہی ہے جو قرآن نے کر دیا۔

آیت فاکان سے اللہ کی توحید کی دلیل اور معبود ہونے کا ثبوت ہے۔ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ نے جو اس عالم کو پیدا کیا وہ کسی مادہ یا مدت کے زیر احتیاج نہیں کیا نہ مادی دنیا کی طرح اس کو ہاتھ پاؤں سے کام کرنے کی ضرورت ہے بلکہ فقط اس کی مرضی و مشیت ہی تخلیق کے لئے کافی ہے۔ مشیت اور تخلیق کے درمیان کوئی زمانہ یا وقت حائل نہیں ہوتا۔

فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ سے یہ بات بتانی مقصود ہے کہ مسیح کے توحیدی مشن میں لوگوں نے ترمیم و تنسیخ کر لی، باہم پھوٹ پڑ گئی، گروہ گروہ ہو گئے وغیرہ۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِبْرٰهِيمَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ○ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ

اور کتاب میں ابراہیم کا تذکرہ کرو وہ بلاشبہ سچے نبی تھے جب انھوں نے اپنے باپ

يٰٓأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْـًٔا ○ يٰٓأَبَتِ

سے کہا ابا تم کیوں ایسی چیز کی پرستش کرتے ہو جو نہ سنتی ہے اور نہ دیکھتی ہے اور نہ تمہارے کام آسکتی ہے ابا واقعی

إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرٰطًا سَوِيًّا ○

جو علم میرے پاس آیا ہے وہ تمہارے پاس نہیں آیا لہٰذا تم میری راہ پر چلو میں تم کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا

يٰٓأَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۖ إِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ○ يٰٓأَبَتِ

ابا شیطان کی پوجا نہ کرو بلاشبہ شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے ابا مجھے

إِنِّي أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ○

اندیشہ ہے کہ رحمٰن کا عذاب تم پر آجائے گا پھر تم شیطان کے ساتھی ہو جاؤ گے

قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ عَنْ آلِهَتِي يٰٓإِبْرٰهِيمُ ۖ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ ۖ وَاهْجُرْنِي

باپ نے کہا ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے پھرا ہوا ہے اگر تو باز نہ آئے گا تو میں پتھروں سے تجھے مار ڈالوں گا مدت

مَلِيًّا ○ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۖ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ۖ إِنَّهُ كَانَ بِي حَفِيًّا ○

تک تو مجھ سے دور ہو جا ابراہیم نے کہا اچھا سلام علیک، میں تمہارے لئے اپنے رب سے دعائے مغفرت کروں گا بلاشبہ وہ مجھ پر مہربان ہے

وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُو رَبِّي عَسَىٰٓ أَلَّآ أَكُونَ

میں تم سے اور ان چیزوں سے جو تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو کنارہ کرتا ہوں اور اپنے رب کی عبادت کروں گا امید ہے کہ میں اپنے

بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَ

سب کو پکار کر محروم نہ رہوں گا ۔ غرض جب ابراہیم اُن لوگوں سے اور اُن چیزوں سے جن کی اللہ کے سوا وہ عبادت کرتے تھے الگ ہو گئے تو ہم نے اُن کو اسحٰق اور

يَعْقُوْبَ ۭ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝ وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۝

یعقوب عطا کئے اور ہر ایک کو نبی بنایا اور ان سب کو اپنی رحمت بخشی اور اُن کے لئے ذکرِ خیر بلند کیا

تفسیر

ان آیات میں خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے آغازِ شباب کا واقعہ ذکر فرمایا اور باپ کے دین کو چھوڑ کر آپ نے جس بے پناہ استقامت کے ساتھ دینِ الٰہی کی طرف رجوع کیا تھا اس کو ظاہر فرمایا۔ آیت کی تفسیر کے قبل ہم تین نکتے بیان کرتے ہیں تاکہ حضرت ابراہیم کے قصے کی اصل غرض پر کچھ روشنی پڑ سکے۔

(۱) رسول پاکؐ کے زمانے میں عرب کے دو گروہ تھے۔ ایک گروہ تو علی الاعلان توحیدِ الوہیت کا منکر تھا اور ایک خدا کو چھوڑ کر چند معبودوں کی پرستش کرتا تھا۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو کہنے کو تو توحید کا مدعی تھا، مگر اس کی توحید شرک آمیز تھی۔ اوّل الذکر گروہ بُت پرستوں کا تھا جو ہزاروں پتھروں کے سامنے سر نیاز جھکاتے تھے اور توحیدِ الوہیت سے بیزار تھے۔ مؤخر الذکر گروہ اہلِ کتاب کا تھا جو بظاہر توحید کا مدعی تھا، مگر واقع میں دو یا تین خداؤں کا مانتا تھا۔ خدا تعالیٰ نے گزشتہ آیات میں اہلِ کتاب کی تردید عقلاً اور نقلاً جب بیان فرما دی تو اب اہلِ شرک اور بُت پرستوں کے موروثی عقیدہ کا استیصال کرنا چاہا۔ بُت پرستوں کے عقیدہ کے استیصال کے لئے حضرت ابراہیمؑ کا قصہ اپنے اندر گوناگوں سامانِ عبرت رکھتا تھا، اس لئے واقعۂ ابراہیمی بیان فرمایا۔

(۲) حضرت ابراہیمؑ تمام عرب کے جدِ اعلیٰ تھے۔ عرب آپ کی عظمت اور علوِ شان کے معترف بھی تھے اور آپ کے دین کو حق بھی سمجھتے تھے، مگر اپنی جہالت کے سبب بُت پرستی اور بے ہودہ رسم و رواج کو دینِ ابراہیمی کی طرف منسوب کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے ان مشرکوں کو توحید کی تعلیم دینے کیلئے انہی کے مورثِ اعلیٰ کا قصہ بیان فرمایا۔ گویا یہ ظاہر فرمایا کہ اگر تم محض تقلیدِ آبا کے شیفتہ ہو تو اپنے جدِ اعلیٰ کی تقلید کرو جو موحد تھا مشرک نہ تھا اور اگر دلائل کی روشنی میں مذہب اختیار کرنا چاہتے ہو تو اُن دلائل پر غور کرو جو تمہارے اعلیٰ بزرگ نے شرک کے خلاف قائم کی تھیں۔ غرضیکہ تقلیداً ہو یا درایۃً بہرحال راہِ توحید پر گامزن ہو۔

(۳) دینِ اسلام کی تعلیم کے مقابلے میں اکثر اہلِ مکہ کہا کرتے تھے کہ ہم اپنے اسلاف کے مذہب کو کیسے چھوڑیں اور کس طرح ان کے رسم و رواج سے مُنہ موڑیں، وہ بے وقوف نہ تھے ہم ان سے زیادہ عقلمند نہیں۔ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ بیان فرما کر یہ تعلیم دی کہ دیکھو تمہارے جدِ اعلیٰ نے کس طرح دلائل کی روشنی میں اپنے باپ کا دین چھوڑا بلکہ اپنے باپ کو بھی چھوڑا اور دلیلِ حق سے اس کے قول کو باطل کیا۔ پھر کیا وجہ کہ جب تم تقلیدِ آباء کے شیفتہ ہو تو کیوں ابراہیم کی تقلید نہیں کرتے اور دلائل کی روشنی میں مذہب کا مطالعہ نہیں کرتے۔ ابراہیمؑ بھی تو تمہارے مورثِ اعلیٰ تھے اُن کی پیروی کرنے سے کیوں گریز کرتے ہو اور بصیرت کے ساتھ کیوں راہِ توحید پر نہیں چلتے۔

تفسیری ابحاث

(۱) حضرت ابراہیمؑ اور صدیق اور نبی تھے۔ علماء نے صراحت کی ہے کہ ہر نبی صدیق ضرور ہوتا ہے لیکن ہر صدیق کا نبی ہونا ضروری نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق تھے مگر نبی نہ تھے۔ نبوت کا منصب صداقت سے بالاتر ہے۔ آغازِ شباب میں حضرت ابراہیم نے آسمان کے ستاروں کی ضیا پاشیوں سے روگردانی کرکے اور رفقائے کائنات کی رنگینیوں سے اظہارِ نفرت کرکے اُس رب العالمین کی طرف اپنا رُخ کیا تھا جو خالقِ السمٰوات والارض ہے۔ مخلوق کے رشتہ کو توڑ کر غیر اللہ سے منہ موڑ کر ایک اللہ سے تعلق جوڑا تھا۔ اس وقت نہ اُن کا کوئی معلم اور مربی تھا نہ ہادی اور مرشد۔ صرف طبیعت اور سرشت اُن کی رہبر تھی اور توفیقِ الٰہی رہنما۔ یہی آپ کے افکار و خیالات، عقائد، اقوال اور اعمال کی محافظ تھی

تھی اور یہی فطری سچائی تھی۔ اس اعتبار سے آپ کو خدا تعالیٰ نے صدیق کے لقب سے ذکر فرمایا، لیکن فطری صداقت اور طبعی ہدایت کے ہوتے ہوئے بھی ضروری نہیں کہ ہر صدیق کو نبوت سے سرفراز کیا جائے اور حضرت ابراہیم حامل نبوت بھی تھے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے آپ کے دونوں اوصاف ذکر فرما دیئے۔

(۲) حضرت ابراہیم کے باپ کا کیا نام تھا؟ قرآن پاک نے آزر بتایا ہے۔ بعض اہلِ تاریخ کا قول ہے کہ آپ کے باپ کا نام تارح یا تارخ تھا اور آزر چچا کا نام تھا۔ قرآن میں جو باپ کا نام آزر بتایا ہے وہ مجازی معنی پر محمول ہے۔ اہلِ عرب چچا کو بھی باپ کہہ دیا کرتے تھے۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ باپ موجود نہ ہو اور چچا ہی مربی ہو۔ لیکن اصحاب تاریخ کا یہ وہم ہی وہم ہے۔ اگر تارخ نام تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا کہ تارخ کسی اور آدمی کا نام تھا اور آزر کوئی جدا ہستی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک لقب ہو اور دوسرا نام۔ تاریخ ایسا مواد پیش کرنے سے قاصر ہے جس سے دو جدا جدا شخصیتیں ثابت ہو سکیں۔ رہا مجازی معنی پر محمول کرنا تو یہ بھی غلط ہے۔ مختلف آیات میں لفظ اَبْ کا ہی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً وَاغْفِرْ لِأَبِيْ إِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ الخ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيْمَ لِأَبِيْهِ الخ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيْمَ لِأَبِيْهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ الخ تمام آیات میں باپ سے چچا مراد نہیں لیا جا سکتا۔ پھر اگر آیات میں لفظ اَب کے معنی عم کے تسلیم بھی کر لئے جائیں تو مسجد حرام کے پاس کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے جو دعا کی تھی اور کہا تھا اَغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ الخ۔ اس دعا میں والدین سے مراد والدہ اور چچا ہو ہی نہیں سکتے۔ لفظ اَب کا اطلاق اگرچہ چچا پر ہوتا ہے، مگر عربی میں لفظ والد کا اطلاق چچا پر نہیں ہوتا خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ والدین کو بحیثیت مجموعی بیان کیا گیا ہو۔ معلوم ہوا کہ ابراہیم کے والد کا نام آزر تھا تارخ ہو یا نہ ہو۔

(۳) حضرت ابراہیم نے اپنے باپ کو چار طور پر خطاب کیا ہے اور ہر خطاب ایک خاص نیرنگی کا حامل ہے، لیکن واضح رہے کہ غضب پر رحمت اور تہذیب کو کہیں جانے نہیں دیا۔ ہر خطاب کے وقت میرے باپ کہہ کر کلام کیا ہے۔ سب سے پہلے آپ نے باپ کو بت پرستی سے روگرداں ہونے اور توحید کی طرف آنے کی دعوت دلائل کی روشنی میں دی اور فرمایا آبا یہ بت نہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں۔ پھر آپ ان کی پرستش کیوں کرتے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ عقلاً قابلِ پرستش وہی ہو سکتا ہے جو پرستار سے اعلیٰ اور افضل ہو اور چونکہ آپ سننے دیکھنے اور نفع نقصان پہنچانے پر قدرت رکھتے ہیں اور بت ان تمام چیزوں سے بے بہرہ ہیں، اس لئے وہ ادنیٰ اور آپ اعلیٰ ہیں۔ پھر اعلیٰ ہو کر ادنیٰ کی پرستش کیوں کرتے ہو۔ اس کے علاوہ قابلِ پرستش وہی ہو سکتا ہے جو عالم کل اور قادر مطلق ہو۔ بت نہ عالم ہیں نہ قادر بلکہ ان کے تو ظاہری حواس بھی نہیں، پھر وہ کس طرح معبودیت قرار پا سکتے ہیں۔ مزید برآں معبود کی عبادت کرنے کا تو حاصل ہی ہو سکتا ہے کہ وہ عابد کی دعا کو سنتا، اس کی حالتِ عبادت کو دیکھتا اور کارسازی کر سکتا ہو۔ جو معبود دیکھنے سننے اور کارسازی کرنے سے عاری ہو وہ کیا مستحق الوہیت ہو سکتا ہے۔

باپ کا درجہ عمر، تجربہ اور جذبۂ دینی میں بیٹے سے عموماً زائد ہوتا ہے، اس لئے آزر کو اپنے بیٹے کے کہنے سے آبائی مذہب کو ترک کرنا اور اولاد کی اتباع کرنا گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے کو بیٹے سے زیادہ دانا تجربہ کار اور ہوشیار سمجھے ہوئے تھا، اس لئے دوسرے خطاب کے وقت ابراہیمؑ نے اپنی برتری، دانائی اور بلند نظری کو پیش کرنے کے لئے فرمایا۔ آبا جو علم مجھے عطا کیا گیا ہے اس سے آپ محروم ہیں یعنی وجہ فضیلت صرف علم ہو سکتا ہے۔ میرے دل میں فطرتاً اور الہاماً جو نورِ علمی جگمگا رہا ہے وہ آپ کے دل میں نہیں ہے۔ حقانیت و صداقت کا پرتو مجھے نظر آ رہا ہے اور آپ اس سے محروم ہیں۔ لہٰذا آپ پر لازم ہے کہ میرا کہنا مانیں میری پیروی کریں، میں آپ کو سیدھے راستے پر لے چلوں گا۔

آزر بت پرستی کو حق سمجھا ہوا تھا۔ آبائی طریقہ پر کاربند ہونے کو صداقت جانتا تھا اور طریق سلف سے روگردانی کو نفس کا فریب اور اغوا یقین کئے ہوئے تھا، اس لئے تیسرے خطاب میں حضرت ابراہیم نے فرمایا آبا شیطان کی پرستش نہ کرو شیطان اللہ کا نافرمان ہے۔ یعنی بتوں کی پرستش اور طریقۂ سلف پر بلا دلیل قائم رہنا شیطانی اغوا ہے۔ یہ بتوں کی پرستش کیا شیطان کی پرستش ہے اور ظاہر ہے شیطان رحمان کا مخالف ہے۔ اللہ اپنی رحمت سے بندوں کو سرفراز کرنا چاہتا ہے اور شیطان شیطنت کر کے ابدی ہلاکت میں ڈالنا چاہتا ہے۔ لہٰذا دشمن کی پرستش اور مہربان دوست سے روگردانی کسی طرح زیبا نہیں۔

آزر کو بیٹے کی بات کا یقین آنا دشوار تھا۔ وہ جانتا ہی نہ تھا کہ شیطان کیسا ہوتا ہے اور رحمٰن کون ہے۔ شیطان کی دوستی کس کو کہتے ہیں اور رحمٰن

کی مدت کے کیا معنی ہیں، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے چوتھے خطاب کے ذیل میں فرمایا ابا! مجھے اندیشہ ہے کہ اگر رحمٰن کی طرف سے تم پر کوئی عذاب آیا تو شیطان کے تم ساتھی ہو جاؤ گے یعنی شرک کرنے اور رحمٰن کی نافرمانی کرنے کا نتیجہ عذاب ہے۔ اب اگر تم شرک کرو گے تو اللہ کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے ہے اور ظاہر ہے کہ شیطان تمہاری حمایت نہ کر سکے گا بلکہ وہ خود مبتلائے عذاب ہوگا، اس لئے تم کو بھی اس کے ساتھ عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔ گویا حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کی طاقت کی ہمہ گیری اور شیطان کی کمزوری و بے بسی کو ظاہر فرما کر باپ کے سامنے صریحاً حقیقت کا انکشاف کیا اور وہ طرزِ گفتگو اختیار کیا جس سے دشمن و دوست اور مجبور و قادر ہستیوں کا امتیاز ہو جائے۔ آزر کو جب دلائل ابراہیمی کا کوئی جواب نہ بن پڑا تو جہالت پر اتر آیا اور قتل کی دھمکیاں دینے لگا۔

رَجْم کے معنی ہیں سنگسار کرنا۔ عام مفسرین نے یہی ترجمہ کیا ہے، مگر ابن عباس، سدی، ابن جریج اور ضحاک وغیرہ نے قصاص اور بدلہ لینے کے معنی لکھے ہیں۔ اس تقریر پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ آزر نے کہا اگر تو نے میرا کہنا نہ مانا اور مجھے ملامت کرتا رہا تو میں بھی جواب میں تجھے سخت سست کہوں گا۔ تو مجھے چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے کہیں چلا جا اب مُنہ مت دکھانا۔

مَلِیًّا کا ترجمہ مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، محمد بن اسحاق وغیرہ نے مدت کیا ہے۔ حسن بصری نے مدت دراز لکھا ہے۔ سدی نے ہمیشہ کا لفظ تحریر کیا ہے۔ مراد سب کی ایک ہے یعنی عمر بھر، لیکن عوفی اور علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس کا جو تفسیری قول نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک مَلِیًّا کا ترجمہ ہے۔ تندرست اور صحیح سلامت۔ یعنی آزر نے کہا خیریت اسی میں ہے کہ میرے پاس سے صحیح سلامت چلا جا کہیں میری طرف سے تجھ کو تکلیف نہ پہنچ جائے۔ ضحاک، قتادہ، عطیہ اور مالک کا بھی یہی قول ہے۔ ابن جریر نے بھی اسی ترجمہ کو ترجیح دی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب ہر نصیحت و پند بے سود دیکھی سلام و وداع کر کے رخصت ہوئے اور چلتے وقت باپ سے وعدہ کر لیا کہ میں پروردگار سے تمہارے لئے دعائے مغفرت کروں گا۔ وہ مجھ پر مہربان ہے امید ہے کہ میری دعا قبول فرمائے گا اور محروم نہ رکھے گا چونکہ اس وقت حضرت ابراہیم کو باپ کا ازلی کافر ہونا معلوم نہ تھا، اس لئے ایسا وعدہ فرما لیا ورنہ پیغمبر کسی رشتہ اور نسب اور دوستی کی پرواہ اللہ کی مخالفت کے موقعہ پر نہیں کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر گھر بار، دوست احباب، اعزا و اقارب اور شہر وطن چھوڑ کر چل دیئے۔

سیاق آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس وقت کا ہے جب کہ نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈال کر دیکھ لیا کہ آپ کا بال بیکا نہ ہوا مزید ایذا دینی مناسب نہ سمجھی بلکہ ملک سے نکال دینے کا ارادہ کر لیا اور حضرت ابراہیمؑ بھی بحکم الٰہی ترک وطن پر راضی ہو گئے اپنی بی بی کو ساتھ لے کر چل دیئے۔ چلتے وقت باپ کو بھی ساتھ لینا چاہا، ہر طریقہ سے فہمائش کی، مگر اس نے ایک نہ مانی مجبوراً آپ چل دیئے۔

(۴) اعلانِ حق، اشاعت صداقت، تبلیغ توحید، تحمل مصائب اور ترک تعلقات کا عوض خدا تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو یہ دیا کہ (ایام پیری میں جبکہ خود ناقابلِ اولاد ہو چکے تھے اور بیوی بانجھ تھی) جلیل القدر بیٹا اور عالی مرتبہ پوتا عنایت کیا۔ یعقوب اسحاق کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے۔ آپ نے اپنی زندگی ہی میں پوتے کو بھی دیکھ لیا تھا۔ خدا تعالیٰ نے ان دونوں کو نبی بھی بنایا اور قبولیت عامہ بھی عطا کی۔ آیات میں حضرت اسماعیل یا دوسری اولاد کا تذکرہ نہیں ہے۔ کیونکہ جن لوگوں کو حضرت ابراہیم نے اپنے وطن میں چھوڑا تھا ان کے عوض خدا تعالیٰ نے یہی دونوں بیٹے عنایت کئے تھے۔ رہی دوسری اولاد تو وہ گزشتہ اعزا و اقارب کا عوض نہ تھی بلکہ محض فضلِ الٰہی تھا۔ اس کے علاوہ حضرت اسحاق و حضرت یعقوب ہی رہتے تھے آپ ہی کی زیرِ نگرانی دونوں نے پرورش پائی اور دونوں صاحبوں کو دیکھ کر ہر وقت خنکیٔ چشم اور سرورِ دل حاصل کرنے کا موقع ملتا رہا۔ حضرت اسماعیل تو ان کو شیر خوارگی کی ہی حالت میں جدا کرنا پڑا اور بحکم الٰہی کعبہ کے پاس لا کر چھوڑ دیا۔ ان کی تربیت، نمو، ترقی اور طفلانہ حرکات کا مزہ نہ پایا۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے اس موقع پر ان کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔

(۵) خدا تعالیٰ نے حضرتِ ابراہیم اور آپ کی اولاد کو بڑی بڑی نعمتوں سے سرفراز فرمایا تھا، لیکن ایک عظیم نعمت ایسی تھی جو آپ سے پہلے کسی کو نہیں عطا فرمائی گئی تھی۔ شہرت اور قبولیت عامہ دنیا میں دعوہ اسرائیل سے پہلے کسی نبی کو اتنی حاصل نہیں ہوئی جتنی ان بزرگوں کو حاصل ہوئی بلکہ اب تک کسی کو اتنی عالمگیر پسندیدگی سے نہیں دیکھا جاتا جتنا ان حضرات کو دیکھا جاتا ہے۔ تقریباً دنیا کے دو تہائی آدمی اب تک ان تینوں بزرگوں کو پیشوا

پیغام: یہودی اور عیسائی عظمت سے ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اہلِ اسلام پانچ وقتہ نمازوں میں اپنے نبی آخرالزماں کے ساتھ ان پر درود بھیجتے ہیں۔ عرب کے مشرک بھی حضرت ابراہیمؑ کو اپنا مرشد اور مقتدا مانتے تھے اور ملتِ ابراہیمی پر کاربند ہونے کے مدعی تھے۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے فرمایا ہم نے ان کو بلند شہرت اور سچی عزت عطا فرمائی۔

مقصودِ بیان

خوردی اور بزرگی کا مدار تفاوت عمر پر نہیں ہے۔ علم وجاہت اور عمل صالح پر ہے۔ معبود کو ذی علم و ذی ہوش قادر مطلق ہونا چاہیے۔ فاضل مفضول کی اور اعلیٰ ادنیٰ کی عبادت نہیں کر سکتا۔ مقتدا کا علم مقتدی سے زائد ہونا لازم ہے۔ جب جاہل آدمی دلائل کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو جاہلانہ دھمکیوں پر اُتر آتا ہے جس طرح آذر نے کیا۔ اس میں در پردہ ایماء ہے اس طرف کہ اہلِ حق کا شیوہ محض یہ ہے کہ دلائل پیش کریں۔ عقل و بصیرت کی روشنی میں اپنے مدعا کو ثابت کریں۔ دھمکیاں دینا جاہلوں کا شیوہ ہے۔ راہِ حق میں اعزاء، واقارب، ماں باپ، وطن، دھن دولت غرض ہر عزیز کو ترک کرنا اور عملی کھڑا ہونا لازم ہے۔ کافر کا مسلمان سے کوئی رشتہ باقی نہیں رہتا۔ اللہ کی راہ میں جو شخص نکل کھڑا ہوتا ہے اور اسی کی خوشنودی کے لئے کل دنیاوی تعلقات کو توڑ دیتا ہے اللہ اس کی کارسازی فرماتا اور اسے غیبی انعام سے سرفراز کرتا ہے۔ نیک اولاد بھی ماں باپ کے لئے اللہ کا بڑا انعام ہے۔ شہرت اور قبولیت عامہ اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ مسلمانوں کو عبرت حاصل کرنی چاہیئے حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ سے جو ہزاروں عبرت انگیز اسباق کا حامل ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ واقعہ ہم کو صحیح ایثار اور کامل قربانی کی تعلیم دیتا ہے۔ کاش مسلمان بلند ہمت، بلند نظر اور بلند خیال ہو جائیں اور راہِ خدا میں پیش آنے والی کسی مصیبت کی پرواہ نہ کر کے اعلانِ حق کے لئے کمرِ ہمت باندھ لیں وغیرہ

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ

(اے نبی) کتاب میں موسیٰ کا تذکرہ کرو وہ بلاشبہ منتخب اور نبی مرسل تھے ہم نے اُن کو طور کے

جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ

دائیں جانب ندا دی اور راز دار بنا کر قریب بلایا اور اپنی رحمت سے اُن کے بھائی ہارون کو نبی بنا کر ان کو عطا

نَبِيًّا ۝ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا

کیا اور (اے نبی) کتاب میں اسمٰعیل کا تذکرہ کرو بلاشبہ وہ وعدے کے سچے اور نبی مرسل

نَّبِيًّا ۝ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝

تھے اپنے گھر والوں کو نماز و زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ تھے

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝

اور کتاب میں ادریس کا تذکرہ کرو وہ بلاشبہ بڑے سچے نبی تھے ہم نے اُن کو ایک بلند مکان میں اُٹھایا

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ وَمِمَّنْ

یہ سب انبیاء جن پر اللہ نے انعام فرمایا تھا یہ لوگ آدم کی نسل سے اور اُن لوگوں کی نسل سے

حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْرَائِيلَ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا

جن کو نوح کے ساتھ ہم نے سوار کیا تھا اور ابراہیم و اسرائیل کی نسل سے اور اُن لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت دی اور منتخب کیا

إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۩ السجدة

جب اُن کے سامنے رحمٰن کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو روتے ہوئے سجدہ میں گر پڑتے تھے

تفسیر ان آیات میں تین نامور پیغمبروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہودی حضرت عیسیٰ کی پیروی کے مدعی تھے۔ مشرکین عرب حضرت اسماعیل کو اولوالعزم بزرگان ملت میں سے شمار کرتے تھے، اور حضرت ادریس فلسفہ و حکمت کی دنیا میں امام مانے جاتے تھے۔ تینوں حضرات کے خصوصی اوصاف اور ذاتی محاسن بیان فرما کر اس انعام کو ظاہر فرمایا جو بطور جزا خدا نے ان کو عنایت کیا تھا۔

چند مباحث (۱) حضرت موسیٰ کے تین اوصاف بیان کئے۔ مخلَص ہونا، رسول ہونا اور نبی ہونا۔ مخلَص کا ترجمہ ہے منتخب حضرت موسیٰؑ کو خدا تعالیٰ نے بلا واسطہ کلام سے سرفراز کیا اور نبی و رسول بنا کر فرعون کے مقابلے پر مامور فرمایا یہی انتخاب و برگزیدگی تھی جس کو ظاہر کرنے کے لئے لفظ مخلَص استعمال کیا۔ حضرت موسیٰ اسرار غیب سے واقف تھے، حقیقت کے شناسا تھے، معرفتِ الٰہی سے سرشار تھے۔ آپ کے پاس غیبی مقدس فرشتہ آتا تھا اور حقائق احکام کی اطلاع دیتا تھا۔ پس یہی آپ کی نبوت تھی اور چونکہ کتاب بھی ملی تھی صاحبِ اُمت بھی تھے جبار و قہار بادشاہ کے مقابلے پر مامور بھی ہوئے تھے، اس لئے آپ رسول بھی تھے۔ اکثر علماء کا قول ہے کہ ہر نبی رسول ضرور ہوتا ہے۔ جو واقفِ حقیقت نہ ہو اس کو پیغمبر کیسے بنایا جا سکتا ہے لیکن ہر نبی کا رسالت و تبلیغ پر مامور ہونا ضروری نہیں۔ اس صراحت کے موافق رسول کے بعد نبی کا تذکرہ بطور تاکید ہوگا۔

میں کہتا ہوں رسالت و نبوت دونوں جدا جدا مراتب ہیں۔ ایک میں ہبوط ہے دوسرے میں صعود۔ ایک سعادت محض روحانی اور عقلی ہے اور سعادت دماغی حواس اور جسمانی اعضاء کی وساطت کی منت کش ہے۔ جس شخص کو خدا تعالیٰ منتخب فرما لیتا ہے اس کی شفاف روح اور روشن عقل کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک پہلو کے اعتبار سے اس کو نبی کہا جاتا ہے اور دوسرے رُخ کے لحاظ سے وہ رسول ہوتا ہے۔ وہ آفتاب قدس کے چہرے پر نور کے ستر ہزار پردے ہیں اور حس کی کرنوں کو براہ راست کوئی دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا۔ جب انسانی دنیا کے دلوں پر جلوہ پاش اور پرتو انداز ہوتا ہے تو چونکہ براہِ راست بلا واسطہ یہ کثیف مادی انسان اُس سے نور حاصل نہیں ہو سکتا اس لئے کسی ایسی ہستی کی ضرورت ہوتی ہے جس کا الحاق عالم بالا سے بھی ہو اور مادی دنیا سے بھی وہ جدا نہ ہو تا کہ آفتابِ قدم سے کسبِ فیض کرنے کے بعد وہ زیریں دنیا کو منور بنا سکے۔ مثال کے طور پر اس طرح سمجھو کہ آفتاب کی شعاعیں براہ راست کھلے میدانوں، بلند پہاڑوں اور اونچے اونچے درختوں پر پڑتی ہیں۔ چٹیل ریگستان، سنسان بیابان سب ہی پر دھوپ پڑتی ہے، مگر کسی کوٹھی یا کمرے کے اندر دھوپ نہیں پہنچتی کیونکہ مضبوط چھت یا کوئی آڑ حائل ہوتی ہے جو براہِ راست سورج کی کرنوں کو کمرے کے اندر پہنچنے سے روکتی ہے۔ اب اگر آفتاب کی روشنی اندر پہنچانی مقصود ہو تو اس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی صاف آئینہ سورج کے مقابل رکھا جائے، لیکن ذرا ترچھا ہونا چاہیے۔ سورج کی شعاعیں اس آئینہ پر پرتو انداز ہوں اور پھر اس آئینہ کا انعکاس کمرے کے اندر ہو۔ گویا آئینہ آفتاب کی کرنوں کو بلا واسطہ جذب کرے اور پھر خود کمرے کی اندرونی فضا پر ضوا فگن ہو، لیکن یاد رہے کہ آئینہ کی پشت پر کوئی مصالحہ ہونا ضروری نہیں بلکہ اس کا ایک رُخ کثیف ہو اور اس قابل بنا جائے کہ سورج کی شعاعوں کو جذب کر کے کمرے کی اندرونی فضا پر عکس ریزی کر سکے۔ اگر پشت پر کوئی کثیف مصالحہ نہ لگا ہو گا تو خود شعاعوں کو جذب کرے گا، مگر عکس ریزی نہ کر سکے گا۔ کرنیں پار ہو جائیں گی۔ بعینہٖ یہی حال آئینۂ نبوت کا ہے۔ آفتابِ ازل کی شعاعوں نے براہِ راست استفاضہ کرنے کی اس تاریک کرہ (یعنی کائنات انسانی) میں قابلیت رکھی۔ قدیم لم یزل کی نور پاشیاں اور پرتو اندازیاں بلا واسطہ عام انسانوں کے لئے بے سود ہیں۔ مادی کثیف چھت وسط میں حائل ہے لہٰذا اس آڑ کے ہوتے ہوئے کسب نور ناممکن ہے۔ اس لئے آئینۂ نبوت کی ضرورت ہے۔ یہ درمیانی ہستی خود عالم

قدس سے کسب فیض کرتی ہے، نور کو جذب کرتی ہے، اسرار غیب اور قوانین الٰہیہ کو حاصل کرتی ہے، عقائد صائبہ اور اعمال صحیحہ کا علم رکھتی ہے اور جذب کرنے کے بعد عام انسانوں کو مستفیض کرنے کے لئے سب پر ضو پاشی کرتی ہے۔ جو اسرار وحی اور راز ہائے مخفی عالم غیب سے اس کو معلوم ہوتے ہیں اور عبادات و معاملات و عقائد کے جو اصلاحی اصول و قواعد اس کو پہنچتے ہیں وہ دنیا کو اس سے فائدہ پہنچاتی ہے، لیکن ہر نبی کا آدمی ہونا ضروری ہے۔ بشریت پر معاملہ کی کثافت لازم ہے ورنہ آدمیوں کو اس سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس تقریر کو جاننے کے بعد آئینہ کی دونوں حیثیتوں پر غور کرنا چاہیئے ایک حیثیت نور حاصل کرنے کی ہے، جذب شعاع کرنے کی ہے، کسب فیض کی ہے۔ دوسری حیثیت ضیا افگنی، نور پاشی اور فیض رسانی کی ہے۔ اول الذکر درجہ نبوت کا ہے جس میں ترقی اور صعود کا اعتبار ہوتا ہے۔ دوسرا درجہ رسالت کا ہے جس میں ہبوط و نزول کا پہلو ملحوظ ہوتا ہے۔ نبی واقف اسرار ہوتا ہے۔ علوم وحی کا شناسا ہوتا ہے، راز درون پردہ کا اس کی روح پر انکشاف ہوتا ہے، اعضائے جسمانی اور مادی حواس کا اس اخذ معارف میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ نہ کسی بیرونی وساطت کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن جب حاصل کردہ علوم و معارف کو انسانی طبقہ تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے تو مادی حواس اور جسمانی اعضاء بر سر کار آتے ہیں۔ زبان سے ہاتھ سے پاؤں سے اور دیگر اعضاء سے تبلیغ کرتا ہے، اس کے پاس جو وحی آتی ہے وہ بر سر عام اس کا اعلان کرتا ہے اس تفصیلی تبصرہ سے ظاہر ہو گیا کہ نبی اور رسول جدا جدا شخصیتیں نہیں ہوتیں صرف اعتبارات کا اختلاف ہوتا ہے۔ تاثر و تاثیر، انفعال و فعل اور استفاضہ و افاضہ کا فرق ہوتا ہے۔ ورنہ کوئی رسول ایسا نہیں جو نبی نہ ہو اور نہ کوئی نبی ایسا ہے جو رسول نہ ہو۔ جن اہل تفسیر نے دونوں کے درمیان عموم خصوص کی نسبت قرار دی ہے وہ غلطی پر ہیں۔ صاحب کتاب کو رسول اور دوسرے نبی کی شریعت کی پیروی کرنے والے کو نبی کہنا خلاف صراحت قرآنی ہے۔ حضرت لوطؑ اور حضرت اسماعیلؑ رسول تھے، مگر صاحب کتاب نہ تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کے پیرو تھے اور حضرت ابراہیمؑ کے متعلق صرف نبی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

(۲) طور کے دائیں جانب سے خدا تعالیٰ نے موسیٰ کو ندا دی۔ اِنِّیٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا۔ طور سے کون سا پہاڑ مراد ہے اور دائیں جانب کس کی تھی اور یہ واقعہ کس کا ہے؟ مفسر سراج نے کہا کہ طور ایک پہاڑ کا نام ہے۔ جب موسیٰ مدین سے آ رہے تھے تو وہ پہاڑ دائیں جانب تھا وہیں سے موسیٰ کو ندا ہوئی تھی، وہیں توریت نازل ہوئی تھی اور اسی جگہ بنی اسرائیل کے نمائندوں کو ابر کے اندر سے خطاب الٰہی کی لذت ملی تھی۔ خطیب کی اس صراحت سے واضح ہوتا ہے کہ طور سے طور سینا مراد ہے جو نہر سویز کے قریب واقع ہے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ طور لغت میں سرسبز پہاڑ کو کہتے ہیں، آیت میں طور سینا مراد نہیں بلکہ کوہ زبیر مراد ہے جو بیت المقدس کے قریب واقع ہے۔ کیونکہ اگر طور سینا مراد لیا جائے گا تو مدین سے مصر کو جاتے ہوئے یہ پہاڑ دائیں جانب واقع نہیں ہوتا بلکہ بائیں جانب ہوتا ہے۔ ابن کثیر اور قتادہ کی تصریحات سے بھی ثابت ہے کہ طور سینا مراد نہیں بلکہ کوئی پہاڑ مراد ہے اور جانب ایمن سے موسیٰ کا دایاں جانب مراد ہے۔

میرے نزدیک ان دونوں اقوال میں مفسر سراج کا قول اصح ہے کیونکہ جس زمانے میں حضرت موسیٰ مدین سے مصر کو واپس آ رہے تھے۔ اس زمانے میں بیت المقدس بلکہ تمام ملک شام میں عمالقہ کا تسلط تھا اور مدین سے مصر کو جاتے ہوئے ادھر راستہ نہ تھا پھر کس طرح موسیٰ کوہ زبیر کی طرف آئے۔ لامحالہ طور سینا ہی مراد ہے۔ رہا یہ اعتراض کہ مدین سے مصر کو جانے والے کے بائیں جانب طور سینا پڑتا ہے۔ دائیں جانب نہیں پڑتا تو یہ اعتراض غلط ہے۔ کیونکہ آیت فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰۤى اِنِّیْۤ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ میں صاف صراحت ہے کہ وادی ایمن کے کنارے یہ ندا ہوئی تھی، یہ کہیں ثابت نہیں کہ سر راہ موسیٰ جا رہے تھے۔ بات یہ ہوئی کہ جب حضرت شعیب کے پاس حضرت موسیٰ واپس آئے اور مصر کے ارادے سے چل دیئے تو وادی سینا میں اترے قیام کیا۔ بائیں جانب دور سے آگ روشن نظر آئی۔ آپ یعنی اسی رخ پر چل دیئے۔ وہاں نعمت رسالت سے سرفراز ہوئے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس وقت بھی آپ کا رخ مصر کی جانب تھا۔ بلکہ اس وقت آگ کی طرف توجہ تھی اور آگ کی طرف رخ کرنے کے وقت طور سینا دائیں جانب واقع ہوا تھا۔

(۳) جب وادی ایمن کے کنارے سے ندا پہنچی آئی۔ موسیٰ کی روح سے مادی پردہ ہٹ گیا۔ نور قدم جگمگانے لگا۔ مرتبہ قرب حاصل ہوا۔ غیبی اسرار کا انکشاف ہوا۔ موسیٰ نے مناجات کی۔ تسلی بخش جواب سے سرفراز کیا گیا۔ تبلیغ احکام پر مامور ہوئے۔ فرعون کو ہدایت کرنے کا حکم ملا۔ موسیٰ نے اپنی زبان

کی گرہ کھولنے کی استدعا کی فوراً زبان آور اور فصیح اللسان ہوگئے۔ لکنت جاتی رہی۔ اکیلے تھے مصر میں کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ بھائی کی محبت نے جوش مارا۔ عرض کیا پروردگار! ہارون کو میرے ساتھ کر دے تاکہ وہ میری ہمنوائی کرے۔ غرض قبول ہوگئی۔ ہارون کو نبوت عطا ہوئی۔ موسیٰ کی خلافت اور وزارت کا درجہ مرحمت ہوا۔ ابن جریر نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ ہارون موسیٰ سے بڑے تھے۔ بعض سلف نے چار سال بڑا لکھا ہے۔

(۴) حضرت اسماعیل کے متعلق ارشاد ہوا کہ وہ صادق الوعد تھے۔ سب انبیاء صادق الوعد ہوتے ہیں کوئی وعدہ خلافی نہیں کرتا پھر اسمٰعیل کی تخصیص کیوں کی؟ اس کی توجیہ مفسرین وغیرہ نے مختلف طرح کی ہے۔ کوئی کہتا ہے اسمٰعیل نے اپنے کسی دوست سے ٹھہرے رہنے کا وعدہ کیا تھا وہ جاکر بھول گیا اور آپ سال بھر وہیں کھڑے رہے۔ کسی نے کچھ اور تاویل کی ہے، لیکن میرے نزدیک اگر روایۃً یہ واقعات صحیح ثابت بھی ہوجائیں تب بھی ناقابلِ امتیاز ہیں، حقیقی وجہ کچھ اور ہے۔ بات یہ ہے کہ حضرت اسمٰعیل نے (اس حکم کی تعمیل کے لئے جو حضرت ابراہیم کو خواب میں ملا تھا جس کی حقیقت سربستہ تھی۔ نہ ابراہیم اس کی علت سمجھے تھے نہ اسمٰعیل) اپنی جان کو راہِ خدا میں قربان ہونے کے لئے پیش کرنے کا وعدہ حضرت ابراہیم سے کیا۔ باپ کے خواب پر اٹھارہ سالہ نوجوان کا یہ ایثار قابلِ ستائش تھا۔ وعدہ کرنے کے بعد اس کو پورا بھی کیا۔ ذبح ہونے کے لئے تیار ہوگئے۔ گویا قربان ہو بھی گئے۔ کیونکہ چھری حلقوم پر پھر ہی گئی۔ مگر عالمِ غیب میں کوئی اور راز مخفی تھا، اس لئے بحکمِ الٰہی محفوظ رہے۔ صادق الوعد ہونے سے اسی طرف اشارہ ہے۔ دیگر انبیاء بھی راہِ حق میں قربان ہوئے۔ یحییٰ، زکریا، اشعیاء، ارمیاء وغیرہ سب ہی جاں نثار تھے۔ مگر جاں نثاری کی وجہ ظاہر تھی تبلیغِ حق کر رہے تھے۔ قوم دشمن ہوگئی۔ انہوں نے اعلانِ توحید اور اصلاحِ خلق سے ہاتھ نہ اٹھایا، قوم نے شہید کر دیا، مگر اسمٰعیل کی قربانی تو انداز اور ہی کیفیت رکھتی ہے۔ خود اپنے ارادے سے حکمِ الٰہی کی تعمیل میں اپنے کو ذبح کرنے کے لئے پیش کیا اور حکمِ ذبح کی وجہ بھی معلوم نہیں نہ کوئی اور مقصد پیشِ نظر ہے۔ یہ قربانی دیگر انبیاء کی قربانی سے بالاتر ہے۔ صداقتِ وعدہ اسی کو کہتے ہیں۔

(۵) حضرت اسمٰعیل رسول اور نبی تھے جو لوگ رسول کو صاحبِ شریعت کہتے ہیں ان کے نزدیک حضرت اسمٰعیل کی شریعت کا مستقل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اسی بنا پر وہ قائل ہیں کہ اسمٰعیل کو بعض خصوصی احکام عطا کئے گئے تھے۔ کعبہ کا طواف، حج اور شکار کے بعض مسائل آپ کے لئے مخصوص تھے اور قبیلۂ جرہم کی ہدایت کے لئے آپ مبعوث ہوئے تھے۔ ہم نے رسول و نبی کی جو توضیح کر دی ہے وہی صحیح ہے کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔ حضرت اسمٰعیل کی خصوصیات ثبوت طلب ہیں۔ کعبہ کا طواف حضرت ابراہیم نے بھی کیا تھا۔ آپ بھی حج کو آئے تھے۔ اسمٰعیل کی کوئی خصوصیت نہیں۔ حضرت اسمٰعیل کا ایک مدحیہ وصف یہ تھا کہ آپ اپنے اہل کو صلوٰۃ و زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔ ابن عباس کے نزدیک صلوٰۃ سے وہ طریقۂ عبادت مراد ہے جو اس وقت تھا اور زکوٰۃ سے عام خیرات صدقات مراد ہیں۔ گویا عبادتِ جسمانی اور عبادتِ مالی دونوں باتوں کی ہدایت حضرت اسمٰعیل کیا کرتے تھے۔ اہل سے مراد گھر والے اور اصفہانی کے نزدیک افرادِ امت مراد ہیں۔ ہر نبی نماز اور صدقات کا حکم دیتا اور آغازِ تبلیغ اپنے گھر والوں ہی سے کرتا ہے۔ پھر حضرت اسمٰعیل کے ان اوصاف کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیوں فرمایا؟ بات یہ ہے کہ نماز نام ہے انتہائی عاجزی، کمزوری، تذلل اور خضوع و خشوع کا جس کو بندہ اپنے پروردگار کے سامنے کرتا ہے۔ بارگاہِ الٰہی میں سرِ نیاز جھکا دیتا ہے، اپنا سر پیش کرتا ہے، روح کی نذر بغرضِ قبول سامنے لاتا ہے، اللہ کے سوا ہر خیال کو دل سے خالی کر لیتا ہے۔ آخری نماز یہی ہو سکتی ہے کہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے سجدہ میں اپنی خوشی سے حلقوم پر چھری پھروا دے۔ اس کے بعد مالی قربانی کا درجہ ہے۔ حضرت اسمٰعیل میں یہ دونوں اوصاف بدرجۂ اکمل موجود تھے۔ اس لئے آپ ہر وقت چاہتے تھے کہ گھر والوں میں یا عام قوم والوں میں ایثارِ مالی اور قربانِ نفسی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ ہر وقت جان و مال کی بازی لگانے کا حکم دیتے تھے۔ اسی بنا پر اللہ نے ان کو پسند کر لیا، چن لیا، انتخاب کر لیا۔

(۶) حضرت ادریس بھی نبی تھے۔ صدیق بھی تھے۔ ادریس کا لفظ عربی ہے یا عجمی؟ آپ کا اصل نام کیا تھا۔ آپ کا نسب کیا تھا؟ یہ تمام مباحث طوالت طلب ہیں۔ ہم مختصراً لکھتے ہیں۔ اکثر علماء کے نزدیک عربی لفظ ہے۔ آپ کا اصل نام اخنوخ (حنوک) تھا۔ آپ حضرت نوح کے پردادا تھے۔ حضرت آدم کے پوتے اور حضرت شیث کے بیٹے تھے۔ یونانی فلسفہ والے آپ کو ہرمس اول کہتے تھے اور حقائقِ کونیہ کا سب سے

بڑا ماہر جانتے تھے۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ علم نجوم، علم حساب اور فن کتابت کے آپ ماہر تھے۔ آپ ہی نے ان علوم کی ایجاد کی۔ کپڑا سینا بھی آپ ہی نے سکھایا۔ بعض ہتھیاروں کی ایجاد بھی آپ ہی کی منت کش ہے۔ بقول اہل کتاب آپ پر ۳۰ صحیفے نازل ہوئے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ کثیر العبادت تھے۔ کثرت عبادت کے سبب تمام فرشتے دوست ہو گئے تھے ایک بار آپ نے ملک الموت سے موت کا ذائقہ چکھنے کی خواہش کی، فرشتۂ موت نے روح نکال کر دوبارہ جسم میں ڈال دی اور عالم برزخ میں پہنچا دیا۔ آپ زندہ ہو کر دوزخ کی سیر کے خواہاں ہوئے حسب الحکم دوزخ کی سیر کی پھر جنت کی سیر کی خواہش کی۔ جنت میں پہنچے تو وہیں رہ گئے اور فرمایا میں نے موت کا مزہ بھی چکھ لیا، دوزخ بھی دیکھ آیا اب جنت سے کیوں نکلوں۔ بالآخر بحکم الٰہی وہیں رہنے لگے۔ یہ اور اس قسم کی دوسری روایات کی بنا پر اسرائیلی ملفوظات پر ہے جو کسی طرح قابل اعتبار نہیں۔ ائمۂ حدیث و روایت نے ان کی تغلیط کی ہے، لیکن آیت قرآنیہ کا سمجھنا ان روایات پر موقوف نہیں۔ رفعت مکانی کا کوئی قصہ روایات صحیحہ سے ثابت نہیں، اس لیے وثوق کے قابل نہیں۔

رفعت سے مراد علو مرتبہ اور قرب الٰہی کا حصول ہے۔ چونکہ حضرت ادریس دنیا سے سیر ہو چکے تھے اور خود وفات کے طالب تھے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ خدا تعالیٰ نے صراحت فرما دی کہ ہم نے ادریس کو علو مرتبہ اور رفعت عزت عطا فرمائی (اور وفات دے کر مقام علیین میں بھی بلند مقام عنایت کیا۔

اس سے آگے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ مذکورۂ بالا تمام انبیاء جو آدم کی اولاد میں سے تھے۔ ان میں سے بعض کا نسلی تعلق ان لوگوں سے تھا جو نوح کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر بچ رہے تھے اور پیچھے آ کر یہ لوگ ابراہیم و یعقوب کی اولاد میں سے تھے۔ ان سب کو خدا تعالیٰ نے راہ راست بتلائی تھی۔ اپنے لئے انتخاب کر لیا تھا۔ یہ سب اللہ کے فرماں بردار شکر گزار بندے تھے، احکام الٰہی کی تلاوت اور مناظرات کے مطالعہ کے وقت روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے تھے اور سر نیاز جھکا دیتے تھے۔

مقصود بیان حضرت موسیٰ کا تذکرہ کر کے یہودیوں کو ایمان، عمل خیر اور اطاعت و فرماں برداری کی تلقین کرنی مقصود ہے اور ضمناً اس بات کا اظہار کرنا غرض ہے کہ جو لوگ اللہ کے فرماں بردار اور اطاعت شعار ہوتے ہیں خدا تعالیٰ ان کو دنیا ہی میں اپنے انعام سے سرفراز فرماتا ہے۔ آیات سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ کو آواز الٰہی پہنچی تھی۔ آپ نے خدا تعالیٰ سے مکالمہ بھی کیا تھا اور آپ ہی کی دعا سے حضرت ہارون کو نبی بنایا گیا تھا۔ مِنْ رَّحْمَتِنَا کا لفظ دلالت کر رہا ہے کہ نبوت کسبی چیز نہیں بلکہ وہبی ہے حضرت اسمٰعیل کو صادق الوعد کہنا یہ بات بتا رہا ہے کہ صدق وعدہ جس حد تک بھی ہو قابل مدح فعل ہے۔ آخری آیات میں صراحت ہے کہ گزشتہ انبیاء میں جو خدا کے برگزیدہ بندے تھے۔ وہ خود بخود برگزیدہ نہیں ہو گئے تھے بلکہ عبرت اندوز نظر، بصیرت کوش فکر، پُر اثر دل، فرماں پذیر جذبات رکھتے تھے، نہ رعونت تھی۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ

اُن کے بعد ایسے ناخلف آئے جنھوں نے نمازیں چھوڑ دیں اور خواہشات کے پیچھے پڑ گئے سو عنقریب

يَلْقَوْنَ غَيًّا ۙ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ

وہ گمراہی کی سزا پائیں گے ہاں جنھوں نے توبہ کی اور ایمان لے آئے اور نیک کام کئے تو وہ جنت میں داخل ہوں گے

وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْئًا ۙ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ

اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا اُن دوامی جنتوں میں (داخل ہوں گے)، جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے غائبانہ وعدہ کر لیا ہے

إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًّا ۝ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا إِلَّا سَلَامًا ۖ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا

بلاشبہ اُس کا وعدہ ضرور آئے گا وہاں بجز سلام کے کوئی بیہودہ بات نہ سُنیں گے اور صبح و شام وہاں اُن کی روزی

بُكْرَةً وَعَشِيًّا ۝ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ۝

اُن کو ملے گی یہی وہ جنت ہے جس کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے اس کو بنائیں گے جو پرہیزگار ہوگا۔

تفسیر آیات کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ گزشتہ انبیاء و صلحا کے بعد اُن کے جانشین ایسے نالائق اور نافرماں بردار لوگ ہوئے جنھوں نے عبادت الٰہی کے ادا کرنے میں سستی کی، وقت پر ادا کرنے میں تاخیر کی یا بالکل ترک کر دیا۔ خواہشات نفس کے پیچھے پڑ گئے۔ ان کی سزا جہنم ہے۔ ہاں جن لوگوں نے سچے دل سے توبہ کر لی۔ اللہ کی وحدانیت، انبیاء کی رسالت، روزِ قیامت اور ضروریاتِ دین کو دل سے مانا اور شریعت کے مطابق نیک اعمال کئے وہ جنت میں داخل کئے جائیں گے۔ ذرہ برابر ان کی حق تلفی نہ کی جائے گی الخ۔

تحلیلِ اجزاء فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ۔ سدی کے نزدیک خَلْفٌ سے مراد یہود اور متبعین یہود ہیں۔ ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔ عکرمہ اور مجاہد وغیرہ کا قول ہے کہ مذکورہ صفات کے لوگ آخر زمانے میں ہوں گے جو بازاروں میں ایک دوسرے پر کود پڑیں گے (لعض علی الاعلان فحش پرستی میں مبتلا ہوں گے) میرے نزدیک تخصیص کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ احادیث سے یہودیوں کی تعیین ثابت نہیں نہ آخر زمانے کی خصوصیت منقول ہے۔ اس لئے عام معنی مراد لینا اولیٰ ہے۔ ہر نبی کے اُمتی جو نفس پرست خواہشات کے پرستار، فرائض الٰہیہ کی ادائیگی میں سستی کرنے والے اور قوانین الٰہی کے خلاف ورزی کرنے والے ہوں سب حکم آیت میں داخل ہیں۔

اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ۔ سدی و قتادہ کے نزدیک فرض نماز کا ترک کرنا مراد ہے۔ ابراہیم نخعی اور ابن مسعود کے نزدیک تاخیر نماز مراد ہے۔ میں کہتا ہوں لفظ اِضَاعَة دونوں کو شامل ہے بلکہ ترکِ صلوٰۃ ہو یا وقت سے تاخیر یا سستی یا ارکانِ نماز کا عدم اعتدال اِضَاعَة کے مفہوم میں سب داخل ہیں۔

غَیًّا حدیث میں آیا ہے کہ جہنم کے اندر غَیّ ایک وادی کا نام ہے۔ (رواہ الحاکم) ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ابو سعید خدری کی روایت ہے حضور ؐ نے فرمایا ساٹھ برس کے بعد نالائق لوگ ہوں گے جو نماز کو ضائع کریں گے اور شہوات کے پیچھے پڑ جائیں گے۔ یہ لوگ غَیّ (طبقۂ جہنم) کو پائیں گے۔ ان کے بعد اور نالائق لوگ پیدا ہوں گے جو تلاوتِ قرآن کریں گے، مگر قرآن ان کے حلق سے نیچے نہ اترے گا۔ قرآن پڑھنے والے تین (گروہ) ہوں گے مومن اور منافق اور فاجر (رواہ ابن ابی حاتم) بشیر بن ابو عمرو راوی نے ولید بن قیس سے دریافت کیا کہ قرآن پڑھنے والے تین گروہوں (کے درمیان یہ تفرقہ) کیسا؟ ولید نے جواب دیا مومن ایمان رکھتے ہوئے قرآن پڑھے گا۔ منافق کے دل میں یقین نہ ہوگا، مگر وہ بھی پڑھے گا اور فاجر کی غرض قرآن پڑھنے سے کمائی کرنی ہوگی۔ (کذا رواہ احمد)

اِلَّا مَنْ تَابَ انسانی سعادت تین امور پر موقوف ہے (۱) عقائد، اعمال اور اقوال کی خرابیوں سے صداقت کے ساتھ رجوع کرنا اور اس امر کا سچے دل سے اقرار کرنا کہ آئندہ کوئی گناہ اور غلطی نہیں کروں گا۔ (۲) ضروریات شرعیہ کو سچا جاننا اور عالمِ غیب و شہود کے متعلق تمام منصوصات قرآنیہ کا اعتراف کرنا (۳) اوامر شرعیہ کے مطابق عمل کرنا اور احکام الٰہیہ پر کاربند ہونا۔

اس تقریر کی وضاحت کے لئے بطور تمثیل اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ کسی کثیف زنگ آلود برتن کو منظورِ نظر، قابل قدر اور مرغوب طبع بنانے اور اعلیٰ ترین ظروف کی فہرست میں داخل کر کے شاہی پیش کش میں لانے کے لئے سب سے پہلے یہ امر ضروری ہے کہ اس کا زنگ اور میل کچیل صاف کیا جائے اور ہر قسم کی کثافت سے محفوظ رکھنے کا انتظام کیا جائے۔ اس کے بعد اس پر مالش اور وارنش کیا جائے۔ پھر ظاہری طور پر اس کو سجا بنا کر کشتی میں لگا کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا جائے۔ یہی صورت انسان کی گناہگار روح اور کفر آلود قالب کی ہے۔ کفر و عصیان کا زنگ پہلے دھونا لازم ہے یعنی گزشتہ معاصی

سے توبہ ضروری ہے تخلیہ کے بعد تجلیہ اور پالش کی ضرورت ہوتی ہے یعنی عقائد صحیحہ کا ہونا لازم ہے۔ پھر تجلیہ اور آراستگی آخری چیز ہے۔ یعنی اعمال حسنہ اور اقوال طیبہ کی ضرورت ہے۔ تاکہ انسان کی کثیف روح اور سیاہ دل شہنشاہِ حقیقی کے ملاحظہ میں جانے کے قابل ہو جائے اور سعادت ابدی حاصل کر سکے۔ ہر سہ امور کی تعبیر تَابَ اور اٰمَنَ اور عَمِلَ صَالِحًا سے آیت مذکورہ میں فرمادی۔

عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ۔ اس آیت کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جنت کے مستحق وہ بندے ہیں جن کو جنت اور سعادت ابدی کا غیبی یقین ہے دائرۂ احساس سے اگرچہ جنت خارج ہے نہ کبھی آنکھ سے دیکھی نہ کان سے اس کی حقیقی کیفیت سُنی نہ دماغ سے اس کا تصور کیا، مگر شرعی صراحت پر ان کا ایمان ہے۔ شیطانی شکوک و اوہام کو قطعاً دخل نہیں۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ غیب سے مراد دل ہے۔ یعنی جنتی وہ لوگ ہیں جو ریا کاری کے لئے پرستش نہیں کرتے بلکہ خلوص دل سے عبادت کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دلوں کو اللہ کا پرستلہ بنا رکھا ہے۔ غیر اللہ کی پرستش سے سچے دل کے ساتھ متنفر ہیں۔

بُكْرَةً وَّعَشِيًّا جنت میں نہ صبح ہوگی نہ شام بلکہ نور ہی نور ہوگا، اس لئے صبح شام سے مراد پورے اوقات ہیں۔ ابن جریر نے ساتھ زہیر بن محمد بیان کیا کہ جنت میں رات نہیں ہے وہ لوگ ہمیشہ نور میں ہوں گے۔ ہاں ان کے واسطے مقدار شب و روز کی ہوگی۔ ترمذی لےلوادر الاصول میں حسن بصری اور ابو قلابہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے حضور اقدسؐ سے عرض کیا یا رسول اللہ کیا جنت میں رات ہوگی؟ ارشاد فرمایا تو نے کس باعث سے یہ دریافت کیا؟ عرض کیا حضور خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ لَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا اس آیت سے میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ جنت میں صبح شام ہوگی۔ ارشاد فرمایا وہاں رات نہیں ہے روشنی روشنی ہے۔ اول وقت گیا آخر وقت آیا۔ آخر وقت گیا اول وقت آیا (یعنی اوقات تو کل نورانی ہیں، مگر اوقات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے) اہلِ جنت کے پاس ان اوقات میں تحفے اور ہدیے آتے رہتے ہیں جن میں دنیا کے اندر نمازیں پڑھتے تھے اور ملائکہ ان کو سلام پہنچاتے ہیں۔

مَنْ كَانَ تَقِيًّا۔ تقویٰ کے مختلف مدارج و مراتب ہیں۔ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کفر و شرک سے آدمی پرہیز رکھے اور اعلیٰ درجہ نبوت کا ہے۔ لہٰذا اتقی کا لفظ ہر مومن کو شامل ہے۔ خواہ نیکو کار ہو یا بدکار۔ اچھا ہو یا بُرا۔

مقصودِ بیان اضاعتِ صلوٰۃ اور اتباعِ شہوات کی بلیغ مذمت اور نفس پرست بندگان ہوا و ہوس کے جہنمی ہونے کی صراحت۔ اِلَّا مَنْ تَابَ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر گناہ توبہ کے بعد معاف ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ توبہ کی تین شرائط پر عمل ہو۔ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا میں صاف صراحت ہے کہ وعدۂ الٰہی میں دروغ کی آمیزش محال ہے۔ اس کا ہر وعدہ لازم الوفا ہے۔ لَا يَسْمَعُوْنَ سے یہ اظہار کرنا مقصود ہے کہ علاوہ روحانی اور مادی لذتوں کے اہلِ جنت کو مکالمات میں بھی کوئی ناخوش گوار اور ایذا رساں بات نہ سننی پڑے گی۔ مَنْ كَانَ تَقِيًّا میں مومن کو امیدوارِ جنت قرار دے دیا۔ خواہ وہ نیک ہو یا بدکار، گنہگار ہو یا فرماں بردار۔ البتہ در پردہ اہلِ شرک و کفر کی امید نجات توڑ دی کیونکہ ان کو تقویٰ کا ادنیٰ درجہ بھی حاصل نہیں۔

کل آیات میں بدکاروں کی مذمت اور نیکوں کی مدح ہے۔ اول فرقہ ناری اور دوسرا ناجی ہے وغیرہ۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ

ہم (فرشتے) بغیر تمہارے رب کے حکم کے نہیں اُترتے اُسی کا ہے جو ہمارے آگے پیچھے اور اس کے درمیان میں

ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۚ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

ہے اور تمہارا رب بھولنے والا نہیں ہے آسمانوں کا زمین کا اور ان کی درمیانی چیزوں کا مالک ہے

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ؑ

پس (اے نبی) اُس کی عبادت اور اس کی عبادت پہ قائم رہو کیا تم اُس کا ہم پلہ کسی کو جانتے ہو

تفسیر خطیب نے سراج میں قتادہ وکلبی کا قول نقل کیا ہے کہ بمشورۂ یہود جب قریش نے اصحاب کہف اور ذوالقرنین اور روح کے متعلق حضور اقدسؐ سے استفسار کیا تو حضورؐ نے ان سے وعدۂ فردا کر لیا، مگر انشاء اللہ نہیں فرمایا تھا، اس لئے جبرئیل کے نزول میں ۱۲ یا ۱۵ یا ۴۰ یوم روز کی تاخیر ہوئی پھر جب جبرئیل آئے اور حضورؐ نے وجہ تاخیر دریافت کی تو جبرئیل نے بحکم الٰہی مذکورہ بالا الفاظ کہے۔ امام احمد، بخاری، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بروایت ابن عباس بیان کیا ہے کہ رسول اقدسؐ نے حضرت جبرئیل سے فرمایا آپ ہمارے پاس ملاقات کے لئے اس سے زیادہ کیوں نہیں آتے؟ اس وقت آیت مذکورہ نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے جبرئیل کو مذکورۂ بالا جواب دینے کا حکم دیا۔

اجزائے تحلیلی

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ۔ اہل تفسیر نے اس آیت کے دو معنی بیان کئے۔ اوّل یہ کہ ہمارا نزول خود اختیاری نہیں بلکہ جب حکم الٰہی ہوتا ہے اس وقت ہم اترتے ہیں۔ اس سے پہلے چونکہ حکم خداوندی نہیں ملا، اس لئے ہم نہیں نازل ہوئے۔ دوسرا مطلب یہ ہے، کہ ہم بلا وجہ نہیں اترتے ہیں جس وقت شریعتِ الٰہیہ کا کوئی حکم نازل کرنا ضروری ہوتا ہے اس وقت ہمارا نزول ہوتا ہے۔ چونکہ اس سے پہلے شریعت کا کوئی جدید حکم خدا تعالیٰ نے نازل نہیں فرمایا تھا، اس لئے ہم بھی نہیں آئے تھے۔ اکثر مفسرین نے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے۔

مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ۔ مَابَیْنَ اَیدِینا سے دنیا اور مَاخَلْفَنَا سے آخرت اور مَابَیْنَ ذٰلِکَ سے نفخۂ اول و نفخۂ دوم کا درمیانی وقت اور حال مراد ہے۔ ابن کثیر نے اس قول کو ابو العالیہ، عکرمہ، مجاہد، سعید بن جبیر، ربیع بن انس، سدی کی طرف منسوب کیا ہے بعض اہل تفسیر نے مَابَیْنَ اَیدِینا سے امرِ آخرت اور مَاخَلْفَنَا سے امرِ دنیا مراد لیا ہے اور اس قول کو ابن عباسؓ، ضحاک، قتادہ، ابن جریج اور ثوری کی طرف منسوب کیا ہے۔ ابن جریر نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ بعض اہل تحقیق کا قول ہے، کہ آیت میں جو تین الفاظ مذکور ہیں ان سے فقط جہات ہی مراد نہیں بلکہ سمت و مکان ہو یا زمانہ ماضی و استقبال و حال سب کو الفاظ شامل ہیں۔ مطلب یہ کہ ہم سے پہلے کا زمانہ اور موجودہ زمانہ اور آنے والا زمانہ نیز وہ مکان جو ہم سے پیچھے ہے یا ہم سے آگے ہے یا پیچھے اور آگے کے درمیان ہے غرض کل عالم اور عالم کی کل کیفیت، کمیت، زمان، مکان، حالت، ہیئت، نوعیت وغیرہ سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا مجاہد کے قول پر اس آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ اے نبی! تمہارا رب تم کو بھولنے والا نہیں۔ یعنی تاخیر وحی سے یہ نہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ تم کو بھول گیا۔ اب تمہارے پاس وحی نہ بھیجے گا۔ سدی نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔ عام مفسرین کے نزدیک نسیان سے حکم کا نسیان مراد ہے۔ یعنی اللہ جو حکم نازل فرماتا ہے اس کو بھولتا نہیں ہے۔ جو حرام کر دیا وہ حرام ہو گیا جو حلال کر دیا وہ حلال ہو گیا اور جس کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کیا وہ معاف ہے، لیکن فیصلہ نہ کرنا نسیان کی وجہ سے نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ نسیان سے پاک ہے۔ مطلب یہ کہ ہماری تاخیر نزول کا سبب یہ ہے کہ کوئی حکم نہیں ملا تھا اور حکم نہ ملنا نسیان کی وجہ سے نہ تھا، خدا تعالیٰ نسیان سے پاک ہے۔ بلکہ تاخیر حکم اللہ کی مصلحت و حکم پر مبنی ہے وہی مہیا کل ہے اور کل کائنات کا رب ہے۔ اس تفسیر کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے، جس کو ابو الدرداء اور جابر نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں جو کچھ حلال فرمایا وہ حلال ہے، اور جو کچھ حرام فرمایا وہ حرام ہے اور جس سے سکوت فرمایا وہ معاف ہے۔ پس عفو الٰہی سے فائدہ اٹھاؤ کیونکہ اللہ کی شان یہ نہیں کہ کسی بات کو بھول جائے (اور بھولنے کی وجہ سے کسی امر کی حرمت و حلت کی صراحت نہ فرمائے۔ کلام مذکور فرمانے کے بعد حضور اقدسؐ نے آیت مذکورہ پڑھی۔ (رواہ البزار وابن المنذر وابن مردویہ والطبرانی والبیہقی وصححہ)

حاصل ارشاد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جبرئیل کی طرف سے ارشاد فرمایا ہم خود نہیں آتے بلکہ پروردگار کے حکم سے آیا کرتے ہیں۔ وہ مصلحتِ وقت

سے خوب واقف ہے۔ اس کو ابتدا، انتہا اور حال کا پورا علم ہے۔ تاخیر نزول سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ آپ کو با مقتضائے وقت بھول گیا۔ کیونکہ وہ بھولنے والا نہیں ہے۔ وہ کل کائنات کا پروردگار ہے اور ربوبیت بغیر کمال علمی کے ہو نہیں سکتا۔ تو جب کل عالم کو اس کا علم محیط ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ تم کو یا وحی بھیجنے کو بھول جائے۔ لہٰذا ہمارے نزول کی تاخیر سے تم ملول نہ ہو بلکہ اللہ کی عبادت پر قائم رہو اور صبر رکھو۔ یہ آخری فقرہ حضورؐ کو تسلی دینے کے لئے نازل ہوا۔ کیونکہ جب وحی میں تاخیر ہوئی تو وہ جھوٹا اور حیلہ ساز کہنے لگے۔ کوئی بولا اب تمہارا خدا تم کو بھول گیا۔ حضورؐ کو ان اقوال سے فطرۃً تکلیف ہوئی اور چونکہ ہر رنج کا علاج اہلِ روحانیت کے نزدیک نماز ہے، اس لئے نماز پر قائم رہنے کا حکم ہوا۔

مقصودِ بیان　فرشتے اللہ کے حکم کے تابع ہیں۔ ان کا دنیا میں آنا بھی بغیر حکمِ الٰہی کے نہیں ہوتا، وہ تفریح کرنے یہاں نہیں آتے بلکہ خدماتِ مفوضہ کو ادا کرنے کے لئے آتے ہیں۔ اللہ نسیان سے پاک ہے۔ رسول پاکؐ بھی حکمِ عبادت سے مستثنیٰ نہیں تھے وغیرہ۔

وَيَقُولُ الْإِنسَانُ أَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ۝ أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ

(کافر) انسان کہتا ہے کہ جب میں مرجاؤں گا تو کیا پھر زندہ کرکے نکالا جاؤں گا کیا آدمی یاد نہیں کرتا

أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ۝ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِينَ ثُمَّ

کہ ہم نے اس سے پہلے اس کو پیدا کیا حالانکہ وہ کچھ بھی نہ تھا قسم ہے تمہارے رب کی ہم اُن کو اور شیطانوں کو ضرور جمع کریں گے پھر

لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ۝ ثُمَّ لَنَنزِعَنَّ مِن كُلِّ شِيعَةٍ أَيُّهُمْ أَشَدُّ

گھٹنوں کے بل دوزخ کے آس پاس ضرور حاضر کریں گے پھر ہر فرقہ میں سے اس شخص کو علیحدہ نکال لیں گے جو سب سے زیادہ

عَلَى الرَّحْمَٰنِ عِتِيًّا ۝ ثُمَّ لَنَحْنُ أَعْلَمُ بِالَّذِينَ هُمْ أَوْلَىٰ بِهَا صِلِيًّا ۝ وَإِن

رحمٰن سے سرکش تھا پھر ہم اُن لوگوں سے بھی زیادہ واقف ہیں جو جہنم میں داخل ہونے کے سبب سے زیادہ قابل ہونگے اور تم میں

مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ

سے کوئی ایسا نہیں جس کا دوزخ پر گزر نہ ہو تمہارے رب پر یہ وعدہ لازمی مقرر ہے اس کے بعد ہم پرہیزگاروں کو

اتَّقَوا وَّنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ۝

بچالیں گے اور ظالموں کو گھٹنوں کے بل اس میں گرا دیں گے

تفسیر　کلبی کا قول ہے کہ اس آیت کا نزول اُبی بن خلف کے حق میں ہوا۔ ایک مرتبہ اُبی نے بوسیدہ ہڈیوں کو ہاتھ میں لیا اور کہنے لگا محمدؐ کا زعم غلط ہے کہ ہم لوگ مرجانے کے بعد زندہ کئے جائیں گے (سراج) بعض مفسرین نے الْإِنسَانُ سے ولید بن مغیرہ یا ابوجہل کو مراد لیا ہے۔ ابن جریج کے نزدیک عاص بن وائل مراد ہے۔ ابن کثیر نے عموماً بغیر تخصیص ان کفار کو موردِ آیت قرار دیا ہے۔

جو کر حشر کے منکر تھے۔

کفار رب وجود قیامت کی تصدیق نہ کرتے۔ کیونکہ مرنے کے بعد وہ انسان کو معدوم خیالی کر لیتے تھے اور اعادۂ معدوم محال تھا، اسلئے مرنے کے بعد دوسری زندگی ان کی نظر میں ناممکن تھی۔ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں نہایت معجزانہ بلاغت کے ساتھ کفار کے شبہ کو زائل فرما دیا، جس سے اصل مدعا کا ثبوت واضح ہو جاتا ہے۔ معدوم دو طرح کا ہوتا ہے۔ (۱) معدوم مطلق یعنی وہ معدوم جس کا مادّہ اور قوامی عنصر بھی موجود نہ ہو، گویا وہ لاشئ محض اور ہیچ ہو (۲) معدوم مثبت یعنی وہ معدوم جس کا مادہ موجود ہو، مگر صورت جسمیہ کا تغیر تبدل ہوتا رہے۔ ایک صورت جسمیہ کے اعتبار سے اس کو موجود کہا جاسکے، جب وہ صورت زائل ہو جائے اور دوسری صورت آجائے تو اس کو معدوم کہا جائے۔ پیدائش سے قبل حسب صراحت شریعت انسان معدوم مطلق تھا، نہ اس کا کوئی قوامی مادہ موجود تھا نہ کوئی اور تخلیقی عنصر تھا۔ اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے اس کو نیست سے ہست کیا، مادہ پیدا کیا، صورت بنائی، دونوں کو ترکیب دے کر انسان نام رکھا۔ مدتِ حیات پوری ہونے کے بعد ہی انسان مر جاتا ہے۔ یعنی اس کی موجودہ صورت ترکیبی زائل ہو جاتی ہے، اجزا پراگندہ ہو جاتے ہیں، خاکی حصّہ خاک میں، ہوائی اجزا ہوا میں، آتشی اجزاء آگ میں اور آبی اجزا پانی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ گویا مرنے کے بعد انسان معدوم مطلق نہیں ہو جاتا بلکہ ایک اعتبار سے موجود رہتا ہے۔ ظاہر ہے جس خدا نے معدوم مطلق کو موجود کیا، جب کہ مادہ بھی موجود نہ تھا تو ایجاد کیا۔ اب معدوم مثبت کو کیا وہ موجود نہیں کر سکتا۔

حدیث صحیح میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مجھے ابن آدم نے جھٹلایا حالانکہ میری تکذیب اس کو روا نہ تھی۔ اس نے مجھے ایذا دی۔ باوجودیکہ مجھے ایذا دینا اس کے لیے جائز نہ تھا۔ اس نے میری تکذیب کی تو اس طرح کی کہ اس نے کہا کہ اللہ ہرگز دوبارہ مجھے اس طرح پیدا نہ کرے گا جس طرح پہلی مرتبہ کیا۔ حالانکہ تخلیق ثانی تخلیق اول سے آسان ہے اور اس نے مجھے ایذا اس طرح دی کہ مجھے صاحب ولد قرار دیا حالانکہ میں احد صمد لم یلد ولم یولد ہوں (رواہ الخطیب فی السراج)

حاصل ارشاد یہ ہے کہ غافل انسان اتنا نہیں سوچتا کہ جب خدا نے نیست سے ہست، اور معدوم سے موجود کیا تو کیا وہ دوبارہ کو مجتمع اور منتشر کو مرکب نہیں کر سکتا۔ کیا ترکیب ثانی اوّل سے دشوار ہے۔

اس کے بعد کفار اور ان کے گمراہ کرنے والے شیطانوں کو جو حشر و انجام قیامت کے دن ہوگا اس کو تنبیہ انگیز اور وعید آمیز طرز بیان کے ساتھ ظاہر فرمایا ہے تاکہ بیان کی دونوں منفعتیں مکمل ہو جائیں۔ برہانی اور خطابی دونوں طریقوں سے مدعا کا ثبوت ہو جائے۔ اہلِ دانش غور و خوض کرنے کے بعد اور سطحی نظر رکھنے والے کوتاہ بین ڈر کر ایمان کی طرف آجائیں اور قیامت کا اقرار کرنے لگیں۔

اجزائے تحلیلی

لَنَحْشُرَنَّهُمْ شیطان انسان کو گمراہ کرتا ہے۔ دنیا میں طرح طرح کی امیدیں دلاتا ہے جن پر انسان ریجھ جاتا ہے۔ قیامت کے دن جب میدانِ حشر میں سب جمع ہوں گے تو امام و مقتدی اور گمراہ و گمراہ کنندہ کو ساتھ ساتھ جکڑا ہوا اور دونوں ایک زنجیر سے بندھے ہوں گے۔ قیامت کے میدان میں ایک مدت تک دھوپ میں کھڑے ہونے اور پیاس کی شدت برداشت کرنے کے بعد جہنم کے پاس سب کو جمع کیا جائے گا تاکہ ہولناک منظر دیکھ کر داخل ہونے سے پہلے رنج و غم اور اندوہ تکلیف میں مبتلا ہو جائیں۔

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيعَةٍ۔ ابن مسعود کا قول ہے کہ اگلے گروہ کو سامنے سے روک لیا جائے گا تاکہ پچھلا گروہ بھی آجائے اور پھر سب علی الترتیب مجرموں کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ قتادہ نے کہا ہر مذہب والوں میں سے جو شخص بدکاری کا پیشوا ہوگا اس کو چھانٹ کر آگے بڑھا جائے گا۔ ابن جریر نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا۔ اس آیت میں یا تو خطاب صرف کافروں کو ہے۔ اس وقت کسی تاویل کی ضرورت نہیں۔ یا خطاب عام انسانوں کو ہے خواہ کافر ہوں یا مومن سب جہنم میں وارد ہوں گے۔ لیکن آیت إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ..... دلالت کر رہی ہے کہ نیکوکار بندے دوزخ سے دور رہیں گے، اس لئے آیت مذکورہ کی علماء نے دو تاویلیں کی ہیں۔ اول تو یہ کہ کافر و مومن سب جہنم میں داخل ہوں گے۔ لیکن مومنوں کو جہنم میں داخل ہونے سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ آگ ان کے حق میں خنکی اور سلامتی کا باعث

ہوگی۔ جس طرح ملائکۂ جہنم کو آگ کوئی دکھ نہیں پہنچا سکے گی۔ اسی طرح اہلِ ایمان کو بھی نارِ جہنم سے کوئی ضرر نہ ہوگا۔ حضرت جابرؓ کا یہی قول ہے۔

دوسری تاویل یہ بیان کی گئی ہے کہ ورود کے معنی داخل ہونا نہیں بلکہ پل صراط پر سے گزرنا مراد ہے۔ محاورۂ عرب میں قریب سے گزرنے کو ورود کہا جاتا ہے۔ صراط پر ہر شخص کا مرور ہوگا خواہ نیک ہو یا بد، مومن ہو یا کافر، نبی مرسل ہو یا عامی گنہگار۔ حسن بصری، سدی، کعب احبار اور ابن عباس کا یہی قول ہے بلکہ بروایت سدی ابن مسعود یہ قول مرفوعاً منقول ہے۔ آیت کے آخری حصہ سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ پل صراط پر سے سب کو گزرنا ہوگا، لیکن جو نیکوکار ہیں وہ دوزخ میں نہ گریں گے تیزی کے ساتھ عبور کر کے نکل جائیں گے اور جو کافر ہیں وہ گھٹنوں کے بل دوزخ کے اندر گر پڑیں گے۔

مقصودِ بیان برہانی اور خطابی طور پر ثبوتِ قیامت کا اظہار، کفار اور شیاطین کے اجتماع کی صراحت، ائمۂ کفر اور پیشوایانِ بدکاری کو شدید وعید، دوزخ کے قریب ہر شخص کو پہنچنا ہوگا خواہ مومن ہو یا کافر وغیرہ۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَيُّ الْفَرِيقَيْنِ

جب اُن کے سامنے ہماری کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو مسلمانوں سے کافر کہتے ہیں کہ (بتاؤ) دونوں فریقوں میں سے کس کا

خَيْرٌ مَّقَامًا وَأَحْسَنُ نَدِيًّا ۝ وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ هُمْ أَحْسَنُ

مکان بہتر اور کس کی مجلس اچھی ہے ہم ان سے پہلے بہتیری اُمتوں کو ہلاک کر چکے ہیں جو سازوسامان اور نمود

أَثَاثًا وَرِئْيًا ۝ قُلْ مَن كَانَ فِي الضَّلَالَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمَٰنُ مَدًّا ۚ

میں اُن سے بہتر تھیں (اے نبی) کہہ دو کہ جو شخص گمراہی میں رہتا ہے اللہ اُس کو خوب ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے۔

حَتَّىٰ إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ فَسَيَعْلَمُونَ

یہاں تک کہ جب وہ چیز اُن کو نظر آجائے گی جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے خواہ عذاب ہو یا قیامت تب معلوم ہوگا

مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضْعَفُ جُندًا ۝ وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا

کہ کس کا مکان بدتر ہے اور کس کی جماعت کمزور ہے اور ہدایت والوں کی ہدایت میں اللہ اضافہ کرتا

هُدًى ۗ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ مَّرَدًّا ۝

ہے اور باقی رہنے والی نیکیاں تمہارے رب کے ہاں باعتبارِ ثواب کے بہتر ہیں اور باعتبارِ انجام کے بھی اچھی ہیں

تفسیر ظاہر بین محسوس پرست انسان چونکہ کوتاہ نظر ہوتا ہے، اس لئے اس کی نظر ہمیشہ دنیوی سازوسامان اور عیش و طرب پر مقصور رہتی ہے۔ اس کو محسوسات مادی سے باہر کوئی چیز نہیں نظر آتی اور اس مادی عالم کے پیچھے روحانی ناز و نعم دکھائی نہیں دیتا۔ اسی بنا پر کفارِ عرب نے جب ان آیاتِ قرآنیہ کو سنا جن میں اہلِ اسلام کا برحق اور کافروں کا باطل پرست ہونا ظاہر کیا گیا تھا تو غریب نادار مسلمانوں کو چھیڑنے اور ان کا مذاق اڑانے ہوئے کہنے لگے۔ تم کہتے ہو کہ اہلِ اسلام حق پر ہیں تو بتاؤ وسیع اور بلند مکانات اور اسبابِ معیشت کی فراخی کس کو حاصل ہے۔ مکان کس کا

اور محفل کس کی اچھی ہے۔ تم نے مسلمان ہو کر کیا کیا۔ ذرا اپنا حال تو دیکھو نہ رہنے کو گوشہ نہ کھانے کو توشہ۔ اس پر بھی غور کرو کہ ہمارے مجمع میں کس قدر عالی قدر سردار اور بلند مرتبہ صنادید و اشرافِ عرب داخل ہیں اور روزانہ کس شان کے ساتھ ان کا اجتماع ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں محمد کی مجلس کو دیکھو چند بے کس بے بس، شکستہ اور خستہ حال فقیر، ذلیل اور بے نوا غلام مفلس اور نادار گدا گر ان کے سوا ان کے پاس اور کون جاتا ہے۔ بے وقوف کوتاہ بین طبقے کے خیال کی تردید کرتے ہوئے خدا تعالیٰ بطور تمثیل فرماتا ہے کہ ان سے پہلے بڑے ساز و سامان اور نام و نمود والے گزرے ہیں، لیکن ان کی شان و شکوہ، جلال و جبروت، دولت و ثروت، عزت و جاہ، حکومت و تسلط، زور اور جیرہ دستی ہماری دستبرد ان کو محفوظ نہ رکھ سکی۔ ہم نے ان کو تباہ کر دیا۔ حاصل ارشاد یہ کہ دنیوی جاہ و جلال اور دولت و مال لائق تفاخر نہیں۔ یہ سب کا سب سرمایۂ فنا ہے۔ آخرت میں زینتِ دنیا کچھ کام نہ آئے گی۔ یہاں تک تو طرزِ بیان استدلال تمثیلی کے طور پر تھا۔ نظیر کو نظیر پر قیاس کر کے گزشتہ کافروں کا نتیجہ موجودہ کافروں کی عبرت کے لئے فرمایا تھا۔ اس سے آگے زاجرانہ طرز میں طریق بیان بدل کر فرماتا ہے کہ اس وقت جیتے جی کثرت اور مکانات کی سربلندی پر کیا ناز کرتے ہو۔ جب مرنے کے بعد یا مرنے سے پہلے اپنے کرتوت کی سزا پاؤ گے یا قیامت کے دن عذابِ الٰہی کو دیکھو گے اس وقت معلوم ہوگا کہ مسکن اور مددگاروں کے اعتبار سے کون گروہ برا ہے۔ اس سے آگے مسلمانوں کو عمل صالح پر قائم رہنے اور استقامت و استقلال اختیار کرنے کی ترغیب دینے کے لئے فرماتا ہے کہ جو لوگ راہِ ہدایت کے طالب ہوتے ہیں اور راہ یاب ہونے کی کوشش کرتے ہیں اللہ ان کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے۔ یعنی کافروں کے نزدیک اہلِ ایمان کتنے ہی خوار و ذلیل ہوں خدا کے نزدیک وہ معزز و مکرم ہیں، کیونکہ کافروں کا سرمایۂ ناز فانی ہے۔ مرنے کے بعد اس کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہے گا۔ البتہ اہلِ ایمان نیکیاں باقی رہیں گی اور انہی کا مآل اچھا ہوگا۔

مقصودِ بیان کوتاہ بین محسوس پرست کافروں کی کوتاہیٔ نظر کی مذمت، اور اس امر کی صراحت کہ دنیوی ساز و سامان قابلِ تفاخر نہیں۔ یہ فانی ہے اور فانی ناقابلِ اعتبار ہوتا ہے۔

آیت مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ بتا رہی ہے کہ کفر و عصیان کے باوجود عیش و آرام کی فراوانی اور دولت و مال کی کثرت درحقیقت اللہ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ حاملانِ ضلالت کو ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے، لیکن انجام کار ایسی گرفت کرتا ہے کہ پھر رہائی ناممکن ہو جاتی ہے۔

آیت وَيَزِيدُ اللّٰهُ الخ دلالت کر رہی ہے کہ جو لوگ راہِ حق کی تلاش میں رہتے ہیں ان کو خدا تعالیٰ ہدایت کرتا ہی دیتا ہے اور مردانِ حق کی ہر وقت امداد کرتا ہے۔ گمراہی اور باطل پرستی کے پردے ان کی نظروں سے اُٹھا دیتا ہے، جلوۂ حق ان کو دکھا دیتا ہے اور ایمانِ استدلالی سے ایمان شہودی حاصل ہو جاتا ہے وغیرہ۔

أَفَرَءَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتَيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا ۝ أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ

بھلا تم نے اُس شخص کو بھی دیکھا جس نے ہماری آیتوں کا انکار کیا اور کہنے لگا کہ مال و اولاد مجھے ضرور ملے گی کیا اُس کو غیب کی خبر ہو گئی

اتَّخَذَ عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا ۝ كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ

یا رحمٰن سے اُس نے کوئی وعدہ لے لیا ہے ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا ہم اس کے قول کو لکھ لیتے ہیں اور اُس کے عذاب کو بڑھاتے

مَدًّا ۝ وَنَرِثُهُ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا ۝ وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ آلِهَةً

جائیں گے اور جو کچھ یہ کہتا ہے بعد پیچھے ہم اس کو لیں گے اور ہمارے پاس تنہا آئے گا لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اوروں کو معبود بنا لیا ہے

لِيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا ۝ كَلَّا ۚ سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ۝

تاکہ وہ اُن کے لئے سبب عزت ہوں ہرگز نہیں عنقریب وہ ان کی عبادت کے منکر ہو جائیں گے اور اُن کے مخالف بن جائیں گے

أَلَمْ تَرَ أَنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا ۝ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۖ

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہم نے کافروں پر شیطانوں کو چھوڑ رکھا ہے کہ وہ اُن کو اُکساتے رہیں سو تم اُن پر جلدی نہ کرو

إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ۝ يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا ۝ وَنَسُوقُ

ہم ان کے لئے گنتی پوری کر رہے ہیں جس دن ہم پرہیزگاروں کو رحمٰن کے پاس مہمان بنا کر جمع کریں گے اور مجرموں کو

الْمُجْرِمِينَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وِرْدًا ۝ لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا

پیاس کی حالت میں جہنم کی طرف ہنکائیں گے سوا اُن لوگوں کے جنھوں نے رحمٰن سے عہد لیا ہوگا اوروں کو شفاعت کا اختیار نہ ہوگا

تفسیر شروع میں انسان گناہ کرتا ہے اور اس کے دل پر کسی جگہ معمولی زنگ کا داغ پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی فطری نورانیت کمزور پڑ جاتی ہے۔ روح میں کثافت اور دانش میں زنگ پیدا ہو کر جلوۂ حق سے اس کو دور کر دیتی ہے۔ اگر اس وقت توبہ کر لیتا ہے تو خیر ورنہ اس کا انہماک گناہ میں بڑھ جاتا ہے۔ وہ بغیر کسی پرواہ کے گناہ کا عادی ہو جاتا ہے۔ پہلے گناہ کا ارتکاب اتفاقی طور پر کرتا تھا، اب گناہ گاری اس کی عادت بن جاتی ہے، لیکن پھر بھی گناہ کو گناہ جانتا ہے۔ اچھے کو اچھا اور برے کو برا سمجھتا ہے۔ زنگ بڑھتے بڑھتے سیاہی کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور سیاہی قلب کو تقریباً محیط ہو جاتی ہے۔ اس سے اگر آگے بڑھتا ہے تو گناہوں کا پردہ دل پر پڑ جاتا ہے۔ اس وقت اس کو گناہ گناہ نظر نہیں آتا۔ وہ گناہ کرتا ہے اور اس کو اچھا سمجھ کر کرتا ہے۔ یہ وقت سخت امتحان کا ہوتا ہے۔ اگر اس وقت بھی توبہ کر لی تو امید ہوتی ہے کہ عقائد صحیحہ اور اعمال صالحہ سے قلب کی کثافت دور ہو جائے اور حق کا پرتو اس پر پڑنے لگے، لیکن اگر ذرا اور قدم آگے بڑھا تو بس دوامی تباہی کے غار میں گرا۔ اگر ایسا آدمی انبیاء و مرسلین اہل حق و یقین اور ارباب ہدایت کا مذاق اڑانے لگتا ہے، ان اقوال و ہدایات کو ہنسی سمجھتا ہے، تمام ارشادات و مواعظ اس کے لئے مزید گمراہی کا باعث ہوتے ہیں، دل پر گمراہی کی مہر لگ جاتی ہے اور کوئی کلمۂ حق دل کے اندر نہیں پہنچ سکتا ایسا شخص جہل مرکب میں مبتلا ہوتا ہے، اسی بدطینت مایوس الرشد گروہ میں سے ایک شخص عاص بن وائل بھی تھا جس کا قصہ صحیح بخاری اور مسلم وغیرہ میں مفصل مذکور ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک صحابی حضرت خباب بن الارت مسلمان ہونے سے قبل لوہار کا کام کیا کرتے تھے اور ہتھیار بنایا کرتے تھے عاص بن وائل نے ان سے کچھ ہتھیار خریدے تھے۔ جب ادائے قرض میں تاخیر ہوئی تو خباب تقاضہ کے لئے عاص کے پاس گئے۔ عاص نے جواب دیا جب تک محمدؐ کی نبوت کا انکار نہ کرو گے میں کچھ نہ دوں گا۔ حضرت خباب نے جواب دیا اگر تو مر کر بھی دوبارہ زندہ ہو تب بھی مجھ سے یہ حرکت سرزد نہیں ہو سکتی۔ عاص بولا کیا میں مر کر بھی دوبارہ زندہ ہوں گا۔ خباب نے جواب دیا اس میں شک ہی کیا ہے سب کو مرنے کے بعد زندہ ہونا ہے اور اپنے کئے کی سزا بھگتنا ہے۔ خدا کے روبرو سب کے حقوق کا فیصلہ ہوگا۔ عاص بولا آخر وہاں بھی تو مجھ کو مال و اولاد ملے گی جاؤ مجھ سے وہاں قرض وصول کر لینا۔ اس پر یہ آیت شروع سے فَرْدًا تک نازل ہوئی۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ کس قدر حیرت انگیز اور تعجب آفریں ہے اس شخص کی حالت جو اللہ کی نعمتیں نصوص اور آیات کا انکار

کرتا ہے اور نہ فقط انکار کرتا ہے بلکہ عقیدۂ حقہ کا مذاق اڑاتا ہے۔ کہتا ہے کہ مرنے کے بعد جب میں دوبارہ زندہ کیا جاؤں گا تو وہاں مجھے مال اور اولاد بھی ضرور ملے گی گویا یہ بات اس کو براہ راست عالم غیب سے معلوم ہو گئی ہے یا خدا تعالیٰ سے اس بات کا اس نے کوئی وعدہ لے لیا ہے۔ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات ہرگز نہیں، اس لئے اس کا خیال خام ہے۔ ہم اس کے گناہ لکھتے جاتے ہیں۔ تمام مال واسباب اور نسل و اولاد چھوڑ کر اس کو ہمارے پاس تنہا آنا ہو گا اور چونکہ وہ کافر تھا ہے اور اسلام کے خلاف کا فرانہ جرأت بھی رکھتا ہے، اس لئے اس کو گوناگوں عذاب دیا جائے گا۔

یہاں تک عاص بن وائل کا قول اور اس کا نتیجہ ظاہر فرمایا تھا۔ اس سے آگے عام کافروں اور مشرکوں کی حالت کا اظہار فرمایا ہے انسان کے دماغ پر جب جہالت کا پردہ پڑ جاتا ہے تو وہ اپنا نوعی شرف و فضل بالکل فراموش کر دیتا ہے۔ اشرف الکائنات ہو کر پتھروں اور درختوں کے آگے سر جھکاتا پھرتا ہے۔ بعض لوگ جو اپنے کو صاحب ہوش و درایت خیال کرتے ہیں کھلم کھلا جامد پرستی تو نہیں کرتے، مگر اپنی نوع کے ان افراد کو جو اخلاق، سیرت، اقوال اور اطوار کی وجہ سے اللہ کے مقرب بن گئے ہیں اور خاص امتیاز و شان کے مالک ہیں اس قدر بلند مرتبہ خیال کرتے ہیں کہ گویا نوع انسانی سے بالاتر ہستی سمجھنے لگتے ہیں۔ بشریت اور آدمیت سے اوپر غیبی طاقتوں کا مالک جانتے ہیں۔ اللہ کی الوہیت طرح طرح سے اس کو معزز مخلوق میں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی عیسیٰ کو مظہر الوہیت قرار دیتا ہے، کوئی عزیز کے اندر خدا کے حلول کا قائل ہو جاتا ہے اور کوئی الوہیت کا مددگار اللہ کی نورانی مخلوق کو قرار دیتا ہے اور خدا کے مقابل میں ان باطل معبودوں کو اپنا حامی، ناصر، مددگار اور کم از کم شفیع ماننے لگتا ہے۔ غرض انسانی اور جنی شیاطین ان کو جس باطل پرستی پر اکساتے ہیں وہ اسی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔ توہم کو تعقل اور تخیل کو علم سمجھنے لگتے ہیں۔

ایسے ہی گروہ کے متعلق خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ: اللہ کو چھوڑ کر یہ باطل پرست گروہ جو دوسروں کو معبود بناتا پھرتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ اس کے معبود اس کے حامی، مددگار اور شفیع ہوں گے۔ یہ خیال اس کا قطعاً غلط ہے۔ عنقریب وقت آئے گا جب اس کے باطل معبود اس کی مخالفت کریں گے اور یہ گروہ خود ان کی الوہیت و پرستش سے انکار کرے گا

اس سے آگے اس سزا و جزا کا بیان ہے جو قیامت کے دن پرہیزگار اہل ایمان اور بدکار کافروں کو دی جائے گی۔

اجزائے تحلیلی

اَفَرَءَیْتَ اس لفظ میں استفہام بطور تعجب ہے۔ خدا تعالیٰ تو تعجب سے پاک ہے۔ اس کے نزدیک تو کوئی تعجب انگیز نہیں۔ ہاں سننے اور دیکھنے والوں کے لئے باقتضائے بشریت و بمقتضائے عقل بعض امور ضرور حیرت آفریں ہیں۔ عاص بن وائل کا وہ قول جس میں اس نے اخروی زندگانی میں اولاد و مال سے بہرہ ور ہونے کا اظہار کیا تھا۔ باوجودیکہ اس کا ایمان نہ روز قیامت پر تھا نہ اخروی زندگانی پر نہ جزا و سزا پر، نہایت تعجب آفریں تھا۔ ہر سننے والا اس قول سے اس کی بے بصیرتی حماقت اور کوتاہی عقل پر حیرت کر سکتا تھا۔ اسی لئے خدا تعالیٰ نے خطابی صیغہ استعمال فرمایا۔ بظاہر خطاب رسول پاک کو ہے، مگر رخ خطاب ہر سامع کی جانب ہے۔

اَطَّلَعَ الْغَیْبَ۔ آئندہ کے متعلق کسی حالت کا صحیح اور یقینی علم دو ہی طریقوں سے ممکن ہے۔ یا تو براہ راست واقعات پس پردہ کا علم ہو جائے اور پردہ ہائے غیب آنکھوں کے سامنے سے اٹھ جائیں یا اللہ کی طرف سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی عہد و پیمان مل جائے جس کی خلاف ورزی ناممکن ہو اور چونکہ عاص کو ان دونوں امور میں سے کوئی بات حاصل نہ تھی، اس لئے قیامت کے دن بہرہ ور اور کامیاب ہونے کا خیال غلط اور بے بنیاد تھا۔

وَنَرِثُهٗ مَا یَقُوْلُ۔ شیخ ابو السعود نے کہا، قول کا وارث ہونے سے مراد ہے مصداق قول کا وارث ہونا۔ یعنی وہ ہلاک ہو جائے گا اور اس کے مال و اولاد کے ہم وارث ہوں گے۔ قرطبی نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ ہم مال و اولاد سے اس کو محروم کر دیں گے اور بجائے اس کے مسلمانوں کو اس کا وارث بنا دیں گے۔ یعنی جس طرح ہم نے اس کو مال و اولاد عطا کی ہے اسی طرح مسلمانوں کو مال و اولاد عطا کریں گے اور اس کو ہلاک کر دیں گے۔ میرے نزدیک ابو السعود کی تشریح زیادہ مناسب ہے۔

لِیَکُوْنُوْا لَھُمْ عِزًّا۔ صاحب معالم نے عِزًّا کا ترجمہ شفیع کیا ہے اور ابن کثیر نے باعث عزت و نصرت لکھا ہے۔

سَیَکْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِہِمْ اس آیت کا مطلب دو طرح بیان کیا گیا ہے۔ ایک تو یہ کہ جن معبودوں کی مدد، نصرت اور شفاعت کے متوقع تھے قیامت کے دن وہ معبود اپنے پرستاروں سے ناراض اور ان کی پرستش کے منکر ہوں گے اور ان کے مخالف بن جائیں گے۔ دوسرا مطلب یہ کہ دنیا میں تو اہلِ کفر مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں اور ان کی نصرت کے امیدوار ہیں، لیکن قیامت کے دن جھوٹے معبود اُن کی مدد نہ کر سکیں گے تو کفار ان کے منکر اور مخالف ہو جائیں گے۔

تَؤُزُّہُمْ اَزًّا۔ بر قول ابن عباسؓ (بروایت علی بن طلحہ) اغوا کرنا مراد ہے۔ مجاہد نے ترجمہ کیا کہ شیاطین کافروں کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہیں یعنی شرک و کفر و بدکاری کی چونکہ مختلف صورتیں ہیں، اس لئے ہر قسم کی بدکاری میں مبتلا کر کے ان کے جدا جدا گروہ بناتے ہیں۔ قتادہ، ثوری، سدی اور عبدالرحمٰن بن زید کے اقوال کا مطلب بھی اسی کے قریب ہے۔

فَلَا تَعْجَلْ عَلَیْہِمْ ممکن ہے کہ جب کفار کی شرارت حد سے بڑھ گئی اور اس کا اندیشہ ہوا کہ اس کا ضرر متعدی ہو کر دوسروں کو پہنچے گا تو حضورؐ نے ان پر جلد عذاب نازل ہونے کی خواہش فرمائی ہو اور ایسی حالت میں تعجیل عذاب کا خیال رحمتِ عامہ اور شفقتِ تامہ کے منافی نہیں۔ خدا تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں حضور والاؐ کی استدعائے عذاب کا اس طرح جواب دیا کہ مقصود درحقیقت ان کا امتحان ہے اور تم دیکھ رہے ہو کہ یہ لوگ خود اپنے بدخواہ شیطان کے اغوا میں پھنسے ہوئے ہیں پس ہم ان کے کرتوت شمار کر رہے ہیں اور وہ مدت پوری کر رہے ہیں جو ان کیلئے مقرر و مقدر ہو چکی ہے۔ قیامت کے دن کو پورا عذاب ہو گا۔

ابن عباس، عطاء، مجاہد، حسن بصری اور قتادہ وغیرہ کے نزدیک المجرمین سے مراد کافر ہیں جن کو جہنم کی طرف نہایت ذلت کے ساتھ ہنکایا جائے گا۔

لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَۃَ۔ یعنی کافروں کی کوئی شفاعت ہی نہ کرے گا نہ سچی طور پر نہ غلط طور پر۔

عَہْدًا۔ اسے عہد مراد ہے توحید یا ایمان و تقویٰ یا عمل صالح۔ مطلب یہ کہ شفاعت صرف ان ہی لوگوں کی ہو سکے گی جو اہلِ ایمان ہوں گے۔

مقصودِ بیان

عاص بن وائل کی اخروی ناکامی کی صراحت اور در پردہ تمام کافروں کی خیران آلی کی طرف اشارہ۔ اس بات کی طرف ایما کہ نتائج آخرت کے اچھا برا ہونے کا یقین دو ہی طریقوں سے ہو سکتا ہے یا تو غیب کا براہ راست علم ہو یا اللہ نے کوئی وعدہ کر لیا ہو اور اس وعدہ کی اطلاع بھی ہو گئی ہو۔ اَمِ اتَّخَذَ کا لفظ اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ اللہ کے وعدہ کا خلاف ہونا ناممکن ہے۔ یَاْتِیْنَا فَرْدًا میں اس امر کی صراحت ہے کہ قیامت کے دن حساب کتاب کے وقت اولاد، اعزا و احباب، دولت و مال اور حکومت و جاہ کچھ کام نہ آئے گا۔ ہر شخص کو تنہا خدا کے سامنے جانا ہو گا۔ سَیَکْفُرُوْنَ الخ میں کافروں کی بے بصیرتی اور کوتاہ بینی پر زور ہے کہ اس وقت چونکہ یہ لوگ میدانِ اختیار میں مطلق العنان چھوٹے ہوئے ہیں، اس لئے باطل دیوتاؤں اور جھوٹے معبودوں سے طرح طرح کی آرزوئیں وابستہ رکھتے ہیں۔ قیامت کے دن جب ان کو اپنی تمناؤں میں ناکامی ہو گی اور جبری عذاب نظروں کے سامنے ہو گا اس وقت معبودوں کی تکذیب کریں گے۔ اس میں پیامِ ہدایت کا لطیف استنباط ہو سکتا ہے اُن اہلِ اسلام کے لئے جو اولیائے کرام، مرشدین عظام، پیرانِ طریقت اور رہبرانِ ملت سے اُمیدیں باندھے بیٹھے ہیں۔ نیک اعمال، صدق مقال اور تعمیر اوامر الٰہیہ کو ترک کر دیا ہے، ہر قسم کی بدکاری میں مبتلا ہیں۔ بلکہ بعض افراد نے تو بزرگوں کی قبروں کو دیوتا، اولیاء و صلحاء کو کارخانۂ قدرت کا خود مختار بادشاہ سمجھ رکھا ہے۔ اُن کو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ پیر پرستی کچھ کام نہ آئے گی۔ اولیاء و صلحاء کبھی اس حرکت کو پسند نہیں کرتے۔ قیامت کے دن خدا تعالیٰ کے سامنے اپنا نام لینے والوں کی اس مشرکانہ حرکت سے وہ بھی اظہارِ براءت کریں گے۔ آیت اِنَّمَا نَعُدُّ لَہُمْ بتا رہی ہے کہ کتنا ہی بڑا کافر و مشرک ہو مقررہ مدت ختم ہونے سے پہلے کسی پر ..... عذاب نہیں آتا۔ لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَۃَ میں صاف صراحت ہے کہ کسی نبی یا ولی کے مقبول الشفاعۃ ہونے کیلئے یہ شرط ہے کہ جس کی شفاعت کی جائے وہ موحد ہو۔ یا یوں کہیئے کہ جس کو اللہ کی طرف سے شفاعت کا قول و قرار مل چکا ہو گا وہی ماذون الشفاعت شفاعت کرسکے گا۔ اس کے علاوہ کوئی کسی کی شفاعت نہ کرے گا وغیرہ۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ

یہ کہتے ہیں کہ رحمٰن اولاد رکھتا ہے تم نے بلاشبہ بڑی سخت بات کہی کہ بعید نہیں اس سے آسمان کے ٹکڑے

مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝

ہو جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں کیونکہ انھوں نے رحمٰن کے لئے فرزند ثابت کیا

وَمَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا

حالانکہ رحمٰن کو شایاں نہیں کہ فرزند رکھے زمین اور آسمانوں میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ رحمٰن

اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ۝ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ

کے حضور میں بندہ بن کر نہ آئے ہم نے ان سب کا احاطہ کر لیا ہے اور خوب شمار کر رکھا ہے ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن

الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۝

تنہا ہمارے سامنے آئے گا جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے عنقریب رحمٰن اُن کے لئے محبت پیدا کر دے گا

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝ وَكَمْ اَهْلَكْنَا

بس یہی بات ہے کہ قرآن کو ہم نے تمہاری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے تم پرہیزگاروں کو خوشخبری سناؤ اور جھگڑالو قوم کو ڈراؤ ان سے پہلے ہم

قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ۭ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ۝

بہتیری قوموں کو ہلاک کر چکے ہیں کیا تم اُن میں سے کسی کو دیکھتے ہو یا اُن کی بھنک سنائی دیتی ہے

تفسیر آغاز بیان میں عاص بن وائل کی کفر طرازیوں کی صراحت فرمائی تھی پھر عام بُت پرستوں اور مشرکوں کے عقیدہ کی وضاحت کر کے اُن کو شدید تنبیہ فرمائی۔ اب مشرکوں کے اس گروہ کے عقیدہ کو نقل کر کے اجمالی تردید اور پُر زور وعید فرماتا ہے جو اللہ کی اولاد ہونے کے قائل تھے۔ یہودی عزیز کو اور عیسائی مسیح کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے۔ صابی فرقہ والے ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ بلکہ مشرکین عرب کا بڑا گروہ اس کا قائل تھا۔ قانون قدرت اور نظام کائنات تمام عالم کا ایک ہے۔ ذرہ سے لے کر آفتاب تک اور فرش سے لے کر عرش تک ایک ہی ضابطہ سب کو گھیرے ہوئے ہے اور اس ضابطہ و قانون کو جاری کرنے والا اللہ ہے جو الوہیت، خلاقیت، ربوبیت اور ایجاد میں یکہ و تنہا ہے۔ کوئی اس کا شریک و معاون نہیں، لیکن کوتاہ بین انسان مشہود غیبی کو نہیں دیکھتا، واحد حقیقی کو نہیں جانتا۔

توضیح مقصد کے لئے اس طرح تقریر کرنی چاہیئے کہ کوئی جماد یعنی غیر نامی مخلوق مثلاً پتھر، پہاڑ، ریگ وغیرہ اپنی جمادی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہر جماد کے اندر ثقل ہے، طول، عرض اور عمق ہے، جسامت ہے، ایسی قوت ہے جو اجزا کو پراگندہ نہیں ہونے دیتی۔ بلکہ سب کو سمیٹے رہتی ہے۔ البتہ کسی میں یہ قوت ضعیف ہے کسی میں قوی۔ چونہ وغیرہ میں یہ قوت حافظۃ للترکیب اتنی کمزور ہے کہ پانی میں ڈالنے سے تمام

اجزا فوراً منتشر اور محلول ہو جاتے ہیں اور پتھر کے اندر یہی قوت اتنی قوی ہے کہ اس کو حل کرنے کے لئے بڑی بڑی کیمیاوی ترکیبوں کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن اختلافِ قوت کے باوجود کوئی جماد ایسا نہیں جس کے اندر نمو کی طاقت ہو اور وہ درختوں اور پودوں کی طرح چھوٹے سے بڑا ہوتا ہو۔ پھر اس کے اوپر کائنات نباتی ہے، لیکن سب کی سب ایک جابر و قاہر ضابطہ کے اندر محدود ہے۔ سب کو قانون فطرت گھیرے ہوئے ہے۔ تمام نباتات اور نمو کرنے والی مخلوق میں جسامت ہے، ثقل ہے چوڑائی لمبائی ہے اجزاء کو تحلیل و پراگندگی سے روکنے والی قوت ہے اور اس کے اوپر ایسی قوت بھی ہے جس کی وجہ سے درخت، سبزے اور پودے میں نمو ہوتا ہے۔ کھاد اور پانی کو درخت کی قوت اپنے اندر کھینچ کر اس کی شکل، بُو، مزہ اور رنگ بدل دیتی ہے۔ درخت میں جب مٹی اور پانی جذب ہو کر آ جاتے تو اپنی اصلی حالت، کیفیت اور ہیئت کو چھوڑ دیتا ہے اور درخت صورتِ نوعیہ کا لباس پہن لیتا ہے۔ اسی قوت کی مختلف شاخیں ہیں۔ کسی کا کام جذب کرنا ہے اس کو جاذبہ کہتے ہیں۔ کسی کا کام ہضم کرنا ہے اس کو ہاضمہ کہا جاتا ہے۔ کسی کا کام جذب شدہ مادّہ کو وقت خاص تک روک رکھنا ہے اس کو ماسکہ کہتے ہیں۔ کسی کا کام فضلات کو باہر کی طرف پھینکنا ہے اس کو دافعہ کہتے ہیں اور اس مجموعہ کا نام غاذیہ ہے۔ غاذیہ کے بعد نامیہ کا کام شروع ہوتا ہے۔ قوت نامیہ تیار غذا کو لے کر درخت کے اندر طبعی تناسب کے ساتھ لمبائی چوڑائی اور اونچائی میں پھیلاتی ہے۔ درخت کی شکل اور رنگ قوامی مادہ کو عطا کرتی ہے۔ پھر اس کے بعد ایک اور قوت ہوتی ہے جو پورے درخت کا جوہر کھینچ کر اس کا تخم تیار کرتی ہے اس کو قوتِ مولدہ کہتے ہیں۔ یہ پورا کارخانہ ہے اور اس کارخانہ کا ہر کارندہ قانون مقررہ سے سرتابی نہیں کر سکتا اور نہ اپنے حدودِ اختیار سے قدم آگے رکھ سکتا ہے۔ کائنات نباتی کے اوپر حیوانی دنیا ہے جس کے اندر تمام ماتحت قوتیں اور طاقتیں موجود ہیں۔ ضروریات جمادی اور لوازم نباتی سب کے سب موجود ہیں، لیکن ان کے ساتھ شعور و احساس کی طاقت بھی ہے۔ ظاہری اور باطنی حواس بھی ہیں۔ سردی، گرمی، خشکی، تری، خشونت اور نرمی کا احساس بھی ہے۔ مرغوب اور غیر مرغوب خوف اور محبت کا جذبہ بھی ہے، مگر کسی حیوان میں یہ طاقت ہرگز نہیں کہ دائرۂ حیوانیت سے باہر قدم رکھ سکے یا لوازم حیوانی کی سطح سے بالاتر چڑھ سکے۔ قانون حیوانی سب کو محیط ہے، ضابطۂ فطرت سب پر حاوی ہے۔ اس سے اوپر انسانی ہستی ہے جس میں خصوصیات حیوانی سے برتر خصوصیات بشری بھی موجود ہیں جس کے ساتھ ادراک بھی ہے۔ معلومات تصوریہ و تصدیقیہ سے نامعلوم تصورات و تصدیقات کو حاصل کرنے کی قوت بھی ہے۔ حقائق و علوم اور یقینیات و معارف کی تحصیل کی طاقت بھی ہے۔ نظریات و فکریات پر غور کرنے اور ان سے صحیح نتائج کو استنباط کرنے کے لئے نفس ناطقہ بھی ہے، لیکن نورِ نفسانی اور ضیائے روحانی کے ساتھ ساتھ مادی کثافت اور جسمانی ظلمت بھی ضرور موجود ہے۔ مادی کثافت کو ایک حد تک صاف کیا جا سکتا ہے، لیکن کوئی انسان انسان رہتے ہوئے دائرۂ مادیت سے خارج نہیں ہو سکتا۔ انسانی نوع کے اوپر وہ مخلوق ہے جو خالص نور اور صرف ضیاء ہی ضیاء ہے جو مادی کثافت اور مادہ کے تمام خواص سے پاک ہے۔ اور پھر سب سے بالاتر خلاقِ مطلق ہے جس پر نور کے ستر ہزار حجاب پڑے ہیں۔ اسی کا جاری کردہ قانون تمام عالم کو مسخر کئے ہوئے ہے اور اسی کا ضابطۂ فطرت کل کائنات میں جاری اور ساری ہے۔

اب ہم آیات کی تفسیر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اللہ تمام عالم کی ایجاد اور سب کو باقی رکھنے میں اور نظام کائنات کے لئے ایک عام قانون جاری کرنے میں کسی مددگار، معاون اور پشت پناہ کا محتاج نہیں۔ کل موجودات اس کے قانون کے زیر عمل ہے، اس کا ضابطۂ فطرت ذرّہ سے لے کر عرشِ بریں تک سب کو مقہور کئے ہوئے ہے۔ لہٰذا کائنات و مخلوقات کی سب سے بڑی قانون شکنی یہی ہو سکتی ہے کہ قادر مطلق اور خلاق علی الاطلاق کے لئے کوئی مددگار، حامی، قوت بازو اور پشت پناہ ہونے کا خیال پیدا کرے۔ کیونکہ درحقیقت اللہ کے مددگار کا قبول کرنا پورے قانون کو شکست کر دینا ہے اور قانونِ فطرت کی شکست سے کائنات کا نظام درہم برہم ہو جانا بدیہی ہے۔ اسی مطلب کو آیت میں بیان کیا ہے کہ لوگ اللہ کو صاحبِ اولاد کہتے ہیں۔ یہ الفاظ اس قدر صریح البطلان اور واضح الفساد ہیں کہ ان سے آسمان پارہ پارہ ہو جائیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ قائم نہ رہ سکیں۔ اللہ کو تو کسی معاون کی ضرورت ہی نہیں ہے پھر اس کا صاحب اولاد ہونا کس طرح زیبا ہے۔ تمام کائنات اس کی مسخر، مطیع حکم اور منقادِ فرمان ہے اور اس کی قدرت

سب کو محیط ہے۔ پھر کیوں کر ممکن ہے کہ قانونِ فطرت کو کوئی شکست کر سکے۔ اللہ کو صاحبِ اولاد کہنا اور مخلوق میں سے کسی کو اس کی اولاد قرار دینا حقیقت میں اللہ کو حادث اور محتاج تسلیم کرنا ہے اور جو خود محتاج ہو کمزور ہو اس کا قانون تمام کائنات کو مسخر نہیں کر سکتا لامحالہ کائنات ارضی و سماوی ایک نظم پر قائم نہیں رہ سکتی۔ آسمان بھی پارہ پارہ ہو جائیں گے اور زمین بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی اور نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے گا۔

یہاں تک تو عام اہلِ شرک اور ان کے ظاہر الفساد اقوال کا بیان اور تھا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ مشرکوں کے شرک آمیز الفاظ سے تمام کائنات باعتبار فطرت نفرت کرتی ہے اور کوئی بھی کفر آمیز کلمات سننا پسند نہیں کرتا۔ مشرکوں کے مقابلے میں نیکو کار اہلِ ایمان کی حالت یقیناً قابلِ محبت، لائق مودت اور سزاوار پسندیدگی ہونی چاہیئے۔ اسی لئے آگے فرماتا ہے کہ جو نیک مومن ہیں اللہ کی محبت و مودت اللہ تمام عالم میں پھیلا دیتا ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ ان سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اس زندگی میں بھی اہلِ عالم ان کو دل سے چاہتے ہیں اور قیامت کے دن بھی انہی کو چاہیں گے۔ امام احمد نے بروایت حضرت ابوہریرہؓ بیان کیا ہے کہ حضور گرامی ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ کو محبوب فرماتا ہے تو جبرئیل کو حکم دیتا ہے کہ مجھے فلاں شخص سے محبت ہے تو بھی اس سے محبت کر۔ جبرئیل اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد آسمان کے رہنے والوں کو ندا دی جاتی ہے کہ فلاں بندہ خدا کو محبوب ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔ تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر زمین پر محبوب بندہ کی مقبولیت عام پھیلائی جاتی ہے الخ۔ (رواہ مسلم والبخاری)

حضرت عثمان نے فرمایا جو شخص نیکی یا بدی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے عمل کی چادر اس کو ضرور اُڑھا دیتا ہے۔

ہم نے آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا مفہوم بطور عموم بیان کیا ہے۔ احادیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ بعض مفسرین نے مخصوص سببِ نزول لکھا ہے۔ مثلاً حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ جب ہجرت کر کے مدینہ میں آئے تو عتبہ، شیبہ اور اُمیہ وغیرہ کے فراق سے بہت پریشان ہوئے کیونکہ اشخاص مذکورہ آپ کے دوست اور رفیق تھے۔ اس وقت آیت مذکورہ نازل ہوئی جس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ پاک مومنوں کے دل میں تمہاری محبت ڈال دے گا۔ اہلِ ایمان تم سے محبت کرنے لگیں گے۔ ابن عباس کا قول ہے کہ آیت کا نزول حضرت علیؓ کے حق میں ہوا۔ حضرت براء بن عازب کی روایت ہے کہ ایک بار حضور گرامی ﷺ نے حضرت علیؓ کو یہ دعا پڑھنے کا حکم دیا۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ لِّیْ عِنْدَکَ عَھْدًا وَّاجْعَلْ لِّیْ عِنْدَکَ وُدًّا وَّاجْعَلْ لِّیْ فِیْ صُدُوْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ مَوَدَّۃً ــــ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی (رواہ الدیلمی فی مسند الفردوس وابن مردویہ فی تفسیرہ)

بہرحال سببِ نزول کی تخصیص سے چونکہ حکم کی تخصیص ضروری نہیں، اس لئے حکم آیت عام ہے۔ خواہ سببِ نزول کچھ بھی ہو۔ پھر اس کے آگے قرآن کے عربی میں نازل ہونے کی وجہ اور قرآن کی اصل غرض بیان فرما کر سورت کو ختم فرما دیا۔

اجزائے تحلیلی

شَیْئًا اِدًّا۔ ابن عباس، مجاہد، مالک اور قتادہ نے اِدًّا کا عظیماً ترجمہ کیا ہے یعنی اللہ کو صاحبِ ولد قرار دینا بہت ہی بڑی بات ہے جس کی عظمت سے زمین و آسمان کانپتے ہیں۔

تَکَادُ السَّمٰوٰتُ الخ۔ اس آیت پر ایک شبہ وارد ہوتا ہے کہ کافروں کی زبان سے کلمۂ شرک صادر ہوتا ہے۔ اس کے اثر سے آسمانوں کے شگافتہ ہونے، زمینوں کے پھٹنے اور پہاڑوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کو کیا تعلق ہے؟ بظاہر یہ کلام غیر مربوط معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے نزدیک جو توضیح صحیح تھی وہ مفصل طور پر ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ خطیب و رازی وغیرہ نے اس شبہ کے ازالہ کے لئے تین جواب دیئے ہیں

(۱) کلمۂ شرک کی خرابی کی عظمت دکھانی مقصود ہے اور یہ بیان کرنا غرض ہے کہ یہ کلمہ اس قدر بے دینی کا ہے کہ جامد چیزیں بھی باوجود بے عقل ہونے کے اس سے متاثر ہو جائیں۔

(۲) یہ کلمہ اس قدر غضب انگیز ہے کہ کہنے والوں کے سروں پر آسمان ٹوٹ کر گر پڑے یا ان کو زمین کے اندر دھنسا دیا جائے یا پہاڑوں کو ان پر گرا دیا جائے۔

(۳) اگر زمین، آسمان اور پہاڑ میں عقل ہوتی اور وہ اس کلمہ کو سمجھتے تو پھٹ جاتے اور گر پڑتے، مگر وائی ہے اولادِ آدم پر جو باوجود کمال عقل و دانش رکھتے ہیں خوب دیکھتے ہیں کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے نہ اس کی نظیر ہے نہ مثال نہ کوئی مشابہ ہے نہ جورو نہ بیٹا نہ ہمسر کل عالم اس کی عظمت، کبریائی اور قدوس و پاکی کے سامنے سرنگوں ہے پھر بھی اس کو صاحبِ اولاد قرار دیتے ہیں۔

ابن جریر نے ابن عباس رض کا قول نقل کیا ہے کہ شرک مذکور ایسا عظیم جرم ہے جس سے سوا جن و انس کے آسمان، زمین، پہاڑ اور تمام مخلوق لرزتی اور گھبراتی ہے اور عظمت و جلال الٰہی سے شگافتہ ہوجانے کے قریب ہوجاتی ہے۔

مادی وغیرہ نے جو جوابات دیئے ہیں وہ متکلمانہ رنگ میں ہیں اور ابن عباس نے کلام کو ظاہری معنی پر محمول کرتے ہوئے جواب دیا ہے

اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا۔ بیٹا بنانا دو ہی طرح سے ہوسکتا ہے یا تو واقعی صلبی بیٹا ہو یا کسی کو بیٹا بنالیا جائے۔ اللہ کی شان میں دو نوں صورتیں ناممکن ہیں۔

اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا۔ غلام بن کر آنے سے مراد ہے فرماں پذیر منقاد اور تابعدار ہونا اور اللہ کی ربوبیت و الوہیت و وحدانیت کے سامنے سر جھکا دینا۔

سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔ آیت کا نزول مکہ میں ہوا تھا اور اس وقت تک اسلام محبوب و مرغوب نہ تھا۔ نہ اہل ایمان سے لوگوں کو محبت تھی۔ اسی لئے فرمایا کہ عنقریب اہل ایمان کی محبت لوگوں کے دلوں میں خدا تعالیٰ ڈال دے گا۔ مطلب یہ کہ عنقریب اسلام غالب ہو جائے گا۔ اس تقدیر پر اس آیت کا نزول حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے حق میں ہوگا۔

مقصودِ بیان اللہ کو صاحب احتیاج سمجھنا اور کسی قسم کے شرک کا قائل ہونا عظیم ترین جرم ہے اور قانون فطرت کی سب سے بڑی خلاف ورزی ہے۔ تمام کائنات (اس جرم کا ارتکاب کرنا تو در کنار) سننے سے بھی لرزہ بر اندام ہے۔ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ الخ سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام کائنات اپنا نوعی فہم رکھتی ہے اور اللہ کی عظمت و کبریائی کی اس قدر معترف ہے کہ کلمات شرک سننے سے بھی ترساں ہے۔ آیت لَقَدْ اَحْصٰهُمْ بتا رہی ہے کہ اللہ براہ راست تمام جزئیات کا عالم ہے خواہ جزئیات مادی ہوں یا غیر مادی۔ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ سے بات واضح ہوتی ہے کہ جو لوگ اللہ کے ہو جاتے ہیں اللہ کل مخلوق کو ان کا کر دیتا ہے اور کائنات ارضی و سماوی کو ان سے محبت ہو جاتی ہے۔ آیت هَلْ تُحِسُّ الخ سے تین باتیں ظاہر ہوتی ہیں:۔ دنیوی زندگانی پر مغرور ہونا عبث ہے۔ دیکھو گزشتہ اقوام میں کسی کا نام و نشان باقی نہ رہا۔ (۲) کفار کے واسطے وعید شدید ہے کہ تم کو اسی طرح ہلاک کیا جائے گا جس طرح گزشتہ کافروں کو ہلاک کیا گیا۔ (۳) حضور گرامی کے لئے تسلی ہے کہ کافروں کا یہ اقتدار اور ایذا رسانی کی طاقت چند روزہ ہے۔ صبر رکھنا چاہیئے وغیرہ۔

سُوْرَۃُ طٰهٰ مَكِّيَّةٌ وَّ هِيَ مِائَةٌ وَّ خَمْسٌ وَّ ثَلٰثُوْنَ اٰيَةً وَّ ثَمَانُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ طٰہٰ مکہ میں نازل ہوئی اس میں ۱۳۵ آیات اور آٹھ رکوع ہیں

اس سورت میں ۱۳۵ آیات، ۱۳۴۱ کلمات اور ۵۲۴۳ حروف ہیں۔ قرطبی نے صراحت کی ہے کہ باتفاق علماء یہ پوری سورت مکی ہے لیکن سیوطی نے اتقان میں آیت فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ۔ الخ کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ محی السنہ نے معالم میں لکھا ہے کہ رسول پاک نے ارشاد فرمایا مجھے ذکر اول سے وہ سورت عطا کی گئی ہے جس میں بقرہ کا ذکر ہے اور الواح موسیٰ سے طٰہٰ اور طواسین عطا کی گئی ہیں اور خزانۂ تحت عرش سے فاتحۂ قرآن اور خواتیم سورۂ بقرہ دی گئی ہیں اور مفصل بطور نفل دی گئی ہیں۔

ذکر اول سے وہ ذکر مراد ہے جو عالم کی پیدائش سے پہلے خدا تعالیٰ کے علم ازلی میں موجود تھا۔ اس کے مقابلے میں لوح محفوظ ذکر ثانی ہے۔ طواسین سے مراد وہ سورتیں ہیں جن کے شروع میں طٰہٰ، طٰسٓ اور طٰسٓمٓ ہے۔ فواتح قرآن سے مراد حروف مقطعات ہیں اور خواتیم سورۂ بقرہ سے مراد آیات اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ الخ ہیں۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ ذکر اول سے منقول ہوکر براہ راست وہ سورۃ آئی ہے جس میں بقرہ کا ذکر ہے اور حضرت موسیٰ کی الواح کا خلاصہ وہی ہے جو طواسین میں مذکور ہے۔ باقی مطلب ظاہر ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان اور بڑا رحم والا ہے

طٰهٰ ○ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ○ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ○

(اے محمد) ہم نے تم پر قرآن اس لئے نہیں اُتارا کہ مشقت اُٹھاؤ بلکہ اُس شخص کی نصیحت کے لئے اُتارا ہے جو ڈرتا ہے

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ○ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ

یہ اُس کا اُتارا ہوا ہے جس نے زمین کو اور اونچے آسمانوں کو پیدا کیا وہ رحمٰن ہے جو عرش پر جلوہ گر

اسْتَوٰى ○ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ○

ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان اور جو کچھ زمین کے نیچے

وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ○ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ○

ہے سب اُسی کا ہے اگر تم چلا کر بات کہو تو وہ چپکے سے کہی ہوئی بات کو بلکہ اس سے بھی پوشیدہ بات کو جانتا ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اُسی کے اچھے اچھے نام ہیں

تفسیر

لفظ طٰہٰ یا تو حروف مقطعہ میں سے ہے جن کی تحقیق سورۂ بقرہ کے آغاز میں گزر چکی ہے۔ مزید تذکرہ کی ضرورت نہیں یا حروف مفسرہ میں سے ہے۔ ثانی تقدیر پر علماء نے مختلف معانی بیان کئے ہیں۔ ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، عطاء، سعید بن جبیر، محمد بن کعب، عطیہ، عوفی، حسن، قتادہ، ضحاک، سدی، ابن ابزیٰ اور بعض دوسرے تابعین نے کہا کہ طٰہٰ کے معنی ہیں یا رجل یعنی اے شخص۔ ایک روایت میں ابن عباس، سعید بن جبیر اور سفیان ثوری کا یہ بھی قول ہے کہ یہ کلمہ نبطی ہے، لیکن ابو مالک نے اس کو معرب قرار دیا ہے (کذا قال ابن کثیر)

قاضی عیاض نے کتاب شفاء میں تفسیر عبد بن حمید سے نقل کرتے ہوئے ربیع بن انس کا یہ قول لکھا ہے کہ حضور گرامیؐ (رات کو تہجد کی) نماز کو کھڑے ہوتے تو ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے اور دوسرا پاؤں اٹھا لیتے تھے۔ اس وقت خدا تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ طا کا ترجمہ ہے دونوں پاؤں کو زمین پر رکھو اور ھا کی ضمیر زمین کی طرف راجع ہے یعنی نماز پڑھتے میں دونوں پاؤں کو زمین پر رکھو۔ ابن الانباری نے لکھا ہے کہ یہ لفظ کسی زبان کا ہو، لیکن چونکہ قریش کی زبان میں اس لفظ کا استعمال تھا، اس لئے یہ لفظ عربی ہو گیا تھا۔ خطیب نے سراج میں اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں آیات مذکورہ کا سبب نزول اس طرح لکھا ہے کہ مکہ میں ابتدائے نزول قرآن کے وقت حضور گرامیؐ تہجد کی نماز میں کبھی اس پاؤں پر اور کبھی اس پاؤں پر اس قدر طویل قیام کرتے تھے کہ قدم مبارک ورم کر آئے تھے۔ جس کو دیکھ کر کفار قریش کہتے تھے کہ اس شخص پر قرآن کیا نازل ہوا یہ تو مصیبت میں پڑ گیا۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی (رواہ ابن مردویہ عن ابن عباس)

یہ بھی منقول ہے کہ آیات قرآنیہ پیش کر کے حضور اقدسؐ اس قدر وعظ و پند فرماتے تھے کہ تمام جسمانی آرام چھوڑ دئے تھے۔ اس پر کفار کے جھگڑے مزید تھے۔ کفار کہنے لگے کہ قرآن کیا اترا یہ شخص مشقت اور دکھ میں پڑ گیا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اے رسول! ہم نے تم پر قرآن اس لئے نہیں اتارا کہ تم دکھ میں پڑ جاؤ۔ تمام ضروری جسمانی آسائشوں کو ترک

کردو بلکہ قرآن کو تو ہم نے رحمت بنایا ہے۔ یہ خدا ترس اور انجام سے خوف کرنے والوں کے لئے پیامِ نصیحت ہے۔ سورج کی روشنی اگر کسی کمرہ کے اندر پہنچانی ہوتی ہے تو دانشمند لوگ ایک آئینہ ذرا ترچھا کر کے سورج کے مقابل رکھتے ہیں۔ سورج کی شعاعیں آئینہ پر پڑتی ہیں۔ آئینہ کی پشت پر چونکہ کوئی کثیف مصالحہ چپاں ہوتا ہے، اس لئے شعاعیں جذب ہو کر پھر منعکس ہو جاتی ہیں اور کمرہ کے اندر روشنی پہنچ جاتی ہے چونکہ کمرہ کی چھت براہِ راست شعاعوں کو اندر نہیں پہنچنے دیتی، اس لئے یہ تدبیر کی جاتی ہے۔ آئینہ کا ایک رُخ صاف ہوتا ہے جدھر سے شعاعیں پڑتی ہیں اور دوسرا رُخ تاریک ہوتا ہے جس کی وجہ سے شعاعیں جذب ہو کر تاریک کمرہ کو انعکاسی روشنی سے منور کر دیتی ہیں۔ سطحِ زمین کے رہنے والے انسان کے خیالات، افکار اور طبعی میلانات جدا جدا ہیں۔ ایک شخص جس عقیدہ کو حق اور جس عمل کو صحیح سمجھتا ہے دوسرا آدمی اس عقیدہ کو باطل اور اس عمل کو غلط جانتا ہے۔ حق و باطل اور صحیح و غلط کا فیصلہ کرنے کے لئے عقلِ انسانی کافی نہیں۔ درایت و تجربہ سے یہ مشکل حل نہیں ہو سکتی، نہ انتظامِ عالم درست نہیں ہو سکتا۔ لامحالہ قانونِ الٰہی کی ضرورت ہے جو اٹل ہو، قیامت تک کے لئے تمام اقوام کیلئے کافی ہو۔ ہر ملک اور ہر گروہ کے منفعت کا اس میں لحاظ ہو، لیکن عام انسان مادی کثافت اور جسمانی آلائشوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے یہ قابلیت نہیں رکھتے کہ ان کے پاس براہِ راست پیغامِ الٰہی آئے اور قانونِ سماوی ان پر نازل ہو۔ ایک ایسے واسطے اور ذریعہ کی ضرورت ہے جس کی پشت پر مادی کثافت کا مصالحہ بھی لگا ہو اور روحانی رُخ اس کا روشن بھی ہو اسی کو عرفِ شریعت میں رسول کہا جاتا ہے۔ رسول پر قدسی فیضان نازل ہوتا ہے اور اللہ ہی کو قانون بھیجنے کا حق ہے۔ کیونکہ تخلیق، ایجاد، تربیت اور ابقاء سب کچھ اسی کے دستِ قدرت میں مرہون ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ تنظیم، قوانین اور اصلاحی ضوابط کا بھیجنے والا اور قواعدِ عدل کو جاری کرنے والا کوئی دوسرا ہو۔ اللہ نے اپنے رسول پر جب قوانینِ عدل نازل فرمائے تو صرف اس لئے نازل فرمائے کہ اس کے بندوں تک پہنچ جائیں اور جو روحیں تاریک ہیں ان میں نور پیدا ہو جائے۔ چنانچہ رسولِ پاکؐ نے ہر شخص کو پیامِ ہدایت سنایا۔ اپنا کھانا پینا، عیش و آرام، سکون و چین سب کچھ قربان کر دیا اور آرام کی زندگی دکھ سے بھر گئی، لیکن جس طرح اشیاء کو دیکھنے کے لئے بیرونی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح آنکھ کے اندر نور ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر باہر اندھیرا ہو تو کچھ نظر نہ آئے گا یا آنکھ میں روشنی نہ ہو تب بھی کچھ نہ سوجھے گا۔ بیرونی روشنی تو قوانینِ شریعت کا نام ہے، لیکن ان سے فائدہ اٹھانے والے وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن کی روحانی آنکھیں روشن ہوں جو انجام بین ہوں اور جو اُخروی زندگانی کی فلاح کے آرزومند ہوں۔ ہر شخص کو قرآن سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ بارش سے پھولوں کی خوشبو بڑھتی ہے، مگر کوڑا اور زیادہ متعفن ہو جاتا ہے۔ رسولِ پاکؐ نے پیامِ ہدایت ہر شخص کو سنانا شروع کیا۔ خود بھی سخت ترین مجاہدے کئے اور کوشش کی کہ تمام بندگانِ خدا یہی ہدایتِ قرآنی کو قبول کریں۔ چونکہ ایسا ناممکن تھا فائدہ صرف مخصوص طبقہ کو پہنچ سکتا تھا، اس لئے ذاتی کاوش اور انتہائی تحمل مشقت سے حضورؐ کو روک دیا گیا۔ اسی کل مضمون کو آیت مذکورہ میں بیان فرمایا ہے۔

خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ قرآن خدا نے نازل کیا کیونکہ آسمان و زمین کا وہی خالق ہے اور فقط خالق ہی نہیں بلکہ سب کا مالک اور مربی بھی ہے اور فقط مربی نہیں بلکہ صاحبِ رحمت اور فیاض بھی ہے۔ کل عالم کا مدبر بھی ہے اور اسی کو قانون بھیجنے کا حق ہے۔ پس اُس نے قرآن نازل کیا اور نازل کیا تو صرف رسول پر۔ کیونکہ ہر شخص فیضانِ قدسی کو براہِ راست قبول نہیں کر سکتا تھا، لیکن رسول پر قرآن نازل کرنے کی یہ غرض ہرگز نہیں کہ خود رسول سخت ترین مجاہدات کر کے عیشِ جسمانی اور آسائشِ بشری کو قربان کر دیں اور زندگانی دکھ سے بھر جائے یا دنیا میں ہر شخص کو انتہائی کاوش برداشت کرنے کے بعد پیامِ ہدایت قبول کرنے پر مجبور کریں اور ہر وقت اسی دُھن میں رہ کر زندگی کے ہر سکون و چین سے دست کش ہو جائیں کیونکہ رسول تو پاک فطرت اور طاہر خلقت ہونے کی وجہ سے خود زیادہ مشقت برداشت کرنے کے ضرورت مند نہیں، رہے اور لوگ تو سب کو قرآن سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ قرآن کے نزول کی اصل غرض یہ ہے کہ جو اہلِ ذکا اور اربابِ بصیرت ہیں ان کو رہنمائی ہو جائے۔

یہاں تک تو خدا کی قدرت اور احاطۂ ملکیت کا اظہار تھا۔ اس سے آگے علمی کمال کا بیان ہے کہ آدمی بلند آواز سے ذکرِ الٰہی اور

دبا کرے یا چپکے چپکے۔ بہرحال خدا کو پوشیدہ سے پوشیدہ خیال کا علم ہے اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ جب قدرت ملکیت اور کمال علمی کا بیان ہو چکا تو اللہ کی وحدانیت و تفرد کا ثبوت خود بخود واضح ہو گیا کیونکہ تفرد فی الالوہیت کا استحقاق تین صفات پر مبنی ہے۔ قدرت، تصرف کامل اور علم۔ جب تینوں صفات بدرجہ اتم خدا تعالیٰ میں موجود ہیں تو لامحالہ وہی الٰہ بے ہمتا اور وحدہٗ لاشریک ہوگا۔

اوپر کی آیت میں لفظ رحمٰن کا اطلاق خدا تعالیٰ پر کیا گیا تھا۔ دیگر صفاتی اسماء پر تو عرب کے کفار کچھ چون و چرا نہ کرتے تھے، مگر رحمٰن کے نام سے چڑتے تھے۔ اُن کے نزدیک صرف مسیلمہ رحمٰن الیمامہ کے لقب سے مشہور تھا۔ اللہ کو وہ کبھی رحمٰن نہیں کہتے تھے، اسی لئے آخر میں فرما دیا کہ تمام اچھے اچھے نام خدا کے ہیں رحمٰن ہو یا رحیم یا کچھ اور۔

تحلیلِ اجزا

عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰی۔ ابن کثیر، محی السنۃ اور خطیب وغیرہم مفسرین نے صراحت کی ہے کہ استواء سے مراد وہ استواء ہرگز نہیں جس سے مخلوق کی مشابہت لازم آئے۔ بلکہ وہ استواء مراد ہے جو اس کی شان کے لائق ہے۔ امام مالک اور حضرت علی کا قول ہے کہ استواء کا مفہوم معلوم ہے اور کیفیت مجہول اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور کیفیت دریافت کرنی بدعت ہے۔ مفسر مدارک نے کہا یہی ہمارا مذہب ہے۔ معالم میں محی السنۃ نے کہا عرش پر استواء اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ہے اس پر ایمان لانا بدون طلب کیفیت کے واجب ہے۔ مفسر غازی نے لکھا ہے کہ استواء کے ساتھ یہ بھی قطعی یقینی ہے کہ اللہ مکان و جہت سے پاک ہے۔ ثوری، اوزاعی، لیث بن سعد، ابن عیینہ اور ابن مبارک وغیرہم سے بھی یہی منقول ہے۔ ابن کثیر نے طویل تقریر کے بعد لکھا ہے کہ یہاں نہ کیفیت کا خیال ہے نہ تشبیہ ہے نہ مثال ہے نہ اللہ کا تعطل ہے۔

ان تمام اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ استواء کے حقیقی معنی مراد ہیں اور کیفیت نامعلوم ہے۔

بعض اہلِ تحقیق نے کہا کہ عرش سے مراد لکڑی لوہے یا سونے چاندی وغیرہ کا تخت نہیں کہ خدا اس پر بیٹھ کر حکومت کر رہا ہو بلکہ یہ کنایہ ہے جس سے مراد تختِ حکومت ہے اور استواء سے مراد الرحمٰن پر اللہ کا متصرفانہ تسلط ہے۔ مخلوق کو پیدا کیا آسمان و زمین سب کچھ بنایا۔ پھر ان پر حکومت و تصرف اور ان کی تدبیر و ترتیب کی۔ یا یوں کہا جائے کہ عرش سے مراد وہ آسمان ہے جو سب کے اوپر ہے اور سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ کل عالم ناسوت اس کے اندر ہے۔ پھر اس کے اوپر عالم ملکوت، عالم جبروت اور عالم لاہوت ہے اور سب سے وراء الوراء ذات پاک ہے۔ شارع نے اس بات کو بطور کنایہ بادشاہوں کے تخت پر بیٹھنے سے تعبیر فرمایا۔ چونکہ تصرف الٰہی ایک خاص سر ہے جس کو بغیر کنایہ و استعارہ و تشبیہ کے نہیں بیان کیا جا سکتا اور نہ وہ بغیر تمثیل کے سمجھ میں آسکتا ہے۔ کیونکہ وہاں نہ جسم ہے نہ جسمیت نہ مکان نہ ہیئت، اس لئے کلام کو ظاہر پر محمول کر کے خدا کو مجسم قرار دینا دانش کا قصور ہے۔

وَمَا تَحْتَ الثَّرٰی۔ ثریٰ کیا چیز ہے اور ثریٰ کے نیچے کیا ہے؟ صحیح احادیث میں اس کی کوئی کیفیت مذکور نہیں۔ اہلِ تفسیر نے جو کچھ لکھا ہے وہ اسرائیلی کتابوں سے نقل کیا ہے جو ناقابلِ اعتبار ہے۔

مجمل طور پر اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح انسان کے بعض اعضاء ظاہر اور محسوس ہیں۔ ہر شخص ان کو دیکھتا ہے ہاتھ پاؤں آنکھ ناک وغیرہ سب کو نظر آتے ہیں اور کچھ اندرونی اجزاء ایسے بھی ہیں جن کو سوا اہلِ علم کے اور کوئی نہیں جانتا کہ عروق شعریہ، دماغ کی خلائیں، قلب کے بطون، وریدوں اور شریانوں کی تعداد وغیرہ عام لوگوں کو معلوم نہیں۔ پھر ارواح طبعیہ، حیوانیہ اور نفسانیہ نیز دماغی قوتیں اور ان کے اقسام یہ سب جاہلوں کی نظر سے پوشیدہ ہیں۔ اہلِ طب ہی ان سے واقف ہیں۔ اسی طرح عالم کے بیرونی اجسام اور اجرام کی خارجی کیفیات و حالات تو عام و خاص جانتے ہیں، مگر اس کے اندرونی اجزاء، باطنی قوتیں اور روحانی طبقات سے سوا اہلِ نظر کے کوئی بھی واقف نہیں۔ اس لئے ثریٰ کے نیچے کیا ہے؟ ثریٰ سے کیا مراد ہے اس کو اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو تفصیل سے ظاہر کرنا اور اس کی کیفیت سے بحث کرنی عام لوگوں کا کام نہیں یہ صرف اہلِ شرع کا کام ہے۔ شارع نے استعارہ اور کنایہ کے طور پر اس کو بیان فرمایا ہے۔ جس سے ظاہری مفہوم ہرگز مراد نہیں۔ ظاہری الفاظ کو سن کر رائے قائم کرنا اور ہر طبقہ کے اوصاف و خواص قائم کرنا انتہائی جہالت ہے۔

السِّرَّ وَ اَخْفٰی ۔ سر وہ راز جو دل میں چھپا کر رکھا جائے اور اخفیٰ وہ راز جس کو خود آدمی نہیں جانتا (ابن عباسؓ) دل میں جو بات پیدا ہو جائے وہ سر ہے اور جس کا خیال بھی نہ آیا ہو وہ اخفیٰ ہے (ضحاک) سر وہ بات ہے جو ایک شخص دوسرے سے چپکے سے کہتا ہے اور اخفیٰ وہ بات ہے جو دل ہی دل میں ہو کسی دوسرے سے نہ کہی گئی ہو (حسن بصری)

اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۔ اللہ کے اسماء توفیقی ہیں یعنی قرآن و حدیث میں جتنے نام مذکور ہیں انہی کا اطلاق خدا پر ہوتا ہے ۔ اپنی طرف سے وضع کرنا صحیح نہیں ، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ تصریح شدہ اسماء کے علاوہ اللہ کے اور اسماء نہیں ہیں ۔ اسمائے حسنیٰ بے شمار ہیں ۔ حدیث شفاعت میں صراحت ہے کہ رسول پاکؐ کو بوقت شفاعت اللہ اپنے وہ محامد و صفات تلقین فرمائے گا جن کا علم کسی کو نہیں عطا فرمایا ۔

مقصود بیان

رسول پاکؐ پر قرآن کا نزول صرف اس لئے ہوا کہ اہل بصیرت اس سے فائدہ اندوز ہوں اور جن کی روحوں میں روشنی اور دلوں میں خدا ترسی ہے ان کو ہدایت ہو جائے ۔ اللہ کی قدرت علم تخلیق ایجاد و تربیت ہمہ گیر ہے ۔ کوئی چیز یہاں تک کہ عرش عظیم بھی اس کی گرفت سے خارج نہیں ۔ جزئیات مادیہ و غیر مادیہ یہاں تک کہ اندرونی رازوں کا بھی خدا عالم ہے ۔ آیت وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ الخ سے استعمال ہوتا ہے فلاسفۂ یونان کے اس قول کا کہ خدا تعالیٰ کو جزئیات مادیہ کا تفصیلی علم نہیں بلکہ من حیث الکل ہے ۔ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ کے ناموں کا حصر نہیں بلکہ ہر وہ نام جو نقص و عیب سے پاک ہو اللہ کا نام ہو سکتا ہے ۔ یہ امر بھی اشارۃً ثابت ہوتا ہے کہ ذات الٰہی تمام نقائص و عیوب سے پاک ہے بلکہ وہ الفاظ جو ذات مقدس پر دلالت کرتے ہیں وہ بھی پاک ہیں ۔

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا

(اے محمدؐ) کیا تم کو موسیٰ کا واقعہ بھی پہنچا جب انہوں نے آگ دیکھی تو اپنی بی بی سے کہا تم ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے

لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى

امید ہے کہ میں تمہارے پاس کوئی انگارا لے آؤں یا آگ پر راستہ پاؤں جب موسیٰ آگ پر پہنچے تو آواز دی گئی اے موسیٰ

اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ

میں یقینی تمہارا رب ہوں تم اپنی جوتیاں اتارو کیونکہ تم طُویٰ کے مقدس جنگل میں ہو میں نے تم کو منتخب کر لیا ہے

فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ

تو جو کچھ وحی کی جائے اس کو سنو میں بلاشبہ اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں میری عبادت کرو اور میری یاد کے لئے پابندی

لِذِكْرِيْ ۝ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۝ فَلَا

سے نماز پڑھو بلاشبہ قیامت آنے والی ہے میں اس کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں تاکہ ہر شخص جو کچھ کرتا ہے اس کا عوض اس کو دیا جائے لہٰذا

يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۝ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ

تم کو اس پر ایمان لانے سے وہ شخص نہ روک دے جس کو اس کا یقین نہیں ہے اور اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہوا ہے ورنہ تم ہلاک ہو جاؤ گے موسیٰ تمہارے دہنے ہاتھ

يَٰمُوسَىٰ ○ قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ

میں یہ کیا ہے؟ موسیٰ نے کہا یہ میری لاٹھی ہے میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اپنی بکریوں کے لئے اس سے پتے جھاڑتا ہوں اور میری دیگر

أُخْرَىٰ ○ قَالَ أَلْقِهَا يَٰمُوسَىٰ ○ فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَىٰ ○ قَالَ خُذْهَا وَلَا

ضروریات بھی اس میں ہیں فرمایا موسیٰ اس کو ڈال دو موسیٰ نے اس کو ڈال دیا فوراً وہ سانپ بن کر دوڑنے لگا فرمایا اس کو پکڑ لو خوف

تَخَفْ ۖ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ ○ وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ

نہ کرو ہم اس کو لوٹا کر پہلی حالت پر کر دیں گے اور اپنے ہاتھ کو سمیٹ کر بغل کی طرف لے جاؤ وہ سفید ہو کر

بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ آيَةً أُخْرَىٰ ○ لِنُرِيَكَ مِنْ آيَاتِنَا الْكُبْرَى ○

بے عیب نکل آئے گا یہ دوسرا معجزہ ہے تاکہ ہم تم کو اپنی بعض بڑی نشانیاں دکھائیں

تفسیر آدمی کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی اجنبی عجیب چیز جس کو دیکھنے سننے اور یقین کرنے کا وہ خوگر نہ ہو ظاہر کی جاتی ہے تو اس کی طبیعت اس چیز سے متنفر ہوتی ہے، انکار کرتی ہے اور بھاگتی ہے اور کسی طرح قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتی، لیکن اگر اس سے کہا جائے کہ یہ بات کوئی نئی نہیں اس سے پہلے بھی ہو چکی ہے جس کو تم بھی مانتے ہو تو انکار کرنے والے کی طبیعت کسی قدر مانوس ہو جاتی ہے اور غور و خوض کرنے کے بعد وہ قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یثرب کے جاہل دیہاتی اللہ کی کتابوں اور رسولوں سے واقف نہ تھے۔ اُن کے ملک میں نہ کبھی کوئی نبی مبعوث ہوا نہ کتاب نازل ہوئی۔ حضور اقدس ؐ نے رسالت کا دعویٰ کیا، ہادیٔ برحق ہونے کا اعلان کیا، قرآن کو ہدایت نامہ کہتے ہوئے اللہ کی کتاب قرار دیا۔ عربوں نے فطری بے بصیرتی کی وجہ سے خلاف انکار کر دیا، لیکن برائے نام یہودیوں کو دین الٰہی کا حامل اور آسمانی کتاب کا مالک جانتے تھے۔ اگر دنیا میں اہل علم کی کوئی جماعت ہو سکتی تھی تو ان کے نزدیک یہودیوں کی تھی۔ خدا تعالیٰ نے رسول پاک ؐ کی رسالت اور قرآن کی ہدایت سے مانوس کرنے اور طبعی بیگانگی کو دور کرنے کے لئے اس جگہ حضرت موسیٰ کا مفصل قصہ، نبوت، رسالت اور احکام ملنے کا تذکرہ فرمایا تاکہ عرب کا طبعی تنفر دور ہو جائے اور وہ قرآن کو کوئی اجنبی کتاب اور رسول کو عجیب رسول نہ خیال کریں۔

آیات مذکورہ میں تین امور کا بیان ہے (۱) حضرت موسیٰ کا دورانِ سفر میں وادیٔ سینا میں پہنچنا، تاپنے کے لئے آگ کی تلاش میں جانا، غیب سے ندا ہونا اور نبوت ملنا۔ (۲) حضرت موسیٰ کو توحید عبادت اور اقرار قیامت کی تعلیم دینا، عقائد الہامیہ اور عبادت پر ثبات و استقامت رکھنا (۳) حضرت موسیٰ کو بے تکلف بنانے اور ان کے دل سے ربانی رعب کو دور کرنے کے لئے لطافت آمیز خطاب کرنا اور معجزات عطا کرنا۔ اس کی مفصل بحث سورۂ اعراف میں گذر چکی ہے۔ ہم یہاں مختصر تبصرہ کرتے ہیں۔

خطیب اور ابن کثیر نے بیان کیا ہے کہ معاہدہ کی مدت جب پوری ہو گئی تو حضرت موسیٰ بی بی کو ساتھ لے کر مدین سے بارادہ مصر چل دیئے۔ حکومتِ شام کے خوف سے معمولی راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا۔ سردی کی شدت تھی، ابر گھرا ہوا تھا، تاریکی چھائی ہوئی تھی، پہاڑوں کے درمیان رہگذر تھی، بی بی پورے دنوں کی حاملہ تھی، تکان اور سردی سے مجبور ہو کر ایک جگہ قیام کیا۔ یہ جگہ وادیٔ سینا میں تھی۔ کوہ طور کی جانب آگ کا شعلہ نظر آیا۔ راستہ بھول گئے تھے، اس لئے روشنی کی جانب چل دیئے تاکہ آگ لے آئیں یا کوئی آدمی راہ بتانے والا مل جائے۔ جہاں سے شعلہ نکل رہا تھا وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک درخت سے شعلے نکل رہے تھے (نورِ الٰہی) کی تجلی ہے۔ بہت تعجب کیا۔ اسی تحیر میں تھے کہ غیب

سے ندا ہوئی۔ خواہ فرشتے نے صدا دی یا خدائی ندا ہوئی کہ موسیٰ! آگاہ ہو جاؤ کہ میں پروردگار ہوں۔ پھر وادیٔ مقدس کی عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے جوتیاں اتارنے کا حکم ہوا۔

(۲) حضرت موسیٰ کو ندائے غیبی نے سب سے پہلے اصلاحِ خلق کی دعوت دی۔ دنیا کی مذہبی اصلاح تین امور پر موقوف ہے۔ مبدء کے متعلق صحیح عقیدہ ہو جائے، معاد پر صحیح یقین پیدا ہو جائے، مدتِ زندگی میں عمل پیدا ہونے کے لئے صحیح راستہ مل جائے۔ انہی تینوں امور کی تعلیم ندائے غیبی نے دی۔ وحی ہوئی کہ موسیٰ اللہ کو وحدہٗ، الوہیت میں یگانہ اور ربوبیت میں فرد سمجھو۔ یہ مبدء کے متعلق صحیح عقیدہ کی تعلیم تھی۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ توحید کا یقین کرنے کے بعد اللہ کی عبادت کرو۔ عبادت عام ہے۔ ذکر قلبی ہو، لسانی ہو، تصور کی یکسوئی اور مراقبہ ہو، استغفار اور دعا ہو، زکوٰۃ خیرات ہو یا اخلاقی معاشرتی تحفظ ہو۔ خصوصاً نماز چونکہ ان سب میں مہتم بالشان چیز تھی، اس لئے خصوصیت کے ساتھ اس کا تذکرہ فرمایا۔ یہ مدتِ زندگی کی اصلاح کی تعلیم تھی۔ آخر میں حقانیتِ قیامت کا عقیدہ تعلیم فرمایا، لیکن تعیینِ وقت نہیں فرمائی، مگر وجودِ قیامت کی دلیل بیان کر دی کہ چونکہ ہر شخص کو اس کے اعمال کی پاداش دینی ضروری ہے، اس لئے قیامت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ جب اصلاح کے اصولِ سہ گانہ کی تعلیم ختم ہو گئی تو آخر میں اس تعلیم پر ثابت قدم رہنے اور استقلال رکھنے کی ہدایت فرمائی کیونکہ جب کوئی اصلاحی تحریک اللہ کا کوئی خاص بندہ دنیا میں پیدا کرنا چاہتا ہے تو باطل پرست گروہ کی طرف سے ہر طرح کا اس سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ حوادث و عوائق کے بڑے بڑے وزنی پتھر اس کے راستے میں ڈالے جاتے ہیں اس کو مصائب و آلام میں مبتلا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تکالیف و موانع سے تنگ آ کر اکثر اہلِ حق کی ہمتوں میں تزلزل اور کمزوری پیدا ہو جاتی ہے اور صحیح راستے پر چلنے والے مجبوریوں کی وجہ سے راہِ حق چھوڑ دیتے ہیں، اس لئے ثبات و استقامت کی تعلیم دینی بھی ضروری تھی تاکہ موسیٰ کی ہمت تمام عوائق سے مقابلہ کر سکے اور کوئی حادثہ سنگِ راہ نہ بن سکے۔

(۳) خدا تعالیٰ کو مقصود تھا کہ اصلاح و ہدایت کا عظیم الشان کام حضرت موسیٰ کے سپرد کیا جائے۔ بنی اسرائیل مصر کو کفر و شرک اور معصیت و بدکاری کی آلائشوں سے پاک کیا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اگر ایک طرف اصلاحی قوانین کی روشنی اور شریعتِ غراء کے نور کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ باطل کی تاریکی دور ہو جائے اور نورِ حق سے تاریک دل روشن ہو جائیں تو دوسری طرف مظہرِ امرِ ہدایت میں قوتِ قاہرہ اور غیبی طاقت کا ہونا بھی لازم ہے تاکہ سرکش طاغوتی طاقتوں سے برسرِ پیکار رہ کر غلبہ حاصل کر سکے۔ اصول کی صداقت، برہان کی قوت اور مرعوب کن مادی طاقت کا مظاہرہ ہمیشہ اصلاحی تحریک پھیلانے کے لئے ضروری ہے۔ حضرت موسیٰ سے تبلیغی کام لینا تھا، فرعون ایسے قہار و جبار حکمراں کے مقابلے میں بھیجنا تھا، پیامِ ہدایت پہنچا کر بنی اسرائیل کو راہِ راست پر لانا تھا، اس لئے حضرت موسیٰ کو دو واضح معجزات عطا فرمائے۔ لاٹھی کا سانپ بن جانا اور پھر اصلی حالت پر آ جانا، ہاتھ میں آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا اجالا پیدا کرنا یہ دونوں معجزے حضرت موسیٰ کے لئے ضروری تھے۔ پہلے معجزے سے اشارہ اس طرف تھا کہ حضرت موسیٰ کو قوتِ غیبی اور تائیدِ قدسی حاصل تھی۔ دنیا کا کوئی شہنشاہ اس کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ دوسرے معجزے سے یہ بات دکھائی تھی کہ شریعتِ موسوی آفتاب سے زیادہ روشن اور دلائلِ موسوی ہر روشنی سے زیادہ چمکدار تھے۔

تحلیلِ اجزاء

هَلْ أَتَاكَ۔ یہ کلام ابتداءً استفہامی رنگ میں ہے، لیکن اللہ چونکہ عالم الغیب والشہادۃ ہے، اس کو کسی بات کے دریافت کی ضرورت نہیں، اس لئے استفہام کا حقیقی مفہوم مراد نہیں بلکہ یہ استفہام تقریری ہے۔ یعنی موسیٰ کا قصہ وحی کے ذریعہ سے تم کو بے شبہ معلوم ہو چکا ہے۔

فَقَالَ لِأَهْلِهِ۔ حضرت موسیٰ کے ساتھ اس وقت آپ کی بی بی صفورا تھیں اور چونکہ اہل کا اطلاق ایک پر نہیں ہوتا، اس لئے اہلِ تحقیق نے جواب دیا کہ صرف صفورا کو اہل کہنا بطور تہذیب ہے۔ جمع کا صیغہ واحد کے لئے بطور تہذیب و تکریم کے استعمال کیا جاتا ہے۔ بعض اہلِ تاریخ کا قول ہے کہ بی بی، خادمہ اور بچہ یہ تینوں موجود تھے، سب کو اہل کہا گیا ہے۔

اَوْ اَجِدُ الخ۔ ابن عباسؓ کے نزدیک ھُدًی سے ہادی مراد ہے۔ حضرت موسیٰ راستہ بھی بھول گئے تھے اور سردی بھی سخت تھی، اس لئے آگ کی بھی تلاش تھی اور رہنما کی بھی۔ آگ سامنے نظر آرہی تھی، اس لئے اس کے ملنے کی امید تو ظاہر کی اور رہنما کا ملنا مشتبہ تھا، اس لئے دوسرے فقرے میں لَعَلَّ کا لفظ استعمال نہ کیا۔ خطیب نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ موسیٰ نے ایک سبز درخت دیکھا جس کو نیچے سے اوپر تک ایک سفید آگ گھیرے ہوئے تھی اور درخت آتش بے دود کا ایک مجسّم شعلہ نظر آتا تھا۔ ابن مسعود کا قول ہے کہ درخت پھل دار بھی تھا۔ بر قول ابن جریج وعکرمہ وہ آگ نہ تھی نور الٰہی تھا۔ موسیٰ پاس پہنچے تو ملائکہ کی تسبیح کی آواز سنائی دی (بر قول وہب) موسیٰ نے اس کو آتشی سوزاں خیال کیا۔ چند پتلی لکڑیاں لے کر جلانا چاہا وہ آگ موسیٰ کی طرف جھکی۔ آپ ڈرے، جھجک کر پیچھے ہٹے پھر ٹھہرے۔ واقعہ حیرت خیز تھا تردد کرنے لگے۔ کبھی آگ کی طرح آگے بڑھاتی۔ کبھی آگ کا میلان پیچھے ہٹاتا۔ یک دم آگ بجھ گئی۔ موسیٰ حیران رہ گئے۔ درخت کی شاخوں کو دیکھا تو فضا میں سر بلند پایا اوپر کو نظر کی تو آسمان سے درخت تک ایک بقعۂ نور دیکھا نظر نہ ٹھہر سکی۔ فوراً آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

محی الدین ابن عربی نے لکھا ہے کہ آتشی پردوں کے اندر سے ندا دی گئی تھی۔ یہ پردے مادّی پردے نہ تھے بلکہ اللہ کی عزت وجلال کے پردے تھے۔ ذاتِ الٰہیہ نظر نہیں آتی کیونکہ لوگوں کی آنکھوں پر اسی قسم کے آتشی حجاب ہیں۔

خطیب نے سراج میں بروایت ابن منبہؒ لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ نے ندائے غیبی کا جواب فوراً دے دیا اور عرض کیا میں آواز سنتا ہوں۔ آواز دینے والے کی جگہ، مقام اور سمت معلوم نہیں ہوتی نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آواز دینے والا کون ہے۔ ندا آئی تیرے اوپر، تیرے ساتھ تیرے آگے، تیرے پیچھے، تیرے دائیں، تیرے بائیں اور تیرے نفس سے بھی زیادہ قریب میں، تیرا پروردگار ہوں۔

فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ۔ حضرت علی، ابو ذر، ابو ایوب اور بعض دیگر صحابہ سے مروی ہے کہ موسیٰ کی جوتیاں مُردار گدھے کی کھال کی بنی ہوئی تھیں عام مفسرین نے جوتیاں اتارنے کے حکم کو وادیٔ مقدس کی تعظیم پر محمول کیا ہے، لیکن مجاہد وعکرمہ نے ایک لطیف ترین توجیہ یہ بھی کی ہے کہ برہنہ پا ہونا تعظیم پر تو دلالت کرتا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مقصود تھا کہ جس وادی میں تجلّیٔ الٰہی پرتو افگن ہوئی ہے وہاں کی خاک حضرت موسیٰ کے پاؤں کو لگ جائے۔ گویا اس میں موسیٰ کو ایک خاص شرف سے نوازنا مقصود تھا۔

دونوں جوتیاں اتار دینے کا حکم دیا۔ اس میں علمائے تحقیق نے لطیف اشارات لکھے ہیں:۔

خطیب نے لکھا ہے کہ پہاڑی سے کسی قدر دُور حضرت موسیٰ بیوی اور بچے کو چھوڑ کر آئے تھے اور فطرتاً دل کا میلان انہی کی طرف ہونا چاہیئے تھا، اس لئے حکم دیا گیا کہ دونوں جوتیاں اتار ڈالو یعنی بیوی اور بچہ کے خیال کو دل سے علیحدہ کر دو۔

ابن عربی نے کہا کہ دونوں جوتیوں سے اشارہ دُنیا اور آخرت کی طرف ہے یعنی معرفت الٰہیہ اور مشاہدۂ انوار میں غرق ہو جا فنا در کونین کی طرف التفات ترک کر دو۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ ہر برہان اور استدلال کی ترکیب دو جملوں سے ہوتی ہے جن کو ملا کر نتیجہ نکلتا ہے، مگر یہ جملوں کی ترکیب علم استدلالی اور برہانی میں ہوتی ہے۔ مشاہدہ یا بداہت یا علم حضوری میں اس ترتیب وترکیب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰ نے انوار قدسیہ کا مشاہدہ آنکھوں سے کیا تھا۔ ندائے غیبی کو کانوں سے سُنا تھا۔ مقصود حق کو دل سے سمجھا تھا۔ اس صورت میں طریق استدلال کی طرز برہان کا ترک لازم تھا۔ اسی بنا پر جوتیاں اتارنے یعنی دونوں مقدمات کو ترتیب دے کر برہانی طور پر نتیجہ نکالنے کو ترک کر دینے کا حکم ہوا۔

اَكَادُ اُخْفِيْهَا۔ ظاہر کلام پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ قرب اخفاء اظہار پر دلالت کرتا ہے۔ اگر کسی چیز کو ظاہر کر دیا جائے اور ظاہر کرنے میں کوئی خاص مصلحت ہو تو کہا جاتا ہے کہ قریب تھا میں اس کو پوشیدہ رکھتا، مگر ظاہر کر دیا۔ حالانکہ قیامت کا اظہار خدا تعالیٰ نے کبھی کسی جگہ نہیں فرمایا۔ یہاں تک کہ ملائکہ اور انبیاء کو بھی اس کا تعینی علم نہیں دیا۔

اس اعتراض کا جواب حسن بصری نے تو اس طرح دیا ہے کہ اللہ کی طرف اگر باب كَادَ کی نسبت ہو تو وجوب کے معنی ہوتے ہیں۔ گویا اَكَادُ اُخْفِيْهَا کا ترجمہ ہوا میں قیامت کو ضرور مخفی رکھوں گا۔ جس طرف لفظ عَسٰى عام محاورہ میں اُمید ظاہر کرنے کے لئے بولا جاتا ہے، مگر اللہ کی طرف اسناد ہو تو تحقیق و وجوب کے معنی ... ہیں۔ ابو مسلم نے اَكَادُ کا ترجمہ اُرِيْدُ لکھا ہے یعنی میں قیامت کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ ۔ حضرت موسیٰ نے نورِ الٰہی درخت پر پرتو افگن دیکھا، ندائے غیبی کو کانوں سے سنا، کلام ربانی بغیر سمت اور مکان کے گوشِ ہوش میں آیا، رسالت و عبودیت کی غیر معمولی تکلیف اٹھانے کا حکم ہوا، ان تمام امور نے کچھ دیر کے لئے مرعوب اور متحیر کر دیا، دل پر دہشت اور دماغ پر ہیبت چھاگئی ۔ ہیبت کو دور کرنے، موسیٰ کو مانوس بنانے اور حیرت و تکلف کے پردے اٹھانے کے لئے سوال کیا گیا "موسیٰ تمہارے دائیں ہاتھ میں یہ کیا ہے؟" حضرت موسیٰ صاف اور مختصر الفاظ میں یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ لاٹھی ہے مزید تطویلِ کلام کی ضرورت نہ تھی، لیکن موسیٰ نے خطاب میں لذت روحانی محسوس کی ۔ رگ رگ میں کیف و سرور کی لہر دوڑ گئی، اللہ سے خطاب کو طول دینا چاہا، اس لئے مختصر جواب پر اکتفا نہ کیا بلکہ لاٹھی کے فوائد بھی بیان کئے ۔ حضرت موسیٰ سے سوال کیا باوجودیکہ خدا عالم تھا تاکہ موسیٰ کو لذتِ خطاب کے حصول کا تفصیلی موقع مل جائے ۔

نیز اشارۃً یہ تلقین کرنی مقصود تھی کہ جس طرح لاٹھی سے تم اپنا جسمانی آرام بھی حاصل کرتے ہو اور بکریوں کے لئے پتیاں بھی توڑتے ہو اسی طرح وہ شریعت جس کا تمہیں حامل بنایا جاتا ہے تمہارے روحانی سکون کا بھی ذریعہ ہے اور قوم کی پراگندہ بھیڑوں کی روحانی غذا کا سامان بھی اس میں موجود ہے ۔ خود بھی اس پر عمل کرو اور قوم والوں کو بھی اس پر کاربند ہونے کی ہدایت کرو ۔

وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ ۔ حضرت موسیٰ نے ذاتی ضرورت اور بکریوں کے پتیاں توڑنے کے بیان پر بھی اکتفا نہ کیا بلکہ آخر میں مجملاً کہہ دیا کہ لاٹھی سے میری دیگر ضرورتیں بھی وابستہ ہیں (مثلاً موذی جانوروں کو مارنا، بکریوں پر حملہ کرنے والے بھیڑیوں کو دفع کرنا، دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنا وغیرہ) یہ لفظ حضرت موسیٰ کی زبان سے نکلا، مگر حقیقت میں تلقین ربانی تھی کہ جس طرح لاٹھی سے تمہاری دیگر ضروریات وابستہ ہیں اسی طرح شریعت و رسالت سے علاوہ خود عمل کرنے اور دوسروں کو عمل پیرا بنانے کے لئے فرعون کے مقابلے میں اتمام حجت حق و باطل کا فیصلہ بنی اسرائیل کی ذلت دور کر کے عزت عطا کرنا اور اقوام عالم میں ان کو سرخرو بنانا بھی مقصود ہے ۔

قَالَ أَلْقِهَا يَا مُوسَىٰ ۔ حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں جب تک لاٹھی تھی اصلی حالت پر تھی کیونکہ ہیبت ناک اور دہشت انگیز سین نظر نہ آتا تھا، سیدھی سادی لکڑی تھی ۔ جب زمین پر ڈالا تو اژدہا بن گئی ۔ گویا یہ بتانا غرض تھا کہ موسیٰ بظاہر معمولی آدمی تھے، ضروریات بشری کے محتاج تھے ۔ نہ صورت سے کسی اندرونی طاقت کا اظہار ہوتا تھا نہ جلال جبروتی نمایاں ہوتا تھا، مگر سرکش طاغوتی طاقتوں سے مقابلہ کرنے کے وقت یہی متبرک مقدس صورت پرشکوہ جلال کا اظہار کرتی تھی ۔ مذہبی طاقت اس کے رونگٹے رونگٹے سے ظاہر ہوتی تھی گویا وہ موسیٰ ہی نہیں معلوم ہوتے تھے جو ہمیں نظر آتے تھے ۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ پہلے جوتیاں اتار دینے کا حکم دیا ۔ یہاں لاٹھی ڈال دینے کی ہدایت کی ۔ جوتیاں چلنے کا ذریعہ ہیں اور لاٹھی تحصیل مقصد کا آلہ ۔ مراد یہ تھی کہ ہر قسم کی طلب ترک کر دو ۔ جب تک تلاش و گریز میں رہو گے، نفسانی اغراض میں مشغول رہو گے معرفت الٰہی کا حصول نہ ہوگا ۔ گریز و طلب چھوڑ دو گے تو خلوص کے مرتبہ پر فائز ہو گے اور معرفت الٰہی حاصل ہو جائے گی ۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ ۔ یعنی ایک ہاتھ کو گریبان میں داخل کر کے دوسری بغل میں پہنچا دو اور پھر باہر نکالو ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ نورِ الٰہی پردہ کے اندر سے پرتو فگن ہوتا ہے ۔ قوت قدسیہ اس جسمانی خاکی جامہ کے اندر سے رونما ہوتی ہے ۔ بغل میں ہاتھ لے جا کر باہر نکالنے سے آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو جائے گی یعنی ہدایت کے غیبی جلوہ سے دنیائے کفر کے ظاہر چکاوے ماند پڑ جائیں گے ۔ یدٌ سے مراد آیت میں صرف ہتھیلی ہے پورا ہاتھ مراد نہیں ۔

مِنْ غَيْرِ سُوٓءٍ سوء سے مراد عیب اور برص ہے ۔ کذا قال ابن عباس و مجاہد و عکرمہ و قتادہ والضحاک والسدی وغیرہم ۔

مقصود بیان

حضرت موسیٰ کے پورے قصہ سے یہ امر بالکل نمایاں ہوتا ہے کہ کل عالم تقدیر ازلی کے تابع ہے ۔ رب العالمین فیاضِ مطلق ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے ۔ نبوت کسبی چیز نہیں محض عطیۂ الٰہی ہے ۔ ظاہری اسباب کی تلاش سنتِ انبیاء ہے ۔ موذی کی تکلیف کو دور کرنے کی کوشش کرنی شیوۂ مسلم ہے ۔ ندائے غیبی سنی جا سکتی ہے، مگر گوشِ ہوش کی ضرورت ہے ۔ مقام مقدس میں جوتیاں اتار کر داخل ہونا انسانی تہذیب ہے ۔ کسی مخصوص مقام پر جلوۂ الٰہی پڑ سکتا ہے اور جہاں مخصوص جلوہ پڑ جاتا ہے وہ متبرک اور مقدس ہو جاتا ہے ۔ أَنَا اخْتَرْتُكَ کا لفظ بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ مختار مطلق ہے مجبور نہیں ۔ بندوں میں سے کسی خاص بندے کو عطائے فضل کے اختیار کرنا اللہ ہی کا کام ہے ۔

اس میں کسب و کوشش کو دخل نہیں۔ بناء عرفان اقرار توحید اور یقین قیامت ہے، لیکن توحید کے ساتھ عبادت یعنی مراقبہ، مجاہدہ، ریاضت، تحمل کی یکسوئی، تفکر و غور اور زندگانی کی اصلاح لازم ہے۔ لِذِکْرِیْ کا لفظ بتاتا ہے کہ ریاکاری یا تساہل و غفلت کی نماز ناقابلِ قبول ہے۔ نماز میں یادِ الٰہی لازم ہے۔ لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ سے قیامت کی ضرورت ظاہر کرنی مقصود ہے۔ فَلَا یَصُدَّنَّکَ الخ سے یہ تعلیم دینی غرض ہے کہ قیامت کا انکار درحقیقت اس شخص سے سرزد ہوسکتا ہے جو خواہشات کا پرستار، ہوائے نفس کا بندہ اور شتر بے مہار بننا چاہتا ہو اور دنیوی زندگانی میں کسی شرعی اصلاحی قید کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ اس سے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ شیطانی گروہ آدمی کے صحیح عقائد اور درست اعمال کو طرح طرح سے برباد کرنا چاہتا ہے، مگر عقائد صادقہ اور اعمالِ صالحہ پر قائم رہنا مسلم کامل کا شیوہ ہونا چاہیئے۔

اہلِ تحقیق نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ کو خدا تعالیٰ نے دو معجزے عطا فرمائے تھے۔ ان دونوں میں سے پہلے میں جبروتِ الٰہی کا اظہار تھا جو فرعون جیسے سرکش کے مقابلے کے لئے ضروری بات تھی۔ دوسرے میں رہنمائی اور روشنی کی طرف اشارہ تھا۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝ وَيَسِّرْ لِيْٓ

فرعون کے پاس جاؤ وہ واقعی حد سے بڑھ گیا ہے موسیٰ نے کہا پروردگار! میرا سینہ کشادہ کردے اور میرا کام میرے

اَمْرِيْ ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۝ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۝ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا

لئے آسان کردے اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات سمجھیں اور میرے کنبہ میں سے میرے

مِّنْ اَهْلِيْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِي ۝ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۝ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۝ كَيْ

بھائی ہارون کو میرا مددگار بنادے اس کے ذریعہ سے میری قوت کو مضبوط کردے اور میرے کام میں اس کو میرا شریک بنادے تاکہ

نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۝ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ

بکثرت ہم تیری پاکی بیان کریں اور بکثرت تیری یاد کریں بلاشبہ تو ہم کو خوب دیکھ رہا ہے اللہ نے فرمایا موسیٰ تمہاری

سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ۝ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ۝ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ

درخواست منظور کی گئی ہم تم پر ایک بار اور بھی احسان کرچکے ہیں جب ہم نے تمہاری ماں کو وہ بات الہام کی تھی

مَا يُوْحٰٓى ۝ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ

جو الہام کے قابل تھی یعنی یہ کہ موسیٰ کو صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دے دریا اس کو کنارے پر لا ڈالے

بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ۭ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۥ

گا اور اس کو میرا اور اس کا دشمن لے لے گا میں نے تم پر اپنی محبت ڈال دی

وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ۝ اِذْ تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ط

تاکہ تم میری آنکھ کے سامنے پرورش پاؤ جبکہ تمہاری بہن یہ کہتی جارہی تھی کہ کیا میں تم کو ایسا شخص بتادوں جو اس کی پرورش کرے

فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۵ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ

چنانچہ ہم نے تم کو تمہاری ماں کے پاس لوٹا دیا تاکہ اُس کی آنکھ ٹھنڈی ہو اور غمگین نہ رہے اور تم نے ایک شخص کو مار ڈالا تھا تو ہم نے تم کو

مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۵ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ۵ ثُمَّ جِئْتَ

غم سے بچا لیا اور آزمائش کے لئے تم کو محنت میں ڈالا پھر تم چند سال مدین والوں میں رہے اس کے بعد تقدیر

عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ۝ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ۝ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ

سے تم آ گئے اور میں نے تم کو اپنے لئے خالص کر لیا تم اور تمہارے بھائی میرے معجزات

بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۝ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝

لے کر جاؤ اور میری یاد میں سستی نہ کرو فرعون کے پاس جاؤ واقعی وہ حد سے بڑھ گیا ہے

تفسیر ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ علمبردار ہدایت میں جبروتی قوت اور اصول و دلائل کی روشنی ہونی ضروری ہے۔ حضرت موسیٰ کو دونوں نعمتوں سے سرفراز کرکے بھیجا گیا اور بھیجنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی بھولی ہوئی بھیڑیں راہ راست پر آجائیں اور وہ نسلِ یعقوب جو اپنے آباؤ اجداد کی تعلیم سے غافل ہو کر طاغوتی طاقتوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گئی ہے اس کو نجات مل جائے، لیکن ان دونوں مقاصد کا حصول کس طرح ممکن تھا جب کہ فرعون ایسا جبار و قہار بادشاہ اسرائیلیوں کے سر پر مسلط تھا اور سب کو غلام بنائے ہوئے تھا اور نہ صرف غلام بنائے ہوئے تھا بلکہ ان کی سادہ لوحی اور جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا، ان کے ضمیر اور دماغ کو لوٹ رہا تھا اور جبر و رعایت کی غیر متناہی قوتوں کو استعمال کرکے ان کے دین و ایمان پر ڈاکہ زنی کر رہا تھا۔ لامحالہ سب سے پہلے فرعون کا مقابلہ کرنا، اس کے پروپیگنڈہ کے زہریلے جراثیم کو قتل کرنا، اس کی طاغوتی طاقتوں کو توڑنا، اس کے دینی اور دنیوی استبداد کی بیخ کنی کرنا حضرت موسیٰ کا فرض اولیں ہونا چاہیئے تھا۔ اس لئے انہیں تبلیغی حکم ملا کہ فرعون نے قانونِ الٰہی، قانونِ فطرت اور قانونِ عقل سے سرتابی اختیار کی ہے جاؤ اور اس کو ہدایت کرو۔ فرعون سے مقابلہ کرنے کے لئے حضرت موسیٰ کو خصوصیت کے ساتھ چار چیزوں کی ضرورت تھی: اس لئے شرحِ صدر لازم تھا، طرح طرح کی سختیاں اٹھانی تھیں، روحانی احکام کی تعلیم، اخلاق حمیدہ کی ترغیب اور فرعون کے تجمل و شان کی آنکھوں میں حقارت پیدا کرنی مقصود تھی اور یہ سب کچھ اسی وقت ممکن تھا جب خود موسیٰ کے دل سے ظلماتی پردے اُٹھ جائیں دلائل و براہین کی روشنی سے دماغ منور ہو جائے، تمام شواہدِ فطرت نگر و بصیرت کے سامنے آجائیں۔ چنانچہ آپ نے سب سے پہلے شرحِ صدر کی التجا کی۔ پھر فرعون کے دربار کی شوکت، تختِ شاہی کا جاہ و جلال اور اسٹاف و مصاحبین کا دبدبہ، سب سے حضرت موسیٰ کو دوچار ہونا تھا، قدم قدم پر کانٹے تھے، ہر راستے میں کوہستانی وزن رکھنے والے پتھر پڑے تھے جن کو دور کرنا لازم تھا۔ حضرت موسیٰ مصر سے قبطی کو قتل کرکے گئے تھے۔ اس کی سزا دینے کے لئے فرعون تیار بیٹھا تھا، اندیشہ تھا کہ فرعون کا دسترس ہو جائے گا تو وہ ضرور اپنے جذبہ انتقام کی آگ کو بجھائے گا۔ ان سب مواقع کو دور کرنے کے لئے توفیق ایزدی اور دینی چیزیں تھیں وہ اطمینان لازم تھی۔ موسیٰ کے مقصد کے مطابق کارخانۂ قدرت کو حرکت دینی لابدی تھی۔ اس

کے لئے حضرت موسیٰ نے دعا کی کہ پروردگار میرے کام میں میرے لئے سہولت اور آسانی فرما دے۔ یہاں تک تو بانیٔ اصلاح و توفیق کے لئے دعا تھی، لیکن موسیٰ محسوس دنیا میں پُرجلال بادشاہ سے مقابلہ کرنے کے لئے جانے والے تھے۔ نہ ان کے پاس کوہ شکن لشکر تھا نہ آلات جنگ کے انبار تھے۔ صرف صداقت و حقانیت تھی، جرأت و ہمت تھی، دلائل و شواہد کا ذخیرہ تھا، علوم و معارف کا خزانہ تھا، جرأت و ہمت قائم رکھنے کیلئے کم ازکم ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ زیادہ نہیں تو اپنے خاندان کا ایک ہی فرد تصدیق و حمایت کے لئے تیار ہونا چاہیئے تھا تاکہ دکھ اور مصیبت کے وقت وہ کچھ کام کر سکے۔ اس کے علاوہ حضرت موسیٰ کی زبان میں لکنت بھی تھی۔ فصاحت و سلاست کے ساتھ اپنے مدعا کا اظہار نہیں کر سکتے تھے، اس لئے ایک ترجمان فصیح اللسان کی ضرورت تھی تاکہ اس کے ذریعہ سے ان براہین و دلائل کو ظاہر کیا جا سکے جن کا بحر ذخار حضرت موسیٰ کے دل و دماغ میں جوش مار رہا تھا۔ ان دونوں مقصدوں کے حصول کے لئے حضرت موسیٰ نے استدعا کی کہ پروردگا! میری زبان کی گرہ کھول دے، لکنت دور کر دے تاکہ لوگ میرا کلام سمجھ سکیں اور میرے بھائی ہارون کو میرا مددگار، پشت پناہ اور قوت بازو بنا دے اور (نبوت یا) اس خاص شغل میں اس کو میرا شریک بنا دے۔ بارگاہ مجیب الدعوات سے حکم ہوا موسیٰ تمہاری دعا قبول کر لی گئی۔ ہم اس سے پہلے بھی تم پر احسان کر چکے ہیں جب تم کو شعور بھی نہ تھا۔ ہم نے فرعون کی گرفت سے بچانے کے لئے تمہاری ماں کے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ صندوق میں بند کر کے اس بچہ کو دریا میں پھینک دے۔ ہمارے القاء کے بموجب ماں نے تم کو تابوت میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا۔ بہتے بہتے صندوق کنارے آ لگا۔ فرعون جو میرا اور تمہارا دونوں کا دشمن تھا اس نے صندوق کو پکڑ لیا اور چونکہ ہم نے اپنی محبت تم پر ڈال دی تھی، اس لئے تم کو جو شخص دیکھتا تھا پیار کرتا تھا۔ بالآخر تم کو تمہاری ماں کے پاس پہنچا دیا (پھر جوان ہونے کے بعد) تمہارے ہاتھ سے ایک آدمی مارا گیا تم بھاگ گئے اور چند سال مدین میں رہے۔ مدت مقررہ پوری ہوگئی تو واپس آئے چونکہ تم کو ہم نے اپنے لئے انتخاب کر لیا تھا، اس لئے یہ تمام احسانات تمہارے ساتھ کئے۔ اب دونوں فرعون کو ہدایت کرنے کے لئے جاؤ۔

تحلیل اجزاء

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ۔ کفر و شرک میں مبتلا ہونے والی اور حد اعتدال سے تجاوز کرنے والی اگرچہ پوری قوم ہی تھی، مگر فرعون سب کا سردار اور گمراہ کرنے والا تھا، اس لئے فرعون کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ فرما دیا۔

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ۔ شرح صدر سے مراد ہے دل کی تنگی دور ہو جانا اور ماسوی اللہ کا خوف دل سے زائل ہو جانا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا اس سوال سے موسیٰ کی مراد یہ تھی کہ سوا اللہ کے میں کسی سے خوف نہ کروں۔ قرآن میں دوسری جگہ اس کی تشریح آئی ہے۔ ارشاد ہے قَالَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ۔

عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ۔ حضرت موسیٰ کی زبان میں گرہ پڑ گئی تھی جس کی وجہ سے صاف بول نہ سکتے تھے اور مخاطب کو مطلب سمجھنے میں دشواری ہوتی تھی۔ بعض اہل تفسیر کا قول ہے کہ آپ کی زبان میں پیدائشی لکنت تھی۔ ابن کثیر وغیرہ نے لکھا ہے کہ بچپن کے زمانے میں جب حضرت موسیٰؑ کے سامنے یاقوت سرخ ایک برتن میں اور انگارے دوسرے طشت میں لائے گئے تو آپ نے انگارہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا جس سے زبان جل گئی اور بولنے سے قاصر ہو گئے۔ رہی یہ بات کہ حضرت موسیٰ نے زبان کی فصاحت و سلاست کی درخواست نہ کی بلکہ ایک گرہ کھولنے کی خواہش کی اور دعا کی کہ لوگ میری بات سمجھ جائیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تبلیغ احکام کے لئے قدرت ادا کی ضرورت تھی، اس لئے موسیٰ نے بقدر ضرورت التجا کی۔ انبیاء و صلحاء اتنی ہی نعمت کے طالب ہوتے ہیں جتنی ضرورت ہوتی ہے۔ ابن عباس نے فرمایا حضرت موسیٰ کی زبان سے صرف ایک گرہ کھول دی گئی تھی۔ حسن بصری کا بھی یہی قول ہے۔ (رواہ ابن کثیر)

اَشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ۔ اس سے مراد مفسرین کے نزدیک نبوت و رسالت ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ نے ہارون کے نبی بنائے جانے کی دعا کی۔ ام المومنین حضرت عائشہ نے اس قول کی تصدیق فرمائی تھی۔ مجاہد کے نزدیک امر سے مراد مشورہ ہے۔

اِذْ اَوْحَيْنَآ۔ حضرت موسیٰ کی والدہ کو جو وحی ہوئی تھی، مگر یہ وحی بطریق نبوت نہ تھی بلکہ قلبی القاء یا خواب یا پختہ ارادہ کی شکل میں تھی۔

اَقْذِفِيْهِ۔ حضرت موسیٰ کی یہ حقیقی بہن تھیں اور مریم نام تھا۔ ابن کثیر وغیرہ نے خلاصہ قصہ اس طرح لکھا ہے کہ نجومیوں نے جب فرعون کو بتایا کہ عنقریب

بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو ملک میں فساد کرے گا اور تیری سلطنت اس کے ہاتھوں برباد ہوگی تو اس نے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ جو لڑکا پیدا ہوتا مارا جاتا۔ بمشیت الٰہی حضرت موسیٰ پیدا ہوئے۔ ماں کو اندیشہ ہوا کہ کہیں فرعون قتل نہ کرادے۔ اس لئے بالقاء ربانی ایک خاص ترکیب سے صندوق بنوایا اور اس میں حفاظت و احتیاط کے ساتھ رکھ کر سر بند کر کے دریا میں ڈال دیا۔ دریا کی ایک شاخ شاہی محل کے اندر آتی تھی۔ صندوق بہتا بہتا حرم سرا کے اندر آگیا۔ شاہی ماماؤں نے نکال کر جناب آسیہ کے حضور میں پیش کیا۔ صندوق کھولا گیا۔ خوبصورت بچہ برآمد ہوا۔ آسیہ کے مشورہ سے فرعون نے متبنیٰ کر لیا۔ دودھ پلانے کے لئے دائی کی تلاش شروع ہوئی۔ چونکہ بنی اسرائیل کے بچوں کا قتل عام جاری تھا اس لئے دائی کمیاب تھی بہرحال دودھ پلانے والیاں بلائی گئیں۔ حضرت موسیٰ نے کسی کا دودھ نہ پیا۔ حرم سرا کے اندر حضرت موسیٰ کی بہن موجود تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ آسیہ ان کی خالہ تھیں انہوں نے اپنی والدہ کا پتہ دیا بلکہ آسیہ کے حکم سے خود بلا کر لائیں۔ حضرت موسیٰ نے اپنی والدہ کا دودھ پی لیا۔ تھوڑا زمانہ تک حرم سرا کے اندر رہ کر حضرت موسیٰ کی والدہ دودھ پلاتی رہیں پھر اپنے گھر لے آئیں اور کبھی کبھی آسیہ کے پاس جا کر دکھا بھی دیا کرتی تھیں۔ فرعون بہرحال خوف زدہ تھا۔ آسیہ کی خواہش پر اس نے موسیٰ کی تربیت گوارا تو کر لی تھی، مگر دل سے قتل کا خواہاں تھا۔ ایک روز حضرت موسیٰ کو گود میں لے رہا تھا حضرت موسیٰ نے اس کی ڈاڑھی نوچ لی۔ فرعون کو قتل کا بہانہ مل گیا۔ آسیہ نے سفارش کی اور معصومیت کو عذر قرار دیا۔ فرعون ضد پر قائم رہا اور کہنے لگا اس نے یہ حرکت دانستہ کی ہے یہ لڑکا بہت ہوشیار ہے۔ آسیہ نے کہا اس کو اچھے برے کی تمیز نہیں یہ شاہی وقار و تہذیب کو سمجھ نہیں سکتا۔ اگر آزمائش کرنی ہے تو ایک طشت میں دہکتے انگارے اور دوسرے طشت میں یاقوت سرخ اس کے سامنے لانے کا حکم دیجئے۔ خود دانا اور نادان ہونے کی وضاحت ہو جائے گی۔ فرعون راضی ہو گیا۔ حسب الحکم دو طشت منگائے گئے۔ حضرت موسیٰ نے انگاروں کے طشت میں ہاتھ ڈال کر ایک چنگاری زبان پر رکھ لی جس کی وجہ سے زبان جل کر اس میں گرہ پڑ گئی اور آپ بولنے سے معذور ہو گئے۔ غرض رفتہ رفتہ آپ جوان ہو گئے۔ اس کے بعد ایک اسرائیلی اور ایک قبطی کا راستہ میں جھگڑا کرنا اور حضرت موسیٰ کا قبطی کو سمجھانا اور اس کا نہ ماننا اور حضرت موسیٰ کا اس کے طمانچہ مارنا اور اس کا مر جانا۔ پھر حضرت موسیٰ کا مدین کی طرف بھاگ جانا مشہور قصہ ہے الخ

مقصود بیان

فرعون طاغی تھا یعنی قانون حق، قانون فطرت اور قانون الٰہی کا مخالف تھا۔ سینہ کا کشادہ ہو جانا اور دماغ کا دلائل و براہین کی روشنی سے منور ہو جانا عظیم ترین نعمت ہے جس کی خواہش حضرت موسیٰ نے بھی کی تھی۔ يَفْقَهُوا قَوْلِي کا لفظ صاف دلالت کر رہا ہے کہ اللہ کے خاص بندے اپنے نفس کے لئے کچھ طلب نہیں کرتے بلکہ اسی چیز کی طلب کرتے ہیں جس کی تعلیم حقانیت کے لئے ضرورت ہوتی ہے اور اتنی ہی خواہش رکھتے ہیں جتنی اعلانِ حق کی خواہش ہوتی ہے۔ حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے قوت بازو اور مددگار تھے۔ انبیاء کو بھی مادی دنیا میں رہتے ہوئے ظاہری اسباب کی فراہمی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگرچہ وہ غیبی طاقت کے مالک ہوتے ہیں۔ مگر خارجی اسباب پر بظاہر ان کی بھی نظر ہوتی ہے۔ أَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي کے الفاظ یہ وضاحت ظاہر کر رہے ہیں کہ موسیٰ مستجاب الدعوات تھے اور آپ کی دعا سے حضرت ہارون کو نبوت ملی تھی۔ اس سے ایک بات یہ بھی واضح ہوگئی ہے کہ ایک وقت میں دو نبی ہوتے ہیں، مگر ایک نبی دوسرے کا تابع رہتا ہے۔ كَيْ نُسَبِّحَكَ الخ سے یہ بات منقبض کرنی فرض ہے کہ مخلص مومن کی ہر خواہش اور ہر دعا کا اصل مرکز یاد الٰہی ہونا چاہئے۔ دنیوی ترقی اور کثرتِ مال ہرگز پیش نظر نہ ہونا چاہئے۔ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ ایک طرح کی وحی ان لوگوں کے پاس بھی آسکتی ہے جو انبیاء نہ ہوں جیسے حضرت موسیٰ کی والدہ کے پاس وحی آئی تھی یعنی القائے قلبی ہوا تھا۔ أَلْقَيْتُ عَلَيْكَ الخ میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جس بندہ سے اللہ محبت کرتا ہے اس کی محبت لوگوں کے دلوں میں بھی پیدا کر دیتا ہے اور اللہ کی محبت کسی کے سابقہ اعمال پر موقوف نہیں بلکہ وہ جس میں صلاحیت فطری ملاحظہ فرماتا ہے۔ اس سے محبت کرتا ہے وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي سے یہ بات دکھانی غرض ہے کہ اللہ اپنے محبوب بندوں کی نگہداشت کا خود ذمہ دار ہے۔ وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا میں اس امر کی جانب ایماء ہے کہ اللہ کے خاص بندوں کی طرح طرح سے آزمائش کی جاتی ہے۔ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي سے صاف ظاہر ہے کہ اعلانِ حق، اشاعتِ دین و تبلیغ صداقت کے لئے خدا تعالیٰ نے بعض خاص بندے پیدا کئے ہیں۔ ہر شخص میں ان فرائض کو انجام دینے کی صلاحیت نہیں ہے وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي میں اس بات کی صراحت ہے کہ جلیل القدر نبی اور عظیم الشان رسول بھی یادِ الٰہی سے مستغنی نہیں ہیں۔ حضرت موسیٰ کو پیدائش اور پرورش اور اعطائے

نبوت کا پورا قصہ مندرجہ ذیل تعلیم دیتا ہے:۔
(۱) باطل پرست انسان طاغوتی طاقتوں کا کتنا ہی استعمال کرے اور اپنی باطل پرستی کو برقرار رکھنے کے لئے کوئی تدبیر کرے اگر اللہ کی طاقت سب کو محیط ہے۔ وہ دشمن کے ذریعہ سے دوست کا کام لے لیتا ہے اور دشمن سے دوست کی پرورش کراتا ہے۔ اس کی تدبیر تک کسی انسانی عقل کی رسائی نہیں (۲) نبوت ایک وہبی چیز ہے۔ (۳) اللہ جس کی حفاظت کرنی اور جس پر نوازش کرنی چاہتا ہے اور اسے خاص انعامات سے مالا مال کرنا چاہتا ہے غیب سے اس کے اسباب بھی ویسے ہی پیدا کر دیتا ہے وغیرہ۔

فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ ○ قَالَا رَبَّنَا إِنَّنَا نَخَافُ أَن

اس سے نرم بات کہو شاید وہ مان لے یا ڈر جائے موسیٰ و ہارون نے کہا اے ہمارے رب ہم کو اندیشہ ہے کہ

يَفْرُطَ عَلَيْنَا أَوْ أَن يَطْغَىٰ ○ قَالَ لَا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ ○

وہ ہم پر زیادتی کرنے لگے گا یا شرارت کرے گا اللہ نے فرمایا تم اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سنتا اور دیکھتا ہوں

فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ ۥ وَلَا

تم اس کے پاس جا کر کہو کہ ہم دونوں تیرے رب کے فرستادہ ہیں ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے ان کو

تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ ○

نہ ستا ہم تیرے رب کی طرف سے ایک معجزہ بھی تیرے پاس لائے ہیں اور سلامتی اس کے لئے ہے جو ہدایت پر چلے

إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ○

ہمارے پاس وحی بھیجی گئی ہے کہ عذاب اس پر ہوگا جو جھٹلائے اور روگردانی کرے

تفسیر فرعون بڑا سرکش، مغرور اور شان و شوکت کا بادشاہ تھا معمولی درجہ کے آدمی کو گفتگو کی درشتی اور وعظ و نصیحت کی سختی ضد پر آمادہ کر دیتی ہے۔ پھر فرعون ایسا جابر کو اگر درشت الفاظ میں نصیحت کی جاتی تو خطرہ یہ تھا کہ وعظ کے غیر موثر ہونے کا اندیشہ تھا بلکہ بجائے مفید ہونے کے مضر ہو فرعون غضبناک ہو جاتا اور تبلیغ کا فرض ادا نہ ہوتا۔ اس لئے آیت مذکورہ میں ہدایت فرما دی کہ فرعون کے ساتھ گفتگو نرمی کے ساتھ کرنا تاکہ تمہاری نصیحت کے نتیجہ میں خوف خدا اور تصدیق نہ کرے تو کم از کم تمہاری تصدیق کا خیال ہی اس کو ہو جائے اور یہ خیال اس کے دل میں خوف پیدا کر دے کہ اگر میں اپنا عقیدہ اور بدکرداری و ستم شعاری ترک نہ کروں گا تو انجام بد سے دوچار ہونا پڑے گا۔

نوٹ خدا تعالیٰ نے فرعون سے نرم گفتگو کرنے کی ہدایت موسیٰ اور ہارون کو فرمائی۔ مفسرین نے اس کا دقیق ترین نکتہ یہ لکھا ہے کہ اگر موسیٰ فرعون سے درشتی کے ساتھ کلام کرتے تو خطرہ اس کا تھا کہ فرعون مزید سرکشی اختیار کرنے لگتا حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو بھی اپنی الٰہی طاقت پر غرور ہو جانے کا اندیشہ تھا اور نرم گفتگو کرنے میں خود کا جذبہ کبھی کار فرما نہیں ہو سکتا۔ نفس انسانی کی فرعونیت کو کامل طور پر شکست ہو جاتی ہے۔

حضرت موسیٰ کو فرعون کی ستم شعاری و جباری معلوم ہو چکی تھی باقتضائے بشری عرض کیا پروردگار! ہم کو اندیشہ ہے کہ کہیں وہ ہم کو ہلاک کرنے

میں پیش دستی یا تکلیف دہی میں زیادتی نہ کرے یعنی ایسا نہ ہو کہ وہ ہم کو مار ڈالے یا کم از کم ناقابل برداشت تکلیف دے سکے۔ حضرت موسیٰ نبی مرسل تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ خدا تعالیٰ ظالموں کو ضرور برباد کرتا ہے اور بربادی کا وقت معین ہوتا ہے۔ لیکن بربادی کا مقررہ وقت کب آئے گا؟ یہ سوا خدا کے کسی کو معلوم ہو سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ کو خیال ہوا کہ ممکن ہے کہ فرعون کو ابھی مزید مہلت دی جائے رسی اور ڈھیلی چھوڑ دی جائے۔ ہم دونوں بھائی تبلیغ کریں اور وہ ہم کو گرفتار کر کے ایذا پہنچائے یا ہلاک کر دے اور ہماری ہلاکت کے بعد اس کی ہلاکت کا وقت آئے، اس لئے حضرت موسیٰ نے اندیشہ کا اظہار کیا۔ اندیشہ کے اظہار سے اصل غرض خدا سے امداد کی دعا کرنی تھی۔ اسی بنا پر خدا تعالیٰ نے تسکین دینے کے لئے فرمایا: تم دونوں کچھ اندیشہ نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں یعنی تمہارا حافظ و ناصر ہوں، تمہاری دعا کو سنتا ہوں۔ فرعون جو برتاؤ تمہارے ساتھ کرے گا اس کو خود دیکھتا ہوں کوئی بات مجھ سے مخفی نہیں ہے۔

تنبیہ مخاطَب اور مخاطِب اس وقت صرف حضرت موسیٰ تھے حضرت ہارون موجود نہ تھے۔ مگر چونکہ موسیٰ متبوع اور ہارون تابع تھے، اس لئے نقل کلام میں مخاطب اور مخاطِب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دونوں کو قرار دیا۔

تحلیل اجزاء

لَعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ابن کثیر نے صراحت کی ہے کہ تذکر سے مراد ہے گمراہی اور معاصی سے باز رہنا اور خشیت سے مراد ہے ڈر کر طاعت کرنا۔ گویا گناہوں سے پرہیز اور اطاعت پر استقامت ان دونوں مقاصد کے لئے حضرت موسیٰ کو فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا۔ ہماری رائے میں یَتَذَکَّرُ اور یَخْشٰی کا جو فرق تھا وہ تفسیری مطلب کے ذیل میں ہم لکھ چکے ہیں۔

ایک شبہ خدا تعالیٰ کو معلوم تھا کہ فرعون ایمان نہ لائے گا، پھر حضرت موسیٰ کو تبلیغ کا کیوں حکم دیا اور کیوں نرم گفتگو کرنے کی ہدایت فرمائی؟ اس کے علاوہ خدا تعالیٰ امید و طمع سے پاک ہے پھر یہ کہنا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے کہ تم دونوں جا کر اس سے نرم کلامی کرو شاید وہ نصیحت قبول کرے اور ڈر کر فرماں بردار بن جائے۔

جواب خدا تعالیٰ کو تو ہر شخص کی حالت کا علم پہلے سے ہوتا ہے، مگر وعظ و نصیحت اور ارشاد و ہدایت کا حکم محض اتمام حجت اور دفع عذر کیلئے دیا جاتا ہے۔ انبیاء کو مبعوث فرمانا کتابیں نازل کرنا اور تبلیغ کی مختلف انواع و اصناف کی ہدایت کرنا ان سب کا مقصد ادائے فرض ہوتا ہے۔ اس سے اہل ایمان کے دلوں میں یقین و خوف مستحکم ہو جاتا ہے اور کافروں میں سے جن کے نصیب میں ازلی سعادت ہوتی ہے وہ راہ راست پر آ جاتے ہیں اور جو ازلاً محروم ہوتے ہیں ان کو کوئی ہدایت فائدہ نہیں پہنچاتی۔ رہا لفظ لَعَلَّ کا استعمال اور خدا تعالیٰ کا امید و طمع سے پاک ہونا ان دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم دونوں فرض تبلیغ ادا کرو اور یہ سمجھتے ہوئے ادا کرو کہ فرعون راہ راست پر شاید آ جائے گا۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم فرعون کو ہدایت کرو کیونکہ اللہ کو امید ہے کہ شاید وہ ہدایت قبول کرلے۔ امید کا رجوع خدا کی طرف نہیں بلکہ حضرت موسیٰ و ہارون کی طرف ہے۔

اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى پیش دستی کرنے سے مراد ہے ہلاک کرنا اور طغیان سے مراد ہے ناقابل برداشت تکلیف دینی۔

اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ۔ حضرت موسیٰ کی معرفت فرعون کو جو پیغام پہنچانا تھا یہاں سے اسی پیغام کی تقریر ہے۔ پیغام میں تین امور کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ سب سے پہلے اللہ کا رب ہونا اور فرعون کا حقیر بندہ ہونا ظاہر فرمایا اور حکم دیا کہ تم اس سے جا کر کہو ہم تیرے رب کے پیغامبر ہیں۔ گویا یہ تعلیم دینی مقصود تھی کہ تو رب نہیں بندہ ہے، تیرا رب کوئی اور ہے جس نے ہم کو تیرے پاس بھیجا ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو جو تو نے زبردستی مصر میں روک رکھا ہے (اور ملک شام کو جو ان کا آبائی وطن ہے جانے نہیں دیتا) ایسا نہ کر۔ تیسری بات یہ تھی کہ بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرنے اور ان پر طرح طرح کا ظلم توڑنے کا جو تو نے سسٹم جاری کر دیا ہے اس کو دور کر دے۔ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کی ہدایت اور نجات کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور اتمام حجت کے لئے فرعون کو بھی تبلیغ توحید کرنی لازم تھی۔ اسی لئے سب سے پہلے توحید کی تلقین اور پھر بنی اسرائیل کے لئے نجات کی کوشش کرنے کا حکم ہوا۔ توحید دو طرح کی ہوتی ہے۔ توحید ربوبیت اور توحید الوہیت۔ اول الذکر سے ترقی کر کے آدمی دوسرے درجہ میں پہنچتا ہے۔ جو شخص خدا کو رب العالمین سمجھے گا وہ لا محالہ اس کو معبود بنانے کی بھی تلقین کرے گا۔ فرعون صابی مذہب کا آدمی تھا ستارہ پرستی اس کا دین تھا۔ وہ خدا تعالیٰ کا

قائل نہ تھا۔ شوکت، دولت، سطوت اور جاہ و جلال نے اس کو اس حد تک مغرور کر دیا تھا کہ وہ فرقہ صابیہ کے خصوصی عقائد سے بھی آگے بڑھ گیا تھا اور اپنی ذات کو رب یعنی سب کا پروردگار اور ان داتا کہنے لگا تھا۔ مگر خالق عالم اور الٰہ مطلق ہونے کا دعویٰ اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ اسی بنا پر رَسُوْلَا کی بجائے رَسُوْلَا رَبِّكَ کا لفظ استعمال کرنے کا حکم ہوا۔

بِاٰيَةٍ الخ اوپر کی آیت میں رسول و پیغمبر ہونے کا دعویٰ تھا۔ ہر دعوے کے لئے ثبوت کی ضرورت ہے۔ اس آیت میں گزشتہ دعوے کا ثبوت پیش کرنے کا حکم ہے۔ اٰیة سے کسی خاص آیت کی طرف اشارہ نہیں بلکہ ایات، بینات، معجزات، عقلی دلائل و براہین اور زبانی حجت بالغہ سب کو یہ لفظ شامل ہے۔

وَالسَّلٰمُ الخ۔ آدمی چھوٹا ہو یا بڑا، جاہل ہو یا عالم فطرتاً ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہم اپنے عقائد سے توبہ کر لیں اور اعمال بدل دیں تو ہم کو کیا فائدہ پہنچے گا اور نہ مانیں گے تو کیا نقصان ہوگا۔ ان آیات میں اسی نتیجہ کا بیان ہے کہ جو شخص راہ راست پر چلتا ہے وہ دارین میں عذاب سے محفوظ رہتا ہے اور جو داعی حق کو جھوٹا جانتا اور اس کی تعلیم سے روگردانی کرتا ہے اس کو دنیا و آخرت میں عذاب الٰہی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

مقصود بیان حضرت موسیٰ و حضرت ہارون کو فرعون سے نرم کلامی اختیار کرنے کا حکم اپنے اندر یہ ہدایت رکھتا ہے کہ واعظ کے لئے خوش خلقی اور نرمی کلام لازم ہے۔ لیکن جہاں نرمی کی ضرورت ہو وہاں نرمی اختیار کی جائے۔ جس طرح فرعون سے کلام کرنے میں نرمی کرنے کی ہدایت موسیٰ کو کی گئی عموماً نرم کلامی کی تلقین موسیٰ کو نہیں کی گئی۔ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ وعظ و نصیحت سے واعظ کا مقصود صرف ہدایت و ارشاد ہونا چاہیئے۔ شہرت، عزت، دولت اور حکومت و جاہ کا حصول پیش نظر نہ ہونا چاہیئے۔ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ کے الفاظ صراحۃً دلالت کرتے ہیں کہ سب سے پہلے اللہ کی توحید، ربوبیت کی تعلیم دینی لازم ہے۔ فَاَرْسِلْ مَعَنَا سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ اگرچہ اعلان توحید اور اصلاح خلق کیلئے مبعوث ہوئے تھے مگر بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ سے رہائی دلانا بھی آپ کا مقصود اولین تھا۔ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى الخ سے تعلیم دی گئی ہے کہ نرمی کلام کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ حق کو چھپایا جائے اور خوشامد کی جائے اور ضروری پیغام صداقت بھی نہ پہنچایا جائے۔ کتنا ہی جبار، قہار، باسطوت بادشاہ ہو اس کے سامنے بھی بغیر کسی جھجک اور رعب کے، تہذیب کے ساتھ اصول حقانیت و صداقت کو ظاہر کرنا مبلغ کا لازمی فرض ہے اور تعمیل دنا فرمانی کے اچھے برے نتائج بتا دینا نہایت ضروری ہے وغیرہ۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝

فرعون بولا موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟ موسیٰ نے کہا ہمارا رب جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب بناوٹ عطا کی پھر اس کو طریقہ سکھلایا

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ

فرعون بولا تو اگلے لوگوں کا کیا حال ہے؟ موسیٰ نے کہا ان کا علم میرے رب کے پاس کتاب میں موجود ہے میرا رب غلطی نہیں کرتا۔

وَلَا يَنْسَى ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّ

اور نہ بھولے اسی نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا اور اس میں تمہارے لئے راستے بنائے اور

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝ كُلُوْا وَارْعَوْا

آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے طرح طرح کی سبزیاں پیدا کیں کھاؤ اور اپنے مویشیوں

أَنْعَامَكُمْ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّأُولِي النُّهَىٰ ۝ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ

کو چراؤ　اس میں　اہل عقل کے لئے　نشانہائے قدرت　ہیں　اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تم کو لوٹائیں گے

وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ ۝ وَلَقَدْ أَرَيْنَاهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ ۝

اور اسی سے　دوبارہ　نکالیں گے　ہم نے فرعون کو اپنی تمام نشانیاں دکھائیں پھر بھی اس نے جھٹلایا اور انکار کیا۔

تفسیر حضرت موسیٰ نے دربارِ فرعون میں پہنچ کر نہایت بلند آہنگی سے فرعون کی ربوبیت کا انکار اور اللہ کی الوہیت کا اعلان کیا۔ یہ ندائے حق اور آوازِ صداقت فرعون کے لئے تمام عمر میں پہلی آواز تھی۔ اس کا اپنی شوکت، سطوت اور طلسمات پر زور تھا، لیکن پُرجلال غیبی آواز سن کر اس کی تمام فرعونیت مقہور ہوگئی اور بجائے عتاب و قہر کے چند ضروری سوال کرنے لگا۔ پہلا سوال یہ کیا کہ تمہارا رب کون ہے؟ فرعون محسوس نے اور کسی غیبی طاقت کا قائل نہ تھا اس کی نظر کوتاہ تھی، اس لئے بطورِ تعجب کے یہ سوال کیا۔ حضرت موسیٰ نے نہایت مختصر مگر جامع جواب دے دیا ایسے الفاظ فرمائے جو اپنے اندر دلائل و براہین کا لامحدود خزانہ پوشیدہ رکھتے ہیں۔ تمام عالم مادی کی تخلیق دو قسم کے اجزاء سے ہوئی ہے ظاہر اور باطن، صورت اور سیرت، ہیئت اور قوت۔ ہر چیز کی ایک ظاہری شکل ہے اور ایک اندرونی طاقت۔ عالمِ جماد سے لے کر انسانی دنیا تک سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ خدا تعالیٰ نے جمادات میں سے ہر ایک کو اس کے مناسب ظاہری ساخت عطا فرمائی اور فطری طور پر اس کے اندر وہی قوت پیدا کی جو ظاہری ساخت کے مناسب تھی بشلاً چونے کی ساخت کھوکھلی بنائی تاکہ آسانی کے ساتھ حل ہو جائے۔ چونکہ اس کی ساخت کھوکھلی تھی، اس لئے اس کے اندر جو قوت محافظِ اجزاء ودیعت رکھی وہ بھی کمزور رکھی۔ چونے کے اجزاء کو منتشر اور پراگندہ ہونے سے بچانے والی قوت اتنی کمزور ہے کہ پانی کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتی۔ ذرا پانی پڑا اور چونے کے اجزاء پراگندہ ہو کر پانی میں حل ہو گئے، لیکن پتھر کو صحت اور اس کی ساخت کو ٹھوس بنایا اور چونکہ اس کے اجزاء ٹھوس بنائے اس لئے اس کے اندر قوت بھی الیسی عطا کی کہ جو نہایت قوی ہے۔ ہر مقابلے کے لئے ہر وقت تیار ہے۔ پتھر کے اجزاء کو پراگندہ کرنا آسان کام نہیں بڑے بڑے کیمیاوی آلات اور کیمیکل ترکیبوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح نباتات کی حالت ہے۔ ہر درخت کو اس کے مناسب شکل اور ظاہر شکل کے مناسب اندرونی قوت مرحمت فرمائی۔ نباتات سے اوپر حیوانی دنیا کا بھی یہی حال ہے۔ مختلف جانوروں کی شکل، ہیئت، رنگ، اعضاء کی ساخت اور اندرونی قوتوں کا تفاوت اپنے اندر ایک خاص تناسب رکھتا ہے۔ نباتات میں صرف نمو کی ضرورت تھی، اس لئے غازیہ اور نامیہ قوتیں اور ان کی خادمات عطا کیں۔ حیوانات میں حس و شعور کی بھی ضرورت تھی، اس لئے ظاہری اور باطنی حواس بھی عطا کئے تاکہ مرغوب و مکروہ، دشمن و دوست اور اچھے بُرے میں تمیز کر سکیں۔ سردی گرمی اور سختی نرمی کی کیفیات کو پا سکیں۔ عالمِ حیوان کے بعد انسان کی باری آئی تو اس کی آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پاؤں، چہرہ مہرہ سب مناسب پیدا کیا۔ اندرونی اعضاءِ رئیسہ وغیرہ سب کی ساخت ضروریاتِ حفظ و بقا کے موافق عطا فرمائی۔ اندرونی حافظہ اور قاطعہ قوتیں مناسب حال مرحمت کیں۔ دماغ کو ایسا بنایا جو مرکزِ القواء، مہبطِ وحی اور موردِ الہام ہو سکے، مادی ارواح کو علوی قوتوں کا حامل قرار دیا اور بعض جوہر قوت کو مرکبِ روحِ مجرد بنایا۔ اگر دنیا کے کل موجودات اور اس کی تخلیق کی تفصیل کی جائے تو بجائے خود ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔ اس لئے ہم ترک کرتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے جو جواب دیا وہ گو نا گوں دلائل کو حاوی تھا، فرمایا میرا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب ساخت، شکل، ہیئت، خصوصیات عوارض وغیرہ عطا کئے اور جسمانی ساخت کے بعد اس کو اندرونی اور بیرونی، مادی اور غیر مادی قوتیں عطا فرمائیں جو فطرۃً یا ارادۃً اچھائی برائی، نیکی بدی اور صحت و غلطی میں امتیاز کرتی ہیں۔ انسان کو حق و باطل اور خیر و شر میں فرق کرنے کا راستہ بتاتی ہیں۔ بدن کو پرورش کرنے اس کو باقی رکھنے اور سلسلۂ نسل جاری کرنے کے لئے جن ذرائع اور آلات کی ضرورت تھی ان سب کو اندرونی اور بیرونی قوتیں فراہم کرتی ہیں اور اس طرح بقائے نوع کی خدمت انجام دیتی ہیں۔ ثُمَّ هَدٰى کا لفظ اس تمام مضمون

کو حاوی ہے۔

الغرض اللہ وہی ہے جو خلاقِ کل، صاحبِ ارادہ اور ہر چیز کا قادر ہے۔ وہ حکیم علیم اور استادِ مطلق ہے۔ ہر شئی کو اسی نے بنایا اور مناسب طور پر بنایا۔ ہر شئی کو طبعی ضروریات اور فطری لوازم پورا کرنے کی قوت اسی نے عطا کی اور مناسب طور پر عطا کی۔

فرعون یہ جواب سُن کر مبہوت ہو گیا۔ ایسا بلیغ کلام اس نے کبھی نہیں سنا تھا، اس لئے غیر محسوس طور پر قوت کا وہ عناد کبھی انکار نہ سکا۔ البتہ طرز سخن بدل کر دوسرا سوال کیا بولا اچھا بتاؤ گزشتہ اقوام کا کیا حال ہوگا؟ یعنی جب الوہیت و ربوبیت کا مرکز ایک ہی غیبی ہستی ہے اور نجات و سعادت کے لئے توحید ضروری ہے تو گزشتہ قومیں جو شرک و بت پرستی میں غرق تھیں ان کی کیا حالت ہوگی۔ کیا وہ سب کے سب بے وقوف اور جاہل تھے۔ کیا کل کے کل گمراہ اور بے دین تھے۔ فرعون کا مطلب ایک یہ بھی تھا کہ کروڑ در کروڑ افراد و اشخاص جواب تک گزر چکے ان کے عقائد و اعمال کا احاطہ کیوں کر ممکن ہے۔ سزا و جزا اور عذاب و ثواب تو اسی وقت ممکن ہے جب عقائد و اعمال کا علم اور احاطہ ممکن ہو۔ کروڑوں انسانوں کے لامحدود حرکات و سکنات کا احاطہ ناممکن ہے۔ پھر کس طرح ان کو سزا جزا دی جا سکتی ہے اور کیونکر تم تکذیب کرنے والے کو مستحق عذاب اور ہدایت قبول کرنے والے کو مستوجب سلامتی و نجات کہتے ہو۔

چونکہ اس سوال کا مطلب دو طرح سے ہو سکتا تھا، اس لئے حضرت موسیٰ نے ایسا جواب دیا کہ سوال کی دونوں شقیں زائل ہو گئیں۔ فرمایا گزشتہ اقوام کا علم خدا ہی کو ہے۔ اسی نے لوحِ محفوظ میں سب کچھ مندرج کر رکھا ہے۔ اُس کے علم میں غلطی اور نسیان ناممکن ہے۔ یعنی اقوام کو نہ تو گمراہ، بے دین اور بے وقوف کہا جا سکتا ہے نہ عقلمند، نجات یافتہ اور دین دار۔ کیونکہ ان کا تفصیلی علم اللہ ہی کو ہے۔ ہمارے سامنے ان کے احوال نہیں نہ فہرست اسماء ہے، ہم ان کے متعلق کوئی رائے زنی نہیں کر سکتے۔ رہی ان کی کثرت اور غیر محدود تعداد تو اللہ ہی کے علم و احاطہ سے وہ خارج نہیں، ان کی کوئی حرکت خدا سے غائب نہیں۔ ان کے تمام افعال، اعمال اور اقوال لوحِ محفوظ میں درج ہیں، ان سب کے اعمال نامے اللہ کے پاس موجود ہیں، وہ ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق سزا جزا دے سکتا ہے۔ غلطی کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو اللہ کو ان کا صحیح علم نہ ہو، غلط اندراج ہو یا مندرجہ اعمال کو سمجھنے میں غلطی ہو جائے۔ سو اللہ ہر غلط فہمی اور غلط اندراج سے پاک ہے۔ یا غلطی کی یہ صورت ممکن ہے کہ خدا بھول جائے، اس کو نسیان ہو جائے تو یہ بھی محال ہے۔ خدا بھول چوک سے منزہ ہے۔ جب غلط فہمی، غلط اندراج اور نسیان کوئی بھی ذاتِ الٰہی میں ممکن نہیں اور اس کا علم سب کو محیط ہے تو پھر سزا جزا کچھ دشوار نہیں۔

جواب کی تکمیل یہاں تک ہو گئی، مگر اللہ کا علم سب کو محیط ہے۔ وہ جزئیات کو فرداً فرداً جانتا ہے۔ یہ ایک دعویٰ تھا اس کا ثبوت نہیں پیش کیا گیا تھا، اس لئے حضرت موسیٰ نے اس کے بعد وہ واضح اور کھلے ہوئے دلائل بیان کئے جن سے خدا کے علمی احاطہ کا ثبوت ہو جائے فرمایا دیکھو اللہ نے سب مخلوق کے لئے زمین کو پرورش گاہ بنایا۔ شروع میں زمین کی یہ شکل نہ تھی نہ وہ قابلِ سکونت تھی۔ اللہ نے اس کو سکونت کے قابل بنایا؛ ہر طرف اس میں راستے بنائے، جاندار چیزوں کے لئے آسمان سے پانی برسا کر روزی پیدا کرنے کا سامان کیا تو جس خدا نے ہر شخص کے آرام کے لئے زمین کو گہوارہ بنایا۔ اپنی غیبی طاقت سے عناصر میں تغیر و تبدل اور انقلاب کر کے پانی برسایا۔ ہر شخص کے لئے اس کے مناسبِ حال روزی فراہم کرنے کا سامان عطا کیا وہ خدا لوگوں کے اعمال سے ناواقف ہے؟ تخلیق سے پہلے تو اس نے پیش آنے والے احوال کی ضروریات کے مطابق اسباب کی تخلیق کی پھر پیدائش کے بعد کیا وہ احوالِ خلق سے ناواقف ہو سکتا ہے۔ اہلِ دانش کے لئے اگر وہ غور کریں تو تخلیقِ الٰہی کے اندر بے انتہا نشانہائے عبرت موجود ہیں، جن سے اللہ کے عالمِ کل ہونے کا ثبوت نمایاں ہوتا ہے۔ رہی سزا جزا پر قدرت تو یہ بالکل نمایاں اور غیر مبہم حقیقت ہے کہ اللہ نے سب کو مٹی سے پیدا کیا۔ یعنی تالیف اشتر مٹی ہے اور مرنے کے بعد ہر شخص مٹی میں مل جاتا ہے خواہ اس کے ذرات ہوا میں اُڑا دیئے جائیں یا آگ سے جلا دیئے جائیں یا سمندر میں غرق کر دیئے جائیں یا زمین میں دفن کر دیئے جائیں۔ بہرحال آخر کار سب مٹی میں مل جاتے ہیں تو پھر کیا وہ بار دگر مٹی سے برآمد ہونا ناممکن ہے۔ جس خدا نے اول تخلیق و ایجاد کی جب کہ مادہ بھی موجود نہ تھا تو کیا موجودہ مادہ کو جمع کر کے دوبارہ اختراع و اظہار کرنے سے وہ قاصر ہے۔ غرض فرعون کے سامنے موسیٰؑ نے ہر مناسب دلیل بیان کی، طرح طرح

سے سمجھایا، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ دلائل نے اس کو مبہوت و مقہور و مزدود کر دیا مگر خبث نفس نے جہالت پر آمادہ کیا۔ قبول حق اور اقرار صداقت سے اس نے گریز کیا۔ ہر دلیل کی جاہلانہ تکذیب کرتا (جاہلانہ تکذیب کی تفصیل آئندہ آیت میں آتی ہے)

تحلیل اجزاء خَلْقَهٗ خلق سے مراد ہے ظاہری شکل و ہیئت، بیرونی اور اندرونی ساخت، اعضاء کا تناسب اور صلاحیت و ڈال۔ علی بن طلحہ نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے ہر چیز کا جوڑا بنایا۔ ضحاک نے ابن عباس کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ اللہ نے انسان کو انسان، گدھے کو گدھا اور بکری کو بکری کو بنایا۔ سعید بن جبیر کا قول ہے کہ اللہ نے ہر جانور کی اس کے مناسب تخلیق کی۔ انسان کی تخلیق میں جانور کی تخلیق کا میل نہیں اور نہ جانوروں میں باہمی تخلیق کا اشتراک ہے۔ مجاہد نے فرمایا اللہ نے ہر چیز کو اس کی صورت اور طاقت عطا فرمائی۔ اسی قول کے مطابق ہم نے آیت کا مطلب بیان کیا ہے۔

ثُمَّ هَدٰى۔ یعنی خلقت ہر چیز کو ایک خاص تمیز اور شناخت کا طریقہ بتا دیا، راحت و آرام حاصل کرنے کی تدبیر سکھا دی۔ باقی اپنے اپنے کمال حاصل کرنے کے راستے دکھا دیئے۔ یہ تمیز و شناخت کبھی تو بمقتضائے فطرت ہوتی ہے۔ مثلاً سردی دور کرنے کے لئے آگ کی طبعی خواہش ہوتی ہے، پیاس بجھانے کے لئے پانی کی طرف فطری میلان ہوتا ہے۔ کبھی مذکورہ شناخت باختیار عقلی ہوتی ہے۔ معنوی کمال، زندگی گزارنے اور سعادت ابدی حاصل کرنے کے طریقے عقل انسانی بتاتی ہے۔ اول الذکر دونوں طریقے جانوروں کو بھی معلوم ہیں، لیکن مؤخر الذکر راہ معرفت صرف انسان کے لئے مخصوص ہے۔

فِيْ كِتٰبٍ۔ کتاب سے مراد لوح محفوظ یا نامہائے اعمال ہیں۔

لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى۔ نقصان علم کی صرف ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ معلوم چیز ذہنی آئینہ سے غائب ہو جائے نہ وہ خود سامنے ہو نہ اس کا تصور۔ اس علمی غیر حاضری کے دو سبب ہوتے ہیں یا تو اس چیز کا علم ہی نہ ہو سکے یا وہ شئی اور اس کا تصور دائرۂ علمی سے خارج ہو یا جاننے کے بعد جاننے والا بھول جائے اور اس طرح علم میں نقصان پیدا ہو جائے۔ خدا تعالیٰ ہر نقصان و عیب سے پاک ہے۔ اس کے علم میں کوئی تغیر نہیں وہ ہر حال میں یکساں ہے، علام الغیوب ہے، محیط کل اور خبیر مطلق ہے۔ ہر امت اور ہر امت کا ہر فرد اور ہر فرد کا ظاہر و پوشیدہ حال اس کے سامنے ہے۔ اس کلام میں فرعون پر بھی ایک خاص تعریض و تشنیع ہے جو ربوبیت کا مدعی بن بیٹھا تھا۔ حالانکہ اس کو اتنا علم بھی نہ تھا کہ جس موسیٰ کو میں گود میں پال رہا ہوں وہ رب العالمین کا رسول بن کر میرے سامنے آئے گا

وَسَلَكَ لَكُمْ۔ یعنی اللہ کی ہدایت کے بموجب تمام انسان پہاڑوں، دریاؤں اور میدانوں میں راستے بنا کر زمین کے مختلف حصوں میں جاتے سامان تجارت ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے اور فائدہ اندوز ہوتے ہیں۔ زمین ایک ہے، لیکن مختلف قطعات کی پیداوار، خاصیت اور آب و ہوا میں اختلاف ہے یہ تمام کارسازی اللہ کی ہے جو اس کے احاطہ علمی پر دلالت کرتی ہے

اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ۔ ازواج کے معنی یا تو اقسام کے ہیں یعنی خدا تعالیٰ نے قسم قسم کی سبزیاں پیدا کیں اور ہر ایک کی شکل، رنگ، بو، مزہ اور منافع جدا جدا بنائے۔ یا اَزْوَاجٌ کا ترجمہ جوڑا جوڑا ہے۔ فلسفہ طبعیات کے ماہرین جانتے ہیں کہ دنیا میں ہر درخت، ہر سبزی اور ہر پتہ اپنا جوڑا رکھتا ہے۔ جس طرح حیوانات نتیجہ خیزی میں جوڑے کے محتاج ہیں اسی طرح نباتات کو بھی بار آوری کے لئے جوڑے کی ضرورت ہے۔ موجودہ سائنس نے جو فلسفہ تلقیح مفصل طور پر بیان کیا ہے وہ نص قرآنی کا شاہد ہے۔ نر و مادہ کے اختلاط کے بغیر نباتات بھی بار آور نہیں ہو سکتے

تنبیہ ابن عطیہ نے صراحت کی ہے کہ حضرت موسیٰ کا کلام اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً پر ختم ہو گیا۔ یہاں سے باری تعالیٰ کا کلام ہے۔ شیخ جلال محلی نے اسی قول کو پسند کیا ہے، لیکن بیضاوی نے صراحت کی ہے کہ یہ کلام بھی حضرت موسیٰ کے کلام کا تتمہ ہے حضرت موسیٰ نے فرعون کے سامنے دلائل قدرت بیان کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ اللہ نے طرح طرح کی سبزیاں پیدا کیں تاکہ انسان اور جانور اس سے فائدہ اندوز ہو سکیں۔ خدا تعالیٰ نے کلام موسیٰ کی حکایت کرتے ہوئے غائب کی ضمیر سے متکلم کے صیغہ کی طرف انتقال فرمایا جس کی علامت ...

مربہیت واقف ہیں۔

اٰیٰتِنَا كُلَّهَا کل آیات سے مراد وہ آیات ہیں جن کا دکھانا فرعون کے لئے ضروری تھا۔ تمام جہان کی کل آیات کا فرعون کے سامنے اظہار تو ناممکن تھا نہ وہ تمام نشانہائے قدرت کو دیکھ سکتا تھا، اس لئے بقرینۂ عقل وہ نشانیاں مراد ہیں جو فرعون کی ہدایت کے لئے پیش کی گئی تھیں۔ یعنی وہ نو آیات جن کا تذکرہ قرآن میں آیا ہے اور بائیبل میں بھی ان میں سے اکثر کی صراحت ہے۔

مقصودِ بیان اللہ ہی خلاق قویٰ واجسام ہے، اسی نے بدن، عوارض بدن، کیفیات بدن اور اشکال بدن کو پیدا کیا پھر کھانے پینے، لباس بنانے اور پہننے کے قواعد سکھائے۔ تعالے شخص وانوع کے طریقے بتائے۔ وہی قادر مطلق ہے۔ عالم کی کل نعمتیں اسی کے دست کرم کا فیض ہیں۔ اللہ عالم کل ہے۔ اس کا علم تمام کلیات جزئیات کو محیط ہے۔ ذہول ونسیان اور غوایت وضلالت سے پاک ہے۔ یعنی اس کا علم حضوری ہے حصولی نہیں۔ کیونکہ ضلال ونسیان علم حصولی کے لوازم وعوارض سے ہے۔ فِي كِتَابٍ کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ اہلِ عالم کے کل احوال اللہ کے علم ازلی میں قبل از تخلیق موجود تھے اور بعد موت بھی موجود رہتے ہیں۔ اللہ کے علم ازلی ہی کا نام لوح محفوظ یا کتاب ہے۔ وہاں دنیا کے کل واقعات، ہر شخص کے تمام حرکات وسکنات اور اقوال وافعال ثبت ہیں جن کی خلاف ورزی ناممکن ہے۔ اَزْوَاجًا کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ ہر سبزہ، ہر درخت اور ہر پودہ زوجیت سے خالی نہیں۔ ہر گھاس کا جوڑا ہے۔ انسان کی پیدائش زمین سے ہوئی ہے وہی اس کا محل زندگی ہے۔ وہی اس کی تربیت گاہ ہے۔ وہی اس کا معاد ہے۔ ہر شخص مرنے کے بعد کسی نہ کسی طور پر زمین میں مل جاتا ہے خواہ اس کو دفن نہ کیا جائے۔ اس کی لاش سمندر میں غرق کر دی جائے یا جانوروں کی خوراک بنا دی جائے یا جلا کر ذرات چاہیں اڑا دیے جائیں، مگر انجام کار زمین میں شامل ہو کر مٹی کے ساتھ مٹی ہو جانا لازم ہے اور یہیں سے اس کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا۔ مجموعۂ آیات کا خلاصہ بیان ہے اللہ کی خلاقی، ربوبیت اور عالم کل ہونے کو ثابت کر کے اس کی الوہیت ویکتائی پر استدلال کرنا، قدرت عامہ اور ہمہ گیری کو ظاہر کر کے حیات ثانیہ اور سزا جزا کے عقیدہ کی صداقت ظاہر کرنا۔

منتظراً اس طرف بھی اشارہ ہے کہ فطری سرکش اور ازلی اشقیا کبھی ہدایت اندوز نہیں ہوتے۔ لامحدود دلائل قدرت اور براہین وحدانیت دیکھتے ہیں، آیات فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں، معجزات انبیاء کا مشاہدہ کرتے ہیں، لیکن سرتابی اور سرکشی کرتے ہیں جس طرح فرعون نے کیا حضرت موسیٰ کے دست حق پرست سے بکثرت معجزات دیکھے، سرکشی کے نتائج مدتوں سامنے آئے، مگر اس کی آنکھوں میں روشنی پیدا نہ ہوئی۔ بحر جہالت میں ڈوبا رہا۔

قَالَ أَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ أَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يَا مُوسَىٰ ۝ فَلَنَأْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ

کہنے لگا موسیٰ کیا تم اپنے جادو سے ہم کو ہمارے ملک سے نکالنے آئے ہو سو اب ہم بھی اس کی مثل جادو لائیں گے

مِّثْلِهِ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهُ نَحْنُ وَلَا أَنتَ مَكَانًا

ہمارے اور اپنے درمیان ایک میعاد صاف میدان میں مقرر کردو جس کے خلاف نہ ہم کریں نہ

سُوًى ۝ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّينَةِ وَأَن يُحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ۝

تم موسیٰ نے کہا تمہارے وعدہ کا وقت روز عید ہے اس روز سب لوگوں کو دن چڑھے جمع کیا جائے گا

فَتَوَلَّىٰ فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهُ ثُمَّ أَتَىٰ ۝ قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ وَيْلَكُمْ لَا

اس کے بعد فرعون لوٹ گیا اور اپنے (سامان) مکر کو جمع کر کے آیا موسیٰ نے ان (جادوگروں) سے کہا غضب ہے تم پر

تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ۝

اللہ پر دروغ بندی نہ کرو ورنہ عذاب سے تم کو ملیامیٹ کردے گا اور جس نے افترا کیا وہ ناکام رہا

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ۝ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ

پھر جادوگر آپس میں اپنی رائے میں اختلاف کرنے لگے اور چپکے چپکے مشورہ کیا بولے واقعی یہ دونوں جادوگر ہیں

يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ

تم کو تمہارے ملک سے اپنے جادو سے نکال دینا چاہتے ہیں اور تمہارے عمدہ مذہب کو معدوم کردینا

الْمُثْلٰى ۝ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى

چاہتے ہیں لہٰذا تم سب ایک تدبیر پہ اتفاق کرلو پھر صف باندھ کر آؤ آج جو غالب آجائے گا وہی کامیاب ہوگا

تفسیر طاغوتی قوتیں جب حق کی صداقت سے برسرِ پیکار رہتی ہیں تو چار طریقے اختیار کرتی ہیں۔ سب سے پہلے اپنی قوت و جبروت اور شکوہ و جلال سے ڈراتی ہیں، قید و بند اور عذاب و ہلاکت سے خوف دلاتی ہیں، اپنی سطوت و گرفت سے مرعوب کرتی ہیں۔ جب یہ حربہ کارگر نہیں ہوتا اور حامل صداقت بغیر کسی خوف کے بے باکانہ ببانگ دہل صداقت کا اعلان کرتا ہے تو دوسرے درجہ میں ذریات شیاطین بھی دلائل و براہین کی طرف رجوع کرتی ہیں۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے اور سننے والوں کے کانوں پر تلبیس و مکر کا پردہ ڈالنے کے لئے دلائل کی روشنی میں مناظرہ کرنا چاہتی ہیں، لیکن چونکہ ان کے دماغ کوتاہ فہم اور عقلیں کور بصیرت ہوتی ہیں، اس لئے وہ وہمیات کو عقلیات اور سفسطہ کو فلسفہ مانتی ہیں۔ حقائق و واقعات کو جدلیات و خطابیات سے بدل دینا چاہتی ہیں۔ اپنی شکست کو چھپانے کے لئے وہ پُرفریب الفاظ سے حاضرین و سامعین کو اپنے مکر کے جال میں پھنسانا چاہتی ہیں، لیکن جب حق کی طاقت ان کے فریب کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیتی ہے، ان کے ہوائی قلعے ڈھا دیتی ہے، عقل کی روشنی میں دلائل کی حقانیت سے حق و باطل اور صحیح و غلط کو جدا جدا کر دیتی ہے اور کوئی فریب نہیں چلتا تو پرستارانِ نفس، حاملینِ صداقت کو طرح طرح متہم کرتے ہیں، اعلانِ حق کو دنیوی فوائد کے حصول پر محمول کرتے ہیں اور ان کے صدق کو ناپاک اغراض سے آلودہ کرنا چاہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں یہ شخص انقلاب پیدا کر کے حکومت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چندہ کر کے مال جمع کرنا اس کا مقصد ہے۔ ہردلعزیزی حاصل کر کے شہرت عامہ کا حصول اس کے پیشِ نظر ہے۔ یہ جادوگر ہے، دھوکہ باز ہے، اگر ایسا نہیں ہے تو کیوں ہمارے مقابلے سے گریز کرتا ہے، لیکن جب ارباب حق مادی مقابلے کے لئے بھی تیار ہو جاتے ہیں اور حق و باطل کا فرق کھل جاتا ہے اور وہ لوگ جن کی فطرت میں خدا تعالیٰ نے سعادت کا نور اور اقرار صداقت کی روشنی ودیعت رکھی ہے، سچائی کو دیکھ کر حقانیت کے معترف ہو جاتے ہیں اور اصحاب حق کا جتھا بڑھنے لگتا ہے تو طاغوتی قدموں میں لرزہ پڑ جاتا ہے، بنیادیں ہلنے لگتی ہیں اور انجام کار اہلِ حق کو ڈرانے اور مغلوب کرنے کے لئے ان کو سخت تکلیفوں کو طرح طرح کی جسمانی سزائیں دی جاتی ہیں۔ قتل و غارت کیا جاتا ہے، جائیداد برباد، مکان تباہ اور عمارتیں مسمار کی جاتی ہیں۔ بہتوں کو نذرِ شمشیر کیا جاتا ہے۔ اس وقت غیرت حق جوش میں آتی ہے اور قہاری قوت برسرِ عمل آ کر اہلِ باطل کے تمام شکوہ و جلال کو غارت کر دیتی ہے۔ ان کے سربفلک محل برباد کر دیئے جاتے ہیں، اموال و املاک خاک میں ملا دیئے جاتے ہیں، طاغوتی جنود کو ہلاکت سے دوچار رہنا پڑتا ہے اور بالآخر سردارِ کفر کا ناپاک وجود صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ فرعون کی بھی یہی حالت ہوئی۔ شروع میں اس نے حضرت موسیٰ کو ڈرایا دھمکایا پھر جاہلانہ انداز میں دو سوال کئے۔

جب حضرت موسیٰ مرعوب نہ ہوئے اور آپ کی دلائل قاہرہ نے فرعون کو متحیر و مبہوت کر دیا اور کوئی جواب نہ بن پڑا تو لگا موسیٰ پر تہمت لگانے۔ بولا موسیٰ تو جادوگر ہے۔ جادو کے زور سے ہمارا ملک چھیننا چاہتا ہے۔ اب ہم بھی تیرے جادو کا مقابلہ جادو سے کریں گے۔ کوئی دن مقرر کر لے، کسی ہموار میدان میں ہمارا تیرا مقابلہ ہوگا۔ حضرت موسیٰ جبروتی طاقت کے حامل تھے وہ جادو سے مرعوب ہونے والے کب تھے۔ آپ نے علی الاعلان مقابلے کا دن مقرر فرما دیا۔ ہندوستان کے ہندوؤں کی طرح اہل مصر کا بھی ایک سالانہ میلہ ہوتا تھا۔ آپ نے فرمایا میلہ کا دن مقرر کرو سب لوگ دوپہر تک جمع ہو جائیں اور علی رؤس الاشہاد حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے۔ فرعون نے تسلیم کر لیا۔ حدود مملکت میں حکم عام نافذ ہو گیا کہ بڑے بڑے ماہر جادوگروں کو جمع کر کے اسکندریہ بھیج دو۔ حضرت موسیٰ نے بطور اتمام حجت پھر سمجھایا کہ دیکھو اس بہتان تراشی اور فتنہ انگیزی سے باز آجاؤ ورنہ تمہارا ستیاناس ہو جائے گا، لیکن کون سنتا تھا اور کون مانتا تھا۔ غرض بڑے بڑے ماہر جادوگر جمع ہو گئے۔ چونکہ اس وقت تک حقیقت نبوت سے ناواقف تھے، اس لئے بعض لوگ موسیٰ کو جادوگر کہتے تھے اور بعض لوگ مقدس صورت دیکھ کر آپ کے جادوگر ہونے سے انکار کرتے تھے۔ بالآخر سب جادوگر مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔

تحلیلِ اجزاء

لِتُخْرِجَنَا مِنْ أَرْضِنَا۔ بیضاوی نے کہا فرعون کا یہ قول محض حیلہ سازی پر مبنی تھا۔ اس سے اس کی حیرانی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کو پہلے سے معلوم ہو چکا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں میری سلطنت برباد ہوگی جس کے متعلق اہلِ نجوم نے مجھے پہلے اطلاع دے دی ہے۔ اتنا تو فرعون بھی جانتا تھا کہ جادو کے زور سے سلطنت نہیں چھینی جا سکتی۔ کسی قوم کو اس کے ملک سے نکالا جا سکتا ہے، لیکن اور کہتا بھی کیا مجبوراً جادوگر ہی کہا۔ کیونکہ رسول کی طاقت سے وہ ناواقف تھا۔ جادوگروں کو ہی غیبی طاقت کا حامل جانتا تھا۔

مَكَانًا سُوًى یعنی ہموار مکان جس میں شور و غل نہ ہو اور کسی سے کوئی واقعہ مخفی نہ رہے (عبد الرحمٰن بن زید) ابن عباس، مجاہد، قتادہ اور سدی وغیرہ نے سُوًى کا ترجمہ عدل و انصاف سے کیا ہے یعنی ایسا مقام جہاں دونوں فریقوں کا انصاف ہو۔

مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّينَةِ۔ یہ حضرت موسیٰ کا قول ہے۔ ابن کثیر، امام رازی، بیضاوی اور اکثر مفسرین نے یہی قول اختیار کیا ہے۔ حضرت موسیٰ نے بحکم الٰہی ایسا دن مقرر کیا جس میں عوام و خواص سب کا اجتماع ہو جائے۔ یَوْمُ الزِّينَةِ سے کون سا دن مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ مجاہد و قتادہ نے نوروز شمسی، ابن عباس اور سعید بن جبیر نے یوم عاشوراء، سدی اور ابن زید نے روز عید مراد لیا ہے۔ ایک اور روایت میں سعید بن جبیر کا قول ہے کہ میلہ کا دن مراد ہے۔ میرے نزدیک ان اقوال میں کوئی منافات نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عاشوراء کے دن اہلِ مصر کی عید ہوتی ہو، میلہ لگتا ہو، وہی دن نوروز کا ہو۔

ثُمَّ أَتَىٰ۔ ابن کثیر نے صراحت کی ہے کہ جشن کے دن سب لوگ جمع ہو گئے۔ فرعون نے تخت سلطنت پر جلوس کیا۔ وزراء، امراء اور ارکانِ دولت اپنی کرسیوں پر بیٹھے۔ دائیں بائیں عام رعایا صف بستہ ہو گئی۔ ساحروں کی جماعت فرعون کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ دوسری طرف حضرت موسیٰ اپنے بھائی کے ساتھ کھڑے تھے۔ فرعون نے جادوگروں سے کہا اپنا اپنا کرتب کامل طور پر دکھانا، کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا، میں تم کو اپنا مقرب بنالوں گا، انعام سے مالا مال کر دوں گا۔ چونکہ یہ مجمع رسول برحق کے مقابلے میں صرف عناد کے تحت کیا گیا تھا اور رسول کا کام اتمام حجت اور نصیحتِ خلق ہے، اس لئے حضرت موسیٰ نے پھر نصیحت کی کہ لوگو! اللہ پر افتراء بندی نہ کرو، شرک و کفر یا تہمت اللہ کی طرف چلانے والوں سے مت لڑو ورنہ تمہارا ستیاناس ہو جائے گا۔

فَتَنَازَعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ۔ جادوگروں نے جب موسیٰ کا کلام سنا تو باہم مختلف الرائے ہو گئے۔ دانشمند اور ارباب رائے بولے دوستو! یہ ساحروں کی باتیں نہیں ہیں، یہ تو کوئی مقدس شخص ہے۔ فرعون اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

بِطَرِيقَتِكُمُ الْمُثْلَىٰ طریقہ مثلیٰ سے مراد قتادہ کے نزدیک اہل طریقہ ہیں۔ یعنی موسیٰ و ہارون بنی اسرائیل کو لے جانا چاہتے ہیں۔ ابن عباس نے حدیث الفتون میں فرمایا کہ طریقہ مثلیٰ سے عیش و آرام کے حصول کا طریقہ مراد ہے۔ یعنی فرعون نے جادوگروں سے کہا کہ اب تک تم لوگ کا دبدبہ سحر

کی بدولت عیش کرتے تھے۔ اب یہ دونوں تمہارا طریقۂ عیش چھیننا چاہتے ہیں۔

ابن ابی حاتم نے بروایت شعبی حضرت علی کا قول نقل کیا ہے کہ طریقۂ مثلیٰ کو لے جانے سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ و ہارون لوگوں کے رخ اپنی طرف پھیرنا چاہتے ہیں۔

مجاہد و عکرمہ نے طریقۂ مثلیٰ سے سردار و اشراف مراد لیے ہیں۔ یعنی یہ تمہارے سرداروں کو برباد اور اشراف کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ میرے نزدیک صحیح ترین قول عبدالرحمٰن بن زید کا ہے کہ طریقۂ مثلیٰ سے مراد مذہب ہے۔ مطلب یہ کہ دونوں اپنا جدید مذہب ظاہر کر کے تمہارے پسندیدہ مذہب کو زائل کرنا چاہتے ہیں۔ یہی اکثر مفسرین کا قول ہے۔

مقصودِ بیان فرعون کی کج فہمی کا اظہار اور اس امر کی طرف لطیف اشارہ کہ دنیا کی بڑی سے بڑی شیطانی طاقت اہل حق کے مقابلے میں مقہور و مغلوب ہو کر تہمت تراشی کرتی ہے اور جو کور بصیرت ہوتا ہے اس کی نظر مادی دنیا سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کو ظاہری دنیا اور اسباب دنیا کے ماوراء کوئی غیبی طاقت دکھائی نہیں دیتی۔

آیت سے یہ بات بھی تاریخی اعتبار سے واضح ہوتی ہے کہ فرعون کے زمانے میں جادوگروں کا بہت زور تھا۔ فرعون خدا ہونے کا مدعی تھا اور اپنی ذات کو قہار اور قادر مطلق جانتا تھا پھر بھی حضرت موسیٰ کے مقابلے سے زک ہو کر اس نے جادوگروں کی مدد طلب کی اور اپنے دعوے کی رو سے فاش ہو گیا۔ اس میں دقیق ایماء اس طرف ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ باطل پرست اشخاص اپنے غلبہ کے لئے کانس پیرتے ہیں، کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔ حق کے مقابلے میں ان کی تمام شیخیاں اور تعلّیاں کرکری پڑ جاتی ہیں ان کو اس کا بھی احساس نہیں رہتا کہ ہم کیا کہتے ہیں اور اپنے عمل سے کس بات کا اظہار کر رہے ہیں، ہمارے قول و فعل میں توافق ہے یا تضاد۔

فَتَنَازَعُوٓا اَمۡرَهُمۡ۔ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ کا تقدس اور صداقت سے بھرا ہوا کلام سن کر مقابلے سے قبل ہی بعض جادوگروں کو یقین ہو گیا تھا کہ موسیٰ جادوگر نہیں بلکہ کسی مقدس غیبی طاقت کا حامل ہے۔

وَيَذۡهَبَا بِطَرِيۡقَتِكُمُ الۡمُثۡلٰى سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اہل جہالت باطل کوش طبقہ جب سچی دلیل پیش نہیں کر سکتا تو اہل حق کے خلاف ناجائز پروپیگنڈہ کرتا اور دوسروں کے جذبات کو طرح طرح سے ابھارتا ہے وغیرہ۔

قَالُوۡا يٰمُوۡسٰٓى اِمَّاۤ اَنۡ تُلۡقِىَ وَاِمَّاۤ اَنۡ نَّكُوۡنَ اَوَّلَ مَنۡ اَلۡقٰى ۝

بولے	موسیٰ	یا تو	تم	ڈالو	یا اوّل	ہم ہی	ڈالنے	والے	نہیں	ہیں

قَالَ بَلۡ اَلۡقُوۡا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمۡ وَعِصِيُّهُمۡ يُخَيَّلُ اِلَيۡهِ مِنۡ سِحۡرِهِمۡ

موسیٰ نے کہا نہیں تم ہی ڈالو	یکایک اُن کے جادو کی وجہ سے	موسیٰ کے	خیال میں	اُن کی رسیاں		اور لاٹھیاں

اَنَّهَا تَسۡعٰى ۝ فَاَوۡجَسَ فِىۡ نَفۡسِهٖ خِيۡفَةً مُّوۡسٰى ۝ قُلۡنَا لَا تَخَفۡ

دوڑتی ہوئی معلوم ہونے لگیں	موسیٰ علیہ السلام اپنے دل میں کچھ	خوف کا	احساس کیا	ہم نے کہا	ڈرو نہیں

اِنَّكَ اَنۡتَ الۡاَعۡلٰى ۝ وَاَلۡقِ مَا فِىۡ يَمِيۡنِكَ تَلۡقَفۡ مَا صَنَعُوۡا ؕ اِنَّمَا

یقیناً تم	ہی غالب	رہو گے	جو لاٹھی تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے	اس کو ڈال دو وہ اُن کی بنائی ہوئی چیز کو نگل لے گی جو کچھ

صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ۝ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا

انھوں نے بنایا ہے وہ جادوگر کا فریب ہے اور جادوگر جہاں آتا ہے کامیاب نہیں ہوتا بالآخر جادوگر سجدہ میں گر پڑے

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ۝

کہنے لگے ہم تو ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لا چکے۔

تفسیر میدان اسکندریہ میں سب جادوگر جمع ہوئے۔ اپنی قوت اور کمال فن پر اعتماد کرتے ہوئے موسیٰ کو مرعوب کرنے کے لئے بولے اگر تم چاہو تو پہلے اپنا داؤں پھینکو ورنہ ہم اپنا داؤں پھینکتے ہیں۔ حضرت موسیٰ قوت قدسیہ کے مالک تھے، غیبی طاقت کے حامل تھے، دنیا کے ذرہ ذرہ میں طاقت الٰہی کو جاری و ساری جانتے تھے ــــ وہ ساحروں کے رعب انگیز کلام سے ڈرنے والے نہ تھے، اس لئے بے باکی کے ساتھ فرما دیا تم ہی آغاز کرو۔ ساحروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینک دیں۔ جادو کی قوت سے تمام رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بن گئیں یعنی چاروں طرف سے سانپ رینگتے نظر آنے لگے۔ باقتضائے بشری شروع میں حضرت موسیٰ کو کچھ خوف ہوا، مگر بوحی الٰہی وہ خوف جاتا رہا اور آپ نے اپنی لاٹھی زمین پر ڈالی۔ لاٹھی ایک مست اژدہا بن گئی اور جادوگروں کے تمام سحریہ سامان کو نگلنے لگی۔ ساحر یہ دیکھ کر بیتاب ہو گئے، ان کے دلوں سے کفر کی گھٹائیں چھٹ گئیں، نور معرفت چمکنے لگا، شکاری خود شکار ہو گیا۔ جادوگروں کو یقین ہو گیا کہ موسیٰ کی طاقت طاغوتی طاقت نہیں بلکہ جبروتی طاقت ہے جو ملکوتی طاقت کی مدد کر رہی ہے۔ فوراً سجدہ میں گر گئے، خود نہیں گرے بلکہ کسی نامعلوم غیبی قوت نے ان کے سروں کو جھکا دیا اور حضرت موسیٰ کی صداقت پر ایمان لے آئے۔ یہ ہے قصہ کا خلاصہ۔

ایک ضروری تحقیق

نیرنگ، طلسم، سحر، معجزہ اور کرامت میں کیا فرق ہے؟ ہم اس بحث کی ضروری مختصر تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔

یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ معمولی اور عادت کے خلاف ہر زمانے میں کچھ نہ کچھ واقعات، عقلی اختراعیات، مصنوعات اور مختلف امتزاجات دنیا میں ہوتے رہتے ہیں، لیکن ان خوارق عادات کے اسباب و علل کیا ہوتے ہیں ان کو اہل تحقیق ہی جانتے ہیں۔ مختلف اخلاط کا توڑ جوڑ، ترکیب و امتزاج مختلف عنصری مواد کو ملا کر نیا مرکب بنانا، مختلف المزاج اخلاط کو ملا کر ایک جدید طاقت پیدا کرنا۔ غرض یہ کہ کل میکانکل اور کیمیکل ایجادات دنیا میں ہوتی رہتی ہیں۔ بجلی، ہوائی جہاز، آب دوز کشتیاں، بم کے گولے، زہریلی گیس، ریڈیو اور مختلف قسم کی مشینیں سب اسی فن کی مرہون منت ہیں۔ گزشتہ زمانے میں اس کو علم نیرنگ کہا جاتا تھا۔ یہ فن عنصری مواد کی تحقیقات، باہم توازن اور تناسب، مختلف اخلاط کا باہم ربط و تعلق بتاتا ہے۔ ماہرین طبعیات ایسی ایسی محیر العقول چیزیں بناتے ہیں اور ایسے تعجب انگیز کام کرتے ہیں جن کو دیکھ کر اہل عالم جادو کہتے ہیں۔ عام طبقہ حقائق سے ناواقف ہوتا ہے، وہ ایجادات کی تہ تک نہیں پہنچتا، اس لئے وہ اس کو نیرنگ کہتا ہے۔ ارسطو، دیمقراطیس، ابن معنی نصیر الدین طوسی وغیرہ علماء گزشتہ زمانے میں بھی ماہرین طبعیات گزرے ہیں اور اس زمانے میں بھی بڑے بڑے سائنس داں اور واقف مادیات موجود ہیں۔

خوارق عادات کی دوسری شاخ وہ ہے جس کو مشرق کے رہنے والے طلسم کہتے ہیں۔ اس کو جاننے والے اب تقریباً مفقود ہیں۔ کیونکہ اس کے حصول میں جوہر عقل کی ذکاوت، صفائی درکار ہے۔ آئینہ اور ایک بہت زیادہ شفاف اور مصلیٰ ہونا لازم ہے۔

طلسمات کے ماہر اول سفلی اور عنصری مواد کے خواص کی تحقیقات کرتے ہیں۔ پھر عنصری مواد کو جمع کر کے کچھ خاص صورتیں اور شکلیں بناتے ہیں اور اسی تناسب کے ساتھ کہ آسمانی نفوس کا فیض ان صورتوں کو حاصل ہو جائے اور سفلی و علوی نفوس کی ترکیب سے ایک محیر العقول چیز بن جائے، مثلاً

اس ترکیب سے زمین پر ایک دائرہ بنا تے ہیں جس کو دیکھ کر چیل، کوا اور بعض دوسرے پرندے ہوا سے اتر کر اس میں گر پڑتے ہیں۔ گزشتہ زمانے میں علم نجوم اور علم طب کا ایک خاص تعلق علم طلسم سے سمجھا جاتا تھا۔

کبھی خرق عادات بطور سحر یا کرامت یا معجزہ سے بھی ہوتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کا نفس ناطقہ، اس کے بدن کی ترتیب، حفاظت اور بقا کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اپنے بدن کے اندر جس طرح چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ تمام بدنی حرکات نفس ناطقہ کے تابع ہیں۔ نفس میں علمی اور عملی تصرفات کی طاقت کیوں ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہر نفس کا تعلق ماوراء مادیات عالم غیب سے ہے۔ اس مادی دنیا کے اوپر کچھ غیبی قوتیں ہیں جن میں سے کچھ رحمانی ہیں اور کچھ شیطانی۔

جب آدمی کا نفس اس مادی دنیا کے جھگڑوں سے ہٹ کر یکسو ہو کر غیبی دنیا کی طرف توجہ کرتا ہے تو اس کو کچھ آنے والی علمی صورتیں اور تجلیاں نظر آتی ہیں۔ غیبی قوتوں کا اس سے خاص کنکشن ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے بعض آنے والے واقعات اس کو قبل از وقت معلوم ہو جاتے ہیں اور اس کے تعلق کے سبب اس کے اندر ایسی طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے خاص بدن کے علاوہ دوسری عنصری مادی چیزوں میں بھی خاص خاص وقت پر تصرف کر سکتا ہے۔ پتھر کو سونا بنا دینا یا درخت کو اپنے پاس بلا لینا، انگلیوں سے چشمہ جاری ہونا، بے جان کا انسانی کلام کرنا وغیرہ وغیرہ اسی قسم کے تصرفات ہیں جو غیبی قوتوں کے تعلقات سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔ اگر اس تعلق میں مزید استحکام ہوتا ہے تو قوی تر قسم کے تصرفات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ مثلاً لاعلاج مریضوں کو اچھا کر دینا، مردوں کو زندہ کر دینا، مٹی کے جانور بنا کر ان میں پھونک مار کر اڑا دینا اگر اس سے بھی زیادہ قوی کنکشن ہوتا ہے تو ایسا نفس فلکیات میں بھی تصرف کر سکتا ہے۔ چاند کو شق کر دینا، سورج کو حرکت سے روک دینا وغیرہ اسی قسم کے تصرفات ہوتے ہیں۔

اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ سحر ہو یا کرامت یا معجزہ سب عالم غیب سے تعلقات پیدا کرنے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ نفوس بشریہ عالم غیب سے متاثر ہو کر مادی اور غیر مادی چیزوں میں حیرت انگیز تاثیر کر سکتے ہیں۔ گویا کرامت معجزہ اور سحر عالم غیب سے اتصال رکھنے کا ایک خاص اثر ہے۔

اب اگر نفس کا تعلق رحمانی اور روحانی قوتوں سے ہے اور انہی کے فیض سے تاثیر پیدا کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے تو ایسے نفس سے جو خارق عادت فعل صادر ہوتا ہے اس کو کرامت اور معجزہ کہا جاتا ہے اور اگر شیطانی طاقتوں سے اتصال کے بعد خرق عادت ظاہر ہوتا ہے تو اس کو سحر کہا جاتا ہے۔ دونوں کی کھلی ہوئی واضح شناخت یہ ہے کہ ساحر بدکردار، بداطوار، نجس اور خبیث ہوتا ہے۔ گندگی اور کثافت ہی اس کو مرغوب ہوتی ہے اور جس شخص سے کرامت یا معجزہ سرزد ہوگا وہ پاک طینت اور پاک روح والا ہوگا۔ خوش خلق، نسیم کریم، طاہر، طیب، خوش خصال اور خوش مقال ہوگا۔

جب سحر اور معجزہ کا فرق ظاہر ہو گیا تو اب یہ بھی بیان اینا ضروری ہے کہ ساحر ہو یا نبی ہو یا ولی ہر ایک کا نفس مبدء فطرت کے اعتبار سے بہت قوی ہوتا ہے۔ ان سب کے نفوس میں پیدائشی طور پر عالم غیب سے اتصال کی بہت زیادہ طاقت ہوتی ہے، لیکن ساحر اس فطری قوت کو سفلی عالم کے اتصال اور بدکرداری، بدگفتاری اور خبث طینت کی وجہ سے کمزور کر لیتا ہے اور نبی یا ولی عقائد کی صحت، اعمال کی درستی، اقوال کی صداقت، معاملات کی سچائی اور اسلوب زندگی کی حقانیت کی وجہ سے فطری تعلق میں مزید استحکام کر لیتا ہے۔

تاہم ساحر کا نفس بھی فطرۃً بہت قوی ہوتا ہے۔ اگر سفلی طبیعت اس پر بالکل چھا نہ گئی ہو، اگر خبث طینت نے اس کا احاطہ کر لیا ہو، اگر قدسی شعاعیں قبول کرنے کی صلاحیت اس سے بالکل زائل نہ ہو گئی ہو تو بہت جلد راہ راست پر آجاتا ہے اور نبی کی شناخت ساحر کو ہی سب سے زیادہ اور سب سے پہلے ہوتی ہے۔ کیونکہ مبدء فطرت کے لحاظ سے نبی کے نفس کی طرح اس کا نفس بھی قوی ہوتا ہے، مگر طریق کار اور خباثت اعمال کی وجہ سے ملکوتی قوتوں سے اس کا اتصال کمزور پڑ جاتا ہے۔ اگر یہ شیطانی قوتوں سے کچھ دیر کے لئے بھی قطع تعلق کر لیتا ہے اور نبی کی ملکوتی قوت کا مطالعہ کرتا ہے تو نور نبوت اس کو بہت جلد نظر آجاتا ہے۔ یہی سبب اور یہی وجہ ہے کہ جب فرعون کے جمع کئے ہوئے ساحروں کو شکست ہو گئی تو فوراً بغیر کسی پس و پیش کے وہ ایمان لے آئے، کفر کے گھٹا ٹوپ بادل ان کی روحوں کے اوپر سے ہٹ گئے اور آفتاب حق کی روشنی

ان کو نظر آنے لگی۔

تحلیلِ اجزاء

قَالَ بَلْ اَلْقُوْا۔ اس کلام سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جرأت، عدم، رعب اور بے باکی ظاہر ہوتی ہے۔ آپ نے بغیر خوف و اندیشہ کے آغاز کرنے کی اجازت دے دی تاکہ حجت نبوی کی تکمیل ہو جائے اور جادوگروں کو اپنی قوت کے اظہار کا ارمان نہ رہ جائے۔

یُخَیَّلُ اِلَیْہِ مِنْ سِحْرِھِمْ اَنَّھَا تَسْعٰی۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ جادوگروں نے رسیوں اور لاٹھیوں میں کسی خاص ترکیب سے پارہ بھر کر ان کو دھوپ میں ڈال دیا تھا تاکہ آفتاب کی گرمی سے ان میں حرکت پیدا ہو اور دیکھنے والے ان کو سانپ سمجھیں۔ میرے نزدیک ابن کثیر کا یہ تاویلی قول غلط ہے۔ قرآن کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ فقط نیرنگ یا شعبدہ ہی نہ تھا نہ طلسم تھا بلکہ سحرِ عظیم تھا۔ جادوگروں نے لوگوں کی نظر بندی کر دی تھی۔ دوسری جگہ صاف ارشاد ہے۔ سَحَرُوْٓا اَعْیُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْھَبُوْھُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِیْمٍ۔

نیرنگ، طلسم اور سحر کا مذکورہ بالا فرق سمجھنے کے بعد کسی تاویل کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً مُّوْسٰی چونکہ سحر سے ڈرنا مرتبہ نبوت کے خلاف ہے، اس لئے مفسرین نے اس آیت کی تاویل کی ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ بہ اقتضائے بشری حضرت موسیٰ کو اندیشہ ہوا کہ میری لاٹھی کا معجزہ تنہا ہے اور ان لوگوں نے اس قدر سانپ بنائے ہیں۔ صرف میری عصا دیکھ کر کون ایمان لائے گا۔

امام رازی نے نفیس تاویل کی ہے کہ حضرت موسیٰ کو سینکڑوں سانپ دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ ان جادوگروں کا سحر بھی میری عصا کی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے۔ اب معجزہ اور سحر میں اشتباہ ہو جائے گا۔ لوگوں کو دونوں کا فرق نمایاں نظر نہ آئے گا، اس طرح مقصود معجزہ فوت ہو جائے گا اور لوگ ایمان نہ لائیں گے۔

تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا بہت بڑا اژدہا بن گیا جس کے چار پاؤں، موٹی گردن، بڑا سر اور نیزے لمبے دانت تھے۔ ابن کثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ لوگ ہیبت کے مارے بھاگے، ایک کے اوپر ایک گرا۔ یہاں تک کہ پچیس ہزار آدمی کچل کر مر گئے۔ ممکن ہے تعین تعداد میں مبالغہ ہو، مگر اتنا یقینی ہے کہ منظر بہت بڑا ہیبت انگیز تھا۔ ہر شخص جان بچانی چاہتا تھا۔ ایسے مجمع میں ہزاروں آدمیوں کا دب کر کچل جانا قیاس کے خلاف نہیں ہے۔

فَاُلْقِیَ السَّحَرَۃُ سُجَّدًا۔ یعنی جادوگر بے اختیار ہو کر سجدہ میں گر پڑے۔ فعل مجہول استعمال کرنے میں خاص نکتہ یہ ہے کہ جادوگروں کا اضطرار ظاہر ہو جائے۔ فعل معروف سے جادوگروں کا سجدہ میں گر پڑنا تو معلوم ہو جاتا، مگر انتہائی مغلوبیت اور بے اختیار ہو جانا ظاہر نہ ہوتا۔

مقصودِ بیان

انبیاء اور اللہ کے وہ خاص بندے جو عالم کے ذرّے ذرّے میں اپنی طاقت کار فرما جانتے ہیں، اللہ کے سوا کسی طاقت سے نہیں ڈرتے۔ حق و صداقت پر کسی کا جادو نہیں چلتا۔

جادو درحقیقت کوئی حقیقت رکھتا ہے۔ محض توہم و سفسطہ پر مبنی نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ دائرۂ بشریت سے خارج نہ تھے۔ یعنی انبیاء کو بھی ابتدائی انفعالات بشری اور تاثرات انسانی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے عصا نے سانپ بن کر ساحروں کے بنائے ہوئے تمام سانپوں کو نگل لیا تھا۔

آیات میں اشارۃً یہ تعلیم ہے اس بات کی کہ بہت سے باطل پرست ناحق کوشش دھوکہ اور فریب سے اشخاص حق و صداقت کا جامہ پہن کر دنیا کے سامنے رونما ہوتے ہیں، مگر سچائی کا مقابلہ کرنے کے وقت ان کی پول کھل جاتی ہے۔ اس لئے مدعیان صداقت کو پرکھنے کی ضرورت ہے۔ فریب کار لیڈر، دھوکہ باز پیران طریقت، اور شکاری ملا، سبھی اہل حق کا لباس پہن کر سامنے آتے ہیں، اس لئے ان سے ہوشیار رہنا لازم ہے۔ زورِ منزور قلم، قوت بیان، تقریر، اور ہمہ گیر زندگی کے جال میں پھنس کر حق و ایمان کو قربان کرنا اور رسول پاک ﷺ کی بتائی ہوئی تعلیم کو

ترک کر دینا خلافِ عقل ہے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ
فرعون بولا کیا تم میرے اجازت دینے سے پہلے اُس پر ایمان لے آئے واقعی وہ تمہارا سب کا بزرگ ہے جس نے تم کو جادو سکھایا

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ
اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں خلاف جہت سے ضرور کاٹوں گا اور ضرور بالضرور کھجور کے تنوں پر تم کو

النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ۝ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰي مَا
سولی چڑھاؤں گا اور تم کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیرپا ہے وہ بولے ہم تجھے ہرگز اُن دلائل پر ترجیح نہ دینگے

جَاۗءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا
جو ہمارے پاس آ چکی ہیں اور نہ اس ذات پر جس نے ہم کو پیدا کیا ہے تجھے جو کرنا ہے کر لے اسی دنیوی

تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ
زندگی میں تو کر سکتا ہے ہم تو بے شک اپنے رب پر ایمان لا چکے تاکہ وہ ہمارے قصور بخش دے اور

مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ
اُس جادو کو بھی بخش دے جس پر تو نے ہم کو مجبور کیا اور اللہ بہتر اور زیادہ باقی رہنے والا ہے بیشک جو اپنے رب کے سامنے

رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰي ۝ وَمَنْ
مجرم ہو کر پہنچے گا سو اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے جس کے اندر نہ وہ مرے گا نہ جیے گا اور جو شخص

يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ
اُس کے پاس بحالتِ ایمانی نیک کام کرنے کے بعد پہنچے گا تو ایسے لوگوں کے درجات بلند

الْعُلٰى ۙ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ
ہیں دوامی جنتیں ملیں گی جن کے اندر نہریں جاری ہوں گی اُن کے اندر وہ ہمیشہ رہیں گے۔

وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا مَنْ تَزَكّٰى ۝ۧ
یہ اُس شخص کا انعام ہے جو پرہیزگار رہا

تفسیر

ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ شیطانی طاقتیں جب ہر طرح مجبور اور مغلوب ہو جاتی ہیں اور ان کے لئے کوئی سبیل عقل باقی نہیں رہتی اور جاہل صداقت پر بھی ان کا قابو نہیں چلتا اور دلائل عمل کی روشنی بھی ان کو نظر نہیں آتی تو آخر کار علمبردار صداقت کے ساتھیوں اور فریق کو توڑنا چاہتے ہیں، اس کے پیچھے کو فنا کر کے اپنی شیطانی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے خواستگار ہوتے ہیں۔ معترفان حقانیت کو جسمانی سزائیں دیتے ہیں، قتل کرتے ہیں، ان کے اموال و املاک پر دست تعدی دراز کرتے ہیں۔

فرعون کی بھی یہی حالت ہوئی۔ حضرت موسیٰ پر اس کا بس نہ چلا۔ خدا کے فرستادہ نبی کی بیانی طاقت اور غیبی قوت نے اس کو مبہوت کر دیا تو اس نے تہمت تراشی پر کمر باندھی، حضرت موسیٰ کو جادوگر کہا، ان کے اعلانِ صداقت کو دنیوی ناپاک اغراض کے حصول پر مبنی قرار دیا اور دعوتِ توحید کو انقلاب سلطنت کی خواہش بتایا۔ جب یہ حربہ بھی کارگر نہ ہو سکا اور دنیائے سحر کی طاقت مغلوب ہو گئی اور حریفانِ موسیٰ خدام موسیٰ بن گئے تو اب اس نے موسیٰ علیہ السلام کے حمایتیوں کو توڑنا چاہا۔ عام لوگوں کو ایمان سے روکنے کے لئے اس نے ساحروں سے کہا تم میری اجازت کے بغیر موسیٰ کے قول پر ایمان کیوں لائے؟ درحقیقت تم نے موسیٰ سے ساز باز کر لی تھی۔ موسیٰ تمہارا سرگروہ ہے۔ تم سب اس کے شاگرد ہو۔ اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں کٹوا کر کھجور کے تنوں سے بندھوا دوں گا تاکہ وہیں تڑپ تڑپ کر مر جاؤ اور تم کو معلوم ہو جائے کہ میری طاقت کس قدر قہار اور پرجبروت ہے۔ گویا فرعون یہ سمجھتا تھا کہ میری حکمرانی اہل مصر کے نہ فقط جسموں اور بدنوں پر ہے بلکہ دماغوں اور روحوں پر بھی ہے۔ کسی کو حق نہیں کہ میری اجازت کے بغیر عقیدہ بھی تبدیل کر سکے، لیکن یہ اس کی اصولی غلطی تھی۔ حکومت و سلطنت کا تعلق اعضائے خارجیہ سے ہے۔ دماغ ہر شخص کا آزاد ہے۔ تصدیق قلبی کسی اجازت کی محتاج نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مومن ساحروں نے صاف طور پر فرعون سے کہہ دیا کہ ہم نے آیات الٰہیہ کا مشاہدہ کر لیا، دلائلِ معرفت ہمارے دلوں میں پیوست ہو گئے، لذتِ ایمان سے ہم بہرہ اندوز ہو گئے۔ اب ناممکن ہے کہ ہم تجھے، تیرے قول، تیرے فعل کو پسند کریں۔ لہٰذا جو تو کرنا چاہتا ہے کر۔ تیرا تسلط صرف اس ظاہری زندگی پر ہو سکتا ہے یعنی اس کو فنا کرنے کی کوشش تو کر سکتا ہے دوامی عذاب نہیں دے سکتا۔ نہ دوام خیر تیرے قبضہ میں ہے۔ تو نے مجبور کر کے ہم کو جادو سکھایا۔ اس پر ہم پشیمان ہیں۔ اس سے پہلے بھی ہم سے بہت قصور ہو گئے ہیں۔ ہم اپنے رب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمارے تمام قصوروں کو معاف فرما دے۔

تحلیل اجزاء

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ۔ جب جادوگر ایمان لائے اور فرعون کی قوت مغلوب ہو گئی تو اس کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ارکانِ سلطنت اور افرادِ رعایا موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لے آئیں، اس لئے کوئی ایسی تجویز کرنی چاہیے کہ اگر کوئی دل موسیٰ کی طرف مائل بھی ہو تب بھی تصدیق و ایمان سے رک جائے، اس لئے دوسروں کو عبرت دلانے کے لئے جادوگروں سے بولا کہ تم میری اجازت کے بغیر موسیٰ کے قول پر ایمان لے آئے، یہ تم سب کی سازش ہے۔ موسیٰ تمہارا سرگروہ ہے، اسی نے تم کو جادو سکھایا ہے تم سب اسی کے شاگرد ہو۔

فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ۔ فرعون نے ساحروں کو دھمکی دی کہ میں تم میں سے ہر ایک کا ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا پاؤں کٹوا دوں گا۔ پھر (مشتہر کرنے اور لوگوں کو عبرت دلانے کے لئے) کھجور کے درختوں کے تنوں پر سے بندھوا دوں گا اور بندش بھی بطریق صلیب کروں گا۔ (اس سے مقصود یہ تھا کہ اس کی ہمہ گیر طاقت کا مظاہرہ ہو جائے اور لوگ ظالم کی قوت سے ڈر جائیں)

مفسرین کا اختلاف ہے کہ فرعون نے اپنی دھمکی پوری کی تھی اور ساحروں کو قتل کیا تھا یا ایسا نہیں کیا۔ ابن کثیر نے صراحت کی ہے کہ فرعون نے ان کو قتل کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا اور وہ ایسا کر بھی گزرا اور یہ فی الحقیقت ان جادوگروں پر اللہ کی رحمت تھی، اسی لئے ابن عباس وغیرہ اکابر نے فرمایا کہ صبح کو وہ ساحر تھے اور شام کو شہید ہوئے۔ انتہیٰ۔ شیخ ابو السعود کا بھی یہی قول ہے۔

لیکن امام رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ فرعون نے جن مومنوں کو دھمکی دی تھی، اس کا پورا کرنا قرآن و حدیث سے نہیں (ثابت)۔ ابو حیان نے لکھا ہے کہ اللہ نے ان مومنوں کو فرعون کے پنجہ سے محفوظ رکھا۔ اس مضمون کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے: اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ۔ یعنی جو لوگ موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کریں گے وہ سب غالب ہوں گے۔ وہ ساحر موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اور آپ کی پیروی انہوں نے کی تھی، اس لئے سالم و غالب رہے۔ شیخ بقاعی نے کہا کہ سورۂ حدید کی آخری صراحت بتا رہی ہے کہ ان مومنوں

نے نجات پائی یعنی فرعون کا دست رس اُن پر نہ ہوا۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى اہل سحر کا کلام اوپر کی آیت پر ختم ہوگیا۔ یہاں سے حق تعالیٰ ایک عام قاعدہ بیان فرماتا ہے جس سے کفر کے نتیجۂ بد کا خوف اور ایمان کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ اس آیت سے مجرم سے مراد کافر و مشرک ہے گناہگار مسلم مراد نہیں۔ کیونکہ امام احمد نے بروایت حضرت ابو سعید خدریؓ بیان کیا ہے کہ رسول گرامی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو دوزخی دوزخ والے ہی ہوں گے (یعنی جن کو ہمیشہ دوزخ میں رہنا ہے) وہ اس کے اندر نہ مریں گے نہ جئیں گے۔ البتہ کچھ آدمی اور ہوں گے جن کے گناہوں کے سبب آگ ان کو جلائے گی۔ ان کو دوزخ کی آگ سے ایک خاص قسم کی موت آجائے گی، یہاں تک کہ جب وہ کوئلہ ہو جائیں گے تو شفاعت کی اجازت دی جائے گی۔ اور ان لوگوں کی ٹکڑیاں ٹکڑیاں جنت کی نہروں میں لائی جائیں گی اور اہلِ جنت کو حکم دیا جائے گا کہ ان پر پانی ڈالو۔ پانی چھڑکنے سے ان میں ایسی روئیدگی ہوگی جیسے سیلاب میں دانہ اُگتا ہے (رواہ مسلم)

حضرت ابو سعیدؓ کی دوسری روایت میں آیا ہے کہ ایک روز حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر کی۔ جب آیت اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا الخ پر پہنچے تو فرمایا الخ۔

ان دونوں روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ میں مجرم سے مراد مشرکین و کفار ہیں، مسلمان گناہگار مراد نہیں۔ رہی یہ بات کہ موت نہ آئے گی تو یقیناً زندہ ہوں گے اور زندگی نہ ہوگی تو یقیناً موت ہوگی۔ حیات عدم موت اور موت عدم حیات کا نام ہے تو بیضاوی نے اس شبہ کو دور کرنے کے لئے آیت کا مطلب اس طرح لکھا ہے:۔ دوزخ کے اندر کفار کو موت نہ آئے گی کہ عذاب سے راحت مل جائے اور نہ خوشگوار زندگی حاصل ہوگی کیونکہ عذاب کی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ بیضاوی کے جواب کا مفاد یہ ہے کہ جہنمی جہنم میں زندہ رہے گا، لیکن ایسے عذاب میں رہے گا جو موت سے بدتر ہوگی۔

مقصودِ بیان جب حکومت و تسلط کا شیطان آدمی کے دماغ پر چڑھ جاتا ہے تو وہ اپنی ذات کو نہ فقط رعایا کے جان و مال کا مالک اور متصرف حقیقی سمجھنے لگتا ہے بلکہ لوگوں کے دماغوں کو اپنا غلام جاننے لگتا ہے۔ اُس کو گوارا نہیں ہوتا کہ کسی کے دماغ میں میری اجازت کے بغیر کوئی تصور و تخیل بھی آسکے یا میرے حکم کے بغیر کوئی شخص کوئی مذہبی یا سیاسی عقیدہ اپنے دماغ میں قائم کرسکے۔ یہ درحقیقت ظلم اور جہالت کا آخری درجہ ہوتا ہے جس پر پہنچ کر آدمی عقل و شعور کی حد سے خارج ہو جاتا ہے۔ فرعون بھی ایسے ہی جاہل احمقوں میں سے تھا جو اپنی ذات کو نہ فقط حکمران اور جبار بادشاہ جانتا تھا بلکہ متصرف القلوب اور مالک اذہان بھی سمجھتا تھا۔

جس کے دل میں نورِ ایمان چمکنے لگتا ہے اور آفتاب ازل کی کرنیں پرتو انداز ہو جاتی ہیں وہ دنیا کی کسی قہار طاقت سے نہیں ڈرتا۔ لالچ اور خوف کے جذبے سے پاک ہو کر جان و مال کو راہِ حق میں قربان کرتا ہے اور ایمان سے مُنہ نہیں موڑتا۔

آیت وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ سے ثابت ہوتا ہے کہ سحر سیکھنا بھی حرام ہے۔

مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ سے فی الجملہ اس بات پر دلالت ہوتی ہے کہ اعتبار انجام کا ہے۔ مرنے کے وقت جو مشرک ہوگا وہ ناقابلِ مغفرت ہے اور جو بوقت موت مومن صالح ہے وہ مغفور ہے وغیرہ۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ	اِلٰى مُوْسٰٓى	اَنْ	اَسْرِ بِعِبَادِيْ	فَاضْرِبْ	لَهُمْ	طَرِيْقًا	فِي
ہم نے	موسیٰ کے پاس	وحی بھیجی	کہ میرے بندوں کو نکال لے جاؤ	اور دریا کے اندر	ان کے لئے	خشک	سڑک

الْبَحْرِ يَبَسًا	لَّا تَخٰفُ دَرَكًا	وَّلَا تَخْشٰى	فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ	بِجُنُوْدِهٖ
بنا دو	تم کو نہ پکڑے جانے کا خوف ہوگا	اور نہ (ڈوبنے کا) ڈر ہوگا	غرض فرعون نے	اپنے لشکر سمیت اُن کا پیچھا کیا

فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝ وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَا هَدَىٰ ۝

لیکن دریا کی زبردست موجوں نے ان کو چھپا لیا اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کر دیا نیک راہ نہ دکھائی

تفسیر ساحروں کے واقعہ کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام مدت دراز تک مصر میں رہے اور تبلیغ حق کرتے رہے۔ فرعون نے بھی انتہائی ظلم پر کمر باندھ لی۔ حضرت موسیٰ کی قوم کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہوگیا۔ بنی اسرائیل کے بے گناہ معصوم بچوں کو نذر شمشیر کرنا شروع کر دیا۔ مختلف اوقات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بددعا سے قوم فرعون مختلف غیبی عذابوں میں مبتلا ہوئی۔ طوفان آنا، ٹڈیوں کا تمام سبزی کھا جانا، تمام قبطیوں کے لئے پانی کا خون بن جانا، ہر برتن میں کیڑے، اور ہر کھانے میں مینڈکوں کا پھیل جانا اور اس قسم کی غیبی تنبیہات ظاہر ہوتی رہیں۔ تاکہ قوم سرکش بیدار ہو جائے، مگر فرعون کی کور باطنی ایسی نہ تھی جو آفتاب قدرت کی شعاعوں کو دیکھ سکتی اور قبطیوں کے مقدر میں ہی نعمت ایمان نہ تھی۔ وہ لوگ غریب اسرائیلیوں کو طرح طرح سے ستاتے، تکلیفیں دیتے۔ یہاں تک کہ جب ان کے بچے بے گناہ قتل کئے جانے لگے تو ان کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا اور غضب الٰہی کا دریا بھی اُمڈا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی آئی کہ بنی اسرائیل کو راتوں رات لے کر نکل جاؤ اور بحر قلزم پر پہنچ کر اس میں عبور کرو تم میں سے کسی کا دامن بھی تر نہ ہوگا۔ دریا کے اندر تمہارے لئے خشک راستہ بنا دیا جائے گا۔

مصر کے اندر بنی اسرائیل کی آبادی قبطیوں سے بالکل جدا تھی وہ حکمراں قوم تھی، کمزور اسرائیلیوں کے ساتھ رہنا اپنے لئے باعث ذلت سمجھتی تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کو اس سے فائدہ پہنچا۔ رات ہی کو سب کو اکٹھا کیا اور سب کو لے کر بحر قلزم کے انتہائی سرے پر جا پہنچے (وہ مقام اب درمیانی خاکنائے کاٹ کر بحیرۂ روم سے ملا دیا گیا ہے۔ یہی نہر سویز ہے۔ یہیں سے کوہ طور کو سیدھا راستہ جاتا ہے)

غرض فرعون کو جب یہ اطلاع پہنچی تو اس نے فوراً اپنی فوج کو جمع ہونے کا حکم دیا اور سب کو لے کر بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔ پیچھے پیچھے تمام لشکری تھے اور اگلے دستہ میں فرعون تھا۔

گروہ بنی اسرائیل کا پچھلا حصہ اور لشکر فرعون کا اگلا حصہ جب قریب ہوگئے تو اسرائیلیوں کو اندیشہ ہوا کہ اب ہماری گرفت ہو جائے گی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس وحی آئی کہ سمندر میں لاٹھی مارو۔ حکم کی تعمیل کی۔ فوراً پانی پھٹ گیا اور بارہ راستے خشک نمودار ہوگئے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل تھے۔ ہر قبیلہ کا ایک جدا راستہ بن گیا اور چونکہ پیچھے سے فرعون کی گرفت کا اندیشہ تھا اور آگے سے یہ خوف تھا کہ کہیں سمندر کا پانی اوپر سے آکر غرق نہ کر دے، اس لئے وحی آئی کہ خوف مت کرو نہ فرعون کا دست رسی کا اندیشہ کرو نہ تلاطم امواج سے ڈرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی پوری جمعیت لے کر پار ہوگئے۔ فرعون لب دریا متحیر کھڑا دیکھتا رہا، غلط کار مشیروں نے اس کو ابھارا اور کہا آپ ہی کے رعب سے تو دریا خشک ہوگیا پھر داخل ہونے میں کیا تامل ہے۔ فرعون نے با دل ناخواستہ دریا میں گھوڑا ڈال دیا۔ پیچھے سب لشکر بھی داخل ہوگیا۔ جب پوری فوج وسط دریا میں پہنچی تو پانی میں ایک موج آئی، سطح سمندر ہموار ہوگئی اور تمام کافر پانی کی راہ سے آگ میں پہنچ گئے۔

تحلیل اجزاء أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي اس کلام کا تعلق آیت لَقَدْ أَرَيْنَاهُ آيَاتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَأَبَىٰ سے ہے۔ یعنی جب ساحروں کا واقعہ گزر گیا اور مدت تک حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر میں رہ کر نشانہائے قدرت دکھاتے رہے اور کوئی طریق ہدایت مفید نہ ہوا تو حضرت موسیٰ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر ملک شام کو چلے جاؤ۔ جس رات کو حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے ہیں اس کی صبح کو بنی اسرائیل کی عید کا دن یعنی یوم عاشوراء تھا۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ اسرائیلیوں سے زیور وجواہر اور کھوٹے عید کے بہانے سے قبطیوں سے بطور رعایت لے اور چل دیے۔

فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا - شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر میں لاٹھی ماری اور فرمایا کہ بحکم الٰہی میرے لئے جدا ہوجا۔ فوراً سمندر پھٹ گیا اور بارہ راستے بن گئے۔ ہر گروہ ایک راستے میں داخل ہوگیا، لیکن یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید ہمارا دوسرا گروہ جو دوسرے راستے سے جارہا ہے غرق ہوجائے۔ اس خیال کو زائل کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے درمیان میں پانی میں ہوکھ کر دیئے تاکہ ہر گروہ دوسرے گروہ کو دیکھتا جائے۔

مقصودِ بیان جو لوگ اللہ کے ہوجاتے ہیں اللہ ہر طرح سے ان کی مدد فرماتا ہے۔ بڑی بڑی قہار طاقتیں بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ معجزۂ انبیا حق ہے۔

بنی اسرائیل کے گذرنے کے بعد سمندر کے اندر خشک راستے پیدا ہوگئے تھے، فرعون مع لشکر کے سمندر میں غرق ہوگیا۔ اللہ کی گرفت سے پُر جبروت جلالت مآب بادشاہ بھی خارج نہیں۔ فرعون مرنے کے وقت بھی گمراہ تھا۔ نفی ہدایت کی صراحت صاف بتارہی ہے کہ فرعون کی آخر دم کی توبہ قبول نہیں ہوئی وغیرہ۔

ایک خاص نوٹ شیخ ابن عربی نے اپنی مشہور تفسیر میں آیت فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ الخ کا مطلب اس طرح لکھا ہے کہ فرعون نے مع لشکر کے بنی اسرائیل کا پیچھا کیا اور یہ چاہا کہ جس طرح خود جسمانی حسی خواہشات کے دریا میں غرق ہے اسی طرح بنی اسرائیل کو نفسانی ہوا و ہوس کے دریا میں غرق کر کے ہلاک کردے، لیکن اس کو ایک عظیم الشان موج یعنی قطران عذاب نے ڈھانپ لیا۔ مطلب یہ کہ ہلاکت سرمدی اور عذاب ابدی میں وہ مبتلا ہوگیا۔

شیخ کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ فرعون عذاب دائمی میں گرفتار ہے اور اس کی توبہ قبول نہیں ہوئی، لیکن فتوحات و فصوص کی بعض عبارتوں کا غلط مفہوم سمجھ کر اہل علم نے نقل کیا ہے کہ ابن عربی کے نزدیک فرعون کی آخری توبہ قبول ہوگئی اور اس کو عذاب سے نجات مل گئی، مگر ابن عربی کے قول کا صحیح مطلب وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ

اے اولادِ بنی اسرائیل ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے بچالیا اور طور کی دائیں جانب (توریت دینے کا) تم سے وعدہ کیا

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۝ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا

اور تم پر من و سلویٰ نازل کیا ہماری دی ہوئی نفیس چیزیں کھاؤ اور اس کے بارے میں

تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝

حد سے نہ بڑھو ورنہ تم پر میرا غضب ٹوٹ پڑے گا اور جس پر میرا غضب ٹوٹا وہ بلاشبہ ہلاک ہوا

وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝

جو شخص توبہ کرے اور نیک عمل کرے پھر ہدایت پر قائم رہے میں اس کو بخشنے والا ہوں

تفسیر اس آیت میں خدا تعالیٰ بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے وہ نعمتیں یاد دلاتا ہے جو فرعون کو غرق کرنے کے بعد ان کو عطا کی گئی تھیں۔ اہل تفسیر کی رائے اس امر میں مختلف ہے کہ کس زمانے کے بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے۔

خطیب نے سراج میں اور بعض دیگر مفسرین نے صراحت کی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جو یہودی تھے خدا تعالیٰ نے ان کو وہ نعمتیں یاد دلائی ہیں جو ان کے آباؤ اجداد کو عطا کی گئی تھیں کیونکہ اسلاف پر جو انعامات کئے گئے ہوں ان کا احسان اولاد پر ہوا کرتا ہے ۔

ابن کثیر اور بیضاوی کے کلام کا میلان اس طرف ہے کہ یہ خطاب انہی بنی اسرائیل کو ہے جو فرعون کے مقابلے میں فتح یاب ہوئے تھے اور جن کو فرعون کے ڈوبنے کے بعد طرح طرح کی نعمتوں سے سرفراز کیا گیا تھا ۔

میرے نزدیک یہی موخر الذکر قول قابل ترجیح ہے ۔ سیاق آیات کا مقتضا یہی ہے ۔

بنی اسرائیل پر خدا تعالیٰ نے تین عظیم الشان احسان فرمائے :- پہلے ان کے پُر جلال ظالم دشمن کو ان کی نظروں کے سامنے تباہ کیا ۔ یہ لیا عظیم المرتبہ احسان تھا جس سے بنی اسرائیل زندہ ہو گئے ۔ ہر وقت کی تکلیف ، ذلت ، مشقت اور مصیبت سے چھوٹ گئے ۔

دوسرا احسان یہ فرمایا کہ جب بنی اسرائیل ابھی دنیا میں با وقعت قوم شمار ہونے لگی اور زندوں میں پڑ گئی تو ان کی دینی ہدایت کے لئے کوہ طور پر توریت ملنے کا وعدہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ طور پر گئے اور مقررہ میقات تک عبادت و ریاضت کی اور ان کو کتاب ہدایت عطا کی گئی ۔

تیسرا احسان دنیوی تھا جب بنی اسرائیل اپنی نافرمانیوں کے سبب تیہ میں پھنس گئے اور رہائی کی کوئی شکل نہ نظر آئی اور تمام زاد راہ ختم ہو گیا اور سوائے موت کے اور کوئی چارۂ کار نہ رہا تو ایسے آڑے وقت میں خدا تعالیٰ نے ان کو غیب سے لذیذ پاکیزہ حلال روزی عطا فرمائی ۔ من اور سلویٰ بلا مشقت ان کو بقدر ضرورت ملنے لگا ، لیکن انھوں نے پھر بھی نافرمانیاں جاری رکھیں ، حلال کو چھوڑ کر حرام اور جائز کو چھوڑ کر ناجائز کی طرف قدم بڑھایا ۔ نتیجہ میں غضب الٰہی میں گرفتار ہوئے ۔ غضب خداوندی کا یہی نتیجہ ہوا کہ علاوہ عذاب آخرت کے وہ دنیا میں بھی ذلت کے غار میں گر گئے ۔ نہ روئے زمین پر کہیں بالشت بھر جگہ پر حکومت ہے نہ عزت و شوکت ۔ یہودی کتنا ہی ٹرا مال دار ہو اس کی صورت پر ذلت برستی ہے ۔ عموماً اقوام عالم ان کو اپنے ملک سے باہر کرنے کے درپے ہیں ۔ عیسائیوں یا مسلمانوں کے زیر تسلط یہ ہمیشہ رہے ہیں اور اب بھی موجود ہیں ۔ البتہ جنھوں نے توبہ کر لی مسلمان ہو گئے اور اپنی ناشائستہ سرکشیاں ترک کر دیں ان کو پھر عروج و عزت کی کرسی مل گئی ۔

تحلیل اجزاء

وَعَدْنٰكُمْ وعدہ فقط حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا گیا تھا ، لیکن چونکہ بنی اسرائیل کے دینی فائدے کے لئے تھا کہ ان کو کتاب الٰہی مل جائے یا گوسالہ پرستی کا قصور معاف ہو جائے ، اس لئے فرما دیا کہ اے بنی اسرائیل ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا ۔

نحاس نے کہا ۔ وَاعَدْنٰكُمْ کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے موسیٰ کو حکم دیا اس بات کا کہ وہ تم کو اپنے ساتھ طور پر لے جانے کا حکم دے تاکہ تمہارے روبرو کلام ہو اور تم کو سنایا جائے ۔

جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَیْمَنَ ۔ پہاڑ کا کوئی دایاں بایاں حصہ نہیں ہوتا ، اس لئے آیت میں دائیں جانب سے وہ سمت مراد ہے جو مصر سے شام کو جاتے ہوئے کوہ طور کے رخ پر ہے ۔

مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۔ طیبات کی دو طرح سے تفسیر کی گئی ہے ۔ حلال اور لذیذ ۔ اگر طیب کے معنی لذیذ لئے جائیں تو کھانے کا حکم بطور اجازت ہے ۔ یعنی لذیذ چیزوں کا کھانا تمہارے لئے جائز ہے ۔

اور اگر لفظ طیبات کا ترجمہ حلال کیا جائے تو کھانے کا حکم بطور وجوب کے ہوگا ۔ یعنی حلال رزق کا کھانا واجب ہے اور حرام رزق کا کھانا حرام ہے ۔

وَلَا تَطْغَوْا فِیْهِ ۔ طغیان کے معنی ہیں حد مقررہ سے تجاوز کرنا اور آگے بڑھنا ۔ آیت میں مراد ہے حلال سے حرام اور جائز سے ناجائز کی طرف بڑھنا ۔ مطلب یہ کہ آرام سے رہو ۔ کھاؤ ، پیو ناشکری اور نافرمانی اور سرکشی مت کرو ۔ آسائش و آرام میں اتنا کر گناہوں میں نہ پڑ جاؤ ۔

فَیَحِلَّ عَلَیْكُمْ غَضَبِیْ ۔ یہودیوں کو خدا تعالیٰ نے پہلے ہی سے تنبیہ کر دی تھی کہ راہ مستقیم پر رہنا ، احتمالی عدہ نہ ہٹنا ورنہ میرا غضب

لازمی طور سے تم پر نازل ہو جائے گا۔ آخرت کے عذاب میں بھی مبتلا ہو گے اور دنیا میں بھی ذلت، مسکنت، محکومی سے دو چار ہونا پڑے گا۔
چنانچہ یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ جب یہودی شریعت کے احکام سے بیزار ہو گئے، انبیاء و صلحاء کو قتل کرنے لگے، سود خواری شروع کر دی، رشوت، خیانت، فریب، دغا اور جھوٹ میں مبتلا ہو گئے تو غضب الٰہی میں گرفتار ہو گئے۔ ہمیشہ کے لئے حکومت و سلطنت سے محروم ہو گئے، ذلت و مسکنت لازم ہو گئی۔ یہودی کہیں ہو دوسری قوموں کے زیر حکومت رہے گا، مسلمانوں کا محکوم ہو گا یا عیسائیوں کا۔

ثُمَّ اهْتَدٰى یعنی جو یہودی سچے دل سے توبہ کر لیں گے، شرک چھوڑ کر توحید کی طرف متوجہ ہو جائیں گے، نبیٔ وقت پر ایمان لائیں گے، فرائض ادا کریں گے اور عمل صالح پر کاربند ہوں گے اور مرتے دم تک راہ ہدایت پر ثابت قدم رہیں گے ان کا قصور معاف کر دیا جائے گا۔

اِهْتَدٰى کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں۔ زجاج کا قول ہے کہ اہتداء سے مراد ہے کہ راہ ہدایت پر مرتے دم تک ثابت قدم رہنا۔
سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ سنت و جماعت پر قائم رہنا مراد ہے۔ ایک روایت میں ابن عباس کا قول ہے کہ اہتداء سے مراد ہے شک میں نہ پڑنا۔
ابن عباس کا تفسیری مطلب بیش بہا مضامین کو حاوی ہے۔ بات یہ ہے کہ کبھی آدمی مسلمان ہو کر نیک عمل شروع کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اگر اس کو دنیوی منافع بدستور سابق حاصل ہوتا رہے تو خیر اور کوئی مالی یا جسمانی نقصان پہنچا تو وہ خیال کرتا ہے کہ مجھ پر یہ مصیبت ایمان یا عمل صالح کی وجہ سے آئی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی ایسا ہوتا تھا۔ بعض دیہاتی حاضر خدمت ہو کر مسلمان ہو جاتے تھے اور جب واپس جاتے اور ان کو کوئی مالی نفع ہوتا تو کہتے واہ کیسا اچھا مذہب ہے جس میں داخل ہوتے ہی مجھے نفع ہوا اور اگر کچھ نقصان ہو جاتا تو دین اسلام کی طرف سے شک میں پڑ جاتے اور خیال کرتے کہ یہ وبال مسلمان ہونے سے مجھ پر آیا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد آدمی اپنے نفس پر دباؤ ڈالنا چاہتا ہے۔ لذت انگیز، تمتع آفرین کو بحکم شریعت ترک کرنا چاہتا ہے، لیکن چونکہ وہ ان کا خوگر ہوتا ہے، اس لئے خواہش نفس کے تحت ان کے جواز کی تاویل کرنے لگتا ہے۔ کبھی کہتا ہے خدا اتنا ظالم نہیں کہ ایسی ضروری مفید چیز کو حرام کر دے جس کو ترک کرنے سے زندگی تلخ ہو جاتی ہے اور انسان متمدن دنیا میں رہنے کے قابل نہیں رہتا۔ خدا نے کب کسی کو ناقابل برداشت تکلیف دی ہے، وہ کہتا ہے کہ شراب ایک لطیف سیال، مفید صحت اور حرارت آفریں شربت ہے۔ آغاز اسلام میں اس کو مصلحتاً حرام کر دیا تھا کہ لوگ خم کے خم چڑھا کر، ہوش و حواس سے عاری ہو کر اچھائی برائی کی تمیز کھو بیٹھتے تھے۔ نہ ان کو اصول حفظان صحت کی پرواہ ہوتی تھی نہ عقل و شعور برقرار رکھنے کا خیال۔ اب چونکہ دنیا ترقی کر کے انتہائی درجہ پر پہنچ گئی ہے اور عقل و شعور کے مغلوب ہونے کا اندیشہ نہیں رہا، اس لئے اگر بقدر ضرورت تھوڑی سی پی لی جائے تو کیا حرج ہے۔ حواس میں تیزی، طبیعت میں جولانی، اعضاء میں چستی اور ہمت میں بلندی پیدا ہونے کا یہ بہترین ذریعہ ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو … تھوڑی سی بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

اسی طرح سود کے متعلق وہ کٹ حجتی کرتا ہے۔ سود وہ ہے جو بنئے لیتے ہیں۔ غریبوں کو روپیہ دے کر قسط وار مضاعف در مضاعف نہایت بے رحمی سے ان سے وصول کرتے ہیں۔ تجارتی سود میں کیا نقصان ہے۔ تجارت کے لئے روپیہ قرض لے کر آٹھ آنہ سینکڑے کا سود دینا اور دس روپیہ سینکڑہ نفع کمانا کون سی غلطی ہے۔ کبھی کہتا ہے تجارتی سود سود ہی نہیں بلکہ اپنے روپے کا جائز نفع ہے۔ اگر کچھ روشن خیال طبقہ ہے تو زنا کو جائز معاہدہ قرار دیتا ہے اور عصمت فروشی عزت بہ کف طبقہ کو قوم کے لئے ضروری جز خیال کرتا ہے۔ اس بندش کو نہ فقط ظلم بلکہ قومی ترقی کیلئے سنگِ راہ سمجھتا ہے۔ چوری کی پاداش میں ہاتھ کاٹنے کو ظلم کہتا ہے۔ بہت سے احکام رسول کو موجودہ زمانے کے لئے غیر مفید بلکہ مضر قرار دیتا ہے اور پھر مسلمان کا مسلمان رہتا ہے۔

یہ سب اغواء شیطانی ہے، اضلال نفسانی ہے، ہوا و ہوس کی بندگی ہے، طبعی خواہشات کی پرستش ہے، اس لئے خدا تعالیٰ نے فرما دیا کہ ایمان و عمل صالح کے بعد یہ بھی لازم ہے کہ آدمی کسی طرح احکام شریعت میں شک نہ کرے ورنہ اس کا ایمان ناقابل اعتبار ہے۔

مقصودِ بیان

بنی اسرائیل کو مختلف احسانات یاد دلا کر ایمان و عمل صالح کی ترغیب۔ دشمن کے پنجہ سے رہا کرانا بہت بڑی نعمت ہے۔ دفع ضرر حصول خیر سے زیادہ قابل وقعت ہوتا ہے۔

اسلاف پر احسان اخلاف کے لئے منت کشی اور احسان مندی کو لازم کردیتا ہے۔

دینی احسان اور شریعتِ حق کا عطیہ بھی موجبِ شکر ہے یعنی قانونِ الٰہی اگر دنیا میں نافذ ہوتا ہے تو خدا تعالیٰ کا اس سے کوئی ذاتی نفع نہیں بلکہ اس پر کاربند ہونا خود انسانوں کے لئے موجبِ سعادت ہے۔

طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ کا لفظ دلالت کررہا ہے کہ رزق دو طرح کا ہوتا ہے۔ حلال اور حرام۔ حلال رزق کا کھانا جائز اور حرام کا کھانا ناجائز ہے، لیکن حلال رزق کو بھی غیر ضروری طور پر کھانا یا استعمال کرنا یا دینا ناجائز ہے، طغیان ہے، حدِ اعتدال سے تجاوز ہے۔

یہودیوں کو وعید کرنے میں در پردہ مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ اگر تم بھی احکامِ خداوندی کی پیروی نہ کروگے اور شریعتِ غرّا پر نہ چلوگے تو تم کو بھی ذلت، نکبت، غلامی، کمزوری، جہالت و افلاس سے دوچار ہونا پڑے گا، اللہ اپنی نعمت تم سے چھین لے گا، تم غضبِ الٰہی میں گرفتار ہو جاؤ گے، لیکن اگر سچے دل سے توبہ کرو گے تو پھر خدا تمہارے قصور معاف کردے گا۔

اس میں درسِ عبرت ہے زمانۂ حاضرہ کے ہندی مسلمانوں کے لئے جو غلام ہیں، محکوم ہیں، ذلیل ہیں، خستہ حال اور بدمآل ہیں، کمزور، بے کس اور بے بس ہیں، جاہل ہیں، مفلس ہیں، پست ہمت، پست قوت اور پست خیال ہیں۔ یہ سب وبال ہے اللہ کے احکام سے سرکشی کا، فرمانِ قرآنی کو نفسانی ہوس رانی کے لئے آلۂ کار بنانے کا، قوم کو مکاری کے جال میں پھنسا کر حرام مال کھانے کا، شریعت کا نام لے کر تسبیح کی آڑ میں شکار کھیلنے کا، تحفے تحائف اور نذرانوں کا نام لے کر مریدوں کی جیبیں کترنے کا اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھوکا مارنے کا۔ مدارس اور یتیم خانوں کے عنوان سے خیانت و غبن کے اڈے قائم کرنے اور چندہ کے نام سے قوم کی جیبوں پر ڈاکہ مارنے کا۔ بزرگانِ دین کی ہڈیاں فروخت کرنے اور عزتِ اسلامی کی پرواہ نہ کرنے کا۔ پس وائے حسرت مشائخِ عظام، علمائے کرام اور لیڈرانِ قوم کی حالت جن کا ظاہر و باطن خوبصورت زہریلے سانپ کے ظاہر و باطن سے کم نہیں۔

وَمَآ أَعْجَلَكَ عَن قَوْمِكَ يَٰمُوسَىٰ ۝ قَالَ هُمْ أُولَآءِ عَلَىٰٓ أَثَرِى وَ

موسیٰ تم کو کون وجہ تمہاری قوم سے جلد لے آئی؟ موسیٰ نے کہا وہ لوگ میرے پیچھے ہیں میں تیری

وَعَجِلْتُ إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضَىٰ ۝ قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنۢ بَعْدِكَ

طرف جلدی چلا آیا تاکہ تو خوش ہو فرمایا ہم نے تمہارے بعد تمہاری قوم کو بلا میں مبتلا کیا

وَأَضَلَّهُمُ ٱلسَّامِرِىُّ ۝ فَرَجَعَ مُوسَىٰٓ إِلَىٰ قَوْمِهِۦ غَضْبَٰنَ أَسِفًا

اور اُن کو سامری نے گمراہ کردیا غرض موسیٰ اپنی قوم کی طرف رنجیدہ ہوکر غصہ میں واپس آئے

قَالَ يَٰقَوْمِ أَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ ٱلْعَهْدُ

کہنے لگے اے قوم! کیا تمہارے رب نے تم سے اچھا وعدہ نہ کیا تھا توکیا تم پر زیادہ زمانہ گزر گیا

أَمْ أَرَدتُّمْ أَن يَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَخْلَفْتُم مَّوْعِدِى ۝

یا تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے رب کا غضب ٹوٹ پڑے اسی لئے تم نے میرے وعدہ کے خلاف کیا

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ

وہ بولے ہم نے اپنے اختیار سے تمہارے وعدہ کا خلاف نہیں کیا بلکہ ہم پر (فرعون کی) قوم کے زیور کا کچھ بار لدا ہوا تھا

الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ۙ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا

اُس کو ہم نے پھینک دیا اسی طرح سامری نے (آگ میں) ڈال دیا پھر سامری نے اُن کے لئے ایک بچھڑا بنا کر

جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۬ فَنَسِيَ ؕ اَفَلَا

نکالا یعنی ایک بدن بنایا جس کی آواز گائے کے ایسی تھی اور بولے یہ تمہارا بھی معبود ہے اور موسیٰ کا بھی معبود ہے پھر موسیٰ بھول گئے (اسے نہیں)

يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۧ

وہ لوگ بھلا یہ بھی نہ دیکھتے تھے کہ وہ اُن کی کسی بات کا جواب دیتا تھا اور نہ اُن کے کسی نفع نقصان پر قدرت رکھتا تھا

ع ۱۴ / ۱۲

تفسیر حضرت موسیٰ جب مصر سے نکلے تھے تو تمام بنی اسرائیل تھے اور عید کے بہانے سے قبطیوں کا زیور بھی لے لیا تھا۔ جب فرعون غرق ہوگیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر شام کی طرف چلے۔ راستے میں بنی اسرائیل کی سرکشی کے سبب ایک لق دق بیابان میں پھنس گئے جس کو وادی تیہ کہا جاتا ہے۔ وہاں کھانے پینے کو کیا رکھا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پروردگار سے دعا کی۔ ان کی دعا سے غیب سے روزانہ منّ (ترنجبین یا ایک خاص قسم کا حلوہ) درختوں پر جمنے لگا اور بٹیریں بھی بکثرت ملنے لگیں، خوب مزے سے گزارا ہونے لگا، لیکن حکم تھا کہ ہر شخص بقدر ضرورت لے، کل کے لئے اندوختہ نہ کرے، لیکن دین کا ثبات، شریعت کا قیام، احکام الٰہیہ کا علم اور کتاب اللہ کا حصول ضروری تھا تاکہ اسرائیلی قوم کے پاس اپنا دستور العمل اور قانون اصلاح ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں حصول کتاب کی دعا کی۔ حکم ہوا ستر بنی اسرائیل کو منتخب کر کے سب کو لے کر طور پہ آؤ اور ایک ماہ کے روزے رکھو (ایک ماہ میں دس روز کا اضافہ بعد کو کر دیا گیا تھا۔ کل چالیس روزوں کا حکم ہوا تھا) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ستر آدمی منتخب کئے اور ان کو لے کر طور کی طرف چل دیئے (سفر خروج باب ۱۹) موسیٰ علیہ السلام کو مناجات و قرب کے شوق نے زیادہ بے قرار کیا تو ساتھیوں سے آگے بڑھ گئے اور سب سے پہلے طور پر جا پہنچے۔ ایک مہینہ کا وعدہ کر گئے تھے وہاں چالیس دن لگ گئے (سفر خروج باب ۲۴)

دس روز کی تاخیر سے لوگوں نے چہ مہ گوئیاں شروع کیں۔ کسی نے کہا موسیٰ کا انتقال ہوگیا، کسی نے کہا خدا کے عتاب میں ماخوذ ہو کر کہیں کو چلے گئے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ ایک شخص سامری بھی تھا جس کا اصلی نام موسیٰ بن ظفر تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی غیبت سے اس نے فائدہ اٹھانا چاہا۔ قوم سے بولا آؤ میں تمہارا معبود دکھاؤں جو تم کو مصر سے نکال کر لایا ہے دیکھو موسیٰ کے لئے حلال نہ تھا کہ قبطیوں کا زیور لے لیتا، اس لئے وہ محبوس ہوگیا اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کل زیور میرے پاس لاؤ تاکہ میں اس کو آگ میں ڈال کر جلا دوں اور موسیٰ کو رہائی ملے۔ بھولے بھالے اسرائیلی سامری کی عیاریاں کب جانتے تھے۔ سب نے بخوشی کل زیور آگ میں ڈال دیا۔ سامری نے سب زیور جلا کر بچھڑے کی شکل کا ایک بت بنا لیا اور وہ خاک جو ایک مرتبہ حضرت جبرئیل کے گھوڑے کے نیچے سے اس نے حاصل کی تھی بچھڑے کے منہ میں ڈال دی۔ بچھڑا ممیانے لگا۔

بعض کا قول ہے کہ کچھ بچھڑے کے حلق کے اندر اُس نے اوتار الصوت بنائے تھے جن سے آواز نکلتی تھی۔

بنی اسرائیل گائے سے بہت زیادہ مانوس تھے۔ مصریوں کو گائے بیل پوجتے دیکھا کرتے تھے۔ مصر سے نکلنے کے بعد ایک قوم کی طرف سے گزرے

تھے جو گائے پرست تھے، گائے کی پرستش ہوتے دیکھ کر ان کے مُنہ میں پانی بھر آیا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے گزارش کی تھی کہ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی معبود مقرر کر دیجئے جیسا اس قوم کا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو جھڑک دیا تھا۔ جب انہوں نے سونے کا بچھڑا بولتا دیکھا تو جذب اندرونی اور اغوائے سامری دونوں نے مل کر اپنا کام کیا اور بچھڑے کے گرویدہ ہو گئے۔ قربانیاں چڑھانے لگے، اس کے سامنے ڈنڈوت اور سجدہ کرتے، اس کے چاروں طرف گھومتے، گھنٹیاں اور ڈھول بجاتے۔ حضرت ہارونؑ موسیٰؑ کے جانشین تھے، انہوں نے ہر چند سمجھایا، لیکن کسی نے نہ مانا بلکہ مارنے کے درپے ہو گئے۔ طُور پر خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو مطلع کیا کہ تیرے بعد تیری قوم گمراہ ہو گئی۔ موسیٰ علیہ السلام غضب ناک حالت میں وہاں سے لوٹے۔ قوم سے کہا کیا خدا تعالیٰ نے تم سے بھلائی کا وعدہ نہیں کیا تھا۔ میں تم سے کہہ کر گیا تھا تم نے میرے وعدے کی خلاف ورزی کی۔ کیا مدت اتنی طویل گزر گئی تھی کہ تم مایوس ہو گئے تھے یا تم نے غضب الٰہی میں مبتلا ہونا چاہا کہ ایسی ناشائستہ حرکت کی۔ لوگوں نے عذر کیا۔ بولے ہم کو سامری نے گمراہ کر دیا ہم نے خود جان بوجھ کر آپ کے حکم کے خلاف نہیں کیا۔ قوم قبط کا زیور ہم ساتھ لائے تھے۔ ہم نے اس کو حسب معمول پگھلانے کے لئے آگ میں ڈال دیا۔ سامری نے بھی ڈال دیا اور پھر اس کا بچھڑا بنا دیا جو بولتا بھی تھا۔ جب چلاتا ہوا بچھڑا تیار ہو گیا تو کہنے لگا یہی تمہارا اور موسیٰ کا معبود ہے۔ موسیٰ اس کو بھول گیا جو کوہ طُور پر خدا سے ملنے گیا تھا۔ غرض ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں۔ ہم سامری کے بہکاوے میں آ گئے۔

تحلیلِ اجزاء

مَا اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِىْ وَ عَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝ حکم الٰہی کے موافق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں سے ستر آدمی منتخب کئے۔ باقی گروہ پر حضرت ہارون کو اپنا خلیفہ بنا دیا اور منتخب آدمیوں کو ساتھ لے کر کوہ طُور کی طرف چل دیئے، لیکن شوقِ مناجات نے جلدی پر آمادہ کیا۔ ہمراہیوں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ طُور پر پہنچے اور صوم و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ یہاں تیس روز کے بجائے پورا چلہ (ایک ماہ ذیقعد اور ابتدائی عشرہ ذی الحجہ کا) صرف ہو گیا۔ جب وقت مناجات آیا تو خدا تعالیٰ نے سبب عجلت دریافت کیا۔ حضرت موسیٰ نے عرض کیا پروردگار! میں میقات پر اس لئے پہلے آ گیا کہ تیری رضا قائم رہے۔ یعنی مجھے اندیشہ ہوا کہ یوں ہی منزل بمنزل سب کے ساتھ آہستہ آہستہ آؤں گا تو شاید تیرے حکم کی تعمیل میں تاخیر ہو جائے۔ رہے ساتھ والے تو وہ بھی میرے نشانِ قدم پر پیچھے آ رہے ہیں۔

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَ اَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ۝ ندائے الٰہی ہوئی۔ تیرے آنے کے بعد ہم نے تیری قوم کو آزمائش و فتنہ میں ڈال دیا۔ سامری نے ان لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ یعنی اب وہ تیرے نقشِ قدم پر نہیں ہیں۔ توحید چھوڑ کر بُت پرستی میں مصروف ہو چکے ہیں۔ مروی ہے کہ سوائے بارہ ہزار کے تمام بنی اسرائیل گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ایک ماہ تک حسب وعدہ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتظار کیا۔ جب مقررہ مدت سے زیادہ دن گزر گئے تو ان کو تشویش ہوئی۔ سامری نے کہا موسیٰ کو طُور پر روک لیا گیا ہے۔ کیونکہ قبطیوں کا زیور وہ ساتھ لائے تھے اور یہ فعل حکم الٰہی کے خلاف تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب زیور لے کر آگ میں ڈال دو۔ سب لوگوں نے سامری کے مشورہ پر عمل کیا۔

سامری کو بعض اہل تاریخ اسرائیلی کہتے ہیں اور اسرائیلیوں کے فرقہ سامرہ سے اس کا نسب ملاتے ہیں، لیکن میں نے جہاں تک تحقیق کی مجھے اسرائیل کا کوئی فرقہ سامری نام کا معلوم نہیں ہوا۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ سامری کرمان کا رہنے والا اجنبی تھا۔ بنی اسرائیل کے ساتھ مصر میں رہنے لگا تھا۔ بعض کا قول ہے کہ باجرما کا رہنے والا تھا جیسا بیضاوی میں ہے کہ باجرما ایک گاؤں کا نام تھا جو مصر کے قریب تھا۔ لیبی نے موصل کا گاؤں قرار دیا ہے۔ سامری کا نام موسیٰ بن ظفر اور بقول ابن کثیر ہارون تھا۔

فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۝ پیام الٰہی سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توریت کی تختیاں ساتھ لیں اور غضب ناک حالت میں لوٹے۔ واپس آ کر دیکھا کہ سونے کا ایک بچھڑا ہے جس کے مُنہ سے بے تلفظ آواز نکل رہی ہے۔ سامنے ڈھولک بج رہی ہے اور لوگ اس کے چاروں طرف وجد میں آ کر ناچ رہے ہیں۔

امام قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ امام ابوبکر طرطوسی سے دریافت کیا گیا۔ آج کل ایک جماعت ہے جو بکثرت یادِ الٰہی کرتی ہے۔ اُن کے جلسہ

میں بعض لوگ ڈھول بجاتے ہیں تو ان میں سے بعض آدمی کھڑے ہو کر وجد میں آکر رقص کرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ بے ہوش ہو کر گر پڑتے ہیں پھر کچھ شیرینی آتی ہے اس پر فاتحہ ہوتی ہے اور پھر سب مل کر کھاتے ہیں۔ کیا ایسے جلسہ میں شریک ہونا جائز ہے؟

امام طرطوسی نے فرمایا خدا تم پر رحم فرمائے۔ صوفیوں کا یہ مسلک گمراہی اور جہالت ہے۔ اسلام تو صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا نام ہے۔ رہا ناچنا اور وجد کرنا تو اس کی ابتدا سامریوں کے آدمیوں سے ہوئی۔ یہ فعل کافروں کا ہے انہی کا طریقہ ہے۔ رہی طبل نوازی تو اس کا آغاز بھی بے دینوں سے ہوا۔ اس ایجاد سے ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو کتاب اللہ سے پھیر دیں۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی مجلس تو بہت باوقار ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ سلطان وقت اور ان کے نائبوں پر لازم ہے کہ ایسے لوگوں کو مساجد وغیرہ میں نہ آنے دیں۔ جس شخص کا ایمان اللہ اور روز قیامت پر ہو اس کے لئے حلال نہیں کہ ایسے لوگوں کے جلسوں میں شریک ہو یا اس معاملے میں ان کی اعانت کرے۔ امام مالکؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد وغیرہ کا یہی مسلک ہے (انتہی نقلاً عن الفتح)

اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا۔ وعدۂ حسن سے مراد (بیضاوی) کے نزدیک عطائے تورات ہے۔ بعض کے نزدیک وعدۂ جنت مراد ہے۔ تفسیر مدارک میں علامہ نسفی نے بیان کیا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ ایسی کتاب نازل کروں گا جس میں ایک ہزار سورتیں ہوں گی اور ہر صورت میں ہزار آیات ہوں گی۔ نسفی کی مراد یہ ہے کہ وعدۂ الٰہی اطاعت بنی اسرائیل اور استقامت دینی پر مشروط تھا مطلب یہ تھا کہ اگر تم لوگ دین پر قائم رہو گے اور اللہ کی اطاعت کرو گے تو ایک مفصل کتاب تم کو عنایت کی جائیگی اور چونکہ انہوں نے سرکشی اور نافرمانی کی اس لئے مفصل کتاب نازل نہ ہوئی بلکہ بہت ہی مختصر تورات ملی۔

بعض لوگوں کے نزدیک فتح شام کا وعدہ مراد ہے۔ میرے نزدیک صحیح وہ قول ہے جس کی ابن کثیر نے صراحت کی ہے کہ تم کو خدا تعالیٰ بشرط اطاعت و فرماں پذیری دین و دنیا کی ہر بھلائی عنایت کرے گا۔ بس یہی خدا تعالیٰ کا وعدہ تھا۔

فَنَسِيَ۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ تذکرہ بھول گئے تھے کہ یہ گوسالہ تمہارا دیوتا ہے۔ عنت میں خدا کو طور پر ڈھونڈنے گئے ہیں۔ یہ کلام سامری کا تتمہ ہے۔ کذا روی عن ابن عباس عن طریق مجاہد۔

بعض لوگوں نے سامری کی طرف ضمیر راجع کی ہے یعنی سامری بھول اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت سابقہ اس کو یاد نہیں رہتی (کذا قال ابن الاعرابی وروی عن ابن عباس عن طریق عکرمہ) موخر الذکر قول ضعیف ہے۔

اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۝ ۔ یہ قول خداوند تعالیٰ کا ہے اور بنی اسرائیل کی جہالت وحماقت پر مخصوص نوع زور نفس ہے کہ وہ بچھڑا جواب بھی نہیں کر سکتا تھا اور نہ نفع نقصان پہنچانا اس کے قبضہ میں تھا اس کے سامنے سر بسجود ہو گئے حالانکہ فرعون کی پرستش کا انکار کر چکے تھے۔

مقصود بیان

خدا کے خاص بندوں کی ہر نقل و حرکت اذنِ الٰہی کے بغیر نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ کسی نیکی کی طرف اقدام و سبقت بھی وہ بغیر اجازت نہیں کرتے اور اگر کبھی زیادتی شوق اور خلوص خاطر کی بنا پر (اپنے اجتہاد سے قبل از اذن الٰہی) وہ کوئی خاص نیکی کرتے ہیں تو ان سے بازپرس ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پر پہلے چلے آئے اور ساتھیوں کو پیچھے چھوڑ آئے تو اگرچہ اس سبقت کا موجب جذبۂ خلوص اور ازدیادِ خیر تھا مگر پھر بھی وجہ تعجیل کے متعلق بازپرس ہو گئی۔ حضرت موسیٰ نے جو کچھ جواب دیا وہ تعلیم دے رہا ہے اس امر کی کہ ہر مومن کے پیش نظر مرضیٔ الٰہی کا حصول ہونا چاہیئے۔

فَتَنَّا قَوْمَكَ کا لفظ بتا رہا ہے کہ اسباب ضلالت کا اجتماع بھی خدا کی طرف سے امتحان ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائش ہر طرح سے کرتا ہے۔

اَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ۔ درحقیقت تو گمراہ کرنا خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے، لیکن سبب کی طرف فعل کی نسبت کر دی جاتی ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل کی گمراہی کا سبب سامری کا فعل تھا، اس لئے سامری کو گمراہ کن قرار دیا، اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ انسان مجبور نہیں بلکہ مختار ہے۔ اگرچہ خالق نہیں؛

مگر فاعل و کاسب ضرور ہے اور اسی پر سزا و جزا مرتب ہوتی ہے۔

غَضْبَانَ اَسِفًا کا لفظ یہ تعلیم دے رہا ہے کہ حکم الٰہی کی خلاف ورزی اور شریعت غرا کی مخالفت ہوتے دیکھ کر مومن کو غصہ آنا لازم ہے

قانونِ خداوندی کی شکست مومن کے جذبۂ اندرونی کو مشتعل کر دیتی ہے۔

پوری آیات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل بہت سادہ لوح قوم تھی، لیکن موجودہ زمانے کے مسلمانوں سے کم۔ کیونکہ انہوں نے سونے کے بچھڑے کو چلاتے دیکھا تھا، اس لئے گمراہ ہوگئے اور یہ خیال نہ کیا کہ معبود کا خود مختار اور قادر مطلق ہونا ضروری ہے۔

مگر اس دور کے مسلمانوں کو تو ادنیٰ فریب کار صوفی مولوی اور پیر معمولی باتوں سے گمراہ کر دیتے ہیں۔

بھوت، آسیب، شہید اور وہ تمام موہوم ہستیاں جو بالکل مجہول الحقیقت اور معدوم الخلقت ہیں آج کل کے عام مسلمانوں کو گمراہ کرنے کو کافی ہیں۔ وہ مٹی کا ڈھیر جو نہ بولتا ہے نہ نفع نقصان پہنچا سکتا ہے نہ یہ معلوم کہ اس کے اندر کبھی کوئی دفن بھی ہوا تھا نہ وہ کوئی غیر معمولی کشش رکھتا ہے۔ عوام بلکہ خواص کا مرکز توجہ بنا ہوا ہے۔

اور مزید گمراہی یہ کہ مسلمانوں کو ہر مٹی کے ڈھیر پر سجدہ ریز دیکھ کر اور رقص و سرود کی محفلیں اور فحش و بے حیائی کی وارداتیں قبروں اور مزاروں کے آس پاس ملاحظہ کر کے اہل عالم کو نہ غصہ آتا ہے نہ تأسف ہوتا ہے۔ کاش کوئی موسیٰ پیدا ہو جائے اور اس گروہ کو ہدایت کرے وغیرہ۔

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ

اور ہارون نے اُن سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اے میری قوم محض تمہاری آزمائش کی گئی ہے اور تمہارا رب تو رحمٰن ہے

فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ۝ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ

میری راہ پر چلو اور میرا کہنا مانو وہ بولے ہم تو اسی پہ جمے بیٹھے رہیں گے تاوقتیکہ موسیٰ ہمارے پاس

اِلَيْنَا مُوْسٰى ۝ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۝ اَلَّا تَتَّبِعَنِ

لوٹ کر نہ آجائے موسیٰ نے کہا ہارون! جب تو نے دیکھا تھا کہ یہ گمراہ ہوگئے تو کیا وجہ مانع ہوئی کہ تم نے میری پیروی نہ کی

اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۝ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ اِنِّيْ

کیا تم نے میری حکم عدولی کی؟ ہارون نے کہا میرے ماں جائے میری داڑھی نہ پکڑ اور نہ سر کے بال پکڑو واقعی

خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ۝

مجھے یہ ڈر تھا کہ تم کہو گے تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور میری بات کا لحاظ نہ کیا

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ۝ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ

موسیٰ نے کہا سامری تیرا کیا حال ہے؟ سامری نے کہا میں نے وہ چیز دیکھی تھی جو اوروں نے نہیں دیکھی تھی میں نے

فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ

فرشتہ کے نقشِ قدم کی ایک مٹھی خاک لے لی اور (بچھڑے کے اندر) ڈال دی میرے دل نے یہی صلاح

لِي نَفْسِي ۝ قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَن تَقُولَ لَا مِسَاسَ ۖ وَ

دی موسیٰ نے کہا تو جا زندگی میں تیری یہ سزا ہے کہ تو کہتا پھر مجھے ہاتھ نہ لگانا اور

إِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّن تُخْلَفَهُ ۖ وَانظُرْ إِلَىٰ إِلَٰهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ

تیرے لئے ایک وعدہ کا وقت مقرر ہے جس کا خلاف تجھ سے نہ کیا جائے گا اور اپنے اُس معبود کو دیکھ جس پر تو جما بیٹھا

عَاكِفًا ۖ لَّنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ۝ إِنَّمَا إِلَٰهُكُمُ اللَّهُ الَّذِي

تھا کہ ہم اُس کو جلائیں گے پھر اُس کو دریا میں بالکل بکھیر دیں گے بس تمہارا معبود تو وہی اللہ ہے جس

لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۝

کے سوا کوئی معبود نہیں اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے

تفسیر حضرت ہارون نے جب بنی اسرائیل کو گوسالہ پرستی میں مبتلا دیکھا تو سوچا مجھے اب کیا کرنا چاہیئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو حکم دیا تھا کہ میری جگہ اپنے قوم کی اصلاح کرنا، اہلِ فساد کے راستے پر نہ چلنا، قوم میں پھوٹ نہ ڈالنا۔ غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر اہلِ توحید کی جماعت لے کر گوسالہ پرستوں سے قتال کرتا ہوں اور ان کا بالکل مقاطعہ کرتا ہوں تو بنی اسرائیل میں پھوٹ پڑ جائے گی، دو فرقے ہو جائیں گے اس لئے مناسب یہی ہے کہ حضرت موسیٰ کی واپسی تک قوم سے الگ ہو جاؤں (سراج) اور چونکہ حضرت ہارون کی کنارہ کشی سے گوسالہ پرستوں کو فائدہ پہنچا۔ کیونکہ سامری نے بھی یہی کہا تھا کہ جب تک موسیٰ علیہ السلام لوٹ کر نہ آئیں تم گوسالہ کے سامنے سجدہ ریز رہو، اس لئے حضرت ہارون کا یہ فعل حضرت موسیٰ کی نظر میں قابلِ مواخذہ قرار پایا۔ حضرت ہارون میں اس شر کو ہاتھ سے دفع کرنے کی طاقت نہ تھی، مگر زبان سے ضرور نصیحت کر سکتے تھے اور ان کی خاصیت ہے کہ شر کو دور کرنے کی ہر امکانی کوشش کرتے ہیں، اس لئے بنی اسرائیل کو زبانی نصیحت بہت کچھ کی۔ سب سے پہلے ان کو اس ناشائستہ حرکت پر زجر و توبیخ کی اور فرمایا لوگو درحقیقت یہ تمہاری آزمائش ہے، تمہارے ایمان کی صداقت، و پائیداری کا امتحان کرنا مقصود ہے۔ الہٰذا تم توحید پر قائم رہو۔ اس کے بعد معرفت الٰہیہ کی طرف متوجہ فرمایا اور فرمایا دیکھو تمہارا رب تو وہ ہے جس کے احسانات ہمیشہ سے ہیں۔ گزشتہ زمانے میں اس نے تم پر بڑے بڑے احسانات کئے ہیں وہ تمہارا محسن ہے، اس کا کوئی مشابہ نہیں۔ تبلیغ توحید کے بعد اقرار نبوت کی طرف مائل کیا، اور فرمایا لوگو۔ تم میرے پیچھے چلو یعنی میں تمہارا امام ہوں، جس راستے پر میں چل رہا ہوں اسی پر چلو۔ آخر میں اتباعِ شریعت کا حکم دیا اور فرمایا لوگو! میرے حکم کو مانو۔ میں جو کچھ کہوں اس کو قبول کرو۔ جب زجر و توبیخ، اعلان توحید، تبلیغ نبوت اور اظہار شریعت کر چکے تو کمبخت بے دین بولے یہ تمہاری تقریر فضول ہے۔ ہم تو موسیٰ کی واپسی تک اس فعل سے باز نہیں آئیں گے۔ اسی حالت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آگئے۔ قوم کو لعنت ملامت کی پھر حضرت ہارون کی طرف متوجہ ہوئے۔ داڑھی اور سر کے بال پکڑ لئے اور بولے تو نے میرا حکم کیوں نہیں مانا، میرے قول پر کیوں نہیں چلا۔ حضرت ہارون نے عاجزانہ طریقہ پر کہا۔ بھائی میرے بال نہ کھینچو، مجھے رسوا نہ کرو۔ میں نے آپ ہی کے حکم کی تعمیل کی۔ اگر میں اپنی جماعت کو لے کر گوسالہ پرستوں سے مقابلہ کرتا تو

بنی اسرائیل میں پھوٹ پڑ جاتی اور پھر آپ کہتے تو نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا، اس لئے میں خود علیحدہ ہو گیا۔

پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سامری کی طرف متوجہ ہوئے اور اس شرک انگیزی کی وجہ دریافت کی۔ سامری نے کہا میں نے رسول کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے کچھ مٹی لے لی تھی وہ اس بچھڑے کے منہ میں ڈال دی۔

بات یہ ہوئی تھی کہ جب بنی اسرائیل دریا میں داخل ہوئے اور فرعون نے اپنی فوج لے کر ان کا تعاقب کیا تو دونوں جماعتوں کے درمیان حضرت جبرئیل بصورت بشری ایک گھوڑے پر سوار آکر کھڑے ہو گئے۔ اس گھوڑے کا قدم جس خشک زمین پر پڑتا تھا وہاں سبزہ اگ جاتا تھا۔ سامری نے یہ کیفیت دیکھ لی اور گھوڑے کے قدم کے نیچے کی مٹی مٹھی بھر کر لے لی اور یہی مٹی بچھڑے کے پیٹ میں ڈال دی۔ مال تو وہی تھا جو فریب کر کے کافروں سے لیا گیا تھا اور مٹی تھی برکت کی۔ حق و باطل کے اختلاط سے ایک کرشمہ پیدا ہو گیا۔ وہ بچھڑا اچھلنے لگا۔ اسی قسم کی چیزوں سے بت پرستی پیدا ہوتی ہے۔

غرض موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو بددعا دی اور فرمایا جا کمبخت تو سدا یہی کہتا رہے گا کہ دیکھو مجھے مت چھونا۔ پیغمبر کی بددعا کا یہ اثر ہوا کہ سامری کسی کے پاس نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اگر کوئی اس کو چھو لیتا تو دونوں کو بخار چڑھ آتا تھا۔ جنگلوں میں سب سے الگ مارا مارا پھرتا تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کو جذام ہو گیا تھا، اس لئے لوگ اس کی ہوا سے بچتے تھے۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے کو توڑ کر جلا کر اس کی خاک ذرہ ذرہ کر کے دریا میں بہا دی اور آخر میں تبلیغ توحید کی۔

تحلیلِ اجزاء

قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْۤا اَلَّا تَتَّبِعَنِ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون سے کہا کہ جب قوم کو تم نے گمراہ ہوتے دیکھا تھا تو میری اتباع کیوں نہ کی۔ اتباع کرنے کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں:۔

اوّل یہ کہ تم نے ان ظالموں کا مقابلہ کیوں نہ کیا، میری سیرت اختیار کیوں نہ کی؟

دوئم یہ کہ ان کو چھوڑ کر طور پر آکر مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔ اوّل معنی اظہر ہیں۔

فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ الخ لفظ ابن عباس کے نزدیک اس آیت میں دیکھنے سے مراد ہے جاننا۔ گویا بَصُرْتُ کا ترجمہ ہوا عَلِمْتُ

عام مفسرین کے نزدیک یہ معنی ہیں کہ جبرئیل خاص مجھی کو دکھائی دئے اوروں کو نہیں۔ پس میں نے ان کے گھوڑے کے قدم کے نیچے کی مٹی مٹھی بھر لی۔ اسی مطلب کو اگر صحیح مان لیا جائے تو کئی باتیں ماننی پڑتی ہیں۔ اوّل یہ کہ رسول سے مراد جبرئیل ہیں۔ دوئم سامری کے قول کو سچ مانا جائے کہ اس نے جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا۔ سوئم یہ کہ بعض اہلِ ضلالت کو وہ غیبی مخلوق نظر آتی ہے جو عام اہلِ ایمان کو نظر نہیں آتی۔ چنانچہ سامری نے جبرئیل علیہ السلام اور ان کے گھوڑے کو دیکھ لیا باوجودیکہ عام بنی اسرائیل نے نہیں دیکھا۔

یہ تینوں امور قرآن و احادیث میں کہیں مذکور نہیں بلکہ آخری نمبر کی تردید تو اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو بکثرت محدثین نے روایت کیا ہے کہ فرشتہ کو وہی دیکھ سکتا تھا جو متبع ہو پھر سامری کس طرح دیکھ سکا۔ اسی بنا پر ابو مسلم نے صراحت کی ہے کہ رسول سے مراد موسیٰ ہی ہیں جبرئیل نہیں اور اثر سے مراد ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طریقہ اور اثر پر قابض ہونے کے معنی ہیں پیروی کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ سامری پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیرو تھا پھر خدا پرستی کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار کی اور دوسروں کو بت پرست بنانے کے اسباب فراہم کئے۔ امام فخرالدین رازی نے اسی معنی کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے واللہ اعلم۔

وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ حسن، قتادہ اور ابو نہیک نے اس آیت کا تفسیری ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ تجھے عذاب دنیا کے بعد آخرت میں ضرور جانا ہے یعنی قیامت کے دن تجھ کو ضرور اٹھایا جائے گا۔ اس مطلب کی بنا پر سامری کے لئے عذاب آخرت یا نجات آخرت کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ ابن کثیر اور بیضاوی نے یہی مطلب کو مجمل چھوڑ دیا ہے۔

بعض غیر معروف اہل تفسیر نے اس آیت کو وعید عذاب آخرت پر محمول کیا ہے۔

خطیب نے سراج میں مطلب اس طرح لکھا ہے کہ مرنے کے بعد تیرے بعثت ضرور ہو گی۔ اگر زندگی میں تو یہ کہہ لے گا تو آخرت میں نجات

مل جائے گی اور دنیوی عذاب ہی پر اکتفا کیا جائے گا اور اگر توبہ نہ کی تو علاوہ عذاب دنیا کے آخرت کے عذاب میں بھی مبتلا ہوگا۔ میرے نزدیک یہی مطلب زیادہ مناسب ہے۔

فِی الْیَمِّ نَسْفًا۔ صاحب درمنثور نے بروایت حاکم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک مفصل قول نقل کیا ہے جس کے آخر میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دریا کے کنارے پر گوسالہ کو ریتیوں سے ریتوایا اور ذرات کو دریا میں بہا دیا۔ جب سب لوگوں نے اس دریا کا پانی پیا تو جن لوگوں نے گوسالہ کی پرستش کی تھی ان کے چہرے زرد پڑ گئے۔ اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے گوسالہ پرستوں کو باہم قتال کا حکم دیا اور سب نے مل کر ایک دوسرے کو قتل کیا۔ یہاں تک کہ ستر ہزار آدمی مارے گئے۔ اس کے بعد توبہ قبول ہوئی اور قتل کا حکم منسوخ ہوا۔

مقصود بیان

حضرت ہارونؑ نے قوم کو نصیحت کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا اس سے یہ تعلیم مستفاد ہوتی ہے کہ وعظ کرنے کے وقت سب سے اوّل گناہوں پر زجر، پھر اللہ کی توحید اور خصوصی صفات کا تذکرہ اس کے بعد رسالت کی تبلیغ اور آخر میں نبوت کی تلقین کرنی چاہیے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارونؑ کی جو گرفت کی اس سے دو امر ظاہر ہوتے ہیں:- (۱) سب سے پہلے قابل گرفت وہ لوگ ہیں جو پوری قوم میں دانشمند اور سب سے بڑے عالم ہوں۔ اُن کی گرفت نہ فقط اس امر پر ہونی چاہیے کہ وہ مرتکب جرم ہوئے بلکہ دوسروں کو جرم کرتے دیکھ کر برداشت نہ کرنا بھی ان کا جرم ہے اور سخت مواخذہ کے قابل ہے۔ (۲) اظہار حق اور حکم شریعت میں کسی قرابت، رشتہ داری اور برادری کی پرواہ نہ ہونی چاہیے قریب ترین عزیز یہاں تک کہ حقیقی بھائی بھی اگر قانونِ شریعت کی خلاف ورزی کرے تو سخت ترین مواخذہ کا مستوجب ہے۔

لفظ فَرَّقْتَ صاف تعلیم دے رہا ہے کہ جمعیت اسلامیہ اور گروہ اہلِ توحید میں پھوٹ ڈالنا اور تفرقہ پیدا کرنا سخت جرم ہے۔ حضرت ہارون نے (اپنی اجتہادی غلطی سے) گوسالہ پرستوں کو غیر اللہ کی پرستش سے روکنے کو باعثِ تفریق خیال کیا تھا، مگر واقع میں وہ علمبردارانِ توحید کی جمعیت میں تفرقہ اندازی نہ تھی بلکہ اعلانِ حق اور اظہارِ صداقت اور تقویتِ اسلام تھی۔

سامری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو جواب دیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض اوقات غیبی مخلوق کافروں کو بھی نظر آجاتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کو جو دنیوی سزا دی اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ اہلِ بدعت و فساد کو جمعیت اسلامیہ سے خارج کر دینا چاہیے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سامری کے بنائے ہوئے بچھڑے کو ریزہ ریزہ کر کے جلا کے دریا میں بہا دیا۔ اس سے تنبیہ کرنی مقصود ہے اس امر پر کہ جن اسباب و ذرائع سے شرک پیدا ہونے کا اندیشہ ہو ان کی بیخ کنی کرنی فرض اولیں ہے وغیرہ۔

نوٹ

شیخ محی الدین ابن عربی نے اس مقام پر ایک عجیب و غریب اور لطیف ترین تحقیق کی ہے۔ اگر ہم چند الفاظ بطور اختصار نقل کر دیں تو فائدہ سے خالی نہیں۔ ابن عربی کے نزدیک موسیٰ سے مراد قلب ہے، ہارون سے مراد عقل، بنی اسرائیل سے مراد روحانی اور جسمانی قوتیں ہیں اور سامری سے مراد نفسانی قوتیں۔ ابن عربی نے فرمایا عقل قلب کا خلیفہ ہے۔ روحانی و جسمانی قوتوں کو درست کرنا اور ان کی اصلاح کرنا اسی کا کام ہے۔ عقل کو مقام استقامت میں رکھنے کے لئے ریاضت، مجاہدہ، دوامِ اطاعت اور حُسنِ عمل کی ضرورت ہے ورنہ کسی طرح روحانی اور جسمانی قوتوں کی اصلاح اس سے نہ ہو سکے گی اور سامری یعنی نفسانی قوتوں کا اس پر جوش و ہجوم ہو جائے گا اور حواس کی طرف میلان ہو کر وہ خواہشات کی آگ بھڑکائے گا اور صورت طبعیہ بصورت گوسالہ متمثل ہو گی جس طرح بیل کا کام سوا کھانے پینے کے کچھ نہیں۔ اسی طرح طبیعت انسانیہ کا کام بھی سوا حصول خواہشات کے اور کچھ نہیں رہے گا، اس لئے عقل کے لئے لازم ہے کہ اگر وہ قلب کی خلیفہ بننا چاہتی ہے تو سب سے پہلے ریاضت و مجاہدہ کرے، حُسنِ عمل کی خوگر ہو تاکہ پہلے خود اس کو مقام استقامت حاصل ہو پھر روحانی و جسمانی قوتوں کا تزکیہ کر سکے۔ انتہیٰ۔

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ

(اے نبی) ہم تم سے کچھ گزشتہ حالات بیان کرتے ہیں اور اپنے پاس سے

مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ۚۖ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

ہم نے تم کو قرآن عطا کیا ہے جو لوگ اس سے اعراض کریں گے وہ قیامت کے دن بڑا بار

وِزْرًا ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ۙ يَّوْمَ

اٹھائیں گے جس میں ہمیشہ رہیں گے اور قیامت کے دن اُن کے لئے بڑا بوجھ ہوگا جس دن

يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا ښ

کہ صور پھونکا جائے گا اور اس روز مجرموں کو ہم کبود چشم اٹھائیں گے

يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ۝ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ

وہ باہم چپکے چپکے کہتے ہوں گے کہ تم لوگ (دنیا میں) صرف دس دن ٹھہرے ہو گے جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں ہم خوب واقف ہیں

اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ۝ۧ

جب کہ ان میں بہتر طریقہ والا کہے گا کہ تم تو صرف ایک ہی دن رہے تھے

ع ۵ ۱۴

تفسیر قرآن پاک میں مختلف قصص اور گزشتہ تاریخی واقعات بیان کیے گئے ہیں ان کے چند فوائد ہیں۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو گزشتہ واقعات کا علم ہو جائے۔ شانِ رسالت کی عظمت میں اضافہ ہو جائے، آپ کے دل کو تسلی ہو جائے، کفارِ عرب خصوصاً قریش کے انکار اور سرتابی سے جو اندوہ و ملال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتا تھا وہ دور ہو جائے اور آپ یہ سمجھ لیں کہ فقط میری قوم ہی میری تکذیب نہیں کر رہی ہے بلکہ گزشتہ اقوام نے انبیاء کے گوناگوں معجزات دیکھ کر بھی ہمیشہ سرتابی کی ہے، معجزات و آیات میں اضافہ ہو۔ کیونکہ گزشتہ واقعات کو بغیر کسی غلطی کے بیان کرنا صرف انہی لوگوں کا کام ہے جو پڑھے لکھے ہوں اور تاریخ سے مہارت رکھتے ہوں۔ ایک بے پڑھے لکھے آدمی کو جو اہلِ علم کی صحبت میں بھی نہ بیٹھا ہو نہ سیکھا ہو بغیر وحیِ الٰہی کے تمام واقعاتِ ماضیہ کا علم کس طرح ہو سکتا ہے، سننے والے کو بھی عبرت ہو کہ انکار کا نتیجہ جو پہلی قوموں کو اٹھانا پڑا وہی ہم کو بھی اٹھانا پڑے گا، اہلِ اسلام کے ایمان میں پختگی پیدا ہو، وہ اہلِ عناد جو طرح طرح کے معجزات پر ہٹ کرتے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ جب تک کوئی عظیم الشان معجزہ نمایاں نہ ہوگا ہم ایمان نہ لائیں گے، ان کے زعم کا ابطال ہو جائے اور ان کو یہ نصیحت مل جائے کہ ایک معجزہ کا انکار گویا کل معجزات کا انکار ہے، جس کو ایک معجزہ کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا اس کو لاتعداد معجزات بھی ہدایت یاب نہیں کر سکتے۔

بیانِ قصص کے یہ مختلف فوائد ہیں۔ انہیں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے انبیائے سابقین کے جو واقعات بیان کئے اُن سے مقصود صرف نصیحت کرنا ہے۔ جس طرح ہم نے ان کو مختلف معجزات عطا کئے تھے اسی طرح ایک عظیم الشان قرآن تم کو عطا کیا جس میں

دین و دنیا کے تمام ضروری مسائل اور عقیدہ و عمل کے تمام اصلاحی قوانین کا تذکرہ ہے۔ اب جو شخص اس قرآن کی صداقت کا انکار کرے گا وہ قیامت کے دن دوامی عذاب میں مبتلا ہوگا۔ الخ۔

تحلیلِ اجزاء

مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا۔ ذکر سے مراد ہے قرآن پاک اور اس میں تنوین تعظیم کی ہے۔ یعنی عظیم الشان قرآن (سراج و کبیر وغیرہ) چونکہ قرآن میں عقیدہ و عمل سے تعلق رکھنے والے تمام اصلاحی امور کا تذکرہ ہے، علوم ظاہری اور اسرار باطنی کا بیان ہے، روحانی کمالات کے حصول اور دین و دنیا میں کامراں ہونے کے طریقوں کا انلہار ہے، اس لئے اس کو ذِکر کہا جاتا ہے۔

مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا خٰلِدِيْنَ فِيْهِ۔ اعراض سے مراد ہے روگردانی بصورت انکار۔ یعنی جو شخص قرآن کی صداقت کا انکار کرے گا وہ دوامی عذاب کا مستحق ہوگا۔

یہ حکم ہر شخص کے لئے عام ہے۔ خواہ مغرب کا باشندہ ہو یا مشرق کا۔ افریقہ کا سیاہ فام غلام ہو یا امریکہ کا عیار تاجر، یورپین ہو یا ایشیائی بہرحال قرآن کی تصدیق اُخروی نجات کے لئے ہر شخص پر لازم ہے۔

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ۔ پہلی مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو سب مر جائیں گے پھر چالیس سال بعد دوبارہ پھونکا جائے گا تو سب زندہ ہو جائیں گے آیت میں دوبارہ پھونکنا مراد ہے۔

صُوْر ایک بہت بڑے سینگ کا نام ہے جو اسرافیل پھونکیں گے۔ اہلِ سُنت کے نزدیک عقیدۂ صور برحق ہے۔ احادیث کی صحیح کتابوں میں ابوہریرہ اور دیگر راویوں کی روایت سے اس کا تذکرہ آیا ہے۔

وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا۔ دوبارہ زندہ ہونے پر مجرموں کی آنکھیں ازرق ہوں گی۔ اَزْرَق کے ترجمہ میں اہلِ تفسیر کے اقوال مختلف ہیں۔ بیضاوی اور خطیب نے لکھا ہے کہ قیامت کے ہولناک امور دیکھنے کے سبب کافروں کی آنکھیں کرنجی سبزی مائل بلی کی آنکھوں کی طرح ہوں گی۔ اہلِ عرب کے نزدیک ایسی آنکھیں منحوس اور معیوب سمجھی جاتی ہیں۔

فراء نے کہا کہ آنکھوں کے ازرق ہونے سے مراد ہے نابینا ہونا۔ بیضاوی کا ایک قول بھی یہی ہے یعنی ہول و خوف کی شدت سے آنکھوں کی پتلیاں پھٹ جائیں گی یا کثرتِ نور سے کافروں کی آنکھیں اندھی ہو جائیں گی، کیونکہ کفر کے سبب اُن کی آنکھوں میں نور کو دیکھنے کی طاقت نہ ہوگی۔

بعض لوگوں نے حیرت و استعجاب سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کو آنکھوں کا ازرق ہونا کہا ہے۔ گویا زرق البصر کا ترجمہ ہوا شخوص البصر۔

ابن عباس نے فرمایا قیامت کے مقامات و احوال متعدد ہیں۔ اس تقدیر پر یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ بوقت حشر کافروں کی آنکھیں اچھی خاصی بینا ہوں گی پھر قیامت کی ہولناکی دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی پھر نیلی ہو جائیں گی اور آخر میں سب نابینا ہو جائیں گے۔

اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا۔ عشرہ میں راتیں بھی شامل ہیں یعنی دن رات (کذا قال صاحب الکشاف)

مدت کا یہ اندازہ یا تو قیام قبر کے متعلق ہوگا یا دونوں مرتبہ صور پھونکنے کے درمیانی مدت کا۔ بیضاوی نے صراحت کی ہے کہ اس سے مراد دنیوی زندگانی ہے۔ یعنی دنیوی زندگی کو وہ لوگ ہفتہ عشرہ کی برابر سمجھیں گے یہی مطلب اظہر ہے۔

مقصودِ بیان

قصص قرآنیہ کے فوائد کی طرف بلیغ اشارہ۔ قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی صراحت اور اس امر کی جانب لطیف ایماء کہ قرآن کے اندر عقائد و اعمال کی اصلاح کے تمام ضروری قواعد مذکور ہیں اور دین و دنیا کی کامرانی کے تمام ضوابط واصول اس میں بیان کر دئے گئے ہیں۔ منکرینِ قرآن کے دوامی جہنمی ہونے کی صراحت اور قیامت کے ہولناک منظر کا بیان۔

نفخ صور کی حقانیت کا اظہار اور اس بات کی توضیح کہ قیامت کے دن دنیوی زندگی بہت ہی قلیل محسوس ہوگی۔ جو لوگ زیادہ دقیق الفہم، دانش مند اور صائب الرائی ہوں گے وہ اس روز دنیوی زندگی کی مقدار کو ایک دن سے زائد نہیں کہیں گے وغیرہ۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا ۝ فَيَذَرُهَا

(اے نبی) تم سے لوگ پہاڑوں کا حال پوچھتے ہیں تم کہہ دو میرا رب ان کو ریزہ ریزہ کرکے بکھیر دے گا پھر زمین کو

قَاعًا صَفْصَفًا ۝ لَّا تَرَىٰ فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا ۝ يَوْمَئِذٍ

ہموار میدان کردے گا کہ تم کو اس میں نشیب و فراز نظر نہ آئے گا اس روز

يَتَّبِعُونَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهُ ۖ وَخَشَعَتِ الْأَصْوَاتُ لِلرَّحْمَٰنِ

سب پکارنے والے کی آواز کے پیچھے ہولیں گے ادھر ادھر نہ مڑیں گے اور رحمٰن کے ڈر سے سب کی آوازیں پست ہوں گی

فَلَا تَسْمَعُ إِلَّا هَمْسًا ۝ يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ

صرف گنگناہٹ سنائی دے گی اس روز سوائے اس شخص کے کہ جس کو رحمٰن اجازت دیدے

لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ

اور اس کی بات کو پسند کرے کسی کی سفارش کام نہ آئے گی وہی جانتا ہے جو لوگوں کے آگے پیچھے ہے

وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ۝ وَعَنَتِ الْوُجُوهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّومِ ۖ وَقَدْ

اور لوگوں کا علم اسے احاطہ نہیں کرتا اور حیّ و قیوم کے سامنے چہرے جھک جائیں گے اور جس

خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ۝ وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ

نے ظلم کا بوجھ اٹھایا وہ ناکام رہے گا اور جو نیک عمل کرے گا اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو

فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا ۝

تو اس کو نہ بے انصافی کا خوف ہوگا نہ نقصان کا

تفسیر اوپر کی آیات میں احوال قیامت کا کچھ مجمل بیان کیا گیا تھا۔ قیامت کا تذکرہ سن کر خاندانِ ثقیف کے کچھ مشرکوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ پہاڑ تو بڑے سخت اور عظیم الجثہ ہیں، قیامت کے دن ان کا کیا حال ہوگا؟
بات یہ تھی کہ دریاؤں کے علاوہ روئے زمین کی سب سے بڑی کائنات پہاڑ ہی ہیں، اس لئے کافروں کو قیامت کی حکونگی سن کر سخت تعجب ہوا اور ایسی چیز کے متعلق استفسار کیا جو ان کی نظروں میں سب سے بڑی اور سخت تھی۔ کفار کے استفسار کے جواب میں آیت مذکورہ نازل ہوئی
ابن کثیر نے لکھا ہے کہ سوال کا مدعا صرف یہ تھا کہ قیامت کے دن پہاڑ باقی رہیں گے یا نہیں؟
حاصل جواب یہ ہے کہ قیامت کے دن پہاڑ اڑتے پھریں گے۔ زمین چٹیل میدان ہوجائے گی جس میں نہ کوئی پستی ہوگی نہ بلندی، نہ موڑ نہ

وادی۔ اس روز (بیت المقدس کے پتھر پر کھڑے ہوکر) اسرافیل علیہ السلام بلند آواز سے محشر کی طرف بلائیں گے۔ ندائے منادی سن کر سب لوگ اپنی اپنی قبروں سے نکل کر ادھر ادھر مڑے بغیر سیدھے آواز کی طرف دوڑیں گے اور میدان حشر میں جمع ہو جائیں گے۔ خوف کی یہ حالت ہوگی کہ کسی کی آواز اونچی نہ نکل سکے گی۔ مشرکوں کی کوئی سفارش کرنے والا نہ ہوگا اور اہل توحید میں سے بھی ان ہی گناہگاروں کی سفارش کی جا سکے گی جن کے متعلق بارگاہ الٰہی سے اجازت ہوگی اور وہی لوگ سفارش کریں گے جن کو اذن ہوگا۔ اس روز مومن نیکوکار کامیاب اور مشرک ظالم ناکام ہوں گے۔

تحلیل اجزاء

لَا تَرٰی فِیْهَا عِوَجًا وَّ لَآ اَمْتًا۔ بعض مفسرین نے عِوَج کے معنی کجی اور موڑ کے لکھے ہیں۔ ابن کثیر نے عِوَج کا ترجمہ وادی، نشیب اور پستی لکھا ہے۔ یہی قول ابن عباس، عکرمہ، مجاہد، حسن بصری، ضحاک، قتادہ اور اکثر سلف کا ہے۔

ایک شبہ

عِوَج بکسر عین کے معنی ہیں عقیدہ کی کجی یا کسی مفہوم کی کجی اور عَوَج بفتح عین کے معنی ہیں کسی خارجی چیز کی ناہمواری اور کجی۔ چونکہ آیت میں زمین کی ہمواری ظاہر کرنی مقصود ہے عِوَج کی جگہ عَوَج مناسب تھا عِوَج کیوں ذکر کیا گیا؟

ازالہ

آیت میں زمین کی انتہائی ہمواری ظاہر کرنی مقصود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر زمین کی ہمواری کا معائنہ کرنے کے لئے ہوشیار لوگوں ..... کو جمع کیا جائے تو ان کو بھی زمین ہموار نظر آئے گی۔ یہاں تک کہ ریاضی و ہندسہ جاننے والے اور تخمینی علوم کے مطابق ذہنی اندازہ لگانے والے بھی اپنے علمی استدلال سے زمین کی ہمواری کی شہادت دیں گے۔

بیضاوی نے ایک بہترین نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ حسن ظاہر کے اعتبار سے تو زمین قَاعٌ اور صَفْصَفٌ (چٹیل میدان) ہوگی اور دقیق علم سے کام لینے والوں کو بھی اس میں کوئی بلندی پستی دکھائی نہ دے گی۔

یَوْمَئِذٍ یَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ۔ داعی سے اسرافیل علیہ السلام مراد ہیں۔ اسرافیل الصخرہ بیت المقدس پر کھڑے ہوکر صور لے کر پکاریں گے اَیَّتُهَا الْعِظَامُ الْبَالِیَةُ وَالْجُلُوْدُ الْمُتَفَرِّقَةُ وَاللُّحُوْمُ الْمُتَمَزِّقَةُ هَلُمِّیْ اِلٰی عَرْضِ الرَّحْمٰنِ (اے گلی ہوئی ہڈیو! پراگندہ کھالو! ریزہ ریزہ شدہ گوشت کے ٹکڑو! رحمان کے حضور میں چلو) ندائے اسرافیل سن کر ہڈی، گوشت، کھال، بال سب کچھ مل کر، جڑ کر، انسانی شکل بن کر قبروں سے نکل کھڑا ہوگا اور ہر شخص آواز کی طرف دوڑے گا۔ بعض کا قول ہے کہ اسرافیل صور پھونکیں گے اور جبرئیل داعی ہوں گے۔

خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ۔ آواز کے پست ہونے سے مراد ہے ساکن ہونا یا خفیف ہونا۔

اِلَّا هَمْسًا۔ ابن عباس کے نزدیک همس کے معنی ہیں پاؤں کی آہٹ۔ عکرمہ، مجاہد، ضحاک، ربیع، قتادہ اور ابن زید وغیرہ کا یہی قول ہے۔ اس تقدیر پر مطلب یہ ہوگا کہ کوئی کسی سے بات نہ کرے گا۔ صرف قدم کی آہٹ محسوس ہوگی۔ بیضاوی نے خفی آواز مراد لی ہے۔

یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اس آیت کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ اوّل تو یہ کہ جس شخص کو اللہ کی طرف سے اجازت ہوگی وہی شفاعت کرے گا دوسرا کوئی شفارش نہ کرے گا اور نہ کسی دوسرے کی سفارش مقبول ہوگی۔

دوسرا مطلب یہ کہ شفاعت کرنے والے اسی کی شفاعت کریں گے جس کے متعلق اجازت ہوگی۔ جس شخص کی سفارش کرنے کی اجازت نہ ملے گی اس کی سفارش نہیں کریں گے۔

ابن کثیر نے دونوں مطالب کا مجموعہ بیان کیا ہے اور اشارہ کیا ہے کہ یہ آیت شافع اور مشفوع دونوں کے حق میں ہے اور دونوں اذن کے محتاج ہیں۔

کیا قیامت کے دن شفاعت ہوگی؟

اہل سنت کا اجماع ہے کہ قیامت کے دن فرشتے، انبیاء، اولیاء اور صلحائے امت شفاعت کریں گے اگرچہ ان کی شفاعت بغیر اذن الٰہی کے نہ ہوگی اس قول کی تائید مختلف آیات سے ہوتی ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗۤ اِلَّا بِاِذْنِہٖ —— کَمْ مِّنْ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُہُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰہُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰی —— لَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی۔ وغیرہ بکثرت آیات ثبوت شفاعت پر دلالت کرتی ہیں۔

احادیث سے بھی شفاعت کی حقانیت ثابت ہوتی ہے۔ بخاری وغیرہ میں مفصل بیان شفاعت موجود ہے۔ ایک طویل صحیح حدیث میں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عرش کے نیچے سرافگندہ ہوں گے اور حمد الٰہی بیان کر رہے ہوں گے تو خدا تعالیٰ فرمائے گا محمد! سر اٹھاؤ اور عرض کرو۔ تمہاری بات سنی جائے گی۔ سوال کرو جو مانگو گے پاؤ گے۔ شفاعت کرو تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی الخ۔

کس کی سفارش ہوگی اور کس کی نہ ہوگی؟

استحقاق شفاعت کے لئے موحد ہونا شرط ہے۔ چنانچہ آیت رَضِیَ لَہٗ قَوْلًا کی تفسیر میں مفسر معالم و سراج نے صراحت کر دی ہے کہ قول سے مراد کلمۂ توحید ہے یعنی جو شخص توحید کا قائل ہوگا اُسی کی شفاعت ہوگی۔ ابن عباس کے نزدیک بھی قول مذکور سے کلمۂ توحید ہی مراد ہے۔

مشہور حدیث شفاعت کے آخر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے گا نکال دو جہنم سے اس شخص کو جس کے دل میں نصف مثقال کی برابر ایمان ہو اور نکال دو جہنم سے اس شخص کو جس کے دل میں ذرہ سے ادنیٰ اور اس سے ادنیٰ اور اس سے ادنیٰ ایمان ہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس شخص کے دل میں ایمان کا کوئی ذرہ ہوگا اسی کی شفاعت مقبول ہوگی، اہل شرک کے متعلق کوئی سفارش قبول نہ ہوگی۔ رہی یہ بات کہ اہل کبیرہ مستحق شفاعت ہیں یا صرف اہل صغیرہ؟ تو اہل سنت کا قول ہے کہ علاوہ صغائر کے کبیرہ گناہ بھی قابل شفاعت ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:- شَفَاعَتِیْ لِاَھْلِ الْکَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ الخ۔

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْہِمْ وَمَا خَلْفَہُمْ بیضاوی کے نزدیک اس سے وہ احوال مراد ہیں جو ان سے پہلے ہو چکے اور جن سے آئندہ ان کو دوچار ہونا ہے۔ خطیب کا قول ہے کہ مَا بَیْنَ اَیْدِیْہِمْ سے وہ امور مراد ہیں جو ان کے مرنے کے بعد دنیا میں ہونے تھے۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ الذکر سے وہ اعمال مراد ہیں جو لوگ کر چکے اور مَا خَلْفَہُمْ سے وہ اعمال مراد ہیں جو آئندہ کرنے والے ہیں۔ میرے نزدیک یہی مطلب زیادہ صحیح ہے۔ ابن کثیر نے کہا اس سے مراد اللہ کے علم کا احاطہ ہے۔ خلاصۂ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مخلوق کے کل احوال کو جانتا ہے۔ اگر کوئی مومن ابتدا میں ہی شفاعت کے لائق ہے تو اس کے لئے ابتدا ہی میں شفاعت کی اجازت ہوگی اور اگر جہنم میں داخل ہونے کے بعد قابل شفاعت ہوگا تو دخول جہنم کے بعد اس کی شفاعت ہوگی اور اگر اس کے دل میں ایمان ہی نہیں ہے اور وہ قابل شفاعت ہی نہیں ہے تو اس کی شفاعت مطلقاً نہ ہوگی۔

وَعَنَتِ الْوُجُوْہُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ —— حَیٌّ وہ ذات جس کو موت نہ آئے اور قَیُّوْمٌ وہ ذات جو ہر چیز کی حفاظت اور تدبیر پر قائم ہو۔ ہر شئی اس کی محتاج ہو اور کسی چیز کا قوام اس کے بغیر نہ ہو۔

وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا۔ ابن عباس اور قتادہ نے کہا کہ ظلم سے مراد شرک ہے۔ کیونکہ اس سے آگے اہل ایمان کا بیان ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ کامل بربادی ہے اس شخص کے لئے جو مشرک ہونے کی حالت میں اللہ سے ملا یعنی شرک پر اس کا خاتمہ ہوا۔

فَلَا یَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا ھَضْمًا ظلم سے مراد ہے حق تلفی اور ثواب کی کمی اور ہضم سے مراد ہے حقوق کی شکست اور بربادی۔ یعنی نیکوکار اہل ایمان کے حقوق کی نہ تو بربادی ہوگی نہ ثواب میں کمی ہوگی۔

مقصود بیان

قیامت کے دن پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ کر اُڑتے پھریں گے اور تمام زمین ہموار ہو جائے گی۔ کہیں نشیب فراز اور پستی بلندی نہ ہوگی۔ منادی کی آواز پر بلے اختیار ہو کر لوگ دوڑیں گے۔ اس سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ بقائے زندگی تک تو آدمی مختار ہے۔ قیامت کے دن مجبور ہوگا۔ اس لئے اگر آج داعی حق کی آواز پر لبیک کہے گا تو مفید ہوگا اور قیامت کے دن دعوت کو قبول کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

قیامت کے دن گناہ گاروں کے متعلق اہلِ صلاح کی شفاعت حق ہے، مگر دو شرطیں ہیں (۱) اذنِ الٰہی (۲) ایمان و توحید کا دل میں موجود ہونا۔

آیات کے آخر میں صراحت ہے کہ قیامت کے دن نیکوکار اہلِ ایمان کی کوئی حق تلفی یا شکستگی حقوق نہ ہوگی ہر منصب کو ثواب بقدرِ عمل ملے گا بقیہ آیات کا خلاصہ ترغیب، ترہیب اور منظر قیامت کی تصویر کشی ہے وغیرہ۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ

اسی طرح ہم نے اس کو قرآن عربی نازل کیا ہے اور طرح طرح پر اس میں ڈرانے کی باتیں ذکر کی ہیں تاکہ لوگ

يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ۝ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ

پرہیزگار بنیں یا قرآن ان کے لئے نصیحت پیدا کر دے پس عالی شان ہے جو سچا بادشاہ ہے (اے نبی) قبل اس کے

بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ۝

کہ وحی تم پر پوری ہو چکے تم قرآن (پڑھنے میں) جلدی نہ کرو اور کہو اے میرے پروردگار مجھے اور زیادہ علم دے

تفسیر ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں کہ قرآن ضابطۂ اصلاح ہے، قانونِ ہدایت ہے، دستور العمل ہے۔ اس کے اندر فلاحِ دارین کے اصول بیان کئے گئے ہیں، یہ تذکرہ قصص نہیں ہے، نہ تاریخ اقوام بیان کرنا اس کی غرض ہے، لیکن چونکہ اسلاف کے لئے ہدایت آمیز عبرت انگیز واقعات بیان کرنے سے انسان کے خیالات و اعمال کی فطرۃً اصلاح ہوتی ہے۔ ہر شخص طبعاً خوگر ہے کہ نظیر و مثال اس کے سامنے پیش کی جائے اور علوم تمثیلیہ بلکہ عوام اکثر خواص کے لئے بھی علوم برہانیہ سے زیادہ مفید ہوتے ہیں، اس لئے قرآن میں جابجا قصص اور تاریخی واقعات مذکور ہیں۔ اسی عنوان کا آیات مذکورہ میں بیان کیا گیا ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جس طرح گزشتہ تاریخی واقعات بیان کرنے سے اصل غرض ہدایت و اصلاح ہے اسی طرح قرآن کو عربی میں نازل کرنے اور قسم قسم کی توبیخ آمیز آیات بیان کرنے سے بھی مقصود ہدایت ہے۔ یعنی اگر قرآن عربی میں نازل نہ ہوتا تو اہلِ عرب کو اس کے مضامین سے براہِ راست کچھ فائدہ نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر قرآن کے اندر آیات وعید کی تکرار نہ ہوتی اور گزشتہ سرکشوں کا عبرت ناک انجام مذکور نہ ہوتا تب بھی کامل طور پر ترغیب اصلاح اور ممانعت از قبائح نہ ہونے پاتی۔ بار بار دھمکیاں دینے، عذابِ آخرت کا منظر پیش کرنے اور اسلاف کی تباہی کا تذکرہ کرنے سے تو اصل مدعا یہ ہے کہ قرآن سن کر لوگوں میں سمجھ پیدا ہو، نصیحت و عبرت حاصل کریں، طاعت کی طرف راغب ہوں اور معاصی کو ترک کریں اور انجام کار ان میں گناہوں سے بچنے کا ملکہ پیدا ہو جائے اور وہ متقی بن جائیں۔

ایک شبہ یہاں ایک شبہ دو طرح سے کیا جا سکتا تھا وہ یہ کہ اگر قرآن کو اللہ کی کتاب مان لیا جائے تب بھی ہم کہتے ہیں کہ خدا کو کتاب بھیجنے کا کیا حق تھا۔ ہر شخص کو عقل دے دی گئی ہے، حواس موجود ہیں، تمام ادراکی اور عقلی قوتیں بھی عطا کر دی گئی ہیں، ہر شخص اپنا اچھا بُرا خود سوچ سمجھ سکتا ہے اور اپنے لئے دستور العمل بنا سکتا ہے۔ پھر اگر قرآن نازل ہی کر دیا گیا تو کیا ضروری ہے کہ اس کے بیان کردہ تمام وعید و وعدے صحیح ہوں۔ کیا ترغیب و ترہیب کے لئے بے بنیاد قصوں کو واقعات کا رنگ نہیں دیا جا سکتا۔ یا ڈرانے اور مائل کرنے کے لئے قیامت، حشر، نشر، صراط، میزان، حساب کتاب اور جنت و دوزخ کی فرضی کیفیات کو حقائق کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔

اس شبہ کو دور کرنے کے لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اللہ بزرگ و برتر ہے، سچا بادشاہ ہے، اور حق ہے یعنی تم نے ذاتِ الٰہی کو جز مخلوق کے مثل سمجھ رکھا ہے اور اس کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مثل قرار دیا ہے یہ غلط ہے وہ پاک و برتر ہے، اس کی ذات، صفات، مشابہت مخلوق سے

بالاتر نہیں وہ ہر عیب و نقصان سے بری ہے۔

یہ تو مجمل جواب ہوا۔ اس سے آگے فرماتا ہے کہ اللہ بادشاہ خود مختار ہے، اس کو احکام نافذ کرنے کا حق ہے۔ وعدہ و وعید کے قوانین اور جزا سزا کے ضوابط بنانے کا اس کو استحقاق ہے۔ قوانین انفرادی نہیں ہوا کرتے۔ ہر شخص کو اپنے لئے جدا قاعدہ بنانے کا کوئی حق نہیں، ورنہ نظام عالم تباہ ہو جائے گا۔ حکمراں طاقت کی ضرورت ہے اور حکمراں طاقت بھی انسان کی کافی نہیں۔ اگر کسی دنیوی بادشاہ کے ہاتھ میں قانون سازی کا اختیار دے دیا جائے تو اس کا بنایا ہوا قانون اصلاح عالم کے لئے کافی نہیں ہو سکتا اور نہ کل اہل عالم کے لئے وہ قانون کافی ہو سکتا ہے۔ لامحالہ الٰہی قانون کی ضرورت ہے کیونکہ وہی تمام اہل عالم کے لئے نافذ الحکم ہے اُس کا امر تمام دنیا میں جاری ہے۔

یہی وعدہ و وعید کی حقانیت اور کیفیات آخرت کی صداقت تو ظاہر ہے کہ خدا کے کل صفات حق ہیں، اس کی ذات حق ہے، عیوب و نقائص سے منزہ ہے۔ لہٰذا اس کا ہر وعدہ و وعید حق ہے، جنت دوزخ حق ہے، صراط و میزان حق ہے، حشر نشر اور جزا سزا حق ہے، اس کا ہر قول حق ہے اس کے بیان میں کسی قسم کے دروغ اور مبالغہ کا احتمال نہیں ہو سکتا۔

اس سے آگے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ جب تک وحی پوری نازل نہ ہو جایا کرے تم الفاظِ قرآنی کو پڑھنے میں جلدی نہ کیا کرو اور اللہ سے ترقی علم کی دعا کرتے رہا کرو۔

اصل بات یہ تھی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم طبعاً تبلیغ و ہدایت کے شوقین تھے۔ جب کوئی جدید وحی نازل ہوتی تو سراسر شوق بن جاتے۔ یہاں تک کہ حضرت جبرئیل کے ساتھ ساتھ ہر کلمہ کو اس خیال سے پڑھنے لگتے کہ کوئی لفظ خیال سے اتر نہ جائے۔ اس فعل کی ممانعت میں اس آیت کا نزول ہوا۔ ایکبار سورۂ قیامت میں بھی اسی مضمون کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ یہاں دوبارہ وہی حکم نازل کیا گیا۔

تحلیلِ اجزاء

لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ۔ اس آیت میں کلمۂ اَوْ منافات کے لئے نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ابتدا میں قرآن سے نصیحت و عبرت حاصل ہوتی ہے۔ طاعات کی ادائیگی اور معاصی سے اجتناب آدمی کرنے لگتا ہے پھر رفتہ رفتہ تعمیل اوامر اور امتناع از معاصی کا جذبہ ترقی کر کے ملکہ راسخہ بن جاتا ہے۔ اس وقت آدمی متقی کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُقْضَىٰ إِلَيْكَ وَحْيُهُ ۔ عجلت سے قرآن کی عجلت مراد ہے۔ بخاری اور ابن کثیر نے یہی تفسیر کی ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ اس آیت میں دو امور کی ممانعت ہے۔ اول جبرئیل سے پیام وحی حاصل کرنے میں جلدی کرنے کی۔ دوسرے جبرئیل کے ساتھ پڑھنے کی۔ ان دونوں باتوں کی ممانعت اس آیت سے مستنبط ہوتی ہے۔

بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ آیت مجمل کا جب تک بیان نازل نہ ہو جائے اس وقت تک مجمل کو بصورت اجمال لوگوں کے سامنے نہ بیان کرو۔

بخاری اور ابن کثیر کے قول کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو صحیح بخاری میں موجود ہے کہ نزول وحی کے وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک خاص شدت و تکلیف ہوتی تھی۔ آپ الفاظ وحی کو زبان ہلا کر اداکرنے لگتے تھے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (ہکذا قال ابن عباس)

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا ۔ یعنی اصل مقصد علم کی زیادتی ہے۔ لہٰذا دل سے دعا کیا کرو کہ پروردگار! اپنی کتاب کا علم مجھے زیادہ عطا فرما۔ پیام وحی میں جلدی کرنی مناسب نہیں۔ کیونکہ جو وحی بھیجی گئی ہے وہ تو ضرور پہنچے گی جلدی بے سود ہے۔

ابن ماجہ نے بروایت حضرت ابوہریرہ بیان کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم زیادتی علم کے لئے یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ انْفَعْنِي بِمَا عَلَّمْتَنِي وَعَلِّمْنِي مَا يَنْفَعُنِي وَزِدْنِي عِلْمًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى كُلِّ حَالٍ ۔

مقصودِ بیان

اس امر کی صراحت کہ قرآن میں بار بار آیات وعید نازل کرنے سے مقصود صرف لوگوں کی اصلاح ہے۔ اس سے بالعرض یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ کسی فعل سے روکنے کا سب سے بہتر ذریعہ یہ ہے کہ اس فعل کا انجام بد اس شخص کے سامنے بیان

کیا جائے، بدترین نتیجہ کی تصویر کشی کر دی جائے۔ ممکن ہے بُرے انجام پر غور کر کے وہ شخص اپنی بداعمالی ترک کر دے۔

آیت فَتَعٰلَى اللّٰهُ میں اس بات کی صراحت ہے کہ خدا تعالیٰ اپنی ذات اور صفات میں کسی سے مشابہت نہیں رکھتا۔ اس کی ذات بھی سب سے جدا اور صفات بھی سب سے برتر ہیں اور اس کا حکم تمام عالم میں جاری و ساری ہے، کوئی قوت اس کے حکم کو روک نہیں سکتی۔ اس کا ہر وعدہ اور ہر وعید حق ہے۔ اس کے کسی قول میں احتمالِ کذب ہو نہیں سکتا۔ لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ سے ایک خاص دینی ادب ملتا ہے کہ جب کسی عالی مرتبہ شخص کی طرف سے کوئی پیام یا حکم موصول ہو تو اس کو خوب غور کر کے گوش ہوش سے سُننا چاہیئے۔ درمیان میں پیام کو کاٹنا مناسب نہیں۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝ وَاِذْ قُلْنَا

ہم نے پہلے ہی آدم کو حکم دے دیا تھا مگر وہ بھول گئے لیکن ہم نے ان میں قطعاً مخالفت نہ پائی جب کہ ہم نے فرشتوں

لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ۝ فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ

سے کہا آدم کو سجدہ کرو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے انکار کیا ہم نے کہا آدم! یہ

هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ۝ اِنَّ لَكَ

تمہارا اور تمہاری اولاد کا دشمن ہے تو کہیں تم کو جنت سے نہ نکال دے پھر تم تکلیف میں پڑ جاؤ جنت میں

اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝ فَوَسْوَسَ

تم کو یہ آرام ہے کہ نہ وہاں بھوکے ہوگے نہ ننگے اور نہ وہاں پیاسے ہوگے نہ دھوپ میں تپو گے مگر شیطان

اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ

نے انہیں بہکایا بولا اے آدم! کیا میں تم کو دوامی زندگی کا درخت اور غیر فانی

لَّا يَبْلٰى ۝ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا

سلطنت بتاؤں پھر دونوں نے اُس درخت سے کھا لیا تو دونوں کے ستر کھل گئے اور اپنے اوپر جنت

يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ صلے

کے پتے چپکانے کرنے لگے اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور گمراہ ہو گئے

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ۝

پھر خدا نے اُن کو نوازا اور اُن پر توجّہ کی اور راہ پر لے آیا

تفسیر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نزول وحی کے وقت زبان مبارک سے کلمات وحی کی تکرار کرتے جاتے تھے اور اس سے مقصود یہ ہوتا تھا کہ کہیں

آیات وحی نہ بھول جائیں اور جو حکم الٰہی نازل ہوا فراموشی کے سبب اس کی تعمیل و تبلیغ سے قاصر نہ رہ جائیں۔ حضرت آدم علیہ السلام حکم الٰہی کو بھول گئے تھے اور شیطانی اغوا میں آکر شجر ممنوعہ کھا بیٹھے تھے۔ چونکہ حضرت آدم کی لغزش بمشیت الٰہی ہوئی تھی۔ اگرچہ فاعل اور کاسب حضرت آدم علیہ السلام تھے، مگر فعل تقدیر کے مطابق ہوا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ باوجود جلالت مرتبہ اور انتہائی احتیاط و تدبر کے کوئی شخص حکم تقدیر سے باہر نہیں ہو سکتا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی کلمات وحی کی تکرار بھول نہ جانے کی غرض سے کرتے تھے اور یاد رکھنے کی انتہائی احتیاط رکھتے تھے جس کی ممانعت کا حکم سابقہ آیات میں دے دیا گیا اور حضرت آدم کا قصہ نقل کر کے یہ امر واضح کر دیا گیا کہ اس قدر احتیاط زیبا نہیں۔ ہوتا وہی ہے جو مقدر میں ہے۔ جو پیام وحی آنے والا ہے وہ ضرور آکر رہے گا اور چونکہ قرآن کی حفاظت کا فیصلہ ناطق ہو چکا ہے، اس لئے تحفظ قرآن خدا تعالیٰ کی طرف سے ضرور ہوگا۔ پھر یاد رکھنے کی اس قدر زیادہ حرص بے سود ہے۔

آیات کا حاصل یہ ہے کہ اے اولادِ آدم یاد کرو اس وقت کو جب کہ ہم نے تمہارے مورثِ اعلیٰ آدم علیہ السلام کے لئے فرشتوں کو سجدہ تعظیم کا حکم دیا اور تاج خلافت ان کے سر پر رکھا گیا، اس وقت سب فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر اس نامراد نے جس کا نام ابلیس تھا (اور جو آدمیوں کا قدیمی دشمن اور حاسد ہے) انکار کر دیا۔ پھر ہم نے تمہارے جد امجد کو ایسے باغ میں رہنے کو جگہ دی جہاں کھانے پینے اور پہننے کا مکمل انتظام کر دیا تھا، وہاں کوئی تکلیف نہ تھی۔ یہاں تک کہ دھوپ کی گرمی بھی نہ تھی ہمیشہ راحت کا سایہ تھا۔ ہم نے آدم سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ خبردار رہنا یہ ابلیس تمہارا اور تمہاری بیوی دونوں کا دشمن ہے۔ اس کے کہنے میں آکر مصیبت میں نہ پڑنا ایسا نہ ہو کہ یہاں سے نکالے جاؤ اور خراب خستہ مارے پھرو۔ مگر شیطان مردود بہروپ بدل کر جا ہی پہنچا اور ناصح مشفق بن کر آدم کے دل میں خطرہ ڈالا۔ کہنے لگا آدم یہ سب کچھ تو تم پر مہربانی ہوئی، مگر تمہاری دوامی زندگی اور شاہانہ طور سے سدا رہنے کا یہاں کوئی انتظام نہیں۔ تمہیں اس باغ میں ایک ایسا درخت بتاتا ہوں جس کا پھل کھانے سے دوامی زندگی اور بے زوال سلطنت تم کو مل جائے گی۔ اس درخت کا نام شجرۃ الخلد ہے۔ خدا نے تم کو اس درخت کے کھانے سے اس لئے منع کیا ہے کہ کہیں تم کو دوامی زندگی اور لازوال سلطنت حاصل نہ ہو جائے۔ بہتر ہے تم اس کو کھا لو۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے باوجودیکہ ہم نے آدم سے اوّل ہی عہد لیا تھا، مگر آدم اپنے عہد کو بھول گئے، استقامت اور پختگی اُن کے ارادہ میں باقی نہیں رہی نہ ہمارے عہد کی حفاظت کی نہ قدیم دشمنی کا خیال کیا۔ غرض نافرمانی کا نتیجہ پیش آیا۔ (دونوں کے) کپڑے بدن سے اتارے گئے۔ برہنگی ظاہر ہونے پر درختوں کے پتے تن سے لپیٹنے لگے۔ پھر آدم، حوّا اور ابلیس سب کے سب اُس باغ سے نکالے گئے اور کہہ دیا گیا کہ تم دونوں کی نوعیں یعنی آدمی اور جن باہم دشمن رہیں گے، لیکن آدم روئے اور توبہ کی خدا نے اُن کی توبہ قبول کی اور دوسری بار سرفرازی بخشی۔

تحلیلِ اجزاء

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ۔ یعنی اولادِ آدم کی تخلیق سے پہلے ہم نے آدم کو نصیحت کر دی تھی، مگر اس نے عہد شکنی کی اور نصیحت کے مطابق عمل نہ کیا۔

فَنَسِيَ کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں۔ مجاہد و حسن بصری کے نزدیک ترک عہد مراد ہے۔ سعید بن جبیر اور ابن ابی طلحہ کے نزدیک حقیقی معنی یعنی بھول جانا ہی مراد ہے۔ دونوں معنی میں توفیق اس طرح کی جا سکتی ہے کہ کھانے سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنا عہد یاد نہ رہا اور جب کھا لیا تو عہد کی خلاف ورزی کی۔

وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا۔ عزم کے بھی دو معنی بیان کئے گئے ہیں۔ اوّل معنی استقامت، پختگی، مضبوطی، ثبات وغیرہ۔ اس تقدیر پر مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے آدم کے ارادے میں مضبوطی اور استقامت نہ پائی۔ اس نے ارادہ کی کمزوری کے سبب عہد کے خلاف کیا۔ اگر اس کا عہد پختہ ہوتا تو شیطان اس کو دھوکہ نہ دے سکتا تھا۔ دوسرے معنی بعض مفسرین نے اس طرح بیان کئے ہیں کہ ہم نے ارتکاب معصیت کا ارادہ نہ پایا اُس سے خطا اور چوک ہو گئی، مگر اس کا ارادہ معصیت کا نہ تھا۔ ابن جریر و قشیری نے دونوں معنی کا اجتماع اس طرح کیا ہے کہ چونکہ آدم نے قلب میں استقامت اور ارادہ میں مضبوطی نہ رکھی، اس لئے اُس کو بھول ہو گئی۔ دونوں معنی میں سے کوئی معنی لئے جائیں بہر حال اس میں رسول پاک کے لئے تسلی ہے کہ اگر تمہارے نقش کے کفار تمہاری ہدایت کے خلاف کرتے ہیں، تو زیادہ رنجیدہ ہونے کی بات نہیں، کیونکہ ان کے خمیر میں ہی نقض عہد

۴۔ ان کے باپ آدم بھی عہد کی خلاف ورزی کر چکے ہیں۔

فَتَشْقٰی ۔ یہ خطاب حضرت آدم کو ہے چونکہ آدم کی خرابی سے حوا کی خرابی لازم تھی، اس لئے حوا کا مستقل تذکرہ نہیں کیا یا یہ وجہ ہے کہ
ے مراد ہے تحصیل معاش کی تکلیف میں پڑ جانا اور یہ کام صرف مردوں کا ہے۔ حصول رزق کی کوشش اور بھوک پیاس کو دفع کرنے کے اسباب
فراہم کرنا صرف مردوں کا فرض ہے، عورتیں تابع ہیں، اس لئے حوا کو خطاب نہیں کیا۔ حسن بصری کا قول ہے کہ شقاوت سے مراد شقاوت دنیوی
ہے۔ چنانچہ اولاد آدم میں سے ہر شخص دنیوی تکالیف میں مبتلا ہے۔ اگر شقاوت آخرت مراد ہوتی تو پھر جنت میں کیوں داخل ہوتا۔

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ ۔ ضروریات معاش میں اہم لوازم چار ہی ہیں۔ انہی کی تکمیل کے لئے انسان سرگرداں پھرتا ہے۔ یعنی کھانا، پینا اور بدن
ڈھانکنا اور راحت و آرام حاصل کرنا۔ جنت میں حضرت آدم کو یہ چاروں چیزیں بغیر کسی تکلیف کے حاصل تھیں۔ آیت مذکورہ میں اضداد اربعہ
کی نفی کر کے انعامات چہارگانہ کا اثبات کیا ہے تاکہ حضرت آدم کو ہر نعمت کی ضد کا خیال کر کے نعمت کی قدر ہو، بھوک کی تکلیف کا خیال کر کے روٹی
کی قدر کریں، پیاس کی شدت پیش نظر رکھ کر سیرابی کا فائدہ محسوس کریں، برہنگی کی شرم تصور کر کے پوشش کو قابل عزت نعمت سمجھیں اور دھوپ کی
تمازت پر غور کر کے سایۂ رحمت کو لازم الوجود انعام جانیں، اور چاروں نعمتوں کو قائم رکھنے کے لئے عہد کی خلاف ورزی نہ کریں۔

اس جگہ یہ وہم ہرگز نہ کرنا چاہیئے کہ حضرت آدم تو اس سے پہلے کبھی جنت سے باہر نہ آئے تھے۔ پھر ان کو بھوک پیاس وغیرہ کی تکلیف کی کیفیت
کا احساس ہی کس طرح ہو سکتا تھا اور وہ تکالیف اربعہ کی حقیقت کیا سمجھ سکتے تھے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے حضرت آدم کو ہر چیز کی حقیقت بتا دی تھی،
تمام نام سکھا دئے تھے۔ نام اور حقیقت کا علم باز داشت کے لئے کافی تھا۔ مزید تجربہ کی ضرورت نہ تھی۔ جس طرح جنت کی کسی نعمت کی اصلی کیفیت
ولذت نہیں پائی ہے۔

فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ ۔ نعمت کتنی ہی بڑی ہو اگر اس کے زوال و فنا کا خیال آجاتا ہے تو کوئی لطف باقی نہیں رہتا۔ شیطان بھی
آخر شیطان ہی تھا۔ اس نے آدم کو بہکانا چاہا، اغوا کی اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ کیونکہ لالچ و خوف دو چیزیں ہی اغوا کا سبب بن سکتی ہیں۔ حضرت
آدم کو ہر طرح راحت حاصل تھی، اس لئے لالچ نہیں دیا جا سکتا تھا اور خدا تعالیٰ کے ہاں ان کی عزت بھی سب سے زیادہ تھی، اس لئے کسی قسم کا ڈراوا
بھی ناممکن تھا، اس لئے اس نے لالچ و خوف دلانے کی ایک اور تدبیر نکالی۔ حضرت آدم سے کہا اگر تم اس درخت کا پھل نہ کھاؤ گے تو موجودہ
نعمتیں تم کو دوامی طور پر نہیں ملیں گی، کچھ زمانے کے بعد زائل ہو جائیں گی، خود بھی مر جاؤ گے اور یہ عیش بھی جاتا رہے گا۔ یہ تو دھمکی تھی۔ پھر بولا اگر
میرے کہنے کے موافق اس درخت کا پھل کھا لو گے تو دوامی زندگی، سرمدی عیش اور لازوال حکومت حاصل ہوگی۔ یہ لالچ تھا۔ حضرت آدم
دھوکہ میں آگئے۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ آدم کا واقعہ بھی عجیب واقعہ ہے۔ ایک طرف خدا تعالیٰ نے آدم کو دوام راحت اور بقائے عیش و عزت
کی ترغیب دی تھی اور فرمایا تھا۔ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ۝ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى الخ دوسری طرف ابلیس نے بھی
لازوال راحت اور غیر فانی عیش کا لالچ دیا اور کہا هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۔ خدا تعالیٰ نے دوام عیش کو معتبر درخت
کا پھل نہ کھانے سے وابستہ کیا تھا اور شیطان نے اسی شجر ممنوعہ کے پھل کھانے کو دائمی راحت و زوال زندگی کے حصول کا سبب قرار دیا تھا۔
خدا تعالیٰ نے آدم کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ ابلیس تمہارا قطعی دشمن ہے، مگر آدم اغوائے شیطانی میں آگئے۔ آدم کا شیطان کی طرف جھک جانا
اور حکم خدا سے پھر جانا دلالت کر رہا ہے کہ تقدیر الٰہی تمام عالم میں جاری و ساری ہے کوئی اس کو دفع کرنے والا نہیں۔ علم کیسا ہی روشن ہو
اور دلیل کیسی ہی واضح ہو، لیکن اس سے کچھ نفع نہ ہوگا جب کہ اللہ نے اس کے خلاف مقدر کیا ہو اور ہر دانا کی دانائی اسی وقت مفید ہوگی جب
تقدیر الٰہی میں نفع آفرینی موجود ہو۔

فَاَكَلَا مِنْهَا ۔ یعنی دونوں نے اس درخت کا پھل کھا لیا ۔۔۔ سَوْاٰتُهُمَا ابن عباسؓ نے فرمایا کہ دونوں اس نوری لباس سے ننگے ہو گئے
جو اللہ نے ان کو پہنایا تھا اور دونوں کی شرمگاہیں برہنہ ہو گئیں۔

مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّۃِ ۔ ابن عادل وغیرہ نے انجیر کے پتے بتائے ہیں ۔ ابن ابی حاتم نے بواسطہ سعید بن جبیر ابن عباس کا بھی قول نقل کیا ہے مجاہد، سدی اور قتادہ نے کہا کہ دونوں نے اوراقِ جنت کو لباس کی طرح لپیٹ لیا تھا (کذا قال البیضاوی) نقل میں انجیر کے پتوں کی کوئی صراحت نہیں ہے ۔

فَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی ۔ یعنی آدم نے وہ فعل کیا جو اس کو نہ کرنا چاہیئے تھا، اس لئے راہِ حق سے مڑ گیا ۔ عزت سے ذلت میں راحت سے مشقت میں پڑ گیا ۔ قاضی ابوبکر ابن العربی نے کہا کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ آدم کو عاصی کہے ۔ یعنی اگرچہ عصیان کی نسبت آیت میں آدم کی طرف کی گئی، لیکن آدم کو عاصی کہنا جائز نہیں ۔ کیونکہ عاصی وہ شخص ہوتا ہے جو عصیان کا عادی ہو جس طرح خیاط وہ شخص ہوتا ہے جو کپڑے سیا کرتا ہو ۔ ایک دو مرتبہ کپڑے سینے سے کوئی شخص خائط یا خیاط نہیں ہو جاتا ۔ بیضاوی نے صراحت کی ہے کہ آدم کی خطا اگرچہ چھوٹی تھی، مگر پھر بھی عصیان و غوایت کی نسبت کرنے سے اولادِ آدم کو یہ تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس سے باز رہنا چاہیئے ۔

مفسر مدارک نے کہا کہ خطائے آدم کا ذکر کرکے یہ نصیحت کرنی مقصود ہے کہ ایک نبی معصوم کی معمولی صغیرہ لغزش پر اتنی سخت گرفت ہوئی لہٰذا تم صغیرہ گناہ بھی نہ کرو ۔ کبیرہ گناہ تو بڑی چیز ہیں ۔

آدم کی خطا صغیرہ تھی یا کبیرہ؟

اہلِ سنت کا اتفاق ہے کہ حضرت آدم کی خطا صغیرہ تھی اور کبائر سے حضرات انبیاء معصوم ہیں، لیکن کیا نبوت سے پہلے کبیرہ گناہ کا ارتکاب اتفاقاً جائز ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے ۔ اکثر کا قول ہے کہ نبوت سے پہلے اور نبوت کے بعد بہرحال انبیاء کبائر سے پاک رہتے ہیں ۔ بعض کے نزدیک نبوت سے پہلے بحالت نادانی ارتکاب کبیرہ ممکن ہے ۔ اہلِ سنت کے علاوہ بعض دوسرے فرقے قائل ہیں کہ انبیاء سے بعد نبوت بھی کبیرہ گناہ کا صدور ہو سکتا ہے، لیکن انبیاء توبہ کر لیتے ہیں ۔ پوری تفصیل سورۂ بقرہ میں دیکھو ۔

مقصودِ بیان

حضرت آدم سے غلطی دانستہ نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ عہدِ الٰہی کو بھول گئے تھے ۔ انبیاء کی نادانستہ خطا بھی قابلِ مواخذہ ہے ۔ اس سے در پردہ یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اللہ کے نزدیک جن لوگوں کا مرتبہ زائد ہوتا ہے ان کی گرفت بھی سخت ہوتی ہے، وہ امور جو عوام کے لئے قابلِ درگزر ہیں، مقربین و خواص سے ان کے متعلق بازپرس ہوتی ہے ۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے ۔ حسنات الابرار سیئات المقربین ۔ ملائکہ نے آدم کو سجدہ کیا، مگر ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا ۔ یہ دنیا دارالآلام ہے ۔ اس میں آنا ہی موجب تکلیف ہے ۔ حضرت آدم کا دنیا میں آنا اگرچہ بمصلحت الٰہی تھا، مگر بظاہر نافرمانی اس کا سبب بنی ۔ جنت دارِ راحت ہے ۔ روحانی یا جسمانی کسی قسم کی تکلیف وہاں نہیں ہے ۔ انسان ضعیف البنیان ہے ۔ شیطان کا دست رس بہت وسیع ہے ۔ دل میں گناہ کا وسوسہ پیدا کرنا شیطان کا کام ہے اس کے وسوسہ سے تمام انسانوں کے باپ بھی محفوظ نہ رہ سکے ۔ جنت میں ایک ایسا درخت تھا جس کے پھل کھانے سے جنت کی تمام نعمتیں خود بخود انسان سے الگ ہو جاتی تھیں ۔ حضرت آدم کی توبہ قبول ہو گئی تھی ۔ اہلِ باطن نے اشاراتِ تفسیر میں لکھا ہے کہ اللہ نے تمام اسمائے جلال و جمال سکھا دئے تھے، اس لئے آدم کو ہر اسم الٰہی کے ذریعہ سے اللہ کی صفت و نعمت کی معرفت حاصل ہو گئی تھی، لیکن قہر جبروتی کی صفت کا مطالعہ ممنوع یہی شجر ممنوعہ تھا ۔ آدم نے جب قہر جبروتی پر نور کا لباس دیکھا تو دل میں اس سے قرب کی خواہش اور اس کے ارتکاب کی جرأت پیدا ہوئی ۔ کیونکہ قہر جبروتی بھی جمال الٰہی کا آئینہ تھا، جس کا پرتو دل پر پڑ رہا تھا ۔ لہٰذا محبت کا پہلو غالب آیا اور حکم کا پہلو مغلوب ہو گیا ۔ جمال کے لطف سے حکم کا خیال مسلوب ہو گیا، ہیجانِ شوق میں آ گئے اور لذتِ مشاہدہ میں غرق ہو گئے ۔ جمال کے شوق میں ظاہری حکم کو فراموش کر دیا چونکہ عہدِ ازلی عہدِ حکمی سے سابق تھا، اس لئے عہدِ ازلی کے مشاہدہ میں عہدِ حکمی کی پرواہ نہ کی اور دریائے قہر میں گر پڑے ۔

مولانا عصام الدین نے ایک مرتبہ خواب میں حضرت آدم کو دیکھا اور کیفیت لغزش دریافت کی ۔ حضرت آدم نے فرمایا مجھے مشاہدۂ سری کا حکم تھا اور یہی حکم تھا کہ شہود کسبی علوم کی طرف التفات نہ کروں، مگر میں نے ایک مرتبہ شیطانی وسوسے سے معرفت علمیہ کے ساتھ صفات کمالیہ کا مشاہدہ کرنا چاہا پس فوراً عتاب ہو گیا وغیرہ

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي

(اس کے بعد) اللہ نے فرمایا یہاں سے دونوں اترو کہ تم میں سے ایک کا دشمن ایک ہوگا پس تمہارے پاس میری طرف

هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ ○ وَمَنْ أَعْرَضَ

سے جب ہدایت آئے تو جو شخص میری ہدایت پر چلے گا وہ نہ گمراہ ہوگا نہ تکلیف میں پڑے گا ۔ اور جو میری نصیحت سے منہ

عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ ○

موڑے گا تو اس کے لئے تنگی کی گزران ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو نابینا اٹھائیں گے

قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا ○ قَالَ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ

وہ کہے گا پروردگار! تو نے مجھے نابینا کیوں اٹھایا میں تو بینا تھا اللہ فرمائے گا اسی طرح تیرے پاس

آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا ۖ وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسَىٰ ○ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي مَنْ أَسْرَفَ

ہماری آیتیں آئیں تو نے ان کو بھلا دیا یونہی آج تجھے فراموش کیا گیا جو حد سے بڑھ جاتا ہے اور اپنے رب کی

وَلَمْ يُؤْمِنْ بِآيَاتِ رَبِّهِ ۚ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ أَشَدُّ وَأَبْقَىٰ ○

نشانیوں پر ایمان نہیں لاتا ہم اس کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں اور آخرت کا عذاب بلاشبہ بہت سخت اور دیرپا ہے

تفسیر

حضرت آدم کی توبہ قبول ہوگئی، قصور معاف ہوگیا۔ گناہ کے زہر سے ابدی ہلاکت نہ ہوئی، مگر پھر بھی جو کچھ اثر پیدا ہو چکا تھا وہ باقی رہا۔ اب مصلحتِ خداوندی کے پورا ہونے کا وقت آیا۔ حکم ہوا تمہاری توبہ قبول ہوگئی، مگر اب تم سب زمین پر اترو اور یاد رکھو کہ تم میں سے ہر ایک دوسرے کا دشمن ہے۔ یعنی آدمی کی نوع ابلیس کی دشمن ہے اور ابلیس آدمی کا دشمن ہے۔ (آدمی کی پیدائش معرفت و عبادت کے لئے ہے اور ابلیس کی ذریات ابلیس کی تخلیق بہکانے اور گمراہ کرنے کے لئے۔ لہٰذا خلقتاً ہر ایک دوسرے کا دشمن ہے) یہ بھی یاد رکھو کہ انسانوں کے پاس اللہ کی طرف سے کتابیں آنا اور پیغمبروں کا مبعوث ہونا اگرچہ واجب نہیں ہے، مگر پھر بھی خدا تعالیٰ تمہاری اولاد کی ہدایت کے لئے اپنے ہادی بھیجے گا۔ پس لازم ہے کہ اہلِ ہدایت کا کہنا مانیں۔ اور ان کے نقشِ قدم پر چلیں کیونکہ اس سے دنیا و دین میں فلاح حاصل ہوگی اور جو لوگ اللہ کی کتابوں کو نہ مانیں گے اور پیغمبروں کی ہدایت پر نہ چلیں گے وہ دونوں جہان میں تباہ ہوں گے۔ قیامت کے دن ان کی آنکھوں میں بینائی نہ ہوگی، نجات کا راستہ ان کو سوجھائی نہ دے گا جس طرح دنیا میں ہدایت کا راستہ ان کو دکھائی نہ دیتا تھا اسی طرح قیامت کے دن اس کو جنت کا راستہ دکھائی نہ دے گا اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا جائے گا جیسے فراموش کردہ آدمی سے کیا جاتا ہے۔

تحلیلِ اجزاء

قَالَ اهْبِطَا ۔ حضرتِ آدم کا قصور معاف کر دیا گیا تھا، توبہ قبول ہوگئی تھی، لیکن اتنا اثر پھر بھی باقی تھا کہ براہ راست دوبارہ جنت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملی، زمین پر اترنے کا حکم ہوگیا۔ اس کے علاوہ مصلحتِ الٰہیہ کے پورے ہونے کا وقت بھی آگیا۔ شیطان کا اغواء کرنا اور شجرۂ ممنوعہ کا پھل کھانا یہ تو ظاہری اسباب تھے، مگر حقیقت کچھ اور تھی ۔ انسانی نسل کو زمین پر پھیلانا

مقصود ہوتا ، کھوٹے کھرے اور اچھے بُرے کی آزمائش کرنی مطلوب تھی ، زمین کو آباد کرنا اصل غرض تھی ۔ لہٰذا زمین پر اُترنے کا حکم ہو گیا ۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ آیات میں کچھ تقدیم و تاخیر ہے ۔ حضرت آدم کی توبہ نزول کے بعد قبول ہوئی تھی جنت سے تو محض نکال دیئے گئے تھے ۔ یہاں آکر انہوں نے گریہ وزاری کی ، برسوں نوحہ و بکا میں مشغول رہے تب کہیں جاکر قصور معاف ہوا ۔ گویا زمین پر جب آگئے تو اس کے بعد توبہ قبول ہوئی ۔

لفظ اِهْبِطَا کا مخاطب کون ہے ؟ شیخ جلال سیوطی اور شیخ جلال محلی کے نزدیک آدم و حوا کو خطاب کیا گیا ہے ۔ شیخ ابن کثیر کا قول ہے کہ آدم حوا ، ابلیس تینوں کو خطاب ہے ۔ میرے نزدیک رو ئے خطاب آدم و ابلیس کی طرف قرار دینا ہے ۔ حضرت حوا چونکہ حضرت آدم کے تابع تھیں ، اس لئے مستقل طور پر ان کو مخاطب نہ بنایا گیا ۔

بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۔ ابن کثیر نے بیان کیا ہے کہ اولادِ آدم اور اولادِ ابلیس میں باہم عداوت ہے ۔ گویا باہمی دشمنی سے مراد ہے اولادِ آدم اور اولادِ ابلیس کی باہمی دشمنی ، لیکن بیضاوی نے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ سے صرف آدمی مراد لئے ہیں اور بیان کیا ہے کہ تمام انسان امرِ معاش میں باہم کشمکش ، کوشش اور کشاکش کرتے ہیں ۔ یہی ان کی باہمی عداوت ہے ۔ میرے نزدیک ابن کثیر کا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ حصولِ معاش کے لئے کوشش کرنی ہر جگہ موجب عداوت نہیں نہ اس کو عداوت کہہ سکتے ہیں ۔ عداوت وہی ہے جو ابدی ہلاکت میں دوسرے کو گرادے ۔ اس قسم کی دشمنی صرف ذریاتِ ابلیس کو اولادِ آدم سے ہے ۔ اس کے علاوہ تمام انسان حصولِ معاش کے لئے بھی ایک دوسرے کے خلاف کوشاں نہیں ۔ علماء ، اولیاء ، ہادیانِ دین ، مرشدانِ حق نما اور انبیاء کرام سب کے سب نسلِ انسانی کے دوست ہیں کوئی بھی دشمن نہیں ۔ رہی یہ بات کہ ہر آدمی ابلیس کا دشمن نہیں ہے بلکہ بیشتر اشخاص اس کے دوست اور پیرو ہیں ۔ تو اس کا جواب ظاہر ہے ۔ بیان کرنا یہ ہے کہ انسان اپنی غرضِ خلقت کے اعتبار سے ابلیس کی ذریات کا دشمن ہے اور ذریاتِ ابلیس نسلِ آدم کی دشمن ہے ۔ انسان کی پیدائش سے مقصود صرف عرفان و عبادت ہے اور ابلیس کی تخلیق کی غرض محض یہ ہے کہ وہ انسان کو گمراہ کرنے کی کوشش کرے ، اسی لئے قیامت تک کے لئے اس کی رسی چھوڑ دی گئی ہے بلکہ روزِ آخر تک اس کو زندگی بھی عطا کر دی گئی ہے ۔ اس بناء پر مطلب بالکل صاف ہے ، ابلیس انسان کا دشمن ہے اس کو ابدی تباہی سے ہم کنار کرنا چاہتا ہے اور انسان شیطان کا دشمن ہے اپنی فطرت کے اعتبار سے عرفان کی طرف مائل ہے ۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ ۔ اِنْ حرفِ شرط ہے اور مَا زائد ہے ۔ لفظ اِنْ لانے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انبیاء کو مبعوث کرنا اور کتابیں نازل کرنا خدا تعالیٰ پر واجب نہیں (کیونکہ اِنْ حرفِ شرط ہے ، مگر شک کے موقع پر بولا جاتا ہے ۔ ہاں لفظ اِذَا یقین و وجوب کے مقام میں مستعمل ہوتا ہے) اللہ کی عنایت ہے کہ وہ اپنا پیامِ ہدایت بندوں تک بھیج دے ورنہ اس پر لازم نہیں ہے ۔

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ ۔ ابن عباس رض نے اس آیت میں کہا کہ قرآن کی اتباع کرنے والے کو دنیوی گمراہی اور اخروی شقاوت سے بچالیتا ہے ۔ (درمنثور) ابن عباس کی مرفوع حدیث ہے کہ جس شخص نے کتاب الٰہی کی پیروی کی اللہ اس کو دنیا میں گمراہی سے بچا کر راہِ راست پر ڈال دیتا ہے اور قیامت کے دن سخت محاسبہ سے محفوظ رکھے گا کیونکہ اس نے خود فرما دیا ۔ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ الخ ۔ رواہ ابن ابی شیبۃ والطبرانی وابو نعیم وابن مردویہ)

عَنْ ذِكْرِيْ ۔ ذکر سے مراد ہیں اللہ کے پیغمبر اور اس کی کتابیں جو ہمیشہ اللہ کی طرف آنے کی یاد دلاتی ہیں ۔

مَعِيْشَةً ضَنْكًا ۔ تنگ معیشت سے مراد کیا ہے ؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے : بیہقی حاکم و مسدد نے بروایت ابو سعید خدری رض اور ابن ابی حاتم رض نیز بزار نے بروایت ابو ہریرہ رض بیان کیا کہ اس سے مراد عذابِ قبر ہے ۔ ضحاک ، عکرمہ اور مالک بن دینار کا قول ہے کہ بدکاری اور رزقِ حرام مراد ہے ۔ ابن عباس نے فرمایا تنگی معیشت اس طرح ہوتی ہے کہ کافر پر نیکی کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اس کو کسی کارِ خیر کی توفیق نہیں ہوتی حضرت علی رض کی مرفوع روایت ہے کہ گناہ کا عذاب تین طرح ہوتا ہے ۔ معاش کی تنگی ، مصائب کی سختی اور تیسری بات یہ کہ بغیر گناہ کے رزق نہیں ملتا ۔ اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ دیندار آدمی قانع ہوتا ہے اس کا بھروسہ اللہ پر ہوتا ہے ، وہ بلندی حوصلہ اور سہولت کے ساتھ خرچ کرتا ہے ، اس لئے اس کی زندگی آسان ہو جاتی ہے اور دین سے روگردانی کرنے والے پر حرص غالب ہو جاتی ہے ، دنیا کی فراوانی کی طرف وہ برابر آنکھ لگائے رہتا ہے ۔ اس پر بخل چھا جاتا ہے ، اس لئے اس کی زندگی تنگی کے ساتھ گزرتی ہے ۔ ابن کثیر نے کہا کافر تنگ معیشت میں رہتا ہے ۔ دنیا میں اس کو

طمانیت نصیب نہیں ہوتی، اس کا سینہ کشادہ نہیں ہوتا۔ اگرچہ بظاہر وہ عیش میں ہو جو چاہے پکے جو چاہے پہنے، جہاں چاہے رہے، مگر قلق و حیرت کی کشمکش میں وہ برابر رہتا ہے۔ تردد سے چھوٹ کر یقین و اعتماد تک نہیں پہنچتا، اسی بنا پر تنگیٔ معاش میں رہتا ہے۔ ایک روایت میں ابن عباس کا قول ہے کہ خدا تعالیٰ کا فرمان ہے جس شخص کو میں نے تھوڑا یا بہت دیا اور اس نے مجھ پر یقین نہ کیا تو اس کے واسطے کوئی بہتری نہیں۔ اس کی معیشت تنگ ہے اور جس قوم گمراہ نے حق سے روگردانی کی اگرچہ اس کے پاس مال و منال بکثرت ہو، مگر ان کی زندگی تنگی میں ہے کیونکہ وہ بدگمان ہیں ان کا خیال ہے کہ اللہ ان کے واسطے معاش کا کوئی بدل نہ دے گا۔ پس جب بندہ نے تکذیب کی اور بدگمانی کی اور اللہ پر بھروسہ نہ کیا تو اس پر اس کی زندگی سخت دشوار اور تنگ ہو جاتی ہے۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں فرمایا گناہوں میں زندگی بسر کرنا ضیق معیشت ہے اگرچہ مال و منال میں وسعت ہو۔

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى۔ یعنی نیکی کی راہ سے اندھا ہوگا۔ ابن کثیر نے عکرمہ کا قول نقل کیا ہے کہ جہنم کے راستے کے سوا اس کو کوئی راستہ نہ سوجھے گا۔ مجاہد، سدی اور ابوصالح نے کہا قیامت کے دن اس کے پاس کوئی حجت نہ ہوگی۔ یہی نابینا ہونے سے مراد ہے۔ نسفی نے مدارک میں بیان کیا کہ آنکھوں کی بینائی سلب ہو جائے گی یعنی آنکھوں کا اندھا ہوگا۔ بیضاوی نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے۔ خطیب نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کافر جب قبر سے نکلے گا تو بینا ہوگا، پھر جب اس کو محشر کی طرف لے جایا جائے گا تو اندھا ہوگا۔

وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۔ نسیان کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں۔ کیونکہ خدائے برتر نسیان سے پاک ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں تُو نے آیاتِ الٰہیہ کا چھوڑا اور بھلا دیا، اسی طرح آج ہم تجھے عذاب میں ڈال کر اس طرح چھوڑ دیں گے جس طرح کوئی بھولی ہوئی چیز فراموش کر دی جاتی ہے۔

مَنْ اَسْرَفَ یعنی حدودِ شرعیہ سے تجاوز کیا۔ آیات سے اعراض کیا اور خواہشات میں پڑ گیا (بیضاوی) سفیان نے کہا اسراف سے مراد شرک ہے۔

مقصودِ بیان

اللہ کی مخصوص نعمتیں نافرمانوں کو نہیں ملتی ہیں، اس لئے حضرت آدم سے جنت کی تمام نعمتیں چھین لی گئیں۔ عالم بالا میں گنہگار بندے نہیں رہ سکتے۔ وہ مقدس طاہر ہستیوں کا مقام ہے، اس لئے حضرت آدم اور شیطان کو آسمان سے زمین پر اتار دیا گیا۔ اولادِ آدم اور ذریاتِ ابلیس کی فطری خلقی دشمنی ہے۔ نسلِ انسانی کے پھیلنے سے پہلے خدا تعالیٰ نے پیامِ ہدایت بھیجنے اور پیغمبروں کو مبعوث کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اللہ اور اس کے پیغمبروں کی ہدایت پر عمل کرنے والا دونوں جہان میں کامیاب ہوتا ہے اور سرکشی کرنے والا عذابِ آخرت کے علاوہ دنیوی تباہی سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ عذابِ آخرت لازوال ہے۔ حضرت آدمؑ کے پورے قصہ میں مندرجہ ذیل عبرت انگیز نصیحت مضمر ہے۔ اللہ کی نافرمانی خواہ کتنی ہی حقیر ہو آدمی کو برباد کر دیتی ہے خواہ کتنا ہی جلیل المرتبہ آدمی ہو، اس لئے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ گناہ کو چھوٹا نہ جانے، ادنیٰ لغزش راندۂ درگاہ کر دیتی ہے۔ جو شخص سچے دل سے اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے اللہ اس کا قصور معاف کر دیتا ہے، تکبر بدترین چیز ہے۔ امرِ الٰہی کی تعمیل میں چون و چرا کرنا اور عقلی توجیہات کرنی موجب بربادی ہیں۔ اللہ کا ازلی حکم اور غیر فانی مشیت ہر چیز پر غالب رہتی ہے۔ عقل و دانش، فہم و ذکا تقدیرِ الٰہی کے مقابلے میں کام نہیں دیتی۔ اعتبار انجام کا ہے۔ حضرت آدم سے قصور ہوا انہوں نے توبہ کر لی بالآخر بدستور سابق مقبول بارگاہ ہو گئے۔ شیطان کی طویل عمر زہد و ریاضت میں کٹی، یہاں تک کہ کثرتِ عبادت کے سبب اُس کا شمار فرشتوں میں ہونے لگا، مگر آخر میں حکم سے سرتابی کی اور ہمیشہ کے لئے برباد ہو گیا وغیرہ۔

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ

کیا اُن کو اس سے بھی ہدایت نہ ہوئی کہ ہم نے اُن سے پہلے کتنی ہی جماعتوں کو ہلاک کر ڈالا جن کے مکانوں میں یہ چلتے پھرتے تھے

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِأُولِي النُّهَىٰ ﴿۱۲۸﴾ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ

اس میں عقل والوں کے لئے بہتیری نشانیاں ہیں اور اگر ایک بات تمہارے رب کی طرف سے پہلے سے طے ہو چکی

لَكَانَ لِزَامًا وَأَجَلٌ مُسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ

ہوتی اور ایک وقت معین پر تو عذاب لازم ہو گیا ہوتا (تو اے نبی) جو کچھ یہ کہتے ہیں تم اس پر صبر کرو اور آفتاب کے طلوع و غروب سے

قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا ۖ وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ

پہلے اپنے پروردگار کی تسبیح پڑھو اور رات کے کچھ اوقات میں اور دن کے کناروں میں بھی

النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضَىٰ ﴿۱۳۰﴾ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا

پڑھا کرو تاکہ تم خوش ہو جاؤ اور ان چیزوں کی طرف نظر بھی نہ اٹھاؤ جن سے مختلف لوگوں کو ہم نے متمتع (فیضیاب)

مِنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴿۱۳۱﴾

کیا ہے یعنی دنیوی زندگی کی رونق بیشک ہم اس سے ان کی آزمائش کرتے ہیں اور تمہارے رب کی دی ہوئی روزی بہت بہتر اور زیادہ پائیدار ہے

تفسیر قرآن چونکہ ایک ہدایت نامہ ہے، اس لئے اس کا اصل موضوع تو قوانین ہدایت اور ضوابط اصلاح کو بیان کرنا ہے، لیکن ضوابط اصلاح پر عمل کرانے کے لئے ایک اثر انگیز طرز بیان کے ساتھ نصیحت کرنی ضروری ہے، اس لئے وعظ کے جو ضروری لوازم ہیں وہ بھی اس کے پیش نظر رہتے ہیں۔ مثلاً اگر قانون مبینہ کو دستور العمل بنایا جائے تو زندگی میں کیا بہترین نتائج حاصل ہوں گے اور مرنے کے بعد کیا ثمرہ خیر برآمد ہوگا اور اگر دستور العمل نہ بنایا جائے تو زندگی اور مابعد زندگی میں کس قسم کے نتائج بد سے دوچار ہونا پڑے گا۔ آیات مذکورہ میں حضرت آدم اور ابلیس کا قصہ بیان کر دیا اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ابلیس انسان کا قطعی دشمن ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کو شیطانی اغوار سے اجتناب کرنا چاہیئے اور اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت پر عمل کرنا چاہیئے تاکہ دنیوی کامرانی اور اخروی نجات حاصل ہو۔ اگر شیطان اور ذریات کی پیروی کی جائے گی اور اللہ کے مقرر کردہ حکم کو ٹھکرا دیا جائے گا اور اس کے بھیجے ہوئے ہدایت نامہ پر عمل نہ کیا جائے گا تو دنیا و دین دونوں برباد ہو جائیں گے۔ دنیا میں تنگی معاش اور آخرت میں عذاب ابدی سے ہم کنار ہونا پڑے گا۔ گویا انبیاء کے حکم کو ماننے کا نتیجہ ہے فلاح دارین اور مخالفت کا نتیجہ ہے ہلاکِ دارین۔ آخرت کے ثواب و عذاب کو دنیا میں رہ کر دیکھنا تو ناممکن ہے۔ مابعد زندگی کے احوال کا مشاہدہ اس زندگی میں محال ہے، اس لئے اس کے متعلق تو صرف بیان شارع اور عقلی استدلال کے علاوہ کوئی دوسرا ذریعۂ علم ہو نہیں سکتا۔ البتہ دنیوی زندگی کی کامیابی و ناکامی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے یا تاریخ اور مشاہدہ کی روشنی میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں نے آسمانی ہدایتوں کو دستور العمل بنایا ان کو کیسی کامرانی حاصل ہوئی اور جن لوگوں نے اللہ کے بھیجے ہوئے قانون کی خلاف ورزی کی وہ کس قدر گہری تباہی کے غار میں گر پڑے۔ نتیجۂ آخرت تو قرآن بار بار بلند آواز سے بیان کرتا ہی ہے، ترغیب و ترہیب اور بشارت و انذار اصل موضوع ہی ہے، لیکن چونکہ اس کا مشاہدہ زندگی میں ناممکن تھا، اس لئے قرآن نے اس کے ثبوت کے لئے عقلی استدلال اور برہانی بیان پر اکتفا کیا۔ دنیوی ثمرات کا اظہار تو چونکہ اس میں تاریخ و مشاہدہ کو کافی دخل ہے، اس لئے ان کے اظہار کے لئے برہان کے علاوہ تمثیل و استقراء سے بھی کام لیا گیا۔ آیت أَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ الخ میں اسی مضمون کو بیان کرنا مقصود ہے۔ قرآن عربی نازل ہوا تھا اور مکہ مدینہ میں نازل ہوا تھا اور

حجاز کے رہنے والے سردی و گرمی کے موسم میں ملک شام وغیرہ کو بغرضِ تجارت جایا کرتے تھے ۔ دورانِ سفر وہ سرِ راہ متعدد شکستہ کھنڈر اور فرسودہ آبادیوں کے نشانات ایسے ملتے تھے جو عاد ثمود لم جدیس وغیرہ اقوام کی تباہی اور آبادیوں بستیوں کا برباد ہو جانا اہلِ نظر کے لئے اپنے اندر ہزاروں درسِ عبرت رکھتا ہے ، لیکن عربوں نے شبانہ روز ان آیاتِ عبرت کا مشاہدہ کیا تھا اور جو حسن انگیز منظر دیکھا تھا وہ محض گزشتہ اقوامِ عرب کے تباہی آگیں کھنڈر ہی تھے ۔ عرب عاربہ اور عرب مستعربہ سے پہلے عرب بائدہ کے بہت قبائل سرزمین عرب پر آباد تھے ۔ ان کا بیش از بیش تسلط تھا ، قبائل کو متنیں تھیں ، جاہ و حشم ، جسمانی طاقت اور دولت کی فراوانی بھی امتیازی حیثیت رکھتی تھی ، لیکن رسول پاکؐ کے زمانے میں ان کا کوئی وجود نہ تھا ۔ انبیاء کی مخالفت کرنے اور قوانینِ الٰہیہ سے سرتابی کرنے کی وجہ سے ان کے تمام جاہ و حشم اور مال و خدم نذرِ بربادی ہو گئے ۔ مکانوں کے کچھ فرسودہ نشانات باقی تھے اور بس ، تاریخ بھی ان کے مفصل حالات بتانے سے قاصر ہے ۔ اُن کی نسلیں بھی صفحۂ ہستی پر باقی نہیں رہیں ، حجاز کے باشندے آمد و رفت میں ان کی ویران بستیوں کے اندر سے ہو کر گزرتے تھے ، اسی لئے قرآن کہتا ہے کہ کیا گزشتہ اقوام کی یہ نمایاں محسوس تباہی بھی عرب کی نصیحت پذیری کے لئے کافی نہیں ہے ۔ کتنی قومیں ان سے پہلے ہلاک ہو گئیں ، ان کے گھروں میں راستے بن گئے ۔ اہلِ دانش کے لئے تو ان علامات کے اندر عبرت اندوزی کا کافی ذخیرہ ہے ، لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں بقا تو کسی قوم اور کسی شخص کے لئے نہیں ۔ ہر قوم کا اپنا دور پورا کر کے لامحالہ فنا سے ہم آغوش ہونا ہے پھر یہ کیسے معلوم ہوا کہ گزشتہ اقوام کی بربادی مخالفتِ انبیاء کی ممنونِ کرم ہے اور کتبِ الٰہیہ کو نہ ماننے سے اُن پر یہ مصیبت آئی تھی ۔ اگر انبیاء کی مخالفت ایسی ہی تباہی انگیز ہے اور کتابِ الٰہی کی تباہی کا نتیجہ یہی نکلتا ہے تو محمدؐ (جو رسول ہونے کے مدعی ہیں) کے مخالفین کیوں تباہ نہیں کر دئے جاتے ؟ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ

ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے ۔ ہر شخص کے موت کی اجل معین ہے ۔ قانونِ قدرت یہی ہے کہ وقت سے پہلے کسی کو تباہ نہیں کیا جاتا ۔ البتہ اسبابِ فنا میں اختلاف ہوتا ہے ۔ معمولی موت تباہی کی موت سے جدا حیثیت رکھتی ہے ۔ درحقیقت یہ خدا کی ازلی حکمت ہے کہ مخالفوں کو وقتِ مقرر تک ڈھیل دیتا رہتا ہے اور باوجود سرکشی کے مقررہ میعادِ زندگی پوری کرنے دیتا ہے ۔ اگر اللہ کی ازلی مصلحت اور تحریرِ ابدی نہ ہوتی تو ان لوگوں پر عذاب کبھی کا آچکا ہوتا ۔

چونکہ الفاظ مذکورہ سے اہلِ اسلام کے لئے کسی قدر یاس انگیز مفہوم مترشح ہو سکتا تھا اور عام مسلمانوں کا خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ جب وقتِ مقرر سے پہلے کافروں کو تباہ نہیں کیا جا سکتا تو مرتے دم تک ان کی یہ دراز دستیاں ہم کو برداشت کرنی پڑیں گی ، اس لئے اللہ تعالیٰ نے رسول پاکؐ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ تم کفار کی تمام بدزبانیوں پر صبر کرو اور اپنا مرکزِ توجہ ہر وقت میں اللہ کی تسبیح و تقدیس کو بنائے رکھو ۔ اس کا نتیجہ تمہارے لئے خوش کن برآمد ہوگا یعنی کفار کی چیرہ دستیاں اور بدزبانیاں مسلمانوں کی توجہ کو انتقام کی طرف مائل نہ کریں ۔ دنیا میں مسلم کا فرضِ اولین عام پھیلانا اور اللہ کی الوہیت و ربوبیت کا اعلان کرنا ہے ۔ اس کا مرکزِ توجہ بس ایک ہی ہے ۔ راستہ کے موانع سے اس کی اصل رفتار میں سستی نہ آنی چاہیئے ، یہ درمیانی روڑے خود بخود الگ ہو جائیں گے ، راستہ صاف ہو جائے گا اور مسرت خیز دل پسند نتیجہ حاصل ہو جائے گا ۔

عموماً کفار کی دنیوی حالت مسلمانوں سے اچھی ہوتی ہے ۔ رسول پاکؐ کے زمانے میں بھی کفار کے پاس تمام اسبابِ عیش و راحت اور سامانِ تجمل و طرب موجود تھے ، عمدہ سواریاں ، دولت کی فراوانی ، غلاموں کی کثرت ، تجارت کا فروغ اور حسین عورتوں کا اجتماع سب کچھ اُن کو میسر تھا ۔ کمزور قلب کے مسلمانوں کے لئے یہ تمام امور دل کشی کے اسباب بن سکتے تھے ۔ ان کو اپنی افلاس آگیں حالت دیکھ کر کفار کی راحت آمیز حالت پر رشک ہو سکتا تھا ، اس لئے فرماتا ہے کہ دنیوی عیش و طرب کے اسباب کی کثرت دیکھ کر مسلمانوں کو لالچ نہ کرنا چاہیئے ۔ درحقیقت ان کے لئے یہ اسبابِ فلاح نہیں بلکہ موجباتِ ہلاکت ہیں ۔ یہ تمام چیزیں فانی ہیں ۔ آخرت کا ثواب اور وہ عیش و آرام جو مسلمانوں کو خدا دینے والا ہے اس سے کہیں زیادہ پائیدار ہے ۔

تحلیلِ اجزاء

يَمْشُونَ فِي مَسٰكِنِهِمْ اس آیت کا ترجمہ دو طرح سے کیا گیا ہے ۔ اول تو یہ کہ گزشتہ قومیں اپنے اپنے مکانوں میں چلتی پھرتی تھیں یعنی عیش و آرام سے رہتی تھیں ۔ دوسرا ترجمہ یہ ہے کہ گزشتہ اقوام کے جو کھنڈر پڑے ہیں اُن میں

عرب کے باشندے چلتے پھرتے ہیں اور انہی کے مکانوں میں انہوں نے راستے بنائے ہیں۔ موخر الذکر ترجمہ بہتر ہے۔

لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّھٰی۔ یعنی ارباب دانش آغاز و انجام پر نظر کر کے موجودہ حالت کو ضرور خالی سمجھتے ہیں، اس لئے انجام کے عذاب سے ڈرتے اور راحت آخرت کی فکر کرتے ہیں اور آیاتِ الٰہیہ سے منہ موڑ کر حماقت سے اس بات کے منتظر نہیں رہتے کہ عذاب آئے گا اور آنکھوں سے دیکھ لیں گے تب مانیں گے۔

وَلَوْلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتْ الخ۔ کلمۂ سابقہ سے مراد ابن کثیر، بیضاوی اور اکثر مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ نے ازل ہی میں اس بات کا حکم دے دیا تھا کہ جب تک اتمام حجت نہ ہو جائے گا اور کافی ڈھیل نہ دے دی جائے گی اس وقت تک کسی کو تباہ نہ کیا جائے گا۔ چنانچہ قیام حجت کے بعد جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ترک وطن کر کے مدینہ تشریف لے گئے اور کافی ڈھیل دے دی گئی اور وقت مقدر آگیا تو جنگِ بدر میں تمام سردارانِ کفر مارے گئے۔ اس تقدیر پر کلمۂ سابقہ سے مراد اتمام حجت اور اجل مسمّٰی سے مراد جنگِ بدر ہوگی۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کلمۂ سابقہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ امت محمدیہ پر دنیا میں عذاب نہ آئے گا۔ اس تقدیر پر معنی یہ ہوں گے کہ اللہ نے چونکہ پہلے ہی فیصلہ کر دیا ہے کہ اُمتِ محمدیہ پر دنیوی عذاب نازل نہ کرے گا اور مقررہ میعاد تک کسی کو ہلاک نہ کرے گا۔ اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوتیں تو عذاب آچکا ہوتا۔

مفسر سراج نے کلمۂ سابقہ سے یہ مراد لی ہے کہ اللہ نے پہلے سے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ اس امت کے کافروں پر قیامت تک کوئی عذاب گزشتہ اقوام کے عذاب کی طرح نہ آئے گا اور سب اپنی مقررہ میعادِ زندگی پوری کریں گے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو کفار کو ہلاک کر دیا جاتا۔ میرے نزدیک یہی توجیہ بہتر ہے۔ آیات قرآنیہ اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہے۔ قرآن میں صاف نص ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ حدیث میں آیا ہے۔ لم ابعث لعانا اللّٰھم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔

اَجَلٌ مُّسَمًّی سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین کے نزدیک جنگِ بدر کی طرف اشارہ ہے (امام بخاری نے یہی تفسیر کی ہے) عام مفسرین کے نزدیک مقررہ میعادِ زندگی کے اختتام کا وقت مراد ہے۔ خواہ جنگِ بدر ہو یا اور کوئی وقت ہو چونکہ عموم آیت یہی اقتضا ہے، اس لئے امام رازی نے اسی کو پسند کیا ہے۔

عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ۔ کفارِ عرب رسول پاکؐ کو شاعر، کاہن، ساحر اور مجنون کہتے تھے اور حضور اقدسؐ کو اس سے رنج ہوتا تھا تسلی کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ آیت جہاد والی آیت سے منسوخ ہو گئی۔ لیکن اہلِ تحقیق کا قول ہے کہ آیت بہر حال محکم ہے منسوخ نہیں۔ شہاب نے کہا کہ تلقینِ صبر سے مراد ترک قتال نہیں بلکہ عدم اضطراب کی تعلیم دینی مقصود ہے۔ مطلب یہ کہ کافروں کے ناشائستہ اقوال و افعال سے تم پریشان خاطر اور مضطرب نہ ہو بلکہ صبر رکھو۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ۔ تسبیح و تحمید سے مراد یا تو مطلق ذکرِ الٰہی ہے جس میں پانچوں وقت کی نماز بھی آگئی یا خصوصیت کے ساتھ پنج وقتہ نمازیں اور تہجد کے نوافل مراد ہیں۔ طلوع آفتاب سے پہلے فجر کی نماز ہے اور غروب سے پہلے عصر کی نماز ہے اور رات کی نمازیں عشاء، تہجد کی ہیں اور دن کے اوّل و آخر حصہ میں فجر و مغرب ہے۔ نماز فجر کی تاکید دوبارہ اس غرض سے ہوئی کہ وہ زیادہ فضیلت کی نماز ہے اور چونکہ آرام سے سونے کا وقت ہے، اس لئے زیادہ اہتمام و توجہ کے قابل ہے۔ رہی ظہر کی نماز تو بقول بیضاوی یہ بھی قبل الغروب میں داخل ہے۔

لَعَلَّکَ تَرْضٰی۔ ابن عباس نے فرمایا کہ لَعَلَّ کے معنی امید کے ہیں، لیکن خدا کی طرف سے جس امید کی صراحت کی گئی ہے وہ وجوبی ہے یعنی خدا تعالیٰ ضرور رسول پاکؐ کو خوش کرے گا۔ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب تک میں اپنی اُمت کے ایک ایک فرد کو جنت میں نہ لے جاؤں گا، راضی نہ ہوں گا۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِہٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْھُمْ زَھْرَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔ تفسیر معالم و سراج میں مذکور ہے کہ ایک روز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مہمان آکر ٹھہرا۔ اس وقت حضورؐ کے پاس ... کچھ نہ تھا کہ مہمان کو کھلاتے، اس لئے ابو رافع کو ایک یہودی دوکاندار

کہ اس کا آٹا قرض خرید نے بھیجا اور کہلا بھیجا کہ بکیم رجب کو قیمت ادا کر دوں گا ۔ یہودی نے آٹا نہیں دیا اور بولا میں محمد سے قرض کا معاملہ نہیں کرتا ۔ ہاں کچھ رہن رکھ جاؤ تو آٹا لے جاؤ ۔ ابو رافع نے حاضر خدمت ہو کر جواب عرض کر دیا ۔ ارشاد فرمایا واللہ میں تو اس کا امین ہوں جو زمین و آسمان میں ہے مگر وہ مجھے قرض دیتا یا میرے ہاتھ فروخت کرتا تو میں ضرور ادا کر دیتا ۔ اچھا تم میری یہ لوہے کی زرہ لے جاؤ ۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ۔

اس شان نزول کو اگر صحیح مان لیا جائے تو لازم آتا ہے کہ اس سورت میں یہ آیت مدنی ہوگی کیونکہ واقعہ مذکورہ مدینہ کا ہے ۔

آیت کی شان نزول اگرچہ خاص ہے ، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایسے واقعات بکثرت ہوتے تھے کہ مال نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا ان سے مفلس مسلمانوں کے دل بھی بغیر متاثر ہوئے نہ رہتے تھے ۔

ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بالاخانے کے اندر ایک چٹائی پر استراحت فرما تھے ۔ حضرت عمرؓ حاضر ہوئے اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشانات دیکھ کر رو دیئے ۔ حضورؐ نے فرمایا عمر! کیوں روتے ہو ؟ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ کسریٰ و قیصر تو اس حال میں ہیں اور خدا کے اشرف الکائنات بندہ کی یہ کیفیت ہے ۔ ارشاد فرمایا ۔ ہائیں کیا تم شک میں ہو اے عمر! کسریٰ و قیصر کو تو ان کے حصے کی تمام نعمتیں دنیا میں دے دی گئیں ۔ الخ ۔

حاصل یہ کہ آیت مذکورہ میں عام مسلمانوں کو تسلی دینی غرض ہے ۔ ورنہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم بہر حال بے نیاز تھے اور دنیوی مال و دولت کو ہیچ جانتے تھے ۔ تمام عمر میں کبھی آپ کو کسی کی دولت دیکھ کر لالچ نہیں ہوا ۔

مقصود بیان ارباب دانش کے لئے تمثیلی شکل میں ہدایت ۔ نصیحت کی پیشکش اور اقوام ہالکہ کی تباہی کو دیکھ کر عبرت اندوز ہونے کی تلقین ۔ عدم نزول عذاب کی وجہ و جبیہ کا بیان اور اس امر کی صراحت کہ وقت سے پہلے موت نہیں آتی ۔ کفار کی ایذا رسانی کے وقت مضطرب نہ ہونے کی ہدایت ۔ اور صبر کے ساتھ برداشت کرنے کا حکم ۔ پنج وقتی نماز کا امر اور در پردہ اس بات کی طرف ہدایت آمیز اشارہ کہ ہر مصیبت کے وقت نماز کی طرف رجوع کیا جائے اور صبر اختیار کیا جائے ۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کا وعدہ اور اس امر کی صراحت کہ صبر و صلوٰۃ ان بہترین نتائج کی کنجی ہیں جن سے آدمی کی ابدی خوشی وابستہ ہے ۔ کفار کے مال کی فراوانی ، اولاد کی کثرت اور جاہ و حشم کی افزونی دیکھ کر لالچ نہ کرنے کی ہدایت اور اس بات کا ضمنی بیان کہ دنیوی مال و متاع شرف و فضل کا سبب نہیں ، نہ یہ مقرب الی اللہ ہونے کی دلیل ہے ۔ بلکہ کفار کے لئے مال کی کثرت مزید وبال کا ذریعہ ہے ۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا ۖ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ

اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور خود بھی اُس پر قائم رہو ہم تم سے روزی نہیں مانگتے بلکہ ہم تم کو روزی دیتے ہیں

وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ۝ وَقَالُوْا لَوْلَا يَأْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ اَوَلَمْ تَأْتِهِمْ

اور انجام پرہیز گاری کا ہے کافر کہتے ہیں کہ اپنے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں لائے کیا ان کے پاس

بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ وَلَوْ اَنَّا اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ

اگلی کتابوں میں کوئی نشانی نہیں آئی اگر اس سے پہلے ہم اُن کو کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو

لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَا اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ

یہ کہتے کہ اے ہمارے رب تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا کہ ہم ذلیل و رسوا ہونے سے پہلے تیرے احکام پر

نَذِلَّ وَنَخْزٰی ○ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ

چلتے (اے نبی) کہدو ہر ایک منتظر ہے تم بھی منتظر رہو عنقریب تم کو معلوم ہوجائے گا کہ

اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ○ ع

ع ۷ / ۱۷

سیدھے راستے والے کون ہیں اور کون ہدایت یافتہ ہے

تفسیر

کتبِ الٰہیہ کے نزول اور انبیاء کی بعثت سے اصلاحِ خلق ہے، لیکن اصلاح کے مدارج مختلف ہیں۔ سب سے پہلے ہادی کے لئے اپنے نفس کی ہدایت و اصلاح لازم ہے تاکہ خود نمونۂ عمل بن کر دوسروں کو نصیحت کر سکے۔ واعظ کے وعظ کا اثر اسی وقت سامعین پر پڑ سکتا ہے جب اپنے قول کے مطابق وہ خود بھی عمل پیرا ہو۔ بے عمل ہادی قوم کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ اپنی ہدایت کے بعد ان لوگوں کی اصلاح سے ابتدا کرنی لازم ہے جن سے ہر وقت کا قریبی تعلق ہے جو ناصح کے اطوار و کردار سے کامل طور پر واقف ہوں۔ دور کے رہنے والوں کی آگ اسی وقت بجھائی جا سکتی ہے جب پہلے اپنے گھر کی آگ بجھائی گئی ہو۔ پھر ان تمام امور میں استقامت، استقلال، پختگی اور جماؤ شرط ہے۔ اگر تکالیف و مصائب سے تنگ آکر یا نفس کی کاہلی کے سبب اپنی ذات کی اصلاح یا قریب ترین رشتہ داروں کی ہدایت ترک کر دی تو ایسی موعظت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اسی بناء پر گزشتہ آیات میں رسول پاکؐ نے پنج وقتی نماز پڑھنے اور کفار کی ایذا رسانی پر صبر کرنے کی تلقین فرمائی تھی اور ان آیات میں گھر والوں کو نماز کا حکم دینے اور خود نماز پر کاربند ہونے اور استقلال رکھنے کا حکم دیا، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان طلبِ معاش میں سرگرداں، عبادت کا التزام اس کو کمائی کرنے سے روک دیتا ہے اس وقت ان کی جان بہت ضیق میں ہوتی ہے نماز پڑھے، دینی ہدایات پر عمل کرے یا اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے روزی کمائے، اس لئے خدا تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :-

رزاق تم نہیں ہم ہیں تم سے کسی کے لئے رزق کی طلب ہم نہیں کرتے، اس لئے طلبِ معاش میں سرگرداں رہ کر ضروری عبادت کو ترک کرنا ناجائز ہے۔ رہا یہ کہ کھائیں گے کیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ رزق دینا تو خدا کے ہاتھ میں ہے تم اس کے حکم کی تعمیل میں سرگرم رہو وہ تم کو رزق دے گا اور اگر بالفرض دوڑ دھوپ اور کوشش کرنے کے بعد بکثرت مال جمع بھی کر لیا تو بے کار ہے، انجام میں کسی کام نہ آئے گا۔ دنیا و دین کی پائیدار فلاح تو پرہیزگاری سے وابستہ ہے۔ اہلِ تقویٰ کا ہی انجام بخیر ہوتا ہے۔

رسول پاکؐ کی پاک ہستی خود معجزہ تھی۔ نشانِ قدرت تھی، آیاتِ الٰہی تھی، مگر کور بصیرت کافروں کو حق نظر نہ آتا تھا، اس لئے مزید معجزہ کے طلبگار ہوتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ گزشتہ انبیاء کے معجزات کی طرح کوئی محسوس معجزہ پیش کرو۔ خدا تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے کیا رسول اللہ کی تصدیق کے لئے وہ شہادتیں کافی نہیں ہیں جو گزشتہ آسمانی کتابوں میں موجود ہیں (جن میں رسولِ اُمّیؐ کا حلیہ، صورت اور اخلاق تک بیان کر دئے گئے ہیں۔ کیا اتنی اٹل شہادتوں کے بعد بھی کسی مزید آیتِ قدرت کی ضرورت باقی رہتی ہے)

اس سے آگے نبی کی ضرورت بیان فرماتا ہے کہ اگر بغیر ارسالِ نبی کے ہم کافروں کو عذاب سے ہلاک کر دیتے تو ان کو خدا کے سامنے جواب دہی کا موقع مل جاتا کہ آخر ہمارے پاس رسول کیوں نہیں بھیجا گیا۔ اگر ہمارے پاس پیغمبر کو بھیج دیا جاتا تو ہم احکام کی خلاف ورزی کیوں کرتے اور کیوں دنیا میں ذلیل اور آخرت میں رسوا ہوتے۔ اس معذرت کے پیشِ نظر خدا تعالیٰ نے پیغمبر کو مبعوث فرما دیا اور کتاب نازل کر دی۔ اس طرح حجت تمام ہو گئی۔ اس کے بعد رسول پاکؐ کو خطاب کر کے فرماتا ہے۔ آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ انجام کے ہم بھی منتظر ہیں تم بھی منتظر رہو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ حق پر کون تھا۔

تحلیلِ اجزاء :- وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ ۔ اہل سے مراد اہلِ بیت ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک عام امت مراد ہے۔ ابن کثیر

نے تفسیر میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اوّل اہلِ بیت کو نماز کا حکم دینے کا امر کیا، پھر نماز پر پابند رہنے کا مؤکد حکم دیا، اس لئے لازم ہے کہ مرد اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دے اور بیوی اپنے شوہر کو بھی ادائے صلوٰۃ پر آمادہ کرے۔ حضور اقدسؐ نے ایسی عورت کو دعا دی ہے۔

ابن النجار، ابن عساکر اور ابن مردویہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد آٹھ ماہ تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کے دروازہ پر جاکر فرمایا کرتے تھے: - اَلصَّلٰوۃُ رَحِمَکُمُ اللہُ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللہُ لِیُذْہِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَہْلَ الْبَیْتِ وَیُطَہِّرَکُمْ تَطْہِیْرًا۔ اس روایت میں میرے نزدیک محل غور یہ امر ہے۔ سورۂ طٰہٰ مکی ہے اور آیت تطہیر مدنی ہے۔ پھر کس طرح حضور اقدس حضرت علی کے دروازے پر آیت تطہیر تلاوت فرماتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مدینہ کا ہے۔ مدینہ میں ہی حضور والا حضرت علی کو نماز کی تیاری کے لئے روزانہ آمادہ فرماتے تھے۔ واللہ اعلم۔

لَا نَسْئَلُکَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُکَ۔ بعض مفسرین نے اس آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ ہم تجھ سے تیرے لئے رزق کے طالب نہیں ہیں بلکہ ہم ہی تجھ کو رزق دیتے ہیں۔ ثوری نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ ہم تلاش رزق کی تجھے تکلیف نہیں دیتے۔ ابن کثیر نے کہا مراد یہ ہے کہ اگر تو نماز باقاعدہ پابندی سے ادا کرے گا تو تجھے رزق ایسی جگہ سے دیں گے جہاں تیرا گمان بھی نہ ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اللہ فرماتا ہے اے ابن آدم! تو میری عبادت کے لئے یکسو ہوجا میں تیرے سینے کو تونگری سے بھر دوں گا اور ناداری کو دور کردوں گا اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تیرے سینے کو افکاروں سے بھر دوں گا اور ناداری کو دور نہ کروں گا (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

حضرت ابن مسعودؓ کی مرفوع روایت ہے جس نے متعدد مقاصد کو صرف ایک مقصد بنا لیا (یعنی افکار دنیا سے بے نیاز ہوکر صرف فکر آخرت کو پیش نظر رکھا) تو اللہ اس کے دنیوی افکار کو دور کردے گا اور جس کے ساتھ دنیا کے مختلف افکار رہے تو اللہ پرواہ نہ کرے گا کہ وہ افکار کی کس وادی میں ہلاک ہوا (رواہ ابن ماجۃ)

حضرت زید بن ثابت سے مروی ہے حضورؐ نے ارشاد فرمایا دنیا جس کا مقصد ہو اللہ اس کے کام پریشان کر دیتا ہے، محتاجی کو اس کے سامنے لے آتا ہے اور دنیا اس کو اسی سے ملتی ہے اور حاصل ہوتی ہے جتنی اس کے لئے لکھ دی گئی ہے اور جس شخص کا مقصد آخرت ہو اللہ اس کے کام مجتمع کر دیتا ہے۔ اس کے دل میں تونگری بھر دیتا ہے اور دنیا اس کے پاس خوار ہوکر آتی ہے (رواہ ابن ماجۃ)

وَالْعَاقِبَۃُ لِلتَّقْوٰی۔ یعنی دنیا و دین میں انجام کار کامیابی انہی لوگوں کو ہوگی جو اہل تقویٰ ہیں۔ تقویٰ سے مراد ہے اللہ کی نافرمانی سے بچنا، اوامر کی تعمیل کرنا اور نواہی کے ارتکاب سے اجتناب رکھنا۔

ایک روز رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا کہ حضور اقدسؐ عقبہ بن رافع کے مکان میں ہیں اور ابن طاب کی قسم کی تازہ کھجوریں آپ کے سامنے لائی گئیں۔ حضورؐ نے اس خواب کی تعبیر دی کہ دنیا اور عاقبت کی رفعت ہمارے ہی لئے ہے اور ہمارا دین طیب ہے۔ اس حدیث سے آیت مذکورہ کے مضمون کی تائید ہوتی ہے۔ گویا عاقبت سے مراد ہے انجام۔ خواہ دنیوی انجام ہو یا جزائے آخرت۔

بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّہٖ۔ آیت سے مراد ہے ایسا معجزہ جیسا گزشتہ انبیاء نے پیش کیا تھا۔ مثلاً ید بیضاء، عصا، ناقہ وغیرہ۔ یا وہ فرمائشی معجزہ مقصود ہے جس کی خواہش وقتاً فوقتاً کفار کیا کرتے تھے۔

اَوَلَمْ تَاْتِہِمْ بَیِّنَۃُ مَا فِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی۔ اس آیت کا مطلب اہل تفسیر نے مختلف طور سے بیان کیا ہے۔ ایک مطلب تو وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ گزشتہ آسمانی کتابوں میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ، کیرکٹر، عادات، اطوار اور نام وغیرہ سب کچھ مذکور ہے۔ پھر شک وشبہ کی کیا گنجائش ہے۔ کیا گزشتہ الہامی کتابوں کی مذکورہ شہادت تصدیق رسول اللہؐ کے لئے کافی نہیں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ انبیائے سابقین کی کتابوں میں صاف طور پر لکھا ہوا ہے کہ جن قوموں نے اپنے زمانے کے انبیاء کی تکذیب کی اور ان کی ہدایتوں پر نہ چلیں وہ ہلاک کردی گئیں۔ پھر کفار عرب کس طرح مطمئن ہیں۔ کیا گزشتہ کتابوں کے واقعات ان کی عبرت کے لئے کافی نہیں ہیں۔

تیسرا مطلب یہ کہ قرآن حکیم میں گزشتہ کتابوں کے تمام واقعات مذکور ہیں۔ تورات و انجیل میں اہل کتاب نے جو تغیرات و تحریفات کی تھیں ان کو بھی کھول کر بیان کر دیا ہے اور جو اصلی احکام تھے ان کی بھی صراحت کر دی ہے۔ اس سے زیادہ قرآن کی صداقت کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس مطلب کو ابن کثیر نے پسند کیا ہے۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰی۔ ذلت سے مراد ہے دنیوی ذلت اور رسوائی سے مراد ہے آخرت کی خرابی۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ ذلت سے مراد جنگِ بدر کی طرف اشارہ ہے جس میں کفار کو دنیوی تباہی سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔

فَتَرَبَّصُوْا۔ یعنی کھانے پینے رہنے سہنے میں مومن و کافر کے درمیان بظاہر کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا، لیکن دونوں کی حقیقت نظر میں فرق ہے ایک کا مطمح نظر سعادت آخرت ہے۔ دوسرے کا نقطۂ نگاہ محض آسائش دنیا ہے۔ اس کو فلاح اُخروی کی کوئی اُمید نہیں۔

مقصودِ بیان

تبلیغ اسلام فرض قطعی ہے، لیکن دوسروں کو نصیحت کرنے کے ساتھ خود بھی عمل کرنا ضروری ہے۔ رزاق خدا تعالیٰ ہے کسی دوسرے کے ہاتھ میں روزی رسانی کا کام نہیں، اس لئے طلب معاش میں پھنس کر ادائے فرض سے غافل ہونا کسی طرح جائز نہیں۔

رسول پاک کی صداقت کی شہادت کتب سابقہ میں موجود ہے۔ انبیاء کو مبعوث کرنے کی غرض اتمام حجت ہے تاکہ قیامت کے دن کسی کو عذر پیش کرنے کا موقع نہ مل سکے وغیرہ۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بَیَانُ السُّبحَانْ

کا

پارہ نمبر ۱۷

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ

فاضلِ اجل حضرت مولانا سید عبدالدائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں سنہ ۱۳۵۶ھ سے باقساط ہر ماہ شائع ہو رہی ہے

عطاء الرحمٰن صدیقی مالک وسیم بک ڈپو دیوبند

نے برائے اشاعت معارف القرآن

محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند (یوپی)

سترھواں پارہ

سُوْرَۃُ الْاَنْبِیَاءِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ مِائَۃٌ وَّ اِثْنَتَا عَشْرَۃَ اٰیَۃً وَّ سَبْعُ رُکُوْعَاتٍ

سورۃ الانبیاء مکی ہے اس میں ایک سو بارہ (۱۱۲) آیتیں اور سات رکوع ہیں

چونکہ اس سورۃ میں انبیاء کا تذکرہ زیادہ ہے، اس لئے سورۃ الانبیاء اس کا نام ہوگیا - اس سورت ایک سو گیارہ یا ایک سو بارہ آیت۔ ایک ہزار ایک سو ساٹھ کلمات اور چار ہزار آٹھ سو نوے حروف ہیں۔ کذا فی السراج۔

قرطبی، رازی وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ یہ پوری سورۃ بالاجماع مکی ہے۔ امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن مسعود کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے اس سورت کا مکی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ کہف، مریم اور سورۂ انبیاء یہ سب سورتیں اول سے ہیں یعنی مکی ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ

لوگوں کے قریب آ لگا ان کا حساب اور وہ غفلت میں پڑے رخ پھیرے ہوئے ہیں جو کوئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے

رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۙ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۗ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ

ان کے پاس آتی ہے اس کو کھیل میں مشغول ہوتے ہوئے سنتے ہیں ان کے دل غافل ہیں ان ظالموں نے چپکے چپکے

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۖ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ

سرگوشیاں کیں کہ یہ تو تم ہی جیسا ایک آدمی ہے کیا پھر بھی آنکھوں دیکھتے جادو میں پڑتے ہو

قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ

پیغمبر نے کہا میرا پروردگار آسمان و زمین کی ہر بات کو جانتا ہے اور وہی سننے والا جاننے والا ہے بلکہ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ قرآن

اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ ۖ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ ۝ مَآ

پریشان خیالات ہیں (نہیں) بلکہ محمد نے اس کو گھڑ لیا ہے (نہیں) بلکہ وہ شاعر ہے پس اُن کو چاہئیے کہ جس طرح پہلے پیغمبر بھیجے گئے یہ بھی ہمارے پاس کوئی نشانی لے آئیں۔

اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا ۚ اَفَهُمْ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا

اُن سے پہلے کوئی ایسی بستی ایمان نہیں لائی جس کو ہم نے ہلاک کردیا ہے تو کیا یہ ایمان لے آئیں گے تم سے پہلے بھی ہم نے آدمی ہی رسول بنا کر بھیجے تھے۔

نُوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا

جن کے پاس ہم وحی بھیجتے تھے پس اگر تم ناواقف ہو تو اہل کتاب سے پوچھ لو اور ہم نے اُن کے ایسے بدن نہیں بنائے تھے

یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِیْنَ ○ ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَاَنْجَیْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَآءُ

کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے پھر ہم نے اُن کو وعدہ سچ کر دکھایا اُن کو نیز جس شخص کو ہم چاہتے تھے ہم نے

وَاَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِیْنَ ○ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكُمْ كِتٰبًا فِیْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ ع

بچالیا اور حد سے آگے بڑھ جانے والوں کو ہلاک کر دیا ہم نے تمہارے طرف ایک کتاب اُتاری ہے جس میں تمہارے لئے نصیحت ہے تو کیا پھر بھی تم نہیں سمجھتے۔

تفسیر محسوس پرست کور باطن انسان آباؤ اجداد کی تقلید کا بندہ ہوتا ہے، عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتا۔ اپنے عقائد و مسلمات کا اس قدر گرویدہ ہوتا ہے کہ کوئی بات ان کے خلاف سُننا گوارا نہیں کرتا۔ اگر اللہ کی طرف سے کوئی ہادی آکر اس کو راہ راست دکھانی چاہتا ہے اور اصلاح و اعمال کے عقائد کے لئے پیام حق سناتا ہے تو یہ پرستارِ نفس اس کے قول کی طرف کان بھی نہیں رکھتا۔ چونکہ اس کی نظر کوتاہ اور بصیرت تاریک ہوتی ہے، اس لئے جب وہ فرستادگانِ خدا کو صورت شباہت میں اپنے ہی جیسا انسان دیکھتا ہے اور ان کو بھی ضروریاتِ حیات کا ویسا ہی محتاج پاتا ہے جیسا معمولی انسان تو اس کو یقین نہیں آتا کہ معمولی صورت رکھنے والا انسان خدا کا پیغامبر ہو سکتا ہے، اس لئے رسالت کا صاف انکار کر دیتا ہے، لیکن علمبردارانِ حق کے اندر غیر معمولی غیبی طاقت ہوتی ہے اور اس زمانے کا کوئی انسان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس لئے کور بصیرت طبقہ کو سر جھکا دینا پڑتا ہے، مگر عاجز ہو جانے سے ایمان نہیں پیدا ہوا کرتا، دل میں یقین نہیں بیٹھا کرتا اور نظر سطحی ہوتی ہے، اس لئے حاملِ حق کی غیبی طاقت کو صداقت اور حق کی طاقت نہیں بلکہ طاغوتی طاقت خیال کرتا ہے۔ کبھی کہتا ہے اس شخص کے پاس وحی نہیں آتی بلکہ یوں ہی پراگندہ خیالات ہیں، تصرفات خواب ہیں، لیکن پریشان خواب چونکہ ضوابط اصلاح اور قوانین ہدایت نہیں پیش کرتے۔ نہ دنیا اُن کے مقابلے سے عاجز ہو سکتی ہے، اس لئے منکرِ حق گروہ اپنی غلطی محسوس کرتے ہوئے دوبارہ کہتا ہے۔ اگر پریشان خواب نہیں تو یہ ضوابط اصلاح عمل دماغی کا نتیجہ ضرور ہیں، خود ساختہ ہیں، تراشیدۂ ذہن ہیں، اس شخص نے سوچ سمجھ کر خود یہ قوانین بنا لئے ہیں جن کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے، لیکن اختراع دماغی بھی معجزہ نہیں ہو سکتی۔ دماغ ہر شخص کے پاس ہے، کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اپنے دماغ سے ایک چیز اختراع کرے اور دوسرا شخص اس چیز میں ترقی نہیں کر سکے اور تمام انسانوں کی دماغی طاقتیں اس کے سامنے پراگندہ ہو جائیں، اس لئے کور بصیرت گروہ حاملِ حق کو شاعر کہنے لگتا ہے۔ کیونکہ شاعر کا شعور عام انسانوں سے زیادہ بلند ہوتا ہے بقول عرب شاعروں کو جنات القا کرتے ہیں۔ ان کا تعلق کسی غیبی طاقت سے ہوتا ہے، لیکن بصیرت رکھنے والے وحی اور شعر کا فرق خوب سمجھتے ہیں۔ کہاں شاعروں کی فلک بندیاں اور کہاں خدائے قدوس کا بھیجا ہوا پیامِ اصلاح۔ دنیا میں شاعر لاکھوں ہوتے ہیں، لیکن کوئی بھی وحی کی طرح قانونِ اصلاح نہ بنا سکا۔ مجبوراً ظالم کافر کہنے لگتا ہے ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس شخص میں کون سی بجلی کی طاقت ہے، کون سی عاجز کُن قوت ہے، ہو نہ ہو یہ جادوگر ہے، جادو کے زور سے دوسروں کو مقابلے سے یہ عاجز کر دیتا ہے۔

کفار عرب بھی کچھ کم کافر نہ تھے۔ رسول پاکؐ نے ان کے سامنے پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا اور کتابِ الٰہی کو بطور معجزہ پیش کیا۔ قوانین کتاب ان کے اعتقادیات اور معمولات کے خلاف تھے۔ ان کی نظر میں نئی چیز تھی، اس لئے ہدایتِ الٰہی کو انہوں نے پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ شخص ہم ہی جیسا معمولی انسان ہے۔ کھاتا ہے، پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، ضروریاتِ بشری کا ہماری ہی طرح محتاج ہے۔ پھر وہ کون سی خصوصیت ہے کہ اللہ کا پیغمبر ہو جائے، لیکن پیامِ ہدایت کی اعجاز آفرینی کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا، اس لئے کبھی قرآن کو خواب پریشان کہتے، کبھی تراشیدۂ دماغ کہتے، کبھی تصرفات شاعری کا نتیجہ قرار دیتے اور کبھی ساحری کا غیر معمولی کرشمہ بتاتے۔ چونکہ ان کا نور بصیرت

افسردہ تھا، باطنی آنکھ اندھی تھی، نظر کوتاہ تھی، ان کے نزدیک وہی معجزہ ثبوتِ نبوت کی دلیل ہو سکتا تھا جو اعیانِ خارجیہ میں محسوس طور پر انقلاب پیدا کر دے، لاٹھی سانپ بن جائے، ہاتھ کا ہالہ آفتاب کی طرح چمکنے لگے وغیرہ وغیرہ، اس لئے وہ اسی قسم کے حسی معجزات کے طلبگار تھے۔ کبھی کہتے کہ پہاڑ سونے کے بن جائیں یا اپنی جگہ سے ہٹ جائیں اور صاف میدان قابلِ زراعت نکل آئے۔ کبھی کہتے کہ فرشتے آسمان سے اتر کر ہمارے سامنے آکر شہادت دیں۔ غرض اسی طرح کی بکواس کرتے اور روحوں میں انقلاب پیدا کرنے والے معجزے کو معجزہ نہ سمجھتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے ان کے ان توہمات کو دور کرنے کے لئے صاف طور پر فرما دیا کہ اس سے پہلے جتنے انبیاء بھیجے گئے وہ سب آدمی ہی تھے۔ دوسرے انسانوں کی طرح وہ بھی فانی تھے انھوں نے طرح طرح کے محسوس معجزات پیش کئے، مگر کچھ نتیجہ نہ ہوا، کافروں نے نہ مانا۔ بالآخر نافرمانوں کو ہلاک کر دیا۔ جب کافروں کا یہی دستور العمل رہا ہے تو پھر یہ لوگ کیسے ایمان لا سکتے ہیں۔ رہا معجزہ کا سوال تو قرآن سے بڑھ کر کون سا معجزہ ہو سکتا ہے۔ یہ معجزہ روحوں میں انقلاب پیدا کرنے والا، اخلاق کی کایا پلٹنے والا اور آنے والے واقعات (عذاب و ثواب) کی یاد دلانے والا ہے۔ مقامِ غور ہے کہ کہاں وہ محسوس مادی معجزات اور کہاں یہ پاکیزہ، پاک اور اصلاح آفریں یادداشت۔

تحلیلِ اجزاء

لِلنَّاسِ۔ ناس سے مراد ابن عباس کے نزدیک کفارِ مکہ ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک عام کافر مراد ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ کسی کی تخصیص نہیں کافر ہوں یا مومن سب مراد ہیں۔

حِسَابُهُمْ اگر ناس سے خاص کفارِ مکہ مراد ہوں تو حساب سے مراد یومِ بدر ہوگا۔ ورنہ عام اہلِ تفسیر نے روزِ قیامت مراد لیا ہے۔ قیامت کا دن اگرچہ ابھی نہیں آیا اور خدا جانے کب آئے، مگر جو چیز یقینی آنے والی ہے وہ بہت ہی قریب ہے۔ ہر دم اس سے قرب ہوتا جاتا ہے۔ اسی بنا پر حضور اقدس ؐ نے ارشاد فرمایا بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ۔ یعنی کلمہ کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو ملا کر دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضور ؐ نے فرمایا میں اور روزِ قیامت ان انگلیوں کی طرح متصل ہیں۔ مطلب یہ کہ میرے بعد کوئی شریعت اور جدید نبی آنے والا نہیں۔ اہلِ تحقیق نے لکھا ہے کہ حساب سے مراد قبر کا حساب ہے۔ موت کے بعد سے ہی اس حالت کے آثار (جو قیامت کے دن ہونے والی ہے) ہر شخص کے سامنے نمودار ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اپنے اعمال کا نتیجہ قبر میں ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ قبر میں اگرچہ تفصیلی حساب نہیں ہوتا، مگر اجمالی حساب ضرور ہوتا ہے۔ توحید و رسالت کے متعلق باز پرس لازم ہے۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ موت سر پر کھڑی ہے حساب کا وقت بہت ہی قریب آگیا ہے، مگر لوگ خوابِ غفلت میں سرشار ہیں کوئی تیاری نہیں کرتے۔

مِنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ ۔ مُحْدَثٍ کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ کفار کے قدیم رسم و رواج کے خلاف ہے۔ جن عقائد و اطوار کے یہ عادی ہیں ان کے موافق نہیں بلکہ نئی چیز ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کا نزول وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ ہر حکم پہلے کے اعتبار سے نیا ہوتا ہے۔ دونوں معنی کا حاصل ایک ہی ہے۔

نوٹ چونکہ معتزلہ کے نزدیک قرآن حادث ہے، اس لئے زمخشری نے کشاف میں محدث کے معنی حادث لکھے ہیں، لیکن اہلِ سنت کے نزدیک بالاجمال قرآن کے معنی قدیم ہیں۔ نزولِ الفاظ حادث ہے، اس لئے ابن کثیر، بیضاوی اور خطیب وغیرہ نے محدث کا ترجمہ جدید فی النزول لکھا ہے۔ امام احمد کے نزدیک ترتیب الفاظ اور ان کا نزول بھی قدیم ہے۔

ایک بار ابن عباس ؓ نے لوگوں کو وعظ و پند کرتے ہوئے فرمایا تھا تم لوگ یہود و نصاریٰ کی کتابوں کے مضامین کیوں دریافت کرتے ہو۔ جو کتابیں ان کے ہاتھوں میں تھیں ان میں تو انہوں نے تبدیل تحریف کمی بیشی کر لی۔ ہاں تمہاری یہ کتاب سب کتابوں سے نئی ہے اس میں کوئی میل نہیں ہے (رواہ ابن کثیر والبخاری بنحوہ) ابن عباس کے مذکورہ قول سے اہلِ سنت کی صراحت کی تائید ہوتی ہے۔

وَأَسَرُّوا النَّجْوَى۔ رسول پاک ؐ کے متعلق مشورہ کرنا چونکہ عظیم الشان امر تھا۔ آپ کی تصدیق سے اپنے تمام موروثی عقائد و اطوار کو چھوڑنا پڑتا تھا اور آپ کی تکذیب روزِ روشن کی تکذیب کے مترادف تھا اس لئے کفار نے باہم خفیہ مشورہ کیا۔

إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یعنی یہ شخص بھی تمہاری طرح آدمی ہے۔ کھاتا ہے، پیتا ہے، چلتا پھرتا ہے، ضروریاتِ انسانی کا تمہاری طرح محتاج ہے۔ پھر

یہ کس طرح رسول ہو سکتا ہے، کس طرح اس کے پاس وحی آ سکتی ہے۔ بشر اور پھر رسول یہ کیسے ممکن ہے۔ اب رہے وہ افعال جو رسول پاک سے بطور معجزہ سرزد ہوتے تھے تو ان کے متعلق کفار کہتے تھے کہ:۔

اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ۔ یہ جادو ہے یعنی جب آدمی کا رسول ہونا ناممکن ہے تو اس سے معجزات کا سرزد ہونا بھی ناممکن ہے۔ رہے خوارق عادات تو وہ ساحرانہ کرشمے کے نتائج ہیں۔

رَبِّیْ یَعْلَمُ۔ یہ کفار کے خفیہ مشوروں کی پردہ دری ہے اور اس امر کی صراحت ہے کہ تمہارا کوئی مشورہ بھی خدا سے مخفی نہیں رہ سکتا۔ رسول پاک کا مطلع ہونا بھی خود ایک معجزہ ہے۔ پھر کس کس معجزے کو سحر کہو گے۔

اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ۔ کفار کو قرآن کے جادو کہنے میں بھی استقلال نہ تھا ان کا مقصود تو صرف نکتہ چینی بلکہ ابلہ فریبی تھی، اس لئے کہنے لگے کہ یہ پریشان خیالات ہیں یعنی سحر کا تو کچھ اثر بھی ہوتا ہے اس قرآن کا تو کچھ اثر بھی نہیں ہے۔ یوں ہی پراگندہ خیالات ہیں کوئی بات کہیں کی کوئی کہیں کی۔

بَلِ افْتَرٰىهُ۔ یعنی پریشان خیالات کی بندش میں تو اختیار کو دخل نہیں ہوتا اور محمدؐ نے قرآن کو قصداً بنایا ہے اور پھر خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ پراگندہ خیالات کو جمع کرنے والے بھی ہیں اور مفتری بھی۔

بَلْ هُوَ شَاعِرٌ۔ یعنی ایسی بندش اور ایسی ترکیب عبارت اور الفاظ کی نشست اور معانی کی تعبیر قرآن کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ یہ شعر گوئی کی عادت ہی ہے۔

فَلْیَاْتِنَا بِاٰیَةٍ۔ یعنی پہلے انبیاء کی طرح کوئی محسوس اور بدیہی معجزہ کیوں نہیں دکھاتے اور کوئی غیبی واضح نشانی کیوں نہیں پیش کرتے الحاصل کفار نے رسول پاکؐ کی رسالت کے متعلق تین شبہات ظاہر کئے۔ (۱) یہ آدمی ہیں اور آدمی رسول نہیں ہو سکتا۔ (۲) یہ ساحر یا کم سے کم شاعر ہیں۔ (۳) انبیائے سلف کی طرح ان کے پاس کوئی معجزہ نہیں ہے۔ ان تینوں شبہات کا جواب مندرجہ ذیل آیات میں خدا تعالیٰ نے دیا ہے۔

مَاۤ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ۔ یہ تیسرے شبہ کا جواب ہے یعنی ان سے پہلے ہم نے جس قدر بستیوں کو ہلاک کیا ہے ان کے رہنے والوں نے اپنے پیغمبر سے وعدہ کر لیا تھا کہ ہم معجزہ دیکھ کر ایمان لے آئیں گے، مگر جب ان کو معجزہ بھی دکھا دیا تب بھی ایمان نہ لائے۔ پھر یہ جو معجزے کی درخواست کرتے ہیں کیا ایمان لے آئیں گے۔ ہرگز نہیں کیونکہ اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰیَةٍ اور جب ایمان نہ لائیں گے تو ہلاک ہونا یقینی ہے اور خدا تعالیٰ کو وقت مقرر تک ان کو ہلاک کرنا منظور نہیں۔ قتادہ نے روایت کی ہے کہ اہل مکہ نے حضور اقدسؐ سے ضد کی اور کہا اگر تمہارا قول سچ ہے تو کوہ صفا کو سونے کا کر دو اور عرب کی سرزمین شاداب و سرسبز بنا دو۔ اگر ایسا کر دو گے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ کفار کی درخواست پر حضرت جبرئیل نازل ہوئے اور کہا اللہ فرماتا ہے اگر تمہاری خواہش ہو تو ہم ان کا سوال پورا کر دیں، لیکن اگر ایمان نہ لائے تو پھر عذاب میں تاخیر نہ ہوگی۔ حضور والاؐ نے جواب دیا میں اپنی قوم کے لئے تدریج و مہلت کا خواستگار ہوں تاکہ ان کی نسل سے اہل ایمان پیدا ہوں۔ اس پر خدا تعالیٰ نے آیت مَاۤ اٰمَنَتْ قَبْلَهُمْ الخ نازل فرمائی۔

رِجَالًا نُّوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ۔ یہ پہلے شبہ کا جواب ہے یعنی تمام گزشتہ انبیاء آدمی ہی تھے۔ فرشتے نہ تھے (پھر تم محمدؐ کی رسالت میں کیوں شبہ کرتے ہو اور کیوں رسالت کو بشریت کے منافی سمجھتے ہو)

فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ۔ کفار مکہ اہل کتاب کو اہل علم جانتے تھے۔ اکثر باتوں میں ان کے معتقد تھے اس لئے حکم ہوا کہ اگر تم کو تاریخی علم نہیں اور آسمانی مذاہب کے قواعد سے واقف نہیں تو اہل کتاب سے دریافت کر لو وہ بتا دیں گے کہ گزشتہ انبیاء انسان ہی تھے۔ کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے تھے۔

عام مفسرین کے نزدیک اہل ذکر سے اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ مراد ہیں۔ مگر ابن کثیر نے صراحت کی ہے کہ عام اہل علم مراد ہیں۔ خواہ یہودی ہوں یا عیسائی یا کوئی اور گروہ۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ كِتٰبًا الخ۔ یہ دوسرے شبہ کا جواب ہے۔ یعنی یہ قرآن سحر اور شاعری نہیں نہ بیہودہ تک بندیاں اور پریشان

خیالات ہیں بلکہ غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ عظیم الشان ہدایت نامہ اور جلیل القدر معلومات ہے۔ اس کے اندر ہدایت و سعادت کے ضوابط ہیں۔ شاعری یا سحر یا کوئی اور چیز ایسی کہاں ہوسکتی ہے۔

ضمیمہ آیت فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ میں دو باتیں تحقیق طلب ہیں۔ اول یہ کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس کیا مذہبی کتابیں بغیر تحریف و تغیر کے موجود تھیں کہ ان سے دریافت کرنے کا حکم دیا؟ دوسرے یہ کہ کیا علماء کی تقلید واجب ہے؟ اور یہ ضروری بات ہے کہ عام لوگ جن مسائل کو جانتے ہوں ان کو اہل علم سے دریافت کریں اور جیسا وہ بتائیں ان کو مان لیں اور اس پر عمل کریں؟

(۱) کفار مکہ ”یا عموماً کفار کو مراد ہے۔ چونکہ کفار مکہ کے نزدیک حاملان علم اور ارباب معرفت صرف یہود و نصاریٰ تھے۔ اہل اسلام کے عالم ہونے کے وہ قائل نہ تھے، اس لئے انہی کے پیشوایان علم سے دریافت کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے۔ اس لئے یہ لازم نہیں آتا کہ اہل اسلام کے باہمی اختلافات کا مرجع بھی تورات و انجیل ہے۔ نہ عیسائیوں اور یہودیوں کی مذہبی کتابوں کی تحریف و عدم تحریف کی کوئی صراحت ہے۔ اس کے علاوہ رسول پاکؐ کے زمانے میں تورات و انجیل کے اکثر احکام بدل دیئے گئے تھے کہیں ہدایت کا حذف و ایزاد بھی کر دیا گیا تھا، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام واقعات و احکام کو اہل کتاب نے بدل دیا تھا اور چونکہ انبیاء کے آدمی ہونے کی صراحت اصل کے موافق باقی تھی، اس لئے مسئلہ خاص میں ان کی شہادت قابل اعتبار سمجھی گئی۔ اس سے تمام مسائل و تحقیقات میں ان کا صائب الرائے اور صحیح العلم ہونا لازم نہیں آتا نہ یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کی کتابیں غیر متبدل اور غیر محرف تھیں۔ تحریف کے ثبوت کے لئے کل احکام و الفاظ کی تحریف کا اثبات ضروری نہیں ہے۔

(۲) اہل اسلام کے لئے تقلید کا جواز و جوب آیت سے مستنبط نہیں ہوتا کیونکہ حکم صرف کفار کو ہے۔

ابن کثیر کے نزدیک چونکہ اہل ذکر سے عام اہل علم مراد ہیں اور باوجود تعین مورد کے خطاب میں عموم ہے، اس لئے اہل اسلام کو بھی علماء سے دریافت کرنے کا حکم آیت سے مستخرج ہوسکتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص نہ جانتا ہو اس کے لئے راہ علم یہ ہے کہ عالم سے دریافت کرلے۔ یعنی عالم کے قول کو ماننا اور اس کا اتباع کرنا جاہل کے لئے ضروری ہے، لیکن اس سے یہ امر کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ اہل علم ناواقف طبقہ کے سامنے شرعی دلائل بھی بیان کریں۔ نہ جاہل کے لئے زیبا ہے کہ وہ علمائے ربانی سے احکام کے دلائل بھی دریافت کرے۔ یہی شرعی تقلید ہے اور اس کا وجوب آیت سے مستنبط ہوتا ہے۔ فافہم۔

مقصود بیان قرب قیامت کی صراحت اور خواب غفلت سے بیدار ہونے کی تلقین۔ اس امر کی توضیح کہ انسان غفلت و تقلید میں سرشار ہے۔ کلمہ حق اگرچہ جدید طور پر اس کے کانوں میں پڑے تو گوش ہوش سے نہیں سنتا اور اس کی طرف نفس کو متوجہ نہیں کرتا۔ کافروں اور مشرکوں کے ظالم ہونے کی نص اور اس بات کا اظہار کہ اللہ سے کوئی چیز غائب نہیں ہوسکتی۔ خواہ وہ آسمان میں ہو یا زمین میں خفیہ ہو یا علانیہ، کفار کے تینوں شبہات کی نقل اور ان کی تردید۔ لفظ بَلْ سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ کفار قرآن کے متعلق کسی خاص وجہ شک پر مستقل نہ تھے کبھی کچھ کہتے تھے کبھی کچھ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ باطل پرست گروہ کے پاس چونکہ کوئی دلیل و حجت نہیں ہوتی، اس لئے وہ حق کے مقابلے میں کسی خاص مدلل نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ اس کی قوت واہمہ شک میں تو ڈال دیتی ہے، لیکن مقررہ وجہ شک پر بھی نہیں رہتی۔ اہل علم سے دریافت کرلے کا عمومی حکم۔ اس بات کی صراحت کہ تمام انبیاء آدمی ہی تھے اور لوازم بشریت کے محتاج تھے، لیکن خدا کے برگزیدہ بندے تھے۔ ان کی مادیت اور جسمانی کثافت فضل و شرف سے مانع نہ تھی۔ اَلْمُسْرِفِیْنَ کا لفظ دلالت کر رہا ہے کہ تباہی و بربادی انہی لوگوں کی ہوتی ہے جو راہ اعتدال سے ہٹ کر افراط و تفریط میں پڑجاتے ہیں۔ مرتبہ خلق سے آگے بڑھ کر خالق کے درجہ تک پہنچانا چاہتے ہیں یا خالق کو اس کے مرتبہ سے گھٹا کر خلق کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ فِیْہِ ذِکْرُکُمْ سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کا اعجاز فقط بلاغت الفاظ ہی کے سبب نہیں نہ یہ کوئی ادب کی خالص کتاب ہے۔ بلکہ درحقیقت یہ ایک عظیم الشان یادداشت اور جلیل القدر ہدایت نامہ ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے، اس لئے دور حاضر کے مسلمانوں کیلئے مفید ترین پیام نصیحت مستنبط ہوتا ہے جنہوں نے قرآن کو فقط تلاوت الفاظ یا تبرک کے لئے گھروں میں رکھ چھوڑا ہے۔ احکام و قوانین کو سمجھنے اور

ان پر عمل کرنے کی طرف قطعاً توجہ نہیں کرتے۔ ان علماء کے لئے بھی درس عبرت ہے جنہوں نے قرآن کو منطق کی کتاب اور اختلافات فقہیہ و کلامیہ کا سرچشمہ بنا رکھا ہے وغیرہ۔

وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنْشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ ○ فَلَمَّا أَحَسُّوا

اور بہت سی بستیاں جو ظالم تھیں ہم نے برباد کردیں اور اُن کے بعد دوسرے لوگوں کو پیدا کیا پھر جب انھوں نے

بَأْسَنَا إِذَا هُمْ مِنْهَا يَرْكُضُونَ ○ لَا تَرْكُضُوا وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ فِيهِ وَمَسَاكِنِكُمْ

ہمارے عذاب کو دیکھا تو اُس سے بھاگنے لگے (ہم نے کہا) بھاگو نہیں وہیں جاؤ جہاں تم کو آرام دیا گیا تھا اور اپنے گھروں کو

لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ ○ قَالُوا يَا وَيْلَنَا إِنَّا كُنَّا ظَالِمِينَ ○ فَمَا زَالَتْ تِلْكَ دَعْوَاهُمْ حَتَّىٰ

جاؤ تاکہ تم سب سے پوچھا جائے کہنے لگے ہائے ہماری خرابی بیشک ہم ظالم تھے پس برابر ان کی یہی گفتگو رہی یہاں تک

جَعَلْنَاهُمْ حَصِيدًا خَامِدِينَ ○ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِينَ

کہ کاٹ کر ہم نے اُن کو ٹھنڈا کردیا اور ہم نے آسمان و زمین اور جو ان کی درمیانی کائنات ہے لغو نہیں پیدا کیا

لَوْ أَرَدْنَا أَنْ نَتَّخِذَ لَهْوًا لَاتَّخَذْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا إِنْ كُنَّا فَاعِلِينَ ○ بَلْ نَقْذِفُ

اگر ہم کوئی کھیل بنانا چاہتے تو اُس کو اپنے پاس سے بناتے اگر ہم کو کرنا ہوتا بات یہ ہے کہ ہم حق کو

بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ ○

باطل پر پھینک مارتے ہیں پس وہ باطل کا سر کچل دیتا ہے اور باطل ایکدم ملیامیٹ ہو جاتا ہے اور تمہارے لئے خرابی ہے اس چیز سے جسکو تم بیان کررہے ہو

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کا ہے اور جو (فرشتے) اُس کے پاس ہیں وہ اُس کی عبادت سے سرتابی نہیں کرتے

وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ ○ يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ ○

اور نہ تھکتے ہیں شبانہ روز اُس کی پاکی بیان کرتے ہیں سستی نہیں کرتے

تفسیر اوپر کی آیت میں بیان کیا تھا کہ انبیاء سے سرکشی کرنے والوں کو ہم نے ہلاک کردیا اور اپنے خاص بندوں کو تباہی سے بچا لیا۔ ان آیات میں بیان فرمایا ہے کہ ایسا واقعہ صرف ایک یا دو مرتبہ ہی نہیں ہوا بلکہ یہ تو عام ضابطۂ قدرت ہے، نیچرل قانون ہے ہمیشہ سے یونہی ہوتا چلا آیا ہے، اس لئے کوئی قوم اس سے مستثنیٰ نہیں۔ افراد و اقوام، طاقت و صحت، عزت و حکومت اور راحت و نعمت کے نشہ میں سرشار ہوتی ہیں، عیش و آسائش کے تمام سامان مہیا ہوتے ہیں، جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ بالآخر جب ان کی ناحق کوشی اور ستمگاری بڑھ جاتی ہے تو

معمولی اسباب ہلاکت کے علاوہ غیر معمولی محسوس عذاب ان پر نازل کیا جاتا ہے اور چاروں طرف سے انکو تباہی گھیر لیتی ہے۔ جب وہ عذاب سے گھر جاتے ہیں تو ایسے وقت میں تمام اسباب عیش و تنعم پر خاک ڈال کر، عزت و حکومت پر لات مار کر اور راحت آفریں کوٹھیاں چھوڑ کر صرف جان بچانے کے لئے غیبی مصائب سے بھاگتے ہیں، لیکن پھر نجات کا وقت نہیں رہتا، موقع نکل چکتا ہے۔ اس وقت ان کو پشیمانی ہوتی ہے اور اسباب ہلاکت پر غور کرتے ہیں تو بالآخر اقرار کرتے ہیں کہ واقعی ہم نے بڑی بیجا حرکتیں کی تھیں یہ انہی کا نتیجہ ہے۔ غرض اسی طرح ان کی ترقی اور شوکت اور جاہ و جلال کی روشن آگ افسردہ کر دی جاتی ہے اور وہ بستیاں جو سرسبز و شاداب کھیتی کی طرح خوش عیشی سے زندگی گزارتی تھیں یکدم تباہ و برباد کر کے کٹی ہوئی کھیتی کی طرح پژمردہ کر کے بھوسہ کی طرح ریزہ ریزہ کر دیا جاتا ہے۔ جب قانون قدرت یہی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ کفار عرب کو باوجود سرتابی، گردن کشی اور راہ عدل سے گریز کرنے کے لئے یونہی چھوڑ دیا جائے اور تباہ نہ کیا جائے ایسا نہیں ہو سکتا۔ ظالم اور جفاکار قوم کو ہلاک کرنا اور ان کی جگہ عادل و منصف اقوام کو قائم کرنا ضرور ہے۔

بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا اور اب بھی ہے کہ انسان اور دوسری چیزیں خود ہی پیدا ہوتی ہیں اور خود ہی مٹ جاتی ہیں۔ ان کی بقا کی بھی ایک خاص حد ہے اور فنا کی بھی ایک مدت ہے۔ آبادی و بربادی اور بقاء و فنا میں اطاعت و معصیت اور فرماں برداری و نافرمانی ۔۔۔ کو کیا دخل ہے۔ اسباب کے معمولی تغیرات کے یہ سب نتائج ہوتے ہیں۔ نیکی بدی اور ایمان و کفر سے ان میں تغیر نہیں ہوا کرتا۔ اس خیال کے استیصال کے لئے فرماتا ہے کہ زمین و آسمان اور ان کی درمیانی کائنات خود بخود پیدا نہیں ہو گئیں۔ ان سب کی کوئی خاص علت اور خاص سبب ہے اور وہ علۃ العلل ذاتِ الٰہیہ ہے اللہ ہی نے ان سب کو بنایا اور ہر فعل کی کوئی مخصوص غرض ہوتی ہے۔ کوئی کام علت غائی اور نتیجہ کے بغیر نہیں ہوتا۔ اس تخلیق عالم کا سبب بھی کسی غرض سے وابستہ ہے، ان کی پیدائش بھی کسی خاص کام کے لئے ہے۔ وہ غرض صرف اطاعت و فرماں پذیری اور معرفت و عبودیت ہے۔ جو مخلوق اس مخصوص غرض سے گردن کشی کرتی ہے فرماں بردار ہونے کی بجائے نافرمان اور مطیع بننے کے عوض معصیت کوش ہو جاتی ہے۔ اس کی گردن اڑا دی جاتی ہے۔ اس کی ہستی مٹا دی جاتی ہے کیونکہ اگر تخلیق عالم سے کوئی غرض وابستہ نہ ہوتی اور کوئی نتیجہ پیش نظر نہ ہوتا اور صرف لہو و تفریح مقصود ہوتا تو اس مادی دنیا کو پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کیا نورانی اور غیر مادی مخلوق لہو کیلئے کافی نہ تھی۔ کیا وہ عالم جو مادہ سے مجرد اور مادی دنیا سے اوپر ہے تفریح کے لئے کچھ کم تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ محسوس و غیر محسوس عالم فقط دل لگی اور تفریح کی چیز نہیں بلکہ اپنے حال قال، وضع فطرت اور تخلیق کے اعتبار سے ذاتِ باری کی خلاقی اور اس کی الوہیت و ربوبیت پر دلالت کر رہا ہے اور ہر وقت اللہ کی عبادت و اطاعت میں مستغرق ہے۔ ان میں سے کوئی بھی مخلوق کی حد سے آگے بڑھ کر خالق کے مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا بلکہ یہ محسوس و مرئی دنیا تو درکنار وہ غیبی نورانی مخلوق ہر وقت قرب الٰہی میں رہتی ہے۔ اس کو بھی مجال نہیں کہ اللہ کی عبادت اور اپنی عبدیت سے سرتابی کر سکے۔ وہ بھی ہر وقت شبانہ روز اللہ کی عبادت میں سرگرم ہے۔

تحلیلِ اجزاء

وَمِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً ۔ ظلم کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو غیر موزوں مقام پر رکھنا، بیجا کام کرنا یا غیر کے ملک میں تصرف کرنا۔ کافر چونکہ توحید کی بجائے شرک کا قائل ہوتا ہے، مخلوق میں خالق کے اوصاف مانتا ہے اور خالق کا فرماں پذیر ہونے کی بجائے اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے، اس لئے اس کو ظالم کہا جاتا ہے۔ علمائے تفسیر نے بیان کیا ہے کہ علاقہ یمن میں ایک گاؤں تھا جس کا نام حضور تھا۔ حضور کے باشندے کافر تھے۔ شعیب بن مہذم (شعیب مدین کے علاوہ یہ ایک اور پیغمبر تھے) نبی نے ان کو نصیحت کی۔ بدبخت کافروں نے پیغمبر کو قتل کر ڈالا (مزار مبارک کوہ ضنین علاقہ یمن میں اب تک موجود ہے) تو غضب الٰہی بصورت بخت نصر نازل ہوا۔ بخت نصر کی فوج نے پوری آبادی کو برباد کر دیا اور قتل عام کر ڈالا۔ لوگوں کو اس وقت اپنے قصور کا احساس ہوا، مگر بیکار تھا۔ اسی قوم کا تذکرہ آیت میں کیا گیا ہے۔

تفسیر سراج میں ذکر کیا ہے کہ حضور و سحولیہ دو شہر تھے۔ جہاں کے کپڑے مشہور ہیں۔ انہی دونوں شہروں کے باشندوں کے متعلق آیت میں تذکرہ ہے۔ ابن ابی حاتم نے بسند منقطوع بیان کیا ہے کہ یمن میں دو گاؤں تھے۔ ایک کا نام حضور اور دوسرے کا نام قلابہ تھا۔ دونوں مقامات [illegible]

رہنے والے بہت مال دار، مرفہ الحال اور خوش عیش تھے۔ انہوں نے ایک شفیق ناصح پیغمبر کو قتل کر دیا تھا، اس لئے ان پر عذاب الٰہی نازل ہوا۔ بخت نصر شاہ بابل نے ان پر تسلط کرنے کے لئے کچھ فوج بھیجی، فوج بابل کو شکست ہوئی۔ دوبارہ پھر یہی واقعہ پیش آیا تیسری بار غصہ میں آکر شاہ بابل نے خود لشکر کشی کر دی۔ حضورا اور قلابہ کے باشندوں میں اس کے مقابلے کی طاقت نہ تھی، اس لئے بھاگے۔ راستے میں ندا آئی۔ کیوں بھاگتے ہو، لوٹ جاؤ۔ ممکن ہے تم کو داخل مشاورت کر لیا جائے اور قوم پر حکومت کرنے کے لئے تمہاری پوچھ گچھ ہو) ندا سُن کر لوٹ آئے بابلی لشکر نے گھیر لیا اور سب کو قتل کر ڈالا۔

بعض مفسرین کا قول ہے کہ ملک شام میں سدوم وغیرہ کی بستیاں مراد ہیں۔ جہاں قوم لوط آباد تھی۔

میں کہتا ہوں کہ خاص قریہ کی تعین کرنی ضروری نہیں۔ ہر ملک اور ہر دیس میں اجاڑ بستیوں کے کھنڈر موجود ہیں۔ شہر کے شہر صفحۂ ہستی سے مٹ چکے ہیں، کوئی زلزلے سے تباہ ہوا، کوئی آسمانی سنگ باری یا سیلاب یا وبا یا پہاڑوں کے آتشی مادوں کے نمودار ہونے سے برباد ہوا۔ کہیں ظالم بادشاہوں کی لشکر کشی نے قتل عام کیا تو کہیں آپس کے نفاق نے خون کی ندیاں بہا دیں۔ یہ سب عذاب الٰہی ہے۔ غیر معمولی آفات و مہلکات اور اتفاقی تباہ کاریاں بد اعمالی سے پیدا ہوتی ہیں۔ کوئٹہ اور بہار کی بربادیاں اہل بصیرت کے لئے اپنے اندر عبرت انگیز درس نصیحت رکھتی ہیں۔ سُننے والے کان، دیکھنے والی آنکھیں اور سوچنے والے دل کی ضرورت ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسُّوْا۔ احساس سے مراد آنکھوں سے دیکھنا یعنی جب عذاب الٰہی کے آثار نمودار ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے اور ہلاک ہونے میں کوئی شبہ نہ رہا۔ یا احساس سے مراد عام بیرونی احساس ہے خواہ آنکھوں سے دیکھنا ہو یا کانوں سے سُننا یا چھونا یا سونگھنا یا چکھنا۔ یعنی جب انہوں نے عذاب الٰہی کے نمایاں آثار دیکھ لئے، مہلک آوازیں سُن لیں، ہلاکت و بربادی کی بو سونگھ لی، کسی قدر مصائب و تکالیف کو چھو لیا اور عذاب کا کچھ مزہ بھی چکھ لیا۔ غرض یہ کہ عذاب کے آنے اور تباہ ہونے میں بالکل شبہ نہ رہا تو لگے بھاگنے۔

یَرْكُضُوْنَ۔ رکض کے لغوی معنی ہیں سواری کے ایڑھ مارنا یعنی وہ سوار ہو کر بھاگے۔ سوار ہو کر بھاگنے سے مراد ہے جلدی بھاگنا اور تیزی سے جان بچانے کی کوشش کرنا۔

لَا تَرْكُضُوْا۔ یعنی ہاتف یا کسی غیبی منادی نے ان کو ندا دی مت بھاگو بلکہ خدا نے تم کو جو مال و زر، عیش و راحت، عمدہ مکانات، زن و اولاد اور خدم و حشم دے رکھا ہے پھر وہیں لوٹ کر جاؤ۔ اب پھر انہی فانی نعمتوں اور ناپائیدار راحتوں پر اتراؤ اور فخر کرو یہ کلام (بطور طنز ہے)۔

لَعَلَّكُمْ تُسْئَلُوْنَ۔ مفسرین نے تُسْئَلُوْنَ کے مختلف معانی بیان کئے ہیں (۱) لوٹ کر جاؤ شاید تم سے سوال کیا جائے کہ یہ بربادی کس سرکشی کا خمیازہ ہے۔ (۲) جاؤ تمہارے نوکر چاکر تم سے اب بھی پوچھ پوچھ کر کام کریں گے جیسا کہ اس سے پہلے کیا کرتے تھے۔ بھاگ کر کہاں جاتے ہو (۳) مت بھاگو بلکہ اپنی بستیوں میں لوٹ کر جاؤ اور آرام کے ساتھ اپنے مکانوں میں رہو شاید وہاں تمہاری جستجو ہو اور نئی حکومت مشورہ کرنے اور حکومت میں شامل کرنے کے لئے تم کو دریافت کرے۔ بہرحال یہ پورا کلام بطور استہزاء ہے۔

حَصِيْدًا۔ یعنی کھیتی کی طرح تلواروں سے کاٹ دیئے گئے۔

خٰمِدِيْنَ۔ یعنی پہلے ان کے ظلم کی آگ روشن تھی۔ مرنے کے بعد افسردہ ہو گئی۔ کچھ حس و حرکت باقی نہ رہی۔

لٰعِبِيْنَ۔ یعنی یہ بلند آسمان اور اس کا سامان آرائش یہ فرش زمین اور اس کی زینت کے تمام اسباب اور یہ درمیانی فضا اور اس کی کائنات ہم نے اپنے کھیل کے لئے نہیں پیدا کی نہ اس سے تفریح مقصود ہے۔ لہٰذا کافروں کا یہ گمان غلط ہے کہ انسان مرنے کے بعد نیست و نابود ہو جائے گا، اس کی زندگی کا کوئی فرض نہیں، خدا کو عذاب ثواب سے کوئی سروکار نہیں، اطاعت و معصیت کوئی چیز نہیں، افراد و اقوام کی بربادی و آبادی خود بخود ہوتی ہے۔ اللہ کی فرماں برداری و نافرمانی کو اس میں دخل نہیں۔

اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا۔ حسن و قتادہ وغیرہ علماء نے بیان کیا ہے کہ یمنی زبان میں لفظ لہو کا اطلاق عورت پر ہوتا ہے اسی بنا پر ابراہیم نخعی نے لہو کا ترجمہ جورو کیا ہے۔ عکرمہ و سدی نے کہا لہو سے مراد اولاد ہے۔ ان دونوں معانی کی بنا پر آیت کی غرض عیسائیوں، یہودیوں اور ان گروہوں کے

عقیدہ کی تردید ہے جو خدا کو صاحب اولاد یا بیوی والا خیال کرتے ہیں۔

میرے نزدیک آیت مذکورہ میں لہو کا ترجمہ زن و فرزند لینا مناسب نہیں۔ قرآن قریشی زبان میں نازل ہوا ہے۔ یمنی محاورہ کو پیش کرنا صحیح نہیں۔ نزول قرآن کے زمانے میں حجاز بلکہ مکہ بلکہ قبیلۂ قریش کی زبان زیادہ قابل اعتبار تھی۔ اسی بنا پر قریش کے لغت اور محاورہ کے مطابق قرآن کا نزول ہوا یعنی زبان تو ہمیشہ سے ناقابل وثوق سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سیاق و سباق کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ پوری آیت کا تو مطلب یہ ہے کہ یہ کل مادی کائنات لہو و لعب اور کھیل کود نہیں بلکہ اپنے اندر حقیقت اور غرض خاص رکھتی ہے۔ اگر اس سے لہو و لعب بھی مقصود ہوتا تو علوی مخلوق (فرشتے) وغیرہ کافی تھے۔ اب اگر لہو کا ترجمہ زن و فرزند کیا جائے گا تو غرض کافی طور پر ثابت نہ ہوگی بلکہ یہ مطلب ہو جائے گا کہ اگر خدا زن و فرزند بنانا چاہتا تو اس کام کے لئے وہ مخلوق کافی تھی جو خدا کی مقرب ہے۔ (یعنی ملائکہ وغیرہ) اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ لہو سے مراد کھیل کود اور تفریح ہے۔ زن و فرزند کی تخصیص مناسب نہیں۔

بعض مفسرین نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ اگر ہم زمین و آسمان میں کسی کو بیٹا بنانا چاہتے تو اپنے ہی جیسا قدیم واجب الوجود بنالتے، فانی اور حادث کی کیا ضرورت تھی، لیکن ہماری ذات لاشریک و بے عیب ہے۔

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ۔ حق سے مراد ہے قطعی دلائل و براہین یعنی حقائق و علوم، ہدایت آمیز مواعظ و نصائح اور معارف ایمانیہ اور باطل سے مراد ہے توہمات و تخیلات، ضلالت انگیز معاصی آفرین اغوا اور شرک آگیں عقائد و افکار۔ درحقیقت باطل ایک بے جان کمزور اور کثیف جسم ہے اور حق ایک سنگ شکن آہنی ہتوڑا۔ جب باطل پر حق کی ضرب پڑتی ہے تو باطل ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے اور ذرات خاک میں مل کر معدوم ہو جاتا ہے۔

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ۔ عرب میں یہودی بھی رہتے تھے جو عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ عیسائی بھی تھے جو مسیح کے ابن اللہ ہونے کے قائل تھے اور مشرکین کا اور ایک خاص گروہ بھی تھا جو ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں جانتا تھا۔ اس آیت میں انہی اولاد پرستوں کی تردید فرمائی ہے مطلب یہ ہے کہ کل عالم اللہ کا پیدا کیا ہوا، فرماں پذیر، مملوک اور مسخر حکم، مقربین بارگاہ کو سرتابی کی مجال نہیں اور سرتابی کرنی تو بجائے خود رہی اللہ کی عبادت کرنی ان کے لئے باعث فخر ہے۔ شبانہ روز وہ اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں، ہر وقت تسبیح پڑھتے ہیں پھر کس طرح شریک الوہیت ہو سکتے ہیں۔

عبداللہ بن حارث بن نوفل تابعی ایک روز کعب احبار کی مجلس میں بیٹھے تھے، اس وقت ان کی عمر بہت کم تھی۔ سن بلوغ کو بھی نہ پہنچے تھے۔ آپ نے کعب احبار سے دریافت کیا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ ۔ جب فرشتے ہر وقت تسبیح پڑھتے ہیں تو اللہ کا پیغام بندوں تک پہنچانا، تعمیل احکام کرنا اور باہم گفتگو کرنا یہ کام کیسے سرانجام پاتے ہیں؟ کعب احبار نے دریافت کیا یہ کون لڑکا ہے؟ لوگوں نے کہا عبدالمطلب کی اولاد میں سے ہے۔ کعب نے عبداللہ کی پیشانی کا بوسہ لیا اور فرمایا بیٹے جس طرح تم چلتے پھرتے اور کام کاج کرتے وقت برابر سانس لیتے رہتے ہو، اسی طرح فرشتے ہر وقت ہر خدمت کو انجام دینے کے دوران میں تسبیح پڑھتے رہتے ہیں۔ ان کی تسبیح کی وہی حالت ہے جو تمہارے سانس کی (رواہ محمد بن اسحاق) ابن ابی حاتم کی روایت سے ثابت ہے کہ حضور اقدس ؐ نے ارشاد فرمایا آسمان میں بالشت بھر جگہ ایسی نہیں جہاں کوئی فرشتہ سجود یا قیام میں نہ ہو۔

مقصود بیان

اقوام پارینہ کی تمثیل دے کر کفار مکہ کو عذاب کی وعید۔ ضابطۂ قدرت کا بیان کہ کفر و معصیت سے بربادی آتی ہے اور برباد شدہ قوم کی بجائے نیکوکار اہل ایمان کو قائم کیا جاتا ہے۔ اس امر کی صراحت کہ عذاب کے آثار نمودار ہونے کے بعد توبہ کوئی نتیجہ خیز نہیں ہوتی۔ اس آیت سے دور حاضر کے مسلمانوں کو عبرت آفرین سبق لینا چاہیئے اور خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ موجودہ تباہی، ذلت، افلاس اور نکبت محض بد اعمالیوں کا خمیازہ ہے۔ اعداء کا تسلط، ظالموں کی ستم کاریاں، طوفان باد و باراں کی تباہ کاریاں، زلزلوں کی قیامت خیزیاں اور وبا و قحط کی وقتاً فوقتاً ہلاکت انگیزیاں معصیت کوشی کا نتیجہ ہیں۔ ترقی کی کوئی اسکیم اور عروج کا کوئی لائحہ عمل مفید نہیں ہو سکتا جب تک احکام الٰہیہ اور قوانین قرآنیہ کی پابندی نہ کی جائے گی۔ اصلاح نفس سے اصلاح افراد ہوتی ہے اور اصلاح افراد سے اصلاح قوم اور اصلاح

تو اسے اصلاحِ عالم، اس لئے اپنی ذات کی اصلاح سب سے مقدم ہے۔ اس سے آگے زمین و آسمان اور درمیانی کائنات کی تخلیق کا پُر از حکمت ہونا ظاہر فرمایا ہے۔ پھر اس امر کی صراحت کی ہے کہ حق باطل پر غالب آتا ہے۔ حق کے مقابلے میں باطل چکنا چور اور ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ آخری آیات میں تقدیس و تنزیہ کا اظہار اور جلیل القدر رفیع المرتبہ مخلوق کا مصروفِ تسبیح و عبادت ہونا بیان فرمایا ہے جس سے در پردہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کی آنکھوں پر غفلت و مادیت کا پردہ پڑا ہے، خدا کی ذات و صفات کا اس کو صحیح اندازہ نہیں۔ اسی وجہ سے وہ مختلف وہمیات اور بے اصل خیالات میں مبتلا ہے، کبھی مخلوق کو خالق کی اولاد قرار دیتا ہے اور کبھی عابد کو معبود کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔ خدا کی وہ نورانی عظیم مخلوق جس کو قرب کا شرف اور نورِ ربانی کی تجلی حاصل ہے وہ کسی قسم کی سرتابی نہیں کرتی۔ اس کی نظر سب سے ہٹ کر ربوبیت اور خالق سے ہٹ کر مخلوق پر پڑتی ہی نہیں۔ وہ ہر وقت تسبیح و تنزیہ اور تقدیس و عبادت میں مستغرق رہتی ہے، اس لئے انسان پر لازم ہے کہ چشمِ بصیرت سے باطل کا پردہ ہٹائے۔ پردۂ مخلوق کے پار خالق کو دیکھے۔ اللہ کی بے مثال قدرت اور ہمہ گیر خلاقی کا مطالعہ کرے اور اس مادی دنیا میں رہتے ہوئے مرکزِ توجہ محض صفاتِ الٰہیہ اور ذاتِ ربانیہ کو قرار دے وغیرہ۔

أَمِ اتَّخَذُوٓا۟ ءَالِهَةً مِّنَ ٱلْأَرْضِ هُمْ يُنشِرُونَ ○ لَوْ كَانَ فِيهِمَآ ءَالِهَةٌ إِلَّا ٱللَّهُ

کیا انھوں نے زمین سے (نکال کر) ایسے معبود بنا رکھے ہیں جو زندہ کر سکتے ہیں | اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا چند معبود ہوتے

لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحَـٰنَ ٱللَّهِ رَبِّ ٱلْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ○ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ

تو ضرور آسمان و زمین تباہ ہو جاتے پس اُن کی بکواس سے پاک ہے وہ خدا جو عرش کا مالک ہے | اُس کے فعل کی اُس سے بازپرس نہیں ہو سکتی بلکہ دوسروں

يُسْـَٔلُونَ ○ أَمِ ٱتَّخَذُوا۟ مِن دُونِهِۦٓ ءَالِهَةً ۖ قُلْ هَاتُوا۟ بُرْهَـٰنَكُمْ ۖ هَـٰذَا ذِكْرُ مَن مَّعِىَ

سے بازپرس ہوگی | کیا ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر معبود بنائے ہیں (اے نبی) کہہ دو اپنی دلیل لاؤ | یہ موجود ہے اُن کی کتاب جو میرے ساتھ

وَذِكْرُ مَن قَبْلِى ۗ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ٱلْحَقَّ ۖ فَهُم مُّعْرِضُونَ ○ وَمَآ أَرْسَلْنَا

ہیں اور اُن کی کتاب جو مجھ سے پہلے تھے بات یہ ہے کہ اکثر ان میں سے ناواقف ہیں حق کو نہیں جانتے اس لئے منہ پھیرتے ہیں | (اے نبی) ہم نے تم سے پہلے

مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِىٓ إِلَيْهِ أَنَّهُۥ لَآ إِلَـٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعْبُدُونِ ○

جو رسول بھیجا اُس کے پاس یہی وحی بھیجی کہ سوائے میرے کوئی معبود نہیں لہٰذا تم میری عبادت کرو

تفسیر

اسلام کا سنگِ بنیاد توحید ہے۔ ان آیات میں اثباتِ توحید کے تین رنگ اختیار کئے ہیں:- اوّل الزامی تردید ہے۔ یعنی غیر اللہ میں چونکہ اوصافِ الوہیت موجود نہیں، اس لئے غیر خدا کو الٰہ کہنا باطل ہے۔ دوسرے عقلی اثبات ہے جو مفیدِ یقین ہے۔ استدلال اقناعی نہیں ہے بلکہ برہانی ہے۔ تیسرے نقلی دلیل ہے۔ تمام آسمانی کتابوں کی تصریحات کو توحید کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ دوسری اور تیسری دلیل کے درمیان اس عقیدہ کے بطلان کی طرف اشارہ ہے جس کی رو سے آبائے علویہ، امہاتِ سفلیہ، اصنام، عناصر اور غیبی نورانی قوتوں کو خدا نہیں بلکہ نائبِ خدا کہا جاتا تھا۔ ہم ذیل میں ہر دلیل کو کسی قدر بسط کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

(۱) اگر اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود ہوگا تو اس میں مسبب کو پیدا اور مردہ کو زندہ کرنے کی طاقت ہوگی اور کچھ نہیں تو کم از کم موجودہ عناصر

کی ترکیب سے کسی خاص مخلوق کو وہ پیدا کر سکے گا۔ مادہ کی تخلیق نہ سہی کم سے کم اس مادۂ ارضی کو خاص صورت جسمیہ اور صورت نوعیہ پہنا کر جان دار تو ضرور کر ہی دے گا، لیکن کفار جن کو اپنا معبود قرار دیتے ہیں انہوں نے نہ کسی مادہ کی تخلیق کی نہ صورت کی نہ موجودہ ارضی مادہ میں کوئی خاص صورت نمودار کر کے کسی جان دار مخلوق کو بنایا پھر ان کو الوہیت کا استحقاق کیسے ہو گیا۔ یہ دلیل یُنْشِرُوْنَ تک ختم ہو گئی۔

(۲) اگر عالم میں دو الٰہ ہوتے تو آسمان و زمین کا بقا نہ ہو سکتا۔ نظیم عالم درہم برہم ہو جاتا۔ قیام نظم دلالت کر رہا ہے کہ اللہ واحد لاشریک ہے۔ اس دلیل کی تفصیل علماء نے مختلف طور پر کی ہے۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں متکلمین کی طرف سے دلیل مذکور کی اس طرح تقریر کی ہے کہ اگر دو الٰہ فرض کئے جائیں تو ان میں سے ہر ایک تمام ممکنات پر قادر ہو گا۔ ہر ایک کو ہر چیز پر اور ہر شی کو ہر کیفیت پر قدرت ہو گی۔ مثلاً زید کی تخلیق اور اس کے ہر حرکت و سکون پر ہر الٰہ کو قدرت ہو گی۔ اب اگر ایک زید کو حرکت دینا اور دوسرا زید کو ساکن رکھنا چاہے گا تو ایک ہی وقت میں کیا ہو گا۔ دونوں کی مراد ایک وقت میں پوری نہیں ہو سکتی ورنہ تناقض عالم اور فساد کائنات لازم آئے گا اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ دونوں کی مراد پوری نہ ہو ورنہ ارتفاع نقیضین کے علاوہ دونوں کی کمزوری اور عاجزی ثابت ہو گی۔ لامحالہ ایک کا منشا پورا ہو گا، دوسرے کا پورا نہ ہو گا، اس لئے غالب ہی الٰہ کہلانے کا مستحق ہو گا۔ اس دلیل پر ایک خاص شبہ وارد کیا گیا ہے۔

شبہ اگر دو الٰہ فرض کر لئے جائیں اور دونوں کو قادر مان لیا جائے تو دونوں کا اندرونی اختلاف کیوں ضروری ہے؟ ممکن ہے کہ دونوں متفق ہو کر ایک کام کو کریں۔ مثلاً زید کو حرکت دینے پر دونوں متفق ہو جائیں یا زید کو ساکن رکھنے پر اتفاق ہو جائے۔ تمانع اور تناقض لازم نہیں اور جب تصادم کا ارادہ نہ ہو گا تو فسادِ عالم کس طرح ہو گا۔

ازالہ بیضاوی نے اپنی تفسیر میں اس شبہ کے ازالہ کی طرف الفاظِ ذیل میں اشارہ کیا ہے۔ اگر دو الٰہ ہوں گے تو دونوں میں اختلاف رائے کی صورت میں تصادم لازم آئے گا جس سے نظامِ عالم کی تباہی ضروری ہے اور اگر اتفاق مان لیا جائے تو لازم آئے گا کہ ایک چیز پر دو قدرتیں پوری جمع ہو جائیں کیونکہ ہر ایک کو ایک کام کی سرانجام دہی کی پوری قدرت ہو گی (ورنہ الٰہ نہ ہو گا) اور جب ہر ایک میں ایک کام کو سرانجام دینے کی پوری توقع ہے تو دوسری قدرت کو اس میں دخل نہیں ہو سکتا۔

اس تقریر پر بھی ایک شبہ وارد کیا گیا ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

شبہ یہ کیوں ممکن نہیں کہ دونوں میں کاملہ قدرت ہے، لیکن جب کسی کام کی سرانجام دہی کے لئے ایک اپنی قدرت کو اثر انداز کرتا ہو تو دوسرا اپنی قدرت کو اثر انداز نہ کرے اور دوسرا کسی کام کو سرانجام دے تو پہلا اس کی طرف اپنی قدرت کو مائل نہ کرے اور چونکہ دونوں خود مختار رہوں گے، اس لئے بلا وجہ ترجیح کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر ایک اپنے اختیار سے دوسرے کو بعض کام کامل طور پہ سرانجام دینے دیتا ہے اور وہ دوسرا پہلے کے کاموں میں دخل انداز نہیں ہوتا۔

اسی شبہ کی بناء پر علامہ تفتازانی نے شرح عقائد میں برہان تمانع کو اقناعی دلیل قرار دیا ہے مفید یقین نہیں قرار دیا۔ لیکن امام غزالی ابن الہمام اور ملا علی قاری وغیرہ علماء نے دلیل مذکور کو حجت قطعیہ کہا ہے، اس لئے ہم ذیل میں ایسی تفصیل بیان کرتے ہیں جو ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہے، لیکن تفصیل سے پہلے چند بنیادی اصول کو جان لینا ضروری ہے۔

(۱) الٰہ کا قادر مطلق ہونا ضروری ہے۔ کسی قسم کی عاجزی اور کمزوری الوہیت کے منافی ہے۔ (۲) کسی کا محتاج نہ ہو۔ احتیاج و الوہیت میں تضاد ہے۔ (۳) سب سے عالی ہو، برتر ہو اور تمام صفات کمالیہ اس میں موجود ہوں، کسی طرح کا نقص اور عیب نہ ہو (۴) اس کے علاوہ جو کچھ ہو اسی کا مسخر و مقہور ہو، وہ سب پہ قادر ہو۔

مذکورۂ بالا اربعہ عناصر کو تسلیم کر لینے کے بعد مدعا کا ثبوت بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر دو الٰہ ہوں گے تو بحکم مقدمہ ۱ دونوں قادر ہوں گے۔ ہر ایک کو کامل تصرف کرنے کی قدرت ہو گی اور بحکم مقدمہ ۲ کوئی محتاج بھی نہ ہو گا اور چونکہ مقدمہ ۳ کے اعتبار سے الٰہ کا سب سے عالی و برتر ہونا ضروری ہے، اس لئے دونوں میں سے ہر ایک سب سے بالا ہو گا، لیکن سب سے اعلیٰ ہونا صرف ایک ہی کے لئے ممکن ہے

دوہم رتبہ ہوں گے تو تساوی تضاد اور تصادم لازم ہے جس سے نظم عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ لہٰذا فوقیت کا ملہ صرف ایک کو حاصل ہوگی اور وہی الوہیت کا مستحق ہوگا۔ اسی تفصیل کی طرف قرآن پاک کی دوسری آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا ہے۔ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ یعنی اگر الٰہ متعدد ہوں گے تو ہر ایک اپنی مخلوق کے واسطے مستقل ہوگا اور ایک دوسرے پر برتری چاہے گا۔ لامحالہ تصادم لازم آئے گا یا ایک دوسرے پر فوق ہو جائے گا جو ماتحت ہوگا وہ ناقص و عاجز ہوگا اور عجز و نقصان الوہیت کے منافی ہے۔ ہم نے جو چار گانہ بیان کئے ہیں آیت فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الخ میں انہی کی طرف اشارہ ہے۔ اللہ کا پاک ہونا یعنی عجز و نقص و عیب نہ ہونا ہے، قادر و مختار ہونا بھی لازم ہے یعنی وہ جو کچھ چاہے کرے۔ کوئی اس سے باز پرس کرنے والا نہ ہو۔ سب سے اعلیٰ اور برتر ہونا بھی لابدی امر ہے اور اس کی ذات کے علاوہ ہر چیز کا اس کے سامنے مقہور و مسخر ہونا بھی قطعی ہے۔ یعنی وہ ہر ایک سے باز پرس کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ الٰہ وہی ہو سکتا جو ہر عیب، نقصان، کمزوری اور احتیاج سے پاک ہو، قادر مطلق اور قاہر کل ہو، سب سے اعلیٰ اور برتر ہو، ہر چیز اس کی مقہور و مسخر ہو اور چونکہ یہ ایک الٰہ کے علاوہ اگر دوسرے الٰہ میں پائے جائیں گے تو تصادم ضروری ہے اور تصادم سے نظم عالم کی ابتری لازم آئے گی، اس لئے ایک الٰہ کے علاوہ کوئی دوسرا اللہ نہیں ہو سکتا۔

اس سے آگے آیت اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ میں نیابت کے عقیدہ کی تردید کی گئی ہے۔ کفار عرب بلکہ عالم شرک کے بڑے بڑے عقلمند اس بات پر قائل تھے اور ہیں کہ اللہ تحت تصرف جو مخلوق ہے اس میں سے بعض ممتاز ہستیاں اگرچہ معبود مطلق الٰہ برحق تو نہیں اللہ اپنی ذات میں تو وحدہٗ لاشریک ہے، مگر صفات الوہیت ان میں بھی پائی جاتی ہیں، وہ ہم کو رزق دیتی ہیں، بارش برساتی ہیں، گرمی کے موسموں کی تبدیلی کرتی ہیں، بہت سے آڑے وقتوں میں ہمارے کام آتی ہیں، مرنے کے بعد بھی ان کی شفاعت کارگر ہوگی، خدا سے وہ ہمار سفارش کریں گی اور یہ تمام اختیارات ان کے ذاتی نہیں بلکہ خداداد ہیں، وہ اللہ کی طرف سے نائب ہیں۔ بطور نیابت تنظیم عالم کے فرائض بالاستقلال دیتی ہیں، خدا تو ہماری حد تصور سے بھی بلند ہے وہاں تک ہماری رسائی ناممکن ہے جب تک ان چھوٹے دیوتاؤں کے سامنے سجدہ ریزی نہ کی جائے تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس شرک آمیز توحید کے عقیدہ کو دور کرنے کے لئے فرماتا ہے کہ لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اور متعدد دیوتا بنا رکھے ہیں جن کا ثبوت نہیں۔ اگر دیوتاؤں کا کوئی عقلی نقلی ثبوت ہے تو پیش کریں۔

(۳) هٰذَا ذِكْرُ سے تیسری نقلی دلیل کا بیان ہے خلاصۂ دلیل یہ ہے کہ دنیا میں جتنے پیغمبر بھیجے گئے اور اصلاح خلق کے لئے جتنے انبیاء مبعوث ہوئے سب کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کی وحدانیت کا اعلان کریں، اس کو وحدہٗ لاشریک جانیں اور اس کے علاوہ کسی کی پرستش نہ کریں۔ ربوبیت الوہیت میں اللہ کا یکتا ہونا کوئی نئی بات نہیں بلکہ تمام آسمانی کتابوں میں اس کی تعلیم دی گئی ہے، ہر نبی کی امت کو یہی ہدایت کی گئی ہے، ہر قوم کے لئے یہی یادداشت بھیجی گئی ہے، مگر چونکہ عقلیں کوتاہ ہیں، نور بصیرت افسردہ ہے، دماغوں پر جہالت کے پردے پڑے ہیں، حقانیت و صداقت لوگوں کو علم نہیں، حقیقت سے ناواقف ہیں، اس لئے وہ حق سے منہ موڑتے ہیں۔

تحلیل اجزاء

مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ۔ اس فقرہ کے تین معانی بیان کئے گئے ہیں۔ (۱) اہل شرک نے کچھ دیوتا بنا رکھے ہیں کی ساخت چاندی یا سونے یا پتھر یا لکڑی یا مٹی کی ہے۔ غرض یہ کہ زمین کی موجودات میں سے کسی خاص چیز سے خود ان کو بناتے ہیں اور پھر خود ہی ان کو دیوتا مانتے ہیں (۲) ابن کثیر نے مِنَ الْاَرْضِ کا تعلق يُنْشِرُوْنَ سے قرار دیا ہے اور جملہ استفہامیہ ہے۔ اگرچہ حرف استفہام محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کافروں نے دیوتا مقرر کر رکھے ہیں، لیکن کیا ان دیوتاؤں میں یہ قدرت بھی ہے کہ کسی معدوم کو موجود اور مردہ زندہ کر سکیں اور وہ مخلوق جو مر کر مٹی میں مل گئی ہے دوبارہ پھر زمین سے ان کا استخراج کر سکیں۔ (۳) بیضاوی نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ کفار کچھ معبود بنا رکھے ہیں جو ان کے اعتقاد میں ایجاد کرتے ہیں۔ گویا عقیدۂ الوہیت کے لئے لازم ہے جب الٰہ مان لیا تو موجد بھی ماننا ضروری ہے کیونکہ الٰہ کو قادر مطلق، اور موجد ہونا لازم ہے۔

اِلَّا اللّٰهُ۔ بظاہر اس جملہ کا مفہوم اصل مدعا کے خلاف ہے۔ لفظ اِلَّا (استثنائیہ) سے مدعا کا عکس لازم آتا ہے۔ کیونکہ آیت کا ترجمہ

رح کیا جاتا ہے اگر آسمان وزمین میں چند الٰہ ہوتے ، مگر اللہ نہ ہوتا تو نظمِ عالم برباد ہو جاتا ۔ اس ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اللہ نہ ہوتا اور دوسرے
تا ہوتے تو بربادی لازم تھی ۔ یعنی اللہ کی موجودگی میں دوسرے دیوتاؤں کا وجود نظمِ عالم کو تباہ نہیں کر سکتا ۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ بھی ہوا ور دوسرے
تا بھی ہوں ۔ اسی لئے نظامِ عالم برباد نہیں ہوا ورنہ اگر اللہ نہ ہوا ور دوسرے دیوتا ہوں تو سارا انتظام برباد ہو جائے ۔ غرض یہ کہ آیت کا سا
وم مفید توحید نہیں ہو سکتا ۔ اس شبہ کے علاوہ دوسرا اعتراض یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ لفظ اِلَّا استثنائیہ ہے اور استثنائیہ کلام اسی وقت صحیح
سکتا ہے جب کہ استثنا سے قبل مستثنیٰ مستثنیٰ منہ میں داخل ہو ۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ تمام خاندان آیا مگر زید نہ آیا ۔ اس مثال میں زید بھی
ندان کا ایک فرد ہے ، مگر آنے میں خاندان کے ساتھ شریک نہیں ہے ۔ اب اصل آیت کی طرف رجوع کرو ۔ اگر چند آلہہ ہوتے ، مگر اللہ نہ ہوتا تو تباہی
پھیلتی ۔ اس تقدیر پر لازم آتا ہے کہ اللہ کا اندراج بھی معبودانِ باطل میں ہو جائے کیونکہ مستثنیٰ کا مستثنیٰ منہ میں داخل ہونا ضروری ہے ۔

دونوں شبہات کا ازالہ

پیش کردہ شبہات اس وقت صحیح ہوں گے جب لفظ اِلَّا کو استثنائیہ قرار دیا جائے ، لیکن
آیت میں اِلَّا استثنائیہ نہیں بلکہ وصفیہ ہے اور اِلَّا وصفیہ لفظ غَیْر کا ہم معنی ہیں ۔ اس
صورت میں آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ اگر اللہ کے علاوہ اور دیوتا ہوتے تو نظامِ کائنات تباہ ہو جاتا ۔ یعنی اللہ تو بہر حال موجود رہی ہے ۔ اس کے
جود کا انکار تو کیا ہی نہیں جا سکتا نہ باری تعالیٰ کی ہستی محلِ نزاع ہے ۔ اس کے علاوہ اگر اور دیوتا ہوتے تو خرابی پیدا ہوتی ۔ مطلب کی اس توضیح
کے بعد شبہات مذکورہ کا استیصال ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ جب اِلَّا استثنائیہ نہیں تو حکم استثنا جاری نہیں ۔ لہٰذا مؤخر الذکر شبہ زائل ہو گیا ۔ اسی
رح اِلَّا کو لفظ غیر کی بجائے قرار دینے سے یہ شبہ بھی پیدا نہیں ہو سکتا ہے (کہ مثبت سے استثنائے منفی ہوتا ہے اور منفی سے مثبت اور آیت میں
مثبت سے استثناء ہے ، اس لئے منفی ہے الخ) کیونکہ آیت میں استثنا ہی نہیں ہے ۔ فافہم ۔

رَبِّ الْعَرْشِ اس لفظ کو ذکر کرنے سے عظمتِ الٰہی دکھانی مقصود ہے یعنی وہ خدا جو خالقِ عرش ہے وہ دیگر کائنات کا یقیناً خالق ہے ،
س لئے قادر و مختار ہے عاجز نہیں ۔ تمام صفاتِ کمالیہ کا مجموعہ ہے ۔ ہر عیب و نقص سے پاک ہے ۔

هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ ۔ یعنی قرآن امتِ محمدیہ کے لئے ہدایت نامہ ، تذکرۂ موعظت اور یادداشت ہے اور گزشتہ آسمانی کتابیں
پنے اپنے زمانے کے لوگوں کے لئے پیامِ ہدایت لے کر آئی تھیں ۔ یا یہ مطلب ہے کہ قرآن میں امتِ محمدیہ کا تذکرہ بھی ہے اور گزشتہ انبیاء کی امتوں کا بھی ۔

وَمَا اَرْسَلْنَا ۔ اس آیت کے مفہوم کی تائید دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے ۔ ایک جگہ آیا ہے ۔ وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ
مِنْ رُّسُلِنَا اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ۔ ایک اور آیت میں ہے وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۔ خلاصہ یہ کہ انبیاء کا ہدایتِ خلق کے لئے مبعوث ہونا متواتر ہے اور یہ بات بھی تواتر سے ثابت ہے کہ ہر پیغمبر
نے خالص توحید کی تعلیم دی اور شرک سے منع کیا اور اس امر کو بھی ہر شخص جانتا ہے کہ متواتر کا انکار سوائے بے وقوف ، معاند اور ناواقف
جاہل کے اور کوئی نہیں کر سکتا ۔ لہٰذا توحید کا انکار قطعی جہالت ہے ۔

مقصودِ بیان

الزامی ، عقلی اور نقلی تینوں طریقوں سے توحید کا ثبوت ، استحقاقِ الوہیت پیدا کرنے والی چہار گانہ شرائط کا ضمنی بیان ۔
اس امر کی صراحت کہ قرآن پاک تمام گزشتہ اقوام کے ہدایت ناموں کا مجموعہ ہے ۔ اس بات پر نص کہ انسان جو حقانیت
صداقت سے منہ موڑتے ہیں اس کی وجہ محض لاعلمی ، ناواقفیت اور جہالت ہے ۔ یعنی جاننے کے بعد حق سے روگرداں رہنا ناممکن ہے ۔ آخر
یں توحیدِ ذاتی و صفاتی کا اظہار اور در پردہ اس بات کی تلقین کہ اللہ کو فقط عقیدۃً وحدہٗ لاشریک جاننا کافی نہیں بلکہ اعمال و افعال میں بھی توحید کے
لاف کوئی مظاہرہ نہ کرنا چاہیئے ۔ عبادت صرف اللہ کے لئے ہونی چاہیئے کوئی دوسرا مستحقِ عبادت نہیں وغیرہ ۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۙ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ

ا فر کہتے ہیں کہ رحمٰن فرزند رکھتا ہے وہ پاک ہے (نہیں) بلکہ وہ اس کے معزز بندے ہیں وہ اُس کے آگے بڑھ کر بات

بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ

نہیں کر سکتے وہ اس کے حکم پر کام کرتے ہیں اللہ اُن کے آگے پیچھے کی حالت جانتا ہے وہ سفارش نہیں کر سکتے

اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ

ہاں جس سے خدا راضی ہو اور وہ اس کے خوف سے ڈرتے ہیں اُن میں سے جو کوئی بھی یہ کہے کہ میں

اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ ع

اللہ کے علاوہ معبود ہوں تو اُس کو ہم جہنم کی سزا دیں گے ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں

تفسیر

یہودی عزیر کو نصاریٰ مسیح کو اور عرب کا خاندانِ خزاعہ ملائکہ کو خدا کی اولاد قرار دیتے تھے۔ ان تمام اولاد پرستوں کی تردید مذکورہ آیات میں کی گئی اور متعدد طریقوں سے کی گئی۔ ہر لفظ بجائے خود ایک بسیط دلیل ہے۔ چونکہ اولاد پرست گروہ اپنے معبودوں کو اپنا سفارشی جانتے تھے، اس لئے ان کے اس عقیدے کی بھی نفی کر دی گئی۔ طریقِ بیان چونکہ خاص تفنن اور نیرنگی رکھتا ہے اسلئے ہم نمبروار ہر دلیل کی توضیح کرتے ہیں۔

(۱) سُبْحٰنَهٗ یعنی اولاد کی ضرورت اس کو ہوتی ہے جو خود عاجز کمزور ہو، زوال پذیر ہو، محتاج ہو۔ خداوند تعالیٰ تمام عیوب سے پاک ہے عاجز نہیں، فانی نہیں، محتاج نہیں، پھر اس کو اولاد کی کیا ضرورت ہے۔

(۲) عِبَادٌ وہ مخلوق جس کو خدا کی اولاد قرار دیا جاتا ہے، اللہ کی عبادت گذار اور پیدا کردہ ہے۔ پھر عابد معبود کی اولاد کس طرح ہو سکتا ہے اور کیوں کر شریکِ خدائی بن سکتا ہے۔

(۳) مُّكْرَمُوْنَ۔ جن کو اللہ کی اولاد کہا جاتا ہے وہ تو اللہ کے معزز بندے ہیں، خدا کی بارگاہ میں ان کی عزت و تکریم ہے۔ ذاتی اور نسبتی طور پر ان میں کوئی عزت نہیں۔ جو کچھ شرف و فضل ہے وہ خداداد ہے تو جس میں ذاتی عزت و کرامت نہ ہو اس کو اللہ کی اولاد کہنا کس طرح جائز ہے۔

(۴) لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ۔ مزعومہ اولاد میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ بغیر اجازت اللہ سے کچھ عرض کر سکیں۔ جب خدا تعالیٰ مخاطب نہ بنائے کچھ کہہ سکیں، ایسا مجبور اور بے طاقت شخص کیسے شریکِ الوہیت اور جزوِ الٰہ بن سکتا ہے۔

(۵) بِأَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ۔ وہ خود کچھ نہیں کر سکتے۔ اللہ کے فرماں بردار اور مطیعِ حکم ہیں۔ جو حکم ملتا ہے ویسا ہی کرتے ہیں۔ اگر وہ اللہ کی اولاد ہوتے تو اتنے کمزور نہ ہوتے، الوہیت کا کوئی شائبہ تو ان کے اندر ہوتا۔ اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِّاَبِيْهِ خدا کی کوئی خاصیت تو ان میں پائی جاتی۔

(۶) وَلَا يَشْفَعُوْنَ۔ وہ شفاعت ضرور کریں گے، مگر صرف اہلِ توحید کی محض انہی لوگوں کی جن کی سفارش کرانی خدا پسند کرے گا۔ خود شفاعت کرنے کا ان کو کوئی حق نہیں۔ پھر بامید شفاعت ان کو اللہ کی اولاد قرار دے کر ان کی پرستش کرنی اور شریکِ الوہیت قرار دینا کہاں تک زیبا ہے ایسی بے کس مخلوق جو بغیر اجازت سفارش بھی نہ کر سکے اللہ کی اولاد نہیں ہو سکتی۔ اللہ کی اولاد ہو اور خود مختار نہ ہو، اس کا اپنا کوئی ارادہ نہ ہو، اس میں اتنی بھی جرأت و طاقت نہ ہو کہ کسی شخص کی سفارش بھی اپنی مرضی سے کر سکے۔ ایسی ہستیاں خدا کی اولاد نہیں ہو سکتیں۔

(۷) اگر خدا کی اولاد ہوتی تو چونکہ ان کے اندر الوہیت کا جزو ہوتا، اس لئے نڈر ہوتیں، کم سے کم اوروں کی بہ نسبت تو ان کو کم خوف ہوتا، ان کو اپنے باپ کا ڈر نہ ہوتا، حالانکہ وہ ہر وقت اللہ کے خوف سے ترساں رہتے ہیں، کافروں اور جاہلوں کی طرح بے باک نہیں ہیں معرفتِ الٰہی چونکہ ان کو زیادہ حاصل ہے، خدا کی جلالت و صفات کا اندازہ ان کو زیادہ ہے، اس لئے ہر وقت ترساں و لرزاں رہتے ہیں، اگر ان کے اندر الوہیت کی آمیزش ہوتی تو اس قدر خوف کیوں ہوتا۔

(۸) وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ یعنی وہ اس قدر بے کس بے بس ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی بالفرض الوہیت کا دعویٰ کرے تو عذابِ الٰہی سے نہیں بچ سکتا پھر

ایسی ہستی کو شریک الوہیت قرار دینا جو خود دعویٰ الوہیت سے بیزار ہو کہاں تک صحیح ہے۔ وہ اپنے پرستاروں کی سفارش کرنا تو درکنار خود بھی اپنے پرستاروں سے راضی نہ ہوگی اور اگر بالفرض راضی ہو جائے تو دوسرے نافرمانوں کی طرح اس کی جزا بھی جہنم ہوگی۔

تحلیل اجزاء

اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی۔ ابن عباس نے فرمایا اس سے مراد صرف اہلِ توحید ہیں جو لوگ توحید کے قائل ہیں انہی کی شفاعت کی جائے گی۔ قتادہ، مجاہد اور حسن بصری کا بھی یہی قول ہے۔ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ ملائکہ قیامت کے دن سفارش کریں گے بیہقی نے کتاب البعث میں بروایت جابر رضی اللہ عنہ بیان کیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے آیت مذکورہ پڑھ کر فرمایا میری شفاعت میری امت والوں میں سے اہلِ کبیرہ کے لئے ہوگی۔

وَهُمۡ مِّنۡ خَشۡيَتِهٖ مُشۡفِقُوۡنَ۔ جن کا رتبہ سوا ہوتا ہے انہی کو خوف بھی سوا ہوتا ہے۔ قرآن کی آیت ہے۔ اِنَّمَا يَخۡشَى اللّٰهَ مِنۡ عِبَادِهِ الۡعُلَمٰٓؤُا۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جو چیز میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو کم ہنستے اور بہت روتے۔

فَذٰلِكَ نَجۡزِيۡهِ۔ شیخ جلال محلی کا قول ہے کہ الوہیت کا مدعی ملائکہ میں سے صرف ابلیس تھا اُسی کا ذکر اس آیت میں ہے ذکر المعلیب۔ مگر یہ قول مخدوش ہے۔ جب ابلیس ملائکہ میں سے تھا تو اس نے الوہیت کا دعویٰ نہیں کیا اور جب راندۂ درگاہ ہوگیا تو ملائکہ میں سے نہ رہا اور ذکر ملائکہ کا ہے۔ اس کے علاوہ سیاق آیت بھی اس کی اجازت نہیں دیتا، اس لئے ابن کثیر نے بیان کیا ہے کہ کلام بطور شرط ہے اور شرط کا تحقق ضروری نہیں صرف فرض کرنا کافی ہے۔ مطلب یہ کہ اگر بالفرض ملائکہ میں سے کوئی مدعی الوہیت ہو جائے تو اس کی جزا بھی جہنم ہے۔

مقصودِ بیان

واجب تعالیٰ کے صاحب اولاد ہونے کی تردید اور اولاد پرستوں کے عقیدہ کا استیصال، مندرجہ ذیل امور کی صراحت۔ اللہ تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے، فرشتے خدا کے معزز و کریم بندے ہیں۔ جب تک اللہ کی طرف سے خطاب نہ ہو، فرشتے خود کچھ بولنے کی جرأت نہیں کرتے، فرشتے معلوم ہیں وہی کرتے ہیں جو حکم ہوتا ہے، خلاف حکم کچھ نہیں کرتے، کوئی فرشتہ اللہ کے علمی احاطہ سے خارج نہیں، اللہ کو ہر ایک کا تفصیلی علم ہے۔ گزشتہ اور آئندہ سب سے وہ مکمل طور پر واقف ہے۔ فرشتے قیامت کے دن شفاعت کریں گے، مگر انہی لوگوں کی جن کی شفاعت کرنا خدا پسند کرے گا یعنی صرف اہلِ توحید کی۔ شرک اس قدر بڑا جرم ہے کہ اگر بالفرض کسی مقرب فرشتے سے بھی سرزد ہو جائے تو وہ بھی راندۂ بارگاہ ہو جائے۔ مسلمانوں کے لئے مندرجہ ذیل پیام ہدایت آیت سے مستخرج ہوتا ہے۔ اللہ کو تمام عیوب سے منزہ جانیں اور یہ سمجھ لیں کہ جس قدر عبودیت و عبدیت میں اضافہ ہوگا اسی قدر عزت میں بھی زیادتی ہوگی۔ تہذیب و ادب کو ملحوظ رکھیں، بزرگانِ ملت اور اکابر اسلام سے تہذیب کا برتاؤ کریں، احکام الٰہیہ پر پابند ہوں، کوئی فعل و حرکت خلاف شرع نہ کریں وغیرہ۔

اَوَلَمۡ يَرَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ كَانَـتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰهُمَا ‌ؕ وَجَعَلۡنَا مِنَ

کیا کافروں کو معلوم نہیں کہ آسمان زمین دونوں منہ بند تھے پھر ہم نے دونوں کو کھول دیا اور ہر جاندار چیز کو

الۡمَآءِ كُلَّ شَىۡءٍ حَىٍّ‌ ؕ اَفَلَا يُؤۡمِنُوۡنَ ○ وَجَعَلۡنَا فِى الۡاَرۡضِ رَوَاسِىَ اَنۡ تَمِيۡدَ بِهِمۡ

پانی سے پیدا کیا۔ کیا پھر بھی یہ ایمان نہیں لاتے اور زمین میں ہم نے پہاڑ پیدا کئے تاکہ وہ ان آدمیوں کو لے کر جھک نہ جائے

وَجَعَلۡنَا فِيۡهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمۡ يَهۡتَدُوۡنَ ○ وَجَعَلۡنَا السَّمَآءَ سَقۡفًا مَّحۡفُوۡظًا ‌ۖۚ وَّهُمۡ

اور اس میں ہم نے کشادہ راستے بنائے تاکہ وہ لوگ راہ پائیں اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا مگر یہ لوگ

عَنۡ اٰيٰتِهَا مُعۡرِضُوۡنَ ○ وَهُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ‌ ؕ كُلٌّ فِىۡ فَلَكٍ يَّسۡبَحُوۡنَ ○

آسمانی نشانیوں سے روگرداں ہیں اللہ وہی ہے جس نے رات دن اور سورج و چاند کو پیدا کیا سب آسمان میں تیر رہے ہیں

تفسیر گزشتہ آیات میں توحید کا ثبوت ہر برہانی، کشفی، خطابی اور استقرائی دلیل سے کیا گیا تھا۔ ان آیات میں خدا تعالیٰ کی عام خلاقی اور ہمہ گیر قہار طاقت کا اظہار فرما کر گزشتہ مضمون کی تائید فرمادی ہے۔ ان آیات میں تخلیق الہیٰ کو پیش کر کے جن دلائل کو بیان فرمایا ہے وہ بالکل بدیہی ہیں اور انتہائے بداہت کی وجہ سے گویا محسوس ہیں، اس لئے بجائے اَوَلَمْ یَعْلَمُوْا کے اَوَلَمْ یَرَ کا لفظ استعمال کیا اور یہ بتا دیا کہ دلائل توحید تو اس قدر واضح ہیں کہ زیادہ غور و فکر اور منطقی نتائج نکالنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ذراسی توجہ کافی ہے، خود غیر مرئی حقیقت مرئی بن کر سامنے آجائے گی۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ مادۂ ایثریہ یعنی ایتھر سب ایک جا جمع تھا اس میں کوئی باہم امتیاز و تفرقہ نہ تھا حقیقت سب کی ایک تھی، لیکن اللہ کی قدرت دیکھو کہ اس نے ایک ہی مادہ سے مختلف انواع کی تخلیق کی، ایتھر کے دو حصے کر کے ایک سے آسمان اور ایک سے زمین بنائی۔ پھر زمین کی مخلوقات کو زندہ کیا۔ حیوانات، نباتات اور جمادات میں سے ہر ایک کو اس کے مناسب زندگی عطا کی۔ گیس چونکہ ایک مضطرب اور قرار نہ پکڑنے والی چیز تھی اور زمین پر آبادی کرنی مقصود تھی، اس لئے زمین میں ثقل پیدا کر کے اس کو قرار دیا۔ پہاڑوں کی میخیں نصب کیں، آدمیوں کی معاشی اور حیاتی سہولت کے لئے جا بجا کشادہ راستے بنائے ادھر آسمان کو جس سیال مادہ سے بنایا تھا اس میں بھی کوئی خاص صورت جسمیہ نہ تھی۔ اس کو ایک خاص صورت عطا کر کے قوت حافظہ للترکیب عطا کی جس نے آسمان کو ٹوٹنے پھوٹنے، شکل بدلنے اور تغیرات خارجیہ کو قبول کرنے سے روک دیا۔ پھر چاند سورج بنائے جن سے شبانہ روز کی تخلیق ہوئی۔ چاند سورج گردش کرنے لگے اور ہر ایک اپنی تدویر میں حرکت کرنے کی صورت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا مچھلی پانی میں تیر رہی ہے۔ کیا یہ تمام دلائل و مشاہدات اللہ کی ہمہ گیر قدرت و بے مثال خلاقی اور بے نظیر وحدانیت کو ثابت نہیں کر رہے ہیں، لیکن کور بصیرت انسان ان پر غور نہیں کرتا، مشاہدات خارجیہ سے منہ موڑتا اور براہین واضحہ سے نظر چراتا ہے۔

تحلیل اجزاء كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا مفسرین نے اس آیت کی توضیح مختلف طور پر کی ہے۔ ابن عباس نے فرمایا کہ آسمان و زمین ہی رتق تھا یعنی آسمان سے پانی نہ برستا تھا اور زمین میں کسی چیز کی روئیدگی نہ تھی۔ اللہ نے ان میں فتق کیا یعنی آسمان سے پانی برسایا اور زمین سے طرح طرح کا سبزہ پیدا کیا (رواہ ابن ابی حاتم) مجاہد اور ابو صالح حنفی نے بیان کیا کہ آسمان ایک تھا اللہ نے اس میں فتق کیا یعنی ایک آسمان سے سات آسمان بنائے اور زمین میں بھی فتق کیا یعنی ایک زمین سے سات طبقات قائم کئے۔ سعید بن جبیر نے کہا زمین و آسمان باہم چسپاں تھے اللہ نے دونوں کو جدا جدا کر دیا۔ حسن بصری اور قتادہ نے کہا زمین و آسمان باہم ملے ہوئے تھے پھر ہوا کے ذریعہ سے دونوں میں فصل کر دیا۔ بعض مفسرین کا قول ہے کہ ابتداء آفرینش میں آسمان و زمین کی کوئی ممتاز شکل نہ تھی، ایک مادہ ایثریہ یعنی ایتھر یا گیس یا دخان تھا۔ یہی تمام عالم کا تخلیقی مادہ تھا خدا تعالیٰ نے اس کے جدا جدا حصے کر کے کچھ حصہ سے آسمان اور کچھ حصے سے زمین بنادی یعنی کچھ حصے کو آسمان کی شکل و صورت اور خواص عطا کر دئے اور کچھ حصہ کو زمین کی صورت جسمیہ عنایت فرمادی۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ۔ پانی سے مراد یا تو نطفہ ہے۔ مطلب یہ کہ ہر جاندار کو ہم نے نطفہ سے بنایا۔ ابن عربی کا یہی قول ہے یا عام پانی مراد ہو اس وقت كُلَّ شَيْءٍ میں نباتات بھی شامل ہوں گے۔ مطلب یہ ہوگا کہ حیوانات و نباتات میں سے ہر چیز کی حیات کا بقا ہم نے پانی پر موقوف رکھا ہے یعنی ہر نامی چیز کو پانی کی سخت ترین ضرورت ہے۔ پیدائش اور بقا دونوں بغیر پانی کے ناممکن ہیں۔ اول صورت میں حضرت آدمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش مستثنیٰ قرار پائے گی۔ کیونکہ دونوں حضرات کی تخلیق نطفہ سے نہیں ہوئی۔ گویا کلیہ واقعیہ نہ ہوگا بلکہ محاورۂ عرب کے موافق اکثر کو کلیہ کہہ دیا گیا ہے۔ مؤخر الذکر تقدیر پر استثناء کی ضرورت نہیں۔

وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ۔ زمین کو نباتات و حیوانات کا مسکن بنانا تھا۔ اگر ہوا یا پانی کی طرح یہ بھی سبک اور لرزاں ہوتی تو کسی نامی جسم کو قرار نہ ہوتا۔ ہر وقت ڈگمگاتی رہتی اور اس پر رہنے والی ہر چیز بھی اضطرابی حرکات کرتی رہتی، اس لئے خدا تعالیٰ نے زمین میں ثقل واقعی پیدا کیا۔ بڑے بڑے پہاڑ نصب کئے۔ ایک تو زمین میں واقعی بوجھ اور پہاڑوں کا وزن۔ دونوں نے مل کر زمین کو قائم رکھنے میں مدد کی، لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ زمین ساکت ہے اس میں حرکت بالکل نہیں ہے۔ کیونکہ آیت سے اضطرابی حرکت اور ڈگمگانے کی نفی مستنبط ہوتی ہے حرکت منتظمہ کی نفی کا استخراج نہیں کیا جا سکتا نہ سکون و حرکت سے قرآن کے بیان کو کچھ سروکار ہے۔ یہ کام علمائے طبعیات کا ہے۔

وَجَعَلْنَا فِيهَا فِجَاجًا۔ شروع میں زمین مادۂ اثیریہ سے بنائی گئی۔ جب گیس میں سختی اور درشتی پیدا کی گئی اور اس کو زمین کی شکل عطا کی گئی تو وہ بالکل ناہموار اور ناقابلِ سکونت تھی۔ نشیب و فراز اور پستی و بلندی کی وجہ سے حیوانات کا استقرار ناممکن تھا۔ اللہ نے زمین کو ہموار کیا، اُس میں جا بجا راستے بنائے تاکہ ایک ملک سے دوسرے ملک اور ایک جگہ سے دوسری جگہ سامانِ تجارت لے جانے میں سہولت ہو۔ زندگی کے کاروبار کی درستگی کی طرف رہنمائی ہو۔

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا۔ آسمان مثل چھت کے ہے۔ زمین سے بظاہر بلند ہے بالکل چھت کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ اس کو خدا نے محفوظ بنایا ہے۔ یعنی شیاطین کی وہاں رسائی نہیں، ناپاک روحوں کو وہاں دخل نہیں، سحر، کہانت اور علم نیرنگ کی وہاں تک پہنچ نہیں۔ علمائے طبعیات کی تاثیر انگیزیاں وہاں بے کار ہیں۔ یا یہ معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ نے آسمان کو جس مادہ سے پیدا کیا وہ سیّال تھا۔ ہر قسم کا تغیر قبول کرنے کی اُس میں قابلیت تھی، لیکن جب اُس کو آسمانی شکل دے دی گئی تو اس کے ساتھ ایک ایسی قوت بھی عطا کر دی گئی جو آسمان کو ٹوٹنے پھوٹنے، ہر قسم کا تغیر قبول کرنے، حرارت و برودت، رطوبت و یبوست کی کیفیات سے متکیف ہونے اور ہر طرح کا تدریجی یا وقتی انقلاب کے پیدا ہونے سے محفوظ کئے ہوئے ہے۔ قوت حافظ للترکیب آسمان کے اجزا کو پراگندہ نہیں ہونے دیتی۔ کیفیات خارجیہ سے متاثر ہونے سے بچاتی ہے وغیرہ۔

خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ۔ یعنی تاریکی اور نور اور ان کے اسباب سدا نے بنائے۔ مطلب یہ کہ آثار اور مؤثرات، مسببات اور اسباب سب ہی کی تخلیق، منت کش فطرت الٰہیہ ہے۔ ہر ایک کا وجود دست قدرت میں مرہون ہے۔

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔ اس آیت کا مطلب ابن عباسؓ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ ستارے اور چاند سورج فلک میں اس طرح دوڑ کرتے ہیں جیسے تکلا چرخے میں دوڑ کرتا ہے۔ اس قول سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام ستارے اپنے محور اور دائرہ پر حرکت کرتے ہیں، مگر ان کی حرکت فلک کی حرکت کے تابع ہے۔ ابن عباسؓ کا دوسرا قول ہے کہ فلک ایک موج مکفوف ہے۔ اس تقدیر پر یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ جس طرح پانی میں مچھلیاں اور دوسرے تیرنے والے جانور تیرتے ہیں اسی طرح آسمان میں ستارے تیرتے نظر آتے ہیں۔ اول قول شاید علمی تحقیق پر مبنی ہو اور دوسرا قول محض ظاہری احساس ہے گویا ثانی قول میں محض تشبیہ ظاہر کرنی مقصود ہے کہ دیکھنے والوں کو آسمان میں ستاروں کی حرکت ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے پانی میں شنا ور جانوروں کا تیرنا۔

نوٹ تقریباً تمام حکمائے عصر اور بعض متقدمین قائل ہیں کہ آفتاب و ماہتاب اور تمام ستارے کسی فلک میں جڑے ہوئے نہیں ہیں بلکہ اپنے مدار پر بذاتِ خود حرکت کرتے ہیں۔ فلک کوئی جسم دار چیز نہیں۔ یہ جو کچھ نیلا گنبد سا نظر آتا ہے فقط حد نظر اور آنکھ کے پردوں پر نیلی شعاعوں کا عکس ہے۔ حکمائے قدیم قائل ہیں کہ نو آسمان ہیں ہر آسمان پر کچھ ستارے ہیں۔ صرف نواں آسمان ستاروں سے خالی ہے۔ ہر ستارہ کی حرکت بذاتِ خود اپنے محور اور دائرہ پر بھی ہوتی ہے اور جس فلک پر وہ ستارہ ہے اس کی حرکت کی وجہ سے بھی ستارہ قسری حرکت کرتا ہے۔ گویا ہر ستارہ میں دو طرح کی حرکات ہیں ذاتی اور قسری۔ قرآن پاک طبعیات کی تحقیق کی کتاب نہیں نہ فلسفۂ تحلیل و ترکیب اور تحقیقِ خواص و اجزا اس کا کام ہے۔ یہ تو صرف آثار اور محسوس آثار سے بحث کرتا ہے اور کائنات جہاں تک شواہد قدرت بن سکتی ہے اس حد تک قرآن کو اس کے بیان سے تعلق ہے۔ اسی لئے اسلام نے اس تفصیل و انکشاف کی کوئی صراحت نہیں کی۔

مقصودِ بیان اس امر کی طرف اشارہ کہ غیر مرئی آثار قدرت اور شواہد فطرت اس قدر واضح ہیں کہ کسی غور و خوض کی ضرورت نہیں۔ صرف سطحی غور کرنے سے بھی غیر مرئی حقیقت مثل مرئی کے سامنے آجاتی ہے۔ ابتدائے تخلیق میں آسمان و زمین باہم مخلوط اور متصل تھے۔ یعنی سب کا مادہ ایک ہی تھا۔ ہر جاندار چیز کی تخلیق نطفہ سے ہوئی ہے، لیکن نطفہ کی صورت میں فرق ہے، اور مختلف نطفوں سے مختلف حیوانوں کی تخلیق اللہ کی ہمہ گیر قدرت کی کافی دلیل ہے۔ آسمان ہر قسم کے مادی تغیرات سے محفوظ ہے، چاند سورج متحرک ہیں حواہ ان کی حرکت دوری ہو یا مستقیم۔ اپنے محور پر ہو یا تیرنے والے جانور کی طرح۔ پوری آیات میں عبرت اندوز اہلِ نظر کے لئے درس مطالعہ ہے اور یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ آسمان و زمین کی خلقت، حیوانات کی ابتدائی آفرینش، زمین کا رسم اضطراب، آسمانوں کا تحفظ، رات اور دن کی پیدائش اور انقلاب، چاند اور سورج اور ان کی حرکات کے آثار قابلِ مطالعہ ہیں۔ صانع کی صنعت، حکیم کی حکمت اور نفاذ کی قدرت ان سے معلوم ہوتی ہے وغیرہ۔

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ أَفَإِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ ○ كُلُّ

اور تم سے پہلے ہم نے کسی بشر کو دوامی زندگی نہیں دی (اے نبی) تو اگر تم مرجاؤ گے تو یہ ہمیشہ رہیں گے ہر شخص

نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَنَبْلُوكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ۖ وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ○

کو موت کا مزہ چکھنا ہے ہم تم کو آزمانے کے لئے مصیبت و راحت میں مبتلا کرتے ہیں اور تم سب کو ہمارے ہی پاس لوٹ کر آنا ہے

تفسیر کفار نے قرآن کی صداقت اور اسلام کی حقانیت سے عاجز ہو کر طرح طرح کی تہمت تراشی اور افترا پردازی سے کام لینا چاہا کبھی حضور کو ساحر و کاہن کہا، کبھی شاعر اور مجنون اور دیوانہ کا خطاب دیا، لیکن اہل حقیقت کی حقیقت رس نظر نے اصل صداقت کو تاڑ لیا اور اس تہمت آفرینی کا کوئی اثر نہ نکلا۔ لوگ بکثرت مسلمان ہونے لگے۔ جب ہر طرح سے عاجز ہو گئے تو بہکانے کا اور طریقہ نکالا۔ کہنے لگے یہ شخص عنقریب مر جائے گا پھر ڈھول کی پول کھل جائے گی، یہ نیا مذہب باقی نہ رہے گا، اس لئے ایسے کمزور اور زوال پذیر مذہب کو اختیار کرنا بے کار ہے۔ اس کے رد میں یہ آیت نازل ہوئی۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اس سے پہلے بقائے دوام کبھی انسان کو حاصل نہ ہوا، کوئی آدمی ہمیشہ نہیں رہا تم بھی آدمی ہو پھر مرنا کون سی تعجب کی بات ہے۔ کیا کفار یہ نہیں جانتے کہ اگر رسول خدا کو موت آئے گی تو کیا وہ موت سے بچ جائیں گے۔ کوئی شخص پنجۂ موت سے بچنے والا نہیں۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے، میدان آزمائش ہے، راحت و تکلیف، صحت و بیماری، فقیری و تونگری، ضلالت و ہدایت، معصیت و طاعت سب آزمائش کی چیزیں ہیں۔ صابر شکر گزار اور بے صبر بدکردار کا اس طرح امتحان ہو جاتا ہے۔ بالآخر سب کو مر کر خدا کے پاس جانا اور اپنے کئے کا مزہ چکھنا ہے۔

تحلیلِ اجزاء وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ۔ اوپر کی آیت میں آسمان زمین اور چاند سورج کا تذکرہ کر کے یہ بتا دینا چاہا تھا کہ دنیا جانداروں کے رہنے کا گھر ہے اور خدا نے اپنی قسم قسم کی نعمتیں یہاں آسائش کے لئے عطا کی ہیں، لیکن اس دنیا کی حالت کو قرار نہیں۔ بلندی کے ساتھ پستی بھی ہے اور دن کے ساتھ رات بھی ہے۔ نور کے ساتھ ظلمت بھی ہے اور راحت کے ساتھ تکلیف بھی ہے، حقیقی قرارگاہ نہیں، اصلی ٹھکانا نہیں، دوامی مسکن نہیں۔ اسی مضمون کی تائید آیت مذکورہ سے کی۔ آیت میں خلد سے مراد دوام ہے۔ مطلب صاف ہے کہ جب تغیر و زوال، فنا و موت مقتضائے فطرت ہے، ضابطۂ قدرت ہے، قانون جبلت ہے تو پھر کسی کو دوام کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ نیک ہو یا بد، مومن ہو یا کافر، رسول ہو یا بدسگال مشرک، سب کو اسی راستہ پر جانا ہے، لیکن خیر و شر، نیکی اور بدی، گناہ اور طاعت، گمراہی اور ہدایت سب کے اثرات مختلف ہیں۔ مرنے کے بعد نیچ اور معدوم محض ہو جانا غلط ہے۔ کئے کی سزا اٹھانی لازمی ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ۔ نفس سے مراد جان ہے یعنی ... حیات۔ اہل حقیقت نے کہا ہے کہ قلب اور روح کو موت نہیں آتی جسم سے روح کا تعلق ٹوٹتا ہے تو اعضائے جسم منتشر ہو جاتے ہیں، ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور روح اپنے اصلی مرکز کی طرف چلی جاتی ہے۔ اجسام حادث ہیں اور ارواح قدیم حادث اگرچہ موجود ہو، مگر فانی ہے۔ بقا کا جلوہ اس میں نظر نہیں آتا اور قدیم اگرچہ آنکھوں سے نہ دیکھے، حواس سے محسوس نہ ہو، مگر باقی ہے بقا کی حقیقت اس میں موجود ہے۔

وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ۔ یعنی مرنے کے بعد سب کی روحیں دوسرے عالم میں چلی جاتی ہیں۔ یہ جسمانی زندگی جاتی رہتی ہے پھر قیامت کے دن دوبارہ جسمانی بعثت ہو کر ادر بدنی جامہ پہنا کر خدا کے روبرو حساب کتاب اور جزا سزا کے لئے پیش کیا جائے گا۔

مقصود بیان کفار کی خیالی تمناؤں کی بیخ کنی، ہر انسان کے مرنے کی صراحت، دنیا کی راحت و تکلیف اور خیر و شر کی اصل غرض کا اظہار اور اس بات کی طرف اشارہ کہ دنیا میں انسان کو نیکی کی طرف رغبت اور بدی سے نفرت کرنی چاہئے وغیرہ۔

وَإِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ۭ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ

(اے محمدؐ) جب کافر تم کو دیکھتے ہیں تو بس تم کو ہنسی بنا لیتے ہیں (اور کہتے ہیں) کیا یہی وہ شخص ہے جو تمہارے معبودوں کا تذکرہ کرتا ہے اور

بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ۭ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا

وہ خود رحمٰن کے ذکر سے انکار کرتے ہیں انسان جلدی کا بنا ہوا ہے عنقریب تم کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاؤں گا تم

تَسْتَعْجِلُوْنِ ۝ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ

مجھ سے جلدی نہ مچاؤ یہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو یہ وعدہ کب آئے گا کاش کافروں کو اس وقت کی

كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

حالت معلوم ہو جائے جبکہ یہ اپنے چہروں کی طرف سے آگ کو نہ روک سکیں گے اور نہ اپنی پشتوں کی طرف سے (روک سکیں گے) اور نہ اُن کی مدد کی جائے گی

بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝ وَلَقَدِ

بلکہ وہ ان پر ایک دم آپڑے گی اور ان کو بدحواس کر دے گی پھر اُس کو دفع نہ کر سکیں گے اور نہ اُن کو مہلت دی جائے گی (اے محمدؐ) تم سے

اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ع

پہلے بھی پیغمبروں کا مذاق اُڑایا گیا تو ان میں سے تمسخر کرنے والوں پر وہی عذاب آپڑا جس کی وہ ہنسی اُڑایا کرتے تھے

تفسیر

اہلِ جہالت کا قاعدہ ہے کہ جب کسی دانشمند عالم کے حکیمانہ اقوال کو سمجھ نہیں سکتے اور مصلح کی اصلاحی اسکیموں کے فوائد جان نہیں سکتے تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ خصوصاً اس وقت جب کہ ہر طرح سے مقابلے کی کوشش کر چکتے ہیں، طرح طرح سے نکتہ چینیاں اور خوردہ گیریاں ختم ہو جاتی ہیں اور ایذا رسانی کا حربہ بھی باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ حضور اقدسؐ کے مصلحانہ احکام اور قرآن کے آسمانی ضوابط جب کفارِ مکہ کی سمجھ میں نہ آئے چند خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کا ہو جانا ان کو عجیب معلوم ہوا تو لگے طرح طرح کے ڈھکوسلے بنانے اور نکتہ چینیاں کرنے اور جب ہر طرح سے تھک گئے تو مذاق اڑانے کی ٹھان لی۔ جدھر حضور جاتے کوئی نہ کوئی کافر آوازیں کستا اور پھبتیاں اڑاتا۔ اگرچہ وہ پھبتیاں نہ ہوتیں۔ بے تکی طعن آمیز بیہودگیاں ہوتیں۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ حضور والا کا گذر ابوجہل کی طرف سے ہوا وہ ہنسا اور بولا لیجئے صاحب عبد مناف کے نبی آ رہے ہیں۔ اس وقت مذکورہ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ تک نازل ہوئی۔ حال ارشاد یہ ہے کہ رسول اللہؐ کو دیکھ کر کافر مذاق اڑاتے ہیں اور طعن آمیز طرز سے کہتے ہیں کیا یہی (بازار میں چکر لگانے والا، پیدل پھرنے والا سودا خریدنے والا اور معمولی انسانوں کی طرح کھانے پینے کی حاجت رکھنے والا حقیر ترین آدمی) تمہارے دیوتاؤں کا برائی کے ساتھ تذکرہ کرتا ہے۔ (اس میں بھی اتنی ہمت کہ پاک دیوتاؤں کی مذمت کرے کیمنت جھوٹے دیوتاؤں اور پتھروں کی بنائی ہوئی مورتیوں کا انکار کرنے والے کا تو مذاق اڑاتے ہیں) حالانکہ خود خدائے برحق کا انکار کرتے ہیں جو تمام عالم اور اہلِ عالم کے لئے رحمٰن ہے جس کو رحمت کاملہ اور معرفت عامہ کے سبب معبود ہونے کا استحقاق بھی ہے یعنی فرضی معبودوں کی قدر و منزلت کے انکار پر تو اتنا طیش اور معبود برحق کے پاک اوصاف کے انکار کرنے پر اتنی جرأت۔

بے وقوف جاہل آدمی محسوس پرست اور وقتی معاملہ کا بندہ ہوتا ہے۔ جو چیز فوراً سامنے آ جائے اور آنکھوں سے دکھ جائے اس کا تو قائل ہو جاتا ہے۔ اگرچہ وہ دھوکا ہی ہو اور غیر محسوس چیز کا انکار کرتا ہے نیز اس شے کو نہیں مانتا جو آئندہ پردہ غیب سے یقینی طور پر ظاہر ہونے والی ہو۔ اگرچہ اس کا وجود

حق ہو۔ کفار مکہ بھی کچھ جاہل نہ تھے بلکہ جاہل معاند تھے۔ رسول پاکؐ جب ان کو عذاب الٰہی سے ڈراتے اور واقعات قیامت کا تذکرہ کر کے خوف دلاتے
گروہ وہی موروثی شبہ پیش کرتے اور کہتے آخر قیامت کب آئے گی؟ کوئی وقت، کوئی ساعت، کوئی دن، آخر کچھ تو معلوم ہو کہیں آ بھی چکے۔ چنانچہ نضر بن
حارث عذاب کا بار بار طلب گار رہتا اور کہتا جو ہوتا ہے کہیں ہو بھی چکے۔ کبھی اپنے خیال کی حقانیت ظاہر کرنے کے لئے انتہائی فریب اور طمع کاری سے
کہتا۔ اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً الخ۔ کفار کے اس استعجال عذاب کے جواب میں خُلِقَ الْاِنْسَانُ
——— وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ تک آیات کا نزول ہوا جن کا حاصل یہ ہے کہ انسان کا خمیر ہی عجلت کا ہے۔ عام طور پر انسان جلد باز واقع ہوا ہے۔
اس لئے عذاب کے نزول کی بھی جلدی مچاتا ہے۔ عنقریب وقت آنے والا ہے کہ اللہ کی نشانیاں سامنے آجائیں گی جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ یعنی
قیامت کا دن اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ عنقریب ہی آنے والا ہے۔ یہ زندگی چند روزہ ہے۔ مرنے کے بعد قیامت کے عذاب کے آثار کافروں پر
نمودار ہو جائیں گے۔ پھر اچانک بغیر کسی تعیین تاریخ کے قیامت کبریٰ آجائے گی۔ اس وقت نہ تو کافروں کا کوئی مددگار ہوگا نہ خود ان میں دفع کرنے کی
طاقت ہوگی۔ آگے اور پیچھے آگ ہی آگ ہوگی۔

اس سے آگے رسول پاکؐ کو تسلی دینے کے لئے فرمایا کہ کفار کی استہزاء اور مضحکہ خیزی سے آپ ملول خاطر نہ ہوں آپ کے واسطے کفار کی یہ ایذا رسانی مخصوص
نہیں ہے بلکہ آپ سے پہلے انبیاء کے ساتھ بھی استہزاء کا برتاؤ کیا گیا لیکن انجام کار انبیاء کو غلبہ حاصل ہوا اور جس عذاب کی کفار ہنسی اڑاتے تھے وہی آن پڑا۔

تحلیل اجزاء

يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ۔ یہ حقیر شخص اتنی جرأت رکھتا ہے کہ تمہارے دیوتاؤں کا تذکرہ برائی کے ساتھ کرتا ہے اُن کو بے کس
بے بس مخلوق بتاتا ہے، ان کی پرستش سے منع کرتا ہے۔ طرح طرح سے ان کی مذمت کرتا ہے۔

وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ۔ کفار قریش نے کہا تھا کہ محمدؐ رحمٰن کو اپنا رب بتاتا ہے۔ ہمارے علم میں تو رحمان الیمامہ (مسیلمہ کذاب
جس نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا) کے سوا اور کوئی رحمٰن ہے نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ خدائے برتر کی رحمت تمام عالم کو محیط ہے۔ پیدائش، حیات، رزق، نعمت
عزت، حکومت، دولت، آرام، آسائش اور دنیا کی ہر نعمت اسی کے قبضہ میں ہے وہی سب کچھ دیتا ہے۔ پھر آخرت کی نجات اور ابدی سعادت کا
بھی وہی مالک ہے۔ وہ ہر طرح سے الوہیت کا مستحق ہے۔ ایسے خدا کے اوصاف ذاتیہ وفعلیہ کا تو کفار انکار کرتے ہیں بلکہ کافران بے دین کے علاوہ اور کوئی
مخلوق خدائے لاشریک کا انکار نہیں کرتی نہ جنات نہ فرشتے نہ درندے نہ پرندے نہ چرندے نہ بے تھا سمندر نہ بے پایاں ریگستان نہ سر بفلک
پہاڑ نہ کوہ رس درخت نہ یہ اونچا آسمان نہ سطح زمین۔ تمام عالم خدا کی ربوبیت ومعبودیت کا مقر ہے صرف معاند کفار انکار کرتے ہیں اور ان قومی
دیوتاؤں کی الوہیت کے انکار کو اہانت وتعجب کی نظر سے دیکھتے ہیں، جو بالکل بے کس مجبور و بے حس ہیں جن کی عبادت سے کسی فائدہ کی امید نہیں
ہوسکتی اور نہ ترک عبادت سے کسی ضرر کا خوف ہوسکتا ہے۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ۔ الانسان سے مراد نضر بن حارث ہے۔ جس کا قول ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ بعض تفاسیر میں مذکور ہے کہ جب خدا
تعالیٰ نے آدم کے پتلے میں روح ڈالی اور وہ سر تک پہنچی تو آدم کو چھینک آئی۔ آپ نے الحمد للہ کہا۔ فرشتوں نے سن کر یرحمک اللہ کہا۔ اس کے بعد
آدم اٹھنے لگے، لیکن اٹھ نہ سکے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ۔ کذا قال عکرمہ وسعید بن جبیر والسدی والکلبی و
مجاہد وابن جریج۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے خمیر ہی میں عجلت داخل ہے۔ اس کی سرشت ہی عجلت سے ہوئی ہے۔ اگر الانسان سے کوئی خاص شخص
مراد نہ لیا جائے تو میرے نزدیک صحیح مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو جس طرح قوت غضبیہ عطا فرمائی ہے، اسی طرح قوت شہوانیہ بھی دی
ہے۔ غضبی قوت کا کام یہ ہے کہ جب کوئی معترت رساں چیز سامنے آئے تو جلد از جلد اس کو دفع کرنے کی کوشش کرے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی
شخص کسی پر لاٹھی یا تلوار یا کوئی اور آلہ ضرب مارنے کے لئے اٹھاتا ہے تو اس شخص کا ہاتھ بغیر سوچے سمجھے اور بغیر ارادہ کئے اٹھ کر چہرے کی آڑ بن جاتا ہے
تاکہ مارنے والے کا حملہ ہاتھ پر رک جائے چہرے پر نہ پہنچ سکے۔ اسی طرح دیگر مصائب کا مقابلہ بھی انسان اضطراراً بغیر سوچے ارادہ کے فوراً کرتا ہے
یہ تمام کام غضبی قوت کے ہیں۔ شہوانی قوت کا کام یہ ہے کہ جو چیز انسان کی نظر میں فائدہ رساں ہو اور سامنے آئے تو جلد از جلد اس کو حاصل کر لیا جائے
خواہ اس سے جسمانی راحت وآسائش وابستہ نظر آتی ہو یا دماغی نشاط پیدا ہوتی ہو یا روحانی لذت کا سرمایہ حاصل ہوتا ہو۔ ... امر مرغوب طبع

ہے اس کو فوراً حاصل کر لیا جائے۔ چونکہ انہی دونوں مادی قوتوں سے انسان کا خمیر ہوا ہے اور سرشت کے اعتبار سے یہ دونوں جلد باز واقع ہوئی ہیں۔ اس لئے فرمایا۔ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ۔

اٰیٰتِیْ۔ آیات سے مراد عام علامات عذاب ہیں خواہ عذاب دنیوی ہو یا قبر کا یا آخرت کا۔ چنانچہ بدر کے دن عجلت پسند کافروں کا قتل ہونا اور بعض کا گرفتار ہونا بھی آیات عذاب میں سے تھا۔

بَلْ تَاْتِیْهِمْ بَغْتَةً۔ اس سے مراد ہے موت کا اچانک آجانا جس سے انسان بدحواس اور مبہوت رہ جاتا ہے۔ کسی طرح اس کو دفع نہیں کر سکتا اور نہ کسی طرح کی مہلت ملتی ہے۔

مقصود بیان

اہلِ حق کا مذاق اڑانا کافروں کا شیوہ ہے۔ الرَّحْمٰن کا لفظ دلالت کر رہا ہے کہ استحقاق الوہیت صرف خدا کو ہے کسی اور کو نہیں۔ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ الخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کافروں کے علاوہ کوئی مخلوق خدا کی ذات وصفات کا انکار نہیں کرتی۔ عجلت انسان کی سرشت میں داخل ہے، لیکن نیکوکار طریقہ ہدایت حاصل کرنے میں عجلت سے کام لیتا ہے اور بدکار جاہل آدمی اسباب ضلالت کی طرف جلد جلد دوڑتا ہے۔ ہیں دونوں گروہ جلد باز۔ بے وقوف انسان اللہ کے اخروی عذاب کو جلد مانگتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ اس کی نظر کے سامنے وہ عذاب نہیں ہوتا، آنکھوں سے نہیں دکھتا، لیکن جب سامنے آجائے گا تو پھر کسی طرح ٹالے نہ ٹلے گا۔ آخری آیت دلالت کر رہی ہے کہ باطل پرست طبقہ ہمیشہ سے اہلِ حق کا مذاق اڑاتا چلا آیا ہے، لیکن اس کو کبھی کامیابی حقیقی حاصل نہیں ہوئی۔ انجام کار غلبہ اہلِ حق کو ہی رہا۔ اس آیت سے یہ امر ضمناً ثابت ہوتا ہے کہ انبیاء کی توہین کفر ہے وغیرہ۔

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ○

(اے محمد) کہہ دو کہ رات اور دن میں رحمٰن کے عذاب سے تم کو کون بچا سکتا ہے بس بات یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے رب کے ذکر سے روگرداں ہیں

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا

کیا ہمارے سوا ان کو معبود بچاتے ہیں وہ تو خود اپنی مدد نہیں کر سکتے اور نہ ان کو ہمارے عذاب سے

يُصْحَبُوْنَ ○ بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ

پناہ دی جائے گی بات یہ ہے کہ ہم نے ان کو اور ان کے باپ دادا کو بہرہ اندوز کیا یہاں تک کہ ان کی عمریں بڑھ گئیں تو کیا وہ نہیں دیکھتے

اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○ قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ

کہ ہم زمین کو ہر طرف سے گھٹاتے چلے آتے ہیں پس کیا یہ لوگ غالب ہیں تم کہہ دو کہ میں تو بس وحی کے ذریعے

بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ○ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ

سے تم کو ڈراتا ہوں مگر بہروں کو جب ڈرایا جاتا ہے تو وہ پکار کو نہیں سنا کرتے اگر تمہارے پروردگار کے عذاب کی

مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ○

ان کو بھاپ بھی لگ جائے تو کہنے لگیں گے ہائے ہماری خرابی بے شک ہم ناحق پر تھے

تفسیر سرکش متمرد غافل انسان جب جاہ و حشم خیل و خدم کا مالک ہو جاتا ہے، صحت قوت جوانی اور اولاد سے شاداں و فرحاں ہو کر اس چند روزہ عیش کی شراب سے سرمست ہو جاتا ہے تو یہ دو آتشہ نشہ اس پر ایسا چھا جاتا ہے کہ وہ اپنی حالت کو لازوال اور نعمت کو غیر فانی خیال کر کے حوادث لیل و نہار کی طرف سے بالکل مطمئن ہو جاتا ہے۔ اللہ کی ہمہ گیر قدرت اور محیط کل رحمت کا تصور بھی اس سے نہیں ہوتا اور من مانے معبودوں کو اپنا کارساز و حاجت روا جانتا ہے۔ پھر اس کے مقابلے میں اہلِ حق کی تعداد چونکہ کم ہوتی ہے اور مادی طاقت بھی کوئی قابل و قعت حیثیت نہیں رکھتی، اس لئے غافل انسان کو اہلِ حق کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی وہ اپنے مقابلے میں ہمیشہ حامل صداقت گروہ کو کمزور، ذلیل اور مغلوب سمجھتا ہے۔ اس خیال کے ازالہ کے لئے خدا تعالیٰ نے آیات مذکورہ نازل فرمائیں۔

ماحصل ارشاد یہ ہے کہ اللہ کی رحمت عام ہے۔ اس نے اپنے رسول رحمۃ للعالمین کو بھیجا جس کے طفیل میں کفار مکہ کو عذاب دنیوی سے محفوظ رکھا۔ اگر اس کی رحمت نہ ہوتی تو پھر کون بچا سکتا۔ جب کہ رات کو تمام کافر خواب غفلت میں بے حس و حرکت پڑے ہوتے ہیں یا دن کو کاروبار حیات میں سرگرم ہوتے ہیں اس وقت غیبی مصائب کے اصول سے کون بچاتا ہے۔ کیا یہ فرضی دیوتا حفاظت کرتے ہیں، جن کو اپنے اوپر سے کسی ضرر کو دور کرنے کی طاقت بھی نہیں۔ پھر کس طرح وہ دوسروں کا ضرر دفع کر سکتے ہیں۔ کفار خواب غفلت میں سرشار ہیں اور دنیوی ناز و نعمت میں اتنے غرہ ہیں کہ حقیقت واقعہ کی طرف توجہ بھی نہیں کرتے۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ صرف ڈھیل دینے کی غرض سے خدا نے ان کو اور ان کے بڑوں کو دنیوی ساز و سامان سے بہرہ اندوز فرمایا اور عیش و عشرت میں رسایا بسایا یہاں تک کہ ان کی لازائل امیدیں بڑھتی گئیں اور سمجھے کہ ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ جب ان کے دل خوب سخت ہو گئے تو خدا نے ایک دم دھر پکڑا اور اسلام کو روز بروز غلبہ اور فتوحات دے کر کفار کے ملک کے ملک اہلِ اسلام کو دے کر ان کی سلطنت بڑھانے لگے اور کافروں سے دنیا کی حکومت بھی چھیننے لگے۔ سمجھنے والے کو تو اتنا ہی بہت ہے، لیکن بہرے پٹے کو کوئی پکار سنائی نہیں دیتی۔ ہلاکت سے کتنا بھی ڈرایا جائے وہ بالکل نہیں سنتا۔

تحلیلِ اجزاء مَنۡ یَّکۡلَؤُکُمۡ یعنی کفار رحمٰن کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ اسی رحمٰن کی رحمت سے شبانہ روز کی غیبی آفات سے بچتے ہیں۔ اگر اس رحمٰن کی رحمت نہ ہوتی تو حوادث لیل و نہار سے کون بچاتا اور رحمٰن کے سوا کون جان و مال کی حفاظت کرتا۔ ابن کثیر نے اسی طرح تفسیر کی ہے۔ اس قول پر مِنَ الرَّحۡمٰنِ میں مِنۡ کے معنی عوض اور بدل کے ہوں گے، لیکن عام مفسرین کے نزدیک مطلب ہے کہ جس رحمٰن کا تم انکار کرتے ہو اگر اسی رحمٰن کا عذاب شب و روز میں کسی وقت تم پر آ جائے تو کون بچائے گا۔

مِنَّا یُصۡحَبُوۡنَ۔ اس جملہ کا مطلب تین طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ ابن عباس نے فرمایا ہمارے مقابلے میں ان کو کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ قتادہ نے کہا اللہ کی خیر ان کے ساتھ نہیں ہے۔ دیگر مفسرین نے کہا وہ خود اللہ کے عذاب سے محفوظ نہیں ہیں۔ ابن عباس کے قول کو ابن جریر نے پسند کیا ہے۔ ابن قتیبہ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ ابن کثیر نے اس آیت کو مستقل رکھتے ہوئے اس طرح مطلب بیان کیا ہے کہ کفار کے دیوتا عاجز و بے کس ہیں۔ وہ اپنے اوپر سے آفت خود ٹال نہیں سکتے تو دوسروں سے کس طرح ٹال سکتے ہیں۔ کفار کو ہماری طرف سے پناہ نہیں دی گئی ہے۔ جو آفت ہو گی ہمارے حکم سے ہو گی۔ غرض یہ کہ کفار کو دیوتا بچا نہیں سکتے اور خدا کی طرف سے پناہ ملنے والی نہیں تو پھر کس طرح شبانہ روز کے حوادث و مہلکات سے ان کو نجات مل سکتی ہے۔ نَنۡقُصُہَا مِنۡ اَطۡرَافِہَا۔ ابن عباس، مقاتل اور کلبی کا قول ہے کہ زمین سے مراد ہے کفار کی زمین اور کم کر لینے سے مراد ہے کافروں کے قبضہ سے نکال کر مسلمانوں کے تسلط میں دے دینا۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین اور دولت و سلطنت پر ناز کرنے والے یہ نہیں دیکھتے کہ عرب کی زمین ہر طرف سے کم ہوتی چلی آ رہی ہے، کافروں کا تسلط گھٹ رہا ہے، اسلام پھیل رہا ہے، کافروں کے مقبوضات مسلمانوں کے قبضہ میں مسلسل آ رہے ہیں۔ جب ایسی حالت ہے تو اب کیا اہلِ کفر اہلِ اسلام پر غالب آ سکتے ہیں۔ اس تفسیر پر یہ شبہ وارد ہوتا ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور جہاد ہجرت کے بعد فرض ہوا تھا پھر ممالک کفر کو گھٹانے کے معنی؟ مکہ میں رہ کر تو مسلمانوں کے قبضہ میں کوئی زمین نہ آئی تھی۔ اس شبہ کا جواب چار طرح سے دیا گیا ہے۔ سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ سورت اگرچہ مکی ہے، مگر یہ آیت مدنی ہے۔ نزول آیت کے وقت جزیرۂ عرب کے اطراف کی زمینیں تدریجاً مسلمانوں کے قبضہ میں آ رہی تھیں اور کافروں کا زور گھٹتا جاتا تھا۔ بیضاوی نے کہا یہ واقعہ ہنوز موجود نہ ہوا، مگر پیشین گوئی کے طور پر آنے والے واقعہ

کی صراحت کردی ۔ حسن بصری کا قول ہے کہ اس سے اسلام کا غالب اور کفر کا مغلوب ہونا مراد ہے ۔ یعنی یہ مقصود نہیں کہ ممالک کفر کافروں کے پنجہ سے نکل کر اسلام کے ہاتھوں میں آرہے ہیں ۔ بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ اسلام کی اشاعت بڑھ رہی ہے ۔ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے ۔ کافروں کا گروہ کمزور پڑ رہا ہے ۔ حبش میں نجاشی اور ان کا گروہ ، مدینہ میں اوس و خزرج کے قبائل اور اطراف عرب میں کچھ اور دانش مند افراد اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے ہیں ۔ غرض اسلام کی شوکت قوت اور اشاعت بڑھ رہی ہے ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس آیت کی بہترین تفسیر وہی ہے جس کی صراحت دوسری آیت میں خود کردی گئی ہے ۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۔ یعنی خدا نے مکہ کے آس پاس آبادیاں ان کی معصیت اور کفر کے سبب ہلاک کر دیں ۔ اہل نظر اگر عبرت کی نظر سے دیکھیں تو آیات الٰہیہ کو دیکھ کر وہ کفر سے باز آ سکتے ہیں ۔ اس تقدیر پر آیت کا اصل مطلب اس طرح ہوگا کہ کیا کفار غور نہیں کرتے اور چشم عبرت سے نہیں دیکھتے کہ خدا تعالیٰ اپنے دشمنوں کو ہلاک کر دیتا ہے ۔ تکذیب کرنے والوں کا ستیا ناس کرتا ہے ، مگر دوستوں کی مدد کرتا ہے ۔ مشرکوں کی آبادیاں تباہ کر کے مومن بندوں کو نجات دیتا ہے ۔ اگر عبرت اندوز نظر ہے تو عرب کے چاروں طرف دیکھ کر نصیحت حاصل کریں ۔ اہل ایمان اور اہل کفر کی حالت کا موازنہ کریں ۔ یہی قول عکرمہ کا ہے ۔

وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ ۔ کفار کے کان بھی تھے ، آنکھیں بھی تھیں ، سنتے بھی تھے اور دیکھتے بھی تھے ، مگر گوش ہوش اور چشم بصیرت کا فقدان تھا ۔ حق بات سن کر اس سے فائدہ نہ اٹھاتے تھے ۔ صداقت کا معائنہ کر کے ہدایت اندوز نہ ہوتے تھے ، اس لئے بطور تمثیل و استعارہ انکو بہرا کہا گیا یعنی جس طرح بہرے کچھ سنتے ہی نہیں ہیں ، ان میں شنوائی کی طاقت ہی نہیں ہوتی ۔ اسی طرح معاند کفار حقیقت سماع سے بے بہرہ معلوم ہوتے ہیں ۔ حق کی آواز کی طرف سے ایسے بے توجہ ہیں کہ گویا انکے اندر قوت سماع ہی نہیں ۔

مقصودِ بیان

اللہ کی رحمت عامہ ہے کہ سرکش نافرمان انسان حوادث لیل و نہار اور آفات غیبی سے محفوظ رہتا ہے ورنہ اس کی غفلت و شرارت تو ہلاکت کھینچ کھینچ کر بلاتی ہے ۔ اللہ اگر نگرانی نہ کرے تو کوئی حفاظت نہیں کر سکتا ۔

آیت لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سے اس بات کی مجمل دلیل بیان کرنی مقصود ہے کہ استحقاق الوہیت اسی کو ہو سکتا ہے جس میں ذاتی طور پر کمل طاقت موجود ہو اور وہ اپنے پرستاروں کی تکلیف دفع کر سکے ۔ جو خود عاجز و بے کس ہو اس کو معبود ہونے کا کوئی حق نہیں ہے ۔ اس سے در پردہ یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ کوئی مخلوق قابل عبادت نہیں ۔ کیونکہ مخلوق ہونا ہی بے کسی اور محتاج ہونے کا ثبوت ہے ۔ اس سے متنبہ ہونا چاہئیے ان بے وقوف جاہل مسلمانوں اور عام نما ناواقف پیروں کو جو اولیاء ، علماء ، مشائخ اور شیطانوں کی قبروں کے پرستار ہیں اور ان کی روحوں کو اپنا کارساز جانتے ہیں ۔ بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ سے یہ بات ظاہر کرنی مقصود ہے انسان کی فراخ دستی ، خوش حالی اور نعمت پروری اس کو مغرور اور بر خود غلط کر دیتی ہے ، وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ تمام راحت و عیش کا سامان میری سعی و محنت کا نتیجہ ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے ، لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے ۔ ایک غیبی طاقت سے تمام تمناؤں کی تعمیر گر کر پاش پاش ہو جاتی ہے اور ساری امیدیں خاک میں مل جاتی ہیں ۔

نَنْقُصُهَا الخ سے یہ امر ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اسلام کی اشاعت تدریجی ہوتی ہے ، مگر غلبہ اہل اسلام ہی کو ہوتا ہے وغیرہ ۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ؕ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ

قیامت کے دن　ہم انصاف کی　ترازوئیں　رکھیں گے پھر کسی شخص کی کچھ بھی حق تلفی نہ کی جائے گی　اگر رائی کے دانہ برابر بھی عمل ہوگا

حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ۝ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ

ہم اس　کو لاکر موجود　کر دیں گے　اور ہم حساب کرنے والے　کافی ہیں　ہم نے موسیٰ و ہارون کو فیصلہ کرنے والی

الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكْرًا لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَهُمْ

کتاب اور ان پرہیزگاروں کو روشنی و نصیحت　دی تھی　جو اپنے رب سے　غائبانہ ڈرتے ہیں　اور قیامت

مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُوْنَ ○ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۰﴾

کا خوف کرتے ہیں اور یہ قرآن بھی بابرکت نصیحت ہے جس کو ہم نے اتارا ہے تو کیا پھر بھی تم لوگ اس کے منکر ہو

تفسیر اوپر کی آیت میں بیان کیا گیا تھا کہ دنیا میں تو مغرور کافر کلمہ حق نہیں سنتے، بہرے پٹ ہو رہے ہیں، لیکن اگر اللہ کے عذاب کی جا بھی ان کو لگ جائے تو سب بہرہ پن جاتا رہے، اپنے ظلم و ستم کا اقرار کرنے لگیں اور موت کے طالب ہو جائیں۔ اب بتانا چاہتے ہیں کہ اس کے بعد قیامت کے دن حقیقی عدل و انصاف ضرور ہوگا۔ کسی کی ذرہ برابر حق تلفی نہیں کی جائے گی۔ رائی کے دانے کی برابر اگر کسی کی نیکی یا بدی ہوگی تو سامنے لائی جائے گی، لیکن کروڑہا کروڑ مخلوق کے ذرے ذرے کا حساب لینے والا کون ہوگا؟ تو ظاہر ہے کہ ایسا محاسب کوئی آج تک پیدا ہوا نہ کسی کی طاقت ہے کہ ایسا حساب لے سکے۔ ایسا محاسب محض خدا تعالیٰ ہے وہی کل حساب لے گا۔ یہ بھی واضح رہے کہ حساب لینے کی ضرورت صرف عدل و انصاف کرنے کے لئے ہے۔ اعمال کی وزن کشی محض صحیح سزا سزا کے لئے ہوگی۔

اس سے آگے انبیاء کے قصوں کا بیان ہے۔ اس سورت میں چودہ پیغمبروں کے واقعات ذکر فرمائے ہیں:۔ موسیٰ و ھارون، ابراہیم، لوط، نوح، داؤد و سلیمان، ایوب، اسمٰعیل، ادریس و ذاالکفل، یونس، ذکریا، عیسیٰ۔ مختلف انبیاء کا تذکرہ کرنے سے دو باتوں کا بیان کرنا مقصود ہے۔ ایک تو یہ کہ حضور اقدسؐ کی تسلی ہو جائے۔ کفار حضورؐ کو تکلیفیں دیتے اور معاندانہ مخالفتیں کرتے تھے، سرکار دو عالمؐ پکڑ پکڑ کر ان کو دوزخ سے کھینچتے تھے، مگر وہ پتنگوں کی طرح آگ میں گرے جاتے تھے۔ اس سے حضور والا کو روحانی تکلیف پہنچتی تھی۔ پھر جسمانی مصائب پہنچانے سے بھی کفار حتی الامکان دریغ نہ کرتے تھے۔ پیغمبروں کا تذکرہ کر کے اس بات کی صراحت فرما دی کہ کفار کی معاندت و مخالفت صرف آپ ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ ہر زمانے کے کافر ایسا ہی کرتے چلے آئے ہیں۔ ہر پیغمبر کو تکلیفیں دی گئی ہیں لیکن انھوں نے صبر کیا۔ بالآخر ان کو فتح ہوئی اور کفار مغلوب ہوئے۔

دوسری بات مخالفین اسلام کے سامنے پیش کرنے کی یہ ہے کہ انبیاء کا مبعوث ہونا اور آسمانی کتابوں کا نازل ہونا اور حق و باطل کا فیصلہ کرنے کیلئے پیام الٰہی کا آنا اور صداقت کے نور کو پھیلانے کے لئے اللہ کے نیک بندوں کا پند و موعظت کرنا فقط تمہارے ہی لئے مخصوص نہیں۔ محمدؐ کوئی نئے نبی نہیں نہ قرآن کوئی اچنبے کی کتاب ہے۔ بلکہ موسیٰ، ہارون، ابراہیم بڑے بڑے انبیاء پہلے بھیجے جا چکے ہیں۔ کتابیں نازل ہو چکی ہیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم قرآن کا انکار کرو اور اللہ کے بھیجے ہوئے پیغام رسانوں کو نہ مانو۔

تحلیلِ اجزاء وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ اس جگہ چند مباحث قابل توضیح ہیں (۱) وزن کشی کس طرح ہوگی (۲) میزان ایک ہے یا متعدد (۳) کیا چیز تولی جائے گی؟ (۴) کیا کافروں کے اعمال کا بھی وزن کیا جائے گا یا صرف اہل ایمان کے اعمال تولے جائیں گے؟ ہم ہر مبحث کی قدرے تفصیل کرتے ہیں۔

(۱) اکثر سلف و خلف نے صراحت کی ہے کہ بلاغت و اصول تفسیر کا قاعدہ ہے کہ جب تک لفظ کے حقیقی معنی مراد لینا ممکن ہو مجاز کی طرف رجوع نہیں کیا جاتا، اس لئے قیامت کے دن وزن کشی کی جو ترازو ہوگی وہ واقعی ترازو ہوگی اس پر اعمال کا وزن ہوگا۔ ہاں وہ میزان عدل دنیا کی ترازوؤں کی طرح نہ ہوگی بلکہ اعمال تولنے کے مناسب ہوگی۔ اعمال (جو کہ اعراض ہیں) کو بصورت جواہر لا کر تولا جائے یا کوئی طریقہ وزن کشی اختیار کیا جائے بہرحال وزن ضرور ہوگا۔ اگرچہ کیفیت مجہول ہے۔ بات یہ ہے کہ کسی چیز کو ناممکن جاننے کے صرف دو ہی طریقے ہیں ایک تو یہ کہ اس چیز کا وجود مشاہدہ کے خلاف ہو۔ یعنی کسی نے کبھی دیکھا نہ ہو۔ انسان کی آنکھیں اس کو دیکھنے کی عادی نہ ہوں۔ اس چیز کا وجود محسوس دنیا سے پرے ہو۔ آدمی کے ظاہری اور باطنی حواس وہاں تک نہ پہنچ سکتے ہوں۔ مثلاً اللہ کی ہستی۔ اس کی ذات و صفات کا وجود، ملائکہ اور غیبی مخلوق، قیامت، حشر نشر، جنت دوزخ اور ان کی تمام کیفیات۔ دوسری ناممکن چیز وہ ہے جس کے وجود کو عقل تسلیم نہ کرے کسی دانشمند کی طبع سلیم اس کو ماننے کے لئے تیار نہ ہو اور اس چیز کا وجود مان لیا جائے تو طرح طرح کی ناممکن خرابیاں لازم آتی ہوں۔ مثلاً شریک الٰہی کا وجود، اللہ کا عجز و نقصان، انبیاء کا تہمت تراشی اور دروغ باف ہونا۔ اول الذکر ناممکن درحقیقت ناممکن نہیں ہے بلکہ مشاہدہ یا حس سے خارج ہے۔ الٰہیات کے مباحث کی بنا ہی خارج از مشاہدہ پر ہے۔ اعمال کی وزن کشی بھی انہیں

غیر محسوس مباحث میں سے ہے۔ مگر اس سے کسی طرح کا عقلی استحالہ لازم نہیں آتا۔ دانشمند طبقہ اصلی واقعہ پر ایمان رکھتا ہے۔ مفصل کیفیت کو نہ جاننا عقیدہ کو کمزور نہیں کر سکتا۔ شریعت میں جو الفاظ آئے ہیں وہ باوجود مجہول الکیفیت ہونے کے اپنے حقیقی معانی پر محمول ہیں۔ قیامت کے تمام مباحث اسی قسم کے ہیں۔ البتہ مؤخر الذکر استحالہ حقیقتاً استحالہ ہے۔ کوئی عقلمند اُس چیز کے وجود کو ہرگز نہیں مان سکتا جس کو ماننے سے عقل سلیم انکار کرتی ہو۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ میزان کے حقیقی معنی ہی مراد ہیں، مگر کیفیت مجہول ہے۔ اگرچہ بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ میزان عدل کے دو پلڑے ہوں گے اور ہر پلڑہ اتنا وسیع ہوگا جیسے مشرق سے مغرب کی مسافت، مگر یہ تمام کیفیات مجہول ہیں۔ الفاظ سے مکمل کیفیت سمجھ میں نہیں آتی۔ مجاہد، ضحاک اور قتادہ کا قول ہے کہ کلام بطور تشبیہ کے ہے یہ مراد نہیں کہ حقیقت میں ترازو عمل تولنے کو کھڑی ہوگی بلکہ مراد یہ ہے کہ حساب انصاف کے ساتھ لیا جائے گا۔ جس طرح دنیا میں محسوسات کا صحیح اندازہ ترازو اور پیمانہ سے ہوتا ہے اسی طرح قیامت میں بھی نیکی بدی اور گناہ و معصیت کا توازن یعنی تقابل کیا جائے گا۔ ایک روایت میں ابن عباس کا بھی یہی قول ہے۔ صاحب بیضاوی کے قول سے بھی اسی مطلب کی ترجیح مترشح ہوتی ہے، مگر خطیب نے اس کو غلط کہا ہے۔

(۲) شیخ ابن کثیر نے ذکر کیا ہے کہ میزان ایک ہی ہے۔ تمام امتوں کے اعمال کی جانچ ایک ہی میزان سے ہوگی۔ عقل بھی اس کی مقتضی ہے کہ تمام دنیا کی خیر و شر کے جانچنے کا ایک ہی ضابطہ، ایک ہی آلہ اور ایک ہی قاعدہ ہونا چاہیئے۔ رہا لفظ مَوَازِيْن بصورت جمع استعمال کرنا تو یہ اعمال موزونہ کی کثرت و تعدد کے لحاظ سے ہے۔ وزن ایک مرتبہ نہ ہوگا بلکہ چند مرتبہ ہوگا کیونکہ جن کے اعمال کا وزن کیا جائے گا ان کی تعداد کثیر ہوگی۔ ہر شخص کے اعمال کی جانچ جدا جدا ہوگی تو گویا ہر شخص کی میزان جدا ہوگی۔ خطیب نے اس کی صراحت کی ہے۔

(۳) اگر میزان کو حقیقی معنی پر محمول کیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وزن کس چیز کا ہوگا؟ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ اعمال نامے تولے جائیں گے۔ امام احمد نے اپنی مسند میں بروایت عبداللہ بن عمرو بن عاص بیان کیا ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا قیامت کے دن میری امت کا ایک آدمی سب لوگوں کے سامنے لا کر کھڑا کیا جائے گا اور اس کے سامنے ننانوے دستاویزیں کھولی جائیں گی۔ ہر دستاویز کی لمبائی حد نظر تک ہوگی۔ پھر استفسار کیا جائے گا کیا ان مندرجات میں تجھے کسی بات سے انکار ہے؟ کیا کراماً کاتبین نے تیری کچھ حق تلفی کی ہے؟ وہ شخص حیران ہو کر عرض کرے گا پروردگار کچھ نہیں۔ حکم ہوگا ہمارے پاس تیری ایک نیکی ہے پھر ایک ریشمی کپڑا نکالا جائے گا جس میں اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ (تحریر) ہوگا۔ اس کے بعد ارشاد ہوگا جاؤ اس کو میزان پہ لے جاؤ۔ وہ شخص عرض کرے گا پروردگار بھلا اس کپڑے کی ان دستاویزوں کے مقابلے میں کیا حقیقت ہے؟ ارشاد ہوگا تیری حق تلفی نہ ہوگی۔ چنانچہ تمام دستاویزیں ایک پلڑے میں اور کپڑا دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا اور نتیجہ میں دستاویزیں ہلکی اور کپڑا وزنی نکلے گا۔ حضورؐ نے فرمایا اللہ رحمٰن و رحیم کے نام کے مقابل کوئی چیز بھاری نہیں ہو سکتی۔ (رواہ الترمذی وابن ماجۃ وقال الترمذی حسن غریب) اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ صحائف اعمال کا وزن ہوگا۔

بعض احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعمال کا وزن ہوگا۔ صحیحین کی ایک حدیث میں آیا ہے دو لفظ ہیں جو زبان پر ہلکے معلوم ہوتے ہیں، مگر وزن میں بھاری اور اللہ کو محبوب ہیں۔ وہ دو لفظ ہیں۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ اور سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ۔

بعض احادیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ خود صاحب عمل کا وزن ہوگا۔ چنانچہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ میزان میں عبداللہ بن مسعودؓ کو احد سے بھی بھاری ہوگا۔ میرے نزدیک حق یہ ہے کہ وزن کشی سے مراد ہے صرف جانچ پڑتال اور نیکی بدی کا مقابلہ خواہ اس کی صورت کچھ ہی ہو، مگر سزا جزا دینے کے لئے اعمال کی جانچ ضرور ہے۔ اعراض کے لئے حقائق ثابت کئے جائیں جیسا کہ بیضاوی نے کہا ہے یا سپید و سیاہ جواہر کی شکل میں رکھا کیا جائے۔ بہر حال یہ محض قیاس آرائی اور خیال تراشی ہے۔ کیفیات قیامت کے ذیل میں عموماً الفاظ بطور استعارہ و تمثیل کے ذکر کئے جاتے ہیں، جن کے اصل حقائق پردۂ خفا میں ہیں، اس لئے بیضاوی کا بیان کردہ مطلب قابل ترجیح ہے۔

(۴) کافر ہو یا مومن ہر شخص کے اعمال کا وزن ہوگا۔ بعض آیات میں کفار کے متعلق صراحت ہے۔ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا تو اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کافروں کے اعمال کا وزن ہی نہ ہوگا بلکہ یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ کفار کے اعمال ہیچ اور ناقابل اعتبار ہوں گے ان کا کوئی وزن ہی نہ ہوگا۔ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ۔ ایک شبہ پیدا ہوتا تھا کہ ہر شخص کے اعمال غیر محدود ہیں پھر کروڑہا کروڑ انسانوں کا محاسبہ پیش ہوگا۔ کس کو معلوم ہوتا

کہ کس شخص کے کیا کیا اعمال ہیں؟ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا یہ کام ہمارا ہے ہم سب کا حساب لینے کے لئے کافی ہیں۔ ہمارے علمی احاطہ سے کسی کا کوئی عمل خارج نہیں ہو سکتا۔ اَلْفُرْقَانَ۔ مجاہد نے کہا فرقان سے مراد کتاب ہے۔ ابوصالح نے کہا وہ توریت مراد ہے جس میں حرام کو حلال اور باطل کو حق سے ممتاز کر دیا تھا۔ ابن زید نے کہا فرقان سے مراد ہے نصرت وغلبہ یعنی کتاب مراد نہیں ہے۔ ابن کثیر نے صراحت کی ہے کہ آسمانی کتاب میں حق وباطل کا تفرقہ گمراہی وضلالت اور حلال وحرام کی تفصیل دل میں نور پیدا کرنے والے احکام اور رقت وخوف پیدا کرنے والی پند ونصیحت ہوا کرتی ہے۔ توریت میں بھی یہ تمام اوصاف تھے، اس لئے اس کو فُرْقَان اور ضِيَاء اور ذِكْر فرمایا۔

يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ۔ غیب سے مراد یا تو باطن ہے یعنی وہ دکھانے کو خدا ترسی نہیں کرتے بلکہ باطن میں خدا سے ڈرتے ہیں یا دنیوی زندگی مراد ہے۔ جبکہ علامات عذاب واضح طور پر نمایاں نہ ہوئے ہوں اور نزع کا وقت نہ ہو یعنی وہ لوگ ایسے وقت میں خدا سے ڈرتے ہیں جبکہ اللہ کا اخروی عذاب وثواب ان کی نظر سے غائب ہوتا ہے۔ یا غیب سے مراد ہے دل۔ یعنی دل سے خدا ترسی کرتے ہیں۔

وَهَٰذَا ذِكْرٌ۔ یعنی جس طرح توریت کو ہدایت نامہ اور قانونِ عدل بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اسی طرح اس قرآن کو یادداشت اور ضابطۂ عمل بنا کر نازل کیا ہے، پھر کیا وجہ کہ قرآن کا انکار کیا جائے۔ بعثتِ انبیاء کی ضرورت ظاہر ہے اور قانونِ الٰہی کا نفاذ بھی لازم ہے پھر قرآن کا انکار کیا معنی رکھتا ہے۔ یہ بھی ایک ہدایت نامہ ہے اور ہدایت نامہ بھی وہ جس پر عمل کرنے سے دین ودنیا کی برکات حاصل ہوتی ہوں۔ دنیا میں عزت، حکومت، تسلط، خیر، فلاح اور راحت وعیش میسر ہوتا ہے اور آخرت میں سرخ روئی اور سعادت حاصل ہوتی ہے۔

مقصود بیان

قیامت کے دن اعمال کی جانچ پڑتال حق ہے۔ قیامت کے دن کسی کی حق تلفی نہ ہوگی۔ یعنی نہ کسی کی نیکی میں کمی کی جائے گی نہ بدی میں اضافہ کیا جائے گا۔ (ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کا قصور معاف کر دیا جائے۔ گنہگار کا قصور معاف کر دینا ظلم نہیں ہے)

توریت ایک قانون کی روشن کتاب اور عمل کی یادداشت تھی متقین کی خصوصیت کے ساتھ صراحت کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ کتابِ الٰہی سے فائدہ اٹھانے والے صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو ٹیڑھے راستے سے بچنا اور سیدھا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اَلَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ سے یہ بات ظاہر کرنی مقصود ہے کہ اللہ سے خوف کرنا اہلِ تقویٰ کی علامت ہے یعنی جو لوگ خدا ترس نہیں وہ اہلِ تقویٰ نہیں ہو سکتے۔ هُم مِّنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ جو لوگ بھروسہ کئے بیٹھے ہیں اور قیامت کا کوئی اندیشہ ان کو نہیں ہے وہ درحقیقت خدا سے ہی نہیں ڈرتے۔ اس سے ان کور باطن صوفیوں کو درس عبرت لینا چاہیئے جو محبت کے دعوے میں اتنے سرمست بنے ہوئے ہیں کہ قیامت کا خوف بھی ان کو نہیں رہا۔ بعض جہلاء شفاعت رسول اللہ پر اتنے پھولے بیٹھے ہیں کہ عذاب الٰہی کی اہمیت ان کی نظر سے بالکل جاتی رہی ہے۔ بعض خانقاہ نشینوں نے قانون رضا وتسلیم سے ایسا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا ہے کہ وہ دوزخ میں جلنے پر بھی تیار ہیں اور صحیح نصوص قرآنیہ کی پرواہ نہیں کرتے۔ بات یہ ہے کہ اللہ کے عذاب کا ان کو صحیح اندازہ ہی نہیں ہے ورنہ ان کو ایسی جاہلانہ جرأت نہ ہوتی وغیرہ۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِن قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ ۝ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا

اس سے پہلے ہم نے ابراہیم کو بھی اُن کی (مخصوص) ہدایت دی تھی اور ہم اُن کو جانتے تھے جبکہ اُنھوں نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے

هَٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ ۝ قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ۝

کہا تھا کہ یہ کیا مورتیاں ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو وہ بولے ہم نے اپنے باپ دادوں کو انہی کی پوجا کرتے پایا ہے

قَالَ لَقَدْ كُنتُمْ أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ قَالُوا أَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ أَمْ

ابراہیم نے کہا تم اور تمہارے باپ دادا کھلی ہوئی گمراہی میں ہیں وہ بولے کیا تم ہمارے پاس سچی بات لے کر آئے ہو

أَنتَ مِنَ اللّٰعِبِينَ ۝ قَالَ بَل رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ ۖ وَأَنَا

یا کھیل کر رہے ہو ابراہیم نے کہا نہیں تمہارا رب وہی آسمانوں کا اور زمین کا مالک ہے جس نے اُن کو پیدا کیا ہے اور میں

عَلٰى ذٰلِكُم مِّنَ الشّٰهِدِينَ ۝ وَتَاللّٰهِ لَأَكِيدَنَّ أَصْنَامَكُم بَعْدَ أَن تُوَلُّوا مُدْبِرِينَ ۝

اس پر گواہ ہوں اور خدا کی قسم تمہارے رُخ پھیر کر جانے کے بعد میں تمہارے بتوں کی ضرور گت بناؤں گا

فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا إِلَّا كَبِيرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ إِلَيْهِ يَرْجِعُونَ ۝ قَالُوا مَن فَعَلَ هٰذَا بِآلِهَتِنَا

پھر ابراہیم نے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا صرف بڑے بت کو چھوڑ دیا تاکہ وہ لوگ اس کی طرف رجوع کریں قوم والے بولے ہمارے معبودوں سے کس نے

إِنَّهُ لَمِنَ الظّٰلِمِينَ ۝ قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ إِبْرٰهِيمُ ۝ قَالُوا فَأْتُوا بِهِ

ایسی حرکت کی واقعی وہ شخص بڑا ظالم ہے (کچھ لوگ) کہنے لگے ہم نے ایک نوجوان کو ان کا تذکرہ کرتے سُنا ہے جسے ابراہیم کہا جاتا ہے (دوسرے) بولے تو اُس کو

عَلٰى أَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُونَ ۝ قَالُوا أَأَنتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِآلِهَتِنَا يٰإِبْرٰهِيمُ

آدمیوں کے روبرو لے آؤ تاکہ لوگ گواہی دیں (غرض ابراہیم کو بلا کر) کہنے لگے ابراہیم کیا تو نے ہمارے معبودوں سے یہ حرکت کی ہے؟

قَالَ بَلْ فَعَلَهُ ۖ كَبِيرُهُمْ هٰذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِن كَانُوا يَنطِقُونَ ۝ فَرَجَعُوا إِلٰى أَنفُسِهِمْ

ابراہیم نے کہا نہیں بلکہ اس بڑے نے کی ہے ان سے خود ہی پوچھ دیکھو اگر یہ بول سکتے ہوں اس پر وہ لوگ اپنے جی میں سوچے

فَقَالُوا إِنَّكُمْ أَنتُمُ الظّٰلِمُونَ ۝ ثُمَّ نُكِسُوا عَلٰى رُءُوسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰؤُلَاءِ

اور پھر (آپس میں) کہنے لگے تم لوگ واقعی تم لوگ ناحق پر ہو اس کے بعد سر جھکا لئے (اور بولے ابراہیم) تو تو جانتا ہے کہ یہ بول

يَنطِقُونَ ۝ قَالَ أَفَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَنفَعُكُمْ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّكُمْ

نہیں سکتے ابراہیم نے کہا تو کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی پوجا کرتے ہو جو نہ تم کو نفع پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان

أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

تُف ہے تم پر اور اُن معبودوں پر جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے

تفسیر یہاں حضرت آدمؑ کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ حضرت کی وجاہت، شخصیت، ہدایت، اور امامت کا عرب کے بیشتر گروہوں کو اعتراف تھا یہودی اور عیسائی بُت پرست اور صابی سب ہی اپنے مذہب کو ابراہیمی مذہب کہتے۔ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کا واقعہ نقل کر کے یہ ظاہر کر دیا کہ ابراہیم چونکہ مشرک نہ تھے اور آپ کو شرک سے اس قدر تنفر تھا کہ اپنے اقارب یہاں تک کہ باپ سے بھی الگ ہو گئے تھے۔ آپ کے نزدیک غیر اللہ کی الوہیت وعبادت اس قدر عظیم الشان جرم تھا کہ باوجود سخت ترین جانی و مالی مصائب برداشت کرنے کے آپ نے شرک کی طرف میلان کیا تو ظاہر ہے کہ جو قوم میں

مشرک ہیں یا شرک آمیز توحید کے قائل ہیں وہ دین ابراہیمی پر نہیں ہو سکتیں۔ ان کا ابراہیم سے کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا۔

حاصل ارشاد ظاہر ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے صغر سنی ہی میں ابراہیم کو راہ راست بتا دی تھی۔ ان کی قوم والے بت پرست تھے۔ حضرت ابراہیمؑ قوم کو جب مورتی پوجا کرتے ہوئے دیکھا تو اعتراض کیا اور بولے تم لوگ کیا مورتیوں کے پیچھے لگے ہوئے بیٹھے ہو؟ قوم والوں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ کہنے لگے ہمارے اسلاف یونہی کرتے چلے آئے ہیں، ہم بھی ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ ابراہیم نے کہا تمہارے اسلاف بالکل واضح گمراہی میں مبتلا تھے پھر ان کی پیروی کے کیا معنی؟ قوم والے بولے ابراہیم! کیا تم ہم سے دل لگی کر رہے ہو یا واقعی کوئی صداقت وحقانیت تمہارے پاس ہے؟ ابراہیم نے کہا میں تمہاری طرح کورانہ تقلید کرنے والا نہیں ہوں۔ میرے پاس اپنے قول کی دلیل موجود ہے۔ رب درحقیقت وہ ذات پاک ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو ایجاد کیا اور ان کو قائم کیا۔ پھر جب رب وہ ہے تو معبود بھی وہی ہے۔ یہ پتھروں کی مورتیاں رب نہیں۔ تم کس استحقاق سے ان کی پرستش کرتے ہو۔ مجھے ان سے سخت نفرت ہے۔ میں موقعہ پا کر ان کو توڑنے کی کوشش کروں گا۔ چنانچہ (ایک روز کسی تیوہار کے موقعہ پر جب سب قوم والے میلہ میں شریک ہونے کے لئے گئے تو) ابراہیم نے سب بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا صرف بڑے بت کو چھوڑ دیا۔ جب لوگ لوٹ کر آئے اور انہوں نے اپنے دیوتاؤں کی خستہ حالی دیکھی تو کہنے لگے ارے بڑا ظلم ہو گیا کس ظالم نے یہ بے جا حرکت کی۔ بعض لوگ کہنے لگے ایک جوان ہے جس کا نام ابراہیم ہے، ہم نے اس کی زبان سے بتوں کا تذکرہ سنا تھا غالباً یہ اسی کی حرکت ہے۔ نمرود اور اس کے اسٹاف نے حضرت ابراہیم کو طلب کیا تاکہ لوگ شہادت دیں اور جرم ثابت ہو نے پر سزا دی جائے۔ حضرت بھی یہی چاہتے تھے کہ مجمع عام میں کفار کو لاجواب کرنے اور بتوں کی کمزوری ظاہر کرنے کا موقع ملے۔ فوراً قاصدوں کے ساتھ ہو لئے۔ لوگوں نے پوچھا ابراہیم کیا تم نے ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ ابراہیم نے جواب دیا (میں نے نہیں) بلکہ بڑے بت نے یہ حرکت کی ہے۔ ان تمام مورتیوں سے پوچھ لو۔ اگر ان کو بولنا آتا ہوگا تو جواب دیں گی۔ اس وقت دانشمند طبقہ کو اپنی گمراہی کا احساس بھی کچھ کچھ ہوا۔ کہنے لگے واقعی ہم بڑی بیجا حرکت میں مبتلا ہیں۔ ایسی کمزور بے بس بے حس مورتیوں کی پوجا کرنی حقیقتاً حماقت ہے۔ اس کے بعد سب نے لاجواب ہو کر سر جھکا لئے، لیکن شیطان نے پھر اکسایا اور یہ خیال پیدا کیا کہ بتوں کا کام ہی بولنا نہیں ہے۔ اگر کوئی چیز ایسا کام نہ کر سکے جو اس کے ذاتی لوازم یا عوارض میں سے نہ ہو اس عجز سے اس شے میں کمزوری پیدا نہیں ہوتی (مثلاً اگر دیوار نہیں بول سکتی تو اس کے لئے عیب اور نقص نہیں ہے) چونکہ مورتیاں فطرةً بولنے سے قاصر ہیں، اس لئے نہ بول سکنے سے ان کی الوہیت میں کوئی نقص نہیں پیدا ہوتا۔ اس شیطانی شبہ کا دل میں آنا تھا کہ بول اٹھے ابراہیم! تم تو واقف ہی ہو کہ یہ مورتیاں ناطق نہیں ہیں۔ حضرت ابراہیم ان کی نافہمی اور کوتاہ بعیرتی کو سمجھ گئے۔ آپ نے وہ طریقہ گفتگو اختیار کیا جس سے کفار کا شبہ بھی زائل ہو گیا اور مقصد توحید کا ثبوت جدید طرز سے بھی ہو گیا۔ فرمایا کمبختو! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ جو چیز نفع نقصان نہیں پہنچا سکتی اس کی پرستش کرنے کے کیا معنی۔ آخر عبادت کی کوئی غرض بھی ہے، پرستش کا کوئی سبب بھی ہے۔ مورتیاں نہ ضرر نہ نفع کر سکتی ہیں نہ فائدہ پہنچا سکتی ہیں۔ پھر ایسی عاجز مخلوق کی پرستش کیا معنی رکھتی ہے۔ کفار لاجواب ہو گئے۔

تحلیل اجزاء

رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ۔ رشد سے مراد وہ ذہنی اور دماغی قوت ہے جو حق کو باطل سے اور صحیح کو غلط سے جدا کر دے۔ چونکہ حضرت ابراہیم کا کوئی ہادی نہ تھا، آپ کو کسی نے راہ راست نہ بتائی تھی، اس زمانہ میں سب سے پہلے موحد آپ ہی تھے، اسی لئے رشد کی نسبت آپ کی طرف کی۔ مِنْ قَبْلُ کے معنی کی تفسیر مختلف طور پر کی گئی ہے یا تو یہ مراد ہے کہ موسیٰ اور ہارون سے پہلے ہم نے ابراہیم کو ہادی کو بنایا تھا یا نزول قرآن اور بعثت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے قبل ہونا مراد ہے (بیضاوی) ابن کثیر نے لکھا ہے کہ قبل سے مراد ہے بلوغ و جوانی سے قبل۔ یعنی ہم نے زمانہ رشد سے پہلے ہی ابراہیم کو فہم و دانش کا ملکہ عطا فرما دیا تھا اور حق وحجت کا الہام ان کے دل کے اندر کر دیا تھا۔ ابن کثیر نے اس کے بعد لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم کا غار میں داخل ہونا وہاں انگوٹھوں سے دودھ پینا اور رات کو وہاں سے برآمد ہو کر کائنات کا مطالعہ کرنا یہ تمام کی تمام اسرائیلی کہانیاں ہیں۔ ان میں صحت بہت کم ہے۔ ان اسرائیلی بیانات کا جو حصہ قرآن کے خلاف ہے ہمارے لئے اس کی تغلیط واجب ہے اور جو موافق ہے اس کی تائید ضروری ہے اور جو محض زائد ہے نہ موافق نہ مخالف تو اس کی تصدیق و تکذیب کے ہم مکلف نہیں ہیں یعنی کسی قسم کے حکم کا اس سے استخراج نہیں ہو سکتا۔

وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ۔ یعنی ابراہیم کی استعداد و صلاحیت آئندہ زندگی کی روئیداد اور محاسن اخلاق کا جامع ہونا سب کچھ ہم کو معلوم تھا اس لئے قبل از بلوغ ہی ان کو راہ راست دکھا دی گئی اور خیر و شر میں امتیاز کرنے کی تعلیم دے دی گئی۔

لِاَبِیْهِ ۔ بعض کے نزدیک اس سے آزر مراد ہے ۔ بعض اہلِ تفسیر کا خیال ہے کہ آزر چچا تھا اور باپ کا نام تارخ تھا ۔ یہاں چچا ہی مراد ہے ۔ بعض اہلِ تاریخ کا قول ہے کہ آزر ہی کا لقب تارخ تھا ۔

فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۔ بیضاوی اور خطیب نے اس طرح مطلب بیان کیا ہے کہ تم ایسی واضح گمراہی میں مبتلا ہو جس کا بطلان کسی ہوش مند سے مخفی نہیں ہے ۔ تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں اور نہ تمہارے آباؤ اجداد کے پاس کوئی دلیل تھی ، محض کورانہ مقلد اور اندھی تقلید کسی طرح جائز نہیں ۔ حاشیہ بیضاوی میں ہے کہ آیت میں تقلید سے مراد اصولی تقلید ہے ۔

مبحث تقلید کی تحقیق

تقلید دو طرح کی ہوتی ہے اصول میں اور فروع میں مثلاً کوئی شخص اگر کہے کہ خدا ایک ہے ، اس لئے کہ عمرو خدا کو ایک کہتا ہے ۔ جنت حق ہے ، اس لئے کہ بکر اس کو حق جانتا ہے ۔ محمد اللہ کے رسول ہیں اس لئے کہ امام ابو حنیفہ نے ایسا ہی کہا ہے تو یہ تقلید فی الاصول ہے اور اگر کوئی شخص کہے کہ جنت پیدا ہو چکی ہے ، اس لئے کہ اشاعرہ کا یہی قول ہے تو یہ تقلید فی الفروع ہو گی ۔ اہلِ تحقیق کے نزدیک اصول میں تقلید جائز نہیں بلکہ قطعاً حرام ہے ۔ ہر مسلمان کے دل میں اصول کا یقین اور قطعی یقین ہونا چاہئے خواہ کوئی دوسرا مانے یا نہ مانے ۔ حشر نشر ، عذاب ثواب ، حساب کتاب ، جنت دوزخ ، ملائکہ ، انبیاء ، آسمانی کتابیں ، اللہ کی وحدانیت ، رسول پاک کی رسالت اور فرائض خمسہ کی فرضیت کا ناقابلِ شک جزم ہونا لازم ہے اور اس طرح لازم ہے کہ اگر دنیا کے تمام انسان اس اصول کو غلط کہیں تب بھی یقین میں تزلزل نہ پیدا ہو ۔ البتہ فروع میں تقلید جائز ہے بلکہ عوام کے لئے ضروری ہے ۔ کیونکہ عام اشخاص کو شرعی احکام کا صحیح علم نہیں ہو سکتا کسی عالم کی طرف رجوع کرنے کے بغیر شرعی مسائل کی واقفیت ناممکن ہے ۔

وَتَاللّٰهِ لَاَكِیْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ مجاہد وقتادہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے یہ الفاظ چپکے سے فرمائے تھے ۔ قوم والوں میں سے صرف ایک آدمی نے سن لیا تھا ، اسی نے بعد کو شہادت دی ۔ سدی نے صراحت کی ہے کہ قوم ابراہیم والے ہر سال ہمیشہ تیوہار کے موقعہ پر میلہ لگاتے تھے اور میلہ سے واپس آکر گھروں میں جانے سے پہلے بتوں کے حضور میں پہنچ کر سجدہ ریز ہوتے تھے ۔ چنانچہ ایک بار حسب معمول تیوہار آیا تو باپ نے حضرت ابراہیمؑ سے میلہ میں چلنے کے لئے کہا ۔ آپ باپ کے کہنے سے تھوڑی دور ساتھ چلے ، لیکن پھر راستے ہی سے حالت بگڑنے کا بہانہ کر کے لوٹ پڑے اور جب لوگ چلے گئے تو پیچھے سے آواز دی ۔ تَاللّٰهِ لَاَكِیْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ کچھ لوگ اس وقت پیچھے رہ گئے تھے انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کے الفاظ سن لئے پھر واپس جا کر بُت خانہ میں پہنچے وہاں قسم قسم کے کھانے بتوں کے سامنے رکھے دیکھے جو بُت پرست قوم نے چڑھائے تھے ۔ حضرت نے بطور استہزاء مورتیوں سے فرمایا اَلَا تَاْكُلُوْنَ جب انہوں نے کوئی جواب نہ دیا تو فرمایا ۔ مَالَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ اس کے بعد تبر لے کر سب مورتیوں کو ریزہ ریزہ کر دیا صرف بڑے بُت کو چھوڑ دیا ۔

ایک شبہ ۔ حضرت ابراہیمؑ نبی تھے ۔ کَیْد کے معنی مکر خفی کے ہیں ۔ ایک نبی اور وہ بھی ابراہیم ایسا نبی کس طرح مکار ہو سکتا ہے ۔

ازالہ کَیْد سے مراد یہاں تدبیر خفی اور کوشش کے ہیں ۔ خفیہ تدبیر اگرچہ کسی جائز معاملہ کے متعلق ہو چونکہ بظاہر کید کے مشابہ ہوتی ہے ، اس لئے اس کو بھی کید کہا جاتا ہے ۔ حضرت ابراہیم نے اپنے دل میں بتوں کو توڑنے کی خفیہ تدبیر اور نیت کر لی تھی اور موقعہ کے منتظر تھے اس لئے اسکو کید کہا ۔ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ ۔ حضرت ابراہیمؑ کا یہ کلام بطور طعن کے تھا کیونکہ کفار کے جواب میں آپ نے خود بُت توڑنے سے انکار نہیں کیا بلکہ بڑے بُت کی طرف بُت شکنی کو منسوب کر دیا اور ظاہر ہے کہ بڑے بُت نے وہ حرکت نہ کی تھی ، کوئی شخص اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا تھا ، اس لئے یہ امر بالکل واضح ہے کہ آپ کا مقصد صرف طعن وتنبیہ کے علاوہ اور کچھ نہ تھا ۔

ایک شبہ حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت ہے کہ ابراہیم نے کبھی کسی چیز کے متعلق جھوٹ نہیں بولا سوا تین باتوں کے اور وہ تین باتیں اللہ کے واسطے تھیں ۔ ایک تو اِنِّیْ سَقِیْمٌ کہا باوجودیکہ بیمار نہ تھے ۔ دوسرے سارہ کو بہن قرار دیا ۔ تیسرے بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ کہا ۔ رواہ ابوداؤد والترمذی وابن المنذر وابن ابی حاتم وغیرہم) اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے تین مرتبہ جھوٹ بولا حالانکہ جھوٹ گناہ کبیرہ ہے اور انبیاء معصوم ہوتے ہیں ان سے گناہ کبیرہ سرزد نہیں ہو سکتا پھر حضرت ابراہیم کے جھوٹ کے کیا معنی ؟

ازالہ حضرت ابراہیمؑ کا قول دروغ نہ تھا بلکہ تعریضاً تھا ۔ صورۃً دروغ نظر آتا تھا ۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں یہی توضیح کی ہے ۔ تعریض دو

طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو وہ جس سے کسی جائز حق دار کی حق تلفی مقصود ہو۔ ایسی تعریض شرعاً ناجائز ہے۔ مثلاً کسی مدعی کے دعوے کو باطل .... کرنے کے لئے کوئی شخص قسم کھائے اور نیت اس کے خلاف ہو تو ایسی قسم میں تعریض ناجائز ہے۔ الفاظ قسم کے وہی معنی لئے جائیں گے جو مدعی کی نیت ہوگی اور جس پر وہ قسم لینا چاہتا ہوگا۔ دوسری تعریض وہ ہے جس سے کسی کے حق کو زائل کرنا مقصود نہیں ہوتا نہ کسی شخص کا مالی اور روحانی نقصان پیش نظر ہوتا ہے۔ صرف اپنی جان و مال کا بچاؤ، آبرو کی حفاظت یا حکم الٰہی کا احترام مد نظر ہوتا ہے۔ اسی قسم کی تعریض جائز بلکہ ضروری ہے۔ حضرت ابراہیم نے دو مرتبہ جو خلافِ واقعہ الفاظ فرمائے ایک مرتبہ اپنے آپ کو بیمار ظاہر کیا۔ دوسری مرتبہ بت شکنی کو بڑے بت کی طرف منسوب کیا۔ یہ تعریضی الفاظ تھے۔ الفاظ کا ظاہری مطلب مراد نہ تھا۔ بلکہ اپنے آپ کو سقیم کہنے سے تو یہ مراد تھی کہ میری حالت بگڑی ہوئی ہے اور واقع میں اس وقت آپ کا مزاج اعتدال پر نہ تھا، لیکن کفار اس سے بیمار ہونا سمجھ گئے۔ دوسری بار آپ نے بت کو بت شکن قرار دیا۔ یہ کلام بطور استہزاء تھا اور کفار کو ان کی حماقت پر تنبیہ کرنے کے لئے تھا، مگر کفار اس کو بھی واقعی خبر سمجھ گئے۔ بہر حال دونوں مرتبہ خلافِ واقعہ کلام کہنا محض اعلاء کلمۃ اللہ، تبلیغ توحید اور احترام امر الٰہی کیلئے تھا۔ تیسری مرتبہ اپنی آبرو اور جان بچانے کے لئے بادشاہ مصر کے سامنے آپ نے اپنی بیوی سارہ کو بہن کہہ دیا۔ ظالم بادشاہ واقعی نسبی بہن سمجھ گیا، مگر آپ کا مقصد دینی بہن ہونے کا ظاہر کرنا تھا۔ اس کی تائید اس قول سے ہوتی ہے جو حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم نے سارہ سے جاتے وقت کہا تھا کہ تو اس کے پاس پہنچ کر میری تکذیب نہ کرنا کیونکہ تو اللہ کی کتاب میں میری بہن ہے۔ اس سرزمین پر سوا میرے اور تیرے اور کوئی مسلمان نہیں ہے۔

چونکہ تینوں کلام صورۃً دروغ کے مشابہ تھے اور نبی کے لئے مشابہت دروغ بھی موجب استغفار ہے، اس لئے آپ نے اپنے کلام سے استغفار کی۔

مقصود بیان

خدا تعالیٰ ہر شخص کے تمام جزئی احوال کو پہلے سے جانتا ہے۔ ہر شخص کی استعداد اس کو معلوم ہے، اس لئے وہ اگر کسی کام کیلئے کسی کا انتخاب کرتا ہے تو وہ انتخاب کرتا ہے تو وہ انتخاب صحیح ہوتا ہے۔ اعلانِ حق اور اظہارِ صداقت میں عزیز قریب یہاں تک کہ ماں باپ کی رعایت و پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔ نہ کبھی طاغوتی جابرہ طاقت کا خوف رسم و رواج اور سوسائٹی کی بندش، اپنی جان و مال اور آبرو کے تحفظ کا خیال اعلانِ صداقت سے مانع ہو، جس طرح حضرت ابراہیم نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ الوہیت کا استحقاق اسی کو ہو سکتا ہے جو رب ہو، نفع نقصان پہنچا سکتا ہو بلکہ پہنچاتا ہو۔ بے کس، بے حس عاجز مخلوق کسی طرح قابلِ پرستش نہیں، کورانہ تقلید حرام ہے۔ عقائد کی بنا تحقیق پر ہونی چاہیئے۔ انسان کی عقل و بصیرت اس کے لئے ہادی ہے۔ اپنی جان، آبرو اور مال کے بچاؤ یا حق و صداقت کی حفاظت کے لئے بطور تعریض مبہم کلام بولنا جائز ہے؟ بظاہر دروغ ہو، مگر قائل کی نیت کے مطابق صحیح ہو وغیرہ۔

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِن كُنتُمْ فَاعِلِينَ ۝ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا

کہنے لگے اس کو جلاؤ اور اپنے معبودوں کی مدد کرو اگر تم کو کچھ کرنا ہے ہم نے حکم دیا کہ آگ تو ابراہیم کے لئے ٹھنڈک اور

عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ ۝ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ ۝ وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا

سلامتی بن جا لوگوں نے ابراہیم سے فریب کرنا چاہا مگر ہم نے انہی کو زیاں کار بنا دیا اور ابراہیم کو بچا لیا اور لوط کو بھی بچا لیا اور

الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ ۝ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً ۖ وَكُلًّا

اس زمین کو بھیجا جہاں ہم نے دنیا جہان والوں کے لئے برکت رکھی ہے اور ابراہیم کو ہم نے اسحٰق عنایت کیا اور یعقوب مزید (بخشا) اور سب

جَعَلْنَا صَالِحِينَ ۝ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ

ہم نے نیک بنایا اور پیشوا بنایا کہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور بذریعہ وحی ہم نے ان کو نیک کام کر

وَأَقَامَ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۙ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ

اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم دیا اور یہ (سب) ہماری عبادت میں لگے رہتے تھے اور لوط کو ہم نے حکمت د

عِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ

علم عطا کیا اور اس بستی سے نجات دی جو ناپاک کام کیا کرتی تھی واقعی وہ لوگ برے کام

فٰسِقِيْنَ ۙ وَاَدْخَلْنٰهُ فِيْ رَحْمَتِنَا ۭ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

کیا کرتے تھے ہم نے لوط کو اپنی رحمت میں لے لیا کیونکہ واقعی وہ نیکوں میں سے تھے

تفسیر جب سوال جواب کا سلسلہ ختم ہوگیا اور شہادت دینے والے نے شہادت دی کہ یہ وہی شخص ہے جو بتوں کو برا کہتا تھا اور ان کو توڑنے کی فکر میں تھا تو آپس میں مشورہ کیا کہ اس کو سزا دینی چاہیے۔ مشورہ کے بعد طے پایا کہ آگ میں جلا دو۔ چنانچہ لکڑیاں جمع کرنی شروع کیں۔ بقول خطیب کوثیٰ نام گاؤں کے پاس سب کا اسٹاک کیا چونکہ ہر شخص کے دل میں انتقام کی آگ مشتعل تھی، اس لئے بغیر اجرت کے ہزاروں من لکڑیوں کا انبار جمع ہوگیا۔ چنانچہ (خطیب کے قول کے موافق) یہاں تک نوبت پہنچی تھی کہ جو شخص مرنے کے قریب ہوتا وہ انبار میں لکڑیاں ڈالنے کی وصیت کر جاتا۔ بوڑھی عورتیں سوت کات کر اس کی قیمت سے لکڑیاں خرید کر ڈھیر میں لا کر ڈال دیتیں۔ بیمار نذر مانتے کہ اگر ہم شفایاب و تندرست ہو جائیں گے تو اتنی لکڑیاں انبار میں ڈالیں گے۔ غرض لکڑیوں کا ڈھیر ہوگیا اور آگ لگا دی گئی۔ سات روز تک آگ جلتی رہی۔ اب ابراہیم کو ڈالنے کا وقت آیا تو آگ کے قریب جانے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ سوچنے لگے کہ کس تدبیر سے ابراہیم کو آگ میں ڈالا جائے۔ کردستان کا رہنے والا ایک شخص تھا جس کا نام بقول بیضاوی ہینون اور بقول شعیب جبائی ہیزن تھا۔ اس نے گوپھن بنانا اور اس میں بٹھا کر چرخ دے کر ابراہیم کو پھینکنا بتایا۔ چنانچہ گوپھن میں بٹھا کر آپ کو آگ میں ڈال دیا گیا۔ ابن کثیر نے ذکر کیا ہے کہ آگ میں پھینکے جانے کے وقت حضرت ابراہیم نے فرمایا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع روایت ہے کہ جب ابراہیم آگ میں ڈالے گئے تو فرمایا اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ فِي السَّمَآءِ وَاحِدٌ وَّاَنَا فِي الْاَرْضِ وَاحِدٌ اَعْبُدُكَ یعنی الٰہی تو آسمان میں ایک ہے اور میں زمین میں تنہا تیری عبادت کرتا ہوں (رواہ ابو العلیٰ فی مسندہ) الغرض ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا گیا، مگر آپ کے بال بھر بھی آنچ نہ آئی۔ آگ کو غیبی حکم ملا کہ خبردار ابراہیم کو تکلیف نہ ہو (حرارت کی بجائے) خنکی ہو جائے۔ مدت کے بعد جب آگ فرو ہوئی اور کوئلے الگ کئے گئے تو حضرت ابراہیم وہاں سے صحیح سلامت برآمد ہوئے اور کفار نے حق کو مغلوب اور صداقت و حقانیت کو مٹانے کے لئے جو تدبیر کی تھی وہ انہی پر لوٹ پڑی۔ حق نمایاں ہوگیا، صداقت کی برہان قطعی واضح ہوگئی اور قوم نمرود میں ہلچل پڑ گئی اور بہت سے کفار کو بھی یقین آگیا کہ ابراہیم حق پر ہے اور ہمارا مذہب باطل ہے۔ نمرود بھی خوف زدہ ہوگیا۔ پھر اس نے ابراہیمؑ سے کوئی تعرض نہ کیا البتہ مناظرات مذاکرات کا سلسلہ جاری تھا۔ ابراہیمؑ کی تمام آزمائشیں ختم ہوگئی تھیں۔ پرجبروت بادشاہ کے مقابلہ میں اظہار حق اور اس کی پاداش میں قید و بند اور سزائے حرق بھی مل چکی تھی، اعزا و اقارب سے بھی قطع تعلق ہو چکا تھا، اپنے اور بیگانے سے طعن و تشنیع بھی سن چکے تھے صرف ترک وطن کا امتحان باقی تھا۔ چنانچہ اس کا بھی وقت آگیا۔ اہل ایمان کو ساتھ لے کر کوثیٰ (عراق میں ایک گاؤں کا نام تھا جو حضرت ابراہیم کا جنم بھوم اور مسقط الراس اور پرورش گاہ تھا۔ ابن اثیر) کو چھوڑ کر ملک شام کو جانے کا حکم ملا۔ ابراہیم کے دو بھائی تھے۔ ایک کا نام ہاران دوسرے کا نام ناحور تھا۔ ہاران کا بیٹا لوط تھا جو حضرت ابراہیم کی نبوت و صداقت پر ایمان لے آیا تھا اور بالآخر خدا تعالیٰ نے اس کو نبوت سے بھی سرفراز کیا تھا۔ ابراہیم کے ایک چچا کا نام بھی ہاران تھا، اس کی بیٹی کا نام سارہ تھا جو ایمان لے آئی تھی اور حضرت ابراہیم نے اس سے نکاح کر لیا تھا۔ ہجرت کا حکم ہوا تو آپ اپنی بیوی سارہ اور بھتیجے لوط کو ساتھ لے کر چل دیئے۔ حضرت ابراہیم نے راستہ میں ہی لوط کو بحیرۂ مردار کے پاس رہنے کا حکم دیا۔ لوط نے سدوم اور عامورہ کی بستیوں میں تبلیغ کی۔ چونکہ لوط کی قوم امرد پرست تھی، اس لئے اس پر عذاب نازل ہوا اور

لوط مع ہمراہیوں کے بچالئے گئے ۔ ملک شام میں پہنچ کر حضرت ابراہیم کے بیٹے اسحاق پیدا ہوئے اور پھر اسحاق کے بیٹے یعقوب ہوئے اور ان
خوب پھلی پھولی ۔ بڑے بڑے انبیاء، صلحاء اور اولیاء پیدا ہوئے اور سب عالم باعمل، نمازی، پرہیزگار اور ہدایت شعار مرشد ہوئے

تحلیلِ اجزاء

یٰنَارُ کُوۡنِیۡ بَرۡدًا ۔ اکثر مفسرین کا قول ہے کہ جس آگ میں حضرت ابراہیم کو ڈالا تھا اسی آگ کو سرد ہونے کا حکم
وہی آگ سرد پڑ گئی تھی، لیکن ابن عباس کے ایک قول سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام دنیا کی آگ کچھ دیر کے لئے سرد پڑ گئی تھی
جبائی نے لکھا ہے کہ اس وقت ابراہیم کی عمر سولہ سال کی تھی۔

وَّسَلٰمًا عَلٰۤی اِبۡرٰهِیۡمَ ۔ حضرت علی نے اس کی تفسیر میں فرمایا یعنی ابراہیم کو کوئی تکلیف نہ ہو ۔ ابن عباس اور ابوالعالیہ کا قول ہے کہ اگر
سَلٰمًا نہ فرماتا تو آگ اتنی سرد ہو جاتی کہ ابراہیم کو اذیت پہنچنے لگتی ۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ اس وقت حضرت ابراہیم کے ساتھ بعض

وَنَجَّیۡنٰهُ وَلُوۡطًا ۔ حضرت ابراہیم بابل (از مضافات عراق) سے ملک شام کو چل دئے ۔ پہلے مقام حران میں پہنچے، یہاں کچھ مدت قیام فر
حران سے مصر کو گئے ، وہاں حضرت سارہ کا مشہور قصہ پیش آیا ، پھر مصر سے فلسطین میں آئے اور مقام سبع میں قیام کیا ۔ یہاں حضرت لو
سے سرفراز کئے گئے اور مقام سدوم و امور وغیرہ کی بستیاں جن کو مؤتفکہ کہا گیا ہے آپ کا میدان تبلیغ [illegible]

اِلَی الۡاَرۡضِ الَّتِیۡ بٰرَکۡنَا فِیۡهَا ۔ اکثر مفسرین کا قول ہے کہ ارض مبارکہ سے مراد ملک شام ہے [illegible] نے لکھا ہے کہ ملک شام
دار الہجرۃ کہتے تھے ۔ یہ بھی مشہور ہے کہ شام ہی سرزمین حشر ہے وہیں عیسیٰ کا نزول ہوگا اور وہیں دجال ہلاک [illegible] نے لکھا ہے کہ شام
طرح کی برکات ہیں ۔ سرسبزی، شادابی، پھل پھول کی کثرت اور کثیر انبیاء کی بعثت یہ سب کی سب موجب برکات ہیں ۔ قتادہ کی روایت ہے
بار حضرت عمرؓ نے کعب احبار سے فرمایا تم شام کی سکونت ترک کر کے مدینہ منورہ کیوں نہیں چلتے ۔ کعب احبار نے جواب دیا میں نے کتاب
ہے کہ شام اللہ کی زمین کا خزانہ ہے، اس میں اللہ کے بندوں کا مخزن ہے ۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص کی روایت ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا ہجرت کے بعد ہجرت ہوگی ۔ نیک بندوں کا مقام ہجرت وہ ہوگا جو ابراہیم
ہجرت تھا ۔ ضحاک کی حدیث میں آیا ہے ۔ طُوۡبٰی لِلشَّامِ ۔

ابن عباس کا ایک قول ہے کہ ارض مبارکہ سے سرزمین مکہ کی مراد ہے ۔ دونوں قولوں میں توافق اس طرح ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے
شام سے لے کر مکہ تک سارا ملک تھا ۔ آپ آکر فلسطین میں مقیم ہوئے اور یہاں سے کچھ اولاد کو شام کی آبادیوں کی طرف بھیجا اور حضرت اسماعیل
والدہ سمیت مکہ میں بسایا ۔ اس طرح کل سرزمین بابرکت ہوگئی ۔

وَیَعۡقُوۡبَ نَافِلَةً ۔ یعنی حضرت اسحاق تو دعا کے بعد عطا کئے گئے اور یعقوب بغیر مانگے ملے ۔ توریت کے سفر پیدائش میں بھی اس کی
ہے ۔ ابن عباس اور قتادہ وغیرہ کا قول ہے ۔ نافلۃ سے مراد ہے پوتا ۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے ابراہیم کو بیٹا اور پوتا عطا کیا ۔

وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡهِمۡ فِعۡلَ الۡخَیۡرٰتِ ۔ خیرات سے مراد ہیں عام نیکیاں یعنی وہ احکام خیر جن کو کرنے کا حکم خدا تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا
نے کہا ۔ فِعۡلَ الۡخَیۡرٰتِ ۔ لفظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ جو علم و حکمت اور دانش و فہم ان کو عطا کیا گیا تھا انہوں نے اس کے مطابق عمل بھی کیا
کی تعمیل کو نہیں چھوڑا ۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ خیرات سے صرف شرائع نبوت مراد ہیں ۔

وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ الخ ۔ عام نیکیوں کے تحت میں نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کا اندراج ہو گیا تھا، لیکن شخصی فرائض میں دو امر اصل الاصول
بدنی عبادت اور مالی حقوق کی ادائیگی ۔ ان دونوں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا کہ یہ دونوں تمام آسمانی شرائع کے مابہ الاشتراک
اصول ہیں ۔ ایک شریعت میں دوسری شریعت سے خاص خاص احکام اور جزئی مسائل میں اختلاف ضرور ہوتا ہے اور ہوا بھی ہے، مگر ان
اصول کی فرضیت تمام شرائع میں عام ہے ۔

وَکَانُوۡا لَنَا عٰبِدِیۡنَ ۔ نیکی کرنے کے دو سبب ہوتے ہیں :- اول تو اس لئے کہ شرعی مذہبی فرض کا ادا کرنا مقصود ہوتا ہے کہ
نیکیاں کرنے کا باعث ہوا ہے ۔ دوسرا سبب انسان کی اپنی طبعی رغبت یا مزاج کا میلان اور قلب کا رجحان ہوتا ہے ۔ آدمی غیر کی طرف

ہے کہ طبعاً شر سے اس کو نفرت ہوتی ہے، بدی کرنے کو اس کا دل ہی نہیں چاہتا۔ انبیاء اور خدا کے خاص خاص بندوں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ نیکی کو اختیاراً اس لئے بھی کرتے ہیں کہ اللہ ان کے کرنے کا حکم دیتا ہے اور اس لئے بھی کہ ان کو گناہ اور بدی سے طبعی نفرت ہوتی ہے۔ پہلی آیت میں صفت اوّل کا بیان تھا اور اس آیت میں صفت دوم کا اظہار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ اللہ کی طرف سے ان کو نیکیاں کرنے، نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا، اس لئے وہ ان فرائض کو ادا کرتے تھے اور ان کی طبیعت و سرشت بھی عبادت گزاری و اطاعت شعاری پر مائل کرتی تھی اس لئے بھی وہ نیکیوں کی طرف راغب تھے۔

حُكْمًا وَّعِلْمًا۔ حکم سے مراد نبوت ہے اور علم سے مراد فہم و دانش یا شریعتِ ابراہیمی کا علم۔ مطلب یہ کہ لوط بن ہاران کو نبوت بھی عطا کی گئی اور فہم و دانش یا شریعتِ ابراہیمی کا علم بھی ان کو دیا گیا تھا۔

تَعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ۔ خبائث کی تفسیر میں مندرجۂ ذیل فواحش کا ذکر کیا گیا ہے۔ قوم لوط امرد پرست تھی، کبوتر باز تھی، جانوروں کو لڑاتی تھی، راہ گیروں کو پتھر اور ڈھیلے مار کر پریشان کرتی تھی، غلّہ کے ناپ تول میں بے ایمانی کرتی تھی۔

قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ۔ یعنی قوم لوط میں دونوں طرح کی خرابیاں تھیں۔ سرشت اور طبیعت کے لحاظ سے بھی وہ برے تھے اور عادت و صحبت کے اعتبار سے بھی۔

اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ مطلب یہ ہے کہ لوط چونکہ نیکو کار فرقے میں داخل تھے، اصلاح پسند تھے، بدکاروں کے گروہ میں رکھنا اس کو مناسب نہ تھا، اس لئے تمام قوم کو تباہ کر کے ان کو بچا لیا۔

مقصود بیان کفار مذہبی دانش سے بہت زیادہ دور ہوتے ہیں۔ اپنے معبودوں کو محتاج مطلق اور عاجز سمجھتے ہوئے بھی دیوتا اور متعال مطلق مانتے ہیں۔ چنانچہ قوم نمرود حضرت ابراہیم کو آگ میں جلا کر اپنے معبودوں کی مدد کرنی چاہتی تھی یعنی مورتیں بے بس بے حس جانتی تھی پھر بھی ان کی پرستش کرتی اور پرستش سے منع کرنے والے کو آگ میں جلا دینا چاہتی تھی۔ جس کا بھروسہ خدا پر ہوتا ہے اور جو صداقت و حقانیت کی راہ میں ہر مصیبت اٹھانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ عین اُس وقت جبکہ تمام دنیوی اسباب نصرت منقطع ہو جاتے ہیں اس کی مدد کرتا اور دکھ سے اس کو محفوظ رکھتا ہے۔ آیت يٰنَارُ كُوْنِيْ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اشیاء کے ذاتی خواص بھی خدا بدل سکتا ہے اور اپنے خاص بندوں کے لئے بدل بھی دیتا ہے۔ ایک یہ امر بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نیکو کار بندوں کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرنے والے اور انبیاء و صلحاء کو دکھ دینے والے انجام کار خود تباہ و برباد اور ناکام ہوتے ہیں۔ سرزمین شام نہایت متبرک ہے، مادی اور روحانی برکات کا سرچشمہ ہے۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ قوم کے مصلح اور لیڈر کے لئے دو امر ضروری ہیں۔ ایک تو اللہ کا فرماں بردار اور اطاعت گزار اور ہر خیر و صلاح کا عامل ہو۔ دوسرے اس کی طبیعت و سرشت اور مزاج کی ساخت ہی اس قسم کی ہو کہ نیکی کی محبت اور بدی سے نفرت ہو۔ بے وقوف نہیں ہوتا، نبوت کے لئے دانش لازم ہے۔ اسی لئے حضرت لوط کو خدا نے حکم و علم دونوں باتیں عطا کی تھیں۔ ایک بات ضمناً یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کے پیغمبروں کی اطاعت و فرماں پذیری ضائع نہیں جاتی، اس سے بڑے بڑے مراتب ملتے ہیں، کبھی یہ اطاعت گزاری نبوت کے درجہ تک پہنچا دیتی ہے جس طرح حضرت ابراہیم پر ایمان لا کر حضرت لوط نبی ہو گئے۔ نیکی بدی کی ضد ہے۔ ضد کا اجتماع ضد کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے نیکو کاروں کا گزارہ بدوں کے ساتھ ناممکن ہے چنانچہ حضرت نوح کو خدا تعالیٰ نے کافروں کی ایذا دہی اور نجاست سے خلاصی عطا فرما دی۔ وغیرہ

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۚ

اور اس سے پہلے جب نوح نے پکارا تو ہم نے اُن کی دعا قبول کی اور اُن کو اور اُن کے متعلقین کو بڑی مصیبت سے بچا لیا

وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ

اور اُن کی اُس قوم کے مقابلے میں مدد کی جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا کیونکہ وہ برے لوگ تھے پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا

وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ

اور (تذکرہ کرو) داؤد اور سلیمان کا جب وہ کھیتی کے متعلق فیصلہ کررہے تھے کیونکہ رات کے وقت کچھ لوگوں کی بکریاں اس میں چر گئی تھیں ہم ان کے فیصلے

شٰهِدِيْنَ ۙ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ۫ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ

واقف ہیں ہم نے سلیمان کو وہ فیصلہ سمجھا دیا اور ہر ایک کو ہم نے حکمت وعلم عطا کیا اور پہاڑوں کو ہم نے داؤد کے تابع بنا دیا تھا

يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ؕ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ

پہاڑ تسبیح کرتے تھے اور پرندوں کو بھی تابع کر دیا تھا اور ہم ہی اس کام کے کرنے والے تھے اور داؤد کو ہم نے تمہاری پوشش بنانی سکھائی تاکہ اس کی وجہ سے لڑائی کے ضرر

بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ۝ وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى

سے تم محفوظ رہو تو کیا تم احسان ماننے والے ہو اور ہم نے زور کی ہوا کو سلیمان کے تابع کر دیا کہ اس کے حکم سے اس زمین میں آہستہ

الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ ۝ وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ

چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں اور ہم ہر چیز سے واقف ہیں اور بعض شیطان سلیمان کے لئے غوطے لگاتے تھے

لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ ۙ

اور اس کے علاوہ بھی کام کرتے تھے اور ہم اُن کو تھامنے والے تھے

تفسیر ان آیات میں تین پیغمبروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایک آدم ثانی یعنی حضرت نوحؑ۔ دوسرے دو اسرائیلی پیغمبر یعنی حضرت داؤد اور ان کے صاحبزادے حضرت سلیمان۔ حضرت نوح کا اجمالی قصہ بیان کرکے کفار کو یہ تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ انبیاء کے مخالفین دنیا میں کامران و کامیاب نہیں ہوتے انجام کار تباہ ہوتے ہیں۔ صرف خدا کا تحمل ہے جس نے کچھ مدت کے لئے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ جب ڈھیل کا زمانہ ختم ہو جائے گا تو مخالفت کرنے والوں کو تباہ کر دیا جائے گا۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے تذکرہ سے ایک تو یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضرت ابراہیم کی نسل میں ایسے جلیل القدر پیغمبر اور تاجور بادشاہ پیدا ہوئے جن کی ظاہری شان و شوکت تمام بادشاہوں سے بڑھ کر اور دائرۂ حکومت کل سلاطین سے زیادہ وسیع تھا۔ یہ سب حضرت ابراہیم کی نیکی اور خدا پرستی کا پھل تھا۔ دوسرے کفار کو یہ بتانا غرض ہے کہ اپنی طاقت، دولت اور معمولی شان و سطوت پر نازاں نہ ہو۔ بے مقدار دنیا پر ریجھنا اور غرور کرنا کم حوصلہ لوگوں کا کام ہے۔ دیکھو داؤد و سلیمان کس قدر زبردست طاقت کے مالک تھے جن کی حکومت پرند چرند پر نہ یہاں تک کہ ہوا اور جنات پر بھی تھی، مگر کیسے منکسر المزاج، خدا پرست اور اللہ کے فرماں بردار تھے۔ پھر ایک یہ بات بھی قابلِ غور ہے حضرت داؤد باوجودیکہ نبی اور بادشاہ تھے مگر جب ایک مقدمہ کے فیصلے میں ان سے ذرا سی چوک ہوئی تو حضرت سلیمان نے احترام پدری، تہذیب پسری، جلالت سلطنت اور شان نبوت کی کچھ پرواہ نہ کی۔ باطل سے نہ فقط روگردانی کی بلکہ باپ کی مخالفت کی۔ پھر کفار کیوں اپنے اسلاف کی اندھا دھند تقلید اور کورانہ پیروی کرتے ہیں۔ باوجودیکہ ان کے اسلاف کا دین باطل تھا پھر اس پر کیوں جمے ہوئے ہیں۔ بغیر سوچے سمجھے باپ دادا کی لکیر کا فقیر بننا کس طرح جائز ہے۔

حضرت نوح کا مختصر قصہ یہ ہے کہ حضرت ادریس کے بعد چالیس سال کی عمر میں آپ کو نبوت ملی۔ نینوا (عراق) کی بستیوں میں آپ نے تبلیغ

شروع کی۔ بقول مشہور نو سو پچاس برس تک تبلیغ کرتے رہے۔ سرکش قوم نے ایک نہ سُنی، چند آدمی ایمان لائے۔ جب آپ کو یقین ہو گیا کہ اب کوئی ایمان نہ لائے گا اور خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم نازل ہو گیا کہ جو ایمان لے آئے گا ان کے علاوہ اور کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ اِنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ اُس وقت آپ نے قوم کی تباہی کی دعا کی اور عرض کیا۔ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔ اے پروردگار! روئے زمین پر کافروں کی کوئی بستی نہ چھوڑ۔ پیغمبر کی بددعا منافع نہیں جاتی۔ سیلاب عظیم تنور سے اُٹھا۔ کل قوم کو غرق کر دیا۔ حضرت نوح اپنے ساتھیوں سمیت ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ سیلاب اترا تو کشتی سے اُترے اور طوفان کے بعد ساٹھ برس زندہ رہے۔ ذکرہ الشیخ فی البحیرہ

حضرت داؤد کو دو خصوصیات عطا کی گئی تھیں (۱) آپ بہت خوش گلو تھے۔ آپ کی آواز سے انسان تو انسان پرندے اور پہاڑ بھی از خود رفتہ ہو جاتے تھے۔ شہر سے باہر نکل کر جب آپ زبور کی تلاوت کرتے تو پہاڑوں میں گونج پیدا ہو جاتی اور پرندے ہوا سے اتر کر چاروں طرف پرے باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور کسی کو اس وقت اپنا ہوش نہ رہتا۔ (۲) لوہے کی زرہ آپ اپنے ہاتھ سے بناتے۔ لوہے کو تپانے اور گرم کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ موم کی طرح آپ اس کو موڑ کر جس طرح کی زرہ چاہتے بنا لیتے۔

حضرت سلیمان کی بھی ان آیات میں دو خصوصیات بیان کی ہیں۔ (۱) آپ کا حکم نہ صرف انسانوں پر تھا بلکہ ہوا بھی حکم کے تابع تھی۔ تیز رفتار ہوا آپ کے حکم سے نرم رفتار ہو جاتی اور ارض فلسطین میں پہنچتی تو تھم جاتی (۲) جنات بھی آپ کے مسخر تھے آپ کے حکم سے سمندروں میں غوطے مار کر موتی نکال لاتے اور بڑے بڑے مشکل کام سرانجام دیتے اور کسی طرح حکم سلیمانی سے سرتابی نہ کرتے تھے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک مرتبہ کسی چرواہے کی بے خبری سے بکریاں کسی شخص کے انگور کے کھیت میں آ پڑیں۔ پتیاں اور کونپلیں کھالیں اور خوشے خراب کر ڈالے۔ صاحب باغ نے بارگاہ داؤدی میں استغاثہ کیا۔ مدعا علیہ نے اقرار کیا۔ نقصان کا اندازہ لگایا گیا تو جتنی قیمت کل بکریوں کی تھی اتنا ہی نقصان ہوا تھا۔ حضرت داؤد نے فیصلہ کیا کہ کل بکریاں باغ والے کو دے دی جائیں۔ فیصلہ کے بعد فریقین باہر نکلے۔ حضرت سلیمان نے فیصلہ دریافت کیا۔ لوگوں نے بیان کر دیا آپ نے فرمایا کہ بکریاں کھیت والے کو دے دیجئے اور چرواہے کو کہئے کہ انگوروں کی بیلوں کی خدمت کرے اور جتنے زمانے میں بیلیں اصلی حالت پر آجائیں اتنے زمانے تک تمام بکریاں کھیت والے کے قبضہ میں رہیں۔ وہ دودھ اور ان سے فائدہ اٹھائے۔ جب کھیت اصلی حالت پر آجائے تو بکریاں چرواہے کو اور کھیت اس کے مالک کو سپرد کر دیا جائے۔ حضرت داؤد نے یہ فیصلہ پسند کیا اور اپنے گزشتہ فیصلہ سے رجوع فرمایا۔

تحلیل اجزاء

اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ۔ یہاں قبل سے تمام مذکورۃ الصدر انبیاء سے قبل مراد ہے کیونکہ حضرت نوحؑ آدم ثانی کہلاتے ہیں۔ آپ حضرت ابراہیم سے بھی پہلے تھے۔

وَاَهْلَهٗ اہل سے مراد ہیں تمام اہل ایمان، صرف اولاد مراد نہیں ہے۔ اہل نبی وہ لوگ ہوتے ہیں جو اُس نبی پر ایمان لائیں اور اُس کے نقش قدم پر چلیں۔

مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ابن کثیر نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ ہم نے سختی اور کافروں کی ایذا رسانی سے نوح اور ان کے ساتھیوں کو نجات دی۔ خلیب نے کہا كَرْبٍ عَظِيْمٍ سے ایذائے کفار اور مصیبت غرق مراد ہے۔ ابو حیان نے بحر میں لکھا ہے کہ کرب سے مراد یہاں صرف غرق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نوح کو ان کے ساتھیوں سمیت ہم نے غرق ہونے سے بچا لیا۔

وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا۔ جمہور علماء کا قول ہے کہ مقدمہ مذکورہ کا فیصلہ حضرت داؤد و سلیمان نے اپنے اجتہاد سے کیا تھا اور غلط کسی نے نہ کیا تھا کیونکہ کل بکریوں کی قیمت نقصان کے برابر تھی، اس لئے کھیت والے کو بکریاں دلا دینا غلط فیصلہ نہ تھا لیکن حضرت سلیمان کا اجتہاد زیادہ صحیح اور قابل ترجیح تھا۔ فریقین راضی ہو گئے کسی کو نقصان نہ پہنچا۔

اسلام میں اجتہاد اور قضاء کا کیا حکم ہے اور کیا ہر مجتہد مصیب ہے؟

امام احمد، ابو داؤد اور ابن ماجہ نے بیان کیا ہے کہ جب ایاس بن معاویہ کو قاضی کہا گیا تو حسن بصری اُن کے پاس آئے۔ ایاس رونے لگے۔ حسن نے وجہ دریافت کی؟ ایاس نے کہا ابو سعید مجھے خبر پہنچی ہے کہ

قاضی تین ہوتے ہیں۔ ایک وہ جس نے غلط اجتہاد کیا وہ دوزخی ہے۔ دوسرا وہ جس نے خواہش نفس کو اجتہاد میں دخل دیا۔ وہ بھی دوزخی ہے تیسرا وہ جس نے صحیح اجتہاد کیا، وہ جنتی ہے۔ حسن بصری نے فرمایا اللہ نے داؤد و سلیمان کا جو فیصلہ قرآن میں نقل کیا ہے وہ لوگوں کے اس قول کی تردید کرتا ہے۔ دیکھو قرآن میں سلیمان کی تعریف کی گئی ہے مگر داؤد کی بھی کوئی مذمت نہیں کی گئی۔ یاد رکھو کہ اللہ نے فیصلہ کرنے والوں کے لئے تین شرطیں لگائی ہیں۔ عوض کی طلب نہ کریں۔ خواہش نفس کو دخل نہ دیں۔ فیصلہ کرنے میں کسی سے نہ ڈریں۔ الخ۔

امام ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضور اقدس نے ارشاد فرمایا جب حکم دینے والے نے اجتہاد کیا اور وہ اجتہاد ٹھیک ہوا تو اس کے لئے دوہرا ثواب ہے اور اگر اجتہاد میں چوک ہو گئی تو اس کے لئے اکہرا ثواب ہے۔ (رواہ البخاری) سنن میں روایت ہے کہ قاضی تین ہیں۔ ایک قاضی جنت میں ہے اور دو دوزخ میں۔ جس قاضی نے حق جانا اور اس کے موافق حکم دیا تو وہ جنتی ہے اور جس نے نہ جانتے ہوئے جہالت سے فیصلہ کیا وہ دوزخی ہے اور جس نے حق جانا اور اس کے خلاف فیصلہ کیا وہ بھی دوزخی ہے۔

بخاری کی مذکورہ بالا روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر مجتہد مصیب نہیں۔ اختلافی مسائل میں اجتہاد صرف ایک ہی کا صحیح ہوگا باقی اقوال غلط ہوں گے۔ مگر چونکہ ہر مجتہد نے حق کی جستجو کی ہے، اس لئے اس کی کوشش قابل اجر ہے، خواہ حق پر پہنچے یا نہ پہنچے حق پر پہنچنا نہ پہنچنا اختیاری نہیں۔ اختیار صرف کوشش و تلاش کا ہے۔ اسی بنا پر حدیث مذکور میں صراحت کی ہے کہ صحیح اجتہاد کرنے والے کو دوہرا اور غلط نتیجے پر پہنچنے والے کو اکہرا اجر ملے گا۔ لیکن ہر مجتہد پر لازم ہے کہ جب غور و فکر کے بعد اس کو اپنے اجتہاد کی غلطی اور دوسرے کے قول کی صحت ظاہر ہو جائے تو سابقہ رائے سے رجوع کر لے جس طرح حضرت داؤد نے رجوع کر لیا تھا۔ باوجودیکہ آپ کا فیصلہ غلط بھی نہ تھا صرف مرجوح تھا۔

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ۔ حضرت داؤد بہت خوش الحان تھے۔ جب آپ زبور کی تلاوت کرتے تو پرندے ہوا میں رک جاتے اور پہاڑوں میں سناٹا پیدا ہو جاتا۔ حدیث میں وارد ہے کہ ایک رات ابوموسیٰ اشعریؓ کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے، حضور اقدسؐ نے متوجہ ہو کر سنا اور فرمایا داؤد کے سروں میں سے ایک سر اس کو دیا گیا ہے۔ ابوعثمان نہدی تابعی کا قول ہے کہ چنگ بربط اور مزامیر کی آواز ابوموسیٰ کی آواز جیسی آواز میں نے نہیں سنی۔ مقاتل کا قول ہے کہ پہاڑ اور پرندے درحقیقت داؤد کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ کلبی کا قول ہے کہ حضرت داؤد کی آواز سے پہاڑوں کا گونجنا اُن کی تسبیح ہے اور پرندوں کا جھنڈ باندھ کر گرد اگرد جمع ہو کر حضرت داؤد کی حمد و ثنا اور آہ و بکا میں شریک ہونا ان کی تسبیح ہے۔

صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ۔ قتادہ نے کہا حضرت داؤد سے پہلے لوگ پتھروں کی زرہ بناتے تھے۔ حضرت داؤد ہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے حلقہ دار زرہ بنائی۔ آپ کے ہاتھ میں لوہا بغیر پگھلائے نرم ہو جاتا تھا۔ حضرت داؤد کا زمانہ بالکل جہالت کا زمانہ تھا۔ صنعت و حکمت کے قلیل ترین حصہ سے بھی لوگ واقف نہ ہوئے تھے۔ حضرت کے زمانہ کے بعد فلسفہ اور حکمت کا ظہور ہوا۔ انباذقلیس یونانی نے حکمت کی بنیاد ڈالی اور پھر فیثاغورث اور دوسرے حکماء پیدا ہوئے اور دنیا میں طرح طرح کی صنعتیں رونما ہوئیں۔ حضرت داؤد کے زمانہ میں کڑی دار زرہ کا بننا ایک نعمت عظیم تھی اور پھر یہ نعمت بھی ایسی تھی جو صرف اپنے بدن کے بچاؤ کے لئے ہی استعمال ہو سکتی ہے۔ دوسرے کو دکھ پہنچانے کی کوئی استعمالی صورت پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ تیر، تلوار، توپ، تفنگ، گن مشین، ہوائی جہاز اور تمام اسلحہ بھی محیر العقول اور فائدہ رساں ایجادیں ہیں، مگر ان کو جارحانہ طور پر استعمال کرنے سے دنیا میں تباہی بھی پھیلتی ہے۔ زرہ کی ایجاد کے اندر ضرر رسانی کا کوئی پہلو ہی نہیں ہے، اسی لئے شکر گزاری کا ضمنی حکم دیا گیا۔

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً۔ ابن کثیر نے بیان کیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا تخت لکڑی کا تھا۔ گھوڑے، خیمے، فرش اور تمام ضروریات اس پر رکھ دیئے جاتے تھے۔ ارکان دولت اور لشکر بھی سوار ہو جاتا تھا پھر حکم سلیمانی ہوا تخت کو اٹھا کر جدھر حکم ہوتا چلی دیتی۔ اوپر سے پرندے سایہ افگن ہوتے۔ حضرت سلیمان جہاں اترنا چاہتے اتر جاتے۔ عبداللہ بن عبید بن عمیر نے کہا کہ سلیمان کے تخت پر سوار گھوڑے چڑھا دیئے جاتے تھے پھر ہوا کو روانہ ہونے کا حکم ہوتا تو آسمان کے نیچے جس بلندی پر پہنچانا چاہتے ہوا پہنچا دیتی۔ الخ۔ (کذا ذکرہ ابن کثیر) آخری قول سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان کا تخت کسی خاص تدبیر سے بنایا گیا تھا جس پر سوار گھوڑے بھی چڑھا دیئے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ گھوڑوں کے چڑھنے

ہوتے تھے یہی معلوم ہوا کہ گھوڑوں کی شکل کی کوئی خاص مشینری تھی جو ہوا کو جذب کرتی تھی اور اس طرح اس عظیم الشان بوجھ کو اٹھاتی تھی اور پھر مشینری کی روک تھام بھی سلیمان کے قبضہ میں تھی جہاں چاہتے تھے اتر پڑتے اور چونکہ یہ ایجاد حضرت سلیمان ہی کی تھی اور بطور معجزہ تھی یعنی اس زمانے میں اور کسی کو یہ قدرت ہرگز نہ تھی کہ ہوا پر اُڑ سکے، اس لئے تسخیر ہوا کو بطور احسان و انعام کے قرآن میں ذکر فرمایا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ حکمت و سائنس نبوت و اعجاز کے منافی نہیں ہے۔ ہر نبی حکیم ہوتا ہے حقائق اشیاء سے سب درجہ واقف ہوتا ہے بلکہ حکیم سے بالاتر علمی مراتب پر فائز ہوتا ہے۔ عالم مادی کے اوپر عالم روحانیت کا بھی اُسے علم ہوتا ہے۔ خصوصاً حضرت سلیمان تو بہت وسیع العلم کثیر المعارف حقائق شناس حکیم تھے۔ فیثا غورث جیسے اساطین حکمت کو جو کچھ حاصل ہوا وہ آپ ہی کے فیض تلمذ کا نتیجہ تھا۔ دیگر حکماء کو جو حقائق کا علم کسب اور تعمل ذہنی سے حاصل تھا اور پھر بھی یقینی نہ تھا، قابلِ شک تھا۔ ان کا علم حضرت سلیمان کو بالمشاہدہ یا بوحی حاصل تھا۔ روح میں روشنی اور فطرت میں نور تھا، حدس کشفی تھا، دماغ میں انجلا رہتا، تحصیل نتائج کے لئے ترتیب مقدمات کی ضرورت نہ تھی، اس لئے کوئی بعید نہیں بلکہ اغلب ہے کہ آپ کو سائنس اور حقائق طبعیات کا ایسا واقعی علم ہو نہ اس زمانے میں کسی کو نہ ہو اور یہ نور علمی آپ کو بطور معجزہ منجانب اللہ عطا ہوا ہو اور اسی حقائق شناسی کا نتیجہ ہو کہ آپ کو تسخیر ہوا اور پرندوں کی بولی سمجھنے کا ملکہ حاصل ہو۔ جنات کی تسخیر اور ان سے حسب منشاء کام لینا بھی اسی نور باطن کا اثر تھا۔ نور باطن ہی انسان کو روحانیات و ملائکہ کی صف میں داخل کر دیتا ہے۔ ہمارے نبی مقدس پر بھی جنات ایمان لائے تھے۔ کیونکہ حضور والا کی وسعت علمی اور روحانیت نے ان کو مسخر کر دیا تھا، سرتابی کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ممکن ہے کہ بعض کوتاہ فہم حضرات ہماری اس تقریر کو انکارِ معجزات پر محمول کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ ان کی بے بصیرتی اور علمی بے بہرگی کی دلیل ہوگی اور اصطلاحات شریعت اور حقائق کلام ربانی سے ناواقف ہوں گے۔ حکمت و دانش کی وسعت معجزہ کا انکار نہیں کرتی بلکہ کسی نبی کو ایسی دانش و حکمت جو اس زمانے میں کسی اور کو نہ ملی ہو خود معجزہ ہے اور خوارق عادات سے ہے کسی نبی سے خارق عادات کا ظہور ہی ایک معجزہ کہلاتا ہے۔ معجزہ کہتے ہی اس فعل کو ہیں جو کسی نبی سے (مقابلے کے وقت) سرزد ہو اور اس زمانے کے تمام انسان اس جیسا کام کرنے سے قاصر ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب سب لوگ نبی کی برابر قوت قدسیہ اور علمی نور نہ رکھتے ہوں گے اور حقائق اشیاء سے اتنے واقف نہ ہوں گے جتنا پیغمبر وقت واقف ہوگا تو وہ حقائق اشیاء کی تحلیل، ترکیب اور تصرف وانقلاب پیغمبر کی طرح کس طور پر کر سکتے ہیں اور کیونکر ان سے وہ افعال ظاہر ہو سکتے ہیں جو پیغمبر سے ظاہر ہوتے ہیں۔ فافہم۔

یہاں ایک یہ بات بھی جان لینی چاہیئے کہ اس آیت میں ہوا کو عاصفہ یعنی تند اور تیز فرمایا اور سورۂ ص میں رخاء یعنی نرم کہا۔ بظاہر دونوں میں منافات ہے۔ اس اختلاف کو دور کرنے اور دونوں آیتوں میں موافقت پیدا کرنے کے لئے مفسر سراج نے لکھا ہے کہ جب ہوا لشکر کو لے کر اُٹھتی تو تیز ہوتی تھی پھر اوپر پہنچ کر نرم پڑ جاتی تھی جس کھیت کی طرف سے گزر ہوتا اس کے پودوں کو جنبش بھی نہ ہوتی نہ ہوا کی رفتار سے گرد اُٹھتی نہ کسی چرند پرند کو اذیت پہنچتی۔ حسن بصری نے فرمایا ہوا اس تیزی سے حضرت سلیمانؑ کو لے جاتی کہ صبح کو ایلیا سے چلتے۔ دوپہر کو اصطخر پہنچ جاتے وہاں قیلولہ کر کے پچھلے دن میں بابل ہوتے ہوئے فلسطین کو لوٹ آتے۔ بعض مفسرین نے یہ جواب دیا ہے کہ ہوا تیز تھی، مگر سلیمان کی مرضی کے مطابق نرم نرم بھی چلتی تھی جس میں کچھ تکلیف نہ ہوتی تھی

مسلمانوں میں معتزلہ جیسے بعض گروہ معجزات انبیاء کو قصہ کہانی جانتے ہیں اور ہر معجزہ کی کچھ نہ کچھ تاویل کرتے ہیں۔ چنانچہ آیت مذکورہ میں جب تسخیر ہوا کی صراحت انہوں نے دیکھی تو اس کی بھی تاویل کر ڈالی۔ کہنے لگے سلیمان کے پاس جہازی بیڑا تھا جو اس زمانے میں کسی اور کے پاس نہ تھا۔ یہ بیڑا حیرام شہر صور کے بادشاہ نے بیت المقدس کی تعمیر کے لئے لکڑیاں لانے کے لئے بنوایا تھا۔ اسی مضمون کو اول کتاب السلاطین کے باب ۵ میں بیان کیا ہے اور چونکہ یہ بیڑا کوہ لبنان (علاقۂ شام) کی طرف سے ہو کر یروشلم آیا کرتا تھا، اس لئے اِلَى الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَکْنَا فِیْهَا کا مطلب بھی صاف ظاہر ہوتا ہے اور چونکہ اس زمانے کے جہاز ہوا کے رُخ پر چلتے تھے اسٹیمر نہ تھے، اس لئے مطلب بالکل صاف ہے کہ سلیمان کے جہازوں کو ہوا یروشلم پہنچا دیا کرتی تھی ممکن ہے کہ سلیمانؑ بھی اس میں سوار ہوتے ہوں اور ہر جہاز کی رفتار چونکہ اونٹ گھوڑے وغیرہ سے تیز ہوتی ہے، اس لئے مجازاً سرعت رفتار کو ظاہر کرنے کے لئے غُدُوُّهَا شَهْرٌ فرمایا۔

میرے نزدیک یہ اور اس قسم کی دوسری تاویلیں محض زائغ تاویلیں ہیں اور حقیقت نبوت سے بے خبری کا نتیجہ ہیں۔ جب معمولی سائنس داں اور ماہرین طبعیات محیر العقول ایجادیں کر سکتے ہیں تو کسی کے انکار کے کوئی معنی ہی نہیں۔ حقائق معجزات سے کماحقہٗ واقفیت اسی وقت ممکن ہے جبکہ انبیاء جیسی قوت قدسیہ موجود ہو۔ تخت سلیمانی کا انکار اور ہوائی جہاز بلکہ لاسلکی اور ریڈیو کا اقرار یا للعجب۔

وَمِنَ الشَّيٰطِيۡنِ مَنۡ يَّغُوۡصُوۡنَ لَهٗ۔ شیاطین سے مراد جنات ہیں۔ کچھ جنات سرکش اور مجرم تھے۔ ان کو حضرت سلیمان نے قید کیا اور زنجیروں سے باندھ دیا تھا۔ بہت سے مختلف کاموں پر لگے ہوئے تھے۔ دریاؤں سے موتی نکال کر لاتے عمارتیں بنواتے، بڑے بڑے پتھر اٹھاتے۔ کوتاہ فہم حضرات جنات کے تابع ہونے کی بھی تاویل کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان کی حکومت نہر فرات سے لے کر فلسطین تک اور ادھر کی سرحد تک تھی اور دریا کے اس پار تفسح سے لے کر غزہ تک تمام امراء و سلاطین آپ کے زیر نگین تھے (دیکھو کتاب السلاطین باب ۴) قوم عمالقہ بہت قد آور تنومند اور سرکش تھی، مگر حضرت سلیمان کے زیر حکم تھی۔ شیاطین و جنات سے مراد بھی عمالقہ ہیں۔ جس طرح بڑے قوی ہیکل جفاکش تنومند آدمی کو دیو اور دیو ہیکل بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن نے عمالقہ کو جن اور شیاطین کہا۔

وَكُنَّا لَهُمۡ حٰفِظِيۡنَ اس فقرہ کا تفسیری مطلب مختلف طور سے بیان کیا گیا ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اللہ ہی نے سلیمانؑ کی حفاظت شیاطین کے شر سے کر رکھی تھی کہ آپ کو کوئی شیطان اذیت نہ پہنچا سکتا تھا بلکہ سب کے سب سلیمان کے قبضہ میں مقہور و مسخر تھے۔ آپ جس کو چاہتے قید کرتے اور جس سے چاہتے منشاء کے موافق کام لیتے۔ مفسر سراج نے زجاج کا قول بیان کیا ہے کہ اللہ نے شیاطین کو فساد کرنے سے روک رکھا تھا، کیونکہ شیطانوں کی عادت تھی کہ دن بھر کام کرتے اور آخری حصہ میں اگر رات آنے سے پہلے فارغ ہو جاتے تو دن بھر کا کیا ہوا کام بگاڑ دیتے۔ بعض نے اس طرح مطلب بیان کیا ہے کہ حفاظت شیاطین سے مراد یہ ہے کہ وہ بھاگ نہ سکتے تھے اور سلیمان کے حکم سے سرتابی ناممکن تھی۔

مقصود بیان

خدا پرستی سے نسل میں برکت ہوتی ہے۔ اہل دانش اور ارباب صلاح بڑی سے بڑی حکومت ملنے پر بھی مغرور نہیں ہوتے۔ اسلئے متاع دنیا اور عارضی معمولی شان و شوکت پر بھڑکنا اور مغرور کرنا بلند حوصلہ اشخاص کے لئے زیبا نہیں۔ حق کو ظاہر کرنے میں جرأت سے کام لینا چاہیئے۔ عظیم الشان بادشاہ کا خوف، اقرباء کی رعایت، باپ کی جلالت، یہاں تک کہ نبی کی نبوت بھی اظہار صداقت سے مانع نہ ہو۔ اس میں پیام بصیرت ہے ان کور مقلدوں کے لئے جو بعض ائمہ کے اقوال کو محض حسن ظن کی بنا پر ملتے ہیں اور باوجودیکہ صراحت احادیث اقوال ائمہ کے خلاف ہے، مگر لوگ حسن ظن رکھتے ہوئے یہ یقین رکھتے ہیں کہ چونکہ ہمارے امام بہت بڑے علامہ اور مجتہد تھے وہ ہم سے بہتر مطلب سمجھتے تھے۔ یہ حدیث بھی ان کو ضرور معلوم ہی ہوگی۔ اسی مرض کے مریض عام اہل اسلام اور خانقاہ نشین صوفی بھی ہیں۔ باوجودیکہ بعض مشائخ کے اعمال و اقوال صراحات شرعی کے خلاف ہوتے ہیں، مگر حسن ظن کا برا ہو کسی کو کچھ نظر نہیں آتا اور شیخ کے ہر فعل کو حکم شرع سے مقدم سمجھا جاتا ہے۔ اس سے ان علماء اور شاہی اسٹاف کو بھی سبق لینا چاہیئے جو ہر صحیح غلط اور حق و باطل میں بادشاہ کے سر میں سر ملاتے ہیں اور نہیں خیال کرتے کہ اسلامی فرض کیا ہے۔ پرندے اور پہاڑ حضرت داؤد کے ساتھ تسبیح میں شریک ہوا کرتے تھے۔ حضرت داؤد کو زرہ سازی کی خاص صنعت آتی تھی۔ ہوا اور جنات حضرت سلیمان کے مسخر تھے۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے تذکرے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے بعض بندوں کے لئے تمام مخلوق یہاں تک کہ بے حس و بے علم کائنات بھی مسخر ہو جاتی ہے وغیرہ۔

وَاَيُّوۡبَ اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىۡ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِيۡنَ ۚ ۖ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ

(اور ایوب نے جب اپنے رب کو پکارا کہ مجھے ایذا پہنچ رہی ہے اللہ تو ارحم الراحمین ہے تو ہم نے ان کی سن لی

فَكَشَفۡنَا مَا بِهٖ مِنۡ ضُرٍّ وَّاٰتَيۡنٰهُ اَهۡلَهٗ وَمِثۡلَهُمۡ مَّعَهُمۡ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَذِكۡرٰى

اور ان کو جو کچھ دکھ تھا اس کو دور کر دیا اور ان کے بال بچے ان کو دیئے بلکہ اپنی طرف سے کرکے اور عبادت کرنے والوں کی یاد کے لئے اتنے ہی

لِلْعٰبِدِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ۚۖ وَاَدْخَلْنٰهُمْ

اور دیئے ۔ اور اسمٰعیل اور ادریس و ذوالکفل کو بھی (یاد کرو) یہ سب صابر بندوں میں سے تھے ہم نے اُن کو

فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ

اپنی رحمت میں لے لیا کیونکہ یہ لوگ بلاشبہ نیک تھے اور ذوالنون جب غصہ ہوکر چل دیے اور سمجھے کہ ہم اُن پر

نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ

تنگی نہ کریں گے مگر بالآخر تاریکیوں میں ندا دی کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے میں بلاشبہ قصور وار

الظّٰلِمِيْنَ ۝ۚۖ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّآ

ہوں تو ہم نے اُن کی سُن لی اور اُن کو غم سے نجات دی اور ایماندا روں کو ہم اسی طرح نجات دیتے ہیں اور زکریا نے

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِيْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ۚۖ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا

جب اپنے رب کو پکارا کہ اے میرے رب مجھے اکیلا نہ چھوڑ تو سب سے بہتر وارث ہے تو ہم نے اُن کی سُن لی اور یحییٰ اُن کو

لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ

عطا کیا اور اُن کی بیوی کو اُن کے لئے بھلا چنگا کر دیا واقعی یہ لوگ نیک کاموں میں جلدی کرتے تھے اور امید و بیم کی حالت میں ہم کو

رَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ۝ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا

پکارتے تھے اور ہمارے آگے عاجزی کرتے تھے اور اُس عورت کو بھی (یاد کرو) جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت رکھی مگر ہم نے اس میں اپنی روح پھونک

وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ

دی اور اُس کو اور اُس کے بیٹے کو جہان کے لئے نشانی بنا دیا واقعی تم سب کا ایک ہی مذہب ہے اور میں تمہارا رب ہوں

فَاعْبُدُوْنِ ۝ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ؕ كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ۝ ع

تو میری عبادت کرو مگر لوگوں نے باہم اپنے دین میں تفرقہ کر لیا لیکن سب ہمارے پاس لوٹ کر آنے والے ہیں

تفسیر ان آیات میں چند پیغمبروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہم ذیل میں ہر ایک کا مختصر قصہ صحیح روایات کے مطابق نقل کرتے ہیں:- (۱) حضرت ایوب رومی تھے۔ وہب بن منبہ نے ان کا نسب اس طرح بیان کیا ہے:- ایوب بن اموص بن رزاح بن روم بن عیص بن اسحاق بن ابراہیم۔ آپ کی والدہ حضرت لوط بن ہاران کی نسل میں سے تھیں۔ بیضاوی نے پورا نسب نہیں بیان کیا۔ صرف اتنا کہا کہ آپ عیص بن اسحاق کی اولاد میں سے تھے۔ حضرت ایوب کی بیوی کا نام برقول صحیح رحمت تھا۔ رحمت حضرت یوسف کی صاحبزادی تھیں۔ بعض لوگوں نے لیا بنت میشا بن یوسف بتایا ہے

بعض نے لیا بنت یعقوب لکھا ہے، لیکن زیادہ صحیح اول قول ہے۔ حضرت ایوب بہت مال دار اور شان و شوکت کے آدمی تھے۔ مولیشی، باغات، کھیتیاں، کوٹھیاں، مکانات، زمینیں سب ہی کچھ خدا نے دے رکھا تھا۔ اولاد بھی آپ کی بہت تھی اور اکثر بیٹے جوان تھے۔ خود بھی خوش رو، حسین، تندرست اور طاقت ور آدمی تھے، لیکن ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔ بالآخر آزمائش کا وقت آگیا۔ جن کے مراتب بڑے ہوتے ہیں ان کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے۔ بحکم الٰہی چند ہی روز میں تمام اولاد مر گئی۔ کوئی ڈوبا، کوئی مکان کے نیچے دب گیا، کوئی کسی مرض سے مر گیا۔ تمام جانور (گھوڑے، اونٹ، بھینس، گائے، بکریاں) وغیرہ تباہ ہوگئے۔ کھیتیاں جل گئیں، اجڑ گئیں، مکانات گر پڑے، تمام سونا چاندی تلف ہوگیا، لیکن حضرت ایوب برابر صبر کے ساتھ شکر کرتے رہے۔ مصائب کا یہاں پر خاتمہ نہ ہوا، خود بیمار پڑ گئے۔ رفتہ رفتہ جذام ہوگیا۔ تمام بدن میں کیڑے پڑ گئے۔ لوگوں نے بستی سے باہر کر دیا۔ شہر سے باہر ایک جھونپڑی میں جا کر پڑ گئے، لیکن شکر سے کسی وقت غافل نہ رہے۔ آپ کی بیوی رحمت بستی میں جا کر محنت مزدوری کر لاتیں، کچھ شوہر کو کھلا دیتیں۔ انجام کار آزمائش کا دور ختم ہوا۔ ایک روز بارگاہِ الٰہی میں رکھ کر دعا کی اور مصائب کے دور ہونے کی استدعا کی۔ نبی کی دعا مردود نہیں ہوتی۔ تیر نشانہ پر بیٹھ گیا، دعا قبول ہوگئی، خدا نے پھر پہلا سا مال و منال دے دیا، نئی اولاد بھی پہلے سے زائد ہوگئی بلکہ قوی اقوال کے موافق تمام مری ہوئی اولاد از سرِ نو زندہ ہوگئی، خود بھی تندرست ہوگئے۔ آپ کی آنی میں مرض جاتا رہا۔ بقول صحیح آپ اٹھارہ برس مصائب میں مبتلا رہے۔ ایک قول میں تیرہ سال اور ایک قول میں سات سال چند ماہ کی صراحت آئی ہے، لیکن اول قول کرخی کا ہے اور وہی بسبب روایت قوی ہے۔ آپ کی کل عمر بقول بعض ترسٹھ [۶۳] سال کی ہوئی، لیکن راجح یہ ہے کہ ایک سو بیس سال زندہ رہے۔ حضرت ایوب کے احوال کی تفصیل صحابہ و تابعین نے بہت زیادہ کی ہے، ابن مسعود، انس، ابن عباس، کعب احبار، عبد اللہ بن سلام، وہب بن اسحاق اور بہت سے علماء نے مفصل احوال نقل کئے ہیں، لیکن مرفوع روایات بہت ہی کم ہیں۔ اکثر روایات کا ماخذ اسرائیلیات ہیں، اس لئے ہم نے اتنا ہی لکھ دیا جتنا شیخ ابن کثیر نے تنقید کے بعد لکھا ہے۔

(۲) حضرت اسمٰعیل بن ابراہیم جو ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ بحکم الٰہی حضرت ابراہیم نے ہاجرہ کو ان کے بچہ سمیت خانہ کعبہ کے پاس چٹیل سنسان ریگستان میں لا کر چھوڑ دیا جہاں نہ پانی تھا نہ دانہ، نہ سایہ نہ سبزہ۔ ہاجرہ کے ساتھ جو کھانا پانی تھا وہ ختم ہوگیا۔ اسمٰعیل پیاس سے بیتاب ہوئے۔ ہاجرہ اسمٰعیل کو چھوڑ کر پانی کی تلاش میں صفا نامی پہاڑ پر چڑھ گئیں کہ شاید وہاں کسی طرف جانور اڑتے نظر آئیں جس سے پانی کا مقام معلوم ہو جائے یا کوئی آدمی مل جائے جس سے کچھ دریافت کیا جا سکے۔ بالآخر مایوس ہو کر اتر آئیں اور اسمٰعیل کے پاس لوٹ آئیں۔ پھر صبر نہ ہو سکا تو دوبارہ گئیں۔ اسی طرح سات چکر لگائے۔ کبھی صفا پہاڑی پر جاتیں، کبھی مروہ پہاڑی پر۔ جب ناامید ہو کر آخر میں لوٹیں تو قدرت الٰہی کا عجیب کرشمہ دیکھا جس جگہ حضرت اسمٰعیل ایڑیاں رگڑ رہے تھے وہاں سے ایک چشمہ پھوٹ نکلا۔ ہاجرہ نے پانی کو منتشر ہونے سے محفوظ رکھنے کیلئے چاروں طرف مٹی کی منڈیر بنا دی اور فرمایا "زَمْ زَمْ" اے پانی ٹھہر اے پانی ٹھہر۔ حدیث میں آیا ہے کہ اگر ہاجرہ ایسا نہ کرتیں تو موجزن خوش گوار دریا ہو جاتا۔ جب حضرت اسمٰعیل جوان ہوئے اور حضرت ابراہیم کے ساتھ مل کر کعبہ کی تعمیر کر چکے تو ایک روز حضرت ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے کا خواب دیکھا۔ انبیاء کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ فوراً تعمیل کے لئے تیار ہوگئے۔ حضرت اسمٰعیل سے مشورہ کیا۔ آپ نے بھی اپنی جان قربان ہونے کے لئے پیش کر دی، لیکن عین ذبح کے وقت خدا تعالیٰ نے اسمٰعیل کو بچا لیا اور ان کی بجائے ایک غیبی مینڈھا ذبح ہوگیا۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ دونوں کی آزمائش ہوگئی۔ آپ کی عمر ۱۳۰ سال ہوئی۔

(۳) ادریس بعض کا قول ہے کہ آپ حضرت شیث بن آدم کے صاحبزادے تھے، لیکن قوی قول یہ ہے کہ آپ کے اور شیث کے درمیان تین نسلیں اور تھیں۔ گویا شیث آپ کی پانچویں پشت میں تھے۔ اصل نام اخنوخ تھا۔ درس علمی کی کثرت کے سبب آپ کو ادریس کہا جاتا ہے۔ ہرمس الہرامسہ بھی آپ ہی کا لقب ہے۔ بہت بڑے دانشمند، حقائق اشیاء سے واقف، بہت چیزوں کے موجد اور زبردست حکیم تھے۔ روئے زمین کو پانچ اقلیموں پر آپ نے تقسیم کیا تھا۔ آپ کے پانچ شاگرد خصوصی تھے۔ ان شاگردوں میں سے ہر ایک کو ایک اقلیم کی ملکیت اور حکومت سپرد کر دی تھی۔ یہ پانچوں بہت بلند پایہ عالم اور فلاسفر گزرے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز خود عالم بالا میں شامل ہونے کی دعا کی۔ چنانچہ ایک پہاڑ کے دامن میں تھے کہ آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ واللہ اعلم۔ آپ کی عمر غالباً چار سو پچاس برس کی ہوئی۔

(۴) ذوالکفل۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری، مجاہد اور بعض دوسرے علماء کے نزدیک آپ ایک مردِ صالح دیندار اور عابد حکیم تھے نبی نہ تھے۔ ابن جریر نے باسناد خود مجاہد کی روایت نقل کی ہے کہ جب الیسع نبی بوڑھے ہوگئے تو انہوں نے اپنا جانشین مقرر کرنا چاہا، لیکن جانشین کے لئے تین شرطیں مقرر کیں:۔ (۱) تمام رات عبادت کرنی ہوگی (۲) ہر روز روزہ رکھنا ہوگا (۳) فیصلہ کرتے وقت غصہ کو دور رکھنا پڑے گا۔ ان شرائط کا جب قوم میں اعلان کیا گیا تو کوئی خلیفہ بننے کے لئے تیار نہ ہوا۔ ایک کم رو حقیر نوجوان تیار ہوگیا، لیکن ذوالکفل کی نبوت کا انکار (بقول ابن کثیر) سیاق قرآنی کے خلاف ہے۔ سلسلۂ انبیاء میں آپ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ماقبل اور مابعد سب ہی انبیاء مذکور ہیں۔ سورت کا نام بھی سورۃ الانبیاء ہے۔ پھر بکثرت روایات سے اس کا ثبوت ہوتا ہے۔ عطاء بن ابی رباح تابعی کی روایت ہے کہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر کے پاس وحی بھیجی کہ تو بنی اسرائیل میں سے کسی کو اپنے کام کا متکفل کردے میں تیری روح قبض کرنی چاہتا ہوں، لیکن ذمہ دینے والے کے لئے تین شرطوں کی تکمیل لازم ہے۔ رات بھر نماز پڑھنی، دن بھر روزہ رکھنا اور لوگوں کے فیصلے کرنے میں غصہ نہ کرنا۔ اگر ان شرائط کی تکمیل کے لئے کوئی تیار ہوجائے تو اس کو اپنا قائم مقام کردے۔ پیغمبر نے قوم کے سامنے شرائط کا اظہار کیا۔ ایک اسرائیلی نوجوان شرائط کا متکفل ہوگیا اور عہد کو پورا بھی کیا۔ اللہ نے اس کو نبی بنادیا (کذا ذکرہ الخطیب فی السراج) بہرحال قوی قول یہی ہے کہ شروع میں ذوالکفل نبی نہ تھے صرف الیسع کے جانشین اور خلیفہ تھے پھر خدا نے ان کو نبی بنادیا۔ ابن عباس کا ایک قول آیا ہے کہ الیاس نبی کا لقب ذوالکفل تھا۔ بعض نے یوشع بن نون اور بعض نے زکریا کا لقب بتایا ہے۔ بیضاوی نے جزم کیا ہے کہ الیاس ہی ذوالکفل تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ غرض ذوالکفل بڑے عابد، زاہد مرتاض نبی تھے۔ علاوہ نبوت کے قوم پر مادی حکومت بھی آپ کی تھی، منصف تھے اور ہمیشہ مصائب پر صبر کرتے تھے۔

(۵) ذوالنون۔ آپ کا نام یونس تھا۔ چونکہ آپ کو مچھلی نگل گئی تھی اور نون مچھلی کو کہتے ہیں، اس لئے آپ کا لقب ذوالنون ہوگیا۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ کسی کو یہ کہنا زیبا نہیں کہ میں یونس بن متی سے افضل ہوں۔ ابن اثیر جزری نے متی آپ کی ماں کا نام اور صاحب قاموس نے باپ کا لکھا ہے۔ آپ نینویٰ علاقہ موصل مضافات شام کے رہنے والے تھے۔ ابن عباس کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شکم ماہی سے نجات پانے کے بعد آپ پیغمبر بنائے گئے تھے۔ مفسر خازن نے اسی قول کو پسند کیا ہے، مگر حسن بصری، شعبی، سعید بن جبیر، ابن مسعود، ابن جریر، ثعلبی اور جمہور علماء کا قول ہے کہ آپ شکم ماہی میں گرفتار ہونے سے پہلے نبی بنادئے گئے تھے۔ آیت پاک میں آتا ہے۔ وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْکِ الْمَشْحُوْنِ الخ۔ آپ نے قوم کو احکام الٰہی کی تبلیغ کی، لیکن کسی نے یقین نہ کیا۔ آپ نے تین روز کے بعد عذاب نازل ہونے کی دھمکی دی اور خود باہر چلے گئے۔ تیسرے روز جب آسمان پر آگ کی سرخی اور عذاب کی علامت نمودار ہوئی تو تمام قوم میدان میں نکل آئی اور بارگاہِ الٰہی میں انتہائی گریہ وزاری کی اور سب کے سب مومن بن گئے۔ اللہ نے عذاب ٹال دیا۔ لوگوں نے حضرت یونس کی تلاش جاری کی تاکہ احترام کے ساتھ واپس لائیں اور قصور معاف کرائیں۔ کسی شیطان نے یونس سے جاکر کہہ دیا کہ عذاب تو کچھ بھی نہیں آیا اور تمام لوگ تمہارے دشمن ہوگئے۔ آپ بخوف ندامت انتہائی غصہ میں وحی کا انتظار کئے بغیر چل دئے اور ایک کشتی میں سوار ہوگئے۔ کشتی گرداب میں پھنس گئی۔ ملاحوں نے کہا شاید کوئی بھاگا ہوا غلام اس کشتی میں سوار ہے جس کی نحوست سے ہم گرداب بلا میں پھنسے ہیں۔ حضرت یونس نے کہا میں ہی بھاگا ہوا غلام ہوں، اپنے مالک سے بھاگا ہوا ہوں مجھے دریا میں ڈال دو۔ لوگوں نے انکار کیا، مگر حضرت کے اصرار کے بعد ڈال دیا۔ دریا کے اندر ایک مچھلی نے آپ کو نگل لیا، تین روز شکم ماہی میں رہے۔ وہاں اللہ سے دعا کی اور اپنے قصور کی معافی چاہی، دعا قبول ہوئی اور بحکم الٰہی مچھلی نے کنارے پر آکر اگل دیا۔

(۶) حضرت زکریا بوڑھے ہوگئے تھے، بیوی بانجھ تھی کوئی اولاد نہ تھی اور دینی کے شرعی انتظام کی ضرورت تھی۔ قوم میں کوئی اس قابل نہ تھا، قدرت الٰہی پر کامل یقین تھا کہ وہ بیکسوں کا سہارا، مایوسوں کو کامران بنانے والا اور نامرادوں کو مراد دینے والا ہے۔ باوجود اسباب مادی نہ ہونے کے وہ پھر بھی سب کچھ کرسکتا ہے۔ اُدھر مریم کی حالت انہوں نے عجیب دیکھی۔ عبادت خانہ کے اندر مریم ہی رہتی تھیں اور زکریا ہی کے زیر نگرانی انہوں نے پرورش پائی تھی، ان کے پاس غیب سے گرمی کے میوے سردی کے زمانے میں اور سردی کے میوے گرمی کی فصل میں رکھے ہوئے دیکھتے تھے اور دریافت کرتے تھے تو مریم جواب دیتی تھیں مجھے یہ میرے پروردگار نے بھیجے ہیں۔ اس واقعہ کو دیکھ کر حضرت زکریا کا دل امید مند ہوا اور ایک روز تہجد کی نماز

کے لیے اولاد کے لئے دعا کی۔ دعا قبول ہوئی اور یحییٰ پیدا ہوئے۔

(۷) حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا مفصل قصہ ہم سورۂ مریم میں ذکر کر چکے ہیں، اس لئے یہاں مکرر ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

تحلیل اجزاء

اِنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ حضرت ایوب نے اٹھارہ سال کے اندر کبھی دفع مصائب کے لئے دعا نہ کی اور اللہ کے امتحان پر ثابت قدم رہے۔ بیوی بار بار آمادہ کرتی تھی کہ اللہ سے دعا کرو، مگر آپ برابر صبر و شکر سے کام لیتے تھے۔ بالآخر جب مجبور ہو گئے تو ایک روز نہایت الحاح سے دعا کی اور عرض کیا الٰہی میں تکالیف و مصائب میں مبتلا ہو گیا تو ارحم الراحمین ہے اب رحم کر۔ مقام غور ہے کہ ایسے سخت وقت میں بھی اپنی ذات کو صراحتاً قابلِ رحم نہ قرار دیا بلکہ پروردگار کو ارحم الراحمین کہا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ میں قابلِ ترحم ہوں یا نہ ہوں تو بے شک ارحم الراحمین ہے اپنے رحم سے مجھے قابلِ ترحم بنا دے اور رحم فرما۔

وَاٰتَیْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ حضرت ایوب کی تمام اولاد یعنی سات بیٹے اور سات بیٹیاں مر گئی تھیں سب کو اللہ نے زندہ کر دیا اور اتنی ہی اولاد اور عنایت کی۔ آیت کا صاف صحیح مطلب یہی ہے۔ ابن عباس، ابن مسعود اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ بعض علماء نے کہا کہ مری ہوئی اولاد تو زندہ نہیں کی گئی تھی، مگر اول اولاد سے دو چند بچے اور دے دیئے گئے تھے۔ یہ قول ضعیف اور صراحت حدیث کے خلاف ہے۔ مختلف احادیث سے ثابت ہے کہ حضرت ایوب کو دوبارہ کامل تندرستی عطا کر دی گئی اور اموال بھی سابق کی طرح مرحمت ہو گئے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ہریرہ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ حضور اقدس نے ارشاد فرمایا جب اللہ نے ایوب کو عافیت دی تو ان پر سونے کی ٹڈیاں برسائیں۔ ایوبؑ نے ان کو ہاتھوں سے پکڑ کر کپڑے میں بھرنا شروع کیا۔ ندا آئی ایوب! کیا ابھی تو سیر نہیں ہوا؟ ایوب نے عرض کیا پروردگارا! تیری رحمت سے کون سیر ہو سکتا ہے۔ (رواہ البخاری والمسلم ایضاً)

رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِیْنَ۔ یعنی ایوبؑ کی انتہائی آزمائش و تکالیف کے بعد تندرستی، اولاد اور اموال عطا کرنے میں دو مصلحتیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ ایوب کی حالت قابلِ رحم ہو گئی تھی، اللہ نے اپنی طرف سے رحمت نازل کی۔ دوسرے یہ کہ عبادت گزار بندوں کی حوصلہ افزائی اور ترغیب بھی مقصود تھی تاکہ دوسرے لوگ صبر کے ساتھ عبادتِ الٰہی میں مستغرق رہیں اور کتنے ہی مصائب کا ہجوم ہو اللہ سے منہ نہ موڑیں۔ مرکزِ توجہ الٰہی کو ہی سمجھتے رہیں۔ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا۔ کوئی مقرب بندہ اللہ پر غصہ نہیں کر سکتا۔ انبیاء کا مرتبہ تو بہت ہی بلند ہے وہ خدا سے کیسے ناراض ہو سکتے ہیں اس لئے آیت کے یہ معنی ہرگز نہیں ہو سکتے کہ حضرت یونس خدا سے ناراض ہو کر چل دیئے تھے بلکہ آیت کا مطلب دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) حضرت یونس خدا سے ناراض ہو کر چل دیئے تھے اور یہ ناراضگی اللہ کی راہ میں تھی۔ انہوں نے بد دعا کی تھی اور یقین تھا کہ عذاب نازل ہو گا مگر عذاب ٹل گیا تو حضرت یونس کے دل میں کبیدگی پیدا ہوئی ادھر کسی نے ان کو یہ اطلاع بھی دے دی کہ قوم والے تمہاری تلاش میں ہیں اور سخت غضبناک ہیں۔ حضرت یونس کو یہ سن کر اور طیش آیا کہ ایک تو میری قوم والے میری نصیحت نہیں مانتے اور پھر اُلٹے مجھ ہی پر غضبناک ہیں اور چونکہ وحی کا انتظار کئے بغیر چل دیئے تھے، اس لئے عتابِ الٰہی میں ماخوذ ہوئے ورنہ قوم کو چھوڑ کر چل دینا کوئی سبب عتاب نہ تھا (کذا رواہ العوفی عن ابن عباس وذکرہ الخطیب فی السراج)

(۲) حضرت یونس مقرب بارگاہ تھے بطریق انبساط ان کو اللہ پر ناز ہوا۔ اس کی رحمت و کرم کے بھروسے پر ایسی حرکت کر بیٹھے جو خلاف ادب تھی۔ یہی انبساط موجب عتاب ہوا۔ میرے نزدیک صحیح مطلب وہی ہے جو خود اسی آیت میں بعد والے فقرے میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔ یعنی حضرت کی خطا اجتہادی تھی، وہ تبلیغ احکام اور بد دعا کرنے کے بعد سب سے الگ ہو گئے اور یقین کر لیا کہ اب میرا کام ختم ہو گیا۔ رسالت کا بار میرے سر سے اتر گیا، فرضِ تبلیغ پورا ہو گیا۔ آئندہ کوئی جدید فرض میرے ذمہ عائد نہ ہو گا۔ چلو میں نالائق قوم سے چھوٹ گیا۔ حالانکہ دوسری طرف نبی کی دعا قبول ہوئی تھی، اللہ کو ان پر رحم آگیا تھا۔ حضرت ایوبؑ کا فرض تھا کہ دوبارہ لوٹ کر جاتے، ندامت کے خیال کو دل سے دور کر دیتے اور تھوک دیتے، مگر انہوں نے ایسا نہ کیا، اس لئے عتاب میں مبتلا ہوئے اور اولوالعزم انبیاء کی فہرست میں آپ کا نام داخل نہ ہو سکا۔ خدا تعالیٰ نے اپنے حبیب محمد رسول اللہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ

فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ۔ معاویہ نے ابن عباسؓ سے کہا کہ کل آج رات میں، قرآن کی موجوں میں غرق ہوگیا اور سوا آپ کے پاس آنے کے رہائی کا اور کوئی راستہ نہ ملا۔ ابن عباسؓ نے وجہ دریافت کی۔ معاویہ نے آیت مذکورہ پڑھ کر دریافت کیا۔ کیا یونس پیغمبر کو یہ خیال ہوا تھا کہ ان پر خدا کو قدرت نہ ہوگی؟ ابن عباسؓ نے جواب دیا یہاں نقدر قدرت سے مشتق نہیں بلکہ قدر سے مشتق ہے جس کے معنی تنگی کے ہیں۔ اللہ نے فرمایا ہے۔ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ گویا اس وقت آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ یونس نے خیال کیا کہ اللہ ان کو تنگ نہیں کرے گا (یعنی مچھلی کے پیٹ میں یا کہیں اور) محبوس نہیں کرے گا۔ عطاء، مجاہد وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔ بعض لوگوں نے لَنۡ نَّقۡدِرَ کے معنی لَنۡ نَّضِيۡقَ ہی بیان کئے ہیں، مگر مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یونس نے قوم سے بھاگتے وقت یہ خیال کیا تھا کہ خدا تعالیٰ اب مجھے تنگ نہ پکڑے گا، مزید بار مجھ پر نہ ڈالے گا اب دوبارہ رسالت پر مقرر نہ کرے گا۔ ایک مرتبہ میں تبلیغ کرچکا دوبارہ فرض تبلیغ میرے ذمہ عائد نہ ہوگا۔

فِي الظُّلُمٰتِ۔ حضرت یونس کو تین تاریکیوں میں قید کیا گیا تھا۔ بحر ظلمات کی تاریکی، مچھلی کے پیٹ کی تاریکی، رات کی تاریکی۔ ابن مسعودؓ، ابن عباس، عمرو بن میمون، سعید بن جبیر، محمد بن کعب، ضحاک، حسن بصری اور قتادہ نے اسی طرح بیان کیا ہے۔ شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ عبد اللہ بن مسعودؓ کا قول ہے بحر اخضر کی ایک مچھلی کو اللہ نے حکم دیا تھا کہ سمندروں کو پھاڑ کر جائے اور بحیرہ میں پہنچ کر یونس کو نگل لے، لیکن یہ بھی حکم دے دیا تھا کہ یونس تیری خوراک نہیں ہے، اس کے گوشت پوست اور ہڈی کو صدمہ نہ پہنچے بلکہ تیرا پیٹ اس کا قید خانہ ہے۔ سعید بن ابی الحسن کا قول ہے کہ چالیس روز شکم ماہی میں رہے۔ (رواہ ابن جریر) عطاء کا قول ہے کہ سات روز رہے۔ عوف اعرابی نے کہا جب مچھلی نے یونس کو نگل لیا تو وہ اپنے کو مردہ یقین کرنے لگے، لیکن جب پاؤں میں ہلانے سے حرکت ہوئی تو اللہ کو پکارا۔ اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر پیٹ کے اندر رہے۔ واللہ اعلم۔

وَكَذٰلِكَ نُـنۡجِى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ۔ یہ فقرہ عام اہل ایمان کو گناہ سے استغفار کی رغبت دلانے کے لئے فرمایا۔ امام رازی نے جامع میں لکھا ہے کہ دعا کرنے کے لئے شرط یہ ہے کہ پہلے تو حمد الٰہی بیان کرے پھر تسبیح پڑھے پھر گناہوں کا اعتراف کرے پھر مغفرت کی دعا کرے۔ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو مسلمان دعا میں یہ الفاظ (دعائے یونس) کہے اور دعا کرے تو اس کی دعا ضرور قبول ہوگی (رواہ الترمذی والنسائی فی الیوم واللیلۃ وقد رواہ البیہقی والحاکم وابن ابی حاتم وغیرہم)

وَاَصۡلَحۡنَا لَهٗ زَوۡجَهٗ۔ ابن عباس، مجاہد اور سعید بن جبیر نے بیان کیا کہ اللہ نے زکریا کی بیوی کا بانجھ پن دور کر دیا۔ آیت کا یہی مطلب ہے۔ عطاء خراسانی اور سدی اور محمد بن کعب کہتے ہیں کہ زکریا کی بیوی زبان دراز تھی خدا نے اس کو خوش خلق کر دیا۔ یہ مطلب سیاق آیت کے خلاف ہے۔

اِنَّهُمۡ كَانُوۡا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ایک تقریر فرمائی تھی جس کے آخر میں فرمایا تھا لوگو! جب اللہ سے دعا کرو اور کچھ مانگو تو پورے طور پر گڑگڑا کر مانگو۔ دیکھو اللہ نے اپنے زکریا اور اس کے لوگوں کی تعریف سے اس آیت میں فرمایا:- اِنَّهُمۡ كَانُوۡا يُسٰرِعُوۡنَ فِى الۡخَيۡرٰتِ الخ۔ اس اثر سے معلوم ہوتا ہے کہ اِنَّهُمۡ میں ضمیر صرف حضرت زکریا اور یحییٰ اور یحییٰ کی والدہ کی طرف راجع ہے، لیکن اکثر مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جتنے انبیاء کا پہلے تذکرہ گذر گیا سب مراد ہیں اور یہ آیت تمام انبیاء کی مدح کا نچوڑ ہے۔

وَيَدۡعُوۡنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا۔ انبیاء حقائق شناس ہوتے ہیں۔ وہ خدا کی دونوں طاقتوں کو جانتے ہیں، اللہ کے غضب سے بھی واقف ہوتے ہیں اور رحمت سے بھی، اس لئے جہاں ان کو رحمت کی امید ہوتی ہے وہاں گرفت کا خوف بھی ہوتا ہے۔ سفیان ثوری کا قول ہے خوف سے مراد ہے اللہ کی عظمت وکبریائی کا خوف۔

لَنَا خٰشِعِيۡنَ۔ ابن عباس نے یہاں خشوع کے معنی تصدیق احکام الٰہیہ لکھے ہیں۔ مجاہد نے ایمان ولیقین، ابو العالیہ نے خوف لازم نے کہا خشوع اس خوف کو کہتے ہیں جو دل میں جما رہے کسی وقت دور نہ ہو۔ حسن، قتادہ، ضحاک، اور باقی علماء کے نزدیک خشوع سے مراد ہے تواضع، ذلت، مسکینی، عاجزی۔ مطلب یہ ہوگا کہ تمام انبیاء صرف خدا ہی سے ڈرتے، اسی کے سامنے اظہار ذلت وعجز کرتے اور اسی پر پختہ لازوال ایمان رکھتے ہیں۔ گویا خدا کے علاوہ ان کو کسی کا خوف نہیں ہوتا نہ کسی کو اعلیٰ و اکبر جانتے ہیں۔

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ یعنی دین فطرت ایک ہے، دین الٰہی ایک ہے، تمام پیغمبروں کا دین ایک ہے، عقائد اور اصول احکام

ایک ہیں، مقصد ایک ہے صرف فروعی اختلاف ہے۔ مصالح زمانے کے مطابق جزئیات کا معمولی اختلاف ہے، مگر لوگوں نے باہم پھوٹ ڈال کر دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ کوئی یہودیت پر اڑ گیا، کوئی عیسائیت پر، کوئی صابی بنا رہا کوئی بُت پرست۔ رسول پاکؐ نے ارشاد فرمایا تھا ہم گروہ انبیاء ہیں علاتی اولاد (کی طرح) ہم سب کا دین ایک ہے۔ یعنی جس طرح چند بھائیوں کا باپ ایک ہو اور مائیں جدا جدا ہوں اسی طرح انبیاء کی حالت ہے۔ دین سب کا ایک ہے، مگر شریعتیں یعنی ہدایت کے راستے اور مذہب کے فروعی احکام جدا جدا ہیں۔

مقصود بیان

حضرت ایوبؑ کی دعا ہم کو یہ تعلیم دے رہی ہے کہ اپنی تکلیف کا اظہار پروردگار کے سامنے کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے مگر ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی حالت کو قابلِ رحم قرار دینا بھی زیبا نہیں ہے بلکہ پروردگار کی رحمت عامہ پر نظر رکھنی لازم ہے۔ اپنے قصور کا اعتراف اور پروردگار کی رحمت کی اُمید یہ دو چیزیں دعا کا جزو ہیں۔ حضرت ایوب صبر سے جس نتیجے پر پہنچے اور جو ثمرہ آپ کو ملا اُس کے علاوہ تلقین صبر و شکر کے ایک بات یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ قادر مطلق ہے، اس کی کارسازی اسبابِ ظاہری کی محتاج نہیں، وہ کارسازی پر آتا ہے تو مُردوں کو بھی زندہ کر دیتا ہے، امیدِ شفا نہیں ہوتی، مگر وہ تندرست کر دیتا ہے۔ حضرت یونس کا قوم سے ناراض ہو کر بغیر پیغامِ وحی کے چلا جانا اور پھر گرفتارِ الم ہونا اور پھر دعا کرنا اور دعا قبول ہو کر نجات پانا ہم کو مندرجۂ ذیل تعلیم دیتا ہے:- (۱) آدمی کتنا ہی نیکوکار فرماں بردار ہو، مگر اس کو ادب کے درجہ پر ثابت قدم رہنا چاہیئے۔ عقل کے دائرہ سے نکل کر اپنے عشق پر مغرور ہو کر ناز کرنا کبھی محبوب حقیقی کی برہمی کا باعث ہو جاتا ہے۔ (۲) فریضۂ الٰہیہ ادا کرنے کے بعد بھی یہ یقین نہ کر لینا چاہیئے کہ ہم نے فرض ادا کر دیا اب کوئی فریضہ ہمارے ذمہ نہیں ہے۔ دیکھو حضرت یونس نے تبلیغ توحید کر دی اور اپنے کو سبکدوش خیال کر لیا اور یقین کر لیا کہ اب کوئی تنگی نہیں پڑے گی اور پروردگار کی طرف سے مزید بندش نہ ہوگی۔ فوراً عتاب میں گرفتار ہوئے (۳) اللہ کی گرفت کے طریقے لامحدود ہیں ہر طور پر خدا مواخذہ کر سکتا ہے۔ (۴) جب کوئی مصیبت پڑے اور رہائی کی امید منقطع ہو جائے تب بھی خدا کی ذات سے اُمید نہ توڑنی چاہیئے۔ خدا تعالیٰ ہر وقت مضطر کی دعا قبول فرماتا ہے۔ حضرت یونسؑ اور حضرت ایوبؑ کا قصہ ہم کو بتا رہا ہے کہ دنیا میں جس قدر مصائب، تکالیف، بیماریاں، بربادیاں، اولاد کی موت اور مالی تباہ کاریاں ہوتی ہیں سب حکمِ الٰہی سے ہوتی ہیں، لیکن آدمی پر مصائب کا نزول کبھی تو اپنے قصور کی پاداش میں ہوتا ہے اور کبھی محض آزمائشی ہوتا ہے پھر یہ بھی ہم کو سبق ملتا ہے کہ نیک بندوں کی گرفت بھی سخت ہوتی ہے اور فوراً ہو جاتی ہے، ان کو مہلت نہیں دی جاتی۔ حضرت یونس کی دعا ہم کو سکھا رہی ہے کہ دعا کرتے وقت سب سے پہلے اللہ کی توحید ذاتی کا اظہار پھر اس کی تقدیس و تسبیح کا بیان اور پھر اپنے قصور کا اعتراف ہونا چاہیئے۔ وَكَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ مصیبت کے وقت مضطر کی پکار کا قبول ہونا صرف حضرت یونسؑ کے لئے ہی مخصوص نہ تھا بلکہ جو کوئی قلب کی گہرائیوں سے اللہ کو پکارتا ہے اور اپنے قصور کا اعتراف کر کے نادم ہوتا ہے خدا اس کی پکار سنتا ہے۔ حضرت زکریا کی دعا بتا رہی ہے کہ بیٹا ملنے کی دعا کرنی ممنوع نہیں ہے بشرطیکہ نیت بخیر ہو۔ اصلاح دین کی نیت سے اگر اسباب دنیا کے لئے دعا کرے تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ آیت يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ تعلیم دے رہی ہے کہ نیکوکاری جہاں تک ممکن ہو سکے انسان کرے اور دل سے تصدیق و یقین بھی رکھے۔ ایمان و عمل صالح کے بعد امید نجات رکھنی چاہیئے، امید کے ساتھ خوف عذاب ہونا بھی لازم ہے۔ گویا آیت میں وعید اُن ہوا پرست بدعمل، بے ایمان گمراہوں کے لئے ہے جو اندھا دھند اللہ پر توکل کئے بیٹھے ہیں۔ بغیر عمل کے نتیجہ کے طالب ہیں، اُن جاہل صوفیوں کو بھی اس سے عبرت کا سبق حاصل کرنا چاہیئے جو کہتے ہیں کہ ہم کو محبت الٰہی کی طلب ہے۔ دوزخ کا خوف نہیں، عذاب کا ڈر نہیں۔ ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جلیل القدر انبیاء بھی خوف و امید سے خالی نہ تھے ان کو بھی عتاب الٰہی کا ہر وقت ڈر لگا رہتا تھا، باوجودیکہ درجات محبت میں وہ تمام اولیاء سے آگے تھے، مگر محبت کا نشہ ان کو عتاب کے خوف سے بے نیاز نہیں کر سکتا تھا۔ آیت اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً الخ بتا رہی ہے کہ دین الٰہی ایک ہی ہے۔ ہر شخص دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، تمام انبیاء نے دین توحید ہی کی تبلیغ کی، مگر ان کی اُمت والوں نے باہم پھوٹ ڈالی، ایک دین کے ہزاروں دین بنا لئے وغیرہ۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ○ وَحَرٰمٌ

جو شخص | بحالتِ ایمان | نیک عمل | کرے گا | تو اُس کی کوشش کی ناقدری نہ ہوگی | ہم بلاشبہ اس کو لکھ لیتے ہیں | اور ناممکن

عَلٰی قَرْیَۃٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ○ حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ

ہے اس بستی پر جس کو ہم نے ہلاک کر دیا کہ ہمارے پاس لوٹ کر نہ آئیں۔ یہاں تک کہ جب یاجوج ماجوج کو کھول دیا جائے گا اور وہ ہیں

كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ ○ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِیَ شَاخِصَۃٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ

بلندی سے دوڑتے آئیں گے اور قیامت کا وعدہ قریب آئے گا تو اس وقت یکایک کافروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی

كَفَرُوْا یٰوَیْلَنَا قَدْ كُنَّا فِیْ غَفْلَۃٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِیْنَ ○ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ

(اور کہیں گے) ہائے افسوس ہم اس کی طرف سے قطعی غفلت میں تھے بلاشبہ ہم ناحق پر تھے بلاشک تم اور وہ چیزیں جن کو اللہ

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ○ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَۃً مَّا

کے علاوہ پوجتے ہو سب دوزخ کا ایندھن ہیں تم سب دوزخ میں داخل ہو گے اگر حقیقت میں وہ معبود ہوتے تو دوزخ

وَرَدُوْهَا وَكُلٌّ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّهُمْ فِیْهَا لَا یَسْمَعُوْنَ ○ اِنَّ

میں نہ جاتے یہ سب ہمیشہ اسی میں رہیں گے وہاں یہ چلائیں گے اور خود کسی کی بات نہ سنیں گے جن

الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓی اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ○ لَا یَسْمَعُوْنَ

لوگوں کے لئے ہماری طرف سے بھلائی مقرر ہو چکی بلاشبہ دوزخ سے دور رہیں گے اس کی آہٹ کو بھی

حَسِیْسَهَا وَهُمْ فِیْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ○ لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ

نہ سنیں گے اور اپنی جی چاہی چیزوں میں ہمیشہ رہیں گے ان کو (قیامت کی) بڑی سے بڑی گھبراہٹ غمگین

وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَۃُ هٰذَا یَوْمُكُمُ الَّذِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○ یَوْمَ نَطْوِی السَّمَآءَ كَطَیِّ

نہ کرے گی اور ان کو فرشتے لینے آئیں گے یہ وہی تمہارا دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا جس طرح کہ ہم آسمانوں کو اس طرح لپیٹیں گے

السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ وَعْدًا عَلَیْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِیْنَ ○

جس طرح مضامین سمیت کاغذ جس طرح اول پیدائش کی ہم نے ابتدا کی تھی ہم اس کو دوبارہ کریں گے یہ وعدہ ہم پر لازم ہے ہم یقینی ایسا کریں گے

تفسیر گزشتہ آیت میں بتایا تھا کہ تمام انبیاء کا دین ایک ہی ہے لوگوں نے تفرقہ ڈال دیا ہے۔ اس آیت میں دین انبیاء کا ایک عام قاعدہ اور ضابطہ بیان کرتا ہے جس سے دین الٰہی کی پہچان ہر شخص کو ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ اول نمبر پر ایمان کامل ہونا ضروری ہے یعنی اللہ کو ذات وصفات میں واحد سمجھے۔ ملائکہ اور تمام انبیاء کو حق جانے، روز قیامت اور بعث جسمانی اور حشر ونشر اور ثواب وعذاب کا عقیدہ رکھے اور اللہ کی تمام کتابوں کو حق سمجھے اور دوسرا نمبر یہ ہے کہ نیک کام کرے یعنی وہ کام کرے اور ایسے کرے جن کو دنیا کے سلیم الطبع صحیح العقل انسان خواہش نفس

اجداد آبائی یا مذہبی تقلید سے علیحدہ ہو کر اچھا کہتے ہوں یا یوں کہو کہ جن کو آسمانی کتابوں میں اچھا کہا گیا ہو، گویا اس آیت میں تمام دنیا کے علمبرداران مذاہب کو دعوت دی ہے کہ جب تم دینِ الٰہی پر قائم رہنے کے مدعی ہو تو پھر محمد رسول اللہ صلعم کا کیوں انکار کرتے ہو۔ قرآن کو کتاب الٰہی کیوں نہیں مانتے یا وجہ دیگر قرآن اور خدا کا برگزیدہ رسول تمام انبیاء اور تمام آسمانی کتابوں کو حق بتاتا ہے اور پھر تم ایک دوسرے کے پیشواؤں کو کیوں برا کہتے ہو یہود حضرت عیسیٰؑ کو کیوں نہیں مانتے۔ انبیاء میں بہت سے لوگ تفریق کیوں کرتے ہیں۔ پھر نیکیوں سے کیوں روگردانی کرتے ہو۔ جو تعلیم تم کو نیکیاں سکھاتی اور برائیوں سے بچاتی ہے اُس پر کیوں نہیں چلتے۔ اس سے آگے قرب قیامت کے احوال کا بیان، روز آخرت کی ہولناکیاں، دوزخ کی لرزہ انگیز کیفیت، دوامی عذاب کی صراحت، بدکاروں کے عذاب اور نیکوں کے ثواب کا بیان کیا گیا ہے جس کو ہم تحلیل اجزاء کے ذیل میں مفصل بیان کریں گے۔ یہاں اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ شروع سے گزشتہ آیات تک پیغمبروں کے مختلف احوال، صبر و شکر، رضا و تسلیم، استقلال و پامردی، قوت ایمان اور شوکت و جلال کا بیان کیا گیا تھا، اس کے بعد وحدتِ دین کی صراحت کی پھر وحدتِ دین کا قاعدہ کلیہ بیان کرتے ہوئے ایمان و نیکی کی ترغیب دی اور یہی اصل مدعا تھا، گویا پیغمبروں کے تذکرے کا حاصل یہ تھا کہ جو لوگ نیکوکار، موحد، خدا ترس اور صابر و شاکر ہوتے ہیں ان کو دنیا میں تباہی سے ہم کنار ہونا پڑتا ہے۔ یہ تو ایمان و کفر اور نیکی و بدی کے دنیوی نتائج کا اظہار تھا۔ آیت حَرٰامٌ سے آخر تک توحید و شرک اور فرمان پذیری و معصیت کے اخروی ثمرات کا اظہار کیا گیا ہے تاکہ جو لوگ کوتاہ فہم اور کم سمجھ ہیں، جن کی نظریں زیادہ بلند نہیں ہیں وہ اپنی ہمتوں کو بلند کریں لیکن موجودہ ہمتوں کے موافق نیکی اور بدی کے دنیوی ثمرات دیکھ کر اچھائی اور ایمان کی طرف راغب ہوں اور گناہ و کفر سے نفرت کریں اور جو طبقہ دنیا کے عیش و راحت اور تکلیف و مصائب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے، یہاں کا دکھ سکھ اس کی نظر میں ہیچ ہے اور عالم فانی کے ماوراء اس کی دور رس نگاہ پہنچی ہوئی ہے اور وہ سعادت ابدی کا خواستگار ہے اس کو قیامت کے احوال، نیکیوں کی اچھی جزا اور بروں کی دردناک سزا سنا کر ایمان و عمل صالح کی رغبت پیدا ہو اور کفر و معصیت سے وہ بیزار ہو جائے۔

تحلیلِ اجزاء

وَحَرٰامٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يَرْجِعُوْنَ۔ اس آیت کا تفسیری مطلب مفسرین نے مختلف طور پر بیان کیا ہے۔ بقاعی نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ ممنوع ہے ایسی بستی کے لئے جس کو ہم نے مار ڈالا وہ ہماری طرف کو لوٹ کر نہ آئیں یعنی جس بستی کو خدا نے مار ڈالا وہ لوٹ کر خدا کے پاس ضرور جائے گی۔ گویا اس سے کفار کے اس گمان کا رد کرنا مقصود ہے جس میں وہ موت کو عدم مطلق جانتے تھے اور کہتے تھے کہ مرنے کے بعد آدمی نیست و نابود ہو جاتا ہے اور خاک میں مل جاتا ہے دوبارہ پھر اس کو زندگی نصیب نہ ہوگی بیضاوی نے اسی کے قریب مطلب بیان کیا ہے مگر لوٹ کر جانے سے حساب و جزا کے لئے لوٹ کر جانا مراد لیا ہے، یعنی جو لوگ مر جاتے ہیں ان کو حساب و جزا کے لئے ضرور جانا ہوگا نہ جانا ممنوع ہے۔ زمخشری نے اس طرح مطلب بیان کیا ہے کہ جن لوگوں کو حالت کفر پر ہلاک کرتے کا ہم نے عزم کر لیا ہے ان کے لئے کفر سے اسلام کی طرف لوٹ کر آنا حرام ہے۔ اس صورت میں ہلاک کرنے سے مراد ہوگا ہلاک کرنے کا ارادہ کرنا اور لَا يَرْجِعُوْنَ میں کلمۂ نفی کو زائد ماننا پڑے گا۔ خطیب نے سراج میں اول معنی کو پسند کیا ہے۔ شیخ جلال محلی نے لا کو زائد قرار دے کر یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جن لوگوں کو خدا نے ہلاک کر دیا ان کے لئے دوبارہ لوٹ کر دنیا میں آنا ممنوع ہے۔ یہ مطلب بالکل صاف ہے اور رجوع سے رجوع الی الدنیا مراد ہے۔ گویا اس مطلب پر عقیدۂ تناسخ کی تردید نکلتی ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ابن عباسؓ کا یہی قول ہے۔ امام باقر، قتادہ اور کثیر علماء نے یہی تفسیر کی ہے۔

مفسر معالم نے لکھا ہے کہ حرام بمعنی واجب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس بستی والوں کو ہلاک کرنے کا ہم نے حکم دے دیا واجب ہے کہ ہم ان کے اعمال قبول نہ کریں کیونکہ وہ حق کی طرف کبھی رجوع نہ کریں گے اور کبھی توبہ نہ کریں گے۔ میرے نزدیک شیخ جلال محلی کا مطلب زیادہ واضح اور صحیح ہے۔

حَتّٰى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ۔ یہ عدم رجوع کی انتہا ہے۔ یعنی کفر سے اسلام کی طرف یا مرنے کے بعد دنیا کی طرف وہ قیامت تک نہیں لوٹیں گے، ان کا لوٹنا محال ہے۔ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ یاجوج ماجوج کے کھلنے سے مراد ہے یاجوج و ماجوج کو بند رکھنے والی دیوار کا کھل جانا جس کو ذوالقرنین نے بنایا تھا اور جس کی تحقیق ذوالقرنین کے بیان میں ہم لکھ آئے ہیں۔ مفسر سراج نے لکھا ہے کہ حذیفہ بن یمانؓ کہتے ہیں ایک روز ہم لوگ قیامت کا تذکرہ کر رہے تھے۔ فرمایا قیامت برپا نہ ہوگی جب تک تم دس نشانیاں اس سے پہلے نہ دیکھ لوگے۔ اس کی

بعد حضورؐ نے ذکر کیا دجال کو، دخان کو، دابۃ الارض کو، مغرب سے آفتاب کے طلوع کو، عیسیٰؑ ابن مریم کے نزول کو، یاجوج ماجوج کے خروج کو اور تین مرتبہ زمین کے دھنس جانے کو، ایک بار مشرق میں، ایک بار مغرب میں اور ایک بار جزیرۂ عرب میں اور آخر میں ایک آگ کا ذکر فرمایا جو یمن سے نکلے گی اور لوگوں کو میدانِ حشر کی طرف ہنکا کر لے جائے گی۔ یاجوج ماجوج کے خروج کا تذکرہ بکثرت احادیث و آثار میں آیا ہے۔ ابن کثیر نے بہت روایات نقل کی ہیں، ہم بخوف تطویل ان کو نقل نہیں کرتے۔

اَبْصَارُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج ماجوج کے خروج اور پھیلاؤ کو دیکھ کر اور قیامت کی دوسری نشانیاں پیشِ نظر جان کر صرف کفار کو حسرت و افسوس ہوگا، اہلِ ایمان کو کوئی اندیشہ نہ ہوگا۔ کفار شروع میں تو اپنی لاعلمی اور غفلت کا اظہار کر کے افسوس کریں گے پھر خود ہی پہلے قول سے رجوع کر کے اپنے آپ کو ظالم قرار دیں گے۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ۔ ماتعبدون سے مراد وہ مخلوق ہے جو ذی عقل نہیں جیسے لکڑی پتھر مٹی یا دوسری معدنی چیزوں کے بت جیسے ستارے، آگ وغیرہ۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ اس سے کفار قریش کے معبود یعنی لکڑی پتھر اور معدنی چیزوں کے ڈھالے ہوئے بت ہی مراد ہیں۔ بہرحال ذی عقل مخلوق اس میں داخل نہیں۔ فرشتے، عزیر، عیسیٰ اور بعض مومن جن خارج ہیں۔ کیونکہ لفظ مَا کا استعمال عربی کلام میں غیر ذی عقل کے لئے ہوتا ہے۔ کفار کے معبودوں کو ان کے ساتھ جہنم میں اس لئے ڈالا جائے گا کہ اپنے معبودوں کو جلتا دیکھ کر ان کی حسرت میں مزید اضافہ ہو۔

وَهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ۔ اس سے مراد یا تو یہ ہے کہ کوئی کلمۂ خیر یا شفاعت و رہائی کے الفاظ نہ سنیں گے یا یہ مراد ہے کہ دوزخ کے جوش و خروش میں کچھ سنائی نہ دے گا۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ جب جہنم کے اندر صرف وہی لوگ رہ جائیں گے جن کو ہمیشہ دوزخ میں رہنا ہے تو آگ کی کیلوں میں بند کر کے آگ سے بھر دیا جائے گا۔ پھر آپ نے یہی آیت پڑھی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ الخ۔ پہلی آیت اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ الخ میں کفار کو تنبیہ کیا تھا کہ تم اور تمہارے معبود سب جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ اس پر ابن الزبعری بولا کہ عزیرؑ اور عیسیٰؑ اور ملائکہ کی بھی تو پرستش ہوتی ہے اور لوگوں نے اللہ کے سوا ان کو بھی تو معبود بنایا ہے۔ قولِ مذکور کی تردید میں یہ آیت نازل ہوئی کہ ہمارے جو بندے شرک سے بیزار اور کفر سے منع کرنے والے تھے ان کو دوزخ سے کیا واسطہ وہ اس سے الگ رہیں گے۔ درحقیقت یہ ابن الزبعری کی غلط فہمی تھی ورنہ وَمَا تَعْبُدُوْنَ کا لفظ لغت عربی میں انسان اور ملائکہ کو شامل ہی نہیں ہے۔ عزیرؑ، عیسیٰؑ اور ملائکہ کا دوزخ میں داخل ہونا اس سے سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

مِنَّا الْحُسْنٰى۔ عکرمہ کے نزدیک حسنیٰ سے رحمت اور دوسرے علماء کے نزدیک سعادت مراد ہے۔ مطلب ایک ہی ہے۔

لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا۔ یعنی کفار کے بدنوں کے جلنے کی جو آواز ہوگی اہلِ رحمت اس کو نہ سنیں گے اور وہ مکروہ آواز ان کے کانوں میں بھی نہ پہنچے گی۔ (ابن کثیر)

فِيْ مَا اشْتَهَتْ۔ یہ لفظ عام ہے ہر قسم کی نعمت کو شامل ہے۔ طبائع مختلف ہیں اور ہر شخص کی اشتہار جدا ہے۔ ہر شخص کی مرغوبات کا تذکرہ ناممکن یا موجب طوالت تھا، اس لئے مجمل لفظ بول دیا۔

اَلْفَزَعُ الْاَكْبَرُ۔ ابن عباسؓ نے فرمایا فزع اکبر سے مراد ہے دوبارہ صور پھونکنا۔ بعض علماء نے کہا فزع اکبر سے وہ وقت مراد ہے جب ندا ہوگی کہ اے دوزخیو! اب موت نہ آئے گی یہیں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ حدیث مرفوع ہے کہ تین گروہ فزع اکبر سے محفوظ رہیں گے۔ وہ امام جس کی امامت سے لوگ خوش رہے وہ شخص جو ہر روز و شب اذان دیتا رہا، وہ غلام جس نے اللہ کا بھی حق ادا کیا اور اپنے آقاؤں کا بھی (رواہ الترمذی) اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ یہ تین گروہ بھی فزع اکبر سے محفوظ رہیں گے۔ یہ مطلب نہیں کہ ان کے سوا وہ سب گروہ فزع اکبر میں مبتلا ہوں گے۔ ابن عباسؓ نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا یہ لوگ اولیاء اللہ ہیں کہ برق سے زیادہ تیز پُل صراط سے گزر جائیں گے اور جہنم میں کفار اوندھے منہ پڑے رہ جائیں گے۔ مؤخر الذکر روایات سے ثابت ہوتا ہے اور ابن کثیر نے بھی اس کی صراحت کی ہے کہ ابن الزبعری کے جواب میں عیسیٰ اور عزیر اور ملائکہ کو مستثنیٰ کرنے کے لئے اس آیت کا نزول نہیں ہوا بلکہ عام اہلِ جنت کی بابت یہ آیت نازل ہوئی، لیکن اکثر مفسرین کا جو قول تھا وہ ہم اوپر بیان کر چکے، کیونکہ تخصیص مورد عموم حکم کا انکار نہیں کرتی ہے یہ ہو سکتا ہے

کہ عیسیٰ اور عزیز کے حق میں آیت کا نزول ہوا، مگر تمام اہلِ جنت اس میں بالتبع شامل ہوں۔ ضحاک اور سعید بن جبیر وغیرہ نے چاند سورج کو اہلِ استثنیٰ میں داخل کیا ہے، لیکن اس روایت میں ضعف و غرابت ہے۔ کیونکہ چاند و سورج کا بے نور ہو جانا ان کے لئے عذاب نہیں۔

یَوۡمَ نَطۡوِی السَّمَآءَ۔ اس آیت کے مضمون کی تائید ایک اور آیت سے ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ **وَالسَّمٰوٰتُ مَطۡوِیّٰتٌۢ بِیَمِیۡنِہٖ** بخاری نے بروایت ابن عمرؓ مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ قیامت کے روز تمام زمین اس کی ایک مٹھی میں ہوگی اور اس کے دائیں ہاتھ میں تمام آسمان لپٹے ہوں گے۔ سوائے مجسمہ فرقہ کے تمام مدعیان اسلام کا اتفاق ہے کہ یہ اور اس قسم کے تمام الفاظ ظاہر معانی پر محمول نہیں ہیں بلکہ بطور کنایہ یا بطور استعارہ استعمال کئے گئے ہیں۔ مخلوق کی طرح نہ اللہ کی مٹھی ہے نہ ہاتھ نہ دیگر جسمانی اعضاء۔ اس قسم کے الفاظ سے مراد تصرف کامل، اقتدار اور اختیار کا اظہار ہے۔

کَطَیِّ السِّجِلِّ۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے کہ سجل کا اطلاق لکھنے والوں پر بھی ہوتا ہے اور جو چیز لکھی جائے (یعنی کاغذ وغیرہ) اس کو بھی کہتے ہیں۔ یہاں سجل سے مراد مکتوب ہے۔ علمائے محققین نے یہی صراحت کی ہے۔ لیکن ابن کثیر نے لکھا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں سجل ایک فرشتہ ہے۔ ابن ابی حاتم نے باسنادِ خود ابن عمرؓ کا قول بیان کیا ہے کہ سجل ایک فرشتہ ہے۔ جب کسی بندے کی دعائے مغفرت اوپر چڑھائی جاتی ہے تو سجل کو لکھ لینے کا حکم ہوتا ہے (رواہ ابن جریر) ابن ابی حاتم نے یہ بھی کہا ہے کہ ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین بن علی سے ثابت ہے کہ سجل ایک فرشتہ ہے۔ سدی نے اس آیت کی تفسیر میں کہا کہ سجل ایک فرشتہ ہے جو نامہائے اعمال پر مؤکل ہے۔ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو اس کا نامۂ اعمال سجل کے پاس آتا ہے وہ اس کو لے کر قیامت تک کے لئے رکھ لیتا ہے۔ شیخ جلال الدین محلی نے بھی اسی معنی کو پسند کیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سجل اگر فرشتہ کا نام بھی ہو تب بھی یہ مطلب یہاں مناسب نہیں۔ کیونکہ تشبیہ سمجھانے کے لئے دی جاتی ہے اور مشبہ بہ ایسی چیز ہوتی ہے جس سے لوگ واقف ہوں اور بیشتر اہلِ تفسیر و اربابِ تحقیق کو معلوم نہیں کہ سجل کیسا فرشتہ ہے نہ احادیث میں اس کا ذکر آیا ہے نہ عام آثارِ صحابہ میں اس کا تذکرہ ہے بلکہ سجل کا اعمال ناموں کو طے کرنا تو کسی کو بھی معلوم نہیں، نہ کسی نے اعمال نامے اور ان کا تہ کیا جانا دیکھا، اس لئے سجل سے فرشتہ مراد لینا کسی طرح زیبا نہیں۔

بعض لوگ قائل ہیں کہ سجل ایک صحابی کا نام تھا جو حضور اقدسؐ کا کاتب تھا۔ اس کے متعلق لوگ چند آثار بھی نقل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ابو داؤد و نسائیؒ نے بھی نوح بن قیس کی روایت سے اس کو نقل کیا ہے (کذا ذکرہ ابن کثیر) لیکن ابن جریر اور ابن کثیر نے ایسے آثار کو منکر موضوع اور غیر صحیح قرار دیا ہے اور صراحت کر دی ہے کہ سجل کسی صحابی کا نام نہ تھا۔ حاصل یہ ہے کہ سجل سے مراد مکتوب ہے یا کاتب۔

مقصود بیان

۔۔ کوئی عمل بغیر ایمان کے خدا کے ہاں مقبول نہیں، بحالتِ ایمان ہر سعی قابل قبول ہے۔ اللہ تمام اعمال کو لکھ لیتا ہے یعنی اعمال غیبی مخلوق بحکم خداوندی ہر عمل کو قیامت کے دن سامنے لانے کے لئے محفوظ رکھتی ہے۔ جو لوگ ہلاک ہو گئے پھر دوبارہ لوٹ کر دنیا میں نہ آئیں گے یعنی آواگون اور تناسخ کا عقیدہ باطل ہے۔ آیۂ صراحت کرتی مقصود ہے کہ کفر و اسلام اور ایمان و شرک ازلی چیزیں ہیں۔ مشیت الٰہی میں جس شخص کا خاتمہ کفر پر لکھا ہے وہ کبھی مسلمان نہ ہوگا۔ قیامت کے قریب یاجوج ماجوج کا خروج حق ہے۔ جو دیوار یاجوج ماجوج کو روکے ہوئے ہے قیامت کے قریب وہ شق ہو جائے گی۔ کفار اور ان کے معبود دوزخ میں جائیں گے اور ہمیشہ رہیں گے۔ دوزخ کے اندر کافروں کو کچھ سنائی نہ دے گا۔ بڑی آگ ہوگی اور اس کی شعلہ انگیزی میں کان پڑی آواز نہ سنائی دے گی۔ عزیر، عیسیٰ اور صلحاء و اولیاء جن کی پرستش جہلاء کرتے ہیں اُن کی قبروں کو چادریں چڑھاتے اور منتیں مانتے ہیں۔ جاہلوں کے ان حرام افعال سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ جہلاء کے افعال کی ان سے باز پرس نہ ہوگی۔ قیامت کے دن آسمانوں کو لپیٹ دیا جائے گا یعنی ان آسمانوں کی بجائے دوسرے آسمان ہوں گے اور از سرِ نو دنیا کی تخلیق ہوگی اور جس طرح آغاز تخلیق کے وقت کوئی نقشہ پیشِ نظر نہ تھا اسی طرح قیامت کے دن تمام دنیا کی صورتیں اور شکلیں از سرِ نو بنا دی جائیں گی۔ گزشتہ اشکال کو سامنے رکھ کر تخلیق نہ کی جائے گی۔ **کَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِیۡدُہٗ** کے الفاظ اپنے اندر ایک پُر شوکت دلیل رکھتے ہیں اور منکرین قیامت کے قول کا پُر زور رد ان سے مستنبط ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ تخلیق کائنات میں تو کسی کو شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ موجودہ صورتیں قدیم نہیں ہیں بلکہ ان سے پہلے دوسری صورتیں تھیں، ہاں مادہ وہی باقی ہے تو اب مادہ کا آغاز اور حدوث مانا جائے یا نہ مانا جائے۔ بہرحال اتنا ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس مادہ پر مختلف صورتیں آتی رہتی ہیں اور ایک ہی مادہ مختلف صورتوں کا جامہ پہنتا اور اتارتا رہتا ہے اور موجودہ صورتوں کا کوئی نقشہ پہلے سے موجود

نہ تھا جب کہ یہ تمام امور واجب التسلیم بلکہ مسلمہ ہیں تو پھر تخلیق ثانوی میں کیوں شبہ کیا جاتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ قیامت کے دن انہی صورتیں پیدا کرے اور مادہ و روح وہی ہوں جو دنیا میں تھے۔ عذاب ثواب سب اسی مادہ و روح کو ہو جس نے دنیا میں اچھے برے کام سرانجام دیئے تھے۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۝ إِنَّ

ہم زبور میں نصیحت کے بعد لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے اس (قرآن)

فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِقَوْمٍ عَابِدِينَ ۝ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ ۝ قُلْ إِنَّمَا يُوحَىٰ

میں عبادت کرنے والی قوم کے لئے کفایت ہے (اے نبی) سارے جہان کے لئے ہم نے تم کو محض رحمت (مجسم) بنا کر بھیجا ہے تم کہدو کہ میرے پاس

إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَهَلْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ آذَنْتُكُمْ عَلَىٰ

وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے تو کیا اب بھی تم گردن جھکاتے ہو اس پر بھی اگر وہ منھ موڑیں تو تم کہہ دو کہ میں نے یکساں طور

سَوَاءٍ ۖ وَإِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ أَمْ بَعِيدٌ مَا تُوعَدُونَ ۝ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ

پر خبر دیدی میں نہیں جانتا کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ قریب ہے یا دور واقعی اللہ پکار کی بات کو جانتا ہے

وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُونَ ۝ وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ ۝ قَالَ

اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اس کو بھی جانتا ہے اور میں نہیں واقف شاید یہ (مہلت) تمہارا امتحان ہو اور ایک خاص وقت تک فائدہ پہنچانا (مقصود ہو) پیغمبر نے

رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ ۗ وَرَبُّنَا الرَّحْمَٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلَىٰ مَا تَصِفُونَ ۝ ع

کہا میرے رب حق کے موافق فیصلہ فرمادے اور ہمارا پروردگار رحمٰن ہے جس سے اُن باتوں پر مدد مانگی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو

تفسیر اس سطح زمین پر جب سے انسان آباد ہے خیر و شر، صلاح و فساد اور نیکی بدی ساتھ ساتھ چلی آتی ہے۔ ہر زمانے میں کچھ لوگ نیک اور اکثر بدکار رہے ہیں۔ جب کبھی بدکاری کا زیادہ زور ہو گیا اور روئے زمین پر خدا کی پرستش کرنے والا کوئی نہ رہا یا کوئی شاذ و نادر رہ گیا اور زمین فسق و فجور اور ظلم و ستم سے بھر گئی تو اس وقت خدا تعالیٰ نے اپنے کسی خاص بندے کو پیغمبر بنا کر کسی خاص قوم یا کسی خاص ملک کی ہدایت کے لئے بھیج دیا۔ پیغمبر نے حسب الحکم نور ہدایت سے دلوں کو روشن کیا، توحید کی روشنی پھیلائی۔ نیک کام کرنے کی تعلیم دی اور مدت زندگانی پوری کرکے پردہ پوش ہو گیا، لیکن تین قوانین دنیا میں آغاز تخلیق انسانی سے عام رہے ہیں: کسی نبی کو تمام دنیا اور کل انسانوں کی ہدایت کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ (۲) کوئی پیغمبر اپنی تبلیغ میں ناکام نہیں رہا۔ ہزاروں پیغمبر کافروں کے ہاتھوں سے شہید ہوئے، مگر دینی نصرت و فتح انہیں کو حاصل رہی، اُن کا دین پھیل کر ضرور رہا خواہ ان کی زندگی میں یا وفات کے بعد (۳) جب کبھی کسی کامل الایمان کامل الفلاح بندے کا مقابلہ کسی کافر سے کسی خاص ملک کے متعلق ہوا اور مومن کامل نے اس ملک سے ظلم کی بیخ کنی کرنی چاہی تو انجام کار غلبہ اہل ایمان کا ہوا۔ ظلم کا استیصال ہو گیا، اس سرزمین کی حکومت مومنین یا صلحاء کے ہاتھوں میں آگئی۔ اگرچہ کل روئے زمین پر کبھی اہل ایمان کا تسلط نہیں رہا، مگر جس خطہ میں وہ پیدا ہوئے اور جہاں تبلیغ کی وہاں ضرور تسلط ہو گیا۔ چند روز کے لئے عارضی شکست ہوئی، مگر آخر میں فتح حاصل ہو گئی۔ حسب دستور قدیم حضرت عیسیٰ کے بعد جب اللہ کی زمین انسانوں کے ظلم و ستم اور کفر و شرک کی تاریکیوں سے سیاہ پڑ گئی تو حضور اقدس محمد رسول اللہ تشریف لائے۔ گزشتہ انبیاء نے انفرادی طور پر جس جز کی تبلیغ کی تھی اس کی تبلیغ

حضورؐ نے تنہا کی، انبیاء نے توحید کا اعلان کیا تھا حضورؐ نے بھی اعلان کیا، انبیاء نے عمل صالح کی ترغیب دی تھی حضورؐ نے بھی ایسا ہی کیا۔ انبیاء نے عذاب کا خوف اور جنت کی بشارت دی تھی حضورؐ نے بھی ترہیب و ترغیب سے کام لیا مگر ان سب سے علیحدہ اور سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ کل روئے زمین کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ کل دنیا کو تباہی سے بچانے کے لئے بوحی الٰہی ایسا قانون پیش کیا جو مشرق، مغرب، ایشیا، آسٹریلیا، افریقہ اور امریکہ غرض کل دنیا کے لئے یکساں مفید ہے اور قیامت اس کے افادہ میں کمی نہیں۔ اقوام میں انقلاب ہو جائے، رسم و رواج بدل جائیں، زبان کا اختلاف ہو، رنگ جدا ہو، صورتیں متغیر ہوں، مگر قانون کی افادی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آ سکتا۔ حضورؐ نے اس کے ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا کہ قیامت تک کے لئے یہ قانون اٹل اور ناقابل تنسیخ ہے۔ جو لوگ اس پر چلیں گے اور کامل طور پر اس کے موافق اپنے نفس کی درستگی اور عالم کی اصلاح کریں گے وہ ہمیشہ رہیں گے یعنی جس ملک میں رہتے ہوں گے وہاں کی حکومت انہی کی ہوگی، کفار ان کے مقابلے پر ذلیل ہوں گے، لیکن اگر دل سے اس ہدایت تامہ کی پیروی نہ کی اور اسلامی گھڑی کا کوئی پرزہ خراب رہ گیا تو پھر غالب و مغلوب اور عزیز و ذلیل ہونے کی کوئی شکایت نہیں۔ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ رسول پاکؐ تمام عالم کے لئے رحمت تھے یعنی حضورؐ نے دنیا کو ایسا درسِ ہدایت دیا اور تمام اہل عالم کے سامنے ایسا قانون پیش کیا کہ جو بھی اس کو مانے اور اس کی ہدایت پر چلے وہ کامیاب و بامراد ہو سکتا ہے۔ عجمی ہو یا عربی، مغربی ہو یا مشرقی، گورا ہو یا کالا، ادنیٰ ہو یا اعلیٰ کسی کو قرآن سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا حق نہیں، اس لئے حضورؐ والا کو رحمۃ للعالمین فرمایا۔ دوسرے انبیاء چونکہ اپنی اپنی قوم کے لئے ہادی تھے، اس لئے وہ کل عالم کے لئے رحمت نہیں ہو سکتے تھے صرف اپنی قوم کے لئے رحمت تھے اور نہ ان کے پیش کردہ قانون میں یہ صلاحیت تھی کہ قیامت تک کی تمام ضروریات کو پورا کر سکے اور جوں کا توں اپنی اصلی شکل پر قائم رہے۔ ہاں قرآن اور صرف قرآن ہی ایسا ہدایت نامہ تھا جو اپنی شکل پر رہتے ہوئے تمام دنیا کے لئے پیامِ ہدایت ہے، درسِ نصیحت ہے، ضابطۂ عمل ہے، قانونِ اٹل ہے۔ اسی مضمون کو صراحتاً اور ضمناً آیاتِ مذکورہ میں بیان فرمایا ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ لوحِ محفوظ کے بعد ہم نے تمام آسمانی کتابوں میں یہ اٹل قانون لکھ دیا ہے کہ جو لوگ کامل الصلاح اور تام العمل ہوں گے زمین پر انہی کی حکومت ہوگی۔ جو زمین ان کا مسکن، مولد اور میدانِ تبلیغ ہوگی وہاں انجام کار ان کی حکومت ہوگی۔ یہ قانون عام تھا اور عبادت گزار فرماں بردار بندوں کے لئے دینی سعادت و نجات کے علاوہ دنیوی کامرانی و نصرت کی بھی بشارت اس میں موجود تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انبیاء آئے اور ان کو نصرت و کامرانی حاصل ہوئی۔ پھر جب آخر دور آیا تو (اے محمدؐ) ہم نے تم کو کل عالم کے لئے باعثِ رحمت بنا کر بھیجا کسی حصۂ زمین کی تخصیص نہیں کی۔ لہٰذا تم توحیدِ الٰہی کا عمومی اعلان کر دو۔ جو مانے مانے اور کٹ حجتی کرے تو اس سے کہہ دو کہ میرا کام اطلاع دینا ہے۔ جزا سزا کا دن ضرور آئے گا۔ کب آئے گا، کس تاریخ کو آئے گا، کس سال میں آئے گا یہ مجھے معلوم نہیں۔ خدا ہی جانے کب آئے گا۔ تم کو اپنی زندگی سنوارنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ یہ دنیوی زندگی اس کی مہلت اور اس کا عیش طرب تمہارے لئے امتحان ہو، اللہ کی آزمائش ہو اور جب آزمائش کا وقت ختم ہو جائے تو تمہاری گرفت کر لی جائے۔ الغرض کفار نے ہدایت رسول کو نہ مانا، سرکشی کی اور کج روی اختیار کی۔ اس وقت رسول اللہؐ نے آخری فیصلہ کی دعا کی اور پروردگار سے عرض کیا کہ میرا ان کا آخری فیصلہ کر دے۔ چنانچہ فیصلہ کر دیا گیا۔ جنگ بدر فیصلہ کا دن تھا جبکہ کافروں کی شان و شوکت اور کل طاقت و تعداد خاک میں مل گئی اور اسلام کا بول بالا ہو گیا۔

تحلیلِ اجزاء

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ۔ سعید بن جبیر، مجاہد، مقاتل اور ابن زید کا قول ہے کہ زبور سے انبیائے سابقین کی تمام کتابیں ہیں اور ذکر سے مراد لوحِ محفوظ ہے۔ یعنی لوحِ محفوظ میں اور تمام آسمانی کتابوں میں (لوحِ محفوظ سے نقل ہو کر آئی ہیں) ہم نے لکھ دیا تھا کہ کسی کو زمین کی حکومت و وراثت نہیں مل سکتی۔ جو کامل الصلاح ہوگا وہی زمین کا حاکم ہوگا۔ قتادہ اور شعبی کہتے ہیں کہ زبور سے مراد قرآن اور ذکر سے مراد توریت ہے یعنی تورات اور قرآن دونوں میں حکم مذکور موجود ہے اور ہو سکتا ہے کہ زبور سے مراد حضرت داؤدؑ کی کتاب اور ذکر سے مراد نصیحت ہو یعنی نصیحت کے بعد ہم نے زبورِ داؤدؑ میں حکم مذکور بھی لکھ دیا تھا۔ ۳۷ زبور، درس ۹ اور ۱۱ میں بھی یہی مضمون مذکور ہے اور عہد عتیق و جدید کی کتابوں میں اس کی صراحت پائی جاتی ہے۔ ابن عباسؓ، حسن بصری اور قتادہ و شعبی کے ایک قول میں آیا ہے کہ زبور سے مراد کتابِ داؤدؑ اور ذکر سے مراد توریت ہے۔ اوّل الذکر قول کو زید بن اسلم، ابن جریر، بیضاوی، خازن، ابو حیان اور ابو السعود وغیرہ نے پسند کیا۔

أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ۔ ارض سے کون سی زمین اور الصالحون سے کون طبقہ مراد ہے؟ اس کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہیں۔

(۱) اکثر علماء کا قول ہے کہ زمین سے عام زمین مراد ہے خواہ دنیا کی ہو یا جنت کی۔ اس قول کی تائید مختلف آیات سے ہوتی ہے۔ ایک آیت ہے۔ إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ۔ یعنی دنیوی زندگانی میں بھی اور قیامت کے دن بھی ہم اپنے پیغمبروں کی اور اہلِ ایمان کی مدد کریں گے۔ ایک اور آیت میں آیا ہے۔ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ۔ یعنی تم میں سے جو اہلِ ایمان اور نیکوکار ہیں ان سے زمین کی خلافت کا خدا نے وعدہ کر لیا ہے۔ جس طرح ان کے اسلاف کو زمین کی خلافت دی تھی اور یہ بھی وعدہ کر لیا ہے کہ اپنے پسندیدہ دین کو ثبات اور با تمکین بھی کرے گا۔ ابن کثیر کا میلان اسی قول کی طرف ہے، لیکن چونکہ ہمیشہ زمین پر عام تسلط کفار کا رہا ہے اور اب بھی ہے اور غلبۂ اسلام کے وقت بھی اس ربع مسکون کی زیادہ حکومت کفار ہی کے قبضہ میں تھی، اس لئے بعض حضرات کو مطلب مذکور کی صداقت میں شک ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ ان کی کوتاہ فہمی ہے۔ انہوں نے الصالحون سے عام نیکوکار مراد لئے اور چونکہ عام نیکوکاروں کو کفار پر غلبہ شاذ و نادر ہی حاصل ہوتا ہے، اس لئے اعتراض کر بیٹھے۔ بات یہ ہے کہ الصالحون میں الف لام عہدی ہے اور اس سے مراد انبیاء و رسل اور ان کے ساتھ والی کامل الایمان، کامل الصلاح جماعت ہے۔ اگر اہلِ ایمان کا گروہ کامل الایمان ہو جائے اور اسلام کے کل ضوابط و قوانین کو لائحہ عمل بنا لے اور خواہش نفس کو دخل نہ دے اور دنیا میں عدل قائم کرنے کے لئے کھڑا ہو جائے تو یقیناً اسی کو فتح و نصرت حاصل ہوگی۔ تاریخ ایسی کوئی نظیر نہیں پیش کر سکتی کہ کامل اہلِ صلاح اپنی کوششوں میں ناکام رہے ہوں۔ اس کے علاوہ الارض سے کل روئے زمین کس طرح لے لیا۔ اس میں استغراقی الف لام نہیں ہے بلکہ یہاں بھی الف لام عہد کا ہے اور مراد وہ سرزمین ہے جہاں اہلِ حق نے تبلیغ کرنی شروع کی۔ انبیاء، صلحاء اور دیگر علمبرداران حق نے جس خطۂ زمین پر اعلانِ صداقت کیا (اگر ان کے اندر اصلاح تھی اور ہوائے نفس کی آمیزش نہ تھی اور وہ دنیوی تعلّی کے طالب نہ تھے) تو ضرور ان کو غلبہ، فوقیت اور فتح حاصل ہوئی اور اب بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں خصوصاً اور عام دنیا میں عموماً کفار کا زور صرف اس لئے ہے کہ اسلام کا نام لینے والوں نے اسلام کے اکثر قوانین کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ نماز روزہ یا زیادہ سے زیادہ حج کی ادائیگی اوّل تو رسماً ہے نیت صحیح نہیں اور اگر دل سے بھی ہے تو ضوابط اسلام کا حصر صرف انہیں تینوں میں نہیں۔ عدل کا قانون پیش نظر رکھنا اور ہوائے نفس کو دور کرنا اور بندگانِ خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرنا اور آپس کی تنظیم کرنا اور بقدر امکان جہادی طاقت پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ یہ سب اسلامی قوانین ہیں جن کا اعلان قرآن پکار پکار کر کر رہا ہے۔ بلکہ میرے نزدیک تو تسلط و غلبہ کے لئے یہ سنگ بنیاد ہیں، یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ چونکہ ۶۸ کروڑ مسلمانوں میں سے ۶۸ نفوس بھی ہوائے نفس کے شائبہ سے خالی نہیں تو پھر فوقیت و عروج و کامرانی کیسے حاصل ہو؟ اس پر بھی جو کچھ خدا نے عزت و حکومت دے رکھی ہے یہ اس کی عنایت ہے ورنہ عام احوالِ اہلِ اسلام تو اس قابل نہیں کہ ہم خدا کو اس کا وعدہ یاد دلا سکیں۔

(۲) بعض علماء کا قول ہے کہ زمین سے جنت کی زمین مراد ہے۔ اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے۔ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ الخ۔ یعنی جنت میں نیک بندے کہیں گے کہ اس خدا کا شکر ہے جس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور سرزمین جنت میں ہم کو ٹھکانا دیا اور یہ اختیار دیا کہ جنت میں ہم جہاں چاہیں رہیں۔ ابن عباس کا قول بروایت مجاہد یہی ہے۔ ابو العالیہ، مجاہد، سعید بن جبیر، شعبی، قتادہ، سدی، ابو صالح، ربیع بن انس، سفیان ثوری اور دیگر تابعین و تبع تابعین نے اسی تفسیر کو پسند کیا ہے۔

(۳) بعض کا قول ہے کہ سرزمین شام و فلسطین مراد ہے اور رازی نے اس قول کی تردید کی ہے۔ بعض مفسرین کا قول ہے الصالحون سے مراد خاص امت اسلامیہ محمدیہ ہے۔ چنانچہ حضرت ابو درداء کا قول مروی ہے کہ آپ نے فرمایا تھا کہ ہم صالحین ہیں۔ میرے نزدیک یہ بلا وجہ کی ترجیح ہے۔ صالحین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اہل الذکر اخلاق سے آراستہ، خالص موحد، اللہ سے ڈرنے والے، اس کی رحمت کی امید رکھنے والے، اپنی زندگی کو اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لئے وقف کرنے والے اور نفس کی آمیزش سے اپنی ہر کوشش کو دور رکھنے والے ہیں۔ خواہ کسی زمانے کے ہوں، کسی نبی کی امت میں ہوں۔ ہاں اہلِ اسلام کو اس قول سے عبرت ضرور حاصل کرنی چاہیے اور دین و دنیا کی کامرانی انشاء اللہ بزرگی اور اصلاحِ عمل سے وابستہ سمجھنی چاہیے۔ واللہ اعلم۔

اِنَّ فِیْ هٰذَا - ہٰذا سے مراد یا تو قرآن ہے یا پیام مذکور۔

لِقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ - عابدین سے مراد ابن عباس کے نزدیک علمائے قرآن ہیں۔ کعب احبار نے فرمایا یہ لوگ اُمتِ محمدیہ کے وہ افراد ہیں جو پانچوں نمازیں پڑھیں، رمضان کے روزے رکھیں اور جن کے پاس مال ہو وہ زکوٰۃ ادا کریں اور زیادہ مال ہو تو حج کریں۔

آیت مذکورہ کی تفسیر میں ابن عباسؓ کی ایک مرفوع روایت ہے کہ پانچوں نمازیں جماعت کے ساتھ مسجد میں پڑھنے والے مراد ہیں۔ (رواہ ابن مردویہ) بعض علماء کا قول ہے کہ قرآن پر عمل کرنے والے مراد ہیں۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ اگر تفسیر عام کی جائے تو اولیٰ ہے یعنی وہ لوگ مراد ہیں جو عالم باعمل ہوں۔ عمل بغیر علم کے نہیں ہو سکتا اور علم بغیر عمل کے بے فائدہ ہے۔ درخت بے ثمر بے کار ہے اور پھل بغیر درخت کے ہو نہیں سکتا۔

اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ - یعنی محمد رسول اللہ صلعم کافروں کے لئے بھی رحمت تھے اور مسلمانوں کے لئے بھی حضورؐ کی رحمت ہمہ گیر تھی۔ مفصل مطلب تو ہم تفسیری معنی کے ذیل میں لکھ آئے ہیں اور رحمت ہونے کے جو معنی تھے اس کی بھی تشریح کر دی ہے۔ یہاں ظاہری روایات کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ آیت مذکورہ کی تفسیر میں حضرت ابن عباس نے فرمایا رسول پاکؐ پر جو شخص ایمان لایا حضور والاؐ کی رحمت دنیا و آخرت میں اس پر پوری ہوگئی اور جو ایمان نہ لایا وہ آخرت سے محروم ہوگیا اور دنیوی عذاب یعنی خسف (زمین میں دھنس جانا) اور مسخ (صورت بگڑ کر کسی جانور کی شکل پر ہو جانا) سے محفوظ رہا (رواہ ابن جریر و ابن ابی حاتم والطبرانی واللفظ للطبرانی) صحیح مسلم میں بروایت ابوہریرہؓ مذکور ہے کہ حضور اقدسؐ سے عرض کیا گیا آپ مشرکوں کے لئے بددعا نہیں کرتے؟ فرمایا مجھے لعنت گر بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے میں تو فقط رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ امام احمد، ابوداؤد، طبرانی اور ابو نعیم نے بروایت ابو امامہ باہلی بیان کیا ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِیْ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ وَهُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ - یعنی اللہ نے مجھے تمام عالم کے لئے رحمت اور اہلِ تقویٰ کے لئے ہدایت بنا کر بھیجا ہے۔ طبرانی نے بروایت جبیر بن مطعم ایک طویل روایت نقل کی ہے جس میں حضور اقدسؐ کی ایذا رسانی اور مدینہ پر چڑھائی کرنے اور انصار کو تکلیف دینے کے متعلق کفار قریش کا مشورہ کرنا مذکور ہے اور آخر میں ہے کہ حضور والاؐ نے ارشاد فرمایا میں رحمت ہوں خدا نے مجھے بھیجا ہے۔ دین کے غالب ہو جانے سے پہلے وہ مجھے موت نہیں دے گا۔ میرے پانچ نام ہیں۔ میں محمد اور احمد ہوں۔ میرا نام ماحی ہے خدا تعالیٰ میرے ذریعہ سے کفر مٹا دے گا۔ میرا نام حاشر ہے۔ میرے ہی قدموں پہ لوگوں کا حشر ہوگا اور میرا نام عاقب ہے۔

اِنَّمَا یُوْحٰۤى اِلَیَّ - یہ قصر صفت علی الموصوف ہے یعنی میرے پاس صرف یہ وحی آتی ہے کہ اللہ ایک ہے۔ مطلب یہ کہ شرک کی وحی نہیں آتی اور کسی پیام الٰہی سے شرک ثابت نہیں ہوتا۔

اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ - یعنی اللہ ایک ہی ہے یہ قصر موصوف علی الصفۃ ہے، مطلب یہ کہ وحدانیت اگرچہ بہت سی جگہ پائی جاتی ہے مگر الوہیت صرف ایک ہی میں ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔

وَاِنْ اَدْرِیْۤ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ - قرب و بعد سے مراد عرفی قرب و بعد ہیں۔ یعنی جس کو کافر قریب و بعید جانتے تھے اور مَا تُوْعَدُوْنَ سے مراد یا تو روز قیامت ہے یا غلبۂ اہلِ اسلام اور شکست کفار یا مشرکوں پر عذاب کا آنا۔ مطلب یہ ہے کہ روز قیامت یا روز نزول عذاب یا غلبۂ اہلِ اسلام کی مخصوص ساعت کا مجھے علم نہیں۔ روز قیامت مراد لینا زیادہ صحیح ہے۔

رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ - یہاں ایک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا فیصلہ تو حق ہی ہوتا ہے پھر بِالْحَقِّ کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس شبہ کا ازالہ دو طرح سے کیا گیا ہے۔ اول تو یہ کہ یہاں فیصلۂ حق سے مراد عذاب ہے وہ حق مراد نہیں جو باطل کے مقابلے میں ہوتا ہے۔ چنانچہ جنگ بدر کے روز یہ فیصلہ ہوگیا۔ دوم یہ کہ اللہ کا فیصلہ تو بے شک حق ہی ہوتا ہے، مگر دعا کرنے والا اپنی رغبت خاطر کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ امام رازی نے بغیر سلسلۂ اسناد کے لکھا ہے کہ حضور اقدسؐ اس آیت کو لڑائیوں میں پڑھا کرتے تھے۔ ابن کثیر نے بروایت زید بن اسلم مرسلاً بیان کیا ہے کہ حضور اقدسؐ جب لڑائی پر تشریف لے جاتے تو وہاں کہتے رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ الخ۔

مقصود بیان

عام قانونِ الٰہی ... کہ اس زمین پر حکومت انہی لوگوں کی ہوگی جو صلاح کامل کے حامل ہیں۔ جو اپنے نفس کی، اپنے گھر کی، ... اقارب کی، محلہ کی، شہر کی، وطن کی، ملک کی بلکہ تمام عالم کی اصلاح کرنی چاہتے ہیں۔ حضور اقدسؐ

کی نبوت تمام عالم کے لئے عام تھی یعنی آپ تمام روئے زمین کے رہنے والوں کے لئے رحمتِ عامہ تھے۔ چاہتے تھے کہ تمام دنیا مسلم ہو جائے اور دوزخ سے نجات پائے۔ کفار پر جو مسخ و خسف وغیرہ کا عذاب نہیں آتا وہ حضور ہی کا صدقہ ہے اور مسلمان تو بہر سرکارِ والاؐ کے غلام ہی ہیں، ان کو تو جو کچھ ملا حضور والاؐ کے طفیل سے ہی ملا۔ اللہ شرک سے بہت زیادہ بیزار ہے۔ رسول پاکؐ کے بھیجنے کی اصل غرض ہی اعلانِ توحید ہے۔ گویا جو وحی حضورِ اقدسؐ کے پاس آتی تھی وہ حامل توحید ہوتی تھی۔ اِنْ اَدْرِیْٓ کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ رسول پاکؐ عالم الغیب نہ تھے (یوں تو حضورؐ کو تمام بدیہیات اور نظریات کا علم تمام مخلوق سے زیادہ تھا، مگر بعض علوم کی تحصیل بغیر ناطقہ کے منتہائے نظر سے خارج ہے وہاں تک سوا خدائی علم کے کسی کا علم نہیں پہنچ سکتا۔ عالم الغیب نہ ہونے سے یہی مراد ہے، لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ بعض لوگوں کی درازئ عمر اور پھر اس پر مرفہ الحالی اور عیش و عشرت کی فراوانی محض آزمائشی ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ ان کا امتحان کرتا اور مزید عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہے وغیرہ۔

سورۃ الحج مدنیۃ وھی ثمان وسبعون اٰیۃ وعشر رکوعات

سورۂ حج مدینہ میں نازل ہوئی اس میں اٹھتر آیات اور دس رکوع ہیں

اس سورت میں دس رکوع، ستر یا اٹھتر آیات، ۱۲۸۳ کلمات اور ۵۴۳۲ حروف ہیں۔ مکی اور مدنی ہونے کے متعلق علماء کا اختلاف ہے۔ ابن زبیر، ابن عباسؓ، مجاہد، قتادہ وغیرہ نے اس کو مدنی کہا ہے، اگرچہ چند آیات کا استثناء کیا ہے۔ قتادہ نے چار آیات یعنی وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ سے عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ تک اور ابن عباسؓ نے صرف تین آیات کو مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ بیضاوی، شیخ جلال، ثعلبی، خطیب اور نحاس وغیرہ نے مکی قرار دیا ہے، لیکن بیضاوی نے چھ آیات کو مستثنیٰ کیا ہے یعنی هٰذَانِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ سے صِرَاطِ الْحَمِيْدِ تک کی نہیں ہے۔ شیخ جلال نے دو آیات (وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ الخ) کا مزید اضافہ کیا ہے۔ نحاس نے دس آیات کو مدنی قرار دیا ہے۔ قرطبی نے کہا یہ سورت مختلط ہے۔ اس کی بعض آیات مکی ہونے کی مقتضی ہیں۔ یعنی وہ آیات جن میں يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ کے لفظ سے خطاب کیا ہے اور کچھ آیات مدنی ہیں یعنی وہ آیات جن کا آغاز يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے کیا ہے۔ غزنوی نے صراحت کی ہے کہ یہ عجیب سورت ہے۔ اس کا کچھ حصہ رات میں اور کچھ دن میں نازل ہوا، کچھ سفر میں اور کچھ حضر میں اترا، کچھ مکی ہے کچھ مدنی، کسی آیت کا صلح کے متعلق نزول ہوا کسی کا جنگ کے متعلق، کوئی ناسخ ہے کوئی منسوخ، کوئی محکم ہے کوئی متشابہ۔

ابن مبارک، شافعی، احمد، اسحاق اور بعض دیگر علماء کا قول ہے کہ اس سورت میں دو سجدے ہیں۔ عقبہ بن عامر کی روایت ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا سورۂ حج کو باقی قرآن پر دو سجدے ہونے کی وجہ سے فضیلت دی گئی ہے۔ فرمایا ہاں جو شخص یہ دونوں سجدے نہ کرے وہ اس کو نہ پڑھے (رواہ احمد و ابو داؤد والترمذی، لیکن ترمذی نے اس کی اسناد کو قوی نہیں قرار دیا) ابن عباس، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری، ابو حنیفہ اور علمائے کوفہ کے نزدیک اس میں ایک ہی سجدہ ہے۔ یہ سورت بالاختصار قرآن کے تمام مضامین و ہدایات کو حاوی ہے۔ اس میں آغاز آفرینش کی تصریحات بھی ہیں، معاد قیامت کے متعلق تنبیہات بھی، گزشتہ اقوام کے عبرت انگیز واقعات بھی ہیں، رسالت کے مسائل بھی اور دوسرے احکام بھی۔

سورۂ انبیاء کے خاتمہ پر مسئلہ معاد کا تذکرہ کیا تھا۔ اس سورت کا آغاز بھی احوال قیامت کی ہولناک کیفیت کے اظہار سے کیا ہے تاکہ ربط قائم رہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم کرنے والا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ

لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو واقعی قیامت کا زلزلہ بڑی سخت چیز ہے جس دن تم زلزلہ کو دیکھو گے تو ہر

كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا

دودھ پلانے والی اپنے شیر خوار بچہ کو بھول جائے گی اور ہر حاملہ کا حمل ساقط ہو جائے گا اور لوگوں کو تم نشہ میں مست دیکھو گے حالانکہ

هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ

وہ نشہ میں نہ ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب سخت ہے بعض آدمی بے جانے بوجھے اللہ کے بارے میں تم سے جھگڑا

عِلْمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۝ كُتِبَ عَلَيْهِ أَنَّهُ مَنْ تَوَلَّاهُ فَأَنَّهُ يُضِلُّهُ

کرتے ہیں اور ہر اُس سرکش کے پیچھے ہو لیتے ہیں جس کے متعلق لکھا جا چکا ہے کہ جو اس کی رفاقت کرے گا وہ اسکو گمراہ کر دیگا

وَيَهْدِيْهِ إِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝

اور دوزخ کے عذاب کی طرف لے جائے گا

تفسیر آغاز سورت سے لے کر دو آیتیں بروایت عمران بن حصینؓ غزوۂ بنی المصطلق کے موقعہ پر رات کے وقت نازل ہوئیں۔ حضور اقدس ؐ نے صحابہ کو آواز دی۔ صحابہ اپنی اپنی سواریاں تیز کر کے حضورؐ کے گرد آ کر جمع ہو گئے۔ سرکار والاؐ نے دونوں آیتیں تلاوت فرمائیں۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے اس رات سے زیادہ رونے والے کبھی نہیں دیکھے یہاں تک کہ جب صبح ہوئی تو لوگوں نے جانوروں پر سے کاٹھیاں نہ اتاریں نہ خیمے نصب کئے نہ ہانڈیاں چڑھائیں یا جو لوگ رو رہے تھے یا غمگین تھے یا فکر میں تھے (رواہ الخطیب فی السراج) اس سے آگے حضرت ابو سعید خدریؓ نے روایت کی ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا خدا تعالیٰ فرمائے گا آدم! آدم عرض کریں گے۔ لَبَّيْكَ رَبَّنَا وَسَعْدَيْكَ ندا آئے گی تجھے حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی اولاد میں سے دوزخ کا حصہ بھیج دے۔ عرض کریں گے پروردگار! دوزخ کا حصہ کیا ہے؟ ندا آئے گی، ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے۔ اس وقت حاملہ کا حمل (شدت خوف سے) گر جائے گا اور بچے بوڑھے ہو جائیں گے۔ وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ یہ حدیث سن کر صحابہ کو بہت بے چینی ہو گئی، چہروں کا رنگ فق پڑ گیا۔ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا یاجوج ماجوج میں سے نو سو ننانوے اور تم میں سے ایک دوزخی ہو گا۔ تم لوگوں میں ایسے ہو جیسے ایک سیاہ بال سفید بیل کی پُشت پر ہوتا ہے یا (یوں فرمایا) جیسے ایک سفید بال سیاہ بیل کی پُشت پر ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم (کُل) اہلِ جنت میں ایک چوتھائی ہو گے۔ راوی کا بیان ہے یہ سُن کر ہم نے تکبیر کہی حضورؐ نے فرمایا تم اہلِ جنت کی ایک تہائی ہو گے ہم نے پھر تکبیر کہی۔ فرمایا تم اہل جنت کے نصف ہو گے ہم نے پھر تکبیر کہی (رواہ البخاری و مسلم والنسائی) قیامت اور حشر و جزا ثابت کرنے کے عقلی و فلسفی دلائل کے علاوہ جذبات کو متاثر کرنا ہی سب سے زیادہ سود مند ہو سکتا ہے۔ جو لوگ عقلِ رسا اور فکر سلیم ایسی نہیں رکھتے کہ براہین فطری یا دلیل منصوصی پر خود غور کر کے ہدایت یاب ہو سکیں اور غیبی عقائد کو مانیں۔ ان کی اصلاح کے لئے بہترین تدبیر یہی ہو سکتی ہے کہ ان کے دماغ پر کوئی غیر معمولی وجدانی اور احساسی اثر ڈال دیا جائے، اس لئے آسمانی کتابوں میں علاوہ فطرتِ عالم پر غور کرنے کی دعوت دینے کے لئے جنت کی بشارت اور دوزخ کا خوف جا بجا دلایا گیا ہے اور اس طریقہ سے جزا سزا کو تسلیم کرایا گیا ہے، لیکن یاد رکھو کہ بشارت کا اثر فوری طور پر اتنا نہیں ہوتا جتنا خوف کا ہوتا ہے رفع مضرت حصولِ منفعت سے اہم ہوتا ہے۔ اسی بنا پر مسئلہ معاد کو ثابت کرنے اور تسلیم کرانے کے لئے خدا تعالیٰ نے ان آیات میں قیامت کی دل انگیز حیرت آفریں واقعی تصویر کھینچی ہے تاکہ نہ سمجھنے والوں کے دماغ بھی راہِ راست پر آ جائیں اور وہ بھی عذاب کے ڈر سے نیکی کی طرف راغب ہو جائیں۔ اس پر بھی جو لوگ منکر رہے اور ان کی قساوت قلب اس حد تک پہنچ گئی کہ وہ کسی طرح کلمۂ ہدایت سے متاثر نہ ہوئے بلکہ اُلٹے کٹ حجتی کرکے جھگڑا کرنے لگے ایسے لوگوں کے متعلق صراحت فرما دی کہ ان کو کسی طرح ہدایت نہیں ہو سکتی، یہ شیطان کے یار ہیں، ان کے واسطے دوزخ کا راستہ کھلا ہے۔

تحلیلِ اجزاء

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا - ناس سے مراد عام ہیں۔ اہلِ مکہ ہوں یا عام اہلِ شرک - مطلب یہ ہے کہ اللہ تمہارا محسنِ اعظم ہے - تم کو عدم سے وجود میں لانا اور باقی رکھنے کا سامان پیدا کرنا، اور پھر کھلا پلا کر زندہ رکھنا اُسی کا کام ہے، اس لئے تم کو اسی سے ڈرتے رہنا چاہیئے۔ وہ عذاب پر قادر ہے - جب وہ موجد اور رب ہے تو یقیناً منتقم اور سزا دینے پر قدرت بھی اس کو ہے۔

اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ الخ - یہاں تین امور تحقیق طلب ہیں :- زلزلۂ قیامت کب ہوگا ؟ اُس کو دیکھنے والے کون لوگ ہوں گے ؟ حاملہ عورت کا حمل ساقط ہونا اور دودھ پلانے والی کا اپنے بچے کی طرف سے غافل ہو جانا کیا واقعی ہوگا یا یہ کلام مجازی ہے، صرف ہیبت انگیز منظر نظروں کے سامنے لانا مقصود ہے ؟ چونکہ تینوں امور ایک دوسرے سے وابستہ ہیں، اس لئے ہم تینوں کی تشریح یکجائی کرتے ہیں - زمین میں زلزلہ ہونا تو مختلف آیات سے ثابت ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا - دوسرے مقام پر آیا ہے۔ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ تیسری جگہ آیا ہے - اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۙ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا چوتھی آیت ہے۔ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ الخ - ان تمام آیات سے زلزلۂ قیامت کا ثبوت ملتا ہے، لیکن وقتِ زلزلہ کے متعلق علماء میں اختلاف ہے - علقمہ، شعبی، ابراہیم اور عبید بن عمیر کا قول ہے کہ یہ زلزلہ روزِ قیامت سے پہلے ہوگا، آفتاب کا مغرب سے طلوع بعد کو ہوگا اور حشرِ مُردگان بھی بعد کو ہوگا - اس قول کی تائید حدیث صور سے ہوتی ہے جس کو ابن جریر، طبرانی اور ابن ابی حاتم نے ابو ہریرہ کی روایت سے نقل کیا ہے جس میں بیان کیا گیا کہ تین مرتبہ صور پھونکا جائے گا - پہلا نفخۂ فزع ہے - دوسرا نفخۂ مدہوشی اور تیسرا نفخۂ قیام - نفخۂ صور پر تمام آسمان و زمین والوں پر گھبراہٹ طاری ہو جائے گی باستثناء اُن لوگوں کے جن کو خدا محفوظ رکھے - پہاڑ اُڑنے لگیں گے، زمین میں سخت زلزلہ آئے گا، دودھ پلانے والیاں دہل جائیں گی، حاملہ عورتوں کے حمل ساقط ہو جائیں گے، بچے بوڑھے ہو جائیں گے الخ - اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں زلزلہ پیدا ہونے کے وقت آدمی زندہ ہوں گے اور قیامت آنے سے پہلے ایسا واقعہ ہوگا - شیخ جلال محلی اور بیضاوی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے - اس قول پر حاملہ کا اسقاطِ حمل اور مرضعہ کا اپنے شیر خوار بچے سے غافل ہونا اور لوگوں کا شدتِ خوف سے شرابیوں کی طرح لڑکھڑانا سب واقعی ہوگا مجازی معنی لینے کی ضرورت نہیں -

حسن بصری نے فرمایا یہ زلزلہ قیامت کے دن آئے گا اور آیت میں اسی زلزلے کا تذکرہ ہے - اس قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جو تفسیری مطالب کے ذیل میں ہم اوپر لکھ آئے ہیں - بعض دوسری احادیث بھی اس کی مؤید ہیں - اس صورت میں اسقاطِ حمل اور ذہول مرضعہ وغیرہ سے مراد مجازی معنی ہوں گے - یعنی ایسا ہولناک زلزلہ ہوگا کہ شدتِ خوف سے عورتوں کے حمل گر جائیں اور دودھ پلانے والیوں کو بچوں کی فکر نہ رہے گی - اکثر مفسرین نے اسی قول کو پسند کیا ہے، لیکن بقائی اور شعرانی نے اس قول پر بھی اسقاطِ حمل وغیرہ کو حقیقی معنی پر حمل کیا ہے۔ بقائی نے صراحت کی ہے کہ مرضعہ سے وہ مرضعہ مراد ہے جو دودھ پلانے کی حالت میں مرگئی اور حاملہ سے وہ حاملہ مراد ہے جو حالتِ حمل میں مرگئی - ان دونوں کو ان کے بچے سمیت اٹھایا جائے گا اور جب وہ زندہ ہو کر اٹھیں گے تو شدتِ ہول سے ان کی وہ کیفیت ہوگی جو آیت میں مذکور ہے -

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ الخ - سدی نے بروایت ابو مالک کہا ہے کہ یہ آیت نضر بن حارث کے حق میں نازل ہوئی - ابن جریج کا بھی یہی قول ہے - یہ شخص بہت جھگڑالو، نساجی اور سیاح تھا - ایران میں جا کر سہراب و افراسیاب اور رستم و کیکاؤس کے قصے یاد کر آیا تھا اور قریش کے سامنے وہی قصے سناتا تھا اور کہتا تھا قرآن میں سوا قصوں کے اور کیا ہے ؟ ایسے قصے تو مجھے بھی بہت آتے ہیں - اس کا گمان تھا کہ قیامت کا آنا اور آدمی کا دوبارہ قبر سے اٹھنا محال ہے - جو خاک ہو گیا وہ کیسے پیدا ہوگا - بیضاوی نے کہا آیت میں نضر بن حارث کی کوئی خصوصیت نہیں - اللہ کی شان میں جو شخص بھی اپنی نادانی سے جھگڑا کرے اور علم صحیح کے بغیر اس کی ذات و صفات میں بحث کرے وہ گمراہ ہے - دہریے دہر کو فاعل و خالق کہتے ہیں - یہودی اور عیسائی تشبیہ یا حلول کے قائل ہیں - بعض مجوسی تعددِ خالق کے قائل ہیں اور مشرک خدا کی خاص صفات کا دوسروں کو بھی حامل جانتے ہیں - یہ سب گروہ جہنمی ہیں - شیطان کی دوستی کے معنی ہیں علم و عمل میں اس کی پیروی کرنا، صداقت و حقانیت کا انکار کرنا، باطل اور باطل پرستوں کی طرف داری کرنا اور اہلِ حق کی مخالفت مول لینا -

مقصودِ بیان: ۔ اللہ کے عذاب سے ڈرنے کا مدلل حکم ۔ زلزلۂ قیامت کے برحق ہونے کی صراحت ۔ قیامت کی ہولناک ہیبت آفریں منظر کی تفصیل ۔ اللہ کی ذات، صفات اور احکام میں نادانی اور لاعلمی کے باوجود بحث کرنے کی ممانعت ۔ اس سے اُس گمراہ نیم تعلیم یافتہ طبقہ کو سبق لینا چاہیے جو نے اللہ کی ذات، اس کے دین اور اس کی کتاب کو میدانِ مزاح بنا رکھا ہے ۔ باوجود قصورِ علمی کے وہ شریعت کے ہر عقیدہ و عمل کی تہ تک پہنچ جانے اور پھر اس کا غلط ثابت کرنے کے مدعی ہوتے ہیں ۔ ان کی نظر کوتاہ ہوتی ہے ، بصیرت میں اور مطالعہ میں تنگی ہوتی ہے پھر بھی وہ احکام قرآنیہ اور فرامین رسول کو ایسے منتر تماشہ میں پڑھتے بلکہ کبھی صراحتاً اعتراض کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک جس قدر علمائے کرام اور ائمہ دین گزرے ہیں سب بے وقوف ، جاہل اور بے بصیرت تھے ۔ خدا نے بصیرت و عقل اسی طبقہ کو عطا کی ہے ۔ آیت مذکورہ میں اس مولوی نما جاہل گروہ کے لئے بھی پیام عبرت ہے جو باوجود مسائل شریعت نہ جاننے کے اپنا علمی وقار قائم کرنے اور مشیخت کی جھوٹی ساکھ بنانے کے لئے دانستہ و نادانستہ ہر مسئلہ کا جواب اس طرح دیتا ہے کہ گویا بانی شرع کا اصل جانشین یہی گروہ ہے ۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ

لوگو! دوبارہ زندہ ہونے میں تم کو کچھ شک ہے تو (اتنا تم کو بھی معلوم ہے کہ) ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے

ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ۭ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ

پھر خون کے لوتھڑے سے ، پھر بوٹی (پوری یا) ادھوری بوٹی سے تاکہ ہم تم پر (اپنی قدرت) ظاہر کریں ۔ اور جسے چاہیں

مَا نَشَاۗءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ

ایک وقتِ مقررہ تک رحم کے اندر ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر بچہ بنا کر تم کو نکالتے ہیں تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو (پھر) تم میں سے کسی کی تو روح

يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـــًٔا ۭ وَتَرَى

قبض ہو جاتی ہے اور کسی کو نکمی عمر تک پہنچا دیا جاتا ہے تاکہ جاننے کے بعد پھر بالکل نادان ہو جائے تم زمین کو

الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ

خشک دیکھتے ہو لیکن جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو لہلہانے لگتی ہے اور ابھر جاتی ہے اور ہر طرح کی نفیس پیداوار اگاتی

بَهِيْجٍ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُـحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ۙ

ہے یہ اس سبب سے کہ اللہ ہی برحق ہے وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہی سب کچھ کر سکتا ہے

وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝

اور قیامت ضرور آنے والی ہے اس میں کچھ شک ہی نہیں اور اللہ اُن لوگوں کو زندہ کرے گا جو قبروں میں ہیں

تفسیر ان آیات میں اللہ کی ہمہ گیر قدرت اور بعث بعد الموت کے امکان پر دو عظیم دلیلیں بیان کی گئی ہیں ۔ یہ عالم کون و فساد ہے ۔ کسی صورت حالت و کیفیت کو ثبات و بقا نہیں ۔ ہر وقت تغیر تبدل اور تلوّن ہوتا رہتا ہے ، ایک صورت جاتی ہے دوسری آتی ہے ، ایک کیفیت

[illegible] کائنات انسانی [illegible] تجربات کے بعد نطفہ بنتا ہے جو نطفہ [illegible] استعمال ہونے کے بعد
[illegible] ہوا اور [illegible] انسانی کا ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔ خط و خال نمایاں ہونا [illegible] انسان پیدا ہوتا ہے
لیکن پیدائش کے بعد [illegible] ہوتا ہے [illegible] آہستہ آہستہ [illegible] ترقی کرتے کرتے
پھر جوان [illegible] ہو جاتا ہے [illegible] بڑھاپے [illegible] ہو جاتے ہیں [illegible]
مان [illegible] جاتی ہے [illegible] پیدا ہو جاتی ہے [illegible] ضعیف [illegible]
[illegible] دوسرے کا دست نگر [illegible] جانے [illegible] قدرت
تو نے دنیا میں پہلی حالت پر لوٹا دینا دکھا دیا۔ ایسی حالت میں [illegible] ہے۔

کائنات انسانی سے ہٹ کر ذرا بے حس اور بے عقل سبزہ کو دیکھو، زمین خشک ہوتی ہے [illegible] خاک [illegible] رحمت
آبِ حیات برساتا ہے، بے جان مٹی میں جان پڑ جاتی ہے۔ خشک زمین سرسبز [illegible] ہے، سبزہ [illegible] قوت نامیہ کا فیض
جاری رہتا ہے، پھول آتے ہیں پھل آتے ہیں پھر بادِ خزاں چلتی ہے [illegible] ہو جاتا ہے [illegible]
بھوسے کے تنکے ادھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ سبحان اللہ مردہ زمین [illegible] قدرت [illegible]
پھر مُردوں کے زندہ ہونے کا انکار کرنا اور حشر نشر کو نہ ماننا کون سی دانشمندی ہے۔

تحلیلِ اجزاء

اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ۔ کفارِ عرب خصوصاً اور کفار عموماً معادِ جسمانی اور حشر اجساد کے منکر ہیں [illegible] قطعی
انکار کے پھر بھی لفظ اِنْ استعمال کیا۔ حالانکہ اِنْ کا استعمال شک کے موقع پر ہوتا ہے اور کفار [illegible] یقینی تھا
اس میں ایک خاص بلاغت ہے۔ خدا تعالیٰ ضمنی طور پر تنبیہ کرنا چاہتا ہے کہ تم لوگ دانشمند [illegible] ہوش [illegible] دانشمند [illegible] حشر
نشر کے یقینی ہونے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا، اس لئے تمہاری حالت اور دماغی قوتیں [illegible] شہادت [illegible] حشر
حقّانیت مان لینا چاہیئے، لیکن بالفرض اگر تمہارے دماغوں میں شک گذرے اور کوئی شبہ ہو تو مندرجہ ذیل دلائلِ فطرت پر غور کرو [illegible]
ان سے نصیحت ملتی ہے۔

فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ۔ اس سے مراد یا تو حضرت آدم کی تخلیق ہے جو مٹی سے بنایا گیا تھا اور چونکہ حضرت آدم ہی سے نسلِ انسانی
چلی ہے، اس لئے کل انسانوں کی پیدائش کا سرچشمہ بھی مٹی ہی ہوئی یا حقیقتاً تمام انسان مراد ہیں۔ ہر انسان نطفہ سے پیدا ہوتا ہے جیسے اس کے
بعد والے فقرہ میں صراحت کر دی ہے اور نطفہ خون سے بنتا ہے اور خون کی آفرینش غذا سے ہوتی ہے اور غذا نباتی ہو یا حیوانی بہرحال اس کا مادۂ تخلیق
مٹی ہے، اس لئے ہر انسان کا مٹی سے بننا ظاہر ہے۔

ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ۔ عورت کے رحم میں نطفہ چالیس روز ٹھہرتا ہے پھر گوشت کا لوتھڑا بن جاتا ہے، مگر [illegible] اس کے اندر کوئی شکل
نہیں پیدا ہوتی نہ نشانات و خط ابھرتے ہیں پھر خطوط پڑنے شروع ہوتے ہیں۔ تشکل اعضا بنتی ہے۔

مُّخَلَّقَةٍ وَّغَیْرِ مُخَلَّقَةٍ۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ مخلّقہ وہ مضغۂ انسانی ہے جس کے اعضا صحیح [illegible] ہوں، کوئی تخلیقی عیب اور
کمی نہ ہو، شکل صورت، اندازہ، طول و قصر، اعضاء کی باہمی ترکیب سب صحیح ہو اور غیر مخلّقہ وہ ہے جس کے اعضاء میں کمی یا اعضاء کی ترتیب میں خرابی
یا شکل وغیرہ میں بگاڑ ہو۔ قتادہ اور ضحاک کا یہی قول ہے۔ مجاہد نے کہا مخلّقہ وہ بچہ ہے جو زندہ پیدا ہوا ہے اور غیر مخلّقہ وہ بچہ جو ساقط ہو جائے۔
ابن کثیر نے لکھا ہے کہ کبھی مضغۂ انسانی میں شکل و صورت بن جاتی ہے اور شکل و صورت بننے کے بعد وہ ساقط ہو جاتا ہے اور کبھی شکل و خطوط تام ہونے
سے پہلے ہی گر جاتا ہے۔ اوّل مخلّقہ ہے اور دوم غیر مخلّقہ [illegible] جو نطفہ رحم میں ٹھہرا رہتا ہے گویا مخلّقہ وہ ہے جس کی صورت بن گئی ہے اور غیر مخلّقہ وہ ہے
جس کی صورت [illegible] ہو اور [illegible] اشارہ ہے [illegible] ساقط [illegible] رحم میں ٹھہرا رہے
مجاہد [illegible] غیر مخلّقہ وہ [illegible] ساقط ہو جانے کا [illegible] اور مخلّقہ وہ بچہ ہے جس کے پیدا ہونے کا علم ہو۔ اس قول کی تائید

ابن مسعود کے اس قول سے ہوتی ہے جو ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے موقوفاً نقل کیا ہے۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا جب نطفہ رحم میں ٹھہرتا ہے تو فرشتہ اس کو اٹھا لیتا ہے اور عرض کرتا ہے پروردگار! یہ مخلقہ ہے یا غیر مخلقہ؟ اگر حکم ہوا غیر مخلقہ ہے تو رحم میں اس کو یونہی ڈال دیتا ہے، وہ خون کی حالت میں گر جاتا ہے اور بچہ نہیں بنتا اور اگر حکم ہوا مخلقہ ہے تو فرشتہ عرض کرتا ہے پروردگار! یہ مرد ہے یا عورت، شقی ہے یا سعید، اس کی اجل کیا ہے، عمل کیا ہیں، اثر کیا ہے، کس زمین پر مرے گا؟ حکم ہوتا ہے ام الکتاب (لوح محفوظ) کو دیکھ، سب کچھ تجھے وہاں مل جائے گا۔ فرشتہ لوح محفوظ دیکھتا ہے، سب کچھ لکھا پاتا ہے وہاں سے لکھتا ہے اور وہ مکتوب اس کے پاس برابر رہتا ہے۔

لِنُبَيِّنَ لَكُمْ۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ نیرنگی تخلیق کی یہ علت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک حال سے دوسرے حال میں ایک شکل کو دوسری ہیئت میں ہم نے تم کو اس لئے منتقل کیا کہ اس تبدیل تدریجی سے تم کو اپنی قدرت کے کرشمے دکھا دیں اور بتا دیں کہ جس خدا نے خاک و پانی کے اجتماع سے بشر کو بنایا اسی خدا نے نطفے سے انسان کو پیدا کیا۔ حالانکہ دونوں میں کھلا ہوا تباین ہے۔ جو خدا نطفہ کو علقہ، علقہ کو مضغہ کرتا اور پھر مضغہ کو ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا کر گوشت پوست کا لباس پہنا کر زندہ انسان کر دیتا ہے اور تمام حواس عقل اور دماغی قوتوں سے اس کو آراستہ کرتا ہے وہی خدا مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنے پر بھی قادر ہے۔

ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ۔ اَشُدّ کے معنی ہیں قوت اور مضبوطی۔ اس سے عنفوانِ شباب مراد ہے جس سے اعضاء میں قوت اور بدن میں مضبوطی آجاتی ہے۔

لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا۔ آخر عمر میں پہنچ کر انسان کے حواس میں فتور، دماغ میں سستی اور علم میں کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ جوانی کے زمانے میں جو کچھ علم حاصل کیا تھا وہ فراموش ہو جاتا ہے، صحیح غلط اور اچھے برے کا امتیاز جاتا رہتا ہے، پیر فرتوت بن جاتا ہے، لیکن ہر شخص کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ ایام پیری سب پر آتے ہیں۔ قوتوں میں ضعف اور اعضاء میں کمزوری سب کے ہوتی ہے، مگر بقول عکرمہ جس نے قرآن پڑھا وہ اس حالت کو نہیں پہنچا۔ اہل ایمان اس سے مستثنیٰ رہتے ہیں۔ اسفل السافلین یعنی ارذل العمر کی حد تک وہی لوگ پہنچتے ہیں جن کے دلوں میں نورِ ایمان نہیں ہوتا اور ایمان کی روشنی سے محروم ہوتے ہیں۔ ورنہ جن کے دلوں میں نورِ ایمان ہوتا ہے ان کے حواس مردہ نہیں ہوتے، البتہ دنیوی علوم و کاروبار میں ان کے بھی ضعف آجاتا ہے۔ دنیوی زندگانی کی اچھائی برائی اور نفع نقصان کا امتیاز ان کو بھی کم رہ جاتا ہے۔

اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ۔ اہتزاز کے معنی ہیں جوش مسرت سے جھومنا۔ یہاں زمین کی قوت نامیہ کا جوش مراد ہے یعنی جب آب حیات برستا ہے تو زمین میں تمام نامیہ قوتیں جوش میں آجاتی ہیں، بیج کھلتے پھولتے ہیں، ابھرتی ہیں اور سبزہ برآمد ہونے کے آثار نمودار ہوتے ہیں اور طرح طرح اور قسم قسم کی سبزیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ہر سبزی رنگ و بو، مزے اور شکل کے اعتبار سے دوسری سے جدا ہوتی ہے۔ حضور اقدس صلعم نے ابو رزین لقیط بن عامر عقیلی سے دریافت کیا، تمہارا گزر اپنے قبیلے کی وادی کی طرف سے بھی ہوتا ہے جبکہ وہ بالکل چٹیل میدان ہوتا ہے۔ لقیط نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا پھر اس وقت بھی تمہارا گزر ہوتا ہے جب وہ سرسبز ہو کر لہلہاتا ہے۔ لقیط نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا کائنات میں یہ اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں وہ مردہ کو زندہ کرتا ہے (رواہ ابو داؤد و ابن ماجہ)

مقصودِ بیان

تخلیق انسانی کے مدارج بیان کرنے ہمگیر قدرت کا اظہار اور حشر بعد الموت کا اثبات اس امر کی طرف ضمنی اشارہ کہ وقوع حشر قابل انکار حقیقت نہیں۔ ہوشمند، بیدار حواس رکھنے والا طبقہ اس میں کسی طرح شک نہیں کر سکتا۔ سبزہ کی پیدائش پانی کی مرہون کرم ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ زمین کے اندر قوت منفعلہ ہے، قوت فاعلہ نہیں اور فاعل و منفعل کے اختلاط کے بغیر کسی چیز کا وجود نہیں ہو سکتا۔ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ انسان و حیوان کی طرح سبزہ کی پیدائش بھی تدریجی ترقی کے ساتھ ہوتی ہے۔ پانی سے متاثر ہو کر زمین کی قوت نامیہ میں جوش پیدا ہوتا ہے یعنی قوت جاذبہ، ماسکہ، ہاضمہ اور دافعہ جب کافی طور پر اپنی خدمات انجام دے چکتی ہیں اور زمین پانی سے متاثر ہو جاتی ہے تو ... کام و زمانہ آتا ہے۔ وہ زمین میں قوت پیدا کرتی ہے، زمین پھولتی ہے، ابھرتی ہے، جو دانہ یا بیج مٹی میں ہوتی ہے اس میں نمو پیدا ہوتا ہے اور ... سبزہ کی کونپل پھوٹ نکلتی ہے مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ باوجودیکہ مادہ منفعلہ اور قوت نامیہ ایک ہی ہے ... اور صورت نوعیہ میں کوئی فرق نہیں، پانی کا عنصر بھی ایک ہی ہے ...

یہ وہ ... انتقال ... اپنی ... قدرت ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۙ ثَانِيَ

اور بعض شخص ایسا بھی ہے ... پہلو

عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

پھیرے ہوئے (کوشش کرتا ہے) کہ ... قیامت کے دن ... چکھنے کے

عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

عذاب کا مزہ چکھائیں گے یہ تیرے پہلے کرتوت کا بدلہ ہے اور اللہ ... ظلم نہیں کرتا ہے

تفسیر

شیخ جلال محلی، خطیب اور مفسر معالم نے لکھا ہے کہ یہ آیت ابوجہل کے بارے میں نازل ہوئی، شیخ لکھتے ہیں کہ بحوالہ ابن جریر مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت بھی نضر بن حارث کے متعلق نازل ہوئی۔

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں جو جدال فی اللہ کرنے والوں کی مذمت کی تھی ان سے مراد تو وہ لوگ ہیں جو دوسروں کی تقلید میں نادانی کے ساتھ اللہ کی ذات وصفات کے متعلق جھگڑا کرتے اور گمراہ ہوتے ہیں اور اس آیت میں وہ گروہ مراد ہے جو خود بعث وحشر کا انکار کرتا اور بغیر دوسرے کی پیروی کے خود اپنی طرف سے خدا اور اس کی قدرت کے متعلق جھگڑا کرتا ہے اور اس نزاع وجدال سے اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ دوسرے بھی میرے ہم خیال ہو جائیں اور وہ بھی میری طرح (گمراہ) ہو جائیں۔ گویا پہلا طبقہ گمراہوں کا تھا اور یہ گروہ گمراہ کرنے والوں کا۔ ہمارے اس قول کا ثبوت خود آیات پر غور کرنے سے ظاہر ہے۔ پہلی آیت میں تو فرمایا تھا وَيَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ۔ یعنی خدا کی شان میں نادانستہ جھگڑا کرنے والا ہر نافرمان شیطان کی پیروی کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ نافرمان شیطان سے گمراہ کرنے والے افراد مراد ہیں اور اتباع کرنے والوں سے مراد گمراہ ہونے والے ہیں، لیکن اس آیت میں فرمایا لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ یعنی شانِ خدا میں جھگڑا کرنے والے کا مقصود یہ ہے کہ دوسروں کو راہِ خدا سے بہکائے اور گمراہ کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گزشتہ آیت میں جن افراد کو شیطانِ مرید فرمایا تھا، اس آیت میں اہلِ جدال سے وہی لوگ مراد ہیں اور گزشتہ آیت میں جن کو اہلِ جدال قرار دیا تھا اُن سے گمراہ ہونے والے اور شیطان مرید کے پھندے میں پھنسنے والے مراد ہیں اسی معنی کو ابن کثیر نے ترجیح دی ہے۔

کسی عقیدے کی صداقت وحقانیت کی جانچ کے تین ہی طریقے ہیں یا تو بدیہیات ان کی صداقت کے شاہد ہوں کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں۔ مثلاً آفتاب روشن ہے، آگ گرم ہے۔ بدیہیات کی صداقت صرف احساس سے جانچی جا سکتی ہے۔ اگر بدیہی میں کسی قدر خفا ہے تو نفس کی ادنیٰ توجہ خفا دور کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے اور اگر عقیدہ کچھ گہرا ہے، ظاہری توجہ سے ثابت نہیں ہو سکتا ہے تو اس کی حقانیت کا علم غور وخوض سے ہوتا ہے۔ چند مقدمات قائم کرنے پڑتے ہیں پھر ان میں ربط ڈھونڈنا پڑتا ہے اور ربط دیکھ کر صحیح ترتیب دینی ہوتی ہے اور اس طرح سے نتیجہ نکالا جاتا ہے۔ یہ طریقہ استدلال ونظر کا ہوتا ہے۔ اس کی تمثیل کے لئے جبر ومقابلہ کے تمام مباحث اور علم الحساب کے اصول پیش کئے جا سکتے ہیں۔ علم صحیح حاصل کرنے کا تیسرا طریقہ حضور وکشف کا ہے۔ انسان کی روح میں منجانب اللہ ایک کشف ہو جاتا ہے اور حقائق واقعیہ نظر کے سامنے آ جاتے ہیں۔ یہ کشف یا تو محض الہامی ہوتا ہے یا وحی کی وساطت سے ہوتا ہے اور آسمانی کتاب میں کسی امر کی صداقت کی صراحت ہو جاتی ہے۔ ان تین طریقوں کے علاوہ صحیح علم حاصل کرنے کا کوئی چوتھا طریقہ نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ جس شخص کو اپنے عقیدہ کی سچائی ثابت کرنے کے لئے مذکورہ طریقوں میں سے کوئی طریقہ نہ مل سکے وہ جاہل، بے وقوف اور کٹ حجتی کرنے والا ہے محض عناد اور بغض سے لوگوں کو راہِ حق سے پھیرتا ہے، نضر بن حارث یا ابوجہل یا اسی قسم

کے دوسرے کفار محض معاند تھے۔ انکار حشر و نشر ثابت کرنے کے لئے ان کے پاس نہ کوئی علم بدیہی تھا نہ نظری ہدایت نہ الہام و وحی اور ظہور کرشمہ ان کا مقصود صرف یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ صداقت پر دوسروں کو لبیک نہ کہنے دیں اور راہِ حق سے لوگوں کو بہکائیں۔ ایسے لوگوں کی پاداش یہ ہے کہ دنیا میں ان کو رسوائی اور ذلت نصیب ہوتی ہے۔ کیونکہ بغیر دلیل و ثبوت کے کوئی قول قابلِ قبول نہیں ہوتا اور آخرت میں بھی عذاب الٰہی میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ اسی مضمون کو آیات مذکورہ میں بیان فرمایا ہے۔

تحلیلِ اجزاء بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ۔ علوم دو طرح کے ہوتے ہیں عقلی اور نقلی۔ علوم عقلیہ وہ ہیں جن کی موجد عقل انسانی ہے اور نقلی علوم وہ ہیں جن کی اشاعت آسمانی کتب کے ذریعہ سے ہوتی۔ عقلی علوم کو سمجھنا دو طرح سے ہوتا ہے یا تو آدمی خود اتنا زیرک اور دانشمند ہو کہ تحصیل علوم کے تمام ضوابط بغیر سیکھے ہوئے اس کے پیش نظر ہوں جس طرح مختلف عقلی فنون ایجاد کرنے والوں کی حالت ہوتی ہے۔ علوم مساحت، جبر و مقابلہ، اقلیدس وغیرہ کے قواعد و اشکال مختلف حکماء نے غور و خوض کرنے کے بعد خود ایجاد کئے اور اگر فطری استعداد اس حد تک حاصل نہ ہو تو حکماء اور ماہرین فنون کے ضوابط پہلے سیکھنے ضروری ہیں اور پھر ان قواعد کے تحت ذہنی عمل کرنا لازم ہے پہلی شق کی نفی کی طرف بِغَيْرِ عِلْمٍ سے اشارہ ہے اور دوسری شق کی نفی وَّلَا هُدًى سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ عقلی علوم کا فہم و درک ہر جاہل کا کام نہیں نہ ہر جاہل کے دماغ میں ان علوم کے ضوابط آسکتے ہیں۔ جاہل کے سامنے تو صرف حاصل ضرب و تقسیم پیش کیا جا سکتا ہے طریق ضرب و تقسیم سمجھنے کی اس میں استعداد نہیں ہوتی۔ اگر جاہل نادان کو کہیں قواعد سمجھانے کی ضرورت پیش آجاتی ہے تو سخت ترین دشواری ہوتی ہے۔ علوم کی دوسری قسم نقلی علوم ہیں۔ ان علوم کے حقائق و ضوابط سمجھنا بھی بہت دشوار ہے۔ عام طبقہ کے سامنے ہر عقیدہ اور عمل کی علت و مصلحت نہیں بیان کی جاتی نہ اس کی سمجھ میں آسکتی ہے۔ خاص خاص افراد بقدر توفیق الٰہی حقائق شرع سے واقف ہوتے ہیں۔ عوام کے سامنے تو سادہ عقائد و اعمال پیش کئے جاتے ہیں جس طرح جبر و مقابلے کے مباحث کسی جاہل گنوار کو سمجھانے میں دشواری ہوتی ہے اس سے کہیں زائد علوم نقلیہ کے حقائق سمجھانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال علوم نقلیہ کی نفی وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ کے لفظ سے کر دی۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ ابوجہل جیسے جھگڑالو کافر لوگ کو نہ تو علوم عقلیہ سے کوئی بہرہ ملا ہے نہ علوم نقلیہ سے۔ اس کے باوجود وہ دوسروں کو راہِ حق سے بہکانے کے لئے اللہ کی شان اور روز حشر کے وقوع و عدم وقوع میں جھگڑا کرتے ہیں۔ حالانکہ عقلی و نقلی مباحث کی تفتیش تحقیق میں دخل دینے کا ان کو حق ہی نہیں ہے ان کا کام تو صرف یہ ہونا چاہیئے کہ جب اللہ کا پیغمبر ان کے عقائد و اعمال کی اصلاح کے لئے اللہ کے احکام پہنچائے تو اُن کو بلا چون و چرا کئے قبول کر لینا چاہیئے۔

ثَانِيَ عِطْفِهٖ۔ جاہل کے دانا بننے اور بے علم کے عالم بننے کی ترکیب یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی نادانی اور جہالت کا احساس کر کے طلب علم کی کوشش کرے اور اہلِ علم سے جہاں تک ممکن ہو سکے فیض حاصل کرنے کے درپے ہو، لیکن جو بے وقوف جاہل اپنے کو علامہ اور محیط کل سمجھے ہوئے ہو اور علماء سے فیض حاصل کرنا تو بجائے خود رہا وہ انتہائی رعونت و غرور سے ان کی طرف گردن نیوڑائے، منہ پھیرلے اور اینٹھتا رہے وہ کبھی عالم نہیں ہو سکتا۔ اس فقرہ سے یہ ظاہر کرنا غرض ہے کہ اللہ کی شان میں نادانی کے ساتھ جھگڑا کرنے والے نہ فقط بے علم اور جاہل ہیں بلکہ مغرور اور رعونت زدہ بھی ہیں، آئندہ عالم ہونے کی امید بھی نہیں۔ کیونکہ تحصیل علم کے لئے طلب شرط ہے اور وہ طلب سے کوسوں دور ہے۔

لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ۔ اگر کوئی جاہل اپنی چالاکی اور مکاری سے چند بے وقوفوں کو اپنا ہمنوا بنا لیتا ہے۔ سفسطہ کو فلسفہ، توہم کو تعقل اور باطل کو حق کے لباس میں نمایاں کر کے اپنے مریدوں کا جتھا بنا بھی لیتا ہے پھر بھی اس کا یہ مکر دیرپا نہیں ہوتا۔ انجام کار پول کھل جاتی ہے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا ہے۔ دنیا ہی میں لوگوں کی نظروں میں ذلیل اور رسوا ہوتا ہے۔ چنانچہ کفار مکہ کے سرداروں کی یہی حالت مختلف واقع میں ہوئی خصوصاً جنگ بدر میں تو ان کو دوامی روسیاہی حاصل ہوئی اور حق و باطل کا امتیاز بالکل واضح ہو گیا۔

مقصودِ بیان:۔ نادان ہوتے ہوئے اللہ کی شان میں گفتگو کرنے اور جھگڑا کرنے کی ممانعت۔ علم کی تینوں قسموں کی طرف تین الفاظ سے اشارہ جہل مرکب میں مبتلا ہونے والے مغرور کی فی الجملہ مذمت اور دوسروں کو گمراہ کرنے کی تشنیع۔ (۳) اور اس طرف اشارہ کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے حق مغلوب نہیں ہوتا۔ باطل پرست دنیا ہی میں ذلیل ہوتا ہے۔ اور حاضرہ مسلمانوں کے لئے آیات سے یہ پیام ہدایت مستنبط ہوتا ہے کہ کوئی ایسا عقیدہ و نظریہ

ایجاد نہ کریں جس سے لوگ گمراہ ہوتے ہوں۔ خواہ ایجاد کرتے وقت گمراہ کرنے کا خیال ہو یا نہ ہو اگر غلط بات پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اسکو زبان قلم سے نہ نکالیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ

اور بعض لوگ کنارہ پر رہتے ہیں اللہ کی عبادت کرتے ہیں اگر اس کو کچھ فائدہ پہنچ گیا تو اس پر مطمئن ہو جاتا ہے اور اگر اس پر

فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝

کوئی مصیبت آجاتی ہے تو اپنے رخ پر پلٹ جاتا ہے یہ دنیا و دین کا نقصان اٹھاتا ہے یہ صریح نقصان ہے

يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۝

اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیز کی عبادت کرتا ہے جو اُس کو نفع پہنچا سکتی ہے نہ نقصان یہی پرلے درجے کی گمراہی ہے

يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ۭ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ۝

ایسی چیز کی عبادت کرتا ہے جس کا ضرر اُسی کے نفع سے قریب ہے یہ کیسا برا دوست اور کیسا برا رفیق ہے

تفسیر ان آیات کے سبب نزول کے متعلق مختلف روایات منقول ہیں لیکن حاصل سب کا ایک ہی ہے۔ ابن عباسؓ کا ایک قول ہے کہ کچھ بدوی دیہاتی جب حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو جاتے اور پھر اپنے وطن کو واپس جاتے تو اگر اس سال خوب بارش ہوتی، مال میں وسعت اور اولاد کی بہتری ہوتی تو کہتے کہ ہمارا دین اچھا ہے اور اگر اس سال قحط پڑ جاتا اور اولاد (کی بیماری یا موت) کا صدمہ پہنچتا تو کہتے اس دین میں کوئی خوبی نہیں ہے (رواہ ابن ابی حاتم وقال سیوطی اسنادہ صحیح) ابن عباس کا دوسرا قول ہے کہ جب کوئی دیہاتی مدینہ میں آتا اور آکر تندرست ہو جاتا اور اس کی گھوڑی کے خوبصورت بچہ پیدا ہوتا اور اُس کی اولاد بھی نرینہ پیدا ہوتی تو دین اسلام سے راضی ہوتا اور اپنی بھلائی پر مطمئن رہتا تھا اور کہتا تھا جب سے میں اس دین میں آیا ہوں مجھے فائدہ ہی ہوا ہے اور اگر مدینہ میں آکر بیمار ہو جاتا یا اس کی بیوی کے لڑکی پیدا ہوتی یا آمدنی میں کچھ تاخیر ہوتی تو شیطانی وسوسہ میں آکر کہتا واللہ جب سے میں اس مذہب میں آیا ہوں مجھے برائی ہی پہنچی ہے (کذا روی العوفی عن ابن عباس وقتادہ والضحاک وابن جریج وکثیر من السلف) حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ ایک یہودی مسلمان ہوا بعد اس کی آنکھیں جاتی رہیں، مال بھی برباد ہو گیا اور اولاد کا بھی صدمہ پہنچا۔ ان حوادث کی وجہ سے اُس نے اسلام کو منحوس جانا اور خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا آپ اپنا اسلام واپس کر لیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا اسلام واپس نہیں ہوتا۔ یہودی بولا میں نے اس دین میں کوئی بھلائی نہیں پائی۔ آنکھیں جاتی رہیں، مال گیا اور اولاد مری۔ حضورؐ نے فرمایا جس طرح کھوٹ بھٹی میں پڑکر چاندی سونے کا میل آگ کے ذریعہ سے صاف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح آدمیوں کی تمام کثافتوں کو اسلام دور کر دیتا ہے۔ (رواہ ابن مردویہ) بہر حال شان نزول کچھ بھی ہو آیت کا مطلب صاف ہے۔

خلاصۂ ارشاد یہ ہے کہ بعض لوگ بغیر قلبی یقین کے مسلمان ہو جاتے ہیں مسلمان ہونے کے بعد اگر ان کو دنیوی بہبودی حاصل ہوئی تو خیر ورنہ مرتد ہو جاتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوگونہ رنج اٹھانا پڑتا ہے، آنے والی مصیبت تو آتی ہی ہے اور ہر نجات آخرت سے محرومی ہو جاتی ہے، دنیا و دین دونوں برباد ہو جاتے ہیں۔ کم بختوں کو اتنا خیال نہیں ہوتا کہ کم از کم اللہ کی پرستش سے فائدہ کی اُمید یا دفع ضرر کی آس تو ہے، بے کس بے بس بتوں کی پوجا سے کیا فائدہ جن میں نہ نقصان پہنچانے کی طاقت نہ فائدہ رسانی کی قوت۔ ان پر بھینٹ چڑھانی، عبادت کرنی، نذر ماننی اور چڑھاوے چڑھانے سے سوا شرافت انسانیت کو قربان کرنے، مال برباد کرنے اور وقت کو ضائع کرنے کے اور کیا نتیجہ، اس سے زیادہ مزید واضح ضرر اور کیا ہو سکتا ہے۔

تحلیل اجزاء عَلٰى حَرْفٍ مجاہد و قتادہ نے حرف کے معنی شک لکھے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حرف کے لغوی معنی ہیں کنارہ۔ جس طرح پہاڑ کی چوٹی کے سرے یا دریا کے کنارے پر کھڑا ہونے والا مضطرب اور خطرناک ہوتا ہے اسی طرح بغیر پختہ ایمان

کے دین اسلام میں داخل ہونے والے بےچین رہتے ہیں۔ دنیوی مفاد حاصل ہو گیا تو کچھ سکھ نصیب ہو جاتا ہے، ورنہ برابر بےچینی میں رہتے ہیں۔

وَاِنۡ اَصَابَتۡهُ فِتۡنَةٌ ۔ فتنہ کے معنی ہیں آزمائش۔ فتنہ کے لفظ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ دنیوی حوادث اسلام و کفر کے ہاتھوں میں نہیں۔ یہ تو اللہ کی طرف سے بطور آزمائش مقدر ہیں۔ استقلال وثبات اور تزلزل و تذبذب کی آزمائش کرنی مقصود ہوتی ہے، مگر بےوقوف لوگ حوادث کو کفر و اسلام سے وابستہ سمجھتے ہیں۔

يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۔ دعا کا لفظ عام ہے۔ ہر قسم کی پرستش، مرادیں مانگنی، بھینٹ چڑھانی، نذر نیاز ماننی اور شفاعت طلب کرنی سب کو یہ لفظ شامل ہے۔

لَمَنۡ ضَرُّهٗۤ اَقۡرَبُ ۔ بتوں کی پوجا کرنے اور ان سے مرادیں مانگنے اور ہر طرح کے چڑھاوے چڑھانے میں فائدہ کی تو کوئی امید نہیں البتہ ضرر ضرور ہے۔ دینی بربادی کے علاوہ دنیا میں بھی نقصان ہوتا ہے، وقت فضول ضائع ہوتا ہے، مال برباد ہوتا ہے، عقیدہ کی قربانی ہوتی ہے اور انسانیت کبریٰ ذلت سے ہمکنار ہوتی ہے۔

ایک شبہ: ۔ اس فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بتوں کی پرستش سے کچھ نفع نقصان ضروری ہے، لیکن پہلی آیت کا مفہوم اس کے برعکس ہے۔

ازالہ ابن کثیر نے اس شبہ کا یہ جواب دیا ہے کہ ضرر و نفع بتوں کی ذات سے وابستہ نہیں، ان کو نفع نقصان کا کوئی اختیار نہیں، مگر ان کی پرستش ضرور نقصان رساں ہے اور دنیا میں بھی نقصان رساں ہے۔ امام رازی نے کبیر میں اس طرح جواب دیا ہے کہ پتھروں سے واقع میں کوئی نقصان وابستہ نہیں، مگر بےوقوف کافر اپنی جہالت سے اُن کو فائدہ رساں خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے، لیکن اگر بفرضِ محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے تو اتنا جان لینا تو ضرور ہی چاہیئے کہ نفع کی امید سے نقصان کا اندیشہ زیادہ ہے۔

میرے نزدیک صحیح جواب یہ ہے کہ پہلی آیت میں لفظ ما کا استعمال کیا ہے جس سے مراد بت یعنی بتوں کے ہاتھوں میں نفع نقصان کچھ بھی نہیں ہے اور اس آیت میں لفظ مَنۡ استعمال کیا گیا ہے جس سے مراد وہ گمراہ کن اشخاص ہیں جن کی پیروی کر کے عام اشخاص گمراہ ہوتے ہیں۔ اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ یہ بیوقوف کفار اپنے ان سرداروں کی پیروی کرتے اور امداد کے لئے پکارتے ہیں جن سے نقصان رسانی کا اندیشہ فائدہ سے زیادہ ہے۔ اس جواب کا ثبوت آئندہ جملہ سے ہوتا ہے جس میں فرمایا ہے کہ وہ (یعنی سردار کفر اور گمراہ کن شخص) برا رفیق اور برا دوست ہے کہ اپنے دوست کو نقصان کا راستہ بتاتا ہے۔

مقصودِ بیان ضعف ایمان کی طنزیہ مذمت اور ایمان کو پختہ رکھنے کی در پردہ ہدایت، دنیوی نفع نقصان کو اسلام و کفر سے وابستہ سمجھنے کی فی الجملہ تردید، گمراہ کرنے والے گروہ کی پیروی کرنے سے پُر لطف باز داشت، دورِ حاضر کے مسلمانوں کے لئے ہدایت کہ ایمان کو پختہ رکھیں، مصائب و آلام میں گرفتار ہو کر ایمان میں تزلزل پیدا نہ کریں اور دنیوی حوادث کو اسلام کا نتیجہ قرار دے کر گمراہ نہ ہوں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدۡخِلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے اللہ بیشک اُن کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے اندر نہریں بہتی ہوں گی

اِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيۡدُ ۞ مَنۡ كَانَ يَظُنُّ اَنۡ لَّنۡ يَّنۡصُرَهُ اللّٰهُ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ

بلاشبہ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے جو شخص یہ گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا و آخرت میں اُس کی ہرگز مدد نہ کرے گا

فَلۡيَمۡدُدۡ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لۡيَقۡطَعۡ فَلۡيَنۡظُرۡ هَلۡ يُذۡهِبَنَّ كَيۡدُهٗ مَا يَغِيۡظُ‏

تو اُس کو چاہیئے کہ آسمان کی طرف ایک رسی تانے پھر اس کو کاٹ ڈالے اور دیکھے کہ اس کی تدبیر اس کی غصہ آور چیز کو کیا دور کر سکتی ہے

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ

اسی طرح قرآن کو ہم نے واضح نشانیاں بناکر اُتارا ہے اور اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے جو لوگ مسلمان

اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ

ہیں اور جو لوگ یہودی ہیں اور ستارہ پرست اور عیسائی اور مجوسی اور مشرک

اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝

ان سب کا باہمی قیامت کے دن اللہ فیصلہ کردے گا بلاشبہ اللہ ہر چیز سے واقف ہے

تفسیر اوپر کی آیات میں کفار کی باطل پرستی پر تشنیع اور اس کا نتیجہ بد ظاہر فرمایا تھا۔ اس آیت میں یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ تک کفار کے مقابل مسلمانوں کا اخروی ثواب اور نیک انجام بیان فرمایا تھا تاکہ اگر کفر سے نفرت پیدا ہو تو ساتھ ہی اسلام سے رغبت بھی ہو۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ ہر بات کی وضاحت اس کی ضد کو بیان کرنے سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ کفر کی ضد اسلام ہے۔ اسلام ہی کی طرف طبائع کا میلان کرانا مقصود تھا لیکن جب تک کفر کی طرف سے قلوب میں نفرت نہ پیدا کی جائے اسلام کی طرف میلان نہیں ہو سکتا۔ جب کفار اور ان کے کفر کی حالت شنیعہ اور نتائج قبیحہ کا بیان ہو گیا تو پھر اصل مدعا کی طرف رجوع فرمایا۔

پھر جب دونوں متضاد فرقوں کی حالت کا بیان ہو چکا تو درمیانی گروہ پر پُر جلال الفاظ میں عتاب نازل فرمایا۔ منافقوں کا گروہ نہ ادھر تھا نہ اُدھر، ظاہر میں مسلم تھا باطن میں کافر۔ مسلمانوں کی نصرت و کامیابی دیکھ کر اس کو حسد ہوتا تھا، وہ نزول وحی و وعدہ نصرت پر رشک کرتا تھا۔ مگر مال کا لالچ اور مال غنیمت سے حصہ ملنے کا خیال، اور اسلام کے غالب ہو جانے کے آثار اس کو مسلمانوں کی طرف جھکنے پر مجبور کر تے تھے۔ اسی بنا پر وہ زبان سے اسلام کا اقرار کرتا تھا۔ پھر تینوں گروہوں کا حال بیان کرنے کے بعد تمام گروہوں کے متعلق ایک قطعی فیصلہ صادر فرمایا اور یہودی، عیسائی، آتش پرست صابی اور اہل اسلام سب کے متعلق آخری ریمارک کردیا کہ قیامت کے دن خود معلوم ہو جائے گا کہ کس کا نتیجہ اچھا ہے کس کا بُرا، کون ناجی ہے کون ناری۔

تحلیل اجزاء مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ۔ اس آیت کے موردِ نزول کے متعلق چند روایات ہیں، لیکن اہلِ درایت کے نزدیک وہ سب درایۃً ضعیف ہیں۔ ہم ان کو نقل کر کے وجہ ضعف بھی لکھتے ہیں۔

(۱) کچھ مسلمان تھے جن کو کافروں پر سخت غصہ آتا تھا، لیکن اللہ نے اپنے رسول کی امداد و نصرت کا جو وعدہ کیا تھا جب اس کے پورے ہونے میں تاخیر ہوئی تو ان مسلمانوں کے دلوں میں کچھ بدگمانی آنے لگی اس پر اس آیت کا نزول ہوا۔ اس قول کے موافق مَنْ كَانَ يَظُنُّ سے مراد وہی ضعیف الایمان مسلمان ہیں۔ کذا ذکرہ الخطیب فی السراج، لیکن چونکہ اس قول کی روایۃً کوئی سند نہیں، اس لئے غلط ہے۔ اپنی طرف سے شان نزول کی ایجاد صحیح نہیں۔

(۲) شیخ جلال محلی، عمادی اور ابوالسعود وغیرہم کے نزدیک مَنْ كَانَ کی ضمیر کافر کی طرف راجع ہے اور يَّنْصُرَهٗ کی ضمیر رسول اللہؐ کی طرف لوٹتی ہے۔ ابن عباس، مقاتل، کلبی، ضحاک، قتادہ، ابن زید، سدی، فراء اور زجاج نے اسی قول کے مطابق تفسیر کی ہے۔ اس قول کے مطابق مقاتل نے شان نزول اس طرح بیان کیا ہے کہ قبائل غطفان و اسد کے چند کافروں نے کہا ہم کو اندیشہ ہے اگر محمدؐ کو فتح حاصل نہ ہوئی تو ہم اپنے حلیفوں سے کٹ کر رہ جائیں گے نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ ہمارے ہم معاہدہ یہودی ہم کو غلہ دینا بھی بند کردیں گے۔ شانِ نزول کے متعلق روایت مذکورہ کو بیشک غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ روایت مذکورہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کافروں کو رسول اللہؐ کے کامران ہونے اور غیبی امداد کے نازل ہونے پر حسد نہ تھا بلکہ تاخیر نصرت کا اندیشہ تھا۔ اگر فوری نصرت و امداد منجانب اللہ ہو جاتی تو ان کے لئے مسرت کا باعث ہوتا یا کم از کم غیظ و حسد تو نہ ہوتا۔

(۳) بعض لوگوں کو امید تھی کہ ہم مدینہ کے رئیس بن جائیں گے، لیکن جب حضور والا مدینہ کو تشریف لے گئے اور اللہ نے آپ کی نصرت کی تو ان کافروں

کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا جو سیادت کے امید وار تھے اسی سبب سے ان کو غیظ و غضب آیا اور وہ رسول پاکؐ سے جلنے لگے تھے ۔ یہ واقعہ ٹھیک ہے ۔ دیگر مفسرین کی تقلید میں ہم نے بھی تفسیری نوٹ اسی قول کے مطابق لکھا ہے اور دیگر اقوال سے بظاہر یہ قول قوی بھی ہے اور روایت و درایت دونوں کے موافق بھی ہے مگر پھر بھی دو شبہے باقی رہتے ہیں ۔ اوّل تو یہ کہ آیت مذکورہ مکی ہے اور روایت کا انطباق اس وقت ممکن ہے جب آیت مدنی ہو ۔ دوسرا یہ کہ محولۂ بالا اُمید واران سیادت کا یہ گمان تھا کہ خدا تعالیٰ اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا اور ان کو غلبہ عطا نہیں فرمائے گا بلکہ ان کو تو رسول پاکؐ کی کامیابی دکھ رہی تھی ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آیت مذکورہ کا سبب نزول مخصوص نہیں نہ کوئی خاص واقعہ گزرا کہ اس کو موردِ نزول قرار دیا جائے بلکہ آیت کا ورود ہر اس دشمنِ اسلام کے حق میں ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے زوال و ضعف کا متمنی تھا یا ہے یا ہوگا اور خواہ مخواہ اسلام کی کامیابی اور مسلمانوں کے غلبہ پر جو کرتا ہے ۔ رہی یہ بات کہ آیت کا مطلب کیا ہے ؟ اس کے متعلق علماء نے اختلاف کیا ہے ۔ ہر شخص نے اپنی تحقیق کے موافق مطلب بیان کیا ہے ۔ ہم ہر تشریح کو معہ حوالہ ذیل میں نقل کرتے ہیں ۔

(۱) شاہ عبدالقادر مفسر دہلوی کی تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہو اور شدت سے گھبرا کر اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر دوسروں کو پکارنے لگے اور اللہ کی نصرت سے بالکل نا اُمید ہو جائے تو وہ اپنے دل کو اس طرح سمجھائے کہ مثلاً کوئی شخص اونچی لٹکی ہوئی رسی کو پکڑے ہوئے لٹک رہا ہو اب اگر وہ شخص چھت پر چڑھ بھی نہ سکے تاہم اُمید تو ہے کہ اگر رسی اوپر سے کھینچ جائے تو چڑھ جائے گا اور اگر اس رسی کو کاٹ ڈالا تو سوائے اس کے کہ اُمید سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اور کیا نتیجہ ہے ۔ اسی طرح اگرچہ بالفعل کسی غیبی مصلحت کے ماتحت اس پر تکلیف ہے ، لیکن اللہ کی رحمت کی مضبوط رسی پکڑا تھام رہا ہے کاٹ نہ ڈالے اور مایوس نہ ہو ، اس کا بدلہ یا تو دنیا ہی میں مل جائے گا ورنہ آخرت میں تو ضرور ملنا ہے اور اگر اللہ سے مایوس ہو کر باطل معبودوں کو پکارنے لگا جو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان تو نہ ادھر کا رہا نہ اُدھر کا ۔ اس قول پر مَنْ کَانَ سے مراد عمومی ہوگی ۔ کافر مومن کی تخصیص نہیں اور یَنْصُرَہٗ کی ضمیر مَنْ کی طرف راجع ہوگی اور سَمَاء سے مراد چھت ہوگی ۔

(۲) مفسر مدارک نے یَنْصُرَہٗ کی ضمیر محمدؐ کی طرف راجع کی ہے اور کاٹ ڈالے سے گلا گھونٹ لینا یا اپنے گلے میں پھانسی ڈال کر رگوں کو کاٹ لینا مراد لیا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ ہم تو اپنے رسول کی دین میں بھی مدد کریں گے اور دنیا میں بھی ۔ اب جس دشمن کو خدا ناگوار گزر رہی ہے وہ اونچی رسی لٹکا کر گلے میں پھندا ڈال کر مر رہے ۔ دیکھے اس کا غصہ اس سے فرو ہوتا ہے یا نہیں ۔ عطاء خراسانی ، مجاہد ، عکرمہ ، ابوالجوزا ، قتادہ اور ابن عباسؓ نے یہی مطلب بیان کیا ہے ۔ ابن کثیر نے بھی اسی کو پسند کیا ہے ۔

(۳) عبدالرحمٰن بن زید نے اس طرح مطلب لکھا ہے کہ جو دشمنِ اسلام دین کو مغلوب کرنے کا خیال خام رکھتا ہے اور رسول پاکؐ کے ناکام رہنے کی اس کو تمنا ہو تو چاہیئے کہ وہ ایک رسی باندھ کر آسمان پر جا چڑھے اور نزول وحی کا سلسلہ منقطع کر دے اور اللہ کی طرف سے آسمانی نصرت نہ آنے دے ، لیکن ایسا کرنا تو ناممکن ہے تو پھر اس غیظ و حسد سے کیا فائدہ ۔ نحاس نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے اور خازن نے بھی اسی مطلب کے موافق ترجمہ کیا ہے ۔ میرے نزدیک شاہ صاحب کا بیان کردہ مطلب زیادہ فہیم اور واضح ہے ۔

کَذٰلِکَ اَنْزَلْنٰہُ ۔ یعنی قرآن کی آیات تو بالکل واضح ہیں ان کی صداقت و حقانیت میں کوئی خفا و ابہام ہی نہیں ، عقل و نقل ، دونوں اس کی کی شہادت دیتے ہیں ، لیکن ہدایت یاب ہونا ہر شخص کا کام نہیں ۔ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے یعنی جس کے اندر ہدایت یاب ہونے کا مادہ ہے وہ راہِ راست پا جاتا ہے ۔ چشمۂ فیض سے ہر مقام پر پھول نہیں پیدا ہوتے ۔ ابر رحمت ہر جگہ ریحان نہیں اُگاتا اپنا اپنا ظرف اور اپنی اپنی قابلیت ہے

وَالصّٰبِئِیْنَ ۔ صابی کون فرقہ تھا ؟ اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے ۔ مجاہد ، عطاء خراسانی اور سعید بن جبیر کا قول ہے کہ صابی ایک بے دین گروہ تھا جو مجوس اور یہود و نصاریٰ کے درمیان تھا ۔ اس قول کا مقصد یہ ہے کہ صابی فرقہ کا کوئی دین نہیں ، مگر سکونت اس ملک میں تھی جو بلادِ مجوس اور ممالک یہود و نصاریٰ کے درمیان تھا گویا قوم صابی قدیم بابل کی رہنے والی تھی ۔ بابل قدیم کے شمالی مشرقی گوشے سے لے کر جنوب تک آتش پرستوں کی حکومت تھی اور شمالی مغرب سے جنوب تک یہود و نصاریٰ کا مسکن تھا ۔ ابن ابی حاتم نے ابوالزناد کا قول نقل کیا ہے کہ فرقہ صابیہ عراق کے متصل کوثیٰ شہر میں رہتا تھا ۔ انبیاء پر [illegible] کا ایمان تھا ، ہر سال تیس روزے رکھتا تھا اور یمن کی جانب رخ کر کے نماز پڑھتا تھا ۔ غالباً کوثیٰ وہ قریہ ہے جہاں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے

تھے اور بعد وہاں سے ہجرت کر گئے تھے۔ ابوالزناد کے قول سے مترشح ہوتا ہے کہ غالباً صابی فرقہ، فرقۂ ابراہیمی تھا جو نمرود کے خوف سے حضرت ابراہیم کے ساتھ نہ جا سکا تھا۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ صابئہ ایک فرقہ ہے جو ستاروں کی پرستش کرتا ہے یعنی ان کو قبلۂ عبادت بناتا ہے اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس عالم کا انتظام اللہ نے انہی کواکب کے سپرد کیا ہے اور یہی کثرانیوں کا عقیدہ تھا جن کی ہدایت کے لئے حضرت ابراہیم مبعوث ہوئے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن زید نے کہا کہ صابی ایک مذہب ہے اس گروہ کا مسکن جزیرۂ موصل یعنی فرات اور دجلہ کا درمیانی رقبہ تھا۔ یہ توحید کا قائل تھا، مگر کسی آسمانی کتاب اور نبی کو نہیں مانتا تھا۔ وہب بن منبہ کا قول ہے کہ فرقۂ صابئہ موحد تو ضرور ہے مگر اس کی کوئی شریعت نہیں حسن بصری کا قول ہے کہ صابی گروہ ملائکہ پرست ہے۔ ابوالعالیہ، ربیع بن انس، سدی، جابر بن زید، ضحاک اور اسحاق بن راہویہ کا قول ہے کہ صابیہ فرقہ اہلِ کتاب کا ایک فرقہ ہے جو زبور پڑھتا ہے۔ خلیل نے لکھا ہے کہ صابیہ کا دین عیسائیوں کے دین کے مشابہ ہے، ان کا قبلہ جنوب کی جانب ہے اور وہ اپنے کو دین نوح پر خیال کرتے ہیں۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ صابیہ گروہ نصاریٰ کا ایک فرقہ ہے جو نوح کے چچا صابی کی طرف منسوب ہے۔ یہ گروہ بعض اصول میں نصاریٰ سے موافق اور بعض امو میں ان کے خلاف ہے۔ میرے نزدیک امام رازی کا قول زیادہ قابلِ ترجیح ہے۔ مجاہد، عطاء خراسانی، سعید بن جبیر اور ابوالزناد وغیرہم کے اقوال سے اس کی تائید مستفاد ہوتی ہے۔

مقصودِ بیان دُکھ ہو یا سُکھ، راحت ہو یا تکلیف، مصائب کا ہجوم ہو یا آرام و آسائش کی فراوانی، بہرحال اللہ سے اُمید منقطع کرنی نہ چاہیئے، کیونکہ اُمید منقطع ہونے سے سوا ضرر کے کوئی فائدہ نہیں۔ کسی کی جائز ترقی دیکھ کر حسد کرنا حرام ہے، اپنے نقصان کے سوا نتیجہ نہیں۔ کاش مسلمان اس پیامِ ہدایت کو غور سے پڑھیں اور عبرت اندوز ہوں اور تمام امیدوں کا مرکز ذاتِ الٰہی کو قرار دیں اور کسی حالت میں اللہ سے مایوس نہ ہوں۔ قرآن کی تعلیم و ہدایت بالکل واضح اور ناقابلِ شک حقیقت ہے، مگر فائدہ ہر ایک کو نہیں پہنچتا۔ ہدایت یاب وہی شخص ہوتا ہے جس کو ہدایت کرنی خدا چاہتا ہے۔ آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَادُوْا کا سیاق چاہتا ہے کہ صابی اور مجوس فرقے بھی کسی آسمانی کتاب کے حامل تھے اُن کا حکم بھی دیگر اہلِ کتاب کی طرح ہے کیوں کہ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں بُت پرستوں اور مشرکوں کا تذکرہ نہیں فرمایا حالانکہ دنیا میں زیادہ گروہ انہی بے دینوں کا تھا بلکہ اہلِ کتاب کے ساتھ فرقۂ صابئہ اور مجوس کا تذکرہ فرمایا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں گروہ بھی اہلِ کتاب تھے ورنہ دیگر مشرکوں اور بے دینوں کو چھوڑ کر صرف ان کا تذکرہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ باوجودیکہ عرب میں صابی تو اس وقت کوئی موجود ہی نہ تھا یا تھے بھی تو بہت کم اور مجوسی مکہ مدینہ بلکہ پورے حجاز میں شاید خال خال ہوں۔ رہے مشرکین اور بُت پرست تو انہیں کا زور تھا یا یہودی اور عیسائی تھے جو اسلام کے سخت دشمن تھے۔ رسولِ پاکؐ کا مقابلہ عموماً بُت پرستوں سے اور کبھی یہود و نصاریٰ سے ہوتا تھا۔ اس وقت مجوسیوں سے بھی کوئی جنگ نہ ہوئی تھی اور نہ مجوسی اسلام کو روک رہے تھے۔ صابیوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، جن کے وجود کے ثبوت کے لئے ہی تاریخی دلائل کی ضرورت ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ عام بُت پرستوں کا تذکرہ تو نہ کیا جائے جن کی تعداد سب سے زیادہ تھی اور جو اسلام کے سب سے بڑے حریف تھے اور مجوس و صابئہ کا تذکرہ کیا جائے۔ ماننا پڑے گا کہ یہ دونوں گروہ بھی حاملِ کتاب تھے اور آیت میں تذکرہ صرف اہلِ کتاب کا ہی ہے۔ یہودی بھی کتاب کے حامل ہیں، عیسائیوں کے پاس بھی کتاب ہے اور مسلمانوں تو قرآنِ برحق کے علمبردار ہی ہیں۔ رہے مجوس تو ان کے پاس بھی کتاب موجود ہے جس کا نام ژند ہے اور جس کی شرح پاژند اور حاشیہ اوستا ہے۔ صفحاتِ تاریخ سے مٹی نہیں۔ مجوس کا عقیدہ ہے کہ زردشت نبی تھے اور انہی پر یہ کتاب نازل ہوئی۔ البتہ صابئہ فرقے کی کوئی کتاب نہیں معلوم ہوتی، لیکن ان کا وجود ہی اس زمانے میں کیا رسولِ پاکؐ کے زمانے میں بھی مشکوک تھا اور تسلیم بھی کر لیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ حضرت نوح یا حضرت ابراہیم کے صحیفے ان کے پاس موجود ہوں اور انہوں نے تحریف کر کے اپنے دین کو بگاڑ لیا ہو۔ بہرحال ان کو بے دین کہنا اور اہلِ کتاب کی فہرست سے خارج کر دینا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ واللہ اعلم۔ غالباً وجوہ مذکورہ کی بنا پر ہی اسحاق بن راہویہ، امام ابوحنیفہ اور بعض دوسرے فقہائے حنفیہ کا قول ہے کہ فرقۂ صابئہ کی عورتوں سے نکاح کرنا اور ان کا ذبیحہ کھانا جائز ہے۔ بعض فقہاء نے صراحت کی ہے کہ نکاح و ذبیحہ کی حلت کی صراحت امام محمد و امام ابویوسف نے کی ہے، امام ابوحنیفہ حرمت کے قائل ہیں۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَ

کیا تم کو نہیں معلوم کہ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند

وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ ۖ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ

اور ستارے اور پہاڑ و درخت و چوپائے اور بہت سے آدمی یہ سب اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں مگر بہت سے (آدمی) ایسے

الْعَذَابُ ۗ وَمَن يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن مُّكْرِمٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ۩

ہیں جن پر عذاب ثابت ہو چکا اور جسے اللہ ذلیل کرے اُس کو کوئی عزت دینے والا نہیں بیشک اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے

تفسیر چاند ہو یا سورج، روشن ستارے ہوں یا اونچے پہاڑ، سرسبز و شاداب درخت ہوں یا مختلف کاموں میں آنے والے جانور۔ بہر حال اللہ سب سے اعلیٰ اور بالا ہے۔ پتھروں میں نمو نہیں، بڑھاؤ نہیں، صرف اتنی قوت ہے کہ اپنے اجزا کو سمیٹے رہیں، مٹی کی طرح ہوا کے جھونکو سے ان کے اجزا پراگندہ نہ ہو جائیں۔ درختوں میں تحفظ اجزا کے ساتھ نمو کی بھی قوت ہے۔ حد خاص تک ان میں بڑھاؤ بھی ہوتا ہے، پھل پھول بھی آتے ہ لیکن شعور نہیں، احساس نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ احساس کی کوئی خاص کیفیت ان میں پائی جائے۔ مثلاً سردی گرمی سے متاثر ہونے کی قوت موجود ہو مگر ا حواس سونگھنا، چکھنا، چھونا، سننا، بولنا، دوست دشمن کی شناخت کرنا، اپنی خواہش اور ارادہ کے تحت حرکت مکانی کرنی وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام کیفیات درخ میں نہیں پائی جاتیں۔ ان خصوصیات کے حامل صرف جانور ہی ہیں۔ رینگنا، اڑنا، گھومنا، پھرنا، تیرنا اور مختلف حرکات کی قوت کا حامل ہونا، بھوک پیاس سردی گرمی، درشتی نرمی کا احساس کرنا، اچھی بری آواز کو سننا، خوش مزہ چیز کو کھانا اور بدمزہ کو چھوڑ دینا غرض یہ کہ خارجی تاثرات باطنی وجدان صرف جا میں ہی پایا جاتا ہے، مگر اس تمام کائنات ارضی میں وہ روشنی، وہ حرارت، وہ قوت فاعلہ اور تاثیر نہیں پائی جاتی جو آسمانی موجودات میں ہے۔ چاند، اور ستاروں کی تاثیرات سے فصول کا مبادلہ، پھلوں کی پیداوار اور پختگی، امراض کا ظہور و زوال اور مختلف مزاج رکھنے والی مخلوق پر مختلف تاثرات نما ہے۔ گویا زمین اور کائنات زمین میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہے، اور آسمانی موجودات میں اثر پیدا کرنے کی قوت ہے اور ان دونوں کے اختلاط سے عالم کون و فساد اور جہانِ تغیر قائم ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ آسمانی مخلوق اس جہان کے لئے باپ کی حیثیت رکھتی ہے اور ز کی کائنات ماں کی پوزیشن کی حامل ہے، لیکن ہیں سب انسان سے کم درجہ پر۔ خدا نے انسان کو قوتِ فاعلہ بھی دی ہے اور منفعلہ بھی، یہ متاثر بھی اور موثر بھی۔ اس کو جسم اور ضخامت بھی دی گئی ہے اور نمو بھی۔ پھر نمو کے ساتھ احساس، شعور اور ارادی حرکت بھی اور ان سب سے بڑھ کر عقل و فکر یہ اپنی فکر سے کائنات میں انقلاب اور تغیر پیدا کرتا ہے۔ تحلیل و ترکیب کرتا ہے اور کائنات فضائی کی تاثیر بدل ڈالتا ہے۔ موسموں کے تغیرات اور کے مبادلہ سے متاثر نہ ہونے کی ترکیب کرتا ہے اور اپنی ترکیب میں کامیاب ہوتا ہے۔ انسانوں کے لئے تمام مخلوق کو اپنا خادم بنا رکھا ہے اور واقعی کُ اس کی خادم ہے۔ اسی کے دم سے سب کی ہستی وابستہ ہے۔ جن لوگوں کی نظر صحیح، فکر درست اور عقل سلیم ہے انھوں نے اپنے مرتبہ کو سمجھ لیا ہے، وہ کسی ہستی کو نوعی ہستی سے برتر نہیں سمجھتے، کل کائنات کو اپنا خدمت گزار جانتے ہیں اور یہاں سے نظر کو اوپر اٹھا کر اس خلاقِ قدوس کے سامنے سر نیاز جھکا دیتے ہیں جو انسان کو کَرَّمْنَا بَنِيٓ آدَمَ کے خطاب سے یاد فرمایا اور عالم کی تمام قوتوں کو آدمی کا مسخر بنایا اور جہان کی کل موجودات کو پیدا کر کے انسان کی پیدائش تحفظ اور بقاء کا سامان فراہم کیا، لیکن اکثر لوگ کوتاہ نظر، تنگ بصیر اور مریض الفہم ہیں۔ ان کی بصیرت میں روشنی اور قوتِ ادراک میں وسعت نہیں۔ انھو اپنی ذہنی رسائی کے مطابق جب غور کیا تو انسانی وجود کو آبائے علویہ اور امہات سفلیہ سے وابستہ پایا، ستاروں کی تاثیریں دیکھیں اور عناصر کا تاثر دیکھا حرارت و برودت کو رطوبت و یبوست سے مربوط پایا، اس لئے کوئی گروہ تو باپ کے سامنے جھک گیا اور کسی نے ماں کے چرن کے لئے اوپر کو نظر اٹھائی تو کائنات کی ظاہری روشنی ستاروں سے وابستہ پائی، چاند سورج کی روشنی سے عالم کو منور پایا، انقلاب فصول اور میوہ غلہ وغیرہ کی پیداوار تغیر

ستاروں کی تاثیر کو کارفرما دیکھا فوراً آسمانی مخلوق کو دیوتا کہنے لگے ۔ مجوسی، صابی اور ہندو انہی نورانی ہیکلوں کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے، انہی کو قاضی الحاجات اور موثر حقیقی جاننے لگے ۔ پھر ستاروں کے نام کی مورتیاں مختلف دھاتوں اور معدنی چیزوں کی بنا کر اُن کی پوجا شروع کر دی اور جن لوگوں نے نیچے کو نظر کی تو اپنی ہستی کو دھرتی ماتا کی گود میں پرورش پاتا دیکھا، اس لئے ارضی کائنات کی غلامی کا طوق اپنی گردنوں میں ڈال لیا، لیکن حقیقتاً یہ انسانیت کبریٰ کی تذلیل تھی ۔ عالم بالا کی پرستش ہو یا زیرین دنیا کے سامنے سجدہ ریز ہونا دونوں صورتوں میں شرف انسانی کی قربانی کرنی پڑتی ہے ۔ آدمی کی فوقیت اور بالادستی تباہ ہو جاتی ہے، فطری برتری کی تذلیل ہوتی ہے ۔ عقل، فہم اور تمام روحانی طاقتوں کو اپنے خادموں کی خدمت میں وقف کر دینا اور ہوش و خرد کو بے ہوش و بے خرد چیزوں کے نام پر بھینٹ چڑھا دینا انسانیت عامہ کی سب سے ذلت ہے، لیکن جن لوگوں کو خدا نے عقل، رسا اور فہم دررس دیا ہے وہ مخلوق کو مخلوق اور خالق کو خالق جانتے ہیں، انسانی ہستی کی تذلیل نہیں کرتے، کل کائنات سے خدمت لیتے ہیں اور اس خدمت لینے کے شکریہ میں خلاق کائنات اور مسخر موجودات کے سامنے جبہ سائی کرتے ہیں ۔ اسی کو معبود مسجود جانتے ہیں اور موثر حقیقی سمجھتے ہیں اور اس طرح اپنے شرف کو برقرار رکھتے ہیں ۔

مذکورہ بالا فرقوں کے علاوہ ایک تیسرا فرقہ اور ہے جو اپنی بلندی حوصلہ اور صحت فکر کا مدعی ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ آسمانی کائنات اور ارضی مکونات میں سے انسان کی پرستش کے لائق کوئی بھی نہیں ۔ ستارے گو کیسے ہی مظہر نور ہوں، اور عناصر اور ان کے مرکبات انسان کے لئے کتنے ہی ضروری ہوں، مگر پھر بھی انسان سے پست درجہ پر ہیں کسی طرح مسجود و معبود ہونے کا ان کو استحقاق نہیں، مگر باہم آدمیوں میں فرق عظیم ہے ۔ آدمی بھی بھانت بھانت کے ہیں ۔ کوئی شیطان کا بھائی ہے، خواہشات کا بندہ ہے اور تاریک روح رکھتا ہے، کسی کی روح روشن ہے، اُس کی تمام خواہشات پر عقل کی حکمرانی ہے، اُس کے ہر لمحۂ زندگی میں للّٰہیت اور خلوص ہے ۔ بندگانِ خدا کی خدمت اور امن پیدا کرنے کی کوشش اس کے پیش نظر رہتی ہے، اس کی پوری زندگی منور ہے اور نہ فقط منور ہے بلکہ وہ مظہر نور الٰہی ہے، اس کے نور سے کل دنیا روشن ہے، قرب الٰہی کا وہ پایہ اس کو حاصل ہے جو کسی دوسری مخلوق کو نہیں ۔ مثلاً مسیح تھے، عزیر تھے، یہ مقربانِ بارگاہ تھے، اخص الخواص تھے، نور قدس کا مظہر تھے، ان میں خدائی کی خاص جھلک نظر آتی تھی، اس لئے ایسے لوگوں کے سامنے سر نیاز جھکا دینا نجاتِ آخرت کا باعث ہے، ان کو خدائی کاروبار کا مختار و کفیل سمجھنا موجب سعادت ہے ۔ یہ گروہ یہود و نصاریٰ کا ہے اس کے عقائد اور استدلالات بظاہر نظر قریب اور جاذب توجہ ہیں، مگر انسانیت کبریٰ کی تذلیل یہ پھر بھی کر رہا ہے ۔ یہ نہیں جانتا کہ انسانیت کے اعتبار سے اچھے بُرے نیک بد انبیاء اور کفار، زاہد اور فاسق سب ہی برابر ہیں، اندرونی اور بیرونی قوتیں سب کی ایک جیسی ہیں، عوارض کا فرق ہے، نفس میں روشنی اور تاریکی پیدا کرنے کا فرق ہے، اعمال کے صلاح و فساد کا فرق ہے ۔ مقام غور ہے کہ اس پرہیزگار گروہ کے اعمال میں صلاح، اقوال میں صدق عقائد میں درستگی اور ارواح میں روشنی کیوں پیدا ہو گئی ۔ کس وجہ سے اس کی قدسی قوتیں جگمگا اٹھیں؟ کیا اللہ کو چھوڑ کر کسی اللہ کے بندے نے مسجود و معبود بنایا تھا یا دوسرے انسان کے سامنے سر نیاز جھکایا تھا؟ اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر اس کو ماننے والے اور اس کی پیروی کرنے والے کیوں اپنی انسانیت اور آدمیت کو قربان کرتے ہیں؟ کیوں شرف فطری کو دوسرے انسان کے قدموں پر نثار کرتے ہیں ۔ امام و مقتدی، نبی اور پیرو، ہادی و مہتدی میں بڑا فرق ہے، مگر انسانیت اور لوازم انسانیت میں یگانگت ہے ۔ خلاقِ فطرت نے انسانیت و آدمیت کے مفہوم میں تفاوت نہیں کیا، باعتبار اصل کے آدمی سب ایک جیسے ہیں، ہر آدمی میں قوتیں برابر ہیں، اعضاء برابر ہیں، حواس برابر ہیں، رہی کثافت اور روشنی، نقصان و کمال، طاقت و ضعف تو اس کے تفاوت سے اصل میں کوئی تفاوت نہیں پیدا ہوتا ۔ یہ عوارض کا اختلاف ہے اور عوارض کے اختلاف سے اصلیت میں تفاوت نہیں پیدا ہوتا ۔ ہر آدمی آدمی ہے، آدمی کی اولاد ہے، کوئی بکرے کی اولاد نہیں، تناسلی سلسلہ بھی سب کا ایک ہی ہے، عمر کے مدارج طے کرنے کا طریقہ بھی ایک ہی ہے ۔ حس و شعور بھی ہر آدمی کا جانور سے زائد ہے گویا باہم افراد میں حس و شعور کا اختلاف ہے، پھر کون سی عقل شہادت دے سکتی ہے کہ عوارض و مراتب کے اختلاف کو اصل کے اختلاف کا سبب قرار دیا جائے اور کسی کے مقرب بارگاہ اور پرتو جمال ہونے کی یہاں تک قدر افزائی کی جائے کہ اپنا فطری شرف انسانی بھی قربان کر دیا جائے اور آدمی باوجود آدمی ہونے کے اپنے کو جانور یا دوسرے آدمی کو آدمیت سے بالاتر سمجھنے لگے ۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو تذلیل انسانیت اور توہین آدمیت ہوگی ۔

اس تمہید کے بعد یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جب آباء علویہ، امہات سفلیہ، موالید ثلاثہ اور فضائی و ارضی مخلوق میں سے کوئی بھی لائق پرستش نہیں اور

نہ کوئی اولوالعزم انسان مسجود لہ اور معبود ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ معبود صرف ایک ہی ہے۔ وہی کل عالم کا مسجود ہے کائنات
کی ہر چیز اسی کے حکم کی مطیع اور اسی کی مسخر و فرماں بردار ہے اور ہر شے اسی طریقے سے اس کو سجدہ کرتی ہے جو اس کی حالت کے سزاوار ہے۔ انسان
سجدہ کرتا ہے، ستارے بھی سجدہ کرتے ہیں، درختوں کی ٹہنیاں، ریگستان کے ذرّے، سمندروں اور دریاؤں کے قطرے اور پہاڑوں کے پتھر
اس کے سامنے سجدہ ریز ہیں، لیکن ہر ایک کا سجدہ جدا نوعیت اور جدا کیفیت رکھتا ہے۔ جب انواع جدا ہیں اور انواع کے خصوصیات جدا ہیں تو
کی ہیئت و کیفیت بھی جدا جدا ہے، مگر ہیں سب ساجد و عابد۔

اسی مضمون کو آیت مذکورہ میں بیان فرمایا ہے۔ کس قدر مختصر الفاظ اور جامع و مدلّل ہدایت ہے جس کی تفصیل کے لئے چند ضخیم مجلّدات کی ضرورت
ہے، لیکن اہلِ نظر کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

تحلیل اجزاء

یَسْجُدُ لَہٗ کل کائنات کے سجدہ کرنے کے دو معنی ہیں۔ اوّل یہ کہ ہر شی اپنے مناسب حال سجدہ کرتی ہے۔ آدمی کا سجدہ
ہے پیشانی اور ناک کو زمین پر رکھنا، درختوں کا سجدہ اور کوئی نوعیت رکھتا ہے اور پہاڑوں ستاروں کا سجدہ کسی
خاص کیفیت و ہیئت کا حامل ہے۔ ابن کثیر نے یہی مطلب لکھا ہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ تمام مخلوق فطرۃ اللّٰہ کی فرماں بردار اور مسخر ہے۔ قانون
سے کوئی سرتابی نہیں کر سکتا۔ چار و ناچار سب کو ضابطۂ فطرت پر چلنا پڑتا ہے۔ اس قول پر سجدہ کے معنی ہیں انقیاد و فرماں پذیری، اطاعتِ قدرت
اور ضابطۂ قدرت کی تعمیل۔ حضور اقدس صلعم نے ارشاد فرمایا آسمان میں چار انگل جگہ ایسی نہیں جہاں کوئی فرشتہ سجود میں نہ ہو۔

مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ۔ لفظ مَن کا استعمال خصوصیت کے ساتھ اصحابِ ہوش و خرد کے لئے ہوتا ہے۔ قوی کا ذکر کرنے کے بعد کمزور کا ذکر اس
ذیل میں آجاتا ہے، اس لئے مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ سے تمام کائنات مراد ہوگی خواہ ذی عقل ہو یا بے خرد جاندار ہو یا بے جان۔
وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ۔ ابوحیان نے بحر میں لکھا ہے کہ عرب میں قبیلۂ حمیر آفتاب کی پرستش کرتا تھا اور قبیلۂ کنانہ چاند کی اور
لخم شعریٰ کے پرستار تھے۔ قبائل طے ثریا کے اور بنی اسد عطارد کے۔ میں کہتا ہوں یہ تو عرب کی حالت تھی۔ عرب کے علاوہ غیر محدود اشخاص
علویہ کو اپنے رزق، بارش، کاروبار کی درستگی اور تاثیرات ارضیہ کا موجب جانتے ہیں۔ بلکہ بعض قومیں تو ستاروں کو مظہر انوار الٰہیہ سمجھتی ہیں۔ اسی
بنا پر ان کی پوجا کرتی ہیں۔ صابی ہوں یا ہندو۔ مجوسیوں کا کوئی خاص یا کوئی اور گروہ بہرحال سب کا رد اس فقرہ سے ہوگیا۔ قرآن پاک کی دوسری آیت
میں آیت میں آیا ہے۔ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ۔ حدیث پاک میں وارد ہے کہ آفتاب عرش کے نیچے جا کر
سجدہ ریز ہوتا اور حکم مانگتا ہے (جب حکم مل جاتا ہے تو زمین کا دورہ کرتا ہے) اب وہ وقت قریب آگیا ہے کہ اس کو حکم دیا جائے گا کہ جدھر سے آیا ہے اسی
طرف لوٹ جا (رواہ البخاری والمسلم) مطلب یہ ہے کہ سورج خود دورہ نہیں کرتا بلکہ فرمان الٰہی کا پابند ہے۔ بظاہر اس کی حرکت خود معلوم ہوتی ہے
مگر فی الحقیقت اس کی مشینری قدرت کے ہاتھ میں ہے، قدرت ہی اس کی کل چلا رہی ہے۔

وَالْجِبَالُ۔ جبال سے مراد یا تو پہاڑ ہیں یا پہاڑوں کے پتھر اور معدنی اشیاء۔ مؤخر الذکر معنی مراد لینے اولیٰ ہیں۔ پہلے معنی کی تائید اس آیت
سے ہوتی ہے جو حضرت داؤد کے قصہ میں سورۂ انبیاء میں آئی ہے کہ داؤد کے ساتھ پہاڑ بھی خدا کی پاکی بیان کرتے تھے اور ثانی معنی کی تائید سورۂ بقرہ
اس آیت سے ہوتی ہے جس میں مذکور ہے کہ بعض پتھر خدا کے خوف سے نیچے کو لڑھک کر گرتے ہیں۔ چاند سورج اور ستاروں کی طرح بعض قومیں پہاڑوں
کی بھی پوجا کرتی ہیں۔ مثلاً ہندو بعض پہاڑوں کے سامنے ڈنڈوت کرتے ہیں اور دھات یا پتھر کی مورتیوں کی پرستش تمام بت پرست اقوام کرتی ہیں
اس لئے ستاروں کے ساتھ پہاڑوں کا بھی تذکرہ کر دیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ نادان لوگ جن پتھروں کی پوجا کرتے ہیں وہ تو خود اپنی کمزوری عجز اور
مخلوق ہونے کے معترف ہیں اور اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔

وَالشَّجَرُ۔ بعض ہندو درختوں کو بھی پوجتے ہیں، پیپل وغیرہ کی تعظیم عبادت کی حد تک کرتے ہیں۔ حالانکہ تمام درخت خدا کے سامنے سربسجود ہیں۔
ابن عباس کا قول ہے کہ ایک صحابی نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! آج رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک درخت کے پیچھے نماز پڑھ رہا
ہوں جب میں سجدہ میں گیا تو اس درخت نے بھی میرے ساتھ سجدہ کیا اور اس نے سجدہ میں یہ الفاظ کہے:۔ اَللّٰهُمَّ اكْتُبْ لِیْ بِهَا عِنْدَكَ اَجْرًا

وَضَعْ عَنِّيْ بِهَا وِزْرًا وَّاجْعَلْهَا لِيْ عِنْدَكَ ذُخْرًا وَّتَقَبَّلْهَا مِنِّيْ كَمَا تَقَبَّلْتَهَا مِنْ عَبْدِكَ دَاوُدَ۔ ابن عباسؓ نے فرمایا پھر حضورؐ نے سجدہ کی ایک آیت تلاوت فرمائی اور سجدہ کیا۔ میں نے خود سنا کہ حضورؐ نے سجدہ میں وہی الفاظ فرمائے جو مذکورہ بالا صحابی نے درخت کے الفاظ بیان کئے تھے۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ وابن حبان فی صحیحہ)

وَالدَّوَابُّ۔ دواب سے مراد تمام جانور ہیں۔ خواہ چرندے ہوں یا پرندے یا درندے یا رینگنے والے کیڑے یا پانی میں تیرنے والے۔ بعض فرقے کچھ جانوروں کو بھی پوجتے ہیں۔ یعنی اتنی تعظیم کرتے ہیں کہ وہ حد عبادت تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ ہندوؤں میں گائے بیل اور بندر وغیرہ کی عظمت تو مشہور ہی ہے۔ حضور اقدس صلعم نے ارشاد فرمایا تھا کہ جانوروں کی پیٹھوں کو مت بناؤ (یعنی ہر وقت ادنیٰ ضرورت کے لئے بھی سوار ہونے کی عادت نہ کرلو) کیونکہ بہت سی سواریاں اللہ کو اپنے سوار سے زیادہ کرتی ہیں (رواہ احمد وقد ذکرہ صاحب المشکوٰۃ)

وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ۔ بہت سے آدمی آدمیوں کو بھی پوجتے ہیں بلکہ اکثر اشخاص اپنے بزرگوں کی تعظیم اس حد تک کرتے ہیں کہ وہ عبادت بن جاتی ہے۔ رام چندر، کرشن، مہادیو، لشمی اور برہما وغیرہ کو ہندو پوجتے ہیں، عزیر کو یہودی اور مسیح کو عیسائی معبود سمجھتے ہیں۔ بکثرت مدعیان اسلام اولیا کی قبروں اور پیروں کے مزاروں کو طواف گاہ، سجدہ گاہ اور عبادت گاہ بنا لیتے ہیں۔ بلکہ اکثر گمراہ تو اولیاء صلحاء وغیرہ کو کارخانۂ قدرت کا متصرف کل خیال کرتے ہیں۔ ان کو قاضی الحاجات اور دافع البلیات سمجھتے ہیں، ان کے ناموں کی نذر نیاز کرتے ہیں، مصائب کے وقت ان کو پکارتے اور ان کی دوہائی دیتے ہیں۔ عرب کے مشرکین نے بہت سے مقتدر انسانوں کی مورتیاں بنا رکھی تھیں جن کے سامنے وہ سجدہ کرتے اور گھومتے تھے۔ بھینٹ چڑھاتے اور نذر نیاز مانتے تھے۔ لات، منات، اساف، نائلہ، ذی الخلصہ، ہبل وغیرہ اسی قسم کی مورتیاں بنا رکھی تھیں۔ مقام غور ہے کہ وہ بزرگ جن کی پرستش پیچھے آنے والے جاہلوں کا فریضہ بن گئی ہے وہ تو اللہ کی الوہیت و ربوبیت کے معترف، ساجد، عابد، خدا سے ڈرنے والے اور اپنے ادنیٰ مخلوق ہونے کا اعتراف کرنے والے تھے، مگر ان کا نام لینے والے اتنے بے وقوف اور ناتراشیدہ کندہ بن گئے کہ بجائے بزرگوں کی تقلید کرنے اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کے الٹے انہیں کو پوجنے لگے اور اس طرح فطری شرف انسانی کو انہوں نے قربان کر دیا، اس لئے بعد کے فقرہ میں بصراحت فرما دیا کہ جس کی خدا اہانت کرتا ہے اس کو کوئی عزت نہیں دے سکتا۔ غیر اللہ کے پرستاروں کو خدا نے ازل سے ذلیل کر دیا۔ اب ان کو کون عزت دے سکتا ہے اور کس طرح یہ اپنی انسانیت کی تذلیل چھوڑ سکتا ہے۔

مقصود بیان اللہ کے سوا کسی بالائی یا زمینی مخلوق کی پرستش سے انسانیت کبریٰ کی تذلیل ہوتی ہے۔ اس سے یہ امر مترشح ہوا کہ انسان تمام کائنات سے اشرف ہے۔ دنیا کی ہر چیز اللہ کو سجدہ کرتی ہے۔ گمراہ ہیں وہ لوگ جو اولیاء اللہ سے مرادیں مانگتے، ان کو حاجت روا اور دافع البلیات جانتے، ان کی نذر نیاز کرتے اور مصائب کے وقت ان کی دہائی دیتے ہیں۔ ضمنی طور پر مسلمانوں کے لئے آیت میں درس نصیحت ہے کہ افراط محبت میں کہیں مخلوق کو خالق کا درجہ نہ دے دینا، انبیاء و اولیاء کو صفات الٰہیہ کا حامل نہ سمجھ لینا اور کسی کے متصرف کائنات ہونے کا عقیدہ نہ بنا لینا۔ فویل لھم شدید الذین یھدون من اتبعھم سبل الشعیر ضلوا واضلوا واخرماد بھم لنار ذلك بما کسبت ایدیھم وان اللہ لیس بظلام للعبید آیت سے یہ بھی مستفاد ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں۔ خواہ کسی قسم کا سجدہ ہو وغیرہ

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ۡ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ

یہ دونوں فریق ایک دوسرے کے مخالف ہیں اپنے پروردگار کے بارے میں جھگڑتے ہیں تو جنہوں نے کفر کیا ان کے کپڑے آگ کے کاٹ کر بنائے جائیں گے

يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ۝ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ۝ وَ

ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا پانی ڈالا جائے گا جس سے ان کے پیٹوں کے اندر کی چیزیں اور کھالیں جل جائیں گی اور

لَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيدٍ ۝ كُلَّمَا أَرَادُوا أَن يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ أُعِيدُوا فِيهَا

اُن کے لئے لوہے کے گرز مخصوص ہوں گے جب گھٹن کے مارے دوزخ سے نکلنا چاہیں گے تو پھر اُسی کے اندر لوٹا دیئے جائیں گے

وَذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ۝ إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

اور (کہا جائے گا کہ) جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو جو لوگ مومن اور نیکوکار ہیں اُن کو بلاشبہ اللہ ایسی جنتوں میں داخل کرے گا

جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا

جن کے اندر نہریں بہتی ہوں گی وہاں اُن کو سونے کے کنگنوں اور موتیوں سے آراستہ کیا جائے گا

وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا حَرِيرٌ ۝ وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوا إِلَىٰ صِرَاطِ الْحَمِيدِ ۝

اور وہاں اُن کا پہناوا ریشم کا ہوگا اور (دنیا میں) پاکیزہ باتوں کی اُن کو ہدایت کردی گئی ہے اور تعریف والے خدا کی راہ اُن کو بتا دی گئی ہے

تفسیر

ایک بار اہلِ کتاب نے مسلمانوں سے مناظرہ کیا اور کہنے لگے ہم کو اللہ کے ساتھ تم سے زیادہ تعلق ہے۔ ہمارا پیغمبر تمہارے پیغمبر سے مقدم ہے اور ہماری کتاب تمہاری کتاب سے پہلے نازل ہوئی۔ مسلمانوں نے جواب دیا ہم تو تمہارے پیغمبر اور اپنے پیغمبر دونوں کو سچا کہتے اور اپنے قرآن اور تمہاری کتاب دونوں پر ایمان رکھتے ہیں اور تم باوجودیکہ ہمارے پیغمبر کی صداقت اور قرآن کی سچائی سے آگاہ ہو چکے ہو، مگر پھر بھی حسد کے مارے ایمان نہیں لاتے۔ اب خود ہی غور کر لو کہ حق ہماری جانب ہے یا تمہاری جانب۔ اس پر دونوں فریقوں کا حال بیان کرنے کے لئے آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ صحیحین میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت ہے آپ نے سخت قسم کھا کر کہا تھا کہ اس آیت کا نزول حمزہؓ اور ان کے دونوں رفیقوں اور عتبہ اور اس کے دونوں ساتھیوں کے بارے میں ہوا تھا جب کہ یہ سب لوگ بدر کے روز میدان میں لڑنے نکلے تھے۔ قیس بن عباد کی روایت ہے کہ بدر کے روز جو دو حریف ٹولیاں لڑنے نکلیں تھیں وہ علی، حمزہ، عبیدہ، شیبہ، عتبہ اور ولید کی تھیں (انفرد بہ البخاری) بخاری نے حضرت علی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا میں ہی پہلا شخص ہوں گا جو قیامت کے دن اپنے حریف کے مقابل فیصلہ کرانے اللہ کے حضور میں حاضر ہوں گا۔

ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت کا نزول صرف چند اشخاص کے متعلق ہوا۔ تین حضرات جلیل القدر صحابی تھے اور تین سردارانِ کفر۔ بدر کے دن وہ تین ان تین سے لڑنے نکلے تھے۔ میرے نزدیک مورد کی تعیین مناسب نہیں اور اگر سبب نزول کی تخصیص ثابت بھی ہو جائے تب بھی حکم عام رہے گا۔

گزشتہ آیت میں دو فریق کا تذکرہ کر دیا گیا تھا۔ ایک وہ فریق تھا جو اللہ کے سامنے سر جھکاتا تھا۔ سجدۂ انقیاد بھی کرتا تھا اور سجدۂ ایمان بھی۔ اس فریق کا بیان كَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ کے فقرہ سے فرمایا۔ دوسرا فریق وہ تھا جو اگرچہ انقیاد پر تو مجبور رہے، مگر سجدۂ ایمان نہیں کرتا۔ اس کو كَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ کہہ کر ظاہر فرمایا تھا۔ انہیں دونوں فریقوں کو آیت مذکورہ میں خَصْمَانِ فرمایا۔ اکثر تابعین کے اقوال سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ مجاہد، عطاء اور قتادہ وغیرہم سے اسی مضمون کے اقوال مروی ہیں (ذکرہا ابن کثیر)

ان آیات میں خدا تعالیٰ نے مومنین و کافرین کے اخروی ثواب و عذاب کا بیان انتہائی ترہیبی و ترغیبی عبارت میں فرمایا ہے۔

تحلیل اجزاء

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ۔ جنگ بدر کے روز مسلمانوں کی طرف سے حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہ بن حارث میدان میں نکلے تھے۔ کفار کی طرف سے عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ برآمد ہوئے۔ حضرات علیؓ و حمزہؓ نے اپنے حریفوں کو قتل کر دیا لیکن حضرت عبیدہؓ کے حریف ولید یا شیبہ کا وار حضرت عبیدہ کی ٹانگ لگ گئی۔ حضرت علی نے پہنچ کر عبیدہ کے حریف کو ختم کر دیا۔ لیکن عبیدہ بھی جانبر نہ ہو سکے۔ حضرت ابوذرؓ کی روایت میں انہی چھ حضرات کو آیت کا موردِ نزول قرار دیا گیا ہے

فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۔ کفر کے مندرجہ ذیل اقسام ہیں اور آیت میں کسی خاص کافر کی تخصیص نہیں ، اس لئے جس شخص میں کفر کی کوئی قسم پائی جائے اس کو وہ عذاب پہنچے گا جو آیت میں مذکور ہے ۔ اللہ کی ہستی کا انکار یا شرک ، ملائکہ ، وحی ، جنت ، دوزخ ، حشر نشر ، عذاب ثواب ، عذاب قبر ، رسالت ، عموم رسالت ، ختم رسالت ، عموم شریعت ، بقائے شریعت الی یوم القیامۃ ، نماز ، روزہ ، حج و زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار ، اللہ میں کسی عیب و نقص کا ثابت کرنا ، کسی حلال کو حرام ، حرام کو حلال جان بوجھ کر قرار دینا ، انبیاء علیہم السلام کی توہین کرنی یہ تمام امور موجب کفر ہیں اور فقرہ مندرجہ بالا سب ایمانیات ہیں ۔

قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ۔ یہ کلام یا تو بطور استعارہ ہے یعنی جس طرح دنیا میں انہوں نے کفر اور سرکشی کا لباس پہن رکھا تھا قیامت کے دن ان کو آگ کا لباس پہنایا جائے گا ۔ لباس پہنانے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح لباس بدن کو محیط ہوتا اور جلد سے لپٹتا ہے اسی طرح عذاب نار ان کو محیط ہو گا یا کلام حقیقت پر محمول ہے ۔ سعید بن جبیر نے فرمایا ان کو لوہے اور تانبے کا لباس پہنایا جائے گا جو گرم ہو کر مثل آگ کے ہو جائے گا ۔ ابراہیم تیمی نے آیت مذکورہ پڑھنے کے بعد فرمایا جس نے آگ کے کپڑے کافروں کے لئے تراشے ان دونوں قولوں سے کلام کے حقیقی معنی کی طرف اشارہ ہے ۔

الْحَمِيْمُ ۔ گرم کھولتا ہوا پانی حمیم کہلاتا ہے ، لیکن ابن عباس ، مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ حمیم سے مراد ہے گلا ہوا تانبا ۔

كُلَّمَا اَرَادُوْا اَنْ يَّخْرُجُوْا ۔ ارادۂ خروج سے مراد ہے عام مفسرین کے نزدیک حقیقی ارادہ ۔ یعنی کفار وہاں سے نکلنے کا ارادہ کریں گے لیکن باہر نکلنا ان کو نصیب نہ ہو گا ۔ یا مجاز بلیغ ہے یعنی آگ کی لپیٹ کافروں کو اوپر اٹھائے گی جس کو دیکھنے والا یہی کہہ سکتا ہے کہ یہ لوگ نکلنا چاہتے ہیں ، مگر واقع میں ان کا یہ ارادہ نہ ہو گا ۔ فضیل بن عیاض کے قول سے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے ۔ آپ نے فرمایا واللہ ان لوگوں کو جہنم سے نکلنے کی کوئی آس نہ ہو گی ، لیکن بات یہ ہو گی کہ آگ کی لپیٹ ان کو اوپر اٹھائے گی اور آتشی گرز ان کو اندر گرا دیں گے ۔

وَذُوْقُوْا ۔ ابن کثیر نے کہا مطلب یہ ہے کہ دوزخیوں کو تکلیف قولی بھی ہو گی اور عملی بھی ، عذاب سخت میں مبتلا بھی ہوں گے اور ناسزا الفاظ بھی سننے پڑیں گے ۔

يُحَلَّوْنَ فِيْهَا الخ ۔ یہ کلام بھی یا تو بطور مجاز ہے یا حقیقی معنی مراد ہیں اور مقصود آرائش و زیبائش ہے ۔ واللہ اعلم ۔

وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ ۔ عموماً اہل تفسیر نے بیان کیا ہے کہ یہ دنیوی حالت کا بیان ہے یعنی مذکورہ نعمتیں بہشت میں ان کو اس وجہ سے حاصل ہوں گی کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اچھی بات اور عمدہ راستہ کی ہدایت کی گئی تھی ۔ اس تقدیر پر قول طیب سے مراد ابن عباس کے نزدیک کلمۂ توحید اور سدی کے نزدیک قرآن ہے اور عمدہ راستہ سے مراد راہ اسلام ہے ۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ بھی ایک بہشتی نعمت کا بیان ہے یعنی اہل جنت کو وہاں پہنچایا جائے گا جہاں اچھی باتیں سنیں گے اور طریق محمود پر پہنچا دیا جائے گا ۔ وہاں اچھی باتیں کیا ہوں گی ؟ اس کی تشریح میں بعض علماء نے مذکورہ ذیل الفاظ لکھے ہیں ۔ اہل جنت سے ہر دروازہ پر فرشتے کہیں گے ۔ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ عطاء کا قول ہے کہ اہل جنت خود زبان سے کلمات طیبات کہیں گے ۔ یعنی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ یا اسی طرح کے دوسرے الفاظ کہیں گے ۔

عذاب آخرت کی سختی کا اظہار اور لفظ فِيْ رَبِّهِمْ سے اس طرف اشارہ کہ اہل ایمان کی خصومت محض اللہ کے واسطے ہونی

مقصود بیان

چاہیئے ۔ خواہشات نفس ، زر ، زمین اور دیگر لذائذ و جذبات کے تحت جھگڑا کرنا مسلم کے شایان شان نہیں ۔ اس کے پیش نظر صرف اللہ کی خوشنودی کا حصول اور حصول رضا کا ذریعہ ہونا چاہیئے ۔ لفظ كَفَرُوْا بغیر تخصیص کے مذکور ہے ۔ اس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ ہر قسم کا کفر موجب عذاب ہے ۔ اہل جنت کی چار نعمتوں کا تذکرہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ۔ رہنے اور تفریح کرنے کے لئے باغات ، آرائش و زیبائش کے لئے ہر قسم کا زیور ، پہننے کے لئے آرام دہ خوبصورت لباس اور لذت روحانی حاصل کرنے کے لئے پاکیزہ الفاظ کا سننا ۔ یہ تمام نعمتیں اہل جنت کو حاصل ہوں گی ۔ گویا مذکورہ بالا تین نعمتیں تو نصیب ہونی لازم ہی ہیں ، مگر ایک خاص نعمت بھی حاصل ہو گی یعنی مقام قرب میں پہنچ کر مناجات الٰہی اُن کو میسر ہو گی اور ان پر نور الٰہی کی جلوہ ریزیاں ہوں گی وغیرہ ۔

اِنَّ الَّذِيْنَ	كَفَرُوْا	وَيَصُدُّوْنَ	عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ	الَّذِيْ جَعَلْنٰهُ		
جو لوگ	کافر ہیں	اور راہِ خدا سے	روکتے	نیز اُس مسجدِ حرام سے روکتے ہیں	جو ہم نے سب لوگوں کے		

لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ۭ وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

لئے بنائی ہے وہاں کا رہنے والا اور باہر سے آنے والا اس میں سب برابر (کے حقدار) ہیں اور جو شرارت سے وہاں کجروی کرنا چاہے گا ہم اسکو دردناک عذاب دیں گے

تفسیر

بد باطن اور بدکار اشخاص دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے جو خود راہ راست پر نہ آئے، اپنے عقائد، اعمال و اقوال درست نہ کرے اور مطلق العنان ہو کر خواہشات کا بندہ بن جائے۔ دوسری قسم وہ ہے جو علاوہ اپنی بدکاری اور کجروی باطنی کے اہل حق کے راستے میں بھی روڑے اٹکائے، دوسروں کو راہ حق سے پھیرنے کی کوشش کرے اور جہاں تک ممکن ہو کار خیر نہ کرنے دے۔ یہ گروہ اول الذکر سے زیادہ خبیث ہوتا ہے اور اس کا ضرر بھی متعدی ہوتا ہے۔ حق پرستوں کو اس کے ہاتھ سے بڑے بڑے دکھ پہنچتے ہیں۔ حضور اقدس کے زمانے کے کفار خصوصاً کفار مکہ بہت زیادہ بد باطن اور خبیث النفس تھے۔ خود تو حق تعالیٰ کی طرف مائل ہوتے ہی نہ تھے، دوسروں کو بھی روکتے تھے۔ مسلمانوں پر بڑے ظلم و ستم توڑتے اور جہاں تک قدرت ہوتی اسلام کی بیخ کنی کے درپے رہتے تھے چنانچہ لوگوں کو کعبہ کا حج کرنا بھی انہوں نے دوبھر کر دیا، قبائل کو مکہ میں آنے سے روک دیا تھا۔ انہیں کی مذمت میں یہ آیت سَوَآءَ ۨالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ تک نازل ہوئی۔ ابن عباس کا قول ہے کہ آیت کا نزول ابوسفیان وغیرہ کے حق میں ہوا تھا جب کہ انہوں نے حضور اقدس اور مسلمانوں کو عام حدیبیہ میں عمرہ کرنے سے روک دیا تھا (کذا ذکر الرازی فی الکبیر)

اس سے آگے دوسری آیت یعنی وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ آخر تک عبداللہ بن انیس کے حق میں نازل ہوئی۔ ایک مرتبہ حضور اقدس نے ابن انیس کی معیت میں ایک انصاری اور ایک مہاجر کو کسی کام کے لئے بھیجا۔ راستہ میں ان میں باہم کچھ جھگڑا ہو گیا۔ عبداللہ نے غصہ میں آکر انصاری کو قتل کر دیا۔ اس پر یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ اس شان نزول کی بنا پر مَنْ يُّرِدْ سے مراد ابن انیس ہوگا اور الحاد سے مراد قتل انصاری۔ لیکن صحابہ و تابعین نے الحاد و ظلم کی تفسیر مختلف الفاظ سے کی ہے۔ اس لئے حکم کو فقط شان نزول پر محصور رکھنا مناسب نہیں۔ الحاد کے معنی ابن عباس، ابن عمر اور دیگر صحابہ و تابعین نے مختلف بیان کئے ہیں۔ کسی نے قتل، کسی نے تحریم حلال و تحریم حرام، کسی نے بے ساختہ جھوٹی قسمیں کھانی، کسی نے مکہ میں غلہ کی بھرتی کرنی، کسی نے اسلامی گورنر کا دوران حکومت میں تجارت کرنا، کسی نے کچھ اور، کسی نے کچھ مراد لیا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اقوال صحابہ و تابعین میں الحاد کی جو تفسیر مذکور ہے وہ بطور مثال مذکور ہے گویا صحابہ نے الحاد کی قسمیں اور مثالیں بیان فرمائی ہیں ورنہ ہر گناہ مراد ہے۔ گناہ کرنا ہر جگہ ناجائز ہے، مگر مکہ کی سرزمین میں تو بہت ہی برا ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جو کفار مسلمانوں کو راہ خدا سے بہکاتے اور مسجد حرام میں آنے سے روکتے ہیں اور جو لوگ مکہ کے اندر شرک، خوں ریزی اور فسق و فجور کرنا چاہتے ہیں اُن سب کے لئے عذاب الیم ہے۔ دیسی ہو یا پردیسی، مکہ میں رہنے والا ہو یا باہر سے آنے والا، مقیم ہو یا مسافر، بہر حال مسجد حرام میں آنے اور طواف کرنے اور عبادت کرنے یا مکہ میں رہنے سہنے کا حق سب کو برابر ہے، کوئی کسی کو روک نہیں سکتا۔ جو شخص مسجد حرام یا مکہ کے اندر گناہ کرے گا اس کو سخت سزا ملے گی۔

تحلیل اجزاء

وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ ابن عباس، ابن عمر، قتادہ، سعید بن جبیر، امام ابو حنیفہ، اسحاق بن راہویہ، حنظل، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز وغیرہم کے نزدیک مسجد حرام سے مراد شہر مکہ ہے۔ مذکورہ حضرات کے نزدیک مکہ کی سکونت، قیام اور وہاں کی سرزمین سے منافع حاصل کرنے کا استحقاق تمام مسلمانوں کو برابر ہے خواہ عجمی ہوں یا عربی، مقیم ہوں یا مسافر، دیسی ہوں یا پردیسی۔ مکہ کی زمین کسی کی ملک نہیں نہ کسی کو اس زمین کا کرایہ اور محصول لینا جائز ہے۔ اس قول کا ثبوت مندرجۂ ذیل احادیث و آثار سے ہوتا ہے۔

امام محمد نے من طریق ابو حنیفہ باسناد ابن عمر مرفوع حدیث بیان کی ہے کہ خدا تعالیٰ نے مکہ کو حرم قرار دیا ہے، اس لئے اس کی زمین کے فروخت کرنے اور اس کی قیمت کھانے کو حرام کر دیا ہے۔ ابن عمر کا قول ہے کہ مکہ کے مکانوں کی فروخت اور ان کا کرایہ حلال نہیں۔

علقمہ کی روایت سے ثابت ہے کہ رسول پاک کے عہد سے حضرت عمرؓ کی وفات تک مکہ کی زمین وقف عام غیر مملوک کہلاتی تھی (رواہ ابن ماجۃ)
مکہ کے اندر کسی کے مکان کے احاطہ میں دروازہ لگانے کی حضرت عمرؓ اجازت نہ دیتے تھے تاکہ حج کرنے والے جہاں چاہیں فروکش ہوں۔

ایک مرتبہ سہیل بن عمرو نے اپنے احاطہ کا دروازہ لگایا۔ حضرت عمرؓ نے ان کو ممانعت کا حکم بھیجا۔ سہیل نے کہا میں تاجر آدمی ہوں، سواری کے جانوروں کے بھاگنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ دروازہ لگانے سے مقصود یہ ہے کہ جانور بھاگ نہ سکیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اگر یہ مقصد ہے (اور مالکانہ قبضہ مقصود نہیں) تو خیر کچھ حرج نہیں۔ ابن عمرؓ کی موقوف روایت ہے کہ جس نے مکہ کے مکان کا کرایہ کھایا اس نے آگ کھائی (رواہ الدارقطنی)

ابن عمرؓ کی مرفوع روایت ہے کہ مکہ مباح ہے اس کے مکانوں کا کرایہ جائز نہیں اور نہ اس کی زمین فروخت ہوگی (رواہ ابن مردویہ)

ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا میرے اور میری نسل کے لئے یہاں ایک زمین بطور جاگیر عطا فرما دیجئے۔ آپ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور فرمایا یہ حرم الٰہی ہے اس میں مقیم و مسافر برابر ہیں۔

تنبیہ یاد رکھو کہ جن حضرات کے نزدیک زمین مکہ کی بیع و شراء اور اس کو کرایہ پر اٹھانا ناجائز ہے۔ ان کے نزدیک مکان کی اینٹ، لکڑی اور دیگر عملہ کی خرید و فروخت بہرحال جائز ہے۔ حرمت صرف زمین کی ہے۔

جمہور کے نزدیک مسجد حرام سے خاص کعبہ اور کعبہ کے آس پاس کی زمین جو حرم کہلاتی ہے مراد ہے۔ اس کی خرید و فروخت وغیرہ ناجائز ہے، عام مکہ کے زمین کی بیع شراء جائز ہے اور آیت میں جو عام اجازت ہے اس سے سکونت کی عام اجازت مراد نہیں بلکہ عبادت کی اجازت مراد ہے مسجد حرام کے اندر عبادت کرنے کا ہر مسلمان کو حق ہے، کوئی کسی کو روک نہیں سکتا۔ جبیر ابن مطعم کی روایت ہے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا اے اولاد عبد مناف اس گھر کا طواف کرنے اور یہاں نماز پڑھنے سے کسی کو مت روکو، شبانہ روز میں کوئی وقت ہو (رواہ الترمذی)

رویانی وغیرہ کا قول ہے کہ مکہ کی زمین کا اجارہ و بیع حرام نہیں مکروہ ہے (کذا ذکر الخطیب)

وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ الخ۔ یعنی مکہ کے اندر جو شخص گناہ کرنا چاہے خواہ اس طرح ہو کہ مکہ کا رہنے والا ہو یا کسی دوسری جگہ کا باشندہ ہو اور مکہ میں پہنچ کر ارادۂ بد رکھتا ہو اس کے لئے عذاب الیم ہے، گناہ کا صرف ارادہ کرنا بشرطیکہ عملی طور پر گناہ نہ کرے اگرچہ شرعاً قابل گرفت نہیں، مگر یہ مکہ محترمہ کی خصوصیت ہے کہ جو اس سرزمین کے اندر گناہ کا عزم بھی کرے وہ بھی ماخوذ ہے۔ عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مسعود، ضحاک بن مزاحم اور ابن زید وغیرہم کا یہی قول ہے۔ ذکرہ ابن کثیر۔ اور یہی صحیح بھی ہے۔

عَذَابٍ اَلِيْمٍ۔ عذاب سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ بعض علماء کے نزدیک عام عذاب مراد ہے خواہ دنیا کا ہو یا آخرت کا۔ چنانچہ مکہ کے اندر خون ریزی، شرک اور فسق و فجور کرنے والوں کو دنیا میں بھی سخت ترین عذاب سے دوچار ہونا پڑا، کہیں قید ہوئے، کہیں لڑائیوں میں ذلت کے ساتھ مارے گئے، کہیں قحط کی مصیبت میں مبتلا ہوئے۔

مقصود بیان مکہ کے ان کافروں کو پُر زور وعید جنہوں نے مسلمانوں کو عمرہ کرنے سے روکا تھا اور اس امر کی درپردہ بشارت کہ عنقریب مکہ کی سرزمین آزاد ہو جائے گی، کسی کو وہاں ملکیت کا استحقاق نہ رہے گا۔ آج جو کفار جابرانہ تسلط کئے ہوئے ہیں اور اہل دین کو عبادتِ الٰہی سے روکتے ہیں کل وہ خوار و ذلیل ہوں گے۔ مسجد حرام میں عبادت کرنے کی عام اجازت اور اس امر کی صراحت کہ مسجد میں کسی کا ترجیحی حق نہیں۔ ہر شخص کعبہ کا حج کر سکتا ہے۔ مساوات فی العبادت کی عمومی صراحت کر کے ذیل میں اس طرف لطیف تنبیہ کہ خدا کے ہاں ذات پات، دولت و فقر، حکومت و محکومی، عزت و ذلت وغیرہ کے اعتبار سے کوئی امتیاز نہیں، اس کے گھر میں سب کا مرتبہ برابر ہے، جو بھی عبادت کرنا چاہے کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ اس بات کی تصریح کہ مکہ کے اندر غیر مسلم اقوام کو اس آیت سے سبق حاصل کرنا چاہئے جنہوں نے مندروں اور گرجاؤں میں تفریق کر رکھی ہے۔ برہمن، ویش اور چھتری قوموں کا مندر علیحدہ ہے اور شودر اقوام کا جُدا۔ یورپین عیسائیوں کا معبد علیحدہ ہے اور انڈین یا غیر یورپین اقوام کا کلیسا علیحدہ۔ پھر پروٹیسٹنٹ اور کیتھولک گرجاؤں کی تفریق اس پر مزید ہے۔ علیٰ ہذا اور بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ فَاعْتَبِرُوْا۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ

اور جب ہم نے ابراہیم کے لئے خانہ کعبہ کی جگہ مقرر کر کے (حکم دیا کہ) کسی چیز کو میرا شریک نہ بناؤ اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں

وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ

اور قیام کرنے والوں اور رکوع سجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھو اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو وہ تمہارے پاس پیادے اور ایسی دبلی اونٹنیوں

ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِىْٓ

پر سوار ہو کر آئیں گے جو ہر دور دراز راستہ سے آئیں گی (اعلانِ حج اس لئے کردو کہ) لوگ اپنے فائدوں اور چند مقررہ ایام میں اُن مویشی چوپایوں (کے ذبح)

اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ

پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے اُن کو عنایت کئے ہیں پس اُن میں سے کچھ کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو

الْفَقِيْرَ ۝ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝ ذٰلِكَ

کھلاؤ پھر چاہیئے کہ اپنے میل کچیل کو دور کریں اور اپنی منتیں پوری کریں اور قدیم گھر کا طواف کریں یہی حکم ہے

وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۗ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى

جو شخص اللہ کی قابلِ حرمت چیزوں کی عظمت کرے تو وہ اُس کے لئے اُس کے رب کے ہاں بہتر ہے سوائے اُن کے جو تم کو پڑھ کر سنائے جاتے ہیں

عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ

سب چوپائے تمہارے لئے حلال کر دیئے گئے لہٰذا تم ایک اللہ کے ہو کر اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتے ہوئے بتوں کی پلیدی سے بچو اور جھوٹ بولنے سے پرہیز

مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۗ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِىْ

رکھو جو شخص اللہ کا شریک قرار دیتا ہے وہ گویا (ایسا شخص ہے کہ) آسمان سے گر کر مر گیا اور پرندے اس کو نوچنے لگے یا ہوا اُس کو

بِهِ الرِّيْحُ فِىْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝ ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى

لے جا کر کسی دور جگہ میں ڈال دے یہ تو ہو چکا جو شخص اللہ کی نامزد چیزوں کی عظمت کرے گا تو وہ متقی ہے اور یہ بات دلوں کی پرہیزگاری

الْقُلُوْبِ ۝ لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝ (ع)

سے حاصل ہوتی ہے چوپایوں سے ایک وقتِ مقرر تک تمہارے لئے فوائد ہیں پھر اُن کے پہنچنے کی جگہ خانہ کعبہ کی طرف ہے

تفسیر اوپر کی آیت میں کعبہ کے اندر عبادت کرنے کی عام اجازت کا اظہار کیا گیا تھا جو بظاہر خلافِ انصاف معلوم ہوتا تھا۔ چونکہ تمام دنیا کے آدمی تو کعبہ کی نگرانی، حفاظت، تعمیر اور صفائی نہیں کرتے، یہ خدمات تو صرف مکہ والوں سے وابستہ ہیں، پھر ان کو ترجیحی حقوق نہ دینا بظاہر خلافِ انصاف ہے۔ ان آیات کے آغاز میں بانیٔ کعبہ کا نام اور وجہ تعمیر کعبہ ظاہر فرما کر شبہ مذکور کا ازالہ فرما دیا کہ کعبہ کو تعمیر کرنے والے مکہ کے قریش یا کوئی دوسری قوم نہیں بلکہ ابراہیم ہیں جو دنیا کے موجودہ انسانوں میں سے اکثر کے باپ ہیں، بلکہ اس وقت تو غالباً کل دنیا حضرت ابراہیم ہی کی اولاد ہے، اس لئے سبق ولد آ[illegible]

(اگر خانۂ خدا کے متعلق ہو سکتا ہے) تو تمام اولاد کو برابر یہ حاصل ہے، لیکن کعبہ کی تعمیر کی کیا غرض تھی؟ وہ غرض صرف اعلانِ توحید اور عبادت خانہ کی تعین تھی، پہلے جو شخص مشرک نہ ہو اور کسی قسم کی عبادت کرنی چاہے اور طریقِ ابراہیمی پر چلے اس کو برابر کا استحقاق ہے۔ ہاں جو لوگ تعمیرِ کعبہ کی اصل غرض سے ہٹ جائیں طریقِ ابراہیمی کو چھوڑ دیں، توحید کی بجائے شرک کرنے لگیں، وہاں فسق و فجور کرنا چاہیں، حرم کی حرمت توڑنے کا ارادہ کریں اُن کا دخل وہاں نہیں ہو سکتا۔
حاصل ارشاد یہ ہے کہ ہم نے ابراہیم کو کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا اور یہ وحی کی کہ اس مخصوص جگہ پر ایک عبادت خانہ بناؤ تاکہ لوگ اس کا طواف کریں، قربانیاں اللہ کے نام پر پیش کریں، خدا پرست اس میں کھڑے ہو کر نماز پڑھیں، رکوع کرنے والے رکوع اور سجدہ کرنے والے سجدہ کریں اور فقط خدائے واحد کو کریں اور اس گھر کو پاک و صاف رکھیں، اللہ کے سوا وہاں کسی اور کی پرستش نہ ہوا کرے۔ جب کعبہ بن گیا تو ہم نے ابراہیم کو حکم دیا کہ اعلانِ عام کردو کہ لوگ چاروں طرف سے حج کرنے آئیں اور مراسم خدا پرستی بجا لائیں۔ یہ بھی پیشین گوئی کردی کہ اگر تم اعلانِ عام کردو گے تو لوگ دور دراز کے ملکوں سے لبیک کہتے ہوئے آئیں گے۔ جن کے پاس سواریاں ہوں گی وہ سوار ہو کر آئیں گے ورنہ پیادہ پا ہو کر دوڑ پڑیں گے۔ چنانچہ ابراہیمؑ نے عرفات کی پہاڑی پر چڑھ کر ندا دی کہ چاروں طرف سے لوگ کعبہ پر ٹوٹ پڑے۔ آواز پہنچی یا نہ پہنچی بہر حال حج کرنے کے لئے لوگ آنے لگے۔ اس سے آگے حج کے منافع اور احکام شعائر مختصر بیان فرمائے ہیں۔ حج کے منافع تو بہت ہیں، مگر ہم مختصر لکھتے ہیں۔

جامع الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ حج کے منافع دو قسم کے ہیں۔ ایک منافعِ دنیا مثلاً تمام مسلمان ایک جگہ جمع ہوتے ہیں باہم میل جول ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کی خو بو طور طریق رسم و رواج اور معاملات سے واقف ہوتے ہیں، ایک قوم دوسری قوم سے علم و ہنر کا استفادہ کرتی ہے، دور دراز ملکوں کے صحیح حالات معلوم ہوتے ہیں، تجارتی فوائد اور تجربے حاصل ہوتے ہیں، قوتِ اجتماعیہ اور اخوتِ دینیہ اور مساواتِ مذہبی کا مظاہرہ ہوتا ہے جس بات پر کل دنیا کے مسلمانوں کو اتفاق کرتا ہے۔ اس پر اتفاق حج کے زمانے میں اس متبرک مقام میں آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ سفر کی عادت اور ریاضت و مشقت برداشت کرنے کا تجربہ ہوتا ہے وغیرہ۔

دوسرے فوائد دینیہ یہ بھی بہت ہیں۔ مثلاً ہزار در ہزار خدا پرستوں کا ایک جگہ جمع ہو کر آسمانی سلطنت کا نمونہ دکھانا، ایک پر دوسرے کے انوار و برکات کا منعکس ہونا تمام دنیا کو یہ دکھا دینا کہ اس روئے زمین پر ایک جماعت موحدین کی بھی ہے جو باہم مساوات کی عملی حامل ہے، جو ایک خدا کی پرستار اور ایک نبی کی پیرو ہے، جن کا لباس، ہیئت طور طریق اور طرزِ زندگی بھی ایک ہی ہے جو افتخارِ شاہانہ اور ذلتِ فقیرانہ سے بے نیاز ہے، اس کے ہاں بادشاہ کو انسانیت سے بالاتر امتیاز اور مسکینوں کو جانوروں کی ذلت حاصل نہیں۔ علاوہ ازیں حج موت کا بھی صحیح نمونہ ہے۔ گھر سے چلنا، اولاد و مال کو چھوڑنا، گویا دنیا سے گزرنے کی یاد دلاتا ہے۔ پھر کعبہ کے قریب پہنچ کر احرام باندھنا گویا کفن میں لپیٹنے کا نمونہ ہے۔ پھر احرام میں شکار و جماع وغیرہ مرغوبات سے رُکنا، مرنے کے بعد تمام لذائذ سے مجبور رہنے کا نمونہ ہے۔ پھر زادِ راہ اور راحلہ کا ہمراہ ہونا اور ہدی کا ساتھ رکھنا اس بات کو یاد دلاتا ہے کہ مرنے کے بعد اعمال ہی کا توشہ ساتھ رہے گا۔ پھر عرفات میں کھڑا ہونا حشر کا نمونہ ہے۔ پھر قربانی کر کے نہانا دھونا صاف ہونا گناہوں سے بری ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ پھر آخری طواف کرنا، حرم کعبہ میں جانا اور تمام ممنوعہ چیزوں کا جائز ہو جانا، جنت میں جا کر وہاں کی نعمتوں سے فیض یاب ہونے کو یاد دلاتا ہے۔

حج کرنے والے درحقیقت سچے عاشقوں کی زندہ تصویر ہوتے ہیں۔ عاشق کے بال دراز، ناخن بڑے بڑے، سر کھلا ہوا، گریبان دریدہ، گیروا لباس ہوتا ہے، ایک دُھن ایک لَو لگی ہوتی ہے، ہر وقت ایک ہی خیال پیشِ نظر رہتا ہے، محبوب کی محبت رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے، تمام لذتوں سے کنارہ کش ہوتا ہے، گھر بار دھن دولت، حکومت عزت سب کو چھوڑ کر کوئے محبوب کی راہ لیتا ہے۔ بجنسہٖ یہی حالت حاجیوں کی ہوتی ہے، یادِ الٰہی میں سرمست ہوتے ہیں، سر کھلا ہوتا ہے، ناخن بڑے اور بال چھوٹے ہوئے ہوتے ہیں، بغیر سیا ہوا لباس ہوتا ہے، خوشبو اور رنگ متروک ہوتا ہے، کوچۂ محبوب کی راہ لیتا ہے، دیوانوں کی طرح صفا و مروہ کے درمیان دوڑتا ہے، پاگلوں کی طرح وصالِ محبوب سے روکنے والے رقیب شیطان کے پتھریاں مارتا ہے، ہر وقت اٹھتے بیٹھتے اپنے محبوب کو پکارتا ہے۔ روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، جھکتا ہے، سجدہ میں گر پڑتا ہے، خانۂ محبوب کے چکر لگاتا ہے، اس کے دروازے کے پتھر کو چومتا چاٹتا ہے، الحاصل دیارِ محبوب میں مر جانے کو حاصلِ زندگی خیال کرتا ہے۔ اے کاش اس فقیر نامہ سیاہ کو بھی محبوبِ عالم اپنے عاشقوں کے گروہ میں داخل ہونے کی توفیق نصیب کرے۔

تحلیلِ اجزاء

اِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ۔ یعنی ابراہیمؑ کو کعبہ بنانے کی جگہ بتادی اور تعمیر کے لئے ایک مقام مقرر کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کعبہ کو تعمیر کرنے والے سب سے اول حضرت ابراہیمؑ ہیں، لیکن خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ کعبہ کے مقام کو ہم نے ابراہیمؑ کی عبادت و عمارت کے لئے نشان زد کر دیا۔ بات یہ ہے کہ طوفان نوحؑ کے سبب کعبہ کی عمارت گرگئی تھی اور اس پر مٹی کا انبار پڑ گیا تھا، حضرت ابراہیم کو دوبارہ اسی جگہ عمارت بنانے کا حکم ہوا۔ تیز ہوا سے ریت اڑ گیا، مٹی صاف ہوگئی، قدیم نشان پر حضرت ابراہیم نے دیواریں اٹھائیں، مگر چھت نہ بنائی البتہ مجر کو اندر داخل کر لیا۔ سطلانی نے شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ کعبہ کی تعمیر دس مرتبہ ہوئی۔ ایک مرتبہ ملائکہ نے بنایا دوبارہ حضرت آدمؑ نے، تیسری بار حضرت شیثؑ نے، چوتھی بار حضرت ابراہیمؑ نے، پانچویں بار عمالقہ نے، چھٹی بار حارث بن مضاض جرہمی نے، ساتویں بار قریش کے مورث اعلیٰ قصی بن کلاب نے، آٹھویں بار قریش نے، نویں بار ۶۴ھ میں عبداللہ بن زبیرؓ نے، دسویں بار حجاج ثقفی نے۔ جمل نے حاشیہ جلالین میں لکھا ہے کہ گیارھویں بار ۱۰۳۹ھ میں خلافت ترکیہ کی طرف سے تعمیر و ترمیم کی گئی۔

وَطَهِّرْ بَیْتِیَ۔ مجاہد و قتادہ نے طہارت سے مراد شرک سے پاک کرنا لیا ہے یعنی میرے گھر کو شرک سے پاک کردو۔ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے جزیرۂ عرب میں مختلف زمانوں میں چند بت پرست قومیں آباد تھیں۔ مثلاً لحم، عبدلیس، عاد، ثمود جرہم اولیٰ وغیرہ۔ ان میں سے بعض قبائل کی مورتیاں کعبہ کے آس پاس رکھی تھیں، لیکن جب وہ قومیں ہلاک ہوگئیں اور کعبہ کی عمارت گرگئی تو تمام مورتیاں بھی ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ حضرت ابراہیم کو حکم ہوا کہ شرک کی کثافتوں اور بتوں کی نجاستوں سے کعبہ کو پاک کردو۔

لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْقَآئِمِیْنَ۔ یعنی کعبہ کا طواف کرنے والے اور نماز پڑھنے والے۔ خطیب نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ طائفین سے مراد ہیں وہ پردیسی جو حج کو جاتے اور قائمین سے مراد وہ اہل مکہ جو وہیں کے رہنے والے ہیں۔ سعید بن جبیر، قتادہ، ربیع بن انس سے بھی یہی تفسیر مروی ہے۔ اس صورت میں آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ کعبہ کو پاک کردو حاجیوں کے لئے اور نمازیوں کے لئے۔ حاجی خواہ پردیسی ہوں یا مکہ کے باشندے اور مجاور۔ گویا طائفین و قائمین سے مراد حاجی ہوئے اور رکوع و سجود کرنے والوں سے مراد نمازی۔ یہ تفسیر میرے نزدیک احسن ہے۔ شیخ جلال محلی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، صاحب کمالین اور حاکم وغیرہ نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ۔ جمہور مفسرین کا قول ہے کہ یہ جملہ بھی حضرت ابراہیمؑ سے متعلق ہے۔ حضرت ابراہیم کو ہی اس میں خطاب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو حج کے لئے پکارو۔ حسن بصری اور اکثر معتزلہ کا قول ہے کہ یہاں سے خطاب رسول پاکؐ کو ہے پہلا کلام تمام ہوچکا۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے فرماتا ہے کہ اے محمد! لوگوں میں حج کا اعلان کردو۔ معتزلہ کی دلیل یہ ہے کہ قرآن پاک میں جس قدر خطابیات ہیں ان میں محمد رسول اللہؐ کو ان کا مخاطب قرار دینے سے کوئی مانع نہیں تو حضورؐ ہی کو مخاطب قرار دینا اولیٰ ہے۔ گویا اس آیت کا نزول فرضیت حج کے لئے ہے۔ چنانچہ ابوہریرہؓ کی روایت سے ثابت ہے کہ حضور اقدسؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا لوگو! اللہ نے تم پر حج فرض کیا ہے حج کرو (مسلم)

یَاْتُوْكَ۔ یعنی لوگوں کو حج کرنے کے لئے پکارو وہ تمہاری طرف آئیں گے۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے مقام ابراہیمؑ حجر یا کوہ صفا یا کوہ ابوقبیس پر کھڑے ہوکر کعبہ کا حج کرنے کے لئے لوگوں کو غائبانہ ندا دی۔ جلال محلی نے کہا کہ آپ کی آواز کل دنیا والوں نے سن لی۔ یہاں تک کہ جو لوگ ماں کے رحم اور باپ کی پشت میں تھے اور قیامت تک ہونے والے تھے سب ہی نے سن لی اور قیامت تک جن لوگوں کی قسمت میں حج کرنا تھا انہوں نے غیبی آواز کے ساتھ لبیک کہی۔ ابن کثیر نے صراحت کی ہے کہ یہ مضمون ان روایات کا ہے جو ابن عباس، مجاہد، عکرمہ اور سعید بن جبیر وغیرہ سے مروی ہیں۔

رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ۔ حج کو آنے کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں پیادہ یا سوار۔ عرب میں عموماً اونٹ کی سواری تھی۔ موجودہ دنیا کی سواریاں اس وقت مستعمل نہ تھیں، اس لئے اس آیت میں اونٹ کی سواری کا تذکرہ کیا۔ دوسری سواریوں کا ذکر نہیں کیا، مگر مراد یہ ہے جس طرح ممکن ہوگا لوگ حج کو آئیں گے، پیدل بھی اور سوار ہو کر بھی۔

تنبیہ: حضرت ابراہیمؑ کی آواز پر لبیک کہہ کر حج کو آنے والے درحقیقت حضرت ابراہیمؑ ہی کے پاس آنے والے ہوئے۔ کیونکہ کسی کے حکم کی تعمیل ممکن ہی اس شخص تک رسائی پیدا کرنے والی ہے۔ پھر حضرت ابراہیمؑ تو اس وقت زندہ موجود ہی تھے اور کعبہ میں تھے، اس لئے حقیقی معنی بھی صحیح ہوسکتے ہیں۔

لِیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ۔ ابن عباس اور اکثر علماء کے نزدیک عام منافع مراد ہیں، دین کے ہوں یا دنیا کے۔ رازی نے اسی قول کو پسند کیا ہے۔

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ ۔ یعنی چند معین دنوں میں اللہ کا نام لیا کریں ۔ بعض کا قول ہے کہ اس سے مراد قربانی کرنا ہے اور اللہ کا نام لینے سے مراد ہے ۔ بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ کہنا یا اَللّٰهُمَّ مِنْكَ وَاِلَيْكَ پڑھنا یا اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ پڑھنا لیکن اس قول پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ایام معلومات سے ایام قربانی مراد ہوں گے حالانکہ اس کا قائل کوئی نہیں ۔ اسی بنا پر اکثر علماء کہتے ہیں کہ عام ذکرِ الٰہی مراد ہے ، جس میں قربانی کو ذبح کرنے کے وقت تکبیر پڑھنی بھی داخل ہے ۔

اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ سے مراد عشرۂ ذی الحجہ ہے ۔ یہ قول ابراہیم نخعی ، مجاہد ، عطاء ، قتادہ ، حسن بصری ، سعید بن جبیر ، ابن عباس ، ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم کا ہے ۔ شافعی و ابو حنیفہ کا بھی یہی مسلک ہے ۔ احمد حنبل کا مشہور قول بھی یہی ہے ۔ عشرۂ ذی الحجہ کو معلومات کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عام عرب حساب سے ناواقف تھے ، مگر چونکہ اس زمانے میں حج ہوتا ہے اور دسویں تاریخ قربانی کے لئے بھی مقرر ہے ، اس لئے عرب کو یہ تاریخیں خصوصیت کے ساتھ معلوم ہوتی تھیں اور جاہلیت کے زمانے میں تو ان دنوں ایک زبردست میلہ لگتا تھا ۔ جہاں پہلوانوں کے دنگل ، اہل سخن کے مشاعرے اور تاجروں کی منڈیاں لگتی تھیں ۔ ایک روایت میں ابن عباس کا قول اس طرح مذکور ہے کہ ایام معلومات چار دن ہیں ۔ ایک یوم النحر (۱۰ ذی الحجہ) اور تین دن اس کے بعد (۱۱ و ۱۲ و ۱۳ ذی الحجہ) یہی قول صاحبین کا ہے اسی کو ابو مسلم نے پسند کیا ہے ۔

بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۔ بہیمہ ہر چوپایہ کو کہتے ہیں خواہ کوئی ہو ، لیکن الانعام کی قید لگنے سے تخصیص ہوگئی اور تین قسم کے جانور اس میں داخل ہوگئے ۔ اونٹ ، گائے ، بیل اور دنبہ بکرا (کشاف) اگر اللہ کا نام لینے سے خاص قربانی کے وقت نام لینا مراد ہو تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے جو قربانی کے جانور ان کو مرحمت فرمائے ہیں اس کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اللہ کی حمد کریں اور اس کی یاد کیا کریں ۔ تکبیر و تہلیل اور تسبیح و تحمید کا شغل رکھیں ۔

فَكُلُوْا مِنْهَا ۔ کھانے کا امر وجوب کے لئے ہے یا اجازت و اباحت کے لئے یا استحباب کے لئے ؟ بعض لوگ وجوب کے قائل ہیں کیونکہ ایام جاہلیت میں برسم یہود یا از خود اپنی قربانی میں سے آپ نہیں کھاتے تھے ۔ خدا تعالیٰ نے اس تنگی کو دور کرنے کے لئے مسلمانوں کو اپنی قربانی کا گوشت کھانے کا حکم دیا ۔ اکثر علماء کا قول ہے کہ امر وجوب کے لئے نہیں بلکہ اجازت کے لئے ہے جس طرح آیت وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا میں شکار کا حکم دیا فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا میں نماز کے بعد متفرق ہو جانے کا امر بطور اباحت ہے اسی طرح آیت مذکورہ میں خود کھانے کی اجازت ہے ، واجب نہیں ۔ مجاہد ، عطاء ، سفیان ثوری بلکہ جمہور اہل تفسیر کا یہی قول ہے ۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ اپنی قربانی کا گوشت خود کھانا مستحب ہے ۔ اب رہا یہ امر کہ کیا ہر قربانی کا گوشت خود کھانا جائز ہے یا نفل و واجب کے احکام کی کچھ تفصیل ہے ؟ تو ظاہر ہے کہ تمام قربانیوں کا ایک حکم نہیں ہو سکتا ۔

قربانیاں چند قسم کی ہوتی ہیں ۔ دورانِ حج میں کوئی ممنوع جرم یا گناہ کر لیا یا حالت احرام میں کسی جانور کا شکار کیا یا حرم کے کسی جانور کو ستایا ، یا جوں ، کھٹمل ، پسّو وغیرہ کو مار دیا ان سب صورتوں میں قربانی کرنی واجب ہے (اس کو عرف فقہاء میں قِران کہتے ہیں) یا حج و عمرہ جدا جدا احرام سے ادا کیا اس وقت بھی قربانی واجب ہے ۔ (اصطلاح فقہ میں اس کو تمتع یا متعہ کہتے ہیں) یا قربانی کرنے کی نذر مانی اس وقت بھی قربانی واجب ہے ۔ اور اگر جوؤں کی تکلیف سے سر منڈا دیا تو اختیار ہے کہ اس کی تلافی کے لئے روزے رکھے یا چھ مسکینوں کو تین ساع غلہ دے یا قربانی کرے (اس کو فدیۂ اذیٰ کہتے ہیں) ان صورتوں کے علاوہ دیگر قربانیاں مستحب یا نفل ہیں ۔ امام شافعی کا قول ہے کہ واجب قربانی میں سے خود کھانا جائز نہیں ۔ امام ابوحنیفہ نے فرمایا سوا تمتع و قران کی قربانیوں کے اور واجبات میں سے نہیں کھا سکتا ۔ ابن عباس و ابن عمر نے فرمایا کفارۂ شکار اور نذر کے علاوہ باقی تمام واجبات میں سے کھا سکتا ہے ۔ امام احمد اور اسحاق حنظلی کا یہی قول ہے ۔ امام مالک نے فرمایا سوا جزائے صید اور نذر اور فدیۂ اذیٰ کے دیگر واجبات میں سے کھا سکتا ہے ۔ رہا نفل قربانی کا حکم تو اس کی اباحت میں کسی کو کلام نہیں ۔ نفل قربانی کا گوشت کسی قدر خود کھانا سب کے نزدیک جائز ہے ۔

وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ۔ بعض کے نزدیک یہ امر بھی استحباب کے لئے ہے ، مگر جمہور کے نزدیک وجوب کے لئے ہے ۔ فقراء کو قربانی کا گوشت دینا واجب ہے بائس کا ترجمہ مختلف طور پر کیا گیا ہے ۔ سخت محتاج آدمی جو سوال نہ کرتا ہو (عکرمہ) تنگدست (مجاہد) لنجا اپاہج (قتادہ) اندھا (مقاتل) غرض ہر شخص نے مختلف معانی بیان کئے ہیں ، مگر ما بہ الاشتراک احتیاج و مجبوری ہے ۔ جو شخص محتاج و مجبور ہو اس کو دینا واجب ہے ۔ کتنا دینا چاہئے ؟ کسی نے نصف دینا واجب قرار دیا ہے کسی کا قول ہے کہ تین حصے کئے جائیں ۔ ایک حصہ دوست احباب کو بطور ہدیہ دیا جائے ۔ ایک حصہ فقراء کو دیا جائے ۔ ایک حصہ اپنے صرف کے لئے رکھا جائے ۔

اگر فقیر بائس نہ ملے تو کیا کیا جائے؟

بیضاوی، جلالین، معالم، سراج، تفسیر ابن کثیر و ابن جریر میں اس کی کوئی تفصیل موجود نہیں لیکن ظاہر ہے کہ بائس کی قید محض اتفاقی ہے احترازی نہیں مسلمانوں کے دلوں میں شفقت پیدا کرنے اور فقراء کی حالت پر رحم کرنے اور ان کی ہمدردی کرنے کی ترغیب دینے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اگر قید کو اتفاقی نہ کہا جائے گا تو ظاہر ہے کہ شدید الامتیاج بے دست و پا ناداروں کو تلاش کرنے میں سخت تکلیف ہوگی۔

ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ۔ ابن عمر کے نزدیک تفث سے مراد ہیں مناسک یعنی اس کے بعد بقیہ مناسک کو پورا کریں۔ مثلاً یوم النحر کی قربانی کے بعد منیٰ کو جانا آخر طواف کرنا وغیرہ۔ ابن عباس، عطار، مجاہد، اور اکثر مفسرین کے نزدیک تفث کے معنی ہیں میل کچیل ناپاکی وغیرہ۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ احرام دور کریں، نہا دھو کر میل کچیل سے پاک ہوں، ناخن کتروائیں، حجامت بنوائیں، بدنی صفائی کریں۔ حاصل دونوں تفسیروں کا ایک ہی ہے۔

وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ۔ یعنی جو کچھ نذر مانی ہے اس کو بھی پورا کریں یا یہ مراد ہے کہ حج میں جو چیزیں واجب ہوتی ہیں جن کے بغیر حج پورا نہیں ہوتا جیسے دم قران و تمتع وغیرہ ان کو پورا کریں۔ اول معنی عام مفسرین نے بیان کئے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر نے اعتکاف بیت اللہ کی نذر مانی تھی تو حضور اقدسؐ نے ان کو پورا کرنے کا حکم دیا۔ دوئم قول سفیان ثوری اور مالک بن انس کا ہے۔ علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ صرف ہدایا و قربانیوں کی نذر پوری کرنے کا حکم ہے۔

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ۔ طواف تین ہوتے ہیں:۔ (۱) اس وقت کیا جاتا ہے جب شروع میں پردیسی آدمی مکہ میں داخل ہوتا ہے اس کو طوافِ قدوم کہتے ہیں۔ (۲) جب دسویں تاریخ کو منیٰ میں قربانی کردی جاتی ہے اور احرام کھولا جاتا ہے تو اس کے بعد کعبہ کا طواف کیا جاتا ہے، اس کو طوافِ زیارت یا طواف افاضہ کہتے ہیں آیت میں یہی مراد ہے۔ (۳) جس وقت حج سے واپس ہوتے ہیں اس وقت بھی ایک طواف کیا جاتا ہے، اس کو طواف رجوع یا طواف وداع کہا جاتا ہے۔ ابن کثیر نے کہا ہے کہ حضور اقدسؐ بھی حج اسی طرح کرتے تھے کیونکہ یوم النحر میں جب حضور منیٰ کی طرف لوٹے تو اول سات کنکریاں ماریں پھر قربانی کی اور سر منڈایا پھر وہاں سے تشریف لا کر طواف کیا۔ صحیحین میں ابن عباس کی روایت ہے کہ حضور اقدسؐ نے لوگوں کو حکم دیا کہ آخری کام بیت عتیق کا طواف ہونا چاہیئے۔ ہاں حائضہ عورتوں کے لئے حضورؐ نے اس حکم میں تخفیف کر دی تھی۔

بیتِ عتیق کا ترجمہ ہے قدیم مکان یا آزاد مکان۔ چونکہ اس سے قدیم کوئی عبادت خانہ دنیا میں نہیں ہے اس لئے اس کو عتیق کہا جاتا ہے (رواہ قتادہ عن الحسن البصری) یا عتیق کہنے کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بیرونی بادشاہ کعبہ پر تسلط نہ کر سکا اور آج تک یہ عبادت خانہ آزاد رہا اور جس نے برائی کا ارادہ کیا خدا نے اس کو تباہ کر دیا۔

وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰهِ۔ حرماتِ الٰہی تمام وہ چیزیں ہیں جن کے کرنے یا نہ کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے گویا اوامر و نواہی دونوں کو یہ لفظ شامل ہے۔ اور تعظیم حرمات سے مراد ہے ان کی خلاف ورزی نہ کرنی۔ بعض لوگوں نے حرمات سے خاص مناسک حج مراد لئے ہیں۔ مناسک حج کی تعظیم یہ ہے کہ دورانِ حج میں کوئی فعل خلافِ شرع نہ کرے۔ خطیب نے مثال کے طور پر چند گناہوں کے نام لئے ہیں۔ مثلاً برہنہ طواف کرنا، اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام پر ذبح کرنا وغیرہ۔ بعض کہتے ہیں کہ حرمات اللہ سے مراد ہیں بیت حرام، مشعر حرام، مسجد حرام، بلد حرام اور شہر حرام۔ ان کی تعظیم یہ ہے کہ ان کا ادب ملحوظ رکھے۔ اُن کے احترام کا ہتک نہ کرے۔

وَأُحِلَّتْ لَكُمُ۔ مشرکین اپنی قربانیوں کی کوئی چیز نہ کھاتے تھے۔ اس کی تردید آیت فَكُلُوا سے مجمل طور پر فرما دی تھی، مگر اس آیت میں حلت کی صراحت کر دی اور فرمایا کہ تمام چوپائے (ذبح کے بعد) تمہارے لئے حلال ہیں۔ ہاں وہ چیزیں حرام ہیں جن کا ذکر (سورۂ مائدہ میں) کر دیا گیا ہے۔

تنبیہ سورۂ مائدہ مدنی ہے اور سورۂ حج مکی، اس لئے بظاہر کلام کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ تفصیلی ذکر سے پہلے استثنار کے کوئی معنی ہی نہیں میرے نزدیک اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ سورۂ حج بھی مدنی ہے بلکہ ۱۰ھ میں نازل ہوئی۔ کیونکہ حج کی فرضیت دسویں ہجری میں ہوئی ہے۔ ورنہ کم از کم آیت مذکورہ تو ضرور مدنی ہے۔ مذکورۂ بالا تمام آیات کا حاصل صرف یہ ہے کہ مشرکوں کے رسم و رواج کو توڑ دیا جائے، ان کے حج کے طریقے کی اصلاح کر دی جائے، حج کا ایک شرعی قاعدہ بتا دیا جائے، مامورات و منہیات کی تفصیل بتا دی جائے اور ان تمام قواعد کی ممانعت کر دی جائے جو مشرکوں نے از خود بنا رکھے تھے، اس لئے آیات میں مختصر طور پر چند اصول و ہدایات مزید بیان کی گئی ہیں تاکہ حج کا صحیح ذائقہ سمجھ میں آجائے۔ مثلاً **فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ**۔ پلیدی دو قسم کی ہوتی ہے (۱) حقیقی پلیدی جو نمایاں طور پر حواس سے محسوس ہوتی ہے، جیسے پیشاب وغیرہ (۲) حکمی پلیدی جس کی نجاست حواس سے محسوس نہیں ہوتی بلکہ عقل صحیح اس کو شناخت کرتی اور دیکھتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس طرح سمجھا یا جا سکتا ہے کہ جس چیز کے لگنے سے ظاہری

بدن ناپاک ہوجائے وہ حقیقی نجاست ہے اور جس کے ارتکاب سے یا جس کی وجہ سے روح گندہ اور کثیف ہوجائے وہ نجاست حکمی ہے۔ جوا، شراب اور تمام لہو و لعب اور دیگر آلات لہو، کفر اسی میں داخل ہے۔ اس کا استعمال روح کو گندہ کر دیتا ہے۔ آیت مذکورہ کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح تم حقیقی اور جسمانی پلیدیوں کو نفرت کرتے ہو اور بدن کو ہر نجاست سے پاک رکھنا چاہتے ہو اسی طرح روح کو بتوں کی نجاست سے بچاؤ، ان کی پرستش نہ کرو، ان کو معبود مسجود، حاجت روا، رازق، متصرف، شفیع اور قابل عظمت چیز نہ سمجھو۔

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ۔ زُور سے مراد جھوٹی گواہی ہے۔ امام احمد نے حزیم بن فاتک اسدی کی روایت سے بیان کیا کہ ایک روز حضور اقدس ﷺ نے نماز پڑھ کر کھڑے ہو کر فرمایا جھوٹی گواہی شرک کی برابر (قرار دی گئی یا بیان) کی گئی ہے۔ پھر حضور ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ابن مسعودؓ نے بھی ایک بار یہی الفاظ کہہ کر آیت مذکورہ تلاوت کی تھی (رواہ سفیان الثوری) صحیحین میں مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کیا میں تم کو بڑے گناہوں سے مطلع نہ کروں؟ صحابہ نے عرض کیا جی ہاں ارشاد فرمایئے۔ فرمایا اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنی۔ حضور ﷺ اس وقت تکیہ کے سہارے سے ایک دم اٹھ بیٹھے اور فرمایا اور قول زور (جھوٹی گواہی) سے بچو۔ ابن عباس سے ایک قول مروی ہے کہ قول زور سے مراد ہے اللہ پر افترا بندی اور بہتان تراشی۔ بعض کا قول ہے اس سے مراد مشرکوں کا وہ قول ہے جو حج کے زمانے میں کہا کرتے تھے۔ لَا شَرِيْكَ لَكَ اِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ الخ۔ یا مشرکوں نے جو اپنی طرف سے تحریم و تحلیل قائم کر لی تھی اور کہتے تھے هٰذَا حَلَالٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ اس قول سے اجتناب رکھنے کا حکم ہے۔ میرے نزدیک زیادہ قابل ترجیح تعمیم ہے۔ اگرچہ رفتار عبادت اور قرینہ تخصیص کا مقتضی ہے اور بظاہر قول زور سے کفار کا وہی شرک آمیز تلبیہ جو حج کے زمانے میں کہا کرتے تھے مراد ہونا معلوم ہوتا ہے، لیکن مطلق جھوٹ مراد لینا اولیٰ ہے، جھوٹ میں ہر قسم کا شرک آمیز کلام، دروغ شہادت، تہمت تراشی اور افترا بندی وغیرہ داخل ہے۔

فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ۔ کسی پہاڑ کی چوٹی یا کسی اور بلند مقام سے گرنے کے بعد آدمی کی ہڈی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے، بند بند جدا ہوجاتا ہے اور جب مردہ لاش میدان میں پڑی رہے تو مُردار خوار پرندے اس کا تکا بوٹی کر لیتے ہیں، سب نوچ کر کھا جاتے ہیں۔ یہی حالت مشرک کی ہوتی ہے۔ جب ایمان کے پہاڑ کی چوٹی سے گرا اور کفر و شرک کی وادی میں پہنچا تو تمام روحانی اور عقلی قوتیں چور چور ہوجاتی ہیں۔ بصیرت و فہم کا ستیاناس ہوجاتا ہے، ہوا و ہوس اور قہر و ظلم کے مردار خوار پرندے اس کی عقل کی لاش کو تکا بوٹی کر کے کھا جاتے ہیں اور اس طرح وہ حقیقی زندگی سے محروم ہوجاتا ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ جس طرح کسی اچھے خاصے آدمی کو آندھی اُڑا کر کہیں کا کہیں پھینک دیتی ہے اسی طرح کافر کی تمام باطنی اور روحانی طاقتیں ہوا و ہوس کی ہوائیں اور خواہشات نفسانی کی آندھیاں اُڑا کر حیوانیت و بہیمیت کے میدان میں پھینک دیتی ہیں اور مشرک آدمی روحانیت و اخلاق باطنی کے تباہ ہونے کے بعد انسانیت سے دُور گر جاتا ہے۔ صورت انسان کی ہوتی ہے، مگر واقع میں وہ شیطان یا درندہ حیوان یا چرندہ جانور ہوتا ہے۔

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ۔ شعائر کے لغوی معنی ہیں علامات اور وہ نشانات جو ہر قوم اور ہر شخص کے امتیاز کے لئے ہوتے ہیں۔ شریعت میں مراد ہیں وہ خاص ضوابط و قواعد جن کو خدا تعالیٰ نے اسلامی برادری کا مخصوص شعار قرار دیا ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، قربانی، حج وغیرہ۔ قومی اور ملکی نشانوں کو ناقابل توجہ سمجھ کر ترک کر دینا حماقت ہے۔ ہر فوج کا مارک جدا ہوتا ہے، ہر جھنڈے کا نشان جدا ہوتا ہے، ہر قوم کی جدا معاشرت اور خاص علامت ہوتی ہے۔ اگر اس کو ترک کر دیا جائے تو قوم قوم نہ رہے گی، شیرازۂ قوم منتشر ہوجائے گا۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے بھی کچھ خاص امتیازات و علامات مقرر کر رکھی ہیں جو ہر مسلمان کی ظاہری شناخت کی معیار ہیں۔ عبادات و معاملات اور صورت و سیرت کی اصلاح کے اصول شعائر الٰہیہ ہیں۔ بعض بے باک طبیعتیں رکھنے والے ان کو فضول جانتے ہیں اور کہتے ہیں دل ہی خدا پرستی ہونی چاہئے بس یہی کافی ہے، ظاہری شعائر اور مخصوص ضوابط اور دستور معاملات کی کیا ضرورت ہے۔ ان بے باکوں کے جواب میں فرمایا کہ قومی اور مذہبی شعار تو دلی پرہیزگاری ہی سے متعلق ہے، تقویٰ کی علامت ہے، ناکارہ نہیں بلکہ اس کا نہ ہونا پرہیزگاری کو کھو دینے والا اور اسلامی شیرازہ کو پریشان کر دینے والا ہے۔ ابن کثیر اور بعض دوسرے اہل تفسیر کے نزدیک شعائر سے عام اوامر و نواہی مراد ہیں۔ محمد بن ابو موسیٰ اشعری اور بعض دوسرے مفسرین کے نزدیک تمام احکام حج شعائر اللہ ہیں۔ قربانی کرنی، طواف کرنا، احرام باندھنا، حرم و احرام میں شکار نہ کھیلنا، حالتِ احرام میں ممنوعات کا ارتکاب نہ کرنا وغیرہ۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا شعائر میں سب سے بڑھ کر بیت (کعبہ) ہے، لیکن اکثر علماء کے نزدیک آیت میں شعائر اللہ سے قربانی کے جانور مراد ہیں۔ ابن عباسؓ کا یہی قول ہے۔ اس قول پر تعظیم شعائر یہ ہے کہ قربانی کے جانور عمدہ چھانٹ کر لئے جائیں، ان کو خوب موٹا کیا جائے۔ حضرت عمرؓ کے پاس تین سو اشرفی کی قیمت کی ایک اونٹنی تھی، آپ نے چاہا کہ اس کو فروخت کر کے اس کی قیمت سے بہت سے اونٹ خرید کر کعبہ کی قربانی کے لئے بھیج دوں۔ حضور اقدس ﷺ سے

استفسار کیا تو سرکار دو عالم نے ارشاد فرمایا نہیں اسی کو بھیج دو۔ حضرت ابن عمرؓ اپنے اونٹوں کو قبلی جھولیں ڈال کر بھیجا کرتے تھے اور ذبح کرنے کے بعد ان جھولوں کو خیرات کر دیتے تھے۔ حضرت سہل نے فرمایا ہم مدینہ میں ہم اور دوسرے مسلمان اپنی قربانی کے جانوروں کو موٹا کیا کرتے تھے (رواہ البخاری)

لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ۔ فیہا کی ضمیر یا بہائم کی طرف راجع ہے یا شعائر کی طرف۔ اول صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ قربانی کے جانوروں سے تمہارے فوائد وابستہ ہیں۔ مثلاً سوار ہونا، بوقت ضرورت ان کا دودھ پینا، آخرت میں ثواب ملنا وغیرہ۔

قربانی کے جانوروں سے فوائد حاصل کرنے کے متعلق دو قول ہیں۔ حرم میں قربانی کے لئے نام زد کرنے اور باقاعدہ ہدی بنانے سے پہلے تو ہر قسم کے فوائد بالاتفاق حاصل کئے جا سکتے ہیں کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے، مگر ہدی بنانے کے بعد بھی امام مالک اور شافعی اور اسحاق حنظلی کے نزدیک قربانی کے جانوروں سے فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں اور شدید ضرورت ہو یا نہ ہو اُن پر سواری کی جا سکتی ہے اور باوجود عدم احتیاج کے ان کا دودھ پیا جا سکتا ہے کیونکہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک بار حضور اقدسؐ نے ملاحظہ فرمایا کہ ایک شخص قربانی کے جانور (ہدی) کو ہانکتا چل رہا ہے۔ فرمایا اس پر سوار ہو جا۔ اس نے عرض کیا حضور یہ ہدی ہے۔ فرمایا سوار ہو جا۔ اس نے عرض کیا یہ ہدی ہے۔ فرمایا کمبخت سوار ہو جا۔ اس حدیث سے ثابت ہے کہ بغیر شدید ضرورت کے بھی قربانی کے جانور پر ہدی بننے کے بعد سوار ہونا جائز ہے۔

ابن عباس، مجاہد، قتادہ، ضحاک وغیرہم کا قول ہے کہ جب قربانی کے جانوروں کو ہدی بنا دیا اور اللہ کے نام پر ذبح کئے جانے کے لئے مکہ کی طرف روانہ کر دیا یا ساتھ لے چلا تو اب اُن پر سوار ہونا جائز نہیں نہ اور کسی قسم کے منافع ان سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ہدی بنائے جانے کے بعد اگرچہ قربانی کے جانوروں سے منافع حاصل کرنے ناجائز ہیں، مگر شدید ضرورت کے وقت فوائد حاصل کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ سواری بھی لی جا سکتی ہے اور دودھ بھی پیا جا سکتا ہے، مگر اندازے سے دودھ کی قیمت قائم کر کے اُس کا صدقہ کرنا پڑے گا۔ رہی وہ حدیث جو امام مالک وغیرہ نے ثبوت میں پیش کی تھی تو وہ حجت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عدم جواز اس وقت ہے جب سخت ضرورت نہ ہو، ممکن ہے کہ حضورؐ نے جس کو سوار ہونے کا حکم دیا تھا وہ بہت کمزور اور ضرورتمند ہو اسی لئے حضورؐ نے اس کو حکم دے دیا اور اگر ضمیر شعائر کی طرف راجع کی جائے اور شعائر سے مراد قربانی کے جانور ہوں تو مطلب میں کوئی فرق نہ ہوگا جو مطلب اوپر بیان کیا جا چکا وہی مطلب اس صورت میں بھی ہوگا اور اگر شعائر سے مناسک حج اور مشاہد مکہ مثلاً صفا مروہ قیام مزدلفہ وغیرہ مراد ہوں تو مطلب اس طرح ہوگا کہ ان علامات دینیہ اور قوانین حج سے تمہارے فوائد وابستہ ہیں۔ دنیوی فوائد بھی تم کو وہاں ملتے ہیں اور دینی منافع بھی حاصل ہوتے ہیں۔

إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى۔ یعنی قربانی کے جانوروں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت ایک معین وقت تک ہے وہ معین وقت ان کے ذبح ہونے کا وقت ہے۔ ذبح کے وقت تک بشرط ضرورت فوائد حاصل کرنے کی اجازت ہے۔

ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ۔ اگر شعائر سے مراد مناسک حج ہوں تو مطلب یہ ہوگا کہ شعائر کا محل بیتِ عتیق ہے یعنی احرام کھولنے اور افعالِ حج سے فارغ ہونے کی جگہ خانۂ کعبہ ہے، کعبہ کے طواف کے بعد حج پورا ہو جاتا ہے احرام کھول دینا چاہیئے۔ اسی بنا پر ابن عباس فرمایا کرتے تھے کہ جس نے کعبہ کا طواف کر لیا وہ احرام سے آزاد ہو گیا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ اور اگر شعائر سے مراد قربانی کے جانور ہوں تو مطلب یہ ہوگا کہ جانوروں کے ذبح ہونے کی حد بیتِ عتیق ہے۔ بیتِ عتیق سے مراد تمام حرم ہے (معالم وسراج) خاص کعبہ مراد نہیں ہے کیونکہ کعبہ کے اندر تو کسی جانور کا خون بہانا جائز نہیں نہ کعبہ مقام ذبح ہے۔

مقصود بیان

کعبہ بنانے کے لئے زمین اور مکان کی تعیین خدا تعالیٰ نے فرما دی تھی۔ یہ کعبہ حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا ہے۔ مقام عبادت یعنی مسجد کو ہر طرح کی بدنی اور روحانی نجاست سے پاک رکھنا واجب ہے۔ اگرچہ آیت میں صرف کعبہ کو پاک رکھنے کا حکم ہے، مگر علت حکم (یعنی عبادت خانہ ہونا) چونکہ مشترک ہے، اس لئے ہر مسجد کے لئے یہی حکم مستفاد ہوتا ہے۔ حج فرض ہے اور حضرت ابراہیم کی اُمت پر بھی فرض تھا۔ سواری پر حج کو جانے سے پاپیادہ جانا فضیلت رکھتا ہے۔ علماء نے یہی مسئلہ استخراج کیا ہے۔ حج میں بہت سے دینی اور دنیوی فوائد ہیں اور سب کو دوران حج میں حاصل کرنا جائز ہے۔ اسی سے استنباط کیا جا سکتا ہے کہ حاجی دوران حج میں تجارت کر سکتا ہے، اہل سیاست کے سیاسی خیالات کا تبادلہ ہو سکتا ہے۔ [illegible] فوائد کے حصول سے مانع نہیں۔ انسان کے لئے چوپائے بڑی نعمت ہیں۔ اس سے گوشت دودھ گھی مکھن وغیرہ کی اہمیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ عشرۂ ذی الحجہ میں اللہ کی یاد کرنی اور تکبیر تہلیل تحمید اور تمجید کا ورد کرنا بہت فضیلت رکھتا ہے۔ قربانی نفل ہو

یا واجب۔ بہرحال اس کا گوشت آدمی خود کھا سکتا ہے بشرطیکہ کسی جرم کی پاداش میں نہ کی گئی ہو۔ لفظ بائس سے اس طرف اشارہ ہے کہ فقراء و مساکین تمہارے دست نگر ہیں، تمہارے مالوں میں ان کا حصہ ہے، ان کی حالت قابلِ رحم ہے۔ اللہ نے جب تم کو توفیق دی ہے تو ان کی حالت زار پر رحم کھاؤ اور اپنے مال میں سے ان کو بھی کھلاؤ۔ نذر منت اللہ کے واسطے ہے تو کسی قسم کی ہو اس کو پورا کرنا واجب ہے۔ آخر میں خانہ کعبہ کا طواف ضروری ہے۔ آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ طواف بھی ایک قسم کی عبادت ہے اور چونکہ غیر اللہ کی عبادت حرام ہے، اس لئے مزاروں کا طواف قطعاً جائز نہیں صرف خانہ کعبہ کا طواف کیا جا سکتا ہے کیونکہ اسی کا حکم ہے۔ اللہ کے اوامر و نواہی کا احترام لازم ہے، سوا ان چوپاؤں کے جن کا ذکر سورۂ مائدہ میں کیا گیا ہے ہر قسم کے چوپائے کا گوشت کھانا جائز ہے۔ بُت اور پتھر کی مورتیاں انسان کی روح کو ناپاک کر دیتی ہیں، ان کی عبادت سے قلب کثیف ہو جاتا ہے، نگہت قلبیہ میں نجاست آجاتی ہے۔ اس لئے ان سے ایسا گریز کرنا چاہیے جس طرح ناپاک چیزوں سے گریز کیا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ مشاہیر اور بہی خواہانِ قوم اور عادل بادشاہوں کے مجسمے یا کسی حکیم فلاسفر اور ماہر علم کا اسٹیچو قائم کرنا جائز نہیں، نہ دیوالی وغیرہ کے وہ کھلونے اور مورتیاں خریدنی اور گھر میں لانی جائز ہیں جو ہندوؤں کے تہواروں کے موقعوں پر جاہل مسلمان اپنے بچوں کی ضد پوری کرنے کے لئے خریدتے اور گھروں میں لاتے ہیں۔ نہ ان کھلونوں کا خریدنا جائز ہے جو جاپان، انگلینڈ، امریکہ وغیرہ سے ہندوستان آتے ہیں اور بازاروں میں فروخت ہوتے ہیں اور جس طرح ان کھلونوں کا خریدنا جائز نہیں اسی طرح فروخت کرنا بھی جائز نہیں، کامل اجتناب ضروری ہے۔ کیونکہ آیت میں اوثان سے مطلقاً بلا قید اجتناب کا حکم دے دیا گیا ہے یہ نہیں فرمایا کہ عبادت کے لئے مت خریدو اور صرف ان کی پرستش سے پرہیز کرو، تفریح کیلئے خرید سکتے ہو۔ اگر پرستش مقصود نہ ہو تو اجتناب ضروری نہیں۔ بہت سے کوتاہ فہم مؤخر الذکر صورت میں جواز کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اب لوگ چونکہ عقل مند اور تعلیم یافتہ ہو گئے ہیں، دنیا انتہائی ترقی کر چکی ہے، تمدن اپنی آخری بلندی پر پہنچ چکا ہے، تہذیب انسانی معراجِ کمال پر چڑھ چکی ہے، اس لئے اس وقت مجسمہ قائم کرنے یا کھلونوں کی خرید و فروخت کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ یہ بے وقوف طبقہ نہیں سمجھتا کہ ہر فرد کے لئے جدا جدا قانون نہیں بنتا، قانون عام ہوتا ہے اور پوری قوم و ملک کے لئے بنایا جاتا ہے خصوصاً اسلامی قانون تو کل دنیا کے لئے ایک ہی ہے۔ اس میں تعلیم یافتہ اور جاہل کا امتیاز اور ہر شخص کا جدا حکم نہیں ہو سکتا۔ مادۂ فساد کی بیخ کنی لازم ہے خواہ اس سے بعض روشن خیال حضرات گمراہ نہ ہوتے ہوں، لیکن عام خرابی کو پھیلنے سے روکنے کے لئے فساد کی جڑ ہی کاٹ دینی ضروری ہے۔ کھلونوں سے جاہلوں میں گمراہی اب بھی پھیلتی ہے۔ ذرا راجپوتانہ میں جا کر دیکھو جاہل مسلمان مہادیو اور لچھمن و کرشن کی مورتیوں کی اب بھی کس قدر عظمت کرتے ہیں۔ نام کے مسلمان ہیں چونکہ تمدن و معاشرے میں ہندوؤں کے ہمدوش ہیں، اس لئے مورتیوں کی عظمت و رفعت بھی کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی قابلِ غور ہے کہ انتہائی روشن خیال، ہوش مند، سیاست داں، حکمراں قومیں اور بڑے بڑے نائٹ اور لارڈ اپنے اسلاف کے مجسموں کی کس قدر عظمت کرتے ہیں نہ فقط عظمت بلکہ ان سے قلبی محبت کرتے ہیں، گمراہی اسی طرح پھیلتی ہے۔ عظمت و محبت ہی پرستش کی حد تک پہنچا دیتی ہے۔ بلکہ ضرورت سے زیادہ محبت و عظمت پرستش کے مترادف ہے۔ یہی پرستش ہے۔ پرستش کے لئے طواف کرنا اور سجدہ ریز ہونا اور ڈنڈوت کرنا ضروری نہیں، پرستش کا تعلق قلب سے ہے۔ اگر جسمانی اعضا کی پرستش نہ سہی تب بھی قلبی پرستش تو ضرور ہو ہی جاتی ہے۔ اسی مادۂ فساد کے استیصال کے لئے بتوں سے عام اجتناب کا حکم دے دیا، اس لئے آگے ہر قسم کے دروغ سے اجتناب کرنے کی ہدایت ہے۔ دروغ خواہ مذہبی ہو یا دنیوی معاملات میں یا شہادت میں سب سے احتراز لازم ہے۔ لفظ حُنَفَاءَ تعلیم دے رہا ہے کہ مسلمان کے پیشِ نظر محض ذاتِ الٰہی اور اس کی خوشنودی کا حصول ہونا چاہیئے۔ اللہ کے معاملہ میں اس کو تمام تعلقات توڑ کر کل دوست احباب، اہل و عیال اور مال و منال سے منہ موڑ کر خدا سے رشتہ جوڑنا چاہیئے۔ مشرک درحقیقت مُردہ ہوتا ہے اس کی روح مر جاتی ہے۔ اس کی عقل فطری فنا ہو جاتی ہے، اس کی اخلاقی اور اصلاحی قوتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ شہوت و غضب کے مُردار خوار پرندے اس کی تمام اندرونی و بیرونی صلاحیتوں کو کھا لیتے ہیں۔ چونکہ اس کا اعتماد اور رجوع اللہ کی طرف نہیں ہوتا، اس لئے سکونِ قلب اور اطمینان اس کو نصیب نہیں ہوتا اور درحقیقت سکون و اطمینان ہی قلبی زندگی ہے۔ قوانین الٰہی کی پابندی اور شعائرِ خداوندی کا احترام ضروری ہے۔ ارکانِ مذہب یا تعلیمات شرعیہ کو خفت کی نظر سے دیکھنا اور ان کا مذاق اڑانا کفر کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔ اللہ کے اوامر و نواہی کی اہانت وہی لوگ کرتے ہیں جن کے دلوں میں ان کا خوف اور تقویٰ نہیں ہوتا ہے۔ قربانی کے جانور پر سوار ہونا یا اور کسی قسم کا فائدہ حاصل کرنا بشرط ضرورت جائز ہے۔ حاجیوں کی بھیجی ہوئی یا ساتھ لے جائی ہوئی قربانیاں حرم کے اندر ذبح ہونی چاہئیں وغیرہ۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ

اور ہر امت کے لئے قربانی کا طریقہ ہم نے مقرر کیا تاکہ ان مویشی چوپایوں کے ذبح کے وقت وہ اللہ کا نام لیں جو اللہ نے ان کو دیئے ہیں

فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا ۭ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ

تم سب کا معبود ایک ہی معبود ہے، تم اسی کے فرمانبردار بنو (اے محمد) اُن عاجزی کرنیوالوں کو بشارت دیدو کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن کے دل

قُلُوْبُهُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰي مَآ اَصَابَهُمْ وَالْمُقِيْمِي الصَّلٰوةِ ۙ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

ڈر جاتے ہیں اور اُن لوگوں کو جو اس مصیبت پر صبر کرتے ہیں جو اُنکو پہنچتی ہے اور باقاعدہ نماز پڑھنے والوں کو اور اُن لوگوں کو جو ہماری (دی ہوئی) چیزوں میں سے کچھ راہِ خدا میں خرچ

تفسیر اس آیت میں تین مضامین بیان کئے ہیں (۱) قربانی کی رسم نئی ہے یا پُرانی اور کیوں ہے؟ (۲) توحید و اطاعت کا حکم (۳) نجاتِ آخرت کی بشارت کے قابل کون لوگ ہیں؟ ہم ذیل میں تینوں نمبروں کی تشریح کرنا چاہتے ہیں تاکہ آیت کا مطلب سمجھ میں آجائے۔

بہت سے بے بصیرت، دہریے اور کوتاہ فہم ہنسا کے حامی کہتے ہیں کہ اسلام خون ریز مذہب ہے۔ اس نے جہاں آدمیوں کا خون بہایا دنیا میں فساد پھیلایا بندگانِ خدا کو محض مذہبی اختلاف کی وجہ سے ذبح کیا وہاں بے کس، بے بس جانوروں کے خون کی ہولی کھیلنے سے بھی اس نے دریغ نہیں کیا۔ لاکھوں جانور ہر سال مسلمان مفت ذبح کر ڈالتے ہیں اور سطحِ زمین پر رہنے والوں کو ان کی سواری، دودھ، گھی اور بال و اون سے محروم کر دیتے ہیں۔ غریب اور مجبور جانوروں نے کیا قصور کیا ہے کہ ان کو اس بے باکی کے ساتھ حلال کیا جاتا ہے۔ یہ کون سا مذہبی شعار ہے اور کون سا تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے۔ تاریک دماغ رکھنے والوں کی طرف سے اسی قسم کی بیہودہ بکواس پر مجلسِ مناظرہ اور ہر مذہبی تبلیغ کی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ یہ کالی رُوح رکھنے والا گروہ محض تعصب سے اسلامی احکام کا مذاق اڑاتا ہے۔ حقیقت سمجھتا ہے، دیکھتا ہے، مگر بصیرت و بصارت پر پردہ ڈال لیتا ہے۔ ذرا سمجھنے کی بات ہے کہ بندہ کا کمال کیا ہے اور آسمانی مذہب کیا سکھاتا ہے؟ آدمی کی سعادت یہ ہے کہ اپنے خالق کو پہچان لے، دل سے اُس سے محبت کرے اور محبت کی تکمیل کے لئے تمام درجاتِ محبت کو طے کر کے فنا فی المحبوب کے درجہ پر فائز ہو جائے اپنی مرغوبات و خواہشات کو قربان کر دے۔ جو چیزیں اس کو دل سے محبوب ہوں سب کو محبوبِ حقیقی کی راہ میں نثار کر دے۔ دنیا میں انسان کو سب سے زیادہ محبوب تین ہی چیزیں ہوتی ہیں۔ اوّل ہر شخص اپنی جان کو عزیز سمجھتا ہے اس کو بچانے کے لئے تمام دنیا کو چھوڑ دیتا ہے۔ دوسرے نمبر پر اولاد کی محبت ہے، اولاد کے لئے آدمی بڑی بڑی مصیبتیں جھیلتا اور سختیاں سہتا ہے۔ تیسرا درجہ مالی محبت کا ہے، اس میں غلّہ، کپڑا، روپیہ پیسہ، مویشی غرض ہر چیز داخل ہے، لیکن واقعی شرف تمام مال میں جانوروں کو حاصل ہے۔ ہر جانور جنسیت میں انسان کا شریک ہے اور انسان کی نوع کا سب سے قریبی تعلق حیوانی انواع سے ہے۔ اس کے بعد نباتی انواع اور ان سے بنی ہوئی چیزوں سے۔ پھر آدمی اپنے بقاء و تحفظ میں زیادہ محتاج حیوانات ہی کا ہے۔ اُن کے اُون سے ڈیرے، خیمے اور کپڑے بناتا ہے، گوشت اور چربی کھاتا ہے، کھال کے جوتے اور طرح طرح کے سامان تیار کرتا ہے، اعصاب اور ہڈیوں سے مختلف دوائیں اور استعمال کی چیزیں بناتا ہے۔ غرض یہ کہ گوشت پوست رگ ہڈی پٹھا کھال بال سینگ کھُر کوئی چیز جانور کی بیکار نہیں۔ اس لئے انسانی نوع کو جو قریبی تعلق حیوانات سے ہے وہ کسی دوسری چیز سے نہیں۔ سونا چاندی اور ہر قسم کے قیمتی پتھر تو براہِ راست کام کی چیزیں ہی نہیں ہیں۔ انسانی ضروریات کی فراہمی کا ذریعہ ہیں۔ ان کے ذریعہ سے انسانی ضروریات حاصل ہوتی ہیں۔ رہا غلّہ روٹی اور دوسری ارضی پیداوار تو ان کا بھی انسان سے تعلق ہے، مگر اس قدر قریبی تعلق نہیں۔ حیوانات میں سے بھی ان جانوروں سے بہت گہرا تعلق ہے جو عام طور پر کام آتے ہیں۔ یعنی اونٹ، گائے، بیل، دُنبہ، بکرا، مینڈھا وغیرہ اور پالتو جانوروں میں انہی کی کثرت بھی ہے، انہی سے انسانی ضروریات زیادہ وابستہ بھی ہیں۔ اب مقامِ غور ہے کہ جب انسان کے لئے حصولِ سعادت کا بس ایک ہی راستہ ہے اور یہ کہ محبتِ الٰہی میں قربانی پیش کرے خواہ کسی قسم کی قربانی ہو، تو ظاہر ہے کہ رضائے مولیٰ کے حصول کے لئے ہر چیز کی قربانی کی جا سکتی ہے۔ اللہ کی توحید پھیلانے اور شرک مٹانے کے لئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ سب سے پہلے اپنی جان پیش کرے اور جان کے بعد اولاد کی قربانی کرے۔ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے اعلانِ حق کی پاداش میں اپنی جان پیش کی تھی اور آتشِ نمرود میں ان کو ڈالا گیا تھا۔ پھر بحکمِ خداوندی اپنے نوجوان بیٹے کو قربان ہونے کے لئے پیش کیا کیونکہ اصل غرض بیٹے کی جان لینی نہ تھی بلکہ حکمِ الٰہی کی تعمیل اور رضائے مولیٰ کا حصول پیشِ نظر تھا۔ پھر تیسرے نمبر پر آپ نے اونٹ، گائے، بکرا، دُنبہ اور مینڈھا وغیرہ پیش کیا۔ گویا اپنے کل مرغوبات و محبوبات کو قربان کر دیا۔ شریعتِ اسلامیہ کے احکام اگرچہ بہت آسان ہیں، مگر اصل مقصد کی طرف سے وہ بھی چشم پوشی نہیں کرتی، اسی لئے حضرت ابراہیمؑ جو سُنت قائم کر گئے ہیں اس پر کاربند ہونے کی ہدایت کرتی ہے، مگر جان اور اولاد چونکہ بہت ہی عزیز چیزیں ہیں اور ہر شخص ان کی قربانی ہر وقت نہیں کر سکتا، اس لئے ہر

حال کسی خاص مقام پیران کی قربانی پیش کرنے سے تو بنظرِ سہولت اسلام نے منع کر دیا، مگر اعلانِ صداقت اور اعلاءِ حق کے لئے جہاد کرنے اور شرک کو مٹانے کیلئے اپنی جان اور اولاد کی قربانی پیش کرنے کا وجوبی حکم دے دیا۔ البتہ تیسری قربانی چونکہ دولت مندوں کے لئے سہل بھی تھی اور ہر صاحبِ مال آسانی کے ساتھ اس کو کر سکتا تھا اور کسی قسم کی دشواری اس میں نہ تھی، اس لئے حکم دے دیا کہ جانوروں کی قربانی یعنی مرغوباتِ قلبی نمبر سوئم کی قربانی ہر دولت مند صاحبِ نصاب پر فرض واجب ہے۔ رہی دیگر اشیاء کی قربانی تو اس کا حکم عمومی ہے جتنی جس کو توفیق ہو راہِ خدا میں اپنا مال پیش کرے اور فقیروں محتاجوں اور ضرورتمندوں کو کھلائے جہانتک ممکن ہو ان کی امداد کرے۔

قربانی کی رسم اسلام کی نکالی ہوئی رسم نہیں بلکہ ہر مذہب میں موجود ہے۔ جہاں اولاد، جانور اور مال غرض ہر چیز کو قربان کرنے کا حکم ہر ملت و اُمت میں ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔ یہودی، عیسائی، مجوسی، صابی، بُدھ، ہندو، دہابیری غرض ہر قوم اور ہر مذہب ہر قسم کی قربانی کا حکم دیتا ہے، مگر نوعیت، ہیئت اور کیفیت جُدا جُدا ہے۔ کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں جانوروں کی بھینٹ چڑھانے اور غلّہ، کپڑا، روپیہ پیسہ دان دینے کی رسم نہ ہو، لیکن اسلامی قربانی اور غیر مذاہب کی قربانی میں بڑا فرق ہے۔ اسلام کا مطمحِ نظر صرف یہ ہے کہ اللہ کی عظمت و کبریائی اور انعامِ عام کا عملی اقرار کیا جائے۔ اس کی ذاتی و صفاتی وحدانیت اور الوہیت و ربوبیت کی یکتائی تسلیم کی جائے، اُسی کے سامنے سرِ نیاز جھکا دیا جائے۔ اللہ کے ذکر کے وقت عاجزی اور فروتنی اور خشوع و خضوع کیا جائے، یادِ الٰہی سے لرز جائیں، تمام مصائب کو استقلال و استقامت کے ساتھ برداشت کیا جائے، تکالیف سے تنگ آکر کبھی بیہودہ کلمات زبان پر نہ آئیں اور شدائد سے مجبور ہو کر ناشکری نہ کی جائے، ہر قسم کی بدنی اطاعت اور مالی صدقات راہِ خدا میں پیش کئے جائیں۔ ہر مسلمان کا نقطۂ نظر ہر قربانی سے بس یہی ہے۔ مگر نافہم بے بصیرت گروہ ان حقائق کو نہیں سمجھتا اور قربانی کو اسلام کی اختراع کردہ رسم بتاتا ہے۔ فافہم۔

مذکورۂ بالا کل مضامین کو نہایت بلاغت و اختصار کے ساتھ آیت مذکورہ میں بیان کیا ہے اور قربانی کی جو اصل غرض ہے اس کو بھی واضح کر دیا ہے اور پھر جو لوگ نجاتِ اُخروی کی بشارت کے مستحق ہیں اُن کے اوصاف کو بھی تفصیل وار بیان کر دیا ہے کہ سوچنے والے سوچیں اور نصیحت حاصل کرنے والے نصیحت حاصل کریں۔

تحلیلِ اجزاء

جَعَلْنَا مَنْسَكًا۔ منسک کے معنی ابن عباس کے نزدیک عید یعنی تہوار۔ ابن عرفہ کے نزدیک ذبح۔ زید بن اسلم کے نزدیک مکہ اور عام مفسرین کے نزدیک عبادت و قربانی کا مقام ہے۔ جمہور مفسرین کا قول ہی اولیٰ ہے۔

اُمّت سے مُراد یا تو ہر قوم ہے یا صرف وہ گروہ ہے جو کسی الہامی مذہب کا پابند ہو یا پابند رہا ہو۔

لِيَذْكُرُوا۔ یہ قربانی کی رسم جاری کرنے کی اصل غرض کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قربانی کی رسم ہر قوم کے لئے ہم نے اس لئے مقرر کی کہ وہ یادِ الٰہی کریں اور خدا کی عظمت و کبریائی کا قولی و عملی اعتراف کریں۔ کس وقت یادِ الٰہی کریں؟ اس کے متعلق فرمایا: عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ۔ جانوروں کو ذبح کرنے کے وقت یادِ الٰہی کریں۔

غرض یہ کہ قربانی خون بہانے کا نام نہیں بلکہ اللہ نے جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور اسبابِ زندگی مرحمت فرمائے ہیں ان کا شکریہ ادا کرنے کے لئے زبان، قلب اور عمل سے اپنی مرغوبات کو قربان کرنے اور اللہ کی کبریائی کا عملی اور زبانی اقرار کرنے کا نام قربانی ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام پر اگر قربانی کی جائے اور بتوں، دیوتاؤں یا بزرگانِ ملت کے ناموں پر بھینٹ چڑھائی جائے تو وہ قربانی نہیں۔ کیونکہ اس میں یادِ الٰہی اور کبریائی کبریائی کا اعتراف نہیں ہے جب ہر قربانی کی غرض یہی ٹھہری کہ اللہ کی ربوبیتِ عامہ کا اعتراف کیا جائے تو فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا۔ لازم ہے کہ اسی کو معبودِ برحق مانا جائے، اس کی الوہیت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے، لیکن صرف زبان سے اقرارِ توحید و الوہیت کرنا چنداں مفید نہیں۔

بلکہ اقرارِ وحدانیت کے یہ معنی ہیں کہ اس کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے اس کے تمام اوامر و نواہی کی پابندی کی جائے۔ جان، اولاد، مال اور ہر مرغوب شئے کو اس کی خوشنودی کے حصول کے لئے وقف کر دیا جائے اور اس کے ہر ایماء کی تعمیل کے لئے سرِ نیاز جھکا دیا جائے۔ اوامر و نواہی کی پابندی کرنے والے اور سرِ نیاز جھکانے والے کون لوگ ہیں؟ ان کے اوصاف کی تفصیل ذیل کی آیات میں فرماتا ہے۔ اَلْمُخْبِتِيْنَ مخبتین سے مراد وہ لوگ ہیں جو سکون و اطمینانِ قلب کے ساتھ اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ ضحاک و قتادہ کے نزدیک تواضع و فروتنی کرنے والے مراد ہیں۔ سدی نے کہا جن کے دلوں میں اللہ کی محبت اور اس کا خوف بھرا ہوا ہے وہ مُخبت ہیں۔ سفیان ثوری نے کہا جو لوگ تقدیرِ الٰہی پر راضی رہتے ہیں اللہ کی فرماں پذیری اور برداشتِ حکم میں سر جھکائے رہتے ہیں وہی مُخبت ہیں۔ میرے نزدیک اس تفصیل و توضیح کی ضرورت نہیں۔ آئندہ جملہ میں خود مخبتین کے معنی کی وضاحت خدا تعالیٰ نے فرما دی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ۔ یعنی مخبت وہ لوگ ہیں جن کے دل یادِ الٰہی کے وقت محبت و خوف کی کیفیت سے بدمست ہو جاتے ہیں۔

وَالصّٰبِرِیْنَ عَلٰی مَآ اَصَابَهُمْ صبر کی تین قسمیں ہیں ۔ کسی چیز سے صبر کرنا ، کسی چیز پر صبر کرنا ، کسی چیز کے مقابلے کے لئے صبر کرنا ۔ قرآن نے تینوں اقسام کے صبر کی تعلیم دی ہے ۔ اول الذکر صبر کے تو یہ معنی ہیں کہ خلاف شرع خواہشات سے نفس کو روکا جائے ۔ زبانی ، قلبی اور عملی حرکتوں سے پرہیز رکھا جائے ۔ متوسط الذکر کی یہ حقیقت ہے کہ جو مصائب و آلام غیبی اسباب کے ذریعہ پہنچے ہوں ان کو ضبط و بلند حوصلگی کے ساتھ برداشت کیا جائے ۔ مثلاً کوئی قریب ترین عزیز یا رفیق ترین دوست مرگیا اور موت سے بچانا ناممکن تھا تو ہائے وائے نہ مچائے ، کپڑے نہ پھاڑے ، منہ نہ پیٹے ، بال نہ نوچے ، کفر و ناشکری کے الفاظ زبان سے نہ نکالے ۔ یا زمینی و آسمانی حوادث کے سبب کھیتی اور باغ تباہ ہوجائیں تو اللہ کے حکم کا نافذ ہونا پیش نظر رکھے ، خدا پر اعتماد نہ چھوڑے ، آئندہ عافیت سے مایوس نہ ہو ، یہ خیال نہ کرے کہ اب خدا میرا دشمن ہوگیا ، اس نے مجھے تباہ کردیا اب کبھی دولت و ثروت نصیب نہ ہوگی ۔ علیٰ ہذا بیماری اور دیگر شدائد سے بے تاب ہوکر حواس کو معطل نہ کردے ، خدا سے ناراض نہ ہوجائے بلکہ قوت تحمل سے کام لے ۔ تیسرے قسم کے صبر کی حقیقت صرف استقلال نفس ، خود اعتمادی ، سعی و کوشش اور طاقت مقابلے کی فراہمی ہے ۔ مصائب و مشکلات کا جواں مردانہ اور دلیرانہ ہمت کے ساتھ مقابلہ کرنا ، جرأت و جلادت کی روح اپنے اندر پیدا کرنا ، عزم میں پختگی اور جوش ، خون میں گرمی اور اُبال ، حوصلہ میں بلندی ، اعداء کے مقابلے میں ثبات و استقلال ، بڑی بڑی طاقتوں کے سامنے ڈٹ جانا ، ظلم کو دُور کرنے کے لئے پُر جبروت فرعونی قوتوں سے ٹکر لینا اور بے باکی و اولوالعزمی کے ساتھ جور و ستم کے تناور درختوں کی جڑیں کاٹ دینا یہ ہے ۔ مؤخر الذکر صبر کا مفہوم ۔ قسم دوم و سوم ایک نہیں ، لیکن اس قدر قریب المعنی ہیں کہ گویا لازم ملزوم ہیں ۔ آیت مذکورہ میں یہی دونوں قسمیں مراد ہیں ۔ دوسرے الفاظ میں اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ صابرین سے مراد ہیں وہ غیور و بہادر مجاہد جو مصائب غیبی اور شدائد نازلہ کے وقت ہائے وائے نہیں کرتے ، مجنونانہ حرکات ان سے سرزد نہیں ہوتیں بلکہ ثبات و استقلال کے ساتھ ان کو برداشت کرتے ہیں اور اگر اعدائے اسلام یا کوئی ظالم طاقت ان کو دکھ پہنچائے تو بزدلی ، بیچارگی ، بے ہمتی اور ذلت نفس کو اپنے پاس نہیں آنے دیتے بلکہ قوت ، شجاعت ، ہمت اور استقلال کے ساتھ دفع کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی ظفر و نصرت کا خدا پر پورا بھروسہ رکھتے ہیں ۔ جو سختیاں جھیلتے ہیں اور شدائد کا مقابلہ کرتے ہیں ، نقصان جان و مال پر بین و بکا اور نوحہ و زاری نہیں کرتے اور اضطراب و تشویش ، غم ، مایوسی ، بے عملی اور پست ہمتی کی رَو میں تنکے کی طرح نہیں بہتے ، جو ہمت ہار کر ، ہاتھ پاؤں توڑ کر بخت و قسمت کا گلہ نہیں کرتے ، اپنی مجبوریوں ، بیچارگیوں اور کمزوریوں کی فریاد برپا نہیں کرتے ۔ جو کبھی نہیں کہتے کہ مصیبت کا پہاڑ ہم پر ٹوٹ پڑا ، تباہی کے سیلاب نے ہم کو گھیر لیا ، بربادی کی آگ نے ہم کو جلا دیا بلکہ ہر دکھ کو ، رنج و مصیبت کو ، کفر و طاقت و دشمن کو ، فرعون نما ظالم کو اور باطل شعار اعدائے اسلام کو فنا کرنے اور دور کرنے کی ہر ممکن سعی کرتے ہیں ، وہی صابرین ہیں ۔ لیکن یہ ورکھنا چاہیئے کہ انفرادی اولوالعزمی اور منتشر ہوکر کفار کا مقابلہ کرنا بے سُود ہے ، جب تک آپس کی تنظیم اور اتحادی طاقت نہ ہو اور جب تک ایک دوسرے کی جانی و مالی مدد نہ کرے اس وقت تک کامیابی ناممکن ہے ۔ اسی لئے آئندہ فقروں میں فرمایا : ۔

وَالْمُقِیْمِی الصَّلٰوةِ ۔ یعنی مخبت وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ کا خوف اور اس کی محبت بھری ہو اور ڈٹ کر وہ اعدائے اسلام کا مقابلہ کرتے ہوں اور تمام مصائب کو دست قدرت میں مرہون سمجھتے ہوں ، لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپس کی تنظیم بھی رکھتے ہوں ۔ ایک دوسرے کی مدد بھی کرتا ہو ، ان کے اندر مساوات و اخوت بھی ہو ، وہ اپنے مال کو اپنا نہیں بلکہ خداداد جانتے ہوں اور اسی لئے اپنے مال کا کچھ حصہ اپنے بھائیوں کی مدد کے لئے صرف کرتے ہوں ، نماز میں خشوع خضوع ہوتا ہے ۔ اللہ کی الوہیت و ربوبیت کا قلبی ، عملی اور قولی اعتراف ہوتا ہے ، محض خدا کی ذات پر بھروسہ رکھنے کا مظاہرہ ہوتا ہے ، رُوح کی پاکیزگی ہوتی ہے اور کل کائنات سے تعلق توڑ کر اللہ سے رشتہ جوڑنا ہوتا ہے پھر آپس کی تنظیم و مساوات بھی ہوتی ہے ، امیر کے حکم کی اطاعت اور امام کے ہر حرکت و سکون کی پابندی ہوتی ہے ۔ اس لئے نماز باجماعت پڑھنا مجاہدین کے لئے ضروری ہے اور آیت میں اقامت صلوٰة کو ان کی خصوصی صفت قرار دیا ، لیکن خالی زبانی یا جانی ہمدردی و امداد سے کام نہیں چلتا ، یوں شیرازۂ قومی جمع نہیں رہ سکتا اور صرف اس طرح ذلت دُور نہیں ہوسکتی ۔ بلکہ سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ انسان اپنے مال کو اپنا مال نہ سمجھے بلکہ خدا کی دی ہوئی ایک مستعار چیز سمجھے اور اس کا کچھ حصہ راہ خدا میں یعنی مسلمانوں کی امداد میں صرف کرے تاکہ قوم کی حالت درست ہوجائے وہ کسی دوسری قوم کی دست نگر نہ رہے ۔ اس لئے خداداد مال کو راہ خدا میں خرچ کرنے کو بھی ضروری قرار دیا اور آخر میں فرمادیا وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۔

کل آیات کا حاصل یہ نکلا کہ ان لوگوں کو نجات و سعادت کی بشارت دے دو جو متواضع ہیں ، اللہ سے محبت رکھتے ہیں ، اس سے ڈرتے ہیں ، اللہ کا نام لینے سے ان کے جذبات محبت و اخوت میں جوش آجاتا ہے ، تمام مصائب کا مقابلہ ڈٹ کر کرتے ہیں اور عالم کی ہر نقل و حرکت میں غیبی طاقت کو کارفرما جانتے ہیں ، باقاعدہ جماعت کے ساتھ نمازیں پڑھتے ہیں اور جو مال خدا نے ان کو دیا ہے اس کا کچھ حصہ راہ خدا میں صرف کرتے ہیں ۔ یہی لوگ قابل بشارت ہیں

مقصودِ بیان

ہر مذہب کے لئے رسم قربانی مقرر کرنے کی صراحت۔ مگر مقصود اس سے اللہ کی یاد کی جائے اور اسی کا شکر ادا کیا جائے۔ توحید کی پُرزور تعلیم۔ اللہ کے ہر حکم و مشیت کے سامنے سر نیاز جھکا دینے کا حکم۔ آیت میں ایک خاص باریک بات یہ ہے کہ ربوبیت عامہ کو الوہیت کی علت قرار دیا اور الوہیت کو اطاعت عامہ کا موجب بنایا۔ گویا خدا واحد لاشریک ہے [illegible] اور اس کے اوامر و نواہی پر کاربند رہنا اس لئے لازم ہے کہ وہ معبود یکتا ہے۔ فروتنی اور تواضع کرنے والوں کی صفت [illegible] محبت کرنے والوں کی ستائش، صابرین کی تعریف، پابندی کے ساتھ باجماعت نماز پڑھنے والوں اور راہ خدا میں مال خرچ کرنے والوں کا مستحسن [illegible] میں ذکر اور ان تمام اوصاف بیان کرنے سے مسلمانوں کے لئے دینی و دنیوی کامیابی کا درس۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ

اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لئے اللہ کے نام کی نشانیاں بنایا ہے تمہارے لئے اس میں فائدہ ہے پس تم ان پر اللہ کا نام لو کھڑے کر کے

فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

پھر جب اُن کے پہلو زمین پر گر پڑیں تو اُس میں سے کھاؤ اور بے سوال اور سائل محتاج کو کھلاؤ اسی طرح ہم نے اُن کو تمہارا مطیع بنایا ہے تاکہ تم شکر کرو

تفسیر

حرم میں ذبح کئے جانے کے لئے مسلمان چاروں طرف سے قربانی کے جانور ہانک دیا کرتے تھے اور چونکہ راستے میں لوٹنے کا اندیشہ ہوتا تھا کیونکہ اس زمانے میں چاروں طرف کفار کا زور تھا، امن عام نہ تھا۔ کسی مسافر کا مال یہاں تک کہ جان بھی محفوظ نہ تھی، اس لئے قربانی کے جانور۔ ان کی خاص علامت مقرر کر دی جاتی تھی۔ قربانی کے جانور اونٹ، گائے بیل، بکری، بھیڑ اور دُنبہ وغیرہ سبھی ہوتے تھے اور سبھی کو ہدی کہتے تھے، بکری اور جانور تو چھوٹے ہوتے تھے، اس لئے ان کی گردنوں میں تو صرف چمڑے کے ٹکڑے بطور علامت ڈال دیئے جاتے تھے۔ صرف اونٹ سب سے بڑا جانور تھا اور اس سے سواری کا کام بھی لیا جاتا تھا، اس کے ہدی ہونے نہ ہونے کا امتیاز صرف چمڑے کے ٹکڑے گلے میں ڈال کر کرنا دشوار تھا۔ بھیڑ بکریوں اور گائے بیلوں کا حرم کی طرف جانا تو سوا قربانی کی غرض کے اور کسی کام کے لئے خلافِ عادت تھا، مگر اونٹ کا سفر ہر عرب کا دستور ہی تھا، اس لئے اُس کے امتیاز کے لئے خاص ممتاز علامت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ کوہان کے دائیں یا بائیں حصہ کو کسی قدر چیر کر دے کر اس کے خون سے چمڑے کا ٹکڑا آلودہ کر کے اونٹ کے پہلو پر مار دیا جاتا تھا تاکہ کھلا ہوا نشان ہر شخص کو معلوم ہو اور ہدی لوجہ اللہ ہونا نمایاں ہو جائے ایسے اونٹ کو بُدنہ کہتے ہیں۔

خلاصہ ارشاد تین امور ہیں:۔ (۱) قربانی کے اونٹوں کا شعائر اللہ ہونا اور ان سے فوائد کا وابستہ ہونا (۲) ان کے ذبح کے وقت تکبیر پڑھنا اور جب وہ مر جائیں تو خود بھی کسی قدر ان کا گوشت کھانا اور ضرورت مند فقیروں کو بھی کھلانا (۳) اور اس بات کا شکر ادا کرنا کہ اتنا لمبا چوڑا عجیب الخلقت جانور خدا نے ہمارے قبضہ میں کر دیا ہے۔

تحلیل اجزاء

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا ۔ بُدن جمع ہے بُدنۃ کی۔ مجاہد کا قول ہے کہ بُدنہ صرف وہ اونٹ ہے جو قربانی کے لئے حرم کو بھیجا جاتا ہے۔ امام شافعی کا بھی یہی قول ہے۔ ابن عمر، سعید بن مسیب، حسن بصری اور عطاء کا قول ہے کہ اونٹ اور گائے دونوں کو بُدنہ کہتے ہیں۔ امام مالک اور امام ابو حنیفہ کا بھی مسلک ہے۔ قربانی اگرچہ بکرے اور دُنبے وغیرہ کی بھی ہوتی ہے اور اس کو ہدی بھی کہتے ہیں مگر بُدنہ نہیں کہتے۔ آیت میں اونٹ ہی مُراد ہے۔

مسئلہ:۔ ابن کثیر نے صراحت کی ہے کہ اونٹ اور گائے میں سات سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں، کیونکہ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی مرفوع روایت ہے کہ حضور اقدسؐ نے ایک گائے اور ایک اونٹ میں سات سات آدمیوں کا شریک ہونا اور سب کی طرف سے صرف ایک کی قربانی کا ہونا ہمارے لئے جائز قرار دیا تھا۔ (رواہ مسلم فی صحیحہ) اسحٰق بن راہویہ کا قول ہے کہ ایک اونٹ یا ایک گائے کی قربانی دس آدمیوں سے بھی ہو سکتی ہے۔ گویا ایک جانور میں دس حصہ دار ہو سکتے ہیں۔ اس قول کا ماخذ وہ حدیث ہے جو مسند احمد اور سنن نسائی میں موجود ہے۔

مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۔ یعنی قربانی کرنی دین الٰہی کی خصوصی علامات میں سے ہے۔ اس سے مسلمانوں کے قلبی خلوص اور شوکت اسلامی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۔ یعنی قربانی کا جانور بھیجنے یا قربانی کرنے میں تمہارے لئے دین و دنیا کے فوائد ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی مرفوع روایت ہے کہ تم اپنے ہدی کو قربانی کرنے کے لئے خوش رکھو۔ یوم النحر میں قربانی کا خون بہانے سے بہتر کوئی عمل نہیں (رواہ الترمذی) ابراہیم نخعی نے اس فقرہ سے یہ حکم استخراج کیا ہے کہ قربانی کے جانور پر سوار

ہونا اور اس کا دودھ پینا جائز ہے ، مگر ضرورت شرط ہے ۔

صَوَآفَّ ۔ اس لفظ کی دو طرح سے تفسیر کی گئی ہے ۔ اول تفسیر کا تو یہ مطلب ہے کہ قربانی محض اللہ کے نام پر کرو ۔ کسی دوسرے کے نام پر نہ کرو ۔ ذبح کے وقت اسی کا نام لو ۔ گویا اس سے اُس ذبیحہ کی ممانعت ہوگئی جو جاہلیت کا دستور تھا کہ بُتوں کے نام پر بھینٹ چڑھایا کرتے تھے ۔ یہ قول طاؤس ، حسن بصری ، مالک بن انس ، عبدالرحمٰن بن زید وغیرہم کا ہے ۔ دوسری تفسیر ابن عمرؓ ، ابن عباسؓ اور اکثر مفسرین سے مروی ہے کہ اونٹ کو تین ٹانگوں پر کھڑا کرو ۔ اگلا بایاں پاؤں باندھ دو اور بسم اللہ واللہ اکبر کہہ کر سینہ پر نیزہ مارو اور اس ترکیب سے اس کا خون نکال دو ۔ اس فعل کو نحر کہتے ہیں ۔ ابن عمرؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اونٹ کو بٹھا کر ذبح کر رہا تھا ۔ فرمایا اس کو کھڑا کر کے باندھ دے یہ محمد رسول اللہ ؐ کی سُنّت ہے ۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ حضور اقدس ؐ اور آپ کے صحابی اپنے اونٹوں کو اس طرح نحر کرتے تھے کہ دھنگنے سے اگلا بایاں پاؤں (اوپر کو موڑ کر) باندھ دیتے تھے اور اونٹ تین ٹانگوں پر کھڑا ہوتا تھا (رواہ ابو داؤد)

فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا ۔ وجب کے معنی ہیں نیچے گر جانا ۔ عرب کے محاورہ میں بولتے ہیں وجبت الشمس سورج نیچے کو گر گیا ۔ آیت میں مراد ہے گر کر مر جانا ۔ کیونکہ مرنے سے پہلے کسی مذبوحہ جانور کا گوشت کاٹ کر کھانا جائز نہیں ۔ ابو واقد لیثی کی روایت ہے حضور اقدس ؐ نے ارشاد فرمایا اگر زندہ جانور (ذبیح) کا ٹکڑا کاٹ لیا جائے تو وہ ٹکڑا مُردار ہے (رواہ احمد وابو داؤد والترمذی وقال صحیح)

اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۔ اگرچہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مجاہد ، ابراہیم نخعی ، ابن جریر اور ائمہ حنفیہ کے نزدیک یہ امر استحباب کے لئے ہے ، مگر صحیح یہ ہے کہ امر وجوبی ہے ، فقراء کو دینا واجب ہے ۔ قانع و معتر کی تفسیری معانی میں علماء کا بہت اختلاف ہے ۔ عوفی کی روایت کے بموجب ابن عباسؓ کا قول یہ ہے کہ قانع وہ شخص ہے جو اپنے گھر بیٹھا رہے اور اس کو ضرورت نہ ہو اور معتر وہ شخص ہے جو تمہارے پاس آکر چاپلوسی تو کرتا ہے ، مگر سوال نہیں کرتا ۔ مجاہد اور محمد بن کعب قرظی کا بھی یہی قول ہے ۔ علی بن ابی طلحہ کی روایت کے بموجب ابن عباس کا قول یہ ہے کہ قانع وہ ہے جو سوال نہ کرے اور معتر وہ ہے جو سوال کرے ۔ قتادہ اور ابراہیم نخعی کا یہی قول ہے ۔ ابن کثیر نے جزم کے ساتھ لکھا ہے کہ ابن عباس ، مجاہد ، قتادہ ، ابن اسلم ، کلبی ، حسن بصری ، مقاتل اور مالک بن انس نے فرمایا کہ قانع وہ ہے جو تمہاری طرف جھکے اور سوال کرے اور معتر وہ ہے جو چاپلوسی تو کرے ، مگر سوال نہ کرے ۔ اسی قسم کے دوسرے اقوال بھی ہیں جن کی تفصیل موجب طوالت ہے ۔ میرے نزدیک قتادہ اور ابراہیم نخعی کا قول زیادہ قابلِ ترجیح ہے ۔

قربانی کی کھال کا کیا حکم ہے ؟

مسند امام احمد میں قتادہ بن نعمان کی روایت سے ایک حدیث ہے ۔ حضور ؐ نے فرمایا اب کھاؤ اور صدقہ دو اور قربانیوں کی کھالوں سے فائدہ اٹھاؤ ، مگر ان کو فروخت نہ کرو ۔ علمائے حنفیہ کے نزدیک کھالوں کو فروخت کر کے ان کی قیمت خیرات کر دینی چاہیئے ۔ حدیث میں جو کھالوں کو فروخت کرنے کی ممانعت آئی ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ فروخت کر کے خود قیمت اپنے تصرف میں لانا جائز نہیں ۔

قربانی کا وقت کب شروع اور کب ختم ہوتا ہے ؟

امام شافعی اور بعض دیگر علماء کا قول ہے کہ جب دسویں ذی الحجہ کو سورج نکلنے کے بعد اتنا وقت گزر جائے کہ نماز اور دونوں خطبے ہو جائیں تو قربانی کا وقت شروع ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ حضرت براء بن عازبؓ نے مرفوعاً بیان کیا ہے کہ حضور اقدس ؐ نے ارشاد فرمایا آج ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ ہم نماز پڑھیں گے پھر واپس ہو کر قربانی کریں گے ۔ پس جس نے ایسا کیا اس نے ہماری سُنّت کے مطابق کیا اور جس نے نماز سے پہلے قربانی کر دی تو وہ قربانی نہ ہوئی بلکہ اس نے اہل و عیال کے لئے گوشت فراہم کیا ہوگا ۔ (صحیحین) امام احمد نے اتنی شرط کا اور اضافہ کیا ہے کہ جب امام نماز اور قربانی کے لئے فارغ ہو جائے تب اور لوگوں کی قربانی کا وقت شروع ہوتا ہے ۔ امام اعظمؒ کے نزدیک چونکہ دیہات کے رہنے والوں پر نماز عید واجب نہیں ، اس لئے ان کو اختیار ہے کہ طلوع فجر کے بعد جس وقت چاہیں قربانی کریں ۔ البتہ شہر والے اس وقت تک قربانی نہیں کر سکتے جب تک امام نماز سے فارغ نہ ہو جائے ۔ رہی یہ بات کہ قربانی کب تک ہو سکتی ہے ؟ تو اس میں علماء کا اختلاف ہے ۔ ابن کثیر نے چھ اقوال ذکر کئے ہیں :- (۱) صرف دسویں تاریخ کو قربانی ہو سکتی ہے اس کے بعد نہیں ہو سکتی (۲) شہر والوں کے لئے صرف دسویں تاریخ ہے اور دیہات والوں کے لئے یوم النحر اور اس کے بعد پورے ایام تشریق میں قربانی جائز ہے ۔ سعید بن جبیر کا یہی قول ہے (۳) شہری ہوں یا دیہاتی سب کے لئے صرف دو روز قربانی کرنی جائز ہے ۔ دسویں اور گیارھویں تاریخ کے بعد مشروع نہیں ۔ (۴) دسویں ، گیارھویں اور بارھویں تاریخ کو قربانی کی جا سکتی ہے ، قربانی کے یہی تین دن ہیں ۔ امام ابو حنیفہ اور امام احمد کا یہی قول ہے ۔ (۵) قربانی کے چار دن ہیں یوم النحر اور اس کے بعد تین روز ۔ یہ قول امام شافعی کا ہے (۶) دسویں تاریخ سے لے کر ماہ ذی الحجہ کے

ختم تک قربانی ہو سکتی ہے۔ یہ قول ابراہیم نخعی اور ابو سلمہ بن عبد الرحمن کا ہے اور یہی عجیب قول ہے۔ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا۔ یعنی اس کام کے لئے ہم نے ان جانوروں کو تمہارا مسخر کر دیا۔ چاہو دودھ پیو، چاہو ان پر سوار ہو اور چاہو تو ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت کھاؤ اور کھلاؤ۔

مقصودِ بیان

قربانی بھی شعائر الٰہیہ میں سے ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ قربانی کا انکار کرتے ہیں وہ شعائر اسلامیہ کے منکر ہیں اور جو لوگ قربانی سے روکتے ہیں وہ کھلے طور پر دین اسلام میں مداخلت کرتے ہیں۔ ذبح اور نحر کے وقت تکبیر پڑھنی چاہیئے۔ تکبیر پڑھ کر چھری پہ دم کر دینا اور پھر اس سے ذبح کر دینا جائز نہیں۔ قربانی کا جانور جب تک مر کر گر نہ جائے اس وقت تک کھانا ناجائز ہے۔ اپنی قربانی کا گوشت خود بھی کھانا جائز ہے اور ہر فقیر کو خواہ سائل ہو یا نہ ہو دینا چاہیئے وغیرہ۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ

اللہ کے پاس نہ اُن کے گوشت پہنچتے نہ اُن کے خون بلکہ اُس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے اسی طرح اللہ نے اُنکو تمہارا مطیع بنا دیا ہے تاکہ تم اللہ کی عظمت کا اظہار کرو اس بات

عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۗ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ۞ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ۞ ع

پر کہ اللہ نے تم کو ہدایت دی (اے محمد) نیکی کرنے والوں کو خوشخبری سُنا دو بلاشبہ اللہ مسلمانوں سے (اُن کے دشمنوں کو) ہٹاتا ہے وہ کسی دغاباز کافر کو پسند نہیں کرتا

تفسیر

اسلام سے پہلے بھی حج اور قربانی کی رسم تھی، مگر کفار نے اس میں بہت سی بیہودہ باتیں اور شرک کے گندے طریقے داخل کر لئے تھے۔ مثلاً جب قربانی کرتے تو بیت اللہ پر گوشت لتھیڑتے اور خون لیپتے تھے۔ اسلام نے حج کو تمام بیہودہ رسموں سے دور کر کے ہر نجاست سے پاک بنا کر عبادت کے رنگ میں رنگ دیا اور جب بعض مسلمانوں نے طریقۂ جاہلیت کے مطابق خانہ کعبہ کو گوشت اور خون سے نجس کرنا چاہا تو ممانعت میں یہ آیت نازل ہوئی (رواہ ابن ابی حاتم باسناد عن ابن جریج) بظاہر جاہلیت کے زمانے کی قربانی اور اسلامی قربانی میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا وہ بھی جانور ذبح کرتے کھاتے کھلاتے تھے بلکہ کفار کی قربانی میں ایک زیادتی یہ بھی تھی کہ وہ خود نہ کھاتے تھے سب گوشت بانٹ دیتے تھے اسلام نے خود بھی کھانے کی اجازت دے دی۔ کوتاہ نظر رکھنے والے اعتراض کر سکتے تھے کہ یہ کیسی قربانی ہے کہ خود ہی قربانی کی اور خود ہی اس میں سے اپنا حصہ نکال لیا، لیکن اسلام طاہر و مطہر مذہب ہے یہ اعمال کا اعتبار بغیر خلوص نیت کے نہیں کرتا، اس لئے عمدہ اسلوب سے سمجھا دیا گیا کہ یہ گوشت پوست خون وغیرہ سب یہیں رہ جاتا ہے، اللہ تک رسائی نہیں۔ وہاں تو تمہاری نیتوں کا خلوص اور دل کی پرہیزگاری پہنچتی ہے۔ خون لیپنے سے کیا کام چلتا ہے۔ پرہیزگار بن کر خالص نیت سے قربانی کرو، خود بھی کھاؤ دوسروں کو بھی کھلاؤ بس قربانی قبول ہو گئی نہ خود کھانے سے قبول میں کچھ نقصان ہو جاتا ہے نہ خون لیپنے سے قبول میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایمان، تقویٰ، نیت کا خلوص اور نیکوکاری قبول ہونے کے ذرائع ہیں۔ خداتعالیٰ نے شیطانی رسوم اور کافرانہ رواج کی ممانعت فرما دی ہے اور مسلمانوں کے تمام مذہبی اور دنیوی معاملات کو ان لغویتوں سے پاک کر دیا ہے۔ اب کہاں وہ قربانی جو ایک مومن دل پرہیزگاری خلوص نیت اور نیکوکاری کے ساتھ بارگاہِ الٰہیہ میں پیش کرتا ہے اور کہاں بے دین خیانت کار ناشکرے کافر کی قربانی جو نہ ایمان پر مبنی ہے نہ تقویٰ اور خلوص نیت پر۔

تحلیلِ احکام

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ۔ یعنی خون لتھیڑنے سے کچھ کام نہیں چلتا۔ بغیر خلوص کے اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ خدا کی بارگاہ میں قربانیوں کا گوشت پوست قبول نہیں ہوتا، وہاں تو رسائی صرف خلوص نیت اور تقویٰ کی ہے۔ قربانی تو صرف ظاہری عمل ہے۔ اگر باطن خالی ہے تو بیکار ہے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں کی طرف نظر نہیں کرتا بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے (مسلم) ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ صدقہ کا مال مسکین کے ہاتھ میں پہنچنے سے پہلے اللہ کے دستِ عظمت میں پہنچ جاتا ہے اور (قربانی کا خون) زمین پر گرنے سے پہلے بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہو جاتا ہے۔ (رواہ ابن ماجہ والترمذی عن ام المومنین عائشہ) موخر الذکر حدیث آیت کے منافی نہیں بلکہ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اخلاص کے ساتھ عمل ہوتا ہے خداتعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کو فوراً قبول فرما لیتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جب گوشت تقسیم ہو جائے اور لوگ کھا لیں اور ان کی پرورش ہو جائے اس وقت قربانی مقبول ہو بلکہ اصل مقصد تو صرف خلوص نیت پرہیزگاری اور نیکوکاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کافر کی

قربانی مقبول نہیں، باوجودیکہ اس کی صورت میں اسلامی قربانی کی صورت سے کوئی فرق نہیں۔ وجہ یہ کہ اس کی بنا پرہیزگاری پر نہیں ہے۔

الْمُحْسِنِيْنَ اہلِ احسان سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایمان و اخلاص کے ساتھ نیک عمل کرتے ہیں اور ہر نیک عمل کے وقت خدا کو حاضر ناظر جانتے ہوں۔ جن کے دلوں میں سچائی، نیتوں میں مرضیٔ الٰہی کی طلب اور اعمال میں پاکیزگی ہو، ہر کام لوجہ اللہ کرتے ہوں، کسی عبادت اور نیکی میں خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک نہ کرتے ہوں۔

یُدٰفِعُ مسلمانوں کی حمایت اور ان کی طرف سے خرابیوں کو دفع کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کی شوکت و طاقت میں اضافہ ہوتا جائے اور کافروں کی طاقت شکستہ ہوتی جائے اور ترقی و تنزل کا یہ سلسلہ برابر جاری رہے یا مسلمانوں کے مذہبی ارکان و رسوم سے تمام جاہلانہ آمیزشیں دور کر دی جائیں اور طریقہ جاہلیت مٹا دیا جائے یا مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے اور کافروں کی تعداد کم کر دی جائے۔ آیت میں مراد متوسط الذکر شق ہے اور اگر اول و آخر شقیں مراد ہوں تو اس سے مسلمانوں کی فتح و نصرت کی جانب اشارہ ہوگا کہ عنقریب خدا تعالیٰ کافروں کا غلبہ توڑ کر ان دغابازوں کو ایسا ذلیل کرے گا کہ پھر مسلمانوں کو حج وغیرہ سے نہ روک سکیں گے۔

مقصودِ بیان

قربانی صرف اسلامی رسم ہے ورنہ اس کا مغز تقویٰ ہے۔ جو قربانی بغیر خلوص نیت کے ہو یا کسی غیر کے نام کی اس میں شرکت ہو قابل قبول نہیں۔ آیت لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ ... میں ایک ایسا ایک مقابلہ کلیہ بیان فرمایا جس سے کافروں کے تمام اعتراضات و شکوک کا ازالہ ہو گیا۔ قربانی کی اصل حقیقت پیش کر کے صاف صراحت کر دی ہے کہ اس سے مقصود اللہ کی عظمت و کبریائی کا مظاہرہ ہے اور خدا اپنی بزرگی و برتری کا اعتراف تمہارے قول و عمل سے کرانا چاہتا ہے۔ **بَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ** سے بھی اسی طرف ایماء ہے کہ جن کے اعمال و اقوال اور عقائد میں خوبی اور حسن نہیں ان کا کوئی عمل قابل قبول نہیں، نہ وہ مستحق بشارت ہیں۔ آخر آیت میں اشارہ کر دیا کہ مسلمانوں کے تمام مذہبی ارکان و شعائر توہمات و خرافات سے پاک ہیں۔ اللہ نے جاہلانہ رسم اور کافرانہ رواج سے ان کے معاملات و عبادات کو پاک کر دیا ہے وغیرہ۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ

جن لوگوں سے لڑائی کی جاتی ہے ان کو (جہاد کی) اجازت دی گئی کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو صرف اس بات پر ان

دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ

کے گھروں سے نکال دیا گیا کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے سے نہ ہٹاتا تو یقیناً خانقاہیں اور

صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ وَ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ

گرجے اور یہودیوں کے عبادت خانے اور وہ مسجدیں ضرور مسمار کر دی جاتیں جن میں بکثرت اللہ کا نام لیا جاتا ہے اور جو شخص اللہ (کے دین) کی مدد کرے گا اللہ اس کی

اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۞ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ

ضرور مدد کرے گا بلاشک اللہ قوی و غالب ہے (اللہ مدد کرے گا) ان لوگوں کی کہ اگر ہم ان کو زمین میں قدرت دیں تو وہ پابندی سے نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور

اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۞

نیک کام کا حکم دیں اور بری بات سے منع کریں اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے سب کاموں کا انجام

تفسیر

خدا تعالیٰ نے ان آیات میں تعمیر و تخریب، فساد و امن اور جنگ و آشتی کا وہ تمام قاعدہ اور قانون عملی بیان فرمایا ہے جس کی تلاش میں بڑے بڑے ہوش مند سرگرداں و حیران ہیں اور قیامت تک کوئی قوم پیش نہ کر سکے گی۔ اس دنیا میں ہر طاقتور کمزور کو ستاتا ہے، قوی ضعیف کو فنا کرتا ہے، بالادست زیردست

کی حق تلفی کرتا ہے۔ بقائے اقویٰ کا سلسلہ جاری ہے اور تنازع للبقاء کی کوششوں میں ہر شخص اور ہر قوم سرگرم ہے، لیکن دنیا میں کس کو زندہ رہنا چاہیئے، کس کو باقی رہنے کا حق ہے؟ اس کے متعلق آج تک روشن دماغ رکھنے والے انسان بھی فریب خوردہ ہی رہے ہیں۔ زمانے سے زائد جو الفاظ ان کی زبانوں سے نکلے وہ یہ تھے کہ حق وصداقت کو دنیا میں باقی رہنا چاہیئے اور باطل و دروغ کی بیخ کنی لازم ہے۔ انصاف و معدلت اور امن و آشتی کے علمبرداروں کو زندہ رہنے کا حق ہے اور ظالموں کو مرجانا چاہیئے، لیکن یہ الفاظ اتنے پُرفریب اور مبہم ہیں کہ حقیقت نظر کے سامنے نہیں آتی۔ آج کیا ہمیشہ سے اخلاق باختہ اقوام نے حق وصداقت، انصاف وعدل و آشتی اور امن نام رکھا ہے طاقت و غلبہ کا، قوت و تسلط کا۔ ڈاکو اور قزاق جب تک کمزور رہیں ڈاکو کہلائے جاتے ہیں۔ جب زبردست طاقت ان میں پیدا ہوگئی اور وہ ملک پر چھا گئے اور بادشاہت و حکومت پر قابض آگئے تو وہی ڈاکو بادشاہ، شہنشاہ، عادل، منصف، حق پرست اور صداقت شعار سمجھے جانے لگے۔ موجودہ دور کی شخصی حکومتیں ہوں یا جمہوریت نما استبدادی طاقتیں سب کی یہی حالت رہی ہے۔ گویا دنیا نے بقائے اقویٰ کا نام بقائے اصلح رکھا ہے اور یہ محض فریب ہے، لیکن اسلام اور صرف اسلام ہے جس نے سیاست عادلانہ حکومت کا معیار تمدنی برتری کو قرار دیا اور مدنیت فاضلہ کا سنگ بنیاد اصلاح معاشری کو بنایا اور معاشرت کی بنا اخلاق پر رکھی اور کل دنیا کو بتا دیا کہ اگر حکام کے اعمال و اخلاق ردی ہوں تو معاشرت صالحہ نہیں پیدا ہوسکتی اور معاشرت صحیحہ کے فقدان سے تمدن تباہ ہوجاتا ہے اور مدنیت فاضلہ اگر موجود نہ ہو تو حکام کو حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ خواہ ان کے پاس مادی طاقتیں بیش از بیش ہوں۔ آیاتِ مذکورہ کے مطالعہ سے تمام امور نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ان آیات میں انقلاب حکومت، جہاد اور تعمیر موجودہ کو برباد کرنے کا ایک معیار بتایا ہے جس کے چند دفعات ہیں (۱) جو لوگ حکومت میں انقلاب پیدا کرنا چاہیں اور سیاست رواں کی عمارت گرانے کے خواستگار ہوں سب سے پہلے ضروری ہے کہ موجودہ قانون و سوسائٹی نے ان پر ظلم کیا ہو، کیونکہ ظلم ہی کے خلاف ان کو آواز نکالنی ہے اور جور و ستم ہی کی بیخ کنی ان کے پیش نظر ہے۔ اس دفعہ کی طرف ظُلِمُوْا سے اشارہ فرمایا (۲) اللہ کی توحید اور خدا کی ربوبیت والوہیت دنیا میں قائم کرنی ان کے پیش نظر ہو اور موجودہ سوسائٹی اس اعلان صداقت کے خلاف ہو وہ اللہ کی الوہیت و ربوبیت کی آواز کو سُننا گوارا نہ کرتی ہو اور یہاں تک برسرپرخاش ہو کہ اہلِ حق کو طرح طرح سے ستائے۔ یہاں تک کہ شہر بدر اور جلاوطن کردینے میں بھی اُسے تامل نہ ہو۔ اس دفعہ کو اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا سے رَبُّنَا اللّٰہُ تک بیان فرمایا ہے۔ (۳) اللہ کا بول بالا کرنا، عدل و انصاف قائم کرنا، غریبوں اور مظلوموں کی مدد کرنی، بے کسوں اور مجبوروں کی اعانت کرنی خواستگارانِ انقلاب کے پیش نظر ہو۔ اس دفعہ کی طرف مَنْ یَّنْصُرُہٗ کے لفظ سے اشارہ کیا۔ (۴) فرائض الٰہیہ کی ادائیگی، آپس کی تنظیم، روح اور بدن کی پاکیزگی اور مساوات ملی مقصود ہو، کسی کو کسی پر ترجیحی حقوق حاصل نہ ہو۔ اس دفعہ کو اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ میں بیان فرمایا (۵) اقتصادی خوش حالی، مزدور اور مفلس طبقہ کی مالی ہمدردی بھیک کی بندش، فاقہ کا انسداد، فقر کی بیخ کنی اور مالی مساوات پیدا کرنی مقصود ہو۔ اس دفعہ کو اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ سے ادا کیا۔ (۶) اچھی باتوں کی اشاعت اور بُری باتوں سے باز داشت مقصود ہو، ہر کار خیر کا عموم تباہی انگیز، اخلاق سوز اور معاشرت کو برباد و تباہ کرنے والے اقوال و افعال کی ممانعت غرض ہو۔ یہ چھے امور ہیں جو جہاد کو ضروری کر دیتے ہیں۔ ہر دفعہ بجائے خود زیادہ اہم ہے۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو ان چھے دفعات کی بنا محض اصلاح عقائد و اعمال پر ہے، صلاحیت کا معیار محض اعمال کی صلاحیت ہے، قوت، تسلط اور غلبہ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جو لوگ ایک ظلم کو دور کرکے دوسری قسم کا ظلم جاری کرنا چاہتے ہیں اور اس کا نام اصلاح رکھتے ہیں جس طرح آجکل فاسیزم یا نشوزم کو تباہ کرنا چاہتا ہے اور بالشویزم امپیریلزم کے خلاف معرکہ آرا رہے۔ حالانکہ سب کی بنا ظلم و استبداد پر ہے۔ یورپ کی ڈیموکریٹی حکومت نام ہے جمہوریت نما انفرادیت کا۔ یہ اعلانِ صداقت کی کوشش نہیں بلکہ انواع ظلم کی فراوانی کی سعی ہے۔ پہلے ایک ظلم تھا لوگ اس کے خوگر تھے اب دوسرا ظلم پیدا ہوا۔ خدا تعالیٰ نے آیت مذکورہ میں اعلانِ خیر، بندشِ شر، مساواتِ مالی، اخوت و تنظیم، انصاف کی اقامت، بیکسوں کی مدد اور اللہ کی وحدانیت کو جواز انقلاب کے غیر منفک اجزاء قرار دیا اور بتا دیا کہ اخلاق کی درستگی معاشرت کو درست کر دیتی ہے اور معاشرت کی درستی سے مدنیت سنور جاتی ہے اور مدنیت کا سنور جانا ہی نام ہے حق و انصاف کی اشاعت کا۔ گویا انقلاب نام ہے بقائے اصلح کی کوشش کا نہ کہ بقائے اقویٰ کی سعی کا۔

آیات مذکورہ کے درمیان خدا تعالیٰ نے انقلاب کا ایک اہم اور ضروری فائدہ بھی بتا دیا وہ یہ کہ اگر حق کے ذریعہ سے باطل کو شکست نہ ہوتی اور ظلم کی جگہ انصاف غالب نہ آتا تو تمام عبادت گاہیں یعنی حق پرستی کے مراکز تباہ ہوجاتے نہ یہودیوں کے دور میں ان کی خانقاہیں قائم رہ سکتیں نہ نصاریٰ کے زمانہ میں ان کے گرجا نہ مسلمانوں کے عہد میں ان کی مسجدیں۔ بلکہ حق پرستی دنیا سے معدوم ہوجاتی اور یہ مراکز حق نظر نہ آتے۔

تحلیلِ اجزاء

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ الخ۔ جب تک مسلمان مکہ میں رہے، کافروں کی طرف سے ایذا رسانی کا سلسلہ برابر جاری رہا کمبخت بے دین مسلمانوں پر آوازیں کستے، طعنے دیتے، سخت سُست کہتے، انتہائی بے رحمی اور سنگدلی کے ساتھ مارتے، بعض کو رسیوں

سے باندھ کر طرح طرح کی ایذائیں دیتے تھے ، اسی کا ماجھین لیتے ، مزدوری کرا لیتے اور اجرت نہ دیتے ۔ راسخ الاعتقاد مسلمانوں کا ایمان تو پہلے ہی چٹان کی طرح مضبوط تھا ۔ اس کے یقین میں تزلزل نہ پیدا ہوتا ۔ مگر جب پٹتے اور زخمی ہونے کی تکلیفیں حد سے بڑھ گئیں تو مسلمانوں نے مختلف اوقات میں خدمت گرامی میں حاضر ہو کر مدافعانہ قدم اٹھانے کی خواستگاری شروع کر دی ، لیکن حضور اقدس ﷺ برابر صبر کی تلقین فرماتے رہے اور قتال و جدال کی اجازت نہ دی ۔ جب بحکم وحی مکہ سے مدینہ کو ہجرت ہو گئی اور مسلمانوں کو استقلال نصیب ہوا اور کفار کی دراز دستیاں کم نہ ہوئیں ، اکیلے دوکیلے مسلمان کو مار لیتے ۔ جو لوگ مکہ میں بعض مجبوریوں کی وجہ سے رہ گئے تھے ان کو دُکھ کی مار دیتے ۔ یہاں تک کہ بعض لوگ شدت آلام کی وجہ سے جانبر نہ ہو سکے ۔ اس وقت آیت مذکورہ نازل ہوئی اور جہاد کا حکم دے دیا گیا ۔ اجازت جہاد کے متعلق یہ پہلی آیت ہے ، اس سے پہلے صبر کی تلقین کے متعلق کچھ اوپر ستر آیات نازل ہو چکی تھیں ۔ ابن عباس ، مجاہد ، قتادہ ، زید بن اسلم ، عروہ بن زبیر اور بہت سے صحابہ و تابعین کا یہی قول ہے ۔ ابن جریر نے بروایت ابن عباس بیان کیا ہے کہ جب مشرکین نے رسول اللہ ﷺ کو اور حضور کے ساتھیوں کو مکہ سے نکالا تو حضرت ابو بکر نے فرمایا ان لوگوں نے اپنے نبی کو نکال دیا ۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۔ اب یہ ضرور ہلاک ہوں گے ۔ چنانچہ مدینہ میں پہنچ کر سب سے اوّل جہاد کی اجازت کے متعلق جب آیت مذکورہ نازل ہوئی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے پہچان لیا تھا کہ عنقریب قتال کا حکم ہو گا ۔ (رواہ احمد و ابن ابی حاتم)

لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ ۔ یہ اجازت جہاد کی علت ہے یعنی جن لوگوں سے کفار لڑتے ہیں اور مارتے ہیں ان کو جہاد کی اجازت ہے ۔ معلوم ہوا کہ جہاد کی اجازت مدافعانہ حیثیت پر مبنی ہے ۔ کفار نے چونکہ مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ تنگ کرنا شروع کر دیا اور مسلمانوں کو ملیا میٹ کرنے کے درپے تھے اس لئے اہل اسلام کو بھی تلوار اٹھانے کی اجازت ہوئی ۔ وَاِنَّ اللّٰهَ ۔ یہ فتح و نصرت کا وعدہ ہے چونکہ ابتدائی حالت میں مسلمانوں کی تعداد کم اور بے سر و سامانی کی کثرت تھی ، اس لئے باقتضائے بشریت اپنی کمزوری کا احساس پیدا ہو سکتا تھا اور ممکن تھا کہ بعض لوگوں کے دلوں میں کچھ پست ہمتی نمودار ہو جاتی اس لئے تسلی کے طور پر وعدۂ نصرت نازل فرمایا اور بقول ابن عباس رضی اللہ عنہ اس وعدہ کو پورا بھی کر دیا ۔ اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا ۔ قتال کی اجازت اور نصرت کا وعدہ کن لوگوں سے کیا گیا ، اجازت جہاد کے اسباب کیا تھے ؟ لفظ ظُلِمُوْا میں مجمل طور پر تو وجہ [illegible] مگر اس جگہ ذرا تفصیل کر دی کہ چونکہ مسلمانوں کو ناحق جلا وطن کیا گیا ، ان کا کوئی قصور نہ تھا ۔ اگر قصور تھا تو یہ کہ وہ اللہ کی ربوبیت کے قائل تھے اور دوسروں کی ربوبیت کا انکار کرتے تھے اور یہ کوئی قصور نہ تھا بلکہ قابل مدح قول تھا ، اس لئے ان غریبوں پر جو کچھ ہوا وہ ناحق ہوا ۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ ۔ اس آیت میں صوامع سے مراد ہیں عیسائیوں کے چھوٹے عبادت خانے ۔ یہ قول ابو العالیہ ، عکرمہ ، ضحاک ، مجاہد اور ابن عباس کا ہے بیع سے مراد ہیں عیسائیوں کے بڑے عبادت خانے ۔ یہ قول ابو العالیہ ، قتادہ ، ضحاک ، ابو صخر اور مقاتل وغیرہم کا ہے اور صَلَوٰت سے مراد ہیں یہودیوں کے [illegible] ۔ کیونکہ یہودی اپنے عبادت خانوں کو صلوات کہتے ہیں ۔ یہ قول عکرمہ ، ضحاک اور قتادہ کا ہے ۔ ایک روایت میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول منقول ہے ۔ اور مساجد سے مراد ہیں [illegible] کے عبادت خانے ۔ پوری آیت میں وجوب جہاد کی مصلحت و حکمت بیان فرمائی ہے وہ یہ کہ اگر انبیاء اور ان کی اُمتوں پر جہاد فرض نہ کیا جاتا اور تلوار اٹھانے کی اجازت نہ دی جاتی تو اہل کفر اللہ کی پرستش نہ کرنے دیتے ، عبادت خانے برباد کر دیتے اور ذکر الٰہی کی اجازت نہ دیتے حضرت موسیٰ اگر فرعونی اور عمالقہ کا مقابلہ نہ کرتے تو یہودیوں کے معبد برباد ہو جاتے اور شریعت موسوی قائم نہ رہتی ۔ اگر عیسائیوں کو تلوار اٹھانے کا حکم نہ ہوتا تو یہودی ان کو کھا جاتے ۔ قسطنطین کی بیوی نے یہودیوں کے ظلم سے اپنی قوت کے ذریعہ ان کو بچایا اور جا بجا عبادت خانے قائم ہوئے ۔ اسی طرح مسلمانوں کو جہاد کی اجازت نہ ہوتی تو کفار و مشرکین عرب اور دنیا کی تمام غیر مسلم اقوام ان کو تباہ کر ڈالتے ، مسجدوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ۔ یہاں تک کہ مسجد نبوی اور کعبہ کو برباد کر دیتے ، اقامت حق اور [illegible] صداقت کا بس یہی ایک ذریعہ ہے کہ ظالموں اور جابروں کا مقابلہ کیا جائے اور قوت کے ساتھ ان کی دراز دستیوں کو روکا جائے ۔

وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ۔ یہ نصرت و امداد کا طرحی وعدہ ہے ، مگر نصرت کی ایک خاص شرط ہے وہ یہ کہ طلبگاران نصرت کو دین الٰہی کی مدد کرنی چاہئے یعنی جہاں تک ممکن ہو جان و مال سے کوشش کریں ، کافروں کا مقابلہ جفاکشی اور تندہی سے کریں اور کافروں کے مقابلے کا مقصد حصول زر و مال ، تسلط عام ، حکومت و شہرت نہ ہو بلکہ دین کا غلبہ اور اسلام کی حمایت مد نظر ہو ۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا اور پھر غلبہ و نصرت کی امید رکھنی خلاف دانش اور تعلیم قرآنی کی خلاف ورزی ہے ۔ یہ مطلب اس وقت ہو گا جب مَنْ یَّنْصُرُهٗ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع کی جائے اور اگر یَنْصُرُهٗ کی ضمیر لفظ مَنْ کی طرف راجع کی جائے تو مطلب اس طرح ہو گا کہ اللہ اس شخص کی مدد ضرور کرے گا جو اپنی مدد آپ کرے ۔ گویا کامیابی کے لئے شرط اولین اپنی کوشش ہے ۔ خدا بھی کوشش کرنے والے کی مدد کرتا ہے ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۔ یہ آیت دفع توہم کے لئے ہے ، ہو سکتا تھا کہ مسلمان اپنی کمزوری کو دیکھتے ہوئے کہتے کہ ہم تمام عرب کے کافروں کے مقابلے میں دین کی حمایت کیا کر سکتے ہیں ، تعداد کم ، سامان ابتر ، اسلحہ جنگ شکستہ ، اس پر فقر و فاقہ مزید ، ایسی حالت میں ہماری مدد سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے ۔ اس وہم کو دور کرنے

کے لئے فرمایا کہ اللہ قوی اور غالب ہے، تم کمزور رہو تو کیا ہے تمہارا خدا تو قوی ہے، تم مغلوب ہو تو کوئی ہرج نہیں تمہارا رب تو غالب ہے۔ اپنی امکانی کوشش کرو باقی معاملہ خدا پر چھوڑ دو اسی پر بھروسہ رکھو، وہ تمہاری مدد کرے گا۔

اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ الخ۔ وہ مہاجرین جو علمبرداران حق تھے اور اعلان صداقت کی پاداش میں گھروں سے نکالے گئے تھے۔ ان کے چند خصوصی اوصاف کا بیان ہے مفلس ونادار تو نماز پڑھتے ہی ہیں ان کو دھن دولت اور حکومت و تجارت کا کوئی کام ہی نہیں ہوتا، مگر قابل استحسان اور لائق تقلید ہیں وہ ہستیاں جو باوجود حکومت، عزت، تسلط اور دولت حاصل ہونے کے نمازیں پڑھتے ہیں الخ۔ آیت میں اگرچہ چاروں حکم بحرف شرط بیان کئے ہیں اور اخبار کی شکل معلوم ہوتی ہے، مگر فی الحقیقت طلبگاران حق اور داعیان جہاد کے لئے یہ حتمی حکم ہے کہ جب تم کو خدا تعالیٰ حکومت و تسلط عطا فرمادے تو نماز کی طرف سے غافل نہ ہونا، زکوٰۃ شرعی نہ چھوڑ دینا، ایسا نہ ہو کہ کہیں حکومت کے نشہ میں سرشار ہو کر فرض الٰہی کی ادائیگی، آپس کی تنظیم و مساوات اور غریبوں کی ہمدردی سے غافل ہو جاؤ اور مغرور بن جاؤ پھر ہر کار خیر کی اشاعت اور کار بد کی ممانعت سے بھی غافل نہ رہنا۔ یہ چاروں اوصاف اہل حق کے امتیازی اوصاف ہیں۔ اگر آیت کو اخبار غیبی پر محمول کیا جائے تو یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ہوئی۔ حضور اقدس کی وفات کے بعد خلفائے اربعہ اور خلافت راشدہ کے زمانے کے اکثر عمال و حکام انصاف و عدل کے علمبردار تھے، نیکی اور خدا پرستی اُن کا شعار تھی، ارکان دین کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے تھے دنیا ان کو چھو نہ گئی تھی۔ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ یعنی اللہ ہر بات کا انجام جانتا ہے، وہ ایسے ہی لوگوں کو حکومت دینا ہے جو خدا ترس اور خدا پرست ہوں، ظالموں کا تختہ اُلٹنے میں اُسی کی مصلحت کو دخل ہے۔

مقصود بیان جہاد کی عام اجازت، اجازت جہاد کی وجہ اور جہاد کی مصلحت، قانون نصرت کا اظہار، کمزور مخلص مجاہدوں کی تسلی اور فی الجملہ مسلمانوں کو تلقین کہ اگر تم کو خدا با اقتدار کر دے اور زمین پر تمہاری حکومت ہو جائے تو راہ حق سے نہ ہٹ جانا، فرائض الٰہیہ اور حقوق عباد اور اقامت عدل اور اشاعت خیر اور اصلاح خلق سے غافل نہ ہو جانا، کل آیات میں انقلاب حکومت کے وجوہ اسباب مواد اور شرائط کا بیان ہے اور اہل بصیرت کو دعوت کا مطالعہ ہے۔

وَاِنْ یُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ۝ وَقَوْمُ اِبْرٰهِیْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ۝

(اے محمد) اگر یہ تم کو جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے بھی نوح کی قوم اور عاد اور ثمود اور ابراہیم کی قوم اور لوط کی قوم

وَّاَصْحٰبُ مَدْیَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَیْتُ لِلْكٰفِرِیْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ ۝

اور مدین والے (انبیاء کو) جھٹلا چکے ہیں اور موسیٰ کو بھی جھٹلایا جا چکا ہے پس (پہلے تو) میں نے کافروں کو ڈھیل دی پھر اُنکو دھر پکڑا تو دیکھو میرا عذاب کیسا ہوا

فَكَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِیَ ظَالِمَةٌ فَهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ

بہتیری بستیاں ہیں جو کو ہم نے ہلاک کر دیا کیونکہ وہ ظالم تھیں اب وہ اپنی چھتوں کے بل گری پڑی ہیں اور بہتیرے کنوئیں بیکار پڑے ہیں اور

قَصْرٍ مَّشِیْدٍ ۝ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِهَاۤ اَوْ اٰذَانٌ

بہتیرے پکے محل (ویران پڑے ہیں) کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ اُن کے ایسے دل ہو جاتے جن سے یہ سمجھ لیتے یا ایسے کان ہوتے جن

یَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ ۝

سے یہ سُن لیتے بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں بلکہ سینوں کے اندر دل اندھے ہو جاتے ہیں

تفسیر رسول پاک جس قوم میں مبعوث ہوئے تھے وہی قوم زیادہ سرکش اور نافرمان تھی۔ چند آدمیوں کو چھوڑ کر تمام مکہ حضور کا دشمن اور منکر تھا جنم بھوم اور پرورش گاہ کی یہ بے عقلی اور سرتابی حضور کے لئے مایوس کن تھی۔ آپ نے امکانی تبلیغ کی، مگر نتیجہ نہ نکلا جس کے سبب اندوہ تفکر نے حضور کو گھیر لیا۔ آپ

اندوہ کو دور کرنے اور تسلی دینے کے لئے آیات بالا کا نزول ہوا۔ جن کا حاصل یہ ہے کہ سرکشی اور سرتابی تمرد اور انکار سب کچھ صرف تمہاری قوم ہی کا شیوہ نہیں بلکہ گزشتہ انبیاء کی اُمتوں کی بھی یہی کیفیت رہی ہے، قوم نوحؑ نے نوح کی تکذیب کی، عاد نے ہود کی مخالفت کی، ثمود نے صالح کو جھٹلایا، اہل والوں نے ابراہیم سے سرتابی کی، مدین والوں نے شعیب کا انکار کیا، موسیٰ کی تکذیب اگرچہ بنی اسرائیل نے نہ کی، مگر فرعون اور اس کی قوم نے کی۔ غرض یہ کہ سب انبیائے سلف کی اُمتوں نے ہدایت سے مُنہ موڑا، مگر ایسا نہیں ہوا کہ خدا نے ان کی فوری گرفت کر لی ہو بلکہ ایک وقت خاص تک کافروں کو مہلت دی اور جب مدت مقررہ گزر گئی تو پھر اوپر کی رسی کھینچ لی گئی، سب کو تباہ کر دیا گیا، کتنی ہی بستیاں اپنی ستمگاریوں اور بدکرداریوں کی وجہ سے ہلاک ہو گئیں، ان کی آبادیاں مسمار پڑی ہیں، مکانات برباد ہیں اور دیواروں کے نیچے چھتیں دبی ہوئی ہیں، مضبوط اور بلند مکان خالی اور کنوئیں بیکار پڑے ہیں، نہ کوئی وہاں رہنے والا نہ پانی بھرنے والا۔ ان کافروں کو خود جا کر دیکھ لینا چاہیئے، مگر ان کو عبرت کیسے حاصل ہو، گوش ہوش کیسے کھلیں اور بصیرت کے پردے سامنے سے کیسے دُور ہوں۔ آنکھوں کی نابینائی ہو تو دور ہو جائے۔ ان کے تو دل اندھے ہیں، عقل کی بے بصیرتی کا کیا علاج۔

تحلیلِ اجزاء

وَكُذِّبَ مُوسٰى۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کی تکذیب نہ کی تھی، اس لئے یہ نہیں فرمایا کہ موسیٰ کی قوم نے ان کی تکذیب کی۔ بلکہ موسیٰ کی نبوت کا انکار قبطیوں نے کیا تھا، اس لئے فرمایا کہ موسیٰ کی تکذیب کی گئی۔

فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ۔ یہ استفہام تقریری ہے۔ بعض نے استفہام تعجب کہا ہے۔ جوہری نے نکیر کے معنی بیان کئے ہیں۔ عذاب منکر یعنی اُلٹ عذاب دینا مثلاً زندہ کو مار ڈالنا، آبادی کو برباد کر ڈالنا، غرض یہ کہ موجودہ حالت کو اُلٹ دینا۔ اس سے مراد ہے سخت عذاب۔ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے پھر جب اس کو گرفتار کرتا ہے تو وہ نہیں چھوڑتا (بخاری و مسلم)

وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ۔ اس سے کوئی خاص کنواں اور خاص محل مراد نہیں بلکہ ویرانی اور بربادی کی حالت بیان کرنی مقصود ہے۔ حضرت علی، عکرمہ، ضحاک، سعید بن جبیر اور ابو الملیح کا قول ہے کہ مشید کے معنی ہیں قلعی کئے ہوئے یعنی وہ محل جن کو چونہ سے پوتا گیا ہو۔ بعض علماء نے اس کا ترجمہ محکم اور مضبوط کیا ہے۔ بیضاوی، خطیب، قرطبی اور ثعلبی وغیرہم نے اس کنوئیں اور محل کے متعلق کچھ روایات ذکر کی ہیں، جن کا تذکرہ آیت میں کیا گیا ہے، مگر اصحاب روایت کے نزدیک وہ تمام روایات بے اصل ہیں، اس لئے ابن کثیر کا اتباع کرتے ہوئے ہم نے بھی اُن کا نقل کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا۔ یعنی کیا اہل مکہ نے جا کر ان کو نہیں دیکھا۔ مکہ والوں نے ملک شام کو جاتے ہوئے بہت مرتبہ فرسودہ کھنڈر اور برباد شدہ آبادیاں دیکھی تھیں ایسی صورت میں انکار سیر کے کوئی معنی نہیں، مگر چونکہ کبھی عبرت کی نظر نہ ڈالی تھی اور نصیحت اندوز دماغ سے نہیں سوچا تھا، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ گویا وہاں نہیں گئے۔

فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا۔ دل تو کفار کے بھی تھے اور سمجھنے کے لئے عقلیں بھی، مگر عقل سے کبھی غور و خوض اور عبرت اندوزی سے کام نہیں لیا تھا۔ امام غزالی نے اوائل احیاء العلوم میں عقل کی چار قسمیں بیان کی ہیں (۱) عقل یعنی نور فطری۔ یہ صرف اہل ایمان کو نصیب ہوتی ہے۔ (۲) عقل دنیوی۔ یہ تمام دنیا والوں میں ہوتی ہے۔ (۳) عقل تجربی۔ یعنی وہ درایت جو تجربہ اور مشق کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ (۴) عقل فنی۔ جو کسی خاص فن کی تحصیل میں مددگار ہوتی ہے۔ موخر الذکر تینوں قسمیں تو کفار و مومنین کے درمیان مشترک ہیں۔ اول قسم صرف اہل ایمان میں پائی جاتی ہے۔ آیت مذکورہ میں اسی قسم کے تعقل کی نفی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ بے بصیرت کفار اپنے دلوں کو مواعظ سے زندہ نہیں کرتے، یقین سے ان کو طاقت ور نہیں بناتے، ناگہانی آفاتِ دنیا ان کو نہیں دکھاتے، زمانہ کی نیرنگیوں سے محفوظ رہنے کی اُن کو تعلیم نہیں دیتے، گردشِ ایام اُن کو نہیں بتاتے، اسلاف فانیہ کی خبریں صاف صاف اُن کو نہیں سُناتے، گزشتہ اقوام کے فرسودہ، بوسیدہ مکانوں کی سیر اُن کو نہیں کراتے۔ الغرض اپنے دلوں کو نہیں سکھاتے کہ گزشتہ قوموں نے کیا عمل کئے اور کہاں سے پھریں اور کیا چھوڑا اور کیا ساتھ لے گئیں اور کہاں جا کر اُتریں۔ کاش ان کی بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ہوتی۔ گوش کے ساتھ ہوش بھی ہوتا، سیر کے ساتھ عبرت بھی ہوتی اور سیاحت کے ساتھ تدبر، تفکر اور تذکر بھی ہوتا، مگر دل کے اندھوں کو بینائی کیسے نصیب ہو، عقل کے مدہوش کو ہوش کہاں سے آئے اور غافل روح والوں کو فکر و ذکر کا حصہ کیسے ملے۔ **فتفکروا اخوانی**۔

مقصودِ بیان

رسول پاکؐ کو کفار کی سرتابی و تکذیب پر تسکین و تسلی۔ عام قاعدہ کی وضاحت کہ تمام بڑے بڑے انبیاء کی تکذیب ہی کی گئی ہے۔ اس بات کی صراحت کہ خدا مہلت دیتا ہے، لیکن جب گرفت کرتا ہے تو پھر سخت گرفت کرتا ہے۔ اس آیت سے ہوش پکڑنا چاہیئے اُن کافروں اور ظالموں کو جو اہل حق کی تکذیب اور اہل صداقت پر ظلم کرنے کے باوجود پھلتے پھولتے اور ناز و نعمت میں بسر کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس فعل بد کا کوئی نتیجۂ بد ان کو اٹھانا نہ پڑے گا۔ آیت میں سیاحتی اور کتابی سیر کی عام تعلیم دی گئی ہے، لیکن تفریح کے لئے نہیں بلکہ عبرت حاصل کرنے اور نصیحت اندوز ہونے کے لئے۔

نتائج کو دیکھ کر اسباب و مبادی کی طرف دماغ کو متوجہ کرنے کے لئے اور اسباب ہلاکت کا مطالعہ کرنے کے بعد ان سے بچنے کے لئے حضرت عبداللہ بن محمد تستری متوفی ۱۵۱۷ھ نے کیا خوب شعر کہے ہیں ؎

یا من یصبو الی داعی الشقاء وقد ۔۔۔ نادی بہ الناعیان الشیب والکبر
ان کنت لا تسمع الذکری ففیم تری ۔۔۔ فی راسک الواعیان السمع والبصر
لیس الاصم ولا الاعمی سوی رجل ۔۔۔ لم یھدہ الھادیان العین والاثر
لا الدھر یبقی ولا الدنیا ولا الفلک ۔۔۔ الاعلی ولا النیران الشمس والقمر
لیرحلن عن الدنیا وان کرہ فراقھا الثاریان البدو والحضر

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ۚ وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا

یہ لوگ تم سے عذاب کی جلدی مچاتے ہیں حالانکہ اللہ ہرگز اپنے وعدہ کی خلاف ورزی نہ کریگا اور تمہارے رب کے پاس کا ایک دن تمہارے شمار کے ہزار برس کی

تَعُدُّونَ ۝ وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ أَخَذْتُهَا وَإِلَيَّ الْمَصِيرُ ۝ قُلْ

برابر ہوگا اور کتنی بستیاں ایسی تھیں جو کہ نافرمان تھیں میں نے اُن کو ڈھیل دی اور بالآخر اُن کو دھر پکڑا اور میری ہی طرف لوٹنا ہے (اے نبی) کہدو

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ فَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ

کہ لوگو! میں تو صرف کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے اُن کے لئے مغفرت اور

وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝ وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ۝

عزت کی روزی ہے اور جو لوگ ہرانے کے لئے ہماری آیتوں میں دوڑے پھرتے وہی دوزخی ہیں

تفسیر رسول پاک ؐ کے زمانہ کے کفار بھی تین لغو شبہات میں مبتلا تھے اور حضور ؐ کے بعد سے اب تک بھی اسلامیات پر اعتراض کرنے والے قیامت کے متعلق تین ہی شکوک پیش کرتے ہیں ۔ اول تو یہ کہ دنیا میں لاتعداد کافر ہیں جو شرک ، کفر اور انکار میں مبتلا ہیں ۔ جب شرک کا نتیجہ تباہی ہے تو پھر وہ ہلاک کیوں نہیں کر دئے جاتے ۔ دوسرا شبہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ کروڑہا کروڑ انسانوں کا حساب کتاب اور اجر و عذاب ایک دن میں کیسے ہو جائے گا ۔ اہل درایت اسکو سمجھ نہیں سکتے ۔ اس قسم کا عقیدہ رکھنا بیوقوفوں کا کام ہے ۔ تیسرا شبہ یہ ہے کہ اب تک جن لوگوں نے خدا کو نہ مانا اس کی الوہیت کیا ہستی ہی کے منکر ہو گئے ۔ وہ خوب پھولے پھلے ، مزے اڑائے عیش و آرام میں رہے ، خدا نے ان کی گرفت کیوں نہ کی ؟ ان تینوں شبہات کا ازالہ آیات مذکورہ سے ہوتا ہے ۔ اول شبہ کا ازالہ تو اس طرح ہوتا ہے کہ اللہ نے شرک کی پاداش میں عذاب نازل کرنے کا وعدہ فرمایا ہے ، لیکن دنیوی عذاب ہوگا یا آخرت کا یا دونوں طرح کے عذاب ہوں گے اور کب ہوں گے فوراً گرفت کر لی جائے گی یا دیر سے ؟ اس کی کوئی صراحت نہیں صرف عذاب کی وعید ہے اور وعدۂ الٰہیہ میں دروغ کا احتمال نہیں ۔ اس لئے تباہی تو ضرور آئے گی ، بربادی ضرور ہوگی ، مگر فوراً ہونا ضرور نہیں ۔ دوسرا شبہ اس طرح زائل ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک جو دن ہے وہ آدمیوں کی گنتی کے ایک ہزار برس کے برابر ہے ۔ مطلب یہ کہ جس کام کی سرانجام دہی کے لئے تم ہزار برس ضروری سمجھتے ہو خدا تعالیٰ اُس کام کو ایک دن میں پورا کر سکتا ہے اور یہ بھی سمجھانے کے لئے ہے کہ حقیقی میں ہزار برس سے زیادہ گنتی نہ تھی ورنہ اس کو کسی کام کے لئے وقت و زمانہ کی ضرورت نہیں ۔ اُس کا کام آنی ہے وہ قیامت کے ایک دن میں کل خلق کا حساب طے کر دے گا ۔ رہا تیسرا شبہ تو اس کو اس طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ دنیا میں بہت بستیاں ایسی تھیں جن کو خاص وقت تک مہلت دی گئی تھی ۔ مدت دراز تک وہ ترقی کرتے رہے ، پھلتے پھولتے ، کھاتے پیتے اور مزے اڑاتے رہے ، لیکن آخرکار برباد کی

سے ہمکنار ہونا تھا اور خدا نے ان کی گرفت کر کے اصل مرکز کی طرف کھینچ لیا ۔ تینوں شبہات کے زوال کے بعد ایک سوال یہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر ہم خدا کی بتائی ہوئی ہدایت پر چلیں تو آخرت میں ہم کو کیا ملے گا ؟ اور سرتابی کریں گے تو کیا نتیجہ ہوگا ؟ اس سوال کا جواب بالکل صاف ہے کہ پہلی صورت میں نجات ، سعادت ، کامرانی اور عزت و مغفرت حاصل ہوگی اور ثانی صورت میں دوامی عذاب ۔

تحلیلِ اجزاء

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ یوں تو عام مشرک آیات وحی کا انکار کرتے ، رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرتے ، روزِ قیامت اور حساب کتاب کو غلط بتلاتے تھے ، مگر بعض اہلِ عناد اپنے انکار میں اس قدر مستحکم تھے کہ وہ آیات وعید کو سُن کر فوری عذاب کے خواستگار ہوتے تھے ۔ انہی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی ۔ عذاب سے مراد عام عذاب ہے ۔ خواہ عذابِ آخرت ہو یا عذابِ دنیا ، مگر چونکہ وہ آخرت کے قائل نہ تھے ، اس لئے عذابِ آخرت کو بھی دنیا میں ہی طلب کرتے تھے ۔

وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ یعنی عذاب کے لئے جلدی کرنا اور اس کے انتظار کی مدت کو بہت شمار کرنا بے سود ہے ۔ ہاں عذاب کے ایام بڑے سخت ایام ہیں ۔ اللہ نے عذاب میں جس کو مبتلا کرنے کا وعدہ کر لیا ہے اور اللہ ہرگز اپنے وعدہ کے خلاف نہ کرے گا ۔ تعجیل و تاخیر کا سوال بیکار ہے ۔ شیخ جلال محلی نے لکھا ہے کہ بدر کے روز کافروں پر عذاب نازل ہوگیا اور دنیا ہی میں ان کو عذابِ الٰہی معلوم ہوگیا

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ یعنی سختی اور تکلیف کی وجہ سے وہاں کا ایک دن تمہارے ہزار برس کے برابر ہوگا ۔ مصیبت کے دن دراز ہی معلوم ہوتے ہیں ۔ یہ مطلب بعض اہلِ تفسیر نے بیان کیا ہے ۔ مجاہد عکرمہ کا قول ہے کہ آخرت کا ایک دن (واقعی طور پر) یہاں کے ہزار برس کی برابر ہوگا ۔ ابن عباس نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ مہلت دینے میں ایک روز اور ہزار برس دونوں برابر ہیں ۔ کیونکہ اللہ قادر ہے جب چاہے مواخذہ کرے ۔ تاخیرِ عذاب سے وقوع میں تردد نہ کرنا چاہیئے ۔

ہمارے نزدیک جو صحیح مطلب تھا وہ تفسیری حل کے ذیل میں ہم نے بیان کر دیا ۔ بعض مفسرین نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ دنیوی زندگانی میں عذابِ آخرت کا نزول ناممکن ہے ۔ کیونکہ دنیا کے تمام اوقات و ایام محدود ہیں اور عذابِ آخرت غیر محدود ہے ۔ وہاں کا ایک دن یہاں کے ہزار برس کے برابر ہے تو ظاہر ہے کہ انسان کی کل مدت حیات آخرت کے ایک لمحہ کے برابر بھی نہیں پھر کس طرح غیر محدود عذاب کو اس بے قدر مدتِ حیات میں نازل کیا جا سکتا ہے ۔ میرے نزدیک یہ توجیہ بھی بُری نہیں ۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ۔ جو لوگ ناس سے مراد اہلِ مکہ لیتے ہیں ان کے نزدیک مورد خطاب صرف اہلِ مکہ ہوں گے ، مگر قرینہ اور رفتارِ کلام کسی تخصیص کی مقتضی نہیں ۔ حضور اقدس ﷺ تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے تھے ، اس لئے کلام کو عموم پر محمول کرنا اولیٰ ہے آیت مذکورہ میں نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ فرمایا ۔ بَشِيْرٌ مُّبِيْنٌ نہیں فرمایا ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بشارت کا اثر انذار سے تو زیادہ وسیع اور قوی نہیں ہوتا ۔ حصولِ عیش کی تمنا تحفظِ زندگانی کے بعد ہوتی ہے ۔ توقع اذیت و رفع مضرت تحصیلِ منفعت سے زیادہ نصیحت آفریں ہوتا ہے ۔

لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ مغفرت سے مراد ہے سابق گناہوں کا معاف ہو جانا ۔ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ اسلام سابق کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے ۔ رِزْقٌ كَرِيْمٌ سے مراد ہے وہ فیضِ روحانی اور عیشِ جنت جس کا آغاز موت کے بعد ہی سے ہو جاتا ہے جس کی کوئی تفصیل الفاظ میں نہیں بیان کی جا سکتی ۔

مُعٰجِزِيْنَ اس لفظ کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں ۔ مجاہد اور ابن زبیر نے کہا کہ جو لوگ رسول پاک ﷺ کی پیروی سے روکتے ہوئے آیاتِ الٰہیہ میں دوڑ لگاتے ہیں ۔ گویا معاجزین کے معنی ہوئے رسول پاک ﷺ کی پیروی سے لوگوں کو روکنے والے ۔ بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ بے رغبتی کیا ہے ۔ یعنی بے رغبتی اور اعراض قلبی کے ساتھ آیات میں دوڑ لگاتے ہیں ۔ میرے نزدیک صحیح مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آیات قرآنیہ میں غور کرتے ہیں اور غور کرنے سے ان کا منشا یہ ہوتا ہے کہ کہیں کوئی گرفت کا موقع مل جائے اور اعتراض کرنے کی گنجائش نکل آئے جس کو پیش کر کے وہ مسلمانوں کو زیر کر سکیں ۔ گویا آیاتِ الٰہیہ میں غور کرنے سے ان کی مراد حاصل ہوتی ہے ۔ عیب چینی اور خورد گیری کی کوشش سے ایسے لوگ دوامی دوزخی ہیں ۔

مقصودِ بیان

اللہ کے وعدے میں دروغ کا امکان نہیں ۔ اللہ کو کسی کام کی سر انجام دہی کے لئے کسی وقت کی ضرورت نہیں ۔ اللہ ظالموں کو مہلت دیتا ہے لیکن بالکل بے توجہ ہو کر نہیں ۔ ایک وقت خاص کے بعد سخت گرفت کرتا ہے ۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم قادرِ مطلق اور مختار عام نہ تھے بلکہ پیامبر اور عذاب الٰہی سے ڈرانے والے تھے یعنی عذاب کا لانا اور مسلط کرنا حدود اختیار سے خارج تھا ۔ نکتہ چینی اور خورد گیری کے لئے آیاتِ الٰہیہ میں غور و خوض کرنا حرام ہے وغیرہ ۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ

(اے محمد) تم سے پہلے ہم نے جو رسول و نبی بھیجے تو ضرور ایسا ہوا کہ جب اُس نے کچھ تمنا کی تو شیطان نے کچھ نہ کچھ اس کی آرزو میں (اپنی طرف سے) ملا دیا

فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي

سو اللہ اس چیز کو مٹا دیتا ہے جو شیطان ملاتا ہے پھر اللہ اپنی آیتوں کو مضبوط کرتا ہے اور اللہ دانا مصلحت بین ہے یہ اس لئے (کرتا ہے تاکہ) اس

الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ

چیز کو جو شیطان ملاتا ہے اللہ بیمار دل والوں اور سخت دل والوں کے لئے آزمائش کا ذریعہ بنا دے بیشک ظالم پرلے درجے کی مخالفت

شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ۝ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ

میں ہیں اور تاکہ وہ لوگ جن کو علم عطا کیا گیا ہے جان لیں کہ وہ تمہارے رب کی طرف سے برحق ہے پس اُس پر ایمان لے آئیں اور ان کے

قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

دل اُن کے سامنے جھک جائیں اور ایمان والوں کو اللہ سیدھی راہ پر پہنچانے والا ہے کافر تو ہمیشہ اس کی طرف سے شک میں پڑے

فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ ۝ اَلْمُلْكُ

رہیں گے یہاں تک کہ اچانک اُن پر قیامت آ پہنچے یا منحوس دن کا عذاب آ پڑے اُس روز حکومت

يَوْمَىِٕذٍ لِّلّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ وَالَّذِيْنَ

اللہ ہی کی ہوگی وہ لوگوں کا باہمی فیصلہ کرے گا پس جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے وہ آرام کے باغوں میں ہوں گے اور جنہوں نے

كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ ع

کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا اُنہی کے لئے ذلت کا عذاب ہوگا

تفسیر

بعض مفسرین اور محدثین اس آیت کے نزول کے متعلق ایک واقعہ نقل کرتے ہیں لیکن ہماری رائے میں وہ واقعہ روایۃً و درایۃً غلط ہے، اس لئے آیات کا مختصر تفسیری حل ہم اوّل لکھنا مناسب سمجھتے ہیں تاکہ فہم مطلب میں کوئی دشواری نہ رہے۔ پھر وہ شان نزول نقل کریں گے اور اس کے بعد روایت و درایت کے اعتبار سے جو غلطیاں معلوم ہوتی ہیں ان کو پیش کریں گے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ اللہ پاک نے پیغمبروں کو علم غیب نہیں دیا۔ اگر باقتضائے بشریت کبھی بھی پیغمبر اپنے دل میں کچھ خیالی باندھتے تھے تو ان کی قوتِ واہمہ (یعنی شیطان) اُس میں دخل انداز ہوتی تھی اور ان کی خیالی آرزو پوری نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس سے ان کی پیغمبری میں کوئی خلل نہ آتا تھا۔ مثلاً رسول کریم ؐ نے ایک بار ہجرت سے پہلے ایک خواب دیکھا کہ میں مکہ چھوڑ کر ایک بستی میں جا کر رہا ہوں جس میں کھجور کے درخت بکثرت ہیں۔ آپ نے خیال کیا (عجب نہیں) وہ بستی ہجر یا یمامہ ہو اور واقع میں وہ مقام مدینہ تھا۔ اسی طرح مدینہ میں ایک بار حضور ؐ نے خواب دیکھا کہ مدینہ سے روانہ ہو کر مکہ پہنچے اور عمرہ کیا اور سر کے بال کتروائے اور منڈوائے۔ حضور ؐ نے خیال فرمایا کہ اسی سال ایسا ہوگا حالانکہ چند سال بعد ہوا۔ غرض اسی قسم کے خیالات ذاتی خیالات تھے آسمانی وحی نہ تھی جس کے خلاف نہ ہوتا۔ ایسے خیالات

کے خلاف واقع ہونے میں مخلص اہلِ اسلام اور منافقین و کفار کا امتحان ہوتا ہے۔ مومن سمجھ جاتا ہے کہ اس سے پیغمبر کی معصوم ذات اور وحی کی صداقت میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔ کیونکہ خیال مقتضائے بشریت ہے اور پیغمبر نہ خدا ہیں نہ عالم الغیب۔ البتہ کفار کو ایسے واقعات سے طعنہ زنی کا موقع مل جاتا ہے لیکن کمبخت اتنا نہیں سمجھتے کہ جب پیغمبر کا ذاتی خیال ٹھیک نہیں اترا تو اس سے وحی کی مزید پختگی اور صداقت ثابت ہوئی۔ کیونکہ اگر وحی بھی رسول پاک ﷺ کی اختراعی چیز ہوتی تو اس کے خلاف بھی کبھی واقع ہوتا۔ ہر تخیل اختراعی کے خلاف کبھی نہ کبھی وقوع ہو ہی جاتا ہے اور چونکہ وحی کے خلاف ہونا ناممکن ہے۔ معلوم ہوا کہ وحی ذاتی خیال نہیں بلکہ منجانب اللہ ہوتی ہے۔ اہلِ تفسیر اس جگہ ایک قصہ نقل کرتے ہیں اور اس کو آیت مذکورہ کا سبب نزول قرار دیتے ہیں۔ خلاصۂ قصہ یہ ہے کہ رسول پاک ﷺ بتوں کی زیادہ مذمت فرماتے تھے مشرکوں نے ایک بار بالاتفاق کہا محمد ﷺ ہمارے بتوں کی بہت زیادہ مذمت کرتے ہیں اتنی مذمت تو یہود و نصاریٰ بھی نہیں کرتے۔ اگر وہ اپنی زبان روک لیتے تو ہم بھی ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اذیت نہ دیتے۔ اسی دوران میں سورۂ والنجم نازل ہوئی۔ جب حضور والا ﷺ نے آیت أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَىٰ تلاوت فرمائی تو شیطان نے بے ساختہ آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری کر دئے: تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلَىٰ وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجَىٰ۔ یعنی یہ دیویاں شہباز بلند پرواز ہیں۔ ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔ یا یہ الفاظ کسی غیبی شیطان نے حضور والا ﷺ کی تلاوت کے ساتھ ادا کئے۔ ہر حال الفاظ مذکورہ ہر کافر نے سن لئے، مگر کسی مسلمان نے نہ سنے۔ کفار سن کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے اب محمد ﷺ اپنے آباؤ اجداد کی طرف لوٹا ہے۔ غرض جب حضور ﷺ سورۂ نجم کے آخر پر پہنچے اور آیت سجدہ تلاوت کی تو تمام مسلمان سجدہ میں سر افگندہ ہو گئے اور ان کے ساتھ کفار بھی سجدہ میں گر پڑے صرف ولید بن مغیرہ نے سجدہ نہ کیا بلکہ مٹھی بھر سنگریزیاں اٹھا کر اپنی پیشانی سے لگالیں۔ تلاوت سے فارغ ہوئے تو مسلمانوں نے کافروں کی سجدہ ریزی پر تعجب کیا۔ کیونکہ کلمات مسلمانوں کے کانوں میں نہ پڑے تھے۔ غرض کفار کو وہ کلمات یاد ہو گئے اور انہوں نے خوب چرچا پھیلایا۔ یہاں تک کہ حبش میں اطلاع پہنچی کہ تمام اہلِ مکہ مسلمان ہو گئے اور سبھوں نے رسول پاک ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی ہے اور اب مکہ میں امن ہے۔ یہ سن کر حضرت عثمان بن مظعون اپنے ساتھیوں سمیت حبش سے مکہ کو چل دئے۔ اس وقت خدا تعالیٰ نے آیات مذکورہ نازل فرمائیں۔

اس شانِ نزول کی تقریر پر تمنی کے معنی تلاوت کے لینا ہوں گے اور مطلب یہ ہوگا کہ نبی نے جب وحی کی تلاوت کی تو شیطان نے کلمات وحی میں اپنی طرف سے چند الفاظ ملا دئے، مگر اللہ نے کلمات شیطان کو منسوخ اور اپنی وحی کو محکم کر دیا۔ اس قصہ کے ناقل مختلف علماء ہیں۔ ابن ابی حاتم نے بطریق محمد بن اسحٰق شہاب الدین زہری سے نقل کیا ہے۔ ابن جریر، ابوبکر، بغوی، بیہقی، بزار اور بعض دوسرے حضرات نے ابوالعالیہ، سدی اور سعید بن جبیر تک سلسلۂ روایت پہنچایا ہے۔ ابن حجر عسقلانی نے اس کی صحت کی طرف میلان کیا ہے۔

ہمارے نزدیک چند وجوہ کی بنا پر یہ قصہ ہی موضوع ہے (۱) کوئی سلسلہ ایسا نہیں جس سے روایت کا اتصال ثابت ہو۔ تمام روایات مرسل اور منقطع ہیں۔ ایک روایت کا سلسلہ کلبی کے توسط سے ابن عباس تک پہنچتا ہے اور کلبی ضعیف ہیں۔ دوسری اسناد میں واقدی کا توسط ہے یہ بھی ضعیف الروایۃ ہیں اور جب اتصال ثابت نہیں تو قصہ مذکورہ ناقابلِ اعتبار ہے۔

(۲) محمد بن خزیمہ اور بیہقی وغیرہ نے حدیث صحیح نقل کی ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے سورۂ والنجم پڑھی اور آخر میں سجدہ کیا اور اس وقت جو کوئی آپ کے ساتھ تھا ہر ایک نے سجدہ کیا صرف ایک قریشی بڈھے نے سجدہ نہ کیا بلکہ مٹھی بھر مٹی اٹھا کر اپنی پیشانی سے لگالی پھر میں نے دیکھا کہ وہ کافر مارا گیا۔ اس حدیث کو مسلم و بخاری نے صحیحین میں بھی نقل کیا ہے۔ واقعہ مذکورہ کی کوئی صراحت اس روایت میں نہیں۔ باوجودیکہ بالاتفاق یہ روایت صحیح ہے۔ دوسری روایت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ہے کہ رسول پاک ﷺ نے سورۂ والنجم میں سجدہ کیا۔ آپ کے ساتھ تمام مسلمانوں، کافروں اور جنوں نے بھی سجدہ کیا (رواہ البخاری) اس روایت میں بھی واقعۂ غرانیق کا کوئی تذکرہ نہیں۔ اسی بنا پر قاضی عیاض نے شفا میں صراحت کی ہے کہ اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ امر تبلیغی میں رسول پاک ﷺ معصوم ہیں۔ کوئی چیز خلاف واقع نہ آپ سے قصداً صادر ہو سکتی ہے نہ سہواً نہ غلطی سے نہ عمداً، اس لئے یہ قصہ باطل ہے۔ حضور ﷺ سے سہواً بھی کلمات مذکورہ کا اختلاط نہیں ہو سکتا۔

(۳) حضور اقدس ﷺ بت پرستی کو دور کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ شرک کا مٹا دینا آپ کا مقصود تھا پھر بتوں کی تعظیم و تکریم کے الفاظ زبانِ مبارک سے کیسے صادر ہو سکتے تھے جس شخص کا ایسا عقیدہ ہو وہ کافر ہے، کیونکہ کافروں کو خوش کرنے کے لئے کفر کی آرزو کرنی کفر ہے اور جو شخص رسول پاک ﷺ کی طرف کسی فعل کفر کی نسبت کرے وہ کافر ہے (ذکرہ الرازی فی الکبیر) امام محمد بن خزیمہ نے کہا زندیق لوگوں نے یہ قصہ بنایا ہے۔ اس قصہ کے موضوع ہونے کے متعلق آپ نے

ایک مستقل تصنیف کی ہے۔ ملا علی قاری نے بھی اس کو موضوعات میں درج کیا ہے۔

(۴) اگر تمنا کے معنی تلاوت کے لئے جائیں اور قصۂ مذکورہ صحیح مان لیا جائے تو علاوہ شرع و عقل کے انکار کے قواعد لغت بھی اس کے خلاف ہیں کیونکہ آیت میں نفی واستثناء ہے جو مفید حصر و استغراق ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ جب کبھی رسول دینی آیات وحی کی تلاوت کرتا ہے تو ہر بار شیطان اس میں دخل انداز ہوتا ہے کبھی ایسا نہ ہوا کہ نبی نے تلاوت کی ہو اور شیطان دخیل نہ ہوا ہو۔ گویا ہر مرتبہ تلاوت کے وقت شیطان کلماتِ وحی میں گڑ بڑی کر دیتا ہے۔ حالانکہ ایسا واقعہ نہیں ہے ہمیشہ آیاتِ الٰہیہ میں کمی بیشی نہیں کراتا۔ اس کا کوئی قائل نہیں نہ کسی کی عقل اس کو مان سکتی ہے۔ ورنہ تمام شرائع و دیانات ناقابلِ اعتبار ہو جائیں گی۔ ناقلین واقعہ بھی واقعہ مذکورہ صرف ایک دفعہ کا نقل کرتے ہیں۔ ہر بار تلاوت کے وقت شیطانی مداخلت کا کوئی بھی مجوز اور راوی نہیں۔ اس لئے قصہ مذکورہ بالکل غلط ہے ورنہ آیت کا مطلب غلط ہے۔

تحلیل اجزاء

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ۔ اس آیت کا ایک صحیح مطلب تو وہ ہے جو ہم نے تفسیری حل کے ذیل میں بیان کر دیا ہے۔ دوسرا خلاصہ مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جتنے انبیاء پہلے گزر چکے ہیں سبھوں نے احکام الٰہیہ کو اپنی اپنی قوم کے سامنے بیان کیا اور پیامِ وحی پڑھ کر سنایا اور یہ تمنا کی کہ قوم مسلمان ہو جائے اور عذابِ شدید سے بچ جائے، مگر ہر نبی کی آرزو میں شیطان دخل انداز ہوا۔ اس نے کافروں کے دلوں سے قولِ پیغمبر کے اثر کو دُور کرنے کی کوشش کی اور اپنی طرف سے طرح طرح کی خرافات ان کے دلوں میں ڈالتا رہا، لیکن انجام کار اللہ کی آیات محکم اور دائم البقاء ثابت ہوئیں۔ خدا کے احکام کو کوئی نہ مٹا سکا اور شیطانی القاء چونکہ کمزور تھا، اس لئے مٹ گیا۔ حق کو فتح ہوئی اور باطل کو شکست۔ اس حق و باطل کی کشاکش اور وحیِ ربانی اور القاءِ شیطانی کے مقابلے کا اصل مقصد یہ تھا کہ راسخ العلم، صحیح الایمان اور پختہ عقیدت رکھنے والے نمایاں ہو جائیں اور جو ضعیف الفہم، تنگی مزاج اہلِ نفاق ہیں اُن کی حقیقت بھی کھل جائے۔ جو حق پرست مومن ہیں ان کے دلوں میں تو القائے شیطانی کی وجہ سے صداقتِ وحی میں شبہ پیدا نہ ہوتا، لیکن جن کے دل بیمار ہیں اور حق سے متاثر ہونے کا مادہ نہیں ہے وہ القائے شیطانی کی وجہ سے وحی کی حقانیت کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ پیامِ الٰہی کے خلاف ان کے دماغوں میں طرح طرح کے وسوسے گھومتے ہیں اور وہ وہمیات کا مقابلہ عقلیات سے کرتے ہیں۔ یہ گزشتہ انبیاء کا تذکرہ تھا جس کے ذکر کرنے سے رسول پاکؐ کو تسلی دینی مقصود ہے۔ بات یہ تھی کہ کفارِ مکہ بھی آخر کار کافر ہی تھے، اصولِ کفر کے پابند تھے۔ قرآن کو سحر و کہانت اور شاعری کہتے تھے۔ احاطۂ مشیتِ الٰہیہ کے فیصلے کو توڑنے کے لئے کہتے تھے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا۔ یعنی جب اللہ کی مشیت محیطِ کل ہے اور اس کی ہمہ گیری سے کوئی بچا ہوا نہیں ہے تو ہمارا اور ہمارے اسلاف کا کفر و شرک بھی اُسی کی مشیت سے ہے۔ اگر وہ چاہتا تو ہم اور ہمارے اسلاف مشرک نہ ہوتے۔ جانوروں کی حرمت و حلت کے قانون پر اعتراض کرنے کے لئے کہتے تھے تعجب ہے کہ جس جانور کو ہم قتل کریں وہ تو حلال ہو اور جس کو خدا (اپنی موت سے) مار ڈالے (یعنی مُردار جانور) وہ حرام ہو یہ کون سا صحیح حکم ہے۔

غرض اسی قسم کی وہمیات کو شرع کے بیان کردہ قواعد و احکام میں دخیل بناتے تھے اور یہ سب کچھ بالقائے شیطانی تھا۔ حضور ان لوگوں کی ضلالت انگیزیوں سے پریشان ہوتے اور لوگوں کی کوتاہ فہمی پر آپ کو افسوس ہوتا۔ اس حزن و ملال کو دور کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے آیاتِ مذکورہ کو نازل فرمایا اور صاف صراحت کر دی کہ ایسی حرکت کفار آپ ہی کے ساتھ نہیں کرتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ تمام انبیاء کو ایسے ہی بے دینوں سے واسطہ پڑا ہے، مگر یہ اغوائے شیطانی اور ضلالت انگیزیاں دیرپا نہیں۔ باطل مٹ جائے گا اور احکامِ الٰہیہ نہایت استواری کے ساتھ قائم رہیں گے۔ یہ مطلب بھی صحیح ہے۔ پہلا مطلب عام مفسرین نے بیان کیا ہے مگر میرے نزدیک یہ مطلب زیادہ واضح ہے۔

لِلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ۔ بیماری سے مراد ہے جہالت، علم کی کمزوری، عقل و بصیرت کی کوتاہی اور قوتِ ایمانیہ کا ضعف۔

اَلْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ۔ دل کی سختی سے یہ مراد ہے کہ کلمۂ حق کا اُن کے دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا جس طرح سخت پتھر کے اندر بارش، ہوا اور دیگر مؤثرات کا اثر نہیں پہنچتا۔ اسی طرح جن لوگوں کے دلوں میں حق سے اثر اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں وہ آیاتِ الٰہیہ سے متاثر نہیں ہوتے اور پیامِ حق کی حقانیت و صداقت میں شک کرنے لگتے ہیں۔ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ۔ نسخ سے مراد ابطال و محو یعنی انجام کار اللہ القائے شیطانی کو مٹا دیتا ہے، تمام توہمات و خرافات کو باطل کر دیتا ہے۔ جس قدر پُرفریب شیطانی طمع کاریاں ہوتی ہیں ان کی قلعی کھول دیتا ہے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نکل آتا ہے۔

حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً الخ۔ اس آیت میں ساعت سے مراد قیامت یا موت ہے اور یوم عقیم سے مراد مجاہد، سعید بن جبیر، قتادہ، ابن عباس اور ابی بن کعب وغیرہم کے نزدیک یوم بدر ہے۔ سیوطی اور ابن جریر نے اسی قول کو پسند کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ اگر یوم عقیم سے مراد بھی روزِ قیامت لیا

جائے گا تو تکرار لازم آئے گی۔ ابن کثیر نے ساعت سے مراد قیامت اور یوم عقیم سے مراد عذاب قیامت لیا ہے۔ اس صورت میں تکرار نہیں لازم آتی بلکہ مراد یہ ہے کہ قیامت اچانک آجائے یا عذاب قیامت وقت مقررہ پر آجائے۔ اگر ساعت سے مراد موت اور یوم عقیم سے مراد روز قیامت لے لیا جائے تو میرے نزدیک کوئی خرابی نہیں۔ مطلب یہ ہوگا کہ کافروں کی موت اچانک آجائے اور یا اچانک موت نہ آئے تو اچانک قیامت آجائے بغیر اسکے ان کا شک زائل نہ ہوگا۔

مقصود بیان

انبیاء کے ذاتی خیالات کے خلاف وقوع ہونا ممکن ہے لیکن اس سے وحی کی صداقت اور پیغمبر کی عصمت میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ پیغمبر ہدایت رحمت کرتا ہے اور شیطان راہ ضلالت دکھاتا ہے۔ اہل ایمان کے دلوں میں وحی ربانی جاتی ہے اور القائے شیطانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ باطل پرستوں کے دلوں میں وحی شیطانی جاتی ہے اور وحی رسالت کو ان کے دل قبول نہیں کرتے۔ جو عالم رسول اللہ کی سنت پر ہدایت کرے گا شیطان کی پیروی کرنے والے اس سے ضرور ضرور کریں گے اور اس کے یقینی اصول و عقائد سے اپنے وہمیات کو ٹکرائیں گے۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اپنے قلب کی حفاظت کرے اور جان لے کہ وحی رسالت رحمانی اور وحی شیطانی دونوں میں سے ایک کا القاء اس کے قلب پر ضرور ہوگا۔ پس خود غور کرے کہ اس کا قلب دونوں میں سے کس کو قبول کرتا ہے۔ جو لوگ توہمات کے خارزار میں نہیں پھنستے اللہ ان کو خود راہ مستقیم بتا دیتا ہے۔ البتہ جن لوگوں کے دل میں شک اور نفاق کا گندہ مواد جمع ہوتا ہے ان کو مرتے دم تک ہدایت نہیں ہوتی وغیرہ۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ

اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں وطن چھوڑا پھر مارے گئے یا مر گئے اللہ اُن کو ضرور عمدہ روزی دے گا اور بلاشبہ اللہ

خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ

بہتر روزی دینے والا ہے اللہ ضرور اُن کو ایسی جگہ میں داخل کرے گا جس کو وہ پسند کریں گے بلاشبہ اللہ دانا اور بُردبار ہے بات یہی ہے اور جو شخص

عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ

اُتنا ہی بدلا لے جتنا اُس کو ستایا گیا ہے پھر اُس پر زیادتی کی جائے تو اللہ اُس کی ضرور مدد کرے گا بلاشبہ اللہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے یہ اس سبب سے ہے کہ

اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ

اللہ (بڑا قادر ہے وہی) رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے یہ اس لئے کہ

اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ۝

اللہ ہی برحق ہے اور اللہ کو چھوڑ کر جس کو یہ کافر پکارتے ہیں وہ باطل ہے اور اللہ ہی عالی شان باعظمت ہے

تفسیر

دنیا میں خیر و شر، حق و باطل، عدل و ظلم، روشنی اور تاریکی، دن اور رات کا جوڑ ہے۔ کبھی دن ہوتا ہے کبھی رات، کوئی ظالم ہے کوئی منصف، کوئی کافر کوئی مومن، رات ختم ہوتی ہے دن آتا ہے، دن جاتا ہے رات آتی ہے، کوئی راہ خدا میں تن من دھن، اہل و عیال اور کل جاہ و جلال قربان کر دیتا ہے اور کوئی شیطان پرستی کے سر صدقہ اپنی پوری زندگی اور زندگی کے کل اسباب آسائش کو کر دیتا ہے۔ یوں ہی کارخانۂ قدرت جاری ہے، خلاق کل کی مصلحت عقلی اسی میں ہے۔ اگر تاریکی ہی تاریکی ہوتی روشنی نہ ہوتی تو تاریکی سے نفرت اور روشنی سے رغبت نہ ہوتی اور اگر روشنی ہی روشنی ہوتی تو ظلمت کا وجود نہ ہوتا تو کائنات اس کی خوگر ہو جاتی اور یہ نعمت کبریٰ بے قدر ہو جاتی۔ پھر اگر یہ انقلاب نہ ہوتا تو قدرت الٰہیہ کا کون قائل ہوتا۔ تغیرات عالم انسان کے دماغ کو کھینچ کر بالجبر ہمہ گیر قدرت کا اقرار کراتے ہیں۔ جب دنیا میں کفر کی تاریکی چھا جاتی ہے تو حکیم مطلق انبیاء کو روشنی پھیلانے کے لئے مبعوث فرماتا ہے۔ جب ظالم کا ظلم حد کمال پر پہنچ جاتا ہے تو علمبردار عدل رونما ہوتا ہے، لیکن ظالموں اور کافروں کو اپنے کرتوت سے باز آنے اور سوچنے سمجھنے کا موقعہ دیا جاتا ہے جس طرح دن کی

روشنی رات کی تاریکی کو یکدم غائب نہیں ہونے دیتی۔ شہنشاہ چین یک دم طلوع نہیں کرتا بلکہ پہلے اس کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح ایک دم اور دفعتاً ظالموں اور کافروں کا وجود صفحۂ ہستی سے نہیں مٹا دیا جاتا ہے بلکہ ڈھیل دی جاتی ہے۔ علمبرداران حق تبلیغ کرتے ہیں کافروں کے ہاتھوں مصائب اٹھاتے ہیں، جسمانی اور مالی اذیتوں کو بطیب خاطر برداشت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی احبابِ واعزاز، اہل وعیال، مال ومنال اور وطنِ عزیز کو قربان بھی کر دیتے ہیں اور تاریکی کو دور کرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں، لیکن جب ظالموں کی چیرہ دستیاں حدکمال سے آگے بڑھنا چاہتی ہیں اور سوائے انقلاب انگیز مقابلہ کے ظلمت کفر کے چھٹنے اور ایمان کی روشنی چمکنے کی کوئی صورت ہی ممکن نہیں ہوتی اور قدرت کا پیمانۂ تحمل لبریز ہوجاتا ہے تو حاملانِ حق کو تلوار اٹھانے کا حکم ہوتا ہے۔ اس وقت بھی ممکن ہوتا ہے کہ ایک ہی حملے میں حق وباطل کا فیصلہ ہوجائے اور کفر وظلم کی جڑیں کٹ جائیں اور اسلام اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ جلوہ ریز ہوجائے۔ مگر حکیم کامل کی مصلحت یہ بھی تاخیر کرتی ہے، تاریک روح والوں کو صفائی باطن کا پھر بھی موقع دیتی ہے، آفتاب کی شعاعیں نکل آتی ہیں، مگر پھر بھی کس قدر تاریکی خبث کے بقیہ اثرات اس کی شعاعوں پر چھائے ہوئے محسوس ہوتے ہیں، مکمل روشنی اس وقت پھیلتی ہے جب سورج اپنی انتہائی تمازت پر ہو اور نصف النہار پر پہنچ جائے۔ غرض جب صحابی ہوتے ہوتے انجام کار کفر اپنے تمام طاغوتی لشکروں کو لے کر دولیغرا ہوجاتا ہے اور اسلام اپنی حقانی فوجوں سمیت اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اہل کفر کو سوچنے سمجھنے کا موقعہ مل چکتا ہے۔ اور اہل ایمان کی بھی کافی آزمائش ہوچکتی ہے اور بالآخر مدد الٰہی اہل حق کی پشت پناہ اور قوت بازو بن جاتی ہے اور حق کا بول بالا ہوجاتا ہے اس وقت انصاف ہمہ گیر اور معارف حق مکمل ہوجاتے ہیں اور شیطان اپنی تمام ذریات کو لے کر کوہستان بطلان کے اندر جا چھپتا ہے۔ اسی مطلب کو آیات مذکورہ میں ادا کیا ہے، طرز ادا معجزہ ہی مضمون حکیمانہ ہے، الفاظ مختصر اور جامع ہیں۔ فتفکروا۔

خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ کلمۂ حق کو پسند کرنے اور امن وانصاف قائم کرنے کے لئے جو لوگ اپنے گھر بار اور وطن عزیز کو چھوڑتے ہیں وہ اپنی موت سے مریں یا دشمن کے مقابلے میں مارے جائیں بہرحال چونکہ ان کی نیت صحیح ہے، اس لئے عالم برزخ میں بھی ان کو رزق الٰہی ملتا رہے گا اور پھر قیامت کے دن بھی، وہ رضوانِ الٰہی کی سرزمین کے مالک ہوں گے۔ راہِ خدا میں قربانی کرنے والوں کو اگر کوئی ستائے تو ان کو بھی اتنی ہی مدافعت کا حق ہے جتنا ان کو ستایا گیا ہو۔ اس پر اگر اہل باطل کی طرف سے دوبارہ زیادتی کی جائے گی تو اس وقت شمشیرِ حق برہنہ ہوجائے گی اور غیبی نصرت مسلمانوں کے شامل حال ہوگی۔ اس تدریجی زوال وترقی اور غیر واقعی انقلاب اور کفر واسلام کے مقابلے کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ کارخانۂ قدرت بھی ان ہی اصول پر چل رہا ہے۔ کائنات کے وجود کی بنیاد بھی انہی پر ہے۔ شبانہ روز کا اس طرح تبادل بھی اسی حکمت کے ماتحت ہے۔ یہی حق وباطل کی صورت ہے۔ باطل پر حق کا غلبہ بھی تدریجی ہوتا ہے۔

تحلیل اجزاء

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا الخ۔ ایک مرتبہ چند صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ ہم اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ مل کر جہاد کرتے ہیں۔ وہ شہید ہوکر اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ جاتے ہیں اور ہم زندہ واپس آجاتے ہیں۔ اگر اپنی موت سے مر گئے اور شہید نہ ہوئے تو اس وقت ہمارا کیا حال ہوگا؟ اس وقت یہ دو آیات مسلمانوں کی تسلی کے لئے نازل ہوئیں۔

ہجرت دو طرح کی ہوتی ہے:۔ ہجرت اسلام اور ہجرت تقویٰ۔ (۱) ہجرت اسلام یعنی اسلام کا بول بالا کرنے، احکام اسلامیہ کو پھیلانے اور تبلیغ اسلام کرنے کے لئے اپنے وطن کو، عزیزوں کو اور تمام کاروبار کو چھوڑ کر نکل جانا ہجرت اسلام کہلاتا ہے۔ مجاہدین بھی چونکہ اشاعتِ اسلام کے لئے کمربستہ ہوتے ہیں اور تمام آسائشوں کو قربان کر کے، دوستوں، رشتہ داروں اور عزیزوں کو چھوڑ کے وطن کو خیرباد کہہ کے جانِ عزیز کو ہتھیلی پر لے کے نکلتے ہیں، اس لئے وہ بھی مہاجرین کے گروہ میں داخل ہیں، وہ طلبا جو علم دین کی تحصیل کے لئے گھربار اور مال ومنال کو چھوڑتے ہیں وہ مہاجرین ہیں، وہ نیکوکار، فرماں بردار اہل ایمان جو اطاعت والدین یا کسی اور حکم شریعت کے تحت خانہ و وطن سے ہجرت کرتے ہیں وہ بھی اہل ہجرت ہیں۔ غرض مہاجر وہ شخص ہے جو کسی اسلامی عقیدہ یا حکم پھیلانے یا اس کی تعمیل کے لئے گھربار چھوڑتا ہے، لیکن نیت کا خلوص شرط ہے کسی دنیوی فائدہ کے حصول کے لئے اگر گھربار چھوڑتا ہے تو ایسا شخص مہاجر کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ آیت میں فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے لفظ سے اسی طرف اشارہ ہے۔ صحیحین کی متواتر یا مشہور حدیث ہے کہ اعمال نیت سے وابستہ ہیں، جو نیت وہی نتیجہ۔ جس کسی کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی تو وہ ہجرت خدا اور رسول کی طرف ہوگی اور جس کی ہجرت کسی دنیوی فائدہ کے حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہوگی اس کی ہجرت اپنی نیت کے موافق نہ ہوگی یعنی اس کو ہجرت شرعیہ نہ کہا جائے گا معلوم ہوا کہ ہجرت میں صدق نیت شرط ہے۔

(۲) ہجرت تقویٰ یعنی تمام ممنوعات سے نفس کو روکنا، شیطانی خواہشات کو ترک کرنا شریعت میں اس کو بھی ہجرت کہا گیا ہے۔ حضرت عمرو بن عبسہ کی حدیث میں ہے حضور اقدسؐ نے فرمایا اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ یعنی منہیات الٰہیہ کو ترک کر دے (رواہ احمد) حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں ہے المهاجر من

هجر الخطایا والذنوب یعنی مہاجر وہ ہے جس نے چھوٹے چھوٹے گناہوں کو چھوڑ دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث ہے المهاجر من هجر ما نهى الله عنه یعنی ممنوعات الٰہیہ کو ترک کرنے والا مہاجر ہے (اول روایت بیہقی اور دوم بخاری کی ہے) صحیح حدیث میں آیا ہے کہ سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے۔ مجاہد وہ ہے جس نے اپنے نفس سے جہاد کیا۔

آیت میں ہجرت تقویٰ تو مراد نہیں ہے کوئی بھی اس کا قائل نہیں بلکہ حقیقۃً اہل و عیال اور احباب و وطن کو چھوڑ کر راہ خدا میں نکلنا مراد ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی علماء میں باہم اختلاف ہے، بعض کے نزدیک وہی مہاجرین مراد ہیں جنہوں نے مکہ کی سکونت چھوڑ کر مدینہ میں بود و باش اختیار کی تھی۔ بعض نے ذرا اور توسیع کر دی ہے۔ ان کے نزدیک ہجرت الی الحبشہ اور ہجرت الی المدینہ دونوں کو شامل ہے۔ کیونکہ صحیح حدیث ہے حضور اقدس ؐ نے ارشاد فرمایا لاهجرة بعد الفتح یعنی فتح مکہ کے بعد ہجرت کا حکم نہیں رہا۔ اہل تحقیق کے نزدیک عام ہجرت اسلامی مراد ہے خواہ رسول اللہ ؐ کے زمانہ کی ہو یا قیامت تک کسی وقت ہو۔ راہِ خدا میں وطن مالوف اور عزیز و اقارب کو چھوڑ کر جانا ہجرت ہے۔ اگرچہ وہ ثواب اس ہجرت کا نہیں ہے جو فتح مکہ سے پہلے وطن چھوڑ کر مدینہ کی سکونت اختیار کرنے والوں کے لئے تھا تاہم ہجرت ضرور ہے اور آیت کے حکم کے مستحق یہ مہاجرین بھی ہیں۔ دار الکفر میں سکونت مستقل رکھنی ممنوع ہے۔ طبرانی نے حدیث نقل کی ہے حضور ؐ نے فرمایا انا برئ من مسلم بين ظهراني المشركين۔ یعنی میں اس مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین کے غلبہ کے باوجود انہی میں رہتا ہے۔

آیت کا مطلب صاف ہے کہ راہِ خدا میں ہجرت کرنے والے خواہ دشمن کے مقابلے میں مارے جائیں یا اپنی موت سے مر جائیں دونوں شہید ہیں۔ شرحبیل بن سمط کی روایت ہے کہ سرزمین روم میں ہم ایک قلعہ کا محاصرہ کئے پڑے تھے، محاصرہ کی مدت دراز ہو گئی۔ کچھ مدت کے بعد حضرت سلمان فارسی تشریف لائے اور فرمایا میں نے رسول اللہ ؐ سے سُنا ہے جو شخص راہِ خدا میں مرابط ہو نیکی حالت میں مرا، اللہ اس کو (راہِ خدا میں مارے جانے والوں کے ثواب کی برابر) ثواب دیتا ہے۔ اس کے لئے (عالم برزخ میں رزق جاری کر دیتا ہے) اگر ثبوت چاہتے ہو تو یہ آیت پڑھو۔ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ قُتِلُوا أَوْ مَاتُوا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللَّهُ رِزْقًا حَسَنًا...... (رواہ ابن ابی حاتم) ایک بحری جہاد میں حضرت فضالہ بن عبید انصاری شریک تھے۔ دورانِ جہاد میں دو جنازے لائے گئے جن میں سے ایک گوپھن کی ضرب میں شہید ہوا تھا اور دوسرا اپنی موت سے مرا تھا۔ لوگوں نے شہید کے جنازہ کی طرف رغبت کی اور دوسرے جنازہ کو چھوڑ دیا۔ حضرت فضالہ اس شخص کی قبر کے پاس جا کر بیٹھے جو اپنی موت سے مرا تھا۔ لوگوں نے کہا آپ نے شہید کا جنازہ چھوڑ دیا اور دوسرے کے پاس جا بیٹھے؟ فرمایا مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ ان دونوں گڑھوں میں سے کس گڑھے میں میرا حشر ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے۔ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ قُتِلُوا أَوْ مَاتُوا الخ یعنی ثواب دونوں کا برابر ہے (رواہ ابن جریر) ابن ابی حاتم نے یہ واقعہ قلعۂ رودس کے محاصرہ کا لکھا ہے۔ ابن جریر کی روایت میں رودس کی بجائے رودس کا لفظ ہے۔

لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللَّهُ رِزْقًا حَسَنًا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۝ لَيُدْخِلَنَّهُم الخ۔ جملہ سابقہ یعنی لَيَرْزُقَنَّهُمْ سے بدل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد خدا تعالیٰ مہاجر کو اچھا رزق اور پسندیدہ مقام عنایت فرما دیتا ہے اور یہ سب چیزیں جنت میں ملیں گی۔ لیکن ابن کثیر اور خطیب وغیرہ نے رزق حسن کو عالم برزخ کی نعمت، اور مقام پسندیدہ کو حشر کے بعد کی نعمت قرار دیا ہے یعنی مرنے کے بعد عالم برزخ میں مہاجرین فی سبیل اللہ کو بہترین رزق ملتا ہے اور پھر حشر کے بعد جنت میں ان کو پسندیدہ مقام عنایت ہو گا۔

رزق جاری ہونے سے لوگوں نے شہداء کی زندگی کو دنیوی زندگی کی طرح مادی زندگی سمجھ لیا ہے بلکہ لوگ تو شہداء کو اسی عالم میں زندہ اور چلتا پھرتا جانتے ہیں، مگر یہ فہم کی غلطی ہے جس طرح شہید کی زندگی برزخی ہے، اُس کی کیفیت احاطۂ بیان سے خارج ہے بلکہ فہم بشری سے بالاتر ہے۔ اسی طرح وہ رزق جو شہداء کو مرنے کے بعد ملتا ہے اس کی کیفیت بھی بیان و ادراک سے باہر ہے اس کو مادی کہنا غلط ہے۔ مجہول الکیفیت کا بیان ناممکن ہے۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ شہداء کو کوئی ممتاز برزخی زندگی اور خصوصی رزق عطا کیا جاتا ہے۔

وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوقِبَ بِهِ۔ ایک بار اتفاق سے محرم کی ۲۸ تاریخ نبی کریم کے بھیجے ہوئے فوجی دستے سے کافروں کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ مشرکوں نے باہم مشورہ کر کے اہلِ اسلام سے لڑنا چاہا۔ مسلمانوں نے اللہ کے واسطے اور قسمیں دیں کہ محترم حرمت کا مہینہ ہے اس میں ہم سے مت لڑو، لیکن کافر نہ مانے اور زیادتی کرنی شروع کر دی۔ مجبوراً مسلمانوں کو لڑنا پڑا اور انجام کار غیبی نصرت سے فتحیاب ہوئے اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی (رواہ ابن جریر وقد ذکر فی المعالم بمثلہ) اگر شان نزول کو صحیح مان لیا جائے تو شاید صورت یہ ہو گی کہ پہلے کافروں نے جبر و تشدد کیا اور مسلمانوں کو ایذائیں دیں، مسلمانوں نے اس کا انتقام لیا پھر کافر موقعہ کے منتظر رہے۔ اتفاق سے ۲۸ محرم کو ان کو موقعہ مل گیا اُس وقت مسلمانوں کو لڑنے میں تردد ہوا، مگر مجبوراً لڑے اور کامیاب ہوئے　　حاصل ارشاد یہ ہے کہ اگر کفار تعدی کریں اور مسلمان بقدر تعدی انتقام لے لیں پھر کفار موقعہ پا کر دراز دستی کریں تو اس وقت بھی مسلمانوں کو مقابلہ کرنا جائز ہے خواہ کوئی مہینہ ہو اللہ ان کی مدد کرے گا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الخ۔ اس آیت کو ماقبل سے ربط دینے کے لئے اہل تفسیر نے مختلف توجیہات اور تاویلیں کی ہیں اور آسان راستہ تو ہمارا ربط دلانا ہے۔ بہترین تفسیر وہی ہے جو ہم نے تفسیری مطلب کے ذیل میں لکھ دی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حق کا باطل سے مقابلہ اور باطل کو یہ قدرت کہ کبھی عارضی طور پر وہ حق پر غالب آجاتا ہے اور مسلمانوں کا کافروں سے قتال پھر اس میں کبھی شکست اور کبھی کامیابی اس کی وجہ کیا ہے۔ عالم میں کفر کی ضرورت کیا تھی، ظلم کا وجود ہی کیوں ہے اور اگر کفر و ظلم کا ہونا ضروری ہی تھا تو پھر جب حق کا باطل سے مقابلہ ہو تو باطل کو فنا ہو جانا چاہیئے۔ مسلمانوں کو قسم قسم کی مصائب اٹھانے کی کیا ضرورت ہے ایک دفعہ قلع قمع کیوں نہیں کر دیا جاتا۔ حکم انتقام اور وہ بھی بقدر جرم اور روزانہ کا جہاد اور وہ بھی مدافعانہ۔ آخر اس میں کیا حکمت ہے؟ یہ شبہات تھے یا ہو سکتے تھے جن کو دور کرنے کیلئے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ کارخانۂ قدرت یونہی جاری ہے، دن آتا ہے رات جاتی ہے، رات آتی ہے دن جاتا ہے، نور و ظلمت کا تبادل ہوتا رہتا ہے، حق و باطل کا مقابلہ اور غلبہ و شکست بھی تدریجی ہے ورنہ خدا تو عالم کل بھی ہے۔ ہر چیز کو دیکھتا اور سنتا ہے اور بزرگ برتر اور با اقتدار بھی ہے۔ نہ سب کچھ آن کی آن میں کر سکتا ہے مگر حکمت و مصلحت تدریج ہی کی مقتضی ہے۔

مقصودِ بیان

راہ خدا میں ہجرت کرنے والوں کے لئے بشارت اور اس بات کی صراحت کہ مہاجرین خواہ اپنی موت سے مریں یا دشمن کے مقابلے میں مارے جائیں بہرحال شہید ہیں، انعام شہادت ان کو ملے گا۔ لفظ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے اس طرف اشارہ ہے کہ خوشنودی خدا حاصل کرنے اور اسلام کا بول بالا کرنے کے لئے ہجرت ہونی چاہیئے۔ اگر نیت کا خلوص نہ ہوگا اور کوئی دنیوی طمع شامل ہوگی تو ہجرت کا ثواب نہ ملے گا۔ بقدر جرم کفار انتقام لینے کی فی الجملہ اجازت اور اس امر کی صراحت کہ عادلانہ انتقام لینے والوں پر اگر زیادتی کی جائے گی تو کبھی کامیابی نصیب نہ ہوگی بلکہ انہی لوگوں کو فتح غلبہ حاصل ہوگی جن پر زیادتی کی جائے گی۔ شبانہ روز کا مبادلہ ظاہر فرما کر حق و باطل کے تدریجی غلبہ و شکست کی مصلحت کی طرف ایماء اور اس امر کی صراحت کہ اللہ حق ہے اور دوسرے تمام معبود باطل اور ہیچ ہیں۔ اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے ان لوگوں کو جو خدا کو چھوڑ کر پیروں فقیروں اور ولیوں کو پکارتے ان کو قاضی الحاجات جانتے اور یا فلان شیئاً للّٰہ کے خطاب سے مخاطب کرتے ہیں۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ کے سوا کوئی ہو خواہ جلیل القدر نبی اعظم ہی ہو کسی کو عالم میں حقیقی تصرف کر لے کی قدرت نہیں، کوئی مشکل ساز اور قاضی الحاجات نہیں، کوئی فقیر اور کوئی ولی ان باتوں کا اختیار نہیں رکھتا وغیرہ۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ۚ

کیا تم کو نہیں معلوم کہ اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے | پھر زمین سرسبز ہو جاتی ہے | یقیناً | اللہ مہربان | باخبر ہے

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ

جو کچھ آسمانوں میں | اور جو کچھ زمین میں ہے اسی کا ہے اور بیشک اللہ ہی | بے نیاز قابل | حمد ہے | کیا تم کو نہیں معلوم کہ جو کچھ زمین میں ہے

مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ؕ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ

اللہ نے اس کو تمہارا مطیع کر دیا اور کشتیوں کو (تمہارا مطیع کر دیا) کہ اللہ کے حکم سے سمندر میں چلتی ہیں اور وہ آسمان کو اس بات سے روکے ہوئے ہے کہ اس کے بلا حکم زمین پر

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ ۝

گر پڑے یقیناً اللہ لوگوں پر | تحقیق مہربان ہے اور وہی ہے جس نے تم کو زندہ کیا پھر وہی تم کو موت دیتا ہے پھر وہی تم کو زندہ کرے گا | بلاشک انسان بڑا ناشکرا ہے

تفسیر

قرآن پاک کا دستور ہے اور یہ طریق تعلیم بہترین بھی ہے کہ احکام و قواعد کی تعلیم دے کر اس کے مقصد یعنی توحید کی تلقین کرتا ہے۔ کیونکہ توحید ہی دائرہ اسلامی کا مرکز اور دینی محور کا وسطی نقطہ ہے۔ اسی لئے اصول و احکام کے تمام خطوط مستقیم نکلتے ہیں۔ اوپر کی آیات میں کچھ حج کے احکام بیان کئے تھے، اُن کی تفصیل بھی کی تھی، اہل ایمان کے خصوصی اوصاف بھی بیان کئے تھے، پھر آخر میں ہجرت کرنے والوں کا ثواب بیان کیا اور کفار سے مقابلہ کرنے کی ضمنی تعلیم بھی دی تھی

پھر اصل مدعا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ انسان کے فوائد دنیا میں تین طور پر ہیں۔ ایک آسمان اور کائنات فضائی سے، دوسرے موجودات ارضی سے، تیسرے سمندروں اور دریاؤں کے پانی سے۔ انہی تینوں کا بیان آیات مذکورہ میں ہے۔ پھر آخر میں آسمان کی چھت کا باقی رہنا اور نیچے نہ گرنا ظاہر کر کے اپنی قدرت کی وسعت ظاہر فرمائی ہے اور سب کے بعد انسان کی پیدائش و موت کو بعثت ثانیہ کی دلیل قرار دے کر وجود حشر کو ثابت کیا ہے۔

(۱) اگر زمین خشک رہتی، پانی نہ برستا، فضائی کائنات میں انقلاب و حرکت نہ پیدا ہوتی تو کس طرح انسان اس زمین پر زندہ رہ سکتا۔ یہ اللہ ہی کا احاطۂ علمی ہے کہ انسانی زندگی کے قائم رکھنے کے لئے اُس نے مختلف اسباب کو مرتب کر کے اور ایک دوسرے سے مربوط فرما کر پانی اتارا جس سے زمین سرسبز و شاداب ہو جاتی ہے۔ اگر وہ پانی برسنے کی خفیہ اندرونی ترکیبیں نہ کرتا تو انسانی کائنات کیسے زندہ رہتی۔ پانی برسنے میں اسباب فضائی و ارضی سب کو دخل ہے۔ آفتاب کی حرارت سے سمندروں سے بخارات اُٹھتے ہیں، درمیانی فضا میں ان کا پانی بن جاتا ہے پھر برس کر زمین کو سیراب کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کی قدرت ہمہ گیر ہے، اس کا علم محیط کُل ہے، اس کی خفیہ تدبیریں جہاں بجا ہیں اور تمام عالم اسی کے دستِ قدرت میں مرہون ہے بلکہ اسی کا مملوک و مخلوق ہے۔

(۲) زمین کی موجودات چار و ناچار انسان کی خادم و فرماں پذیر ہے۔ جمادی حالت سے انسانی حالت تک رفتہ رفتہ تکمیل ہوتی ہے، بہت سی چیزیں تو انسان کے تصرف میں آتی ہیں۔ جانوروں کا گوشت، اون، چربی، دودھ، دہی، مکھن، گھی، ہڈی، پٹھا، خون وغیرہ انسان اپنے کام میں لاتا ہے۔ بہت سے غلے، میوے اور پھل، بوٹیاں، جڑیں، پتیاں، سبزیاں، ترکاریاں، قسم قسم کے پتھر سب انسان کے تصرف میں آتے ہیں۔ ان کے علاوہ غیر معروف چیزیں بھی انسانی ہستی کی فطری طور پر خادم ہیں۔ کیونکہ اس کے ماتحت ہیں اور ماتحت مافوق کی خادم ہوتی ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ اُن کی تخلیق انسانی تخلیق کا جُز ہے۔ یہ بھی خدا تعالیٰ کی قدرت عامّہ اور ربوبیت تامّہ کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔

(۳) پانی بھی انسان کا مسخر ہے۔ علاوہ دیگر وجوہ تسخیر کے انسان کے سفر کرنے کا ذریعہ ہے۔ انسانی تدبیروں سے کشتیاں اور جہاز پانی کی سطح پر چلتے ہیں اور پانی کی مجال نہیں کہ ان کو غرق کر سکے۔ اس سے بھی اللہ کا احسان عظیم اور تصرف عمیم ثابت ہوتا ہے۔

یہ تو حصولِ فوائد کے ذرائع کا بیان ہوا۔ دفع ضرر تو اس کی گوناگوں صورتیں ہیں۔ ایک بالکل واضح بات یہ ہے کہ زمین پر آسمان نہیں گرتا، خدا نے روک رکھا ہے یہ بھی اس کی مہربانی اور رافت ہے ورنہ اگر گر پڑتا تو تمام دنیا تباہ ہو جاتی اور جب وقت مقرر پر آسمان ٹوٹے گا تو یقیناً دنیا تباہ ہو جائے گی۔

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ اللہ پیدا [illegible] ہے، وہی مارتا ہے، لامحالہ پھر وہی دوبارہ اٹھائے گا۔ بعثت [illegible] میں کیا استحالہ ہے۔

الحاصل تمام کائنات اور اس کے تغیرات خدا کی وحدانیت الوہیت اور ربوبیت کو ثابت کر رہے ہیں اور انہی تغیرات سے وجود قیامت کی حقانیت بھی ثابت ہوتی ہے۔

تحلیلِ اجزاء

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ تفسیری مطلب صاف ہے۔ ہم یہاں دو نکتے بیان کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) اَنْزَلَ ماضی کا صیغہ ہے۔ بظاہر تُصْبِحُ کی جگہ بھی اَصْبَحَتْ یعنی ماضی کا صیغہ ہونا چاہیئے تھا اور ترجمہ اس طرح ہونا چاہیئے تھا کہ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے اوپر سے پانی اتارا جس سے زمین سرسبز ہو گئی۔ مضارع کا صیغہ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ زمین کا مختلف متعدد اوقات میں سرسبز ہوتے رہنے کا بیان کرنا مقصود ہے۔ اگر تُصْبِحُ کی بجائے ماضی کا صیغہ استعمال کیا جاتا تو وہی ترجمہ ہوتا جو اوپر مذکور ہوا اور مطلب کا اظہار ہو سکتا۔ مقصد تو یہ ہے کہ ایک مرتبہ پانی برسنے کے بعد مختلف اوقات میں زمین سرسبز ہوتی رہتی ہے۔ برسات کا پانی پورے سال کام دیتا ہے۔

(۲) اَلَمْ تَرَ استفہامی شکل میں ہے اور جملہ استفہامیہ میں جو مضارع کا صیغہ آتا ہے قواعد عربی کے لحاظ سے اس کو منصوب پڑھنا جائز ہوتا ہے۔ حالانکہ تمام اہلِ قرأت کے نزدیک فَتُصْبِحُ میں نصب (زبر) پڑھنا جائز نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مضارع پر نصب (زبر) پڑھنے کا جواز اس لئے ہوتا ہے کہ وہاں لفظ اَنْ (جو فعل مضارع کو نصب (زبر) دیتا ہے) محذوف ہوتا ہے اور مضارع کا صیغہ پھر مضارع نہیں رہتا بلکہ خاص استقبال کا ہو جاتا ہے۔ اب اگر یہاں نصب پڑھنا جائز ہوگا تو فَتُصْبِحُ کا صیغہ محض استقبال کے لئے ہو جائے گا اور ترجمہ اس طرح ہو جائے گا کہ پانی کی وجہ سے زمین سرسبز ہو جائے گی۔ اس ترجمہ پر اصلی مقصد ادا نہ ہوگا۔ کیونکہ مقصد تو یہ ہے کہ زمین کا ہر وقت میں سرسبز ہوتے رہنا بیان کیا جائے اور ترجمۂ مذکورہ میں صرف استقبال کی تخصیص ہے۔

ایک شبہ: عربی میں حرف فاء تعقیب یعنی فوری بعدیت کو ظاہر کرتا ہے تو کیا بارش ہونے کے فوراً بعد زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔

ازالہ: تعقیب ہر چیز کی جدا نوعیت رکھتی ہے۔ مثلاً جَآءَ زَیْدٌ فَعَمْرٌو کا مطلب یہ ہے کہ پہلے زید آیا پھر عمرو آیا۔ عمرو اور زید کے درمیان کوئی نہیں آیا اور نہ عمرو کے آنے میں اتنی تاخیر ہوئی جس کو تاخیر کہا جا سکے۔ بارش ہونے کے بعد مدت مقررہ کے اندر خواہ دو دن میں یا تین چار روز میں سرسبزی پیدا ہو جاتی ہے

کسی دوسری چیز کی ضرورت پڑتی ہے نہ اتنی تاخیر ہوتی ہے جس کو سبزہ کی روئیدگی کے لئے تاخیر کہا جا سکے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ لطیف کے معنی ہیں لطف اور دقتِ نظر سے تدبیر کرنے والا۔ جن لوگوں نے لطیف کا ترجمہ مہربان کیا ہے وہ بظاہر غلط ہے۔ اگرچہ تاویل کے بعد اس کو صحیح کہا جا سکتا ہے۔ بارش برسا کر خدا تعالیٰ سبزی کس طرح پیدا کرتا ہے؟ اس کی پوری کیفیت کائنات ارضی و فضائی کی حقیقت پر بصیرت کی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتی ہے۔ تمام غور ہے کہ زمین ایک سی ہے، طبیعت ہر چیز کی ایک ہے، لیکن شکل، ہیئت، مزہ، بو اور خاصیت کے اعتبار سے ہر ٹکڑا دوسرے ٹکڑے سے جدا ہے، کوئی سخت ہے کوئی نرم، کوئی سرد کوئی گرم، کوئی قابلِ روئیدگی کوئی بنجر۔ جب زمین پر بخارات بشکلِ آبی برستے ہیں اور ایک ہی پانی سے مختلف قطعات ارضی سیراب ہوتے ہیں تو ہر ملک اور ہر بستی کی زمین بھی وہاں کے باشندوں اور جانوروں کے طبائع کے موافق سبزہ پیدا ہوتا ہے۔ کہیں گلزار پیدا ہوتا ہے کہیں جھاڑ جھنکاڑ، کہیں مفید پھل اور دل خوش کن پھول پیدا ہوتے ہیں، کہیں محض خبیث ناکارہ خار زار، غلہ، میوہ، پھول، بوٹیاں ہر دیس میں وہیں کے مناسب پیدا ہوتی ہیں۔ یوپی میں زعفران، بادام، ناریل وغیرہ نہیں پیدا ہوتے۔ یہ اللہ کی خفیہ کارسازی ہی ہے کہ ہر ملک والوں کے مناسب ان کو رزق، میوہ اور دوائیاں ملتی ہیں۔

سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ ۔ مافی الارض سے تمام موجودات ارضی مراد ہے۔ انسان کے فائدے کے لئے زمین کی تمام پیداوار بنائی گئی ہے۔ بعض جانوروں اور چیزوں سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ تو انسان کو معلوم ہے اور اکثر چیزوں کے فوائد نامعلوم ہیں، لیکن گہری نظر سے دیکھنے کے بعد انکشاف ہوتا ہے کہ زمین کی ہر چیز انسان کو فائدہ پہنچانے کے لئے کمربستہ ہے خواہ آدمی کو معلوم ہو یا نہ ہو۔ انسانی وجود اور بقا میں کائنات ارضی کا ذرہ ذرہ مددگار ہے۔ وجہ یہ ہے کہ زمین کی موجودات میں نوع انسانی تمام انواع سے اعلیٰ و بالا ہے اور یہ تسلیم کردہ قاعدہ ہے کہ نوع عالی کے اندر تمام انواع سافلہ و متوسطہ باعتبار اپنی حیثیت کے داخل ہیں۔ مثلاً جنگل کے جس قدر جانور ہیں وہ اپنی نوعی حیثیت کچھ بھی رکھتے ہوں، مگر حیوانیت کے لحاظ سے انسانی حیوانیت کے تحت ہی ہیں۔ اسی طرح ہر قسم کا درخت نوعی خصوصیات کے لحاظ سے اگرچہ جدا حیثیت رکھتا ہے، مگر نمو کے اعتبار سے انسانی نمو سے ادنیٰ درجہ پر ہے۔ غرض زمین کے اندر جو کچھ ہے وہ انسان کا خادم اور اس کے بقا کا ذریعہ ہے اور یہ اللہ کا احسانِ عظیم ہے کہ اس نے بغیر انسانی کوشش کے تمام ارضی کائنات کو آدمی کی خدمت کے لئے سرگرم عمل کر رکھا ہے۔ اس فقرہ میں دو باتیں اور بھی بتانی مقصود ہیں:۔ (۱) جب کل کائنات ارضی انسان کی خادم ہے تو ان میں تصرف کرنا جائز ہے، مگر ہر طرح کا تصرف نہیں کیا جا سکتا نہ خادم کو اس کے غیر مناسب کام پر مجبور کرنا جائز ہو سکتا ہے۔ کھانے کی چیز سے سواری کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ لباس سے خوراک کے فوائد نہیں حاصل ہو سکتے، اس لئے مناسب ہے کہ موجودات سے کام لینے میں انسان غور و فکر عقل، دانائی بصیرت اور شائستگی و تہذیب کو کام میں لائے۔ حرام حلال مفید مضر اور اچھے برے کی تمیز کرے۔ اگر زہر کا استعمال بھی کرنا ہو تو مناسب تدبیر کے ساتھ کرے۔ اللہ نے کام میں لانے کا جو طریقہ مقرر فرمایا ہے اسی طریقے سے استعمال کرے اور جس طریقہ استعمال سے منع کیا ہے اس سے باز رہے۔ بصورت اوّل آدمی فرماں بردار، شائستہ، مہذب اور عقل مند کہلائے گا اور خلاف ورزی کی صورت میں محض جانور، نالائق، وحشی، بیہودہ اور غیر مہذب جیسے الفاظ کا مستحق ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ قانون فطرت کے مطابق چلے۔ اگر نیچر کی خلاف ورزی کرے گا تو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچے گا۔ (۲) جب زمین اور زمین کی کل موجودات انسان کی خادم ہے تو انتہائی افسوس ہے اُن لوگوں کی حالت پر جو اپنے خادموں کے پرستار بنے ہوئے ہیں۔ پتھروں، درختوں، دریاؤں اور پہاڑوں کو اپنا معبود مسجود بناتے ہیں اور خلاقِ کل کی بجائے ان ادنیٰ خدمت گاروں کے سامنے ڈنڈوت کرتے اور سرِ نیاز جھکاتے ہیں۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔

اِلَّا بِاِذْنِهٖ یعنی بقا اور فنا دونوں میں اللہ کی طرف احتیاج ہے۔ آسمان کو پیدا کر کے بصورت موجودہ روک رکھنا اور زمین پر نہ گرنے دینا یہ کام بھی اللہ ہی کا ہے اور جس نے روک رکھا ہے اسی کے قبضہ میں گرا دینا بھی ہے۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ یہ حالت عام انسانوں کی ہے۔ عموماً انسان کوتاہ فہم اور ناشکرے واقع ہوئے ہیں۔ اپنی پیدائش، اسبابِ پیدائش، بقائے اسباب، بقائے زندگی اور اسبابِ زندگی پر غور نہیں کرتے۔ ذرا سی مصیبت پر بیہودہ کلمات زبان سے نکال بیٹھتے ہیں۔ کوئی اپنے کو بدقسمت [illegible] ہے کوئی مصیبت زدہ اور یہ نہیں سوچتا کہ اللہ کی کس قدر مخلوق اس کی زندگی کو باقی رکھنے کے لئے سرگرم عمل ہے اور کن کن خفیہ ذرائع و اسباب کو کام میں لا کر خدا نے اس کی زندگی کے ڈورے کو جاری رکھا ہے۔ اگر غذا و لباس کے معمولی عارضی اور ظاہری ذرائع محسوس نہ بھی ہوتے ہوں! ور کبھی کسی وقت کھانا نہ ملتا ہو تب بھی غور کرنا لازم ہے کہ جس وقت بھی غذا ملتی ہے وہ کیسی لطیف و دقیق تدبیروں سے ملتی ہے کہاں پیدا ہوتی ہے، کس طرح پیدا ہوتی ہے، کہاں سے آتی ہے اور کس طرح آتی ہے اور پھر قعرِ شکم میں پہنچ کر کس طرح پکتی ہے اور کس طرح تمام اعضاء کو تقسیم کی جاتی ہے اور پھر کس طرح اعضاء میں نشو و نما ہوتا اور قوت پہنچتی ہے۔ اس کے علاوہ سانس لینے کے لئے ہوا کہاں سے آتی ہے، کیسے پھیپھڑوں میں پہنچ کر قلب کو تازہ رکھتی ہے اور کس طور پر خون کو صاف کرتی اور بدن کو بدرقۂ حیات پہنچاتی ہے۔ عام انسا

ان تمام امور پر غور کرنے سے قاصر ہے، مگر بعض روشن بصیرت والے غور بھی کرتے ہیں اور ہر دکھ سکھ میں اللہ کا شکر بجا لاتے ہیں اور کسی وقت اپنے کو بدقسمت نہیں کہتے۔ آیت میں عام لوگوں کا بیان ہے، بلند مراتب رکھنے والے اہل ایمان کا تذکرہ نہیں۔ وہ بہرحال مستثنیٰ ہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ الانسان میں الف لام جنسی ہے استغراقی نہیں ہے، اس لئے آیت میں مخلص اہل ایمان داخل ہی نہیں ہیں۔

مقصود بیان

ہوسکتا ہے کہ آسمان سے پانی برسا کر زمین کو سرسبز کرنے سے اس طرف لطیف اشارہ ہو کہ جب پروردگار عالم مُردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکنی چاہتا ہے تو اپنی رحمت سے اپنے احکام نازل فرماتا ہے۔ جن لوگوں کے دلوں میں فطری صلاحیت و استعداد ہوتی ہے وہ اُن کا اثر قبول کرتے اور ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتے ہیں، اُن کو معرفتِ الٰہیہ نصیب ہو جاتی ہے، لیکن جو محروم ازلی ہیں جن کے دلوں کی زمین شور اور بنجر ہے یا پتھروں کی طرح سخت ہے ان پر فیضانِ رحمت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جس طرح وہ پہلے خشک اور گیاہ تھی ویسی ہی باقی رہتی ہے۔ اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کی ہدایات اور اللہ کی کتابوں کے فرامین، اُن شور اور سخت دلوں پر کوئی اثر نہیں کرتے۔ یہ تو سادہ لوح اور بے بصیرت لوگوں کی حالت ہوتی ہے جن کو گمراہ یا غوی کہا جا سکتا ہے باقی جو لوگ گمراہ اور غوی ہیں جن کے دلوں کی سرزمین میں عفونت اور گندگی بھری ہے اُن پر جب فیضانِ رحمت ہوتا ہے اور وہ اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایات سُنتے ہیں تو ضد، عناد اور کجروی ان کے اندر سے مزید بُو پیدا کر دیتی ہے۔ وہ معارضہ، مکابرہ اور مجادلہ کرنے لگتے ہیں، اہل حق کے استیصال کے درپے ہو جاتے ہیں، نورِ الٰہی کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں اور احکام خداوندی کو مٹانے کی کوششوں میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ پانی ایک ہی ہوتا ہے، لیکن زمین کے اختلاف کی وجہ سے اثرات مختلف پیدا ہوتے ہیں۔ کتابِ الٰہی کی ہدایت ایک ہی ہوتی ہے، پیغمبرِ برحق پیام ایک ہی پہنچاتا ہے، مگر دلوں کی استعداد کے تفاوت سے کہیں معرفت و صداقت کے خوشبودار پھول اور لذیذ حسین پھل نمودار ہوتے ہیں اور کہیں خبث باطن اور عناد و تعصب کے معرفت رساں خارزار۔ یہ اپنی اپنی قابلیت اور اپنا اپنا حصہ ہے۔ آیت لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔ صاف بتا رہی ہے کہ عالم کے ذرہ ذرہ کی حرکات اور چپے چپے کا انقلاب قدرت کے ہاتھ میں ہے اور سب کچھ اللہ کی مشیت سے ہوتا ہے۔ پس بے وقوف ہیں وہ لوگ جو اپنے آپ کو اور اپنی تدبیروں کو یا کسی پیر فقیر غنی ولی کو مختارِ مطلق اور متصرف حقیقی جانتے ہیں، لیکن ان سے بھی زیادہ بیوقوف ہیں وہ لوگ جو تمام انواع عالم کو ایک مرتبہ پر جانتے ہیں اور پتھروں کی طرح اپنے کو مجبور مطلق سمجھے ہوئے ہیں اُن کی ہدایت کی نظر بھی اندھی ہے۔ پہاڑوں کے پتھروں، ریگستان کے ذرّوں، باغوں کے درختوں، سمندروں کے قطروں اور خشکی و تری کے زندہ جانوروں میں بڑا فرق ہے۔ پھر دوسری جاندار اور نامی مخلوق سے انسان کا امتیاز ان کو کیوں نظر نہیں آتا۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ درختوں کا نمو اپنی جگہ پر قائم رہتے ہوئے ہوتا ہے، خدا تعالیٰ اُن کی جگہ پر ان کو روزی پہنچاتا ہے کیونکہ ان کو اپنی جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ طلبِ رزق کے لئے جانے کی اُس نے قدرت نہیں دی، لیکن جانوروں کو حس اور ارادی حرکت کی طاقت دی ہے، اس لئے حصول روزی کے لئے کوشش اور تگ و دو بھی ان کو سکھا دی ہے۔ ایک جگہ پڑے پڑے درختوں کی طرح رزق حاصل کرنا ان کے لئے ناممکن ہے۔ کسی لنجے اپاہج جانور کا ذکر اس سے جدا ہے۔ پھر بے وقوف انسان کیسے کیسے سمجھ گیا کہ وہ بھی پتھروں کی طرح مجبور محض ہے اور احکام شرعیہ کا مکلف نہیں ہو سکتا۔ باوجودیکہ خدا نے اس کو تمام کائنات سے زیادہ طاقت و عقل مرحمت کی ہے اور مکلف ہونے کے اسباب فراہم کر دیئے ہیں۔ پوری آیات میں ربوبیت عامہ کو دکھلا کر الوہیت کو ثابت کیا ہے اور الوہیت کو وحدانیت کے ثبوت کا ذریعہ قرار دیا ہے اور آخر میں خلق و فنا کی قدرت دکھا کر حشر جسمانی ثابت کیا ہے۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ط اِنَّكَ لَعَلٰى

(اے نبی) ہر اُمت کا ایک عبادت کا طریقہ ہم نے مقرر کر دیا ہے جس پر وہ چلتے ہیں لہٰذا اُن کو چاہیئے کہ اس امر میں تم سے جھگڑا نہ کریں اور تم اپنے رب کی طرف بلائے جاؤ بلاشبہ

هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ○ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْ

تم سیدھے راستے پر قائم ہو ۔ اور اگر وہ لوگ تم سے جھگڑا کریں تو کہہ دو اللہ خوب جانتا ہے جو تم کر رہے ہو ۔ قیامت کے دن تمہاری اختلافی باتوں کا

مَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ○ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ط

تمہارے آپس میں اللہ فیصلہ کر دے گا ۔ کیا تم کو نہیں معلوم کہ جو کچھ آسمان و زمین میں ہے اللہ اس کو یقیناً جانتا ہے

إِنَّ ذَٰلِكَ فِي كِتَابٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ○

یہ (سب کچھ) کتاب میں ہے بلاشبہ اللہ پر یہ آسان ہے

تفسیر شریعت اسلامیہ کے اصول اور ضوابط کلیہ مشرکوں کے تعامل خود ساختہ اصول سے بالکل مختلف تھے۔ رہے احکام و جزئیات تو ان میں بھی اس قدر کثیر تفاوت تھا کہ اگر تباین کہا جائے تو بیجا نہیں۔ البتہ اسرائیلی شریعتوں سے اصول کے اعتبار سے اس شریعت کو کوئی اختلاف نہ تھا صرف فروع اور بعض احکام میں تفاوت زمانہ کے تفاوت کے پیش نظر تھا، مگر مشرکین اپنی صداقت کے مدعی تھے اور آباؤ اجداد کے تعامل کو ثبوت میں پیش کر دیتے تھے۔ دوسری جانب اہل کتاب دین الٰہی پر ہونے کے دعوے دار تھے اور اسلامی احکام کو غلط کہتے تھے۔ بعض اوقات مناظرہ و بحث تک نوبت پہنچتی تھی، لیکن بحث سے کوئی نتیجہ نہ نکلتا تھا۔ کیونکہ طلب حق کے لئے اہل کتاب بحث ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی حقانیت کا اثبات اور احکام اسلامیہ کا ابطال اُن کے پیش نظر ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں مناظرہ مناظرہ نہیں ہوتا بلکہ نزاع اور مجادلہ بن جاتا ہے۔ ایسے مکابرات کی بندش کے لئے آیات مذکورہ کو نازل فرما کر صراحت کر دی کہ ہر امت، اور ہر گروہ کا طریقۂ عمل جُدا جُدا ہے۔ ہر قوم کا راستہ جُدا ہے (یعنی ہر زمانہ میں ہر قوم کے لئے جدا جدا شریعت نازل فرمائی گئی ہے اور الگ الگ نبی آئے ہیں اور انہوں نے اپنی اپنی قوم کی راہ نمائی کی ہے۔ اب یہ زمانہ محمد رسول اللہ ﷺ کا ہے، اُن کی شریعت پر عمل کرنے کا ہے، اُن کے لائے ہوئے قوانین و احکام کو ماننے کا ہے، اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا ہے، جھگڑا کرنے کی کون سی بات ہے) اس لئے ان لوگوں کو جھگڑا نہ کرنا چاہیئے۔ آپ اپنے کام سے غافل نہ ہوں، دعوت حق دیئے جائیں، مناظرہ کی ضرورت نہیں، آپ بالکل واضح ہدایت اور سیدھے راستے پر ہیں (یعنی مناظرہ طلب حق اور تحقیق صداقت کے لئے ہوتا ہے اور جب اسلام کی حقانیت کا انکشاف کسی مزید تحقیق کا محتاج نہیں تو پھر مناظرہ سے کیا فائدہ) اس کے بعد اگر یہ لوگ مجادلہ کریں اور جھگڑے اٹھائیں تو بجائے مناظرہ کرنے کے ان سے صاف کہدیجئے کہ ہمارا تمہارا فیصلہ تو قیامت کے دن خدا کے سامنے ہوگا۔ وہ عالم کے ذرّے ذرّے سے واقف ہے۔ تمہارے اعمال کو کامل طور پر جانتا ہے، تمہارا کوئی عمل اُس سے مخفی نہیں بلکہ وہ تمہارے تمام کرتوت اور عالم کے کُل حرکات و سکنات تو اس کے علم ازلی میں پہلے سے موجود ہیں (یعنی یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ قیامت کے دن ہماری زندگی کے کل اعمال کیسے سامنے لائے جائیں گے اور حق و باطل کا فیصلہ کس طرح کیا جائے گا) لہٰذا اعمال کے موافق حق و باطل کا فیصلہ خدا کے نزدیک کوئی دشوار کام نہیں۔

تحلیل اجزاء لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا۔ ابن عباسؓ کا قول بروایت عطاء اس طرح منقول ہے کہ منسک سے مراد ہے شریعت اور راستہ۔ اسی قول کو پیش نظر رکھ کر ہم نے تفسیری حل کے ذیل میں مطلب بیان کیا ہے جو کسی خاص مورد نزول کا محتاج نہیں بلکہ عام مطلب ہے اور حضور اقدسؐ کے زمانے پر ہی موقوف نہیں بلکہ ہر زمانے میں بطور عموم حکم جاری ہے اور طالبان حق کو چھوڑ کر دوسرے اہل نزاع اور جھگڑالو لوگوں کے مقابلے سے اعراض کرنے کی عام ہدایت ہے، لیکن معالم اور سراج وغیرہ میں آیات کا ایک خاص سبب نزول بھی بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بدیل بن ورقاء، بشر بن سفیان، یزید بن خنیس اور اسی قسم کے دوسرے مشرکوں نے صحابہ سے کہا تھا یہ کیا بات ہے کہ جس جانور کو تم خود قتل (ذبح) کرتے ہو اس کو تو کھاتے ہو اور جس کو اللہ مارتا ہے (یعنی جو اپنی موت سے مرجاتا اور مُردار ہو جاتا ہے) اُس کو نہیں کھاتے؟ اس کے جواب میں آیات مذکورہ کا نزول ہوا۔ اس شان نزول کی صحت کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو آیت میں مَنسَكًا کے معنی طریقۂ ذبح کے ہوں گے۔ عکرمہ اور مجاہد کی روایت میں ابن عباس سے یہی معنی منقول ہیں۔ اس تقدیر پر خلاصۂ مطلب یہ ہوگا کہ ہر گروہ کا طریقۂ ذبح جُدا جُدا مقرر ہے (یعنی کوئی بغیر تکبیر پڑھے ذبح کرتا ہے، کوئی تکبیر پڑھ کر، کوئی گردن بالکل جُدا کر دیتا ہے، کوئی جُڑی رکھتا ہے، کوئی گردن مروڑ کر مارتا ہے کوئی رگیں کاٹ کر اور یہ لوگ اپنی موت سے مرے ہوئے کو بھی ذبح جانتے ہیں) اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے، اپنا اپنا طریقہ ہے اور ہر ایک اپنے طریقے کی حقانیت کا مدعی ہے، مگر طریقۂ حق کون سا ہے؟ اس کا فیصلہ قیامت کے دن خدا کے سامنے ہو جائے گا مجادلہ کی ضرورت نہیں۔ تم دعوت اسلام دیئے جاؤ کیونکہ تم راہ مستقیم اور طریق حق پر ہو (یعنی کافروں کے جھگڑوں سے تمہارا طریقہ یا طریقہ کی حقانیت بدل نہیں سکتی۔ اس سے آگے مطلب صاف ہے۔

فَلَا يُنَازِعُنَّكَ الفاظ کے لحاظ سے یہ نہی کفار کو ہے اور ممانعت کا رُخ بھی انہی کی طرف ہے۔ کیونکہ جدال و نزاع انہی کی طرف سے تھا وہی باطل پر تھے، مگر درحقیقت فائدہ نہی اسلام کے حق میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جانشین علماء کو باطل پرست کافروں سے جھگڑا کرنے اور نزاع پیدا کرنے کی ممانعت کرنی مقصود ہے۔ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ۔ مناظرہ و مکابرہ کی مذکورہ بالا ممانعت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تبلیغ اسلام چھوڑ دی جائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جھگڑالو لوگوں سے مباحثہ نہ کرو، اپنے کام میں مشغول رہو، اسلام کی تبلیغ کئے جاؤ۔ کیونکہ جب راہ ہدایت اور طریقہ مستقیم واضح ہو گیا اور یہ امر یقین کی حد تک پہنچ گیا کہ اسلام ہی

طریق حق ہے تو پھر اس کی طرف دوسروں کو نہ بلانا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ ۔ اوپر کی آیت میں بیان کیا تھا کہ قیامت کے دن تمہارے باہمی اختلاف کا فیصلہ ہوگا کیونکہ خدا کو تمہارے تمام اعمال معلوم ہیں، انہی کے مطابق فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اس سے بعض بے بصیرت لوگوں کو شبہ ہو سکتا تھا کہ جزئی جزئی کا علم اور ہر فعل و حرکت کی واقفیت خدا کو کیسے ہے کس طرح ممکن ہے کہ خدا کو ہماری کل تفصیلی حالت کا علم ہو۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ اللہ کو کائنات ارضی و سماوی کی ہر حالت کا مفصل علم ہے بلکہ سب ہر چیز کی تفصیل لوح محفوظ یعنی خدا کے ازلی علم میں موجود ہے اسکو مزید تفصیل کی ضرورت ہی نہیں اسلئے محاسبۂ اعمال اور ان کے مطابق قیامت کے دن فیصلہ کرنا اس کے لئے آسان ہے۔

تنبیہ: بعض صحیح احادیث میں آتا ہے کہ سب سے پہلے اللہ نے قلم کو پیدا کیا اور اس سے فرمایا لکھ۔ قلم نے عرض کیا پروردگار کیا لکھوں؟ فرمایا لکھ جو کچھ ہونے والا ہے۔ سب قلم نے لکھ دیا۔ جفّ القلم بما هو كائن۔

مسلم کی صحیح حدیث میں آیا ہے کہ زمین و آسمان کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے اللہ نے مقدرات خلق کو تقدیر فرما دیا تھا اس وقت اس کا عرش پانی پر تھا۔ دونوں اور اسی قسم کی دوسری حدیثیں حقیقی معانی پر محمول نہیں ہیں بلکہ پاک نبی کے الفاظ گرامی ہیں جن کی حقیقت وہی سمجھے جو نبی کی طرح علم و ادراک رکھتا ہو اور جو کہ رسول پاک کی طرح معرفت کسی کو نہیں حاصل ہو سکتی، اس لئے ایسے رموز کے حقائق کا انکشاف بھی نہیں ہو سکتا۔ حضور نے جو کچھ فرمایا وہ بطور استعارہ فرمایا جس سے اللہ کے علم ازلی کی ہمہ گیری اور قدامت ظاہر کرنی مقصود ہے۔ لوح و قلم کی حقیقت کیا ہے۔ قلم کا لکھنا کیسا ہے؟ یہ سب رموز و اسرار ہیں جن کا انکشاف اُمت کے لئے ناممکن ہے۔ ہم توفیہ پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

مقصود بیان اہل جدال سے مباحثہ اور جھگڑا کرنے کی عام ممانعت، لیکن یاد رکھو کہ مناظرہ کی ممانعت نہیں۔ آیت میں صرف نزاع اور جدال کی ممانعت ہے۔ دعوت الی الحق کا حکم۔ اللہ کے علم ازلی کی ہمہ گیری کی صراحت اور اس بات کی ہدایت کی طرف لطیف اشارہ کہ جہاں تک ممکن ہو نیک عمل کرو اور راہ ہدایت پر چلو۔ کیونکہ ذرہ ذرہ کا محاسبہ درپیش ہوگا وغیرہ۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا

یہ لوگ اللہ کے علاوہ ایسی چیز کو پوجتے ہیں جس کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں اُتاری اور نہ ان کو اس کی کچھ تحقیق ہے اور ان

لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ۝ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِىْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ

ظالموں کا کوئی مددگار نہیں اور جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو (اے محمد) تم ان کافروں کے چہروں پر ناخوشی

كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ؕ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ؕ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ

کے آثار دیکھو گے ان سے بن پڑے تو ان لوگوں پر حملہ کر بیٹھیں جو ہماری آیتیں پڑھتے ہیں کہہ دو کیا میں اس سے زیادہ ناگوار چیز

مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ اَلنَّارُ ؕ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ

ع ۱۲

تم کو بتاؤں وہ آگ ہے کافروں سے اللہ نے اس کا وعدہ کر رکھا ہے وہ کیسا بُرا ٹھکانا ہے اے لوگو! ایک مثال

مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا

بیان کی جاتی ہے تم اُس کو غور سے سُن لو اللہ کے سوا جن کی تم پوجا کرتے ہو سب جمع ہو کر بھی ایک مکھی نہیں پیدا کر سکتے

لَهٗ ۭ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـــًٔـا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ۭ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝

اور اگر مکھی اُن سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو اس کو چھڑا نہیں سکتے طالب و مطلوب دونوں کمزور ہیں

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ رُسُلًا وَّ

انہوں نے اللہ کی اُس کے مرتبہ کے موافق عظمت نہ کی بلاشبہ اللہ قوی و غالب ہے فرشتوں اور انسانوں میں سے اللہ پیغام پہنچانے والے

مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

منتخب کر لیتا ہے بلاشبہ اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے جو کچھ اُن کے آگے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے وہ (سب کو) جانتا ہے اللہ ہی کے پاس سب کام لوٹائے جائیں گے

تفسیر دنیا میں ہمیشہ سے دو گروہ چلے آئے ہیں۔ ایک گروہ اہلِ کتاب کا دوسرا مشرکوں کا۔ اہلِ کتاب جب تک صاحبِ کتاب کی ہدایت پر چلے، خالص موحّد اور ہدایت یافتہ رہے جب نبی کے احکام اور فرامین کی خلاف ورزی شروع کی گمراہی کے غار میں گر پڑے۔ شروع میں یہودی راہِ حق پر تھے، حضرت موسیٰ کے پیرو تھے، توریت ان کے لئے دستورِ عمل تھا۔ جب زمانہ دراز ہوا اور نبی کی وفات کو مدت ہوگئی تو گمراہی پھیلتی گئی۔ اسی طرح عیسائی ابتدائی دور میں حق پرست تھے، انجیل پر اُن کا ایمان تھا، شاہراہِ عمل واضح تھا، لیکن کچھ مدت کے بعد گمراہ ہوگئے اور اگر زردشت کو نبی اور ژند کو الہامی کتاب مان لیا جائے تو یہ بھی اپنے زمانہ میں حق پر تھے اور فرشتوں کو کارخانۂ قدرت کا ادنیٰ خادم جانتے تھے یا اگر صابی فرقہ کو قوم ابراہیمی تسلیم کر لیا جائے تو ان کی صداقت بھی مسلّمہ تھی اور یہ ستاروں کو مظہر انوار اور ناقابلِ پرستش مخلوق سمجھتے تھے، لیکن تمام اہلِ کتاب رفتہ رفتہ مشرکین کے گروہ میں عقیدۃً اور عملاً داخل ہوگئے۔ اگرچہ زبانوں سے توحید کا اقرار اور شرک کا انکار کرتے تھے، مگر حالت اُنکی بالکل مشرکوں کی ایسی ہوگئی۔ وہ بھی خدا کو واحد مگر معبودوں کو متعدد اور بُتوں کو شفیع جانتے تھے یہ بھی خدا کو واحد مگر عزیز، مسیح اور ملائکہ کو معبود و مسجود سمجھنے اور اپنا کارساز و شفیع ماننے لگے۔ توحید توحید نہ رہی، شرک آمیز ہوگئی۔ جس طرح مشرکوں کا شرک توحید آمیز تھا اسی طرح ان کی توحید شرک آمیز ہوگئی اور جس طرح مشرکوں کے پاس اپنے عقیدہ و عمل کو ثابت کرنے کے لئے سوائے تعاملِ اسلاف کے اور کوئی عقلی نقلی دلیل نہ تھی اسی طرح ان اہلِ کتاب کے پاس سوائے پارینہ آمد و شد کے کوئی خدا کا حکم یا عقلی فیصلہ نہ تھا۔ خلاصہ یہ کہ سبھوں کی حالت ایک جیسی ہوگئی۔ آخر میں اسلام آیا اور نہایت شان و شوکت کے ساتھ آیا، کھرا کھوٹا، حق و باطل جدا جدا کر کے دکھا دیا، توحید میں سے شرک کو الگ چھانٹ کر نکال لیا، باطل معبودوں کی کمزوری اور بے بسی ظاہر کی۔ بُت پرستوں سے تو فرمایا دیکھو یہ تمہارے دیوتا کس قدر کمزور اور ناتواں ہیں کہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے بلکہ یہ تو ایسے بے بس اور بےکس ہیں کہ جو مٹھائی ان پر چڑھائی جاتی ہے اس میں سے مکھیاں اپنی خوراک لے کر اور اُس سے چھین کر جب اُڑ جاتی ہیں تو یہ اُن سے چھین بھی نہیں سکتے۔ ایسے ناتواں زار مخلوق کی پرستش سراسر حماقت ہے۔ معبودِ برحق کے مرتبہ کا اندازہ تم کو قطعاً نہیں، تم نہیں جانتے کہ معبود ہونے کے لئے کس قدر طاقت کی ضرورت ہے اور کن کن اوصافِ کمالیہ کا موجود ہونا معبود بننے کے لئے لازم ہے۔ غور کرو اور اس بُت پرستی سے باز آؤ۔ رہے اہلِ کتاب تو وہ اپنے زعم میں اپنے پاس دلیل بھی رکھتے تھے۔ ان کے معبود اپنے زمانہ میں مقرب بارگاہِ الٰہی اور برگزیدہ انسان بھی گزرے تھے یا جلیل القدر فرشتے تھے۔ بہرحال ان کے معبودوں میں قدرت و کمال کی کچھ جھلک تھی، اس لئے وہ آستینیں چڑھا کر میدان میں آتے تھے اور اپنے معبودوں کو مظہر الوہیت کہتے تھے۔ ان کی تردید کے لئے فرمایا کہ تمہارے معبود خدا نہ تھے، دیوتا نہ تھے، مظہرِ الوہیت نہ تھے (البتہ) خدا کے برگزیدہ اور منتخب کردہ پیامبر تھے۔ کوئی فرشتہ تھا، کوئی انسان، مگر اس برگزیدگی اور فضیلتِ رسالت کے باوجود ان کی پوری حالت کا خدا کو علم تھا (یعنی وہ عالمِ کامل نہ تھے) اور خدا ہی کی طرف تمام کاموں کا رجوع ہوگا (یعنی اُن کی طرف نہ ہوگا نہ سوائے خدا کے ان میں سے کوئی تم سے بازپرس کرنے والا ہوگا۔ لہٰذا وہ کسی طرح قابلِ پرستش نہیں قرار پا سکتے۔ عدمِ علم اور رسالت خود احتیاج کی علامتیں ہیں اور محتاج معبود ہو نہیں سکتا۔

تحلیلِ اجزاء مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ کسی عقیدہ یا عمل کی صداقت و حقانیت ثابت کرنے کے لئے دو ہی ذرائع ہیں نقلی یا عقلی۔ یا تو خدا تعالیٰ اپنے نبی کی معرفت اپنے کلام میں کسی عقیدہ و عمل کا حکم دے دے یا عقلِ سلیم اور فطرتِ خالصہ اُس کی حقانیت کی شہادت دے، لیکن غیراللہ کی پرستش کی اجازت تو کسی طرح ثابت نہیں۔ اول الذکر (اجازتِ الٰہی) کی نفی کی طرف مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا میں اشارہ فرمایا

اور مؤخرالذکر (فطرت سلیمہ اور عقل روشن کی اجازت) کی نفی کی طرف وَمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ سے ایماء فرمایا۔ خلاصہ یہ کہ شرک فی العبادت کی اجازت تو نہ خدا نے اپنی کسی کتاب میں دی، نہ عقل سلیم اس کی شہادت دیتی ہے۔ رہی یہ بات کہ اگرچہ عقل و نقل سوائے خدا کے کسی کی پرستش کی اجازت نہیں دیتی، مگر یہ معبودانِ (باطل) وقت پڑے اپنے پرستاروں کی مدد کریں گے یا اُن سے کسی شفاعت کی اُمید ہو سکتی ہے تو یہ بھی غلط ہے۔

وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ۔ کیونکہ ایسی زبردست بیجا حرکت کرنے والوں کا کوئی بھی مددگار نہیں ہو سکتا (ان باطل معبودوں میں سے کسی میں اتنی صلاحیت ہی نہ ہوگی کہ وہ مدد کر سکیں یا اگر شفاعت کی قوت ہوگی بھی تو وہ خود بیزار ہو رہے گے مدد کرنی تو بجائے خود رہی)

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ۔ اس آیت میں بدباطن خبیث النفس کافروں کی حالت کا بیان ہے۔ اہل عناد و باطل پرست جاہل آدمیوں کی یہ خاصیت ہی ہوتی ہے کہ جب اُن کی جہالت پر اُن کو متنبہ کیا جائے اور ان کے عقیدہ و عمل کی غلطی بیان کی جائے تو چونکہ ان کے پاس اپنے عقیدہ و عمل کا ثبوت پیش کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہوتی، اس لئے جہالت پر اُتر آتے ہیں اور اہل حق سے ہاتھا پائی کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہی حالت کفار مکہ کی بھی تھی جس کا اظہار آیت مذکورہ میں کیا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ ـ بُت پرستوں کی جہالت و حماقت ظاہر کرنے کے لئے مشرکین میں سے اُس طبقے کو جو قدرے ذی ہوش ہے خطاب فرماتے ہوئے بطور تمثیل ایک دلیل بیان فرماتا ہے اور گوش ہوش سے سُننے کی تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کہ :-

اِنَّ الَّذِيْنَ ـ جن بُتوں کی تم پرستش کرتے ہو اگر وہ سب بھی جمع ہو کر اپنی پوری قوت صرف کریں تب بھی ایک مکھی نہیں بنا سکتے یعنی مکھی کا ڈھانچہ بنا کر اُس میں جان نہیں ڈال سکتے۔ غرض یہ کہ جب مکھی ایسی حقیر چیز پیدا کرنے کی ان میں طاقت نہیں تو پھر کسی کو نفع نقصان پہنچانے کی طاقت بدرجۂ اولیٰ نہیں۔ کسی زبردست طاقت کے مقابلہ میں اپنے پرستاروں کی امداد کرنی تو بہت بڑی طاقت کو چاہتی ہے، مکھی تو بہت ہی ذلیل اور کمزور چیز ہے اُس کی تخلیق تو چنداں دشوار بھی نہیں ہے۔ جب اُن میں اس قدر کمزوری ہے تو اپنے پرستاروں کی مدد کس طرح کر سکیں گے۔ اَلَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ سے بعض لوگوں کے نزدیک شیاطین مراد ہیں اور بعض کے نزدیک کافروں کے سردار مگر صحیح یہ ہے کہ بُت مراد ہیں۔

وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ الخ۔ بتوں کی کمزوری ظاہر کرنے کے لئے یہ دوسری دلیل ہے اور پہلی دلیل سے زیادہ بتوں کی کمزوری ظاہر کر رہی ہے کہ مکھیوں کا مقابلہ بھی نہیں کر سکتے اور ان سے اپنے کو محفوظ بھی نہیں رکھ سکتے۔ خطیب نے ابن عباس رضی کا قول نقل کیا ہے کہ مشرکین بُتوں پر زعفران کا پالش کرتے اور ان کے سروں پر شہد مل کر دروازے بند کر دیتے تھے، لیکن کیواڑوں کے سوراخوں سے مکھیاں گھُس کر شہد چاٹ جاتی تھیں۔ ابن زید نے کہا کہ بُتوں کو نہلا کر، جواہر کے زیور پہنا کر قسم قسم کی خوشبوئیں اُن پر ملتے تھے، مگر مکھیاں گھُس کر خوشبوئیں چاٹ جاتیں اور نجاست سے آلودہ کر دیتی تھیں۔

ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ـ سُدی اور ضحاک کہتے ہیں کہ طالب سے مراد عابد اور مطلوب سے مراد معبود یعنی بُت ہے۔ ابن عباس کا ایک قول ہے کہ طالب سے مراد مکھی اور مطلوب سے مراد بُت ہے۔ مکھی اس چیز پر بیٹھتی ہے جو بُتوں پر چڑھائی جاتی ہے۔ ابن عباس کا دوسرا قول ہے کہ طالب سے مراد بُت اور مطلوب سے مراد مکھی۔ یہی قول قوی ہے۔ ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ـ یعنی بے عقل بُت پرستوں نے اللہ کی الوہیت کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ اُن کو نہیں معلوم کہ معبود میں کن صفات و خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ان کو الوہیت اور ضروریات الوہیت کا صحیح اندازہ ہوتا تو وہ بتوں کو کیوں پُوجتے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ اس فقرہ میں معیار الوہیت بیان کیا ہے۔ اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ مستحق الوہیت وہ ذات ہے جو قادر اور غالب ہو اور چونکہ کمال قدرت و غلبہ سوائے خدا کے کسی میں نہیں، اس لئے اس کے سوا کوئی معبود ہونے کے سزاوار بھی نہیں۔

اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ اس آیت میں اہل کتاب کی خرافات کا رد ہے۔ اہل کتاب عزیر اور مسیح وغیرہ کو مظہر الوہیت قرار دیتے اور ان کی تصویروں کے سامنے سر نیاز جھکاتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ یہ خدا کے برگزیدہ پیامبر تھے، مظہر الوہیت یا الٰہ نہ تھے۔ اس سے آگے اپنی الوہیت کی دو صفتیں بیان کی ہیں۔ ایک تو کمال علمی اور دوسرے مرجع کل ہونا۔ چونکہ یہ دونوں صفتیں خدا ہی میں موجود ہیں کسی پیغمبر یا فرشتہ میں نہیں، اس لئے وہی مستحق الوہیت بھی ہے۔

شیخ جلال محلی نے ذکر کیا ہے کہ قریش کی ایک جماعت جس کا سردار ولید بن مغیرہ تھا، کہا تھا کہ ہم میں سے ایک یتیم لڑکے پر قرآن نازل ہوا ہے۔ تعجب ہے۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی اور صراحت فرما دی کہ یہ تو انتخاب الٰہی ہے جس کو چاہتا ہے اپنی رسالت کے لئے چن لیتا ہے۔

یہ سبب نزول سوائے شیخ جلال محلی کے اور کسی نے نہیں بیان کیا اور نہ سیاق و سباق اس کی اجازت دیتا ہے۔ اگرچہ شانِ نزول کے مطابق اس آیت کا مطلب ہو جاتا ہے، صحیح وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کر دیا کہ عام اہل کتاب کی خرافات رد کرنا اس آیت سے مقصود ہے۔ واللہ اعلم۔

مقصود بیان

کفار کی جہالت کا اظہار اور اس امر کی طرف لطیف اشارہ کہ جو مسئلہ نقلی و عقلی دلیل سے ثابت نہ ہو اس کو ماننا حماقت ہے۔ ہٹ دھرم کفار کے جاہلانہ سلوک کا بیان کہ ان کو کلمۂ حق سننا بھی گوارا نہیں۔ اس کے بعد کافروں کے لئے عذاب دوزخ کی صراحت، مشرکوں کے عقیدہ کو باطل کرنے کے لئے بتوں کی انتہائی کمزوری ظاہر کر کے الوہیت اصنام کا استیصال۔ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا کہہ کر معیارِ الوہیت کا بیان کہ خدا میں قوت اور غلبہ ہونا لازم ہے۔ جس میں قوت کاملہ اور غلبہ تامہ کی صلاحیت نہ ہو وہ معبود ہونے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ سے اہل کتاب کے عقیدہ کی تردید۔ اس سے ایک بات یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ نبوت و رسالت کسبی نہیں محض موہبت الٰہیہ ہے وہ جس کو چاہتا ہے نبوت کے تاج سے سرفراز فرماتا ہے۔ چونکہ اس آیت میں صرف انسانوں اور فرشتوں کی پیامبری کا تذکرہ ہے۔ جنات کی نبوت کا کوئی ذکر نہیں، اس لئے بعض لوگوں نے یہاں سے استخراج کیا ہے کہ جنات نبی نہیں ہوئے نہ اپنی قوم کی اصلاح کر سکے نہ دوسروں کی ہدایت کے لئے۔ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ سے اہل کتاب کے مقابلے میں الوہیت کے خصوصی اوصاف کا اظہار اور اس امر کی طرف اشارہ کہ آخرت میں جزا سزا کا جس سے واسطہ ہوگا اور جس کے سامنے فیصلے کے لئے جانا ہوگا وہی خدا ہے۔

السجدۃ

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۩ السجدۃ

ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو اور بھلائی کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ

اور اللہ کی راہ میں کوشش کرو جیسا کہ کوشش کرنے کا حق ہے اس نے تم کو انتخاب کیا اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی اپنے باپ ابراہیم کے دین پر قائم

اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ

رہو اسی نے پہلے سے تمہارا نام مسلمان رکھا اور اس نے قرآن میں بھی (تمہارا نام مسلمان رکھا) تاکہ رسول تم پر گواہ بنیں اور تم (دیگر) لوگوں پر گواہ بنو

عَلَى النَّاسِ ښ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ع ۱۰ / ۱۷

پس باقاعدہ نماز پڑھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ (کے احکام) کو مضبوط پکڑے رہو وہی تمہارا کارساز ہے سو کیسا اچھا کارساز اور کیسا اچھا مددگار ہے

تفسیر

جب اوپر کی آیات میں اہل کتاب اور مشرکین کے عقائد و اعمال کا بطلان واضح کر دیا تو اب روئے سخن مسلمانوں کی طرف کیا اور امت اسلامیہ کی برتری ظاہر کرتے ہوئے مندرجۂ ذیل امور کی ہدایت فرمائی (۱) ملتِ ابراہیمی پر چلو یعنی توحید خالص اختیار کرو، شرک کی آمیزش نہ کرو۔ (۲) نمازیں پڑھو (۳) زکوٰۃ دو (۴) نمازیں وہ تنظیم کے قاعدے اختیار کرو جو خدا کے سوا کسی کے لئے جائز نہیں یعنی رکوع اور سجود کرو (۵) ہر کار خیر کرو (۶) اللہ کی راہ میں کامل جہاد کرو (۷) ہر کام میں اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بات یہ ہے کہ خالص توحید کے بعد فرائض انسانیہ کی ادائیگی ہر مسلمان کا فرض قطعی ہے۔ فرائض انسانیہ عام ہیں کہ ان کا تعلق خالص حق اللہ سے ہو یا حق العباد سے۔ سب سے مقدم اسلامی فریضہ یہ ہے کہ روح میں روشنی اور پاکیزگی پیدا کی جائے، اپنے خالق کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے، ذکر الٰہی میں تمام دنیا کو فراموش کر دیا جائے، آپس کی تنظیم قائم کی جائے، چھوٹے بڑے، امیر غریب، حاکم محکوم، آقا غلام، شریف رذیل غرض ہر قسم کا امتیاز دور کر کے مساوات کا مظاہرہ کیا جائے۔ جس قوم میں روح مساوات پیدا نہ ہو اس کو کبھی عروج و ترقی حاصل نہیں ہو سکتی جس مذہب میں روحانیت اور باطنی پاکیزگی نہ ہو وہ الہامی مذہب نہیں ہو سکتا، ان تمام امور کا مجموعہ نماز ہے، اس لئے سب سے پہلے نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ دنیا سے بدی کا وجود مٹانا ضروری ہے، لیکن شر کو مٹانے کی کیا تدبیر ہے، کیا فقط وعظ و نصیحت کرنا اور خود ارتکاب ممنوعات کرنا شر کو مٹا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ جو سیئات کی بہترین شکل یہ ہے کہ انسان خود نمونۂ عمل بن جائے اور ہر کار خیر کا خود پابند ہو، اس لئے ہر نیک کام کرنے کا حکم دیا۔ پھر راہ خدا میں جہاد کرنا یعنی کافروں اور منکروں کے مقابلے میں صف آرا ہونا، ہر قسم کے مصائب اور حوادث کو مذہب کے سر سے دور کر دینے کی کوشش کرنی اور صرف اللہ کا بول بالا اور اسلام کا جھنڈا اونچا کر لے

کے لئے جانیں قربان کر دینی کسی زندہ مذہب کی زندگی قائم رکھنے کے لئے بہت ہی ضروری ہے، اس لئے جہاد کا حکم دیا۔ پھر جب تک عام افراد قوم روزی کی طرف سے مطمئن اور مستغنی نہ ہوں، مالی حالت درست نہ ہو، دولت و افلاس کا تفرقہ مٹ نہ جائے، مالی برتری کا امتیاز دُور نہ ہو جائے، امراء فقیروں کی ہمدردی نہ کریں اور اصحاب ثروت مالی قربانیاں نہ کریں اُس وقت تک امن عام، اطمینان دہین، عزت و ترقی اور مکمل عروج حاصل نہیں ہو سکتا۔ عدل قائم ہونا ناممکن ہے، لُوٹ مار اور سفاکی کی بیخ کنی محال ہے، مال کی محبت دلوں سے دُور ہونی دشوار ہے۔ ان امور کی تعلیم کے لئے زکوٰۃ کا حکم دیا، لیکن ان تمام امور کے باوجود اسلام زندگی کی رُوح سمجھنی چاہتا ہے اور دنیا و مافیہا کا حقیقی خیال دلوں سے دور کرنے کا خواستگار ہے۔ اسلام کے نزدیک مادی طاقت، اقتصادی قوت، قلبی یاد، آپس کی ہمدردی، محبت و اخوت اور غریبوں کی امداد بے کار نہیں بلکہ اسلام اور مدل کے ضروری اجزاء ہیں، مگر ان کے ساتھ ساتھ ان میں سے کوئی چیز مؤثر حقیقی اور فعالِ مطلق نہیں۔ کیونکہ عالم کے ہر ذرّہ کی حرکت مشیت کے تابع ہے، کوئی سبب نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا جب تک مسبّب کی مدد اس کو حاصل نہ ہو، اس لئے آخر میں تمام اسباب ترقی کی روح کی تعلیم کی اور فرمایا اللہ پر بھروسہ رکھو وہی تمہارا کارساز اور مددگار ہے۔ آیات کے درمیان چند دیگر امور کی بھی وضاحت فرمائی ہے جس کی تشریح ہم تحلیل اجزاء کے ذیل میں کریں گے۔

تحلیلِ اجزاء

اِرۡكَعُوۡا وَاسۡجُدُوۡا ۔ خطیب نے بحوالہ ابن عباسؓ بیان کیا ہے کہ آغازِ اسلام میں نماز میں اگر رکوع کرتے تو سجدہ نہ کرتے اور سجدہ کرتے تو رکوع نہ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی اور رکوع و سجود دونوں کا حکم دیا۔ اکثر مفسرین کا قول ہے کہ رکوع کو سجدہ کے ساتھ ملا کر بیان کرنے سے یہاں پوری نماز مراد ہے۔ مطلب یہ کہ نماز پڑھا کرو۔ رکوع اور سجدہ چونکہ نماز کے خصوصی ارکان تھے اور ایسے افعال تھے جن کا عمل سوا خدا کے کسی کے لئے جائز نہیں، اس لئے قیام و قعود کو ذکر نہ کیا۔ صرف رکوع و سجود کو ذکر کیا۔ اس قول کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ سورۂ حج مدنی ہے اور مدینہ کی آغاز سکونت سے ہی نماز مع رکوع و سجود کے مشروع تھی۔ البتہ وجوبِ صلوٰۃ سورۂ والنجم سے پہلے معراج میں ہو گیا تھا۔ امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کے نزدیک سجدہ سے مراد سجدۂ صلوٰۃ ہے، سجدۂ تلاوت نہیں۔ البتہ سورۂ ص میں سجدۂ تلاوت ضرور ہے۔ امام شافعی، احمد، اسحاق اور عبداللہ بن مبارک کے نزدیک اگرچہ سجدۂ صلوٰۃ ہی مراد ہے، مگر سجدۂ تلاوت بھی اس جگہ مسنون ہے۔ سورۂ ص میں سجدۂ تلاوت نہیں ہے۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔ عقبہ بن عامر کی روایت کردہ مرفوع حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ حج میں دو سجدے ہیں، مگر ترمذی نے اس حدیث کی تضعیف کی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَاعۡبُدُوۡا رَبَّكُمۡ ۔ اوپر کے فقرے میں صرف نماز کا حکم تھا۔ اس فقرے میں عام عبادت کا حکم ہے۔ خواہ روزہ ہو، تہلیل، تکبیر، تسبیح تحمید ہو یا کچھ اور ہو۔

وَافۡعَلُوا الۡخَيۡرَ ۔ خیر میں تمام واجبات فرائض سنن اور مستحبات شامل ہیں بعض نے صرف مستحبات مراد لئے ہیں۔ اوّل قول اولیٰ ہے۔

لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۔ یعنی مذکورۂ بالا امور خیر کا ادا کرنا بغیر اُمید فلاح کے مفید نہیں۔ رسماً اور عادۃً کرنے سے کوئی نتیجہ نہیں، دکھاوٹ بے سُود ہے، ہر کارِ خیر کرنے کے وقت اُمید فلاح رکھنی چاہیئے اور فلاح سے مراد ہے فلاح آخرت خواہ اس کو جنت کہو یا نجات یا دیدار الٰہی یا کوئی اور نعمت۔

جَاهِدُوۡا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۔ اکثر مفسرین کے نزدیک اس جہاد سے مراد ہے اعدائے اسلام سے جنگ کرنا اور ان کے مقابلے میں تلوار اٹھانی اور حَقَّ جِهَادِهٖ کا یہ مطلب یہ ہے کہ اپنی انتہائی کوشش اور طاقت صرف کرو (ابن کثیر) بعض لوگوں نے حَقَّ جِهَادِهٖ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ خالصاً لوجہ اللہ جہاد کرو، دنیوی طمع شامل نہ ہو۔ بعض نے کہا ایسا جہاد کرو جس میں اللہ اور سردار لشکر کی مخالفت نہ ہو۔ بعض کے نزدیک حَقَّ جِهَادِهٖ سے ایسا جہاد کرنا مراد ہے جس میں کسی کی ملامت کا خوف نہ ہو۔ عبداللہ بن مبارک نے فرمایا کہ جہاد سے جہادِ نفس مراد ہے یعنی نفس کو ناجائز خواہشوں سے روکنا اسی کو جہادِ اکبر کہا گیا ہے اور یہی حق الجہاد ہے۔ فضالہ بن عبید انصاری کی روایت ہے حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا مجاہد وہ ہے جس نے طاعتِ الٰہی میں اپنے نفس سے جہاد کیا۔ رواہ ابن حبان والبیہقی فی شعب الایمان والترمذی فی جامعہ وقال حدیث صحیح۔ اہلِ تحقیق کہتے ہیں تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔ جہادِ نفس بھی جہاد ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا پہلے ہم لوگ یوں بھی تو پڑھا کرتے تھے جَاهِدُوۡا فِى اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ فِى الزَّمَانِ كَمَا جَاهَدۡتُمۡ فِىۡ اَوَّلِهٖ ۔ یعنی جس طرح تم نے آغاز دور میں راہِ خدا میں کامل طور پر کوشش کی اسی طرح آخر دور میں بھی کوشش کرنا۔ حضرت عبدالرحمٰن نے فرمایا جی ہاں، مگر امیر المؤمنین ایسا کب ہوگا؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ اُس وقت ہوگا جب بنی اُمیہ کی بادشاہت اور بنی مغیرہ کی وزارت ہوگی (حضرت عمرؓ نے یہ الفاظ بطور کشف و الہام فرمائے تھے) اس اثر سے ثابت ہوتا ہے کہ عام جہاد مراد ہے۔ کیونکہ بنی اُمیہ مسلمان بادشاہ تھے اُن کے خلاف جہادِ سیف تو کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ البتہ منہیات و ممنوعات سے

ان کو زبانی روکنا اور احیائے اسلام کی کوشش مسلمانوں کا فرض تھا اور یہی فریضہ اہلِ حق نے ادا کیا۔

هُوَ اجْتَبٰىكُمْ۔ یہ اہلِ اسلام کے لئے نہ مٹنے والا امتیاز و نشان ہے۔ تمام اُمتوں پر خدا تعالیٰ نے اُمتِ محمدیہ کو شرف عطا فرمایا ہے۔ دوسری آیت میں آیا ہے جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔ یعنی خدا تعالیٰ نے تم کو امت عادلہ قرار دیا ہے۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ۔ اُم المومنین حضرت عائشہ کی مرفوع حدیث ہے کہ بجواب استفسار حضور اقدس ؐ نے حرج کے معنی تنگی بیان فرمائے تھے۔ دین میں تنگی نہ ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر قسم کی نفسانی خواہش پوری کرنا اور نفس کو مطلق العنان چھوڑ دینا اسلام میں جائز ہے۔ ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہ ؓ نے حضرت ابن عباس سے فرمایا تھا ہم پر دین میں کوئی تنگی نہیں خواہ ہم چوری کریں یا زنا کریں۔ ابن عباس ؓ نے فرمایا تنگی کیوں نہیں۔ ان افعال کی اجازت تو ہو نہیں سکتی) ابوہریرہ ؓ نے آیت مذکورہ تلاوت فرما کر دریافت کیا پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ ابن عباس ؓ نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو گناہ اور سختی کا معاہدہ بنی اسرائیل پر عائد تھا وہ اللہ نے تم پر سے اٹھا دیا ہے۔ الحاصل مطلب یہ ہے کہ دوسری شریعتوں کی طرح خدا نے اسلام کو سخت اور تنگ نہیں کیا۔ دوسری آیت میں آیا ہے۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ جب حضور اقدس ؐ نے حضرت معاذ ؓ اور حضرت ابوموسیٰ ؓ کو یمن روانہ کیا تھا تو فرمایا تھا آسانی کرو سختی مت ڈالیو، بشارت دیجو نفرت مت دلائیو۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے حضور ؐ نے فرمایا بعثت مع الحنيفية السمحة مجھے سیدھا اور سہل دین دے کر بھیجا گیا ہے۔ شریعت یہود کے احکام بہت سخت تھے۔ مثلاً بغیر قتل کے توبہ قبول نہ ہوتی تھی۔ رات کو جو گناہ آدمی کرتا تھا صبح کو اس کے دروازے پر لکھا ہوتا تھا۔ اگر نجاست کپڑے کو لگ جائے تو پانی سے پاک نہ ہوتی تھی اُتنے کپڑے کو کاٹنا پڑتا تھا۔ بدھ مذہب میں بنیاسی سنیاسی بننے اور دنیا کو ترک کر کے سادھو اختیار کرنے کا حکم ہے۔ ہندو کے مذہب میں تو کھلی ہوئی سختی ہے۔ غیر کے ہاتھ لگانے سے دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے اپنے ہاتھ سے چوکا کرنا پڑتا ہے۔ بغیر غسل کئے کھانا ممنوع ہے، ہزاروں پاک چیزیں حرام کر دی گئی ہیں۔ موت زلیت اور سفر حضر میں بہت تنگی ہے، مگر اسلام ان تمام تنگیوں سے پاک ہے۔ کوئی گناہ ایسا نہیں جس کی معافی توبہ واستغفار یا کفارہ و قصاص سے نہ ہو جائے، اوقاتِ عبادت میں سہولت، مسلمانوں کے لئے تمام پاک زمین عبادت گاہ ہے۔ پانی نہ ملے یا غسل و وضو نہ کر سکے تو تیمم کی اجازت ہے۔ نماز میں کھڑا ہونا ممکن نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھ لے، بیٹھنا ممکن نہ ہو تو لیٹ جائے۔ سفر میں عبادت کی تخفیف کر دی گئی، روزہ نہ رکھنا جائز کر دیا گیا۔ بیمار کے لئے تو اور بھی سہولت کر دی گئی۔ بوقت اضطرار حرام چیزوں کو کھانا بھی جائز کر دیا گیا۔ ہر مہذب لباس پہننے کی اجازت، ہر پاک چیز کھانے کی اجازت، تعداد ازواج، کمائی کے طریقوں میں وسعت، تعامل اور رسم و رواج میں وسعت غرض ہر قسم کی سہولت ہی سہولت ہے۔

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ۔ عرب کے اکثر باشندے اپنے مذہب کو ابراہیمی مذہب کہتے تھے۔ یہودی اپنی شریعت کو شریعت ابراہیمی قرار دیتے تھے۔ عیسائی الگ ملتِ ابراہیمی پر ہونے کے دعوے دار تھے اور کعبہ کی رکھوالی تو اس معاملہ میں سب سے پیش پیش تھی، مگر حقیقت میں کوئی بھی دین ابراہیمی پر نہ تھا بلکہ شریعتِ اسلامیہ شریعتِ ابراہیمیہ کے موافق تھی۔ اصول میں تو تمام الہامی مذاہب متفق ہیں، مگر شریعت اسلامیہ اکثر جزئیات اور فروعی احکام میں بھی ابراہیمی ملت کے موافق ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ تم ملتِ ابراہیمی پر قائم رہو جس طرح خدا نے ملتِ ابراہیم کو سہل بنایا تھا اسی طرح تمہاری شریعت کو بھی آسان کر دیا۔ یہ خطاب عرب کو ہے کیونکہ حضرت ابراہیم تمام عرب مستعربہ کے جد امجد تھے یا خطاب عام اُمت اسلامیہ کو ہے کیونکہ حضرت ابراہیم سب مسلمانوں کے روحانی باپ تھے۔

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ۔ هُوَ کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹتی ہے یعنی گزشتہ آسمانی کتابوں میں اور اس قرآن میں اللہ نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ ابن عباس، مجاہد، قتادہ، عطاء، ضحاک، سدی، مقاتل اور ابن مبارک سب نے یہی تفسیر کی ہے۔ ابن کثیر و ابن جریر وغیرہ مفسرین نے اسی کو پسند کیا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے حضور ؐ نے ارشاد فرمایا اللہ نے تمہارا نام مسلمین، مومنین اور عباد اللہ رکھا ہے۔ رواہ البخاری فی التاریخ والنسائی والترمذی والبیہقی وقال الترمذی حدیث حسن صحیح۔ بعض مفسرین نے حضرت ابراہیم کی طرف ضمیر راجع کی ہے یعنی ابراہیم ؑ نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے، مگر یہ غلط ہے کیونکہ اس کے آگے وَفِيْ هٰذَا۔ کا لفظ ہے۔ حضرت ابراہیم نے اُمت محمدیہ کا نام مسلم رکھا ہو تو کوئی حرج نہیں مگر اس قرآن میں انہوں نے اس اُمت کا نام مسلم کیسے رکھ دیا۔ قرآن خدا کی کتاب ہے، کلام اللہ رسول پاک ؐ پر نازل ہوا حضرت ابراہیم پر نہیں اترا پھر کلام اللہ میں اور اس کلام اللہ میں جو محمد رسول اللہ ؐ پر نازل ہوا حضرت ابراہیم کیسے مسلم نام رکھ سکتے تھے۔

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ۔ یعنی جب خدا نے تمہارا نام مسلم رکھا تو تمہارے اندر ضرور وصف اسلام متحقق ہے کیونکہ خدا عالم الغیب

ہے اس کے تسمیہ میں غلطی نہیں ہو سکتی اور مسلم کا لفظ حقیقی اوصاف کو ظاہر کر رہا ہے۔ یعنی جان مال اہل و عیال اور تمام لوازم حیات اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے پیش کرنے والا۔ تو ظاہر ہے کہ ایسا ہی شخص عادل اور صالح شہادت ہو سکتا ہے۔ پس تم قیامت کے دن تمام اُمتوں پر گواہ ہو گے اور رسول اللہ صلعم پر اسلام کی گواہی دیں گے۔ کعب احبار نے فرمایا تھا اس امت کو تین خصوصیات عطا ہوئی ہیں جو کسی اُمت کو عطا نہیں ہوئیں۔ تمام لوگوں پر شاہد ہونا، دین میں تنگی نہ ہونا اور دعا قبول ہونے کا حتمی وعدہ کرنا۔ ابن زید کا قول ہے کہ اس اُمت کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے کسی اُمت کا نام مسلمین مؤمنین نہیں رکھا۔

فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ۔ اسلام سے سب سے زیادہ قریبی تعلق رکھنے والی چیز چونکہ نماز ہے، اس لئے دوبارہ تاکیدی حکم دیا۔

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ۔ اس سے شرعی زکوٰۃ مراد ہے یا تمام خیرات و صدقات مراد ہیں خواہ وجوبی ہوں یا استحبابی۔

وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ۔ یہ روح احکام ہے۔ نماز، زکوٰۃ، جہاد، فعل حسنات، ترک سیئات سب کی روح اعتصام باللہ ہے۔ اگر اللہ پر بھروسہ نہ ہو اور عبادت پر غرہ ہو جائے یا تنظیم، اخوت و مساوات، اور مادی طاقتوں پر اعتماد کلی ہو جائے اور ظاہری اسباب کو مؤثر حقیقی سمجھ لے تو روح اسلام ان تمام اعمال سے نکل جاتی ہے اور کوئی نیکی اسلامی نیکی نہیں رہتی اور نہ قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ صورۃً عبادت جہاد، زکوٰۃ اور کار خیر ہو گا، مگر مغز خیر اُس کے اندر نہ ہو گا۔ آخر میں اعتصام باللہ کا حکم دینے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اندھا دھند توکل کرنا اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا اور فراہمی اسباب کی کوشش نہ کرنی اور شرعی عبادات و معاملات سے منہ موڑنا اور پھر اس کے باوجود نجاتِ آخرت اور سعادت دنیا کا اُمیدوار ہونا قباحت ہے۔

برتوکل زانوئے اشتر بہ بند کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ۔ یہ مسلمانوں کو واقعی تسکین و تشفی ہے۔ جب تک کسی شخص کو اپنی کامیابی کا پورا یقین نہ ہو اور اپنے حریف کو مغلوب کرنے کا ناقابل تردد اطمینان نہ ہو اس کو کامیابی حاصل ہونی دشوار ہے، لیکن ایسا ناقابلِ زوال یقین کیسے ہو۔ اہل دنیا کو اپنی جسمانی مالی اجتماعی اور جنگی طاقت پر اعتماد ہوتا ہے۔ مگر مسلمانوں کا نقطۂ نظر بہت بلند ہے۔ وہ جسمانی طاقت کو بیماری کے ادنیٰ حملہ سے زائل ہونے والا، مالی قوت کو ایک گردش زمانہ سے برباد ہو جانے والا، اجتماعی شوکت کو ایک ادنیٰ پروپیگنڈے سے منتشر ہونے والا اور جنگی طاقت کو ادنیٰ مقابلے سے تباہ ہو جانے والا جانتا ہے، اس کا اعتماد کسی مادی طاقت پر نہیں ہوتا بلکہ روح کائنات پر ہوتا ہے، ناصر غیبی پر ہوتا ہے اور معین مطلق پر ہوتا ہے۔ **فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ**۔ ایک حدیث میں آتا ہے جس کا تو متولی ہے وہ کبھی ذلیل نہیں ہوتا اور جس سے تجھے عداوت ہے اُس کو کبھی عزت نہیں مل سکتی۔

مقصودِ بیان

رکوع و سجود کا خصوصی حکم دینے سے اس طرف لطیف اشارہ کہ یہ نماز کے خصوصی ارکان ہیں یعنی رکوع و سجود عبادت کے خاص اجزاء ہیں۔ اسی لئے غیر اللہ کے لئے ہر قسم کا سجدہ حرام ہے۔ ایمان کے بعد سب سے پہلے نماز کا حکم دینے سے بھی نماز کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ رَبَّكُمْ کے لفظ سے استحقاق معبودیت ظاہر کرنا مقصود ہے کیونکہ خدا رب ہے اُس کے سوا کوئی رب نہیں، اس لئے وہی مستحق پرستش بھی ہے۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مسلمان کی ہر عبادت کار خیر اور زندگی کے ہر عمل میں اُمید فلاح کا شمول لازم ہے۔ بغیر اُمید کے محض رسمی طور پر عبادت کرنی بے سود ہے۔ حَقَّ جِهَادِهٖ کا لفظ بتا رہا ہے کہ بقدر امکان اسلام کی مدد کرنی لازم ہے۔ خدا تعالیٰ ناقابلِ برداشت تکلیف نہیں دیتا۔ انتہائی کوشش کے بعد جو کچھ کر سکتے ہو۔ اِجْتَبٰىكُمْ کے لفظ سے یہ تعلیم دینی غرض ہے کہ جب تم کو دیگر اقوام پر برتری عطا کی گئی ہے تو تم کو عقائد و اعمال اور اقوال میں بھی وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جو موجب برتری ہو۔ وہ طریقہ کون سا ہے؟ طریقۂ ابراہیمی ہے۔ طریقۂ ابراہیمی کیا تھا؟ طریقۂ اسلام تھا۔ یعنی اہل و عیال، مال و منال، جاہ و جلال اور جان عزیز راہ خدا میں اسلام کا بول بالا کرنے کے لئے وقف کر دو اور مسلم بن کر اس قابل ہو جاؤ کہ خدا کے سامنے دوسری قوموں کے متعلق شہادت دے سکو۔ شاہد کا عادل ہونا ضروری ہے، اس لئے گفتار، رفتار، اور اطوار میں تم عدل اختیار کرو۔ آخر میں اللہ پر بھروسہ رکھنے کی تعلیم ہے اور نصرت و کامرانی کا پختہ وعدہ ہے۔

سترہواں پارہ ختم ہوا۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بیان السبحان

کا

پارہ نمبر ۱۸

قَدْ اَفْلَحَ

فاضلِ اجل حضرت مولانا سید عبدالدائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں ۱۳۵۹ھ سے باقساط ہر ماہ شائع ہو رہی ہے

عطاء الرحمٰن صدیقی مالک و رسیم بکڈپو دیوبند

نے برائے اشاعت معارف القرآن

محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند (یوپی) سے شائع کیا

ضروری اعلان

دین حق کی تبلیغ واشاعت کیلئے عظیم الشان پروگرام

اظہار تشکر

ہم خدائے برتر و توانا اور اپنے مخلص معاونین کے صمیم قلب سے ممنون و مشکور ہیں اور ساتھ ہی مسرت کے ساتھ یہ اعلان کر رہے ہیں کہ تفسیر بیان السبحان بحمد للہ تکمیل کو پہونچی جو کہ ۴۲ جزو پر مشتمل ہے اگر مخلص معاونین حضرات اپنا تعاون جاری نہ فرماتے تو اس پریشان کن دور میں شاید ہمارے ارادے حوصلہ شکن ہوجاتے کاغذ کی گرانی بحرانی حد تک بڑھ چکی ہے اور اس پر بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ لہذا فوراً ھدیہ میں اضافہ کرنا پڑا -/5 روپیہ۔ امید ہے کہ ہمارے معاونین حضرات ہماری مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے ہمیں درگذر فرمائیں گے۔

چند گذارشات

(۱) مکمل سیٹ تفسیر بیان السبحان کا مجلد -/230 روپیہ جو کہ ۴۲ جزدوں میں ہے پچاس فیصدی کمیشن کاٹ کر -/15 روپیہ ہے علاوہ محصول ڈاک (۲) مکمل سیٹ تفسیر بیان السبحان غیر مجلد -/210 روپیہ جو کہ ۴۲ جزوں میں ہے۔ لیکن یہ قیمت علاوہ محصول ڈاک کے ہے۔ چار جلدوں میں مکمل ہوا ہے ایک جزو کا ہدیہ یعنی فی جزو -/5 روپیہ ہے لیکن ممبران و تاجران کو اس پر پچاس فیصدی کمیشن کاٹ دیا جائے گا۔ یعنی فی جز کمیشن کاٹ کر 2/50 روپیہ فی پارہ دیا جائے گا۔ لیکن علاوہ محصول ڈاک کے یعنی ایک پارہ کی وی، پی جو جاوے گی وہ -/4 روپئے میں بھیجی جاوے گی۔ مع محصول ڈاک کے دو پاروں کی وی، پی -/8 روپیہ اور تین پاروں کی وی، پی 11/25 روپیہ اور چار پاروں کی وی، پی -/14 روپیہ اور پانچ پاروں کی وی، پی 16/50 روپیہ میں بھیجی جائے گی۔ یہ غیر مجلد کی قیمت ہے اور مع محصول ڈاک کے ہے اور اب مجلد کی قیمت یعنی ۱۰ پاروں کی وی، پی -/33 روپئے مع محصول ڈاک کے بھیجی جائے گی۔ مجلد پانچ پاروں کی وی، پی -/19 کی ہوگی۔ بیس پاروں تک ایک ایک ہی پارہ ہے اور اکیس ۲۱ سے انتیس ۲۹ پاروں تک ہر پارے کے دو جزو ہیں اور تیسواں پارہ کے چار جزو ہیں اسلئے ۲۶ تا ۳۰ ۱۴ جزوں کی جلد بنائی جائے گی۔ آخر کی جلد کا 37/50 روپیہ ہے۔

نوٹ

بحمد للہ فتاویٰ عالمگیری کے ۲۷ جزو طبع ہو چکے ہیں۔ ان کا ہدیہ بھی حسب بالا ہوگا۔ جو رعایت ممبران و تاجران کو مندرجہ بالا دی گئی وہ پیش کی جائے گی۔ فی جزو فتاویٰ عالمگیری رحمہ کا -/5 روپیہ کمیشن کاٹ کر ممبران و تاجران کو پچاس فیصدی کمیشن کاٹ کر 2/50 روپیہ علاوہ محصول ڈاک کے دیا جائے گا۔ وی، پی چار روپے کی مع محصول ڈاک کے جاوے گی دو پاروں کی وی، پی -/8 روپئے تین کی 11/25 روپیہ چار جزو کی -/14 روپیہ اور پانچ جزو کی 16/50 روپیہ غیر مجلد کی قیمت اور مجلد دس پاروں کی -/33 روپیہ مع محصول ڈاک کے بھیجی جاوے گی۔

اٹھارواں پارہ

سُوْرَةُ الْمُؤْمِنُوْنَ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ مِائَةٌ وَثَمَانَ عَشْرَةَ اٰيَةً وَسِتُّ رُكُوْعَاتٍ

سورۃ مومنون مکہ میں نازل ہوئی اس میں ایک سو اٹھارہ آیتیں اور چھ رکوع ہیں

اس سورت میں چھ رکوع ہیں۔ قراء بصرہ کے نزدیک ۱۱۹ ۔ اور قراء کوفہ کے نزدیک ۱۱۸ آیات ہیں۔ کلمات کی تعداد ۱۸۴۰ اور حروف کی تعداد ۴۸۰۲ ہے۔ قرطبی نے تصراحت کی ہے کہ یہ سورت بالاجماع مکی ہے۔ عبداللہ بن سائب کی روایت ہے کہ مکہ میں فجر کی نماز میں حضور اقدس ؐ نے سورۂ مومنون شروع کی۔ جب موسیٰ و ہارون یا (عیسیٰ) کے تذکرہ پر پہنچے تو سرکار دوعالم کو کچھ کھانسی آئی فوراً رکوع کردیا (رواہ البخاری والمسلم و ابوداؤد والترمذی وابن ماجہ وغیرہم)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ

بلاشبہ وہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو نماز میں خشوع کرنے والے ہیں اور جو بیہودہ باتوں

اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ

سے منہ موڑنے والے ہیں اور جو زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کو بچانے والے ہیں

اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ

سوائے اپنی بیبیوں اور باندیوں کے کیونکہ اس صورت میں ان پر ملامت نہیں ہاں جو لوگ اس کے علاوہ ہوس کریں گے

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ

وہ حد سے بڑھنے والے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی نگہداشت کرنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرنے

يُحَافِظُوْنَ ۘ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

والے ہیں یہی لوگ وارث ہونے والے ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے جس کے اندر وہ ہمیشہ رہیں گے

تفسیر سورۂ حج کے آخر میں فرمایا تھا کہ اے امتِ محمدیہ خدا نے تم کو برگزیدہ کیا ہے، تم ملتِ ابراہیمی پر ہو، اللہ ہی نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ تم کو حق ہے کہ جو

دنیا میں لوگوں کی نیکی بدی اور حق و باطل پر ہونے کی شہادت دو جس کو بالاتفاق تم اچھا کہو وہ اچھا اور جس کو برا کہو وہ برا ہے۔ جس کام کے صحیح ہونے پر بہ اعتبار اجماع ہو جائے وہ چیز صحیح اور جس چیز کے غلط ہونے پر اجماع ہو جائے وہ چیز غلط ہے اور تمہارے ہدایت یافتہ یا گمراہ ہونے کے شاہد تمہارے پیغمبر ہیں۔ تمہاری اچھائی برائی پیغمبر کی شہادت پر موقوف ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ گواہ جب تک عادل اور معتبر نہ ہو اس کی گواہی بیکار ہے۔ چنانچہ شہادت کے قابل اعتبار ہونے کے چند اصول کے متعلق اجمالی ہدایت بھی کر دی تھی اور فرما دیا تھا کہ نماز پابندی سے پڑھو، زکوٰۃ ادا کرو اور دین اسلام کو مضبوطی سے پکڑے رہو۔ اس سورت میں اصول حسنات کی تفصیلی تشریح فرمائی ہے اور تفصیل سے پہلے صراحت کر دی ہے کہ جو شخص ان اصول پر کاربند ہوگا وہ بلاشبہ فلاح یاب اور کامران ہوگا۔ اصول فلاح کیا ہیں؟ اس کی مفصل تفسیر تو ہم نمبروار تحلیل اجزا کے ذیل میں کریں گے۔ یہاں مختصر طور پر بتا دینا ضروری ہے کہ اس جگہ اصول سعادت سات ذکر کئے ہیں (۱) نماز میں خشوع کرنا (۲) بیہودہ باتوں سے پرہیز کرنا (۳) زکوٰۃ دینا (۴) زنا سے بچتے رہنا (۵) امانت میں خیانت نہ کرنا (۶) عہد کی نگہداشت کرنا (۷) نماز کو پابندی سے ادا کرنا۔ اصول سبعہ مذکورہ میں سے بعض تو اخلاق کی جڑ ہیں، بعض معاشرت کی اور چونکہ سیاست اسلام کے نقطۂ نظر کے موافق اخلاق و معاشرت سے ہی مبنی ہے کوئی مستقل چیز نہیں، اس لئے اس کا اصول جدا بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

تحلیل اجزاء

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ یعنی فلاح پانے اور سعادت حاصل کرنے کے لئے دو شرطیں ہیں۔ پہلی لازمی شرط تو ایمان ہے اور دوسری شرط اصول سبعہ کی پابندی ہے۔ جو اہل ایمان ارکان سبعہ کے پابند ہو گئے ان کو یقینی فلاح حاصل ہو گئی۔ لفظ قَدْ تحقیق کے لئے ہے اور اَفْلَحَ ماضی کا صیغہ ہے۔ جو تحقق اور وقوع پر دلالت کرتا ہے۔ غرض یہ کہ ایمان و یقین کے ساتھ ظاہری و باطنی صفات کا حصول بھی ضروری ہے۔ صحیح کی ایک روایت میں آتا ہے کہ کسی شخص نے حضرت عائشہ رضؓ سے حضور اقدس ﷺ کا خلق دریافت کیا (یعنی وہ خلق جس کی تعریف میں خدا تعالیٰ نے وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (فرمایا ہے) ام المومنین نے فرمایا تو قرآن پڑھتا ہے؟ پھر خود ہی آیت قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ سے یُحَافِظُوْنَ تک تلاوت کی اور فرمایا رسول اللہ کا خلق یہی تھا۔

اہل ایمان سے مراد وہ فرقہ ہے جو اللہ کو الوہیت و ربوبیت میں واحد جانتا ہو، اللہ کے تمام پیغمبروں اور کتابوں پر یقین رکھتا ہو، حشر و نشر جنت و دوزخ وغیرہ کو مانتا ہو، ملائکہ اور اسلام کے تمام بدیہی ارکان پر اس کا ایمان ہو۔ غرض علم مبدء و معاد اور عقیدہ کی ہر شاخ کی صحت کو یہ لفظ شامل ہے۔

فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ۔ خشوع کے کیا معنی ہیں اور یہ دل کا فعل ہے یا اعضائے ظاہری کا؟ اس کے متعلق صحابہ کے اقوال مختلف ہیں۔ قرآن پاک میں آیا ہے اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ۔ یعنی کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ اہل ایمان کے دل خدا کی یاد کے وقت نرم پڑ جائیں اور ان میں رقت پیدا ہو جائے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خشوع قلب کا فعل ہے۔ دوسری آیت میں آیا ہے۔ خَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ یعنی اللہ کے خوف سے سب کی آوازیں پست ہو گئیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خشوع ظاہری بیرونی اعضاء کا فعل ہے۔

حضرت علی رضؓ نے فرمایا خشوع دل کا خشوع ہے۔ ابراہیم نخعی وغیرہ علماء کا یہی قول ہے۔ ابن کثیر نے کہا کہ نماز میں خشوع اسی کو حاصل ہوگا جو نماز کے لئے اپنا دل خالی کر لے، تمام چیزوں سے دل کی توجہ ہٹا کر نماز کے لئے یکسو ہو جائے۔ ایسی حالت میں نماز اس کے لئے راحت اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگی۔ ابن عباس رضؓ نے فرمایا خٰشِعُوْنَ سے مراد ہیں خوف و سکون رکھنے والے۔ مجاہد، حسن بصری، قتادہ اور زہری وغیرہم کا یہی قول ہے۔ میرے نزدیک صحیح فیصلہ یہ ہے کہ خشوع کے معنی کا اختلاف مضاف الیہ کے اختلاف سے ہوتا ہے۔ خشوع دل کی صفت بھی ہے اور اعضاء خارجیہ کی بھی۔ اعضاء ظاہری میں خشوع پیدا ہونے کے معنی ہیں سکون تواضع فروتنی عاجزی اور اعتدال اور دل کے خشوع کے معنی ہیں اللہ کے خوف اس کی ہیبت سے رقیق ہو جانا۔ خشوع کی ابتدا دل سے ہوتی ہے۔ رقت اور اللہ کی عظمت و کبریائی کی ہیبت اول دل میں پیدا ہوتی ہے پھر اس کا اثر بیرونی اعضاء پر نمایاں ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ظاہری شکل فروتنی اور مسکینی کی بنائے اور دل میں رقت اور اللہ کا خوف نہ ہو تو یہ بے عقلی کی نقل ہوگی۔ حضرت علی رضؓ اور حضرت ابن عباس رضؓ کا بھی یہی مطلب ہے۔ حضرت ابن عباس رضؓ نے خشوع قلب کا ظاہری اثر بیان فرما دیا اور یہ یقینی ہے کہ بغیر مؤثر اور مبدء آثار کے صحیح اثر نمایاں نہیں ہو سکتا اور حضرت علی رضؓ نے مبدء خشوع کا ذکر کر دیا، لیکن بیرونی آثار کا بھی انکار نہیں کیا۔ چنانچہ ان حضرات کے مطلب کی انہی کے دوسرے اقوال میں تصریح آئی ہے۔ حضرت علی رضؓ نے فرمایا تھا خشوع قلب میں ہوتا ہے اور یہ بھی (خشوع ہے) کہ نماز میں ادھر ادھر التفات نہ کرو۔ ابن عباس رضؓ نے خاشعون کی تفسیر میں فرمایا کہ سکون کے ساتھ تذلل اختیار کرنے والے (اہل خشوع) ہیں یعنی سکون قلب کا فعل ہے اور تذلل اعضاء کا۔ دونوں باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بہت سی نمازیں صرف ایسی ہوتی ہیں کہ پڑھنے والوں کا حصہ ان سے صرف تکان اور تکلیف ملتی ہے یعنی ثواب نہیں ملتا۔ معاذ بن جبل رضؓ نے فرمایا نماز میں جو شخص دائیں بائیں کے آدمی کو پہچانے اس کی نماز کچھ نہیں ہے۔ حسن بصری نے فرمایا جس نماز میں قلب حاضر نہ ہو وہ عذاب کی طرف

زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ احادیث، آثار اور اقوال علماء سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں خشوع کرنے سے مراد ہے اللہ کے خوف سے ڈرنا معانی کا لحاظ رکھنا، توجہ کو یکسو کرنا، اللہ کو حاضر ناظر سمجھنا، اس کے آگے سرِ نیاز جھکانا، فروتنی اور عاجزی کرنا، ادھر اُدھر نہ دیکھنا، داڑھی یا کپڑوں وغیرہ سے مشغول نہ کھیلنا جو امور یکسوئی کو توڑنے والے ہوں یا ظاہری ادب کے خلاف ہوں ان سے کنارہ کش رہنا۔

تنبیہ فقہاء کا گروہ چونکہ ظاہری احکام کی تحقیق کرنے والا اور افعال جوارح سے بحث کرنے والا ہوتا ہے اور بیرونی شرائط واجبات اور مکروہات و ممنوعات کی تنقیح اس کے پیشِ نظر ہوتی ہے، اس لئے نماز کے شرائط میں اس گروہ نے خشوع قلب کو بیان نہیں کیا، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فقہاء کے نزدیک باعتبار شرع حضور قلب نماز میں ضروری نہیں، ہاں بحیثیت فقہ ضروری نہیں۔ اہلِ تصوف کی نظر ظاہر سے زیادہ باطن کی اصلاح کی طرف ہوتی ہے وہ جذبات نفس اور روحانیات کی درستگی کے زیادہ خواہشمند ہوتے ہیں، اس لئے انہوں نے خشوع قلب کو نماز کے لئے صراحۃً لازم قرار دیا ہے۔ لیکن ظاہری اعتدال ادب اور فروتنی کے ضروری ہونے کا انہوں نے بھی انکار نہیں کیا۔ اسی بنا پر شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی حنبلی کے نزدیک نماز کے ہر رکن میں حضورِ نیت شرط ہے۔ ابراہیم حنبلی نے اپنے رسالے میں اس کی صراحت کر دی ہے۔ حضرت علی رض کی نظر ظاہر سے زیادہ باطنی اصلاح کی طرف تھی، اس لئے آپ نے خشوع کی تفسیر خوف قلب اور ہیبت سے کی۔ حضرت ابن عباس رض فقہ کی طرف زیادہ مائل تھے، اس لئے آپ نے خشوع کی توضیح میں تذلل، عجز اور اعتدال کے الفاظ استعمال کئے، ورنہ دونوں بزرگوں کے نزدیک خشوع کے لئے قلبی اور ظاہری اصلاح ضروری ہے۔

هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ — ابن عباس رض کے نزدیک لغو سے مراد ہے شرک۔ حسن بصری کے نزدیک تمام معاصی۔ زجاج کے نزدیک ہر باطل لہو اور غیر محمود افعال و اعمال اس میں داخل ہیں۔ بعض اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ پہلی آیت میں حضورِ قلب اور یادِ الٰہی میں یکسوئی اختیار کرنے کی تعریف کی تھی۔ اس آیت میں بیہودہ اور ممنوعات چیزوں سے اجتناب کرنے کو بیان کیا۔ گویا پہلی آیت میں کرنے کی مدح تھی اور اس آیت میں نہ کرنے کی اور فعل و ترک ہی کی درستگی نفس پر بہت شاق ہوتی ہے۔ اسی کی صلاحیت درحقیقت قابلِ ستائش ہے۔

لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُونَ — زکوٰۃ سے مراد مالی زکوٰۃ ہے اور جانی زکوٰۃ بھی مراد ہو سکتی ہے، لیکن اصطلاحی زکوٰۃ چونکہ مدینہ میں ہجرت کے بعد فرض ہوئی اور آیت مکی ہے، اس لئے وہ زکوٰۃ مراد نہیں ہو سکتی جس کی شرعاً مقدار معین ہے اور جو مقررہ نصاب کو چاہتی ہے بلکہ عام صدقات و خیرات مراد ہیں۔ بقاعی، ابن کثیر اور خطیب وغیرہم نے یہی تفسیر کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قابلِ مدح ہے مومنوں کی یہ صفت کہ وہ اپنے مال کو راہِ خدا میں خرچ کرتے، یتیموں مسکینوں اور دیگر اہلِ ضرورت کی مالی مدد کرتے ہیں۔ اور اپنے نفس کی بھی زکوٰۃ دیتے ہیں، نفس کو تکلیف ہونے کے باوجود اعمال صالحہ کے پابند رہتے ہیں اور ہر قسم کی مالی و عملی نجاست سے نفس کو پاک رکھتے ہیں۔

لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُونَ — زناکاری سے اخلاق برباد، معاشرت تباہ، سوسائٹی فنا اور نظامِ امن غارت ہو جاتا ہے۔ زوجین میں محبت نہیں رہتی، نسل کا اعتبار نہیں رہتا، امراض متعدیہ کی کثرت ہو جاتی ہے، بے حیائی پھیلتی ہے، جسمانی قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جلق وطی بہائم اور لواطت وغیرہ کی حالت میں جس سے عام بدنی ضعف، اعصاب کی کمزوری، عقل کا فتور، دماغ کی سستی اور جوہرِ انسانی کا بے فائدہ تضییع ہوتا ہے، اس لئے آیت مذکورہ میں زنا وغیرہ سے انتہائی اجتناب کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کہ اپنی شرمگاہ کا اظہار اور کشف بھی سوا جائز صورتوں کے نہ ہونا چاہئے۔ جائز کون سی صورتیں ہیں؟ (۱) شرعی جوڑے یعنی جن سے حکم شرع کے مطابق نکاح کر لیا ہو ان سے جماع حلال ہے۔ ہر منکوحہ سے جماع درست نہیں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ماں بہن بھانجی بھتیجی وغیرہ سے نکاح کر لے، مگر ایسا نکاح حرام ہے، اس لئے منکوحہ نہیں فرمایا بلکہ ازواج (جوڑا) کہا۔ (۲) وہ باندیاں جو منکوحہ تو نہیں، مگر مملوکہ ہیں ان سے جماع شرائطِ شرعی کے ساتھ جائز ہے۔ ان دونوں کے علاوہ ہر قسم کی وطی حرام ہے۔ مثلاً لواطت مرد یا عورت سے۔ وطی بہائم، جلق وغیرہ۔

لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ اس آیت میں دو صفتوں کا بیان ہے۔ پہلی صفت امانت کی نگہداشت ہے۔ امانت کسی قسم کی ہو مال کی ہو یا آبرو کی یا کسی راز کی یا مشورہ دینے کی۔ بہرحال اس کی نگہداشت ضروری ہے۔ انتہائی نگہداشت کے بعد اگر تکمیل امانت نہ ہو سکی تو مواخذہ نہ ہوگا۔ اسی طرح عہد کی پابندی ضروری ہے۔ وفائے عہد کی انتہائی کوشش لازمی ہے۔ عہد عام ہے کسی انسان سے ہو یا خدا سے یا اپنے نفس سے۔ خطیب نے لکھا ہے کہ عہد کبھی اللہ سے ہوتا ہے جس طرح تمام ارکان اسلام اور احکام مخصوصہ ہیں۔ کبھی ایک انسان کا دوسرے انسان سے ہوتا ہے کبھی عہد نفس سے ہوتا ہے۔ جیسا کوئی شخص اپنے دل میں کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کا عہد کر لیتا ہے، باوجودیکہ شرعی حکم کوئی نہیں ہوتا ہے مؤخر الذکر عہد اگر خلافِ شرع ہو تو اس کا توڑنا واجب ہے۔ اگر قسم کھائی ہو تو کفارہ

ادا کر دینا چاہیئے اور اگر شرع کے موافق ہو تو اس کی پابندی ضروری ہے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا منافق کی تین علامتیں ہیں۔ بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ (رواہ البخاری والمسلم)

تنبیہ:۔ آیت مذکورہ میں امانت وعہد کی نگہداشت کو قابلِ مدح قرار دیا ہے، ادا کرنے یا پورا کرنے کا حکم نہیں دیا۔ کیونکہ کبھی عہد کرنے کے بعد ایسے مواقع پیش آجاتے ہیں کہ مجبور ہو کر آدمی عہد کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اسی طرح جتنے ارکانِ شرعیہ اور احکام منصوصہ ہیں وہ عہود الٰہیہ ہیں، مگر آدمی ان کو پورا نہیں کر سکتا، لیکن اہلِ ایمان پر لازم ہے کہ پورا کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں اور استغفار کرتے رہیں۔

عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ۔ ابن مسعودؓ اور ایک جماعت تابعین جیسا ابو الضحیٰ، علقمہ، سعید بن جبیر، عکرمہ وغیرہم کے نزدیک حفاظتِ نماز سے مراد ہے اوقاتِ نماز کی نگہداشت یعنی ہر نماز کے وقت میں نماز پڑھنا۔ ابن مسعودؓ نے حضور اقدس ﷺ سے دریافت کیا کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ ترین عمل کونسا ہے؟ فرمایا وقت پر نماز پڑھنا الخ۔ (رواہ البخاری والمسلم) حاکم نے مستدرک میں جو روایت کی ہے اُس میں یہ الفاظ ہیں (اللہ کو سب سے زیادہ پسندیدہ عمل یہ ہے کہ) نماز وقت کے اول حصہ میں (پڑھی جائے) قتادہ نے کہا اوقات نماز اور رکوع سجود سب کی نگہداشت مراد ہے (کذا ذکرہ ابن کثیر) خطیب نے لکھا ہے کہ آیت کا تفسیری مطلب یہ ہے کہ مومن وہ ہیں جو نماز کو برابر پڑھتے ہیں۔ مفروضہ ارکان اور سنت میں سے کوئی حصہ نہیں چھوڑتے، کوشش کے ساتھ نماز کو پورا کرتے ہیں اور ہر نماز کو اس کے وقت میں ادا کرتے ہیں۔

یاد رکھو کہ نماز کی تاکید اور مزید ترغیب کے لئے صفاتِ اہلِ ایمان کا آغاز بھی نماز سے کیا اور اختتام بھی اسی پر کیا، مگر آغاز میں خشوع خضوع رکھنے کی تلقین تھی اور اختتام میں تحفظ اوقات، اعتدالِ ارکان اور پابندی کی ہدایت ہے۔ نماز کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے حدیث میں بھی آیا ہے کہ نماز دین کا ستون ہے۔

مقصود بیان جو اہلِ ایمان صفات مذکورہ کے حامل ہیں ان کی فلاح قطعی ہے۔ نماز کے ظاہری اور باطنی ارکان کی پابندی لازم ہے۔ جس طرح ظاہری ارکان کے ادا کئے بغیر نماز صحیح نہیں ہوتی، اسی طرح اگر نماز میں یکسوئی رکھنے کی کوشش نہ کی جائے اور دل میں خشوع نہ پیدا کیا جائے تو نماز نہیں ہوتی۔ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ بیہودہ قول بیہودہ فعل اور بیہودہ صحبت سے پرہیز رکھے۔ فضول خرچ نہ کرے۔ افسوس آجکل مسلمان کس قدر لغویات میں مبتلا ہیں۔ ان کی زندگی اور زندگی کے تمام اوقات لغو کاموں میں صرف ہوتے ہیں۔ بےضرورت مکانات کی تعمیر، فضول اسباب کی خریداری اور شادی اور غم کے موقعوں پر فضول رسموں میں روپے کی بربادی اور بسا اوقات ان لغو رسمیات کے سبب گردن شکن قرض کا بار، قبروں پر قوالی ناچ گانا، عرسوں میں بے دریغ روپے کا بہاؤ، سینما، تھیٹر اور دیگر عشق پرستوں میں عزیز ترین روپے کی قربانی، حضرت امام حسینؓ اور تعزیوں کی ساخت میں مال کا تلف کرنا، شراب خواری، قمار بازی، کوکین کا ذوق، چرس، سُلفہ، بھنگ اور افیون کی لت غرض ہر طرف اور ہر طرح سے اوقاتِ زندگی، صحت جسمانی، مال اور نسل کی بربادی کے سامان کی فراہمی۔ یہی آجکل مسلمانوں کا دستور العمل اور کارنامۂ زندگی ہے۔ کبوتر بازی، پتنگ بازی، بٹیر بازی، مرغ بازی، سٹہ بازی اور خدا جانے کن کن بازیوں میں باپ دادا کی جمع کی ہوئی دولت رائگاں برباد کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ آیت مذکورہ پکار پکار کر کیا تعلیم دے رہی ہے۔ حکم ناطق تو ہم کو بتا رہا ہے کہ زندگی کا کوئی لمحہ فضول مت ضائع کرو۔ بے کار جلسوں میں شرکت مت کرو، غیر مفید صحبت میں مت بیٹھو، کل زندگی اور زندگی کے شبانہ روز اور شبانہ روز کے کل ساعات اور کل ساعات کے تمام لمحات دین و دنیا کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کرو۔ فضول گفتگو بھی نہ کرو، بے کار خیال بھی دماغ میں نہ لاؤ، تعلقات، تخیلات، تصورات، احساسات اور اقوال و افعال کو کارآمد بناؤ یہی اسلامی وصف ہے۔ حکم زکوٰۃ (یعنی خیرات و صدقات) ہم کو اخوت، مساوات اہلِ ضرورت کی ہمدردی، اسلام و مسلمین کی مالی اعانت اور قوم کی اقتصادی حالت درست کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ ادائے امانت اور وفائے عہد کا حکم، اخلاقی حالت کو سنوارنے، دنیا میں وقار قائم کرنے اور نیت کو سالم رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ ممانعت زنا کا حکم متعہ کو اور ہر قسم کی مہذب عیاشی کو بھی حرام کر رہا ہے۔ اخلاقی معاشرتی اور جسمانی حالات کی اصلاح اور بقائے اصلاح کی تلقین کر رہا ہے۔ تحفظِ نسل، اجتناب عن الفواحش، بقائے صحت اور حفاظت دولت کے سامان فراہم رکھنے کی تعلیم بھی اس سے مستفاد ہوتی ہے اور آخر میں نماز کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝

ہم نے انسان کو	مٹی کے خلاصہ سے	پیدا کیا	پھر ایک محفوظ جگہ میں	نطفہ بنا کر رکھا

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا

پھر نطفہ کو لوتھڑا بنایا پھر لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا بنایا پھر گوشت کے ٹکڑے میں ہڈیاں پیدا کیں پھر ہڈیوں کو

الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ

گوشت پہنایا پھر اس کی ایک اور صورت بنائی پس بزرگ ہے اللہ بہتر اچھا پیدا کرنے والا پھر تم ضرور

بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝

مر دگے

پھر تم قیامت کے دن زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے

تفسیر آخرت کی اچھائی برائی اور عذاب ثواب کا انحصار اس امر پر ہے کہ آدمی مر کر دوبارہ پیدا ہوا اور قیامت کے میدان میں عذاب ثواب کے لئے اس کو پیش کیا جائے۔ کوتاہ نظر رکھنے والے، ناقص الفہم جاہل قیامت ہی کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں کہ مر کر کون دوبارہ ہوا۔ عرب کے ایک شاعر نے کہا تھا ؎

الموت ثم خلق ثم حشر — حدیث خرافۃ یا ام عمر

اور فقط اسی شاعر ہی پر انکار حشر منحصر نہ تھا بلکہ عرب کا عام طبقہ دوبارہ زندہ ہونے کا قائل نہ تھا۔ خدا تعالیٰ نے ان آیات میں تخلیق انسان کی ابتدا، اور درمیانی درجات آفرینش کو بیان کر کے حشر نشر پر استدلال قطعی کیا ہے۔ کیونکہ جب خدا تعالیٰ نے بے جان مٹی کو جاندار بنایا، کثیف اور بے عقل مادہ کو انسانی صورت کا جامہ پہنا کر ذہین اور زیرک کیا اور اس کا نام آدم رکھا اور پھر نسلِ انسانی کو برقرار رکھنے کے لئے جوہر انسانی کا خلاصہ باپ کی پشت سے کھینچ کر ماں کے رحم میں ایک وقت خاص تک امانت رکھا اور اس نطفہ کو تمام درجاتِ تغیر طے کرا کے مختلف صورتوں میں نمودار کر کے آخر میں گوشت، ہڈی، پٹھا، رگ ریشہ، کھال بال غرض کل ضروریات تخلیقی عطا کر کے جیتا جاگتا آدمی بنا کر پیدا کیا۔ پھر مدتِ زندگانی ختم کرا کے ایک وقت خاص پر اس کے لئے موت بھیجی، تو ایسا قادر مطلق خلاقِ کامل فاعل علی الاطلاق خدا کیا دوبارہ قیامت کے دن حشر انسانی نہیں کر سکتا؟ کر سکتا ہے اور ضرور کرے گا۔

تحلیلِ اجزاء خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۔ ابن کثیر کا قول ہے کہ الْاِنْسَان سے مراد آدم ہیں۔ گویا آیات میں آغاز آفرینش انسانی کا بھی بیان ہے اور پھر نسلِ انسانی کو جاری رکھنے کے قانون اور طریقۂ تناسل کا بھی اظہار ہے۔ حضرت آدم کو مٹی کے خلاصہ سے بنایا گیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی مرفوع روایت ہے کہ اللہ نے آدم کو ایک مٹھی خاک سے بنایا جس کو تمام زمین سے لیا تھا، اسی لئے زمین کے موافق آدم کی اولاد ہوئی کچھ سرخ کچھ سفید، کچھ کالی، کچھ درمیانی کچھ ان میں سے ناپاک (بدکردار بداطوار) ہیں اور کچھ پاکیزہ (مومن کامل انبیاء، اولیاء، صلحاء) اور کچھ درمیانی درجہ میں (رواہ احمد وابوداؤد والترمذی وقال حسن صحیح) قتادہ۔ اہلِ تفسیر نے انسان سے عام انسان مراد لیا ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ سے مراد صاف پانی ہے۔ مجاہد نے تفسیر کی ہے یعنی نطفہ۔ بعض نے کہا طین سے مراد آدم ہیں۔ اول تقدیر پر مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے انسان یعنی آدم کو مٹی کے خلاصہ سے بنایا پھر نسلِ انسانی کو قائم رکھنے کے لئے نطفہ کشی کا قانون جاری کیا۔ دوسری صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ انسانی نطفہ کی تخلیق مٹی سے کی (کیونکہ انسان کی تمام غذا مٹی سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان گوشت، گھی دودھ دہی کھاتا ہے یا غلہ میوہ سبز ترکاری وغیرہ۔ اول الذکر مؤخر الذکر کا نتیجہ ہے اور ثانی الذکر میں سے ہر شے زمین سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس غذا سے خون گوشت ہڈی گدی اور تمام جسم انسانی پرورش پاتا ہے۔ خون کا خلاصہ نطفہ کہلاتا ہے تو یقیناً نطفہ بھی مٹی ہی کا خلاصہ قرار پایا) پھر اس نطفہ کو وقت معین تک رحم مادر میں کھا الخ

فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۔ یہاں قرار کے معنی ہیں قیام گاہ یعنی ٹھہراؤ کی جگہ اور مکین کے معنی ہیں محفوظ۔ یعنی اللہ نے نطفہ کو ایسے مقام میں رکھا جو نہایت محفوظ تھا۔ ضائع ہو جانے اور بگڑ جانے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔

فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا ۔ عظام کا ترجمہ اکثر مفسرین نے ہڈیاں کیا ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا عظام پشت کی ہڈی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے مرفوع حدیث

بیان کی ہے کہ آدم کا پورا جسم بوسیدہ ہو جاتا ہے سوائے دم گزی کے کہ اسی سے انسان پیدا ہوا ہے اور اسی میں (قیامت کے دن) پھر (تمام اجزاء کو) ملا دیا جائیگا (رواہ البخاری) ابن کثیر اور بعض مفسرین نے اس سے ڈھانچہ مراد لیا ہے اور یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ نے مضغہ کو سخت شکل میں تبدیل کر دیا۔ یعنی سر اور دو ہاتھ اور دو پاؤں اُن کی ہڈیوں رگوں اور پٹھوں سمیت بنا دیئے۔ نتیجہ اختلاف یہ ہے کہ ابن کثیر کے نزدیک صرف ہڈیاں ہی مراد نہیں ہیں بلکہ تمام سخت اعضاء کل اجزاء سمیت مراد ہیں اور اکثر مفسرین کے نزدیک صرف ہڈیاں مراد ہیں۔

خَلْقًا اٰخَرَ۔ رحم مادر کے اندر بچہ کے مختلف احوال اور اطوار ہوتے ہیں۔ ہر منٹ کی کیفیت دوسرے منٹ کی کیفیت سے جدا ہوتی ہے اور یہ تمام تغیرات تدریجی ہوتے ہیں ایک دم سے نہیں ہو جاتے، اسی لئے محسوس بھی نہیں ہوتے۔ البتہ ایک تغیر انقلابی ہوتا ہے اور وہ اپنی نوعیت، کیفیت اور حالت سے بہت ہی ممتاز ہوتا ہے۔ جب ہڈی گوشت پوست اور رگ پٹھے سے بن کر ڈھانچہ تیار ہو جاتا ہے تو اس وقت بحکم الٰہی اس میں دفعتاً جان پڑ جاتی ہے۔ یہ انقلاب فوراً اور آن کی آن میں ہو جاتا ہے اور ایسا ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے صحیح معنی میں نوع انسانی کا ایک فرد بن جاتا ہے۔ روح پڑنے سے پہلے بچے کو انسان نہیں کہا جا سکتا تھا نہ اس میں حرکت اور ارادہ تھا نہ سننے دیکھنے خیال و فکر کرنے اور فہم و ادراک کی طاقت تھی۔ روح پڑتے ہی یکدم جنبش پیدا ہوتی اور تمام بیرونی و اندرونی حواس بر سر ظہور آ جاتے ہیں۔ گویا یہ تخلیق پہلی تخلیق سے بالکل جدا ہوتی ہے، جماد کو انسان اور بے شعور و بے جان کو ذی شعور اور جان دار بنا دیتی ہے۔ ایک منٹ پہلے جو چیز مردہ اور جامد تھی اب وہی بے حس بے بس چیز اشرف المخلوقات کہلانے کی مستحق بن جاتی ہے اور بزرگ ترین خزانہ ہائے فطرت اور اسرار قدرت کی حامل بن جاتی ہے خَلْقًا اٰخَرَ کی مذکورہ تفسیر حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، شعبی، ابو العالیہ، حسن بصری، قتادہ، ضحاک، ربیع بن انس، ابن زید، سدی وغیرہم اکابر سے مروی ہے۔ ابن کثیر و ابن جریر نے بھی اسی کو پسند کیا ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ بچہ کی حالت کی نیرنگی یعنی اس کا بڑھنا پھر جوان ہونا پھر بوڑھا ہو جانا سب ہی کی طرف خَلْقًا اٰخَرَ سے اشارہ ہے۔ اہل تحقیق کے نزدیک یہ تعبیر کمزور ہے۔

فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔ ابن ابی حاتم نے بطریق جابر جعفی بیان کیا کہ حضرت زید بن ثابت نے فرمایا مجھ سے رسول اللہؐ نے آیت لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ الخ لکھوائی۔ جب ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ پر پہنچے تو معاذ بن جبلؓ فوراً بول اٹھے۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ حضورؐ مسکرا دیئے۔ معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ حضور کس بات پر مسکرائے۔ فرمایا ابھی یہ آیت ختم ہوئی ہے۔ ابن کثیر نے یہ حدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ جابر جعفی ضعیف راوی ہے۔ اس کی روایت ناقابل اعتبار اور منکر ہے۔ اس کے علاوہ قصہ مذکور درایت کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ معاذ بن جبل مدینہ میں اسلام لائے تھے اور زید بن ثابت بھی مدینہ میں تحریر وحی کی خدمت انجام دیتے تھے۔ حالانکہ سورت مکی ہے۔

خطیب وغیرہ نے لکھا ہے کہ واقعہ مذکورہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کا ہے۔ ابن سعد کاتب وحی تھا۔ اُس نے زبان مبارک سے سننے سے پہلے ہی فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ کہہ دیا تھا اور حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا تھا ختم آیت کا اسی پر نزول ہوا ہے۔ اس پر ابن سعد کو زعم ہو گیا کہ رسول اللہؐ کی طرح مجھ پر بھی وحی آتی ہے۔ چنانچہ مرتد ہو کر بھاگ گیا اور جب مکہ فتح ہوا اُس وقت دوبارہ مسلمان ہوا۔ اس قصہ پر بھی وہی اعتراض ہوتا ہے کہ سورت کا نزول تو مکہ میں ہوا اور عبداللہ بن سعد مدینہ سے مرتد ہو کر بھاگا تھا۔ ابن ابی حاتم نے بروایت انسؓ بیان کیا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ اللہ کے فضل سے میں چار باتوں میں اپنے رب سے موافق ہو گیا۔ میں نے حضور اقدسؐ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ مقام ابراہیم کے پیچھے ہم نماز پڑھیں تو بہتر معلوم ہوتا ہے۔ اس پر آیت وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى نازل ہوئی۔ میں نے عرض کیا تھا یا رسول اللہؐ! حضور کے پاس دین دار مسلمان اور کفار اور بدکار منافق سب ہی آتے ہیں۔ اگر حضور اقدسؐ ازواج مطہرات کا پردہ کرا دیں تو مناسب ہے۔ اس پر آیت وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَاسْــَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ نازل ہوئی۔ میں نے ازواج مطہرات سے کہا تم رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے جھگڑا مت کرو ورنہ اللہ پاک اپنے رسول کو تم سے بہتر بیبیاں عطا کرے گا اس پر آیت عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ الخ نازل ہوئی اور جب آیت وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ سے ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ تک نازل ہوئی تو میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔ اس پر حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا عمر! یوں ہی آیت کا خاتمہ ہے۔ (رواہ ابن ابی حاتم و ابو داؤد الطیالسی و ابن مردویہ و ابن عساکر) یہ روایت ضعیف نہیں ہے۔ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۔۔۔ یعنی مرنے کے بعد جب وقت مقررہ پر قیامت آ جائیگی تو تم کو دوبارہ زندہ کر کے روح اور جسم کے ساتھ اٹھایا جائیگا۔ اس پوری آیت میں انسان کی تخلیقی کیفیت اور آغاز زندگی کا نشو و نما بیان کر کے بعثت ثانیہ کے وقوع پر استدلال کیا ہے۔ یہاں تک ثبوت قیامت کے لئے دلائل انفس کا

بیان تھا۔ اس سے آگے دلائل آفاقی کا بیان ہے۔

مقصودِ بیان انسانِ اوّل کے تخلیقی مادہ کا اظہار اور پھر نطفہ کشی کے عام سلسلہ کا بیان اور پھر نطفہ پر جو نیرنگیاں اور تغیرات طاری ہوتے ہیں اُن کی مفصل صراحت۔ مٹی سے انسانی نطفہ کی تخلیق اپنے اندر پیامِ موت کا درسِ عبرت رکھتی ہے کہ انسان جس کیفیت اور جس چیز سے بنا ہے پھر اسی حالت پر ہو کر آنا ہے اور اسی چیز میں ملنا ہے۔ یہ خدا کی ہمہ گیر قہار قدرت کی دلیل ہے اور حشرِ جسمانی کا انکار کرنے والوں کو خاموش کرنے کے لئے بُرہان قاطع ہے وغیرہ۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ○ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۢ

ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان بنائے اور ہم مخلوق سے بے خبر نہیں تھے آسمان سے ہم نے اندازہ کے موافق پانی

بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ○ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ

برسایا پھر اُس کو زمین میں ٹھہرا دیا اور ہم اس کے لے جانے پر البتہ قادر ہیں پھر اُس سے ہم نے تمہارے لئے کھجور

مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ

اور انگوروں کے باغ پیدا کئے جن میں بکثرت تمہارے لئے میوے ہوتے ہیں اور انہی میں سے تم کھاتے ہو اور وہ درخت بھی پیدا کیا جو طورِ سینا سے

سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ○ وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا

نکلتا ہے اور تیل نیز سالن کھانے والوں کے لئے پیدا کرتا ہے چوپایوں میں بھی تمہارے لئے مقامِ غور ہے ہم تم کو وہ چیز پلاتے

فِىْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ○

ہیں جو اُن کے پیٹوں (کے اندر سے پیدا ہوتی ہے) اور تمہارے لئے اُن میں بکثرت منافع ہیں انہیں سے بعض کو تم کھاتے ہو اور اُن پر نیز کشتیوں پر سوار ہوتے ہیں

ع ۲۲

تفسیر یہاں سے دلائل آفاقی کا بیان ہے۔ تمام عالم نظامِ قدرت کے تحت ایک خاص ترتیب سے بنا ہے۔ ایک سبب ہے دوسرا مسبّب۔ ایک فاعل ہے دوسرا نتیجہ۔ اسی طرح عالم کی ہر کڑی دوسری کڑی سے وابستہ ہے اور اس مسلسل گول زنجیر کا نام دنیا ہے۔ نیچی نگاہ رکھنے والے صرف اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ فلاں چیز سے فلاں چیز پیدا ہوتی ہے، لیکن ذرا اونچی نظر رکھنے والے سلسلۂ اسباب کی سیر کرتے ہیں۔ چیونٹی خیال کرتی ہے کہ سفید کاغذ پر حرف بنانے والی روشنائی ہے، لیکن ذرا اوپر نظر اٹھاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سیاہی حروف نہیں بناتی بلکہ قلم بناتا ہے۔ اس سے بھی اونچا اگر دیکھتی ہے تو قلمی روانی کو حرکتِ دست کے زیر اثر پاتی ہے اور حرکتِ دست انسان کی قوتِ محرکہ فاطلہ کی تابع ہے اور قوتِ محرکہ فاطلہ قوتِ محرکہ ارادیہ کی مسخر ہے، لیکن ارادہ کون کرتا ہے یہ چیونٹی کی عقل کی رسائی سے خارج ہے۔ یہی حال تمام عالم کا ہے۔ دنیا کے ذرّہ ذرّہ اور پتہ پتہ اور قطرہ قطرہ میں شواہد قدرت موجود ہیں جو خدا کی صنعت حکمت معرفت ربوبیت اور الوہیت و وحدانیت کا کھلم کھلا پتہ دے رہے ہیں، لیکن نظر کی ضرورت ہے۔ آیاتِ مذکورہ میں اسی سلسلہ کی چند کڑیاں بیان کی ہیں۔ اوّل فرمایا کہ ہم نے سات آسمان بنائے، کیسے بنائے، کس طرح بنائے، کیوں بنائے؟ اس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ کل فائدہ کا بیان ناقابلِ بیان ہے۔ ساخت کی صرف ایک کیفیت بیان فرما دی کہ آسمان راستے ہیں یعنی ارواح و ملائکہ کی آمد و رفت کے یا ستاروں کی رفتار و سیاحت کے۔ مقامِ غور ہے کہ آسمان میں نہ کوئی شگاف ہے نہ سوراخ نہ دروازہ نہ کھڑکی نہ آنکھوں سے کوئی رستہ دکھائی دیتا ہے، پھر بھی فرشتوں کی اور غیر مخلوق کی آمد و رفت برابر جاری ہے اور اگر ستاروں کو آسمانوں میں جڑا ہوا مان لیا جائے تو ان کی سیاحت بھی روزانہ کا مشاہدہ ہے۔ پس کس قدر تعجب انگیز ہے آسمانوں کی ساخت کہ بغیر منفذ اور سوراخ کے یہ آنا جانا صاف اور سیر و سیاحت کا سلسلہ ان میں جاری ہے۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ان کی ساخت بے جوڑ

اور بے ربط نہیں۔ اُن کے اجزا کا اتصال اُن کی صورت نوعیہ وجسمیہ ان کا عمل و قوتیں ان کی شان قیام اور ان کا باہمی ربط اور ایک دوسرے سے تعلق سب کچھ مصلحت وحکمت کے زیر اثر ہے۔ اب ذرا نیچے اُتر کر فضائی کائنات میں سے صرف بارش کو دیکھئے۔ فضا میں پانی بنتا ہے نیچے اترتا ہے، کتنا اترتا ہے، کیسے اترتا ہے، کتنا بنتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں بے اندازہ ہیں۔ اگر بغیر اندازہ بغیر علم اور بغیر قدرت کے ہوتیں تو ایک ہی روز میں تمام عالم غرق ہو جاتا۔ بادل آتے ہیں اکثر خالی نکل جاتے ہیں، کوئی برس جاتا ہے، وہ خالی کیوں نکل جاتے ہیں؟ کوئی اور برسنے والا کیوں برس جاتا ہے؟ یہ اندازہ الٰہیہ ہے۔ کون پوچھ سکتا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ پھر پانی اندازہ کے موافق زمین پر اترتا ہے اور زمین کے اندر قرار پکڑتا ہے، کہیں کم کہیں زیادہ۔ ہو سکتا تھا کہ تمام پانی خشک ہو جاتا اور زمین بے جان رہ جاتی، لیکن ایسا نہیں ہوتا اس سے زمین میں جان پڑ جاتی ہے۔ طرح طرح کے درخت اور پھل پھول پیدا ہوتے ہیں، درختوں کی روئیدگی بھی قابل غور ہے۔ پانی سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اس کا رنگ، شکل، بُو، مزہ، کیفیت نوعیت، خاصیت ہر چیز پانی سے جُدا ہے۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ پانی کی کارسازی ہے سینکڑوں قسم کے درخت پیدا ہوتے ہیں اُن سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جانوروں اور انسانوں کی روزی کا سامان فراہم ہوتا ہے، جانور بھی کھاتے ہیں اور آدمی بھی۔ اب ذرا اور آگے بڑھئے اور دیکھئے کہ جانور سبزہ کھاتا ہے۔ اسی سبزہ سے اس کے بدن میں کیا کیا چیزیں بنتی ہیں۔ گوشت، پوست، اُون، ہڈی پٹھا وغیرہ وغیرہ سب کچھ سبزی ہی کی پیداوار ہے۔ پھر ان کے پیٹ کے اندر سے ایک ایسی چیز برآمد ہوتی ہے جو ہیں اندرون شکم کی نجاست، بُو، رنگ اور کثافت کا شائبہ بھی نہیں ہوتا یعنی صاف سفید شیریں صاف دودھ پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی سبزہ ہی کی پیداوار ہے۔ جانوروں سے انسانوں کو یہی فوائد حاصل نہیں ہوتے بلکہ سواری، باربرداری اور دیگر ضروریات کو پورا کرنے میں بھی انسان بعض جانوروں کا محتاج ہے۔ یہ ہے کارخانہ قدرت کا تسلسل اور حضرت انسان کی بقائے زندگی کے اسباب کی ترتیب۔ پھر ذرا کشتیوں کو دیکھئے لکڑیوں سے بنائی جاتی ہیں، لکڑی پانی سے پیدا ہوتی ہے اور یہی جڑی ہوئی لکڑیاں پانی پر تیرتی ہیں اور انسان کی سواری وباربرداری کے کام آتی ہیں۔ کیا یہ کچھ کم تعجب انگیز امر ہے کہ پانی پانی پر تیرتا ہے اور انسان کو پانی میں ڈوبنے سے روکتا ہے۔ آخر لکڑی کی ساخت بھی تو پانی ہی سے ہوتی ہے، صرف نوعیت، کیفیت اور خاصیت کا فرق ہے۔ مادہ تخلیق یا سبب تخلیق وہی ہے۔ یہ ہیں خالق تعالیٰ کا رد الانسان پر اللہ کے احسانات اس کے باوجود بھی انسان اور بے عقل انسان اللہ کی ربوبیت، الوہیت اور وحدانیت کو نہیں مانتا اور ان تدریجی تغیرات و انقلابات دیکھتے ہوئے روز آخرت کا انکار کرتا ہے۔

تحلیل اجزاء وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ۔ بظاہر اس فقرہ کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اوپر سات آسمانوں کو بنایا ہے یعنی پہلے انسانوں کو پیدا کیا پھر ان کے اوپر آسمانوں کو بنایا، مگر یہ مطلب غلط ہے۔ صحیح معنی یہ ہے کہ ہم نے آسمانوں کو بنایا اور وہ بالائی سمت میں ہیں۔ آنکھوں سے اوپر نظر آتے ہیں۔ گویا فَوْقَكُمْ کا فعل ظرف نہیں بلکہ حال ہے اور ذوالحال مؤخر ہے۔

سَبْعَ طَرَائِقَ مجاہد نے طرائق کا ترجمہ سماوات کیا ہے۔ سماوات کو طرائق کہنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ ان میں ملائکہ کی آمد و رفت کے راستے ہیں یا ستاروں کی رفتار ان میں ہوتی ہے۔ طرائق کا ترجمہ تہ بہ تہ کیا گیا ہے چونکہ آسمان تہ بہ تہ ہیں، اس لئے ان کو طرائق کہا گیا۔ فراء، زجاج اور ابوعبیدہ وغیرہ نے یہی لغت تحقیق کی ہے۔

وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ۔ اس آیت کا مطلب دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ ایک کہ اللہ نے آسمانوں کو بنایا، مگر بنا کر یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ ان کا نظام اور بقاء، واسباب بقاء، اور کیفیت بقاء، و حفاظت اور اسباب حفاظت سب کچھ اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اسی کا دست قدرت اور تدبیر کارفرما ہے کہ آسمان نیچے نہیں گرتا اور زمین پانی سے گل نہیں جاتی، یہ اسی کی کارسازی ہے کہ زمین بھی مرکز کشش ہے اور چاند بھی بلکہ ہر ستارہ بجائے خود کشش کے تاروں میں جکڑا ہوا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تاروں کو بے جوڑ اور بے ربط نہیں پیدا کیا۔ تناسب اور توازن ہر چیز میں ملحوظ ہے۔ عالم کی ترتیب بتا رہی ہے کہ یہ کسی حکیم قادر کی صناعی ہے جمادات سے لے کر فلکیات تک اور مادیات سے لے کر مجردات تک۔ تمام مخلوق نظم و تربیت کے دائرہ کے اندر ہے۔ انمل بے جوڑ نہیں۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ۔ ربوبیت والوہیت کی یہ دوسری دلیل ہے۔ پانی اوپر سے برستا ہے، کیوں برستا ہے اور کتنا برستا ہے؟ یہ تمام امور اندازۂ الٰہیہ کے مطابق ہوتے ہیں۔ اگر بارش کا نزول خاص اندازہ کے تحت نہ ہوتا اور یونہی بادلوں کے دہانے کھول دئیے جاتے تو زمین اور زمین کی تمام کائنات غرق ہو جاتی یا خلاف موسم مینہ برستا سب مخلوق تباہ ہو جاتی۔

فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ۔ پھر مینہ برستا ہے تو کہاں جاتا ہے، زمین کے اندر جذب ہو جاتا ہے۔ ممکن تھا کہ یونہی رائیگاں چلا جاتا اور زمین خشک رہ جاتی، مگر ایسا نہیں ہوتا بقدر ضرورت زمین کے اندر رہ جاتا ہے۔ تالابوں، جھیلوں، نالیوں اور وادیوں میں جمع ہو جاتا ہے اور وقت ضرورت کام آتا ہے۔

فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ۔ حجاز میں کھجوروں اور انگوروں کی پیداوار کثرت ہے، اس لئے خصوصیت کے ساتھ ان کا تذکرہ کیا۔

اس کے علاوہ کھجور و انگور غذا بھی ہے اور دوا بھی ۔ غذائے دوائی ہے اور دوائے غذائی ۔ یہ اوصاف کم چیزوں میں پائے جاتے ہیں کوئی دوا ہے کوئی غذا ، کھجور یہ اوصاف اربعہ کا مجموعہ ہیں ۔ جنات و باغات سے مراد عرفی باغات نہیں بلکہ ہر وہ چیز ہے جو پانی سے پیدا ہوتی ہے ۔ خواہ درخت ہو یا الحیق ہو ، میوہ جات ہوں یا اناج اور پھل پھول ، جڑی بوٹیاں ، سبزیاں ۔

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ ۔ شجرۃ سے مراد درخت زیتون ہے ۔ زیتون سے تیل بھی نکلتا ہے ، جو مختلف دواؤں میں استعمال کیا جاتا ہے اور جزو غذا بنایا جاتا ہے اور عرب صرف زیتون کے تیل کو بطور سالن استعمال کرتے ہیں ۔ درخت زیتون کی بیشتر پیداوار کوہ طور میں ہوتی ہے ۔

سیناء ایک وادی کا نام ہے اور طور پہاڑ کا ۔ یہ پہاڑ اس وادی میں واقع ہے ۔ بعض کا قول ہے کہ طور سرسبز پہاڑ کو کہتے ہیں اور خشک پہاڑ کو جبل کہا جاتا ہے ۔ درخت زیتون کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے کیا کہ تمام درختوں سے اس کی عمر زیادہ ہوتی ہے ۔ یہاں تک کہ مفسر خازن نے بعض اہل تحقیق کا قول نقل کیا ہے کہ اس کی عمر تین ہزار برس کی ہوتی ہے ۔ بلحاظ منافع اور ضرورت کے لحاظ سے اس کی لکڑی اور تیل بہت ہی اہم ہے ۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۔ یہ قدرت واسعہ اور ربوبیت تامہ کی چوتھی دلیل ہے ۔ چوپایوں کا توالد و تناسل شعور و احساس نمو اور حرکت تلاش رزق اور نوعی تربیت ، اعضا کی ساخت اور اشکال کی بوقلمونی اپنے اندر درس عبرت اور سامان معرفت رکھتی ہے ۔ مویشی کی حقیقت اور خواص و احوال پر غور کرنا تو اہل تحقیق کا کام ہے ، مگر نمایاں فوائد ہر شخص دیکھتا ہے ۔ مثلاً :۔

نُسْقِيْكُمْ الخ ۔ ان کے پیٹ کے اندر سے دودھ نکلتا ہے جس میں آلائش شکم کی کوئی آمیزش نہیں ہوتی نہ خون کا رنگ ہوتا ہے نہ بو نہ مزہ اور نہ خاصیت ہوتی ہے ۔ پستان میں آکر رنگ ، بو ، مزہ ، کیفیت اور خاصیت ہر چیز جدا ہو جاتی ہے ۔ انسان اس کو کھاتا ہے پیتا ہے اور اتنے فوائد حاصل کرتا ہے کہ بعض دودھ سے بہتر کوئی غذا ہی نہیں ۔

وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ ۔ دودھ کے جانوروں کا اون ، کھال ، ہڈی اور پٹھا وغیرہ سب ہی کام کی چیزیں ہیں ۔ لوازم معاش اور ضروریات زندگی کی فراہمی میں اجزائے حیوانی کا کافی دخل ہے ۔ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۔ یعنی جانوروں کا گوشت ، مکھن ، چربی ، گھی وغیرہ کھایا جاتا ہے ۔ انسان کی غذا جس طرح نباتات سے پیدا ہوتی ہے ، اسی طرح اجزائے حیوانی سے بھی بنتی ہے ۔

وَعَلَيْهَا ۔ بعض جانور سواری اور بار برداری کے بھی کام آتے ہیں ۔ بظاہر یہ فائدہ بہت حقیر نظر آتا ہے ، لیکن جس زمانے میں ریل ، ہوائی جہاز اور موٹر و بس کا رواج نہ تھا اس زمانے میں سواری کے لئے جانوروں کا وجود بیش بہا نعمت تھی بلکہ اب بھی اگر گھوڑے اونٹ اور بعض دوسرے جانور نہ ہوں تو ہر وقت دیہات کو سامان کس طرح لے جایا جا سکتا ہے نہ راستے ہیں نہ پختہ سڑکیں ، نہ ریلوے لائن ۔ خصوصاً ریگستانوں میں تو بغیر جانوروں کے گذارہ ہو ہی نہیں سکتا ۔ افریقہ کے صحرا ، عرب کے ریگستان اور راجپوتانہ کے بیابان ایسے دشوار گذار ہیں کہ سوائے اونٹ کے بار برداری اور سواری کے لئے دوسری چیز استعمال نہیں کی جا سکتی ۔

وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۔ اللہ کی یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے کہ اس نے دریائی سفر طے کرنے اور سمندروں میں آنے جانے اور مال و اسباب لے جانے کا ذریعہ جہازوں اور کشتیوں کو بنا دیا ۔ اگر جہاز نہ ہوتے تو کوئی دریائی سفر نہ کر سکتا اور ایک ملک کی پیداوار دوسرے ملک تک نہ پہنچ سکتی ۔ پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ کشتیاں پانی پر کس طرح تیرتی ہیں اور کون چیز ان کو پانی کی سطح پر روکتی اور تہ نشین ہونے سے بچاتی ہے ۔

مقصود بیان تخلیق کائنات ، ترتیب کائنات دکھا کر اپنی الوہیت و وحدانیت اور کمال قدرت پر استدلال اور ضمناً تخلیق ثانوی کا ثبوت ۔ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام عالم جس طرح اپنے وجود و خلق میں خلاق مطلق کا محتاج ہے اسی طرح بقا اور تحفظ میں بھی ہر وقت اسی کا دست نگر ہے ۔ اس سے ایک بات یہ بھی واضح ہوتی ہے کہ تسلسل کائنات بے ربط نہیں ۔ ترتیب عالم خاص علم و حکمت اور قدرت کے تحت ہے ۔ یونان کے وہ فلاسفر غلطی پر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ کو جزئیات مادیہ کا تفصیلی علم نہیں اور وہ گروہ بھی کھلی ہوئی گمراہی میں ہے جو خدا کو صاحب ارادہ نہیں مانتا اور عالم کو بخت و اتفاق کا ممنون کرم بتاتا ہے ۔ مَآءًۢ بِقَدَرٍ کا لفظ بتا رہا ہے کہ اگرچہ تخلیق آبی مادی اسباب کے تحت اثر ہوتی ہے ، مگر اس کی کیفیت و کمیت خلاق عالم کے اندازہ سے خارج نہیں ۔ اسباب عام آثار کی پیدائش بھی صانع مطلق کی جلیل القدر حکمت کے بغیر ناممکن ہے ۔ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ سے یہ دکھانا غرض ہے کہ جس طرح خدا خالق ہے اسی طرح فنا کرنے پر بھی قادر ہے ۔ احیاء و اماتت ، ایجاد و فنا اور تخلیق و اعدام کی اسی کو قدرت ہے ۔ لَعِبْرَةً کا لفظ اہل تحقیق کو دعوت ذہنی دے رہا

ہے کہ جانوروں کی حقیقت، خواص اور احوال پر غور کرو اور اللہ کی قدرت قاہرہ کا اقرار کرو۔ وَعَلَی الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ سے اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں تعلیم صنعت بھی خدا داد ہے۔ اگر خدا نہ سکھاتا تو انسان محروم رہ جاتا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ

ہم نے نوح کو ان کی قوم کے پاس بھیجا نوح نے کہا اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں

اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ

کیا تم ڈرتے نہیں نوح کی قوم کے کافر سردار کہنے لگے یہ تمہاری ہی طرح ایک انسان ہے تم پر

اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ښ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا

فوقیت حاصل کرنا چاہتا ہے اگر اللہ بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو اتارتا ہم نے تو یہ بات اپنے اگلے باپ دادوں میں

الْاَوَّلِيْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ قَالَ رَبِّ

بھی نہیں سنی اس شخص کو تو جنون ہے لہٰذا ایک وقت تک تم اس کے منتظر رہو نوح نے کہا اے

انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ ۝ فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا

پروردگار! میری مدد کر کیونکہ انہوں نے میری تکذیب کی ہم نے نوح کے پاس وحی بھیجی کہ ہمارے سامنے ہمارے حکم کے مطابق کشتی بناؤ

فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَ

پھر جب ہمارا عذاب آجائے اور تنور ابلنے لگے تو ہر نوع میں سے نر و مادہ کو کشتی میں بٹھا لینا اور اپنے گھر والوں کو

اَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ ۚ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ

(بٹھا لینا) باستثنار اس شخص کے جس پر حکم ہو چکا ہے اور ان ظالموں کے متعلق مجھ سے کچھ نہ کہنا یہ قطعاً غرق

مُّغْرَقُوْنَ ۝ فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ وَمَنْ مَّعَكَ عَلَي الْفُلْكِ فَقُلِ الْحَمْدُ

کر دیئے جائیں گے پھر جب تم اور تمہارے ساتھی کشتی پر بیٹھ چکو تو تم کہنا اس اللہ کا شکر ہے

لِلّٰهِ الَّذِيْ نَجّٰىنَا مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَقُلْ رَّبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا

جس نے ظالم لوگوں سے ہم کو نجات دی اور (یہ بھی) کہنا کہ پروردگار! مجھے برکت والی جگہ میں اتار

وَّاَنْتَ خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ وَّاِنْ كُنَّا لَمُبْتَلِيْنَ ۝

تو بہترین اُتارنے والا ہے بیشک اِس واقعہ میں بہت سی نشانیاں ہیں اور واقعی ہم آزمائش کرنیوالے ہیں

تفسیر انبیاء کے تذکرے مختلف آیات و سُوَر میں مختلف اغراض کے لیے کیے گئے ہیں۔ ہر جگہ جُدا مقصود ہے۔ اس جگہ بھی چند پیغمبروں کا تذکرہ کیا گیا ہے جس سے چند امور کی طرف ایمار کرنا مقصود ہے:۔

(۱) محمدؐ سے جس طرح کفار کج بحثیاں کرتے ہیں اور ناقابلِ توجہ شکوک پیش کرتے ہیں اسی طرح گزشتہ انبیاء کی قومیں بھی کرتی تھیں۔ عناد و تعصب اور بیجا جاہلانہ مخالفت اور آباؤ اجداد کی کورانہ تقلید اور حق سے روگردانی ان کا بھی شعار تھا۔

(۲) کفار کی سرکشی جب انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ تبلیغ کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔ ہدایت یاب ہونے کی کوئی امید نہیں رہتی تو مقدس انبیاء کے ہاتھوں سے بغیر ظاہری اسباب کے غیبی معجزات ظاہر کرائے جاتے ہیں۔ جن سے گناہ گار مجرم تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، مگر اہلِ حق کو کوئی ضرر نہیں پہنچتا۔ یہ خدا کا عام دستور ہے۔ کفار مکہ بھی اس سے مستثنےٰ نہیں ہو سکتے۔ جب تبلیغ کا زمانہ ختم ہو جائے گا اور کفار کی چیرہ دستیاں اور سرتابیاں کم نہ ہوں گی اور ہدایت یاب ہونے کی اُمید منقطع ہو جائے گی اس وقت ان کو بھی برباد کر دیا جائے گا۔

(۳) نبوت و رسالت کوئی نئی چیز نہیں ہمیشہ سے آدمی ہی نبی ہوتے چلے آئے ہیں اور سبھی نے اعلانِ توحید کیا ہے، مگر کفار کی مخالفت اور مقدس رسولوں پر تہمت تراشی اور ان کو دیوانہ پاگل کہنا بھی کوئی جدید بات نہیں۔ آدمِ ثانی یعنی نوحؑ کو بھی اس کی قوم نے دیوانہ کہا تھا۔

(۴) ہمیشہ سے انبیاء نے کفار کی ایذا رسانی پر صبر کیا اور عام اہلِ ایمان بھی کافروں کی جفائیں سہتے رہے۔ لہٰذا محمدؐ اور آپ کے صحابہ کو بھی ایک وقتِ خاص تک کافروں کے مظالم برداشت کرنے چاہئیں۔ آخر میں حق کی فتح ہوتی ہے۔ انجام کار مسلمانوں کو بھی نصرت حاصل ہوگی۔

آیاتِ مذکورہ کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جب نوحؑ نے اپنی قوم کو شرک سے منع کیا اور صرف خدا کی عبادت کا حکم دیتے ہوئے عذابِ الٰہی سے ڈرایا تو بڑے سے بڑے کافروں نے جواب دیا تم بھی ہماری طرح انسان ہو تم میں کوئی زائد خصوصیت نہیں ہے۔ اگر اللہ کو کوئی پیمبر بھیجنا تھا تو فرشتہ کو بھیجا ہوتا۔ ہم نے تو ایک خدا کی پرستش کا حکم کبھی اپنے اسلاف سے نہیں سُنا، تمہاری باتیں خلافِ عقل ہیں، تم پاگل ہو۔ تم کہتے ہو عذاب آئے گا ہم بھی دیکھیں کب آتا ہے۔ نوحؑ جب مایوس ہو گئے تو اللہ سے امداد کی دعا کی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ آیات میں بالکل واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔

تحلیلِ اجزاء نُوْحًا۔ شیخ سیوطی نے لکھا ہے کہ نوح لقب اور عبداللہ نام۔ امام رازی نے یشکر نام لکھا ہے۔ آپ عراق میں نینوا یعنی کوفہ کے قریب رہتے تھے اور وہیں تبلیغ رسالت کی تھی۔

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ الخ یعنی حضرت نوحؑ نے کہا کہ چونکہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا مستحقِ الوہیت نہیں، اس لئے وہی معبود بھی ہے۔ تم اس کی پرستش کرو۔ اگر شرک کرو گے تو عذابِ اُخروی کے علاوہ عذابِ دنیوی میں بھی مبتلا ہو گے۔ آدمی کی طبیعت فطرۃً خوفناک چیز سے ڈر جاتی ہے۔ گناہ سے باز رکھنے کے لئے حصولِ نعمت کا لالچ اتنا مفید نہیں ہوتا جتنا خطرۂ جان مفید ہوتا ہے، اس لئے آپ نے بجائے اُخروی سعادت اور دنیوی کامرانی کا لالچ دینے کے عذاب سے ڈرایا۔

فَقَالَ الْمَلَؤُا۔ کسی مصلح کی نصیحت ماننے سے تین باتیں مانع ہوتی ہیں (۱) آدمی خیال کرتا ہے کہ اگر میں نے اس شخص کے کہنے سے اپنے افعال چھوڑ دئے اور اس کو اپنا ہادی و مرشد تسلیم کر لیا تو میری قومی سیادت و برتری، حکومت اور فوقیت زائل ہو جائے گی مجھے اس کا محکوم اور مطیع ہونا پڑے گا۔ اب سے پہلے اس کی کوئی پوزیشن نہ تھی اب یہ سب کا آقا اور مقتدا ہو جائے گا، میرا قومی وقار خاک میں مل جائے گا۔ (۲) انسان کی بدنیتی اور خبث اندرونی حق سے سرتابی پر اُس کو مجبور کرتا ہے۔ اگرچہ حق پرستی اور نیکوکاری سے اس کو دنیوی نقصان نہ پہنچتا ہو، مگر طبیعت ہی اتنی خبیث ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ کج روی، اہلِ حق کی مخالفت اور صداقت سے سرکشی کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ (۳) آدمی کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر میں نے اس ریفارمر کے قول کو مانا تو آباؤ اجداد کے قدیم طریقہ کو چھوڑنا پڑے گا۔ تمام خاندانی، قومی اور ملکی رسم و رواج ترک کرنا ہوگا۔ اعداء کی طعنہ زنی برداشت کرنی ہوگی اور سوسائٹی سے الگ تھلگ رہنا پڑے گا۔ ان تینوں مواقع میں نمبر اوّل کا اندیشہ تو صرف دولتمندوں ہی کو ہوتا ہے

غریبوں کے پاس نہ مال ہوتا ہے نہ اُس کے ضائع ہونے کا خوف ہو نہ سیادت قومی اور حکومت ہوتی ہے جس کے زائل ہونے کا اندیشہ ہو۔ نمبر دوئم کا وجود بھی زیادہ تر ثروت والے طبقہ میں ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ دولت و مال کا نشہ طبیعت کی خباثت و سرکشی بڑھا دیتا ہے۔ ایک تو فطرتاً مزاج خبیث ہوتا ہے پھر دولت اس کو اور بھی احکامِ الٰہی سے دور کر دیتی ہے۔ رہے وہ غریب جو شریر الطبع فطرۃً ہوتے ہیں وہ بد باطن اُمراء کے پیرو ہو جاتے ہیں۔ مال دار بد معاش مفلس اوباشوں کا جتھا بنا لیتا ہے اور سب کا امام ہو جاتا ہے۔ نمبر سوئم کا اندیشہ ضرور غریب و امیر زیر دست اور بالا دست فقیر اور امیر سب کو ہوتا ہے بلکہ غریبوں کو اپنی غربت کی وجہ سے سوسائٹی سے نکالے جانے کا زیادہ اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن امیر کو اپنی جائیداد اور مال و منال سے محروم ہو جانے کا قوی خطرہ ہوتا ہے۔ قومی رسم و رواج اور سوسائٹی کے قواعد کی خلاف ورزی اکثر موروثی جاگیر و معافیات سے محروم کر دیتی ہے۔ پھر سوسائٹی سے ترکِ تعلق کا خوف سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے۔ الغرض صداقت کو قبول کرنے سے جو امور مانع ہوتے ہیں ان کا وجود بیشتر اُمراء اور اہلِ ثروت میں ہی ہوتا ہے۔ اسی لئے انبیائے حق اور مصلحین و مرشدین کی مخالفت یہی سب سے پہلے کرتے ہیں۔ حضرت نوح نے جب توحید کا ڈنکا بجایا تو سردارانِ قوم نے ہی سب سے پہلے مخالفت کی اور مندرجہ ذیل اوہام پیش کئے :۔

(۱) مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ یہ تمہاری طرح آدمی ہے۔ اعضائے جسمانی کی تعداد اور ساخت لوازم زندگانی کی ضروریات خواص بشری اور کوائف انسانی سے آلودگی کسی بات میں عام لوگوں سے ممتاز حیثیت نہیں رکھتا۔ چلتا ہے پھرتا ہے کھاتا ہے پیتا ہے غرض تمام ضروریاتِ انسانی کا محتاج ہے۔ صورت شکل میں بھی آدمی ہی ہے پھر خدا کا پیامبر ہونا کیسے ممکن ہے۔

(۲) يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ۔ یہ شخص چونکہ کوئی ممتاز پوزیشن نہیں رکھتا۔ طاقت، دولت، ثروت، خاندانی وجاہت، حکومت کچھ بھی اس کے قبضہ میں نہیں، اس لئے برتری کا خواستگار ہے۔ اپنے بلند مرتبہ کا جویاں ہے، اس لئے اس نے مصلح اور پیغمبر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔

(۳) وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ الخ۔ اگر ہماری ہدایت کے لئے پیامبر کا آنا ضروری تھا تو فرشتہ پیامبر ہو کر آتا۔ اس کو امتیازی شان بھی حاصل ہے۔ اس معمولی انسان کی رسائی خدا تک کیسے ہو سکتی ہے اور اس کے پاس اللہ کا پیام کیسے آ سکتا ہے۔

(۴) مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا۔ تم ہم کو توحید کی طرف بلاتے ہو اور قدیم مذہب کو ترک کرنے کی تلقین کرتے ہو۔ حالانکہ ہمارے اسلاف قدیمہ میں سے کوئی بھی ایک خدا کی پرستش نہ کرتا تھا۔ ہم نے تو توحید کا پیام اپنے گزشتہ بزرگوں سے کبھی نہیں سُنا (کیا وہ سب گمراہ تھے کیا ان کی سمجھ سے تمہاری سمجھ تیز ہے ؟)

(۵) تم دیوانے ہو گئے ہو تم کو جنون ہو گیا ہے جو ایسی بہکی بہکی نئی باتیں کہتے ہو۔ تمام دنیا کے عقل مندوں کے خلاف عقیدہ رکھنا اور عمل کرنا پاگلوں کا کام نہیں تو اور کیا ہے اس کے بعد اپنی قوم کی طرف خطاب کر کے کہنے لگے۔

فَتَرَبَّصُوْا اس آیت کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ نوح تم کو عذاب کی دھمکی دیتا ہے، تم کو انتظار کرنا چاہیئے کہ عذاب کب آتا ہے۔ یعنی نہ کوئی عذاب آئے گا اور نہ کچھ مصیبت نازل ہوگی یہ فقط دھمکی ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ نوح کو جنون ہو گیا ہے۔ جب تک جنون رہے گا یہ ایسی بکواس کرتا رہے گا۔ تم کچھ پرواہ نہ کرو اور دیکھو کہ اس کا پاگل پن کب دُور ہوتا ہے۔ جب دیوانگی جاتی رہے گی تو راہِ راست پر آ جائے گا۔ یا حِیْنٍ سے مراد ہے وقتِ موت یعنی نوح کی موت کا انتظار کرو۔ نوح مر جائے گا تو یہ بیہودہ وعظ بھی جاتا رہے گا۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ۔ الغرض جب قوم نوح کے کسی فرد کے مومن ہونے کی امید باقی نہ رہی تو وحی نازل ہوئی۔ اِنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ اے نوح جو لوگ تمہاری قوم کے ایمان لا چکے، لا چکے۔ آئندہ کوئی ایمان نہ لائے گا۔ تم ان کی بد اعمالیوں کا رنج نہ کرو حضرت نوح نے پیامِ الٰہی سن لیا تو دعا کی۔ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا پروردگار کافروں کی کوئی بستی زمین پر نہ چھوڑ۔ تیر نشانہ پر بیٹھ گیا۔ دعا قبول ہو گئی۔ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ۔ حکم ہوا کشتی پر ہر نوع کا جوڑا سوار کر لو اور اپنے اہل و عیال کو بھی بٹھا لو، مگر جو شخص بفیصلۂ ایزدی کافر ہے اس کو مت سوار کرنا۔ حضرت نوح نے حکم کی تعمیل کی۔ لیکن آپ کا بیٹا کنعان اور اس کی ماں نے کشتی پر سوار ہونے سے انکار کر دیا، طوفانِ عظیم آیا۔ حضرت نوح نے کنعان کو ڈوبتے دیکھ کر التجا کی پروردگار! یہ میرا بیٹا ہے۔ ارشاد ہوا یہ تیری اہل میں سے نہیں ہے۔ اس کے اعمال اچھے نہیں ہیں۔ خبردار ایسی جاہلانہ درخواست نہ کرنا۔

وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ظالموں کی نجات کے متعلق مجھ سے کوئی بات نہ کرنا۔ ان کو غرق ہونا ہے۔ نہ نعوذ قطعی ہو چکا ہے۔ یہ قطعاً غرق ہو جائیں گے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ۔ آیت مذکورہ میں حکم دیا گیا جانوروں کو اور اپنے اہل و عیال کو کشتی پر سوار کر لو، مگر عام اہلِ ایمان کو سوار کر لینے کا کوئی

تذکرہ نہ فرمایا۔ بات یہ ہے کہ اہل سے گھر والے اور بیوی بچے ہی مراد نہیں ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کنعان اور اس کی والدہ کو غرق نہ کیا جاتا بلکہ عام اہلِ ایمان ہی مراد ہیں۔ نبی کی اہلی اس کی فرماں برداری سے ہی ہوتی ہے۔ اگر گھر والے بھی فرماں بردار نہ ہوں تو نبی کا ان سے کوئی رشتہ اور تعلق نہیں۔ اسی بنا پر کنعان کو حکم اہل بیت سے خارج کر دیا گیا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ ۔ یعنی خشکی میں طوفانِ عظیم آنا اور کافروں کی تمام بستیوں کا غرق ہو جانا اور اہلِ ایمان کا نجات پانا اور اس طرح سے انواع کا سلسلہ باقی رکھنا اور کافروں کو ایک مدت دراز تک ڈھیل دینا اور آخر میں اہلِ حق کو فتح عطا کرنا ان تمام امور میں آیاتِ قدرت اور علاماتِ حکمت ہیں تاکہ غور کرنے والے غور کریں اور سمجھیں کہ اللہ کی آزمائش بہت طویل ہوتی ہے۔ خدا بہت زیادہ ڈھیل دیتا رہتا ہے۔ دنیوی آسائش و راحت کی فراوانی، مال و اولاد کی کثرت، عزت و حکومت اور صحت و قوت پر نازاں نہ ہونا چاہیئے۔ حق سے عدول کرنے اور صداقت سے مُنہ پھیرنے کا انجام تباہی ہے۔ آج نہیں تو کل تباہی آ سکے گی۔ یہ عیش و عشرت اور ناز و نعمت کے اسباب اور راحت و طرب کے ذرائع باقی نہ رہیں گے۔ نبی کی نافرمانی بلاخیز اور عذاب آفریں ہے۔ آن کی آن میں طوفانِ عظیم بپا کر دیتی ہے اور اللہ کی قدرت قاہرہ بھی غیر متناہی ہے، ہمہ گیر ہے، محیطِ کل ہے، اس کو ظاہری اسباب کی ضرورت نہیں۔

مقصودِ بیان رسولِ پاک اور گروہ اہلِ ایمان کو تسلی اور کافروں کی ایذا رسانی پر ثابت قدم رہنے کی ضمنی تلقین اور کفار کے بیہودہ شبہات اور لغو کلام سے رنجیدہ نہ ہونے کی در پردہ ہدایت اور اس امر کی طرف لطیف اشارہ کہ انبیائے سابقین اور ان کی کافر قوموں کا بھی باہم اسی طرح معاملہ رہا ہے۔ **قَالَ الْمَلَؤُا** کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ کفر و معصیت کے امام عموماً دولت مند ہی ہوتے ہیں۔ **مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ** کے الفاظ نقل کر کے اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ اہلِ ظاہر کی آنکھیں ظاہری حالات کو دیکھتی ہیں۔ ان کے نزدیک معیارِ فضیلت صرف دنیوی احوال کی برتری ہے۔ دولت، وجاہت، عزت، حکومت، نسب اور تسلط و سیادت ہی ان کے نزدیک مایہ الامتیاز چیزیں ہیں۔ ان کی چشم باطن کور ہوتی ہے۔ روحانیت، صداقت، حقانیت اور پاکیزگیٔ نفس کا ان کو شعور نہیں ہوتا اور نہ طہارت باطنی کو وہ قابلِ توجہ سمجھتے ہیں۔ مدعیانِ حق پر تہمت تراشیاں کرتے ہیں۔ اعلانِ صداقت کی غرض دنیوی ناپاک لالچ کو قرار دیتے ہیں۔ **فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ** کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے وہ غیبی قدرت کے زیرِ اثر ہوتا ہے، مگر قدرت کا ظہور ظاہری اسباب کی شکل میں ہوتا ہے۔ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیرونی اسباب کو چھوڑ کر انحصار صرف اللہ پر توکل رکھنا فطرت اور شریعت کی تعلیم کے خلاف ہے۔ حضرت نوح لیسے صاحب عزت نبی کو بھی کشتی بنانے کا حکم ہوا اور انواع کا سلسلہ قائم رکھنے کے لئے تمام بیشی نظر درندوں پرندوں چرندوں کا ایک ایک جوڑا لے کر سوار کرنے کی ہدایت کر دی گئی۔ خدا قادر تھا کہ بغیر کشتی کے بھی اہلِ حق کو اور تمام حیوانوں کو بچا لیتا یا ان کا نوعی سلسلہ قائم رکھتا، مگر نظامِ کائنات نظمِ قدرت کے تابع ہے۔ قدرت کا نظم یہی ہے کہ اسباب سے نتائج پیدا ہوتے ہیں، اس لئے ایسی ترکیب حضرت نوح کو بتائی گئی۔ پس کان کھول کر سُن لینا چاہیئے اور آنکھیں کھول کر دیکھ لینا چاہیئے اُن خانقاہ نشین صوفیوں اور مدرسہ گیر مولوی کو جو مادی طاقت کی فراہمی کو غیر ضروری بلکہ ناجائز کہتے ہیں اور اپنی پستی و بےحوصلگی کے مظاہرہ کا ذریعہ حکمِ شریعت کو قرار دیتے ہیں اور بغیر سمجھے ہوئے قانونِ قضا و قدر کی آڑ لیتے ہیں وغیرہ۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۚ فَاَرْسَلْنَا فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ

پھر اُن کے بعد اور اُمت پیدا کی اور اُنہی میں کا ایک رسول اُن کے پاس بھیجا (اور حکم دیا کہ) اللہ کی عبادت کرو

مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۧ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ

ع۲

جس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں کیا تم ڈرتے نہیں ہو اُن کی قوم کے وہ سردار بولے جنھوں نے کفر کیا تھا اور

كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ

ملاقاتِ آخرت کی تکذیب کی تھی اور دنیوی زندگانی میں ہم نے اُن کو آسودگی دی تھی یہ تو تمہارا ہی طرح انسان ہے جو تم

مِمَّا تَأْكُلُونَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُونَ ۝ وَلَئِنْ أَطَعْتُم بَشَرًا مِّثْلَكُمْ إِنَّكُمْ إِذًا

کھاتے ہو وہی یہ کھاتا ہے اور جو تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے اگر تم اپنے جیسے آدمی کی اطاعت کروگے تو نقصان قطعاً

لَّخَاسِرُونَ ۝ أَيَعِدُكُمْ أَنَّكُمْ إِذَا مِتُّمْ وَكُنتُمْ تُرَابًا وَعِظَامًا أَنَّكُم مُّخْرَجُونَ ۝

اٹھاؤ گے کیا یہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جاؤ گے تو (پھر قبروں سے) نکالے جاؤ گے

هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوعَدُونَ ۝ إِنْ هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا

بعید ہے بعید ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے بس ہماری تو یہی دنیوی زندگانی ہے مرتے ہیں اور جیتے ہیں (اس کے بعد)

نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا وَمَا نَحْنُ لَهُ بِمُؤْمِنِينَ ۝

ہم دوبارہ زندہ نہیں کئے جائیں گے یہ تو بس ایک آدمی ہے جس نے اللہ پر دروغ بندی کی ہے ہم تو اس کا یقین نہیں کریں گے

قَالَ رَبِّ انصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ۝ قَالَ عَمَّا قَلِيلٍ لَّيُصْبِحُنَّ نَادِمِينَ ۝ فَأَخَذَتْهُمُ

پیغمبر نے کہا میرے پروردگار میری مدد کر کیونکہ انھوں نے مجھے جھوٹا کہا ارشاد ہوا عنقریب یہ لوگ پشیمان ہوں گے چنانچہ سچے وعدہ کے

الصَّيْحَةُ بِالْحَقِّ فَجَعَلْنَاهُمْ غُثَاءً ۚ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝

موافق اُن کو ایک چیخ نے پکڑلیا اور ہم نے انکو خس وخاشاک بنادیا پس لعنت ہو ظالم لوگوں پر

تفسیر حضرت نوحؑ کی وفات کے بعد کچھ زمانے تک لوگ توحید پر قائم رہے جب امتدادِ زمانہ سے حالت بگڑ گئی تو ہدایت کے لئے نبی کو بھیجا گیا۔ نبی نے شرک کی ممانعت کی توحید کا حکم دیا اور عذابِ قیامت سے ڈرایا اور نیکوکاری کی ہدایت کی۔ جو لوگ بادۂ ثروت سے سرشار تھے وہ آگے بڑھے خود تو گمراہ تھے اپنے پیچھے چلنے والوں کو بھی گمراہ کیا۔ وہی بیہودہ کمزور بے بنیاد شبہات پیش کئے۔ رسول کی ظاہری حالت وشکل اپنی جیسی دیکھ کر لگے مخالفت کرنے اور دنیوی لالچ پر ریجھ کر قیامت کا بھی انکار کردیا۔ کہنے لگے ہڈیاں جب ریزہ ریزہ ہوجائیں گی تو پھر دوبارہ ان کا زندہ ہونا ناممکن ہے۔ یہ بات بعید از عقل ہے۔ دنیا کے بعد کوئی اور عالم نہیں نہ حشر ہے نہ محشر۔ یہ اللہ پر محض افتراء ہے۔ ہم ایسی احمقانہ بات کو ماننے والے نہیں۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو اس سے پہلے کافروں کا ہوا تھا۔ ایک غیبی دھماکے یا چیخ سے کافروں کا ستیاناس ہوگیا۔ بیخ وبن اکھڑ گئی، نسل منقطع ہوگئی، رونے والا بھی نہ رہا۔ یا للعبرۃ۔

تحلیلِ اجزاء فَأَرْسَلْنَا فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ یہ قصہ قوم نوح کے بعد کسی قوم کا ہے۔ آیت میں کسی قوم کی تعیین ابھی نہیں کی گئی ہے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک اس قوم سے ہود مراد ہے۔ کیونکہ سورۂ اعراف میں قوم ہود یعنی عاد کو قوم نوح کے بعد خلیفۂ ارض قرار دیا گیا ہے اور فرمایا ہے۔ وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ۔ لیکن اس قول پر شبہ وارد ہوتا ہے۔ ان آیات میں عذابِ صیحہ سے ہلاک ہونے کی صراحت ہے اور قوم عاد کو عذابِ صیحہ سے ہلاک نہیں کیا گیا بلکہ آندھی سے برباد کیا گیا۔ اس شبہ کی بنا پر بعض مفسرین نے قوم ثمود مراد لی ہے، مگر ہوسکتا ہے کہ قوم عاد پر دونوں عذاب آئے ہوں۔ دھماکے سے بھی ان کو ہلاک کیا گیا ہو اور آندھی سے بھی۔ بہرحال آیت میں کوئی تعیین نہیں۔ ممکن ہے کہ عاد وثمود کے علاوہ کوئی اور قوم مراد ہو۔ واللہ اعلم۔

وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ یعنی عقیدہ کے اعتبار سے تو وہ قیامت کا انکار کرتے تھے اور دولت کے نشہ میں اتنے بدمست تھے کہ مال ومنال کی فراوانی ہی کو

انہوں نے معیار بزرگی قرار دے رکھا تھا۔ اس بنا پر نبی کو بھی خیال میں نہ لاتے تھے۔ ان کے نزدیک نبی کا مادرائے بشر ہونا ضروری تھا۔

لَیَقُوْلُ كُفْرًا اَنَّكُمْ اِذًا مِّتُّمْ بدمست کافروں نے نبی کی نبوت کے انکار پر دو ہی دلیلیں پیش کی ہیں۔ اوّل تو نبی کی ذات پر حملہ کیا اور ان ہی کی شکل و حالت کو دیکھا کہ فضیلت نبی کا انکار کر دیا کیونکہ مرشد کے اندر کوئی امتیازی شان اور نمود، وصف ضرور ہونا چاہیئے اور باطنی خصوصیات کو دیکھنے کی اُن کی آنکھوں میں طاقت نہ تھی جب بزعم خود نبی کو ناقابل نبوت قرار دے چکے تو مزید ثبوت میں نبی کا قول پیش کیا اور کہنے لگے دیکھو اگر یہ نبی ہوتا تو ایسی جاہلانہ بات کیوں کہتا۔ اللہ پر بہتان تراشی نبی کا شیوہ نہیں اور یہ شخص خدا پر دروغ بندی کر رہا ہے اور حشر و نشر کو ضروری قرار دیتا ہے۔ ایسا بدیہی البطلان قول نبی کی زبان سے کیسے نکل سکتا ہے۔ مرنے کے بعد جینے کے معنی ہی کیا ہیں۔ آدمی مر کر مٹی میں مل گیا پھر کیسے بعثت ثانیہ ہو سکتی ہے۔ اس کی یہ تہدید کس قدر فہم انسانی سے دُور ہے۔

نَمُوْتُ وَنَحْيَا اکثر مفسرین نے اس فقرہ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ بس کسی کا پیدا ہونا اور کسی کا مرنا یعنی موت و حیات کی کشمکش ہے۔ یہی دنیوی زندگانی ہے۔ اس کے بعد کوئی زندگی نہیں۔ شاید یہ مطلب بھی ہو کہ دنیوی زندگانی کے سوا کوئی زندگانی نہیں، عذاب و ثواب سب کچھ یہیں ہوتا ہے۔ آدمی مرتا ہے اور مر کر دوبارہ یہیں پیدا ہوتا ہے۔ یعنی عذاب ثواب کے لئے تناسخ اور آواگون کا سلسلہ جاری ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا روز حشر نہ ہوگا جس میں اجسام بوسیدہ کو پھر دوبارہ پیدا کیا جائے اور روح اسی جسم عنصری مادی کے ساتھ پھر اُٹھے۔ واللہ اعلم۔

بِالْحَقِّ - یعنی عذاب سے ان کو ہلاک کر دینا عدل کے خلاف نہ تھا۔ قوم سرکش پر ظلم و ستم نہ تھا بلکہ وہ لوگ اسی کے مستحق تھے۔

فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ - قوم ظالم سے مراد اگرچہ قوم ہود یا قوم عاد ہے، مگر در پردہ تمام ظالموں اور کافروں کو حکم ہے کہ تم یقینی طور پر اللہ کی پھٹکار کے مستحق ہو۔ اللہ کی بارگاہ تک تمہاری رسائی نہیں ہو سکتی۔ شرک و کفر کے ساتھ قرب الٰہی کا دعویٰ بے حقیقت ہے۔

مقصود بیان

قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ - کا لفظ دلالت کر رہا ہے کہ قوم عاد میں جو نبی مبعوث ہوئے تھے وہ عاد ہی کی قوم کے تھے کوئی اجنبی نہ تھے۔ انبیاء کی تکذیب اور حق کی مخالفت میں پیش قدمی کرنے والے عموماً وہی لوگ ہوتے ہیں جن میں جاہ و اقتدار پائے جاتے ہیں۔ قوم کی سیادت اور وجاہت کے مالک ہوتے ہیں، کافر ہوتے ہیں، حشر نشر کے منکر ہوتے ہیں اور مال دار ہوتے ہیں۔ گویا جن لوگوں کو اپنی سیادت کے ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور قیامت پر اُن کا یقین ہو اور غربت مالی بھی دلگیر نہ ہو وہ آسانی کے ساتھ حق کو قبول کر لیتے ہیں۔ جن کے دل سیاہ، روحیں مُردہ اور باطن کور ہوتے ہیں ان کو ظاہری اسباب تفوق کے سوا حقیقی معیار فضیلت نظر نہیں آتا۔ وہ روح کی پاکیزگی دل کی روشنی اور اندرونی اخلاق کی بلندی سے ناواقف ہوتے ہیں۔ دولت، صحت، حکومت، عزت، سیادت وغیرہ آزمائشی چیزیں ہیں۔ اللہ ڈھیل دیتا رہتا ہے، مگر اللہ کی ڈھیل امتحانی ہوتی ہے۔ بالآخر سخت ترین گرفت کر لی جاتی ہے۔ اشخاص و اقوام کا انقلاب، باطل و حق کا مقابلہ پھر حق کا ظہور اور باطل کی شکست، انبیاء کی فتح اور ان کے حریفوں کی تباہی اہل نظر کے لئے عبرت انگیز ہے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ ۝ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝

پھر اُن کے بعد ہم نے اور اُمتیں پیدا کیں کوئی گروہ اپنی میعاد سے نہ آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے

ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ۭ كُلَّمَا جَاۗءَ اُمَّةً رَّسُوْلُهَا كَذَّبُوْهُ فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا وَّجَعَلْنٰهُمْ

پھر ہم نے اپنے پیغمبر لگاتار بھیجے جب کبھی کسی اُمت کے پاس اُس کا رسول گیا انہوں نے اُسکو جھوٹا سمجھا غرض ہم بھی ایک کے پیچھے ایک کو ہلاک کرتے گئے

اَحَادِيْثَ ۚ فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ ثُمَّ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى وَاَخَاهُ هٰرُوْنَ ڏ بِاٰيٰتِنَا وَ

اور ہم نے انکو کہانیاں بنا دیا پس لعنت ہو بے ایمان قوم پر پھر ہم نے موسیٰ کو اور اس کے بھائی ہارون کو اپنے معجزات اور واضح دلیل دے کر

سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ۝ فَقَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ

فرعون اور اُس کے سرداروں کے پاس بھیجا مگر وہ مغرور بن گئے اور وہ تھے ہی سرکش لوگ کہنے لگے کیا ہم ایمان لائیں

لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ۝ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا

کے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں باوجودیکہ انکی قوم ہماری خدمتگار ہے غرض انہوں نے موسیٰ و ہارون کی تکذیب کی اور تباہ کر دیئے گئے اور ہم نے موسیٰ کو

مُوْسَى الْكِتٰبَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ

کتاب عطا کی تاکہ وہ لوگ ہدایت پائیں ابن مریم کو اور اُن کی ماں کو ہم نے نشانی بنایا اور ایک اونچی ہموار چشمہ دار زمین میں ان دونوں کو رہنے کو جگہ دی تھی

تفسیر حضرت نوح کے بعد صرف ایک پیغمبر کا تذکرہ فرمایا تھا۔ مشار الیہ پیغمبر کے بعد ہزاروں پیغمبر آئے اور جس کام پر مامور تھے اس کو انجام دیا اور قوم نے ان کی تکذیب و مخالفت کی۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ کا عظیم الشان دور آیا۔ آپ بڑے جلیل القدر نبی تھے چونکہ آپ کو مستقل کتاب عطا کی گئی تھی اور ایک کثیر التعداد مظلوم قوم کی نجات کے لئے مبعوث کیا گیا تھا، اس لئے انبیاء کے مجمل تذکرے کے بعد آپ کا خصوصیت کے ساتھ صراحۃً کیا گیا۔ حضرت موسیٰ کے بعد بھی بہت سے پیغمبر ہوئے، مگر توریت پر سب کے سب عمل کرتے رہے، چھوٹے بڑے صحیفے نازل ہوتے رہے، مگر کوئی مستقل شریعت نازل نہ ہوئی۔ بالآخر حضرت عیسیٰ پر اسرائیلی نبوت کا سلسلہ ختم ہوا اور مسیح نے بڑی شان کے ساتھ تبلیغ شروع کی، مگر کفار نے باوجود واضح معجزات کے مخالفت کی اور آپ ترک وطن پر مجبور ہوئے۔

ان تمام آیات میں مندرجہ ذیل امور قابل غور ہیں: (۱) مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء آئے اور مختلف قوموں میں۔ کسی ملک کسی قوم اور کسی سمت کی تخصیص نہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ صرف ملک شام، عراق یا مصر و فلسطین میں ہی انبیاء گزرے ہیں اور ہندوستان، چین، ایران، روم، افریقہ وغیرہ میں کوئی نبی نہیں پیدا ہوا غلط ہے۔ (۲) ہر اُمت نے پیغمبر وقت کی تکذیب و مخالفت کی ہے۔ خیر و شر اور حق و باطل کا مقابلہ ہمیشہ سے چلا آیا ہے اور انجام کار اہل حق کو فتح ہوتی ہے، مگر اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کسی قوم کی ہلاکت مقررہ معینہ مدت سے پہلے ہو گئی۔ عذاب آئے، غیبی سزائیں دی گئیں، مگر ہلاکت اسی وقت ہوئی جس وقت ازل میں مقرر ہو چکی تھی گویا شرک و معاصی سے اشخاص و اقوام کی مدت زندگانی کوتاہ نہیں ہو جاتی۔ باقی آیات کی مزید توضیح ہم ذیل میں کرتے ہیں۔

تحلیل اجزاء قُرُوْنًا اٰخَرِيْنَ سورۂ اعراف میں عاد کے بعد صالح، لوط، شعیب، یونس اور ایوب وغیرہ کا تذکرہ ہے، اس لئے بعض مفسرین نے سمجھ لیا کہ قرونا آخرین سے انہی انبیاء کی اُمتیں مراد ہیں، مگر اس حصر کی کوئی وجہ نہیں۔ ابراہیم، اسحاق، یعقوب اور ان پیغمبروں کے علاوہ جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے اور بھی بہت سے پیغمبر اور ان کی اُمتیں گزری ہیں۔ بلا وجہ حصر تخصیص آداب تفسیر کے خلاف ہے۔

فَمَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا۔ اُمت سے مراد یا تو گروہ اور قوم ہے یا افراد و اشخاص۔ دونوں صورتوں میں مطلب ایک ہی ہے کہ جس قوم یا جس شخص کی جو مدت زندگانی خدا نے مقرر کی ہے وہ ضرور پوری ہوتی ہے۔ غیبی حوادث جو موجب ہلاکت ہوتے ہیں وہ مقررہ زندگانی کو قبل از وقت قطع نہیں کرتے اور نہ مدت معینہ سے زائد کوئی باقی رہ سکتا ہے۔

تنبیہ اہل سنت کے نزدیک موت ایک ہی ہے۔ کوئی شخص بیماری سے مرے یا کسی ناگہانی حادثہ سے یا قتل کیا جائے یا دریا میں ڈوب جائے۔ بہرحال وہ اپنے وقت مقررہ پر مرتا ہے، قبل از وقت نہیں مرتا۔ جتنی زندگانی اس کے لئے مقرر کر دی گئی ہے اتنی وہ پوری کرتا ہے۔ ہاں معتزلہ و شیعہ فرقہ کے نزدیک دو اجلیں ہیں۔ ایک مقررہ ایک ناگہانی۔ مقتول کو اگر قاتل قتل نہ کرتا تو وہ دوسری اجل تک رہتا۔ قاتل اس کی زندگی کاٹ دیتا ہے اور مقررہ اجل تک نہیں پہنچنے دیتا۔ یہی اس کا جرم ہے۔ اس فرقہ کے نزدیک آیت میں اجل سے مراد آخری اجل ہے۔ پہلی اجل سے تو تقدیم تاخیر ہو سکتی ہے، مگر معتزلہ کا یہ قول بالکل غلط ہے کیونکہ اگر کوئی شخص ہیضہ، طاعون وغیرہ سے مر گیا تو کیا ہیضہ، طاعون وغیرہ کو مجرم مقتل قرار دیا جائے گا یا اگر پاؤں پھسل کر مر گیا تو پاؤں کا قصور کہا جائے گا۔ بات صرف یہ ہے کہ مقتول ہو یا کسی معمولی بیماری سے مرنے والا

یا اچانک حادثہ سے مرنے والا سب کی موت ایک ہی ہے اور بحکم الٰہی مقررہ وقت پر آتی ہے۔ مگر اسباب مختلف ہوتے ہیں۔ اگر کوئی انسان کسی کی موت کا سبب بن گیا تو چونکہ ذی ہوش، باعقل اور صحیح الحواس ہے اس لیے مجرم کہا جاتا ہے اور کوئی بے عقل جانور یا مخبوط الحواس انسان یا کوئی مرض سبب ہلاکت ہوتا ہے تو اس کو مجرم نہیں قرار دیا جاتا۔

كُلَّمَا جَاءَ أُمَّةً یعنی ہر اُمت نے اپنے پیغمبر کی تکذیب کی۔ اس میں رسول پاکؐ کو تسلی ہے کہ قریش یا اہل مکہ یا عرب کے باشندے جو آپ کی تکذیب کر رہے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ باطل پرست گروہ ہمیشہ حق اور صداقت کی مخالفت کرتا چلا آیا ہے اور ہر اُمت نے اپنے نبی کی تکذیب کی ہے۔

فَأَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا اس فقرہ کا مطلب دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ ہم نے ایک کے بعد دوسرے قرن کو پے در پے ہلاک کیا۔ دوسرا یہ کہ پہلی اُمت کی طرح دوسری امت کا بھی تکذیب میں وہی حال رہا اور سب کفار ایک ہی دستور پر عمل کرتے رہے۔ اوّل معنی اولیٰ ہے۔

وَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ یعنی ان کا ایسا ستیاناس کیا کہ کوئی نشان باقی نہ رہا۔ قصے اور تذکرے رہ گئے۔

فَبُعْدًا لِقَوْمٍ جو لوگ اللہ، اس کے رسول، روزِ قیامت اور ضروریات دین پر ایمان نہیں رکھتے وہ رحمتِ الٰہیہ کے دائرہ تک آخرت میں نہیں پہنچ سکتے، ان کو کبھی نجات و سعادت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہمیشہ اللہ کی پھٹکار میں رہیں گے۔

بِآيَاتِنَا وَسُلْطَانٍ مُبِينٍ ابن عباسؓ کے نزدیک آیات سے مراد معجزات اور سلطان مبین سے مراد کوئی خاص آیت ہے۔ بعض کا قول ہے کہ آیات سے مراد تو وہی معجزات ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے اور سلطان مبین سے یہ مراد ہے کہ یہ معجزات موسیٰ اور ہارون کی نبوت پر بکلّم کھلا دلالت کر رہے ہیں۔ میرے نزدیک زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ معجزات کے علاوہ حضرت موسیٰ کو ایک خاص شان اور مخصوص ہیبت و وقار عطا کیا گیا تھا جس کی وجہ سے فرعون اور اس کے اسٹاف کو ہمت نہ ہوتی کہ آپ کو قید کر سکتا یا کسی اور طرح کی جسمانی ایذا پہنچانے کی ہمت کر سکتا۔ یہی جلالت، شان اور وقار تھا جس نے بنی اسرائیل کو سخت ترین احکام کی تعمیل پر مجبور کیا اور با دلِ ناخواستہ وہ ان احکام کو مانتے رہے۔ یہاں تک کہ گوسالہ پرستی کی سزا میں بحکم موسیٰ آپس میں ایک دوسرے کو بغیر رعایت کے قتل کیا ورنہ بنی اسرائیل بہت ہی نافرمان اور سخت دل تھے۔ اگر موسیٰ کو خاص جلالت و ہیبت عطا نہ کی جاتی تو محض معجزات دیکھ کر وہ صداقت کے اقرار پر آمادہ نہ ہوتے۔

امام رازی نے آیت مذکورہ کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ موسیٰ اور ہارون دونوں کو آیات (یعنی نو معجزات) عطا کئے گئے تھے۔ میرے نزدیک امام کا یہ استخراج مبنی بر صحت نہیں۔ کیونکہ کسی نقل قرآن و حدیث سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے معجزات میں شریک تھے۔ اگر موسیٰ کے ہاتھ میں چمکتا ہوا اجالا تھا تو ہارون کے ہاتھ میں بھی تھا۔ اگر موسیٰ کی لاٹھی سانپ بن جاتی تھی تو ہارون کی لاٹھی بھی سانپ بن جاتی تھی۔ اگر موسیٰ نے لاٹھی مار کر دریا کے پانی کو خشک کر دیا تھا تو ہارون نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ نقل کی مخالفت کے علاوہ عقل و درایت کے بھی خلاف ہے کہ جو معجزہ موسیٰ کا تھا وہی ہارون کا تھا۔ کیونکہ اصل پیغمبر موسیٰ تھے۔ موسیٰ کی دعا سے ہارون کو بھی پیغمبر بنایا گیا تھا لہٰذا گویا ہارون ذیلی نبی تھے۔ پھر معجزات میں موسیٰ کے ساتھ ہارون کی شرکت کیسے ہو سکتی تھی۔ بات یہ ہے کہ معجزات موسوی سے جس طرح حضرت موسیٰؑ کے قول کی تصدیق ہوتی تھی اسی طرح حضرت ہارون کے قول کی بھی تائید ہوتی تھی۔ اسی لئے فرمایا کہ موسیٰ اور ہارون دونوں کو معجزات دے کر ہم نے بھیجا۔ نتیجۂ معجزہ دونوں کے حق میں ایک تھا۔

إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ صرف فرعون اور اس کے اسٹاف کا تذکرہ اس لئے کیا کہ عام قبطی اپنے سرداروں کے تابع ہی تھے۔ سرگروہ طبقہ کو تبلیغ کرنی گویا پوری قوم کو تبلیغ کرنی تھی۔ پھر حضرت موسیٰ کی بعثت کی اصل غرض بنی اسرائیل کی نجات تھی۔ قبطیوں سے اس کا کوئی خاص تعلق نہ تھا۔

وَكَانُوا قَوْمًا عَالِينَ حکومت، عزت، ثروت اور بالادستی انسان کو مغرور بنا دیتی ہے۔ قوم فرعون بالادست تھی۔ مصر میں اس کی حکومت تھی، پوری تجارت و زمینداری اس کے قبضہ میں تھی۔ بنی اسرائیل محکوم، ذلیل، خوار اور مزدور تھے۔ زیردستی اور بالادستی کے تفرقہ نے قوم فرعون کو مغرور بنا دیا تھا۔ غریب اسرائیلیوں پر وہ طرح طرح سے ظلم کرتے تھے۔ اسی غرور و استعلاء کے نشہ سے چور ہو کر انہوں نے کہا کہ:-

وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ موسیٰ و ہارون کے جسمانی اعضاء، ساخت، صورت، لوازم زندگی اور ضروریاتِ حیات ہماری طرح ہیں۔ پھر اس پر مزید یہ ہے کہ ان کی قوم ہماری پرستار ہے یعنی وہ ہمارے غلام ہیں، ان کا کام ہماری خدمت ہے (عبادت سے مراد دینی عبادت نہیں کیونکہ بر بنائے تحقیق بنی اسرائیل نے فرعون کو کبھی رب نہیں کہا اور نہ کبھی اس کی الوہیت کا اقرار کیا بلکہ پرستاری سے مراد ہے غلامی اور ہر وقت کی خدمتگاری)

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ جب فرعون اور اس کا لشکر ہلاک ہو گیا اور بنی اسرائیل کو ظالموں کی قید سے نجات مل گئی اور حضرت موسیٰ ان کو ساتھ لے کر چل دئے اور قانونِ عدل کے اجراء کا وقت آ گیا تو حضرت موسیٰ نے اپنی وفات کے وقت توریت کو ایک صندوق میں رکھوا دیا (دیکھو توریت سفر استثناء ۳۱ باب ۲۴ درس) اصل توریت کچھ

زمانہ تک باقی رہی پھر بنی اسرائیل کے فتنہ و فساد اور ہر ج و مرج میں برباد ہو گئی) حضرت سلیمانؑ نے جب تابوت کھولا تو تراشے ہوئے دو پتھر رکھے ہوئے تھے مذکور (دیکھو کتاب اوّل سلاطین ۸ باب ۹ درس) اس سے ثابت ہوا کہ حضرت موسیٰ کے بعد جو کتاب بنام توریت تصنیف کی گئی جس میں حضرت موسیٰ کے سترہ حافظ ہیں وہ اصل توریت نہیں ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس میں توریت کے بعض احکام یا بعض معانی والفاظ بھی ہوں۔ اسی بنا پر اہل اسلام بھی اس توریت کو کہتے ہیں، لیکن تحریف شدہ جانتے ہیں۔

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً ۔یہاں سے حضرت عیسیٰ کے قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ مریم کا احوال زندگی اور مسیحؑ کے معجزات وغیرہ آیت میں نہیں بیان کئے صرف اتنی بات بتائی کہ مسیح اور ان کی والدہ کو اللہ نے ایک عظیم الشان نشانی بنایا تھا ظاہر ہے کہ حضرت مریم دوشیزہ مدالو عفیفہ تھیں۔ بغیر قربت مرد کے ان کے بطن سے بچہ کا پیدا ہونا عام ضابطۂ تولید کے خلاف تھا۔ پھر مسیح بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں اپنی ماں کی پاک دامنی اور خدا کی وحدانیت والوہیت کی شہادت دی۔ یہ بھی قدرت کی عجیب ترین نشانی تھی۔ جمہور مفسرین نے آیت کی یہی تفسیر کی ہے۔

إِلَىٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ ۔ ربوہ کے معنی ہیں ٹیلہ اور ذات قرار سے مراد ہے سرسبز اور معین سے مراد ہے شاداب جہاں پانی بکثرت ہو۔ مطلب یہ کہ مریم و عیسیٰ کی قرارگاہ ایسے ٹیلہ کو بنایا جو سرسبز تھا جہاں قسم قسم کی سبزیاں خوب و نفیس پیداوار اچھی تھی اور پانی بھی بہت تھا۔ جابجا چشمے اور تالاب تھے (مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، قتادہ اور ابن عباس نے یہی تفسیر کی ہے) رہی یہ بات کہ ٹیلہ کہاں تھا اور مریم اپنے بچہ کو لے کر وہاں گئی تھیں ۱۹ انجیل متی دوسرے باب تیرھویں درس میں صراحت ہے کہ جب بنی اسرائیل مسیح اور ان کی والدہ مریم کے دشمن ہو گئے تو مریم کا چچازاد بھائی یوسف نجار مریم و مسیح کو لے کر ہیرودیس حاکم یروشلم کے خوف سے مصر کو چلا گیا اور تینوں حضرات سالہا سال وہاں رہے۔ مصر بہت سرسبز شاداب ملک ہے، دریائے نیل وہاں جاری ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ربوہ سے رملہ مراد ہے (رملہ ملک مصر میں ایک خاص جگہ ہے) بعض اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ رملہ فلسطین میں کوئی خاص مقام ہے، لیکن سعید بن مسیب رضؓ عبداللہ بن سلام رضؓ حسن بصری رضؓ زید بن اسلم رضؓ خالد بن معدان رضؓ کا قول ہے کہ ربوہ سے مراد دمشق ہے۔ مجاہد نے کہا مراد غوطۂ دمشق ہے۔ قتادہ اور ضحاک کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس مراد ہے۔ میرے نزدیک صحیح ترین قول یہ ہے کہ مصر مراد ہے۔ اسرائیلی روایات بھی اسی کے موافق ہیں۔ واللہ اعلم۔

مقصودِ بیان

ہر قوم کا عروج و زوال اور ترقی و تسفل مقدر ہے۔ نافرمانی اور کفر سے مدت بقا میں کوتاہی نہیں پیدا ہوتی نہ سرکشی و طغیان سے ہلاکت قریب آجاتی ہے، مگر وقت مقررہ پر بربادی ہوتی ہے اور یہی مقررہ پاداش ہوتی ہے۔ ہاں اُخروی سعادت و نجات سے مایوسی اور رحمت خداوندی سے محرومی ضرور کفر و معصیت کا نتیجہ ہے۔ پے در پے انبیاء کا مبعوث ہونا اور ہر نبی سے اس کی اُمت کا سرکشی کرنا تاریخ کا مسلم الثبوت مسئلہ ہے۔ حضرت موسیٰ کو معجزات کے علاوہ ایک خاص جلال اور رعب بھی عطا کیا گیا تھا جس کو سلطان مبین کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ فرعون اور اس کی قوم بالادست تھی، اسی لئے غرور و نخوت کے نشہ سے سرشار تھی۔ مریم اور مسیح قدرت کی نشانیوں میں سے ایک عظیم الشان نشان تھے۔ مسیح کے معجزات کمالات اور محیر العقول کارنامے تو مشہور ہی ہیں۔ البتہ مریم کی اعجوبہ زائی سوائے اس کے کچھ نہ تھی کہ ان کے بطن سے مسیح بغیر قربت مرد کے پیدا ہوئے تھے۔ گویا آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ۖ إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ○ وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ

اے پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال کرو جو کچھ تم کرتے ہو میں بلاشبہ اس سے بخوبی واقف ہوں تم سب کا واقعی یہ ایک ہی

أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ○ فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ

مذہب ہے اور میں تمہارا رب ہوں لہٰذا مجھ سے ڈرو مگر لوگوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا ہر گروہ اُس سے خوش ہے جو اُس کے پاس

فَرِحُونَ ○ فَذَرْهُمْ فِي غَمْرَتِهِمْ حَتَّىٰ حِينٍ ○ أَيَحْسَبُونَ أَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهِ مِنْ مَالٍ وَبَنِينَ ○

ہے (اے نبی) تم اُن کو اُن کی غفلت میں ایک وقت تک رہنے دو کیا یہ لوگ خیال رکھتے ہیں کہ ہم جو مال و اولاد سے ان کی مدد کئے جاتے ہیں

نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ ۚ بَل لَّا يَشْعُرُونَ ○ إِنَّ الَّذِينَ هُم مِّنْ خَشْيَةِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ ○

تو ان کی بھلائیوں میں جلدی کر رہے ہیں بات یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے نہیں جو لوگ اپنے پروردگار کے خوف سے ڈرتے ہیں

وَالَّذِينَ هُم بِآيَاتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُونَ ○ وَالَّذِينَ هُم بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُونَ ○ وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا

اور جو اپنے پروردگار کی آیتوں کا یقین رکھتے ہیں اور جو اپنے رب کا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے اور وہ لوگ کہ جو کچھ دیتے ہیں ایسی

آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ ○ أُولَٰئِكَ يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُونَ ○

حالت میں دیتے ہیں کہ اُن کے دل اس بات سے ترساں ہوتے ہیں کہ انکو اپنے رب کے پاس لوٹ کر جانا ہے ایسے لوگ نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور انہی کی طرف سبقت...!

تفسیر ابتدائے آفرینش سے ایک فطری ہدایت عالم میں جاری ہے اور اسی کا پیام لے کر تمام انبیاء و مرسلین اس جاہل انسان کی رہنمائی واصلاح کے لئے آئے ہیں یعنی ہر نبی نے آکر توحید کی تعلیم دی۔ روزِ آخرت کے عذاب سے ڈرایا، نیک اعمال کی ترغیب دی، لیکن اس دنیا میں ہوا و ہوس کا شیطانی جال پھیلا ہوا ہے جس کا ہر حلقہ انسان کو جکڑنے کے لئے کافی ہے۔ کمزور عقل والے آدمی کا قول و عمل اور فکر اس جال کے پھندوں میں پھنسا ہوا ہے۔ جال کے پھندے جدا جدا نوعیت کے ہیں، لیکن سب سے بڑا پھندہ حُبِّ مال کا ہے۔ مالی محبت انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ اسی کو وہ برکات و راحت کا سرچشمہ، عیش و طرب کا خزانہ، ترجیح و امتیاز کی کان اور تفوق و برتری کا گنجینہ سمجھتا ہے۔ مال کی فراوانی اور دولت کی بہتات ہر شخص کے پیشِ نظر ہے۔ کثرتِ مال کے بعد آدمی کو کثرتِ اولاد کی تمنا ہوتی ہے۔ مخصوصاً نرینہ اولاد کی کثرت تو بہت ہی غرور انگیز ہوتی ہے۔ حُبِّ اولاد کا پھندہ بھی ایسا مضبوط ہے کہ جب دل اس میں گرفتار ہو جاتا ہے تو خیر و شر اور حق و باطل کا امتیاز جاتا رہتا ہے۔ عقل و بصیرت کی فضا میں پرواز کرنا پھر نصیب نہیں ہوتا۔ مذکورۂ بالا دونوں حلقے خصوصیت کے ساتھ ہر آدمی کے لئے قوت آزما ہوتے ہیں۔ جو شخص ان میں گرفتار ہو جاتا ہے وہ حلال و حرام کا فرق، پاک و ناپاک کا امتیاز اپنے دل سے کھو دیتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، مکاریاں کرتا ہے، دغا فریب کرتا ہے، طرح طرح کی بداعمالیوں کا مرتکب ہوتا ہے، مگر حُبِّ مال و اولاد کا پردہ اس کی بصیرت پر چونکہ پڑا ہوتا ہے، اس لئے اس کو اپنی بداعمالیاں اور طریق اکتساب کی خرابیاں نہیں سوجھتیں۔ تیسرا حلقہ جس میں بیشتر گروہ کے قلوب گرفتار ہیں فرقہ بندی کا ہے۔ ہر شخص اپنے گروہ اور اپنے آبائی فرقہ کو برحق جانتا اور اس کی جنبہ داری کرتا ہے۔ اس کو اپنے فرقہ کے عقائد و اعمال کی کمزوری اور غلطی کا احساس کبھی نہیں ہوتا۔ اعتقادیات ہوں یا عملیات، رسمیات ہوں یا عبادات سب کچھ اپنے فرقہ کے اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ اس تفرقہ نے آدمی کی آنکھوں کو اندھا کر دیا، حق و ناحق کا معیار زائل کر دیا۔ خیر و شر میں امتیاز کرنے کی قوت کو کھو دیا، ہوا و ہوس کی ان تینوں بندشوں کو دور کرنے کے لئے انبیاء مبعوث ہوئے۔ ان کو حکم دیا گیا کہ دنیوی زندگانی میں کھانا پینا پہننا اور لوازم زندگی کو کام میں لانا تو ضروری ہے، مگر حرام و حلال کا فرق اور پاک و ناپاک کا امتیاز بھی اشد ضروری ہے۔ مالی ہوس میں پھنس کر نفس کو مطلق العنان چھوڑ دینا اور اپنے جائز حق سے آگے بڑھ کر پرائے حق پر بغیر کسی استحقاق کے دست درازی کرنی جائز نہیں۔ پھر یہ بھی زیبا نہیں کہ اولاد کی محبت یا کسی اور سبب سے انسان بدکاریوں کا ارتکاب کرے۔ اندرونی و بیرونی گناہوں کے جال میں پھنس جائے۔ ہر قول و عمل میں نیکی اور اچھائی کا لحاظ رکھنا لازم ہے۔ ہر حرکت و سکون میں بدی سے پرہیز رکھنا ضروری ہے۔ رہا قومی تفرقہ اور فرقہ بندی کا تعصب تو یہ بھی انتہائی لغو چیز ہے۔ دین عالم میں ایک ہی ہے شاخیں خواہ لاکھوں ہوں، مگر جڑ ایک ہی ہے۔ ایک ہی خدا ہے ایک ہی اُس کا دین ہے۔ توحید کا عقیدہ اور قیامت و رسالت کا اقرار تمام مذاہب کا سنگِ بنیاد ہے۔ ایک اللہ کی پرستش لازم ہے۔ بس بابرکت ہیں وہ لوگ جنہوں نے ان تینوں نصیحتوں پر عمل کیا، اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا۔ اسی کی عبادت پر قائم رہے۔ ہر وقت اس کے عذاب کا خوف رکھا۔ مالی محبت کو دل پر مسلط نہ ہونے دیا۔ جو کچھ خدا نے ان کو دیا بقدر امکان انہوں نے اس کو اللہ کی راہ میں صرف کیا اور قبول ہونے نہ ہونے کا اندیشہ پھر بھی ہر وقت کرتے رہے۔ یہی گروہ حامل برکات ہے اور یہی فرقہ نیکیوں کی طرف دوڑنے والا ہے۔

تحلیل اجزاء **يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ**۔ مذکورۂ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر زمانہ کے کافر اپنے وقت کے پیغمبر کو اپنا ایسا انسان اور ضروریاتِ زندگی کا اپنی طرح محتاج بلکہ فریفتہ سمجھتے تھے۔ ان کی نظر کوتاہ تھی، اس لئے ان کو امتیازی معیار نظر نہ آتا تھا۔ اس آیت میں انبیاء کا خصوصی شعار اور عام لوگوں سے ممتاز کرنے والا

درجہ ظاہر فرماتا ہے۔ زجاج کا قول ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ سے خطاب رسول پاکؐ کو ہے۔ ابن کثیر کے نزدیک حضرت عیسیٰ کو خطاب ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ رسول پاکؐ کو وہ پیام سنایا گیا ہے جو ہر زمانہ میں ہر نبی کو دیا گیا تھا۔ گویا مطلب یہ ہے کہ ہم نے گزشتہ انبیاء سے کہہ دیا تھا کہ اے پیغمبرو پاکیزہ روزی کھانا الخ۔

كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ۔ شوافع کے نزدیک طیبات سے مراد لذیذ اور پاکیزہ غذائیں ہیں۔ احناف کے نزدیک حلال روزی مراد ہے خواہ لذیذ ہو یا نہ ہو۔ سعید بن جبیر اور ضحاک کا یہی قول ہے۔ ایک مرد حسن بصری نے فرمایا خدا کی قسم اللہ نے زردی، سرخی یا شیرینی اور ترشی کا حکم نہیں دیا بلکہ یہ حکم دیا کہ حلال چیزیں کھاؤ۔ اس قول سے بھی احناف کی تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ ابن ابی حاتم نے مرفوع حدیث بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ ام عبداللہ بنت شداد بن اوس نے خدمت گرامی میں ایک پیالہ دودھ بھیجا کہ حضورؐ اس سے افطار کر لیں کیونکہ سخت گرمی تھی اور حضورؐ کا روزہ تھا۔ حضورؐ نے قاصد کو (مع دودھ کے) واپس کر دیا اور فرمایا کیا بکری تیری ہے؟ ام عبداللہ نے دوبارہ عرض کرایا حضور بکری میری ہی ہے، خاص اپنے مال سے خریدی ہے۔ یہ سن کر حضورؐ نے دودھ نوش فرمایا۔ دوسرے روز ام عبداللہ نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر گزشتہ دن کا واقعہ عرض کیا۔ فرمایا اللہ نے پیغمبروں کو حکم دیا ہے کہ وہی کھائیں جو طیب ہو اور نیک کام ہی کریں۔ امام احمد نے بروایت ابوہریرہؓ بیان کیا ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا لوگو! اللہ طیب (پاک) ہے وہ طیب ہی کو قبول کرتا ہے اس نے مومنوں کو وہی حکم دیا جو انبیاء کو دیا تھا۔ پیغمبروں سے فرمایا تھا یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اور مومنوں سے فرمایا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ اس کے بعد حضورؐ نے ارشاد فرمایا بعض آدمی لمبے چوڑے سفر کرتے ہیں کہ بال پریشان اور چہرہ گرد آلود ہو جاتا ہے، مگر چونکہ اس کا کھانا حرام اس کا پینا حرام اور اس کا لباس حرام اور غذا مخلوط بالحرام ہوتی ہے، اس لئے وہ (اگرچہ) آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر یا رب یا رب کہتا ہے مگر اس کی دعا کیسے قبول ہو سکتی ہے (رواہ مسلم والترمذی ایضاً) حاصل یہ کہ اکل حلال کی ہدایت خدا تعالیٰ نے ہر پیغمبر کو کر دی تھی۔ اس آیت سے دو حکم مستفاد ہوتے (۱) حلال و حرام کا فرق لازم ہے۔ اپنی کمائی کی چیز استعمال کرنی اور پرائے مال پر دست درازی نہ کرنی لازم ہے۔ جو چیزیں خدا تعالیٰ نے حرام کر دی ہیں ان سے پرہیز رکھنا ضروری ہے۔ (۲) جو لوگ حلال اور پاکیزہ چیزوں سے بھی پرہیز رکھتے اور فاقہ کشی کر کے بدن کو خشک اور قوت جسمانی کو افسردہ کر لیتے ہیں اور اس کو ریاضت خیال کرتے ہیں۔ وہ گمراہی میں ہیں۔ رہبانیت اور زہد خشک کی اجازت کسی پیغمبر کو نہیں ملی۔ چونکہ غذا سے بدن میں قوت اور چستی، طبیعت میں جرأت اور ہمت میں بلندی پیدا ہوتی ہے اس لئے اس کے بعد فرمایا:-

وَاعْمَلُوْا صَالِحًا یعنی پاک چیزیں کھاؤ۔ بدن میں قوت و نشاط پیدا ہونے کے ضروری اسباب کام میں لاؤ، اور نیک کام کرو۔ اللہ کی پاک نعمتیں کھا کر اس کی نافرمانی نہ کرو۔ لیکن بعض وقت انسان حلال کی طلب کرتا ہے مگر مشتبہ روزی حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح نیک کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے، مگر کر نہیں سکتا۔ موانع اور مجبوری کی عوائق اس کو روک دیتے ہیں، اس لئے فرمایا:-

اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ میں تمہارے اعمال سے بخوبی واقف ہوں۔ نیت، ارادہ کو بھی جانتا ہوں اور کام سے بھی باخبر ہوں۔ کسب معیشت میں جو صورت بھی نمودار ہو اس کا علم مجھ کو ہے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ پاک روزی کھا کر اللہ کے فرمان کے مطابق عمل کرنا لازم ہے۔ کیونکہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا اور دوسروں کے گن گانا اہل دانش و ارباب بینش کے نزدیک احسان فراموشی ہے۔

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ۔ امت کے معنی ہیں شریعت اور طریقہ یعنی تم سب کا طریقہ اور وہ شریعت جو سب کے لئے خدا نے جاری کی ہے ایک ہی ہے۔ توحید الٰہی اور عبادت خداوندی اور معرفت ربوبیت و الوہیت تمام آسمانی مذاہب کا مقصود اصلی ہے۔ لہٰذا اللہ کی ذات کو مرکز توجہ اور نقطۂ نظر بنانا لازم ہے۔ رسول پاکؐ نے ابن عباس سے فرمایا تھا اے لڑکے اللہ کے حقوق کی رعایت رکھنا اللہ تیری حفاظت کرے گا۔

تمام انبیاء کے بعد گمراہ کافروں اور متعصب مقلدوں نے دین الٰہی کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، مذہب میں افراط و تفریط کر کے اور اپنی طرف سے احکام الٰہی میں تر و خشک کی آمیزش کر کے جدا جدا فرقے بنا لئے اور ہر فرقہ اپنے تراشیدہ خیالات میں مگن نظر آنے لگا۔ یہود اپنی حقانیت کے خیال میں سرخوش ہیں۔ عیسائی اپنی صداقت کے عقیدہ سے سرمست ہیں (مجوسی، صابی، بدھ، ہندو اور سکھ وغیرہ سب اپنے ہی آبائی عقائد و عبادات اور معاملات کو برحق جانتے ہیں) مگر دین الٰہی کا کہیں پتہ نہیں۔ مذہب فطرت پارہ پارہ ہو گیا۔ لہٰذا ان سے حجت و تکرار بے کار ہے۔

فَذَرْهُمْ اے محمدؐ! آپ ان کو یونہی خواب غفلت میں سرشار اور دنیا کے جہالت میں غرق رہنے دیجئے تا وقتیکہ اسلام کی صداقت و حقانیت اور شوکت و جلالت خود آفتاب بن کر ضیا پاش نہ ہو جائے۔

حَتّٰى حِیْنٍ۔ بعض علماء کے نزدیک حین سے مراد وقت ہے۔ جب اسلام اپنی پوری شان و شوکت سے دنیا میں ظاہر ہو جائے اس وقت تہدید و وعید اور تنبیہ و

توضیح مفید ہوگی ۔ بعض علماء کے نزدیک موت یا عذاب الٰہی کا وقت مراد ہے ۔

اَیَحْسَبُوْنَ ۔ کفار کے مال و ثروت کی فراوانی اور اولاد کی کثرت ظاہر بین طبقہ کے لئے نظر فریب اور دلکش ہوتی ہے ۔ چونکہ ان کا منتہائے نظر دنیوی عیش و طرب اور ظاہری راحت و سکون ہی ہوتا ہے اس لئے کثرتِ مال و اولاد کو وہ اپنے مذہب کی صداقت اور برکات قدسیہ کے نزول کا مظہر جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر اہلِ ایمان حق پر ہوتے تو ذلت و نکبت اور افلاس و خستہ حالی میں کیوں مبتلا ہوتے ۔ دنیوی عیش و دولت ان کو کیوں حاصل نہ ہوتا ۔ خدا تعالیٰ اس کے رد میں فرماتا ہے کہ مال و اولاد کی کثرت کو موجب برکت اور سبب صداقت خیال کرنا عدم شعور کی دلیل ہے ۔ اگر عقل ہوتی تو یہ عیش و راحت کو حقانیت مذہب کی دلیل نہ قرار دیتے اس سے مقصود تو محض دنیوی امداد ہے ۔ آخرت نجات و سعادت کا اس پر حصر نہیں ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ ۔ درحقیقت اہلِ صدق و احباب برکات وہ لوگ ہیں جن کے اندر پانچ اوصاف پائے جاتے ہیں (۱) اللہ ہی سے ڈرتے ہیں ۔ یعنی دنیا میں کسی مافوق قوت اور موہومی قدرت کا ان کو خوف نہیں ہوتا ، باطل معبودوں اور مصنوعی دیوتاؤں سے کوئی اندیشہ نہیں ہوتا ۔ اللہ کی طاقت کو ہمہ گیر جانتے اور اسی کو اپنا مرکز توجہ بنائے رہتے ہیں نہ مال و اولاد پر ان کو بھروسہ ہوتا ہے نہ دنیوی جاہ و حشم اور خیل و خدم پر نہ اپنی ذات پر نہ اپنے اعمال پر (۲) اللہ کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں اور آیات قضا و قدر کا ان کو یقین ہوتا ہے یعنی عالم میں جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ بحکم الٰہی ہوا اور مبنی بر مصلحت ہوا ۔ گویا مسرت و غم کے جذبات سے وہ بالاتر ہو جاتے ہیں اور اللہ کے حکم کو تمام عالم میں جاری و ساری سمجھتے ہیں ۔ یہ تو ان کا عقیدہ اور قلبی یقین ہوتا ہے باقی ظاہری اعمال و اقوال کے لحاظ سے (۳) وہ اللہ کے ساتھ ربوبیت و الوہیت و عبادت میں کسی کو شریک نہیں کرتے نہ کسی کو اپنا حاجت روا جانتے ہیں نہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش کرتے ہیں نہ ان اوصاف میں جو باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں کسی کو اس کا ساجھی اور شریک خیال کرتے ہیں ۔ یہاں تک تو عقائد قلبی اور اعمال بدنی اور اقوال لسانی کا بیان تھا ۔ اس سے آگے مالی حقوق کے ادا کرنے کی تفصیل ہے (۴) جو کچھ راہِ خدا میں دیتے ہیں وہ یہ خیال رکھتے ہوئے دیتے ہیں کہ ہم کو لوٹ کر اللہ کے پاس جانا ہے ہم خطاوار ہیں ۔ نہ معلوم ہماری کارگزاریاں قبول بھی ہوئیں یا نہیں ۔ غرض اصحاب صداقت اور سابقین فی الخیرات و مؤمنین مخلصین جن جن کی نیت صادق ، ارادے پاک ، خدمات پسندیدہ اور اعمال صالح ہوتے ہیں ، مگر اس کے باوجود وہ اپنے پسندیدہ کردار پر مغرور نہیں ہوتے بلکہ امید کا مرکز محض ذات یگانہ و بے ہمتا ہی کو قرار دیتے ہیں ۔ ممکن ہے کہ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا سے فقط مالی حقوق مراد نہ ہوں بلکہ تمام معاملات و عبادات مراد ہوں ۔ امام احمد ابن ابی حاتم ابن ماجہ اور ترمذی وغیرہ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ آیت وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ کا مصداق کیا وہ لوگ ہیں جنہوں نے زنا کیا ، چوری کی اور شراب پی ، مگر اللہ سے ڈرتے رہے ؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا صدیق کی بیٹی ! (یہ لوگ آیت کے مصداق نہیں) بلکہ وہ لوگ ہیں جو نماز پڑھتے ، روزہ رکھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں پھر بھی ڈرتے رہتے ہیں کہ یہ خدمات قبول ہوئیں (یا نہیں) ترمذی نے یہ حدیث ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی بیان کی ہے ۔ اس حدیث سے مؤخر الذکر تفسیر کی تائید ہوتی ہے ۔

مقصود بیان

حلال روزی کی تلاش لازم ہے ، پیداوار ارضی ، فضائی اور آبی میں سے کچھ چیزیں حلال اور کچھ حرام ہیں ۔ ایک بات یہ بھی مستفاد ہوتی ہے کہ زہد خشک اور ترکِ اکل و شرب بڑے سے بڑے عابد زاہد کے لئے بھی جائز نہیں ۔ یہاں تک کہ انبیاء کے لئے بھی غذا کے ذریعہ سے جسمانی قوتوں کا تحفظ لازم ہے ۔ پس عبرت حاصل کریں وہ جاہل خانقاہ نشین جو ترکِ غذا کو جزو تصوف اور ترکِ لذات کو ترقی روحانیت کا سبب جانتے ہیں ۔ ان کو یاد رکھنا چاہئے کہ حلال چیز اپنے اوپر حرام کر لینا سخت ترین جرم بلکہ کفر ہے ۔ ہاں وہ مرشدانِ صداقت مآب جو اطبائے ارواح ہیں اگر کسی روحانی بیمار کو چند روز کے لئے حلال چیزوں سے پرہیز رکھنے کا حکم دے دیں تو حکم آیت کی خلاف ورزی نہ ہوگی ۔ جس طرح طبیب و ڈاکٹر بیماری کی حالت میں بعض مضر چیزوں سے پرہیز رکھنے کی ہدایت کرتا ہے اگرچہ وہ حلال ہوتی ہیں مگر صحت ہو جانے پر تمام چیزوں کی اجازت دے دیتا ہے ۔ اسی طرح روحانی طبیب بھی جب کسی روح کو بیمار دیکھتے ہیں تو تشخیص مرض کے بعد شریعت کے مطابق نسخۂ شفا تجویز کرتے ہیں اور عارضی طور پر پرہیز بھی بتا دیتے ہیں اور جب روح کو صحت ہو جاتی ہے تو پھر ہر جائز چیز کی اجازت دے دیتے ہیں ۔ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا کا لفظ بتا رہا ہے کہ طیبات سے تمتع اندوز ہونے کی اصل غرض عمل صالح ہے ۔ اگر عمل صالح نہیں تو پھر کھانا پینا بے کار ہے ۔ اُمَّةً وَّاحِدَةً کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ تمام الہامی مذاہب اصول میں متحد ہیں ، فروعی اختلافات ناقابل اعتبار ہیں ، تعلیم توحید اور عبادتِ الٰہیہ سے کوئی سچا مذہب خالی نہیں ، مگر پیغمبروں کے بعد آنے والی نسلوں نے فروعی اختلاف پر اصولی اختلاف کا رنگ چڑھا دیا اور مابہ الاشتراک چیز کو بھی بدل ڈالا ۔ توحید کو شرک آمیز اور عبادتِ الٰہیہ کو عبادتِ مخلوق کے ساتھ مخلوط کر دیا ۔ فَذَرْهُمْ کا حکم خواہ مخواہ کی کج بحثیوں اور ایسے مناظرات کرنے کی ممانعت کر رہا ہے جن کا مقصود تلاشِ حق اور راستی کی جستجو نہیں بلکہ اپنے قول کی برتری کا اظہار اور مقابل کو اپنی قوت سے خاموش کر دینا پیش نظر

ہوتا ہے۔ بَلْ لَا يَشْعُرُونَ سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مال کی کثرت اور اولاد کی فراوانی بلکہ دنیوی عیش و راحت کی بہتات دلیل صداقت نہیں۔ نہ مذہبی حقانیت کا اظہار جاہ و حشم کی زیادتی سے ہوتا ہے بلکہ معیار صداقت توحید، خلوص ایمان بالقدر اور آخرت پر یقین رکھنا ہے وغیرہ۔

وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتَابٌ يَنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ○ بَلْ قُلُوبُهُمْ

اور لوگوں پر ظلم نہیں کیا جائیگا بات

ہم کسی شخص پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے جو سچ سچ بات بتا دے گی

فِي غَمْرَةٍ مِنْ هَذَا وَلَهُمْ أَعْمَالٌ مِنْ دُونِ ذَلِكَ هُمْ لَهَا عَامِلُونَ ○ حَتَّى إِذَا أَخَذْنَا مُتْرَفِيهِمْ

صرف یہ ہے کہ ان کے دل اس کی طرف سے غفلت میں ہیں اور علاوہ اس کے ان کے اور بھی بہتیرے اعمال ہیں جن کو وہ کر رہے ہیں یہاں تک کہ جب ان کے آسودہ لوگوں کو

بِالْعَذَابِ إِذَا هُمْ يَجْأَرُونَ ○ لَا تَجْأَرُوا الْيَوْمَ إِنَّكُمْ مِنَّا لَا تُنْصَرُونَ ○ قَدْ كَانَتْ

ہم عذاب میں پکڑیں گے تو اس وقت وہ چلا اٹھیں گے ہم کہیں گے آج مت چلاؤ ہماری طرف سے تمہاری قطعی مدد نہیں کی جائے گی میری آیتیں

آيَاتِي تُتْلَى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُونَ ○ مُسْتَكْبِرِينَ بِهِ سَامِرًا

تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں تو تم ایڑیوں کے بل الٹے بھاگ گئے تھے اس سے سرکشی کرتے تھے افسانہ بنا کر بیہودہ

تَهْجُرُونَ ○ أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ أَمْ جَاءَهُمْ مَا لَمْ يَأْتِ آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ ○ أَمْ

بکتے تھے کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس ایسی چیز آئی جو ان کے اگلے باپ دادوں کے پاس نہیں آئی یا انہوں

لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ ○ أَمْ يَقُولُونَ بِهِ جِنَّةٌ بَلْ جَاءَهُمْ بِالْحَقِّ

نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا اس لئے اس کا انکار کرتے ہیں یا کہتے ہیں کہ اس کو جنون ہے یہ کچھ بھی نہیں ہے حق ان کے پاس

وَأَكْثَرُهُمْ لِلْحَقِّ كَارِهُونَ ○ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ

آ پہنچا اور ان میں سے اکثر لوگ حق کو برا سمجھتے ہیں اگر حق ان کی خواہشوں پر چلے تو آسمان و زمین اور ما ان میں رہنے والے درہم برہم

وَمَنْ فِيهِنَّ بَلْ أَتَيْنَاهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُعْرِضُونَ ○ أَمْ تَسْأَلُهُمْ خَرْجًا

ہو جائیں ہم ان کو ان کی نصیحت پہنچا سکے مگر یہ نصیحت سے روگرداں ہیں یا تم ان سے کچھ اجرت

الربع

فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ○ وَإِنَّكَ لَتَدْعُوهُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ○

مانگتے ہو اجر تو تمہارے پروردگار کا ہی بہتر ہے وہی سب سے بہتر روزی دینے والا ہے درحقیقت تم ان کو سیدھی راہ کی دعوت دیتے ہو

وَاِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ ۝ وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا

مگر جو لوگ آخرت کا یقین نہیں کرتے وہ اس راستے سے ہٹے ہوئے ہیں اگر ہم اُن پر رحم فرمائیں اور اُس تکلیف

مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ۝ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا

کو دور کر دیں جو اُن پر ہے تو یقیناً یہ لوگ اپنی سرکشی میں سرگرداں ہو کر اور بھی بڑھ جاتے ہیں ہم نے انکو عذاب میں پکڑا تھا مگر انھوں نے نہ تو اپنے رب کے

لِرَبِّهِمْ وَمَا یَتَضَرَّعُوْنَ ۝ حَتّٰۤى اِذَا فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِیْدٍ اِذَا هُمْ فِیْهِ مُبْلِسُوْنَ ۝

سامنے عاجزی کی اور نہ گڑگڑائے یہاں تک کہ جب ہم نے اُن پر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیا تو فوراً اس سے توڑ بیٹھے۔

تفسیر حق کو چھوڑنے اور صداقت سے منہ موڑنے کے چند اسباب ہو سکتے ہیں۔ (۱) پیام ہدایت ناقابلِ برداشت ہو اس کی تعمیل طاقتِ انسانی سے بالاتر ہو، مگر ضوابطِ اسلام پر کاربند ہونا اور فرائض شرعیہ کو ادا کرنا استطاعت بشری سے بالاتر چیز نہیں بلکہ سہولت عادی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتی۔ قوانین اسلامی کا التزام بہت سہل ہے، اس لئے اسلام سے روگردانی کرنے کی یہ وجہ بھی نہیں ہو سکتی۔ (۲) پیامِ حق کو قبول کرنے کے بعد یہ اندیشہ ہو کہ خدا جانے ہم کو اس تعمیل حکم کا کچھ نتیجہ ملے گا یا نہ ملے گا، ہماری نیکیاں اور خوبیاں باعثِ اجر ہوں گی یا نہ ہوں گی۔ اگر اجر ملے گا تو پورا ملے گا یا کمی ہونا ممکن ہے۔ ہمارے اقوال و افعال اور حرکت و سکون کی جزا سزا کس طرح ملے گی۔ باوجودیکہ جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ معدوم ہو جاتا ہے، ماضی لوٹ کر نہیں آسکتا، اعادۂ معدوم محال ہے۔ پھر ہم کیوں اپنی عیش پرستیوں اور لذت اندوزیوں سے دست کش ہوں اور کیوں خواہ مخواہ عملاً کسی کے غلام بن جائیں اور کیوں کسی کے حکم کے بغیر دنیوی فائدہ کی تعمیل کریں۔ اسی قسم کے شبہات بھی آدمی کو ترکِ ہدایت پر مجبور کرتے ہیں، مگر ضوابطِ اسلامیہ ان شبہات سے بھی پاک ہیں۔ انسان کی ہر نقل و حرکت اور ہر رفتار و گفتار لکھ لی جاتی ہے۔ نامۂ اعمال مرنے کے بعد بھی موجود رہتا ہے۔ فرشتوں کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔ پھر اعمال نامہ میں تمام افعال و اقوال کا صحیح اندراج ہے، کمی بیشی نہیں۔ یہی اعمال نامے قیامت کے دن سامنے آئیں گے اور انہی کے مطابق سزا جزا ملے گی۔ ذرہ برابر کسی کی حق تلفی نہ ہو گی۔ نا کردہ گناہ کو مجرم نہیں قرار دیا جائے گا نہ نیکوکار کو اس کے کردار کی پوری جزا سے محروم رکھا جائے گا۔ لہٰذا حق سے عدول کرنے کی یہ وجہ بھی ممکن نہیں۔ (۳) پیامِ ہدایت پر غور نہ کیا جائے اُس کے مصالح اور مفاسد کو نہ سمجھا جائے، تعمیل کے فوائد اور عدم تعمیل کے نقائص نہ جانے جائیں، بصیرت اور دانش کو کام میں نہ لایا جائے، اس لئے کتابِ حق کی خوبی پر اطلاع نہ ہو، لیکن یہ قصور انسان کا ہے پیامِ حق کا نہیں۔ غور کرنا نہ کرنا آدمی کا کام ہے۔ سوچنا سمجھنا محاسن و معائب پر مطلع ہونا، نقائص و فوائد کو جاننا اور حق کی تلاش کرنا انسان کا فرض ہے۔ حق سے روگردانی کی یہ وجہ قابلِ توجہ نہیں۔ (۴) پیام لانے والا کوئی نئی بات نئے طریقے پیش کرے جو اس قانونِ قدرت کے خلاف ہو جس کا استمرار تمام عالم میں ابتدائے آفرینش سے ہے، مثلاً کوئی اگر کہے کہ میں خدا ہوں یا خدا کا بیٹا ہوں، یا خدا کا بھائی ہوں یا آسمان کا باشندہ ہوں۔ اس طرح کی خرافات ضرور نا قابلِ توجہ ہے، لیکن جب کوئی رسول اسی طریقہ سے پیامِ حق پہنچائے جس طرح انبیاء آغاز سے پہنچاتے رہے ہیں اور وہی تعلیم دے جو دیگر پیغمبروں نے دی ہے۔ رسم و رواج اور خود ساختہ تعامل کو دور کر کے اصل تعلیم پیش کرے تو انکار کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمیشہ سے انبیاء مبعوث ہوتے چلے آئے ہیں۔ شرک کو چھوڑنے اور توحید کو مضبوط پکڑنے کی ہر ایک نے ہدایت کی ہے، پھر اعراض و روگردانی کی کیا وجہ اور قرآن کو پس پشت ڈالنے کا کیا سبب۔ (۵) رسول کوئی اجنبی مخلوق ہو انسان نہ ہو یا انسان ہو تو اس کی صداقت و کیرکٹر مجہول ہو، اس کا چال چلن اچھا نہ ہو، لیکن واقعہ ایسا بھی نہیں ہے۔ رسول پاکؐ فرشتہ نہ تھے جن نہ تھے کوئی اور غیبی مخلوق نہ تھے انسان تھے۔ انسانوں کی طرح کھاتے پیتے چلتے پھرتے اور اٹھتے بیٹھتے تھے۔ آپ کی صداقت امانت، وفائے عہد صدق مقال، امین کا لقب پا چکے تھے تو جو شخص معمولی گفتگو میں بھی جھوٹ نہ بولتا ہو وہ خدا پر جھوٹا الزام کیسے لگا سکتا ہے اور نبی ہونے کا غلط دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے۔ جو شخص لوگوں کا امین ہو وہ خدا کی امانت میں خیانت کس طرح کر سکتا ہے۔ جو شخص مخلوق سے وعدہ کر کے خلاف ورزی نہ کرے وہ اللہ سے کئے ہوئے وعدہ کی خلاف ورزی کیونکر کر سکتا ہے۔ لہٰذا رسول پاکؐ کو نہ ماننے اور قرآنی ہدایت سے منہ موڑنے کی یہ وجہ نہیں ہو سکتی (۶) پیامبر کا دماغ صحیح نہ ہو، توازن حواس بگڑ گیا ہو، بہکی بہکی باتیں کرتا ہو، کبھی کچھ کہتا ہو کبھی کچھ۔ دیوانہ کی

تناسب اور اقوال میں توازن کہاں ہوتا ہے۔ چونکہ اس قول کا بطلان بالکل واضح تھا، اس لئے تفصیل چھوڑ کر صرف تنبیہی انداز بیان پر اکتفا کیا۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ الخ۔ اس آیت میں ساتویں سبب انکار کا بطلان ہے۔ ابوصالح، مجاہد اور سدی نے کہا حق سے مراد خدا تعالیٰ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ ان کی قلبی خواہشات کو قبول فرما کر شریعت کو ان کے موافق نازل کر دے تو نظم عالم تباہ ہو جائے گا کیونکہ مشرکوں کی قلبی خواہشات میں شرک ہی ہے اور شرک تمام تباہیوں کا سرچشمہ ہے، اس لئے حدیث میں آیا ہے کہ کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہش قرآن کی تابع نہ ہو۔ حق عز و جل نے جو قرآن نازل فرمایا وہ عین حق ہے اور جو شریعت بھیجی وہ عین صواب ہے۔ آدمی اس دنیا میں راہ آخرت کا مسافر ہے۔ اس کی منزل اُخروی زندگانی ہے۔ اگر اس دنیا کی گھٹا ٹوپ اندھیری میں خواہش نفس کے مطابق چلے گا اور معتبر تجربہ کار رہنما کی پیروی نہ کرے گا تو ظاہر ہے کہ کسی کھائی خندق میں گر جائے گا۔ امام احمد نے بروایت ابن عباسؓ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضورؐ نے خواب میں دیکھا کہ دو فرشتے آئے ایک سرہانے اور دوسرا پائین بیٹھ گیا۔ پائین والے نے سرہانے والے فرشتے سے کہا اس شخص کی اور اس کی امت کی حالت کوئی مثال دے کر بیان کرو۔ سرہانے والا فرشتہ بولا ان کی اس طرح سمجھو کہ کچھ مسافر چلتے چلتے ایک لق و دق بیابان کے کنارے پہنچے۔ ان کے پاس زاد راہ اتنا نہ تھا کہ بیابان کو طے کر سکیں یا واپس ہو جائیں۔ اسی سوچ میں تھے کہ ایک حلہ پوش آدمی آیا اور کہنے لگا اگر میں تم کو سرسبز باغات اور لبریز حوضوں تک پہنچا دوں تو کیا تم میرے پیچھے چلو گے؟ سبھوں نے اقرار کیا۔ اس نے سب کو لے جا کر سرسبز چمنستان اور شاداب لبریز حوضوں تک پہنچا دیا۔ لوگوں نے وہاں سے وہاں پہنچ کر خوب کھایا پیا اور موٹے تازے ہو گئے۔ رہنما نے کہا دیکھو تم میری پیروی کرنے سے کس حالت کو پہنچ گئے اور پہلے تمہاری کیسی حالت زار تھی۔ اب میں کہتا ہوں کہ آگے اس سے بھی زیادہ نفیس گلزار، بہترین چمنستان، عمدہ میوے، شیریں چشمے اور شاداب حوض ہیں۔ تم میرے ساتھ چلو۔ ایک گروہ بولا اللہ یہ صادق ہے ہم اس کی پیروی کریں گے۔ دوسرے گروہ نے کہا ہم کو یہی کافی ہے یہیں ٹھہرے رہیں گے ہم اسی پر خوش ہیں۔

حضرت عمرؓ کی روایت کردہ ایک طویل حدیث صحاح میں موجود ہے جس کا ابتدائی حصہ یہ ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا میں تم لوگوں کو کمر پکڑ کر جہنم میں گرنے سے روک رہا ہوں، مگر تم زبردستی دوزخ کی آگ میں گرنا چاہتے ہو اور جہنم میں ایسے گرتے ہو جیسے پتنگے آگ میں گرتے ہیں۔ اب ایسا لگتا ہے کہ (شاید) میں تمہاری کمر چھوڑ دوں (اور تم جہنم رسید ہو جاؤ)

أَمْ تَسْأَلُهُمْ خَرْجًا یہ آٹھویں سبب انکار کا ازالہ ہے۔ رسول پاکؐ نے صاف طور پر کہہ دیا تھا مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ۔ دوسری جگہ فرمایا لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا۔ حضور اقدسؐ نے تمام عمر فاقہ و فقر سے بسر کی۔ موٹا مختصر کپڑا اور معمولی سے بھی کم درجہ کی غذا کھائی۔ بہت ہی خام مکانوں میں رہے۔ نہ فلک بوس کوٹھیاں بنائیں نہ شاندار زربفت، کمخواب اور زریں لباس پہنا نہ نفیس غذائیں کھائیں نہ تزک و احتشام کے ساتھ رہے نہ خیل و خدم اور جاہ و حشم کی طرف کبھی رغبت کی۔ اگر حضورؐ کسی بات کی خواہش فرماتے تو ہر رغبت کی تکمیل بسہولت ممکن تھی۔ اس قدر تو دنیائے کفر بھی اقرار کرتی ہے کہ طائف نجد بحرین میں حجاز بلکہ جزیرۂ عرب کے کل حصوں پر حضورؐ کی دنیوی حکومت بھی ہو گئی تھی۔ پھر جزیرۂ عرب کا بادشاہ اپنی خواہشات نفسانی کی تکمیل کرنے سے کس طرح قاصر رہ سکتا تھا۔ ہجرت سے پہلے آغاز دور اسلامی میں جب کافروں نے طرح طرح کے لالچ دئے، حضورؐ کو مکہ کا سردار ماننے کے لئے تیار ہو گئے، بڑے بڑے امراء نے اپنی بیٹیوں سے نکاح کرنے کی خواستگاری کی اور تبلیغ سے روکنا چاہا مگر حضور اقدسؐ نے کسی کی پرواہ نہ کی اور کسی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا اور صاف فرما دیا کہ اگر اب معاوضہ کو انکار قرآنی کی دلیل قرار دیا جائے تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ رسول پاکؐ عبادت، حکومت، دولت اور کسی طرح کے عیش و طرب کے خواستگار نہیں ہیں۔

وَإِنَّكَ لَتَدْعُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ۔ یہ نویں سبب انکار کا ابطال ہے اور مدلل ابطال ہے۔ رسول پاکؐ کا بتایا ہوا راستہ ٹیڑھا نہیں۔ تباہی کے غاروں میں گرانے والا نہیں بلکہ منزل مقصود تک صحیح طور پر بسہولت پہنچانے والا ہے۔ مکارم اخلاق، حسن معاشرت، تعمیر مدنیت اور اصلاح عقائد کی تعلیم آپ کا مقصود ہے جس سے روح روشن، دماغ منور اور باطن چمک دار ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ کی تعلیم اعمال کا سنگ بنیاد روز آخرت کا عقیدہ ہے۔ ذرہ ذرہ کا حساب اور جزا سزا کا ہونا اولین ہدایت ہے۔ لامحالہ زندگی کا کوئی قدم نجات آخرت کے تخیل سے خالی نہیں اٹھ سکتا۔ تخیل آخرت ہر وقت پیش نظر رکھنے سے زیادہ سیدھی شاہراہ زندگی اور کیا ہو سکتی ہے۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جزا سزا کے قائل نہیں وہ کج راہ ہیں۔ کیونکہ بلاخوف سزا مطلق العنان ہو کر خواہش پرستی کے ہر میدان میں دوڑ سکتے ہیں۔ صحیح، غلط، مفید، مضر اور جائز ناجائز کا ان کے نزدیک کوئی معیار نہیں ہو سکتا۔ وہ مانوسات خاطر اور مالوفات قلب کے حصول کے لئے بادیہ گمراہی میں سرگرداں گھوم سکتے ہیں۔ عاقبت کا عقیدہ نہ ہونے کی وجہ سے بغیر کسی اندیشہ کے وہ تباہ کاریاں اور بربادیاں اور حق تلفیاں بے دریغ کر سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ راہ زندگی کی کجی

اور کیا ہو سکتی ہے۔

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ۔ ابتدائی آیت میں جس عذاب کی پیشین گوئی کی تھی اور صراحت فرمائی تھی کہ مبتلائے عذاب ہونے کے وقت کافر کوئی مدد نہ پائیں گے اس کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے۔ رحم کرنے، عذاب دور کرنے اور توبہ قبول کرنے کی غایت یہی ہو سکتی ہے کہ توبہ کر کے خدا سے بجز شرک و معصیت کی طرف قدم نہ اٹھائیں۔ اس کا معنوی نہ فرمانبرداری کے دائرہ سے نہ نکلیں گے، مگر کافروں کی حالت ایسی مایوس کن ہے کہ عذاب سے رہائی دینے اور رحم کھا کر مصیبت دور کرنے کے بعد بھی ان کی ہدایت اور اسلام کی کوئی آس نہیں۔ وہ سختی سے نجات پا کر پھر سرکشی و معصیت کے بیابانوں میں دوڑیں گے اور بادیۂ کفر میں سرگرداں پھریں گے، اس لئے ان پر رحم نہیں کیا جا سکتا اور جو عذاب آنے والا ہے اس سے نجات نہیں مل سکتی۔

وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ۔ اس آیت میں عذاب سے مراد قحط سالی ہے جس میں کفار مکہ سات برس تک مبتلا رہے۔ صحیحین کی روایت ہے کہ جب قریش نے حضورؐ کی نافرمانی کی اور سرکشی کی تو آپ نے بددعا فرمائی اور یہ الفاظ فرمائے۔ اَللّٰهُمَّ اَعِنِّیْ عَلَیْهِمْ بِسَبْعٍ كَسَبْعِ یُوْسُفَ نتیجہ یہ ہوا کہ کفار سات برس تک قحط میں مبتلا رہے کہ بھوک کے سبب آنکھوں کے سامنے دھواں نظر آنے لگا۔ مصیبت سے تنگ ہو کر ابوسفیان حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا محمدؐ! میں تم کو اللہ کا اور رشتہ داری کا واسطہ دیتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ہم لوگ خون اور اونٹوں کا اون بھی کھا گئے۔ حضورؐ کو رحم آگیا اور رفع قحط کی دعا فرمائی (اور کال دور ہو گیا) اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (رواہ النسائی والطبرانی والحاکم وغیرہم)

خطیب نے ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ ثمامہ بن اثال حنفی کو جب حضورؐ نے قید سے چھوڑ دیا تو اس نے اپنے ملک میں جا کر مکہ والوں کی رسد بند کر دی اور یمامہ سے غلہ آنا موقوف ہو گیا۔ مکہ میں قحط پڑ گیا۔ یہاں تک کہ قریش نے خون تک کھا لیا۔ اس وقت ابوسفیان نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا محمدؐ! تم رحمۃ للعالمین ہونے کا دعویٰ کرتے ہو اس کے باوجود تم نے باپوں کو تلوار سے قتل کیا اور بیٹیوں کو بھوک سے مارا اس پر یہ آیت نازل ہوئی (رواہ البیہقی) خطیب کی یہ روایت بسبب درایت غلط ہے کیونکہ ثمامہ کی گرفتاری اور رہائی کا واقعہ مدینہ کا ہے اور ابوسفیان کا یہ کہنا کہ باپوں کو تم نے تلواروں سے مارا خود دلالت کر رہا ہے کہ یہ قصہ جنگ بدر کے بعد کا ہے۔ مکہ میں تو جہاد کی اجازت ملی ہی نہ تھی اور آیت مکی ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ مدینہ کا واقعہ مکی آیت کا سبب نزول نہیں بن سکتا۔ لہٰذا مذکورۃ الصدر روایت صحیح ہے اور یہی آیت کا سبب نزول ہے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ عذاب قلیل سے تو وہ لوگ خدا کی طرف نہیں جھکتے اور بارگاہ الٰہی میں تضرع نہیں کرتے۔

حَتّٰۤی اِذَا فَتَحْنَا۔ اس آیت میں جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب عذاب شدید کا دروازہ ان کے داخل ہونے کے لئے کھول دیا جائے گا تو اس وقت یہ بالکل ناامید ہو جائیں گے۔ بعض مفسرین نے اس کو فتح مکہ کی طرف اشارہ قرار دیا ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ ہر کافر کی موت سے اس کے لئے عذاب شدید کا دروازہ کھل جاتا ہے اور رہائی کی ہر امید منقطع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا عذاب شدید سے وہ عذاب مراد ہے جس کا آغاز موت کے بعد سے ہو جاتا ہے۔

مقصود بیان

قوانین اسلام ناقابل برداشت نہیں، ان کی پابندی طاقت انسانی سے بالاتر نہیں بلکہ اصول مذہب کی تعمیل بہت آسان ہے۔ ہر عمل کا اندراج اعمال نامے میں ہوتا ہے، اس لئے قیامت کے دن حساب کی غلطی کا احتمال نہیں۔ قیامت کے دن کسی پر ظلم نہ ہوگا یعنی غیر مجرم کو مجرم قرار نہیں دیا جائے گا اور نہ کسی نیکوکار کے اجر میں کمی کی جائے گی۔ تقدیر کا لکھا ضرور پورا ہوتا ہے جس کی قسمت میں جو عمل لکھے ہیں وہ ان کو ضرور کرے گا۔ ثروت مند طبقہ کفر و معاصی کا امام ہوتا ہے، اس لئے اسی کی گرفت سب سے پہلے ہوتی ہے۔ قرآن پر غور کرنا اور اس کے احکام و عقائد کو بصیرت کی نظر سے دیکھنا لازم ہے۔ قرآن میں تدبر و تفکر کرنے والے کو پیام قرآنی کی صداقت معلوم ہو جاتی ہے۔ شرک و گناہ سے اجتناب اور خیر و صلاح کا ارتکاب کی تعلیم ہر نبی کا شیوہ رہا ہے۔ رسول پاکؐ نے بھی سنت انبیاء کے موافق تعلیم دی۔ اُن کے راستہ سے علیحدہ ہو کر کوئی راستہ نہیں نکالا۔ رسول پاکؐ کا کیرکٹر مجہول نہیں تھا۔ قریش اور بعض دوسرے قبائل حضورؐ کے عادات اطوار رفتار گفتار سے اچھی طرح واقف تھے، مگر دیدہ و دانستہ حق کا انکار کرتے تھے۔ ان کو صداقت سے طبعی نفرت تھی۔ پیام الٰہی اور ہدایت سماوی کسی کے نفسانی خیالات اور شیطانی خواہشات کی تابع نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اگر پیام ہدایت خواہشات بشری کا تابع ہوتا انتظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ قرآن نصیحت کی کتاب ہے۔ اصلاح عقیدہ و عمل کی یاد داشت ہے۔ رسول پاکؐ دنیوی اُجرت کے طالب نہ تھے۔ مال، عزت، حکومت، سیادت یا عیش و طرب کی کوئی خواستگاری آپ کو نہ تھی بلکہ حضورؐ کا بھروسہ محض خزانۂ الٰہی پر تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیام حق پہنچانے اور وعظ و تبلیغ کرنے کی اُجرت لینی حرام ہے (خواہ تحفہ و ہدیہ کی صورت میں ہو یا نذر و نیاز کی شکل میں) اسلام کا راستہ بالکل سیدھا ہے وغیرہ۔

وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۚ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ○ وَهُوَ الَّذِي

اللہ وہی ہے جس نے تمہارے کان آنکھیں اور دل پیدا کیے مگر تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو اسی نے

ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ○ وَهُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ

تم کو زمین پر پھیلایا اور اُسی کی جانب تم اُٹھا کر لائے جاؤ گے وہی تم کو زندگی اور موت دیتا ہے اور رات و دن کا بدلنا اُسی کا کام ہے

أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○ بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالَ الْأَوَّلُونَ ○ قَالُوا أَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَإِنَّا

کیا تم سمجھتے نہیں بات یہ ہے کہ یہ بھی وہی کہتے ہیں جو اگلوں نے کہا تھا کہنے لگے جب ہم مر جائیں گے اور مٹی بن جائیں گے تو کیا

لَمَبْعُوثُونَ ○ لَقَدْ وُعِدْنَا نَحْنُ وَآبَاؤُنَا هَٰذَا مِن قَبْلُ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ○

پھر ہم کو زندہ کرکے اُٹھایا جائیگا یہ وعدہ تو ہم سے اور اس سے پہلے ہمارے باپ دادا سے ہوچکا ہے یہ صرف اگلے لوگوں کی داستانیں ہیں

تفسیر اسلام کا سنگِ بنیاد دو چیزیں ہیں۔ اللہ کی توحید و الوہیت و ربوبیت اور وقوعِ قیامت۔ ان دونوں کو ثابت کرنے کے لیے قرآن میں جا بجا عقل و بصیرت اور مشاہدہ کو دعوت فکر دی گئی ہے اور ہر ہوش مند کو دلائلِ فطرت اور براہینِ انفس و آفاق پر غور و تدبر کرنے کے لیے بلند آہنگی سے پکارا گیا ہے۔ اللہ کے مادی و علمی احسانات، پُر مصلحت تخلیق اور ہمہ گیر قدرت اس کی ربوبیت کے دلائل ہیں اور ربوبیت کے ثبوت سے الوہیت ثابت ہو جاتی ہے۔ پھر ہر آن کا تغیر و انقلاب، کون و فساد، تبدیلیاں اور استحالات جہاں خدا کی غیر محدود قوت پر دلالت کرتے ہیں وہاں یہ بھی بتا رہے ہیں کہ عالم کا طبعی مقتضا ہی نیرنگی اور تغیر ہے، ایک صورت کا آنا دوسری کا، ذراتِ عالم کا جڑنا ٹوٹنا اور اتصال و انفصال کا تبادلہ، مختلف احوال و اشکال کا توارد اور فصول کا انقلاب اس کائنات کا ذاتی مقتضا ہے اور چونکہ ذاتی اقتضا میں اختلاف نہیں ہو سکتا، اس لیے وجودِ قیامت سے کوئی چیز مانع نہیں۔ خدا تعالیٰ نے جب ذراتِ کائنات کو جمع کرکے اس کا نام دنیا اور زندہ دنیا رکھا ہے جو ان اجزا کو پریشان کرکے وجود کو عدم اور زندگی کو موت سے بھی بدل سکتا ہے اور کہہ یہ بھی ممکن ہے بلکہ ضروری ہے کہ انہی ذرات کو دوبارہ جوڑ دے اور کائناتِ اولیٰ کائناتِ اُخریٰ بن جائے۔ آیاتِ مذکورہ میں خدا تعالیٰ نے مضامین مذکورہ کو بیان فرمایا ہے۔ اوّل تخلیقِ انسانی کو دکھا کر اپنی ربوبیت کو ثابت کیا ہے پھر ذراتِ عالم کے اجتماع و انتشار کی طرف اشارہ کرکے وجودِ قیامت کا ہونا ظاہر کیا ہے۔ اس کے بعد زندگی اور موت کا توارد اور اپنی محیط کل قدرت دکھا کر حقیقتِ قیامت پر استدلال کیا ہے۔ آخر میں احوالِ عالم کا تغیر اور شبانہ روز کا انقلاب مجملاً بیان کرکے عقل و بصیرت کو دعوتِ تدبر و تفکر دی ہے اور قیامت کی ممانعت کو نتیجہ تفکر قرار دیا ہے۔

(۱) علم و معرفت کے ذرائع انسان کو تین ہی قسم کے عطا کیے گئے ہیں۔ انہی قوتوں سے کوئی چیز معلوم ہو سکتی ہے۔ کان، آنکھ اور دل قرآن جا بجا دیکھنے، سننے اور ہر چیز کو دعوت دیتا ہے اور سوچنے پر زور دیتا ہے کہ ان تینوں میں کسی ایک سے بھی چیز نا قابلِ یقین ہوتی ہے۔ علم کا مدار یا بیرونی تجربہ ہے یا صرف ذہنی عمل پر۔ بیرونی تجربہ کا معیار کان اور آنکھ کا عمل ہے اور ذہنی عمل قلبی تدبر کا نام ہے۔ مقام غور ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو یہ تینوں قوتیں عطا کی ہیں۔ مادی جسم اور وہ مادی جسم جو سراسر کثیف اور تاریک ہے اس میں روشن قوتوں کا محل قرار پایا۔ روشنی اور تاریکی، کثافت اور لطافت باہم متضاد ہیں۔ ایک کا اجتماع دوسرے کے ساتھ ناممکن ہے مگر خدا تعالیٰ نے دو مختلف ضدوں کو جمع فرما دیا یا تاریکی کے ساتھ نور کو ملا دیا، کثافت لطافت کا حامل بنا دیا۔ مادی انسان میں دیکھنے، سننے اور سمجھنے کی قوتیں پیدا کر دیں۔ ایسا ربِ کل اگر مستحقِ پرستش نہیں تو اور کون معبود بننے کی اہلیت رکھ سکتا ہے۔ وہ منعمِ حقیقی جس نے اندھیرے میں اجالا اور تاریکی میں نور پیدا کر دیا۔ خاکی پنجرے میں نورانی پرندوں کو بند کر دیا اس سے بڑھ کر اور کون منعم ہو سکتا ہے۔ مگر کم ہی ایسے لوگ ہیں جو اس راز کو سمجھتے ہوں اور پروردگار عظیم کا شکر ادا کرتے ہوں۔

(۲) یہ بھی غور طلب چیز ہے کہ ذرات عالم پہلے بالکل منتشر تھے۔ خدا تعالیٰ نے ان کے اندر کہربائی لہریں اور برقی موجیں پیدا کیں اور پھر سب کو جوڑ کر انسان کی شکل بنا کر زمین پر تمام انسانوں کو ترکیبی شکل میں پھیلا دیا۔ اس زمین پر انسان کچھ زمانہ تک رہتا ہے پھر مر جاتا ہے، ذرات منتشر ہو جاتے ہیں۔ تو اب بالکل واضح حقیقت ہے کہ جس خدا نے پہلے ذرات کو جمع کر کے ان کو انسانی شکل عطا کر کے زمین پر پھیلایا تھا اور پھر ذرات کو پراگندہ کر دیا تھا۔ کیا وہ دوبارہ ان ذرات کو اکٹھا کر کے ترکیب دے کر زندہ بنا کر اپنے پاس نہیں بلا سکتا۔ یقیناً بلا سکتا ہے۔ اسی کا نام حشر جسمانی ہے اور یہی قیامت ہے۔ یہ بھی سوچو کہ

(۳) حیات و موت کس چیز کا نام ہے؟ مشیت الٰہیہ اور ارادہ ربانی کا ہے۔ ذرات میں اللہ نے اپنی مشیت سے کہربائی لہریں اور برقی موجیں پیدا کر دیں۔ لوگوں نے اس کو زندگی سمجھ لیا اور انہی برقی موجوں کی اثر اندازی بند کر دی۔ ذرات کا تعلق فطری کہرباء سے منقطع کر دیا۔ لوگوں نے اس کو موت کہہ دیا۔ حقیقتاً زندگی اور موت مشیت الٰہیہ کا نام ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خدا باختیار صاحب ارادہ ہے، اس کی مشیت اور قدرت مطلق رہے گا۔ مارنے اور جلانے سے کبھی عاجز نہیں ہوتا۔ پھر کس قدر حماقت ہے کہ دنیوی زندگی اور زندگی کے بعد موت کا اقرار بوجہ بدیہی ہونے کے کیا جائے اور اس سے آگے بڑھ کر دوسری زندگی کا انکار کر دیا جائے۔ اس زندگی و موت کے بعد خدا تعالیٰ کی مشیت، اس کا ارادہ، اس کی قدرت اور اس کا اختیار سلب ہو جاتا ہے یا خدا کسی طور پر عاجز ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر جو قیامت کی حقانیت کو تسلیم کرنے سے کون چیز مانع ہو سکتی ہے۔ اس پر بھی غور کرو کہ

(۴) اللہ اپنی قدرت سے شبانہ روز کا تبادلہ کرتا رہتا ہے۔ رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کو لاتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے دن اور موت کی رات بھی اسی نے بنائی ہے۔ پھر کیا وجہ کہ صبح قیامت نہ نکلے اور عدم کی تاریکی ہی رہے۔ لیل و نہار کا تبادلہ بتا رہا ہے کہ زندگی اور موت کے شبانہ روز بھی (ایک کے بعد ایک) آئیں گے۔ شب موت کے بعد صبح قیامت ضرور ہوگی۔ البتہ صبح قیامت کے بعد پھر کبھی عدم کی رات نہیں آئے گی۔ ان حقائق کو سمجھنے کے لئے تدبر و تفکر کی ضرورت ہے۔ حقیقت و صداقت کو اقوال پارینہ قرار دینا اور یہ کہ ہمیشہ سے لوگ یونہی کہتے چلے آئے ہیں، لیکن قیامت کبھی نہیں آئی، اس لئے کبھی نہیں آئے گی قطعاً غلط ہے۔ فرسودگی اور بوسیدگی کو دیکھتے ہوئے تخلیق ثانوی کا انکار بے بنیاد حماقت ہے۔ بعثت ثانیہ ہوگی اور ضرور ہوگی۔

تحلیل اجزاء

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ الخ۔ یعنی اللہ کا یہ عظیم الشان احسان ہے کہ اس نے تمہارے فائدہ کے لئے سمع بصر اور قلب پیدا فرمائے۔ سمع و بصر آلات فہم ہیں اور قلب محل علم ہے۔ دوسرے جانوروں کو اگرچہ اس نے حواس عطا فرمائے ہیں جن سے وہ بعض محسوسات کا فہم رکھتے ہیں، مگر ان کو قلب یعنی عقل مرحمت نہیں فرمائی۔ انسان کا جسم بھی باعتبار جسم و نمو نباتات کی طرح تھا۔ نباتات سے ممتاز کرنے کے لئے اللہ نے اس کو آلات فہم دے کر دائرہ حیوانی میں داخل کیا۔ پھر حیوانوں پر فضیلت دینے کے لئے قلب عطا کیا۔ بغرض تمام مادی کائنات پر اس کو برتری عطا کی۔ یہ عظیم الشان احسان موجب شکر ہے، مگر

قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ۔ انسان بہت ہی کم شکر کرتا ہے۔ اہل علم نے کہا یہاں قلت بمعنی عدم ہے یعنی انسان کا حقیر ترین شکر کرنا نہ کرنے کے برابر ہے۔ آیت میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ جس شخص نے آلات فہم و عقل سے فائدہ نہ اٹھایا، گوش ہوش سے احکام الٰہی کو نہ سنا، آنکھوں سے آیات قدرت کو نہ دیکھا، دل سے معرفت حاصل نہ کی اور اللہ کی عظمت و جلالت پر غور نہ کیا تو اس نے امتیازی خصوصیات کو کھو دیا جو اللہ نے اس کو عطا کی تھیں اور ایسا آدمی خود دو ٹکا سا بھی اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ کتنا بے وقوف ہے وہ دولت مند جو بخل کی وجہ سے روپیہ صرف نہیں کرتا اور فاقہ کرتا ہے یا دوسروں سے بھیک مانگتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ الخ اللہ نے انسانوں کو دانوں کی طرح زمین پر پھیلا دیا پھر وہی سمیٹ کر سب کو اپنے پاس بلائے گا جو ابتداء تھی وہی انتہا ہوگی۔ بات یہ ہے کہ زمین کی حرکت دوری ہے۔ سلسلۂ عالم کا ہر حلقہ دوسرے حلقہ سے وابستہ ہے۔ ابتدائی کڑی کا آغاز جہاں سے ہوا ہے۔ انتہائی کڑی کا اختتام بھی اسی جگہ ہونے والا ہے۔ اس سطح زمین پر انسان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی زمین پر دانے پھیلے ہوتے ہیں۔ کوئی گیہوں کا دانہ، کوئی چنے کا، کوئی جوار کا، کوئی دھان کا۔ ہر دانے کا رنگ جدا، بو جدا، شکل جدا، جنس جدا اور حال جدا ہوتا ہے اسی طرح ہر انسان صفات، حالات، رنگ، ہیئت، جسامت، زبان، تہذیب، مزاج اور اعمال میں دوسرے سے الگ ہے۔ ایک نسل اور پھر اس قدر اختلاف یہ سب خدا کی مصلحت اور ہمہ گیر قدرت ہے۔ وحدت کو کثرت کے رنگ میں جلوہ گر کرنا اس کی کارسازی اور حکمت ہے۔ پھر سب کو اکٹھا کر کے اصل مرکز پر لے آنا بھی کچھ بعید نہیں۔

وَهُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ۔ ظاہر ہے کہ اللہ پیدا کرتا ہے ماں کے پیٹ کے اندر نطفہ میں تغیرات ہوتے ہیں، تبدیلیاں ہوتی ہیں، بڑے بڑے انقلابات اور استحالات کے بعد بچہ بن جاتا ہے پیدا ہوتا ہے۔ پھر زندگی کی مقررہ میعاد پوری کر دیتے کے بعد اللہ اس سے اپنی دی ہوئی امانت واپس لے لیتا ہے اور وہ مر جاتا ہے۔ تو جس نے احیاء کے آثار اور امانت کا مالک ہے کیا وہ دوبارہ تخلیق نہیں کر سکتا۔

وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ۔ شبانہ روز کا اختلاف بتلاتا ہے کہ عالم کی کسی حالت کو قرار نہیں۔ نور کے بعد ظلمت اور تاریکی کے بعد روشنی لازم ہے۔ یہ دنیا رات ہے سب لوگ زندگی کے خواب میں سرشار ہیں۔ لیکن ہر رات کی ایک صبح ہوتی ہے۔ عالم آخرت کے اُفق سے آفتاب قیامت طلوع ہونے والا ہے۔ کائنات میں ضرور اجالا ہوگا۔ شبانہ روز کا اختلاف بتا رہا ہے کہ عدم اور بعثت ثانیہ کا تبادلہ بھی ضرور ہوگا۔

بَلْ قَالُوا مِثْلَ مَا قَالَ الْأَوَّلُونَ ... الخ یعنی یہ لوگ اپنے اسلاف کے کورانہ مقلد ہیں۔ ان کے پاس نہ دلیل عقلی ہے نہ حجت شرعی۔ محض وہم و خیال سے کام لیتے ہیں، ہوش و بصیرت کو بے کار رکھ چھوڑا ہے۔ انسانی حواس کی رسائی ایک خاص حد تک ہے جہاں حواس کی پہنچ نہیں ہوتی وہاں عقل سے کام لیا جاتا ہے اور جہاں عقل بھی عاجز رہ جاتی ہے وہاں عقل کل کے صراحات کی پیروی اور محض پیروی کی جاتی ہے۔ مگر کفار مکہ نے ایسا نہ کیا۔ جو کام عقل کا تھا وہ حواس سے لینا چاہا۔ اسباب تخلیق اور اللہ کی ہمہ گیر قدرت کو سمجھنا عقل کا کام تھا انھوں نے حواس کو آگے بڑھایا۔ وہم و خیال اور ظن و تخمین کو برسرکار لائے اور جو کچھ ان کے اسلاف نے کہا وہی بغیر سوچے سمجھے انہوں نے کہنا شروع کر دیا۔ عقل سے خود سوچا نہ بصیرت سے سمجھا۔ فَهَلَكُوا كَمَا هَلَكَ الْأَوَّلُونَ۔

إِنْ هٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ۔ کافروں کی جہالت فقط اتنی ہی نہ تھی کہ صرف رسول پاک ﷺ کے پیش کردہ عقائد کی صحت کا انکار کر دیتے بلکہ انہوں نے بڑھ کر گزشتہ حاملان ہدایت کے اقوال پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی۔ تمام انبیائے سابقین نے وجود قیامت کی حقانیت کو واضح طور پر ظاہر فرما دیا ہے، مگر ان بدبختوں نے فرامین انبیاء اور صراحات مرسلین کو پارینہ قصص قرار دیا اور اثبات قیامت کی دلیل کو انکار کی دلیل بنا لیا۔

مقصود بیان

یہاں سے ایک یہ بھی استخراج کی جا سکتی ہے کہ کل اعضائے جسمیہ کو معطل چھوڑ دینا کفران ہے۔ ہر حواس اور دانش سے کام نہ لینا ناشکری ہے۔ ہر عضو کا فطری فریضہ ادا کرنا لازم۔ اگر کوئی شخص اچھے خاصے کانوں کو بہرا کر لے، آنکھیں پھوڑ لے، گونگا بن جائے اور بات کرنی چھوڑ دے، یا ہاتھ پاؤں کی حرکت بند کر دے تو وہ علاوہ احمق اور جاہل ہونے کے ناشکرا بھی ہے۔ خداداد نعمت سے فائدہ نہ اٹھانا ناشکری نہیں تو اور کیا ہے۔ پس گوشہ نشین ہوش سے سبق لینا چاہیے ان جاہل مولویوں اور گمراہ پیروں کو جنھوں نے اپنی قوت کسبیہ کو ارتحال رکھی ہے اور قوم کے چندوں یا مزاروں کے نذرانوں پر زندگانی کے دن مہاجنوں کی طرح گزار رہے ہیں یا مریدوں کے تحائف و ہدایا ان کی بقائے حیات کے کفیل ہیں اور خود کچھ کماتے ہیں نہ کسب کرتے ہیں۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت اور ہاتھ پاؤں ہلا کر روزی پیدا کرنی ان کے نزدیک دوسروں کا فرض ہے۔ مسند ارشاد و ہدایت پر بیٹھا رہنا اور وقف کی کمائی پر بسر کرنا یا مریدوں کی بھینٹ کھانا یا وعظ و تقریر کے ذریعہ سے قوم سے چندہ جمع کر کے اپنا پیٹ بھرنا ان کا کام ہے۔ یہ لوگ ناشکرے نافرمان اور کافر نعمت ہیں۔ ان پیشہ ور گداگروں کو بھی اس سے نصیحت حاصل کرنی چاہیئے جن کی قوت بھیک مانگنے میں ہے۔

ان جاہل ظاہر پرستوں کو بھی اس سے درس بصیرت لینا چاہیے جو عقل کو بے کار جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسائل شریعت خصوصاً توحید اور عقیدۂ معاد میں عقل کو رسائی نہیں۔ آیت مذکورہ پکار پکار ان کی تردید کر رہی ہے کیونکہ جس طرح کانوں سے سننا اور آنکھوں سے دیکھنا ضروری امر ہے اسی طرح عقل سے سوچنا سمجھنا غور و خوض کرنا اور دماغ کو تفکر و تدبر میں مشغول رکھنا بھی اقتضائے فطرت کے مطابق اور ارشاد الٰہی کے موافق ہے۔ ظاہری حواس سے کام نہ لینے والا بہرا، اندھا اور گونگا کہلاتا ہے تو کیا بصیرت و قلب سے کام نہ لینے والا احمق بیوقوف اور جاہل کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

يُحْيِي وَيُمِيتُ اور وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ کے الفاظ سے یہ تعلیم دینی غرض ہے کہ اگرچہ حیات و موت اور شبانہ روز کا ادل بدل اسباب خارجیہ کے تحت ہوتا ہے۔ ہر نتیجہ کا ایک سبب اور ہر اختلاف و تغیر کی ایک علت ضرور ہوتی ہے مگر کوئی سبب بغیر اذن الٰہی کے مسبب کو اور کوئی علت بغیر حکم خداوندی کے معلول کو نہیں پیدا کر سکتی۔ کارخانۂ قدرت کا کل انتظام اور سلسلۂ اسباب و نتائج کا کل بندوبست اللہ کے دست قدرت میں ہے۔ فاعل حقیقی اور مختار مطلق وہی ہے۔ درمیانی اسباب اگرچہ بیکار نہیں مگر صاحب اختیار اور قادر مطلق بھی نہیں۔

بَلْ قَالُوا سے کورانہ تقلید کی ممانعت مترشح ہوتی ہے۔ تقلید اسلاف اندھا دھند ممنوع ہے۔ عقل و بصیرت کی روشنی میں تقلید کرنی بُری چیز نہیں، مگر اسلاف کا نقال بن جانا بغیر سوچے سمجھے کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اپنی عقل سے کام لینا لازم ہے۔ وغیرہ

قُلْ لِّمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○ سَيَقُولُونَ لِلّٰهِ ۚ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ○

(اے محمد) پوچھو کہ اگر تم کو معلوم ہے تو بتاؤ کہ زمین اور جو زمین میں ہیں کس کے ہیں؟ وہ ضرور جواب دیں گے اللہ کے ہیں تو کہو پھر تم نصیحت کیوں نہیں لیتے

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ○ قُلْ

پوچھو سات آسمانوں کا اور عرش عظیم کا مالک کون ہے؟ وہ ضرور کہیں گے یہ سب اللہ کا ہے تو کہو پھر کیوں نہیں ڈرتے پوچھو

مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ

کہ اگر تم کو معلوم ہے تو بتاؤ کہ ہر چیز کی حکومت کس کے ہاتھ میں ہے اور کون پناہ دیتا ہے اور اسکے مقابلہ میں پناہ نہیں مل سکتی وہ صاف کہیں گے یہ سب

قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ○ بَلْ اَتَيْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا كَانَ مَعَهٗ

اوصاف اللہ کے ہیں تو کہو پھر تم پر کہاں سے جادو پڑتا ہے بلکہ ہم نے ان کو حق بات پہنچادی اور وہ قطعاً جھوٹے ہیں اللہ نہ کوئی بیٹا رکھتا ہے نہ اس کے ساتھ کوئی

مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۢ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ ﴿۹۱﴾

دوسرا معبود ہے ورنہ ہر معبود اپنی مخلوق کو لے جاتا اور ایک معبود دوسرے معبود پر چڑھائی کرتا ان لوگوں کے خرافات سے اللہ پاک ہے

عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ ع

غائب وحاضر کا جاننے والا ہے اور اُن کی شر انگیز بولی سے بالاتر ہے

تفسیر کسی مطلب کو ثابت کرنے کے صرف دو ہی طریقے ہیں یا تو صرف عقلی دلائل اور براہین کو پیش کیا جائے۔ مقدمات عقلیہ کو ترتیب دے کر شرائط انتاج کا لحاظ رکھتے ہوئے نتیجہ نکالا جائے یا عقلی ثبوت کو محسوس کا جامہ پہنا کر پیش کیا جائے اور محسوس سے غیر محسوس پر استدلال کیا جائے۔ اول طریقۂ اثبات مشکل ہے۔ روشن سمجھ رکھنے والے ہی اس سے فائدہ اندوز ہو سکتے ہیں۔ عقلیات محض پر محض عقل کی روشنی میں غور کرنا اور آلائش مثال سے ان کو آزاد رکھنا بڑے بڑے عقل مندوں ہی کا کام ہے۔ دوسرا طریقہ بہت اقرب الفہم ہے۔ ہر شخص ادنیٰ تامل کے بعد محسوس کو جانتا اور سمجھتا ہے۔ معقولات کو محسوسات کا جامہ پہنا کر اگر پیش کیا اور مختلف جزئیات دکھا کر امر عام پر استدلال کیا جائے تو عوام کی سمجھ میں آجاتا ہے۔ قرآن نے استدلال کے دونوں طریقے استعمال کئے ہیں، مگر اہل ہوش کا طبقہ بہت ہی محدود ہے، اس لئے برہانی استدلال بھی قرآن میں بہت ہی کم ہے۔ اور عوام یعنی معمولی دماغ رکھنے والوں کی چونکہ کثرت ہے، اس لئے طریقۂ استقراء کا استعمال بھی قرآن میں جابجا ہے۔ آیات مذکورہ میں توحید الوہیت کو ثابت کیا ہے اور استقرائی رنگ میں ثابت کیا ہے۔ اول بے پناہ قوت اور تخلیق اور قدرت قاہرہ کو بیان کیا ہے پھر بصفت ربوبیت کی تکمیل کے لئے عالم کا موجودہ بندوبست اور علویات و سفلیات میں تصرف کامل ظاہر فرما کر نفع اور نقصان پہنچانا اللہ کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ غرض کائنات کی ایجاد و تخلیق اور تربیت و حکومت اور کامل تصرف کو اپنے لئے مخصوص بتا کر الوہیت و وحدانیت کو ثابت فرمایا ہے۔ استحقاق الوہیت اور وحدانیت کا ثبوت برہانی طور پر عوام کی سمجھ میں نہ آسکتا تھا۔ وہ عقلیات کو وہمیات سے جدا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، اس لئے پہلے زمین و آسمان کی تخلیق و ایجاد اور ملک و حکومت کو بیان فرما کر کافروں سے سوال کرنے کا حکم دیا کہ اس کائنات کا موجد مربی حاکم منتظم اور متصرف حقیقی کون ہے اور چونکہ معمولی عقل اور چھوٹی سمجھ رکھنے والا بھی اس کا یہی جواب بے اختیار دے گا کہ سوائے ایک غیبی قاہر قدرت کے کسی کو عالم کے پیدا کرنے، برقرار رکھنے اور انتظام رکھنے میں کوئی دخل نہیں ہے، اس لئے لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ وہی الٰہ مطلق اور واحد و یگانہ بھی ہے۔ خدا کی خدائی میں کوئی شریک نہیں۔ آخر میں استحالہ شرک دکھانے کے لئے مجملاً اُن خرابیوں کو ظاہر فرمایا ہے جو چند خدا ہونے یا خدا کے صاحب اولاد ہونے کی صورت میں پیدا ہونی لازم ہیں۔ خدا کا بچہ بھی خدا ہونا چاہیئے اور ہر خدا کو با اختیار بے احتیاج خلاق مطلق اور قادر حقیقی ہونا بھی ضروری ہے، اس لئے بدیہی نتیجہ ہے کہ اگر چند خدا ہوں گے یا خدا کا کوئی بچہ ہوگا تو (علاوہ بے نیازی میں قصور آنے اور احتیاج پیدا ہونے کے) انتظام عالم درہم برہم ہو جائے گا۔ ہر ایک دوسرے سے مقابلہ کرے گا۔ تنافس اختلاف اور تقابل لازمی

امر ہے اور پھر ان فضائیوں میں لگائے کا مردار ہونا یقینی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ وہ خدا مستحق الوہیت ہو سکتا ہے جس میں مندرجۂ ذیل اوصاف موجود ہوں (۱) زمین آسمان اور کل کائنات کا خالق اور رب ہو (۲) کل عالم کا انتظام اور تمام حکومت و تصرف اس کے قبضہ میں ہو اور وہ ہر چیز کا مالک ہو (۳) اس میں ایسی زبردست طاقت ہو کہ جس کو چاہے مصائب و آفات سے بچا لے اور اگر کسی کو مبتلائے عذاب و مصیبت کرنا چاہے تو کوئی روکنے والا اور بچانے والا نہ ہو (۴) اس کو ہر چیز کا علم ہو، حاضر و غائب اس کے آئینۂ علم کے سامنے حاضر ہوں۔ باطن و ظاہر اس سے پوشیدہ نہ ہو اور چونکہ اوصاف مذکورہ اللہ کے سوا کسی میں نہیں پائے جاتے، اس لئے اس کے سوا کوئی معبود یا الوہیت میں شریک یا ربوبیت میں ساجھی بھی نہیں یہی سبب ہے کہ وہ صاحبِ اولاد بھی نہیں اور نہ اس کی طرف صاحبِ اولاد ہونے کی نسبت کرنی ممکن ہے۔

عرب میں چار قسم کے مشرک رہتے تھے۔ کچھ تو خدا کو صاحبِ اولاد کہتے تھے۔ عزیر کو، مسیح، ملائکہ کو خدا کی اولاد قرار دیتے تھے۔ یہ گروہ تو یہودیوں، عیسائیوں اور صابیوں کا تھا۔ کچھ لوگ فلکیات میں ستاروں کی اور عنصریات میں آگ کی پرستش کرتے تھے، انھیں کو مظاہر انوارِ الوہیت جانتے تھے۔ یہ گروہ مجوسیوں کا تھا۔ کچھ سورج کی پوجا کرتے تھے جس طرح ہندوستان کا ہندو دیوی کی پوجا کرتا، ہنومان کو مانتا اور لشن کی مورت پر پھل چڑھاتا ہے۔ ان کے سامنے ڈنڈوت اور سجدہ ریزیاں کرتا اور طرح طرح کی نذر نیاز اور بھینٹ پیش کرتا ہے، لیکن بایں ہمہ ان کو ایشور یعنی خلاق عالم نہیں کہتا۔ اسی طرح عرب کے بت پرست لات، عزیٰ، منات، نائلہ، ہبل اور بعض دوسری مورتیوں کی پوجا کرتے تھے، ان کو مظہر الوہیت جانتے اور سمجھتے تھے۔ مورتیوں سے طرح طرح کی مرادیں مانگتے، ان کو اپنا حاجت روا سمجھتے، اُن پر بھینٹ چڑھاتے، اُن کے ناموں پر بُن کرتے، ان کا طواف کرتے اور گھنٹی یا ناقوس بجا کر شرف انسانی کی ریشان کے سامنے کرتے تھے، مگر خلاق عالم خدا ہی کو کہتے تھے۔ طاقت قاہرہ اور لامتناہی قوت کا حامل اسی کو قرار دیتے تھے۔ (۴) کچھ لوگ خدا کے وجود ہی کے منکر تھے۔ دہر اور طبیعت کو مبداء کائنات سمجھتے تھے اور قدیم عالم کے قائل تھے۔ موخر الذکر گروہ بہت ہی کم تھا گویا نہ تھا۔ اول الذکر تینوں جزیرۂ عرب میں آباد تھے بجز سوا دو تین اشخاص (قیس بن ساعدہ، زید وغیرہ) کے کوئی خالص موحد نہ تھا۔ خدا تعالیٰ نے مشرکوں کے تین گروہوں کے سامنے ان کے مسلمات بیان فرما کر توحید خالص کو ثابت کیا اور بتایا کہ کارخانۂ قدرت کا خود مختار حاکم یا کارندہ کوئی بھی نہیں، ایجاد و تخلیق، تربیت و انتظام، حکومت و تصرف و کمال قدرت اور احاطۂ علمی کی طاقتیں خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہیں، اس لئے کسی طرح زیبا نہیں کہ کسی کو خدائی وصف میں اُس کا ساتھی قرار دیا جائے یا کسی ایسی صفت کی اس کی طرف نسبت کی جائے جو الوہیت و کمال کے منافی ہو۔

تحلیلِ اجزاء قُلۡ لِّمَنِ الۡاَرۡضُ الخ۔ رسول پاک کی بعثت سے قبل عرب کے مشرک کبھی تخلیق عالم پر غور کرنے کی تکلیف گوارا نہ کرتے تھے۔ نہ ان میں از خود ایجاد کائنات پر غور کرنے کی صلاحیت تھی۔ رسول پاک کی بعثت کے بعد جب شرک فی العباد سے منع کرنے کے لئے ان سے اس قسم کے سوالات کئے گئے تو انہوں نے ذہنی فکر کے بعد فوراً خلاق مطلق کا اقرار کیا اور تمام عالم کو اسی کا مرہون ایجاد قرار دیا، مگر شرک پھر بھی نہ چھوڑا جس طرح آج کل بکثرت مسلمان اس بیماری کے مریض ہیں۔ خدا کو واحد لاشریک خالق رازق عالم اور مختار کل جانتے ہوئے بھی مٹی کے ڈھیروں سے مرادیں مانگتے اور ان کو قرب الٰہی کا ذریعہ بتاتے ہیں۔ اسی طرح کفار عرب بھی ان مورتیوں کو جو انہوں نے اپنے نیکوکار اسلاف کی صورت یا نام پر بنا رکھی تھیں کارساز اور حاجت روا سمجھتے اور ان سے مرادیں مانگتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے ان کو دعوتِ فکر دیتے ہوئے آیت مذکورہ میں فرمایا کہ جب تم کو علم ہے کہ کل کائنات کو پیدا کرنے والا اور سب کا مالک خدا ہی ہے تو پھر کیوں دوسروں کو اس کی عبادت اور امتیازی اوصاف میں شریک کرتے ہو۔ کیا تم اتنا نہیں سمجھتے کہ جو خلاق کل اور مالک ہے وہی معبود بھی ہے۔

اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ پہلی آیات میں اَفَلَا تَذَكَّرُوۡنَ فرمایا تھا اور یہاں اَفَلَا تَتَّقُوۡنَ فرمایا۔ تقویٰ کا درجہ تذکر کے بعد ہے۔ غور و فکر کے بعد جب آدمی کسی نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے اور کسی عقیدہ کو صحیح مان لیتا ہے تو پھر اس کو خیال ہوتا ہے کہ اس عقیدہ کے خلاف دوسرا عقیدہ قائم کرنا باطل ہے اور باطل پر جمنے سے طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہونی یقینی ہیں، اس لئے وہ غلط عقیدے سے اجتناب کرتا ہے یا یوں کہا جائے کہ پہلا فقرہ شرک فی العقیدہ سے روکنے کے لئے فرمایا تھا اور یہ فقرہ شرک فی العمل سے باز رکھنے کے لئے استعمال کیا۔ عَرۡش کی تفسیری تحقیق ہم سورۂ بقرہ میں کر چکے ہیں مگر یہاں بھی چند ضروری اقوال نقل کرنے مناسب ہیں۔

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ابو داؤد کی مرفوع روایت میں آیا ہے حضور والا نے ارشاد فرمایا اللہ کی شان بہت بڑی ہے۔ حضورؐ نے ہاتھ کو قبہ کی طرح محدب بنا کر فرمایا تمام آسمانوں پر اللہ کا عرش اس طرح ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا خدا کا عرش بادشاہوں کے تخت کی طرح نہیں تو وہ بادشاہوں کی طرح تخت پر نشست کرتا ہے بلکہ اس کا عرش عظیم الشان ہے۔ مجاہد کا قول ہے کہ عرش کے اندر یہ آسمان و زمین ایسے ہیں جیسے کسی بیابان میں کوئی چھلا پڑا ہو۔ ابن عباسؓ نے ایک قول میں فرمایا عرش کا اندازہ سوا خدا کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔ (یہی حق ہے)

تنبیہ: آیت میں اَلْعَرْشِ الْعَظِیْمِ کا عطف السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ پر کیا ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرش ساتوں آسمانوں کے علاوہ ہے۔ بعض احادیث میں بھی وارد ہے۔ قُلْ مَنْۢ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ۔ سابق آیات میں اللہ کو خلاق و موجد ثابت کیا تھا۔ اس آیت میں حکومت، تصرف اور انتظام کا مالک اس کو قرار دیا ہے۔

وَهُوَ یُجِیْرُ وَلَا یُجَارُ عَلَیْهِ۔ اس فقرہ میں اللہ کی ہمہ گیر قدرت اور محیط کل طاقت کا اظہار کیا ہے۔ عرب میں پناہ دہی اور پناہ گیری کا عام دستور تھا جاہلیت و بربریت کے سبب عرب کے باشندے غارت گری اور خوں ریزی کے خوگر تھے، اس لئے کمزور قبیلہ یا شخص کا جان و مال محفوظ نہ تھا۔ کسی زبردست شخص یا طاقتور قبیلہ کی پناہ کے بغیر کمزور کی زندگی ناممکن تھی۔ پھر مجرموں کو پناہ دینے کو بدنی یا خاندانی طاقت کا مظاہرہ کمال سمجھا جاتا تھا۔ اپنے مہمان کی اونٹنی کے پیچھے جساس کا اپنے بہنوئی کلیب کو قتل کر دینا اور اس سے خمیازہ میں تغلب و بکر کی چالیس سالہ جنگ ہونا اور اس قسم کے لامحدود واقعات اسی پناہ گیری اور پناہ دہی کے جذبہ کے تحت ظہور پذیر ہوتے رہتے تھے۔ قرآن پاک نے بھی عرب کے عام دستور و رواج کا لحاظ کرتے ہوئے فرمایا کہ خدا ہر ایک کو پناہ دے سکتا ہے اور اس کے خلاف کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ پناہ دینے سے مراد ہے عذاب اور سزا سے بچانا نہ کہ غیر مجرم کو مجرم قرار دینا۔ خلاصہ یہ کہ وہ مختار مطلق اور قادر و قاہر ہے اس سے بڑھ کر کسی میں طاقت نہیں۔

فَاَنّٰی تُسْحَرُوْنَ۔ قرآن کے یقینی دلائل اور شیریں طرز بیان کے مقابلے میں بہت سے لوگ کہتے تھے کہ محمدؐ ساحر ہیں، یہ جادو کر دیتے ہیں اور قرآن جادو ہے جو لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ اس کے رد میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اب کدھر سے کدھر جادو کیا جاتا ہے۔ یعنی تمہارے ہی مسلمات ہیں جو پیش کئے جاتے ہیں کوئی نئی چیز تو بیان نہیں کی جاتی۔ البتہ تم کو دعوتِ فکر دی جارہی ہے کیا دعوتِ فکر بھی جادو ہے۔

بَلْ اَتَیْنٰهُمْ بِالْحَقِّ۔ قرآن کو جادو کہنا، شرک فی العبادت کا عقیدہ رکھنا، بتوں کو قرب الٰہی کا ذریعہ خیال کرنا، توحید سے منہ موڑنا، رسول پاکؐ کو جھوٹا سمجھنا اور قیامت کا انکار کرنا وغیرہ وغیرہ تمام امور باطل ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ان وہمی خرافات کو زائل کرنے کے لئے عقائد صحیحہ اور اعمال حسنہ کی تعلیم دی، قرآن نازل فرمایا اور دین اسلام بھیجا۔ یہی حق ہے اور اس کے علاوہ ہر چیز جھوٹ۔

مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ مِنْ وَّلَدٍ۔ عیسائی اور یہودی مسیح اور عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اور مشرکین کے بعض خاندان ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ اس جملہ میں ان کے عقیدہ کی بیخ کنی فرمائی بلکہ اس کے ابدعام شرک کی تردید کے لئے فرمایا کہ چند خدا کے ہونے کے تو یہ معنی ہیں کہ انتظام پراگندہ ہو جائے۔ ہر خدا اپنی مخلوق کو لے کر الگ ہو جائے اور پھر ان کا باہم تخالف، تناقض اور تحارب ہو۔ ایک دوسرے پر غالب آنے کا خواستگار ہو کیونکہ اتحاد و اتفاق احتیاج کی علامت ہے اور خدا محتاج نہیں ہو سکتا، اس لئے تخالف و تضاد لازمی ہے اور تخالف سے نظم کائنات کی بربادی لازم ہے۔

مقصود بیان الوہیت و وحدانیت کا پرزور اثبات۔ الوہیت کے لئے اوصاف چہارگانہ کی ضرورت کا اظہار، حقائق عالم پر غور کرنے کی دعوت، مفاسد شرک کی وضاحت۔ اس بات کی صراحت کہ اسلام اور قرآن حق ہے اور چونکہ واقعی حق ہمیشہ حق ہوتا ہے اور حق میں تغیر و تبدل محال ہے، اس لئے قرآن کی تعلیم ناقابل ترمیم ہے یہی ازلی سرمدی ہے وغیرہ۔

قُلْ رَّبِّ اِمَّا تُرِیَنِّیْ مَا یُوْعَدُوْنَ ۙ۝ رَبِّ فَلَا تَجْعَلْنِیْ فِی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَاِنَّا عَلٰۤی اَنْ

تم کہو اے میرے رب اگر تو مجھے وہ عذاب دکھا دے جس سے انکو ڈرایا جارہا ہے تو میرے پروردگار تو مجھے ظالم لوگوں میں شامل نہ کرنا اور ہم اس بات پر قادر ہیں

نُّرِیَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ ۝ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ ؕ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ ۝

کہ جس عذاب کا وعدہ ان سے کر رہے ہیں تم کو دکھا دیں بدی کو اس صورت سے دفع کرو جو اچھی ہو ہم ان کے خرافات بکنے کو خوب جانتے ہیں

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ ۙ۝ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ ۝ حَتّٰۤی اِذَا

تم کہو اے میرے رب میں شیطانوں کے وسوسوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور اے میرے پروردگار میں اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ میرے پاس آ جائیں (کفار باز نہ

جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا

آئیں گے) یہاں تک کہ جب اُن میں سے کسی کو موت آئے گی تو کہے گا اے میرے رب مجھے واپس بھیجئے تاکہ جس (دنیا) کو میں چھوڑ آیا ہوں اس میں پہنچ کر نیک عمل کروں ہرگز نہیں

كَلِمَةٌ هُوَ قَاۗىِٕلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَاۗىِٕهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝

بلاشبہ یہ ایک فضول بات ہے جس کو وہ کہے گا اُن کے آگے ایک پردہ رہے گا اُس دن تک جبکہ وہ اُٹھائے جائیں گے

تفسیر ہر پیغمبر کی بعثت اصلاحِ خلق کے لئے ہوتی ہے۔ رسول پاکؐ بھی اس ضابطہ سے جُدا نہ تھے۔ اصلاحِ خلق کی غیر محدود صورتیں ہیں، لیکن جنسی مفہوم کا لحاظ کرتے ہوئے صرف دو ہی صورتوں میں کل اصلاحات کا حصر کیا جا سکتا ہے۔ اوّل یہ کہ بندہ کا اپنے خالق سے معاملہ درست ہو جائے۔ اللہ کی خوشنودی ہر وقت اس کے پیشِ نظر رہے۔ اپنے اعمال پر غرّہ نہ ہو جائے۔ قہارِ مطلق کی آتشِ غضب سے ہر آن ترساں اور لرزاں رہے۔ نیک عمل اور اطاعت کی کوشش کرے، مگر پھر بھی بر بھی سے ڈرتا رہے۔ اللہ کتنا ہی بڑا مرتبہ عطا فرما دے شہنشاہِ عالم کر دے، اپنا مقرب بنا لے یا خلعتِ نبوت سے سرفراز فرما دے، مگر بندہ اپنی بندگی پر نظر رکھے اور قہر کی آگ سے ہمیشہ پناہ مانگتا رہے۔ دوسرے خلق سے معاملہ کو درست رکھے۔ عزیزوں اور دوستوں سے سلوک کرنا اور اپنے حلقہ والوں کو خوش رکھنا تو معمولی بات ہے، کمال یہ ہے کہ دشمنوں اور غیروں سے ایسا سلوک کرے کہ ان کو کبھی حرفِ گیری کا موقعہ نہ ملے اور اخلاق و محبت کے جال میں وہ خود پھنس جائیں۔ معمار کا کمال یہ ہے کہ کیسی ہی ناکارہ اینٹ ہو، کتنا ہی بدشکل ناہموار روڑہ ہو زیادہ سے زیادہ مصالحہ میں اس کو چھپا کر کسی مناسب جگہ پر اس کو پیوست کر دے۔ بندۂ کامل کا بھی یہی فرض ہے کہ اخلاق کے مصالحہ کو زیادہ سے زیادہ صرف کرے اور سرکش دشمنوں کو اس طرح ملا لے اور اس طور پر ان کی اصلاح کرے کہ خود بخود کھنچے چلے آئیں، اُن کی ہر دشمنی، ہر مخالفت اور ضرر رسانی کی کوشش کو محبت، حلم اور خلق سے برداشت کرے اور رفتہ رفتہ ان کی اصلاح کر ڈالے۔ حدِ اعتدال اور دائرۂ عقل سے خارج کر دینے والی دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک تو قوتِ شہوانیہ کے غلبہ کا تابع ہو کر عفت و قناعت کو کھو دینا اور دنیوی لالچ سے مسحور ہو کر خود پسندی، خود غرضی اور حرص و ہوا کے جال میں پھنس جانا۔ دوسرے مخالفوں کی مخالفت کا مقابلہ جبر و استبداد، قہر و ظلم اور سفاکی سے کرنا، ہر ادنیٰ مخالفت کرنے والے کو خانماں برباد کر دینا، جوشِ غضب میں آ کر دنیا میں تباہ کاری، بربادی اور سفاکی پھیلا دینا۔ یہ دونوں تباہ کن عمل انسان عقل کو کھو کر اور شیطانِ نفس سے مغلوب ہو کر کرتا ہے۔ جو طاقت قوتِ شہوانیہ و غضبیہ پر حکمراں ہے اور ہمیشہ عقل سے برسرِ پیکار رہتی ہے شرعی زبان میں اس کا نام شیطان ہے۔ شیطان ہی ہر قسم کی بدکاریوں اور ہلاکت انگیزیوں پر آدمی کو اکساتا ہے، اس لئے سب سے پہلے بندۂ مصلح کا فرض ہے کہ شیطان کی چیرہ دستیوں سے اللہ کی پناہ مانگے تاکہ دائرۂ عقل میں رہ کر اعتدال کے ساتھ خدمتِ مفوضہ کو انجام دے اور اصلاحِ خلق کر سکے اور چونکہ خالق و خلق سے معاملات کی درستی بغیر توفیقِ الٰہی کے ناممکن ہے اسی کی کارسازی عالم میں جاری و ساری ہے، اس لئے تمام اصلاحات کی طلب اور ہر ارادہ و سعی کی درخواست بھی اسی سے کرنی لازم ہے۔

مضامین مذکورہ کو آیت میں بیان فرمایا ہے سب سے پہلے ارشاد فرمایا کہ اے نبی کافروں پر اگر عذاب نازل ہو تو تم کو اپنی بندگی اور خدا کے قہر کی بے پناہ طاقت پر نظر رکھتے ہوئے اس سے پناہ مانگنی ضروری ہے۔ اس کے بعد خلق سے حسنِ سلوک کے متعلق فرمایا کہ برائی کو بھلائی سے، دشمنی کو محبت سے اور بدسلوکی کو سلوک سے دفع کرنا تمہارے لئے لازم ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی ساتھ دشمنوں کی چیرہ دستیوں اور وسوسہ انگیزیوں سے اللہ کی پناہ مانگنی بھی ضروری ہے۔ بندہ سے شیطان کا قرب بھی تباہی انگیز ہے۔ اُس کے قریب سے بھی محفوظ رہنے کی دعا کرنی لازم ہے تاکہ ان غیراں مآب اور انجام برباد اشخاص کا ایسا حشر نہ ہو جو مرنے کے بعد عذاب کو دیکھ کر دنیا میں جانے اور نیک عمل کرنے کے خواستگار ہوں گے۔ اس وقت ان کی کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ دنیا میں دوبارہ لوٹ کر جانا ناممکن ہوگا۔ قیامت تک عالمِ برزخ میں رہنا ہوگا اور پھر برزخ کے بعد میدانِ حشر میں جمع ہو کر اپنے کئے کرتوت کو بھگتنا پڑے گا۔

تحلیلِ اجزاء اِمَّا تُرِيَنِّيْ مَا يُوْعَدُوْنَ۔ اس آیت کا مطلب دو طرح بیان کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ ہر انسان خواہ جلیل القدر پیغمبر ہی ہو اللہ کا حق کامل طور پر ادا نہیں کر سکتا۔ شانِ الٰہی طاقتِ بشری کی انتہائی وسعت سے بے انتہا بلند ہے۔ انسان جو کچھ عبادت اور عمل صالح کرتا ہے وہ پروردگار کے تخلیقی احسانات کے شکر کو ادا نہیں کرتے۔ چہ جائیکہ کسی جدید استحقاق کو پیدا کریں۔ اسی لئے ایک حدیث میں آیا ہے کہ مَا عَبَدْنٰكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ ایک اور صحیح حدیث ہے کہ حضور اقدسؐ نے ایک روز صحابہ کرام سے فرمایا کوئی شخص اپنے اعمال کی بدولت جنت میں نہ جائے گا۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہؐ کیا حضور بھی۔ فرمایا میں بھی ہاں اگر

مجھے پروردگار اپنی رحمت سے ڈھانک لے تو جنت میں جاؤں گا۔ شانِ قہر کے سامنے مقرب ترین فرشتے اور عظیم الشان انبیاء ترساں و لرزاں ہیں۔ اسی لئے آدابِ عبودیت کی تعلیم دیتے ہوئے پروردگار نے فرمایا تم خدا سے دعا کرو کہ اے میرے رب اگر تو جو عذاب میرے سامنے کافروں پر نازل فرمائے تو مجھے اس ناحق کوش حق فراموش گروہ سے الگ رکھنا تاکہ قہر کی آگ میں سوکھے کے ساتھ گیلا بھی نہ جل جائے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ خطاب رسول پاکؐ کو ہے، مگر روئے خطاب اس زمانہ کے مسلمانوں کی طرف ہے اور ان کو اللہ سے ڈرنے اور عذابِ الٰہی سے خائف رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ بہرحال رسول پاکؐ کے عذاب میں شامل ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ کافروں پر عذاب ضرور نازل ہوگا اور اللہ کا عذاب ایسا ہولناک ہے کہ اس سے جلیل القدر نبی اور مجسمہ ایمان مسلمانوں کو بھی پناہ مانگنی چاہیئے۔ ابن کثیر نے ایک ذیل حدیث کا کچھ ٹکڑا نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں (حضورؐ نے دعا کی) وَاِذَا اَرَدْتَّ بِعِبَادِكَ الْفِتْنَةَ فَاقْبِضْنِيْ اِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ۔ یعنی پروردگار! جب تو اپنے بندوں کو کسی آزمائش میں مبتلا کرنا چاہے تو آزمائش سے پہلے میری روح قبض کر لینا۔ مجھے مبتلائے امتحان نہ کرنا (رواہ احمد والترمذی) آیت مذکورہ میں آئندہ عذاب کے مطابق در پردہ تنبیہ ہے جس کا وقوع جنگ بدر کے موقعہ پر ہوا اور لڑائی ختم ہونے کے بعد حضور والاؐ نے سرداران کفر کی لاشوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے فلاں ولد فلاں ہم سے ہمارے رب نے (رحمت کا) جو وعدہ فرمایا تھا وہ پورا کر دیا۔ کیا تم سے تمہارے رب نے جو عذاب کی وعید فرمائی تھی وہ بھی تم نے پالی۔

وَاِنَّا عَلٰٓى اَنْ نُّرِيَكَ مَا نَعِدُهُمْ لَقٰدِرُوْنَ۔ یعنی ہم نے کافروں پر عذاب نازل کرنے کا جو وعدہ کیا ہے اس کے پورا کرنے پر ہم ہر وقت قادر ہیں۔ تمہاری زندگی ہی میں تم کو دکھا سکتے ہیں، مگر ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے اور مشیتِ الٰہی وقت سے پہلے کوئی کام نہیں کرتی) چنانچہ مدینہ کو ہجرت کرنے کے بعد سب سے پہلا عذاب جنگِ بدر کی شکل میں نمودار ہوا۔ پھر فتح مکہ کے روز کافروں پر وعید مذکور پوری ہوئی۔

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ۔ اس آیت میں دشمنوں سے سلوک کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ اسی کی تائید ایک اور آیت سے بھی ہوتی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے۔ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ یعنی خوش خوئی سے دشمنوں کی مدافعت کر، خوش خلقی کی بدولت تمہارا دشمن دشمنی کو چھوڑ کر بڑے گہرے دوست کی طرح بن جائے گا۔ آیت مذکورہ بہت سے مضامین کو حاوی ہے۔ بدکلامی کے عوض بدکلامی نہ کرنی، ایذاء کے مقابلے میں ایذاء نہ دینی، برائی کے عوض بھلائی کرنی، تکلیفیں اٹھا کر دعا دینی اور نرمی و مدافعت کی تدبیر کرنی۔ اس قسم کے تمام اخلاقیات کی تعلیم آیت سے مستفاد ہوتی ہے۔ حضور اقدسؐ کافروں کے ہاتھوں سے انتہائی تکلیفیں اٹھانے کے بعد بھی بددعا نہ فرماتے تھے بلکہ اللہ سے ان کے ہدایت یاب ہونے کی درخواست کرتے تھے اور فرماتے تھے اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ تورات میں حضورؐ کے صفات میں ایک وصف یہ مذکور ہے کہ وہ نبی بدی کا مقابلہ بدی سے نہیں بلکہ بھلائی سے کرے گا۔ حدیث میں صاف صراحت ہے کہ برائی کو برائی دور نہیں کرتی بلکہ بھلائی ہی دور کرتی ہے۔ ایک اور حدیث میں حضورؐ نے حکم دیا ہے جو تم سے قطع تعلق کرے تم اس سے میل کرو، جو تمہیں نہ دے تم اس کو دو۔ الخ۔ مجاہد کا قول ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ کافروں کی ایذاء رسانی سے چشم پوشی کرو۔

تنبیہ آیت مذکورہ باتفاق مفسرین آیت جہاد سے منسوخ نہیں بلکہ ہر حکم کا محل جدا ہے۔ تبلیغ اسلام کے مختلف مظاہر ہیں۔ بیگانوں یگانوں اور دشمنوں کو جاں نثار بنانے کے علیحدہ علیحدہ پہلو ہیں۔ حکم جہاد حسنِ سلوک کا متناقض نہیں۔ کیونکہ اعتدال کے ساتھ قوتِ غضبیہ کو استعمال کرنا عدالت کے خلاف نہیں جیسی معاشرت قوتِ شہوانیہ کے اعتدال کی ایک شاخ ہے اور جہاد باشرائط بھی قوتِ غضبیہ کے توسط کا ایک شعبہ ہے۔ دونوں میں تضاد ممکن ہی نہیں۔

مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ۔ ہمزات کا لفظ ہر قسم کے شیطانی وسوسوں کو شامل ہے خواہ ان کا تعلق غضبیات سے ہو یا شہوانیات سے، اصلاح نفس کے خلاف ہو یا اصلاح خلق کے خلاف۔ ابن کثیر نے نقل کیا ہے کہ حضور والاؐ اس طرح دعا فرماتے تھے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ وَنَفْخِهٖ وَنَفْثِهٖ۔ ابوداؤد نے سنن میں بیان کیا ہے کہ حضور اس طرح فرماتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَرَمِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَدْمِ وَمِنَ الْغَرَقِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ يَّتَخَبَّطَنِيَ الشَّيْطٰنُ عِنْدَ الْمَوْتِ۔ یعنی پروردگار میں تیری پناہ چاہتا ہوں سٹھیا جانے کی عمر سے اور دیوار وغیرہ میں دب کر مر جانے سے اور پانی میں ڈوبنے سے اور موت کے وقت شیطان کے اغواء سے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا حضور اقدسؐ ہم کو یہ کلمات سکھاتے تھے تاکہ ہم سوتے وقت پڑھ لیا کریں۔ اَعُوْذُ بِكَلِمٰتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ غَضَبِهٖ وَعِقَابِهٖ وَمِنْ شَرِّ عِبَادِهٖ وَمِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ وَاَنْ يَّحْضُرُوْنِ۔

اشارہ کفار فقط تکذیب ہی نہ کرتے تھے بلکہ طرح طرح سے تکلیفیں بھی دیتے رہتے تھے۔ باقتضاء بشری ممکن تھا کہ حضور اقدسؐ بہت زیادہ دلگیر ہو کر کفار کے حق میں کچھ بددعا فرما دیتے، اس لئے مذکورۂ بالا تعلیم فرما دی۔ اس سے نصیحت حاصل کرنی چاہیئے ان علماء کو جو مدعیانِ اسلام کے سب و شتم اور تکفیر و تفسیق میں مبتلا ہیں اور

بجائے تعوذ کے بدکلامی کرتے ہیں اور ہر وقت کفر کی مشین سے کفر کے فتوے ڈھالتے رہتے ہیں۔

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ - یہاں کچھ کلام محذوف ہے۔ اوپر کی آیت میں شیطان کی وسوسہ انگیزیوں سے اللہ کی پناہ مانگنے کی تعلیم دی۔ اس آیت میں شیطانی وسوسوں میں پھنسنے کا نتیجہ قبیح بیان فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان کی ضلالت انگیزیوں سے اللہ کی پناہ مانگو تاکہ ان کافروں کی ایسی حالت نہ ہو جو عمر بھر کفر و معصیت کرتے ہیں اور جب علاماتِ موت نمایاں ہو جاتی ہیں، مرنے کا وقت آجاتا ہے، عذاب کے فرشتے سامنے نظر آتے ہیں تو گزشتہ زندگی کو برباد کرنے پر افسوس کرتے ہیں اور خواہش مند ہوتے ہیں کہ ان کو دنیا میں دوبارہ جانے کی اجازت دے دی جائے تاکہ نیک عمل کر سکیں۔

قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ - رب کا لفظ مفرد ہے، اور ارجعوا جمع کا صیغہ ہے۔ ایسے موقع پر جمع کا صیغہ استعمال کرنا قواعد عربی کے خلاف ہے، اس لئے اہل تفسیر نے یہاں تاویل کی ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اللہ کی عظمت و ہیبت ظاہر کرنے کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا۔ اگر کسی عظیم القدر بادشاہ یا جلیل الشان عالم یا خاندان کے سرپرست یا اور کسی وجیہ باعظمت سے خطاب کیا جاتا ہے تو جمع کا صیغہ کبھی استعمال کر لیا جاتا ہے۔ دوسرا جواب ابو البقاء نے تبیان میں دیا ہے کہ صیغہ جمع استعمال کرنے سے ایک ہی فعل پر بار بار اصرار کرنا مقصود ہوتا ہے۔ گویا کافر مقصد یہ ہے کہ پروردگار! تو مجھے دنیا میں واپس کر دے۔ ایک شاعر کا قول ہے۔ "الا فارحموا یا الٰہ محمد"۔ الٰہ کا لفظ مفرد ہے اور ارحموا جمع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے محمدؐ کے اللہ تو مجھ پر متواتر مسلسل رحم فرما۔ یہ جواب میرے نزدیک زیادہ بلاغت انگیز ہے۔ اکثر مفسرین کا قول ہے کہ دنیا میں واپس جانے کی درخواست اہلِ کفر بوقت موت کرتے ہیں۔ ابن جریر کی روایت ہے کہ رسول اللہ نے امّ المومنین عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا کہ مومن جب ملائکہ کو دیکھتا ہے اور ملائکہ اس سے دوبارہ واپس کرنے کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو کہتا ہے کیا تم مجھے پھر غم کدے میں واپس کر دو گے؟ نہیں، ایسا نہ کرو بلکہ مجھے اللہ کی طرف لے چلو اور کافر استفسار ملائکہ کے جواب میں کہتا ہے اے رب! مجھے وہیں واپس کر دے تاکہ میں نیک عمل کر سکوں (یہ روایت مرسل ہے)

حضرت جابر بن عبد اللہ کی روایت ہے کہ کافر کے سامنے مرنے کے بعد وہ تمام چیزیں جمع کر کے لائی جاتی ہیں جو قبولِ حق سے اس کو روکتی تھیں۔ اس وقت وہ کہتا ہے۔

رَبِّ ارْجِعُوْنِ۔

عام مفسرین کے اقوال کے خلاف ابن ابی حاتمؒ نے ابو ہریرہؓ کا ایک قول نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ کافر کو جب قبر میں داخل کر دیا جاتا ہے اور اس کو دوزخ کے اندر اپنا ٹھکانا نظر آتا ہے تو اس وقت وہ **رَبِّ ارْجِعُوْنِ** کہتا ہے۔ واللہ اعلم۔

وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ - ابو صالح اور دیگر علمائے تابعین نے لفظ وراء کا ترجمہ آگے کیا ہے یعنی کافروں کے آگے ایک عالم برزخ ہے جس میں وقت حشر تک رہنا ہوگا۔ مجاہد نے کہا برزخ وہ پردہ ہے جو دنیا و آخرت کے درمیان حائل ہے۔ محمد بن کعب قرظی نے لکھا ہے کہ برزخ دنیا و آخرت کے درمیان ہے نہ وہ اہلِ دنیا کے ساتھ ہیں کہ کھائیں اور پئیں اور نہ اہلِ آخرت کے ساتھ ہیں کہ اپنے اعمال کا بدلہ پائیں۔ ابو صخر صدوسی کا قول ہے کہ برزخ مقابر ہیں جو نہ دنیا میں ہیں نہ آخرت میں۔

مقصود بیان

اللہ کی عظمت و جلالت کے سامنے جلیل القدر انبیاء بھی لرزہ براندام ہیں۔ عذابِ الٰہی اس قدر ہولناک اور ہیبت خیز ہے کہ مقربانِ بارگاہ باوجود محفوظ و مامون ہونے کے اُس سے ڈرتے ہیں۔ انبیاء کا کام اصلاحِ خلق ہے، مگر اصلاح خلق سے پہلے اصلاح نفس ہونی چاہیئے۔ کفار پر عذابِ الٰہی دنیا میں بھی نازل ہو سکتا ہے۔ اہلِ صلاح کو چاہیئے کہ بدکرداروں سے علیحدہ رہیں، کہیں خشک کے ساتھ تر بھی سوختہ نہ ہو جائے۔ برائی کو بھلائی سے دشمنی کو نرمی سے اور بدخوئی کو خوش خلقی سے رفع کرنا مسلمان کا فریضہ ہے۔ شیطان کی ضلالت انگیزیاں بہت ہی طاقتور ہیں۔ اللہ نے اپنے رسول کو بھی حکم دیا ہے کہ ان سے پناہ مانگتے رہیں۔ شیطان کا قرب بھی مضرت خیز ہے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ شریر اور بدکار کی صحبت بھی بُری ہے۔ بوقت موت حسرت و یاس کا سماں کافر کی نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرنے کے وقت توبہ قبول نہیں ہو سکتی۔ ایمان بالمشاہدہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ قیامت کے دن تک سب کو عالمِ برزخ میں رہنا ہوگا۔ اس سے تناسخ کا محال ہونا بھی ظاہر ہے۔

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَاۤ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ ○ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ

پھر جب صور پھونکا جائے گا تو اُس روز اُن میں رشتے ناطے نہیں رہیں گے اور نہ ایک دوسرے کو پوچھے گا　پھر جن کا پلّہ بھاری ہوگا　وہی کامیاب

هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ ۝

ہوں گے — اور جن کا — پلہ ہلکا ہوگا — وہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے خود اپنا نقصان کیا — وہ ہمیشہ جہنم میں — رہیں گے

تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ ۝ أَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ ۝

اُن کے چہروں کو آگ جھلس دے گی اور اس کے اندر انکی صورتیں بگڑی ہوں گی کیا میری آیتیں تمہارے سامنے نہیں پڑھی جاتی تھیں اور تم انکی تکذیب کیا کرتے تھے

قَالُوا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ ۝ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا

وہ کہیں گے اے ہمارے رب ہماری بدبختی ہم پر غالب آگئی تھی اور ہم گمراہ لوگ تھے — اے ہمارے رب ہم کو اس سے نکال دے اگر ہم دوبارہ ایسا کریں تو

فَإِنَّا ظَالِمُونَ ۝ قَالَ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ۝ إِنَّهُ كَانَ فَرِيقٌ مِنْ عِبَادِي

بے شک ہم ظالم ہیں — اللہ فرمائے گا اسی میں تم ذلیل رہو — مجھ سے بات نہ کرو — میرے بندوں میں سے ایک گروہ کہا کرتا تھا اے

يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ ۝ فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ

ہمارے رب ہم ایمان لائے تو ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما تو سب سے بڑھ کر رحیم ہے تو تم نے اُن کو مسخرہ بنا لیا

سِخْرِيًّا حَتَّىٰ أَنْسَوْكُمْ ذِكْرِي وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ تَضْحَكُونَ ۝ إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا

تھا یہاں تک کہ انھوں نے تم کو میری یاد بھلادی اور تم انکی ہنسی اڑاتے تھے — میں نے آج اُن کو اُن کے صبر کا یہ بدلہ

صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ ۝

دیا کہ وہی کامیاب ہیں

تفسیر ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے کہ روشن عقل رکھنے والے تو عقلی دلائل کو مانتے اور سمجھتے ہیں۔ اُن کے عقائد و افکار کی اصلاح کے لئے قرآن میں محض عقلی براہین مذکور ہیں اور ان سے کم درجہ رکھنے والے چونکہ بصیرت کا کم حصہ رکھتے ہیں۔ معقولاتِ صرف کو نہیں سمجھ سکتے، اس لئے ان کے عقائد درست کرنے کے لئے قرآن نے معقولات کو محسوسات کا جامہ پہنا کر پیش کیا اور عقلیات کو تمثیلات سے دل نشین بنایا، لیکن ان دونوں اصلاحی طریقوں کے علاوہ ایک تیسرا طریقہ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ ہر قسم کے عقائد و اعمال کے نتائج کی تصویر کھینچ کر سامنے رکھ دی جائے جس سے معمولی بلکہ بلند ذہنیت رکھنے والوں کو بھی خوف اور رغبت پیدا ہو اور جزا سزا کے خیال سے لوگ اپنے اعمال و عقائد درست کرلیں ماسی نقطۂ خیال کے تحت قرآن میں جابجا قبر اور قیامت کے احوال کو مفصل بیان کیا گیا ہے کہیں دوزخ کا تذکرہ ہے، تو کہیں جنت کی تفصیل کہیں صلب وزن کا بیان ہے تو کہیں نفخ صور اور قیام قیامت کا اظہار۔ آیات مذکورہ میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ تبلیغ و اصلاح کی اسی تیسری قسم میں داخل ہے۔

تحلیلِ اجزاء فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ عام طور پر مشہور ہے کہ صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا۔ پہلی آواز سے ہر جاندار پر بے ہوشی اور دہشت طاری ہو جائے گی۔ آیت ناطق ہے وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللَّهُ۔ دوسری آواز سے سب زندہ ہو جائیں گے۔ ارشاد فرمایا ہے۔ ثُمَّ نُفِخَ فِيهِ أُخْرَىٰ فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ۔ لیکن سیوطی نے بدور سافرہ میں کسی عالم کا قول نقل کیا

فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ ... خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ الخ۔ ہے کہ صور تین مرتبہ پھونکا جائے گا پہلا نفخۂ فزع ہوگا۔ صور کی آواز سُن کر سب گھبرا جائیں گے۔ دوسرا نفخہ صعق ہے جس کو سُن کر سب بیہوش اور مردہ ہوجائیں گے اور تیسرا نفخۂ قیام ہے جس کو سُن کر سب زندہ ہوجائیں گے۔ ممکن ہے کہ نفخۂ صعق نفخۂ قیام کے بعد ہو۔ جب سب لوگ زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے تو اس وقت تیسری مرتبہ صور کی آواز سُن کر سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے۔ واللہ اعلم۔

آیت مذکورہ میں نفخ صور سے کون سا نفخہ مراد ہے؟ اس میں اختلاف ہے۔ خطیب نے بروایت سعید بن جبیرؓ ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ پہلا نفخہ مراد ہے کیونکہ نفخۂ ثانی کے بعد لوگ ایک دوسرے سے پوچھ گچھ کریں گے۔ خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ۔ لیکن ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ نفخ دوم یعنی نفخۂ قیام مراد ہے۔ رہی باہم سوالات کی نفی تو ظاہر ہے کہ قیامت کے اوقات واحوال مختلف ہوں گے۔ ظہور جلالِ الٰہی کے وقت لوگوں پر بدحواسی طاری ہوگی۔ قیامت کی ابتدائی ہولناکی دیکھ کر سراسیمہ ہوجائیں گے۔ زبانیں گونگی، دماغ معطل اور حواس پراگندہ ہوجائیں گے۔ کسی کو کسی کا خیال نہ ہوگا، کوئی کسی کی خبر نہ لے گا۔ پھر جب وقوع قیامت کا یقین ہوجائے گا اور جزا سزا کی طرف کا اطمینان میسر آجائے گا اور جزا سزا کے اسباب پر غور کریں گے تو باہم سوالات کریں گے۔

فَلَا أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ قیامت کے دن کسی بزرگ یا نبی کی قرابت کا لحاظ نہ کیا جائے گا۔

حضرت مسور بن مخرمہ کی روایت ہے حضور والا نے ارشاد فرمایا:۔ فاطمہ میرا ایک ٹکڑا ہے جو چیز اس کو دل تنگ کرتی ہے وہ مجھے دل تنگ کرتی ہے اور جو چیز اسے خوش کرتی ہے وہ مجھے خوش کرتی ہے۔ قیامت کے روز تمام نسب منقطع ہوجائیں گے بس میرا نسب اور سبب اور خسر و دامادی کا رشتہ قائم رہے گا اور سبب سے مراد ہے تعلق خصوصی مثلاً رضاعت غلامی وغیرہ (رواہ احمد بسند جید)

صحیحین میں ہے حضورؐ نے فرمایا فاطمہ میرا ٹکڑا ہے جو چیز اسے دل گیر کرتی ہے وہ مجھے دل گیر کرتی ہے اور جو چیز اُسے دکھ پہنچاتی ہے وہ مجھے دکھ پہنچاتی ہے۔

امام احمد نے بروایت ابو سعید خدریؓ بیان کیا حضور والا نے فرمایا کیا حال ہے ان لوگوں کا جو کہتے ہیں رسول خدا کا ناتا اُس کی قوم کو نفع نہ دے گا۔ نہیں ضرور نفع دے گا۔ خدا کی قسم میرا ناتا دنیا و آخرت میں ملا ہوا ہے۔ لوگو! میں تمہارا پیش خیمہ ہوں۔

حضرت عمرؓ کی روایت ہے حضور اقدسؐ نے فرمایا قیامت کے دن سوا میرے نسب وسبب کے ہر سبب ونسب منقطع ہوجائے گا (رواہ البزار والطبرانی وابو نعیم والحاکم والضیاء المقدسی فی المختارۃ)

بعض علماء کا خیال ہے کہ قیامت کے دن رسول اللہ کا رشتہ بھی کام نہ آئے گا کیونکہ حضورؐ نے اپنی صاحبزادی سیدہ زہراؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ تم جو کچھ چاہو مجھ سے مانگ لو مگر میں اللہ کے مواخذہ سے تم کو نہیں بچا سکتا۔ اسی طرح ایک بار حضور والا نے اُم المومنین عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا تھا (اوّل حدیث صحاح میں مذکور ہے) غالباً یہ حضورؐ نے اس وقت فرمایا تھا جب وحی خاص سے آپ کو نسب کی نفع رسانی کے متعلق علم نہ ہوا تھا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب کسی کو عذاب دینے کے متعلق ارادۂ الٰہیہ ہوچکا ہو تو پھر اس کے عذاب کو کون روک سکتا ہے۔ یہ بھی وجہ ممکن ہے کہ نسب پر بھروسہ کر کے آدمی ادائے فرض اور حُسنِ اعمال کی طرف سے غافل ہوجاتا ہے اس لئے حضورؐ نے صاف فرمایا کہ اللہ کے مواخذہ سے میں نہیں بچا سکتا۔

رہا آیت کا مطلب تو ظاہر ہے کہ آیت میں انقطاعِ سبب مراد نہیں۔ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ قیامت کے دن رشتے ناتے منقطع ہوجائیں گے۔ جو رشتہ ایک مرتبہ دنیا میں ہوچکا اس کا انقطاع ممکن ہی نہیں۔ باپ بہر حال باپ رہے گا اور بیٹا بہر حال بیٹا۔ ہاں قیامت کے دن چونکہ سلسلۂ تولید دنیا کی طرح نہ ہوگا بلکہ ہر شخص اپنی قبر سے اُٹھے گا، اس لئے مجازاً کہا جاسکتا ہے کہ نسب منقطع ہوجائے گا۔ آیت کا اصل مطلب یہ ہے کہ کسی کا رشتہ دار کام نہ آئے گا۔ بیٹا باپ سے بھاگے گا اور باپ بیٹے سے۔ بیوی شوہر سے اور شوہر بیوی سے يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ الخ

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ۔ یعنی جس کی نیکیوں کا پلڑہ بدی کے پلڑہ سے بھاری ہوگا وہ نجات پائے گا۔ میزان کیا ہے اور وزن کیسے ہوگا؟ اس کے متعلق علماء کے مختلف اقوال ہیں:۔ (۱) یہ اور اس قسم کے تمام الفاظ مجازی ہیں۔ نیکی اور بدی کا مقابلہ کر کے ایک کو عدل کے ساتھ دوسرے پر ترجیح دینی ہے۔

(۲) وزن سے مراد ہے قدر و مرتبہ اور موازین سے مراد ہیں اعمال حسنہ یعنی جس کے اعمال کی قدر و منزلت ہوگی وہ کامیاب ہوگا۔ اردو میں بھی کہا جاتا ہے "اس کو کوئی وزن اور قیمت حاصل نہیں" یعنی اس کی کچھ قدر نہیں۔ ایک اور روایت میں آیا ہے۔ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا۔ (اے قدراً)

(۳) درحقیقت اعمال کے تولنے کی ترازو قائم ہوگی جس کے دو پلڑے ہوں گے جیسا کہ صحیح احادیث میں آیا ہے، مگر میزان اور وزن کی کیفیت مجہول ہے، کوئی نہیں بتا سکتا

کہ اعمال کو (جو اعراض و کیفیات ہیں) ترازو میں کیسے تولا جائے گا، مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ ترازو دنیا کی ترازو کی طرح نہ ہوگی۔

تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ - یعنی ان کے چہروں کو آگ جھلس دے گی۔ دوسری آیت میں آیا ہے۔ تَغْشٰى وُجُوهَهُمُ النَّارُ ایک اور آیت میں فرمایا ہے۔ لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَنْ وُجُوهِهِمُ النَّارَ ابن ابی حاتم نے بروایت ابوہریرہؓ بیان کیا ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا دوزخیوں کو جب دوزخ کی طرف ہانک دیا جائے گا تو اس کی لپٹ ان کو لگے گی۔ جس سے تمام (بدن کا) گوشت ایڑیوں پر آگرے گا۔ ابن مردویہ نے بروایت ابوالدرداءؓ بیان کیا ہے کہ حضور اقدسؐ نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا کہ دوزخ کی ایک لپٹ سے ان کا گوشت ایڑیوں پر گر پڑے گا۔

وَهُمْ فِيهَا كٰلِحُونَ - یعنی وہ آگ میں جھلس کر اینٹھ کر بدشکل ہو جائے گی۔ امام احمد نے بروایت ابوسعید خدریؓ بیان کیا کہ حضور والاؐ نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا آگ اس کو بھون دے گی کہ اوپر کا ہونٹ پھول کر وسط سر تک پہنچ جائے گا اور زیریں لب لٹک کر ناف تک آجائے گا (رواہ الترمذی وقال حسن غریب)

أَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِي تُتْلٰى عَلَيْكُمْ الخ - جب اہل دوزخ چلائیں گے، شور مچائیں گے، پناہ مانگیں گے، رہائی کے خواستگار ہوں گے تو فرشتے بحکم خداوندی ان سے کہیں گے کیا خدا تعالیٰ نے تمہیں توحید کا پیام تمہارے پاس نہ بھیجا تھا، کیا اس کے پیغمبر نہ پہنچے تھے، کیا اس کے احکام نازل نہ ہوئے تھے۔ پھر کیوں تم نے ان کی تکذیب کی۔ بجائے اطاعت کے انبیاء کو کیوں ایذا دی اور مومنوں کو طرح طرح سے کیوں ستایا اور پیغمبروں کا مذاق کیوں اڑایا۔ اب کئے کی طرح بھگتتے رہو۔ آج اہل ایمان ہی صبر و استقامت کی وجہ سے کامیاب ہوں گے۔

قَالُوا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا - یعنی خواہشات نفسانیہ نے ہم کو گھیر لیا تھا۔ شرک و گناہ کے خوگر ہو گئے تھے اور یہ عادت ہماری طبیعت ثانیہ بن گئی تھی کہ جو افعال و احوال ہم سے سرزد ہوئے وہ شقاوت و نامرادی تک پہنچانے والے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ہماری عقل جاتی رہی تھی۔ اچھائی برائی سوجھتی نہ تھی۔ سیدھا اور ٹیڑھا راستہ دکھائی نہ دیتا تھا اور ہم گم کردہ راہ ہو گئے تھے۔

مقصود بیان قیامت کے دن صور پھونکا جانا حق ہے۔ قیامت کے دن نسبی تفاخر نہ ہوگا۔ کوئی کسی کی پرستش نہ کرے گا، نسبی سلسلہ منقطع ہو جائے گا، شرافت و رذالت، ذات پات، اونچ نیچ کچھ نہ ہوگی، اس لئے نسب پر بھروسہ کر کے اعمال میں سستی نہ کرنی چاہیئے۔ میزان اور وزن کشی حق ہے۔ اعمال کا ضرور وزن کیا جائے گا۔ اعمال کی گرانی موجب فلاح ہے اور اعمال کی خفت موجب ہلاکت۔ کفار دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ احکام الٰہی کو نہ ماننا اور ان کی تکذیب کرنی دوامی عذاب کا سبب ہے۔ بری عادت طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے اور پھر انسان کو گمراہ کر دیتی ہے، اس لئے بری عادت سے اجتناب لازم ہے وغیرہ۔

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ ۝ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَادِّينَ ۝ قٰلَ

اللہ فرمائے گا برسوں کے شمار سے تم زمین میں کتنی مدت رہے وہ کہیں گے ہم ایک دن یا ایک دن سے بھی کچھ کم رہے گنتی والوں سے پوچھ لے اللہ فرمائیگا

إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ۝

تم بیشک تھوڑی مدت رہے کاش تم جانتے ہوتے کیا تمہارا یہ خیال تھا کہ ہم نے تم کو بیکار بنایا اور تم کو ہمارے پاس لوٹ کر نہ آنا ہوگا

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ ۝ وَمَنْ يَدْعُ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ لَا

پس برتر ہے اللہ بڑا بادشاہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ عرش بزرگ کا مالک ہے جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کی پرستش کریگا کہ جسکی (ع)

بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُونَ ۝ وَقُلْ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِينَ ۝

(حقانیت) کی اسکے پاس کوئی دلیل نہیں اس کا حساب اس کے پروردگار کے ہاں ہوگا واقعی بات یہ ہے کہ کافر فلاح نہ پائینگے (اے محمد) تم کہو اے میرے رب مجھ کو معاف کر اور رحم فرما تو سب سے بڑا رحیم ہے

ع ۶

تفسیر اہلِ فلسفہ کہتے ہیں کہ حرکت نام ہے زمین یا فلک الافلاک کے دورہ کا جس سے مہینہ، ہفتہ، رات، دن، گھنٹہ منٹ پل وغیرہ بنتے ہیں۔ گویا زمانہ نام ہوا ایک اعتباری غیر حقیقی چیز کا جس سے حرکت فلک الافلاک یا حرکت ارض کا اندازہ اور اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ یہ بالکل فرضی بے حقیقت چیز ہے کیونکہ جو گزر گیا وہ ماضی تھا جو آئے گا وہ استقبال ہوگا جو موجود ہے وہ حال ہے اور موجودہ کوئی زمانہ نہیں بلکہ ایک آن ہے جس کا کوئی وجود نہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ ماضی نام ہے چند حالوں کے مجموعہ کا۔ کیونکہ ماضی کا ہر حصہ کبھی حال تھا۔ اسی طرح استقبال نام ہے چند حالوں کا۔ کیونکہ استقبال کا ہر حصہ کبھی حال ہوگا اور حال ایک فرضی چیز ہے۔ معلوم ہوا کہ زمانہ بے حقیقت شے ہے۔ دنیا کے شبانہ روز ساعات اور لمحات قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ گزشتہ دکھ کا اثر رہتا ہے نہ سکھ کا۔ بہترین اور بدترین غذا، اعلیٰ اور ادنیٰ لباس، شاندار کوٹھیاں اور پھونس کی جھونپڑیاں بوسیدہ اور فرسودہ ہونے کے بعد ایک جیسی ہو جاتی ہیں۔ مٹی کے ساتھ مل کر سب مٹی ہو جاتی ہے۔ تحلیل و ہضم کے بعد اچھی بری غذا کا فضلہ ایک ہوتا ہے۔ اسی بنا پر جب قیامت کے دن کافروں کو قائل کرنے اور حسرت زدہ بنانے کے لئے دنیوی زندگی کی مقدار دریافت کی جائے گی تو جواب دیں گے ایک دن یا اس سے بھی کم ہمارا قیام دنیا میں رہا۔ یہ ہمارا تخمینہ ہے صحیح تعداد ان فرشتوں کو معلوم ہوگی جن کے متعلق حساب کتاب کا کام ہے۔ کفار جو نکہ اندازہ ظاہر کریں گے اور اندازہ واقع میں غلط ہوگا کیونکہ ہم کہہ چکے ہیں کہ زمانہ بے حقیقت چیز ہے، خواہ سال ہو یا قرن یا ہفتہ یا ایک دن سب ناقابلِ اعتبار چیزیں ہیں، اس لئے بحکمِ الٰہی فرشتہ اُن سے کہے گا تمہارا قیام دنیا میں زیادہ نہیں رہا بہت ہی کم رہا (دن آدھے دن کی تعیین غلط ہے یعنی دن تو پھر کوئی واقعی چیز سمجھا جاتا ہے، تمہارے قیام کی مدت تو بالکل ناقابلِ اعتبار تھی) کاش تم دنیا میں اس حقیقت کو سمجھ جاتے (یعنی فانی کو فانی جانتے۔ دنیا کے جاہ و دولت اولاد کی کثرت اور حکومت و عزت پر نہ ریجھتے۔ مدت عمر کی طوالت اور صحت و طاقت کی فراوانی تم کو غافل نہ بنا دیتی) اسی ہوتا اور اسی برتر یہ تمہارا خیال تھا کہ تم کو یونہی رائیگاں پیدا کیا گیا ہے۔ انقلاب فصول اور اختلاف ایام کی ایک خود بخود پیدا وار تم بھی ہو۔ کبھی لوٹ کر خدا کے پاس جانا نہیں ہے۔ آج وہ تمہارا باطل خیال بے بنیاد اور غلط ثابت ہو گیا۔

قیامت کی ہولناک کیفیت بیان کرنے کے بعد پھر صفاتی اور ذاتی توحید کے برہانی بیان کی طرف کلام کا رُخ کیا جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

یاد رکھو کہ اللہ اللہ ہے، تمام صفات کمالیہ اس میں موجود ہیں۔ خصوصاً وہ شہنشاہ مطلق ہے۔ تمام کائنات میں تصرف، ہر چیز پر قدرت اور بروزِ قیامت جزا و سزا کا اختیار اُسی کو ہے۔ پھر وہ دنیوی بادشاہوں کی طرح نہیں نہ اس کی حکومت ان بادشاہوں کی ایسی حکومت ہے۔ ان کی سلطنتیں اور حکومتیں تو عارضی ہیں، زوال پذیر ہیں، چند روزہ ہیں اور اس کے باوجود ناتمام ہیں۔ ظاہری احوال پر حکمرانی کرتے ہیں۔ نظامِ قدرت ان کے ہاتھ میں نہیں اور اللہ متصرف حقیقی ہے۔ ہر درج و ہر شے کہ دنیا اس کی مسخر ہے، اس لئے وہی حق ہے۔ اس کے علاوہ ہر بادشاہ کی حکومت، ہر امیر کی امارت بلکہ ہر موجود کا وجود باطل ہے بلکہ صفات مذکورہ کے بیان سے جس خدا کی تعیین ہوتی ہے، خدا کا جو تخیل قائم ہوتا ہے وہ بھی ایک مجسمہ ہے، دماغی تراشیدہ ہے، وہ بھی خدا نہیں۔ خدا تو ہر تصور، تخیل، توہم اور تدبر و فہم سے بالاتر ہے۔ بس یوں سمجھو کہ وہی الٰہ جامع صفات کمالیہ ہے کوئی دوسرا معبود نہیں نہ کسی کو کمال حاصل ہے نہ اس کا کوئی مشابہ اور نظیر ہے۔ ناقص کامل کے مشابہ ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے شرک کا عقیدہ رکھنے والے کسی طرح حق پر ہو ہی نہیں سکتے۔ ان کو نجات و فلاح مل ہی نہیں سکتی الخ۔

تحلیلِ اجزاء قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ۔ زمین میں ٹھہرنے سے مراد ہے دنیوی زندگی یعنی جس دنیوی زندگانی کو تم فوز عظیم سمجھتے اور مومنوں پر ہنستے تھے اس کی کل مدت کیا تھی؟ بعض علماء کا قول ہے کہ قبر میں قیام کی مدت مراد ہے یعنی تم قبروں میں کتنے سال رہے۔

يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ۔ قیامت کی ہولناکیاں اُن کے دماغوں کو معطل کر دیں گی۔ اس کے علاوہ گزرا ہوا وقت مصیبت کے زمانہ میں بہت ہی کم معلوم ہوتا ہے، اس لئے حقیر ترین مقدار ظاہر کریں گے اور چونکہ ان کو خود صحیح اندازہ نہ ہوگا، اس لئے تردد کا لفظ زبان سے نکالیں گے۔

فَسْـَٔلِ الْعَآدِّيْنَ۔ شمار کرنے والوں سے مراد ہیں حساب کے فرشتے یعنی کراماً کاتبین۔ قیامت کے دن بھی کفار خدا کی اصل صفات کا اندازہ نہ کر سکیں گے۔ خدا تعالیٰ ان کو توبیخ کرنے اور حسرت دلانے کے لئے گزشتہ زندگانی کی مدت دریافت فرمائے گا وہ سمجھیں گے کہ ہم سے نہ قطعی طور پر تعیین ایام و ساعات دریافت کی جا رہی ہے۔ خدا کو معلوم نہیں ہے، اس لئے عرض کریں گے کہ شمار کرنے والوں کو صحیح تعداد کا علم ہوگا ان سے دریافت کر لیا جائے۔ صحیح ہے کور چشم کو آفتاب کی روشنی کبھی دکھائی نہیں دے سکتی۔

اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا۔ فرشتہ کہے گا کہ دن ہو یا دن سے کم (تم سے تعیین دریافت کرنی مقصود نہیں ہے) مقصد یہ ہے کہ رہے بہت ہی کم مدت، مگر یہ خیال تو دنیا میں ہونا چاہیے تھا یعنی دنیا کی زندگی کو قلیل اور ہیچ سمجھنا بے کار ہے۔ دنیا کو فانی اور ناقابلِ اعتبار سمجھنا اور اس پر اعتماد نہ کرنا تو وہاں مفید ہو سکتا تھا یہ دار الجزاء ہے۔ مشاہدہ کے بعد اقرار بے سود ہے۔ ابن ابی حاتم نے بروایت ایفع بن عبد الکلاعی بیان کیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا جب خدا تعالیٰ جنتیوں کو جنت میں اور دوزخیوں کو دوزخ میں داخل

فرمائے گا تو فرمائے گا اے اہلِ جنت تم دنیا میں کتنے سال رہے؟ وہ عرض کریں گے۔ ایک دن یا اس سے کم۔ ارشاد فرمائے گا اس ایک روزہ یا ایک روزہ سے کم تجارت میں تم نے میری رحمت، رضامندی اور جنت کا فائدہ اٹھایا۔ اب تم اس میں ہمیشہ رہو۔ پھر فرمائے گا اے اہلِ دوزخ تم دنیا میں کتنے سال رہے؟ وہ عرض کریں گے ایک دن یا اس سے بھی کم۔ ارشاد فرمائے گا تم نے اس یک روزہ یا ایک روزہ سے کم زندگی میں میرا غضب اور دوزخ کمایا۔ اب تم اس میں ہمیشہ رہو۔

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ الخ۔ یعنی کیا تم نے اپنی دنیوی زندگانی کو رائگاں اور انجام سے غیر متعلق سمجھ رکھا تھا۔ حشر نشر اور بعثت ثانیہ کا تم کو یقین نہ تھا۔ حساب کتاب اور سزا جزا پر ایمان نہ رکھتے تھے، مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ۔ اللہ کی بزرگی اور بلندی جسمانی نہیں، مادی نہیں، روحانی یا نفسانی نہیں صرف طور مرتبہ اور نقائص و عیوب سے پاکی مراد ہے۔ ہر وہ وصف جو پروردگار قدوس کے ذاتی کمال کے منافی ہے خدا اس سے پاک ہے۔ یہ بھی مراد ہو سکتی ہے بلکہ ہے کہ اللہ کا حقیقی تصور و تخیل اور ادراک و فہم کوئی دماغ نہیں کر سکتا، ناقص میں کامل سما نہیں سکتا، ممکن واجب کا احاطہ نہیں کر سکتا، کوزہ میں دریا کو بھرا نہیں جا سکتا، لامحدود کو محدود میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔

رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡكَرِيۡمِ حیرت ہے ابن کثیر نے لفظ کریم کی تفسیر میں اس جگہ لکھا ہے "منور محیط عالم" میں نہیں سمجھ سکتا کہ احاطۂ عالم اور نورانیت لفظ کریم سے کس طرح مستفاد ہوتی ہے۔ کیا عرش کی کرامت یہ کچھ کم ہے کہ وہ عرشِ الٰہی ہے۔ اللہ کی طرف اس کو نسبت ہے، تمام عالم سے بڑا ہے۔ احاطہ و نورانیت سے تفسیر کرنی تفسیر نہیں بلکہ تاویل ہے جس کی صحت کی ذمہ داری ابن کثیر ایسے محقق پر عائد ہوتی ہے۔

تتمہ ایک بار کوئی جن رسیدہ یا اور کوئی دماغی خلل کا مریض حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے سامنے سے گزرا۔ آپ نے اس کے کان میں آیت اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ الخ پڑھ دی وہ فوراً اچھا ہو گیا حضورؐ کو اطلاع ملی تو فرمایا قسم ہے اُس (خدا) کی جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے۔ اگر یقین والا آدمی اس کو پہاڑ پر پڑھ دے گا تو وہ جگہ سے ٹل جائے گا (رواہ ابن ابی حاتم) (وقال السیوطی وقد رواہ الحکیم الترمذی وابو الیعلیٰ وابن المنذر وابن مردویہ وابراہیم ایضاً)

وَمَنۡ يَّدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ یعنی شرک کرنا اور اللہ کی ذات و صفات میں کسی کو ساجھی قرار دینا بالکل بے بنیاد اور باطل عقیدہ ہے جس کا کوئی عقلی اور نقلی ثبوت نہیں اور ایسے عقیدہ سے خواہ مخواہ اعمال نامہ سیاہ ہوتا ہے جس کی حساب فہمی ضرور ہو گی۔

یہاں ایک شبہ کیا جا سکتا ہے کہ آیت کے ترجمہ سے الوہیت غیر اللہ کی کامل نفی نہیں ہوتی۔ کیونکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص اللہ کے ساتھ دوسرے کو خدا مانے تو عقلی و نقلی ثبوت سے خالی ہے، لیکن اگر کوئی اللہ کو نہ مانے اور خدا کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا معبود مانے تو اس کے عقیدہ کا بطلان آیت سے واضح نہیں ہوتا۔ یہ شبہ بے بنیاد ہے۔ کیونکہ اول تو آج تک کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جو خدا کی خدائی کا انکار کرتا ہو اور دوسروں کی خدائی کو مانتا ہو۔ یہاں تک کہ بدھ مت کے شیدائی بھی ایسا عقیدہ نہیں رکھتے۔ اس کے علاوہ یہ بات ہے کہ آیت میں شرک فی الالوہیت کی نفی کی گئی ہے اور جب شرکت فی الالوہیت محال ہے تو استقلال فی الالوہیت بدرجۂ اولیٰ محال ہوگا کیونکہ جب کسی میں ناتمام الوہیت نہیں ہو سکتی تو مستقل کامل الوہیت نہ ہوتی بالکل ظاہر ہے۔

اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الۡكٰفِرُوۡنَ۔ آغاز سورت میں فرمایا تھا کہ مومن ہی فلاح یاب ہوں گے۔ پھر مومنوں کے خصوصی امتیازی اوصاف بیان فرمائے تھے۔ اب اختتام سورت کے قریب کافروں کے متعلق فرمایا کہ وہ فلاح یاب قطعاً نہ ہوں گے۔ اس نفی و اثبات اور بشارت و انذار سے اصل مقصد کی تبلیغ واضح طور پر ہو گئی۔

اس سے آگے رسول پاکؐ کو خطاب کرتے ہوئے دعا تعلیم فرمائی جو ہر مومن کا شعار ہونا ضروری ہے۔ ہر مسلمان کا مطمح نظر صرف سعادتِ آخرت ہے، اور نجات اخروی اللہ کی رحمت و مغفرت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، اس لئے آخر میں حصول رحمت و مغفرت کی دعا فرما دی۔ اس سے یہ بات بھی اشارۃً معلوم ہو گئی کہ بڑے بڑے انبیاء یہاں تک کہ رسول مقدسؐ بھی رحمتِ الٰہی کے محتاج ہیں اور ان کو بھی اپنے زہد و اتقا اور ریاضت و عبادت پر بھروسہ نہیں۔

مقصودِ بیان آخرت کی ہولناکیاں دنیوی زندگانی کو بے مقدار کر دیں گی۔ یہاں تک کہ کافروں کو بھی گزشتہ زندگی ایک دن سے زائد نہیں معلوم ہو گی۔ بقاء دنیا کی مدت بہت ہی قلیل ہے، اس لئے اس پر ریجھنا اور فنا پذیر ساز و سامان اور شوکت و جاہ پر نازاں ہونا جائز نہیں۔ قیامت حق ہے اور حشر جسمانی ضرور ہو گا۔ اللہ ہی حقیقی بادشاہ ہے، اسی کی ذات حق ہے باقی ہر چیز کا وجود باطل ہے۔ معمولی چیزوں میں بھی کسی بڑی ہستی کی طرف انتساب کرنے سے بزرگی آ جاتی ہے۔ عرش میں بزرگی اللہ کی طرف نسبت کرنے سے پیدا ہوتی ہے ورنہ دیگر مخلوق کی طرح عرش بھی ایک مخلوق ہے۔ کافروں کی کبھی نجات نہ ہو گی۔ اپنے اعمال پر ناز کرنا اور تقدس پر مغرور ہونا زیبا نہیں۔ کوئی شخص صرف اپنے اعمال کی بدولت اللہ کی رحمت و مغفرت کے بغیر نجات نہیں پا سکتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ پر کسی کا استحقاق نہیں ہے۔ ہر انسان سے خواہ وہ جلیل القدر

نبی ہی ہو کچھ نہ کچھ فرو گذاشت ہونی ضروری ہے۔ کامل حق اطاعت ادا کرنا طاقتِ بشری سے خارج ہے وغیرہ۔

سُوْرَةُ النُّوْرِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ اَرْبَعٌ وَّسِتُّوْنَ اٰيَةً وَّتِسْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ نور مدنی ہے اس میں ۶۴ آیات اور نو (۹) رکوع ہیں

ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ نے فرمایا یہ سورت مدنی ہے۔ جمہور مفسرین کا اسی پر اتفاق ہے۔ اس میں ۶۲ یا ۶۴ آیات ہیں اور ۱۳۱۶ کلمات اور ۱۰ ۶۴۱ حروف ہیں۔
مجاہد نے مرفوع روایت بیان کی ہے کہ اپنے مردوں کو سورۂ برأت سکھاؤ اور اپنی عورتوں کو سورۂ نور۔ (رواہ البیہقی وابن المنذر مرسلاً)
اس سورت میں چونکہ زنا اور تہمتِ زنا کی سزا کا مفصل بیان ہے (اور یہود و نصاریٰ کے مذہبی حکم میں بین بین) اعتدالی حکم دیا گیا ہے اور زنا کا صدور بغیر عورت کی شرکت کے ناممکن ہے۔ عورت کم عقل ہونے کے سبب بہت جلد بہکانے میں آجاتی ہے نہ دین کی اس کو خبر رہتی ہے نہ عقل کام دیتی ہے نہ عزت و ناموس کی اس کو پرواہ ہوتی ہے، اس لئے عورتوں کو خصوصیت کے ساتھ سورۃ سکھانے کا حکم دیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ

یہ ایک سورت ہے جس کو ہم نے اتارا اور اس کے احکام کو فرض کیا ہے اس میں صاف صاف آیتیں اتاری ہیں تاکہ تم نصیحت پکڑو زنا کار عورت اور زنا کار مرد

فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ

میں سے ہر ایک کو سو درّے مارو اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے

كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اَلزَّانِيْ

حکم کی تعمیل میں تمہیں ان پر ترس نہ آنا چاہئے اور ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہیئے زنا کار مرد

لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً ۖ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

زنا کرنے والی یا شرک کرنے والی عورت سے نکاح کرتا ہے اور زانیہ عورت صرف زانی مرد یا مشرک مرد سے نکاح کرتی ہے اور یہ نکاح مسلمانوں پر حرام کر دیا گیا ہے

تفسیر اسلام نام ہے عالم غیب کے متعلق صحیح عقیدہ رکھنے اور آپس کے معاملات میں باہم دست درازی سے محفوظ رکھنے کے قواعد کا۔ مبدأ و معاد عذاب ثواب ملائکہ انبیاء سابقین کتب سماویہ اور اللہ کی ذات و صفات کو صحت فکر کے ساتھ ماننے کی جہاں اسلام تعلیم دیتا ہے وہاں یہ بھی سکھاتا ہے کہ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے ظالم مظلوم کو اور قوی ضعیف کو نہ ستائے۔ غیر کے حقوق پر ہاتھ نہ بڑھائے۔ حقوق سیاسیہ، معاشرہ اور مالیہ کامل طور پر عدل کے ساتھ ہر شخص ادا کرتا رہے۔ نظم عالم قائم رہے فساد و بدامنی نہ پھیلے نہ کوئی تباہ کاری پھیلانے کی کوشش کرے۔

عام طور پر مشہور ہے کہ دنیا نام ہے تین چیزوں کا ۔ زن ۔ زر ۔ زمین ۔ انہی تین کی وجہ سے اس عالم پر فساد اور بدامنی پھیلتی ہے ، غارت گری اور خونریزی ہوتی ہے ، خیانت جھوٹ فریب اور مکر کے جال لگائے جاتے ہیں ۔ انسان کی خود غرضی انہی ارکان ثلاثہ پر محدود ہے اور ہر شخص خواہ نادار فقیر ہو یا امیر کبیر یہاں تک کہ حکمران مطلق بادشاہ انہی چیزوں کی طرف اپنا طبعی میلان پاتا ہے ۔ جاہ و حشم ، خیل و خدم اور تمام تزک و شان انہی موالید ثلاثہ کے مختلف مظاہر ہیں ، لیکن باوجود اس کے کہ دنیا کی ہر آن بان کا سہرا انہی تینوں کے سر ہے ۔ آپس میں ان سب کا درجہ ایک نہیں ہے ۔ انسان کا فطری میلان سب کی طرف یکساں نہیں ہے ۔

کسی کا میلان ایک کی طرف ہے کسی کا دوسری طرف ۔ منافع اور اغراض میں اختلاف ہے ۔ جس نوعیت کی رغبت زمین کی طرف ہوتی ہے وہ رغبت دوسرے مال کی طرف نہیں ہوتی اور جو خواہش عموماً مال کی ہوتی ہے وہ عورت کی نہیں ہوتی ۔ طریق استعمال ، محل استعمال اور غرض استعمال ہر چیز کی جدا جدا ہے ۔ ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ہر صنف کو اپنی دوسری صنف کی طرف جو میلان ہوتا ہے وہ عالم کی کسی چیز کی جانب نہیں ہوتا ۔ اگرچہ زر و زمین کی خواہش بھی ہمہ گیر ہے ، مگر عورت کی طرف مرد کو اور مرد کی طرف عورت کو جو عطف قلبی میلان اور نفسانی موثر ہوتا ہے وہ تھوڑی دیر کے لئے ہر چیز سے بے پرواہ کر دیتا ہے ۔ ایک نگاہ صنفی پر دنیا کی ہر شئی قربان کی جا سکتی ہے اور کی جاتی ہے اور عقل کی روشنی میں بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے ۔ کیونکہ مرد و عورت ایک ہی نوع کی دو صنفیں ہیں اور ایک میں دوسرے کے لئے اسباب دلکشی موجود ہیں پھر تناسل احتیاج اور بقائے نوع کی ضرورت اس پر مزید ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جاندار فطرۃً اسی صنفی جذبے کا حامل ہے ۔ کوئی حس و ہوش رکھنے والا داعی کشش سے خالی نہیں ۔ گو ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپس کے معاملات میں اگرچہ حق تلفی اور دست اندازی کی لاکھوں صورتیں ہیں جن کا ظہور وقت پر ہوتا رہتا ہے ، مگر فساد ، حق تلفی اور امن سوزی کا سر رشتہ ناجائز صنفی تعلقات کے ہاتھ میں ہے ۔ انسان کو جس چیز کی رغبت زیادہ ہوتی ہے اس کے حصول کا ہر طور وہ مشتاق بھی زیادہ ہوتا ہے اور کوشش بھی زیادہ کرتا ہے اور چونکہ طبعی میلان طرفین میں ہوتا ہے ، اس لئے بہت جلد امن سوزی کا مظاہرہ ہو جاتا ہے ۔ آدمی زمین کے حصول کی کوشش کرتا ہے ، مگر مال آدمی کی طرف نہیں دوڑتا نہ اس کو کسی خاص مالک کے قبضہ میں جانے کی تمنا ہوتی ہے ، مگر صنفی عواطف کی آگ دونوں طرف ایک جیسی لگی ہوتی ہے ۔ اگر عقل و دانش مذہب اور رسم و رواج کا پانی اس کو ٹھنڈا نہ کرتا رہے تو دنیا کا امن بہت جلد سوختہ ہو جائے ۔ گزشتہ سورت میں خدا تعالیٰ نے توحید ، معرفت ، رسالت اور عقیدۂ معاد کی مفصل اصلاحی کیفیت بیان فرمائی تھی ۔ اب اس سورت میں معاملات و تعلقات کی اصلاح کے قواعد بیان فرماتا ہے اور چونکہ تمام سوشیل بلکہ کیپٹل اور پولیٹیکل اصلاحات کی جڑ صنفی تعلقات کی اصلاح ہے ، اس لئے سب سے پہلے زنا کے احکام بیان فرمائے ۔ زنا کی خرابیاں اتنی واضح ہیں جن کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ اخلاق کی بربادی معاشرت کی تباہی ، تہذیب و شائستگی کی آبرو ریزی ، صحت جسمانی کا فقدان ، نسل کا اختلاط اور قانون فطرت کی خلاف ورزی زنا کے پیش پا افتادہ نتائج ہیں ۔ زنا سے فقط دونوں زناکار مرد و عورت ہی اپنی شخصیت ، وقار ، خلق ، عزت اور تہذیب کو برباد نہیں کرتے بلکہ اگر یہ سلسلہ قائم رہے تو خاندان کے خاندان اور قومیں کی قومیں مختلف مصائب کا شکار ہو جاتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جتنی سخت سزا زنا کی مقرر کی ہے کسی دوسرے اخلاقی یا مالی جرم کی اتنی سنگین تعزیر مقرر نہیں کی ۔ ہر ہوش مند کہہ سکتا ہے کہ جو لوگ امن عالم میں چنگاری ڈالتے ہوں ان کے وجود سے صفحۂ ہستی کو خالی کر دینا بہتر ہے ۔ بہ نسبت کہ کل اہل دنیا کو سوختہ ہونے کی اجازت دی جائے ۔

زنا کی اجازت ایک ایسی مردم آزاری ہے اور تباہ کاری کی بنیاد ہے جس کی مدافعت دنیا کی کوئی جمہوری اور شخصی طاقت نہیں کر سکتی ، اس لئے مناسب یہی ہے کہ زنا کے بیج ، زمین اور کاشت کار سب کو سوختہ کر دیا جائے تاکہ آگے کو نہ مرض رہے نہ مریض نہ بیماری دوسروں کو اثر کر سکے ۔ شریعت یہود میں زنا کی سزا میں زانی کو قتل کیا جاتا تھا ۔ توریت کتاب احبار کے بیسویں باب میں ہے " وہ جو دوسرے کی جورو کے ساتھ یا اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے ان دونوں کو قتل کر دیا جائے ۔ گویا شوہر دار عورت سے زنا کرنے کی پاداش قتل ہے ۔ پھر ۱۹ باب کے ۲۰ درس میں غیر کی لونڈی اور غیر کی منگیتر سے زنا کرنے کی سزا میں صرف کوڑے مارنے کا حکم ہے ، لیکن انجیل میں صراحت ہے کہ مسیح کے پاس ایک زناکار عورت کو مارنے کے لئے لائے تو آپ نے کوڑے مارنے کی اجازت نہ دی ۔ گویا شریعت عیسوی میں زنا کی کوئی سزا ہی مقرر نہیں ، معمولی جرم ہے ۔ اتنا معمولی کہ قابل پاداش بھی نہیں ۔ ہاں اسلام نے اس خبیث جرم کی سزا سخت ترین مقرر کی ۔ شوہر دار اور غیر شوہر دار عورت آزاد اور باندی محصن اور غیر محصن سب کے احکام جدا جدا بیان کئے اور ایسا جامع قانون بنا دیا جس میں ترمیم کی گنجائش نہیں ۔ اب تحلیل اجزا کے ذیل میں ہر مبحث کی مفصل تشریح کریں گے ۔

تحلیل اجزاء

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا ۔ سورۃ کا لغوی معنی ہے اعلیٰ مرتبہ (ابن کثیر) سورت لغت میں ٹکڑے ٹکڑے کو بھی کہتے ہیں ۔ قرآن کے ایک سو چودہ حصے کر دئے گئے ہیں اور ہر حصہ بجائے خود عظیم الشان ٹکڑا ہے ، اس لئے اس کو سورۃ کہا جاتا ہے ۔ یعنی ہم نے یہ عظیم الشان جلیل القدر سورۃ خود نازل کی ہے کسی کے دماغی اختراع اور ذاتی خواہش کو اس میں دخل نہیں ہے اور ہم نے خود ہی اس میں احکام مقرر کئے ہیں ۔

وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۔ آیات سے مراد ہیں وہ احکام جن کی صداقت، حقانیت اور عموم افادہ بالکل واضح ہے ۔ عرب ایسے جاہل، ان پڑھ، ناشائستہ غیر مہذب ملک میں (جہاں زنا کی سیکڑوں شاخیں نکالی گئی تھیں اور طرح طرح سے خواہشات نفس کو پورا کرنے کے لئے زنا کے مختلف نام رکھ لئے تھے کسی کو نکاح مقت کسی کو استبضاع، کسی کو نکاح بنایا اور کسی کو نکاح ضیزن کہتے تھے) ایسے شستہ مہذب مفید قواعد کا اجراء اگر خدا کی طرف سے کھلی نشانی نہیں تو اور کیا ہے ۔ رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ فَرَضْنٰهَا سے تو اشارہ ہے زنا، حجاب اور تہمت زنا وغیرہ کے احکام کی طرف اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ سے مراد ہیں معارف اور دلائل توحید جو سورت کے آخر میں بیان کئے گئے ہیں گویا اس سورت میں باہمی تعامل و معاشرت کے متعلق جو احکام ہیں ان کا اظہار تو لفظ فَرَضْنٰهَا سے فرمایا اور توحید و الوہیت کے متعلق جو بیان ہے اس کی طرف لفظ آیات بینات سے اشارہ کیا ۔

لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۔ اوامر و نواہی جو بغیر سوچے سمجھے نہیں ہوں، جن کے احکام کی بنا مصالح و فوائد پر نہ ہو جو فائدے کی بجائے اہل دنیا کو نقصان پہنچانے والے ہوں وہ خدا کی طرف سے نہیں ہو سکتے، اس لئے خداوند قدوس فرماتا ہے کہ اس سورت میں ہم نے جو احکام مقرر کئے ہیں (وہ کوئی داستان یا افسانہ نہیں بلکہ دستور العمل اور قانون زندگی ہیں) جن پر چل کر ہر شخص اور ہر گروہ سعادت و فلاح پا سکتا ہے ۔ غور کرو سوچو سمجھو نصیحت حاصل کرو اور ان پر چلو ۔ گناہ انسان کے دل میں کدورت اور سیاہی پیدا کر دیتا ہے ۔ روح میں صفائی اور پاکیزگی نہیں رہتی ۔ نور فطری زائل ہو جاتا ہے، لیکن جب گناہ سے کنارہ کش ہو جاتا ہے تو اصل فطرت پھر چمک اٹھتی ہے، نور حق ضیا پاش ہوتا ہے اور قلب اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ جلوہ قدس کو قبول کرنے لگتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اوامر کو بجا لانے سے پہلے منہیات سے اجتناب ضروری ہے ۔ ارتکاب منہیات کی صورت میں اوامر کی پابندی فائدہ نہیں پہنچا سکتی ۔ یہ ہی امور قابل تفکر و تذکر ہیں ۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ ۔ زنا کی استدعا کا آغاز اگرچہ عموماً مرد کی طرف سے ہوتا ہے، مگر استدعا کا سر چشمہ دواعی اور اسباب ہیں جن کی حامل عورتوں کی جسمانی ساخت، حسن و جمال و رعنائی ہوتی ہے ۔ عورت کی خاص ادا اور توازن اعضاء مرد کو اپنی طرف مائل کرتا ہے، اس لئے عورتوں کو زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے ۔ مزید برآں عورت کی رضامندی کے بغیر عموماً زنا کے واقعات نہیں ہو سکتے ۔ مرد کتنی ہی خواہش کرے، مگر آخری فیصلہ عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے ۔ اسی لئے زانی سے زانیہ کا لفظ مقدم ذکر کیا گیا ۔ زنا آنکھ کا بھی ہوتا ہے، کان کا بھی، ہاتھ اور پاؤں کا بھی تخیل اور تفکر کا بھی اور خصوصیات صنفی کی تکمیل کا بھی ۔ مثلاً غیر محرم کو قصداً دیکھنا آنکھ کا زنا ہے ۔ کسی کے حسن و جمال کا تذکرہ قصداً سننا اور اس سے لذت اندوز ہونا کان کا زنا ہے ۔ اسی طرح غیر محرم کی ناجائز گفتگو سننی بھی کان کا زنا ہے ۔ کسی کے وصل کی تدبیر سوچنی، دماغ کو راغب کرنا، زنا کا پختہ ارادہ کر لینا، پاؤں سے چل کر زنا کے لئے جانا یا ہاتھ سے کسی اجنبی کو بارادۂ زنا چھونا سب زنا کے حکم میں داخل ہیں ۔ مگر شرعی مقررہ سزا صرف فعل مخصوص کی اور کسی قسم کے زنا سے متعلق نہیں ۔ نہ ان کو زنائے حقیقی کہہ سکتے ہیں ۔ ہاں مقدمات زنا ضرور ہیں ۔ مجازاً ان کو بھی زنا کہا جا سکتا ہے ۔

مرد یا عورت سے لواطت امام ابو حنیفہ کے ہاں زنا نہیں ۔ ایسے فعل کی سزا وہ نہیں جو زنا کی ہے بلکہ اس کا تعزیری حکم جدا ہے ۔ امام شافعی لواطت کو بھی زنا کہتے ہیں اور سزا بھی دینے کے قائل ہیں ۔

حالت حیض و نفاس میں اپنی بیوی یا باندی سے قربت بھی اگرچہ حرام ہے، مگر زنا نہیں ۔ وطی بالبہائم، جلق، استمناء وغیرہ تمام امور شرعاً حرام ہیں، مگر زنا کی حد ان افعال کے ارتکاب کرنے والوں پر جاری نہ ہوگی ۔

فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا اس آیت سے صرف اتنا ثابت ہے کہ زانی اور زانیہ کے سو کوڑے مارو ۔ آزاد کے مارو یا غلام اور باندی کے، شادی شدہ کے مارو یا غیر شادی شدہ کے، جلا وطن بھی کر دیا کرو یا نہ کرو اس کی کوئی تفصیل آیت میں نہیں ہے ۔ اس کی کامل تشریح احادیث اور فقہ میں موجود ہے ۔

ابتدائے اسلام میں زنا کی سزا بیاہی عورت کے لئے یہ تھی کہ موت تک اس کو گھر میں قید کیا جائے اور کہیں نکلنے نہ دیا جائے اور کنواری کے لئے کوئی سزا مقرر نہ تھی ۔ آیت ناطق ہے ۔ وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ۔ اسی طرح لونڈی غلام جو زنا کے مرتکب ہوتے تھے تو ان کو جوتے تھپڑ مار کر چھوڑ دیتے تھے ۔ کچھ زمانے کے بعد یہ حکم بدل دیا گیا ۔ بیاہی کی سزا سنگسار کرنا اور کنواری کی سزا سو کوڑے مقرر ہوئے ۔ خارجیوں کے نزدیک سنگسار کرنے کی سزا قطعاً نہیں ہے ۔ سو کوڑوں کی سزا دی جائے خواہ کنواری ہو یا شادی شدہ ۔ البتہ باندی غلام کی سزا آدھی ہے ۔ ان کے پچاس کوڑے مارے جائیں ۔ خدا تعالیٰ نے فرما دیا ہے ۔ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ یعنی اگر لونڈیاں زناکاری کا ارتکاب کریں تو ان کو آزاد عورتوں سے نصف سزا دی جائے ۔ غلام کا حکم آیت میں مذکور نہیں، مگر قیاساً

اس کا حکم بھی وہی ہوگا جو باندی کا ہے۔ اب ہم ذیل میں کسی قدر تفصیل کرتے ہیں۔

مبحث اوّل بحکم آیت مذکورہ باندی کی سزا آدھی یعنی پچاس کوڑے ہیں۔ چونکہ سنگسار کرنے کی تنصیف نہیں ہو سکتی، اس لئے اگر شادی شدہ باندی نے زنا کی ہو تو اس کو کامل طور پر سنگسار کیا جائے گا اور اگر کنواری نے ایسی حرکت کی ہو تو اس کو پچاس کوڑے مارے جائیں گے۔ غلام کو باندی پر قیاس کر کے اس کی سزا میں بھی تنصیف کر دی جائے گی۔

مبحث دوم شادی شدہ اور غیر شادی شدہ کی تفصیل امام شافعیؒ کے نزدیک غیر شادی شدہ کے سو کوڑے مارے جائیں اور ایک سال کے لئے شہر بدر بھی کیا جائے۔ امام مالکؒ کے نزدیک مرد کو شہر بدر بھی کیا جائے اور عورت کو نہ کیا جائے۔ امام ابو حنیفہؒ شہر بدر کرنے کو ضروری نہیں قرار دیتے بلکہ حاکم وقت کو اختیار ہے چاہے تعزیراً شہر بدر کر دے چاہے نہ کرے۔

مالکؒ و شافعی کی دلیل وہ حدیث ہے جس کو حضرت ابو ہریرہؓ نے نقل کیا ہے کہ ایک بار خدمتِ گرامی میں دو بدو آئے۔ ایک نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے اس بیٹے نے فلاں شخص کی بیوی سے زنا کیا میں نے اس کے جرم کے تاوان میں سو بکریاں اور ایک چھوکری دے دی، لیکن علماء سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ میرے بیٹے کو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور ایک سال کو شہر بدر کیا جائے گا اور اس عورت کو سنگسار کیا جائے گا۔ حضور اقدسؐ نے فرمایا قسم ہے اس خدا کی جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے میں کتاب الٰہی کے موافق تم دونوں کا فیصلہ کر دوں گا۔ تو چھوکری اور بکریاں واپس لے لے۔ تیرے لڑکے کے سو کوڑے لگائے جائیں گے اور ایک سال کے لئے شہر بدر کیا جائے گا۔ اے انیس تم صبح کو جا کر اس عورت سے دریافت کرنا کہ وہ اقرار کرے تو سنگسار کر دینا۔ صبح کو انیس عورت کے پاس گئے اس نے اقرار کیا، اس لئے اس کو پتھروں سے مار ڈالا (رواہ البخاری ومسلم) اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر شادی شدہ کی سزا میں شہر بدر کیا جانا بھی ضروری ہے کیونکہ حضور والا نے فرمایا تھا میں کتاب اللہ کے موافق تم دونوں کا فیصلہ کر دوں گا اور پھر مذکورہ فیصلہ فرمایا معلوم ہوا کہ فیصلہ مذکورہ حکم کتاب کے موافق ہے۔

احناف کہتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ سے خود واضح ہو رہا ہے کہ کوڑوں کے علاوہ جلا وطنی کی سزا تعزیری ہے کیونکہ قرآن پاک میں کسی جگہ کوڑوں کی سزا کے ساتھ جلا وطنی کا حکم مذکور نہیں ہے اور حضور کا فرمان بھی غلط نہیں ہو سکتا۔ پس سوائے اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ حضور والا نے کوڑوں کی سزا کو حکم کتاب قرار دیا اور مقررہ تعداد سے کمی بیشی نہیں فرمائی۔ اسی کو بقسم فرمایا کہ میں تمہارا فیصلہ کتاب الٰہی کے موافق کروں گا۔ رہا جلا وطنی کا حکم تو وہ تعزیر تھا، حدِ شرعی نہ تھی، اس لئے امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ امام وقت کو تعزیری سزا کا اختیار ہے چاہے دے یا نہ دے ہاں حد شرعی ضرور جاری کی جائے گی کیونکہ حدیث ظنی ہے اور ظنی کو قطعی کی طرح مان کر حکم قطعی کی طرح ترمیم نہیں کی جا سکتی۔ اب رہی محصن اور غیر محصن کی سزا کی تفریق تو اس کے متعلق خوارج قطعاً سنگساری کی سزا دینے کے منکر ہیں کیونکہ آیتِ قرآنیہ میں کوئی تفصیل محصن اور غیر محصن کی نہیں ہے۔ سب کی سزا ایک ہی بیان کی گئی ہے، لیکن ابو حنیفہؒ، شافعیؒ اور مالکؒ قائل ہیں کہ شادی شدہ کو رجم کرنا چاہیئے اور غیر شادی شدہ کو کوڑے مارنے چاہئیں۔ کیونکہ رجم کی سزا سنت صحیحہ اور متواترہ سے ثابت ہے۔ حضور اقدسؐ نے حضرت ماعز کو سنگسار کرایا تھا۔ نیز حدیث مذکورۂ بالا سے ثابت ہے کہ انیس نے جا کر بحکم نبوی اعرابی کی عورت کو سنگسار کیا تھا۔ پھر قرآن پاک کی وہ آیت جو منسوخ التلاوت اور باقی الحکم ہے صاف بتا رہی ہے کہ شادی شدہ کو سنگسار کیا جائے۔ علاوہ ازیں اجماع بھی اس پر منعقد ہو چکا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے بیان کیا کہ ایک روز فاروق اعظمؓ نے ممبر پر کھڑے ہو کر فرمایا لوگو! اللہ نے محمدؐ کو حق کے ساتھ بھیجا تھا اور جو احکام نازل کرنے تھے نازل کر دیئے۔ اُن میں ایک آیت رجم بھی تھی جس کو ہم نے پڑھا اور یاد کیا۔ رسول اللہؐ نے بھی رجم کرایا اور ہم نے بھی حضورؐ کے بعد رجم کرایا مجھے اندیشہ ہے کہ مدت دراز گزر جانے پر لوگ کہیں گے کہ رجم والی آیت تو کتاب اللہ میں ہمیں نہیں ملتی۔ پس یاد رکھو کہ اللہ کا نازل کردہ فرض حکم ترک کرنے سے وہ لوگ گمراہ ہو جائیں گے۔ رجم کرنا کتاب اللہ میں برحق ثابت ہے اُس شخص کو (رجم کیا جائے گا) جس نے زنا کیا ہو اور وہ شادی شدہ ہو خواہ مرد ہو یا عورت اور زنا کے گواہ ہوں یا حمل ہو یا وہ اقرار کرے (رواہ البخاری ومسلم) نسائی کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے دورانِ خطبہ میں فرمایا کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کتاب اللہ میں رجم کا حکم نہیں ہے۔ اگر مجھے اندیشہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے عمرؓ نے کتاب اللہ میں وہ (آیت) بڑھا دی جو اس میں نہ تھی تو میں آیت (رجم) کو ویسے ہی ثبت کر دیتا جیسے وہ نازل ہوئی تھی۔

امام احمد کی روایت ہے کہ دورانِ خطبہ میں حضرت عمرؓ نے رجم کا ذکر کیا اور فرمایا ہم کو رجم کی ضرورت ہے اس کے بغیر چارہ نہیں۔ ان احادیث کے علاوہ اور بھی روایات ہیں جن سے رجم کی سزا کا اجماعِ صحابہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ امام احمد کے نزدیک شادی شدہ زانی کو پہلے سو کوڑے مارے جائیں گے پھر سنگسار کیا جائے گا۔ اوّل سزا بموجب آیت بحکم ہے اور دوسری سزا بحکم حدیث بلکہ بحکم اجماع قطعی ہے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت ہے حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا اب اللہ نے زنا کار عورتوں کے لئے

ماہ کر دی کنوارا کنواری سے زنا کرے تو سو کوڑے اور ایک سال شہر بدر کی سزا ہے اور شادی شدہ شادی شدہ سے زنا کرے تو سو کوڑے اور رجم کی سزا ہے (رواہ مسلم وابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ)

حضرت علیؓ کے پاس سراجہ کو (ایک عورت جس نے زنا کیا تھا) لائے تو آپ نے جمعرات کے روز اس کو سو کوڑے مارے اور جمعہ کے روز سنگسار کر دیا اور فرمایا میں نے کوڑے بحکم الہٰی مارے اور سنگسار بسنت رسول اللہ ﷺ کر دیا (رواہ احمد)

بحث سوم کوڑے کس طرح مارے جائیں؟

خطیب نے ذکر کیا ہے کہ کوڑا دھاردار نہ ہو جس سے کٹ کر زخم ہو جائے اور نہ اتنا فرسودہ ہو کہ چوٹ نہ لگے۔ ہر کوڑا علیحدہ مارا جائے۔ ایک ہی جگہ سب نہ مارے جائیں۔ ایسے اعضا پر نہ مارے جائیں جن پر لگنے سے ہلاکت ہو جائے۔ مثلاً اعضائے تناسل، چہرہ، اعضائے رئیسہ وغیرہ۔ اگر بدن پر پوستین ہو تو اتار دیا جائے۔

زنا کے ثبوت کے لئے معاملہ کے چار گواہ ہونے ضروری ہیں یا مجرم خود اقرار کرے۔ اگر گواہ نہ ہوں اور مجرم اقرار نہ کرے یا دونوں میں سے ایک اقرار نہ کرے اور ایک اقرار کرے تو منکر کو سزا نہ دی جائے گی۔

سزا دینے کا اختیار حاکم وقت کو ہے۔ کوئی شخص اپنے ہاتھ میں قانون نہیں لے سکتا۔ بطور خود سزا دینے کا کوئی مجاز نہیں۔ ہاں اگر کوئی آقا اپنی باندی کو سزا دینی چاہے تو اپنے ہاتھ سے دے سکتا ہے بشرطیکہ حاکم نے حکم دے دیا ہو۔

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ یعنی زانی اور زانیہ پر تم کو ایسا ترس نہ آئے کہ اللہ کے حکم کو پورا کرنے میں تساہل کرنے لگو اور شرعی حد کو معطل کر دو (مجاہد، عکرمہ، عطاء، سعید بن مسیب وغیرہم) بعض کا قول ہے کہ آیت میں تخفیف ضرب کی ممانعت ہے۔ زہری کا قول ہے کہ زنا اور بہتانِ زنا کی سزا میں سخت کوڑے مارے جائیں اور شراب خواری کی سزا میں کسی قدر آہستہ۔ علمائے حنفیہ کا قول ہے کہ زنا کی سزا میں پوری قوت سے مارے اور بہتانِ زنا کی سزا میں اس سے آہستہ اور شراب خواری کی سزا میں سب سے آہستہ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ رافت کی ممانعت سے طبعی رافت کی ممانعت مراد نہیں۔ یہ تو فطری چیز ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایسا ترس نہ آئے جس سے حد شرعی متروک ہو جائے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حدود کے متعلق آپس میں درگزر کر دو۔ جو حد مجھ تک پہنچ جائے گی وہ واجب ہو جائے گی (یعنی ترک نہ کروں گا) شیخ حماد (امام ابو حنیفہؒ کے استاد) نے کہا بہتانِ زنا کی سزا اس طور پر دی جائے کہ اس کا لباس نہ اتارا جائے اور زانی کا لباس اتار لیا جائے۔ اپنے قول کے ثبوت میں حماد نے آیت مذکورہ پڑھی۔ سعید بن ابی عروبہ نے کہا یہ آیت تو تعمیلِ حکم میں سستی نہ کرنے کے متعلق ہے۔ حماد نے فرمایا ضرب میں تخفیف نہ کرنے کے متعلق بھی ہے عامر شعبی کا بھی یہی قول ہے کہ شدتِ ضرب میں ترحم نہ کیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک باندی نے زنا کیا۔ آپ نے اس کی ٹانگوں میں درے مارے۔ آپ کے صاحبزادے عبید اللہ نے بطور یاد دہانی آیت مذکورہ پڑھی۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا بیٹے کیا تیرے خیال میں میں نے اس چھوکری کو مارنے میں کچھ نرمی کی ہے؟ اللہ نے مجھے حکم نہیں دیا کہ میں قتل کر دوں یا سر پر ماروں۔ میں نے اس کو مار دی تو دکھ پہنچا دیا (بس یہی حکم ہے)

إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔ حاملانِ اسرائیلیات احکام الہٰی کو جاری کرنے میں سستی کرتے تھے۔ اگر اعلیٰ طبقہ کسی جرم کا ارتکاب کرتا تو اسے سنگین سزا دیتے۔ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسا کرنے سے منع فرمایا اور صراحت فرما دی کہ اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو احکام الہٰی کی بجا آوری میں سستی اور نرمی نہ کرو یعنی کسی کی رعایت نہ کرو۔ عزیز قریب ہو یا اجنبی دوست ہو یا دشمن بڑا آدمی ہو یا حقیر فقیر، سب کو ایک طرح کی سزا دو۔

وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ یعنی زنا کی سزا علیٰ رؤس الاشہاد لوگوں کے سامنے دی جائے۔ یہ شہادت عامہ مجرموں کو رسوا کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ تمام مومن ان کے لئے مغفرت کی دعا کریں، نصر بن علقمہ کا بھی یہی قول ہے۔ قتادہ نے کہا شہادت عامہ کا حکم نصیحت و عبرت حاصل کرنے اور مجرموں کو شرم دلانے کے لئے ہے۔

طَائِفَةٌ کے معنی میں اختلاف ہے۔ علی بن ابی طلحہ کے نزدیک ایک شخص کو بھی طائفہ کہا جا سکتا ہے۔ مجاہد، عکرمہ اور امام احمد کا بھی یہی قول ہے کہ کم سے کم ایک شخص کا حاضر ہونا ضروری ہے۔ اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی قول ہے۔ زہری نے کم از کم تین کی تعداد لکھی ہے۔ سعید بن جبیر اور امام مالک نے کم سے کم چار کی شرط لگائی ہے شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے۔ ربیعہ نے پانچ اور حسن بصری نے دس آدمیوں کا حاضر ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ خطیب نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ چار ہوں یا زیادہ۔ یہی قول قابلِ ترجیح ہے۔

تفسیر سراج میں لکھا ہے کہ امام المسلمین کا رجم کے وقت حاضر ہونا ضروری نہیں نہ گواہوں پر حضور واجب ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے ماعز اور غامدیہ عورت کو رجم کرنے کا حکم دیا تھا اور خود تشریف نہ لے گئے تھے۔ احناف کے نزدیک قول میں تفصیل ہے۔ اگر مجرم خود اقرار کرے تو امام وقت کا موجود ہونا ضروری نہیں اور اگر شہادت سے ثبوت ہو تو سب سے پہلے گواہ پتھر ماریں پھر حاکم وقت پھر اور لوگ۔

تبیین میں مذکور ہے کہ اگر گواہ نے رجم سے انکار کر دیا تو حد ساقط ہو جائے گی۔ مسائل حنفیہ میں مذکور ہے کہ مجرم کا صحیح العقل اور سلیم البدن ہونا لازم ہے۔ دیوانہ نہ ہو۔ ضعیف الخلقت نہ ہو۔ اگر بیمار ہوگا تو صحت کے وقت کا انتظار کیا جائے گا جب تندرست ہو جائے گا تو شرعی حد جاری جائے گی (کذا فی محیط السرخسی) پھر یہ بھی لازم ہے کہ بالغ ہو قابل جماع ہو اور چار جلسوں میں اقرار کرے۔ زنا کے سزا یافتہ کو غسل و کفن نہ دیا جائے گا اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً اَوْ مُشْرِكَةً (الخ۔ اس آیت کا تفسیری مطلب مختلف طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ہم ذیل میں تفصیل کر کے ہمارے نزدیک جو قابل ترجیح مطلب ہے اس کی صراحت کریں گے۔

(۱) یہ ایک خاص عورت کا تذکرہ ہے۔ خطابی نے صراحت کی ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول خصوصیت کے ساتھ ام مہزول کے متعلق ہوا تھا کیونکہ امام احمد نے بروایت ابن عمرؓ بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے ام مہزول سے نکاح کرنے کی اجازت حضور اقدس ﷺ سے طلب کی۔ ام مہزول پیشہ ور زانیہ تھی اور اس نے اپنے ہونے والے شوہر کے تمام مصارف کی ذمہ داری کر لی تھی۔ حضور والاؐ نے درخواست کنندہ کو آیت مذکورہ پڑھ کر سنائی (رواہ النسائی)

مجاہد کا قول ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول عناصر کے حق میں ہوا تھا۔ امام ترمذی کی روایت ہے کہ مرثد بن ابی مرثد ایک صحابی تھے۔ کفار مکہ جن مسلمانوں کو (مکہ سے مدینہ کو) آنے نہ دیتے تھے اور قیدی بنا کر روک رکھتے تھے ان مسلمانوں کو خفیہ بھگا کر لانے کا کام مرثد انجام دیتے تھے کہ میں ایک فاحشہ کسبی تھی جس کا نام عناق تھا اور جاہلیت میں مرثد کا اس سے تعلق تھا۔ ایک مرتبہ رات کے وقت کسی مسلمان کو بھگانے کے لئے مرثد مکہ کے کسی نخلستان کی دیوار کے نیچے پہنچے۔ رات چاندنی تھی۔ اتنے میں عناق ادھر سے گزری اور آہستہ آہستہ مرثد کے پاس تک پہنچی پھر پہچان کر مرثد کا نام لے کر آواز دی۔ مرثد نے بھی جواب دیا۔ بولی مرحبا مرحبا۔ آج میرے گھر رات کو رہو۔ مرثد نے کہا عناق خدا تعالیٰ نے زنا کو حرام کر دیا ہے۔ جب وہ مایوس ہوئی تو اس نے شور مچا دیا اے خیمہ والو! یہ شخص تمہارے قیدیوں کو بھگا کر لے جانا چاہتا ہے۔ آواز سن کر آٹھ آدمی مرثد کے پیچھے دوڑے۔ مرثد بھاگے آخر ایک غار میں گھس گئے۔ لوگ بھی پیچھے آئے غار پر پہنچ کر انھوں نے پیشاب کیا، مگر مرثد ان کو نہ دکھے جھک مار کر واپس چلے گئے۔ مرثد دوبارہ پہنچ گئے اور موقعہ پا کر ایک مسلمان کو اپنی پشت پر لاد کر نکال لائے۔ جب مدینہ پہنچے تو خدمت گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ! میں عناق سے نکاح کر لوں؟ حضورؐ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اتنے میں آیت اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً الخ نازل ہوئی۔ حضورؐ نے آیت مذکورہ پڑھ کر فرمایا مرثد تو اس سے نکاح مت کر (قال الترمذی حسن غریب ورواہ ابوداؤد والنسائی ورواہ الحاکم وصححہ والبیہقی وغیرہم)

ابن عباسؓ کے بعض اقوال میں آیا ہے کہ یہ آیت ان عورتوں کے حق میں نازل ہوئی جو دور جاہلیت میں حرام کاری کا پیشہ کرتی تھیں۔ مجاہد نے کہا انہی پیشہ ور کسبیات میں سے ایک عورت ام جمیلہ بھی تھی۔ اللہ نے انہی عورتوں سے نکاح کرنے کی ممانعت فرما دی (یہ روایت مرسل ہے)

ابو صالح کہتے ہیں کہ فقرائے اہل صفہ نے خواہش کی تھی کہ ان پیشہ ور عورتوں سے نکاح کر لیں جو شوہروں کے مصارف کی بھی ذمہ دار ہونے کے لئے تیار تھیں۔ ان کو روکنے کے لئے آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔

(۲) زانی اور زانیہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو زنا کے سزا یافتہ ہوں۔ انہی کے متعلق حکم آیت بیان کیا گیا ہے۔ سزا یافتہ مرد سزا یافتہ عورتوں سے اور سزا یافتہ عورتیں سزا یافتہ مردوں سے نکاح کر سکتی ہیں۔ کیونکہ ابن ابی حاتم نے بروایت ابوہریرہؓ بیان کیا کہ حضور اقدس ﷺ نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا لَا يَنْكِحُ الزَّانِي الْمَجْلُودُ اِلَّا مِثْلَهُ اخطیب نے ذکر کیا کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرد و عورت کو زنا کی سزا میں کوڑے مارے پھر باہم نکاح کر لینے کی رغبت دلائی، مگر مرد نے انکار کر دیا۔ حضرت علیؓ کے سامنے ایک شخص (زنا کا سزا یافتہ) پیش کیا گیا جس نے ایک (عفیفہ) عورت سے نکاح کر لیا تھا۔ آپ نے دونوں میں تفریق کرا دی اور فرمایا تو اپنی جیسی کسی سزا یافتہ عورت سے نکاح کر۔ حسن بصری اور ابراہیم نخعی نے آیت مذکورہ کا مطلب اسی طرح بیان کیا ہے۔

(۳) امام شافعیؒ کے نزدیک آیت مذکورہ کا حکم پہلے جاری تھا پھر آیت وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ سے منسوخ ہو گیا۔

(۴) ابن کثیر وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ آیت میں نکاح سے مراد ہے جماع اور مباشرت اور آیت میں حکم انشائی نہیں بلکہ خبری ہے یعنی عموماً ایسا ہوتا ہے کہ زانی کا مقصد

ایسی عورت سے پورا ہوتا ہے جو بدکاری کی خوگر ہو یا وہ مشرک کہ حرمت زنا کا اعتقاد نہ رکھتی ہو اور ایسے ہی زانیہ کی مراد اس سے یہ آتی ہے جو بدنام ہو یعنی حرمت زنا کا قائل نہ ہو۔ الغرض زنا کی قباحت اور زنا کی شناخت آیت سے واضح ہوتی ہے۔ گویا مراد یہ ہے کہ زانی ہی زنا کرتا ہے خواہ اس زانیہ سے کرے جو زانیہ اسلام ہے یا مشرکہ سے کرے۔ اسی طرح زانیہ ہی زنا پر راضی ہوتی ہے خواہ ایسے شخص سے جو زانی ہو اور مدعی اسلام ہو یا مشرک ہو۔ زناکاری مسلمان کا کام نہیں۔ خلاصہ یہ کہ زانی کو زانیہ سے اور زانیہ کو زانی سے اُنس ہوتا ہے۔ نیک بی بی سے بدکار مرد کو اور بدکار عورت سے نیک مرد کو محبت نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کی مزاج کی افتادہ طبیعتوں کا وقوع اور عادات و خصائل کا اختلاف اُنس پیدا ہونے سے مانع ہوتا ہے۔ ابن عباس، سعید بن جبیر اور عکرمہ وغیرہم کے اقوال کا رجحان اسی مطلب کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ میرے نزدیک بھی یہی قول ارجح ہے۔

(۵) نکاح بمعنی عقد ہے اور آیت میں عموم کا بیان ہے۔ یعنی عموماً بدکار مرد بدکار عورتوں ہی سے اور بدکار عورتیں بدکار مردوں سے نکاح کرتی ہیں۔ کوئی بھلا آدمی بدکار عورت سے نکاح کرنے پر راضی نہیں ہوتا نہ کوئی نیک عورت بدکار مرد سے نکاح کرتی ہے۔ اسی طرح بدکار مرد و عورت اس شخص سے نکاح کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں جو شرک میں مبتلا ہو اور حلت و حرمت کے احکام کی اس کو پرواہ نہ ہو۔ یہ مطلب بہت کمزور ہے۔

وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اس آیت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ زانی اور زانیہ نیز مشرک اور مشرکہ سے نکاح کرنا پاک دامن مؤمن اور مؤمنہ کے لئے حرام ہے۔ ابن مسعودؓ کا یہی قول ہے۔ امام مالکؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔ ابن مسعودؓ نے صراحت کی ہے کہ اگر کسی مرد نے کسی عورت سے زنا کیا اور پھر اسی سے نکاح کر لیا تو وہ دونوں ہمیشہ زنا میں مبتلا رہیں گے۔ بقول خطیب ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کا بھی ایک قول یہی ہے، مگر علمائے اہل تحقیق کے نزدیک زانی اور زانیہ سے نکاح کرنا ناجائز نہیں ہے بشرطیکہ انہوں نے سچے دل سے توبہ کر لی ہو اور بدکاری چھوڑ دی ہو کیونکہ بدکاری جاری رکھتے ہوئے کسی کے عقد میں آ جانا اور اپنے ناشائستہ افعال پر قائم رہنا تو اسلام کسی طرح گوارا نہیں کرتا۔ بحکم حدیث دیوث کی سخت ترین سزا ہے بلکہ بعض روایات میں جنت سے اس کو مایوس کر دیا گیا ہے، اس لئے توبہ شرط ہے۔ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور اکثر علماء کا یہی قول ہے۔ یہی آیت کی صراحت اور اس کا جواب تو آیت میں نکاح کی حرمت کا اظہار ہی نہیں کیا گیا۔ یہ محض غلط فہمی ہے بلکہ ذٰلِكَ سے اشارہ زنا اور شرک کی طرف ہے یعنی زنا اور شرک مسلمان کے لئے حرام کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ عام طور پر مشرک اور زناکار اس میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ فافہم۔ بہر حال فاحشہ عورتوں سے نکاح کر لینا اگرچہ بقصد تعفف جائز ہے، مگر شرافت و تقویٰ کے خلاف ہے۔

مقصود بیان سورۂ نور ایک عظیم الشان سورت ہے۔ اس میں باہمی تعامل کے متعلق بعض احکام اور معارف و توحید کے بعض حقائق و نکات بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ تمام احکام کاغذی زینت بنانے کے لئے نہیں بلکہ عبرت و نصیحت حاصل کرنے، عمل کرنے اور کاربند ہونے کے لئے ہیں۔ ان پر غور کرنا چاہیئے ان کے فوائد کو سوچنا اور سمجھنا چاہیئے۔ زانی اور زانیہ کے سو کوڑے مارے جائیں۔ حکم الٰہی کی بجا آوری میں رشتہ، قرابت، مجرم کی دولت، عزت، رسوخ، وجاہت۔ غرض کوئی چیز سستی پیدا نہ کرے، جو شخص حکم الٰہی کو پورا کرنے میں کسی کی رعایت کرے گا اس کا ایمان ناقص ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو خدا کی ذات، حکمت اور تصرف و قدرت کا یقین ہی کم ہے یا قیامت پر اس کا ایمان نہیں ہے۔ جزا سزا کی طرف سے نڈر ہے ورنہ حکم الٰہی کے خلاف دوسرے مصالح کو پیش نظر رکھنا اور دوستوں، عزیزوں، دولت مندوں اور عزت والوں کی رعایت کرنی کسی طرح جائز نہیں۔ عادت، مزاج اور افتادِ طبیعت کو انتخاب نکاح میں بڑا دخل ہے۔ باہمی مجانست و مشاکلت اور طبعی مناسبت ایک کو دوسرے کی طرف مائل کرتی ہے۔ بدکار نیکو کار کی طرف راغب نہیں ہو سکتا۔

مشرک کو زانی کے ساتھ ملا کر بیان کرنے سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ زنا پر جرأت کرنی سخت ترین جرم ہے جس کا صدور بظاہر کسی مؤمن سے ہونا بعید ہے یہ کام اہل شرک کا ہے مسلمانوں کے لئے حرام ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ زنا کرنے کے وقت مومن مومن نہیں رہتا، اس کا ایمان خارج ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔ وغیرہ۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا

اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں پھر چار گواہ نہ پیش کریں تو اُن کے اسی کوڑے مارو اور اُن

تقبلوا لهم شهادة ابدا واولئك هم الفسقون ۙ الا الذين تابوا من بعد

کی گواہی (پھر) کبھی قبول نہ کرو یہ لوگ فاسق ہیں ہاں اس کے بعد جو لوگ توبہ کر لیں

ذلك واصلحوا فان الله غفور رحيم ۝ والذين يرمون ازواجهم ولم يكن لهم

اور نیک عمل کر لیں تو اللہ غفور رحیم ہے اور جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور ان کے پاس

شهداء الا انفسهم فشهادة احدهم اربع شهدت بالله انه لمن الصدقين ۝

سوا اپنی ذات کے اور گواہ نہ ہوں تو ایسے کسی شخص کی گواہی یہی ہے کہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر کہدے کہ بلاشبہ میں سچا ہوں

والخامسة ان لعنت الله عليه ان كان من الكذبين ۝ ويدرؤا عنها العذاب

اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر اللہ کی لعنت ہو اور عورت کی سزا یوں ٹل سکتی ہے

ان تشهد اربع شهدت بالله انه لمن الكذبين ۙ والخامسة ان غضب الله عليها

کہ وہ اللہ کی قسم کھا کر چار بار شہادت دے کہ وہ بلاشک جھوٹا ہے اور پانچویں بار یوں کہے کہ اگر وہ سچا ہو تو

ان كان من الصدقين ۝ ولولا فضل الله عليكم ورحمته وان الله تواب حكيم ۝ ع

مجھ پر اللہ کا غضب ہو اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کا کرم نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ توبہ قبول کرنے والا مصلحت بین ہے (تو تم دشواری میں پڑ جاتے)

تفسیر زنا سنگین ترین جرم ہے۔ اسلام نے اس کی سزا بھی سخت ترین مقرر کی ہے جو اس فعل پر روکنے کے لئے بہت کافی ہے اور جب تک اسلامی سزاؤں کا رواج رہا یہ حرکت شنیعہ مسلمانوں سے تقریباً مفقود رہی۔ لیکن جتنا جرم سنگین ہوتا ہے اتنا ہی اس کا ثبوت بھی دشوار ہونا قرین عقل ہے۔ بغیر قتل نفس کے کسی شخص کو پتھروں سے مار ڈالنا بہت سخت کام ہے، اس لئے اس کا ثبوت بھی بہت ہی اہم ہے۔ تہمت زنا سے علاوہ تہمت زدہ کی آبروریزی اور اس کے زوال و وقار کے سخت ترین جسمانی سزا برداشت کرنی یہاں تک کہ کبھی سنگسار ہونا پڑتا ہے۔ کیونکہ دنیا میں فقط خیر ہی نہیں ہے شر بھی ہے۔ رحمت کے فرشتے ہر وقت برسر مدد اگرچہ ہیں، لیکن شیطانی جال بھی ہر وقت دامنگیر رہتا ہے۔ ہر انسان میں نیکی اور سعادت کی ایک قوت ہے اور شر و شقاوت کی دو قوتیں ہیں۔ شیطان انسان کی رگ رگ میں خون کے ساتھ دوران کرتا ہے، اس لئے ہو سکتا تھا بلکہ بکثرت ہوتا رہتا ہے کہ کسی پاک دامن، نیک چلن باوجاہت مرد یا عورت کی آبروریزی کے لئے بد باطن ناخدا ترس شیطان کے چیلے پیچھے پڑ جائیں اور زنا کی تہمت لگا دیں یا کسی بدکار عورت کو لالچ دے کر زنا بالجبر کا دعوی دائر کرا دیں، اس لئے ضرورت پڑی کہ ثبوت زنا کا ایک قانون بنا دیا جائے جس کے دفعات کی تکمیل بہت ہی سخت ہو اور بصورت عدم ثبوت تہمت لگانے والے پر نیز جھوٹے گواہوں پر سخت ترین سزا جاری کی جائے۔ بہتان تراش فاسق جتنی سزا ضعیف نیکوکار مومن کو دلانی چاہتا تھا اتنی سزا خود برداشت کرے اور اتنی نہ سہی تو کم از کم اس کے قریب قریب ضرور ہونی چاہئے کیونکہ زنا سے قوم کی قوم تباہ ہوتی ہے اور تہمت زنا سے صرف ایک شخص کی آبروریزی ہوتی ہے، اس لئے زنا کی سزا سے تہمت زنا کی سزا کسی قدر خفیف ہونی چاہیے۔

لیکن کبھی کوئی شوہر اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگاتا ہے۔ غیر عورت پر تہمت لگانے سے تو عداوت اور بدخواہی یا آبروریزی کا مظاہرہ ہوتا ہے، مگر اپنی عورت

بر بہتان لگانے پر عموماً اس جذبے کی کارفرمائی نہیں ہوتی اور عقل سلیم عام طور پر (باستثناء بعض) اس بات کو نہیں مانتی کہ کوئی شخص بغیر قوی سبب کے اپنی بیوی پر ناجائز الزام لگانے کی جرأت کرے کیونکہ اپنی بیوی پر تہمت لگانے سے آدمی کی اپنی آبرو پر بھی بٹہ لگتا ہے اور زنا کی شہادت کا نصاب بہت اہم ہے۔ اس کی تکمیل عملی بات نہیں۔ نہ زنا کا ارتکاب علی الاعلان گواہوں کے سامنے کیا جاتا ہے، اس لئے شوہر یا بیویوں کے لئے اسلام نے بہتانِ زنا کے قانون میں ذرا نرمی کر دی اور چار گواہ فراہم نہ ہونے کی صورت میں دونوں کو چار مرتبہ قسم کھانے کا حکم دیا اور لعان کا قانون جاری کیا اور لعان کے بعد تفریقِ زوجین کا حکم دے دیا۔ تاکہ کسی پر بغیر قصور کے حدِ زنا بھی جاری نہ ہو اور مدعی ثبوت کی دشواری سے بچ جائے۔ انہی دونوں قوانین کو آیاتِ مذکورہ میں بیان فرمایا۔

تحلیلِ اجزاء

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ یعنی جو لوگ پاک دامن نیکوکار عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور چار گواہ معائنہ کے اپنے قول کے ثبوت میں نہ پیش کر سکیں تو ان کے اسی دُرّے مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو۔ وہ فاسق ہیں، مگر ہاں جب وہ توبہ کریں اور نیک ہو جائیں تو خیر اللہ غفور رحیم ہے۔ آیت مذکورہ میں تہمت لگانے والوں کی کوئی تخصیص نہیں۔ مرد ہوں، عورتیں ہوں، مسلمان ہوں، کافر ہوں، آزاد ہوں، مملوک ہوں، بالغ ہوں، نابالغ ہوں، صحیح العقل ہوں یا مجنون ہوں آیت کا عموم چاہتا ہے کہ سب کو مقرر کردہ سزا دی جائے، مگر دیوانے اور نابالغ بچے کو اکثر احکامِ شرع سے بحکمِ حدیث اجماع نے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ اس لئے جمہور علماء کے نزدیک بہتان تراشی کے لئے بلوغ و عقل بھی ضروری ہے۔ ہاں اگر آقا اپنے غلام پر تہمت لگائے اور ثابت نہ کر سکے تو بالاجماع آقا پر حد جاری نہ ہوگی، مگر اُخروی گرفت سے نہ بچ سکے گا۔ صحیح حدیث ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس نے اپنے مملوک پر زنا کی تہمت لگائی قیامت کے روز اس پر حدِ قذف (تہمتِ زنا) جاری کی جائے گی۔ ہاں اگر مملوک ایسا ہی ہے جیسا آقا نے کہا ہے تو اُخروی عذاب نہ ہوگا۔

مُحْصَنٰت کے دو معنی بیان کئے گئے ہیں۔ ایک نفوس محصنہ یعنی وہ نفوس جو پاک دامن اور عفیف ہیں خواہ مرد ہوں یا عورتیں۔ اس تقدیر پر آیت کا حکم مردوں پر زنا کی تہمت لگانے والوں کو بھی بصراحت شامل ہوگا، لیکن بعض علماء قائل ہیں کہ محصنات کا لفظ صرف عورتوں کو شامل ہے۔ رہے مرد تو ان پر تہمت لگانے والوں پر بھی بالاجماع یہی سزا ہے۔ گویا آیت سے صرف پارسا عورتوں پر تہمت لگانے والوں کا حکم معلوم ہوا اور اجماع نے تہمت لگانے والوں کا بھی یہی حکم مقرر کر دیا۔

اِحْصَان کے معنی ہیں پاک دامنی اور عفت۔ محصنہ وہ عورت ہے جو زنا اور شبۂ زنا سے ہمیشہ پاک رہی ہو خواہ مسلمہ ہو یا کافرہ، آزاد ہو یا مملوکہ، بالغہ ہو یا نابالغہ، دیوانی ہو یا صحیح العقل، غریب ہو یا امیر، شریف ہو یا رذیل، آیت کے عموم میں ہر پارسا نیکوکار عفت شعار عورت داخل ہے، مگر علماء نے از روئے احادیث احصان کے لئے چند شرطیں مقرر کی ہیں۔ تہمت زدہ عورت مسلمہ ہو یا عاقلہ، بالغہ ہو یا آزاد ہو، کافرہ پر تہمت لگانے والے کو یہ سزا نہ دی جائے گی اگرچہ وہ عفیفہ ہو۔ ایک تو وقت مناسب سزا تجویز کرے گا، لیکن زہری، ابن ابی لیلیٰ اور سعید بن مسیب نے کافرہ پر تہمت لگانے پر بھی یہی سزا جاری کرنے کا حکم دیا ہے۔ دیوانی، نابالغ یا لونڈی پر تہمت لگانے سے بھی حدِ شرعی جاری نہیں ہوتی۔ اسی طرح تہمت زدہ عورت کا پاک دامن ہونا ضروری ہے۔ اگر کبھی اس سے زنا کا صدور ہو گیا اور پھر اس نے توبہ کر لی اور پھر کسی وقت اس پر کسی نے زنا کی تہمت لگائی اور ثبوت نہ ہو سکا تو تہمت لگانے والا مقررہ سزا کا مستحق نہ قرار پائے گا۔ ایک بات یہ بھی جاننے کے قابل ہے کہ جو لوگ تہمت کے مجرم قرار پائیں خواہ کوئی ہوں بحکم عمومِ آیت سب کو اسی دُرّے مارے جائیں، مگر چونکہ نصِ قرآنی کے بموجب زنا کرنے والے مملوک کی سزا نصف ہے اور بجائے سو کوڑوں کے غلام اور باندی کے پچاس کوڑے لگانے کا حکم ہے، اس لئے امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ اور امام مالکؒ وغیرہ نے تہمت تراش باندی و غلام پر نصف سزا جاری کرنے یعنی چالیس کوڑے مارنے کا فتویٰ دیا ہے۔ ایک روایت کے بموجب حضرت علیؓ کا بھی یہی قول ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کا قول ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ بھی باندیوں اور غلاموں کو یہی سزا دیتے تھے، لیکن ابن مسعودؓ کے نزدیک بہتان تراش مملوک کو بھی پوری سزا دی جائے گی۔ اوزاعی کا بھی یہی قول ہے۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز اموی نے جو بہت متقی اور باشرع خلیفہ تھے پوری سزا دی تھی۔

چند مباحث

(۱) اگر کسی شخص نے کسی پر زنا کی تہمت لگائی تو چار مرد عادل باشرع آزاد بطور شہادت پیش کرنے ضروری ہیں جو شرعی شہادت ادا کریں۔ اگر نصابِ شہادت پورا نہ ہوا تو بہتان تراش اور پیش کردہ گواہوں پر حدِ قذف جاری ہوگی۔ گواہوں کو بھی بہتان تراش سمجھا جائے گا۔ مؤلف فتح البیان نے ذکر کیا ہے کہ اگر گواہ پورے چار نہ ہوں تو حسن بصری، شعبی، احمد، ابوحنیفہ، محمد بن حسن کے نزدیک گواہوں پر حدِ قذف جاری نہ ہوگی۔ حالانکہ حضرت عمرؓ نے مغیرہ بن شعبہ پر تہمت لگانے والوں کو نیز تینوں گواہوں کو کوڑے لگوائے تھے۔ مؤلف فتح البیان نے امام ابوحنیفہ پر یہ غلط اتہام لگایا ہے۔ امام صاحب نے کہیں نہیں کہا کہ اگر زنا کے شاہد تین سے کم ہوں تو صرف بہتان تراش پر تہمت کی سزا جاری کی جائے گی اور گواہوں پر جاری نہ کی جائے گی، طحاوی نے شرح الآثار میں صاف صراحت کی ہے کہ اگر تین گواہ

معائنہ زنا کی شہادت دی اور چوتھے نے کہا میں نے دونوں کو ایک لحاف میں دیکھا تھا تو اول الذکر تینوں گواہوں پر حد قذف جاری کی جائے گی اور چوتھے گواہ کو سزا نہ دی جائے گی۔ مبسوط میں ہے کہ قاذف کی طرف سے چار گواہوں سے کم قبول نہ کئے جائیں گے۔ اگر بہتان تراش نے معائنہ زنا کے چار گواہ پیش کئے تو تین خبر اور تین گواہ پیش کئے اور بولا چوتھا گواہ میں ہوں تو اس کے قول کی طرف التفات نہ کیا جائے گا۔ اس کو اور اس کے تینوں گواہوں کو کوڑے لگائے جائیں گے۔ علمائے احناف کی یہ تصریحات واضح طور پر بتا رہی ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کا وہ قول نہیں جو مؤلف فتح البیان نے نقل کیا ہے۔ اماموں پر یہ محض بہتان ہے۔

(۲) جس جلسہ میں بہتان تراش تہمت لگائے اسی جلسہ میں چار گواہ پیش کرنے ضروری ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تہمت لگانے کے بعد گواہ تلاش کرتا پھرے اور دوسرے جلسہ میں گواہ پیش کرے یا کوئی گواہ کسی وقت پیش کرے اور کوئی گواہ کسی وقت۔ اگر ایسا کرے گا تو امام مالکؒ، حسن بصری، امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کے نزدیک اس پر اور اس کے گواہوں پر حد قذف جاری کی جائے گی۔ احناف کے نزدیک اتحادِ مجلس شرط ہے۔ دعویٰ اور شہادت دونوں ایک ہی مجلس میں ہونا چاہئے۔ امام شافعی کے نزدیک گواہوں کا اجتماع اور تفرق دونوں برابر ہیں، تعداد پوری ہونی شرط ہے کسی طرح پوری ہو جائے۔ کذا ذکرہ الخطیب۔

(۳) حد قائم کرنے اور کوڑے لگانے کا اختیار امام المسلمین یا اس کے نائب مجسٹریٹ، جج اور قاضی وغیرہ کو ہے۔ کوئی دوسرا بطور خود ایسا نہیں کر سکتا۔

(۴) زنا کی سزا امتدادِ زمانہ سے ساقط ہو جاتی ہے یعنی مدت دراز گزر گئی ہو اور مدت کے بعد زنا کا ثبوت ہو تو حد شرعی جاری نہ کی جائے گی۔ یہی حکم شرابخواری کی سزا کا ہے، لیکن تہمت زنا کی سزا ہر وقت جاری ہو گی۔ جب تہمت زدہ دعویٰ کرے اس کا دعویٰ مسموع ہو گا۔

فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً الخ۔ زنا کی تہمت لگانے والے کے لئے قرآن نے تین سزائیں مجموعی طور پر تجویز کی ہیں (۱) اسی کوڑے مارے جائیں تاکہ جو سزا وہ دوسرے کو دلوانی چاہتا ہے اس کے قریب قریب خود برداشت کرے (۲) اس کی شہادت کبھی کسی معاملہ میں قبول نہ کی جائے خواہ کیسا ہی معزز با وجاہت اور دولت مند حکمران ہو کیونکہ اس نے ایسا جھوٹ بولا جس سے ایک نیکوکار پاک دامن کی آبروریزی ہوئی ہے۔ اگر اس کے قول کو مان لیا جاتا تو ایک غریب کی آبروریزی کے علاوہ جان پر بھی بن جاتی یا جان جاتی رہتی۔ ایسا مکار، بے باک جب اس وقت جھوٹی شہادت دینے اور تہمت لگانے سے باز نہ رہا جب کہ اس کو ثقہ قابلِ اعتماد اور نیکوکار سمجھا جاتا تھا تو سزا یافتہ ہونے کے بعد آئندہ جھوٹ بولنا کیسے چھوڑ سکتا ہے... اگرچہ توبہ ہی کرے۔ ایسے آدمی کی سرشت میں بیہودگی اور یاوہ گوئی ہوتی ہے۔

(۳) ایسے لوگ فاسق ہیں۔ بھلے آدمیوں کی برابری اور عزت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ خدا اور مسلمانوں کی شرعی مجالس سے مطرود ہیں۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا۔ اس جملہ سے پہلے تین جملے مذکور ہیں ایک فَاجْلِدُوْهُمْ دوسرا وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا اور تیسرا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ شعبی کا قول ہے کہ مذکورہ بالا تینوں جملوں سے اس جملہ کا استثناء ہے یعنی اگر بہتان تراش توبہ کر لیں اور اپنی حالت درست کر لیں تو پھر نہ ان کے کوڑے لگائے جائیں گے نہ عدم قبول شہادت کا حکم ہو گا نہ ان کا فسق باقی رہے گا۔ ابن عباس، فاروق اعظم، سعید بن جبیر، مجاہد، عطاء خراسانی، مالکؒ اور شافعیؒ کہتے ہیں کہ آخری دو جملوں سے استثناء ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سزا ملنے سے پہلے کوئی شخص صحیح توبہ کرے تو سزائے تازیانہ تو معاف نہیں ہو گی البتہ ردِ شہادت اور فسق کا حکم جاتا رہے گا۔ اس کی شہادت آئندہ قابلِ قبول ہو گی اور فاسق نہیں رہے گا۔ ابراہیم نخعی، قاضی شریح اور امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ صرف آخری جملہ سے استثناء ہے یعنی توبہ کرنے سے نہ تو سزائے تازیانہ معاف ہو سکتی ہے نہ شہادت آئندہ قبول ہو گی بلکہ فسق عند اللہ باقی نہ رہے گا۔ دنیوی سزا برابر دی جائے گی۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ الخ۔ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں امام احمد کے حوالے سے بروایت ابن عباسؓ بیان کیا ہے کہ جب آیت وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ الخ نازل ہوئی تو سید الانصار سعد بن عبادہؓ نے خدمتِ گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا یہ آیت یونہی نازل ہوئی ہے (یا اس کے بعد کوئی اور حکم بھی ہے) حضور اقدس ﷺ نے فرمایا اے گروہ انصار سن رہے ہو تمہارا سردار کیا کہہ رہا ہے؟ انصار نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ حضور ان کے کہنے کا کوئی اثر نہ لیں یہ بڑے غیرت دار آدمی ہیں۔ ان کی غیرت کا یہ حال ہے کہ جس کسی عورت سے انہوں نے نکاح کر لیا پھر ہم میں سے کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ اس عورت سے نکاح کر لے۔ سعد نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! میں یہ تو یقیناً جانتا ہوں کہ یہ آیت حق ہے اور اللہ کی طرف سے ہے، مگر مجھے اس بات کا تعجب ہے کہ اگر کسی ذلیل عورت کو میں ...... ایسی حالت میں پاؤں کہ کوئی بدکار اس کی رانوں کو دابے ہوئے ہو تو مجھے اختیار نہ ہو گا کہ کوئی حرکت کر سکوں اور اس کو دکھ پہنچا سکوں، یہاں تک کہ چار گواہوں کو ڈھونڈ کر لے آؤں۔ خدا کی قسم میں گواہوں کو لانے نہ پاؤں گا کہ وہ بدکار اپنا کام کر کے چلتا بنے گا۔ ابن عباسؓ نے کہا اس قصہ کو چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز ہلال بن امیہ عشاء کے وقت اپنے گھر آئے اور اپنی بیوی کے پاس ایک شخص کو پایا۔ خود آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے (اس کی باتیں) سنیں، مگر بغیر کسی جوش انگیز حرکت کے یوں ہی

رات گزار دی اور صبح سویرے خدمتِ گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہؐ! عشاء کے وقت میں اپنے گھر پہنچا تو اپنی بیوی کے پاس ایک مرد کو دیکھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سُنا۔ ہلال کا قول حضور والاؐ کو ناگوار ہوا۔ اس پر انصار جمع ہوئے اور کہنے لگے سعد بن عبادہ نے جو کچھ کہا تھا ہم اسی میں مبتلا ہو گئے۔ اب رسول اللہ ہلال کو تہمتِ زنا کی سزا دیں گے اور آئندہ اس کی شہادت ناقابل پذیرائی قرار پا جائے گی۔ ہلال بولے خدا کی قسم مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے لئے اس سے چھوٹنے کی کوئی سبیل ضرور نکال دے گا۔ پھر حضور والاؐ سے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے قطعاً معلوم ہے کہ جو کچھ میں نے عرض کیا تھا وہ حضور کو ناگوار گزرا تھا، مگر خدا جانتا ہے کہ میں سچا ہوں۔ ابن عباسؓ نے کہا خدا کی قسم رسول اللہؐ ہلال پر حدِ قذف جاری کرنے کا حکم دینے ہی والے تھے کہ وحی نازل ہوئی اور آیات وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ الخ اتری۔ حضور کی افسردگی دور ہو گئی اور فرمایا ہلال تمہیں بشارت ہو کہ اللہ نے تمہارے لئے سبیل نکال دی۔ ہلال نے کہا میں تو اپنے پروردگار سے یہی اُمید لگائے ہوئے تھا۔ اس کے بعد حضور والاؐ نے ہلال کی عورت کو بلایا اور دونوں کو اللہ کا حکم پڑھ کر سنایا۔ دونوں کو نصیحت کی اور متنبہ فرمایا کہ آخرت کا عذاب دنیا کے عذاب سے بہت سخت ہے۔ ہلال نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! واللہ میں نے اس عورت کے متعلق سچ کہا ہے۔ عورت نے کہا حضور اس نے جھوٹ کہا ہے۔ سرکارِ عالیؐ نے ارشاد فرمایا ان دونوں میں لعان کراؤ۔ چنانچہ اوّل ہلال سے قسم کھانے کو کہا گیا۔ ہلال نے چار مرتبہ خدا کو گواہ کر کے کہا کہ میں سچا ہوں۔ جب پانچویں مرتبہ کہنے کی باری آئی تو ہلال سے کہا گیا ہلال اللہ سے ڈر دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے آسان ہے اور اس شہادت سے (اگر جھوٹی ہے) تجھ پر عذاب کا وجوب ہو جائے گا۔ ہلال نے کہا واللہ مجھے خدا عذاب نہ دے گا جس طرح اس نے مجھے قذف کی سزا سے بچا لیا۔ غرض پانچویں بار ہلال نے کہا اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر خدا کی لعنت ہو۔ اس کے بعد عورت سے ادائے شہادت کے لئے کہا گیا اس نے چار مرتبہ خدا کو گواہ کر کے کہا کہ یہ شخص جھوٹا ہے۔ پانچویں شہادت کے وقت حضورؐ نے اس کو روکا اور فرمایا اللہ سے ڈر، دنیا کا عذاب آخرت کے عذاب سے آسان ہے۔ یہ شہادت تو موجبہ ہے (عذاب کو واجب کر دینے والی ہے بشرطیکہ جھوٹی ہو) تیرے لئے عذاب کو ضروری کر دے گی۔ یہ سن کر عورت ذرا جھجکی اور قریب تھا کہ اقرار کر لے، مگر پھر بولی واللہ میں اپنی قوم کو رسوا نہ کروں گی۔ یہ کہہ کر پانچویں شہادت اس طرح ادا کر دی کہ اگر یہ مرد سچا ہو تو مجھ پر اللہ کا غضب ہو۔ اس کے بعد حضورِ اقدسؐ نے دونوں میں تفریق کرا دی اور حکم دے دیا کہ اس عورت کا فرزند کسی باپ کے نام سے نہ پکارا جائے اور کوئی اس کے فرزند پر تہمت نہ لگائے، اگر کوئی اس عورت یا اس کے فرزند پر تہمت لگائے گا اس کو قذف کی سزا دی جائے گی۔ الخ۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ہلال نے اپنی بیوی پر جس شخص سے تعلق رکھنے کا دعویٰ کیا تھا اس کا نام شریک بن سحماء تھا۔ روایت مذکورہ اکثر صحاح میں موجود ہے، مگر الفاظ میں کچھ تغیر ہے۔ حاصل سب کا یہی ہے کہ آیت مذکورہ ہلال بن اُمیہ کے واقعہ کے متعلق نازل ہوئی تھی۔

اسی قسم کا ایک اور واقعہ بھی ہوا تھا جس کو امام احمد نے بروایت سہل بن سعد بیان کیا ہے اور تمام اصحابِ صحاح نے سوائے ترمذی کے اس کو کم و بیش الفاظ میں نقل کیا ہے۔ حضرت عویمر نے حضرت عاصم بن عدی کو خدمتِ گرامی میں بھیجا اور یہ دریافت کرایا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو مبتلا دیکھے اور اس کو قتل کر دے تو کیا قاتل کو قتل کیا جائے گا یا نہیں؟ حسب مشورہ عاصم نے خدمتِ گرامی میں حاضر ہو کر عرض کر دیا۔ حضورؐ نے سوال کو ناگوار سمجھا۔ عاصم نے واپس آکر عویمر سے سرگزشت کہہ دی۔ عویمر نے کہا بہ خدا میں تو ضرور خدمتِ گرامی میں حاضر ہو کر دریافت کروں گا۔ چنانچہ عویمر خدمتِ والا میں حاضر ہوئے۔ اس وقت نزولِ وحی ہوا تھا۔ حضور والاؐ نے عویمر اور اس کی بیوی کو طلب فرما کر دونوں میں لعان کرا دیا۔ لعان کے بعد عویمر نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! اب اگر میں اس عورت کو لے جاؤں گا تو (لوگ کہیں گے) میں نے اس پر بہتان تراشی کی تھی۔ یہ کہہ کر حضور کے فرمان سے پہلے انہوں نے بیوی کو علیحدہ کر دیا۔

اس واقعہ کو بھی بعض مفسرین نزولِ آیت کا سبب قرار دیتے ہیں۔ طریقۂ لعان اور آیت کا مطلب ہلال بن اُمیہ کے قصہ سے واضح ہے، اس لئے ہم مکرر تشریح کرنی نہیں چاہتے۔

لعان کے چند مسائل

لعان کے بعد زوجین کا نکاح باقی نہ رہے گا اور پھر ان دونوں کا نکاح صحیح نہ ہوگا۔ جو بچہ اس حمل سے پیدا ہوگا وہ اس مرد کا نہ کہلائے گا نہ کسی دوسرے مرد کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ عورت کو ملاعن مرد کے ترکہ میں سے کچھ نہ ملے گا نہ مرد کو ملاعنہ عورت کی میراث ملے گی۔ اس بچہ کو اپنی ماں کا ترکہ تو ملے گا مگر باپ کا ترکہ نہ ملے گا۔ امام ابو حنیفہؒ لعان کو طلاق کہتے ہیں۔ شافعیؒ فسخِ نکاح کہتے ہیں۔ مالکؒ اور شافعیؒ کا قول ہے کہ آزاد ہو یا غلام، مسلم ہو ذمی، لعان کا حکم سب کے لئے برابر ہے۔ زہری، اوزاعی، ابو حنیفہ قائل ہیں کہ جن میں شہادت کی اہلیت ہو وہی لعان کے اہل ہیں۔ یعنی مسلمان ہو، آزاد ہو، جھوٹی شہادت کا سزا یافتہ نہ ہو۔ غلام یا ذمی یا وہ آزاد مسلمان جو کبھی شہادتِ کاذبہ میں سزا پا چکا ہو اگر لعان کا خواستگار ہوگا تو لعان کا حکم نہ دیا جائے گا۔ لعان کے وقت اگر مرد یا عورت کوئی بھی قسم سے گریز کرے گا تو سزا دی جائے گی۔ مرد اگر گریز کرے گا تو حدِ قذف جاری ہوگی یعنی اسّی دُرّے مارے جائیں گے۔ الخ

عورت گریز کرے گی تو اس کو سنگسار کیا جائے گا۔ اوّل قسم مرد کو دی جائے گی اور وہ قسم کھالے تو پھر عورت کو دی جائے گی۔ لعان بالفاظ شہادت ہوگا۔ طلاق ہو جانے پر عورت کے ایامِ عدت کا نان نفقہ واجب نہیں۔ اسی طرح جو مہر دے چکا ہے اس کے واپس لینے کا بھی کوئی حق نہیں۔ لعان کرانے اور قسم لینے سے پہلے سنت ہے کہ قسم کھانے والے کو نصیحت کی جائے اور اس کو عذاب الٰہی سے ڈرایا جائے۔

مقصودِ بیان کسی مسلمان پاک دامن کی آبرو ریزی بہت ہی سنگین جرم ہے۔ خصوصاً بغیر شرعی ثبوت کے زانی کہنا ایسا سخت گناہ ہے جس کی پاداش دوامی اور استمراری ہے۔ علاوہ اسی کوڑے لگائے جانے کے ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کی نظروں میں ذلیل، خوار اور ناقابلِ اعتبار ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے دوامی فسق کی مہر (جب تک سچی توبہ نہ کرلے) اس پر لگ جاتی ہے۔ بارِ ثبوت مدعی کے ذمہ ہے۔ زنا کا نصابِ شہادت ثبوتِ قتل سے بھی زیادہ اہم ہے قتل کے ثبوت کے لئے دو مردوں کی شہادت کافی ہو جاتی ہے، مگر زنا کے ثبوت کے لئے چار معتبر شہادتوں کی ضرورت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ تمام جرموں کے مجرم صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو ان کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مثلاً قتل کا مجرم قاتل ہوتا ہے مقتول نہیں ہوتا، مگر زنا بالرضا کے دو مجرم ہوتے ہیں عورت اور مرد اور ہر مجرم کے جرم کو ثابت کرنے کے لئے کم از کم دو شاہدوں کی ضرورت ہے، اس لئے زنا کے ثبوت کے لئے چار شہادتیں لازم ہیں۔ مدعی کو شرعی شہادت کے قانون میں شاہد تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ اگرچہ انگریزی ضابطۂ شہادت مدعی کو بھی شاہد مانتا ہے۔ اسلام میں ثبوت کے بعد صفائی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ ہاں بصورت عدمِ ثبوت مدعی کے خلاف کیس چلایا جا سکتا ہے جس کا مجاز حاکمِ وقت ہے۔ بلکہ زنا میں جھوٹے مدعی کو سخت ترین سزا دینی واجب ہے۔ توبہ سے دنیوی سزا ساقط نہیں ہوتی۔ ہاں خدا کا جرم معاف ہو جاتا ہے اور قیامت کے مواخذہ سے آدمی بچ جاتا ہے۔ اپنی بیوی پر زنا کا دعویٰ کرنے والے اگر شرعی شہادت پیش کرنے سے قاصر ہوں تو شرعی الفاظ میں ان کو پانچ مرتبہ قسم کھانی ہوگی۔ ہر شاہد کے بجائے ایک قسم ہوگی اور پانچویں قسم اپنے دعوے کی صداقت کو پختہ کرنے کے لئے ہوگی اور چونکہ مدعی کی قسموں سے دعوے کا ثبوت نہیں ہو جاتا صرف اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ وہ دعوے کا ذب کی سزا سے بچ جاتا ہے، اس لئے عورت اپنی صفائی پیش کر سکتی ہے اور شرعی صورت صفائی کی صرف یہ ہے کہ مدعی کی ہر قسم کے مقابل قسم کھائے اور پانچویں مرتبہ بجائے لعنت کے غضب کا لفظ استعمال کرے۔ کل آیات کا سیاق دلالت کر رہا ہے کہ حقوق العباد بہت ہی اہم ہیں۔ خصوصاً کسی کی عزت و آبرو قریب قریب جان کے برابر ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ وقعت رکھتی ہے۔ ان سے مؤمن مسلمانوں کو تنبیہ حاصل کرنی چاہیئے جو کہ انتہائی بے باکی کے ساتھ دوسرے مسلمانوں کی آبرو ریزی کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ باہمی جھگڑوں میں طرح طرح کے الزام لگاتے ہیں، عدالتوں میں جھوٹے مقدمات دائر کرتے ہیں اور ناکردہ گناہ کو پھیلانے کی ناپاک کوشش کرتے ہیں۔ بس تجارت پیشہ صنعت لگا کر بھی دراصل شہرت حاصل کرنا چاہیئے ہو اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کا جھوٹا پروپیگنڈا کرتا ہے اور دوسروں کی جان و مال اور آبرو پر ناجائز حملہ کرنے سے باک نہیں کرتا، برابر حملے کرتا رہتا ہے وغیرہ۔

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنكُمْ لَا تَحْسَبُوهُ شَرًّا لَّكُم بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ لِكُلِّ امْرِئٍ

جو لوگ یہ طوفان لے کر آئے ہیں وہ تم ہی میں کی ایک جماعت ہے تم اپنے حق میں اُس کو بُرا نہ سمجھو بلکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہے ان میں سے ہر شخص کے لئے

مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ مِنَ الْإِثْمِ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○ لَّوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ

وہی گناہ ہے جو اُس نے کیا ان میں سے جس کا اس تہمت میں بڑا حصہ ہے اسی کے لئے بڑا عذاب ہے جب تم نے ایسا سنا تھا تو ایسا کیوں نہ

ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ مُّبِينٌ ○ لَّوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ

ہوا کہ مسلمان مرد و عورتوں نے اپنے بھائی بہنوں کے حق میں اچھا خیال کیا ہوتا اور کہا ہوتا یہ صریح بہتان ہے وہ اس پر چار گواہ کیوں

بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ○ وَلَوْلَا فَضْلُ

نہیں لائے پھر جب چار گواہ نہ لائے تو اللہ کے نزدیک وہی بلاشبہ جھوٹے ہیں اور دنیا و آخرت

اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَمَسَّكُمْ فِي مَآ أَفَضْتُمْ فِيهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ إِذْ

ہیں تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو اُس کے چرچا کرنے میں تم پر کوئی بڑی آفت آپڑتی تم اسی

تَلَقَّوْنَهٗ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهٗ هَيِّنًا وَهُوَ

کو اپنی زبانوں پر لاتے تھے اور ایسی بات کہتے تھے جس کی تمہیں کوئی تحقیق نہ تھی اور اس کو آسان (ہلکا) سمجھ رہے تھے حالانکہ اللہ کے

عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيمٌ ۝ وَلَوْلَآ إِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُونُ لَنَآ أَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ۝

نزدیک یہ بڑی بات تھی جب تم نے اس کو سُنا تو کیوں نہیں کہہ دیا کہ ایسی بات کا زبان پر لانا ہم کو سزاوار نہیں تو پاک ہے یہ تو بڑا بہتان ہے

تفسیر ہلال اور عویمر کو زنا کے قانونِ شہادت کی شکایت بھی ہوئی تھی اور سعد بن عبادہ نے صاف کہدیا تھا کہ اگر کوئی اپنی بیوی کے پاس کسی غیر شخص کو دیکھے گا تو وہ جب تک گواہوں کو ڈھونڈنے جائے گا وہ بدچلن شخص اپنا کام پورا کر کے چلا جائے گا۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہدیا تھا کہ اگر کوئی آدمی اپنی بیوی کو کسی کے ساتھ آلودہ دیکھے اور اس کو قتل کر ڈالے تو اس کو قتل کیا جائے گا اور اگر زبان سے نکالے تو کوڑے لگائے جائیں گے اور اگر چُپ رہے گا تو یونہی گھُٹ کر مر جائے گا۔ یہ عجیب حکم ہے نہ اُگلے بنتی ہے نہ نِگلے۔ لیکن قانونِ الٰہی مصالحِ عامہ کو پیشِ نظر رکھ کر نازل ہوتا ہے۔ کسی خاص شخص یا واقعہ مخصوص کا خصوصی لحاظ اور استثنائی نگہداشت اس میں نہیں ہوتی۔ زنا کی سزا بہت سنگین ہے۔ اس کا ثبوت بھی بہت اہم ہونا چاہیئے تھا ورنہ ہر کس و ناکس جس پر چاہتا تہمت لگوا کر سزا دلوا دیتا۔ ہر دشمن اپنے دشمن کو ذلیل رسوا اور پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے اور عالم خیر و شر حق و باطل اور نور و ظلمت سے بھرا ہوا ہے۔ روشنی پر اعتماد رکھنا اور تاریکی کا اندیشہ نہ رکھنا خلافِ دانش ہے، قانون کے ایک پہلو پر نظر کرنا اور دوسرے رُخ کو نہ دیکھنا کوتاہ بصری کی علامت ہے۔ خدا تعالیٰ نے قانونِ زنا ہمیشہ کے لئے نازل فرمایا۔ بعض صحابہ کی نظر کوتاہ تھی وہ قانون کی ہمہ گیری اور افادی حیثیت پر غور نہ کر سکے اور سطحی نظر سے اعتراض کرنے لگے۔

آغاز آیات مذکورہ سے اٹھارہ آیات تک خدا تعالیٰ نے ایک ایسا عظیم الشان واقعہ بیان فرمایا ہے جو اپنی نوعیت، عظمت، افادیت اور مصلحت کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ تاریخ اسلامی بلکہ تمام عالم کی تاریخ نبوت ایسے واقعہ سے خالی ہے۔ کسی نبی کی بیوی پر ایسا اتہام نہیں لگایا گیا جیسا اُم المومنین حضرت عائشہ رضؓ پر لگایا گیا۔ اس واقعہ کو بیان کرنے اور اس پر مفصل تبصرہ کرنے سے مقصود قرآنی یہ ہے کہ جب محترم معظم رسول برحق کی عفیفہ معصوم بیوی پر لوگ اتہام لگانے سے نہ رُکے اور دشمنوں نے اُن کو مطعون کیا اور نہ فقط دشمنوں نے بلکہ خدام اور دوستوں نے بھی ان کی تائید کی اور آگ پر پانی چھڑک کر مزید شعلہ انگیزی کی۔ نہ رسولِ پاک صلعم کی حرمت کا لحاظ کیا نہ پاک دامن ام المومنین کی عفت و عزت کا۔ تو پھر کس طرح دنیا میں کسی شریف صالح نیکوکار کی عزت و آبرو محفوظ رہ سکتی ہے۔ جب تک ثبوت زنا کی شہادت کو اہم اور غیر معمولی نہ قرار دیا جائے اور کیونکر حق و باطل کا امتیاز ہو سکتا ہے تاوقتیکہ شہادتِ زنا کا قانون سنگین دفعات میں نہ جکڑ دیا جائے۔

تقریباً تمام اصحاب حدیث نے واقعۂ افک کو لکھا ہے، لیکن طول و قصر میں اختلاف ہے، الفاظ و معانی میں کمی بیشی ہے، راویوں کا سلسلہ جدا جدا ہے۔ ہم مختصر طور پر تمام روایتوں کا خلاصہ بیان کرتے ہیں تاکہ قرآنی آیات کی تفسیر سمجھنے میں سہولت ہو جائے۔ بخاری اور مسلم اور بعض دیگر اصحاب صحاح نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ حضور اقدس جب کسی سفر کو تشریف لے جاتے تو ازواج مطہرات میں سے کسی کو ساتھ لے جاتے، لیکن اس خیال سے کہ کسی کو شکایت کا موقعہ باقی نہ رہے۔ آپ قرعہ ڈال لیا کرتے تھے جس بی بی کا نام نکل آتا اس کو ساتھ لے جاتے۔ چنانچہ ۶ھ میں جب غزوۂ بنی مصطلق پر تشریف لے جانے کا ارادہ کیا تو قرعہ اندازی کے بعد حضرت عائشہ رضؓ کو ساتھ لے لیا۔ مقام مقصود پر پہنچ اور کام انجام دے کر کچھ مدت کے بعد واپس تشریف لے آئے واپسی میں جب مدینہ کے قریب پہنچے تو ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ حضرت عائشہ رضؓ قضائے حاجت کے لئے ہودج سے نکل کر ایک طرف کو چل دیں اور لشکر سے دور قضائے حاجت کرنے کے بعد واپس تشریف لائیں۔ اسی اثناء میں سینہ پر ہاتھ مار کر جو دیکھا تو ہار نظر نہ آیا۔ وہ ہار آپ کی بڑی بہن حضرت اسماء رضؓ کا تھا جس کو مستعار لائی تھیں۔ اس کو ڈھونڈنے پھر واپس گئیں۔ ڈھونڈنے میں دیر لگی قافلہ چل دیا۔ بی بی عائشہ ہلکی پھلکی اور دُبلے بدن کی تھیں، عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی پھر

نے تمہاری براءت نازل فرمادی (فرطِ مسرت میں) حضرت ابوبکرؓ و ام رومانؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا اٹھو رسول اللہ ﷺ کا شکریہ ادا کرو۔ ام المؤمنین اس وقت بے حد غصے میں تھیں۔ بولیں میں رسول اللہ ﷺ کا شکریہ ادا نہیں کروں گی اللہ کا شکر ادا کروں گی اور تمہاری شکرگزار نہیں ہوں تم سب نے سنا اور اللہ کی حمد و ثنا کروں گی جس نے میری براءت نازل کی۔ جن لوگوں نے یہ بہتان سنا کسی نے انکار نہیں کیا۔ اس موقع پر اِنَّ الَّذِيْنَ جَاۗءُوْ بِالْاِفْكِ سے دس آیات نازل ہوئیں۔ حضرت ابوبکرؓ کو بسبب حضرت عائشہؓ کی براءت معلوم ہوگئی تو بہتان تراشی کرنے والوں پر آپ کو غصہ آگیا۔ مسطح بن اثاثہ پر، یہ قرابت دار تھے اور آپ ہی ان کی معاش کے ذمہ دار اور مصارف کے کفیل تھے اور مسطح کی آلودگی ظاہر ہوچکی تھی۔ اس لئے قسم کھالی کہ اب میں اس کو کچھ نہ دوں گا کیونکہ عائشہ کے حق میں اس نے ایسی زبردست بہتان تراشی کی ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ ... غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ تک نازل فرمائی اور حضرت ابوبکرؓ پھر مسطح کو نفقہ دینے لگے (انتہی مختصراً)

واقعہ افک میں شرکت کرنے والے علاوہ منافقوں کے تین مسلمان بھی کہے جاتے ہیں۔ حسانؓ بن ثابت انصاری، مسطحؓ بن اثاثہ بن عباد بن عبدالمطلب اور حمنہؓ بنت جحش ام المؤمنین زینب بنت جحش کی بہن تھیں۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ صفوان بن معطل کو جب اس اتہام کا علم ہوا تو انہوں نے آکر حسان کے تلوار ماری جس کے زخم کا نشان آخر تک رہا۔ یہ بھی بعض روایات سے ثابت ہے کہ مذکورہ بالا تینوں حضرات پر حد قذف جاری کی گئی تھی۔

حضرت حسان آخر عمر میں نابینا ہوگئے تھے ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے اندر بلالیا اور بیٹھنے کے لئے گدی بچھادی۔ حسان گدی پر بیٹھ کر چلے گئے۔ ایک شخص بولا حسان نے تو آپ پر افترا بندی کی تھی اور اللہ نے آپ پر بہتان تراشنے والے کو عذاب عظیم کی وعید کی۔ پھر آپ نے اس کو اندر بلا کر بٹھایا۔ ام المؤمنین نے فرمایا نابینا ہونے سے بڑا کون سا عذاب ہے۔ مجھے اللہ سے امید ہے کہ وہ اس کے نابینا ہونے ہی کو اس کے حق میں عذاب عظیم کردے گا (یعنی اسی سزا پر اکتفا کرے گا۔ آخرت میں عذاب نہ دے گا) عامر شعبی کی روایت ہے مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا حسان کے شعر سے بہتر شعر میں نے نہیں سنا۔ اس شعر کی بنا پر میں حسان کے لئے جنت کی امید کرتی ہوں۔

سفیان بن حارث بن عبدالمطلب نے رسول اللہ ﷺ کی ہجو کی تھی۔ حسان نے اپنے شعر میں اس کو جواب دیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

هَجَوْتَ مُحَمَّدًا فَاَجَبْتُ عَنْهُ ۔۔۔ وَعِنْدَ اللّٰهِ فِيْ ذَاكَ الْجَزَاءُ

فَاِنَّ اَبِيْ وَوَالِدَتِيْ وَعِرْضِيْ ۔۔۔ لِعِرْضِ مُحَمَّدٍ مِنْكُمْ وِقَاءُ

یعنی اے سفیان تو نے محمد ﷺ کی ہجو کی اور میں نے ان کی طرف سے جواب دیا۔ میرے ماں باپ اور عزت و آبرو سب محمد ﷺ کی آبرو پر قربان۔

میرے نزدیک تحقیق یہ ہے کہ خبر گھڑنے والے اور پھیلانے والے اور تصدیق کرنے والے تو صرف منافق ہی تھے چند مسلمان جن میں حسان اور مسطح داخل ہیں صرف ناقل تھے۔ ان کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے تکذیب نہ کی اور بغیر سوچے سمجھے لوگوں کے سامنے نقل کردیا۔ ورنہ اس خبر کی تصدیق کرنے والے اور پھیلانے والے یہ حضرات نہ تھے۔ حضرت حسان نے ام المؤمنین حضرت عائشہ کی مدح میں خود ایک قصیدہ کہا ہے جس کا کچھ حصہ صحیح میں موجود ہے۔ ہم ذیل میں چند اشعار نقل کرتے ہیں جن میں حضرت حسان خود تہمت تراشی کے الزام سے اپنی براءت پیش کررہے ہیں ؎

حَصَانٌ رَزَانٌ مَا تُزَنُّ بِرِيْبَةٍ ۔۔۔ وَتُصْبِحُ غَرْثٰى مِنْ لُحُوْمِ الْغَوَافِلِ

یعنی وہ عفیفہ کہ جن کی نسبت برائی کا گمان بھی نہیں کیا جاتا اور وہ کسی کی غیبت بھی نہیں کرتیں۔ کسی کی غیبت کرنا اس کا گوشت کھانا ہے۔ وہ کسی کا گوشت نہیں کھاتیں۔

حَلِيْلَةُ خَيْرِ النَّاسِ دِيْنًا وَمَنْصِبًا ۔۔۔ نَبِيِّ الْهُدٰى وَالْمَكْرُمَاتِ الْفَوَاضِلِ

وہ ایسے شخص کی بی بی ہیں جو دین اور مرتبہ نبوت میں افضل الخلق ہیں اور دین ہادی ہیں۔

عَقِيْلَةُ حَيٍّ مِنْ لُؤَيِّ بْنِ غَالِبٍ ۔۔۔ كِرَامُ الْمَسَاعِيْ مَجْدُهَا غَيْرُ زَائِلِ

وہ خاندان لؤی بن غالب کی باعزت شریف عورت ہیں ان کی بزرگی ناقابل زوال ہے

مُهَذَّبَةٌ قَدْ طَيَّبَ اللّٰهُ خِيْمَهَا ۔۔۔ وَطَهَّرَهَا مِنْ كُلِّ شَيْنٍ وَبَاطِلِ

وہ سراپا پاک ہیں ہر عیب سے صاف، مہذب اور شستہ ہیں۔

فَاِنْ كَانَ مَا بُلِّغْتَ عَنِّيْ قُلْتُهُ ۔۔۔ فَلَا رَفَعَتْ سَوْطِيْ اِلَيَّ اَنَامِلِيْ

میرے متعلق جو خبر آپ کو پہنچائی گئی ہے اگر وہ میں نے کہی ہو تو خدا کرے میری انگلیاں اتنی طاقت نہ دیں کہ میں اپنا کوڑا اٹھا سکوں ([illegible])

حکم کی ہمہ تن تعمیل کرے۔ آپ سے، آپ کے اصحاب سے، آپ کی آل سے، آپ کے گھر والوں سے اور ازواج سے محبت کرے اور ان کی محبت کا یہ تقاضا ہے کہ ان کی عزت و حرمت میں کسی دشمن کی پرواہ نہ کرے۔ قوانین قرآنیہ کو اپنا دستور زندگی بنائے، قطرہ قطرہ بھی قیامت کو ماننے کی حقیقت یہ ہے کہ جنت و دوزخ، حساب کتاب، عذاب ثواب اور بدلہ الٰہی کو حق سمجھے، کافروں اور مشرکوں کی دوامی سزا جہنم جانے اور مومنوں کی جزا جنت کو خیال کرے۔ یہ یقین رکھے کہ اللہ عادل ہے کسی کی حق تلفی نہ کرے گا۔ دنیا کا ذرہ ذرہ عمل ہر شخص کے سامنے آئے گا۔ اسی کے مطابق جزا سزا ہوگی۔ یہ ہیں اصلی ایمان کے اجزائے عظیم اور ستون جن سے ایمان وابستہ ہے جو ستون اگر اکھاڑ دیا جائے تو پھر کوئی عمارت قائم نہیں رہ سکے گی۔ اگر چند مضبوط ستونوں کو کاٹ دیئے تو ایمان کا درخت جڑ سے گر پڑے گا۔ رہی شاخیں تو وہ اعمال ہیں جو بہت زائد ہیں۔ مثلاً حیا، عفت، حلم، بردباری، تقسیم اپنی، غنا، تقویٰ، مروت، امر بالمعروف سے تکبر، ضعیف و مسکینوں سے ہمدردی، اعلان حق کی جرأت، شجاعت، سخاوت، سیاسی تدبر، کمالات فاضلہ کے حصول کی کوشش، احکام قرآنیہ کو جاننا، گالی گلوچ، جھوٹ، غیبت، مکر، دھوکہ بازی، عیاری، چوری، خیانت، ظلم سے پرہیز، بزدلی، سفاکی اور حق تلفی سے اجتناب، عرفی، اخلاقی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی خوبیوں کو حاصل کرنا اور ہر قسم کی برائی کو چھوڑنا ایمان کی شاخیں ہیں۔ ایمان میں جس قدر کمزوری ہوگی اسی قدر جڑ کی کمزوری کے سبب ان شاخوں میں بھی جان نہ ہوگی۔ اور چونکہ رسول پاک کی عزت و حرمت کا ہر وقت لحاظ رکھنا اور آپ کی اذیت سے بچنا ستون ایمان ہے اس لئے بے ادبی سے پرہیز کرنا اصل ایمان کا مقتضا ہے اس لئے عظمت و احترام کو برقرار رکھنا اور ان امور سے اجتناب رکھنا جو حضور کی عزت و حرمت پر دھبہ آنا ہر مومن کے لئے بہت ہی ضروری ہے۔ اگر جذبہ محبت و احترام کا فقدان ہو تو ایمان کا درخت جڑ سے گر پڑے گا۔ اسی لئے آیت مذکورہ میں خدا تعالیٰ تمام اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ اگر تم مومن ہو اور ایمان دار ہونے کا دعویٰ ہے تو اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔ اللہ اپنے احکام تمہارے سامنے کھول کھول کر بیان فرماتا ہے یعنی اصول کے علاوہ تم کو جزئیات اور فروع کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ ادب، اخلاق حمیدہ اور تہذیب سکھاتا ہے جن باتوں سے خرابیاں پیدا ہونے والی ہیں نفاق، رنجش، اخلاق کی بربادی، امن اور انتظام کی تباہی پیدا ہونے والی ہے اُن سے وہی خوب واقف ہے۔ جو احکام اس نے تم کو دیئے اور جن باتوں سے منع کیا ہے اُن کے مصالح کو وہ جانتا ہے۔ اس لئے تمام اوامر و نواہی کی پابندی تم پر لازم ہے۔ لیکن بعض بیہودہ لوگ جن کی سرشت ہی خراب ہوتی ہے وہ فحش باتیں پھیلانے کی دھن میں ہر وقت لگے رہتے ہیں، ان کے دلوں میں یہی ولولہ ہوتا ہے کہ کسی طرح اہل ایمان میں گندی اور ناپاک باتیں پھیلائیں۔ وہ ہمیشہ اسی بات میں سرگرم رہتے ہیں کہ زید کی بیٹی نے ایسا کیا اور عمر کی بیوی نے ایسا کیا۔ ایسے لوگوں پر خدا کی طرف سے دکھ کی مار پڑے گی۔ دنیا میں بھی منہ کالا ہوگا مصیبت اٹھانی پڑے گی اور آخرت میں بھی عذاب الٰہی سے دوچار ہونا ضروری ہے۔ حد قذف ان پر جاری کی جاتی ہے، لوگوں کی نظروں میں ذلیل اور رسوا ہوتے ہیں، ان کی شہادت ناقابل قبول ہو جاتی ہے مسلمانوں کے جلسوں میں بیٹھنے کے قابل نہیں رہتے اور مرنے کے بعد جو برا حال ہوگا وہ تو ظاہر ہے۔ عائشہ رض پر تہمت لگانے کا جرم تو بہت سنگین تھا اگر اللہ تعالیٰ اپنا فضل نہ کرتا اور قصور معاف نہ کرتا تو تہمت تراشی کرنے والوں پر سخت قہر نازل ہوتا۔

تحلیلِ اجزاء

أَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِهٖ ۔ اس آیت میں روئے خطاب اگرچہ اُنہی مسلمانوں کی طرف ہے جو تہمت صدیقہ میں کسی طور پر حصہ لینے والے تھے اور انہی کو زجر کرنی مقصود ہے جن میں کچھ آمیزش واقعہ مذکورہ سے تھی، مگر مقصود خطاب عام ہے۔ ہر زمانہ کے مسلمانوں کا اس آیت کے حکم سے تعلق ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ رسول پاک ﷺ کی کسی بیوی یا گھر والی یا گھر والے پر اس قسم کا بہتان نہ کبھی باندھو، کبھی یہ بھی تصور نہ کرو کہ ازواج مطہرات یا اہل بیت نبوت سے ایسی شنیع حرکت سرزد ہو سکتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ عام تعبیر کی جائے تو آیت کا سیاق اس کی نفی نہیں کرتا۔ یعنی خدا تعالیٰ تمام مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ کسی پاک دامن، پاک طینت شخص کی آبرو ریزی کرنے کا خیال بھی نہ کرو، کسی پر بغیر شرعی ثبوت کے دھبہ نہ لگاؤ۔ اگر تم واقعی مومن ہو تو رسول پاک، بزرگان اسلام بلکہ ہر مومن کی عزت و حرمت محفوظ رکھنے کا خیال رکھو۔

ذیلی نتائج

افسوس ہے اُن خوارج و نواصب کے حال پر جنہوں نے شیطانی وہمیات میں پھنس کر تعلیمات منصوصہ کی پرواہ نہ کی۔ بے وقوف ہیں وہ لوگ جو ضعیف اور آحاد روایتوں کی تاریکی سے آل اطہار، صحابہ اخیار اور ازواج طیبات کی نورانی زندگیوں پر پردہ ڈالتے ہیں اور ہر مجلس میں ہر گوشہ تحقیق میں بیٹھ کر ان برگزیدہ پسندیدہ ہستیوں کی خوردہ گیری کرنے کی جستجو کرتے ہیں۔ فويل لهم و ويل للذين ... ما سموا لهم وانفسهم قد ضلوا واضلوا كثيرا۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ أَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ الخ۔ حضرت علی رض نے فرمایا جو شخص زنا کی تہمت خود لگائے اور جو شخص تراشیدہ تہمت کو لوگوں میں مشہور کرنا چاہے دونوں شخص گناہ میں برابر ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں میں زنا اور بہتان زنا کو پھیلانے کی خواستگاری کرنے والوں کے لئے سخت سزا مقرر ہے یعنی جو شخص کسی بے قصور کو بدنام کرنے کے لئے جھوٹی خبریں تراشے اور لوگوں میں مشہور کرے اور جو شخص اس جھوٹی جنگ آمیز خبر کے پھیلانے میں حصہ لے اور وہ شخص جو خود زنا یا فحش پرستی کو مسلمانوں میں رواج دے سب ایک ہی حکم میں ہیں۔

وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا

نہ کھا بیٹھیں کہ قرابتداروں کو اور محتاجوں کو اور خدا کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو کچھ نہ دیں گے اور مناسب ہے کہ معاف

وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○

کریں اور درگزر کریں کیا تم اس بات کے خواستگار نہیں ہو کہ اللہ تم کو بخش دے اللہ غفور رحیم ہے

تفسیر شیطنت کے معنی ہیں راہ اعتدال سے بڑھ جانا، مادی قوتوں کا غالب آجانا، نفس کی خواہشات و شہوانیات کا مطیع ہوجانا، ذاتی انتقام کے جذبہ کو بروئے عمل لانا، اہل حق کی امداد و ضروری سے کنارہ کش ہوجانا۔ علاوہ ابلیس کے دو اندرونی شیطان بھی ہر شخص کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں بلکہ ہر شخص کی ذات میں ان کا تسلط غیر محسوس اثر ہر وقت پھیلا رہتا ہے۔ ایک ناجائز تفوق اور غیر ضروری مطاعم و ملابس اور غیر حلال صنفی تعلقات پر برانگیختہ کرتا رہتا ہے، دولت و مال کی حرص، شہرت، عزت اور نام و نمود کی خواہش، فریب کاری اور دروغ بافی اور بہتان تراشی اسی شیطان کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ دوسرا شیطان حق داروں کے حقوق پامال کراتا، بے محل غیر مقام غضب پیدا کرتا، حمیت کی جگہ بزدلی ظاہر کراتا، غارت گری، سفاکی، خون ریزی، پست حوصلگی یا ضرورت سے زائد بیجا بلند ہمتی کا جذبہ بروئے عمل لاتا ہے۔ ان دونوں شیطانوں کا مقابلہ کرنے کے لئے علاوہ ملائکہ خیر کے خدا تعالیٰ نے ہر انسان کو ایک خاص قوت عطا فرمائی ہے جو ہر کام کی اچھائی برائی سوچتی، خیر و شر میں تفرقہ کرتی اور حق و باطل کا فیصلہ کرتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ مذکورہ بالا دونوں شیطان اپنی شیطنت چھوڑ کر اعتدال کی توسطی راہ پر آجائیں، لیکن یہ ایک قوت ہے اور وہ دو ہیں۔ دو کا ایک پر غالب آنا بالکل واضح حقیقت ہے، اس لئے تخلیقی اعتبار سے کوئی شخص ذاتی طور پر اپنے احوال، اقوال اور اعمال درست کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ ہاں جب توفیق الٰہی اور مدد ربانی شامل حال ہوتی ہے تو دونوں شیطانوں کے منہ میں ایک قوت خیر لگام لگا دیتی ہے اور دونوں کو اپنا مطیع بنا لیتی ہے۔ ایسے آدمی کو نیک اور صالح الاعمال کہا جاتا ہے۔ اسی مضمون کو آیات مذکورہ میں بیان فرمایا ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ تم شیطان کے نقش قدم پر مت چلو ورنہ گمراہ ہو جاؤ گے۔ شیطان تم کو برائی اور بے حیائی کی تعلیم دیتا ہے اور افراط و تفریط کی طرف مائل کرتا ہے (اور تم میں ذاتی طور پر اس کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے) یہ صرف اللہ کی رحمت و مہربانی ہے کہ وہ برائیوں سے تم کو بچاتا اور گناہوں کی کثافت سے تم کو پاک رکھتا یا پاک کرتا ہے۔ اگر اس کی شفقت و رحمت نہ ہوتی تو کوئی شخص پاکیزہ مقال اور پاکیزہ اعمال نہ ہو سکتا۔ اللہ جس کو چاہتا سدھارتا اور سنوارتا ہے۔ پس لازم ہے ان لوگوں پر جن کو خدا نے دولت، مال میں برتری اور رزق میں وسعت دی ہو کہ وہ ذاتی جذبۂ انتقام کو کام میں نہ لائیں بلکہ دینی جذبہ کو ملحوظ رکھیں۔ جو لوگ قرابتدار مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ ہیں ان کی امداد سے دست کش نہ ہوں۔ اگر ذاتی طور پر ان کو دکھ پہنچا ہو تب بھی درگزر کریں کیونکہ اللہ ان کے ہر وقت کے قصور سے درگزر فرماتا رہتا ہے۔ کیا ان سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ دین الٰہی کی خاطر وہ اپنے مجرموں کی غلطیوں کو معاف کر دیں۔

تحلیل اجزاء خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ۔ علی بن ابی طلحہ کی روایت سے ثابت ہے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا خطوات شیطان سے مراد ہیں اعمال شیطان۔ عکرمہ نے کہا شیطانی وسوسے مراد ہیں۔ قتادہ نے کہا ہر گناہ شیطانی خطوہ ہے۔ ابو مجلز کا بھی یہی قول ہے۔ آیت مذکورہ میں مسلمانوں کو ہر قولی فعلی اور طریق زندگانی میں شیطان کی پیروی کرنے سے منع فرمایا، لیکن شیطانی حرکات کی کیا علامت ہے؟ معیار امتیازی کیا ہے اور شیطان کی پیروی کرنے سے کیا خرابیاں پیدا ہوں گی؟ اس لئے ارشاد فرمایا شیطان تم کو بے حیائی اور برائی کی تعلیم دیتا ہے۔ جو ہر فحش آفریں اور تباہی خیز ہے وہ شیطانی اغواء ہے۔ ہر معصیت کی طرف بڑھنا شیطانی پیروی ہے، اس لئے ہلاکت آفریں، حیا شکن، غیرت سوز، تباہی خیز اور معصیت امور سے اجتناب ضروری ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ۔ یعنی شیطان کا تسلط بہت ہی قوی ہے، اس کا جال ہمہ گیر ہے۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ آدمی گناہوں سے توبہ کرتا اور ندامت سے معصیت کا دھبہ دھو ڈالتا ہے اور اخلاق و دین کے میل کچیل سے روح کو پاک کر لیتا ہے۔ اگر اللہ کی رحمت نہ ہوتی تو تخلیقی طاقت کی امداد سے شیطان کا مقابلہ کرنا اس پر غالب آنا اور ممنوعات و مہلکات سے بچنا ناممکن تھا۔

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ ۔ علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ مسطح بن اثاثہ حضرت ابوبکرؓ کے بھانجے یا خالہ زاد بھائی تھے ۔ انھوں نے جنگ بدر میں بھی شرکت کی تھی ، مسلمانوں کے ساتھ ہجرت بھی کی تھی ، مخلص مسلمان تھے ، لیکن اپنی کم فہمی کے سبب منافقوں کے پروپیگنڈے کا شکار ہوئے ۔ چونکہ مفلس تھے ، اس لئے ان کی تمام ضروریات کے کفیل حضرت ابوبکرؓ ہی تھے ۔ جب صدیق اکبرؓ کے نزدیک ثابت ہوگیا کہ مسطح نے واقعۂ افک میں حصہ لیا ہے تو آپ نے قسم کھالی کہ آئندہ مسطح کو کچھ نہ دوں گا ۔ آپ نے مسطح سے صاف کہدیا کہ تم جہاں چاہو چلے جاؤ نہ میں تم سے نہ تم مجھ سے ۔ مسطح نے کہا میں آپ کو اللہ اور اسلام اور قرابت کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھے نہ نکالئے ، میرا اول سے کچھ قصور نہیں ہے ۔ صدیق اکبرؓ نے فرمایا کیا تو نے غضب الٰہی نہیں کمایا ، کیا تو نے بہتان نہیں باندھا ؟ مسطح نے کہا میں بہتان باندھنے والا نہیں ہوں ۔ صرف حسان کا قول سُن کر کچھ میری زبان سے بھی نکل گیا ہے ۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تمہارا عذر خدا نے قبول نہیں فرمایا ، اس لئے تم نکل جاؤ ۔ مسطح مایوس ہو کر نکلے لیکن متحیر تھے کہ کہاں جاؤں ، کوئی مومن ٹھہرانے پر تیار نہ تھا بلکہ مہاجرین نے تو قسم کھالی کہ جس نے اس بہتان سے کچھ بھی لگاؤ رکھا ہے ہم اس سے تعلق اور رشتہ داری قائم نہ رکھیں گے ، اس لئے بے چارے مسطح بہت پریشان اور مایوس تھے ۔ اس پر مذکورہ بالا پوری آیت غَفُورٌ رَّحِيمٌ تک نازل ہوئی اور بطور عموم مسلمانوں کو مسکین مہاجر قرابتداروں سے سلوک منقطع نہ کرنے کی ہدایت کی گئی اور عفو و درگذر کا حکم دیا گیا ۔

أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ ۔ مسطح حضرت ابوبکرؓ کے قرابتدار اور مسکین مہاجر بھی تھے ، اس لئے ان تینوں اوصاف کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ فرمایا تاکہ ابوبکرؓ کا دل پسیج جائے اور وہ مسطح کو بدستور سابق مصارف دینے شروع کر دیں گے ۔ گو حکم عمومی تھا ، مگر مورد نزول چونکہ حضرت ابوبکرؓ کا واقعہ تھا ، اس لئے اس کا لحاظ ضروری تھا ، اس لئے قرابتداری ، مسکینی اور ہجرت کی قید لگائی ورنہ حسن سلوک کرنے اور ذاتی جذبات کو اہل اسلام کی پرورش میں دخیل نہ بنانے کے لئے ہجرت و قرابت ضروری نہیں ۔ اگر کسی اجنبی کو کوئی شخص کچھ بطور امداد دیتا ہو اور اس اجنبی سے دینے والے کو کچھ دکھ پہنچ جائے تو امداد بند کر لینی کسی طرح مناسب نہیں ۔ ذاتی معاملات میں جوش غضب سے مجبور ہو کر کار خیر کو بند کر دینا اسلامی شیوہ نہیں ۔

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۔ اس فقرے میں مزید تاکیدی حکم ہے ۔ ہو سکتا تھا کہ حکم سابق کے مطابق لوگ عمل کرتے اور اپنے مجرموں کا نان نفقہ بند نہ کرتے اور اس کے باوجود دل میں کشیدگی اور کبیدگی باقی رہتی ۔ نادان کرنے والے مجرم کو دکھ پہنچانے کا خیال بدستور قائم رہتا ۔ صرف آیت کے حکم سے مجبور ہو کر بادل ناخواستہ بندش رزق نہ کرتے ، اسلئے فرمایا کہ فقط ذریعہ معاش ہی مقصود نہیں ہے اور نہ ضرورت مند اہل قرابت کی پرورش کرانا اور اور دل سے سلوک کرانا ہی اصل غرض ہے بلکہ جذبۂ خصومت کو مٹانا مقصود ہے ۔ تعلیم اسلامی یہ ہے کہ مجرم کے قصور کو معاف کر دیا جائے اور اس کی ناشائستہ حرکت سے درگذر کی جائے تاکہ رابطۂ قرابت ، عاطفۂ دینی اور داعیۂ محبت باقی رہے ۔ اس کے بعد مزید تاکید کرنے کے لئے فرماتا ہے :-

أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۔ یعنی تم میں سے کون شخص ہے جو قصور وار نہیں ، خطا کار نہیں ، مجرم نہیں پھر کیا تم اس بات کو پسند کرو گے کہ اللہ تمہاری گرفت کرے اور قصور معاف نہ کرے ۔ تم یہ بات ہرگز پسند نہ کرو گے ، اور جب تم خود اپنے قصور کی گرفت پسند نہیں تو لازمی طور پر آپس میں بھی ایک دوسرے کے قصور سے درگذر کرنی چاہیئے ۔
علمائے روایت نے لکھا ہے کہ آیت مذکورہ کے نزول کے بعد حضور اقدسؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو بلا کر حکم الٰہی سنایا ۔ جب آیت أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ پر پہنچے تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا اے ہمارے پروردگار ! ہم تو تجھ سے مغفرت کے امیدوار ہیں ۔ اس کے بعد بارگاہ نبوت سے اٹھ کر مسطح اور ان کے ساتھیوں کو طلب فرمایا اور کہا اللہ نے جو حکم نازل فرمایا ہے مجھے بسر و چشم منظور ہے ۔ میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا تھا اُس وقت کیا تھا جب خدا تم سے ناخوش تھا اور جب اُس نے تم کو بخش دیا تو اب آؤ ۔ یہ کہہ کر سابق سے دوگنی تنخواہ جاری فرمادی ۔ سبحان اللہ ! عجیب جذبات تھے اور عجیب احساسات تھے اور عجیب دینی اقتدار تھا ۔ روح کے گوشہ گوشہ میں دین کا تسلط قائم ہو چکا تھا کسی طرح نفس اور جذبات نفس کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی تھی ۔ کچھ دیر پہلے جو شخص آبرو ریزی کا مجرم اور دشمن تھا آن کی آن میں اس کو دوست بنا لیا جاتا ہے اور تمام گزشتہ قصوروں پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے ۔ اسی کا نام ہے ۔ اَلْحُبُّ لِلّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ ۔

مقصود بیان
شیطان کی پیروی کرنے کی ممانعت اور شیطانی پیروی کے نقائص کا بیان ۔ اس امر کی صراحت کہ کوئی شخص بطور خود شیطانی حملے سے بچ کر پاک دامن نہیں رہ سکتا جب تک تائید الٰہی شامل حال نہ ہو ۔ گناہوں سے محفوظ رہنا یا نادم ہو کر توبہ کرنی ناممکن ہے ۔ جذبات دینیہ ، رقت جنسیہ اور رابطۂ انسانیہ کی نگہداشت رکھنے کی دعوت ، باہم کدورت اور کبیدگی دور کرنے اور حلم و عفو سے کام لینے کی ہدایت ۔ حضرت ابوبکرؓ کی مدح اور عام دولتمندوں کو فقراء کی امداد کرنے کی ترغیب خواہ مخالف ہوں یا موافق ۔ آخر میں صراحت کہ آپس کے تعلقات کو قائم رکھنا اور مجرموں کے جرم سے درگذر کرنی مغفرت الٰہیہ کے حصول کا باعث ہے وغیرہ ۔

(۷)

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ

جو لوگ پاکدامن بے خبر مسلمان عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں وہ دنیا و آخرت میں ملعون ہیں اور اُن کے لئے اُس روز بڑا عذاب ہوگا

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ يَوْمَئِذٍ يُوَفِّيهِمُ اللَّهُ دِينَهُمُ

جبکہ اُن کے برخلاف ان کی زبانیں اور اُن کے ہاتھ پاؤں اُن کے اعمال کی شہادت دیں گے اُس دن اللہ اُن کی واجبی سزا پوری پوری دے گا۔

الْحَقَّ وَيَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ ۝ الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ

اور وہ جان لیں گے کہ اللہ ہی سچا (اور حقیقت کو) کھولنے والا ہے ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے

(ع)

وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ أُولَٰئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ

اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے ہیں اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے یہ اس سے بری ہیں جو لوگ ان کے متعلق کہتے ہیں ان کے لئے مغفرت اور عزت کی روزی ہے

تفسیر شریروں اور خبیثوں کے درجات مختلف ہیں کوئی کمزور ہوتا ہے کوئی قوی، کوئی بہت قوی۔ شریر جس قدر عیار، مکار اور دھوکہ باز ہوتا ہے اسی قدر پروپیگنڈہ سے بھی واقف ہوتا ہے۔ بعض شرارت پسند پاکدامن بھولی بھالی عورتوں اور سیدھے سادے نیک مردوں پر بدچلنی کی تہمت تو لگا دیتے ہیں، لیکن چونکہ ملک میں ان کی رسائی اور رسوخ نہیں ہوتا، اس لئے شہادت پیش کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ان کے زیر اثر شیطانوں کا حلقہ نہیں ہوتا کہ وہ جھوٹے جھوٹے گواہ پیش کر سکیں، اس لئے وہ قذف کی سزا پاتے ہیں، لیکن پرلے درجہ کے خبیث ایسے بھی ہوتے ہیں جو لوگوں کو دھوکہ دے کر اپنا حلقہ بنا لیتے ہیں اور شیطانوں کا یہ گروہ قوم، ملک اور مذہب کے لئے بڑا خطرناک ہو جاتا ہے۔ جھوٹے مدعا کے لئے بھی اُن کو جھوٹے گواہ میسر آ جاتے ہیں اور چونکہ اسلام کے ظاہری احکام کی بنا ظاہری ثبوت پر ہے۔ دلوں کا علم تو خدا کو ہے، اس لئے یہ ماخوقی گروہ اپنے اکثر مقاصد میں جتھے کی قوت سے غالب آ جاتا ہے۔ ذہنی چالاکیوں سے یا قانون کے انطباق میں دھوکہ دے کر حکام کو اپنا ہم خیال بنا کر اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ لے لیتا ہے یا بیرونی اثر و رسوخ کو کام میں لا کر ظاہری قانون کی گرفت ان پر نہیں ہو سکتی اور خواہ مخواہ بے قصور خلق خدا کی عزت و آبرو سے یہ لوگ کھیلتے ہیں اور حق تلفیاں کرتے ہیں۔ ایسے گروہ کو اس کی مذموم حرکات سے باز رکھنے کے لئے کوئی ظاہری ضابطہ اور تعزیر مفید نہیں ہو سکتی اگر ان کی حرکات کی روک تھام ہو سکتی ہے تو صرف اس طور سے کہ ان کو تنبیہ کی جائے کہ اگر چہ تم دنیا میں عدالتی سزا سے بچ جاتے ہو اور جھوٹے گواہ پیش کر کے کسی بے قصور کو داغدار کر دینا تو سہل ہے، مگر یاد رکھو کہ آخرت کا عذاب اس ہمہ گیر فریب دہی سے ٹل نہیں سکتا پھر غیرت مند کو اگر عدالت کے سامنے مجرم قرار دے بھی دیا تب بھی وہ پبلک کی نظروں میں وقار رہتا رہے گا اور مسلمانوں کی برادری سے خارج ہونا پڑے گا، ہر شخص کی نگاہ میں ذلیل و خوار ہوگا، ہر طرف سے پھٹکار برسے گی، سوسائٹی بائیکاٹ کر دے گی اور زندگی وبال ہو جائے گی۔ اس تدبیر کے بغیر اس ماخوقی گروہ کو شیطانی حرکات سے باز رکھنے کی اور کوئی ترکیب ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی مضمون کو آیات مذکورہ میں بیان فرمایا ہے اور آخر میں حضرت عائشہؓ نیز تمام ازواج مطہرات کی پاکدامنی ظاہر کرنے کے لئے ایک عام عرفی قاعدہ بتا دیا ہے جس کو ہر زمانہ میں ہر شخص جانتا ہے کہ نیکوں کی رغبت نیکوں سے اور بدوں کا میلان بدوں کی طرف ہوتا ہے، نیک کے ساتھ بد کی موافقت نہیں ہو سکتی۔ رسول پاک ﷺ طاہر مطہر طیب مطیب ہیں۔ آپ کی بیبیاں اور باندیاں اور گھر والے بھی لازمی طور پر پاک دامن، پاک طینت، پاک عمل اور پاک باطن ہیں۔ ورنہ رسول اللہ ﷺ کو ان کی طرف میلان اور آپ کی طبیعت کو ان سے وابستگی نہیں ہو سکتی الخ۔

تحلیل اجزاء إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ ۔ الذین یرمون کا لفظ اگرچہ صرف مردوں کو شامل ہے، مگر قرآن پاک میں اکثر احکام مردوں کو مخاطب کر کے نازل فرمائے ہیں۔ یا مردوں کے حق میں ان کا نزول ہوا ہے، لیکن عورتیں بالتبع اور حتمی طور پر ان احکام کی مکلف ہیں، اسی لئے علماء نے بالاجماع صراحت کر دی ہے کہ اگر کوئی عورت پاک دامن مرد پر زنا کی تہمت لگائے تو وہ بھی اس سزا کی مستحق ہے۔ ہاں اگر توبہ کر لیں تو بحکم آیت سابقہ اُخروی سزا معاف ہو سکتی ہے، مگر اس آیت

پر توبہ کے بعد عذاب آخرت کے معاف ہوجانے کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ اس لئے بہتان تراشی کرنے والوں سے مراد یا تو ابن اُبی اور اس کا منافق گروہ ہے اور لفظ عام سے خاص افراد مراد ہیں یا تمام وہ لوگ مراد ہیں جو کفر کی حالت میں مریں یا وہ لوگ مراد ہیں جو بہتان تراشی کے بعد توبہ نہ کریں اور اسی حالت میں ان کا انتقال ہوجائے یا صرف حضرت عائشہ اور دیگر امہات المومنین پر قذف کرنے والے مراد ہیں۔ عام قاذف کا اُخروی قصور توبہ سے معاف ہوسکتا ہے۔ امہات المومنین پر تہمت لگانے والے کا قصور کسی طرح نہیں معاف ہوسکتا۔ میرے نزدیک تخصیص کی کوئی وجہ نہیں، اگرچہ صدیقہ کے قصہ کا تتمہ ہے، مگر حکم عمومی حکم ہے۔ ازواج مطہرات کا قاذف ہو یا اور کسی بھولی بھالی پاک دامن عورت پر الزام لگانے والا ہر ایک کی یہی سزا ہے۔ اس میں نہ کافر کی تخصیص ہے نہ مسلم کا استثناء۔ البتہ اتنا ضرور کہنا ہوگا کہ جب گزشتہ آیت میں صراحت فرما دی ہے کہ توبہ کے بعد عذاب آخرت معاف ہوجائے گا تو اس جگہ مزید تقلید کی ضرورت نہیں تھی۔ بقرینہ عقلیہ جو استثناء وہاں تھا وہی یہاں ہے اور ایسا قرآن پاک میں اکثر آیا ہے۔ جا بجا کافروں اور معصیت شعاروں کو وعید کی گئی ہے، مگر کہیں کہیں توبہ کرنے والے نیکوکاروں کو مستثنیٰ بھی کرلیا ہے مگر یہ واقعۃً استثناء ہر جگہ ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ جس جگہ استثناء لفظاً نہیں وہاں عقلاً ضرور ہے۔

اَلْغٰفِلٰتِ یعنی بھولی بھالی عورتیں جنہوں نے فعل بد کا کرنا تو درکنار اس کا خیال بھی نہ کیا، اُن کو اس کی خبر بھی نہیں۔ یہ پاک دامنی کا کمال اور نزاہت و طہارت کی انتہا ہے۔ بات یہ ہے کہ پاک دامنی کے درجات مختلف ہوتے ہیں مثلاً کبھی ایسا موقع ہی میسر نہ آسکے یا دینداری کا جذبہ غالب ہو یا خاندانی، قومی اور شخصی عزت و حرمت کا پاس ہو یا سوسائٹی کی شرم ہو یا سزا کا ڈر ہو، لیکن ان سب سے بڑھ کر بھولا پن ہے کبھی نیک نفسی سعادت فطری اور طبعی طہارت آدمی کو پاک دامن رکھتی ہے اس کے دل میں بدکاری کا خیال بھی نہیں گزرتا، وہ واقف ہی نہیں ہوتا کہ بدکاری کیسی ہوتی ہے۔ یہ طہارت نفس کا آخری درجہ ہے۔

اس آیت میں دو قیدیں ہیں:۔ (۱) الغافلات (۲) المومنات محصنات کے ساتھ پہلی قید اتفاقی ہے یا واقعی ہے جو کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے لگائی گئی ہے ورنہ جو شخص کسی پاکدامن عورت پر تہمت لگائے گا وہ مذکورہ سزا کا مستحق ہوگا خواہ اس کی پاک دامنی کسی بنا پر ہو، وہ بدکاری سے بے خبر ہو یا باخبر اس کے اندر طبعی طہارت ہو یا نہ ہو، فطرۃً وہ نیک نفس ہو یا جذبۂ دینی سے مغلوب ہو کر یا سوسائٹی کی لاج سے مجبور ہو کر یا سزا کے خوف سے ترساں ہو کر وہ پاک دامن رہی ہے بہرحال اس کو پاک دامن کہا جائے گا اور اس پر تہمت لگانے والا دارین میں خوار ہوگا۔

یہی دوسری قید بھی اتفاقی ہے۔ مشرک پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے والوں کی بھی یہی سزا ہے کیونکہ یہ آپس کے تعامل اور حقوق العباد کا بیان ہے۔ اس میں کافر اور مشرک کا کوئی امتیاز نہیں۔ دنیوی عزت کا کافر کو بھی ویسا ہی پاس و لحاظ ہوتا ہے جیسے مومن کو غیر مسلم کی عزت کا تحفظ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا مسلم کا، لیکن بعض علماء کا قول ہے کہ غیر مسلم پر تہمت لگانے والے کی یہ سزا نہیں، اس لئے مومنات کی قید احترازی ہے جو غیر مسلم کا اس قید سے اخراج ہوجاتا ہے۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ چونکہ ابن عباس اور بعض دیگر مفسرین و محدثین کے اقوال سے ثابت ہے کہ ان تمام آیات کا نزول حضرت عائشہؓ کی طہارت و پاک دامنی واضح کرنے کے لئے ہوا تھا۔ اگرچہ حکم عام ہے اور تمام پاک دامنوں کو شامل ہے، اس لئے ام المومنین میں جو صفات طہارت موجود تھیں خدا تعالیٰ نے ان کو بیان فرما دیا اور کمال طہارت ثابت کرنے کے لئے اوصاف مذکورہ کا ذکر کیا۔ حضرت عائشہؓ عفیفہ تو بہرحال تھیں پھر جذبۂ عفت کسی دوسرے سبب کے زیر اثر نہ تھا بلکہ فطری نیک نفسی اور طبعی نظافت اس کا باعث تھی۔ اس کے علاوہ آپ کامل الایمان تھیں، رسول پاکؐ اور خدا پر آپ کو کامل یقین تھا۔ ان اوصاف و محامد کی موجودگی میں فعلِ بد کا ارتکاب ممکن نہ تھا۔

یَوْمَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ الخ۔ شہادت سے مراد عام شہادت ہے قالی ہو یا حالی۔ قالی شہادت زبان سے ہوگی اور حالی شہادت ہاتھوں اور پاؤں سے یا شہادت سے مراد صرف قالی شہادت ہے اور آیت کو ظاہری معنی پر محمول کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام اعضاء کو گویا کردے گا اور وہ زبان کی طرح نطق کریں گے اور کوئی حالت چھپا نہ رکھیں گے۔ یہی مضمون بعض احادیث سے ثابت ہے مسلم، نسائی اور ابن ماجہ اور بعض دوسری کتابوں میں حضرت انس بن مالک وغیرہ کی روایات اسی مضمون کی وارد ہیں۔

اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ الخ۔ اس آیت کا مطلب تین طرح سے بیان کیا جاسکتا ہے اور ہر مطلب بجائے خود صحیح ہے:۔ (۱) خبیثات اور طیبات سے مراد ہیں بُری اور اچھی باتیں۔ مطلب یہ ہے کہ بُری باتیں بُرے آدمیوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور اچھی باتیں اچھے آدمیوں کے ساتھ۔ اسی طرح بُرے مرد بُری باتوں سے خصوصیت رکھتے ہیں اور اچھے مرد اچھی باتوں سے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی چونکہ وہ بُرے تھے، اس لئے ان سے بُری باتیں سرزد ہوئیں۔ ان کو بُری باتوں سے خاص لگاؤ تھا اور عائشہؓ چونکہ اچھی اور پاکیزہ طبیعت والی ہیں، اس لئے ان کو بُری باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ گندہ ناپاک باتوں سے ان کو لگاؤ نہیں ہے۔ ابن

عباسؓ، مجاہد، عطاء، سعید بن جبیر، شعبی، ضحاک، حسن بن ابو الحسن اور حبیب بن ثابت سے یہی مطلب مروی ہے کہ شیخ ابن جریر نے بھی اسی کو پسند کیا ہے جس میں لطیف ہیں اور تقریر وغیرہ ہے

(۲) خبیثات و طیبات سے بدکار اور نیکوکار مراد ہیں اور آیات میں عرف و عادات کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عام قاعدہ ہے کہ نیک مردوں کو نیک عورتوں سے اور بدکار مردوں کو بدکار عورتوں سے لگاؤ ہوتا ہے اسی طرح نیک عورتوں کو نیک مردوں سے اور بد عورتوں کو بد مردوں سے انس ہوتا ہے اور چونکہ رسول پاک ﷺ طیب، طاہر اور مجسم طہارت ہیں اس لئے آپ کو کسی ایسی عورت سے لگاؤ نہیں ہو سکتا جو ناپاک اور بدکردار ہو۔ حاصل کلام یہ ہے کہ عائشہؓ پاک دامن اور نیکوکار ہیں طبعاً اور فطرتاً پاک دامن ہیں

(۳) خبیثات و طیبات سے بُری اور اچھی عورتیں مراد ہیں اگر عرف و عادت کی حکایت نہیں ہے بلکہ ایک شرعی حکم ہے کہ زناکار سے نکاح زناکار کا ہوتا ہے اور پاک دامن سے پاک دامن کا یعنی بدکار سے نیکوکار کا نکاح نہیں ہوتا، کوئی نیکوکار کسی بدکار سے اس کی بدچلنی برقرار رہتے ہوئے نکاح نہیں کر سکتا جب تک بدچلن اپنی بدچلنی سے توبہ نہ کرے اس وقت تک اس کا نکاح کسی نیک چلن سے نہیں ہو سکتا۔ حاصل یہ کہ اگر عائشہ بدچلن ہوتیں تو رسول پاک ﷺ ان سے نکاح نہیں کرتے۔ یہ مطلب اگرچہ مقدم الذکر دونوں مطلبوں سے کمزور ہے اگر صحیح ہے۔ اس سے دیوثی اور بے غیرتی کا کلی انسداد ہو جاتا ہے کسی مومن صالح کے لئے حلال نہیں کہ بدکردار بدچلن عورت سے یہ جانتے ہوئے نکاح کرے کہ وہ بدچلنی نہیں چھوڑے گی۔ نہ یہ جائز ہے کہ کوئی صالح مرد اپنی عورت کی بدچلنی دیکھتے ہوئے اس کو اپنے ساتھ رکھے اور ناگواری رضامندی یا چشم پوشی کرے۔

ہاں اگر بدکار عورت یا بدکار مرد توبہ کرے تو چونکہ اب وہ بدچلن نہیں رہا اس لئے پاک دامن کے ساتھ اس کا نکاح صحیح ہے۔

مقصود بیان

حضرت عائشہؓ اور دیگر امہات المومنین کی پاک دامنی کا اظہار۔ عفیفہ بھولی بھالی عورتوں پر تہمت لگانے والوں کے لئے سخت وعید۔ عورت کے بھولے پن اور عفت کی ضمنی مدح۔ قیامت کے دن اعضائے جسمانی کی شہادت دینے کی صراحت۔ ایک عام قاعدے کا اظہار اور طبعی میلان کی صراحت کہ نیک کی رغبت خاطر نیک کی طرف اور بد کا انس بد سے ہوتا ہے۔ اچھے لوگوں کا اچھی باتوں سے اور بُرے لوگوں کا بُری باتوں سے لگاؤ ہوتا ہے وغیرہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ

مسلمانو! سوائے اپنے گھروں کے دوسروں کے گھروں میں نہ داخل ہونا تاوقتیکہ اجازت نہ لے لو اور اُن گھر والوں کو سلام علیک نہ کر لو یہ تمہارے لئے بہتر ہے

لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ

عجب نہیں کہ تم یاد رکھو پھر اگر تم اُن میں کسی کو نہ پاؤ تو جب تک تم کو اجازت نہ دی جائے اُن کے اندر نہ جاؤ اور اگر تم سے کہہ دیا جائے

ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا

کہ واپس چلے جاؤ تو واپس چلے آؤ یہی تمہارے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اُسکو بخوبی جانتا ہے ہاں اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ جن مکانوں میں کوئی

بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۝

نہ رہتا ہو اور اُن کے اندر تمہارا کچھ سامان ہو تو اندر چلے جاؤ اللہ تمہارے ظاہر و باطن کو جانتا ہے

تفسیر

کسی خرابی اور برائی کے انسداد کی تکمیل اُسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کے تمام اسباب، ذرائع، وسائل اور موجبات کی بیخ کنی کر دی جائے۔ مثلاً شراب خواری سے بازداشت کامل طور پر اسی وقت ممکن ہے جب شراب کشی کی ملک میں ممانعت کر دی جائے اور شراب خواروں کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے روک دیا جائے۔ اور شراب پینے کی سخت سزا مقرر کر دی جائے وغیرہ۔ زنا بھی ایک اخلاقی، معاشرتی اور اجتماعی تباہی ہے اس کی ممانعت بھی لازم تھی چنانچہ بازداشت کی تکمیل کے لئے پہلے اس کی سزا کو مفصل بیان فرما دیا۔ اُخروی اور دنیوی ذلتوں کی تفصیل کر دی۔ اب یہاں سے زنا میں مبتلا کرنے والے اسباب اور موجبات کی روک تھام کرنی مقصود ہے۔ زنا کے اصلی اسباب تو شہوانی قوتوں کا جوش، اخلاق و فضائل کا تناسب اور مزاجوں کا انس ہے مگر ان اسباب کا ظہور اس وقت ہو سکتا ہے جب نظر بازی اور بامرہ نوازی کے

مواقع ہاتھ آئیں، باہم ملاقات کی کوئی صورت نمودار ہو، کشش کے لیے سلسلے کا ہونا لازم ہے۔ اگر مواصلات اور ذرائع تعلق منقطع ہوں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ زنا کا کوئی واقعہ پیدا ہو سکے۔ عموماً زنا کے کیس وہیں ہوتے ہیں جہاں عورت و مرد میں کسی قسم کا اتصال ہو۔ دور کا رشتہ ہو، پڑوس ہو، ایک دوسرے کے مکان میں بغیر اجازت کے آمد و رفت ہو اور کسی قسم کا تکلف نہ ہو، خلوت و جلوت میں کوئی خاص احتیاط نہ ہو، کسی عورت کے شوہر سے کسی شخص کی دوستی ہو اور وہ بے تکلف گھر میں چلا آئے۔ یہ اور اسی قسم کے دیگر اسباب ہی زنا کا مادہ فراہم کرتے ہیں اور خفیہ دبی ہوئی آگ کو بھڑکاتے ہیں۔ مرد و عورت کا صنفی تعلق اور ایک دوسرے کی طرف کشش فطری ہے۔ جب مواقع نہ ملیں اور مواقع میسر آجائیں تو شہوانی قوتوں کی کارفرمائی ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ اسلام چونکہ حکیمانہ اور مصلحانہ مذہب ہے، چند بے تکی غیر مربوط عبادت ہی کا نام اسلام نہیں ہے، اس لئے اخلاقی معاشرتی اور اجتماعی اصلاحات کے مکمل اور جامع قوانین کی تعلیم اس نے دی ہے۔ ایک دوسرے کے مکان میں بغیر اجازت کے اندر آجانا ویسے بھی وحشیانہ فعل اور جاہلانہ عمل ہے، شائستہ تہذیب کا انسان اس کو اچھا نہیں کہہ سکتا۔ باپ ہو یا بیٹا بھائی ہو یا چچا عورت کے لئے پردہ ہر ایک سے ضروری ہے، مگر پردہ کے درجات مختلف ہیں۔ کسی سے چہرہ کا بھی پردہ ہوتا ہے کسی سے چہرہ کا پردہ ضروری نہیں ہوتا، لیکن اس کے سامنے بازو نہیں کھولے جا سکتے، کہیں بازو کھولے جاتے ہیں، مگر پشت و شکم کو چھپانا ضروری ہوتا ہے وعلیٰ ہذا باقی اعضائے جسم کو چھپانا یا نہ چھپانا تفاوت رشتہ کے اعتبار سے ہوتا ہے پھر ہر عورت اپنے مکان میں حوائج کو پورا کرنے پر مجبور ہوتی ہے اور ننگی کھلی رہتی ہے۔ غسل وغیرہ کی احتیاج بھی سمجھ کو پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر باپ بیٹا یا بھائی چچا وغیرہ بغیر اجازت گھسے چلے جائیں تو ناگواری کا باعث اور بدتہذیبی کا مظاہرہ ہوتا ہے اور اگر رشتہ قوی نہیں ہے یا بالکل اجنبیت ہے تو اس وقت بغیر اجازت کے داخل ہونا تو بڑے بڑے قبائح کا حامل ہوتا ہے، اس لئے آیات مذکورہ میں خدا تعالیٰ نے چند مفید قوانین کی ہدایت فرما دی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مکان تین ہی طرح کا ہو سکتا ہے۔ اول وہ مکان جس میں آدمی خود اپنی بی بی کو لے کر رہتا ہے۔ دوسرا وہ مکان جس میں باپ بھائی اجنبی دوست پڑوسی وغیرہ رہتا ہے۔ تیسرا وہ مکان جس میں کوئی نہیں رہتا، مثلاً سرِ راہ پڑاؤ کے مکانات یا غیر آباد کھنڈر یا تجارتی کوٹھیاں یا بازار و دکانیں یا مدارس وغیرہ۔ اول الذکر تو بہرحال اپنا مکان ہے اس میں اگر صرف بی بی ہے تو کوئی خاص احتیاط لازم نہیں۔ البتہ احادیث سے ثابت ہے کہ اگر پردیس سے آئے تو اپنے گھر میں بھی اچانک نہ گھس جائے، لیکن اس کا بیان آیت میں کچھ نہیں ہے۔ متوسط الذکر مکان میں داخل ہونے کے لئے آہٹ سے، آواز سے، حرکات سے یا کسی اور طریق سے صاحب مکان کو اطلاع دینی اور سلام علیک کرنی اور اس سے داخلہ کی اجازت مانگنی ضروری ہے اور اگر اجازت نہ ملے تو واپس ہو جانا ضروری ہے کشیدگی اور کبیدگی کی کوئی وجہ نہیں ہے اور اگر مسکونہ مکان میں کوئی نہ ہو تب تو داخل ہونا اور یونہی بلا اجازت گھس جانا بہت ہی برا ہے۔ رہا غیر مسکونہ مکان تو اس میں داخل ہونے کے لئے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں بشرطیکہ وہاں جانے کی حاجت ہو۔ سرِ راہ پڑاؤ پر اترنا، وہاں کی خالی کوٹھریوں میں داخل ہونا، تمام تجارتی دوکانوں میں کچھ لین دین یا کسی اور کام کے لئے جانا، مدارس و مکاتب، سرائے، ہوٹل یا کسی اور عمومی عمارت میں داخل ہونا اور اجازت کا خاص لحاظ نہ رکھنا جائز ہے۔ طہارت اخلاق، تزکیۂ نفس اور تہذیب فضائل کے بہترین قوانین ہیں۔

تحلیل احترام

لَا تَدْخُلُوْا: ایک بار ایک انصاری عورت نے خدمتِ گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ! میں اپنے گھر میں اکثر ایسی حالت میں ہوتی ہوں کہ اپنے اوپر کسی شخص کی نظر پڑنی مجھے ناگوار ہوتی ہے۔ خواہ باپ ہو یا بیٹا، مگر گھر والے یونہی گھسے چلے آتے ہیں۔ اس وقت آیات مذکورہ کا نزول ہوا۔ بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ۔ یعنی اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں بغیر اجازت لئے نہ داخل ہو۔ اپنے مکان سے مراد ہے وہ مکان جس میں آدمی خود اپنی بی بی کو لے کر رہتا ہو۔ خواہ مکان اپنی ملک ہو یا کرایہ کا ہو یا یونہی عارۃً ہو۔ اگر کرایہ کا یا مانگے کا مکان ہے تب بھی وہ رہنے والے کا کہلائے گا۔ اصل مالک کو بغیر اذن و اجازت کے اس میں داخل ہونا جائز نہیں۔ اگر ماں اور بہن بھی ساتھ رہتی ہو تب بھی گھر میں داخل ہوتے وقت استیذان لازم ہے۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا تھا تم ماؤں اور بہنوں کے پاس جانے کی اجازت لے لیا کرو۔ عطاء نے ابن عباسؓ سے کہا میری بہنیں میرے زیر پرورش ایک ہی مکان میں میرے ساتھ مقیم ہیں۔ کیا ایسی صورت میں بھی مجھے گھر میں داخل ہونے کی اجازت لینی ضروری ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا ہاں۔ عطاء نے مکرر کہا، مگر ابن عباسؓ نے وہی فرمایا۔ سہ بارہ درخواست پر فرمایا کیا تم اُن کو برہنہ دیکھنا پسند کرتے ہو؟ عطاء نے کہا نہیں۔ ابن عباسؓ نے فرمایا تو پھر اجازت لینی لازم ہے۔ اگر گھر میں صرف بی بی ہے تو خاص اجازت کی ضرورت نہیں۔ غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ کی قید اسی مفہوم پر دلالت کر رہی ہے، مگر بقول ابن کثیر اپنے آنے کی اطلاع دے دینی اولیٰ ہے۔ اچانک پہنچ جانا مناسب نہیں۔ ابن مسعودؓ جب اپنے گھر میں داخل ہوتے تو پہلے کھنکھارتے یا نخنخ کہتے (اوس بن تمیمہ) ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ ابن مسعودؓ گھر میں داخل ہوتے وقت کوئی آہٹ کرتے یا بات کرتے یا آواز اونچی کرتے۔ امام احمدؒ نے اسی لئے صراحت کی ہے کہ اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت کھنکھارنا یا پاؤں کی آواز پیدا کرنی مستحب ہے۔ رسولِ پاک نے اچانک اندھا دھند سے آکر اپنے

گھر میں داخل ہو جانے کی ممانعت فرمائی تھی (مگر یہ معترضہ واپسی کے متعلق علم تھا، اس لئے ممانعت ہرگز نہیں ہے)۔

حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا استیناس اور سلام دو چیزیں ہیں۔ کھنکھارنا، کھٹکھٹانا، تہذیب کے ساتھ دروازہ کا حلقہ بجانا، نیز جس کے ساتھ کلام کرنا پاؤں کی آہٹ پیدا کرنی یا کوئی ایسا مہذب ذریعہ استعمال کرنا جس سے صاحب خانہ کو اطلاع ہو جائے استیناس کے ذیل میں داخل ہے۔ عام مفسرین نے استیناس کے معنی استیذان لکھے ہیں۔ امام مالکؒ نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے، بلکہ قرطبی نے ابی بن کعبؓ، ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ کی قرأت اسی طرح نقل کی ہے یعنی تَسْتَاْنِسُوْا کی جگہ تَسْتَاْذِنُوْا مذکورہ بالا صحابہ کی روایت میں آیا ہے۔

رہی یہ بات کہ استیناس پہلے ہو یا سلام؟ تو آیت میں اس کی کوئی تفصیل نہیں۔ تعلیم سنت اور تعامل صحابہ کی روشنی میں علماء نے اس کی تفصیل کی ہے کہ اگر مکان بڑا ہو اور سلام کی آواز نہ پہنچے تو پہلے اطلاع کرانی اور اجازت طلب کرانی ضروری ہے پھر ملاقات کے وقت سلام کرنا چاہیئے اور اگر مکان چھوٹا ہو تو اذن طلب کرنے سے پہلے سلام کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس طرح اگر کیا جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ اگر کوئی گھر والا سامنے مل جائے تو پہلے سلام کرنا چاہیئے پھر اذن مانگنا چاہیئے۔ بہرحال یہ تمام طریقے مستحسن اور آداب ہیں۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ جاہلانہ دستور کی بندش ہو جائے۔ جاہل کی طرح لوگوں کے دروازوں پر چیخنا، زور سے کیواڑوں کو پیٹنا، کنڈی کو زور سے بجانا، دروازہ پر اینٹ پتھر مارنا یہ تمام امور بدتہذیبی اور ناشائستگی پر دلالت کرتے ہیں جن سے اجتناب لازم ہے، لیکن یاد رہے کہ اجازت طلب کرنے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ جس گھر میں داخل ہونے کا ارادہ ہو اس میں پہلے اندر جھانک لے پھر اجازت مانگے نہ دروازہ کے مقابل سیدھا کھڑا ہونا زیبا ہے۔ اس سے حکم استیذان کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے بلکہ دائیں بائیں کھڑا ہو کر اجازت مانگنی اور سلام کرنا زیبا ہے۔ حضرت عبداللہ بن بشرؓ کی روایت ہے کہ حضور پاکؐ جب کسی کے دروازہ پر تشریف لے جاتے تو دروازہ کے سامنے نہ کھڑے ہوتے، بلکہ دائیں بائیں ٹھہر کر فرماتے السلام علیکم السلام علیکم۔ وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں دروازوں پر پردے ڈالنے کا رواج نہ تھا (الفرد۔ ابوداؤد) ایک شخص نبوت کدہ پر حاضر ہوا اور ٹھیک دروازہ کی طرف رخ کر کے کھڑا ہوا اور باریابی کی درخواست کی۔ حضورؐ نے فرمایا یوں نہیں ہٹ کر کھڑے ہو۔ طلب اذن کا حکم تو نظر کے بچاؤ کے لئے ہے (ابوداؤد) صحیحین میں مروی ہے حضور اقدسؐ نے فرمایا اگر کوئی تیری اجازت کے بغیر تجھے جھانکے اور تو کنکری مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دے تو تیرا کچھ قصور نہیں۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اجازت چاہنے والا اپنا مشہور نام بتائے۔ میں میں نہ کرے۔ حضرت جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں میں حضورؐ کی خدمت میں پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ حضورؐ نے فرمایا کون ہے؟ میں نے جواب دیا میں ہوں۔ حضورؐ نے کراہت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا میں ہوں، میں ہوں۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ تین مرتبہ اجازت لینی والی ہے یعنی ایک بار اجازت طلب کرے۔ اگر جواب نہ ملے تو کچھ توقف کے بعد دوبارہ اذن کا خواستگار ہو۔ پھر بھی جواب نہ ملے تو تیسری بار بقدرے توقف کے بعد اطلاع کرائے۔ اب اگر آنے والا کوئی اجنبی یا غیر محرم رشتہ دار ہو تو صریح اجازت لینی ضرور ہے خواہ دروازہ بند ہو یا نہ ہو اور اگر محرم قرابت دار ہو تو صریح اجازت کی ضرورت نہیں البتہ آہٹ اور استیناس وغیرہ سے اپنی آمد کی اطلاع دے دینی ضرور ہے۔

وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا تین مرتبہ اجازت طلب کرنے کے بعد اگر صاحب خانہ اندر سے خود کہہ دے یا کہلوا دے کہ واپس چلے جاؤ اس وقت ملاقات نہ ہوگی تو برا ماننے کی کوئی بات نہیں واپس آ جانا چاہیئے۔ دروازہ پر بیٹھا رہنے سے واپس آ جانا زیادہ اچھا ہے۔ قتادہ نے فرمایا اگر داخلہ کی اجازت نہ ملے تو دروازہ کے باہر نہ بیٹھ جائے کیونکہ ہر شخص کو کام ہوتا ہے۔ ہاں اگر اجازت مانگے بغیر دروازہ پر منتظر رہا تو جائز ہے۔ حضرت ابن عباسؓ جب طلب احادیث کیلئے انصاریوں کے دروازے پر تشریف لے جاتے تو اطلاع نہ کراتے تھے بلکہ باہر بیٹھ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ صاحب خانہ خود ہی کسی کام سے باہر آتا تو اس سے کہتے اور فرماتے ہم کو طلب علم کا یونہی حکم ملا ہے۔

اگر تین مرتبہ اجازت طلب کرنے کے بعد گھر میں سے کوئی جواب نہ آئے تب بھی واپسی جائز ہے۔ جواب کے انتظار میں کھڑا رہنا ضروری نہیں۔ ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فاروق اعظمؓ کے خلافت کدہ پر آئے اور تین مرتبہ اجازت طلب کرنے کے بعد بھی کوئی جواب نہ ملا واپس چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد امیرالمومنین کو خیال ہوا۔ فرمایا کیا میں نے عبداللہ بن قیس (ابوموسیٰ) کی آواز نہیں سنی تھی۔ جاؤ اس کو اندر آنے کی اجازت دو۔ خادم نے باہر آکر تلاش کیا تو آپ لوٹ چکے تھے۔ امیرالمومنین نے طلب فرمایا تشریف لے آئے۔ امیرالمومنین نے فرمایا تم لوٹ کر کیوں چلے گئے؟ ابوموسیٰ نے کہا میں نے تین بار اجازت مانگی، نہ ملی تو میں واپس چلا گیا کیونکہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی تین مرتبہ اجازت مانگے اور اذن نہ دیا جائے تو لوٹ جائے۔ فاروق اعظم نے فرمایا اس حدیث کے ثبوت کے لئے تم کوئی گواہ پیش کرو ورنہ

میں تم کو سزا دوں گا۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ انصاریوں کی جماعت کے پاس گئے اور ان سے قصہ کہا۔ انصاریوں نے کہا ہم میں سے یہ سب سے چھوٹی عمر والا (یعنی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ) شہادت دے گا۔ غرض حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ نے حدیث کی تصدیق کی اور شہادت دی۔

بُیُوْتًا غَیْرَ مَسْكُوْنَةٍ۔ جب اوپر کی آیت میں بغیر اجازت کسی کے گھر میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی گئی تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اکثر تجارت کی غرض سے مکہ اور مدینہ کے درمیان آتے جاتے چوپال ایسے غیر آباد ٹپاؤ اور سرائے میں ٹھہرنا ہوتا ہے کہ وہاں کوئی آدمی نہیں ہوتا ایسی صورت میں کس سے اجازت لیں اور کس کو سلام علیک کریں؟ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن زید اور شعبی کا قول ہے کہ بیوت غیر مسکونہ سے تاجروں کی دوکانیں، کوٹھیاں اور سرائے کے ہوٹل وغیرہ قیام گاہیں مراد ہیں۔ یعنی جب تاجر نے دوکان کھول کر داخلے کی عمومی اجازت دے دی اور فروخت کرنے کے لئے سامان لگا دیا تو پھر اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں۔ شیخ سیوطی نے ذکر کیا ہے کہ محمد بن حنفیہ، مجاہد اور قتادہ کے نزدیک بیوت غیر مسکونہ سے وہ مکان مراد ہیں جو سرِ راہ مسافروں کے اترنے کے لئے بنا دیئے جاتے ہیں۔ اگر وہ مکان خالی ہوں کوئی مسافر وہاں ٹھہرا نہ ہو تو بدون اجازت ان میں داخل ہونا اور قیام کرنا جائز ہے۔ عطاء کا قول ہے اس سے مراد وہ کھنڈر ہیں جہاں رفع ضرورت کے لئے لوگ آیا جایا کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک بیوت مکہ مراد ہیں اگر وہ خالی ہوں۔ کیونکہ مکہ کے مکانات (بر قول محمد بن حنفیہ و امام ابو حنیفہ) کسی کی ملک نہیں ہیں۔

فِیْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ۔ متاع سے مراد یا تو اسباب و سامان ہے یعنی جن غیر مسکونہ مکانوں میں تمہارا سامان ہو اور وہاں کوئی رہتا نہ ہو تو بغیر اجازت داخل ہونا جائز ہے یا متاع سے مراد ہے تمتع یعنی منفعت مثلاً سردی گرمی سے بچاؤ، استراحت، حفاظت وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ جن غیر مسکونہ مکانوں میں تم کو داخل ہونے کی ضرورت ہو، خواہ سردی گرمی سے بچنے کی ضرورت ہو یا کوئی اور کام ہو تو بدون اذن داخل ہو سکتے ہو (بشرطیکہ وہاں کوئی مقیم نہ ہو) جابر بن زید کا یہی قول ہے۔

وَاللّٰهُ یَعْلَمُ الخ یعنی نیت خراب نہ ہونی چاہیئے، نیک طینتی، خوش نیتی اور جذبۂ صلاح لے کر داخل ہونا چاہیئے۔ چوری، زنا، مردم آزاری یا اسی قسم کا کوئی دوسرا خیال کار فرما نہ ہو۔

مقصود بیان زنا اور دواعی زنا کی کامل بندش، آداب معاشرت، تہذیب اور شائستگی کی تعلیم۔ بغیر اذن و سلام علیک کے مسکونہ مکانوں میں داخل ہونے کی ممانعت۔ اس امر کی طرف ضمنی اشارہ کہ صاحب خانہ پر اجازت دینی لازم نہیں، اس لئے اگر منع کرے تو لوٹ جانا چاہیئے۔ عام فرودگاہوں، یا زائد کی عمومی دوکانوں اور تجارتی کوٹھیوں میں داخل ہونے کے لئے اجازت لینے کی ضرورت نہیں وغیرہ۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ

(اے نبی) مسلمانوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی نگہداشت رکھیں یہ ان کے لئے پاکیزہ تر ہے جو کچھ

خَبِیْرٌ بِمَا یَصْنَعُوْنَ ○ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ

کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر ہے اور مسلمان عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت رکھیں

وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُیُوْبِهِنَّ وَلَا

اور اپنے سنگھار کو سوائے اس حصہ کے ظاہر نہ کریں جو کھلا رہتا ہے اور اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈال لیا کریں اور اپنا

یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ

سنگھار ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے باپ دادا پر یا اپنے شوہروں کے باپ دادا پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے

بُعُولَتِهِنَّ أَوْ إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي إِخْوَانِهِنَّ أَوْ بَنِي أَخَوَاتِهِنَّ أَوْ نِسَائِهِنَّ أَوْ مَا مَلَكَتْ

شوہروں کے بیٹوں پر یا اپنے بھائیوں پر یا اپنے بھتیجوں پر یا اپنے بھانجوں پر یا اپنی عورتوں پر یا اپنی

أَيْمَانُهُنَّ أَوِ التَّابِعِينَ غَيْرِ أُولِي الْإِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ أَوِ الطِّفْلِ الَّذِينَ لَمْ يَظْهَرُوا

باندیوں پر یا اپنے طفیلیوں پر یعنی اُن مردوں پر جو صاحب شہوت نہ ہوں یا اُن لڑکوں پر جو عورتوں کے حالات سے

عَلَىٰ عَوْرَاتِ النِّسَاءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ ۚ وَتُوبُوا

واقف نہ ہوئے ہوں اور اپنے پاؤں مار کر نہ چلیں کبھی اُن کا وہ سنگھار ظاہر نہ ہو جائے جو وہ چھپاتی ہیں اے مسلمانو!

إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○

تم سب اللہ کی جناب میں توبہ کرو تاکہ تم کامیاب ہو

تفسیر زنا کا سبب اگرچہ میلان طبع شہوانی جوش اور مزاجی تناسب ہوتا ہے لیکن میلان طبع پیدا کرنے والا شہوانی قوتوں برانگیختہ کرنے والا اور ایک کا دل دوسرے کی طرف کھینچنے والا بس ایک ہی سبب ہے یعنی نظر۔ اگر دیدبان قلب کی حفاظت کر لی جائے تو زنا کے ایک ہزار واقعات میں سے ۹۹۹ پیدا ہی نہ ہوں۔ ہر قسم کی شیفتگی فریفتگی اور وابستگی اسی برقی کشش سے ہوتی ہے۔ حسن و جمال کا ادراک، تناسب اعضا اور رفتارِ جسم کی شناخت آنکھوں سے ہی ہوتی ہے۔ اس کے اتفاقی دوسرے اسباب ہیں مثلاً آواز کا سننا، بدن کو چھونا یا بغیر دیکھے کسی نابینا کے تعلقات محض مراسلات و مکاتبات سے پیدا ہو جانا۔ یہ تمام امور اتفاقی ہیں۔ تاہم بندش ان کی بھی ضروری ہے تاکہ اس شجرۂ خبیثہ کی بیخ ہی اکھڑ جائے۔

آیات مذکورہ میں اول مردوں اور عورتوں کو اپنی اپنی نظر نیچی رکھنے کا حکم دیا ہے اور چونکہ عورت کی ہر ادا عورت ہے، ہر حرکت عورت ہے، چال ڈھال، گفتار، اطوار سب ہی عورت ہیں۔ ادنیٰ سنگھار جذبات شوق میں طوفان برپا کرنے کے لئے کافی ہے، اس لئے ہر قسم کے سنگھار کو چھپانے، زیور کی آواز پیدا کرنے، رفتار میں، آہٹ میں اور مرور و عبور میں آہستگی کا لحاظ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اتفاقی اسباب کے تحت ناجائز تعلق ہو سکتا تھا، اس لئے مردوں اور عورتوں کو حفاظت فروج کی خاص نصیحت فرما دی۔ ہاں عرفاً اور عادۃً جن مردوں کے سامنے آنے جانے میں ہرج نہیں سمجھا جاتا، شریف انسان رشتہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے جہاں ناجائز تعلقات کا تصور بھی نہیں کر سکتے وہاں ایک حد تک بے پردہ ہونے کی اجازت بھی دے دی۔ مثلاً بیٹا، باپ، بھائی، بھتیجہ، بھانجہ، ناکارہ نیک طینت مخنث اور ناواقف بچے یا بہت ہی بوڑھے کبیرے پیش خدمت۔ یہ سب خوردی بزرگی اور قرابت رحم کا لحاظ کرتے ہوئے کبھی بدنگاہی نہیں کر سکتے۔ سوتیلے بیٹے بھی اسی گروہ میں داخل ہیں۔ علاوہ بدنگاہی سے محفوظ ہونے کے مذکورۂ بالا اشخاص تعامل میل جول نشست برخاست اور ساتھ رہنے کے اعتبار سے بھی کسی طرح پردہ کے قابل نہیں ورنہ معاشرت میں سخت دشواری پیدا ہو جاتی، اس لئے ان سب سے پردہ کرنے کی اجازت ہے تاکہ معاشرت میں آسانی ہو۔

تحلیلِ اجزاء يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ اس آیت میں مسلمان مردوں کو دو حکم دئیے ہیں آنکھیں نیچی رکھیں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ حضرت ابو امامہ سے مروی ہے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا تم چھ باتوں کا ذمہ لو میں تمہارے لئے جنت کا ذمہ دار ہوں۔ تم میں سے کوئی بات کرے تو جھوٹ نہ بولے، کسی کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت نہ کرے، وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی نہ کرے۔ آنکھیں بند رکھو۔ ہاتھوں کو روکو اور شرمگاہوں کو بچائے رکھو (رواہ البغوی) حضرت ابو ہریرہؓ سے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا دونوں آنکھوں کی زنا بدکاری کی نظر ہے۔ زبان کی زنا گفتگو ہے۔ کانوں کی زنا (بدکاری کا) سننا ہے۔ ہاتھوں کی زنا (ناجائز) گرفت، پاؤں کی زنا (زنا کے مقامات پر) جانا ہے۔ دل خواہش کرتا ہے اور شرمگاہ اس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے (صحیحین مسلم) صحیح بخاری میں ہے حضور ﷺ نے فرمایا جو شخص ذمہ داری کرے اپنے جبڑوں کے درمیانی چیز (یعنی زبان) کی حفاظت کرے اور اپنی دونوں ٹانگوں کی درمیانی چیز یعنی (شرمگاہ) کی نگہداشت کرے میں اس کے لئے جنت کا ضامن ہوں۔

آیت مذکورہ میں زنا کا ابتدائی اور انتہائی درجہ بیان فرما دیا اور دونوں سے بچنے کی ہدایت فرما دی۔ درمیانی درجہ کا ذکر نہیں کیا، کیونکہ آغاز و انجام کی ممانعت تمام درمیانی درجات کو مستلزم ہے۔ صحیحین کی مذکورہ بالا احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ زنا کی ابتدا نظر سے ہوتی ہے پھر ہاتھوں کو چھونے، کانوں کو سننے اور پاؤں کو چلنے کا موقع ملتا ہے اور (آخر میں) واقعی زنا کا درجہ ہے۔ یہ تمام اسباب اور دواعی ہیں۔ اگر انسان زنائے حقیقی میں مبتلا نہ ہوا تو اگرچہ نظری، سماعی، دستی اور رفتاری گناہ کا مرتکب ہوا مگر حکم زنا اور سزائے زنا سے محفوظ رہا اور اگر انجام کار عمل بھی ہو گیا تو تمام گزشتہ گناہوں پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اسی بنا پر بعض سلف کا قول ہے کہ بری نظر سے دیکھنا قلب کے لئے ایک زہر آلود تیر ہے۔

آیت مذکورہ میں آنکھ بند رکھنے اور شرم گاہ محفوظ رکھنے کا حکم ہے مگر اس جگہ کوئی تفصیل نہیں کہ کس عورت کو نہ دیکھا جائے اور کس سے شرم گاہ کو محفوظ رکھا جائے اور چونکہ تمام عورتوں کو نہ دیکھنے اور سب سے الگ رہنے کا حکم تو ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے علماء نے دوسری آیات اور احادیث کی ہدایت کے موافق اس کی تفصیل کی ہے۔ باجماع اہل سنت ہر اجنبی عورت کا منہ اور ہاتھ دیکھنا بضرورت جائز ہے۔ باقی اعضاء پر نظر کرنی حرام ہے اور بغیر ضرورت اجنبی عورت کا چہرہ اور ہاتھ دیکھنا بھی حرام ہے۔ ہاں اگر اچانک نظر پڑ جائے تو پہلی نظر معاف ہے، مگر دوبارہ نظر ڈالنی جائز نہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا تھا: اے علی نظر کے بعد نظر مت ڈال کیونکہ پہلی تیرے لئے ہے دوسری تیرے لئے نہیں (رواہ ابو داؤد والترمذی) جریر بن عبداللہ البجلیؓ نے جب حضور اقدس ﷺ سے اچانک نظر پڑ جانے کا حکم دریافت کیا تو حضور ﷺ نے نظر پھیر لینے کا حکم دیا۔ (رواہ مسلم وابو داؤد والترمذی والنسائی) اگر اجنبی عورت نہ ہو یعنی ایسی عورت ہو جس سے شرعاً نکاح جائز نہیں تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک صرف وہی اعضاء دیکھنے درست ہیں جو کام میں کھل جاتے ہیں مثلاً ہاتھ، بازو، گردن، سر، پاؤں وغیرہ۔ باہم مردوں کو بھی ستر کی ضرورت ہے۔ ناف سے لے کر گھٹنے تک دوسرے مرد کو بغیر ضرورت خاص دیکھنا جائز نہیں۔ اسی طرح ایک عورت دوسری عورت کو ناف سے گھٹنے تک نہیں دیکھ سکتی۔

مسئلہ چونکہ غیر محرم پر نظر ڈالنی حرام ہے، اس لئے مومن پر لازم ہے کہ ایسے مقامات پر بغرض تفریح بھی نہ جائے جہاں نظر بد سے حفاظت مشکل ہے مثلاً میلہ، انگریزی پارک وغیرہ۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: اِیَّاکُمْ وَالْجُلُوْسَ عَلَی الطُّرُقَاتِ یعنی سرراہ بیٹھنے سے اجتناب کرو۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! ہماری نشست گاہیں سرراہ ہیں وہاں بیٹھنے کے بغیر چارہ نہیں۔ فرمایا یہ ضروری ہی ہے تو راستے کا حق ادا کرو۔ عرض کیا حضور ﷺ راستے کا حق کیا ہے؟ فرمایا نظر کو بند رکھنا (راہگیروں کو) تکلیف پہنچانے سے باز رہنا، سلام کا جواب دینا، نیک بات کا حکم دینا اور بری بات سے منع کرنا۔

علمائے سلف نے باجماع لکھا ہے کہ امرد لڑکوں کا حکم بھی عورتوں کی طرح ہے۔ کسی لڑکے کو نظر جما کر دیکھنا حرام ہے اس سے آدمی فتنہ میں پڑ جاتا ہے۔

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ایک روز اسماء بنت یزید انصاریہ اپنے نخلستان میں موجود تھیں کچھ عورتیں ان کے پاس گئیں جن کے کرتے بہت لانبے تھے، لیکن پاجامے نہ تھے (اور سروں پر اوڑھنیاں بھی نہ تھیں، پاجامے نہ ہونے کی وجہ سے پازیبیں نمودار ہو رہی تھیں (اور اوڑھنیاں چونکہ سروں پر نہ تھیں صرف گردن میں پیچھے کو پڑی ہوئی تھیں، اس لئے چاک گریبان بالکل کھلا دکھائی دے رہا تھا) اور سینہ و گیسو بالکل نمایاں نظر آ رہے تھے۔ اسماء نے عورتوں کی یہ حالت دیکھ کر کہا یہ کیسی بری حرکت ہے؟ ادھر اس مومنہ بی بی نے اظہار نفرت کیا ادھر خدا تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں (رواہ مقاتل بن حیان و قد ذکرہ الشیخ ابن کثیر)

جس طرح عورت کا حسن و جمال مرد کے لئے دل فریب اور جاذب طبع ہے اسی طرح مرد کا تناسب اعضاء اور جسمانی ساخت عورت کے لئے مفتون کن اور دل کش ہے۔ گزشتہ آیت میں مردوں کو ہدایت کی گئی کہ کسی اجنبی عورت کو نہ دیکھیں۔ ان آیات میں عورتوں کے لئے خاص ہدایات ہیں۔

یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ۔ آیت کا عموم مقتضی ہے کہ تمام اجنبی مردوں کو دیکھنا خواہ شہوانی نظر ہو یا نہ ہو ہر حال حرام ہے۔ ابو داؤد اور ترمذی وغیرہما کی روایت سے ثابت ہے کہ ایک بار عبداللہ بن ام مکتوم حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت حضور ﷺ کے پاس ام المومنین ام سلمہؓ اور ام المومنین میمونہؓ موجود تھیں۔ حضور ﷺ نے دونوں کو پردہ کرنے کا حکم دیا۔ دونوں بیبیوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا یہ نابینا نہیں ہے؟ کیا اس کو کچھ دکھتا ہے؟ کیا ہم کو یہ پہچان سکتا ہے؟ فرمایا کیا تم دونوں نابینا ہو، کیا تم اس کو نہیں دیکھ سکتی ہو؟ اس حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ غیر مرد کو عموماً دیکھنا ناجائز ہے۔ کیونکہ واقعہ مذکورہ آیت حجاب کے نازل ہونے کے بعد کا ہے، لیکن علماء کے ایک گروہ نے صراحت کی ہے کہ غیر مردوں کو دیکھنا اس وقت حرام ہے جب فتنہ کا اندیشہ ہو اور نظر خواہش آمیز ہو یا کشش قلبی کا اندیشہ ہو۔ سادہ شستہ نظر حرام نہیں۔ کیونکہ عید کے دن جب حبشی غلام مسجد کے سامنے چھوٹے چھوٹے نیزے لے کر اپنے کرتب دکھا رہے تھے تو حضور اقدس ﷺ نے اپنی آڑ میں حضرت عائشہؓ کو کھڑے کر کے حبشیوں کے کرتب دکھائے تھے (رواہ مسلم) اگر مطلقاً نظر حرام ہوتی تو حضور اقدس ﷺ حضرت عائشہؓ کو کبھی غیر مردوں کے کرتب کی تفریح نہ کراتے۔

میرے نزدیک حق یہ ہے کہ شرعاً غیر مردوں کو دیکھنا اسی وقت حرام ہے جب نظر پُر فریب ہو یا فتنہ انگیزی کا اندیشہ ہو۔ سادہ نظر ناجائز نہیں، لیکن چونکہ فریب نفس کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ کون سی نظر فتنہ انگیز اور کون سی فتنہ سے بے خطر ہے۔ نگاہ دل کی دیدبان ہے دل اٹکانا ہے اور نظر جال ہے اور شیطان طبع اختیار سے خارج ہے، اس لئے ناجائز کششوں کے تمام اسباب کی بندش ضروری ہے اور حفاظت بھی عموماً لازم ہے۔

وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ۔ یعنی ناجائز مقامات سے شرم گاہوں کی حفاظت کریں (قتادہ وسفیان ثوری) یا غیر کی نظر سے بچائے رکھیں (ابوالعالیہ)

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا۔ خطیب نے کہا ہے کہ زینت دو قسم کی ہوتی ہے پوشیدہ اور ظاہر۔ پوشیدہ زینت کی مثال ہے پازیب، پاؤں میں مہندی کا رنگ، بازو بند، جھومر، بالیاں، ہار، طوق، حمائل، گلوبند وغیرہ اور جس جگہ یہ زیور پہنے جاتے ہیں وہ بھی حکم زینت میں داخل ہیں اور ظاہری زینت سے چہرہ، ہاتھ اور ہاتھوں میں مہندی کا رنگ، بیرونی لباس برقعہ، چادر وغیرہ۔ ابن مسعود، حسن بصری، ابن سیرین، ابن الجوزا، ابراہیم نخعی کا غیر محرم کے نزدیک پاؤں کے کپڑے بھی ظاہری زینت میں داخل ہیں جن کا اظہار محارم کے سامنے جائز ہے۔ ابن عمر، ابن عباسؓ، عطاء، عکرمہ، سعید بن جبیر اور جابر بن زید کے نزدیک انگوٹھی بھی ظاہری زینت کا حکم رکھتی ہے۔

بہر حال اگر ضرورت سخت ہو مثلاً شہادت دینی ہو یا نکاح کا موقعہ ہو یا استغاثہ ہو یا بیماری وغیرہ ہو یا کوئی اور ضروری کام ہو تو عورت اجنبی مردوں کے سامنے بھی چہرہ یا ہاتھ اور ظاہری لباس کو بشرطیکہ بدن کا دیدبان نہ ہو ظاہر کر سکتی ہے اور ضرورت نہ ہو تو جائز نہیں۔ بوڑھی، جوان، شادی شدہ اور ناکتخدا سب اس حکم میں برابر ہیں۔ البتہ مواقع فتنہ و امن کے اختلاف کی بنا پر احکام میں شدت وخفت ہو جائے گی۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں عورتوں کا پردہ نہ تھا۔ ان کے گریبان بہت کشادہ ہوتے تھے جن سے گلا اور سینہ دکھائی دیتا تھا، گیسو بھی سامنے نظر آتے تھے، کانوں کی بالیاں بھی چھپی نہ رہتی تھیں۔ اس رواج کو دور کرنے کے لئے خدا نے حکم دیا کہ اپنی اوڑھنیاں چاک گریبان پر ڈالے رہو۔ مراد یہ ہے کہ چاک گریبان تنگ رکھو تاکہ گلا اور سینہ کھلا نہ رہے اور سروں سے اوڑھنیاں اوڑھو۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو مہاجرات نے اپنی چادریں پھاڑ کر اوڑھنیاں بنالیں۔ ابو داؤد کی روایت میں آیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں نے ایمان اور کتاب اللہ کی تصدیق کے لحاظ سے انصار کی عورتوں سے زیادہ افضل کسی کو نہیں پایا جب یہ آیت وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ نازل ہوئی اور مردوں نے جاکر اپنی عورتوں کو نازل شدہ آیت سنائی تو ہر عورت نے فوراً اٹھ کر اپنی چادر پھاڑ کر اوڑھنی بنالی الخ۔

وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ۔ اس آیت میں پوشیدہ زینت کا حکم بیان فرمایا ہے۔ ظاہری زینت کے اظہار کا حکم تو پہلے بیان کر دیا گیا۔ پوشیدہ زینت کا اظہار سوا اُن لوگوں کے جن سے شرعاً نکاح حرام ہے اور کسی کے سامنے جائز نہیں۔ شوہروں کے لئے تو ہر زینت ہی ہوتی ہے، اس لئے شوہروں کے سامنے تو ہر قسم کی زینت کا اظہار نہ فقط جائز بلکہ مستحب ہے۔ رہے دوسرے رشتہ داران کی تفصیل ذیل کی عبارت میں درج ہے۔

اَوْ اٰبَآئِهِنَّ۔ یعنی باپ دادا، نانا، پرنانا، پردادا غرض وہ تمام اسلاف جن کے تخم سے عورت کی پیدائش ہوئی خواہ بالواسطہ یا بلا واسطہ سب آباء کے حکم میں داخل ہیں۔ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ۔ یعنی خسر، خسر کا باپ، دادا، نانا وغیرہ۔ غرض شوہر کی کل اصل۔

اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ۔ یعنی بیٹے، پوتے، پڑپوتے، نواسے، پرنواسے وغیرہ یعنی اپنی نسل۔

اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ۔ یعنی سوتیلے بیٹے پوتے وغیرہ۔ غرض شوہر کی اولاد۔

اَوْ اِخْوَانِهِنَّ۔ یعنی سگے بھائی ہوں یا سوتیلے، پھر علاتی ہوں یا اخیافی یا دودھ شریک ہوں (شرعی عرف میں چچا، ماموں، خالہ اور پھوپھی کے بیٹے بھائی نہیں بلکہ اجنبی کے حکم میں ہیں۔ ان کے سامنے زینت کا اظہار جائز نہیں)

اَوْ بَنِیْٓ اِخْوَانِهِنَّ۔ یعنی بھتیجے اور ان کی کل نسل۔ خواہ سگے بھائی کی نسل ہوں یا سوتیلے بھائی کی یا رضاعی بھائی کی۔

اَوْ بَنِیْٓ اَخَوٰتِهِنَّ۔ یعنی بھانجے اور ان کی کل نسل خواہ سگی بہنوں کی نسل ہو یا سوتیلی بہنوں کی یا رضاعی بہنوں کی (خالہ، ماموں، چچا وغیرہ کی بیٹیاں شرعی عرف میں بہنیں نہیں ہیں، اس لئے ان کے بیٹوں کے سامنے پوشیدہ زینت کا اظہار جائز نہیں)

آیت میں چچا اور ماموں کا ذکر نہیں۔ جمہور کے نزدیک ان کا حکم بھی دیگر محارم کی طرح ہے کیونکہ ان سے نکاح حرام ہے۔ ان کے سامنے بھی پوشیدہ زینت کا اظہار جائز ہے۔

اَوْ نِسَآئِهِنَّ۔ اپنی عورتوں سے مراد (بقول مفسرین) مسلمہ عورتیں ہیں۔ ابن مسعود کی صحیح روایت میں آیا ہے کہ کوئی عورت دوسری عورت کے سامنے ایسی بے پردہ نہ ہو

کہ وہ اس کا حلیہ اپنے مرد سے اس طرح بیان کرے کہ گویا وہ اس کو دیکھ رہا ہے (متفق علیہ) آیت کی صراحت سے کافر عورت خارج ہو گئی۔ فاروق اعظم رضؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو لکھا تھا مجھے اطلاع ملی ہے کہ کچھ مسلم عورتیں غیر مسلم عورتوں کے ساتھ حماموں میں جاتی ہیں۔ کیا آپ کی اجازت سے ہے حالانکہ جائز نہیں کہ کسی ذمی عورت کی شرم گاہ کو سوا اس کی ہم ملت عورت کے کوئی دوسری عورت دیکھ سکے (رواہ سعید بن منصور) مجاہد کا قول بھی یہی ہے کہ کسی مومنہ کا مشرکہ کے سامنے بے پردہ ہونا جائز نہیں۔ مکحول اور عبادہ بن نسی کے نزدیک مسلمان عورت کے لئے یہودی یا عیسائی دائی کا استعمال مکروہ ہے۔ مگر ابن ابی حاتم نے عطا کا قول نقل کیا ہے کہ جب صحابہ کرام بیت المقدس میں پہنچے تو ان کی عورتوں کی دائیاں یہودی اور عیسائی عورتیں تھیں۔ دراصل یہ ہے کہ بدرجہ ضرورت غیر مسلم دائی کا استعمال جائز ہے۔

اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ۔ ظاہر آیت باندی اور غلام دونوں کو شامل ہے۔ اپنے غلاموں سے بھی پردہ ضروری نہیں۔ علماء کے ایک گروہ کا یہی خیال ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت عائشہؓ، حضرت اُم سلمہؓ اور حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول ہے۔ بیہقی اور ابو داؤد نے بروایت انس بن مالک بیان کیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ ایک غلام سیدۃ النساء کے لئے لائے اس وقت سیدہؓ ایک اوڑھنی اوڑھے ہوئے تھیں، لیکن وہ اتنی چھوٹی تھی کہ سر ڈھانکتی تھیں تو پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں کو چھپاتی تھیں تو سر کھل جاتا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کچھ حرج نہیں یہ تمہارا مملوک ہے اور میں تمہارا باپ ہوں۔ ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں اس غلام کا نام عبداللہ بن مسعدہ فزاری لکھا ہے۔ اس حدیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اپنے غلام سے پردہ نہ کرنا جائز ہے، لیکن ابن مسعود، مجاہد، عطاء، حسن، ابن سیرین، شعبی، ابو حنیفہ، ابن جریج اور بکثرت علماء کا قول ہے کہ غلام سے پردہ کرنا ضروری ہے۔ سعید بن مسیب نے صراحت کر دی ہے کہ آیت النور میں صرف باندیاں مراد ہیں۔ رہی حدیث مذکور تو اس میں غلام سے پردہ نہ کرنے کا کوئی حکم مذکور نہیں ہے۔ کیونکہ عبداللہ بن مسعدہ اس وقت جبکہ حضور اس کو لائے تھے بچہ تھا۔ سیدۃ النساء کو ہبہ فرمایا تھا آپ نے اس کو پرورش کیا اور بالغ ہونے کے بعد آزاد کر دیا تھا۔ امام احمد اور ابو داؤد کی روایت میں تو صراحت ہے کہ مکاتب سے پردہ کرنا ضروری ہے۔

اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ۔ یعنی وہ کمیرے جن کو عورت کی ضرورت نہ ہو۔ ابن عباسؓ کے نزدیک اس سے مراد وہ طفیلی آدمی ہیں جو عورت کے خواہشمند نہ ہوں مجاہد نے مادہ ورح کے لفظ سے تفسیر کی ہے۔ عکرمہ اور اکثر سلف نے مخنث مراد لئے ہیں، لیکن واضح رہے کہ مخنث سے بھی بے پردہ ہونا اس وقت جائز ہے جب وہ مخنث فتنہ انگیز نہ ہو دوسرے لوگوں کے سامنے کسی عورت کا حسن و جمال بیان نہ کرے ورنہ فتنہ انگیز مخنث کا زنانہ مکان میں یونہی بے روک ٹوک چلا آنا جائز نہیں۔ بخاری کی روایت ہے کہ کاشانہ نبوت میں ایک مخنث آتا جاتا تھا۔ لوگ اس کو غیر اولی الاربہ میں شمار کرتے تھے۔ ایک روز اس نے عبداللہ کے سامنے بنت غیلان باشندہ طائف کے حسن و جمال کی تعریف کی تو حضور ﷺ نے ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کو ہدایت فرما دی کہ آئندہ یہ تمہارے گھر میں نہ آیا کرے۔ (رواہ مسلم ایضاً)

اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ۔ یعنی وہ بچے جو عورتوں کے خصوصی احوال صنفی تعلقات و کیفیات اور حرکات و سکنات سے ناواقف ہیں ان سے پردہ ضروری نہیں، لیکن جب حس شعور کو پہنچ جائیں اور عورتوں کے خصوصی احوال کو سمجھنے لگیں خواہ جوان نہ ہوئے ہوں، مگر ان سے پردہ لازم ہے۔

مذکورہ بالا تمام مردوں کے سامنے پوشیدہ زینت کا اظہار جائز ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، بدظنی کا شبہ نہ ہو، خارجی کیفیات مانع نہ ہوں، بدچلن اور بداطوار مرد کے سامنے بے پردہ ہونا خواہ وہ محرم ہی ہو جائز نہیں۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ کسی عورت کا تخلیہ اپنے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے مرد سے خواہ وہ باپ ہی ہو جائز نہیں۔ حدیث میں اس کی صراحت آئی ہے خصوصاً یہ زمانہ تو بہت پُر آشوب ہے۔ رشتہ داری اور قرابت کے پردہ میں خوب بدچلنیاں ہوتی ہیں، اس لئے زیادہ اجتناب و احتیاط کی ضرورت ہے۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ۔ زمانہ جاہلیت میں اگر کوئی عورت ٹھوس کڑے پہن کر راستہ میں چلتی اور اس کی آواز نہ پیدا ہوتی تو وہ مردوں کی نظر جذب کرنے یا اپنی رعنائی کا اظہار کرنے کے لئے پاؤں زمین پر مارتی تاکہ آواز پیدا ہو۔ خدا تعالیٰ نے اس آیت میں ایسی نازیبا حرکت سے منع فرما دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب عورت کی مخفی زینت مخفی ہو تو اس کا اظہار کسی طرح جائز نہیں یہاں تک کہ خوشبو لگا کر باہر نکلنا یا مسجد کو جانا بھی منع ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا اگر عورت عطر لگا کر کسی مجلس کی طرف سے گزرے، تو اس کی ایسی ہی۔ یعنی وہ زانیہ ہے (رواہ ابو داؤد والنسائی والترمذی) حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جو عورت مسجد کو جانے کے لئے خوشبو لگائے اس کی نماز خدا تعالیٰ قبول نہیں فرماتا تاوقتیکہ وہ گھر جا کر جنابت کے غسل کی طرح غسل نہ کر لے (رواہ ابن ماجہ)

مقصود بیان — آبرو کے تحفظ کا قانون، معاشرت کو برباد کر دینے والے اسباب کی روک اور ہر قسم کے زنا کی بندش۔ مردوں اور عورتوں کو نیچی نظریں رکھنے کا حکم اور ارتکاب خواہش سے باز داشت۔ گویا زنا کے ابتدائی اور انتہائی درجات کی ممانعت جس میں جسمانی مراتب کی ممانعت بطور لزوم

مستنبط ہوتی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ کے الفاظ سے اس امر پر تنبیہ کہ نیتوں اور ارادوں کو بھی پاک رکھنا چاہیئے۔ افعال واعمال کی غرض اگرچہ مخفی ہو مگر خدا اس سے واقف ہے۔ گویا ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی اخلاقی طہارت مسلمانوں کے لئے لازم ہے۔ جو عورتیں ظاہری زینت بوقتِ ضرورت غیر مردوں کے سامنے ظاہر کر سکتی ہیں اور باطنی زینت سے آگے بڑھ کر کوئی شخص سوا شوہر کے نہیں دیکھ سکتا۔ اس سے تنبیہ حاصل کرنی چاہیئے اس زمانہ کی مغرب پرست فیشن زدہ عورتوں کو جو گریبان چاک کئے، بازو اور سینہ کھولے سر راہ بے روک ٹوک پھرتی، پارکوں میں تفریح کرتی، اور مردوں کے ساتھ شیر و شکر ہو کر گھومتی ہیں اور ان عورتوں کو بھی اس سے درس نصیحت حاصل کرنا چاہیئے جنہوں نے برائے نام برقعہ کی قید قبول کی ہے۔ باہر نکلتے وقت نہایت زرق برق جاذبِ نظر اور دلکش جوڑے زیب تن کرتی ہیں اور مردوں کے لئے شکار گاہ نظر بنتی ہیں۔ کاش ان میں غیرتِ اسلامی ہوتی اور ان کے مردوں میں تحفظ ناموس عفت عصمت اور تعلیم مذہب پر عمل کرنے کا کچھ احساس ہوتا۔ آیت میں تو صاف صراحت ہے کہ سر اور سینہ کو چھپانا اور اوڑھنی کو گریبان پر ڈالے رکھنا عورت کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ دلوں کو ڈسنے والے ناگ سر سے ہی لٹک کر نیچے آتے ہیں اور عمارتِ حسن کے برج سینہ پر ہی نمودار ہوتے ہیں، اس لئے ان کو چھپانا ہی زیادہ ضروری ہے، مگر فلسفۂ اسلام سے بے خبر مرد اور عورتیں اگر ظاہری طور پر پردہ کی پابندی کرتے بھی ہیں تب بھی مظاہر حسن کو بے روک ٹوک نمایاں رکھتے ہیں۔ سر برہنہ گلے میں دوپٹے پڑے ہوئے، سینے کھلے ہوئے، لباس اتنا باریک جو عیانِ بدن ہوتا ہے اور اتنا چست جس سے اعضاء کا توازن و تناسب بالکل نمایاں ہوتا ہے۔ کاش حقیقتِ اسلام کو سمجھنے والے دماغ پیدا ہوں اور پوست کو پکڑنے کی بجائے مغز تک ان کی رسائی ہو۔

آیت کی تفصیل بتا رہی ہے کہ جہاں اسلام نے اسباب زنا اور دواعی فحش کی بندش کی ہے وہاں عورتوں کو بالکل قیدی بھی نہیں بنا دیا، معاشرت میں تنگی نہیں پیدا کی۔ جن لوگوں سے پردہ کرنے میں دشواری تھی ان سے پردہ نہ کرنے کی اجازت دے دی۔

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۭ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ

اور اپنی رانڈوں کا اور اپنے اُن غلام و باندیوں کا نکاح کردو جو اس لائق ہوں اگر وہ محتاج ہوں گے تو اللہ اپنے فضل سے ان کو غنی کر دے گا

مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ

اور اللہ گنجائش والا باخبر ہے اور جو لوگ نکاح کا مقدور نہیں رکھتے وہ پاک دامن رہیں یہاں تک کہ اللہ اپنے فضل

اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ

سے اُن کو غنی کر دے اور تمہارے جو مملوک مکاتبت کے خواستگار ہوں تو اُن کو مکاتب بنا دو بشرطیکہ تم کو اُن میں شائستگی

فِيْهِمْ خَيْرًا ڰ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۭ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ

معلوم ہو اور ان کو اللہ کے اُس مال میں سے کچھ دو جو اللہ نے تم کو دیا ہے اور دنیوی زندگی کا سامان حاصل کرنے کے لئے اپنی باندیوں کو

تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ

زنا کرنے پر مجبور نہ کرو اگر وہ بچنا چاہیں جو شخص اُن کو مجبور کرے گا تو مجبور کئے جانے کے بعد اللہ اُن کے لئے غفور رحیم

رَّحِيْمٌ ۝ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ع ۸ ۱۰

ہے ہم نے تمہارے پاس صاف صاف احکام اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کی مثالیں اور پرہیزگار لوگوں کے لئے نصیحت نازل کر دی

تفسیر عمرانی دنیا میں ایک گونہ تسلسل ہے لیکن تسلسل کی حیثیات مختلف ہیں۔ اشخاص کی بقاء نوع کی بقاء پر موقوف ہے۔ اگر نوع فنا ہو جائے تو افراد کہاں سے آئیں۔ اسی طرح نوع کی بقاء بھی افراد کی بقاء سے وابستہ ہے۔ اگر افراد سب معدوم ہو جائیں تو نوع بھی مفقود ہو جائے گی۔ قدرت کا یہ قاعدہ عام ہے۔ نباتی حیوانی اور انسانی کائنات میں جاری اور ساری ہے۔ انار کا درخت اگر دنیا میں ہو گا تو انار کی نوع باقی رہے گی۔ گھوڑے، گدھے، بکری، بھیڑ، اونٹ، گائے وغیرہ کے افراد ہوں گے تو ان کی نوع ہو گی۔ اسی طرح انسان کے افراد موجود ہوں گے تو انسان نوعِ انسانی کی بقاء ہو گی۔ نباتی اور حیوانی کائنات تو شرعی احکام پر مکلف نہیں۔ قدرتی طور پر بعض نباتات و حیوانات کا بعض سے جوڑا لگ جاتا ہے اور ایک کا دوسرے سے ربط ہو جاتا ہے لیکن بعض حیوانات مطلق العنان بھی ہیں جن کا کوئی جوڑا نہیں ہوتا۔ صرف انسان اس مادی کائنات میں ذی عقل و ہوش مند ہونے کی وجہ سے شرعاً مکلف ہے۔ گزشتہ آیت میں زنا اور دواعی زنا کی ممانعت کر دی گئی تھی، مگر نوعِ انسانی کے تسلسل کے لئے مرد و عورت، قران اور صنفی قربت ناگزیر ہے۔ تخم اور زمین کے ملاپ کے بغیر سبزہ پیدا نہیں ہوتا، اس لئے قانونِ ازدواج شریعت نے جاری فرما دیا اور چونکہ عمرانِ انسانی کی کثرت اور دنیا کی آبادی اسلامی تعلیم کا مقصد ہے اس لئے ہر اس شخص کو نکاح کی ترغیب دی جس کا جوڑا نہ ہو خواہ مر گیا ہو یا طلاق وغیرہ کے سبب چھوٹ گیا ہو تاکہ نسلِ انسانی منقطع نہ ہو۔ فطری اور طبعی طور پر بھی ہر آدمی کے اندر قوتِ شہوانیہ کا مخفی خزانہ موجود ہے اور بھوک و پیاس کی طرح اقتضائے صنفی بھی اضطراری ہے اور چونکہ اسلام دینِ فطرت ہے، اس لئے فطری تقاضا کی بیخ کنی کا حکم اس نے نہیں دیا بلکہ ایک قانون کے تحت میں اس کو داخل کر دیا جو مصالح عامہ کے لئے مفید اور عمرانِ بشری کے لئے سود مند ہے۔ اسلام سے پہلے عرب میں زنا کے علاوہ صنفی قربت کی اور بھی متعدد صورتیں تھیں جن کو بلا نام نکاح کہا جاتا تھا ورنہ حقیقتاً وہ عیش پرستی کے مختلف مظاہر تھے۔ نکاحِ ضیزن، نکاحِ لبتایا، نکاحِ متعہ وغیرہ۔ اسلام نے صرف موجودہ ازدواجی شکل کا نام نکاح رکھا اور صاف حکم دے دیا کہ جن کا جوڑا نہ ہو ان کا شرعی جوڑا کر دو خواہ آزاد ہوں یا باندی غلام، مفلس ہوں یا دولت مند، مجرد ہوں یا رنڈوے۔ اگر انتہائی افلاس کے سبب کوئی شخص نکاح نہ کر سکتا ہو تو چند روز پاک دامنی کے ساتھ صبر کرے، مگر جس وقت استطاعت ہو جائے اس وقت نکاح کر لے۔ باندی اور غلام پر چونکہ آقا کی شرعی خدمت لازم ہے، اس لئے ازدواجی زندگی کے فرائض وہ آسانی انجام نہیں دے سکتے۔ دو فرضوں کی بیک وقت ادائیگی سخت دشوار ہے، اس لئے وہ بیچارے سخت مجبوری کے سبب نکاح سے قاصر رہتے ہیں۔ قرآن نے ان کی آزادی کے لئے ایک تمثیل بیان کر دیا کہ اگر وہ رفتہ رفتہ اپنے عوض مقررہ رقم اپنے آقا کو ادا کر دیں تو ان کی جان چھوٹ سکتی ہے اور وہ آزاد ہو کر ازدواجی زندگی بسہولت بسر کر سکتے ہیں۔ اس لئے اگر مالک و مملوک دونوں راضی ہوں تو باہم معاہدہ کتابت ہو سکتا ہے۔ جاہلیت کے زمانہ میں لوگوں نے قربتِ صنفی کو شکمِ پُری اور حصولِ زر کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ ایک شخص کے پاس چند باندیاں ہوتی تھیں اور وہ ان کو حرام کاری پر مجبور کرتا تھا اور عصمت فروشی کی اجرت خود لیتا تھا۔ اس زمانہ میں بھی غیر مسلم حکومت کے اکثر شہروں میں یہ پیشہ موجود ہے کھلے خزانے قیصر بازار عفت پاشیاں اور لذت فروشیاں ہو رہی ہیں۔ خاندانوں کے خاندان تباہ ہو رہے ہیں۔ لاکھوں افراد کی رگوں میں اس حرام کی آمدنی کا خون دوڑ رہا ہے۔ گوشت پوست، ہڈی پٹھا، عصمت، حسن سب اسی اجرتِ خبیثہ کی پیداوار ہے۔ نسلیں حرام کی ہیں، زندگیاں حرام کی ہیں اور موتیں حرام کی ہیں۔ قرآن نے قدرتی قانون کی اس شکست سے روکا، حد اعتدال سے آگے بڑھنے کی ممانعت کی، فراخی اور دیوثی کی واضح لفظوں میں بندش کی اور صاف کہہ دیا کہ باندیوں سے کمائی کمانی اور عصمت فروشی کرا کے اجرت لینی جائز نہیں، تو آزاد عورتوں کی عصمت فروشی تو بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہے۔

کل آیات کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ قوتِ شہوانیہ کو مطلق العنان چھوڑ دینا جس طرح ناجائز ہے اسی طرح فطری اقتضاء کو ملیامیٹ کرنا اور صنفی تعلقات کے تخیل کو چھوڑ کر سادھو بدھو بن جانا بھی حرام ہے۔ درمیانی درجہ پر قائم رہنا اور اعتدالِ شرعی کے ساتھ قوتِ شہوانیہ کا استعمال لازم ہے۔

تحلیلِ اجزاء وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ اس جملہ میں تین الفاظ ہیں۔ ہم ہر لفظ کی توضیح کرتے ہیں (۱) اَنْكِحُوا یعنی نکاح کی اجازت دے دو یا نکاح کرانے کی کوشش کرو۔ یہ خطاب اولیاء اور سرپرستوں کو ہے کہ تم بالغ عورتوں اور مردوں کو نکاح کرنے سے نہ روکو۔ امام شافعی وغیرہ نے اس سے ثبوت پیش کیا ہے کہ کوئی عورت بغیر شرعی سرپرست کی اجازت کے نکاح نہیں کر سکتی ورنہ سرپرستوں کو نکاح کرانے کا حکم دینے کے کوئی معنی نہیں۔ اسی مضمون کی تائید مختلف احادیث سے ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ جو عورت بغیر اپنے سرپرست کی اجازت سے نکاح کرے اس کا نکاح باطل ہے باطل ہے باطل ہے (اخرجہ ابوداؤد والترمذی) حضرت ابوموسیٰ اشعری نے فرمایا تھا لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ۔ یعنی بغیر ولی کے نکاح نہیں ہو سکتا (رواہ ابوداؤد والترمذی) امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جوان آزاد عورت اپنے نکاح کی خود مختار ہے۔ بغیر اذن ولی کے اپنا نکاح کر سکتی ہے۔ ہاں اگر اس نے غیر کفو میں نکاح کیا ہے جس سے پورے خاندان کی ذلت ہوتی ہو تو اس کا ولی نکاح فسخ کرا سکتا ہے۔ رہی آیت تو اس کا مفہوم وہ نہیں جو امام شافعیؒ نے سمجھا۔ نکاح کرا دو یا نکاح کرانے کی کوشش کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نکاح کرانے کا اختیار صرف اولیاء ہی کو ہے بلکہ اس سے رسمِ جاہلیت کی بندش مقصود ہے۔ اسلام سے قبل عرب کے باشندے اپنے رشتہ دار رانڈ بیوہ عورتوں کا نکاح نہ ہونے دیتے تھے جہاں وہ خود چاہتے

بیٹھ کراتے تھے نہ چلنے دیتے تھے نہ کراتے تھے۔ رشتہ دار بیوہ کے نکاح کا اختیار انہوں نے اپنے ہاتھوں میں رکھا تھا گویا عورتیں جانوروں سے زائد اختیار نہ رکھتی تھیں۔ قرآن نے ان کو حکم دیا کہ عورتوں کا نکاح کراؤ یعنی نکاح جائز سے ان کو نہ روکو بلکہ نکاح کرانے کی کوشش کرو۔ اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ نکاح کرنے کا اختیار عورت کو خود نہیں ہے۔ پھر ایک اور آیت میں حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ آیا ہے نکاح کرنے کی نسبت عورت کی طرف ہے۔ اگر عورت کو اپنا نکاح کرنے کا اختیار نہ ہوتا تو حسب قاعدۂ زبان تَنْكِحَ نہ ہوتا بلکہ تُنْكَحَ کہا جاتا۔ پھر اَيَامٰى کا لفظ چونکہ مردوں اور عورتوں سب کو شامل ہے، اس لئے اگر اس آیت سے بیوہ یا نا کتخدا عورتوں کے نکاح کا اختیار سرپرستوں کے لئے ثابت کیا جاتا ہے تو لازم آتا ہے کہ مجرد مردوں کے نکاح کا اختیار بھی ان کے سرپرستوں ہی کو ہو خود ان کو نہ ہو۔ حالانکہ یہ بات باجماع اہل سنت غلط ہے۔

(۲) اَيَامٰى یہ لفظ اَيِّمٌ کی جمع ہے۔ ابو عمرو اور کسائی نے صراحت کی ہے کہ اہل لغت ایم اس عورت کو کہتے ہیں جس کا شوہر نہ ہو خواہ وہ دوشیزہ ہو یا بیوہ ہو یا مطلقہ ہو۔ ابو عبیدہ نے لکھا ہے کہ اس لفظ کا اکثر استعمال عورت پر ہوتا ہے۔ مرد پر اطلاق مجازاً ہوتا ہے لیکن جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ اَيِّم کا اطلاق عورت اور مرد دونوں پر ہوتا ہے جس مرد کی بیوی نہ ہو خواہ نکاح ہی نہ ہوا ہو یا طلاق دے دی ہو یا مرگئی ہو اس کو اَيِّم کہتے ہیں۔ جس کا شوہر نہ ہو خواہ نکاح نہ ہوا ہو یا شوہر مرگیا ہو یا طلاق دیدی ہو۔ آیت میں عام معنی ہی مراد ہیں۔

(۳) مِنْكُمْ اس سے مراد ہے مسلمان ہونا۔ یعنی جو مرد اور عورتیں تم میں سے ہوں۔ مراد یہ کہ مسلمان ہوں اور تنہا ہوں اور ان کا جوڑا نہ ہو تو ان کا جوڑا لگا دو۔

ایک امر تحقیق طلب یہ ہے کہ آیت میں جو نکاح کا حکم ہے یہ حکم وجوبی ہے یا استحبابی ہے یا کس قسم کا ہے؟ شیخ ابن کثیر نے صراحت کی ہے کہ علماء کے ایک گروہ کے نزدیک نکاح کرنا واجب ہے بشرطیکہ نکاح کی قدرت ہو، نان نفقہ دے سکتا ہو، حقوق زوجیت ادا کر سکتا ہو کیونکہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ۔ اے گروہ جوانان تم میں سے جس میں نکاح کی طاقت ہو وہ نکاح کرے کیونکہ نکاح سے (حرام) نظر کی بندش اور شرمگاہ کی حفاظت بخوبی ہو جاتی ہے۔ (متفق علیہ)

ایک اور حدیث میں آیا ہے جب تم سے وہ شخص جس کے دین اور خلق کو تم پسند کرتے ہو نکاح کی درخواست کرے تو نکاح کردو ورنہ زمین پر بڑا فتنہ و فساد ہوگا۔ (رواہ النسائی و ابن ماجہ)

امام ابو حنیفہ، امام مالک اور اکثر علماء کے نزدیک نکاح سنت مؤکدہ ہے اور قریب بوجوب ہے لیکن قدرت اور طاقت شرط ہے اور اگر مغلوب الشہوۃ ہو کہ زنا میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو واجب ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے نکاح کو سنت قرار دیا تھا اور پھر فرمایا تھا جو شخص میری سنت سے روگردان ہو گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔ یعنی اس کا مجھ سے کچھ تعلق نہیں۔ ایک اور صحیح حدیث میں آیا ہے لوگو! ایسی عورتوں سے نکاح کرو جن میں کثیر النسل ہونے کی قابلیت ہو اور نسل بڑھاؤ کیونکہ میں تمہاری (کثرت) سے گزشتہ امتوں پر فخر کروں گا۔

خطیب نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو میری فطرت چاہے وہ میری سنت اختیار کرے اور میری سنت نکاح ہے۔ ایک اور حدیث ہے کہ جس کے پاس نکاح کے قابل مال ہو اور وہ نکاح نہ کرے تو ہم میں سے نہیں ہے۔ امام شافعی وغیرہ کے نزدیک حکم نکاح بطور اباحت و جواز کے ہے۔ زائد سے زائد یہ کہ مستحب ہے۔ چونکہ امام ابو حنیفہ نکاح کو عبادت بلکہ ایک قسم کا جہاد کہتے ہیں، اس لئے سنت مؤکدہ ہونے کے قائل ہیں اور امام شافعی ایک عرفی معاملہ خیال کرتے ہیں، اس لئے جواز یا استحباب کے قائل ہیں۔

تنبیہ اگر جوش شہوت سے آدمی مجبور ہو جائے اور نکاح کی کوئی صورت نمودار نہ ہو تو خصی ہو جانا یا کافور وغیرہ کھا کر شہوت کو مردہ کرنا جائز نہیں۔ حدیثیں اس کی ممانعت آئی ہے بلکہ روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ صاف صراحت ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ جو نکاح نہ کر سکے اس پر روزے رکھنا لازم ہیں۔ اس سے شہوت کو شکست ہو جاتی ہے۔

وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ۔ یعنی نکاح کردو اپنے مسلمان غلام اور باندیوں کے بغرض اس امر کے کہ باندی کا نکاح غلام سے کرا دو یا آزاد مرد سے اسی طرح غلام کا نکاح آزاد عورت سے کرا دو یا باندی سے۔ صالحین سے مراد ہیں مسلمین یعنی مسلمان باندیوں اور غلاموں کا نکاح کرا دو۔ اس جگہ صالحین کی قید ذکر کی اور آزاد مرد و عورت کا نکاح کرانے میں اس قید کو ذکر نہیں کیا کیونکہ وہاں مِنْكُمْ فرما دیا تھا جس سے صاف ظاہر تھا کہ مسلمان ہی مراد ہیں اور باندی غلام کا غیر مسلم ہونا بھی ممکن تھا کیونکہ بہت سے صحابیوں کے پاس غیر مسلم مملوک تھے، اس لئے صالحین (مسلمین) کی شرط لگانی ضروری تھی، اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ صالحین سے پرہیزگار اور متقی ہی مراد نہیں ہیں بلکہ صرف مسلمان ہونا مراد ہے۔ بعض اہل تفسیر نے صالحین سے مراد وہ غلام باندی لئے ہیں جن میں نکاح کی صلاحیت ہو یعنی بالکل سادہ لوح یا بہت کمسن نہ ہو۔

اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ نکاح سے روکنے والی چیز سب سے زیادہ ناداری ہے۔ مفلس کے پاس جب اپنے گزران کے لئے کچھ نہیں تو بیوی کا بارکس طرح اپنے سر لے سکتا ہے اور غریب کے ساتھ کون (اپنی) بہن بیٹی کا نکاح کرنا گوارا کر سکتا ہے۔ یعنی ناداری میں مبتلا دنیا کا بیشتر حصہ ہے۔ دولت مند مرفہ الحال طبقہ تو ابنائے انسانی کا پانچواں حصہ بھی نہیں ہے۔ اگر فقر و افلاس کو عدم نکاح کا عذر قرار دیا جائے گا اور ظاہری اسباب معاش کی فراہمی پر ازدواجی زندگی کو موقوف رکھا جائے گا تو نظام عالم تباہ ہو جائے گا۔ عافیت اور امن کی زندگی اہل عالم کو نصیب نہ ہو گی فسق و فجور اور بدکاریاں پھیل جائیں گی کیونکہ اقتضائے صنفی کو پورا کرنا فطرت انسانی ہے۔ جائز ذرائع میسر نہ ہوں گے تو ناجائز حدود کے اندر داخل ہونا یقینی ہے۔ اسی لئے آیت مذکورہ میں صراحت فرما دی کہ فقر و افلاس کو نکاح سے مانع قرار نہ دو، جذبۂ عفت پیش نظر رکھو غنی کرنے والا اللہ ہے۔ آج کا افلاس کل کو مالداری سے بدل سکتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے فرمایا لوگو! اللہ نے جو تم کو نکاح کا حکم دیا ہے اس کی تعمیل کرو۔ اس نے جو تونگر کرنے کا تم سے وعدہ کیا ہے وہ اپنے وعدہ کو پورا کرے گا۔ ابن مسعود رضؓ نے آیت مذکورہ تلاوت کر کے فرمایا لوگو! نکاح میں تونگری کو تلاش کرو۔ بغوی اور سیوطی نے بھی حضرت عمر فاروق رضؓ کا قول اسی مضمون کا نقل کیا ہے حضرت ابوہریرہ رضؓ سے مرفوع روایت ہے کہ اللہ پر تین شخصوں کی مدد کرنے کا حق ہے۔ ایک وہ نکاح کرنے والا جس کی نیت (شہوت رانی کی نہیں بلکہ) پاک دامن رہنے کی ہو۔ دوسرا وہ مکاتب جس کی نیت ادا کی ہو۔ تیسرا راہ خدا میں جہاد کرنے والا (رواہ احمد والترمذی والنسائی وابن ماجۃ) سیوطی نے حضرت عائشہ رضؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے۔ عورتوں سے نکاح کرو وہ تمہارے پاس مال لائیں گی یعنی اللہ غیب سے تم کو مال دار کر دے گا (وقد رواہ البزار والدارقطنی وابوداؤد ووقفہ مرسلاً عن عروۃ مرفوعاً)

حاصل کلام یہ ہے کہ اگر کوئی نکاح اس جذبہ کے تحت کرے گا کہ اس کی عفت و پاک دامنی باقی رہے تو اللہ اس کو تونگر کر دے گا۔

وَلۡیَسۡتَعۡفِفِ الَّذِیۡنَ الخ بعض باندی غلام ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے آقا کسی طرح ان کو نکاح کی اجازت نہیں دیتے۔ بعض آزاد عورتیں بھی ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی کم عمری یا بدصورتی کے سبب کوئی ان کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، اسی طرح بعض مرد بھی ایسے ہوتے ہیں کہ فقیری بے سروسامانی یا بدصورتی یا کسی اور سبب سے اپنی بہن بیٹی کا نکاح کوئی شخص ان کے ساتھ کرنا گوارا نہیں کرتا۔ اس صورت میں نکاح کی کوئی صورت نہیں بنتی۔ آیت مذکورہ میں ایسے لوگوں کو ہدایت فرما دی کہ اگر نکاح کی کوئی صورت نہ بن پڑے تو پاک دامنی کو ضائع نہ کرنا، کوشش کر کے عفت کو برقرار رکھنا جب تک کہ اللہ اپنے فضل سے موانع کو دور کر کے کام پورا نہ کر دے یعنی اگر بالفعل نکاح کی کوئی صورت ممکن نہیں ہوتی تو یہ یقین نہ کر لینا کہ کبھی نکاح ہو ہی نہ سکے گا، اس لئے حرام کی طرف نیت نہ کرنا۔ اللہ ضرور موانع دور کر دے گا اور اپنے فضل سے کام پورا کر دے گا۔

وَالَّذِیۡنَ یَبۡتَغُوۡنَ الۡکِتٰبَ۔ مکاتبت کا مطلب یہ ہے کہ آقا اپنے غلام یا باندی کو اس شرط پر آزاد کر دے کہ ایک مقررہ مدت کے اندر تم کما کر کے اتنا روپیہ مجھے دے دو اور غلام باندی اس کو قبول کر لے تو جس وقت مقررہ رقم پوری ہو جائے گی آزادی کامل ہو جائے گی۔ اسلام سے پہلے بھی اس کا دستور تھا اور اسلام نے بھی اس کو جاری رکھا بلکہ ترغیب دی۔ خطیب نے لکھا ہے کہ حویطب بن عبدالعزیٰ کے غلام نے جب حویطب سے مکاتبت کی درخواست کی اور حویطب نے انکار کر دیا تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ حویطب نے سو دینار پر غلام کو مکاتب کر دیا اور بوقت وصول دس اشرفیاں چھوڑ دیں صرف نوے وصول کیں۔ یہ غلام جنگ حنین میں شہید ہوا۔

اگر غلام مکاتب بننے کا خواستگار ہو تو آقا پر مکاتب بنانا واجب ہے یا نہیں؟ اور آیت میں حکم وجوبی ہے یا استحبابی؟ اس کے متعلق علماء میں اختلاف ہے حضرت عمر فاروق رضؓ، ابن عباس رضؓ، عکرمہ، عطاء، مسروق، ضحاک، عمرو بن دینار وغیرہم سے وجوب کی روایت ہے۔ ابن جریر نے بھی اس قول کو پسند کیا ہے۔ کیونکہ حضرت انس رضؓ کے غلام سیرین نے جب حضرت انس رضؓ سے کتابت کی درخواست کی اور انس نے انکار کر دیا تو سیرین نے جا کر حضرت عمر رضؓ سے استغاثہ کیا۔ فاروق اعظم نے انس رضؓ سے فرمایا اس کو مکاتب کر دو۔ انس رضؓ نے جب بھی انکار کیا تو حضرت عمر رضؓ نے انس کے درہ مارا اور فرمایا فَکَاتِبُوۡهُمۡ اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِیۡهِمۡ خَیۡرًا۔ غرض حضرت انس رضؓ نے سیرین کو مکاتب کر دیا (رواہ ابن جریر) امام شافعی ابتداءً وجوب کے قائل تھے، مگر آخر میں رجوع کر لیا اور فرمایا حدیث میں آیا ہے۔ لَا یَحِلُّ مَالُ امۡرِءٍ مُّسۡلِمٍ اِلَّا بِطِیۡبِ نَفۡسٍ یعنی کسی مسلمان آدمی کا مال بالجبر لینا حلال نہیں، اس لئے بالجبر کتابت کرانا بھی جائز نہیں۔ کتابت کا حکم صرف استحبابی اور مستحسن ہے۔ امام مالک رحؒ، امام ابوحنیفہ رحؒ، سفیان ثوری، عبدالرحمن بن زید اور زید بن اسلم وغیرہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ رہا حضرت عمر رضؓ کا حضرت انس رضؓ کو انکار کتابت پر درے مارنا۔ اس سے وجوب ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ حضرت انس رضؓ جلیل القدر صحابی اور حضور اقدس کے خاص خادم تھے، دین کے پیشوا تھے، دولت مند تھے۔ ایسے شخص کا استحبابی مسنون حکم سے بلاوجہ انکار کرنا حضرت عمر رضؓ کو ناپسند ہوا اور آپ نے کوڑا مار دیا۔

کتابت کی شرطیں

خطیب نے لکھا ہے کتابت کی چار شرطیں ہیں:- (۱) آقا خود مختار ہو، حسن سلوک کرنے کا اس کو اختیار حاصل ہو یعنی بچہ اور دیوانہ نہ ہو۔ (۲) غلام میں عقد کتابت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہو یعنی بچہ اور دیوانہ نہ ہو (۳) باہمی رضامندی سے عقد کتابت ہو جائے خواہ تحریری ہو یا زبانی (۴) عوض مالی ہو۔ امام شافعی رحؒ کے نزدیک بدل کتابت کی ادائیگی قسط وار ہونی چاہیئے۔ کم از کم دو قسطیں ہونی لازم ہیں۔ امام ابوحنیفہ رحؒ کے نزدیک قسط وار ادائیگی ہو یا بغیر قسط دونوں

صورتیں جائز ہیں۔ آیت میں اس کی کوئی تفصیل نہیں جس طرح ہو جائے ویسی ہی تکمیل کرنی چاہیئے۔

اِنۡ عَلِمۡتُمۡ فِیۡہِمۡ خَیۡرًا۔ مجاہد، حسن، عطار، ضحاک، طاؤس اور مقاتل کے نزدیک خیر سے مراد مال ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ کا قول بھی ایک روایت میں اسی طرح آیا ہے۔ بعض کے نزدیک حرفہ پیشہ اور کمائی کی صلاحیت مراد ہے۔ نخعی کے نزدیک سچائی اور امانت داری اور دین داری مراد ہے۔ ماحصل تمام اقوال کا قریب قریب ہے۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ غلام میں امانت و دیانت اور سچائی کے ساتھ مال پیدا کرنے کی صلاحیت ہو اس کو کوئی پیشہ آتا ہو یا تجارت وغیرہ میں شعب ہو تو مکاتب کرنا چاہیئے تاکہ ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں سے بھیک مانگتا پھرے اور مانگ مانگ کر بدل کتابت کرے یا مکاتب ہونے کے بعد بے کچھ کمائے بیکار بیٹھا رہے بدل کتابت ادا کرنے کے بدلے میں آزاد ہونے اور بالآخر غلامی کی طرف رجوع کرنا پڑے۔ اس طرح مکاتب بنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔

وَّاٰتُوۡہُمۡ مِّنۡ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیۡۤ اٰتٰىکُمۡ۔ اس آیت کا مطلب دو طرح سے بیان کیا ہے۔ اول یہ کہ جب مکاتب کرو تو کچھ مال غلام کو دے دو تاکہ وہ تجارت کر کے بدل کتابت ادا کر سکے۔ دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ جو بدل کتابت طے ہو جائے بوقت ادا کچھ اس میں تخفیف کر دو۔ مثلاً خود پہلے قیمت قرار پائی اور پانچ قسطوں میں ادا کرنا طے ہوا تھا ایک قسط چھوڑ دو۔ حضرت عمرؓ نے جب اپنے غلام ابو امیہ کو مکاتب بنایا اور ابو امیہ نے پہلی قسط ادا کر دی تو آپ نے وہ روپیہ لوٹا کر غلام کو دے دیا اور فرمایا اس کے ذریعہ سے بدل کتابت ادا کرنے میں مدد لو۔ ابو امیہ نے عرض کیا اگر آپ آخری قسط معاف کر دیتے تو بہتر تھا۔ فرمایا شاید مجھے وہ وقت میسر نہ آئے۔ اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ چوتھا قیمت معاف کر دینا بہتر ہے۔ نسائی نے اسی مضمون کی روایت نقل کی ہے، لیکن امام مالک نے ابن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ کم از کم ساتواں حصہ ضرور معاف کر دینا چاہیئے۔ یہ دونوں مطلب اس صورت میں ہوں گے جب آیت کا روئے خطاب آقاؤں کی طرف ہو اور اگر عام مسلمانوں کو مخاطب قرار دیا جائے تو معنی میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ مکاتب کی مدد کریں، جہاں تک ممکن ہو بدل کتابت ادا کرانے میں مکاتب کی امداد کریں اور مسلمانوں کے بیت المال سے بدل کتابت ادا کیا جائے۔ یہ قول امام ابو حنیفہؒ کا ہے اور پر لطف ہے۔ ابراہیم نخعی، بریدہ اسلمی اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ ابن عباسؓ نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔

تنبیہ اسلام پر حملہ کرنے والوں اور قوانین اسلام کو حریت سوز ثابت کرنے والوں کو آیت مذکورہ سے اپنی غلطی پر متنبہ ہونا چاہیئے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام حریت سوز نہیں بلکہ حریت نواز ہے۔ انسداد غلامی میں جتنا اسلام کا ہاتھ ہے کسی اور مذہب کا نہیں۔ اسلام نے عام مسلمانوں کو وجوبی حکم دیا ہے کہ آزاد کرانے میں حصہ لو اور جہاں تک ممکن ہو سکے اس کی کوشش کرو۔

وَلَا تُکۡرِہُوۡا فَتَیٰتِکُمۡ عَلَی الۡبِغَآءِ۔ اسلام سے پہلے عرب کا دستور تھا کہ اپنی چھوکریوں اور باندیوں کو کمائی پر مجبور کرتے تھے۔ ہر باندی پر روزانہ کی رقم مقرر کر دیتے تھے اور اس طرح اپنی باندیوں کی خرچی کھاتے تھے۔ جس کی باندیاں کمائی کرنے والیاں زیادہ ہوتیں اتنی ہی اس کی شہرت اور عزت ہوتی اور وہ فخر کرتا۔ اگر کسی باندی کے حمل قرار پا جاتا تو مفت کا بچہ ہاتھ آتا اور وہ بھی مملوک قرار پاتا اور اگر وہ کسی سردار یا معزز آدمی کے نطفہ سے ہوتا تو وہ شخص زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر بچہ کو لے جاتا اور اس طرح خواہ مخواہ بچہ ہاتھ آتا۔ اسی قسم کے دلّالوں میں سے ایک عبد اللہ ابن ابی بن سلول منافق بھی تھا اس کی چھ باندیاں تھیں جن کی خرچی کھاتا تھا۔ معاذہ، عمرہ، مسیکہ، امیمہ، اروی، قتیلہ۔ جب زنا کی حرمت کا حکم ہو گیا اور مسلمانوں نے ہر قسم کی فحاشی سے کنارہ کشی کر لی تو حرام کاری کا بازار بھی سرد پڑ گیا۔ اکثر باندیوں نے بھی توبہ کر لی، مگر ابن ابی حرکات شنیعہ سے باز نہ آیا اور باندیوں کو زناکاری پر بدستور مجبور کیا۔ غالباً مسیکہ اور امیمہ نے پیشہ وری سے انکار کر دیا۔ ابن ابی نے ان کو مارا۔ انہوں نے حضرت ابو بکرؓ سے شکایت کی اور حالت کا اظہار کیا۔ آپ نے باندیوں کو ابن ابی کے قبضہ سے نکال لینے کا حکم دے دیا۔ یہ واقعہ مختلف آثار اور روایات سے ثابت ہے ہم نے مختصر نقل کر دیا۔ اکثر اہل تفسیر کا قول ہے کہ آیت مذکورہ ابن اُبی ہی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ اِکۡرَاہ کے معنی ہیں مجبور کرنا۔ عرف عام میں مجبوری کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ کسی کے ہاتھ پاؤں باندھ دئیے جائیں اتنا مارا جائے کہ جان کا خطرہ ہو جائے جان لینے کی ایسی سخت دھمکی دی جائے جس کے وقوع کا یقین ہو جائے۔ یہ سب صورتیں اکراہ کی ہیں۔ البتہ معمولی زدو کوب، ڈانٹ ڈپٹ اور سخت سست کہنا، کسی قسم کی جسمانی یا روحانی تکلیف دینی، لباس و غذا میں کمی کر دینی وغیرہ اکراہ کے حکم میں داخل نہیں ہو سکتیں۔

اِنۡ اَرَدۡنَ تَحَصُّنًا۔ بظاہر آیت کا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ اگر باندیاں عفت کی خواستگار رہیں تو ان کو زنا پر مجبور نہ کرو اور اگر خود پاک دامن نہ رہنا چاہیں تو زنا پر مجبور کر سکتے ہو، مگر یہ مفہوم غلط ہے۔ بات یہ ہے کہ اکراہ کا تحقق ہی اس وقت ہو گا جب وہ خود عفت کی خواہش مند ہوں۔ اگر وہ خود طالب عصمت نہ ہوں اور نفس فروشی کرنی چاہیں تو مجبور کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس لئے ارادۂ عفت کی شرط واقعی ہے۔ چونکہ حرمت زنا کے حکم کے بعد بعض باندیاں عفت کی خواہش مند تھیں اور ان کے آقا ان کو زناکاری پر مجبور کرتے تھے، اس لئے اظہار واقعہ کے طور پر فرما دیا کہ اگر باندیاں عفت فروشی نہ کرنی چاہیں تو ان کو زنا پر مجبور نہ کرو۔

غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ دیکھو جس آقا نے اپنی باندی کو زنا پر مجبور کیا۔ اور بالجبر اس سے یہ ناشائستہ حرکت کی تو اللہ اس کی ناشائستگی کو معاف فرمادے گا اس پر کچھ گناہ نہ ہوگا۔ ابن عباس رض، مجاہد، قتادہ، اعمش، حسن بصری، زہری، زید بن اسلم اور ابن مسعود وغیرہ مفسرین نے یہی مطلب بیان کیا ہے۔ ابن مسعود وابن عباس رض نے یہ کہا کہ اس حالت کا گناہ آقا پر ہوگا۔ مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ امت محمدیہ کی بھول چوک اور مجبوری معاف ہے۔

وَمَثَلًا مِّنَ الَّذِیْنَ خَلَوْا ۔ یعنی گزشتہ اقوام کی جو حالت ہوئی، احکام خداوندی کی مخالفت کی جو پاداش ان کو ملی اللہ نے عبرت اندوزی اور نصیحت پذیری کے لئے اس کو بیان فرمادیا۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ قرآن پاک میں تین امور ہیں۔ کچھ احکام ہیں جو راہ اعتدال بتلانے والے، اصلاح کو ظاہر کرنے والے اور حق کو باطل سے ممتاز کرنے والے ہیں۔ کچھ گزشتہ افراد و اقوام کے واقعات ہیں جن کو نصیحت پذیری اور عبرت اندوزی کے لئے ذکر فرمایا ہے اور اجمالی طور پر کل قرآن ان فکر والوں کی ہدایت کا سرچشمہ ہے جن میں حق پذیری اور باطل پرستی سے روگردانی کا مادہ موجود ہے جن کا نور فطرت اور ضیائے عقل افسردہ نہیں ہے۔ حضرت علی رض نے فرمایا اس قرآن میں تمہارے باہمی تعامل کے احکام ہیں اور گزشتہ لوگوں کے انجام کار کی خبر ہے اور آئندہ واقعات کا قطعی فیصلہ ہے۔ اس میں حل لگی اور بھول نہیں ہے جس سرکش نے اس کو چھوڑا اللہ نے اس کی کمر توڑی اور جس نے اس کے سوا دوسرے سے ہدایت چاہی اللہ نے اس کو گمراہ کیا۔

مقصود بیان

اسلام فطری مذہب ہے۔ تمدن بشری اور انسانی آبادی کو بڑھانے کا حامی ہے، اس لئے بوقت ضرورت اس نے نکاح کو واجب قرار دیا ہے اور عام حالات میں بشرط استطاعت نکاح کی ترغیب دی ہے۔ اس سے دو مسائل مترشح ہوئے اوّل یہ کہ ترک دنیا کے قوت شہوانیہ کو بالکل ختم کرنے کے لئے سنیاسی بنیاسی بن جانا اور سادھو بن کر ازدواجی زندگی سے کنارا کش ہو جانا جائز نہیں۔ دوسرے یہ کہ ضبط تولید کی کوئی ترکیب استعمال کرنی اور بندش نسل کی کوشش کرنی ناجائز ہے یہ فطرت کے خلاف ہے اور مقصود نکاح اس سے فوت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بے محل تعلقات مثلاً کسی عورت کا عورت سے اور مرد کا مرد سے یا خود اپنا جوہر ضائع کرنا یہ تمام صورتیں تعلیم شریعت کے خلاف ہیں۔ اقتضائے فطری کو پورا کرنے کی شرعی صورت صرف نکاح صحیح ہے۔ بیوہ عورتوں یا ناکتخدا بالغ مردوں اور عورتوں کے نکاح کی کوشش کرنی ضروری ہے۔ ان کو جائز مستحسن نکاح سے روکنا ناجائز ہے۔ فقر و غنا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ نکاح کا ترجیحی معیار اس کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ صلاح و دینداری ترجیحی معیار ہے۔ عام طور پر جو مشہور ہے کہ روزی بیوی کی تقدیر سے ہوتی ہے اس میں کسی قدر صداقت ہے۔ کیونکہ آیت میں نکاح کرنے پر غنی کرنے کا وعدہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے عورت اپنی روزی خود لے کر آتی ہے بلکہ نکاح سے مرد کی روزی میں بھی برکت پیدا ہو جاتی ہے۔ عقد کتابت کی اسلام نے انتہائی ترغیب دی ہے۔ گویا مطلب یہ ہے کہ باندی غلام کو آزاد کرو۔ انسانوں کو جانوروں کے دائرہ سے نکالو۔ اگر مفت آزاد نہیں کر سکتے ہو اور اس قدر مالی نقصان کو ناقابل برداشت سمجھتے ہو تو معاوضہ کی شرط پر آزاد کر دو، لیکن طے شدہ معاوضہ میں سے کچھ چھوڑ دینا اور معاف کر دینا بنظر نیکی ضروری ہے۔

زنا تیغ فی قرمساقی اور عصمت فروشی کی کمائی کھانی حرام ہے۔ باندیوں کو زنا پر مجبور کرنا اور پیشہ کرانا ناجائز ہے تو آزاد عورتوں کو پیشہ ور بنانا بدرجہ اولی ناجائز ہے وغیرہ۔

اللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِیْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ

اللہ آسمانوں کا اور زمین کا نور ہے اُس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہو طاق کے اندر ایک چراغ وہ چراغ ایک شیشہ میں ہو وہ شیشہ ایک

كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّیٌّ یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَیْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِیَّةٍ وَّلَا غَرْبِیَّةٍ ۙ یَّكَادُ

چمکتے ہوئے ستارے کی طرح معلوم ہوتا ہو اور وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے روشن ہوا اور (وہ) درخت نہ مشرق کی طرف ہو نہ مغرب کی طرف ہو اور ایسا

زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ؕ یَهْدِی اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ

سا تیل قریب ہے کہ اشتعال ہو اگرچہ اُس کو آگ نہ چھوئے روشنی پر روشنی ہے اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کی راہ دکھاتا ہے اور

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

لوگوں کو (سمجھانے کے) لئے مثالیں　بیان کرتا ہے　اور اللہ　ہر چیز سے　واقف ہے

تفسیر

ہوشمند عارف کا مقصود اس دنیا میں صرف یہ ہے کہ کائنات کی واقعی حقائق و کیفیت کا علم حاصل کر کے رب کائنات کی معرفت تک پہنچ جائے تاکہ اس طریقے سے اپنے اصل مرکز سے مل جائے، جو قطرہ سمندر سے نکلا ہے پھر سمندر میں گم ہو جائے اور تمام اعتباری وجود اعتباری افکار کو جذب کر کے اپنے وجود حقیقی کے حقیقی نور کے ساتھ پیوستہ ہو جائیں۔ حکماء اور فلاسفر بھی اسی دھن میں اپنی طویل اور بیش قیمت زندگیاں گزار کر چل دیئے اور انبیاء علیہم السلام بھی خالق سے مخلوق انسانی کو ملانے کے لئے تشریف لائے اور سب نے حسب مرتبہ اپنے اپنے زمانہ میں روشنی پھیلائی۔ آخر میں ہمارے نبی کریم صلوٰۃ اللہ علیہ وسلامہ بھی بڑا ثقالہ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں وحی خفی اپنی سنت کی جگمگاتی شمعیں لے کر آئے۔ قرآن نے خوابیدہ اور راہ گم کردہ نسل انسانی کو بیدار کیا اور سیدھا راستہ دکھایا اور حکمت و معرفت کی تعلیم دی۔ قرآنی حکمت کوئی نئی حکمت نہیں۔ اس میں وہی جوہر قدیم نمایاں ہے جس کی تلاش میں عقلائے سلف سرگرداں رہے تھے۔ سب سے پہلے قرآن نے الٰہیات کے ایک عظیم الشان مبحث کی تعلیم دی یعنی مبدا، و معاد کے متعلق صحیح درس دیا۔ عالم کو حادث مسبوق بالزمان اور متغیر قرار دیا اور صحیح معاد کا صحیح سبق دیا۔ تناسخ ارواح اور معاد روحانی کا ابطال کیا۔ حشر نشر جسمانی اور عذاب ثواب مادی ثابت کیا۔ الٰہیات کی اس تعلیم کے ساتھ ساتھ امور عامہ (الٰہیات کی ایک عظیم الشان بحث) کی بھی ضروری بحث کی۔ اللہ کی توحید اس کی ذات صفات، ملائکہ کا وجود اور غیبی طاقتوں کے تصرفات و تعلقات کی تفصیل کی۔ الٰہیات کی تعلیم کے بعد حکمت عملیہ کی کامل ترین بحث بہت ہی تفصیل و توضیح سے ظاہر فرمائی۔ اخلاق، معاشرت، سماج، مدنیت، سیاست غرض حکمت عملیہ کی ہر شاخ کو تشریح و توضیح کے ساتھ بیان کیا ایسے مسائل و قوانین کی تعلیم دی جو امن عالم، اصلاح انسانی اور عمران بشری کے لئے سود مند تھے۔ تباہی انگیز فساد آفرین اور امن سوز حرکات سے منع کیا۔ اس کے بعد طبعیات، فلکیات و عنصریات سے بھی قدرے بحث کی، مگر صوری اور مادی تحقیقات کو غیر مفید اور غیر ضروری سمجھ کر چھوڑتے ہوئے صرف فاعلی اور غائی مباحث کا انکشاف کیا۔ کائنات کی کیا شکل ہے۔ کیا اجزائے ترکیبی کیا ہیں، ترتیب عالم کس طرح ہے؟ ان مباحث سے کنارہ کشی کی۔ صرف یہ بتلایا کہ ان کا خالق کون ہے۔ انسان کی تخلیق سے عالم کو کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ لیل و نہار کا تبدل تغیر کن منافع کو حامل ہے۔ ابر کا اٹھنا، مینہ کا برسنا، ہواؤں کا چلنا، سبزہ کا اگنا، غلہ کا پیدا ہونا، درختوں کا بار ور ہونا، جانوروں کا زمین پر پھیلنا کیا فائدہ رکھتا ہے؟ گویا حقائق کو چھوڑ کر مقاصد کو ظاہر کیا اور ماہیت سے کنارہ کش ہو کر سانیت کو بیان فرمایا۔ رہے ریاضی کے مباحث مساحت حساب، جبر و مقابلہ، اقلیدس، ہندسہ وغیرہ تو ان مباحث کو عقل انسانی پر چھوڑ دیا۔ کیونکہ اول تو ان میں سے زیادہ تر فنون کو عقل انسانی قطعی اور یقینی طور پر خود جانتی ہے حساب اقلیدس اور مساحت کے اصول اختلافی نہیں بلکہ تمام عقلاء کے نزدیک ایک ہی ہیں ان فنون میں عقل بشری غلطی نہیں کرتی۔ دوسرے معرفت الٰہیہ میں ان کو براہ راست کوئی خاص دخل بھی نہیں ہے۔ اس لئے اذہان اہل علم پر ان فنون کے اختراع، بحث اور تفتیش کو چھوڑ دیا۔ قرآنی تعلیم میں کیا حکمت کی تعلیم میں بھی سب سے مشکل اور دشوار بحث اللہ کی ذات و صفات کی ہے۔ تمام الٰہیات بلکہ طبعیات، فلکیات اور عنصریات کی بناء اسی بحث پر ہے۔ اللہ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ کہاں ہے؟ اس کی قدرت کیسی ہے؟ علم کیسا ہے؟ تصرف کس طرح ہے؟ ارادہ کیونکر ہے؟ یہ تمام سوالات ہر ہوشمند اپنے دماغ میں مسلسل پاتا ہے حکمائے سابقین نے اس میدان میں خوب گھوڑے دوڑائے، مگر کوئی غار و خندق میں جا گرا، کسی کے ہاتھ پاؤں راستے ہی میں ٹوٹ گئے، کوئی منزل کے رخ سے ہٹ کر دوسری طرف چل دیا۔ ایک عارف نے خوب کہا ہے ؎

دریں ورطہ کشتی فرو شد ہزار　　　که پیدا نہ شد تختہ بر کنار

اللہ کی حقیقت کسی مخلوق کی سمجھ میں نہیں آسکتی واجب و ممکن کا فرق ہے۔ قدیم و حادث کا فرق ہے۔ آمر و مامور، خالق و مخلوق اور غنی و محتاج کا فرق ہے، مجرد و مادی کا امتیاز ہے۔ قرآن نے جا بجا اللہ کی توحید و ربوبیت و الوہیت پر زور دیا ہے صفات کی پاکی اور تقدس کو بیان کیا ہے۔ قرآن کا بیشتر حصہ اسی تعلیم سے بھرا ہوا ہے، مگر ہر جگہ صفات ہی کو بیان کیا ہے اور ذات کو بحیثیت صفات کے ہی روشناس کرایا ہے، لیکن ذہن انسانی بہت مطلق العنان واقع ہوا ہے۔ قوت واہمہ اور نفس ناطقہ کی جگہ پاؤں روک کر بیٹھنا گوارا نہیں کرتے۔ وہ ذات کو ذات کی حیثیت سے حل کرنا چاہتے ہیں اور حقیقت ذات کے متعلق سوالات کرتے ہیں، مگر اس کی تشریح بتمامہ تو ناممکن ہے تاہم تسلی و تشفی کے لئے ظاہری الفاظ کا جامہ پہنا کر کسی قدر ممکن ہے۔ اسی تشریح کو آیات مذکورہ اپنے اندر لئے ہوئے ہیں اور اہل طبقہ کو دعوت فکر دے رہی ہیں جس کو ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں:۔

ذرہ ہو یا آفتاب، قطرہ ہو یا سمندر، زمین ہو یا آسمان، فرش ہو یا عرش مگر حقیقی سب کا ممال ہے۔ سب ایک حرکت میں مشغول ہیں۔ محسوس غیر محسوس اور نیم محسوس

کائنات تغیر تبدل اختلاف رد و بدل اور تلون سے خالی نہیں ہے۔ تمام عالم کے مادہ میں ہر وقت لہریں، موجیں اور فطری بے تابیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک تاج فلیبی پوشیدہ طاقت ان کے پردوں کے اندر چھپی ہوئی ہے جو ہر وقت کائنات کے مادہ میں طوفانی لہریں پیدا کر رہی ہے اگر اس سربستہ قوت کو ان کے اندر سے نکال لیا جائے تو کچھ نہ رہے۔ تاریک ہو یا نورانی کثیف ہو یا لطیف، ٹھوس اور جامد ہو یا سیال اور متحرک۔ سب کے اندر یہی غیبی فطرت کار فرما ہے اس کو لوگ مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ کوئی پرماتما اور روح کائنات کہتا ہے کوئی نور السموٰت والارض کہتا ہے، کوئی وجود حقیقی اور علۃ العلل کہتا ہے۔ یہ نور خود بھی اتنا روشن ہے کہ عقول کائنات کی آنکھیں اس کو دیکھنے سے چندھیا جاتی ہیں۔ کوئی ذہنی نگاہ اس پر ٹھہر نہیں سکتی اور انکشاف فطری کے کوئی معنی نہیں جب کہ وہ خود ہی نظر کی روشنی اور بصیرت ذہنی کی ضیاء ہے۔ جس نظر میں وہ نہیں وہ نظر نہیں جو بصیرت اس سے خالی ہو وہ بصیرت نہیں۔ وہ نور مطلق، ضیائے بسیط اور بہائے کائنات ہے خود بھی باوجود انتہائی پوشیدہ ہونے کے اس قدر ظاہر ہے کہ شدت ظہور کے سبب خفاء کے انتہائی پردوں کے اندر چھپا ہوا ہے اور تمام کائنات کی روشنی بھی اسی سے ہے وہ بے ہمہ ہے مگر باہم بھی ہے۔ ظاہر بھی ہے باطن بھی ہے، اول بھی ہے آخر بھی ہے خود ہی عالم ہے خود ہی عالم ہے خود ہی معلوم ہے نور ہے، نور پاش ہے اور صاحب نور ہے۔ اس کی کوئی ہیئت نہیں، کیفیت نہیں، صورت نہیں، مقدار نہیں، مساحت نہیں، رنگ نہیں بو نہیں۔ وہ واحد ہے مگر عدد سے خارج قدیم ہے مگر قدم سے بالاتر۔ الفاظ کا ایر پھیر اس کی حقیقت کو ظاہر نہیں کر سکتا۔ وہی وجود حقیقی ہے اور تمام اعتباریات ہیں۔ رگوں میں خون دوڑتا ہے رگیں تڑپتی ہیں۔ خون کو قوت دوڑاتی ہے۔ قوت میں کار فرما روح طبعی یا روح نفسانی یا روح حیوانی کی ہوتی ہے اور ان مادی روحوں پر عام روح انسانی کا تصرف ہوتا ہے، لیکن تمام ارواح کائنات ایک روح بسیط ازلی ابدی لم یلد ولا یزال کے زیر اثر ہیں نہ فقط زیر اثر ہیں بلکہ سب ارواح کی روحانیت اور ہر نور کی نورانیت اسی روح مطلق کا نام ہے۔ اسی کی جلوہ پاشیاں اور ضیاء ریزیاں اور لمعہ آفرینیاں ہیں۔ مختلف مظاہر ہیں، اشکال ہیں، صورتیں ہیں، کیفیتیں ہیں، مگر ظہور مطلق بے شکل بے صورت اور بے کیفیت ہے وہ نہ جسم ہے نہ جسمانی نہ مادہ نہ مادی نہ جوہر نہ عرض نہ قوت نہ فعل اس کو ظاہر کرنے والے جتنے الفاظ ہیں سب مجازی ہیں یہی اللہ ہے۔

نور خداوندی در حقیقت ہر تمثیل و تشبیہ سے پاک ہے۔ ہر قسم کے بیان محاکات سے منزہ ہے، لیکن سمجھانے اور دماغوں میں یک گونہ جلا پیدا کرنے کے لئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح کسی محراب یا طاقچہ کے اندر.... چراغ ہو اور چراغ میں بہترین قسم کا تیل ہو، اتنا بہترین کہ بغیر آگ لگائے ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اب روشن ہو جائے گا یہی حالت نور خداوندی کی ہے۔ اس مطلب کی توضیح کے لئے ہم قدرے تفصیل کرنی چاہتے ہیں۔ تمام عالم انسانی میں علم و ادراک کے چار ہی مراتب ہیں اور ہر مرتبہ کے اعتبار سے نفس انسانی کا جدا نام ہے پہلا مرتبہ بالکل سادگی کا ہے۔ آدمی پیدا ہوتا ہے تو اس کو کوئی علم نہیں ہوتا، مگر علم کی استعداد ضرور ہوتی ہے۔ اس مرتبہ کو عقل ہیولانی یا عقل سادہ کا مرتبہ کہتے ہیں۔ دوسرا مرتبہ علم کا ابتدائی مرتبہ ہے۔ بالکل نمایاں، واضح اور بدیہی چیزوں کا علم ہوتا ہے۔ مگر استعداد ذہنی اور نظری علوم کے حصول کی بھی ہوتی ہے۔ یہ درجہ انسان کو بچپن کی عمر سے آخر عمر تک حاصل رہتا ہے۔ بدیہیات کی سمجھ ہر انسان میں کم و بیش ہوتی ہے۔ آگ کو گرم اور برف کو سرد ہر شخص جانتا ہے۔ رات کو تاریک اور دن کو روشن ہر آدمی سمجھتا ہے (سوا ماؤف الحواس انسان کے) البتہ کم و بیش کا فرق ضرور ہوتا ہے۔ یہ درجہ عقل بالملکہ کا ہے یعنی اس مرتبہ میں نفس انسانی واضح چیزوں کا علم رکھتا ہے۔ ایسی چیزوں کو جانتا ہے جن کو جاننے میں غور و خوض اور فکر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ سوچ بچار کی حاجت نہیں ہوتی، لیکن اس کے ساتھ اس میں ایسی قوت ضرور ہوتی ہے کہ مخفی، غیر واضح اور نظری چیزوں کو سوچ بچار کرنے کے بعد جان لے۔ گویا بدیہیات کا علم اور نظریات کے علم کی استعداد جس مرتبہ میں انسانی نفس کو ہوتی ہے اس مرتبہ کا نام عقل بالملکہ ہے۔ عقل بالملکہ کسی شخص میں اتنی کمزور ہوتی ہے کہ وہ دائرہ حیوانی میں داخل ہونے کے قابل ہوتا ہے۔ سوا ظاہر ترین اشیاء کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھتا۔ کسی چیز میں ذرا اخفا ہوا اور وہ لاعلم ہوا، لیکن کسی شخص میں اتنا ضعف نہیں ہوتا بلکہ وہ معمولی خفاء رکھنے والی چیزوں کو بھی جانتا ہے۔ علیٰ ہذا عقل بالملکہ جب اپنے انتہائی درجہ پر پہنچ جاتی ہے تو تمام بدیہیات کا اس کو علم ہوتا ہے اور نظری علوم کی سوجھ اس طرح ہوتی ہے وہ ایسا مرتبہ ہوتا ہے کہ ادنیٰ فکر تمام نظریات کا انکشاف کر لیتی ہے یقینی امور اگرچہ بالفعل حاصل نہیں ہوتے پوشیدہ حقائق کا علم اگرچہ موجود نہیں ہوتا، مگر ادنیٰ التفات نظر سے ہر قسم کا انجلاء ہو جاتا ہے۔ اسی مرتبہ کو قوت قدسیہ کا درجہ کہتے ہیں جو انبیاء و اولیاء میں ہوتی ہے یہی وہ درجہ ہے جس میں ذرا انگلی دبانے کی دیر ہوتی ہے اور بس۔ بٹن دبا دیا اور تمام کہربائی لہروں اور برقی موجوں نے جگمگا دیا اور کل حقائق کا انکشاف ہوا۔ تیسرا درجہ عقل بالفعل کا ہے اس میں بدیہیات کے علاوہ تمام نظریات بھی حاصل ہوتے ہیں۔ مزید غور و فکر کی ضرورت نہیں ہوتی، مگر ہر وقت تمام نظریات دل و دماغ میں مستحضر نہیں ہوتے۔ غیبی امور کے انکشاف کے لئے التفات نفس کی ضرورت پڑتی ہے۔ قدسیہ توجہ عالم بالا کی طرف کرنا لازم ہوتی ہے۔ ایک عارف نے سچ کہا ہے ؎

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم   گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

چوتھا مرتبہ عقل مستفاد کا ہے۔ اس مرتبہ میں تمام اشیاء بدیہی ہوں یا نظری، ظاہر ہوں یا پوشیدہ، نفس کے سامنے حاضر رہتی ہیں التفات نفس کی بھی ضرورت نہیں رہتی

یہ درجہ فنافی اللہ کا ہے۔ اس مرتبہ میں پہنچ کر آدمی آدمی نہیں رہتا، ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ عقل و خرد سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور قطرہ دریا میں مل کر اپنی ہستی کو فنا کر دیتا ہے۔
مذکورۂ بالا تشریح سے واضح ہو گیا کہ نفس انسانی کے چار مراتب ہیں عقل سادہ، عقل بالملکہ، عقل بالفعل، عقل مستفاد اور عقل بالملکہ کی انتہائی ترقی کا نام قوت قدسیہ ہے۔
اب تمثیل مذکورہ کی توضیح دو طرح سے کی جا سکتی ہے۔ اول یہ کہ عقل ہیولانی کے درجہ کو محراب یا طاقچہ سمجھو پھر عقل ہیولانی کے بعد جو عقل بالملکہ کا درجہ آتا ہے اس کو قندیل قرار دو، پھر عقل بالفعل کے درجہ کو چراغ جانو جس کے اندر علوم و معارف کا تیل بھرا ہے۔ آخر میں عقل مستفاد کے درجہ کو چراغ کی روشنی جانو۔ یہی روشنی نور الٰہی ہے جو عقل مستفاد کو روشن کر رہی ہے اور مختلف پردوں کے اندر چھپی ہوئی ہے۔ ابتدائی پردہ عقل سادہ کا ہے پھر عقل بالملکہ کا پھر عقل بالفعل کا پھر عقل مستفاد کا جس طرح چراغ کی روشنی قندیل سے نکل کر طاقچے سے باہر آتی ہے اور آس پاس کی چیزوں کو روشن کرتی ہے اسی طرح نور الٰہی عقول کے پردوں سے پھوٹ کر کل عالم کو منور کر رہا ہے۔
توضیح مثال کی دوسری صورت یہ ہے کہ چونکہ قوت قدسیہ ایسے مرتبہ کا نام ہے جس میں کہربائی کرنٹ ظہور پذیر ہوتا ہے؛ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ طاقچہ یا محراب تو عقل سادہ کا مرتبہ ہے اور بلوریں قندیل عقل بالملکہ ہے۔ اس قندیل میں چمک دمک قوت قدسیہ سے پیدا ہوتی ہے۔ قوت قدسیہ ایسا تیل ہے جس کا تعلق مادی دنیا سے بھی ہے اور مجردات سے بھی۔ یہ ایسے درخت سے حاصل کیا گیا ہے جو نہ شرقی ہے نہ غربی، نہ مجردات سے ہی فقط اس کا تعلق ہے نہ مادیات سے بلکہ یہ ایک درمیانی چیز ہے۔ عالم قدس سے جس نور کا طلوع ہوتا ہے عالم زیریں تک قوت قدسیہ اس کو پہنچا دیتی ہے۔ قوت قدسیہ کو جو چیز روشن کرنے والی ہے اور اس چراغ کے تیل میں جو چیز نورانیت پیدا کرنے والی ہے وہ نور الٰہی ہے تو گویا دو نور ہوئے۔ ایک قوت قدسیہ کا نور دوسرا فیض الٰہی کا نور۔ نور علیٰ نور کے یہی معنی ہیں، لیکن قوت قدسیہ کو روشن کرنے والا نور ہر ایک کو نہیں دیکھتا۔ انبیاء اور اولیاء کا تعلق ذاتِ الٰہیہ سے ہر ایک کو نظر نہیں آتا۔ ہاں جن کی فطری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور جن کی چشم بصیرت میں روشنی ہے وہ دیکھتے ہیں کہ انبیاء اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔ خدا پر غلط اتہام نہیں لگاتے بلکہ ان پر فیضان باری تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہی مطلب ہے اس قول کا کہ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کو دیکھنے کا راستہ بتا دیتا ہے۔ واللہ اعلم وعلمہٗ اتم۔

تحلیلِ اجزاء

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط یہ پوری آیت اتنی نورانی اور واضح ہے کہ شدت ظہور کے سبب انسانی دانش کی آنکھیں اس پر ٹھہر نہیں سکتیں اور عقل بشری کما حقہٗ سمجھنے سے قاصر ہے۔ تاہم عقلائے اسلام اور صحابۂ کرام نے جو کچھ تفسیر و تاویل کی ہے ہم اس کو نقل کرتے ہیں۔
بیضاوی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ نور وہ کیفیت ہے جس کو آنکھ دیکھتی ہے اور اس کی وجہ سے دوسری تاریک چیزیں دکھائی دیتی ہیں جس طرح سورج کی روشنی سے چاند اور دوسرے اجسام روشن ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر نور سے دوسری چیزوں کا انکشاف ہے اور چونکہ یہ کیفیت اقسام عرض میں سے ہے اور عرض ممکن کی قسم ہے اور خدا ممکن نہیں بلکہ واجب ہے، اس لئے نور کا اطلاق خدا تعالیٰ پر حقیقۃً نہیں ہو سکتا بلکہ مجازاً ہوتا ہے۔ نور کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے۔ خطیب اور دیگر علمائے تفسیر نے بھی اسی کی تائید کی ہے اور عام علمائے اسلام نے صراحت کی ہے کہ نور کا حقیقۃً اطلاق خدا تعالیٰ پر نہ کیا جائے، لیکن در حقیقت بیضاوی کو دھوکہ ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ جوالیقی ایسے علماء نے (جو فرقہ مجسمہ کے حامی تھے) صراحت کی ہے کہ اللہ جسم ہے، مگر دوسرے جسموں کی طرح نہیں ہے، وہ نور ہے، مگر دوسرے انوار کی طرح نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں آنکھ کان اور چہرہ وغیرہ سب کچھ ہیں مگر مخلوق کی طرح نہیں اور مجسمہ کا یہ عقیدہ سراسر گمراہی ہے۔ عوام اس سے بآسانی گمراہ ہو جاتے ہیں، اس لئے علمائے اسلام نے صراحت کی ہے کہ نور کا اطلاق خدا پر نہ کیا جائے۔ علماء کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ لفظ نور کا اطلاق خدا تعالیٰ پر مجازاً ہے حقیقۃً نہیں ہے۔ احادیث صحیحہ میں نور کا اطلاق خدا تعالیٰ پر آیا ہے۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ رسول پاکؐ جب رات کو اٹھتے تو فرماتے اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ الخ۔ (متفق علیہ) بعض عوام کو گمراہی اور غلط فہمی سے بچانے کے لئے صحابہ و تابعین اور علمائے متقدمین و متاخرین نے لفظ نور کے مرادی معنی بیان کئے ہیں۔ ابن عباس نے فرمایا اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے یعنی ہادی ہے کیونکہ نور سبب ہدایت ہوتا ہے۔ زجاج اور ضحاک نے فرمایا نور سے مراد ہے مدبر یعنی اللہ آسمانوں اور زمینوں کا بہترین انتظام فرماتا ہے جس طرح شہر کے حاکم اور بادشاہ کو کہتے ہیں کہ وہ شہر کا نور ہے یعنی شہر کی رونق اس کے انتظام سے ہوتی ہے۔ خطیب نے لکھا ہے کہ ابی بن کعب، ابو العالیہ اور حسن بصری نے فرمایا اللہ آسمانوں اور زمینوں کا منور ہے یعنی ان میں نور پیدا کرنے والا اور ان کو روشن کرنے والا ہے۔ سورج، چاند، ستارے، انبیاء، اولیاء، علماء سب اس کا نور ہیں۔ اسی نور سے اس نے عالم کو روشن کیا ہے۔ امام غزالی نے مشکوٰۃ الانوار میں فرمایا تاویل کی کوئی ضرورت نہیں اللہ واقعی نور ہے، نور کا اطلاق خدا پر مجازاً نہیں ہے حقیقۃً ہے۔ غزالی کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ عقل کی بینائی آنکھ کی بینائی سے اعلیٰ ہے۔ آنکھ کی بینائی سے بھی اشیاء کا ظہور ہو جاتا ہے اور عقل کی بینائی سے بھی ظہور ہوتا ہے، مگر عقلی ظہور آنکھ کے ظہور سے قوی اور اشرف ہے، اس لئے عقل کا نور آنکھ کے نور سے افضل ہے۔ عقلی انوار کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ نور ہے جو فطری ہے۔ اگر حواس بدرست جبلی اور کثافت

مادی مانع نہ ہو تو ہر شخص اس کو ادراک کرتا اور جانتا ہے اس نور میں غلطی نہیں۔ اگر عقل سلیم نہیں اور بصیرت کوتاہ ہے اور دانش نابینا ہے تو فطری نور کا حصول ہی نہ ہوگا اور اگر عقل سالم، بصیرت دور رس اور دانش رسا ہے تو نور فطری کا ظہور ہوگا۔ درمیانی درجہ کوئی نہیں۔ دوسرا نور کسبی ہے۔ سوچنے غور کرنے اور سمجھنے کی کوشش کے بعد کسبی نور حاصل ہوتا ہے۔ لیکن سوچنے اور غور کرنے کے طریقے میں غلطی ہو جاتی ہے۔ اس غلطی کو دور کرنے کے لئے ہادی اور مرشد کی ضرورت ہے اور سب سے بڑھ کر ہادی کلام الٰہی ہے، کلام انبیاء اور کلام اولیاء ہے، اس لئے کلام الٰہی اور انبیاء کو بھی نور کہا گیا ہے اور ملائکہ بھی نور ہیں، ان کے اجسام بھی نورانی ہیں۔ یہ سب تو انوار عقلیہ ہیں رہے انوار حسیہ مادیہ تو ان کی دو قسمیں ہیں سفلیہ عنصریہ جیسے آگ کا نور اور علویہ اثیریہ جیسے ستارے، چاند، سورج۔ خلاصہ یہ کہ انوار کی دو قسمیں ہیں، کسبیہ اور فطریہ۔ پھر انوار فطریہ کی دو قسمیں ہیں عقلیہ اور حسیہ۔ پھر عقلیہ کی دو قسمیں ہیں علویہ یعنی ملائکہ اور سفلیہ یعنی انبیاء اور اولیاء۔ اسی طرح انوار فطریہ حسیہ کی دو قسمیں ہیں سفلیہ اور علویہ اور چونکہ تمام انوار عقلیہ و حسیہ ممکن ہیں اور ممکن کا وجود غیر کی طرف سے ہوتا ہے فی نفسہ وہ وجود سے خالی ہوتا ہے، اس لئے یہ تمام انوار اپنی ذات میں وجود سے خالی ہیں اور وجود ہی کا نام نور اور عدم کا نام تاریکی ہے، اس لئے تمام انوار کی نورانیت ذاتی نہیں بلکہ کسبی ہے جو دوسرے نور سے حاصل شدہ ہے۔ واقع میں ذاتی لحاظ سے یہ تمام انوار تاریک ہیں ان میں جو نورانیت معلوم ہوتی ہے وہ ایک نور مطلق بسیط کا پرتو ہے۔ یہی نور مطلق نور حقیقی ہے اور اس کا نام اللہ ہے۔

ایک یہ امر تنقیح طلب ہے کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور کس طرح ہے؟ اور سماوات و ارض سے کیا مراد ہے؟ علماء کے نزدیک بالاتفاق آسمانوں سے مراد ہے علوی موجودات اور بالائی کائنات اور زمین سے مراد ہے سفلی مخلوق اور زیریں عالم۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ اللہ تمام عالم کے لئے نور ہے۔ بالائی کائنات میں دو طرح کا نور ہے، مادی اور روحانی۔ چاند سورج اور ستارے مادی انوار ہیں ان سے تمام علوی اجرام بلکہ سفلی اجسام بھی روشن ہیں۔ روحانی انوار فرشتے اور غیبی نورانی مخلوق ہے جن کا مسکن مختلف آسمان، عرش، کرسی وغیرہ ہیں۔ سفلی نور بھی دو طرح کا ہے مادی اور روحانی۔ مادی نور ظاہری طور پر تو آگ کی روشنی ہے بلکہ ہر پتھر کے اندر جو بجلی کے خزانے موجود ہیں سب انعامات ظاہرہ ہیں، لیکن ہر چیز کے اندر ایک باطنی نور بھی ہے جس کی وجہ سے سفلی کائنات کا نظام قائم ہے۔ ہر عنصر اور مرکبات عنصریہ کو ایک خاص طاقت ملی ہے جس سے آگے بڑھنا ناممکن ہے۔ عناصر مفردہ کے اندر باختلاف انواع خاص خاص طاقتیں ہیں جن سے ان کی عنصریات باقی ہیں پھر ان عناصر سے جو سب سے پہلے مرکبات ہوتے ہیں ان کے اندر عناصر سے زائد ایک خاص ترکیبی طاقت ہے پھر مرکبات ثانویہ میں مرکبات اولیہ سے بڑھ کر طاقت ہے۔ اسی طرح ترقی کرتے کرتے نوع انسان تک رسائی ہوتی ہے۔ انسان سے نیچے تمام انواع میں ایک نور باطنی مادی ہے جس کے مظاہر اور مقدار ظہور میں تفاوت ہے۔ پتھروں میں بھی ایک خاص قوت ہے جو ان کے اجزاء کو منتشر نہیں ہونے دیتی۔ سبزہ میں بھی علاوہ قوت جمادیہ کے ایک خاص قوت ہے جس کے ذریعہ سے نمو ہوتا ہے۔ جانوروں میں بھی ایک خاص قوت ہے جس کے ذریعہ سے علاوہ نمو کے احساس ہوتا اور ارادی حرکت ہوتی ہے۔ سب سے بلند درجہ انسان کا ہے۔ اس کے اندر بھی ایک خاص قوت ہے جس کو حواس کی تیزی کہا جاتا ہے۔ یہ تمام قوتیں انوار مادیہ ہیں۔ مادی انوار کے علاوہ اسی سفلی عالم میں انسان کو ایک روحانی نور بھی ملا ہے جس کے ذریعہ سے سوچ بچار اور غور و فکر کرتا، حق و باطل اور خیر و شر میں امتیاز کرتا اور صحیح نتیجہ پر پہنچتا ہے۔

عالم بالا اور عالم زیریں کے تمام انوار مادیہ ہوں یا روحانیہ، ظاہرہ ہوں یا باطنہ ایک نور خاص کے پرتو ہیں۔ تمام انوار کی نورانیت اسی غیبی نور سے ہے۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے یہی معنی ہیں۔

مَثَلُ نُوْرِهٖ۔ اوپر کی تقریر سے واضح ہو گیا کہ اللہ خود تمام عالم کا نور ہے۔ اگر اس سے مراد حقیقت ہو (غزالی اور دیگر اہل تحقیق کا یہی قول ہے) تو مَثَلُ نُوْرِهٖ میں نور سے مراد نورانیت ہوگی یعنی اللہ خود حقیقتاً نور ہے اور اس نور کی نورانیت کو بطور تمثیل اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے اور اگر نور کا اطلاق خدا تعالیٰ پر مجازاً ہو یعنی یہ مراد ہو کہ اللہ صاحب نور ہے تو مَثَلُ نُوْرِهٖ میں نور سے نورانیت مراد لینے کی ضرورت نہیں۔ ہماری اس تقریر سے وہ شبہ رفع ہو گیا جو مَثَلُ نُوْرِهٖ کے لفظ کے متعلق ہو سکتا تھا، شبہ یہ ہو سکتا تھا کہ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے اللہ کا نور ہونا ثابت ہوتا ہے اور مَثَلُ نُوْرِهٖ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ خود نور نہیں بلکہ اس کا نور اس کی ذات سے جدا چیز ہے کیونکہ نُوْرِهٖ کا لفظ قواعد عربی کے لحاظ سے مضاف اور مضاف الیہ ہے اور یہی بدیہی بات ہے کہ مضاف اور مضاف الیہ میں تغایر ضروری ہے، اس لئے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ کا نور اللہ کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔

بہرحال نور الٰہی سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ جمہور اہل کلام کے نزدیک نُوْرٌ سے مراد ہدایت ہے یعنی اللہ کی ہدایت ظاہر و مظہر ہونے میں شفاف صاف چراغ کی روشنی کی طرح ہے۔ حسن بصری، سفیان بن عیینہ اور زید بن اسلم کے نزدیک مراد قرآن ہے۔ عطاء کا قول ہے کہ رسول اللہ کی ذات گرامی مراد ہے۔ اُبی بن

کعب اور ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نور سے وہ نورِ ایمان مراد ہے جو ہر مومن کے دل میں ہوتا ہے یعنی نورِ ایمان۔ غزالی کے نزدیک قوتِ عقلیہ، قوتِ فکریہ اور قوتِ قدسیہ مراد ہے۔ کعب احبار کہتے ہیں نورِ نبوت محمدیہ مراد ہے۔ ابن عباسؓ کے قول کی تائید اس حدیثِ مرفوع سے ہوتی ہے جو امام احمد نے بروایت ابو سعید خدری نقل کی ہے اور ابن کثیر نے اس کو صحیح الاسناد لکھا ہے (اگرچہ اصحاب ستہ نے اس کو روایت نہیں کیا) حضورؐ نے فرمایا:- القلوب اربعۃ قلب اجرد فیہ مثل السراج یزھر، وقلب اغلف مربوط علی غلافہ وقلب منکوس وقلب مصفح۔ فاما القلب الاجرد فقلب المؤمن سراجہ فیہ نورہ واما القلب الاغلف فقلب الکافر واما القلب المنکوس فقلب المنافق عرف ثم انکر واما القلب المصفح فقلب فیہ ایمان ونفاق ومثل الایمان فیہ کمثل البقلۃ یمدھا الماء الطیب ومثل النفاق فیہ کمثل القرحۃ یمدھا الدم والقیح فای المدتین غلبت علی الاخریٰ غلبت علیہ۔ یعنی دل چار قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قلب اجرد یہ مومن کا دل ہوتا ہے نورِ الٰہی (ایمان) اس میں چراغ کی طرح روشن ہوتا ہے۔ دوسرا قلبِ اغلف جو (جہالت وکفر کے) غلاف میں لپٹا ہوتا ہے تیسرا قلب منکوس (اوندھا قلب) یہ منافق کا دل ہوتا ہے جو جاننے کے بعد انکار کرتا اور نادان ہوتا ہے۔ چوتھا قلب مصفح (ٹیڑھا دل ہے) اس میں نفاق بھی ہوتا ہے اور ایمان بھی۔ قلب مصفح میں ایمان کی حالت تو ایسی ہوتی ہے جیسے سبزہ جو پاکیزہ پانی سے بڑھتا ہے اور نفاق کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی پھوڑا (جو خون اور کچلہو سے بڑھتا ہے۔ اب جو قوت بڑھ کر ہوگی وہی غالب آجائے گی (خواہ ایمان ہو یا نفاق)

كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ الخ۔ کعب احبار نے اس تمثیل کا خلاصہ یہ لکھا ہے کہ مشکوٰۃ سے مراد ہے حضورِ اقدسؐ کا سینہ اور زجاجہ سے مراد ہے نبوت اور شجرۂ مبارکہ ملتِ ابراہیمی ہے جو شرقی ہے نہ غربی۔ بلکہ اس کا فیضانِ نبوت سب کے لئے برابر ہے تیل کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ گویا بھڑکنے کا مادہ اس میں تیار ہے۔ قریب ہے کہ بغیر آگ لگائے وہ جل اُٹھے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ حضورِ اقدسؐ اپنے کمالاتِ نبوت کا منہ سے اظہار فرمائیں یا نہ فرمائیں، مگر نورِ نبوت خود مظہر ہے۔ اکثر لوگ دیکھتے ہی آپؐ کی غیر معمولی قدسی صفت کے قائل ہو جاتے ہیں۔ نور پر نور کے یہ معنی ہیں کہ ایک تو نورِ ابراہیمی پہلے ہی سے منتقل ہوتا چلا آتا تھا۔ دوسرا خود حضورِ گرامیؐ کا نور تھا۔ تمام مفسرین نے تمثیل کا خلاصہ بالکل ظاہری الفاظ کے مطابق اس طرح لکھا ہے کہ فرض کرو ایک طاقچہ ہے جس میں شیشہ کا قندیل ہے، قندیل کے اندر چراغ ہے، چراغ میں زیتون کا صاف تیل بھرا ہوا ہے۔ یہ تیل ایسے درخت سے لیا گیا ہے جو کھلے ہموار میدان کا ہے نہ شرقی کنارہ پہ ہے جس کو ایک طرف سے دھوپ نہ لگے نہ غربی کنارہ پہ ہے کہ دوسری طرف سے دھوپ نہ لگے۔ چونکہ ایسا درخت بہت سرسبز مضبوط اور پختہ ہوتا ہے، اس لئے اس کے پھل کا تیل بھی نہایت اچھا ہوگا۔ یہی حالت خدا کے نور کی ہے۔ نورِ الٰہی مومن کے ایمانی تیل کو اس کے قلبی چراغ میں روشن کر رہا ہے جس کا پرتو چاروں طرف پھیلتا ہے۔

لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ابن عباسؓ، ابن کثیر اور اکثر مفسرین نے شرقی غربی نہ ہونے کا مطلب یہ لکھا ہے کہ وہ درخت کھلے میدان یا پہاڑ کی چوٹی پر تنہا کھڑا ہے۔ ادھر ادھر کوئی درخت یا آڑ نہیں۔ نہ شرقی سمت کو مائل ہے کہ اس کو چڑھتی دھوپ کی شعاعیں نہ پہنچیں نہ غربی سمت میں ہے کہ آخر دن میں دھوپ اس پہ نہ پڑے۔ نہ غار میں ہے نہ نشیبی مقام میں۔ ایسا درخت مضبوط، تناور اور پختہ ہوتا ہے اور اس کا تیل بھی نفیس ہوتا ہے۔ عکرمہ، مجاہد، سعید بن جبیر اور اکثر تابعین نے یہی مطلب بیان کیا ہے۔ ابو العالیہ نے حضرت ابی بن کعب کا قول اس طرح بیان کیا ہے کہ شرقی غربی ہونے سے مراد ہے آفتاب کی تمازت سے محفوظ رہنا اور حالتِ اعتدال پہ قائم رہنا مومن کی بھی یہی حالت ہوتی ہے اس پر کتنے ہی مصائب آئیں وہ ثابت قدم رہتا ہے اس کے استقلال میں کمی نہیں آتی۔

نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ۔ مجاہد نے کہا اس سے مراد ہے آگ کا نور اور تیل کا نور۔ سدی نے کہا جس طرح آگ اور تیل کا نور ساتھ ساتھ ہوتا ہے اسی طرح مومن کے ایمان کا نور اور قرآن کا نور ملا ہوا ہوتا ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا پہلے نور سے مراد ہے مومن کے ایمان کا نور اور دوسرے نور سے مراد ہے عمل صالحہ کا نور۔ ہمارے نزدیک جو مطلب نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ کا ہے وہ ہم نے اوپر لکھ دیا۔

يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ امام احمد نے بروایت عمرؓ بیان کیا ہے کہ حضورِ اقدسؐ نے ارشاد فرمایا اللہ نے اپنی مخلوق کو تاریکی میں پیدا کیا پھر اس پہ نور پاشی فرمائی۔ لہٰذا جس کو اس کے نور کا کوئی حصہ اس روز ملا ہے۔ اس نے راہِ راست اختیار کی اور جس کو اس کے نور کا کوئی حصہ نہیں ملا وہ گمراہ رہا۔

مقصودِ بیان اللہ نور ہے یعنی تمام عالم اپنی ذات وحقیقت کے اعتبار سے تاریکی ہے اور تاریکی عدمِ نور کا نام ہے۔ لہٰذا تمام کائنات ذاتی لحاظ سے معدوم ہے جس طرح چراغ کا نور تاریکیوں میں پھوٹتا ہے اسی طرح ہدایتِ الٰہیہ کا نور شبہات وتوہمات کی اندھیریوں کو چیر کر باہر نکلتا ہے اور جس طرح نور ظلمت پہ غالب آتا ہے اسی طرح حق وہدایت کو باطل وگمراہی پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اور جس طرح تاریکی تہ بہ تہ ہوتی ہے اور اس کے مختلف پردے ہوتے ہیں۔ اسی طرح کفر وضلالت کی تاریکی مختلف انواع کی ہوتی ہے اور نفس وشیطان طرح طرح کی تاریکیوں میں انسانی قلب کو لے جانا چاہتا ہے۔ مومن کا دل مظہرِ نورِ الٰہی ہے، خانۂ خدا ہے،

شیشۂ نورانی ہے۔ یہی وہ درمیانی کڑی ہے جس کا تعلق جسم سے بھی ہے اور اخلاق جسم سے بھی۔ اس (ا) عالم بالا سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ایسی روشنی ہے کہ بغیر کسی مزید فیضان کے مشتعل معلوم ہوتا ہے۔ پس نصیحت حاصل کرنی چاہیئے اس گمراہ طبقہ کو جو روشنی کی تلاش میں تاریکی کی طرف دوڑتا ہے، ہدایت کی جستجو میں گمراہی میں پناہ لیتا ہے۔ اپنے اندر کے مخزون انوار کو چھوڑ کر باہر کی اندھیریوں میں سرگرداں پھرتا ہے۔ آیت قرآنیہ دعوت غور دے رہی ہے اور مراقبۂ نفس کی طرف بلا رہی ہے۔ دوسری جگہ قرآن نے صاف فرمایا ہے وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ نور الٰہی تمہارے دلوں میں موجود ہے تم کو دکھائی کیوں نہیں دیتا۔ مگر اللہ جس کو چاہتا ہے اپنا نور دکھا دیتا ہے، ہر نابینا کو روشنی نہیں دکھتی، اندرونی روشنی کو دیکھنے کے لئے بیرونی روشنی کی بھی ضرورت ہے۔ جس طرح بیرونی روشنی بغیر اندرونی روشنی کے نظر نہیں آتی۔ آنکھوں میں نور ہو تو باہر کا اجالا بھی دکھتا ہے۔ شریعت کی روشنی کے بغیر نور الٰہی نہیں دکھتا۔ قرآن کی اور سنت کی شمع کی روشنی قلبی روشنی کے دریافت کرنے کے لئے لازم ہے۔ یَہۡدِی اللّٰہُ لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ سے اسی طرف اشارہ ہے وغیرہ۔

فِیۡ بُیُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنۡ تُرۡفَعَ وَ یُذۡکَرَ فِیۡہَا اسۡمُہٗ ۙ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیۡہَا بِالۡغُدُوِّ وَ الۡاٰصَالِ ﴿ۙ۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ

جن مقامات کے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے کہ اُن کی تعظیم کی جائے اور اُن میں اُس کا نام ذکر کیا جائے اُن مقامات میں صبح و شام کچھ لوگ ایسے خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں جن کو

لَّا تُلۡہِیۡہِمۡ تِجَارَۃٌ وَّ لَا بَیۡعٌ عَنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَ اِیۡتَآءِ الزَّکٰوۃِ ۪ۙ یَخَافُوۡنَ یَوۡمًا

اللہ کی یاد کرنے اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے سے نہ کوئی سوداگری روکتی ہے نہ خرید فروخت اُن کو اُس دن کا خوف لگا رہتا ہے

تَتَقَلَّبُ فِیۡہِ الۡقُلُوۡبُ وَ الۡاَبۡصَارُ ﴿٭ۙ۳۷﴾ لِیَجۡزِیَہُمُ اللّٰہُ اَحۡسَنَ مَا عَمِلُوۡا وَ یَزِیۡدَہُمۡ مِّنۡ

جس میں دل اور آنکھیں اُلٹ جائیں گی تاکہ اللہ ان کے بہتر کاموں کی اُن کو جزا دے اور اپنے فضل سے زیادہ بھی

فَضۡلِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾

دے اور اللہ جس کو چاہتا ہے بے شمار روزی دیتا ہے

تفسیر

یوں تو تمام بالائی اور زیرینی کائنات انوار الٰہیہ سے جگمگا رہی ہے نہ کسی مکان کی خصوصیت ہے نہ زمان کی۔ چونکہ وہ نور سرمدی بے کیف ہے، بے رنگ ہے اور بے صورت ہے، اس لئے وہ ہر قید سے آزاد ہے، کوئی پردہ اس کو روک نہیں سکتا، کوئی تاریکی مانع نہیں ہو سکتی، مادی کثافت حائل نہیں ہو سکتی۔ وہ ہر نظر میں ہے، ہر دانش میں ہے، ہر محسوس و غیر محسوس میں ہے، ہر مادی صورت میں ہے۔ ہر مجرد طاقت میں ہے، ماضی و حال میں ہے، استقبال میں ہے بلکہ کوئی ماضی اور استقبال اس کے لئے ماضی و استقبال نہیں۔ ہر زمانہ اس کے لئے حال ہے۔ ہر غیب اس کے لئے شہود ہے۔ ہر قوت اس کے لئے فعل ہے، مگر جس طرح آنکھ کی نظر خود اپنی ذات کو نہیں دیکھ سکتی۔ کیونکہ انتہائی وضوح و ظہور دیکھنے سے مانع ہوتا ہے، اپنی ذات سے بے پردہ ہونا دیکھنے سے روکتا ہے۔ سورج کی روشنی اور دھوپ دیکھی جا سکتی ہے۔ سورج پر نظر نہیں جم سکتی۔ کہربائی لہروں کی جھلکیاں نظر آ سکتی ہیں اصل کرنٹ کو نہیں دیکھا جا سکتا، اسی طرح نور الٰہی کو بے پردہ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ آفتاب قدس کی حقیقت پر کسی دانش و بینش کو قرار نہیں ہو سکتا۔ برق سرمدی کی لمعہ ریزیوں اور نور ریزیوں کے لئے مادی کثافتوں کے پردوں کی ضرورت ہے۔ لیکن ہر تاریکی میں یہ قابلیت نہیں ہوتی کہ روشنی کو جذب کر سکے، ہر آنکھ میں دیکھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، اس لئے خاص آنکھ خاص دل اور خاص بینش و دانش کی ضرورت ہے۔ قلوب مومنین ہی ان جلوہ آفرینیوں کو اٹھانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ اہل معرفت کی آنکھیں ہی اس نور قدس کو دیکھ سکتی ہیں۔ جس کے چہرۂ پرنور کے ستر ہزار حجاب پڑے ہیں اور جس طرح ہر قلب و بصر اس نور جلی کو نہیں دیکھ سکتا۔ اسی طرح ہر جگہ اور ہر وقت بھی اس کی پرتو اندازی نمایاں نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ وہ زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے، مگر کبریائی نور حقیقت کے نمایاں کرنے اور شاہد ازل کا چہرہ دکھلانے کے لئے زمان و مکان کی صلاحیت ضروری ہے۔ دنیوی مکانوں میں بعض مخصوص مکان ہیں جہاں خصوصی پرتو اندازیاں ہوتی ہیں اور جہاں نوری نقاب و حجاب کے چند پردے خصوصیت کے ساتھ اٹھ جاتے ہیں اور اصل چہرہ کی کچھ جھلک نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ مقامات معابد ہیں اور مساجد میں بھی خصوصیت کی طاقت ہے۔ کہیں نور کے نورانی چہرہ سے ایک نقاب اٹھتا ہے کہیں دو کہیں دس کہیں بیس۔ کعبہ ہے،

مسجد نبوی ہے، بیت المقدس ہے، مسجد قبا ہے، آسمان پر بیت المعمور ہے وغیرہ وغیرہ یہاں نور کی نقاب کشائی زیادہ ہوتی ہے اور دوسری مساجد میں کم۔ اسی طرح ہر وقت اور ہر زمانہ بھی ایک حیثیت نہیں رکھتا۔ اگرچہ وہ قید وقت سے آزاد ہے، مگر اوقات زمانہ کی صلاحیتیں یقیناً مختلف ہیں جس طرح مقامات کا تفاوت تھا اسی طرح اجزاء زمانی کا تفاوت ہے۔ صبح شام یا نصف شب یا سحر وغیرہ ظہور نور کے خاص اوقات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اوقات میں کثافت کم ہے یا کوئی اور وجہ ہو بہرحال جلوہ ریزی اور نور آفرینی کے یہ اوقات خاص ہیں۔ اس تقریر کا نشاء یہ نکلا کہ چہرہ نور کو نمایاں کرنے اور برق حقیقت کے کوندا سے دیکھنے کے لئے بعض مقام مخصوص ہیں، اور اوقات مخصوص ہیں۔ اوقات مخصوص ہیں اس کو دیکھنے کے لئے دل مخصوص ہیں آنکھیں مخصوص ہیں۔ مساجد و معابد خصوصیت کے ساتھ مظاہر شہود ہیں۔ صبح و شام کے اوقات خاص طور پر جلوہ آفرینی کے اوقات ہیں یہی وجہ ہے کہ مسجدوں میں صبح و شام کے وقت اہل معارف اپنے تماشا گاہ کو ڈھونڈتے ہیں، شوقین کی آنکھوں اور عارف کا دل انتظار خاص میں ہوتا ہے اور ان کی امیدیں بڑھ جاتی ہیں اور محبوب کے اوصاف بیان کر کے اس کو پکارتے ہیں۔ کبھی نام لے کر آواز دیتے ہیں۔ کبھی جمال ڈھال رعنائی زیبائی ادا اور دوسرے خصوصیات کی رٹ لگاتے ہیں تاکہ ان کا محبوب رحم کھا کر اپنے عاشقوں کی طرف توجہ کرے اور اپنے چہرہ کے نقاب کا کوئی گوشہ اٹھا دے اور یہی سبب ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو ان عاشقوں کی حقیقت کی آنکھیں الٹ پلٹ ہو جائیں گی اور دل مضطرب ہوں گے کہ حسن معشوق کے جمال کی کرن دنیا میں دیکھی تھی ان کی چند شعاعیں یہاں بھی نظر آجائیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

تحلیلِ اجزاء

فِیْ بُیُوْتٍ جمہور مفسرین نے اس کو کلام سابق کا تتمہ قرار دیا ہے یعنی وہ چراغ جو بلوری قندیل میں ہے ان مقامات میں صاف تیل سے روشن کیا گیا ہو کسی گندہ اور ناپاک مکان میں نہ ہو جس کی روشنی صاف باطنوں کی آنکھوں میں بے قدر معلوم ہوتی ہو بلکہ ایسے مکانوں میں ہو جن کو بلند کرنے کا اللہ نے حکم دیا۔ مکانوں سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق چار قول ہیں۔ (۱) بیوت رسول اللہ مراد ہیں (۲) عام مساجد و معابد مراد ہیں۔ بیت المقدس میں خصوصیت کے ساتھ روشنی کی جاتی تھی، اس لئے خصوصیت کے ساتھ یہ مقامات مراد ہیں (۳) مومنوں کے سینے مراد ہیں جن کے اندر قلوب کے چراغوں میں نور ایمان کا تیل روشنی پھیلا رہا ہے۔

اَنْ تُرْفَعَ۔ بلند کرنے سے مراد یا تو عمارت کو بلند کرنا ہے یا عظمت و حرمت کرنا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا زمین پر اللہ کے گھر آسمان والوں کی نظر میں ایسے چمکتے ہیں جیسے زمین والوں کی نظر میں ستارے۔

وَیُذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ۔ ابن عباسؓ کے نزدیک ذکر الٰہی سے مراد تلاوت قرآن ہے یا عام ذکر الٰہی مراد ہے۔

یُسَبِّحُ لَهٗ فِیْهَا۔ علی بن ابی طلحہ کی روایت کے بموجب ابن عباسؓ کے نزدیک غُدُوّ سے مراد فجر کی اور آصال سے مراد عصر کی نماز ہے کیونکہ یہی دونوں نمازیں اوّل فرض ہوئی تھیں۔ ابن عباسؓ کا دوسرا قول ہے کہ غُدُوّ میں نماز چاشت بھی شامل ہے۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ اکثر مفسرین نے تسبیح سے فرض نماز مراد لی ہے۔ غُدُوّ سے مراد تو نماز صبح ہے اور آصال سے ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں ہیں کیونکہ لفظ اَصِیل کا اطلاق ان اوقات پر ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لفظ غدو کو مفرد اور آصال کو بصورت جمع استعمال کیا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک عام تسبیح و تقدیس مراد ہے جس میں فرض نمازیں بھی داخل ہیں۔

رِجَالٌ اس لفظ سے مراد یا تو مرد ہی ہیں۔ اس صورت میں صرف مردوں کے لئے یہ حکم مخصوص ہوگا۔ عورتوں کے لئے جماعت میں حاضر ہونا ضروری نہیں۔ اس مفہوم کی تائید بعض احادیث و آثار سے ہوتی ہے۔ امام احمد کی روایت ہے کہ ابو حمید ساعدی کی بیوی نے عرض کیا یا رسول اللہ میں آپ کے ساتھ نماز پڑھنی پسند کرتی ہوں۔ فرمایا مجھے معلوم ہے کہ تو میرے ساتھ نماز پڑھنی پسند کرتی ہے، مگر تیرے لئے اپنے مخصوص کمرے میں نماز پڑھنی عام کمرے میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور عام کمرے میں نماز پڑھنی احاطہ کے اندر نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور احاطہ میں نماز پڑھنی اپنی قوم کی مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے اور قوم کی مسجد میں نماز پڑھنی میری مسجد میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔ یہ حکم سن کر اس عورت نے اپنی کوٹھری کے ایک گوشہ میں نماز کی جگہ بنالی اور اسی میں نماز پڑھتی رہی۔ حضرت ام سلمہؓ کی مرفوع حدیث ہے کہ عورتوں کے لئے سب سے بہتر مسجد ان کے گھروں کی کوٹھریاں ہیں (رواہ احمد) حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا اب جو عورتوں نے نئی چالیں نکالی ہیں اگر رسول اللہ صلعم اس زمانہ تک ہوتے تو عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے منع کر دیتے جیسے بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کر دیا گیا تھا (رواہ البخاری) خلاصہ یہ کہ عورتوں کا جماعت میں بغیر کسی زینت اور خوشبو کے شریک ہونا اگرچہ جائز ہے مگر قابل مدح نہیں ہے۔ آیت میں مدح و ترغیب صرف مردوں کے لئے ہے یا رجال سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی ہمتوں میں مردانگی ہو۔ خواہ مرد ہوں یا عورتیں۔ ابن کثیر نے یہی معنی لکھے ہیں۔ کیونکہ نماز کے ساتھ ادائے زکوٰۃ کی مدح و ترغیب ہے اور ادائے زکوٰۃ صرف مردوں کے لئے مخصوص نہیں۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ مسجدوں میں تسبیح و تقدیس وہ مردان کامل کرتے ہیں جن کو کوئی تجارت یہاں تک کہ کسی چیز کی فروخت جس میں نقد روپیہ وصول ہوتا اور زیادہ دلکش کے اسباب ہوتے ہیں اللہ کی یاد سے اور نماز ادا کرنے سے اور زکوٰۃ دینے سے نہیں روکتی۔

ابن مسعود نے بازار میں دیکھا کہ جونہی اذان ہوئی کچھ لوگوں نے اپنا تجارتی سامان چھوڑا اور نماز کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ فرمایا یہی ان لوگوں میں سے ہیں جن کے متعلق خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ الخ (رواہ ابن جریر) حضرت ابو درداء نے مسجد کے سامنے ایک اونچی جگہ قیام کیا تھا۔ ایک روز فرمایا میں نے یہاں قیام کیا تھا روزانہ خرید و فروخت کرتا تھا۔ ہر روز تین سو دینار نفع حاصل کرتا تھا۔ ہر وقت مسجد میں نماز کو حاضر ہوتا تھا میں نے یہ چاہا تھا کہ ان لوگوں میں سے ہو جاؤں جن کے حق میں اللہ نے فرمایا ہے۔ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ الخ۔

تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ۔ یعنی وہ مردان خدا اس دن سے ڈرتے ہیں جب کہ ان کے دل مضطرب ہوں گے کہ خدا جانے آج نجات ہو یا ہلاکت اور آنکھیں بھی الٹ پلٹ ہوں گی اندر دائیں بائیں خوف آمیز نظروں سے دیکھیں گے۔ مکمل مطلب ہم تفسیر یا ابو جعفر کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ بظاہر اس آیت کے مفہوم کا تعلق آخرت کی اس جزا سے ہے جو مردان خدا کو ملے گی یعنی اللہ کے نیک بندوں کو قیامت کے دن بے حساب انعام ملیں گے، لیکن ایک شبہ کا ازالہ بھی اس سے ہو سکتا ہے۔ مذکورۂ بالا آیت میں تجارتی کاروبار کو چھوڑ کر اذان سنتے ہی نماز کو چلے جانے کا حکم تھا اور اس سے تجارت کی کمی اور کاروبار کی کمزوری بالکل ظاہر تھی، اس لئے فرمادیا کہ دینے والا تو خدا ہے خدا جس کو چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔ کاروبار اور تجارت رزاق نہیں، اس لئے خدا کی خوشنودی حاصل کرنی اور اس کا فرض ادا کرنا مقدم ہے۔

مساجد کے چند احکام

چونکہ آیت بالا میں مساجد کو بلند کرنے کا تذکرہ آیا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کے احکام مفصل بیان کر دئے جائیں تاکہ غلط فہمی باقی نہ رہے۔ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے مسجد بنائی اور اس میں یاد الٰہی کی اللہ اس کے لئے جنت میں گھر بناتا ہے (رواہ ابن ماجہ عن عمر)

ام المومنین حضرت عائشہ رض کی روایت ہے حضور ﷺ نے حکم دیا ہم کو کہ گھروں میں مسجدیں (نماز کے لئے مخصوص مقامات) بنائیں۔ ان کو پاکیزہ اور خوشبودار رکھیں (رواہ احمد و اہل السنن الا النسائی ومثلہ رواہ احمد و ابو داؤد عن سمرۃ بن جندب)

مسجدوں میں نقش و نگار کرنے اور رنگ برنگ کے پالش کرنے کی ممانعت ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا تھا کہ لوگوں کے لئے ایسی مسجدیں بنانا جس میں سردی گرمی سے حفاظت کی جگہ ہو مگر خبردار سرخ یا زرد رنگ نہ رنگنا اس سے لوگ فتنہ میں پڑ جائیں گے۔

ابن عباس رض کہتے ہیں حضور ﷺ نے فرمایا مسجدوں میں نقش و نگار کرنے کا مجھے حکم نہیں دیا گیا ہے (ابو داؤد عن سمرۃ بن جندب) ابن عباس رض نے فرمایا تم ضرور مسجدوں میں نقش و نگار کرو گے جیسے یہودیوں اور عیسائیوں نے کئے تھے۔

آداب مسجد

حضور ﷺ نے مسجدوں میں خرید و فروخت کرنے اور اشعار پڑھنے سے منع فرمادیا (رواہ احمد و اہل السنن۔ وقال الترمذی صحیح) مسجد کے اندر جنگ جدال، قتال، شور مچانا، جھگڑنا، چھوٹے بچوں کو دیوانوں کو اندر داخل کرنا، سونا اور ناپاک چیزیں اندر لے جانا ممنوع ہے۔ فضول مسجد کے اندر ہو کر گزرنا بھی جائز نہیں، جمعہ کے روز مسجد میں خوشبو لگا کر جانا مسنون ہے۔ دنیا کی باتیں کرنے کی بھی ممانعت ہے۔ کسی قسم کی بدتہذیبی کا مظاہرہ بھی حرام ہے۔

مسجد میں داخل ہوتے وقت حضور اقدس ﷺ یہ دعا کرتے۔ أَعُوذُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ وَبِوَجْهِهِ الْكَرِيمِ وَسُلْطَانِهِ الْقَدِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ (رواہ ابو داؤد عن ابن عمر)

ابو حمید یا ابو اسید کی روایت ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت حضور فرماتے اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِي أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ اور نکلتے وقت فرماتے اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِي أَبْوَابَ فَضْلِكَ۔

ابو ہریرہ کی مرفوع روایت ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت رسول پر سلام بھیجا اور پھر کہو اَللّٰهُمَّ اعْصِمْنِي مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ (رواہ ابن ماجہ وابن خزیمۃ وابن حبان)

مقصود بیان

مساجد کا احترام، تعظیم، تعمیر اور صفائی ضروری ہے۔ مسجد ذکر الٰہی کا مقام ہے یعنی دنیوی باتیں وہاں کرنی ناجائز ہیں صبح اور شام کا وقت خصوصی اوقات میں سے ہے اس میں اللہ کی یاد بہت ضروری ہے۔ سچا مسلمان وہ ہے جس کے پیش نظر خدا کی خوشنودی ہو، دنیا کا کوئی لالچ اس کو یاد الٰہی سے غافل نہ کر سکے، اس کی زندگی خدا کے لئے وقف ہو، ہمہ وقت خدا کا دھیان لگا رہے۔ اذان سنتے ہی تمام کاروبار ختم کر کے مسجد کا رخ کر لینا چاہیئے۔ رازق خدا ہے، کاروبار صرف ظاہری ذریعہ ہے وغیرہ۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً حَتَّىٰ إِذَا جَاءَهُ لَمْ يَجِدْهُ

اور جو لوگ کافر ہیں اُن کے اعمال مثل اُس سراب کے ہیں جو میدان میں ہو کہ پیاسا اس کو پانی خیال کرتا ہو۔ یہاں تک کہ جب اُس کے پاس جاتا ہے تو کچھ نہیں پاتا

شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۗ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۙ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ

اور اللہ کو اپنے پاس موجود پاتا ہے پس اللہ اس کا حساب پورا پورا دیدیتا ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے یا جیسے گہرے سمندر میں کچھ تاریکیاں

لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۗ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۗ اِذَآ

ہوں سمندر کے اوپر لہر پر لہر چھا رہی ہو اور لہر کے اوپر بادل ہو غرض بعض تاریکیاں بعض پر ہوں اگر اُن

اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۗ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝ ع ۵ ۱۱

میں کوئی اپنا ہاتھ نکالے تو سوجھائی نہ دے اور جس کو اللہ ہی نے روشنی دی ہو (اس کے لئے کہیں) روشنی نہیں

تفسیر تمام کائنات ایک خاص حرکت میں ہے خواہ جامد ہو یا متحرک، ذی عقل ہو یا بے عقل، ہوش و خرد کا مالک ہو یا دانش و فرزانگی سے بے بہرہ ایک فطری حرکت سب ہی پائی جاتی ہے اور حرکت کے لئے چھ چیزوں کی ضرورت ہے۔ مبدا جہاں سے حرکت شروع ہوتی ہے۔ منتہیٰ جہاں حرکت ختم ہوتی ہے۔ مسافت جس میں حرکت ہوتی ہے۔ زمانہ جس سے مقدار حرکت معلوم ہوتی ہے۔ غرض حرکت اور حرکت کرنے والا۔ حرکت زندگی سے شروع ہوتی ہے۔ زندگی کا نام حرکت ہے اور انتہا حرکت موت پر ہوتی ہے، لیکن زندہ ہونے سے پہلے کیا تھا اور مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ یہ کائنات کہاں سے آئی ہے اور کہاں کو جا رہی ہے۔ یہ بحث اہل نظر کے مراقبہ نفس کی محتاج ہے۔ میدان حرکت عام لوگ تو میدان زندگی ہی کو جانتے ہیں اور زمانہ حرکت بھی یہی اوقات زندگانی ہیں، عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے، لیکن حرکت کی غرض کیا ہے؟ یہاں سطحی نظر رکھنے والے خاموش ہیں۔ مقصود زندگانی کیا ہے، شکم کی پرستش کرنے والے اور شہوت و غضب کے بندے اس کو نہیں جانتے۔

اس مادی دنیا میں اگرچہ ہر چیز مکلف ہے قانون فطرت پر چلنا ہر ایک کے لئے ضروری ہے ایک ہی نظام کے تحت سب جکڑے ہوئے ہیں۔ ہر ایک قدرت الٰہی کا مسخر ہے، مگر انسان تمام کائنات میں اشرف ہے، اس لئے شرعی تکالیف کا بار اسی پر ڈالا گیا ہے اور اوامر و نواہی کی تکمیل کی ذمہ داری اسی کی گردن پر عائد ہوتی ہے۔ ہر ہوشمند اور باخرد ہونے کے سبب ہر شخص اپنا نتیجہ اور انجام حرکت سوچتا اور سمجھتا ہے، لیکن کسی کی نظر صرف اسی زندگانی تک محدود ہے۔ مادی پردوں سے آگے کچھ نہیں دکھائی دیتا۔ ایسے لوگ تو کھانے پینے اور بچے پیدا کرنے کی کشاکش میں مبتلا ہیں اور ان کی زندگی بہائم کی زندگی ہے۔

ان سے اوپر ایک اور طبقہ ہے جس کی نظر اونچی ہے وہ غور کرتا ہے کہ کہاں سے آیا تھا اور کہاں کو جا رہا ہے۔ اس زندگی کے بعد کسی دوسری زندگی میں پہنچنا ہے۔ وہاں کیا ہوگا؟ راحت و تکلیف سے دوچار ہونا پڑے گا۔ پھر وہاں حصول نجات و راحت کے کیا اسباب ہیں۔ یہ گروہ ہوشمندوں کا ہے، لیکن مبدا و منتہا میں غور کرنے میں بڑا اختلاف ہے۔ افکار و خیالات مختلف ہیں، ذہنی انکشاف جدا جدا ہیں، عقائد و ظنیات علیحدہ علیحدہ ہیں۔ بعض لوگ صحیح درک رکھتے ہیں اور اکثر گمراہ ہیں جو لوگ صحیح علم رکھتے ہیں اور فطرت کے بتائے ہوئے عقائد یعنی شرعی تعلیم کے موافق اپنا یقین رکھتے ہیں وہ حق پر ہیں اور جو اوہام باطلہ کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں ان سے یہ گورکھ دھندا حل نہیں ہوتا۔ حق و باطل کی گتھی ان سے نہیں سلجھتی کسی کو قیامت کا ہی یقین نہیں ہوتا۔ آواگون کو قیامت جانتا ہے، کوئی قیامت کا قائل ہے، مگر حشر جسمانی کو نہیں مانتا، کوئی حشر نشر کو بھی مانتا ہے، مگر خدا کو ربوبیت میں واحد نہیں سمجھتا۔ بتوں کو، دیوتاؤں کو اور باطل معبودوں کو اپنا شفیع یقین کرتا ہے۔ کوئی خدا ہی کو رب جانتا ہے، مگر اس کی توحید بھی شرک آمیز ہے۔ کہیں باپ کا قائل ہے کہیں بیٹے کا، کہیں تثنیہ کا کہیں تثلیث کا۔ غرض عقائد باطلہ کی اندھیریوں سے انسانی دماغوں کی دنیا تاریک ہے اور جب انجام زندگی صحیح معلوم نہیں منزل مقصود غلط قائم کر رکھی ہے تو پھر شاہراہ عمل جس پر اس زندگانی میں گامزن ہے وہ بھی غلط ہی ہوگا۔ اگرچہ قدم فرسائی کا بظاہر بہت کشادہ اندھیرا راستہ دکھائی دیتا ہے، مگر چونکہ اس کا رخ منزل کی طرف نہیں ہے، اس لئے غایت پر پہنچنا ناممکن ہے یہی حال حق و یقین سے روگردانی کرنے والوں کا ہے۔ چونکہ عقائد صحیح نہیں، منزل آخرت کو غلط طور پر سمجھا ہے، اس لئے اس زندگی میں جو اعمال کرتے ہیں یا تو وہ فساد انگیز، تباہی آفریں، انسانیت سوز، امن اور صلاح کو برباد کرنے والے ہوتے ہیں یا بظاہر اچھے معلوم ہوتے ہیں، مگر ان کا رخ ٹیڑھا ہوتا ہے۔ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کو خوش کرنے کے لئے نیکیاں کی جاتی ہیں اور انتہائی کوشش کی جاتی ہے مگر ایسی دوڑ بیکار ہے جو منزل کے رخ کے خلاف ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آب حیات کے پیاسے اس زندگی میں پانی کی تلاش میں گھومتے ہیں اور انہوں نے آب نما سراب کو دیکھ کر یقین کر لیا ہے کہ یہی پانی ہے، مگر وہ پانی نہیں دھوکہ ہے۔ اگرچہ آب و تاب میں پانی سے کم

نہیں، مگر اس زندگانی کی حرکت جب ختم ہوگی اور شاہراہ عمل کی دوڑ ختم ہو کر منزل پر پہنچ جائے گی تو سوا حسرت و یاس کے کوئی نتیجہ نہ نکلے گا اور ابدی ہلاکت سے دوچار ہونا پڑے گا۔ یا وہ گروہ جو عقائد باطلہ اور افکار ظلمانی کی اندھیریوں میں پھنسا ہوا ہے اس کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے جیسے کوئی شخص قعر سمندر کا اندر ہو، اندھیری رات ہو، گھٹا ٹوپ ابر چھایا ہوا ہو، موج پر موج آ رہی ہو، طوفان اٹھ رہا ہو کہ وہ نہ ساحل پر پہنچ پاتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص بالائی تاریکیوں میں بند ہے۔ راہ نجات سوجھنا تو درکنار اس کو اپنا ہاتھ نہیں سوجھ سکتا۔ یہی حال غلط عقیدہ رکھنے والے بداعمال انسان کا ہوتا ہے۔ جہالت کی اندھیری کے اندر پھنسا ہوتا ہے اور ایسی جہالت ہے کہ ناواقف ہوتا ہے بلکہ جہالت کو علم سمجھا ہے، اس لئے تہ بہ تہ جہالت میں بندھا ہوتا ہے اور ظلمانی جہالت کی لہریں اس کے دماغ پر مسلط ہوتی ہیں پھر شہوت و غضب کے گھٹا ٹوپ بادلوں کی اندھیری اس پر مزید ہوتی ہے۔ مادی قوتیں اس کی علمی قوت پر چھائی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان تاریکیوں میں نور فطرت گم ہو جاتا ہے اور گم شدہ نور کو دینے والا کوئی نہیں۔

تحلیلِ اجزاء

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ان آیات میں کافروں کو اور ان کے اعمال کی توضیح کے لئے دو مثالیں دی ہیں۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ پہلی مثال میں تو یہود و نصاریٰ اور منافقوں کی حالت کو واضح کیا ہے۔ یہ تینوں گروہ برائے نام خدا کتاب اللہ اور روز قیامت کے قائل ہیں، عذاب ثواب کو مانتے ہیں اور اسی بناء پر بظاہر عبادت مذہبی اور کار خیر بھی کرنے کے مدعی ہیں، مگر ایمان ان کا بے حقیقت ہے، ان کی توحید خالص نہیں اور ان کے اعمال آخرت میں سود مند نہ ہوں گے جس طرح پیاسے کے لئے سراب نفع بخش اور تسکین دہ نہیں ہوتی۔ یہ لوگ جہل مرکب میں مبتلا ہیں، باطل پرست ہوتے ہوئے اپنے کو پرستار حق جانتے ہیں۔ دوسری مثال ان کافروں کی حقیقت کو واضح کر رہی ہے جو جہل سادہ میں مبتلا ہیں۔ اسلاف کے کورانہ مقلد ہیں، اصنام پرست ہیں، دیوتا پرست ہیں، ستارہ پرست ہیں، عناصر پرست ہیں۔ غرض یہ کہ کھلم کھلا غیر اللہ کی پرستش کرتے ہیں۔ جن کے پاس برائے نام بھی کوئی آسمانی کتاب نہیں۔ یہ لوگ تہ بہ تہ جہالت میں گھرے ہوئے ہیں۔ سمندر کے قعر میں ظلماتی موجوں کے مانند گھٹا ٹوپ ابر کے نیچے پھنسے پڑے ہیں۔ ابی بن کعبؓ، ابن عباسؓ، مجاہد اور قتادہ وغیرہم نے یہی توضیح کی ہے یا یوں کہا جائے کہ دونوں مثالوں میں کافروں کے اعمال کی تشریح کی گئی ہے۔ کافروں کے اعمال کو دونوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ غیر مفید اور بے سود ہونے میں وہ سراب کی طرح ہیں۔ بکو دبے بودے ہیں۔ لغو اور بے کار ہیں اور چونکہ محض بے نور ہیں، اس لئے تہ بہ تہ اندھیروں کی طرح ہیں یا تقسیم اس طرح کی جائے کہ کافروں کے اعمال دو طرح کے ہیں کچھ اعمال تو دیکھنے میں اچھے معلوم ہوتے ہیں بظاہر ان میں دلکشی ہے، ان کی صورت نیکی کی ہے، مگر واقع میں جسم بے روح ہیں۔ ان کی حالت تو سراب کی طرح ہے جو نمائش و نمود کے لحاظ سے نظر فریب ہوتی ہے، مگر حقیقت سے خالی ہوتی ہے، پیاسے کی پیاس نہیں بجھا سکتی اور بعض اعمال ظاہری صورت میں بھی برے ہیں۔ چوری، زنا، غصب حقوق، کذب، بہتان، مکاری وغیرہ ان میں سراسر تاریکی ہی تاریکی ہے۔

وَوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ یعنی کافر جب مرتا ہے تو اللہ کے پاس جاتا ہے اس وقت اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ عالم، سمیع، بصیر اور باخبر ہے۔ کوئی ذرہ اس سے چھپا ہوا نہیں۔ گویا اللہ کو اپنے پاس پانے سے مراد ہے اللہ کا ناظر و حاضر ہونا۔

وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ اس آیت کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے اول یہ کہ اللہ کل خلق کا حساب جلد لے گا۔ ارب در ارب مخلوق کا تفصیلی حساب صرف ایک دن کے کچھ حصہ میں لے لے گا۔ جلال محلی نے ذکر کیا ہے کہ حدیث میں آیا ہے تمام خلق کا حساب دنیوی ایام کے آدھے دن کی مقدار میں ہو جائے گا گویا صرف چند گھنٹوں میں۔ مطلب یہ کہ قیامت کا دن اگرچہ بہت طویل ہوگا، مگر حساب بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ دنیوی زندگانی بہت ہی قلیل ہے۔ عنقریب خدا تعالیٰ حساب لے گا اس کا حساب جلد ہونے والا ہے۔

ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ یعنی تین تاریکیاں ہیں قعر سمندر کی تاریکی، موجوں کی تاریکی، ابر کی تاریکی۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے فرمایا کہ تہ بہ تہ تاریکیاں مراد ہیں (یعنی تین کی خصوصیت نہیں) کافر پر پانچ تاریکیاں مسلط ہوتی ہیں۔ قول کی، عمل کی، مدخل کی، مخرج کی، انجام آخرت کی۔ سدی اور ربیع بن انس کا بھی یہی قول ہے۔

حسن بصری نے کہا آیت میں تین اندھیریاں مذکور ہیں۔ کافر انہی تین اندھیریوں میں گھرا ہوتا ہے۔ اعتقاد کی اندھیری، قول کی اندھیری اور عمل کی اندھیری۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کافر کا درجہ تاریک، قوت سمع تاریک، بصارت تاریک ہوتی ہے۔ یہی تین اندھیریاں ہیں یعنی اس کے دل پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ گوش ہوش بند ہوتے ہیں اور چشم حق نیوش بھی وا نہیں ہوتیں یا کافر پر تین تاریکیاں اس طرح مسلط ہوتی ہیں کہ اول تو جہالت کی تاریکی ہوتی ہے دوسری جہالت سے ناواقفیت کی تاریکی ہوتی ہے چونکہ وہ اپنی واقفیت سے لاعلم ہوتا ہے اس لئے مزید اندھیری میں پڑا ہوتا ہے۔ جو جاہل اپنی جہالت کا احساس رکھتا ہو اس کے عالم ہونے کی کبھی امید ہو سکتی ہے، لیکن جس جاہل کو اپنی جہالت کا احساس نہ ہو اس کے عالم ہونے کی امید نہیں کی جا سکتی۔ تیسری تاریکی جہل مرکب کی ہے۔ کافر باوجود ناواقف ہونے کے جانتا ہے کہ میں واقف ہوں۔ یہ درجہ بہت سخت ہے۔ ناواقف پھر ناواقفیت سے لاعلم ہوتا ہے اور پھر اس پر مزید یہ کہ اپنی واقف کاری کا یقین۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ تاریکی کے تین مراتب اس طرح ہیں کہ (۱) غفلت یعنی بیوقوفی سے گناہ کرنا اس کو تغافل کہتے ہیں (۲) وقاحت

یعنی علی الاعلان نڈر کسی شرم کے گناہ کرنا اور کسی قسم کی پرواہ نہ کرنا اس کو انہماک کہتے ہیں (۳) جہل مرکب یعنی گناہ کو اچھا سمجھ کر کرنا اس کو جحود کہتے ہیں۔ یہ تینوں تاریکیاں کافر میں جمع ہوتی ہیں اور ایک کے اوپر دوسری چڑھی ہے۔ واللہ اعلم۔

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا الخ یعنی جس کے دل میں خدا نے نور ایمان نہ پیدا کیا ہو یا فطری روشنی بجھا دی ہو اس کو کوئی ہدایت نہیں کر سکتا۔

مقصود بیان کفار کے اعمال ناقابل ثواب ہیں۔ آخرت میں فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ کافروں کی بعض خوش اعمالیاں نظر فریب اور دلکش ضرور ہوتی ہیں، مگر وہ جسم بے روح کی طرح ہیں۔ تشنگان نجات کی تشنگی دور نہیں کر سکتیں۔ خدائے واحد یگانہ کو چھوڑ کر یا اس کی خالص توحید سے منہ موڑ کر جو لوگ بھٹکتے پھرتے ہیں وہ جہالت کی تہ بہ تہ تاریکیوں میں بند ہیں، ان کے دماغ پر جہالت کے پردے پڑے ہیں، ان کی آنکھوں پر کور نظری کی جھلی چھائی ہوئی ہے اور ان کے کانوں پر عدم شنوائی کی مہر لگی ہیں، اس لئے حق کو نہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں، ان کی روح تاریک ہے، دل تاریک ہے، تمام علمی قوتیں تاریک ہیں، ان کا فطری نور بجھ گیا ہے جس کو اللہ روشنی نہ دے اس کو کوئی روشنی دینے والا نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت خداداد ہے۔ اللہ کے سوا کسی کے قبضہ میں نہیں۔ رہبری اللہ ہی کا کام ہے۔ انبیاء اور اولیاء رہبر نہیں صرف رہنما ہیں، منبع ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ باطنی نور سوائے اللہ کے کوئی پیدا نہیں کر سکتا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ

کیا تم کو معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی ہے اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے اور پرندے بھی پر پھیلائے (پاکی بیان کرتے ہیں) ہر ایک اپنی تسبیح

تَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝

اور دعا سے واقف ہے اور جو کچھ یہ کرتے ہیں اللہ خوب واقف ہے اور آسمان و زمین کی حکومت اللہ ہی کی ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهٗ ثُمَّ يَجْعَلُهٗ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ بادلوں کو چلاتا ہے پھر اُن کو باہم ملاتا ہے پھر اُن کو تہ بہ تہ بناتا ہے پھر تم کو اُن کے اندر سے بارش نکلتی دکھائی دیتی

خِلٰلِهٖ ۚ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْۢ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهٗ عَنْ

ہے اور آسمان سے یعنی اُن پہاڑوں سے جو آسمان میں ہیں اولے نازل کرتا ہے پھر اُس کو جس پر چاہتا ہے گراتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ہٹا

مَّنْ يَّشَآءُ ؕ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ ؕ يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ اِنَّ فِيْ

دیتا ہے اس کی بجلی کی چمک (ایسی تیز ہے کہ) آنکھوں کو اُچکنے لگتی ہے اللہ رات و دن کو (بھی) بدلتا رہتا ہے اس میں بلاشبہ

ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى

آنکھوں والوں کے لئے عبرت ہے اور اللہ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا تو بعض جانور پیٹ کے بل چلتے

بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ؕ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

ہیں اور بعض دو پاؤں پر چلتے ہیں اور بعض چار پاؤں پر چلتے ہیں اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے بلاشبہ

عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝

اللہ سب کچھ کر سکتا ہے ۔ ہم نے روشن آیتیں نازل کی ہیں اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے رستہ کی طرف ہدایت دیتا ہے

تفسیر

گزشتہ آیات پر تفصیلی غور کرنے سے بالاجمال یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کافر ہو یا مومن ، مشرک ہو یا موحد ، ہر ایک کو نورِ فطرت سے ایک حصہ ملا ہے اور ہر ایک کے قلب ، روح اور بدن پر نفس ، شعاعوں کی پڑنا لازمی ضرور ہے ۔ مگر مومن کا ایمانی نور اس نورِ فطرت کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔ اس کو قلبی آنکھوں سے نوری حجابوں کے اندر چھپی ہوئی روشنی دکھتی ہے ۔ مگر کافر کا باطنی نور افسردہ ہو جاتا ہے ۔ اس کی روح اور قلب پر جہالت ، غضب اور شہوت کے پردے پڑ جاتے ہیں ۔ بداعتقادی ، انہماک اور جہد کی تہ بہ تہ تاریکیاں اس کے باطنی وجدان پر چھا جاتی ہیں اور فطری روشنی ان مادی کثیف تاریکیوں میں گم ہو جاتی ہے ۔ اب یہ بتانا چاہتا ہے کہ انسان کی ہی خصوصیت نہیں کل کائنات اسی نورِ سرمدی سے چمک رہی ہے ۔ فرشتے اور عالمِ قدس کے مجردات ہوں یا آسمان اور آسمانی کائنات یا عناصر اور ان کے مادی مرکبات سب میں وہ غیبی قدرت کارفرما ہے ۔ سب اسی کے مسخر اور زیرِ حکم ہیں یہاں تک کہ حس و شعور رکھنے والے پرندے درندے چرندے اور ان سے نیچے صرف نمو رکھنے والا سبزہ اور بیج ۔ یہ بھی ادنیٰ درجہ کی جمادی مخلوق جو صرف دو دو عنصروں سے مرکب ہونے والی کائنات مثلاً بخارات دخان اور بخار و دخان سے پیدا ہونے والی فضائی پیداوار مثلاً مینھ ، اولا ، بجلی وغیرہ ۔ سب نمونہائے فطرت ہیں ، آثارِ قدرت ہیں ، مظاہرِ نور ہیں ، دلائلِ حکمت اور براہینِ مشیت ہیں ، لیکن ان کو دیکھنے اور پہچاننے کے لئے نورانی آنکھوں کی ضرورت ہے ۔ اگر دل کی آنکھوں میں روشنی ہو تو ہر شخص دیکھ سکتا ہے ۔ شاہد کائنات کا چہرہ نظر آ سکتا ہے ۔ دنیا کی ہر چیز خواہ جامد ہو یا سیال ، باحواس یا بے حس ، ہوشمند ہو یا بے خود سب اپنی اپنی زبان سے اللہ کی کارسازی ، احاطۂ قدرت ، اجتماعِ کمال اور پاکی کی شہادت دے رہی ہے ۔ کل عالم کا ایک نظامِ قدرت کے تحت چلنا اور ضابطۂ فطرت سے سرتابی کی قدرت نہ رکھنا ۔ اللہ کی ہمہ گیر قدرت ، محیطِ کل مشیت اور جہاں پیمان صنعت و حکمت پر دلالت کر رہا ہے ۔ مگر سمجھنے کے لئے رسا دماغ اور سیدھے راستہ پر چلنے والی عقل کی ضرورت ہے اور حقیقت تک پہنچانے والا راستہ اسی کو ملتا ہے جس کو خدا چاہتا ہے ورنہ ہر قسم کی نشانی بے کار ہے ۔

تحلیلِ اجزاء

اَلَمْ تَرَ ۔ یہ خطاب بظاہر رسول اللہ کو ہے ، مگر اور لوگ جس میں دیکھنے کی صلاحیت ہو وہ مخاطب ہے ۔ دیکھنا آنکھوں سے بھی ہوتا ہے اور دل سے بھی ۔ یہاں آنکھوں سے دیکھنا مراد نہیں بلکہ روایتِ قلبی مراد ہے ۔ اس لفظ کو استفہامی شکل میں بیان کیا ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ عقل کی آنکھوں سے ہر شخص کو دیکھنا چاہیئے ، بصیرت کو کام میں لانا چاہیئے اور سطحیات کو چھوڑ کر مغز تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔ آنکھوں سے تو ہر شخص اپنے ماحول کو دیکھتا ہے ، مگر دل کی آنکھوں سے وہی دیکھتا ہے جس کی چھپا ہوا دل میں نورِ بصیرت ہوتا ہے ، اس لئے ہر مومن کو نورِ بصیرت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ روح میں روشنی پیدا ہونے کے بعد سربستہ حقائق اور پوشیدہ اسرار دکھائی دیں اور کل کائنات کی اندرونی آواز کا مفہوم سمجھ میں آ سکے ۔

مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ یعنی فرشتے تمام روحانیات ، چاند ، سورج ، ستارے اور کل علوی مجردات ۔

وَالْاَرْضِ ۔ یعنی انسان ، جن ، کل جانور ، درخت ، پھل ، پھول ، پتھر ، تمام معدنیات ، ریگستان ، سمندر اور اس کی کل موجودات ۔ یہاں تک کہ فضا میں پر پھیلا کر تمام اڑنے والے پرندے سب اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں ، لیکن اپنے اپنے رنگ میں ۔ کوئی دوسرا ان کی زبان سمجھے یا نہ سمجھے ان کے طریقِ عبادت کو جانے یا نہ جانے ، مگر اپنے اپنے طریقِ عبادت اور زبانِ تسبیح سے واقف ہیں اور اللہ ان کے اقوال کو خوب جانتا ہے ۔

صَلَاتَهٗ وَتَسْبِیْحَهٗ ہر چیز اللہ کی پاکی کس طرح بیان کرتی ہے اس کے متعلق علماء کا اختلاف ہے ۔ کچھ لوگ قائل ہیں کہ تسبیح دو طرح کی ہوتی ہے مقالی اور حالی ۔ عالم کی چیزوں میں جو ذی عقل ہیں وہ زبان سے خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور جو غیر ذی عقل ہیں وہ اپنی حالت سے خدا کے تقدس پر دلالت کرتے ہیں ۔ جمہور متکلمین کا قول ہے کہ تسبیح سے مراد حالی تسبیح ہے ۔ ہر چیز اپنی تخلیق اور نظم کے لحاظ سے دلالت کر رہی ہے کہ اس کا صانع ہر عیب سے پاک اور ہر نقصان سے بری ہے ۔ اوّل قول کو بیضاوی وغیرہ مفسرین نے پسند کیا ہے ، مگر امام رازی نے ثانی قول کو صحیح کہا ہے ۔ کیونکہ اوّل قول پر حقیقی اور مجازی معنی کا ایک وقت میں مراد لینا ضروری قرار پاتا ہے ۔ تسبیح حقیقت میں زبان سے پاکی بیان کرنے کو کہتے ہیں اور حالی تسبیح حقیقت میں تسبیح نہیں بلکہ مجازی تسبیح ہے ۔ اس کے علاوہ بعض انسان مکلف ہی نہیں ہیں ۔ مثلاً دیوانہ یا بچہ پھر ان کی تسبیح مقالی کے کوئی معنی ہی نہیں ۔ پھر مشرکین و کفار کا گروہ خدا کو عیوب سے پاک نہیں کہتا ۔ لامحالہ تسبیح سے مراد حالی تسبیح ہوگی ۔ درختوں کا ہر پتہ ، ریگستان کا ہر ذرہ ، سمندر کا ہر قطرہ اور جاندار و بے جان مخلوق کی ہر حالت ، ہر کیفیت اللہ کی توحید ، قدرت ، حکمت اور کمال کی شاہد ہے ، لیکن میرے نزدیک امام رازی کا اعتراض صحیح نہیں کیونکہ حقیقی اور مجازی معنی کا اجتماع اس وقت لازم آتا ہے جب دونوں

کو ایک وقت میں مراد لیا جائے ، مگر واقعہ ایسا نہیں ہے ۔ لفظ تسبیح مشترک لفظی نہیں ہے بلکہ مشترک معنوی ہے اور اشتراک معنوی میں لفظ کی وضع کسی عام معنی کے لئے ہوتی ہے ۔ جس کے مصداق کم سے کم دو فرد ہوتے ہیں ۔ لفظ تسبیح کے لغوی معنی پاکی بیان کرنے کے ہیں خواہ کسی طرح ہو ۔ اس معنی کے دو فرد ہیں ۔ زبان سے پاکی بیان کرنا اور حالت کا پاکی پر دلالت کرنا ۔ لہٰذا آیت میں مفہوم عام مراد ہے ۔ زبان سے تسبیح وہ مخلوق کرتی ہے جس میں زبانی تسبیح کی قابلیت ہوتی ہے اور ضمیر بھی مقتضی ہوتا ہے ۔ مثلاً ملائکہ اور عاقل بالغ مومن اور حالی تسبیح وہ مخلوق کرتی ہے جس میں زبانی تسبیح کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی جیسے جمادات و نباتات یا صلاحیت ہوتی ہے ، مگر کوئی عارضی مانع ہوتا ہے ۔ مثلاً دیوانہ کا جنون اور بچہ کا بچپن یا ضمیر مقتضی نہیں ہوتا ۔ مثلاً کفار کا کفر اور مشرک کا شرک ۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح قول وہ ہے جس کو ابن کثیر نے ذکر کیا ہے کہ تسبیح سے زبانی تسبیح مراد ہے ۔ ہر چیز زبان سے ہی خدا کی پاکی بیان کرتی ہے ، مگر ہر چیز کی زبان مخصوص ہے ، اس لئے تسبیح بھی جدا جدا ہے ۔ عام انسان ان کی زبان نہیں سمجھتے ، لیکن خاص خاص روشن ضمیر رکھنے والے کبھی کبھی ان کی بولی سمجھ بھی لیتے ہیں ۔ چنانچہ ایک بار حضور کی مجلس میں کنکریوں کی تسبیح سنی گئی ۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا کھانا کھایا جاتا تھا اور ہم اس کی تسبیح سنتے تھے (بخاری) مسجد نبوی میں کھجور کا ایک ستون تھا حضور والا اس کا سہارا لے کر تقریر فرمایا کرتے تھے جب ممبر بن کر تیار ہو گیا اور حضور اس ممبر پر خطبہ پڑھنے کھڑے ہوئے اور ستون کو چھوڑ دیا تو وہ رو دیا اور حاضرین نے اس کے رونے کی آواز سنی (بخاری) پھر حضور نے اس کو گلے لگا لیا اور اس کا رونا بند ہوا ۔ اونٹ کا حاضر خدمت ہو کر شکایت کرنا تو مشہور ہے ۔ بہر حال ہر چیز اپنی زبان میں اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے ، مگر سننے کے لئے دل کے کان اور دیکھنے کے لئے عقل کی بصارت اور سمجھنے کے لئے بصیرت کی ضرورت ہے ۔ ہر شخص کائنات کی بولی سمجھ نہیں سکتا ، اس لئے دوسری آیات میں ارشاد فرمایا ہے وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے ۔ البتہ ہر چیز اپنی طرز عبادت اور تسبیح کو جانتی ہے اور خدا ان کے ہر عمل سے واقف ہے ۔ یہاں تک تو اللہ کے احاطۂ علمی اور شیوع نوری کا بیان تھا ، اس سے آگے مبداء و معاد کے مسئلہ کی تشریح فرماتا ہے ۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی اللہ ہی نے آسمان زمین اور ان کی موجودات کو پیدا کیا اور یہ تمام خلق اسی کے قبضہ و تصرف میں ہے ۔ اس کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتی ۔ اس کے سوا کوئی دوسرا خالق و متصرف اور مختار نہیں ہے ۔

وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ اور اسی کے پاس سب کو واپس جانا ہے ۔ گویا یہ تمام کل عالم ایک گول حلقہ بنانے والی زنجیر ہے ۔ جس کا ابتدائی کنارہ اللہ کے دست قدرت سے نکلا ہے اور انتہائی کنارہ اسی کے دست قدرت تک پہنچ کر ختم ہوتا ہے ۔ اسی زنجیر کو دوری حرکت ہوتی ہے تو تمام منازل حیات ہر چیز طے کرنے کے بعد آخر کار خدا ہی کی طرف لوٹ جاتی ہے ۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ۔ مذکورۂ بالا آیت میں اللہ کا خلاق محیط کل ہونا ظاہر فرمایا تھا ۔ یہاں سے قدرت کی ہمہ گیری کا ثبوت قدرے تفصیل کے ساتھ چند مثالیں دے کر پیش کیا ہے ۔ فلاسفۂ متقدمین کے اقوال کی پیروی ، شمس بازغہ ، افاضۂ قدسیہ اور اشارات وغیرہ میں صراحت کی گئی ہے کہ جب بخارات یعنی وہ اجزاء ہوائیہ جن میں اجزائے مائیہ مخلوط ہوتے ہیں ۔ سمندروں اور نشیبی غاروں سے نکل کر اوپر کو چڑھتے ہیں اور ہوا کے دونوں طبقوں کو چیر کر تیسرے طبقہ میں جس کو طبقۂ زمہریر کہا جاتا ہے پہنچتے ہیں تو چونکہ طبقۂ زمہریر نہایت سرد طبقہ ہے ، اس لئے بخارات کو مقامی سردی لگتی ہے اور سردی لگنے سے عموماً تکاثف پیدا ہوتا ہے یعنی اجزاء وابستہ ہو جاتے ہیں ۔ اب اگر سردی کی تاثیر خفیف ہوتی ہے تو بخارات بستہ ہو کر ابر کی شکل میں نمودار ہو جاتے ہیں اور ان میں ثقل پیدا ہو جاتا ہے اور چونکہ وزنی ہونے کے بعد نیچے کو گرنا چاہتے ہیں ۔ اس لئے نزولی حرکت سے پگھل کر مینہ کے قطرے بن کر برسنے لگتے ہیں اور اگر قوی سردی لگی ہے تو اجتماعی حالت پیدا ہونے سے پہلے اگر ان میں بستگی پیدا ہوئی تو برف پیدا ہو جاتا ہے اور اگر اجتماعی حالت پیدا ہونے کے بعد بستہ ہوئے تو اولے کی شکل میں ٹکڑے ٹکڑے نیچے گرتے ہیں ، لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دھواں (یعنی وہ اجزاء آتشیں جن میں اجزاء ارضیہ مخلوط ہوتے ہیں) اوپر کو چڑھتا ہے اور اوپر پہنچ کر اجزاء بخاریہ (یعنی ابر) کے اندر بند ہو جاتے ہیں اور زور کے ساتھ بخارات کو پھاڑ کر نکلنا اور اوپر کو چڑھنا چاہتے ہیں تو ان کی گردش یا سخت بخارات کو پھاڑنے سے سخت رگڑ کی وجہ سے چمک بھی پیدا ہوتی ہے اس کو برق کہتے ہیں ۔ یہی اجزاء دخانیہ برق کے ساتھ ساتھ فوراً زمین پر کبھی کبھی گر پڑتے ہیں اور جس پر گرتے ہیں اس کو خاکستر کر دیتے ہیں ۔ یہی صاعقہ ہے علماء طبعیات کی یہ تحقیق خلاف حق نہیں ہے ۔ شرعی تصریحات بھی اس کا انکار نہیں کرتیں ۔ البتہ ان کائنات کی پیدائش کی اصلی اغراض و فوائد کو زور دے کر قرآن نے بیان کیا ہے اور کہیں اجمالاً ماہیت اور علت پیدائش کا بھی تذکرہ کیا ہے چنانچہ ان آیات میں ابر و بارش ، ژالہ ، صاعقہ اور برق کی پیدائش پر عبرت آفریں تذکرہ کیا ہے اور ان کی پیدائش سے قدرت کی ہمہ گیری پر استدلال کیا ہے ۔

مقام غور ہے کہ عناصر کا باہم انقلاب اور صورتوں کا تغیر اور نوعیت کی تبدیلی کس نے کی پانی کی شکل کو ہوا کی شکل میں تبدیل کرنا پھر ہوا کو کھینچ کر اوپر لے جانا اور پھر وہاں پہنچ کر پانی کی شکل میں تبدیل کر دینا پھر آبی اجزاء کی رگڑ سے خزانۂ آتش یعنی برق کو پیدا کرنا اور آتش مبہم یعنی صاعقہ کو پیدا کرنا اور اس کو زمین پر گرانا اور اس مقام یا اس شخص پر گرانا جس کو ہلاک کرنا مقصود

ہے کس کی قدرت کی کارسازی اور حکمت کی ہمہ گیری ہے۔ پھر سیال اجزاء کو وابستہ کر کے زمین پر مختلف اغراض و فوائد کے لئے پھینکنا کس کا کام ہے؟ کس قدر بصیرت آفرین ہے یہ حکمت وقدرت کی عناصر کی ترکیب و انقلاب سے موجوداتِ زمین کو زندہ کرنے والے اسباب بھی پیدا ہوتے ہیں اور ہلاکت کرنے والے ذرائع بھی۔ بارش سے زندگی اور صاعقہ سے ہلاکت باوجود اسباب کے اتحاد کے کس قدر حیرت خیز ہے اور فعل بھی نہیں کہ اضطراراً یہ کام سرانجام پاتا ہے بلکہ ہر ہر قدم پر قدرت و ارادہ ہمہ گیر ہے۔ لطیف کو کثیف اور کثیف کو لطیف بنانا بے اختیاری چیز نہیں۔ سیال کو جامد اور جامد کو سیال کر دینا اضطراری فعل نہیں۔ بجلی گرتی ہے۔ مقام مخصوص اور شخص مخصوص پر گرتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے تعین اور تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ محض مشیتِ غیبی اور ارادۂ الٰہیہ ہے جس کو چاہتا ہے ہلاک کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بچا لیتا ہے۔

ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ۔ یعنی ہوا سے ابر پیدا ہوتا ہے اور ہوا اصل خلقت سیال ہے اور سیال چیز میں تالیف و اجتماع اجزا اس کی طبیعت کے خلاف ہے، مگر خدا ان میں تالیف اور بستگی پیدا کرتا ہے اور نہ فقط بستگی بلکہ

ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَامًا ۔ ان کو تہ بہ تہ بناتا ہے۔ خفیف اور سیال کی ترکیب بعض اجزا کا نیچے بعض کا اوپر ہونا اگر مشیت الٰہیہ کے زیر اثر نہیں تو اور کیا ہے ورنہ باوجود طبیعت کے اتحاد اور خفت و سیلان کی یگانگت کے یہ ترتیب اور تہ بہ تہ ہونا کیوں ہے۔

وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِن جِبَالٍ ۔ اس آیت کی تفسیر دو طرح سے کی گئی ہے اول یہ کہ سماء سے آسمان مراد ہے اور جبال سے پہاڑ یعنی آسمان کے اس حصہ سے جس میں اولے کے پہاڑ ہیں۔ اللہ اولے برساتا ہے اس مطلب پر ثابت ہوتا ہے کہ آسمان میں اولے کے پہاڑ ہیں جہاں سے ژالہ باری ہوتی ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ آسمان سے ابر مراد ہے اور ابر کے وہ بڑے بڑے عظیم الشان ٹکڑے جو کوہ نما ہیں ان کو پہاڑ قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابر سے یعنی ابر کے ان عظیم الشان ٹکڑوں سے جو کوہ نما ہیں اللہ اولے برساتا ہے۔

فَيُصِيبُ بِهِ مَن يَشَاءُ ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس آیت کا مطلب دو طرح سے ہو سکتا ہے اول یہ کہ مینہ اور اولے خدا کی مشیت کے موافق نازل ہوتے ہیں خدا تعالیٰ جہاں سبزی اور شادابی پیدا کرنی چاہتا ہے اپنی رحمت سے وہاں بارش اور مناسب اولے نازل فرماتا ہے اور جہاں خشکی اور قحط پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے وہاں بارش کا نزول اور اولے کی بارش نہیں ہوتی۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ خدا جس کھیتی یا باغ یا پھل یا جانور یا مکان یا انسان کو فنا کرنا چاہتا ہے وہاں اولوں کو بطور عذاب نازل فرماتا ہے اور جس کی تباہی مقصود نہیں ہوتی اس کو بچا لیتا ہے۔ بہرحال آیت میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ بارش اور اولوں کا نزول اضطراری نہیں۔ اگرچہ یہ حیات و ممات کے اسباب ہیں، مگر ہیں خدا کے قبضہ میں۔ اسباب کی لگام اللہ کے دست قدرت میں ہے وہ جدھر چاہتا ہے ان کو پھیر دیتا ہے۔

يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ ۔ نور نور میں جذب ہو جاتا ہے۔ روشنی روشنی کو کھینچتی ہے۔ آنکھوں میں بھی نور ہے اور بجلی میں بھی چمک ہے اور چونکہ بجلی کی روشنی آنکھوں کی روشنی سے زائد اور قوی ہے، اس لئے آنکھوں کے نور کو اپنی طرف کھینچ لینا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہربائی طاقت اور بجلی کی لہریں ہر چیز کی روح (یعنی زندگی کی روشنی) کو کھینچ کر اس کو مردہ کر دیتی ہیں۔ بخاری اجزاء سے بنی ہوئی بجلی جب کوندتی ہے تو آنکھوں کو چندھیا دیتی ہے، پلکیں جھپک جاتی ہیں، آنکھوں کا نور اپنے مرکز میں پناہ لیتا ہے اگر آنکھیں کھلی رہیں اور نور برق کا مقابلہ نور نگاہ سے ہو جائے تو یقیناً بجلی نگاہ کو اپنی طرف کھینچ کر آنکھوں کو بے نور کر دے گی۔

يُقَلِّبُ اللَّهُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۔ فضائی کائنات کے بیان کے بعد قدرت کی ہمہ گیری کے ثبوت کے لئے یہ دوسری مثال ذکر کی ہے۔ شبانہ روز کا تبادلہ بالکل محسوس ہے۔ آفتاب یا زمین کی حرکت سے رات دن کا انقلاب بدیہی ہے۔ آفتاب یا زمین کو کون حرکت دیتا ہے سطح زمین پر روشنی اور تاریکی کیسے اور کس کے حکم سے پیدا ہوتی ہے؟ ظاہر ہے کہ سلسلۂ اسباب کی یہ ترتیب اور باہم وابستگی بغیر ناظم مطلق کی حکمت کے نہیں ہو سکتی، لیکن چشم بصیرت کی ضرورت ہے، عقل کی بینائی سے ان حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ شب و روز سے اشارہ ہر حالت کے انقلاب کی طرف ہو۔ صحت و بیماری، دولت و افلاس، عزت و ذلت، قوت و ناتوانی، آبادی و بربادی، سرسبزی و خشکی، ایمان و کفر، انصاف و ظلم، حق و باطل، خیر و شر ان سب میں ادل بدل ہوتا رہتا ہے۔ اسباب کچھ بھی ہوں، مگر تغیر اسباب خالقِ اسباب کی قدرت و مشیت سے ہوتا ہے۔ فتفکروا۔

وَاللَّهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِّن مَّاءٍ ۔ یہ مثال بھی ثبوت قدرت کی توضیح کے لئے بیان کی ہے۔ اس کی تفسیر دو طرح سے بیان کی جا سکتی ہے (۱) ہر وہ چوپایہ جس کی پیدائش پانی سے ہے اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے ورنہ ایک قطرہ پانی سے اتنے بڑے قد و قامت اور ہیکل عظیم کا پیدا ہونا اور ایک بوند سے تمام اعضاء کا پھوٹ نکلنا عقل کو متحیر بنا دیتا ہے۔ لاکھوں بال، نسیں، رگیں، پٹھے، اوتار، عضلات، ہڈیاں، پسلیاں، اندرونی و بیرونی قوتیں، حس، شعور، ارادہ، حرکت کی طاقت اتنے حقیر مقدار کے قطرے میں کہاں سے آئی اور کیسے آئی۔ قفال نے اسی تفسیر کو پسند کیا ہے (۲) دَابَّة سے مراد ہر جاندار ہے خواہ جن ہو یا انسان یا دوسرے حیوانات سب کی اصل پانی ہے۔ فلسفہ بھی بتاتا ہے کہ تمام کائنات کی اصل ایک سیال مادہ ہے کوئی اس کو گیس کہتا ہے کوئی کچھ۔ قرآن نے اس کو پانی کہا ہے۔ لفظی اختلاف ہے مطلب سب کا ایک ہی ہے۔ خواہ پانی یا گیس سے مختلف الاجناس مختلف الانواع

(خطیب نے اسی قول کو ترجیح دی ہے) اور مختلف تشخصیات رکھنے والے جانداروں کی پیدائش اور ہر ایک کے جنسی نوعی اور شخصی امتیازات کا تفرقہ اللہ کی قدرت پر دلالت کر رہا ہے

فَمِنْهُمْ مَّنْ الخ۔ اس کلام میں حصر مقصود نہیں ہے صرف عمومی حالت کا اظہار مقصود ہے۔ کوئی جانور پیٹ کے بل چلتا ہے جیسے سانپ، مچھلی وغیرہ۔ کوئی دو پاؤں سے چلتا ہے جیسے انسان بن مانس وغیرہ۔ کوئی چوپایہ ہے جیسے گھوڑا، گدھا، اونٹ، بکری، گائے، لیکن کوئی بے شمار پاؤں رکھتا ہے جیسے کیڑا، کنکھجورا۔ اس آخری قسم کی طرف یَخْلُقُ اللّٰہُ سے اشارہ کیا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ تمام مذکورہ بالا نشانیوں کا نتیجہ اور لب لباب ہے اور چونکہ عام طبقہ جہالت کی تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے۔ محسوس سے غیر محسوس کی طرف انتقال ذہنی کرنا ان کے بس کی بات نہیں اس لئے فرمایا:۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ ۔ یعنی دماغوں کو بیدار کرنے اور جہالت کو دور کرنے اور علمی روشنی پیدا کرنے کے لئے ہم نے آیات نازل کیں جن سے علمی اور عملی حقائق کا انکشاف ہوتا ہے صحیح غلط میں امتیاز اور خیر و شر میں تفرقہ سمجھا آتا ہے، مگر آیات الٰہیہ کے باوجود اکثر لوگ جہالت کی وادی میں سرگرداں پھر رہے ہیں۔ کوئی نشانی، کوئی دلیل، کوئی تذکیر ان کے دماغوں میں روشنی اور اعمال میں اصلاح نہیں پیدا کر سکتی، اس لئے فرمایا:۔

وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ اللہ جس کو چاہتا ہے علم و عمل کا سیدھا راستہ بتاتا ہے۔ اسباب کی تاثیر بھی دستِ قدرت کی محتاج ہے۔ خالی عقل یا فطرت یا نزول احکام وحی کسی کو ہدایت یافتہ نہیں بنا سکتی۔ ہادی برحق اللہ ہی ہے۔

مقصود بیان تمام کائنات اپنے خالق کو پہچانتی ہے اور اپنی زبان میں اس کی تسبیح و تقدیس بیان کرتی ہے۔ لیکن افسوس غافل و جاہل انسان یا تو خدا کا شریک تسلیم کرتا یا خدا کے اندر ایسے اوصاف مانتا ہے جن سے اس کی اہانت لازم آتی ہے۔ نظر عبرت سے دیکھنا چاہیئے مسلمانوں کے اس گمراہ کن طبقہ کو جو زبان سے اگرچہ توحید کا قائل ہے مگر عملاً انبیاء، اولیا صوفیہ فقراء اور پیروں کا مظہر الوہیت اور متصرف ربوبیت ثابت کرتا ہے جو خدائی اوصاف کا مالک دوسروں کو قرار دیتا ہے رزق، اولاد، عزت و دولت کا طالب مخلوق سے ہوتا ہے اور در بدر سجدہ ریزیاں کرتا ہے۔ حالانکہ کل کائنات کی فطرت خدا کی پاکی بیان کرتی اور شرک و عیب سے اس کو منزہ کہتی ہے ابر کے اجزاء منتشر ہوتے ہیں اللہ ان کو جمع کرتا اور تہ بہ تہ بناتا ہے۔ اولوں کی بارش اگرچہ اسباب ارضیہ و سماویہ سے ہوتی ہے اگر مشیت الٰہیہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ اسباب سے نتائج بغیر اذن الٰہی کے پیدا نہیں ہوتے وہی مسبب الاسباب ہے۔ ابر کا اٹھنا، اکٹھا ہو کر گھٹا ٹوپ ہو جانا پھر اس مینہ کا برسنا، اولوں کا گرنا، بجلی کوندنا اور شبانہ روز کا ادل بدل ہونا اور جانوروں کا مختلف الاطوار اور مختلف الاشکال ہونا اللہ کی الوہیت اور احاطۂ قدرت کے نمایاں آثار ہیں۔

وَیَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالرَّسُوْلِ وَاَطَعْنَا ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ ؕ وَمَآ اُولٰٓئِکَ

(منافق) کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لے آئے اور فرمانبردار ہو گئے پھر اس کے بعد ان میں کا ایک فریق منہ پھیر لیتا ہے یہ لوگ

بِالْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

مومن نہیں ہیں اور جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کا باہمی فیصلہ کر دیں تو فوراً ان میں کا ایک گروہ روگردانی کرتا ہے

وَاِنْ یَّکُنْ لَّھُمُ الْحَقُّ یَاْتُوْٓا اِلَیْہِ مُذْعِنِیْنَ ۝ؕ اَفِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ یَخَافُوْنَ

اور اگر ان کا حق ہوتا ہے تو رسول کے پاس گردن جھکائے چلے آتے ہیں کیا ان کے دلوں میں مرض ہے یا شک میں پڑے ہیں یا ان کو یہ اندیشہ

اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ وَرَسُوْلُہٗ ؕ بَلْ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ع اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ

ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان پر ظلم کریں گے نہیں بلکہ یہی ظالم ہیں جب مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسول

کی لوک بالکل نکل گئی۔ یہ طبقہ مؤلفۃ القلوب کا تھا۔ بعض افراد ایسے بھی تھے جن کے دل نہ فقط سیاہ تھے بلکہ دلوں پر چاروں طرف مادیت کا سیاہ زنگ چڑھا ہوا تھا۔ زنگ و آلائش
میں کثافت ٹھنس گئی تھی۔ دلوں پر جہالت کے قفل لگے ہوئے تھے۔ بصیرت پر گمراہی کی مہریں لگ چکی تھیں، کانوں میں جمود و انکار کی ڈاٹیں اور آنکھوں پر عناد و فساد کے پردے پڑے
ہوئے تھے۔ موعظت و نصیحت کا پانی اندر جا ہی نہ سکتا تھا، ہدایت کی روشنی کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ نہ دل تھے سمجھنے کے قابل، نہ آنکھیں تھیں دیکھنے کے لائق، نہ کانوں میں سننے
کی صلاحیت تھی۔ یہ طبقہ منافقوں کا سردار تھا۔ کیونکہ ایسے بھی تھے جن کے کانوں میں سوراخ اور آنکھوں میں کسی قدر روشنی عام لوگوں کو دکھائی دیتی تھی یا وہ خود اپنی آنکھوں کو ابھار کر آنکھوں
والوں کی شکل بنا کر دکھلاتے تھے۔ کانوں کو اس طرح مائل اور متوجہ کرتے تھے کہ کہنے والے کو سننے کا یقین ہو جائے۔

یہ گروہ بڑا خطرناک تھا۔ تھے یہ بھی کافر، مگر مومن نما۔ دل ان کے بھی سخت زنگ آلود اور ٹیڑھے تھے۔ مگر استقامت و راستی کا ان پر دھوکہ ہوتا تھا۔ ان کے دلوں میں لچک
تھی، مسلمانوں کے سامنے آتے تھے تو دلوں میں کجی نظر نہ آتی تھی اور تخلیہ میں اپنے ہم نواؤں سے ملتے تھے تو وہی کج باطنی بر سر ظہور آتی تھی، دلوں کی خمیدگی نمایاں ہو جاتی تھی۔ یہ طبقہ منافقین
کا تھا۔ انہی میں سے بعض کے متعلق آیات کا نزول ہوا ہے۔ نفاق و خلوص کی پہچان کے لئے خدا تعالیٰ نے ان آیات میں ایک عام ضابطہ مقرر فرما دیا ہے وہ یہ کہ طبیب روحانی کی بتائی
ہوئی دوا جو شخص استعمال کرے اور ہدایت کردہ پرہیز جاری رکھے اور نشست، برخاست، خواب و بیداری اور فعل و حرکت میں ہر حکم کی تعمیل کے لئے تیار رہے سمجھو کہ یہ تندرست ہے
بیمار نہیں اور جو طبیب کو طبیب حاذق نہ سمجھے یا طبیب مشفق نہ سمجھے یا اس کو اندیشہ ہو کہ اگر ہم نے اس کی تجویز کردہ دوا پی اور بتائے ہوئے پرہیز پر عمل کیا تو ہلاک ہو جائیں گے تو سمجھ لو
کہ یہ منافق بیمار رہے۔ چاہے وہ کتنا ہی قسم کھا کر کہے کہ میں علاج کر رہا ہوں، طبیب کو حاذق جانتا ہوں، مگر طبیب کے قسمیہ حکم میں اگر چون و چرا کرتا ہو تو اس کے بیمار ہونے کا یقین کرلو۔

تحلیل احترام وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللَّهِ اوپر کی آیات میں ذکر کیا تھا کہ ہم نے آیات بینات نازل کی ہیں، مگر ان سے فائدہ انہی لوگوں کو پہنچتا ہے جن کو فائدہ پہنچانا خدا
کو مقصود ہے۔ اب ان آیات میں اس گمراہ طبقہ میں سے ایک خاص گروہ کا بیان ہے جو کہ شمع ہدایت رکھتے ہوئے راہ حق نہ پاتے تھے جو قسمیہ سے فرماں برداری کا
اقرار کرتے تھے اور موقع پر منہ موڑ کر پشت دکھا جاتے تھے۔ قتادہ نے فرمایا یہ لوگ منافق تھے جنہوں نے ایمان و طاعت کا اظہار کیا تھا، مگر درحقیقت وہ دوسروں کو بھی ایمان و طاعت
سے روکتے تھے۔

مقاتل کہتے ہیں کہ بشر ایک منافق تھا کچھ زمین کے متعلق کسی یہودی سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔ یہودی نے کہا ہم تمہارے پیغمبر کے پاس چلو۔ ان کے فیصلے کو میں تسلیم کر لوں گا۔ منافق بولا محمد
تو ہم پر ظلم کریں گے، وہاں نہیں کعب بن اشرف یہودی کے پاس چلو اس سے فیصلہ کرائیں گے۔ اس پر اس آیت کا نزول ہوا۔ ضحاک کا قول ہے کہ مغیرہ بن وائل ایک منافق تھا، زمین کے متعلق
اس کا جھگڑا حضرت علی بن ابی طالب سے ہو گیا۔ شیر خدا رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس ﷺ کی طرف رجوع کرنے کو کہا، مگر اس نے انکار کیا۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ کچھ لوگ زبان سے تو مدعی ہوتے ہیں کہ ہم کو رسول
کی رسالت اور عقائد شریعت کا دل سے یقین ہو چکا ہے اور عملی طور پر بھی فرماں بردار ہیں، مگر جب وقت آتا ہے تو اصل بدبو ظاہر ہو جاتی ہے۔ انہی میں کا ایک گروہ اسلام اور بانی اسلام سے
منہ موڑ کر پشت پھیر کر چل دیتا ہے۔ ایسے لوگ بالکل مومن نہیں۔ ان کا شمار اہل ایمان دار عمل کے گروہ میں سرے سے ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایمان تو فعل قلب کا نام ہے اور قلب کا فعل ایک ہی ہو سکتا
ہے یا موافقت یا مخالفت یا جہالت۔ جانور جاہل قلوب رکھتے ہیں۔ اہل ایمان کے دلوں میں موافقت ہے اور ان کے دلوں میں مخالفت ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ یہ لوگ جانوروں سے
بھی بدتر ہیں۔ نہ فقط جاہل ہیں بلکہ حق کے مخالف بھی ہیں۔

ایک شبہ آیت میں کہا گیا ہے کہ کچھ ایمان و طاعت کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن ان میں سے بعض اشخاص وقت پر منہ موڑ کر چل دیتے ہیں، اس لئے یہ لوگ مومن نہیں۔ اس پر
شبہ کیا جا سکتا ہے کہ منہ موڑ کر چل دینے والے تو بعض افراد ہیں، پورے گروہ کو ایمان سے کس طرح خارج کیا جا سکتا ہے۔ دیگر اشخاص نے تو مخالفت نہیں کی۔

ازالہ جو لوگ منہ موڑ کر چل دیے ان کی مخالفت کا تو اظہار ہو گیا، اس لئے مومنوں کی فہرست سے خارج کر دئیے گئے اور باقی اشخاص چونکہ ان کے تابع اور عقیدہ میں ان کے موافق تھے
زبان سے دعویٰ تھا مگر دل میں ایمان نہ تھا، اس لئے یہ بھی مومن نہیں ہو سکتے۔

وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ۔ جھوٹ، سچ اور ایمان و نفاق کے جانچ کرنے کی یہ ایک کسوٹی ہے جس پر منافق پورے نہیں اترتے۔ اصل ایمان کا مدار تسلیم ہے جو اللہ اور اس کے
رسول کے سامنے سر جھکا دے خواہ اس کا نفع ہو یا ضرر یا نقصان بہرحال حکم شریعت کو قبول کرے تو وہ مومن ہے جو سرتابی یا اظہار ناراضگی کرے وہ منافق ہے۔ ان منافقوں کی حالت یہ ہے
کہ جب اللہ کی طرف یعنی قرآن کی طرف، اور رسول خدا کی طرف یعنی فرمان رسول کی طرف (جو وحی خفی ہے اور قرآن کی تفسیر ہے) ان کو بلایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ چلو شرعی فیصلہ کرالو تو روگردانی کرتے
ہیں گویا عمل سے مخالفت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہاں اگر شرعی فیصلہ سے ان کو کچھ فائدہ پہنچتا ہو اور ان کے حریف کا نقصان ہوتا ہو تو انتہائی فرماں برداری کے ساتھ آجاتے ہیں۔ اس سے ثابت
ہوا کہ ان کے دلوں میں شریعت کی صداقت کا یقین نہیں صرف مالی لالچ ہے۔ رسول کی رسالت اور قرآن کی حقانیت سے ان کا کوئی سروکار نہیں، خواہش نفس کے بندے ہیں۔ جہاں ہوا و حرص

کو پورا ہوتے دیکھتے ہیں تو متوجہ ہو جاتے ہیں، ورنہ منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔

اَفِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْا الخ۔ انکار کی دو ہی وجوہ ہو سکتی ہیں یا تو رسول میں کوئی خرابی ہو، حق تلفی اور ظلم کرنے کا اندیشہ ہو یا انکار کرنے والے میں خرابی ہو۔ اوّل الذکر خرابی تو واقعہ کے خلاف ہے۔ خدا اور اس کے رسول سے بڑھ کر کون عادل ہو سکتا ہے لامحالہ دوسری شق ہی صحیح ہے۔ انکار کرنے والوں میں خرابی دو طرح کی ہو سکتی ہے یا تو ان کے دلوں میں ایمان راسخ نہیں ہوا اور مرض نفاق مستحکم ہے تو ایسا آدمی ضرور رسول اللہ کے فیصلے سے انکار کرے گا اور اگر نفاق نہ ہو دل میں خلوص ہی ہو تب بھی ایمان کے دائرہ سے نکلنے کیلئے کافی ہے۔ عدالت رسول پر شک کرنے والا بھی مومن نہیں ہو سکتا۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ ان کے انکار کو دیکھ کر ان تین باتوں میں سے ایک بات کہہ سکتا ہے یا تو ان کے دلوں میں مرض نفاق مستحکم ہے جو کسی طرح زائل نہیں ہو سکتا اور وہی انکار پر آمادہ کرتا ہے۔ یا کوئی عارضی شک پیدا ہو گیا ہے کہ حق طریقے سے ہمارا فیصلہ نہ ہو گا یا ان کو خوف ہے کہ اللہ اور اللہ کا رسول ان کی حق تلفی کرے گا اور انصاف نہ کرے گا۔ بہرحال تینوں درجات نفاق کے ہیں۔

ضمیمہ آیت پکار کر کہہ رہی ہے کہ قاضی، عالم ہو اور دل کے سامنے باہمی جھگڑوں کا مرافعہ کرنا لازم ہے کیونکہ وہ نائب رسول اور جانشین نبی ہے۔ بقول ابن خواز منداد قاضی کا عادل اور عالم ہونا ضروری ہے۔ مؤلف فتح البیان نے بھی اس شرط کو ضروری قرار دیا ہے۔ کیونکہ اگر قاضی جاہل ہو گا تو وہ شریعت کے مطابق فیصلہ نہیں کر سکتا اور اگر کھلا ظالم ہو گا تو علاوہ رسول اللہ کی غلط جانشینی کے اس سے انصاف کی امید ناممکن ہے، مگر قرطبی نے ان دونوں شرطوں کو غیر ضروری قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ حاکم کا حکم ماننا بہرحال واجب ہے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا الخ۔ اوپر کی آیات میں منافقوں کی حالت اور طریق عمل کو ظاہر کیا تھا۔ اس آیت میں ان کے مقابل باخلاص مومنوں کی حالت کا اظہار فرمایا ہے تاکہ نفاق و ایمان کی کسوٹی نمایاں ہو جائے اور مخلص و منافق کو جانچنے کا ایک ضابطہ معلوم ہو جائے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ مخلص اہل ایمان کو جب خدا اور رسول کے فیصلہ کی طرف بلایا جاتا ہے تو وہ اپنے نفع نقصان کے خیال کے بغیر محض حق جوئی کے لئے فوراً قبول کر لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کو گوش ہوش سے سنتے، دل سے اس پر یقین رکھتے اور عمل سے اس کو مانتے ہیں۔ درحقیقت اہل فلاح یہی لوگ ہیں۔

حضرت عبادہ بن صامت انصاری ؓ نے وفات کے وقت اپنے بھتیجے جنادہ بن امیہ کو وصیت فرمائی تھی کہ سننا اور ماننا تم پر واجب ہے۔ خواہ تعمیل کرنے میں تم پر دشواری ہو یا آسانی۔ خوشی ہو یا ناخوشی۔ خواہ دوسرے کو تم پر ترجیح دی جائے (یا تم کو دوسرے پر) یہ بھی واجب ہے کہ اپنی زبان کو عدل پر قائم رکھو اور خدا کے حکم میں جگہ ملامت کرو۔ ہاں اگر تم کو ایسی بات کا حکم دیں جو کھلا گناہ ہو اور کتاب الٰہی کے مخالف ہو اس وقت تم قرآن کی پیروی کرو (رواہ قتادہ) حضرت ابو درداء نے فرمایا تھا اسلام بغیر طاعت کے نہیں اور خیر جماعت میں ہی ہے اور خیر خواہی واجب ہے اللہ کی اس کے رسول کی خلیفہ کی اور عام مومنوں کی۔ حضرت عمر ؓ نے اسلام کا راستہ جن چیزوں کو قرار دیا تھا ان میں سے ایک بات یہ بھی کہ جس کو اللہ نے مسلمانوں کے کام کا سرپرست اور ذمہ دار کر دیا ہو اس کا حکم بھی ماننا لازم ہے (رواہ ابن ابی حاتم)

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ الخ۔ یہ ایک عام ضابطہ کا بیان اور معیار اسلامی کا اظہار ہے۔ ابن عباس ؓ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ اطاعت خدا سے فرائض الٰہیہ کی ادائیگی، اطاعت رسول سے رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کی پیروی، خشیۃ اللہ سے گزشتہ گناہوں کی سزا کا اندیشہ اور تقویٰ سے آئندہ گناہوں سے نفس کی بازداشت مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ درجۂ فوز کو پہنچنے والے وہ لوگ ہیں جو اللہ کے فرائض اور رسول اللہ کی سنتوں کو ادا کرتے ہیں گزشتہ گناہوں کا مواخذہ ہونے سے ڈرتے ہیں اور آئندہ گناہوں سے نفس کو روکتے ہیں۔ ابن کثیر نے اطاعت خدا اور رسول کو عام قرار دیا ہے خواہ ایجابی ہو یا سلبی یعنی فرائض و سنن کی ادائیگی ہو یا ممنوعات و مکروہات سے اجتناب۔ بات یہ ہے کہ حصول سعادت کے لئے تخلیہ اور تحلیہ دونوں کی ضرورت ہے۔ نفس کو گناہوں سے بچانا، خصائل رذیلہ میل کچیل صاف کرنا اور مہلکات نفس کے زنگ کو دور کرنا سب سے پہلے ضروری ہے پھر عبادات، حسن معاملات، ادائے واجبات اور پابندی مستحبات کے زیور سے نفس کو آراستہ کرنا لازم ہے۔ استعمال دوا بغیر پرہیز کے بیکار ہے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ الخ۔ مذکورۂ بالا تنبیہ و ہدایت کے بعد منافقین قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ ہم خالص مومن ہیں۔ اگر آپ ہم کو گھر بار اور اہل و عیال چھوڑ کر کہیں جانے کا حکم دیں تو ہم تیار ہیں حکم بردار ہیں۔ اس کے جواب میں خدا تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان سے کہہ دو کہ جھوٹی قسمیں کھانے اور باتیں بنانے کی کیا ضرورت ہے، تمہاری فرماں برداری کی حقیقت معلوم ہے پھر قسمیں کھانے سے اعتبار کس کو آنے لگا۔ یا یہ مطلب ہے کہ ضابطہ کی اطاعت اور دستور کے مطابق فرماں برداری تم سے بھی طلب کی جاتی ہے۔ اس کے خلاف تابعداری کی باتیں بنا کر اور قسمیں کھا کر اپنے آپ کو تابعدار جتانا دنیا سازی کی باتیں ہیں۔ اللہ تو دلوں کی حالت جانتا ہے، اس لئے اس قسم کی باتیں بنانا فضول ہے۔ تبلیغ اسلام کی ذمہ داری جو رسول پر ہے اس کے جواب دہ ہیں) اور اطاعت کی ذمہ داری جو تم پر ہے اس کے جواب دہ تم ہو۔ پس رسول تو اپنا کام پورا کر چکے اب تم اپنی فکر کرو کہ کیا کرنا چاہیے تھا اور کیا

قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ۔ چونکہ منافقوں کی قسمیں نفاق پر مبنی تھیں، اس لئے قسم کھانے کی ممانعت فرما دی۔ اس سے سچی قسم کھانے کی ممانعت نہیں نکلتی۔

طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ کے دو معنی ہیں۔ پہلا معنی یہ ہے کہ اطاعت و فرماں برداری تو ایک مشہور معروف چیز ہے۔ ہر شخص کو اس کا علم ہو جاتا ہے کتنی ہی چھپانے کی کوشش کی جائے قلبی طاعت چھپ نہیں سکتی۔ اعمال سے اس کا اظہار ہو ہی جاتا ہے، اس لئے قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں۔ دوسرے معنی ابن جریر نے یہ لکھے ہیں کہ تمہاری طاعت تو معلوم ہو گئی ایسے زبانی قول سے کیا فائدہ جب عمل نہ ہو۔ جھوٹی قسم کھانے سے بے عمل قول کا یقین نہیں آ سکتا۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۔ اللہ کی اطاعت ظاہر وحی یعنی قرآن پر چلنا ہے اور رسول اللہ کی اطاعت وحی خفی یعنی سنت کی تعمیل کرنی ہے۔ گویا قرآن و سنت دونوں پر چلنے کا نام اطاعت کاملہ ہے۔

فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۔ یعنی فرض جدا جدا ہے۔ امت کا فرض اطاعت اور رسول کا کام تبلیغ ہے۔ کسی کے ماننے نہ ماننے سے رسول کو فائدہ نقصان نہیں پہنچتا۔ اگر تم رسول کے حکم پر چلو گے تو خود ہدایت پاؤ گے نہ چلو گے گمراہ ہو گے۔ حضرت علقمہ بن وائل سے مروی ہے کہ حضرت سلمہؓ نے ایک مرتبہ خدمت اقدس میں عرض کیا یا رسول اللہ اگر ہم پر ایسے سردار ہوں جو اپنا حق تو ہم سے لیں اور ہمارا حق نہ دیں تو ہم کو کیا کرنا چاہیئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اُن پر اُن کی ذمہ داری ہے اور تم پر تمہاری ذمہ داری ہے۔ (رواہ مسلم والترمذی)

حضرت جابرؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا حضور اگر بدکردار سردار کی زیر قیادت ہم کافروں سے جہاد کریں۔ فرمایا ہاں کافروں سے جہاں کہیں ہو جہاد کرو۔ سرداروں کا فرض اُن کے ذمہ ہے اور تمہارا فرض تمہارے ذمہ ہے۔

مقصود بیان زبانی اقرار و عملی مخالفت کے بعد باوجود مومن ہونے کے لئے کافی نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر ناراض ہونا اور شرعی احکام سے سرتابی کرنا نفاق کی علامت ہے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ جو لوگ شرعی احکام و اصول کی توہین کرتے ہیں اور ان کو ناقابل التفات سمجھ کر ہنسی اڑاتے ہیں وہ ایمان سے خارج ہو جاتے ہیں۔ احکام اسلامی کی طرف میلان کی غرض حُبِ مالی کو نہ قرار دینا چاہیئے۔ یہ ضعف ایمان کی بلکہ نفاق کی نشانی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ظالم سمجھنا اور حکم قرآنی کو ظلم کہنا کافر بنا دیتا ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ باہمی فساد و نزاع کی چارہ جوئی شرعی نقطۂ نظر سے کریں اور شریعت جو حکم دے اس پر عمل کریں خواہ فائدہ ہو یا نقصان۔ مومن پر لازم ہے کہ فرائض الٰہیہ کو ادا کرے، سنتِ رسول کی پیروی کرے، گزشتہ گناہوں کے مواخذہ سے ڈرے اور آئندہ گناہوں سے اجتناب کرے۔ ایمان و اخلاص کو ثابت کرنے کی جھوٹی قسمیں کھانی ناجائز ہیں۔ اخلاص کا ثبوت عمل سے ہوتا ہے۔ آیات کا سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ عمل بہت زیادہ ضروری ہے اگرچہ جزوِ ایمان نہیں، مگر ایمان اس پر موقوف ضرور ہے وغیرہ۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ

تم میں سے جو لوگ مومن اور نیکوکار ہیں اُن سے اللہ نے وعدہ کر لیا ہے کہ زمین میں اُن کو ضرور جانشین بنائے گا جس طرح اُن سے پہلے لوگوں کو

مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ

جانشین بنایا اور ضرور بالضرور اُن کے لئے اس دین کو مضبوط کر دے گا جس کو اللہ نے اُن کے لئے پسند کیا ہے اور خوف کے بعد اُن کو امن دے گا

يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ وَ

کہ وہ میری عبادت کیا کریں گے کسی چیز کو میرا شریک نہ بنائیں گے اور اس کے بعد جو لوگ ناشکری کریں گے وہی فاسق ہیں اور

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ

تم ٹھیک ٹھیک نماز پڑھا کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور رسول کا کہنا مانو تاکہ تم پر رحم کیا جائے (اے نبی) تم خیال بھی نہ کرنا کہ

تیس سال بہت قوت وشوکت رہی پھر گھٹنے لگی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اب ان سے زیادہ کمزور حالت دنیا میں کسی قوم کی نہیں اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ عدالت سے انحراف ہوا، انصاف کی طرف توجہ نہ رہی، عبادتِ الٰہیہ میں سستی پیدا ہوگئی ۔ سچ ہے جو قوم اللہ کی ناشکری کرتی ہے وہ خدا کو ہرا نہیں سکتی اور اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہو سکتی ۔

تحلیلِ اجزاء

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا ابن ابی حاتم، طبرانی اور حاکم نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مدینہ تشریف لائے تو تمام جزیرۂ عرب بلکہ حدود شام کے رہنے والے عیسائی بھی دشمن ہوگئے ۔ ہر وقت دشمنوں کی یورش کا خطرہ رہتا تھا، شبانہ روز خوف کی حالت تھی، ہر وقت مسلمان ہتھیار بند رہتے تھے ۔ ایک بار ایک صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہمارے لئے ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا کہ ہتھیار کھول کر امن کے ساتھ رہیں اور اللہ کے سوا ہم کو کسی کا خوف نہ ہو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی قدر اسی حالت پر صبر کرنا پڑے گا، لیکن پھر ایسی حالت ہو جائے گی کہ تم امن کے ساتھ جلسوں میں چادریں اوڑھے بیٹھے رہوگے اور ہتھیار کا نام بھی نہ ہوگا۔ یہ آخری جملے صرف ابوالعالیہ کی روایت میں آئے ہیں ۔ اس وقت آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔ آیات کا سبب نزول اگرچہ صحابہ کی خطرناک حالت میں ہے مگر آیت کا حکم صرف صحابہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام وہ لوگ جو مومن نیکوکار، عبادت گزار، نمازی، پرہیزگار اور فرائض ادا کرنے والے اور محرمات سے اجتناب رکھنے والے ہیں سب کے لئے وعدۂ نصرت عام ہے، کسی زمانہ میں ہوں اور کسی ملک کے باشندے ہوں صرف خلفائے اربعہ اور مہاجرین یا اہلِ عرب کے لئے یہ حکم نہیں ہے ۔ روایات سلف میں جو صراحت آئی ہے کہ صحابہ سے خدا نے وعدۂ نصرت کیا ہے ۔ اس سے مراد تخصیص حکمی نہیں بلکہ تعیین مورد کی صراحت مقصود ہے ورنہ حکم تمام اہلِ حق کے لئے عام ہے ۔

لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ ۔ شیخ ابن عربی نے لکھا ہے کہ زمین سے عرب وعجم کی زمین مراد ہے ۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ نے میرے لئے زمین لپیٹ دی کہ میں نے اس کے مشارق و مغارب کو دیکھ لیا۔ عنقریب میری امت کی حکومت وہاں تک پہنچ جائے گی جہاں تک میرے لئے زمین لپیٹ دی گئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے نیکوکار مومنوں سے وعدہ کر لیا ہے کہ روئے زمین کی حکومت ان کو عطا کرے گا تاکہ اقامت عدل، اشاعتِ خیر اور ممانعت شر میں وہ اللہ کے اور اس کے رسول کے نائب ہوں اور یہ وعدۂ خلافت مسلمانوں سے ہی کوئی نیا وعدہ نہیں بلکہ ان سے پہلے گزشتہ اقوام کو بھی اسی طرح حکومت و عزت عطا کی تھی ۔ بنی اسرائیل وغیرہ کو بھی ملک میں تسلط اور ترفع بخشا تھا۔

وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ ۔ ہوش مند اور سمجھدار طبقہ دنیا میں کم ہے ۔ دلائل و براہین کی روشنی میں کسی چیز کی صداقت وحقانیت کا اقرار کرنے والے بہت ہی قلیل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حق کی مخالفت کثیر افراد کی طرف سے ہوتی ہے اور دنیا کی زیادہ آبادی استیصال صداقت کے درپے رہتی ہے ۔ دین اسلام کی قوت اگرچہ اپنے اصول اور ناقابلِ زوال ضوابط کی وجہ سے ہے، مگر جن کی آنکھوں میں روشنی نہ ہو ان کو سورج کی شعاعیں نظر نہیں آتیں، اس لئے ضروری ہوا کہ روحانی اور ذہنی صداقت کے ساتھ ساتھ تلوار بھی اہلِ حق کے ہاتھ میں دے دی جائے تاکہ اگر حق کی اشاعت صداقت کے زیر اثر ہو تو اس کی حفاظت تلوار سے ہو۔ خدا تعالیٰ نے قرآن پاک نازل فرما کر روحانی پاکیزگی اور معرفت کے اصول بتلائے، خلق کا خالق سے رشتہ جوڑا، معاشرت، اخلاق اور سماج و مدنیت کے ضوابط کی تعلیم دی، سیاست کے قواعد سکھائے، مگر مفسد اہلِ عناد کو زیر کرنے کے لئے اہلِ ایمان کو عمومی تسلط اور حکومت عامہ بھی عطا کی تاکہ کوئی دنیوی اقتدار اور ضوابط قرآنی کی مخالفت نہ کر سکے اور سلطنت کے زیر سایہ قرآنی ہدایات پھیل جائیں ۔ حقیقت میں خلافتِ ارضی فقط مادی ترفع اور جسمانی حکمرانی ہی کا نام نہیں بلکہ استخلاف کا اصل منشاء دین حق کو قوت پہنچانا اور صداقت کی حمایت کرنا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب اقوام پارینہ بلکہ مسلمانوں نے بھی استخلاف کی اصل غرض کو فراموش کر دیا اور سلطنت کو صرف ظاہری برتری اور نام ونمود کا ذریعہ بنالیا اور دین کی حمایت واشاعت کو پس پشت ڈال دیا تو خدا نے ان سے ظاہری شوکت و جلال بھی چھین لیا کیونکہ اس وقت اہلِ حق کی سلطنت اور اہلِ باطل کی حکومت میں کوئی فرق نہ رہا تھا اور واقعیاتِ دینی فوت ہو گیا تھا۔ اسی مطلب کی وضاحت آیت مذکورہ میں فرمائی ہے اور اس کے بعد توصاف ارشاد فرمادیا ہے کہ اہلِ حق کو جو خوف وہراس کفار کی طرف سے ہے خدا تعالیٰ اس کو ضرور دور کر دے گا اور خوف کی بجائے امن عطا فرمادے گا تاکہ آزادی کے ساتھ اعلانِ توحید کریں اور اللہ کی عبادت بے روک ٹوک کر سکیں۔

وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ ۔ لیکن اگر اس انعام سے کسی نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور عطائے سلطنت کی اصل غرض کو فوت کر دیا اور عدل کو چھوڑ کر ظلم کی طرف میلان کیا اور توحید وعبادت کے جذبہ کو پس پشت ڈال کر دنیوی کامرانی وعیش پرستی کو مطمح نظر بنالیا اور اس طرح کفرانِ نعمت کیا تو ایسے لوگ فاسق ہیں، حکم الٰہی سے سرتابی کرنے والے ہیں، حدود شریعت سے خارج ہونے والے ہیں یعنی ان سے نہ وعدۂ نصرت ہے نہ ان کو تسلط عطا کرنے یا قائم رکھنے کی صراحت ہے ۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ جب خلفائے اربعہ کے بعد خلافتِ اسلامیہ سنتِ کسرویہ پر چلنے لگی اور ہرقلی یاد کو اس نے تازہ کرنا شروع کر دیا اور دنیوی نام ونمود اور ظاہری ابہت کے جال میں پھنس گئی اور بیت المال رعایا کا نہ رہا بلکہ سلطنت کا خزانہ ہو گیا اور بادشاہ کا موروثی مال سمجھا جانے لگا اور فسق وفجور پھیل گیا اور خلافت نبویہ کی جگہ تسلط قیصری نے

لے لی تو مسلمانوں کے اقبال کے ستارہ کو گہن لگنا شروع ہوگیا صعود کی بجائے ہبوط اور سعادت کی بجائے نحوست آگئی اور اصول قرآنی کی خلاف ورزی نے حکومت اسلامیہ کی جڑ کو گھن کی طرح کھانا شروع کر دیا اور انجام کار یہ روز بد دیکھنا نصیب ہوا جو ہماری نظروں کے سامنے ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۔ اس لئے لازم ہے کہ اللہ کے فرمانوں پر مسلمان کاربند رہیں، خصوصاً نماز کی پابندی رکھیں، شرعی زکوٰۃ دیں اور ہر قول و عمل میں رسول کے نقش قدم پہ چلیں تاکہ اللہ ان پر رحم فرمائے اور اپنی رحمت سے ان کو سرفراز کرے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الخ۔ نزول آیات کے وقت عرب کی کفر پرستی، جہالت آفرینی اور شر انگیزی کے علاوہ دنیا کی ممتاز سلطنتیں بھی کافر تھیں۔ دولت قیصر، حکومت کسریٰ، سلطنت مصر اور امارت عمان کا شاہی مذہب اسلام نہ تھا بلکہ دنیا میں سے بھی کوئی فرد مسلمان نہ تھا۔ کہیں ستارہ پرستی اور آتش پرستی کا رواج تھا کہیں صلیب پرستی اور برائے نام عیسائیت مقبول طبائع تھی ایران کے زیر اثر عراق میں اور روم کے زیر اثر شام میں کافروں ہی کی حکومتیں تھیں۔ یہ تو بیرونی حالت تھی مسلمانوں کے وطن کی حالت بھی بہت ہلاکت آفریں تھی۔ خیبر، فدک اور مدینہ کے یہودی بغل کے گھونسہ بنے ہوئے تھے، منافق آستین کا سانپ تھے، قبائل غطفان اور قریش کی وہ شوراشوری تھی کہ الامان،

اس لئے مسلمانوں کو اپنے مذہب، جان، مال، اولاد اور آبرو کا خطرہ ہونا اقتضائے بشریت کے موافق تھا، اس لئے بطور تسلی کے فرمایا کہ یہ تمام کفار خدا کو ہرا نہیں سکتے۔ آخر میں ان کا برا انجام ہوگا۔ یعنی کفار کی ظاہری طاقت مال کی فراوانی، لشکر کی کثرت، جاہ و جلال کی سطوت کوئی بھی خدا پر غالب نہیں آسکتی۔ مسلمانوں میں اگرچہ مادی قوت نہیں، ہتھیاروں اور فوجوں کی طاقت نہیں، ملک کی وسعت نہیں مگر خدائی طاقت ان کے ساتھ ہے جو تمام عالم پر غالب ہے وہی کافروں پر مسلمانوں کو غالب کرے گا اور وہی عالمگیر قوتوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دے گا، اس لئے ہراس و خوف نہ کرنا چاہیئے۔

مقصود بیان

جو لوگ مومن ہونے کے ساتھ نیکوکار ہیں خدا نے ان سے وعدہ کر لیا ہے کہ دنیا کی سلطنت ان کو عطا فرمائے گا، لیکن حکومت عطا کرنے کا منشاء یہ ہرگز نہیں ہے کہ ظالموں کے پنجہ سے دنیوی مردار کو نکال کر دوسرے مردار خوار گدھوں کے حوالہ کر دیا جائے بلکہ دنیوی سلطنت دینے کا اصل منشاء دین کو مستحکم کرنا ہے۔ اس سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ دنیا کی طلب، حکومت کی خواہش اور سلطنت کے حصول کی کوشش ممنوع نہیں، مگر جذبہ دینی کے تحت ہونا چاہیئے۔ حصول دولت و حکومت سے مقصود یہ ہو کہ اشاعت دین اور استحکام اصول قرآنی ہو۔ تبلیغ اسلامی بے روک ٹوک کی جائے۔ محض دنیا طلبی مقصود نہ ہو۔ جو حکومتیں اور قومیں اللہ کے انعام کی ناشکری کرتی ہیں اپنی انعام کی اصل غرض کو منتہائے نظر نہیں بناتیں اور مال و دولت کو محض عیش پرستی و آرام طلبی کا وسیلہ سمجھ لیتی ہیں ان سے وعدۂ نصرت نہیں ہے وہ نافرمان ہیں۔ اس فقرہ میں دور حاضر کے مسلمانوں کے لئے خزانۂ نصیحت پوشیدہ ہے کیونکہ تمہارے اعمال خراب ہوگئے، دنیا کو تم نے مطمح نظر بنا لیا اور اسلام کو خیرباد کہہ دیا ہے یا زیادہ سے زیادہ ثانوی قرار دے لیا ہے، اس لئے خدا نے بھی تمہاری مدد کرنی چھوڑ دی اور تم کو ذلیل کر دیا۔ اب بھی اگر نماز کی پابندی کرو گے اور قاعدہ اسلامی کے مطابق برادران ملت کی ہمدردی مالی کرو گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستہ پر چلو گے تو خدا تعالیٰ تم پر ضرور رحم فرمائے گا اور اس ذلت سے نکال دے گا۔ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ کا لفظ بتا رہا ہے کہ نماز زکوٰۃ اور دیگر فرائض کی ادائیگی اور اطاعت رسول، خدا پر بندہ کا حق واجب نہیں کر دیتی بلکہ اس کے رحم کا مستحق بنا دیتی ہے۔ آیت لَا تَحْسَبَنَّ تلقین کر رہی ہے کہ کفار کی مادی طاقت اور ظاہری شوکت کتنی بھی ہو، مسلمان کو اس سے ڈرنا نہ چاہیئے بلکہ خدا پر بھروسہ رکھتے ہوئے مقابلہ کی کوشش کرنی چاہیئے خدا کامیاب کرے گا۔

ضمیمہ

آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے بعض مفسرین نے خلفائے راشدین و خلافت کا استنباطی ثابت کیا ہے اور لکھا ہے کہ چونکہ ان خلفائے کرام کے عہد میں ایران اور روم کی وسیع الاطراف سلطنتیں فتح ہوئیں۔ اہواز، خراسان اور ممالک افریقیہ پر تسلط ہوا اور امن کے ساتھ ان کے زمانہ میں اسلام کی اشاعت ہوئی۔ اس لئے خلفائے راشدین کی خلافت کا حق ہونا اس آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ استنباط صحیح نہیں محض روافض و خوارج کی تردید کرنے کا شوق اس قسم کے استنباط کا باعث ہے۔ کسی خلیفہ کے زمانے میں ممالک اسلامیہ کی توسیع اس کی خلافت کو برحق ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے جب تک اس خلیفہ کی زندگی اسلامی سانچے میں نہ ڈھلی ہو۔ ہر قول و عمل سے اطاعت رسول کا مظاہرہ نہ ہوتا ہو اس وقت تک توسیع ملکی کو خلافت کے برحق ہونے کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا ورنہ لازم آئے گا کہ عبدالملک بن مروان کو بھی خلیفہ برحق مانا جائے جس کے زمانہ میں محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا۔ عباسیہ میں سفاح، منصور، ہارون، مامون وغیرہم کو بھی خلفائے راشدین کہا جائے جنہوں نے ممالک اسلامیہ کی توسیع میں کافی حصہ لیا۔ حالانکہ یہ سب لوگ غاصب تھے۔ تاریخ اسلامی کے اوراق جہاں ان کی فتوحات سے روشن ہیں وہاں ان کے سیاہ اخلاق اور خلاف شرع احوال زندگی سے کالے بھی ہیں۔ پھر بنی امیہ اور عباسیہ ہی نہیں بلکہ ہر جلیل القدر بادشاہ کو خلیفۂ منصوص قرار دیا جائے خواہ وہ تیمور ہو یا جلال الدین اکبر یا اورنگ زیب یا بہمنی یا سلجوقی حکمران۔ حالانکہ واقعہ ایسا نہیں ہے۔ خلفائے راشدین کی امتیازی خصوصیت توسیع ملکی نہیں جہاد نفسانی اور ایثار اسلامی ہے، اتباع سنت اور جذبۂ اطاعت الٰہی ہے، ملکی فتوحات کو ثانوی

نازک ترین مبحث کے چہرے سے نقاب اٹھایا تھا اور واجب کی چند خصوصی صفات کو سادہ مگر پر حکمت الفاظ میں بیان کیا تھا تو اس کے فوراً بعد تنازع البقاء کے پیچیدہ مسئلہ کو حل کیا اور وہ اصول بتائے جن پر کاربند ہو کر معمولی اور کمزور قوم قہار سلطنتوں پر غالب آسکتی ہے۔ حکم نماز تنظیم حکم ادائے زکوٰۃ سے باہمی تعاون اور حکم اطاعت رسول سے امیر کے حکم کو بغیر کسی چون و چرا کے ماننے کی طرف اشارہ تھا اور ایمان و عمل صالح کو قومی عروج و ترقی اور وقار و تسلط کا واحد ذریعہ قرار دیا تھا۔ اس مسئلہ سے فارغ ہو کر اصلاح معاشرت و اخلاق کی طرف رخ کیا اور اس معمولی عام رواج کی درستگی کی جس کی خوگر تمام غیر مہذب قومیں ہیں۔ ہر انسان پر روزانہ بعض اوقات ایسے گزرتے ہیں کہ وہ ان میں تخلیہ کا طالب ہوتا ہے ہر آدمی کی چند ذاتی حالتیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ اسی کی ذات سے خصوصیت رکھتی ہیں۔ باپ ہو یا ماں، بیٹا بیٹی ہو یا خادم و خادمہ وہ کسی کی مداخلت اس وقت گوارا نہیں کرتا۔ کوئی مہذب آدمی اپنے اعزا و اقارب، خدام یہاں تک والدین و اولاد کے سامنے مقاربت منفی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ سوتے وقت ننگا کھلا بھی ہوتا ہے۔ غیر مردوں کی بندش تو آیت حجاب اور دیگر احکام سے ہو گئی تھی، مگر اہل خانہ کا ایک دوسرے کے پاس بے روک ٹوک چلا آنا اور آپس میں خلط ملط ہونا انسانی ضروریات کی تکمیل کے لئے از بس ضروری تھا، اس لئے اس کی بندش نہیں کی گئی تھی لیکن ایک گھر کے رہنے والے بھی چونکہ بعض اوقات تنہائی پسند کرتے ہیں، اس لئے باہم ایک دوسرے کی مداخلت بغیر اجازت کے تکدر طبائع کا باعث ہو جاتی ہے۔ اسی مداخلت بیجا سے روکنے اور شرف اخلاق کی تعلیم دینے کے لئے مذکورہ بالا آیات کا نزول ہوا۔

تحلیل اجزاء

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِیْنَ مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ۔ مملوک سے عام مملوک مراد ہے۔ باندی ہو، غلام، خادمہ ہو یا خادم سب کو اجازت لے کر داخل ہونا چاہیئے۔ وَالَّذِیْنَ لَمْ یَبْلُغُوا الْحُلُمَ۔ اور وہ بچے جو نابالغ ہوں، مگر شعور دار ہوں لڑکے ہوں یا لڑکیاں، اپنی اولاد ہو یا دوسرے کی ان کا داخلہ بھی بغیر اجازت حاصل کئے ممنوع ہے۔

ثَلٰثَ مَرّٰتٍ۔ یعنی تین اوقات میں نماز فجر سے قبل، دوپہر کو، سوتے وقت اور نماز عشاء کے بعد۔ یہی تینوں اوقات ننگا کھلا ہونے کے ہیں۔ گرم ممالک میں ان اوقات کے علاوہ نابالغ بچوں اور گھر کے خدمت گاروں کو اجازت لے کر آنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ضروریات خانگی کی تکمیل کے لئے ان کا آنا جانا ضروری ہے اور ہر وقت اجازت لینے میں سخت دشواری ہے۔

وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ۔ ہاں جب بچے بالغ ہو جائیں تو ان کو بھی اسی طریقہ سے اجازت لے کر آنا چاہیئے جس طرح ان سے بڑی عمر والے اجازت لے کر آتے ہیں۔ آیت حجاب میں اس حکم کو مفصل بیان کر دیا ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں میں جس رات جوان ہوا اس کی صبح کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے اس کا تذکرہ کیا۔ ارشاد فرمایا اب تم عورتوں میں بلا اجازت مت جایا کرو۔ خطیب نے لکھا ہے کہ سعید بن مسیب کا قول ہے کہ اپنی ماں کی خدمت میں جانے کے لئے بھی اجازت طلب کرنے کی ضرورت ہے۔ حضرت حذیفہؓ سے دریافت کیا گیا کیا ماں کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے بھی اجازت طلب کرنے کی ضرورت ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے فرمایا ہاں۔ اگر اجازت نہ مانگے گا تو ہو سکتا ہے کہ اچانک اس کو ایسے حال میں دیکھے جو ماں کو ناگوار ہو۔ ابن مسعودؓ اور جابرؓ سے اسی مضمون کی روایات منقول ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ نکلا کہ غیر مردوں کو اور اجنبیوں جوانوں اور بالغوں کو تو اجازت لے کر اندر داخل ہونے کا حکم پہلے ہو چکا تھا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ الخ میں اس کی تفصیل آ گئی تھی۔ اب رہ جاتے گئے وہ جو ہر طرح گھر میں رہتے جن سے عادۃً پردہ نہیں کیا جاتا خواہ اپنے ہوں یا بیگانے۔ یہاں تک کہ اپنی اولاد ہو یا بھائی بہن یا ان کی اولاد۔ اسی طرح باندی غلام سے بھی کوئی خاص احتیاط کی ضرورت نہیں۔ یہ ہمیشہ خدمت ہوتے ہیں۔ ہر وقت آقا کے پاس آتے جاتے ہیں۔ ان کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، مگر بعض مسلمانوں کو ان کا بے وقت آنا جانا اور بغیر اجازت لئے ناگہاں آجانا بھی ناگوار معلوم ہوتا تھا اور ہے بھی یہ حرکت تہذیب خانگی کے خلاف۔ کسی کا دل چاہتا ہے کہ سونے کے وقت جب کپڑے اتار دئے ہوں کوئی ہوشیار بچہ خواہ اپنا عزیز ہی ہو یا کوئی غلام باندی خادم خادمہ بے روک ٹوک چلا آئے، اس لئے حکم دے دیا کہ باندی، غلام اور نابالغ بچے تینوں اوقات میں اجازت لے کر آیا کریں۔ رہے باقی اوقات تو ان میں اجازت لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ ہر وقت کے آنے جانے والے ہیں۔ ہر وقت اجازت لینے میں دشواری ہے اور بچے جب بالغ ہو جائیں تو ان کو ہر وقت اسی طرح سے اذن داخلہ طلب کرنا چاہیئے جس طرح بڑے اور بالغ مردوں کو اجازت طلب کرنے کا حکم ہے۔

حکم آیت محکم ہے یا منسوخ؟

صحیح یہ ہے کہ حکم آیت منسوخ نہیں محکم ہے۔ شعبی، ابن کثیر، زمخشری اور دیگر مفسرین کا یہی قول ہے۔ سعید بن جبیر نے فرمایا لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے واللہ منسوخ نہیں ہے، مگر لوگوں نے اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔ ابن ابی حاتم نے بروایت عکرمہ بیان کیا کہ دو آدمیوں نے ابن عباسؓ سے اوقات ثلاثہ میں اجازت لینے کے حکم کو دریافت کیا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ پردہ پوش ہے پردہ چاہتا ہے۔ آغاز اسلام میں عموماً گھروں میں نہ تھے نہ پلنگ کے پردے ہوتے تھے نہ دروازوں پر پردے تھے۔ اکثر ایسا ہو جاتا تھا کہ کوئی شخص اپنی بیوی کے پاس ہوتا اور اس کا خادم یا لڑکا اچانک آجاتا، اس لئے اللہ

نے اوقات ثلاثہ میں اجازت لے کر داخل ہونے کا حکم دے دیا پھر اللہ نے لوگوں کو پردے دے دیئے اور رزق میں وسعت عطا کی، اس لئے انہوں نے دروازوں پر پردے لٹکا لئے اور پلنگ کے پردے بھی بنا لئے۔ پس اب بعض لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہ رہی کہ پردے کی وجہ سے اجازت طلبی کے حکم سے بے نیاز ہو گئے اور اذن مانگنے کی ضرورت نہ رہی (قال ابن کثیر اسنادہ صحیح)

ابن عباسؓ کا قول دوسری روایت میں اس طرح آیا ہے کہ لوگوں نے تین آیتوں پر عمل کرنا (چھوڑ دیا)۔ ایک آیت یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِیَسْتَاْذِنْکُمُ الَّذِیْنَ — الخ اور دوسری سورۂ نساء والی آیت وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَۃَ اُولُوا الْقُرْبٰی الخ اور تیسری سورۂ حجرات والی آیت اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ مگر میں تو اپنی باندی کو بھی حکم دیتا ہوں کہ اندر آنے کی مجھ سے اجازت طلب کرے۔ یہ تمام اقوال آیت کے غیر منسوخ ہونے پر دلالت کر رہے ہیں۔ سدی نے فرمایا کچھ صحابی اوقات ثلاثہ میں اپنی بیبیوں سے قربت کرنی پسند کرتے تھے تاکہ غسل کر کے بفراغت نماز کو آئیں، اس لئے اللہ نے حکم دے دیا کہ ان اوقات میں ان کے خدام و اطفال اُن کے پاس نہ جائیں۔

سعید بن مسیب اور بعض دیگر علماء کے نزدیک آیت کا حکم منسوخ ہے۔ میرے نزدیک طلب اجازت کا حکم دوامی ہے سوا اس صورت کے جبکہ اجازت عام ہو۔ خواہ صراحۃً یا دلالۃً۔ کسی شخص نے اپنے کمرہ کا پردہ باندھ دیا اور خود سامنے بیٹھ گیا یا کھلے دالان میں بغیر کسی حجاب کے بیٹھا یا لیٹا رہا تو گھر والوں کو کسی مزید اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر اس نے پردہ لٹکا دیا یا اپنے خلوت خانہ میں پہنچ گیا تو پھر بغیر اجازت لئے کوئی اندر نہیں جا سکتا۔

حکمِ آیت واجب ہے یا مستحب؟

بعض لوگ حکم آیت کو صرف استحبابی کہتے ہیں، مگر جمہور کے نزدیک وجوبی ہے۔ خطیب نے اسی کی تائید کی ہے اور قرطبی نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہی اکثر علماء کا قول ہے۔

حکم مذکور مردوں عورتوں لڑکوں اور لڑکیوں سب کے لئے عام ہے۔ ابن عباسؓ اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے کیونکہ اوقات مخصوص میں ہر ایک کا داخل ہونا ناگوار کیفیت پیدا کر سکتا ہے خواہ کچھ ہو یا بچی، غلام ہو یا باندی، اپنا ہو یا بیگانہ۔ چنانچہ بقول مقاتل ایک بار اسماء بنت مرثد کا لڑکا ایسے وقت بغیر اجازت لئے ان کے پاس گیا جو اسماء کو ناگوار ہوا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا اُس وقت آیت مذکورہ کا نزول ہوا (معالم)

دوسری روایت میں ہے کہ اسماء بنت مرثد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی اور کھانا تیار کیا۔ لوگوں نے بلا اجازت آنا شروع کر دیا۔ اسماء نے خدمت مبارک میں عرض کیا یا رسول اللہ! یہ بات بہت بری ہے کہ کوئی بے روک ٹوک چلا آئے ایسی حالت میں کہ مرد و عورت ایک چادر میں ہوں۔

اسی طرح ایک اور واقعہ بھی گزرا جس کو ابن عباسؓ نے نقل کیا ہے کہ ایک بار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی انصاری لڑکے کو حضرت عمرؓ کے بلانے کے لئے بھیجا۔ دوپہر کا وقت تھا عمرؓ سو رہے تھے۔ لڑکا گھر میں گھس گیا اور عمرؓ کو بیدار کیا حضرت عمرؓ کا کپڑا کچھ کھل گیا تھا۔ دل میں خیال آیا کہ کاش ان کے آنے جانے کی بابت بھی کوئی حکم خداتعالیٰ نازل فرما دیتا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے تو حضورؐ نے یہ آیت سنائی۔

اسی قسم کے بعض اور واقعات بھی تھے جن کو موردِ نزول قرار دیا جا سکتا ہے، مگر کسی واقعہ سے مرد و عورت اور بچہ کی تخصیص نہیں معلوم ہوتی، اس لئے آیت کا حکم بحال عام ہے۔

وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ۔ جوان عورتوں اور عمر رسیدہ عورتوں کے لئے تو چادر میں لپٹ کر نکلنے کا اور نظریں نیچی رکھنے کا وجوبی حکم آیت حجاب میں دیا جا چکا تھا، مگر وہاں کوئی لفظ ایسا مذکور نہ تھا جس سے جوان یا ادھیڑ عورتوں کی تخصیص ہو سکتی بلکہ تمام ایماندار عورتوں کے لئے عمومی حکم تھا۔ اس آیت میں ضعیف عورتوں کے لئے پردے کے حکم میں بطور استثناء تخفیف کر دی (ہکذا قال ابن عباس) سعید بن جبیر، مقاتل، ضحاک اور قتادہ کے نزدیک قواعد سے وہ عورتیں مراد ہیں جو بوڑھی ہوں اور سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے آئسۃ الاولاد و منقطع الحیض ہو گئی ہوں۔

الّٰتِیْ لَا یَرْجُوْنَ نِکَاحًا۔ جن کو جماع کی خواہش نہ رہی ہو۔ مردوں یا نکاح کی طرف رغبت نہ رہی ہو (اگر کسی سن رسیدہ عورت میں کچھ جمال باقی ہو اور مرد کو اس کی طرف رغبت ہو سکتی ہو تو وہ اس حکم میں داخل نہیں ہے)

فَلَیْسَ عَلَیْھِنَّ جُنَاحٌ اَنْ یَّضَعْنَ ثِیَابَھُنَّ۔ ایسی عورتوں کے لئے جائز ہے کہ اپنے کپڑے یعنی اوپر کی چادر اور برقعہ اتار دیں، مگر شرط یہ ہے کہ اس سے سنگھار دکھانا مقصود نہ ہو۔ کون سے کپڑے اتارے جائیں اور کون سے نہ اتارے جائیں؟ تو اس کے متعلق ابن مسعود، ابن عباس، ابن عمر، مجاہد، سعید بن جبیر، ابو الشعثاء، ابراہیم نخعی، قتادہ، حسن بصری، زہری، اوزاعی اور دیگر تابعین و مفسرین کا بالاتفاق قول ہے کہ اوپر کی چادر دلائی وغیرہ اتارنا مراد ہے۔ [illegible] اتارنا کسی طرح جائز نہیں۔ پھر یہ جواز بھی اس وقت ہے جب اظہار زینت مقصود نہ ہو۔ زینت کا اظہار تو غیر مرد کے سامنے جائز ہی نہیں۔ عورتوں نے جب ام المومنین حضرت عائشہؓ سے زیور اور کپڑے کا حکم پوچھا تو آپ نے فرمایا عورتو! اللہ نے تمہارے واسطے زینت حلال کر دی ہے بشرطیکہ غیر محرم اس کو تم سے نہ دیکھے (رواہ ابن ابی حاتم عن ام الضیاء)

وَأَنْ يَسْتَعْفِفْنَ الآیۃ حکم مذکور تو جواز کے متعلق تھا لیکن اگر اتار نے کے بجائے بھی عمر رسیدہ عورتیں اپنے تنا کپڑے بھی نہ اتاریں تو بہتر ہے تاکہ طرح سے بدنظر سے محفوظ رہے

مقصود بیان: تہذیب خانگی کے ایک مفید ترین قاعدے کی تعلیم، کپڑے اتار کر (لیٹ جانا یا ستر ڈھیلا مخفی ہو) سونے کا جواز، گھر کے خادم و خادمہ نیز نابالغ غلام کی خاص رعایت کی گئی ہے۔ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ سے حکم کے غیر منسوخ ہونے کی طرف اشارہ، اجنبی و غیر لڑکے جو بالغ ہو گئے ہوں اجنبی مردوں کے حکم میں ہیں ان سے بھی ویسا ہی پردہ کرنا چاہیئے جیسا اجنبی مردوں سے کیا جاتا ہے۔ بوڑھی عورتوں کے لئے اس حکم میں تخفیف ہے وغیرہ۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَلَا عَلَىٰ

نہ اندھے پر کچھ گناہ ہے نہ لنگڑے پر کچھ گناہ ہے نہ بیمار پر کچھ گناہ ہے اور نہ خود

أَنفُسِكُمْ أَن تَأْكُلُوا مِن بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ

تم پر اس بات میں کوئی گناہ ہے کہ تم اپنے گھروں میں سے یا اپنے باپ کے گھروں میں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں میں سے یا اپنے بھائیوں کے

أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ عَمَّاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ

گھروں میں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں میں سے یا اپنے چچوں کے گھروں میں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں میں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں میں سے یا اپنی خالاؤں

خَالَاتِكُمْ أَوْ مَا مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهُ أَوْ صَدِيقِكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَأْكُلُوا جَمِيعًا

کے گھروں میں سے یا ان لوگوں کے گھروں میں سے جن کی کنجیاں تمہارے قبضہ میں ہیں یا اپنے دوست کے گھروں میں سے کچھ کھا لو کچھ گناہ نہیں ہے کہ سب مل کر کھاؤ

أَوْ أَشْتَاتًا ۚ فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُبَارَكَةً

یا الگ الگ کھاؤ اور جب تم گھروں میں داخل ہو تو اپنے لوگوں کو سلام کرو یہ اللہ کی طرف سے پاکیزہ مبارک دعائے خیر

طَيِّبَةً ۚ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۶۱﴾ ع

ہے اللہ اپنے احکام تم سے اسی طرح بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو

تفسیر: کوئی قوم ترقی کے زینہ پر قدم نہیں رکھ سکتی جب تک اس میں تنظیم، تعاون اور تناصر نہ ہو اور تنظیم بغیر مساوات کے ناممکن ہے۔ مساوات کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ آمر و مامور، حاکم و محکوم اور خورد و کلاں کے جائز امتیازات کو بھی دور کر دیا جائے۔ کیونکہ اگر یہ امتیازات اٹھا دیئے گئے تو قوم کے افراد خود سر اور شتر بے مہار بن جائیں گے۔ تنظیم ہوا تو دور رہا انھیں باہم ارتباط اور وابستگی بھی نہ رہے گی ہر ایک بجائے خود حاکم ہوگا اور ہر شخص اپنے ہاتھ میں قانون لے لے گا۔ کسی قانون کا اثر و تسلط ان پر نہ رہے گا۔ مساوات کے یہ معنی ہیں کہ باوجود فطری فرق مراتب اور نیچرل اختلاف طبائع کے پوری قوم ایک ڈورے میں منسلک ہو جائے۔ ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ اپنا کام انجام دے اور قومی گھڑی کو چلانے کے لئے سب باہم مدد کریں۔ اس قسم کی مساوات اس وقت تک ناممکن ہے جب تک دلوں سے غرور و رعونت دور نہ ہو جائے۔ بڑے چھوٹوں کو ذلیل اور توہین کو باعث حقارت سمجھنے کا جذبہ مفقود نہ ہو جائے۔ آپس میں برادرانہ میل ملاپ پیدا نہ ہو جائے اور سب الفت و محبت کے نشہ سے سرشار نہ ہو جائیں۔ اسی لئے اسلام نے جا بجا باہم ارتباط و تآلف کی نہایت بلیغ تاکید کی ہے اور ہدایت کی ہے۔ برادری اور محبت کی تلقین کی ہے، تفرقہ اور پھوٹ سے روکا ہے، نفاق اور باہمی ٹکراؤ سے باز داشت کی ہے، قوم کو ایک عمارت قرار دیا ہے۔ جس کا ہر فرد دوسرے فرد سے وہی ارتباط رکھتا ہے جو کسی مکان کی ایک اینٹ کو دوسری اینٹ سے ہوتا ہے۔ کبھی جمہور اسلامی کو بدن انسانی بتایا جس کے تمام اعضا ایک دوسرے کے دکھ درد میں برابر شریک ہیں۔ ایک عضو کی تکلیف تمام اعضا کا تکلیف ہے

یہ سب کچھ صرف اس لئے کیا کہ قومی افراد میں محبت و یگانگی پیدا ہو اور شائستہ اخوت کا ایک دوسرے کی طرف کھینچیں۔ رنگ، شکل، زبان، وطن، نسب، قوت، صحت، دولت، عقل اور بصیرت کے اختلاف کے باوجود سب کو سب ایک ہی جذبہ کے حامل ہوں۔ مذکورہ بالا ناجائز امتیازات کے سبب کسی کو کسی پر برتری نہ ہو اور کوئی اپنی صحت و طاقت یا دولت و نسب یا رنگ و شکل یا زبان و وطن یا امارت و حکومت کے نشہ سے بدمست ہو کر اپنے کو دوسرے سے بالاتر سمجھے۔ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور کلام و سلام میں کوئی شخص رعونت کا مظاہرہ نہ کرے۔ تندرست بیمار کو، بڑا چھوٹے کو اور مالدار غریب کو اپنا بھائی سمجھے۔ اسی نقطۂ نظر کے تحت آیات مذکورہ میں تعلیم مساوات کی غرض سے دو اصول بیان فرمائے ہیں۔ ایک قاعدہ کھانے پینے کے متعلق ہے دوسرا اسلام کے متعلق۔ پہلے قاعدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اندھا ہو یا انکھیارا، لنگڑا لولا ہو یا صحیح پاؤں والا، تندرست ہو یا بیمار سب باہم مل کر کھا سکتے ہیں، کسی کو کسی کی طرف سے نفرت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، کسی کو کسی کی طرف سے کراہت کرنا جائز نہیں، کوئی بھی ہو اس کو اپنے قریبی رشتہ داروں سے تکلف نہ کرنا چاہیئے۔ ماں باپ، چچا، پھوپھی، ماموں، خاوند اور بچے دوست آشنا نیز بھائی بہن آقا اور غلام سب کو باہم ربط ضبط سے رہنا اور میل ملاپ سے گزارا کرنا چاہیئے۔ کوئی دوسرے سے تکلف نہ کرے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے ہاں بغیر کسی خاص دعوت کے بھی جب چاہے کھانے پینے کی چیزیں کھا پی سکتا ہے۔ دوسرے قانون کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی سلام ایک بابرکت دعا ہے، پاکیزہ تحفہ ہے، اس لئے گھروں میں داخل ہونے کے وقت گھر والوں کو سلام کرنا چاہیئے یعنی خوردی بزرگی، حاکمیت و محکومیت، دولتمندی اور افلاس کو سلام کرنے میں قطعی دخیل نہ بناؤ۔ یہ تو دعائے برکت اور تحیۂ سلامتی ہے اس میں رعونت اور غرور کو بالکل اثر انداز نہ کرو۔

تحلیل اجزاء

نابینا، بیمار، لنگڑے کا تذکرہ ان آیات میں بظاہر غیر مفید اور بے محل معلوم ہوتا ہے صحیح مطلب سمجھنے کے لئے شانِ نزول کو جاننا ضروری ہے۔ آیات مذکورہ کے احوال نزول میں متعدد واقعات ذکر کئے گئے ہیں۔ ہم بعض کو مختصر طور پر نقل کرتے ہیں تاکہ اصل مفہوم قرآنی صحیح طور پر سمجھ میں آسکے۔ کیونکہ

(۱) سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ جب آیت لَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً نازل ہوئی تو مسلمان انتہائی پرہیزگاری کے سبب صرف اپنے ہی گھروں کا کھانا درست جانتے تھے۔ عزیزوں رشتہ داروں اور دوستوں کے گھروں کے کھانے میں کوئی شرعی حق اپنا نہ جانتے تھے، اس لئے اس سے اجتناب کرتے تھے اور اسی جذبۂ احتیاط کے تحت اندھے، لنگڑے اور بیمار کے ساتھ نہ کھاتے تھے۔ کیونکہ اندھے کو تو کچھ نہیں سوجھتا۔ ہوسکتا ہے بلکہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ کھانے والا اچھا لقمہ خود کھا لیتا ہے اور اندھا بیچارہ رہ جاتا ہے۔ لنگڑا اپنی کمزوری کی وجہ سے حاضر ہونے میں دیر کردیتا ہے اور اس کا شریک طعام پہلے سے کھانے پر بیٹھ جاتا ہے اور کھانا شروع کردیتا ہے اور بیمار تو بیچارہ مجبور رہتا ہی ہے وہ سیر ہو کر بہ رغبت کھانا کھا ہی نہیں سکتا۔ اسی بنا پر لوگوں نے ان تینوں کے ساتھ شرکت طعام ترک کردی تھی۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی کہ اندھوں، لنگڑوں اور بیماروں کے ساتھ کھانا کھانے میں کوئی حرج نہیں اور نہ عزیزوں اور دوستوں کی دعوت کھانے میں کوئی مضائقہ ہے اور چونکہ لوگوں نے انتہائی احتیاط کی وجہ سے ساتھ کھانا ترک کر دیا تھا کہ کہیں نادانستگی میں ایک دوسرے کا حق نہ کھا جائے، اس لئے فرمایا کہ مل کر کھانے میں بھی کوئی گناہ نہیں۔

(۲) عبد الرزاق نے مصنف میں بروایت مجاہد بیان کیا ہے کہ مسلمانوں میں دستور تھا کہ کسی اندھے یا لنگڑے یا مجبور کو کھانا کھلانے کے لئے اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں کے گھر لے جاتے تھے اور وہاں جا کر خود بھی کھاتے تھے اور ساتھیوں کو بھی کھلاتے تھے مگر ساتھیوں کو کھانے میں تامل ہوتا تھا اور ناخواندہ دعوت میں شریک ہونے کو اپنی دیانت کے خلاف سمجھتے تھے، اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

(۳) ضحاک سے مروی ہے کہ اسلام سے پہلے لوگ اندھوں، لنگڑوں اور بیماروں کے ساتھ کھانے میں کراہت کرتے تھے اور علاوہ نفرت طبع کے ان کا غرور بھی ان کو اجازت نہ دیتا تھا کہ ان غریبوں کے ساتھ کھانا کھا کر اپنی توہین کریں۔ اس رواج کو دور کرنے کے لئے آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

(۴) سدی کا قول ہے کہ ابتدائے اسلام میں جب مسلمان اپنے عزیزوں کے گھر جاتے اور ان کی عورتیں کھانے کی کوئی چیز بطور تواضع پیش کرتیں تو مالک مکان کے موجود نہ ہونے کی صورت میں وہ لوگ ان کے گھر کا کھانا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ اس خیال کو دور کرنے کے لئے آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

میرے نزدیک یہ تمام اسباب نزول ناقص ہیں۔ پوری آیات سے ان کا تعلق نہیں معلوم ہو سکتا اور نہ ان اسباب میں سے کسی ایک کو مجموعی آیات کے نزول کا سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ پہلی تفصیل تو نمایاں طور پر کمزور ہے۔ اندھے کے متعلق تو کم کھانے کی کچھ نہ کچھ تاویل کی جا سکتی ہے، لیکن لنگڑے کے کم کھانے کی کوئی وجہ ظاہری نہیں ہو سکتی نہ وہ مجلس دعوت میں شرکت کرنے سے تاخیر کر سکتا ہے نہ اس کے ساتھ کھانے میں اس کی حق تلفی کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ آیت میں لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ آیا ہے جس کا ترجمہ ہے کہ اندھے پر کوئی تنگی نہیں ہے یعنی اندھے کے لئے جائز ہے اور سبب نزول کو صحیح مان لیا جائے تو مطلب اس طرح ہوگا کہ عام مسلمانوں پر اندھے کے ساتھ کھانا کھانے میں کوئی تنگی نہیں ہے یعنی ان کے لئے جائز ہے کہ اندھے کے ساتھ کھائیں گویا مطلب الٹا ہو جائے گا اس لئے عَلَى الْاَعْمٰى کے معنی فِي الْاَعْمٰى لینے پڑیں گے جو بلاوجہ تاویل ہے۔

دوسرے سبب نزول کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اندھے، لنگڑے اور بیمار کے لئے تو ناخواندہ دعوت میں شرکت کی اجازت نکل آتی ہے، لیکن وَلَا عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ کے معنی سمجھ میں نہیں آتے کیونکہ ناخواندہ دعوت میں شرکت سے تامل تو اندھوں وغیرہ کو ہوتا تھا خود رشتہ داروں اور عزیزوں کو نہ ہوتا تھا پھر رشتہ داروں اور عزیزوں کو برادری کی دعوت میں شرکت کی اجازت دینے کے کیا معنی ہوسکتے ہیں۔

تیسری شانِ نزول کی بنا پر بھی عزیزوں اور دوستوں کے ہاں کھانا کھانے کی اجازت کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کیونکہ کراہت و نفرت تو صرف اندھوں، لنگڑوں اور بیماروں کے ساتھ کھانا کھانے سے ہوتی تھی۔ عزیزوں کے گھر کھانے سے تو کوئی نفرت نہ تھی۔

چوتھی شانِ نزول پر اندھوں، لنگڑوں اور بیماروں کے تذکرہ کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ مالک مکان کی غیر موجودگی میں ان کے گھر کی کوئی چیز (خواہ وہ بطور تواضع پیش کی گئی ہو) کھانا لوگ خلافِ دیانت سمجھتے تھے۔ اس کی اجازت آیت میں دے دی گئی، لیکن اندھوں، لنگڑوں اور بیماروں سے دفعِ حرج کے کیا معنی۔

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ کوئی ایک خاص واقعہ سبب نزول نہیں۔ آیت میں صرف ایک حکم مذکور نہیں۔ تین حکم ہیں اور ہر ایک کا مورد جدا جدا ہے۔ اگرچہ مجموعۂ آیات کا نزول ایک وقت میں ہوا ہے۔ چونکہ اندھے، لنگڑے اور بیمار کسی کے ساتھ ناخوانده مہمان کی صورت میں جاکر اس کے کسی عزیز یا دوست کے گھر کھانا کھانے کو خلافِ دیانت سمجھتے تھے، اس لئے ان کو اجازت مل گئی کہ تم لوگ تو ان کے ساتھ ان کے اعزاء و احباب و اقارب کے ہاں کھانے کو جا سکتے ہو، تمہارے لئے کوئی تنگی نہیں نہ یہ فعل خلاف دینداری ہے اور چونکہ مالک مکان کی غیر موجودگی میں ان کے گھر کی کوئی چیز کھانا جائز نہ سمجھتے تھے، اس لئے اجازت دے دی کہ برادرانہ بے تکلفی اس قسم کی خودداری کی اجازت نہیں دیتی، تم ان کی غیر حاضری میں بھی ان کے گھر کا کھانا کھا سکتے ہو اور چونکہ آیت لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ کی وجہ سے لوگوں نے انتہائی اجتناب شروع کردیا تھا۔ یہاں تک کہ باہم مل کر کھانا بھی مناسب نہ سمجھتے تھے کہ شاید دوسرے کا کچھ حصہ نادانستہ کھا جائیں، اس لئے عام اجازت دے دی کہ انفرادی اور اجتماعی صورتوں میں کھانا کھانا جائز ہے۔

اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ یعنی اندھے، لنگڑے، بیمار اور خود تم اپنے گھروں سے کھا سکتے ہو۔ مطلب یہ کہ اندھے وغیرہ بھی تمہارے گھروں سے کھا سکتے ہیں۔

یہاں ایک شبہ ہوتا ہے کہ اپنے گھر تو ہر شخص کھاتا ہی ہے پھر اپنے گھروں سے کھانے کی اجازت دینے کے کیا معنی؟

اس شبہ کا ازالہ دو طرح سے کیا گیا ہے۔ اول یہ کہ اپنے گھروں کے کھانے کا تذکرہ صرف مساوات کو ظاہر کرنے کے لئے کیا گیا ہے یعنی جس طرح آدمی اپنے گھر بے تکلف کھاتا ہے اسی طرح قریبی عزیزوں اور دوستوں کے گھر کھانے میں بھی تکلف نہ کرنا چاہیے پھر یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جو مجبور و ناچار ہیں جیسے اندھے، اپاہج وغیرہ ان کے گھر تمہارے ہی اپنے گھروں کی طرح ہیں۔ ان کا گھر قرار دو کیونکہ ان بے چاروں کا تو کوئی گھر ہی نہیں ہے وہ تمہارے دستِ نگر ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اپنے گھر سے مراد ہے وہ گھر جو بیوی یا اولاد کا گھر ہو اسی لئے اولاد اور بیوی کے گھر کا تذکرہ آیت میں نہیں کیا گیا ہے۔ اصحاب سنن نے روایت کی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِيْكَ تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔ دوسری حدیث میں آیا ہے وَلَدُ الرَّجُلِ مِنْ كَسْبِهٖ اولاد بھی آدمی کی کمائی میں سے ہے یعنی جس طرح اپنی کمائی پر آدمی کو دسترس ہوتا ہے اسی طرح اولاد اور اس کے مال پر بھی آدمی کا حق ہے۔ ایک اور حدیث ہے کہ پاکیزہ ترین کھانا وہ ہے جو اپنی کمائی کا ہو اور اولاد آدمی کی کمائی ہے۔ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ بقاعی نے لکھا ہے کہ آباء سے نرینہ اصول مراد ہیں یعنی باپ دادا پردادا وغیرہ۔

اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ یہاں بھی مؤنث اصول مراد ہیں۔ ماں، نانی، پرنانی وغیرہ۔

اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ یعنی حقیقی بھائی بہن ہوں یا علاتی یا اخیافی یا رضاعی۔ خطیب نے لکھا ہے کہ اگر بہن کا نکاح ہوگیا ہو تو اس کے شوہر کی اجازت ضروری ہے۔ میرے نزدیک یہ قید بے کار ہے کیونکہ اجازت تو بہن کا کھانا کھانے کی ہے اور بہن کا کھانا وہی ہوگا جو اس کی ملک ہو، اس کے شوہر کی ملک اس کی ملک نہیں ہوسکتی۔ اگر بہن کا مال ہے تو اس کے شوہر کی اجازت کی کیا ضرورت۔ شوہر کو روکنے کا کوئی حق ہی نہ ہوگا۔

اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ یعنی باپ کا بھائی حقیقی ہو یا علاتی یا اخیافی یا رضاعی۔

اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ یہاں بھی خطیب نے شوہر کی اجازت کی شرط لگائی ہے، مگر بے کار ہے۔ ہاں عمّات کا لفظ حقیقی اور غیر حقیقی دونوں کو شامل ہے۔ باپ کی بہن ہو کسی طرح کی ہو۔

اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ یعنی ماں کے بھائی کیسے ہی ہوں حقیقی یا غیر حقیقی۔

اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ یہاں بھی عموم ہے کیسی ہی خالہ ہو۔

اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ یعنی اس گھر سے بھی تم کھا سکتے ہو جس کی کنجی ایسی کہ تم مالک ہو۔ اس سے کیا مراد ہے؟ صحابہ و تابعین کے اقوال اس کے متعلق مختلف ہیں۔ ضحاک کے نزدیک غلام کا مال مراد ہے۔ غلام کا مال چونکہ مولیٰ کا مال ہے، اور غلام کے کل خزانوں، دفینوں اور اثاث و متاع کا مالک اس کا آقا ہوتا ہے، اس لئے مالک اپنے غلام کے مال میں سے کھا سکتا ہے۔ یہ قول ضعیف ہے کیونکہ مالک ہی نہیں ہوتا کل آقا کا مال ہوتا ہے اور آقا اگر غلام کا مال کھائے گا تو اپنا ہی مال کھائے گا۔

عکرمہ کا قول ہے کہ اس سے مراد خزانچی ہے۔ خزانچی کو حق ہے کہ دستور کے مطابق عرف کے بموجب خزانے میں سے کچھ کھالے۔

مجاہد و قتادہ نے کہا اس سے مراد اپنے ہی گھر ہیں جن میں غلہ کا اسٹاک کیا جاتا ہے یا کھانے پینے کی چیزوں کی بھرتی کی جاتی ہے۔

ابن عباسؓ نے فرمایا اس سے مراد مختار عام اور زراعت و باغات کا کارندہ ہے۔ مختار عام اور کارندہ کے لئے جائز ہے کہ اپنے زیر تصرف باغات کے کچھ پھل اور زیر عمل مویشی کا کچھ دودھ بغیر اجازت مالک کے کھا پی لے، لیکن ساتھ لانا جائز نہیں۔

سعید بن جبیر اور سدی کا قول ہے کہ عام خادم مراد ہے غلام ہو، نوکر ہو، کارندہ ہو، خزانچی ہو، مختار عام ہو، کوئی ہو سب کے لئے اپنے زیر تصرف مال میں سے دستور کے مطابق کچھ کھا لینا بغیر اذن مالک کے جائز ہے۔

لیکن سب سے زیادہ صحیح قول وہ ہے جس کو نحاس نے پسند کیا ہے اور زہری نے بروایت عروہ بیان کیا ہے کہ ام المومنین عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب جہاد کو جانے کا شوق مسلمانوں کو بہت زیادہ تھا۔ اگر اپنے گھر کے اکیلے ہی ہوتے، مگر جہاد کو ضرور جاتے۔ گھر میں قفل لگا دیتے تھے اور کسی کو نگرانی کا ذمہ دار بنا کر کنجیاں دے کر جہاد کو چلے جاتے۔ جاتے وقت نگرانِ مکان سے کہہ جاتے کہ تم کو جس چیز کی ضرورت ہو ہمارے مکان میں سے لینا اور کھا لینا، لیکن نگران حضرات بہت زیادہ احتیاط کرتے تھے اور زیر نگرانی مکان میں سے کوئی چیز لے کر کھانے کو حلال نہ جانتے۔ خدا تعالیٰ نے آیت مذکورہ نازل فرما کر زیر نگرانی مکانات میں سے کھانے کی اجازت دے دی اور عقیدۂ حرمت کا ازالہ فرما دیا۔ اَوْ صَدِيْقِكُمْ یعنی مخلص دوست کے گھر سے کھانا بھی جائز ہے۔ اگرچہ وہ قرابتدار نہ ہو۔ ابن کثیر نے یہ شرط لگائی ہے کہ ایسے دوست کے گھر سے اس کی اجازت کے بغیر کھانا جائز ہے جس کو اس کا کھانا ناگوار نہ گزرے۔

ایک دفعہ حسن بصری اپنے مکان میں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ دوستوں کی ایک جماعت گھر کے اندر موجود ہے اور تخت کے نیچے جس برتن میں حلوا اور مٹھائی رکھی تھی اس کو نکال کر سب کھا رہے ہیں۔ حسن بصری کا چہرہ کھل گیا اور ہنسنے لگے اور فرمایا میں نے اپنے بزرگوں (صحابہ) کو یونہی پایا تھا۔

اب اس آیت میں تین سوالات تنقیح طلب ہیں (۱) کتنا کھانا جائز ہے؟ کیا اجازت کے بغیر کھانا جائز ہے (۲) آیت کا حکم محکم ہے یا منسوخ ہو گیا؟ ہم تینوں کی تنقیح کئے کرتے ہیں۔ علمائے تفسیر نے صراحت کی ہے کہ بقدر ضرورت حسب دستور و رواج کھانا جائز ہے۔ ساتھ باندھ کر لانا یا کسی دوسرے کو اس میں سے بغیر اذن مالک کے کھلانا ناجائز ہے۔ عام اقوال و روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اجازت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اجازت کے بعد تو ہر شخص کا کھانا جائز ہے انجان ہو یا جان پہچان، عزیز ہو یا غیر۔ دوستوں اور عزیزوں کی کوئی تخصیص نہیں۔ قتادہ و حسن بصری کا یہی قول ہے۔ ابن زید کا قول ہے کہ یہ بغیر اجازت کے کھانے کا حکم تو ابتدا میں تھا جب کہ گھروں پر پردے نہ تھے اور نہ روکنے کے لئے کیواڑ تھے۔ جب کوئی گھر میں آتا اور بھوک کی خواہش ہوتی اور مالک مکان موجود نہ ہوتا تو جو کھانا پاتا کھا لیتا، لیکن اب تو دروازہ بند کر کے جاتے ہیں۔ اب کسی کے مکان میں بغیر اذن کے داخل ہونا ہی ناجائز ہے۔ علامہ نسفی نے مدارک میں لکھا ہے کہ اب بغیر اجازت کے نہ کھانا چاہیئے۔ جلال محلی نے لکھا ہے کہ مذکورہ گیارہ اقسام کے گھروں سے کھانا جائز ہے۔ اگرچہ مکان کا مالک موجود نہ ہو۔ بشرطیکہ اس کی اجازت صراحۃً ہو یا قرینہ سے اجازت معلوم ہو۔ اگرچہ قرینہ ضعیفہ ہو۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ اجازت کا ضعیف قرینہ بھی کافی ہے بلکہ یہ بات بھی کافی ہے کہ مالک مکان کو جب اطلاع پہنچے گی تو اس کو ناگوار نہ ہوگا۔ اگر کھانے والے کو مالک کی ناگواری کا گمان نہ ہو تو کھا لینا جائز ہے۔ امام احمد اور امام ابوحنیفہ کا یہی قول ہے۔ مگر یاد رہے کہ کسی کے مکان میں بغیر اطلاع اور بلا اذن کے داخل ہونا جائز نہیں۔ کھانے کا جواز تو اس صورت میں ہے جب کہ کسی عزیز کے مکان پر جائے اور اس کے گھر والے موجود ہوں اور اندر پہنچ جائے تو وہاں کچھ کھا لینا بغیر صریح اجازت کے بھی جائز ہے۔ واللّٰہ اعلم۔

اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا۔ یعنی اجتماعی اور انفرادی طور پر کھانا جائز ہے نہ یہ حرام ہے نہ وہ ممنوع۔ اس عمومی اجازت کے دو سبب ہیں۔

(۱) جب آیت لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ نازل ہوئی تو لوگوں نے ساتھ مل کر کھانے سے اجتناب کرنا شروع کر دیا۔ کیونکہ کسی کی خوراک زیادہ ہوتی تھی اور کسی کی کم۔ ساتھ مل کر کھانے میں مساوات نہیں رہتی تھی، اس لئے ان کو اندیشہ ہوا کہ شاید اس طرح کھانے سے ہم اکل بالباطل کے مرتکب نہ ہو جائیں۔

(۲) قتادہ کا قول ہے کہ قبیلۂ کنانہ کا ایک گروہ تنہا کھانے کو جائز نہیں سمجھتا اور تنہا خوری کو خواری کا سبب جانتا تھا۔ اگر کسی روز ساتھ کھانے کے لئے کوئی نہ ہوتا تو

جنگل کو تلاش کرنے جاتا اور ڈھونڈ کر لاتا اور اس کے ساتھ کھانا کھاتا۔ یہ اسلام سے پہلے کا دستور تھا۔ اسلام نے انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح سے کھانے کو جائز کر دیا۔
الغرض یہ بغیر مہمان کے کھانا نہ کھاتے تھے تو ان کو بھی تنہا کھانے کی اجازت دے دی گئی۔

امام بخاری نے اس آیت کی تفسیر کے لئے ایک مستقل باب قائم کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ساتھ بیٹھ کر کھانا جائز ہے۔ اگرچہ لوگوں کی خوراک کم و بیش ہو۔ بلکہ فضیلت ساتھ مل کر کھانے کی ہی ہے۔ مختلف احادیث میں اس کی فضیلت آئی ہے۔ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ ہم کھاتے ہیں، مگر سیر نہیں ہوتے۔ فرمایا شاید تم الگ الگ اکیلے کھاتے ہو؟ اس نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا اپنے کھانے پر سب جمع ہو کر بسم اللہ کہہ کر کھایا کرو، سیر ہو جاؤ گے تم کو برکت حاصل ہوگی (احمد و ابو داؤد)

فَسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ۔ انفسکم سے مراد ہیں اپنے لوگ یعنی مسلمان آپس میں ہیں گویا سب مسلمان ایک جان کی طرح ہیں۔

بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اعزا و اقارب اور دوست احباب مراد ہیں۔ ایک روایت میں حضرت جابرؓ کا قول ہے کہ اپنے گھر والے مراد ہیں، لیکن تعمیم اولیٰ ہے۔ بظاہر سعید بن جبیر، حسن بصری، قتادہ اور زہری کا یہی قول ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ جب کسی کے گھر میں داخل ہو تو سلام کرو۔ ابن جریج نے عطار سے پوچھا کہ جب میں باہر آکر دوبارہ گھر میں جاؤں تو کیا سلام کرنا مجھ پر واجب ہے؟ عطار نے فرمایا واجب نہیں مستحب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت انسؓ سے فرمایا تھا کہ جب تو اندر جائے تو سلام کر۔ تیرے گھر میں برکت زیادہ ہوگی۔ (رواہ البزار) مجاہد کا قول ہے کہ جب کوئی شخص اپنے گھر والوں کے پاس جائے تو سلام کرے اور اگر ایسے گھر میں جائے جہاں کوئی نہیں ہے تو اس طرح کہے اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ۔ قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ ثوری کی روایت میں مجاہد کا قول اس طرح ہے کہ جب خالی گھر میں داخل ہو تو کہے۔ بِسْمِ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا مِنْ رَّبِّنَا اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ۔ مجاہد کا یہ بھی قول ہے کہ مسجد میں داخل ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پڑھے۔ قفال نے صراحت کی ہے کہ اگر کسی جگہ غیر مسلم بھی ہوں (اور مسلم بھی ہوں) تو اس طرح سلام کرے۔ اَلسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی۔ حدیث سے یہ بھی ثابت ہے۔

کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ یعنی اللہ نے مجالست و معاشرت کے احکام تم کو کھول کر بتا دئے۔ ان آداب کی خوبی اور فوائد اگرچہ عام لوگوں کی نظر سے پوشیدہ ہے، مگر تعلیم الٰہی بہت ہی پُر مغز ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس میں فضائل و برکات بہت ہیں، یہ تہذیب و شائستگی کی تلقین ہے، میل محبت اور انس بڑھانے والی تعلیم ہے، نظم قومی کو درست رکھنے کی ہدایت ہے، باہمی تعاون و تناصر کا ذریعہ ہے، ہر فرد کے بُت کو توڑنے کا آلہ ہے، دعائے رحمت ہے، طلب برکت ہے، اظہار مساوات ہے، جذب قلوب کا سبب ہے وغیرہ۔

مقصود بیان

آیت کی تعلیم سے مترشح ہوتا ہے کہ بیکسوں اور مجبوروں پر رحم کرو۔ ان کو اپنے آدمی سمجھو، اپنے گھر والوں کی طرح ان کی پرورش کی ذمہ داری کرو۔ یہاں تک کہ اگر کبھی اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ہاں دعوت میں جانے کا اتفاق ہو جائے تو ان کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ وَلَا عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ میں صراحۃً تعلیم ہے کہ مسلمانوں کو باہم ربط ضبط میل ملاپ اور بے تکلفی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ رابطۂ اسلامی اور علاقۂ قرابت و صداقت کے باوجود دوامی محبت کو برسر کار لانے کی طرف قدم بڑھانا چاہئے تاکہ تمام مسلمان انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت کے دائرہ میں داخل ہوں۔ اجتماعیت بغیر محبت و یگانگت کے نہیں ہو سکتی اور یگانگت بغیر بے تکلفی کے ناممکن ہے۔ رعونت آفریں خودداری اور غیریت پیدا کرنے والی عزت نفس قومی اجتماع کو تباہ کرنے والی ہے۔ انفرادی میل ملاپ سے خاندانوں کی تنظیم ہوتی ہے اور جذبۂ ایثار پیدا ہوتا ہے اور خاندانی تنظیم سے قومی شیرازہ جمع ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بے تکلفی کو توڑنا تنظیم خاندانی اور اجتماعیت قومی کے لئے سنگ بنیاد ہے۔ منافرت و بغض کو دور کرنے والا اور محبت و مساوات پیدا کرنے والا ہے۔ جَمِیْعًا کا لفظ بتا رہا ہے کہ کھانا دونوں حالتوں میں جائز ہے انفرادی ہو یا اجتماعی۔ نہ اجتماعیت پیدا کرنے میں اتنا غلو کرنا چاہئے کہ انفرادیت فنا ہو جائے اور ساتھیوں کی کمی کی وجہ سے کوئی کھانا کھانے والا نہ ملے تو آدمی بھوکا مرتا رہے نہ ایسی تنہا خوری چاہئے کہ چھوت چھات کا مرض پیدا ہو جائے اور ایک دوسرے کو ناپاک سمجھنے لگے۔ درمیانی راستہ اختیار کرنا بہتر ہے۔

سلام کرنے کی تعلیم بتا رہی ہے کہ ہر مسلمان کو دوسرے کی طرف سے صاف دل پاک باطن ہونا چاہئے۔ کوئی کسی کی طرف سے رنج اور بغض نہ رکھے۔ سلام دعائے سلامتی ہے اور اللہ کی رحمت کے نزول کی طلب ہے جو ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کے لئے بغیر کسی تخصیص کے کرنی چاہئے اور ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص دوسرے کے لئے دعائے سلامتی دل سے کرے گا تو اس کی طرف سے اپنے دل میں بغض کیسے رکھ سکتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ رسم اسلام کی تعلیم سے باہمی منافرت و مخالفت کی بیخ کنی مقصود ہے۔ تحیۂ مبارکہ طیبہ سے اسی طرف اشارہ ہے۔ سلام کی یہی برکت و پاکیزگی ہے کہ اس سے باہمی تنافر دور ہو جاتا ہے وغیرہ۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتَّىٰ يَسْتَأْذِنُوهُ

مسلمان وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہوں اور جب رسول کے ساتھ کسی اجتماعی کام پر ہوں تو رسول سے اجازت لیئے کے بغیر

إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ

نہ جائیں (اے نبی) جو لوگ تم سے اجازت لیتے ہیں وہی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اگر وہ تم سے اپنے کسی کام کے لئے اجازت لیں

فَأْذَن لِّمَن شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ

تو ان میں سے جس کو چاہو اجازت دیدو اور ان کے لئے اللہ سے دعائے مغفرت کرو بلاشبہ اللہ غفور رحیم ہے

تفسیر اسلام کا دعویٰ کرنے والے تین قسم کے ہیں :- (۱) وہ لوگ جو دنیا کو دکھانے اور بنانے اور مسلمانوں میں کفر کی ریشہ دوانیاں کرنے کے لئے زبانوں سے اسلام کا اظہار کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے گروہ میں ملے جلے رہتے ہیں، لیکن واقع میں ان کے دل منکر ہوتے ہیں، ان کے ضمیر اسلامی عقائد و تعلیم کو بہت برا جانتے ہیں مگر مصلحت وقتی ان کو ظاہری مسلمان بننے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ گروہ منافقوں کا ہوتا ہے۔ مسلمان بننے سے ان کے مقاصد مختلف ہوتے ہیں یا تو ان کے پیش نظر کوئی لالچ ہوتا ہے یا مسلمانوں میں عظیم الشان طاقت ہوتی ہے جس کے سامنے سر خم کرنا اور مسلمانوں میں اپنا وقار پیدا کرنا ہوتا ہے یا کافروں کی طرف سے مسلمانوں کے اندرونی احوال کی جستجو مقصود ہوتی ہے یا مسلمانوں کے اندر پھوٹ پیدا کرنے کا ارادہ ہوتا ہے یا اسی قسم کا کوئی ذاتی یا قومی مقصد ہوتا ہے جس کو وہ مسلمان بن کر پورا کرنا چاہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی ایسے لوگ تھے اور اس زمانہ میں بھی ہیں اور ہر دور میں ہوتے ہیں۔ یہ گروہ تو قطعاً مسلمان نہیں۔

(۲) دوسرا گروہ وہ ہے جو موروثی طور پر مسلمان ہے۔ اسلامی فرقہ میں پیدا ہوا، عقائد اسلامیہ کا قائل ہے اور دل سے قائل ہے اور چونکہ اسلامی فرقہ میں اس کی پیدائش اور پرورش ہوئی ہے اس لئے مردم شماری کے وقت وہ نہایت زور کے ساتھ اپنا نام مسلمانوں کی فہرست میں درج کراتا ہے اور غیر مسلم فرقوں کے مقابلے میں اپنے گروہ کی کثرت پر ناز کرتا ہے، مگر احکام اسلامی کی تعلیم نہیں کرتا، اس کا نفس کسی شرعی قید کو برداشت نہیں کر سکتا، فرائض مذہب کو ادا کرنا اس پر بار ہوتا ہے۔ یہ گروہ نام کا ضرور مسلمان ہے، عقیدہ کے لحاظ سے بھی مسلمان ہے مگر اسلام کے کسی کام کا نہیں بلکہ بعض اوقات اسلام اور مسلمانوں کے لئے باعث شرم بن جاتا ہے۔ غیر مسلم بدعمل یا بے عمل مسلمانوں کو دیکھ کر کہنے لگتے ہیں کہ دیکھو مسلمان ایسے بے عمل یا بدعمل ہوتے ہیں۔ اس گروہ میں دو طرح کے افراد پائے جاتے ہیں ایک حصہ وہ ہے جو احکام اسلامی پر نہیں چلتا اور اوامر و نواہی کی پابندی اپنی نفسانی خواہش کے غلبہ کے سبب نہیں کر سکتا، مگر اپنی بداعمالیوں پر اس کو پشیمانی ضرور ہوتی ہے۔ اگر گناہ کرتا بھی ہے تو چھپ چھپا کر بہت تردد کے بعد۔ خدا سے توبہ بھی کرتا ہے، مگر پھر توبہ کی شکست بھی کرتا ہے۔ یہ حصہ مسلمان ہے قطعی مسلمان ہے، مگر گناہ گار، قابل مواخذہ، عذاب کا مستحق، امیدوار مغفرت ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس کے عقائد تو ضرور اسلامی ہیں، مگر افعال و اعمال کافرانہ ہیں۔ اس کو کوئی گناہ کرتے شرم نہیں آتی، کسی بدعملی پر پشیمان نہیں ہوتا، بے باکی کے ساتھ برے کرتوت کرتا ہے، مسلمانوں سے نہیں شرماتا۔ یہ گروہ قریب کفر کے ہوتا ہے۔ اگر ایک قدم آگے بڑھاتا ہے تو کافر ہو جاتا ہے۔ اس کا وجود مسلمانوں کے لئے باعث شرم اور مضرت رساں ہے۔ یہ شجرۂ خبیثہ ہے جس کو کاٹ دینا بہتر ہے ورنہ اس کے کانٹوں میں دوسرے مسلمانوں کے الجھ جانے کا اندیشہ ہے۔

تیسرا گروہ ان صحیح العقیدہ صادق العمل لوگوں کا ہے جو اسلام کے مطابق عقائد رکھتے ہیں، خدا اور رسول کے فرمان پر چلتے ہیں، پاک باطن، پاک خو اور پاک باز ہیں۔ ان کی رفتار اطوار اور گفتار سے حکم الٰہی کی تعمیل کا مظاہرہ ہوتا ہے اور تعلیم اسلامی کا پرتو جھلکتا ہے۔ یہ گروہ کامل الایمان اور مخلص العمل لوگوں کا ہے۔ آیت مذکورہ میں اسی گروہ کے لوگوں کی شناخت فرمائی ہے اور ان کے ایمان اور اخلاص فی العمل کو سراہا ہے۔

تحلیل اجزاء إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ۔ بیہقی اور محمد بن اسحاق نے بروایت عروہ و محمد بن کعب قرظی بیان کیا کہ جنگ خندق کے زمانہ میں ایک طرف ابوسفیان قریش کو ساتھ لے کر مدینہ پر چڑھ آیا اور دوسری طرف قبائل غطفان نے بھی یورش کر دی۔ ابوسفیان نے تو رومۃ الجندل کے کنوئیں پر ڈیرے ڈالے اور قبائل غطفان کوہ احد کے پاس اترے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی سے شہر کے آس پاس خندق کے کھودنے کا حکم دے دیا تھا۔ مسلمان نہایت جفاکشی اور محنت سے خندق کھودنے میں مشغول تھے، خود سرکار دوعالم بھی شریک کار تھے۔ اگر کھودنے کے دوران میں کسی مسلمان کو کوئی ضرورت پیش آجاتی تھی تو وہ اجازت لے کر چلا جاتا تھا اور کام پورا کرنے کے بعد فوراً واپس

آجاتا تھا مگر منافق بہانہ جوئی کرتے تھے، خندق کھودتے کسمساتے تھے اور نظر بچا کر چپکے سے کھسک جاتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی مدح میں یہ آیت نازل فرمائی۔ اس میں ضمناً منافقوں کی مذمت بھی ہے۔ انتہیٰ۔

منافق عام طور پر وقت پر مسلمانوں کا ساتھ نہ دیتے تھے جنگ احد میں ابن ابی بن سلول نے صرف اسی بنا پر شرکت نہ کی کہ اس کی رائے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام مسلمانوں کی رائے کے مقابلے میں نہ مانا یہ مسلمانوں کو اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راستہ میں چھوڑ کر اپنے تین سو آدمی لے کر واپس چلا آیا۔ اسی طرح روزانہ جماعت کی نمازوں میں واقعات ہوتے رہتے تھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اکثر دوران تقریر میں علامات نفاق بیان فرماتے تھے اور منافق اپنے دلوں میں گھٹ کر رہ جاتے تھے اور دائیں بائیں تاک جھانک رکھا کرتے جب موقعہ پاتے سرک جاتے اور نماز چھوڑ آتے، لیکن اگر کوئی دیکھتا ہوتا تو خوف و شرم سے بادلِ ناخواستہ بیٹھے رہتے اور نماز میں شرکت کر لیتے۔ یہ عام منافقوں کا روزانہ کا دستور تھا۔ اس آیت کے نزول کے بعد مسلمانوں کا دستور العمل یہ تھا کہ اول تو نماز یا جہاد کو چھوڑ کر کسی کام کے لئے جاتے ہی نہ تھے اور اگر کوئی ضرورت سخت پیش آجاتی اور حوائج بشری کو پورا کرنا مقصود ہوتا تو حضور سے اجازت حاصل کر کے جاتے اور فوراً آجاتے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ کامل مومن وہی لوگ ہیں جن کا ایمان اللہ اور اس کے رسول پر ہو اور اگر کوئی ایسا امر مسلمانوں کے سامنے ہو جس میں سب کا اجتماع ضروری ہو تو وہ جمع ہو جائیں اور بغیر اجازت حاصل کئے کوئی غیر حاضر نہ ہو۔ اجازت لے کر اپنے کام کو جانا ایمان کی علامت ہے، لیکن طلب اجازت کے بعد بھی یہ ضروری نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اجازت دے دیں بلکہ اجازت دینا نہ دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں ہے۔ مناسب سمجھیں اجازت عطا کریں نہ مناسب سمجھیں نہ دیں الخ۔

وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلَىٰ أَمْرٍ جَامِعٍ امر جامع سے مراد ہے وہ امر جس میں عام مسلمانوں کا اجتماع ضروری ہو خواہ ادائے عبادت کے لئے ہو جیسے جمعہ کی نماز یا روزانہ پنج وقتی جماعت یا دشمنوں کو دفع کرنے کے لئے ہو جیسے جہاد وغیرہ پر جانا یا کسی اور تعمیری مشورہ کے لئے ہو۔

اس آیت میں دو فقرے ہیں اور دونوں پُر مغز ہیں۔ اول یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونا شرط ہے۔ اگر حضور اقدس کسی کام کی تکمیل کا ارادہ کریں اور عام مسلمانوں کو جمع ہونے کا حکم دیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی سب مسلمانوں کو اختیار کرنی چاہیئے۔ علماء نے اس سے استخراج کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کو اپنا قائم مقام کر دیا ہو یا شرعی شروط کے ساتھ وہ حضور کا قائم مقام ہو اس کے حکم سے سرتابی کرنی بھی ویسی ہی حرام ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے۔ امیر کا حکم ماننا فرض ہے۔ دوسرا یہ کہ امر جامع ہونا ضروری ہے۔ ہر وقت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنا ضروری نہیں۔ کل دنیوی کاروبار کو چھوڑ کر صحبتِ رسول میں رہنا لازم نہیں۔ اسی طرح جانشینِ رسول کے ہمرکاب ہر وقت رہنا نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ ممنوع ہے۔ ہاں اگر مسلمانوں کو اجتماع کا حکم عمومی ہو خواہ لشکرکشی کے لئے یا جماعت کے لئے یا کسی اور کام کے لئے تو فوراً جمع ہو جانا واجب ہے اور جب تک امیر اجازت نہ دے مجمع کو چھوڑ کر آنا ناجائز ہے۔

فَإِذَا اسْتَأْذَنُوكَ لِبَعْضِ شَأْنِهِمْ۔ انسان کو ضرورتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک دینی ضرورت مثلاً جنگ تبوک کو جاتے وقت حضرت عمرؓ کو عمرہ کرنے کی ضرورت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر آپ عمرہ کرنے مکہ کی طرف چل دئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روانگی کے وقت فرمایا بھائی ہم کو اپنی نیک دعاؤں میں نہ بھولنا۔ پھر عمرہ کر کے واپس آگئے اور مسلمانوں کے ساتھ آملے۔ ایسی ضرورت چونکہ دینی ضرورت ہے۔ اگرچہ اس کی تکمیل بھی اجازت کی محتاج ہے۔ بغیر حصول اجازت کے دینی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بھی مجمع عام سے غیر حاضر ہونا ناجائز ہے۔ مگر چونکہ اس قسم کی ضرورت اہلِ نفاق کو پیش نہیں آتی، اس لئے اس کے ذکر کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ دوسری ضرورت دنیوی ہوتی ہے کہ کوئی خانگی کاروبار ہو یا گھر والوں کی مجبوری یا حوائج بشریہ کو پورا کرنے کی احتیاج۔ بہرحال تمام ضروریات دنیوی کو پورا کرنے کے لئے حصول اجازت کی ضرورت ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جب کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگے تو آپ اس کو رخصت دے ہی دیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (یا امیر شرعی کو) اختیار ہے مناسب سمجھیں اجازت دیں نہ مناسب سمجھیں نہ دیں۔ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللَّهَ۔ اجازت لے کر بھی کسی دنیوی کام کے لئے جانا مناسب نہیں کیونکہ اس وقت دنیوی کام کو دینی کام پر ترجیح دینا لازم آتا ہے، اس لئے استغفار کا حکم دیا۔

مقصودِ بیان اجتماعیتِ اسلام میں شرکت کرنی اور ہر طرح سے ساتھ دینا ضروری اور لازم ہے۔ اس کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوتا۔ ایمان نام فقط اللہ اور رسول کو ماننے کا نہیں بلکہ صدقِ عمل بھی ضروری ہے۔ اسلام پر جو مصیبت آپڑے سب کو مل کر اس کو دفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ امر جامع کی موجودگی میں انفرادیت اور خود پسندی حرام ہے۔ یہ ضعیف ایمان کی علامت ہے۔ آج کل کے مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ گوش ہوش کھول کر سننا چاہیئے۔ جمہوریتِ اسلام کی کشتی اس وقت بھنور میں ہے چاروں طرف انفرادیت اور استبداد کا شور شر ہے۔ مفادِ شخصی کو مفادِ قومی پر قربان کیا جا رہا ہے۔ وطنی اور لسانی بھوت سر پر سوار ہیں، آپس کی پھوٹ ہے، غیر ملکی ہجوم

ہے، غلامی ہے، بے چارگی ہے۔ اگر اس وقت زندہ رہنے کی کوشش کی جائے گی تو فنا کی قبر میں اترنا لازم ہے۔ زمانہ ورق اُلٹ رہا ہے، ہماری ذلت خود خریدہ ہے، ہماری پس ماندگی خود آوردہ ہے، کام کو تفرقہ کے دیوتے لقمہ بنالیا ہے۔ نفاق وشقاق کا شیطان ہمارے سروں پر سوار ہے۔ اگر یہی عالم افتراق اور طوفانِ انتشار قائم رہا اور اس کی بڑھتی ہوئی لہریں روکنے کے لئے اتحادِ باہمی کا بند نہ باندھا گیا تو یقیناً ہم پانی بھرنے اور لکڑیاں چیرنے کے سوا کسی کام کے نہ رہیں گے۔ کاش اب بھی ہم ہوش سے کام لیں اور سنبھلیں لیگ والے ہوں یا احرار، قوم پرست ہوں یا خاکسار، کانگریسی مسلمان ہوں یا جمعیت والے سب کو اس وقت متحد ہو کر کام کرنے کی ضرورت ہے کہ تنازع للبقاء اور جہد للحیات کا فیصلہ یہی ہے۔ بھائیو! آیت پکار کر کہہ رہی ہے کہ ضرورت جامعہ کے وقت پس ماندگی ایمان سے خارج کر دیتی ہے۔ پھر وقت حاضر سے بڑھ کر اجتماع و اتحاد و یک جہتی کی ضرورت اور کس وقت ہوگی۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ؕ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ

(مسلمانو!) رسول کو ایسے نہ پکارو جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو اللہ اُن لوگوں کو جانتا ہے جو تم میں سے آڑ میں

مِنْكُمْ لِوَاذًا ۚ فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖۤ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ

ہو کر کھسک جاتے ہیں جو لوگ رسول کی مخالفت کرتے ہیں اُن کو ڈرنا چاہئے کہ کہیں اُن پر کوئی مصیبت نہ آپڑے یا دردناک عذاب

اَلِيْمٌ ۝ اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قَدْ يَعْلَمُ مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ ؕ وَيَوْمَ يُرْجَعُوْنَ

نہ پہنچے خوب سُن لو جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے جس حال میں تم ہو اللہ خوب جانتا ہے اور جس روز تم کو لوٹا کر اُس

اِلَيْهِ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ع

ع ۹ / ۱۵

کی طرف لے جایا جائے گا وہ اُن کے کئے ہوئے کام اُنکو بتا دے گا اور اللہ ہر شے سے خوب واقف ہے۔

تفسیر اگر کوئی شخص دوسرے کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق کوئی مشورہ دیتا ہے تو اس کی تین صورتیں ہوتی ہیں یا (۱) مشورہ دینے والا یا کسی کام کو طلب کرنے والا کم درجہ رکھتا ہے۔ اس کی عقل کوتاہ اور بینش کمزور ہے، معاملہ فہمی کی قوت اتنی نہیں جتنی اس شخص میں ہے جس کو مشورہ دیا جا رہا ہے، اس کی دینی بصیرت بھی زیادہ وسیع نہیں حقائقِ دین کا علم اس کو کم ہے۔ ایسے شخص کا ماننا ضروری نہیں۔ غور کرنے کے بعد اس کے مشورہ کو ٹھکرا بھی جا سکتا ہے بلکہ ایسے شخص کے ہر مشورے کو مان لیا جائے تو عقل کی ضیا اس فعل کو بے وقوفی کی علامت سمجھتی ہے (۲) مشورہ دینے والا مساوی حیثیت رکھتا ہے، دنیوی معاملات میں بھی اس کو بصیرت حاصل ہے اور دینی حقائق سے بھی واقف ہے، ماحول کی سمجھ بھی رکھتا ہے اور شریعت شناس بھی ہے، لیکن جس شخص کو مشورہ دیا جا رہا ہے، اس سے اس کی حیثیت ممتاز نہیں، علمی عملی حالت ہے، ایسے شخص کے مشورہ سے بھی سرتابی کی جا سکتی ہے مگر انتہائی غور و فکر اور سوچنے سمجھنے کے بعد اس کا مشورہ وقعت رکھتا ہے، مگر اس کی مخالفت بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کا ہر قول صحیح ہو، ہر حکم واجب التعمیل ہو (۳) مشورہ دینے والا اور کسی کام کی طرف بلانے والا عظیم الشان مرتبہ کا مالک ہو، وجاہت و وقار میں بھی ممتاز ہو، عزت و شخصیت بھی بلند ترین رکھتا ہو، دنیوی بصیرت اور معاملہ فہمی بھی اس کی سب سے زیادہ اونچی ہو اور دینی حقائق کا علم بھی اس کو سب سے زیادہ ہو، خلوص و صداقت میں بھی اس کی ذات و خیالات پر شک نہ کیا جاتا ہو، وہ خدا کی طرف سے ہر فکری اور عملی غلطی سے معصوم بھی ہو۔ ایسے شخص کے حکم کی تعمیل میں چون و چرا کرنا اور غور و فکر کے لئے وقت لینا اور غلطی و راستی جانچنے کے لئے خواہ مخواہ تاخیر کرنا نہ صرف قومی نظم کو برباد کرنے والا ہے بلکہ حماقت آفرین، مضحکہ خیز اور ضرر انگیز حرکت ہے۔ امر معصوم کے ہر حکم کی تعمیل عقل کی دنیا میں واجب ترین چیز ہے۔ آیات ذیل اسی مضمون کو پر زور لہجہ میں بیان فرمایا ہے۔

تحلیلِ اجزاء لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ میں آیات سابقہ کا تتمہ ہے۔ ان آیتوں کا کوئی جدید سبب نزول نہیں۔ گزشتہ مضمون کی تکمیل اس سے ہوتی ہے۔ لفظ دعاء کے معنی تین طور پر بیان کئے گئے ہیں (۱) عرفی دعاء مراد ہے یعنی دعاؤں کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائے خیر کے

طالب اور ان کی بددعا سے ڈرتے رہو، کسی امر کی مخالفت نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہارے لئے بددعا کردیں۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس، حسن بصری اور عطیہ عوفی کا یہی قول نقل کیا ہے۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح پکارو جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو یعنی نام یا کنیت لے کر نہ پکارو بلکہ خطاب کرتے وقت یا رسول اللہ یا نبی اللہ یا کوئی تعظیمی لفظ کہا کرو۔ اس معنی کو ابو نعیم نے بروایت ضحاک ابن عباس کا قول قرار دیا ہے۔ اس توجیہ کا خلاصہ یہ ہے کہ عمل کے علاوہ قول میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے تعظیمی نہ کرو، نام بھی لو تو عزت و شان کے ساتھ۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جس کام کے لئے بلائیں اور کسی خدمت کے لئے مامور کریں تو امر رسول کو ایسا نہ سمجھو جیسا کہ تم میں سے ایک دوسرے کو بلاتا ہے اور کسی کام کا حکم دیتا ہے کہ دل چاہا تو چلے گئے اور وہ کام کرلیا اور نہ دل چاہا تو نہ گئے نہ وہ کام کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان وقعت رکھتا ہے۔ اس کی تعمیل میں ڈھیل کرنی حرام ہے۔ اس معنی کو مبرد، قفال اور ابن عادل نے پسند کیا ہے اور سیاق آیت کے بھی مناسب ہے کیونکہ اوپر اور نیچے کی آیت میں حکم رسول کی اطاعت کا وجوب ظاہر فرمایا ہے۔ احتمالاً یہ ہی (معنی) والی کڑی بھی مسلسل مضمون کی کڑی ہے کوئی جدید حکم نہیں۔ ہم نے بھی تفسیری تمہید میں اسی مضمون کی تفصیل کی ہے۔ واللہ اعلم۔

قَدۡ يَعۡلَمُ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ الخ اوپر کی آیات میں مسلمانوں کو اجتماعیت میں شامل رہنے کی تعلیم دی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرماں برداروں کی مدح فرمائی تھی۔ اس آیت میں نافرمان منافقوں کو دھمکی دی ہے اور ظاہر فرمایا ہے کہ مسلمانوں کی نظر سے بچنا سہل ہے، مگر خدا کے علم سے مخفی رہنا ناممکن ہے۔ چپکے سے سرک کر نکل جانے والوں کو خدا جانتا ہے اور جب خدا بے ایمانوں سے واقف ہے تو:۔

فَلۡيَحۡذَرِ الَّذِيۡنَ يُخَالِفُوۡنَ عَنۡ اَمۡرِهٖۤ الخ۔ امر رسول کی مخالفت کرنے والوں اور حکم نہ ماننے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ کہیں دردناک عذاب نہ آجائے اور کوئی قیمتی تباہی دامنگیر نہ ہو جائے۔ فِتۡنَةٌ سے مراد ہے دنیوی عذاب، قحط، تنگدستی، ناگہانی موت، دشمنوں کی دراز دستی، زلزلہ، طوفان باد و باراں وغیرہ اور عَذَابٌ اَلِيۡمٌ سے مراد ہے آخرت کا عذاب یعنی کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا و آخرت میں وہ برباد ہو جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کی پاداش میں دونوں جہان برباد ہوں۔ کیونکہ:۔

اَلَاۤ اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ تمام عالم خدا کے قبضہ میں ہے، متصرف حقیقی اور مختار مطلق ہے۔ وہ ہر طرح سے عذاب میں مبتلا کرسکتا ہے پھر آخرت میں اس کو بارگاہ میں حاضر ہونا ہی ہے۔ وہی ہر بات کا مرجع اور مرکز حقیقی ہے اس کا کیا کرایا سامنے آئے گا۔

عقبہ بن عامر کہتے ہیں کہ میرے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاتمہ سورۂ نور کی یہ آیت تلاوت فرمائی اور دونوں آنکھوں کے نیچے دونوں انگلیاں رکھ کر بِكُلِّ شَىۡءٍ بَصِيۡرٌ (اے رب تو ہر چیز کو دیکھتا ہے) فرمایا (رواہ الطبرانی وقال السیوطی اسنادہ حسن)

مقصود بیان تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم، امر رسول سے خلاف ورزی کرنے کی ممانعت۔ رسول پاک کی مخالفت کرنے پر نزول عذاب کی دھمکی، اور اللہ علمی کی صراحت۔ قیامت کے دن تمام کیا کرایا سامنے آنے کی نفی وغیرہ۔

سُوۡرَةُ الۡفُرۡقَانِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ سَبۡعٌ وَّسَبۡعُوۡنَ اٰيَةً وَّسِتَّ رُكُوۡعَاتٍ

سورۂ فرقان مکہ میں نازل ہوئی اس میں ستر آیتیں (اور) چھ رکوع ہیں

اس سورت کا نزول اس وقت ہوا جب کہ مشرکین کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر طرح طرح کے اعتراض کرتے اور رنگ برنگ کے شبہات پیدا کرتے تھے۔

اس سورت میں چھ رکوع، ستتر آیات، آٹھ سو بہتر کلمات اور تین ہزار سات سو اسی حروف ہیں۔ یہ بالاتفاق مکی ہے۔ البتہ شیخ جلال الدین محلی اور سیوطی کی (تفسیر جلالین) میں خطیب نے وَالَّذِيۡنَ لَا يَدۡعُوۡنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ سے رَّحِيۡمًا تک مستثنیٰ کیا ہے۔ قرطبی نے صراحت کی ہے کہ بقول ابن عباس و قتادہ یہ تین آیات ہیں جو مدینہ میں نازل ہوئی تھیں۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا امام مالک، امام الشافعی، صحیح ابن حبان اور سنن بیہقی میں حضرت عمر کا ایک واقعہ مروی ہے کہ ایک روز ہشام بن حکیم نماز میں سورۂ فرقان پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر نے کان لگا کر سنا تو بہت سی جگہ اس لہجہ میں اختلاف پایا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کو سکھایا تھا۔ جب ہشام نے سلام پھیرا تو عمر نے ان کی گردن میں چادر ڈال کر کھینچا اور دریافت کیا تم کو یہ سورت اس طرح کس نے پڑھائی ہے؟ ہشام نے کہا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی ہے۔ عمر نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو

مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے طریقے سے پڑھائی ہے۔ بغرض ہشام کو کھینچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے اس شخص کو سورۂ فرقان اس طریقہ سے پڑھتے سنا ہے جو حضور نے مجھے تعلیم نہیں فرمایا تھا۔ سرکار عالی نے ارشاد فرمایا اس کو چھوڑ دو۔ ہشام تم پڑھو۔ ہشام نے اسی مسجد والی قرأت سے پڑھا جو میں نے سنی تھی۔ ارشاد فرمایا یونہی نازل ہوئی ہے۔ پھر فرمایا عمر اب تم پڑھو۔ حضرت عمرؓ نے اس قرأت سے پڑھا جو حضورؐ نے ان کو سکھائی تھی۔ ارشاد فرمایا یونہی نازل ہوئی ہے۔ قرآن سات قرأتوں پر اترا ہے جو آسان ہو وہ پڑھو۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ

بابرکت ہے وہ خدا جس نے اپنے بندہ پر قرآن نازل کیا تاکہ وہ دنیا جہان کو ڈرانے والا ہو جائے وہ خدا کہ آسمانوں کی

السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ لَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّ لَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ وَ خَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ

اور زمین کی حکومت اسی کی ہے وہ کوئی لڑکا رکھتا ہے اور نہ بادشاہت میں کوئی اس کا شریک ہے اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اسے اندازہ

تَقۡدِیۡرًا ﴿۲﴾ وَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِـہَۃً لَّا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡئًا وَّ ہُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ وَ لَا یَمۡلِکُوۡنَ

سے درست کیا لوگوں نے اس کو چھوڑ کر معبود بنالئے جو کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے بلکہ خود ہی مخلوق ہیں اور اپنے نقصان

لِاَنۡفُسِہِمۡ ضَرًّا وَّ لَا نَفۡعًا وَّ لَا یَمۡلِکُوۡنَ مَوۡتًا وَّ لَا حَیٰوۃً وَّ لَا نُشُوۡرًا ﴿۳﴾

نفع کا اختیار نہیں رکھتے اور نہ وہ مرنے جینے کے مالک ہیں اور نہ دوبارہ اٹھنے کے

تفسیر جب سے مدنیت اور سماج کی بنیاد پڑی ہے اُس وقت سے ایک دوسرے کی حق تلفی، دراز دستی اور بیجا تصرف شروع ہو گیا۔ ہر شخص نے اپنے حق سے زائد حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی اور استحقاق محنت سے آگے بڑھ کر آرام طلبی اور عیش پسندی کے اقتضاء کو پورا کرنے کے لئے جائز و ناجائز کی قید کو توڑ دیا۔ ہوشمند طبقہ نے روکا چیرہ دستیوں کی بندش کرنے کی کوشش کی، مگر چونکہ خواہش نفس کا تسلط طریق غاصب پر تھا، کوئی نصیحت مفید نہ ہوئی۔ سمجھدار لوگوں نے زیادتی اور ظلم کو دور کرنے کے لئے اپنے روشن دماغ سے کام لے کر کچھ قانون بنائے، مگر نفس پرست طبقہ نے ان کو صحیح تسلیم نہ کیا اور چونکہ فطانت و زیرکی سے پرستاران نفس کو بھی حصہ ملا تھا، اس لئے ہوشمندوں کے بنائے ہوئے قوانین کو غیر مفید بلکہ ضرر رساں ثابت کرنے کی انہوں نے انتہائی کوشش کی، ہر قانون کی خوردہ گیری اور ہر ضابطہ کی عیب چینی کی، افکار و خیالات میں اختلاف تھا، جذبات اور خواہشات میں تفرقہ تھا، طریق جُدا جُدا تھا، عقل و دانش کا تفاوت تھا۔ ان تمام اسباب نے کل قوم کو ایک قانون پر متفق الرائے اور متحد العمل نہ ہونے دیا۔ جوں جوں آبادی کی ترقی ہوتی گئی اختلاف کی خلیج بھی وسیع ہوتی گئی۔ حق پرستوں نے جدا قانون بنایا اور چیرہ دستوں نے الگ من گھڑت ضابطہ مقرر کیا۔ حق پرستوں کا بنایا ہوا قانون بھی ناقص تھا اور ستم گاروں کا اختراعی ضابطہ تو خود غرضی پر مبنی ہی تھا۔ مؤخر الذکر کی خرابی یہ تھی کہ اس پر عمل کرنے سے ظلم کو قانونی شکل حاصل ہو گئی۔ جور نے عدل کا جامہ پہن لیا اور فریادی کی فریاد کا دروازہ بند ہو گیا۔

اول الذکر قانون کے ناقص ہونے کے چند اسباب تھے:- (۱) قانون بنانے والوں کو فطرت کی بدلتی ہوئی رنگینیوں کا من کل الوجوہ علم نہ تھا۔ تمام احوالِ عالم کے کل احوال اور رسم و رواج کا پتہ نہ تھا۔ اختلاف طبع اور تلوّن مزاجی سے پوری شناسائی نہ تھی۔ قانون بنانے کے وقت ان کے سامنے ایک قوم یا چند اقوام تھیں، سطح زمین پر آباد ہونے والی کل اقوام نہ

تھیں۔ پھر اپنے ہی زمانہ کے لوگوں کی حالت ان کو معلوم تھی آئندہ آنے والی نسلوں کا پتہ نہ تھا۔ رنگ، شکل، زبان، وطن اور خیال و فکر کا اختلاف ان کے پیش نظر نہ تھا۔ واضعین آئین کا علم محدود، زمانہ محدود اور قوم محدود تھی۔ اس لئے ان کے بنائے ہوئے قانون کل دنیا کے لئے مفید نہ ہو سکے۔

(۲) قانون بنانے والے مجبور و بے کس تھے۔ ان کو اختیار کامل حاصل نہ تھا۔ جس قوم کے لئے انہوں نے قانون بنایا تھا وہ ان کی پیدا کی ہوئی نہ تھی۔ اس لئے پہلے سے ان کے طبائع اور سرشت کا واضعین کو صحیح اندازہ نہ تھا۔ اس لئے جو آئین وضع کیا اس کو عمومی افادی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔

(۳) ان کا قانون کامل طور پر صحیح و غلط کا پورا پورا امتیاز پیدا نہ کر سکتا تھا کیونکہ دماغ تراشیدہ اور زود لیدہ فکر تھا اور افکار کا اختلاف فطری ہے۔ اس لئے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ان ہوشمندوں نے جو کچھ بتایا اور قوم میں بطور دستور العمل جاری کیا وہ صحیح تھا۔

(۴) قانون کو پھیلانے والے معصوم نہ تھے لیس لئے صحیح ہو یا غلط بعض حالہ غلطیوں سے پاک نہ تھی جس گروہ نے ہوشمندوں کے بنائے ہوئے قانون کو پھیلایا وہ خود صحیح تحقیق کرنے والے طبقہ میں بنا۔ اس لئے اس کی قانون فہمی اور اشاعت دستور العمل قابل پذیرائی نہ تھی۔ یہ وجوہ ایسے تھے جنہوں نے عقلاء کے بنائے ہوئے قانون کو ناقص اور ناقابل عمل بنا دیا تھا۔ ایسے وقت میں ضرورت ہوئی کہ ان سب سے ہٹ کر کوئی اور واضع عدالتی قانون بنائے جس سے ظلم و جور کی بیخ کنی اور حقوق کی حد بندی ہو جائے۔ نقائص بالا کا لحاظ کرتے ہوئے چار امور کا ہونا لازم قرار پایا:۔ (۱) مجموعہ قوانین ایسا ہو جو حق و باطل کا صحیح طور پر امتیاز کر دے، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دے۔ حقیقت و واقعیت کے لحاظ سے اس کی بنا صحت اور عدل پر ہو (۲) جس کو شائع اور جاری کرنے پر مامور کیا جائے وہ ظلم و جور جنبہ داری اور خود غرضی سے معصوم ہو، اجرائے آئین میں کسی کی رعایت نہ کرے، نفس پرستی کا شمہ اس میں نہ ہو، اس کے قول اور فعل کو لوگ شبہ سے نہ دیکھتے ہوں، راست باز، صداقت شعار، صادق القول اور بے لاگ حاکم ہو (۳) مجموعۂ قوانین تمام دنیا کے لئے عام ہو، اس پر عمل کرنے سے کسی کا نقصان حالی نہ ہوتا ہو، ہر قوم کی سرشت، خو، خصلت، اور رسم و رواج کی اصلاح کرنے والا ہو، اتنا دشوار نہ ہو کہ بغیر دشواری کے اس پر عمل نہ کر سکے نہ اتنا آسان ہو کہ لوگوں کو مطلق العنان اور شتر بے مہار کر کے چھوڑ دے، اس میں کسی امیر غریب، حاکم محکوم، آقا غلام، قوی کمزور، ادنیٰ اعلیٰ، مشرقی مغربی اور گورے کالے کی تخصیص نہ ہو سب کے لئے یکساں عام ہو، قانون بنانے والا قادر مختار خلاق مطلق، عالم غیب، زندگی اور موت کا مالک ہو، کل نقائص سے پاک ہو، عدیم المثال اور بے نظیر ہو، کل خلق کا ضرر و نفع اس سے وابستہ ہو، سب کا صحیح اندازہ اس نے کر لیا ہو۔ ان اصول چہارگانہ کی تکمیل کسی انسان یا انسان کے بنائے ہوئے قوانین سے ہونی ناممکن تھی۔ انسانی کوتاہ دستی پر رحم کھا کر ضرورت انسانی کے موافق اس خدا نے جو خلاق مطلق ہے، خود مختار، مالک نفع و ضرر ہے، عالم الغیب والشہادۃ ہے، متصرف حقیقی ہے، کل عالم کی حکومت، ملکیت اور تربیت اسی کے دست قدرت میں ہے، ہر چیز کا صحیح اندازہ کرنے والا ہے ایک عظیم الشان مجموعۂ قانون مرتب فرما کر نازل کیا جو خیر و شر اور حق و باطل میں امتیاز کرنے والا ہے، تمام اقوام عالم کی معاشرت، مدنیت، سیاست، اخلاق، رسم و رواج غرض زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح کرنے والا ہے جس کی بنا عدالت پر ہے پھر جس بزرگ ہستی پر نازل کیا وہ عبدیت و عبودیت میں ممتاز درجہ رکھتی تھی، کمال عبدیت اس کو حاصل تھا، اس لئے جور، جنبہ داری اور غایت چشم پوشی، خود غرضی اور نفس پرستی کا شبہ بھی اس پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انسانی شرف کا انتہائی درجہ کمال عبدیت ہی ہے اور اس کو یہ مرتبہ حاصل تھا، اس لئے ہر بشری غلطی سے اس کو تقدس حاصل تھا اور افراط و تفریط کے نامناسب جذبات نے اس کو چھوا بھی نہ تھا۔ اسی مضمون کو آیات مذکورہ میں مجمل طور پر بیان فرمایا ہے۔

تحلیل اجزاء

تَبَارَكَ الَّذِیْ زجاج نے تَبَارَكَ کے معنی تقدس لکھے ہیں۔ ابن عباسؓ نے خیر و خوبی کی زیادتی سے تفسیر کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر عیب و نقص سے پاک ہے اور خیر و خوبی اس میں پائی جاتی ہے اور اس نے ہر قسم کی خوبی عطا فرمائی ہے۔ گو اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ ہدایت خلق کے لئے قرآن کو نازل کرنے والا مخلوق میں سے کوئی فرد نہیں کیونکہ مخلوق کے ہر فرد میں کوئی عیب و نقصان ضرور پایا جاتا ہے اور جب وہ خود ناقص ہے تو دوسرے کو خیر و خوبی کیسے دے سکتا ہے اور کل دنیا کی ہدایت کے لئے کوئی مجموعۂ قوانین کیسے بنا سکتا ہے۔ قانون عام جاری کرنے کا اختیار اسی کو ہے جو ذات و صفات میں کامل ہے اور ہر طرح سے فیاض ہے اور کامل الذات والصفات خدا ہی ہے۔

نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ اس جملہ میں تین لفظ تنقیح طلب ہیں:۔ (۱) تَنْزِیْل کے معنی ہیں قدرے قدرے حسب موقعہ اتارنا۔ قرآن اسی طرح نازل ہوا ہے یکدم نہیں نازل ہوا۔ چونکہ خدا تعالیٰ ہر خوبی عطا کرنے والا ہے، اس لئے اس نے اوامر و نواہی میں بھی تدریجی و آہستگی اختیار فرمائی۔ سیوطی نے اتقان میں لکھا ہے کہ جب تعلیم دینے والے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سیکھنے والا کمال حاصل کر لے اور جو کچھ تعلیم حاصل کرے اس کو آسانی کے ساتھ ضبط کر لے تو وہ آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ تعلیم دیتا ہے، سبق سبق پڑھاتا ہے تاکہ سیکھنے والے کو کوئی تکلیف نہ ہو اور اس کا دماغ سہولت کے ساتھ تمام اسباق کو یاد کر لے۔ خدا تعالیٰ ارحم الراحمین اور مصالح عباد کا عالم ہے۔ اس نے کمال رحمت سے یکدم کل

احکام نازل نہ فرماتے تاکہ عمل کرنے والوں کو غیر معمولی تکلیف نہ ہو۔ اگر پورا قرآن ایک دفعہ نازل ہو جاتا تو سب پر عمل یکدم ممکن نہ ہوتا اور بنی اسرائیل کی طرح امت محمدیہ بھی غیر معمولی تکلیف میں مبتلا ہو جاتی۔

(۲) فرقان کے لغوی معنی ہیں فرق کرنے والا۔ قرآن فرق کرنے والا ہے حق و باطل میں، خیر و شر میں، عدل و ظلم میں، ہدایت و ضلالت میں، حرام و حلال میں، علم و جہالت میں، نور و ظلمت میں، مفید و مضر میں، مفسد و مصلح میں، صدق و کذب میں، راستی و کجی میں، صواب و خطا میں۔ رفتہ رفتہ ۲۳ سال میں نازل ہو کر اس نے انسانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کی تعلیم دی، سیدھا راستہ بتایا، تاریکی کے غار سے نکال کر روشنی کی سطح پر لایا، تباہ کاریاں بند کیں، عمرانیات کو ترقی دی، فساد کی جگہ صلاح، کذب کی جگہ صدق، کجی کی جگہ راستی اور ظلم کی جگہ عدل کو قائم کیا۔

(۳) خدا نے اپنے خاص بندے پر قرآن نازل فرمایا جس پر قرآن نازل ہوا اس کا عقیدہ بھی درست تھا، اعمال بھی صحیح تھے، اقوال میں صداقت تھی اور فطرۃً ہر لغزش سے معصوم بھی تھا گویا بشری کمال کے انتہائی درجہ پر پہنچا ہوا تھا اور خدا کا کامل بندہ تھا۔ لفظ عَبْدِہٖ میں انتہائی اوصاف کی طرف اشارہ ہے۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ رحیم و کریم اور پاک خدا نے آہستہ آہستہ ایک عظیم الشان کتاب جو حق و باطل کا فیصلہ کرنے والی ہے اپنے معزز محترم بندہ پر نازل فرمائی تاکہ :- لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا۔ وہ تمام عالم کو پیام خداوندی سنا دے اور صاف کہدے کہ جو شخص اس پیام کے خلاف کرے گا وہ دنیوی اور اخروی عذاب میں مبتلا ہوگا۔ لفظ عالمین میں چونکہ کوئی تخصیص نہیں، اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ تبلیغ محمدی تمام مکلف انسانوں کے لئے تھی۔ ایک اور آیت میں آیا ہے قُلْ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ صحیح حدیث میں وارد ہے بُعِثْتُ اِلَى الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ۔ ایک اور حدیث میں حضورؐ نے اپنی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا پہلے نبی کو صرف اسی کی قوم کی ہدایت کے لئے بھیجا جاتا تھا، مگر مجھے سب کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا ہے۔

اس آیت سے بعض اہل تفسیر نے استخراج کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جنات کی ہدایت کے لئے بھی بھیجا گیا تھا کیونکہ عالمین کا لفظ جنات کو بھی شامل ہے۔ میرے نزدیک یہ استنباط ضعیف ہے کیونکہ عالمین کو اگر عام معنی پر چھوڑ دیا جائے گا تو اس میں تمام کائنات مادی اور روحانی، ہوشمند اور بے عقل، جامد اور نامی حساس اور بے حس سب ہی داخل ہوں گی۔ حالانکہ یہ امر بداہۃً باطل ہے کہ حضورؐ کو پہاڑوں، بیابانوں، دریاؤں، درختوں اور زمینوں کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرائن عقلیہ کے تحت عالمین سے عالم انسان ہی مراد لیا جائے گا۔ جنات کو لفظ عالمین میں شامل سمجھنا تخمین بلا محض ہے۔ رہی یہ بات کہ حضور والا کو جنات کے لئے بھی پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا یا نہیں؟ یہ بحث دوسری جگہ کی ہے اور بالاتفاق علماء حضورؐ کی بعثت جنات کے لئے بھی ہوئی ہے، لیکن اس آیت سے اس مضمون کا استخراج نہیں کیا جا سکتا۔

اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ — اس عبارت میں کامل طور پر توحید و تنزیہ کو ثابت کیا ہے اور قرآن نازل کرنے اور آئین عدالت جاری کرنے کا استحقاق جن وجوہ کی بنا پر ہو سکتا ہے ان کو بیان فرمایا ہے اور ضمنی طور پر فرقہائے کفار کے عقائد کا ابطال کیا ہے۔ سب سے پہلے فرمایا کہ زمین و آسمان کی حکومت، تصرف، تربیت سب اللہ ہی کے قبضہ میں ہے یعنی اس کے سوا کسی کو نفع نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں پھر فرمایا اس کے کوئی اولاد بھی نہیں نہ حکومت میں کوئی ساجھی ہے، اس نے ہر چیز کو پیدا بھی کیا ہے اور ایک خاص اندازہ مقرر فرما کر پیدا کیا ہے، اس لئے وہ وحدہٗ لاشریک، معبود برحق اور یگانۂ مطلق ہے اور مخلوق میں اصلاحی قانون جاری کرنے کا اس کو حق ہے اس سے آگے کفار کے دیوتاؤں اور معبودوں کی کمزوری اور بے کسی دکھا کر ابطال شرک کرنے کے بعد توحید کے مضمون کو تمام کیا ہے۔

مقصود بیان

خدا تعالیٰ ہر عیب و نقصان سے پاک ہے اور ہر خیر و خوبی عطا کرنے والا ہے۔ قرآن کا نزول رفتہ رفتہ ہوا تھا یکدم نازل نہیں ہوا۔ قرآن ہدایت و گمراہی اور حق و باطل میں فرق کرنے والا ہے۔ لفظ فُرْقَان سے نصیحت حاصل کرنی چاہیئے اس گمراہ نیم تعلیم یافتہ طبقہ کو جو قرآن کے بعض اصول کو مصالح وقت کے مناسب نہیں جانتا، خلاف حق قرار دیتا اور ناقابل عمل سمجھتا ہے اور بعض قواعد شرائع کو شدت و سختی پر محمول کرتا ہے۔ لفظ عَبْدِہٖ بتا رہا ہے کہ رسول پاکؐ خدا کے خاص بندے تھے اور کمال عبدیت انسانی مراتب میں سب سے بڑا مرتبہ ہے۔ لِلْعٰلَمِيْنَ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی ہدایات کسی قوم، کسی ملک اور کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ کل اقوام اور ہر زمانہ کے لئے عام ہیں اس سے مذہب اسلام کا ناقابل نسخ ہونا بھی مستنبط ہو سکتا ہے۔ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی چیز اندازۂ الٰہی سے خارج نہیں۔ عمر، رزق، موت، صحت، عزت غرض ہر چیز کا اندازہ ہر شخص کے لئے خدا تعالیٰ نے پہلے سے کر لیا ہے لَا يَخْلُقُوْنَ سے غیر اللہ کی الوہیت کا استحقاق اور الوہیت کو باطل کرنے کے لئے چند دلائل کا بیان فرمایا ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ اللہ کے سوا ہر چیز بے بس ہے، اس لئے کسی کو معبودیت کا استحقاق نہیں۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ ۚ فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا

کافر کہتے ہیں کہ یہ تو نرا جھوٹ ہے جو (محمد نے) خود تراش لیا ہے اور دوسرے لوگوں نے اس کی مدد کی ہے ان لوگوں نے بڑا ظلم اور

وَزُورًا ۚ وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ قُلْ أَنْزَلَهُ

جھوٹ کا ارتکاب کیا اور کہنے لگے کہ یہ اگلوں کی کہانیاں ہیں جن کو محمد نے لکھوا لیا ہے اور وہی ان کے سامنے صبح و شام پڑھی جاتی ہیں (اے محمد) کہدو اس کو اس خدا

الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ إِنَّهُ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ وَقَالُوا مَالِ هَٰذَا

نے اتارا ہے جو آسمان و زمین کی چھپی باتوں کو جانتا ہے بلاشبہ وہ غفور رحیم ہے (کافر) کہتے ہیں اس رسول کو کیا ہو گیا

الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ ۙ لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا

ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے کیوں اس کے پاس کوئی فرشتہ نہیں اتارا جاتا کہ اس کے ساتھ ہو کر ڈرائے

أَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا ۚ وَقَالَ الظَّالِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا

یا کیوں اس کی طرف کوئی خزانہ (آسمان سے نہیں پھینک دیا جاتا یا کیوں اس کے پاس کوئی باغ نہیں کہ جس میں سے یہ کھایا کرتا ظالم کہتے ہیں کہ تم محض ایک جادو زدہ شخص

مَسْحُورًا ۝ انْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا ۝ ع

ع ۹ / ۱۶

کا اتباع کئے ہوئے ہو دیکھو انھوں نے تمہاری کیسی مثالیں بیان کیں اور گمراہ ہو گئے ان کو راہ نہیں مل سکتی۔

تفسیر خیر و شر اور حق و باطل کا مقابلہ آغاز آفرینش سے برابر ہوتا چلا آیا ہے۔ باطل پرست طبقہ دلائل و براہین کا مقابلہ اپنی کج بحثی سے کرتا رہا ہے اور توہم کو عقل کا جامہ پہناتا جاہل طبقہ کا ہمیشہ سے شعار رہا ہے۔ پیغمبران الٰہی نے جب پیام خداوندی سنایا اور عقائد و اعمال کو درست کرنے کی ہدایت سے بے دین جاہلوں نے سرتابی کی اور عناد پیشہ کافروں نے ہدایت کو ضلالت، حق کو باطل اور راستی کو غلط ظاہر کرتے ہوئے مخالفت و معاندت کا مظاہرہ کیا۔ جاہلوں کے دماغ دانش کی روشنی سے تو خالی ہوتے ہیں، دلیل و برہان کا پرتو ان کے دلوں پر نہیں پڑتا عقل و فہم کو چھوڑ کر جہالت پر اتر آتے ہیں اور حق کا مقابلہ دو طرح سے کرتے ہیں (۱) پیغمبروں کا مذاق اڑاتے، ان کو کاہن کہتے اور ساحر مفتری کذاب شاعر بتلاتے ہیں اور اپنے ہمنوا حلقہ کے سامنے ظاہر کرتے ہیں کہ خدا کا انسانوں سے کیا علاقہ اور اگر علاقہ ہو بھی تو اس مادی کثیف انسان کو وہ اپنا پیغامبر کیسے بنا سکتا ہے جو معمولی آدمیوں کی طرح کھاتا پیتا چلتا پھرتا اور اٹھتا بیٹھتا ہے اللہ سے اس شخص کا خاص تعلق کیسے ہو سکتا ہے پھر اس کے پاس شوکت و جلال نہیں، مال و متاع نہیں، غیبی خزانہ نہیں، فرشتوں کا لشکر نہیں۔ ایسا فقیر نعیم آدمی کیسے پیغمبر ہو سکتا ہے (۲) پیغمبر کی پیش کردہ ہدایت نامہ پر بھی جاہلانہ نکتہ چینی کرتے ہیں، کبھی کہتے ہیں یہ قصوں کی کتاب ہے اور مجموعہ کہانیاں ہے ہدایت کا اس سے کیا تعلق، پارینہ افسانوں سے کیا ہدایت ہو سکتی ہے۔ اس شخص نے یہ کتاب خود لکھی ہے یا اپنے دوستوں سے لکھوائی ہے اور خدا پر دروغ بافی کی ہے۔ اسی قسم کے دوسرے شبہات بھی یہ بے دین طبقہ کرتا چلا آیا ہے۔ رسول پاک کے زمانے میں بھی بہت سے اہل عناد اور کور باطن کافر تھے جو اعتراضات گزشتہ کافروں نے اپنے پیغمبروں پر کئے تھے وہی اعتراضات یہ بھی کرتے تھے۔ کبھی رسول کی ذات کو مورد طعن و تشنیع بناتے۔ جادو زدہ جادوگر وغیرہ کہتے۔ کبھی کتاب الٰہی کو پارینہ افسانوں کا مجموعہ قرار دیتے اور جب کہا جاتا کہ ایک اُمّی بے پڑھا لکھا آدمی ایسے صحیح تاریخی واقعات کیسے بیان کر سکتا ہے تو جواب دیتے کہ اہل کتاب سے لکھوا لیتے ہیں۔ غرض اس طرح خود بھی گمراہ ہوتے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے۔ کفار کی اس تمام خرافات کا ازالہ لطافت آفرین معجز طرز بیان کے ساتھ خداتعالیٰ نے ان آیات میں بیان فرمایا ہے جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

تحلیل اجزاء - وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا - مکہ میں چند غیر ملکی اہل کتاب تھے۔ ایک کا نام عداس بن عبید تھا۔ یہ حویطب بن عبد العزّیٰ کا غلام تھا۔ دوسرے کا نام

یسار تھا یہ علا حضرمی کا غلام تھا تیسرے کا نام ابو فکیہہ تھا یہ بھی ایک رومی غلام تھا چوتھے کا نام جبر تھا۔ نضر بن حارث مکہ کا ایک تاجر اور رئیس شخص تھا۔ بیوپار کے سلسلے میں عرب سے باہر شام کے ملک اور روم و ایران کے ملکوں میں جایا کرتا تھا وہاں سے رستم و اسفندیار اور شاہان روم کی داستانیں خرید کر کے لاتا اور رات کو سب لوگوں کو جمع کر کے سنایا کرتا تھا۔ آدمی کے خیال کی بلندی و پستی اس کے دماغ کی رفعت و انحطاط کے موافق ہوتی ہے۔ (نضر بھی کوتاہ نظر آدمی تھا، اس کا منتہائے علم صرف چند داستانیں تھیں)۔ قرآن میں قصص انبیاء کا تذکرہ تمثیلی اور تشبیہی صورت میں جا بجا آیا ہے۔ نضر کو تمثیل کے فوائد تو معلوم نہ تھے برہان استقراء اور تمثیل کے قواعد سے اس کا دماغ خالی تھا وہ سمجھا قرآن بھی کوئی داستان ہے اور بس۔ کہنے لگا مجھے اس سے بہتر داستانیں یاد ہیں، لیکن قرآنی قصص چونکہ فرضی افسانے نہ تھے بلکہ صحیح تاریخی واقعات تھے اور واقعات بھی وہ جو مشہور نہ تھے فقط علمائے اہل کتاب کو بھی ان کا کچھ علم تھا اور رسول پاک ﷺ کی صحبت علمائے اہل کتاب سے رہتی نہ تھی، اس لئے بالکل واضح حقیقت تھی کہ پیغمبر رسول اللہ کو یہ تاریخی حقائق کیسے معلوم ہوئے؟ تو اس کا جواب نضر اور اس کے ساتھی یہ دیتے تھے کہ چونکہ اہل کتاب کتب میں موجود ہیں محمد کا میل جول ان سے ہے وہ انبیاء کے قصے ان کو سنا دیتے ہیں اور یہ ترتیب دے کر ان کو خاص طرز بیان میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہ جواب اتنا بیہودہ اور کمزور تھا کہ ادنیٰ سمجھ والا بھی اس کو صحیح تسلیم نہیں کر سکتا کیونکہ معمولی قصص کو ایسے رنگ میں پیش کرنا جس سے عرب کے تمام فصحاء، بلغاء اور حکماء عاجز ہو گئے، انسانی طاقت سے بالاتر ہستی کا کام ہے قرآن نام چند قصوں ہی کا نہیں ہے بلکہ ہدایت نامہ ہے، قوانین اصلاح کا مجموعہ ہے اور پھر معجز طرز بیان بھی ہے، اس لئے خدا تعالیٰ نے نضر جیسے کافروں کے مذکورہ بالا اقوال کا مفصل جواب نہیں دیا بلکہ بطور تنبیہ مختصراً اتنا فرما دیا کہ ان کا قول بالکل بیجا اور سراسر جھوٹ ہے۔ قرآن کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ اس عالم الغیب خدا کا نازل کیا ہوا ہے جو رازہائے کائنات سے واقف ہے، ان کی یہ بہتان تراشی اور افترا بندی تو فوری مواخذہ کی مقتضی تھی، مگر خدا چونکہ غفور رحیم ہے اس لئے اس نے ان کی پاداش کو آخرت پر موقوف رکھا اور فوراً گرفت نہ فرمائی۔

وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ الخ۔ ابن جریر، ابن منذر اور محمد بن اسحاق نے بروایت ابن عباس رضی بیان کیا ہے کہ ایک بار عتبہ بن ربیعہ، ابو سفیان، صخر بن حرب، نضر بن حارث، ابوالبختری، اسود بن عبد یغوث، زمعہ بن اسود، ولید بن مغیرہ، ابو جہل بن ہشام، امیہ بن خلف، ابن ابی امیہ، عاص بن وائل اور بعض دوسرے سرداران مکہ جمع ہوئے اور باہم مشورہ کیا کہ اس وقت محمد کو بلا کر جو کچھ کہنا سننا اور فیصلہ کرنا ہے کر لو تاکہ ہماری طرف سے مصالحت کی تحریک میں کوئی کمی نہ رہ جائے اس کے بعد جو کچھ کرنا ہو گا کیا جائے گا۔ چنانچہ حضور ﷺ کو بلایا گیا۔ سرکار فی الفور تشریف لائے۔ حاضرین نے کہا محمد ﷺ! ہم نے تم کو چند باتیں کرنے کے لئے بلایا ہے۔ ہم تم سے دریافت کرتے ہیں کہ تم نے جو یہ جدید تحریک پیدا کی ہے اس کی غرض کیا ہے؟ اگر اس کا مطلب حصول مال ہے تو ہم چندہ کر کے تمہارے لئے اتنا مال جمع کئے دیتے ہیں کہ کوئی تم سے زیادہ مالدار کوئی نہ ہو گا اور اگر تم حصول سیادت کے خواستگار ہو تو ہم باتفاق آراء تم کو سردار بنانے کے لئے تیار ہیں اور اگر حکومت کے طالب ہو تو یہ بات بھی دشوار نہیں۔ رسول پاک ﷺ نے جواب دیا مجھے ان باتوں میں سے کسی کی خواہش نہیں۔ نہ مال چاہتا ہوں نہ سیادت کا خواستگار ہوں نہ امارت کا طالب۔ حق بات یہ ہے کہ خدا نے مجھے اپنا پیامبر بنا کر بھیجا ہے اور اپنی کتاب مجھ پر نازل فرمائی ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ تم کو (جنت کی بشارت اور دوزخ کا عذاب بتاؤں میں نے تم کو پیام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اب اگر تم نے میرے قول کو مان لیا تو دنیا و آخرت میں تمہارے لئے کامیابی ہے اور اگر نہ مانا تو مجھے کیا میں صبر کئے رہوں گا یہاں تک کہ خدا میرا اور تمہارا فیصلہ فرما دے۔ سرداران کفر بولے محمد! ہم نے جو امور تمہارے سامنے پیش کئے اگر تم ان میں سے کسی کو قبول نہیں کرتے تو اچھا اپنے رب سے درخواست کرو کہ وہ کوئی فرشتہ آسمان سے اتار دے جو تمہارے ساتھ رہے، تمہارے قول کی تصدیق کرے اور ہمارے اعتراضات کا جواب دے یا یہ دعا کرو کہ خدا تعالیٰ تمہارے لئے سرسبز باغ، شاندار کوٹھیاں اور سونے چاندی کے محلات بنا دے تاکہ تمہاری حالت ایسی شکستہ نہ رہے جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ تمہارے پاس ایک غیبی خزانہ بھی ہونا چاہیئے تاکہ دوسرے فقیروں کی طرح تم بازاروں میں جوتیاں چٹخاتے نہ پھرا کرو۔ تمہارے غیبی خزانے کو دیکھ کر ہم کو یقین ہو گا کہ واقعی تم کو کوئی خاص شرف حاصل ہے اور تم مرتبہ رسالت کے لائق ہو۔ حضور والا نے فرمایا میں اس قسم کی کوئی درخواست خدا سے نہیں کروں گا۔ میری بعثت کی غرض یہ نہیں ہے۔ مجھے تو صرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے کفار کے مقولے کو آیات مذکورہ میں نقل فرمایا ہے اور مختصر طور پر ان کے شبہات کو دور کر کے فہمائش بھی فرمائی ہے۔

وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ الخ۔ کور دماغ کافر نبوت اور بشریت میں منافات سمجھتے تھے۔ ان کے دماغوں میں یہ بات جمی ہوئی تھی کہ آدمی نبی نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتے تھے کہ محمد جب ہماری طرح کھانے پینے کے محتاج اور انتظام معاش و رزق کے لئے بازاروں میں چلنے پھرنے کے حاجت مند ہیں تو پھر ہم پر فوقیت کیا ہوئی اور نبی کس طرح بن گئے۔ رسول کو فرشتہ ہونا چاہیئے تھا۔ اگر فرشتہ نہ ہوتا تو کم از کم فرشتہ کو ان کا مصاحب بن کر تو ہمارے سامنے ضرور آنا چاہیئے تھا تاکہ عالم غیب سے ان کا خاص تعلق ہم کو معلوم ہوتا۔ یہ بھی نہ ہوتا تو معاش کی طرف سے ان کو بے فکری ضرور ہونی چاہیئے تھی اور کسی غیبی خزانے سے ان کو بے مشقت روزی ملنی چاہیئے تھی۔ شاندار محلات اور سونے چاندی کے مکانوں میں ان کی سکونت لازم تھی اور جب ان باتوں میں سے کچھ بھی نہیں تو پھر نبوت کا دعویٰ کرنا ان کی عقل کے فتور کا نتیجہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے سحر کر دیا ہے کہ عقل جاتی رہی ہے۔

اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا — کفار کو کسی بات پر اقرار نہ تھا۔ قرآن کی حقانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے تو وہ قائل نہ تھے۔ نبوت اور معجزہ ان کے نزدیک ناقابلِ تسلیم چیزیں تھیں، اس لئے ادھر ادھر کی پریشان باتیں کہتے تھے۔ ساحر، کاہن، دیوانہ اور اسی طرح اور بیہودہ الفاظ حضور کی شان میں استعمال کرتے تھے، لیکن تمام کلام حقیقت سے دور اور صداقت سے خالی تھے۔ مختلف پراگندہ پگڈنڈیاں تھیں جن پر گامزن تھے، مگر منزلِ مقصود تک کسی طرح رسائی نہ ہوتی تھی۔ راہِ حقیقت سے دور بھٹکے پھرتے تھے۔ کیونکہ اگر راہِ حقیقت مل جاتی تو اس پر جم جاتے، مگر ٹیڑھے راستے پر چل کر کچھ دور آگے بڑھ کر اپنی غلطی کا علم ہو جاتا تو لوٹ آتے اور دوسری پگڈنڈی پر چلنے لگتے۔ اسی طرح متحیر و سرگرداں پھرتے رہتے تھے۔

مقصودِ بیان رسالت بشریت کے منافی نہیں، کھانا کھانا اور بازاروں میں آدمیوں کی طرح گھومنا پھرنا شانِ نبوت کے خلاف نہیں۔ مقصد رسالت دنیوی شان و شوکت نہیں، نہ فرشتہ کسی کی تصدیق کرتا پھرتا ہے وغیرہ۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَ

بابرکت ہے وہ خدا کہ اگر وہ چاہے تو تمہارے لئے اس سے بہتر ایسے باغات بنا دے جن کے اندر نہریں جاری ہوں اور

يَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ۝ بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ۝

تمہارے لئے بہت سے محل کر دے بات یہ ہے کہ یہ قیامت کو جھٹلاتے ہیں اور قیامت کی تکذیب کرنے والوں کے لئے ہم نے دوزخ تیار کر رکھی ہے

اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ۝ وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا

جب دوزخ اُن کو دُور سے دیکھے گی تو یہ اُس کا غصہ اور غرانا سُنیں گے اور جب اُس کی کسی تنگ جگہ میں

ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ۝ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا

اُن کو جکڑ کر ڈال دیا جائے گا تو وہ وہاں موت کو پکاریں گے آج ایک موت کو نہ پکارو بلکہ بہت سی موتوں کو

كَثِيْرًا ۝ قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّ

پکارو (اے نبی) کہہ دو کیا یہ بہتر ہے یا وہ دوامی جنت جس کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے جو اُن کا صلہ اور

مَصِيْرًا ۝ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَاۗءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ۭ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْــُٔوْلًا ۝

ٹھکانا ہے جو چاہیں گے اُن کو وہاں ملے گا اور وہ ہمیشہ رہیں گے یہ تمہارے پروردگار کا وعدہ مطلوبہ لازم ہے

تفسیر انبیاء کی نبوت کی تکذیب اور مرسلین کی رسالت کا انکار دراصل انکار قیامت پر مبنی ہے۔ کوردانش انسان اس محسوس ناپائیدار زندگی پر پھولا پھرتا ہے اور حقیقت حیات کا انکار کرتا ہے اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کا بندے سے تعلق کس طرح ہو سکتا ہے۔ واجب کا ممکن سے اور قدیم کا حادث سے رشتہ کیسے ممکن ہے۔ ایک بے بضاعت انسان کو اچھے اعمال کرنے اور برے اعمال سے باز رہنے کی تکلیف کس طرح دے سکتی ہے اور اس ہلیت سے اس کا مقصد کیا ہے۔ حساب کتاب اور عذاب و ثواب کا حاصل کیا ہے۔ آنکھ کوتاہ نظر آدمی سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی دنیوی زندگانی ہے۔ رنج و راحت ہے۔ آئندہ رنج ہوگا نہ دکھ ہوگا نہ شکوہ۔ بعض لوگ آئندہ عذاب ثواب کے قائل تو ہوتے ہیں مگر ضرورت ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ ہر انسان کی عقل کو تعلیم و رہنمائی کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور انسان کا خالق سے رشتہ نہیں مانتے۔ بعض آدمی صرف روحانی دکھ کو مانتے ہیں جسمانی اور روحانی جسمانی کو نہیں مانتے

نہ روزِ قیامت ان کی نظر میں کوئی حقیقت رکھتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ انکارِ رسالت کا اصل سبب انکارِ قیامت ہے اور تکذیب نبوت کی حقیقی وجہ تکذیب حشر و حساب ہے۔ آیات مذکورہ میں خدا تعالیٰ نے انکارِ نبوت کے اصول گر کو بیان فرمایا ہے اور بطرز ترہیب و ترغیب اور تخویف و تنبیہ سے دماغوں میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ محسوس پرست طبقہ کی نظر بلند نہیں ہوتی۔ محسوس لذت اور محسوس تکلیف پر اس کی ہمت مقصود ہوتی ہے۔ ہدایت کا یہی طریقہ اس کے لئے کچھ مفید ہو سکتا ہے۔

تحلیلِ اجزاء

تَبٰرَكَ الَّذِیْۤ الخ۔ اللہ کی قدرت غیر متناہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اُسی نے مختلف آدمیوں کو شاندار محلات اور فلک نما عمارتیں عطا کی ہیں خزائن و دفائن، مال و منال، سطوت و جاہ، عزت و حکومت اُسی کی دی ہوئی ہے، اس لئے وہ اپنے نبی کو دنیا میں بھی شاداب باغات اور عظیم الشان محلات دے سکتا تھا لیکن مصالحِ عباد سے وہ بخوبی واقف ہے۔ اسرارِ قدرت کے تحت اُس نے ایسا نہیں کیا۔

آیت کا حاصل یہ ہے کہ کفار نے جن امور کی درخواست کی ہے وہ تو بہت حقیر ہیں۔ اگر خدا چاہے تو ان سے بہتر چیزیں آپ کو دے سکتا ہے اور ان کی درخواست سے زیادہ اپنے عطیہ سے سرفراز کر سکتا ہے۔

سفیان ثوری نے بروایت حبیب بن ثابت سے بروایت خیثمہ بیان کیا کہ (خدا تعالیٰ کی طرف سے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دے دیا گیا تھا کہ اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کو اتنے خزائن و دفائن دے دیں جو آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دئے اور نہ آپ کے بعد کسی کو دیں گے اور اس عطیہ سے اللہ کے ہاں جو عزت آپ کی ہے وہ کم نہ ہوگی۔ حضور والا نے جواب دیا یہ سب میرے لئے آخرت میں جمع رکھا جائے۔ اسی کے متعلق آیت مذکورہ نازل ہوئی (رواہ ابن ابی خیثمہ فی المصنف وابن جریر والفریابی وغیرہم) ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں طرز بیان کا کچھ اختلاف ہے مگر حاصل روایت یہی ہے۔

خطیب نے سراج منیر میں ایک حدیث نقل کی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا کہ اگر میں چاہوں تو وادی مکہ کو میرے لئے سونا بنا دیا جائے۔ میں نے عرض کیا پروردگار میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز بھوکا رہوں اور ایک روز سیر شکم کی حالت میں تیرا شکر ادا کروں اور حمد و ثنا بیان کروں۔

اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں چاہوں تو مکہ کے پہاڑ سونے کے بن کر میرے ساتھ چلیں۔ اللہ کے پاس سے میرے پاس فرشتہ آیا تھا اُس نے کہا تھا کہ تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ اگر تم چاہو تو (عاجز) بندہ اور نبی رہو اور اگر چاہو تو نبی بادشاہ کر دئے جاؤ۔ میں نے جبرئیل کی طرف دیکھا جبرئیل نے مشورہ دیا کہ تواضع اختیار کیجئے۔ میں نے عرض کیا پروردگار! میں نبی اور بندہ (عاجز) رہنا چاہتا ہوں۔ اُم المومنین نے فرمایا اس کے بعد کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکیہ لگا کر کھانا نہیں کھایا اور فرمایا کرتے تھے میں ویسے ہی کھاؤں گا جیسے بندہ کھاتا ہے اور ویسے ہی بیٹھوں گا جیسے بندہ بیٹھتا ہے۔ اس مضمون کی روایت مشکوٰۃ میں بھی موجود ہے (من شاء فلیطالع ہہناک)

بَلْ كَذَّبُوْا بِالسَّاعَةِ۔ مطلب یہ ہے کہ صدق رسالت اور حقانیت نبوت کو دریافت کرنا کافروں کا اصل مقصود نہیں ہے نہ راہِ حقیقت اور طریق ہدایت کی جستجو ان کی غرض ہے محض عناد و مخالفت اور تکذیب و انکار ان کا منتہائے نظر ہے۔ اگر ان کی درخواست کے موافق تم کو باغات اور محلات دے دئے جائیں تب بھی یہ لوگ نہ مانیں گے۔ اگر ان کے ایمان کی اُمید ہوتی اور تحقیق رسالت ان کا مقصود ہوتا تو خدا تعالیٰ ان کی درخواست سے بڑھ کر تم کو عطا کر دیتا، مگر بات یہی ہے کہ ان کو محض عناد کا مظاہرہ کرنا مقصود ہے۔ وہ سرے سے قیامت ہی کے منکر ہیں پھر درخواست پوری کرنے سے کیا حاصل۔ ابن کثیر نے آیت کا مطلب اس طرح لکھا ہے یہ گمان نہ کرنا کہ کافر تم کو جھوٹا جانتے اور تمہارے قول کی تکذیب کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ وہ یقیناً تم کو امین صادق جانتے اور تمہاری حقانیت پر اعتقاد رکھتے ہیں، مگر بات یہ ہے کہ قیامت کے منکر ہیں۔ ان کی نظر دنیا کے ناپائیدار حقیر مال و منال پر مقصور ہے، اُخروی رنج و راحت ان کے نزدیک ہیچ ہے (کذا قال الخطیب) میرے نزدیک اول مطلب زیادہ واضح ہے۔ کیونکہ ابن کثیر اور خطیب کے قول کے موافق لازم آتا ہے کہ کفار کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت یقینی ہو۔ حالانکہ ان کو حضور کی نبوت پر ایمان ہی نہ تھا۔ اگر ابو طالب کی طرح بعض شاذ مثالیں بیان کی جائیں تو ان پر کافروں کی عمومی حالت کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ عام کافر رسالت کے منکر تھے۔ واللہ اعلم۔

وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِیْرًا۔ ساعت سے مراد روزِ قیامت ہے اور بقول حسن بصری جہنم کا نام ہے۔ بعض اہل تفسیر قائل ہیں کہ دوزخ کے طبقات میں سے ایک طبقہ کا نام سعیر ہے۔ ابو مسلم اصفہانی نے اَعْتَدْنَا کا ترجمہ "ہم نے مہیا کر دیا" کیا ہے۔ اس لفظ سے اہل سنت بعض اشاعرہ و ماتریدیہ نے استخراج کیا ہے کہ دوزخ پیدا ہو چکی ہے اور اس وقت موجود ہے۔

وَاِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۭ بَعِیْدٍ الخ۔ یہاں دو امور تنقیح طلب ہیں (۱) کیا دوزخ کافروں کو دور سے دیکھے گی۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ معتزلہ کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ کافر دوزخ کو دیکھیں گے یعنی دوزخ کو اس جگہ تک لایا جائے گا کہ اگر اس کی آنکھیں ہوتیں تو وہ دیکھ لیتی۔ زمخشری نے کشاف میں اسی مطلب کی صراحت کی ہے مگر تعجب ہے کہ بیضاوی نے

بھی زمخشری کے اتباع میں یہی مطلب لکھا ہے۔ حالانکہ اہل سنت کے نزدیک آیت کی ظاہری اسنادیں بھی کوئی استحالہ نہیں۔ خدا تعالیٰ قیامت کے دن دوزخ میں بصارت وشعور پیدا کر دے گا اگرچہ اس کی بصارت آدمی کی طرح نہ ہوگی۔ مجاہد نے ابن عباس رضؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آدمی کھینچ کر جہنم کی طرف لایا جائے گا تو وہ اس کو دیکھ کر اس طرح آواز نکالے گی جس طرح جو کھ کو دیکھ کر خچر آواز نکالتا ہے (وقال ابن کثیر اسنادہ صحیح) ابن عباس رضؓ کا ایک اور قول ہے کہ کافروں کو سو برس کی راہ کی مسافت سے دیکھ کر دوزخ میں غیظ پیدا ہوگا جس کو کفار سنیں گے۔ بات یہ ہے کہ جہنم کی ستر ہزار لگامیں ہیں اور ہر لگام کو ستر ہزار فرشتے تھامے ہوئے ہوں گے۔ جب دوزخ کافروں کو دیکھے گی تو اس میں ایک بھڑک پیدا ہوگی کہ آنکھوں کے اندر جو آنسو رہ گیا ہوگا وہ نکل آئے گا پھر دوبارہ بھڑک پیدا ہوگی تو دل اپنے ٹھکانوں سے کھنچ کر حلقوم میں آجائیں گے۔ ان اقوال کے ظاہری الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ دوزخ کی طرف نسبت کرنی حقیقی ہے۔ البتہ مسافت کی تعیین اور سو برس کی صراحت اور ستر ہزار باگوں کی تخصیص اور ہر باگ کو ستر ہزار فرشتوں کا اس خاص تعداد کے ساتھ تھامے رہنا یہ سب کچھ بر سبیل استعارہ ہے اور اس سے مقصود ہیبت وعظمت کا اظہار ہے۔ عربی زبان میں ستر اور ستر کے الفاظ تعداد کی زیادتی ظاہر کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ ان سے تعیین عددی مقصود نہیں ہوتی جس طرح صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ذاتِ الٰہی پر نور کے ستر ہزار حجاب پڑے ہیں۔ یہاں بھی کثرتِ حجابات کا اظہار مقصود ہے۔

(۲) اس آیت میں آیا ہے کہ دوسرے کافر لوگ دوزخ کے غیظ اور زفیر کو سنیں گے، لیکن دوسری آیت میں آیا ہے شہیق کو سنیں گے اور دوزخ شدت غیظ سے پارہ پارہ ہو جانے کے قریب ہوگی۔ اندر سانس کھینچنے کو جس سے سینے میں ابھار پیدا ہو جاتا ہے شہیق کہتے ہیں اور باہر سانس نکالنے کو زفیر کہا جاتا ہے۔ دونوں آیتوں میں زفیر وشہیق سے مراد دونوں طرح کا جوش اور لپٹ ہے۔ دوزخ کا تنفس اس کا اشتعال ہے۔ ابن عباس کا قول ہے کہ جہنم کی شہیق ایسی ہوگی جیسے خچر جو کھ دیکھ کر شہیق کرتا ہے اور دوزخ کی زفیر سے ہر شخص خوف زدہ ہو جائے گا۔ عبدالرزاق نے باسناد صحیح بواسطہ مجاہد عبید بن عمیر کی روایت نقل کی ہے کہ زفیر جہنم سے ہر مقرب فرشتہ اور نبی مرسل بھی بخوف غضب الٰہی منہ کے بل گر پڑے گا۔ بہرحال شہیق اور زفیر سے مراد جہنم کی لپٹ کی آواز ہے جس کی کیفیت نامعلوم ہے۔

تغیظ سے مراد غصہ وغضب کا جوش ہے۔ شیخ جلال محلی نے لکھا ہے کہ تغیظ کے سننے سے مراد ہے اس کو دیکھ لینا اور جان لینا گویا لوگ جہنم کے غیظ کو دیکھیں گے اور اس کی کیفیت کو جانیں گے۔

مَكَانًا ضَيِّقًا الخ۔ اگرچہ جہنم بہت وسیع ہے اور اس کی گہرائی بہت زیادہ ہے، لیکن سرکش کافروں کو سخت عذاب دینے کے لئے سخت ترین تنگ جگہ میں ٹھونسا جائے گا اور وہ آپس میں جکڑے ہوئے ہوں گے اور شیطانوں کے ساتھ زنجیروں سے بندھے ہوں گے۔ ابن کثیر نے بروایت قتادہ ابن عمر کا قول نقل کیا ہے کہ کافروں کو جہنم میں ایسی تنگ جگہ ٹھونسا جائے گا جیسے پوری نیزہ میں ٹھونکی جاتی ہے۔ یحییٰ بن سعید کی روایت ہے کہ حضور اقدسؐ نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا قسم ہے خدا کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ کافروں کو آگ میں اس طرح ٹھونسا جائے گا جس طرح میخ کو دیوار میں ٹھونسا جاتا ہے۔

خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ باوجود اس تنگی کے کافروں کے ہاتھوں کو گردن کے ساتھ آتشی زنجیروں سے جکڑا جائے گا اور ہر کافر کے پاؤں کے ساتھ اس کا شیطان زنجیروں سے بندھا ہوگا۔

دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُورًا۔ دوزخ میں جب اس قدر تنگی، بندش اور عذاب کی حالت ہوگی تو کافر پکاریں گے "ہائے مرے"۔ ابن عباس رضؓ نے فرمایا ثبور کے معنی ہیں تباہی یعنی تباہی (وبربادی) کو پکاریں گے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ثبور کے معنی ہیں ہلاکت یعنی کفار موت کو پکاریں گے اور کہیں گے اے موت تو کہاں ہے۔

امام احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم، بزار اور بیہقی نے بروایت انس بن مالک رضؓ بیان کیا ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے پہلے ابلیس کو آگ کا لباس پہنایا جائے گا تو وہ چلائے گا یا ثبوراہ پھر اس کی ذریات کو آگ کا لباس پہنایا جائے گا تو وہ بھی پکاریں گے یا ثبورہم۔ ابن کثیر اور سیوطی نے اس حدیث کو صحیح الاسناد کہا ہے اگرچہ مسند اور صحاح ستہ میں یہ روایت نہیں ہے۔

وَادْعُوا ثُبُورًا كَثِيرًا۔ جہنم کے عذاب کے اقسام کثیر ہوں گے، طرح طرح کی تکلیف ہوگی، ہر قسم کی سختی بجائے خود ثبور ہوگی اور ہر صنف عذاب مستقل ہوگی، اس لئے حکم دیا جائے گا کہ ایک ثبور نہیں بلکہ بکثرت ثبور کو پکارو یعنی ایک ہی قسم کا عذاب یہاں باعثِ ثبور نہیں بلکہ ہر صنفِ عذاب موجب ثبور ہے۔ اس لئے ایک عذاب کی تکلیف سے تنگ آکر موت کے طالب نہ ہو بلکہ ہر طرح کے عذاب سے دکھ پاکر تم موت کے طلب گار ہو گے۔

قُلْ أَذَٰلِكَ خَيْرٌ۔ یہاں ہمزۂ استفہام سے حقیقت استفہام مراد نہیں کیونکہ جنت کی راحت دوزخ کی تکلیف سے یقینی طور پر بہتر ہے۔ اس میں استفہام کی ضرورت نہیں بلکہ استفہام سے مقصود کفار کو ملامت کرنا اور حسرت دلانا ہے (کما قال الرازی فی الکبیر والخطیب فی السراج)

اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ الخ۔ ابو مسلم اصفہانی نے کہا جنت الخلد وہ ہے جس کی نعمت کبھی زائل نہ ہو۔ جنت کی اضافت خلد کی طرف بیانی ہے یعنی وہ جنت جو دار الخلد ہے۔

لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ۔ اس آیت سے بعض لوگوں کے دماغوں میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ جب اہل تقویٰ کو جنت کے اندر ہر مطلوب چیز ملے گی اور ان کی ہر خواہش پوری کی جائے گی تو پھر اہل جنت کے درجات و مراتب کا تفاوت کیا معنی رکھتا ہے؟ کیونکہ جب درجات کا تفاوت ہوگا تو چھوٹے درجہ والے بڑے مرتبہ والوں کی مساوات کے طالب ہوں گے۔ اگر ان کی خواہش پوری کر دی جائے گی تو تفاوتِ درجات کے کوئی معنی نہیں اور خواہش پوری نہ کی گئی تو آیت مذکورہ کی صراحت غلط ہے۔

اس شبہ کا جواب رازی اور خفاجی وغیرہ نے دیا ہے کہ اپنے مرتبہ سے زائد کی خواہش ہی اہل جنت کو نہ ہوگی ان کو اپنی سوا الاتر کوئی نظر ہی نہ آئے گا وہ اپنی حالت کو بہترین راحت تصور کریں گے گویا اپنے مرتبہ سے بڑے مرتبہ کا تصور بھی ان کو نہ ہوگا۔ حدیث کے الفاظ میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ نوری صفار ..... ہر شخص کی استعداد کے مطابق ہوگی اور اس کے دماغ میں وہی خواہش پیدا ہوگی جتنی اس کی استعداد ہوگی اور چونکہ استعداد کی ایک خاص حد ہوگی، اس لئے خواہش کی بھی ایک خاص حد ہوگی۔ کم استعداد والا بڑی استعداد والے کے برابر استدعا نہیں کرے گا۔ اس طرح تفاوتِ درجات بھی قائم رہے گا اور ہر خواہش کی تکمیل بھی ہو جائے گی۔

كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا۔ وعدۂ مسؤلہ سے کیا مراد ہے اور اللہ پر واجب ہونے کے کیا معنی ہیں؟ ہم دونوں مطلبوں کی ترتیب وار تشریح کرتے ہیں:-

(۱) ابن جریر نے بعض علمائے عربیت کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وعدۂ مسؤلہ سے مراد ہے واجبی وعدہ۔ ابن عباسؓ نے فرمایا وَعْدًا مَّسْئُوْلًا کا یہ مطلب ہے کہ مانگ لو جو میں نے تم سے وعدہ کیا تھا تمہاری استدعا ضرور پوری کی جائے گی۔ محمد بن کعب قرظی نے لکھا ہے کہ قیامت کے دن فرشتے اپنے رب سے درخواست کریں گے رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ۔ گویا وعدۂ مسؤلہ سے وہ وعدہ مراد ہے جس کو پورا کرنے کی استدعا فرشتے کریں گے اور سوال کرنے والے فرشتے ہوں گے۔

ابو حازم نے کہا کہ قیامت کے دن اہل ایمان عرض کریں گے پروردگار! ہم نے تیرے حکم پر عمل کیا تھا تو اپنے فضل سے وہ وعدہ پورا کر جو تو نے ہم سے کیا تھا۔ گویا اس قول پر سوال کرنے والے عام اہل ایمان ہوں گے جو قیامت کے دن سوال کریں گے اور وعدہ سے مراد وہ وعدہ ہے جو خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں سے قرآن میں کیا ہے۔

خطیب نے سر لوحی میں اکثر علماء کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سوال سے وہ سوال مراد ہے جو مسلمان اپنے رب سے دنیا میں کرتے ہیں اور کہتے ہیں رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ الخ یعنی مومنوں نے دنیا میں جو حصول جنت کی دعا اللہ سے کی تھی وہ قیامت کے دن پوری کی جائے گی۔ حاکم نے مستدرک میں ایک حدیث نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کے دن مومن کو لا کر پروردگار کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔ اللہ فرمائے گا میرے بندے! میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ مجھ سے دعا کر اور میں نے تجھ سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ تیری دعا قبول کروں گا اور تو مجھ سے دعا کیا کرتا تھا چنانچہ میں نے تیری ہر دعا قبول کر لی۔ کیا ایسا نہیں ہوا تھا کہ فلاں فلاں دن تیرے اوپر ایک غم آیا تھا اور تو نے اس غم کو دور کرنے کی مجھ سے دعا کی تھی اور میں نے تیرا غم دور کر دیا تھا۔ بندہ عرض کرے گا ہاں پروردگار یونہی ہوا تھا۔ خدا تعالیٰ فرمائے گا میں نے دنیا میں ہی تیری دعا پوری کر دی۔ پھر تو نے فلاں فلاں دن تیرے اوپر جو غم تھا اس کو دور کرنے کی دعا کی تھی میں نے تجھے اس سے خلاصی نہیں دی تھی۔ بندہ کہے گا بے شک پروردگار ایسا ہوا تھا۔ خدا تعالیٰ فرمائے گا میں نے اس کے عوض جنت میں تیرے لئے ایسے انعامات کا ذخیرہ کر دیا تھا۔ پھر تو نے فلاں فلاں روز مجھ سے ایک حاجت پوری کرنے کی دعا کی تھی اور میں نے وہ حاجت پوری کر دی تھی۔ بندہ اقرار کرے گا۔ اللہ فرمائے گا میں نے تیری وہ دعا دنیا ہی میں پوری کر دی اور تو نے فلاں دن مجھ سے ایک حاجت پوری کرنے کی استدعا کی تھی میں نے وہ پوری نہیں کی۔ بندہ عرض کرے گا جی ہاں! اللہ فرمائے گا میں نے اس کے عوض تیرے لئے جنت میں ایسی ایسی نعمتیں جمع کر رکھی تھیں۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا بندۂ مومن کی دعا اللہ خالی نہیں چھوڑتا یا دنیا میں اس کو پورا کر دیتا ہے یا آخرت میں ذخیرہ رکھتا ہے۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ اگر گناہ اور قطع رحم کی دعا نہ ہو تو ہر دعا قبول کی جاتی ہے یا فوراً دنیا میں دے دی جاتی ہے۔

(۲) اللہ پر کوئی چیز واجب نہیں کیونکہ بندہ کا کوئی استحقاق خدا کے ذمہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ جن آیات سے اللہ کی بے نیاز ذات پر کسی امر کا ضروری ہونا سمجھ میں آتا ہے ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چونکہ ہم نے وعدہ کر لیا ہے اور اپنے ذمہ ضروری اور لازم کر لیا ہے اور ہم سے زیادہ سچا کوئی ہو نہیں سکتا، اس لئے ہمارے وعدے کی خلاف ورزی نہ ہوگی اور اسی بنا پر اس کی تکمیل کی درخواست بھی کی جا سکتی ہے (واللہ اعلم)

مقصود بیان

اللہ اپنی مشیت میں مختار ہے۔ مال کی کثرت، خزانہ کی فراوانی یا شاندار کوٹھیوں کا حصول رسالت و نبوت کا مقصود نہیں ہے۔ فرمائشی معجزات عطا نہیں کئے جاتے۔ اگرچہ خدا ہر درخواست کو پورا کر سکتا ہے۔ انکار نبوت کا اصل باعث انکار قیامت ہے۔ اقرار قیامت کے بعد ضرورت

نبوت بالکل ظاہر ہے۔ قیامت کے دن کفار عذاب کی سختی سے تنگ آکر موت کے طلب گار ہوں گے۔ موت کے طالب بنانے کے لئے ہر صنف عذاب کافی ہے اہل تقویٰ سے جنت کا وعدہ خدا نے کیا ہے۔ ہر جنتی کو اس کی خواہش کے مطابق مرتبہ دیا جائے گا۔ اللہ کے وعدہ کی خلاف ورزی محال ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَقُولُ أَأَنتُمْ أَضْلَلْتُمْ عِبَادِي هَٰؤُلَاءِ

جس دن ہم ان کافروں کو اور ان چیزوں کو جمع کریں گے جن کی یہ لوگ پرستش کیا کرتے تھے اور اللہ فرمائے گا کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا

أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ ۝ قَالُوا سُبْحَانَكَ مَا كَانَ يَنبَغِي لَنَا أَن نَّتَّخِذَ مِن دُونِكَ مِنْ

یا خود وہ راہ راست سے بھٹک گئے تھے وہ جواب دیں گے تو پاک ہے ہم کو زیبا نہیں کہ تیرے سوا دوسروں کو کارساز بنائیں

أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِن مَّتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ نَسُوا الذِّكْرَ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا ۝ فَقَدْ كَذَّبُوكُم

بات یہ ہے کہ تو نے ان کو اور ان کے اسلاف کو آسودہ کیا یہاں تک کہ تیری یاد بھلا بیٹھے اور یہ ہلاک ہونے والے لوگ تھے (ہم کہیں گے) اب تمہارے

بِمَا تَقُولُونَ فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا وَلَا نَصْرًا ۚ وَمَن يَظْلِم مِّنكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا

قول کی انھوں نے تکذیب کردی اب نہ تم خود ٹال سکتے ہو نہ مدد کر سکتے ہو جو شخص تم میں سے ظلم کرے گا ہم اس کو بڑے عذاب کا مزہ

كَبِيرًا ۝ وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ

چکھائیں گے (اے نبی) تم سے پہلے ہم نے جتنے نبی بھیجے وہ سب کھانا کھایا کرتے تھے اور بازاروں میں

فِي الْأَسْوَاقِ ۗ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً أَتَصْبِرُونَ ۗ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا ۝

چلا پھرا کرتے تھے ہم نے تم میں سے ایک کو دوسرے کے لئے آزمائش بنایا ہے کیا تم صبر کرو گے اور تمہارا رب خوب دیکھ رہا ہے

تفسیر

عقیدہ کی صحت بہت ہی اہمیت رکھتی ہے اسی پر تمام اعمال کا مدار ہے اگر عقیدہ صحیح ہوگا تو اعمال بھی غالباً صحیح ہوں گے اور جو عقیدہ غلط ہوگا تو صحت اعمال کی کوئی توقع اور امید نہیں۔ عقیدہ کی صحت کے یہ معنی ہیں کہ دماغی یقین واذعان واقعہ کے خلاف نہ ہو جیسا یقین ہو ویسی ہی واقفیت ہو۔ اگر خلاف واقع ہو تو ایسے عقیدہ کو غلط کہا جاتا ہے۔ صحت یقین سے صحت عمل پیدا ہوتی ہے اور صحت عمل سے صحیح نتیجہ نکلنا یقینی ہے اور غلط یقین سے عمل غلط ہو جاتا ہے اور عمل کی غلطی نتیجہ کی غلطی کی کفیل ہے۔ قیامت کے دن کفار پر ہر قسم کا عذاب ہوگا۔ روحانی، جسمانی، دماغی اور وجدانی ہر طرح کی اذیت ان کو ہوگی، لیکن مزید کوفت اس کی ہوگی کہ جن کی پرستش میں عمریں برباد کیں دماغوں میں حسن یقین قائم کیا، اعضائے جسمانی کو ان کی خوشامد اور عبادت میں لگائے رکھا، ان کی محبت میں مالی قربانیاں کیں، قیامت کے دن وہی بیزار ہوں گے اور کافروں کے جرم سے برأت کا اظہار کریں گے۔ اگر کسی کی خوشنودی اور حمایت حاصل کرنے کی انتہائی کوشش کی جائے اور اس کے لئے ہر قسم کی مالی اور جانی قربانیاں کی جائیں اور اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلے کہ وہ اپنے پرستار و خادم کی حمایت کرنے کے لئے تیار ہو جائے اور ہر طرح کی مدد کرے، لیکن کامیابی نہ ہو اور مفید سود مند ثابت نہ ہو تو زیادہ افسوس نہیں ہوتا بلکہ اپنے حامیوں کی کمزوری عاجزی کا بہانہ ہاتھ لگ جاتا ہے اور ایک طرح سے دل کو تسلی ہو جاتی ہے کہ جن کو ہم نے طرفدار بنانے کے لئے مالی اور جانی قربانیاں کی تھیں انہوں نے ہماری حمایت کی، ہماری قربانیاں بے کار تو نہیں گئیں۔ البتہ ان کی حمایت ہم کو بچا نہ سکی۔ زیادہ حسرت ناک یہ منظر ہوتا ہے کہ جس کے لئے جان و مال برباد کیا، ہر قسم کی خوشامد کی، اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے عیش و عشرت کو قربان کیا اسی نے آخر میں آنکھیں دکھائیں اور زبانی لعنت کی۔ چنانچہ جہاں کافروں کو جہنم میں ہر قسم کا عذاب ہوگا وہاں ایک عذاب یہ بھی ہوگا کہ

جن کی تمام عمر پرستش کرتے تھے خدا کے سامنے پیش کریں گے وہی ان سے بیزاری ظاہر کریں گے اور انہی کو مجرم قرار دیں گے۔ اسی مطلب کو شروع آیات سے نَذِیْرًا تک بیان کیا ہے۔ اس کے بعد عام نبوت کو لوازم بشریت کے منافی قرار دیتے ہوئے غرض نبوت، یعنی الجملہ روشنی ڈالی ہے اور آخر میں مسلمانوں کو افلاس، مصائب، جفاکشی اور مقابلہ کی سختی پر صبر کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

تحلیلِ اجزاء

وَیَوْمَ یَحْشُرُهُمْ الخ یعنی قیامت کے دن جب سب کا حشر ہوگا اور سب کو خدا کے سامنے جمع کیا جائے گا تو کافروں کی حسرت میں اضافہ کرنے کیلئے اور غم واندوہ کو بڑھانے کے لئے خداتعالیٰ مشرکوں کے مواجہہ میں ان کے معبودوں سے دریافت فرمائے گا کہ کیا تم نے میرے سوا اپنی پرستش کے لئے ان جاہلوں کو حکم دیا تھا یا یہ خود تمہاری دعوت کے بغیر تمہاری عبادت کر کے گمراہ ہوئے۔ اس آیت میں تنقیح طلب یہ امر ہے کہ مشرکوں سے کون سے مشرک مراد ہیں اور معبودوں سے کون سے معبود اور کون سے مسجودوں سے استفسار کیا جائے گا۔ کیونکہ مشرکوں کے مختلف اقسام ہیں کوئی مسیح اور صلیب کا پرستار ہے، کوئی عزیر کا کسی نے اپنے علماء و مشائخ کو معبود کا درجہ دے رکھا ہے، کوئی بُت پرست، کوئی عناصر پرست اور کوئی ستارہ پرست ہے۔

شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ بقول مجاہد معبودوں سے مراد مسیح، عزیر اور ملائکہ ہیں۔ اس قول پر دو اعتراض ہوتے ہیں:- (۱) یہ کہ سوا پرستاران مسیح و عزیر و ملائکہ کے دوسرے مشرک اس حکم سے خارج ہوں گے۔ ملامت اور حسرت وندامت میں اضافہ انہیں مشرکوں کو ہوگا جو انسانوں یا فرشتوں کے پرستار ہیں (۲) لفظ مَا کا استعمال عربی کلام میں بے عقل کے لئے ہوتا ہے، اس لئے فرشتوں اور انسانوں کو مراد لینا صحیح نہیں ہو سکتا۔ اگر انسان اور فرشتے مراد ہوتے تو مَا یَعْبُدُوْنَ کی جگہ مَنْ یَعْبُدُوْنَ کہنا چاہیئے تھا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ معبودوں سے عام معبود مراد ہیں پتھر ہوں یا درخت، عناصر ہوں یا ستارے، انسان ہوں یا جنات یا فرشتے سب سے بازپرس ہوگی، مگر جواب دینے والے اور مشرکوں سے بیزاری کا اظہار کرنے والے صرف انسان یا فرشتے ہوں گے اور یہی تمام معبودان باطل کے نمائندے بن کر بارگاہِ الٰہی میں اپنے گروہ کی برأت ظاہر کریں گے۔ اس قول پر صرف ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ لفظ مَا کو بطور عموم استعمال کیا گیا اور اہل عقل کو بھی اس میں داخل کیا گیا۔ اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں۔ پہلا جواب یہ ہے کہ کلام عربی میں ایسا ہوتا ہے کہ جس کی تعداد غالب ہوتی ہے اس کو دوسرے پر تغلیب دے کر ایسا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو فرقۂ غالب کے لئے موضوع ہوتا ہے، اگر فرقہ مغلوب کو ضمناً اس میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن پاک میں جابجا مردوں سے خطاب کیا گیا ہے اور عورتیں ضمناً داخل ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت میں لفظ مَا سے معبودوں کی ذات مراد نہیں بلکہ معبود بنائے جانے کا وصف مراد ہے۔ مثلاً کہتے ہیں مَا زَیْدٌ زید کس صفت کا آدمی ہے؟ یہ مراد نہیں کہ زید کون ہے؟ اس صورت میں آیت کا ترجمہ اس طرح ہوگا کہ جس روز مشرکوں کو اور ان چیزوں کو (ذی عقل ہوں یا بے عقل) جن میں صفت معبودیت مشرک مانتے تھے خداتعالیٰ اٹھائے گا الخ۔

مَا کَانَ یَنْۢبَغِیْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِیَآءَ اس آیت کا مطلب تین طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ پہلا مطلب یہ ہے کہ مشرکوں کے معبود جواباً عرض کریں گے پروردگارا! تو ہر طرح کے شرک سے پاک ہے۔ ہم کو یہ اختیار ہی کہاں تھا کہ ہم اپنے اولیاء یعنی پرستار بناتے جو تجھے چھوڑ کر ہماری پرستش کریں۔ شیخ ابن کثیر نے یہ مطلب لکھا ہے کہ پروردگارا تو پاک ہے ہم ہوں یا یہ مشرک کسی کو یہ اختیار نہیں ہو سکتا کہ تیرے سوا کوئی بھی کسی کو اپنا پرستار بنائے، اس لئے ہم بھی ان کو اپنا پرستار کیسے بنا سکتے تھے۔ میرے نزدیک لطیف ترین مطلب یہ ہے کہ مشرکوں کے معبود استفسار الٰہی کے جواب میں عرض کریں گے پروردگارا تو پاک ہے خود ہمارے لئے جائز نہ تھا کہ تیرے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بناتے یعنی جب یہ جائز نہ تھا کہ ہم اپنا کارساز دوسروں کو تسلیم کریں تو پھر دوسروں کے کارساز ہم کس طرح بن سکتے تھے اور کس طرح کارساز بنائے جانے پر راضی ہو سکتے تھے۔ پہلے دونوں قولوں پر اَوْلِیَآءَ کا ترجمہ پرستاران کرنا ہوگا اور تیسرے قول پر کارساز اور سرپرست۔

وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ یعنی مشرکوں کے معبود عرض کریں گے پروردگارا! ان کی گمراہی کا سبب یہ ہوا کہ تو نے ان پر اور ان کے آباؤ اجداد پر اتنے احسانات وانعامات کئے کہ وہ تجھے بھول گئے۔ خواہشات نفس کے بندے بن کر تیری توحید و عبادت کو چھوڑ بیٹھے۔ ماحصل مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تو ان کے ساتھ کوئی خاص احسان بھی نہیں کیا تھا تو نے اپنے انعامات سے ان کو سرفراز کیا تھا، مگر یہ ایسے کور باطن اور سیاہ دل تھے کہ بجائے تیرا احسان ماننے کے اور تیری عبادت کرنے کے ایسے لوگوں کی پرستش کرنے لگے جو نہ ان کے پروردگار تھے نہ مربی۔ تجھے فراموش کر دیا اور دوسروں کو یاد رکھا۔ درحقیقت یہ لوگ خراب ہی تھے ان میں کوئی بھلائی ہی نہ تھی ہلاک ہونے والے ہی تھے۔

فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۔ یعنی مشرکوں پر جب عذاب ہوگا تو وہ اپنی بے گناہی ظاہر کرنے کے لئے کہیں گے۔ پروردگارا ہم کو تو ان معبودوں نے گمراہ کیا تھا۔ یہ بہکانے والے تھے ہم بہک گئے اصل قصوروار ان کا ہے۔ اس پر مشرکوں کے معبودوں سے سوال کیا جائے گا۔ وہ اپنی بیزاری اور برأت کا اظہار کریں گے۔ اس وقت خداتعالیٰ بطور ملامت مشرکوں سے فرمائے گا تمہارے معبودوں نے تو تمہارے قول کی تکذیب کر دی اور صاف برأت کا اظہار کر دیا۔ آیات کا مطلب اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ خداتعالیٰ مشرکوں سے فرمائے گا تم جو ان کو اپنا کارساز اور دین و دنیا میں اپنا مددگار جانتے اور اپنا حامی کہتے تھے آج انہوں نے تمہارے اعتقاد و قول کی تکذیب کر دی، تم کو گمراہ بتلایا اور اپنی برأت ظاہر کر دی۔

فَمَا تَسْتَطِيعُونَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا۔ یہ خطاب مشرکوں کو ہے مطلب یہ ہے کہ اب عذاب خداوندی کو اپنے اوپر سے نہ تو تم خود دفع کر سکتے ہو نہ کوئی تمہاری مدد کر سکتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ الخ۔ رسول پاکؐ کی بازاروں میں آمد و رفت اور ضروریات معاش کی تکمیل کو کفار نبوت کے خلاف سمجھتے تھے۔ کھانا پینا بھی ان کی نظروں میں شانِ نبوت کے خلاف تھا۔ پھر افلاس و فقر کو بھی وہ مانع نبوت جانتے تھے۔ ان اعتراضات کو دفع کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے یہاں دو جواب دئے۔ ایک الزامی اور دوسرا برہانی۔ الزامی جواب تو یہ ہے کہ محمدؐ سے پہلے اور انبیاء و مرسلین بھی گزرے ہیں، لیکن لوازم بشریت سب میں موجود تھے، کھاتے پیتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے (اور کسی کے پاس غیبی خزانہ نہ تھا نہ فرشتہ ساتھ ساتھ منادی کرتا پھرتا تھا) جب قدرت کا یہی دستور العمل ہے اور فطرت اسی کو مقتضی ہے کہ لوازم انسانیت کی تکمیل نبوت سے مانع نہیں تو پھر محمدؐ کے اندر نئی بات پیدا ہونے کی تم کیوں خواستگاری کرتے ہو اور کس لئے ان کو فرشتہ دیکھنے کے طلبگار ہو۔

وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ۔ یہ برہانی جواب ہے۔ محمد بن اسحاق نے آیت مذکورہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو اپنے انبیاء کو مالدار بنا دیتا، مگر اس کا منشا یہی ہے کہ بندوں کی آزمائش کرے اور انبیاء کی تصدیق و تکذیب کو معیار امتحان قرار دے۔ صحیح مسلم میں بروایت عیاض بن حمار مرفوع حدیث موجود ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِنِّی مُبْتَلِیْكَ وَمُبْتَلٍ بِكَ یعنی اے محمد میں تمہاری آزمائش کرنے والا ہوں اور دوسروں کو تمہاری وجہ سے امتحان میں ڈالنے والا ہوں یعنی تمہارے ثابت قدم رہنے اور صبر کرنے کی آزمائش مقصود ہے اور تمہارے ذریعہ سے عام لوگوں کی آزمائش بھی غرض ہے کہ کون تم پر ایمان لاتا اور تمہاری ہدایت پر عمل کرتا ہے اور کون تمہاری تکذیب کرتا اور تمہارے حکم سے سرتابی کرتا ہے۔

میرے نزدیک محمد بن اسحاق نے جو آزمائش کو ایک خاص صورت کے ساتھ مخصوص کر دیا وہ سیاق اور عموم آیات کے خلاف ہے بلکہ خطاب میں کوئی تخصیص نہیں۔ رسول اللہ بھی مخاطب ہیں اور عام مسلمان بھی مخاطب ہیں اور کافروں کی طرف بھی خطاب کا رخ ہے۔ ہر گروہ یا کہ ہر شخص کی آزمائش دوسرے کے مقابلہ کی صورت میں ہو رہی ہے۔ رسول اللہ صلعم نے باوجود تبلیغی طاقت رکھنے کے کفار کے ہاتھوں سخت مصائب برداشت کیں۔ ابوجہل ایسے کافر ہر وقت مقابلہ پر ڈٹے رہے۔ انجام میں اگرچہ کافروں کو تباہی سے ہمکنار ہونا پڑا۔ مگر مقابلہ کے دوران میں کبھی ان کا پلہ غالب بھی رہا۔ پھر حضورؐ کو طرح طرح کی تکلیفیں بھی اٹھانی پڑیں۔ کسی نے شاعر کہا، کسی نے کاہن، کسی نے جادوگر بتایا، کسی نے جادو زدہ، کسی نے دیوانہ، کسی نے دنیوی عروج و جاہ کا طالب اور حضورؐ نے سب کے بیہودہ کلام پر صبر کیا اور اپنی شان میں گستاخی کرنے کی سزا کا کبھی خیال نہ کیا۔ نہ باقتضائے بشری جوشِ نفسانی پیدا ہوا۔ پھر فقر و فاقہ مجبوری اور بے کسی سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ تمام عمر افلاس سے گزاری یہ سب حضورؐ کا امتحان تھا ادھر کافروں کی آزمائش بھی مقصود تھی۔ ہو سکتا تھا کہ کافروں کے دماغوں کو پلٹ دیا جاتا اور وہ سب کے سب ایک آن میں اسلام کے حلقہ بگوش ہو جاتے یا ایسے اسباب پیدا کر دئے جاتے جن سے ان کے شبہات زائل ہو جاتے بلکہ پیدا ہی نہ ہوتے، مگر اس طور پر ان کی آزمائش نہ ہوتی اور اختیار کی قوت سلب ہو جاتی پھر مسلمانوں میں ہمیشہ ہر حیثیت و کیفیت کے اعتبار سے تفاوت قائم رکھا اور اس تفاوت کو معیار امتحان قرار دیا۔ امیر اور فقیر بادشاہ اور غلام، حاکم و محکوم، تندرست اور بیمار، عالم اور جاہل غرض ہر فرقہ کی آزمائش دوسرے فرقہ کے مقابل پر کی۔ فقیر شکایت کرتا ہے کہ میں تونگر کی طرح کیوں نہ ہوا، دولتمندوں سے حسد کرتا ہے اور ناداری کے سبب اپنے اندر قسم قسم کی بد اخلاقیاں پیدا کرتا ہے، مگر اس کو حکم ہے کہ فقر پر صبر کرے شکایت نہ کرے، دولتمندوں سے حسد نہ کرے اور بد اعمالیوں کا مجرم نہ ہو ادھر دولت مند طبقہ جو فقیروں کو حقیر و ذلیل سمجھتا ہے، ان سے تکبر و غرور کا برتاؤ کرتا ہے اور مفلسوں کو جانوروں کی طرح سمجھتا ہے۔ اس طبقہ کو حکم ہے کہ اپنے زیر دستوں کو ذلیل نہ سمجھے ان سے خوش خلقی اور مساوات کا برتاؤ کرے۔ جہاں تک ہو سکے مالی ہمدردی کرے اور خدا داد دولت میں فقیروں کو حصہ دار بنائے۔ اسی طرح مریض اپنی بیماری کا شکوہ کرتا اور حاسد و جو بند لوگوں پر حسد کرتا ہے اور طاقت ور تندرست آدمی بیماروں سے کراہت و نفرت کرتا، ان کے قرب سے پرہیز کرتا اور ان کی خدمت کو اپنے لئے باعث عار جانتا ہے، لیکن اول گروہ کو حکم ہے کہ بیماری کا شکوہ زبان پر نہ لائے اور تندرستوں سے حسد نہ کرے۔ مؤخر الذکر طبقہ کو حکم ہے کہ بیمار سے نفرت و کراہت نہ کرے، جہاں تک ہو سکے اس کی خدمت کرے، اپنی تندرستی کا شکریہ ادا کرے اور کمزور کا طاقت ور پر جو حق ہوتا ہے اس کو ادا کرے۔ غرض ہر گروہ کا امتحان اس کے مخالف گروہ کے مقابلہ سے ہو رہا ہے۔ ثعلبی نے بروایت ابو درداءؓ بیان کیا ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا کہ عالم کی بربادی جاہل سے اور جاہل کی بربادی عالم سے ہے، بادشاہ کی بربادی رعیت سے ہے، مالک کی بربادی مملوک سے اور مملوک کی بربادی مالک سے ہے، قوی کی تباہی کمزور سے اور کمزور کی تباہی قوی سے ہے۔ غرض تم میں سے بعض بعض کے آزمائش ہیں۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ہر طبقہ کے حقوق ہیں جو کیفیت زندگی کے اعتبار سے اس کی ضد ہے۔ اگر اس کے حقوق ادا کرتا ہے گا تو تباہی سے بچا رہے گا۔ حق تلفی کرے گا تو خود دنیوی و اخروی تباہی سے ہمکنار ہوگا۔

آیت کا حاصل مطلب یہ نکلا کہ انسانوں میں سے ہر گروہ دوسرے گروہ کے لئے سبب آزمائش ہے۔ کفار کی درخواست کے مطابق رسول کو دولتمند اور خزانۂ غیب کا حامل بنا دیا

دشوار نہ تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ فرشتہ ہر وقت تصدیق رسول کے لئے ان کے ساتھ رہتا۔ غرض ہر فرمائش کو پورا کرنا ممکن تھا مگر امتحان انسانی جو اصل مقصد تھا فوت ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ کفار کی درخواست پوری نہیں کی جا سکتی۔ بس اے مسلمانو! تم کو کفار کی ایذا رسانی اور تکالیف دہی اور اپنے فقر و فاقہ پر صبر کرنا چاہیئے۔ کافروں کی طرح معیار فضیلت دنیوی شان و شکوہ کو نہ قرار دو۔ تمہاری حالت سے خدا بخوبی واقف ہے، وہ کافروں کو بھی دیکھ رہا ہے، اس کا ہر کام مصلحت کے موافق ہوتا ہے۔

مقاتل کے بعض اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ کا نزول ابو جہل، ولید بن عقبہ اور نضر بن حارث وغیرہم کے حق میں ہوا۔ مذکورہ کفار نے جب دیکھا کہ ابوذر، ابن مسعود، عمار بن یاسر، بلال حبشی، صہیب رومی اور عامر بن فہیرہ جیسے کمزور اور نادار لوگ مسلمان ہو گئے تو کہنے لگے اگر یہ اسلام اچھا ہوتا تو یہ لوگ ہم سے پیش قدمی نہ کر سکتے۔ اب اگر ہم اسلام لاتے ہیں تو کمتر سمجھے جاتے ہیں۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

مقصود بیان قیامت کے دن وہ تمام معبودان باطل جن کی پرستش کفار کرتے ہیں اظہار برأت کریں گے اور کوئی مدد نہ کرے گا۔ اس سے عبرت حاصل کرنی چاہئے اُس کوتاہ فہم مسلم طبقہ کو جس نے انبیاء، فقہاء و مشائخ اور اولیاء و فقراء کو ربوبیت و الوہیت کا درجہ علاوہ دے رکھا ہے، ان سے طرح طرح کی دعائیں مانگتے اور ان کو اپنے کارساز و حاجت روا جانتے ہیں۔ اس بے وقوف گروہ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کو اپنی امید میں کبھی کامیابی نہیں ہوگی۔ قیامت کے دن اولیاء و صلحاء اس سے بیزاری ظاہر کریں گے۔ غیر اللہ کی پرستش پر کوئی نیک بندہ راضی نہیں ہو سکتا۔ ولٰکن مَّتَّعْتَهُمْ کا لفظ بتا رہا ہے کہ دنیا کا عیش و آرام، مال و دولت اور عزت و جاہ وغیرہ یاد الٰہی سے غافل ہونے کے اسباب ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو ان مواقع کے باوجود ذکر الٰہی سے غافل نہیں رہتے۔ لوازم بشریت کی تکمیل اور ضروریات معاش کے حصول کی کوشش شان نبوت کے حصول کے خلاف نہیں۔ دنیا دار امتحان ہے۔ ہر شخص دوسرے کے لئے سبب آزمائش ہے۔ مسلمان پر لازم ہے کہ صبر، استقامت اور ہمت سے کام لے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بَیَانُ السُّبحَانُ

کا

پارہ نمبر ۱۹

وَقَالَ الَّذِيْنَ

فاضلِ اجل حضرت مولانا سیّد عبد الدّائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں سنہ ۱۳۵۶ھ سے بہ اقساط ہر ماہ شائع ہو رہی ہے

ناظرین مولوی کے اصرار پر

عطاء الرحمٰن صدیقی مالک وسیم بک ڈپو دیوبند

نے برائے اشاعت معارف القرآن

محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند یو۔ پی سے شائع کیا

انیسواں ۱۹ پارہ

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَاۗءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ نَرٰي رَبَّنَا ۭ لَقَدِ

اور کہا ان لوگوں نے جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے کیوں نہیں نازل کئے گئے اور کیوں ہم کو ہمارا رب دکھائی نہیں دیتا

اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ۝ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰۗىِٕكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَىِٕذٍ

بیشک انھوں نے اپنے آپکو اپنے دلوں میں بہت بڑا سمجھا اور بڑی سخت سرکشی کی جس روز وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس روز گنہگاروں کو خوش خبری

لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَاۗءً

نہ ہوگی اور کہیں گے پناہ پناہ اور جو کچھ کام انھوں نے دنیا میں کیا ہے ہم اس کی طرف متوجہ ہونگے اور اس کو ذرات

مَّنْثُوْرًا ۝ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَىِٕذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ۝ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاۗءُ

پریشان بنا دیں گے اس روز اہل جنت باعتبار قیام گاہ کے بہتر اور باعتبار آرام گاہ کے اچھے ہوں گے جس دن کہ آسمان بادل پر سے پھٹ

بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰۗىِٕكَةُ تَنْزِيْلًا ۝ اَلْمُلْكُ يَوْمَىِٕذِۨ الْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۭ وَكَانَ يَوْمًا عَلَي الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ۝

جائے گا اور بکثرت فرشتے اتارے جائیں گے حقیقی حکومت اُس روز رحمٰن کی ہوگی اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا

تفسیر بدکاری اور بدعقیدہ انسان کی بدی کا آغاز ایک سیاہ نقطہ سے ہوتا ہے جو اس کے دل پر پڑتا ہے پھر رفتہ رفتہ یہ سیاہ نقطہ بڑھ کر پورے دل کو سیاہ کر دیتا ہے بشروع میں روح و دماغ پر قدرے میل اور زنگ ہوتا ہے۔ بدکرداری کے استمرار سے ساری روح اور پورا دل زنگ آلود ہو جاتا ہے بدی کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ آدمی چھپ کر تنہائی کے گوشہ میں کوئی گناہ کرتا ہے اور انتہا یہ ہوتی ہے کہ علی الاعلان سر بازار بغیر کسی جھجک شرم کے بڑے سے بڑا گناہ اور بدترین فسق و فجور کرنے لگتا ہے۔ جس طرح بدکرداریوں کے درجات ہیں ٹھیک اسی طرح کفر کے بھی مراتب ہیں ابتدائی کفر بس اتنا ہوتا ہے کہ آدمی نبوت یا قیامت وغیرہ سے انکار کرتا ہے مگر انکار کی وجہ کوئی غرض نفسانی نہیں ہوتی بلکہ طلب حق کے باوجود سادہ لوحی کے سبب نبوت پہ اس کا کامل یقین نہیں ہوتا پھر اس سادہ کفر میں ترقی ہوتے ہوتے اس حد تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ رسول اور قیامت اور خدا کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ نبی کا دشمن بن جاتا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر انتہائی کفر و عناد کا اس طرح مظاہرہ کرتا ہے کہ اپنے آپ کو رسول کا ہم پلہ بلکہ خدا کے برابر سمجھنے لگتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ یہ جاہل فقیر اس قابل کب تھا کہ اس کے پاس فرشتے آتے۔ فرشتوں کو تو ہمارے پاس آنا چاہئے تھا ہم صورت، وجاہت، حُسن، طاقت، دولت، ثروت اور عزت و وقار میں اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔ بعض گستاخ اس سے بھی اونچا اڑنا چاہتے ہیں وہ کہتے ہیں ہم ایسے سامنے خدا آئے گا تو مانیں گے اور جب تک خدا کو نہ دیکھیں نہ مانیں گے۔ فرشتے اور فرشتوں کا نزول کیسا ہم براہ راست خدا سے گفتگو کریں گے اسی قسم کے مختلف المراتب کافر رسول اللہ کے زمانے میں بھی تھے۔ بعض لوگ سادہ لوحی کے سبب رسالت کے منکر تھے۔ بعض مخالفت کی حد تک پہنچ گئے تھے۔ بعض مخالفت سے آگے بڑھ کر عناد کے علمبردار تھے۔ بعض اس قدر گستاخ ہوگئے تھے کہ رسول پاک کا مذاق اڑاتے تھے۔ آخری درجے کے ملعون (جن کا ذکر آیات میں ہے) ایسے بھی

تھے جو انتہائی غرور و رعونت کی وجہ سے کہتے تھے کہ فرشتوں کا نزول ہم پر کیوں نہیں ہوتا ہم میں کیا کمی ہے اور محمد کو ہم پر کیا فوقیت ہے۔ بعض اس سے بھی پرلے درجے کے بے دین تھے جو کھلم کھلا خدا کو دیکھنا چاہتے تھے اور رُو در رُو خدا سے تصدیق کے طالب تھے۔

تحلیل اجزاء

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ یعنی جن کو خدا سے ملنے کا یقین تو درکنار امید بھی نہیں وہ کہتے ہیں کہ فرشتے ہم پر کیوں نازل نہیں ہوتے اس صورت میں رجا کے معنی امید ہوں گے۔ بعض مفسرین نے رجاء کے معنی اس جگہ خوف کے لکھے ہیں یعنی جن لوگوں کو خدا سے ملنے کا ڈر نہیں۔ مطلب یہ کہ چونکہ روزِ قیامت پر ان کا ایمان نہیں اس لئے خدا کے پاس جانے سے بے خوف ہیں۔

لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ کفار کہتے تھے کہ فرشتے ہمارے پاس کیوں نہیں اُترتے۔ یا تو وہ نزولِ ملائکہ کے خواستگار اس لئے تھے کہ فرشتے اُتر کر رسول اللہ کی تصدیق کریں اور براہِ راست ان کے پاس وحی آئے کہ یہ رسول سچا ہے تم اس کی پیروی کرو۔ یا وہ رسول کو درخورِ اعتناء نہ سمجھتے تھے۔ اپنے کو رسول سے افضل، اعلیٰ اور اشرف جانتے تھے۔ اس لئے کہتے تھے کہ اس فقیر حقیر انسان پر تو فرشتے نازل ہوں اور ہم پر نہ ہوں اس کی کیا وجہ۔

اَوْ نَرٰى رَبَّنَا۔ کفار کا دائرۂ رعونت اس سے بھی زیادہ وسیع تھا وہ رسول سے بھی بڑھ کر اپنے کو سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ دنیا میں خدا کو ان مادی آنکھوں سے دیکھنے کا مستحق اپنے کو جانتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم خود اپنے رب کو دیکھ لیتے اور وہ براہِ راست ہم کو حکم دیدیتا یا رسول اللہ کی تصدیق کر دیتا تو ہم مان لیتے ایسے تو نہ مانیں گے۔ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے انہوں نے اپنے کو بہت بڑا سمجھ رکھا ہے اور اپنی قدرت و استعداد سے آگے قدم اُٹھایا ہے۔ یعنی معجزاتِ قاہرہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا چاہئے تھا بجائے اس کے کہ سربسجود ہوتے انھوں نے سرکشی کی اور اتنی دیدہ دلیری سے کام لیا کہ ایسی درخواست کرنے لگے جس کو زبان پر لانے سے نفوسِ قدسیہ بھی تھراتے ہیں۔

يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ۔ ملائکہ کو دیکھنے کے دن سے مراد ابن عباسؓ کے نزدیک وقتِ موت اور دیگر مفسرین کے نزدیک روزِ قیامت ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ وقتِ موت ہو یا روزِ قیامت۔ بہرحال عذاب کے فرشتوں کو کفار ہیبت ناک شکل میں دیکھیں گے۔ حدیث میں آیا ہے کہ کافر کی سانس جب حلق میں آتی ہے تو فرشتے اس سے کہتے ہیں کہ اے نفسِ خبیث جسم سے نکل اور گرم لو کھولتے ہوئے پانی اور گرم لپٹ کی طرف چل۔ قیامت کے دن بھی عذاب کے فرشتے کافروں کو ہر طرف سے گھیرے ہوں گے اور مجرموں کو کوئی عافیت کی شکل نظر نہ آئے گی۔

وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا۔ حجرًا محجورًا کہنے والے قیامت کے دن فرشتے ہوں گے۔ مجاہد، حسن، عکرمہ، ضحاک، قتادہ، عطیہ، عوفی، عطاء، ابن کثیر وغیرہ کا یہی قول ہے۔ ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن فرشتے کفار سے کہیں گے آج تم پر خوشی حرام و ممنوع ہے آج کا دن تمہاری مصیبت و عذاب کا ہے۔ تم خوشی کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتے (ہکذا فسرہٗ ابو سعید الخدری وقد رواہ ابن ابی حاتم عنہ) ابن جریج کا قول ہے کہ مذکورہ بالا قول مشرکوں کا قول ہے۔ یعنی قیامت کے دن عذاب کے فرشتوں کی خوفناک ہیبت خیز شکلیں دیکھ کر مشرک کہیں گے کہ کاش ہم میں اور ان فرشتوں میں کوئی مضبوط آڑ ہو جاتی جو ہم کو ان سے پناہ مل جاتی۔ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا۔ اگر تخم خراب ہو تو پھل کتنے ہی خوبصورت اور خوشرنگ ہوں مگر کیف آور، لذیذ اور خوش ذائقہ نہیں ہوتے۔ کافروں کے عقائد غلط ہوتے ہیں۔ اللہ کے رسولؐ اور روزِ قیامت پر ان کا ایمان نہیں ہوتا اس لئے ان کا کوئی عمل اچھا نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ ظاہری صورت میں اچھا معلوم ہوتا ہو۔ قیامت کے دن جب خدا تعالیٰ بندوں کے اعمال کا حساب لے گا۔ دو میزانِ عدل پر سب کے اعمال کی جانچ کی جائے گی تو جن اعمال کو کفار نجات دہندہ سمجھتے تھے وہ بھی بیکار ثابت ہوں گے اور جس طرح سورج کی شعاعوں میں نمودار ہونے والے پریشان ذرات جمع نہیں کئے جا سکتے اسی طرح ان کا تمام کیا کرایا رائیگاں جائیگا (ہکذا روی عن علیؓ وابن عباسؓ ومجاہد وعکرمہ وسعید بن جبیر والسدی والضحاک والحسن البصری وغیرہم) حقیقت یہ ہے کہ اس جہانِ فانی میں زندگی نام ہے نسبت الی اللہ کا جس انسان کو اللہ سے نسبت حاصل ہے وہ زندہ ہے جو دوسروں کی طرف منسوب ہے وہ مردہ ہے۔ جو اعمال خدا کی طرف منسوب ہیں اور اسی کے نام پر کئے جاتے ہیں وہ مردہ اور خاک برباد ہیں جن کا کوئی نتیجہ نہیں۔

وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا۔ یعنی جنت بہترین قرارگاہ یا آرام گاہ ہے۔ یہاں ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اَحْسَنُ اسم تفضیل کا صیغہ ہے جس کا ترجمہ بہترین ہے اور بہترین کے مقابل بہتر ہوتا ہے۔ جنت کا بہترین ہونا یقیناً جہنم کے اعتبار سے ہے اس سے ثابت ہوا کہ جہنم میں بہتری ہے اگرچہ جہنم کی برابر نہیں۔ جہنم بہتر ہے اور جنت بہترین۔ اس شبہ کا ازالہ دو طرح سے کیا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ تفضیل دو طرح کی ہوتی ہے۔ نفسی اور اضافی۔ یہاں تفضیل نفسی ہے یعنی ایک چیز کی

مانوخوبی اعلیٰ پیمانہ پر بیان کرنا۔ تفضیل اضافی نہیں ہے۔ اور مقابل کا لحاظ تفضیل اضافی میں ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ یہ بہت ہی مالدار اور بہت ہی حسین ہے اس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ زید واقعی بڑا مالدار اور بہت حسین ہے کسی مقابل کا لحاظ نہیں۔ دوسرا یہ کہ زید بکر سے زیادہ مالدار اور حسین ہے۔ مؤخر الذکر صورت تفضیل اضافی ہے اور اول الذکر تفضیل نفسی کی اُس وقت مطلب یہ ہوگا کہ بہتری کے جتنے مراتب ہو سکتے ہیں ان سب سے جنت اعلیٰ و افضل ہے۔ اب دوزخ کا بہتر اور حسن ہونا لازم نہیں آتا۔ دوم یہ کہ تفضیل اضافی ہے۔ مگر جنت کی بہتری کا مقابلہ دوزخ سے نہیں بلکہ دنیا کے عیش و طرب اور آرام و راحت سے ہے۔ دنیا کے راحت و عیش میں بھی اگرچہ خوبی اور بہتری ہے مگر اس سے بہتر جنت کا آرام و سکون ہے۔

وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ۔ اس آیت کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے (۱) غمام سے نورانی سفید ابر مراد ہے۔ یہ معمولی ابر مراد نہیں۔ ملائکہ اور دیگر روحانیات کے انوار بہ صورتِ ابر سفید نمودار ہوں گے۔ قیامت کے دن آسمان پھٹ کر روحانیات اور ملائکہ بصورتِ ابر نیچے اتریں گے۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن جب تمام جن و انس اور چرند و پرند ایک میدان میں جمع ہوں گے تو پھر پہلا آسمان شق ہوگا اور اس کی کائنات نیچے اترے گی جو تمام جن و انس سے زائد ہوگی اور ان کو گھیر لے گی۔ پھر دوسرا آسمان شق ہوگا اور اس کی کائنات اترے گی اور تمام جن و انس اور پہلے آسمان کے ملائکہ کو گھیر لے گی۔ اسی طرح ساتوں آسمان شق ہوں گے۔ پھر ہمارا پروردگار غمام کے سائبان میں نازل ہوگا اور عرشِ الٰہی کے گرداگرد کروبی ہوں گے جن کی تسبیح و تقدیس اور تہلیل سے ایک گونج پیدا ہوگی۔ الخ

دوسرا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن آسمان پر کسی قسم کا ابر نہ ہوگا۔ ابر پھٹ جائے گا اور آسمان صاف برآمد ہوگا یعنی قیامت کے دن جب یہ موجودہ آسمان پھٹ جائے گا اور نیا آسمان پیدا ہوگا تو پہلے آسمان کے آثار میں سے کچھ دھواں اور بخارات موجود ہوں گے۔ لیکن جب ملائکہ اور روحانیات کے اُترنے کا وقت آئے گا تو وہ دھواں بھی صاف ہو جائے گا اور نیا آسمان نمودار ہوگا اور فرشتے نازل ہوں گے اس مطلب پر تشقق کے معنی انکشاف لینا ہوں گے۔

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ۔ ملک اور بادشاہت حقیقتاً تو دنیا میں بھی خدا ہی کی ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔ مگر یہاں ظاہری بادشاہ اور مجازی حکمران بھی ہیں قیامت کے دن ظاہری حکومت بھی کسی کی نہ ہوگی۔ دوسری آیت میں آیا ہے کہ خدا تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ہ جب کوئی جواب دینے والا نہ ہوگا تو خود ہی فرمائے گا۔ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ حدیثِ صحیح میں آیا ہے کہ اُس روز اللہ پاک آسمانوں کو اپنے دائیں ہاتھ میں اور زمینوں کو بائیں میں لپیٹ لے گا۔ پھر فرمائے گا میں سلطان ہوں میں ہی دیان ہوں۔ کہاں گئے زمین والے بادشاہ۔ کہاں گئے جبار، کہاں گئے متکبر؟

لِلرَّحْمٰنِ۔ یعنی قیامت کے دن حکومت کسی ظالم جابر کی نہ ہوگی بلکہ اُس خدا کی ہوگی جو اپنی مخلوق پر سب سے زیادہ مہربان اور شفیق ہے مگر اس کی رحمت قیامت کے دن صرف اہلِ ایمان پر ہوگی۔ کافروں کے لئے وہ دن دشوار ہوگا۔

مقصود بیان انبیاء کے علاوہ کسی کے پاس فرشتے نہیں آسکتے۔ اس قسم کی درخواست کرنا نہایت گستاخ لوگوں کا کام ہے۔ دنیا میں اللہ کا دیکھنا ممکن ہے۔ قابلیت و استعداد سے زیادہ درخواست کرنا رعونت کی علامت ہے۔ کافروں کو فرشتے دکھائی دیتے ہیں لیکن زندگی میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد اس سے استخراج کیا جاسکتا ہے اس امر کو کہ فرشتے نورانی اور روحانی مخلوق ہیں اور انسان مادی کثیف۔ اگر مادی کثافت کو عقائدِ صحیحہ اور اعمالِ صالحہ کے پانی سے صاف نہ کر لیا جائے تو نورانی مخلوق سے مناسبت نہیں رہتی بلکہ بے تعلقی ہو جاتی ہے۔ اس لئے ایسے سیاہ درون کو باطنی آدمی کو نورانی مخلوق نہیں دیکھ سکتی۔ کافروں کے اعمال قیامت کے دن رائیگاں جائیں گے۔ ان کی کوئی بھلائی بارآور اور نتیجہ خیز نہ ہوگی۔ قیامت کے دن زمین پر روحانیت کا نزول ہوگا اور ابر سفید کی شکل میں ہوگا۔ (واللہ اعلم)

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا يٰوَيْلَتٰى

اور جس دن کہ کافر اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا (اور) کہے گا کاش میں نے رسول کے ساتھ کوئی راہ لی ہوتی ہائے افسوس!

يَٰوَيْلَتَىٰ لَيْتَنِي لَمْ أَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا ۝ لَّقَدْ أَضَلَّنِي عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ إِذْ جَاءَنِي ۗ وَكَانَ الشَّيْطَٰنُ

کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا اُس نے مجھے اُس نصیحت پر عمل کرنے سے بہکا دیا جو میرے پاس آچکی تھی اور شیطان انسان کو

لِلْإِنسَٰنِ خَذُولًا ۝ وَقَالَ الرَّسُولُ يَٰرَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْءَانَ مَهْجُورًا ۝ وَكَذَٰلِكَ

وقت پر دغا دینے والا ہے رسول نے کہا میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو ناقابل التفات بنا لیا ہم نے اسی طرح

جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِينَ ۗ وَكَفَىٰ بِرَبِّكَ هَادِيًا وَنَصِيرًا ۝

ہر نبی کے دشمن مجرموں میں سے بنائے اور تمہارا رب ہدایت دینے اور مدد دینے کو کافی ہے

تفسیر دنیا کا فطری قاعدہ ہے کہ جس شخص کی طبعی مناسبت اور مزاجی افتاد کسی کے مطابق ہوتی ہے وہ اسی سے دوستی کرتا ہے کیونکہ ادنیٰ محرک سے طبیعت برسرِ کار آجاتی ہے اور تالّف قلبی ظاہر ہو جاتا ہے اور اگر طبعی مناسبت نہ ہو تو دوستی کسی طرح پیدا نہیں ہوتی۔ اخلاق، عادات اور اطوار کی یکسانیت اور قلبی میلان دوستی پیدا کرنے کے ضروری اسباب ہیں۔ اہلِ فلسفہ قائل ہیں کہ کچھ لوگ طبعًا شریر ہیں اور کچھ سرشتی نیک ہیں اور کچھ فطرۃً اور خلقۃً سادہ ہیں۔ جو شریر ہیں اُن کا میلان شریروں کی طرف ہوتا ہے کوئی مناسبت نیکوں سے نہیں ہوتی۔ نشست و برخاست، سکون و حرکت، خواب و بیداری، رفتار و گفتار غرض ہر عمل اور عقیدہ میں وہ نیکیوں کے مخالف اور بدوں کے موافق ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو کوئی راہِ راست پر نہیں لا سکتا اور کسی قسم کی نصیحت و ہدایت سودمند نہیں ہوتی کیونکہ اُن کے طبعی اقتضاء سے کوئی ان کو روک نہیں سکتا۔ اگر خارجی دباؤ یا مالی لالچ یا کسی خوف کے سبب یہ نیکوں کے موافق ہو بھی جاتے ہیں تو محض اوپرے دل سے۔ ان کے دل کی گہرائیوں میں بدستور خبث و گندگی بھری ہوتی ہے جو ادنیٰ محرک سے اوپر کو نکل آتی ہے۔ اسی سرشتی عادت کو حدیث میں ناقابلِ زوال قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے مگر (یہ سرشتی) عادت بدل نہیں سکتی۔

جو لوگ بالطبع نیک ہیں اُن کی دوستی نیکوں سے ہوتی ہے کسی قسم کا اغواء اُن کو راہِ راست سے بھٹکا نہیں سکتا۔ بدترین صحبت ان پر اپنا زہریلا اثر نہیں ڈال سکتی۔ بدمعاشوں کی فساد انگیزیاں ان کو بہکا نہیں سکتیں۔ کوئی لالچ و خوف ان کو طریقِ راستی سے بھٹکا نہیں سکتا۔ اگر کسی خارجی وجہ سے عارضی طور پر ان کا میلان خاطر بدی کی طرف نظر آتا بھی ہے تب بھی ادنیٰ تنبیہ سے وہ بیدار ہو جاتے ہیں اور اپنی غلط روی کا احساس کر کے لوٹ پڑتے ہیں اور اپنے فطری اقتضاء کو پورا کرتے ہیں۔ یہی طبقہ صحیح مہتدی اور برحق ہادی ہوتا ہے۔

تیسرا گروہ فطرۃً سادہ لوح ہوتا ہے۔ اس پر ہر نیکی و بدی کا اثر پڑتا ہے اس کا طبعی میلان ماحول کے طابع ہوتا ہے۔ اغواء و ہدایت دونوں سے وہ اثر پذیر ہوتا ہے یہ تصریحات تو فلاسفروں کی ہیں لیکن حضور اقدسؐ نے صحیح حدیث میں صراحت فرما دی ہے کہ سب لوگ سرشت کے لحاظ سے نیک اور صالح ہوتے ہیں سب کی فطرت صحیح ہوتی ہے لیکن والدین کی تربیت اور ماحول اُن کو کبھی بگاڑ دیتا ہے۔ اس حدیث کی صراحت سے ہم کلام حکماء کو اس طرح مطابق کر سکتے ہیں کہ جس چیز کو فلاسفروں نے سرشت خلقت اور فطرت سے تعبیر کیا ہے وہ درحقیقت فطرت نہیں ہوتی بلکہ طبیعتِ ثانیہ ہوتی ہے جس کی پیدائش کے موجب والدین ہوتے ہیں۔ حضورؐ نے جس چیز کو فطرت فرمایا ہے وہ طبیعتِ انسانی کا بالکل ابتدائی درجہ ہے۔ بہرحال طبیعتِ ثانیہ کہا جائے یا اس کو فطرت و سرشت کے الفاظ سے تعبیر کیا جائے اس کے تین درجات ہوتے ہیں، شر، خیر اور سادہ ہر زمانے میں تینوں اقسام کے آدمی موجود رہتے ہیں۔ حضورؐ کے زمانہ میں بھی موجود تھے جو سرشت کے لحاظ سے نیک تھے وہ ادنیٰ نصیحت پر مومن اور نیکوکار بن گئے جو سادہ لوح تھے ان کو زیادہ نصیحت کرنے کی ضرورت پڑی۔ ہر طرح سے تبلیغ اسلام کی گئی۔ دوسری طرف شریروں نے اُن کو روکا۔ غرض جو کشاکش غالب آئی ویسے ہی ان کی حالت ہو گئی۔ کوئی کافر رہا کوئی مسلمان ہو گیا۔ البتہ جو لوگ شریر تھے ان میں سے بعض پر تو کسی نصیحت لالچ اور خوف نے کوئی اثر نہ کیا اور وہ فنائی السقر ہو گئے اور بعض پر مالی لالچ یا خوف یا ظاہرداری کو ملانے کے جذبے نے اپنا کام کیا اور وہ بظاہر حضورؐ کے دوست بن گئے اور دکھلانے کے لئے مسلمان بھی ہو گئے مگر اندرونی دوامی جذباتِ شر ان کے مردہ نہ ہوئے اس لئے وہ موقع پا کر پھر

اپنے ہم مذاق لوگوں میں جا ملے اور رسول اللہؐ کا دامن چھوڑ کے شیاطین کی دوستی کی طرف انھوں نے ہاتھ بڑھا لئے۔ ایسے ہی لوگوں کو آیتِ مذکورہ میں ظالم کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور ہر نبی کا عدو بھی انہی کو قرار دیا ہے۔

تحلیلِ اجزاء

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ۔ خطیب نے بروایت ابن عباسؓ لکھا ہے کہ آیتِ مذکورہ میں ظالم سے مراد عقبہ بن ابی معیط بن امیہ بن عبد شمس ہے۔ عقبہ کا قاعدہ تھا کہ جب سفر سے واپس آتا تو سردارانِ قوم اور اہلِ محلہ کی دعوت کرتا اور سب کو کھانا کھلاتا۔ عقبہ حضورؐ کی خدمت میں بھی بیٹھتا تھا اور آپ کی شیریں کلامی اس کو اچھی معلوم ہوتی تھی۔ ایک بار جب اس نے حسبِ معمول لوگوں کی دعوت کی تو حضورؐ کو بھی بلایا۔ حضورؐ دعوت میں تشریف لے گئے لیکن کھانا سامنے آیا تو کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا جب تک تو مسلمان نہ ہو جائے گا میں تیرا کھانا نہیں کھا سکتا۔ عقبہ نے کلمہ پڑھ لیا اور حضورؐ نے کھانا تناول فرمایا۔ عقبہ کا ایک دوست تھا جس کا نام ابی بن خلف تھا دونوں میں بڑی گاڑھی دوستی تھی۔ ابی بن خلف کو جب عقبہ کے مسلمان ہونے کی خبر معلوم ہوئی اس نے آکر ملامت کی اور کہا اب مجھ سے تمہارا رشتۂ دوستی منقطع ہو گیا تم بے دین ہو گئے۔ اپنے اسلاف کے دین سے پھر گئے۔ عقبہ نے کہا میں بے دین نہیں ہوا۔ نہ اسلاف کے مذہب سے پھرا ہوں۔ بات صرف اتنی تھی کہ محمدؐ میرے گھر آئے تھے مگر انھوں نے کھانے سے انکار کر دیا مجھے شرم آئی کہ ایک شخص میری دعوت میں آکر بغیر کھانا کھائے چلا جائے اس لئے ظاہری طور پر میں نے کلمہ پڑھ لیا ورنہ میں نے اپنا مذہب نہیں چھوڑا۔ ابی بن خلف بولا ایسے تو تمہاری رضامندی نہیں ہو سکتی اگر تم اس کے منہ پر تھوک دو اور اس کی گردن دبا دو اور منہ پر پتھر مار دو تو دوستی برقرار رہ سکتی ہے عقبہ نے اقرار کر لیا۔ دونوں باہر آئے تو دار الندوہ میں حضورؐ کو بحالتِ سجدہ پایا۔ عقبہ نے حسبِ مشورہ ناشائستہ حرکت کی۔ حضورؐ نے فرمایا جس وقت مکہ سے باہر تیرا سامنا ہو گا اس وقت تلوار تیرے سر پر چلاؤں گا۔ چنانچہ بدر کی لڑائی میں عقبہ کو گرفتار کر کے لایا گیا۔ حضورؐ نے حضرت علی کو حکم دیا اس کو قتل کر دو۔ حضرت علیؓ نے اس کو جہنم رسید کر دیا بعض روایات میں آیا ہے کہ عاصم بن ثابت بن افلح انصاری نے عقبہ کو قتل کیا۔ رہا ابی بن خلف تو جنگِ احد میں حضورؐ کے دستِ حق پرست سے اس کے خفیف سا چرکا تلوار کا لگ گیا جس کی تکلیف سے چلاتا تھا۔ آخر رابغ میں پہنچ کر مر گیا۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ سببِ نزول عقبہ ہو یا کوئی اور شقی آیت کا حکم ہر ظالم کافر کے لئے عام ہے۔ قیامت کے دن ہر ظالم کافر نادم ہو گا کہ اس نے رسول اللہ کا راستہ چھوڑ کر کافروں اور گمراہ کرنے والوں کو دوست کیوں بنایا۔ آیت میں لفظ فُلَانًا سے مراد اگرچہ بر تقدیر تخصیص مورد امیہ بن خلف یا اس کا بھائی ابی بن خلف ہے۔ مگر ہر کافر اپنے دوست کافر کے اتباع پر قیامت کے دن پشیمان ہو گا اس لئے فُلَانًا سے کافروں کے عام دوست بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

عَنِ الذِّكْرِ۔ ذکر سے مراد عام نصیحت ہے۔ ابن کثیر کے نزدیک قرآن مراد ہے۔

وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا۔ یعنی شیطان انسان کو وقت پر دغا دینے والا ہے۔ خطیب کے نزدیک شیطان سے مراد وہی خلیل ہے جس کا ذکر اوپر کی آیت میں کیا ہے۔ خطیب نے صراحت کی ہے کہ شیطان ہر شخص کا جدا ہوتا ہے۔ جو کسی کو بہکائے وہ اس کا شیطان ہے۔ انسان ہو یا جن۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت کا حکم ان لوگوں کو شامل ہے جو کسی گناہ پر متفق ہو کر باہم دوست بنے ہوں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے حضورؐ والا نے ارشاد فرمایا نیک دوست اور بد دوست کی مثال ایسی ہے جیسے مشک بیچنے والا اور لوہار کی بھٹی دھونکنے والا۔ مشک بیچنے والا تم کو وہی دے گا جو اس کے پاس ہے اور کچھ نہ سہی تو خوشبو تو ضرور ہی لے گی اور بھٹی جھونکنے والا تمہارے کپڑے جلا دے گا اور کچھ نہ سہی تو اس کی بدبو تو تم کو ضرور ہی پہنچے گی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا آدمی اپنے دلی دوست کے دین پر ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر شخص پر یہ دیکھ لینا لازم ہے کہ وہ کس کو اپنا قلبی دوست بنا رہا ہے (رواہ ابو داؤد والترمذی)

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ۔ رسول سے مراد محمد ہیں (ابن کثیر) جس وقت حضورؐ اقدس بر سرِ عام قرآن کی تلاوت فرماتے تو شیطان کافر خوب شور و غل مچاتے تاکہ کسی کو پڑی آواز سنائی نہ دے اور بیہودہ ادھر ادھر کی آوازیں لگاتے تاکہ کلام پاک کانوں میں نہ پڑے۔ حضورؐ اقدس رحمۃٌ للعالمین تھے آپ نے ایسے ملعون کافروں کے لئے بھی بارگاہِ الٰہی میں بد دعا نہ فرمائی مگر ایک روز جنابِ الٰہی سے راز دارانہ شکوہ ضرور کیا جس کا بیان اس آیت میں خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔ مہجور کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ قوم نے قرآن کو ترک کر دیا۔ اس پر عمل نہ کیا اور اس کے اوامر و نواہی کو نہ مانا۔ دوسرا معنی یہ کہ میری قوم نے قرآن کو لغو اور بیہودہ سمجھ رکھا تھا کبھی اس کو سحر کہتے تھے کبھی پارینہ داستان وغیرہ۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ۔ اس کلام میں رسول پاکؐ کو تسلی دی ہے کہ قوم کی دشمنی اور سرتابی فقط تمہارے ہی لئے نہیں ہے بلکہ تم سے پہلے بھی ہر نبی کا

کوئی نہ کوئی بے دین کافر دشمن ضرور رہا ہے اس لئے تم قوم کی دشمنی پہ صبر رکھو جس طرح دوسرے انبیاء نے صبر کیا۔

مقصودِ بیان

آدمی اپنے دوست کے بہکاوے میں آجاتا ہے اس لئے گمراہ سے دوستی کرنی زیبا نہیں۔ رسولِ پاک نے خدا تعالیٰ کی جناب میں اپنی قوم کا شکوہ ضرور کیا تھا اگرچہ بددعا نہیں فرمائی۔ لفظ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا سے خلیب نے استنباط کیا ہے کہ خیر و شر اور ایمان و کفر دونوں کا خالق خدا ہے کیونکہ اللہ ہی نے کافروں کو انبیاء کا دشمن بنایا اور چونکہ انبیاء سے عداوت و دشمنی کفر ہے تو گویا خدا نے کفر کو پیدا کیا۔ هَادِيًا اور نَصِيرًا سے یہ بتانا مقصود ہے کہ خدا ہی ہدایت کرنے والا ہے اور وہی اہلِ ایمان کا مددگار ہے۔ کافروں پر غلبہ عطا فرماتا ہے وغیرہ۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ

کافر کہتے ہیں کہ اس پر سارا قرآن ایک دم کیوں نہیں نازل کیا گیا (اے محمد) اس لئے ہوا کہ اس کے ذریعے سے ہم تمہارے دل کو مضبوط

وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۝ اَلَّذِيْنَ

کردیں یہی وجہ ہے کہ اسکو ٹھہر ٹھہر کر ہم نے پڑھ سنایا یہ لوگ تمہارے سامنے جو کچھ اعتراض کرتے ہیں ہم تمہارے پاس واقعی جواب اور اس سے بہتر کھول کر پہنچا دیتے ہیں (ع)

يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝

جن لوگوں کو منہ کے بل جہنم میں لے جایا جائے گا وہی لوگ بہ اعتبار جگہ کے بدترین اور گم کردہ راہ ہوں گے

ع ۳ ۱۴

تفسیر

تعلیم کا کمال یہ ہے کہ متعلم پر بار نہ ہو اور رفتہ رفتہ اس کی جہالت دور ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرینِ تعلیم بچوں کے لئے غیر محسوس طور پر علمی ترقی کے اسباب فراہم کرتے ہیں اور ایسی تدریجی تعلیم دیتے ہیں کہ بچوں کی دلچسپی باقی رہے اور شوق میں اضافہ ہوتا رہے اور ساتھ ہی ساتھ علم میں بھی ترقی ہو۔ اللہ کے پیغمبروں کا بھی یہی دستور العمل تھا۔ حکمائے شریعتِ الٰہیہ نے بھی اپنی قوموں کو آہستہ آہستہ سُدھارنے کی کوشش کی اور تدریجی وحی کے ذریعہ اُن کے احوال و اعمال کی اصلاح کی لیکن بعض خاص حالات میں قوم کی انتہائی سرکشی کے پیشِ نظر بعض آسمانی کتابیں یکدم بھی نازل ہو گئیں اور چونکہ لوگوں پر یکدم پوری کتاب کو ماننا اور اس پر بتمامہ عمل کرنا شاق گزرا اس لئے انھوں نے کتاب الٰہی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بنی اسرائیل کے توریت سے سرتابی کرنے کی یہی وجہ تھی جس زمانے میں رسولِ پاک مبعوث ہوئے وہ گمراہی اور تاریکی کا دور تھا۔ روئے زمین پر خدا کو حقیقی طور پر واحد جاننے والا بالکل نہ تھا اور اگر کوئی تھا بھی تو وہ کہیں گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا تھا۔ مشرق سے مغرب تک کفر و شرک اور بداعمالیوں میں لوگ مبتلا تھے۔ بدکاریوں کے اتنے خوگر ہو گئے تھے کہ بُرائی ان کی نظر میں بُرائی نہ رہی تھی بلکہ قابلِ فخر چیز بن گئی تھی۔ خرابی اور بدی کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ وہ استحسان اور خوبی کا جامہ پہن لیتی ہے۔ ایسا ہی حضورؐ کے زمانے میں عوام و خواص کا حال تھا اور یہ رفتار ایک دو سال کی نہ تھی بلکہ قرنہا قرن سے اسی اخلاقی بربادی اور وجدانی تباہی کی حکومت تھی۔ ظالم قانونی شکل میں نمودار ہو کر اہلِ انصاف کا لاکھ کار بن گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت اور ایسے ماحول میں یکدم انقلاب سود مند ہونے کی بجائے مضرت رساں ہوتا۔ کیونکہ خوگرانِ جور کو دفعتہً کار بند کرنا سہل کام نہ تھا۔ نظریات اور مُسلّمات کو بیک وقت بدل دینا ناممکن نہیں تو دشوار ترین ضرور تھا۔ اسلام ایک انقلابی تحریک ضرور تھی مگر مصلحانہ اور حکیمانہ رنگ میں مسلمات و اصولِ زندگی کو بدلنا قرینِ عقل تھا۔ یہی سبب تھا کہ قرآن یکدم نازل نہ کیا گیا بلکہ رفتہ رفتہ احکام اُتارے گئے۔ کلیات و اصول کو تدریجاً بدلا گیا۔ مسلمہ خوبیوں کی خرابی پر آہستہ آہستہ تنبیہ کی گئی اور انصاف نما جور کی بیخ کنی سب ترین صورت سے کرنی مناسب سمجھی گئی۔ مگر کوتاہ اندیش اور کوتاہ فہم اور کوتاہ بصیرت لوگوں کو یہ حقائق یہ فوائد اور یہ رموز و اسرار کس طرح سمجھ میں آسکتے تھے وہ لگے اُلٹا اعتراض کرنے کہ قرآن بتمامہ یکدم کیوں نہ اُتارا گیا۔ یہ شاعرانہ تصنیف کیسی کہ آج ایک غزل کہہ دی کل قصیدہ تصنیف کر دیا۔ پرسوں کوئی مثنوی تصنیف کر دی۔ معلوم ہوتا ہے یہ خدا کا کلام نہیں بلکہ دماغی زائیدہ اور فکری تراشیدہ ہے ورنہ یکدم نازل نہ ہونے کی کیا وجہ۔ خدا کے ان احمق بندوں کو کیا معلوم تھا کہ خدا

علام الغیوب اور واقف اسرار کا کام ہے۔ تدریجی نازل کرنے میں اس کے کیا رموز ہیں۔ انہی رموز کو آیات مذکورہ میں اجمالاً بیان فرمایا ہے اور کفار کو ان کی حماقت پر پُر لطف تنبیہ کی ہے۔

تحلیلِ اعتراض

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ ایک مرتبہ مشرکوں نے کہا محمد جو نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں اگر واقعی میں نبی ہیں تو اللہ تھوڑی تھوڑی وحی نازل کر کے ان کو بار بار تکلیف کیوں دیتا ہے۔ ایک دم سارا قرآن کیوں نہیں نازل ہو گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد خود ہی سوچ سوچ کر بنا لیتے ہیں اور خدا کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس پر آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔

لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا۔ قرآن سے دل کو جمائے رکھنے کی علماء تفسیر نے چند صورتیں لکھی ہیں (۱) حضور اقدس اور اکثر صحابہ لکھے پڑھے نہ تھے۔ اگر یکبارگی اتنی بڑی کتاب نازل ہوتی تو حفظ نہ رہتی۔ لوگوں کا اعتماد لکھنے پر ہوتا نتیجہ یہ ہوتا کہ گزشتہ کتابوں کی طرح رفتہ رفتہ رسم خط کے اختلاف، طرز نگارش کے فرق یا خواہشِ نفس کے باعث اس میں بھی تحریف و تبدیلی ہو جاتی۔ لیکن جب تھوڑا تھوڑا نازل ہوا تو دلوں میں جمتا گیا لوگوں نے بے تکلف یاد کر لیا اور کسی تبدل تغیر کا امکان نہ رہا (۲) اگر تمام احکام یکبارگی نازل ہو جاتے تو سب کی یکدم تبلیغ دشوار تھی قوم کا ان پر ثابت رہنا شاق تھا۔ بنی اسرائیل کی طرح مسلمان بھی مخالفت پر کمربستہ ہو جاتے اور بڑا فساد ہوتا۔ حضور کو ہر وقت بے چینی اور اضطراب رہتا۔ رفتہ رفتہ نازل کرنے میں یہ بات نہ ہوئی اور سکونِ خاطر پیدا ہوتا رہا (۳) وقتاً فوقتاً نئے حوادث پیش آتے تھے اور ہر حادثہ میں جبرئیل کلام الٰہی لے کر آتے تھے اور وحی کا سلسلہ منقطع نہ ہوتا تھا اس سے حضور کے دل کو قوت حاصل ہوتی تھی۔ اگر یکدم پوری کتاب الٰہی نازل ہو جاتی تو سلسلۂ وحی منقطع ہو جاتا۔ وقتاً فوقتاً ہدایت و احکام کے نزول کا تسلسل باقی نہ رہتا اور بارگاہِ الٰہی سے ربط و تعلق روز افزوں نہ رہتا۔ (۴) یکدم قرآن نازل ہو جاتا تو کفار مقابلہ میں کہہ سکتے تھے کہ اتنی بڑی کتاب ہم کیونکر لا سکتے ہیں جب تھوڑا تھوڑا نازل ہوا اور مقابلہ کی دعوت کے باوجود کسی ٹکڑے کا بھی جواب نہ بن پڑا اور سب کفار لاجواب ہو گئے تو اس سے حضور کے دل کو قوت حاصل ہو گئی اور کافروں کو اپنی شکست کا کوئی عذر بھی نہ رہا۔ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ کے ذیل میں یہ تمام امور داخل ہیں (ابن کثیر۔ خطیب حقانی)

وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ۔ مَثَل سے مراد ہے اعتراض اور شبہ سعید بن جبیر نے بقول ابن عباسؓ آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ کفار نے جب کبھی کوئی ایسی بات پیش کی جس سے خدا یا رسول پر خوردہ گیری ہوتی ہو تو ہم نے اس کے جواب میں جبرئیل کو وحی حق کے ساتھ نازل کر دیا اور حق کو صاف کر دیا میرے نزدیک یہ مطلب کچھ ژولیدہ ہے۔ صاف مطلب یہ ہے کہ جب کفار نے کوئی اعتراض کیا تو ہم نے کبھی اس کا واقعی جواب اور کبھی واقعی جواب سے بھی بہتر جواب کھول کر بیان کر دیا۔ اس صورت میں اَحْسَنَ سے مراد ہے حق یعنی واقعی جواب سے احسن۔ بات یہ ہے کہ کفار نے قرآن اور رسول پر مختلف شبہات اور متعدد اعتراضات وارد کئے تھے خدا تعالیٰ نے ان کے لغو اعتراضات کا واضح جواب دیا جس سے چہرۂ حق پر باطل کا کوئی غبار نہ رہا۔ اور جواب دینے میں دو طریقے اختیار فرمائے۔ ایک تو اس طرح کہ جتنا اعتراض تھا اتنا ہی جواب دے دیا۔ یہ طریقہ تو اقتناعی جواب کا تھا جس سے کفار کا اعتراض زائل ہو گیا اور بس۔ دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کفار کے اعتراض کی توضیح کی اس کے ہر پہلو پر تفصیلی روشنی ڈالی اور پھر برہانی طور پر اصل مدعا کو ثابت کیا۔ یہ طریقہ پہلے طریقہ سے بہتر ہے۔ کیونکہ پہلا طریقہ تو صرف کوتاہ فہم طبقہ کے لئے وجہ تسلی ہو سکتا تھا اور اس طریقہ سے روشن دماغوں میں بھی برہان و دلیل کی روشنی چمکنے لگی اور حقانیتِ قرآن کی کامل وضاحت ہو گئی۔

اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ۔ یعنی قیامت کے دن کافروں کو اوندھے منہ جہنم کی طرف ہنکایا جائے گا۔ ابن کثیر نے بحوالۂ صحیح بخاری ایک روایت لکھی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ قیامت کے دن کس طرح کافر کو منہ کے بل ہنکایا جائے گا؟ حضور نے فرمایا جس پاک قدرت والے نے اس کو پاؤں کے بل چلایا ہے وہ قادر ہے کہ قیامت کے دن اس کو منہ کے بل چلائے۔ مجاہد، حسن بصری، قتادہ اور اکثر مفسرین تابعین نے آیت مذکورہ کی تفسیر اسی طرح کی ہے۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ آخرت، دنیا کا آئینہ ہے جو یہاں کیا وہ وہاں نظر آئے گا۔ امام غزالی وغیرہ نے اس مطلب کو ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ امام نے لکھا ہے کہ دنیا میں کفار ہمیشہ پستی اور زمین کی طرف مائل رہتے ہیں یعنی اس خاک پر جو چیزیں محسوس و مادی ہیں انہی سے ان کے دل وابستہ رہتے ہیں۔ ماوراء مادہ اور پہاڑ کو کچھ نظر نہیں آتا۔ اس وجہ سے ان کے دل سرنگوں اور اوندھے ہو گئے ہیں۔ قیامت کے دن جب ان کا حشر ہوگا تو اسی شکل پر ہوگا جو دنیا میں انھوں نے اختیار کی تھی۔ اسرار شریعت کو جاننے والے جانتے ہیں کہ عذاب و ثواب درحقیقت اختیاری اعمال کا

نام ہے۔ خداتعالیٰ نے قیامت کے دن اپنی طرف سے کچھ زیادہ نہیں فرمایا گا۔ بلکہ دنیوی اعمال ویسی ہی شکل اختیار کرلیں گے جو اُن کے مناسب ہوگی۔ غزالی کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ اوندھے منہ حشر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کفار کے دل چونکہ اوندھے تھے اس لئے یہ سرنگونی اور واژونی قیامت کے دن منہ کے بل حشر ہونے کی صورت اختیار کرے گی۔ امام غزالی نے مضمون لطیف بیان کیا ہے۔ فتفکروا۔

أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَكَانًا وَأَضَلُّ سَبِيلًا ۝ یعنی آخرت میں ان کا ٹھکانا بدترین ہوگا۔ اور دنیا میں یہ بہت ہی گمراہ تھے۔ غرض یہ کہ گم کردہ راہی ہی کو بدترین مقام پر پہنچاوے گی۔

مقصودِ بیان قرآن کے تدریجی نزول کے فوائد مندرجہ ذیل ہیں جن کی طرف لفظ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ اجمالاً اشارہ کر رہا ہے۔ تثبیت قلب میں یہ سب امور مندرج ہیں۔ سہولتِ حفظ، نشاط قاری، مجتہدین کی پیدائش، اجزائے تبلیغ کی آسانی، مکارمِ اخلاق اور عقائدِ صحیحہ کی تعلیم عمل کے لئے آسانی کا لحاظ، قرآنی اعجاز کی تکمیل، سلسلۂ وحی کا عدم انقطاع، حوادث کے مطابق احکام کا نزول، لوگوں کے نو بنو شبہات کے جواب، مصالحِ وقتی کے تحت احکام کی صراحت وغیرہ۔ قرآن میں کافروں کی ہر نکتہ چینی اور خوردہ گیری کا جواب ہے۔ کہیں صرف اقتناعی ہے اور کہیں برہانی وغیرہ۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَجَعَلْنَا مَعَهُ أَخَاهُ هَارُونَ وَزِيرًا ۝ فَقُلْنَا اذْهَبَا إِلَى

ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اُن کے ساتھ اُن کے بھائی ہارون کو وزیر بنایا تھا پھر ہم نے کہا تم دونوں اُن لوگوں

الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَدَمَّرْنَاهُمْ تَدْمِيرًا ۝ وَقَوْمَ نُوحٍ لَمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ أَغْرَقْنَاهُمْ

کے پاس جاؤ جنھوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی ہے (چنانچہ وہ گئے مگر کافر نہ مانے) تو ہم نے اُن کو بالکل برباد کردیا اور نوح کی قوم نے جب پیغمبروں کو جھٹلایا

وَجَعَلْنَاهُمْ لِلنَّاسِ آيَةً ۖ وَأَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ عَذَابًا أَلِيمًا ۝ وَعَادًا وَثَمُودَ وَأَصْحَابَ الرَّسِّ

تو ہم نے اُن کو ڈبو دیا اور سارے لوگوں کے لئے نشانی بنا دیا اور ظالموں کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے اور (ہم نے برباد کردیا) عاد کو اور ثمود کو اور کنوئیں

وَقُرُونًا بَيْنَ ذَٰلِكَ كَثِيرًا ۝ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْأَمْثَالَ ۖ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيرًا ۝ وَلَقَدْ أَتَوْا

والوں کو اور ان کے درمیان بہت سی اُمتوں کو اور سب ہی سے ہم نے مثالیں بیان کیں اور سب کو برباد کردیا یہ (کفار) اُس بستی پر

عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِي أُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۚ أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ نُشُورًا

ہو آئے ہیں جس پر بُرا برساؤ برسایا گیا تھا تو کیا انھوں نے اُس کو دیکھا نہیں بات یہ ہے کہ وہ لوگ جی اُٹھنے کی توقع ہی نہیں رکھتے

تفسیر قرآن چند علمی اور فکری قواعد کا مجموعہ ہی نہیں ہے نہ محض مبدء و معاد کے متعلق چند تصریحات کا ذخیرہ ہے بلکہ پارینہ داستانوں کی کتاب ہے۔ نہ فقط ذہنی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی انقلاب کی تحریک ہی ہے بلکہ ایک موعظت نامہ ہے، ایک شمع ہدایت ہے، عقل و دانش کے لئے درسِ حقیقت ہے، اہلِ حق کے لئے دعوتِ عمل ہے، اصلاحی دفترِ نظریات ہے۔ عقول میں انقلاب پیدا کرنے والی اور اعمال کو صحیح کرنے والی کتاب ہے، فلسفہ کی گتھیوں کو سلجھانے والا پُر حکمت مقالہ ہے۔ اصحابِ شعور کو درسِ شعور دینے والی کتاب ہے۔ اربابِ بصیرت کی بصیرت کو روشن کرنے والا آفتاب ہے۔ اس کا طرزِ بیان معجزانہ، اندازِ خطابت واعظانہ اور طریقۂ تعلیم حکیمانہ ہے۔ اس خاکستری فرش پر رہنے والے انسان تین طبقوں میں منقسم ہیں کچھ بلند ترین خیال اور روشن ترین دماغ کے حامل ہیں۔ ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے اور منطق کی ترازو میں تولتے ہیں۔ بصیرت کی نظر سے کھوٹے کھرے

کو پہچانتے اور صحت وسقم کی نگاہ سے ہر قول کو جانچتے ہیں۔ کچھ لوگ درمیانی درجہ کے ہیں۔ نہ تو بالکل کور دماغ تاریک دل اور سادہ لوح ہیں نہ حقائق اشیاء کی تحلیل و ترکیب اور فلسفیانہ دقائق کی موشگافی کرنے پہ قادر ہیں۔ ولکن وسط بین الطرفین وحال بین الحالین۔ کچھ لوگ بہت ہی کوتاہ اندیش بے بصیرت اور کور دانش ہیں۔ مادی اور جسمانی پردوں کے اندر ان کی نگاہیں نہیں پہنچتیں افادی اور استفادی نظر سے کسی چیز کو نہیں دیکھتے۔ ان کی فہم و دانش بہت کمزور ہوتی ہے۔ حقائق و معارف کے انوار ان کو نظر نہیں آتے۔

سطح سے گزر کر گہرائیوں تک ان کی نگاہ کی رسائی نہیں۔ ظاہر بین ہیں ظاہر پرست ہیں اور ظاہر فہم ہیں۔ قرآن چونکہ ہدایت نامہ تھا اس کے پیش نظر تمام طبقات اور کل اصناف بشری کی اصلاح تھی اس لئے طریقۂ ہدایت میں بھی اس نے تنوع اختیار کیا اول الذکر طبقہ کی اصلاح کے لئے برہانی طریقہ اختیار کیا۔ فلسفیانہ حقائق کو اپنے سامنے واشگاف کیا اور عقلی صحت وسقم کے رنگ میں ان کو دعوت فکر دی۔ متوسط طبقہ کے لئے برہانی طرز مل سود مند نہ تھا اس لئے صرف اقتناعی طرز کلام پر اقتصار کیا۔ آخر الذکر گروہ چونکہ کور باطن تھا اس کی سمجھ میں زندگی کے اسرار اور رموز ہدایت و ضلالت کا مفہوم اور راستی و کجی کا فرق نہ آتا تھا۔ وہ صرف ظاہری نتائج کو دیکھ سکتا تھا۔ مزید گہرائیوں میں گھسنے کی اس میں صلاحیت نہ تھی۔ اس میں اس کی ہدایت کے لئے ترہیب و ترغیب کا طریقہ اختیار کیا۔ تشبیہ و تمثیل سے اس کے ذہن و عمل پر اثر ڈالنے کی کوشش کی۔ عذاب جہنم کی ہولناکیوں اور ثواب جنت کی جل باریوں کا نقشہ اس کے سامنے کھینچا تاکہ ثواب کی رغبت اور عذاب کا خوف پیدا ہو کر اس کے عقائد و اعمال کی درستگی ہو جائے۔ گزشتہ انبیاء کی حالت اور ان کی اقوام کی فرماں پذیری و معصیت کوشی بیان کی اور پھر دونوں کے نتائج بھی ظاہر کیے تاکہ قرآن کو ماننے اور اس پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہو اور نافرمانی کی صورت میں تباہی کی تصویر نظروں کے سامنے آجائے۔ یہی سبب ہے کہ چند برہانی و اقتناعی دلائل کے بعد آخرت کے عذاب و ثواب پر قرآن ضروری ریمارک کرتا ہے اور پیغمبروں کی فرمانبرداری اور نافرمان قوموں کا تذکرہ کر کے نصیحت پذیری کا مواد پیش کرتا ہے۔ چنانچہ ان آیات میں بھی چند پیغمبروں کی نافرمان قوموں کا عبرت انگیز نتیجہ بیان کر کے موعظت پذیری کا درس دیا ہے۔

تحلیل اجزاء: وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ۔ انبیاء کے ان قصص کو مختصر طور پر بیان کر کے رسول پاک کی تسلی کا سامان فراہم کیا ہے۔ اور گویا یہ درس دیا ہے کہ قوم کی سرکشی کچھ تمہارے ہی ساتھ مخصوص نہیں۔ گزشتہ انبیاء کی قوموں نے بھی اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی تھی۔ لیکن انجام کار تکذیب کرنے والوں کو برباد کر دیا گیا جن میں سے بعض کے آثار اب بھی باقی ہیں جن کو عرب کے باشندے دیکھتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ جس طرح گزشتہ نافرمان قومیں تباہ کر دی گئیں اور پیغمبروں سے سرکشی کر کے اس کی پاداش میں برباد ہو گئیں۔ اسی طرح قریش اور دوسرے نافرمان آخر میں ہلاک ہوں گے۔

هٰرُوْنَ وَزِيْرًا۔ یہاں وزیر بمعنی مددگار ہے۔ گزشتہ زمانہ میں کچھ پیغمبر تو ایسے گزرے ہیں جو نبوت میں مستقل تھے اور کچھ پیغمبر ذیلی تھے مستقل انبیاء کے زیر حکم تبلیغ کرتے تھے۔ حضرت ہارون بھی ذیلی پیغمبروں میں سے تھے۔ حضرت موسیٰ مستقل نبی تھے اور ہارون مددگار تھے۔ حضرت ہارون کو نبوت ہی حضرت موسیٰ کی استدعا پر ملی تھی اس لئے ان کو حضرت موسیٰ کا وزیر فرمایا۔

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا۔ اس فقرے کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ آیات سے مراد معجزات ہیں۔ لیکن شبہ کیا جا سکتا ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کو نبی بنا کر بھیجا گیا تھا اس وقت فرعون اور اس کی قوم نے معجزات کی تکذیب کہاں کی تھی۔ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ فرعون تک پہنچے ہی نہ تھے۔ نہ معجزات دکھانے کا موقع آیا تھا۔ پھر تکذیب کس طرح کر سکتے تھے۔ اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور ہارونؑ کو جو حکم ملا تھا اس کی نقل تو خدا تعالیٰ نے ان الفاظ میں فرما دی کہ ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اس قوم کے پاس جانے کا حکم دے دیا لیکن اس کلام سے سامع کو تسلی نہ ہوئی کیونکہ معلوم نہ ہوا کہ کس قوم کے پاس جانے کا حکم دیا تھا اس لئے رسول اللہ اور آپ کی امت کے علم کے لئے فرمایا یہ قوم وہ ہے جس نے (انجام کار) ہماری آیات کی کوئی پروا نہ کی کہ حضرت موسیٰ اور ہارون کو جتنا حکم ملا تھا وہ تو الی القوم پر ختم ہو گیا لیکن اہل قرآن کو سمجھانے کے لئے خدا تعالیٰ نے الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا زائد کر دیا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ قوم فرعون نے ہماری توحید و ربوبیت کا انکار کیا تھا۔ توحید کی فطری اور عقلی دلائل کو نہ مانا تھا اس وقت آیات سے مراد توحید کی فطری اور عقلی نشانیاں ہوں گی اور کلام میں کوئی سقم نہ رہے گا جو محتاج تاویل ہو۔

ضمیمہ: امام رازی نے کبیر میں صراحت کی ہے کہ فرعون ایک فلسفی شخص تھا حقائق اشیاء کی تحلیل و ترکیب فلسفیانہ رنگ میں کرتا تھا علم طبیعات اور

کیمیکل اور میکنیکل تحقیقات و تصرفات کا ماہر تھا اشیاء کے خواص اور خواص کے نتائج سے کافی طور پر واقف تھا طلسم اور سحر کا بھی اس کو علم تھا (طلسم کسی
علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے کائناتِ سماوی کی تاثیرات کو سفلی مادیات کی طرف متوجہ کر کے محیر العقول اثرات ظاہر کئے جاتے ہیں اور سحر وہ فن ہے جس کے ذریعہ
سے سفلی قوتوں کو سفلی مادیات میں بروئے عمل بنایا جاتا ہے۔ تاثیراتِ علوی کا یہاں بھی لحاظ کیا جاتا ہے مگر علوی تاثیرات کو سفلی مادیات کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں
پڑتی) انہی علوم کے زور پر اس نے بہت صنعتیں اور مفید چیزیں ایجاد کی تھیں۔ تحقیقِ کائنات کے متعلق اس کا وہی عقیدہ تھا جو فلاسفۂ یونان میں افلاطون کا تھا
کہ ہر نوع کا ایک رب (موکل، فرشتہ) جدا ہے۔ مگر افلاطون کے اور اس کے عقیدہ میں یہ فرق تھا کہ افلاطون کے نزدیک رب الارباب واجب تعالیٰ ہے اور فرعون
اپنی ذات کو رب الاعلیٰ کہتا تھا ہو سکتا ہے کہ فرعون اپنی ذات کو انسانیت کا مظہرِ اتم جانتا ہو اور چونکہ نوعِ انسان اشرف الانواع ہے اور فرعون بزعمِ خود انسانیت کا
مظہرِ اکمل تھا اس لئے رب الانواع ہونے کا دعویٰ اس نے فلسفیانہ رنگ میں کر دیا۔ بہرحال خدا کا ضرور منکر تھا اور خلاقِ عالم فاطرِ مطلق اور رب السمٰوات والارض
کے وجود کا قائل نہ تھا تو گویا فطرت و عقل کی وہ نشانیاں جو بداہۃً واجب تعالیٰ کے وجود پر دلالت کر رہی ہیں اور حدوثِ عالم سے محدث کی ذات کو ثابت کر رہی
ہیں ان کو فرعون تسلیم نہ کرتا تھا۔ تکذیبِ آیات کا بھی یہی مطلب ہے۔

كَذَّبُوا الرُّسُلَ اس فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوح نے نہ فقط نوح کی تکذیب کی تھی بلکہ عموماً رسولوں کی منکر تھی۔ ہو سکتا ہے کہ حضرت نوحؑ
کے ذیل میں ان لوگوں میں سے جو نوح پر ایمان لائے تھے بعض کو پیغمبر بنا دیا گیا ہو اور قوم نوح نے ان پیغمبروں کی تکذیب کی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نوح سے پہلے جو
پیغمبر گزرے تھے شیثؑ اور ادریسؑ وغیرہ قوم نوح ان کو بھی نہ مانتی ہو۔

وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً۔ یعنی قوم نوح کی غرقابی کو خدا تعالیٰ نے لوگوں کے واسطے عبرت و نصیحت کی نشانی بنا دیا۔ حضرت نوح کی بددعا سے
ایسا عظیم الشان طوفان آنا جس کی نظیر تاریخ عالم میں مفقود ہے۔ پھر طوفان میں ہر کافر کو غرق کرنا اور نوح کا مع مومنوں کے سالم رہنا پھر بقیہ لوگوں کی نسل میں
اتنی برکت ہونا کہ اطرافِ عالم اس سے بھر گئے خدا کے قادرِ مطلق اور محیطِ کل ہونے کا کھلا ثبوت ہے۔ رسولوں کی فرماں پذیری اور نافرمانی کا واضح نتیجہ ہے اہلِ بصیرت
اور اربابِ ہوش کے لئے عبرت اندوزی کا بہترین ذخیرہ ہے۔

وَّعَادًا یعنی حضرت ہودؑ کی قوم جس کو آندھی کے طوفان سے ہلاک کیا گیا تھا۔

وَّثَمُوْدَا۔ یعنی حضرت صالحؑ کی قوم جس کو عذابِ صیحہ سے تباہ کیا گیا تھا۔

وَّاَصْحٰبَ الرَّسِّ۔ ابو عبیدہ کا قول ہے کہ رس معنی کنوئیں کو کہتے ہیں۔ اصحاب الرس سے قوم شعیب مراد ہے۔ جنہوں نے آبپاشی کرنے اور جانوروں کو پانی
پلانے کے لئے عرب کے شمال و مغرب میں ملک شام کے متصل بکثرت کنوئیں کھود لئے تھے۔ ان کی ہدایت کو حضرت شعیبؑ کو بھیجا گیا۔ جب انہوں نے سرکشی کی تو
قہر آسمانی سے ہلاک ہوئے۔ اس قول پر اصحب الرس اور اصحاب مدین ایک ہی قوم ہوگی۔ صحاح میں آیا ہے کہ رس اُس کنوئیں کا نام تھا جو قوم ثمود کے آثارِ
باقیہ میں سے تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ رس ایک وادی یا شہر کا نام تھا۔ یہ شہر کہاں تھا؟ اس میں اختلاف ہے۔ ابن کثیر نے بعض کتابوں میں صراحت کی ہے کہ
بصرہ کے قریب ایک آبادی کا نام رس تھا۔ ابن جریر نے عکرمہ کا قول نقل کیا ہے کہ فلج کے رہنے والے اصحاب الرس تھے یہی اصحاب یٰسین ہیں فلج انطاکیہ
کے قریب ایک شہر تھا جہاں حبیب نجار کو شہید کیا گیا تھا (حبیب نجار وہی شخص تھا جس کا تذکرہ سورہ یٰسین میں آیا ہے کہ جب لوگوں نے پیغمبروں کی تکذیب کی
تو شہر (فلج) کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور قوم کو نصیحت کی پیغمبروں کا کہنا مانو یہ تم سے کسی اُجرت کے طالب نہیں پھر ان کا کہنا کیوں نہیں
مانتے۔ اس پر لوگوں نے حبیب کو مار ڈالا اور خدا تعالیٰ نے ان لوگوں کو ہلاک کر دیا چونکہ سورہ یٰسین میں ان لوگوں کا تذکرہ آیا ہے اس لئے ان لوگوں کو اصحاب
یٰسین کہا جاتا ہے) عکرمہ کے نزدیک اصحاب الرس اور اصحاب یٰسین (یعنی جنہوں نے اُن تین پیغمبروں کی تکذیب کی تھی جن کا ذکر سورہ یٰسین کے آغاز میں ہے)
ایک ہی تھے۔ رس حقیقت میں شہر فلج میں ایک کنواں تھا شہر کو اس کنوئیں کی طرف نسبت کر کے رس کہا جاتا ہے۔ سدی اور مقاتل وغیرہما کا بھی یہی قول ہے کہ
رس ضرور فلج کو کہا جاتا تھا مگر یہ صوبہ یمامہ میں ایک شہر تھا۔ گویا ملک یمامہ میں یہ شہر واقع تھا۔ ابن ابی حاتم نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ شہر رس
آذربائیجان (ملک فارس) میں تھا۔ ابن جریر نے لکھا ہے کہ اصحاب الرس اور اصحاب الاخدود ایک ہی تھے۔ یمن میں ایک بادشاہ تھا جس کا لقب ذو نواس
تھا اس کو یوسف بھی کہتے تھے۔ ذو نواس شاہ یمن کو قتل کرنے کے بعد سنہ ۴۲۰ء میں بادشاہ ہوا یثرب میں پہنچ کر اس نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اور

عیسائیوں کا سخت دشمن بن گیا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے اعلان کیا کہ جو عیسائی اپنے دین پر قائم رہے گا اس کو جلا دیا جائے گا۔ چنانچہ بڑے بڑے خندق کھدوا کر ان میں آگ روشن کرادی اور عیسائیوں کو گرفتار کرا کے بلوایا جس نے یہودی بننے سے انکار کیا اس کو آگ میں ڈبو دیا اور اس طرح ہزاروں عیسائی عیسائیت پر قائم رہنے کے جرم میں نذرِ آتش کر دیئے گئے۔ بالآخر ۵۲۹ء میں حبشیوں کے ہاتھوں اس کی حکومت برباد ہوگئی اور ۵۳۳ء میں ملک یمن کی حکومت حبشی کے قبضہ میں پہنچ گئی۔ خطیب نے لکھا ہے کہ بعض کے نزدیک حنظلہ نبی کی قوم اصحاب الرس کہلاتی ہے۔ ان لوگوں نے حضرت حنظلہ کو شہید کر دیا تھا جس کی پاداش میں خدا تعالیٰ نے ان کو غارت کر دیا۔ واللہ اعلم

وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ كَثِيْرًا۔ قرون بقول قتادہ ستر سال اور بقول زرارہ بن اوفی ۱۲۰ سال کا ہوتا ہے۔ ذٰلِكَ سے اشارہ یا تو عاد و ثمود کی طرف ہے یعنی خدا نے عاد و ثمود کے درمیان بہت سی قوموں کو ہلاک کر دیا۔ یا گزشتہ اقوام کی طرف اشارہ ہے خواہ قوم نوحؑ ہو یا بنی اسرائیل یا عاد و ثمود۔ بہرحال ان کی درمیانی مدت میں خدا تعالیٰ نے قرنہا قرن کو تباہ کیا۔

عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ الخ۔ اس سے قوم لوط مراد ہے جو بحیرۂ مردار کے کنارے آباد تھی۔ بغوی نے معالم میں لکھا ہے کہ قوم لوط کی آبادیاں پانچ قصبوں میں تھی جن میں سے چار قصبوں والے بدکار امرد پرست تھے۔ اللہ نے پتھر برسا کر ان کو ہلاک کر دیا بلکہ آبادی کو ہی الٹ دیا۔ علمائے طبعیات کہتے ہیں کہ زمین کے الٹنے کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ نیچے گندھک اور کوئلہ کا کافی مواد ہوتا ہے جس کے گیس سے زلزلے آتے ہیں۔ زمین پھٹتی ہے اور بعض حصے تہ و بالا ہو جاتے ہیں۔ ممکن ہے وہ قوم جن بستیوں میں آباد تھی ان کے نیچے گندھک اور کوئلہ کا ذخیرہ ہو۔ کیونکہ قانونِ قدرت یہی ہے کہ تباہی و بربادی بغیر مادی اسباب کے نہیں ہوتی۔ اگرچہ خدا تعالیٰ بغیر سبب کے بھی حال میں ہر قسم کا تصرف کر سکتا ہے۔ مگر عادتِ الٰہیہ یونہی رہی ہے کہ ہر نتیجہ اسباب سے وابستہ ہے اور ہر شئے کا حدوث اس کے تخلیقی ذرائع سے ہوتا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ گندھک اور کوئلہ کی کانیں زمین کے اندر ہزاروں بلکہ لاکھوں مقامات پر ہیں لیکن انقلاب و تباہی وہیں ہوتی ہے جہاں حکمِ الٰہی ہوتا ہے۔ ہر جگہ یہ اسباب بر سرِ عمل نہیں ہوتے۔ اسباب سے نتیجہ پیدا ہونا اور گندھک سے گیس اٹھ کر آبادیوں کا الٹ جانا حکمِ خداوندی پر موقوف ہے۔ اور تباہی کا حکم اسی وقت ہوتا ہے جب لوگ قانونِ قدرت سے سرتابی کرتے اور اپنے زمانے کے پیغمبر کی ہدایات کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ قومِ لوط نے بھی چونکہ وضعِ فطری کی مخالفت کی اور حضرت لوطؑ کی نصیحت کو نہ مانا اس لئے خدا تعالیٰ کی قوتِ قاہرہ نے اسبابِ ہلاکت کو حرکت دی اور قوم کی قوم کا تختہ تاراج ہو گیا یہاں تک کہ زمین ہی الٹ گئی۔ پھر اوپر سے پتھروں کی بارش ہوئی تاکہ جو لوگ اتفاقاً زلزلہ اور زمین کے الٹنے سے بچ گئے ہوں وہ پتھروں کی بارش سے ہلاک ہو جائیں۔

اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا۔ قریش کے قبیلے کے اکثر آدمی تجارت پیشہ تھے ملکِ شام و فارس کو بغرضِ تجارت جاتے تھے اور قومِ لوط کی تباہ شدہ بستیوں کی طرف سے ان کا گزر ہوتا تھا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ لوگ تباہ شدہ بستیوں کو (سرِ راہ) دیکھتے نہیں ہیں؟ ضرور دیکھتے ہیں مگر عبرت کی نظر سے نہیں دیکھتے اس بے باکی کی وجہ صرف یہ ہے کہ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا۔ ان کو قیامت آنے کا خیال ہی نہیں ہے۔ یہ قیامت کا اندیشہ ہی نہیں رکھتے یعنی جب وجودِ قیامت کے قائل نہیں تو پھر دنیا میں کردار کی پاداش کے کیسے قائل ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کی ہلاکت باریوں کو اتفاقی حوادث پر محمول کرتے ہیں اور آبادی و بربادی کو اتفاق کے ہاتھوں میں مرہون سمجھتے ہیں۔

مقصودِ بیان

ہلاک شدہ اقوام اور ان کے انبیاء کا تذکرہ کر کے رسولِ پاکؐ کو تسلی دینی مقصود ہے کہ قوم کی سرکشی دستورِ قدیم ہے انبیاءِ سابقین سے بھی ان کی قوموں نے سرتابی کی تھی مگر انجام کار تباہی سے ہمکنار ہونا پڑا اور انبیاء کو کامیابی حاصل ہوگئی۔ سرکش کافروں کے لئے بھی عبرت کا سبق آیات میں مضمر ہے کہ وہ اپنی سرتابی چھوڑ دیں ورنہ برباد ہونے کے لئے تیار ہو جائیں۔ دورِ حاضر کے مدعیانِ اسلام کو بھی اس عبرت آموز موعظت سے درسِ بصیرت حاصل کرنا چاہیئے اور سمجھ لینا چاہیئے کہ انبیاء کی تعلیم سے گردن کشی کا نتیجہ خسران و تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کی موجودہ بربادی اور ذلت ان کی خود آوردہ ہے۔ کاش اہلِ بصیرت تمام عالم کے لیڈروں کو چھوڑ کر تمام ریفارمروں کے سرتاج کے جھنڈے کے تلے آجائیں اور تعلیمِ نبوی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جائیں، پھر ذلت کا عزت سے، پستی کا بلندی سے، غلامی کا حکومت سے اور افلاس کا دولت سے بدل جانا یقینی ہے وغیرہ

وَإِذَا رَأَوْكَ إِن يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا هُزُوًا أَهَٰذَا الَّذِي بَعَثَ اللَّهُ رَسُولًا ۝ إِن كَادَ لَيُضِلُّنَا

یہ لوگ جب تم کو دیکھتے ہیں تو تمہاری ہنسی ہی بناتے ہیں کہ کیا یہی وہ شخص ہے جس کو اللہ نے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے اگر ہم جمے نہ رہتے تو یہ

عَنْ آلِهَتِنَا لَوْلَا أَن صَبَرْنَا عَلَيْهَا ۚ وَسَوْفَ يَعْلَمُونَ حِينَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ أَضَلُّ سَبِيلًا ۝

شخص تو ہم کو ہمارے معبودوں سے بہکانے لگا تھا یہ لوگ جب عذاب کو دیکھ لیں گے تو عنقریب جان لیں گے کہ کون زیادہ گمراہ ہے۔

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا ۝ أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ

بھلا اس شخص کو دیکھو تو جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا لیا ہے کیا تم اس کے نگہبان ہو سکتے ہو یا خیال کرتے ہو کہ ان میں کے اکثر

يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ ۖ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا ۝ ع

ع ٢

سنتے یا سمجھتے ہیں وہ تو بس چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

تفسیر ہم اس کتاب میں ایک سے زیادہ مرتبہ لکھ چکے ہیں کہ انسان اپنی تین پوشیدہ قوتوں کے زیرِ حکم کام کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں اس مادی پتلے کی لگام ہے وہ جدھر چاہتی ہیں اس خاکی گھوڑے کو موڑ دیتی ہیں۔ ایک روحانی ملکی قوت ہے جس کا کام سوچ بچار کرنا، اچھے برے میں فرق کرنا۔ حق و باطل میں امتیاز کرنا اور صحیح غلط میں تفرقہ کرنا ہے۔ علومِ صحیحہ اور عقائدِ حقہ کا حصول اسی قوت کا عمل ہے۔ دلائل کو ترکیب دے کر نتیجہ تک پہنچنا اسی کا کام ہے۔ کائنات کو دیکھ کر اس کی شکلیں دماغ میں لے کر فطرتِ سلیمہ کے مطابق استدلال کرنا اسی کا حاصل سعی ہے۔ دوسری قوت خواہشات کی ہے۔ مرغوب کو حاصل کرنا اور مطلوب لذت کو پانے کی کوشش کرنا اس کا کام ہے۔ کھانے پینے، صنفی لذت حاصل کرنے، لباس پہننے، مال جمع کرنے، دوستوں اور عزیزوں سے محبت کرنے کی جائز ناجائز خواہش کا مرکز یہی قوت ہے۔ تیسری قوت مدافعت، ان سب کا سرچشمہ ہے۔ ہر وہ شے جو حصولِ مطلوب سے مانع ہو اس کو راستہ سے جائز ناجائز طور پر دفع کرنا علو برتری سطوت جاہ شوکت اور سلطنت کرنا اسی قوت کا کام ہے۔ یہ تینوں قوتیں ہر شخص کے دماغ اور اعضائے جسم پر حکومت کرتی ہیں۔ اگر اول الذکر موخر الذکر قوتوں پر غالب رہتی ہے تو نیکی کی طرف رغبت بدی سے نفرت نیکوں سے محبت اور بدوں سے عداوت پیدا ہوتی ہے۔ بصیرت روشن اور گوشِ ہوش وا ہوتے ہیں۔ خواہشاتِ نفس پر روح کی حکمرانی ہوتی ہے اور اگر معاملہ بالعکس ہوا تو بصیرت و عقل کی اندھی آنکھیں اور ہوش کے کان بند ہو جاتے ہیں۔ آدمی خواہشات و نفسانیات کا بندہ بن جاتا ہے۔ اللہ کے نیک بندوں کا مذاق اڑاتا ہے اور طاغوت پرست شیطانوں سے دوستی کرتا ہے۔ ایسے آدمی کو راہِ حق نہیں ملتی۔ روح و روحانیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ عقل و مدارکِ عقل سے اس کا سروکار نہیں ہوتا۔ ایسے ہی لوگ انبیاء و صلحاء سے سرکشی کرتے اور طرح طرح سے ان کو ستاتے ہیں۔ رسولِ پاکؐ کے زمانے میں بھی ان انسان نما جانوروں کی کمی نہ تھی۔ آیاتِ مذکورہ میں مختصر طور پر انہی کا تذکرہ کیا ہے۔ شیاطین کی یہ ذریات حضورِ والا کا مذاق اڑاتی تھی اور سرکارِ عالی کی ظاہری مالی کمزوری کو دیکھ کر استہزائیہ کلمات زبانوں سے نکالتی تھی۔ ان کے پیشِ نظر نفسانی خواہشات کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ رسولِ پاکؐ ان شیطانوں کو راہِ راست پر لانے کی بہت کچھ کوشش کرتے تھے مگر نفس کے بندے اللہ کے پرستار کیسے بن سکتے تھے۔ ظاہر میں وہ ذی ہوش اور اربابِ بصیرت و بصارت نظر آتے تھے۔ مگر حقیقۃً ان کی عقل کی آنکھیں نابینا اور ہوش کے کان بند تھے۔ وہ انسان نما جانور تھے بلکہ جانوروں سے بھی بدتر کیونکہ جانوروں میں تو ادراکی روحانی قوت فطرۃً نہیں اس لئے مجبور ہیں اور ان کور دانشوں میں دانش و عقل کی قوت سرشتی موجود تھی مگر انہوں نے اس کو مردہ کر رکھا تھا اس لئے جانوروں سے بھی زیادہ بے بصیرت اور بد بصارت تھے۔

تحلیلِ اجزاء:۔ وَإِذَا رَأَوْكَ إِن يَتَّخِذُونَكَ إِلَّا هُزُوًا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ اس آیت کا نزول ابوجہل کے متعلق ہوا۔ ابوجہل کو اسلامی

اس سے پہلے لوگ ابوالحکم کہتے تھے کیونکہ دنیا کے معاملات میں سخت جاہل تھا۔ اسی لئے اس کا لقب ابوجہل ہوگیا۔ یہ کمبخت رسول پاک کو دیکھ کر کہا کرتا تھا کہ دیکھو کیا بے حیثیت آدمی ہے کیا اسی ذلیل آدمی کو خدا نے اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ پیغمبر ایسے ہی ہوتے ہیں ہم نے بڑا دھوکا کھایا تھا۔ ہم نے اس شخص کی باتیں غور سے سنی تھیں اس نے کیسی چکنی چپڑی باتیں کیں کہ قریب تھا کہ ہم اپنے معبودوں اور دیوتاؤں کو چھوڑ دیں اور گمراہ ہو جائیں مگر خیر ہوگئی ہم اپنے دیوتاؤں کی پرستش پر جمے رہے اور اس کے اغوا سے بچ گئے۔

وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ الخ۔ یعنی جب کافروں نے آیات بینات معجزات واضحات اور دلائل عقلیہ سے منہ موڑ لیا اور کلام حق کو سننا چھوڑ دیا اور ایسی بے ہودہ باتوں پر جم گئے اور باطل پرستی پر فخر کرنے لگے تو اب سوائے اس کے ان کو سمجھانے کا کوئی راستہ نہیں رہا کہ مرنے کے بعد عذاب ان کے سامنے آئے تب ان کی آنکھیں کھلیں گی اور اپنی گمراہی کا یقین ہو۔ چنانچہ جب ابوجہل اور اس کے ساتھی جنگ بدر میں مارے گئے تو اختتام جنگ کے بعد حضور والا نے مقتولوں کی لاشوں کو پکار کر خطاب فرمایا کہ ہم سے جو کچھ ہمارے پروردگار نے وعدہ فرمایا تھا وہ ہم نے پالیا کیا تم نے بھی وہ (عذاب) پالیا جس کی وعید تمہارے رب نے دی تھی۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت میں مشرکوں کا عجیب حال تھا ایک زمانہ تک ایک پتھر کی پوجا کرتے تھے پھر جب اس سے زیادہ خوبصورت پتھر ان کو مل جاتا تھا تو پہلے معبود کو چھوڑ کر دوسرے کی پرستش شروع کر دیتے تھے۔ دوسری روایت میں ابن عباسؓ نے فرمایا کہ کافر کا دستور ہے کہ جس چیز کو اس کا جی چاہتا ہے اس کے پیچھے ہو جاتا ہے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ خواہشات نفس کی پیروی اور میلان قلبی کا اتباع کفار کے رخ پر ہوتا ہے عقلی رجحان اور شرعی صراحت سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس کا معیار ذہنی صرف رغبت و نفرت ہے۔ ہر چند کہ حقانیت قرآن اور صداقت رسول کے عقلی اور فطری شواہد موجود ہیں مگر چونکہ کافروں کا جی نہیں چاہتا اس لئے وہ نہیں مانتے مطلق العنان رہنا چاہتے ہیں۔ حلت و حرمت کی قیود کو ان کے نفوس برداشت نہیں کرتے۔ حضور اقدس نے صحیح حدیث میں ارشاد فرمایا ہے:۔ لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ یعنی کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی نفسانی خواہش اس (دین و قرآن) کے تابع نہیں ہو جاتی جس کو میں لے کر آیا ہوں۔ ایک اور حدیث میں حضور نے فرمایا سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں کے درمیان ہے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے

ان کنت تبغی الرشاد محضا لامر دنیاک والمعاد

فخالف النفس فی ھواھا ان الھویٰ جامع الفساد

یعنی اگر دنیا اور دین کے کاموں میں خالص ہدایت چاہتا ہے تو خواہش نفس کی مخالفت کر کیونکہ خواہش نفس سب برائیوں کی جڑ ہے۔

مسئلہ:۔ کلبی نے صراحت کی کہ آیت قتال سے یہ آیت منسوخ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آیت کے منسوخ ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں تقویٰ کا مسئلہ بنیاد ہی آیت ہو پھر نسخ کی کیا وجہ۔

اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا۔ رسول پاک رحمۃ للعالمین تھے کوشش فرماتے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ بے دین کافروں کو دوزخ سے کھینچیں جو لوگ جان و مال اور آبرو کے دشمن تھے ان کے ساتھ بھی حضور شفقت فرماتے اور ان کے انکار و کفر پر ملول ہوتے تھے لیکن وہ کمبخت نفس پرست تھے حق پرست نہ تھے۔ صداقت کی ان کو جستجو ہی نہ تھی پھر کس طرح ہدایت یاب ہو سکتے تھے۔ اس لئے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ نفس پرست ہیں خواہشات کے بندے ہیں کیا ان کو ایمان کے دائرے میں لانے کے لئے آپ کفیل ہیں۔ یعنی ہدایت و ضلالت آپ کے اختیار میں نہیں آپ کا کام رسالت ہے پرستاران نفس کی کفر پر اڑیاں کا مسئلہ آپ ذمہ دار نہیں۔

تنبیہ:۔ خواہش نفس کی پرستش کے معنی یہ ہیں کہ آدمی ہر دینی اور دنیوی امور میں اپنے نفس کا فرمان بردار ہو جائے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔ جاہ پرستی، دولت پرستی، شہرت پرستی، حکومت پرستی، زر پرستی، زن پرستی، اولاد پرستی۔ یعنی اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز یا دوسرے شخص کی اتنی اطاعت کرنی کہ حکم الٰہی کی کوئی پرواہ نہ ہو نفس پرستی ہے۔ میلان خاطر کی اطاعت ہے اور کفر ہے۔

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ الخ۔ کفار بظاہر سنتے بھی تھے سمجھتے بھی تھے۔ لیکن ان کو اس سننے اور جاننے سے کوئی فائدہ نہ پہنچتا تھا کیونکہ ظاہری کانوں سے سننا اور عقلی سمجھ سے جاننا سود مند نہیں ہوتا۔ سماع حقیقی، ادراک و معرفت کے لئے گوش ہوش وا ہونے اور عقل کی آنکھیں روشن ہونی چاہئیں اسی لئے فرمایا کیا تم خیال کرتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتا اور سمجھتا خیال کرتے ہو ایسا نہیں ہے ان کی حالت چوپایوں کی طرح ہے۔

بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا ۝ بلکہ وہ مویشیوں سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ علماء نے اس کلام کی چند وجوہ لکھی ہیں۔ اول یہ کہ جانوروں کی تخلیق جس غرض کے لئے کی گئی ہے اس کو وہ پورا کرتے ہیں مگر کافروں کی پیدائش کا جو مقصود ہے (یعنی اللہ کی معرفت و عبادت) اس کو وہ پورا نہیں کرتے۔ دوم یہ کہ جانور اپنے پالنے والوں کے فرمانبردار ہوتے ہیں۔ اپنے ساتھ اچھائی برائی کرنے والے کو پہچانتے ہیں۔ جو چیز ان کے لئے مفید ہے اس کو کھاتے اور جو مضر ہو اس سے اجتناب کرتے ہیں۔ اپنی چراگاہ اور پانی پینے کے گھاٹ کے راستے کو جانتے ہیں۔ مگر کفار کی حالت عجیب ہے۔ یہ اپنے پروردگار کے فرمانبردار نہیں اور اس کے احسان کا شکر نہیں کرتے۔ اپنے دشمن شیطان کو نہیں پہچانتے۔ اس کے کہنے پر چلتے ہیں۔ یہ ثواب آخرت کے طلبگار نہیں اور عذاب آخرت سے خائف نہیں۔ راہِ حق سے ناواقف ہیں۔ حالانکہ حق کا راستہ ان کو منزلِ مقصود تک پہنچانے والا ہے (کذا قالہ الخطیب) سوم یہ کہ جانور فطرتاً بے عقل ہیں۔ فسق و فجور اور بداعمالیوں سے روکنے والی عقل ان میں موجود نہیں ہے اس لئے جو بدکاری ان سے سرزد ہو اس کو بدکاری نہیں کہا جاتا۔ اگر ان کو معرفت میں کمال حاصل نہیں تو یہ بات قابلِ گرفت نہیں کیونکہ وہ مجبور ہیں لیکن کافر ہوشمند عقل والے ہیں۔ دانش رکھتے ہیں انہوں نے گمراہی اختیار کی معرفت حق چھوڑ دی، خواہشات کی پیروی کی اور دانش و بصیرت کو خود مردہ کر لیا تو یہ سخت مواخذہ کے مستحق ہیں۔ اندھا کنوئیں میں گر جائے تو معذور ہے اور آنکھوں والا کنوئیں میں گر جائے تو قابلِ ملامت و سرزنش ہے۔

مقصود بیان کفار کی کم دانشی اور خباثتِ نفس کا بیان اور اس امر کی صراحت کہ کفر پرستی کافروں کی رگ رگ میں رچ گئی تھی یہاں تک کہ وہ ہدایت کو ضلالت سمجھتے تھے۔ ہوا و ہوس کی پرستش سخت ترین جرم ہے۔ اس سے عبرت حاصل کرنی چاہئے ان عالم نما مولویوں کو جو دنیوی فوائد کے لئے حق کو چھپاتے اور خواہشِ نفس کے حصول کے لئے شریعتِ غرا میں تاویلیں کرتے ہیں۔ نصیحت پکڑنی چاہئے ان نفس پرست بے دینوں کو جو چند روپیہ کی خاطر مسائلِ شریعت کو اپنی خواہش کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح درس بصیرت حاصل کرنا چاہئے اس نیم تعلیم یافتہ طبقہ کو جو احکامِ شریعت کو صرف اس لئے نہیں مانتا کہ اس کا دل نہیں چاہتا اس کی عیش پرستی میں فرق آتا ہے۔ یہ گروہ حکم قرآنی کو ٹھکرا دیتا ہے محض اس لئے کہ حکمِ قرآنی کو مان کر اس کی شیطانی اغراض حاصل نہیں ہوتیں۔ غرض نصیحت حاصل کرنی چاہئے زر پرستوں کو، جاہ پرستوں کو، حکومت پرستوں کو، شریعت میں تحریف کرنے والے مولویوں کو، دین فروش پیروں کو، ریاکار صوفیوں کو، گمراہ کرنے والے لیڈروں کو، آبرو باختہ اخبار نویسوں کو، بددماغ پروفیسروں اور خود پسند بیرسٹروں کو وغیرہ۔

قِيلًا ۝ أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا ۝

ہے — کیا تم نہیں دیکھتے کہ تمہارے رب نے کس طرح سایہ کو پھیلایا ہے اگر اللہ چاہتا تو اس کو ساکن کر دیتا پھر آفتاب کو ہم نے سایہ کا رہنما بنایا ہے

ثُمَّ قَبَضْنَاهُ إِلَيْنَا قَبْضًا يَسِيرًا ۝ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَالنَّوْمَ سُبَاتًا وَجَعَلَ

پھر آہستہ آہستہ ہم اس کو سمیٹ کر کھینچ لیتے ہیں — اسی خدا نے تمہارے لئے رات کو پردہ — اور نیند کو — آرام بنایا ہے — اور دن کو اٹھنے

النَّهَارَ نُشُورًا ۝ وَهُوَ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ ۚ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً

کا وقت مقرر کیا ہے — وہی اپنی رحمت سے آگے آگے ہواؤں کو خوشخبری دینے کے لئے بھیجتا ہے — ہم ہی آسمان سے پاک پانی نازل

طَهُورًا ۝ لِنُحْيِيَ بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا وَنُسْقِيَهُ مِمَّا خَلَقْنَا أَنْعَامًا وَأَنَاسِيَّ كَثِيرًا ۝ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ

کرتے ہیں — تاکہ اس کے ذریعے سے مردہ شہر کو زندہ کر دیں اور اپنی مخلوقات میں سے بہت سے چوپایوں اور انسانوں کو ہم پلاتے ہیں — اسی پانی کو ہم نے لوگوں

بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوا فَأَبَىٰ أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُورًا ○ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ نَذِيرًا ○

بیں تقسیم کر دیا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں مگر بہتیرے لوگ ناشکری کیے بغیر نہ رہے ۔ اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک ڈرانے والا بھیجتے ۔ سو (اے محمد)

فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا ○

تم کافروں کا کہنا نہ مانو ۔ اور اس قرآن کے ذریعہ اُن کا پُرزور مقابلہ کرو

تفسیر ۔ بے عقل اور مردہ دانش والے اپنے کالے دماغوں سے تین شبہات پھیلا کر عمومی اور خصوصی نبوت کے متعلق پیش کرتے ہیں (۱) نبوت کی ضرورت ہی کیا ہے بلکہ ممکن ہی نہیں انسان مادی ہے، کثیف ہے، تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کا ربط نورِ مجرّد سے کس طرح ہوسکتا ہے۔ تاریکی اور روشنی میں تضاد ہے اور ضدین کا اجتماع ناممکن ہے (۲) انسانیت کے اعتبار سے تمام انسان برابر ہیں پھر محمدؐ کو کیا ترجیحی وجود حاصل ہیں کہ ان کو نبوت حاصل ہوگئی کیا یہ انسان نہیں یا ان کی انسانیت تاریک نہیں (۳) اگر محمدؐ کو نبی بنا دیا تو خیر لیکن دوسروں کو کیوں نہ بنایا گیا بعض دوسرے آدمی بھی اُن کے ساتھ نبی ہوگئے ہوتے۔ ہمارے پاس بھی وحی آتی اور فرشتہ نازل ہوتا آخر اس مانع کی کیا وجہ۔ یہی تین رکیک شبہات ہیں جو نبوت کے متعلق وارد کئے جاتے ہیں۔ رسول پاکؐ کے زمانہ میں بھی ایسے شکوک پیش کئے جاتے تھے۔ اور اس زمانے میں بھی کور مغز لوگ اس قسم کی بکواس کرتے رہتے ہیں اور سفسطہ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ فلسفہ کے مدعی ہیں۔ لیکن آیات مذکورہ کو غور سے پڑھنے کے بعد شبہاتِ مذکورہ کا کامل ازالہ ہوجاتا ہے آیات کا مطالعہ تمثیلی صورت میں تمام شکوک کی بیخ کنی کر رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ مادہ نام کثافت کا ہے اور کثافت نورانیت کی ضد ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ارضی مخلوق ہو یا فضائی کائنات یا آسمانی موجودات ہر چیز مادہ سے بنتی ہے۔ صورتیں جدا جدا ہیں لیکن تمام عنصری مخلوق کا مادہ ایک ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اسی کائنات میں بعض چیزیں بالکل تاریک ہیں بعض چیزیں نورانی ہیں لیکن ان میں اتنا نور نہیں کہ دوسروں کو منور کر دیں۔ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اپنے انعکاس اور سایہ سے دوسروں کو منور کر دیتی ہیں پھر ان نور پاش چیزوں میں بھی نورانیت کا تفاوت ہے۔ کہیں روشنی کم ہے کہیں زیادہ آگ ہے، بجلی ہے، ستارے ہیں، چاند ہیں، سورج ہے۔ یہ سب چیزیں روشن ہیں اور تمام کائنات کو روشن کرنے والی بھی ہیں۔ اگر روشن اجسام نہ ہوتے تو تمام عالم میں تاریکی ہی تاریکی ہوتی۔ صورت شکل رنگ وضع اور مساحت وغیرہ کا یکایک اختلاف معلوم نہ ہوسکتا محسوسات میں حسن و قبح اور خوش رنگی و بدرنگی کا تفاوت ظاہر نہ ہوتا۔ عالم کا یہ انتظام نہ ہوسکتا۔ یہ روشنی ہی ہے جس نے حسی ظاہری دنیا میں تفاوت قائم کر کے انتظام میں مدد دی ہے۔ بعینہٖ یہی حال اعمال و عقائد کی دنیا کا ہے اگر خدا تعالیٰ کے بعض بندے اپنی روحوں اور دماغوں کو نورِ الٰہی سے منور کرنے کے بعد دوسرے تاریک دماغ لوگوں پر نور پاشی نہ کریں اور قوانینِ معاشرت ضوابطِ مدنیت اصول سیاست اور قواعد اخلاق کو تعلیم الٰہی کے مطابق جاری نہ کریں تو جور و ستم سفاکی و خونریزی حق تلفی و بدنظمی سے اس سطح کے رہنے والے چیخ اٹھیں دنیا میں تباہی ہی تباہی کا وجود ہو بربادی اور فساد کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔ عالم میں سکون کی جگہ اضطراب کا دور دورہ ہو اور کل کائنات انسانی ہر وقت انقلاب کا شکار ہوتی رہے۔ رہا مادی اور مجرد کا تعلق تو یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ مادی کائنات میں سے بعض کا تعلق تو مجرد سے زیادہ قوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں نورانیت ہے۔ جو اجسام تاریک ہیں وہ بلحاظ فطرت نورِ مقدس سے کمزور ہے اسی وجہ سے وہ تاریک ہیں۔ اشیاء کی نورانیت میں جس قدر بیشی ہے اتنا ہی اُن کا تعلق نورِ مطلق سے پختہ ہے۔ جب تمام کائنات کا یہ فطری ضابطہ ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ عالمِ انسانی اس سے مستثنیٰ ہو۔ انسان بھی ایک مادی مخلوق ہے۔ اس مخلوق میں سے بعض افراد کا تعلق نبی نور سے قوی ہے اور بعض کا کمزور جس کا تعلق قوی ہے اس کا دماغ خود بھی روشن ہے اور دوسرے کے دماغوں کو بھی روشن کرنے والا ہے ایسے افکار و اعمال بجائے خود بھی صحیح ہیں اور دوسروں کے عقائد و اعمال کی بھی اصلاح کرنے والے ہیں۔ اس کا اندرونی تعلق نورِ مقدس سے ہے اور ظاہری ربط انسانوں سے جس طرح چاند ستارے، سورج وغیرہ غیبی نور سے روشنی کو حاصل کرتے ہیں اور مادی کائنات پر نور پاشی کرتے ہیں اسی طرح نورانی روح کے آدمی بھی نورِ بے کیف سے علوم صحیحہ اور معارف حقہ کی روشنی حاصل کرتے اور دوسرے انسانوں کو اس سے مستفیض کرتے ہیں۔ اس تقریر سے پہلے شبہ کا ازالہ ہوگیا اور یہ ثابت ہوگیا کہ اگر چاہتا تو نما ... دائمی تاریکی کو قائم رکھتا، ٹھہرا ہی سے بے شمار چراغ پیدا ہوتیں سائے کو ساکن بنانا خدا کے بس میں تھا یعنی کسی کو نبی بنانا

خدا کے بس میں نہ تھا۔ مگر اس کی حکمت بالکل ظاہر ہے۔ رہا دوسرا شبہ تو اس کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تمام نورانی اجسام ایک جیسے نہیں کسی میں روشنی کم ہے کسی میں زیادہ۔ سورج میں سب سے زیادہ۔ جب سورج نکلتا ہے تو کل دنیا کو روشن کر دیتا ہے۔ سورج کا رُخ جدھر ہوتا ہے ادھر ہی روشنی کا رُخ ہو تا ہے ستارے چاند، بجلی کوئی بھی اس کے طلوع ہونے کے بعد اپنی روشنی سے دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ سورج کو یہ شرف کیوں حاصل ہے۔ صرف اس کی روشنی کے سبب ورنہ مادی ہونے کی حیثیت سے وہ تمام مادیات کی طرح ہے۔ اسی طرح محمدؐ اگرچہ انسان ہیں اور انسانیت کے لحاظ سے دوسرے انسانوں کی طرح ہیں مگر روحانی نور روح کی روشنی اور عقل کی ضیا کے سبب اُن میں یہ صلاحیت ہے کہ دوسروں کو روشن کر دیں۔ دوسرے انسانوں میں یہ قابلیت نہیں ہے۔ اسی لئے دوسروں کو نبی نہ بنایا گیا اور سب میں سے محمدؐ کا انتخاب کر لیا گیا۔ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا سے اسی مضمون پر روشنی پڑ رہی ہے۔ تیسرے شبہ کا جواب بھی اسی تقریر سے مترشح ہوتا ہے۔ کیونکہ آفتاب کی موجودگی میں کسی دوسرے ستارے یا آگ وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ جب آفتاب محمدی چمکنے لگا تو پھر دوسرے نبی بچوں کی کیا ضرورت رہی۔ اگر خدا چاہتا تو گانوؤں گانوؤں اور قصبہ قصبہ ایک ایک نبی بھیج دیتا مگر سردار انبیاء اور راس المرسلین کی بعثت کے بعد اس کی ضرورت نہ رہی۔ واللہ اعلم۔

تحلیل اجزاء

أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ۔ اللہ کی ذات کو کوئی دیکھ نہیں سکتا ان مادی آنکھوں سے دنیا میں اُس کو دیکھنا ناممکن ہے اس لئے فقرۂ مذکور میں رویت سے مراد رُوحانی اور عقلی مشاہدہ ہے۔ مشاہدۂ ذات کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ خارجی مصنوعات کو دیکھ کر صفات کا مشاہدہ کیا جائے اور پھر مشاہدۂ صفات سے مشاہدۂ ذات کی طرف انتقال کیا جائے۔ یہ مشاہدہ عام عقلاء، حکماء، اولیاء اور علماء کو حاصل ہوتا ہے دوسری صورت یہ ہے کہ سب سے پہلے خود ذات کا مشاہدہ کیا جائے پھر صفات کا مشاہدہ ہو اور صفات سے منتقل ہو کر افعال کو دیکھا جائے۔ یہ مرتبہ خاص خاص انبیاء کا ہے۔ فقرۂ مذکورہ میں رسول اللہ کو خطاب ہے اور مشاہدۂ ذات کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس کے بعد باقی آیات میں صفات و افعال کے مشاہدہ کی تلقین ہے۔

كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ابو عبیدہ جو فن لغت کا امام ہے قائل ہے کہ ظل وہ ہے جو طلوع آفتاب سے زوال آفتاب تک ہوتا ہے اور فئی وہ ہے جو زوال سے غروب تک ہوتا ہے (نقلہ القرطبی) ابن السکیت کا قول بھی یہی ہے اگرچہ الفاظ مختلف ہیں۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ سائے سے مراد وہ سایہ ہے جو طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک ہوتا ہے۔ بیضاوی نے ذکر کیا ہے کہ سایہ نور و ظلمت کی درمیانی چیز کا نام ہے۔ خالص تاریکی میں طبیعت نہایت پریشان ہوتی ہے اور حواس میں انقباض ہوتا ہے اور خالص روشنی میں نگاہ چوندھیا جاتی ہے۔ گرمی اور تمازت سے طبیعت میں تکدر پیدا ہوتا ہے ابن کثیر کے قول کے موافق ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، ابو العالیہ، ابو مالک، مسروق، مجاہد، سعید بن جبیر، نخعی، ضحاک، حسن بصری اور قتادہ وغیرہم کے اقوال ہیں۔

شیخ ابو السعود نے کہا ہے کہ آیت میں ظل سے مراد وہ سفیدہ نہیں جو طلوع فجر سے طلوع آفتاب تک ہوتا ہے۔ سیاق آیت اس کے خلاف ہے یہاں سائے سے مراد عرفی سایہ ہے۔ مفسرین نے جس کو ظل قرار دیا ہے وہ عرف عرب کے خلاف ہے۔ اگرچہ وہ بھی افق شرقی کا سایہ ہوتا ہے مگر عرب اس کو ظل نہیں کہتے تھے۔ ظل وہ شے ہے کہ جب آفتاب کسی کثیف جسم کی آڑ میں آجاتا ہے تو کچھ حصہ پر دھوپ نہیں پڑتی اور جہاں آفتاب مقابل ہوتا ہے وہاں دھوپ پڑتی ہے۔ دھوپ اور سایہ برابر برابر ہوتے ہیں۔ اسی کا مشاہدہ کرانا اور اس سے قدرت الٰہی پر استدلال کرانا مقصود ہے۔ میرے نزدیک بھی ابو السعود کا قول آیت کے سیاق کے موافق ہے۔ ظل کے وہ معنی جو ابن کثیر وغیرہ نے لکھے ہیں وہ ظل جنت کے متعلق ہیں اور ظل ممدود میں وہی معنی مراد ہیں۔ لیکن اس جگہ ظل سے مراد وہی ظل ہے جو دھوپ کی برابر ہوتا ہے اور اسی کو عرف میں ظل کہتے ہیں۔

آیات کا مطلب دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ ایک ظاہری، دوسرا حقیقی۔ اول مطلب یہ ہے کہ جس وقت آفتاب افق شرق سے برآمد ہوتا ہے تو ہر شے کا سایہ بہت لمبا پڑتا ہے۔ پھر جس قدر سورج چڑھتا جاتا ہے اُسی قدر اُس کے مقابل سایہ گھٹتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ٹھیک دوپہر کو ہر شے کا سایہ اُس کی جڑ میں آلگتا ہے۔ پھر زوال کے بعد آفتاب کے مقابل دوسری جانب بڑھتا ہے۔ یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے شام کے وقت بالکل ناپید ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ہم نے سائے کو ایسی چیز بنایا ہے جس کا گھٹنا بڑھنا آفتاب کی رفتار پر موقوف ہے۔ آفتاب کو گویا سائے کا رہبر بنا دیا ہے کہ جس طرف چاہے اُس کو لے جائے اور جس طرح چاہے اس کو کم و بیش کرتا ہے۔ آخر کار ہم سب کو اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں اور سایہ اپنی اصل کو جا لگتا ہے یعنی معدوم

ہو جاتا ہے کیونکہ ہر شے کی اصل عدم ہے۔ ہم میں یہ بھی قوت ہے کہ اگر چاہتے تو سائے کو ایسی چیز بنا دیتے کہ اس کو آفتاب سے کچھ تعلق نہ ہوتا۔ آفتاب نکلتا اور ڈھل جاتا، کم و بیش ہوتا لیکن سایہ ایک ہی جگہ پر قائم رہتا یا سایہ پیدا ہی نہ ہوتا۔

یہ تو آیات کا ظاہری مطلب ہوا حقیقی مطلب یہ ہے کہ آفتاب سے مراد ہے ذاتِ الٰہیہ اور سائے سے مراد ہے تمام عالم کا وجود۔ چونکہ تمام کائنات کا وجود اللہ کے وجودِ حقیقی کا پرتو ہے اس لئے اس کو ظل کہا گیا۔ سائے کو دراز کرنے سے مراد ہے کائنات کو عدم سے وجود میں لانا اور سائے کے گھٹنے سے مراد ہے عالم کا زوال۔ سائے کو ساکن کرنے سے مراد یہ ہے کہ کائنات کا وجود ہی نہ ہوتا یا ہوتا تو حدِ کمال تک نہ پہنچتا۔ سمٹ جانے سے مراد یہ ہے کہ کائنات مرنے کے بعد بالکل فنا اور معدومِ محض نہیں ہو جاتی بلکہ جس طرح ہر چیز کا سایہ اس کی طرف سمٹ کر آجاتا ہے اسی طرح مرنے کے بعد تمام کائنات سمٹ کر خدا تعالیٰ کی طرف پہنچ جاتی ہے۔ اور آفتاب سائے کا رہنما ہے۔ اس سے مراد ہے کہ جن لوگوں کی عقل روشن ہے وہ جانتے ہیں کہ سائے کا وجود حقیقت میں کچھ بھی نہیں۔ جدھر آفتاب کا رُخ ہوتا ہے سایہ اس کے تابع ہوتا ہے اسی طرح تمام کائنات کا وجود کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ آفتاب لم یزل ولا یزال کے تابع ہے وہ جس طرف کو چاہتا ہے اس کائنات کا رُخ پھیر دیتا ہے کبھی مشرق کی طرف کبھی مغرب کی طرف، وہی اس کو گھٹاتا بڑھاتا ہے یعنی مارتا اور جلاتا ہے۔ عروج و انحطاط زوال و ترقی سب اسی کے قبضہ میں ہے۔

حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ ذاتِ الٰہیہ کا ہی وجود حقیقی ہے۔ تمام کائنات کا وجود اس کا سایہ ہے۔ اُس نے کائنات کو معدوم سے موجود کیا اور وہی سب کو فضائے ظاہری میں لایا۔ اگر وہ چاہتا تو کائنات پیدا ہی نہ ہوتی یا ہوتی تو حدِ کمال تک نہ پہنچتی۔ جب آفتاب کی کرنیں اس کائنات پر پڑنی موقوف ہو جائیں گی تو ہر چیز اپنی اصل سے آلگے گی اور سب فنا ہو جائیں گے۔ عقل کی روشنی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آفتاب ہی سائے کی اصل علت ہے خدا ہی نے یہ تمام عالم بنایا ہے۔ کُل کائنات کی لگام اُسی کے دستِ قدرت میں ہے۔ وہ جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ یہ مطلب اگرچہ واضح اور لطیف ہے مگر زیادہ پُر لطف اور نازک مطلب وہ حقائق ہیں جو ہم تفسیری مقالے میں اوپر لکھ آئے ہیں۔ بہر حال یہ کلام مقدس ہے جس کا ظاہری مطلب بالکل صاف ہے اور عقلاء کے لئے اس میں بے شمار حقائق و دقائق مضمر ہیں۔ جس قدر سلیم عقل سے غور کیا جائے اُسی قدر انکشافات ہوتے جاتے ہیں۔ والعلم عند اللہ وما توفیقی الا باللہ۔

وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا۔ خطیب نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو سائے کو پائیدار کر دیتا آفتاب سے اس کا زوال نہ ہوتا۔ ابن کثیر نے بھی یونہی لکھا ہے۔ بعض مفسرین نے بطور اشارہ اس سے مستنبط کیا ہے کہ رسول کا بھیجنا خدا پر واجب نہیں۔ اگر وہ چاہتا تو عالم میں تاریکی قائم رکھتا، کسی کو ہدایت کی روشنی نصیب نہ ہوتی۔ لیکن اس نے اپنی رحمت سے پیغمبروں کو بھیج کر روشنی پھیلائی۔

ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا۔ اس آیت کا مطلب بھی دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ اول یہ کہ آفتاب کو سائے کی شناخت کی علامت بنا دیا۔ طلوعِ آفتاب کے بعد اصل و ظل میں امتیاز ہو جاتا ہے۔ یہ قول ابن کثیر کا ہے۔ سدی اور قتادہ نے بیان کیا کہ آفتاب کے دلیل ہونے کے یہ معنی ہیں کہ سایہ اس کے تابع ہے پیچھے لگا رہتا ہے۔ ظل کی کمی بیشی اور پھیلنا سمٹنا آفتاب ہی کے تابع ہے۔ حاصل دونوں کا قریب ہی قریب ہے۔

ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا۔ اپنی طرف قبض کرنے سے یہ مراد ہے کہ سائے کا ظہور بقدرتِ الٰہی ہوتا ہے۔ پھر آخر میں خدا تعالیٰ اس کو معدوم کر دیتا ہے اور عدم ہر چیز کی اصل ہے۔ معدوم کرنے سے یہ مراد نہیں کہ بالکل فنا ہو جاتا ہے بلکہ اپنی اصل سے جا ملتا ہے۔ جہاں سے چلا تھا وہیں جا پہنچتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہر چیز کے وجود کا آغاز قدرتِ الٰہی سے ہوتا ہے۔ اس لئے وہی سب کا مبدا ہے تو فنا ہونے کے بعد سایہ خدا کی طرف (جو ہر چیز کا اصل مرکز ہے) پہنچ جاتا ہے۔

قَبْضًا يَّسِيْرًا۔ ابن عباسؓ کے نزدیک یسیر کا ترجمہ سریع، مجاہد اور سدی کے نزدیک خفی اور ایوب بن موسیٰ کے نزدیک قلیل قلیل ہے۔ مسلم مفسرین نے اس کا ترجمہ سَهْلًا کیا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ بہت جلد سایہ کو سمیٹ لیتا ہے۔ سایہ سمٹتا جاتا ہے اور کسی کو سمٹتا ہوا آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا یہاں تک کہ سب سمٹ جاتا ہے صرف درختوں اور چھتوں وغیرہ کا سایہ رہ جاتا ہے یا تھوڑا تھوڑا کر کے سمیٹ لیتا ہے یا آسانی سے قبض کر لیتا ہے۔

تنبیہ: علمائے اشارات نے آفتاب سے آفتابِ ہدایت اور سائے سے انبیاء و اولیاء کا وجود مراد لیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ علم کو قبض کرنے کے یہ معنی نہیں کہ اللہ علم کو تم سے کھینچ لے گا بلکہ اس سے مراد ہے اہلِ علم کو قبض کرنا۔ علماء آہستہ آہستہ اُٹھ جائیں گے اور قریب قیامت کے جب کوئی عالم نہ رہے گا تو لوگوں کی سرداری جاہلوں کے قبضہ میں آجائے گی۔ وہ فتوے دیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ آفتابِ ہدایت (یعنی

ذاتِ مقدس) نے انبیاء و اولیاء کے اسرار دنیا میں پھیلایا ہے اور وہی آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر اس سایہ کو اٹھاتا ہے یہاں تک کہ سب کو اٹھا لے گا اور ایسے بے دین جاہلوں کے رہ جانے تک ہوگا یہ کوئی عالم باقی نہ رہے گا۔ جاہل اپنے جاہلانہ فتووں سے لوگوں کو گمراہ کریں گے اور عالم کہلائیں گے۔ (فتفکروا یا اساتذۃ المعاہد علیہم والسلاطین المعاہد الاسلامیہ وائمۃ الزوایا الشرعیۃ بل انتم جاہلون ام عالمون بل انتم علی اعلام الھدیٰ تصعدون ام فی بیداء الجہل والضلال تعدون۔ کلا انما تذکرۃ فمن شاء ذکرہ)

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الخ یہاں سے بہت زیادہ روشن عقل رکھنے والوں کے لئے قدرت، وحدانیت اور نبوت کے دلائل کو بیان کیا تھا اہل بصیرت ہی نشانِ کو سمجھ سکتے تھے لیکن متوسط اور عامی طبقہ حقائقِ مذکورہ کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس جگہ سے ان دونوں گروہوں کی ہدایت کے لئے آثارِ ربوبیت اور علاماتِ قدرت کو واضح لفظوں میں ظاہر فرمایا ہے۔

لِبَاسًا۔ رات پردہ پوش ہے عیب، برہنگی اور گناہ کو چھپا لیتی ہے جس طرح لباس بدن کو چھپا لیتا ہے اور نیند ہر جاندار کے لئے راحت و چین حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ صاحب کشاف نے لکھا ہے کہ سبات موت کو کہتے ہیں۔ جب رات کو سب جاندار سو جاتے ہیں تو ایک سناٹا چھا جاتا ہے گویا سب مر جاتے ہیں اور قیامت کا سماں ہے۔ پھر دن کو سب اٹھتے ہیں تو گویا قبروں سے اٹھتے ہیں۔

وَالنَّوْمَ سُبَاتًا۔ جب انسان یا حیوان بیداری کی حالت میں اعضاء کی تمام قوتوں کو حرکت میں لاتا ہے۔ دماغ کی ظاہری اور باطنی قوتوں سے کام لیتا ہے مدرکہ اور فاعلہ قوتیں برسرِ عمل ہوتی ہیں تو تمام اعضاء میں اضمحلال اور کوفت پیدا ہو جاتی ہے۔ اندرونی قوتیں، بیرونی جاسوس آرام کے خواستگار ہوتے ہیں آنکھیں بے ساختہ بند ہو جاتی ہیں، قوتِ شنوائی اپنا کام چھوڑ دیتی ہے، سونگھنے اور چکھنے کی قوتیں معطل ہو جاتی ہیں، چھونے کی قوت بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ خارجی تعطل کے بعد دماغ کو کچھ چین ملتا ہے، اعضاء کو سکون میسر آتا ہے، صرف طبیعت بدنیہ اپنے اندرونی نظام میں مشغول رہتی ہے مگر اس کا حسی شعور و ارادہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ طبیعت بدنیہ مرتے دم تک اپنے کام میں منہمک رہتی ہے لیکن دماغ اور دیگر اعضاء کا تعطل ہر خواب کے وقت ہو جاتا ہے۔ اگر دماغ کافی طور پر اپنے عمل سے رک گیا تو استغراقی نیند آتی ہے اور اگر معدہ کے بخارات یا کسی اور اندرونی بیرونی عارضہ کے سبب اس کو کافی تعطل کا موقع نصیب نہ ہوا اور پریشان خواب دیکھتا رہا تو نیند ناقص ہوتی ہے اور اعضاءِ جسم کو ضرورت کے مطابق آرام نہیں ملتا مگر پھر بھی سکون ضرور حاصل ہوتا ہے۔ کم و بیش کا فرق ہے۔ یہ معنی تو اس صورت میں ہوں گے کہ سُبَات کے معنی راحت لئے جائیں، اور نشور سے مراد کاروبار کے لئے اٹھنا مراد لیا جائے اور اگر سُبات کا ترجمہ موت اور نشور کا ترجمہ حشر کیا جائے تو یہ جملہ بطور تمثیل یا استعارہ کے ہوگا۔ آدمی مرتا ہے تو اس کی موت کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ بحکمِ الٰہی اس کے اندرونی اور بیرونی اعضاء اپنا فریضہ ادا کرنا چھوڑ دیتے ہیں طبیعت و قوتیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ اس میں بدن کو برقرار رکھنے کی قابلیت نہیں رہتی، تیل ختم ہو جاتا ہے اس لئے چراغ بجھ جاتا ہے یا تیل موجود بھی ہوتا ہے تو کسی آندھی کے جھونکے سے بجھ جاتا ہے۔ بہرحال طبیعت مغلوب، حواس مفقود اور تمام قوتیں بیکار ہو جاتی ہیں۔ نیند میں یہ تمام امور تو نہیں ہوتے البتہ حواس کا تعطل، قوتوں کا سکون اور اعضاء کا اضمحلال ضرور ہوتا ہے۔ صرف طبیعت برسرِ عمل رہتی ہے۔ تو گویا نیند ایک گونہ موت ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے اَلنَّوْمُ اَخُو الْمَوْتِ نیند موت کی بہن ہے۔ پھر جب آدمی بیدار ہوتا ہے تو تمام قوتیں گویا زندہ ہو جاتی ہیں۔ حواس اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ اعضاء میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور قیامت کی سی چہل پہل شروع ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مُردے قبروں سے نکل کر زندہ ہو کر پھیلے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيَاحَ الخ۔ یہ بھی قدرت کی کارسازی ہے کہ جب انسان اور دوسرے جاندار بلکہ ہر سبزہ حرکت کے سبب اپنی رطوبت کو فنا کر چکا ہو اور رطوبت حاصل کرنے کی اس کو ضرورت ہوتی ہے تو خدا تعالیٰ اس کی ضرورت پورا کرنے کے اسباب پیدا کر دیتا ہے۔ بخاراتِ آبی کو اٹھاتا ہے اور پھر ان کا استحالہ اور انقلاب کرتا ہے اور بارش کی شکل میں ان کو نازل فرماتا ہے۔ بارش کے نزول سے پہلے ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں، ہواؤں کی رفتار اور کیفیت کو جاننے والے سمجھ لیتے ہیں کہ اب مینہ برسنے والا ہے۔ اس مینہ سے کیا فوائد ہوتے ہیں ان کا مختصر جامع ذکر آیت میں کیا ہے۔ پہلا فائدہ یہ ہے کہ چٹیل میدان اور خشک زمین شاداب اور سرسبز ہو جاتی ہے۔ گویا ان میں روحِ زندگی پڑ جاتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ چوپائے اس کو پیتے اور فنا شدہ رطوبت کا بدل حاصل کرتے ہیں اس کے علاوہ اور بھی فوائد ہیں جن کا تذکرہ آیت میں واضح طور پر نہیں کیا۔ مثلاً آبادیوں کو جراثیم سے پاک کرنا۔ کثافت کو دور کرنا، بیماریوں کو دفع کرنا، موسم کو خوشگوار بنانا۔ سامانِ فرحت بہم کرنا وغیرہ۔ پھر بارش کا امر بڑی دیکھو کہ نیچے سے جو بخارات اٹھتے ہیں وہ مختلف خاصیات و کیفیات کے حامل ہوتے ہیں۔ صاف بھی ہوتے ہیں گندے بھی ہوتے ہیں۔ لطیف بھی ہوتے ہیں کثیف بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا پانی ہی کر جب اوپر سے برستا ہے تو صاف شفاف اور پاک ہوتا ہے اس میں کوئی کثافت اور گندگی

نہیں ہوتی خود بھی پاک ہوتا ہے اور دوسری ناپاک چیزوں کو بھی پاک کر دیتا ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا۔ اس جملہ کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے:۔ (۱) ہم نے قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں ابر و باراں کی پیدائش وغیرہ کے احوال کو مکرر سہ کرر بیان کیا تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں، عبرت پکڑیں اور ہماری قدرت کو سمجھیں (۲) صَرَّفْنٰهُ میں ضمیر مینھ کی طرف راجع ہے۔ یعنی ہم نے تحقیق مطر کو باعثِ عبرت قرار دیا، ابر اٹھتا ہے کہیں برستا ہے کہیں نہیں برستا، ادھر سے آدھر جاتا ہے آدھر سے اِدھر آتا ہے۔ خدا تعالیٰ اس کو جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ ابن کثیر نے یہی مطلب بیان کیا ہے۔ (ابن عباس رضؓ اور ابن مسعود رضؓ نے فرمایا ہر سال بارش برابر مقدار میں ہوتی ہے کسی سال دوسرے سال سے کم نہیں ہوتی مگر اللہ اس کو جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ یہ فرما کر دونوں صحابیوں نے آیت مذکورہ تلاوت فرمائی جس سے معلوم ہوا کہ تصریف سے ابر کی تصریف مراد ہے اور صَرَّفْنٰهُ میں ضمیر مطر یا سحاب کی طرف راجع ہے۔ مفسر مواہب الرحمٰن نے بیان کیا کہ مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ شبانہ روز کی کوئی گھڑی ایسی نہیں کہ اس میں مینھ نہ آتا ہو مگر اللہ اس کو جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ ابن مسعود رضؓ نے مرفوعاً بیان کیا کہ کسی سال بہ نسبت دوسرے سال کے بارش زیادہ نہیں ہوتی لیکن اللہ نے روزی بانٹ دی ہے اور روزی کو بارش کے اندر دنیوی آسمان میں رکھا ہے۔ ہر سال مقرر وزن اور مقرر پیمانہ کے ساتھ اس کو نازل فرماتا ہے جب کوئی قوم گناہ کرتی ہے تو اللہ اُس قوم سے پھیر کر دوسری قوم پر برساتا ہے اور جب سب نافرمان ہو جاتے ہیں تو پھر میدانوں اور سمندروں پر برساتا ہے۔

فَاَبٰٓى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا۔ عرب کے باشندے عقیدہ رکھتے تھے کہ بارش کا سبب چند مخصوص ستاروں کا طلوع و غروب ہے چنانچہ نچھتر کو بارش کا سبب جانتے تھے۔ ہندوستان کے ہندوؤں کا بھی یہی عقیدہ ہے لیکن یہ عقیدہ کفر ہے۔ اسی کے متعلق خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اکثر لوگ باران رحمت کا انکار کرتے ہیں یعنی ستاروں کو بارش کا سببِ حقیقی جانتے ہیں۔ زید بن خالد جہنی سے مروی ہے کہ حدیبیہ میں ایک رات بارش ہوئی۔ صبح کو جب معمول حضورؐ نے ہم کو نماز پڑھائی اور نماز کے بعد فرمایا تم جانتے ہو کہ تمہارے رب نے اس رات کیا فرمایا؟ حاضرین نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول بخوبی واقف ہے۔ فرمایا اللہ نے فرمایا میرے بندوں نے ایسی حالت میں صبح کی کہ بعض کا مجھ پر ایمان ہے اور بعض کافر ہیں جنھوں نے کہا کہ فلاں ستارہ کی وجہ سے بارش ہوئی اُن کا ایمان ستاروں پر ہوا اور اللہ کا انھوں نے انکار کیا اور جنھوں نے کہا کہ اللہ کے فضل اور رحمت سے ہم پر بارش ہوئی تو اُن کا مجھ پر ایمان رہا اور ستاروں کا انھوں نے انکار کیا (رواہ مسلم فی صحیحہ)

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۝ مذکورہ بالا آیات میں دو مبحث کا بیان تھا ایک تو آفتاب کا طلوع اور اس سے سایہ کا پیدا ہونا دوسرا بارش کا نزول اور اُس سے زمین کا سرسبز ہونا۔ سورج سے دنیا میں روشنی پیدا ہوتی ہے لیکن ہر جگہ دھوپ نہیں ہوتی۔ جہاں خدا چاہتا ہے برساتا ہے اور نہیں چاہتا تو بارش نہیں ہوتی۔ خاص بندوں کی روحوں پر علمی اور عرفانی بارش کا فیضان بھی ایک قسم کا مینھ اور ایک خاص قسم کی روشنی ہے۔ یہ بارش اور روشنی ہمہ انسانوں پر نہیں ہوتی۔ پتھر پر پانی کی تاثیر نہیں ہوتی اور نہ چھتوں اور بڑے بڑے سایہ دار درختوں کے نیچے دھوپ پہنچتی ہے۔ روحانی فیضان یعنی نبوت کی بارش بھی ہر جگہ نہیں ہوتی اور نہ رسالت کا نور ہر شخص کے دماغ میں چمکتا ہے لیکن اگر خدا چاہتا تو ہر بستی اور ہر گاؤں میں نبی پیدا کر دیتا مگر ایسا کرنا چونکہ قانونِ قدرت اور مصالح عباد کے خلاف ہے اس لئے ایسا نہیں کیا۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ الخ۔ جب رسول اللہ کی نبوت دلائل سے ثابت ہو گئی تو آپ کا فروں کی طرف میلان کرنے کی انہیں ممانعت فرما دی۔ رسول پاکؐ کے متعلق بہر حال اطاعتِ کفار کا احتمال نہ تھا اس لئے روئے سخن عام مسلمانوں کی طرف قرار دینا بہتر ہے۔

جہاد کی مختلف قسمیں ہیں جن میں سے دو نمایاں حیثیت رکھتی ہیں: تلوار سے جہاد اور دلائل سے جہاد۔ یہاں موخر الذکر مراد ہے۔ اس کے دو سبب ہیں۔ اول یہ کہ جَاهِدْهُمْ بِهٖ کا ترجمہ بقول ابن عباس رضؓ یہ ہے کہ جہاد بالقرآن کرو یعنی حقائقِ قرآنیہ اور دلائل علمیہ کفار کے سامنے پیش کرو اور اس طرح ان کو شکست دو۔ اگر جہاد سیف مقصود ہوتا تو "بِهٖ" کو نہ لایا جاتا۔ دوسرے یہ کہ سورہ فرقان مکی ہے اور جہاد سیف کا حکم مدینہ میں نازل ہوا، مکہ میں اتنے طاقتور ہی نہ ہوئے کہ تلوار سے مدافعت کرنے کا حکم دیا جاتا۔

وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ

اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے ایک تو میٹھا اور تشنگی کو دور کرنے والا ہے اور دوسرا شور بد مزہ ہے اور ان دونوں کے درمیان اس نے مضبوط آڑ

حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۭ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا

کردی ہے اُس نے پانی سے آدمی کو بنایا پھر اُس کا نسب اور خسرال کا رشتہ قائم کیا اور تمہارا رب قادر ہے

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ۭ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰي رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ۝ وَمَآ

اور اللہ کے سوا ایسی چیز کو پوجتے ہیں جو نہ اُن کو نفع پہنچا سکتی ہے نہ نقصان اور کافر اپنے رب کی مخالفت پر ایک دوسرے کا مددگار ہوتا ہے

اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ قُلْ مَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَاۗءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى

تم کو صرف خوشخبری دینے اور ڈرانے کے لئے بھیجا ہے تم کہہ دو کہ میں اس کی مزدوری تم سے کچھ نہیں چاہتا ہاں جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار

رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ وَتَوَكَّلْ عَلَي الْـحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ۭ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ

کرے تم اُس زندہ خدا پر بھروسہ رکھو جس کو کبھی موت نہ آئے گی اور اسکی تعریف کے ساتھ پاکی بیان کرو وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے

خَبِيْرَۨا ۝ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَي

باخبر ہونے کیلئے کافی ہے اُسی نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کی درمیانی کائنات کو چھ دن کے دَور میں پیدا کردیا پھر وہ عرش پر جلوہ فرما ہوا

الْعَرْشِ ڔ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔــلْ بِهٖ خَبِيْرًا ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ

ہوا وہ بڑا مہربان ہے کسی باخبر سے پوچھ لو جب اُن سے کہا جاتا ہے رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں رحمٰن کیا چیز ہے کیا جس کو

اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ۝ۧ تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَاۗءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا

تم حکم دو اُسی کو سجدہ کرنے لگیں تمہارے اس قول سے اُن کی نفرت اور بڑھ جاتی ہے بابرکت ہے وہ خدا جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں چراغ اور

سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ

روشن چاند بنایا اور اُسی نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا اُس شخص کے لئے جو غور کرنا چاہے

يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝

یا شکرگزاری کا ارادہ کرے

تفسیر اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات پر ہم لکھ آئے ہیں کہ خیر و شر، حق و باطل اور نیکی بدی تو عام ہیں۔ اللہ کی کارسازی اور حکمت عالیہ کے قربان جائیے کہ اس نے نور کو ظلمت اور آفتاب کو سائے کے ساتھ ساتھ پیدا کیا اور ایک دوسرے کو لازم ملزوم قرار دیا۔ اہل بصیرت کے لئے دعوتِ فکر ہے کہ شور سمندر میں جب مختلف دریا جا کر ملتے ہیں تو دور تک ان دریاؤں کا دھارا مستقل طور پر الگ بہا جاتا ہے، ایک طرف شیریں پانی ہے اور اسی کے برابر دوسری طرف تلخ اور شور پانی ہے۔ دونوں کے درمیان نہ کوئی دیوار ہے نہ پردہ دونوں متصل ہیں لیکن اس کے باوجود دونوں مخلوط ہونے

نہیں پاتے۔ کھاری کا اتصال شیریں سے ہے مگر اختلاط اور آمیزش نہیں۔ مقام بصیرت ہے کہ پانی باوجود سیال اور رقیق ہونے کے اپنے قطرات کو دوسرے پانی کے قطرات سے جُدا رکھتا ہے اور مخلوط نہیں ہونے دیتا۔ ان دونوں کو باہم اختلاط و امتزاج سے روکنے والا کون ہے۔ محض قدرتِ خداوندی اور حکمتِ ایزدی۔ یہی حالت دنیا میں کفر و اسلام کی ہے، نیکی بدی کی ہے اور اچھائی برائی کی ہے۔ یہاں اچھے آدمی بھی ہیں اور بُرے بھی، مسلمان بھی کافر بھی، روشن دل والے بھی ہیں اور سیاہ باطن بھی لیکن دونوں میں امتیاز قائم ہے۔ جن کی طبیعتوں میں نیکی کوٹ کر بھری گئی ہے اور جن کے دلوں میں ایمان جما ہوا ہے وہ کسی طرح بدی کا اثر نہیں لے سکتے اور جو سرشتی بد ہیں یعنی بدی ان کی طبیعتِ ثانیہ ہو گئی ہے اُن کو ہر قسم کی نصیحت اور پند و موعظت بیکار ہے۔ اگر گھر گھر نبی بھیج دیا جائے تب بھی اشقیائے ازلی کے لیے بے سود ہے۔ باوجودیکہ پانی کی طرح انسان کی فطرت میں اثر پذیری کا مادّہ موجود ہے۔ مگر ہمہ گیر قدرتِ الٰہیہ کے زیر اثر ایک صنف دوسری صنف سے اثر پذیر نہیں ہوتی اللہ کے خلاف ہر کافر کمربستہ نظر آتا ہے لیکن آپس میں ہر ایک دوسرے کے لیے پُشت پناہ بنا رہتا ہے۔ کسی انسان یہاں تک کہ رسول اعظم میں بھی یہ طاقت نہیں کہ ان کو راہِ راست پر لے آئے۔ (ان) نصیحت کرنا، دوزخ سے ڈرانا اور جنت کی خوشخبری دینی اللہ کے پیغمبروں کا کام ہے۔ پیغمبروں کے جانشینوں کا کام ہے رسول اعظم کا کام بھی یہی ہے مگر سرشت بدل دینا اور کسی کا کام نہیں۔ ہر انسان مرج البحرین ہے ملکوتی قوت بھی اس میں موجود ہے۔ تمام روحانی قوتوں کا اشاک اس کے اندر ہے اور ساتھ ہی ساتھ شیطانی قوتیں بھی کارفرما ہیں۔ ایک دماغ، ایک روح ایک قلب ہے اور ایک ہی وقت میں دو متضاد حکمراں اس پر مسلط ہیں مگر دونوں میں حد فاصل عقل ہے جو باہم گڑبڑ نہیں ہونے دیتی۔ ملکوتی قوت اگر برسرِ اقتدار ہے تو آدمی کی طبیعت، اخلاق، اعمال، اقوال اور عقائد میں شیرینی ہوتی ہے۔ خلق خدا کو اس سے نفع پہنچتا ہے۔ اور شیطانی طاقت اگر غالب ہے تو طینت طبیعت اور پوری زندگی میں تلخی ناخوشگواری اور شوریت پیدا ہوتی ہے۔ کسی کو اس کے ہاتھ سے سکھ نہیں نصیب ہوتا۔ اُس کے عقائد شور، اعمال تلخ اور اقوال ناخوشگوار ہوتے ہیں۔ ہر انسان اگرچہ صورت شکل اور جسمانی کیفیات کے لحاظ سے مختلف نظر آتا ہے۔ ننھیال اور ددھیال ہر ایک کی جدا ہے مگر اللہ کی قدرت ہے کہ ایک ہی پانی سے سب کی تخلیق ہوئی ہے۔ ایسی حالت میں لازم تو یہ تھا کہ قدرتِ الٰہی کے سامنے ہر آدمی سرِ تسلیم جھکا دیتا۔ مگر بدسرشت کافر قادرِ مطلق خدا کو چھوڑ کر ایسے بے بس عاجز فرضی دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں جن کو نفع ضرر پہنچانے کا کوئی اختیار نہیں۔ اُس خدا سے جس کی رحمت کل کائنات کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے منہ موڑ کر محتاجِ مطلق جھوٹے معبودوں کی عبادت کرتے ہیں اور جب رحمٰن کل کی عظمت و کبریائی اور الوہیت کا اقرار کرنے کے لئے زمین عجز پر سرِ نیاز رکھنے کا حکم اُن کو دیا جاتا ہے تو بطور انکار و تعجب کہتے ہیں بائیں رحمٰن کیا چیز ہے۔ ہم تمہارے کہنے سے کیسے سر جھکا دیں۔ رحمٰن کیسا ہوتا ہے۔ غرض جو کافر ازلی ہیں اُن کو کوئی ہدایت مفید نہیں ہو سکتی ان کی پیدائش اس لئے کی گئی ہے کہ حق کا امتیاز نمایاں ہو جائے۔

تحلیل اجزاء

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ۔ یعنی اللہ نے دو طرح کے سمندر بہا دیئے اور دونوں کو باہم متصل رکھا۔ ایک شور دوسرا شیریں۔ دونوں کے درمیان ایک حد فاصل قائم کی جو آنکھوں سے اگرچہ نہیں دکھائی دیتی۔ دونوں میں کوئی آڑ اور پردہ نظر نہیں آتا مگر قدرت نے باوجود روانی کے دونوں کو مخلوط ہونے سے روک دیا۔ یہی حجاب قدرت ہے جو باہم آمیزش سے مانع ہے۔ بحر چونکہ عربی زبان میں سمندر کو کہتے ہیں اس لئے ہم نے توضیح مطلب میں خاص تیر کا لحاظ رکھا۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ حکیم مطلق کی غیبی قدرت نے ہر جگہ شیریں اور شور پانی کو ساتھ ساتھ رکھا ہے۔ آگرہ کے تمام کنوئیں تلخ ہیں لیکن شہر کے قریب جو دریائے جمنا بہہ رہا ہے وہ شیریں ہے۔ جمنا کی شیرینی سے شہر کے اندرونی کنوئیں اثر پذیر نہیں ہیں بلکہ بہت مقامات پر دو کنوئیں باوجود قریب ہونے کے شیرینی اور تلخی کا نمایاں فرق رکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ زمین کے اختلاف کے سبب ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ زمین کے اندر مسام ہیں، پانی ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ قریب کے دو پانی زمین کے مسامات میں نفوذ کر کے باہم دوسرے کو متاثر نہ کریں۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ

شبہ ہو سکتا ہے کہ سمندر دنیا میں شور ہی ہے۔ بحر روم ہو یا بحر ہند یا بحر ظلمات یا مختلف کھاڑیاں اور خلیجیں سب ہی کا پانی شور ہے پھر دوسرا شیریں سمندر کہاں ہے جس کے ساتھ شور سمندر کے ملنے کو قرآن نے قدرت کا عجوبہ خیز کرشمہ قرار دیا ہے؟ ابن جریر نے اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا ہے کہ تلخ بحر سے مراد ہے یہی سمندر جس کا پانی ساکن ہے خواہ کوئی سمندر ہو اور شیریں سمندر سے مراد ہیں دجلہ فرات اور نیل جیسے دریا کہ جب یہ جا کر سمندر سے ملتے ہیں اور بحری شکل اختیار کرتے ہیں تو دور تک اپنا دھارا جدا رکھتے ہیں اور اپنے دھارے پر بہتے ہیں اور باوجود شور سمندر کے پانی سے ملنے کے اپنے پانی میں ملاحت نہیں پیدا ہونے دیتے۔ ابن جریر اور ابن کثیر نے اسی توضیح کو پسند کیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ ۔ یہ بھی اللہ کی حکمت کی کارسازی اور احسانِ عظیم ہے کہ اُس نے انسان کو نطفہ سے بنا کر پیدا کیا پھر باہم ارتباط و محبت پیدا کرنے کے لئے دو قسم کا تعلق پیدا کر دیا ایک نسبی دوسرا خسرالی۔ یہی دونوں تعلق ہیں جن پر یگانگت موقوف ہے۔

فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ۔ مصباح میں خلیل ابن احمد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عورت کے رشتہ دار مرد سے صہر کہلاتے ہیں۔ عورت کے بھائی، باپ، خالہ، نانی، ماموں، چچا وغیرہ سب اصہار ہیں۔ زہری نے لکھا ہے کہ صہر خسرالی رشتہ داروں کو کہتے ہیں خواہ مرد کے خسرالی ہوں یا عورت کے (یہی صحیح ہے) آیت میں نسب سے مُراد یا تو صرف مرد ہیں کیونکہ مرد ہی سے سلسلۂ نسب وابستہ ہے اور صہر سے مراد عورت ہے۔ یا نسب سے وہ لوگ مراد ہیں جن سے کسی قسم کی قرابت ہو۔ اور صہر سے مراد وہ لوگ ہیں جن سے خسرالی رشتہ ہو خطیب اور بغوی نے موخر الذکر توضیح کو پسند کیا ہے۔

وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ۔ یعنی خدا کی قدرت عجیب ہے۔ پانی ایک ہی ہے۔ مادّہ میں کوئی فرق نہیں۔ مادّہ کے سرچشمہ میں کوئی فرق نہیں لیکن وہی مادہ کبھی مرد کی صورت اختیار کر لیتا ہے کبھی عورت کی۔ کبھی اس سے لڑکا بنتا ہے کبھی لڑکی۔ باوجود اتحاد مادّہ کے اصناف کا تفرقہ اور ہر صنف کی ساخت، اعضا کی شکل، رجحانات و میلانات اور اطوار و عادات میں امتیاز کس قدر نمایاں ہے۔ گویا جس طور پر پانی ایک ہی ہوتا ہے مگر شیرینی اور تلخی، خوشگواری اور ناگواری وغیرہ میں کھلا ہوا تفاوت ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک پانی سے بنے ہوئے مرد و عورت کی شکل، عادت، طبیعت وغیرہ میں نمایاں فرق ہوتا ہے اور جس طرح خوبصورتی، بدصورتی، خوش مزاجی اور بد مزاجی، ذہانت اور غباوت بلکہ تمام عملی اور فکری قوتیں مختلف ہوتی ہیں۔ اسی طرح مرغوباتِ طبع اور دماغی پسندیدگی میں بھی تفاوت ہے۔ کوئی کفر کو پسند کرتا ہے، کوئی ایمان کا شیفتہ ہے، کوئی گمراہی اور شرک پر ست رہا ہے تو کوئی ہدایت و اسلام کا دلدادہ ہے۔ معلوم ہوا کہ خیر و شر اور اسلام و کفر کا مقابلہ اسی طرح خلقی ہے جس طرح اختلافِ صنفی اور امتیازِ شکل و وجدان پیدائشی ہے۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ الخ۔ یہاں تک تو عموم قدرت کی چہارگانہ دلائل کا بیان تھا جن سے اللہ کی قدرت کی ہمہ گیری اور حکمت کا احاطۂ تامہ ہوتا تھا اور عموم قدرت و حکمت کے ثبوت سے ربوبیت عامہ کا اظہار ہوتا تھا اور ربوبیت ہی باعث الوہیت ہے۔ اس لئے الٰہ مطلق کی توحید اہل بصیرت کے لئے بالکل واضح ہو گئی لیکن کور باطن کفار ان نکات و حقائق سے ناواقف ہوتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ استحقاقِ الوہیت کس طرح ہو سکتا ہے اور ربوبیت کا معیار کیا ہے۔ اس آیت میں کفار کی اسی حماقت کو واضح کیا ہے کہ اللہ کے مقابلہ کرنے، اس کی توحید کو مٹانے، حق کو مغلوب کرنے اور معصیت و شرک کی پشت پناہی کرنے کے لئے تو کفار باہم مددگار ہوتے ہیں اور مل کر حق و اہلِ حق کا مقابلہ کرتے ہیں مگر ہیں اتنے کور دماغ کہ الوہیت کے معیار سے بھی ناواقف ہیں۔ وہ بے بس بے کس مخلوق جن میں کسی قسم کی طاقت ہی نہیں اور درحقیقت وہ نہ کسی کو نقصان پہنچا سکتی ہے نہ فائدہ اس کی پرستش کرتے ہیں اور قادر مطلق خدا سے منہ موڑتے ہیں۔

عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ۔ اس جگہ ظہیر کے معنی میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ ابو عبیدہ نے لکھا ہے کہ پس پشت چیز کو ظہیر کہتے ہیں اور دستور ہے کہ جس چیز کی قدر نہ ہو اس کو پیٹھ کے پیچھے ڈال دیتے ہیں، اس لئے ظہیر کا ترجمہ حقیر، ذلیل، بے قدر ہو گیا۔ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ ظہیر کے لغوی معنی ہیں پشت پناہ اور مددگار۔ ابن کثیر نے مددگار ترجمہ کیا ہے۔ مجاہد اور سعید بن جبیر کا بھی یہی قول ہے۔ زید بن اسلم نے لکھا ہے کہ ظہیر ولی دوست کو کہتے ہیں۔ بہر حال مددگار ترجمہ کیا جائے یا ولی دوست، یہاں مطلب یہ ہے کہ اللہ کے خلاف گناہ، شرک، توحید کو محو کرنے اور باطل کو پھیلانے کے لئے کفار شیطان کے دوست اور اپنے ساتھیوں کے مددگار ہوتے ہیں۔ اس سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر نبوت کی کیا ضرورت باقی رہی۔ جب کفار اہلِ حق کے مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار ہیں اور کسی طرح صداقت کو قبول نہیں کر سکتے تو پیغمبر کس مرض کی دوا ہیں اور آسمانی ہدایات کی کیا ضرورت ہے؟ اس شبہ کو دور کرنے اور رسول پاک کو تسلی دینے کے لئے فرماتا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۔ یعنی اے رسول! تمہارا کام صرف یہ ہے کہ کافروں کو آئندہ ابدی ہلاکت سے ڈراؤ اور مومنوں کو دائمی نجات کی بشارت دو۔ کسی کو زبردستی مسلمان بنانا تمہارا کام نہیں، نہ کسی کے ہدایت یاب ہونے نہ ہونے کی باز پرس تم سے ہو گی۔ بطور اتمام حجت یہ پیام بھی پہنچا دو اور کافروں سے کہہ دو کہ

مَآ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ الخ۔ اس ہدایت و موعظت و نصیحت کا کوئی معاوضہ میں تم لوگوں سے نہیں چاہتا۔ میری مزدوری صرف یہی ہے کہ تم اللہ کے راستہ پر چلو اور بس۔ یہ فقرہ بڑی شفقت سے بھرا ہوا ہے۔ جس طرح کوئی استاد اپنے شاگرد کو بڑی شفقت محبت سے پڑھا کر عالم بنا دے اور پھر کہے کہ میں اپنی کارگزاری کی کوئی اُجرت یعنی تم سے نہیں چاہتا۔ میری اُجرت یہی ہے کہ تم اپنے علم کو یاد رکھو اور اس پر عمل کرو۔ منشا یہ ہے کہ پڑھے ہوئے کو یاد رکھنا تمہارے ہی نفع کا سبب ہے، لیکن چونکہ ہر وقت تمہارا نفع پیش نظر ہے، اور مجھے تم سے اتنی محبت ہے کہ تمہارے فائدہ کو اپنا فائدہ سمجھتا ہوں، اس لئے مجھے اس سے ایسی مسرت ہوتی ہے۔

اُجرت لینے سے ہوتی ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الخ۔ کفار چونکہ ایک دوسرے کے پشت پناہ اور مددگار تھے۔ رسول پاک اور مسلمانوں سے برسرپیکار تھے اور ہر وقت دکھ پہنچانے کے درپے تھے۔ کل جزیرۂ عرب میں حضور اقدسؐ کا طرفدار سوائے چند مسلمانوں کے کوئی نہ تھا۔ گویا ظاہری مدد کے تمام اسباب منقطع تھے۔ اس لئے بطور تسلی ارشاد فرماتا ہے۔ تم اس خدا پر بھروسہ رکھو جو کبھی معطل ہونے والا نہیں۔ نہ کبھی اس کی قدرت طاقت اور احاطۂ علمی کو موت آسکتی ہے۔ یعنی ایسے قادر توانا کی موجودگی میں کسی کی عداوت و کینہ توزی کی پرواہ نہ کرو۔ اس میں تعریض ہے کفار پر کہ ان کو اپنی قوت مال اور جتھے پر ناز ہے جو سراسر حماقت ہے کیونکہ یہ تمام چیزیں فانی ہیں، زوال پذیر ہیں انحصار تو اس قادر مطلق کی ہے جو لازوال اور ناقابلِ فنا ہے۔

فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ۔ احادیث میں آیا ہے کہ خدا تعالےٰ نے کل عالم چھ روز میں پیدا کیا۔ اس کی مکمل تشریح ہم مختلف مقامات پر لکھ آئے ہیں۔ مزید تشریح موجب طوالت ہے۔ یہاں اس امر کو ذکر کرنے سے یہ منشاء معلوم ہوتا ہے کہ تمام کائنات کا پورا انتظام تدریجی ہے۔ قانونِ قدرت ہے کہ ہر کام کی تکمیل آہستہ آہستہ ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ عالم کی پیدائش بھی دفعتہً ایک دم سے نہیں ہوئی بلکہ خدا نے چھ روز کے متفرق اوقات میں کائنات کی تخلیق کی۔ اگرچہ اس کی قدرت کا دائرہ بہت وسیع ہے وہ اگر چاہتا تو آن کی آن میں پورے عالم کو پیدا کر دیتا۔ مگر ہر کام میں آہستگی قانونِ قدرت کا عین منشا ہے پس تمام کافروں کو ایک دم میں مسلمان کر دینا یا دفعتہً سب کو غارت کر دینا اگرچہ خدا کی قدرت میں ہے مگر وہ دین کی اشاعت اور اسلام کا غلبہ آہستہ آہستہ کرنا چاہتا ہے اس لئے اس نے کفار کو ڈھیل دے رکھی ہے۔ پس کفار کی ایذا رسانی سے رسول پاک اور مسلمانوں کو تنگ دل نہ ہونا چاہیئے اور یقین رکھنا چاہیئے کہ شش روزہ تخلیقِ عالم کے بعد جس طرح عرشِ الٰہی کا ظہور ہوا۔ اسی طرح اس تدریجی نشوونما کے بعد آخر میں اسلام کا عام تسلط ضرور ہوگا اور مسلمان لامحالہ برسر اقتدار آئیں گے۔

فَسْئَلْ بِهِ خَبِيرًا۔ اس جملہ میں بظاہر خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے مگر رسول اللہؐ تو خود سب سے زیادہ حقائقِ کائنات سے واقف اسرارِ قدرت کے عالم اور حکمتِ الٰہیہ کے عارف تھے۔ اولیاء انبیاء اور ملائکہ میں سے کوئی بھی آپ کی برابر معرفت نہ رکھتا تھا۔ پھر دوسرا عالم ایسا کون ہو سکتا تھا جس سے دریافت کرنے کا حکم حضورؐ کو دیا جاتا۔ اس لئے سمجھ لینا چاہیئے کہ روئے خطاب رسول اللہ کی طرف نہیں بلکہ عام لوگوں کی طرف ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو آسمانی علوم اور عقلی معارف کے عالم ہیں ان سے دریافت کر لو۔ وہ سب اللہ کی غیر متناہی قدرت اور محیطِ کل حکمت کی تصدیق کریں گے۔ بات یہ ہے کہ ہر شخص میں یہ قابلیت نہیں کہ خدا تعالےٰ اس کو مخاطب بنائے اور اصلاح عام مقصود ہے اس لئے خطاب تو تقریباً ہر جگہ رسول اللہ کو فرمایا ہے مگر اکثر مقامات پر روئے سخن عام لوگوں کی طرف ہے۔

اسْجُدُوا لِلرَّحْمٰنِ۔ رحمٰن کا لفظ اگرچہ عربی ہے۔ فعلان کے وزن پر ہے مادہ رحم ہے مگر صراحتِ قرآنی سے پہلے عرب کے باشندے نہ خدا کو رحمٰن کہتے تھے نہ اپنے دیوتاؤں کو اس لئے اللہ کا صفاتی نام رحمٰن سن کر ان کو تعجب ہوا اور جب ان کو حکم دیا گیا کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو اظہارِ تعجب اور انکار کے طور پر کہنے لگے:۔

وَمَا الرَّحْمٰنُ۔ رحمٰن کیا چیز ہے؟ یعنی اللہ کو رحمٰن کہنے سے انھوں نے قطعاً انکار کر دیا اور چونکہ رحمٰن کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا اس لئے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور بولے رحمٰن کیا چیز ہے؟

أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا۔ کیا ہم اس چیز کو سجدہ کریں جس کو سجدہ کرنے کا تم حکم دے رہے ہو۔ یعنی جس چیز کا تم نے رحمٰن نام رکھ چھوڑا ہے ہم اس کو سجدہ نہیں کر سکتے۔ تعجب ہے کہ مفسر حقانی نے اپنی تفسیر کے حاشیہ پر لکھا ہے کہ بعض کہتے ہیں کفار نہیں جانتے تھے کہ رحمان اللہ کا نام ہے مگر یہ ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ لفظ عربی ہے بلکہ تکبراً خدا سے انکار کرتے تھے انتہیٰ۔ اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مفسر حقانی کے نزدیک کافروں کو علم تھا کہ اللہ کا نام رحمٰن ہے۔ شاید مفسر مذکور نے اس آیت پر غور نہیں کیا۔ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا میں لفظ مَا بتا رہا ہے کہ کفار کے نزدیک رحمٰن خدا کا نام نہ تھا ورنہ بجائے مَا کے لفظ مَنْ استعمال کیا جاتا اور آیت اس طرح ہوتی أَنَسْجُدُ لِمَنْ تَأْمُرُنَا۔ اس کے علاوہ صلح حدیبیہ کے صلحنامہ کے الفاظ مفسر مذکور کو یاد نہیں رہے جو غزوات کی تمام کتابوں میں مذکور ہیں کہ جب صلحنامہ کے کاتب نے صلحنامہ لکھتے وقت شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ آخر میں محمد رسول اللہ لکھا تو قریش کے نمائندے نے لفظ رحمٰن سے انکار کر دیا اور آخر میں سے لفظ رسول اللہ مٹوا دینا چاہا اور کہا ہم رحمٰن سے واقف نہیں۔ اپنی تحریر کا آغاز باسمک اللّٰھم سے کرتے ہیں۔ اس لئے آغاز تحریر میں یہی الفاظ لکھو الخ۔ یہ ردّ و قدح صاف بتا رہی ہے کہ کفار کے نزدیک رحمٰن خدا کا نام نہ تھا۔ مفسر حقانی نے جو بعض کی طرف اس قول کو منسوب کیا پھر اس کے غیر مسلّم ہونے کی صراحت نہیں کی ہے یہ غلط ہے۔ تمام علماء کا یہی قول ہے کہ کفار کے نزدیک رحمٰن خدا کا نام نہ تھا بلکہ مسیلمہ کذاب کو لوگ

کے لقب سے ذکر کرتے تھے۔ بہ اجماع ائمہ حنفیہ اس آیت پر سجدہ واجب ہے۔

وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا - یعنی سجدہ کے حکم سے کفار میں نفرت و سرکشی کا اضافہ ہوتا ہے۔ ضحاک کا قول ہے کہ اس جگہ حضور اقدس، حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت عمرو بن عنبسہؓ اور حضرت عثمان بن مظعونؓ نے فوراً سجدہ کیا۔ مشرکین و کفار پھر بھی متأثر نہ ہوئے بلکہ مسجد کے کنارے جا کر ہنسنے لگے۔ اس فقرے سے کفار کی ہنسی کی طرف اشارہ ہے۔

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ بدی جن لوگوں کی سرشتی چیز ہو جاتی ہے ان کو نیکی سے قطعاً نفرت ہو جاتی ہے۔ ابر رحمت کی بارش سے اُن کے طبعی خس و خاشاک میں مزید عفونت بڑھتی ہے۔ ہر پیام ہدایت اُن کے لئے موجب گمراہی بن جاتا ہے۔ یہی حالت کفار مکہ کی تھی۔ قرآن پاک کا جب کوئی جدید حکم حکمت و ہدایت کا بار اپنی رحمت لے کر نازل ہوا اُن کی گمراہی بڑھی اور زحمت میں اضافہ ہوا یہاں تک کہ اُس خدا کو جس کی خصوصی صفت رحمٰن ہے ایک سجدہ کرنے میں بھی اُن کو تکلیف ہوتی تھی بلکہ اپنی خرابی نظر نہ آتی تھی۔ اُن کو اتنی سمجھ بھی نہ تھی کہ لفظ رحمٰن کیسی گوناگوں رحمتوں کا حامل ہے اور رحمٰن کو سجدہ کرنے سے نہ فقط یہ کہ اہلِ استحقاق کو دونوں جہان کی کامیابی حاصل ہوتی ہے بلکہ مجرموں کے جرائم بھی آب رحمت سے دُھل جاتے ہیں مگر کم فہم کوتاہ بیں اور قاصر دانش والے اس نکتہ کو کیا سمجھ سکتے تھے۔ انھوں نے تو لفظ رحمٰن کا ہی مضحکہ اُڑانا شروع کر دیا اور ماستہزاءً اللہ کو بے عقل حیوانوں اور عدیم الحیٰوۃ چیزوں کی فہرست میں داخل کر کے کہنے لگے مَا الرَّحْمٰنُ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا - فلکیات کے ماہروں نے صراحت کی ہے کہ آسمان کی خیالی تقسیم بارہ حصوں پر ہے اور خربوزہ کے قاشوں کی طرح ہر حصہ دوسرے سے ممتاز ہے۔ ہر حصہ کو برج کہتے ہیں۔ ہر برج میں مختلف ستارے نظر آتے ہیں جو کٹتے جاتے اور جمع ہوتے ہیں اور ستاروں کے اجتماع سے مختلف صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ کہیں شیر کی صورت کہیں مچھلی کی کہیں بچھو کی۔ انہی اشکال کی مناسبت سے ہر برج کا نام رکھ دیا گیا ہے۔ مثلاً برج اسد، برج ثور، برج حوت، برج عقرب، بارہ بروج کی ترتیب اس طرح ہے۔ حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو، حوت، فصول کا تبادلہ موسموں کا اختلاف اور کل سفلی واقعات و سوانح کا وقوع یہاں تک کہ طبائع و اخلاق کا اختلاف بھی انہی بروج میں ستاروں کے خروج و دخول سے ہوتا ہے۔ جب آفتاب برج حمل میں آتا ہے تو بہار شروع ہوتا ہے اور حوت پر سردی ختم ہو جاتی ہے۔

مجاہد، سعید بن جبیر، ابو صالح، حسن بصری اور قتادہ کا قول ہے کہ بروج بڑے بڑے ستارے ہیں۔ یہ قول بھی حکماء کے قول کے خلاف نہیں۔ کیونکہ چند ستاروں کے اجتماع سے جو خاص شکل بن جاتی ہے اُس کو برج کہا جاتا ہے۔ گویا چند ستاروں کے اجتماع سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا ستارہ بن گیا۔ یہی علمائے مذکورہ کا مطلب ہے۔ حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، محمد بن کعب، ابراہیم نخعی اور سلیمان اعمش کا قول ہے کہ یہ حفاظت کرنے والے ملائکہ کے ٹھکانے ہیں۔ ان بزرگوں نے وقت نظر سے کام کیا ہے چونکہ اہل بصیرت کے نزدیک تمام نظام کائنات کا تحفظ باطنی قوتوں کے ذریعے سے جن کو شریعت میں ملائکہ کہا جاتا ہے ہوتا ہے۔ اور ان قوتوں (ملائکہ) کے مرکز یہی بروج ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ بروج ملائکہ کے ٹھکانے ہیں۔ لیکن شریعت میں تعداد بروج کی کوئی صراحت نہیں۔ ہاں لفظ بروج سے استخراج کیا جا سکتا ہے کہ برجوں کی تعداد نو سے یقیناً زائد ہے کیونکہ لفظ بروج فعول کے وزن پر ہے اور عربی زبان میں فعول کی جمع کثرت کا وزن ہے جس کا اطلاق دس سے کم پر نہیں ہو سکتا۔

وَقَمَرًا مُّنِيْرًا - دوسری آیت میں آیا ہے وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّالشَّمْسَ سِرَاجًا۔ بعض مفسرین نے صراحت کی ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ چاند کی روشنی مستقل ہے۔ عام طور پر جو علمائے فلکیات چاند کی روشنی کو سورج کا پرتو اور انعکاسی اثر کہتے ہیں وہ غلط ہے جس طرح سورج بذات خود روشن ہے اسی طرح چاند بھی نورانی چیز ہے۔ حاصلِ ارشاد یہ ہے کہ چاند سورج کی گردش اور بروج سے اُن کا طلوع و غروب قدرت الٰہیہ پر دلالت کرتا ہے۔ انسانی سرت و حیات کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ اللہ کی رحمت عامہ کا ثبوت اس سے ملتا ہے۔ اگر چاند رات کو اور سورج دن کو نہ ہوتا تو روشنی عالم میں کہاں سے آتی۔

جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً - یہ بھی قدرت کی کارسازی ہے کہ رات کے بعد دن آتا ہے اور دن کے بعد رات۔ نہ ہمیشہ رات رہتی ہے کہ تمام کاروبار معطل ہو جائیں۔ نہ ہر وقت دن رہتا ہے کہ سکون کی کوئی گھڑی نہ ملے۔ مجاہد و قتادہ نے خِلْفَةً کا ترجمہ مخالف یعنی رات دن کے مخالف ہے اور دن رات کے۔ ایک روشن ہے دوسری تاریک۔ کبھی رات بڑی دن چھوٹا اور کبھی دن بڑا رات چھوٹی۔ اگر یکسانیت اور ایک جیسی حالت ہوتی تو نظام کائنات قائم نہ رہتا۔ بہر حال نصیحت پذیر قلب اور عبرت آموز دماغ رکھنے والوں کے لئے چاند سورج اور شبانہ روز کی تخلیق اور ان کے رد و بدل میں اللہ کی ہمہ گیر قدرت اور عمومی رحمت کو جاننے اور رحمٰن عالم کے احسانات کا شکر ادا کرنے کا غیر محدود ذخیرہ موجود ہے۔

مقصودِ بیان

اللہ کی عمومی قدرت اور محیطِ کل حکمت کا اظہار۔ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ کا اصل مفہوم تو وہی ہے جس کو تحلیلِ اجزاء کے ذیل میں ہم لکھ آئے ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اس سے کفر و اسلام اور حق و باطل کی طرف اشارہ سمجھا جائے۔ عالم میں باوجود ظاہری مساوات اور نوعی یکسانگت کے طبائع، اطوار اور خو خصلت کا اختلاف موجود ہے۔ انسان کی اندرونی تخلیق بھی مختلف قوتوں سے ہوتی ہے جسمانی ساخت بھی جدا جدا عناصر کے اثرات ہیں۔ پس یہی حالت مختلف انسانوں کی ہے۔ باوجود ہم نوع ہونے کے کافر، مومن، نیک چلن، بدچلن، خوش اعمال، بداعمال، ہدایت یافتہ، گمراہ، حق طلب اور ناحق کوش سب ہی موجود ہیں اور حق و باطل کے یہی دو سمندر ہیں جو دنیا کو محیط ہیں لیکن ایک دوسرے میں آمیز ہونے کی طاقت نہیں رکھتا۔ خدا تعالیٰ نے دونوں کے درمیان فطری اور عقلی حدِ فاصل قائم کر دی ہے۔ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ کافر داخلی بصیرت سے کورے ہیں، باوجودیکہ اپنے معبودوں کو بیکس بے بس دیکھتے اور جانتے ہیں اور ان میں کسی قسم کا استحقاق الوہیت و معبودیت نہیں پاتے مگر پھر بھی اُن کے پرستار بنے ہوئے ہیں۔ اس سے استحقاقِ الوہیت کی ناقابلِ انکار دلیل کا بھی استنباط کیا جا سکتا ہے۔ رسولِ پاکؐ کے بشیر و نذیر ہونے کی صراحت اور اس سے درپردہ اس طرف اشارہ کہ رسول کسی کو ہدایت یاب بنانے اور گمراہی سے نکالنے کے کفیل نہیں۔ تبلیغ کا اجر طلب کرنے کی ممانعت۔ اس سے نصیحت پکڑنی چاہیے اُن دین فروش واعظوں کو جو وعظ کی فیس مقرر کرتے یا بغیر مقرر کئے لینے کے درپے رہتے ہیں۔ تبلیغِ اسلام کی اُجرت قطعاً ناجائز ہے۔ یہ دین فروشی ہے جو صراحتہً حرام ہے۔ اُن حافظوں کو بھی عبرت حاصل کرنی چاہیے جو روپیہ دو روپیہ لے کر میت کے لئے قرآن پڑھتے ہیں۔ لیکن جب واعظ تبلیغ کی اُجرت نہ لیں گے تو کھائیں گے کیا۔ ایسے پیشہ وروں کو بیدار کرنے کے لئے فرمایا کہ خدا حی ہے اس کی قدرتِ علم اور خبر گیری کو موت نہیں آسکتی۔ اس پر بھروسہ رکھنا چاہئے وہ خود روزی کے اسباب پیدا کر دے گا۔ تخلیقِ عالم چھ دنوں میں کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ قانونِ قدرت کے مطابق ہر چیز کی تکمیل آہستہ اور تدریجاً ہوتی ہے۔ دفعتہً کسی کام کا ہو جانا گو ممکن ہے مگر ضابطہ قدرت کے خلاف ہے۔ رحمٰن اللہ کا خصوصی نام ہے۔ کفار اللہ کو رحمٰن نہیں کہتے تھے۔ آسمان پر برج ہیں اور ان برجوں میں چاند سورج آتے جاتے ہیں۔ شبانہ روز کی پیدائش اور اُن کا باہمی تبادل اپنے اندر درسِ بصیرت رکھتا ہے مگر عبرت آموزیِ دانش اور شکر گزار قلب کی ضرورت ہے۔ وغیرہ

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝

رحمٰن کے بندے وہ لوگ ہیں جو زمین پر آہستگی سے چلتے ہیں اور جب جاہل اُن سے بات کرنے لگتے ہیں تو وہ سلامتی کی بات کہہ دیتے

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ

ہیں اور وہ لوگ ہیں جو رات بھر اپنے رب کے سامنے سجدہ اور قیام کرتے ہیں اور وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم سے دوزخ کا عذاب دور رکھ

اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا

بلاشبہ اُس کا عذاب لازم ہونے والا ہے وہ بُری جگہ اور بُرا مقام ہے اور وہ لوگ ہیں کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو فضول

وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ

خرچ نہیں کرتے اور نہ کنجوسی کرتے ہیں بلکہ ان دونوں کے درمیان ان کا خرچ ہوتا ہے اور وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو شریک کر کے عبادت نہیں کرتے اور نہ

النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝ يُضٰعَفْ

خلافِ حق کسی ایسے شخص کو قتل کرتے ہیں جس کا قتل کرنا اللہ نے حرام کر دیا ہے اور نہ وہ زنا کرتے ہیں اور جو ایسا کرے گا وہ عذاب پائے گا قیامت کے دن

لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيهِ مُهَانًا ۝ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا

اُس کا عذاب دوگنا کر دیا جائے گا اور خوار ہو کر ہمیشہ اس میں رہے گا ہاں جس شخص نے توبہ کرلی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے

فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ

ایسے لوگوں کی برائیاں خدا نیکیوں سے بدل دے گا اور اللہ غفور رحیم ہے اور جس نے توبہ کرلی اور نیک عمل کیے وہ بلاشبہ

يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَا

اللہ کی طرف ایسا رجوع کرتا ہے اور وہ لوگ ہیں جو جھوٹی شہادت نہیں دیتے اور جب بیہودہ بات کی طرف سے گزرتے ہیں تو بزرگانہ طریقہ پر اور وہ لوگ ہیں کہ

ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ

جب اُن کو اُن کے پروردگار کی آیتوں سے نصیحت کی جاتی ہے تو بہرے اندھے ہو کر اُن پر نہیں گرتے اور وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو ہماری بیبیوں کی اور ہماری

ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا

اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا چونکہ انھوں نے صبر کیا اُس کے صلہ میں انہی لوگوں کو جنت کے بالاخانے دیئے جائیں گے اور وہاں

تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۗ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۚ

دعائے خیر و سلام سے ان کا استقبال کیا جائیگا اس کے اندر وہ ہمیشہ رہیں گے وہ اچھا ٹھکانا اور رہنے کی جگہ ہے (اے نبی) کہہ دو کہ اگر تمہاری دعا نہ ہوتی تو میرا پروردگار تمہاری ذرا بھی پروا

فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ۝

نہ کرتا تم جھٹلا چکے اب اُس کا وبال لازم ہوگا

ع ۶ ربع

تفسیر یہ آیات اور اس کے بعد نہایتے سورت تک کل آیات باہم مربوط ہیں۔ خدا تعالیٰ نے ان میں کامل الایمان فرماں پذیر بندوں کے مخصوص احوال بیان کئے ہیں۔ جن کو مخصوص شمائیہ اسلام کہا جائے تو مناسب ہے۔ ایمان باللہ، عبادات توکل، دعا، شرافت نفس، فروتنی، تواضع، امن عام کی طلب، اقوام کی زندگی، حق تلفی سے اعراض، اخلاق ذمیمہ سے اجتناب، غرض اسلامی فرائض و شعائر کی جامع تعلیم ان آیات میں دی ہے۔ تحلیل اجزا کے وقت ہم تفصیل کریں گے یہاں مختصر تفسیری نوٹ ضروری ہے۔ یہ تو معلوم ہے کہ اللہ رحمٰن ہے۔ اس کی رحمت ہمہ گیر ہے، محیط کل ہے اور کائنات کے ذرہ ذرہ پر چھائی ہوئی ہے۔ نظام عالم کو امن سکون اور عافیت سے چلانے کے لئے اس نے اپنی لامتناہی حکمت و قدرت کے خزانے کھول دیئے ہیں۔ آسمانوں کو بنانا، اس میں ستارے پیدا کرنا پھر ستاروں کو رواں کرنا، ان کے طلوع غروب اور ٹھہرانے کے مقامات مقرر کرنا، رات اور دن کو پیدا کرنا اور باہم مبادلہ کرنا اور ہر ایک کی کیفیت، حالت اور فوائد میں اختلاف قائم رکھنا، ہواؤں کی روانی اور دریاؤں کی طغیانی، ابر باراں کی بارانی اور آفتاب کے پیچھے سایہ کی روانی، شیریں اور تلخ سمندروں کو جمع کرنا، ضدین کو ملانا اور ہر ایک کو اس کے راستہ پر چلانا، سمندروں سے بخارات کو اٹھانا، فرورت منتخلہ کی فضا میں کھینچ کر لانا اور ہوا کو پانی کی شکل دے کر تشنہ زمین پر برسانا پھر اس سے سبزہ، بیل، پھول اور غلہ پیدا کرنا، جھیلیں، کھاڑیاں، تالابوں اور گندلوں کو کر اور اس طرح پرندوں اور درندوں کی ضرورت زندگانی کو پورا کرنا رحمت عامہ کا محسوس کرشمہ ہے۔ انسان کو ہوش، حواس، ظاہری اور باطنی قوتیں عطا کرنا، عقل و بصیرت کی دولت سے اس کے دماغ اور معانی فضا کو منور کرنا، کائنات روح و قلب پر آفتاب نبوت کو پرتو فگن کرنا، بصیرت بستہ اور عقل خفتہ لوگوں کی روحوں پر نور کی لمعہ ریزیاں کرنے کے لئے انسانی شکل کی قندیلوں میں نور مجسم کی شمعیں روشن کرانا اور تاریک دلوں کی اندھیری دور کرنے کے لئے ہدایت کے ستاروں کو چمکانا یعنی رازخانہ غیب سے قوانین

ہدایت دے کر بھولے بھٹکوں کو راستہ بتانے کے لئے انبیاء و مرسلین کو بھیجنا اللہ کی بلا انتہا اور بے پناہ رحمت کا روحانی جلوہ ہے۔ غرض رحمت یزدانی اور ربوبیت ربانی نے نظام کائنات کو فساد سے بچانے کے لئے اور تباہی و بربادی سے محفوظ رکھنے کے لئے وہ کچھ کیا جس کا تصور کرنا انسانی مدرکات کی رسائی سے بالاتر ہے۔

اور یہ بھی معلوم ہے کہ انسان کی ساری کائنات ایک خاص نظام کے زیر اثر چل رہی ہے۔ تمام ساکن و متحرک دنیا قانون فطرت کی مسخر ہے۔ اپنے طبعی دائرہ کے اندر رہتے ہوئے ارتقاء کے منازل طے کرنا ہر فرد کے پیش نظر ہے۔ عناصر بسیطہ ہوں یا مرکبات ثنائیہ یا جامد و ساکن معدنیات یا نامی نباتات یا حساس حیوانات یا فضائی کائنات یا عالم بالا کی مخلوقات سب اپنے مخصوص نوعی ضابطہ کے زیر عمل ہیں کسی کی مجال نہیں کہ اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے سے سرتابی کرے یا نظم عالم کو برباد کرنے کی کوشش کرے۔ مگر انسانی فہم و فکر رکھنے والا انسان، ہوش و بصیرت کا مالک انسان، روح و قلب کا حامل انسان کس قدر کج رو، کج خلق، کج دماغ واقع ہوا ہے۔ قانون قدرت سے سرکشی کرتا ہے، ضابطۂ فطرت کی خلاف ورزی کے درپے رہتا ہے، بلندی کی طرف اُڑنے کی بجائے پستی کی طرف دوڑتا ہے، عروج کی جگہ ہبوط اختیار کرتا ہے، امن کی جگہ فساد اور آبادی کی کوشش کے عوض تباہی و بربادی پھیلانے کا ساعی رہتا ہے، باوجود عقل و خرد رکھنے کے فطرت کے قانونی دفعات کو نہیں سمجھتا، راہِ مستقیم کو چھوڑ کر خواہشات کی پگڈنڈیوں پر سرگرداں و حیران پھرتا ہے، آنکھوں میں نور رہتے ہوئے تباہی کے غاروں میں گرتا چلا جاتا ہے، عام شاہراہ کھلی ہوئی ہے مگر خارزار میں اُلجھتا پھرتا ہے، مقصود تخلیق سے غافل، قانونِ فطرت سے جاہل اور خلق و خالق کے تعلقات سے ناواقف ہے، رحمتِ رحمانی اور احسانِ ربانی کا تو تقاضا یہ تھا کہ عقل و خرد رکھنے والا انسان اس کارگاہ قدرت میں کسی کو اللہ کا شریک نہ قرار دیتا اور اس کے سوا کسی کو کارساز اور قادر مطلق نہ جانتا، مخلوق کے سامنے سر نہ جھکاتا، محتاج کے در پر جبہ سائیاں نہ کرتا، اللہ کے سوا کسی کو اپنا معین نہ سمجھتا، دین و دنیا کی جو حاجت مانگتا اُسی سے مانگتا، اپنی پیدائشی بے بسی اور کمزوری پر نظر کرتے ہوئے سر افتخار بلند نہ کرتا اور بادۂ نخوت سے سرشار ہو کر اللہ کی زمین پر اکڑ کر نہ چلتا، بیہودہ اور جاہل طبقہ سے جاہلانہ طور پر نہ اُلجھتا بلکہ فساد سے بچنے اور امن کو برقرار رکھنے کے لئے درگزر سے کام لیتا اور الگ رہتا، قوام زندگی کو درست رکھنے کے لئے خدا داد دولت کو بے کار برباد نہ کرتا نہ مال کا پجاری بن کر سانپ کی طرح اس کی حفاظت کرتا بلکہ مال کو اپنی اور دوسروں کی زندگانی کا کفیل اور محافظ بناتا اور اعتدال و استقامت کے ساتھ تصرف کرتا، حق تلفی اور باطل کوشی نہ کرتا اور نفس انسانی کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور امن و آشتی کے قانون پر عمل کرتے ہوئے ناحق سفاکی و خون ریزی سے کنارہ کش رہتا، معاشرت باہمی، میل جول، اخلاق اور مدنیت کے حقوق کی پاس داری کرتے ہوئے اپنے شخصی حق کے دائرہ سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرتا اور بغیر کسی شرعی جواز کے صنفی تمتع حاصل کرنے کے درپے نہ ہوتا، جھوٹ بول کر اور جھوٹی گواہیاں دے کر دوسرے بنی نوع انسان کو مالی جانی نقصان نہ پہنچاتا اور ناجائز طریقہ عمل اختیار کر کے دوسروں کے حقوق پر دست درازی نہ کرتا، قانونِ قدرت کے خلاف قائم ہونے والی مجالس میں شرکت نہ کرتا بلکہ شرف انسانی کو بچانے کے لئے ایسی بیہودہ محفلوں کی طرف سے بزرگانہ وقار کے ساتھ گزر جاتا اور قانونِ قدرت کو توڑنے والوں کا مددگار نہ بنتا۔ یہ تھا حکم فطرت اور اقتضائے نیچر، مگر آہ! سرکش، غافل اور جاہل انسان نے ان اصول و قواعد کی پرواہ نہ کی اور باوجود ہوشمند اور باشعور ہونے کے بہائم سے بھی زیادہ بے عقل بن گیا اور دیکھتے بھالتے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لیا۔

ہاں دنیا میں کچھ آدمی ایسے بھی ہیں جو فطرت کی منشاء کو سمجھ کر نیچرل قواعد پر چلتے ہیں، خواہشات کے بُتوں کو توڑ کر غیر اللہ سے مُنہ موڑ کر اللہ اور فقط اللہ کی بارگاہ میں جبہ سائی کرتے ہیں۔ رات کو خلاق رحمٰن کے سامنے سر نیاز جھکاتے اور دارین کی فلاح و بہبود کی طلب اُسی سے کرتے ہیں۔ فروتنی اور نیاز کو اپنی زندگانی کا لائحۂ عمل بناتے ہیں، اللہ کی زمین پر تواضع کے ساتھ چلتے ہیں، جاہلوں کی طرح جاہلانہ فساد پھیلانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ سوقیانہ بیہودہ مجالس سے شریفانہ وقار کے ساتھ گزر جاتے ہیں، بے وقوفوں اور بدتمیزوں کی گفتگو کا جواب آشتی اور نرمی سے دیتے اور ان کے بدسلیقہ کلام کا اثر نہ لیتے ہوئے درگزر کرتے ہیں، قوام زندگی معتدل رکھتے ہیں، میانہ روی سے کام لیتے ہیں جس سے دولت پرستی کا مظاہرہ ہوتا ہو نہ خدا داد نعمت کو رائیگاں بے قدری کے ساتھ برباد کرتے ہیں کہ آئندہ تباہی سے ہمکنار ہونا پڑے بلکہ میانہ چال چلتے ہیں، اپنے حق سے زائد دراز دستی نہیں کرتے، زنا سے اجتناب رکھتے ہیں اور بے جا ناجائز طور پر انسانی خون کو نہیں بہاتے اور نہ جھوٹ بول کر جھوٹی گواہیاں دے کر کسی کی حق تلفی کرتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ کے اس اللہ کے جس کی رحمت ذرہ ذرہ پر چھائی ہوئی ہے خاص بندے، فرمان پذیر بندے اور قانونِ قدرت پر چلنے والے بندے ہیں۔ یہ ہی ہیں وہ جن کو عیش ابدی اور سرور سرمدی اور لازوال راحتیں میسر آئیں گی اور اللہ کے بنائے ہوئے غیر فانی مسرت کدے ان کے ٹھکانے ہوں گے۔

بس یاد رکھو! اے سرکش انسانو! احسان فراموش انسانو! ناحق کوش انسانو! اگر تم کو قانونِ قدرت کی پرواہ نہیں۔ اگر تم ضابطۂ فطرت سے مُنہ موڑتے ہو، اگر تم انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانیت کی پستی میں جا رہے ہو، اگر تم اللہ کے بھیجے ہوئے رسول کی ہدایت سے سرتابی کرتے ہو اور نیچرل قوانین کی پکار نہ سننے کے واسطے ہوش کے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہو اور اللہ کے اتارے ہوئے فرمان سے گردن موڑتے ہو تو اللہ کو بھی تمہاری کچھ پرواہ نہیں، اس کی کوئی غرض تم سے وابستہ نہیں،

انجام کار تمہارا ٹھکانا نہایت المناک ہوگا اور سخت ترین دوامی سزا تم کو برداشت کرنی پڑے گی۔

تحلیلِ اجزاء

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ۔ اللہ کے بندے تو سبھی ہیں، سبھی کو خدا نے پیدا کیا ہے، مگر یہاں مخصوص فرماں پذیر، نیکوکار، اطاعت شعار بندے مراد ہیں، جو اپنی نیکوکاری کے سبب ہی کو بندگانِ خدا کہلانے کا مخصوص حق ہے۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے خاص بندے یہ لوگ ہیں۔ یہ امر بھی جاننا ضروری ہے کہ عِبَادُ اللہ نہیں فرمایا بلکہ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ فرمایا۔ حالانکہ عباد کے ساتھ تو لفظ اللہ کا لانا زیادہ ضروری تھا۔ عبدیت کے ساتھ معبودیت کا ذکر زیادہ دل نشین ہے۔ بات یہ ہے کہ تخلیق، تربیت، ابقاء وغیرہ تمام احسانات کی اصل علت رحمتِ الٰہیہ ہے۔ اگر خدا رحمٰن نہ ہوتا تو کائنات پیدا نہ ہوتی یا پیدا ہوتی تو باقی نہ رہتی یا باقی رہتی تو اس کی تربیت و ترقی کے اسباب معدوم ہوتے یہ اللہ کی رحمت ہی ہے جو ہر احسان کی واحد کفیل ہے۔ پس اللہ میں استحقاقِ معبودیت صرف صفتِ رحمت سے پیدا ہوتا ہے اور چونکہ گزشتہ آیات میں رحمتِ الٰہیہ کے اکثر مظاہرہ کا ذکر کر دیا گیا تھا اور ایجاد و ابقاء کی مختلف شاخیں بیان کر دی گئی تھیں اور ان لوگوں کا بھی تذکرہ ہو چکا تھا جو خدا کی رحمت کے منکر تھے اس مناسبت سے اس جگہ ان لوگوں کے اوصاف کا تذکرہ ضروری ہوا جو اللہ کی رحمت کو دل سے مانتے، اس کے احسان کا شکریہ ادا کرتے اور عطوفتِ ربانی کا مقابلہ ایمان اطاعت اور فرماں پذیری سے کرتے ہیں۔

يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا کے معنی آہستگی اور آسانی کے ہیں، لیکن یہاں مراد ہے وقار آمیز متواضع چال اور نخوت و غرور سے پاک رفتار، خواہ تیز ہو یا آہستہ، دوڑ کر ہو یا قدم قدم۔ گویا اکڑ کر اترا کر چلنے کی ممانعت ہے، نازک خرامی اور شاہ گامی حرام ہے۔

اس آیت کی صحیح تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار تھی۔ حضور کریم چلتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اوپر سے اتر رہے ہیں (یعنی ہر قدم کو جما کر رکھتے تھے) اور زمین کو طے کر رہے ہیں (یعنی کس قدر تیز چلتے تھے) اسی بنا پر بعض اسلاف نے زیادہ سست چال کو مذموم قرار دیا ہے اور بناوٹ پر محمول کیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک جوان کو بہت آہستہ چلتے دیکھا فرمایا کیا تو بیمار ہے؟ اس نے عرض کیا نہیں۔ یہ سن کر آپ نے درہ اٹھایا اور فرمایا قوت سے چل۔

شیخ حسن بصری نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا واللہ بعض مومنوں کے کان، آنکھیں اور جسمانی اعضاء میں کمزوری محسوس ہوتی ہے ناواقف ان کو بیمار خیال کرتا ہے حالانکہ ان کو کوئی مرض نہیں۔ صرف خوفِ خدا ان کے دلوں میں اس قدر بیٹھ گیا ہے کہ اوروں کے دلوں میں نہیں بیٹھا۔ الخ۔

قَالُوْا سَلٰمًا۔ سلام کہنے کی تفسیر میں مختلف اقوال منقول ہیں۔ مجاہد کے نزدیک راستی سعید بن جبیر کے نزدیک اچھی بات اور حسن بصری کے نزدیک شرعی سلام مراد ہے۔ اول قول پر مطلب یہ ہوا کہ جب جاہل ان سے بیہودہ کلام کرتے ہیں تو وہ بدگوئی سے کام نہیں لیتے بلکہ راستی اختیار کرتے ہیں، جاہل کو جواب دیتے وقت جاہل نہیں بن جاتے۔ دوسرے قول کا مطلب بھی اسی کے قریب ہے۔ حسن بصری کے قول پر یہ مطلب ہوگا کہ جاہل کی بدکلامی کے وقت جھگڑے کو قطع کر کے اور پیچھا چھڑانے کے لئے وہ سلام رخصتی کر لیتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک سلام سے مراد سکوت ہے۔

بہترین مطلب وہ ہے جس کا پتہ حدیث سے چلتا ہے کہ سلام سے مراد دعائیہ کلام ہے۔ امام احمد نے بروایت نعمان بن مقرن بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص نے دوسرے کو گالی دی۔ اس نے جواب میں صرف علیک السلام کہا۔ حضور نے فرمایا تم دونوں کے درمیان ایک فرشتہ ہے۔ گالی دینے والے نے جب گالی دی تو فرشتے نے دشنام زدہ سے اس گالی کو دور کر دیا اور گالی دینے والے سے کہا تو ہی ایسا ہے، تو ہی اس لائق ہے پھر جب دشنام زدہ نے علیک السلام کہا تو فرشتے نے کہا (اس پر سلام) نہیں بلکہ تجھ پر سلام ہے، تو ہی اس لائق ہے۔ ابن کثیر نے اس حدیث کو صحیح الاسناد کہا ہے۔

خلاصہ ارشاد یہ ہے کہ جاہلوں کی جہالت سے درگزر کرتے اور حلم و عفو سے کام لیتے بلکہ دعائیں دیتے ہیں۔ یہ واقعی شریفانہ فعل ہے۔ جاہلوں کی جہالت کا جواب سوائے سکوت اور عفو و درگزر کے اور کچھ ہو نہیں سکتا جھگڑا قطع کرنے اور آبرو کو بچانے کا بس یہی ایک طریقہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا۔ سجدہ اور قیام میں رات گزارنے سے مراد رات کو نماز پڑھنا ہے، لیکن تمام رات نہیں نہ رات کے زیادہ حصہ میں نماز پڑھنے کی ترغیب ہے۔ بلکہ نصف رات سے کم میں نماز پڑھنا مراد ہے۔ کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝

حسن بصری نے اس آیت کی تفسیر میں عموم و توضیح کی ہے۔ فرمایا ہے وہ اللہ کے سامنے کھڑے رہتے ہیں اور نیاز کے ساتھ اس کے آگے سر رکھ دیتے ہیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں۔

بعض کے نزدیک اس سے نماز تہجد کی طرف اشارہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۔ حسن بصری نے فرمایا زوال پذیر مصیبت کو غرام نہیں کہتے بلکہ لازوال سخت کا نام غرام ہے۔ اللہ کے نیک بندوں کا یہ خاص وصف ہے کہ ان کو اپنی شبینہ عبادت پر غرور نہیں ہوتا بلکہ عبادت گذار ہونے کے باوجود وہ اللہ سے عذاب جہنم کو دور رکھنے کی دعا کرتے رہتے ہیں۔ گویا ان کی نظر میں عبادت سے استحقاق مغفرت نہیں پیدا ہوتا اور نہ اللہ پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ عبادت گزاروں کو عذاب آخرت سے محفوظ رکھے بلکہ اس کی رحمت وعفو کی اُمید ان نیک بندوں کو ہوتی ہے اور دعا قبول ہی ہے۔

اشاعرہ کے نزدیک اللہ پر کوئی چیز واجب نہیں، اعمال حسنہ موجب بالذات نہیں بلکہ اللہ نے چونکہ نیکو کار مومنوں کی نجات کا وعدہ فرمالیا ہے اور اللہ کے وعدہ میں جھوٹ ہونے کا احتمال نہیں، اس لئے طاعت گزار اہل ایمان کی نجات کی یقینی قطعی امید کی جا سکتی ہے۔ ورنہ خدا تعالیٰ مختار مطلق ہے۔ وہ اپنی ملک میں ہر طرح سے تصرف کر سکتا ہے اس کا کوئی فعل ظلم نہیں۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۔ اس آیت میں اسراف اور تنگی دونوں کی ممانعت اور درمیانی چال چلنے کی ہدایت ہے۔

امام احمد نے بروایت ابو درداءؓ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا معیشت میں اعتدال رکھنا دانائی ہے نیز امام احمد نے ابن مسعودؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضور والا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو میانہ روی رکھے گا وہ محتاج نہ ہوگا۔

ابو بکر بزار نے بروایت حذیفہ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تونگری میں اعتدال رکھنا خوب ہے اور عبادت میں اعتدال رکھنا بھی خوب ہے۔ غرض کھانے پینے پہننے اور ضروریات زندگی میں میانہ روی رکھنی مستحسن ہے اور حد اعتدال سے بڑھنا گھٹنا ممنوع ہے۔

حسن بصری نے فرمایا اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے (خواہ کتنا ہی زیادہ ہو) اسراف نہیں ہوتا۔ ایاس بن معاویہ نے کہا اللہ کے حکم سے تجاوز کرنا اسراف ہے۔ یہی مطلب اُن علماء کا ہے جو قائل ہیں کہ اللہ کی نافرمانی میں خرچ کرنے کا نام اسراف ہے۔

صحیح یہ ہے کہ ریاکاری اور نام نمود کے لئے یا ضروریات لازمہ سے زائد خرچ کرنا اسراف ہے۔ اللہ کی راہ میں اپنے نفس کا خیال چھوڑتے ہوئے کل مال خرچ کر دینا اسراف نہیں۔ بعض مخلص صحابہ کا طرز عمل اس کا شاہد ہے۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۔ یعنی اللہ کے مخلص بندے شرک کرنا تو در کنار کسی دوسرے (فرضی) معبود کو پکارتے بھی نہیں۔ صحیحین میں مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ایک بار خدمت گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کون ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ کا شریک قرار دینا۔ حالانکہ اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔ ابن مسعودؓ نے عرض کیا اس کے بعد کون سا گناہ ہے؟ فرمایا اولاد کو اس خوف سے مار ڈالنا کہ وہ تیرے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائے گی۔ عرض کیا اس کے بعد کون سا گناہ ہے فرمایا ہمسائی سے زنا کرنا۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا اسی کی تصدیق میں حق تعالیٰ نے وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ آخر تک (یعنی مُهَانًا تک) آیات نازل فرمائیں۔

اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ قتل نفس سے مراد اولاد کا قتل اور زنا سے مراد ہمسائی سے زنا کرنا ہے، لیکن آیت کا حکم مقید نہیں۔ بات یہ ہے کہ حکم شرع کے خلاف تو ہر قتل سخت ترین جرم ہے، مگر اولاد کا قتل بہت زیادہ سنگین ہے، اسی طرح زنا کی تمام اقسام حرام ہیں، مگر ہمسائی سے زنا کرنا بہت زیادہ جرم ہے۔ ایک تو زنا اور دوسرے حق ہمسائگی کا اسقاط، اس لئے حدیث میں خصوصیت کے ساتھ قتل اولاد اور ہمسائی سے زنا کرنے کا تذکرہ ہے۔

حجۃ الوداع کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا یہ فقط چار باتیں ہیں:- (۱) شرک مت کرو (۲) جس کو قتل کرنا حرام ہے اس کو ناحق قتل مت کرو (۳) زنا مت کرو (۴) چوری مت کرو (رواہ النسائی) اس حدیث میں قتل اور زنا کی کوئی مخصوص صورت بیان نہیں فرمائی بلکہ مطلقاً ہر قتل ناحق اور زنا کی ممانعت کر دی۔

وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔ اس سے مراد خون ناحق کی ممانعت ہے۔ قصاص لینا، سنگسار کرنا، جہاد میں کافروں کو مارنا اور دوسرے تعزیری میں قتل کرنا شرعی اجازت ہے حکم آیت سے خارج ہیں۔

قہستانی نے ذکر کیا ہے کہ بیوی یا بہن یا بیٹی وغیرہ کو اگر فعل بد میں مشغول پاکر مغلوب الغضب ہو کر زانی اور زانیہ دونوں کو قتل کردیا تو جائز ہے۔ سعد بن عبادہ کی حدیث اس کی مؤید ہے۔

بعض علماء نے صراحت کی ہے کہ اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی بدکاری سے تنگ آ کر عدالت میں استغاثہ کرے اور یہ دعویٰ کرے کہ اس نے مجھے طلاق دیدی ہے مگر شوہر انکار کرے اور مدعیہ کے پاس ثبوت نہ ہو اور حاکم عدم ثبوت کی صورت میں مدعیہ کا دعویٰ خارج کردے اور اس کے شوہر کے سپرد کردے اور شوہر اس کو تنگ کرتا رہے اور عورت کو کوئی مفر نہ ہو اور مجبور ہو کر موقع پاکر اس بدکار شوہر کو جو طلاق دینے کے بعد بھی بیجا نہیں چھوڑتا قتل کردے تو مباح ہے۔

وَلَا يَزْنُونَ۔ آیت میں زنا کی مطلقاً ممانعت ہے۔ ملک یا نکاح غیر موقت کے بغیر ہر صنفی قربت زنا ہے خواہ متعہ ہو یا کچھ اور قیامت تک حرام ہے۔

مقداد بن اسود کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تم زنا کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول نے زنا کو حرام کیا ہے تو قیامت تک حرام ہے۔ فرمایا ہاں مگر کوئی مرد اگر دس عورتوں سے زنا کرے تو آسان ہے۔ بہ نسبت اس کے ہمسایہ کی بیوی سے زنا کرے۔ الخ۔ (رواہ احمد)

ہثیم بن مالک طائی کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شرک کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں کہ آدمی اپنا نطفہ ایسے رحم میں ڈالے جو اس کیلئے حلال نہیں (رواہ ابوبکر بن ابی الدنیا)

وَيَخْلُدْ فِيهِ مُهَانًا۔ مطلب یہ ہے کہ جس نے شرک اور قتل اور زنا کا ارتکاب کیا وہ قیامت کے عذاب میں دوامی طور پر گرفتار رہے گا اور ایسے شخص کو دوگنا عذاب ہوگا۔ ایک شرک کا اور دوسرا گناہوں کا۔ یہ مطلب ہرگز نہیں کہ صرف قاتل اور زانی لازوال عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ آیت وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ میں اشارہ مجموعہ کی طرف ہے یا یوں کہا جائے کہ خلود کے لغوی معنی ہیں مدت دراز خواہ اس کی انتہا ہو یا نہ ہو۔ مشرک، قاتل اور زانی تینوں اپنے اپنے فعل کی پاداش میں مدت دراز تک دوزخ میں رہیں گے، لیکن چونکہ دوسری آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرک دوامی طور پر جہنم میں رہے گا اور مشرک کے علاوہ جس کو چاہے گا بخش دے گا۔ شرک کبھی نہ بخشا جائے گا، اس لئے مشرک کے حق میں خلود کے معنی مدت دراز غیر منقطع لئے جائیں گے اور قاتل و زانی کے حق میں خلود بمعنی مدت دراز منقطع ہوگا۔ واللہ اعلم۔

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا۔ چند مشرکوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا حضرت! ہم شرک میں مبتلا رہے خون ناحق بھی کئے، زنا کا ارتکاب بھی کیا اور ان کے علاوہ چھوٹے بڑے دوسرے گناہ بھی کئے۔ اب بتلائیے ہمارے گناہ معاف ہونے کی کیا صورت ہے۔ اگر ہمارے گناہ معاف ہو سکتے ہوں تو ہم ایمان لا سکتے ہیں۔ اس وقت آیت کا نزول ہوا۔ بظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح شرک توبہ سے اسی طرح جرم زنا اور قتل ناحق بھی ہو جاتا ہے خواہ قتل عمد ہو یا قتل خطا، لیکن ابن عباس کا قول ہے کہ قتل عمد توبہ سے معاف نہیں ہوتا کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے:۔ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا الخ۔ اور چونکہ یہ آیت مدنی ہے اور آیت بالا مکی ہے، اس لئے آخری حکم ناطق ہے اور قصداً قاتل کی توبہ مقبول نہیں۔ ابن عباس کا قول جمہور کے قول کے خلاف ہے۔ بات یہ ہے کہ قتل عمد میں قانون الٰہی کے احترام کی شکست بھی ہوتی ہے اور بندہ کے حق پر دست درازی بھی ہوتی ہے گویا قتل ناحق دوہرا جرم ہے۔ توبہ سے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی سزا تو معاف ہو جاتی ہے، مگر مقتول کا حق پھر بھی باقی رہتا ہے اور آخرت میں اسی حق میں قاتل کے پکڑے جانے کا اندیشہ ہے، مگر جس طرح دوسرے حقوق العباد کی معافی آخرت میں ہوگی یعنی اللہ جب معاف کردے گا تو امید ہے کہ مظلوموں کو احسان و انعام سے سرفراز فرما کر ظالموں کا قصور ان سے معاف کرادے۔ اسی طرح قتل ناحق کی بھی معافی ہو سکتی ہے۔ شرک ایسے عظیم الشان گناہ کی معافی توبہ سے ہو جائے اور اس سے کم درجہ گناہ کی معافی نہ ہو یہ بات شرعی اور عقلی صراحت کے خلاف ہے۔ رہا مکی اور مدنی ہونے کا جواب تو آیت اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ الخ مدنی ہے، لیکن بالاجماع توبہ سے شرک مٹ جاتا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ قتل ناحق کی توبہ مقبول نہ ہو۔ ایسے احکام میں مدنی اور مکی ہونے کا اختلاف اثر انداز نہیں ہوتا۔

فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ اس آیت کا مطلب دو طرح بیان کیا گیا ہے:۔ (۱) علی بن ابی طلحہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کے مصداق وہ جاہل اہل ایمان ہیں جنہوں نے شرک اور گزشتہ گناہوں کو ترک کردیا اور ایمان دار، فرماں بردار، اطاعت گزار بن گئے۔ اللہ نے برائی کی جگہ بھلائی ان کو عطا کی اور بری حالت سے اچھی حالت پر کردیا۔ عطاء، سعید بن جبیر، حسن بصری، ابوالعالیہ، قتادہ اور دیگر جماعت تابعین نے یہی مطلب بیان کیا ہے۔

(۲) بعض علماء کا قول ہے کہ جب بدکار خطا وار اپنے گناہوں سے توبہ استغفار کرتا ہے تو اللہ اس کی گزشتہ برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کردیتا ہے۔ یعنی جب کسی

گناہوں کو یاد کر کے اس پر ندامت و پشیمانی ہوگی اور گریہ و زاری کے ساتھ توبہ کی تو گزشتہ خرابیاں قابلِ مؤاخذہ نہیں رہتیں اگرچہ نامۂ اعمال میں ان کا اندراج رہتا ہے، مگر قیامت کے دن ان کا مواخذہ نہ ہوگا اور چونکہ گریہ و زاری کی اور اپنے کئے پر ندامت کا اظہار کیا ہے، اس لئے یہ زاری اور عاجزی اور ندامت قابلِ ثواب نیکیاں بن جاتی ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ اول قول پر اطاعت، فرماں پذیری اور ایمان گزشتہ شرک و معاصی کی جگہ ہو جاتے ہیں اور اس طرح سیئات کا حسنات سے تبادلہ ہو جاتا ہے اور دوسرے قول پر صرف ندامت و استغفار ہی سابقہ گناہوں کو ساقط کر کے نیکیاں بن جاتے ہیں۔ مزید اطاعت کوشی اور فرماں پذیری ضروری نہیں۔ مؤخر الذکر مطلب کی تائید بعض احادیث کے مضمون سے ہوتی ہے اور اول مطلب کا ماخذ بھی احادیث میں موجود ہے۔ فافہم واللہ اعلم۔

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۔ زُور کے معنی میں اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے۔ محمد بن حنفیہ کے نزدیک بیہودگی اور راگ و رنگ مراد ہے۔ ابوالعالیہ، طاؤس، ابن سیرین، ضحاک، ربیع بن انس وغیرہم نے مشرکوں کے تہوار اور میلے مراد لئے ہیں۔ عمرو بن قیس کے نزدیک ہر بری مجلس مراد ہے۔ مالک نے بقول زہری شراب خواری کے جلسہ کی تعیین کی ہے کیونکہ بروایت مالک یہ حدیث منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص کا اللہ اور روزِ قیامت کا یقین ہو وہ ایسے دسترخوان پر نہ بیٹھے جس پر شراب ہو۔ بعض نے جھوٹی گواہی خاص طور پر مراد لی ہے اور شہادت کے معنی گواہی دینے کے لکھے ہیں یعنی جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

حاصل ارشاد ظاہر ہے کہ اللہ کے خاص بندے گناہوں کے جلسوں میں کافروں کے تہواروں اور میلوں میں، فسق و فجور کی محفلوں میں اور راگ رنگ کی مجلسوں میں نہیں جاتے یا یہ مطلب کہ جھوٹ نہیں بولتے اور جھوٹی گواہی نہیں دیتے ہیں، لیکن اگر اتفاقی سے نادانستہ طور پر کسی بیہودہ جلسہ کی طرف سے گزر ہو جاتا ہے اور محفلِ رقص و سرود ہوتی ہے یا کوئی میلا ٹھیلا یا حرام قوالی کی مجلس ہوتی ہے تو وہ دیکھنے اور لطف اندوز ہونے کے لئے ٹھہر نہیں جاتے بلکہ شریفانہ اور بزرگانہ چشم پوشی کر کے گزر جاتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا۔ اس آیت کا مطلب بھی دو طرح بیان کیا گیا ہے۔ اول یہ کہ آیات سے آیاتِ قدرت مراد ہیں۔ تمام عالم میں قدرتِ الٰہیہ کے آثار موجود ہیں۔ جاذبِ نظر اشکال، نغمہ انگیز آوازیں، دل کش مرغزار، طرح طرح کے جانور، آسمان و زمین کی کائنات، فضائی مخلوقات ہر ایک کا رنگ، شکل، ساخت جسم اور اندرونی بیرونی خوبیاں غرض عالم کی ہر چیز اپنے اندر درسِ بصیرت رکھتی ہے، لیکن جاننے والے دماغوں اور سمجھنے والے ذہنوں کا تفاوت ہے۔ کوتاہ فہم، بے بصیرت، کور دانش اور سقیم الذہن لوگ تو ہر نشانی کو دیکھتے ہیں، اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں، اس کو مشغلۂ تفریح بناتے ہیں، حسن کے پرستار نغمے سے مسرور اور بشاشت انگیز مناظر سے تمتع گیر ہوتے ہیں۔ بس یہی ان کا منتہائے نظر ہے۔ جسمانی لذت اور مادی کیف سے آگے ان کی نظر نہیں پہنچتی، ان کے ہوش و خرد کی آنکھوں میں نور نہیں ہوتا کہ حقیقت تک پہنچ سکیں نہ ان کے گوشِ بصیرت وا ہوتے ہیں کہ فطری دلائل و شواہد کی آواز سن کر کوئی نصیحت و عبرت حاصل کریں۔ بس گویا وہ آیاتِ الٰہیہ پر اندھے بہرے ہو کر گرتے ہیں، لیکن جن کی بصیرت کی آنکھوں میں نور ہے، ہوش کے کان کھلے ہوئے ہیں اُن کو ہر چیز میں غیبی قدرت کے کرشمے نظر آتے ہیں، ان کیلئے درخت کی ہر پتی دفترِ معرفت ہے، پرندوں کی ہر آواز نغمۂ قدرت اور فطرت کا راگ ہے اور کائنات کی ہر حرکت بصیرت افروز، عبرت آفریں، نصیحت انگیز اور درسِ حکمت ہے۔ (۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ آیات سے مراد احکامِ قرآنی ہیں۔ جن لوگوں کے دلوں میں ایمان نہیں ہوتا اور دکھاوٹ کے لئے وہ مومن بنتے ہیں وہ قرآن کی آیات سن کر دوسرے خالص مومنوں کو دکھانے کے لئے اندھا دھند تیار ہو جاتے ہیں اور قرآنی حکم کی ظاہری تعمیل کرنے پر بغیر کسی اندرونی جذبہ کے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اسی طرح جن لوگوں کے دلوں میں ایمان ہوتا ہے مگر کمزور ہوتا ہے ان کے جذبات فوری طور پر متاثر ہو جاتے ہیں اور چند منٹ کے لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایمان مجسم ہیں۔ ان سے بڑھ کر مخلص مومن سطحِ ہستی پر اور کہیں نہیں، لیکن جونہی جذبہ فرو ہوتا ہے ٹھنڈا رہ جاتا، افسردگی ٹوٹ آئی وہی بے حسی اور جمود طاری ہو گیا جو پہلے تھا، گویا احکامِ الٰہیہ کو سنا ہی نہ تھا۔

لیکن جو لوگ پختہ ایمان اور راسخ جذبۂ اسلام رکھتے ہیں وہ احکامِ الٰہیہ کو سنتے ہیں، غور کر کے سمجھتے ہیں اور جب حکم کا منشاء اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے تو تعمیل کی کوشش کرتے ہیں اور پھر پابندی رکھتے ہیں۔

اول الذکر دونوں گروہ قابلِ مذمت ہیں اور مؤخر الذکر طبقہ لائقِ ستائش ہے آیت میں اسی گروہ کی تحسین کی گئی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۔ کامل ایمان رکھنے والے نیکوکار بندے اپنی فطرتِ سلیمہ اور حق طلب طبیعت کی وجہ سے دنیا میں شر اور باطل پرستی کا کوئی مظاہرہ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ خود تو مومنِ کامل اور متقی ہوتے ہیں، اپنی ذات کے علاوہ کسی دوسرے کو بھی معصیت کوش اور نافرمان دیکھنا ان کو گوارا نہیں ہوتا خصوصاً اپنے اہل و عیال، دوست احباب اور متعلقین کو تباہی کے غار سے نکال کر جنت و سعادت کی سطح پر

لانا چاہتے ہیں، اُن کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ دار آخرت میں ان کے تمام اہل تعلق جمع ہوں تاکہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ اس لئے وہ اپنے رب سے التجا کرتے ہیں کہ پروردگار ہمارے جوڑے اور اولاد ایسی دے جو اپنے ایمان اور تقویٰ کی وجہ سے دونوں جہاں میں ہماری آنکھوں کی خنکی اور دل کی ٹھنڈک ہوں۔ اس پر ہر گنہگار گروہ کو اولاد خاندان کی نافرمانی اور معصیت کوشی سے قلبی تکلیف ہوتی ہے اور آخرت میں بھی ان کو مبتلائے عذاب دیکھ کر رنجور ہوگا۔ اس لئے عزیزوں اور دوستوں کو بھی وہ مومن متقی دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔

ابن عباسؓ کے نزدیک ٹھنڈک سے دونوں جہان کی ٹھنڈک مراد ہے۔ عکرمہ نے فرمایا اللہ کے خاص بندوں کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ ان کی اولاد خوبصورت ہو بلکہ اولاد و ازواج کو اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار اور اللہ کے رسول کا اطاعت گزار دیکھنا چاہتے ہیں۔

حسن بصری نے فرمایا واللہ مومن کی آنکھ کی ٹھنڈک دنیا میں اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی کہ اس کے بیٹے بیٹیاں پوتے نواسے پرپوتے پرپوتے اور دیگر قرابتدار دیندار اللہ کے اطاعت گزار ہوں۔

نوٹ: اَزْوَاجْ زوج کی جمع ہے۔ عربی زبان میں زوج جوڑے کو کہتے ہیں۔ مرد کا جوڑا عورت اور عورت کا جوڑا مرد ہوتا ہے۔ اس لئے لفظ ازواج مرد اور عورت دونوں کو شامل ہے۔

ذُرِّیّٰت کا لفظ پوری نسل کو شامل ہے خواہ صلبی بیٹے بیٹیاں ہوں یا ان کی اولاد۔

اِمَام کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ نیک آدمی دنیا میں بھی چاہتے ہیں کہ ان کا ماحول نیک ہو، نسل اور تعلق والے دیندار ہوں، پورا خاندان خوش سیرت اور صالح کار ہو اور وہ سب کے رہبر اور سرپرست ہوں۔ آخرت کے متعلق بھی نیک لوگوں کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے گروہ کے پیشرو ہوں، ان کی اولاد اور دوست احباب اللہ ان کے ہم مشرب ہم مسلک رہ کر آخرت میں ان سے جا کر ملیں اور عذاب الٰہی سے بچ جائیں اور سب مل کر ایک دوسرے کو راحت میں دیکھ کر خوش ہوں۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا۔ غرفہ جنت میں ایک خاص مقام کا نام ہے جو دوسرے منازل و مراتب سے بہت اونچا ہے۔

حق کی راہ پر چلنا اور دین مستقیم سے نہ ہٹنا بہت زیادہ صبر آزما ہے۔ حق کا راستہ پھولوں سے بچھا ہوا نہیں، کانٹوں سے لبریز ہے۔ جنت کی راہ مصائب سے گھری ہوئی ہے راستہ پر قائم رہنا ہر شخص کا کام نہیں بلکہ شیر مردوں کا شیوہ ہے۔ عیش و راحت، سکھ اور چین، دولت و تنعم، عزت و حکومت اور بعض اوقات خاندان اور جان کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔ ایسے جاں گسل اور زندگی سوز مراحل پر صبر کرنے والوں کے لئے آخرت میں بلند مراتب اور محترم منصب ہیں۔ لفظ غرفہ اور صبر سے اسی طرف اشارہ ہے۔

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا یہاں تک عباد الرحمٰن کے خصوصی اعمال اور ذاتی اوصاف اور ثمرات طیبات کا بیان تھا بسلسلۂ بیان کہ بد سلامتی کا فروں اور سرکشی کرنے والوں کو عذاب کی دھمکی بھی تھی۔ یہ ترغیب و ترہیب سے نصیحت کو دلنشین بنانے کا ایک خاص طرز کلام تھا۔ مگر کفار سرکش کفار مشفق و ناصح کی شفقت صلحیٰ سے کب فائدہ اٹھانے والے تھے اور ناصح برحق کی بے بہا نصیحتوں کی کب پرواہ کرتے تھے۔ غرور و خود پرستی کی انتہا بے دینی تھی، وہی پندار تھا وہی غفلت و جہالت تھی وہی راہ حق سے رو گردانی تھی اور وہی کبر و نخوت پر مٹی تھی، اس لئے خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دے دیا کہ ان سے کہہ دو اگر تم کو اپنی بہبودی نجات اور اخروی فلاح و سعادت کی طلب نہیں۔ اگر تم رحمٰن اعظم کے طالب نہیں تو خدا کا بھی تمہاری کچھ پرواہ نہیں۔ یعنی اگر چاہو ہدایت کو مانو اور راہ حق پر چلو تو تمہارا ہی فائدہ ہے، خدا کی کوئی غرض تمہاری ہدایت یابی سے وابستہ نہیں، وہ تمہارا محتاج نہیں، اس کا کوئی فعل ذاتی غرض پر مبنی نہیں، تم نہیں مانتے نہ مانو عنقریب لازوال عذاب میں ماخوذ ہو گے۔ حسن بصری نے فرمایا کہ لزام سے مراد عذاب آخرت ہے، لیکن حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت ابی بن کعب، مجاہد، ضحاک اور قتادہ وغیرہم کا قول ہے کہ کفار بدر جس وقت مارے گئے فوراً عذاب لزام میں گرفتار ہو گئے۔

غالباً ان بزرگوں کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے کافروں پر تو مرنے کے بعد قیامت تک عذاب برزخی جاری رہتا ہے اور قیامت کے دن عذاب لزام ہوگا، مگر مقتولین بدر پر مرتے ہی عذاب لزام قائم ہو گیا۔ واللہ اعلم۔

میرے نزدیک کفار بدر کے مخصوص تذکرہ کی کوئی وجہ نہیں نہ آیت میں صرف ان کو عذاب کی وعید ہے نہ فقط ان کے معذب ہونے کی پیشین گوئی ہے بلکہ ہر سرکش کافر کو وعید ہے۔ پھر تخصیص کی کوئی وجہ نہیں۔

مقصود بیان: رحمٰن کے خاص بندوں کے امتیازی اوصاف کا بیان، معاشرت، مدنیت اور تہذیب منزل کے مفید ترین اصول کی تعلیم عباد الرحمٰن

کرنے سے اس طرف اشارہ کہ اللہ کی رحمت عامہ دنیا میں سکون، امن اور نظم قائم کرنا چاہتی ہے، اس لئے بندگانِ خدا کا بھی فرض ہے کہ ان قوانین پر عمل کریں جن سے نظم عالم تباہ نہ ہو، فساد نہ پھیلے اور مخلوق کا سکون دکھ سے نہ بدل جائے۔ شادمانی اور وقار کے ساتھ چلنے کی ممانعت، جاہلوں کی جہالت سے درگزر کرنے اور جھگڑے کی آتش سے قطع کرنے کی ہدایت، نماز شب کا حکم اور باوجود عبادت گزار شب زندہ دار ہونے کے اپنی عبادت پر مغرور نہ ہونے کی طرف اشارہ، اس امر کا تذکرہ کہ نجاتِ آخرت اعمال کی صلاحیت پر موقوف نہیں بلکہ رحمت الٰہی پر موقوف ہے تاہم عبادت ضروری ہے۔ ضروریات زندگی میں اقتصادی چال سے چلنے کا حکم تا کہ قوامِ حیات درست رہے۔ توحید کا پرزور اظہار، قتل حق اور زنا کے ارتکاب کی ممانعت، کبیرہ گناہوں سے توبہ کرنے کی ترغیب اور توبہ کے قبول ہونے کی صراحت، لیکن اس بات پر تنبیہ کہ زبانی توبہ توبہ کرنا مقبول نہیں توبہ کی شرط یہ ہے کہ سچے دل سے ہو، دل میں ایمان اور ایمان کے ساتھ نیک کام ہو۔ جھوٹ بولنے اور جھوٹی شہادت دینے اور بیہودہ لہو و لعب کے جلسوں میں شرکت کرنے کی ممانعت۔ مجالس لغو کی طرف سے اگر گزر ہو جائے تو بزرگانہ وقار اور شریفانہ تمکنت کے ساتھ گزر جانے کا پوشیدہ امر۔ آیات فطرت کو بے سوچے سمجھے نظر انداز کرنے اور ان سے عبرت اندوز ہونے کی ترغیب اور احکام شرع کو خوب سوچنے سمجھنے کے بعد عمل کرنے کا ضمنی حکم۔ اہل و عیال، دوست احباب اور دیگر متعلقین کی اُخروی نجات کے لئے دعا کرنے کی ترغیب اور یہ ہدایت کہ بدکار ماحول کے ساتھ میل جول اور نشست و برخاست نہ اختیار کی جائے بلکہ شب و روز کا اٹھنا بیٹھنا ایسے لوگوں کے ساتھ ہونا چاہیے جو ہدایت یافتہ اور پرہیزگار ہوں۔ قُرَّةَ أَعْيُنٍ کے لفظ سے اس مفہوم کی طرف تلمیح کہ ہر قسم کی اولاد اور بیویاں مومن کی آنکھ کی ٹھنڈک نہیں ہوتیں بلکہ چشم مومن کی خنکی اسی اولاد و عیال سے حاصل ہوتی ہے جو اللہ کی فرماں بردار اور اطاعت گزار ہو۔

بِمَا صَبَرُوا سے اس طرف اشارہ ہے کہ راہِ اسلام پر قائم رہنا اور حق پر استقامت اختیار کرنا مشکل اور صبر آزما کام ہے، مصائب و آلام کو برداشت کرنا پڑتا ہے، مالی اور بدنی قربانی دینی پڑتی ہے جسمانی اور روحانی صدمے اٹھانے پڑتے ہیں۔ الحاصل حق کا راستہ بہت پرخطر اور پُر عذاب ہے، اس پر چلنا حوصلہ طلب ہے، مگر نتائج بھی بہت ہی پسندیدہ اور خوشگوار ہیں۔

لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ سے تعلیم دینی مقصود ہے کہ ہدایت کی طلب، آخرت کی خواہش، نجات و سعادت کی استدعا اور دعا میں اللہ پاک کی تمنا خالق سے ربط و تعلق کا لازمی اثر ہے اور بندہ کو پہچان کر کہ ہر معبود کو بھی عبد کی پرواہ نہیں رہتی۔ وغیرہ۔

سُوْرَةُ الشُّعَرَآءِ مَكِّيَّةٌ وَّهِيَ مِائَتَانِ وَّسَبْعٌ وَّعِشْرُوْنَ اٰيَةً وَّاِحْدٰى عَشَرَ رُكُوْعًا

سورۂ شعراء مکی ہے اس میں دو سو ستائیس آیات اور گیارہ رکوع ہیں

اس سورت کا نام بقول امام مالک سورۂ جامع بھی ہے۔ قرطبی نے بروایت حضرت براء ابن عازب بیان کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ نے بجائے توریت کے مجھے سبع الطوال اور بجائے انجیل کے مبین اور بجائے زبور کے طواسین عطا فرمائی ہیں اور حوامیم و مفصل مجھ کو زیادہ دی گئی ہیں۔ مجھ سے پہلے کسی نبی کو ان کے حصول کا شرف نہیں ملا۔ گویا قرآن پاک توریت، انجیل اور زبور کا مجموعہ ہے اور ان تینوں کتابوں سے اس کی ہدایت میں اضافہ ہے۔

جمہور علماء کے نزدیک یہ سورہ مکی ہے۔ البتہ حضرت ابن عباسؓ نے وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ سے پانچ آیات تک استثناء کیا ہے اور پانچوں آیات کو مدنی کہا ہے۔

اس سورت میں گیارہ رکوع اور ۲۲۶ یا ۲۲۷ آیات ہیں۔ ۱۲۹۷ کلمات اور ۵۵۴۲ حروف ہیں۔

شعراء کے ضلالت انگیز کلام اور بے ہودہ بکواس پر چونکہ اس سورت میں خصوصی ریمارک ہے، اس لئے اس کا نام ہی سورۂ شعراء ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے

اَللّٰہ اسمِ اعظم جامع یا اسمِ ذات ہے اور اَلرَّحْمٰن وہ ہے جو اپنی رحمت کے سبب گناہگاروں کو جلد ماخوذ نہیں فرماتا بلکہ ڈھیل دیتا ہے اور توبہ کا موقع عنایت فرماتا رہتا ہے۔ اور اَلرَّحِیْم وہ ہے جو اپنے بندوں کے دلوں کو توفیقِ محبت سے زندہ کر کے اپنی رضامندی سے سرفراز فرماتا ہے اور نیک کاموں کی توفیق عطا فرماتا رہتا ہے۔

طٰسٓمّٓ ○ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ○ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○

یہ روشن کتاب کی آیتیں ہیں (اے نبی) شاید اس غم میں تم اپنی جان کھو بیٹھو گے کہ یہ مسلمان نہیں ہوتے

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ○ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ

اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے ایک نشانی نازل کر دیں کہ اس کے سامنے ان کی گردنیں جھک جائیں رحمٰن کے پاس سے ان کے

ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ○ فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا

پاس جو نئی نصیحت آتی ہے اُس سے ضرور وہ رُخ پھیر لیتے ہیں سو یہ جُھٹلا چکے اب عنقریب ان پر اس بات

كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ○

کی حقیقت آپہنچے گی جس کی وہ ہنسی اُڑاتے تھے کیا یہ نہیں دیکھتے کہ زمین میں کس قدر ہر قسم کی نفیس چیزیں ہم نے پیدا کی ہیں

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ○ ع ۱

اس میں بیشک بڑی نشانی ہے لیکن ان میں کے بہتیرے ایمان لانے والے نہیں اور تمہارا رب زبردست و مہربان ہے

تفسیر

طٰسٓمّٓ کو قتادہ نے قرآن کا نام، مجاہد نے سورت کا نام، ابن عباس نے اللہ کے نام کی قسم اور محمد بن کعب نے چند خصوصی صفات کی قسم قرار دیا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ مقطعات کی تفسیر سے علماء عاجز ہیں۔

آیاتِ مذکورہ کا توضیحی مطلب بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پوری سورت کا خلاصہ مختصر ترین الفاظ میں بیان کر دیا جائے تاکہ تفسیری مطالب کے سمجھنے میں دشواری نہ رہے۔

مکی زندگی بہت سخت تھی۔ ہر وقت ہر طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کافروں کا نرغہ رہتا تھا، بے پناہ مخالفت تھی، شبانہ روز کے تمام اوقات اور ہر ساعت کے تمام لمحات مخالفت سے لبریز تھے۔ اسلام کی روح پرور باتیں اور قرآن کی نجات آفریں ہدایات کافروں کو عجیب معلوم ہوتی تھیں اور آباؤ اجداد کے مسلک کو چھوڑ دینا ان پر بہت ہی شاق تھا۔ اسلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے طرح طرح کی بے تکی خواہشیں کرتے تھے۔ پہاڑوں کو مکہ کی چاروں طرف سے ہٹا دینا، ریگستان میں نہریں جاری کر دینا، فرشتوں کو ساتھ ساتھ نہ لگا کر رہنا، پہاڑ سونے کے بن جانا، غرض اسی قسم کی اور بیہودہ درخواستیں کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مشفق قوم تھے، اصلاح کا پورا جوش برسرِ عمل تھا، دردمندی حد سے بڑھی ہوئی تھی، کافروں کی سرکشی اور کج بحثی سے بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے اور دل ہی دل میں کڑھتے تھے۔ اس سورت میں حضور کو تسلی دی گئی ہے۔ سات پیغمبروں کا تذکرہ کر کے ان کی قوموں کی سرکشی بیان کی ہے تاکہ کفارِ مکہ کی سرکشی کا زیادہ افسوس نہ رہے اور انبیائے سابقین کی اُمتوں کے احوال کو سُن کر کسی قدر تسلی ہو۔

عرب کے جاہل کوتاہ فہم اور بے بصیرت لوگ غیبی قوت، قدسیہ اور روحی و ربانی کے تو قائل نہ تھے، کبھی کسی پیغمبر کی بعثت کی خبر اپنی قوم میں سُنی بھی نہ تھی۔ مگر قرآن کی لطافت، حلاوت، اور طرزِ ہدایت کو کبھی فرقہ اور رفتہ رفتہ بھی نہ تھے۔ کچھ کہتے تھے یہ تو شاعری ہے۔ اس زمانے میں شاعری کا بہت زور تھا، قوم پر شاعری کا بھوت سوار تھا، ہر خاندان اور قبیلہ کو اپنی شاعری پر فخر تھا، سالانہ میلوں میں مشاعروں کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ ایک تو طبعاً نظم سے انس تھا پھر عام قوم پر شاعروں کا اقتدار اور ادبی شوق آفریں تھا۔ جب قرآنی سلاست

وبلاغت اور ہم برا آخرت کا کوئی جواب نہ بن پڑا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر اور قرآن کو شعر کہنے لگے، لیکن قرآنی بلاغت کا شاعری سے واقعہ میں کوئی تعلق نہ تھا، نمایاں فرق موجود تھا، قرآن نام صرف شیریں الفاظ، دلچسپ طرز ادا اور مناسب بندش ہی کا نہیں بلکہ معجز الفاظ کی تہ میں نجات آخرت اور سعادت آگیں ہدایات ہیں، عقائد و اعمال کی اصلاح کا پیغام زندگانہ ہے، روح پرور کیف ہے، مکارم اخلاق، نظم بلاد اور تمدن کے مفید ترین مضامین عالیہ ہیں۔ عربی شاعری میں سوائے ذاتی فخر، قومی جہالت، عشق بازی، شراب خوری ہوس و لہو کے تذکرے کے اور کیا رکھا تھا۔ اونٹوں، گھوڑوں، ریت کے ٹیلوں اور لق و دق جنگلوں کی انتہا پسندیوں کے ذکر کے علاوہ عربی شاعری میں کوئی مضمون نہیں۔ اگر طرفہ اور زہیر جیسے شاعروں کے کلام میں کہیں کہیں اخلاقی مضامین کا اظہار ہے بھی تو بہت ہی ناقص۔ پس مضامین قرآن کو شاعری سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ شاعری ضلالت خیز، قرآن ہدایت انگیز، شاعری ہلاکت آفریں، قرآن نجات آگیں، شاعری انسانیت سوز اور روح فرسا، قرآن حیات اور سعادت افزا۔ اس سورت میں شعراء پر خاص ریمارک اسی بنیادی فرق کو ظاہر کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔

آیات مذکورہ کی تفسیری وضاحت

اس خاکدانِ ہستی میں اللہ نے انسان کو مختار بنایا ہے۔ جو اندرونی اور بیرونی قوتیں اس کو عطا کی ہیں اور کسی مخلوق کو نہیں دیں۔ انسان مختلف قوتوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس کے اندر ایسی طاقت ہے جو ہر خیر و شر اور نیکی و بدی کا سرچشمہ ہے۔ مادی اور روحانی دونوں قوتیں موجود ہیں اور دونوں برسرِ عمل ہیں۔ انسان مجبور بھی ہے اور مختار بھی، صاحب ارادہ بھی ہے اور مسلوب الارادہ بھی، اپنے دائرۂ قدرت سے آگے بڑھنے کی آدمی میں سکت نہیں، اس لئے اس کو مجبور اور مسلوب الارادہ کہا جا سکتا ہے اور اپنے دائرہ کے اندر وہ ہر نیکی بدی کر سکتا ہے، اس لئے اس کو صاحبِ ارادہ اور مختار بھی کہہ سکتے ہیں۔ قوتوں کی تخلیق خدا نے کی اور استعمال انسان خود کرتا ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ موم میں ہر شکل قبول کرنے کی صلاحیت ہے خوبصورت چیزیں بنائی جائیں یا بد ہیئت، دونوں شکلوں کو یہ قبول کر سکتا ہے۔ انسانی قوتوں کا بھی یہی حال ہے روپے کا مصرف اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔ انسانی طاقتوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ اسلحہ کا استعمال جائز طور پر بھی کیا جا سکتا ہے اور ناجائز خوں ریزی کے لئے بھی ان کو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ انسانی اعضاء کی بھی یہی حالت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ موم روپیہ ہتھیار وغیرہ میں علم، ارادہ اور اختیار کی قوتیں نہیں، ان کو اپنے تصرف پر قابو نہیں، مگر انسان مختار، صاحبِ ارادہ اور عالم ہے، اس کو اپنے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے ہر قسم کا تصرف کرنے پر قدرت ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر خدا تعالیٰ انسان کو تخلیقی قوتوں کے بھروسہ پر چھوڑ دیتا اور کوئی پیام ہدایت نہ بھیجتا تب بھی انسان کو اپنی کجروی اور گمراہی کو جائز ثابت کرنے کا کوئی عذر صحیح میسر نہ آتا کیونکہ جب خدا تعالیٰ نے عقل و بصیرت دے دی، سوچنے سمجھنے اور سیدھے راستے پر چلنے کی قوت عطا کی، ہوش و حواس اور نیکی بدی میں امتیاز کرنے کی قوت مرحمت کر دی تو پھر مزید رہنمائی کا فرض اس کے ذمہ نہ رہا، لیکن اس نے اپنی رحمت عامہ کو کام میں لا کر انبیاء و مرسلین کو بھیجا، مختلف کتابیں نازل کیں ہدایت کے پیام بھیجے، اصلاحی قوانین و ضوابط بتائے خصوصاً قرآن عظیم کو نازل کیا جو صحیح غلط بدی خیر شر راستی و کجی میں امتیاز کرنے والا ہے۔ جس کی ہدایت واضح اور رہنمائی کامل ہوتی ہے، مگر مغلوب العقل اور مسلوب الفکر انسان خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوا، دن دہاڑے سورج کی شعاعیں اس کو سجھائی نہ دیں، آیات قرآنیہ کی مطابقت میں آیاتِ فطرت موجود تھیں جو پکار پکار کر پیامِ ہدایت کی تصدیق کر رہی تھیں، مگر مردہ دل انسان کی موت نما نیند نے اس فطری پکار کی بھی پرواہ نہ کی اور جہالت کی نیند سونے والوں نے کروٹ نہ لینا تھی نہ لی۔

اب مردہ روحوں کو زندہ کرنے اور خوابیدہ انسان کو بیدار کرنے کا ایک ہی راستہ رہ گیا تھا وہ یہ کہ ان کی قوتِ اختیار سلب کر لی جاتی، ارادہ طاقت چھین لی جاتی شر کی طرف میلان (بزور دستی) موقوف کر دیا جاتا اور بدی کی جانب بڑھنے کی ہمت ہی معدوم کر دی جاتی، لیکن ایسا کرنے کے بعد انسان انسان نہ رہتا۔ اگر خدا چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا مگر فطرتِ انسانیہ معدوم ہو جاتی۔ ارادہ اور اختیار کے سلب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا خصوصی امتیاز زائل ہو جائے اور بہائم یا فرشتوں کی طرح ہو جائے۔ اور یہ ضابطۂ قدرت کے خلاف تھا، اس لئے خدا نے کسی پر جبر نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حکمت سے واقف تھے، مگر شفقت قومی اور رحمت نبوتی کے جذبہ سے مجبور تھے، پکڑ پکڑ کر دوزخ میں گرنے سے روکتے تھے۔ انسانی پتنگوں کو شمع جہنم پر قربان ہونے سے منع کرتے تھے، رسیاں باندھ کر تباہی کے غاروں میں سر افگندہ ہونے سے باز رکھتے تھے، لیکن محرومانِ ازلی کب مانتے تھے۔ حضور کی شفقت و رحمت کو ذاتی اغراض پر محمول کرتے اور کوئی رقیبانہ سرکشی کا ٹھکانہ رکھتے تھے۔ رؤف و رحیم نبی کو اس عدم فرمانبرداری سے رنج ہوتا، جان گسل الم ہوتا، مگر کیا کرتے مجبور تھے، جبر کی طاقت نہ تھی۔ یہ حالت تھی کہ خدا تعالیٰ نے تسلی بخش پیام ہدایت بھیجا کسی قدر ترش، مگر محبت آمیز لہجہ میں اس شفقت سے بچایا، اس سے روکا، انبیاء سابقین کی اُمتوں کا تذکرہ کر کے کافروں کی کفر طرازی سے متاثر نہ ہونے کی ہدایت کی اور صاف فرمایا کہ بالجبر

فرماں بردار بنا دینا ہمارے لئے آسان تھا مگر ہم نے ایسا نہ کیا صرف آیاتِ ہدایت نازل کیں اور ان کی تائید میں آیاتِ فطرت پیدا کر دیں۔ اب اگر یہ لوگ تکذیب کرتے ہیں تو کرنے دو پرواہ نہ کرو۔ اس تکذیب و استہزاء کا وبال ان کو خود بھگتنا ہے۔ اللہ زبردست غالب ہے مگر وہ رحیم بھی ہے اپنی رحمت کے صدقہ میں اس نے کچھ مہلت کے لئے ڈھیل دے رکھی ہے ورنہ احاطۂ قدرت اس کا تنگ نہیں نہ یہ لوگ اس کے دائرۂ گرفت سے خارج ہیں۔

تحلیلِ اجزاء

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ۔ کتاب سے مراد قرآن ہے جو حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے والا ہے جس کی ہدایت بالکل واضح اور جس کا اعجاز صاف نمایاں ہے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ الخ۔ مسلمانوں کی زندگی کا یہ عجیب دور تھا سخت ترین آزمائش کا زمانہ تھا۔ قوم کی قوم دشمن، کھانے پینے کی محتاجی اس پر کمال ایمانی کی یہ حالت کہ آنکھوں کے سامنے دوزخ اور جنت موجود تھی، ان کو گویا آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ ہمارے باپ بیٹے بھائی اور دیگر اعزاء، احباب دوزخ میں گر رہے ہیں، مگر اُف کرنے کی تاب نہ تھی۔ کوئی شخص بیٹے، باپ یا بھائی کو پھانسی پر چڑھتے دیکھے اور اُف نہ کرے یہ عجیب دردناک منظر ہوتا ہے۔ یہ تو عام مسلمانوں کی حالت تھی۔ رہے برحق ہادی مطلق جن کے ایک ہاتھ میں اہلِ جنت کی فہرست تھی اور دوسرے ہاتھ میں دوزخیوں کی اور دنیا کے تمام انسانوں سے زیادہ جذبۂ رحمت کے حامل بھی تھے ان کے اندوہ و رنج کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو صرف باپ کے دوزخی ہونے کا رنج تھا۔ یہاں چچا بھتیجے بھائی برادر بلکہ خاندان کا خاندان آگ میں جلتا اور پھانسی پر لٹکتا دکھائی دے رہا تھا اور نہ فقط خاندان بلکہ امت دعوت کے نونہال خوش جمال سوختہ نظر آ رہے تھے۔ نہ تاب گزارش تھی نہ طاقت سکوت اگر گویم زبان سوزد، ور دم در کشم مغز استخواں سوزد – کی مصداق حضور کی حالت تھی۔ دیکھنے والے حالت کو دیکھ کر کہہ سکتے تھے کہ اگر یہی روحانی الم اور جسمانی اندوہ رہا تو خدانخواستہ جان لے کر ٹلے گا۔ ایسے وقت میں خدا تعالیٰ نے تسلی دینے کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔ طرز سخن بظاہر عتاب آمیز ہے مگر محبت و شفقت سے بھرا ہوا ہے۔

ایک شبہ کلام عربی میں لفظ لعل امید کے معنی میں مستعمل ہے اور امید وہی شخص کرتا ہے جس کو انجام معلوم نہ ہو۔ خدا تو عالم الغیب ہے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کل آئندہ حالت معلوم تھی پھر امید ظاہر کرنے کے کیا معنی؟

ازالہ لفظ لعل امید کے معنی میں یہاں مستعمل نہیں ہے۔ عربی میں کیا تقریباً ہر زبان میں امید کا صیغہ ایسے موقع پر بھی بولتے ہیں جہاں انتہائی شفقت کا اظہار مقصود ہو۔ آیت مذکورہ میں بھی محبت بے پایاں کا اظہار مقصود ہے۔

اس طور پر بھی ازالہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کلام اگرچہ خدا تعالیٰ کا ہے، مگر اس سے مقصود حضور کی حالت کا بیان ہے گویا رسول اللہ کی حالت ایسی ہے جس کو دیکھ کر دیکھنے والے کہہ سکتے ہیں کہ شاید ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کے رنج میں آپ اپنی جان ہار دیں گے اور گھل گھل کر مر جائیں گے۔

تیسرا جواب اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ صیغۂ امید بول کر حضور کو ڈرانا مقصود ہے کہ اگر آپ کی یہی ہمدردی رہی تو ایک دن شاید اسی رنج میں آپ جان کھو بیٹھیں گے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ قرآن تو بالکل روشن ہے اس کی ہدایت واضح ہے، نورانی عقل والے اس کی ہمہ گیر روشنی کا انکار نہیں کر سکتے، لیکن جو کور دماغ ہیں جن کی روح میں روشنی نہیں ان کو قرآنی ہدایات کی روشنی نہیں دکھتی۔ ایسے کور باطن لوگوں کے ایمان نہ لانے پر آپ کو اپنا جی ہلکان نہ کرنا چاہیئے۔ نصیب دشمناں ایسا نہ ہو کہ جان پر آ بنے۔ بات یہ ہے کہ دنیا آزمائش گاہ ہے ہر شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے کہ دلائل نبوت اور براہین فطرت دیکھ کر جس کا جی چاہے باختیار خود ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے۔ اگر ہم ایمان پر مجبور کرنا چاہتے تو ایسی بڑی نشانی نازل کر دیتے جس کے آگے گردن جھکائے بغیر ان کو چارہ نہ ہوتا اور مجبور اور مضطر ہو کر ایمان لے آتے مگر اس وقت آزمائش نہ ہوتی اور ابتلا کا مقصد فوت ہو جاتا۔ اٰيَةً سے مراد ہے مجبور ہو کر فرماں بردار ہو جانا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا ذلیل اور مطیع ہونا مراد ہے۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اعناق سے مراد ہیں سرداران، کیونکہ اعناق القوم سرداروں کو کہتے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگر ہم چاہتے تو ایسی عظیم الشان، مجبور کن نشانی نازل کر دیتے کہ سرداران کفر مجبور ہو کر فرماں بردار اور مومن بن جاتے اور کسی کو سرتابی کی مجال نہ رہتی۔

مُحْدَثٍ یعنی ذکر محدث سے یہ مراد نہیں کہ ضابطۂ فطرت اور دستور قدرت کے خلاف کوئی نیا نصیحت نامہ نازل فرمایا جاتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ جس دستور موعظت پر یہ کفار چلنے کے لئے تیار نہیں ہیں اور جو ان کے رسم و رواج کے اعتبار سے نیا ہے (اگرچہ طریقۂ انبیاء وہی ہے) تو ایسے دستور نصیحت سے یہ لوگ روگردانی کرتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ اس جدید قانون کو جاری کرنے کے خدا تعالیٰ انہیں کی بہبودی چاہتا ہے کیونکہ وہ رحمٰن ہے اپنے بندوں پر رحم کرتا ہے۔ دستور جدید پر عمل کرنے میں نہیں کا نقصان ہے، وہ اپنی کی تباہی سے حفاظت ہے، مگر لوگوں کا ہدایت سے سرتابی کرنا ان کا شیوہ ہے۔

مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ۔ یعنی قسم قسم کی عمدہ چیزیں خدا تعالیٰ نے بنائی ہیں۔ عناصر، جمادات، نباتات، حیوانات، فلکیات و سماویات وغیرہ کل چیزیں اپنے اندر درس عبرت رکھتی ہیں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً۔ یعنی مطلوب نشانی سے بڑھ کر قدرت کی نشانیاں موجود ہیں۔ فرمائشی معجزہ اتنا اہم نہیں جتنا قدرتی نظام اہم اور بصیرت افروز ہے۔ جب ملاحظہ فطرت ان کے لئے ایمان آفریں نہیں تو فرمائشی معجزات کی تکمیل کس طرح موجب ہدایت ہو سکتی ہے۔

مقصود بیان

قرآنی ہدایت کے واضح ہونے کی صراحت اور در پردہ اس طرف اشارہ کہ جو شخص ضوابط قرآنی اور صراحت قرآنی پر شک کرے اور کسی غیر تعلیم کو قرآنی تعلیم سے زیادہ صادق و مفید جانے وہ کور باطن ہے۔ بے بصیرت ہے۔ اس سے عبرت حاصل کرنی چاہئیے اس زمانہ میں تعلیم یافتہ طبقہ کو جو روسو کارل مارکس اور دوسرے عقلمندوں کے بنائے ہوئے اقتصادی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی قوانین کو قرآنی تعلیم سے زیادہ مفید جانتے اور ان کو انسانی دنیا کی ضروریات کا بہترین کفیل قرار دیتے ہیں اور ان کے مقابلے میں قوانین کتاب اللہ کو ظالمانہ، معصیت آفریں اور مصلحت عامہ کے خلاف سمجھتے ہیں۔ آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے۔ اس سے یہ امر بھی ثابت ہوتا ہے کہ کافروں کے کفر پر رسول اللہ کو انتہائی رنج ہوتا تھا اور حضور والا نہ فقط اہل ایمان کے شفیق تھے بلکہ کافروں کی ابتر حالت دیکھ کر بھی حضور کو بہت زیادہ اندوہ و الم ہوتا تھا۔ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ الخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خدا اگرچہ قادر مطلق ہے سب کچھ کر سکتا ہے مگر اس نے انسان کا اختیار سلب نہیں کیا تاکہ مقصود امتحان پورا ہو سکے۔ پس گمراہ ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ انسان مجبور محض ہے۔ مِنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ نصیحت آفریں تعلیم دینے کا حق خدا سے زیادہ کسی کو نہیں۔ دانشمندوں کا گروہ جو اصلاحی قوانین بناتا ہے وہ جذبۂ رحمت کے زیر اثر بناتا ہے دنیا میں امن قائم کرنا، فساد کا استیصال کرنا اور اہل عالم کو چین سکھ کی زندگی عطا کرنا ان کا مقصود ہوتا ہے۔ چونکہ ان کی نظر محدود اور جذبۂ رحمت قوی ہوتا ہے اس لئے اپنے منتہائے نظر کے مطابق وہ قوانین بناتے اور ان کو انسانوں میں جاری کرتے ہیں، لیکن اللہ رحمٰن ہے۔ اس سے بڑھ کر رحم والا کوئی نہیں ہے اس لئے اس کے بنائے قانون کو تمام دانشمندوں کے قوانین سے زیادہ شفقت آمیز ہونا چاہئیے وغیرہ۔

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا يَتَّقُوْنَ ۝ قَالَ رَبِّ

اور جب موسیٰ کو تیرے رب نے ندا دی کہ ظالم قوم یعنی فرعون کے پاس جاؤ کیا وہ پرہیزگاری نہیں کریں گے موسیٰؑ نے کہا

اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۝ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ ۝

پروردگار مجھے ڈر ہے کہ وہ میری تکذیب کریں گے اور میرا سینہ تنگ ہو جائے گا اور میری زبان نہ چلے گی اس لئے ہارون کو پیغمبر بنا دے

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ۝ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ۝

اور میرے ذمہ ان کا ایک قصور ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ مجھے قتل کر ڈالیں گے۔ اللہ نے فرمایا ہرگز نہیں تم دونوں میری نشانیاں لے کر جاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں (اور سب کچھ) سنتے

فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۝ قَالَ اَلَمْ

رہنے والے ہیں۔ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم رب العالمین کے فرستادہ ہیں ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے فرعون نے کہا ہم نے

نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۝ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ

بچپن میں تجھے اپنے ہاں پرورش نہ کیا تھا اور کیا تو ہم میں اپنی عمر کے چند سال نہیں رہا تھا اور کیا تو نے وہ حرکت نہ کی تھی جو کر چکا تو ضرور ناشکرا

الْكٰفِرِيْنَ ۝ قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ط فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ

ہے ۔ موسیٰ نے کہا میں نے اس وقت جو وہ حرکت کی تھی تو میں چوک گیا تھا اور تم سے ڈر کر بھاگ گیا تھا پھر میرے رب نے مجھے

حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ط

حکمت دی اور مجھ کو پیغمبروں میں سے کر دیا اور یہ بھی کوئی نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے

تفسیر

اس سورت میں سات قصے مختلف انبیاء کے بیان کئے ہیں۔ ہم قصص قرآن کے مفصل فوائد ایک سے زیادہ مقامات پر لکھ چکے ہیں، اس لئے مزید اعادہ موجب تطویل ہے۔ یہاں صرف یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جو قوم زیادہ سرکش اور ظالم گزری ہے اس کے نبی کو اتنا ہی با عظمت اور پُر جلال بنا کر خدا نے بھیجا ہے۔ دنیا میں بہت سے جلال و جبروت والے بادشاہ گزرے ہیں جن کے زمانے میں سائنس و فلسفہ بھی اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچا ہوا تھا اور مال و دولت جاہ و حشم، ممالک محروسہ کی وسعت، فوج کی غیر محدود طاقت، ہمہ گیر شان و شوکت غرض ہر دنیوی نعمت ان کے ہمرکاب تھی۔ جب تک یہ عظیم الشان بادشاہ اور ان کی کوششیں حکومت راہِ راست پر رہیں خدا نے اپنے لامحدود انعامات کی بارش برابر ان پر کی، لیکن جب انہوں نے حدِ فطرت سے آگے قدم بڑھایا یا بادۂ نخوت سے سرمست ہو کر عبدیت کے دائرہ سے باہر نکلنا چاہا فوراً غیبی کوڑا ان کے منہ پر پڑا۔ اوّل جلیل القدر انبیاء کو پیام ہدایت آخری دے کر بھیجا گیا۔ پیغمبروں نے نرمی سے سمجھایا، معجزات دکھائے، سرتابی کے رسوا کن نتائج سے ڈرایا۔ انجام بد کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ کر رکھ دی، مگر جن کی آنکھوں پر رعونت و غرور کی چربی چھائی ہوئی ہو ان کو کچھ نہیں سوجھتا۔ سرکش بادشاہوں، پُر جلال امیروں اور مغرور لیڈروں نے ایک دھاندلی، انبیاء کی ہنسی اڑائی، جسمانی دکھ پہنچائے، طاغوتی سازشوں سے کام لیا۔ البتہ چند بے کس غریب کنگال اور عافیت طلب فقیروں نے پیغمبروں کا ساتھ دیا۔ شیطانی گروہ نور حق کو بجھانے کے درپے ہو گیا، باطل کی آندھیاں زور و شور سے چلنے لگیں، مالی استحصال، عدالتی اور فوجی طاقتوں کے مظاہرات حق پرستوں کی بیخ کنی کے لئے کئے گئے، مگر اللہ والوں کی پشت پر غیبی ہاتھ ہوتا ہے، اللہ کی تلوار ان کی ہدایت کے لئے بے نیام ہو جاتی ہے، طاغوتی گروہ کی کوئی طاقت کام نہ آئی کو حق سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ ہر ریشہ دوانی اور وسیسہ کاری اُلٹی پڑی، لیکن اہل حق کو غلبہ یونہی حاصل نہ ہوا بڑی سے بڑی مالی اور جانی قربانیاں کرنی پڑیں، افلاس واحتیاج، ملکی قانون کی سخت گیری، گھر بار کی بربادی، نوجوان اولاد کا ظالموں کے ہاتھوں خون میں لوٹنا، معصوم بچوں کا بے آب و دانہ تڑپنا، مال و اولاد کا چھنا، اہل و عیال سے جدا ہونا، عزیز وطن اور دوستوں کو چھوڑنا غرض مصائب و آلام اور طاغوتی قہر کا کوئی پہاڑ ایسا نہ تھا جو اہل حق پر نہ ٹوٹا ہو اور تباہی و بربادی کا کوئی زلزلہ ایسا نہ تھا جس نے اللہ والوں کے دلوں کو نہ ہلا دیا ہو۔ خوب لوٹے گئے، خوب جھنجھوڑے گئے، خوب دبائے گئے، خوب تپائے گئے بالآخر اُبھرے۔ کندن کی طرح چمکے، بادشاہ کی طرح بڑھے۔ نورِ حق پھیلا اور پھیل کر رہا اور چمک کر رہا۔ قدیم سے یہی دستور چلا آیا ہے، فطرت کا ضابطہ یہی ہے، قدرت کا قانون یہی ہے، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ سبھی کو روح فرسا مصیبت کے پہاڑ اٹھانے پڑے۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہ رہے، سرزمین عرب کا بچہ بچہ دشمن تھا، اپنے اور بیگانے خون کے پیاسے تھے، خوف و طاقت کے پہاڑوں سے ٹکرانا پڑا، انسانی تخیل کی انتہائی رسائی جس مصیبت و الم تک ہو سکتی تھی وہ سب آپ پر اور آپ کے جاں نثار ساتھیوں پر توڑی گئی۔ شدائد و آلام کا مقابلہ کرتے کرتے جب مسلمانوں کے کوہ طاقت بازو زخمی ہو گئے تو غیبی تسکین کی روح پرور ہوائیں چلیں۔ انبیاء اور ان کی قوموں کا تذکرہ کر کے صبر، پامردی اور استقامت کی تلقین کی گئی اور انجام کار پامردی اور استقلال کا جو زریں نتیجہ نکلنا تھا نکلا، اسلام غالب آیا اور طاغوتی قوتوں کو شکست ہوئی۔ اس سورت میں ساتوں قصے اپنے اندر یہی درسِ بصیرت رکھتے ہیں۔

تحلیل اجزاء وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى۔ یہ واقعہ کوہ طور کا ہے جب حضرت موسیٰ اپنی بی بی صفورا کو لے کر واپس آ رہے تھے اور آگ دیکھ کر پہاڑ پر گئے تو وہاں ایک غیبی ندا بغیر کسی وساطت کے آواز و حروف کی کیفیت کے ساتھ سنی اور حکم ہوا کہ ظالم قوم فرعون اور قبطیوں کے پاس جا کر پیغام پہنچاؤ۔ حضرت موسیٰؑ کو ندائے ربانی کا پہلا موقع تھا اس سے قبل ایسا دل نواز خطاب کبھی نہ سنا تھا۔ اس لئے عرض کیا: رَبِّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ — پروردگار! مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھوٹا جانیں گے میرا سینہ کشادہ نہ ہوگا اور زبان نہ چلے گی۔

مشہور ہے کہ فرعون کی بی بی نے حضرت موسیٰ کو ابتدائی شیر خوارگی کی حالت میں نیل کی تہ سے نکلوا کر اپنا بیٹا بنایا تھا۔ آپ نے ایک بار فرعون کی داڑھی پکڑ لی تھی

اس نے غضبناک ہو کر قتل کا حکم دے دیا۔ بیوی نے سفارش کی اور کہا یہ نادان بچہ ہے۔ اس کو آپ کی عظمت کا کیا احساس ہو سکتا ہے۔ آگ اور یاقوت دونوں اس کے لئے برابر ہیں۔ فرعون حضرت موسیٰ کی طرف سے پہلے سے کھٹک رہا تھا، زندہ چھوڑنا نہ چاہتا تھا، بہانے کا طلب گار رہتا تھا۔ بیوی کی سفارش پر بطور تجربہ ایک طشت میں یاقوت سرخ اور دوسرے طشت میں انگارے بھر کر موسیٰ کے سامنے رکھے۔ حضرت موسیٰ نے ایک انگارا اٹھا کر زبان پر رکھ لیا جس سے زبان پر گرہ پڑ گئی اور لکنت پیدا ہو گئی۔ فرعون کو نادانی کا یقین ہو گیا اور معاملہ آیا گیا ہو گیا۔ جو لوگ اس واقعہ کو صحیح کہتے ہیں ان کے نزدیک لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ سے اسی طرف اشارہ ہے۔

بعض اہل تفسیر کہتے ہیں کہ آپ کی زبان میں قدرتی لکنت تھی۔ مذکورہ واقعہ غلط ہے۔ بعض کہتے ہیں اس سے لکنت ثابت نہیں ہوتی صرف اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ سلاست سے گفتگو نہ کر سکوں گا۔ چونکہ موسیٰ کے مزاج میں تیزی اور غصہ تھا اور تیز مزاج آدمی سنجیدہ اور سلیس گفتگو نہیں کر سکتا، اس لئے موسیٰ نے کہا کہ میری زبان رواں نہ ہو گی۔

فَاَرْسِلْ اِلٰی ھٰرُوْنَ۔ ہارون کو رسول بنا دیا جائے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ موسیٰ نے بار نبوت کو اٹھانے سے انکار کیا بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہارون کو بھی نبی بنا کر میرا مددگار کر دیا جائے۔ دوسری آیت اسی مطلب کی مؤید ہے جس میں حضرت موسیٰ نے درخواست کی تھی کہ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ ھٰرُوْنَ اَخِی اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ وَ اَشْرِکْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ ۔

وَلَھُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ۔ حضرت موسیٰ نے ایک قبطی کو مکا مار کر بلاقصد قتل کر دیا تھا اور پھر فرعون کے ڈر سے بھاگ کر مدین چلے گئے تھے۔ وہاں حضرت شعیب کی صاحبزادی سے نکاح کیا برسوں رہے، مدت گزر گئی، مگر دل میں کھٹکا لگا ہوا تھا کہ قبطی کو قتل کیا ہے خدا جانے مصر پہنچ کر کیا ہو؟ اس لئے عرض کیا کہ مجھے اندیشہ ہے وہ گزشتہ جرم کی پاداش میں مجھے قتل نہ کریں۔ قبطی کو قتل کرنا گناہ نہ تھا، فرعون ہزاروں کو تہ تیغ کر چکا تھا اگر موسیٰ نے ایک قبطی کو مار ڈالا تو کون سا جرم تھا، مگر فرعون کی نظروں میں جرم عظیم تھا۔ ظالم قوم اپنی دراز دستیوں پر غور نہیں کرتی اور مظلوم کا ادنیٰ قصور بھی اس کے نزدیک ناقابل عفو جرم ہوتا ہے۔

ایک شبہ حضرت موسیٰ نبی تھے اور اللہ کی طرف سے ایک خدمت پر مامور کئے گئے تھے پھر کس طرح انہوں نے اتنی بزدلی کی کہ اپنے جان کے اندیشہ سے حکم تبلیغ سے اعراض کیا اور اعراض کے لئے بہانہ پیش کیا۔ مقربان الٰہی تو تعمیل حکم میں جان سے دریغ نہیں کرتے۔

ازالہ حضرت موسیٰ نے بہانہ نہیں کیا نہ بزدلی کی بلکہ ان کو اندیشہ ہوا کہ میں اگر مصر پہنچا اور قبطیوں کو اطلاع ہو گئی تو وہ مجھے گرفتار کر کے ادائے رسالت سے قبل ہی قتل کر دیں گے اور منشائے الٰہی پورا نہ ہو سکے گا اور میں مجرم قرار پاؤں گا، اس لئے پہلے سے طے کر لینا چاہیئے یا تو یہ اطمینان ہو جائے کہ وہ مجھے قتل ہی نہ کر سکیں گے یا یہ معلوم ہو جائے کہ ادائے رسالت سے پہلے مجھ پر دسترس ہی نہ ہو گی یا کم از کم میں بری الذمہ ہو جاؤں۔ اگر پیام پہنچانے سے پہلے قتل ہی کر دیا جاؤں تو عدم ادائے رسالت کی بازپرس مجھ سے نہ ہو۔

فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَاۤ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ۔ فَاْتِیَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَاۤ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ یہ کلام اس وقت کا ہے جب حضرت موسیٰ کی درخواست حضرت ہارون کو پیغمبر بنا دیا گیا۔ اس وقت اگرچہ ہارون موسیٰ کے ساتھ موجود نہ تھے، لیکن چونکہ حضرت موسیٰ رسالت میں اصل تھے اور ہارون تابع تھے، اس لئے حضرت موسیٰ سے خطاب کرتے وقت تثنیہ کا صیغہ بولا اور فرمایا تم دونوں جاؤ۔

اٰیٰت سے مراد معجزات ہیں اس وقت حضرت موسیٰ کو صرف دو معجزات ملے تھے۔ ید بیضا اور عصا، اس لئے جمع کے صیغہ سے دو معجزے مراد ہیں اور کلام عربی میں ایسا ہوتا ہے یا دل سے خوف و ہراس کا دور ہونا، قبطیوں کا حضرت موسیٰ کے قتل پر قادر نہ ہونا، زبان کا رواں ہو جانا یہ سب بھی اللہ کی نشانیاں تھیں یہ سب مراد ہیں۔ یا آیات سے مراد احکام ہیں۔

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۔ حضرت یعقوبؑ کے ساتھ ان کے بیٹے پوتے حضرت یوسفؑ سے ملنے مصر آئے تھے۔ یہاں ان کی نسل میں خدا تعالیٰ نے برکت دی اور چند نسلوں کے بعد ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ قبطیوں نے وطنی تحریک شروع کر دی۔ فرعون موسیٰ سے پہلے شاہان مصر تو کچھ زیادہ جذبہ عصبیت نہ رکھتے تھے بنی اسرائیل کو اگرچہ کامل طور پر شہری حقوق حاصل نہ تھے، مگر پھر بھی کچھ زیادہ ذلت کی نظر سے ان کو نہ دیکھا جاتا تھا۔ اس فرعون کے زمانے میں ان پر غیر معمولی سختیاں کی جانے لگیں، عام طور پر ان سے بیگار لی جاتی، ذلیل ترین خدمات پر مامور کیا جاتا، حکومت کے تمام شعبوں سے خالی تھے، انسانی آزادی قطعی سلب تھی، مدنی حقوق تو درکنار آدمیت کے حقوق سے بھی محروم تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ان کی حالت اور بھی سقیم ہو گئی تھی۔ ہیبت ناک خواب فرعون نے دیکھا تھا۔ نجومیوں نے اس کی تعبیر میں کہا کہ ایک اسرائیلی لڑکا مصر میں انقلاب پیدا کرے گا اور اس کے ہاتھ تیرا تخت و تاج غارت ہو گا۔ فرعون پہلے سے ہی بنی اسرائیل کا دشمن تھا اس تعبیر کو سن کر اور بھی برافروختہ ہو گیا حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے۔ یہ حکم ایسا وحشیانہ تھا جس کی نظیر تاریخ کے صفحات میں موجود نہیں۔ بنی اسرائیل پہلے ہی سے غلام تھے

تنگ تھے اور ترکِ وطن کا ارادہ کر کے ملک شام کو جانا چاہتے تھے، مگر حاکمِ شام فرعون مصر کا دشمن تھا، اس لئے بنی اسرائیل کو فرعون نے مصر ہی میں روک رکھا تھا کہ کہیں شام میں ہو کر دشمن کے ہاتھ قوت نہ بن جائیں۔ قتلِ اولاد کے حکم سے اولاً ہجرت پر آمادہ ہو گئے، مگر فرعون کی چیرہ دستیوں نے ہمت میں سکت نہ چھوڑی تھی اور کسی میں جرأت نہ تھی کہ پنجۂ ستم سے رہائی دلاتا اور جلا وطن ہونے کی اجازت لے سکتا۔ خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ہارون کو حکم دیا کہ جا کر فرعون کے پنجہ سے بنی اسرائیل کو آزاد کرائیں اور سب کو ساتھ لے کر مصر سے شام کو چلے جائیں۔ چنانچہ موسیٰ اور ہارون نے حکم کی تعمیل کی اور مصر پہنچ کر اسرائیلیوں کی واگذاشت کی فرمائش کی۔ فرعون کے سامنے کب کسی اسرائیلی نے ایسی جرأت کر کے ایسی درخواست کی تھی، وہ بنی اسرائیل کو آدمی ہی کب سمجھتا تھا۔ جو درجہ ہندوستان میں اچھوت اقوام کا تھا اور کسی قدر اب بھی ہے اس سے کہیں بدتر فرعون کی نظر میں بنی اسرائیل تھے۔ حضرت موسیٰ کا کلام سنتے ہی جذبۂ طاغوتی بر سرِ جوش آیا۔ حضرت موسیٰ کو دیرینہ احسانات یاد دلاتے ہوئے انتہائی رعونت کے ساتھ کہنے لگا کہ تیرے اندر بھی ہمت ہو گئی (کہ تیرے اندر بھی یہ جرأت ہو گئی، کیا تجھے یاد نہیں کہ) :-

اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۙ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۔ ہم نے تجھے بچپنے کو پالا تھا اور برسوں تو ہمارے زیرِ پرورش رہا تھا پھر تو نے ایک بدترین حرکت کی۔ اب تو نے ہمارے تمام احسانوں کو بھلا دیا۔ واقع میں تو بڑا احسان فراموش ہے۔

قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۔ حضرت موسیٰ نے اقرار کیا اور فرمایا ہاں مجھ سے وہ حرکت ہو گئی تھی مگر اس وقت میں ناواقف تھا۔

ایک شبہ ضلالت کے معنی ہیں گمراہی اور اشاعرہ کے نزدیک عصمت انبیاء قبل از نبوت بھی مسلم ہے پھر حضرت موسیٰ نے اپنی گمراہی کا اقرار کیسے کیا۔ کیا حضرت نبوت سے پہلے گمراہ تھے؟

ازالہ ضلالت کے دو معنی ہیں (۱) گمراہی یعنی راہِ حق سے پھر جانا اور سیدھے راستے کو چھوڑ کر ٹیڑھے راستے پر چلا جانا اور اسی کو راہِ حق سمجھے، مسجد کی راہ چھوڑ کے مندر کی راہ اختیار کرے اور اسی کو مسجد کا راستہ سمجھے (۲) ناواقفیت اور جہالت یعنی راہِ حق کی جستجو اور طلب۔ اول قسم کی ضلالت انبیاء کے حق میں ناممکن ہے نبوت سے پہلے ہو یا بعد۔ دوسری قسم کی ضلالت نبوت سے پہلے ہو سکتی ہے۔ بقول ابن عباس و مجاہد و قتادہ و ضحاک یہی مراد ہے۔ نبوت سے پہلے حضرت موسیٰ راہِ حق سے ناواقف تھے، ہمہ تن طلب گار تھے۔ رسول پاک کو بھی خطاب کرتے ہوئے خدا تعالیٰ نے سورۂ والضحیٰ میں فرمایا ہے۔ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى۔

الحاصل حضرت موسیٰ نے اپنی ناواقفیت کا عذر پیش کیا۔ گویا آپ کا مقصد یہ تھا کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ گھونسہ مارنے سے وہ مر جائے گا میں نے عمداً قتل نہیں کیا اس میں فرعون پر تعریض بھی کر دی کہ تو نے عمداً لاکھوں معصوموں کو بے گناہ قتل کرا دیا تجھ سے بڑھ کر مجرم کون ہو سکتا ہے۔ میں نے تو ناواقفیت کی حالت میں بغیر ارادۂ قتل قتل کیا اور تو نے جانے بوجھے بے دریغ خوں ریزی کی۔

فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا ۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا پھر جب تم لوگوں کے ڈر سے میں بھاگا تو اس کے بعد خدا تعالیٰ نے مجھے علم عطا کیا اور نبی بنا کر تمہارے پاس بھیجا۔
وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۔ رہا یہ امر کہ تم نے میری پرورش کی اور اب مجھ پر اس کا احسان جتلاتے ہو تو اس کا مجھ پر کوئی احسان نہیں، یہ تو اس وجہ سے تھا کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا تھا۔ اس کی اصل وجہ یہی کہ تم نے بنی اسرائیل کو انسانی آزادی سے محروم کر رکھا تھا اور سب کو غلام سمجھ لیا تھا اور یہاں تک ان پر ظلم کیا تھا کہ کاہنوں کے کہنے سے ان کے نوزائیدہ بچوں کو تم ذبح کر دیتے تھے۔ اسی سفاکی کے دور میں میں پیدا ہوا۔ میری ماں نے ڈر کے مارے مجھے صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا اور صندوق بہتے بہتے تمہاری بیوی کے ہاتھ لگ گیا، اس نے مجھے پال لیا۔ یہ ساری باتیں اسی وجہ سے ہوئیں کہ بنی اسرائیل تمہارے پنجۂ ستم میں گرفتار تھے ورنہ میں تمہارے پاس پہنچتا ہی کیوں اور میری پرورش میرے والدین ہی کیوں نہ کرتے۔ غرض اس پرورش کا اصل سبب تمہارا ظلم ہے۔ لاکھوں پر ظلم کر کے ضمنی طور پر بغیر کسی ارادہ کے میری پرورش کر دی کون سا احسان ہے۔

مقصود بیان اللہ کی آواز بغیر کسی وساطت کے بعض انبیاء سن سکتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کی غرض فقط بنی اسرائیل ہی کی اصلاح نہ تھی بلکہ فرعون اور اس کی قوم کو ہدایت کرنی بھی ان کا طریقہ تھا۔ اگرچہ بنی اسرائیل کو سدھارنا اصل منشاء تھا۔ معمولی انسان ہو یا جلیل القدر انبیاء احتیاجِ بشری سے کوئی بری نہیں۔ نظامِ قدرت اسباب کی کڑیوں سے وابستہ ہے۔ ہر کام کی تدبیر کرنی اور شروع کرنے سے پہلے ظاہری اسباب کو فراہم کرنے کی کوشش کرنی لازمی فریضہ ہے۔ حضرت موسیٰ نے ندائے ربانی کے جواب میں جو کچھ عرض کیا تھا وہ اسی کی کامل تعلیم دے رہا ہے۔ اتنا جانتے ہوئے کہ پیغمبر اللہ کی طرف سے خاص خدمت پر مامور کیا جاتا ہے، لیکن اپنی کمزوری خطابت، تعلیمی اور نزاکت فطری و دو دلا ... پیش فرماتے اور اسباب کی تکمیل کے فراہم نہ ہونے کو ظاہر کر کے ... یہ طرزِ گفتگو تعلیم دے رہا

جو کہ دینی خدمت کرنے کے لئے بھی پہلے اسباب کی فراہمی کا خیال ضرور ہونا چاہیئے۔ لفظ ... بتا رہا ہے کہ ظاہری اسباب ہوں یا نہ ہوں اگر اللہ کسی کام کو کرانا چاہتا ہے تو بڑی سے بڑی طاقت رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی۔

آیت اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو جو فرعون کے پاس بھیجا گیا اس کی غرض علاوہ دعوت توحید اور تبلیغ اسلام کے بنی اسرائیل کی رہائی بھی تھی۔

وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ کا لفظ بتا رہا ہے کہ حضرت موسیٰ نے قبطی قانون کے خلاف کوئی نا روا حرکت ضرور کی تھی یعنی قبطی کو مار ڈالا تھا، اپنی غرض کے لئے کسی پر احسان کرنا در حقیقت احسان نہیں وغیرہ۔

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝

فرعون نے کہا رب العالمین کیا چیز ہے؟ موسیٰ نے کہا آسمانوں کا اور زمین کا اور اُن کی درمیانی کائنات کا مالک ہے اگر تم یقین کرلو (تو مان لو)

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ۝ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ

فرعون نے اپنے آس پاس کے لوگوں سے کہا کیا سُن رہے ہو؟ موسیٰ نے کہا وہ تمہارا بھی رب ہے اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا بھی رب ہے فرعون بولا تمہارا پیغمبر جو تمہارے پاس

الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۝ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

بھیجا گیا ہے ضرور دیوانہ ہے موسیٰ نے کہا وہ مشرق و مغرب اور اُن کے درمیان جو کچھ ہے سب کا مالک ہے اگر تم عقل رکھتے ہو (تو سمجھ لو)

قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۝ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ مُّبِيْنٍ ۝

فرعون بولا اگر تو نے میرے سوا کسی کو معبود قرار دیا تو میں ضرور تجھے قید کردوں گا موسیٰ نے کہا اگر میں تیرے سامنے کوئی صریح دلیل لے آؤں تب بھی

قَالَ فَاْتِ بِهٖٓ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَّنَزَعَ

فرعون بولا اچھا پیش کرو اگر تو سچا ہے موسیٰ نے اپنی لاٹھی کو ڈالا تو فوراً وہ کھلم کھلا اژدہا بن گئی اور اپنا ہاتھ

يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَاۗءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۝ۧ قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۝ يُّرِيْدُ اَنْ

۲
ع
۶

گریبان میں ڈال کر نکالا تو فوراً وہ ناظرین کے لئے سفید (معلوم ہونے لگا) فرعون نے اپنے اردگرد کے سرداروں سے کہا بلاشبہ یہ شخص ماہر جادوگر ہے اپنے جادو سے تم کو تمہارے

يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ڰ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِي الْمَدَاۗىِٕنِ

ملک سے نکال دینا چاہتا ہے اب تم لوگ کیا مشورہ دیتے ہو وہ بولے اس کو اور اس کے بھائی کو مہلت دیجئے اور شہروں میں سپاہی

حٰشِرِيْنَ ۝ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ۝ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ وَّقِيْلَ

بھیج دیجئے کہ ہر زبردست ماہر جادوگر کو لے آئیں غرض ایک مقرر دن کے خاص وقت پر جادوگروں کو جمع کیا گیا اور لوگوں سے

لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ۙ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ○

کہہ دیا گیا	کہ تم بھی	جمع ہو جاؤ	تاکہ اگر	جادوگر	غالب آجائیں	تو ہم ان کی	پیروی کریں

تفسیر سرکش انسان جب طاقت، حکومت، دولت اور عظمت کے نشے سے چور ہو جاتا ہے تو آنکھوں پر خود فریبی کی پٹی آجاتی ہے، دماغ پر نخوت کا بھوت سوار ہو جاتا ہے عقل پر جہالت، آنکھوں پر رعونت کے موٹے موٹے پردے پڑ جاتے ہیں۔ آغاز و انجام کی طرف سے غافل ہو کر ہم چو من دیگرے نیست کی صدا بلند کرتا ہے۔ چار دانگ عالم میں ھَلْ مِنْ مُّبَارِزٍ کا ڈنکا بجاتا ہے اور بر بنائے غلط فہمی یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ بر خود غلط ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کو اپنی ہستی کے سوا کوئی قادر مطلق اور خالق برحق نظر نہیں آتا۔ بادۂ نخوت تمام ادراکی قوتوں کو معطل کر دیتی ہے۔ نظر و فکر، غور و خوض، ادراک و عرفان یہاں تک کہ باطنی احساس اور وجدان سے بھی کورا ہو جاتا ہے۔ یہ درجہ انتہائی جہالت کا ہوتا ہے۔ نعوذ باللہ بد اندیشی کی تاریکی بہت گھٹا ٹوپ ہوتی ہے جو تمام نورانی قوتوں پر چھا جاتی ہے۔ خدا کی صفات و حالات کا اقرار تو درکنار وہ حقیقت الٰہیہ کے وجود سے ہی انکار کر دیتا ہے اور جب کلمۂ حق کسی حق پرست کی زبان سے سنتا ہے تو اس کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے، جوش و غضب کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر نقلی اور فطری دلائل سے مغلوب ہو گیا اور پرستار حق نے موجودات ذہنیہ کو محسوسات کا جامہ پہنا کر سامنے لا کھڑا کیا اور اس غرور کے زیر کوئی نہ بچا تو سمند ناز پر مزید تازیانہ پڑتا ہے، سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے اور کریلا اور نیم چڑھا بن جاتا ہے، مغلوب الحواس ہو کر سطحیت پر اتر آتا ہے، اپنی مافوق قوت سے ڈراتا ہے، اور تمام جنود شیطانی اس کا ہمنوا ہوتا ہے، لیکن جب حق پرست اللہ والے اس کی مادی طاقت سے بھی مرعوب نہیں ہوتے اور جلال میں آکر غیبی قوت قدسیہ سے استمداد کر کے بجز حق کی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اس وقت غرور کا دیوتا کسی قدر ہوش میں آتا ہے، کچھ کچھ نشہ اترنا شروع ہوتا ہے، ادھر ادھر بغلیں جھانکتا ہے، اگر طاقت کا گھمنڈ اب بھی آسانی سے نہیں اترا کرتا اس سے عجز زدہ انسان بھی اپنے حواس کو درست کر کے تمام علمی، مالی، ملکی، جسمانی، فوجی طاقتوں کو جمع کر کے مقابلہ کی کوشش کرتا ہے، لیکن جب حق کے پہاڑ سے ٹکرا کر اس کی تمام طاقتیں پاش پاش اور چور چور ہو جاتی ہیں تو اس وقت کامل طور پر نشہ اترتا ہے اور آستانۂ حق پر پیشانی جھکا دیتا ہے مگر اس وقت ہر اقرار اور ایمان بے کار ہوتا ہے۔ تقدیر الٰہی کی کمان سے انتقام کا جو تیر نکلتا ہے وہ واپس نہیں ہو سکتا۔ حضرت موسیٰ کے مقابلے میں فرعون نے بھی انہیں دھمکیوں، رعب، اندازیوں اور لشکر کشیوں سے کام لیا۔ سب سے پہلے رب العالمین کا نام سنکر ہی کو اچنبا ہوا، صفات الٰہیہ کا تو اس کو تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا، غبی اور دہری خیال کا آدمی تھا وجود باری کے اقرار سے بھی سرکشی کی اور رب العالمین کو اپنی مقدار جانتا، اپنی دماغی طاقتوں کو اس قدر محیط کل سمجھا کہ حقیقت الٰہیہ کو دریافت کرنے لگا۔ بولا رب العالمین کیا چیز ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ عارف کامل تھے اور فرعون کی بیہودہ سخنی سے واقف تھے اور حقیقت الٰہیہ کا تصور انسانی دائرۂ فکر کائنات کے احاطہ علم سے خارج تھا، اس لئے آپ نے اللہ کی ربوبیت عامہ کی تھوڑے تھوڑے تشریح کی اور جس قدر انکار اور اچنبا فرعون کو بڑھتا گیا اسی قدر آپ ربوبیت الٰہیہ کی تفصیل میں اضافہ کرتے گئے۔ یہاں تک کہ فرعون لاجواب ہو گیا اور جاہلانہ دھمکیوں پر اتر آیا، لیکن جب کوئی دھمکی کارگر انداز اور رعب افگن نہ دیکھی اور حق کی پرجلال طاقت کو اپنے سامنے کارفرما پایا اس وقت بھی موقعہ تھا کہ ہوش سے کام لیتا، عقل کی آنکھیں کھولتا، جہالت کے پردے بصیرت کے چہرے سے دور کرتا۔ ایک طرف عصائے موسیٰ اژدہا بن کر غیبی قہاری طاقت کا مظاہرہ کر رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ اللہ کی طاقت کی لاٹھی اور اس لاٹھی کی ایک جنبش مغرور آسمانی جاہ بادشاہوں کے قصر حکومت میں زلزلہ پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ دوسری طرف ید بیضا کی شکل میں آفتاب ہدایت کی غیبی روشنی پرتو انداز تھی جس سے ہر باطل پرست کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں، لیکن افسوس یہ غفلت اور رحمت کا مظاہرہ، یہ غضب اور طاقت کا جلوہ اور یہ آفتاب قہر و مہر کا محسوس شکل میں آنا بھی بے سود۔ فرعون مرعوب ضرور ہوا مگر عقل کی آنکھوں سے پٹی نہ کھلی، اپنی مادی طاقت کو جمع کرنے اور جیتی ہوئی بازی پر غلبہ پانے کی فکروں میں منہمک ہو گیا، موسیٰ کو جادوگر قرار دیا، ہادی برحق کی ہدایت کو ذلیل، دنیوی اغراض کے حصول پر محمول کیا اور ساحروں کو اکٹھا کرنے کا حکم دے دیا۔

تحلیل اجزاء وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ: حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہا تھا میں رب العالمین کا رسول ہوں۔ فرعون کے کان میں یہ بات نئی پڑی تھی۔ موسیٰ سے قبل اس کے سامنے کوئی رب العالمین کا نام لینے والا نہ تھا۔ اس لئے انکار، استہزاء اور تعجب سے بولا رب العالمین کون ہے؟ میں تو رب اعلیٰ تو میں ہوں میرے سوا اور کون رب العالمین ہے جس نے تمہیں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ عام مفسرین نے لفظ مَا کو مَنْ کے معنی میں لے کر تفسیر کی ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں تو صاف مذکور ہے فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى اس وقت ترجمہ وہی ہوگا جو ہم نے اوپر بیان کر دیا۔ البتہ امام رازی نے لکھا ہے کہ فرعون نے رب العالمین کی ماہیت دریافت کی تھی

اگرچہ مفسرین نے امام رازی کے قول کو ضعیف کہا ہے مگر میرے نزدیک یہ قابلِ ترجیح ہے۔ بات یہ ہے کہ فرعون بزعم خود ربِ اعلیٰ بنا ہوا تھا اور دہری خیال کا آدمی تھا۔ اللہ کی ذات اور وجود کا بھی منکر تھا۔ نظامِ کائنات کو قدیم جانتا تھا اور اس کو بخت و اتفاق کا نتیجہ قرار دیتا تھا۔ جب موسیٰ نے اس کے سامنے رب العالمین کا لفظ بولا تو مناسب یہ تھا کہ اللہ کی ربوبیت کے متعلق دلائل کا استفسار کرتا، مگر اس کو وجود ہی کا انکار تھا۔ صفتِ ربوبیت کے متعلق کچھ دریافت کرنا تو اقرارِ وجود پر مبنی ہے، اس لئے بجائے صفتِ ربوبیت کے ذاتِ الٰہیہ کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ وہ سمجھا کہ شاید جس کو رب العالمین کہہ رہا ہے وہ بھی طرح فانی، حادث، محتاج اور ممکن چیز ہوگی اس نے حقیقت دریافت کی۔ اس کے علاوہ موسیٰ کی ہنسی بنانی بھی تھی۔ اگر سیدھا سادھا کلام کہتا اور دریافت کرتا رب العالمین کون ہے تو استہزاء کیسے ہوتا، اس لئے الفاظ کو بدل کر بولا رب العالمین کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ وہ کیا چیز ہوتی ہے؟ حضرت موسیٰ اس کی کوتاہ فہمی اور کور دانش کو سمجھے، مگر حقیقتِ الٰہیہ کا بیان تو درکنار تصور بھی ناممکن تھا۔ ناپیدا کنار سمندر کو کوزہ میں بند کرنا ناممکن ہے۔ موسیٰ نے بھی الفاظ بدل کر ذرا تفصیل سے جواب دیا کہ رب العالمین وہ ہے جو آسمان و زمین اور اس کی درمیانی کائنات کا رب ہے اس کو سمجھنے اور جاننے کے لئے دلائل و براہین کی ضرورت نہیں۔ یہ بالکل بدیہی چیز ہے صرف اذعان اور ایمان کی ضرورت ہے۔ اگر تمہارے اندر یقین کا جذبہ ہے تو یقین کرو کہ وہ خالقِ کائنات ہے۔ فرعون نے حاضرین کی طرف رُخ کرتے ہوئے بطور استہزاء کے کہا سُن رہے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ حضرت موسیٰ نے دیکھا کہ اس نے میری بات کو ہنسی میں اڑا دیا تو مزید تشریح کرتے ہوئے فرمایا رب العالمین وہ ہے جو:-

رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِیْنَ ۔ تمہارا اور تمہارے اسلاف کا رب ہے یعنی آسمان و زمین اور دوسری فضائی کائنات کی تخلیق، تربیت، نظم کی زندگی وغیرہ اگرچہ بدیہی ہے، مگر کچھ بھی اس میں کسی قدر خفا ہے، لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ تم پیدا ہوئے اور تمہارے اسلاف بھی پیدا ہوئے تھے اور اب وہ آباؤ اجداد موجود نہیں۔ ان تصرفات کا مالک اب رب العالمین ہے۔ گردشِ کائنات تو بخت و اتفاق کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا تھا، مگر اپنی اور اپنے اسلاف کی تخلیق، تربیت اور بقاؤ فنا کو کس دور دوران کا ثمرہ کہا جا سکتا ہے جبکہ نمایاں طور پر ان سے اللہ کی حکمت، قدرت، علم اور ارادہ کا اظہار ہو رہا ہے۔ یہ سُن کر فرعون لاجواب ہوگیا اور تو کچھ بن نہ پڑی بولا:- اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْۤ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۔ یہ تمہارا پیغمبر قطعاً دیوانہ ہے ایسی بہکی بے تکی باتیں کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے سمجھا یہ بالکل کور بصیرت ہے۔ بدیہی حقیقت کا مذاق اڑاتا ہے، اس لئے طرزِ سخن بدل کر بولے:-

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَهُمَا الخ۔ رب العالمین وہ ہے جو مشرق سے لے کر مغرب تک سب کا رب ہے۔ اگر تمہارے اندر عقل ہو تو اس پر غور کرو یعنی بدیہی مت سمجھو، واضح حقیقت مت جانو، عقل کے گھوڑے دوڑاتے ہو تو دوڑاؤ نتیجہ پھر بھی وہی نکلے گا جو کہہ چکا ہوں۔ اس مادی محسوس کائنات کا ذرہ ذرہ حمد باری اور اس کی ربوبیت کو ثابت کر رہا ہے۔ پتہ پتہ اور قطرہ قطرہ میں وحدانیت کی عقلی دلائل موجود ہیں۔ جب موسیٰ نے بداہت و عقل دونوں کو اللہ کی ہستی اور اس کی ربوبیت کے ثبوت میں پیش کیا اور فرعون مبہوت ہوگیا تو دھمکیوں پر اتر آیا۔ کہنے لگا:-

لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَیْرِیْ الخ۔ اگر میرے علاوہ تم کسی کی الوہیت کے قائل ہوگے تو میں تم کو قید خانہ میں بند کردوں گا۔ فرعون کے زمانے میں قید خانہ کی صورت وہی ہوتی تھی جو راجگانِ ہند کے زمانے میں تھی۔ گہرے تاریک اندھے کنوئیں کھدوا لئے جاتے تھے۔ ان کے اندر قیدیوں کو بند کر کے اوپر سے بھاری بھاری پتھر رکھوا کر منہ بند کرا دئے جاتے تھے اور قیدی گھٹ گھٹ کر اندر ہی مر جاتے تھے۔ انگریزی تاریخوں میں کلکتہ کے واقعات میں جو بلیک ہول یا کال کوٹھری کا لفظ آتا ہے اس سے بھی زیادہ تنگ، تاریک اور بتکلیف وہ فرعون کا قید خانہ تھا۔ فرعون نے خیال کیا کہ میرا رعب اور دربار کا جلال اور رعب وہ ماحول تو موسیٰ پر اثر نہ کر سکا۔ اب شاید مصیبت اور تکلیف کا خوف موسیٰ کو اعلانِ حق سے روک دے۔ لیکن صداقت جب دل نشین ہو جاتی ہے تو نکل نہیں سکتی۔ موسیٰ کی ہستی معمولی ہستی نہ تھی۔ غیبی قوت قدسیہ اور الٰہی جلال پر تو فگن تھا۔ آپ کی ذات قہر و مہر کی مجموعہ تھی۔ اس وقت تو حکمِ الٰہی کے تحت نرم کلامی سے کام لیتے رہے۔ عقلی اور یقینی دلائل بیان کرتے رہے، اپنی طاقت کا کوئی مظاہرہ نہ کیا، جب حجت و دلیل کا وقت گزر گیا اور فرعون اپنی مادی طاقت پر مغرور ہو کر سخت کلامی پر اتر آیا تو آپ نے سطوت و جلال کے ساتھ حق کی قہاریت کا اظہار مناسب سمجھا اور فرمایا:-

اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ ۔ کیا واضح اور نمایاں نشانی کے بعد بھی تمہارا یہی خیال رہے گا یعنی میرے پاس ایسی کھلی ہوئی نشانی اور نمایاں طاقت ہے کہ اس کی موجودگی میں تم میرا کچھ نہیں کر سکتے۔ فرعون نے کہا اگر سچے ہو تو پیش کرو ہم بھی دیکھیں وہ کیا واضح نشانی ہے۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ الخ۔ اب وقت آگیا تھا کہ حق کی لاٹھی کو جنبش دی جائے اور اس قوم کے سامنے جو عقل و بصیرت سے عاری اور فہم و فکر سے کوری ہے اور اپنی

طاقت کے نشہ سے سرشار ہو حق و صداقت کی طاقت کا مظاہرہ کیا جائے۔ حضرت موسیٰ نے لاٹھی زمین پر پھینک دی فوراً لاٹھی کا اژدہا بن گیا۔ یہ سماں دیکھتے ہی بھگدڑ پڑ گئی۔ درباری الگ بھاگے، فرعون نے تخت کے نیچے پناہ لی۔ رعب شاہی اور جلال دربار یکدم کافور ہو گیا اور مجبور ہو کر موسیٰ سے التجا کی کہ اس بلا کو دور کرو۔ حضرت موسیٰ نے اژدہے پر ہاتھ ڈالا اور وہ فوراً اصلی حالت پر آ گیا۔ غیبی قہاریت نے قصرِ مادیت کو توڑنے کے لئے ظہور کیا تھا۔ جب قصرِ رعونت شکست ہو گیا تو پھر عصائے موسیٰ کی شکل میں دکھائی ہو گئی۔ یہ نشانی تو قہر کے مظاہرے کے لئے تھی اس کے بعد حضرت موسیٰ نے آفتابِ مہر کی نور پاشی کرنی چاہی، شمعِ روحانیت کو چمکانا چاہا، اپنی صداقت کی روشنی پھیلانی چاہی اور ضیائے حق کو نمایاں کرنے کے لئے گریبان کے اندر سے ہتھیلی نکال کر کھول دی تو موسیٰ کے ہاتھ کے اجالے سے نظر کو خیرہ کر دینے والی روشنی نکلنے لگی جس پر نظر ٹھہرنا تو بجائے خود رہا کوئی اس کی طرف نگاہ بھی نہ اٹھا سکتا تھا۔ پہلا اجلال رسالت کا مظاہرہ تھا اور دوسرا علوئیتِ نبوت کا مظاہرہ۔ پہلے دریائے قہر کی طغیانی تھی اور دوبارہ ہدایت کے دُرِ یتیم کی تابانی۔ فرعون حیران تھا کہ کیا کہے اور کیا کرے۔ اس زمانے میں جادوگروں کا زور تھا، ہر شخص کے سر پر جادو کا بھوت چڑھا ہوا تھا۔ درباریوں کے سامنے اپنی بات بنانے کی ترکیب کی۔ اس کے بعد اہلِ دربار کو موسیٰ کے خلاف ابھارنے کے لئے بولا یہ تم کو تمہارے ملک سے نکال کر خود تسلط کرنا چاہتا ہے۔ اب تدبیر بتاؤ کیا کرنا چاہیئے۔ فرعون کے دعوئ ربوبیت کی شکست تو حرکت سے ہو رہی تھی معجزۂ عصا سے پناہ چاہتا بزعمِ خود ساحر کے مقابلے میں شکست کھاتا۔ مجبور ہو کر درباریوں سے مدافعت کی تدبیر دریافت کرتا یہ سارے کے سارے واقعات اس کی کمزوری اور عاجزی پر دلالت کر رہے تھے، مگر جب گمراہ انسانوں کے سروں پر دولت حکومت اور مادی طاقت کا نشہ چڑھ جاتا ہے تو وہ اہلِ حق کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر امکانی صورت سے نبرد آزمائی کرنا چاہتا ہے۔ اہلِ دربار بولے:۔

اَرْجِهْ وَاَخَاهُ الخ۔ اس وقت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ اور اس کے بھائی سے قرارداد مہلت کر دیجئے اور تمام ممالک محروسہ سے بڑے بڑے جادوگروں کو بلائیے اور جادوگروں سے ان کا مقابلہ کرائیے۔ اس میں خود فرعون کے ربوبیت کے دعوے کی شکست تھی۔ ربِّ اعلیٰ ہو کر جادوگروں کی پناہ پکڑنی کس قدر عجیب حرکت تھی، مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ غلبہ حاصل کرنے اور سرخرو ہونے کی اور کوئی صورت ہی نظر نہ آئی۔ مجبور ہو کر خدائی کے دعوے سے کسی قدر نیچے اتر کر جادوگروں کو چاروں طرف سے طلب کیا۔ ہزار ہا جادوگر جمع ہو گئے۔ بقول ابن اسحاق تمام جادوگروں کے سردار چار آدمی تھے سابور، عازور، حطحط اور مصفیٰ۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ۔ فرعون مع جاہ و حشم و خیل و خدم کے سب جادوگروں کو ساتھ لے کر نوروز یا کسی اور تہوار کے دن اسکندریہ کے میدان میں پہنچا اور پبلک میں بھی عمومی اعلان کرا دیا کہ سب کے سب مقابلے کے میدان میں جمع ہو کر موسیٰ اور بنی اسرائیل کی شکست کا تماشا دیکھنا چاہیئے۔

مقصودِ بیان

فرعون بہت ہی کور بصیرت تھا جو اللہ کی حقیقت و ماہیت دریافت کرنا چاہتا تھا۔ حضرت موسیٰ کے جواب میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی ہستی اور وحدانیت کو شانِ ربوبیت سے پہچانا جا سکتا ہے۔ تصورِ ذات ناممکن ہے۔ حقیقتِ الٰہیہ تخیل کی رسائی سے بالاتر ہے۔ اللہ کی ذات اور ہستی پر استدلال لمّی طور پر نہیں کیا جا سکتا صرف اِنّیت بیان کی جا سکتی ہے۔ ابتدائی جواب میں اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ اور آخری جواب میں تَعْقِلُوْنَ کہنا اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ خدا کا وجود بالکل بدیہی ہے۔ ہمہ گیر قدرت اور محیطِ کل تصرف اس کی ہستی کو ثابت کر رہا ہے۔ ہر جگہ نشاناتِ الوہیت نمایاں ہیں۔ ہر شخص اس کو آنکھوں سے محسوس کی طرح دیکھ کے ایسا یقین کر سکتا ہے جیسا محسوسات و مشاہدات کا کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر کسی کی نظر میں اتنی قوت نہ ہو تو اس کو بصیرت و دانش سے کام لینا چاہیئے۔ مصنوعات سے صانع اور مقدورات سے قادر پر استدلال کرنا اہلِ فہم کا کام ہے۔ فرعون کا موسیٰ کو دھمکی دینا بتا رہا ہے کہ باطل کی طاقت مجبور و لاجواب ہو کر قدرتِ حق کو پنجۂ ستم میں گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ آشتی سے درشتی اور نرمی سے سختی پر اتر آتی ہے اور ہر ممکن طریقہ سے کوشش کرتی ہے کہ کسی طرح حق پر غالب آ جائے اور نورِ صداقت کو اپنی طاغوتی آندھیوں کے جھونکوں سے بجھا دے۔ آخر میں حضرت موسیٰ کا خداداد معجزوں کو ظاہر کرنا سمجھا رہا ہے کہ جاہل اور غفلت شعار انسان کو خوابِ نخوت سے بیدار کرنے کے لئے حقانیت و صداقت کے دلائل کی بجائے طاقت کے ہتھوڑے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب مطرقہ سخت سر پر پڑتا ہے، باطل و غضب کا جنون دماغ سے بہہ کر نکلتا ہے اس وقت رعونت کا بھوت اترتا اور انانیت کا جنون زائل ہوتا ہے۔ کور بصیرت طبقہ کے پاس بصیرت کی روشنی نہیں ہوتی وہ ہر چیز کو مادی کثیف آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ غیر محسوس غیبی قوت جب تک محسوسات کا جامہ پہن کر سامنے نہ آئے ان کے قصرِ غرور میں لرزہ نہیں آتا۔ دلائل کی ضیا سے اہلِ بصیرت کے دماغ روشن ہوتے ہیں، مگر مادہ پرست اور کور بصیرت کو سمجھانے کے لئے تشدد کا اظہار اور مادی طاقت کے مظاہرے کے بغیر اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا۔ سچ ہے اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ

فرعون کا موسیٰ کو جادوگر کہنا ثابت کر رہا ہے کہ ہر شخص دوسرے کی نقل و حرکت کو اپنی آنکھوں کی روشنی کے مطابق دیکھتا ہے جس کی نظر کوتاہ، نظرِ بصیرت تاریک اور عقل کی آنکھیں نابینا ہوتی ہیں، جو شہوت و غضب کا بندہ ہوا اور ہوس کا شیفتہ اور دنیوی ذلیل اغراض کا فریفتہ ہو جاتا ہے اس کو اہلِ حق کی ہدایت آفریں زندگی میں بھی

نفسیاتی امراض پوشیدہ محسوس ہوتی ہیں۔ وہ اہلِ صداقت کے بے غرض اصلاح کے پیغام کو بھی شیطانی مقاصد کی کوشش پر محمول کرتا ہے اور اپنے ذہن کا آئینہ علمبردارانِ حق کو جانتا ہے۔ فرعون کے ساتھیوں کا مشورہ دینا اور پھر فرعون کا جادوگروں کو جمع کرانا ظاہر کر رہا ہے کہ باطل کے پاؤں نہیں ہوتے۔ دماغ زدہ گروہ آخر میں تنکے کا سہارا ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اس وقت اس کو اپنی شخصیت وجاہت انانیت اور محیط کل دوسرے کا بھی پاس نہیں رہتا۔ بالکل بچوں کی طرح باتیں بنانے لگتا ہے وغیرہ۔

فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالُوا لِفِرْعَوْنَ أَئِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ

چنانچہ جب جادوگر آگئے تو انہوں نے فرعون سے کہا اگر ہم غالب رہیں تو ہم کو کچھ معاوضہ بھی ملے گا؟ فرعون نے کہا بیشک اس وقت

إِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى أَلْقُوْا مَا أَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝ فَأَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَ

تم مقربین میں شامل کر لئے جاؤ گے موسیٰ نے ان سے کہا ڈالو جو کچھ تم ڈالتے ہو جادوگروں نے اپنی رسیاں اور

عِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ فَأَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَإِذَا هِيَ

لاٹھیاں ڈالیں اور بولے فرعون کے اقبال کی قسم ہم ہی غالب رہیں گے پھر موسیٰ نے اپنی لاٹھی ڈالی تو جو سانگ وہ

تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُوْنَ ۝ فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝ قَالُوْا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ رَبِّ مُوْسٰى

بنا رہے تھے اس کو لاٹھی نگلنے لگی فوراً بے اختیار ہو کر جادوگر سجدہ میں گر پڑے اور بولے ہم رب العالمین پر ایمان لائے جو موسیٰ اور

وَهٰرُوْنَ ۝ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ أَنْ اٰذَنَ لَكُمْ إِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ فَلَسَوْفَ

ہارون کا رب ہے فرعون نے کہا میری اجازت سے پہلے تم ایمان لے آئے یقیناً یہ تم سب کا بزرگ ہے جس نے تم کو جادو سکھایا ہے اچھا اب تم کو

تَعْلَمُوْنَ لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِيْنَ ۝ قَالُوْا لَا ضَيْرَ

معلوم ہو جائے گا میں جانب خلاف سے ضرور تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر تم سب کو سولی دوں گا جادوگروں نے کہا کچھ ہرج نہیں

إِنَّا إِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝ إِنَّا نَطْمَعُ أَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَا أَنْ كُنَّا أَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ہم کو تو ضرور اپنے رب کے پاس لوٹ کر جانا ہے چونکہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں اس لئے ہم کو امید ہے کہ ہمارا رب ہماری خطائیں معاف کر دے گا۔

تفسیر

دنیا میں سب بد ہیں نہ سارے نیک ہیں۔ نیک وبد اور صالح وطالح ملے جلے ہیں جن کو عام لوگ ظاہری احوال کے سبب برا جانتے ہیں ان میں بہتوں کی فطرت نیک اور خلق جوہر نورانی ہوتا ہے، لیکن بد صحبت، بد ماحول اور بد سوسائٹی کے اثر سے ان کے دلوں پر قدرے زنگ اور روحوں پر کچھ کثافت چڑھ جاتی ہے۔ آتش سعادت... ماحول کی راکھ میں پوشیدہ ہو جاتی ہے، مگر حق کی چنگاری بالکل مردہ نہیں ہوتی، سرکشی نورگل نہیں ہو جاتا ہے۔ اگر ان کو صیقل گر مل جائے اور اپنی علمی وعملی طاقت وتدبیر سے زنگ کو مانجھ کر کثافت دور کر دے، تو فوراً جیسی جوہر کندہ کی طرح چمکنے لگتا ہے، باطل وکذب کی خاک ہٹتے ہی آتش حق نمودار ہو جاتی ہے۔ اور اسی آب وتاب کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے جو اس کا فطری آئینہ ما ہوتا ہے۔ پھر دوبارہ صاف شدہ روحوں کو زنگ آلود کرنے کی کتنی بھی کوشش کی جائے اور چاند پر خاک ڈالنے کی کوئی بھی تدبیر کی جائے۔ اگر واقع میں جوہر فطری درخشاں ہو گیا ہے اور بالکل صفائی ہو گئی ہے تو دوبارہ زنگ نہیں چڑھتا نہ چاند پر خاک ڈالی جا سکتی ہے۔ لاریم انذخت۔

کہ کوئی طیفار بھی اس سعید گروہ کو حق سے روگرداں نہیں کرتی، سخت سے سخت جسمانی و روحانی تکلیف باطل کے قدموں پر سر جھکانے کی طرف مائل نہیں کر سکتی، بالکل یہی جادوگروں کا حال ہوا۔ ان کی روح میں فطرۃً روشنی، دماغ پاک اور دل صاف تھے۔ فرعون کے تسلط، پبلک کی باطل پرستی اور گندے ماحول نے ان کے روشن جواہر پر کسی قدر زنگ پیدا کر دیا تھا۔ جب حضرت موسیٰ کے مقابل آئے تو حق کی روشنی سامنے دیکھ کر سرشتی روشنی نمایاں ہو گئی اور نورِ قلبی نورِ ہدایت میں منضم ہو جانے کے لئے دوڑا اور بالآخر مل کر ایک ذات ہو گیا۔ عشق دل میں موجود تھا، مگر کار فرما نہ تھا معشوق کو بے حجاب دیکھ کر کار فرما ہو گیا۔ ہوا اور ہوس کی دیواروں کو توڑ کر رغبت و خوف کے حجابوں کو ہٹا کر معشوق تک عاشقوں کو پہنچا دیا۔ اہل و عیال، زر و مال اور بال و کمال کی پرواہ کئے بغیر تمام ساحر از خود رفتہ ہو کر رب مطلق کا کلمہ پڑھنے لگے۔ فرعون نے سمجھایا، ڈرایا، دھمکایا، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا، بادۂ توحید کا جو اثر رگ رگ میں رچ گیا اس میں کمی نہ آئی۔ بالآخر سولیاں دیں، صلیبوں پر لٹکایا، ہاتھ پاؤں کٹوائے، مگر شاہد ازل کو دیکھ کر ان کی روحوں کو جو سکھ اور سکون حاصل ہو گیا تھا اس کو یہ تکلیفیں زائل نہ کر سکیں۔ عشق کے پہاڑوں کو سیل مصائب کی پیہم یورشیں اور طوفان خیز موجوں کا تعادم اپنی جگہ سے نہ ہلا سکا۔

تحلیلِ اجزاء

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ الخ۔ السحرۃ سے مراد وہ جادوگر ہیں جن کو فرعون نے موسیٰ کے مقابلے کے لئے بلوایا تھا۔ غرض جادوگر مقررہ میدان میں جمع ہوئے، لیکن مقابلے سے پہلے انہوں نے اپنا معاوضہ بشرطِ غلبہ طے کر لیا۔ فرعون نے مقررہ مالی اجرت کے علاوہ ان کو شاہی اسٹاف میں داخل کر لینے کا بھی وعدہ کیا گویا مال و عزت دونوں کا لالچ دیا۔

تنبیہ

جادوگروں نے فرعون سے اجرت و معاوضہ کی جو درخواست کی تھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جادو کی حقیقت کچھ بھی ہو اس سے کیفیات و احوال میں کچھ بھی تغیر ہو جاتا ہو خوف کے کتنے ہی مظاہر، اس سے نمودار ہو جاتے ہوں، اشیاء اپنے مکانوں سے زائل ہو جاتی ہوں، لوگوں کی نظر میں خیرگی پیدا ہو جاتی ہو بہر حال کچھ بھی ہو مگر اشیاء کی حقیقت میں انقلاب پیدا کرنا جادوگر کے بس کی بات نہیں۔ کنکریوں کو سونے چاندی میں فی الحقیقت بدل دینا دائرۂ جادو سے خارج ہے ورنہ جادوگر معاوضہ کی درخواست نہ کرتے۔ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰۤى اَلْقُوْا۔ علمبرداران حق بے خوف ہوتے ہیں۔ باطل کا کوہ شکن اژدہام بھی ان کو مرعوب نہیں کر سکتا وہ حق کے سوا ناحق سے نہیں ڈرتے۔ اسی جذبۂ بے باکی کے سبب حضرت موسیٰ نے جادوگروں سے کہا تم جو کچھ وار کرنا چاہتے ہو کرو۔ جادوگروں نے اپنا کام شروع کیا، لاٹھیاں اور رسیاں زمین پر پھینکیں جو رینگنے لگیں اور بقول بعض) سانپوں کی شکل نظر آنے لگی۔ حق کی طاقت سے چونکہ وہ اس وقت تک ناآشنا تھے اپنا حامی اور پشت پناہ فرعون ہی کو جانتے تھے، اس لئے حملہ کرتے وقت بولے فرعون کے اقبال سے ہم ضرور غالب ہوں گے۔ اس وقت تک کامل طور پر حضرت موسیٰ کے دل پر جلال ربانی نے ظہور نہ کیا تھا حضرت کو بھی سانپ رینگتے دکھائی دئیے اور باقتضائے بشری کچھ اندیشہ بھی اندر محسوس کیا، مگر جونہی غیبی جلال نے پشت پر ہاتھ رکھا فوراً خوف دور ہو گیا اور بے باک ہو کر آپ نے لاٹھی زمین پر ڈالی۔

فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا یَاْفِكُوْنَ۔ وہ قاہری قوت جو لاٹھی کا ظاہری جامہ پہنے ہوئے تھی فوراً ظہور پذیر ہو گئی ایک اژدہا بن گیا اور جو کچھ جادوگروں نے جادوئی تہدید کا مظاہرہ دکھایا فوراً سمجھ گئے کہ یہ انسانی کرشمہ سازی نہیں، بہت ہی بلند قدرت کی کارفرمائی ہے، طاغوتی طاقت نہیں نبوت کی قدسی قوت ہے پس فوراً

فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِیْنَ۔ سجدہ میں گر گئے۔ خود اپنے اختیار سے نہیں گرے بلکہ اندرونی نور فطرت نے گرا دیا اور بیرونی قوت اعجاز نے گرنے پر مجبور کر دیا۔

اور بولے:۔

اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہم کو رب العالمین کی قہاری قدرت کا یقین ہے، اس کی ہمہ گیر طاقت کو ہم نے مان لیا، اس کی الوہیت و ربوبیت پر ہم ایمان لے آئے۔ درحقیقت رب العالمین وہی ہے جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے جس نے ان دونوں کو بھیجا ہے۔

قَالَ فِرْعَوْنُ الخ۔ فرعون کے غصہ کا پارہ چڑھ گیا، مغلوب الغضب ہو گیا، شکست، رسوائی، روسیاہی، حکومت کا زوال اور ملک کی بغاوت سب کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ موسیٰ اور ہارون پر تو کچھ بس نہ چلا جادوگروں کو قتل کی دھمکی دی اور بولا میری اجازت کے بغیر تم ایمان کیسے لائے۔ اب میں تمہارے ہاتھ پیر لنڈورا کر دار پر کھینچوں گا۔ بے وقوف نہیں سمجھا کہ قلبی عقیدت اور ایمان اختیاری چیز نہیں، اجازت و عدم اجازت کو اس میں دخل نہیں، بڑی سے بڑی مادی طاقت کا اس پر تسلط نہیں پھر ایمان لانے میں فرعون سے مشورہ کرنے کے معنی ہی کیا ہو سکتے تھے، مگر برا ہو پندارِ سلطانی اور تمکنتِ شیطانی کا جو دماغوں کے تصور و تخیل یقین و تصدیق پر بھی جابرانہ حکومت کرنے کا خواستگار رہتا ہے۔ حق طلب ساحروں کو اس قطع و برید اور دار و رسن کی دھمکی حق سے روگرداں نہ کر سکی تھی۔ نہایت بے باکی سے بول لے:۔

لَا ضَیْرَ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا الخ۔ اس زندگی کے فنا ہونے کی کچھ پرواہ نہیں، جسمانی مصائب کا کوئی ڈر نہیں، اس لئے ہم کو کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا کیونکہ ہم کو

اپنے مرکز پر پہنچتا ہے۔ منزلِ مقصود رب العالمین تک رسائی حاصل کرنی ہے۔ وہاں ہم کو ضرور جانا ہے۔ انجام اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ہم کو اپنے رب سے یہی طمع ہے کہ وہ ہماری خطاؤں کو معاف کرے اور گناہوں پر پردہ ڈال دے کیونکہ اس گروہ میں سب سے پہلے ایمان دار ہم ہی ہیں۔

مقصودِ بیان

جادو سے اشیاء کی حالت نہیں بدل سکتی، لیکن کیفیت کی ظاہری تبدیلی ممکن ہے۔ آدمی کی ظاہری حالت کتنی ہی بری کیوں نہ ہو، کیسا ہی خبیث کافر ہو اس کے دل میں اگر نورِ وحدت جگمگا رہا ہے۔ اگر اس کی بصیرت کی آنکھوں میں روشنی ہے تو ادنیٰ تحریک سے وہ راہِ راست پر آجاتا ہے۔ جادوگروں کی سجدہ ریزی اضطراری تھی۔ نورِ نبوت ان کو آنکھوں سے دکھ رہا تھا، جلوۂ حق ان کی نظروں کے سامنے چمک رہا تھا، اس لئے بے اختیار ہو کر سجدے میں گر پڑے نعمت و عیش اور جاہ و مال اور نکال کی کچھ پرواہ نہیں کی۔ اس میں درسِ بصیرت ہے اس ضعیف الایمان مسلمان کے لئے جس کو حق سے روگردانی کرنے پر ادنیٰ لالچ یا خوف آمادہ کر دیتا ہے۔ کہاں ہیں ہندوستان کے علمائے کرام ومشائخ عظام، لیڈران ذوی الاحتشام اور حکام واجب الاحترام جو غیر مسلم گورنمنٹ کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ چند ٹکوں کا لالچ اور معمولی حراست و نظربندی کا خوف ان کو حق سے ڈگمگا دیتا ہے۔ زبانوں سے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں کہ ہم حاملانِ شریعت ہیں، ہم اربابِ طریقت ہیں، ہم علمبردارانِ حریت ہیں اور ہم محافظینِ ملت ہیں، لیکن قرآن پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو سبھوں کے دل مُردہ، روحیں افسردہ اور ارادے پژمردہ ہو جاتے ہیں۔ شریعت کے ناقابلِ نسخ ہونے کے یہ بلند آہنگ دعوے اور قوانینِ حکومت سے یہ اس کا عملاً نسخ اور پھر ان بزرگوں کی طرف سے اس نسخ کی عملی تائید اور زبانی انکار یا للعجب زبان سے توحیدِ خدا کی رٹ اور عملاً مال و منال، جاہ و جلال، شہرت و عزت، حکومت و سطوت غرض یہ کہ غیر اللہ کے اقرارِ الوہیت کا مظاہرہ دریا میں غرق ہونے کے باوجود خشک دامن رہنے کا دعویٰ عبرت حاصل کرنی چاہیئے جادوگروں کے حال سے جن کو فرعون لیسے طاغوتی پرشکوہ طاقت حق سے نہ پھیر سکی۔ جان دے دی، مگر جاناں کی چوکھٹ نہ چھوڑی۔ دنیا پرست دماغ رکھنے والو تمہارا کیا حال ہے۔ چند پیسوں کو ایمان فروخت کر دیا۔ شرم کرو شرم۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْٓ اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ○ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ ○

ہم نے موسیٰ کے پاس وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے کر نکل جاؤ بیشک تمہارا پیچھا کیا جائیگا پھر فرعون نے شہروں میں نقیب بھیجے

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِیْلُوْنَ ○ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ○ وَاِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ ○ فَاَخْرَجْنٰهُمْ

کہ یہ تھوڑی سی جماعت ہے انھوں نے ہم کو بہت غصہ دلایا ہے اور ہم سب صاحب احتیاط ہیں (تم سب ہمارے پاس چلے آؤ)

مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ○ وَّکُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ کَرِیْمٍ ○ کَذٰلِکَ ؕ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ○ فَاَتْبَعُوْهُمْ

نتیجہ یہ ہوا کہ فرعون والوں کو ہم نے باغوں سے اور چشموں سے اور خزانوں سے اور عمدہ مقاموں سے نکال دیا اسی طرح واقع ہوا اور ان چیزوں کا ہم نے بنی اسرائیل کو وارث بنا دیا

مُّشْرِقِیْنَ ○ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓی اِنَّا لَمُدْرَکُوْنَ ○ قَالَ کَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ

فرعون والوں نے سورج نکلتے بنی اسرائیل کا پیچھا کیا جب دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے سامنے آگئیں تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا اب ہم ضرور پکڑ لئے گئے موسیٰ نے کہا ہرگز نہیں میرے

رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ○ فَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ

ساتھ میرا رب ہے وہ جلد مجھے راستہ بتا دیگا ہم نے موسیٰ کے پاس وحی بھیجی کہ اپنی لاٹھی سمندر پر مارو (موسیٰ نے تعمیل کی) فوراً دریا پھٹ گیا اور ہر ٹکڑا بڑے دریا کی

فِرْقٍ کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ ○ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِیْنَ ○ وَاَنْجَیْنَا مُوْسٰی وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِیْنَ ○ ثُمَّ

طرح ہو گیا اور اس جگہ ہم نے دوسروں کو پاس پہنچا دیا موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کو ہم نے بچا لیا اور

أَغْرَقْنَا الْآخَرِينَ ۝ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝ ع

دوسروں کو ڈبو دیا اس واقعہ میں بڑی نشانی ہے اور ان میں سے اکثر ایمان والے نہ تھے تمہارا رب بلاشبہ غالب اور مہربان ہے

تفسیر ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ پیغمبروں کو بھیجنا اور کتابیں نازل کرنا اور پیغام ہدایت پہنچانا خدا پر لازم نہیں، کیونکہ اس نے ہر شخص کو عقل و بصیرت فہم و ادراک اور روحانی قوت عطا کر دی ہے جو برے بھلے اور مفید و مضر میں تمیز کر سکتی ہے۔ پھر دلائل فطرت اور براہین قدرت بھی کائنات کے ذرہ ذرہ میں نمایاں ہیں۔ غور و فکر کے بعد ہر شخص وجود صانع اور توحید باری پر استدلال کر سکتا ہے، مگر خدا تعالیٰ ارحم الراحمین ہے، رحمٰن مطلق ہے اس کی رحمت عامہ کا یہ اقتضا نہ تھا کہ انسان کو فقط عقل و بصیرت کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا جائے کیونکہ عقل کی حریف دو قوتیں اور بھی انسان میں موجود ہیں جو اکثر غالب آتی ہیں اور ادراک عقلی پر تسلط پا کر انسان کو گمراہ کر دیتی ہیں۔ سلیم عقل اور سادہ فکر رکھنے والے بہت کم ہیں، مادی قوتوں پر عقلی حکومت کرنے والے شاذ ہیں۔ شواہد فطرت کا مطالعہ کرنے کے بعد وہم کی آمیزش سے پاک ہو کر ربوبیت و الوہیت کو سمجھنے والے انگلیوں پر شمار کرنے کے قابل ہیں، اس لئے خدا تعالیٰ نے بھولے بھٹکے لوگوں کے لئے پیغمبروں کو بھیجا، کتابیں نازل کیں، قوانین ہدایت جاری کئے۔ پیغمبروں نے اللہ کے حکم کی تعمیل کی، فرامین الٰہیہ پر عمل کر کے ہدایت کی، گمراہی کے غاروں سے بچایا، سیدھا راستہ بتایا، اپنی صداقت کے ثبوت کے لئے معجزات ظاہر کئے، قوت قدسیہ کا مظاہرہ کیا، علمبرداران صداقت کے جھنڈے کے نیچے کچھ لوگ آ گئے، بعض گمراہوں نے راہ راست اختیار کر لی، لیکن اکثروں نے تکذیب کی، پیغمبروں کو جھوٹا جانا، ہر ممکن تکلیف دی، مقابلے کئے، مناظرے کئے، مجادلے کئے، لڑے مرے اور جہنم رسید ہوئے۔ یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ:-

پیغمبروں نے ایک وقت خاص تک ہدایت و ارشاد سے کام لیا، رہنمائی کا کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ دو سال چار سال دس سال سو سال بہرحال جتنی ان کی مدت نبوت تھی یا جتنی مدت ان کو نبوت کرنے کا حکم ہوا اتنی مدت تک تبلیغ کرتے رہے۔ نرمی، سختی، آشتی، درشتی، مناظرہ، مجادلہ سب ہی سے کام لیا اور جب مدت معینہ گزر گئی اور وقت تبلیغ ختم ہو گیا تو انہوں نے گمراہ گروہ سے کنارہ کشی اختیار کی۔ اپنے ہدایت یافتہ گروہ کو گمراہوں سے علیحدہ کر کے باطل پرست طبقہ کے ساتھ رہنا سہنا بھی گوارا نہ کیا کیونکہ ایمان کا اجتماع کفر سے، فرمانبرداری کا اختلاط معصیت کوشی سے، نیکی کی آمیزش بدی سے اور ہدایت کا ارتباط ضلالت سے ناممکن تھا۔ پرستاران حق نے نبی کی معیت میں وطن چھوڑا، گھر بار کو خیرباد کہا، دوستوں اور عزیزوں کو وداع کیا، مال و منال اور جائدادوں کو ترک کیا اور تمام مالوفات قلبی کو رخصت کر کے راہ خدا میں نکل کھڑے ہوئے۔ حضرت یونسؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت دانیالؑ اور خود حضرت موسیٰ کے واقعات اس پر شاہد ہیں کہ مسلمانوں نے کفر سے بیزار ہو کر کس قدر قربانیاں کیں۔ اس امر کو سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ اللہ نے کسی پر جبر نہیں کیا ہے۔ ہو سکتا تھا کہ وہ تمام عالم کو مومن بنا دیتا، مگر اس سے انسان کا فطری اختیار سلب ہو جاتا، انسان مختار نہ رہتا مجبور ہو جاتا۔ غرض تکلیف باقی نہ رہتی، عقل و بصیرت کی بخشش بے کار ہو جاتی، مادی قوتوں کو عطا سود مند نہ ہوتی، اس لئے خدا تعالیٰ نے کسی کو ہدایت یافتہ ہونے پر مجبور نہیں کیا اور ہر شخص کو مطلق العنان چھوڑ کر راہ راست پر چلنے یا نہ چلنے کا اختیار دے دیا صرف عطوفت ربانی کے زیر اثر انبیاء کو بھیج دیا اور رہنمائی کرا دی۔

یہ بات بھی قابل فہم ہے کہ خدا تعالیٰ نے اگرچہ انسان کو مطلق العنان بنا دیا ہے، کسی راستے پر چلنے سے ان کو نہیں روکا ہے، مگر پھر بھی اس مطلق العنانی کی ایک خاص حد ہے جن لوگوں نے رہنما کی رہنمائی سے سرتابی کی۔ ان کو ڈھیل ضرور دی گئی، ایک وقت تک چھوڑ دیا گیا، لیکن جب ڈھیل کی انتہا ہو گئی اور یہ مطلق العنان جانور اس عالم کے سبزہ زاروں کو چرنے لگے اور نظام کائنات کو تباہ کرنے کا جھنڈا اٹھا لیا تو غیبی قدرت نے ان بدلگاموں کی لگام کھینچ لی، ڈھیلی رسی کو ایسا کھینچا کہ گلے میں سخت ترین پھندا پڑ گیا۔ کتنا ہی تڑپے کتنا ہی ہاتھ پاؤں مارے، کتنی ہی اضطرابی حرکات کیں، مگر پھندا نہ کھلا اور یونہی فی النار ہو گئے۔

حضرت موسیٰ اگرچہ پُر جلال اور صاحب سطوت نبی تھے، مزاج میں، طبیعت میں حق کا جوش اور عادت میں غصہ کی تیزی تھی، مگر فرعون کے پاس بھیجتے وقت اللہ نے ان کو نرمی اختیار کرنے اور نرم کلام کرنے کی ہدایت کر دی۔ پھر فرعون کی سرکشی اور سرکشی کے بعد مقابلہ اور مقابلے کے بعد شکست ہو جانے پر بھی اس کی ناقابل رہائی گرفت نہیں کی، بدستور سابق اس کو مطلق العنان رہنے دیا، حکومت باقی رکھی، جاہ و دولت اور خیل و خدم کچھ بھی نہ چھینا، مگر وقتاً فوقتاً عبرت خیز نشانیاں حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے ظاہر کرائیں، محسوس اور بدیہی کرشمہائے قدرت نمودار کئے، غیبی سطوت کے ناقابل انکار مظاہر رونما کئے اس پر بھی فرعون کی سرکشی بڑھتی گئی، اہل حق کو دکھ پہنچانے کا اس نے بیڑا اٹھا لیا، علمبرداران صداقت کی اذیت کو شعار زندگی بنا لیا، پہلے جتنی تکلیفیں دیتا تھا اس سے کہیں زیادہ ایذا دینے پر تل گیا۔ آخر پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا، رحمت کے باران کے خشک ہونے کا موقع آ گیا، ڈھیل کا وقت ختم ہو گیا، دریائے غضب میں جوش نمودار ہو گیا، غضب کی لہریں اٹھنے لگیں، دوسری طرف اہل حق کو بھی کافروں سے الگ رکھنا ضروری تھا، ان کا بھی امتحان مقصود تھا کہ

کون مال ومنال خانہ وکاشانہ اور عیش وراحت کو چھوڑ کر راہِ خدا میں اٹھتا اور ترکِ وطن کرتا ہے اور کون ضعیف الایمان، پست حوصلہ اور امتحان میں خام ہے۔ پھر یہ بھی ضروری تھا کہ بیرونِ حق کو ان کی حوصلہ شکنی صبر آزمائیوں کا دنیوی صلہ دیا جائے اور غلامی سے چھڑا کر سرداری عطا کی جائے۔ ان مصالح اور فوائد کے پیشِ نظر حضرت موسیٰ کو حکم ہوا کہ اسرائیلیوں کو ساتھ لے کر راتوں رات مصر سے شام کی طرف نکل جاؤ۔ فرعونی تمہارے پیچھے آئیں گے، مگر پرواہ نہ کرو وہ تم کو دکھ نہ پہنچا سکیں گے ہم بنی اسرائیل کو نوازنا اور ان کو غارت کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے حکم کی تعمیل کی۔ مشورہ کے بعد تاریخ معین کر کے تمام اسرائیلی قبائل کو رات کے وقت لے کر چل دئے۔ قلزم پر پہنچے تو فرعون اپنی جمعیت سمیت آپہنچا۔ بنی اسرائیل ڈرے، مگر حسب الحکم موسیٰ نے پانی میں لاٹھی ماری، بارہ راستے خشک بن گئے۔ اہلِ حق کا گروہ خشکی میں گزر گیا۔ اب بھی وقت تھا کہ فرعون بصیرت کی آنکھوں سے دیکھتا اور جہالت کی پٹی کھول دیتا۔ ممکن تھا کہ اس عظیمی قدرت کے پیشِ نظر آپ آئینہ میں دیکھ لیتا، مگر وائے بدنصیبی اور کور دانشی کہ نہ سمجھا۔ حلیف کہ اہلِ حق کے فی سبب نجات کو اس کی رعونت نے اپنی قہاریت کا مظاہرہ جانا اور مشیرانِ بد کے مشورہ سے سمندر میں لشکر سمیت داخل ہو گیا۔ بس وقت آگیا تھا کہ ظالموں کے وجود سے سرزمینِ مصر کو پاک کر دیا جائے، نوبت آگئی تھی کہ قصرِ غرور کو ملیامیٹ کر دیا جائے۔ ایسی ساعت آپہنچی تھی کہ زبردستوں کو غارت کر کے زیردستوں کو ان کے پنجے سے رہا کرایا جائے۔ جونہی طاغوتی لشکر پانی کے وسط میں پہنچا پانی کا سمندر موت کا سمندر بن گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سب کو پانی نے آگ میں داخل کر دیا۔

تحلیل اجوار اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْٓ الخ۔ عبادی سے مراد ہیں بنی اسرائیل۔ حضرت موسیٰ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاؤ۔ فرعون مع فوج کے تمہارے پیچھے آئے گا (مگر تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا) حسب الحکم حضرت موسیٰ نے خفیہ مشورہ کیا اور تمام قبائل کے سرداروں کو حکم الٰہی سے آگاہ کیا۔ سب تیار ہو گئے۔ ایک تاریخ مقرر ہو گئی۔ تہوار یا کسی تقریب کے بہانے سے اسرائیلی عورتوں نے اپنی ہمسائی قبطی عورتوں سے ان کے زیورات بھی عاریتہ لے لئے اور سب راتوں رات چل دئے، صبح ہوئی، فرعون کو خبر ملی اس نے فوراً۔۔۔

فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآئِنِ الخ۔ تمام ممالکِ محروسہ میں نقیب چوبدار اور بھرتی کرنے والے بھیج دئے اور یہ کہلا بھیجا کہ فوراً جمع ہو کر چلے آؤ۔ بنی اسرائیل کا گروہ اگرچہ تھوڑا ہے، مگر ہم سے الگ ہو کر چلے ہیں ہم سب کو ان کی طرف سے اندیشہ ہے، اس لئے ملکی امداد ضروری ہے یا مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ ایسی ہی حرکتیں کرتے رہتے ہیں جن سے ہم کو غصہ آتا ہے اور ہمیں ناگواری ہوتی ہے۔ اوّل مطلب زیادہ اچھا ہے ثانی مطلب عماد بود دیگر مفسرین نے لکھا ہے۔

شِرْذِمَۃٌ چھوٹے گروہ کو کہتے ہیں اور قلیلون سے مزید تاکید ہو گئی، مگر یہ قلت تعداد باعتبار قبطیوں کے تھی واقع میں اسرائیلیوں کی تعداد کم نہ تھی۔

جس طرح ہندوستان میں بعض جماعتوں کی تعداد کم ہے اور واقع میں وہ بہت ہیں۔ مثلاً سکھ عیسائی مسلمانوں سے کم ہیں اگرچہ واقع میں لاکھوں ہیں اگرچہ فی نفسہ کروڑوں ہیں۔ یہی حالت مصر میں بنی اسرائیل کی تھی۔ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مورخین نے لاکھوں ہونے کی صراحت کی ہے، مگر ابن خلدون نے بھی انکار نہیں کیا۔ اس کے باوجود قبطیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس لئے فرعون نے بنی اسرائیل کو شرذمۃ قلیلۃ قرار دیا۔

وَاَوْرَثْنٰہَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الخ۔ اسلام کے حریف پادری کہتے ہیں کہ قرآن کی یہ آیت غلط ہے کیونکہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب فرعون اور اس کا لشکر دریا میں غرق ہو گیا تو ان کے خزائن و دفائن، باغات اور چشمے، محلات اور نہریں سب کی سب بنی اسرائیل کو دے دی گئیں اور قومِ موسیٰ ان کی مالک ہو گئی۔ حالانکہ یہ صراحت اجماعی اور متفق علیہ تاریخ کے خلاف ہے۔ یہ قابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ فرعونِ موسیٰ کے غرق ہونے کے بعد اس کے خاندان کے اور لوگ بادشاہ ہوئے اور نہایت شان کے ساتھ حکومت کرتے رہے۔ سلطنتِ فراعنہ کا خاتمہ اہلِ بابل کے ہاتھوں سے ہوا نہ کہ بنی اسرائیل اور موسیٰ کے ہاتھوں سے۔ بنی اسرائیل کی حکومت تو کبھی مصر میں قائم ہی نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ موسیٰ اور ان کے ساتھی بنی اسرائیل تو بیسیوں برس تیہ میں سرگرداں رہے، ان کو لوٹ کر مصر جانا نصیب ہی نہ ہوا۔ ہاں شام اور فلسطین میں ان کی حکومت قائم ہو گئی اور ایک مدت تک عروج رہا۔ معلوم ہوا کہ قرآن کی مذکورہ بالا صراحت غلط ہے۔

جواب:۔ اسلام کے حریف قرآن کو کیا سمجھیں اور اصولِ بلاغت سے ان کو کیا واقفیت، ان کو نہیں معلوم کہ عربی بلاغت میں ایک قاعدہ ایجاز بالحذف کا بھی ہے۔ مضاف کو کسی خاص نکتہ کے سبب حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا جاتا ہے۔ آیت میں بھی مضاف محذوف ہے۔ اصل عبارت اس طرح تھی:۔ وَاَوْرَثْنَا مِثْلَہَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ یعنی فرعون اور اس کی قوم کے باغات، محلات، خزائن اور چشمہائے شاداب کی طرح ہم نے بنی اسرائیل کو بھی باغات، محلات، خزائن وغیرہ عطا کر دیے۔ یہ مطلب نہیں کہ بعینہ وہی نعمتیں ہم نے فرعون سے چھین کر بنی اسرائیل کو دے دیں۔

رہی ایجاز بالحذف کی ضرورت اور خاص حکمت تو اس کے لئے ذرا نکتہ رس اور دقیق فہم دماغ کی ضرورت ہے جس سے غالباً دشمنانِ اسلام محروم ہیں۔

تعصب کا زنگ نکتہ رس دماغوں پر چڑھا رکھا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب دو چیزوں میں قوی مشابہت اور انتہائی یگانگت ظاہر کرنی ہوتی ہے اور وصف شبہ میں اتحاد رکھتا ہوتا ہے تو اس لفظ کو حذف کر دیتے ہیں جو مشابہت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ مشابہت پر دلالت کرنے والے کو ذکر کرنے سے مشبہ و مشبہ بہ میں تغایر سمجھا جاتا ہے اور وصف شبہ میں کامل اتحاد ظاہر نہیں ہوتا اور مقصود ہوتا ہے مقدار و صفی کا ایک ہونا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ اگر تم اس طرح کہو کہ زید شیر ہے تو اس سے (زید کی شجاعت کامل طور پر ظاہر ہوتی ہے کیونکہ تم نے زید کو بعینہ شیر قرار دیا اور اگر اس طرح کہو کہ زید شیر کی مثل ہے تو گویا وصف شجاعت کا ثبوت اس سے بھی ہوتا ہے، مگر پہلے قول کی طرح نہیں ہوتا کیونکہ اس صورت میں زید اور شیر کے درمیان مغایرت باقی رہتی ہے۔ دوسری مثال میں اس طرح سمجھو کہ اگر زید بکر کی صورت کی طرح ہے۔ چال ڈھال اور رفتار گفتار میں بھی کامل مشابہت ہے۔ اب تمہارے پاس زید آئے اور تم بکر کی صورت سے انتہائی مشابہت کو ظاہر کرنے کے لئے کہو کہ بکر آ گیا تو گویا تم نے زید کو حد سے زیادہ بکر کے مشابہ قرار دیا اور وصف تشبیہ کو کامل طور پر ظاہر کر دیا اور اگر یوں کہو کہ زید آ گیا جو بکر کی مثل ہے تو اس سے وصف تشبیہ کا کمال ظاہر نہ ہوا کیونکہ لفظ مثل لانے سے تم نے زید اور بکر میں مغایرت ثابت کر دی۔ اب ذرا آیت پر غور کرو مقصود یہ ہے کہ جو محلات اور باغات و خزانے وغیرہ بنی اسرائیل کو ملک شام اور فلسطین میں دئے گئے تھے وہ عظمت اور شان و شوکت میں فرعون اور فرعونیوں کے محلات و باغات وغیرہ سے اتنے مشابہ تھے کہ گویا وہی تھے، ذرہ برابر بھی نہ تھی۔ اس مطلب کا اظہار بغیر لفظ مثل کے ہوتا ہے۔ اگر لفظ مثل کو ذکر کیا جاتا تو علاوہ طول الفاظ کے مقصد کا ظہور نہ ہوتا صرف اتنا معلوم ہو جاتا کہ فرعون اور فرعونیوں کی نعمتوں کی طرح بنی اسرائیل کو بھی نعمتیں دی تھیں، ذرہ برابر کمی نہ تھی۔ فافہم لانہ اہم واتم۔

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ ۔ فرعون اپنے کل طاقتی گروہ کو ساتھ لے کر بنی اسرائیل کے پیچھے چل دیا اور سورج نکلتے نکلتے قریب پہنچ گیا۔ بنی اسرائیل کی جماعت اور فرعون کے گروہ کی تعداد کتنی تھی اس کی تفصیل نہ قرآن میں ہے نہ کسی قابل اعتبار حدیث میں۔ صرف اسرائیلی روایات ہیں جو اہل کتاب کی دماغی زائیدہ اور خود تراشیدہ ہیں۔ ابن مسعود، ابن عباس، عبد بن حمید، ابن منذر اور کعب احبار وغیرہم سے جو روایات اس کے متعلق آئی ہیں وہ قطعاً ضعیف اصول روایت کے خلاف ہیں، اس لئے ہم کسی کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔

فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۔ بنی اسرائیل کے ساتھ اس وقت حضرت ہارون ہراول دستہ میں تھے۔ یوشع بن نون ان کے ساتھ تھے اور حضرت موسیٰ ساقۃ الجیش میں تھے۔ قلزم کے کنارے پہنچ کر سب کے سب متحیر کھڑے ہو گئے۔ پیچھے سے فرعون کی جماعت آ رہی تھی کچھ نہیں بن پڑتا تھا کہ کیا کریں۔ حضرت یوشع گھبرا کر دوڑے ہوئے آئے اور عرض کیا یا نبی اللہ آپ کے رب نے یہیں آنے کا حکم دیا تھا؟ حضرت موسیٰ نے فرمایا ہاں۔ یوشع چلے گئے۔ صبر نہ ہو سکا تو دوڑتے ہوئے پھر چلے آئے اور وہی پہلا قول عرض کیا اور وہی جواب پایا۔ اتنے میں فرعون کا لشکر قریب آ پہنچا۔ اس وقت بنی اسرائیل نے مضطرب ہو کر کہا اب ہم یقیناً پکڑے گئے۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا ہرگز نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرا رب میرے ساتھ ہے وہ خود مجھے راستہ بتا دے گا۔ یہ جواب ہی دینے پائے تھے کہ حکم نازل ہوا:-

اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۖ فَانْفَلَقَ الخ۔ لاٹھی کو سمندر پر مارو۔ موسیٰ نے حکم کی تعمیل کی۔ سمندر کا پانی پھٹ گیا اور ادھر ادھر سمٹ کر بارہ خشک راستے بن گئے بیچ میں خشکی تھی اور ادھر ادھر پانی کا پہاڑ بغیر کسی رکاوٹ کے کھڑا معلوم ہوتا تھا۔

کوتاہ فہم لوگ کہتے ہیں کہ قرآن نے عصائے موسیٰ کی کیفیت کو بڑے مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس آیت میں پڑھو عصا کا معجزہ نظر آتا ہے۔ فرعون کے دربار میں لاٹھی کا سانپ بنا، ساحروں کے مقابلے میں اژدہا بن گیا، پتھر پر مارا اور اس سے چشمہ جاری ہو گیا اور پانی خشک ہو کر راستے نکل آئے۔ رات کو بجلی اور چوکیداری کا کام بھی لاٹھی ہی دیتی تھی۔ یہ عجیب لاٹھی تھی۔ ان بے وقوفوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ موسیٰ کی لاٹھی بظاہر لکڑی کی تھی، مگر اس سے کہیں قہار یت اور کہیں علومی قدرت کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ درحقیقت اللہ کے قہر اور اس کی قدرت نے لاٹھی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ نہ لاٹھی کے یہ افعال تھے نہ موسیٰ کی یہ طاقت تھی جس طرح نور ہدایت آفتاب بن کر حضرت موسیٰ کی ہتھیلی سے چمکنے لگا تھا۔ حالانکہ موسیٰ کا ہاتھ گوشت پوست اور ہڈی پٹھے کے سوا اور کسی چیز سے بنا نہ تھا۔ پھر یہ نورانی چمک ہی تو تھی جو آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ اسی طرح اللہ کے قہر اور طاقت نے عصائے موسیٰ کی شکل اختیار کر لی تھی۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۔ یعنی اللہ زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔ زبردست ایسا کہ فرعون جیسے بادشاہ کو دم کے دم میں غارت کر دیا، اس کے لشکر کو تباہ کر دیا۔ رحیم ایسا کہ بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم کو فرعون کے پنجے سے نجات دے کر شام و فلسطین کی حکومت عطا کی۔

مقصودِ بیان

اللہ اپنے فرماں بردار حق پرست بندوں کی مدد آڑے وقت میں ضرور کرتا ہے۔ ظاہری طاقت ہو یا نہ ہو وہ کارسازی فرماتا ہے جس طرح اس نے بنی اسرائیل کی مدد فرمائی۔ اللہ کا غضب بہت سخت چیز ہے اس کا مقابلہ ناممکن ہے، اس کی ڈھیل امتحانی ہوتی ہے اور گرفت بھی بہت سخت ہوتی ہے۔ اصحاب موسیٰ نے خیال کیا تھا کہ ہم پکڑے گئے۔ یہ بات ظاہر کر رہی ہے کہ جن کو اللہ کی مدد و نصرت کا حقیقی مشاہدہ حاصل نہیں ہوتا وہ ظاہری اسباب کو دیکھنے اور

ان سے رنج و راحت اور طمع و خوف کو وابستہ رکھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے جواب دیا وہ ظاہر کررہا ہے کہ مشاہدۂ صفات کرنے والوں کی نظر ظاہری اسباب پر نہیں ہوتی، اُن کو سامنے آجانے والی مصیبت سے بھی کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ حضرت موسیٰ نے سمندر میں لاٹھی ماری تھی اور اس سے سمندر پھٹ گیا تھا اور پانی پھٹ کر راستے نکل آئے تھے اور پانی کے اِدھر اُدھر سمٹ جانے سے راستوں کے دونوں طرف پہاڑ کھڑے معلوم ہوتے تھے وغیرہ۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرٰهِيمَ ○ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ ○ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا

ان کو ابراہیم کا قصہ پڑھ کر سناؤ جب ابراہیم نے اپنے باپ سے اور قوم سے کہا تم کیا پوجتے ہو؟ انھوں نے کہا ہم بتوں کو پوجا کرتے ہیں ان کے سامنے

عٰكِفِينَ ○ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ○ أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ○ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا

بیٹھے رہتے ہیں ابراہیم نے کہا جب تم پکارتے ہو تو کیا سنتے ہیں یا تم کو نفع نقصان پہنچاتے ہیں وہ بولے نہیں بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا

آبَاءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُونَ ○ قَالَ أَفَرَءَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ○ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ ○

کو ایسا ہی کرتے پایا ہے ابراہیم نے کہا بھلا دیکھو تو جن چیزوں کی تم اور تمہارے اگلے باپ دادا پوجا کررہے ہیں

فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِي إِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِينَ ○ الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ○ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ

وہ میرے دشمن ہیں مگر ہاں وہ رب العالمین (میرا دوست ہے) جس نے مجھے پیدا کیا مجھ کو وہی راہ دکھاتا ہے وہی مجھ کو کھلاتا پلاتا ہے

وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ○ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ ○ وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ

اور جب میں بیمار ہوجاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے وہی مجھے مارے گا پھر وہی مجھے زندہ کرے گا اسی سے مجھے امید ہے کہ بروزِ جزا میرے گناہ بخش دے گا۔

تفسیر عارفِ کامل کا منتہائے نظر سب سے بلند ہوتا ہے۔ مادیت کے پردوں کے اندر وہ ذاتِ مجرد کو دیکھتا ہے۔ اس کو معلوم کیا محسوس ہوتا ہے کہ ایجاد و ابقاء اور تمام تصرفات کی مالک ایک غیبی طاقت ہے۔ عالم میں جو کٹھ پتلیاں ناچتی دکھائی دیتی ہیں ان کے تاروں کو حرکت دینے والا ایک پوشیدہ ہاتھ ہوتا ہے۔ پیدا کرنے والا پھر اسر و سامان کرتا مثلاً قوت غاذیہ کے خدام کے ذریعہ سے غذا کو جسم کے لئے فراہم کرنا پھر غاذیہ کے بعد قوت نامیہ کا فعل شروع کرانا اور جسم کو تناسب طبعی پر بڑھانا پھر تمام جسم سے ایک خاص جوہر کھینچ کر قوت مولدہ کے سپرد کرنا پھر مولدہ اور قوت مصورہ کے اشتراک سے انسان کا پتلا بنانا پھر اس میں عالم مجرد کی روح پھونکنا یہ سب قوت غیبی کا کرشمہ ہے پھر پیدا کرنے کے بعد کھانے پینے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، سوچنے سمجھنے، سونے جاگنے، اچھے برے میں امتیاز کرنے اور صحیح غلط کو جاننے کے راستے بتانا، ظاہری حواس کے ذریعہ سے باطنی حواس کو اطلاع دینا اور پھر نفس ناطقہ کی قوت فکریہ کے زیر حکم قوت باعثہ کو حرکت دینا اور قوت فاعلہ کو باعثہ کی تعمیل پر آمادہ کرنا اور اس طرح بقائے شخصی کے وسائل مہیا کرنا یہ سب حکیم مطلق اور قادر برحق کی کارسازی ہے۔ بھوک پیاس کو دور کرنے کے لئے کھانے پینے کی چیزیں دینا، بیماری کو دور کرکے تندرست کرنا پھر مقرر وقت پر زندگی کا سلسلہ کاٹ دینا اور پھر قیامت کے وقت دوبارہ زندہ کرنا اسی خلاقِ اعظم کی اعجوبہ زائی ہے۔ جب عارف کی نظر یہاں تک پہنچ جاتی ہے اور مادیات سے اوپر قدرت برحق کی کارفرمائی دیکھنے لگتی ہے اور مقام مشاہدہ میں اس کی رسائی ہوجاتی ہے تو اب اس تفکر و تخیل اور اس بلند پروازی سے جو چیز بھی اس کو روکتی ہے اور جوش بلندی سے پستی کی طرف اس کو کھینچتی ہے وہ اس کو دشمن نظر آتی ہے اور واقع میں بھی وہ دشمن ہوتی ہے کیونکہ حقیقت سے روک کر اعتباریات کی طرف کھینچنے والی سیدھے راستہ سے ہٹا کر تباہی کے غاروں میں داخل کرنے کے لئے ٹیڑھے راستوں پر چلانے والی کعبۂ مقصود کے رُخ سے منہ موڑ کر مندروں اور بُت کدوں کی راہ بتانے والی اور قادر سے چھڑا کر محتاجوں کے قدموں پر سر جھکا دینے والی جو چیز بھی ہے وہ دشمن ہے۔ جاہ و حشمت ہو، دولت و حکومت ہو، رشتۂ قرابت ہو، علاقۂ زوجیت ہو، سلسلۂ محبت و مودت ہو کچھ بھی ہو اللہ کی طرف سے توجہ کو برگشتہ

کرنے والی ہر شے دشمن ہے۔ یہ تمام مادی چیزیں حادث ہیں، مخلوق ہیں، محتاج ہیں، مجبور ہیں اور اللہ قدیم ہے، واجب ہے، خالق ہے، قادر ہے اور مختار ہے اس لئے عارف کی نظر کے سامنے یہ مادی پردے بے حقیقت ہیں۔ وہ ان درمیانی منزلوں اور مسافر خانوں میں ٹھہر کر اپنے وقت کو برباد کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا مرکزِ توجہ سرمدیا ذات سے بھی اوا ہوتا ہے اس کو وہ اپنی منزل قرار دیتا ہے، لیکن بہر حال وہ اسی خاکی جامہ میں ہوتا ہے، اسی مادی ماحول میں رہتا ہے، انہی موجودہ اسباب سے کام لیتا ہے، یہی روزی کھاتا ہے اور یہی لباس پہنتا ہے، ظاہری نظر سے انہی محسوس چیزوں کو دیکھتا ہے اور بظاہر اس کی زندگی انہی مادی اسباب کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی نظر آتی ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ کسی وقت سہواً بلا ارادہ اس کی نظر چوک جائے، شاید کسی وقت ایک لمحہ کے لئے منزلِ اصلی کی طرف سے غافل ہو جائے۔ اہل و عیال، دوست احباب، ماں باپ اور دیگر متعلقین کی طرف اس کی توجہ کو کھچاؤ ہو جائے۔ اگرچہ یہ توجہ اور کھچاؤ حقیقی نہیں ہو سکتا صرف ظاہری ہوتا ہے وما سوی اللہ کو کارسانہ اور قادر خالق نہیں جانتا نہ اپنا مطمح نظر بناتا ہے، مگر ظاہر میں کچھ نہ کچھ تو زندگی کے تعلقات کو نباہنے پر مجبور ہوتا ہے اور یہی چیز اس کی نظر میں قابلِ گرفت اور مجرمانہ حرکت ہوتی ہے اسی کو وہ قصور اور خطا قرار دیتا ہے، اور اپنی بلندیٔ نظر کے تحت اس گناہ سے بھی توبہ کرتا ہے اور ڈرتا ہے کہ کہیں اس کا یہ مجبوری کا قصور بھی نہ پکڑ لیا جائے۔

حضرت ابراہیمؑ بھی عارفِ کامل تھے۔ ان کی نظر مخلوقات کے پردوں کو چیر کر خالق تک پہنچ چکی تھی۔ ذرہ ذرہ، پتہ پتہ اور قطرہ قطرہ میں اللہ کی خفیہ قدرت ان کو کارفرما نظر آتی تھی۔ جب انہوں نے ماحول کو مادہ پرست پایا، ماں باپ، چچا، خاندان، احباب، اہلِ محلہ اور برادرانِ وطن کو بتوں اور مورتیوں کے آگے سر جھکاتے دیکھا اور ہر ایک کی دانش و عقل کا قافلہ لٹتا نظر آیا تو صبر نہ ہو سکا۔ فرمانے لگے تم لوگ یہ کیا پوجا کرتے ہو؟ کیا ان چیزوں میں کچھ قدرت ہے؟ کیا تمہاری پکار کو یہ سنتے ہیں؟ کیا تمہارا نفع نقصان ان سے وابستہ ہے؟ اور کیا تمہاری مصیبت کو یہ دفع کر سکتے ہیں؟ اور کیا تمہاری حاجت کو پورا کرنے کی ان میں طاقت ہے؟ مشرک اندھے کیا دیکھنے کا دعویٰ کر سکتے، گونگے کیا جواب دے سکتے، پرستارانِ باطل اپنی باطل پرستی کی کیا عقلی توجیہ کرتے، مجبور ہو کر سوسائٹی کے رواج اور اسلاف کے رسم و رواج کی آڑ لے کر جواب دیا یہ ہمارے بزرگوں کا طریقہ ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ہم کو تو اس کی کچھ وجہ معلوم نہیں ہمارے سارے بزرگ یونہی کرتے چلے آئے ہیں اور وہ چونکہ یقیناً دانشمند اور اصحابِ فہم تھے اس لئے ضرور اچھا فعل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تمہارے اور تمہارے اسلاف کے یہ تمام معبود میرے دشمن ہیں، حق سے روکنے والے ہیں، مشاہدۂ قدرت سے باز رکھنے والے ہیں، منزلِ مقصود کے راستے کے پتھر ہیں، گلستانِ مراد کے کانٹے ہیں۔ میرا مطمح نظر صرف رب العالمین ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے وہی زندگی کے میدان میں دوڑنے کے اور اصل مقصد تک پہنچنے کے راستے بتانے والا ہے۔ وہی کھلاتا پلاتا اور بیماری کو دور کر کے تندرستی دیتا ہے۔ غرض یہ کہ وہ خلاق، قادرِ مطلق، ہادیٔ برحق، حاجت روا اور کارساز ہے۔ زندگی اور زندگی کے وجود اور بقاء کے تمام وسائل کا مالک ہے پھر سلسلۂ زندگی کو قطع کرنا بھی اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور دوسری زندگی میں بھی اسی سے واسطہ پڑے گا۔ اسی سے مجھے امید ہے کہ میرے قصور سے درگذر فرمائے گا اور ان ظاہری تعلقات کی لغزشوں کو معاف فرمائے گا۔

تحلیلِ اجزاء

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ۔ یہ دوسرا قصہ حضرت ابراہیمؑ کا ہے۔ اس کو بیان کرنے کے مختلف فوائد ہیں۔ مثلاً مکہ کے کافروں کو تنبیہ فرمائی کہ توحید کی تعلیم، نبوت کا دعویٰ، معادِ جسمانی کا اقرار، عذاب ثواب کا یقین، بت پرستی سے نفرت اور اللہ کی صفات کا اظہار کوئی نئی بات نہیں تمہارے مورثِ اعلیٰ ابراہیم کا یہی طریقہ تھا۔ ان کی بھی یہی تعلیم تھی وہ بھی غیر اللہ کی پرستش سے روگرداں تھے، انہوں نے بھی نفع نقصان اور موت و حیات کا مالک خدا کو ہی سمجھا تھا پھر تم کیوں ان کی تعلیم سے گردن کشی کرتے ہو اور کیوں ان کے طریقہ پر چلنے والوں کی رہنمائی کا انکار کرتے ہو۔ کفار کو تنبیہ کرنے کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تعلیم دینی مقصود ہے کہ دیکھو ابراہیم کی قوم یہاں تک کہ اس کے باپ نے بھی اس کی مخالفت کی۔ سب کے سب اس کو نقصان پہنچانے پر کمربستہ ہو گئے۔ ابراہیم کو بڑی بڑی حوصلہ شکن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، خار زار میں گھسنا پڑا۔ قدم قدم پر نوکیلے پتھروں کے زخم کھانے پڑے، مگر کچھ پرواہ نہ کی۔ تمام شدائد کو استقامت اور خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ اعدائے صداقت سے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بالآخر کامیاب ہوا۔ لہٰذا تم بھی ان کافروں کی مخالفتوں سے کبیدہ خاطر نہ ہو۔ حق کی مخالفت ہمیشہ سے کافروں کا شیوہ رہا ہے۔ آخر میں تم کامیاب ہو گے۔ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ۔ حضرت ابراہیمؑ جانتے تھے کہ ان کی قوم بتوں کو پوجتی ہے، مگر کافروں کو لاجواب اور شرمندہ کرنے اور بتوں کی طرف سے ان کی توجہ و عقیدت کو پھیرنے کے لئے آپ نے استفسار کیا۔

فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ۔ کفار بت پرستی میں بہت پختہ تھے۔ انہوں نے جواب دیا کہ بتوں کی پوجا کرتے ہیں بلکہ دن بھر ان کے گرد رہا کرتے ہیں یعنی ہم کو اس بت پرستی پر فخر ہے۔ ہم ان کے خادم ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا:۔

هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ۔ یعنی تم ان کی پرستش اور خدمت کس غرض سے کرتے ہو، کیا یہ تمہاری پکار کو سنتے ہیں یا تمہارا نفع نقصان ان سے وابستہ ہے

کہ یہ تمہاری کارسازی اور حاجت روائی کر سکتے ہیں مگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں تو بلاوجہ جبہ سائی اور خدمت گزاری حماقت ہے۔ جب یہ خود بے جان اور مجبور رہیں تو تمہاری مدد کیا کر سکتے ہیں۔

قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا الخ۔ کافروں کو کوئی جواب بن نہ پڑا۔ مورتیوں کی بے چارگی ان کو خود معلوم تھی جواب کیا دیتے کہنے لگے یہ ہمارے اسلاف کا طریقہ ہے۔ ہم ان کے پیرو ہیں (یعنی وہ یقیناً ہوش مند اور اہل بصیرت تھے، ان کے اعمال اور افعال حق تھے ہم کو وجہ معلوم نہیں تو نہ سہی یہ ہماری کوتاہ فہمی ہے۔ ہمارے بزرگ ہی اصل کو اچھا جانتے تھے ہماری پیروی کے لئے اتنا کافی ہے۔

نوٹ: بے جان چیزوں کو پکارنا اگرچہ وہ سامنے موجود ہوں بیوقوفی ہے۔ کوئی حسی یا عقلی دلیل اس کو جائز ثابت نہیں کر سکتی اور اگر اللہ کو پکارا جائے کسی حالت میں پکارا تو عقلاً اور نقلاً صحیح ہے کہ خدا تعالیٰ سنتا ہے آواز دھیمی ہو یا بلند یا صرف قلبی دعا خدا سب سے واقف ہے، اس لئے اس سے دعا کرنی بہرحال خلاف عقل نہیں، لیکن اگر زید کو پکارا جائے وہ سامنے یا کسی قریب مقام میں ہی نہیں ہے، مگر زندہ ہے تو ایسی پکار حماقت ہے۔ عقلمند کہہ سکتے ہیں کہ زید کو جب آواز پہنچنے کا احتمال نہیں تو پکارنا بے معنی ہے۔ اسی طرح اگر زید مر گیا تو بعید ترین مقام میں پہنچ گیا۔ اس دنیا سے نکل کر عالم برزخ میں چلا گیا اس کو پکارنا اور آواز سننے کی امید رکھنا اور دعا قبول ہونے کی تمنا رکھنا بالکل بے وقوفی ہے۔ بہت سے احمق اعتقاد رکھتے ہیں کہ فلاں بزرگ اور ولی ہماری پکار کو سنتا ہے، اس کی حالت ہماری حالت کی طرح نہیں ہے وہ روحی قوت سے سن لیتا ہے، لیکن یہ عقیدہ سراسر گمراہی ہے۔ علمائے حنفیہ سب کے سب متفق ہیں کہ مُردے نہیں سنتے (یعنی وہ لوگ جن کی یہ ظاہری زندگی منقطع ہو گئی ہو جن کو عرف میں زندہ نہیں کہا جاتا گو واقع میں زندہ ہوں اور برزخی حیات ان کو حاصل ہو، مگر کسی کو اس دنیا کی پکار بلا واسطہ سننے کی قدرت نہیں) پس تعجب ہے۔ پس تعجب ہے اُن بت پرستوں، دیو پرستوں قبر پرستوں اور مُردہ پرستوں پر جو تعزیوں، مورتیوں اور قبروں وغیرہ سے مرادیں مانگتے اور ان کو پکارتے ہیں۔

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ الخ۔ کفار کے معبودوں کی بے بسی اور عاجزی پر ریمارک کرنے کے بعد حضرت ابراہیم نے خداوند قدوس کے ان اوصاف کمالیہ کو بیان فرمایا جو اس کی ہمہ گیر قدرت اور محیط کل جبروت پر دلالت کرتے ہیں۔ پیدا کرنا اور پھر پیدا کر کے اسباب بقا کو فراہم کرنا اور پھر مقرر وقت پر مارنا اور موت کے بعد قیامت کے دن دوبارہ زندہ کرنا اللہ کے یہ چار خصوصی اوصاف ہیں۔ ان حالات کے علاوہ تمام انسانوں کی کوئی پانچویں حالت نہیں اور چاروں حالتوں کا مالک خدا تعالیٰ ہے، اس لئے اسی کو الوہیت کا استحقاق ہے۔ حضرت ابراہیم کے بیان کا خلاصہ یہی ہے۔

تنبیہ: بھوک پیدا کرنا، پیاس لگانا، گمراہ کرنا، بھٹکاتا، بیمار کرنا اور تکلیف میں رکھنا، غرض یہ اور اس قسم کے دوسرے افعال بھی خدا ہی کے ہیں۔ اسی کے حکم سے گمراہیاں پھیلتی ہیں، بیماری اور تنگ دستی آتی ہے، مصائب کا نزول ہوتا ہے، مگر ان اوصاف کی خدا تعالیٰ کی طرف نسبت کرنا ظاہر بین، کوتاہ فہم طبقہ کی نظر میں استحقاق الوہیت نہیں پیدا کرتی اور حضرت ابراہیم کی گفتگو بے وقوف جماعت سے تھی جس کی بصیرت ہی کوتاہ تھی، اس لئے آپ نے نزول مصائب کا فاعل اللہ کو نہ قرار دیا ورنہ کمزور دماغ والے ضرور اُچٹ جاتے اور خدا کی الوہیت کا اگر ماننے والے بھی ہوتے تو نہ مانتے اور کہہ دیتے کہ جو خدا ہم پر مصائب نازل کرتا ہے اور بجائے سختی کو دور کرنے کے شدائد میں مبتلا کرتا ہے ہم ایسے خدا کو کیوں مانیں اور کس امید پہ اس کی الوہیت کا اقرار کریں۔ اس سے تو ہمارے یہ بت ہی اچھے کہ ہم کو کوئی دکھ نہیں پہنچاتے، لیکن پھر بھی خدا کی رحمت عامہ کے تذکرے کے ساتھ اس کی قہاریت کا بیان کسی قدر ضروری تھا۔ رغبت اور خوف دونوں جذبے انسان کو راہ راست پر آنے سے مجبور کرتے ہیں۔ اگر صرف انعامات کا تذکرہ کر دیا جاتا اور قہاریت کی ہمہ گیری نہ دکھائی جاتی تو قوم کافر سے کس طرح حق پر آنے کی امید کی جا سکتی تھی۔ کیونکہ وہ لوگ سمجھ لیتے کہ جب خدا اتنا رحیم و کریم ہے اور قہر و غضب الٰہی نام کو نہیں تو پھر اس کی اطاعت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ فرماں برداری کی جائے یا نہ کی جائے اس کی رحمت تو بہرحال عام رہے گی اور قہر کا کوئی اندیشہ نہیں، اس لئے حضرت ابراہیمؑ نے احساناتِ الٰہیہ کا تذکرہ کرنے کے بعد یہ بھی فرما دیا کہ جہاں وہ جلاتا، کھلاتا، پلاتا اور بیماروں کو تندرست کرتا ہے وہاں وہ مارتا بھی ہے اور پھر آخرت میں بھی اسی سے واسطہ پڑے گا۔

تفریع: حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کے چند خصوصی اوصاف بیان فرمائے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان اوصاف کا مالک سوا خدا کے اور کوئی نہیں جو شخص اللہ کے سوا کسی غیر کو ان اوصاف کا حامل سمجھتا ہے وہ کافر ہے۔ پس حرام ہے کسی پیر، فقیر، ولی، نبی، دیوتا، اوتار، عناصر، مقابر، کواکب اور کسی مخلوق سے اللہ کو چھوڑ کر اولاد مانگنا، رزق طلب کرنا، شفائے مرض کی درخواست کرنا یا کسی کو دافع البلیات اور قاضی الحاجات جاننا۔ ان تمام عقائد و افعال سے آدمی کافر اور قطعی کافر ہو جاتا ہے۔

بعض جاہل بزعم خود عالم نہایت بلند آہنگی سے کہتے ہیں کہ بے شک کسی کو کارساز حقیقی جاننا اور اصلی قاضی الحاجات اور خلاق مطلق سمجھنا کفر ہے، مگر شفائے

مرض، دفعِ مصیبت، حصولِ رزق، مقدمہ میں کامیابی اور عطائے اولاد کا وسیلہ کسی بزرگ کو بنانا کس طرح اس سے منع ہو سکتا ہے، کسی بزرگ سے استمداد کرنی، اولاد اور رزق کے حصول، مقصد کی کامیابی یا مصیبت کے دفع کرانے کی دعا کرانے کی کیا ممانعت ہے جس طرح اطباء سے ایسی دوا کو تجویز کرانے کی خواہش کی جاتی ہے جس سے شفا حاصل ہو جائے، حاکموں سے نوکری کی درخواست کی جاتی ہے، طاقتوروں سے دنیوی امور میں مدد لی جاتی ہے، زندہ بزرگوں اور نیک لوگوں سے دعا کرائی جاتی ہے، اسی طرح ان بزرگوں سے جو اس عالم سے پردہ پوش ہو گئے استمداد کرنی جائز ہے اس میں نہ شرک ہے نہ کفر۔

یاد رکھو کہ یہ محض دھوکہ اور فریب ہے ۔ آیات مذکورہ پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ کارسازِ حقیقی خدا ہے۔ اب رہی ظاہری کارسازی کی نسبت تو یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ بے محل کوئی کام کرنا بے وقوفی ہے۔ اللہ نے جس کام کے جو ذرائع بنائے ہیں ان کا استعمال کرنا تو عین عقلمندی ہے، مگر صحیح ذرائع کو چھوڑ کر آلات کو توڑ کر غلط طریقہ پر چلنا اور کامیابی کی امید رکھنا حماقت ہے۔ مثلاً چھت سے اترنے کے لئے زینہ بنایا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص زینہ پر سے اترے تو اس کو عقلمند کہا جائے گا، لیکن اگر کوئی زینہ کو چھوڑ کر اوپر سے کود پڑے تو اس کو بیوقوف کہا جائے گا۔ اب اگر کوئی کودتے ہی مر گیا تو یقیناً بے وقوفی کی موت مرا اور اگر زینہ پر سے اترتے ہیں پاؤں پھسل گیا اور مر گیا تو دنیا اس کو بیوقوف نہیں کہہ سکتی اور شریعت میں بھی وہ شہید ہوا، لیکن اگر کوئی کسی بزرگ کا تصور کر کے یہ خیال کرتے ہوئے کہ میرا ہاتھ ان کے کاندھے پر ہے کود پڑے اور مر جائے تو یقیناً دنیا اس کو بیوقوف کہے گی اور اس کی موت بھی حرام ہو گی کیونکہ وہ زینہ سے نہیں اترا اور اللہ کے بتائے ہوئے جائز ذریعہ کو اس نے استعمال نہ کیا بلکہ اپنی طرف سے ایک نیا ذریعہ ایجاد کیا اور اس کی قوت واہمہ نے فطرتِ الٰہیہ کے خلاف ایک فرضی ذریعہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ زینہ کو ترک کرنا یا خود تراشیدہ تخیل کو زینہ سمجھنا دونوں بیوقوفی کی علامتیں ہیں۔ بالکل یہی حال ہے مذکورۂ بالا مسائل کا۔ علاج کرانے کے لئے خدا تعالیٰ نے اطباء اور ڈاکٹروں کو بنایا ہے۔ نوکری کی درخواست کرنے کے لئے امراء و سلاطین کو مقرر کیا ہے، مقدمات کے فیصلے کے لئے حاکموں کو متعین کیا ہے غرض "ہر کسے را بہر کارے ساختند و ہر کارے را بہ کسے سپردہ"۔ لیکن کس قدر بیجا ہے یہ حرکت کہ انجینیر سے علاج کرایا جائے، مکان بنانے کی درخواست ڈاکٹر سے کی جائے، ایک نادار بڑھیا سے حکومت و امارت کی خواہش کی جائے۔ پس ظلم عظیم ہے کہ ان بزرگوں سے جو (گو واقع میں زندہ ہیں مگر اس عالم سے ان کا تعلق قطع ہو گیا ہے اور برزخی زندگی میں پہنچ گئے) کسی دنیوی معاملے کی دعا کرائی جائے اور حاضر و ناظر سمجھ کر دستِ امداد ان کی طرف بڑھایا جائے حقیقت میں استمدادی عقیدہ کی تعمیر محض اس بنیاد پر ہے کہ احمق لوگ مرنے کے بعد بھی بزرگوں کی زندگی ایسی ہی مانتے ہیں جیسی اس دنیا والوں کی زندگی ہے اور اس دنیا سے ان کا ویسا ہی تعلق جانتے ہیں جیسا مرنے سے پہلے تھا۔ ہر وقت اور ہر مقام پر ان کو حاضر و ناظر یقین کرتے ہیں۔ دنیوی زندگی اور برزخی زندگی میں فرق نہیں سمجھتے۔ فی الواقع عقیدہ کی بنیاد ہی حماقت و کفر ہے۔ جو مر گیا اس کا کوئی تعلق مادی دنیا اور یہاں کے جھگڑوں بکھیڑوں سے نہیں رہا نہ اس کو اس نظامِ مادی میں کوئی دخل رہا۔

مقامِ غور ہے کہ جب تک اہل اللہ اس دنیا میں اس زندگانی کے جامہ میں ہوتے ہیں تو ان کو دنیا داروں کے جھگڑوں کی طرف توجہ کرنے کا بہت کم وقت ملتا ہے نہ وہ اس زق زق بق بق میں پھنسنے کو اچھا سمجھتے ہیں۔ تاہم چونکہ اس خاکدان میں ہوتے ہیں، ان کی پاک روحیں اس جسمانی پردہ میں بند ہوتی ہیں، اس لئے کبھی کبھی ان کو دنیا والوں کے مخمصوں میں پڑنے کی مجبوری ہوتی ہے اور جمال یار کے مشاہدہ سے کچھ دیر کے لئے ان کو چشم پوشی کرنی پڑتی ہے، لیکن جب ان کی روحوں کے منتی پرندے قفسِ عنصری سے آزاد ہو کر مقامِ قرب میں پہنچ گئے اور نورِ مجرد کے مشاہدۂ جمالی میں غرق ہو گئے اور کوئی رکاوٹ نہ رہی اور مادیت کا پردہ اٹھ گیا اور جسمانیت کے پہاڑ نظروں کے سامنے سے ہٹ گئے تو پھر کب وہ اس کثیف خاندان اور اس کے معاملات کی طرف توجہ کر سکتے ہیں اور شمع جمال کے پروانوں کو کہاں اتنی فرصت کہ وہ کسی دوسری طرف نظر بھی اٹھا سکیں۔ فاعتبروا۔

وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ الخ۔ یعنی قیامت کے دن خطاؤں کو بخشنے کا خدا ہی کو حق ہے۔ اس کے سوا کسی کو مغفرت کا اختیار نہیں، اس سے شفاعتِ انبیاء و اولیاء کے ناممکن ہونے پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ شفاعت کے معنی مغفرت کے نہیں بلکہ سفارش کے ہیں اور قیامت کے دن انبیاء و صلحاء کا شفیع ہونا مختلف آیاتِ قرآنی اور احادیثِ صحیحہ کی رو سے حق ہے۔

مقصودِ بیان حضرت ابراہیم کا واقعہ ذکر کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذائے کفار پر صبر رکھنے کی تلقین اور کافروں کو ان کی باطل پرستی پر تنبیہ کرنی مقصود ہے۔ فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیْنَ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس شخص کے دل میں کسی کی محبت رچ جاتی ہے واقع میں وہ کتنی ہی نازیبا اور خلافِ حق ہو، مگر اس کے نزدیک قابلِ فخر ہوتی ہے اور وہ علی الاعلان اپنے کرتوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بھی نہیں شرماتا۔ حضرت ابراہیم کی پوری گفتگو کا مقصد صرف اللہ کی الوہیت کا اثبات اور غیر اللہ کی الوہیت کا رد ہے۔ آپ نے اللہ کی ربوبیت سے اس کی الوہیت پر استدلال کیا ہے اور اس کو واحد فی الربوبیت ظاہر کر کے واحد لاشریک ثابت کیا ہے

(اور اللہ ہی) کو حاجت روائی کا مظہر قرار دیا ہے وغیرہ۔

رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ۝ وَاجْعَل لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ ۝ وَاجْعَلْنِي

اے میرے رب مجھے حکمت عطا کر اور نیکوں سے ملا دے اور پچھلے لوگوں میں میرا ذکر خیر کر دے اور وارثان

مِن وَرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ ۝ وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ ۝ وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ

بہشت میں سے مجھے بنا دے اور میرے باپ کو بخش دے بلاشبہ وہ گمراہوں میں سے ہے اور مجھے رسوا نہ کرنا اُس روز جبکہ لوگوں

يَوْمَ لَا يَنفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۝ إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ۝ وَأُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝ وَ

کو اٹھایا جائے گا اُس روز جبکہ نہ مال کام آئے گا نہ اولاد ہاں جو شخص پاک دل لے کر اللہ کے پاس جائیگا (وہی فائدہ میں رہے گا) اور جنت پرہیزگاروں کے پاس کر دی جائیگی اور

بُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِلْغَاوِينَ ۝ وَقِيلَ لَهُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ ۝ مِن دُونِ اللَّهِ هَلْ يَنصُرُونَكُمْ

دوزخ گمراہوں کے لئے ظاہر کر دی جائیگی اور اُن سے کہا جائے گا وہ معبود کہاں ہیں جن کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے تھے کیا وہ تمہاری مدد

أَوْ يَنتَصِرُونَ ۝ فَكُبْكِبُوا فِيهَا هُمْ وَالْغَاوُونَ ۝ وَجُنُودُ إِبْلِيسَ أَجْمَعُونَ ۝ قَالُوا وَهُمْ فِيهَا

کر سکتے ہیں یا مدد حاصل کر سکتے ہیں اس کے بعد اُن کو اور تمام گمراہوں کو اور شیطان کے لشکروں کو سب کو دوزخ میں اوندھے منہ ڈال دیا جائیگا وہ دوزخ کے اندر جھگڑتے

يَخْتَصِمُونَ ۝ تَاللَّهِ إِن كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ إِذْ نُسَوِّيكُم بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ وَمَا أَضَلَّنَا

ہوئے کہیں گے بخدا ہم بلاشبہ صریح گمراہی میں تھے جبکہ ہم تم کو رب العالمین کے برابر قرار دیتے تھے ہم کو تو بس ان

إِلَّا الْمُجْرِمُونَ ۝ فَمَا لَنَا مِن شَافِعِينَ ۝ وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ ۝ فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُونَ مِنَ

مجرموں نے گمراہ کیا اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے نہ غمخوار دوست پس کاش ہم کو ایک بار لوٹنا مل جائے تو ہم

الْمُؤْمِنِينَ ۝ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ

ایمان والوں میں سے ہو جائیں اس واقعہ میں بڑی نشانی ہے اُن میں اکثر ایماندار نہ تھے اور تمہارا رب بلاشبہ غالب اور مہربان ہے

تفسیر دنیا میں دانش مند بھی ہے اور بے وقوف کور بصیرت طبقہ بھی۔ روشن دماغ بھی ہیں اور اصحاب حماقت بھی، روشنی اور تاریکی، رات اور دن، اچھائی اور برائی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لوازم بشریت کے اقتضا اور فریضۂ خلقی کی ادا میں دونوں گروہ برابر ہیں۔ کھانے پینے، چلنے پھرنے، سونے جاگنے اور مقتضائے صنفی کو پورا کرنے میں عقلمند اور بے وقوف ایک ہی حالت رکھتے ہیں۔ البتہ کمی بیشی جائز ناجائز عقل کی مطابقت اور مخالفت کا فرق ضرور ہے، لیکن بایں ہمہ دونوں گروہوں کے منتہائے نظر اور مقصد زندگانی میں اختلاف عظیم ہے اور اس قدر تفاوت ہے کہ اس کو تباین کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ حماقت مآب گروہوں کا مقصد محض عیش و عشرت، راحت و چین، مال و دولت، دنیوی حکومت، سطوت اور عمومی تسلط کا حصول ہے۔ تندرستی جسمانی، قوت، عمر کی درازی، فلک بوس محلات کی تعمیر، خیل و حشم کی فراہمی اور اسی قسم کی دوسری

زوال پذیر نعمتیں ان کی زندگانی کا نصب العین بنی ہوئی ہیں اور مادی نعمتوں سے اوپر ان کی نظر نہیں اٹھتی نہ ان کا مطمعِ نظر دوسری راحت ہو سکتی ہے۔ اگر وہ کوشش کرتے ہیں تو انہیں چیزوں کو حاصل کرنے کی۔ اگر دعا کرتے ہیں تو انہیں چیزوں کی فراہمی کی یہاں تک کہ اگر تصور کرتے ہیں تو انہیں اضافی اندوختوں کا، لیکن ان کے خلاف ہوشمند گروہ کا نقطۂ نگاہ بہت بلند ہو وہ اس بے مقدار مال و متاع، ذلیل عزت و حکومت، حقیر محلات و قصور اور چند روزہ صنفی لذت اندوزیوں کو ناقابلِ التفات سمجھتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر فلاحِ آخرت ہوتی ہے اور دنیوی نعمتوں کی اگر ان کو خواہش ہوتی ہے تو اس لئے کہ اخروی سعادت کے حصول کا ذریعہ اس کو بنا سکیں۔ دنیا بجائے خود اپنے دلوں کو ان کی طرف نہیں کھینچ سکتی۔ ہاں دنیا میں خصوصیت کے ساتھ وہ دو باتوں کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ ان کو حقیقتِ کائنات کا علم حاصل ہو جائے، اشیاء کی واقعی صورتیں ان کے دماغوں کے سامنے آجائیں۔ وہم اور مغالطہ کے پردے ان کی بصیرت پر باقی نہ رہیں۔ عالمِ قدس کی سیر کیا کریں۔ براہِ راست ان کا تعلق خدا سے ہو جائے اور اس طرح ان کی قوتِ نظریہ کامل ہو جائے۔ دوسری خواہش یہ ہوتی ہے کہ آئندہ نسلیں ان کو جھوٹا، مفتری، ظالم، ناحق کوش، جاہل اور بیہودہ ہوس کا بندہ نہ کہیں ان کا ذکرِ خیر باقی رہے، جہاں تک ہو سکے لوگ ان کو برا نہ کہیں۔ حضرت ابراہیم بھی عارفِ کامل اور پختہ عقل کے آدمی تھے۔ اس سے بڑھ کر ان کی عقل و انسانیت کی تکمیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ خلیل اللہ اور نبی تھے، اس لئے آپ نے بھی خدا سے دین و دنیا کے متعلق جو دعا کی وہ وہی تھی جو ایک دانا طبقہ کیا کرتا ہے۔ فہم کی رسائی اور حکمت مانگی، نیکو کار گروہ میں شامل ہونے کی خواہش کی، ذکرِ خیر کے باقی رہنے کی استدعا کی اور فلاحِ آخرت کی تمنا کی۔ بس یہی آپ کا منتہائے نظر تھا۔ قرآن میں حضرت ابراہیم کی جو دوسری دعائیں مذکور ہیں جن سے بعض دنیوی مقاصد کے حصول کی تمنا کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ محض اس لئے کی تھیں کہ فلاحِ آخرت ان سے وابستہ تھی۔ بجائے خود حضرت ابراہیم کی توجہ کو وہ چیزیں جذب نہیں کر سکتی تھیں۔

تحلیلِ احترام

رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا۔ حضرت ابراہیمؑ نے کافروں کو سمجھایا تھا کہ جب اللہ کے سوا کوئی نفع نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ جو کچھ فائدہ یا ضرر پہنچتا ہے اللہ ہی کی طرف سے پہنچتا ہے۔ اگرچہ آدمی اس کو کسی اور کی طرف سے سمجھے۔ یہ نصیحت اور تبلیغ تو صرف مکالمہ کی حد تک تھی۔ اس کے بعد آپ نے خود ان کے بت توڑ ڈالے۔ گویا عملاً سمجھایا کہ دیکھو ان میں ضرر پہنچانے کی کوئی طاقت نہیں۔ اگر نقصان پہنچا سکتے تو مجھے پہنچاتے۔ اس پر کافروں کو طیش آیا۔ غصہ کے مارے سانپ کی طرح بل کھائے، بادشاہِ وقت سے جا کر شکایت کی۔ اس نے حضرت ابراہیم کو طلب کیا۔ آپ نے پہنچ کر توحیدِ الٰہی کا اعلان کیا۔ ایسی پر زور دلائل بیان کیں کہ نمرود حیران رہ گیا۔ کچھ بس نہ چلا تو تشدد پر اتر آیا اور پیغمبرِ برحق کو قید کر دیا۔ ہزاروں من لکڑیاں جمع کر کے ان کو آگ لگوائی اور دہکتی ہوئی آگ میں حضرت کو پھنکوا دیا۔ پروردگارِ عالم کو اس میں بھی اپنی قدرت کے کرشمہ کا اظہار مقصود تھا۔ مشتعل آگ کے شعلوں کو اس نے ابراہیمؑ کے لئے گلزار بنا دیا۔ نمرود پر عجیب ہیبت چھا گئی۔ ڈر کے مارے سہم گیا۔ اپنی قوت کو شکست دیکھ کر نرمی پر اتر آیا اور حضرت سے درخواست کی کہ آپ میرے ملک سے چلے جائیے۔ طالبانِ حق اہلِ باطل کے ساتھ خود ہی رہنا پسند نہیں کرتے۔ حضرت ابراہیمؑ خود ہی کافروں کی صحبت سے متنفر تھے، ترکِ وطن کے لئے تیار ہو گئے۔ پھر عالمِ غیب میں یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ نمرود اور اس کی قوم پر عذاب نازل ہو، اس لئے اہلِ ظلم دارانِ صداقت کی علیحدگی ضروری تھی۔ غرض ابراہیمؑ نے ملکِ شام کا قصد کیا اپنی اور باپ کو بھی ساتھ لے جانا چاہا، لیکن وہ ازلی گمراہ تھا۔ ساتھ جانا درکنار کہنے لگا ابراہیم! اگر تو نے مجھے ساتھ لے جانے کا نام بھی لیا تو پتھروں سے مار ڈالوں گا۔ جا یہاں سے نکل جا۔ مجھے میری حالت پر چھوڑ دے۔ حضرت نے فرمایا میرا رب رحیم ہے میں آپ کے لئے اس سے استغفار کروں گا۔ یہ کہہ کر اپنی بی بی سارا اور لوط اور مومنوں کی جماعت کو ساتھ لے کر راہِ حق میں نکل کھڑے ہوئے۔ گھر بار اور عزیزانِ وطن کو چھوڑا اور اللہ کی طرف منہ موڑ کر چل دیئے۔ چلتے وقت پروردگار سے دعا کی:-

رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا الخ۔ پروردگار! مجھے حکم عطا فرما۔ حکم سے ابن عباسؓ کے نزدیک علم، عکرمہ کے نزدیک فہم و دانش اور سدی کے نزدیک فیصلۂ نبوت مراد ہے۔ نیکوں کے ساتھ شامل کر دینے کا یہ مطلب ہے کہ سرزمین کافروں کی ہے۔ ملکِ شام نیکوں کا مرکز ہے وہاں پہنچا دے۔ یا یہ مراد ہے کہ دنیا اور آخرت میں مجھے نیکوں کے گروہ کے ساتھ رکھ۔

میرے نزدیک مناسب یہ ہے کہ حکم کی درخواست سے مراد ہے قوتِ علمیہ کی تکمیل کی طلب اور نیکوکاروں کے ساتھ شامل ہونے کی دعا سے مراد ہے قوتِ عملیہ کی تکمیل کی خواہش۔ گویا حضرت ابراہیم نے اپنی علمی اور عملی قوتوں کو کام میں لانے کی دعا پروردگار سے کی۔ پھر اپنے مشن کو کامیاب بنانے کی بھی خواہش کی اور عرض کیا پروردگار! میرا ذکرِ خیر آئندہ نسلوں میں بھی باقی رکھنا۔ یعنی دنیا میں میرا تذکرہ سچائی اور حقانیت کے ساتھ قائم رہے اور شرک کو چھوڑ کر راہِ توحید جو میں نے اختیار کی ہے اس کو آئندہ نسلیں بھی پسند کریں اور اسی راہ پر چلیں۔ اس کے بعد آپ نے آخرت کی فلاح کے متعلق دعا کی۔

عکرمہ اور لیث نے بیان کیا ہے کہ تمام اہلِ کتاب حضرت ابراہیم سے محبت رکھتے ہیں۔ ہر گروہ آپ کے طریقہ پر چلنے کا مدعی ہے۔ اگرچہ طریقۂ ابراہیمی پر صحیح طور پر چلنے کا فخر صرف امتِ محمدیہ کو حاصل ہے۔

وَاغْفِرْ لِأَبِي إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ۔ حضرت ابراہیم نے اپنے لئے دعا کرنے کے بعد اپنے باپ کے لئے دعا کی۔

یہاں ایک شبہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اسرارِ الٰہیہ سے بہت زیادہ واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ میرا باپ گمراہ ہے اور خدا کا دشمن ہے پھر دشمنِ خدا کے لئے مغفرت کی دعا کرنے کے کیا معنی ہوسکتے ہیں ؟

اس شبہ کا ازالہ دو طرح سے کیا جاسکتا ہے۔ اوّل صورت کا اظہار تو خدا تعالیٰ نے خود دوسری آیت میں فرمادیا ہے۔ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ یعنی ابراہیمؑ نے اپنے باپ سے اس کے واسطے خدا سے دعا کرنے کا وعدہ کرلیا تھا اس لئے اس کے واسطے خدا سے دعائے مغفرت کی، لیکن جب ابراہیمؑ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ میرا باپ اللہ کا مخالف ہے تو انہوں نے باپ کی کوئی ہمدردی نہ کی اور اظہارِ بیزاری کیا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اَغْفِرْ لِأَبِي کا یہ مطلب نہیں کہ میرے پروردگار! میرے باپ کو بخش دے۔ کیونکہ اس کے بعد خود ہی حضرت ابراہیمؑ نے کہا إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّينَ وہ گمراہ ہے راہِ راست سے بھٹکا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ راستے سے بھٹکے ہوئے کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کا مطالبہ ہرگز حضرت ابراہیمؑ نہیں کرسکتے۔ مشرق کی طرف جانے والے کا مغرب کی منزل پر پہنچنا عقلاً قابلِ تسلیم نہیں اور خلافِ عقل بات کی خواہش جلیل القدر پیغمبر کر نہیں سکتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ پروردگار! میرے باپ کی مغفرت کے اسباب فراہم کردے یعنی اس کو ہدایت کردے کیونکہ وہ گمراہ ہے، لیکن اس کے بعد جب خدا تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیمؑ کو اطلاع مل گئی کہ ان کا باپ ازلی گمراہ ہے اس کے نصیب میں ہدایت ہی نہیں ہے تو پھر آپ نے کوئی درخواست نہ کی۔ تقدیرِ الٰہی کے خلاف زبان نہ ہلائی اور باپ سے بیزاری کا اظہار کردیا۔ مؤخر الذکر جواب زیادہ صحیح ہے اور دونوں آیتوں کے مفہوم سے مناسبت رکھتا ہے۔

إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ - قلبِ سلیم کی تفسیری مراد میں اختلاف ہے۔ ابن سیرین نے فرمایا قلبِ سلیم وہ ہے جس کا عقیدہ اللہ کی توحید اور حشر نشر کی حقانیت پر ہو۔ مجاہد و حسن بصری نے کہا جو قلب شرک سے پاک ہو وہ سلیم ہے۔ ابوعثمان نیشاپوری کا قول ہے کہ قلبِ سلیم وہ ہے جو بدعت سے پاک ہو اور سنت پر قائم ہو۔

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ قلبِ سلیم کے عام معنی لئے جائیں کیونکہ آیت میں کوئی خاص قید نہیں بیان کی یعنی وہ قلب جو شرک اور معاصی سے پاک ہو وہ سلیم ہے۔

فَمَا لَنَا مِن شَافِعِينَ - یعنی قیامت کے دن کافروں کی کوئی سفارش نہ کرے گا نہ کوئی ان کا یار و مددگار ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کافر ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے، لیکن اس سے اہلِ ایمان کے لئے شفاعت ہونے کا انکار مستنبط نہیں ہوسکتا۔

مقصودِ بیان:۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے ابتدائی الفاظ بتارہے ہیں کہ مسلم کامل کا انتہائی نقطۂ نظر یہ ہونا چاہیے کہ اس کی دونوں قوتیں کامل ہوجائیں۔ اس کا علم و عمل صحیح اور حکمِ الٰہی کے مطابق ہوجائے۔ وَاجْعَل لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْآخِرِينَ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عارف کا مقصود فقط یہ نہیں ہوتا کہ اپنی ناؤ کو کھینچ کر ساحلِ مراد پر لے جائے بلکہ دوسرے گم کردہ راہ گروہ کو بھی امن کے جہاز پر بٹھا کر نجات دینا بھی اس کے پیشِ نظر رہتا ہے۔ خود موحد عارف بن جانا اور دوسروں کے دلوں میں نورِ توحید کو متمکن کرنا اہلِ حق کا شیوہ ہے۔ يَوْمَ لَا يَنفَعُ الخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک دل سالم نہ ہو اور شرک کی آلودگی سے پاک نہ ہو اس وقت تک کوئی بدرقہ اور معنوی غذا (یعنی انبیاء و صلحاء کی سفارش یا مال و اولاد اور دیگر ذرائع) مفید نہیں ہوسکتی۔ بیمار کو کوئی قوی غذا سودمند نہیں ہوتی۔

اس سے آگے دوزخ کی ہیبت ناکی کا اظہار کیا ہے۔ کافروں کی نامرادی، بدانجامی اور مایوسی کی تصویر کھینچی ہے اور اہلِ ایمان خدا کے فرماں بردار بندوں کے علاوہ تمام گروہوں کی خسرانِ مآل اور بدانجامی کی تفصیل کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کو کیا کیا امور پیش آئیں گے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٠٥﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٠٦﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٠٧﴾ فَاتَّقُوا

قومِ نوح نے پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا کیا تم ڈرتے نہیں ہو واقعی میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں تم اللہ سے

اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٠٨﴾ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٠٩﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١١٠﴾

ڈرو اور میرا کہنا مانو ... میں تم سے اس کی کوئی اُجرت بھی تو نہیں مانگتا میری اُجرت تو پروردگارِ عالم [illegible] ذمہ ہے تو [illegible] اللہ سے [illegible] ڈرو اور میرا کہنا مانو

قَالُوا أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ ﴿١١١﴾ قَالَ وَمَا عِلْمِي بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١١٢﴾ إِنْ حِسَابُهُمْ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّي لَوْ

وہ بولے کیا تم [illegible] ذلیل لوگ [illegible] نوح نے کہا اس کام سے مجھے کیا [illegible] رب کے [illegible]

تَشْعُرُوْنَ ۝ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ

کاش تم سمجھو اور میں مسلمانوں کو نکالنے والا نہیں میں تو محض صاف طور پر ڈرانے والا ہوں وہ بولے نوح اگر تم باز نہ آؤ گے

لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ۝ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِيْ وَ

تو ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے نوح نے کہا پروردگار! میری قوم نے مجھے جھٹلایا تو میرا ان کا فیصلہ کر دے اور مجھے اور

مَنْ مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ۝

میرے ساتھی مسلمانوں کو بچا دے چنانچہ ہم نے اُن کو اور اُن کے ساتھیوں کو بھری ہوئی کشتی میں بچا لیا پھر اس کے بعد باقی لوگوں کو ڈبو دیا

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝

اس واقعہ میں بلاشبہ بڑی نشانی ہے ان میں سے اکثر ایماندار نہیں ہیں تمہارا رب بلاشبہ زبردست اور مہربان ہے

تفسیر انسان کے دماغ میں رعونت، سرکشی اور نافرمانی کا نشہ پیدا کرنے والا اور خودی کو بڑھا کر دعائے خدائی تک پہنچانے والا صرف مال و منال، سطوت و جلال اور دولت و اقبال ہے۔ دولت مند انسان ایسا بادۂ پندار سے مخمور ہو جاتا ہے کہ اس کو غریب و بے نوا طبقہ انسانیت سے خارج اور حقوقِ آدمیت کا نااہل نظر آنے لگتا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ وہ اپنی ہستی کو عام آدمیوں کی ہستی سے بالاتر چیز سمجھنے لگتا ہے اور مادی طاقت پر گھمنڈ کر کے فقیروں اور مسکینوں کو دماغی آزادی کا مستحق ہی نہیں سمجھتا یہی وجہ کہ کسی غریب کے منہ سے اگر کوئی کلمۂ حق سنتا ہے تو نہایت غرور کے ساتھ گردن موڑ لیتا ہے اور مفلس کی صداقت کو قابلِ توجہ بھی نہیں قرار دیتا، لیکن اگر اتفاق سے غریبوں کا گروہ اجتماعی طاقت پیدا کر لیتا ہے اور دولتمندوں کو مجبوراً مفلسوں کے سوادِ اعظم کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے تو اس ہادیٔ معصوم کے ہر قول و عمل کو بیہودہ نفسانی اغراض سے وابستہ کہتا اور رعونت و جاہ کے حصول کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اگر جب بیدار مغز رہنما ہر قسم کے لالچ سے اپنے کو بالاتر ثابت کر دیتا ہے اور طمانیت سے اعلان کر دیتا ہے کہ پیامِ ہدایت سے میرا مقصد نہ زر و مال کا حصول ہے نہ سیادت و حکومت کی طلب نہ میں کسی اُجرت کا خواستگار ہوں، صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم لوگ اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح کر لو اور اطوار کو درست کر لو یہی میرا منتہائے نظر ہے اور بس۔ تو اس وقت پندار کا یہ گروہ لاجواب ہو کر جاہلانہ بد دماغی پر اتر آتا ہے۔ کہتا ہے یہ ذلیل کمینے تو ننگے ہیں، بھوکے ہیں، لالچی کُتے ہیں جو ان کے سامنے ٹکڑا ڈال دے اُسی کی طرف ہو جاتے ہیں، یہ ہی تمہارے ساتھ ہیں، لالچ کی وجہ سے تمہارے ساتھ ہوئے ہیں۔ ہم کو تو کوئی لالچ نہیں، ہم ان کمینوں کی تقلید کیوں کریں اور کیوں تم کو سچا جانیں اور کس طرح تمہارا کہنا مانیں۔ پھر اس ذلیل گروہ کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، میل جول کرنا اور ربط ضبط بڑھانا ہمارے لئے باعثِ توہین ہے۔ اگر تم اپنے پاس سے ان کو نکال دو تو ہم تمہارے قول پر غور کریں گے اور سوچیں گے کہ تم صحیح کہتے ہو یا غلط۔ اس تمام کشمکش کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ اس بد سرشت گروہ کو اپنی بدمستی اور سرشاری کے خلاف کوئی لفظ سننا گوارا نہیں ہوتا، اس لئے پاکبازوں کے ہر قول کی مخالفت کرنی اس کا شیوہ ہوتا ہے اور چونکہ حق ایک ہے اور اس کے مظاہر مختلف ہیں، پیام ایک ہے پیامبر بہت ہیں، صداقت ایک ہے، مگر زمانہ اور احوال کے اختلاف کے سبب حاملانِ صداقت میں تعدد ہے۔ اس لئے ایک علمبردارِ حق کی مخالفت گویا کل حاملانِ حق کی مخالفت ہوتی ہے۔ دشمنی تو حق سے ہوتی ہے، انکار تو صداقت کا ہوتا ہے۔ اسی بنا پر صداقت جس ہستی کے قول و فعل سے ظاہر ہوتی ہے اسی سے باطل پرستوں کو دشمنی ہوتی ہے، پیامِ حق جس کے منہ سے سنتے ہیں اس کا انکار کرتے ہیں، قانونِ ہدایت سے سرتابی کرنا اصل غرض ہوتی ہے، اس لئے کسی ایک حاملِ قانون کی ہدایت کو نہ ماننا اس تمام گروہ کے معمول بہا کو مستلزم ہوتا ہے جو قانونِ مذکور پر چلنے کی ہدایت کرتا ہے۔ الغرض جب بد طینت کوتاہ فہم بیمار طبیب حاذق کی تشخیص کو نہیں مانتے، اس کی ہدایت کو ٹھکرا کر بد پرہیزیوں میں مشغول رہتے ہیں تو ان بد پرہیزیوں کا نتیجہ سوا ہلاکت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ شرک اور گناہ کا مرض بدن کو گھیر لیتا ہے اور ابدی ہلاکت نصیب ہوتی ہے، دنیا میں تباہی اور آخرت میں روسیاہی حاصل ہوتی ہے، لیکن جو سمجھدار بیمار مشفق حاذق طبیب کی ہدایت پر چلتا ہے اس کی بتائی ہوئی دوا لیتا اور اس کے حکم کے موافق پرہیز رکھتا ہے اس کو کامل صحت حاصل ہو جاتی ہے اور دوامی زندگی میسر آتی ہے۔ دنیا میں بھی وہ کامیاب ہوتا ہے اور آخرت میں بھی اس کو سعادت ملتی ہے۔ حضرت نوحؑ کی قوم کی ایسی ہی حالت تھی۔ اول تو حضرت نوحؑ کو ذلیل سمجھ کر ان کے قول کی طرف توجہ نہ کی، لیکن جب غریب لوگ کچھ حضرت پر ایمان لے آئے تو آپ کی

آپ کی تعلیم کو حصول دنیا کا آلہ کار قرار دے کر کہنے لگے تم پہلے ذلیل تھے کوئی تم کو پوچھتا نہ تھا۔ اب اس بہانہ سے دولت منداور سردار بننا چاہتے ہو۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا میں کسی چیز کا خواستگار نہیں، تم سے کچھ مانگتا نہیں، صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی حالت درست کرلو اور ابدی ہلاکت سے بچو۔ کہنے لگے ہم تمہاری بات کیسے مانیں اور کس طرح تم کو صادق جانیں اور تمہارے قول پر عمل کریں، تمہارے پیرو تو ذلیل، کمینے، بدمعاش ہیں ہم ان کے ساتھ کس طرح میل گوارا کر سکتے ہیں۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا مجھے ان کی اندرونی حالت سے کیا سروکار ہے یہ لوگ پہلے یہ کیا کرتے تھے اب تو یہ مومن ہیں، ان کو اپنے پاس سے نکال نہیں سکتا تم مانتے ہو مانو نہ مانتے ہو نہ مانو۔ میرا کام تو صرف ابدی ہلاکت اور سرمدی عذاب سے ڈرانا ہے۔ مغرور قوم لاجواب ہو کر جاہلانہ دھمکیوں پر اتر آئی۔ کہنے لگی نوح اگر تو اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو ہم تجھے سنگسار کر دیں گے پتھر مار کر مار ڈالیں گے۔ حضرت نوحؑ اپنی تبلیغ تمام کر چکے تھے، آئندہ کسی کے مسلمان ہونے کی امید بھی نہ تھی اور کافروں کی دست درازیاں انتہا کو پہنچ چکی تھیں مجبور ہو کر اپنے اللہ سے شکایت کی اور عرض کیا پروردگارا میری قوم نے برابر مجھے جھٹلایا سچا نہ جانا اب میرا اس کا فیصلہ ہی کر دے اس کا کام تمام کر دے اور مجھے مومنوں کی جماعت سمیت اپنے عذاب سے محفوظ رکھ۔ غرض حضرت نوحؑ مومنوں کی جماعت لے کر کشتی پر سوار ہو گئے۔ طوفان آیا اور تمام نافرمان ڈوب گئے۔ اس واقعہ میں اللہ کی قدرت غیبی طاقت اور ہمہ گیر حکمت کی نشانیاں موجود ہیں۔ آگ سے پانی نکالنا، فضا سے تنور سے ایک طوفان برپا کرنا پھر مومنوں کو بچا لینا اور کافروں کو ہلاک کر دینا بتاتا ہے کہ اسباب میں تاثیر اللہ ہی نے پیدا کی ہے جو جب چاہے ان کی تاثیر سلب کر سکتا ہے۔ بدکاری کا انجام تباہی ہے۔ ایک خاص حد تک رسی کو ڈھیلا چھوڑا جاتا ہے بالآخر کھینچ لیا جاتا ہے۔ کھنچاؤ اور بندش کے بعد رہائی ناممکن ہوتی ہے۔ قدرت کی ان نشانیوں کو سمجھنے کے لئے عبرت اندوز طبع اور نصیحت پذیر سمجھ کی ضرورت ہے، مگر دنیا میں غور و فکر سے کام لینے والے اور واقعات و نظائر سے عبرت پکڑنے والے بہت کم لوگ ہیں اور اکثر نورِ ایمان سے خالی ہیں۔

تحلیلِ اجزاء كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ۔ حضرت نوحؑ کا واقعہ بیان کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینی مقصود ہے اور یہ بتانا غرض ہے کہ انبیاء کی تکذیب کرنا اور ان کو دکھ پہنچانا اور اہلِ حق کو ایذائیں دینی نئی بات نہیں۔ نوح کی قوم نے ایسا کیا تھا، صدہا برس تک مخالفت پر کمربستہ رہی تھی اور ایک نسل دوسری نسل کو وصیت کر جاتی تھی کہ نوحؑ کے قول کو سچا نہ جاننا اور اپنے اسلاف کے طریقہ کو نہ چھوڑنا لیکن اس کا حشر کیا ہوا، عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئی اور نوحؑ کو مومنوں کی جماعت سمیت فتح و نجات حاصل ہوئی۔

ایک شبہ قوم نوحؑ نے حضرت نوحؑ کی تکذیب کی تھی۔ دوسرے انبیاء کو نہ ماننے کی کہیں صراحت نہیں۔ پھر صرف تکذیب نوحؑ کو عموماً انبیاء کی تکذیب کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے اور کیونکر آیت کا ظاہری مطلب صحیح ہو سکتا ہے۔

ازالہ تکذیب در حقیقت حق کی تھی۔ کلمۂ حق کو صحیح ماننا اور اس پر عمل کرنا کافروں کو ناگوار تھا۔ پیغمبر کی تکذیب کے یہ معنی ہیں کہ اس کی تعلیم کو وہ صحیح نہ جانتے تھے، اس لئے ایک پیغمبر کی تکذیب بھی تمام پیغمبروں کی تکذیب ہوئی۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ اگر طب کی کتابوں میں کسی مرض کو پہچاننے کا ایک خاص قاعدہ لکھا ہوا اور اس مرض کی دوا کی نوعیت بھی مقرر ہو، مگر فصلوں کے تغیر و مزاجوں کے اختلاف اور دوسری حالتوں کے تقاضے کی مناسبت سے متعدد دوائیں لکھ دی ہوں اور اختیار دے دیا ہو کہ جس ملک اور جس فصل میں ان دواؤں میں سے جو دوا مناسب ہو وہ تجویز کی جائے۔ اب کوئی حاذق طبیب مریض کو دیکھ کر مرض کی تشخیص کرتا اور دوا تجویز کرتا ہے اور اسی قاعدے پر عمل کرتا ہے جو طب کی کتابوں میں اس نے پڑھا ہے، لیکن مریض اس کو جھوٹا کہتا ہے اور اس کی بتائی ہوئی دوا کا استعمال نہیں کرتا تو گویا اس مریض نے تمام اطباء کی تکذیب کی کیونکہ ہر ماہر طبیب اسی قانونِ طب کے موافق تجویز و تشخیص کرے گا جس قانون کے زیرِ عمل پہلے طبیب نے تشخیص و تجویز کی تھی اور اسی نتیجہ پر پہنچے گا جس پر پہلا طبیب پہنچا تھا اور وہی ہدایت کرے گا جو اول طبیب نے کی۔ قانون ایک، تشخیص ایک، تجویز ایک۔ لہٰذا ایک قول کو جھوٹا جاننا تمام کے قول کو جھوٹا جاننے کو مستلزم ہوا۔

أَخُوهُمْ نُوحٌ نوح نسبی بھائی نہ تھے بلکہ قومی اور وطنی بھائی تھے۔

أَلَا تَتَّقُونَ یعنی تم شرک اور معصیت سے پرہیز کیوں نہیں کرتے اور شرک کے نتیجۂ بد سے کیوں نہیں ڈرتے۔

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت نوحؑ امانت و دیانت میں مشہور تھے۔ قوم آپ کی امانت سے خوب واقف تھی اور ظاہر ہے کہ جو قومی معاملہ میں امین ہو وہ اللہ پر تہمت تراشی کیسے کر سکتا ہے، اس لئے حضرت نوحؑ نے فرمایا کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا، پیغام رسانی میں کمی بیشی نہیں کرتا۔ امانت کے ساتھ ادائے رسالت کر رہا ہوں۔

وَأَطِيعُونِ یعنی میری نصیحت کو مانو۔ عقائد و اعمال کی اصلاح کے متعلق میں جو حکم دوں اس کی تعمیل کرو اور جس سے منع کروں اس سے باز رہو۔ دنیوی معاملات میں اطاعت مقصود نہیں ہے۔

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۔ مراد یہ ہے کہ میں مال و زر، حکومت اور امارت کا خواہش مند نہیں ہوں۔ اس اصلاح کی کوئی اجرت بھی تم سے نہیں مانگتا۔ میری نصیحت غرض پر مبنی نہیں۔ میرا اجر تو خدا پر ہے۔

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ رب العالمین کا لفظ استعمال کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ میرا اللہ پر کوئی حق نہیں، مگر چونکہ وہ رب العالمین ہے، اس لئے اس کے فضل و کرم سے اُمید ہے کہ اس خدمت کا اجر مجھے دے گا۔

وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ۔ یعنی کافروں نے جواب دیا نوح! ہم تمہارے کہنے پر کیسے چل سکتے ہیں جبکہ تمہاری بات ماننے والے تو کمینے رذیل لوگ ہیں۔ اگر تمہاری تعلیم کچھ بھی حقانیت رکھتی تو ہمارے سردار اور شرفاء تمہارے پیرو ہوتے۔ ان بے وقوفوں کے ماننے سے ہم تصدیق نہیں کر سکتے۔

قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ یعنی حضرت نوحؑ نے فرمایا مجھ پر لازم نہیں کہ ان لوگوں کے گزشتہ اعمال کا علم حاصل کروں اور دریافت کروں کہ پہلے یہ لوگ کیا کرتے تھے، ان کے افعال شریفانہ تھے یا رذیلانہ، امیرانہ یا فقیرانہ۔ حساب کرنے والا تو اللہ ہی ہے۔ وہی واقف ہے کہ یہ کیا کرتے تھے۔ اب تو یہ مومن ہیں اور مومنوں کو اپنے پاس سے میں نکال نہیں سکتا۔

لَوْ تَشْعُرُوْنَ ۔ کاش تم میں اتنا شعور ہوتا۔ ایسی نمایاں اور واضح بات کو سمجھ لیتے کہ ایمان کے بعد گزشتہ اعمال کا محاسبہ باقی نہیں رہتا اور ایمان میں شرافت و رذالت اور امارت و فقر کو کوئی دخل نہیں۔ مومن ہو جانے کے بعد سب برابر ہو جاتے ہیں۔ ذلت و عزت کا معیار صرف ایمان ہے۔ نسبی اور مالی برتری کوئی چیز نہیں۔

اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ۔ یعنی حضرت نوحؑ نے دعا کی کہ پروردگار! میری قوم نے میری بات نہیں مانی، مجھے سچا نہ جانا۔ اب کوئی چارۂ کار نہیں۔ میرا ان کا فیصلہ کر دے۔ ان کو تباہ کر دے اور مجھے مومنوں سمیت بچا لے۔ حضرت نوحؑ پر ایمان لانے والے تقریباً اسی (۸۰) آدمی تھے۔ یہی تعداد عام اہل تفسیر نے بیان کی ہے۔ واللہ اعلم واقعی تعداد کتنی تھی۔ بالآخر نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم ہوا۔ آپ نے حکم کی تعمیل کی۔ کشتی تیار ہو گئی تو اس پر خود تمام مومنوں کو ساتھ لے کر سوار ہو گئے۔ پیشِ نظر جانوروں کا ایک ایک جوڑا بھی ساتھ لے کر رکھوایا تاکہ ان کی نسل منقطع نہ ہو۔ ضروری سامان بھی ساتھ لے لیا۔ حضرت نوحؑ کی بیوی اور کنعان نامی بیٹا سوار نہ ہوئے۔ ان کو آپ کی نبوت اور بیان کردہ طوفان کا یقین نہ تھا۔ بالآخر طوفان اٹھا اور اتنا اٹھا کہ پہاڑوں پر چڑھ گیا۔ سب کے سب غرق ہو گئے۔ صفحۂ ہستی پر کسی کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ سیلاب ختم ہونے کے بعد حضرت نوحؑ کشتی سے اترے۔ آپ پر جو لوگ ایمان لائے تھے عمومی وبا سے وہ بھی مر گئے، صرف چند بیٹے باقی رہ گئے۔ انہیں کی نسل سے یہ زمین پھر آباد ہوئی اور بستیاں بسائی گئیں۔ اسی بنا پر حضرت نوحؑ کو آدم ثانی کہا جاتا ہے۔

لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۔ یعنی اللہ غالب بھی ایسا ہے کہ کافروں کو دم کے دم میں غرقاب کر دیا اور رحیم بھی اس قدر ہے کہ مومنوں کو اس قدر زبردست طوفان سے بچا لیا۔ ہمیشہ نافرمانوں پر اس کا قہر اور فرماں برداروں پر اس کی رحمت ہوتی ہے۔

مقصودِ بیان

تمام انبیاء پر ایمان لانا فرض ہے۔ ایک نبی کی تکذیب کل انبیاء کی تکذیب ہے۔ ہم قوم اور ہم وطن آدمی کو بھائی کہا جاتا ہے۔ تبلیغ اسلام اور وعظ و نصیحت کا معاوضہ لینا جائز نہیں۔ اللہ پر کسی نیک عمل کا ثواب دینا لازم نہیں، وہ جو کچھ دے گا اپنی مہربانی اور فضل سے دے گا کیونکہ وہ رب العالمین ہے۔ حضرت نوحؑ پر ایمان لانے والے اکثر و بیشتر مفلس تھے، اس لئے کفار ان کو رذیل و ذلیل سمجھتے تھے۔ دنیا پرست انسان کے دماغ پر چونکہ مال و دولت کا بھوت سوار ہو جاتا ہے، اس لئے وہ معیارِ فضیلت مال ہی کو خیال کرتا ہے۔ مفلس آدمی اس کی نظر میں ذلیل اور رذیل ہوتا ہے، لیکن فی الحقیقت معیار کمال ایمان اور عمل صالح ہے۔ جاہل سرکش لاجواب ہو کر اپنی مادی قوت پر بھروسہ کر کے تشدد اور دھمکیوں پر اتر آتا ہے۔ اسی طرح اہل باطل اہل حق کو ستاتے ہیں۔ کلمۂ حق کو سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ حضرت نوحؑ نے مایوس ہو کر اپنی قوم کے لئے بددعا کی تھی۔ اللہ اپنے نیک بندوں کی مدد فرمایا کرتا ہے۔ حضرت نوحؑ کو ان کی جماعت سمیت اللہ نے کشتی میں نجات دی تھی۔ طوفانِ نوحؑ ضرور آیا تھا۔ پورے قصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیتِ کفار پر صبر کی تلقین ہے اور کافروں کو نافرمانی کی سزا میں ہلاک و برباد ہونے کی دھمکی ہے۔

كَذَّبَتْ عَادُ ۨ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝

عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا جب اُن سے اُن کے بھائی ہود نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں ہو میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَتَبْنُوْنَ

تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو ۔ میں تم سے اس کی اجرت بھی تو نہیں مانگتا ۔ میری اجرت تو پروردگار عالم کے ذمّہ ہے ۔ کیا تم ہر اونچی

بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ۝ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ۝ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ

جگہ پر ایک عبث یادگار بناتے ہو اور مضبوط محل تیار کرتے ہو شاید تم ہمیشہ رہو گے اور جب ہاتھ ڈالتے ہو تو زبردست

جَبَّارِيْنَ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّ

گرفت کرتے ہو ۔ تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور اُس خدا سے ڈرو جس نے اُن چیزوں سے تمہاری مدد کی جو تم کو معلوم ہے اُس نے چوپائے بیٹے

بَنِيْنَ ۝ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ

باغ اور چشمے دے کر تمہاری مدد کی مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا تم پر خوف ہے وہ کہنے لگے تم ہم کو

اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ۝ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ

نصیحت کرو یا واعظوں میں سے نہ ہو ہمارے لئے برابر ہے یہ تو اگلے لوگوں کا دستور ہے ہم کو تو عذاب ہوگا نہیں غرض

فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۗ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ

انہوں نے ہود کو جھٹلایا تو ہم نے انہیں تباہ کر دیا اس واقعہ میں بلاشبہ بڑی نشانی ہے اُن میں سے اکثر ایماندار نہ تھے اور تمہارا رب یقیناً غالب اور مہربان ہے

تفسیر

کم سمجھ محسوس پرست لوگ صرف اسی مادی دنیا کے شیفتہ ہوتے ہیں ۔ یہی محسوس عیش و تنعم یا مصائب و شدائد ان کی نظروں کے سامنے ہوتے ہیں ۔ یہی فنا اور زوال پذیر زندگی ان کے نزدیک قطعی اور ناقابل تغیر ہوتی ہے ، وہ اسی دور کی کشاکش کو حقیقی اور اصلی سمجھتے ہیں ۔ آئندہ زندگی کا تصور ان کے نزدیک احمقانہ خیال ہوتا ہے ۔ جزا سزا اور ثواب و عذاب کے یقین کو مزاح انگیز اور جہالت آفریں عقیدہ جانتے ہیں اور چونکہ ہر قسم کی اخروی پاداش اور حساب کتاب کو وہمی تصرف سے زیادہ وقعت نہیں دیتے ، اس لئے آخرت کے ہر تخیل سے ان کا دماغ خالی ہوتا ہے ۔ اسی بنا پر ہر نیکی کا جذبہ مردہ ، انصاف و صداقت کے عواطف افسردہ اور کار ہائے خیر کے دواعی پژمردہ ہوتے ہیں ۔ دنیا میں جائز ناجائز اور حرام و حلال کی تفریق ان کے نزدیک ایک بیہودہ خیال اور عدل و ظلم کا امتیاز مجنونانہ فعل ہوتا ہے ۔ نام و نمود عزت و دولت شہرت سطوت اور جاہ و جبروت کے خواہاں ہوتے ہیں ۔ فلک بوس کوٹھیاں سیسہ پلائی ہوئی بنیادوں پر قائم کئے ہوئے منارے اور جواہر کی روکشی کرنے والے محلات بناتے ہیں تاکہ بہتر سے بہتر تجمل و شان کا اظہار ہو اور آئندہ طویل مدت تک ان کا نام قائم رہے ۔ شاہان مصر نے اہرام اسی لئے بنائے ، ہندوستان کے مہاراجوں نے مشہور ترین مندر اسی لئے تعمیر کئے ، قوم عاد نے بڑی عمارتیں کو شہر منانے والی یادگاریں اور اونچے اونچے مکانات اسی جذبہ نمود کے تحت قائم کئے تھے ۔ یہ قوم بڑی مالدار تھی ، صاحب شوکت تھی ، جبروت و جاہ کی مالک تھی ، اپنے زمانہ میں حکومت و سطوت میں نظیر نہ رکھتی تھی ، گویا عربی قوم تھی ، مگر مصر سے ترکستان اور ہند تک ایشیا کے اکثر ملکوں میں انہی کا پھریرا لہراتا تھا اور آخرت پر چونکہ یقین نہ تھا ، فسق و فجور ، بدمعاشی ، بے جا ظلم ، جبر اور جبر و تعدی ان کا شیوہ تھا ۔ قوی کمزور کو ستاتا ، اس کے مال پر قبضہ کرتا ، عزت و ناموس کو برباد کرتا اور غریبوں سے طرح طرح کی بیگاریں لیتا تھا ۔ ٹیلوں پہاڑیوں پر اونچے اونچے منارے مقبروں کے نام سے قائم کئے تھے ۔ سرسبز اور شاداب مقامات پر شاہانہ کوٹھیاں تعمیر کی تھیں ، پائیں باغ اور چمنستان لگا رکھے تھے ۔ ان کی نسل بھی زیادہ تھی ۔ ملک کا ملک انہی کی قوم سے آباد تھا ۔ مویشی اور چوپائے بھی ان کے پاس بہت تھے ۔ غرض آرام و رفاہیت کا تمام سامان فراہم تھا ، غفلت و پندار کے کل اسباب موجود تھے ۔ خود پسند تھے ، خود غرض تھے اور رعونت نما تھے ۔ حق و صداقت ، عدل و انصاف ، خدا ترسی اور رحم سے ان کو دشمنی تھی ۔ خدا تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لئے حضرت ہود کو مبعوث

فرمایا۔ ہود نے عذابِ الٰہی سے ڈرایا۔ قوم نے سرکشی کی، عذاب کی وعید کو داستانِ پارینہ کہا۔ بالآخر اللہ نے ان کا وجود مٹا دیا اور کوئی نام لیوا نہ رہا۔

تحلیلِ اجزاء

كَذَّبَتْ عَادُ ٱلْمُرْسَلِينَ۔ مشہور ہے کہ عاد ایک شخص کا نام تھا اس کی نسل کا نام بھی عاد ہو گیا۔ عاد حضرت نوح کے پوتے ارم کا بیٹا تھا علامہ یہ تاریخی ملفوظات کہاں تک صحیح ہیں۔ ہم کو ان تحقیقات سے کوئی سروکار نہیں، صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ قوم عاد عرب استانوں کی رہنے والی ہر گیر تسلط رکھنے والی اور بہت طاقتور شوکت مند قوم تھی۔ عرب بائدہ میں اس کا شمار کیا جاتا ہے۔ حضرت ہود کو اس کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا تھا۔ حسبِ دستور انبیاء حضرت نے قوم کو افعالِ شنیعہ سے منع کیا، عذابِ خدا سے ڈرایا اور یہ ظاہر کیا کہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا، خدا کی طرف سے مجھے یونہی حکم ملا ہے میں بغیر کسی کمی بیشی کے تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں اس اصلاح و ہدایت سے میرا مقصود کسی دنیوی مفاد کا حصول بھی نہیں ہے تم سے کسی معاوضہ کا خواستگار نہیں۔

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ کیا تم بیہودہ یادگاریں قائم کرنے کے خیال سے اور فضول سیرگاہیں بنانے کے لحاظ سے یہ اونچے اونچے منارے بناتے اور مقبرے تعمیر کرتے ہو اور وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ الخ۔ مضبوط ترین محلات چنواتے ہو اور یہ خیال کئے ہوئے ہو کہ یہ جہانِ فانی بقائے جاودانی کا مقام ہے یہ فنا نہ ہوگا۔ قوم عاد اگرچہ دنیا کو محسوس طور پر جانتی تھی اور کسی حالت کا برقرار نہ رہنا ان کے پیشِ نظر تھا، مگر ان کے عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس دنیا کو لازوال سمجھے ہوئے تھے اور اپنی زندگی کو دوامی زندگی جانتے تھے۔ ابن ابی حاتم نے بروایت عون بن عبداللہ بن عقبہ روایت کی ہے اور امام ابو اسماعیل ازدی نے بھی بسندِ جید بیان کیا ہے کہ جب حضرت ابو درداء غوطہ (قریب دمشق) پہنچے اور دیکھا کہ مسلمانوں نے اونچے اونچے مکان بنائے اور قسم قسم کے درخت لگا کر گلزار بنا رکھے تھے تو مسجد میں تشریف لے گئے۔ اول نماز پڑھائی پھر بلند آواز سے فرمایا اے اہلِ دمشق تم کو شرم نہیں آتی، تم حیا نہیں کرتے، تم وہ چیز جمع کرتے ہو جو نہیں کھاؤ گے وہ مکان بناتے ہو جس میں نہیں رہو گے، وہ امیدیں باندھتے ہو جن کو کبھی نہ پاؤ گے۔ تم سے پہلے بہت گروہ گزر چکے ہیں جو جمع کرتے اور خوب جوڑتے تھے، عمارتیں بناتے اور بہت مضبوط بناتے تھے، امیدیں باندھتے تھے اور بڑی لمبی باندھتے تھے، لیکن نتیجہ کیا ہوا جب رات گزری اور صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ سب آرزوئیں فریب تھیں، جمع کیا ہوا ذخیرہ باعثِ ہلاکت تھا اور بنائے ہوئے مکان قبریں تھیں۔ خبردار!

قوم عاد کے ممالک عدن سے عمان تک تھے، ان کی فوجوں میں سوار اور پیادے بھی تھے، لیکن کیا اب کوئی خریدار ہے جو قوم عاد کی میراث دو کوڑی مال پر مجھ سے خرید لے۔ وَإِذَا بَطَشْتُم بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ۔ قوم عاد کے دلوں میں حبِ دنیا تھی، جاہ پسندی تھی، مال کی ہوس تھی، جائز ناجائز کی تفریق انہوں نے مٹا دی تھی، کوئی قانون عدل نہ تھا، ضابطۂ انصاف نہ تھا، صرف قوت و شوکت معیارِ برتری تھا جس کی لاٹھی اس کی بھینس والی مثال پورے طور پر صادق تھی، غریبوں کے مال و ناموس پر دست درازی زبردستوں کا شیوہ تھی، کمزوروں سے بیگار لینے کا عام دستور تھا، ضعیفوں کو ستانا قابلِ فخر تھا، اپنے مخالفوں کی سخت ترین گرفت قومی شعار تھا۔ حضرت ہود نے اس بیہودہ طرزِ عمل کی حرکت سے روکا اور اللہ کے عذاب سے ڈرایا پھر اللہ کے انعامات و احسانات کی یاد دلائی اور فرمایا:۔

وَٱتَّقُوا ٱلَّذِىٓ أَمَدَّكُم الخ۔ اللہ نے تم کو ہر طرح کی وسعت و فراخی دے رکھی ہے۔ اولاد کی کثرت، مویشیوں کی وسعت، طرح طرح کے باغات اور چشمے سب کچھ تم کو دے رکھا ہے۔ لہٰذا اس سے ڈرو کہیں غیبی گرفت نہ ہو جائے اور سخت عذاب میں نہ پکڑ لئے جاؤ۔ غرض حضرت ہود نے نصیحت کا حق ادا کر دیا، ڈرایا دھمکایا، ترغیب دی، اللہ کی نعمتیں یاد دلائیں سب کچھ کیا، لیکن پتھر پر جونک اثر نہیں کرتی، گنبد پر اخروٹ نہیں ٹھہرتا، بد دماغ غافل جاہلوں کے دماغوں پر حق کی نصیحت کارگر نہیں ہوتی بولے:۔

سَوَآءٌ عَلَيْنَآ الخ۔ تمہارا نصیحت کرنا نہ کرنا ہمارے لئے دونوں برابر ہیں، تمہارا وعظ داستانِ پارینہ ہے۔ گزشتہ لوگوں کا بھی یہی دستور تھا، وہ یونہی کہتے تھے۔ ہم مدت سے یونہی سنتے چلے آئے ہیں، لیکن (نہ کبھی پہلے عذاب آیا) نہ عذاب آئے گا۔

جب قوم عاد کی سرکشی اس حد تک پہنچ گئی اور طغیانِ دماغی کی یہ نوبت آگئی تو انہوں نے نہ آئندہ عذاب کا انکار کیا بلکہ گزشتہ صحیح واقعاتِ عذاب کی تکذیب کی تو:۔

فَأَهْلَكْنَٰهُمْ اللہ نے ایک آندھی کا طوفان ان پر بھیجا۔ موسم سرما کا اختتام تھا۔ شوال کی ۲۲ تاریخ تھی۔ یہ طوفان آٹھ دن اور سات راتیں مسلط رہا، درختوں اور مکانوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالا اور سرکش قوم کو اڑا کر پہاڑوں کے پتھروں پر دے پٹکا جس کی وجہ سے گردنیں ٹوٹ کر سر تن سے جدا ہو گئے اور دھڑ پڑے ہوئے ایسے معلوم ہونے لگے جیسے درختوں کے تنے کٹے پڑے ہیں۔

مقصودِ بیان

قوم عاد بہت سرکش تھی، مضبوط مکان اونچے منارے اس لئے بناتے کہ ہماری یادگار قائم رہے۔ یہ ناجائز نہیں کہ اولاد، مویشی، باغ، سبزہ زار، نہریں اور چشمے وغیرہ اللہ کی نعمتیں ہیں، مگر ان ظاہری نعمتوں پر ریجھنا اور آخرت سے غافل ہو جانا جائز نہیں۔ اگر ان پر بھروسہ کر لیا جائے

رحمتیں زحمتیں بن جاتی ہیں اور اسباب حیات اسباب موت ہو جاتے ہیں مسلمان کو چاہیئے کہ اللہ کی قہاریت سے ہر وقت خوف زدہ رہے اور اس کی نعمتوں کی قدر کرے۔ نعمت کا شکریہ اور عذاب کا خوف لازم ہے یقین رکھنا چاہیئے کہ جس خدا نے یہ بیش بہا نعمتیں عطا فرمائی ہیں وہ ان کو چھین بھی سکتا ہے اور جس نے فارغ البالی کی زندگی دی ہے وہ برباد بھی کر سکتا ہے۔ پیامِ حق سے سرتابی کرنے کا نتیجہ ہلاکت ہے وغیرہ۔

(۷) كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ

ثمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا جب اُن سے اُن کے بھائی صالح نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں میں واقعی تمہارا امانتدار پیغمبر ہوں

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ أَتُتْرَكُونَ

اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو میں تم سے کوئی مزدوری بھی تو نہیں مانگتا میری اُجرت تو پروردگارِ عالم کے ذمّہ ہے کیا تم کو

فِي مَا هَاهُنَا آمِنِينَ ۝ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝ وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ۝ وَتَنْحِتُونَ مِنَ

یہاں کی چیزوں میں امن سے رہنے دیا جائیگا یعنی باغوں چشموں کھیتوں اور اُن کھجوروں کے درختوں میں جن کے خوشے ٹوٹے پڑتے ہیں تم اِتراتے ہوئے

الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۝ الَّذِينَ

پہاڑوں سے گھر تراش کر بناتے ہو اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور حد سے آگے بڑھنے والوں کا کہنا نہ مانو جو ملک میں

يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ۝ مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا

تباہی پھیلاتے ہیں عافیت قائم نہیں کرتے وہ بولے تم تو یقیناً جادو زدہ ہو تم ہماری طرح آدمی ہی ہو

فَأْتِ بِآيَةٍ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ قَالَ هَٰذِهِ نَاقَةٌ لَهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَعْلُومٍ ۝ وَ

لہٰذا اگر سچے ہو تو کوئی نشانی پیش کرو صالح نے کہا یہ اونٹنی ہے پانی پینے کی ایک باری اس کی اور ایک مقرر دن کی باری تمہاری ہے

لَا تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ فَعَقَرُوهَا فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ ۝ فَأَخَذَهُمُ

تم اِس کو کسی طرح کی تکلیف نہ دینا ورنہ ایک بڑے دن کا عذاب تم پر آجائے گا مگر انہوں نے اونٹنی کے پاؤں کاٹ ڈالے اور پھر پشیمان ہوئے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو عذاب

الْعَذَابُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ۝

نے پکڑ لیا اس میں بلاشبہ نشانی ہے ان میں اکثر ایماندار نہ تھے بلاشبہ تمہارا رب غالب اور مہربان ہے

تفسیر: اس ماحول ثمود کی بستی پر چار طرح کے آدمی آباد ہیں جو اصلاح و فساد، آبادی و بربادی اور بناؤ بگاڑ کے اعتبار سے مختلف احوال رکھتے ہیں (۱) کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو اللہ کو واحد لاشریک جانتے ہیں اور اس کی عبادت و معرفت میں سرگرم رہتے ہیں۔ آپس میں مل جل کر رہتے، میل و محبت سے زندگی بسر کرتے اور قانون انصاف سمجھتے ہیں، کوئی کسی کا حق نہیں مارتا، کوئی کسی پر زیادتی نہیں کرتا، مختلف پیشے کرتے ہیں، آپس میں کوشش کے ساتھ اپنی روزی کماتے ہیں، سچائی اور دیانت کے ساتھ

باہمی معاملات کرتے ہیں۔ اتحادی اور اجتماعی قوت سے ضروریات عامہ کو فراہم کرتے ہیں، کسی کی جان اور مال و ناموس کو لوٹنے کے خیال سے بھی دور رہتے ہیں۔ ایسے لوگ واقعی کامل اہلِ اصلاح ہیں۔ دنیا میں ان کی حکومت اور سلطنت پائیدار ہوتی ہے، جب تک ان کی حالت نہ بگڑے کوئی ان کی سلطنت چھین نہیں سکتا، کھیتیاں اور باغات انہی کے دم سے سرسبز ہوتے ہیں، مدنیت میں اضافہ انہیں کے وسیلے سے ہوتا ہے، دنیا کی رونق اور آبادی انہیں کی برکتوں سے بڑھتی ہے۔ یہ گروہ اس حکمت کدۂ ہستی کے لئے نور پاش سورج اور ضیا بیز چاند ہے، یہ بارانِ رحمت ہے، ریاحِ راحت ہے، ریحانِ عافیت ہے، دنیا بھی ان کی اور آخرت بھی ان کی، یہ فلاحِ کونین کے حامل اور مرضئ مولا کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ (۲) کچھ لوگ مذکورہ گروہ کے بالکل خلاف ہوتے ہیں، اللہ کے پرستار ہونے کی بجائے نفس کے پرستار ہوتے ہیں، عبادتِ الٰہی کی جگہ ہوا و ہوس کی بندگی کرتے ہیں، توحید سے ان کو دشمنی اور عبادت سے ان کو نفرت ہوتی ہے، قوت و ثروت کا نشہ ہر وقت ان کی آنکھوں میں رہتا ہے، کمزوروں کو ستاتے، ضعیفوں کو روندتے، غریبوں کو لوٹتے، بیواؤں، یتیموں اور بے کسوں کو برباد کرتے ہیں، کسی کمزور کا مال، جان اور ناموس ان سے محفوظ نہیں، ظلم و جور ان کا شعار، آبرو ریزی، سفاکی، غارت گری، جعل سازی، مکاری، دغابازی اور فریب دہی ان کا شیوہ، انصاف و عدل کا تذکرہ ان کے لئے مضحکہ انگیز حکایات اور رحمت و رحم کی ترغیب ان کے لئے داستانِ پارینہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے ہاتھوں سے اس زمین کی کھیتیاں برباد، باغ تباہ، آبادیاں اجاڑ اور تالاب خشک ہوتے ہیں، ہر طرف بے چینی اور بربادی کا ظہور ہوتا ہے۔ ایسی قوم کی حکومت اس زمین پر قائم نہیں رہ سکتی، سلطنت کو بہت جلد زوال ہو جاتا ہے، غیبی اسباب انقلاب پیدا کر دیتے ہیں اس کو حکومت کی جگہ غلامی، عزت کی جگہ ذلت اور دولت و ثروت کی جگہ افلاس و ناداری سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے۔ دنیا میں بھی اس کو تباہی نصیب ہوتی ہے اور آخرت میں رو سیاہی اور خسران مآلی حاصل ہوگی (۳) کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کو واحد لاشریک جانتے ہیں، رات بھر سجدہ ریزیاں بھی کرتے ہیں، صائم الدہر اور قائم اللیل نظر آتے ہیں، مگر بندگانِ الٰہی کے حقوق کو پامال کرتے ہیں۔ فتنہ انگیز، فتنہ پرداز اور فتنہ بپا ہوتے ہیں۔ لوگوں کی جان و مال اور آبرو ان کے دست تطاول سے غیر محفوظ ہوتی ہیں، کھیتیاں اجاڑتے، باغوں کو برباد کرتے، آبادیوں کو ویران کرنے کی کوششیں کرتے اور دنیا میں طرح طرح کی تباہ کاریاں پھیلاتے ہیں، جائز روزی، ترقی، عزت اور ظلم کے حصول سے ان کو نفرت ہوتی ہے، حلال پیشہ سے ان کو عار آتی ہے۔ آرام طلب، کاہل، سست اور عیش پسند ہونے پر ان کو ناز، غرور اور فخر ہوتا ہے۔ ایسی قوم کی حکومت دنیا میں باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ گروہ اگرچہ توحید کا قائل اور عبادت گزار ہوتا ہے، مگر توحید کا حقیقی مفہوم اور عبادت کا اصلی منشاء یہ قوم نہیں سمجھتی اس لئے اس کی توحید اگرچہ مفقود نہیں ہوتی، مگر ناقص ضرور ہوتی ہے اسی بنا پر اس کو دنیا میں عروج و ترقی، کامرانی و عزت نصیب نہیں ہوتی اور آخرت میں بھی ماخوذ ہونا پڑے گا، لیکن چونکہ توحید کا جذبہ اس کے دل میں ہوتا ہے اور ناقص وحدانیت کا اس کو اقرار بھی ہوتا ہے، اس لئے دوامی عذاب سے محفوظ رہے گا، کبھی نہ کبھی نجات ضرور ہو جائے گی۔ (۴) کچھ لوگ تیسرے نمبر کے بالکل برعکس ہوتے ہیں توحید اور قیامت وغیرہ پر ان کا ایمان نہیں ہوتا، مگر عمرانی بہتری میں اضافہ اور دنیا کی سرسبزی ان کے پیش نظر ہوتی ہے۔ حق تلفی، تباہ کاری، خونریزی ظلم اور نفاق و شقاق سے پرہیز کرتے ہیں، انصاف و عدل پر تمام معاملات میں عمل پیرا رہتے ہیں، اصل توحید کی تمام شاخیں موجود ہوتی ہیں۔ ان لوگوں کی حکومت دنیا میں دیر پا رہتی ہے، ثروت و راحت، عزت و جاہ سب کچھ ان کو میسر ہوتا ہے، روزانہ ترقی، ہر دم عروج اور ہر آن اقبال بڑھتا جاتا ہے۔ کیونکہ اہلِ حکومت کے سایہ میں اہلِ عالم کو چین حاصل ہوتا ہے، مگر آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔

مؤخر الذکر تینوں گروہ مفسدین کے ہیں اور اول الذکر گروہ اہلِ صلاح کا ہے۔ کسی قوم کی بد دماغی اور بے وقوفی جب حد سے گزر جاتی ہے تو نمبر اول کی مفسد بن جاتی ہے۔ قوم ثمود بھی نمبر اول کی مفسد تھی نہ تو اللہ، اس کے رسول اور قیامت پر اس کو یقین تھا نہ فسق و فجور اور ظلم و جور کو وہ برا سمجھتی تھی۔ حضرت صالح نے ہر چند نصیحت کی، مگر قوم نے ایک نہ مانی اور بالآخر صفحۂ ہستی سے اس کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔

تحلیلِ اجزاء

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الخ۔ جس طرح قوم عاد عرب کے جنوبی حصہ میں رہتی تھی اسی طرح قوم ثمود کا مسکن شمالی عربستان تھا۔ وادی القراء اور شام کے درمیان مقام حِجر میں یہ لوگ رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ تبوک کے لئے مسلمانوں کی ستر ہزار فوج لے کر تشریف لے گئے تو آپ کا گزر مقام حجر کی طرف سے بھی ہوا۔ حضور لشکر کے پیچھے تھے اور اگلا دستہ کنویں پر جا کر ٹھہرا جس سے کفار ثمود پانی پیا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے اس کنویں سے ہانڈیاں بھی چڑھائیں اور کچھ لوگ تباہ شدہ قوم کے کھنڈروں کی سیر کو بھی گئے۔ حضور کو اطلاع ہوئی تو حکم دے دیا کہ ہانڈیاں اُلٹ دو، گوندھا ہوا آٹا جانوروں کو کھلا دو اور یہاں اقامت نہ کرو۔ صحابہ نے حکم کی تعمیل کی۔ پھر آگے بڑھ کر حضور نے اس مقام پر قیام کیا جہاں حضرت صالح اور مومنوں کی جماعت رہتی تھی۔

أَتُتْرَكُونَ الخ۔ یعنی کیا تمہاری یہ کھیتیاں، مرغزار، باغ، چشمے اور نخلستان یونہی ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیئے جائیں گے، ان کو فنا نہ ہوگی اور تم یونہی ہمیشہ مزے اڑاتے رہو گے، موت سے بے خوف ہو کر اسی راحت و چین میں رہو گے۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا تم کو موت ضرور آئے گی۔

طَلْعُهَا هَضِيمٌ ۔ ہضیم کے معنی میں بھی اختلاف ہے۔ ابن عباس کے قول پر ہضیم گچھے کو کہتے ہیں۔ ابو صالح نے گدر نرم ترجمہ کیا ہے۔ مجاہد کہتے ہیں جو گچھا پختہ رسیلا اور عمدہ ہو ہضیم ہے۔

وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ ۔ قوم ثمود بہت طویل القامت تھی۔ اس میں بڑے ڈیل ڈول کے آدمی تھے، اس لئے پہاڑوں کے اندر پتھر تراش کر مکان بنا کر رہتے تھے۔ انسان آغاز تمدن میں ایسے اونچے اونچے مکان بنانے سے واقف بھی نہ تھا اور قوم ثمود کا زمانہ حضرت ابراہیم سے بھی بہت پہلے تھا، اس لئے وہ لوگ کچھ زیادہ تمدن بھی نہ رکھتے تھے۔ اسی بنا پر پہاڑوں کے اندر غار بنا کر رہتے تھے، لیکن شیخ عماد نے ذکر کیا ہے کہ فَارِهِينَ کے معنی ہیں حاذقین یعنی کاریگر، استاد اور ماہر فن۔ چونکہ ثمود کو پہاڑ کاٹنے اور پتھروں پر نقش و نگار بنانے میں کمال حاصل تھا، اس لئے وہ پہاڑوں کے اندر بڑے بڑے پتھر نہایت خوبی کے ساتھ تراش کر عمدہ عمدہ مکان بناتے اور اپنی صنعت پر اتراتے تھے۔

وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۔ قوم ثمود توحید کی بھی منکر تھی، قیامت کو بھی نہ مانتی تھی، حساب کتاب کو بھی نہ مانتی تھی، عدل و انصاف بھی اس کی نظر میں کوئی حقیقت نہ رکھتا تھا، خونریزی اور غارت گری کا بازار گرم تھا، غریبوں کے مال و ناموس پر دست درازی کرنے کا عام دستور تھا۔ اپنی طاقت، ثروت اور حکومت پر بالا دستوں کو ناز تھا اور زیر دستوں پر رحم کرنا کمزوری کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ گویا وہ لوگ نمبر اول کے فساد انگیز اور فتنہ پرور تھے، اس لئے حضرت صالح نے ان کو نصیحت کی کہ شرک و بت پرستی کو چھوڑو، غریبوں پر دست درازی نہ کرو، ظلم و جور سے کنارہ کش ہو جاؤ اور ان شیطانوں کا کہنا نہ مانو جو دنیا میں تباہی پھیلانے والے ہیں۔

قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ۔ ابن عباسؓ کے ایک قول سے معلوم ہوتا ہے کہ مسحر کے معنی ہیں مخلوق یعنی قوم نے جواب دیا کہ صالح تجھے ہم کو نصیحت کرنے کا کیا حق ہے۔ تو ہمارا خالق نہیں معمولی مخلوق کا درجہ رکھتا ہے۔ عام مفسرین نے مسحر کا ترجمہ سحر زدہ کیا ہے۔ شیخ عماد نے اسی ترجمہ کو اظہر قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قوم صالح نے صالح کو سحر زدہ قرار دیا یعنی جس طرح سحر زدہ مختل الحواس اور بے عقل ہوتا ہے، بد حواسی کی باتیں کرتا ہے اسی طرح حضرت صالح کو انہوں نے سادہ لوح اور بے عقل قرار دیا اور کہا تیری تو مت ماری گئی ہے۔ جادو زدہ کی طرح تو بے عقل ہے جو ایسی باتیں کرتا ہے اور پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا ۔ تجھے ہم پر کیا برتری حاصل ہے۔ آدمیت میں بالکل ہماری طرح ہے۔ کور دماغ اور اندھی بصیرت والوں کی نظر میں آدمی نام گوشت پوست کے لوتھڑے کا ہے۔ فضائل عملیہ اور کمالات علمیہ ان کے نزدیک اسباب فوقیت نہیں ہوتے۔ ظاہر بین آنکھیں اندرونی روحانیت اور فیضان قدسی کو نہیں دیکھ سکتیں۔ عالم غیب سے تعلق رکھنے والے جب اپنے خاص کنکشن کی بنا پر کچھ علوم صحیحہ حاصل کرنے کے بعد جاہل لوگوں کو نصیحت کرتے ہیں تو وہ اپنی نابینائی کی وجہ سے ان کے مرتبہ کو نہیں دیکھ سکتے اور حقیقت آفریں نصیحت کو دماغی وسواس کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس کثیف انسان کا عالم بالا سے تعلق ہو نہیں سکتا، ہماری طرح یہ بھی معمولی آدمی ہے (اگر پیغامبر ہو کر کسی کو آنا ہی تھا تو کوئی فرشتہ آیا ہوتا)

فَأْتِ بِآيَةٍ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ۔ قوم نے کہا صالح تم جب تک کوئی نمایاں محسوس عظیم الشان ثبوت اپنی نبوت کا پیش نہ کرو گے ہم نہیں مانیں گے۔ مروی ہے کہ کسی تہوار کے موقع پر سب لوگ شہر کے باہر ایک میدان میں جمع ہوئے۔ حضرت صالح نے بطور اتمام حجت ان کو پھر نصیحت کی، مگر کسی نمایاں معجزے کے ظہور کے سب نے ماننے سے انکار کر دیا۔ حضرت صالح نے فرمایا اچھا کیا چاہتے ہو؟ قوم نے مطالبہ کیا کہ اس پہاڑ سے ایک اونٹنی ہماری آنکھوں کے سامنے برآمد ہو جائے۔ پیغمبر نے فرمایا پھر تو نے کو تو ایسا ہو جائے گا، لیکن اس کے بعد اگر کسی نے انکار کیا اور کفر پر قائم رہا تو ہلاک کر دیا جائے گا۔ دونوں طرف سے قول قرار ہو گیا۔ حضرت صالح نے دعا کی۔ پہاڑ میں ایک جنبش پیدا ہوئی اور پہاڑ تھرایا پھر پھٹ کر اندر سے ایک اونٹنی برآمد ہوئی جو معمولی اونٹنیوں سے بہت ہی زیادہ لمبی چوڑی تھی۔ دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوئی۔ تقریباً چار ہزار آدمی ایمان لے آئے باقی کافر رہے۔ حضرت صالح نے فرمایا: هَٰذِهِ نَاقَةُ اللَّهِ یہ اللہ کی بھیجی ہوئی اونٹنی ہے جو ضابطۂ مقررہ کے خلاف پہاڑ سے پیدا ہوئی ہے کوئی اس کو نہ ستائے ورنہ آفت میں مبتلا ہو جائے گا۔ اس کے بعد اونٹنی قائم رہی۔ گرمی کے زمانے میں وادی کے نشیب میں چرتی تھی اور قوم کے جانور اوپر چلے جاتے تھے اور سردی کی فصل میں وہ اوپر چڑھ جاتی تھی اور تمام جانور نیچے آ جاتے تھے۔ اس سے کافروں کو بہت غصہ آیا اور ان کے جانور بھوکے رہنے لگے۔ اس پر مزید مصیبت یہ پڑی کہ تمام جانوروں کے پانی پینے کا تالاب ایک ہی تھا۔ اونٹنی اس تالاب پر آتی تو تمام مویشی بھاگ جاتے اور سب پانی اونٹنی پی جاتی، مگر اس کے عوض اس کا دودھ اتنا ہوتا تھا کہ جو جس قدر چاہتا دوہ کر لے جاتا مگر دودھ کسی طرح کم نہ ہوتا تھا۔ لوگوں کو اس سے بہت تکلیف ہونے لگی اور حضرت صالح سے اس کی شکایت کی۔ آپ نے فیصلہ کیا:۔

لَهَا شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَعْلُومٍ ۔ کہ باری مقرر کر لو۔ ایک دن پانی اونٹنی پئے گی اور ایک دن تمہاری باری ہو گی۔ لوگوں نے مان لیا اور

باری مقرر ہوگئی۔ حضرت نے فرمایا اب اس کو کچھ دکھ نہ پہنچانا ورنہ سخت عذاب میں پکڑے جاؤ گے۔ مدت تک یہی دستور رہا۔ مدت کے بعد اتفاق ایسا ہوا کہ ایک حسین بدکار نہایت مال دار عورت تھی، اس کے مویشی سب سے زیادہ تھے اس کو اس تقسیم سے ناگواری ہوئی تھی۔ اس نے ایک بدکار آدمی کو جس کا نام قدار تھا اونٹنی کے قتل پر آمادہ کیا۔ قدار نے سرداروں سے مشورہ کیا۔ سب نے رائے پاس کر دی۔ بغرض قدار اپنے ساتھیوں کو لے کر تاک میں رہا اور ایک روز موقع پا کر:۔

فَعَقَرُوهَا۔ اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں، اونٹنی گر پڑی، سب نے اس کا گوشت تقسیم کرلیا۔ اونٹنی کو قتل کرنے والے اگرچہ چند آدمی تھے، مگر مشورہ چونکہ سب کے لئے تھا، اس لئے آیت مذکورہ میں قتل کی نسبت سب کی طرف کی گئی۔ حضرت صالح کو خبر پہنچی۔ آپ تشریف لائے اور خوب روئے۔ ظالم قوم نے آپ کا مسخرہ اڑایا۔ پیغمبر برحق نے فرمایا مسخرہ کیا اڑاتے ہو اب تمہارا وقت آپہنچا۔ صرف تین روز کی مدت ہے چوتھے روز عذاب آئے گا۔ چنانچہ پہلے دن لوگوں کے چہرے سرخ، دوسرے دن زرد اور تیسرے دن سیاہ ہوگئے۔ تیسرے ہی دن ان کو ہلاکت کا یقین ہوگیا تھا مرنے پر تیار ہوگئے تھے۔

فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ۔ جب چوتھے روز صبح ہوئی تو چہروں کا رنگ اصلی حالت پر آنے لگا اس سے ان کو خیال ہوا کہ یہ کوئی بیماری تھی جو تین روز رہ کر جاتی رہی۔ یہ خیال کرنا تھا کہ عذاب الٰہی آگیا۔

فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ۔ زمین میں جنبش پیدا ہوئی زور کا زلزلہ آیا۔ بدکیش گھٹنوں کے بل گر پڑے، زمین میں گڑگڑ پیدا ہوئی اور اوپر سے ایک سخت کرخت چیخ سنائی دی جس سے جگر پھٹ گئے اور سب بے دین مر گئے۔

تنبیہ بڑے بڑے روشن خیالی کا دعویٰ کرنے والے دماغ زدہ لوگ کہتے ہیں کہ انبیاء کے معجزات کی کوئی حقیقت نہیں، معمولی واقعات کو قرآن نے بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ زلزلہ، طوفان، باد و باراں اور پہاڑوں کی آتش فشانی گردش لیل و نہار کے کرشمے ہیں۔ عذاب غیبی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ صالحؑ کی فرضی داستان ہے۔ بھلا معجزہ سے اثبات نبوت کا اعلان توحید سے اظہار صداقت اور اونٹنی کا کیا تعلق ہے۔ اسی طرح دوسرے معجزات یا تو بالکل فرضی ہیں یا انقلاب کائنات کے معمولی واقعات ہیں۔

ہمارا موضوع بحث اس جگہ چونکہ صرف ناقۂ صالح ہے، اس لئے ہم اس کی کسی قدر تفصیل کرنی چاہتے ہیں۔ عام معجزات کی تحقیق متعدد مقامات پر اسی کتاب میں کی جاچکی ہے، مزید تکرار بے فائدہ ہے۔ یاد رکھو کہ معجزہ نام ہے صرف اس امر کا کہ غیبی قدرت محسوس کا جامہ پہن کر غیر معمولی طور پر سامنے آجائے اور کسی مدعی نبوت کے دست حق پرست پر اس کا ظہور ہو۔ اس زمانے کے لوگ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ ہمیشہ معجزات کی نوعیت زمانہ کے ماحول کے مناسب ہوا کرتی ہے، جس قوم اور جس زمین میں جو رجحان ہوتا ہے اس کے موافق غیبی قدرت معجزانہ شکل اختیار کرتی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں سحر کا عام چرچا تھا، اس لئے جو معجزات آپ کو دیئے گئے وہ ایسے تھے جن کو دیکھ کر کوتاہ نظر رکھنے والے سحر کا دھوکہ کھاتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں طب کا زور تھا، اس لئے لا علاج بیماروں کو اچھا کرنا اور مُردوں کو زندہ کرنا آپ کا معجزہ قرار پایا۔ حضرت صالح کی قوم بہترین سنگ تراش اور پتھروں پر عمدہ نقش و نگار کرنے والی تھی، اس کو اپنی مہارت فن پر ناز تھا۔ پتھروں کی خوبصورت مورتیاں ڈھالنا اور طرح طرح کی حسین شکلیں بنانا ان کا شیوہ تھا، اس لئے مناسب تھا کہ پتھروں کی شکل بدل کر ہی کوئی عجیب الخلقت مورت نظروں کے سامنے لائی جائے تاکہ لوگوں کو حقیقت اعجاز میں کوئی شبہ نہ رہے۔ مورت کا کمال یہ ہے کہ خوبصورت ہو، عجیب ہو، بغیر کسی تکلیف کے حیرت انگیز طریقہ پر بنائی گئی ہو اور سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس میں جان پڑ جائے اور ساکت و صامت ہونے کے متحرک اور زندہ جیتی جاگتی ہو۔ حضرت صالحؑ نے ملاحظہ کیا کہ یہ لوگ پہاڑوں اور پتھروں سے زیادہ مانوس ہیں۔ تصرفات حجری پر ان کو ناز ہے، اس لئے آپ نے دعا کی کہ پہاڑ کے اندر سے بغیر کسی دستی تصرف اور انسانی کاریگری کے ایک عجیب الخلقت حیرت آفریں مورت ظاہر فرما دی جائے جو علاوہ غیر معمولی کلانی اور محیر العقول جسامت رکھنے کے متحرک، جاندار اور حساس بھی ہو اور چونکہ موجودۃ الوقت جانوروں میں اونٹ سب سے زیادہ عجیب الخلقت جانور تھا اور واقع میں اونٹ کی شکل انتہائی عجیب ہے۔ دُم چھوٹی، چھوٹے کان، لمبی گردن، لمبی ٹانگیں، پشت پر کوہان، چال میں تعب انگیز لے کیف رعنائی اور آواز میں سامعہ گداز دلکشی ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے حضرت صالح کی دعا قبول کی اور ان پتھروں سے جن کو تراشنے اور منقش کرنے پر ثمود کو فخر تھا ایک اونٹ نما شکل ظاہر فرما دی۔ مورتیاں کھلونے بھی بناتے تھے مگر اتنی طویل عریض عجیب اور محیر العقول مورت کسی نے نہ بنائی تھی اور کسی میں یہ قدرت نہ تھی کہ بنائی ہوئی مورتوں میں جان ڈال دے یا حساس و متحرک بنا دے۔ حضرت صالح کی دعا سے پیدا شدہ اونٹنی حیرت آفریں جسامت رکھنے کے علاوہ زندہ تھی، حساس متحرک تھی۔ کھاتی تھی پیتی تھی، چلتی پھرتی تھی۔ بغیر کسی انسانی تصرف کے پیدا ہوئی تھی۔ درحقیقت وہ اونٹنی نہ تھی بلکہ غیبی قدرت نے ایک محسوس شکل اختیار کرلی تھی پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ قوم ثمود کو اپنے مویشیوں کی کثرت پر ناز تھا، یہی ان کا سرمایہ تنعم تھا،

حیوان کا سامان دولت تھا، لیکن صالح کی اونٹنی تمام جانوروں سے زیادہ جسیم و سیم اور طویل القامت تھی۔ اس سے بھی غیبی طاقت کا اظہار ہوتا تھا کہ تمام قوم کفار کا سرمایہ تفاخر ایک طرف اور ناقہ صالح ایک طرف۔ بات یہ ہے کہ انسان کی تخلیق مادہ اور صورت سے ہوئی ہے، ہر شخص کا نفس مدبرہ اپنے بدن میں جس طرح چاہتا ہے تصرف کرتا ہے، فربہ اور لاغر ہونا، بدشکل اور خوش شکل بننا، گورا، کالا، طاقت ور، کمزور، متناسب الاعضاء یا بے جوڑ ہونا نفس کے تصرفات ہی کا ممنون کرم ہے۔ یہ حالت تو عام انسانوں کی ہے، لیکن جن کا نفس بالملکہ زیادہ قوی ہوتا ہے، جن کو قوت قدسیہ حاصل ہوتی ہے، جن کا عالم بالا سے براہ راست تعلق ہوتا ہے ان کے نفسوں میں یہ طاقت بھی ہوتی ہے کہ جس طرح اپنے بدنی مادہ میں تصرف کرتے ہیں اسی طرح دوسری کائنات میں بھی تصرف کر سکتے ہیں۔ جمادات، نباتات، حیوانات یہاں تک کہ فضائی کائنات اور آسمانی مخلوقات میں بھی ان کا تصرف جاری ہوتا ہے۔ انبیاء اور اولیاء کے نفوس نہایت طاقتور اور روشن ہوتے ہیں۔ جب درجہ سب کو تمام مادی دنیا میں تصرف کرنے کی کلی و جزئی قوت ہوتی ہے۔ حضرت صالح بھی نبی تھے۔ اگر انہوں نے مادۂ حجری میں تصرف کر کے پتھروں سے اونٹ کی شکل نمودار کر دی تو کیا استحالہ لازم آتا ہے۔ معجزہ سے صرف یہ فائدہ ہوتا ہے کہ صاحب معجزہ کے نفس کی غیر معمولی قوت اور کائنات کے مادہ میں تصرف کرنے کی طاقت کا اظہار ہو جائے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ اس شخص کا عالم غیب سے براہ راست تعلق ہے۔ عالم قدس سے اس کے پاس پیام آتا ہے اور موجودۃ الوقت دنیا کے تمام انسانوں پر اس کو فوقیت حاصل ہے۔ یہ بات ہر معجزہ سے حاصل ہو جاتی ہے، اس لئے ہر معجزہ کو مثبت النبوۃ کہا جاتا ہے۔ البتہ معجزہ کی نوعی خصوصیت ماحول اور رسم و رواج اور عام میلان طبائع کے تابع ہے۔ لوگوں کا جس طرف رجحان خاطر ہوتا ہے اسی میل کا معجزہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

مقصود بیان

قوم ثمود کے پاس بکثرت باغات، کھیتیاں، نخلستان اور چشمے تھے، پتھر تراشی اور نقاشی میں ان کو کمال تھا۔ اسی بنا پر پہاڑوں میں خلا کر کے اور پتھر کاٹ کر مکان بناتے تھے، لیکن نمبر اول کے مفسد تھے، سرداروں نے عوام کو بھی گمراہ کر دیا تھا، ظاہر بین آنکھیں مادیت سے اوپر کچھ نہیں دیکھ سکتیں اس لئے نبی کی ہستی ان کو معمولی نظر آتی ہے۔ حضرت صالح کو اونٹنی کا معجزہ دیا گیا تھا، قوم والوں نے اونٹنی کو قتل کر دیا تھا، مگر آثار عذاب دیکھ کر پریشان بھی ہوئے تھے، لیکن پشیمانی بے سود ثابت ہوئی سب ہلاک کر دئے گئے۔ اس قصہ سے ثابت ہوتا ہے کہ عوام کو گمراہ کرنے والے سردار ہوتے ہیں۔ بدکار سرداروں کی اطاعت پوری قوم کو تباہ کر دیتی ہے۔ کسی کام کا مشورہ دینے والے اور اتفاق رائے ظاہر کرنے والے بھی اس کام کے مرتکب قرار دئے جاتے ہیں۔ اگرچہ فی الحقیقت کام کرنے والے چند ہوں جس طرح ناقہ صالح کو قتل کرنے والے چند تھے، مگر سب کی طرف قتل کی نسبت کی گئی۔ نشان قدرت کو مٹانے کی کوشش کرنی موجب ہلاکت ہے۔ ناقہ صالح کے قتل کی کوشش کرنے والے خود ہلاک

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝

لوط کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ ان سے ان کے بھائی لوط نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں میں بلا شبہ تمہارا امانتدار پیغمبر ہوں

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ أَتَأْتُونَ

تم خدا سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور میں تم سے اس کی کوئی اجرت بھی تو نہیں مانگتا میری اجرت تو بس رب العالمین کے ذمہ ہے کیا تم

الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ ۝ وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عَادُونَ ۝

دنیا جہان میں مردوں سے فعل کرتے ہو اور اپنی ان بیبیوں کو چھوڑتے ہو جو تمہارے رب نے تمہارے لئے پیدا کی ہیں بات یہ ہے کہ تم لوگ حد سے بڑھنے والے ہو

قَالُوا لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَا لُوطُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِينَ ۝ قَالَ إِنِّي لِعَمَلِكُمْ مِنَ الْقَالِينَ ۝ رَبِّ

وہ لوگ کہنے لگے لوط! اگر تم باز نہ آؤ گے تو ضرور نکال باہر کئے جاؤ گے لوط نے کہا میں تو بہرحال تمہارے عمل سے بیزار ہوں پروردگار!

نَجِّنِي وَأَهْلِي مِمَّا يَعْمَلُونَ ۝ فَنَجَّيْنَاهُ وَأَهْلَهُ أَجْمَعِينَ ۝ إِلَّا عَجُوزًا فِي الْغَابِرِينَ ۝ ثُمَّ دَمَّرْنَا

مجھے اور میرے گھر والوں کو ان کے کاموں [illegible] تو ہم نے ان کو اور ان کے سب گھر والوں کو بچا لیا ہاں البتہ ایک بڑھیا پیچھے رہنے والوں میں رہ گئی اس کے بعد

الْاٰخَرِیْنَ ۝ وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ ۝ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا

دوسروں کو ہم نے ہلاک کر دیا اور ہم نے اُن پر برساؤ برسایا تو کیا بُرا برساؤ تھا اُن لوگوں کا جو ڈرائے گئے اس واقعہ میں بلاشبہ بڑی نشانی ہے اُن میں سے

كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝ ع

اکثر ایماندار نہ تھے تمہارا رب بے شک زبردست اور مہربان ہے

ع ۹ / ۱۶ / ۱۳

تفسیر انسان کی عقل پر جب مادی قوتوں کا عام تسلط ہو جاتا ہے اور روحانی طاقت نفسانی طاقتوں سے مغلوب ہو جاتی ہے تو علاوہ علم و ادراک سے غافل ہونے اور حقائق کائنات سے توجہ کو ہٹا لینے کے بعد اس کی مادی قوتیں بھی صحیح کام نہیں کرتیں۔ اچھے برے، مفید مضر اور غلط صحیح کا فرق اس کو معلوم نہیں ہوتا۔ نفس کا گھوڑا بے لگام یا بدلگام ہو جاتا ہے اور کھائی خندق کی تمیز نہیں رہتی اور انسان نفسانی قوتوں کو ٹھیک استعمال کرنا بھی بھول جاتا ہے۔ قوت غضب کبھی اتنے جوش پر ہو جاتی ہے کہ ادنی محرک سے انسان دوسرے کی جان و مال یہاں تک کہ خاندان اور کنبے کے استیصال کے درپے ہو جاتا ہے۔ کبھی اتنی افسردہ اور پژمردہ ہو جاتی ہے کہ حمیت اور غیرت کے معاملے میں بھی اس کو غصہ نہیں آتا۔ اپنے نام و ناموس کو لٹتا دیکھتا ہے اور سکون سے بیٹھا رہتا ہے۔ اسی طرح شہوت کی قوت کبھی ناجائز استحقاق اور عدم استحقاق کا فرق اٹھا دیتی ہے اور یہاں تک ترقی کرتی ہے کہ محل اور بے محل کو نہیں سمجھتی اور صنفی تعلقات عورتوں کی بجائے مردوں سے قائم کر لیتی ہے اور اس طرح مداخلت بیجا کی مجرم ہوتی ہے۔ کبھی یہ قوت اتنی مُردہ ہو جاتی ہے کہ مردانگی اور رجولیت کو چھوڑ کر نسوانی لباس پہن لیتی ہے اور اچھا خاصہ مرد زنانہ بن جاتا ہے۔ حضرت لوطؑ کی قوم بھی مغلوب العقل اور ضعیف البصیرت ہونے میں انتہا کو پہنچ گئی تھی، اس کی صحیح ادراکی طاقت مفقود ہو گئی تھی، اس لئے توحید اور معاد وغیرہ کی منکر تھی۔ نفسانی قوتوں کا اتنا تسلط بڑھ گیا تھا کہ مختل الحواس ہو گئی تھی۔ قوتِ غضبی کا جوش اتنا کارفرما تھا کہ ذرا سی مخالفت پر کسی کو لوٹنا اور قتل کر دینا معمولی کام تھا، رہزنی اور غارت گری عام پیشہ تھا۔ پھر شہوانی گھوڑا اتنا مطلق العنان تھا کہ عورتوں کی بجائے صنفی تعلقات لڑکوں سے قائم کر لیتے تھے اور قوت کا بے محل استعمال کرتے تھے۔ حضرت لوطؑ نے ان کو افعال شنیعہ سے باز رہنے کی ہدایت کی نہ مانے تو عذاب آیا۔ بستی کی بستی اُلٹ دی گئی۔ جو کوئی بچا تھا اُس کو سنگباری کر کے ہلاک کر دیا گیا۔

تحلیلِ اجزاء كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلِیْنَ ۔ لوط بن ہاروں حضرت ابراہیمؑ کے حقیقی بھتیجے (یا بھانجے) تھے۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے بابل کی سکونت ترک کی تو لوطؑ بھی ہمرکاب ہوئے۔ خدا تعالیٰ نے ان کو ذیلی پیغمبر بنا دیا اور حضرت ابراہیمؑ نے بحیرۂ مردار والی آبادیوں کو ہدایت کرنے کے لئے آپ کو بھیجا۔ شام کے جنوبی مشرقی طرف بحر مردار (جھیل) واقع ہے۔ اس کے پاس پانچ شہر تھے۔ سدوم اور عمورہ وغیرہ ممتاز بستیاں تھیں۔ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ قوم لوطؑ کی بستیاں بلاد غور کے نام سے مشہور رہیں جو فلسطین اور بلاد کرک و شوبک کے درمیان واقع ہیں۔

وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۔ ازواج سے مراد ہیں جائز عورتیں یعنی تم مردوں سے نفسانی تعلقات قائم کرتے ہو اور وہ عورتیں جو فطرۃً صنفی تعلقات کے لئے پیدا کی گئی ہیں اور مردوں کے لئے جوڑے ہیں تم ان کو ترک کرتے ہو یہ شہوت رانی کی انتہائی حد ہے اور دائرۂ فطرت سے باہر قدم رکھنا سرکشی ہے۔

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ۔ یعنی فقط اغلام ہی تمہاری اس حرکت کا مظاہرہ نہیں کر رہا ہے جو خلافِ وضع فطرت ہے بلکہ تمہارے اندر اور بھی عیوب ہیں جو قانونِ فطرت سے تجاوز کرنے پر دلالت کر رہے ہیں۔ واقعی حد اعتدال سے آگے بڑھنا تمہارا شیوہ ہے اور تم ضابطۂ نیچر سے سرکشی کرنے والی قوم ہی ہو۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ یٰلُوْطُ الخ ۔ قوم لوطؑ کی بصیرت اندھی تھی، عقل پر مادیت کا غلبہ تھا، مشفق معصوم کی نصیحت کو ماننا تو درکنار کہنے لگے لوطؑ اگر تم اس وعظ و نصیحت سے باز نہ آئے اور یونہی روکتے ٹوکتے رہے تو ہم اپنی بستی سے تم کو نکال دیں گے۔ یہاں تمہیں رہنا نصیب نہ ہو گا۔ حضرت لوطؑ نے فرمایا (جلاوطن کرنے کی کیا دھمکی دیتے ہو)

اِنِّیْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِیْنَ ۔ مجھے تو تمہاری اس بد اطواری سے ویسی ہی نفرت و عداوت ہے، میں تمہارے ساتھ رہنا پسند ہی کب کرتا ہوں۔ قوم بدکیش حضرت کی دشمن بن گئی اور طرح طرح سے ایذائیں دینے لگی۔ مجبور ہو کر حضرت لوطؑ نے دعا کی:۔

رَبِّ نَجِّنِیْ وَاَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ ۔ پروردگار! مجھے اور میرے آدمیوں کو ان کی بدکرداری کے عذاب سے بچا لے۔ اہل سے مراد صرف گھر والے ہی نہیں بلکہ تمام مومن مراد ہیں جو لوگ حضرت لوطؑ پر ایمان لائے تھے وہ سب آپ کے آدمی تھے اور آپ کے اہل کہلانے کے مستحق تھے، لیکن باوجود قریبی تعلق اور رشتۂ قرابت کے جو لوگ

آپ کے فرمان پذیر نہ تھے وہ اہلِ لوط کہلانے کے مستحق نہ تھے۔ بدکار نیک سے کوئی رشتہ نہیں۔ نسبی تعلق محض اعتباری ہے اصل تعلق ہم مسلک ہونے کا ہے پھر چونکہ آگ اور پانی، تاریکی اور نور، رات اور دن ساتھ جمع نہیں ہو سکتے اسی طرح نیکی اور بدی کا ایک جگہ اجتماع بھی ناممکن ہے۔ کافروں نے لوطؑ کو نکالنے کی دھمکی دی تھی۔ ان کی طبیعتیں لوطؑ کے خلاف تھیں۔ حضرت لوطؑ ان سے بیزار تھے ان کے ساتھ رہنا نہ چاہتے تھے اللہ نے آپ کو وحی الہام یا کشف یا برہانِ فطری کے ذریعہ یہ بھی معلوم تھا کہ فطرت کے خلاف حرکت کرنے والے زندہ نہیں رکھے جا سکتے۔ ان کی تباہی یقینی ہے۔ ضرور عذاب نازل ہوگا اور ان کو غارت کرے گا، اس لئے دعا میں اپنی اور اپنے اہلِ تعلق کے بچاؤ کی خواہش کی۔

فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ الخ: مفصل قصہ ہم دوسری جگہ لکھ چکے ہیں، اس لئے تفصیل کی ضرورت نہیں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ غیبی عذاب آیا۔ فرشتوں نے حضرت لوطؑ سے آکر کہہ دیا ہم اس بستی کو اُلٹنے آئے ہیں تم اپنے آدمیوں کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ اور اس بدکار قوم کی بدکاری کا افسوس نہ کرو۔ حضرت لوطؑ مومنوں کی جماعت کو لے کر صبح سویرے نکل گئے۔ صرف بیوی رہ گئی وہ کافروں کی سازش میں شریک تھی اور ایمان دار نہ تھی۔ فرشتوں نے زمین کا تختہ اُلٹ دیا اوپر سے پتھروں اور کنکروں کی بارش ہوئی جس کی وجہ سے وہ آدمی بھی ہلاک ہو گئے جو اس وقت بستی کے باہر تھے۔

ظاہری صورت میں اس طرح سمجھو کہ جس طرح گندک اور کوئلہ کی کان اٹھتی ہے اور زمین تہ و بالا ہو جاتی ہے اور اوپر سے سوختہ، پتھر اور کنکر برستے ہیں، بالکل یہی حالت قوم لوطؑ کی آبادیوں کی ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ زمین کے اندر آتش گیر مادہ ہو اور اس کی سوزش یہ رنگ لائی ہو، مگر مومنوں کا پہلے سے بچ کر نکل جانا اور مخفی قوتوں کی کارفرمائی بغیر اذنِ الٰہی کے نہیں ہوتی۔ قوم کی سرکشی جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو خدا تعالیٰ غیبی اسبابِ ہلاکت کو ظہور پذیر کر دیتا ہے جس سے بدکیش تباہ ہو جاتے ہیں، مگر اہلِ طاعت بچ جاتے ہیں۔

تنبیہ: بحیرۂ مردار کے ساحل پر بسنے والوں سے حضرت لوطؑ کا کوئی نسبی رشتہ نہ تھا، مگر حضرت لوطؑ نے وہاں اپنا وطن بنا لیا تھا۔ وطنی اشتراک کی وجہ سے لوطؑ کو ان کا بھائی فرمایا۔

مقصودِ بیان

خلاف وضع فطرت شہوت رانی ممنوع ہے۔ اس سے تباہی آتی ہے۔ نیکوں کا اجتماع بدوں کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ آدمی کی اہل اور آل وہی ہے جو اس کے مسلک پر ہو۔ خلاف چلنے والا اگرچہ قریب ترین رشتہ دار ہو، مگر اس کو اہل نہیں کہا جا سکتا۔ اہلِ باطن کو بعض آنے والے امور کشف یا وحی کے ذریعہ سے معلوم ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت لوطؑ کو اپنی قوم پر عذاب آنے کی خبر معلوم ہو گئی تھی۔ حضرت لوطؑ کو پہلے سے عذاب آتا ہوا دکھائی دیا تھا۔
کسی قوم کی بربادی ارضی و سماوی آفات سے بغیر اذنِ الٰہی کے نہیں ہوتی اور خدا کے قہر کو ابھارنے والی انسان کی بدکاریاں ہیں وغیرہ۔

(۱۱) كَذَّبَ أَصْحَابُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ ۞ إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۞ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۞

بَن کے رہنے والوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا جبکہ اُن سے شعیب نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں میں تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۞ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۞ أَوْفُوا

اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو میں تم سے اس کی کوئی اُجرت بھی تو نہیں مانگتا میری اُجرت تو رب العالمین کے ذمہ ہے پورا پورا

الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ۞ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ۞ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ

ناپ دیا کرو اور کم دینے والے نہ بنو اور سیدھی ترازو سے تولا کرو لوگوں کو اُن کی چیزیں کم نہ

أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۞ وَاتَّقُوا الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِينَ (ط)

دیا کرو اور ملک میں فساد پھیلاتے نہ پھرو اور اُس خدا سے ڈرو جس نے تم کو پیدا کیا اور اگلی مخلوق کو پیدا کیا ہے

قَالُوٓا اِنَّمَآ اَنۡتَ مِنَ الۡمُسَحَّرِيۡنَ ۙ﴿۱۸۵﴾ وَمَآ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا وَاِنۡ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الۡكٰذِبِيۡنَ ۚ﴿۱۸۶﴾ فَاَسۡقِطۡ

وہ بولے تم تو بس جادو زدہ ہو اور ہماری طرح ایک آدمی ہو ہم تو تم کو جھوٹا ہی خیال کرتے ہیں اگر تم

عَلَيۡنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ؕ﴿۱۸۷﴾ قَالَ رَبِّىۡۤ اَعۡلَمُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۸۸﴾ فَكَذَّبُوۡهُ

سچے ہو تو آسمان کا کوئی ٹکڑا ہم پر گرا دو شعیب نے کہا میرا پروردگار تمہارے عمل کو خوب جانتا ہے مگر انھوں نے

فَاَخَذَهُمۡ عَذَابُ يَوۡمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ﴿۱۸۹﴾ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا

شعیب کو جھٹلایا نتیجہ یہ ہوا کہ سائبان والے دن کے عذاب نے اُن کو پکڑ لیا بلا شبہ وہ ایک بڑے دن کا عذاب تھا اس میں یقیناً بڑی نشانی ہے اُن

كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۹۱﴾

میں سے اکثر ایماندار نہ تھے تمہارا رب بیشک غالب اور مہربان ہے

ع ۱۴

تفسیر ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ فتنہ پروری اور فساد انگیزی کے مختلف مظاہر ہیں۔ توحید سے منہ موڑنا اور شرک سے رشتہ جوڑنا بھی فساد ہے۔ حشر نشر اور عذاب ثواب کا انکار بھی فساد ہے۔ مخلوق خدا کو ستانا، لوٹ مچانا، جعل سازی اور بے ایمانی کرنا بھی فساد ہے غرض عقائد کی غلطی اور ذاتی اعمال کی خرابی یا معاشرتی امور میں بد دیانتی یا تمدنی اور شہری حقوق کی خیانت سب ہی فساد انگیزی کی قسمیں ہیں، امن عالم کو ہر چیز تباہ کرنے والی ہے، دنیا کی رونق و شادابی، عمران و آبادی سب برباد ہوتی ہے۔ اگر قوم عقائد بھی غلط رکھتی ہو، عبادتِ الٰہیہ سے بھی گردن کش ہو اور بندگانِ خدا کے حقوق بھی تلف کرتی ہو تو وہ مفسدِ اعظم ہے۔ حضرت شعیبؑ کی قوم بھی فتنہ پرور تھی۔ عقائد کی خرابی اور ترکِ عبادت کے علاوہ بڑی بے ایمان اور غارت گر تھی، تجارتی لین دین میں بے ایمانی کرتی تھی، تو لنے ناپنے کے وقت دیتی تھی کم اور لیتی تھی زیادہ جس میں جیب تراش اور گانٹھ کٹے بھی بہت تھے، غارتگری اور رہزنی بھی ان کا شیوہ تھا۔ غرض حصول مال کے تمام ناجائز ذرائع پر ان کا قبضہ تھا، ان کے دست برد سے سیدھے سادے کمزور لوگوں کا مال محفوظ نہ تھا۔ حضرت شعیبؑ نے ان کو نصیحت کی، عذابِ الٰہی سے ڈرایا، مگر بے دینوں نے نہ مانا آخر ہلاک ہوئے۔ زلزلہ آیا، آسمان سے مہیب چیخ سنائی دی، کوہ آتش فشاں سے سوختہ دھواں اُٹھ کر ابر کی شکل میں نمودار ہوا اور اس سے آگ کے شعلے برسے اور سب بدکیش تڑپ تڑپ کر جہنم رسید ہو گئے۔

تحلیلِ اجزاء كَذَّبَ اَصۡحٰبُ لۡـَٔيۡكَةِ الۡمُرۡسَلِيۡنَ قوم شعیبؑ پر چونکہ مین قسم کا عذاب نازل ہوا تھا، اس لئے بعض لوگوں کا گمان ہے کہ حضرت شعیبؑ کو یکے بعد دیگرے تین قوموں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا تھا:- (۱) اصحاب مدین (۲) اصحاب ایکہ (۳) اصحاب الرس۔ سدی اور عکرمہ کا قول ایک روایت میں آیا ہے کہ سوا شعیبؑ کے کسی نبی کو دو مرتبہ تبلیغ پر نہیں مامور کیا گیا۔ شعیبؑ کو ایک بار اہلِ مدین کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا جو نافرمانی کی پاداش میں عذاب صیحہ سے ہلاک ہوئے اور دوسری مرتبہ اصحاب الایکہ کی طرف بھیجا گیا جو عذاب الظلہ میں گرفتار ہوئے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ جدا جدا قومیں تھیں، مگر یہ روایت ناقابل اعتبار ہے کیونکہ سلسلہ میں اسحاق بن بشر کاہلی ضعیف راوی ہے۔ ابن عساکر نے بروایت عبداللہ بن عمرو مرفوعاً روایت کی ہے کہ اصحاب مدین اور اصحاب ایکہ دو قومیں تھیں۔ اللہ نے دونوں کی ہدایت کے لئے شعیبؑ کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا شیخ عماد نے لکھا ہے کہ اس کا مرفوع ہونا قابل تامل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے عبداللہ بن عمرو کا قول ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اصحاب مدین اور اصحاب ایکہ دونوں قومیں جداگانہ تھیں، ایک ہی قوم کے لئے دونوں لفظ استعمال کئے گئے ہیں مدین تو ایک سرزمین کا نام تھا اور ایکہ درختوں کے جھنڈ کو جو نرم اور شاداب زمین پر ہو کہتے ہیں۔ اصحاب مدین کے کنوؤں کے پاس نرم اور شاداب زمین تھی وہاں درختوں کے جھنڈ تھے انہی کی طرف قوم کی نسبت کر دی گئی۔ شیخ عماد اور شیخ جلال نے اسی قول کو ترجیح دی۔ نیز اور خطیب نے سراج میں بھی اسی کو پسند کیا ہے۔

یہ خیال بھی غلط ہے کہ یہ قوم درختوں کو پوجتی تھی، اس لئے اصحاب الایکہ کے لقب سے مشہور ہوئی، قوم شعیبؑ درختوں کی پرستار نہ تھی بُت پرست تھی۔

حضرت شعیبؑ کا اس قوم سے کوئی رشتہ نہ تھا صرف ہم وطنی تھی۔ اس جگہ اگرچہ شعیبؑ کو قوم کا بھائی نہیں کہا، لیکن دوسری آیت میں اصحاب مدین کا بھائی کہا ہے

یعنی دلطنی بھائی۔

قوم شعیبؑ چونکہ لین دین میں بے ایمانی کرتی تھی، اس لئے حضرت شعیبؑ نے نصیحت کی کہ:۔

اَوْفُوا الْكَيْلَ الخ بھرپور ناپا کرو، سیدھی ترازو سے تولا کرو اور کسی کو کم نہ دیا کرو۔ خرید فروخت کے دو طریقے تھے۔ کسی پیمانے سے ناپ کیا تولنے سے تول کر۔ حضرت نے دونوں طریقوں میں کم و زن کشی کی ہدایت فرمائی اور چونکہ وہ لٹیرے اور راہزن بھی تھے، اس لئے حضرت شعیبؑ نے فرمایا:۔

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ۔ ملک بھر میں فساد برپا کرتے اور تباہی پھیلاتے نہ پھرا کرو۔ یعنی راہزنی اور غارت گری نہ کیا کرو اور اسی قہار و قادر مطلق خدا سے ڈرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے دوسری قوموں کو پیدا کیا یعنی جس خدا نے تم کو اور گزشتہ قوموں کو پیدا کیا وہ تم کو فنا بھی کر سکتا ہے۔ ایجاد اس کا کام ہے تو معدوم کرنے پر بھی وہ قادر ہے۔

قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ الخ۔ کافروں نے پیامبر حق کا وہی جواب دیا جو پہلے بے دین انبیاء کو دیتے چلے آئے تھے کہ تم جادو زدہ اور بے عقل ہو، تم نبی کس طرح ہو سکتے ہو، ہماری طرح انسان ہو، ہم پر تم کو کیا فوقیت ہے۔ ہمارے خیال میں تم جھوٹے ہو۔ اگر سچائی کا دعویٰ ہے تو:۔

فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا الخ۔ ہمارے اوپر آسمان کا کوئی ٹکڑا لاکر گرا دو۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہمارے اوپر کوئی سل گرا دو۔ حضرت شعیبؑ نے فرمایا:۔

رَبِّي أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ میرا رب تمہارے کرتوت سے خوب واقف ہے۔ یعنی تمہارا کوئی قول و فعل اللہ کے احاطۂ علمی سے خارج نہیں ہے۔ نہ سمجھنا کہ تمہاری یہ بد اعتقادیاں، یہ بد عملیاں اور یہ گستاخیاں خدا کو معلوم نہیں وہ ضرور جانتا ہے (اور مناسب وقت پر سزا بھی دے گا)

فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ۔ غرض عذاب آ گیا۔ سات روز سخت گرمی پڑی، زمین میں زلزلہ آیا، ہیبت ناک چیخ سنائی دی جس سے ہیبت سے دل پھٹ گئے۔ قریب کے آتش فشاں پہاڑ سے آتشیں دھواں اٹھ کر ابر کی شکل میں نمودار ہوا اور اس سے آگ کے شعلے برسے جس سے سب بے دین جل کر خاک سیاہ ہو گئے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے بیان کیا کہ اللہ نے سات روز تک سخت گرمی ان پر مسلط رکھی، پینا ابال کھانے لگے پھر بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا اس کے نیچے سب جمع ہو گئے کچھ خنکی محسوس ہوئی اتنے میں اس سے آگ کے شعلے برسنے لگے۔ عکرمہ، سعید بن جبیر، حسن بصری اور قتادہ وغیرہم سے اسی طرح مروی ہے۔ عبدالرحمٰن بن زید کا قول ہے کہ جب سب لوگ بادل کے نیچے جمع ہو گئے تو آفتاب کی حرارت کو خدا نے ان پر تیز کر دیا کہ سب سوختہ ہو گئے (مطلب یہ کہ ابر سے آگ کے شعلے نہ برسے تھے بلکہ آفتاب کی تمازت بڑھ گئی تھی)

ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قوم شعیب زلزلہ میں مبتلا ہوئی اور ایسی گرمی چھائی کہ دم گھٹنے لگے۔ مجبوراً گھروں سے نکل کر جنگل کو چلے گئے کہ شاید تسکین ہو۔ وہاں ابر کا ایک ٹکڑا آیا سب اس کے نیچے جمع ہو گئے اللہ نے ابر میں سے آگ برسائی اور سب ہلاک ہو گئے۔

قوم شعیب پر تین قسم کا عذاب آیا تھا۔ قرآن پاک میں تین مقامات پر تینوں کا بیان ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ سخت زلزلہ سے ان کو ہلاک کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کافروں نے شعیبؑ سے کہا تھا ہم تم کو اور تمہارے ساتھ والے مومنوں کو اپنے شہر سے نکال دیں گے چونکہ انہوں نے پیغمبر برحق کو جنبش دینی اور ان کے مقام سے ہلانے کی دھمکی دی تھی، اس لئے عذاب زلزلہ میں گرفتار ہوئے۔ سورۂ اعراف میں یہی تفصیل ہے۔ سورۂ ہود میں مذکور ہے کہ بیہودہ قوم نے شعیبؑ سے مسخرہ پن کیا اور گستاخی سے پیش آئی کہنے لگے کیا تمہاری نماز ہم سے یہ چاہتی ہے کہ اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں اور اپنے مال میں اپنی خواہش کے موافق تصرف نہ کر سکیں، ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ اس قول پر عذاب صیحہ میں گرفتار ہوئے اور غیبی سخت چیخ سے جگر پھٹ گئے۔ زمین میں جب زلزلہ آتا ہے تو اندر گڑگڑاہٹ ہوتی ہے اور کسی جگہ سے زمین پھٹ کر زبردست دھماکہ بھی ہوتا ہے یہی عذاب صیحہ تھا۔ پھر اس جگہ سورۂ شعراء میں چونکہ آسمان سے کسی سل یا پتھر برسنے یا آسمان کے کسی ٹکڑے کے گرنے کی خواہش کی تھی، اس عذاب ظلہ کا تذکرہ یہاں مناسب تھا۔ آتشیں دھواں کبھی زمین کے اندر سے زلزلہ کے موقعہ پر نکلتا ہے اور اوپر جا کر ابر کی طرح چھا جاتا ہے پھر اس سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔ (علمائے طبعیات ان تمام امور سے واقف ہیں) یہی عذاب الظلہ تھا اور چونکہ ان تمام ارضی و سماوی آفات کا ظہور بدکار قوم کی بدکاریوں کی وجہ سے ہوا تھا اور مومنوں کی جماعت محفوظ رہی تھی، اس لئے یقیناً بے دینوں کے لئے غیبی عذاب تھا۔

مقصود بیان

حضرت شعیبؑ اصحاب ایکہ کے پیغمبر تھے اور اصحاب ایکہ میں منجملہ دوسری خرابیوں کے تجارتی لین دین میں بے ایمانی اور رہزنی و غارتگری کی عادت بھی تھی (اور یہی خرابیاں اصحاب مدین میں بھی تھیں) اور اصحاب مدین کی ہدایت کے لئے بھی حضرت شعیبؑ کو مبعوث کیا گیا تھا جیسا کہ دوسری آیات میں صراحت ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ قوم مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قوم تھی) پیغمبروں کا کام نہ فقط عقائد کی اصلاح ہوتا ہے بلکہ معاملات اور معاشرت کی درستگی بھی ان کا فرض ہے۔ حضرت شعیب کی نصیحت سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ انسان جب گمراہی کی دلدل میں زیادہ دھنس جاتا ہے اور باطل کی سیاہی دل کو گھیر لیتی ہے تو

اولیاء، انبیاء بلکہ خدا کی شان میں گستاخیاں کرنے لگتا ہے اور نہایت ڈھٹائی سے مضحکہ انگیز درخواست کرنے لگتا ہے اور چونکہ اس کے خیال میں درخواست کا پورا ہونا محال ہوتا ہے اس لئے اس کا مقصود محض استہزاء ہوتا ہے۔ قوم شعیب نے بھی نہایت بے باکی سے پارۂ آسمان کو نازل کرنے کی درخواست کی تھی۔

وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ ⑪

یہ قرآن قطعاً رب العالمین کا اتارا ہوا ہے　اس کو روح الامین نے تمہارے دل پر اتارا ہے　تاکہ تم بھی ڈرانے والوں میں سے ہو جاؤ

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُبِينٍ ۝ وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ۝ أَوَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ آيَةً أَنْ يَعْلَمَهُ عُلَمَاءُ بَنِي

(یہ قرآن) صاف عربی زبان میں ہے　اور اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی یقیناً یہ ہے　کیا اُن لوگوں کے لئے یہ دلیل نہیں ہے کہ ان کو علمائے بنی اسرائیل نہیں

إِسْرَائِيلَ ۝ وَلَوْ نَزَّلْنَاهُ عَلَىٰ بَعْضِ الْأَعْجَمِينَ ۝ فَقَرَأَهُ عَلَيْهِمْ مَا كَانُوا بِهِ مُؤْمِنِينَ ۝

جانتے　اگر ہم اس کو کسی عجمی پر اتارتے　اور وہ ان کو پڑھ کر سناتا　تب بھی یہ لوگ اس پر ایمان نہ لاتے

كَذَٰلِكَ سَلَكْنَاهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ ۝ لَا يُؤْمِنُونَ بِهِ حَتَّىٰ يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيمَ ۝ فَيَأْتِيَهُمْ

اسی طرح ہم نے مجرموں کے دلوں میں انکار کو راہ دی　یہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے　یہاں تک کہ دردناک عذاب کو دیکھ لیں گے　جو اُن کی

بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ فَيَقُولُوا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُونَ ۝ أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ۝ أَفَرَأَيْتَ

بے خبری میں اچانک اُن پر آپڑے　پھر کہنے لگیں　کیا ہم کو مہلت مل سکتی ہے　کیا یہ لوگ ہمارے عذاب کی جلدی مچا رہے ہیں　بھلا دیکھو

إِنْ مَتَّعْنَاهُمْ سِنِينَ ۝ ثُمَّ جَاءَهُمْ مَا كَانُوا يُوعَدُونَ ۝ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يُمَتَّعُونَ ۝ وَمَا

تو اگر چند سال ہم ان کو مزہ اڑا لینے دیں　پھر وہ عذاب اُن پر آپڑے جس سے اُن کو ڈرایا جاتا ہے تو وہ شے ان کے کیا کام آئیگی جس سے اُن کو بہرہ اندوز کیا جاتا ہے اور ہم

أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنْذِرُونَ ۝ ذِكْرَىٰ وَمَا كُنَّا ظَالِمِينَ ۝ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيَاطِينُ ۝

نے جس بستی کو ہلاک کیا اُس کو ڈرانے والے یاددہانی کے لئے ضرور تھے　ہم ظالم نہیں ہیں　اس قرآن کو شیطان لے کر نہیں اترتے

وَمَا يَنْبَغِي لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيعُونَ ۝ إِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُولُونَ ۝ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتَكُونَ

اور نہ اُن کو یہ کام مناسب ہے نہ وہ ایسا کر سکتے ہیں　یقیناً اُن کو سننے سے روک دیا گیا ہے　تم اللہ کے ساتھ دوسرے معبودوں کو نہ پکارو ورنہ تم بھی

مِنَ الْمُعَذَّبِينَ ۝ وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ۝ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ ⑫

عذاب ہو جاوے　اپنے قریب کے کنبہ داروں کو ڈراؤ　اور اپنے بازو کو اُن ایمانداروں کے لئے جھکا دو جو تمہارے تابعدار ہوگئے ہیں

فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ۝ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ

اگر تمہارا کہنا نہ مانیں تو کہدو میں تمہارے عمل سے بیزار ہوں تم خدائے غالب مہربان پر بھروسہ رکھو جو تم کو اس وقت بھی دیکھتا ہے جب تم کھڑے ہوتے ہو

وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ۝ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ۝ تَنَزَّلُ

اور جب سجدہ کرنے والوں میں تم پھرتے ہو بلاشبہ وہ سننے والا باخبر ہے کیا میں تم کو بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں ہر بہتان تراش

عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ۝ وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۝ أَلَمْ

گنہگار پر اترتے ہیں سنی ہوئی بات اس پر ڈالتے ہیں اور ان میں اکثر جھوٹے ہوتے ہیں اور شعراء کی راہ پر گمراہ ہی چلتے ہیں کیا تم نہیں

تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۝ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

دیکھتے کہ وہ ہر میدان میں سرگرداں پھرتے ہیں اور جو کہتے ہیں کرتے نہیں ہاں جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے

وَذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيرًا وَانتَصَرُوا مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا ۗ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ ۝

ع ۱۱ ۱۵

اور اللہ کی یاد بکثرت کی اور مظلوم ہونے کے بعد بدلا لیا وہ لوگ بہتر ہیں اور ظلم کرنے والے عنقریب جان لیں گے کہ کیسی جگہ لوٹ کر جائیں گے

تفسیر قرآن پاک کا نزول ہوا اور عرب کو اطلاع ہوئی تو ان کو حیرت ہوگئی۔ الفاظ وہی تھے جو عام بول چال میں استعمال ہوتے تھے، عبارت کی ترکیب بھی سادہ تھی، لیکن اس کے باوجود الفاظ کی بندش، طرز ادا کی بلندی، کلام کی روانی جزالت اور طراوت کے ساتھ حلاوت پھر معانی کی دل فریبی، قوانین کا انضباط اور اصلاحی نظام کی جاذبیت ایسی تھی جو بچہ بچہ کے دل کو کھینچتی تھی اور عورتیں تک ایک کیفِ بے خودی سے سرشار ہو جاتی تھیں۔ عرب نے کلام کی ایسی تاثیر اور پُر فریبی کبھی نہ دیکھی تھی نہ سنی تھی، اس لئے عجیب کشمکش میں ہوگئے۔ طبری وغیرہ نے لکھا ہے کہ جب سردارانِ قریش نے رسول پاک کی خدمت میں ہر قسم کی ترغیب وطمع دینے کے لئے عقبہ کو بھیجا اور عقبہ نے امارت و دولت، حسن و جمال، غرض ہر کشش پیدا کرنے والی پیشکش کی تو حضور والا نے آخر میں قرآن پاک کی چند آیات تلاوت فرمائیں۔ عقبہ نے بیخود ہو کر اپنے ہاتھ دہن مبارک بند کر دیا اور بولا محمد! تمہیں اپنے خدا کا واسطہ یہ کلام نہ کہو میرا دل کھنچتا ہے۔ یہ بارگاہِ نبوت سے واپس جا کر اپنے گھر میں گوشہ نشین ہوگیا۔ سردارانِ قریش کے غیرت دلانے سے باہر نکلا تو کہنے لگا میں نے ایسا کلام سنا ہے جو کبھی نہیں سنا تھا، جس نے مجھے بے خود کر دیا میں اب پیام رسانی نہیں کر سکتا۔

عرب کے جاہل خانہ بدوش وحشی باشندے نورِ نبوت اور قوتِ قدسیہ سے تو واقف ہی نہ تھے۔ توہم اور تخیل کی سرحد سے آگے ان کے دماغوں کی رسائی ہی نہ تھی، اسلئے غیبی طاقت اور فوق البشریت قوت کا مالک صرف تین گروہوں کو خیال کرتے تھے یا تو ساحر ان کی نظر میں غیر معمولی تصرفات کر سکتے تھے اور جادو کی طاقت ان کو تسخیر کن نظر آتی تھی یا کاہنوں کا تعلق ان کو عالمِ بالا سے معلوم تھا اور کاہن کے پاس ایک غیبی مخلوق کا آنا اور واقعات عالم کی قبل از وقت اطلاع دینا مسلم تھا یا شاعروں کے پاس جنات آ کر الہام والقاء کرنے کے وہ قائل تھے۔ یہی تین طبقے سطحِ بشریت سے بالاتر طاقت کے حامل سمجھے جاتے تھے، لیکن قرآن کی اعجوبہ کاری، کیف انگیزی، لذت آفرینی اور اعجاز نمائی یہی تو کر اس کو یقین کے ساتھ نہ سحر کہا جا سکتا تھا نہ کہانت نہ شعر۔ جادوگر کثیف غلیظ رہتے ہیں، بد خلق اور بد طینت ہوتے ہیں ان کی سحر آفرینی کی بنا بدکرداری اور بد اطواری پر ہوتی ہے۔ رسول پاک طاہر مطہر لطیف ونظیف تھے پھر قرآن کو سحر کس طرح کہا جا سکتا تھا۔ یہ تو سراسر طہارت نظافت کی تعلیم دینے والا اور نہ فقط جسمانی پاکیزگی کی تلقین کرنے والا تھا بلکہ روح کی شستگی اور شائستگی کی بھی ہدایت کرتا تھا۔ کاہن ضرور مسجع کلام بولتے تھے مگر ان کے کلام پہ یہ تاثیر کہاں تھی، اس کے علاوہ ان کی ساری کہانت خارجی آلات و ریاضت کی محتاج تھی۔ پھر ان کے کلام کا اخلاق معاشرت اور عقائد کی اصلاح سے کچھ تعلق نہ تھا۔ چند بے تکے الفاظ کی بندش ہوتی تھی اور بس نہ ضوابط اصلاحی کی ہدایت ہوتی تھی نہ توانین ہدا کی تعلیم نہ مبدء و معاد کے متعلق صحیح عقائد سے ان کو کوئی غرض۔

رہے شاعر تو ان کے کلام کی بنیاد ہوا پرستی، خیالی بلند پروازی ان کی معراجِ کمال تھی۔ پھر یہ صحیح ہے کہ شاعر کی ہمہ دریا بیانی، آتشِ معانی اور سرمستی قوم کی سحر آفرینی زبان کی لطافت بیان کی قوت اور سلاست، طرزِ ادا کا زور، بندش کی پُرکاری اور الفاظ کی شوکت سننے والے کو براہِ گوش بادۂ سرجوش پلاتی تھی اور سننے کے بعد ایسا سکر انگیز کیف دماغ پر چھا جاتا تھا کہ خودی اور خودکاری کا احساس جاتا رہتا تھا، لیکن سرشاری پیدا کرنے والے الفاظ کی تہ میں کس قسم کے معانی کا تسلسل تھا اور کس نوعیت کے مضامین ادا کئے جاتے تھے عرب کا شاعر کس چیز کا سوگر تھا اور اس کی شاعری کا پروگرام کیا تھا؟ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ اصلاح کی جگہ فساد، آبادی کی جگہ بربادی اور تعمیر کی اصول تخریب کا مظاہرہ پوری شاعری میں نظر آتا تھا۔ عہد جاہلیت کی عربی شاعری پر سطحی نظر ڈالی جائے تو بس اتنا دکھائی دے گا کہ اونٹ ہنکانے والے، آب و گیاہ کی تلاش میں سرگرداں پھرنے والے، چشموں اور تالابوں پر اترنے والے صحرا نشینی کے خوگر، خانہ بدوشی کے شیفتہ، غارتگری کے شیدا، ظالم، جابر، غیر متمدن، بے جا عصبیت اور بے محل حمیت کے پرستار، خون آشام، ایک قطرہ کے عوض ہزاروں لاکھوں انسانوں کی بھینٹ چڑھانے والے، شراب خواری اور قمار بازی میں کاوش، انسانیت کو تباہ کرنے والے اور بیہودہ تفاخر سے عالم پر اپنی جہالت و بربریت کا سکہ جما دینے والے، قدیم محبوب کے فرسودہ نشانات دیکھ کران کی بوسیدگی سے متاثر ہو کر گزشتہ ایام وصال کی تصویر کشی کرنے والے اور منظم تاثرات کو رقت انگیز لہجہ میں پانی کے بہاؤ کی طرح زبان سے بہانے والے، عشق بازی کی داستانیں سنانے والے، شکار کے واقعات کو بیان کرنے والے، کسی کی حد سے زیادہ مدح کرنے والے اور کسی کی رسوائی انگیز ہجاء کرنے والے غرض عالم کے امن اور آبادی کو بے چینی اور بربادی سے بدلنے والے گروہ کا نام شاعر تھا۔

یہ امر بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ بعض شعراء نے اصلاحی مضامین کو بھی بیان کیا ہے۔ مثلاً عدی بن زید نے اپنے قطعات میں حوادثِ دہر کا سیال انقلاب ظاہر کیا ہے۔ قیس بن سعد نے دینی واعظانہ شاعری میں موت و فنا کی تصویر کشی سبک بیانی کے ساتھ کی ہے۔ زہیر اور طرفہ نے بعض اشعار میں حکمت آگیں اور موعظت آفریں مضامین کا اظہار کیا ہے، لیکن کسی شاعر نے عقائد، اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست اور کل اعمال و احوال کی اصلاح کا مکمل پروگرام نہیں پیش کیا۔ اسلامی شعراء کا بھی بیشتر کلام خرافات و ہذیانات سے پُر ہے۔ کہیں کہیں ہدایت آفریں مضامین کا بیان کلام کی مجموعی حالت پر اثر نہیں ڈال سکتا اور کسی ایک صنف کے متعلق کبھی کبھی کچھ بیان کر دینا شاعری کی سرشت کو نہیں بدل سکتا اور شعر کو تخیل کی سطح سے آگے بڑھا کر تفکر و تعقل کے دائرہ میں کہیں پہنچا سکتا۔

لیکن قرآن پاک قرآن ان خرافات سے پاک ہے جو واضح شستہ عربی زبان میں ہے۔ اس امین فرشتہ کے ذریعہ سے پروردگار نے اپنے رسول کے قلب پر اس کو اتارا ہے جو ہر سہو و نسیان اور خورد برد سے فطرۃً معصوم ہے، یہ القاء کے شیطانی نہیں، وسواسِ دماغی نہیں، شاعروں کی گمراہی یا ہذیانات نہیں، معاد کے متعلق صحیح عقائد کی تعلیم دینے والا ہے، اصلاح بشری کے قواعد بیان کرنے والا ہے، شرک سے بیزاری اور اللہ پر بھروسہ کرنے کی تلقین اس کی خصوصیت ہے، ایمان اور نیک اعمال کی ہدایت اس کا شیوہ ہے، کذب، گناہ، بداطواری اور بدکرداری سے باز داشت اس کا شعار ہے۔ گزشتہ آسمانی کتابوں میں اس کی بشارتیں موجود ہیں۔ پس اس پر بھی اگر بدکار ظالم مجرم اس کی تصدیق نہ کریں تو ان کی گرفت سخت ہوگی اور وہ عذاب الٰہی میں ماخوذ ہوں گے۔

تبصرہ

آیات مذکورہ میں چونکہ صراحت فرمائی ہے کہ روح امین اس قرآن کو لے کر رسول پاک کے قلب پر نازل ہوتے ہیں اور یہ شیطانی القاء نہیں ہے، اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ القاءِ ملکی اور القاءِ شیطانی کی تفصیل بیان کر دی جائے اور کسی قدر حقیقت واضح کر دی جائے اور نبوت و جوگ وغیرہ کا فرق ظاہر کر دیا جائے تاکہ وحی اور کہانت میں التباس نہ رہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ نبوت کسبی ہے یا وہبی اور انسانی علم کی انتہا کس حد پر ہے۔ آخر میں شاعری کی حقیقت کی بھی کسی قدر تحلیل کی گئی ہے تاکہ قرآن پاک اور شاعروں کی یاوہ گوئی کا فرق معلوم ہو جائے۔

حقیقتِ نبوت

اہل علم کے نزدیک یہ حقیقت بالکل عریاں ہے کہ یہ عالم اور اس کی کائنات ایک خاص ترتیب پر ہے۔ اسباب و مسبب کی زنجیر میں کل موجودات جکڑی ہوئی ہے اور ہر کڑی دوسری کڑی سے وابستہ ہر موجود کا درجہ دوسرے موجود کے بعد ہے۔ پیش آنے والے حوادث اور تغیر پذیر اشیاء میں باہم ایک قسم کا ربط و اتصال ہے۔ فطرت کی نیرنگیاں ختم نہیں ہوتیں اور نہ کسی نقطہ پر پہنچ کر ان بوقلمونیوں کی انتہا ہوتی ہے۔ عالم عنصری کے ہی گوناگوں ردو بدل اور تغیرات کو ذرا حقیقت رس نظر سے دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ عناصر کا یہ سلسلہ کس ترتیب سے قائم ہے۔ کس طرح ایک کے اوپر دوسرا اور دوسرے کے اوپر تیسرا عنصر واقع ہے اور کیونکر اس صعودی تدریج کے ساتھ عناصر میں تغیرات و انقلابات ہوتے رہتے ہیں۔ پہلے زمین ہے، زمین کے اوپر پانی ہے پانی کے اوپر ہوا ہے اور ہوا کے بعد آگ ہے۔ ہر عنصر کا کرہ دوسرے عنصر کے کرہ سے ملا ہوا ہے اور عنصر اپنے بالائی یا زیریں عنصر کی صورت اختیار کرنے پر آمادہ رہتا ہے اور کیونکر آہستہ آہستہ تغیر و تبدل کو قبول کرتا ہے۔

پھر یہ ثابت شدہ امر ہے کہ طبقات عناصر میں سے ہر بالائی طبقہ زیرین طبقہ سے لطیف ہے۔ پانی سے ہوا لطیف ہے اور ہوا سے آگ لطیف ہے۔ چاروں عناصر میں سب سے کم ثقل آگ کا ہے۔ آخر میں عالم افلاک تمام عناصر سے زیادہ لطیف ہے۔ افلاک سے برتر ان قوتوں یا نفسوں کا مرتبہ ہے جن سے افلاک وغیرہ میں یہ آثار نمودار ہوتے ہیں۔ ان نفوس کی لطافت سب سے زیادہ ہے۔ یہ ترتیب اور کیفیت تو ان عناصر کی تھی جن کو بسیط کہا جاتا۔ اب ذرا ان موجودات کی حالت پر غور کرو جو عناصر کی ترتیب و امتزاج سے بنے ہیں اور جس کو عالم تکوین کہنا مناسب ہے۔ عالم تکوین میں معدن یا جمادات ہیں، نباتات ہیں، حیوانات ہیں۔ ان کی باہمی تدریج و ترقی ایک شگفتہ سلسلہ رکھتی ہے۔ معدن کا بالائی طبقہ نباتات کے زیریں طبقہ سے ملا ہوا ہے۔ گویا معدن کا جو ارفع و اعلیٰ ہے وہ ادنیٰ درجہ کی گھاس پات اور بے تخم روئیدگی تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس بے تخم خود رو روئیدگی سے عالم نبات شروع ہوتا ہے اور ترقی کرتے کرتے اپنے بالائی افق تک پہنچتا ہے۔ نباتات کا اعلیٰ کرہ کھجور اور انگور وغیرہ کے درختوں کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ جب نباتات افق اعلیٰ پر پہنچتی ہے تو وہاں کے حیوان کا زیرین ترافق شروع ہوتا ہے۔ حیوان کے زیرین افق میں گھونگا، سیپ، خراطین وغیرہ وہ جاندار شامل ہیں جن میں صرف لمس کی قوت پائی جاتی ہے۔

اس بیان کا خلاصہ یہ نکلا کہ آفاق تکوین کے باہمی اتصال کے معنی یہ ہیں کہ موالید ثلاثہ میں سے ہر طبقہ کے کامل ترین افراد اپنے خواص و استعداد کے لحاظ سے اس قابل ہوتے ہیں کہ بالائی طبقہ کے ادنیٰ افراد میں شامل ہو سکیں۔ موالید ثلاثہ کے بالائی طبقہ یعنی عالم حیوان میں گوناگوں نوعیں اور بڑی وسعت ہے۔ یہ سلسلۂ حیوانیت ابتدائی درجہ سے شروع ہو کر تدریجی ترقی کرتے کرتے اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے جو درجۂ انسانیت کے قریب ہے۔ اس درجہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غور و فکر کی قوت موجود ہے اور ایک زینہ اگر اور بلند ہوا تو انسانیت کے نچلے افق میں داخل ہو جائے گا اور یہی وہ مرتبہ ہے جو انسان کو عالم انسانی کے ابتدائی افق میں ملتا ہے۔ اس کے بعد غور کرنے سے مختلف عالموں میں رنگا رنگ آثار نظر آتے ہیں۔ محسوسات کی دنیا میں افلاک و عناصر کی نیرنگیاں نظر آتی ہیں اور عالم کون و فساد میں نمو اور ادراک کی بوقلمونی دکھائی دیتی ہے جو اس بات کی پوری دلیل ہے کہ اجسام سے باہر کوئی موثر ضرور موجود ہے جس کی تاثیر سے یہ آثار و کوائف ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اگر وہ نہ ہو تو یہ تمام نیرنگیاں اور بوقلمونیاں پردۂ عدم میں چھپی رہیں۔ یہ موثر کون ہے؟ کہاں ہے؟ اس کے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اجسام کے اندر یقیناً نہیں ہے ورنہ وہ بھی عالم تکوین کا ایک جزء ہو جائے گا بلکہ اس دنیا میں رہتا ہے جو عالم تکوین کے اوپر ہے یعنی اس موثر فی الاجسام کا مسکن ہے وہ خود بھی روحانی ہے اور روحانیات کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ لیکن اس جسمانی کائنات سے اس کا تعلق صرف جسمانی و روحانی کے اتصال کی وجہ سے ہو گیا ہے۔ یہی موثر روحانی نفس ناطقہ ہے جس کو افعال و آثار کے لحاظ سے محرک بھی کہتے ہیں اور مدرک بھی۔ اس تقریر سے ظاہر ہو گیا کہ حرکت و ادراک کے عالم سے اوپر ایک اور عالم ہے جہاں سے عالم اجسام کو حرکت و ادراک کی قوت ملتی ہے اور خود اس عالم کو کوئی کثیف مادہ نہیں بلکہ وہاں ادراک اور خالص علم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہی عالم، عالم ملکوت یا عالم روحانیات ہے۔ ہر نفس میں بشری دائرہ سے آگے بڑھ کر عالم ملکوت میں پہنچنے کی قوت ہے اور اسی قوت کے ذریعہ انسان کسی نہ کسی وقت جنس ملائکہ میں داخل ہو سکتا ہے جبکہ اس کی روحانیت بالفعل کامل ہو جائے۔ اس بیان سے یہ نتیجہ نکلا کہ عالم انسانی میں زیریں اور بالائی دو کنارے ہیں۔ زیریں کنارہ جسم سے متصل ہے اور بالائی کنارہ افق ملکوت سے۔ جسمانی افق کے ساتھ ملنے کا فائدہ یہ ہے کہ محسوس اشیاء کا علم ہو سکے اور حسی موجودات کو جاننے سے بالفعل تعقل کی قابلیت و استعداد پیدا ہو جائے اور عالم ملکوت سے اتصال کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو غیر محسوس غیبی علوم حاصل ہو جاتے ہیں اور گزشتہ و آئندہ کے انکشاف پر دسترس ہو جاتی ہے کیونکہ تمام گزشتہ و آئندہ حوادث اور کل کائنات کے علمی نقوش ملائکہ کے تعقل میں زمان و مکان کی قید کے بغیر موجود ہیں۔ جب نفس انسانی کا اتصال عالم روحانیت سے ہوتا ہے تو اس کو بھی کم و بیش بعض علم ملائکہ کا مل جاتا ہے۔ رہا یہ کہ اتصال کیونکر ہوتا ہے تو اس کی وجہ ظاہر ہے کہ مراتب موجودات کی ایک محکم ترتیب اس طور سے پائی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ کی ذاتیں اور قوتیں دوسرے مرتبہ کی ذات و قویٰ سے متصل ہیں۔

پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ نفس انسانی اگرچہ آنکھوں سے نہیں دیکھتا، لیکن اس کے آثار بدن میں موجود ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسم اور اس کے تمام اجزاء اور اعضاء نفس اور نفس کی قوتوں کے آلات ہیں۔ مثلاً قوت عملی کے کام کو پورا کرنے کے لئے اعضاء ہیں۔ ہاتھ روکنے اور حملہ کرنے کے لئے، پاؤں چلنے کے لئے اور تمام جسم عام حرکت کے لئے۔ اسی طرح علمی قوت اپنے مراتب طے کرتی ہوئی اور درجہ بدرجہ ترقی کرتی ہوئی بالآخر نفس ناطقہ پر پہنچ جاتی ہے۔ کیونکہ ظاہری حواس اپنے آلات (آنکھ، ناک، کان، زبان، تمام بدن) سے کام لے کر محسوسات کا علم حاصل کرتے ہوئے باطنی حواس سے متصل ہیں۔ ظاہری حواس کا سب سے اول تعلق حس مشترک سے ہوتا ہے۔ ظاہری محسوسات کی تصویریں حس مشترک میں پہنچ جاتی ہیں تو وہ ان کو خیال کے حوالے کر دیتا ہے اور خیال ان محسوسات کی مثالی تصویریں جو خارجی مادہ سے خالی ہوتی ہیں نفس تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کے بعد وہم کا درجہ آتا ہے۔ جو صورتیں حس مشترک اپنے اندر رکھتا ہے ان کے اندرونی معنی کا ادراک وہم کرتا ہے۔ مثلاً زید اور عمرو کی صورتیں حس مشترک

میں منقوش ہو جاتی ہیں پھر خیال میں پہنچ جاتی ہیں، لیکن دوستی دشمنی، باپ کی شفقت، درندے کی خونخواری ان سب کا ادراک واہمہ کرتا ہے۔ پھر حافظہ خیالی صورتوں اور وہم کے ادراک کردہ معانی کو محفوظ رکھتا ہے۔ گویا حافظہ وہم و خیال کا خزانہ ہے جو ان دونوں کی معلومات کو وقت حاجت کے لئے اپنے پاس رکھ چھوڑتا ہے پھر یہ سب قوتیں ترقی کر کے متفکرہ تک پہنچتی ہیں یہی وہ قوت ہے جس سے حرکت فکریہ حاصل ہوتی ہے اور تعقل کی جانب توجہ واقع ہوتی ہے۔ نفس انسانی بھی اس قوت کے ساتھ ہمیشہ حرکت کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ نفس ہمیشہ اس بشری آلائش اور ادراک قویٰ سے رہائی پانے کا مشتاق رہتا ہے اور اسی تحریک کی حالت میں حرکت فکریہ کے ساتھ تعقل بالفعل کرنے لگتا ہے اور ملاء اعلیٰ سے مشابہ ہو جاتا ہے اور بغیر جسمانی آلات کے ادراک کرنے کے روحانیت کی جانب توجہ برابر قائم رہتی ہے اور بعض اوقات بشریت اس کی روحانیت سے بلند ہو کر عالم ملکوت کے افق اعلیٰ میں داخل ہو جاتا ہے، لیکن یہ مرتبہ انسان کو حرکت فکریہ یا اکتساب سے حاصل نہیں ہو سکتا بلکہ یہ فطرت الٰہی پر موقوف ہے وہ جس کو چاہتی ہے دیتی ہے۔

حکماء انبیاء اولیاء کے علم کا فرق

نفوس بشریہ کے تین طبقے ہیں:۔ پہلا طبقہ طبعاً روحانی ادراک سے عاجز و قاصر ہے، اس لئے اس طبقہ کے نفوس حرکت فکریہ کے وقت حسی اور وہمی معلومات کی طرف رُخ کرتے ہیں اور جو معلومات حافظہ و واہمہ کے اندر ہوتے ہیں ان کو خاص طریقے سے ترتیب دے کر تصوری او تصدیقی نتائج نکالتے ہیں۔ اس طبقہ کے علوم خیالی ہوتے ہیں کیونکہ ان علوم کی انتہا بدیہیات پر ہوتی ہے۔ بدیہیات سے آگے نہیں بڑھتے اور اگر بدیہیات میں کوئی فتور واقع ہو جائے تو یہ علوم بھی درہم برہم ہو جائیں گے۔ غالباً انسان کے جسمانی ادراک کی یہی حد ہے اور علماء کے مدرکات اور علوم اسی حد پر ختم ہو جاتے ہیں۔ حکماء کے قدم جمنے کی یہی حد ہے۔ نفوس انسانی کا دوسرا طبقہ حرکت فکریہ کے ساتھ روحانی تعقل کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ان کا ادراک کے لئے بدنی حالات کی حاجت باقی نہیں رہتی کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس طبقہ کو آلات جسمانیہ کی مدد کے بغیر ادراک و تعقل کی قوت عنایت فرمائی ہے۔ اس لئے اس طبقہ کے ادراک و علم کا دائرہ بہت وسیع ہے اور بدیہیات سے گزر کر وجدان کے طریقہ پر عالم معنی کے مشاہدات جس کی ابتدا اور انتہا مقرر نہیں ہو سکتی پیش نظر ہوتے ہیں۔ یہ مرتبہ علوم دینی اور معارف ربانی سے واقف علماء اور اولیاء کا ہے اور اہل سعادت کو موت کے بعد برزخ میں ملتا ہے۔

تیسرا طبقہ بشری جسمانیت اور روحانیت سے بالکل الگ ہونے اور ملائکہ کے افق اعلیٰ میں پہنچنے کی فطری قابلیت رکھتا ہے تاکہ کسی وقت عالم ملکوت کی سیر کرے، شہود ملائکہ کا مرتبہ پائے اور اس مبارک وقت میں کلام رحمانی سن سکے۔ یہ مرتبہ انبیاء کا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص وقت میں بشریت سے جدا ہو جانے کی قوت فطرۃً عطا کی ہے۔ بشری حالت سے جدا ہو جانا ہی حالت وحی ہے اور وہ فطرت ہے جو اللہ نے ان کی سرشت میں مرکوز فرمائی ہے اور جسم کے تعلق کے باوجود ان کو بدنی نقائص اور جسمانی خرابیوں سے پاک و برتر پیدا کیا ہے کیونکہ ان کے نفوس مقدسہ میں فطرۃً وہ استقامت ودیعت ہے جس کی وجہ سے وہ عالم ملکوت سے متصل ہو جاتے ہیں اور ان کی پاک طبیعتوں میں عبادات کی وہ رغبت و محویت ہوتی ہے جو ملکوت کو ان پر منکشف کر کے انہیں اسی عالم میں پہنچا دیتی ہے۔ غرض کہ انبیاء اپنی اس فطرت و محویت کی وجہ سے کسب و تحصیل کے بغیر جب چاہتے ہیں انسانی مرتبہ سے نکل کر ملاء اعلیٰ میں پہنچ جاتے ہیں اور اس عالم میں ملاء اعلیٰ سے جو کچھ القاء و الہام ہوتا ہے اس کو ساتھ لے کر پھر مدارک بشریہ کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ بندگان خدا کو اس القاء و الہام کی تبلیغ کر سکیں۔

وحی کے اقسام

ایک دن حارث بن ہشام نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس وحی کیسے آتی ہے؟ جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا احیانا یاتینی مثل صلصلۃ الجرس وھو اشدہ علی فیفصم عنی وقد وعیت ما قال واحیانا یتمثل لی الملک رجلا الخ۔ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحی اور القاء کے وقت کبھی آواز کا ایک سناٹا سنائی دیتا ہے جس کو رمزاً کلام و خطاب کہنا مناسب ہے۔ انبیاء اسی آواز سے القاء یا الہام کے معنی کو سمجھتے ہیں اور یہ آواز ابھی منقطع نہیں ہونے پاتی کہ وہ اس کو اچھی طرح سن اور سمجھ لیتے ہیں اور بعض اوقات حامل وحی (فرشتہ) کسی آدمی کی صورت میں سامنے آکر کلام کرتا ہے اور وہ اسے اچھی طرح سنتے ہیں اور باخذ وحی پھر بشری حالت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور مفہوم وحی کا ادراک ایک پل میں ہو جاتا ہے کیونکہ القاء وحی جزء جزء دیر تک نہیں ہوتا رہتا بلکہ تمام وحی دفعتہً نازل ہوتی ہے اس لئے کہ وحی بہت سریع النزول ہے۔ اسی سرعت نزول کی وجہ سے اس القاء و الہام کو وحی کہتے ہیں کیونکہ لغت میں وحی کے معنی ہی سرعت کے ہیں۔

اول قسم کی وحی انبیائے غیر مرسلین پر نازل ہوتی ہے یعنی ان کو محض ایک گونج اور سنسناہٹ سنائی دیتی ہے اور حامل وحی کا بصورت بشری سامنے آکر کلام کرنا انبیائے مرسلین سے مخصوص ہے اسی لئے پہلے طریقہ کی وحی زیادہ کامل اور افضل ہے۔ حدیث مذکور میں حارث بن ہشام کے استفسار کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ کبھی گھنٹہ کی سی

سخت گونج سنتا ہوں اور جو کچھ اس حالت میں کہا جاتا ہے انقطاعِ آواز کے وقت اس کو سمجھ چکا ہوتا ہوں اور کبھی حامل وحی کسی آدمی کی صورت میں میرے سامنے آتا ہے اور جو کچھ کہتا ہے اسے سنتا اور سمجھتا ہوں۔ اس حدیث میں وحی کے دونوں طریقوں کا فرق واضح ہوتا ہے۔

وحی کا پہلا درجہ اس لئے شدید الاثر ہوتا ہے کہ نبی کو ابتدائے وقت کے درجہ سے نکل کر بالفعل عالم ملکوت سے اتصال ہوتا ہے۔ اس خروج و عروج میں ایک قسم کی دشواری کے تحمل کے بعد جب نبی کو مدارج بشری سے اوپر ملکوتی قوت حاصل ہو جاتی ہے تو وحی سنائی دیتی ہے اور اس کے ماسوا صورتیں صعوبت انگیز معلوم ہوتی ہیں، مگر جب وحی پے بہ پے آنے لگتی ہے اور بار بار القاء ہونے لگتا ہے تو پھر عالم ملکوت کا اتصال جس میں ابتداءً دشواری محسوس ہوتی تھی سہل و گوارا ہو جاتا ہے۔ نزول وحی کی گرانی ہی کی طرف آیت إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا میں اشارہ ہے۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ اگر وحی سخت سردی میں آتی تھی تو انقطاعِ وحی کے بعد پیشانی مبارک سے پسینہ ٹپکتا تھا۔ اسی صعوبت و تعب کی وجہ سے نزول وحی کے وقت انبیاء پر بے خودی اور غشی طاری ہوتی ہے اور حلق سے اضطراری آواز خرخر نکلنے لگتی ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ انبیاء نزول وحی کے وقت دائرہ بشریت سے جدا ہو کر افق ملکوتی میں پہنچتے ہیں اور کلام نفسانی (خطاب ملکوتی) کا ان پر القاء ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ دائرۂ بشریت سے مفارقت صعوبت انگیز اور تعب آفریں ہوتی ہے کیونکہ نفس کو اپنی ذات اور افق سے منسلخ ہونا پڑتا ہے۔ یہی معنی ہیں اس لفظ غطّ کے جو وحی کی ابتدائی حالت کو تعبیر فرماتے ہوئے حضورؐ نے بیان کیا تھا اور ارشاد فرمایا تھا فَغَطَّنِي حَتّٰى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدُ ثُمَّ اَرْسَلَنِي الخ۔ ہم ابھی لکھ چکے ہیں کہ جب وحی پے در پے نازل ہوتی ہے تو تدریجاً بعد والی وحی اولین وحی سے کسی قدر کم صعوبت انگیز ہوتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تشریف رکھتے تھے چھوٹی سورتیں نازل ہوتی تھیں، لیکن ہجرت کے بعد طویل سورتیں نازل ہوتی تھیں۔ دیکھو غزوۂ تبوک میں سورۂ براءت پوری یک دم نازل ہوئی اور آیۃ الدین باوجود طویل ہونے کے یک بار اتری۔

اس تقریر کا حاصل یہ نکلا کہ وحی نام ہے اس القائے ملکوتی اور الہام ربانی کا جس کا نزول انبیاء کے قلب پر اس وقت ہوتا ہے جب وہ دائرۂ بشریت سے منسلخ اور جدا ہو کر عالم ملکوت میں پہنچتے ہیں اور انسلاخ کی یہ طاقت خدا تعالیٰ کی طرف سے انبیاء کو فطرۃً حاصل ہوتی ہے۔ کسب اور تحصیل کو اس میں دخل نہیں ہے اور چونکہ دائرۂ بشریت سے بالکلیہ انسلاخ کے بعد یہ القائے ربانی ہوتا ہے، اس لئے اس میں کسی قسم کی غلطی اور دروغ کی آمیزش ہونے کا احتمال نہیں ہوتا۔ پھر جب انبیاء واپس ہو کر مدارک بشری کی طرف لوٹ کر اپنے حواس میں داخل ہوتے ہیں تو بندگانِ خدا کو وحی ملکوتی کی تبلیغ کرتے ہیں۔

کہانت یا جوگ کی حقیقت

نبوت کی بحث ختم کرنے کے بعد اب ہم کہانت یا جوگ کے متعلق کچھ بیان کرتے ہیں۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ نفس انسانی میں دائرۂ بشریت سے خارج ہو کر اپنے مافوق عالم ارواح میں شامل ہونے کی قابلیت و صلاحیت موجود ہے اور انبیاء کو نظر و کسی وقت خاص میں انسلاخ و شمول کا یہ مرتبہ حاصل ہوتا رہتا ہے اور یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس مرتبہ پر پہنچنے کے لئے نہ ان کو ریاضت و کسب کی ضرورت ہوتی ہے نہ معلومات تصوریہ و تصدیقیہ کی ترکیب سے مدد لیتے ہیں نہ داخلی حواس کو کام میں لانے کی ان کو ضرورت پڑتی ہے نہ کلام حرکت اور افعال بدنی وغیرہ سے ان کو اعانت کی حاجت ہوتی ہے بلکہ ان کا یہ خروج و عروج طرفۃ العین میں واقع ہو جاتا ہے اور چونکہ انسانی طبیعت میں دائرۂ بشریت سے خارج ہونے کی استعداد موجود ہے تو قیاس اسی کا متقاضی ہے کہ انسان کے بعض افراد میں یہ قوت طبقۂ انبیاء سے کمتر اور ناقص پائی جائے اور یہ کمی ایسی ہو کہ جیسی ناقص افراد میں کامل افراد کی نسبت و اعتبار سے ہوتی ہے۔ غرض کہ نوع انسان میں بعض افراد ایسے بھی ہیں جو حرکتِ فکریہ سے عقلی قوت کو حرکت میں لا کر مدارک حسیہ سے الگ اور بالاتر ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ فطرتاً یہ مرتبہ ان کو میسر نہیں ہوتا۔

چونکہ فطرت ان لوگوں کی ناقص ہوتی ہے، اس لئے بسبب یہ نقصانِ فطرت ان کو دائرۂ بشریت سے خارج ہونے اور عالم ملکوت کے ساتھ اتصال پیدا کرنے سے روکتا ہے اور یہ خیالی امور جزئیہ سے مدد لیتے ہیں۔ کبھی شفاف اجسام (پانی ہڈی وغیرہ) سے بطریق خاص استعانت کرتے ہیں، کبھی مسجع کلام اور طیور و حیوانات کے افعال و حرکات کی مدد سے اپنے مقصود تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہ احساس و تخیل حصولِ انسلاخ کے لئے ان کی مدد کرتا ہے اور ان میں ادراک کی قوت فطرۃً ناقص ہوتی ہے۔ اس کی کمی کو کبھی احساس تخیل شامل حال (ہمزاد) ہو کر پورا کر دیتا ہے۔ یہی ناقص قوت کہانت یا جوگ کی قوت کہلاتی ہے اور ناقص کے نقصان کو پورا کرنے کا جو طریقہ وہ استعمال کرتے ہیں اسی کا نام علم کہانت ہے۔

لیکن اس طبقہ کے نفوس چونکہ فطرۃً ناقص ہوتے ہیں اور جبلّی طور پر کمال سے قاصر رہتے ہیں، اس لئے انتہائی احساس و تخیل کے بعد بھی ان کے علم کا قدم جزئیات سے آگے نہیں بڑھتا بلکہ جزئیات کا علم بھی ان کو نہیں ہوتا۔

کاہن یا جوگی اپنے ظاہری حواس کو معطل کر کے عالمِ بالا سے اتصال کی قوت کو (خارجی مددگار یعنی مستحق کلام یا استخوان وغیرہ کے ذریعہ سے) قوی کرتا ہے اور اس کے دل میں کچھ امورِ جزئیہ کے متعلق خطرات گزرتے ہیں جن کو وہ وقتاً فوقتاً بیان کرتا ہے۔ کبھی اس کا بیان واقعی اور سچ ہوتا ہے اور کبھی غلط اور سراپا دروغ کیونکہ عالم روحانیت سے اتصال کی علامت فطرۃً تو کاہن میں کمزور ہوتی ہے اور خارجی ذرائع سے فطری نقصان پورا نہیں ہوتا، اس لئے اس کے خطرات میں صدق وکذب دونوں واقع ہوتے ہیں اور اس کے اقوال وثوق واعتبار کے قابل نہیں رہتے۔ اگرچہ بعض اوقات وہ اپنے زعم میں اپنے اوراک کو کامل سمجھ کر محض گمان اور تخمین سے یا لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے غیب کی باتیں بتانے لگتا ہے، مگر عالم روحانیت سے اتصال ناقص ہونے کی وجہ سے اس کا کلام مخلوط بھی ہوتا ہے اور سچ بھی صحیح بھی اور غلط بھی۔

ایک بار حضورِ اقدسؐ نے ابن صیاد سے دریافت فرمایا تم کو غیب کی خبریں سچی معلوم ہوتی تھیں یا جھوٹی؟ اس نے جواب دیا سچی اور جھوٹی دونوں طرح کی خبریں میرے پاس آتی تھیں حضورؐ نے فرمایا تو سب حقیقت امر خلط ملط ہو جاتی تھی۔

حاصل تقریر یہ ہے کہ کاہن یا جوگی کے دل میں عالم بالا سے اتصال کے وقت جو خطرات پیدا ہوتے ہیں ان میں دو نقصان ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ان کا تعلق صرف امورِ جزئیہ سے ہوتا ہے۔ قواعد عامہ اور ضوابط کلیہ سے نہیں ہوتا۔ دوسرا یہ کہ ان خطرات میں صدق وکذب دونوں ہوتے ہیں اور ان دونوں امور کا باعث وہی فطری نقصان ہے۔ ان ہی خطرات کو القائے شیطانی کہا جاتا ہے۔

کہانت کی حقیقت سمجھنے کے بعد یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ بعض علماء کے نزدیک حضورِ والاؐ کے زمانے کے بعد کہانت ختم ہو گئی۔ کیونکہ بعثت کے زمانے میں شیاطین سنگسار کر دیئے گئے تاکہ آئندہ عالمِ بالا کی خبریں نہ لا سکیں اور کاہنوں کو غیبی خبریں شیطانوں ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوتی ہیں۔ شیاطین ہی عالم روحانیت کے قریب پہنچ کر کچھ معلومات حاصل کر کے کاہنوں کو پہنچاتے ہیں اور چونکہ شیاطین کو عالم ملکوت تک پہنچنے سے روک دیا گیا، اس لئے کہانت بھی نیست ونابود ہو گئی، لیکن یہ دلیل ثبوت دعویٰ کے لئے کافی نہیں ہے کیونکہ ہم کہہ چکے ہیں کہ کہانت القائے شیطانی سے بھی ہوتی ہے اور کبھی کاہن بزعم خود اپنے ظن وتخمین کو صحیح سمجھ کر لوگوں کو غیب کی باتیں بتانے لگتا ہے جو اکثر غلط ہوتی ہیں القائے شیطانی کی نفی سے اختراع نفوس کی نفی لازم نہیں آتی پھر قرآن مجید کی آیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں اور نہ احادیث سے ثابت ہے کہ تمام احوال واشیاء کے دریافت سے شیطانوں کو روک دیا گیا بلکہ ان سے روک دیا گیا جو لعنت سے متعلق ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ آسمانی خبروں کا انقطاع صرف زمانۂ نبوت ہی میں ہوا تھا۔ زمانۂ نبوت کے بعد کہانت کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا کیونکہ کوئی امر مانع نہیں رہا۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ کہانت کا ظہور زمانۂ نبوت کے قریب ہی ہوتا ہے اور نبوت کے بعد کہانت باقی نہیں رہتی اور وقتاً فوقتاً انبیاء کی بعثت زمانہ میں یہی کیفیت ہوتی رہتی ہے، لیکن یہ قول بھی ثبوت کا محتاج ہے۔ دعوے کے ثبوت کے لئے جو دلائل بیان کئے جاتے ہیں وہ کمزوری سے خالی نہیں، اس لئے ذکر نہ کرنا ہی اولیٰ ہے۔

کاہن اگر کسی نبی کے معاصر ہوتے ہیں تو وہ نبی کے صدق اور اعجاز کو سمجھتے اور جانتے ہیں۔ کیونکہ نبوت کا جزئی وجدان وعلم ان کو ہوتا ہے، لیکن باوجود اس آگاہی کے وہ لوگ اپنے لئے نبوت کی بے جا طمع میں گرفتار ہو کر نبی کو جھٹلاتے اور اس کی نبوت سے انکار کرتے ہیں جیسے امیہ بن صلت (عرب کا مشہور شاعر) اور ابن صیاد اور مسیلمہ وغیرہ نے رسول پاکؐ کے مقابلے میں خود نبی بن بیٹھنے کی بے جا طمع اور لا حاصل کوشش کی، لیکن بعض کاہنوں کی طبیعتوں پر جب راستی غالب آتی ہے اور ہوا و ہوس سے دل خالی ہوتے ہیں تو نبئ وقت کی نبوت پر ایمان لے آتے ہیں جیسے طلحہ اسدی اور سواد بن قارب کے متعلق مشہور ہے۔

نبوت اور کہانت کی اس تحقیق سے آیات پاک کا مطلب بخوبی واضح ہو گیا کہ قرآن پاک کلام الٰہی ہے اتارا ہے۔ رسولِ خدا کے دل پر فرشتہ کے ذریعہ سے اس کلام کا القاء ہوا ہے۔ یعنی جب حضورِ والاؐ تمام عالم جسمانی سے پاک ہو کر مادی حواس سے بالاتر ہو کر عالمِ ملکوت میں شامل ہو جاتے تھے اس وقت آپ کے دل پر اس کلام کا القاء ہوتا تھا۔ یہ کاہنوں کی خرافات نہیں ہے، القائے شیطانی نہیں ہے۔ کیونکہ مقدس نفوس پر القاء کرنا شیطانوں کا کام ہی نہیں ہے اس کے لئے مناسب ہی نہیں کہ جن لوگوں کو فطرۃً عالمِ ملکوت سے کامل اتصال حاصل ہو ان کے دلوں پر کچھ القاء کر سکیں۔ اس کے علاوہ عالمِ ارواح تک شیطانوں کی رسائی ناممکن ہے وہ عالمِ ملکوت کا کلام سن نہیں سکتے القائے شیطانی تو ان لوگوں کے دلوں پر ہوتا ہے جن کا قول وعمل غلط ہوتا ہے، جن کے کردار میں خرابی اور کلام میں دروغ ہوتا ہے۔ شیاطین ایسے ہی لوگوں کے دلوں پر القاء کرتے ہیں جن میں بیشتر جھوٹے ہوتے ہیں۔

شاعری کی حقیقت

آیات میں شاعری کی پیروی کرنے والے کو گمراہ قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ عرب قرآن پاک کو بلیغ ترین شاعری کا مظاہرہ بھی کہتے تھے، اس لئے شاعری کی حقیقت بھی یہاں واضح کر دینی ضروری ہے۔ ہم شعر کی تعریف کرنا نہیں چاہتے نہ شاعری کا وہ مفہوم ظاہر کرنا چاہتے

ایک پہیلی ہے اور جس سے ہر شخص واقف ہے۔ اس جگہ شاعری کی تحلیل مقصود ہے۔

اہلِ تحقیق کے نزدیک یہ امر ثابت شدہ ہے کہ شاعری کا مدار صرف احساس کی بیداری اور تخیل کی لطافت پر ہے۔ خیالی کی حد سے آگے شاعری کی رسائی نہیں۔ شاعری معانی ہو یا تخیلی۔ بہر حال شعر جذبات کی بولتی ہوئی تصویر کا نام ہے۔ جذبات کی ترتیب و تکوین کس طرح ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر جذبہ گرد و پیش کا مطیع ہے اور حالات مطابق جذبات بدلتے رہتے ہیں۔ شاعر بھی دوسرے انسانوں کی طرح ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور سماج کے مطالبات اور اپنے گرد و پیش کی عکسی تصویریں اپنی شاعرانہ قوت پر ثبت کرتا ہے اور پھر ان کی تعبیر کرتا ہے یعنی ماحول کے جذبات کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کی زبان سے انفرادی انسان نہیں بلکہ اجتماعی انسانیت بولتا ہے۔ معمولی انسان اور شاعر میں فرق صرف اس قدر ہے کہ ایک ماحول سے متاثر ہوتا ہے ترجمانی نہیں کرسکتا۔ دوسرا تاثر کے بعد مترجم بھی ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ گرد و پیش کے جذبات کا بچا احساس و تخیل کے سانچہ میں ڈھال کر اس اسلوب سے پیش کرنا کہ موجود یا متصور محسوس کی تصویر لوگوں کی آنکھوں میں پھر جائے اور سامعین کے جذبات محبت و نفرت برانگیختہ ہو جائیں۔ شاعروں کا کام ہے۔

صاحب چہار مقالہ نے ذرا زیادہ واضح الفاظ میں اس کی توضیح اس طرح کی ہے کہ شاعری نام ہے مقدمات موہومہ کی ترتیب سے اچھی چیز کو بدنما اور بری چیز کو خوشنما ثابت کرنے کا تاکہ محبت و غضب کی قوتیں مشتعل ہو جائیں۔

شیخ بو علی سینا نے کتاب الشفا میں لکھا ہے۔ لا نظر للمنطقی فی شیء ومن ذلک الا فی کونہ کلاماً تخیلیاً یعنی اہل منطق کے پیش نظر صرف یہ ہے کہ شعر کی تخیل پر ہے (وزن و قافیہ کی ضرورت نہیں) خواجہ نصیر الدین طوسی نے اساس الاقتباس میں شعر ادبی اور شعر منطقی کا فرق ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"نظر منطقی خاص است بہ تخیل و وزن را از جہت اعتبار کنند کہ بوجہے اقتضائے تخیل کند و صناعت منطقی باحث از شعر تخیل است و بالعرض از دیگر احوال و بحسب ایں عرف ہر سخن را کہ وزنے داشتہ باشد خواہ آں سخن برہانی باشد یا خطابی خواہ صادق خواہ کاذب یا گر ہمہ توحید خالص یا ہذیانات محض باشد آں را شعر خوانند"۔

اس کلام سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ اہلِ منطق کے نزدیک شاعری نام ہے صرف تخیل قضایا کا اور تخیل چونکہ غیر یقینی چیز ہے، اس لئے شعر نام ہوا قضایا کاذبہ کے مجموعہ کا، لیکن اہلِ ادب کے نزدیک ہر موزوں کلام کو شعر کہتے ہیں خواہ وہ برہانی اور یقینی ہو یا خطابی اور تخیلی، سچ ہو یا جھوٹ۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ جب تخیلات کی تاثیر نفس پر ہوتی ہے تو وہ متاثر ہو کر کسی چیز کی طرف راغب ہو جاتا ہے یا اس سے نفرت کرنے لگتا ہے کیونکہ تخیل کا اثر نفس پر بمقابلہ تصدیق کے جلد پڑتا ہے۔ تخیل میں تعجب بہ نسبت صدق کے زیادہ ہوتا ہے اور تعجب سے نفس کو لذت کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ تخیل سے نفس میں یا انبساطی اور انشراحی کیفیت پیدا ہوتی ہے یا انقباضی یعنی تخیل اس قدر مرغوب بالطبع ہے کہ باوجود غیر یقینی ہونے کے بغیر غور و فکر کے نفس پر فی الفور اثر ڈالتی ہے اور علم و حکمت باوجود یقینی ہونے کے غور و فکر کے بعد نفس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ تخیل تصدیق کے مقابل ہے اور تخیل کا نتیجہ تاثر نفس ہے، اس لئے اہلِ منطق مخیلات صادقہ کو تخیل شعری سے خارج سمجھتے ہیں اور بدیہیات صادقہ اور اولیات صحیحہ کا استعمال شعری قضایا میں جائز نہیں سمجھتے کیونکہ وہ یقینی ہوتے ہیں اور علم و حکمت کے مقابل نہیں ہوتے بلکہ ان کے موافق ہوتے ہیں۔ لہٰذا منطقیوں کے نزدیک ایسے اشعار جو یقینیات سے ہوں یعنی جن میں تخیل صادق ہوں شعر نہیں ہیں، لیکن اہلِ ادب کے نزدیک تخیل تصدیق کے مقابل نہیں، اس لئے تخیلات صادقہ ہوں یا کاذبہ بہرحال ان کو شعر کہا جائے گا۔ حاصل کلام یہ نکلا کہ اہلِ منطق کے نزدیک تو تخیل نام ہی غیر یقینی چیز یعنی جھوٹ کا ہے اور شعر کا مدار تخیل پر ہے، اس لئے شاعری نام ہوا محض جھوٹ کا اور اہلِ ادب کے نزدیک تخیل صادق بھی ہو سکتی ہے اور کاذب بھی، صحیح بھی اور غلط بھی اور شعر کا مدار تخیل پر ہے، اس لئے شاعری نام ہوا جھوٹ اور سچ کے مرکب کا یا کبھی جھوٹ اور کبھی سچ کا۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ دنیا میں کسی گروہ اور کسی شخص کے نزدیک شاعری کی رسائی تخیل سے آگے نہیں، عالم روحانیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ فکر کو حرکت دینے کے بعد توفیق کی جانب نفس کو متوجہ کرنے سے کوئی غرض نہیں۔ صرف تخیل کی بلند پروازی معیارِ شاعری ہے۔ لہٰذا شاعر نام ہوا ایک وہمی یا خیالی انسان کا۔ جس کا کمال یہ ہے کہ جھوٹ کو سچ کا جامہ پہنا کر پیش کرے یا کم از کم اتنا ہو کہ کبھی جھوٹ بولے اور کبھی سچ۔ لہٰذا شاعروں کی پیروی کرنے والے اور ان کی شاعری کو الہام ربانی اور ٹھوکتا کہنے والے سراسر گمراہ ہیں۔ قرآن کا حرف حرف سچا ہے جھوٹ کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ شاعروں کی خیالی بلند پروازی کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ مقدمات موہومہ کو ترتیب دے کر اچھے کو بدنما اور برے کو خوشنما بنانے سے اس کو قطعی بیزاری ہے پھر کس طرح اس کو شعر کہا جا سکتا ہے۔

تحلیلِ اجزاء وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعٰلَمِينَ یعنی قرآن بلاشبہ خدا تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔ رب العالمین کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ جس طرح نظامِ کائنات کو چلانے والا اور تمام عالم کی بقاء کے اسباب پیدا کرنے والا ہے کہ ہر حلقہ کو دوسرے حلقہ سے وابستہ کر کے کل کائنات کا تحفظ

کرنے والا ہے۔ اسی طرح اس کی ربوبیت روحانی دنیا کو بھی گھیرے ہوئے ہے۔ انسان کی ہدایت کے قوانین و ضوابط نازل کرنا اور عدل قائم کرنے کے واسطے مجموعہ قواعد نافذ کرنا بھی اسی کا کام ہے، اس لئے اس نے یہ کتاب نازل فرمائی ہے، لیکن یہ ہدایت نامہ اس نے کیسے نازل کیا۔ واجب کا ممکن سے اور قدیم کا حادث سے کیسے تعلق ہو سکتا ہے، کیا لکھی لکھائی کتاب آسمان سے گر پڑی یا غیب سے ندا ہوئی یا براہ راست خدا تعالیٰ رسولِ خدا سے باتیں کرتا ہے اس کی کیفیت ظاہر کرنے کے لئے فرمایا:۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ کہ یہ کتاب روح امین کی معرفت رسول اللہؐ کے قلب پر اتاری گئی یعنی فرشتے نے پیام الٰہی کا القاء رسول پاکؐ کے دل پر کیا۔ روح امین سے مراد ہیں جبرئیل۔ زہری نے فرمایا کہ دوسری آیت میں صراحت ہے کہ جبرئیل ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر کلامِ الٰہی کا القاء کرتے تھے۔ فرمایا مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ اس سے معلوم ہوا کہ آیت مذکورۂ بالا میں بھی روح امین سے مراد جبرئیل ہیں۔ جبرئیل کے لئے دو لفظ استعمال فرمائے۔ روح اور امین۔ دونوں لفظوں سے باطل توہمات کا ازالہ مقصود ہے۔ وہم ہو سکتا تھا کہ جبرئیل فرشتہ ہیں رسول اللہ کے قلب پر القاء کرنے کی ان میں کس طرح طاقت ہے۔ ایک مخلوق دوسری مخلوق میں حلول کس طرح کر سکتی ہے۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ جبرئیل روح ہیں یعنی مادۂ جسمانی سے خالی ہیں ان کا جسم نوری ہے اور نوری جسم کا حلول کرنا ممکن بلکہ واقع ہے۔ نور کا نفوذ جسم میں آسانی سے ہو سکتا ہے (دیکھو جب شیطان کسی خبیث انسان کے اندر حلول کر جاتا ہے تو وہ انسان اپنی بولی چھوڑ کر اس شیطان کی بولی بولنے لگتا ہے جس کو لوگ آسیب یا جن کہتے ہیں اور شیطان ناری ہے، لیکن نار چونکہ خاک سے لطیف ہے، اس لئے انسان کے خاکی جسم میں ناری مخلوق کا نفوذ ہو جا سکتا ہے۔ اسی طرح ہوائی اجسام بھی انسان کی رگ رگ میں گھس جاتے ہیں۔ پھر نوری کائنات تو سب سے زیادہ لطیف ہے اس کا نفوذ بہت ہی آسان ہے) ایک وہم یہ ہو سکتا تھا کہ جبرئیل جس کلام کا القاء کرتے ہیں ممکن ہے کہ وہ اپنی طرف سے الہام کرتے ہوں یا خدا تعالیٰ کے کلام میں کچھ خورد برد کر دیتے ہوں یا ان کو کچھ سہو و نسیان ہو جاتا ہو جس سے اصل پیغام میں تغیر ہو جاتا ہو۔ اس وہم کو دور کرنے کے لئے فرمایا جبرئیل امین ہیں ہر قسم کے سہو و نسیان اور خطا بالقصد سے معصوم ہیں خدا نے ان کو امین بنایا ہے، اس لئے خیانت نہیں کر سکتے۔

اس کے بعد عَلَىٰ قَلْبِكَ فرمایا۔ یہ بھی ایک شبہ کا ازالہ ہے۔ بظاہر وہم ہوتا تھا کہ شاید جبرئیل کا القاء بھی شیطانی القاء کی طرح ہوتا ہے جس طرح کوئی جن یا شیطان آدمی کی رگ رگ میں گھس جاتا ہے اسی طرح جبرئیلؑ بھی رسول اللہؐ کے بدن میں حلول کر کے رگ رگ میں سرایت کر جاتے تھے۔ اس وہم کو دور کرنے کیلئے فرمایا کہ جبرئیل کا القاء رسول اللہؐ کے قلب یعنی قوتِ علمیہ پر ہوتا ہے۔ شیطان کی طرح حلول یا سرایت کرنا ضروری نہیں۔ الہام و وحی کے لئے قلب سے حامل وحی کا تعلق ہونا ضروری ہے۔ نفوذ کامل قطر ضروری ہے۔

لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ۔ مخلوق کا خالق سے تعلق صرف اس لئے ہوتا ہے کہ حقائق کائنات یا صفات اور جلوۂ ذات کا انکشاف اس مخلوق پر ہو جائے اور اس غیبی انکشاف کے لئے جبرئیل کی وساطت کی کوئی ضرورت نہیں پھر جبرئیل کی معرفت کلام کا نزول کیا معنی اور کیا غرض رکھتا ہے۔ اسی غرض کو فقرۂ بالا میں بیان فرمایا جس کا حاصل یہ ہے کہ نزولِ وحی کی غرض صرف انکشاف علمی نہیں بلکہ گمراہ انسانوں کو پیام ہدایت پہنچانا اور بصورت خلاف ورزی ابدی ہلاکت سے ڈرانا مقصود ہے، اس لئے پیام ہدایت نازل فرمایا ورنہ محض جلوۂ صفات اور پرتوِ ذات دکھانے کے لئے کسی کتاب اور پیام کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اب رہا یہ خیال کہ جبرئیل کا القاء تو روحانی ہوگا، اس لئے ضرور ہے کہ معانی کا الہام ہو الفاظ رسول اللہؐ کے خود ساختہ ہوں، جبرئیل کی معرفت رسول اللہ کے دل میں معانی کا خطور ہوا ہو اور معانی کو الفاظ کا جامہ پہنا کر رسول اللہؐ نے خود پیش کر دیا ہو۔ اس وہم کو دور کرنے کے لئے فرمایا:۔

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ۔ یعنی جبرئیل کا القاء صرف القائے معانی نہیں بلکہ معانی الفاظ سمیت خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل کئے جاتے ہیں اور قرآن نام الفاظ و معانی کے مجموعہ کا ہے۔ پھر قرآن کے الفاظ فصیح و اضح عربی زبان کے ہیں یعنی قرآن کی زبان خالص عربی ہے۔ سفیان ثوری نے کہا کہ وحی کا نزول ہمیشہ عربی زبان میں ہوا پھر ہر نبی نے اپنی زبان میں ترجمہ کر کے قوم کو سنایا اور قیامت کے دن سریانی زبان میں کلام ہوگا البتہ جنت میں داخل ہونے کے بعد اہلِ جنت عربی میں کلام کریں گے۔

(رواہ ابن ابی حاتم) یہ کلام سفیان ثوری کا ہے حدیث نہیں نہ اس کا کوئی ثبوت ہے۔ در مختار میں جامع الرموز سے نقل کر کے لکھا ہے کہ اہلِ جنت کی زبان عربی اور دری فارسی ہوگی یہ بھی بے بنیاد اور موضوع ہے۔ ثقات نے ایسی کوئی روایت نہیں بیان کی۔

وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ۔ اس آیت کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔

(۱) اِنَّہٗ کی ضمیر رسول پاکؐ کی طرف راجع ہے۔ مطلب یہ کہ رسول اللہؐ کا تذکرہ، آپ کے احوال و صفات کا بیان اور حلیہ وغیرہ کا اظہار گزشتہ انبیاء کی کتابوں میں

فرمایا گیا ہے۔ مختلف انبیاء نے اپنی اپنی قوموں کو حضور ؐ کے خصوصی احوال بتا دیئے تھے اور بشارت دے دی تھی۔ حضرت عیسیٰ ؑ کی بشارت کے متعلق قرآن پاک کی دوسری آیت میں صراحت سے فرمایا ہے۔ وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ یعنی حضرت عیسیٰ ؑ نے بنی اسرائیل سے فرمایا تھا مجھے تمہاری ہدایت کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے۔ میں توریت کی بھی تصدیق کرتا ہوں اور اُس رسول کریم کی بشارت بھی دیتا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا۔

ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا تھا میرے بعد ایک سردار آنے والا ہے میں اس کی جوتی کا تسمہ باندھنے کے لائق بھی نہیں ہوں وہ اپنے سوپ سے پھٹک کر بد کاروں کو نکال کر آگ میں کر دے گا۔ اس کے ہاتھوں میں یہ اختیار ہوگا۔ علماء اہل کتاب نے اگرچہ کتب سابقہ میں جا بجا تحریفیں کر ڈالی ہیں اور اصل کتب کا ملنا ناممکن ہوگیا ہے تاہم موجودہ کتب میں جو کچھ ملتا ہے اس میں بھی اتنی پیشین گوئیاں اور بشارتیں موجود ہیں جن کو جمع کرنے سے طویل الذیل کتابیں بن جائیں گی۔ ہم مختصر آچند بشارات نقل کرتے ہیں۔ اشعیاء نبی کی کتاب کے ساٹھویں باب میں ہے۔

"اُٹھ روشن ہو کہ تیری روشنی آئی اور خداوند کے جلال نے تجھ پر طلوع کیا۔ دیکھ کہ تاریکی زمین پر چھا جائے گی اور قوموں پر بھی، لیکن خداوند تجھ پر طلوع کرے گا اور اس کا جلال تجھ پر نمودار ہوگا۔ قومیں تیری روشنی میں اور بادشاہ تیرے ظہور کی تجلی میں چلیں گے۔"

اس پیشین گوئی کے بعد تجلی الٰہی کا یہ ظہور قوم عرب کے علاوہ اور کہیں نہیں ہوا۔ اگر اہل کتاب کسی اور کو اس پیشین گوئی کا مصداق قرار دے سکتے ہیں تو ثبوت پیش کریں۔

توریت سفر استثناء کے ۳۳ باب میں ہے "خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ ہی سے وہ جلوہ گر ہوا وہ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لئے تھی۔"

اس کلام کی تفسیر بالکل ظاہر ہے سینا سے خداوند کے آنے کا مطلب تو یہی ہے کہ حضرت موسیٰ پر کوہ طور کے مقام میں تجلی الٰہی ہوئی۔ رہے شعیر اور فاران تو شعیر مدینہ کے باہر ایک پہاڑ ہے اور فاران مکہ کا پہاڑ ہے۔ رسول اللہ ؐ کا ظہور کوہ فاران سے ہوا پھر مدینہ میں اقامت گزین ہوئے اور وہاں کوہ شعیر سے نور رسالت چمکا۔ اس کے داہنے ہاتھ میں آتشیں شریعت یعنی قرآن بھی تھا اور دس ہزار صحابیوں کے ساتھ مکہ بھی آپ نے فتح کیا۔ اس سے زیادہ واضح تعین کے ساتھ اور کیا ہو سکتی ہے۔

اسی طرح کتاب اشعیاء کے ۶۰ اور ۶۱ اور ۶۲ باب میں صراحت ہے اور تفصیل کے ساتھ بشارتیں موجود ہیں جن کو بخوف طوالت ہم نقل کرنے سے معذور ہیں۔

(۲) دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن یعنی اس کے اصول نرالے نہیں بلکہ کتب سابقہ میں موجود ہیں۔ تمام شرائع الٰہیہ اصول کے اعتبار سے متحد ہیں۔ اختلاف صرف بعض فروع میں ہے۔ اس سے قرآن کے ناسخ ہونے پر کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ قرآن نے اصول شریعت کو نسخ نہیں کیا بلکہ کتب سابقہ میں جو تفصیلی احکام جزئیہ تھے ان میں سے بعض کو بمصلحت منسوخ کیا ہے۔ اس سے یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کتب سابقہ کی محض نقل ہے کیونکہ رسول پاک اُمّی تھے، کتب سابقہ کو پڑھا نہ تھا نہ کسی سے سنا تھا پھر نقل کے کیا معنی۔ ہاں قرآن نے تائید ضرور کی ہے اور وہ تائید محض اس وجہ سے ہے کہ شریعت الٰہیہ ایک ہے انبیاء مختلف ہیں مگر ایک ہی پیام کے حامل ہیں، اس لئے نہ کسی آسمانی کتاب کو اصل کہا جاسکتا ہے نہ کسی کو نقل۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر کتاب دوسری کتاب کی تائید کرتی ہے۔

اَوَلَمْ یَکُنْ لَّهُمْ اٰیَةً الخ چونکہ یہ سورت مکی ہے، اس لئے قرآن کا اس جگہ یہ دعویٰ کرنا کہ علمائے بنی اسرائیل بھی رسول اللہ ؐ کے احوال، صفات اور حلیہ سے واقف ہیں۔ عجیب اعجازی دعویٰ اور زبردست پیشین گوئی ہے۔ نزول سورت کے وقت تک مدینہ میں اسلام نہ پھیلا تھا، علمائے بنی اسرائیل سے کوئی گفتگو نہ ہوئی تھی، اس لئے قریش اور اہل مکہ کے مقابلے میں یہ پُر زور دعویٰ کرنا محض جرأت صادقانہ ہے۔ قریش اور دوسرے اہل مکہ دین الٰہی کا حال اور علم کا خازن بنی اسرائیل کے علماء کو جانتے تھے، اس لئے خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ اسرائیلی علماء رسول اللہ ؐ (کے احوال خصوصی، صفات اور حلیہ وغیرہ) کو بخوبی شناخت کرتے ہیں۔ یہ رسول اللہ ؐ کی صداقت کی بڑی نشانی ہے چنانچہ واقعہ بھی ایسا ہی تھا۔ حضور کی بعثت سے قبل ہی بحیرا راہب نے حضور ؐ کو شناخت کر لیا تھا اور ابو طالب سے کہہ دیا تھا کہ یہ وہی نبی معلوم ہوتا ہے جس کی بشارت مسیح نے دی تھی۔ پھر دعوائے رسالت کے بعد بعض اسرائیلی علماء نے تصدیق کی۔ پھر حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں بیت المقدس کے محاصرہ کے وقت جب فاروق اعظم خود تشریف لے گئے اور بیت المقدس کے سب سے بڑے راہب نے آپکو شناخت کیا تو اپنی کتابوں کی صراحت کے مطابق شہر کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ اس کے علاوہ علمائے بنی اسرائیل پیغمبر آخر الزماں کے پیدا ہونے کے تو منتظر ہی تھے تمام صفات و احوال و بشارات کو اپنی مذہبی کتابوں میں پڑھتے ہی تھے، لیکن جب حضور کی بعثت ہوئی تو دنیوی مصالح کی خاطر منکر ہو گئے اور بقدر امکان حضور کے صفات و احوال کو اپنی کتابوں سے نکال ڈالا۔

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ الخ۔ بعض کافروں کا خیال تھا کہ چونکہ محمدؐ عربی ہیں، اُن کی زبان عربی ہے، قرآن بھی عربی میں ہے، اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خود ہی بنا لیا ہے۔ خدا تعالیٰ اس شبہ کے جواب میں فرماتا ہے کہ اگر محمدؐ کے علاوہ کسی عجمی شخص پر اس قرآن کا نزول ہوتا تب بھی اس کی تصدیق یہ لوگ نہ کرتے یعنی صاف کہہ دیتے کہ اس شخص کی زبان تو عربی ہے نہیں پھر عربی کتاب یہ کیسے بنا سکتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کسی دوسرے نے اس کو سکھا دیا ہے۔ عام مفسرین کو یہاں دھوکہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے آیت کا مطلب اُلٹا بیان کیا ہے لکھا ہے کہ اگر قرآن کو کسی عجمی زبان میں نازل کیا جاتا تب بھی یہ اس کی تصدیق نہ کرتے۔ یہ مطلب غلط ہے مطلب صحیح وہی ہے جو ہم نے کہا ہے۔ ہاں ایک مطلب اور یہ ہو سکتا ہے کہ اگر قرآن کو کسی عجمی آدمی پر نازل کیا جاتا (اور قرآن بھی عجمی زبان میں ہوتا) تب بھی یہ لوگ نہ مانتے اور کہہ دیتے کہ کتاب الٰہی غیر زبان میں ہے ہم اس کو کیا جانیں۔ واللہ اعلم۔

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ الخ۔ یعنی جس طرح رسول اللہ کو باران رحمت کی طرح بھیجنا اور قرآن کو نور آفتاب کی طرح اتارنا ہمارا کام ہے اسی طرح رسول اللہؐ کی رسالت اور قرآن کی صداقت کا انکار بھی قلوب کافرین کے اس گندے بُودار مادہ کی وجہ سے ہے جس کو ہم نے ان کے دلوں میں داخل کیا ہے اور چونکہ ہم نے ان کے دلوں میں انکار کو داخل کر دیا ہے، اس لئے یہ کسی طرح ایمان نہ لائیں گے۔ ہاں اگر اچانک بغیر شعور و خبر کے اللہ کا عذاب ان کی نظروں کے سامنے آجائے تو مان لیں گے اور اس وقت مہلت کے طالب ہوں گے، مگر اس وقت کا ایمان اضطراری ہوگا اختیار کو اس میں کوئی دخل نہ ہوگا اور اضطراری ایمان قابل قبول نہیں۔

فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ۔ یعنی جب علامات مرگ طاری ہو جائیں گی اور موت کا فرشتہ سامنے آجائے گا اور عذاب دکھائی دینے لگے گا تو اس وقت ان کافروں کو تمنا ہوگی کہ کاش ہم کو کچھ مہلت مل جاتی کہ ہم ایمان لا کر نیکیاں کر لیتے۔

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ (یعنی اس وقت تو (بطور مزاح) یہ لوگ عذاب کے فوری نزول کے طالب ہیں، لیکن مرنے کے وقت مہلت کے طالب ہوں گے۔ اچھا بالفرض اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ الخ۔ اگر برسا برس کی مہلت ان کو مل بھی جائے اور آخر پھر عذاب آئے تو اس مہلت سے کیا فائدہ۔ نفع تو ایمان سے وابستہ ہے۔ عذاب سے رہائی بغیر ایمان کے نہیں ہو سکتی۔ حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن کافر کو جہنم کے اندر ڈال کر ذرا دبا کر اوپر کو ابھار لیا جائے گا اور اس سے دریافت کیا جائے گا کیا تو نے کبھی راحت دیکھی تھی؟ کافر کہے گا کبھی نہیں الخ۔ (ابن کثیر)

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ۔ لوگ اعتراض کرتے تھے اور اب بھی بیہودہ دماغ والے کہتے ہیں کہ پیام الٰہی بندوں تک پہنچانے اور ضابطۂ ہدایت نازل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ عقل انسانی بھلائی برائی کو سوچنے کے لئے کافی ہے۔ اس کا جواب ایک تو آیت تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ میں دیا تھا دوسرا جواب اس آیت میں دیا ہے۔ حاصل جواب یہ ہے کہ نیکی اور بدی توام ہیں اور بدی کی پاداش بھی یقینی ہے۔ اگر کسی بستی والے زیادہ تمرد کار ہو جائیں تو ان کی بدکاری لازم ہے اور یہی ضابطۂ قدرت ہے کہ زمین پر فتنہ و فساد بپا کرنے والوں کے وجود سے سطح زمین کو خالی کر لینا ضروری ہے، لیکن اتمام حجت کے لئے آخری نصیحت کرنی بھی لازم ہے۔ عقل و فطرت اگرچہ بہترین کارفرما ہیں، لیکن جب بصیرت پر پردہ پڑ جائے اور سمجھنے کی قوت ماؤف ہو جائے تو برے بھلے میں امتیاز پیدا کرانے کے لئے پیغمبروں کا آنا اور ہدایت ناموں کا پیش کرنا بھی ضروری ہے، اس لئے تمام انبیاء مختلف اوقات میں آئے اور عذاب الٰہی سے ڈرایا اور معصیت و کفر کے نتائج بد سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد بھی جن لوگوں نے سرتابی کی ان کو تباہ کر دیا گیا۔

ذِكْرٰى وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۔ لیکن شبہ ہو سکتا تھا کہ گزشتہ اقوام کا نتیجہ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ کیا ضروری ہے کہ اس امت کا بھی وہی حشر ہو جو پہلی قوموں کا ہوا۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ یہ قرآن یاد داشت ہے، ہدایت نامہ ہے، پیام نصیحت ہے۔ اگر اس قوم کو بھی بغیر نصیحت کئے ہلاک کر دیا جاتا تو عدل الٰہی کے خلاف ہوتا۔ دوسری قوموں کو نصیحت آئی اور اس امت کے لئے کوئی ہدایت نامہ نہ بھیجنا انصاف ربوبیت کے منافی ہے اور خدا ظالم نہیں ہے۔ اس کے بعد جو بھی اس ہدایت نامہ پر کرے گا کامیاب ہوگا۔ اگر مخالفت کرے گا برباد کر دیا جائے گا۔

وسواسی دماغ رکھنے والے کور بصیرت لوگ کہتے تھے اور اب بھی بعض نافہم کہتے ہیں کہ کاہنوں کے پاس بھی کوئی غیبی مخلوق آتی تھی اور ان کو آئندہ واقعات کی اطلاع دیتی تھی اور وہ بھی فصیح مسجع کلام بولتے تھے پھر ہم کو کیسے یقین ہو سکتا ہے کہ قرآن پیام الٰہی ہے اور فرشتہ کی وساطت سے اس کو نازل کیا گیا ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ کوئی جن رسول اللہؐ کا دوست ہو اور وہ سکھا جاتا ہو اور رسول اس کے قول کو کلام الٰہی کہتے ہوں۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا:۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ الخ۔ کہ شیاطین اور خبیث جنات نے اس کو نازل نہیں کیا ہے۔ اس کی تین وجوہ ہیں (۱) فطرۃً شیاطین کے لئے یہ نقل

سزاوار نہیں۔ کیونکہ خبیث جنات اور شیاطین کو ناپاک مضامین سے دلی رغبت ہے۔ ناپاک باتیں ان کی خوراک ہیں۔ روح کو سنوارنے والے مضامین، دل کو پاک رکھنے والے مطالب اور اخلاق کو صاف کرنے والے امور سے ان کو نفرت ہے۔ توحید معرفت فانی سے نفرت اور باقی سے رغبت۔ غرض قرآن کا پورا نامۂ ہدایت شیاطین کو کیا معلوم۔ ان کو تو وہی شہوت آفرین، لذت آگیں روح پرور تاریکی اور دل پر زنگ پیدا کرنے والی باتیں معلوم ہیں جو انسان کو برباد کرنے والی ہیں اور اگر معلوم بھی ہوں تو وہ ایسی تعلیم دوسروں کو کس طرح دینے لگے جن سے ان کو خود عداوت ہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ تعلیم قرآنی کی ان میں قدرت بھی نہیں ہے۔ کسی مقدس پاک باز قلب تک ان کی رسائی ہی ناممکن ہے پھر وہ القا کس طرح کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں کی فطرت ناقص ہے ان کے قلوب تک رسائی ہوتی تو ممکن ہے، لیکن جن کی فطرت کامل ہے، جن کے علم و ادراک کا درجہ تخیل بلکہ تفکر سے بھی بالاتر ہے ان کے قلوب تک یہ شریر ناقص الفطرت شیاطین کیسے پہنچ سکتے ہیں۔

(۳) اور بالفرض اگر مان بھی لیا جائے کہ پاکباز ہستیوں کے قلوب تک شیاطین کی رسائی ممکن ہے، لیکن ملاءِ اعلیٰ اور عالم ملکوت تک ان کی رسائی ناممکن ہے جہاں سے قرآن کا نزول ہوا ہے وہاں ان کی دسترس نہیں ہو سکتی کیونکہ عالم روحانیات اور خطیرۃ القدس تک پہنچنے سے خدا تعالیٰ نے شیاطین کو روک دیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ بعثت نبوی سے پہلے جنات آسمان (عالم ملکوت) تک چڑھ جایا کرتے تھے۔ وہاں سے کوئی بات سن جاتے تھے۔ اس ایک بات میں سو جھوٹ ملا کر ساحروں اور کاہنوں سے کہہ دیا کرتے تھے، لیکن بعثت نبوی کے زمانے شیطانوں کو وہاں جانے سے روک دیا گیا۔ اس کی مکمل تشریح ہم تعبو میں لکھ چکے ہیں۔ جب کافروں کے بے سروپا بیہودہ شبہات کا ازالہ کامل طور پر فرما دیا تو اب اصل مدعا کی تلقین کرنے کی ہدایت فرماتا ہے۔

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ الخ۔ ہر پیغمبر کی بعثت کا اصل منشا اشاعت توحید ہے۔ خصوصاً رسول پاک کے زمانہ میں تو تمام دنیا ہی کفر و شرک کی تاریکی میں پھنسی ہوئی تھی۔ عرب، ایران، ترکستان، روم، ہند، چین، مشرق، مغرب سبھی نے خدا کو چھوڑ رکھا تھا اور اپنی خواہش کے مطابق جدا جدا معبود بنا رکھے تھے۔ یہاں تک کہ اہل کتاب بھی جوہرِ توحید کھو بیٹھے تھے۔ یہودی عزیر کو ابن اللہ کہتے تھے، نصاریٰ تثلیث کے قائل تھے مسیح کو خدا کا بیٹا اور مریم کو خدا کی بیوی مانتے تھے۔ اسی طرح کے عقائد کفریہ و شرکیہ پھیلے ہوئے تھے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اصل مقصد سوا اس کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ کل عمرانی دنیا میں توحید کی اشاعت کی جائے اور شرک سے بچایا جائے۔

فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ۔ یعنی اگر شرک کرو گے تو تم بھی عذاب الٰہی میں ماخوذ ہو گے۔ ظاہر ہے کہ رسول پاکؐ کی ذاتِ پاک سے شرک کے صدور کا احتمال بھی نہیں ہو سکتا تھا، پھر کیوں اس قسم کا دھمکی آمیز خطاب حضور کو کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شرک انتہائی بری چیز ہے۔ آیت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اگر جلیل القدر نبی سے بھی بالفرض شرک کا صدور ہو جائے تو وہ بھی راندۂ درگاہ ہو جائے گا اور اس کی جلالت قدر عذاب الٰہی سے اس کو نہ بچا سکے گی۔ رہی یہ بات کہ اشاعتِ توحید کیسے کی جائے، اعلانِ حق کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے، پوسٹر، پمفلٹ، ہینڈ بل، اشتہارات، ریڈیو، اخبار غرض موجودہ دنیا کا استعمال کردہ کوئی طریقہ اس زمانہ میں رائج نہ تھا پھر اسلامی پروپیگنڈہ کرنے کی کیا صورت اختیار کرنی مناسب تھی۔ اس کے متعلق فرماتا ہے:۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ کہ اپنے قریبی خاندان والوں کو تبلیغ کرو اور عذاب الٰہی سے ڈراؤ۔ بات یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک جس کا مرتبہ زیادہ ہوتا ہے اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے۔ نبوت سب سے بلند مرتبہ ہے، اس لئے انبیاء کا امتحان بھی سخت ترین ہوتا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان بھی سب سے بہت سخت لیا گیا۔ دور کے رہنے والوں کو پیام بھیجنا اور غیر ملکوں میں انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کچھ زیادہ صبر آزما اور حوصلہ فرسا چیز نہیں ہے۔ کیونکہ اجانب کی نفرت و عداوت سے کچھ زیادہ ضرر پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ تکلیف دہ اور حوصلہ شکن اور تنگ دل کرنے والی چیز صرف یہ ہے کہ انسان کے اقارب اور خاندان والے اس کی دشمنی پر کمربستہ ہو جائیں۔ انقلاب تحریک خصوصاً مذہبی انقلاب کی تعلیم یقیناً دوست کو دشمن اور یگانہ کو تشنہ خون بنانے والی چیز ہے۔ اسی بنا پر جب حضورؐ نے اقارب کو جمع کر کے حکم الٰہی سنایا تو یگانے بیگانے بن گئے بلکہ مال، عزت اور جان کے دشمن ہو گئے۔ جو بھی تکلیفیں اور مصیبتیں اپنے خاندان والوں کے ہاتھوں سے حضور کو اٹھانی پڑیں ان کا بیسواں حصہ بھی غیروں کے ہاتھوں سے برداشت کرنے کا اتفاق نہ پڑا۔

مذکورۂ بالا وجہ کے علاوہ قریبی خاندان والوں کو سب سے پہلے تبلیغ کرنے کے حکم کی وجہ یہ بھی ہے کہ گھر والے اور قریبی رشتہ دار حضور والا کے چال چلن، طور طریق اور معاشرت و اخلاق سے واقف تھے۔ آپ کی کل زندگی ابتدا سے ان کے پیشِ نظر تھی، اس لئے اگر ایمان لانے کی کچھ قوی امید ہو سکتی ممکن تھی تو انہی سے تھی۔

پھر ایک خاص وجہ یہ تھی کہ ہر خیر و فائدہ کا استحقاق اہل قرابت کو ہی سب سے پہلے حسب تفاوت درجہ ہوتا ہے جیسے سلوک، مالی امداد، سرپرستی اور خبرگیری وغیرہ کے اول ترین مستحق قریبی رشتہ دار ہی ہوتے ہیں۔ اسلام اور اقرار توحید سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس فانی دنیا کی کوئی دولت عزت، حکومت وغیرہ اس نعمت عظمیٰ کا مقابلہ نہیں کر سکتی اس لئے سب سے اول اقارب ہی کو تبلیغ کرنے کا حکم ہوا۔

اگرچہ اسلام میں تمام انسانوں کا استحقاق برابر ہے، مگر تقدم و تاخر میں ضرور فرق ہے، اس لئے سب سے اول اقارب ہی کو تبلیغ کرنے کا حکم ہوا۔

متعدد طرق سے حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ جب آیت وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ نازل ہوئی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ بکری کی ران (کا سالن) اور ایک صاع (کی روٹی) اور پیالہ دودھ تیار کر رکھو۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ پھر مجھے حکم دیا کہ بنی ہاشم کو دعوت میں لے آؤ۔ میں لے آیا۔ دعوت میں آنے والوں کی تعداد ایک کم یا ایک اوپر چالیس تھی اور ان میں سے ہر شخص تنہا اونٹ کا سہ سالہ بچہ مع شوربہ کے کھا سکتا تھا۔ جب کھانے کا برتن سامنے آیا تو حضورؐ نے کسی قدر سر گوشت اوپر سے اٹھا کر فرمایا کھاؤ چنانچہ سب نے سیر ہو کر کھا لیا اور کھانا ویسے ہی رہا جیسے پہلے تھا بہت ہی خفیف کمی نمودار ہوئی تھی۔ پھر دودھ کا پیالہ سامنے لایا گیا تو سب نے سیر ہو کر پی لیا مگر دودھ پھر بھی باقی رہا۔ کھانے سے فراغت کے بعد حضورؐ نے ان سے گفتگو کرنی چاہی، لیکن حاضرین نے حضورؐ کی گفتگو سے پہلے کہنا شروع کیا کہ آج کی طرح کبھی ہم نے سحر نہیں دیکھا حضورؐ خاموش رہے۔ پھر حضورؐ نے مجھ سے فرمایا کہ ایک ران اور ایک صاع کا کھانا میرے لئے تیار کراؤ۔ اس کے بعد بنی ہاشم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تم میں سے کون میرے دین کی ضمانت کرتا ہے۔ جو دین کی ضمانت کرے گا وہ میرے اہل میں میرا خلیفہ ہوگا۔ کسی نے کچھ جواب نہ دیا۔ عباس بھی موجود تھے وہ بھی خاموش رہے۔ میں بھی عباس کی بزرگی کے لحاظ سے خاموش رہا۔ حضورؐ نے دوبارہ پھر فرمایا۔ عباس پھر بھی خاموش رہے۔ میں نے عباس کا سکوت دیکھ کر عرض کیا یا رسول اللہ! میں (ضامن ہوں) (رواہ ابن ابی حاتم)

بخاری و مسلم وغیرہما نے بروایت ابن عباسؓ بیان کیا ہے کہ جب آیت مذکورہ نازل ہوئی تو حضورؐ نے کوہ صفا پر چڑھ کر دور کے قبائل کو آواز دی۔ یہاں تک کہ قریش کے تمام قبائل کے نام لئے۔ سب جمع ہو گئے اور جو خود نہ آسکا اس نے اپنا نمائندہ بھیجا۔ قریش بھی آ گئے۔ حضور والا نے ارشاد فرمایا اگر میں تم کو بتاؤں کہ (پہاڑ سے اس طرف) وادی میں تم پر چھاپہ مارنے کے لئے لشکر جمع ہو رہا ہے تو کیا تم میری تصدیق کرو گے؟ حاضرین نے جواب دیا بے شک! کیونکہ ہم نے بارہا آپ کی صداقت کا تجربہ کیا ہے کبھی کوئی بات جھوٹ نہیں کہی۔ حضورؐ نے فرمایا اچھا تو میں تم کو مطلع کرتا ہوں کہ ایک سخت عذاب آنے والا ہے۔ یہ سن کر ابولہب نے کہا تیرے لئے تباہی ہو۔ کیا اسی لئے تو نے ہم کو جمع کیا تھا۔

بخاری نے بروایت ابوہریرہؓ اتنا زائد روایت کیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا تھا اے قریش! تم اپنا بندوبست خود کر لو۔ میں تمہارے اوپر سے خدا کا عذاب دور نہیں کر سکتا۔ اے (اولاد) عبد مناف میں خدا کے مقابلے میں تمہارے کچھ کام نہ آؤں گا۔ اے عباس بن عبد المطلب میں خدا کے خلاف تیرے کچھ کارآمد نہ ہوں گا۔ اے صفیہ! میں اللہ کے مقابلے پر تیرے لئے کچھ سود مند نہ ہوں گا۔ اے فاطمہ بنت محمد! تو میرے مال میں سے جو کچھ چاہے مانگ لے لیکن خدا کے مقابلے میں میں تیرے کچھ کام نہ آؤں گا۔

امام احمد نے بروایت عائشہ صدیقہؓ بھی اسی کی مثل نقل کیا ہے۔ وقد رواہ مسلم ایضاً۔ امام احمد نے بروایت ابوہریرہ بیان کیا ہے کہ جب آیت وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ نازل ہوئی تو قریش اور تمام عوام و خواص کو حضورؐ نے جمع کیا اور فرمایا اے گروہ قریش اپنے کو آگ سے بچاؤ۔ اے اولاد عبد المطلب! اپنے کو آگ سے نکالو۔ اے گروہ کعب اپنی جانوں کو آگ سے محفوظ کر لو۔ اے گروہ بنی ہاشم! اپنے آپ کو آگ سے دور رکھو (اے فاطمہ بنت محمد! تو اپنی جان کو آگ سے بچا اللہ کی قسم میں خدا کے مقابلے میں تمہاری مدد کرنے کا قابو نہیں رکھتا۔ ہاں میرا رشتہ ملا ہوا ہے سو میں اس کے حق کو پورا کروں گا (رواہ الترمذی والنسائی وغیرہما)

ابو یعلیٰ نے حضرت ابوہریرہ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا اے اولاد قصی! اے اولاد ہاشم! اے اولاد عبد مناف! میں تمہارا نذیر ہوں، موت بگاڑنے والی ہے اور قیامت وعدہ گاہ ہے۔ حضرت علیؓ کی روایت میں آیا ہے کہ حضورؐ نے اپنے گھر والوں کو جمع کیا جن کی تعداد ۳۰ تھی۔ حضورؐ نے ان سے فرمایا کون ضامن ہوتا ہے میرے دین کا اور میرے وعدوں کا جو ضامن ہو جائے گا وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا اور میرے لوگوں میں خلیفہ ہوگا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے تین مرتبہ یہ آواز دی اور ہر بار میں نے اپنے آپ کو پیش کیا (رواہ احمد)

ایک شبہ آیت مذکورہ سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول پاکؐ کو ڈرانے اور پیام پہنچانے کا حکم صرف اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کی نبوت عام نہ تھی۔ اگر عام ہوتی تو یہ تخصیص کیوں ہوتی۔

ازالہ حضور والا کی نبوت عمومی تھی۔ جس طرح جہاد کا حکم ترتیبی ہے اسی طرح تبلیغ کا حکم بھی ترتیبی ہے۔ سب سے پہلے اہل قرابت کو ہدایت کرنے کا حکم ہوا پھر حکم ہوا۔ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ۔ اس آیت میں صرف اہل مکہ کو ہدایت کرنے کا حکم ہوا پھر حکم ہوا۔ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى

وَمَنْ حَوْلَهَا اس آیت میں عموماً اہلِ مکہ اور مکہ کے آس پاس رہنے والوں کو تبلیغ کرنے کا حکم ہوا پھر سب کے بعد فرمایا لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ یعنی میں تم کو اور ان تمام لوگوں کو جن کو میرا پیام رسالت پہنچے ڈرانے کے لئے آیا ہوں۔ اس آیت میں تمام اقوامِ عالم کو دعوتِ توحید دینے کا اعلان فرمایا۔ اسی بنا پر حضور والاؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ قسم اس خدا کی جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے اس امت کا ہر وہ شخص جس کو میری رسالت کی اطلاع پہنچ گئی ہو خواہ وہ یہودی ہو یا عیسائی اگر ایمان نہ لائے گا تو لازمی آگ میں جائے گا۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ تبلیغ قومی کا نتیجہ دو ہی شکلوں میں نمودار ہو سکتا ہے یا تو لوگ مانیں گے اور اپنے راہنما کی ہدایت پر عمل کریں گے یا نہ مانیں گے اور بدستور سرتابی کرتے رہیں گے، اس لئے خدا تعالیٰ نے دونوں گروہوں کے متعلق حکم اپنے حبیب کو آیت مذکورہ میں دے دیا اور فرمادیا کہ جو مومن تمہارا ساتھ دیں ان کے لئے اپنے اخلاق اور تواضع کے پر بچھا دو۔ یعنی جس طرح پرندہ اپنے بچوں کو پروں میں لے لیتا ہے تم بھی اپنے سایۂ رحمت میں اہلِ ایمان کو لے لو اور جو لوگ تمہارا حکم نہ مانیں ان سے علیحدہ ہو جاؤ اور ان کے اعمال سے اپنی بیزاری کا اعلان کردو۔ گویا اس آیت میں خدا تعالیٰ نے رشتۂ قرابت اور وصلات مودت سے بڑھ کر رشتۂ ایمانی کو قرار دیا کہ جو لوگ اسلامی بھائی ہیں وہ تمہارے قرابتدار ہیں۔ اگرچہ نسب و وطن کے اعتبار سے بہت ہی دوری رکھتے ہوں اور جو لوگ رشتۂ اسلامی میں منسلک نہیں ہیں وہ اگرچہ قریب ترین قرابتدار ہوں، مگر ان کا تم سے کوئی تعلق نہیں۔

بات یہ ہے کہ انسانی دنیا میں ربط ضبط، میل ملاپ، مواصلت اور تعلقات پیدا کرنے والے صرف چھ ذرائع تھے۔ انہی چھ عواطف و دواعی کے زیر اثر اقوام کی تفریق جتھوں اور گروہوں کا امتیاز اور پارٹیوں اور امتوں کی حدبندی تھی۔

پہلا نمبر قرابتداروں کا تھا۔ آدمی کے والدین اولاد اور حسب ترتیب درجہ دوسرے رشتہ دار مل کر ایک جدی یا ذوی الارحام یا ایک قبیلے کے افراد کہلاتے تھے اور اس جذبہ کی جاہلیت و بربریت کے دور میں زیادہ کارفرمائی تھی۔

دوسرا نمبر سلسلۂ ازدواج کا تھا۔ بیوی اور اس کے رشتہ دار حسب تفاوت مرتبہ قبیلہ کی تنظیم، ترتیب اور ساخت میں دخل رکھتے تھے۔

تیسرا نمبر صداقت اور دوستی کا تھا۔ حلیف اور رجاہ کا شمار اسی نمبر کے ذیل میں ہے۔ دورِ جاہلیت میں رشتۂ دوستی برادری اور مواخاۃ پر ترجیح حاصل کر لیتا تھا۔

چوتھا نمبر محبت و عشق کا تھا۔ عاشق اپنے محبوب کی طرف داری کا وہ غالب جذبہ رکھتا تھا کہ اس کو محبوب کے اشارہ ابرو پر اپنی جان اور تمام جذبات قربان کرنے میں کوئی دریغ نہ ہوتا تھا۔ کبھی جذبۂ محبت اگر کمزور ہوتا تھا تو قرابت کا عاطفہ اس پر غالب آجاتا تھا، لیکن ایسا بہت ہی کم ہوتا تھا۔

پانچواں نمبر جغرافیائی حدود اور اشتراک لسانی کا تھا۔ ایک زبان بولنے والے اور جغرافیہ کی حدبندی کئے ہوئے ایک ملک کے رہنے والے ایک قوم کے افراد کہلاتے تھے اور دوسری زبان بولنے والوں یا دوسرے ملکوں کے رہنے والوں کے مقابلے میں یکجہتی سے کام لیتے اور حمیت وطنی کے زیر اثر آجاتے تھے۔ جاہلی دور میں یہ عاطفہ بھی بہت ہی طاقتور تھا۔ اکثر بڑی قوموں کا سنگِ تقویم یہی جذبہ تھا۔

چھٹا نمبر عاطفۂ انسانیت کا تھا۔ انسان کو دوسرے انسان سے خواہ وہ کوئی ہو جو رابطہ اور میلان ہوتا تھا وہ انسان کے علاوہ دوسرے حیوانوں سے نہ تھا، مگر یہ جذبہ وحشت کے دور میں بہت ہی ضعیف تھا۔

اسلام نے ایک جذبۂ الفت کا اور اضافہ کیا جس کا مرتبہ جذبۂ انسانیت عامہ کے نیچے اور باقی تمام جذبات کے اوپر قرار دیا۔ اگرچہ تمام جذباتِ الفت کو اسلام نے اپنی اپنی جگہ ضروری اور لازم سمجھا، مگر پانچوں جذبات سے فوق جذبۂ دینی کو جگہ دی۔ اگر دوسرے جذبات کا مذہبی جذبہ سے مقابلہ کسی وقت ہو جائے تو اسلام کی تعلیم کے بموجب مذہبی جذبہ کو کارفرما ہونا چاہیئے۔ قرابت، دوستی، زوجیت، محبت، اشتراک لسانی وطنیت سب اپنی اپنی جگہ قابل لحاظ ہیں، مگر کافر بھائی سے اجنبی مسلم بہتر ہے۔ غیر مسلم دوست سے مسلم دشمن قابلِ ترجیح ہے۔ کافر بیوی پر مسلمہ اجنبیہ عورت فوقیت رکھتی ہے۔ غیر مسلم برادرانِ وطن سے غیر وطنی مسلم اخوت کا زیادہ مستحق ہے۔ گویا اسلام نے اپنی انقلابی تحریک کی سیاسی، تمدنی، معاشرتی یہاں تک کہ اقتصادی اور اخلاقی بنیاد اسی مذہبی جذبہ پر قائم کی اور کل اہلِ اسلام کو عمومی برادری کے رشتہ میں منسلک کر دیا۔ اسی لئے آیت مذکورہ میں خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ مومنوں کے لئے اپنے بازو بچھا دو اور کافروں کے اعمال سے اپنی بیزاری کا اعلان کر دو یعنی ایمان کو کفر کو حد فاصل قرار دو۔ اس میں قرابت، مودت، زوجیت، جوار وطنیت اور اشتراک کی لسانی کا لحاظ نہ کرو، جو مومن ہے وہ تمہارا دوست ہے خواہ کوئی ہو، کہیں کا رہنے والا ہو، کوئی زبان بولنے والا ہو، کسی رنگ کا ہو اور جو کافر ہے وہ تمہارا دشمن ہے خواہ رشتۂ قرابت کے لحاظ سے وہ تمہارا بھائی ہی ہو۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۔ مذہبی انقلاب کی تحریک پیش کرنے کا لازمی نتیجہ یہ نکل سکتا تھا بلکہ نکلا بھی تھا کہ اپنے عزیز ترین قرابتدار دشمن بن گئے معاند مخالفین کے پیدا ہو گئے اور چونکہ انقلاب کی تعلیم بظاہر تخریبی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر تعمیری پروگرام کے لئے گزشتہ طریقِ زندگی کی تخریب لازم ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اصلاحات کی مخالفت کرنے والوں کا گروہ زیادہ ہوتا ہے۔ خصوصاً وہ لوگ زیادہ عناد و فساد کا مظاہرہ کرتے ہیں جن کے پاس دولت، عزت اور وجاہت و سیادت ہوتی ہے کیونکہ انقلاب کی کارفرمائی کے بعد ان کو امتیازی اوصاف کا فقدان نظر آتا ہے۔ چنانچہ رسول پاکؐ کی اصلاح آفریں پیام کی مخالفت بھی سرداروں اور سرمایہ داروں نے زیادہ کی تمام رؤسائے مکہ مخالف ہو گئے اور پھر سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ قبیلۂ قریش و کنانہ کے سرداروں نے بھی ان کا ساتھ دیا بلکہ حضورؐ کی مخالفت میں ان سے پیش پیش رہے۔ ان کے پاس کوئی مادی طاقت نہ تھی نہ زیادہ مال تھا نہ جتھے کی کثرت تھی نہ ہمنواؤں کی فراوانی تھی، اس لئے سرکار دوعالم کو تسلی دینے کے لئے خدا تعالیٰ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی جس کا حاصل یہ ہے کہ اس خدا پر بھروسہ رکھو جو تمام کائنات پر غالب بھی ہے اور تم پر رحیم بھی ہے اس کی قدرت و تعرف سے کوئی چیز خارج نہیں اور اس کی رحمت تمہارے شاملِ حال ہے، لیکن کسی کو محفوظ رکھنے کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ حفاظت کرنے والا طاقتور ہو اور حمایت کرنے کے لئے تیار ہو بلکہ اس کو اپنے آدمی کے تمام احوال کی اطلاع ہونی بھی لازم ہے تاکہ ضرورت کے وقت بچاؤ کر سکے۔ اگر اس کو خبر ہی نہ ہو تو وہ کتنا ہی کریم خواہ اور حامی ہو اور کتنا ہی طاقتور ہو، مگر اپنے کی حمایت کرنے اور بچانے کا اس کو موقع ہی نہ ملے گا، اس لئے فرمایا :۔

اَلَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ الخ یعنی وہ تمہاری ہر نقل و حرکت اور سکون و سکوت سے واقف ہے، تمہارے کل احوالِ زندگی اس کی نظر کے سامنے ہیں۔ وہ بینا، دانا اور شنوا بھی ہے، اس لئے وہ ہر طرح سے تمہاری حفاظت کرے گا۔ تم اسی کی ذات پر بھروسہ رکھو۔

عکرمہ کا قول ہے کہ حِيْنَ تَقُوْمُ سے مراد ہے نماز کا قیام رکوع اور سجود۔ ضحاک نے کہا عام اٹھنا مراد ہے۔ خواہ بستر سے اٹھنا ہو یا کسی اور جگہ سے۔ قتادہ، مقاتل حسن بصری اور عطاء خراسانی کہتے ہیں کہ تَقُوْمُ سے مراد ہے تنہا نماز پڑھنا اور تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ سے مراد ہے رسول اللہؐ کا بحالت نماز پس پشت سے مقتدیوں کی حالت کو دیکھنا۔ کیونکہ حضورؐ جس طرح آگے سے چیزوں کو دیکھتے تھے اسی طرح پُشت کے پیچھے سے بھی دیکھتے تھے۔ کیونکہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا تم اپنی صفیں برابر رکھو میں تم کو پسِ پُشت سے دیکھتا ہوں۔

ابن کثیر نے ذکر کیا ہے کہ بزار اور ابن ابی حاتم کی روایت سے ثابت ہے کہ ابن عباسؓ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ تقلب سے مراد ہے رسول پاک کی روحِ مبارک کا منتقل ہونا اور ساجدین سے مراد ہیں انبیاء یا مومنین۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہؐ کے نورِ مبارک یا روحِ پاک کے حامل ہمیشہ انبیاء یا اہلِ ایمان ہی رہے ہیں۔ حضورؐ کے آباؤ اجداد میں کوئی کافر نہیں گزرا۔ اہلِ تشیع نے استدلال کیا ہے کہ حضورؐ کے تمام اسلاف مومن گزرے ہیں۔ عبداللہ، عبدالمطلب، ہاشم، عبد مناف، قصی، کلاب، کعب، مرہ، لوی، غالب وغیرہ سب ہی مومن تھے۔ اس ہدایت اور اس قول کو اگرچہ بیضاوی اور زمخشری وغیرہما نے ذکر نہیں کیا، مگر معالم کے علاوہ سراج وغیرہ نے نقل کیا ہے، مگر علاوہ ضعفِ روایت کے یہ مطلب بوجوہ ذیل خلافِ درایت ہے۔ ساجدین سے مراد اگر انبیاء ہوں تو یہ بداہت کے خلاف ہے۔ کیونکہ انبیاء کا سلسلہ ابتدائے آفرینش سے رسول پاکؐ تک مسلسل نہیں رہا اور اگر اہلِ ایمان ہوں تب بھی غلط ہے کیونکہ بکثرت انبیاء کے باپ کافر گزرے ہیں۔ مثلاً ابراہیمؑ کا باپ آزر بنصِ قرآنی مشرک تھا۔ پھر اگر مان لیا جائے اور تسلیم بھی کر لیا جائے کہ انبیاء کا توارثی سلسلہ ہمیشہ اہلِ ایمان ہی کا گزرا ہے تب بھی سب کا ساجد ہونا ثابت نہیں ہو سکتا۔ مثلاً رسول اللہؐ کے باپ کا نماز پڑھنا کہیں ثابت نہیں، نہ حضورؐ کا بالائی طبقہ نماز پڑھتا تھا بلکہ وہ لوگ نماز سے واقف ہی نہ تھے، اس لئے محض دعویٰ بلا دلیل قابلِ پذیرائی نہیں ہو سکتا امام رازی نے بھی اس روایت کی تضعیف بصورت درایت کی ہے جس کی نقل کرنا موجب تطویل ہے۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ الخ۔ ہم ایک مرتبہ سے زائد لکھ چکے ہیں کہ الہام شیطانی بھی ہوتا ہے اور ملکی بھی، نفسانی بھی اور روحانی بھی۔ عرب کا عقیدہ تھا کہ جن لوگوں کے دلوں میں جنات القاء کرتے ہیں ان میں سے ایک گروہ کاہنوں کا ہے اور دوسرا شاعروں کا، اس لئے رسول اللہؐ کی نبوت پر عام طور سے ستم کیا جا سکتا تھا، لیکن ظاہری تشابہ واقعی اتحاد پر دلالت نہیں کرتا۔ نبوت اور کہانت اور شاعری میں بڑا فرق ہے۔ وحی نبوت کا القائے شیطانی نہ ہونا اوپر کی آیات میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اب کاہنوں اور شاعروں کی امتیازی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔ پہلے کاہنوں کی خصوصیت ظاہر فرمائی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ شیطانوں اور خبیثوں کا نزول انہی لوگوں پر ہوتا ہے جو بہت زیادہ جھوٹے اور بدکار ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ شیاطین عمل اور قول کے اعتبار سے خبیث ہوتے ہیں۔ ان کے عمل میں شر اور قول میں کذب ہوتا ہے، اس لئے ان کا طبعی تناسب بھی انہی لوگوں سے ہوتا ہے جو بدکار اور جھوٹے ہوتے ہیں اور رسول پاکؐ نکو کار خوش اطوار پاک باز صادق و صدیق ہیں پھر ان سے

شیطانوں کو طبعی مناسبت کیسے ہو سکتی ہے اور ان کے قلب تک خبیثوں کی رسائی کیونکر ممکن ہے۔

یُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ - اس فقرہ کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ شیطان چھپے چوری سے عالم ملکوت کی طرف کان لگاتے اور وہاں سے کوئی خبر لے اُڑتے ہیں پھر کاہن اس ایک بات میں سو جھوٹ ملا کر لوگوں سے بیان کرتے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ خبیث آدمی شیطانوں کے القاء کی طرف کان لگاتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ابر میں فرشتے بعض ایسے امور کے متعلق گفتگو کرتے ہیں جو زمین پر ہونے والا ہوتا ہے۔ شیطان ان کی بات کو سن کر لے بھاگتا ہے اور کاہن کے کان میں اس طرح کھن کھن کرتا ہے جیسے کوئی شیشہ کھنکھناتا ہے۔ پس کاہن اس ایک بات میں سو جھوٹ ملا دیتا ہے۔ دوسری روایت میں آیا ہے کہ ہر بات کو جن لے اڑتا ہے اور اپنے دوست کے حلق میں مرغی کی کڑکڑی (کی آواز کی طرح) ڈال دیتا ہے پھر وہ لوگ اس میں سو جھوٹ ملاتے ہیں۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ الخ - شاعری کی بنیاد تخیل پر ہے۔ نفس میں رغبت یا نفرت پیدا کرنا، محبت یا خوف کے جذبہ کو ابھارنا اسی کا کام ہے۔ قرآن پاک نے اپنا اصلاحی پروگرام ترغیبی اور ترہیبی رنگ میں پیش کیا، کفر و معصیت کی بھیانک تصویر کھینچ کر رکھ دی اور عذاب آخرت کا ایسا نقشہ اتارا کہ غیر معتبر کو معتبر کر دیا اسی طرح ایمان و عمل صالح کو ایسا پیکر جمال بنا کر ظاہر کیا کہ بجائے نظر فریب ہونے کے دل اس کی طرف کھنچنے لگے اور ثواب آخرت کی وہ حسین تصویر پیش کی کہ اس کو دیکھنے کے لئے اندھوں کی آنکھوں میں بھی نور پیدا ہو گیا۔ جذبات کو ابھارنے میں قرآن کو شاعری سے بظاہر یک گونہ مشابہت ہے۔ کم فہم لوگوں نے اس ظاہری مشابہت کو دیکھتے ہوئے قرآن کو فقرہ شاعری کہنا شروع کر دیا اور یہ خیال کیا کہ شاعری کا مقصود تو صرف یہ ہے کہ برے کو خوشنما اور اچھے کو بدنما بنا کر پیش کرے اور جذبات میں وقتی ابھار پیدا کرے، لیکن قرآن حقائق و واقعات کی غلط تصویر کشی نہیں کرتا نہ اس کا مقصود فقط جذبات کو ابھارنا ہے، اس کے پیش نظر اصلاح ہے، اس لئے اس کا کام جذبات کو ابھار کر بروئے کار لانا ہے، عمل کی اصلاح اس کی اصل غرض ہے اور عمل کی درستگی جذبات کو ابھارے بغیر ناممکن ہے، اس لئے ترہیبی اور ترغیبی پیرایۂ بیان اختیار کرنا ضروری ہے۔ قرآن پاک نے اسی فرق کی طرف آیت مذکورہ میں رمز کیا اور ارشاد فرمایا کہ بیراہ لوگ شاعروں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ مثلاً دو شاعروں میں جب ہجائیہ مقابلہ ہوتا ہے تو کچھ لوگ ایک کی طرف دار ہو جاتے ہیں اور کچھ دوسرے کے اور یہ طرفداری محض جذبات کے ابھار کا نتیجہ ہوتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ - دیکھو شعراء شاعری کی ہر وادی میں سرگرداں پھرتے ہیں، کبھی مدح کرتے ہیں کبھی مذمت، کبھی تعریف کبھی ہجو۔ جو لائق مدح ہو اس کی مذمت کرتے ہیں اور جو لائق مذمت ہے اس کی مدح کرتے ہیں۔ عشق بازی و فسق و فجور کی باتوں میں آہوں سے آسمان کا گنبد گرا دیتے ہیں، آنسوؤں سے بحر قلزم بہا دیتے ہیں۔ شب ہجر کے طول کو قیامت سے بڑھا دیتے ہیں۔ شب وصال کی عیش و عشرت کے مقابلہ میں جنت الفردوس کو ہیچ بتاتے، بدکار معشوق کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کے مقابلہ میں حسن پیغمبری کی تنقیص کرتے ہیں اور آزادی میں رندو بدکار اور فاسق و معصیت شعار کی استادی کا دم بھرتے ہیں۔ غرض بقول علی بن ابی طلحہ ہر بیہودگی کے دریا میں گھسے چلے جاتے ہیں اور بقول ضحاک و مجاہد بیہودہ کلام کے بیابان میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

وَاَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ - کردار سے انہیں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ کلام میں طومار بندی کرتے ہیں جس میں سے بیشتر حصہ بقول ابن عباس رضی اللہ عنہ جھوٹ ہوتا ہے۔ بہت شاعروں کو نہ کبھی شراب سے واسطہ پڑا نہ وصل یار کا موقع ملا نہ ہجر و فراق کی سختیاں جھیلنی پڑیں، لیکن کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا میخانہ جہنم شکم میں اتار دینے کے عادی ہیں۔ معشوق رعنا سے بارہا ان کو ہمکنار ہونے کا موقع ملا ہے، شب فراق میں اکثر سکرات کی کیفیت ان پر طاری رہی ہے۔ یہ تو عام شاعروں کی حالت ہوتی ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا الخ - لیکن جو شاعر محض شاعر نہیں بلکہ مومن نیکو کار ہیں، بکثرت یاد الٰہی کرتے ہیں اور مظلوم ہونے کے بعد انتقام لیتے ہیں یعنی جب کفار اولیاء اللہ اور مسلمانوں کی ہجو کرتے ہیں تو وہ بھی اپنی شاعری سے کام لیتے اور کفار کی مذمت کرتے ہیں۔ وہ حالت مذکورہ سے مستثنیٰ ہیں۔ ایسے شاعر قابل مذمت نہیں۔

محمد بن اسحاق نے بروایت سالم براد بیان کیا ہے کہ جب آیت وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ نازل ہوئی تو حسان بن ثابت، عبداللہ بن رواحہ اور کعب بن مالک خدمت گرامی میں روتے ہوئے حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ خدا نے جب اس آیت کو نازل فرمایا تو اس کو بخوبی معلوم تھا کہ ہم لوگ شاعر ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہم کو اسی حکم میں شامل فرما دیا۔ حضور اقدس ﷺ نے اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا فقرہ تلاوت فرمایا اور ارشاد فرمایا یہ تم لوگ ہو یعنی تمہاری طرح جو شعراء ہوں وہ مستثنیٰ ہیں۔ اس روایت سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آیت اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کا نزول حضرت حسان وغیرہ شعراء انصار کے متعلق ہوا ہے کیونکہ آیت مکی ہے اور

شعرائے انصار مثلاً حضرت حسانؓ وغیرہ مستثنیٰ تھے بلکہ مقصود یہ ہے کہ نیکوکار مومن جیسے شعرائے انصار تھے مذمت شعراء سے مستثنیٰ ہیں وہ کوئی ہوں کسی زمانے میں ہوں۔

شاعری ممنوع ہے یا مستحسن؟

بتقاضائے مبحث ہم ذرا اس کی تفصیل کرنی چاہتے ہیں۔ ظاہر آیت سے شعراء کی مذمت مترشح ہوتی ہے۔ نیز امام احمد نے بروایت حضرت ابوسعید خدری بیان کیا ہے کہ ایک بار ہم لوگ حضور والاؐ کے ہمرکاب جا رہے تھے۔ مقام عرج میں ایک شاعر اپنے اشعار پڑھتا ہوا سامنے آیا حضورؐ نے فرمایا شیطان کو روک دو۔ اگر تم میں سے کسی کے جوف میں کچ لہو بھر جائے تو اس سے بہتر ہے کہ اس کا جوف شعر سے بھرا ہو۔ اسی قسم کی دوسری روایات بھی منقول ہیں جن سے شاعری اور شاعروں کی مذمت ثابت ہوتی ہے، لیکن ان روایات کے مقابلے میں بکثرت ایسی روایات بھی موجود ہیں جو شاعری کے استحسان پر دلالت کرتی ہیں۔ خود بھی حضورؐ نے اشعار سنے، بعض شاعروں کی تعریف بھی کی اور شعر کہنے کا حکم بھی دیا۔ مثلاً حضرت کعب بن مالک کے استفسار کے جواب میں حضور والاؐ نے ارشاد فرمایا تھا۔ مومن جہاد کرتا ہے تلوار سے اور اپنی زبان سے۔ قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضہ میں جان ہے کہ تم جس چیز (زبان یا شعر) سے ان کو مارتے ہو وہ گویا تیروں کی مار ہے یعنی تم جو شعروں میں مشرکوں کے قبائح بیان کرتے ہو تو یہ تیروں کی طرح ان پر اثر کرتے ہیں (رواہ ابویعلیٰ وابن مردویہ) صحیح روایت سے ثابت ہے کہ حضور والاؐ نے فرمایا ان من الشعر الحکمۃ۔ یہ بھی ثابت ہے کہ حضور والاؐ نے حسان سے فرمایا تھا تو مشرکوں کی ہجو کر جبرئیل تیرے ساتھ ہیں۔ فتح مکہ کے وقت حضرت عبداللہ بن رواحہ نے یہ شعر پڑھے:۔

خَلُّوا بنی الکفار عن سبیلہ   الیوم نضربکم علےٰ تنزیلہ

ضربًا یزول الہام عن مقیلہ   ویذھب الخلیل عن خلیلہ

حضرت عمرؓ نے ابن رواحہ کو رسول اللہؐ کے سامنے اور حرم محترم کے اندر شعر پڑھتے ہوئے روکا۔ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا عمر! رہنے دو۔ تیر مارنے سے زیادہ قریش پر ان کا اثر ہوتا ہے۔

حضرت عائشہؓ کی روایت سے ثابت ہے کہ جب حضرت حسانؓ کو حضورؐ نے شعر کہنے کے لئے طلب فرمایا تو حسان نے حاضر خدمت ہو کر عرض کیا قسم اس خدا کی جس نے آپ کو نبی برحق بنا کر بھیجا ہے میں اپنی زبان سے ان کو چمڑے کی طرح جھیل ڈالوں گا۔ حضورؐ نے فرمایا جلدی نہ کرو۔ ابوبکر انساب سے زیادہ واقف ہیں۔ میرا نسب بھی انہی میں سے ہے۔ ابوبکر میرا نسب الگ کر کے تم کو بتائیں گے۔ حضرت حسان ابوبکر کے پاس آئے اور (تفصیل نسب کرنے کے بعد) حاضر خدمت ہو کر عرض کیا یا رسول اللہؐ ابوبکر نے حضورؐ کا نسب الگ کر کے مجھے بتا دیا۔ اللہ کی قسم اب حضور کا نسب ان میں سے نکال لوں گا جیسے گوندھے ہوئے آٹے میں سے بال۔ حضرت عائشہ رضؓ فرماتی ہیں میں نے خود سنا حضور اقدسؐ حسان سے فرما رہے تھے روح القدس برابر تیرا مددگار رہے گا۔ جب تک تو اللہ اور اس کے رسول سے (کافروں کی) بدگوئی کو دور کرتا رہے گا۔

مسلم کی روایت کردہ حدیث سے ثابت ہے کہ حضور اقدسؐ نے ایک شخص سے اُمیہ بن صلت کے اشعار پڑھنے کی فرمائش کی۔ اس نے اشعار سنانے شروع کئے یہاں تک کہ سو شعر سنا دئے۔

شعبی کا قول ہے کہ ابوبکرؓ، عمرؓ اور علیؓ تینوں حضرات شعر کہتے تھے لیکن علی سب سے زیادہ شعر کہتے تھے۔ ابن عباسؓ نے مسجد کے اندر عمر بن ابی ربیعہ مخزومی کو اس کا پورا قصیدہ جس کے اشعار ستر سے تھے سنا تھا۔ ایک ہی مرتبہ سن کر یاد کر لیا تھا۔

حاصل کلام یہ کہ شاعری کی مدح اور ذم ممانعت اور جواز دونوں حکم منقول ہیں، اس لئے محققین نے فیصلہ کیا ہے کہ اچھے اشعار مستحسن ہیں۔ حمد و نعت، حمایت اسلام، اصلاح مسلمین اور اسی قسم کے دوسرے مضامین کے شعر مستحسن ہیں اور اخلاق و حسنِ اعمال کو برباد کرنے والے فسق و فجور کی تعلیم دینے والے، دنیا میں بربادی اور فساد و تباہی بپا کرنے والے اشعار ممنوع ہیں۔ آیت اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا الخ میں اسی طرف اشارہ ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی یہی فیصلہ مترشح ہوتا ہے۔ حضور اقدسؐ نے ارشاد فرمایا تھا اچھے شعر اچھے کلام کی طرح اور بُرے شعر بُرے کلام کی طرح ہیں۔ قرطبی نے اس روایت کو قابلِ اعتماد کہا ہے۔

وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا الخ۔ آغاز سورت میں فرمایا کہ قرآن پاک کے احکام نہایت واضح ہیں۔ اے رسول! آپ کو کفار کے ایمان نہ لانے کا زیادہ رنج نہ کرنا چاہئے (نصیب دشمناں) کہیں جان پر نہ بن جائے۔ اب اختتام سورت پر فرماتا ہے کہ ان ظالموں کو عنقریب اپنا انجام اور مآل کار معلوم ہو جائے گا۔ قتادہ اور دیگر علماء کے نزدیک آیت کا مصداق صرف گمراہ اور بدکیش شاعر ہی نہیں ہیں بلکہ ہر ظالم بدکار کو آیت کا حکم عام ہے۔ یہاں تک کہ اہل مکہ کی بھی تخصیص نہیں ہے۔ ہر زمانہ اور ہر

ملک کے جفا کار اس حکم میں داخل ہیں اور ظلم کے درجات مختلف ہیں، اس لئے وعید بھی اپنے اندر مختلف درجات کی تنبیہات رکھتی ہے۔ ہر ظالم کو اس کے ظلم کی پاداش ملنی لازم ہے، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا ظلم سے بچو کیونکہ قیامت کے دن ظلم اندھیریاں بن کر چھا جائے گا اور ظلم) تاریکیاں ہو جائیں گی۔

مقصودِ بیان قرآن کا نزول جبرئیل کی وساطت سے ہوا ہے۔ براہِ راست کوئی آیت نہیں اتری۔ نزولِ قرآن کی کیفیت الہامی اور معقانی تھی۔ حضور ﷺ کے قلب مبارک پر القاء ہوتا ہے۔ فرشتہ کی رسائی قلب تک ہو سکتی ہے۔ قرآن کے معانی ہی فقط الہامی نہیں ہیں بلکہ الفاظ بھی خدا کی طرف سے نازل کردہ ہیں، اختراعی نہیں ہیں۔ ربّ العٰلمین کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ جس طرح جسمانی تربیت اللہ کی ربوبیت کا مقتضا ہے۔ اسی طرح روحانی تربیت کیلئے ہدایت نامہ بھیجنا بھی صفت ربوبیت کا کرشمہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ حضور کے خصوصی اوصاف اور ناقابلِ شک امتیازات کا اظہار گزشتہ آسمانی کتابوں میں کر دیا گیا تھا۔ یا یوں کہو کہ قرآن کے اصول وہی ہیں جو گزشتہ آسمانی کتابوں کے تھے۔ قرآن نے پیشین گوئی کی تھی جو حرف بحرف سچی تھی کہ اسرائیلی علماء رسول اللہ کے احوال، صفات، خلق اور امتیازات سے واقف ہیں۔ مشرکین مکہ قرآن کی صداقت کا انکار محض عناد اور شیطانی سے کرتے تھے واقع میں ان کو ایمان لانا ہی نہ تھا۔ خدا تعالیٰ ظالم نہیں ہے اس کے عدل کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے ہدایت نامہ بھیج دیا جائے۔ اس کے بعد سرکشی کرنے والوں کو تباہ کیا جائے بغیر پیغمبر بھیجا اور ہدایت، آفریں وحی نازل کئے خدا تعالیٰ نے کسی قوم کو ہلاک نہیں کیا۔ وحی قرآنی الہام الٰہی سے بالکل الگ چیز ہے۔ شیاطین میں یہ طاقت ہی نہیں ہے کہ کلام ربانی کو حاصل کرنے کے بعد مقدس دلوں میں القاء کر سکیں۔ کیونکہ پاکیزہ دلوں تک شیطان کی رسائی ہی نہیں ہو سکتی۔ نزولِ قرآن کے زمانہ میں شیطانوں کو عالمِ ملکوت کی گفتگو سننے سے روک دیا گیا تھا۔ شرک اتنی بدترین چیز ہے کہ اگر جلیل القدر انبیاء سے صادر ہو جائے تو عذاب الٰہی سے بچ نہیں سکتے۔ سب سے پہلے تبلیغ کا حکم قریبی رشتہ داروں کے متعلق ہے۔ رابطۂ اسلامی قرآن کی نظر میں تمام روابط سے زیادہ قابلِ ترجیح ہے اور اسلامی مواخاۃ ہر اخوت پر غالب ہے۔ مسلمانوں سے تواضع کرنی اور کافروں کے اعمال سے بیزاری مسلمانوں کا فرضِ اولین ہے۔ اعلانِ حق اور اشاعت صداقت میں کسی طاغوتی قوت کی پرواہ نہ کرنی چاہیئے اور اللہ کے بھروسے پر اسلامی فریضہ کو ادا کرنا چاہیئے۔ نماز دونوں طرح سے رسول اللہ ﷺ پڑھا کرتے تھے تنہا بھی اور جماعت کے ساتھ بھی۔ (تنہائی کی نماز سے مفسرین کے نزدیک تہجد کی نماز مراد ہے) شیاطین کا نزول صرف بدکاروں پر ہوتا ہے معلوم ہوا کہ کاہن بدکار اور جھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر شاعری اصلاحی اور مذہبی نہ ہو تو ممنوع ہے۔ ایسے بیہودہ شاعروں کی پیروی کرنے والے بدراہ ہیں۔ مظلوم ہونے کے بعد انتقام لینا جائز ہے۔ کافروں نے اگر ہجا کرنے میں پہل کی ہو تو اسلامی شعراء کے لئے ان کو ہجائیہ جواب دینا مستحسن ہے۔ ظالموں کا نتیجہ برا ہوتا ہے وغیرہ۔

سُوْرَةُ النَّمْلِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَلٰثٌ وَّتِسْعُوْنَ اٰيَةً وَّسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ نمل مکی ہے اس میں ترانوے آیات اور سات رکوع ہیں

یہ سورت مکی ہے ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ ابن عباسؓ اور ابن زبیرؓ کا یہی قول ہے۔ کسی مفسر نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے۔ سیوطی نے اس پر اجماعِ علماء نقل کیا ہے۔ آیات کا شمار ۹۳ یا ۹۴ یا ۹۵ ہے۔ کلمات ۱۱۴۹، اور حروف ۴۷۹۹ ہیں۔ ہکذا ذکرہ الخطیب فی السراج۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے

طٰسٓ تِلْكَ اٰيٰتُ الْقُرْاٰنِ وَكِتَابٍ مُّبِيْنٍ ۝ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ

قرآن اور روشن کتاب کی یہ آیتیں ہیں ان مسلمانوں کے لئے ہدایت وخوشخبری ہیں جو ٹھیک ٹھیک

الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ

نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت کا بھی یقین رکھتے ہیں جو لوگ آخرت کا یقین نہیں رکھتے ہم ان کے اعمال ان کو آراستہ کر دکھاتے ہیں سو وہ بھٹکتے پھرتے

فَهُمْ يَعْمَهُونَ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَهُمْ سُوءُ الْعَذَابِ وَهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْأَخْسَرُونَ ۝ وَإِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْآنَ

ہیں انہی لوگوں کے لئے برا عذاب ہے اور وہی آخرت میں سخت نقصان اٹھانے والے ہوں گے (اے محمد) اللہ مصلحت بین دانا کی طرف سے تم پر قرآن القا

مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ عَلِيمٍ ۝

کیا جاتا ہے

تفسیر دنیا کی ہر نوع اور ہر شخص اپنے کمال و جمال پر نازاں ہے اور ہر چیز بجائے خود اپنے کو مجموعہ فضائل سمجھے ہوئے ہے۔ اگر چمنستان اپنے حسین پھولوں اور عطر بیزیوں پر مغرور ہے تو گھوڑا بھی اپنی ظاہری سبز پوشیوں پر فریفتہ ہے۔ گو پھول کانٹوں کے ماحول میں رہتے ہوئے اپنے حسن و جمال اور نزہت و نظافت کو محفوظ رکھنے کا مدعی ہے تو گھوڑے کا سبزہ بھی عفونت انگیز خس و خاشاک کی صحبت کے باوجود اپنے کو نباتاتی دنیا کا سرتاج جانتا ہے۔ ایک نوع کے ذیلی افراد یا ایک جنس کے تحت مختلف انواع میں باہم معیار فضل و برتری کیا ہے اور کس طرح ہم ایک کو دوسرے پر ترجیح دے سکتے ہیں۔ یہ صرف فیضان قدس سے اثر پذیری کے بہترین نتائج اچھے ثمرات کو دیکھ کر ہی سمجھ میں آسکتا ہے۔ قدسی فیضان برابر ہے، قدرت کا غیبی غیر مرئی پوشیدہ ہاتھ سب کو بغیر تخصیص کے بانٹ رہا ہے صرف لینے والے کی قابلیت کا فرق ہے۔ باران رحمت کا نزول ہر جگہ ایک ہی حیثیت رکھتا ہے، آفتاب جود کی عکس ریزیاں اور ضیا پاشیاں کل کائنات پر برابر ہیں، لیکن قسام ازل کی تقسیم سے حصہ لینے والے مختلف قابلیتیں رکھنے والے ہیں۔ مبدء فیاض کے فیضان سے حصہ پانے والی انواع میں سے انسانی نوع کو جو خصوصیت حاصل ہوئی وہ اس کائنات میں دوسری نوع کو حاصل نہیں ہوئی پھر انسانی نوع کے تحت بھی غیر محدود ناقابل شمار افراد ہیں اور ہر شخص فیاض حقیقی کی جود سے دامن مراد بھرتا نظر آرہا ہے، لیکن اس کے دامن میں کیا ہے یہ دامن کھول کر ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ کسی نے خزف ریزوں اور کوڑیوں سے دامن بھرا ہے اور کسی کا دامن آب ناک موتیوں اور دلکش آفتاب جواہر سے مالا مال ہے پھر مقدار میں بھی اختلاف ہے۔ خزانۂ قدرت کا دروا ہے، مگر لوٹ میں حصہ لینے والے اپنی طاقت کے اندازہ سے حصہ لیتے نظر آتے ہیں۔

یہ تو مادی وجود اور حیات حیوانی کو نوازنے والے فیضان کا تذکرہ تھا۔ لیکن فیاض حقیقی کی وہ پرتو ریزیاں اور لمعہ آفرینیاں جو عالم روح کو منور کر رہی ہیں برابر اپنی ضیا پاشیوں میں مشغول ہیں۔ روحانی اور قلبی پودہ کو شاداب اور بارآور کرنے کے لئے روحانی بارش کا نزول برابر ہو رہا ہے اور برابر میٹھے میٹھے قطروں کا مینہ برس رہا ہے۔ اسی روحانی جلوہ آفرینیوں اور قلبی آب پاشیوں کا آخری دور جس کا قرآن نام ہوا اور فیاض حقیقی کا غیر مادی فیضان انجیل کے بعد قرآنی آیات کی شکل میں نمودار ہوا۔ آفتاب قرآنی چمکنے کے بعد نصف النہار پر چڑھا اور کل کائنات پر اس نے اپنی روشنی کا جواب ڈال دیا۔ احکام قرآنی کی بارش تمام مخلوق پر ہوئی، لیکن جس میں جتنی قابلیت تھی اتنا ہی اور ویسا ہی حصہ اس کو ملا۔ اسی قرآن کا نزول لوگوں کی آبادی، خوشحالی اور ترقی و نجات کا بھی باعث ہوا اور اسی سے بعض لوگوں کو زبوں حالی اور زیاں کاری نصیب ہوئی۔ پس قرآن ان لوگوں کے لئے تو پیام بشارت لایا جو مدنی روحانی فرائض ادا کرنے والے اور افراد انسانی کی تنظیم کرکے ان کو تباہی و بربادی سے بچانے والے اور دنیوی پردہ کے ڈراپ ہونے کے بعد دوسرا منظر دیکھنے کے منتظر ہیں اور اس کوتاہ فہم بے بصیرت نابینا گروہ کے لئے موجب زیاں کاری ہے جو اسی نمود بے نمود پر ریجھا ہوا ہے اور آئندہ ہونے والے نئے تماشے کا یقین نہیں رکھتا اور چونکہ آئندہ زندگی پر اس کو یقین ہی نہیں، اس لئے اس کی درستگی کے لئے کوئی تیاری بھی نہیں کرتا، مگر یاد رکھو کہ اس سے قرآنی فیض میں کوئی کمی یا خرابی لازم نہیں آتی۔ خدائے حکیم و علیم نے ہدایت نامہ سب کے لئے بھیجا۔ ہدایت یاب ہونے کی کوشش کرنی نہ کرنی ہر شخص کا جدا جدا کام ہے۔ اسی مضمون کو اختصار کے ساتھ آیت مذکورہ میں بیان فرمایا ہے۔ اہل فہم اس سے منتج ہونے والی روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔

تحلیل اجزاء تِلْكَ آيَاتُ الْقُرْآنِ وَكِتَابٍ مُبِينٍ۔ یعنی یہ آیات جن کی تلاوت اس سورت میں کی جا رہی ہے کسی کاہن کی بکواس نہیں، کسی ساحر کی شعبدہ بازی نہیں، کسی شاعر کی تک بندی نہیں بلکہ قرآن اور اس عظیم الشان کتاب کی آیات ہیں جو حق و باطل میں تفرقہ کرنے والی اور انسانی نجات و سعادت کا راستہ واضح طور پر بتانے والی ہے۔ جس کی کوئی بات عقل کے خلاف نہیں، کسی حکم میں خفا نہیں، اس کی ہدایت ہر انسان کے لئے عام ہے، مگر اس کی راہنمائی سے فائدہ اٹھانے والے صرف اہل ایمان ہی ہیں۔

هُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ۔ یہ اہل ایمان ہی کے لئے باعث ہدایت اور سبب بشارت ہے بلکہ مجسم ہدایت و بشارت ہے۔ اس کا ہر لفظ مسلمانوں

کی راہ حق نظر آتی ہے اور دائمی سعادت و نجات کی خوشخبری حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ فقط قلبی تصدیق او رعقیدہ کی صحت سے کمالِ ایمانی حاصل ہو جاتا ہے اور انسان ہر عمل سے بے نیاز ہو کر بے قید بن جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تکمیل ایمان کے لئے خصوصیت کے ساتھ دو عمل کی پابندی ضروری ہے۔ اوّل نور روح میں روشنی پیدا کرنے، خالق کے دربار میں حاضری دینے اور تنظیم و مساوات کا مظاہرہ کرنے کے لئے لازم ہے کہ ؎

اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ مسلمان پابندی کے ساتھ مع شرائط و قیود کے پنجگانہ نماز ادا کرتے ہوں۔ دوسرے یہ کہ اہل اسلام کو مضبوط بنانے، دوسری قوموں سے بے نیاز کرنے اور مساوات اسلامی پیدا کرنے کے لئے ان کی مالی ہمدردی کریں۔ خصوصاً شرع کا مقرر کردہ نصاب یعنی وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ۔ مستحقین کو زکواۃ دیتے ہوں۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بھی کہ نماز پڑھنے اور زکاۃ دینے کا مقصد حصول شہرت و عزت اور ریاکاری کا مظاہرہ نہ ہو۔

وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ۔ بلکہ روز آخرت پر ان کو کامل یقین ہو اور یہ اعتقاد رکھیں کہ خداوند تعالیٰ کے سامنے جانا ہے۔ ایک دن حشر ضرور ہوگا اور تمام اعمال کی بازپرس ہوگی اور ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا اس لئے جہاں تک ہو سکے حصول خیر کی کوشش کی جائے اور اگر آخرت پر ایمان نہ ہو تو کسی کار خیر کی طرف انسان توجہ بھی نہ کرے گا اور اگر کوئی نیک کام کرے گا بھی تو اس کی اصل غرض کسی دنیوی وجاہت، عزت، سیادت، تفوق اور عیش و آرام کے حصول کی خواہش ہوگی اور ایسی ناکارہ نیکی کوئی اچھا اثر نہ پیدا کر سکے گی اور اس سے نہ روح میں جلا پیدا ہو سکتی ہے نہ قلب میں روشنی نہ خدا سے کوئی تعلقات درست ہو سکتے ہیں نہ مخلوق سے خالق کا رشتہ ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں کام کمال ایمان کے ضروری شرائط ہیں۔ ان کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ شرائط اور بھی ہیں، لیکن عبادات میں نماز کی اور مالیات میں زکواۃ کی اہمیت چونکہ زیادہ تھی، اس لئے انہی کے ذکر پر اکتفا کیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ الخ۔ مومنین کاملین کا حال بیان کرنے کے بعد اس آیت میں کافروں کی زبوں حالی اور بدحالی ظاہر فرمائی ہے۔ اس آیت کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ اول یہ کہ خدا تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے، اس لئے اسی نے کافروں کی گمراہی کے اسباب فراہم کر دیئے اور ان گمراہی آفریں اسباب کی طرف کافروں کے دلوں میں رغبت پیدا کر دی۔ اس لئے کفار اپنے اعمال پر ریجھے ہوئے ہیں۔ اپنے بد کاروں کو اچھا سمجھتے اور زشت اطوار کو مستحسن جانتے ہیں۔ (جلال)
دوسرا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن میں بھی اچھے کاموں کو تفصیل سے بیان کر دیا جن کو اختیار کرنے سے آخرت میں نجات وسعادت ہو سکتی تھی، مگر کافروں نے ان ہدایات کو قبول نہ کیا اور دنیائے فانی کو جو ان کے سامنے موجود تھی پسند کیا۔ خدا تعالیٰ نے ان کی پسند پر چھوڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی بد کرداریوں کو اچھا سمجھنے لگے۔

فَهُمْ یَعْمَهُوْنَ۔ عَمَہ کے لغوی معنی ہیں کور بصیرت ہونا، دل کا اندھا ہونا اور عقل کا نابینا ہونا۔ مرادی معنی مختلف اہل تفسیر نے مختلف طور پر بیان کئے ہیں۔ مفسر جلال کے نزدیک مراد یہ ہے کہ راہ نہیں پاتے بلکہ حق سے دور بھٹکتے پھرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ چونکہ حُبِّ دنیا کی وجہ سے ان کے دل اُلٹے ہو گئے ہیں، نور عقلی اور بصیرت روحانی بے نور ہو گیا ہے، اس لئے ان کو مادیات سے ماوراء عالم بالا کی خوبیاں نظر نہیں آتیں اور آخرت میں نجات پیدا کرنے والے اعمال ان کو نہیں سوجھتے۔ پس راہ حق سے وہ دور رہتے ہیں اور اندھوں کی طرح بھٹکتے پھرتے ہیں۔

ابو العالیہ نے فرمایا وہ اپنی گمراہی میں بڑھتے چلے جاتے ہیں یعنی ان کی عقلیں تو اندھی ہیں۔ اب جس قدر چلنے کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں اسی قدر گمراہی میں اضافہ ہوتا ہے۔
قتادہ نے فرمایا وہ لہو و لعب کرتے ہیں یعنی لہو و لعب بے کار چیز ہے اسی طرح ان کے اعمال بھی ناکارہ ہیں۔ آخرت میں ان کا کوئی ثمرہ نہیں۔
حسن بصری نے فرمایا وہ ضلالت میں زیادہ سرگرداں رہتے ہیں۔ یعنی وہ چونکہ دنیا میں منہمک اور غرق ہیں، اس لئے ان کا انہماک جس قدر بڑھتا ہی جاتا ہے اتنی ہی تحیر فی الاضلال میں اضافہ ہوتا ہے۔ وَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ۔ خسارۂ آخرت کی دو صورتیں ہوں گی۔ ایک تو درجات کی کمی بیشی کی وجہ سے ان کے درجات میں اختلاف ہوگا۔ کسی کا درجہ بالا ہوگا کسی کا پست۔ نیچے درجہ والا اوپر والے کے لحاظ سے یقیناً نقصان میں ہوگا۔ خسارہ کی دوسری شکل ہے ناکامی اور قطعی نامرادی۔ ایسے ناکام لوگ سب سے زیادہ خسارہ میں ہوں گے۔ ان کے خسارہ سے بڑھ کر اہل محشر میں سے کسی کا خسارہ نہ ہوگا۔ اَخْسَرُوْنَ سے یہی معنی مراد ہیں اور اس خسارہ میں وہی لوگ پڑیں گے جو دوامی جہنمی ہوں گے گویا هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ سے مراد یہی ہوئی کہ کفار ہمیشہ جہنم میں پڑے رہیں گے۔

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ عَلِیْمٍ۔ مومنوں اور کافروں کا فیصلہ فرمانے کے بعد صراحت فرماتا ہے کہ اس قرآن کا نزول خدائے حکیم و علیم کی طرف سے ہے۔ یعنی سعادت اور شقاوت اور نجات و ہلاکت کا جو طریقہ اور حکم قرآن نے آیات مذکورہ میں کھول کر بیان کر دیا وہ ناقابل انکار بلکہ ناقابل شک ہے۔ کیونکہ قرآن کسی انسان یا جن یا فرشتہ کا دماغی زائیدہ نہیں ہے جس کی صداقت محل تامل ہو بلکہ خدا کا بھیجا ہوا ہے اور خدا سب سے بڑھ کر علیم و حکیم ہے، اس کے علم سے کوئی چیز خارج نہیں اور

نہ اس کی مصلحت بینی اور حقیقت شناسی کے دائرہ میں تنگی ہے، اس لئے اس نے جو کتاب فیصل بھیجی وہ اپنے علم وحکمت کے موافق بھیجی پھر اس میں شک وشبہ کی گنجائش کس طرح ہوسکتی ہے۔

مقصودِ بیان

قرآن حق وباطل میں فیصلہ کرنے والا اور سعادت وشقاوت کی واضح تفصیل کرنے والا ہے۔ اس سے یہ امر مترشح ہوا کہ قرآنی قانون کے مقابلے میں کوئی دوسرا قانون ناقابلِ عمل ہے۔ کیونکہ حق وباطل کا فیصلہ کسی قانون میں ایسا نہیں ہوسکتا جیسا قرآن میں ہے۔ پس گمراہ ہیں وہ لوگ جو ضوابطِ اسلامیہ اور حدود قرآنیہ کو غیر مفید، مضرت رساں اور وحشت آفریں سمجھتے ہیں اور اپنے اختراعی قوانین سے ضوابطِ حق کی اصلاح کرنی چاہتے ہیں۔ ھُدًی وَّبُشْرٰی کا لفظ بتارہا ہے کہ ہدایتِ قرآنی اگرچہ ہمہ گیر ہے، کافر ومسلم کا اس میں کوئی امتیاز نہیں، لیکن اس کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانے والے چونکہ اہلِ ایمان ہی ہیں، اس لئے قرآن کی ہدایت وبشارت انہیں کے لئے مخصوص ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ اور ادائے زکوٰۃ کو محلِ مدح میں ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ نماز وزکوٰۃ اسلام کے وہ عظیم الشان ضروری ارکان ہیں جن کے بغیر ایمان کی عمارت کا اپنی جگہ قائم رہنا بہت دشوار ہے۔ پس عبرت حاصل کریں۔ حمایتِ اسلامی کا بلند آہنگی سے دعویٰ کرنے والے وہ لیڈر جو زبانوں سے تو اسلام کی طرفداری کرتے دیکھتے ہیں، لیکن اپنے بے نمازی ہونے سے اسلام کی جڑ کو کھوکھلی کر رہے ہیں اور نصیحت قبول کریں وہ جاہل صوفی جو فنا فی المرشد کو نماز سے بڑھ کر جانتے اور غنائے حرام کو عرفان کا زینہ سمجھتے اور فرض عبادت کو غیر ضروری خیال کرتے ہیں۔ زکوٰۃ کا تذکرہ جس اہمیت کے ساتھ فرمایا ہے وہ تازیانۂ عبرت ہے ان بیچاروں کے لئے جو مایہ کے سانپ بنے بیٹھے ہیں اور قابلِ لعنت سرمایہ داری میں گرفتار ہیں۔ پھر وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ الخ کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ بغیر یقینِ معاد کے کوئی نیکی قبول نہیں۔ ریاکاری یا دنیوی مفاد کے پیشِ نظر نیکی کرنی درحقیقت نیکی نہیں۔

اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖۤ اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ۝

جب موسیٰ نے اپنی بیوی سے کہا میں نے آگ دیکھی ہے میں وہاں سے جلد تمہارے پاس کوئی خبر لاؤں گا یا تمہارے تاپنے کے لئے کوئی روشن انگارا لادوں گا۔

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ یٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا

پھر جب موسیٰ آگ پر پہنچے تو ندا دی گئی کہ مبارک ہے وہ شخص جو اس آگ کے اندر ہے اور جو آگ کے آس پاس ہے اور پاک ہے اللہ رب العالمین موسیٰ میں بلاشبہ اللہ

اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ وَ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰى لَا

غالب مصلحت بین ہوں تم اپنی لاٹھی ڈال دو جب موسیٰ نے لاٹھی کو سانپ کی طرح حرکت کرتے دیکھا تو پیٹھ پھیر کر بھاگے اور منھ موڑا (ہم نے کہا) موسیٰ خوف

تَخَفْ ۫ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

نہ کرو ہمارے حضور میں پیغمبر ڈرتے نہیں ہیں ہاں جو شخص گناہ کرے پھر برائی کے بعد اُس کے عوض نیکی کرے تو میں غفور رحیم ہوں

وَ اَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ۫ فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝

اور اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں ڈالو وہ بے عیب سفید ہوکر نکلے گا (یہ دونوں معجزے) منجملہ نو معجزوں کے ہیں انکو لے کر فرعون اور اسکی قوم کے پاس جاؤ یہ لوگ بلاشبہ فاسق

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ

ہیں چنانچہ جب اُنکے پاس ہماری نشانیاں واضح طور پر پہنچیں تو بولے یہ تو کھلا جادو ہے بے انصافی اور غرور سے اُن نشانیوں کا انکار کر بیٹھے حالانکہ اُن کے دل اُن آیات کا یقین کرتے تھے

كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ۝ ع

پس دیکھو کہ مفسدوں کا انجام کیسا ہوا

تفسیر

تمام کائنات ممکن بالذات اور بر مذہب برحق حادث ہے امکان اور حدوث کا جو پردہ اس کے چہرہ پر پڑا ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ مادہ پرستی کی بھول بھلیوں میں سرگرداں پھرنے والی مخلوق حقیقت کے چہرے کو نہیں دیکھ سکتی، مادی نظر رکھنے والے حسی دنیا سے آگے نہیں بڑھ سکتے، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر چیز میں نورِ حق پرتو فگن ہے۔ جلوۂ جمال چپہ چپہ للہ ذرہ ذرہ سے عیاں ہے اور انتا عیاں ہے کہ کمزور نظر رکھنے والوں کی نگاہ خیرگی پیدا کرنے کے بعد ان کے لئے انتہائی مخفی بن گیا ہے۔ انتہائے ظہور کا نتیجہ لازمی طور سے خفا ہوتا ہے۔ سفیدی کا آخری درجہ سیاہی ہے، خورشید چوٹی پر پہنچنے کے بعد نابیناؤں کو ظلمت معلوم ہونے لگتا ہے، اسی لئے سطحی النظر لوگوں کو رب کائنات کے جمالِ جہاں آرا کا نظارہ نہیں آتا۔ ہاں اسی مادی دنیا میں کچھ عرفان نصیب بندے ایسے بھی ہیں جو حقیقت کے چہرے سے مجاز کا پردہ اٹھا دیتے ہیں۔ ممکن میں واجب اور حادث میں قدیم کی جلوہ کاری دیکھتے ہیں اور "برگِ درختاں سبز در نظر ہوشیار ؛ ہر ورقے دفتریست زمعرفتِ کردگار" سے بھی آگے بڑھ کر ہر تر و خشک مجرد و مادی بلکہ ذات کائنات کی ہر لہر میں نورِ پروردگار کی لمعہ آفرینیاں مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ پھر ان عارفانِ کامل میں سے بعض کی آنکھوں سے بالکل ہی مادی پردے اٹھا دئیے جاتے ہیں اور وہ نورِ قدس کو مجسم اور جلوۂ مجرد کو محسوس شکل میں دیکھنے لگتے ہیں۔ جس طرح حضرت موسیٰ نے نورِ بے کیف کو مجسم شکل میں اپنی آنکھوں سے دیکھا، لیکن یاد رکھو کہ الٰہِ کائنات کا اصل چہرہ کوئی نہیں دیکھ سکتا، اس کے چہرہ پر نور کے بے انتہا حجاب پڑے ہوئے ہیں۔ عارفوں کی کامیابیاں اور فائز المرامیاں صرف اسی حد تک پہنچ کر ٹھہر جاتی ہیں کہ وہ ایک دو تین چار پانچ غرض حسبِ تفاوتِ مرتبہ اپنی اپنی نسبت حجاب اٹھا دیکھے اور بس۔ اگر جلوۂ ذات بغیر نوری حجاب کے ایک لمحہ کے لئے پرتو فگن ہو جائے تو کل کائنات سوختہ ہو جائے۔

پھر یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ ابتدا میں عارف کو نور بشکلِ نار نظر آتا ہے۔ نورِ خالص کو بغیر کسی آڑ کے دیکھنے کی اس میں طاقت نہیں ہوتی۔ حضرت موسیٰ کو بھی نار نظر آئی تھی جو درخت کا سبز لباس پہنے ہوئے تھی اور بس کا کنکشن خدا جانے کہاں سے تھا۔ واقع میں وہ نور تھا، لیکن امکان و حدوث کی کثافت کا جامہ پہن کر بشکلِ نار نمودار ہوا تھا۔ موسیٰ کا نورِ قلب کھینچ کر آنکھوں میں آیا اور نورِ قلب نے آنکھوں کے حجاب کے اندر سے نور کو حدوث کے حجاب کے اندر دیکھا۔ جب چاشنی چکھی اور چسکا لگا تو اب موسیٰؑ نے اپنی حدِ نگاہ سے آگے قدم بڑھانے کا ارادہ کیا اور نورِ بغیر کثافتِ حدوث کے دیکھنا چاہا اور جھٹ درخواست کر دی۔ رَبِّ أَرِنِي أَنظُرْ إِلَيْكَ جلوۂ ذات کی استدعا تو موسیٰ نے بھی نہ کی تھی۔ صرف محض نور کو ہی دیکھنا چاہتے تھے، مگر پروردگار کے نوری حجاب کو بغیر مادی حجاب کے دیکھنا بھی موسیٰ کی فطری طاقت سے خارج تھا، اس لئے انکار کر دیا گیا۔ حرفِ گستاخانہ نہ تھا مگر دیکھنے والے میں قابلیت نہ تھی۔ چنانچہ شفاف نور کے ایک پرتو سے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ پہلے بھی ان میں نورِ سادہ کو دیکھنے کا ہوش نہ تھا، لیکن بے ہوشی ایسی ہوئی کہ نورِ کثافت کے حجاب میں بھی دیکھنے سے معذور ہو گئے۔ مزید تشریح ہم تحلیلِ اجزاء کے ذیل میں کریں گے۔

تحلیلِ اجزاء

إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ الخ۔ قبطی کو قتل کرنے کے بعد جب حضرت موسیٰؑ مصر سے بھاگ کر مدین کو گئے اور وہاں حضرت شعیبؑ کی صاحبزادی صفوراً سے نکاح کیا اور دس برس تک وہیں مقیم رہے۔ دس برس کے بعد واپس ہوئے۔ راستہ میں وادیٔ سینا میں داخل ہو گئے۔ رات اندھیری تھی راستہ بھول گئے۔ سردی بہت سخت تھی۔ بی بی کو ایک جگہ بٹھا کر بولے تم یہاں ٹھہرو میں نے ایک جگہ آگ دیکھی ہے، تمہارے تاپنے کے لئے آگ لینے جاتا ہوں۔ اگر آگ مل گئی تو لے آؤں گا ورنہ کسی سے آبادی کا کچھ پتہ دریافت کروں گا۔ غرض چل دئیے جب قریب پہنچے تو دیکھا کہ ایک درخت سے شعلے نکل رہے ہیں اور آسمان تک ایک آگ سی معلوم ہو رہی ہے۔

جن کے دماغوں میں اللہ نے نورِ معرفت نہیں پیدا کیا وہ کہتے ہیں کہ تمام عالم میں ایک گیس ہے، درختوں سے بھی اس کا ظہور ہوتا ہے، سمندروں سے بھی اس گیس کی چنگاریاں اٹھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کہیں پہاڑوں سے بھی اس کی تابناکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ موسیٰؑ نے بھی وہی گیس دیکھا تھا۔ ان عقل کے اندھوں سے کوئی پوچھے کہ گیس میں روشنی کس نے پیدا کی؟ یہ کس کے حسن کا پرتو ہے جس نے ادنیٰ پرتو اندازی سے کثیف مادی گیس کو منور کر دیا۔ وہی اپنے جمالِ جہاں آرا کا ایک چمکارا موسیٰؑ کو دکھا سکتا ہے۔ اس میں کون سا اشکال ہے۔ اسی لئے ابن عباسؓ نے فرمایا وہ نار نہ تھی بلکہ نور تھا۔ ابن منذر، ابن ماجہ، ابن ابی حاتم، بیہقی اور عبد بن حمید وغیرہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کی روایت نقل کی ہے کہ ایک بار رسول مقدسؐ نے تقریر کی۔ ارشاد فرمایا اللہ نہیں سوتا ہے سونا اس کی شان کے مناسب نہیں، وہ ترازو کے پلے پست اور بلند کرتا ہے، رات کے اعمال دن ہونے سے پہلے اور دن کے اعمال رات ہونے سے پہلے اس کے سامنے لائے جاتے ہیں، اس کا حجاب نور ہے۔ اگر اس حجاب کو کھول دے تو اس کے چہرہ کے انوار (یعنی انوارِ ذات) سے ہر چیز سوختہ ہو جائے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰؑ نے نوری حجاب بشکلِ نار دیکھا تھا، ذات کے انوار نہ دیکھے تھے پھر اس کی کیا وجہ کہ نور کو بشکلِ نار دیکھا اور نورِ سادہ کو نہ دیکھا ہم ابھی اس کا سبب ذیل میں لکھیں گے۔

فَلَمَّا جَاءَهَا نُودِيَ أَن بُورِكَ مَن فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا۔ جب موسیٰ قریب پہنچے تو ندا آئی (کہاں سے آئی کیسے آئی؟ اس کی کوئی تفصیل نہیں فرمائی اس لئے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ندا بے کیف تھی، بے مزہ تھی، جہت اور زمان کی قید سے بالاتر تھی جس کو موسیٰؑ نے ہی سنا اور وہی سن سکتے تھے اور انہی کو سنانے کی غرض تھی بہر حال

آواز آئی) کہ وہ اور جو آگ کے گرد و اگر د ہے سب با برکت ہے۔ آگ کے اندر اور گرد اگرد کیا چیز تھی اور اس سے کیا مراد ہے؟ قرطبی نے کہا کہ موسیٰ مراد ہیں اور یہ خطاب خدا تعالیٰ کی طرف سے بطور تحیۂ موسیٰ سے کہا گیا۔ سدی وغیرہ کا قول ہے کہ ملائکہ مراد ہیں یعنی آگ کے اندر اور باہر نوری ملائکہ ہیں آگ نہیں ہے۔

میرے نزدیک یہ دونوں قول تکلف سے خالی نہیں ہیں۔ بہتر مطلب وہ ہے جو حسن بصری اور سعید بن جبیر نے بیان کیا کہ اس آگ کے اندر اور باہر پروردگار کا نور ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ نے موسیٰ سے فرمایا کہ یہ آگ جس کو تم آگ سمجھے ہوئے ہو آگ نہیں ہے اس کے اندر اور باہر نور الٰہی جلوہ فرما ہے اور وہ بابرکت ہے اس کی برکت سے تم کو یہ روشنی پھیلتی نظر آرہی ہے، لیکن شبہ ہو سکتا تھا کہ کیا خدا نے اس میں حلول کر لیا تھا یا خدا مجسم ہو کر نظروں کے سامنے آگیا تھا؟ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے فرمایا:

وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ آگ کے اندر اور باہر خدا نہیں وہ رب العالمین ہے۔ ہر مماثلت مشابہت اور حلول و تجسم سے پاک ہے۔ رب مربوب میں اور خالق مخلوق میں حلول نہیں کر سکتا بلکہ یہ اس کے نوری حجاب کا پرتو ہے، اس کی ذات کے انوار رونما نہیں ہو سکتے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے مذکورہ بالا حدیث میں کہ اگر انوار الوجہ نمودار ہو جائیں تو ہر چیز سوختہ ہو جائے۔ حاصل یہ نکلا کہ آگ کے اندر اور باہر جو چیز نظر آرہی ہے وہ خدا نہیں نہ ذاتِ الٰہی کے انوار ہیں بلکہ نوری حجاب کی پرتو فگنی ہے جو نار کی شکل میں نمودار ہو رہی ہے۔

یٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ یعنی پہلے موسیٰ کو دور سے آگ دکھائی دی پھر ندائے غیبی کے ذریعہ سے یہ انکشاف ہوا کہ یہ نار نہیں ہے اس کے اندر نور ہے۔ پھر بیان سے موسیٰ کے دماغ کو الوہیت خالص کی طرف منتقل فرمایا کہ میں ہی خدا ہوں یہ سب پرتو ہے اس میں نہ میری ذات کا حلول ہے نہ صفات کا۔ یہ محض عکس ریزی اور جلوہ افگنی ہے۔ اس ترتیب سے حضرت موسیٰ کے قلب کو گویا الوہیت خالصہ کا مشاہدہ کرا دیا۔ اس سے نور کی بشکل نار نمودار کرنے کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی کہ چونکہ خدا ہر مماثلت و مشابہت سے پاک ہے نہ اس کی ذات کا حلول ہو سکتا ہے نہ صفات کا، اس لئے اس کا نور مقدس کوئی دیکھ نہیں سکتا تاوقتیکہ وہ نور اپنی خالص نورانیت سے نیچے نہ اترآئے اور کسی قسم کا مادی کثیف جامہ نہ پہن لے۔ اگرچہ نور خالص کا دیکھنا ناممکن نہیں، لیکن ان کثیف آنکھوں سے اس کثیف زندگانی میں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔

وَاَلْقِ عَصَاكَ الخ۔ جب موسیٰ کی روحانی تربیت ہو چکی اور مشاہدہ الوہیت ختم ہو گیا تو پھر عالم سے عملی اور قرب سے تکلیف کے درجہ کی طرف منتقل فرمانا چاہا اور حکم ہوا لاٹھی ہاتھ سے ڈال دو (اس جگہ درمیانی گفتگو کا تذکرہ نہیں ہے۔ اقتضائے مقام کے مطابق واقعہ کی حکایت فرمائی ہے) موسیٰ نے حکم کی تعمیل کی۔ لاٹھی فوراً سانپ بن کر رینگنے لگی۔ موسیٰ اس وقت مشاہدۂ نور سے نیچے اتر آئے تھے۔ اگرچہ اس وقت بھی عالم حواس میں داخل نہ ہوئے تھے، مگر پھر بھی آمیزش حواس قائم تھی، اس لئے سانپ کو رینگتا دیکھ کر بھاگے اور منہ پھیر کر نہ دیکھا۔ ندا آئی کہ موسیٰ خوف نہ کرو میں موجود ہوں۔ میرے حضور میں مرسل کسی چیز سے ڈرتے نہیں ہیں یعنی یہ ظہور غضب تمہارے لئے نہیں ہے بلکہ تمہاری طاقت کے نمودار ہونے کا منشاء کچھ اور ہے۔

اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ الخ۔ اس فقرہ کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ شیخ عماد، خطیب اور اکثر اہل تفسیر نے صراحت کی ہے کہ یہ استثنائے منقطع ہے یعنی لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ سے استثناء نہیں ہے بلکہ مستثنیٰ منہ محذوف ہے جس پر کلام سابق دلالت کر رہا ہے۔ چونکہ صراحت فرمائی تھی کہ میرے حضور میں اہل رسالت کو خوف نہیں ہوتا، اس لئے یہ بات خواہ مخواہ سمجھ میں آتی تھی کہ جو مرسل نہیں ان کو ضرور خوف ہوتا ہے۔ اس پر علاوۃً اظہار فرمایا کہ جس نے اپنے نفس پر ظلم کیا اس کو ضرور خوف ہوگا، لیکن جب اس نے بیجا حرکت کرنے کے بعد توبہ کر لی اور بدی کو نیکی سے بدل دیا اور معصیت کی جگہ فرماں برداری اختیار کی تو میں غفور رحیم ہوں۔

(۲) بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ استثناء متصل ہے اور آیت مذکورہ سے استثنیٰ ہے۔ مطلب اس طرح ہوگا کہ اصحاب رسالت کو اندیشہ نہیں ہوتا۔ ہاں ظالموں کو ضرور خوف ہوتا ہے، اس لئے حضرت موسیٰ کے دل میں وہم گزر سکتا تھا کہ میں نے بھی قبطی کو قتل کیا ہے میں بھی ظالم ہوا (اگرچہ قبطی کو قتل کرنا رسالت سے قبل تھا اور واقع میں ظلم بھی نہ تھا اور نہ قتل عمد تھا، مگر مقدس نبی اپنے تقدس کے لحاظ سے اس کو اپنے لئے ظلم خیال کر سکتے تھے، اس لئے فرمایا کہ نہیں جو لوگ ظلم کے بعد توبہ کر لیتے ہیں ان کا گناہ ملیامیٹ ہو جاتا ہے میں غفور رحیم ہوں ان کا قصور معاف کر دیتا ہوں۔

وَاَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ الخ۔ پہلا معجزہ جلالی تھا یہ دوسرا معجزہ جمالی عطا ہوا اس سے قہاریت کا اظہار ہوتا تھا اس سے رحمت و عطوفت نمودار ہوتی ہے۔ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ کا مطلب یہ ہے کہ بغل میں ہاتھ دبا کر نکالو وہ چمکتا ہوا نکلے گا، لیکن برص یا کسی اور مرض کی وجہ سے اس کی سفیدی نہ ہوگی۔ ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ (ہاتھ کے چمکنے کی روشنی سے تکلیف نہ ہوگی بلکہ ٹھنڈک ہوگی) اور تم ہاتھ ... (تفسیر ...) اس سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ واللہ اعلم۔

فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ۔ یعنی موسیٰ کو جو یہ دونوں معجزات دیئے گئے یہ منجملہ ان نو معجزات کے تھے جن سے سرفراز فرما کر ان کو فرعون اور فرعونیوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا تھا ۔ اہلِ تحقیق نے لکھا ہے کہ نو معجزات بہ تفصیل ذیل تھے :-

(۱) عصا (۲) یدِ بیضاء (۳) طوفان نیل (۴) ٹڈیوں کا دَل (۵) فرعونیوں کے لئے جوؤں کی کثرت (۶) مینڈکوں کی ایسی فراوانی کہ ہر چیز اور ہر برتن میں جیب سے بھی مینڈک نکل آتے تھے (۷) قبطیوں کے لئے تمام پانی کا خون ہو جانا اور ان کا بے آب تڑپنا (۸) قحط سالی کی وجہ سے کھیتیاں کا تباہ ہو جانا (۹) اور آخر میں بحرِ قلزم کا بنی اسرائیل کے لئے خشک ہو جانا ۔

وَاسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ۔ یعنی جب موسیٰ فرعون کے پاس گئے اور مختلف اوقات میں مختلف معجزات دکھائے تو انہوں نے ساحروں سے مقابلہ کرایا اور جب ساحر مقہور و مسلمان ہو گئے تو فرعون اور اس کی قوم تا دل سے بھی معجزات کی حقانیت کے دل میں قائل ضرور ہو گئے مگر سرکشی اور غرور نے ان کو اعترافِ رسالت سے روک دیا ۔ ان کو اپنی برتری، حاکمانہ قومیت اور مخدومانہ عزت کو ٹھیس لگتی نظر آئی، اس نے موسیٰ کی پیروی سے کنی ختم کیا جیسا خود کتابوں میں پڑھا کہ آن کی آن میں فرعون لشکر سمیت غرق ہو گیا اور پیغمبر خدا کے قول کو نہ ماننے کی پاداش میں دوامی ہلاکت نصیب ہوئی ۔

مقصودِ بیان

رحمتِ الٰہیہ نامحدود ہے ۔ موسیٰ آگ لینے کے لئے گئے پیغمبری مل گئی ۔ رحمتِ پروردگار بہانہ ڈھونڈتی ہے ۔ موسیٰ نے نورِ خالص نہ دیکھا تھا بلکہ وہ نور دیکھا تھا جو مادی کثیف جامہ میں ملبوس ہو کر نمودار ہوا تھا جس کو قرآن نے نار فرمایا ہے ۔ اللہ کی ذات و صفات حلول مشابہت مشاکلت اور ہر قسم کے تجسم سے پاک ہیں ۔ رب العالمین کا لفظ بتا رہا ہے کہ رب کا حلول ... میں اور خالق کا مشابہت سے نہیں ہو سکتی ۔ پس جھوٹے ہیں وہ لوگ جو ظہورِ انوار اور حلول میں کوئی فرق نہیں کرتے ۔ آدمی اور آدمی کے علاوہ دوسری مقدس موجودات مظہرِ انوار اور جلوہ گاہ ہو سکتی ہے ۔ انوارِ الٰہیہ کا کسی میں حلول نہیں ہو سکتا ۔ سانپ کو رینگتا دیکھ کر حضرت موسیٰؑ بھی بمقتضائے بشری سہما گئے تھے یہ معلوم ہوا کہ انبیاء ہوں یا اولیاء، سوا خصوصی اوقات کے اقتضائیات بشری سے کوئی بھی جدا نہیں ہو سکتا ۔ فرعون کی قوم حضرت موسیٰؑ کے معجزات کی دل سے قائل ہو گئی تھی، مگر جاہ پسندی، عزت کی پرستش اور غرور و نخوت کی سرمستی نے ان کو اعترافِ حق سے روک دیا ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صرف دل سے یقین کر لینا ایمان کے لئے کافی نہیں ہے ۔ اگر کوئی شخص مجبور و مضطر نہیں تو تصدیقِ قلبی کے ساتھ زبانی بھی ضروری ہے ۔ اس سے ایک یہ بات مترشح ہوئی کہ جاہ طلبی، عزت پسندی، حکومت پرستی، نفسانی ہوا و ہوس انسان کو اقرارِ حق سے روکنے والی چیزیں ہیں ۔ باوجود قلبی یقین کے انسان اس فانی دنیا کے عیش و طرب میں ایسا منہمک ہو جاتا ہے کہ اس کے دماغ سے دور اندیشی کی قوت بالکل سلب ہو جاتی ہے ۔ حضرت موسیٰؑ کے پورے قصہ میں مندرجۂ ذیل ہدایات مضمر ہیں :-

(۱) خدا جس کو نوازنا چاہتا ہے اپنی نبوت سے سرفراز فرماتا ہے ۔ یہ ضروری نہیں کہ دولت مند مغرور اور سرمست انسان کو نبی بنائے ۔ دیکھو موسیٰ ایسے غریب الوطن مفلس کو اس نے نبوت سے سرفراز فرمایا جن کو راہ نمائی کے لئے کوئی ساتھی بھی میسر نہ تھا ۔ پس جس طرح اس نے موسیٰؑ کو خلعتِ رسالت پہنایا اسی طرح اس نے محمدؐ کو اپنا رسولِ خاص بنا دیا ۔ لہٰذا کافروں کا یہ گمان غلط ہے کہ اگر نبی ہی بنانا تھا تو اس مفلوک الحال شکستہ بال کو نبی کیوں بنایا جو بازاروں خود سودا خریدتا پھرتا ہے ۔

(۲) خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ نبی کے پاس خدا کی عطا کردہ دو طاقتیں ہوتی ہیں ۔ نبی کی قہاری طاقت بھی اتنی قوی ہوتی ہے کہ آن کی آن میں پُرجبروت بادشاہوں کے تختِ سلطنت کو الٹ سکتی ہے اور رحمت و عطوفت بھی ان کی بے پایاں ہوتی ہے کہ بغیر ظاہری اسباب کے دم کے دم میں کل ماحول کو روشن کر سکتی ہے ۔ موسیٰؑ کی دونوں طاقتوں کا تذکرہ کر کے یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ محمدؐ میں بھی یہ دونوں طاقتیں موجود ہیں ، اس لئے کافروں کی طاغوتی قوت ان پر غالب نہیں آسکتی نہ ہدایات کا مقابلہ کسی دوسرے لیڈر کی طرزِ رہنمائی سے کیا جا سکتا ہے ۔

(۳) پیغمبر برحق کی مخالفت سے پُرجلال بادشاہوں کی شاہی برباد ہو جاتی ہے ۔ فرعون جیسے شہنشاہ کی حکومت موسیٰؑ کا کچھ نہ بگاڑ سکی اور انجام کار خود ہی اس کو تباہ ہونا پڑا ۔ اسی طرح کفار کی مخالفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ۔ آخر میں یہ لوگ خود ہی برباد ہوں گے وغیرہ ۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی كَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا کیا تھا ۔ دونوں نے کہا اس اللہ کا شکر ہے جس نے اپنے بہت سے ایماندار بندوں پر ہم کو فضیلت دی

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ

اور سلیمان داؤد کے جانشین ہوئے اور کہنے لگے لوگو! ہم کو پرندوں کی بولی سمجھادی گئی ہے اور ہمیں ہر چیز دی گئی ہے بے شک یہ کھلا ہوا

الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ۝ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ

فضل ہے سلیمان کے واسطے جنات اور انسان اور پرندوں کی فوجیں جمع کردی گئی تھیں بس وہ اُنکے سامنے کھڑے کرتے جاتے تھے یہاں تک کہ جب یہ چیونٹیوں

النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَتَبَسَّمَ

چیونٹیوں کے جنگل میں پہنچیں تو ایک چیونٹی نے کہا کہ اے چیونٹیو اپنے گھروں میں گھس جاؤ تم کو سلیمان اور اُس کا لشکر بے خبری کی حالت میں پامال نہ کردے سلیمان

ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا

اسکی بات سن کر مسکرا کر ہنس پڑے اور کہنے لگے پروردگار! مجھے اس نعمت کا شکر ادا کرنے کی توفیق دے جو تونے مجھ پر اور میرے والدین پر کی ہے اور نیک عمل کرنے کی بھی

تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

توفیق دے جس کو تو پسند کرتا ہو اور اپنی رحمت سے مجھے نیک بندوں میں شامل کردے

تفسیر

آیات کے متعلق تفسیری نوٹ لکھنے سے پہلے ہم چند یقینی علمی امور کو مختصر آسان الفاظ میں ذکر کرنا چاہتے ہیں:- جن ایک غیبی مخلوق ہے جس کی تخلیق ناری ہے جن میں توالد و تناسل ہوتا ہے جس کا حقیقی مادی جسم بھی ہوتا ہے، جس کے افراد بکثرت ہیں، جس کے افراد میں ربط ضبط، میل ملاپ انسانوں کی طرح ہے جو ایک دوسرے کی بولی ایسی ہی سمجھتے ہیں جیسے انسان باہم سمجھتے ہیں، جن کے پاس سمجھنے کی قوت بھی ہے اور وہ معاملات کو سمجھنے میں مفید مضر کو پہچانتے ہیں۔ اگرچہ ان کی ادراکی قوت اتنی روشن نہیں ہے جتنی انسان کی۔ تاہم فہم و احساس کی طاقت ضرور حاصل ہے اور جن میں نحو بھی ہوتا ہے۔

(۲) جمادات کی ایک خاص جنس ہے جس کے تحت بکثرت انواع ہیں۔ مثلاً نوشادر کی ایک نوع ہے، لوہے کی ایک نوع ہے۔ اسی طرح جمادات کے تحت بہت انواع ہیں پھر ہر نوع کے تحت ہزاروں افراد اور اشخاص ہیں۔ سونے چاندی لوہے پتھر رانگ وغیرہ کے ہزاروں اقسام ہوتے ہیں۔

جمادات کی ہر نوع کے افراد میں ایک خاص قوت حافظ للترکیب ہوتی ہے جس کو اگرچہ ہم شعوری قوت تو نہیں کہتے، لیکن اس کے افعال ضرور شعوری قوت کے افعال کی طرح ہوتے ہیں۔ مثلاً لوہے کے اجزا لوہا، پتھر کے اجزا پتھر، سونے کے اجزا سونا اور چاندی کے اجزا چاندی ہوتے ہیں۔ پتھر کے تمام اجزا پتھر کیوں ہوتے ہیں ان کے اندر کون سی ایسی قوت ہے کہ جو عناصر کو کھینچ کر پتھر کی شکل بننے کو مجبور کرتی ہے۔ وہ کون سی طاقت ہے جو سونے کے اندر تمام عنصری اجزاء کو سونا بناتی ہے اور چاندی کے اندر تمام اجزا کو چاندی اور لوہے کے اندر لوہا۔ حالانکہ یہی موجودہ عنصر ہیں جن سے سونا چاندی لوہا پتھر رانگ وغیرہ ہر چیز بنتی ہے، لیکن ایک خاص تناسب کا لحاظ رکھنا اور مخصوص مقدار و کیفیت کے ساتھ ہر نوع کے افراد کی ساخت کو جدا کرنا ایک خاص قوت کا کام ہے جس کا فرض ہر نوع میں جدا جدا ہے۔ یہ قوت نوع حجر میں عناصر کی ایک خاص مقدار کو جمع کرتی ہے اور ضرورت سے زیادہ کمی بیشی کو روکتی ہے۔ پھر خاص مقدار عنصری میں ایک خاص کیفیت امتزاجی پیدا کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے پتھر کے تمام اجزا پتھر ہی والے ہیں یہی قوت سونے چاندی رانگ غرض تمام انواع جماد میں یہی عمل کرتی ہے۔ ہم اس قوت کو گو شاعرہ نہ کہیں، لیکن شاعر نما ضرور کہنا پڑے گا کیونکہ اس کے افعال ہم کو اس کے شعور کی طرف رہنمائی کررہے ہیں۔ مرکبات دوسرے درجہ کے ہوں یا تیسرے درجہ کے بہرحال ترکیب بغیر خاص تناسب مقدار و کیفیت کے نہیں ہوسکتی۔ یہ کیفیت و مقدار کا خاص تناسب اور خاص مزاج اسی قوت شاعر نما کے ہاتھ میں مرہون ہے۔

پھر یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ہر نوع جماد بلکہ ہر فرد جماد کی خاص قوت اپنے نوعی اور شخصی ضروریات سے خوب واقف ہے۔ اگرچہ وہ اپنے سے بالاتر طبقہ (نباتات و

جمادات وغیرہ کی ضروریات کا علم نہیں رکھتی، مگر اپنے طبقہ کے ضروریات بقا سے ضرور واقف ہے یا واقف بنا رہی ہے۔ ہم حیوانی علم کو پیش نظر رکھتے ہوئے تو جمادی قوت کی واقفیت کو علم نہیں کہہ سکتے، مگر ہمارا یہ انکار صرف اصطلاحی انکار ہوگا ہم نے منطقی یا فلسفی اصطلاح بنالی ہے کہ جمادات قوت علم نہیں رکھتی اور اس میں شعور و احساس نہیں ہوتا مگر یہاں تک حقیقت و واقعہ کا تعلق ہے ہم اس کا اظہار و اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جمادات کی ساخت کو بنانے اور قائم رکھنے والی جو قوت ہے وہ اپنی نوعی اور شخصی ضروریات سے خوب واقف ہے۔ ہر نوع کے افراد میں جو قوت ترکیبی نوعی اور شخصی ہے وہ نہ فقط حافظ ترکیب ہے بلکہ حفظ ترکیب چونکہ بغیر واقفیت کے ناممکن ہے۔ اس لئے اپنا مخصوص (جس کو ہم اصطلاحی علم نہیں کہتے) ضرور رکھتی ہے اور اسی علم و واقفیت کی وجہ سے وہ اپنی ضروریات کی فراہمی اور موانع کی مدافعت کرتی ہے۔

پھر یہ بھی جان لینا ضروری بلکہ یہ مسلم حقیقت ہے کہ ہر نوع جماد کے افراد باہم فطری ربط ضبط اور میل ملاپ رکھتے ہیں اور ان کا باہمی ملاپ ایسا ہوتا ہے جو دوسری نوع کے افراد سے نہیں ہوتا۔ مثلاً پتھر کو پتھر سے جو ملاپ ہوتا ہے وہ سونے سے نہیں ہوتا فطری طور پر پتھر سے پتھر ملنے پر ایک ذات ہو جاتا ہے، لیکن سونے کے ساتھ ملنے پر یک ذات نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بیرونی جابر قوت اس کو ایک ذات ہونے پر مجبور نہ کرے معلوم ہوا کہ ہر نوع کے افراد کا باہم میلان اور ایک دوسرے سے وابستگی ہی ملاپ اور وابستگی تمام ضروریات وجود و بقاء کی مددگار ہے اور یہی ربط ضبط بتا رہا ہے کہ ہر نوع کے افراد آپس میں ایک دوسرے کی ضروریات سے واقفیت رکھتے ہیں اور ایک فرد دوسرے فرد کو اپنی ضروریات سے (اس فطری زبان سے جس کو ہم لفظوں میں بیان نہیں کرسکتے) مطلع کرتا اور دوسرے کی ضروریات سے مطلع ہوتا ہے کیونکہ اطلاع کے بغیر ضروریات کی فراہمی ناممکن ہے۔ بس یہی جمادی زبان ہے۔

(۳) نباتات اور روئیدگی رکھنے والے اجسام کی بھی ان گنت نوعیں ہیں۔ خود رو سبزہ لاکھوں انواع کا ہوتا ہے۔ جن درختوں کو عام لوگ جانتے ہیں وہ بھی ہزاروں عدد ہیں، لیکن ہر نوع نباتات میں وہ تمام چیزیں پائی جاتی ہیں جو جمادی انواع میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً سیب و انار کے درختوں ہی کو لیجئے سیب کے درخت کا ہر جز ہی ہوتا ہے جس میں سیب ہونے کی خوبو ہوتی ہے اور انار کا درخت انار ہونے کی خوبو رکھتا ہے۔ ایک زمین ہوتی ہے۔ کھاد، پانی اور ہوا میں بھی یکسانگت ہوتی ہے، لیکن سیب کے درخت کی قوت کھاد، پانی، مٹی اور ہوا کی مناسب مقدار، مناسب کیفیت اور مناسب حالت کو جذب کر کے سیب کے درخت کی شکل بناتی اور اسی میں سیب کے تمام خواص پیدا کرتی ہے اور انار کے درخت کی قوت اسی کھاد پانی مٹی اور ہوا کی ایک خاص مقدار اور مناسب کیفیت کو کھینچ کر انار کے درخت کے اجزا تیار کرتی ہے۔ قابل سوال یہ امر ہے کہ اگر اس قوت میں مخصوص علم و شعور نہیں تو یہ ایک ہی چیز کے اندر مناسب تبدیل تغیر اور کیفیات کا اختلاف کس طرح ہوتا ہے اور کس طرح ایک ہی چیز کہیں انار اور کہیں سیب کے درخت کی شکل اختیار کرتی ہے۔ ہم اس نباتی شعور کو شعور کہیں یا نہ کہیں لیکن اتنا مان لینا ضروری ہے کہ نفس نباتی ہر نوع کا ممتاز ہے اور اپنی نوعی اور شخصی ضروریات کو فراہم کرنے سے واقف ہے۔ مناسب اجزا و کیفیات کا فراہم کرنا اور غیر موزوں اجزائے کیفیات کو دفع کرنا بغیر نوعی شعور کے ناممکن ہے۔ نفس نباتی اپنی تمام جاذبہ ماسکہ اور ہاضمہ قوتوں سے اس فطری شعور کے بعد کام لیتا، ضروریات کو فراہم کرتا اور موانع کو دور کرتا ہے۔

پھر یہ بھی تسلیم شدہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ہر نوع نبات کے افراد باہم میل ملاپ اور ربط ضبط ایسا رکھتے ہیں جو دوسری نوع کے افراد سے ان کو فطرۃً میسر نہیں۔ انار کا درخت انار کے درخت سے اور سیب کا درخت سیب کے درخت سے مانوس ہے۔ ہر درخت کو اجنبی درخت سے نفرت اور اپنے برادر سے رغبت ہوتی ہے الغرض ہر نوع کا درخت اپنے بھائی کے احوال و کوائف وغیرہ سے فطرۃً واقفیت رکھتا ہے۔ اگر ایک کو دوسرے کے احوال سے واقفیت نہ ہوتی تو اس کی طرف میلان اور ایک کا دوسرے کی مدد کرنا ناممکن ہو جاتا۔ ہم اس واقفیت کو طبعی واقفیت کہیں یا حسی۔ ایک نوع کے درختوں کے باہمی میلان کو فطری میلان کہیں یا ارادی یہ صرف لفظوں کا اختلاف ہے اور لفظوں کے اختلاف سے حقیقت بدل نہیں سکتی۔ اگرچہ ہم انواع نباتات بلکہ ہر نوع کے افراد کے علم و ارادہ کا انکار کریں تو یہ انکار خاص اصطلاح پر مبنی ہوگا۔ اپنی اصطلاح میں ہم نبات کے اندر حس و ارادہ کے قائل ہوں یا نہ ہوں، مگر نباتات کی نوعی و شخصی واقفیت اور باہمی میلان و رغبت کا انکار نہیں کرسکتے جس سے ہر درخت کا فطری علم و ارادہ آشکارا ہوتا ہے۔

ایک درخت کا دوسرے درخت کی ضروریات پر مطلع ہونا مثلاً نر کھجور کا مادہ کھجور سے ملاپ بلکہ ہر درخت کی نوعی تلقیح بتا رہی ہے کہ درختوں کو باہمی ضروریات کا علم ہے اور ہر ایک دوسرے کو اپنے حوائج سے مطلع کرتا ہے۔ یہ اطلاع کس زبان میں ہوتی ہے اس کو عام لوگ نہیں سمجھتے اور نہ یہ ان کے سمجھنے کی چیز ہے۔ حقائق شناس طبقہ اس کا پہلی قائم کرسکتا ہے، مگر کیفیت نہیں بتاسکتا۔ تاہم جمادات کی طرح درختوں کی بھی ایک بولی ہے اور اسی بولی کے ذریعہ سے ہر نوع کے افراد افہام و تفہیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں اور اپنی بقائے حیات کی کوشش کرتے ہیں۔

(۴) نباتات سے بالائی طبقہ یعنی حیوانات کی انواع بھی بے شمار ہیں۔ ہزاروں لاکھوں اقسام کے جانور ہوتے ہیں۔ ابھی ابھائی تعبیر کا سلسلہ نا قابل حصر ہے پھر حیوان کی ہر نوع کے تحت ان گنت افراد ہیں۔ گھوڑا، اونٹ، ہاتھی، شیر، بھیڑیا، کبوتر، باز، شاہین، فاختہ، بلبل غرض لا تعد و لا تحصیٰ انواع اور ہر نوع کے بے شمار اشخاص ہیں۔ تمام حیوانوں میں وہ تمام قوتیں ہیں جو جمادات و نباتات میں موجود ہیں۔ نوعی اور شخصی ضروریات کی فراہمی ہر جاندار کرتا ہے، لیکن اس کا احساس و ارادہ زیریں طبقوں سے زیادہ واضح ہے۔ جسمانی ساخت میں جن قوتوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ سب اس میں موجود ہیں اور نمایاں طور پر موجود ہیں۔ غرض جسمانی، ارادی حسی شعوری تمام طاقتیں جانوروں میں بالکل واضح اور ناقابلِ انکار ہیں۔ رغبت و نفرت کے جذبات بھی ان میں موجود ہیں۔ نوعی میل ملاپ اور تعلق و تالیف بغیر اطلاع و واقفیت کے ناممکن ہے، اس لئے ہر قسم کے جانوروں میں اپنے ابنائے جنس کی ضروریات و حوائج کی اطلاعات کا ایک ذریعہ پایا جاتا ہے جس کو ہم جانوروں کی بولی کہتے ہیں۔ جانوروں کی بولی اگرچہ عام انسانوں کے لئے ناقابلِ فہم ہے، مگر جانور آپس میں دوسرے کا مطلب اسی بولی سے خوب سمجھ لیتے ہیں۔

(۵) حیوان سے بالاتر انسان کا درجہ ہے۔ اس میں تمام کائنات کی جسمانی قوتیں، ارادی اور حسی طاقتیں موجود ہیں بلکہ یہ سب سے زیادہ خصوصیت کا حامل ہے۔ اس کو قوتِ فکریہ بھی عطا ہوئی ہے۔ یہ ضروریاتِ زندگی کے علاوہ غور و فکر کر کے حقائق کی تحلیل و ترکیب بھی کر سکتا ہے۔ اس کو عالمِ صغیر کہا جاتا ہے۔ صرف اس لئے کہ کل کائنات کی منتشر خصوصیات کا یہ مخزن ہے۔ اس جگہ ہم اس کی قوتوں کی مزید تحلیل کرنا چاہتے ہیں۔

انسان میں اجزائے جسمانی کی حفاظت کرنے والی قوت بھی ویسی موجود ہے جیسے جمادات میں نمو کی طاقت اور اس کے تمام خدام بھی ایسے ہی ہیں جیسے نباتات میں۔ جس و شعور وغیرہ بھی اس طرح پایا جاتا ہے جس طرح حیوانات میں اور سب سے بالا قوتِ تفکر بھی ہے۔

اب چونکہ فطرت کی طرف سے اس کو قوتِ فکر عطا ہوئی ہے اور تمام احساس و ارادہ تخیل قوتِ فکریہ کے ہی خادم ہیں، اس لئے ہم عقلاً یہ سمجھنے پر مجبور رہیں کہ اس کی قوتِ فکریہ کہ کل کائنات کو گھیرے ہوئے ہے اور اس کے تفکر کی زد سے عالم کی کوئی بھی کلی اور جزئی حقیقت خارج نہیں اور جب اس کی قوتِ علمیہ محیطِ کل ہے تو ظاہر ہے کہ جمادات، نباتات، حیوانات اور جنات کی کوئی وجدانی، حسی اور شعوری اور وہمی تخیلی کیفیت اس سے غائب نہیں ہو سکتی۔ کائنات کی پوری مادی اور علمی طاقتیں اس کی مسخر ہونی لازم ہیں۔ یہاں تک کہ جمادی نباتی اور حیوانی نطق بھی اس کے احاطۂ علمی سے باہر نہ ہونا چاہیئے کیونکہ جب یہ مجموعۂ عالم قرار پایا تو عالم کے کل فصول و خواص کا علم اس کو ہونا ضروری ہے۔ اس مختصر تقریر کا خلاصہ یہ نکلا کہ انسان کو تمام جہان کی حسی، شعوری اور نطقی کیفیت کا علم اور کل عالم کو اپنا فرماں پذیر بنانے کی قوت کا حامل ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اس کا ظہور ان کامل عقلاء میں ہوتا ہے جن کا آئینۂ فکر صاف ہے اور ان کا تفکر نقوشِ روحانیت کا آئینہ دار ہے۔ ایسے گروہ عقلاء کو انبیاء، اولیاء کہا جاتا ہے جن کا علم تلقینی تو بجائے خود ہے علم تفکری بھی غلطی سے محفوظ ہوتا ہے۔ ان کی قوتِ فکر کے آئینہ میں کل جہان اور کیفیاتِ جہان کی تصویریں منعکس ہو جاتی ہیں اور ان کو جس طرح بعض مخصوص اوقات میں عالمِ بالا کے حقائق کا علم ہو جاتا ہے اسی طرح اس مادی دنیا کے کل کوائف یہاں تک کہ پرندوں، چیونٹیوں، کیڑوں، مچھلیوں، درختوں اور پتھروں تک کی بولی کی بھی واقفیت ہو جاتی ہے۔ اس پوری جماعت عقلاء کا علمی اور حکمی تسلط اگرچہ تمام کائنات پر ہو سکتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک کا مرکز توجہ ایک ہی ہو۔ ان میں سے بعض حضرات اس مادی دنیا کے احوال و حقائق کے علم کی طرف بیشتر توجہ رکھتے ہیں بعض اس طرف کم توجہ کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور ہمارے حضور گرامی صلوات اللہ علیہم اجمعین سب ہی کائنات حقائق کا عمومی انکشاف رکھتے تھے اور آئینۂ فکر میں تمام منقوشات پاتے تھے اور کائنات میں بوقتِ ضرورت ہر قسم کا تصرف کر سکتے تھے۔ مینڈکوں اور جوؤں کی کثرت، دریا کا خشک ہو جانا حضرت موسیٰؑ کے اسی عمومی تسلط کا ایک مظاہرہ تھا۔ آگ کا گلزار بن جانا حضرت ابراہیمؑ کے کامل تصرف کا ایک اثر تھا۔ بیماروں کو اچھا کر دینا اور مُردوں کو زندہ کرنا حضرت عیسیٰؑ کے علمی اور حکمی تسلط کو ظاہر کرتا تھا۔ سنگریزوں کا تسبیح پڑھنا اور انگلیوں سے پانی پھوٹ کر اتنا بہنا کہ ایک لشکر سیراب ہو گیا۔ اونٹ کا حاضر ہو کر شکایت کرنا، درختوں کا ادھر ادھر سے آ کر ایک جا جمع ہو کر آڑ بن جانا اور رفع حاجت کے بعد پھر اپنی جگہ واپس چلا جانا۔ تمام پتھروں اور درختوں کا حضورؐ کو سجدہ کرنا یہ اور اس قسم کے دوسرے تصرفات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محیطِ کل فکری اور امری طاقت کو ثابت کر رہے ہیں۔

چنانچہ اسی قسم کے غیر محدود علمی احاطہ اور محیطِ کل طاقت کے مالک حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ بھی تھے۔ حضرت داؤدؑ کے ساتھ پہاڑ تسبیح پڑھا کرتے تھے، دستِ مبارک میں پہنچ کر لوہا موم کی طرح نرم ہو جاتا تھا۔ حضرت سلیمانؑ پرندوں اور دوسرے جانوروں کی بولی سمجھتے تھے۔ تمام جانوروں پر ان کی حکومت تھی۔ یہاں تک کہ جنات بھی ان کے فرمانبردار تھے۔

اب رہی یہ بات کہ حضرت داؤدؑ و سلیمانؑ ہی کی کیا خصوصیت تھی جس کی وجہ سے ان کے اس علمی فضل کو آیاتِ مذکورہ میں ظاہر فرمایا؟ تقریر مذکورۂ بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام انبیاء ان خصوصیات کے مالک ہوتے ہیں تو اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے جس کو ہم اوپر بھی بیان کر چکے ہیں۔ بات یہ ہے کہ انبیاء کا مرکزِ توجہ اگرچہ ملائے اعلیٰ ہے اور ہر

ایک کا استغراق فکری عالمِ بالا ہی کی طرف ہوتا ہے اور وہیں سے روحانی ضیا پاشیاں ہر ایک کے دماغ پر ہوتی ہیں، مگر اس عالمِ خلق کی طرف توجہ بھی تمام انبیاء کی ضروری ہے کیونکہ تبلیغ دین کا وہی فرض تھا۔ اب بعض انبیاء نے تو صرف مہمتِ تبلیغ خدا کی ادا کرنا طاقت سے کام لیا اور صرف آتے ہی معجزات سے کام لیا جو عارضی اور وقتی طور پر ان کو فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی سے سبک دوش کرنے والا تھا اور بعض نے لغت علمی کے حصول کے لئے نہ صرف حقائق کائنات کے مشاہدے میں اپنے بیشتر اوقات صرف کئے بلکہ ہمہ گیر دسترس اور انتظام کائنات کا مطالعہ ان کی توجہ کا ثانوی مرکز ہو گیا۔ مثلاً حضرت ابراہیم کا آگ کو گلزار بنا دینا اور حضرت عیسیٰ کا مُردوں کو زندہ کر دینا اور حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درختوں کو بلوانا اور چاند کو شق کرنا اور پہاڑوں کا لرز کر تسبیح پڑھنا اور ستون کو رلانا بعض خاص اوقات میں ہوا، لیکن حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں لاٹھی کا سانپ بن جانا اور ہاتھ کے چھالے کا آتشیں قمقمہ کی طرح چمکنا ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ اسی طرح حضرت داؤد کے ہاتھ میں لوہے کا نرم پڑ جانا اور حضرت سلیمانؑ کا جنات کو مسخر کرنا اور پرندوں کی بولی سمجھنا کسی خاص وقت اور کسی خاص ضرورت پر موقوف نہ تھا بلکہ ہمیشہ یہ حضرات مذکورہ تصرفات کرتے رہتے تھے۔ اگرچہ یہ اور اس قسم کے دوسرے انکشافات و تصرفات دوسرے انبیاء سے بھی ہوئے، مگر وہ صرف چند مرتبہ وقتی ضرورت کے تحت ہوئے، لیکن حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ وغیرہم کے مذکورہ انکشافات و تصرفات مدت العمر ہوتے رہے کیونکہ ان حضرات نے اس امری دسترس اور انتظام کائنات کے مطالعہ کو اپنی توجہ کا ثانوی مرکز بنا لیا تھا اور ماول الذکر حضرات نے صرف عالمِ بالا کے مشاہدہ پر اکتفا کیا اور زیرین کائنات کو حقیر سمجھ کر نا قابلِ توجہ سمجھا۔

ایک شبہ

چونکہ قوتِ فکر کا حامل تو ہر انسان ہے اور زیرین الواح کے تمام کمالات کا مجموعہ بھی ہے، اس لئے ضرور معلوم ہوتا ہے کہ کل کائنات کا انکشاف اور تمام زیرین تصرفات کا مالک ہر شخص ہو، انبیاء اور اولیاء ہی کی کیا خصوصیت ہے؟

ازالہ

شبہ بالکل صحیح ہے، مگر اتنا سمجھ لینا بھی لازم ہے کہ صرف قوتِ فکریہ کا حامل ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ قوتِ فکریہ کو مجلّٰی اور مصفّٰی رکھنے کی بھی ضرورت ہے۔ آئینہ عکس ریز ضرور ہوتا ہے، اس میں ہر تصویر کے ثبت ہونے کی صلاحیت ضرور ہوتی ہے، مگر اس کی عکس ریزی اسی وقت ممکن ہے جب زنگ اور کثافت سے پاک صاف ہو۔ آئینۂ روح کی بھی یہی حالت ہے۔ اگر یہ صاف ہو گیا تو یقیناً اس میں تمام کائنات کے کل کمالات کے نقوش ثبت ہوں گے لیکن جتنا مکدر ہو گا اسی قدر ثبت نقوش اور عکس ریزی میں کمی ہو گی۔

توہم

لیکن اس جواب سے لازم آتا ہے کہ عوام کو نہیں تو خواص کو ہی کل کائنات کے انکشافات و تصرفات کی قدرت ہو۔ کیونکہ ان کا آئینۂ فکر تو صاف ہوتا ہے۔ حکماء، جوگی، سنیاسی، بھکشو اور دوسرے تارک الدنیا سادھو راہب جنہوں نے اپنی عمریں مادی کثافت کو دور کرنے اور روح کو صاف کرنے میں بسر کر دیں ان کو تو کم از کم مرتبۂ مذکورہ حاصل ہونا ہی چاہیئے۔

ازاحہ

حقیقت یہ ہے کہ کامل انکشاف و تصرف سے روکنے والے اسباب پانچ ہیں:- (۱) نفس کے جوہر و ذات ہی میں نقصان ہو اور یہی نقصان انکشافِ کامل سے روکتا ہو۔ مثلاً بچہ کا نفس اپنی خلقت و فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے ناقص ہوتا ہے اور کمال کے درجہ پر فائز نہیں ہوتا (۲) جوہرِ نفس میں کوئی بیرونی کثافت اور تاریکی ہو، بے جا خواہشات میں انہماک اس آئینہ پر زنگ چڑھا دے اور اس کی وجہ سے حق کا ظہور اس آئینہ میں نہ ہو سکتا ہو (۳) منزلِ مقصود کی طرف صحیح رُخ ہو، رفتار ہو، مگر اصل جہت سے مُڑ کر دوسری طرف۔ مثلاً بہت نیک صوفی اور تارک الدنیا درویش بدنی عبادت و ریاضت کی طرف اتنی توجہ کرتے ہیں اور اوراد و وظائف میں اتنا انہماک رکھتے ہیں کہ ان کو اپنے قلبی آئینہ کو مشاہدہ کرنے کا زیادہ وقت نہیں ملتا اور جتنا مراقبہ کرنا چاہیئے اُتنا نہیں کرتے۔ جب معائنہ، مطالعہ، مشاہدہ اور مراقبہ نہیں کرتے تو پھر حقائقِ کائنات کے نقوش کی عکس ریزی کیسے ہو سکتی ہے (۴) کبھی تقلیدی حجاب انکشاف سے مانع ہوتا ہے۔ ایامِ طفلی سے بطور وراثت انسان کے قلب میں ایک خاص عقیدہ متمکن ہوتا ہے اور چونکہ ہر انسان اپنے عقیدہ کو صحیح سمجھتا ہے، اس لئے یہی حُسنِ ظن انکشافِ حقائق سے روکتا ہے (۵) انکشافِ حقائق کا صحیح طریقہ استعمال نہیں کیا جاتا اور غلط طریقہ اختیار کرنے سے انکشاف نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ اگر کسی کی پُشت کے پیچھے کوئی چیز رکھی ہے اور سامنے آئینہ رکھا ہے تو پسِ پشت کی چیز کا عکس سامنے والے آئینہ میں نہیں پڑ سکتا جب تک ایک خاص طریقے سے عکس ریزی کی کوشش نہ کی جائے۔ خاص طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ ایک اور آئینہ پُشت کے پیچھے اتنا ترچھا رکھا جائے کہ پشت کی چیز کا عکس اس میں آ جائے۔ پھر چونکہ پسِ پُشت کا آئینہ ترچھا ہے، اس لئے وہ سامنے والے آئینہ پر عکس ریزی ضرور کرے گا۔ اور اس طرح پُشت کی چیز دکھائی دے جائے گی۔ یہی حالت آئینۂ فکر کی بھی ہے۔ حقائقِ کائنات کی عکس ریزی کا اگر صحیح طریقہ استعمال نہ کیا گیا تو انکشاف کامل نہ ہو گا۔ اس تفصیل کو سمجھنے کے بعد توہم کا ازالہ ہو گیا کہ حکماء، جوگی، سنیاسی وغیرہ کے لئے انکشاف سے مانع یا نمبر اول یا نمبر سوئم یا نمبر چہارم یا نمبر پنجم ہے۔ نمبر دوئم کی نفی ہی حصولِ حقائق

کے لئے کافی نہیں ہوتی اور انبیاء اولیاء بندی میں پاکیزگی اور انواع مرتفع ہوتے ہیں۔

تحلیلِ اجزاء

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ حضرت داؤدؑ کا زمانہ حضرت موسیٰؑ کے ۵۶۹ برس بعد ہوا ہے اور آپ کی عمر سو سال ہوئی اور حضرت سلیمانؑ کی عمر پچاس برس سے کچھ زائد ہوئی (دکبیر سیوطی) کہا جاتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کے اُنیس ۱۹ بیٹے تھے جن میں سے نعمت صرف حضرت سلیمانؑ کو ملی۔ واللہ اعلم۔

عِلْمًا سے مراد ایک خاص قسم کا علم ہے۔ یوں تو تمام انبیاء عالم ہوتے ہیں اور سب کا علم وہبی ہوتا ہے اور عالمِ بالا سے ان کے پاس وحی آتی ہے پھر کائنات کے حقائق کا انکشاف اور تصرف کرنے کی طاقت بھی سب پیغمبروں کو حسبِ مراتب حاصل ہوتی ہے، مگر دیگر انبیاء کے لئے وہ انکشاف و تصرف جو حضرت داؤد و سلیمانؑ کو حاصل تھا بوقتِ ضرورت حاصل ہو جاتا تھا اور چونکہ ان دونوں حضرات نے بعض موجودات کے کشف و تصرف کو اپنی توجہ کا ثانوی مرکز قرار دے لیا تھا، اس لئے ایک خاص قسم کا علم ان کو ہر وقت حاصل تھا۔ وہ علم کیا تھا؟ اہلِ تحقیق نے لکھا ہے کہ حضرت داؤدؑ کے ساتھ تلاوتِ زبور کے وقت پہاڑ اور پرندے تسبیح پڑھتے اور آپ ان کی تسبیح کو سنتے اور جانتے تھے۔ آپ کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ بغیر تپانے اور پگھلانے کے لوہا آپ کے ہاتھ میں نرم ہو جاتا تھا جس سے آپ ہر طرح کی زرہیں بناتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ کا تصرف جنات اور پرندوں (اور تمام حیوانات) پر تھا۔ آپ ان کی بولیاں سمجھتے تھے بلکہ ہوا بھی آپ کی مسخر تھی۔ فلسفہ کی کتابوں میں حضرت سلیمانؑ کو حکیم یعنی حقائق کا عالم کہا جاتا ہے اور یہ بھی منقول ہے کہ حکیم فیثاغورث آپ ہی کا شاگرد تھا اُس کو جو کچھ حاصل ہوا آپ ہی کے فیض سے حاصل ہوا اور چونکہ حقائقِ کائنات سے وہ علمی واقفیت اللہ کا بڑا احسان ہے اس لئے دونوں حضرات نے بطورِ شکر یہ کہا تھا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ جس طرح عام لوگوں کے مراتب مختلف ہیں اسی طرح اہلِ ایمان کے درجات کا بھی اختلاف ہے۔ انتہا پر انبیاء کا درجہ ہے پھر انبیاء کے بھی مراتب مختلف ہیں۔ بعض انبیاء بعض پر فضیلت رکھتے ہیں۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمانؑ پیغمبر برحق تھے اور جماعتِ انبیاء میں داخل ہونے کے بعد بعض سے بالا اور بعض سے زیریں تھے، اس لئے شکریہ کے وقت ہر دو حضرات نے اپنی فی الجملہ فضیلت کا اظہار کیا۔

وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ۔ وراثت صرف مالی ہی نہیں ہوتی بلکہ علمی وراثت بھی ہوتی ہے۔ حضرت زکریا نے جب بیٹا پیدا ہونے کی دعا بارگاہِ الٰہی میں پیش کی تو یہ الفاظ کہے يَرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ظاہر ہے کہ حضرت زکریاؑ کی مراد مالی وراثت نہ تھی کیونکہ وہ بیچارے غریب مفلس تھے۔ نجاری کا پیشہ کر کے زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کے پاس اتنا مال کہاں تھا جس کے لئے وارث بنانے کی دعا کرتے۔ اس کے علاوہ وہ پیغمبر تھے اور پیغمبر کی شان کے شایاں نہیں کہ وہ اپنے اندوختہ مال کا وارث پیدا ہونے کی خواہش کرے۔ یہ فکر تو حریصانِ دنیا کو ہوتی ہے اور مرتے وقت ان کی جان مال میں اٹکی رہتی ہے۔ پھر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ حضرت زکریا نے ایسا بیٹا پیدا ہونے کی دعا کی تھی جو ان کا اور دوسرے بنی اسرائیل کا وارث ہو۔ اب اگر اس سے مالی وراثت مراد لی جائے گی تو بڑی مشکل پڑ جائے گی کیونکہ بیٹا اپنے باپ کا وارث تو ہو سکتا ہے، لیکن تمام قوم کا جس کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے کس طرح وارث بن سکتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت زکریا کی دعا میں وراثت سے مالی وراثت مراد نہیں۔

ایک صحیح حدیث میں آیا ہے العلماء ورثۃ الانبیاء یعنی علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ ظاہر ہے یہاں بھی مالی وراثت مراد نہیں کیونکہ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ نحن معشر الانبیاء لانورث ولا نورث یعنی ہمارا گروہ انبیاء کا گروہ ہے جو نہ خود کسی کے وارث ہوتے ہیں نہ ان کا کوئی وارث ہوتا ہے۔

مؤخر الذکر حدیث بالاجماع صحیح ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اول الذکر حدیث میں علماء کو جو انبیاء کا وارث قرار دیا ہے اس سے مالی وراثت مراد نہیں۔ انبیاء کا مالی وارث کوئی نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر حضرت سلیمانؑ حضرت داؤدؑ کے کیونکر وارث ہوئے اور وارث ہونے سے کیا مراد ہے؟ اکثر مفسرین نے علم و نبوت کی وراثت مراد لی ہے، مال داؤدؑ کی وراثت مراد نہیں ہے یعنی جو علم و نبوت حضرت داؤدؑ کو عطا ہوئی تھی وہی میراث حضرت سلیمانؑ کو ملی تھی، لیکن اس پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ وراثت اگرچہ مالی نہ ہو، مگر پھر بھی مفہوم وراثت کے لئے انتقال لازم ہے۔ اگر سلیمانؑ داؤدؑ کے علم و نبوت کے وارث ہوئے تو کیا داؤدؑ کا علم اور ان کی نبوت منتقل ہو کر سلیمانؑ کو ملی۔ علم و نبوت تو انتقال کی چیز نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وراثت کا انتقال لازم نہیں۔ قرآن ناطق ہے۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ یعنی وہی لوگ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ دوسروں سے چھین کر ان کو فردوس نہ دی جائے گی بلکہ جنت کا مالک ان کو بغیر دوسرے کا حق غصب کئے ہوئے کیا جائے گا۔ حاصل جواب یہ ہے کہ وراثت کا لفظ ایسے موقع پر بھی بولا جاتا ہے جہاں تشبیہی تملک ہو۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ اس شخص کو دانش و ذکاوت اپنے باپ کی میراث میں ملی ہے۔ یعنی یہ دانش و فہم کا اسی طرح

مالک ہے جس طرح اس کا باپ مالک تھا۔ یہی معنی آیت مذکورہ کے ہیں۔ جس طرح حضرت داؤد علم و نبوت کے حامل تھے اسی طرح حضرت سلیمان بھی علم و نبوت کے حامل ہوئے اور بغیر نقل کے ہوئے تو گویا جس طرح بیٹا اپنے باپ کے مال کا مالک بغیر فصل کے ہوتا ہے اسی طرح حضرت سلیمان اپنے باپ کی نبوت و علم کے وارث بغیر فصل کے ہوئے۔

وَقَالَ يٰاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ الخ۔ حضرت سلیمانؑ کو کمال دانش، علم و فضل اور نبوت سب کچھ اپنے باپ کی طرح حاصل تھا اور تین خصوصیات ان میں زائد تھیں۔ اوّل یہ کہ وہ پرندوں (وغیرہ) کی بولی سمجھتے تھے۔ دوسرے جنات ان کے فرمان پذیر تھے۔ تیسرے ہوا ان کی مسخر تھی۔ پہلی خصوصیت کا بیان آیت مذکورہ میں فرمایا ہے۔ آیت میں کسی پرندہ کی تخصیص نہیں ہے نہ حدیث میں اس کا کوئی تذکرہ ہے، اس لئے خطیب و خازن وغیرہ مفسرین نے جو چند پرندوں کے مخصوص نام لکھے ہیں وہ غلط ہیں۔ ان کی بنا محض اسرائیلی روایات پر ہے جو اہلِ حق کے نزدیک ناقابلِ قبول ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کے منطق الطیر سے واقف ہونے کی صراحت اگرچہ بائبل میں تفصیل کے ساتھ نہیں اور نہ چیونٹی کا وہ قصہ جو آئندہ آیات میں مذکور ہے کہیں بیان کیا گیا ہے لیکن اتنا ضرور ثابت ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی دانش ہمہ گیر اور علم بہت وسیع تھا۔ اول کتاب السلاطین کے چہارم باب میں مذکور ہے کہ خدا نے سلیمانؑ کو دانش اہلِ مشرق اور اہلِ مصر سے کہیں زیادہ دی تھی۔ سلیمان نے درختوں کی کیفیت بیان کی۔ کوہ لبنان کے سرو کے درخت سے لے کر اس زوفہ تک جو دیوار سے اُگا ہوتا ہے۔ نیز چوپایوں، پرندوں، رینگنے والے کیڑوں اور مچھلیوں کا حال بھی بیان کیا۔

رہی یہ بات کہ حضرت سلیمانؑ کو جانوروں کے نطق کا علم کس طرح ہوتا تھا؟ تو اس کی مشرح تفصیل ہم تفسیری مقالات میں لکھ چکے ہیں۔ ان مفرد و مرکب الفاظ کا استعمال جو دل کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہو حقیقی نطق کہلاتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے کائنات کی ہر نوع کے افراد کو مخصوص طور پر افہام و تفہیم اور اطلاع و اخبار کا ذریعہ بنا دیا ہے جس کے ذریعہ سے وہ آپس میں کلام کرتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کو بھی ان کے مطالب کا علم ہو جاتا تھا کیونکہ اظہارِ مطالب کے ذرائع کو وہ سمجھتے تھے۔ اس تفصیل کے بموجب نطق کے مجازی معنی لینے کی ضرورت نہیں ہوتی جس طرح کہ بیضاوی نے مراد لی ہے کیونکہ نطق کا اطلاق صرف انسانوں کی گفتگو پر ہی نہیں ہوتا بلکہ ہر ایسی آواز نکالنے والے کو بھی نطق کہتے ہیں جو دوسرے کو مطلب سمجھا دے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دوسرے انواع کا نطق انسانوں کے نطق کی طرح نہیں ہے۔

وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ۔ یہ بھی حضرت سلیمانؑ کا مقولہ ہے۔ ہر چیز کے عطا کئے جانے سے مراد یہ نہیں کہ کل کائنات حضرت سلیمان کو دے دی گئی تھی۔ یہ صرف محاورہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نبوت و سلطنت کو جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب خدا تعالیٰ نے عطا فرما دیں۔ مقاتل نے کہا اس سے مراد ہے نبوت، سلطنت اور جن و انس کی فرمان پذیری اور ہوا کی تسخیر۔ میرے نزدیک تخصیص کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ ابھی معلوم ہو چکا کہ حضرت سلیمانؑ پرندوں کی بولی کا مفہوم بھی سمجھ لیتے تھے۔ چیونٹیوں اور دوسرے کیڑوں کی گفتگو سے بھی واقف تھے، اس لئے مراد یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے جن چیزوں کی خواستگاری کی تھی وہ سب ان کو عطا کر دی گئی تھیں اور اسی کو آپ نے فضل مبین قرار دیا، لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ حضرت نے یہ کلام رعونت اور غرور سے فرمایا تھا۔ پیغمبر ایسے بیہودہ جذبات سے پاک ہوتے ہیں بلکہ اس کلام کے اظہار کا باعث جذبۂ منت کشی اور داعیۂ شکر تھا۔ انہوں نے پروردگار کے فضل کو اظہارِ شکر کے لئے بیان کیا تھا۔ ہمارے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اظہارِ شکر کے لئے فرمایا تھا کہ میں اولادِ آدم کا سردار ہوں، لیکن یہ کلام بطورِ فخر نہیں ہوتا۔

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ الخ۔ حضرت سلیمانؑ کا لشکر تین طرح کا تھا۔ انسان، جنات اور پرندے تینوں گروہ اپنی اپنی جگہ موءدب قائم رہتے تھے۔ اجازت نہ تھی کہ کوئی اپنی جگہ چھوڑ کر دوسرے کی جگہ چلا جائے۔ گویا جس طرح شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ موکبِ شاہی میں فوج کو چلنا چاہیئے اسی طرح حضرت سلیمانؑ کا لشکر جو مختلف انواع کے افراد سے مرکب تھا مرتب رہتا تھا۔ انسان تو انسان رہے بلکہ لایعقل پرندے تک خلافِ ادب گڑبڑ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ گویا حضرت سلیمانؑ کی دوسری خصوصیت تھی۔

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ الخ۔ اس قصہ کو بیان کرنے سے دو باتوں کا اظہار مقصود ہے۔ ایک تو حضرت سلیمان کے لشکر کے تزک و احتشام کا مظاہرہ۔ دوسرے چھوٹے چھوٹے کیڑوں یہاں تک کہ چیونٹیوں کی بولی کو سمجھنا۔

کعب احبار کا قول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمانؑ وادیٔ سدیر ضلع طائف میں تشریف لئے جا رہے تھے۔ موکب شاہی بھی ہمرکاب تھا تو ایک چیونٹی نے دوسری

لہ قتادہ و مقاتل نے کہا چیونٹی کا ملک شام کی ایک وادی میں ہے۔ ثعالبی نے اول قول کو پسند کیا ہے۔ کیونکہ طائف میں اب بھی ایک وادی ہے جس کو وادی النمل کہا جاتا ہے۔

چیونٹیوں سے کہا چلو سوراخوں میں گھس جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ کی فوج تم کو پامال کر دے۔ اگرچہ وہ دانستہ تم پر ظلم نہ کریں گے، لیکن ان کو خبر بھی نہ ہوگی اور تم پامال ہو جاؤ گی۔ حضرت سلیمانؑ چیونٹی کا قول سن کر مسکرانے لگے یہاں تک کہ آپ کو ہنسی آگئی (ہنسی کے دو سبب تھے اول تو آپ کو چیونٹی کے قول پر تعجب ہوا کہ وہ آپ کو بے خبر جانتی تھی دوسرے اپنے علم کی ہمہ گیری سے مسرت ہونا چنانچہ انسان فرد کی نمود دیکھتا ہے اور انبیاء چونکہ تکبر سے پاک ہوتے ہیں، اس لئے) آپ نے فوراً دعا کی پروردگار لہٰذا مجھے توفیق عطا فرما کہ میں تیرے ان احسانات کا شکریہ ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کئے ہیں۔ اپنے اوپر کئے ہوئے احسان کا شکریہ ادا کرنا تو اصولی طور پر لازم ہی ہے، لیکن اس احسان کا شکریہ ادا کرنا جو والدین پر کیا گیا ہو اگرچہ واجب نہیں، لیکن بزرگوں کے شایانِ شان ضرور ہے۔ اس کے علاوہ حضرت سلیمانؑ کا خاندان شاہی نہ تھا، اسلاف بادشاہ نہ تھے، سلطنت کی ابتدا حضرت داؤدؑ سے ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ نبوت، حکمت اور دانش کے حصول اور سلطنت کے ذریعہ کی بہم رسانی کا شکریہ بھی ضروری قرار پایا۔ شکریہ ادا کرنے کی تین صورتیں ہیں (۱) منعم کی نعمت کو سمجھنا اور یہ یقین کرنا کہ منعم کا یہ محض احسان ہے (۲) انعام کو قبول کرتے وقت اپنی محتاجی اور ذلت کو ظاہر کرنا (۳) منعم کی ثنا و حمد کرنا۔ ان تینوں طریقوں سے حضرت سلیمان نے پروردگار کا شکر ادا کیا بلکہ اتنی بات زیادہ بھی ظاہر کی کہ شکر ادا کرنے کی توفیق ملنی بھی پروردگار ہی کی طرف سے ہے۔ لیکن شکر کی ہر سہ اقسام کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ منعم کے اظہار منت کشی کے بعد اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرے۔ زبان سے شکر کرنا اور فعل سے اس کے خلاف کرنا ہرگز شکر نہیں بلکہ اگر اس کو استہزاء یا فریب کہا جائے تو مناسب ہے، اس لئے حضرت سلیمانؑ نے اپنی دعا میں کہا:۔

وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ کہ پروردگار! مجھے ایسے نیک کام کرنے کی توفیق بھی عنایت فرما جو تجھے پسند ہوں۔ نیک کام تو بہر حال قابلِ پسندیدگی ہوتے ہی ہیں، مگر بعض نیک اعمال خلوص کے ساتھ کئے جاتے ہیں اور بعض اوپرے دل سے، اور اوپرے دل سے نیک کام اگرچہ بجائے خود اچھے ہوں، مگر عالی مرتبہ لوگوں کے حال و مرتبہ کے مناسب نہیں، اس لئے حضرت سلیمانؑ نے ... کہہ کر پُر خلوص عمل صالح کی توفیق ملنے کی درخواست کی، لیکن آپ کو معلوم تھا کہ نجات و فوز کا مدار اچھے اعمال پر نہیں، محض رحمتِ الٰہیہ پر ہے۔ عمل صالح تو موجودہ احسان کا شکر بھی کامل طور پر ادا نہیں کر سکتے، اس لئے عرض کیا کہ:۔

وَاَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ۔ اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں کے گروہ میں داخل فرما دے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا صالح وہ ہے جو کبھی معصیت نہ کرے اور نہ معصیت کا ارادہ دل میں لائے اور ایسے لوگ سوا انبیاء کے دوسرے نہیں ہوتے، اس لئے صالحین سے مراد انبیائے سابقین ہیں۔

حضرت سلیمانؑ کو تمام دنیوی نعمتیں حاصل تھیں۔ عزت، حکومت، سلطنت، حکمت، علم کی غیر معمولی وسعت اور نبوت سب ہی کچھ میسر تھا، مگر چونکہ عارف باللہ کی نظر میں عمل صالح سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں اور حقیقی راحت آخرت کی نجات ہے، اس لئے حضرت سلیمان نے باوجود اس قدر عظمت و شکوہ کے پھر بھی عمل صالح اور فوزِ ابدی کی تمنا کی۔ مروی ہے کہ ایک بار حضرت سلیمانؑ مع خدم و حشم کے کہیں جا رہے تھے۔ ایک کاشتکار کھیت میں ہل جوت رہا تھا۔ کہنے لگا خانوادۂ داؤد کو بڑی سلطنت عطا ہوئی ہے۔ اس کی خبر (جنات یا ہوا یا پرندوں کے ذریعہ سے) حضرت سلیمانؑ کو ہو گئی۔ آپ تنہا پیدل اس کے پاس تشریف لے گئے اور سلام علیک کے بعد فرمایا کہ مناسب نہیں کہ جس کام کو قدرت نہ ہو اس کی تمنا کرو۔ پھر فرمایا اگر ایک بار تسبیح (سبحان اللہ کہنا) بارگاہِ الٰہی میں قبول ہو جائے تو آلِ داؤد کی سلطنت سے بڑھ کر ہے۔

مقصودِ بیان

علم اللہ کی نعمتِ عظمیٰ ہے اور ایسی نعمت ہے جس کا شکریہ حضرت داؤدؑ و حضرت سلیمان علیہم السلام نے بھی ادا کیا ہے۔ اس لئے اہلِ علم و اہلِ ایقان پر لازم ہے کہ وہ اس نعمتِ کبریٰ کا شکریہ ادا کریں۔ علم، دولت، حکومت، عزت، جاہ و حشم وغیرہ (اگر غرور انگیز اور تکبر آفریں نہ ہوں تو) نمایاں فضیلت کے اسباب ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت سلیمانؑ نے ان کو اللہ کا فضل مبین فرمایا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر تین طرح کا تھا۔ اول انسان۔ دوئم جنات۔ سوئم پرندے۔ وادیٔ نملہ چیونٹیوں کا ایک وادی تھا۔ نملہ کسی قبیلہ کا نام نہیں نہ جن سے مراد قوم عمالقہ ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی دعا تعلیم دے رہی ہے کہ پروردگار کی نعمت کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے اور شکریہ ادا کرنے کی توفیق بھی خدا ہی سے مانگنی ضروری ہے پھر شکریہ ادا کرنے کے یہی معنی نہیں کہ احسان کا زبان سے فقط اقرار کر لیا جائے بلکہ اعمال نیک اور طاعت الٰہی سے منت کشی کا مظاہرہ کرنا چاہیئے، لیکن یہ یقین رکھنا لازم ہے کہ فوزِ آخرت اعمال پر موقوف نہیں بلکہ اللہ کی رحمت سے وابستہ ہے۔

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ ۝ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَذْ

سلیمان نے پرندوں کی حاضری لی اور بولے کیا بات ہے کہ میں ہُدہُد کو نہیں پاتا کیا وہ غیر حاضر ہے میں ضرور اس کو سخت سزا دوں گا یا اس کو ذبح کر ڈالوں گا

أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَٰنٍ مُّبِينٍ ۝ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ فَقَالَ أَحَطتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِۦ وَجِئْتُكَ مِن سَبَإٍ

یا میرے سامنے کوئی صاف دلیل پیش کرے — سو ہُدہُد تھوڑی ہی دیر میں آگیا اور عرض کیا میں نے ایسی بات معلوم کی ہے جو آپ کو معلوم نہیں ہوئی اور میں آپ کے

بِنَبَإٍ يَقِينٍ ۝ إِنِّي وَجَدتُّ ٱمْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِن كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ ۝ وَجَدتُّهَا

پاس سبا سے ایک یقینی خبر لیکر آیا ہوں میں نے دیکھا کہ وہاں کے لوگوں پر ایک عورت حکومت کرتی ہے اور اُس کو ہر چیز دی گئی ہے اور اُس کا ایک بڑا تخت ہے لیکن میں نے اُس

وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِن دُونِ ٱللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ ٱلشَّيْطَٰنُ أَعْمَٰلَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ ٱلسَّبِيلِ فَهُمْ

کو اور اس کی قوم کو اللہ کو چھوڑ کر آفتاب کو سجدہ کرتے پایا — شیطان نے اُن کے اعمال نظر فریب کر دیئے ہیں — اور اُن کو راہ سے روک دیا ہے اس لئے وہ راہ

لَا يَهْتَدُونَ ۝ أَلَّا يَسْجُدُوا۟ لِلَّهِ ٱلَّذِي يُخْرِجُ ٱلْخَبْءَ فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ۝

پر نہیں چلتے — یعنی اُس اللہ کو سجدہ نہیں کرتے جو آسمان و زمین کی چھپی بات کو نکال لیتا ہے — اور تمہارے کھلے چھپے سے واقف ہے

ٱللَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ ٱلْعَرْشِ ٱلْعَظِيمِ ۩ ۝ قَالَ سَنَنظُرُ أَصَدَقْتَ أَمْ كُنتَ مِنَ ٱلْكَٰذِبِينَ ۝ ٱذْهَب — السجدة

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہی عرشِ عظیم کا مالک ہے — سلیمان نے کہا اچھا ہم دیکھیں گے کہ تُو نے سچ کہا یا تو جھوٹا ہے — میرے

بِّكِتَٰبِي هَٰذَا فَأَلْقِهْ إِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَٱنظُرْ مَاذَا يَرْجِعُونَ ۝ قَالَتْ يَٰٓأَيُّهَا ٱلْمَلَؤُا۟ إِنِّيٓ أُلْقِيَ إِلَيَّ

اس خط کو لے جا اور اُن کے پاس لے جاکر ڈال دے پھر اُن کے پاس سے ہٹ جا اور دیکھ وہ کیا جواب دیتے ہیں — ملکۂ سبا نے کہا اے اہلِ دربار! میرے پاس ایک

كِتَٰبٌ كَرِيمٌ ۝ إِنَّهُۥ مِن سُلَيْمَٰنَ وَإِنَّهُۥ بِسْمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحْمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ ۝ أَلَّا تَعْلُوا۟ عَلَىَّ وَأْتُونِى مُسْلِمِينَ ۝ (ع)

گرامی نامہ آیا ہے — وہ سلیمان کی طرف سے ہے — اور اس کا مضمون یہ ہے بسم اللہ الرحمن الرحیم کہ میرے مقابلہ میں تم لوگ تکبر نہ کرو اور مسلمان ہو کر میرے پاس آجاؤ

قصہ کا خلاصہ تو ہم تحلیل اجزا کے ذیل میں لکھیں گے۔ یہاں ان اعتراضات کو نقل کرنا چاہتے ہیں جو اعدائے اسلام کی طرف سے اس مقام پر کئے گئے ہیں۔ نقل اعتراضات کے بعد تنقیح جواب بھی کریں گے جس سے تمام شبہات جڑ سے اکھڑ جائیں گے۔

(۱) پہلا اعتراض یہ ہے کہ جب سلیمان ؑ کا علم اس قدر ہمہ گیر تھا کہ پرندوں اور کیڑوں تک کی بولی آپ سمجھتے تھے تو ہُدہُد کو ڈھونڈنے کے کیا معنی۔ کیا آپ کو اتنا بھی معلوم نہ ہو سکا کہ ہُدہُد کہاں ہے؟

(۲) دوسرا اعتراض یہ ہے کہ سلیمان ؑ فلسطین و شام کے بادشاہ تھے اور شام سے یمن کا فاصلہ اتنا نہیں کہ سلیمان کو وہاں کی حالت اتنی بھی نہ معلوم ہو کہ وہاں بادشاہ کون ہے، مملکت جمہوری ہے اور یمن کی بستی کہاں ہے، وہاں کے باشندے کیا مذہب رکھتے ہیں، سلیمان کا علم ہُدہُد کے علم سے تو کمزور نہ تھا کہ ہُدہُد کو ایک چیز معلوم ہو جائے اور سلیمان کو نہ ہو۔ حضرت سلیمان ؑ سے سینکڑوں برس پہلے بابل، شام اور مصر کے بادشاہوں کو ایک دوسرے کے حال سے کامل واقفیت ہوتی تھی اور اس واقفیت کی بنا پر وہ باہم لشکر کشی کرتے تھے۔ خبر رسانی کے ذرائع اگرچہ اس زمانہ میں ایسے نہ تھے جیسے آج کل ہیں۔ تاہم جاسوسوں اور مخبروں کے ذریعہ سے قریبی ممالک کے حالات کا انکشاف ہو جاتا تھا۔ پھر اگر جنات کا تابع ہونا بھی تسلیم کر لیا جائے تو اعتراض کو مزید تائید حاصل ہو جاتی ہے۔ جنات کے لئے تو ملک یمن کچھ دور نہ تھا۔ پھر سلیمان کے لاعلم ہونے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔

(۳) تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر ہُد ہُد سے مراد خاص جانور ہے تو اس کی رفتار میں ایسی سُرعت کیسے ہو سکتی ہے کہ تھوڑی دیر میں اڑ کر شام سے یمن پہنچ جاتا تھا اور وہاں سے لوٹ کر آجاتا۔

(۴) چوتھا اعتراض یہ ہے کہ ہُد ہُد جانور تھا تو اس کو کسی کے مذہب کی کیا شناخت، بے عقل جانور خدا پرستی اور ستارہ پرستی میں فرق کس طرح کر سکتا ہے؟

(۵) پلک جھپکتے بلقیس کا تخت یمن سے شام میں آجائے، عقل اس کو قبول نہیں کرتی۔ مراسلات اور نقل وحمل کے ذرائع اس زمانے میں اگرچہ غیر معدود ہیں اور وہ ایجادیں ہو چکی ہیں جو متقدمین کے خیال میں بھی نہ گزری تھیں، لیکن اتنا سریع الحرکت نقل وحرکت اب بھی ناممکن ہے پھر اس زمانے میں جب کہ علم کی اتنی وسعت نہ تھی کس طرح طرفۃ العین میں تخت سامنے آگیا۔

(۶) کیا اس شخص کا علم جو پلک جھپکتے تخت لے آیا تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے علم سے بھی زائد تھا کہ وہ اپنے علمی زور سے ایک کام کر سکا اور سلیمانؑ نہ کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ بالکل بے حقیقت ہے۔ اس لئے بائیبل میں کہیں مذکور نہیں اور اگر اس کی کچھ حقیقت بھی ہو تو قرآن نے معمولی واقعہ کو افسانہ کے رنگ میں بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے جو اکثر صداقت سے خالی ہے۔ معتزلہ نے ان اعتراضات سے بچنے کے لئے قرآن کے بیان میں تاویلیں کی ہیں۔ مثلاً ان کا قول ہے کہ ہُد ہُد سے مراد پرندہ نہیں بلکہ حضرت سلیمانؑ کے سواروں کے افسروں کا نام تھا۔ طیر سے مراد وہ باز پیما سوار ہے جو آن کی آن میں گھوڑے دوڑا کر دور دور پہنچ جاتے تھے گویا اڑتے تھے۔ انہیں سواروں کا افسر حضرت سلیمانؑ کی اطلاع کے بغیر اثنائے سفر میں چاروں طرف کے احوال معلوم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا اور اسی نے نامہ بری کی خدمت انجام دی تھی۔ عِفْرِيتٌ مِّنَ الْجِنِّ سے مراد قوم عمالقہ کا دیو ہیکل آدمی۔ قوی ہیکل کو دیو کہہ لیا کرتے ہیں۔ طرفۃ العین میں تخت لانے کا مطلب واقعی لحظہ بھر میں لے آنا نہیں ہے۔ یہ صرف محاورہ کا لفظ ہے جس سے مراد جلدی اور سُرعت ہے۔ عام طور پر بولا جاتا ہے کہ میں پلک جھپکتے میں یہ کام کر دوں گا۔ رہی سلیمانؑ کی لاعلمی اور ہُد ہُد کا باخبر کرنا تو یہ ناممکن نہیں۔ اس زمانے میں خبر رسانی کے ذرائع نہ تھے۔ ممکن ہے کہ سلیمان کو مفصل خبر پہلے معلوم ہوئی ہو۔ معتزلہ نے اسی قسم کی تاویلیں کی ہیں جن میں سے بعض نص قرآنی کے خلاف ہیں۔ بعض احادیث کا نقض کرتی ہیں بعض کو عقل قبول نہیں کرتی۔ اہل حق کے نزدیک ہُد ہُد پرندہ ہی کا نام تھا اور واقعی اس نے پیامبری اور جاسوسی کی خدمت انجام دی تھی اور عفریت من الجن واقعی دیو تھا، قوم عمالقہ کا آدمی نہ تھا اور وہ عالم جس نے تخت لانے کا فوری وعدہ کیا تھا اور حسبِ نص قرآنی جس کے پاس علم کتاب تھا۔ وہ پلک جھپکتے ہی تخت کو لے آیا تھا۔ معتزلہ کے اقوال کا رد بہت واضح ہے اور تمام تاویلیں دھ[illegible]کا ہیں اور سب کی بنا مرتبۂ نبوت سے انکار کرنے پر یا حقیقتِ رسالت سے ناواقفیت پر ہے۔ ہم آیت دَاوُدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا کے ذیل میں تفسیری تتبع کے موقع پر اس کی مکمل وضاحت کر چکے ہیں۔ مزید تفصیل دیکھنی ہو تو رازی وغیرہ کی تفسیروں میں دیکھنی چاہیے۔ یہاں اہل سنت کے مذہب کے مطابق ہم اعتراضات کا ازالہ کرتے ہیں۔

نمبر اوّل کا جواب یہ ہے کہ حضرت سلیمان علام الغیوب نہ تھے، تمام دنیا کے واقعات وحوادث ہر وقت آپ کے پیش نظر نہ رہتے تھے نہ تمام عالم کے پرندوں، چرندوں، درندوں اور درندوں کے مکالمات ہر وقت سنتے رہتے تھے۔ ورنہ ایسے علمی ہجوم سے سلیمانؑ کیا بڑے سے بڑے نبی اور جلیل القدر فرشتے کی زندگی بھی ناممکن ہو جانا لازم ہے۔ پرندوں وغیرہ کی بولی سمجھنے کے یہ معنی ہیں کہ بوقت ضرورت آپ جانوروں کے مکالمات وخطابات کو سمجھ لیتے تھے نہ یہ کہ ہر وقت جانوروں کی جستجو میں رہتے تھے۔ تمام انبیاء قوت قدسیہ کے حامل ہوتے ہیں، ان کا آئینۂ فکر صاف ہوتا ہے۔ حوادث وموجودات کی عکس ریزی اس پر ہوتی رہتی ہے۔ لیکن یہ بات ضروری نہیں ہوتی کہ ہمہ وقت تمام کائنات کے حقائق اور واقعات کے نقوش خواہ مخواہ ثبت ہوتے رہیں۔ ورنہ علم الٰہی اور علم نبوی میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔ مخلوق مخلوق ہے، خالق خالق ہے۔ خالق کا علم محیطِ کل ہے اور مخلوق میں حصول علم کی صلاحیت ہے۔ فعلیت وصلاحیت میں بڑا فرق ہے پھر علمی صلاحیت میں بھی بڑا اختلاف ہے۔ ادنیٰ مخلوق سے لے کر اعلیٰ نبی تک بڑا فصل ہے۔ رہا سلیمان کا قریبی ممالک اور ہم جوار سلاطین کی حالت سے ناواقف ہونا اور ہُد ہُد کا آپ کو مطلع کرنا تو اس میں کوئی استحالہ نہیں۔ سلیمان علام الغیوب نہ تھے۔ بغیر ذریعہ کے کل مفصل احوال ان کو اپنی رعایا کے بھی نہ معلوم ہو سکتے تھے۔ دوسرے بادشاہوں اور حاکموں کی طرح آپ بھی خبر رسانی کے محتاج تھے۔ ہاں آپ کو یہ امتیاز تھا کہ دوسرے بادشاہوں کا ذریعہ اطلاع صرف انسانوں کی مخبری یا جاسوسی ہوتی ہے، لیکن سلیمان کے پاس چار طرح اطلاع آتی تھی۔ کبھی ایک ذریعہ سے کبھی دوسرے ذریعہ سے کبھی تیسرے ذریعہ سے کبھی چوتھے ذریعہ سے۔ آپ کے پاس وحی بھی آتی تھی جس سے بعض ضروری خبریں معلوم ہو جاتی تھیں۔ گویا کبھی فرشتے آکر آپ کو خبر دیتے تھے کبھی خبر رسانی کا کام جنات سے لیا جاتا تھا۔ کبھی وہ آدمی بھی لا کر خبریں دیتے تھے جن کے متعلق مخبر رسانی کی خدمت کی جاتی تھی۔ کبھی جانور بھی اس خدمت پر مامور ہوتے تھے۔ بغیر ذرائع کے علم ہو جانا تو ناممکن تھا اور ذرائع یہی چار تھے کہ انسانوں نے آکر کہا سب کوئی خرابی نہیں۔ جن نے آکر کہا جب کوئی

برائی نہیں۔ جانوروں نے اطلاع دی جب استحالہ نہیں اور وحی کی اطلاع تو ہر غلطی سے محفوظ ہوتی ہی تھی ملک یمن کی مفصل کیفیت آپ کو جنات نے بتائی نہ کسی آدمی نے خبر دی کیونکہ وہ اس خدمت پر مامور نہ تھے۔ پرندہ نے بتادی کیونکہ وہ اس خدمت پر مامور تھا۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ سلیمانؑ کو جنات اور آدمیوں کے ذریعہ سے ملک یمن کی حالت معلوم تھی، مگر پرندہ یہ سمجھا کہ آپ کو معلوم نہیں، اس لئے اس نے آکر کہا کہ میں آپ کو ایسی بات بتاتا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں یہ پرندہ کا گمان تھا۔ حضرت سلیمان کے علم سے وہ ناواقف تھا، اس لئے ایسی بات کہی۔ حضرت سلیمانؑ نے جواب میں نہ اس کی تصدیق کی نہ قرآن نے اس کی کچھ صراحت کی کہ پرندہ کی اطلاع سے پہلے سلیمان کو علم تھا یا نہ تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سلیمان کو ویسے تو یمن اور شاہان یمن کی اطلاع ہو، مگر یمن میں جو حکومت کا غیر معمولی انقلاب ہوگیا تھا اور خلاف قاعدہ بلقیس کو ملکہ بنا دیا گیا تھا اور بلقیس کی تخت نشینی کو زیادہ مدت نہ گزری تھی، اس لئے آپ کو علم نہ ہو سکا۔ بات یہ ہے کہ عرب بائدہ کے بقیہ خاندانوں کو تباہ اور پراگندہ کرنے کے بعد قحطان (جس کو توریت میں یقطان کہا گیا ہے) جن عابہ بلاد عرب کے جنوبی حصہ میں حکومت قائم کی۔ قحطان کے بعد اس کا بیٹا یعرب حکمران ہوا۔ یعرب کے بعد یشجب اور یشجب کے بعد اس کا بیٹا عبد شمس (جس کا لقب سبا تھا اور جس کے نام شہر سبا کی تعمیر ہوئی) بادشاہ ہوا۔ سبا کے چند بیٹے تھے جن میں حمیر سب سے بڑا تھا۔ باپ کے بعد حکومت کی عنان اس کے ہاتھوں میں آئی۔ اس کی نسل شاہان تبابعہ کہلاتی ہے۔ تبع لقب کے چند بادشاہ ہوئے جن میں سے ایک شرحبیل بھی تھا۔ اس کا تخت گاہ شہر مارب تھا اور قصر غمدان بھی اسی نے بنایا تھا۔ شرحبیل کے مرنے پر اس کا بیٹا ہدہاد حکمران ہوا۔ ہدہاد کی کوئی نرینہ نسل نہ تھی ایک لڑکی تھی جس کا نام بلقیس تھا عرب کو عورت کی حکومت پسند نہ تھی، اس لئے بلقیس بادشاہ نہ بن سکی بلکہ بلقیس کا چچا زاد بھائی مالک تخت نشین ہوا۔ مالک بہت عیاش اور تھا۔ رعایا کی پاک دامن لڑکیوں کی عصمت اُس سے محفوظ نہ تھی۔ جذبۂ عیش پرستی پر بھینٹ چڑھانے اس نے ایک روز بلقیس کو اپنے محل میں طلب کیا۔ بلقیس نے اپنے ناموس کو بچانے کے لئے یہ تدبیر کی کہ پہلے سے کسی طرح دو آدمیوں کو قصر غمدان میں چھپا دیا اور خود تنہا بادشاہ کے پاس گئی اور تنہائی میں موقع پا کر اس کے دونوں آدمیوں نے مالک کو قتل کردیا۔ اس دلیرانہ قدم کی وجہ سے اہل یمن نے بلقیس کو اپنی ملکہ بنا لیا۔ ہُد ہُد کو جب یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تو اس نے حضرت سلیمان کو آکر اطلاع دی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو بغیر ذریعہ کے فوراً اطلاع کس طرح ہو سکتی تھی کہ بلقیس نے مالک کو قتل کر دیا۔ اس تقریر سے دوسرے اعتراض کا بھی استیصال ہوگیا۔

نمبر ۳ کا ازالہ بھی بالکل واضح ہے کیونکہ یہ واقعہ فلسطین کا نہیں ہے نہ ہُد ہُد فلسطین سے اڑ کر یمن کو گیا تھا بلکہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان مع خیل و حشم کے حجاز سے واپس آرہے تھے۔ اثنائے راہ میں صنعا (یمن کا ایک شہر) کے قریب پڑاؤ کیا۔ یہیں سے ہُد ہُد غائب ہوا اور ملک یمن کی خبر لے کر واپس ہوا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک گھنٹہ میں آیا یا ایک دن میں۔ بہرحال حضرت سلیمانؑ کی مراسلت بھی اسی جگہ سے ہوئی۔ اب سرعت رفتار کا سوال ہی باقی نہیں رہتا، ایک گھنٹہ میں کثیر مسافت طے کر لینی پرندوں کے لئے بالکل سہل ہے بہر حال ہُد ہُد تو نامہ بری اور خبر رسانی کی خدمت انجام دیا ہی کرتا تھا۔

نمبر ۴ کے حل کے لئے اس تفسیری مقالہ کو پڑھو جو قصہ کے آغاز میں ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ یہاں بالاختصار اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ انسان کے علاوہ دیگر انواع کو اگرچہ تعالی فکر کا علم نہیں ہوسکتا اور مقدمات معلومہ کو ترتیب دے کر وہ نتائج نکالنے سے معذور رہیں، لیکن جزئیات بدیہیہ کی معرفت سے تو قاصر نہیں۔ احساس اور توہم، تخیل سے تو سب بہرہ ور ہیں۔ حیوانات ذی روح میں رغبت و نفرت کے جذبات موجود ہیں۔ دشمن سے بھاگنا اور دوست کی طرف بڑھنا جانور بھی جانتا ہے۔ شیر وغیرہ سے ہر صحرائی جانور ڈرتا ہے۔ بھوک لگتی ہے تو کھیتوں اور سبزہ زاروں میں چرنے کے لئے سب صحرائی جانور آتے ہیں۔ پیاس محسوس ہوتی ہے تو پانی پر اترتے ہیں۔ کبھی شکاری کی بو سونگھ کر بھاگ جاتے ہیں۔ مختلف پرندے طرح طرح کے آشیانے بناتے ہیں۔ گھونسلوں کے اندر سونے، آرام کرنے اور انڈے دینے کے جدا جدا خانے بناتے ہیں۔ شہد کی مکھی چھتہ پر دربانی کی خدمت انجام دیتی اور جو مکھی اندر جانا چاہتی دربان اس کا منہ سونگھ کر اندر داخل ہونے کی اجازت دیتی ہے تاکہ پتہ ہو جائے کہ یہ مکھی کسی پاکیزہ پھول کا عرق چوس کر آئی ہے یا کسی گندہ مقام پر بیٹھی اور اس کا ناپاک کثیف رس چوس کر آئی ہے۔ اگر سونگھنے کے بعد اس کو کثافت معلوم ہوتی ہے تو ہرگز اندر جانے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ مار کر پیچھے گرا دیتا ہے۔ غرض اسی قسم کے بکثرت مشاہدات، حسیات، تجربات اور قرائن صحیحہ ہیں جن سے جانوروں کے حسی علم پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ کواکب بینی، اصنام پرستی یا خدا پرستی تو بالکل محسوس چیزیں ہیں ان کو معلوم کر لینا کون سی بڑی بات ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہُد ہُد سلیمان نے (جس کا نام یعفور یا عنبر کہا جاتا ہے) ملک یمن کے کسی ہُد ہُد سے مل کر مفصل خبر اپنی زبان میں دریافت کرلی ہو پھر آکر سلیمانؑ سے کہہ دیا ہو۔

پانچویں اعتراض کی بنا رعنایات اور شرف الموت ر الکلام قائم ہے۔ ہم مادی نور کو دیکھتے ہیں کہ وہ پلک جھپکتے ہی سیکڑوں ہزاروں میل جاکر مفصل خبر دریافت کرنے کے بعد واپس آجاتا ہے۔ ہر شخص کے پاس آنکھیں ہیں اور ان میں نور ہے اور آنکھ کھولتے ہی یہ نور تمام فضا کی سیر کر آتا ہے یہاں تک کہ آسمان کے تارے دیکھ کر بھی واپس آجاتا ہے نہ اس کے جانے واپس آنے اور خبر معلوم کرنے میں کوئی محنت صرف ہوتا ہے نہ کوئی دشواری ہوتی ہے۔ ہر شخص روزانہ ہزاروں

مرتبہ ایسا کرتا ہے پھر کہربائی طاقت کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جو آن کی آن میں ہزاروں میل کے فاصلے کی ثقیل ترین چیز کو کھینچ لیتی ہے۔ یہ تو مادی علوم کے مظاہرات ہیں پھر اگر کسی کو نور مجرد کا کوئی حصہ حاصل ہو گیا ہو اور وہ پلک جھپکتے میں بلقیس کا تخت اٹھا کر لے آئے تو کون سی دشواری ہے۔ کیا آن کی آن میں جبرئیل اور دوسرے فرشتے انبیاء کے پاس نہیں آیا کرتے تھے یا انبیاء سے ایسے معجزات ظہور پذیر نہ ہوتے تھے جن کے مقابلے سے مادی دنیا کے رہنے والے عاجز ہوتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضور گرامی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے معجزات نیز اولیاء اللہ کی غیر معمولی کرامت کیا قابلِ انکار ہو سکتی ہے۔ اب بھی اشراقی علوم کے ماہر ایسے ایسے کام کرتے ہیں جو کہ مادی نظریہ رکھنے والے کسی طرح رد نہیں کر سکتے۔ قرآن نے بھی تو بلقیس کے تخت کو لانے والا ایک ایسے شخص کو ظاہر کیا ہے جو علم کتاب سے واقف یعنی نور مجرد کا حامل تھا۔ خواہ اس کو اسم اعظم کا عالم کہو یا کوئی دوسری روحانی طاقت کا حامل قرار دو۔ مطلب صاف ہے کہ ایک شخص جس کی روح میں غیر معمولی علمی روشنی تھی آن کی آن میں بلقیس کے تخت کو لے آیا۔

رہا چھٹا اعتراض تو اس سے بھی معترض کی کوتاہ فہمی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ کیسے معلوم ہوا کہ سلیمان کو وہ علم نہ تھا جو تخت لانے والے کو تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے تو خود اپنے اہلِ صحبت سے فرمایا تھا کہ تم میں سے کون تخت کو لا سکتا ہے؟ اگر سلیمانؑ خود ناواقف نہ ہوتے اور ان کی نظر میں تخت کا فی الفور آنا ناممکن ہوتا تو وہ اپنی امت اور زیر دستوں سے کیوں اس قسم کی خواہش کرتے۔ چنانچہ آپ کے حکم پر ایک دیو نے عرض کیا میں آپ کے برخاست ہونے سے پہلے اس کو لا سکتا ہوں۔ حضرت سلیمان کا منشا اس قول سے پورا نہ ہوا اور آپ کو معلوم ہو گیا کہ اس جن میں اتنی ہی طاقت ہے، اس لئے خدمت پر مامور نہ فرمایا۔ یہ دیکھ کر حاضرین اور رفیق یا قدیمان صحبت میں سے ایک شخص نے عرض کیا میں پلک جھپکتے میں اس کو لا سکتا ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت سلیمان تخت کو اپنے پاس دیکھ کر خوش ہوئے اور پروردگار کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنے خوشہ چینوں میں ایسے عالی رتبہ لوگ پیدا کئے۔ اس واقعہ سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت سلیمانؑ کا علم تخت لانے والے شخص کے علم سے کمزور تھا۔ امت اور نبی کے علمی مراتب میں بڑا فرق ہے۔ بصیرت کے لئے اتنا ہی کافی ہے ورنہ کمزور فہم والوں کے اعتراضات کا سلسلہ تو کہیں رک نہیں سکتا۔

اب رہا موجودہ بائبل میں اس قصہ کا فقدان تو یہ بھی انکار کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ بائبل میں انبیاء کی کثیر کتابوں کے حوالے موجود ہیں جو اس وقت بالکل ناپید ہیں۔ بائبل میں موجود نہ ہونے سے انبیائے سابقین کی کتابوں میں نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ دیکھو اول کتاب السلاطین کے دسویں باب میں اور دوسری کتاب التواریخ کے نویں باب میں سلیمانؑ کے پاس سبا کی ملکہ کا حاضر ہونا لکھا ہے اور اول کتاب التواریخ کے خاتمہ داؤد کے دیگر حالات کا حوالہ صموئیل نبی اور ناتن نبی کی تاریخوں کا دیا ہے حالانکہ یہ کتابیں اس وقت مفقود ہیں۔

تحلیلِ اجزاء

وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ الخ حضرت سلیمانؑ محاذ سے واپس آ رہے تھے۔ راستہ میں صنعاء کے قریب فروکش ہوئے۔ مجاہد و سعید بن جبیر نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ہدہد کے متعلق یہ خدمت سپرد کی تھی کہ بوقت ضرورت لشکر کے لئے پانی تلاش کرے۔ ہدہد زمین کے اندر پانی اس طرح دیکھ لیتا ہے جس طرح تم لوگ زمین کے اوپر کی چیزیں دیکھتے ہو۔ ہدہد جہاں پانی کا نشان بتاتا حضرت سلیمانؑ جنات کو وہاں بھیج کر کنواں یا باؤلی وغیرہ کھدواتے اور اس طرح پانی مل جاتا۔ ایک مرتبہ آپ ایک میدان میں فروکش ہوئے اور وہاں قیام کا قصد کیا اور پانی کی تلاش کے لئے ہدہد کو طلب فرمایا۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ابن عباسؓ نے جب ہدہد کی یہ کیفیت بیان کی تو حاضرین میں سے ایک خارجی شخص نے جس کا نام نافع بن ازرق تھا کہا آپ ہدہد کی یہ حالت بیان کرتے ہیں حالانکہ وہ بیچارا تو اتنا کمزور ہے کہ بچہ بھی جال لگا کر اس کو پکڑ لیتا ہے اور اس کو جال نظر بھی نہیں آتا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا میں اس بات کا کچھ جواب نہ دیتا، لیکن اندیشہ ہے کہ یہ شخص جا کر کہے گا کہ میں نے ابن عباسؓ کو لاجواب اور ساکت کر دیا اس لئے جواب دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ قضا آتی ہے تو آنکھ اندھی ہو جاتی ہے۔ محمد بن اسحاق نے لکھا ہے کہ حضرت سلیمان روزانہ تخت پر جلوہ فرما ہوتے تو روزانہ باری باری ہر قسم کے طیور حاضر ہوتے تھے۔ ایک روز آپ نے ملاحظہ فرمایا تو ہدہد کو غیر حاضر پایا۔ ابن اسحاق کے قول سے متبادر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ سفر کا نہ تھا بلکہ حسب معمول حضرت سلیمانؑ جس طرح تخت پر رونق افروز ہوتے تھے اسی طرح ایک روز جلوہ فرما تھے اور ہدہد غیر حاضر تھا۔ لیکن یہ قول خلافِ تحقیق ہے۔ صحیح قول وہ ہے جس کو کلبی نے ذکر کیا ہے کہ دورانِ سفر میں ایک جگہ ہدہد سایہ کئے رہتا تھا اور یہ مقررہ خدمت پر مامور تھا۔ جب سامنے نظر نہ آیا تو حضرت سلیمانؑ نے فرمایا کیا میری نظر غلطی کر رہی ہے یا ہدہد واقعی غیر حاضر ہے۔ لشکر میں تلاش کر لیا جب نہ ملا تو فرمایا لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا میں اس کو ضرور سخت سزا دوں گا۔ بغوی نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ میں اس کے پر نوچ ڈالوں گا۔ مجاہد، ابن جریج اور ابن عباسؓ نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔ أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ یا میں اس کو ذبح کر ڈالوں گا یعنی یا تو مار ڈالوں گا یا پر نوچ کر ڈنڈا کر ڈالوں گا۔

أَوْ لَيَأْتِيَنِّي بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ ۝ یا وہ غیر حاضری کا کوئی واضح عذر پیش کرے۔ حضرت سلیمانؑ نے تقسیم سزا دینے کو کہا تھا لیکن غیر حاضری کی وجہ سے ناواقف تھے، اس لئے آخر میں استثنا کیا۔

فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيْدٍ الخ۔ کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ہُدہُد حاضر خدمت ہوا اور آتے ہی کہا میں ایسی پختہ خبر لایا ہوں جس کا آپ کو علم ہی نہیں۔ میں نے بچشم خود دیکھا کہ ملک سبا میں ایک عورت حکمران ہے اور حکمرانی بھی بطور نیابت یا گورنری کے نہیں بلکہ وہ تخت نشین ملکہ ہے اور ہر قسم کا کامل اقتدار اور جاہ و حشم اس کو حاصل ہے، لیکن وہ اور اس کی قوم آفتاب پرست ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر سب کے سب آفتاب کی پوجا کرتے ہیں۔

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ أَعْمَالَهُمْ الخ۔ یہ آیات تو ہُدہُد کے قول کا تکملہ ہیں۔ یعنی ہُدہُد نے یہ بھی کہا کہ وہ شیطان کے بہکاوے میں ہیں باوجود راہِ حق سے منہ موڑنے کے اپنے اعمال کو حق اور مستحسن سمجھتے ہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ اللہ کو سجدہ کرتے جس میں ہر طرح سے الوہیت کا استحقاق ہے۔ وہ آسمان و زمین کی ہر چیز کا خالق، تمام اشیاء کا مالک اور رب ہے واقف یہاں تک کہ دلوں کی باتوں کو بھی جانتا ہے اور اس کی عظمت کی یہ حالت ہے کہ عرش عظیم کا مالک ہے، مگر وہ لوگ ایسا نہیں کرتے بلکہ آفتاب کو پوجتے ہیں۔

یہ آیات بطور جملہ معترضہ کے خدا تعالیٰ نے دوران قصہ میں خود اپنے اوصاف کو ظاہر کرنے کے لئے فرمائیں۔ چونکہ بلقیس جو ملکہ تھی مالک ملک تھی اور اس کا باعظمت تخت بھی تھا پھر وہ اپنی قوم سمیت آفتاب کی پوجا کرتی تھی اور آفتاب اپنی روشنی سے تمام کائنات کو روشن کرنے والا اور پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرنے والا ہے، اس لئے خدا تعالیٰ نے انہیں اوصاف سے کامل متصف اپنی ذات کو قرار دے کر فرمایا کہ اللہ کے تین خصوصی اوصاف ہیں۔ وہ تمام عالم کا خالق ہے۔ عدم سے وجود میں لانے والا اور نیستی کی تاریکی سے ہستی کی روشنی میں نکالنے والا ہے۔ یہ بات سورج میں نہیں۔ پھر اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے۔ تمہاری کوئی چھپی ظاہر بات اس سے پوشیدہ نہیں۔ سورج کی روشنی میں بے شک جا در سورج سے انکشاف تو ظاہری چیزوں کا ہو جاتا ہے، مگر اس طور سے کہ سورج کو خود ان کا کشف و علم نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اللہ کا عرش اتنا بڑا ہے جس کا تقابل کسی مخلوق سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی واقعی عظمت بے پایاں ہے۔ پھر خدا کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کو سجدہ کرنا بلقیس اور اس کی قوم کو زیبا نہ تھا۔ اللہ تو ایک ہی ہے، کوئی دوسرا قابل پرستش نہیں۔ ان آیات کو ہُدہُد کا قول نہ قرار دینا بلکہ دورانِ قصہ میں پروردگار عالم کا قول سمجھنا ہی زیادہ صحیح ہے۔ اگرچہ عام مفسرین نے اول شق کو اختیار کیا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں پہلی وجہ یہ ہے کہ ہُدہُد ایک ادنیٰ جانور تھا اور پیامبری کی خدمت پر مامور تھا، گو کچھ عزت، دانش اور قوت میں تمام جانوروں سے برتر نہ تھا پھر کوئی بھی ہوتا اور اس کی پوزیشن کتنی ہی بلند ہوتی، مگر اللہ کے پیغمبر کے سامنے سوا ضروری کلام کے ایسی گستاخی نہ کرتا کہ پورا وعظ ناصر پڑھنے لگتا۔ دنیوی بادشاہوں کے درباروں میں ایسی بے باکی سے گفتگو کرنے کی مجال بڑے بڑے وزیروں اور امیروں میں نہیں ہوتی۔ سلیمان تو علاوہ بادشاہ ہونے کے جلیل القدر پیغمبر بھی تھے اور پھر توحید ذاتی و صفاتی سے اس زمانہ کی کل مخلوق سے زیادہ واقف تھے۔ آپ کے سامنے ہُدہُد کی ایسی ہرزہ سرائی زیبا نہیں تھی۔ ہُدہُد کو کتنا ہی بڑا موحد اور عالم کہا جائے، مگر اللہ کی الوہیت و توحید کا جو علم پیغمبر برحق کو تھا وہ ہُدہُد کو ہرگز حاصل نہ تھا، اس لئے ہر قسم کی زائد از ضرورت گفتگو بارگاہ نبوت میں نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ يَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ ہُدہُد نے حضرت سلیمان اور حاضرین اور حاضرین مجلس کو خطاب کر کے نہیں کہا تھا نہ اس کی یہ جرأت تھی کہ اس طرح تحکم آمیز الفاظ سے خطاب کر سکتا۔ یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ پاک پروردگار کے ہیں۔ واللہ اعلم و علمہ احکم و اتم۔

يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ۔ ابن عباس، عکرمہ، مجاہد، سعید بن جبیر اور قتادہ سے مروی ہے کہ پوشیدہ کو نکالنے سے مراد ہے کل مخلوق کے احوال پر مطلع ہونا اور کسی چیز کا باری تعالیٰ کے علم سے غائب نہ ہونا، لیکن سعید بن مسیب اور زید نے کہا کہ اس سے مراد ہے پانی برسانا اور زمین سے سبزہ اگانا۔ میں کہتا ہوں کہ اس تخصیص کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیا حرج ہے اگر یوں کہا جائے کہ خدا تعالیٰ ان چیزوں کو باہر نکالتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں مخفی ہیں یعنی جو چیزوں کو پیدا کرنے کی قوت آسمان و زمین میں ہے خدا تعالیٰ ان چیزوں کو پیدا کر دیتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ نیستی سے ہستی میں اور عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

قَالَ سَنَنْظُرُ أَصَدَقْتَ۔ الخ۔ حضرت سلیمانؑ نے غیر حاضری کی معقول وجہ سنی تو سزا دینے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور فرمایا ہم تیرے جھوٹ سچ کی آزمائش کرتے ہیں۔ جا میرا یہ خط ان لوگوں (یعنی بلقیس اور اس کے درباریوں) کے پاس لے جا اور جا کر ان کے پاس ڈال دینا اور پھر وہاں سے ہٹ کر منہ موڑ کر ایک طرف کو ہٹ کر سننا کہ وہ کیا باتیں کہتے ہیں۔ غرض حضرت سلیمانؑ نے ہُدہُد کو خط دے کر روانہ کر دیا اور ہُدہُد نے ملکہ محل میں کسی روشن سے داخل ہو کر نامۂ گرامی بلقیس کے سامنے ڈال دیا۔ بلقیس کو ضرور تعجب ہوا ہوگا کہ ہُدہُد یہ خط کس طرح لایا، مگر خط سربمہر دیکھ کر اس کا تعجب دور ہو گیا اور سمجھ گئی ہوگی کہ یہ ہُدہُد نامہ بر ہے اور کسی بزرگ ہستی کا خط لے کر آیا ہے۔ اسی بنا پر اس نے اپنے اشراف کو مخاطب کر کے کہا:۔

يٰٓأَيُّهَا الْمَلَؤُا إِنِّيْٓ أُلْقِيَ إِلَيَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ۝ سردارو! میرے سامنے ایک باوقعت اور محترم خط لایا گیا ہے۔ خط کی وقعت و شان کا اندازہ اس نے اول تو مہر ہی سے کر لیا ہوگا پھر مضمون پڑھ کر وہ ضرور سمجھ گئی ہوگی کہ کسی پُرجلال طاقتور باشوکت بادشاہ کا خط ہے، اس لئے اس نے خط کو کریم کہا۔

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ؏ تمام مفسرین کا قول ہے کہ یہ پورے الفاظ خط کے ہیں جو حضرت سلیمانؑ نے لکھا تھا :-

"از سلیمان ـــــ اللہ رحمٰن ورحیم کا نام لے کر شروع کرتا ہوں۔ تم اپنے آپ کو مجھ سے برتر نہ سمجھو۔ فرماں بردار ہو کر میرے پاس آجاؤ۔"

یہ ضروری نہیں کہ حضرت سلیمانؑ نے بعینہٖ یہی الفاظ لکھے ہوں گے۔ کیونکہ اس زمانے کے اسرائیلیوں کی زبان عبرانی تھی عربی نہ تھی۔ مگر بتانا مقصد یہ ہے کہ ہر نامہ کا آغاز اپنے نام سے کیا جس طرح بڑے بڑے بادشاہ اپنے محکوموں کو حکم بھیجتے وقت کرتے ہیں اور اللہ کے نام سے شروع کیا تھا۔

بعض اہل تفسیر کا قول ہے کہ یہ الفاظ بلقیس کے ہیں جو اس نے اپنے درباریوں سے کہے تھے۔ یعنی بلقیس نے کہا تھا یہ خط سلیمانؑ کی طرف سے آیا ہے جس کا آغاز اللہ کے نام سے ہے اور مضمون یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو مجھ سے برتر نہ سمجھو اور فرماں بردار ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔

مقصودِ بیان

حضرت سلیمانؑ عالم الغیب نہ تھے نہ اپنے لشکر کی جزئی حالت سے واقف تھے۔ یہاں تک کہ بعض وقت آپ کو ارکان لشکر میں سے بعض کی غیر حاضری کا بھی علم نہ ہوتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء غیب داں نہیں ہوتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض وقت قوت قدسیہ کی روشنی میں غائب اور غیر موجود چیزوں کی تصویریں دیکھ لیں اور ان کو بعض غیبی باتوں کا قبل از وقوع علم ہو جائے۔ فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ ہُد ہُد کے علم میں یہ بات تھی کہ جو مجھے معلوم ہوئی ہے اس سے ابھی تک سلیمان بھی واقف نہیں ہیں، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سلیمان کو واقع میں بلقیس اور اس کے ملک کا حال معلوم نہ ہو۔ بلقیس اور اس کی قوم آفتاب پرست تھی۔ آیت يُخْرِجُ الْخَبْءَ سے مقصود ہے کہ خدا تعالیٰ حقیقتاً اشیاء کو روشنی میں لاتا ہے یعنی معدوم سے موجود کرتا ہے پھر وہ لایعقل ذریعہ کشف نہیں بلکہ خود ہی عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ حضرت سلیمانؑ نے جو خط ہُد ہُد کو دیا تھا اس کو پیش کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا تھا کہ ان کے سامنے ڈال دینا اور خود دیکھو وہ کر منہ موڑ کر منتظر رہنا کہ وہ کیا گفتگو کرتے ہیں۔ فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ اور اُلْقِيَ اِلَيَّ کے الفاظ واضح دلالت کر رہے ہیں کہ ہُد ہُد نامہ بر آدمی نہ تھا جانور ہی تھا۔ کیونکہ حضرت سلیمانؑ نے ہُد ہُد کو خط دیتے وقت یہ نہیں فرمایا کہ فَادْفَعْهُ اِلَيْهِمْ اور نہ بلقیس نے دفع اور ارسال کا لفظ استعمال کیا اور خط کو کسی طرف ڈال دینا یا پھینک دینا انسانی تہذیب کے بالکل خلاف ہے بلکہ آداب شاہی کے تو بالکل منافی ہے۔ اگر ہُد ہُد نامہ بر سپہ سالار ہوتا تو حضرت سلیمانؑ اس سے ہرگز نہ فرماتے کہ یہ خط لے جا کر ان کے سامنے ڈال دینا بلکہ پیش کرنے یا ہاتھ میں دینے یا پہنچانے کے الفاظ استعمال کرتے۔ پھر بلقیس بھی یوں نہ کہتی کہ میرے سامنے خط ڈالا گیا ہے بلکہ یوں کہتی کہ میرے پاس بھیجا گیا ہے یا مجھے دیا گیا ہے یا اسی قسم کے دوسرے الفاظ کہتی۔ نامۂ سلیمانؑ کے الفاظ کی ترتیب تین باتوں کی تعلیم دے رہی ہے۔ ایک یہ کہ بڑا حاکم اپنے ماتحتوں کو حکم بھیجتے وقت اپنے نام سے آغاز کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ خط اللہ کے نام سے شروع کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ خط مختصر اور جامع الفاظ میں ہونا چاہیئے وغیرہ۔

قَالَتْ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِيْ فِيْۤ اَمْرِيْ ۚ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ۝ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا

ملکہ سبا نے کہا اے اہل دربار! مجھے میرے معاملے میں مشورہ دو میں کوئی کام فیصل نہیں کیا کرتی تاوقتیکہ تم حاضر نہ ہو۔ وہ بولے ہم بڑے طاقتور جنگ جو ہیں

بَاْسٍ شَدِيْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَيْكِ فَانْظُرِيْ مَاذَا تَاْمُرِيْنَ ۝ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْۤا

اور آپ کو اختیار ہے آپ جو کچھ حکم دیں غور کر لیجئے۔ ملکہ سبا نے کہا بادشاہ جب کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو برباد کر دیتے ہیں اور

اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝ وَاِنِّيْ مُرْسِلَةٌ اِلَيْهِمْ بِهَدِيَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ ۝

وہاں کے معزز لوگوں کو ذلیل بنا دیتے ہیں ان کی یہی عادت ہے۔ میں ان کے پاس ایک ہدیہ بھیجتی ہوں اور دیکھتی ہوں کہ ایلچی کیا جواب لے کر آتے ہیں

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ ۫ فَمَاۤ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىكُمْ ۚ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ۝

جب سلیمانؑ کے پاس قاصد پہنچا تو سلیمان نے کہا کیا تم مال سے میری امداد کرتے ہو جو کچھ اللہ نے مجھے دے رکھا ہے وہ تمہارے عطیہ سے بہتر ہے تم ہی اپنے ہدیہ سے خوش رہو

ارْجِعْ إِلَيْهِمْ فَلَنَأْتِيَنَّهُمْ بِجُنُودٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ مِّنْهَا أَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ○ قَالَ يٰٓاَيُّهَا

تو ان کے پاس واپس چلا جا ہم اُن پر ایسی فوجیں لے کر آتے ہیں جن کا ان سے مقابلہ نہ ہو سکے گا اور ہم ان کو وہاں سے ذلیل و خوار کر کے نکال دیں گے   سلیمان نے کہا اے

الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَأْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّأْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ○ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ

اہل دربار! اُن کے مسلمان ہونے سے قبل تم میں سے کون ملکہ کا تخت میرے پاس لا سکتا ہے   ایک دیو بولا آپ اپنی جگہ سے اُٹھنے نہ پائیں گے کہ میں اس کو

اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ○ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ

لے آؤں گا اور میں اس پر قوی اور امانتدار ہوں   ایک شخص کے پاس کتاب کا کچھ علم (اسم اعظم) تھا وہ بولا آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے

قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۖ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ

میں اس کو آپ کے پاس لے آؤں گا   چنانچہ جب سلیمان نے اُس تخت کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو بولے یہ میرے رب کا فضل ہے وہ مجھ کو آزمانا چاہتا ہے

اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ○

کہ میں اُس کا شکر کرتا ہوں یا ناشکری جو شخص شکر کرتا ہے وہ اپنے فائدہ کے لئے کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو میرا رب   بے نیاز ہے   کریم ہے

تفسیر

خط کا مضمون پڑھنے اور سنانے کے بعد بلقیس نے اپنے اشراف سے کہا سردارو! اس معاملے میں مشورہ دو کہ سلیمان کے پاس جاؤں یا نہ جاؤں۔ ارکان دولت نے جواب دیا ہم طاقتور ہیں، جنگجو بھی کسی سے کم نہیں مگر اختیار آپ کو ہے آپ جیسا مناسب سمجھیں ہم کو حکم دیں ہم اس کی تعمیل کریں گے۔ بلقیس نے سوچا کہ لڑائی سے سوائے خونریزی اور بربادی کے حاصل ہی کیا ہے۔ سلیمان کے مقابلے میں کامیابی ناممکن ہے، اس لئے کہنے لگی بادشاہوں کا دستور ہے کہ جب کسی ملک کو فتح کرتے ہیں تو بستیوں کو برباد کر دیتے ہیں اور ملک والوں کو زیر و زبر کر ڈالتے ہیں اور یہ قاعدہ کسی ایک بادشاہ کا نہیں بلکہ بادشاہوں کا دستور العمل ہی یہ ہے۔ اس لئے فی الحال لڑائی چھیڑنی مناسب نہیں نہ فی الفور چلا جانا مصلحت ہے بلکہ اول میں سلیمان کے پاس کچھ تحفہ بھیجتی ہوں اور اس اثناء میں انتظار کرتی ہوں کہ قاصد کیا جواب لے کر آتے ہیں؟ یعنی اگر سلیمان پیغمبر ہیں تو میری اطاعت اور تحفہ پر کسی طرح راضی نہ ہوں گے۔ اس وقت بجز اسلام لانے اور حاضر دربار ہونے کے کوئی چارہ نہ ہوگا اور اگر صرف بادشاہ ہیں تو تحفہ کو اطاعت کی علامت سمجھ کر چپ ہو رہیں گے اور اسلام لانے کی خواہش نہ کریں گے اُس وقت ہم اپنی قوت سے کام لیں گے اور شاہانہ مقابلہ کریں گے۔ ارکان حکومت کو یہ رائے پسند آئی اور بیش قیمت تحائف دے کر ایلچی کو بھیجا گیا۔ حضرت سلیمان کے پاس قاصد نے پہنچ کر تحائف پیش کئے مگر آپ لالچی بادشاہ تو نہ تھے اور نہ ملک گیری کی آپ کو ہوس تھی نہ استعمار کے بھوکے تھے۔ آپ کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ اہل یمن مسلمان ہو جائیں، اس لئے تحائف کو آپ خاطر میں نہ لائے اور فرمایا اللہ کا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے۔ تمہاری مالی مدد کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس خداداد دولت ہے جو تمہارے ان ہدیوں سے بڑھ کر ہے۔ تم اپنے تحفوں سے خود خوش ہو، ہم کو بھی ان سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔ جاؤ جا کر کہدو کہ حاضر ہوں ورنہ ہم ایسا طاقتور کثیر لشکر بھیجیں گے جس کا وہ مقابلہ نہیں کر سکیں گے ہم ان کو ذلیل کر کے نکال دیں گے یعنی ملک تمہارے ہاتھ سے جائے گا اور ذلت بھی اٹھانی پڑے گی۔ یہ حکم لے کر ایلچی واپس چلا گیا۔ ادھر حضرت سلیمان نے اپنے درباریوں سے کہا ہے کوئی اُن لوگوں کے آنے سے پہلے بلقیس کا تخت میرے پاس لائے۔ مجھ میں اس کی طاقت بھی ہے اور میں امانت دار بھی ہوں کچھ خیانت نہ کروں گا۔ ایک آدمی اور بھی وہاں حاضر تھا اور اس کو کتاب الٰہی (لوح محفوظ) کا علم بھی تھا یعنی وہ اسم اعظم سے واقف تھا۔ اس نے کہا میں پلک جھپکنے سے پہلے لا سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ لے آیا۔ اس نعمت غیر مترقبہ کا شکریہ حضرت سلیمانؑ نے بارگاہ الٰہی میں پیش کیا اور فرمایا یہ میرے پروردگار کی عنایت ہے اس بے مثال قدرت دے کر میری آزمائش کرنی چاہتا ہے کہ میں کفران نعمت کرتا ہوں یا شکر ادا کرتا ہوں۔ اس کے بعد فرمایا شکر اور کفر ان سے پروردگار کو کچھ نفع نقصان نہیں پہنچتا جو شکر گزار ہوگا وہ اپنے لئے ہوگا یعنی خدا تعالیٰ اس کو مزید نعمتوں سے سرفراز فرمائے گا اور ناشکری کرے گا تو خدا کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ اس کو کچھ پرواہ نہیں۔

تحلیل اجزاء

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ ۔ قوت سے مراد ہے جسمانی طاقت، تعداد کی کثرت اور اسلحہ کی فراوانی۔ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ باس شدید سے مراد غالباً جنگی مہارت ہے۔ مطلب یہ کہ ارکین دولت نے کہا ہمارے پاس طاقت بھی خوب ہے، اسلحہ کی بھی کمی نہیں اور ہم فنون جنگ میں بھی ماہر ہیں۔

وَالْاَمْرُ اِلَيْكِ یعنی اب معاملہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بلقیس خود مختار حکمراں تھی۔ ارکین سلطنت سے مشورہ اس نے محض دلجوئی یا حصول رائے کیلئے کیا تھا۔

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً القریۃ بستی میں داخل ہونے سے یہ مراد نہیں کہ آبادی کے اندر داخل ہو جائیں بلکہ بلقیس کی مراد یہ تھی کہ جب کوئی جدید بادشاہ دشمن کے

ملک پر چڑھائی کرتا ہے تو اس کو تباہ کر دیتا ہے۔ کھیتیاں برباد، باغ اجاڑ اور آبادیاں ویران ہو جاتی ہیں پھر وہ بستی والوں کو زیر و زبر کر دیتے ہیں۔ حاکموں کو محکوم، محکوموں کو حاکم، زبردستوں کو زیر دست اور زیر دستوں کو زبردست بنا دیتے ہیں۔ اگر اس وقت ہم نے سلیمان سے مقابلہ کیا تو ہماری کامیابی مشکل ہے ہم سر نہ آ نہیں ہو سکتے۔ خواہ مخواہ ہم لوگ برباد ہو سکے۔ اس پر لشکر کشی مناسب نہیں اور نہ فی الحال میرا چلا جانا قرین مصلحت ہے بلکہ میں پہلے سلیمانؑ کی آزمائش کرتی ہوں اور ان کے پاس کچھ ہدیہ بھیجتی ہوں۔ اگر انہوں نے قبول کر لیا تو خوش ہو کر ہمارے ملک سے ٹل جائیں گے اور اگر ہمارے اسلام کی خواہش ہوگی تو سمجھیں گے کہ وہ دنیوی بادشاہ ہیں پھر ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر معاملہ دگرگوں نظر آیا اور ثابت ہو گیا کہ سلیمانؑ پیغمبر ہیں تو فرماں برداری کے سوا چارہ نہیں۔

بِهَدِيَّةٍ۔ بکثرت اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ بلقیس نے تحفہ میں جواہر و مروارید کا ایک بیش بہا ہار بھیجا تھا۔ بعض نے سونے کے برتن اور کسی نے سونے کی اینٹیں بھیجنی بیان کی ہیں۔ مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا کہ کچھ چھوکریاں چھوکروں کے لباس میں اور کچھ چھوکرے چھوکریوں کے لباس میں بھیجے تھے اور درخواست کی تھی کہ ان کو ممتاز کیجئے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ خدا ہی جانے کیا بھیجا تھا۔ یہ تو اسرائیلی روایات ہیں، خدا جانے کہاں تک صحیح ہیں۔

بَلْ أَنتُم بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُونَ ۔ یعنی حضرت سلیمانؑ نے کہا میرے پاس اللہ کا دیا اتنا ہے کہ تمہارا ہدیہ اس کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ مجھے اس کا لالچ نہیں ہو سکتا یہ ہدیہ تمہاری ہی خوشی کے لائق ہے۔

فَلَنَأْتِيَنَّهُم بِجُنُودٍ۔ یعنی ایلچی کو پیام کچھ نہ دیا بلکہ بطور وعید کے فرمایا تم جاؤ اب ہم اتنا عظیم الشان لشکر بھیجتے ہیں جس کے مقابلہ کی ان میں طاقت نہیں۔ ہمارا لشکر پہنچ کر ذلت کے ساتھ ان کو باہر نکال دے گا۔ اس کلام میں اگرچہ کوئی قید نہیں، مگر سیاق بتا رہا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا مقصود یہ تھا کہ اگر انہوں نے اطاعت نہ کی اور مسلمان ہو کر حاضر نہ ہوئے تو ہم ہم لشکر کشی کریں گے۔ محمد بن اسحاق نے بروایت بن رومان بیان کیا ہے کہ جب قاصد واپس گئے اور ملکہ کو اطلاع دی تو اس نے کہا یہ شخص کوئی دنیوی بادشاہ نہیں۔ مجھ میں اس کے مقابلہ کی قوت نہیں۔ میں اس سے جنگ نہیں کر سکتی۔ اس کے بعد قاصد کے ذریعہ سے اطلاع بھیجی کہ میں ارکین دولت سمیت حاضر خدمت ہوتی ہوں۔ قاصد کو آگے بھیج کر ملکہ پیچھے سے چل دی۔ حضرت سلیمانؑ کو ملکہ کی روانگی کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اپنے درباریوں سے فرمایا:۔

يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا الخ۔ سردارو! ملکہ کے آنے سے پہلے کون شخص اس کا تخت میرے پاس لا سکتا ہے۔ قتادہ، سدی، زہیر بن محمد، عطاء خراسانی نے اس جگہ لکھا ہے کہ حضرت سلیمان کو بلقیس کا تخت پسند تھا اور تخت کو لینا چاہتے تھے اور چونکہ ملکہ کے مسلمان ہونے کے بعد اس کا تخت لینا مناسب نہ تھا، اس لئے پہلے سے طلب فرمایا۔ مجھے ایسے جلیل القدر علماء کے اس قول پر تعجب ہے۔ ان بزرگ ہستیوں نے اللہ کے پیغمبر کو ایک لالچی دنیا دار، حیلہ جو آدمی خیال کر لیا۔ ایسی حیلہ جوئی اور دنیا طلبی شان نبوت کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ حضرت سلیمانؑ کے پاس خداداد چیزیں ایسی تھیں جو تخت بلقیس سے کہیں بڑھ چڑھ کر اور قیمتی تھیں۔ مزید برآں حضرت سلیمانؑ نے بلقیس کا تخت دیکھا ہی کب تھا جو اگر تخت ہی مقصود تھا تو تخت کے جواہرات اکھاڑنے اور بدلنے کا کیوں حکم دیا۔ پھر کسی کے مال کو اگرچہ صاحب مال کافر ہو چوری کر لینا کہاں جائز ہے۔ خصوصاً انبیاء کی شان تو اس سے بہت ہی بلند ہے۔ یہ مال غنیمت تو نہ تھا کہ اس کو لینا جائز قرار دیا جائے اور اگر غنیمت کا مال بھی مان لیا جائے تو پہلے انبیاء کے لئے مال غنیمت حلال کب تھا۔ صاف حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اللہ نے میرے واسطے مال غنیمت حلال کر دیا ہے۔ حالانکہ انبیاء سابقین کے لئے حلال نہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ بلقیس کے اطمینان قلب کے لئے حضرت سلیمانؑ کرنے حضرت سلیمانؑ اس کو شان نبوت اور خدا کی قدرت دکھانی چاہتے تھے۔ آپ کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ دیکھ تجھے اپنی ملوکیت پر ناز ہے اللہ کی قدرت اور نبوت کی طاقت کے مقابلے میں تیری شوکت و سطوت اور حشمت و سلطنت کوئی چیز نہیں۔ بقدرت الٰہی تیرا بیش قرار تخت آن کی آن میں منگوا سکتا ہوں۔ پھر بلوری حوض بنوا کر اس کے اندر جلوس فرمانا اور بلقیس کو وہاں طلب کرنا اور بلور کو بلقیس کا پانی سمجھنا بھی بلقیس کی کم فہمی اور عجز دانش ظاہر کرنے کے لئے تھا اور یہ جتانا مقصود تھا کہ جو عقل محسوسات میں غلطی کرتی ہے اور مشاہدات میں دھوکا کھا جاتی ہے تو معقولات میں اس کی غلطی محتاج ثبوت نہیں۔ اسی بنا پر بلقیس کو اپنے بے بصیرت ہونے پر متنبہ ہوا اور وہ توبہ کر کے مسلمان ہو گئی۔

قَالَ عِفْرِيتٌ ۔ مجاہد نے عفریت کے معنی سرکش بتلائے ہیں۔ شعیب جبائی، یزید بن رومان اور وہب بن منبہ نے اس جن کا نام کوزن کہا ہے۔

أَقَوِيٌّ أَمِينٌ۔ اس فقرہ کا مطلب دو طرح سے ہو سکتا ہے ایک یہ کہ جن نے اپنی قوت و امانت کو ظاہر کیا اور کہا میں اس کام کو انجام دینے کی طاقت رکھتا ہوں اور امانتدار بھی ہوں۔ راستہ میں جواہر وغیرہ میں خیانت نہ کروں گا۔ امین ہونے کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ جن نے کہا مجھ میں طاقت ہے اور طاقت کو امانت کے ساتھ صرف کروں گا اور کوشش میں دریغ نہ کروں گا۔

قَالَ الَّذِي عِندَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ۔ اس سے مراد حضرت سلیمان کے دربار کا ایک خاص شخص ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا اس کا نام آصف بن برخیا تھا وہ ایک صدیق شخص تھا اور اسم اعظم جانتا تھا۔ مجاہد نے اسطوم، قتادہ نے بلیخا اور زہیر بن محمد نے ذوالنور نام بتایا ہے۔ واللہ اعلم۔

فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا الخ۔ امام رازی نے لکھا ہے کہ تخت کا حضور حضرت سلیمانؑ کے معجزہ سے ہوا تھا۔ سلیمانؑ ہی کتاب کے سب سے بڑے عالم تھے۔ گویا امام کے نزدیک الَّذِي عِندَهُ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتَابِ سے حضرت سلیمانؑ ذات مراد ہے، مگر امام نے اس کلام پر غور نہیں فرمایا کہ جس شخص کے پاس علم کتاب تھا اس نے کہا میں آپ کے پاس اس تخت کو آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے لا سکتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ کہنے والا اور حضرت سلیمانؑ کو خطاب کرنے والا کوئی دوسرا شخص تھا جس نے بطور کرامت تخت کو لا کر حاضر کر دیا۔ اگرچہ یہ مرتبہ

حضرت سلیمانؑ کی نبوت کی خوشہ چینی ہی سے اس کو حاصل ہوا تھا، مگر یہ فعل اسی کا تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے معجزہ کو اس میں کچھ دخل نہ تھا۔

فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ ۝ حضرت موسیٰؑ نے بھی فرمایا تھا إِن تَكْفُرُوا أَنتُمْ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فَإِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے جن و انس یکسر دل ہو کر اعلیٰ درجہ کے متقی بن جائیں تو اس سے میری سلطنت میں کچھ اضافہ نہ ہو جائے گا اور اگر تمہارے اگلے پچھلے جن و انس یک دل ہو کر اعلیٰ درجہ کے کافر و بدکار ہو جائیں تو میری سلطنت میں کچھ نقصان نہ ہو جائے گا۔ اے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں جن کو میں شمار کرتا ہوں اور جن کا پورا بدلہ دوں گا۔ بس جو کوئی بھلائی پائے وہ اللہ کی حمد و ثنا کرے اور جو کوئی بھلائی کے سوا کچھ اور پائے وہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔

مقصودِ بیان بلقیس کا اپنے اشراف سے مشورہ کرنا بتا رہا ہے کہ بعض معاملات میں خود مختار بادشاہ بھی بتقاضائے فطرت مشورہ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اگرچہ قطعی فیصلہ کرنا انسان کا اپنا کام ہے اگر منفی و مثبت میں سے کسی ایک کو ترجیح دینی بغیر اہل شوریٰ کے مشورہ کے مناسب نہیں۔ پھر مشورہ بھی ان لوگوں سے لیا جائے جو اصحاب الرائے ہوں، عوام سے مشورہ لینا گمراہ ہونا ہے۔ ارکانِ دولت کا جواب دلالت کر رہا ہے کہ محکوم کو حاکم کی اور رعایا کو بادشاہ کی اطاعت کرنی لازم ہے۔ محکوم کتنا بھی طاقتور ہو لیکن بادشاہ کی فرماں برداری اس کا شعار ہونی چاہئے۔ بلقیس کی گفتگو اور شاہانِ جہان کے متعلق ریمارک بتا رہا ہے کہ وہ بہت عقلمند تھی۔ حضرت سلیمانؑ کا ہدیہ کو رد کرنا اور درشت جواب دینا دلالت کر رہا ہے کہ حق پرست صداقت مآب دنیوی مال کے لالچی نہیں ہوتے بلکہ اشاعت اور اعلانِ صداقت ان کا مطمع نظر ہوتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کا تخت کو آن کی آن میں اپنے اشراف کے آدمی سے منگوا لینا بتا رہا ہے کہ اس آدمی کو خدا تعالیٰ نے کوئی خاص علم روحانی عطا فرمایا تھا اور اس نے کوئی مادی ذریعہ استعمال نہیں کیا تھا۔ بلقیس کے ایلچی کو حضرت سلیمانؑ کی دھمکی ظاہر کر رہی ہے کہ اعلائے دین اور فرمانِ رسول سے سرتابی کرنے والوں کو ان کی املاک و جائیداد سے بے دخل کرنا اور وطن سے خارج کرنا جائز بلکہ ضروری ہے۔ بلقیس کے تخت کو طلب کرنے سے مقصود یہ نہ تھا کہ کسی کے مال کو چوری کر کے منگوا لیا جائے بلکہ اس سے قدرت اور طاقتِ نبوت کا اظہار مقصود تھا۔ اسی لئے حضرت سلیمانؑ نے تخت کو اپنے پاس موجود دیکھ کر (بجائے) یہ کہا کہ یہ میرے پروردگار کی مہربانی ہے یعنی اس نے میرے ہاتھ پر اپنی قدرت کو ظاہر فرمایا اور ایسے عالم لوگ میرے متبعین میں سے بنائے جو تمام مادی طاقتوں کو مغلوب کرنے والی روحانی قوت رکھتے ہیں۔ لِيَبْلُوَنِي کا لفظ بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کبھی بطور امتحان ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ جس طرح مصائب و آلام میں مبتلا فرما کر اپنے بندوں کی آزمائش و امتحان کرتا ہے اسی طرح غیر معمولی نعمت و راحت اور درجات و مراتب سے سرفراز فرما کر بھی امتحان لیتا ہے اور اس کے امتحان سے انبیاء بھی بچے ہوئے نہیں ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کے آخری فقرے بتا رہے ہیں کہ شکر و ناشکری کا نتیجہ اچھا یا برا انسان کو خود ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو نہ کسی کی حمد و ثنا اور طاعت و عبادت سے فائدہ حضور پہنچتا ہے نہ کفران و سرکشی سے نقصان وغیرہ۔

قَالَ نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا نَنظُرْ أَتَهْتَدِي أَمْ تَكُونُ مِنَ الَّذِينَ لَا يَهْتَدُونَ ۝ فَلَمَّا جَاءَتْ قِيلَ أَهَٰكَذَا

(پھر) کہنے لگے اس تخت کی صورت بدل ڈالو ہم دیکھیں وہ پہچانتی ہے یا ناواقفوں میں سے ہی رہتی ہے۔ چنانچہ جب ملکہ سبا آئی تو اس سے کہا

عَرْشُكِ ۖ قَالَتْ كَأَنَّهُ هُوَ ۚ وَأُوتِينَا الْعِلْمَ مِن قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِينَ ۝ وَصَدَّهَا مَا كَانَت تَّعْبُدُ مِن

گیا یہ تمہارا تخت ہے؟ اس نے کہا معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے کہ گویا وہی ہے اور ہم کو تو پہلے ہی علم ہو چکا ہے ہم تو مسلمان ہو چکے ہیں۔ ملکہ سبا کی رکاوٹ کا سبب وہ معبود تھے جن کی وہ اللہ

دُونِ اللَّهِ ۖ إِنَّهَا كَانَتْ مِن قَوْمٍ كَافِرِينَ ۝ قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۖ فَلَمَّا رَأَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَكَشَفَتْ

کو چھوڑ کر عبادت کیا کرتی تھی وہ بیشک کافر قوم سے تھی۔ اس سے کہا گیا کہ اس محل میں داخل ہو۔ جب ملکہ نے اس کو دیکھا تو اس کو حوض سمجھی اور اپنی پنڈلیوں

عَن سَاقَيْهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّن قَوَارِيرَ ۗ قَالَتْ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي وَأَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمَانَ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

سے کپڑا اٹھا لیا۔ سلیمانؑ نے کہا یہ شیشوں سے بنا ہوا محل ہے۔ ملکہ بولی اے میرے رب! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ اب میں سلیمانؑ کے ساتھ اللہ رب العالمین کی فرمانبردار ہوتی ہوں

تفسیر ہم متعدد دفعہ اوپر لکھ چکے ہیں کہ علم کے درجات چار ہیں۔ احساس، توہم، تخیل، تفکر۔ ملتقی جزئیات کے علم کی ابتدا احساس سے ہوتی ہے اور انتہا تفکر پر۔ ان چاروں مراتب کا

فرق ایک مثال میں اس طور پر سمجھو کہ شیر کی صورت آنکھوں سے دیکھ کر دماغ میں اس کی صورت کو ثبت کر لینا احساس ہے پھر یہ سمجھنا کہ یہ میرا دشمن ہے علم توہمی ہے۔ پھر شیر کی تصویر اور اس کی عداوت کے معنی کو دماغ میں اس طور پر جمع رکھنا کہ جب دوبارہ سہ بارہ چہار بارہ وہی شیر سامنے آجائے تو سمجھ لیا جائے کہ یہ وہی شیر ہے جس کو میں نے کل دیکھا تھا اور یہ کل والا دشمن ہے اس سے بچا گنا چاہیئے ورنہ کھائے گا۔ یہ درجہ تخیل کا ہے۔ سامنے والے شیر کو دیکھ کر یہ سمجھ لینا کہ شیر انسان کا دشمن ہوتا ہے یعنی مادی جزئیات سے ایک عام حقیقت کا انتزاع کرنا تفکر ہے، لیکن تفکر فقط اس کا نام نہیں کہ مادی جزئیات کے ذریعہ سے عام حقیقت تک انسان کی رسائی ہو جائے بلکہ ان علوم کو سمجھنا جن کا تعلق مادہ اور مادیات سے نہیں مثلاً فرشتوں کی حقیقت اللہ کی ذات وصفات اور مبداء و معاد کا علم بھی تفکر کہلاتا ہے۔

اس مختصر تبصرہ کو سمجھنے کے بعد یہ بھی جان لینا ضروری ہے کہ عموماً عالم کی علمی ترقی درجہ بدرجہ ہوتی ہے۔ اول احساس کی صحت کی ضرورت ہوتی ہے پھر توہم کی صحت لازم ہے پھر تخیل صحیح ہونا چاہیئے اور آخر میں تفکر کا صحیح ہونا لازم ہے جس شخص کا احساس غلط ہوگا وہ تخیل صحیح نہیں کر سکتا اور جس کا تخیل غلط ہو وہ تفکر کی صحت سے محروم رہتا ہے۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جو ابتدائی تینوں درجات پر استقامت وصحت کے ساتھ چڑھ جائے وہ خواہ مخواہ صحیح تفکر کے درجہ پر پہنچ جائے گا کیونکہ ہم ابھی بتا چکے ہیں کہ تفکری علم صرف مادی جزئیات سے انتزاع کرنے ہی کا نام نہیں بلکہ اس کے بغیر بھی ہوتا ہے۔ ابتدائی تینوں درجات کی صحت سے تفکر کی ایک شاخ صحیح ہو جاتی ہے اور دوسری شاخ (یعنی وہ تفکر جو محض عقلی علوم سے تعلق رکھتا ہے) سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس قول سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جب تک احساسی علم صحیح نہ ہو عقلی معرفت نہیں ہوتی، لیکن ایسا ہونا ممکن ہے کہ کسی کے احساسی علم صحیح ہو، مگر قوت فکریہ غلط کام کرے اور تفکر صحیح نہ ہو یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کے عقائد درست ہوتے ہیں اور قوت فکریہ صحیح کام کرتی ہے اُن کا تخیل، توہم اور احساس ضرور صحیح ہوتا ہے، لیکن بہت لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی دنیوی عقل یعنی علم کے ابتدائی تینوں درجات ٹھیک ہوتے ہیں، مگر عقائد غلط ہوتے ہیں۔ علوم دنیا کے تمام مباحث میں ان کی عقل خوب تیز اور صحیح دوڑتی ہے، مگر روحانی اور عقلی علوم کے میدان میں وہ لنگڑا کر چلتے ہیں

حضرت سلیمانؑ کو بلقیس کے علم تفکری کا امتحان لینا تھا، لیکن علم تفکری کا امتحان کس طرح لیا جا سکتا یقیناً وہ اور اس کی قوم آفتاب پرست تھی اور ان کے تفکر کی غلطی میں کوئی شک نہ تھا، اس لئے آپ نے چاہا کہ بلقیس کی تفکری صلاحیت کی جانچ کریں اور یہ معلوم کریں کہ اس میں رہنمائی اور تفکر صحیح کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں اور تفکر کی صلاحیت معلوم کرنے کے لئے احساس وتخیل وغیرہ کی جانچ ضروری تھی، اس لئے آپ نے تخت کی ہیئت بدلوا کر ایک بار جانچ کی اور دوبارہ بلوری حوض بنوا کر نظر فریبی کا سامان مہیا کیا۔ تخت کو تو بلقیس اتنا سمجھ گئی کہ گویا یہ میرا تخت ہے۔ اور یہی اُس نے کہہ دیا، لیکن بلوری حوض کو وہ نہ پہچان سکی اور بالآخر اپنی کمزوری کا اقرار کرتے ہوئے اُس نے اپنے تفکر کی غلطی تسلیم کر لی اور شرک سے توبہ کی گویا بلقیس کا جو زبان حال اپنے عقائد کے صحیح ہونے کا دعویٰ تھا اس کی تردید حضرت سلیمان نے کر دی اور فرما دیا کہ ابھی تو تمہارا احساسی علم بھی صحیح نہیں۔ تفکری علم کی صحت کا دعویٰ کرنا تو بہت ہی دور ہے۔ ہاں تفکری علم حاصل کرنے کی صلاحیت تم میں موجود ہے۔

تحلیلِ اجزاء

قَالَ نَکِّرُوْا لَهَا عَرْشَهَا۔ جب حضرت سلیمانؑ کے سامنے بلقیس کا تخت آیا تو نزول بلقیس سے پہلے حضرت سلیمانؑ نے اس کے امتحان کے اسباب فراہم کرنے کا ارادہ کیا اور حکم دیا اس تخت کی صورت بدل دو یعنی اس کے جواہر اکھاڑ کر دوسرے جواہر جڑ دو۔ ابن عباسؓ نے فرمایا تخت کے جواہر نکلوا ڈالے۔ مجاہد نے کہا سرخ کی جگہ زرد اور زرد کی جگہ سرخ لگوا دئیے۔ عکرمہ نے کہا کمی بیشی کر دی۔ بہرحال ہیئت کو تبدیل کرنے کا حکم دے دیا۔ خواہ کسی طرح ہو ایسا کیوں کیا؟

نَنْظُرْ اَتَهْتَدِیْٓ اَمْ تَکُوْنُ الخ۔ تاکہ یہ معلوم کہ بلقیس ہدایت پاتی ہے یا نہیں؟ اس آیت کا مطلب دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اول ہدایت سے مراد اس جگہ شناخت لی جائے۔ یعنی تبدیل ہیئت سے مقصود یہ تھا کہ دیکھیں کہ ملکہ اپنے تخت کو پہچانتی ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ ہدایت کے لغوی معنی ہی مراد لئے جائیں۔ لیکن ہدایت تفکری مراد ہو مطلب یہ کہ بلقیس میں صحت عقائد، ایمان واسلام اور صواب فکری کی قابلیت ہے یا نہیں؟ اس بات کو جانچنے کے لئے حضرت سلیمانؑ نے تخت کی صورت بدلوا دی کیونکہ ہم ابھی لکھ آئے ہیں کہ احساس کی غلطی تفکر کی غلطی پر دلالت کرتی ہے اور صائب الفکر آدمی عموماً احساس میں غلطی نہیں کرتا۔

فَلَمَّا جَآءَتْ الخ۔ جب بلقیس آگئی تو بحکم شاہی تخت اس کے سامنے لایا گیا (بلقیس تخت کو غور سے دیکھنے لگی) دریافت کیا گیا کیا آپ کا تخت بھی ایسا ہی ہے؟ ملکہ نے جواب دیا اتنی زیادہ مشابہت ہے کہ گویا وہی معلوم ہوتا ہے۔ بلقیس اپنا تخت تو اسے نہ کہہ سکی کیونکہ اپنا تخت مقفل کر آئی تھی پھر ہیئت بھی بدلی ہوئی تھی، مگر شدت مشابہت سے تشبیہ طور پر عینیت کی قائل ضرور ہوگئی۔ حضرت سلیمانؑ نے فرمایا یہ تخت تمہارا ہی ہے؟ بلقیس نے کہا (طاقت ملکی کے کمال اور وسعت دسترس کے اس مظاہرہ کی ضرورت ہی کیا تھی) ہم کو تو اس واقعہ سے پہلے ہی آپ کے علمی کمال اور ہمہ گیر طاقت کا علم ہو چکا تھا، اس لئے ہم آپ کے مطیع ہو چکے ہیں۔ گویا اب تک بلقیس ایمان نہ لائی اور سلیمانؑ کی ہمہ گیر طاقت اور

علی کمال کو اپنی فرمان پذیری کا سبب قرار دیا۔ ایمان نہ لانے کی وجہ وہی باطل پرستی اور خدا مذاقی کفر شعاری تھی۔

قِيلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ حضرت سلیمانؑ نے ایک عالی شان قصر بنوایا۔ وسط میں بہت بڑا حوض رکھا حوض میں پانی بھر دیا اور رنگ برنگ کی مچھلیاں اس میں چھوڑ دیں پھر اوپر سے صاف بلوریا سفید شیشے سے اس کو پٹوا دیا۔ یعنی پانی کی سطح پر مکمل فرش شیشہ کا کرا دیا۔ شیشہ اتنا شفاف تھا کہ نظر ہی نہ آتا تھا۔ دیکھنے والا پانی اور مچھلیوں ہی کو دیکھتا تھا۔ غرض اسی تیاری کے بعد وسط حوض میں شہ نشین کے اندر حضرت سلیمانؑ نے جلوس فرمایا اور بلقیس کو وہیں طلب فرمایا۔ بلقیس حوض کے کنارے پر پہنچی۔ بلور کو انتہائی شفاف ہونے کی وجہ سے دیکھ نہ سکی۔ سامنے حضرت سلیمانؑ موجود تھے۔ جانے کا اور کوئی راستہ نہ تھا، اس لئے مجبوراً پانی میں داخل ہونے کے لئے اس نے پائنچے یا دامن اوپر کو اٹھائے اور پنڈلیاں کھول دیں۔ حضرت سلیمانؑ نے کہا کہ یہ پانی نہیں شیشہ سے پٹا ہوا صحن ہے۔ کپڑا اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ اُس وقت بلقیس کو ندامت ہوئی اور اپنی عقل کی کمزوری کو سمجھ گئی اور اعتراف قصور کرتے ہوئے شرک سے تائب ہو کر خالص مومنہ ہو گئی۔ یہاں مجاہد، عکرمہ، محمد بن کعب، سدی اور ابن جریج وغیرہ کے عجیب اقوال مفسرین نے لکھے ہیں۔ کوئی کہتا ہے بلقیس کی پنڈلیوں پر بال تھے اور حضرت سلیمان کو اس کا علم ہو چکا تھا اور آپ چاہتے تھے کہ خود آنکھوں سے دیکھ کر خبر کی تصدیق کریں تاکہ نکاح کر سکیں۔ بعضوں نے اس کے علاوہ بیجا توجیہات لکھی ہیں، مگر سب کی تمام اسرائیلی خرافات ہیں۔ کہیں صحیح مذہبی یا تاریخی ثبوت نہیں، اس لئے ہم نے ایسی بے بنیاد روایات نقل کرنے سے پرہیز کیا ہے۔

مقصود بیان

ظلم احساسی کی صحت و غلطی سے علم تفکری کی صحت و غلطی پر استدلال کیا جاتا ہے جس طرح حضرت سلیمان نے بلقیس کے تخت کو بدل کر اس کی ہدایت کی صلاحیت کو دریافت کیا۔ بعض وقت انسان باوجود شناخت حقانیت اور اعتراف صداقت کے ٹیڑھے راستے پر قائم رہتا ہے اور اس کے دو سبب ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے معمول اور دستور زندگی کو نہیں چھوڑنا چاہتا۔ اپنا عقیدہ اور طرز عمل اس کو اتنا محبوب ہوتا ہے کہ وہ اس سے کنارہ کشی گوارا نہیں کر سکتا۔ دوسرے قومی رسم و رواج، سوسائٹی کی شرم، آباؤ اجداد کی تقلید اور معمول کا طرز زندگی اس کو اختیار حق سے مانع ہوتا ہے۔ یہی دونوں مانع ابتدائے امر میں بلقیس کو بھی ایمان و اسلام سے روکتے رہے۔ لیکن یہ امتناع اور باز داشت اسی وقت تک رہتی ہے جب تک جذبۂ صداقت پوری طرح سے کارفرما نہیں ہوتا اور حق کی روشنی دل کو منور نہیں کرتی۔ جب نور حق دل کے گوشہ گوشہ میں جگمگا جاتا ہے تو اس وقت نہ تقلید اسلاف کا خیال رہتا ہے نہ خودداری و خود پسندی کا نہ سوسائٹی اور ملک کا بلکہ مضطرب ہو کر آدمی حق کے قدموں پر سر جھکا دیتا ہے جس طرح بلقیس نے کیا وغیرہ۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ فَإِذَا هُمْ فَرِيقَانِ يَخْتَصِمُونَ ۝ قَالَ يَا قَوْمِ

ہم نے ثمود کے پاس اُن کے بھائی صالح کو یہ کہنے بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو مگر وہ دو فریق ہو کر لگے جھگڑنے صالح نے کہا اے میری

لِمَ تَسْتَعْجِلُونَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ ۖ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُونَ اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝ قَالُوا اطَّيَّرْنَا

قوم تم کیوں بھلائی سے پہلے بُرائی کی جلدی مچاتے ہو تم کیوں اللہ سے استغفار نہیں کرتے کہ تم پر رحم کیا جائے وہ کہنے لگے ہم تم

بِكَ وَبِمَن مَّعَكَ ۚ قَالَ طَائِرُكُمْ عِندَ اللَّهِ ۖ بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ تُفْتَنُونَ ۝ وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ

کو اور تمہارے ساتھیوں کو منحوس سمجھتے ہیں صالح نے کہا تمہارا شگون اللہ کے ہاں ہے بات یہ ہے کہ تم لوگوں کی آزمائش کی جاتی ہے اس شہر میں نو آدمی ایسے تھے

رَهْطٍ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝ قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللَّهِ لَنُبَيِّتَنَّهُ وَأَهْلَهُ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ

جو ملک میں فساد پھیلاتے تھے اصلاح نہ کرتے تھے انہوں نے کہا کہ باہم معبود کی قسم کھاؤ کہ ہم ضرور رات کو صالح پر اور اُن

لِوَلِيِّهِ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ أَهْلِهِ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ۝ وَمَكَرُوا مَكْرًا وَمَكَرْنَا مَكْرًا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝

کے گھر والوں کو جا کر مار دیں گے پھر اس کے وارث سے کہہ دیں گے کہ ہم تو تمہارے متعلقین کے ہلاک ہونے کے وقت موجود بھی نہ تھے ہم بالکل سچے ہیں انہوں نے ایک خفیہ تدبیر کی تھی اور ہم نے بھی

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا

ایک خفیہ تدبیر کی جس کی اُن کو خبر بھی نہ ہوئی پس دیکھ لو اُن کے مکر کا انجام کیسا ہوا ہم نے اُنکو اور اُنکی قوم والوں کو سب کو ہلاک کر دیا یہ اُن کے گھر اُن کے ظلم کی پاداش میں کھنڈر

ظَلَمُوْا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ○

پڑے ہیں اس واقعہ میں واقف کار قوم کے لئے بڑی نشانی ہے اور ہم نے اُن لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور ڈرتے تھے

تفسیر

جب کسی قوم کی سرکشی حد سے بڑھ جاتی ہے اور اس کا سارا طرزِ زندگی خلاف فطرت ہو جاتا ہے تو ضابطۂ قدرت یہی ہے کہ اس کو برباد کر دیا جاتا ہے اور اس کا وجود سطحِ زمین سے مٹا دیا جاتا ہے۔ وہ قوم چونکہ مردہ ہوتی ہے، اس لئے اس کی قرارگاہ بھی زمین کے اندر ہو جاتی ہے اور سطحِ بالائی کو اپنی تاریک زندگی کے سیاہ داغوں کو داغدار کرتے رہنے کا کچھ حق نہیں رہتا، لیکن قدرت جس طرح اپنی علمی قہاریت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اسی طرح اپنی ربانی عطوفت کا سایہ بھی ڈالتی رہتی ہے اور چونکہ قہاریت کا درجہ ربکیفیت سے مؤخر ہے، اس لئے سرکش قوم کو ہلاک کرنے سے پہلے رب مطلق اس کی اصلاح کے لئے کسی رہنما کو بھیج دیتا ہے اور اس کے ذریعہ سے اپنا ربانی پیام بدنصیب قوم تک پہنچا دیتا ہے اور یہ بھی کہلا بھیجتا ہے کہ جو لوگ اس پیام کو مانیں گے اور اس قانون ہدایت پر چلیں گے ان کا ستیاناس نہیں کیا جائے گا، لیکن جو لوگ اس نقارۂ بیداری کی آواز کو سننے کے بعد بھی سوتے رہے اور خواب جہالت سے بیدار نہ ہوئے ان کو غیبی بربادی چاروں طرف سے گھیرے گی اور عذاب الٰہی ان کی جڑ اکھاڑ کر رکھ دے گا۔ خدا کے بھیجے ہوئے مصلح لیڈر یعنی پیغمبر برحق کی اذان کو سُن کر کچھ لوگ تو چونک پڑتے ہیں اور آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھتے ہیں اور اپنے شفیق ریفارمر کے ساتھ ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگ بدستور جہالت و سرکشی کے طلاطم میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ پیارا نبی ان کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر ہشیار کرتا ہے، مگر وہ کروٹ نہیں لیتے، محسن پیغمبر پر جنوں کہتا ہے کہ دیکھو چاروں طرف طوفان ہے تم گھرے ہوئے ہو اب بھی وقت ہے کہ توبہ کرو زندگی کو سدھارو اور ایمان و نیک اعمال کی کشتی میں بیٹھ کر ساحل مراد پر پہنچ جاؤ، اگر ایسا نہ کرو گے تو ابھی طوفان کی موجیں تم کو غرق کر دیں گی، مگر سرکش لوگ بجائے اطاعت و فرماں پذیری کے اور بجائے فکر نجات کے نبی سے فوراً عذاب کے فی الفور آنے کی خواہش کرنے لگتے ہیں۔ طوفان تو بہرحال آنے والا ہوتا ہی ہے اور آمد طوفان کی علت اس قوم کی معصیت، سرکشی، غفلت، جہالت، کج روی اور بدکاری ہوتی ہے، مگر وہ نابینا قوم نبی کی دعوت افروزی کو مصائب نازلہ کا سبب قرار دیتی ہے اور معصوم پیغمبر سے کہتی ہے جب سے تم نے یہ نئی باتیں نکالی اور ہم میں پھوٹ ڈالی ہے اس وقت سے یہ طوفان معصیت ہم پر نازل ہوا ہے۔ یہ ساری نحوست تمہاری ہے۔ کمبخت غور نہیں کرتے کہ طوفانِ بلا تو ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے مسلط ہوتا ہے ان کی زیاں کاریاں طوفانِ عذاب کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور بقانونِ قدرت زہر کھانے کا نتیجہ ہلاکت مقرر ہے۔ نبی کی تشریف آوری سے تو بعض ہلاکت سے بچ جاتے ہیں اور جو بیمار طبیب روحانی کی ہدایت کے موافق گناہوں کے زہر سے پرہیز کر کے نیکیوں کا تریاق کھاتے ہیں وہ موت سے محفوظ رہتے ہیں، مگر نابیناؤں کو چونکہ روشنی نظر نہیں آتی، اس لئے بدکیش کافر نبی کو ہی معصیت کا سبب قرار دیتے ہیں اور نہایت گستاخانہ لہجہ میں کہتے ہیں کہ لاؤ وہ عذاب و ہلاکت کہاں ہے جس کی تم ہم کو دھمکی دیتے ہو اگر سچے ہو تو جلد لاؤ ہم بھی تو دیکھیں کہ وہ کونسی ہلاکت یا تباہی ہے جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ بعض بے دین اتنے بے باک اور سرکش ہوتے ہیں کہ وہ صرف طلب عذاب ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ مشفق و کریم نبی کو قتل کرنے کی سازش کرتے ہیں اور گلستانِ ہدایت کے گل ہزارہ کو اپنے لئے کانٹا سمجھ کر اس کو توڑ دینے کے خواہشمند ہوتے ہیں، لیکن تا کے، بالآخر رحمت غیبی کا پردہ اٹھ جاتا ہے اور قہاریت کا سیاہ دیو رونما ہو کر بدکیشوں کو اپنا شکار بنا لیتا ہے اور اس طرح قوم سرکش کے وجود سے صفحۂ ہستی پاک ہو جاتا ہے۔ ہاں وہ لوگ باقی رہ جاتے ہیں جو ایمان و عمل صالح کی کشتی میں بیٹھ کر طوفان کے اندر سے گذر کر ساحل مراد پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہ قدرت کا ایک عام ضابطہ ہے حضرت صالحؑ کی قوم ثمود کا بھی یہی دستور العمل رہا اور یہی نتیجہ نکلا۔ صالحؑ کی دعوت پر کچھ لوگ خواب خرگوشی سے بیدار ہو کر آپ کے ساتھ ہو لئے اور ایمان و عمل صالح کے چھینٹوں نے خواب کے تمام آثار ان کے دماغوں سے دور کر دیئے اور وہ صحیح سالم ساحل مقصود پر پہنچ گئے اور کچھ لوگ متواتر آوازیں اور خلک شگاف صدائیں سننے کے بعد بھی بیدار نہ ہوئے، حضرت کے کلام کو احمقانہ کلام سمجھا اور گستاخانہ پیرایہ میں عذاب کے خواستگار ہوئے اور خشک سالی کی جو بلا ان پر مسلط ہوئی تھی اس کا باعث معصوم نبی کو ٹھہرایا اور اپنی بدکرداریوں پر نظر نہ کی اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے بہت آگے بڑھ کر آپ کے قتل کی سازش کی اور رات کی تاریکی میں اپنے منہ کی پھونکوں سے نورِ الٰہی کو بجھانا چاہا اور اس مسجد کو (جس میں حضرت صالحؑ اور آپ کے پیرو خالق بے ہمتا کی پرستش کرتے تھے) جاتے وقت آپ کو شہید کرنے کی کوشش کی۔ بالآخر ڈھیل کا وقت ختم ہو گیا۔ یکدم ہیبتناک چیخ میں پھنس گیا اور ایسا بند ہوا کہ پھر اضطرار بسیار کے بعد بھی نہ کھلا اور سب برباد ہو گئے۔

تحلیلِ اجزاء وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا۔ قوم ثمود عاد ثانیہ کہلاتی ہے۔ عاد اول قوم ہود ہے۔ قوم ثمود کی سکونت عرب کے شمالی مغربی گوشے میں تھی۔

مدینہ سے تبوک جاتے وقت سرِ راہ ان کے فرسودہ کھنڈر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ملے۔ کہا جاتا ہے کہ عادِ اولیٰ سے سو برس بعد قوم ثمود کا زمانہ تھا۔ حضرت صالح قوم ثمود کے بھائی تھے یعنی ان میں قومی اور وطنی برادری تھی، اگرچہ دین وملت میں جدائی تھی۔ حضرت صالح نے اپنی قوم کو اللہ کی توحید کی طرف بلایا، شرک سے منع کیا اور اللہ کی پرستش کرنے کی نصیحت فرمائی۔ اس نصیحت کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ لوگ مومن بن گئے اور کچھ بدستور مشرک زیاں کار رہے۔ مومنوں کا گروہ غریب اور کافروں کا گروہ دولت مند تھا۔

فَإِذَا هُمْ فَرِيقَانِ يَخْتَصِمُونَ۔ انہی دونوں گروہوں میں جھگڑا ہونے لگا اور ہر فریق اپنے کو بجانب حق ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی جھگڑے کی تفصیل باری تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے۔ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحًا مُّرْسَلٌ الخ اس جھگڑے کا نتیجہ کچھ نہ نکلا مومن اپنے ایمان پر اور کافر اپنے کفر پر قائم رہے۔ صالح نے ہر چند عذاب الٰہی کی دھمکی دی اور فرمایا اگر میرا کہا نہ مانوگے تو تباہ کر دیئے جاؤ گے، مگر کافروں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی بلکہ گستاخی میں مزید اضافہ ہو گیا اور بے باکی کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ حضرت صالح سے کہنے لگے کہ تم ہم کو عذاب وہلاکت سے ڈراتے ہو لاؤ وہ عذاب کہاں ہے۔

وَقَالَ يَا قَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُونَ بِالسَّيِّئَةِ الخ۔ حضرت صالح نے فرمایا برائی کو طلب کرنے میں جلدی کیوں کرتے ہو استغفار کیوں نہیں کرتے کہ وہ رحم کھا کر عذاب سے محفوظ رکھے۔ میں نے عذاب کا خوف تو اس لئے دلایا تھا کہ تم ڈر کر توبہ کرو مگر تم نے بے باکی اختیار کی اور تباہی کے خواستگار بن گئے۔ یہ بات زیبا نہیں۔

قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ الخ۔ کہنے لگے موجودہ مصیبت تو ہمارے اوپر تیری نحوست سے آئی ہے (جب سے تو نے ہمارے دیوتاؤں کی مذمت شروع کی ہے اسی وقت سے ہم پر یہ مار پڑی ہے۔ نہ تو ہمارے معبودوں کو برا کہتا اور بزرگوں کے مذہب کو چھوڑنے کی تلقین کرتا نہ یہ مصیبت ہم پر آتی۔ وہ لوگ قحط کی بلاؤں میں مبتلا ہو گئے تھے اور تنگ حالی نے ان کو گھیر لیا تھا وہ اپنے کردار و اطوار کو وہ صحیح سمجھتے تھے۔ اگر ان کے نزدیک گنہگار تھے تو حضرت صالح اور ان کے ساتھ والے مومن۔ اس لئے ان بزرگوں کو انہوں نے منحوس قرار دیا۔ سرکش معصیت شعار قوم کو جب ہلاکت سے پہلے کسی قدر جھنجوڑا جاتا ہے اور دنیوی مصائب میں مبتلا کر کے توبہ کا موقعہ دیا جاتا ہے تو وہ اپنی مصیبت کا باعث اہل حق کو قرار دیتی ہے۔ حضرت موسیٰ کے ساتھیوں کی بھی حالت تھی۔ فَإِذَا جَاءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوا لَنَا هَٰذِهِ ۖ وَإِن تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَطَّيَّرُوا بِمُوسَىٰ وَمَن مَّعَهُ۔ اگر ان کو خیر وبرکت اور بھلائی حاصل ہوتی تو کہتے ہم اس کے حق دار ہی ہیں ہم کو یہ پہنچنا ہی چاہیئے تھے اور اگر کبھی کوئی خرابی یا مصیبت آ پڑتی تو اس کو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کہتے۔ مکے کے کافروں کا بھی یہی حال تھا۔ عام قحط پڑا تو منحوسوں نے اس کا سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کو قرار دیا اور صاف کہہ دیا کہ تم چونکہ ہمارے دیوتاؤں کو برا کہتے ہو اس لئے وہ ناراض ہو گئے ہیں اور انہوں نے اپنا دستِ کرم کھینچ لیا ہے۔ یہ ساری نحوست تمہاری ہے۔

قَالَ طَائِرُكُمْ عِندَ اللَّهِ۔ حضرت صالح نے فرمایا یہ نحوست تو تمہارے (اعمال کے ساتھ وابستہ ہے اور) خدا کی طرف سے مقدر ہو چکی ہے۔ اس کی اصل غرض یہ ہے کہ تمہاری آزمائش کی جائے۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ اس زمانے میں شہر کے اندر ثمود کی نو جماعتیں تھیں یعنی نو جتھے تھے اور ہر جتھے کا ایک سردار تھا۔ ان سرداروں میں سے ایک کا نام قدار بن سالف تھا۔ سب سرداروں نے مل کر مشورہ کیا کہ صالح کی طرف سے روزانہ ہماری جانیں ضیق میں ہیں، اس لئے ایک دم فیصلہ ہی کر لو۔ باہم قسم کھالو کہ صالح اور اس کے کنبہ کو رات کو چھپ کر قتل کر دیں۔ اب اگر کوئی وارث خون کا دعوی کرے گا تو کہہ دیں گے ہمیں کیا معلوم ہم وہاں موجود بھی نہ تھے۔ ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے کہ جب قوم ثمود نے ناقۂ صالح کو قتل کر دیا تو حضرت صالح نے فرمایا اب تین روز اپنے گھروں میں اور مزے مار لو۔ چوتھے روز عذاب آئے گا۔ کفار نے باہم کہا صالح تین روز کے بعد ہماری ہلاکت کا اعلان کرتا ہے بہتر ہے کہ اس مدت سے پہلے ہم اس کا کام تمام کر دیں۔ پہاڑ کی گھاٹی میں حضرت صالح کی مسجد تھی جس میں آپ عبادت کرتے تھے۔ کفار نے مشورہ کیا اور رات کو پہاڑی کے قریب کسی گھاٹی میں چھپ کر راستہ کے کنارے بیٹھ گئے اور منتظر رہے کہ صالح نماز کو آئے گا تو ہم اس کا کام تمام کر دیں گے اور وہاں سے لوٹ کر اس کے گھر والوں کو مار ڈالیں گے۔ محمد بن اسحاق نے لکھا ہے کہ رات کے وقت حضرت صالح کے مکان پر وہ لوگ قتل کرنے کے ارادے سے پہنچے تھے۔

وَمَكَرُوا مَكْرًا الخ۔ یعنی ان لوگوں نے ایک خاص تدبیر کی تھی۔ مطلب یہ کہ غارتیں چھپ کر گھر میں شبخون مار کر صالح کو قتل کرنا چاہا تھا۔ اس کے مقابلے میں اللہ نے بھی ایک خفیہ تدبیر کی۔ ان کو پتہ بھی نہ تھا کہ اللہ نے ان کی بربادی کی کیا تدبیر کی تھی۔ بالآخر ان کی مکاری کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے ان سب کا صفایا کر دیا۔ آبادیاں اور بستیاں اجڑ گئیں اور کوئی نام لیوا پانی دینا باقی نہ رہا۔ مکر کی پاداش کو مکر کہنا ایک محاورہ کی بات ہے۔ جس طرح بدی کی سزا کو بدی کہہ لیا جاتا ہے اسی طرح مکر کی پاداش کو مکر فرما دیا۔

فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا۔ اب دیکھو (تبوک کے راستہ میں) ان کی بستیاں اجڑی پڑی ہیں اور یہ ان کی ستم گاریاں اور بدکرداریاں تھیں یعنی خدا کا انہیں

کہ خواہ مخواہ کسی قوم کو برباد کر ڈالے۔ درحقیقت تباہی کا باعث قوم کی دراز دستیاں اور بے جا کرتوت ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگر بدکرداری تباہی کی علت نہ ہوتی تو نیکوکار مومن عمومی عذاب سے کس طرح رہائی پاتے اور کیونکر عمومی ہلاکت سے بچتے۔ مشہور ہے کہ حضرت صالح چار ہزار اہلِ ایمان کو لے کر وطن سے دور نکل گئے۔ حدودِ یمن میں پہنچ کر آپ کی ایک جگہ وفات ہوگئی۔ جس جگہ آپ کی وفات ہوگئی اس کا نام حضرموت ہوگیا یعنی حضرموت کی وجہ تسمیہ حضرت صالح کی وفات ہے۔ ساتھیوں نے ایک شہر بسالیا جس کا نام حاصورہ رکھا۔ واللہ اعلم۔

مقصودِ بیان:۔ اہلِ حق اور اہلِ باطل ہمیشہ باہم مخالف ہوتے ہیں فَاِذَا ھُمْ فَرِیْقٰنِ کا لفظ بتا رہا ہے کہ تفریق انسانی کے اسباب اگرچہ بکثرت ہوتے ہیں۔ نسلی تفریق، وطنی تفریق، پیشہ کی تفریق، افلاس و مال کی تفریق، مگر سب سے بڑی تفریق مذہبی عقائد و اعمال کی ہے جس کو اختیار کرتے ہی فوراً قومی تفریق ہوگئی اور دو فریق بن گئے۔ اللہ کے پاک پیغمبر اپنی قوم کے ہمدرد اور انتہائی شفیق ہوتے ہیں۔ جب ترغیب اور ثواب کی بشارت اصلاح عقیدہ و عمل کے لئے ناکافی ہوتی ہے تو وہ ترہیبی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور سرکشی کو انجام کی بربادی سے ڈراتے ہیں۔ مگر بعض بدکیش، ایسے کور بصیرت ہوتے ہیں کہ بجائے خوف زدہ ہو کر نیکی کی طرف راغب ہونے کے عذاب کے خواستگار بن جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک پیغمبر کا قول صداقت سے خالی ہوتا ہے اور ان لوگوں کو جن کی آنکھوں پر شرک و گناہ کا موٹا پردہ پڑا ہوتا ہے غیبی عذاب نہیں نظر آتا۔ پھر جب ڈرانے دھمکانے اور توبہ کی طرف راغب کرنے کے لئے فطرت کے تصرفات بصورت عذاب ابتدائی شکل میں نمودار ہوتے ہیں اور اصلی عذاب کے نزول سے پہلے جو کچھ حوادث و مصائب کا عمومی تسلط ہوتا ہے مثلاً قحط عمومی پڑتا ہے، وبا پھیلتی ہے، بے روزگاری اور افلاس کی وبا عام ہوتی ہے تو بے دین اس وقت بھی بیدار نہیں ہوتے اور اپنے بُرے کردار سے باز نہیں آتے بلکہ بعض الٹی عقل والے تو مصائب عامہ کا سبب اہلِ حق کی نحوست کو قرار دیتے ہیں اور نیکوں کی نیکی ان کی نظر میں نحوست بن جاتی ہے گویا ان کی عقل بالکل اُلٹی ہو جاتی ہے اور گناہ ان کے دلوں کو جکڑ لیتا ہے۔ پس نصیحت پکڑیں وہ جاہل کور دانش مسلمان جو عموماً نیکی و عبادت سے گریز کرتے رہتے ہیں۔ ہر چند ان کو ترغیب دی جائے، مگر وہ کسی طرح اللہ کی بندگی کی طرف نہیں آتے بالآخر اگر مجبور کر کے ان کو مسجد میں بلوالیا جائے اور ان کے ضمیر کے خلاف کوئی جابر قوت ان کو نماز میں شریک ہونے پر مجبور کر دے اور وہ ایک وقت کی نماز کے بعد ان کو کوئی دکھ پہنچ جائے۔ مثلاً گھر میں کوئی بیمار ہو جائے کوئی جانور یا بچہ مر جائے، کھیتی برباد ہو جائے یا باغ اجڑ جائے تو ضرور کہنے لگتے ہیں کہ ہم پر یہ آفت نماز کی وجہ سے آئی ہے ہم کو تو نماز راست نہیں۔ یاد رکھو کہ یہ کافرانہ باتیں ہیں۔ نیکی کبھی باعثِ نحوست نہیں ہوتی بلکہ مصائب نازلہ کا اصل سبب بدکاری اور ظلم و ستم گاری ہے۔ اہلِ باطل اہلِ حق کو مغلوب و برباد کرنے کی کیسی ہی خفیہ تدبیریں کریں، مگر تدبیر الٰہی سے پیش نہیں لے جا سکتے۔ اللہ کی غیبی تدبیر اہلِ حق کی حفاظت اور اہلِ باطل کی بربادی میں لگی رہتی ہے، مگر کور دانش کور بصر جاہل اللہ کے غیبی ہاتھ کو نہیں دیکھتا۔ نادانی سے مکاریوں اور بدافعالیوں میں مست رہتا ہے وغیرہ۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ○ اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً

اور لوط کو ہم نے بھیجا جبکہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کیا تم دیکھتے ہوئے بیحیائی کا کام کرتے ہو کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں پر شہوت کے ساتھ

مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ○ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا

دوڑتے ہو واقعی تم جہالت شعار قوم ہو لوط کی قوم کا سوا اس کے کوئی جواب نہ تھا کہ انھوں نے کہا لوط کے لوگوں کو

اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ○ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۡ قَدَّرْنٰهَا

اپنی بستی سے نکال دو یہ لوگ بڑے پاک رہنا چاہتے تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے لوط کو اور ان کے لوگوں کو بچا لیا سوا اُن کی بیوی کے ہم نے

مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ○ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَاۗءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ○ ع قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ

تجویز کر لیا تھا کہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوگی اور اُن پر برسا دیا پس بُرا برساؤ تھا ان لوگوں پر جو ڈرائے گئے تھے (اے محمد) کہہ ہر طرح کی تعریف اللہ کو

عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ؕ آٰللّٰهُ خَیْرٌ اَمَّا یُشْرِکُوْنَ ؕ

زیبا ہے اور اس کے برگزیدہ بندوں پر سلام ہو کیا اللہ بہتر ہے یا جن کو یہ (خدائی میں) شریک کرتے ہیں

تفسیر جب عقل کی روشنی افسردہ ہو جاتی ہے، جب نورِ فطرت بجھ جاتا ہے، جب دل پر سیاہی آجاتی ہے، جب روح زنگ آلود ہو جاتی ہے اور جب اچھائی برائی میں امتیاز پیدا کرنے والی قوت مردہ ہو جاتی ہے اس وقت خواہشات کا عام تسلط ہو جاتا ہے۔ ہوا و ہوس اپنی بساط بچھا لیتے ہیں۔ نفسِ طاغوتی کا ڈیرا قائم ہو جاتا ہے آدمی کی آنکھوں پر عیش پرستی کا موٹا پردہ پڑ جاتا ہے، ناز و نعمت کے نشے سے دماغ سرشار ہو جاتے ہیں، جائز ناجائز اور حق و باطل کا فرق معدوم ہو جاتا ہے، انتہائی عیاشی کا نتیجہ نکلتا ہے کہ محل اور بے محل کا امتیاز بھی جاتا رہتا ہے، آدمی آدمی نہیں رہتا بلکہ آدمی نما جانور بن جاتا ہے، عقلِ فکری تو در کنار عقلِ شعوری و حسی بھی پژمردہ ہو جاتی ہے، ایسے وقت میں حصولِ لذت کے ہر طریقہ کو اور عیش پرستی کے ہر ذریعہ کو آدمی اپنے لئے حلال بنا لیتا ہے اور خواہشِ نفس کو پورا کرنے کے ہر راستہ میں نہایت بے باکی سے گامزن ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی روشن دماغ رکھنے والا راہنما اس کو شفقت کے ساتھ اس کی خواہشات سے روکتا اور مطلق العنانی سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور حرام و حلال کی حدود مقرر کر کے سرحدِ حرام میں داخل ہونے سے منع کرتا ہے تو اس ہوس زدہ انسان کے غصہ کا پارا چڑھ جاتا ہے۔ شفیق ناصح کی گوش ہوش سے سننے کے بجائے وہ اپنے پیارے دوست کا دشمن بن جاتا ہے۔ جو خدا پرست انسان اس نابینا کو غار میں گرنے سے روکتا ہے۔ یہ اپنی جہالت کی لاٹھی اس کو مارنے کے درپے ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے مغز میں عقل کی روشنی نہیں ہوتی، اس لئے تمام مادی قوتیں اس کی روح پر تسلط جما لیتی ہیں۔ پہلے قوتِ شہوانیہ کا زور اس کی بصیرت کو مغلوب کرتا ہے تو آخر میں بے محل غضب کی افراط اور بھی عقل کو مردہ کر دیتی ہے۔ شفیق ناصح کی مخالفت اور اہلِ حق کی عداوت کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ایسے سرکش انسان تباہی ہم کنار بربادی بردوش اور ہلاکت در بر ہو کر ابدی فنا کے غار میں گر پڑتے ہیں۔ غیبی طوفان کی ایک ہلاکت بار لہر ان کو غرق کر دیتی ہے اور اللہ کی قہاری طاقت کی ایک حرکت ان کے نام و نشان کو مٹا دیتی ہے۔ قوم لوطؑ کی بھی یہی حالت تھی۔ عیش پرستی کا جن ان کے سر پر سوار تھا۔ بادۂ ہوس سے دماغ سرشار تھے۔ شہوت کا پردہ آنکھوں پر پڑ گیا تھا اور زناکاری کی بھی حدود سے بڑھ کر لواطت کو مرکزِ شہوت بنا لیا تھا۔ یہی دو نہیں پوری قوم کی قوم اس خلافِ فطرت حرکت میں مشغول ہو گئی تھی۔ حضرت لوطؑ نے ان کو نصیحت کی فہمائش کی عذاب سے ڈرایا، قانونِ فطرت سمجھایا، مگر کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اُلٹے لوطؑ کے دشمن بن گئے اور پیغمبرِ برحق کو ان کے خاندان سمیت جلا وطن کرنے کے درپے ہو گئے۔ آخر میں اس بے وقوف قوم کا جو نتیجہ ہوا اس کا اظہار بحیرۂ مردار سے اب بھی ہو رہا ہے۔ سدوم کی بستیاں اب بھی اپنی بربادی کے فرسودہ نشانات دکھا رہی ہیں۔

تحلیلِ اجزاء وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ باشندگانِ سدوم وغیرہ کا حضرت لوطؑ سے کوئی نسبی رشتہ نہ تھا، اس لئے اس جگہ قوم سے مراد امتِ تبلیغ ہے۔ بحیرۂ مردار کے کنارے پانچ بستیاں تھیں جن کی اصلاح کا حکم حضرت لوطؑ کو دیا گیا تھا۔ قوم سے مراد انہیں بستیوں کے باشندے ہیں۔

اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ۔ فاحشہ سے مراد لواطت ہے۔ آئندہ آیت میں اس ابہام کی تفسیر موجود ہے۔

وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ۔ یعنی دیدہ و دانستہ تم لواطت کا ارتکاب کرتے ہو۔

لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً۔ رجال سے مراد لڑکے ہیں۔ قوم لوط امرد پرست تھی اور ہو سکتا ہے کہ عام رجال مراد ہوں کیونکہ امرد پرستی کی انتہا یہ ہے کہ پھر کسی نابالغ لڑکے اور نابالغ مرد میں امتیاز نہ رہے اور قوم لوط لواطت کی شیدائی تھی اس لئے ہو سکتا ہے کہ امرد پرستی کی حد سے بھی آگے بڑھ گئی ہو۔

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝ یعنی تم اپنی بدکاری اور بد انجامی سے ناواقف ہو مطلب یہ ہے کہ تم جانور ہو جس طرح جانور قوتِ فکریہ سے محروم ہوتا ہے اور نتائج و عواقب سے ناواقف۔ اسی طرح تمہاری حالت ہے اور تم نے بھی قوتِ عقلیہ کو مُردہ بنا لیا ہے اور بہائم کی طرح شہوت رانی کے درپے ہو، محل اور بے محل کا فرق نہیں کرتے۔ قاعدہ ہے کہ جو قوم عقل کی روشنی سے محروم ہو جاتی ہے وہ دلائل کا مقابلہ دلائل سے نہیں کر سکتی۔ علم کے مقابلے میں جہالت اور برہان کے مقابلے میں دھمکیوں پر اتر آتی ہے۔ بہائم صفت انسان عاجز ہو کر درندوں کی خو خصلت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی حالت قوم لوطؑ کی بھی تھی۔ حضرت کے صداقت آفریں کلام کا کوئی صحیح جواب نہ دے سکے تو جاہلانہ دھمکیوں پر اتر آئے اور کہنے لگے۔

اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ۔ لوطؑ کو اس کے کنبہ سمیت اپنی بستی سے نکال دو۔ یہ لوگ بہت پاک باز اور پاک طینت بنتے ہیں۔ غرض جب بد کیش کافروں نے حضرت لوطؑ کی اہانت و ایذا کی کوشش اٹھا نہ رکھی تو بربادی کا وقت سر پر آپہنچا تو اوپر سے آتش ناک کنکریلے پتھروں کی بارش ہوئی اور زمین کا تختہ اُلٹ گیا، مگر حضرت لوطؑ اور ان کے گھر والے محفوظ رہے۔ کیونکہ نزولِ عذاب سے پہلے ہی راتوں رات آپ اپنی عیال کو ساتھ لے کر بستی چھوڑ کر حضرت ابراہیمؑ کے پاس جانے کے ارادے سے چل دیئے تھے، مگر حضرت کی بیوی

کافرہ تھی۔ اس نے کافروں کو حضرت لوطؑ کے گھر پر چند خوبرو مہمانوں کے قیام کی اطلاع دی تھی اور اسی نے چلتے وقت اپنی قوم کی تباہی پر منہ موڑ کر دیکھا تھا اور اظہارِ رحم کیا تھا، اس لئے اس کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الخ۔ انبیاء کے قصص ختم کرنے کے بعد روئے خطاب حضور اقدسؐ کی طرف فرماتے ہوئے حاصلِ قصص بیان فرماتا ہے۔ کوتاہ بصیرت رکھنے والے لوگ کہتے ہیں کہ قرآن میں سوا پارینہ قصص کے اور رکھا ہی کیا ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ قرآن کا اصل منشاء ہدایت ہے اور ہدایت کی تبلیغ کبھی قرآن نے بصورت برہان کی ہے اور کبھی بصورت تمثیل اور کبھی بصورت ترغیب و ترہیب۔ روشن دماغ رکھنے والے دلائل و براہین کے طالب ہوتے ہیں سو ان کے لئے بھی قرآن میں سرمایۂ ہدایت موجود ہے۔ متوسط ذہانت والے عقلی دلائل کو نہیں سمجھتے، ان کے دماغ میں صرف اتنی جولانی ہوتی ہے کہ نظیر پر اور مثال کو مثال پر قیاس کر لیں۔ جو قرآن نے ہدایت بصورت تمثیل بھی کی۔ گزشتہ اقوام و انبیاء کے مناسب قصص عبرت دلفریب طرزِ ادا کے ساتھ بیان کئے اور معصیت و فرماں پذیری کا برا اچھا انجام ظاہر فرما کر صراحت کر دی کہ جو گزشتہ اقوام کو اپنی معصیت و سرکشی یا اطاعت و فرماں پذیری کے نتائج برداشت کرنے پڑے تھے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم لوگ معصیت و اطاعت کے عواقب سے خالی رہو۔ رسول کی فرماں پذیری میں کونین کی سعادت ابدی نجات اور حقیقی زندگی مضمر ہے اور نافرمانی دونوں جہان کی بربادیاں اور تباہیاں ساتھ لاتی ہیں، لیکن جو لوگ صورتِ تمثیل کو بھی نہ سمجھتے تھے اور بہت ہی چھوٹے دماغ رکھتے تھے ان کی ہدایت کا طریقہ سوا ترغیب و ترہیب کے اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے ان کو عذابِ آخرت کی ہولناکی کی تصویر اور ثوابِ آخرت کی راحت آفرینی کا فوٹو دکھایا۔ آیت مذکورہ میں تمثیلی صورت اختیار کرتے ہوئے انبیاء کے قصص کا اصل منشاء ظاہر فرمایا ہے۔ اول استحقاق حمد اللہ کے لئے ثابت کیا پھر برگزیدہ اور نیک بندوں کو دین و دنیا کی سلامتی کی بشارت دی اور آخر میں مشرکوں کے نتیجۂ بد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شرک کا استیصال اور توحید کا اثبات فرمایا اور اپنے رسول کو صاف حکم دے دیا کہ تم کہدو کہ حمد کا ثبوت اللہ ہی کے لئے ہے اور اس کے برگزیدہ بندوں کو دوامی نجات حاصل ہوتی ہے اور کفار و معصیت شعار گروہ ہلاک ہوتا ہے۔ پس ایسی صورت میں اللہ کو معبود ماننا بہتر ہے یا غیروں کا پرستار بننا؟ ظاہر ہے کہ باطل معبود اگر مدد کر سکتے ہیں تو دنیا ہی میں اپنے پرستاروں کی کرتے اور عذابِ الٰہی سے ان کو بچا لیتے مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ ہاں اللہ نے اپنے نیک بندوں کی مدد کی اور ہلاکت و تباہی سے ان کو بچا لیا۔ لہٰذا اسی کو استحقاقِ الوہیت ہے۔

مقصودِ بیان

لفظ قوم کا اطلاق ہم وطنوں اور امت والوں پر بھی ہوتا ہے۔ نسبی اشتراک ضروری نہیں۔ لواطت بے حیائی ہے۔ جو شخص شہوت کے جال میں پھنس جاتا ہے اس کو اہلِ حق سے عداوت ہو جاتی ہے اور صداقت یا دلائل کے مقابلے سے عاجز آ کر وہ کینہ توزی کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ بیوی پر بھی لفظ اہل کا اطلاق ہوتا ہے ورنہ حضرت لوطؑ کی بیوی کا استثنا صحیح نہ ہوگا، مگر یہ اہلیت باعتبار نسب یا رشتہ کے ہوتی ہے۔ حقیقت میں اہل کہلانے کا مستحق وہی ہے جو طریقہ و عمل میں موافقت رکھتا ہو۔ کفر و اسلام بلکہ ہر چیز یہاں تک کہ پیچھے رہنا اور آگے بڑھنا بھی تقدیرِ الٰہی میں پہلے سے موجود ہے۔ تقدیر خداوندی میں جو شخص کافر ہے اس کو نبی کا انتہائی قرب بھی مومن نہیں بنا سکتا جس طرح لوطؑ کی بیوی مومن نہ بن سکی۔ اللہ کے برگزیدہ بندوں کو دوامی نجات و سلامتی حاصل ہوتی ہے اور کافر تباہ ہوتے ہیں وغیرہ۔

(اُنیسواں پارہ ختم ہوا)

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

تفسیر

بَیَانُ السُّبْحَان

(۲۵) مسلسل

کا

پارہ نمبر ۲۰

اَمَّنْ خَلَقَ

فاضلِ اجل حضرت مولانا سید عبد الدائم جلالی

وہ تفسیر جو رسالہ مولوی دہلی میں ۱۳۵۶ھ سے بہ اقساط ہر ماہ شائع ہو رہی ہے

عطاء الرحمٰن صدیقی مالک وسیم بکڈپو دیوبند

نے برائے اشاعت معارف القرآن

محمدی پرنٹنگ پریس دیوبند (یوپی)

بیسواں پارہ

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ

وہ کون ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اس پانی سے تر و تازہ باغات پیدا

بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ؕ﴿﴾ اَمَّنْ جَعَلَ

کئے تم کو اتنا مقدور نہ تھا کہ تم اِن باغات کے درختوں کو اُگا سکتے کیا اب بھی اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے بات یہ ہے کہ یہ لوگ سچ کج رو ہیں وہ کون ہے جس

الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَاۤ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ

نے زمین کو قرارگاہ بنایا اور اس کے درمیان نہریں بنائیں اور اُس کو مضبوط کرنے کے لئے پہاڑ بنائے اور دونوں سمندروں کے درمیان حجاب بنایا کیا اب بھی

مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ﴿﴾ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ

اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے بات یہ ہے کہ اکثر لوگ ناواقف ہیں وہ کون ہے جو مجبور کی دعا قبول کرتا ہے جب وہ اس کو پکارتا ہے اور اس کی تکلیف دور

وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؕ﴿﴾ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ

کرتا ہے اور تمہیں زمین میں (ایک دوسرے کا) جانشین بناتا ہے کیا اب بھی اللہ کے کوئی اور معبود ہے تم لوگ بہت کم نصیحت مانتے ہو وہ کون ہے جو تمہیں دریا اور جنگل کی

الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا

تاریکیوں میں راہ بتاتا ہے اور وہ کون ہے جو بارش سے قبل خوشخبری دینے والی ہوائیں چلاتا ہے کیا اب بھی اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے اللہ ان کی شرک

يُشْرِكُوْنَ ؕ﴿﴾ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ

انگیزیوں سے پاک ہے وہ کون ہے جو ابتداءً پیدا کرتا ہے پھر دوبارہ پیدا کرے گا اور وہ کون ہے جو آسمان و زمین سے تم کو رزق پہنچاتا ہے

ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿﴾ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ

کیا اب بھی اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے (اے محمد) کہہ دو اگر سچے ہو تو اپنی دلیل پیش کرو کہہ دو سوائے خدا کے جو کوئی آسمانوں میں

وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿﴾ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي

اور زمین میں ہے غیب کو نہیں جانتا اور وہ نہیں جانتے کہ کب اُٹھائے جائیں گے بلکہ اُن کا علم آخرت کے بارے میں کمزور

الْاٰخِرَةِ ۫ بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْهَا ۫ بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ ۝ ع

ہوگیا ہے بات یہ ہے کہ وہ آخرت کی طرف سے شک میں ہیں بلکہ وہ اُس سے نابینا ہیں

تفسیر برہان و دلیل کی دو قسمیں ہیں (۱) اصل سے فرع پر، علت سے معلول پر اور سبب سے نتیجہ استدلال کرنا یعنی پہلے علت و سبب کا علم اصل کیا جائے پھر معلول کو معلوم کیا جائے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ مادی بخار کی علت تعفنِ اخلاط ہے۔ دن کی روشنی پھیلنے کا سبب آفتاب کا طلوع ہے۔ سبزہ کے پیدا ہونے کی وجہ تخم کی صلاحیت ہے اور کھاد پانی ہوا وغیرہ کی مناسب مقدار و کیفیت ہے۔ اگر اب تعفنِ اخلاط کو پہلے معلوم کر لیا جائے اور اخلاط کو متعفن جان کر بخار کے وجود ثابت کیا جائے یا طلوع آفتاب کا حکم حاصل کرنے کے بعد اس سے دن کی روشنی کا اثبات کیا جائے یا تخم صلاحیت اور کھاد پانی ہوا وغیرہ کا اجتماع دیکھ کر سبزہ کی روئیدگی پر استدلال کیا جائے تو یہ استدلال لمّی اور حقیقی ہوگا اور اس طریقۂ استدلال سے جو علم حاصل ہوگا وہ یقیناً کامل ہوگا۔

(۲) فرع پر اصل پر، معلول سے علت پر اور مسبب سے سبب کو معلوم کیا جائے پھر اس سے اصل علت اور سبب کا علم حاصل کیا جائے۔ مثلاً بخار دیکھ کر یہ ثابت کیا جائے کہ اخلاط میں تعفن ہے یا دھوپ دیکھ کر یہ کہا جائے کہ آفتاب ضرور روشن ہے یا سبزہ کو دیکھ کر یہ جان لیا جائے کہ اس بیج تخم میں صلاحیت تھی اور ہوا پانی وغیرہ کی مناسب مقدار اس کی مددگار تھی۔ اس طریقۂ استدلال کو انّی کہا جاتا ہے اور اس سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ حقیقی استدلال کے علم سے کمزور ہوتا ہے۔ گویا اول طریقہ میں شئی کی علت اور سبب کا اظہار ہوتا ہے اور مؤخر الذکر طریقہ میں صرف تحقیق و تنقیح مقصود ہوتی ہے۔ اب یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ اگر جس کسی چیز کی کوئی علت موجود ہو اور سبب موجود ہو تو اس کا علم سبب و علت کی جانب سے حاصل ہوتا ہے اور جس چیز کی علت موجود ہی نہ ہو یا اس کی علت کا علم نہ ہو تو اس کو جاننے کا طریقہ صرف اس کے آثار و علومات ہوتے ہیں۔

تمام کائنات اسباب و علل کے سلسلے میں جکڑی ہوئی ہے۔ ایک شئی دوسری شئی کی علت ہے۔ مثلاً انسانی غذا حیوانی اور نباتی اجزا سے تیار ہوتی ہے جو جاتی اور حیوانی اجزا عناصر سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً آسمان سے پانی برسنے سے تو سبزہ پیدا ہوتا ہے۔ پانی ابر سے ابر بخارات سے۔ بخارات سمندروں اور دریاؤں سے اور سمندر گیس سے بنتے ہیں گیس کی ترکیب و ایجاد ذرات کہربائیہ کے اجتماع سے ہوتی ہے اور ذرات کو مجتمع کرنے والی قوت طبیعت ہے۔ طبیعت میں اجتماعی قوت کہاں سے آئی، اس کی قوت کہاں سے آئی، اس کی علت کیا ہے، وہ کوئی غیر محسوس طاقت ہے۔ بہرحال عالم کی ہر کڑی کی بندش اس ہستی سے ہے جس کی کوئی علت نہیں۔ اب اگر آخری علت کا علم حاصل کرنا ہوگا تو چونکہ اس کی کوئی علت نہیں، اس لئے استدلال کی پہلی شق تو قائم نہیں کی جاسکتی۔ یا تو اس کے آثار معلومات اور فعلی نشان کو دیکھ کر نشان پیدا کرنے والے پر ذات کا استدلال کرسکتے ہیں۔

اس تقریر کا خلاصہ یہ نکلا کہ باری تعالیٰ کی ہستی یا الوہیت یا وحدانیت کو برہانِ حقیقی سے ثابت کرنا محال ہے۔ کیونکہ اس کی کوئی علت نہیں وہی علۃ العلل ہے البتہ کائنات کا تنوع، عالم کی نیرنگی اور مادی و غیر مادی دنیا انقلاب ہم کو اس کی ہستی اور الوہیت کا پتہ دے رہا ہے، اس لئے قرآن نے جہاں بھی اللہ کی ہستی اور الوہیت کو بیان کیا ہے وہاں عالم کے تصرفات کائنات جنسی نوعی اور شخصی کی تخلیق اور نظام قدرت کی یک رنگی کو پیش کیا ہے اور اس طرح وجودِ الٰہی اور ربوبیت و الوہیت کی یکتائی کو ثابت کیا ہے۔ آیات مذکورۃ الصدر بھی اس طرز استدلال کی حامل ہیں۔

اب یہ امر بھی جان لینا ضروری ہے کہ کائنات امکانی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے (۱) محسوس (۲) نیم محسوس (۳) غیر محسوس۔ آسمان زمین ابر سے پانی کی بارش۔ بارش سے سبزہ اور گلزار کا پیدا ہونا، دریاؤں، نہروں اور ندیوں کا جاری ہونا، زمین پر پہاڑوں کی میخوں کا قائم ہونا، زمین پر انسانوں کی حکمرانی اور عالم تسلط اور زمین کا قابل سکونت ہونا، شور اور شیریں سمندروں کا اتصال اور اتصال کے بعد ایک کا دوسرے سے آمیختہ نہ ہونا۔ گویا دونوں کے درمیان ایک اوٹ ہوجانا، بارش ہونے سے پہلے ٹھنڈی ہواؤں کا چلنا یہ تمام امور محسوس ہیں صحیح حس رکھنے والے ان سے واقف ہیں کسی تدبر و تفکر وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب صحراؤں اور جنگلوں میں مسافر چلتے ہیں اندھیری راتیں ہوتی ہیں، راستہ معلوم نہیں ہوتا، کوئی راہبر واقف وہاں موجود نہیں ہوتا ایسی حالت میں انسان کا ضمیر رہنمائی کرتا ہے اور آدمی منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ یہی حالت دریائی سفر کی ہوتی ہے۔ جب سمندر کی موجوں سے مقابلہ کرتا ہوا جہاز رواں دواں ہوتا ہے۔ رات کی تاریکی، گھٹا کی سیاہی اور تراکم امواج کی ظلمت چھائی ہوتی ہے نہ یہ معلوم ہو کہ جہاز کہاں جارہا ہے کدھر کو رخ ہے نہ اس سے واقفیت کہ منزل مقصود کتنی دور ہے۔ ایسی حالت میں جہاز کے کپتان کا ضمیر خود راہنمائی کرتا ہے وہ کسی خاص سمت کا رخ کرتا ہے اور ساحل مراد پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ غیبی الہام اور مخفی القا نیم محسوس کا درجہ رکھتا ہے ایک وجدان ہوتا ہے جس کا شعور بھی ایک حد تک وجدانی ہوتا ہے

مگر وجہ وجدان نہیں بتائی جاسکتی۔ تفکر کو اس میں اگرچہ کافی دخل نہیں ہوتا، مگر پھر بھی فکر و غور کے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح انسانی اور حیوانی زندگی کو باقی رکھنے کا اسباب اور حیاتِ شخصی و نوعی کا سلسلہ قائم رکھنے کے وسائل کچھ محسوس ہیں کچھ نیم محسوس۔ انسان و حیوان کی زندگی بغیر رزق کے ناممکن ہے اور رزق کچھ تو محسوس ہے۔ مثلاً نباتی و حیوانی غذا کی فراہمی کے سماوی و ارضی ظاہری اسباب کو ہر شخص دیکھتا سنتا پاتا اور جانتا ہے، لیکن کچھ اسباب رزق مخفی بھی ہیں جیسے ہوا و روشنی اور اسی قسم کی دوسری چیزیں ایسی ہیں جن کے بغیر زندگانی ناممکن ہے، لیکن مکان و زبان کو حس دریافت نہیں کرسکتی، شعور نہیں پاسکتا، ظاہری اور باطنی حواس و مشاعر کی رسائی سے ان کی حقیقت خارج ہے ایسی چیزیں نیم محسوس کا درجہ رکھتی ہیں۔ آثار محسوس ہیں پھر بھی اصل شئ تک حس کی رسائی نہیں۔ گویا مکان و زمان ایک محسوس مادی چیز بھی ہے اور غیر محسوس بھی۔ رزق کو فراہم کرنے والے غیبی خدام اور نہ نظر آنے والی مخفی ہستیاں اور کائناتی اندرونی قوتیں سب کے سب نیم محسوس امور ہیں۔ یہی حالت اس وقت ہوتی ہے جب مصائب کی اندھیریاں چھائی ہوتی ہیں۔ طوفانِ حوادث ہر لمحہ حوصلہ فرسا ہوتا ہے۔ کامرانی اور کامیابی کا تو ذکر ہی کیا ہے ایک قدم آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ عقل پیا علم د ارادہ رکھنے والا انسان شکستہ بال و بدحال بن جاتا ہے۔ گرداب بلا میں زندگی کی کشتی پھنس جاتی ہے۔ اس وقت کوئی مخفی قوت دستگیری کرتی ہے۔ طوفانی لہروں کو روکتی ہے، سیل حوادث کو دفع کرتی ہے اور بے قرار انسان کو پھر سکون نصیب ہوجاتا ہے۔ یہ غیبی امداد بھی نیم محسوس کا درجہ رکھتی ہے، اسباب ظاہری منقطع ہوچکے ہیں، کوئی وسیلہ اور ذریعہ پیش نظر نہیں ہوتا کوئی معین و مددگار محسوس نہیں ہوتا، مگر غیبی کار فرمائی اور سرانجام دہی اندرونی طور پر پھر اسباب کا سلسلہ جوڑ دیتی ہے اور دفع اغیر محسوس سبب کو کوئی مخفی طاقت دیکر مضطر بندہ کی مدد پر آمادہ کردیتی ہے۔ یہ مخفی کار فرمائی نہ تو بالکل غیر شعوری ہوتی ہے جس کے اسباب کا تو اصل بالکل سمجھ میں نہ آئے نہ بالکل حسی اور وجدانی ہوتی ہے بلکہ نیم محسوس کا درجہ رکھتی ہے۔ تیسرا حصہ غیر محسوس امور کا ہے۔ موجودہ کائنات کا ظاہری وجود تو ہر شخص جانتا ہے، وجود کی اجمالی بداہت سے تو ہر شخص واقف ہے لیکن آغاز و انجام کی کسی کو خبر نہیں۔ کائناتی سلسلہ کب سے ہے۔ ابتدائی کڑی کہاں سے ہے، کس کے ہاتھ میں اولین کنارہ ہے۔ پھر آخری حلقہ کہاں ہے اور لوٹ کر کس کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ ابتداء و انتہا ایجاد و اعادہ اور حیاتِ اولیٰ و ثانیہ کا مالک کون ہے؟ اس کو سمجھنا شعور احساس توہم اور تخیل کا کام نہیں نہ احساسی احاطہ اس کو گھیر سکتا ہے۔ یہ محض برہانی اور عقلی امور ہیں، جن کو جاننا روشن عقل والوں کا کام ہے۔ اسی طرح وہ تمام امور جن کا ثبوت شواہد و دلائل اور امثال و براہین سے نہیں ہوسکتا سوفسطائی تصور کی انتہائی بلند پروازی بھی وہاں تک نہیں پہنچا سکتی۔ عقلِ افلاطونی اپنی تمام تصویروں کے ساتھ بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ پردۂ عدم میں کیا ہے۔ آئینۂ استقبال کے پس پشت کون تصویریں ہیں۔ سماوی اور ارضی پردہ داریاں اپنے اندر کیا اعجوبہ نمائیاں رکھتی ہیں۔ ان کو سوا علام الغیوب کے کون جانے، خلاقِ مطلق کے علاوہ کس کو ان کا علم ہوسکتا ہے۔ پھر حشر کائناتی کب ہوگا، استقبال سے خارج زمانہ کب آئے گا جس کی ہر کڑی ماضی و مضارع کے تو اصلی سلسلہ سے باہر ہے۔ اس کو جاننے والا بھی سوا رب علی الاطلاق کے کون ہے۔

پس کائنات کی یہ سہ گانہ رنگ ریزیاں بتا رہی ہیں کہ کوئی رنگین ادا رنگ ریز عقل انسانی سے بالاتر کسی پردہ میں چھپا ہوا رنگ پاشیاں کررہا ہے کسی مخفی نقاش کی یہ تمام نقش آفرینیاں ہیں اور کسی لم یزل ولا یزال کی سرمدی قدرت کی یہ اعجوبہ کاریاں ہیں۔ آسمان ہو یا زمین سمندر اور دریا ہوں یا سنگی پہاڑ اور آبی بادل فرش زمین سے چپیاں رہنے والا سبزہ ہو یا تناور ثمردار سایہ دار درخت سب اس کی الوہیت کو بتا رہے ہیں۔ بری اور بحری تاریکیوں میں راہ بتانے والا مصیبت زدہ مضطر الحال شکستہ بال کی دست گیری کرنے والا عالم الغیب والشہادۃ، خالق الارض والسموات، صاحب الخلق والامر، مالک الملک والملکوت، مبدئ و معید وہی ایک اللہ ہے اسی نے سب کو بنایا، وہی سب کو اپنی طرف بلاتا ہے، وہی دوبارہ پیدا کرے گا، وہی اصل مرکز ہے، اسی کے ہاتھ میں کائنات کی ابتدائی و انتہائی کڑیاں ہیں۔ تعالی اللہ عما یشرکون۔

آیات مذکورہ میں کائنات کے سہ گانہ اقسام کو پیش کرکے اللہ نے اپنی الوہیت و وحدانیت پر استدلال کیا ہے اور ناقابلِ تردید مضمون کو مختصر ترین بلیغ عبارت میں ادا فرمایا ہے۔

تحلیلِ اجزاء

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اوپر بیان کیا تھا کہ اللہ بہتر ہے یا وہ ہستیاں جن کو خدا کا شریک سمجھا جاتا ہے، یعنی اللہ قادر و توانا ہے، اس کو استحقاقِ الوہیت حاصل ہے یا بے کس و بے بس فرضی معبودوں کو جو نفع کے مالک ہیں نہ نقصان کے۔ یہاں سے اپنی ربوبیت تامہ، خلاقیت کاملہ اور رحمت کاملہ کو بیان کرکے وحدت الوہیت کا اثبات فرماتا ہے۔ اتنے بڑے آسمان جن کے احوال و اسرار خواص و اغراض، بلندی و وسعت اور عجائب و غرائب کو مفصل جاننے سے کل عالم کی عقل عاجز ہے کس نے بنائے؟ زمین کے اندر کس قدر عجائب، آفرینش حیرت انگیز خزائن موجود ہیں، کیسی قوتیں اور مخفی فوائد چھپے ہوئے ہیں کہ جس قدر

جاننے کی کوشش کی جاتی ہے اتنے ہی اسرار قدرت کے انکشاف میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ آسمان و زمین ہمیشہ سے تو نہ تھے پھر ان کا موجد کون ہے؟

وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً الخ۔ کیسی عبرت آفریں حکمت ہے کہ تمام سمندر، دریا، نہریں اور کھاڑیاں تو زمین پر یا زمین کے آس پاس یا زمین کے اندر ہیں، لیکن عمل تبخیر کے ذریعہ سے پانی اوپر سے برستا ہے جس سے سرسبز اور شاداب چمنستان پیدا ہوتے ہیں۔ اگر بارش نہ ہوتی تو نباتات کی روئیدگی اور زندگی ناممکن تھی۔ اتنے قیمتی اسباب کو پیدا کرنا اور فراہم کرکے درخت و سبزہ کو اگانا اللہ کی قدرت کے سوا دوسرے کی قدرت سے خارج ہے۔ یہ برہان الوہیت اس قدر واضح ہے جس کا انکار معاند کفار اور سرکش مادہ پرست بھی نہیں کر سکتے، لیکن حق سے روگردانی کا بُرا ہو دیدہ و دانستہ حق سے عدول کافروں کا شعار ہے۔

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا الخ۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ زمین کو پانی کے وسط میں کس نے قرار سے رکھا۔ زمین میں دوری حرکت ہو یا نہ ہو، مگر اضطراب نہیں۔ پانی، لہریں اور تبخیر زمین میں اضطراب پیدا کرنے سے قاصر ہیں پھر کردی بنانے کے باوجود زمین کی ویسی پیدائش اور ساخت ایسی کی کہ قابل سکونت ہو سکے۔ زندہ اجسام اس پر رہ سکیں۔ پھر اگر کامل طور پر یبوست ہوتی اور زمین اپنی اصلی طبیعت پر قائم رہتی تو انتہائی خشکی کی وجہ سے کوئی چیز اس پر زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ زمین کی خشکی کو دور کرنے اور اعتدالی کیفیت پیدا کرنے کے لئے کہیں کہیں دریا اور نہریں جاری فرمائیں اور زمین کو سکون رکھنے کے لئے جا بجا پہاڑوں کو میخوں کی طرح قائم کیا۔ پھر یہ بات مزید غور طلب ہے کہ پانی بالطبع سیّال ہے، مگر اس کے باوجود شور و شیریں سمندر باہم مخلوط نہیں ہوتے۔ دونوں کی سطح برابر ہے۔ متصل بھی ہیں، لیکن دونوں میں ایک پردہ ہے جو مخلوط نہیں ہونے دیتا اور دونوں سمندروں کی طاقت کا ایسا فطری توازن ہے جو ایک دوسرے کی طرف نہیں کھنچنے دیتا۔ یہ تمام مشاہدات اللہ کی الوہیت کو ثابت کرتے ہیں، مگر سمجھنے والے دماغوں کی ضرورت ہے۔ جو لوگ فطری طور پر نور علم سے محروم ہوں یا نور فطرت کو افسردہ کر چکے ہوں ان کی سمجھ میں یہ حقائق نہیں آ سکتے۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ الخ۔ لائق غور ہے یہ امر کہ جب ظاہری اسباب کا سلسلہ منقطع ہو چکتا ہے اور مصیبت کا پہاڑ اپنی پوری ہیبت ناکیوں کے ساتھ سر پر آ پہنچتا ہے اور سیل حوادث سے رہائی کی کوئی شکل نظر نہیں آتی اور تمام مادی طاقتوں کی کار فرمائی ختم ہو جاتی ہے تو مصائب میں گھرا ہوا انسان بے قرار ہو کر غیبی قدرت سے مدد کا طالب ہوتا ہے اور اضطرار کے ساتھ نامعلوم فطرت کے سامنے دست سوال بڑھاتا ہے، اس وقت اس کی مدد کون کرتا ہے اور کون مصیبت کے پہاڑ کو اس کے سر سے ٹالتا ہے۔ پھر دیکھو کہ انسان کو بطور توارث اس زمین کی موجودات پر کس نے حکومت عطا کی؟ عمرو مرتا ہے اس کا بیٹا زید باپ کا جانشین ہوتا ہے اور جس طرح عمرو کائنات ارضی پر حکومت کرتا تھا اور سب کو اپنے زیر حکم رکھتا تھا اسی طرح زید کا بھی عمومی تسلط ہو جاتا ہے یہ طریقہ کس نے جاری کیا۔ ایسی قدرت کس نے عطا کی، انسان کو یہ شرف کس نے بخشا اور توارث نوعی کا یہ سلسلہ کس نے قائم کیا؟ یہ بالکل بدیہی مشاہدہ ہے۔ خاص طور پر غور و فکر کا محتاج نہیں، مگر عبرت اندوز نظر اور نصیحت گیر دانش کی ضرورت ہے اور معاند کافروں میں اس کا فقدان ہے۔

اَمَّنْ یَّهْدِیْكُمْ فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ الخ۔ صحراؤں اور بیابانوں میں مسافر چلتا ہے، راستہ بھول جاتا ہے۔ کالی رات، درختوں کا گھنا سایہ، گھٹ ٹوپ ابر، سیاہی در سیاہی در سیاہی۔ ایسی حالت میں کون اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ الہامی طور پر کون اس کے ضمیر کی توجہ منزل مقصود کی طرف موڑتا ہے۔ جہاز کا کپتان کسی بندرگاہ سے چلتا ہے، جہاز کا لنگر اٹھاتا ہے، پانی کی لہریں تہ بہ تہ ہو کر اوپر چڑھ آتی ہیں، سمندر کے بخارات فضا میں چھا جاتے ہیں، اندھیری رات ہوتی ہے راستہ دکھائی نہیں دیتا ایسی حالت میں قطب نما کے ذریعہ سے یا قلبی القاء کے زیر اثر کپتان بہت زیادہ پس و پیش ایک سمت کو اختیار کر لیتا ہے جہاز کا رخ ادھر ہی کو کر دیتا ہے اور ساحل مراد پر پہنچ جاتا ہے۔ قلب کی یہ آواز، ضمیر کی صدا، ارادہ کا یہ الہام، قطب نما کی یہ ایجاد کس نے کی۔ پھر یہ غور کرو کہ پانی کے برسنے سے پہلے ٹھنڈی ہوائیں کون چلاتا ہے جو بارش کی آمد کی بشارت دیتی ہیں۔ اسباب و مسببات کا یہ سلسلہ کس نے قائم کیا۔ علت و معلول کا اور آثار و مؤثر کا یہ رابطہ کس نے بنایا؟ کیا ستاروں کی یہ قدرت ہے، کیا اجرام فلکی اس کی حقیقی علت ہیں، کیا طبیعت کو مؤثر قرار دیا جا سکتا ہے؟ قطعاً نہیں۔

اَمَّنْ یَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ۔ غور کرو کہ آغاز و انجام کی یہ کڑیاں کس کے دست قدرت میں ہیں۔ جب کچھ نہ تھا اس وقت یہ کائنات کی تخلیق کس نے کی؟ مادہ اور مادیات کی پرستش کرنے والو بتاؤ کہ ایجاد مادہ کس نے کی۔ یہ مخلوق اپنی شخصی اور نوعی زندگی میں قدیم بالذات نہیں ہے اور وجود ملین ذات ہے معلوم ہوا کہ قدیم بالوجود نہیں ہے تو بتاؤ اس حادث الوجود کا اولین وجود کس نے بنایا۔ پھر ان فنا شدہ اشکال و صور کا اعادہ کون کرے گا جن کو کافر معدوم محض سمجھتے ہیں۔ درخت خشک ہوتا ہے پھر پھوٹتا ہے، سبزہ جل جاتا ہے پھر لہلہاتا ہے، تخریب تعمیر کا پیش خیمہ ہے۔ سنگ بنیاد پھر بھی قائم ہے اسی طرح انسان کی ابتدائی تخلیق اور مدت حیات پوری ہونے کے بعد موت کا ورود اور پھر قیامت کے دن حیات ثانیہ کوئی محال امر نہیں۔ اب بتاؤ کہ یہ ایجاد و اعادہ اور آغاز و انجام کی کڑیاں کس کے ہاتھوں میں ہیں اور فقط اسی نے

کہ تخلیق میں ہی فیاض کی احتیاج ہو اور پیدائش کے بعد کائنات اس سے مستغنی ہو جائے بلکہ تربیت اور بقاء بھی اسی کے قبضہ میں ہے۔ شخصی زندگانی قائم رکھنے کے لئے سماوی اور ارضی کار فرمائی اور ظاہری و باطنی اسباب کو فراہم کر کے کائنات کی ہر قوت سے رزق باری یہ سب کچھ اسی کے دست کرم کی عطا ہے۔ اگر یہ ورنگا سعادے ہمتا کے علاوہ کسی اور میں یہ قدرت ہو، آغاز و انجام کا کوئی مالک ہو، ایجاد و ابقاء پر قادر ہو اسباب رزق پیدا کر سکتا ہو تو بیان کرو۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ الخ ایجاد و ابقاء پر قدرت بغیر علم کے نہیں ہو سکتی اور کائنات کے پردوں کے اندر بکثرت ایسے حقائق مخفی ہیں۔ جہاں تک انسانی تصور کی رسائی بھی ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ استقبال کن اعجوبہ نمائیوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اور ماضی نے کس قدر حیرت بار واقعات کو اپنی آغوش میں چھپا لیا ہے اس کو کون جان سکتا ہے، کس کا ایسا ہمہ گیر علم ہو سکتا ہے، کون ایسا احساس و شعور رکھتا ہے۔ بس عالم الغیب وہی ایک اللہ ہے۔

بلکہ اس سے بھی ذرا آگے چلئے یہ کون بتا سکتا ہے کہ حشر کب ہو گا، وہ وقت کب آئے گا جو دائرۂ اوقات سے خارج ہے۔ ماضی اور حال و استقبال کے حدود سے بالا و الا زمانہ کب آئے گا۔ یہاں علم کی آخری کڑی بھی ٹوٹ جاتی ہے اور انتہائی کوشش کے بعد بھی جس چیز کا علم نہیں ہو سکتا۔ کافر دنیا اس چیز کے وجود میں ہی شک کرنے لگتی ہے حالانکہ یہ اندھا پن بے بصیرتی اور کوتاہ بصری ہے۔ علم و نظر کی نارسائی سے کسی چیز کے وجود میں شک کرنے لگنا سخت حماقت ہے۔

وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ۔ یعنی قیامت کا تعیینی علم سوا خدا کے کسی کو نہیں۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور جلیل القدر فرشتوں کو بھی صرف علامات اور آثار کا علم تھا۔ آیت میں صاف صراحت ہے۔ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً۔ مسلم کی روایت میں مذکور ہے کہ حضرت جبرئیل نے حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کا وقت پوچھا تو سرکار عالی نے فرمایا جس سے پوچھا جا رہا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ۔ اس آیت کا مطلب چند طور سے بیان کیا گیا ہے

پہلا مطلب یہ ہے کہ باوجودیکہ روز قیامت کے متعلق ان کا علم بالکل کامل ہے، مگر یہ بھی شک میں پڑے ہیں۔ قتادہ نے کہا ان کا علم آخرت میں نافذ نہیں۔

بقول عطاء ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آخرت میں ان کا علم ختم ہو جائے گا۔ جہاں ندامت مفید نہ ہوگی۔ سدی وغیرہ کا بھی یہی قول ہے۔

- بروایت علی بن ابی طلحہ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ آخرت میں اُن کا علم غائب ہو جائے گا۔

میرے نزدیک آیت کی ترتیب اور سیاق کا لحاظ رکھتے ہوئے اس طرح ہے کہ آخرت کے متعلق کفار کا علم فنا ہو گیا۔ یعنی کافروں کے علم کی رسائی سے روز قیامت خارج ہے۔ ان کو قیامت کا یقین نہیں بلکہ شک میں پڑے ہیں علم تصدیقی حاصل نہیں۔

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا بَلْ هُمْ مِّنْهَا عَمُوْنَ۔ بلکہ شک بھی کیا بلکہ بالکل بے بصیرت ہیں۔ قیامت کی طرف سے بالکل اندھے ہیں۔ ان میں جاننے کی صلاحیت ہی نہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ آخرت میں کافروں کی چار حالتوں کا بیان کیا گیا ہے۔ اوّل تو ان کی بے شعوری کو بیان فرمایا کہ ان کو قیامت کا وقت معلوم نہیں۔ پھر فرمایا وقوع قیامت کے قائل ہی نہیں۔ تعیین وقت وغیرہ تو علیحدہ چیز ہے۔ ان کا علم سلسلۂ مبحث قیامت پر پہونچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ پھر فرمایا ان کو قیامت کے متعلق شک ہے جس کو زائل نہیں کرتے آخر میں فرمایا وہ نابینا ہیں، قیامت کی طرف سے ان کی عقلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور ان کی چشم بصیرت بند ہے۔

مقصود بیان محسوس ہم محسوس اور غیر محسوس اشیاء کو پیش کر کے الوہیت، ربوبیت اور وحدانیت کا ثبوت اور اللہ کے ان اوصاف کا بیان جس سے اس کی ربوبیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ تخلیق کائنات، بارش کا نزول، باغوں کی پیدائش اور سرسبزی، بے قرار کی دعا قبول فرما کر مصیبت کو دفع کرنا، تاریکیوں میں راستہ بتانا اور رہنمائی کے اسباب کو پیدا کرنا، بارش سے پہلے ٹھنڈی ہوا چلانا، رزق دینا، فیض یہ اور اسی قسم کے دوسرے کام اللہ کے لئے مخصوص ہیں کسی دوسرے کو ان کی سرانجام دہی میں دخل نہیں۔ پس گمراہ ہیں وہ لوگ جو کسی ولی، نبی، اوتار، دیوتا وغیرہ کو مختار کائنات یا متصرف فی العالم سمجھتے ہیں۔ یا اس دنیا کی کنجی اللہ کے علاوہ کسی اور کے ہاتھ میں جانتے ہیں۔ آخری آیت بتا رہی ہے کہ علم غیب اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ نہ کسی مقرب فرشتے کو نہ جلیل القدر نبی کو۔

علم غیب کی بحث ہم اوپر متعدد مقامات پر مفصل لکھ آئے ہیں۔ مزید اعادہ موجب اطناب و تطویل ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَآؤُنَآ اَئِنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ۝ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَ

کافر کہتے ہیں　کہ جب ہم　اور ہمارے　باپ، دادا　مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم (قبروں سے) نکالے جائیں گے　یہ وعدہ تو ہم سے　اور ہمارے باپ

أَبَآؤُنَا مِن قَبْلُ ۖ إِنْ هَٰذَآ إِلَّآ أَسَٰطِيرُ ٱلْأَوَّلِينَ ○ قُلْ سِيرُوا۟ فِى ٱلْأَرْضِ فَٱنظُرُوا۟

باپ دادوں سے پہلے بھی کیا جا چکا ہے یہ تو صرف اگلوں کے قصے ہیں کہہ دو کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو

كَيْفَ كَانَ عَٰقِبَةُ ٱلْمُجْرِمِينَ ○ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُن فِى ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ○

کہ مجرموں کا انجام کیا ہوا اے نبی تم اُن کا غم نہ کھاؤ اور یہ جو فریب کرتے ہیں اُس سے تنگ نہ ہو

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا ٱلْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ○ قُلْ عَسَىٰٓ أَن يَكُونَ رَدِفَ لَكُم بَعْضُ ٱلَّذِى

یہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو (تو بتا دو) کہہ دو کیا عجب ہے کہ جس کی تم جلدی مچاتے ہو اُس کا کچھ

تَسْتَعْجِلُونَ ○ وَإِنَّ رَبَّكَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى ٱلنَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ ○ وَإِنَّ رَبَّكَ

حصہ قریب آجائے تمہارا رب یقیناً لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے تمہارا رب یقیناً

لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ○ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِى ٱلسَّمَآءِ وَٱلْأَرْضِ إِلَّا فِى كِتَٰبٍ مُّبِينٍ ○

جانتا ہے جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپاتے ہیں اور جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں اور آسمان و زمین میں کوئی چھپی چیز ایسی نہیں جو روشن کتاب میں نہ ہو

تفسیر

انسان مر کر کہاں جاتا ہے، اس کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ کیا معدوم محض ہو جاتا ہے یا اس کا کوئی جُز باقی رہتا ہے۔ اگر کوئی جُز باقی رہتا ہے تو کیا دوبارہ تخلیق اور پھر ترکیب اجزا ممکن ہے یا محال؟ یہ بحث ہمیشہ سے اذہانِ انسانی کا نگاہ بنا رہا ہے۔ روشن دانش رکھنے والوں نے منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں پر خوب خوب بحثیں کی ہیں۔ مثبتین کے دلائل کی بنیاد تین امور پر ہے۔ اوّل یہ کہ آدمی مر کر معدوم محض نہیں ہو جاتا بلکہ اس کا کوئی جز باقی رہتا ہے اور وہ جز ہی تمام اجزا کا ترکیبی مرکز ہے۔ دوسرا یہ کہ اتصال و انفعال تحلیل و ترکیب اور فساد و کون مادہ کے خواص ذاتیہ میں سے ہیں۔ ایک صورت فنا ہوتی ہے، اجزا تحلیل ہو جاتے ہیں، باہم اجزا جدا جدا ہو جاتے ہیں تو کوئی نئی صورت پیدا ہوتی ہے۔ دوبارہ اجزا میں اتصال ہوتا ہے۔ از سرِ نو اجزا کی ترکیب ہوتی ہے۔ یہ قانونِ فطرت عام اور مستمر ہے۔ تیسرا یہ کہ واجب و ممکن اور قدیم و حادث میں بڑا فرق ہے۔ ایک، اپنی ہستی میں بے نیاز ہے عالمِ کل ہے۔ صاحبِ ارادہ اور مالکِ قدرت ہے۔ محالاتِ واقعیہ کے علاوہ ہر چیز پر قادر ہے۔ دوسرا محتاج اور جاہل ہے۔ پس انسان جب مر کر معدوم محض نہیں ہو جاتا بلکہ آبی خاکی یا ہوائی شکل آجاتی ہے۔ صورتِ ترکیبیہ باطل ہو کر صورتِ عنصریہ پیدا ہو جاتی ہے، لیکن پھر بھی اس کے مادہ میں یہ قابلیت ہے کہ از سرِ نو اجزا کا اتصال ہو جائے۔ دوبارہ اجزا متصل ہو کر صورتِ ترکیبیہ اختیار کر لیں اور پھر جیتا جاگتا انسان بن جائے اور چونکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اس کو ہی ہر چیز کا تفصیلی علم حاصل ہے، اس لئے انسانی بدن کے منتشر اجزا اور ان اجزا کی تبدیل شدہ حالت و کیفیت کو بخوبی وہ جانتا ہے اور ایک خاص وقت میں تمام تبدیل شدہ اجزا کو واپس لا کر از سرِ نو انسانی ساخت درست کر دے گا اور جیتا آدمی بنا دے گا جیسی ہونا ہوگا اس کا نام روزِ قیامت ہے۔ بدن انسانی کے اجزا خواہ خاکی شکل میں ہو گئے ہوں یا ہوائی شکل میں انہوں نے آتشی صورت اختیار کر لی ہو یا آبی۔ بہرحال خدا تعالیٰ ان کو ایک ایک کر کے جمع کر دے گا اور ترکیبی صورت عطا فرما کر دوبارہ زندہ فرمائے گا۔

منکرین قیامت کے انکار کا مدار دو باتوں پر ہے۔ اوّل یہ کہ انسان مر کر مطلق فنا ہو جاتا ہے اس کا کوئی حصہ باقی نہیں رہتا اور معدوم محض کا اعادہ محال ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ کو جزئی جزئی اور ذرہ ذرہ کا تفصیلی علم نہیں اور اجمالی علم فراہمی اجزا کے لئے کافی نہیں۔ جب اللہ کو معلوم ہی نہیں کہ بدنِ انسانی کے پراگندہ اجزا کہاں گئے اور ہر جز کس حالت کس صورت اور کس کیفیت کا حامل ہے تو پھر دوبارہ سب کو جمع کر کے از سرِ نو ترتیب دینا کس طرح ممکن ہے۔ عرب کے کفار بھی قیامت کے منکر تھے۔ ان کو تعجب ہوتا تھا کہ جب انسان مر کر معدوم محض ہو گیا یا معدوم محض نہ بھی ہوا (تو) بدن کے اجزا منتشر و پراگندہ ہو گئے، ترکیبی صورت جاتی رہی اور عنصری شکل پیدا ہو گئی تو

بکھیران کو جمع کرنا اور نئی شکل و وجود پہنانا کیونکر ممکن ہے۔ الہامی شریعتیں ہمیشہ سے قیامت کو ثابت کرتی چلی آئی ہیں اور ہر شریعت کا بنیادی عقیدہ وقوع قیامت کا رہا ہے اور ہر نبی نے اپنی اُمت کو یہی تعلیم دی ہے، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح انکار قیامت کا عقیدہ کائنات انسانی کے ابتدائی درجہ تک پہنچتا ہے اسی طرح انکار قیامت کا عقیدہ بھی آغاز آفرینش کا ہمعصر ہے۔ قیامت کا انکار کرنے والوں کو اپنے انکار کی تائید میں عقلی تعلقات کے علاوہ یہ بات ہاتھ آ گئی کہ باوجود ابتدائے دور نبوت سے برابر ہر آسمانی ریفارمر قیامت سے ڈراتا چلا آیا ہے، لیکن آج تک قیامت کا دن نہیں آیا۔ ماضی پر استقبال کو قیاس کیا جا سکتا ہے اور یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کبھی قیامت نہ ہو گی۔ قرآن نے کافروں کے تمام بے بنیاد شبہات کا حل ان آیات میں کر دیا۔ اللہ کے علم کی ہمہ گیری بتائی، کمالِ قدرت کو ظاہر کیا، مادہ کے کون و فساد کا بیان کیا۔ فنائے عالم کی تصویر کشی کی اور صراحت فرما دی کہ ماضی کو مستقبل پر قیاس کرنا غلطی ہے۔ اگرچہ اب تک قیامت کیوں نہیں آئی، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اللہ صاحبِ فضل ہے وہ اپنے بندوں کو توبہ استغفار اور اصلاح حالت کے مزید مواقع عطا فرمانا چاہتا ہے۔

تحلیلِ اجزاء

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَإِذَا كُنَّا تُرَابًا وَآبَاؤُنَا الخ۔ کفار نے بطور تعجب و انکار کے کہا تھا ہمارے اور ہمارے اسلاف کے تمام اجزاء اپنی ہیئت ترکیبی کو چھوڑ چکے بلکہ صورت نوعیہ بھی زائل ہو چکی اور مٹی کی شکل میں تبدیل ہو گئی تو پھر از سر نو ترکیب اجزاء اور تخلیق صورت اور بعثت جسمانی کس طرح ہو سکتی ہے۔ گویا کفار نے مادہ کی انفعالی اور تحلیل ترکیبی قابلیت کا بھی انکار کیا اور خدا تعالیٰ کی قدرت و علم کو بھی تسلیم نہ کیا اور انکار کی مزید تائید میں عدم وقوع قیامت کو پیش کیا اور ماضی کو مستقبل پر قیاس کر کے کہنے لگے یہ پرانی داستان ہے۔ ہمارے اسلاف سے بھی یوں ہی کہا گیا تھا لیکن اب تک قیامت نہ آئی اور جب اب تک نہ آئی تو آئندہ بھی نہ آئے گی۔ چونکہ کفار کا یہ شبہ اللہ کی قدرت و علم اور مادہ کی قابلیت کے انکار پر مبنی تھا اور امور ثلاثہ کا انکار بدیہی حماقت ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے بجائے جواب دینے کے غرض و غایت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا۔ دنیا میں چل پھر کر کافروں کے انجام بد کو دیکھو یعنی بعثت انبیاء اور وعدۂ قیامت کی اصل غرض یہ ہے کہ لوگ اپنے عقائد و اعمال کی اصلاح کر لیں۔ پس قابل غور ہے ان بستیوں کی حالت جو اس غرض کو نہ سمجھیں اور قیامت کا انکار کر کے برباد ہو گئیں اور اپنے اعمال و افعال کو درست نہ کر سکیں ۔۔۔۔ ان کی بربادی کی تصویر اگر دیکھنی ہو تو بوسیدہ کھنڈروں اور برباد شدہ بستیوں میں دیکھو۔ یہ سب ان کے اعمال کا خمیازہ تھا جس سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ انبیائے مرسلین کی ہدایت حق تھی اور انکار و عناد موجب تباہی ہے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُن فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ۔ کفار عرب خصوصاً مکہ کے رہنے والے بھائی برادر رسول پاکؐ اور جماعت اہل ایمان کو ہر طرح کی تکلیفیں دیتے اور ہر ممکن اذیت پہنچاتے تھے۔ کفار کی ایذا رسانی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دو قسم کی تکلیف پہنچتی تھی۔ ایک تو کافروں کی بد آلی اور بد انجامی کا رنج ہوتا تھا۔ آپ رحمت عالم تھے کافروں کو جہنم کے غار میں گرتے دیکھ کر آپ کو دکھ پہنچتا تھا۔ حضور واقف تھے کہ یہ کل اللہ کی مخلوق ہے اور تیری واقفیت سے ماواقف ہے، ان کی حالت مزید قابل رحم ہے۔ دوسری تکلیف یہ تھی کہ دوستوں عزیزوں اور عام مومنوں پر کفار کی بے پناہ یورش اور ہر وقت کی سخت گیری حوصلہ آزما تھی۔ قدم قدم پر تکلیفوں کے کانٹے بچھے ہوئے تھے اور کل اہل مسلمانوں کے لئے اذیت رساں تھا۔ کفار کی طرف سے ہر مسلمان کے سامنے فریب، مکر اور دھوکہ و موانع کا جال بچھا ہوا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج ہوتا تھا اور ہر وقت دل میں کبیدگی رہتی تھی۔ ان دونوں صدموں سے محفوظ رہنے کی ہدایت آیت بالا میں خدا تعالیٰ نے فرمائی۔ اول فرمایا ان کی فریب کاریوں اور مکر آفرینیوں سے کبیدہ خاطر نہ ہو لیکن ان کی حالت رحم سے آگے بڑھ چکی ہے، اس لئے ان کی بربادی کا غم نہ کرنا چاہیے اور خبر دی کہ اپنی ہلاکتی چالوں سے مسلمانوں کو فریب نہ دے سکیں گے اور دین کا بڑھتا ہوا سیلاب ان کی مکاریوں کی ریت سے نہ رک سکے گا، اس لئے ان کی فریب کاریوں سے تنگ نہ ہونا چاہیے۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ الخ۔ کفار کا روز قیامت اور جزا سزا پر یقین نہ تھا۔ ان کو حشر کی وعید توہم اور بے بنا تخیل سے زیادہ نہ تھی، اس لئے وہ بطور استہزاء یا بطریق استفہام کہتے تھے کہ اچھا ہاں اگر قیامت آنے والی ہے تو کب آئے گی ہزاروں برس ہو گئے اب تک نہ آئی پھر اب آئے گی۔ گویا وہ فوری طور پر نزول عذاب کے خواستگار تھے چونکہ آخرت کا ہر وعدہ وعید ان کی نظر میں ہیچ تھا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

قُلْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ رَدِفَ لَكُم الخ۔ جس عذاب کی تم کو شدت طلب ہے ہو سکتا ہے کہ وہ قریب ہی آ لگا ہو جس طرح ایک گھوڑے پر اگلے سوار کے پیچھے لگا ہوا دوسرا سوار بیٹھا ہوتا ہے اسی طرح عذاب الٰہی بھی متصل ہے۔ علماء نے صراحت کی ہے کہ جس عذاب کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے وہ عام کافروں

کے لئے تو موت کے بعد ہی شروع ہو جاتا ہے اور ان کافروں کے لئے جو جنگ میں برسرِ پیکار تھے علاوہ عذاب بعد الموت کے قتل ہونا بھی ایک عذاب تھا۔ ابن عباس، مجاہد، ضحاک، عطاء خراسانی، قتادہ اور سدی سے یہی مطلب مروی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص مرا اس کی قیامت قائم ہو گئی۔

بات یہ ہے کہ مرنے کے بعد جو زندگی ہو گی اس کی کوئی حد نہیں، اس لئے موجودہ زندگی کتنی ہی طویل ہو، حیات بعد الموت کے مقابلے میں قلیل ترین ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ قیامت اب پیچھے ہی آ گئی ہے زیادہ دیر نہیں۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ۔ زندگی کی مدت میں کمی بیشی ناممکن ہے جتنی جس کو عطا کر دی گئی اس میں تغیر نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ برکت و بے برکتی کا فرق ضرور ہو جاتا ہے، لیکن ایامِ حیات ناقابلِ تبدیل ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ نیکو کار اہلِ ایمان کی نیکیاں بڑھ جائیں اور ان کے اجر میں اضافہ ہو جائے اور کافر دنیوی زندگی کی آڑ میں عذاب بعد الموت سے کچھ زمانہ کے لئے بچے رہیں گویا یہ دنیوی زندگانی مومن و کافر دونوں کے لئے اللہ کی نعمت ہے، لیکن کوتاہ نظر انسان اس حقیقت کو نہیں سمجھتا اور تاخیرِ عذاب کو استحالۂ عذاب پر محمول کرتا ہے اور بڑھ بڑھ کر فوری عذاب کا طلب گار ہوتا ہے کیونکہ اس کی نظر میں عذاب کا وقوع محال ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے فوری گرفت نہ ہونے کی حکمت آیت مذکورہ میں بیان فرما دی کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ کفر و عصیان کے باوجود مقررہ رشتۂ حیات منقطع نہیں ہوتا اور فوراً عذاب نہیں نازل ہوتا۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ۔ کفر و عصیان پر فوری گرفت نہ ہونے کے متعلق یہ احتمال ہو سکتا تھا کہ شاید خدا تعالیٰ کو کافروں کی ظاہری کفر کرنے کا علم نہیں۔ اسی وجہ سے وہ فوراً عذاب نازل نہیں کرتا۔ چونکہ یہ احتمال غلطی پر مبنی تھا، اس لئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو ان کے ظاہر و باطن کا علم یقینی ہے۔ اندرونی و بیرونی حالات سے وہ بے خبر نہیں ہے بلکہ اس کے پیشِ نظر دلوں کی اندرونی کیفیات اور اعضائے جسمانی کے ظاہری افعال ہیں اشیاء کے وجود ذہنی اور وجود خارجی دونوں سے واقف ہے اور فقط یہی نہیں کہ اس کو موجودات ہی کا علم ہو بلکہ:۔

وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔ ہر وہ چیز جس کا وجود کائنات سماوی و ارضی و فضائی میں غائب ہو، مگر ظاہر نہ ہو کسی کو معلوم نہ ہو یا اس طور سے ہو کہ ابھی درجۂ تقرر میں ہو وجود کا جامہ نہ پہنا ہو آئندہ موجود ہونے والی ہو۔ دونوں قسم کی چیزوں کا علم اللہ کو ہے اور یہ علم استحضاری ہے۔ ہر وقت اس کی علمی کتاب میں حاضر ہے۔

کتابِ مبین کی تحقیق

کتاب مبین سے لوح محفوظ مراد ہے۔ یہ تمام علماء کے نزدیک مسلّم ہے، لیکن کتاب مبین یا لوح محفوظ کیا چیز ہے، کوئی مادی شئی ہے یا نہیں اس کی کیا کیفیت ہے، کیا حیثیت ہے، کہاں ہے، کس طور پر ہے، یہ تمام امور بحث طلب ہیں، علمائے متقدمین و متاخرین کا اختلاف اس کے متعلق بہت طویل الذیل ہے، مختلف اقوال نقل کرنے موجب طوالت ہیں۔

میرے نزدیک تحقیق یہ ہے کہ لوح محفوظ یا کتاب مبین سے اللہ کے علم کی طرف اشارہ ہے۔ لوح محفوظ نہ کوئی مادی تختی ہے نہ تانبے پیتل یا اور کسی مادی چیز کا پترہ ہے۔ نہ کوئی واقعی حادث اور ممکن چیز ہے۔ کیونکہ یہ بات اہلِ تحقیق کے نزدیک تسلیم شدہ ہے کہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی کوئی چیز مٹ نہیں سکتی نہ اس میں کسی طرح کا تغیر و تبدل ممکن ہے جو کچھ اس میں لکھا ہے وہ ازلی ابدی ہے، سرمدی ہے، ناقابلِ زوال اور مستحیل الفنا ہے اور چونکہ ہر ممکن قابلِ زوال اور حادث ہے، اس لئے کسی حادث کو ملزوم واجب کا حامل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اگر لوح محفوظ کوئی واقعی تختی ہے تو ظاہر ہے کہ ممکن ہو گی اور اس پر تمام علوم قدیمہ واجبہ ثبت ہوں گے اور ممکن کا حامل واجب ہونا محال ہے اس لئے لوح محفوظ کا کوئی ممکن و حادث چیز ہونا محال ہے۔ بس حق یہ ہے کہ لوح کنایہ ہے اللہ کے علم ازلی و ابدی سے اس اندازۂ سرمدی سے جو کسی چیز کے وجود بالفعل پر موقوف نہیں بلکہ ہر ممکن الوقوع چیز کی ہر کیفیت اور ہر حالت کا اندراج اس میں پہلے سے ہے اور جس طرح علم الٰہی کا مسئلہ علماء و عقلاء کے نزدیک معرکۃ الآراء رہا ہے اور آج تک پردہ خفا میں ہے، اس کی کیفیت، ہیئت حالت اور واقعی صورت کا کسی کو پتہ نہیں اجمالی اور تفصیلی کا فرق ہے پھر تفصیل و اجمال کی کیا کیفیت ہے۔ علم بالصورت ہے یا نہیں۔ بہر حال علم الٰہی کے متعلق آج تک کوئی صحیح فیصلہ نہ ہو سکا کہ کیسا اور کیا ہے اسی طرح لوح محفوظ کی مفصل کیفیت بھی ظاہر نہیں کی جا سکتی نہ کسی ممکن میں یہ طاقت ہے کہ واجب کے تمام حالات کا احاطہ کر سکے اور ان کو جان لے۔ بالاجمال اتنا کہا جا سکتا ہے کہ علم الٰہی کی وہ ناقابل حدوث اور مستحیل الامکان فہرست جس میں تمام اشیاء کی ہر کیفیت قبل الحدوث وجود ہے وہی لوح محفوظ اور کتاب مبین ہے واللہ اعلم۔

اصل مسئلہ تھا

چونکہ کفار کو وجودِ قیامت میں شبہ تھا اور استحالۂ قیامت کے ثبوت میں وہ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ مرنے کے بعد انسانی بدن کے اجزاء منتشر ہو جاتے ہیں، ترکیب بالکل ٹوٹ جاتی ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اجزائے انسانی عناصر بسیطہ کی حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ پھر ایسی حالت میں

ان اجزائے پریشان کے مکان اور کیفیت کا کس کو علم ہو سکتا ہے اور کس طرح ممکن ہے کہ بغیر علم کے ان کو جمع کیا جا سکے۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے موخر الذکر دونوں آیتوں کو نازل فرمایا جن کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کو علم ہمہ گیر ہے۔ جواہر تو بجائے خود رہے اعراض بھی اس کے علم سے باہر نہیں متعلق خطرات، دماغی تصورات اور ذہنی وجود کا بھی اس کو علم ہے بغیر اختیار کے وجود سے قبل جب اُن کی ہستی مرتبہ تقدیر و تقرر میں ہوتی ہے بلکہ زمانہ و دانیات کے وجود سے بھی پہلے اللہ کو ہر چیز کا علم تھا اور ہے پس کوئی وجہ نہیں کہ وجودی ظہور کے بعد فنا کے علم سے کوئی چیز غائب ہو سکے خواہ کسی شکل میں ہو۔ بسیط ہو یا مرکب، آسمان میں ہو یا زمین میں، سب کا علم اس کو ہے، اس لئے وجود قیامت اور حشر نشر کو ناممکن نہیں کہا جا سکتا اور نہ تاخیر عذاب کی علت عدم علم کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

مقصود بیان وقوع قیامت کے متعلق کفار کے شبہات کا بیان اور ان کے شبہات کا ازالہ۔ انکار قیامت کرنے والوں کو تنبیہ۔ کافروں کی دسیسہ کاریوں اور اذیت رسانیوں سے تنگ دل نہ ہونے اور صابر رہنے کی ہدایت۔ کافروں کی زبون حالی اور خستہ مآلی پر غم کرنے کی ممانعت اس سے مترشح ہوتا ہے کہ اسلام دنیا میں غیار رشتۂ اتحاد قائم کرنے آیا ہے۔ اگر اعزا اقارب اور دوست احباب کافر ہوں تو مسلمان کا ان سے کوئی رشتہ ہمدردی باقی نہیں۔ ان کی تباہی پر مسلمان کو کوئی رنج کرنے کی اجازت ہے، مگر یاد رکھو کہ ہمدردی نہ کرنے کی تعلیم صرف ذہنی امور میں ہے اور کفر کی وجہ سے جو تباہی آئے صرف اس پر افسوس نہ کرنے کی ہدایت ہے ورنہ اسلام نسبی اور رحمی تعلقات کو منقطع کرنے نہیں آیا۔ دنیوی سلوک کی ہدایت کرتا ہے اور جہاں تک اسلام کا ضرر نہ ہو کافر اقارب سے حسن سلوک کرنے کا حامی ہے۔ آیت عَسٰٓی اَنْ یَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ اشارہ کر رہی ہے کہ قیامت قریب ہی ہے بالکل پیچھے آ لگی ہے۔ اس کے بعد کی آیت دلالت کر رہی ہے کہ مسلمان ہو یا کافر دونوں کی زندگی دونوں کے لئے بزرگ ترین نعمت ہے کیونکہ ایک کی زندگی سے نیکیوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے دوسرا عذاب بعد الموت سے کچھ دنوں کے لئے بچا رہتا ہے۔ آیت وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ بتا رہی ہے کہ خدا تعالیٰ جواہر و اعراض موجود و معدوم سب سے واقف ہے۔ اس کے علم تفصیلی سے کوئی چیز خارج نہیں۔ ہر چیز کو اس کے تقرر کے درجہ میں بھی وہ جانتا ہے۔ وجود خارجی اور وجود ذہنی دونوں اس کے لئے برابر ہیں وغیرہ۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَقُصُّ عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَكْثَرَ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ○ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّ

بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل کے سامنے اکثر اُن چیزوں کو بیان کرتا ہے جن میں وہ اختلاف کرنے لگے اور بلاشبہ وہ ایمانداروں کے

رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ○ اِنَّ رَبَّكَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ ○ فَتَوَكَّلْ عَلَى

لئے ہدایت و رحمت ہے تمہارا رب قطعاً اپنے حکم سے ان کا باہمی فیصلہ کر دے گا وہ غالب و دانا ہے تم اللہ پر بھروسہ

اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِیْنِ ○ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ ○

رکھو تم بلاشک صریح حق پر ہو تم مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ بہروں کو آواز سُنا سکتے ہو جب وہ پیٹھ پھیر کر چلے جائیں

وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِی الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ وَاِذَا وَقَعَ

اور نہ تم اندھوں کو اُن کی گمراہی سے روک سکتے ہو تم صرف انہی لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اطاعت گزار ہیں اور جب ان

الْقَوْلُ عَلَیْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ ۙ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ ۠ ع

(کافروں) پر وعدہ آپڑے گا تو ہم زمین سے ایک جانور برآمد کر دیں گے جو اُن سے کلام کرے گا کہ فلاں اشخاص ہماری آیتوں پر یقین نہیں رکھتے

تفسیر دنیا میں دو طرح کے آدمی ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جس کے پاس کوئی مذہبی علمی ذخیرہ نہیں ہے، نہ اس کا مذہب الہامی ہے نہ اس کو الہامی کتاب کے حامل نے

کا دعویٰ ہے۔ وہ جن قوانین پر چل رہا ہے ان کی سند ان کے پاس نہیں نہ کوئی پیغمبر ان قواعد کو لے کر آیا بلکہ دستورِ زندگی خود رو خود ساختہ اور دماغی زائیدہ ہے جس عقیدے و عمل کا رواج پڑ گیا اسی پر اب کار بند نظر آنے لگے اور رسمِ اسلاف کو دین و ملت سمجھنے لگے۔ یہ گروہ حق سے اندھا، صداقت کا کلام سننے سے بہرا اور حقیقت حقانیت کو سمجھنے سے بے بہرہ ہے۔ اس کے حواس اور دل مُردہ اور روحیں افسردہ ہیں۔ اس گروہ میں بہت سے لوگ مادر زاد نابینا ہیں جن کو حق کی کوئی روشنی ہدایت نہیں راہِ راست نہیں دکھا سکتی، کوئی طرزِ صداقت ان کو سنائی نہیں دے سکتی۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو الہامی آسمانی مذہب کے حامل ہونے کا مدعی ہے۔ دنیا اس کے دستور العمل کو سرچشمہ جانتی ہے۔ وہ بھی اپنے مقابلے میں دوسروں کو جاہل جانتا ہے اور واقعتہً بھی اس کے پاس مذہبی، تاریخی علمی ذخیرہ ہے۔ یہ گروہ علماء عقلاء اور حاملانِ صداقت کا کہلاتا ہے اور اس کے علمی ذخیرے کے ہر حرف ہر نقطہ کو بھی لوگ جوہرِ آب دار سمجھتے ہیں، لیکن یہ امر قابلِ فراموشی نہیں کہ علوم و معارف کے مدعی جو علمی اور تاریخی ذخیرہ اپنے پاس رکھتے ہیں وہ سب کے سب صحیح ہی نہیں ہوتے۔ ان کی مدتِ زندگی چونکہ طویل ہوتی ہے اور گوناگوں انقلاب ان پر آ چکے ہیں، اس لئے ان کی مذہبی کتابیں بھی کچھ سے کچھ ہو جاتی ہیں۔ الہامی تصریحات اور آسمانی منصوصات میں رد و بدل ہوتے ہوتے یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ بیشتر علمی ذخیرہ پایۂ ثبوت سے گر جاتا ہے اور علم و عمل کی ساری صداقت حوادث کی تاریکی میں گم ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت میں ان میں پھوٹ پڑ جاتی ہے۔ ہر محقق اپنی تنقیح کو آسمانی تصریح سمجھتا ہے اور ہر عالم کے پیرو اپنا ایک گروہ بنا لیتے ہیں اور دوسرے تمام گروہوں کو غلطی کا حامل قرار دیتے ہیں۔ اس طرح ایک آسمانی مذہب چند فرقوں میں بٹ جاتا ہے۔ کسی فرقہ کی کوئی بات حق ہوتی ہے اور کسی کی کوئی۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مباحث میں تمام فرقوں کے کل اقوال غلط ہوتے ہیں اور حق سب کی نظر سے گم ہوتا ہے۔ اب اگر آئندہ کوئی محقق پیدا ہو اور ان کے باہمی تفرقوں اور ژولیدہ بیانوں میں سے حق کو چھانٹنا ہے اور جس بحث میں سب نے غلطی کی ہے اس کی وضاحت کرنی چاہے اور سب سے الگ امر کو ثابت کرنا چاہے تو اس کے لئے دو باتیں لازم ہیں۔ اوّل یہ کہ تمام فرقوں کی کل مذہبی کتابیں پڑھے، سب کے اقوال اور اختلافات کو جانے اور سمجھے اور اس کے پاس الہامی کتاب کا بھی کوئی نسخہ موجود ہو تاکہ اقوالِ علماء اور تحریف شدہ متنوں کے ملفوظات اصل نسخہ سے مطابق کر کے دیکھے۔ جو قول مخالف ہو اس کو رد کر دے اور جو تصریحِ آسمانی کے موافق ہو اس کو برحق قرار دے۔ دوسرے یہ کہ جہاں سب کے اقوال غلط ہوں وہاں علمی تاریخی تنقیح کرنے کا اس کو ملکہ بھی ہو تاکہ صحیح ماخذ سے صحیح نتیجہ اخذ کر سکے۔ اور تنقیحی ملکہ کا پیدا ہونا کثرتِ ممارست اور وسعتِ مطالعہ پر موقوف ہے جس شخص کا مطالعہ ہمہ گیر نہ ہو گا اس کے اندر تنقیحی ملکہ کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔

اگر مذکورۂ بالا دونوں امور یا دونوں میں سے ایک امر نہ ہو تو کوئی محقق صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا۔

ظہورِ اسلام کے وقت عرب میں دونوں قسم کے لوگ تھے۔ ایک گروہ تو بالکل ہی بے پڑھا لکھا جاہل تھا۔ یہ گروہ عموماً بُت پرستوں کا تھا اس کے پاس کوئی مذہبی کتاب نہ تھی نہ کوئی آسمانی الہامی ذخیرہ تھا۔ اسلاف کا رسم و رواج ہی اس کا دستورِ زندگی تھا۔ اسی گروہ میں سے رسول پاک مصداق لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ دوسرا گروہ علم مذہبی اور مذہبی کتابوں کا حامل تھا۔ اس گروہ کو علوم کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔ یہی اہلِ کتاب کا گروہ کہلاتا تھا جس میں سے کچھ لوگ عیسائی تھے اور کچھ یہودی، لیکن کثرتِ انقلابات اور امتدادِ زمانہ اور علماء کی ہوس پرستی کی وجہ سے ان کے علماء متفرق ہو گئے تھے۔ بہت جگہ الفاظ اور عبارتوں کا رد و بدل ہو گیا تھا۔ بیشی اور کمی اور حذف و ازدیاد سے تو شاید کوئی بحث اور کوئی حکم خالی نہ رہا تھا۔ اسی اختلافِ خواہشات، انقلابِ دہر اور امتدادِ زمانہ کی وجہ سے ان کے علماء متفرق ہو گئے تھے۔ ہر عالم نے اپنا ایک گروہ بنا لیا تھا اور ہر امام اپنی ہی حقانیت کا دعویدار تھا۔ یہ اختلاف و انشقاق صرف فقہی مسائل اور فرعی مباحث پر ہی محصور نہ تھا بلکہ تاریخی حقائق اور اصول عقائد و اعمال میں باہم اختلاف ہو گیا تھا۔

مذکورۂ بالا دونوں گروہوں کی اصلاح ضروری تھی۔ بے پڑھے لکھے گروہ کو جس طرح راہِ حق دکھانی لازم تھی اسی طرح بنی اسرائیل کے لئے بھی ایک شمعِ ہدایت کی ضرورت تھی تاکہ ان کے باہمی اختلافات مٹ جائیں۔ حق بات سب کو معلوم ہو جائے اور آسمانی تصریحات پر متفق ہو جائیں۔ چنانچہ قرآن نے دونوں باتوں کی تکمیل کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس گروہ میں پیدا ہوئے تھے جو عموماً پڑھا لکھا نہ تھا بلکہ پڑھنے لکھنے کو باعثِ عار جانتا تھا۔ آپ کا اختلاط علماءِ اہلِ کتاب سے بھی نہ تھا لیکن جو کتاب آپ نے پیش کی وہ تاریخی واقعات اور عقائدی اصطلاحات میں عدیم النظیر تھی۔ بنی اسرائیل میں جن امور کے متعلق باہمی اختلافات تھے ان کا فیصلہ قرآن نے صراحت اور حق کے ساتھ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسا ناطق فیصلہ جبھی ممکن تھا اور وہ ہی کر سکتا تھا جو اسرائیلیوں کے کل اختلافات سے واقف اور پھر اصل حق پر مطلع ہو۔ مگر چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ظاہری اسباب کے لحاظ سے تعلم و تعلیم، درس و تدریس، اختلاطِ علماء سے بہت دور تھے، اس لئے قرآن نے جو کچھ بیان کیا وہ حضور والا کا دماغی زائیدہ نہیں ہو سکتا بلکہ وحیِ ربانی اور الہامِ آسمانی اس کا اصل منبع ہے۔ وحیِ خداوندی نے ہی ان امور کا فیصلہ کیا جن میں اسرائیلی دنیا معرکۃ الآرا بحثیں کرتی تھی۔ پھر قرآن نے بنی اسرائیل کے اختلافی مباحث پر صداقت کے ساتھ ریمارک کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ تمام دنیا کے لئے خواہ بے پڑھا لکھا طبقہ ہو یا عام تعلیم یافتہ گروہ خود بھی ایک مکمل قانونِ زندگی پیش کیا جو ماننے والوں کے لئے سراسر رحمت اور عین ہدایت ہے۔ اب اگر کوئی شخص آفتابِ نیم روز کے نور سے فائدہ نہ اٹھا سکے تو یہ اس کی آنکھوں کا قصور ہے اور اس کو اندھا کہنا ہی زیبا

ہے یا اگر کوئی شخص ایسی آواز کو سن نہ سکے جو زمین کے گوشہ گوشہ پر پہنچتی ہو تو یہ اس کی گراں گوشی ہے اور ایسے آدمی کو بہرا ہی کہنا مناسب ہے۔ اسی میں نورِ آفتاب اور صدائے حق کا کوئی قصور نہیں اور اگر مردہ دل رکھنے والے کلام حق کو شنوائی نہ کریں تو یہ ان کی مُردہ دلی ہے۔ مردہ دلوں کو کوئی زندہ نہیں کر سکتا، مادرزاد بہروں کو کوئی زندہ نہیں کر سکتا۔ علاوہ از بہروں کو کوئی پکار سنائی نہیں دے سکتی، پیدائشی اندھوں کی آنکھوں میں کسی طرح نور پیدا نہیں ہو سکتا۔ قلب خلقت انسان کی قدرت کے خلاف ہے۔ رسول پاک ؐ کا کام ہدایت و رہنمائی ضرور ہے، مگر اندھے کو کوئی راستہ نہیں دکھا سکتا۔ حضور کا فریضہ تبلیغ پیام معرفت تھا، ملکی بہروں کے کان پھاڑ کر کلام کو دلنشین کون بنا سکتا ہے۔

یہ حق و باطل اور ثواب و غلط کا امتیاز تھا اگرچہ اہلِ بصیرت کے نزدیک بالکل ظاہر ہے حق کھلا ہوا ہے، مگر اس پر بھی باطل پرست اپنے کو برسرِ حق جانتے تھے اور مسئلہ کی کٹ حجتی کا انقطاع کسی طور پر ممکن نہیں تھا اس لئے کہ دنیا کے اختتام کا وقت جب آجائے تو غیب سے کوئی ناطق شہادت باطل پرستوں کے انکار و کفر کو ثابت کر دے اور آخری دور میں کوئی قدرتی دستاویز گمراہ گروہ کی باطل پرستی کو واضح کر دے اور اس وقت کافروں کو اپنی ضلالت کا یقین ہو تو ہو ورنہ اس سے پہلے تو ناممکن ہے۔

تحلیلِ اجزاء

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَقُصُّ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بنی اسرائیل کی اصل کتابیں تو ہر قسم کی غلطی اور دروغ بیانی سے پاک تھیں، اس لئے کہ آسمانی اور الہامی تھیں۔ نہ ان میں عقائد کی غلط تعلیم تھی نہ مبدا و معاد کے متعلق جھوٹا بیان نہ خلافِ واقعہ تاریخی امور کا اندراج نہ خلافِ شریعت اعمال و احوال کی تلقین، لیکن حواریین کے زمانے سے تغیر و تبدل شروع ہوا اور اختلافات و خواہشات کی اندھیریوں میں نورِ صداقت چھپ کر رہ گیا۔ کتبِ الٰہیہ کے الفاظ و معانی کو بگاڑ دیا گیا جس کی وجہ سے اصل مطلب فوت ہو گیا۔ اس وقت قرآن پاک نازل ہوا جس نے بندگانِ نفس کی اختراعی تحریفات کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا اور اصل حق روشن ہو گیا۔

ہم مثال کے طور پر مولانا عبدالحق کی تفسیر کے چند حوالجات نقل کرتے ہیں۔ مولانا نے اس جگہ کسی قدر سیر حاصل بحث کی ہے، لیکن تقابل بالقرآن میں زیادہ وضاحت سے کام نہیں لیا۔ ہم واضح طور پر اسرائیلی کتب کی تصریحات کا قرآنی ملفوظات سے مقابلہ کر کے دکھانا چاہتے ہیں اور بعض مباحث کی غلطی و راستی اہلِ بصیرت کی دانش پر چھوڑتے ہیں۔

(۱) اہلِ کتاب نے اللہ کی ذات و صفات کے متعلق بہت غلط عقائد قائم کر رکھے تھے جن کی اصلاح قرآن پاک نے کی۔ مثلاً موجودہ تورات میں ہے کہ خدا نے چھ روز میں زمین و آسمان کو بنایا اور ساتویں روز آرام کیا۔ قرآن پاک نے چھ روز میں آسمان و زمین بنانے کی تو تصدیق کی، لیکن چونکہ خدا تھکنے اور آرام سے بے نیاز ہے، اس لئے فرما دیا وَمَا مَسَّنَا مِن لُّغُوبٍ یعنی آسمان و زمین کو پیدا کرتے میں ہم کو تکان نے چھوا بھی نہیں۔

تورات سفر پیدائش باب اوّل ورس ۲۶ میں ہے:-

"تب خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت اور اپنی مانند بنائیں"

چونکہ خدا کی نہ کوئی شکل و صورت ہے نہ اس کا کوئی مشابہ و مانند ہو سکتا ہے، اس لئے قرآن نے بطور اصلاح فرمایا لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ اس کی مثال اور مانند کوئی چیز نہیں۔ حضرت آدم کے قصہ کے متعلق سفر تکوین کے دوسرے باب میں ہے۔

"خداوند نے عدن کے پورب کی طرف ایک باغ لگایا اور آدم کو وہاں رکھا اور اس باغ کے بیچ میں ایک درخت رکھا جو حیات کا اور نیک و بد کی پہچان کا درخت اور آدم کو اس کے کھانے سے منع کر دیا۔ پھر آدم نے اس کو کھا لیا تو (خداوند نے) اسی رشک و حسد میں آکر اس کو باغ سے نکال دیا۔"

اس کے آگے تیسرے باب میں ہے:-

"خدا نے کہا دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا (یعنی کوئی خدا تھا جن میں سے ایک کی مانند ہو گیا) اور اب ایسا نہ ہو کہ ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت سے بھی کچھ کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے، اس لئے خداوند نے اس کو باغِ عدن سے باہر کر دیا۔"

مذکورہ بالا عبارت سے چند امور مستفاد ہوتے ہیں:- اوّل یہ کہ عدن کے شرقی جانب ایک باغ تھا جہاں آدم ؑ کو رہنے کا حکم ملا تھا۔ گویا آدم ؑ کا مسکن اسی زمین پر کوئی باغ تھا۔ دوم یہ کہ باغ میں ایک درخت تھا جس سے نیکی اور بدی کی شناخت ہوتی تھی اور اس کے کھانے سے بقائے دوام حاصل ہوتی تھی۔ سوئم یہ کہ آدم کو اس درخت کے کھانے سے منع کر دیا تھا اور منع کرنے کی علت یہ تھی کہ انسان کی درازدستی گوارا نہ کرتا تھا اور یہ نہ چاہتا تھا کہ انسان ہمیشہ جیتا رہے۔ چہارم یہ کہ خدا نے رشک و حسد سے آدم ؑ کو باغ سے نکال دیا جبکہ اس نے شجرۂ ممنوعہ کو کھا لیا تھا۔

قرآن نے فیصلہ کیا کہ (۱) آدم کو باغ میں رکھا گیا تھا۔ وہ دنیوی باغ نہ تھا وہاں دنیوی مصائب میں سے کوئی مصیبت نہ تھی (۲) شجرِ ممنوعہ سے نیکی اور بدی کی شناخت کے یہ معنی ہیں کہ اسی کو کھانے سے آدم ؑ نافرمان ہو گیا اور نہ کھاتا تو نافرمان نہ ہوتا۔ وہ کوئی ایسا درخت نہ تھا جس کے کھانے سے بقائے دوام حاصل ہو جاتی بلکہ یہ

شیطان نے آدم سے کہا تھا کہ تم کو اس درخت سے اس لئے روک دیا گیا ہے کہ کہیں اس کے کھانے سے تم دوامی زندگی اور غیر فانی ملک کے مالک نہ بن جاؤ۔ یہ قول خدا کا نہیں بلکہ شیطان کا تھا واقع میں وہ شجرۃ الخلد نہ تھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جب آدم نے اس کو کھا لیا تو پھر اس پر کیوں فنا طاری ہوئی اور کیوں ہمیشہ زندہ نہ رہا۔ معلوم ہوا کہ یہ قول خدا وندی نہ تھا بلکہ شیطان نے آدم سے کہا تھا هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (ع ۳) خدا بے مانند اور بے مثل ہے نہ متعدد خدا ہونے کا امکان تھا کہ آدم درخت ممنوعہ کھا کر کسی ایک کی مانند ہو سکتا نہ وہ درخت شجرۂ حیات تھا۔ (ع ۱۲) خدا رشک و حسد سے پاک ہے ہر وہ چیز جس سے ذات و صفات میں نقصان پیدا ہو سکتا ہے خدا اس سے منزہ ہے۔

پھر اسی سفر کے پانچویں اور چھٹے درس میں ہے:۔

"تب خداوند زمین پر انسان پیدا کرنے سے پچھتایا اور نہایت دلگیر ہوا"۔

قرآن کہتا ہے کہ خدا علیم و حکیم ہے۔ اس سے عالم کی ذرہ برابر چیز مخفی نہیں وہ کسی فعل کے نتیجے سے غافل نہیں۔ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ نہ کوئی کام خدا نے خلاف مصلحت کیا ہے کہ نتیجہ پر پہنچ کر اس کو ندامت ہو۔

کتاب خروج کے باب ۱۶ و ۲۴ اور کتاب احبار کے باب ۲۶ میں ہے

"خدا تعالیٰ بدلی میں اترا اور خیمہ کے دروازے پر ٹھہرا رہا اور اس کے منہ سے آگ اور نتھنوں سے دھواں نکلا اور وہ ایک کروبی پر سوار ہو کر اڑا اور اسرائیل کے ستر لوگوں نے موسیٰ اور ہارون کے ساتھ خدا کو کرسی پر بیٹھا دیکھا اور کھایا اور پیا اور اس کا لباس برف سا سفید اور اس کے سر کے بال صاف اور سفید اون کی مانند تھے"

تھوڑی سی بصیرت رکھنے والا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ کس قدر خرافات ہے۔ قرآن نے اس واقعہ کو کیسی صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ ماحصل یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے جب موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم تمہاری بات کو سچا نہیں جان سکتے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہ دیکھ لیں ہرگز نہیں مان سکتے۔ اس گستاخی کی سزا خدا نے یہ دی کہ آسمان سے ایک بجلی گری اور سب گستاخوں کو ہلاک کر گئی۔ گویا قرآن نے اصل واقعہ کو تو بیان کر دیا اور اس سے آگے جتنی خرافات تھی سب کا انکار کر دیا۔ خدا کو دیکھنا تو بجائے خود رہا دیکھنے کی خواہش کرنے والوں کو جلا ڈالا۔

کتاب خروج کے باب ۲۰ درس ۵۔ اور باب ۳۴ درس ۷ میں ہے نیز کتاب یرمیاہ کے باب ۳۲ درس ۱۸ میں مذکور ہے کہ:۔

"خدا تعالیٰ باپ دادوں کے کرتوت کی سزا تیسری چوتھی پشت میں دیتا ہے"۔

ارباب دانش جانتے ہیں کہ باپ کے کرتوت کی سزا بیٹے پوتے کو دینا کتنا ظلم ہے اور خدا ظالم نہیں، اس لئے قرآن نے صاف فیصلہ کر دیا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى کوئی کسی کا بار نہ اٹھائے گا۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

(۲) ملائکہ اور انبیاء کے متعلق زناکاری، بت پرستی، شراب خواری، دغابازی اور قتل و غارت وغیرہ کی سینکڑوں تہمتیں اسرائیلی کتب میں مذکور ہیں۔ انجیل یوحنا کے دسویں باب میں مسیح کا قول ہے کہ:۔

"مجھ سے پہلے جس قدر انبیاء آئے تھے چور اور قزاق تھے"۔

ظاہر ہے کہ جب فرشتے اور انبیاء بھی پاک دامن نہ ہوں گے تو پھر تبلیغ و رسالت کا فرض کون انجام دے گا اور ایسے ناقابل اعتبار پیمبروں کی پیامبری کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ قرآن نے فرشتوں کے متعلق فرما دیا وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ اور انبیاء کے متعلق فرمایا وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ گویا قرآن نے ملائکہ اور انبیاء کو معصوم قرار دیا۔ (۳) یہودیوں میں صدوقی، فریسی وغیرہ کئی فرقے تھے کیونکہ جب دوبارہ توریت بنائی گئی تو اس میں آخرت کا کچھ حال نہ لکھا گیا، اس لئے صدوقی فرقہ آخرت کا منکر ہو گیا مگر فریسی گروہ قائل رہا لیکن یہ اقرار بھی درپردہ انکار کے مرادف تھا کیونکہ بعض لوگوں نے تو صاف کہہ دیا کہ کوئی یہودی جہنم میں نہیں جائے گا۔ ہم اللہ کے پیارے ہیں، ہم کو خدا عذاب نہ دے گا۔ کوئی جماعت قائل تھی کہ عذاب تو ہم پر ہوگا مگر صرف اتنی مدت جتنی مدت ہم نے گؤسالہ کی پرستش کی یعنی ۴۹ دن عذاب ہوگا تو بجائے ۴۹ دن کے صرف ایک ہفتہ کا عذاب ہوگا۔ قرآن نے اس کا فیصلہ ایسے غیر مبہم الفاظ میں کر دیا جس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ جو مومن نیکوکار ہوگا وہ عذاب سے محفوظ ہوگا اور جو مشرک بدکار ہوگا وہ جہنم میں جائے گا۔

(۴) باہم عیسائی فرقوں میں سخت اختلاف تھا۔ کوئی مسیح کو خدا کا بیٹا اور مریم کو خدا کی بیوی کہتا تھا، کوئی مسیح کو خدائی کا جزو قرار دیتا تھا، کوئی اقانیم ثلاثہ کو

خدا کہتا تھا۔ قرآن نے سورۂ مریم میں اس کا صحیح فیصلہ کر دیا مسیح کو عبداللہ، کلمۃ اللہ اور روح القدس قرار دیا، خدا کو وحدہٗ لاشریک بتایا۔

(۵) یعقوب حواری کا قول تھا کہ ایمان بغیر عمل کے قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ پولوس شریعت کی پابندی کو لعنت اور خدا کی ناراضگی کا سبب بتلاتا تھا جیسا کہ اس کے خطوط میں لکھا ہے۔ قرآن نے اعمال کو مدارِ ایمان نہیں بلکہ مظاہرِ ایمان قرار دیا، بے عمل موحد کو بھی مومن بتایا۔ فرمایا وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا۔ یعنی اگر مومنوں کے دو گروہ باہم کشت و خون میں مبتلا ہو جائیں۔ معلوم ہوا کہ کشت و خون ریزی کے باوجود ایمان سلب نہیں ہوتا گویا قرآن نے تو موحد گناہ گار کو رحمت سے محروم کیا اور تو بہ کی بھی گنجائش نہ چھوڑی نہ صاحبِ معصیت کی حوصلہ افزائی کر کے گناہ کو ناقابلِ توجہ چیز قرار دیا اور یہی اعتدال کا راستہ ہے۔

وَإِنَّهُ لَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ۔ قانونِ موسوی میں بہت زیادہ سختی تھی۔ عیسوی شریعت میں انتہا سے زیادہ نرمی ہو گئی۔ جب مذہبِ عیسوی میں تحریف شروع ہوئی تو پولوس نے قانونِ شریعت کی پابندی کو حرام کر دیا۔ اس وجہ سے شرعی احکام کی نرمی سختی سے بدل گئی اور یعقوبی فرقہ نے تو خود ہی اتنا تشدد کر رکھا تھا کہ ایمان کا سنگِ بنیاد عمل قرار دے لیا تھا۔ اس سبب سے اس گروہ میں تارک الدنیا فقیر بہت زیادہ پیدا ہوئے۔ لوگوں نے تمدن و حضارت سے کنارہ کش ہو کر تمام صنفی اور عملی اور بدنی لذتیں اپنے اوپر حرام کر لیں اور دین عیسوی بالکل خاصی تعذیب بن گیا۔ تمام طبعیات کو محرمات کی طرح چھوڑ دیا گیا اور اس عذابِ نفس کا نام ریاضت رکھا۔

رہے ہندوستان کے ہندو تو برہمنوں نے اور بھی ستم ڈھایا تھا۔ ہر قسم کا گوشت اپنے اوپر حرام کر لیا۔ ہر نعمت و زینت کے ترک کو عبادت سمجھنے لگے۔ برتنوں کی جگہ درختوں کے پتوں پر کھانا شروع کیا، برہنہ بدن پھرنا اور بدن پر مٹی ملنا کمالِ نفس کی علامت قرار پائی۔ صرف ایک لنگوٹی یا زائد سے زائد ایک دھوتی (جس سے رانوں کا اندرونی حصہ کھلا رہے) پہننے کا رواج ہو گیا اور کمالِ بشری کی علامت اسی خلافِ فطرت قید کو قرار دے لیا۔ بدھ مت میں سختی کہیں اس سے بھی زیادہ تھی۔ خود گوتم نے وہ سختیاں جھیلیں اور ایسی اُلٹی مشقیں کیں کہ انسانیت کی مُردہ لاش سے بدبو آنے لگی اور دنیا کے دماغ اس غلط طریقۂ ریاضت کے تعفن سے سڑ گئے۔ ان بندشوں، قیدوں اور بیڑیوں کو کاٹنے کے لئے اسلام آیا۔ قرآن نے ہر خلافِ فطرت زنجیر کو کھول دیا۔ لوگوں کی گردنوں سے ایسے سخت قوانین کی جکڑ بندیوں کو دور کر دیا۔ ہر قسم کی حلال لذت کو نہ فقط مباح کیا بلکہ اس سے تمتع پذیر ہونے کو ضروری قرار دیا اور قرآن کے حکم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت ترین عبادت سے بھی منع فرما دیا۔ طے کا روزہ رکھنے کی بھی ممانعت کر دی نکاح کو بھی سُنّت قرار دیا، سونے کو ضروری بتایا، بیوی بچوں کے حقوق کو ادا کرنے کی بھی وجوبی تعلیم دی اور قرآن پاک درحقیقت اہلِ ایمان کے لئے رحمت ہو گیا، لیکن دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یا ہونے والے تھے جو بالکل مطلق العنان ہو کر بہیمانہ زندگی گزارنے کو مباح بلکہ مستحسن جانتے تھے۔ ہر عورت یہاں تک کہ بیٹی اور ماں سے بھی ان کے ہاں نکاح جائز تھا بلکہ بعض فرقوں کے ہاں تو نکاح کی ضرورت ہی نہ تھی۔ تمام عورتیں اور مرد بغیر کسی امتیاز و خصوصیت کے تمتع اندوز ہو سکتے تھے نہ کوئی کسی کی بیوی تھی نہ کوئی کسی کا شوہر تھا۔ ہر ایک کو ہر ایک سے لذت پذیر ہونے کا اختیار تھا۔ مالی سرمایہ میں بھی انفرادیت حرام تھی۔ نام کو منقولہ یا غیر منقولہ ملکیت نہ تھی۔ غرض مال اور عورتوں میں اشتراکیت عام تھی۔ پہلا گروہ مجوسیوں کا تھا اور دوسرا گروہ مزدکی فلسفہ کے علمبرداروں کا۔ اس قدر اباحت اور مطلق العنانی نہ فقط فطرت کے خلاف تھی بلکہ انسان کو حیوان سے بھی زیادہ پست ترین درجہ میں پہنچانے والی تھی۔ انسان کی روحانیت کے باغ کو لوٹنے والی، اخلاقِ فاضلہ کو تباہ کرنے والی، امنِ عام کو برباد کرنے والی اور شرفِ انسانی کو گھن لگانے والی تھی، اس لئے کسی طرح بھی مناسب نہ تھا کہ قرآن اس قدر عموم اور مطلق العنانی کی اجازت دیتا اور گروہِ بشری کو گمراہی کے غار میں گرا آنا یا گرنے دیتا۔ اسی بنا پر اس نے اعتدال کا راستہ اختیار کیا اور جس طرح اہلِ ایمان کے لئے رحمت تھا اسی طرح ان کے لئے ہدایت بھی بن گیا۔ ہُدًی و رحمۃٌ کے الفاظ انہیں دونوں مضامین پر دلالت کرتے ہیں۔

إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ۔ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت فیصلۂ قیامت کے متعلق ہے، لیکن سباق و سیاق بتا رہا ہے کہ فیصلہ سے مراد اختلافی اقوال کا فیصلہ ہے اور یہ فیصلہ وہی ہے جو قرآن نے کیا ہے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ ان اسرائیلی فرقوں کے اختلافات کا فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے وہی ان کا قضیہ چکائے گا، لیکن فیصلۂ الٰہی میں ان کی نفسانی خواہشات کو دخل نہیں بلکہ حکمتِ الٰہیہ پر اس کا مدار ہے۔ وہ اپنے حکم سے جو چاہے گا فیصلہ کرے گا اور یہ فیصلہ کرنے کا حق اس کو اس وجہ سے ہے کہ وہ سب سے قوی اور سب سے زیادہ واقفیت رکھنے والا ہے۔ طاقت اور علم دو ہی چیزیں ہیں جن پر حکمِ ناطق کا مدار موقوف ہے اور چونکہ یہ دونوں اوصاف بدرجۂ اتم احکم الحاکمین میں موجود ہیں، اس لئے اسی کو فیصلہ کرنے کا حق ہے۔ نتیجۂ کلام یہ نکلا کہ قرآن کی صراحتیں انسانی خواہشات کے تابع نہیں ہیں نہ کسی کی حمایت اور دوسرے کی مخالفت اس کی غرض ہے بلکہ یہ فیصلۂ الٰہیہ ہے جس کا مدار محض حکمِ الٰہی پر ہے۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ۔ جب قرآن ہر گروہ کی بے جا جنبہ داری سے پاک ہے تو ظاہر ہے کہ کوئی فرقہ بھی اس سے خوش نہیں ہو سکتا اور کوئی جماعت بھی اس کے فیصلہ پر راضی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ہر پارٹی ہر جتھا اور ہر گروہ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہو گا، اس لئے تمام دنیا میں صرف رسول پاک ﷺ یا چند برگزیدہ ہستیاں

ہوں گی جو فیصلۂ قرآنی پر خوش اور حق کی حمایت پر تیار ہوں گی باقی تمام گروہ ان علمبرداران کو دنیا سے مٹانے کے لئے باہم ساعی ہوں گے اور اسلام کی روشنی کو کفر کی آندھیاں ہر طرف سے اٹھ کر اپنی طوفانی جھکڑوں سے بجھانا چاہیں گی اس وقت سوا اللہ کے کوئی بھی گروہ حق کا حامی نہ ہوگا اور وہ وقت بہت کڑا ہوگا۔ اسی حالت کو پیشِ نظر رکھ کر ارشاد ہوتا ہے کہ تم اللہ پر بھروسہ رکھو تم روشن حق پر ہو یعنی کسی کی مخالفت اور عناد کی پرواہ نہ کرو اور کسی سے خائف ہو کر حق سے منہ نہ موڑو۔ اللہ تمہارا حامی ہے اور دل کی تسلی کے لئے یہ امر کافی ہے کہ تم ایسی صداقت پر ہو جو بالکل واضح ہے اور اس کی روشنی تمام آفاق پر پھیل رہی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ باوجود وضوحِ حقیقت اور طلوعِ صداقت کے کفار پھر کفر کی اندھیریوں میں سرگرداں پھرتے ہیں اور ان کو راہِ حق دکھانے کی کیا تدبیر ہے؟ تو اس کے متعلق فرماتا ہے کہ کفار مردہ ہیں ان کی بصیرت روحِ تفکر اور حیاتِ تدبر مردہ ہو گئی ہے ان کو سنانا تمہارے بس کی بات نہیں۔ ہاں اگر اللہ ان کو زندگی عطا فرما دے یا زندگی نہ عطا فرمائے تو کم از کم ان کے کانوں میں سننے کی طاقت پیدا کر دے تو سن سکتے ہیں) اس پر مزید یہ کہ وہ بہرے پٹ ہیں اور قطعی بہرہ سن نہیں سکتا۔ خصوصاً اس وقت جبکہ سننا بھی نہ چاہے اور پکارنے والے کی آواز سے رُخ پھیر کر بھاگے، کفار کی بھی یہی حالت تھی۔ اول تو ان کے گوشِ حقیقت بہرے تھے حق کی آواز سن ہی نہیں سکتے تھے اس پر تماشا یہ تھا کہ وہ سننا بھی نہ چاہتے تھے۔ وحشی جانوروں کی طرح صداقت کی آواز سے بھاگتے تھے۔ پھر فقط بہرے نہیں بلکہ اندھے بھی ہیں اور تم اندھوں کو راستہ نہیں بتا سکتے یعنی کافروں کی قلبی بینائی زائل ہو چکی ہے تو جس طرح آنکھوں کے اندھے کو راستہ نہیں دکھایا جا سکتا اسی طرح کورِ بصیرت کو راہِ حق نہیں دکھائی جا سکتی۔ غرض یہ کہ علم و واقفیت حاصل کرنے کے لئے صرف تین ہی ذرائع ہیں (۱) قوتِ فکریہ صحیح ہو، عقل سالم ہو اور بصیرت روشن ہو۔ دل زندہ ہو تاکہ حقیقت کا ادراک کیا جا سکے اور ان دلائل و براہین کو سمجھنا ممکن ہو جو محض عقلی اور نظری ہیں۔ سو کافروں کی قوتِ فکریہ بھی صحیح نہیں، اس لئے وہ براہینِ حق کو کیسے سمجھ سکتے ہیں (۲) کان کھلے ہوں ان میں سننے کی طاقت ہو تاکہ ان محسوسات کا علم ہو سکے جن کا تعلق قوتِ سامعہ سے ہے۔ اگر خود دماغ میں تدبر و تفکر اور تبصر و تعقل کی طاقت نہیں اور مبادی کو ترتیب دے کر نتائج کا اخذ کرنا بطورِ خود ناممکن ہے تو دوسروں کے کلام کو سن کر واقفیت حاصل کر لی جائے۔ سو کافروں میں یہ بات بھی مفقود ہے۔ ان کے گوشِ ہوش بھی بیٹھ گئے ہیں۔ ان ظاہری کانوں سے کچھ حاصل نہیں۔ سننے کے بعد نہ سمجھنا گویا قوتِ سامعہ کا فقدان ہے (۳) آنکھیں روشن ہوں بینائی کی قوت ہو تاکہ محسوساتِ کی تصویریں دیکھ کر ان کے محسوس نقوش سے اندرونی معانی کا استنباط ہو سکے اور مصنوع سے صانع پر استدلال کیا جا سکے سو کافر اس سے بھی بے بہرہ ہیں ظاہری آنکھوں کے پردوں سے کیا فائدہ جبکہ مرکزِ نور ماؤف ہو اور دیکھنے کا اصل فائدہ حاصل نہ ہو سکے۔ جب کافروں کے پاس علم کے یہ تینوں ذرائع نہیں تو پھر ان کو راہِ معرفت دکھانی ناممکن ہے۔ ہاں آوازِ صداقت انہیں لوگوں کو سنائی جا سکتی ہے جن کی عقلیں روشن ہوں، سماعتیں و دلائل کو سمجھ کر ان پر یقین رکھتے ہوں اور شواہدِ قدرت کو مانتے ہوں اور پھر اپنی تمام قوتوں کو یقینِ برہانی کے تابع بنا دیتے ہوں۔ ایسے لوگوں کو آوازِ صداقت کا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اسی مفہوم کو اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ میں بیان فرمایا ہے۔

ایک شبہ صحیح مسلم میں مذکور ہے کہ جب جنگِ بدر ختم ہو گئی تو مقتول کافروں کی لاشوں پر کھڑے ہو کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہم سے جو وعدہ ہمارے رب نے کیا تھا ہم نے وہ تو پا لیا۔ کیا تم نے بھی وہ چیز واقعی پائی جس کی وعید تم کو تمہارے رب نے دی تھی؟ اس پر کسی شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا حضور مُردوں سے خطاب کر رہے ہیں۔ یہ تو مُردے ہیں مر چکے۔ ارشاد فرمایا خدا کی قسم تم ان سے زیادہ نہیں سنتے، مگر فرق صرف اتنا ہے کہ یہ جواب نہیں دے سکتے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مُردے سنتے ہیں، لیکن آیت اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى میں عدمِ سماعِ موتیٰ کی صراحت ہے۔ فَكَيْفَ التَّطْبِيْق :

ازالہ اس شبہ کا ازالہ دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ اول یہ کہ آیت مذکورہ میں موتیٰ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دل مردہ ہوں۔ بصیرت، روحانیت اور نورِ فطرت مردہ ہوں یعنی کفار کے وہ لوگ مراد نہیں جن کی مادی حیات کا رشتہ منقطع ہو گیا اور سننے سے مراد ہے گوشِ ہوش سے سننا اور کلمۂ حق کو سن کر قبول کرنا چونکہ کفار کے دل مردہ تھے اور کلمۂ حق کو وہ سن کر قبول نہیں کرتے تھے، اس لئے ان کو مردہ کہا گیا اور کلمۂ حق کو سن کر اثر پذیر نہ ہونے کو نہ سننے سے تعبیر کیا گیا۔ کیونکہ ایسے سننے سے کیا فائدہ جس سے کوئی اثر نہ قبول کیا جائے۔ اگر کسی فعل کی اصل غرض اور غایت حاصل نہ ہو تو مجازاً اس فعل کی نفی صحیح ہو سکتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص اگر بالکل بے وقوف ہو تو اس کو گدھا کہہ دیا جاتا ہے کیونکہ انسانیت کا تقاضا علم و توقف ہے جب علم نہیں تو انسانیت نہیں۔ لہٰذا آیت سے عدمِ سماعِ موتیٰ پر استدلال صحیح نہیں۔

دوم یہ کہ حدیث سے عام مُردوں کا سننا ہرگز ثابت نہیں ہوتا اور آیت میں عمومِ سماعِ موتیٰ کی نفی ہے۔ رہا بعض صورتوں میں خاص مُردوں کا سننا تو یہ بقدرتِ الٰہیہ ممکن ہے جیسا کہ مقتولینِ بدر نے سنا تھا۔ امام ابو حنیفہؒ اور جمہور علماء کا یہی قول ہے۔ لہٰذا آیت و حدیث میں کوئی تناقض نہیں۔ حدیث میں ایک خاص قدرتِ الٰہیہ کا اظہار ہے اور آیت میں عمومِ سماعِ موتیٰ کی نفی۔

مقصودِ بیان : قرآن نے بنی اسرائیل کے باہمی، مذہبی اور علمی اختلافات کا فیصلہ کیا اور نہایت صحیح کیا۔ لیکن جس قدر ضروری تھا اتنا کیا نہ یہ کہ کل اختلافی مباحث کا

کردیا - قرآن کامل قانونِ ہدایت ہے - اصلاح بشری کا سیدھا راستہ بتاتا ہے - اس میں بیجا قیود بھی نہیں جو زندگی کی خوشگواریوں کو تلخ کامیوں سے بدل دیں نہ اس قدر آزادی ہے کہ انسانی اُفق انسانیت سے نکل کر دائرۂ حیوانیت میں داخل ہو جائے - اس مطلب کی طرف آیت وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ اشارہ کر رہی ہے - قانون نافذ کرنے اور اختلافات دور کرنے کا حق صرف خدا کو ہے کیونکہ جب تک کامل طاقت اور علم محیط نہ ہو فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اور خدائی طاقت سب سے بڑی طاقت اور اس کا علم سب سے زیادہ وسیع علم ہے، اس لئے اسی کو اجرائے قانون و فیصلۂ اختلاف کا حق بھی ہے - اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز بنانے کا کسی انسان کو حق نہیں خواہ نبی ہو یا امام، مجتہد یا ولی، کامل یا صوفی، مرشد یا پیر دستگیر یا روشن دماغ فلاسفر یا جمہور امت یا پارلیمنٹری حکومت یا حکام و وکلاء کا گروہ - ہاں تصریحات الٰہیہ اور فیصلۂ ربانیہ کے اصول کے تحت جزئیات کا استخراج استنباط ہر اجتہادی دماغ رکھنے والا انسان کرسکتا ہے - بشرطیکہ اس کو قوانین الٰہیہ کا پورا علم ہو - بیس جو لوگ مدعی ہیں کہ عارف چونکہ حقیقت سے واقف ہوتے ہیں اس لئے اگر وہ خلافِ شرع کام کرنے کا حکم دیں تو فوراً کر لینا چاہیئے کیونکہ ان کی نظر نتائج پر ہوتی ہے اور بعض ان کاموں کا ثمرۂ تعمیمی نتیجہ اچھا ہوتا ہے جو ظاہر میں ناجائز اور بُرے معلوم ہوتے ہیں - یہ اُن لوگوں کی حماقت ہے - نتیجہ اچھا ہو یا بُرا ہم کو اس کی پرواہ کے بغیر فعل کے حُسن و قبح کو جانچنے کیلئے قوانین الٰہیہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے - ان لوگوں کے دماغ کی حماقت آب ہیں جو قوانین ربانی کی مخالفت مصلحت وقتی کے ماتحت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قانونِ شرع ضرور اپنی جگہ ٹھیک ہے بلکہ اس وقت اس جگہ مصلحت اس کی مقتضی ہے کہ اس کے خلاف کیا جائے گویا بعض حالات میں وہ لوگ ناسخ خود بن جاتے ہیں -

کفار کے پاس علم نہیں - علم کے تین ذرائع ہیں عقل سلیم یعنی روحانیت - گوش ہوش اور بصیرت اندوز آنکھ اور چونکہ کفار کے تینوں ذرائع معدوم یا شکستہ اور ناقص ہیں، اس لئے ان کو صداقت و حقانیت سے کوئی بہرہ نہیں مل سکتا - آیت اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى سے امام ابوحنیفہ رح اور جمہور علماء نے استخراج کیا ہے کہ مرنے کے بعد کوئی مردہ زندہ کا کلام نہیں سُن سکتا - ہاں خاص صورتوں میں یا کسی مخلوق کی وساطت سے خدا ان کو سنوا دے تو یہ ممکن ہے -

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ۝ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ قَالَ

اور جس دن ہم ہر امت میں سے اُن لوگوں کے گروہ کو جمع کریں گے جو ہماری آیات کو جھٹلاتے تھے پھر اُن کو روک کر کھڑا کیا جائے گا یہاں تک کہ جب وہ حاضر ہو جاویں گے

اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا

اور اللہ فرمائے گا کیا تم نے میری آیتوں کی تکذیب کی تھی حالانکہ تم کو ان کا علم بھی نہ تھا بتاؤ تم کیا کرتے تھے اُن کے ظلم کی پاداش میں اُن پر وعدہ ثابت

ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ۝ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ

ہو جائے گا تو وہ بول بھی نہ سکیں گے کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ اُن کے آرام کرنے کے واسطے ہم نے رات بنائی اور دن کو روشن کیا اس میں

فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي

ایماندار قوم کے لئے بہتیری نشانیاں ہیں اور جس دن صور پھونکا جائے گا تو جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہوگا گھبرا

الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ۝ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ

جائے گا مگر جس کو اللہ چاہے اور سب اُس کے حضور میں عاجزی سے حاضر ہوں گے تم پہاڑوں کو اپنی جگہ جما ہوا خیال کرو گے حالانکہ

تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ۝ مَنْ جَآءَ

وہ بادلوں کی طرح چلیں گے یہ سب چیزیں اللہ کی بنائی ہوئی ہیں جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا تھا بیشک وہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے جو کوئی نیکی

بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُم مِّن فَزَعٍ يَوْمَئِذٍ آمِنُونَ ○ وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ

لے کر آئے گا اس کو اس سے بہتر ملے گا اور یہ لوگ اس روز کی گھبراہٹ سے امن میں ہوں گے اور جو لوگ بدی لے کر آئیں گے اُن کو اوندھے منہ آگ

وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○

میں ڈال دیا جائے گا (اور کہا جائے گا) کہ تم کو اسی کی سزا دی جا رہی ہے جو تم کیا کرتے تھے

تفسیر خدا نے سمجھنے سوچنے اور عبرت اندوز ہونے کے لئے دانش و عقل عطا فرمائی ہے یہ عقل مند اور ذی ہوش طبقہ صحیح غلط اور حق و باطل کا فیصلہ اس نور فطرت (عقل سلیم) کی روشنی میں کر لیتا ہے جو اس کو عطا کیا گیا ہے یہ تنہائی کے لمحات اور دماغی تدبر جو کا پرقیاس کو دکھا دیتا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ ایسا سلیم دماغ نہیں رکھتے کہ خود کچھ مبادی کو ترتیب دے کر صحیح نتیجہ نکال سکیں اور کلیات یا جزئیات فیلا دیہ کی طرح توجہ کر کے خلاصہ علمی حاصل کر سکیں۔ ان کے لئے آلات و ذرائع کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ اس امر کے محتاج ہوتے ہیں کہ مادی جزئیات سے صور و معانی کا استنباط کر کے نتیجہ حاصل کریں۔ ایسے لوگوں کے لئے خدا تعالیٰ نے یہ آنکھیں بنائی ہیں تاکہ محسوسات خارجیہ کا مشاہدہ اور معائنہ کریں اور پھر ان سے صور و معانی کا اخذ کر کے اپنے دماغ میں ترتیب دے کر نتیجہ نکالیں۔ لیکن ان سے بھی پست درجہ کے کچھ آدمی ہیں جو مشاہدہ کرنے کے بعد بھی اخذ نتائج پر قادر نہیں۔ ہاں اگر کوئی دوسرا شخص ان کو کچھ بتا دے، سکھا دے، پڑھا دے، سنا دے اور کی پکائی دماغی غذا ان کو مل جائے اور ترتیب معانی کی محنت ان کے دماغ سے نہ لی جائے تو حقیقت ان کی سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے کان بنائے ہیں تاکہ دوسروں کے ملفوظات اور اقوال کو سن کر دماغ نشین کریں اور صداقت کو سمجھیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ علم حقیقت کے یہ تمام دروازے انہی لوگوں کے لئے کھلے ہیں جو اپنے دماغوں کے اندر اثر اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں ورنہ عقل و دانش کچھ کام نہیں کرتی جب کہ اس کے کام میں وہم دخل انداز ہو اور ظاہری آنکھیں کچھ نہیں کر سکتیں جب کہ دماغ میں عبرت اندوزی کی صلاحیت نہ ہو کیونکہ دیکھنے والی چیز تو اندر کا نور ہے آنکھ تو صرف ذریعہ ہے اور باہر نور بھی نور ہے۔ اگر دماغ میں نور علم نہ ہو تو باہر کی کوئی چیز نہیں دیکھ سکتی نہ تاریکی میں نور دیکھے گا نہ روشنی میں۔ ہاں جن کے دماغوں میں نورانی طاقت قوی ہے ان کو اندھیرے میں بھی دکھتا ہے۔ اسی طرح ہوش کے کان کھلے ہوئے نہ ہوں تو ان کو ظاہری کانوں سے کچھ فائدہ نہیں۔ ہزار دلیلیں سننے کے بعد بھی ایک بات اس کے کان میں نہیں بیٹھتی۔ پس جو لوگ معطل العقل اور ماؤف الحواس ہیں ان کو سمجھانے کا طریقہ سوا جبر کے کچھ نہیں، لیکن انسانی کائنات مجبور نہیں یہ دنیا عالم اختیار ہے، مگر ایک وقت ضرور ایسا آئے گا جب انسان کی یہ تمام خود اختیاریاں چھین لی جائیں گی اور اللہ کی ایک غیبی نشانی (دابۃ الارض) اسی زمین سے برآمد ہو کر کفر و ایمان کا فیصلہ کر دے گی۔ اس وقت نیک اور فرماں بردار اور سرکش و عاصی اور کافر بالکل ممتاز ہو جائیں گے، دل کی بات پیشانی پر نمودار ہو جائے گی حق و باطل کے امتیاز کا یہ آخری درجہ ہوگا۔ جو لوگ فہم و سماع و بصارت نابینا اور کور شعور بے ہوش رکھتے ہیں وہ بھی نمایاں طور پر صداقت و بطلان میں فرق دیکھیں گے، لیکن اس وقت سمجھنا، دیکھنا اور سننا بے سود ہوگا۔ کیونکہ کچھ ہی مدت کے بعد ارادۂ اختیار کی قوتیں سلب کر لی جائیں گی۔ قیامت کبریٰ بپا ہوگی۔ مومن و کافر گروہ در گروہ ہو کر جدا جدا محاسبہ کیلئے پیش ہوں گے۔

تحلیلِ اجزاء وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ۔ اس فقرہ میں قول سے کیا مراد ہے؟ علمائے تفسیر کے اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ مجاہد نے فرمایا اس سے مراد ہے ایمان نہ لانے کی صراحت کر دینی یعنی جب لوگ مایوس الایمان ہو جائیں گے اور کسی کے ایمان لانے کا امکان نہ رہے گا تو دابۃ الارض کا خروج ہوگا۔ بعض کے نزدیک قول سے عذاب (یعنی عذاب نازل ہونے کا حکم) اور بعض کے نزدیک غضب الٰہی مراد ہے یعنی جب لوگوں پر عذاب نازل ہونے یا غضب مسلط ہونے کا وقت آ جائے گا تو الخ۔ اکثر علماء کا خیال یہ ہے کہ جب علماء سب مر جائیں گے اور قرآنی علوم اٹھ جائیں گے تو دابۃ الارض کا خروج ہوگا۔ وقوع قول سے قرآنی علوم کا اٹھ جانا ہی مراد ہے۔

أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ۔ دابۃ الارض کے کلام کرنے سے کیا مراد ہے؟ حضرت علیؓ، عطاء خراسانی، قتادہ، حسن بصری اور ابن عباسؓ کا ایک قول یہ ہے کہ اس سے باتیں کرنا مراد ہے۔ دابۃ الارض بقدرت الٰہیہ لوگوں سے باتیں کرے گا۔ ابن جریر نے اسی قول کو پسند کیا ہے۔

ابن عباسؓ کا دوسرا قول ہے کہ دابۃ الارض کافر و مومن کی پیشانی پر داغ لگا دے گا جس سے ہر شخص مومن و کافر کو جدا جدا شناخت کرے گا کسی کی حالت مشتبہ نہ رہے گی۔ ابن عباسؓ کا تیسرا قول یہ ہے کہ باتیں کرنا اور داغ لگانا دونوں مراد ہیں۔ ابن کثیر نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور قرآن و حدیث کے ظاہری تعارض کو دور کرنے کے لئے

یہی تفسیر زیادہ مناسب ہی ہے۔ اب یہاں چند امور تنقیح طلب ہیں :-

(۱) آیت مذکورہ میں اَخْرَجْنَا فرمایا خَلَقْنَا نہیں فرمایا۔ بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دابۃ الارض کی تخلیق پہلے ہو چکی ہے یا ہو چکی ہوگی اور طلوع و ظہور قیامت کے قریب ہوگا۔ ہاں اگر اخراج سے مراد تخلیق لی جائے تو کوئی فرق نہ رہے گا۔

(۲) دابۃ الارض کہاں سے نکلے گا؟ حضرت حذیفہ بن اسید کی روایت ہے کہ ہم لوگ قیامت کا تذکرہ کر رہے تھے۔ حضور برآمد ہوئے۔ ارشاد فرمایا قیامت اس وقت تک بپا نہ ہوگی جب تک تم دس نشانیاں نہ دیکھو گے۔ مغرب سے طلوع آفتاب، دخان، دابۃ الارض کا خروج، یاجوج ماجوج کا خروج، عیسیٰ بن مریم کا خروج، دجال کا خروج، مغرب کی طرف زمین کا دھنسنا، ایک آگ کا عدن کے غار سے نکلنا جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی، لوگ جہاں رات کو ٹھہریں گے آگ بھی ان کے ساتھ رات کو وہیں ٹھہرے گی اور جہاں دوپہر کو ٹھہریں گے آگ بھی دوپہر کو ٹھہرے گی (رواہ احمد و مسلم والاربعہ) حذیفہ اسید کی دوسری روایت ہے کہ حضور والا نے دابۃ الارض کے تذکرہ کے ذیل میں فرمایا اس کا خروج تین مرتبہ ہوگا۔ پہلی بار صحرا (مکہ) کے آخری حصہ میں۔ اس خروج کا تذکرہ اہلِ مکہ تک نہیں پہنچے گا پھر وہ زمانہ دراز تک پوشیدہ ہو جائے گا۔ دوسری بار اس سے قریب تر نکلے گا۔ مکہ والوں تک خبر پہنچے گی۔

(تیسری بار) جب کہ لوگ سب سے محترم مسجد یعنی مسجد حرام میں ہوں گے اور کچھ کھٹکا بھی نہ ہوگا کہ اچانک دابۃ الارض اپنے سر سے گرد جھاڑتا ہوا رکن و مقام کے درمیان رونما ہوگا۔ لوگ اجتماعی و انفرادی صورت میں اس سے بھاگیں گے۔ سب سے پہلے وہ مسلمانوں کی ایک جماعت سے ملے گا۔ یہ لوگ جان لیں گے کہ حکم الٰہی سے بھاگنے کی ہم میں طاقت نہیں۔ دابۃ الارض ان کے چہرے چمکتے ہوئے تاروں کی طرح روشن کر دے گا پھر وہ چل دے گا (اتنی تیزی کے ساتھ) کہ نہ کوئی پکڑنے والا اس کو پکڑ سکے گا نہ بھاگنے والا اس سے بھاگ سکے گا۔ بعض لوگ نماز کی نیت باندھ کر اس سے بچنا چاہیں گے۔ دابۃ الارض ایسے لوگوں کے پیچھے سے آ کر کہے گا اے شخص اب تو نماز پڑھنے لگا۔ یہ کہہ کر سامنے آ کر اس کی پیشانی پر داغ لگا کر چلتا بنے گا۔ اس کے بعد لوگ اموال میں شرکت کریں گے (یعنی انفرادی ملک ختم کر دی جائے گی ہر چیز اجتماعی ہو جائے گی) مومن و کافر میں شناخت ہو جائے گی۔ مومن کافر کو کافر کہہ کر اپنا قرضہ مانگے گا اور کافر مومن کو مومن کہہ کر اپنا حق طلب کرے گا (رواہ ابوداؤد و ابن جریر) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے قیامت کا سب سے پہلا نشان مغرب سے آفتاب کا طلوع اور چاشت کے وقت دابۃ الارض کا خروج ہوگا۔ ان دونوں میں سے جو بھی پہلے ظاہر ہوگا دوسرا اس کے قریب ہی نمودار ہوگا (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے بوقت خروج دابۃ الارض کے ساتھ موسیٰؑ کا عصا اور سلیمانؑ کی انگشتری ہوگی۔ کافر کی ناک پر عصا سے داغ لگائے گا اور سلیمانؑ کی انگشتری سے مومن کے چہرے پر ٹھپہ لگا دے گا۔ یہاں تک کہ ایک دسترخوان پر جمع ہونے کے وقت مومن و کافر کی شناخت ہوگی (رواہ ابوداؤد واحمد و ابن ماجہ)

حضرت بریدہ کا قول ہے کہ حضرت رسول اللہؐ نے وادی کے قریب اس جگہ جس کے گرد ریت کے ٹیلے تھے دابۃ الارض کے خروج کی جگہ بتائی تھی (رواہ ابن ماجہ)

عبد بن حمید اور ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عمر کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دابۃ الارض کا پہلا قدم انطاکیہ (کی سرزمین) پر ہوگا۔ ظاہر یہ ہے کہ خروج تو مکہ کے قریب وادی سے ہوگا پھر جزیرۂ عرب سے باہر دوسرے ممالک میں سب سے پہلے اس کا ظہور انطاکیہ (سرحد شام) میں ہوگا۔

(۳) دابۃ الارض کیا چیز ہے اور اس کی کیسی شکل ہوگی۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے دابۃ الارض ایک چوپایہ ہوگا جس کے بدن پر بکثرت بال ہوں گے اور حجاز کی کسی وادی سے برآمد ہوگا (رواہ عبدالرزاق عن معمر عن قتادہ)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے دابۃ الارض کوہ صفا کے ایک شگاف سے نکلے گا اور گھوڑے کی رفتار کی طرح چلے گا (رواہ ابن ابی حاتم)

حضرت عبداللہ بن عمرو کا قول ہے دابۃ الارض جیاد کی پہاڑی سے نکلے گا اور مکہ سے روانہ ہو کر عسفان پہنچے گا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا وہ ایسا جانور ہے جس کے بال پر کھر اور داڑھی ہے مگر دم نہیں ہے اور تیز رفتار گھوڑے کی چال سے تین روز تک نکلے گا اور ہنوز اس کا ایک تہائی حصہ برآمد نہیں ہوا۔ (رواہ ابن ابی حاتم)

بعض علماء کا خیال ہے کہ دابۃ الارض وہی ہے جس کو صحیح مسلم کی حدیث جساسہ کہا گیا ہے اور تمیم داری کی حدیث میں جس کا مفصل ذکر موجود ہے۔ واللہ اعلم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دابۃ الارض کی کوئی خاص شکل، حلیہ اور رنگ نہیں ظاہر فرمایا۔ آثار صحابہ و تابعین میں جو کچھ آیا ہے اس کو اختصار کے ساتھ ہم نے نقل کر دیا۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم۔

مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا۔ اہل حشر تمام امتوں کا مجموعی طور پر ہوگا۔ پھر اہل کفر و تکذیب کو بغرض عذاب علیحدہ نکالا جائے گا۔ گویا ہر امت میں سے تکذیب کرنے

والوں کا گروہ چھانٹ لیا جائے گا۔ آیت کا یہی مطلب ہے۔

فَهُمْ يُوزَعُونَ۔ اس لفظ کا ترجمہ اور مطلب مختلف فیہ ہے۔ بعض اہل تفسیر نے کہا اگلے لوگوں کو اتنی دیر روکا جائے گا کہ پچھلے آکر مل جائیں پھر سب کو جمع کر کے دوزخ میں لے جایا جائے گا۔ ابن عباسؓ نے فرمایا ان کو دھکے دیئے جائیں گے۔ عبدالرحمٰن بن زید نے کہا سب کو ہنکایا جائے گا۔

قتادہ کا قول ہے سب تکذیب کرنے والے اگرچہ جدا جدا امتوں کے افراد ہوں گے، لیکن سب کو اکٹھا کر کے ایک گروہ بنا دیا جائے گا۔

وَلَمْ تُحِيطُوا بِهَا عِلْمًا۔ یوں تو اللہ کی آیات کا علمی احاطہ کوئی بھی نہیں کر سکتا بلکہ کائنات کے کسی ذرہ کی حقیقت نہیں جان سکتا، لیکن بعض خواص و صفات کا علم ضرور ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرمائے گا کہ تم کو میری آیات کا صحیح علم بھی نہ تھا، ان کی حکمت سے تم واقف بھی نہ تھے پھر بھی تم نے ان کی تکذیب کی کیا تم نے یہ تکذیب بالارادہ اور دانستہ کی تھی یا:۔

أَمَّاذَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ۔ یا کسی شغل میں مبتلا ہو کر آیاتِ الٰہیہ کو جھٹلایا تھا۔ حاصل یہ کہ قیامت کے دن کافروں کے خیالات، افکار اور عقائد کے متعلق باز پرس ہوگی، لیکن ان کو کوئی جواب نہ بن پڑے گا اور وہ کچھ نہ بول سکیں گے۔

أَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا اللَّيْلَ الخ۔ تمام کائنات اللہ کی توحید اور معاد جسمانی کی حقانیت پر دلالت کر رہی ہے۔ اس عالم کا ذرہ ذرہ تغیر پذیر اور اس کا ہر تغیر پر حکمت ہے، لیکن ایک بدیہی حقیقت جس کا انکار کوئی دیوانہ اور بچہ بھی نہیں کر سکتا شب و روز کا انقلاب ہے۔ سکون، دلجمعی، راحت اور اجتماعی حواس کے لئے خدا تعالیٰ نے رات بنائی ہے اور دن کی روشنی میں تمام حواس اور خصوصاً آنکھیں امور معاش کی دیکھ بھال میں مشغول رہتی ہیں۔ اگر رات نہ ہوتی تو انسانی قوتیں بہت جلد تحلیل ہو کر فنا ہو جاتیں اور دن نہ ہوتا تو اصلاح معاش ناممکن ہو جاتی۔ یہ دونوں اپنی پر حکمت تخلیق کے اندر اللہ کی الوہیت و ربوبیت کے ان گنت دلائل چھپائے ہوئے ہے، لیکن سمجھنے کے لئے نور ایمانی کی ضرورت ہے۔ اگر دماغ میں نور نہ ہو تو باہر کی روشنی بے سود ہے جن لوگوں کی چشم بصیرت وا ہے ان کو تاریکی میں بھی روشنی دکھائی دیتی ہے اور اندھیرے میں بھی سب کچھ دیکھ جاتا ہے اور جو کور بصیرت ہیں ان کو دن میں بھی کچھ نہیں سوجھائی دیتا۔ شب و روز کی تخلیق سے قیامت پر بھی استدلال کیا جاتا ہے۔ اس دنیا کی کل زندگی درحقیقت ایک رات ہے جس میں تمام اعمال کے نتائج پر پردہ پڑا ہوا ہے اور کسی کو اپنے کرتوت کی پاداش نہیں دکھائی دیتی اور اسی بنا پر ایک قسم کا سکون حاصل ہے، لیکن جس طرح ہر رات کی انتہا صبح پر ہوتی ہے اسی طرح یہ لیل حیات بھی ختم ہوگی اور صبح قیامت نکلے گی اس وقت آنکھیں کھلیں گی۔ تمام مخلوق بیدار ہوگی اور سب کیا کرایا سامنے آئے گا۔ فطرت پکار پکار کر جگا رہی ہے، مگر آہ ہم غافل ہیں اور خواب سرمستی میں غرق۔

وَيَوْمَ يُنفَخُ فِي الصُّورِ الخ۔ ثبوت قیامت کے ضمنی تذکرہ کے بعد آغاز قیامت کی کیفیت بیان فرماتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ بحکم الٰہی اسرافیل صور پھونکے گا پس پہلا نفخہ نفخۂ فزع ہوگا اور یہ طویل ہوگا اور دنیا کی آخری عمر میں ہوگا۔ قیامت ایسے لوگوں پر بپا ہوگی جن کے افعال جانوروں کی طرح ہوں گے۔

عام علماء کا قول ہے کہ صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا پہلا نفخۂ صعق اور دوسرا نفخۂ بعث ہوگا۔ آیت مذکورہ میں نفخۂ فزع میں سے دونوں میں سے کوئی نفخہ مراد ہے۔ قشیری، قرطبی اور ماوردی کے نزدیک نفخۂ بعث مراد ہے۔

شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ نفخہ تین بار ہوگا۔ پہلا نفخۂ فزع، دوسرا نفخۂ صعق یا نفخۂ موت تیسرا نفخۂ بعث۔

صحیح مسلم میں بروایت عبداللہ بن عمرو مذکور ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں دجال نکلے گا اور چالیس (سال، مہینے یا دن) (نسیان از راوی) تک رہے گا۔ پھر خدا تعالیٰ عیسیٰ بن مریم کو بھیجے گا گویا وہ عروہ بن مسعود (کی ہمشکل) ہوں گے۔ عیسیٰ دجال کا پیچھا کر کے اس کو قتل کریں گے۔ پھر سات برس تک لوگ ایسے اطمینان سے رہیں گے کہ دو آدمیوں میں بھی عداوت نہ ہوگی۔ اس کے بعد خدا تعالیٰ شام کی طرف سے ایک خوشگوار ہوا بھیجے گا جس کی وجہ سے روئے زمین پر جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا اس کی روح قبض ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص پہاڑ کے غار کے اندر گھس جائے گا تو وہاں بھی وہ ہوا پہنچ کر اس کی جان قبض کرے گی۔ پھر ایسے بدکار لوگ باقی رہ جائیں گے جو پرندوں کی طرح سبک اور درندوں کی طرح بے سمجھ ہوں گے۔ کسی اچھے برے کام کو نہ جانیں گے۔ شیطان مجسم ہو کر ان کے سامنے آئے گا اور کہے گا کیا تم میری بات مانو گے؟ لوگ کہیں گے ہاں۔ شیطان بت پرستی کا حکم دے گا۔ سب بت پرست ہو جائیں گے۔ ان کو روزی بکثرت ملے گی۔ بڑے عیش میں ہوں گے پھر صور پھونکا جائے گا جو شخص اس کی آواز سنے گا کان جھکا کر اس طرف توجہ کرے گا تاکہ اچھی طرح آسمان کی طرف سے سن سکے۔ صور کی آواز سب سے پہلے ایک شخص سنے گا جو اپنے اونٹوں کا پیاؤ درست کر رہا ہوگا۔ وہ سن کر بیہوش

ہو جائے گا اور سب لوگ بے ہوش ہو جائیں گے (یعنی مر جائیں گے) اس کے بعد پروردگار شبنم کی طرح مینہ برسائے گا جس سے لوگوں کے جسم پیدا ہوں گے پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب اٹھ کھڑے ہوں گے الخ۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صور صرف دو مرتبہ پھونکا جائے گا ایک نفخۂ موت یا نفخۂ صعق، دوسرا نفخۂ بعث یا نفخۂ حشر۔ نفخۂ فزع کا اس میں کہیں تذکرہ نہیں۔

میرے نزدیک مطابقت و توفیق کی بہتر صورت یہ ہے کہ اس طرح کہا جائے نفخہ دو ہی مرتبہ ہوگا، لیکن اول نفخہ کے ابتدائی حصہ کا نام نفخۂ فزع ہے جس سے عام گھبراہٹ پیدا ہو جائے گی اور بڑھتے بڑھتے یہی نفخہ نفخۂ صعق بن جائے گا جس سے تمام جان دار بیہوش ہو جائیں گے یعنی موت کی بیہوشی ان پر طاری ہو جائے گی اور سب مر جائیں گے۔ پھر مدت کے بعد دوبارہ نفخ صور سے سب زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ شاید ابن کثیر کا یہی مطلب ہے۔

اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ۔ یعنی جس کو خدا چاہے گا فزع صور سے بچائے گا اس سے آگے آیت میں آیا ہے وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ بہر حال ان دونوں آیات سے اتنا ثابت ہے کہ بعض لوگ فزع صور سے بمشیت الٰہیہ محفوظ رہیں گے، لیکن وہ کون لوگ ہوں گے؟ اس میں اختلاف ہے۔ مفسر فتح البیان کے نزدیک انبیاء و شہدا پر فزع طاری نہ ہوگا۔ بیضاوی وغیرہ نے انبیاء، شہداء، حور العین، خدام جہنم، حاملانِ عرش بلکہ عام ملائکہ اور مومنوں کو مستثنیٰ کیا ہے اور یہی صحیح ہے بشرطیکہ نفخۂ فزع سے نفخۂ اول کا ابتدائی حصہ مراد لیا جائے کیونکہ اگر انتہائی حصہ یعنی نفخۂ صعق مراد لیا جائے گا تو اس سے انبیاء تک بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ حضرت موسیٰ کے متعلق حضور والا نے ارشاد فرمایا وہ عرش کا پایہ پکڑے ہوں گے مجھے نہیں معلوم کہ وہ ان میں سے ہوں گے جن کو اللہ نے مستثنیٰ فرمایا ہے یا کوہ طور کی بیہوشی اس بیہوشی کا عوض ہو گئی یا وہ پہلے ہوش میں آ جائیں گے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ نفخۂ صعق کی تاثیر سے حضور والا بھی محفوظ نہ ہوں گے۔ البتہ ایک شبہ کیا جا سکتا ہے کہ صحیح مسلم کی حدیث مذکورۂ بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ صور اس وقت پھونکا جائے گا جب کہ دنیا میں کافر ہی کافر ہوں گے۔ جتنے اہلِ ایمان ہوں گے ان کی روحیں نفخۂ صور سے پہلے ہی اس خوشگوار ہوا سے جو ملک شام کی طرف سے آئے گی قبض ہو چکی ہوں گی۔ پھر جب کوئی مومن اس وقت موجود ہی نہ ہوگا تو مستثنیٰ کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ نفخۂ فزع کا اثر ہر زندہ دولوں پر ہوگا یعنی زندہ لوگ اسی مادی زندگی اور مردہ روحیں عالم ارواح میں گھبرا جائیں گی اور ذی شعور کائنات میں سے کوئی ایسا نہ ہوگا جس پر فزع طاری نہ ہو سوا ان لوگوں کے جن کو خدا تعالیٰ نے مستثنیٰ خواہ وہ انبیاء ہوں یا عام مومنین یا جلیل القدر فرشتے اور حاملانِ عرش ہوں یا عام ملائکہ، حوریں ہوں یا جہنم کے خدام یا کوئی اور کسی کی تخصیص نہیں۔

وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ۔ یعنی نفخۂ بعث کے بعد بارگاہِ الٰہی میں بلا توقف حاضر ہوں گے اور کسی کو تاخیر کی مجال نہ ہوگی۔ داخر کے معنی ذلیل کے ہیں۔ گویا بہ اضطرار احاضرِ بارگاہ ہوں گے۔ اس سے یہ ہرگز مستفاد نہیں ہو سکتا کہ اس روز خدا تعالیٰ انبیاء اور اولیاء کو بھی ذلیل کرے گا کیونکہ بعثت کے وقت عزت مقبولیت اور ذلت مردودیت کا کوئی موقعہ ہی نہ ہوگا۔ ذلت سے مراد قدرتِ الٰہیہ کا مسخر اور مطیع حکم ہونا ہے۔

تَحْسَبُهَا جَامِدَةً۔ یعنی پہاڑوں کو جو تم ثابت برقرار اور ایک جگہ جمے ہوئے خیال کرتے ہو قیامت کے دن وہ بادلوں کی طرح اڑتے رہیں گے۔ ایک اور آیت میں آیا ہے۔ يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا۔ سورۂ قارعہ میں ہے وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ الخ۔ قتادہ کے نزدیک نیکی سے مراد اخلاص ہے۔ امام زین العابدین نے کلمۂ توحید مراد لیا ہے۔ بہر حال اس آیت میں صراحت ہے کہ عام اہلِ ایمان فزع صور سے محفوظ ہوں گے۔

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ سئیہ سے مراد باجماع صحابہ و تابعین شرک ہے۔ متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ گناہگار مسلمانوں کے لئے دوامی جہنم نہیں ہے۔

مقصودِ بیان

قیامت کے قریب دابۃ الارض کا خروج حق ہے۔ دابۃ الارض انسانوں کی طرح کلام کرے گا اور کفر و ایمان کا قطعی فیصلہ کر دے گا۔ قیامت کے دن ہر امت کے کفار کو جمع کیا جائے گا۔ بغیر علم و واقفیت کے کسی چیز کا انکار نا سمجھی ہے اس سے نصیحت پکڑنی چاہیے علماء کے اس گروہ کو جو بغیر علم طبع زاد فتویٰ صادر کرتا ہے۔ نیز اس جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی اپنی دراز دستیوں سے باز آ جانا چاہئیے جو شرائع الٰہیہ اور قوانین ربانیہ سے واقف نہیں ان کے مصالح جاہل ہیں، لیکن ان کا مذاق اڑانے میں بہت جری ہیں۔ آیت اَلَمْ يَرَوْا الخ سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ اس دنیا کی یہ زندگی مثل رات کے ہے جس میں ہر گناہ و معصیت پر پردہ پڑا ہوا ہے اور ہر کافر بجائے خود مگن ہے، لیکن جب صبح قیامت ہوگی تو ساری حقیقت کھل جائے گی۔ نفخ صور سے کل کائنات پر ایک عام گھبراہٹ طاری ہو جائے گی۔ ہاں بعض لوگ اس عمومی فزع سے محفوظ بھی ہوں گے۔ خدا ظالم نہیں۔ کافروں کو ان کی بداعمالی کی سزا دی جائے گی وغیرہ

إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ ۖ وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ

(اے محمدؐ! کہہ دو) مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اُس شہر کے رب کی عبادت کروں جس نے اس کو حرم بنایا ہے ہر چیز اُسی کی ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ

مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْآنَ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ

فرماں بردار رہوں اور قرآن پڑھوں پھر جو کوئی راہ پر آجائے تو اپنے فائدے کے لئے راہ پر آئے گا اور جو گمراہ رہے تو تم

إِنَّمَا أَنَا مِنَ الْمُنْذِرِينَ ۝ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ ع

کہہ دو میں صرف ڈرانے والا ہوں کہو کہ تعریف اللہ کو زیبا ہے عنقریب وہ اپنی نشانیاں تم کو دکھائے گا سو تم انکو پہچان لوگے اور تمہارا رب تمہارے اعمال سے بےخبر نہیں ہے

تفسیر ہر شخص معمولی کمالات علمیہ حاصل نہیں کرسکتا نہ ہر آدمی میں یہ صلاحیت ہے کہ ہر قسم کا علم اس کو عطا کیا جائے۔ اگر فی نفسہٖ نفس ناطقہ میں خود ذاتی استعداد ہو بھی تب بھی موانع اور عوائق سنگ راہ بن جاتے ہیں۔ نقصان جوہر طریقۂ حصول علم کی غلطی جہت توجہ کی خرابی، حجاب تقلیدیہ سب امور نفس ناطقہ کو حصول علم سے مانع ہوتے ہیں۔ پھر یہ موانع تو علوم حکمیہ اور ادراکات فلسفیہ کے ہیں۔ ان تمام حقائق سے بالاتر قوت قدسیہ کا عمل ہے جو کسی ریاضت و محنت کا مرہون نہیں بلکہ محض کشف اور غیبی انکشاف کا نام ہے اور عموماً لوگ اس مقدس قوت سے محروم ہیں۔ سوا اس خاص گروہ کے جس کو خدا تعالیٰ نے عالم بالا کے نقوش علمیہ حاصل کرنے کی صلاحیت دی ہے۔ یہی گروہ اولیاء و انبیاء کا ہے۔ عالم بالا سے فیضان اور حظیرۂ قدس سے روشنی تو تمام اولیاء و انبیاء کو حاصل ہوتی ہے۔ لیکن کم و بیش کا فرق ہے مرتبہ میں تفاوت ہے۔ اولیاء کے اوصاف اور روشن قلوب پر انکشافات علمیہ الہام کے ذریعہ سے ہوتے ہیں اور انبیاء کی پاک روحوں پر غیبی پرتو اندازی الہام کے علاوہ وحی کے ذریعہ سے بھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت کی کرسی ولایت کے رتبہ سے بالاتر ہے اور ہر ولی نبی کا خوشہ چیں ہوتا ہے۔ اولیاء کا صرف ایک کام ہوتا ہے وہ یہ کہ جو نقوش علمیہ عالم بالا سے ان کو حاصل ہوں اور ان کی روشنی میں وہ اپنے نفس کی ظلمت کو دور کرنے کی کوشش کریں اور بس۔ لیکن انبیاء کا کام ان سے سخت ہے وہ اپنے نفس کی اصلاح پر بھی مامور ہیں اور دوسروں کو بھی ایسی تدبیریں بتانے پر مکلف ہیں جن سے ان کی ناؤ پار لگ جائے۔ انبیاء کے پاس جو وحی آتی ہے اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ سب سے پہلے اس وحی کے مطابق وہ اپنی زندگیوں کو سنواریں پھر اپنی امتوں کو وہی پیام پہنچادیں۔ لیکن خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی نبی کا یہ کام ہرگز نہیں کہ وہ ہاتھ سے پکڑ کر کسی کو غار سے کھینچ لے یا کسی کی ناؤ خود چلا کر پار لگادے۔ ان کا کام صرف رہنمائی اور نصیحت ہے۔ ایسی تدبیریں بتانی اس کا فرض ہے جس پر عمل کر کے قوم کو نجات ابدی مل جائے۔ لیکن اگر کوئی اس کے حکم پر عمل نہ کرے اور اس کی بتائی ہوئی راہ نجات پر نہ چلے تو یہ خود اس کی بدنصیبی ہے۔ نبی سے اس کا کوئی مواخذہ نہیں ہوسکتا۔ نبوت و رسالت کا یہ عام قاعدہ ہے۔ اسی قاعدے کے ماتحت حضور اقدسؐ کو خدا تعالیٰ نے آیاتِ بالا میں حکم دیا ہے کہ تمہارا مقدم ترین فرض یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرو بلکہ اپنی تمام مادی، روحانی، ظاہری اور باطنی قوتوں کو اللہ کا فرماں بردار بنادو اور مسلم ہوجاؤ۔ اس کے بعد تم اس بات پر مامور ہو کہ جو غیبی پیام تمہاری روح پر القا کیا جاتا ہے اور باطنی طور پر جو کچھ تمہارے سامنے پڑھا جاتا ہے اس سے لوگوں کو مطلع کردو اور لوگوں کو راہ نجات بتادو۔ اب جس کسی کو اس راستہ پر چلنا ہے چلے گا اور منزلِ مقصود پر پہنچ جائے گا جو کج روی اختیار کرے گا وہ تباہ ہوگا۔ کج روی کے نتیجۂ بد سے آگاہ کرنا تمہارا کام ہے اور ماننا نہ ماننا لوگوں کا کام ہے۔ اگر کوئی نہ مانے تب بھی موجب شکر ہے کہ اس نے تم کو راہِ ہدایت دکھا کر لوگوں کو سعادت و شقاوت اور فوز و ہلاکت کے طریقہ سے آگاہ کردیا۔

تحلیلِ اجزاء إِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ رَبَّ هَٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِي حَرَّمَهَا۔ الْبَلْدَة سے مراد مکہ ہے۔ خدا تعالیٰ نے مکہ کو حرمت عطا فرمائی۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے حضور اقدسؐ نے فتح مکہ کے روز ارشاد فرمایا وہ شہر ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق کے دن خدا تعالیٰ نے اس کو باحرمت بنادیا پس یہ شہر خدا داد حرمت کے تحت سب قیامت تک باحرمت ہے۔ یہاں کے کانٹے نہ کاٹے جائیں۔ شکار کو نہ بھڑکایا جائے۔ یہاں گرا ہوا مال نہ اٹھایا جائے۔ ہاں وہ شخص اٹھا سکتا ہے جس کو شناخت کرانی مقصود ہو نہ یہاں کے درخت کاٹے جائیں الخ۔ (بخاری) یہ حدیث شہرت بلکہ تواتر کی حد کو پہنچی ہوئی ہے گزشتہ آیات میں آغاز انجام پر کافی تبصرہ فرمایا تھا۔ ان آیات میں اپنے نبی کو اصلاح نفس کا حکم دیا اور حرمت مکہ پر یادگار کر کے گویا ساکنانِ مکہ کو خطاب

اور اہل عرب کو عموماً تنبیہ فرمائی کہ خدا تعالیٰ نے تمہارے اس شہر کو باحرمت بنایا اس کے کعبہ کو مرجع خلائق قرار دیا مگر تم نے اپنی بداعمالیوں اور نافرمانیوں سے اس کو گندہ کر دیا۔

وَلَهُ كُلُّ شَيْءٍ الخ اوپر کی آیت میں بیان تھا کہ اس خدا کی پرستش کرو جس نے کعبہ کو باحرمت بنایا۔ اس سے شبہ ہو سکتا تھا کہ ملکیت و ربوبیت کا تعلق کیا صرف کعبہ سے ہی ہے، اس لئے یہاں بتایا کہ کوئی خصوصیت نہیں، اس کا اختیار تخلیقی و تصرفی تو ہمہ گیر ہے۔ ہر چیز اس کی مخلوق، اس کے زیر تصرف اور تحت اختیار ہے۔

وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ گزشتہ آیات میں صرف عبادت الٰہیہ کا حکم دیا گیا تھا۔ اس میں عمومی اطاعت و فرماں پذیری کی تعلیم دی گئی۔ تاکہ دو باتیں معلوم ہو جائیں۔ اول یہ اتباع شریعت نام صرف عبادت الٰہیہ کا ہی نہیں بلکہ اپنی پوری زندگی اطاعت الٰہی میں صرف کر دینی اور گفتار، اطوار، کردار کو تابع حکم بنا دینا اور کل نفس و نفسانیات کو قربان کر دینا ہی درحقیقت اسلام ہے اور یہی اتباع شریعت کی تکمیل ہے۔

دوسرے یہ دکھانا مقصود ہے کہ اللہ کی عبادت و اطاعت اور اسلام و فرماں پذیری سے عام عوام تو درکنار مقرب نبی کو بھی رہائی نہ ہوتی جا ہے جس طرح مسلمان ہونے پر مکلف ہیں اسی طرح نبی بھی مامور ہیں۔ ان کا رتبہ عالی عبادت الٰہیہ اور اسلام و انقیاد سے ان کو مستثنیٰ نہیں کر سکتا۔ بلکہ

وَأَنْ أَتْلُوَ الْقُرْآنَ۔ نبی کا فرض تو اور بھی زیادہ ہے۔ اپنے نفس کی اصلاح کے ساتھ احکام قرآنی کی تبلیغ بھی ان کے لئے ضروری ہے۔ تلاوت سے مراد تبلیغ ہے۔ ابن کثیر نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ صرف پڑھ لینا مراد نہیں ہے۔

فَمَنِ اهْتَدَىٰ الخ۔ اب رہی کسی کی رہائی یا گمراہی تو نبی سے اس بات کا کوئی تعلق نہیں۔ نبی کا کام صرف اتنا ہے کہ سیدھے راستے سے ہٹ کر چلنے والوں کو ہلاکت و بربادی پر متنبہ کر دیں۔ ماننا نہ ماننا ان کا کام ہے۔ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے پر چلے گا منزل مقصود پر پہنچ جائے گا نہ چلے گا ہلاکت ابدی کے غار میں گر جائے گا۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الخ۔ ابن کثیر نے اس آیت کا تفسیری مطلب اس طرح بیان کیا کہ حمد کا استحقاق اور ثبوت اس معبود برحق کے لئے ہے جس نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا اور کسی کے کفر پر مواخذہ نہیں فرمایا۔ جب تک اتمام حجت کے لئے رسول کو مبعوث نہ فرما دیا اور اپنی قدرت کی نشانیاں ظاہر نہ فرما دیں۔ اب جو شخص سرتابی کرے گا تو یہ نہ سمجھے کہ خدا اس کے کرم سے ناواقف ہے اور مواخذہ نہ کرے گا۔ خدا سے کوئی چیز مخفی نہیں نہ وہ کسی شے سے ناواقف ہے۔

مقصود بیان

مکہ کی حرمت قطعی ہے یعنی وہاں کے درختوں کو کاٹنا، کانٹوں کو چھانٹنا، جانوروں کو شکار کرنا (ما عدا حرم) ناجائز ہے۔ وہ جانور مستثنیٰ ہیں جن کو حضور والا نے مستثنیٰ فرمایا ہے۔ مثلاً سانپ، بچھو وغیرہ۔ جتنا جس کا مرتبہ بلند ہوتا ہے اتنی ہی خدمت سپردہ اکی سخت ہوتی ہے۔ عوام کا کام صرف اصلاح نفس ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ علاوہ اپنی اصلاح کے دوسروں تک پیام اصلاح پہنچانا بھی تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان بشرطیکہ دیوانہ یا بچہ نہ ہو فرائض شرعیہ سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکلف تھے اور حقوق عبادت و اصلاح کا اہم مطلوبی تھا تو دوسرے اولیاء و ابرار کی کیا مجال ہو شرعی فرائض سے اپنے سبکدوش ہونے کا دعویٰ کر سکیں۔ پس جھوٹے ہیں وہ لوگ جو اصحاب معرفت کو تکالیف شرعیہ سے مستثنیٰ خیال کرتے اور طریقۂ رسول اللہ کے خلاف ہیں۔ وہ جاہل صوفی جو فقر کے مدعی ہیں اور فرائض اسلامی کے ادا کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں۔

آیت فَمَنِ اهْتَدَىٰ الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کا کام رہنمائی ہے رہبری نہیں۔

سُورَةُ الْقَصَصِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ ثَمَانٌ وَثَمَانُونَ آيَةً وَتِسْعُ رُكُوعَاتٍ

سورۂ قصص مکی ہے اس میں اٹھاسی آیات اور نو رکوع ہیں

اس سورت کا نام سورۂ موسیٰ بھی ہے۔ اس میں ۹ رکوع ۸۸ آیات ۱۴۵۴ کلمات ۶۰۱۱ حروف ہیں۔ حسن، عکرمہ، عطاء اور اکثر تابعین علماء کے نزدیک پوری سورت مکی ہے۔ شیخ جلال الدین محلی نے آیت إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ سے إِلَىٰ مَعَادٍ تک مستثنیٰ کی ہے اور فرمایا ہے یہ آیت جحفہ میں نازل ہوئی وہ نہ مکی ہے نہ مدنی، اس لئے آیت مذکورہ کو انہوں نے مستثنیٰ کیا ہے اور مدنی بھی نہیں ہے۔ میرے نزدیک شیخ محی الدین کا یہ قول صحیح نہیں کیونکہ اکثر علماء کا یہ قول ہے کہ جو آیات ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں خواہ کسی مقام پر ان کا نزول ہوا ہو وہ مکی ہیں۔ اگرچہ جحفہ میں نازل ہوئی اس کو مکی یا مدنی کہا جائے گا اور جو بعد

صحیح میں نزول ہجرت کے بعد ہوا۔ لامحالہ اس کو مدنی کہنا پڑے گا۔ کیونکہ تمام آیات قرآنی بقول مفسرین یا تو مکی ہیں یا مدنی۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے

طٰسٓمّٓ ۝ تِلۡكَ اٰيٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِيۡنِ ۝ نَتۡلُوۡا عَلَيۡكَ مِنۡ نَّبَاِ مُوۡسٰى وَفِرۡعَوۡنَ بِالۡحَـقِّ

یہ روشن کتاب کی آیتیں ہیں ہم تم کو موسیٰ اور فرعون کا کچھ واقعی حال ایماندار قوم (کی ہدایت) کے لئے

لِقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ۝ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِى الۡاَرۡضِ وَجَعَلَ اَهۡلَهَا شِيَعًا يَّسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَةً

پڑھ کر سناتے ہیں بلاشبہ فرعون اُس زمین پر بڑھ چڑھ گیا تھا وہاں کے رہنے والوں کو اُس نے الگ الگ گروہ بنا دیا تھا جس میں سے

مِّنۡهُمۡ يُذَبِّحُ اَبۡنَآءَهُمۡ وَيَسۡتَحۡىٖ نِسَآءَهُمۡ‌ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الۡمُفۡسِدِيۡنَ ۝ وَنُرِيۡدُ اَنۡ نَّمُنَّ

ایک گروہ کو تو اتنا کمزور بنا دیا تھا کہ اُن کے لڑکوں کو ذبح کیا کرتا تھا اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتا تھا وہ بیشک تباہی انگیز تھا اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں

عَلَى الَّذِيۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا فِى الۡاَرۡضِ وَنَجۡعَلَهُمۡ اَئِمَّةً وَّنَجۡعَلَهُمُ الۡوٰرِثِيۡنَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمۡ

پر احسان کریں جن کو ملک میں کمزور سمجھا گیا تھا اور اُن کو پیشوا بنا دیں اور اُن کو وارث ملک کردیں اور اُس ملک میں

فِى الۡاَرۡضِ وَنُرِىَ فِرۡعَوۡنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوۡدَهُمَا مِنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَحۡذَرُوۡنَ ۝ وَاَوۡحَيۡنَاۤ

اُن کو جما دیں اور فرعون و ہامان اور اُن کے لشکروں کو بنی اسرائیل کے ہاتھوں وہ چیز دکھا دیں جس کا وہ خطرہ کیا کرتے تھے ہم نے موسیٰ کی

اِلٰٓى اُمِّ مُوۡسٰٓى اَنۡ اَرۡضِعِيۡهِ‌ ۚ فَاِذَا خِفۡتِ عَلَيۡهِ فَاَلۡقِيۡهِ فِى الۡيَمِّ وَلَا تَخَافِىۡ وَلَا تَحۡزَنِىۡ‌ ۚ اِنَّا

ماں کو الہام کیا کہ موسیٰ کو دودھ پلا اور جب تجھے اس پر خوف ہو تو اس کو دریا میں ڈال دے اور کچھ خوف و غم نہ کر ہم ضرور

رَآدُّوۡهُ اِلَيۡكِ وَجَاعِلُوۡهُ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۝ فَالۡتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرۡعَوۡنَ لِيَكُوۡنَ لَهُمۡ

اس کو تیرے پاس لوٹا دیں گے اور اس کو پیغمبر بنائیں گے غرض فرعون کے گھر والوں نے موسیٰ کو اُٹھا لیا تاکہ ان کے لئے وہ دشمن

عَدُوًّا وَّحَزَنًا‌ ؕ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوۡدَهُمَا كَانُوۡا خٰطِـئِيۡنَ ۝ وَقَالَتِ امۡرَاَتُ

اور باعث اندوہ بن جائے یقیناً فرعون و ہامان اور اُن کی جماعتیں خطاکار تھیں فرعون کی بیوی نے

فِرۡعَوۡنَ قُرَّتُ عَيۡنٍ لِّىۡ وَلَكَ‌ ؕ لَا تَقۡتُلُوۡهُ‌ ۖ عَسٰٓى اَنۡ يَّـنۡفَعَنَاۤ اَوۡ نَـتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمۡ لَا

کہا یہ میری اور آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اس کو قتل نہ کرو کیا عجب ہے کہ یہ ہمارے کام آئے یا ہم اس کو بیٹا بنا لیں وہ انجام سے بے خبر تھے

يَشْعُرُونَ ۝ وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسٰى فٰرِغًا ۖ إِنْ كَادَتْ لَتُبْدِي بِهِ لَوْلَا أَنْ رَّبَطْنَا

نہ تھے ۔ موسیٰ کی ماں کا دل بے قرار ہوگیا اگر ہم اس کو ایماندار رکھنے کے لئے اُس کے دل پر بندش نہ کردیتے

عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ فَبَصُرَتْ بِهِ عَنْ جُنُبٍ

تو قریب تھا کہ وہ قصہ کو ظاہر کردیتی موسیٰ کی ماں نے موسیٰ کی بہن سے کہا اس کے پیچھے پیچھے چلی جا چنانچہ وہ اسکو دور سے دیکھتی رہی

وَّهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلٰٓى

اور لوگوں کو اس کی خبر بھی نہ تھی اور ہم نے پہلے سے موسیٰ پر دودھ پلائیوں کی بندش کررکھی تھی تو موسیٰ کی بہن نے کہا کیا میں تم کو ایسے گھرانے

أَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُونَهُ لَكُمْ وَهُمْ لَهُ نٰصِحُونَ ۝ فَرَدَدْنٰهُ إِلٰٓى أُمِّهِ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا

کی خبر دوں جو تمہاری طرف سے خیر خواہی کے ساتھ اس کی پرورش کریے غرض ہم نے موسیٰ کو اُن کی ماں کے پاس لوٹا دیا تاکہ اس کی

وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ أَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ ع

ع ۳

آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور غمگین نہ ہو اور جان لے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے مگر اکثر لوگ ناواقف ہیں

تفسیر

ہم متعدد مقامات پر لکھ چکے ہیں کہ خداتعالیٰ نے انسان کو تین قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ عقلیہ، بہیمیہ، سبعیہ۔ جو لوگ سعید الفطرت اور سلیم الجبلت ہیں اُن کی عقلیہ قوت خود بھی اعتدال پر ہوتی ہے اور موخر الذکر دونوں قوتوں کو اعتدال پر رکھتی ہے، وہ مخدوم ہوتی ہے اور یہ دونوں خادم، وہ فرماں روا ہوتی ہے اور یہ دونوں فرماں پذیر، لیکن جو لوگ معکوس الخلقت اور کثیف نژاد ہوتے ہیں۔ ان کی مادی قوتیں عقلی قوت پر مسلط ہوتی ہیں۔ ان کی دانش شہوت و غضب کی تابع ہوتی ہے۔ وہ اپنے دماغوں پر شیطانی تدبیریں اور طاغوتی اسکیمیں حکمراں کر لیتے ہیں۔ ان کے لئے طریقۂ زندگی میں کج روی کے دو مظاہر ہوتے ہیں۔

(۱) یا تو وہ اپنی مادی قوتوں کو جائز امور سے بھی روک دیتے ہیں اور فطری اقتضائیات کو مردہ کر لیتے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ اس مادی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور سواری کو منزلِ مقصود پر پہنچنے سے قبل قتل کردینے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سوار بھی راستہ میں پڑا رہ جاتا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہوتا ہے۔ تمام مادی تعلقات قطع کرنے کے بعد انسان کی روح منزلِ معرفت پر پہنچنے سے پہلے ہی افسردہ ہوجاتی ہے اور ادھر ادھر وادیٔ تحیر میں سرگرداں پھرتی ہے۔ یہ گروہ ان جاہل صوفیوں، بن باس کرنے والے جوگیوں اور تارک الدنیا سادھوؤں کا ہے جو دنیوی تعلقات منقطع کر لیتے ہیں اور اپنے بدن کو خلافِ فطرت ریاضتیں کرکے اور محنت سے سخت تکلیفیں دیکر قبل از وقت مردہ کر لیتے ہیں۔ نتیجہ میں ان کو کامرانی نہیں ہوتی، راہ سعادت نہیں ملتی، روح تفکر مردہ ہوجاتی ہے اور معرفت کے ابتدائی درجات طے کرنے سے قبل ہی بیابانِ حیرانی میں گم ہوکر خسر الدنیا والآخرۃ کے مصداق بن جاتے ہیں۔ لوگ ان کو اولیاء، اصفیاء اور اربابِ قوت قدسیہ خیال کرتے ہیں اور جہلاء خدا رسیدہ بزرگ خیال کرتے ہیں، مگر حقیقت میں وہ زندیق شیطان ہوتے ہیں جو کائنات کی فطرت کو بدلنا چاہتے ہیں اور زبردست گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ خود گمراہ ہوتے ہیں دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا۔

(۲) یا شہوانی اور غضبی قوتوں کو تمامًا مطلق العنان چھوڑ دیتے ہیں کہ عقل و دانش کے قوی ان کو روکنے سے عاجز ہوجاتے ہیں بلکہ ان کی قوت بینش پر بھی درندگی و حیوانیت کا تسلط پورا ہوجاتا ہے، وہ ہر جائز و ناجائز کی قیود سے آزاد ہوتے ہیں۔ کوئی عرفی، عقلی اور شرعی قانون ان کو جکڑ بند نہیں کرتا۔ طرح طرح کی شیطانی اسکیمیں انہی کار برآری کے لئے وہ سوچتے اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ پرائی زمین، اجنبی عورت اور بیگانہ مال سے ان کے دہن آز کو باک نہیں ہوتا۔ حکومت استبدادی جبریت عامہ، ہر دوسروں کی آزادی کا سلب، چوری، ڈاکہ زنی، محترم عزتوں کی بربادی سب کچھ ان کی نظر میں جائز ہوتا ہے۔ ان کی خواہش کی ادنیٰ مخالفت محال الوقوع

کی جان مال آبرو اور خاندان کو برباد کرنے کے لئے کافی سمجھتی ہوتی ہے۔ یہ اپنی ذلیل ترین نفسانیت پر لاکھوں معصوم جانوں کو قربان کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ اسی موخرالذکر گروہ سے مصر کا ایک سرکش ظالم فرعون بھی تھا جس نے اپنی خواہشات پر بنی اسرائیل کے قیمتی ہاتھ پاؤں بھینٹ چڑھادئے تھے۔ ان کو مدنی حقوق اور شہری آزادی سے بھی محروم کردیا تھا۔ تجارت ان کی آزاد نہ تھی، ملازمت میں ان کا کوئی حق نہ تھا، ان کو شودر سمجھا جاتا تھا جن کا فرض یہی یہ تھا کہ قبطیوں کی خدمت کریں، محنت شاقہ، اجرت قلیل اور عموماً بیگار اور بصورت انکار سزائے تازیانہ، تاریک کنوؤں میں قید کرنا، حاملہ عورتوں سے تین تین منزلوں کے مکانوں پر پتھر کھنچوانا اور ذلیل سے ذلیل کام لینا یہی ان کے معدلت گوش آقاؤں کا طرۂ امتیاز تھا اور ان تمام مظالم کے باعث وہ قانونی سفاکی تھی جس کے بانی فرعون اور اس کے ارکان حکومت تھے پھر ظالموں نے اپنی سفاکیوں پر بس نہیں کیا بلکہ فرعون کی ایک موہوم خواب کی بے حقیقت تعبیر پر محض اپنی حکومت کے بیجا تحفظ کے غیر حقیقی تخیل کے باعث بنی اسرائیل کے ہزاروں نرینہ بچوں کو تہ تیغ کردیا اور معدن نھی روحیں! پنے پاک بدنوں سے جدا ہو کر ظالموں کی دہائی دینے بارگاہ احکم الحاکمین میں پہنچیں، اس وقت دربار قہاریت جوش میں آیا۔ ننھی روحوں کی فریاد سے مصر کی سرزمین پر غیبی شعلہ بار ہوائیں چلنے لگیں موسیٰؑ پیدا ہوئے، فرعون کے گھر میں پرورش پائی، جوان ہوئے، نبی زادی سے شرعی عقد کیا، کوہ طور پر نبوت کی خلعت پہنی پھر لاٹھی کی شکل میں قوتِ جبروت اور ید بیضا کی شکل میں ملکوتی قوت کو ساتھ لے کر دوبارہ دربار فرعون میں آدھمکے۔ بڑے بڑے مناظر ہوئے مباحثے ہوئے، مجادلے ہوئے بالآخر مقاتلہ کا وقت آگیا تو اپنی قوم کو ساتھ لے کر اللہ کا نام لے کر وطن، جائیداد، گھر بار سب کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ غضبناک شیطان کا پارۂ شیطنت چڑھ گیا۔ ان کو کب گوارا تھا کہ کوئی ان کی مرضی کے خلاف اپنی جائیداد اور گھر بار چھوڑ کر صرف معصوم جان کو بھی لے کر چلا جائے سب شیطان پیچھے چڑھ دوڑے، ابلیس نے آنکھوں پر پردے ڈال دیئے۔ بحر قلزم کو خشک دیکھ کر خیال کیا کہ ہمارے ملک الاجہاں پناہ کے رعب سے پانی خشک ہو گیا ہے۔ جسمانی قوتوں سے آگے بڑھ کر دماغی قوتوں پر شیطان کی حکومت ہو جاتی ہے تو مت ماری جاتی ہے اور عقل کا تباہ ہونا ہی ہلاکت کی نشانی ہے۔ فرعون اور اس کے ساتھیوں کی مت ماری گئی، سب دریا میں گھس پڑے، غضب الٰہی کی شعلہ بار موج آئی اور پانی سے کھینچ کر جہنم کی آگ میں لے گئی۔ مفصل قصہ اور تحقیق مطالب تحلیل اجزاء کے ذیل میں پڑھو۔

تحلیلِ اجزاء

طٰسٓمٓ یہ حروف مقطعات متشابہات میں سے ہیں۔ ان کی حقیقی تاویل سوا خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ بعض تفسیری مطالب علماء بیان کرتے ہیں، لیکن وہ فی الحقیقت مراد نہیں، اس لئے قلم کو روک لینا ہی مناسب ہے۔ اللّٰہ اعلم بمرادہٖ۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ۔ کتاب مبین سے مراد قرآن ہے۔ مُبِیْن کے دو معنی ہیں (۱) ظاہر اور روشن کرنے والا (۲) ظاہر اور روشن۔ قرآن میں دونوں معنی موجود ہیں۔ قرآن حق کو باطل سے، صحیح کو غلط، خیر کو شر سے، راستی کو کجی سے اور ہدایت کو گمراہی سے جدا کرنے والا ہے۔ راہِ سعادت اور طریق نجات اس سے واضح ہو جاتی ہے پھر خود بھی اپنی صداقت و حقانیت میں اتنا روشن ہے کہ اپنی نظیر آپ ہی ہے کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں "آفتاب آمد دلیل آفتاب" مطلب یہ ہے کہ مندرجہ ذیل آیات اس کتاب کی ہیں جو گزشتہ حوادث کو صحیح صحیح بیان کرنے والا، آئندہ واقعات کی سچی تصویر کھینچنے والا اور اصلاحی قوانین حیات کی مفید ترین روشن تعلیم دینے والا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا پورا قصہ بنی اسرائیل کے تاریخی واقعات، موسیٰ کے معجزات، حق و باطل کا مقابلہ حق کا غلبہ، باطل کی شکست، نبوت کی طاقت کے مقابلے میں فرعون ایسے قہار پُر جبروت بادشاہ کی تباہی جس طور پر ذیل کی آیات میں بیان کی گئی ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ تاریخی صفحات کی ورق گردانی کے بعد صحیح تنقیح اس سے اختلاف نہیں کرسکتی۔ اگر قرآن صادق نہیں تو گزشتہ واقعات کی اتنی صحیح تصویر کشی کس طرح ممکن تھی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعہ سے ان واقعات کا علم نہیں ہوا تو پھر کس نے بتائے جن واقعات کو بیان کرنے میں اہل کتاب کے فرقے باہم مختلف تھے، ان پر صحیح ریمارک کس نے سکھایا اور اصل لب لباب کس نے نکالا۔ ان تمام کیفیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن واقعی مبین الصداقت ہے اور مظہر الحقائق ہے۔

نَتْلُوْا عَلَيْكَ مِنْ نَّبَاِ مُوْسٰى وَفِرْعَوْنَ بِالْحَقِّ موسیٰ اور فرعون کے کل واقعات کا مفصل بیان مقصد قرآنی سے غیر متعلق ہے۔ قرآن داستان کی کتاب نہیں۔ درحقیقت یہ اصلاحی پروگرام ہے جو اہلِ ایمان کو راہِ نجات دکھاتا ہے، بشارت و انذار اور وعظ و تذکیر کے لئے جتنے قصہ کی ضرورت ہے اتنا قرآن نے بیان کردیا تاکہ سننے والے عبرت حاصل کریں۔ بشرطیکہ ایمان کی صلاحیت ان کے دلوں میں موجود ہو۔ پورا قصہ ظاہر کرنا اگرچہ لذت بخش اور لطف آفریں ضرور ہے مگر لاحاصل ہے۔ ہدایت و اصلاح کو اس سے تعلق نہیں۔ نبی کے ساتھ جبروتی اور ملکوتی طاقتوں کا ہونا مغرور ذی جاہ بادشاہ کا بادۂ نخوت سے سرشار رہنا، نفس پرست انسان کا غریبوں کی آزادی سلب کرنا اور اپنی نفسانیت کے دیوتا پر لاکھوں غریبوں کو قربان کرنا اور ننھی معصوم جانوں کو بھینٹ چڑھانا پھر حق و باطل کے مقابلے کے

وقت باطل کا شکست کھانا، طاقتور فرعون کی طاقت کا برباد ہونا اور کمزور اسرائیل کا برسرِ حکومت ہونا اتنے قصہ سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے جتنا ان آیات میں بیان فرمایا ہے اسی لئے فرمایا کہ ہم موسیٰ اور فرعون کا کچھ قصہ تمہارے سامنے بیان کرتے ہیں جتنا اصلاح و ہدایت کے لئے ضروری ہے۔

اہلِ کتاب نے اپنی کتابوں میں تحریفات و تغیرات بکثرت کر لئے تھے۔ بعض مقامات پر تو کتب الٰہیہ کو مجموعۂ داستان بنالیا تھا۔ تمام صحیح غلط رطب یابس قصے بغیر کسی ثبوت کے درج کر دیئے تھے، مگر قرآن نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے جتنا قصہ بیان کیا وہ من و عن صحیح ہے اور ہر قسم کی خرافات سے پاک ہے، اسی لئے بالحق فرمایا یعنی موسیٰ و فرعون کا جتنا قصہ ہم نے بیان کیا وہ سچا اور صحیح ہے۔ خلاف واقعہ آمیزشوں سے پاک ہے۔

عَلَا فِي الْاَرْضِ۔ بظاہر الارض سے فرعون کے ممالک مقبوضہ مراد ہیں۔ یعنی اپنی حدود حکمرانی میں فرعون سب سے بڑھا چڑھا ظالم اور جابر تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عام زمین مراد لی جائے یعنی اس وقت زمین پر جتنے بادشاہ تھے فرعون سب سے زیادہ ظالم اور سرکش تھا۔ اول معنی قوی ہیں۔

وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا۔ شیع جمع ہے شیعۃ کی اور شیعہ کے معنی ہیں گروہ یعنی فرعون نے اپنی رعایا کو گروہ در گروہ کر دیا تھا اور باہم پھوٹ ڈال کر حکومت کر رہا تھا۔ یا یہ مطلب ہے کہ ایک گروہ کو اس نے سب سے بالا اور مخدوم بنا دیا تھا اور دوسرے گروہ کو ذلیل اور خدمت گار کر دیا تھا۔ قبطیوں کو اس نے حکومت میں حصہ دیا تھا۔ ان کے لئے جدا قانون تھا اور بنی اسرائیل کو شودر بنا رکھا تھا ان کو مدنی حقوق سے کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔ یہ مطلب بھی ممکن ہے کہ فرعون نے اپنی عیاریوں اور دراز دستیوں اور ستم آفرینیوں سے سب کو اپنا مطیع و منقاد بنا رکھا تھا۔ نیشاپوری نے تشیع کے معنی اطاعت و انقیاد ہی لکھا ہے۔

يَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ۔ طائفہ سے مراد ہے اسرائیلی گروہ۔ فرعون نے بنی اسرائیل کو کمزور یعنی خدمت گار بنا رکھا تھا۔ ان کو تجارت میں آزادی نہ تھی۔ ملازمت کے حقوق میسر نہ تھے، دماغ اور زبان پر قید لگائی ہوئی تھی۔ بنی اسرائیل کی طاقت کو برباد کرنے اور کمزور بنانے کا جو طریقہ ہوسکتا تھا اور جو تدبیر ممکن تھی فرعون نے اس سے دریغ نہ کیا تھا۔ گویا بنی اسرائیل کے متعلق فرعون کی وہی پالیسی تھی جو اس زمانہ میں عموماً ظالم حکومتوں کی اپنی رعایا کے متعلق ہوتی ہے۔ پھوٹ ڈلوانا، گروہ بندی کرانا، ہر طرح سے ہر طریق سے رعایا کی طاقت کو کمزور کرنا پھر چین سے حکومت کرنا اس زمانے کی حکومتوں کا وطیرہ ہے۔ فرعون کا صرف بنی اسرائیل کے متعلق یہ شعار تھا۔

يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ الخ۔ ظالم فرعون نے گزشتہ شدائد و مصائب ڈھانے پر ہی بس نہیں کیا بلکہ بنی اسرائیل کی قطع نسل اور تذلیل کے درپے ہوگیا۔ اس کا حکم عام ہوگیا کہ اسرائیلیوں کے جو نرینہ بچے پیدا ہوں وہ قتل کر دیئے جائیں اور لڑکیاں ہوں تو زندہ چھوڑ دی جائیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ لڑکے قتل ہوتے رہیں گے تو بنی اسرائیل کی نسل بڑھ نہ سکے گی اور رفتہ رفتہ یوں ہی ختم ہو جائیں گے اور لڑکیاں ہوں گی تو قبطیوں کے زیر تصرف رہیں گی جس کی وجہ سے بنی اسرائیل کو کبھی آنکھ اٹھانے کا موقع نہیں ملے گا۔ یہ وجہ بھی بیان کی گئی ہے کہ فرعون نے کوئی ہیبت ناک خواب دیکھا اس کی تعبیر کے ذیل میں یا یوں ہی ستاروں کی حرکات کو دیکھ کر کاہنوں اور نجومیوں نے بتایا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو قبطیوں کی حکومت کو برباد کر دے گا۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ جب نورِ اصلاح پر افساد کے موٹے پردے پڑ جائیں اور قوت عقلیہ مادی قوتوں کے زیر تصرف آجاتی ہے اور آدمی مطلق العنان شیطان بن جاتا ہے اس وقت اپنی ایک اینٹ کی حفاظت کی خاطر دوسروں کی عالی شان کوٹھیاں ڈھا دینے سے دریغ نہیں کرتا اور اپنی ذات کو موہومی خطرہ سے بچانے کے لئے لاکھوں معصوم جانوں کو بے باکی کے ساتھ لوٹنے میں بھی اس کو تامل نہیں ہوتا یہی حال فرعون اور قبطیوں کا تھا۔ موہومی خواب کی موہومی تعبیر نے بنی اسرائیل کی ہزاروں معصوم جانوں کو بے باکی کے ساتھ لوٹنے کی اجازت دے دی، اس لئے خدا تعالیٰ نے فرمایا:۔

اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ۔ فرعون اہلِ فساد میں سے تھا۔ یعنی اس کا جذبۂ اصلاح مُردہ ہو چکا تھا نہ فقط یہ کہ وہ خود بدکردار تھا بلکہ وہ دنیا میں تباہ کاری پھیلانے کو پسند کرتا تھا۔ شیخ ابن کثیر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ فرعون کو اپنی بربادی کی خبر شاید بنی اسرائیل سے ہی پہنچی تھی کیونکہ جب حضرت ابراہیمؑ اپنی بی بی سارہ کو لے کر مصر میں داخل ہوئے اور شاہ مصر نے سارہ کی طرف دست گناہ بڑھایا اور سارہ کی بددعا سے اس کا ہاتھ شل ہوگیا اور توبہ کرنے پر پھر اچھا ہوگیا۔ اسی طرح تین مرتبہ کمبخت نے بہ نیت بد کی اور آخر میں جب قطعی عزم کر کے اپنی دراز دستی سے تائب ہوا اور حضرت سارہ نے دعا کی اور فالج زدہ ہاتھ اچھا ہوگیا تو مجبور ہو کر ہاجرہ نام ایک کنیز حضرت سارہ کی خدمت کے لئے دی اور حکم دیا کہ یہ لوگ آدمی نہیں جنات ہیں ان کو ملک سے نکال دو۔ چنانچہ حضرت ابراہیم سارہ کو لے کر چلے آئے، مگر واپسی کے وقت آپ نے سارہ سے فرمایا (بادشاہ نے تجھے نکالنے کا حکم دیا تو دلگیر نہ ہو) تیری نسل سے ایک شخص پیدا ہوگا جس کے ذریعہ سے

فرعون مصر ہلاک ہوگا۔ یہ بشارت بنی اسرائیل کے پاس الہٰی آئی تھی اور بنی اسرائیل سے قبطیوں نے سن کر فرعون تک پہنچائی۔ بہرحال کچھ بھی ہو قطع نسل کے ارادے سے فرعون نے ظالمانہ حکم دیا ہو یا نجومیوں کی تعبیر کے سبب یا بنی اسرائیل کی موروثی بشارت کی وجہ سے۔ بنی اسرائیل کے نرینہ بچے بے دریغ ذبح کیے جانے لگے، لیکن تقدیر الہٰی نہیں ٹلتی۔ فرعون اپنی تدبیروں سے تقدیر الہٰی یا رفتار سیارگان یا تعبیر خواب کو بدلنا چاہتا تھا اور یہ اس کی انتہائی کم فہمی اور بے وقوفی تھی۔

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا خدا کو منظور تھا کہ وہ بنی اسرائیل جن کو کمزور کر دیا اور ذلیل بنانے کی شیطانی تدبیریں کی جاتی تھیں انہیں کو اپنے فضل سے سرفراز فرمائے۔ دنیوی بادشاہت اور دینی سیادت ان کو عطا فرمادے اور فرعون و فرعونیوں کو ہلاک کر کے وسطی ایشیا (الارض) کی حکومت ان کو مرحمت فرمادے اور فرعون ہامان اور ان کے گروہ کو وکھادے کہ جس حکومت کے زوال کا ان کو اندیشہ ہے وہ ضرور ہو کر رہے گا اور بنی اسرائیل کے ہاتھوں ہو کر رہنے کا۔ چنانچہ اللہ کا منشا پورا ہوا۔ شام، فلسطین اور عراق کا بیشتر حصہ بنی اسرائیل کے زیر حکومت آگیا اور فرعون وغیرہ غارت ہوئے اور ہزار برس سے زیادہ بنی اسرائیل کی سلطنت رہی۔

نوٹ: وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ سے یہ مراد نہیں کہ ملک مصر کا وارث ہم بنی اسرائیل کو بنادیں۔ کیونکہ مصر میں حکومت کبھی اولاد اسرائیل کو نہیں ملی تھی نہ بنی اسرائیل یہاں لوٹ کر آئے نہ حضرت موسیٰ کے زمانے کے فرعون کی تباہی کے بعد اس کے خاندان سے حکومت زائل ہوئی بلکہ چند پشتوں تک برابر اسی خاندان میں سلطنت رہی۔ مراد صرف یہ ہے کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے قبطیوں کو دولت و مال وجاہ و حشم اور عزت و حکومت عطا فرمائی تھی اسی طرح فرعون موسیٰ کی ہلاکت کے بعد بنی اسرائیل کو بھی ان نعمتوں سے سرفراز فرمانا مقصود تھا۔ اسی بنا پر الارض سے مراد ہم نے شام، فلسطین وغیرہ لیے ہیں کیونکہ انہی ممالک میں اسرائیلیوں کو عمومی اقتدار اور تسلط حاصل ہوا تھا۔ جن مفسروں نے فرعون کے مال متاع اور حکومت و ملک کا وارث بنی اسرائیل کو بنانے کی صراحت کی ہے وہ غلطی پر ہیں۔ یہ امر اجماعی تنقیح اور تاریخی تحقیق کے خلاف ہے۔

وَأَوْحَيْنَا إِلَى أُمِّ مُوسَى أَنْ أَرْضِعِيهِ قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس موقع پر لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ کی والدہ کا نام یوخانذہ یا یوخابیت بنت لاوی بن یعقوب تھا۔ اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ جب اولاد اسرائیل کا قتل عام ہوا تو فرعونیوں کو اندیشہ ہوا کہ اب اگر یہی رواج رہا تو ہماری خدمت کون کرے گا، اسلئے فرعون نے حاکم کیا کہ نہ تو بنی اسرائیل کو اتنا موقع دیا جائے کہ ان کی مردم شماری بڑھ جائے نہ ایسا ہونا چاہیے کہ ہم خدمت گاروں سے محروم ہو جائیں۔ بلکہ ایک سال کی پیداوار باقی رکھی جائے اور ایک سال کی پیداوار ہلاک کر دی جائے۔ فرعونیوں نے یونہی حکم جاری کردیا۔ حضرت ہارون اس سال پیدا ہوئے جو نجات کا سال تھا۔ اس لئے کسی نے پرسش نہ کی اور حضرت موسیٰ قتل عام کے سال پیدا ہوئے۔ والدہ کو آثار حمل دیکھ کر سخت فکر تھی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے جوں جوں ولادت کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا فکر میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ بالآخر ایک روز بغیر کسی علامت ولادت کے موسیٰ پیدا ہو گئے۔ ماں نے چھپا لیا لیکن تابہ کے فرعون کی طرف سے عورتیں بچوں کی تلاش میں پھرتی تھیں۔ اگر کوئی عورت باردار معلوم ہو اور بچہ پیدا ہو تو اس کی اطلاع کریں (ماں نے غالباً خیال کیا ہوگا کہ ایسے بچہ کو جس کو لا محالہ قتل ہونا ہے دودھ پلانا بھی بے کار ہے، لیکن شفقت مادری اور وہ بھی موسیٰ ایسے بچہ کی محبت جس کو دیکھ کر غیروں کے دل بھی جھک جاتے تھے اجازت نہ دیتی تھی کہ کس طرح تنہا بچہ کو پھینک دیں اور اپنی آنکھوں کا نور خود دور ہونے دیں۔ اسی کشمکش و پیچ میں تھیں کہ) اللہ کی طرف سے دل میں ایک بات آئی یا فرشتہ نے تعلیم دی یا خواب میں ملہم ہوا۔ بہرحال والدہ نے ایک صندوق میں نہایت آرام سے رکھ کر سر بمہر بند کر کے نیل میں صندوق ڈال دیا چونکہ حضرت موسیٰ کا مکان نیل کے کنارے ہی تھا اور شاہی محل کے اندر بھی نیل کی ایک شاخ جاتی تھی، اس لئے ان کو امید ہوئی کہ شاید ڈوبنے سے پہلے یہ صندوق بہتا بہتا فرعون کے محل میں پہنچ جائے اور کوئی اس بچہ کو نکال لے۔

نوٹ: آیت مذکورہ میں ابن عباس کے نزدیک وحی سے الہام مراد ہے۔ بعض مفسرین نے صراحت کی ہے کہ موسیٰ کی والدہ نے یہ ساری ترکیب خواب میں دیکھی تھی۔ اس تاویل کے کرنے کی ضرورت صرف اس وجہ سے ہوئی کہ اکثر علماء کے نزدیک کسی فرشتہ کا علاوہ نبی کے کسی آدمی کے پاس آنا جائز نہیں نہ علاوہ پیغمبر کے کسی کے پاس وحی اصطلاحی آسکتی ہے، لیکن بعض اہل تحقیق نے جب دیکھا کہ بنص قرآنی مریم کے پاس فرشتہ آیا تھا اور مریم نبی نہیں تھیں۔ اس کے علاوہ بخاری وغیرہ نے وہ حدیث نقل کی ہے جس میں حضور نے صراحت فرمائی ہے کہ اللہ کا فرشتہ تین آدمیوں کے پاس گیا جن میں سے ایک گنجا دوسرا اندھا تیسرا برص والا تھا، اس تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کے علاوہ دوسروں کے پاس بھی فرشتہ کا آنا جائز بلکہ ثابت ہے۔ اسی بنا پر ان مفسرین نے وحی کے اصل معنی لئے ہیں۔
بعض کا خیال ہے کہ موسیٰ کی والدہ اور فرعون کی بیوی دونوں حقیقی بہنیں تھیں۔ فرعون کی بی بی نے اپنی بہن کو یہ ترکیب بتادی تھی اور یہ سب ملی بھگت تھی، لیکن

پھر بھی شفقتِ مادری اس کام کی اجازت نہ دیتی تھی اندیشہ تھا کہ بچہ دریا میں ڈوب جائے گا اور اگر نہ بھی ڈوبا تب بھی وہ میرے ہاتھوں سے بہر حال نکل جائے گا پھر مجھے نصیب نہ ہوگا۔ اس اندیشہ اور غم کو دور کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے الہام کے ذریعہ سے تسکین ظاہر فرمائی۔ میرے نزدیک یہ قول کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کیوں کہ آئندہ آیات میں بھی خدا تعالیٰ نے خود صراحت فرمائی ہے کہ موسیٰ کی والدہ کے دل میں اگر ہم صبر کا القاء نہ کرتے تو وہ کل واقعہ کا اظہار کر دیتی۔ اگر واقعی سازش تھی اور سازش کامیاب ہوگئی۔ یعنی اپنی خالہ کے پاس پہنچ گیا اور کسی قسم کا اندیشہ نہ رہا تو وہ اب بے تاب ہو کر اظہار کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے موسیٰ کی والدہ کو الہام کیا کہ بچہ کو دودھ پلائے جا، لیکن جب تجھے انکشاف واقعہ یا قتل کا اندیشہ ہو تو اس کو صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دینا اور ہرگز اندیشہ نہ کرنا (کہ یہ بچہ ڈوب جائے گا یا اور کسی وجہ سے مر جائے گا) اور (اس کے گم ہونے کا غم بھی نہ کرنا ہم ضرور اس کو لوٹا کر تیرے پاس پہنچا دیں گے اور اپنا پیغامبر بنائیں گے یعنی ہم کو رسالت کا کام لینا ہے، اس لئے ضرور زندہ رکھیں گے۔ فرعون اور اس کے طرف دار ہرگز اس کو نہ مار سکیں گے۔

فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ غرض والدہ موسیٰ نے صندوق کو دریا میں ڈال دیا، صندوق بہتا بہتا شاہی محل میں جا پہنچا۔ ماماؤں اور چھوکریوں نے بہتا دیکھ کر فرعون کی بیوی کو اطلاع دی۔ اس نے نکلوایا۔ فرعون کی بی بی آسیہ نے بچہ کا دلکش حسن دیکھ کر محبت بھری نظروں سے اس کو پیار کیا اور دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ اس کی پرورش ہم کریں گے۔ آلِ فرعون سے مراد یا تو فرعون کی بیٹی ہے یا عام گھر والے۔

لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا الخ۔ صندوق کے اندر سے بچہ نکالنے والوں نے نیز فرعون کی بیوی وغیرہ نے خیال کیا تھا کہ اس بچہ کی پرورش سے آئندہ ہم کو مسرت اور قوت حاصل ہوگی۔ ممکن ہے یہ ولی عہد سلطنت ہو جائے، لیکن یہ غرض پوری نہ ہوئی۔ نتیجہ موسیٰ اور باعث غم ثابت ہوئے۔ لِيَكُوْنَ میں لام غرض کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ لام عاقبت کے لئے ہے یعنی غرض تو ان کی اور تھی، مگر نتیجہ غرض کے خلاف نکلا تو گویا درحقیقت انہوں نے موسیٰ کو نکالا ہی اس لئے تھا کہ ان کا دشمن اور سبب غم پیدا ہو۔

وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ ۔ فرعون کو بچہ کا علم ہوا۔ اس نے آ کر دیکھا۔ چہرہ دل کش اور علامات سے ہونہار بچہ نظر آیا۔ نسب معلوم نہ تھا بفراست خیال کیا کہ غالباً یہ اسرائیلی ہے، اس لئے قتل کے درپے ہو گیا۔ بیوی نے کہا یہ میری اور تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اس کو قتل نہ کرو۔ مروی ہے کہ فرعون نے اپنی بیوی سے کہا تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگا میرے لئے تو ٹھنڈک نہیں ہے (رواہ النسائی) اسی لئے آخر میں بیوی نے کہا (اگر ٹھنڈک نہ بھی سہی تو کم از کم) اس سے نفع کی امید ہے ضرر کا اندیشہ نہیں (اور اگر ہم کو ہماری زندگی میں نفع نہ بھی پہنچا سکا تو یہ ممکن ہے کہ ہم اس کو بیٹا بنا لیں) اور ہمارے بعد یہ سلطنت کا کام سنبھال لے۔ غالباً آسیہ نے یہ علت اور وجہ دل میں قائم کی ہوگی۔ کیونکہ فرعون کے منہ پر تو ایسی بات کہنی بدشگونی اور بے ادب کی علامت تھی، لیکن آسیہ مؤمنہ تھی اس کو موت کا یقین تھا فرعون کی وہ قائل نہ تھی۔ غیر اللہ کی پرستش سے وہ بیزار تھی۔ فرعون کو ایک انسان اور انسان کی طرح مرنے والا خیال کرتی تھی۔ فرعونیوں کو اللہ کی حکمت بالغہ کا علم نہ تھا وہ واقف نہ تھے کہ پردہ ہی پردہ میں کیا گل کھلنے والا ہے اور گھر کے ہی چراغ سے گھر کو آگ لگنے والی ہے۔ غرض موسیٰ کو محل میں پرورش کرنا طے ہو گیا۔

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى الخ۔ ادھر موسیٰ کی ماں کا دل بے چین ہوا۔ محبت مادری نے جوش مارا۔ دل کے اندر صرف موسیٰ کی یاد باقی رہی دوسرا ہر خیال نکل گیا (ابن عباس، مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابو عبیدہ، ضحاک، حسن بصری، قتادہ) بے اختیار ہو کر قریب تھا کہ کل معاملہ کو ظاہر کر دیں۔ مگر اللہ نے دل پر صبر کی گرہ لگا دی حزن و بے صبری جاتی رہی۔

لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ یعنی خدا تعالیٰ نے والدہ موسیٰ کو صبر عطا فرما کر معاملہ کا انکشاف اس لئے نہ ہونے دیا کہ وہ قدرت الٰہیہ کا مشاہدہ کر کے اپنے ایمان کو پختہ کر لیں۔

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ ۔ یعنی موسیٰ کی والدہ نے بچہ کو دریا میں ڈال کر اپنی لڑکی (جو موسیٰ کی بڑی بہن تھی) سے کہا کہ تو اس کے پیچھے جا اور نگرانی رکھ کہ یہ صندوق کہاں جاتا ہے اور کیا معاملہ پیش آتا ہے؟ بہن نے جس کا نام کلثوم یا مریم کہا جاتا ہے۔ صندوق کی دیدبانی کی اور صندوق محل میں پہنچا تو محل کے اندر گئی اور:۔

فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ دور سے اس کو دیکھا (مجاہد) یا ایک طرف سے دیکھا (ابن عباسؓ) یا الگ الگ سے دیکھا گویا بے غرضی کے ساتھ دیکھا اور حقیقت

واقعہ معلوم کرلیا (قتادہ) اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ الخ۔ حضرت موسیٰ کی پرورش کرنے کے لئے دودھ پلانے والی عورتوں کی تلاش کی گئی۔ بہت انائیں آئیں، لیکن موسیٰ نے کسی کا دودھ نہ پیا۔ اسی کے متعلق خدا تعالیٰ نے فرمایا ہم نے موسیٰ پر تمام دودھ پلانے والیوں کے دودھ کو پہلے ہی بند کردیا تھا۔ موسیٰ کی بہن دور سے اس تماشہ کو دیکھ رہی تھی۔ جب بچہ نے کسی کا دودھ نہ پیا اور محل والوں کو تشویش ہوئی کہ اب پرورش کی کیا صورت ہوگی تو اس نے موقع پاکر کہا ایک گھر مجھے معلوم ہے جہاں ایک دایہ رہتی ہے اگر اس کے سپرد کردیا جائے تو وہ اور اس کے گھر والے خیر خواہی کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیں گے اور وہ اس کے بہی خواہ بھی ہیں۔ ابن عباسؓ کے ایک قول میں آیا ہے کہ بہی خواہی کا لفظ سن کر محل کی عورتیں چرچے لگیں اور خیال کیا کہ غالباً یہ عورت بچہ کی کیفیت اور اس کے نسب سے واقف ہے، اس لئے ہمشیرۂ موسیٰ سے دریافت کیا تجھے معلوم ہے کہ وہ بہی خواہ بھی ہیں۔ سمجھدار لڑکی نے جواب دیا میں اس وجہ سے کہتی ہوں کہ شاہزادہ کو دودھ پلانا بڑی عزت کی بات ہے۔ انعام شاہی کی امیدان کو بہی خواہی پر مجبور کرے گی۔ غرض موسیٰ کی والدہ کو بلایا گیا۔ انہوں نے اپنے بڑے لڑکے یعنی حضرت ہارون کا دودھ ظاہر کیا جو موسیٰ سے ایک سال پہلے (بروایت مذکورہ) پیدا ہوئے تھے۔ فرعون کی بی بی نے لڑکے کو ان کے سپرد کردیا اور وہ خوشی خوشی اپنے جگر پارہ کو لے کر چلی گئیں۔ آئندہ آیت میں فَرَدَدْنٰهُ اِلٰى اُمِّهٖ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ کا یہی مطلب ہے۔

وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ۔ یعنی جو وعدہ موسیٰ کی والدہ سے خدا تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ہم تیرے بچہ کو دوبارہ تیرے پاس واپس پہنچادیں گے اور اس کو پیغمبر بنائیں گے۔ اس وعدہ پر یقین دلانے کیلئے ہم نے موسیٰ کو اس کی ماں کے پاس لوٹا دیا۔

ایک شبہ چونکہ موسیٰ لوٹ کر اپنی ماں کے پاس پہنچ گئے تھے، اس لئے وعدۂ الٰہی کی ایک شق پر تو ان کو یقین حاصل ہوگیا ہوگا، لیکن موسیٰ کے پیغمبر ہونے کا یقین اس سے کیسے پیدا ہوسکتا ہے، اس لئے وعدہ سے پورا وعدہ مراد لینا غلط ہے۔ صرف جزو وعدہ یعنی موسیٰ کی واپسی مراد ہے۔

ازالہ آیت مذکورہ میں پورا وعدہ ہی مراد ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب موسیٰ کی ماں نے اپنے ہاتھ سے اپنے بچہ کو دریا میں ڈالا تو باقتضائے بشری نجات موسیٰ کی اُمید کی ایک جھلک بھی ان کے دل میں ہوسکتی تھی۔ تمام اسباب ظاہرہ ان کی امید کو منقطع کررہے تھے۔ رہی موسیٰ کی رسالت تو اس کا ترتب نجات پر تھا۔ جب بظاہر نجات ناممکن تھی تو رسالت کا کیا امکان ہوسکتا تھا، لیکن جب موسیٰ ظاہری اسباب کے خلاف نجات پاکر ماں کی گود میں پہنچ گئے اور جس بات کو انہوں نے ناممکن سمجھا تھا وہ واقع ہوگئی اور تجربہ سے ثابت ہوگیا کہ قدرت غیبی ہمہ گیر ہے۔ اسباب کی لگام اسی کے ہاتھوں میں ہے تو پھر رسالت موسیٰ میں کیا شبہ ہوسکتا تھا یہ تو ظاہری اسباب کے لحاظ سے ناممکن بھی نہ تھی۔ واللہ اعلم۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ کی ضمیر ناس کی طرف راجع ہے جو حکماً مذکور ہیں۔ اگرچہ صراحۃً تذکرہ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اکثر آدمی مادہ پرست اور ظاہری اسباب کے گورکھ دھندے میں پھنسے ہوئے ہیں ان کو وسعت قدرت کی ہمہ گیری کا یقین نہیں۔ وہ اللہ کو ذرہ ذرہ کا عالم اور ہر چیز کا صانع نہیں جانتے۔ دنیا کی بہت سی چیزوں اور بکثرت واقعات کو عبث جانتے ہیں ان کی نظر صرف ظاہر پر مقصور ہے وہ ناواقف ہیں کہ بہت مرتبہ مصیبت ظاہری کا انجام مصیبت ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ جو کچھ خدا چاہتا ہے وہ ہوکر رہتا ہے۔ اگرچہ تمام دنیا اس کی مخالفت کرے بلکہ مخالفت کرنے والوں سے خدا اس کام کو کراتا ہے اور ان کو پتہ بھی نہیں ہوتا۔

مقصود بیان قرآن کتاب مبین ہے۔ یعنی معاش و معاد، زندگی اور آخرت شقاوت و نجات کے راستے نمایاں طور پر بیان کرتا ہے۔ مبین کا لفظ دلالت کررہا ہے کہ قرآن خلاف عقل نہیں کیونکہ عقل سلیم ہی حقائق اصلیہ کی تہ پہنچنے کی کوشش کرتی ہے اور قرآن نے واقعی حقائق کا انکشاف مصلحت عباد کے لباس میں کیا۔ لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ قرآن کی داستان کی کتاب نہیں بلکہ اس کے اندر جتنے قصے مذکور ہیں وہ حقیقت رس دماغوں اور صداقت شعار نظروں کے لئے عبرت و موعظت اور ایمان و ایقان کا سرمایہ کے حامل ہیں۔ نافرمانوں کی تباہی، فرماں پذیروں کی کامیابی حق کے غلبہ اور باطل کی شکست کے علاوہ ایک کھلی ہوئی حقیقت یہ سامنے آجاتی ہے کہ وہ قصص جن کو اسرائیلیوں نے کچھ سے کچھ بنالیا تھا اور ہزاروں تنقیحات و تحقیقات کرنے کے بعد اصل حق پردہ کے اندر چھپا رہ گیا تھا قرآن نے بلا کم و کاست اس کو ظاہر کیا۔ یہ کام ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں پر ایمان کی صلاحیت موجود ہے۔ بجائے خود قرآن کی حقانیت پر ایک لازوال یقین پیدا کرنے کا باعث ہے جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا کو چونکہ مقام زم

میں ذکر کیا ہے، اس لئے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ پھوٹ ڈال کر حکومت کرنی تعلیم قرآن کے خلاف ہے۔ یَسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ بادشاہ پر لازم ہے کہ تمام رعایا کو ایک نظر سے دیکھے اور انصاف کے مقابلے میں کسی کی جانبداری نہ کرے نہ کسی خاص طبقہ کو کمزور کرنے کی کوشش کرے ورنہ ظالم ہوگا۔ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کسی خاص سبب کے زیر اثر بنی اسرائیل کی نسل کو کم کرنا بھی چاہتا تھا اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ کر ان کی تذلیل کے درپے تھا۔ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ سے در پردہ یہ بات نکلتی ہے کہ کسی کا ناحق قتل، آبرو ریزی، بے جا طرفداری اور نفاق پھیلانا فساد انگیزی کی ایک شاخ ہے۔ ایسا آدمی یقیناً مفسد ہے وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ کا لفظ بتا رہا ہے کہ خدا صاحب ارادہ ہے اور اس کا ارادہ جزئی جزئی چیزوں سے بھی متعلق ہوتا ہے اور تصرف و تخلیق سے پہلے ہوتا ہے يَحْذَرُوْنَ کے لفظ سے ثابت ہے کہ فرعون اور اس کے طرفداروں کو بنی اسرائیل کی طرف سے اپنی حکومت کے زوال کا خطرہ تھا۔ ایک امر یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ اقتضائے حکمت الٰہیہ کے خلاف شیطان کو تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہے، اسی لئے اس کو قدرت نہ ہوئی کہ فرعون کو یقینی طور پر بتا سکتا کہ تیری سلطنت کو تباہ کرنے والا موسیٰ یہی ہے۔ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰى سے ثابت ہے کہ نبی کے علاوہ بھی دوسرے انسانوں کے حق میں لفظ وحی کا استعمال جائز ہے۔ اگرچہ عرفی وحی کا اطلاق صحیح نہیں ہے۔ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کی کیفیات پر بھی اقتدار و تصرف باری تعالیٰ کا ہے وہی کسی چیز کی طرف دلوں کو موڑتا ہے اور کسی چیز سے روکتا ہے۔ ایک امر یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ فطری محبت مصلحت پر غالب آجاتی ہے۔ اور آدمی باوجود ذی ہوش ہونے کے مضطر ہو جاتا ہے۔ موسیٰ کا صندوق پانی میں ڈالنا بہن کا پیچھے پیچھے جانا حرم شاہی میں پہنچ کر دور سے دیکھنا، وہاں کی عورتوں کو دایہ کی خدمت کے لئے اپنی ماں کا پتہ بتانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام امور تعلیم دے رہے ہیں کہ حکمت الٰہیہ بہت دقیق ہے وہ انہی اسباب ظاہرہ سے اپنا کام لے لیتی ہے اور اسباب کی درستی بھی منشائے الٰہی ہوتی ہے اور وعدۂ خداوندی پر بھروسہ کرکے تکمیل اسباب کی طرف سے غافل نہ ہونا چاہیئے وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ کا لفظ صاف دلالت کر رہا ہے کہ وعدۂ الٰہی کی خلاف ورزی ناممکن ہے۔ کیونکہ خود خدا نے اس کی صراحت فرما دی ہے۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَدَخَلَ

اور جب موسیٰ اپنی جوانی کو پہنچ گئے اور ٹھیک ہو گئے تو ہم نے اُن کو حکمت اور علم عطا کیا ہم نیکو کاروں کو ایسا ہی صلہ دیتے ہیں موسیٰ اس شہر

الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ ۡ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَ

میں ایسے وقت میں داخل ہوئے جب لوگ بے خبر تھے وہاں دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں ایک تو اُن کی قوم کا ہے اور

هٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِىْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِىْ مِنْ عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۖ

دوسرا اُن کے دشمن (کی قوم) کا جو اُن کی قوم کا تھا اُس نے موسیٰ سے اس شخص کے مقابلہ میں مدد مانگی جو دشمن کی قوم کا تھا موسیٰ نے اُس کے مکہ مارا اور اس کا کام تمام کر دیا

قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ فَاغْفِرْ لِىْ

(پھر) کہنے لگے یہ شیطانی حرکت ہوئی بلاشبہ وہ کھلا ہوا گمراہ کن دشمن ہے عرض کیا پروردگار! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا تو مجھے معاف کر دے

فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَىَّ فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ ۝

اللہ نے معاف کر دیا وہ بلاشبہ غفور رحیم ہے موسیٰ نے کہا اے میرے رب چونکہ تو نے مجھ پر فضل فرما دیا اس لئے اب میں مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا

فَأَصْبَحَ فِي الْمَدِينَةِ خَائِفًا يَتَرَقَّبُ فَإِذَا الَّذِي اسْتَنْصَرَهُ بِالْأَمْسِ يَسْتَصْرِخُهُ ۚ قَالَ لَهُ مُوسَىٰ

صبح کو موسٰی شہر میں ڈرتے ڈرتے خبر لینے اُٹھے تو پھر وہی شخص جس نے کل موسٰی سے مدد مانگی تھی موسٰی کو پکار رہا تھا موسٰی نے اس سے کہا

إِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُبِينٌ ۝ فَلَمَّا أَنْ أَرَادَ أَنْ يَبْطِشَ بِالَّذِي هُوَ عَدُوٌّ لَهُمَا قَالَ يَا مُوسَىٰ أَتُرِيدُ أَنْ تَقْتُلَنِي

تو صریح بد راہ ہے پھر موسٰی نے جب اُس شخص کو پکڑنا چاہا جو اُن دونوں کا دشمن تھا تو (اسرائیلی نے) کہا موسٰی! کیا تم مجھے بھی ویسے ہی مار ڈالنا

كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْأَمْسِ ۖ إِنْ تُرِيدُ إِلَّا أَنْ تَكُونَ جَبَّارًا فِي الْأَرْضِ وَمَا تُرِيدُ أَنْ تَكُونَ مِنَ الْمُصْلِحِينَ ۝

چاہتے ہو جیسے کل تم نے ایک آدمی کو مار ڈالا بس تم تو ملک میں ستمگار ہی بننا چاہتے ہو اور میل ملاپ کرنے والے بننا نہیں چاہتے

وَجَاءَ رَجُلٌ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ قَالَ يَا مُوسَىٰ إِنَّ الْمَلَأَ يَأْتَمِرُونَ بِكَ لِيَقْتُلُوكَ فَاخْرُجْ

ایک شخص شہر کے کنارے سے دوڑتا ہوا آیا کہنے لگا موسٰی! اہلِ دربار تمہارے قتل کا باہم مشورہ کر رہے ہیں تم یہاں سے نکل جاؤ

إِنِّي لَكَ مِنَ النَّاصِحِينَ ۝ فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ ۖ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ ع

میں تمہارا خیر خواہ ہوں موسٰی وہاں سے ڈرتے خبر لیتے نکل گئے اور بولے پروردگار! مجھے ان ظالموں سے بچا

تفسیر قانونِ قدرت اور مصلحت ربانی ہے کہ طبعی صلاحیت و استعداد کے موافق صورتوں کا فیضان اور خدمات و فرائض کی تفریق ہوتی ہے۔ جماد اجسام سے لے کر ذی روح کائنات تک سب اسی قدرتی سلک میں منسلک ہیں۔ مادۂ حجری میں استعداد صلاحیت تھی۔ اسی لئے اس کو ناقابل استحالہ صورت عطا فرمائی گئی۔ چونہ کی طبیعت کمزور تھی اسی لئے اس کو ایسی صورت ملی جو پانی کے ایک قطرہ سے بگڑ جاتی ہے اور اسی اختلاف استعداد کی بنا پر پتھر اور چونہ کے خصائص میں اختلاف ہے۔ خدمات مفوضہ کی انجام وہی میں تفرقہ ہے، نوعیت کار میں امتیاز ہے۔ پتھر کی جگہ چونہ اور چونہ کی جگہ پتھر کام نہیں دے سکتا۔ دانہ کے اندر آغاز نمو کے وقت باریک سوئی پھوٹ کر نکلتی ہے پھول پتیاں تنے شگوفے وغیرہ اس وقت نہیں پیدا ہوتے۔ کیونکہ دانہ کی موجودہ حالت اس بار ثقیل کو برداشت نہیں کر سکتی جوں جوں نمو کی استعداد اور خاکی آبی ہوائی غذا کی کشش میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اسی وقت نمو میں اضافہ اور صورت میں فرق ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ درخت جب کامل طور پر جوان ہو جاتا ہے تو اس میں برگ و بار آتے ہیں، شگوفے اور پھل کھلتے ہیں اور بقاء نوع کے لئے اس میں ہزاروں دانے ہوتے ہیں۔ حیوانی دنیا کی ترقی بھی اسی قانون کی رہین ہے۔ نطفہ سے بڑھ کر ایام ولادت تک اور پھر ولادت سے بڑھتے بڑھتے جوانی تک یہی نیرنگی اپنا ظہور کرتی رہتی ہے۔ ہر استعداد اور ہر وقت کے مناسب صورت، خاصیت اور کیفیت کا فیضان عالم بالا سے ہوتا رہتا ہے۔ نہ قابلیت و استعداد ہر وقت ایک طرح کی ہوتی ہے نہ صورت و سیرت اور کیفیت و شکل میں یگانگت رہتی ہے۔ انسان بھی اسی غیر فانی قانون سے سرتابی نہیں کر سکتا جسمانی اعتبار سے اس کی بھی وہی حالت ہے جو دوسرے حیوانوں کی ہے۔ جتنا غذائی مادہ میں اضافہ ہوتا ہے اور جیسا ہوتا ہے اتنا اور ویسا ہی طبیعت مدبرہ فعل کرتی ہے۔ اعضاء میں نمو، قوت ساخت میں تغیر، شکل میں تبدیل، رنگ کا نکھار، حسن کا ابھار، تلون سب کچھ اسی اٹل ضابطۂ فطرت کے تحت ہوتا ہے۔ پھر فقط جسمانی حالات کا تغیر ہی نہیں ہوتا بلکہ اندرونی ارادی اور ادراکی قوتیں بھی اس کی ممنونِ کرم ہیں۔ شروع میں بچہ ناواقف ہوتا ہے جوں جوں آگے بڑھتا ہے علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بدیہیات کا معمولی علم پھر خفی بدیہیات کا علم پھر بدیہیات سے نظریات کی طرف انتقال، مقدمات علمیہ کی ترتیب اور ان سے نتیجہ کا اخذ، مبادی سے مطالب کی جانب اور مطالب سے مبادی کی جانب ذہنی حرکت پھر کل علوم نظریہ کا استحضار یہ سب کچھ استعداد قابلیت کے موافق ہوتا ہے اور انسان اپنی قوت مفکرہ کو صحیح طور پر کام میں لانے کی وجہ سے حقائق کائنات کا ماہر رموز ہستی سے واقف اور اسی عالم کون و فساد کی تہ تک پہنچنے والا حکیم بن جاتا ہے، لیکن علم کی اس سطح تک رسائی معمولی آدمیوں کی نہیں ہوتی۔ ہر دانش و فہم کی یہاں باریابی ممکن نہیں۔ تمام علمی مواقع

اور کل عوائق معرفت کا ازالہ ضروری ہے۔ نفس انسانی آزاد ہو، اس کی آنکھوں پر تقلید کا پردہ نہ پڑا ہو۔ منزلِ مقصود کا رُخ صحیح ہو، طریق توجہ بھی درست ہو، دھیان فرودگاہوں کو ہی اصل منزل نہ سمجھ لیا جائے اور ان تمام باتوں کے ساتھ ذہنی تربیت بھی ٹھیک ہو۔ اس وقت شاہدِ حکمت دماغ میں جلوہ فگن ہوتا ہے۔ لیکن جتنے عوائق و موانع موجود ہوں گے جس قدر ترتیبِ ذہنی میں غلطی ہوگی جتنا دخل درمعقولات قوتِ واہمہ کرے گی اتنا ہی نتیجہ غلط نکلے گا اور حقائقِ علمیہ سے جہالت رہے گی، اسی لئے کوئی حکیم و فلاسفر غلطی سے معصوم نہیں ہوتا۔ تمام اکتسابی علوم میں غلطیاں ہوتی ہیں۔

لیکن انسانوں میں سے کچھ اشخاص ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو فطرۃً کچھ تخلیقی امتیاز حاصل ہوتا ہے۔ ان کی روحوں اور عقلوں میں وہ روشنی وہ جلاء، وہ صفاء اور وہ آب و تاب ہوتی ہے جو دوسرے آدمیوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ ان کو علومِ حکمیہ کی ضرورت نہیں ہوتی وہ ہر ترتیبِ دماغی سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ وہ جو علم و معرفت حاصل کرتے ہیں چشم زدن میں حاصل کرتے ہیں۔ ان کے دماغوں میں نیچر کی طرف سے کہربائی لہریں موجزن ہوتی ہیں۔ فقط بٹن دبانے کی دیر ہوتی ہے۔ جونہی بٹن دبایا علمی روشنی نے رگ و ریشہ کو منور کر دیا۔ یہ لوگ قوتِ قدسیہ کے مالک، اسرارِ وحی کے حامل اور مہبطِ ملائکہ ہوتے ہیں۔ انوارِ معرفت ان کی روحوں پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے علوم میں غلطی کا امکان نہیں ہوتا، لیکن یاد رکھو کہ جس طرح پھول پھل لانے اور حسنِ جسمانی میں نکھار پیدا ہونے کے لئے اعضاء کی ساخت مکمل ہونی ضروری ہے جس طرح علومِ حکمیہ سے واقف ہونے اور نظریات کو ترتیب دینے کے لئے علمی قوت کا انتہائی ترقی پر پہنچنا لازم ہے۔ اسی طرح مہبطِ وحی و موردِ ملائکہ منزلِ انوار اور مالکِ اسرار ہونے کے لئے قوتِ قدسیہ کی تکمیل لابدی ہے۔ اعضاءِ جسمانی جب تک حدِ کمال تک نہیں پہنچیں گے جب تک قوتِ شعور و ادراک اپنی بالائی چوٹی پر نہ پہنچ جائے گی اس وقت تک نفسِ انسانی میں کامل تزکیہ کی صلاحیت نہ پیدا ہوگی۔ ہر چیز میں زنگ دور کرنے کے بعد جلاء اور صفائی کے بعد چمک پیدا ہوتی ہے۔ انسانی نفس کی بھی یہی حالت ہے۔ تزکیۂ نفس کا قابل ترین وقت وہ ہے جب انسان کی تمام مادی اور غیر مادی قوتیں مکمل ہو چکی ہوں، شخصی طاقت اپنی ترقی کے مدارج طے کر چکی ہو، نفس شعور و ادراک کے آخر درجہ تک پہنچ چکا ہو ایسے وقت میں اربابِ قوتِ قدسیہ کی پاک روحوں پر انوارِ معرفت جلوہ فگن ہوتے ہیں۔ وحی کا نزول اور قدوسی ملائکہ کا ہبوط ہوتا ہے، اس کے بعد کبھی صاحبِ وحی کو وحی کے حصول و تحصیل یا ابلاغ و ارسال میں غلطی نہیں ہوتی۔ کبھی علمی و عملی فساد کی طرف اس کی طبیعت کو رغبت نہیں ہوتی، کبھی اس کے کشفی علوم و واردات میں کذب و گناہ کا دخل نہیں ہوتا۔ ہاں دو خرابیوں کا پھر بھی احتمال رہتا ہے۔ اوّل اجتہادی غلطی۔ اگر وحی منصوص جس کا مطلب صاف ہے تو اس میں غلطی ممکن نہیں، لیکن اگر وحی بصورتِ خواب ہے یا بہت زیادہ مبہم ہے تو اس سے استنباطِ احکام میں کبھی غلطی بھی ہو جانا ممکن ہے۔ یہی اجتہادی غلطی ہے جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں خواب دیکھا تھا کہ مجھے ایک بستی کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ملا ہے جہاں بکثرت نخلستان ہیں وہاں پہنچ کر آزادی کے ساتھ میں دین کی تبلیغ کر سکوں گا۔ حضور والا نے اجتہاد فرمایا کہ وہ طائف یا ہجر کا مقام ہے، لیکن واقع میں وہ یثرب یا مدینہ تھا۔ دوئم یہ کہ بغیر کسی ارادہ اور قصد کے اچھے کام کا برا نتیجہ بھی نکل سکتا ہے، لیکن چونکہ کوئی شخص نتیجہ سے واقف نہیں نہ اس کا ذمہ دار ہے۔ افعال کے حسن و قبح کو جانچنے کی کسوٹی صرف قانونِ شریعت ہے، اس لئے اگر باشرع فعل کا برا نتیجہ نکلے تو پیغمبر کیا کسی شخص سے اس کا مواخذہ نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً کسی نے مسافروں کے آرام کے لئے کنواں کھدوایا، لیکن اس میں کوئی گر کر مر گیا، سایہ کے لئے درخت بویا مگر کوئی شخص اس پر چڑھ کر گر گیا، دو آدمیوں میں صلح کرانے کے لئے دو کو ادنیٰ تنبیہ کی یا قتل و سفاکی سے روکنے کے لئے کسی نے معمولی طمانچہ بھی مار دیا، لیکن اتفاق سے وہ شخص مر گیا۔ یہ تمام افعال اچھے ہیں کوئی بھی قابلِ مواخذہ نہیں اگرچہ ان کا اتفاقی نتیجہ کبھی بُرا نکلتا ہے۔

لیکن جن کی روحیں زیادہ روشن ہوتی ہیں ان کو اپنی نادانی کے مواخذہ کا بھی زیادہ اندیشہ ہوتا ہے۔ جاہل آدمی بے باکی کے ساتھ ہر کام کر لیتا ہے اور نتیجہ کی کچھ پرواہ نہیں کرتا اور ذی علم شخص کو اندیشہ لگا رہتا ہے کہ اگر میرے کام کا نتیجہ برا نکلا تو لوگ مجھے کیا کہیں گے اور مجھ سے مواخذہ کیا جائے گا تو میں کیا جواب دوں گا۔ صاحبِ علم ہو کر ایسی نادانی کے ارتکاب کی میرے پاس کیا حجت ہوگی۔ اسی طرح جتنی علم میں ترقی ہوتی ہے اتنی ہی معمولی حرکات و سکنات کی نگہداشت کرنی پڑتی ہے۔ یہاں تک کہ علم کے بہت بلند درجہ پر پہنچ کر معمولی فروگذاشت کو بھی آدمی گناہ عظیم سمجھنے لگتا ہے اور اگر اتفاقاً نادانستہ بغیر ارادہ کے اس سے کوئی گناہ نما حرکت سرزد ہو جائے تو وہ اس کی پاداش سے اپنے کو بری نہیں سمجھتا بلکہ مخلی گناہگار اور قصوروار جانتا ہے۔ اگرچہ واقع میں وہ قصوروار نہیں ہوتا نہ قابلِ مواخذہ ہونا اس کا ممکن ہے۔ حضرت موسیٰ ایک عظیم الشان خلعت لے کر خدا تعالیٰ کی طرف سے آئے تھے۔ روح میں روشنی، عقل میں صفائی، جسمانی ساخت مکمل، اخلاق میں پاکیزگی اور طبیعت مطمئنہ کے مالک تھے۔ جب سن شعور کی انتہا کو پہنچے، ارادہ اور علم کی قوتیں پختہ ہو گئیں، علوم قدسیہ کی آخری چوٹی پر پہنچ گئے تو قوتِ قدسیہ میں روشنی پیدا ہونے

اور علوم معرفت کی بخشش پانے کا وقت آیا، لیکن حصولِ نبوت ہونے سے پہلے ایک واقعہ پیش ہو گیا۔ سرِ راہ ایک قبطی اور دوسرے اسرائیلی کو لڑتے دیکھ کر بچاؤ کرنا چاہا، قبطی نے سرکشی کی، آپ نے گھونسہ مارا، وہ مر گیا۔ یہ قصور دانستہ نہ تھا، مقصد صحیح تھا۔ فساد کی روک تھام مقصود تھی۔ حمایتِ حق کا جذبہ کارفرما تھا، لیکن دنیوی بازداشت کے خوف سے مصر سے بھاگ نکلے کیونکہ ہم کہہ چکے ہیں کہ اب علوم حکمیہ سے بالاتر نورِ معرفت کی ضیا ریاشی کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ خدا تعالیٰ نے اسباب بھی ویسے ہی پیدا کئے، مگر موسیٰ غافل تھے اور اپنے کو مجرم سمجھ کے بھاگ گئے تھے۔ آٹھ سال یونہی دیس بدر رہے۔ پھر وطن کو لوٹنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت تمام کثافت و زنگ دور ہو چکا تھا اور آئینۂ روح بالکل صاف تھا۔ بس طور پر پہنچنے کے بعد ہی شاہدِ نبوت و رسالت نے روحِ موسوی پر اپنا عکس ڈالا اور موسیٰ نبی مرسل ہو کر لوٹے۔

تحلیلِ اجزاء

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰۤی یعنی جب موسیٰ جوانی کو پہنچ گئے اور تمام اندرونی و بیرونی اعضاء میں نیز ظاہری اور باطنی قوتوں میں استواء اور ہمواری ہو گئی، کسی قسم کا نقصان نہ رہا۔ مالک، مجاہد اور سفیان ثوری کا قول ہے کہ اَشُد کا ابتدائی درجہ بلوغ کا ہے اور انتہائی سن ۳۴ برس ہے اور استواء کا آغاز ۳۳ برس سے اور انتہا ۴۰ برس پر ہوتی ہے۔ نیشاپوری نے اپنی تفسیر میں ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اَشد کا زمانہ ۱۸ برس سے ۳۰ برس تک، اور استواء کا وقت ۳۰ سے ۴۰ برس تک ہوتا ہے۔ دونوں قولوں کے مطابق استواء کی آخری مدت ۴۰ برس کی عمر ہے۔ بظاہر آیت میں یہی مراد ہے، اسی سن میں پہنچ کر تمام اندرونی اور بیرونی قوتوں کی تکمیل ہو جاتی ہے اور آدمی پورا آدمی ہو جاتا ہے۔ دانش و بینش کی طاقت اور جسمانی قوت تمام مدارج طے کر کے آخری نقطہ پر پہنچ جاتی ہے، بشرطیکہ افکار و امراض کا حملہ نہ ہو۔ اس کے بعد انحطاط غیر یقین کا دور شروع ہوتا ہے۔

اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا۔ بروایت ابن کثیر مجاہد کا قول ہے کہ علم سے مراد نبوت ہے، لیکن سکونتِ مصر کے زمانہ میں نزولِ وحی کا ثبوت نہیں، اس لئے اس قول پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ سدی کا قول ہے کہ حکم سے مراد حکمت یعنی مذہبی فقاہت اور علم سے مراد فہم و دانش ہے۔ محمد بن اسحاق کا قول بھی اسی کے قریب ہے۔ بعض نے حکم سے حکمت اور علم سے علم کسبی مراد لیا ہے۔ موخر الذکر دونوں قول ناقابلِ انکار ہیں۔ کیونکہ نبوت سے پہلے بھی غیر اللہ کی پرستش سے بیزار اور ایک دانشمند انسان تھے اور چونکہ شہزادوں کی طرح پرورش پائی تھی، اس لئے یقیناً مروجہ علوم سے بھی بہرہ اندوز ہوں گے۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ۔ یعنی جس طرح موسیٰ کی ماں نے اللہ کے حکم کو سچا مان کر بچہ کو دریا میں ڈال دیا اور اللہ نے بچہ کو واپس دے دیا اور پھر اس بچہ کو فہم و دانش اور علم و معرفت عطا کی۔ اسی طرح فرماں بردار نیکوکاروں کو اللہ اجر عطا فرماتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ جس طرح حدِ شعور کو پہنچنے پر ہی موسیٰ نے گمراہی سے اعراض اور حق کی طرف رُخ کیا۔ فرعون کی قہاریت کا خوف اور مصر کی حکومت کا لالچ اس کو حق سے روگرداں نہ بنا سکا اور اس کے صلہ میں خدا تعالیٰ نے اس کو علم و دانش اور حکمت و فراست عطا فرمائی۔ اسی طرح خدا ہر نیکوکار کو اجر عطا فرماتا ہے۔ پہلا مطلب معنی کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہے اور دوسرا مطلب قربتِ الفاظ کا لحاظ کرتے ہوئے زیادہ مبہم معلوم ہوتا ہے۔

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا۔ مدینہ سے کون سا شہر مراد ہے اور غافل پا کر نکلنے کا کیا سبب ہے؟ مجاہد کے نزدیک عین الشمس مراد ہے۔ بعض نے خاص مصر کی صراحت کی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ مصر سے دو فرسخ پر فرعون نے شاہی بستی منف بسائی تھی۔ وہاں موسیٰ کو آنے کا حکم نہ تھا۔ کیونکہ موسیٰ فرعون کے خیالات اور طریقِ عبادت پر معترض ہوا کرتے تھے، اس لئے فرعون ناراض تھا۔ ایک روز آنکھ بچا کر موسیٰ وہاں پہنچ گئے۔ بعض نے لکھا ہے کہ بچپن میں موسیٰ نے فرعون کی داڑھی پکڑ لی تھی۔ فرعون نے ناراض ہو کر حکم دے دیا تھا کہ شہر میں موسیٰ نہ رہے نہ ہمارے پاس آئے بلکہ کسی الگ مقام پر رہے، لیکن یہ ذکر بے ربط ہے۔ صرف یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ موسیٰ نے شاہزادوں کی طرح پرورش پائی تھی، اس لئے عوام سے ربط پیدا کرنے اور ادھر ادھر بازاروں میں گھومنے کی ممانعت ہو گی۔ ایک روز صبح کو یا شام کو یا دوپہر کو نگرانی کرنے والوں کو غافل پا کر باہر نکل آئے۔ اس وقت شہر والے بھی کاروبار میں مشغول نہ تھے خواہ دوپہر کا وقت ہو جس میں سکون عام ہو یا بالکل صبح ہو کر لوگ کاروبار کے لئے نہ اٹھے ہوں یا شام ہو۔

فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ یعنی موسیٰ کے گھونسے نے قبطی کا کام تمام کر دیا اور قبطی مر گیا۔ موت بھیجنا تو خدا کا کام ہے، مگر فعل کی نسبت اسباب کی طرف مجازاً کر دی جاتی ہے۔ موسیٰ کا گھونسہ ظاہری سبب تھا، اس لئے موت کی اسناد گھونسہ کی طرف کر دی۔

قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ موسیٰ اگرچہ اس وقت نبی نہ تھے، لیکن دانشمند نیکوکار اور مصلح تھے اور فساد کے بالطبع دشمن تھے۔ کام کیا تھا اچھائی کیلئے ہو گئی بُرائی۔ جذبۂ حق، بندشِ فساد اور اصلاح کار کا خیال پیشِ نظر تھا، مگر نتیجہ میں بغیر کسی عادی سببِ ہلاکت کے موت واقع ہو گئی، اس لئے فوراً پشیمان ہوئے اور کہنے

گئے یہ شیطانی حرکت ہے۔ کمبخت کھلا ہوا دشمن ہے ہر وقت راہِ راست سے بہکانے کے درپے رہتا ہے۔ اگرچہ یہ قتل عمد نہ تھا نہ عادی سبب ہلاکت تھا نہ نیت بیجا تھی مگر موسیٰ سے یہ حرکت سرزد ہوئی تھی۔ بلند رتبہ والوں کی نادانستہ لغزش بھی خطا سمجھی جاتی ہے، اس لئے آپ نے فوراً توبہ کی اور اپنی ذات سے بے جا حرکت سرزد ہونے کا اعتراف کیا اور اپنے آپ کو ظالم قرار دیا۔

نوٹ:۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ موسیٰ اس وقت نبی نہ تھے، اس لئے اس حرکت سے موسیٰ کی عصمت نبوی ساقط نہیں ہوتی اور اگر مجاہد کا قول تسلیم کر لیا جائے تب بھی نادانستہ نتیجۂ بد کا ظہور جبکہ فعل کے وقت نیت صحیح ہو کسی کو مجرم نہیں قرار دے سکتا۔ رہ گیا اعترافِ ظلم تو وہ شانِ نبوت کا ایک مظاہرہ تھا جس نے معمولی فروگذاشت کو خطاو ظلم کا جامہ پہن کر موسیٰ سے اعترافِ ظلم کرایا۔ بڑے آدمیوں کا ہر عمل ایک خاص رفعت رکھتا ہے۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ۔ یعنی موسیٰ نے اللہ کے انعام و احسان کی قسم کھا کر عہد کیا کہ آئندہ مجرموں کا ساتھ نہ دوں گا۔ بعض مفسرین نے اس آیت سے استخراج کیا ہے کہ جس اسرائیلی کی حضرت موسیٰ نے مدد کی تھی وہ مجرم یعنی کافر تھا جب ہی تو حضرت نے عہد کیا آئندہ مجرموں یعنی کافروں کا ساتھ نہ دوں گا۔

خطیب نے استنباط کیا ہے کہ اس اسرائیلی کا مسلم و موحد ہونا اس آیت سے بطور اشارہ نکلتا ہے کیونکہ جب اسرائیلی کی مدد کی وجہ سے اللہ نے بخش دیا تو موسیٰ نے عہد کیا۔ میرے نزدیک دونوں استنباط ناقابل قبول ہیں۔ خطیب کا قول تو اس لئے غلط ہے کہ اسرائیلی کی مدد کی وجہ سے اللہ نے موسیٰ کو معاف ہی نہ کیا تھا، مغفرت کی بنا اسرائیلی کی مدد ہی نہ تھی۔ آیت میں اس پر کوئی دلالت نہیں۔ دوسرے یہ کہ انعام سے مغفرت مراد لینی ہی صحیح نہیں کیونکہ حضرت موسیٰ نے تو صرف توبہ کی تھی مغفرت کا ان کو کیا علم ہو سکتا تھا اس وقت تک نبی نہ تھے۔ اول استخراج اس لئے غلط ہے کہ ہر مجرم کافر نہیں ہوتا۔ کافر ہونا کیسے معلوم ہوا۔ سیدھے مطلب کو مفسرین نے ٹیڑھا کر دیا۔ موسیٰ پر خصوصیت کے ساتھ اللہ کے بڑے احسان تھے۔ ایامِ ولادت سے لے کر زمانۂ جوانی تک موسیٰ کی زندگی حیرت انگیز تھی۔ انعام سے بس وہی گزشتہ احسانات مراد ہیں۔ موسیٰ نے قسم کھا کر کہا ایسے بیہودہ بدمعاش جو سرِ راہ لڑتے پھرتے ہیں ان کا آئندہ ساتھ نہ دوں گا۔ بدمعاشوں کی طرح سرِ راہ لڑنا جھگڑنا درست نہ تھا، گریبان ہونا اور پنجہ بریش ہونا ہی مجرمانہ حرکت ہے۔ موسیٰ کو اپنی عزت و وقار کا پاس لحاظ کرتے ہوئے دخل نہ دینا چاہیے تھا، لیکن غلطی ہو گئی تو آئندہ ایسے بدمعاشوں کے معاملات میں دخل انداز ہونے سے توبہ کر لی۔ مجرمین سے ایسے ہی بیہودہ جھگڑالو مراد ہیں۔ کافر و مسلم سے اس کا تعلق ہے، لیکن سوءِ اتفاق کہ دوسرے روز پھر ویسا ہی قصہ سامنے آیا۔ وہی اسرائیلی دوسرے قبطی سے جھگڑا کرتا ہوا نظر آیا۔ موسیٰ نے اسرائیلی سے کہا تو کھلا ہوا بیہودہ ہے یہ کہہ کر قبطی کی طرف ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے کہ اسرائیلی سمجھا مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں کیونکہ اپنے متعلق تنبیہی کلمات سن ہی چکا تھا۔ جونہی یہ خیال ذہن میں گزرا فوراً گزشتہ راز اس نے کھول دیا۔

اِنَّكَ لَغَوِیٌّ مُّبِیْنٌ۔ خازن، محلی اور اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ الفاظ موسیٰ نے اسرائیلی سے فرمائے تھے، لیکن قرطبی کا قول ہے کہ روئے سخن قبطی کی طرف تھا کیونکہ وہ کھلا ہوا کافر تھا۔ اول قول اظہر و واضح ہے۔

قَالَ یٰمُوْسٰی اس قول کا قائل اکثر مفسرین کے نزدیک اسرائیلی تھا۔ اس نے راز فاش کیا تھا، لیکن بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ قول قبطی کا تھا کہ کل جس قبطی کو قتل کیا تھا وہ موسیٰ تھے، مگر شاہزادہ کی شان کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ خاموش ہو گیا۔ پھر جب موسیٰ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو چلا اٹھا:۔

اِنْ تُرِیْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ۔ الخ یعنی شاہزادوں کے مناسب نہیں کہ وہ رعایا کو قتل کریں۔ آپ شاہزادہ ہو کر ایسی دراز دستی کرتے ہیں۔ آپ کا کام تو صلح و آشتی کرانا اور امن پیدا کرنا ہے۔ قتل و خون ریزی آپ کا کام نہیں۔ غرض راز فاش ہو گیا۔ قبطی تو ویسے ہی موسیٰ کے مخالف تھے۔ ہر بات میں بنی اسرائیل کی حمایت موسیٰ کا شیوہ تھا۔ قبطیوں کی دست درازی آپ کو گوارا نہ تھی۔ پورا اسٹاف آپ کا دشمن ہو گیا۔ جب ایسا سنگین جرم ان کو معلوم ہوا تو سب نے یک زبان ہو کر فرعون کو ابھارا۔ جوڈیشل کمیٹی نے مشورہ کے بعد طے کیا کہ موسیٰ سے انتقام لیا جائے۔

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَی الْمَدِیْنَةِ یَسْعٰی الخ قبطیوں میں سے ایک شخص جس کا نام حزقیل کہا جاتا ہے اور جو در پردہ موحد تھا اس فیصلہ سے واقف ہو کر دوڑتا آیا اور آ کر موسیٰ سے کہا میں آپ کا خیر خواہ ہوں دشمن امراء آپ کے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہاں سے کہیں چلے جائیں۔ خیر خواہ ہونے کا اظہار اس لئے کیا کہ چونکہ قبطی تھا، اس لئے ہو سکتا تھا کہ وہ دھوکہ دے کر موسیٰ کو بھگانا چاہتا ہو۔ موسیٰ یہ سنتے ہی نکل کھڑے ہوئے، لیکن راستے میں تاک جھانک لیتے جاتے تھے کہ کہیں میری تلاش میں آدمی نہ آتے ہوں کہیں مجھے پہچان نہ لیا جائے۔ بھاگتے وقت پروردگار سے اپنی خلاصی کی دعا کی۔

مقصودِ بیان

کمال علمی ہو یا دانش روشن یا نبوت عموماً اعضائے جسمانی اور اندرونی قوتوں کی تکمیل کے بعد ملتی ہے حضرت موسیٰ کی جب اندرونی اور بیرونی قوتیں مستحکم ہوگئیں اور ملتی فطری ترقی ان کے مناسب تھی وہ پوری ہوگئی تو اس وقت ان کو فہم و دانش کا کمال قوت فیصلہ کی رسائی اور قوت قدسیہ کی روشنی عطا فرمائی گئی۔ حضرت موسیٰ کا اسرائیلی کی حمایت کرنا بتا رہا ہے کہ ہم قوم ہم نسب اور ہم مشرب کی حمایت فطری چیز ہے اور جذبۂ وطنیت پر جذبۂ قومیت غالب آتا ہے۔ پس کم فہم ہیں وہ لوگ جو قومیت پر وطنیت کو غالب کرنے کے خواستگار ہیں۔ خلاف فطرت کرنا ناممکن ہے، لیکن حضرت موسیٰ کا پشیمان ہونا اور پھر استغفار کرنا تعلیم دے رہا ہے کہ نسبی اشتراک کے جذبہ سے مغلوب ہو کر ناحق کی حمایت کرنی جرم ہے۔ مجرموں کا طرف دار بننا کسی طرح جائز نہیں۔ حضرت موسیٰ کا شہر کے اندر ڈرتے ڈرتے پھرنا اور تاک گھات لگانا بتا رہا ہے کہ اسباب کی فراہمی اور ظاہری امور کی ترتیب نہ خلاف دانش ہے نہ خلافِ شرع نہ خلافِ توکل بلکہ یہ خوش تدبیری ہے موافقت فطرت ہے اور اہل علم کا فرض ہے۔ ایک قبطی کا آکر موسیٰ کو جوڈیشیل کمیٹی کے مشورہ سے مطلع کرنا بتا رہا ہے کہ اسباب کی لگام خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے وہ جب چاہتا ہے تو دشمنِ قوم میں سے بھی بعض آدمیوں کو دوست بنا دیتا ہے۔ ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے خاص مخلص بندوں کی حمایت آڑے وقت میں کرتا ہے اور اپنے دوستوں کو بے مدد نہیں چھوڑتا۔ موسیٰ کا مصر سے نکل کر بھاگ جانا ثابت کر رہا ہے کہ نجات، عافیت اور فلاح کی ظاہری کرنی فریضۂ انسانیت و دانش ہے۔ لیکن اپنی تدبیر پر قطعی بھروسہ کر لینا بھی اہل ایمان کا شیوہ نہیں۔ اسی لئے باوجود بھاگنے کے خدا تعالیٰ سے دعا کی گویا ایمان نام ہے ظاہری اسباب کی فراہمی کی کوشش کرنے اور پھر خدا پر بھروسہ رکھنے کا۔ حضرت موسیٰ کے فرار سے عبرت پکڑنی چاہیئے اس گمراہ گروہ کو جو اسباب و ذرائع کو ترک کر کے، لنگر کو توڑ کے، ملاح سے کنارہ کش ہو کے گوشہ نشین بن کے زندگی گزارنی چاہتے ہیں اور اس نازیبا حرکت کو توکل اور وثوق باللہ کہتے ہیں۔ ایسے توکل کی تعلیم اور اس پر عمل تعلیم نبوت کے خلاف ہے۔ حضرت موسیٰ کا مصر سے خروج اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ سے ہجرت کرنا دونوں واقعات سے ملتے ہیں۔ تدبیر سے منہ موڑ لینا دانش اور نبوت دونوں کے خلاف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس تدبیر پرست گروہ کو بھی نصیحت پکڑنی چاہیئے جو اپنی تدبیروں کو تقدیر کا بانی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں تدبیر ہی تقدیر کو بناتی ہے۔ یاد رکھو تدبیر تقدیر کو بناتی نہ تدبیر مؤثر ہے مؤثر صرف حکم الٰہی ہے وہی تدبیر کو بناتا اور بگاڑتا ہے وغیرہ۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى رَبِّىٓ اَنْ يَّهْدِيَنِىْ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ○ وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ

اور جب موسیٰ نے مدین کی طرف رخ کیا تو کہا اُمید ہے میرا رب مجھے سیدھی راہ پر لے جائے گا اور جب مدین کے پانی پر آتے

عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۖ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ۖ قَالَتَا

تو وہاں لوگوں کا ایک مجمع دیکھا جو پانی پلا رہے تھے اور دو عورتیں الگ کو اپنی بکریاں روکے کھڑی تھیں موسیٰ نے ان دونوں سے کہا تمہارا کیا مطلب ہے،

لَا نَسْقِىْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ○ فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓى اِلَى الظِّلِّ فَقَالَ

انہوں نے کہا جب تک چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلا کر نہیں لیجاتے ہم پانی نہیں پلاتے کیونکہ ہمارے باپ بہت بوڑھے ہیں (اور وہ آ نہیں سکتے) موسیٰ نے ان دونوں کے جانوروں

رَبِّ اِنِّىْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ ○ فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِىْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۫ قَالَتْ

کو پانی پلایا پھر ہٹ کر سایہ کی طرف جا کر کہا پروردگار تو مجھ پر جو بھلائی بھی کرے میں اس کا حاجتمند ہوں پھر موسیٰ کے پاس اُن دونوں عورتوں میں سے ایک عورت شرماتی ہوئی آئی

اِنَّ اَبِىْ يَدْعُوْكَ لِيَجْزِيَكَ اَجْرَ مَا سَقَيْتَ لَنَا ۗ فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ ۙ قَالَ لَا

اور بولی میرے باپ تم کو بلا رہے ہیں تاکہ تم کو اس کا صلہ دیں جو تم نے ہمارے جانوروں کو پانی پلایا ہے غرض جب موسیٰ اس کے پاس گئے تو اُس شخص سے موسیٰ نے تمام قصہ

تَخَفْ ۫ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ ۝ قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا یٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۫ اِنَّ خَیْرَ

بیان کیا اُس شخص نے کہا تم اندیشہ نہ کرو ظالموں سے تم بچ آئے ان دونوں عورتوں میں سے ایک بولی ابا ان کو نوکر رکھ لیجئے کیونکہ بلا شبہ

مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ ۝ قَالَ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ هٰتَیْنِ

امانتدار آدمی ان سب سے بہتر ہے جن کو آپ نوکر رکھنا چاہیں اس شخص نے کہا میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح اس

عَلٰۤى اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَ مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ

شرط پر تم سے کردوں کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو اور اگر دس سال تم پورے کردگے تو تمہاری طرف سے احسان ہے اور میں تم پر مشقت

اَشُقَّ عَلَیْكَ ؕ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ قَالَ ذٰلِكَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَكَ ؕ

ڈالنی نہیں چاہتا انشاءاللہ تم مجھ کو نیک لوگوں میں پاؤ گے موسیٰ نے کہا میرا تمہارا یہ قول قرار ہو چکا

اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ ۝ ع

ان دونوں میں سے جونسی مدت بھی میں پوری کردوں تو مجھ پر زیادتی نہ ہو اور ہمارے قول پر اللہ گواہ ہے

تفسیر

اللہ کے منتخب اور برگزیدہ بندے وہی ہیں جو عیش و راحت میں پڑ کر نہ خود کو بھولتے ہیں نہ رنج و غم میں اپنا مرکز توجہ ہٹاتے ہیں۔ سکھ میں یادِ الٰہی اور دکھ میں صبر و امید قائم رکھتے ہیں۔ چونکہ ایسے لوگوں کا عیش و سرمد اور غم والم مراتب و درجات میں اضافہ کرنے کے لئے ہوتا ہے، اس لئے ان کو نہ غرور پیدا ہوتا ہے نہ شکوہ۔ ان لوگوں کی کارسازی عالم غیب سے ہوتی ہے۔ یہ مرضیٔ مولا کی جستجو میں سرگرم ہوتے ہیں۔ اللہ راہِ نجات اور طریق کامرانی خود ان کو بتادیتا ہے اور ایسی توفیق عنایت فرماتا ہے جو رشد تک لے جانے والی اور شاہدِ مقصود سے ہمکنار کرنے والی ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ کی بھی یہی حالت تھی۔ حمایت میں حق کا جذبہ کارفرما تھا۔ آپ نے شاہزادوں کی طرح پرورش پائی تھی، کل مملکتِ مصر ناز بردار تھی، لیکن جذبہ حق کو خواہشات کا پانی افسردہ نہیں کر سکتا۔ فرعون کی پرجبروت طاقت اور شاہانہ عیش و آرام نے فرعونی مذہب کی طرف آپ کو مائل نہیں کیا اور غیر اللہ کی پرستش سے آپ کو فطری نفرت تھی جس کی وجہ سے فرعون اور فرعونیوں کو آپ کی طرف سے کدورت خاطر اور قلبی بغض پیدا ہوگیا تھا۔ اصل بات تو یہی تھی، لیکن اتفاقاً قتل قبطی کا واقعہ پیش ہوگیا اور موسیٰ نے ساری راحت و نعمت پر لات مار کر راہِ فرار اختیار کی۔ اس وقت ممکن تھا کہ نیچے اتر کر افریقہ کے صحرا میں چلے جاتے یا کسی اور طرف کا رخ کرتے، لیکن مشیت الٰہی آپ نے بحرِ قلزم کو پار کرکے مدین کا رخ کیا۔ راستہ معلوم نہ تھا، سفر کے عادی نہ تھے، شدائد کو برداشت کرنے کے خوگر نہ تھے، کبھی پیادہ چلے نہ تھے، لیکن راہِ خدا میں خدا کا نام لے کر چل کھڑے ہوئے نہ کوئی منزلِ مقصود تھی نہ کوئی رہبر و راہ نما بس باطنی جذبہ کارفرما تھا تو اتنا کہ میرا پروردگار خود مجھے سیدھا راستہ بتا دے گا۔ جب منزلِ مقصود نہیں تو سیدھا راستہ کیسا کہاں پہنچانے والا۔ مراد یہ تھی کہ ایسی جگہ پہنچا دے گا جہاں شرک کی دنیا نہ ہو اللہ کے سوا دوسرے کو معبود نہ بنایا جاتا ہو۔ جہاں جلوۂ حق نظر آتا ہو، شمع ہدایت روشن ہو، نورِ الٰہی لمعہ ریز ہو، آفتابِ رشد پرتو فگن ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مدین کے راستے پر پڑ گئے، حضرت شعیب کی بستی میں پہنچ گئے۔ سچ ہے سونا سونے میں مل جاتا ہے۔ اللہ کو مقصود تھا کہ موسیٰ کی روحانی جلا ہو کی جائے تہذیب کر چکے تھے، باطنی کثافت بھی زائل ہو چکی تھی۔ تمام عیوب نفسانی اور امراضِ قلبی دور ہو چکے تھے۔ اگرچہ اس میں بھی پوری تکمیل نہ ہوئی تھی، لیکن ابھی دو مرتبے اور طے کرنے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت شعیب کی صحبت میں رہ کر اور دوسرا کوہ طور پر پہنچ کر۔ عالم قدس سے اتصال روح میں روشنی، دماغ میں نورِ قدسی اور حقائق کائنات کا انکشاف تو پیغمبر کی صحبت میں رہ کر میسر آیا جس سے علم الیقین ترقی کرکے عین الیقین بن گیا یعنی ایمان استدلالی سے ایمان شہودی تک رسائی ہوگئی، لیکن ابھی حق الیقین کے مرتبہ پر پہنچنا تو دلذت حسّی اور مرحلہ نوشی ہونا تھا۔ جلال و جمال کا پرتو خود دیکھنا تھا۔ چنانچہ یہ بات طور پر پہنچ کر حاصل ہوئی۔ اگر ہم کو پیاس لگی ہو اور کوئی معتبر سچا آدمی آکر اطلاع

دے کہ پانی کا حوض دروازہ پر موجود ہے تو بلاشبہ ہم کو یقین آجائے گا، لیکن اس یقین سے پیاس نہ بجھے گی، لیکن اگر ہم دروازہ پر پہنچ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو یقین میں ضرور اضافہ ہوگا۔ اگر پہلے ضعیف احتمال کذب باقی رہ گیا تو اب وہ بھی زائل ہو جائے گا، لیکن پیاس اب بھی نہ بجھے گی۔ پھر اگر حوض میں ہم خود اتر کر خوب بھر پانی پی لیں تو پیاس دور ہو جائے گی۔ عارف کو بھی ان درجات سے گزرنا ہوتا ہے۔ پہلا زینہ ایمان استدلالی یا علم الیقین کا ہے جس پر حضرت موسیٰ فطرۃً چڑھے ہوئے تھے۔ خدا کو واحد لاشریک، کارساز مطلق، خلاق کائنات، مالک، مبدء ومعاد جانتے تھے۔ حضرت شعیبؑ کی صحبت میں پہنچ کر آنکھوں سے دیکھ لیا اور علم الیقین عین الیقین سے بدل گیا۔ عالم قدس سے اتصال ہونا شروع ہو گیا۔ غیبوبیت سے مشہود تک ترقی کی، لیکن روحانی پیاس اب بھی نہ بجھی تھی۔ آخر میں طور پر پہنچ کر حق الیقین کے مرتبہ پر فائز ہوئے۔ خود جلال وجمال کی روشنی دیکھ لی۔ بادۂ وصل سے سرشار ہو گئے۔ پہلے اتصال ہوا تھا تو اب ملکۂ اتصال پیدا ہو گیا۔ پہلے دیکھا تھا تو اب پی لیا۔ عرفان کامل کا یہی مرتبہ ہے، لیکن پھولوں کا فرش نہیں، گلزار اور چمنستان نہیں، خارزار اور مہیب جھاڑیاں ہیں قدم قدم خندقیں ہیں، نوکیلے پتھر ہیں، ہر جھاڑی میں قزاق اور رہزن چھپے ہوئے ہیں، ہر پتھر کی آڑ میں خونخوار وحشی درندے تاک میں لگے ہوئے ہیں راہ معرفت میں عارف کو بڑی بڑی حوصلہ فرسا مصائب شدائد برداشت کرنی ہوتی ہیں۔ فقر وفاقہ ضعف ومرض، وحدت وحشت جسمانی، آرام غریب الوطنی اور طرح طرح کی صبر آزما تکالیف سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ سخت سے سخت ضعف اور مسلسل فاقوں کی حالت میں بھی خدا کی خدمت بغیر کسی ذاتی غرض کے کرنی پڑتی ہے۔ شیطانی لشکر اپنی پوری قوت سے سرمایۂ عفت کو لوٹنے کے درپے ہوتا ہے، مگر نہایت استقلال وپامردی سے اس کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ غضبی جوش اور نفس کی سرکشی کو توڑنا پڑتا ہے اس وقت کہیں شاہد مقصود سے ہمکناری نصیب ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ کو بھی یہ تمام مدارج طے کرنے پڑے۔ تنہا سفر، لق ودق بیابان، پیادہ پا، پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ نوکیلے کانٹوں نے پاؤں چھلنی کر دیے، کئی روز تک کچھ کھانے کو نہ ملا پھر بخار کی تکلیف، پیاس کی شدت، وطن اور تمام عیش وعشرت نعمت اور حکومت کے چھوٹنے کا خیال ایسی حالت میں بھی آپ نے بے کس لڑکیوں کی خدمت کی۔ بغیر لالچ کے چند شہ زور مردوں کے ہٹانے کا پتھر خود کنویں سے ہٹا کر ان کی بکریوں کو پانی پلا دیا۔ ایک لڑکی بلا کر لے گئی راستہ میں ہوا کے سبب کہیں اس کا کپڑا اڑنے یا بدن سے چسپاں ہونے لگا۔ موسیٰ کو گوارا نہ ہوا۔ فرمایا میں آگے جاؤں گا تم پیچھے رہو تاکہ تمہارے لباس پر بھی میری نظر نہ پڑے۔ اللہ اللہ کس قدر عفت کوشی تھی۔ پھر پیغمبر زادی سے نکاح ہو گیا تو آٹھ سال بکریاں چرائیں۔ شاہزادہ اور وہ بھی مصر کا۔ جنگل میں بکریوں کا ریوڑ چراتا پھرتا ہے۔ پھر اس تدبیر سے غضبی قوتوں کے جوش کو ٹھنڈا کیا گیا۔ اس کے بعد وہ مرتبہ عطا کیا گیا جس کی طلب ہر عارف کو ہوتی ہے۔

تحلیلِ اجزاء

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ. ابن عباسؓ نے فرمایا کہ موسیٰ مصر سے مدین کی طرف بھاگے۔ مدین تک آٹھ روز کا راستہ تھا۔ آپ برہنہ پا تھے کچھ کھانے کو بھی نہ تھا۔ راستہ میں درختوں کی پتیاں کھا کر گزارہ کرتے تھے۔ مدین پہنچنے تک تلووں کی کھال گر گئی تھی، لیکن خدا پر بھروسہ تھا۔ ایسے دکھ کی حالت میں خدا سے مایوس نہ ہوتے تھے۔

قَالَ عَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يَّهْدِيَنِيْ الخ۔ ابوسعد نے فرمایا مدین سے مصر کو تین راستے گئے تھے۔ حضرت موسیٰ نے درمیانی راستہ اختیار فرمایا تھا اور یہ صرف غیبی راہنمائی تھی، اور آپ کا پیچھا کرنے والے دائیں بائیں کے راستوں پر گئے۔

وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدَانِ یہ دونوں لڑکیاں حضرت شعیب کی صاحبزادیاں تھیں اور چونکہ بالغہ تھیں، اس لئے عورتیں فرمایا۔
ابوسعد نے فرمایا کہ لڑکیاں دوسری طرف نشیبی زمین پر اپنی بکریوں کو روکے کھڑی تھیں تاکہ دوسرے لوگوں کی بکریوں میں نہ مل جائیں۔ شیخ خازن نے لکھا ہے کہ دور کھڑی تھیں۔ بہرحال غرض یہ تھی کہ جو پانی چرواہوں کے جانوروں سے بچ جائے وہ اپنی بکریوں کو پلا لیں کیونکہ چرس کھینچنے کی ان میں طاقت نہ تھی۔ حضرت موسیٰ کو ان پر رحم آیا۔

قَالَتَا لَا نَسْقِيْ الخ۔ یعنی حضرت موسیٰ کے دریافت کرنے پر دونوں لڑکیوں نے ایک نے دوسرے کی طرف سے کہا کہ ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے معاش کا کاروبار نہیں کر سکتا۔ مجبوراً ہم کو خود یہ کام کرنا پڑتا ہے اور ہم بھی کمزور ہیں خود آب کشی کی طاقت نہیں، اس لئے جب چرواہے اپنے مویشی کو پانی پلا کر جانوروں کو نکال کر لے جاتے ہیں تو ان کا بچا ہوا پانی ہم اپنی بکریوں کو پلا دیتی ہیں۔

فَسَقٰى لَهُمَا۔ حضرت موسیٰ کو رحم آیا۔ کمزور کی اعانت کا جذبہ کارفرما ہوا اور خود اٹھ کر چرس کھینچ کر بکریوں کو پانی پلا دیا۔ شیخ جلال الدین محلی نے

لکھا ہے کہ اس کنویں کے برابر کوئی دوسرا کنواں تھا جس نے موسیٰ نے پانی پلایا تھا۔ کیونکہ اس کنویں پر چرواہے پلا رہے تھے۔ امام عماد نے کہا اسی کنویں سے پانی پلایا تھا یہی اظہر ہے۔ ابن کثیر نے ایک طویل اور صحیح سلسلہ کے ساتھ حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ جب مدین کے کنویں پر پہنچے تو وہاں کچھ لوگ اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے۔ پانی پلا کر انہوں نے کنویں کے منہ پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا جس کو دس آدمیوں سے کم نہیں اٹھا سکتے تھے موسیٰ نے دیکھا کہ دو عورتیں الگ کھڑی ہیں ان سے کیفیت دریافت کی۔ انہوں نے اپنا واقعہ بتایا۔ آپ کنویں پر آئے اور پتھر اٹھا کر ایک چرس کھینچ کر سب بکریوں کو سیراب کر دیا۔ اس روایت سے چند باتیں معلوم ہوئیں :۔ (۱) لوگ پانی پلا کر چلے گئے تھے اور لڑکیاں انتظار میں کھڑی تھیں تو حضرت موسیٰ نے اسی کنویں سے پانی پلایا تھا جس سے اور چرواہے پلایا کرتے تھے (۲) حضرت موسیٰ بہت طاقتور تھے (۳) کمزوروں کی خدمت کا جذبہ کارفرما تھا (۴) حضرت موسیٰ بہت دیندار تھے لڑکیوں کو آپ نے کوئی جواب نہ دیا پھر ان کی طرف التفات کی (۵) غیر محرم سے کلام کرنے کے بعد منت کشی کا امیدوار نہ ہونا چاہیئے (۶) نامحرم سے بغیر ضرورت کے کلام نہ کرنا چاہیئے۔ رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ الخ۔ پانی پلا کر ایک درخت کے سایہ میں چلے آئے اور دعا کی پروردگار! تو جو عافیت و بھلائی مجھے عطا فرمائے میں اس کا محتاج ہوں یعنی غریب الوطن بھی ہوں، کوئی دوست یا رشتہ دار ساتھ نہیں، مفلس بھی ہوں، فاقہ سے بھی ہوں، تھکا ماندہ بھی ہوں، مجھے راحت کے کھانے اور ہمدردی کی ضرورت ہے اس تفسیر پر لفظ اَنْزَلْتَ مضارع کے معنی کا حامل ہوگا اگرچہ صیغۂ ماضی ہے مگر مضارع کے معنی میں ہے اور دعا کے موقع پر بجائے مضارع یا امر کے ماضی کا صیغہ مستعمل ہوتا ہے بعض مفسرین نے ماضی کا ہی ترجمہ کیا ہے اگر میرے نزدیک یہ قول کمزور اور سیاق کے خلاف ہے۔ ابن جریر نے حضرت ابن مسعودؓ کا ایک قول نقل کیا ہے۔ ابن مسعود نے فرمایا میں اونٹ پر سوار ہو کر دو روز میں مدین پہنچا اور اس درخت کو دریافت کیا جس کے نیچے حضرت موسیٰ بیٹھے تھے چنانچہ میں نے وہ درخت دیکھا سرسبز لہلہا رہا تھا۔ میرا اونٹ بھوکا تھا اس کی پتیوں کی طرف اونٹ نے منہ جھکایا اور کچھ دیر پتیاں چبا کر تھوک دیا پھر میں نے حضرت موسیٰ کے لئے دعا کی اور لوٹ آیا۔ اس روایت کی اسناد صحیح ہے۔ شیخ ابن کثیر نے بھی اس کا انکار نہیں کیا ہے، لیکن ابن کثیر نے ایک اور روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن مسعود اس درخت کو دیکھنے گئے تھے۔ جس سے موسیٰؑ خطاب الٰہی سنا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ دونوں درختوں کو دیکھنے کے لئے ابن مسعودؓ چلے گئے ہوں، لیکن حل طلب یہ امر ہے کہ موسیٰ کے زمانہ کا درخت ڈھائی ہزار برس کیسے باقی رہا اور ابن مسعودؓ نے اس کو کیسے دیکھا۔ بظاہر یہ امر معلوم ہوتا ہے کہ درخت کی جڑ قدیم ہوگی، لیکن اس درخت سے مختلف زمانوں میں مختلف درخت پھوٹتے رہے ہوں گے جن میں سے ایک کو ابن مسعودؓ نے بھی دیکھا ہوگا۔ جب درخت پرانا ہو جاتا ہے تو اس کے گدّے زمین پر جھک جاتے ہیں اور ٹیڑھے ہو کر زمین سے مل کر نئی جڑ پکڑ لیتے ہیں اور اس طرح ایک درخت سے بیسیوں درخت ہو جاتے ہیں اور بن اور جنگل میں ایسے درخت بکثرت ہوتے ہیں، اس لئے کوئی بعید نہیں اگر ابن مسعود نے ایسا کوئی درخت دیکھا ہو جس کی اصل وہی درخت موسوی ہو۔

فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا الخ۔ محمد بن اسحاق نے اسرائیلی روایات سے اخذ کر کے لکھا ہے کہ بڑی لڑکی کا نام صفورا یا صفرا اور چھوٹی کا نام لیّا یا لیّا یا صفیرا تھا واللہ اعلم۔ بہرحال لڑکیوں نے حضرت شعیب سے جا کر واقعہ کہا۔

موسیٰ کی قوت، دیانت اور جذبۂ رحمت و خدمت گزاری کا اظہار کیا۔ حضرت شعیب نے ایک لڑکی کو بلانے کے لئے بھیجا۔ لڑکی شرماتی لجاتی آئی اور بولی میرے والد کو بلاتے ہیں تاکہ تمہاری خدمت کا صلہ تم کو دیدیں۔ نبی مفت خور نہیں ہوتے۔ حضرت شعیب نے بھی گوارا نہ کیا کہ خواہ مخواہ کسی کے منت کش ہوں، اس لئے بلا بھیجا۔ لیکن وہ اجر کیا تھا۔ طعام و قیام تو بطور مہمان نوازی تھا پھر کیا تھا۔ صرف اتنا تھا کہ لڑکیوں کی زبانی سن کر نیز الہام کے ذریعہ سے بھی حضرت شعیبؑ کو موسیٰ کا جلیل القدر اولوالعزم ہونا معلوم ہو گیا ہوگا اور ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور ہو گئے ہوں کہ موسیٰ کو اپنے پاس رکھو تاکہ ان کی روح میں روشنی، قلب میں سکون، قوتوں میں اعتدال اور دماغ میں طمانیت پیدا ہو جائے۔

فَلَمَّا جَآءَهٗ الخ۔ یعنی موسیٰؑ نے شعیبؑ سے اپنا نام ولدیت (موسیٰ بن عمران بن یصہر بن قاہث بن لاوی بن یعقوبؑ) طریقۂ پیدائش احوال، پرورش، قتل قبطی اور فرار کا واقعہ بیان کیا تو حضرت شعیبؑ نے فرمایا اب تم کچھ اندیشہ نہ کرو۔ یہاں ان کی دسترس نہ ہوگی۔ تم ظالموں کے پنجہ سے نکل آئے۔ اتفاقی قتل کا انتقام لینے والے اور بنی اسرائیل کو ذلیل خستہ حال اور پامال کرنے والے یقیناً ظالم تھے۔ اس کے علاوہ کفر و شرک سب سے بڑا ظلم ہے اور فرعونی مشرک تھے، اس لئے حضرت شعیبؑ نے ان کو ظالم فرمایا۔

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا۔ حضرت شعیبؑ کی ایک لڑکی نے باپ سے کہا آپ ان کو نوکر رکھ لیجئے کیونکہ یہ طاقتور بھی ہیں اور امانت دار بھی اور نوکر میں یہی دو تو اوصاف اس کو قابل انتخاب بنانے والے ہیں۔۔ ابوحیان نے کہا کہ یہ مختصر، جامع اور پُرحکمت کلام ہے۔ کیونکہ جس شخص کے اندر دو خصلتیں موجود ہوں، کام بخوبی انجام دے اور امانتدار بھی ہو تو پھر کامل طور پر کام اس کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا حضرت شعیبؑ نے لڑکی سے دریافت کیا تجھے اس شخص کی قوت وامانت کہاں سے معلوم ہوئی؟ لڑکی نے جواب دیا اس لئے کہ کنویں سے پتھر ہٹا دیا اور چرس کھینچ لیا اور جب اس کو بلانے گئی تو اس نے نظر نہ اٹھائی بلکہ مجھے پیچھے چلنے کو کہا۔ ان دونوں باتوں سے میں اس کی طاقت وامانت کو سمجھ گئی۔ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے تین شخصوں کی فراست تین شخصوں کے متعلق یادگار ہے۔ شعیبؑ کی فراست موسیٰ کے متعلق۔ حضرت ابوبکرؓ کی فراست حضرت عمرؓ کے متعلق الخ۔

عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ۔ حضرت شعیبؑ نے کہا میں اپنی ایک لڑکی کا تم سے نکاح کرنا چاہتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ آٹھ سال تم کو یہاں رہ کر میرا کام کرنا ہوگا اور اگر دو سال تم اپنی طرف سے اضافہ کر دو تو یہ تمہارا احسان ہے۔ اس آیت میں چند امور تنقیح طلب ہیں:۔ (۱) حضرت موسیٰ سے حضرت شعیب نے کسی لڑکی کی تعیین صراحتہً نہیں کی مجمل کلام بولا۔ معلوم ہوا کہ اس طرح ولی یا وکیل کو اس زمانے کی شریعت میں اختیار تھا کہ دو لڑکیوں میں سے جس کا نکاح چاہے کرا دے بشرطیکہ نکاح کرنے والا بھی اس شرط پر راضی ہو اور چونکہ شریعت اسلامیہ میں کوئی حکم اس کا ناسخ نہیں ہے، اس لئے اجازت سابقہ بحالہ قائم ہے۔ (۲) بظاہر حضرت شعیب کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا مہر اس کے شوہر کی مقررہ خدمات بھی ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ آپ نے مالی مہر نہیں مقرر کیا بلکہ ہشت سالہ خدمات کو عوض نکاح قرار دیا۔ ایک حدیث میں بھی آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے تعلیم قرآن مہر قرار دے کر ایک عورت کا نکاح کر دیا۔ اسی لئے داؤد ظاہری کے متبعین کہتے ہیں کہ نکاح کے لئے مالی مہر ضروری نہیں، لیکن یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ آیت سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت شعیب نے لڑکی کا مہر خدمت کو قرار دیا تھا کیونکہ موسیٰ کی ہشت سالہ نوکری بیوی کا مہر ہوتی تو پھر حضرت شعیب اس کو اپنا کام کیوں قرار دیتے اور باپ کو بیٹی کا مہر لینا اور اس سے فائدہ اٹھانا کب جائز ہے۔ حالانکہ حضرت شعیب نے فرمایا تھا کہ تم میرا کام آٹھ سال تک کرو۔ معلوم ہوا کہ یہ خدمت بطور ادائے مہر نہ تھی بلکہ نکاح کی ایک خارجی شرط تھی مہر تو کچھ اور رہا جو موسیٰ کے ذمہ تھا۔ مطلب یہ ہے کہ شعیب نے موسیٰ سے کہا میں تمہارا نکاح اپنی لڑکی سے کئے دیتا ہوں لیکن بطور لزوم آٹھ سال اور بطور اختیار دس سال میرے پاس رہ کر کام کاج کرنا ہوگا۔ رہی حدیث تو اول تو وہ خبر واحد ہے اس کے علاوہ قرآن پاک کی صاف آیت ہے۔ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ الخ۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کا مالی مہر ضروری ہے، اس لئے حدیث کو وقت خاص اور موردِ خاص پر محمول کیا جائے گا یا منسوخ سمجھا جائے گا۔ یہی سبب ہے کہ امام اعظمؒ نے مہر مالی ضروری قرار دیا ہے۔

(۳) آیت مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر کے علاوہ لڑکی کے ولی کو نکاح کے لئے خارجی شرط کر لینی جائز ہے اور شوہر پر اس کی تکمیل لازم ہے۔ اگر ایک مقررہ مدت تک یا ہمیشہ کے لئے عورت کے گھر رہنے کی شرط مقرر ہو گئی تو پھر وہاں سے بغیر اجازت کے چلا آنا اور ترک سکونت کرنا جائز نہیں۔

(۴) حضرت شعیب نے ہشت سالہ قیام کی شرط کیوں لگائی تھی؟ اس کے دو سبب ہیں۔ اوّل تو وہی ہے جس کی آپ نے خود بھی صراحت کر دی تھی کہ مجھے کام کاج کی ضرورت ہے یعنی میں کمزور ہوں، نابینا ہوں، بوڑھا ہوں۔ گھر کی دیکھ بھال اور کاروبار کی سرانجام دہی نہیں کر سکتا۔ دوسرا حقیقی سبب یہ تھا کہ موسیٰ کی عزت وکرامت صلاح واستعداد سے بفراست یا بالہام حضرت شعیب واقف ہو چکے تھے اور پورا قصہ سننے کے بعد یہ سمجھ گئے تھے کہ موسیٰ خدا کا کوئی برگزیدہ بندہ ہے مگر مزاج میں تیزی اور سختی ہے تربیت کی ضرورت ہے، اس لئے دامنِ نبوت میں چھپا کر ایک مدت تک اصلاح کرنی اور بکریوں سے نافرمان، بے وقوف جانوروں کو چرانے کی خدمت پر مامور کر کے رعونت نفس اور جوش غضب کو توڑنا ضروری تھا۔ اس جذبہ کی اصلاح کے تحت آپ نے موسیٰ کو اپنے پاس رکھنا ضروری سمجھا۔

(۵) حضرت موسیٰ مدین میں کتنی مدت رہے؟ آٹھ سال کی مدت تو بطور لزوم قرآن پاک سے ظاہر ہی ہے کیوں کہ جب موسیٰ نے شرط کر لی تو اس کو پورا بھی کیا لیکن بعض علماء کے قول سے دس سالہ قیام بھی ثابت ہوتا ہے۔ ایک یہودی نے سعید بن جبیر سے دریافت کیا کہ موسیٰ نے دونوں مدتوں میں سے کون سی مدت پوری کی تھی؟ سعید نے جا کر حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا دس برس پورے کئے تھے۔ (رواہ البخاری)

وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ۔ موسیٰ نے شعیب سے کہا میں راضی ہوں۔ دونوں مدتوں میں سے کوئی سی مدت پوری کروں گا۔ اگر میں نے آٹھ سال آپ کا کام کیا اور پھر جانا چاہا تو آپ کو مجھ پر زیادتی کرنے کا اور مزید دو سال روکنے کا حق نہ ہوگا۔ ہمارے اس قرارداد کا ضامن اللہ ہے۔ مراد یہ کہ کوئی دستاویز نہیں کوئی چیز رہن نہیں، کوئی ضمانت مالی نہیں اور نہ کوئی گواہ ہے۔ البتہ اللہ کو گواہ کر کے ہم اقرار کرتے ہیں۔

مقصود بیان

جن) کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے سب سے سخت امتحان انبیاء کا ہوتا ہے۔ موسیٰ کو لق و دق صحرا میں بھوکا پیاسا، پیادہ پا، حالت خوف میں سفر کرانا انتہائی آزمائش تھی۔ (۲۱) سے اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اگر راحت و عیش کے بعد مصیبت آ پڑے تو آدمی کو صبر سے کام لینا چاہئے رحمت الٰہی سے مایوس نہ ہو جانا چاہیئے بلکہ سید ھا راستہ طلب کا) دعا اسی سے کرنی چاہیئے جیسا حضرت موسیٰ نے کیا۔ حضرت موسیٰ بہت طاقتور، دیندار اور صفت کوش تھے۔ کمزوروں کی خدمت بغیر لالچ کے کرنی اہل طاقت کا شعار ہونا چاہیئے۔ خدمت کر کے احسان جتانا اہل ایمان و صلاح کا شیوہ نہیں۔ موسیٰ نے بھی لڑکیوں پر اپنی خدمت کا احسان نہ رکھا۔ غیر محرم سے بضرورت بخلوص نیت کلام کرنا جائز ہے۔ لیکن بلا ضرورت ناجائز ہے جس طرح حضرت موسیٰ نے کیا۔ اوّل لڑکیوں سے ان کا کام دریافت کیا پھر خاموشی سے کام کرنے کے بعد کوئی گفتگو نہ کی۔ ایک امر یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ کمزور کی خدمت رائگاں نہیں جاتی۔ پروردگار غیب سے اجر فرماتا ہے۔ اور ایسے عظیم استثنائی اجر عطا فرماتا ہے جو خدمت سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ مگر بے کسوں کی خدمت کے وقت معاوضہ کی خواہش دل میں نہ ہونی چاہیئے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کو اسی بے لالچ خدمت کے عوض وہ اجر ملا جس کا ان کو گمان بھی نہ تھا۔ پناہ کی جگہ امن، ہشت سالہ روزی کا انتظام، نبی زادی سے نکاح، معزز نبی کی صحبت، سب کچھ اسی خدمت کا صلہ تھا۔ موسیٰ کو بکریاں چرانے کی خدمت سپرد کرنے سے غالباً اس طرف ایماء ہے کہ آگے چل کر انسانوں کے ریوڑ کو چرانا ہوگا۔ بکری بھیڑ بہت بے وقوف جانور ہے حد هر سے روکو پھر اسی طرف جاتی ہے اور کمزور بھی ہے۔ ایک لٹھ میں مر بھی سکتی ہے اور بھیڑیا خصوصیت کے ساتھ اس کو شکار کرنے کی تاک میں لگا رہتا ہے۔ چرواہے کو بہت ضبط و تحمل، محنت و چوکسائی سے کام کرنا پڑتا ہے۔ نبی کو بھی آئندہ انہی احوال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ شیطان بھیڑیا ہے ہر شخص کو شکار کرنے کی تاک میں لگا رہتا ہے اس سے حفاظت کرنی، نافرمان انسانوں کو نافرمانی پر ضبط کرنا اور باوجود ان کی مخالفت و عداوت کے ہر وقت ان کی عداوت میں سرگرم رہنا معمولی کام نہیں۔ خواہش و غضب کے تمام جذبات کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ قوت عقلیہ کی تمام روشنی میں چوکسائی کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موسیٰ کو بکریاں چرانے کی خدمت سپرد کی گئی۔ اپنی بیٹی، بہن یا کسی زیر نگرانی محرم عورت کا نکاح کرانے کے وقت ولی کے لئے خارجی جائز شرط مقرر کرنی جائز ہے پھر فریقین میں سے کسی کو خلاف شرط کرنا جائز نہیں۔ شرط سے بڑھ کر زیادہ دینا کرنا تبرع اور نیکی ہے۔ لیکن تبرع پر کوئی شخص مجبور نہیں خواہ زیادہ دے یا نہ دے وغیرہ۔

فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا

غرض جب موسیٰ نے مدت پوری کردی اور اپنی بیوی کو لے کر چل دیئے تو طور کی طرف سے ایک آگ دیکھی اپنی بیوی سے کہا تم ٹھہرو

اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْٓ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ○ فَلَمَّآ

میں نے آگ دیکھی ہے شاید وہاں سے میں تمہارے پاس کوئی خبر لاؤں یا کوئی چنگاری لے آؤں تاکہ تم تاپ لو جب

اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ

موسیٰ آگ پر پہنچے تو اُس مبارک مقام میں وادی کے دائیں کنارے سے ایک درخت کے اندر سے ندا دی گئی کہ

یّٰمُوْسٰٓی اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ

موسیٰ! یقیناً میں اللہ ہوں تمام جہان کا پروردگار اور تم اپنی لاٹھی کو ڈال دو موسیٰ نے جب لاٹھی کو سانپ کی طرح لہراتا دیکھا

وَّلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ یُعَقِّبْ ۚ یٰمُوْسٰٓی اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۫ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ○ اُسْلُكْ

تو پیٹھ پھیر کر بھاگے اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا (ہم نے کہا) موسیٰ آگے آؤ خوف نہ کرو یقیناً تم امن میں ہو اپنا ہاتھ

يَدَكَ فِىْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ ۡ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ

اپنے گریبان میں　داخل کر　وہ بے عیب سفید ہو کر نکلے گا　اور خوف سے مطمئن ہونے کے لئے اپنے بازو کو اپنی طرف سمیٹ لو　تمہارے

بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ○

رب کی طرف سے　یہ دو نشانیاں ہیں (ان کو لے کر) فرعون کے اور اس کے سرداروں کے پاس جاؤ　وہ نافرمان　قوم ہے۔

تفسیر موسیٰ راہِ معرفت کی تین منزلیں طے کر چکے تھے۔ ظاہر باشرع تھا کوئی میل کچیل کثافت اور غلاظت نہ تھی۔ فسق فجور اور عصیان کاری میں مبتلا نہ تھے۔ ظاہری اخلاق شستہ، عادت پاکیزہ، اطوار حمیدہ، گفتار سنجیدہ، رفتار پسندیدہ تھی۔ باطنی امراض میں بھی مبتلا نہ تھے، حبِ جاہ و مال نہ تھا، شوکت و حشمت کی آرزو نہ تھی، عزت و سلطنت کی خواہش نہ تھی، اپنے تکلیف دینے والوں پر چھا جانے کی تمنا نہ تھی، ذاتی انتقام کا جذبہ نہ تھا، راہِ راست پر گامزن تھے، گمراہی سے بھاگ گئے تھے، کج راہی سے منہ نہ موڑا تھا، عیش و عشرت کو چھوڑا تھا، اللہ سے توڑنے والے ہر رشتہ کو توڑا تھا، اللہ کی راہ میں چل کھڑے ہوئے تھے، قدرت نے راہنمائی کی۔ موسیٰ دماغی تحیر میں مبتلا تھے۔ انقباض تو نہ تھا، مگر انقباض کا درجہ انبساط کو طے کر رہے تھے۔ حضرت شعیب کی صحبت میں رہ کر انبساط کامل حاصل ہو لیا روح میں روشنی اور دماغ میں سکون پیدا ہوا۔ روحانی معائنہ حق بھی کر لیا، مگر جرعہ کشی کی تمنا تھی۔ آخر حق الیقین حاصل کرنے کا وقت آ گیا، سفر کی تمام منزلیں طے کر لیں، حوض کے کنارے پہنچ گئے، پانی کے لئے بیتاب تھے فوراً گھس پڑے خوب سیر ہو کر پی لیا۔ پیاس بجھ گئی، لیکن یاد رکھو کہ ذاتِ الٰہی کا نور اور جلال و جمال کا پرتو بغیر حجاب کے نظر نہیں آ سکتا۔ عارف کی روحانی بینائی اتنی تیز نہیں ہو سکتی کہ نورِ مقدس کو اپنے اندر سما سکے۔ اگر نورِ ذات بلا حجاب عارف کی روح پر پرتو فگن ہو تو روحانی بینائی سلب ہو جائے۔ موسیٰ بھی مادی اسباب سکون کے مجموعہ یعنی اپنی بیوی کو ساتھ لے کر چلے، مگر روح تشنہ تھی بیتاب تھی، آنکھوں کے پردے ٹھنڈے تھے، دل کی آنکھوں میں خنکی کی ضرورت تھی۔ جو نہی وادیٔ مقدس میں پہنچے آگ نظر پڑی۔ محبوبہ جسم کے آرام کے لئے آگ لینے چلے، لیکن کیا معلوم تھا کہ آبِ حیات کا سرچشمہ اسی آگ کے اندر ہے۔ پہنچ کر دیکھا تو کیا دیکھا نار کے پردے میں نور دیکھا۔ آواز سنی، کیا سنی، کیسے سنی۔ ہوا کے سروں میں بے کیف آواز بغیر حرف و صورت کے سنی۔ یوں تو کوئی جگہ نورِ قدرت اور ندائے غیبی کو خالی نہیں۔ ہر جگہ برقِ ربانی کی لمعہ پاشیاں اور دعوتِ پس پردہ کی ترنم ریزیاں ہیں، لیکن نور کا ایک حجاب اٹھنے کے لئے خاص مقامات کی ضرورت ہے۔ ذاتِ الٰہیہ کے چہرہ پرنور کے ستر ہزار حجاب پڑے ہیں۔ ان میں ایک حجاب دو حجاب چند حجاب کا اٹھنا خاص محل، خاص مقام اور خاص حالات و واقعات چاہتا ہے اور حجاب نوری کے اٹھنے کے بعد نورِ بے کیف کو دیکھنا بھی ہر آدمی کا کام نہیں، موسیٰ کی آنکھوں کی ضرورت ہے یا سید الکونین ملک المقربین کی قوت بصیرت کی۔ بہر حال موسیٰ نے متبرک مقام میں مادی حجاب کے اندر سے نورِ بے کیف کی پرتو اندازیاں مشاہدہ کیں۔ ذات صرف کا دیکھنا تو ناممکن ہی تھا، اس لئے اس بحث کو درمیان میں لانا ہی فضول ہے۔ درخت کے اندر سے آواز بھی آئی اور آواز آئی ربوبیت کاملہ صفت جلال کے ظہور کو دیکھنے کی موسیٰ میں طاقت نہ تھی کیا کسی میں بھی نہیں ہے اسلئے جمال کا پرتو دکھایا گیا اور قہاریت کو چھوڑ کر ربوبیت کی آواز سنائی گئی۔ عرفان کی یہ آخری منزل تھی جس پر موسیٰ کو پہنچا دیا، لیکن موسیٰ کا درجہ دوسرے عارفوں سے بلند تھا۔ اتنا ہی کافی نہ سمجھا گیا کہ فقط موسیٰ خود سیراب ہو کر لوٹ آئیں بلکہ رحمت کا اقتضاء تھا کہ معرفت کا کوئی چھینٹا دوسروں پر بھی پڑے، نبوت تو مل گئی مگر نبوت سے موسیٰ ہی کو پہنچا تھا۔ واقفِ اسرار ہونے سے موسیٰ کا رونگٹا رونگٹا جگمگا اٹھا، مگر دوسروں کی روحیں تو ویسی ہی تاریک تھیں اور حکمتِ ربانی اس نور کی کچھ کرنیں دوسرے اہلِ استعداد کے دلوں پر بھی ڈالنا چاہتی تھی، اس لئے نبوت کے بعد رسالت پر فائز کیا گیا اور حکم ہوا کہ اب جا کر شاہ گمراہ اور اس کی قوم تیرہ درون کو ہدایت کرو۔ تکمیل رسالت کے لئے ضروری تھا کہ جبروتی اور ملکوتی قوتوں کا کچھ شمہ عطا فرمایا جائے تاکہ ہدایت کی چمک سے دل منور ہو جائیں اور قہر کے تسلط سے طاغوتی قلعوں میں زلزلہ آ جائے، اس لئے جبروتی قوت بصورت عصا اور ملکوتی طاقت بصورت ید بیضاء مرحمت ہوئی۔ موسیٰ باقتضائے بشریت کچھ خوف زدہ بھی ہوئے کیونکہ عرفان کے زینہ پر تو رفتہ رفتہ چڑھنے کے عادی ہو چکے تھے چند منزلیں طے کرتے آئے تھے، اس لئے نور کی جگمگاہٹ اور بے کیف آواز کی ترنم ریزی ان کو متحیر یا خائف نہ بنا سکی، لیکن فرضِ رسالت کی تفویض اور جبروتی طاقت کی بخشش حیرت انگیز اور حیران کن تھی۔ آغاز جوانی سے اس کے عادی ہی نہ تھے۔ اس سبب سے عصا کو بصورت سانپ لہراتے دیکھ کر ڈر رہے، مگر تسکینِ رحمانی سے ہر خوف دور ہو گیا۔

تحلیلِ اجزاء

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ الخ۔ حضرت موسیٰ حضرت شعیب کے پاس دس برس رہے۔ میعاد پوری ہو گئی تو اپنے رشتہ داروں کو دیکھنے کا شوق دل میں پیدا ہوا۔ مصر کو خفیہ مصر آنے کا ارادہ کیا۔ حضرت شعیب کی اجازت سے اپنی بی بی اور کچھ بکریوں کو ساتھ لے کر پیادہ پا چل دیئے بقول ابن عباسؓ راستہ میں بہک گئے، کوئی راہ گیر بھی نہ تھا جس سے راستہ پوچھتے، سردی کی رات تھی، ابر گھر کر آیا کچھ بوندیاں بھی پڑیں۔ مجبوراً وادیٔ مقدس کے کنارے پر ایک گوشہ میں فروکش ہوئے۔ بیوی کو وضع حمل کے آثار ظاہر ہوئے، چقماق سے آگ نکالنے کی کوشش کی، مگر نہ نکلی۔ اچانک کوہِ طور کی طرف سے آگ دکھائی دی۔ یہ درحقیقت آگ نہ تھی تجلیٔ الٰہی تھی جو ایک ہرے سبز درخت سے نکل رہی تھی۔ آگ کی چمک دیکھ کر وحشت کم ہوئی۔ بی بی سے کہا تم اسی جگہ ٹھہرو میں نے آگ دیکھی ہے جاتا ہوں، ممکن ہے تمہارے تاپنے کے لئے کوئی چنگاری لے آؤں یا وہاں کوئی آدمی مل جائے جس سے راستہ معلوم ہو جائے۔

نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ الخ۔ بحرِ قلزم کی دونوں شاخوں کے درمیان مدین ہے۔ دو دن کے فاصلہ پر کوہِ طور کی وادی ہے۔ وہیں موسیٰ ٹھہرے تھے۔ بی بی کو چھوڑ کر آگ کی تلاش میں بڑھے تھے تو دائیں طرف ایک متبرک مقدس ٹیلے پر ایک ہرا سبز درخت کھڑا تھا اس میں سے آواز آئی میں ہی اللہ ہوں اور ربّ العالمین ہوں یعنی الوہیت عامہ اور ربوبیت تامہ میرے لئے ہی ہے۔ موسیٰ نے نور بھی دیکھا اور آواز بھی سُنی، لیکن آواز کیسے سُنی اور درخت میں سے آواز کیسے نکلی؟ اور صوتِ الٰہی درخت میں کیسے حلول کر گیا اور بے کیف چیز باکیف کیسے بن گئی؟ علماء نے اس کی تنقیح مختلف طور پر کی ہے۔ معتزلہ نے صراحت کی کہ باری تعالیٰ کسی جسمانی چیز کے ذریعہ سے کلام کر سکتا ہے، صوتِ الٰہی کے حلول کی ضرورت نہیں صرف اللہ کی توجہ کافی ہے۔ ہر چیز میں اللہ اپنا کلام پیدا کر کے سنوا سکتا ہے۔ پتھر کی طرف توجہ کی تو پتھر اس کے حکم سے زبان بن کر کلام کرنے لگا اور درخت کی طرف توجہ کی تو درخت بولنے لگا۔ معتزلہ کی تاویل اگرچہ فی نفسہ صحیح ہے اللہ کی توجہ سے بے حس اور جامد چیزیں کلام کر سکتی ہیں، لیکن اس جگہ یہ جواب مناسب نہیں کیونکہ اگر درخت کا کلام کرنا مراد ہوگا تو درخت کو کسی طرح زیبا نہیں کہ وہ رب العالمین ہونے کا دعویٰ کرے حقیقتاً یہ درخت کا کلام نہیں ہو سکتا بلکہ درخت کے پردے کے اندر بولنے والا کوئی اور تھا۔

علمائے ماوراء النہر کا قول ہے کہ اللہ کا کلام قدیم ذات قدیم سے قائم ہے اس کا سننا ناممکن ہے نہ اس کا انفکاک ذات سے ہو سکتا ہے نہ وہ حروف سے مرکب ہے نہ اس کو کیفیت صوتی عارض ہو سکتی ہے۔ ہاں درخت میں سے جو کلام سنا گیا وہ حروف سے مرکب تھا اور صوتی تھا اور کلام قدیم پر دلالت کر رہا تھا۔ یہ جواب بھی ضعیف ہے۔ کیونکہ درخت سے جو کلام سنا گیا وہ اگرچہ حروف غیر قادہ سے مرکب تھا اور صوت و لہجہ کا محتاج تھا تو یقیناً حادث تھا اور حادث قدیم پر کس طرح دلالت کر سکتا ہے۔ قدیم کی تعبیر حادث سے ناممکن ہے۔ ہاں اگر مجازی دلالت مراد ہو جس طرح قرآن حادث قرآن قدیم (کلام نفسی) پر دلالت کرتا ہے۔ ممکن ہے یہ جواب صحیح ہو جائے۔ اشعری کا قول ہے کہ وہ کلام جو نہ آواز کے ذریعہ سے ہو نہ حروف سے مرکب ہو اس کا بھی سُنا جانا ممکن ہے جس طرح ذاتِ الٰہی نہ جسم ہے نہ عرض، مگر اس کا دیکھا جانا ممکن ہے۔ یہ جواب بھی ناقابلِ قبول ہے۔ کیونکہ سماعِ عرفی بغیر صوت و حروف کے ناممکن نہ ذات محض کو حالت تجرد میں دیکھنا ممکن ہے نہ وہ دیکھے جانے کی چیز ہے۔ میرے نزدیک صحیح جواب یہ ہے کہ جس طرح ذات باری کو ہزاروں نوری حجابوں کی آڑ میں سے دیکھنا ممکن ہے۔ اگرچہ بلاحجاب ان آنکھوں سے اس کو نہیں دیکھا جا سکتا اور اسی طرح حضرت موسیٰ نے جب رویت ذات مجرد کی درخواست کی تو تہدیدی نفی کے ساتھ حکم ملا لَنْ تَرٰنِیْ اسی طرح بغیر حروف صوت کے پردوں کے کلام الٰہی نہیں سنا جا سکتا۔ البتہ موسیٰ نے صوت بے کیف اور کلام بے صوت کو سنا تھا، مگر گوشِ روح سُنا تھا، سر کے کانوں سے نہیں سنا تھا اور اس میں کوئی استحالہ نہیں۔ امام غزالی اور ایک جماعت متکلمین نے صراحت کی ہے کہ موسیٰ نے اللہ کا کلامِ نفسی بغیر حروف اور بلا آواز کے سنا تھا۔ غالباً اس قول سے یہی مراد ہے کہ روحانی کانوں سے سُنا تھا نہ سر کے کانوں سے واللہ اعلم۔

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ الخ۔ آیات مذکورۂ بالا تک تو آخری منزل عرفان تک پہنچانے کی صراحت تھی۔ اس آیت سے لوازمِ رسالت کے عطا کا آغاز ہے مطلب یہ ہے کہ تجلی دکھانے اور صوت بلاکیف سُنانے کے بعد پروردگار نے دریافت کیا موسیٰ تیرے ہاتھ میں کیا چیز ہے اور خدا تعالیٰ اگرچہ واقف تھا، لیکن موسیٰ کو مانوس کرنے اور گفتگو کا مزید موقع عنایت فرمانے کے لئے ایسا خطاب کیا گیا۔ موسیٰ نے عرض کیا الٰہ العالمین یہ میری لاٹھی ہے۔ بکریوں کے لئے درختوں سے پتیاں جھاڑنا اور ٹیک لگا کر کھڑا ہونا اور بعض دوسری ضروریات کی تکمیل اس سے ہوتی ہے۔ ارشاد ہوا اس کو ہاتھ سے زمین پر ڈال دے۔ موسیٰ نے حکم کی تعمیل کی۔ جونہی لاٹھی زمین پر گری اس کی ماہیت بدل گئی پہلے لاٹھی تھی اب سانپ بن گئی اور سانپ بھی اژدہا، لیکن اژدہا حرکت نہیں کر سکتا اور وہ چھوٹے سانپ کی طرح پھرتی سے کودتی پھرتی تھی۔ موسیٰ اس راز سے واقف نہ تھے۔ باقتضائے بشریت خوف زدہ ہو کر بھاگنے لگے۔ غضبِ الٰہی کا ظہور سانپ کی شکل میں دیکھا تو راہِ فرار اختیار کی اور خیال ہوا کہیں

مجھ پر اس غضب کا اثر نہ پڑ جائے۔ یہ تخیل و تصور محض انسانی اقتضاء تھا ورنہ پیغمبر اور اللہ کے خاص بندے غضب سے مامون ہوتے ہیں صرف طاغوتی لشکر قہر الٰہی اور غضب تمہاری کا شکار ہوتا ہے، اسی لئے شفقت و رحمت کے لہجہ میں ندائے غیبی ہوئی۔

يٰمُوسٰى أَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ موسیٰ ادھر آؤ خوف نہ کرو تم امن یافتہ گروہ میں سے ہو یعنی غضب کا نزول تو سرکش اور نافرمان لوگوں پر ہوتا ہے اور تم مقربین بارگاہ میں سے ہو، اس لئے تمہاری ربّیت کا اثر تم پر نہیں پڑ سکتا۔ اپنی سابق جگہ پر لوٹ آؤ۔ یہ سانپ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ ندا سنتے ہی غضبی خوف موسیٰ کے دل سے دور ہوگیا، فوراً واپس چلے آئے اور اژدہے کا کچھ خیال نہ کیا۔ یہ معجزہ بصورت تخویف عطا ہوا تھا اس کے بعد دوسرا معجزہ تنویری عطا ہوا اور حکم ہوا:۔

اُسْلُكْ يَدَكَ فِي جَيْبِكَ یعنی قمیص کے گریبان کے اندر بغل کے نیچے بائیں طرف قلب کے متصل اپنا ہاتھ لے جاؤ اور پھر نکالو (بہت زیادہ روشنی پیدا ہو جائے گی) تمہارا ہاتھ صاف سفید ہوکر نکلے گا، لیکن کسی بیماری کی وجہ سے نہ ہوگا بلکہ یہ قدرت کی نشانی اور آیت تنویر ہوگی۔ گویا یہ نور قلبی کا عکس ہوگا جس کا ظہور ہاتھ پر محسوس ہوگا کہ ہر اہل ایمان اس کو دیکھ کر روحانی اور قلبی اطمینان اور راہ ہدایت پائے گا۔

وَاضْمُمْ إِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ یعنی اپنے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر سمیٹ کر جذب کر تاکہ دل کا خوف دور ہو جائے۔ مجاہد کا قول ہے کہ شروع میں حضرت موسیٰ فرعون سے بہت ڈرتے تھے۔ جب اس دیکھتے تو اللہ کی پناہ مانگتے۔ خدا تعالیٰ نے یہ حکم دے کر موسیٰ کے دل سے فرعون کا خوف نکال دیا بلکہ معاملہ برعکس کر دیا۔ پہلے موسیٰ فرعون سے ڈرتے تھے اس کے بعد فرعون موسیٰ سے ڈرنے لگا۔ عبدالرحمٰن بن زید اور ابن جریر کا قول ہے کہ اژدہے سے جو ڈر موسیٰ کے دل میں ہوگیا اس کو دور کرنے کے لئے یہ ترکیب بتائی گئی۔ گویا رہب سے مراد اژدہے کا خوف ہے۔ ابن کثیر نے کہا ہے کہ اژدہے کی کوئی خصوصیت نہیں بلکہ ہر خوف و رعب کو دفع کرنے کے لئے یہ حکم عام تھا۔ یعنی جب کبھی بمقتضائے بشریت دل میں کچھ خوف پیدا ہو تو دونوں ہاتھوں کو سمیٹ کر سینے سے ملا لو خوف دور ہو جائے گا خواہ کسی طرح کا خوف ہو۔ حاصل کلام یہ کہ فرعون کے پاس جانے اور اس سے مقابلہ کرنے کے لئے دو باتیں ضروری تھیں۔ اول یہ کہ اس کی سلطنت، شوکت اور طاقت کا خوف موسیٰ کے دل میں نہ ہو۔ اس کی مالی اور فوجی قوت نظر میں ہیچ ہو جائے۔ اس کام کے لئے تو بالکل آسان ترکیب بتا دی گئی۔ دوسرے مقابلے کا ساز و سامان اور طاقت و فوج کی ضرورت تھی، لیکن اللہ کا پیغمبر مادی طاقتوں پر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ خداداد قلبی طاقت کا حامل ہوتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ کو پرجبروت طاقت بشکل عصاء رحمت ہوئی۔ ان دونوں کے علاوہ شمع ہدایت اور رحمت کی روشنی کی بھی ضرورت تھی تو ید بیضاء کی شکل میں نمودار کیا گیا اور یہ تمام ساز و سامان دے کر حکم دیا گیا کہ اب فرعون اور اس کے اسٹاف سے مقابلہ و مناظرہ کرنے جاؤ وہ ظالم ہیں۔ حد اعتدال سے ہٹ چکے ہیں، قانون قدرت سے نکل چکے ہیں، نظام کائناتی سے ہٹ کر چل رہے ہیں۔

نوٹ:۔ عصائے موسیٰ کا سانپ بن جانا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا فقط صورت اور خواص میں تبدیل ہو جاتی تھی یا ماہیت اور حقیقت میں انقلاب ہو جاتا تھا۔ یہ بحث بہت طویل اور تنقیح طلب ہے۔ اہل فلسفہ انقلاب ماہیت کو محال جانتے ہیں، لیکن یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ محال عقلی اور چیز ہے اور محال عادی اور ہے۔ ماہیت کے عقلی استحالہ پر کوئی دلیل نہیں۔ ہاں صرف انقلاب ماہیت بایں معنی محال ہے کہ ممکن واجب یا واجب ممکن ہو جائے، لیکن اس کے جواز کا کوئی قائل نہیں۔ مابہ الاختلاف یہ امر ہے کہ کیا ایک نوع کا کوئی فرد اپنی نوعیت کے دائرہ سے نکل کر دوسری نوع کے دائرہ میں داخل ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اہل حق اس انقلاب کو عقلاً جائز اور فلاسفہ ناجائز سمجھتے ہیں، مگر جو چیز عقلاً ناجائز ہو وہ کسی طرح واقع نہیں ہو سکتی۔ محال عقلی واقعی محال ہوتا ہے۔ طاقت نبوت سے بطور معجزہ بھی اس کا وقوع نہیں ہو سکتا، لیکن معجزات کا وقوع تو ناقابل انکار ہے پھر اگر معجزات سے صرف صورتوں کی تبدیلی اور خواص کا تغیر کیا جائے تو یہ بات سحر اور نظر بندی سے بھی ہو جاتی ہے۔ شئی اپنی اصلی نوعیت پر رہتی ہے صرف احوال و صفات اور صورت کا تغیر ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں معجزہ کا کوئی امتیاز نہ رہے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ معجزہ سے بطور خرق عادت حقیقت میں انقلاب ہو جاتا ہے۔ لاٹھی واقعی طور پر سانپ بن گئی تھی نہ یہ کہ لاٹھی لکڑی ہی کی تھی اور اس نے سانپ کی شکل و خاصیت اختیار کر لی تھی۔ ایسا کہنا گمراہی ہے۔ اسی بناء پر امام رازی نے صراحت کی ہے کہ اگر قلب ماہیت ممکن نہ ہو تو انبیاء کے معجزات ہیچ ہو کر رہ جائیں گے۔ ہاں انسانی تدبیروں سے بغیر کسی روحانی طاقت کے انقلاب ماہیت ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ اگر کوئی کیمیا گر اپنی تحلیلی اور ترکیبی تحقیقات سے تانبے کو حقیقتاً سونا بنانے کا مدعی ہو تو وہ جھوٹا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کیمیاوی طریقۂ عمل سے تانبا سونے کی شکل اختیار کر لے مگر اس میں نہ سونے کی خاصیت پیدا ہوگی نہ نوع نحاس سے وہ خارج ہوگا۔ اگر کوئی صاحب قوت قدسیہ سے پیتل کو ایک نظر میں سونا بنا دے تو واقعی سونا بن جائے گا۔ اس میں خاصیت فعل تاثیر سب کچھ سونے کی ہوگی اور وہ نوع صفری سے نکل کر نوع ذہبی میں داخل ہو جائے گا واللہ اعلم۔

مقصودِ بیان

موسیٰ اپنی مقررہ مدت پوری کر کے مدین سے لوٹے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وعدہ کی وفا لازم ہے اور شرطِ نکاح کو پورا کرنا ضروری ہے اور تکمیل شرط کے بعد بیوی کو شوہر کی اطاعت کرنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیئے۔ جہاں شوہر لے جائے وہاں جانا لازم ہے۔ حضرت موسیٰ نے حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرائی تھیں۔ حضرت شعیب کی زندگی میں ہی حضرت موسیٰ کو نبی بنا دیا گیا تھا۔ اگر بیوی کو پیار محبت اور تہذیب کے ساتھ بہ لفظ جمع خطاب کیا جائے تو یہ مستحب ہے جس طرح حضرت موسیٰ نے اپنی بی بی کو (بلفظ جمع) خطاب کیا۔ بقدر ضرورت معاش کے لئے کوشش اور مزدوری یا کوئی دوسرا حلال پیشہ اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں بلکہ اپنی روزی خود کمانا آدابِ نبوت کے موافق ہے۔ پس گمراہ ہیں وہ خانقاہ نشین صوفی اور محتاج مطلق پیر جو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گوشہ نشین ہو کر مریدوں پر اپنی معاش کا بار ڈال دیتے ہیں اور تحائف و ہدایا کی آڑ لے کر مسلمانوں کا مال لوٹتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کو درخت سے ندا ہوئی تھی، مگر وہ صوتِ الٰہی تھا۔ اللہ کی الوہیت و ربوبیت میں شرک نہ کرنا تعلیمِ الٰہی کا اولین و آخرین منشاء ہے۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰ کو جو سب سے پہلے ندا ہوئی اس میں اسی کا اعلان تھا۔ معلوم ہوا کسی دوسرے کو رزاق، خلاق یا دیگر اوصافِ الوہیت و ربوبیت کا حامل سمجھنا کفر ہے اور کوئی بندہ خواہ کتنا ہی مقرب ہو جائے عبودیت کے دائرہ سے باہر نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی الوہیت و ربوبیت کو ماننا سب کا فرض ہے۔ اس سے یہ امر بھی مترشح ہوتا ہے کہ جب عبدیت سے نہیں نکل سکتا اور الوہیت کے درجہ میں نہیں پہنچ سکتا تو عبادت سے بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عبادت مظاہرۂ عبدیت ہے۔ موسیٰ کے دل میں سانپ کو دیکھ کر خوف پیدا ہوا تھا لیکن وہ سانپ سے خوف نہ تھا۔ موسیٰ اتنے بزدل نہ تھے بلکہ وہ غضبِ الٰہی سے خوف تھا۔ اسی بنا پر ان کو امن کا پیام دیا گیا اور باوجود سانپ کے بحالہٖ موجود ہونے کے موسیٰ کا خوف جاتا رہا بلکہ انہوں نے پھر دوبارہ اس کو پکڑ لیا اور سانپ بدستور سابق لاٹھی بن گیا۔ موسیٰ کا ہاتھ بطور معجزہ بہت روشن ہو گیا تھا۔ اس سے اشارہ نورِ ہدایت کی طرف ہے جس طرح لاٹھی سے اظہار غلبہ و تسلط اور قہر و غضب کی طرف ہے گویا موسیٰ کے ایک ہاتھ میں غلبہ کی طاقت اور دوسرے میں مشعلِ ہدایت تھی۔ اگرچہ ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی امراض و اعراض کو خدا تعالیٰ بغیر کسی ظاہری تدبیر کے بھی دور کر سکتا ہے، لیکن منظم اسباب سے وابستگی فطرت کا قانون ہے۔ اسی بنا پر خوف کو دور کرنے کے لئے موسیٰ کو سینہ پر ہاتھ رکھنے اور سمیٹنے کا حکم ہوا تھا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی سمجھو جیسے رسول پاکؐ نے حضرت ابوہریرہؓ کو حکم دیا تھا کہ چادر پھیلاؤ۔ ابوہریرہؓ نے چادر پھیلا دی۔ حضورؐ نے دونوں ہاتھوں کا لپ بنا کر چادر کی طرف اس طرح اشارہ کیا جیسے کوئی چیز ہاتھوں میں بھر کر چادر میں لوٹ رہے ہیں۔ اس کے بعد حکم دیا گیا چادر کو گود کی طرف سمیٹ لو۔ ابوہریرہؓ نے حکم کی تعمیل کی۔ اس وقت سے ابوہریرہ کا سینہ مخزنِ احادیث اور منبعِ علم ہو گیا۔ جو لفظ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے سنتے فوراً یاد ہو جاتا اور پھر کبھی نہ بھولتے۔ یہ ممکن تھا کہ حضورؐ والا ایک نظر بھر کر سینہ کو سرچشمۂ علوم بنا دیتے اور حقیقت میں ہوا بھی یہی تھا، مگر یہ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ حضورؐ نے حقیقت کو ظاہری اسباب کا جامہ پہنا کر رونما فرمایا۔ حضرت موسیٰ کو فرعون اور اس کے اسٹاف کے پاس جا کر تبلیغ کرنے کا حکم ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ یقین ہو کہ وہ راستہ پر نہ آئے گا تب بھی پیغام پہنچا دینا ضروری ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ○ وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا

موسیٰ نے کہا پروردگار میرے میں نے اُن کا ایک آدمی مار ڈالا ہے مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ صاف بیان بھی ہے

فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ○ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ

اس کو میرے ساتھ مددگار بنا کر بھیج دے تاکہ وہ میری تصدیق کرے مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھوٹا سمجھیں گے اللہ نے فرمایا ہم تمہارا بازو تمہارے بھائی سے قوی کریں گے

وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْكُمَا ۚۛ بِاٰیٰتِنَاۤ ۚۛ اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ ○ فَلَمَّا

اور تم دونوں کو غالب کر دیں گے اُن کا دسترس تم تک ہمارے معجزوں کے سامنے نہ ہو سکے گا تم دونوں اور تمہارے ساتھی غالب رہیں گے غرض جب

جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِاٰیٰتِنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَاۤ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًی وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِیْۤ اٰبَآىِٕنَا

موسیٰ ہماری کھلی نشانیاں لے کر اُن لوگوں کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا یہ تو بس جھوٹا جادو ہے ہم نے یہ اپنے اگلے باپ دادا میں بھی نہیں

الْأَوَّلِينَ ۝ وَقَالَ مُوسَىٰ رَبِّي أَعْلَمُ بِمَن جَاءَ بِالْهُدَىٰ مِنْ عِندِهِ وَمَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ

سُنا　موسیٰ نے کہا میرا رب اُس کو خوب جانتا ہے جو اس کے پاس سے ہدایت لے کر آیا ہے　اور جس کا انجام بخیر

الدَّارِ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۝ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي

ہوگا　بلاشبہ ظالموں کا　بھلا نہیں ہوتا　فرعون نے کہا　اے اہلِ دربار! میں تو اپنے سوا تمہارے لئے کوئی معبود نہیں سمجھتا

فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامَانُ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَل لِّي صَرْحًا لَّعَلِّي أَطَّلِعُ إِلَىٰ إِلَٰهِ مُوسَىٰ وَإِنِّي لَأَظُنُّهُ مِنَ

ہامان! میرے لئے مٹی (کی پلیٹیں) پکوا　اور میرے لئے ایک محل تیار کر　تاکہ میں موسیٰ کے خدا کو جھانکوں اور میں تو اُسے

الْكَاذِبِينَ ۝ وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ ۝

جھوٹا ہی خیال کرتا ہوں　فرعون اور اس کی جماعتوں نے اُس ملک میں ناحق سرکشی اختیار کر رکھی تھی　ان کا خیال تھا کہ انکو ہمارے پاس لوٹ کر نہ آنا

فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ ۖ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ ۝

پڑے گا مگر ہم نے فرعون کو اس کے لشکروں سمیت پکڑ لیا　اور (اُن) کو دریا میں پھینک دیا　تو دیکھو ظالموں کا　انجام　کیسا ہوا

وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا يُنصَرُونَ ۝

اور ہم نے　ان کو پیشوا بنایا کہ دوزخ کی طرف آنے کی دعوت دیتے تھے　اور قیامت کے دن　اُن کی　مدد نہیں　کی جائے گی

وَأَتْبَعْنَاهُمْ فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ هُم مِّنَ الْمَقْبُوحِينَ ۝

اس دنیا میں　بھی ہم نے ان کے　پیچھے　پھٹکار　لگا دی　اور قیامت کے دن بھی　وہ بدحال　لوگوں میں　ہوں گے

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِن بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَىٰ بَصَائِرَ لِلنَّاسِ

اور اگلی امتوں کو　ہلاک کر چکنے　کے بعد　ہم نے موسیٰ کو　کتاب دی تھی　(جس میں)　لوگوں کے لئے دلیلیں　اور ہدایت

وَهُدًى وَرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝

اور رحمت　تھی　تاکہ وہ　نصیحت　پکڑیں

تفسیر ہر آدمی خواہ جاہل ہو یا عالم، کافر ہو یا مسلم کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے اس مادی دنیا سے کنارہ کش ہو کر عالم مافوق الطبیعۃ طرف توجہ ضرور کرتا ہے۔ ایک وقت خاص ایسا ضرور آتا ہے کہ انسانی دماغ کے تمام شعور کرنے والے حواس خارجی اثر پذیری سے بالکل آزاد ہو جاتے ہیں نہ باہر کی کسی صورت کی توجہ ہوتی ہے نہ معنی کی طرف بلکہ خیال اور حافظہ میں جتنے صوری اور معنوی نقوش ہوتے ہیں ان سے بھی توجہ ہٹا لیتا ہے۔ اس وقت انسان کا ضمیر سادہ اور محض رہ جاتا ہے۔ ایسے وقت میں اس کا رُخ عالم بالا کی طرف ہوتا ہے۔ اور اس حالت میں جو خبر اس کے نفس کے اندر عالم بالا کی طرف سے آتی ہے وہ بالکل صحیح ہوتی ہے لیکن کمزور توجہ والے آدمی اس کا امتیاز نہیں کر سکتے اور دماغی موجودات کی تحلیل و

ترکیب میں نفس سادہ کے ادراک کو بھی غائب کر دیتے ہیں اور جن کی ضمیری طاقت اور نفس ناطقہ کی قوت مادی لشکر یعنی حواس خمسہ پر غالب ہوتی ہے اور وہ اختیاراً ہر چیز کی طرف سے توجہ ہٹا کر عالم قدس کی طرف رُخ کر سکنے کے خوگر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو اہل مراقبہ اور متصوفین کہا جاتا ہے۔ یہی حضرات صاحب الہام اور حامل القاء ربانی ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے نفس کی جودت اور ضمیر کی روشنی بہت قوی اور تیز ہوتی ہے اور کسی مشق اور کسی کسب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایک ادنیٰ اور لمحہ بھر کی توجہ سے عالم قدس کے راز ان پر کھل جاتے ہیں۔ گزشتہ، آئندہ یا موجودہ احوال کے علمی نقوش ان کی روح پر واضح ہو جاتے ہیں اور بہت دیر تک وہ ہر چیز کے سامنے موجود رہنے کے باوجود ہر چیز کے غائب ہوتے ہیں۔ گویا عالم قدس اور دنیائے غیب سے براہ راست بغیر کسی اختیار کے ان کا تعلق ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو نبی یعنی واقف اسرار قدس کہا جاتا ہے۔ ان کا ہر علمی انکشاف وحی کے ذریعہ سے ہوتا ہے یعنی عالم بالا کی کوئی مخلوق (فرشتہ) یا نورانی دنیا کا آفتاب یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی روحوں پر فیضان کرتا ہے۔ یہی فیضان فیضان نبوت اور یہی کلام کلام وحی ہوتا ہے۔ آدمی کو علمی شکلیں دکھتی ہیں اور عرفانی آوازیں سنائی دیتی ہیں، لیکن ان مادی کانوں اور آنکھوں سے نہیں بلکہ گوش روح اور چشم ضمیر سے۔ بعض لوگوں کی حالت اس سے بھی زیادہ ترقی کر جاتی ہے اور کسی مادی جسم کے اندر ان کو غیبی علوم براہ راست یا فرشتہ کی وساطت سے حاصل ہوتے ہیں۔ جس طرح حضرت موسیٰ کو درخت کے اندر سے آواز سنائی دی۔ یا جبرئیل کبھی کبھی انسانی شکل میں حضور اقدس کے سامنے آئے، یہ تمام احوال روح کے احوال ہوتے ہیں اور تمام تاثرات وانکشافات سادہ نفس کے ہوتے ہیں۔ یہاں تک نبوت کا درجہ ہوتا ہے اور انفعالی یا تاثری حالت ہوتی ہے، روح کے فعل اور اثر کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

لیکن یاد رکھو کہ ہر نبی کے نفس ناطقہ پر جو علمی فیضان اور نقوش عرفانیہ کی بارش ہوتی ہے وہ صرف اسی لئے نہیں ہوتی کہ وہ خود ہی لذت چش اور تمتع اندوز ہو جائے اور بس۔ بلکہ جہاں اس کی جرعہ کشی اور لذت اندوزی مقصود ہوتی ہے وہاں یہ بھی مقصود ہوتا ہے کہ اس عرفانی فیضان کا چھینٹا حواس کی دنیا میں پہنچنے کے بعد دوسروں پر بھی چھڑکے جس آخری منزل تک اس کی رسائی ہوتی ہے اس کے ابتدائی یا درمیانی درجہ تک پہنچنے اور حاصل کرنے کی دوسروں کو بھی ترکیب بتائے اور ہر ایک کے طریقے تعلیم کرے۔ وجہ یہ ہے کہ نبی کے علمی نقوش میں کچھ حصہ ایسا بھی ہوتا ہے جس کا تعلق دوسروں سے ہوتا ہے۔ گویا جہاں تک انفعال وتاثر کی حد ہے وہ تو نبوت کی حد ہے اور جہاں سے فعل وتاثیر اور متاثر بنانے کا کام شروع ہوتا ہے وہاں سے رسالت کا آغاز ہوتا ہے، اسی لئے ہمارا مسلک ناقابل تردید قول ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جو رسل من اللہ نہ ہو یا جس کے متعلق فریضہ تبلیغ نہ ہو کیونکہ نبوت نام ہے صرف اس بات کا کہ کوئی آدمی وحی یا بلا واسطہ مکالمہ کے ذریعہ سے اسرار قدس سے واقف ہو جائے، لیکن واقف ہونے کے بعد کچھ حصہ سے دوسروں کو واقف کرنا اور اپنے خم کدہ میں سے ایک چھینٹا دوسروں کو عطا کرنا یہ کام بھی ہر نبی کے متعلق ضرور ہوتا ہے اور یہی رسالت ہے۔ نبوت کی تکمیلی حالت اس وقت ہوتی ہے جبکہ نبی کا نفس تمام حواس باطنہ سے غائب ہو کر عالم بالا سے علمی فیضان کو قبول کرنے میں مشغول ہوتا ہے اور رسالت کا فرض اسی وقت ادا ہوتا ہے جبکہ حواس کی دنیا میں دوبارہ آکر اپنے عرفانی خزانے میں بقدر ضرورت کچھ درہم دوسروں کو بھی بانٹتا ہے۔ جب حضرت موسیٰ کو غیبی آواز سنائی گئی اور کلام کا القاء کیا گیا اور نور قدسی دکھایا گیا اور ان کی پیاس بجھائی گئی تو نبوت کی تکمیل ہوئی۔ پھر فرعون اور فرعونیوں کے پاس جا کر ان کو ہدایت کر۔ نبی کی خدمت سپرد کی گئی۔ یہ تو رسالت کی تفویض ہوئی اور اس خدمت کو سر انجام دینا حواس کی دنیا میں جا کر ضروری قرار دیا گیا تو آپ نے سمجھ لیا کہ مادی دنیا میں جا کر مجھے یہ کام کرنا پڑے گا اور وہاں فرعون کی حکومت اور عمومی تسلط ہے پھر ایسی صورت میں کہ مجھ سے ایک شخص کا قتل ہو چکا ہے میں ویسے ہی ان کا مجرم ہوں اس کے علاوہ میری زبان نہیں چلتی، میرے کلام میں سلاست نہیں، تعاویر علمیہ کے اظہار اور اصلی خدوخال رونما کرنے کے لئے وہ حسن آفرینی اور رنگ بھرنے کی ضرورت ہے پھر نئے علوم کا انکشاف ہوگا، وہ لوگ کور باطن اور تیرہ درون ہیں، میرا قول ان پر کیا اثر کرے گا اور جب اثر نہ ہوگا تو فرض رسالت کس طرح ادا ہوگا۔ یہ باتیں سمجھ کر آپ نے گزارش کی۔ پروردگار! میں نے ان کا ایک آدمی مار ڈالا ہے مجھے اندیشہ ہے کہ (پیام ہدایت سننے سے قبل ہی) وہ مجھے مار ڈالیں گے تو امور کار رسالت کی سرانجام دہی نہ ہو سکے گی۔ اس کے علاوہ میرے کلام میں سلاست بھی نہیں ہے اور وہاں کلام کی روانی ضروری ہے، اس لئے میری زبان کو رواں بنا دے۔ پھر ان کی تیرہ درونی بھی میری بات ماننے پر ان کو آمادہ نہ ہونے دے گی، اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھوٹا کہیں گے، اس لئے میرے بھائی ہارون کو میرا مددگار بنا دے تاکہ وہ میری تصدیق بھی کرے اور سلاست بیان کے ساتھ ان کو فہمائش بھی کرے۔ حکم ہوا تمہاری خواہش منظور ہو گئی، تمہارے بھائی کو تمہارا مددگار بنا دیا گیا تم اپنی کمزوری اور جرم قتل کا کچھ اندیشہ نہ کرو۔ تم پر ان کا دسترس نہ ہوگا بلکہ تم دونوں کے جو لوگ ساتھی ہوں گے اور تمہارا کہنا مانیں گے وہ بھی کافروں پر غالب رہیں گے۔ فرعون اور اس کے ساتھیوں کو تمہارے گروہ پر کوئی تسلط حاصل نہ ہوگا۔ انجام کار تمہارا ہی غلبہ ہوگا۔ موسیٰ کو اطمینان ہو گیا۔ نبوت ورسالت کے سارے ساز وسامان کے ساتھ واپس آ گئے۔ ادھر ہارون بھی نبوت کا خلعت پہن چکے تھے۔ دونوں بھائی مل کر فرعون کے پاس پہنچے اور رب العالمین کا پیغام پہنچایا۔ اس نے نہ مانا۔ انہوں نے معجزات پیش کئے۔ انہوں نے معجزات کو جادو کہا، انہوں نے انجام کی بربادی سے ڈرایا۔ فرعون نے لاجواب ہو کر کہا مجھے تو اپنے سوا کوئی معبود معلوم نہیں۔ اب جو تم نے ایک دوسرے

خدا کا نام لیا ہے تو اچھا ہم بلند ترین عمارت پر چڑھ کر اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ گویا وہ سمجھا کہ خدا بھی انہیں مادی آنکھوں سے نظر آنے والا کوئی مادی جسم ہے۔ نتیجہ میں اپنے لشکر سمیت قلزم میں غرق ہو گیا۔ اس کے بعد تکمیل رسالت کا دوسرا انتظام ہوا۔ پہلے تو رسول کی بیرونی طاقت برسرِ عمل تھی اور فرعون ایسے قہار بادشاہ کے مقابلے میں سرگرم تھی۔ جب اس کا تختہ تاراج ہو گیا تو اب ان علمی نقوش کا کچھ حصہ جو عالم الغیب سے تعلق پیدا ہونے کے بعد حاصل ہوئے تھے دوسروں کے دماغوں پر ثبت کرنا اور کثیف روحوں کو روشن کرنا بھی ضروری تھا۔ اس لئے تورات مقدس عنایت ہوئی۔ تورات کیا تھی؟ انہیں پوشیدہ عرفانی خزانوں کے اندر سے نکلے ہوئے کچھ چمکدار جواہر تھے جو موسیٰ کو مختلف اوقات میں عطا فرمائے گئے تھے۔ لیکن یہ جواہر وہ تھے جو دوسروں کے زیب گلو اور زینت دستار بھی ہو سکتے تھے اور جس سے قوم کی زندگانی کے فوائد بھی وابستہ تھے یوں تو تورات کا ہر حصہ اور خزانۂ عرفان کا ہر جوہر اپنے اندر بصیرت افروز درخشانی دکھاتا تھا اور ہر شخص کی آنکھوں میں اس کو دیکھ کر خیرگی پیدا ہو سکتی تھی، مگر خصوصیت کے ساتھ موسیٰ کی قوم رہنمائی کی زیادہ حاجت مند تھی۔ اس لئے تورات پاک بنی اسرائیل کے لئے ہدایت مجسم بن کر آئی اور یہ محض پروردگار عالم کی رحمت تھی جس طرح نبوت اور اسرار غیب کی واقفیت صرف نبی کے لئے رحمت ہوتی ہے اور بغیر کسی ریاضت و کسب کے عرفانی فیضان نبی کی روح پر ہوتا ہے اسی طرح نبوت کا وہ حصہ جس کا تعلق قوم کی حالت کو سدھارنے سے ہوتا ہے وہ قوم کے لئے رحمت ہوتا ہے اور اسی کا نام کتاب الٰہی ہے۔ گویا کتاب الٰہی جس قوم پر نازل ہوتی ہے وہ نعمت غیر مترقبہ اور بغیر استحقاق کے استیجاب کے غنیمت باردہ ہوتی ہے یعنی تورات مقدس بنی اسرائیل کیلئے راحت مجسم اور رحمت کاملہ تھی۔

تحلیلِ اجزاء قَالَ رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ الخ ہم اس سے پہلے دو مرتبہ مختلف مقامات پر حضرت موسیٰ کے قصہ سے قبل بتا آئے ہیں کہ موسیٰ کو فرضِ رسالت ادا کرنے کے مقابلے میں اپنی جان عزیز نہ تھی۔ دوسرے جلیل القدر نبی تھے۔ معمولی مجاہد اپنی جان قربان کر دیتا ہے بلکہ بات صرف اتنی تھی کہ جب نبوت سے سرفراز کرنے کے بعد رسالت کی خدمت سپرد کی گئی تو موسیٰ کو چونکہ فرعون کی فرعونیت معلوم تھی، اس لئے خیال کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ فرضِ رسالت ادا کرنے سے پہلے مجھے قتل کر دیا جائے اور میں ادائے فرض نہ کر سکوں۔ پھر ایک ظاہری سبب موجود بھی تھا کہ موسیٰ ایک قبطی کو قتل کر چکے تھے اس کے انتقال کا بہانہ فرعونیوں کے لئے کافی تھا اس خیال کو پیش نظر رکھ کر مذکورہ گزارش کی۔

ایک شبہ: موسیٰ نبی تھے اور نبی کی شایانِ شان نہیں کہ اللہ کے سوا کسی سے خوف کرے خواہ خوف کی علت کچھ بھی ہو۔

ازالہ: درحقیقت حضرت موسیٰ کو غضبِ خداوندی سے خوف تھا۔ وہ واقف تھے کہ جس شخص پر خدا کا غضب ہوتا ہے اس سے کسی خیر کی امید نہیں ہو سکتی۔ خدا تعالیٰ اس میں بدی کے تمام اسباب و موجبات پیدا فرما دیتا ہے نبی کا قتل جرم عظیم اور سخت ترین غضبِ الٰہی کا موجب تھا، اس لئے حضرت موسیٰ نے خیال کیا کہ شاید سخت ترین غضب میں مبتلا کرنے کے لئے مجھے قتل کرنا بھی فرعون کے مقدر میں ہو اور وہ غضبِ الٰہی کا آلۂ کار بن کر مجھے قتل کر دے۔ یعنی فرعون سے خوف درحقیقت غضبِ الٰہی سے خوف تھا۔ اس کے علاوہ دوسرا جواب وہی ہے جو ہم نے اوپر ذکر کر دیا کہ موسیٰ کو اپنے قتل کا اندیشہ نہ تھا، ان کو حکم خداوندی کے مقابلے میں اپنی جان عزیز نہ تھی۔ اندیشہ صرف اس بات کا تھا کہ تبلیغ حکم سے پہلے اگر مجھے قتل کر دیا گیا تو ادائے رسالت میں کوتاہی ہو جائے گی۔ ممکن ہے مجھ سے اس کا مواخذہ کیا جائے تو درحقیقت یہ قتل کا خوف نہ تھا بلکہ ادائے رسالت میں قصور کی بازپرس کا اندیشہ تھا۔

وَاَخِیْ هٰرُوْنُ الخ فرعون اور فرعونی بہت ہی سیاہ باطن تھے اور بنی اسرائیل ان کے زیر تسلط، اس لئے موسیٰ کو خیال ہوا کہ جب کوئی میری بات نہ مانے گا تو تبلیغ سے کیا فائدہ۔ پھر موسیٰ کی زبان میں لکنت بھی تھی۔ بیان کو طاقت و سلاست کے ساتھ جاری نہ رکھ سکتے تھے، اس لئے فصیح اللسان تیز بیان معبر کی ضرورت تھی تاکہ مافی الضمیر کی ادا میں کوئی کوتاہی نہ ہو۔ ان دونوں اسباب کے تحت آپ نے ہارون کی نبوت کے لئے درخواست کی اگر زبان نہ ہو تو ناچار۔ دعا قبول ہوئی۔ ہارون کو نبی بنا دیا گیا اور اطمینان دلا دیا گیا کہ تم پر کافروں کا قابو نہ چلے گا۔

بِاٰیٰتِنَا اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَکُمَا الْغٰلِبُوْنَ ابن جریر کی تفسیر کے موافق یہ کلام پہلے کلام سے جڑا ہے۔ بِاٰیٰتِنَا کا تعلق الْغٰلِبُوْنَ سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے عطا کردہ معجزات کے سبب تم دونوں اور تمہارے پیچھے چلنے والے غالب رہیں گے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اگر سابق کلام کے ساتھ بِاٰیٰتِنَا کو مربوط کیا جائے تب بھی معنی میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ دونوں آیتوں کا ملا کر یہ مطلب ہوگا کہ ہم تم کو غلبہ عطا کریں گے۔ ہمارے عطا کردہ معجزات کے سبب ان لوگوں کا دسترس تم پر نہ ہوگا۔ تم مع تابعین کے غالب رہو گے۔

ایک شبہ آیت مذکورہ واضح طور پر بتا رہی ہے کہ موسیٰ اور ہارون کو ماننے والے اور نقشِ قدم پر چلنے والے غالب رہیں گے کافروں کا ان پر تسلط نہ ہوگا اور یہ بھی متعدد آیات سے ثابت ہے کہ جن ساحروں کو فرعون نے موسیٰ کے مقابلے کے لئے جمع کیا تھا وہ ایمان لے آئے تھے پھر فرعون کو ان پر قابو کیوں دیا گیا اور فرعون نے کیسے ان کے ہاتھ پاؤں کٹوا کر صلیب پر لٹکوا دیا اور کس طرح اس کو یہ قدرت حاصل ہوئی؟

ازالہ: مشہور علماء نے اپنی تفسیر میں اس شبہ کا ازالہ اس طرح کیا ہے کہ قرآن پاک سے صرف اتنا ثابت ہے کہ فرعون نے ساحروں کے ہاتھ پاؤں کٹوانے اور صلیب پر کھنچوانے کی

دھمکی دی تھی۔ اس کی کسی جگہ صراحت نہیں بلکہ اشارہ اور دلالت سے بھی معلوم نہیں ہوتا کہ فرعون اس دھمکی میں کامیاب بھی ہوگیا تھا اور واقعی اس نے ہاتھ پاؤں کٹوا دیئے تھے نہ احادیث صحیحہ سے اس کا ثبوت ملتا ہے صرف اسرائیلی حکایات ہیں جو اہلِ اسلام کے نزدیک ناقابلِ قبول ہیں۔

میرے نزدیک اس صورت سے بھی جواب دیا جاسکتا ہے کہ مَنِ اتَّبَعَكُمَا سے بنی اسرائیل مراد ہیں کیونکہ شریعت موسوی صرف بنی اسرائیل کے لئے تھی۔ حضرت موسیٰ و ہارون کی بعثت عمومی نہ تھی صرف اپنی قوم کے لئے تھی، نہ آج تک سوا حضورِ گرامی کے کسی نبی کی بعثت عمومی ہوئی، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ جن لوگوں پر غالب نہ دینے کا وعدہ فرمایا گیا تھا ان پر کبھی فرعون کا قابو نہ چلا۔ حضرت موسیٰ کی بعثت کے بعد سے ہی بنی اسرائیل کے بچوں کا قتلِ عام موقوف ہوگیا اور جو اسرائیلی موسیٰ کے پیرو ہوگئے وہ فرعون کی گرفت سے باہر رہے۔ ہاں دوسری اقوام میں سے جنہوں نے موسیٰ کی شریعت کو مانا وہ ضرور مومن ہوئے، لیکن ان لوگوں کے حکم میں داخل نہ ہوسکے جن کو غلبہ دینے کی قرآن میں صراحت ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ الخ۔ آیات بینات سے مراد عصا اور ید بیضاء ہیں۔ چونکہ ان میں سے ہر معجزہ اپنے اندر گوناگوں نشانہائے قدرت رکھتا تھا۔ لاٹھی سانپ بھی بن جاتی تھی، لاٹھی مارنے سے دریا بھی خشک ہوگیا تھا، لاٹھی مشعلِ راہ کا کام بھی دیتی تھی، اس لئے دو معجزوں کو آیات بینات فرمایا۔

قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُفْتَرًى الخ خطیب نے سراج میں لکھا ہے کہ اسلاف کی کورانہ تقلید تحقیق و تنقیح کی آنکھ اندھا کر دیتی ہے۔ اگر فرعون اور فرعونی دعوتِ موسوی کو حق جانتے اور اللہ کو واحد مانتے اور معجزات کی تصدیق کرتے تو اپنے موروثی مذہب سے کنارہ کش ہونا پڑتا۔ جاہل کا قاعدہ ہی یہ ہے کہ وہ اپنے باپ دادا کو ہمہ صفت موصوف خیال کرتا ہے۔ جسمانی طاقت، علمی وسعت، خیالات کی صداقت، اعمال و اقوال کی حقانیت غرض ہر کمال کا حامل اپنے بزرگوں کو سمجھتا ہے اور ہر نقص و عیب سے ان کو پاک جانتا ہے قبطیوں کی بھی یہی حالت تھی۔ ان کی نظر میں موسوی دعوت بالکل نئی تھی۔ ان کے باپ دادا بت پرست تھے وہ بن دیکھے خدا کی پرستش کرنے پر کس طرح آمادہ ہوسکتے تھے۔ حال کو ماضی پر قیاس کرنے والے کیونکر حق کی روشنی کو اپنی پھوٹی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے، لیکن معجزات موسیٰ کا مقابلہ بھی کرتے نہ بنتی تھی۔ چاروناچار موسیٰ کو غیبی طاقت کا حامل ماننا پڑا اور ضرور اقرار کرنے پر مجبور ہوئے کہ موسیٰ جس قوت کے مالک ہیں وہ ہم میں نہیں ہے، مگر ان کی نظر محسوس پرستی سے بلند نہ جاسکتی تھی۔ نبوت کی طاقت اور عالم الغیب سے فیضان قدسی تعلق کا ان کو یقین نہ تھا۔ اگر ان کے پیشِ نظر کوئی عجیب طاقت تھی تو وہ سحر کی تھی۔ اس زمانہ میں جادوگروں کو ہی سرچشمۂ عجائب اور حاملین طاقت سمجھا جاتا تھا، اس لئے کوتاہ نظر رکھنے والوں نے موسیٰ کے معجزات کو قوتِ نبوت کا کرشمہ اور عالمِ قدس کا فیضان تو نہ سمجھا بلکہ سحر کی طاقت خیال کیا، لیکن کوئی جادوگر اپنے جادو کو خدا کی طرف منسوب نہیں کرتا اور اصلاحِ خلق کا مدعی نہیں ہوتا اور عقائدِ صحیحہ کی تلقین نہیں کرسکتا، اس لئے مکمل جادو کہنا بھی کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا تھا۔ مجبوراً کہنے لگے ہے تو جادو البتہ اس میں اتنی زیادتی ہے کہ اس کو خدا کی طرف منسوب کردیا گیا ہے اور خود ساختہ اعجوبہ کاری کو جھوٹ موٹ خداداد قرار دے دیا گیا ہے۔

مَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا۔ یعنی اللہ کی الوہیت و ربوبیت اور وحدانیت یا اللہ کی طرف سے کسی پیغامبر کی رسالت تو ہم نے اسلاف سے کبھی نہیں سُنی۔ یہ بالکل نئی بات ہے اور کسی بات کو مان کر ہم بزرگوں کے طریقے کو نہیں چھوڑ سکتے۔

وَقَالَ مُوسَىٰ رَبِّي أَعْلَمُ الخ۔ کافروں کو اپنی صداقت کا دعویٰ صرف اس بناء پر تھا کہ وہ طریقۂ اسلاف پر قائم تھے اور طریقۂ اسلاف ہی ان کی نظر میں طریقۂ ہدایت تھا۔ حضرت موسیٰ نے ان کے مقابلے میں برہانی اور عقلی طور پر ہدایت و ضلالت اور صدق و کذب کا ایک معیار قائم فرمایا۔ ظاہر ہے کہ کسی راستہ کا صحیح یا غلط، سیدھا یا ٹیڑھا ہونا دو باتوں پر موقوف ہے۔ اول یہ کہ جس نے راہ قائم کی اور سڑک بنائی ہے اس کا علم مساحت سب سے ممتاز تھا، خود ساختہ راستہ پر چلنا منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیوں پر چلنے سے صحرا گردانی میں گمراہ پھرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں حاصل نہیں ہوسکتا۔ انجینئر اور ماہر مساحت نے آپ کو اگر راہِ مستقیم قریب ترین اور بہت زیادہ سہل لائن پر بنادی ہو تو وہی راہ منزل پر پہنچا سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جس راستہ پر آدمی گامزن ہو حقیقتاً وہ پڑاؤ پر پہنچانے والا اور مہلکاتِ صحرا سے بچا کر منزلِ عافیت تک پہنچانے والا ہو یہی دو باتیں کسی راستہ کے راست اور کج ہونے کے لئے معیار ہیں اور چونکہ راہِ زندگی سے واقف اللہ سے بڑھ کر کوئی نہیں، خواہش، رغبت، لالچ، خوف، غضب اور دوسرے مادی جذبات کے لٹیرے صحرائے زندگی میں بہت ہیں اور ان سے بچا کر علم و عمل کے قافلے کو منزلِ سعادت تک پہنچانے کا طریقہ صرف اللہ ہی کو معلوم ہے۔ وہی جانتا ہے کہ اخلاق، معاشرت، سیاست اور خیالات و افکار کو سدھارنے کا کون سا راستہ ہے اور اس صحرائے پُرخار میں راہِ اعتدال کیا ہے، اس لئے اگر اسی کے قائم کردہ راستے کو بتانے والا اس کی تعلیم کے موافق کوئی آملے تو ایسے پیغامبر کا ہی قول قابلِ پذیرائی ہے اور ایسے ہی راہنما کی رہنمائی رہروی کو واجب کرتی ہے۔ اللہ کے بتائے ہوئے طریقِ نجات کو چھوڑ کر اسلاف یا خود ساختہ پگڈنڈیوں پر چلنا حماقت ہے جو رہبر یا رہرو خود راہ سے واقف نہ ہو اس کی رہنمائی درحقیقت گمراہی پیدا کرنے والی ہے۔ اس سے کافروں کے اس خیال کی تردید ہوگئی کہ ہمارے اسلاف ہی کا طریقہ طریقۂ ہدایت ہے۔ کیونکہ کافروں کے اسلاف کا راستہ وہ راستہ نہ تھا جس پر چلنے کی خدا نے تعلیم دی ہے بلکہ انہوں نے اس زندگی کی صحرانوردی اپنے خیالات و توہمات کے

زیر رہنمائی کی تھی اور ایسی راہروی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچا سکتی۔ لہٰذا ان کی نسلوں کو اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے سے سوا ہلاکت و بربادی کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ ان کا قائم کردہ راستہ جس منزل پر پہنچا رہا ہے وہ منزلِ نجات نہیں۔ پس اندھا دھند اسلاف کی پیروی کرنی اور اس راستہ کو چھوڑنا جس کو اللہ کا پیغام بتا رہا ہے ہلاکت انگیز نہیں تو اور کیا ہے؟ حضرت موسیٰ نے بھی اسی مطلب کو مختصر الفاظ میں بیان کر دیا۔ فرمایا ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ہو اور خدا ہی خوب واقف ہے اور خدا ہی خوب جانتا ہے کہ کون اس کے پاس سے پیامِ ہدایت لے کر آیا ہے یعنی تمہارے اسلاف خدا کی طرف سے پیامِ ہدایت لے کر نہ آئے تھے اور میں خدا کا فرستادہ ہوں اس کی تعلیم کے موافق راستہ بتا رہا ہوں، اس لئے میرا بتایا ہوا راستہ صحیح اور تمہارے اسلاف کا طریقِ زندگی ٹیڑھا ہے۔ اس کے علاوہ منزلِ عافیت پر پہنچنے نہ پہنچنے کا علم بھی خدا ہی کو کامل طور پر ہے۔ راہِ اعتدال سے ہٹنے والوں کو منزل پر پہنچنا نصیب نہ ہوگا۔ انجام کی عافیت و سعادت ظالموں کو نصیب نہیں ہو سکتی اور چونکہ میرا بتایا ہوا راستہ واضح طور پر طریقِ اعتدال ہے اس میں افراط و تفریط نہیں کسی قسم کا ظلم نہیں، انحراف نہیں، لہٰذا یہی راہِ نجات ہے اور اسی پر چلنے والے فلاح یاب ہیں۔ کفار نے اپنی حقانیت کے لئے دلیل بیان کی تھی وہ توہم پرستی اور رسم و رواج کی پابندی سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ گفتگو جذباتی تھی جس کو وہ عقلی رنگ دینا چاہتے تھے محض خواہشِ نفس کی پیروی تھی جس کو صداقت کا جامہ پہنا کر رونما کیا گیا تھا، لیکن حضرت موسیٰ کا جواب برہانی تھا، عقلی تھا۔ آپ نے حق و ضلال کا ایک معیار قائم کر کے پر زور استدلال کے ساتھ اپنی حقانیت کو ثابت کیا جس سے کفار لاجواب ہو گئے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ الخ۔ کفار کے لاجواب ہونے سے فرعون کو اندیشہ ہوا کہ کہیں میرے ارکان حکومت اور عام پبلک میری الوہیت کے عقیدہ سے نہ پھر جائے، لیکن موسیٰ کے دلائل کا جواب بھی نہ بن پڑتا تھا، اس لئے تعقدہ کو رفع گزشتہ کرنے اور اپنی الوہیت کو جمانے کے لئے اپنے اشراف سے کہنے لگا سردارو! مجھے تو اپنے سوا تمہارا کوئی معبود معلوم نہیں۔ اس سے مراد یہ تھی کہ چونکہ میں تم سب سے زیادہ عالم ہوں اور مجھے رب العالمین کے ثبوت و وجود کا علم نہیں، اس لئے تم کو میری الوہیت اور موسیٰ کے خدا کے انکار میں کچھ تامل نہ ہونا چاہئے۔ اگر واقع میں موسیٰ کا کوئی خدا ہوتا اور جیسا موسیٰ نے بیان کیا وہ سچ ہوتا تو مجھے ضرور معلوم ہوتا۔ اس کے بعد روئے سخن موسیٰ کی طرف کیا اور جاہلانہ گفتگو پر اتر آیا اور موسیٰ کو قید کر دینے کی دھمکی دی اس سے یہی مقصود تھا کہ کفار کی نظر میں میری قوت اور ہمہ گیر تسلط کا مظاہرہ ہو جائے اور ان کو میری الوہیت کے انکار کا موقع نہ ملے۔ موسیٰ کو دھمکی دینے کا بیان اسی جگہ نہیں دوسری آیت میں اس کی صراحت ہے۔

فَاَوْقِدْ لِیْ یٰھَامٰنُ الخ۔ لیکن موسیٰ کو دھمکی دینے اور کافروں کے سامنے اپنے علم کی ہمہ گیری اور الوہیت کے عموم کو بغیر ثبوت کے پیش کرنے سے ان لوگوں کی تسکینِ خاطر نہیں ہو سکتی جو ثبوت اور دلیل کے طالب تھے، اس لئے وقتی شبہات کو لطائف الحیل سے ٹالنے کے لئے کہنے لگا ہامان! پختہ اینٹوں کا ایک بلند مکان بنوا تاکہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں۔ میرے خیال میں تو موسیٰ جھوٹا ہے یعنی خدا نظر نہ آئے گا اور جب نظر نہ آیا تو سمجھو موسیٰ جھوٹا ہے (ابن جریر) فرعون واقعی یا تو اس قدر کوتاہ نظر تھا کہ اونچائی سے بلند اس کی نگاہ کو رسائی نہ تھی اور وہ موسیٰ کے خدا کو محسوس مرئی مادی چیز سمجھے ہوئے تھا اسی لئے اس نے جھانک کر دیکھنے کی خواہش کی یا بڑا مکار تھا کہ اس طرح لوگوں کو مغالطہ میں ڈال کر اپنی الوہیت پر جمائے رکھنا چاہتا تھا۔ بہرحال مقصد دونوں صورتوں میں موسیٰ کی تکذیب تھی اور تکذیب بھی غرور آمیز۔ کم ظرف اور قاصر النظر لوگ مادی دولت و حکومت پر مغرور ہو کر تمام فضائلِ علمیہ و عملیہ کا جامع اپنی ذات کو سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کی نظر میں سب سے بڑا مالدار اور مختارِ مطلق حاکم ہونا ہی علامۂ دہر اور فاضلِ اجل ہونے کا ثبوت ہوتا ہے۔ اسی پندارِ نفس اور برخود غلطی کا شکار فرعون بھی تھا الخ۔

فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ۔ مذکورۂ بالا گفتگو کے بعد مقررہ تاریخ پر ساحروں کا ایمان لانا، فرعون کا ان کو دھمکی دینا پھر مدت تک بنی اسرائیل پر ظلم کرتے رہنا اور موسیٰ کی بد دعا سے محض عبرت دلانے کے لئے طرح طرح کے عذاب آنا وغیرہ واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے کا اس جگہ تذکرہ نہیں کیا گیا۔ دوسری آیات میں مذکور ہیں۔ انجام کار فرعون اور اس کے پورے جتھے کو بحرِ قلزم میں غرق کر دیا۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً الخ۔ علمی، مالی اور جسمانی طاقت اس دنیا کا سرمایۂ افتخار ہے۔ اگر اس طاقت کو صداقت و حقانیت کی طرفداری میں صرف کیا جائے تو درحقیقت یہ خدا کی عظیم الشان نعمت ہے اور باطل کی حمایت کی جائے تو یہی طاقت موجبِ وبال ہے۔ فرعون اور اس کا گروہ بڑا طاقتور تھا۔ دولت و حشمت، تسلط و حکومت اور دنیوی علوم سے مالا مال تھا۔ لیکن اس خداداد طاقت کو اس نے حق کی مخالفت میں صرف کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی طاقت ان کے لئے زیاں کاری اور خسرانِ مآلی کا موجب بن گئی۔ خود بھی تباہ ہوئے اور آنے والی نسلوں کی گمراہی و تباہی کا بار بھی ان پر پڑا کیونکہ کمزور طبقہ ہمیشہ طاقتور کا پیرو ہوتا ہے اور ہر مقتدی کی گمراہی کا وبال مقتدیٰ پر پڑنا لازم ہے۔ حدیث میں صاف صراحت ہے کہ جو شخص دنیا میں برا طریقہ ایجاد کرے گا اس پر اپنی بدکرداری کا وبال بھی ہوگا اور ان لوگوں کا بار بھی ہوگا جو قیامت تک اس راہِ بد پر گامزن ہوں گے۔ فرعون اور اس کے اسلاف کی بھی یہی حالت تھی۔ غریبوں، کمزوروں اور زیردست لوگوں پر ان کا اثر تھا۔ اگر یہ راہِ راست پر ہوتے تو وہ لوگ بھی سیدھے راستے پر چلنے لگتے، اگر یہ خود

بد راہ تھے، اس لئے وہ بھی گمراہ ہو گئے۔ قیامت کے دن بھی زبردست لوگ ان کے پیچھے پیچھے اور یہ ان کے آگے آگے دوزخ کی طرف جائیں گے۔

وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً الخ یعنی فرشتے نیک بندے آسمان زمین اور کائنات فضائی سب ہی مشرکوں پر لعنت کرتے ہیں۔ پس اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگی ہوئی ہے اور قیامت کے دن تو بہر حال ان لوگوں کی حالت ابتر ہوگی۔

شیخ بقاعی نے فرمایا اس سے زیادہ فرعون کے ملعون و مردود ہونے کی اور کیا صراحت ہوگی۔ پس جو شخص فرعون کے مومن ہونے کا قائل ہے (یعنی ابن عربی) اس کا قول ناقابل قبول ہے (کذا فی السراج والخطیب)

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ الخ۔ ہر نبی کو خدا نے لوگوں کی ہدایت کیلئے مبعوث فرمایا اور وحی بھیج کر عقائد و اعمال کی اصلاح کرائی، لیکن حضرت موسیٰ سے پہلے کسی نبی پر کوئی مکمل مجموعہ نازل ہوا صرف صحیفے یعنی متفرق طور پر مختلف احکام نازل ہوئے اور جب لوگوں نے ان صحیفوں کو نہ مانا تو خدا تعالیٰ نے ان کو ہلاک کر کے ان کا جانشین دوسری قوموں کو بنا دیا اور عمران انسانی کا نظام یونہی جاری رہا۔ یہاں تک کہ حضرت موسیٰ کا دور آیا۔ جب فرعون اور اس کے ساتھی غرق ہو چکے تو حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر ملک شام کو جانے کے ارادے سے چل دیئے۔ راستہ میں کنعان کی طرف سے گذر ہوا۔ وہاں کچھ لوگ گائے کی پرستش کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر جاہل اسرائیلیوں کے منہ میں بھی پانی بھر آیا محسوس پرستی کا جذبہ لوٹ آیا۔ کہنے لگے موسیٰ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی معبود بنا دیجئے جیسا ان کا معبود ہے۔ موسیٰ نے فرمایا تم لوگ بڑے جاہل ہو توبہ کرو۔ اس کے بعد آگے چل کر قوم کو چھوڑ کر طور پر پہنچے اور تورات مقدس کی تختیاں لکھی لکھائی ملیں۔ تورات کیا تھی اس کا بیان خود اسی آیت میں ہے۔ درمیانی واقعہ کا اس جگہ تذکرہ نہیں ہے۔

بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًی وَّرَحْمَةً۔ یہ تینوں تورات کے اوصاف ہیں۔ تورات بصیرت تھی، ہدایت تھی اور رحمت تھی۔ یعنی عقائد افکار اور خیالات میں روشنی پیدا کرنے والی تھی۔ اس سے دل میں نور اور روح میں جلا پیدا ہوتی تھی۔ اللہ کی ذات و صفات، کائنات، غیب اور مبداء و معاد کے متعلق واہمہ کی ہر ظلمت و کثافت دور ہو جاتی تھی اور علم معرفت سے نفس انسانی کا ذرہ ذرہ جگمگانے لگتا تھا۔ پھر اعمال، افعال اور اقوال کی اچھائی برائی، راستی اور کجی صحت اور غلطی پر بھی تورات نے ریمارک کئے تھے۔ عبادات الٰہیہ کی صحیح تعلیم، حقوق العباد کی ادا کا طریقہ اور معاملات میں حسن سلوک بھی تورات نے بتایا تھا۔ اخلاق و معاشرت کو درست کرنے کے مواعظ اس میں موجود تھے۔ غرض یہ قوت علمیہ و عملیہ کی اصلاح کے پورے ضوابط کی تعلیم تھی۔ پھر جو لوگ تورات کے موافق علم و عمل کو سدھارنے والے تھے ان کے لئے دنیوی و اخروی سعادت و فلاح کا حصول بھی یقینی تھا، اس لئے تورات ان کے لئے رحمت تھی۔ گویا قوت علمیہ کی اصلاح کے لحاظ سے تورات بصیرت تھی اور قوت عمل کو سدھارنے کے اعتبار سے ہدایت تھی اور نتیجہ میں رحمت بھی تھی۔ تینوں اوصاف تورات میں موجود تھے۔

مقصودِ بیان

انبیاء کو فیضان نبوت کے وقت اگرچہ کوئی تردد و شک نہیں اور نہ عالم قدس سے نور باری کے وقت ان کے لئے چون و چرا کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ مگر جب فرض رسالت سپرد کیا جاتا ہے تو وہ مادی دنیا کے ماحول و کوائف کو پیش نظر رکھتے ہیں اور اس عالم اسباب میں ادائے رسالت کی تکمیل کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے ان کی درخواست کرتے ہیں اور تبلیغ کے راستے میں ہر اٹکنے والے روڑے کو دور کرنے کی استدعا کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کا **رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا** الخ کہنا اس مضمون پر دلالت کر رہا ہے کہ صرف کلام کی حقانیت، اثر انگیزی کے لئے کافی نہیں بلکہ عام لوگ طرز ادا سلاست بیان کو بھی کسی کلام کی حقانیت و صداقت کا ضروری جزء سمجھتے ہیں۔ اسی مضمون کی وضاحت حضرت موسیٰ کے الفاظ **هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا** وغیرہ کر رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ خوش بیانی، شیریں بیانی اور سامعہ نواز طرز ادا بھی واعظ کے لئے ضروری ہے۔ فقط عالم ہونا کافی نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ کی استدعا سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ہارون ذیلی نبی تھے۔ حضرت موسیٰ نے درخواست کر کے ان کو نبی بنوایا تھا اور حضرت موسیٰ کی تقلید کرنی ان کا فرض تھا۔ پس اس جگہ سے وہ بحث واضح ہوگئی کہ نبی کی تقلید کرنی جائز ہے یا نہیں۔ جو لوگ عدم جواز کے قائل ہیں وہ فروع اور طریقہ عمل میں تقلید کرنے کے جواز کے قائل ہیں۔ لہٰذا نزاع صرف لفظی رہ گیا ہے۔ **اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَکُمَا الْغٰلِبُوْنَ** کا سیاق بتا رہا ہے کہ اہل حق کو غلبہ حاصل ہوتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی حقانیت پر تعلیم الٰہی کے موافق قائم رہیں، جذبۂ نفس کو دخیل نہ بنائیں اور اگر کہیں کسی حامل حق کی مغلوبیت نظر بھی آ جائے جس طرح کہ بعض انبیاء کو کفار نے شہید کر دیا یا حضرت امام حسینؓ پر یزیدیوں کا تسلط ہو گیا تو اس سے حق کی مغلوبیت نہ سمجھ لینی چاہئے۔ یہ اہل حق کی قربانی کا اظہار اور ان کے مراتب کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ اس طرح کی قربانیوں کے بعد حق کو اور بھی غلبہ حاصل ہوا کرتا ہے۔ "اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد" اسی قسم کی جفاکشی کے بعد اہل حق کو اپنے مشن میں مزید کامیابی ہوتی ہے۔ رسم و رواج اور تقلید اسلاف کا پردہ انکشاف حق اور اتباع صداقت سے روکنے والا ہے۔ یہی ایک چیز ہے جو انسان کی نظر کو کوتاہ اور بصیرت کو مردہ کر دیتی ہے۔ حضرت موسیٰ کے معجزات واضحات اور پیام حق آگین کے مقابلے میں کافروں کے طریقۂ اسلاف کو پیش کرنا اس مفہوم پر واضح دلالت کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰ نے معیار حق و باطل دو باتوں کو قرار دیا۔ ایک یہ کہ ہدایت کا پیام اور قوانین

اصلاح کو بھیجنا صرف اللہ کا کام ہے۔ دوسرے یہ کہ تعلیمِ الٰہی کا آخری انجام بہتر ہے۔ پس جو قانون اللہ کی طرف سے نہ آیا ہو وہ ناقابلِ قبول ہے اصلاحی نہیں تباہی انگیز ہے۔ یہاں سے نصیحت حاصل کرنا چاہیئے۔ اُس اشتراکی اشتمالی اجتماعی یا نسلطائی یا جمہوری خیالات رکھنے والے نوجوانوں کو جو بالشوازم یا فیسی ازم یا امبریلزم یا ڈیموکریٹی ضوابط کو قوانینِ الٰہیہ پر ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کے بہت سے تعزیری احکام، اقتصادی اصول اور سیاسی قواعد پہلے زمانے میں ضرور صحیح تھے، لیکن اب اگر ان پر عمل کیا جائے تو بربریت، وحشت اور جہالت کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ ان بے وقوفوں کو نہیں معلوم کہ قانون تعادل و مساوات اللہ سے بڑھ کر کون بنا سکتا ہے۔ ظلم و انصاف کا فیصلہ اس کے سوا کون کر سکتا ہے۔ جو رہ اعتدال اللہ نے قرآن پاک میں بتادی اس سے ادھر ادھر ہٹنا یقینی گمراہی یا کجراہی ہے۔ قرآن میں نہ سرمایہ داری کی تعلیم ہے نہ اشتراک فی الاملاک کی نہ اس قدر تملک و تملیک کہ غریب طبقہ پس جائے نہ ایسی مساوات کہ زندگی دوبھر ہو جائے۔ انسان دولت اور حکومت کے نشہ سے چُور ہو کر اپنی ذات کو تمام صفات کا مجموعہ سمجھنے لگتا ہے۔ اپنے زیردست لوگوں سے ہر چیز میں یہاں تک کہ علم میں بھی اپنے کو بڑھ چڑھ کر سمجھتا ہے۔ فرعون بھی ایسا ہی تھا۔ اس نے بھی درباریوں کو خطاب کر کے کہا تھا کہ مجھے تو اپنے سوا تمہارا کوئی معبود معلوم نہیں۔ مقصد یہ تھا کہ اگر کوئی معبود اور ہوتا تو مجھے ضرور معلوم ہوتا اور چونکہ مجھے معلوم نہیں، اس لئے واقع میں ہی نہیں ہے۔ جاہل کی نظر محسوس پرستی سے آگے نہیں بڑھتی۔ فرعون کی قوم والے تو منکرانِ حُسن ضرور تھے۔ رہا فرعون تو وہ یادانستہ ہو کر دنیا چاہتا تھا یا واقع میں وہ کوتاہ نظر تھا، اسی لئے خدا کو بلند مینارہ سے جھانک کر دیکھنا چاہتا تھا اور آنکھوں سے نظر نہ آنے سے وہ اللہ کے وجود نہ ہونے پر استدلال کرنا چاہتا تھا۔ فرعون کو پانی میں غرق کر کے دوزخ میں لے جانے سے غالباً اس طرف اشارہ ہے کہ بیوقوف انسان اس زندگی میں جس چیز کو سرمایۂ عیش و راحت سمجھے ہوئے ہے وہی اس کے لئے موجبِ ہلاکت ہے۔ شیطان دنیوی نشاط و طرب کی چیزوں میں انسان کو مشغول کر کے اللہ کا نافرمان بناتا ہے۔ یہی اسبابِ طرب و نشاط آدمی کو ہلاک کر کے دار العذاب میں پہنچا دیتے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی لیڈر یا پیشوائے قوم اللہ کی نافرمانی کی طرف لے جائے تو اگرچہ اس کی پیروی میں تمام عیش و نشاط اور دولت و حشمت حاصل ہو، لیکن آدمی کو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ہم کو بربادی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً سے اس طرف ایماء معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سے سرکشی کرنے والوں پہ اس دنیا میں بھی ان کے مرنے کے بعد پھٹکار پڑتی رہتی ہے۔ ان کا نام اچھائی کے ساتھ دنیا نہیں لیتی۔ شداد، فرعون اور یزید کے نام کس نے نہیں سُنے اور کون ان کو اپنا بزرگ ماننے کے لئے تیار ہے۔

(اللہ کی تمام کتابیں) خصوصاً وہ تورات مقدس جو اس دنیا میں سب سے مجموعہ کتابی شکل میں اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تھی لوگوں کے لئے رحمت تھی۔ یعنی اللہ پر لازم نہ تھا کہ وہ کسی پیغمبر کو مبعوث فرماتا یا اپنا کوئی حکم بھیجتا کیونکہ انسان کو سوچنے سمجھنے اور راہِ ہدایت اختیار کرنے کے لئے اللہ نے عقل دے دی تھی، اس لئے انسان بالکل عاجز و مجبور نہ تھا۔ اچھائی برائی اور نیکی و بدی کے راستے اس کے سامنے کھلے ہوئے تھے وہ جس راستہ پر چلنا چاہتا چل سکتا تھا لیکن رحمتِ پروردگار نے گوارا نہ کیا کہ فقط عقل و فہم کے ہاتھوں میں انسان کو چھوڑ دیا جائے بلکہ اپنی طرف سے اچھائی برائی کا امتیاز پیدا کرنے کے لئے اس نے کتابیں بھی اتاریں۔ افکار و اعمال کی راستی و کجی، صحت و غلطی واضح کی اور یہ سب کچھ تقاضائے رحمت تھا لزوم نہ تھا۔ بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً سے شاید اسی طرف اشارہ ہے وغیرہ۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ وَلٰكِنَّآ

(اے محمد) جب ہم نے موسیٰ کو حکم دیا تھا تو تم غربی جانب موجود نہ تھے اور نہ وہاں حاضر تھے ولیکن ہم

اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ

نے بہتیری اُمتیں پیدا کیں پھر اُن کی عمریں دراز ہو گئیں اور (اے محمد) نہ تم اہلِ مدین والوں میں قیام پذیر تھے کہ ان کو ہماری آیات پڑھ کر سناتے ہو

وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝ وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ

بلکہ ہم رسول بنانے والے تھے اور نہ اُس وقت تم طور کے کنارے پر تھے جبکہ ہم نے ندا دی تھی یہ صرف تمہارے رب کی مہربانی ہے

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ○ وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ

تاکہ تم اُس قوم کو ڈراؤ جن کے پاس تم سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا　تاکہ وہ نصیحت پکڑیں　اگر یہ بات نہ ہوتی کہ جب اُن کے گزشتہ

مُّصِيْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ

کرتوت کی وجہ سے اُن پر مصیبت آپڑے گی　تو یہ کہنے لگیں گے　کہ پروردگار تونے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا تاکہ ہم تیری آیتوں کی پیروی کرتے

وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ

اور مسلمان　ہوجاتے　جب ہماری طرف سے　ان کے پاس حق پہنچ گیا　تو کہنے لگے اس کو ویسا ہی کیوں نہ دیا گیا جیسا

اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظٰهَرَا ۟ وَقَالُوْٓا

کہ موسیٰ کو دیا گیا تھا　کیا یہ لوگ اُس کا انکار نہیں کرچکے جو موسیٰ کو پہلے دیا گیا تھا (کیا انھوں نے نہیں) کہا کہ یہ دو جادوگر ہیں جو ایک دوسرے کے مددگار

اِنَّا بِكُلٍّ كٰفِرُوْنَ ○ قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَآ اَتَّبِعْهُ اِنْ كُنْتُمْ

ہوگئے ہیں اور کہنے لگے تھے ہم دونوں کے منکر ہیں (اے نبی) تم کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو اللہ کی طرف سے کوئی ایسی کتاب لاؤ جو ان دونوں سے ہدایت میں بہتر ہو تاکہ میں

صٰدِقِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَآءَهُمْ ؕ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ

اس کی پیروی کروں　پس اگر وہ تمہارا کہنا نہ مانیں　تو جان لو کہ یہ اپنی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں　اور جو شخص اللہ کی رہنمائی کے بغیر اپنی خواہش

هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ ع

کے پیچھے پڑا ہو　اُس سے زیادہ گمراہ کون　ہوسکتا ہے　اللہ ظالم　لوگوں کو　ہدایت نہیں　دیتا

تفسیر جب آدمی کسی وقت فوق الشعور عالم میں پہنچ جاتا ہے تو اس کو وہ چیزیں نظر آتی ہیں جو ان مادی حقائق میں نظر نہیں آتیں۔ گزشتہ، آئندہ اور موجودہ اشیائ کی علمی تصویریں عالم قدس (یا عالم بالا یا لوح محفوظ یا مبدء فیاض یا عالم روحانیت) میں ہر وقت موجود ہیں صرف پرتوپذیری کی صلاحیت روح میں ہونی درکار ہے۔ جب روح میں روشنی پیدا ہوجاتی ہے تو روح ان حواس سے غائب ہوکر یعنی قوتِ مفکرہ اور تحت الشعور طاقتوں سے بالا پہنچ کر علمی نقوش حاصل کرلیتی ہے۔ اس حصولِ علمی کے چند طریقے ہیں (۱) خواب میں انسان کو بہت سے صحیح واقعات گزشتہ، آئندہ اور موجودہ دنیا کے معلوم ہوتے ہیں بشرطیکہ پیٹ تمام غذائی کثافتوں سے خالی ہو اور معدہ کے بخارات روح کو عالم بالا کی طرف توجہ کرنے سے نہ روکیں۔ منامی علم ہر انسان کو کچھ نہ کچھ ضرور حاصل ہوتا ہے لیکن جن کی روحیں پاک، صاف اور روشن ہیں ان کے تمام خواب سچے ہوتے ہیں اور جن کی روحیں کثیف ہیں ان کے خواب کا کوئی حصہ کبھی صحیح ہوتا ہے اور عموماً غلط کیونکہ ان کی روح انہی مادی جھگڑوں میں خواب کی حالت میں بھی پھنسی رہتی ہے، اس لئے دائرۂ مادیت سے خارج نہیں ہوسکتی۔ اتفاق سے ہی ایسا موقع ملتا ہے کہ وہ مادی علائق سے ہٹ کر عالم بالا کی طرف توجہ کرسکے۔ (۲) دق یا کوئی اور برا نام مرض جس نے مادی قوتوں کو بہت کمزور کردیا ہو اس وقت بھی انسان کو نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں اور ایسے مریض کا تعلق بعض وقت عالم بالا سے ہوجاتا ہے کیونکہ روح کو روکنے والی طاقت کمزور پڑجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر علماء نے علمی گتھیوں کا حل اس وقت کیا جبکہ وہ کسی دیرینہ جسمانی مرض میں مبتلا ہوئے۔ عالم بالا سے تعلق رکھنے کا یہ مرتبہ بھی عام لوگوں کو حاصل ہوجاتا ہے، مگر اس میں بھی روح کے لطافت و کثافت کے فرق کو دخل ہوتا ہے۔ (۳) ریاضت و مجاہدہ۔ اگر انتہائی

عبادت، مراقبہ، ریاضت اور عمومی روزہ کی وجہ سے آدمی اپنی مادی طاقت کو کمزور کر لیتا ہے۔ کھانا صرف اتنا کھاتا ہے کہ زندہ رہنے، پانی صرف اتنا پیتا ہے کہ پیاس سے نہ مرے، غول نشاطِ نفس سے کنارہ کشی کر لیتا ہے، غصہ اور ہوس کی طاقتوں کو مُردہ کر لیتا ہے تو روح میں چمک اور تخیل میں یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے۔ تخیل کی یکسوئی اور روح کی لطافت اسکو عالم بالا سے اتصال کرنے میں مدد دیتی ہے اور عالم بالا کے نقوش اس کے آئینۂ روح پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ اس درجہ میں اہلِ اسقام اور اسلام کے منکر سب ہی شریک ہیں۔ اگر عبادت و ریاضت شریعت کے دائرہ کے اندر رہ کر کی ہے اور تمام مادی طاقتوں کو حکم قرآنی کے بموجب استعمال کیا ہے لہٰذا پھر روح میں روشنی پیدا ہو کر نقوشِ علمیہ عالم بالا سے حاصل ہوئے ہیں تو اس کو کشف کرامت وغیرہ کہا جاتا ہے اور اگر اتباعِ شریعت کا لحاظ نہ رکھا محض مادی طاقتوں کو مردہ کرنے سے سروکار رکھا خواہ تعلیم شریعت کے موافق ہو یا نہ ہو تو روح میں چمک اور تخیل میں یکسوئی ضرور پیدا ہو گی، مگر کثافت بالکل دور نہ ہو گی، روحانیت کمل طور پر زندہ نہ ہو گی۔ تاہم نقوشِ علمیہ کا حصول کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا جس طرح جوگی، سنیاسی، بنیاسی اور مسمریزم کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کی روحوں کو لطافتِ کاملہ تو نہیں ہوتی پھر بھی کچھ روشنی پیدا ہو جاتی ہے (۴) روح میں فطری روشنی اتنی قوی ہو کہ معمولی ریاضت وہ ابیہ عارضی کثافت دور کرنے کے لئے کافی ہو، یہ مرتبہ خالص انبیاء کا ہوتا ہے۔ ان کی روحوں پر فیضان کسی عملِ کامنت کش نہیں ہوتا ہے۔ یہ طبقہ اس مادی دنیا میں رہتے ہوئے بھی تمام مادیات سے اپنی روحوں کو غائب کر سکتا ہے۔ اس کی تحت الشعور قوتیں سب کی سب مغلوب ہوتی ہیں۔ اس گروہ کی روحانی روشنی کی پرتو پذیری کا آغاز سچے خوابوں سے ہوتا ہے پھر رفتہ رفتہ عالم ملکوت کے نمائندوں کی شکلیں کبھی اس کی آنکھوں کے سامنے آتی ہیں کبھی نہیں آتیں، بلکہ محض القاء اور وحی سے ہی گزشتہ، آئندہ یا موجودہ احوال کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ کبھی ان کو اس حد تک ترقی مل جاتی ہے کہ ملکوتی قاصدوں کی وساطت کی بھی ضرورت نہیں رہتی بلکہ خود اپنے روحانی کانوں سے پیامِ غیب سنتے اور روحانی آنکھوں سے صورِ علمیہ کو دیکھتے ہیں، ان کے کشف میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ ان کی روحوں کے سامنے کبھی تحت الشعور قوتوں کے مسلوبات فوق الشعور معلومات کا جامہ پہن کر نمودار نہیں ہو سکتے، اس لئے وحی و کشف میں کبھی ان کو التباس و اشتباہ نہیں ہوتا۔ وحی کے ذریعہ سے ان کو گزشتہ واقعات کی شکلیں اور آئندہ حالات کی تصویریں دکھا دی جاتی ہیں جو چیز دوسروں کی نظر سے غائب ہوتی ہے وہ ان کی روحوں کے سامنے حاضر ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کا کوہ طور پر جانا وہاں موسیٰ سے خطاب ہونا یا مدین میں حضرت شعیب کے پاس پہنچنا، ان سے اور ان کی لڑکیوں سے گفتگو ہونا اور ان کی بکریاں چرانا یہ تمام واقعات وحی کے ذریعہ سے رسول پاکؐ کی روحانی قوت پر منکشف ہوئے نہ حضور والاؐ وہاں اس وقت موجود تھے نہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ سلسلۂ انبیاء آغاز آفرینش انسانی سے جاری رہا۔ اس کی وجہ نقطۂ یہ ہے کہ خواب یا کسی بار یک مرض یا زہد و ریاضت سے حاصل کئے ہوئے انکشافات میں غلطی کا احتمال قائم رہتا ہے۔ قوت واہمہ روح کے ادراکات میں ضرور دخل انداز ہوتی ہے۔ القاءِ شیطانی اور الہامِ رحمانی میں امتیاز مشکل ہوتا ہے۔ بسا اوقات تحت الشعور قوت کے معلومات فوق الشعور طاقت کے معلومات سے غلط ملط کر کے صحیح اور غلط میں گڑبڑ کر دیتے ہیں۔ تمیز نہیں ہو سکتا کہ عالم بالا سے کون سے نقوشِ علمیہ کا فیضان ہوا اور دماغ نے اپنے خود زائیدہ معلومات کو کس حد تک انہیں ملایا۔ یہی وجہ ہے کہ مقدم الذکر تینوں مراتب کا صرف اہلِ اسلام میں ہی نہیں بلکہ تمام اشخاص میں برابر اتنی روشنی حاصل کر لیتے ہیں۔ البتہ نبوت کا فیضان کسی غلطی کا احتمال نہیں رکھتا اور چونکہ اس دنیا کے رہنے والوں کو حق و باطل اور خیر و شر میں تمیز کرنے اور راہِ ہدایت پر چلنے کے لئے ان علمی ہدایات اور اصلاحات کی ضرورت ہے جو براہِ راست عالم بالا سے آئے ہوں۔ اور افراد و اقوام کے باہمی اختلافات کا علمی قدسی فیصلہ ضرور ہونا چاہیئے، اس لئے نبی کا آنا بھی ضرور ہے، مگر ہر وقت نبی کی ضرورت نہیں کیونکہ بعد کو آنے والے نبی کا علمی فیصلہ بھی وہی ہو گا جو سابق نبی نے کہا اور سابق نبی کا فیصلہ جب بحالہ باقی ہو تو مزید نبی کی کیا ضرورت رہتی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی کتاب اور وہ قدسی صحیفہ جو عالم غیب سے نبی کو دیا ہو جب تک اصلی صحیح حالت میں ہو تو دوسرا نبی نہیں آ سکتا، لیکن قدسی صحیفہ میں اگر ادنیٰ ترمیم و تغیر کر لی گئی ہو تو دوسرے نبی کا آنا لازم ہے تاکہ تغیر و تبدیلی کو دور کر کے پھر اصلی حالت میں قدسی صحیفہ کو پیش کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب کتابِ الٰہی میں قدرے تغیر لوگوں نے کر لیا تو خدا نے جدید نبی کو بھیج کر اس کی اصلاح کرا دی، لیکن طول زمانہ اور امتدادِ مدت کے سبب اگر لوگ کتابِ الٰہی میں بہت زیادہ تبدیلیاں اور غیر معمولی تغیرات کر لیں اور تحریف و ترمیم اس حد تک پہنچ جائے کہ اصلی کتاب بالکل مسخ ہو جائے تو پھر جدید صحیفہ کا نازل ہونا لازم ہو جاتا ہے کیونکہ اصل کتاب میں طبع زاد اور دماغی تراشیدہ ملفوظات و عبادات کی زیادتی اس قدر ہو جاتی ہے کہ ان کو دور کرنے کے معنی سوا اس کے اور کچھ نہیں ہوتے کہ از سر نو نئی کتاب پیش کی جائے۔ بہر حال ایسے وقت میں نئی کتاب اترتی ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کو تورات دی گئی۔ دورِ موسوی کے بعد لوگوں نے اس میں قدرے قدرے تغیر کرنا شروع کر دیا۔ مختلف انبیاء آئے انہوں نے آکر ان تغیرات کو اپنے اپنے زمانہ میں دور کر کے اصل کتاب کو پاک صاف شکل میں پھر پیش کر دیا۔ جب تورات میں تغیرات بہت زیادہ ہو گئے تو زبور اور زبور کے بعد انجیل کا نزول ہوا۔ یہ دونوں کتابیں ہی گویا تورات کی اصلاحی شکلیں تھیں، لیکن جب زمانہ بہت زیادہ گزر گیا اور تورات کے بیانات کو نہ فقط فراموش کر دیا بلکہ بالکل مسخ کر دیا گیا تو پروردگار نے محض اپنی رحمت سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برحق نبی بنا کر بھیجا تاکہ بعد کو آنے والی نسلوں کو قیامت کے دن شکایت کا موقع نہ ملے اور کوئی عذر پیش نہ کر سکے کہ گزشتہ قوموں کے پاس تو برابر انبیاء آتے رہے، ہمارے زمانے میں اللہ کا پیغام اپنی اصلی شکل میں مٹ چکا تھا اور اس کی صورت مسخ ہو چکی تھی، اسلئے

ہم کو معلوم نہ تھا کہ خدا کا اصل پیغام کیا ہے پھر کوئی نبی بھی نہ آیا جو اصلاح یا تجدید کے ساتھ صحیح طور پر پیغام پہنچاتا اب ہمارا کیا قصور ہے۔ اس عذر کو دور کرنے کے لئے خداوند تعالیٰ نے حضور والا کو پیغمبر بنا کر بھیجا اور ایک جدید ہدایت نامہ جو اصول و قوانین عامہ میں بالکل تورات کی طرح اصلاحی تھا نازل فرمایا اور اس کا نام قرآن رکھا۔ تورات کی طرح قرآن بھی اللہ کا پیغام کمل تھا فرق صرف زمانہ کا تھا۔ پہلے تو لوگ کہتے تھے کہ موسیٰ کی طرح ہم اس پر عمل کریں گے لیکن جب قرآن نازل ہو گیا اور ان کی نفسانی خواہشات کے موافق نہ ہوا قرآن نے اصلاحی اصول میں تورات کی موافقت اور لوگوں کی خواہشات کی پرواہ کئے بغیر صحیح اصول ہدایت پیش کئے اور بلند آہنگی سے اعلان کیا کہ اصول میں قرآن و تورات متحد ہیں تو خواہشات کے بندے کہنے لگے اگر ایسا ہے تو ہم دونوں میں سے کسی کو نہیں مانتے۔ دونوں انسانی افتراء پردازیاں اور سحر آفرینیاں ہیں جو باہم متحد و متفق ہیں۔ درحقیقت یہ منکر و کفر پرست گروہ حقانیت و صداقت کا طالب ہی نہ تھا۔ اس کا مقصود صرف یہ تھا کہ آسمانی پیغام کی آڑ لے کر اپنے نفسانی مقاصد کو پورا کرے۔ ہوا و ہوس کے بندے روحانیت سے کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے۔ اصلاح زندگی ان کے پیش نظر ہی نہ تھا، تحقیق حق سے ان کو کوئی غرض ہی نہ تھی۔ بس پرستار ہوس تھے۔ ایسے لوگوں کو راہ راست ملنی ناممکن تھی جو خود ہی حق کا طلب گار نہ ہو اس کو راہ راست نہیں مل سکتی۔

نوٹ :- ہم نے اوپر لکھا ہے کہ جب قدسی صحیفہ سے لوگ قدرے قدرے تغیر کر لیتے ہیں تو نبی کا آنا ضرور ہو جاتا ہے تاکہ تغیر کو دور کر کے اصلاح کی جا سکے اور جب تبدیلیاں بہت زیادہ ہو جاتی ہیں تو نئی کتاب آتی ہے جو انسان کی ہر تراش خراش سے پاک ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اگر قدسی صحیفہ اور عالم غیب سے اتری ہوئی کتاب اصلی حالت میں موجود ہو اور اس میں کچھ تغیر نہ ہو گیا ہو اور عبارت میں تراش خراش اور مسخ و فسخ نہ کر لیا گیا ہو تو کسی نبی کی ضرورت باقی نہیں رہتی کیونکہ آنے والا نبی اس لئے آ سکتا ہے کہ اللہ کی کتاب کو اصلی صورت میں پیش کر دے اور جب کتاب اللہ اصلی حالت میں موجود ہے تو پھر کسی نئے نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہیں۔ رہا پند و موعظت تو اس کے لئے کتابی امت میں سے علماء اور اہل صفا کافی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس کے بعد کسی جدید نبی کے آنے کی ضرورت نہیں۔ قرآن اصلی شکل میں موجود ہے اور حسب صراحت قیامت تک اسی طرح باقی رہے گا جس طرح نازل ہوا تھا۔ پس کسی جدید کتاب کی ضرورت ہے نہ کسی نئے نبی کی نہ اب کبھی آئندہ ایسی ضرورت ہو گی۔ ہدایت و موعظت کے لئے علمائے اسلام کافی ہیں۔ اتنے سے کام کیلئے نبی کی ضرورت نہیں۔

تحلیل اجزاء

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا إِلَى مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشَّاهِدِينَ۔ غربی سے مراد یا تو وادی ایمن کا غربی گوشہ ہے یا کوئی غربی ہے اور امر سے مراد نبوت ہے۔ ان آیات میں خدا تعالیٰ نے حضور اقدس کے صدق رسالت پر پُرلطف تنبیہ کی ہے کہ محض وحی کے ذریعہ سے آپ انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کے صحیح صحیح احوال بیان کرتے ہیں جس سے سننے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ وہاں موجود تھے اور اپنی آنکھوں سے واقعات کو دیکھ رہے تھے، حالانکہ ایسا نہ تھا بلکہ آپ کی پیدائش ایسی قوم میں ہوئی جس کے پاس آپ سے پہلے کوئی نبی آیا ہی نہ تھا۔ آیت مذکورہ کا حاصل مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے موسیٰ کو نبوت کا کام سپرد کیا تھا اس وقت آپ وادی ایمن کے غربی جانب یا غربی پہاڑ میں سکونت پذیر نہ تھے نہ آپ وہاں موجود تھے کہ کسی کو خیالی شبہ ہو سکے کہ یہ تو دیکھی ہوئی باتیں ہیں ان کا بیان کرنا کیا کمال ہے۔

وَلَكِنَّا أَنْشَأْنَا قُرُونًا الخ۔ بلکہ موسیٰ کے بعد صدیاں گزر گئیں، بہت اقوام پیدا ہوئیں اور رہیں۔ مدت دراز ہو گئی نبوت کے آثار بھی مٹ گئے، اخبار و واقعات میں بھی تغیر کر لیا گیا، شرائع اور احکام بھی بگاڑ کر کچھ سے کچھ بنا لئے گئے۔ ایسی صورت میں بغیر وحی کے صدیوں پہلے کے واقعات جوں کے توں کس طرح معلوم ہو سکتے تھے۔

وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ الخ۔ نہ آپ شعیبؑ کی بستی مدین میں رہتے تھے کہ یہ آیات ان سے پڑھ کر سیکھی ہوں اور پھر عرب کے سامنے بیان کی ہوں بلکہ ان احوال کی خبریں ہم نے ہی آپ کو بھیجی ہیں اور آپ کے بیان کی بنا صرف نبوت اور وحی پر ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا الخ۔ نہ آپ طور کے کسی گوشہ میں اس وقت موجود تھے جب ہم نے موسیٰ کو تورات دی تھی۔ اکثر مفسرین نے نداء دینے سے تورات عطا فرمانے کے لئے خطاب کرنا مراد لیا ہے اور بظاہر آیت کا یہی مطلب بھی ہے۔ سیاق و سباق سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک نداء سے مراد ہے کہ طور پر امت محمدیہ کو نداء دینا۔ اس کے ثبوت کے لئے چند روایات پیش کی جاتی ہیں (۱) حضرت ابوہریرہؓ نے آیت مذکورہ کی تفسیر میں فرمایا کہ امت محمدیہ کو نداء دی گئی تھی کہ اے امتِ محمدیہ میں نے تمہاری درخواست سے پہلے تم کو عطا کیا اور تمہاری دعا سے پہلے قبول فرمایا (رواہ النسائی و ابن جریر و ابن ابی حاتم) خطیب نے ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ نے امتِ محمدیہ کو نداء فرمائی پس انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کی پشت سے جواب دیا:- اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكُ لَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ۔ اللہ نے فرمایا اے امتِ محمدیہ! میرے غضب پر میری رحمت غالب ہے۔ میں نے تمہاری درخواست سے پہلے تم کو عطا کیا اور تمہاری دعا سے پہلے قبول فرمایا اور تمہارے استغفار سے پہلے بخش دیا۔ تم میں سے جو شخص قیامت کے دن لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کی شہادت لائے گا وہ جنت میں داخل ہو گا اگرچہ اس کے گناہ سمندر کے کف سے زائد ہوں۔ عمرو بن عنبہ کی روایت ہے کہ میں نے حضور اقدس سے دریافت کیا کہ آیتِ مذکورہ میں نداء سے کیا مراد ہے؟ اور وَلَكِنْ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ میں رحمت کا کیا مفہوم ہے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ تخلیقِ عالم سے دو ہزار سال پہلے اللہ

نے عرش پر لکھ رکھا تھا پھر ندا فرمائی تھی اے امتِ محمدیہ! میرے غضب پر میری رحمت سابق ہے۔ میں نے تمہارے مانگنے سے پہلے عطا کیا اور تمہارے استغفار سے پہلے بخش دیا۔ جو شخص سچے دل سے لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کی شہادت دے گا اور اسی حالت میں مجھ سے ملے گا تو میں اس کو جنت میں داخل کروں گا (رواہ ابن مردویہ عن ابن عباس کذا والنسائی وابن جریر وابن ابی حاتم عن ابی ہریرہ مثلہ) ان تمام روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ندا سے مراد وہ ندا ہے جو تخلیقِ عالم سے پہلے خدا تعالیٰ نے امتِ محمدیہ کو دی تھی اور وہی اس کی رحمت تھی، لیکن وہب بن منبہ نے بیان کیا کہ جب اللہ نے موسیٰ سے خطاب کیا تو امتِ محمدیہ کے فضائل بیان فرمائے۔ موسیٰ نے عرض کی پروردگار! میں ان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ حکم ہوا تم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہاں اگر چاہو تو ان کی آواز میں تم کو سنوا دوں۔ موسیٰ نے عرض کی پروردگار! ایسا ہی ہو جائے۔ چنانچہ پروردگار نے امتِ محمدیہ کو ندا دی اور سب نے آباء کی پشت سے جواب دیا۔ اس قول پر ندا دینے کا واقعہ کوہِ طور کا ہی ہوگا اور یہی کسی قدر قرینِ عقل وقیاس اور مناسب سیاق کلام معلوم ہوتا ہے۔ ندائے ازلی مراد لینا سیاق وسباق کے مخالف ہے، لیکن اگر روایاتِ مذکورہ کا صحیح ثبوت مل جائے تو پھر قیاس اور رفتارِ کلام کو دخل دینا مناسب نہ ہوگا، مگر مذکورہ روایات اہلِ تحقیق کے نزدیک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی ہیں، اس لئے وہی مطلب زیادہ صحیح ہے جو جمہور مفسرین نے بیان کیا ہے۔

مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الخ۔ اگرچہ حضورِ اقدس صلعم کی رسالت تمام عالم کے لئے عام تھی، لیکن آپ کی بعثت عرب میں ہوئی، اس لئے سب سے پہلے ایمان لانا عرب پر واجب ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ عرب کو جزیہ لے کر چھوڑنے کا حکم نہیں ہوا بلکہ ایمان لانا ان کے لئے ضروری قرار دیا گیا۔ اس آیت میں ثبوت ہے اس امر کا کہ حضرت اسماعیلؑ کے بعد عرب نے دینِ ابراہیمی کو بگاڑ دیا اور توحید کو شرک آمیز کر لیا تو ان کی اصلاح کے لئے کسی نبی کو نہیں بھیجا گیا۔ دوسرے ممالک میں متواتر اور پیہم نبی آتے رہے، لیکن عرب میں کوئی نہیں آیا۔

ایک شبہ جزیرۂ عرب کے مختلف حصے ہیں۔ یمن، حجاز، یمامہ وغیرہ سب ہی عرب کے صوبجات ہیں۔ مورخین کی صراحت اور تفسیری شہادت موجود ہے کہ حضرت ہود کی قوم عاد یمن کی رہنے والی تھی اور قوم ثمود کی تباہی کے آثار تو اس وقت مسلمانوں نے دیکھے ہی تھے جب غزوۂ تبوک کے ارادہ سے حضور کے ہمرکاب سرحدِ شام کی طرف جا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ صالح اور ہود عرب کے رہنے والے تھے اور عربوں کی اصلاح کے لئے ہی ان کو بھیجا گیا تھا۔ یہ دونوں نام بھی عربی ہیں۔ حالانکہ حدیث مذکور کا مفہوم صراحۃً بتا رہا ہے کہ عرب میں حضور والا سے پہلے کوئی نبی نہیں آیا۔ دونوں میں تطبیق کس طرح ممکن ہے؟

ازالہ عرب کے تین طبقات تھے۔ (۱) عرب بائدہ اس میں عاد، ثمود، جرہم اولیٰ، عمم، جدلیس وغیرہ اقوام کو شمار کیا جاتا ہے۔ یہ تمام قومیں فنا ہو گئیں ان کی تاریخ بھی مٹ گئی۔ صحیح احوال بھی گوشۂ گمنامی میں پڑ گئے۔ ہود وصالح وغیرہ انبیاء انہیں کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے تھے (۲) عرب عاربہ۔ یہ لوگ مسلمان تھے ان کا مسکن ملک یمن، حضر موت، شحر وغیرہ تھا۔ ان کی اصلاح کے لئے بھی پیغمبروں کو بھیجا گیا۔ چنانچہ بلقیس ملکۂ سبا کا حضرت سلیمانؑ کے پاس جا کر مسلمان ہونا تو مشہور ہی ہے۔ ذوالقرنین (ابوکرب یعنی صعب ذویزن، ذوجدن، ذونواس وغیرہ) بادشاہ انہیں قوموں میں ہوئے اور یہی حصۂ آخری دور میں متمدن مہذب اور ذی علم مانا جاتا تھا۔ (۳) عرب مستعربہ۔ جب قبیلۂ جرہم ثانی حضرت اسمٰعیل نے جوان ہونے کے بعد جرہم ثانی کے قبیلہ میں ہی نکاح کر لیا اور نسل بڑھی تو یہی قوم عرب مستعربہ کہلانے لگی کیونکہ حضرت اسمٰعیل عربی نہ تھے عراقی یا شامی تھے ہاں جرہم ثانی کا قبیلہ عربی تھا۔ دونوں کے ملنے سے نئے عرب بنے جن کو عرب مستعربہ کہا گیا۔ عرب مستعربہ کو ہی عدنانی عرب کہا جاتا ہے کیونکہ یہ سب معدبن عدنان کی نسل میں سے تھے اور زمین حجاز، یمامہ، نجد وغیرہ میں ان کی سکونت تھی۔ ان میں سے ہی حضور اقدس صلعم تھے۔ آیت میں بھی عرب مستعربہ ہی مراد ہیں ان کی اصلاح وہدایت کے لئے خدا تعالیٰ نے کسی کو نبی بنا کر نہیں بھیجا صرف حضرت اسمٰعیل نبی ہوئے تھے۔ سو اس وقت عرب مستعربہ کا وجود نہ تھا۔ گویا حضرت اسمٰعیل جرہم ثانیہ کی اصلاح کا کام کرتے۔ آپ کی نسل میں کوئی نبی نہ ہوا اور آخر میں ہوا تو ایسا عظیم الشان کہ تمام عالم کا معلم بن کر آیا صلی اللہ علیہ وسلم۔

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ الخ۔ مصیبت سے مراد عذابِ قیامت کی مصیبت ہے۔ یعنی اگر نبی کو مبعوث نہ کیا جاتا اور ہدایت نامہ نہ بھیجا جاتا تو بدکردار، بدگفتار اور بدعقائد رکھنے والے لوگوں کو قیامت کے دن یہ ضعیف ترین عذر پیش کرنے کا موقع مل جاتا کہ ہمارے پاس چونکہ کوئی تنبیہ واصلاح کرنے والا پیغامبر نہیں آیا تھا، اس لئے مجبور تھے اللہ کا حکم ہمارے سامنے ہی نہ تھا کہ ہم اس پر عمل کرتے۔ اگرچہ یہ عذر بھی قوی اور قابلِ پذیرائی نہیں کیونکہ ہر انسان کو سوچنے سمجھنے اور حق وباطل میں فیصلہ کرنے کے لئے عقل دے دی گئی تھی۔ تاہم ایک کمزور معذرت ضرور ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے اتمامِ حجت کے لئے اپنے رسولِ کریم کو بھیج دیا۔

مسئلہ: اس مقام سے علماء نے استخراج کیا ہے کہ کسی شخص کو زیبا نہیں کہ آئندہ کے متعلق کسی بات کا دعویٰ کرے مثلاً مفلس کہے کہ اگر میں مال دار ہو جاؤں تو خوب خیرات

کروں یا جاہل کہے کہ اگر میں عالم ہو جاؤں تو اچھے اچھے عمل کروں کیونکہ یہ انانیت کا دعویٰ بے بنیاد اور جھوٹا ہے۔ اگر جذبۂ اصلاح دل میں ہوتا تو مفلسی میں بھی تکمیل اصلاح ممکن ہے اور جاہل کوشش کرتے اور کچھ سیکھنے کے بعد بھی اپنی اصلاح کر سکتا ہے۔ اس قسم کی باتیں کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معذرت بارد اور حیلہ بہانا تراش کر یہ شخص اپنی ہوس رانی پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا الخ حق سے مراد رسول پاک کی ذاتِ گرامی یا قرآن ہے۔ اس آیت کا مطلب دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ پہلا مطلب تو وہی ہے جو ہم تفسیری مقالہ کے ذیل میں لکھ چکے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ نے قرآن پیش کر دیا اور کفار نے ہدایت قرآنی کو اپنی نفسانی خواہشات کے خلاف پایا تو کہنے لگے اس کے احکام تورات کے احکام کی طرح کیوں نہیں ہیں۔ ان کی مراد یہ تھی کہ جو تورات یہودیوں کے پاس اس وقت ہے اس کے مطابق احکام قرآن کے کیوں نہیں ہیں، لیکن جب قرآن نے دعویٰ کیا کہ قرآن تورات کے بالکل موافق ہے۔ اصول وہی ہیں، قوانین وہی ہیں۔ اصلی تورات اور قرآن کے اصول میں کوئی فرق نہیں، تم کمبخت جنہوں نے انکار کرنے لگے اور تورات و قرآن دونوں کو نہ مانا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو گئے اور قرآن آ گیا تو کہنے لگے جیسے معجزات موسیٰ کو دیئے گئے تھے (مثلاً لاٹھی کا سانپ بن جانا، سمندر کا خشک ہو جانا وغیرہ) ایسے معجزات محمد کو کیوں نہ دیئے گئے (مجاہد کا قول ہے کہ یہودیوں نے قریش کو سکھایا تھا کہ وہ حضور اقدس سے یہی معجزات کے ظاہر کرنے کا سوال جو حضرت موسیٰ کو دیئے گئے تھے) خدا تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اس زمانے کے کافروں نے کیا موسیٰ کے معجزات کا انکار نہ کیا تھا۔ یعنی اگر وہی معجزات پھر ظاہر کر دیئے جائیں تو یہ کفار مکہ بھی انکار کریں گے جیسا قبطی کافروں نے انکار کیا تھا۔

قَالُوْا سِحْرٰنِ تَظَاهَرَا ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس جگہ دو قرائتیں ہیں۔ ایک یہی جو مشہور ہے دوسری سِحْرٰن کی جگہ سَاحِرَان۔ موخر الذکر قرأت پر ساحران سے مراد ہیں موسیٰ اور ہارون (صرح بہ سعید بن جبیر و ابو رزین) مسلم بن یسار نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ موسیٰ اور محمد مراد ہیں (وبہ قال الحسن البصری) سعید بن جبیر کے قول پر ساحرین قول کے قائل قبطی قرار پاتے ہیں اور حسن بصری کے قول پر کفار قریش۔ اسی قول کی تائید بغوی کی اس روایت سے ہوتی ہے جس کو خطیب نے لکھا ہے کہ قریش نے جا کر یہودیوں سے محمد کا حال پوچھا۔ یہودیوں نے کہا ہماری کتابوں میں ان کے احوال موجود ہیں۔ اس پر قریش نے غصہ ہو کر کہا ان دونوں نے عہد و پیمان کر لیا ہے۔ ہم دونوں میں سے ایک کو بھی نہیں مانتے۔ اول الذکر قرأت پر سِحْرٰن سے مراد تورات و قرآن ہوں گے۔ گویا کفار قریش نے دونوں کتابوں کو جادو قرار دیا۔ علی بن ابی طلحہ اور عوفی نے ابن عباس سے یوں ہی روایت کی ہے (وبہ قال العاصم والسدی و عبدالرحمٰن بن زید)

قُلْ فَاْتُوْا بِكِتٰبٍ الخ یعنی جب تم تورات اور قرآن کو جادو کہتے ہو اور قائل ہو کہ یہ دونوں سحر کی کتابیں ہیں جو باہم موافق ہیں تو لامحالہ ان کی ضلالت انگیزی اور گمراہ کن میں کوئی شبہ نہ ہوگا۔ کیونکہ سحر سے زندگی کی ہدایات اور آخرت کی سعادت کے حصول کے طریقے نہیں حاصل ہوتے وہ ایک وقتی چیز ہوتی ہے جس سے کوئی اصلاح مقصود نہیں ہوتی۔ صرف ساحر کے عروج و برتری اور بزرگی و عظمت کا مظاہرہ مقصود ہوتا ہے، اس لئے سحر کہنے کے بعد یقیناً تمہارے خیال میں یہ ہدایت کی کتابیں نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی ہدایت نامہ پیش کرو۔ اگر ایسا نہ کر سکو گے تو واضح طور پر ثابت ہو جائے گا کہ تم ان کتابوں کی مخالفت محض ہوا پرستی کے سبب کرتے ہو۔ کیوں کہ تمہارے شیطانی جذبات کی موافقت ان کتابوں کی ہدایات سے نہیں ہوتی، اس لئے تم ان کو جادو کہتے ہو۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ الخ یعنی قانونِ ہدایت نافذ کرنا اور زندگی کو صحیح راستہ پر چلانے کے لئے عقائد و اعمال کا ایک لائحہ عمل بنانا کسی انسان کا کام نہیں بلکہ خدا کا ہے۔ اختلافِ جذبات، افتراقِ احوال و ضروریات اور تنوعِ افکار و خیالات کی وجہ سے کوئی فرد اور کوئی جمہور قوانینِ اصلاح بنانے کی اہلیت نہیں رکھتا اور اگر موجودہ حالت کو دیکھ کر کوئی عقلمند شخص یا دانشمند جماعت وقتی طور پر کوئی اصلاحی قانون بنا بھی لے پھر بھی پیش ہونے والے حالات چونکہ اس کے سامنے نہیں ہو سکتے نہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ کل کیا حالت پیش ہوگی، اس لئے وہ وقتی قانون اس وقت کے بعد بے کار ہو جاتا ہے۔ پس قانون بنانے اور نافذ کرانے کا حق صرف خدا تعالیٰ کو ہے کیونکہ وہی علام الغیوب ہے۔ اب جو شخص خود ساختہ قانون اور خواہشِ نفس کے زیبا تر بنائے ہوئے ضابطہ پر چلے گا اس سے بڑھ کر گمراہ اور ناحق شناس اور کون ہو سکتا ہے۔ خود تراشیدہ مذہب نہ مذہب حق ہو سکتا ہے بلکہ وہ نفسانی جذبات کا آئینہ ہوگا اور جو لوگ خود اپنے اوپر ظلم کریں اور حق کی طرف مائل نہ ہونا چاہیں ان کو خدا بھی راہِ راست نہیں دکھاتا۔

مقصودِ بیان حضرت موسیٰ اور حضرت شعیب کے گزشتہ واقعات حضور والا کو وحی کے ذریعہ سے معلوم ہو گئے تھے۔ پیغمبروں کو بھیجنا خدا تعالیٰ پر لازم نہیں بلکہ اس کی رحمت ہے۔ بعثتِ انبیاء کی اصل علت یہ ہے کہ قیامت کے دن کسی کو جھوٹ موٹ عذر کرنے کا موقع بھی نہ ملے۔ عرب معتقریہ کی ہدایت کے لئے حضور اقدس سے پہلے کوئی نبی نہیں آیا۔ قرآن اور رسول اللہ کی ذاتِ گرامی عین حق تھی۔ بدباطن، ہوا پرست گروہ خدائی کے قانون کے پردہ میں اپنی ہوس رانی میں مشغول رہنا چاہتا ہے، لیکن جب

اس کی خواہشات کی مطابقت قانونِ شریعت نہیں کرتا تو وہ اس کا انکار کر دیتا ہے۔ جادو وہایت انگیز اور اصلاح آفریں نہیں ہوتا اور اللہ کی کتابیں مخزنِ اصلاح ہیں، اس لئے ان کو جادو سے کوئی تعلق نہیں۔ جو قوانین طبع زاد اور خود ساختہ ہوں یا جمہوری بہرحال ناقابلِ عمل ہیں نہ ان سے ایسی اصلاح ہو سکتی ہے جیسی قوانینِ الٰہیہ سے ہو سکتی ہے۔ پس اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے ان شیفتگان فقہ کو جو آیات منصوصہ اور احادیث صریحہ کے باوجود قیاس کو ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں ہم آیات واحادیث کا مطلب کیا جانیں۔ ہمارے امام نے جو حکم دیا ہم تو اس پر چلیں گے نیز نصیحت کرنا چاہیئے اُس جاہل گمراہ صوفی کو جو پیر کی تعلیم کو بہرحال واجب العمل خیال کرتا ہے خواہ وہ شریعت کے موافق ہو یا مخالف اور جب اس کو رد کیا جاتا ہے حافظ کا یہ شعر پڑھ دیتا ہے ؎

بمی سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مغاں گوید کہ سالک بیخبر نہ بود زراہ ورسم منزلہا

یہ سادہ لوح طبقہ اپنی حماقت کا شکار ہے، نصِ شریعت کو صرف پیر سے حسنِ ظن رکھنے کی وجہ سے ترک کر دیتا ہے اور اسی کو فقر کامل اور تصوف صحیح جانتا ہے۔ اس جدید تہذیب کے شیدائی کو بھی اس سے سبق لینا چاہیئے جو کارل مارکس، لینن، ٹراسکی اور کانٹ کے نظریات وجہلات کو قرآنی اصول وضوابط پر ترجیح دیتا ہے اور کلام ربانی کو اقتصادی انقلابات کی اسکیم سے زیادہ وقعت نہیں دیتا پھر درسِ بصیرت لینا چاہیئے اس ڈیموکریٹک سوسائٹی کو بھی جو خود ساختہ قوانین جمہوریت کو منصوصات ربانی کے مقابلہ میں پسند کرتا ہے اور کہتا ہے کہ شریعت کے بعض قوانین اس زمانے کے موافق تھے جب کہ تمدن اپنی انتہائی بلندی پر نہیں پہنچا تھا اور انسانی تہذیب ابتدائی زینہ پر تھی۔ ان تمام گروہوں کو عقل کے کان کھول کر سن لینا چاہیئے کہ اگر قرآن سے بہتر کوئی ہدایت نامہ ان کے پاس ہو بشرطیکہ وہ خدا کی طرف سے کسی پیغمبر پر نازل ہوا ہو تو پیش کریں۔ انسانی دماغ تنوع پذیر ہے۔ اس کو چند منٹ بعد کا بھی علم نہیں ایسے جاہل اور جذباتی مقنن کا بنایا ہوا قانون تو کسی طرح انسانی اصلاح کا کفیل نہیں ہو سکتا وغیرہ۔

وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ مِن قَبْلِهِ هُم بِهِ

ہم نے پے در پے اُن کے لئے یہ قرآن بھیجا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں جن لوگوں کو ہم نے اس سے پہلے کتاب دی ہے وہ اس پر بھی

يُؤْمِنُونَ ۝ وَإِذَا يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ قَالُوا آمَنَّا بِهِ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّنَا إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلِهِ مُسْلِمِينَ ۝ النصف

ایمان لاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے یہ بلاشبہ برحق ہے ہمارے رب کی طرف سے ہم اس سے پہلے بھی یقیناً

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ

مسلمان تھے چونکہ انہوں نے صبر کیا اور نیکی سے بدی کو دفع کرتے ہیں اور ہمارے دئے ہوئے میں سے کچھ خرچ کرتے رہے اس لئے ان کو دوہرا اجر دیا جائے گا

وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ ۝

جب یہ لغو بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کش ہو جاتے اور کہتے ہیں ہمارے لئے ہمارے اعمال اور تمہارے لئے تمہارے اعمال تم پر سلام ہو ہم جاہلوں سے الجھنا نہیں چاہتے

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝

(اے محمد) جس کو تم چاہو ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ جسے اللہ چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے وہی راہ پر آنے والوں کو خوب جانتا ہے

تفسیر ضابطۂ فطرت اور قانونِ قدرت ہر مکان، ہر زمان اور ہر قوم کے لئے ایک ہی ہے۔ جو خیال وعمل صحیح ہے وہ صحیح ہے جو غلط ہے وہ غلط ہے۔ زمانہ اور مقام کے اختلاف سے حقائق میں تغیر نہیں ہو سکتا جس طرح ہر وقت اور ہر جگہ آگ کی گرمی اور خشکی اور پانی کی خنکی اور تری مسلم الثبوت ہے۔ اسی طرح ضابطۂ فطرت کی یکرنگی اور یکسانیت بھی ناقابلِ تردید ہے۔ ہاں جس طرح تنور، بھٹی، انجن اور چولہے کی آگ کی شکل میں تغیر محسوس ہوتا ہے۔ سمندر، دریا، نہر، چشمہ، کنواں، گلاس اور لوٹا اپنے اپنے پانی کا رنگ اور شکل جدا جدا دکھاتا ہے۔ اسی طرح قانونِ قدرت ہر زمانہ اور ہر مقام میں علیحدہ علیحدہ رنگ میں ظہور کرتا ہے۔ دوسرے بدیہیات

کی طرح قانونِ شریعت بھی بدیہی ہے، مگر کور بصیرت لوگ اس کی بداہت کے منکر ہیں جس طرح سورج کی روشنی بدیہی ہے، مگر نابینا اس کو نہیں دیکھ سکتے۔ پس قانونِ شریعت آغازِ آفرینش سے انتہائے عالم تک ایک ہی ہے اور بالکل واضح ہے، مگر مظاہر مختلف ہیں۔ نیکی ہر وقت نیکی ہے اور بدی ہر وقت بدی، مگر ضروریات مختلف ہیں، زمانے مختلف ہیں، ماحول مختلف ہیں، اقوام و اشخاص کے عادات و خصائل مختلف ہیں، دماغی صلاحیتیں اور طاقتیں مختلف ہیں۔ اسی بنا پر قانونِ شریعت کا لباس بھی ہر زمانہ میں مختلف رہا۔ ہر نبی لے ایک ہی قانون پیش کیا، مگر نئے لباس میں۔ ایک ہی ہدایت نامہ جاری کیا، مگر جدا قالب میں ڈھال کر۔ اب جن لوگوں کو خدا تعالیٰ نے عقل رسا اور فہم روشن عطا فرمایا ہے وہاں ہزار رنگوں کے اندر بھی یک رنگی رکھتے ہیں۔ حقیقت مشترک ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی۔ ہر نبی کو وہ سچا جانتے اور اس کی ہدایتوں کو وہ اسی دور والوں کیلئے واجب العمل مانتے ہیں اور تمام انبیاء کو باہم مصدق یقین کرتے ہیں۔ پس حضور ﷺ کی بعثت سے قبل جو حق پرست اہلِ کتاب کا اپنے پیغمبر کی کتاب پر سچا ایمان تھا جب ان کے سامنے قرآن لایا گیا تو اس کے سامنے بھی انہوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اختلاف لباس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے قرآن کے تمام جزئی احکام کو حق سمجھا اور ان پر عمل کیا اور صاف طور پر اعلان کر دیا کہ ہم تو پہلے سے ہی اس کو مانتے تھے، ہمارا ایمان تھا کہ ہر کتابِ الٰہی دوسری کتابِ الٰہی کے خلاف نہیں ہوتی حقیقت مشترک ہوتی ہے۔ پس پہلی کتاب کو برحق ماننے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم قرآن کو بھی سچا جانتے ہیں کیونکہ قرآن بھی انہیں اصول و قوانین کی تائید کرتا ہے جن کی تعلیم پہلی کتاب نے دی تھی۔ ناجائز خواہشات سے نفس کو روکنا، برائی کو بھلائی سے دفع کرنا، بندگانِ خدا کی بوقتِ ضرورت اعتدال کو ملحوظ رکھ کے امداد کرنی، جاہلوں کے منہ نہ لگنا، ان کی بیہودگیوں سے چشم پوشی کرنی یہ تمام باتیں ان کے اندر پہلے سے موجود تھیں، اس لئے جب قرآن نے انہیں اصول کی تعلیم دی تو انہوں نے بغیر چوں و چرا کئے بے کم و کاست مان لیا۔ رہے وہ لوگ جن کا ایمان گزشتہ تعلیمِ الٰہی پر نہ تھا اور بندگیٔ نفس ان کا شعار تھا۔ ایسے لوگوں کو ہدایتِ قرآنیہ کا قائل کرنا اور تعلیمِ خداوندی پر ان سے عمل کرانا ناممکن ہے جس کو خدا نے توفیق راہ یابی نہ دی اس کو رہنمائی کر کے منزلِ مقصود پر پہنچانا ناممکن ہے۔ اسی مضمون کو مجمل طور پر آیاتِ مذکورہ میں بیان کیا ہے۔

تحلیلِ اجزاء وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ الخ۔ اس آیت کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ عبد الرحمٰن ابن زید نے کہا مطلب یہ ہے کہ ہم نے دنیا کی بھلائی کو آخرت کی بھلائی سے ملا دیا۔ سدی نے کہا یعنی واضح اور صاف طور پر بیان کیا۔ قتادہ نے کہا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ہر سابق فرقہ کا انجام بیان کر کے ظاہر فرما دیا کہ آئندہ اہل کفر کا انجام کیا ہوگا۔ گزشتہ کو آئندہ کے لئے عبرت بنا دیا تاکہ آنے والے لوگ ہوشیار و بیدار ہو کر اس چند روزہ زندگی میں اپنے لئے بھلائی کی راہ اختیار کریں۔ مجاہد وغیرہ نے کہا آیت میں مفصل بیان کرنا مراد ہے۔ رہی یہ بات کہ لَهُمْ سے کون لوگ مراد ہیں اور نزولِ آیت کن لوگوں کے حق میں ہوا؟ تو مجاہد کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ قریش مورد آیت ہیں، لیکن رفاعہ قرظی یا رفاعہ بن سموئل نے فرمایا کہ آیت مذکورہ دس یہودی عالموں کے بارے میں نازل ہوئی جن میں سے ایک میں بھی ہوں (رواہ ابن جریر و ابن ابی حاتم) بعض علماء نے قولِ فیصل اس طرح بیان کیا کہ نزولِ آیت قریش کے بارے میں ہو یا یہودی علماء کے۔ بہرحال آیت کا حکم انہیں لوگوں پر منحصر نہیں جن کے حق میں نزول ہوا بلکہ قیامت تک تمام کفار حکمِ آیت میں داخل ہیں اور سب کو دعوتِ بصیرت آیت میں دی گئی ہے۔

میرے نزدیک سیاق و سباق کا لحاظ کرتے ہوئے یہ مطلب زیادہ صحیح ہے کہ ہم نے لوگوں کی ہدایت کے لئے مسلسل غیر منقطع احکام نازل فرمائے۔ ہر زمانے میں ہر قوم کی ہدایت کے لئے نبی کو مبعوث فرمایا، وحی بھیجی اور کتاب یا صحیفہ یا خاص ہدایت و اصلاح کا پیام بھیجا۔ گویا جب تک حکمِ سابق بحالت خود باقی رہا دوسرا حکم نازل نہ ہوا۔ جب اس میں تغیر آیا فوراً حکم جدید بھیج دیا، لیکن ان تمام احکام میں تو اصل قائم رہا، ہر حکم دوسرے حکم سے وابستہ اور جڑا ہوا رہا۔ ثانی حکم اول حکم کے مخالف نہ ہوا۔ غرض یہ کہ ہر ثانی کتاب نے پہلی کتاب کی تائید کی۔ گویا اس سے اس کا وصل رہا اور اس طرح کتبِ سماویہ اور پیاماتِ الٰہیہ کا سلسلہ نہ ٹوٹا۔ اس تقدیر پر لَهُمْ سے عام لوگ مراد ہوں گے خواہ مومن ہوں یا کافر اور قول سے کتبِ الٰہیہ یا احکامِ ربانیہ مراد ہوں گے اور وَصَّلْنَا سے سلسلۂ احکام کی باہم وابستگی اور عدم مخالفت مراد ہو گی۔ واللہ اعلم۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الخ یعنی جن لوگوں کو قرآن سے پہلے کوئی آسمانی کتاب توریت یا انجیل مل چکی ہے وہ قرآن کو پہلے ہی سے مانتے ہیں۔ کیونکہ سابق کتبِ سماویہ میں قرآن اور محمد ﷺ پر ایمان لانے کا حکم دے دیا گیا ہے اور جب ان کتابوں کو صدقِ دل سے مان لیا گیا تو گویا قرآن کو مان لیا۔

وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ۔ جب صادق الایمان اہلِ کتاب کے سامنے قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں یہ بے شک اللہ کا کلام ہے ہم اس کو مانتے ہیں، ہم تو آج کے پہلے مان چکے ہیں۔ یعنی ہمارا ایمان تو اپنی کتابوں پر پہلے ہی سے تھا اور ان میں اس کی صراحت موجود ہے۔ لہٰذا ہم اس کو پہلے ہی مان چکے ہیں۔ آیاتِ مذکورہ کا یہ مطلب بالکل واضح ہے۔ دوسرا مطلب وہ ہے جس کو ہم تفسیری مقالہ میں لکھ چکے ہیں کہ چونکہ تمام کتبِ سماویہ میں حقیقت مشترک ہے اختلاف صرف جزئی ہے، لباس مختلف ہیں، جوہر ایک ہی ہے، اس لئے حقیقت رس بصیرت اور سابق ایمان رکھنے والے خوب سمجھتے کہ یہ کلامِ ربانی ہے۔ اصول و قوانین تمام کتابوں کے ایک ہی ہیں، فرق صرف

زمانی اور مکانی ہے اور اس فرق سے حقیقت میں اختلاف نہیں ہوتا، اس لئے وہ صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا ایمان اس پر پہلے ہی سے تھا ہم تو اس کو پہلے ہی سے مانتے تھے اول مطلب پر قرآن پاک اور حضور والا کی رسالت کے متعلق کتب سماویہ سابقہ میں بشارات موجود ہونے کی طرف اشارہ ہوگا اور دوسرے مطلب پر اس کی ضرورت نہیں۔

سعید بن جبیر کا قول ہے کہ آیاتِ مذکورہ کا نزول اُن ستر علماء النصاریٰ کے حق میں ہوا جن کو نجاشی شاہ حبشہ نے حضور کی خدمت میں بھیجا تھا۔ جب وہ لوگ حاضر خدمت ہوئے تو سرکار والا نے ان کے سامنے پوری سورۂ یٰسین تلاوت فرمائی۔ وہ رونے لگے اور مسلمان ہوگئے۔

اس شانِ نزول پر شبہ وارد ہوتا ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور عطائے انصاری کا واقعہ مدینہ میں ہوا۔ اس شبہ کا ازالہ دو طرح سے ہے۔ اول یہ کہ اگر سورت مکی ہے مگر یہ آیات مدنی ہیں۔ دوئم یہ کہ آئندہ ہونے والے واقعہ کو خدا تعالیٰ نے پہلے سے بیان فرمایا کیونکہ وہ عالم الغیب ہے۔ چونکہ وہ لوگ ایسا کرنے والے تھے، اس لئے خدا تعالیٰ نے قبل از وقت ان کے اوصاف بیان فرمادئے۔ یہی وہ اہلِ حق ہیں جن کے متعلق آیات ذیل کا نزول ہوا۔ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى الخ۔ اور انہی کی حالت بیان کی گئی ہے اس آیت میں اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا۔ مزید تفصیل ابھی آتی ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ الخ۔ یعنی مذکورہ بالا اشخاص کو قیامت کے دن دوگنا اجر ملے گا۔ ایک سابق کتب سے اسلام سے پہلے ایمان صادق رکھنے اور ان پر عمل کرنے کا اور دوسرا قرآن کو ماننے اور اس کے احکام پر چلنے کا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے حضور والا نے ارشاد فرمایا تین فریق ہیں جن کو ثواب دوگنا ملے گا۔ ایک وہ کتابی شخص جو پہلے اپنے پیغمبر پر ایمان لایا تھا پھر مجھ پر ایمان لایا۔ دوسرا وہ غلام جس نے اللہ کا حق بھی ادا کیا اور اپنے آقاؤں کا بھی۔ تیسرا وہ شخص جس کے پاس کوئی مسلمان باندی تھی۔ پھر اس نے اس باندی کو ادب (مسائل اسلام) اچھی طرح سکھا کر آزاد کرکے اس سے نکاح کرلیا۔ حضرت ابو امامہ نے فرمایا فتح مکہ کے روز میں حضور کی سواری کے نیچے تھا (یعنی رکاب کے پاس تھا) سرکار والا نے ایک حسین تقریر فرمائی جس میں ارشاد فرمایا یہودیوں اور عیسائیوں سے جو شخص مسلمان ہوگیا اس کو دوہرا ثواب ملے گا اور اس کا (دنیوی) حکم یہ ہے کہ جو چیز ہمارے لئے مفید ہے وہ اس کے لئے مفید ہے اور جو ہمارے لئے خلاف ہے وہ اس کے لئے خلاف ہے۔

بِمَا صَبَرُوْا۔ صلاح پسند صداقت شعار مسلمان ہوجانے والے اہلِ کتاب کے چار خصوصی اوصاف خدا تعالیٰ نے اس جگہ بیان فرمائے۔ اول یہ کہ وہ صبر کرتے ہیں صبر رکھنے کی مختلف صورتیں ہیں، شدائد مصائب پر صبر رکھنا، راہِ اسلام میں جو تکلیفیں اٹھانی پڑیں ان پر صبر کرنا۔ بڑی مصیبت ہو یا ادنیٰ تکلیف ہر صورت اللہ کی شکایت اور قسمت کے شکوہ کا لفظ زبان پر لانا خواہ افلاس کی تکلیف ہو یا بیماری کی، قید و بندگی ہو یا قرض داری کی یا کچھ اور۔

لیکن ان سب سے بالاتر صبر کی حقیقت یہ ہے کہ فرائض شریعت کو ادا کرنے پر نفس پر جبر کیا جائے اور ممنوعات و مکروہات سے اپنی طبیعت کو روکا جائے۔ یہ صبر عمومی ہے گویا شیطانی جذبات اور انسانی میلانات سے کنارہ کش ہوکر اپنے ارادہ اور عمل کو حکمِ الٰہی کے تابع بنالینا صبر کا بلند ترین درجہ ہے اور غالباً آیت میں یہی مراد ہے۔

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ دوسرا وصف یہ ہے کہ وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ اس آیت کا مطلب سید صاحب اہلِ تفسیر نے یہ بیان کیا ہے کہ برائی کرنے والے کے ساتھ بھلائی کرنی مستحسن اور قابلِ ستایش امر ہے، اس لئے یہ لوگ بھی برائی کے عوض بھلائی کرتے ہیں، مگر یہ مطلب غلط ہے۔ برائی کو بھلائی سے دفع کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ بات یہ ہے کہ عفو ہو یا انتقام کسی کے قصور سے درگزر ہو یا مواخذہ اور سزا دونوں باتیں اپنے اپنے موقع پر اچھی ہیں۔ انتقام کے موقع پر عفو کرنا، صلاح عالم کو برباد کرنا اور حقوق اللہ کے احترام میں ضعف پیدا کرنا ہے۔ فاسق و فاجر اور ڈاکو سے درگزر کرنی اور محارم الٰہیہ کو شکست کرنے والے کو مواخذہ کے شکنجہ میں نہ کسنا جائز نہیں۔ اسی طرح عفو کے موقع میں انتقام لینا پستی کی اور جذبات نفس کی بندگی پر دلالت کرتا ہے، قاتل سے انتقام لینا اگرچہ جائز ہے، لیکن مقتول کے وارثوں کے لئے معاف کردینا اولیٰ۔ علیٰ ہذا اپنے خاص حقوق کو چھوڑ دینا بلندی حوصلہ اور قوتِ روحانیت کی دلیل ہے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس طریقہ کو شریعت نے پسند کیا اور مستحسن سمجھا ہے اس طریقہ سے وہ برائی کو دفع کرتے ہیں۔ عفو کے موقع پر عفو کرنا حسنہ ہے۔ آیت میں صرف عفو و درگزر کرنے ہی کی طرف اشارہ نہیں ہے۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ ان کا تیسرا وصف یہ ہے کہ جو کچھ خدا تعالیٰ نے ان کو اپنی رحمت سے عطا فرمایا ہے اور وہ یہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ تمام چیز خداداد ہے ہم خود اس کے خالق و مالک نہیں اس میں سے کچھ راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ رزق کا لفظ ہدایت، علم، مال، جسمانی طاقت، صحت وغیرہ سب کو شامل ہے۔ اگر خدا نے کسی کو قوتِ تاثیر تقریر یا عقل و صلاح کی روشنی عطا فرمائی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو بھی ہدایت کرے اور جہاں تک ممکن ہو راہ راست بتائے۔ اگر خدا نے عالم بنایا ہے تو لوگوں کو بھی سکھائے پڑھائے۔ اگر مال دیا ہے تو دوسروں کو بھی مالی مدد دے۔ اگر جسمانی طاقت اور صحت عنایت کی ہے تو کمزوروں بیماروں

بیکسوں کی جسمانی خدمت کرے، مؤمن پر نعمتِ خداداد کا کچھ حصہ راہِ خدا میں صرف کرے، لیکن کل مال دے کر ایک دستِ افسوس ملنا بھی جائز نہیں، اس لئے کچھ مال دینے کو قابلِ مدح وصف قرار دیا۔ اگر تمام مال خیرات کرنے کے بعد اپنی ضرورت کے وقت افسوس ہوا اور یہ خیال پیدا ہو کہ کاش اگر ہم کچھ مال رکھ لیتے تو یہ ضرورت بند نہ ہوتی تو افسوس کرنے سے گزشتہ خیرات کا ثواب جاتا رہتا ہے، اس لئے کل مال دے دینا مستحسن فعل نہیں۔ ہاں جن لوگوں کو دینے کے بعد اپنی شدید ترین ضرورت کے وقت بھی پچھتاوا نہ ہو ان کے لئے کل مال خیرات کرنے کی بھی ممانعت نہیں جس طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنا کل مال راہِ خدا میں لاکر حاضر کر دیا تھا۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ الخ۔ یہ چوتھا وصف ہے کہ جب ان سے کوئی شخص بیہودہ طور پر الجھتا ہے اور مکابرہ و مجادلہ کرنا چاہتا ہے اور حق کا طلبگار نہیں ہوتا تو وہ اس سے جھگڑا نہیں کرتے اور جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے یہ کہتے ہوئے الگ ہو جاتے ہیں کہ ہمارے اعمال ہمارے لئے تمہارے کرتوت تمہارے لئے، ہم ناواقف لوگوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔ بس السّلام علیکم۔

آیاتِ مذکورہ کی شانِ نزول میں ایک قول سعید بن جبیرؓ کا ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ دیگر اقوال ذیل میں درج کرتے ہیں:-

محمد بن اسحاق نے کتاب البشیر میں لکھا ہے کہ جب حضور والا مکہ میں مقیم تھے تو ملک حبش سے تقریباً بیس آدمیوں کا ایک وفد حاضرِ خدمت ہوا۔ یہ سب عیسائی تھے اس وقت حضور مسجد حرام میں تشریف فرما تھے اور کعبہ کے آس پاس قریش کے مشرک موجود تھے۔ اہلِ حبش نے حاضر ہو کر ان تمام اوصاف کا بخوبی مطالعہ کیا جو کتب سابقہ میں آنے والے نبی کے متعلق انہوں نے پڑھے تھے۔ حضورؐ نے ان کو اسلام کی دعوت اور قرآن پاک سنایا۔ قرآن پاک سن کر وہ رونے لگے اور مسلمان ہو گئے۔ پیغمبر آخر الزماں کی جو علامات ان کو معلوم تھیں وہ سب آپ کے اندر پائیں، اس لئے سچے دل سے ایمان لے آئے۔ جب مجلسِ مبارک سے اٹھ کر باہر آئے تو چند قریشیوں کے ساتھ ابو جہل ان کے سامنے آیا اور کہنے لگا تمہاری قوم نے اس شخص کا حال دریافت کرنے تم کو بھیجا تھا لیکن تھوڑی ہی دیر بیٹھنے کے بعد تم نے اس کی تصدیق کر لی اور اپنا دین چھوڑ دیا۔ ہم نے تم سے زیادہ بے وقوف وفد اور کوئی نہیں دیکھا۔ ارکانِ وفد نے جواب دیا ہم تم سے جہالت نہیں کرنی چاہتے۔ تم اپنے دین پر ہو ہم اپنے دین پر۔ تمہاری باتوں سے ہم کو کچھ فائدہ نہیں۔

محمد بن اسحاق نے کہا یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ نجران (یمن) کے عیسائیوں کا بھی ایسا ہی واقعہ گزرا ہے۔

زہری کہتا تھا ہم اپنے علماء سے سنتے چلے آئے ہیں کہ اس آیت کا نزول نجاشی اور ان کے آدمیوں کے بارے میں ہوا ہے۔ مقاتل نے بھی حبش کے عیسائیوں کے ان آیات کے نزول کی صراحت کی ہے۔

سعید بن جبیر کے ایک قول میں آیا ہے کہ حاضر ہونے والے حبشی تھے اور تعداد میں چالیس تھے۔ انہوں نے آکر مسلمانوں کو تنگ دست اور خستہ حال دیکھا تو بارگاہِ رسالت میں عرض کیا یا رسول اللہ ہمارے پاس بکثرت مال ہے اگر اجازت ہو تو ہم جا کر لے آئیں اور مسلمان بھائیوں کی کچھ ہمدردی کریں۔ حضورؐ نے اجازت دے دی اور انہوں نے وعدے کے مطابق تکمیل کی۔ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ سے اسی طرف اشارہ ہے۔

ابن کثیر نے سعید بن جبیر کے سابق قول کا لحاظ کرتے ہوئے کل تعداد ستر لکھی ہے۔ ابن عباسؓ کا ایک قول مروی ہے جس سے کل تعداد اسی ہونا ظاہر ہوتی ہے۔ چالیس نجرانی، بتیس حبشی اور آٹھ شامی۔ خطیب نے نزولِ آیت کا ان یہودی علماء کے حق میں لکھا ہے جو مدینہ کے رہنے والے تھے اور عبداللہ بن سلامؓ کے ساتھی تھے۔ میری رائے میں قول جامع وہی ہے جو حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ کچھ حبشی تھے کچھ نجرانی اور کچھ شامی۔ اب یہ سب ایک وقت میں حاضر ہو کر مسلمان ہوئے ہوں یا متفرق زمانوں میں آئے ہوں۔ بہرحال کتابی علماء کا گروہ تھا اور مسلمان ہو گیا تھا۔ انہیں کے حق میں آیاتِ مذکورہ نازل ہوئیں۔ اگرچہ حکم میں عموم ہے۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ الخ۔ محبت انسانی وہ میلانِ خاطر اور رغبتِ قلب ہے جو ایک آدمی کو اپنی ذات یا دوسرے سے ہوتی ہے۔ اسی جذبہ کے زیرِ اثر ایک شخص دوسرے کی طرف کھنچتا ہے۔ نتائجِ محبت مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی محبت کی غرض صرف اپنے دل کی تسکین ہوتی ہے، کبھی دوسرے کو فائدہ پہنچانا پیشِ نظر ہوتا ہے۔ محبت کے پیدا کرنے والے اسباب اور انسانی جذباتِ کشش کو ابھارنے والے وسائل و ذرائع یوں تو غیر محدود اور ان گنت ہیں۔ تاہم افراد سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف اصول نو ہیں۔ (۱) اپنے نفس سے محبت یہ فطری طور پر کم و بیش ہر آدمی اپنے دل میں رکھتا ہے۔ کوئی شخص نہیں پسند کرتا کہ اس کی ذات کو تکلیف یا مضرت پہنچے۔ اگرچہ بناوٹی طور پر بہت سے لوگ تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور بعض ابنائے انسان خود دانستہ گوارا کرتے ہیں، لیکن یہ تصنع ہوتا ہے یا زیادہ سے زیادہ بلندی حوصلہ کے تحت اس کو طبیعت ثانیہ کا درجہ دیا جا سکتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ سامنے سے کوئی شخص اگر لاٹھی یا تلوار کا وار کرے تو مضروب کا ہاتھ بغیر کسی ارادہ اور اختیار کے اوپر کو اٹھ ہی جاتا ہے اور وہ اپنے نفس کو مضرت سے بچانا چاہتا ہی ہے۔

(٢) محبت اقارب۔ ہر شخص کو فطرۃً اپنے اعزا واقارب سے محبت ہوتی ہے۔ اس کا دل والدین، اولاد اور دوسرے رشتہ داروں کی طرف کھنچتا ہے خواہ رقتِ جنسیت کو پورا کرنے کے لئے یا ان کو فائدہ پہنچانے کے لئے اقارب کی طرف کشش ضرور ہوتی ہے۔

(٣) دوستوں کی محبت۔ جو لوگ عادات، اطوار اور خصائل میں دوسروں سے مشابہت رکھتے ہیں ان میں باہم دوستی ہو جاتی ہے اور ہر دوست اپنے دوست میں میلانِ خاطر رکھتا ہے جس قدر عادات میں یکسانیت زیادہ ہوتی ہے اسی قدر صداقت میں پختگی ہوتی ہے۔ جتنی مشابہت فی السیرۃ کم ہوتی ہے اتنی ہی دوستی میں کمی ہوتی ہے یہاں تک کہ اگر اطوار میں یگانگت بالکل نہ ہو یا اتحاد فی السیرۃ کی باہم اطلاع نہ ہو یا بالکل اجنبیت اور مغائرت ہو تو دوستی بالکل نہیں ہوتی۔

(٤) محبت زوجیت۔ ہر شخص کو اپنے جوڑے سے فطری انس ہوتا ہے۔ اگرچہ پہلے سے رشتہ داری اور صداقت نہ ہو، لیکن جونہی زوجیت کا علاقہ قائم ہوا انس کا آغاز شروع ہو گیا۔ اب آگے بڑھ کر اگر خصائل واطوار میں یکرنگی نمودار ہوئی تو علاقۂ زوجیت کے ساتھ علاقۂ صداقت بھی پیدا ہو جاتا ہے اور محبت محکم ہو جاتی ہے اور اگر اخلاق میں یکرنگی اور طبیعت میں یکسانی نہ ہوئی تو علاقۂ صداقت پیدا نہیں ہوتا صرف زوجیت کا تعلق رہ جاتا ہے اور اگر اخلاقی مغائرت منافرت و تناقض کی حد تک پہنچ گئی تو رشتۂ زوجیت بھی منقطع ہو جاتا ہے۔

(٥) وطنی محبت۔ ہر شخص کو کم و بیش اپنے وطن اور اپنے اہلِ وطن سے محبت ہوتی ہے۔ بعض مصالح کے زیرِ اثر اگر کوئی شخص وطنی جذبہ کو مُردہ نما کر بھی لیتا ہے تب بھی یہ جذبہ مُردہ نہیں ہوتا۔ حصولِ مقصد کے بعد پھر برسرِ کار آجاتا ہے۔

(٦) مذہبی محبت۔ جو لوگ افکار خیالات اور عقائد میں متفق ہوں، زندگی کے کسی ایک قانون کو دل سے مانتے ہوں اور اس کو لائحہ حیات سمجھتے ہوں۔ ان میں باہم محبت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائی کو عیسائی سے، یہودی کو یہودی سے، ہندو کو ہندو سے اور مسلمان کو مسلمان سے محبت ہوتی ہے پھر معمول بہ مذہب کے تحت جس فرقہ سے انسان کا قلبی تعلق ہوتا ہے اس فرقہ والوں سے اس کو خصوصی وابستگی ہوتی ہے۔ آریہ کو آریہ سے، سناتن کو سناتنی سے، سُنی کو سُنی سے اور شیعہ کو شیعہ سے۔ کیتھولک فرقہ والے کو اپنے ہم مشرب سے اور پروٹسٹنٹ کو اپنے ہمنوا سے خصوصی اُنس اسی بنا پر ہوتا ہے۔ انہی افکار و خیالات کی زیرِ رہنمائی سیاسی، اقتصادی اور مذہبی گروہ بنے۔ فاسٹ اور بالشویک اسی محبت کی ظاہری شکلیں ہیں۔ جمہوریت اور شخصیت اسی کے مظاہر ہیں۔ بہر حال یہی جذبۂ مذہبی خدمت کرنے والوں کی تعظیم و احترام اور تکریم کرنے کا باعث بھی یہی جذبہ ہے یہاں تک کہ آسمانی مذاہب کے علمبردار چونکہ اپنے اپنے مذہب کو الہٰی سمجھتے ہیں اور خدا ہی کو اپنے تعمیری پروگرام کا بانی جانتے ہیں، اس لئے سب کو محبت کرنے کا دعویٰ ہوتا ہے اور راہِ خدا میں کم و بیش مالی اور جانی قربانیاں اسی جذبۂ محبت کے تحت ہر مذہب والا کرتا ہے اور اس کو اپنے لئے سعادت کا مظاہرہ سمجھتا ہے۔

(٧) محبت جمال۔ ہر آدمی فطرۃً دیدہ زیب شکل کی طرف اپنے اندر میلان پاتا ہے، لیکن جمال و حُسن کا چونکہ کوئی معیار نہیں۔ قدرتی جمال و حُسن کا چونکہ کوئی معیار نہیں۔ قدرتی جمال اور فطری کمال ہر چیز میں نمایاں ہے، اس لئے مذاقِ حُسن بھی مختلف ہے۔ کسی کے نزدیک اگر کوئی شکل حسین ہے تو دوسرا اس کو قبیح سمجھتا ہے۔ یہ جذبۂ محبت جب انتہائی ترقی پر پہنچ جاتا ہے تو عشق، شیفتگی، فریفتگی، وارفتگی اور اس سے بڑھ کر دوسرے مراتب جنون تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

(٨) محبت، خدمت و ہمدردی۔ اگر کوئی شخص کسی کی ہمدردی اور خدمت کرے تو مخدوم کو خادم سے کچھ نہ کچھ اُنس پیدا ہو جاتا ہے۔

(٩) محبت انسانیت عامہ۔ ہر انسان میں دوسرے انسان سے محبت کرنے کا مادہ موجود ہے۔ جو اُنس ایک انسان کو دوسرے انسان سے ہوتا ہے وہ غیر انسان سے نہیں ہوتا۔ بظاہر تو یہ جذبہ بہت ضعیف نظر آتا ہے، لیکن اگر مذکورۂ بالا تمام جذبات سے قطع کی جائے تو یہ جذبہ برسرِ کار رکھتا ہے۔ فرض کرو کہ ایک شخص کسی جزیرے میں بند ہے۔ ہر قسم کی غذا، راحت، آسائش، پوشش اس کو میسر ہے، سونے چاندی اور جواہر کے انبار بھی اس کے پاس موجود ہیں۔ فلک بوس کوٹھیاں بھی رہنے کے لئے تیار ہیں گلگشت کے لئے فرحت آفریں چمن اور نگہت بیز گلستان بھی ہے، لیکن آدمی کی شکل کبھی دیکھنے کو نہیں ملتی نہ کسی شخص کی آواز سنائی دے سکتی ہے نہ آئندہ کبھی انسانوں تک پہنچنے کی امید ہے اس وقت یہ جذبہ برسرِ عمل آتا ہے اور ہر قسم کی عیش و راحت اور دولت و نعمت کو آدمی بائے استحقار سے ٹھکرا کر اپنے ہم نوع افراد تک پہنچنا چاہتا ہے اور جب تک کسی انسان کی صورت نہ دیکھ لے یا کسی کی آواز نہ سُن لے اس کو چین نہیں آتا۔

یہ نو اقسام کی محبت ہے۔ مختلف عقلاء نے بلا اختلاف آراء مختلف اقسام کو قابلِ ترجیح سمجھا ہے۔ مثلاً کوئی کہتا ہے کہ محبتِ نفس کا درجہ سب سے بالا ہے۔ کوئی محبت اولاد کو بزرگ ترین سمجھتا ہے، کسی کو رشتۂ زوجیت کی حکومت بہت پسند آتی ہے۔ کوئی عشقِ جمال کا اتنا شیفتہ ہے کہ تمام دوسرے جذباتِ محبت کو اس پر قربان کر دیتا ہے۔ کسی کے نزدیک داعیۂ وطنیت سب سے زیادہ قوی ہے۔ بہر حال مختلف خیالات ہیں اور مختلف رائیں۔ اسلام تمام جذباتِ محبت کا احترام کرتا ہے

نفس زوجیت، قرابت، صداقت، وطنیت، خدمت، انسانیت غرض ہر محبت کی اسلام نے اجازت ہی نہیں دی بلکہ جائز حد تک ترغیب بھی دی۔ بیوی کی نگرانی، کفالت، سرپرستی اور دلجوئی کی تلقین کی۔ ماں باپ سے اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا۔ دوستوں سے موالات، اہلِ وطن کی پاس داری، خادموں پر رحم کرنے اور ان کے مساوات برتنے کی تعلیم دی۔ انسانی برادری کے حقوق کی بھی تفصیل کی۔ پڑوسیوں کے گھر والوں کے یہاں تک کہ اپنے نفس کے حقوق بھی بتائے، لیکن سب سے بالا کرسی جذبۂ مذہبی کو عطا کی۔ صاف طور پر صراحت کر دی۔ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ۔ جذبۂ اسلامی کا مقابلہ اگر دوسرے جذبات سے ہو جائے تو تمام جذبات کو اسلام پر قربان کر دینے کا حکم دیا۔ یہاں تک کہ بانیٔ اسلام کی محبت کو ہر محبت پر ترجیح دی۔ حضورؐ نے صاف ارشاد فرمایا لَنْ يُّؤْمِنَ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ مَّالِهٖ وَوَلَدِهٖ۔ الحدیث۔ یہی سبب تھا کہ حضرت علیؓ نے عمران بن طلحہ کو بلایا اور مرحبا کہہ کر بٹھایا۔ پھر فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ میں اور تمہارے باپ سلمہ قیامت کے دن بھائیوں کی طرح ہوں گے اور یہی باعث تھا کہ جب جنگ صفین کے دوران میں قیصر روم نے امیر معاویہ کو خط لکھا اور امداد دینے کی خواہش کی تو آپ نے فرمایا تم لوگ اس رومی کتے سے جہاد کے لئے تیار ہو جاؤ۔ لوگوں نے عرض کیا علی ہو لشکر لے کر سر پر آ رہے ہیں۔ معاویہ نے فرمایا مجھے علی محبوب ہیں یا یہ رومی کتا۔ حاصل یہ کہ دینی محبت کو اسلام نے تمام جذبات سے بالاتر جگہ دی ہے، لیکن دوسری قسم کی محبت کی بھی بشرطیکہ وہ محبت اسلامی میں سنگِ راہ نہ ہو اجازت بلکہ ترغیب دی ہے۔

اب یہ تو ظاہر ہے کہ اختلاف مذہب کے سبب کسی مسلمان کو کافر سے دینی محبت نہیں ہو سکتی۔ ہاں دوسری قسم کی محبت ہو سکتی ہے اور اسلام نے اس کی بندش بھی نہیں کی۔ اب ہم آیت کے مطلب کی طرف آتے ہیں۔ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ رسولِ پاکؐ کے دل میں اقارب، احباب، اہلِ وطن، امہات المومنین اور عام انسانوں کی محبت حسب مرتبہ ضرور تھی، اس لئے بحکمِ قرآنی آپ نے تبلیغ اسلام کا آغاز اپنے گھر والوں سے کیا پھر قریب ترین رشتہ داروں کو دعوت دی۔ ان میں سے آپ کے سب سے بڑے مددگار اور سرپرست عبدالمطلب تھے۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو آپ کے چچا ابوطالب نے اپنی اولاد کی طرح حضورؐ کی کفالت کی۔ لہٰذا باقتضائے بشری حضورؐ کی قوی ترین خواہش یہی تھی اور رغبت قرابت کا یہی تقاضا تھا کہ ابوطالب کے مسلمان ہونے کی آپ کے دل میں شدید ترین تمنا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی تھا، لیکن ابوطالب برابر گریز کرتے رہے۔ بالآخر جب انتقال کا وقت آیا تو حضورؐ نے انتہائی کوشش کے ساتھ ابوطالب کو اسلام کی ترغیب دی اور فرمایا چچا ایک ہی مرتبہ کلمہ پڑھ لیجئے تاکہ قیامت کے دن اللہ کے سامنے میں شہادت دے سکوں، لیکن محرومانِ ازلی کو ہدایت کس طرح ہو سکتی ہے۔ نبی کا کام رہنمائی ہے منزلِ مقصود پر پہنچانا نہیں ہے اسی وجہ سے ابوطالب مسلمان نہ ہوئے۔ چنانچہ :-

سعید بن مسیب نے اپنے والد مسیب بن حزن مخزومی کے حوالے سے روایت کی ہے کہ جب ابوطالب کے انتقال کا وقت قریب آیا تو حضورؐ ان کے پاس تشریف لے گئے۔ وہاں ابوجہل بن ہشام اور عبداللہ بن مغیرہ کو بیٹھا پایا۔ حضورؐ نے فرمایا چچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ کہہ دو تاکہ میں اس کی حجت خدا کے سامنے پیش کر سکوں۔ ابوجہل اور عبداللہ نے کہنا شروع کیا ابوطالب کیا تم عبدالمطلب کے مذہب سے پھر جاؤ گے؟ حضورؐ برابر کلمہ پڑھنے کی تلقین فرما رہے تھے اور وہ دونوں بھی اپنا قول دہرا رہے تھے۔ یہاں تک ابوطالب نے کہا میں عبدالمطلب کے مذہب پر ہوں۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ ابوطالب نے کہا کہ اگر مجھے خوف نہ ہوتا کہ قریش مجھے عار دیں گے اور کہیں گے کہ موت کے ڈر سے ابوطالب نے کلمہ پڑھ لیا تو میں صرف تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کرنے کے لئے یہ کلمہ کہہ دیتا۔ اس کے بعد ابوطالب کا انتقال ہو گیا۔ حضورؐ والا غمگین ہو کر یہ فرماتے ہوئے نکل آئے کہ میں اللہ سے تمہارے لئے دعائے مغفرت کروں گا جب تک مجھے ممانعت نہ ہو جائے۔ اس پر اللہ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے نبی آپ اگر محبت، قرابت یا کسی اور جذبہ محبت کے تحت کسی کو منزلِ مقصود پر پہنچانا اور مسلمان کر لینا چاہیں تو آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ کام تو خدا کا ہے خدا جس کو چاہتا ہے منزلِ مقصود پر پہنچا دیتا ہے۔ آپ کا کام تو صرف رہنمائی ہے۔ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کس میں ہدایت یاب ہونے کی صلاحیت ہے اور کون اس قابل ہے کہ اس کو مسلمان کیا جائے۔

مقصود بیان

اللہ کے پیامات میں ہمیشہ تسلسل رہا۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ خدا تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب کے کل احکام بدل دیئے گئے ہوں اور دوسری کتاب نازل نہ کی گئی ہو۔ اور اللہ کی کتابوں میں تو اصل بایں معنی بھی قائم رہا کہ ہر کتاب نے گزشتہ کتابوں کی تائید کی اور اصول عامہ میں ان سے اتفاق کیا جس کا اپنی مذہبی کتابوں پر سچا ایمان ہے وہ قرآن کو بھی سچ مانتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ کی صداقت اور قرآن کی حقانیت کا تذکرہ تمام آسمانی کتابوں میں کر دیا گیا تھا۔ اہلِ کتاب اگرچہ مسلمان ہو جائیں تو ان کو دوہرا ثواب ملے گا۔ اول امر و نواہی کی پابندی یا اللہ کے حلال و حرام اور امر و نہی میں اپنی رائے کو دخل نہ دینا اور ان پر بے چون و چرا عمل کرنا قابلِ

مدح وصف ہے۔ صَبَرُوْا کے لفظ سے اسی طرف اشارہ ہے۔ جو امر شریعت نے مستحسن سمجھا اور جس موقعہ پر جس کام کے کرنے کا حکم دیا وہ حسن ہے، اس لئے موقع عفو میں عفو اچھا ہے اور موقع انتقام میں انتقام بہتر ہے۔ آیت وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ کا یہی منشا ہے ـــــ خدا داد طاقت ہمت علم اور مال کو راہ حق میں خرچ کرنا لازم ہے لیکن اتنا کہ آئندہ ندامت وحسرت نہ ہو۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سے اس طرف اشارہ ہے کہ جاہلوں کے منہ لگنا اور ان سے کٹ حجتی کرنی ممنوع ہے۔ خوش تدبیری کے ساتھ جھگڑے کی رسی کو کاٹ دینا ہی ضروری ہے۔ ہدایت یعنی منزل مقصود پر پہنچانا اللہ کا کام ہے۔ کسی کا ہاتھ پکڑ کر اللہ تک پہنچا دینا کسی شخص یہاں تک کہ نبی کے بس کی بات بھی نہیں وغیرہ۔

وَقَالُوٓا إِن نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ أَرْضِنَا ۚ أَوَلَمْ نُمَكِّن لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى إِلَيْهِ

(کافر) کہنے لگے کہ اگر ہم تمہارے ساتھ مل کر ہدایت پر چلیں تو اپنی زمین سے اچک لیے جائیں گے کیا ہم نے امن والے حرم میں ان کو جگہ نہیں دی جہاں ہماری طرف سے

ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّن لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ

ہر قسم کے پھل رزق بن کر کھنچے چلے آتے ہیں بات یہ ہے کہ ان میں کے اکثر بے علم ہیں ہم بہت سی ایسی بستیاں ہلاک کر چکے ہیں جو اپنی معاش

مَعِيشَتَهَا ۚ فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّنۢ بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ۖ وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَمَا

پر اترا چلی تھیں۔ تو یہ ان کے گھر موجود ہیں جو ان کے بعد بسائے نہیں گئے مگر تھوڑے سے اور ہم ہی وارث ہوئے تمہارا

كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ أُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي

رب بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا تا وقتیکہ بڑے شہر میں کوئی رسول نہ بھیج دے جو ہماری آیتیں انکو پڑھ کر سنائے اور ہم بستیوں کو ہلاک نہیں کیا

الْقُرٰٓى إِلَّا وَأَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ ۝ وَمَآ أُوْتِيْتُم مِّن شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا ۚ

کرتے مگر جبھی جبکہ وہاں کے باشندے ظالم ہوں جو کچھ بھی تم کو دیا گیا ہے وہ دنیوی زندگی کا سروسامان اور یہیں کی رونق ہے

وَمَا عِندَ اللهِ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى ۚ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ أَفَمَن وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا فَهُوَ لَاقِيْهِ

اور جو اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر اور زیادہ پائدار ہے کیا تم سمجھتے نہیں بھلا جس شخص نے ہم سے اچھا وعدہ کیا ہے اور وہ اسکو پانے والا بھی ہے اس شخص کی

كَمَن مَّتَّعْنٰهُ مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ هُوَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ۝

برابر ہو سکتا ہے جس کو دنیوی زندگی کا سروسامان بھی ہم نے دے دیا پھر قیامت کے دن اس کو (دوزخ میں) حاضر کیا جائے گا

تفسیر ہم ایک سے زائد مرتبہ لکھ آئے ہیں کہ اعلیٰ دماغ کے انسانوں کو چھوڑ کر اکثر متوسط ذہنیت رکھنے والے اور سب کے سب ادنیٰ طبقہ کے آدمی محسوس پرست واقع ہوئے ہیں۔ جو چیز حواس ظاہرہ سے معلوم کی جا سکے اسی کے وہ قائل ہوتے ہیں۔ ان کے جذبات نفرت ورغبت میں ابھار اور برانگیختگی محض خارجی اشیاء سے اثر پذیری کے ماتحت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ان کو کبھی کوئی چیز الگ نظر آبھی جاتی ہے تو اس کا یقین ان کے دلوں میں اتنا قوی نہیں ہوتا کہ محسوس فوائد اضرار کا تصور اس سے مغلوب ہو سکے۔ ان کے پیش نظر ظاہر شکل میں سامنے آجانے والا نفع یا نقصان ہوتا ہے۔ پھر جو نفع نقصان فوراً بغیر تاخیر کے سامنے آجائے اس کا اثر ان کے دماغ پر زیادہ قوی ہوتا ہے اور جو

اور جو منفعت و مضار تاخیر کے ساتھ رونما ہو اس سے اثر پذیری ضعیف ہوتی ہے۔ وہ نقد کو تیرہ ادھار پر ترجیح دیتے ہیں۔ معمولی فوائد عاجلہ کثیر فوائد عاجلہ سے ان کی نظر میں زیادہ وقعت رکھتے ہیں۔ فوری کمزور نقصان سے آئندہ ہونے والے کثیر نقصان کے وہ زیادہ اثر اندوز ہوتے ہیں۔ اس محسوس پرستی کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی نظر صرف خارجی اسباب و ذرائع پر مقصور ہوتی ہے۔ دنیوی وسائل کو ہی وہ اسباب حقیقیہ سمجھتے ہیں۔ یہ وسائط ان کے نزدیک وسائط نہیں ہوتے بلکہ نفع نقصان کی باگ ڈور کا مالک وہ انہی کو سمجھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ انہیں کے قبضہ میں نفع نقصان پہنچانا ہے۔ بس اسی بنا پر اگر جنت کا لالچ یا دوزخ کا خوف یا اسلامی عقائد و اعمال کی حقانیت و صداقت کسی قدر ان کی دماغ نشین ہوتی بھی ہے تب بھی وہ سوسائٹی، اقارب، احباب اور حالات حاضرہ سے اتنے اثر اندوز ہوتے ہیں کہ اسلامی تعلیم کو ان اثرات کے مقابلے میں ان کے دماغوں میں کوئی جگہ نہیں ملتی۔ فی الحقیقت ایسے آدمی نفع نقصان کا مالک ایک خدا کو نہیں جانتے، غیبی طاقت قاہرہ پر ان کو یقین نہیں ہوتا۔

اسی قسم اور اسی حالت کے کچھ آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی موجود تھے جن کو اگرچہ اسلامی اصول کی حقانیت کسی قدر معلوم ہوگئی تھی لیکن یہ خیال پیش نظر رہتا تھا کہ مسلمان مٹھی بھر ہیں ان کے پاس مال و جلال نہیں، شوکت و سطوت نہیں، طاقت و جبروت نہیں، عزت و حکومت نہیں۔ اب اگر ہم بھی مسلمان ہوگئے تو عرب کے تمام لوگ ہمارے دشمن بن جائیں گے، چاروں طرف سے چڑھ آئیں گے، مال و اسباب لوٹ لیں گے، روزی کے ذرائع مفقود ہو جائیں گے، ہم کو برباد کر ڈالیں گے۔ انہی کا تذکرہ مذکورہ آیات میں کیا گیا ہے اور صاف طور پر بتا دیا گیا ہے کہ امن و فساد، حفاظت و ہلاکت سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ دنیوی طاقت و سطوت کے بغیر بھی خدا تعالیٰ ظالموں کی دست درازی بند کر سکتا ہے اور بڑی سے بڑی طاقت بھی بغیر محسوس اسباب ہلاکت کے برباد کر سکتا ہے۔ دیکھو کل ملک عرب فتنہ زار بنا ہوا ہے لیکن حرم کو خدا نے ان تمام ظالموں کی دست برد سے محفوظ کر رکھا ہے۔ حرم کے اندر مقتول کے ورثہ قاتل سے ملتے ہیں اور ان کو انتقام لینے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا۔ ارض حرم میں کوئی لشکر کشی نہیں کرتا۔ نہ ان کمزوروں جاہلوں اور سفاکوں کو دست قتل و غارت دراز کرنے سے روکنے والی حرم کے اندر کوئی سلطنت ہے نہ دنیوی طاقت۔ پھر بھی ان کی مجال نہیں کہ یہاں کوئی سفاکی کر سکیں۔ پھر یہ بھی دیکھو کہ گزشتہ قومیں کس قدر طاقتور اور شوکت پسند تھیں۔ ان کے پاس مال بھی تھا جلال بھی تھا ہتھیار بھی تھے کثرت افراد بھی تھی کوئی ظاہری سبب ہلاکت بھی موجود نہ تھا، لیکن جب انہوں نے قانون فطرت کو نہ مانا اور باوجود بعثت رسول کے اللہ کے حکم سے سرتابی کی تو غیبی طاقت نے ان کو تباہ کر دیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ حفاظت ہو یا ہلاکت، آبادی ہو یا بربادی سب خدا کے ہاتھ میں ہے وہ بغیر ظاہری اسباب کے جس کی چاہے حفاظت کر سکتا ہے اور جس کو چاہے ہلاک کر سکتا ہے۔ منشائے عروج و زوال اور صلاح و فساد اللہ کی فرمان پذیری اور نافرمانی ہے نہ کہ ظاہری طاقت و ضعف۔ اس سے سوسائٹی اقارب اور احباب کے خیال کو حق کے قبول کرنے سے مانع بنانا حماقت ہے اور یہ خیال کرنا بے بنیاد ہے کہ اگر ہم مسلمان ہو جائیں گے تو کفار ہم پر حملہ کر دیں گے اور ہمارا گھر بار لوٹ لیں گے اور اگر مان بھی لیا جائے کہ دنیا کا یہ مال و متاع مسلمان ہونے سے تلف ہو جائے گا تب بھی نقصان ہے۔ یہ عیش و راحت اور مال و دولت تو تلف پذیر ہی ہے اس کا اعتبار ہی کیا۔ ناپائیدار چیز ناقابل بھروسہ ہوتی ہے راحت تو وہی ہے جو ناقابل زوال اور ابدی ہو اور وہ خدا کے پاس ہے جو آخرت میں نصیب ہوگی اور اس کے حصول کا ذریعہ صرف اسلام ہے۔ اگر ناپائیدار راحت و عیش کو کھو کر لازوال سعادت و آرام مل جائے اور ایک روپیہ دینے سے لاکھوں کروڑوں بلکہ ان گنت دولت نصیب ہو جائے تو کیا گھاٹا ہے۔

تحلیل اجزاء وَقَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ الخ۔ ابن عباسؓ نے فرمایا حارث بن عامر بن نوفل کہا کرتا تھا کہ اگر ہم مسلمان ہوگئے تو عرب کے کفار چاروں طرف سے یورش کر کے اس بستی سے نکال دیں گے اور ہمارا گھر بار کاروبار تباہ اور بچے لاوارث ہو جائیں گے۔ یہ قول فقط حارث ہی کا نہ تھا بلکہ دوسرے لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے انہیں کے متعلق آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ حالانکہ ان کا یہ خیال غلط ہے کیونکہ قریش کے علاوہ دوسرے عرب قریش کو اپنا پیشوا اور مقتدا سمجھتے تھے ان کی مذہبی مخالفت کرنے پر بھی آمادہ نہ ہو سکتے تھے۔ دوسرے لوگوں نے اسلام کی مخالفت میں سرگرم کوشش کی، اس لئے کہ قریش اسلام کے مخالف تھے، مگر قریشی حیلہ بازوں نے اسلام سے باز رہنے کی علت، دوسروں کی مخالفت اور اپنے جان و مال کی حفاظت کے خیال سے قرار دیا۔

خدا تعالیٰ اس کی تردید میں فرماتا ہے :-

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا الخ۔ یعنی دوسرے عربوں سے خطرہ کرنا اور ظاہری طاقتوں سے مرعوب ہو کر اسلام سے روگرداں ہونی غلطی ہے۔ کوئی دنیوی طاقت ہماری مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان جس کا ایک کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ حرم کو ہم نے امن کا مقام بنایا ہے۔ اگرچہ تمام جزیرۂ عرب میں لوٹ مار اور جدال و قتال کا بازار گرم رہتا ہے، لیکن حرم کے اندر کسی کی مجال نہیں کہ لشکر کشی یا قتل و غارت کرے۔ باوجودیکہ کوئی دنیوی طاقت وہاں موجود

بھی نہیں ہے، لیکن پھر بھی حرم کے اندر رہنے والے ہر خطرہ سے محفوظ ہیں۔ یہاں تک کہ جو جانور حرم کے اندر رہتے ہیں یا بھاگ کر اندر چلے آتے ہیں ان کو بھی کوئی شکار نہیں کر سکتا۔ ان کے لئے بھی حرم امن کا مقام ہے۔ پھر قدرت کی کارسازی یہ بھی عجیب ہے کہ سرزمین مکہ ہر قسم کی پیداوار سے خالی ہے۔ کھجوروں کے علاوہ غلّہ اور میوہ یہاں پیدا نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ ایسے مقام میں لوگوں کو بھوکا مر جانا چاہیئے، لیکن خدا تعالیٰ نے ان کے رزق کا مکمل انتظام فرما دیا ہے۔ مصر، ہند، شام، طائف اور اطراف سے ہر قسم کا پھل اور غلہ یہاں آتا ہے یہ قدرت کی کارسازی ہے، مگر ناواقف لوگ نہیں جانتے کہ اس میں قدرت کا کیا راز ہے۔ وہ تو صرف ظاہری اسباب پر نظر رکھتے ہیں، حقیقت کا ان کو کیا علم۔ تو جس خدا نے اتنی کارسازی کی وہ اتنا نہیں کر سکتا کہ یہ لوگ مسلمان ہو جائیں تو کافروں کے دستبرد سے ان کے جان و مال اور اہل و عیال محفوظ رکھے یا بالفرض ان کو گھر بار چھوڑنا بھی پڑے تو ان کے مقدر کا رزق ہر جگہ اطمینان سے ان کو پہنچائے۔ یہ کیوں اپنے وطن کو اپنا رزق سمجھے ہوئے ہیں۔ یہاں تو کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہوتی۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ الخ۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے دو باتیں ظاہر فرمائی ہیں۔ اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ بغیر ظاہری اسباب ہلاکت کے بھی برباد کر دیتا ہے یعنی جس طرح وہ بقائے زندگانی کا سامان بغیر ظاہری اسباب کے فراہم کر دیتا ہے۔ دیکھو حرم کے رہنے والوں کو ہر خطرہ سے محفوظ رکھا اور دور دور سے ان کو پھل اور غلہ پہنچایا اسی طرح اگر ظاہر میں عیش و راحت اور امن چین کے تمام ذرائع موجود بھی ہوں تب بھی وہ غیبی اسباب ہلاکت کے تحت تباہ کر دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ مضرت اور فائدہ اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔ دیکھو گزشتہ قومیں باوجود شوکت، مرفہ الحال اور خوش عیش ہونے کے کس طرح برباد کر دی گئیں۔ ان کی ہلاکت کسی ظاہری طاقت کے ہاتھ سے نہیں ہوئی نہ ان کو کسی دنیوی قوت نے برباد کیا بلکہ اللہ ہی نے اپنی قہاریت سے ان کو تباہ کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کی بربادی کا اصل سبب ان کا غرور تھا۔ جب عیشِ ناپائیدار پر ریجھ گئے اور مال و منال پر اترانے لگے اور اس غرور میں آکر انہوں نے اللہ کے پیغمبروں کی ہدایت سے گردن نخوت موڑلی اور ان کے تمام احکام کو پائے تکبر سے ٹھکرا دیا تو اللہ نے ان کو برباد کر دیا۔ معلوم ہوا کہ تباہی لانے والی چیز وہی ہے جس کو یہ لوگ سبب آبادی سمجھتے ہیں۔ مال، جلال اور قوت وجاہ پر غرور کرنا اور اللہ کے حکم کو نہ ماننا اصل موجب ہلاکت ہے۔

إِلَّا قَلِيلًا۔ اس لفظ کا مطلب ابن عباسؓ نے اس طرح بیان کیا ہے کہ کوئی مسافر اور راہ گیر جب ادھر سے نکلتا ہے تو گھڑی دو گھڑی دم لینے کے لئے وہاں کھنڈروں میں ٹھہر جاتا ہے اور بس۔ کوئی مستقل رہنے والا وہاں نہیں۔ ان کی ویرانی اب بھی حیرت انگیز ہے۔ زمخشری نے ایک لطیف معنی بیان کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اس لفظ کا مطلب یہ ہے کہ اس جگہ بداعمال قوم کی نحوست اس قدر اثر کئے ہوئے ہے اور خدا تعالیٰ نے اصلی باشندوں کی بدکاری کے سبب اس مقام کو اس قدر ہلاکت بار کر دیا کہ اگر کوئی شخص وہاں جا کر رہے، تو زیادہ عرصہ نہیں ٹھہر سکتا، تھوڑے ہی عرصہ میں ہلاک ہو جاتا ہے۔ گویا ہر وقت وہاں اللہ کی لعنت برستی ہے۔ علامہ زمخشری کے اسی مطلب کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے جس کو اصحاب صحاح نے نقل کیا ہے کہ غزوۂ تبوک کو جاتے وقت کچھ صحابی مقام حجر کے کھنڈروں میں گئے اور وہاں کے کنوئیں میں سے پانی بھر کر آٹا گوندھا۔ حضورؐ کو اطلاع ہوئی تو فوراً برتنوں کا پانی پھنکوا دیا، آٹا اونٹوں کو کھلوا دیا، بوریا بستر اٹھا کر آگے چلنے کا حکم دیا اور فرمایا اللہ کی شان بے پرواہ ہے۔ اس قوم پر اللہ کا عذاب ہوا ہے تم وہاں نڈر ہو کر مت جاؤ۔ اگر جاؤ تو گریاں و ترساں (یہ بستیاں قوم ثمود کے کافروں کی تھیں) اس کے بعد جہاں حضرت صالح اور ان کے ساتھیوں کا مقام سکونت تھا وہاں حضورؐ نے فروکش ہونے کا حکم دیا۔ وہ بھی فرسودہ اور بوسیدہ کھنڈر تھے۔ تاہم وہ سلامِ رحمت کا مقام تھا۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ الخ۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ایک قانون ظاہر فرمایا ہے تاکہ عرب کے خصوصاً مکہ کے کافروں کو تنبیہ ہو، اور رسالت کی اصل غرض بھی سمجھ میں آجائے۔

آیت مذکورہ میں اُمّ القریٰ سے مراد بعض علماء کے نزدیک مکہ ہے، لیکن یہ خواہ مخواہ کی زیادتی ہے۔ سیاق کلام اس یقین کا انکار کرتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ تو اقوام کی تباہی (و بربادی) کا ایک عام قانون بیان فرمانا چاہتا ہے جس سے غرض یہ ہے کہ مخلوق کو برباد کرنا خدا کا اصل منشا نہیں۔ اصل سبب لوگوں کی بداعمالی ہے۔ زہر کھانے کا نتیجہ ہلاکت ضرور ہے، مگر بحکم الٰہی۔ خدا ظالم نہیں کہ بلا وجہ لوگوں کو تباہ کر دے، بلکہ جو لوگ قانونِ قدرت سے سرتابی کرتے ہیں اور ضابطۂ فطرت پر نہیں چلتے ان کی لازمی سزا یہی ہوتی ہے۔ خدا ان پر ہلاکت کو مسلط کر دیتا ہے۔ پہلے کسی پیغمبر کو وہاں کے بڑے شہر میں بھیجتا ہے جس طرح رسول اللہ کو مکہ میں بھیجا۔ جب لوگ پیغمبر کی ہدایت کو بھی نہیں مانتے، ضابطۂ قدرت اور ہدایت رسول کی مخالفت کرتے ہیں تو ان پر غیبی عذاب نازل کیا جاتا ہے۔ پس متنبہ ہونا چاہیئے اس سے مکہ کے کافروں کو کہ اگر وہ بداعمالی سے باز نہ آئیں گے اور رسول اللہؐ کی ہدایت پر نہ چلیں گے تو برباد کر دیئے جائیں گے۔ گویا ہلاکت کا اصل سبب ہدایت پیغمبر کی مخالفت ہے نہ کہ ان کی اطاعت۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا الخ۔ متاع کہتے ہیں برتنے کے سامان کو ظاہر ہے کہ برتنے کا سامان زندگی کو باقی رکھنے اور آرام اٹھانے کے لئے ہوتا ہے مقصود اصلی نہیں ہوتا، لیکن اگر کوئی بیوقوف سامان کو اصل مقصود بنا لے اور چھپا کر رکھے اور استعمال نہ کرے تو اس کی زندگی تکلیف سے گزرے گی۔ ایسے آدمی کے پاس برتنے کا سامان موجود ہو یا نہ ہو دونوں برابر ہیں۔ موجود ہو اور بچا بچا کر رکھے استعمال نہ کرے یا موجود ہی نہ ہو دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ پس اس سے سمجھ لینا چاہیئے کہ دنیا اور دنیوی زندگی کا کل سامان آخرت کی زندگی میں آرام کرنے اور اس کو سدھارنے کے لئے ہے۔ انسان کو یہ زندگی اسی لئے دی گئی ہے کہ وہ یہاں کی چیزوں کو استعمال کر کے اخروی زندگی کا سکھ حاصل کرے۔ اب اگر کوئی بیوقوف آدمی اس دنیوی سامان کو استعمال ہی نہ کرے بچا بچا کر رکھے اور اصل مقصود سمجھ لے یا استعمال کرے تو بیجا طور پر اس کی اخروی زندگانی تکلیف سے خالی نہ ہوگی دکھ اٹھانا پڑے گا۔

دوسرا مطلب جس کو اکثر مفسرین نے لکھا ہے یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز ناپائیدار اور فنا پذیر ہے اور آخرت کی ہر نعمت باقی رہنے والی ہے۔ لہٰذا دنیوی عیش پر ریجھنا عقلمندی کا کام نہیں۔ بلکہ ایسی کوشش کرنی چاہیئے کہ لازوال نعمت ہاتھ آئے۔ ناپائیدار عیش کو آنے والی لازوال نعمت پر ترجیح دینا حماقت ہے۔ پس یہ خیال کرنا کہ اگر ہم مسلمان ہو جائینگے تو چاروں طرف سے کفار چڑھائی کر دیں گے۔ ہمارا گھر بار لٹ جائے گا اور روزی کا دروازہ بند ہو جائے گا بیوقوفی ہے۔ یہاں کا عیش تو ناقابلِ توجہ ہے۔ عیشِ آخرت کا مرکزِ توجہ ہونا چاہیئے۔ جو چیز آخرت کے حصول سے روکے اس کو راستہ سے ہٹا دینا چاہیئے۔

اَفَمَنْ وَّعَدْنٰهُ وَعْدًا حَسَنًا الخ۔ مجاہد نے فرمایا اس آیت میں جن دو شخصوں کا ذکر ہے ان سے حضور والا کی ذاتِ گرامی اور ابوجہل مراد ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ نزول آیت حضرت حمزہؓ حضرت علیؓ اور ابوجہل کے متعلق ہوا۔ مقدم الذکر دونوں حضرات سے اللہ نے وعدہ حسنہ فرمایا اور کچھ دنیوی عیش دینے کے بعد قیامت کے دن جس کی پکڑ ہوگی وہ ابوجہل ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ہر مومن و کافر کو آیت کا حکم شامل ہے۔ یہی زیادہ صحیح ہے۔

مقصود بیان کسی دنیوی لالچ یا خوف کی وجہ سے شریعت کے حکم سے سرتابی نہ کرنی چاہیئے۔ کارسازِ حقیقی اللہ کو سمجھنا لازم ہے۔ نفع اور ضرر کا مالک اور قادرِ مطلق اسی کو یقین کرنا چاہیئے۔ ظالموں کی چیرہ دستی کا اندیشہ اور ملازمت، تجارت یا دوسرے مشاغلِ حیات کی بربادی کا خیال قبولِ حق سے مانع نہ ہونا چاہیئے۔
حرم کے اندر فسق و فجور خصوصیت کے ساتھ ممنوع ہے۔ جدال، قتال، اشکار اور ہر قسم کا جھگڑا کرنا حرام ہے۔ حرم کے اندر ہر قسم کا مروجہ غلہ اور اس ملک کے فواکہ آتے ہیں اور یہ اللہ کا بڑا احسان ہے۔
اقوام کی تباہی عیش پسندی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ حق سے سرتابی کرنی موجبِ ہلاکت ہے اور اللہ ظالم نہیں۔ اتمامِ حجت کے لئے خدا تعالیٰ نے ہر بڑے شہر میں پیغمبر کو بھیجا اور قوم نے سرکشی کی تو اس وقت ہلاک کر دیا وغیرہ۔

وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ○ قَالَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ

جس دن اللہ اُن کو بلائے گا اور فرمائے گا میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کو تم (شریک) گمان کرتے تھے تو جن لوگوں پر ہمارا عذاب ثابت ہو چکا ہوگا

الْقَوْلُ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَغْوَيْنَا ۚ اَغْوَيْنٰهُمْ كَمَا غَوَيْنَا ۚ تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ۖ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا

وہ کہیں گے پروردگار! انہی لوگوں نے ہم کو بہکایا تھا جس طرح ہم خود بہکے تھے اُن کو بھی بہکایا ہم تیرے آگے ان سے بیزار ہیں یہ لوگ ہم کو نہیں

يَعْبُدُوْنَ ○ وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَرَاَوُا الْعَذَابَ ۚ لَوْ

پوجتے تھے اور حکم ہوگا اپنے شرکاء کو پکارو وہ اُن کو پکاریں گے مگر وہ اُن کو جواب نہ دیں گے اور عذاب دیکھیں گے کاش

اَنَّهُمْ كَانُوْا يَهْتَدُوْنَ ○ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ ○ فَعَمِيَتْ

وہ راہِ راست پر ہوتے اور جس دن (اللہ) ان کو پکارے گا اور فرمائے گا تم نے پیغمبروں کو کیا جواب دیا تھا؟ پس اس روز

عَلَیْہِمُ الْاَنْۢبَآءُ یَوْمَئِذٍ فَہُمْ لَا یَتَسَآءَلُوْنَ ○ فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا

اُن سے باتیں نہ بن پڑیں گی اور آپس میں بھی وہ ایک دوسرے کو نہ پوچھیں گے جس نے توبہ کر لی اور ایمان لے آیا اور نیک کام کئے

فَعَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِیْنَ ○

تو امید ہے کہ وہ کامیاب ہو جائے

تفسیر دنیا میں امتداد زمانہ اور اختلاف افکار و احوال نے تین فرقے پیدا کئے۔ اول وہ گروہ جو خود بھی حق پرست اور موحد تھا۔ توحید کی تعلیم ہی اس نے دوسروں کو دی۔ شرک، لوازم شرک اور شرک پیدا کرنے والے اسباب سے بچنے کی ہدایت کی اور اس کی قوم نے مدت دراز تک اس کی تعلیم کے موافق عمل کیا۔ یہ گروہ توالی حق کا ہے اور دین الٰہی پر چلنے والا ہے، آسمانی کتابوں کی تعلیم کو ماننے والا ہے۔ بے چون و چرا راہ مستقیم پر گامزن ہے۔ براہ راست خدا سے تعلق رکھنے والا ہے۔ درمیانی وسائل سے قطع نظر کر کے خالق پر اس کی نگاہ ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس کے پیشوا اور مقتدا موحد کامل تھے۔ انہوں نے توحید کی تعلیم دی تھی اور ان کے زمانہ میں ان کی پیروی کرنے والے خالص موحد ہی تھے، لیکن جب ان رہنمائوں کا انتقال ہو گیا اور ان کی صورتیں نظر سے اوجھل ہو گئیں اور جانشینوں کو اندیشہ ہوا کہ اب قوم راہ راست سے بھٹک جائے گی اور اپنے رہنماؤں کو بھول جائے گی۔ ایسی حالت میں انہوں نے بخلوص نیت پیشواؤں کے نام مسجدوں کے دروازوں پر عام گذرگاہوں پر لکھ دیئے تاکہ عوام اپنے پیشواؤں کو نہ بھول جائیں اور ان کی ہدایات طاق نسیاں پر نہ ڈال دی جائیں۔

بظاہر حال اگرچہ یہ کام برا نہ تھا، لیکن بدعت کا نتیجہ ہمیشہ برا ہوتا ہے۔ خواہ اس وقت برا معلوم ہوتا ہے یا نہ ہو۔ چنانچہ اس بدعت کا نتیجہ کچھ مدت کے بعد یہ ہوا کہ بیوقوف لوگوں نے نام کی جگہ نشان اور بزرگوں کی صورتیں بنالیں۔ پھر جس خاندان کا وہ بزرگ تھا اس خاندان نے اپنے گھروں میں ان کی تصویریں آویزاں کر دیں، دیواروں پر کھینچیں اور جب زیادہ زمانہ ہو گیا تو صورتوں کی جگہ مجسمے بنالئے گئے، لیکن ابھی تک ان کی پوجا شروع نہیں کی گئی پھر جہالت بڑھتی گئی اور یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ گھر کے کسی بال بچے نے اس تصویر یا مورت سے بے ادبی کی اور وہ کسی بیماری میں مبتلا ہو گیا تو جاہلوں نے بہ اغوائے شیطانی خیال کر لیا کہ اسی مقدس تصویر سے بے ادبی کرنے کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ اس سے معذرت آمیز معافی مانگنے لگے۔ اب اگر وہ مر گیا تو سمجھ لیا کہ ہمارے مقتدا ہم سے راضی نہ ہوئے اور بچہ انہی کی مار میں آگیا اور اگر اتفاقاً بچہ اچھا ہو گیا تو یقین ہی ہو گیا کہ واقعی بچہ انہیں کے عتاب میں تھا۔ غرض ان مورتوں اور تصویروں کو نفع نقصان کا مالک اور کائنات کا حقیقی متصرف ماننے لگے۔ ایک قادر مطلق مجرد طاقت کی جگہ فرضی محسوس دیوتاؤں اور معبودوں کو دے دی اور بزعم خود پیشواؤں کی ہدایات کے خلاف مخلوق کو کارساز سمجھنے لگے۔ یہ گروہ تدریجی طور پر شرک میں مبتلا ہو گیا پھر جہالت اسی حد پر آکر نہ رک گئی بلکہ سونے چاندی اور قیمتی پتھروں سے فرضی معبودوں کی مورتیاں بننے لگیں اور جب امتداد زمانہ کی وجہ سے پیشواؤں کی اصل تصویریں اور خدوخال دماغوں سے زائل ہو گئے تو فرضی تخیل نے اس کی جگہ لے لی اس کے تخیل اور توہم کے موافق مورتیاں گڑھی جانے لگیں۔ پھر یہ کام بھی غیر ضروری سمجھا جانے لگا کیونکہ اس میں صنعت اور تراش خراش کی ضرورت پڑتی تھی بلکہ چکنا سفید پتھر دیکھا اس کو اٹھا لیا اور گھر میں لے جا کر رکھ دیا اور اس کی پرستش شروع کر دی گئی۔ سفر حضر میں اس کو ساتھ رکھا، معبود کو جیب میں ڈالے پھرتے رہے۔ غرض جہالت یونہی ترقی کرتی رہی۔ تیسرا گروہ وہ ہے جس کے ہادی اور راہنما بھی گمراہ مشرک اور بداعمال تھے۔ فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا۔ عمرو بن لحی نے سب سے پہلے ملک شام سے لاکر کعبہ کے اندر بت رکھے اور عوام نے ان کی پیروی کی۔ وہ خود بھی بت پرست بنا اور دوسروں کو بھی بت پرست بنایا۔ یہ گروہ اصل و فرع دونوں کے لحاظ سے گمراہ تھا، لیکن مؤخر الذکر دونوں فرقوں کے درمیان ایک حقیقت مشترک ہے خواہ ان کے پیشواؤں نے اس کی تعلیم دی ہو یا نہ دی ہو، مگر شرک میں دونوں مشترک ہیں اور اپنے زعم اور تخیل کے بندے ہیں۔ برہان عقلی اور حق سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اپنے معبودوں کو کارساز، ضار اور نافع سمجھتے ہیں، ان سے مرادیں مانگتے ہیں، ان کی فرضی مورتیوں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں، شیطانی وسوسہ اور وہمی اختراع کے زیر اثر مخلوق میں الوہیت کا جز ثابت کرتے ہیں اور یہ خیال کئے ہوئے ہیں کہ جس طرح دنیا میں یہ ہمارے کارساز ہیں مرنے کے بعد بھی کارسازی کریں گے حالانکہ وہ دنیا میں کارساز تھے نہ آخرت میں ان ناخلف مریدوں کے کام آئیں گے۔ بعض میں تو شفاعت کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہوگی مثلاً بت پتھر وغیرہ اور بعض میں صلاحیت ضرور ہوگی، مگر ان کا ان نالائقوں سے کچھ تعلق ہی نہ ہوگا وہ اللہ کے سامنے ان سے بیزاری کا اظہار کریں گے اور صاف اعلان کر دیں گے کہ ہم نے ان کو کبھی شرک کی تعلیم نہیں دی یہ اپنے تخیل اور زعم کے پرستار بنے ہمارے پرستار نہ تھے۔ رہے تیسری قسم کے معبود یعنی معبودوں کا وہ فرقہ جنہوں نے شرک کی تعلیم دی تھی۔ جب شرک پرست لوگ قیامت کے دن ان

سے التجا اور مدد کی درخواست کریں گے تو وہ بدبخت خود ہی انجام بد میں مبتلا ہوں گے۔ وہ صاف کہہ دیں گے کہ ان ہم نے ان کو گمراہ کیا تھا۔ یعنی ہم کو ان پر کچھ اقتدار نہ تھا۔ ہم نے ان پر کچھ زبردستی نہ کی تھی۔ ہم اپنے شیطانی زعم اور غلط تخیل کی وجہ سے گمراہ ہوئے۔ اس وقت شرک پرست گروہ مبہوت و متحیر ہوگا۔ ہر چند اپنے حامیوں کو مدد کے لئے پکارے گا، لیکن کوئی ان کی فریاد نہ سنے گا اور یونہی جہنم رسید ہوگا۔

تحلیلِ اجزاء

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ۔ اس آیت کا نزول اگرچہ قریش کے حق میں ہوا کیونکہ اس وقت روئے سخن قریش ہی کی طرف تھا، لیکن بیان کی حیثیت عمومی ہے، اس لئے حکم آیت تمام مشرکوں کو شامل ہے۔ قیامت کے دن کافروں کو پکارنے والے فرشتے ہوں گے چونکہ اللہ کے حکم سے فرشتے ندا دیں گے، اس لئے ندا کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف مجازاً کر دی۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ کا خطاب اگرچہ تہدید آمیز اور عذاب آفریں ہو، مگر پھر بھی لذت بخش ہے اور قیامت کے دن کافروں کو خطاب الٰہی کی نعمت نصیب نہ ہوگی۔ غرض بحکم الٰہی فرشتہ پکارے گا۔ وہ فرضی معبود جن کو تم لوگ اپنے زعم و تخیل سے خدائی صفات میں شریک سمجھتے تھے۔ نفع نقصان، کارسازی اور بربادی کا مالک جانتے تھے۔ عالم کا متصرف ان کو خیال کرتے تھے اور قیامت کے دن جن کی حمایت کرنے کا تم کو بھروسہ تھا آج وہ کہاں ہیں حمایت کے لئے ان کو بلاؤ۔

قَالَ الَّذِينَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ۔ قول سے مراد ہے قول عذاب اور قول عذاب وہ وعدۂ الٰہی ہے کہ دوزخ کو آدمیوں اور جنوں سے بھرا جائے گا۔ بہرحال دوزخیوں کے سرگروہ اور ہر قوم کے گمراہ کن گمراہ جواب دیں گے کہ پروردگار ہم نے ان کو گمراہ کیا تھا جیسے ہم خود گمراہ تھے یعنی ہم نے راہنمائی کی اور ہماری قیادت بغیر ثبوت و دلیل کے تھی انہوں نے اس کی پیروی کی ہم نے ان پر جبر نہیں کیا۔ ان کو اپنے خیال میں آزادی تھی یہ کیوں ہمارے خیال پر بغیر ثبوت کے چلے ہم ان سے بیزار ہیں۔ ان کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ہمارے پرستار نہ تھے اپنے تخیل کے پرستار تھے۔

یاد رکھو بغیر شرعی دلیل اور آسمانی صراحت کے کسی کے قول کو ماننا اور اس پر چلنا بھی شرک ہے کیونکہ درحقیقت خالق کا حکم بغیر چون و چرا کے ماننا فرض ہے۔ اب اگر دوسرے کا حکم بغیر ثبوت کے مانا تو گویا اس کو اپنا رب بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آیت اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ الخ نازل ہوئی تو عدی بن حاتم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم راہبوں کو رب تو نہیں مانتے تھے۔ ارشاد فرمایا کیا ایسا نہیں تھا کہ احبار و رہبان (علماء و مشائخ) جو کچھ (اپنی طرف سے) کہتے تم اس پر چلتے تھے (او کما قال) عدی نے عرض کیا ہاں حضور ایسا تو تھا۔ ارشاد فرمایا بس یہی شرک تھا (رواہ الترمذی) عیسائیوں میں اب تک دستور ہے کہ روزہ کے ایام کو کسی عذر کی وجہ سے پوپ دوسرے موسم میں بدل دے تو اس کے پیرو اس تبدیلی کو جائز سمجھتے ہیں۔

وَقِيلَ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ الخ۔ اس آیت میں شرکاء سے مراد وہ شرکاء ہیں جن کو بزعم خود کافروں نے خدائی میں شریک بنا رکھا تھا۔ حالانکہ انہوں نے ہمیشہ توحید کی تعلیم دی اور شرک سے منع کیا۔ مثلاً حضرت عیسیٰ اور حضرت عزیر وغیرہ۔ چونکہ یہ لوگ ہیبتِ الٰہی سے لرزہ براندام ہوں گے۔ اگرچہ دوسروں کے فعل و عقیدہ کا جرم ان کے ذمہ عائد نہ ہوگا لیکن پھر بھی اپنی جگہ پر ان پر ہیبت طاری ہوگی، اس لئے کافر ان کو کتنا ہی پکاریں گے مگر یہ جواب تک نہ دیں گے اور ممکن ہے وہی جامد و بے حس مخلوق مراد ہو جن کو کفار بزعم خود اپنا حامی سمجھ کر پوجا کرتے تھے چونکہ ان میں بولنے کی قابلیت ہی نہ ہوگی، اس لئے کوئی جواب نہ دیں گے۔

وَيَوْمَ يُنَادِيهِمْ فَيَقُولُ مَاذَا أَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِينَ۔ یہ ندا بھی بحکم الٰہی فرشتہ ہی دے گا اور باز پرس کی جائے گی کہ (علاوہ عقل عطا کرنے اور دلائل فطرت پیدا کرنے کے جو پکار پکار کر توحید کی طرف بلا رہی تھیں) اللہ نے جو تمہارے پاس پیغمبر بھیجے تھے اور انہوں نے تم کو راہِ راست کی طرف بلایا تھا تم نے ان کا حکم کیوں نہ مانا اور یاد ہے تم نے دعوتِ مرسلین کا کیا جواب دیا تھا؟ تو دنیا میں اگرچہ پیغمبروں کے مقابلے میں وہ کٹ حجتیاں کرتے اور نسبتی غرور سے سرمست ہو کر پیغمبروں کے ماننے والوں کو ذلیل اور رذیل کہتے تھے، لیکن قیامت کے دن ان کو کوئی جواب بن نہ پڑے گا اور ایسا بھی ممکن نہ ہوگا کہ باہم پوچھ کر کوئی جواب نہ دے سکیں (کذا قال مجاہد)

فَعَسَىٰ أَنْ يَكُونَ۔ اہلِ تفسیر نے اس جگہ لفظ عَسٰی کے معنی لزوم کئے ہیں۔ یعنی جن لوگوں نے دنیا میں توبہ کر لی اور نیک کام کئے اللہ ان کو ضرور فلاح یاب فرمائے گا۔

میرے نزدیک اس کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ عَسٰی کے معنی امید ہی کے ہیں کیونکہ اللہ نے کسی خاص شخص کا تذکرہ نہیں فرمایا۔ ایک جماعت کا حکم بیان فرمایا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس نے صدقِ دل سے توبہ کی اور اللہ نے اس کی توبہ قبول کر لی تو وہ ضرور فلاح یاب ہوگا، لیکن اس کو اپنی توبہ اور نیک اعمال پر مغرور نہ ہونا چاہیئے اور یقین نہ کر لینا چاہیئے کہ چونکہ میرے اعمال اچھے ہیں، اس لئے جنت میں مجھ کو بھیجنا خدا پر لازم ہو گیا۔ ایسا عقیدہ صحیح نہیں ہے بلکہ یہ امید رکھنا چاہیئے کہ چونکہ میں مخلص نیت اللہ کے حکم کو مانتا ہوں، اس لئے میرے پروردگار کی رحمت مجھ پر ضرور رہے گی، لیکن اسی کے ساتھ اعمال کے رد ہونے اور عذاب میں ماخوذ ہونے کا خوف بھی دل میں لگا رہنا لازم ہے۔ ممکن ہے توبہ نہ قبول ہوئی ہو یا اعمال پسند نہ آئے ہوں یا اگر

اعمال بھی پسند کر لئے گئے ہوں تو ان کو اللہ نے دنیوی احسان کا عوض قرار دے دیا گیا ہو اور قیامت کے دن خالی ہاتھ رہنا پڑے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ کوئی اپنے اعمال کے سبب جنت میں جائے گا جب تک اللہ کی رحمت شامل نہ ہو الخ۔

مقصود بیان

اللہ کی الوہیت یا ربوبیت، ذات یا صفات دونوں میں شرک کرنا حرام ہے جن کی شفاعت کے بھروسہ پر مشرک پوری زندگی گزار دیتے ہیں۔ اور موہومی مددگاروں کی ایسی امید پر پرستش کرتے ہیں قیامت کے دن ان کو حمایت کی قدرت ہی نہ ہوگی، نہ وہ ان کی شفاعت کریں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انبیاء، صلحاء اور ملائکہ کا مشرکوں سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اس سے نصیحت حاصل کرنا چاہیئے اس نادان گروہ کو جو محبتِ رسول میں اس قدر غلو کرتا ہے کہ اس نے حضورؐ والا کو صفاتِ الٰہیہ میں شریک بنا رکھا ہے اور عبرت پکڑنی چاہیئے اس پیر پرست قبر پرست بدعتی کو جس نے اولیائے کرام کو اپنا دنیوی و اخروی کارساز سمجھ رکھا ہے۔ قیامت کے دن ان بزرگ ہستیوں کا اس [illegible] گروہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اگر شفاعت بحکمِ خداوندی ہوگی تو انہی پاک باطن اہلِ توحید کی ہوگی جو اللہ کو ذات، صفات، الوہیت اور ربوبیت میں یگانہ و بے ہمتا سمجھتے ہیں، لیکن باغوائے شیطانی و بہ تسلط نفسانی ان کے اعمال خراب ہو گئے۔ معصیت فی العمل تو قابلِ شفاعت ہو سکتی ہے، شرک ناقابلِ شفاعت ہے۔ مَاذَا أَجَبْتُمُ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ پیغمبرِ وقت پر ایمان لانا ضروری ہے اور ہدایات شرعیہ پر کاربند ہونا لازم ہے۔ کوئی فلاسفر، حکیم، درویش، صوفی، مصلح، ولی اتباعِ پیغمبر سے مستغنی نہیں نہ عقلی ایمان کافی ہے۔ فَهُمْ لَا يَتَسَاءَلُونَ سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کفار باہم باز پرس اور خبر گیری نہ کر سکیں گے۔ اس سے مسلمانوں کے حق میں عدمِ شفاعت پر استدلال نہیں کیا جا سکتا الخ۔ وغیرہ۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ ۗ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ○ وَرَبُّكَ

تمہارا رب جو چاہتا پیدا کرتا اور پسند کرتا ہے　ان لوگوں کے ہاتھ اختیار نہیں۔　اللہ پاک ہے　اور ان کی شرک انگیزیوں　سے برتر ہے　اور تیرا رب

يَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا يُعْلِنُونَ ○ وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ

جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں　وہی اللہ ہے　اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔　دنیا و آخرت میں اسی کو ہر تعریف

وَالْآخِرَةِ ۖ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا

زیبا ہے　اور اُسی کے ہاتھ حکم ہے اور اسی کے پاس تم کو لوٹ کر جانا ہوگا　کہہ دو کہ دیکھو تو سہی اگر　تم پر اللہ روزِ قیامت تک　دن　رکھے

إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِضِيَاءٍ ۖ أَفَلَا تَسْمَعُونَ ○ قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ

تو اللہ　کے سوا　کون معبود　تم پر روشنی لا سکتا ہے　کیا تم سنتے　نہیں ہو　کہہ دو　دیکھو تو سہی　اگر

جَعَلَ اللَّهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ

اللہ تم پر ہمیشہ　روزِ قیامت تک　دن رکھے　تو اللہ کے　سوا کون　معبود تم پر رات کو لا سکتا ہے　جس میں تم کو

فِيهِ ۖ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ○ وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ

آرام ملے　کیا تم　دیکھتے نہیں ہو　اس نے اپنی رحمت سے　تمہارے لئے　رات دن بنائے　تاکہ رات میں تم آرام حاصل کرو　اور (دن میں)　اللہ کا فضل

فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ فَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ○ وَ

(روزی) تلاش کرو اور اس کا شکر کرو جس دن اللہ ان کو پکارے گا اور فرمائے گا میرے وہ شریک کہاں ہیں جن کو تم (شریک) گمان کرتے تھے اور

نَزَعْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا فَقُلْنَا هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ فَعَلِمُوْٓا اَنَّ الْحَقَّ لِلّٰهِ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ ع ۱۵ ۱۰

ہر گروہ میں سے ہم ایک گواہ نکال لیں گے پھر کہیں گے اپنی دلیل پیش کرو اس وقت وہ جان لیں گے کہ سچی بات اللہ کی ہے اور جو باتیں وہ بنایا کرتے تھے سب گم گزری ہو جائیں گی

تفسیر دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جس کے پیرو اپنے مذہب کو آسمانی مذہب کہتے ہوں اور پھر توحید کے قائل نہ ہوں، لیکن اسلام نے انہی علمبردارانِ توحید میں سے بہتوں کو مشرک قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ توحید کے متعلق اسلام کا نظریہ دوسرے مذاہب کے نظریہ سے مختلف ہے وہ کیا ہے؟ اس کی تفتیش کے لئے دوسرے مذاہب کے نظریات کو پیش کرنا اور پھر اسلامی نظریہ کو ظاہر کرنا لازم ہے، لیکن یہ بحث بہت طویل ہے۔ تاہم آیت مذکورہ کے مضمون کو روشنی میں لانے کے لئے مختصر طور پر بیان کرنا ضروری ہے۔ آؤ غور کریں کہ توحید کے متعلق دوسرے مذاہب کے کیا نظریات تھے اور اسلام نے کیا کیا؟

یہ تو ظاہر ہی ہے کہ آغاز آفرینش سے انسان سربستہ حقیقت کے انکشاف اور خالقِ عالم تک پہنچنے کے طریقے معلوم کرنے میں سرگرمی کے ساتھ کوشش کرتا رہا ہے، لیکن حقیقت تک رسائی ہوئی یا نہ ہوئی یہ دوسری بات ہے۔

ایران، ہندوستان اور چین کا انسان ہزاروں برس ایک گم گشتہ حقیقت کو پالینے کے لئے کبھی اس نے پتھروں کو پیشِ نظر رکھا کبھی فطرت کے منظروں سے اس کو جھانکا۔ درخت ستارے اور روشن عناصر مشعلِ راہ بنائے گئے، لیکن کبھی تجریدی صورت میں عین ذات پر نگاہ ٹھہر کر نہ ڈالی، مادی صورتوں کا شیفتہ بنا رہا۔ اس کی ناکمل انسانیت مادی صورتوں کی غلام بنی رہی روح انسانی کو کبھی تجریدی سیر کرنی نصیب نہ ہوئی اور نہ کبھی ذہنی آزادی میسر آئی۔ اسلام نے اس قسم کی توحید کو شرک آمیز قرار دیا۔

یونان، روما اور المانیہ کا انسان آزاد حقائق کی ایک دنیا پیدا کرتا ہے جس کی وسعتیں اور ترقیاں ہر طرف ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اس نے نظام انسانیت کے ہاتھ اور پاؤں سے روایتی عقائد اور سماجی بیڑیاں کاٹ دیں۔ خارجی قید و بند کی کڑیوں سے روح کو آزاد کر دیا۔ انہی قوانین و اصول کی پابندی کی جن کو وہ دل سے صحیح جانتا تھا، لیکن روح کو داخلی آزادی کا کوئی قانون نہ بتایا۔ روح کو نفسانی خواہشات اور بہیمانہ جذبات سے پاک کرنے کا کوئی دستور ظاہر نہ کیا۔ پھر خارجی آزادی کو (باوجود رسوم و سماج کی قید و بند کو توڑ ڈالنے کے) دوسرے سماجی تعلقات میں بند کر دیا۔ اپنے کند اور تنگ ذہن سے ان باتوں کو جو فطرۃً عام اور معمولی تھیں اس طرح خرد برد کر ڈالا کہ وہ قدرتی کیلئے محض اتفاقی اور ناگہانی امور کا مجموعہ ہو کر رہ گئے۔ وہ سادہ اصول جن کو ایک سادہ قانون کی شکل میں ہونا چاہیئے تھا، رسوم کے پیچیدہ جال میں پھنس کر رہ گئے، اس لئے روح کی آزادی آزادی نہ رہی۔ تنقیہ نہ ہو سکا، ذہنی وسعت ختم ہو گئی اور توحید پھر شرک آمیز ہو گئی۔

رہے یہودی تو ان کے یہاں ضرور مجرد وحدانیت کے قانون کو تفکر کی بلندیوں پر لے جایا گیا تھا صرف یہی گروہ ذات وحدہ کا اعتقاد رکھتا تھا اور ان کا توحیدی نظریہ تخیل کی صورت میں تھا، لیکن اس نظریہ کو بھی اس تخصیص سے آزاد ہونا تھا جو یہوواہ (یہودیوں کا خدا) کی پرستش میں سد راہ ہوتی تھی۔ یہوداہ اسی قوم کا نام تھا۔ ابراہیم کا، اسحاق کا، اسرائیل کا۔ گویا اس خدا نے صرف یہودیوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اس تعلقات کی تخصیص کو اسلام نے فنا کر دیا پھر یہ تو یہودی مذہب کی اصلی حالت تھی، لیکن ان میں سے بعض گروہوں نے اسی رنگ میں اپنی توحید کو رنگ لیا تھا۔ جس میں روما کے عیسائیوں نے اپنے نظریہ کو رنگا تھا اور توحید شرک آمیز کے جال سے نہ بچ سکے تھے۔ اسلام نے آکر تخصیص و انحصار کے خرخشوں کو تباہ و برباد کر دیا، روح کا تنقیہ کر کے اسے پاک اوصاف بنا دیا۔ محض مجرد ذات کو توجہ و عبادت کا مرکز قرار دیا اور خالص داخلی عرفان کو حقیقت کا واحد مقصد گردانا۔ یعنی اسی ذاتِ غیر مشروط کو حیات کی شرط قرار دیا۔ روح عالمگیر رہے، تصور اگرچہ محدود ہے، لیکن غیر معین اور سادہ۔ روح کی اس عالمگیری اور تصور کی غیر محدود غیر معین سادگی اور پاکیزگی میں انسان کے لئے کسی اور مقصد کی ضرورت نہیں رہتی سوا اس کے کہ وہ اس عالمگیر سادگی کو حاصل کرے۔ اسلام کا اللہ یہودیوں کے خدا کی طرح ایجابی اور محدود مقصد نہیں رکھتا۔ اسلام کا مقصد اور واحد مقصد محض [illegible] ہے۔ ذات کی تجریدی طور پر پرستش کرنی ہے۔ آدمی کی روح کے لئے صرف یہی ایک کام ہے کہ وہ اسی ذاتِ وحدہٗ کی پرستش میں منہمک ہو جائے اور تمام خارجی موجودات تو اسی ذاتِ واحد کا مطیع بنا ہے۔ یہ ذات وحدہٗ دراصل روح کی خصوصیت رکھتی ہے، لیکن چونکہ انسان کی داخلیت (روح) خارجی اشیا سے ملوث ہوتی رہتی ہے ذاتِ وحدہٗ اس لوث سے منزہ رہتی ہے اس طرح سے داخلیت (روح) ایک طرف کو بالکل آزاد ہونے نہیں پاتی۔ دوسری طرف اس کی

عبادت کا مرکز مادی بھی نہیں ہونے پاتا۔

لیکن اسلام ہندوانہ نہیں نہ راہبانہ طور پر واجب الوجود میں گم ہو جانا یہاں کوئی حقیقت رکھتا ہے۔ یہاں داخلیت (روح) زندہ اور غیر محدود ہے۔ یعنی یہاں روح وہ قوت ہوتی ہے جو دنیاوی زندگی میں محض منفی مقاصد کے ساتھ داخل ہوتی ہے اور دنیوی معاملات میں اپنے کو محض اس طرح سے مشغول کرتی ہے اور ان میں اس طرح مداخلت کرتی ہے جس سے ذات وحدہٗ کی تحریم و تکریم میں ترقی ہو۔ اسلام کا مرکز توجہ تمام تر عقلی ہوتا ہے۔ کوئی بُت یا خدا کی کسی قسم کی شکل و صورت پیش نہیں کی جاتی۔ اسلام کے خصائص میں یہ بات جاری و ساری ہے کہ عالم موجودات میں کوئی چیز مقرر اور مستقل نہیں ہو سکتی۔ ہر چیز کی قسمت میں ہے کہ اپنے کو حرکت دے اور دنیا کی بے انتہا وسعتوں میں پھیل جائے کہ تمام کل سوا اس ذات واحد کے علاوہ سے کسی اور صورت سے ایک نہ کہی جا سکے تمام امتیازات تہس نہس ہو جائیں۔ نسلی، سیاسی، زبانی، ہوٹی قومی تفرقے مٹ جائیں۔ صرف انسان رہ جائے اور وہ بھی محض انسان اور دوسری طرف محض خالص مجرد ذات وحدہٗ لاشریک۔ یہی صبغۃ اللہ ہے، یہی فطرت اللہ ہے۔ اس اسلامی انقلاب کی رو میں بہہ کر انسانی دنیا قرنوں اور صدیوں کی ارتقائی منزلیں سالوں اور مہینوں میں طے کر لیتی ہے۔ عقل کے پاؤں باقاعدہ منطق کی بھول بھلیوں میں رہ جاتے ہیں اور عشق کی مشعل سے عقل کی خرمن پر ایک چنگاری جس سے اصل حقیقت پا لینے کا یہ عمل بجلی کی طرح انسانی ذہن پر چمک جاتا ہے اور اس حقیر بے مایہ ہستی کو جو ہزاروں سال تک حقیقت کو پا لینے کے لئے ٹکٹکی لگائے تکتی رہی پیپل کے درخت کا سایہ ڈھونڈتی رہی، گنگ و جمن کے پانی میں غوطے کھاتی رہی، آگ اور پتھروں کا طواف کرتی رہی، ستاروں کے سامنے سجدے کرتی رہی اور اپنے جیسے انسانوں کو دیوتا سمجھ کر پوجتی رہی اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ حقیقت کو تجریدی شکل میں دیکھ سکے۔

یہ ہے اسلام کا پیام توحید، عمل تفرید، قانون تجرید اور تعلیم تجمید و تحمید۔ یہی الوہیت و ربوبیت کی تقدیس ہے۔ اسی تجرد و تفرد اور احاطہ کل کو آیات مذکورہ میں مختصر طور بیان فرمایا ہے۔ حاصل بیان یہ ہے کہ علاوہ ذاتِ واحد کے کسی کو تخلیقی اور حکمی اختیار ہی نہیں۔ اختیار اور ہمہ گیر مشیت اسی کو حاصل ہے۔ اس کا علمی دائرہ محیط کل ہے۔ آغاز انجام اور ازل ابد کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ جس طرح وہ خلاقِ مطلق ہے اسی طرح حکومت کی کل لگام بھی اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔ شبانہ روز کا دور اور تاریکی و روشنی کا تعاقب و تبادل اسی کے اشارۂ ابرو کا محتاج ہے۔ اس تخلیق تصرف حکم اور مطلق العنان اختیار میں کسی کو دخل نہیں۔ بس ایک انسان رہ جاتا ہے اور ذاتِ مجرد کا ہمہ گیر احاطہ۔ لہٰذا درمیانی علائق روابط اور قیود و بندگی بندشوں کو توڑ کر ہر انسان کو ذاتِ مجرد سے تعلق جوڑنا چاہیئے اور تمام وسائط کو اس طرح استعمال کرنا چاہیے کہ انسان اور خالق کی باہمی گرہ مضبوط ہو جائے الخ۔

تحلیل اجزاء

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ۔ یعنی کسی مخلوق کو تخلیق کا اختیار نہیں نہ پیدائش میں کسی کی مشیت و مرضی کو دخل ہے نہ کسی کو یہ اختیار ہے کہ الوہیت و نبوت کا انتخاب خود کر سکے جس کو چاہے نبی قرار دے نہ لائحہ زندگی اور دستورِ حیات بنانے کا کسی کو اختیار ہے نہ مخلوق کی حکومت مطلقہ کسی کے ہاتھ میں ہے بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے نبی بناتا ہے اور جو مناسب جانتا ہے قانون جاری کرتا ہے۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ الخ۔ اس کی ذات صفات اختیار تخلیق وغیرہ میں کوئی دخیل نہیں، کوئی اس کا ساجھی اور شریک نہیں۔ اہلِ شرک آمیز توحید کے قائل اس کے متعلق جو افترا بندیاں اور بہتان تراشیاں کرتے ہیں۔ ان سے وہ پاک ہے۔

وَرَبُّكَ يَعْلَمُ الخ۔ ان آیات میں ان چند خصوصی اوصاف کا تذکرہ فرمایا ہے۔ جو اللہ کو واحد بے ہمتا اور یگانہ و متفرد ثابت کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا عالم کل ہے مخلوق کی کوئی ظاہر اور پوشیدہ حرکت ایسی نہیں جس سے وہ کامل طور پر واقف نہیں۔ اس سے رد ہو گیا فلاسفہ کے اس مشائیہ گروہ کا جس کا قائد ارسطو تھا اور جو قائل تھا کہ اللہ کو کلیات کا علم تو ہے مگر جزئیات مادیہ کا تفصیلی علم نہیں ہے۔ نیز اس گروہ کے قول کی بھی تردید ہو گئی جو خدا تعالیٰ کے علم بالصور کو حصولی قرار دیتا ہے۔ کیونکہ آیت کا کھلا ہوا مطلب یہی ہے کہ بندوں کے ہر فعل کو خواہ وہ پوشیدہ ہو یا ظاہر اللہ جانتا ہے گویا ہر شے پر اللہ کا علم حضوری ہے۔

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ مجوسیہ دو معبود کہتے ہیں یزدان اور اہرمن۔ اہلِ تثلیث تین (اقانیم) کے قائل ہیں۔ عام مشرک کروڑوں کو معبود و مسجود بناتے ہیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ جب اللہ کو اللہ مان لیا تو اب کوئی دوسرا اِلٰہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اللہ اس ذات کو کہتے ہیں جس میں تمام صفاتِ کمال موجود بالفعل ہوں تو ظاہر ہے کہ ایسی ذات ایک ہی ہو گی کیونکہ اگر دوسری ذات ایسی فرض کی گئی تو جو کمالات اس کو حاصل ہوں گے وہ پہلی ذات کو اگر حاصل نہ ہو سکے تو وہ جامع کمالات نہ ہو گی اور اگر اس کو دوسرے کے تمام کمالات حاصل ہونا فرض کر لیا جائے تو یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ دوسرے کی ذات کا فرض کرنا بتا رہا ہے کہ اس سے استقلال و عزت اور بے ہمتائی فوت ہو گئی اور نقصان آ گیا۔ اس کے علاوہ الوہیت کا یہ میں اگرچہ دونوں شریک ہوں گے مگر الوہیت [illegible] کہ بلاشبہ ہو گی اور کسی کو دوسرے کی الوہیت تخصیصیہ حاصل نہ ہو گی اور یہی نقصان ہے جو کمالِ الوہیت کے منافی ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ جب اللہ ہو اللہ [illegible] جامع صفات کمالیہ مان لیا گیا تو پھر کسی دوسرے کا اِلٰہ ہونا ناممکن ہے۔ اسی لئے آیت [illegible]

هُوَ اللّٰہُ فرمایا پھر غیر کے الٰہ ہونے کی نفی فرمائی۔

لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولٰى وَالْآخِرَةِ ۔ آغاز و انجام اور دنیا و آخرت میں اللہ ہی کو استحقاق حمد حاصل ہے۔ اس کے دو سبب ہیں۔ اول یہ کہ اللہ ازلی ہے، ابدی ہے، سرمدی ہے۔ نہ اس کا آغاز نہ اس کی انتہا۔ اول وہی آخر وہی۔ اس کے علاوہ ہر چیز حادث ہے۔ حادث کی ابتدا بھی ہوتی ہے اور انتہا بھی۔ گویا ہر چیز اپنے آغاز میں باری تعالیٰ کی محتاج ہے اور اللہ مستغنی اور چونکہ اپنے آغاز میں ہر چیز اللہ کی محتاج ہے، اس لئے دوسری چیزوں کا آغاز اس سے وابستہ نہیں ہو سکتا۔ جو خود دوسرے سے مانگ کر اپنا وجود لائی ہو وہ دوسروں کو وجود کیسے عطا کر سکتی ہے لامحالہ اس کو حمد کا استحقاق بھی ہو سکتا ہے اور اللہ واجب الوجود قدیم ازلی ہے اپنی ہستی میں کسی کا محتاج نہیں بلکہ ہر چیز کو موجود کرنا اسی کے دستِ کرم کا ایک چھینٹا ہے۔ لہٰذا وہی استحقاق حمد رکھتا ہے۔ اسی طرح ہر شے فنا پذیر ہے۔ اللہ قدیم ابدی ہے، اس لئے ہر چیز کی ہستی انجام کے اعتبار سے ہیچ ہے اور جو اپنی ہستی میں مستقل نہ ہو وہ دوسری کو زوال سے کس طرح بے نیاز کر سکتا ہے۔ لہٰذا انجام کے اعتبار سے بھی اللہ کے سوا کسی کو استحقاق حمد حاصل نہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ دنیا میں جو کوئی کسی کو کچھ دیتا ہے کچھ نہ کچھ اس سے غرض وابستہ ہوتی ہے۔ رقت جنسیت کو دور کرنا، دل کا سکون حاصل کرنا، فوری عوض کی خواہش، اجر اخروی کا طالب ہونا وغیرہ، لیکن خدا کی عطا ہر غرض سے پاک ہے، اس نے جو کچھ عطا فرمایا وہ اہلِ عالم کے فائدہ کے لئے نہ کہ ذاتی سکون حاصل کرنے یا عوض کے طلب کرنے کے لئے اور جو عطا وابستہ غرض ہو وہ استحقاق حمد نہیں پیدا کرتی۔ بے لاگ بخشش موجبِ حمد ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں جو کوئی کسی کو کچھ دیتا ہے وہ فی الحقیقت کچھ نہیں دیتا بلکہ دینے کی چیز، دینے کا موقعہ، دینے کی توفیق، دینے کی قوتیں، دینے کا ارادہ سب کچھ خداداد ہے گویا دینے والا انسان صرف آلۂ کار ہے اس کی تعریف کرنی مجازی ہے حقیقی حمد کا استحقاق اللہ ہی کو حاصل ہے۔ بظاہر دینے والا انسان نظر آتا ہے حقیقت میں دینے والا پروردگار ہے۔ انسان صرف ذریعہ ہوتا ہے۔ جس طرح کاٹنے والی چیز تلوار نظر آتی ہے لیکن درحقیقت ہاتھ کی قوت اور انسان کا ارادہ کاٹتا ہے۔ چیونٹی خیال کرتی ہے کہ کاغذ پر حروف روشنائی بنا رہی ہے، لیکن ذرا نظر اوپر اٹھاتی ہے تو اس کو قلم سے روشنائی نکلتی نظر آتی ہے، اس لئے وہ قلم کو نقاش و کاتب خیال کرتی ہے، لیکن کچھ غور کرنے کے بعد ہاتھ کی حرکت قلم کی محرک نظر آتی ہے، اس لئے وہ ہاتھ کو کاتب کہتی ہے پھر ہاتھ کی حرکت چونکہ مرکز اعصاب کی حرکت کے تابع ہوتی ہے، اس لئے وہ مزید غور کرنے کے بعد مرکزِ اعصاب کو سببِ حرکت سمجھتی ہے۔ مگر مرکزِ اعصاب کی حرکت انسان کی قوتِ ارادیہ کی خادم ہے، اس لئے حقیقتہً محرک ارادۂ انسانی ہوتا ہے۔ یہاں تک تو معمولی دماغ بھی پہنچ جاتے ہیں، لیکن اہلِ معرفت جانتے ہیں کہ انسانی ارادہ کی کوئی لہر اور کوئی توجہی حرکت بغیر الٰہی ارادہ اور غیبی مخفی توفیق کے ممکن نہیں، اس لئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عالم کی ہر حرکت کا اصل محرک ارادۂ باری تعالیٰ ہے۔ لہٰذا اسی کو ستائش کا استحقاق ہے۔

ایک شبہ دنیا میں خیر بھی ہے اور شر بھی، حسن بھی اور قبیح بھی، اچھائی بھی اور برائی بھی اور یہ ظاہر ہے کہ استحقاق حمد صرف عطائے خیر سے پیدا ہوتا ہے۔ رہا عطائے شر تو وہ موجب ذم ہے۔ پس جب اللہ مستحق حمد ہے تو اس کو مستحق ذم بھی ہونا چاہیے۔ کیونکہ تقریر مذکور سے ثابت ہوتا ہے کہ عالم کی ہر حرکت کا محرک خدا تعالیٰ ہے۔

ازالہ ہم نے اسی تفسیر میں ایک مقام پر لکھ دیا ہے کہ عالم میں حقیقتہً شر موجود ہی نہیں ہے۔ عالم کا ذرہ ذرہ صنعت کے کمال اور صانع کے جواد ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ تخلیق میں کوئی خرابی نہیں (کیونکہ بجائے خود ثابت ہے کہ وجود عدم سے اور نور ظلمت سے بہتر ہوتا ہے) اب عرفاً یا شرعاً جس چیز کو برا یا قبیح کہا جاتا ہے وہ ہمارے فعل یا کسب کی ممنون ہے۔ کسی اچھی چیز کو بے موقع استعمال کرنے کا نام شر ہے ورنہ واقع میں شر کوئی حقیقت نہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ شراب کی تخلیق بری نہیں، شراب بھی انگور ہی سے بنتی ہے انگور میں کوئی خرابی نہیں۔ رہا شراب کا استعمال تو وہ حرام اور مذموم ہے شراب کا استعمال اچھا نہیں اور یہ ذم ہو حرمت شرعی یا عرفی ہے۔ اس سے کمال صنعت میں کوئی عیب پیدا نہیں ہوتا۔ بازار میں فروخت ہونے والے پاکیزہ لذیذ پھل اچھے ہیں، لیکن چوری کر کے یا غصب کر کے ان کو کھانا حرام یا مذموم ہے۔ واقع میں ان کے اندر کوئی خرابی نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ عالم خیر ہی خیر ہے، شر کا وجود صرف اضافی ہے واقعی نہیں، اسی لئے اللہ مستحق حمد ہی ہے مستحق ذم نہیں فسقط به الایراد۔

کائنات کا ذرہ ذرہ ایک خاص نظم و نظام کے ساتھ چل رہا ہے۔ نظم کائنات کا ناظم اس قانون کا مقنن اور اس مشینری کو چلانے والا وہی ہے جو اس کا خلاق و موجد ہے۔ گزشتہ فقرہ سے اللہ کے موجد کل ہونے کو ظاہر کرنا مقصود تھا۔ اس جملے میں بقائے حیات اور استمرار وجود میں ہر شئی کی احتیاج دکھانی غرض ہے اور یہ بیان کرنا ہے کہ اللہ ایسا فاعل نہیں کہ فعل کرنے کے بعد پھر اس کی ضرورت نہ رہے بلکہ وہ موجد و خلاق ہے۔ مخلوق ہونے کے بعد بھی کوئی چیز اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی جس طرح معلول کا وجود

بغیر علت کے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح معلول کی بقا بھی بغیر علت کے نہیں ہو سکتی۔ فلاسفہ اور بعض معتزلہ کا وہ قول غلط ہے کہ طبیعت انواع فاعل اور مادہ قابل ہے اور عمل کی ضرورت ہی نہیں یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ طبیعت غیر شاعرہ کو قوت فاعلیت اور مادۂ لا یعقل کو قوتِ انفعال خدا نے عطا کر دی اور عطا کرنے کے بعد اب اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ نہ نظمِ کائنات میں اس کو کوئی دخل ہے۔ یہ عقیدہ ملحدانہ ہے۔ طبیعت میں فاعلیت اور مادہ میں انفعالیت اس نے پیدا کی، مگر پیدا کرنے کے بعد بھی اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ مادہ کے اندر جو صورت پیدا ہوتی ہے وہ طبیعت نوعیہ کے ذریعہ سے ہوتی ہے، لیکن بحکم الٰہی ہوتی ہے۔ طبیعت خود بے شعور ہے اور شعور کے اندر نظام نہیں چل سکتا۔ یہ سب نظام ایک ہستی کے تابع ہے جو عالم کل ہے۔

وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ سلسلۂ عالم کا جہاں سے آغاز ہوا ہے وہیں پہنچ کر اختتام ہو جائے گا۔ آغاز کا سرا اور انتہا کی آخری کڑی ایک ہی مرکز سے وابستہ ہے یعنی اللہ کی طرف سب کو جانا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ فنا ہونے اور مرنے کے بعد بھی خدا ہی سے واسطہ پڑے گا۔ مفصلۂ بالا تینوں جملوں سے واضح ہو گیا کہ اللہ کے سوا چونکہ ہر چیز مخلوق ہے خواہ ہوشمند یا لا یعقل، بہرحال کسی کو اپنی ہستی، بقائے ہستی اور انجامِ ہستی پر قدرت حاصل نہیں، لیکن کسی چیز کو موجد، قاضی الحاجات، وسیلۂ وجود اور کارساز بننے کی قابلیت بھی حاصل نہیں۔ اگر خدا تعالیٰ نے بعض کے متعلق بعض خدمات کر دی ہیں تو وہ محض آلات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آلات کے سامنے سر بسجود ہونا اور نفع و ضرر وابستہ سمجھنا اور ان سے مرادیں مانگنا اہلِ عقل کا شیوہ نہیں۔ ہوشمند انسان ہتھیار والے سپاہی کو قاتل کہتا ہے نہ کہ ہتھیار کو۔ اگر خوشامد کرنی اور درگزر و عفو کی طلب کرنی ہوتی ہے تو سپاہی سے کرتا ہے نہ کہ تلوار سے۔ اگر ڈرتا ہے سپاہی سے نہ کہ ہتھیار سے۔ ہاں عارضی خوف جو ہتھیار سے دل پر چھا جاتا ہے وہ صرف اس وجہ سے کہیں سپاہی اس ہتھیار کو ہمارے استعمال نہ کرے۔ واقع میں ہتھیار نہ قاتل نہ مختار نہ خوف کی چیز۔ بس یہی حالت کل کائنات کی ہے نہ کسی سے نفع وابستہ ہے نہ ضرر۔ اللہ ہی کارساز اور خلاقِ آلات ہے۔ تمام فرضی معبود بے کار ہیں۔ اگر کوئی درجہ دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ان میں اس کی کوئی صلاحیت ہو تو اتنا کہ ان کو ظاہری اسباب سمجھ لیا جائے اور بس اور ظاہری مسبب ہونا ان کو معبود نہیں بنا دیتا۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ الخ۔ ان تین آیات میں لَهُ الْحُكْمُ کی تفصیل فرمائی ہے۔ اور کیسے واضح طور پر شرک فی الصفات کا ابطال کیا ہے جس میں کسی موقوف کو بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اگر قیامت تک مسلسل رات ہو جائے تو پھر کس میں طاقت ہے کہ دن نکال دے اور اگر مسلسل دن ہو جائے تو رات کون لا سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ شبانہ روز کا دور اور نور و ظلمت کا پھیر اسی کے دستِ قدرت میں ہے اور چونکہ عالم مادیات کی کوئی چیز خدا کی گرفت سے باہر نہیں اور کسی دوسرے کو تصرف کائنات میں کوئی دخل نہیں۔ نور سے اشارہ وجود اور ظلمت سے اشارہ عدم کی طرف بھی ہو سکتا ہے۔ ان دونوں سے حرکت و سکون کی جانب ایما بھی ممکن ہے۔ وجود ہو یا عدم، حرکت ہو یا سکون، سب کچھ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے اور چونکہ عالم وجود و عدم یا حرکت و سکون سے خالی نہیں، اس لئے تصرف و اقتدار سوا خدا کے کسی کو عالم میں حاصل نہیں۔ یہ ہے حقیقت استدلال کی اور مغز بیان کا۔

اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ۔ رات میں صورت نہیں دکھائی دیتی آواز سنائی دیتی ہے، اسی لئے رات کے ساتھ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ کا لفظ مناسب تھا اور دن میں صورت بھی دکھائی دیتی ہے آواز کم سنائی دیتی ہے، اس لئے دن کے ساتھ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کہنا موزوں تھا۔

لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ یعنی رات اس لئے بنائی کہ اس میں سکون دماغی اور جسمانی حاصل کرو۔ نیند سے حواس اور اعضاء کی تکان دور ہوتی ہے اور دن اس لئے بنایا کہ تم روزی تلاش کرو، مگر یاد رکھو کہ ظاہر دینے والے کو حقیقۃً دینے والا نہ سمجھ لینا چاہیئے بلکہ اس کو دینے کا ذریعہ خیال کرنا اور جو کوئی بھی جو کچھ دے درحقیقت اس کو فضلِ خداوندی یقین کرنا اور جب فضلِ الٰہی جان لو تو اللہ ہی کا شکر ادا کرنا، کفرانِ نعمت نہ کرنا کہ عطا فرمائے تو خدا اور دینے والا سمجھو تم فرضی معبود کو یا کسی پیر فقیر کو۔

وَیَوْمَ یُنَادِیْهِمْ الخ۔ اس آیت میں اس اجمال کی تفصیل ہے جس کو وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ میں بیان فرمایا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ معبود جن کو تم بزعم خود حامی، ناصر اور شفیع خیال کرتے ہو قیامت کے دن کچھ کام نہ آئیں گے اور اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور اس وقت اضطراراً خدا کی قدرت قاہرہ اور یکتائی کے قائل ہو جاؤ گے تو پھر اب جبکہ ہوش و حواس موجود ہیں کیوں کر بے کار چیزوں کو خدا کا شریک قرار دیتے ہو۔ چونکہ یہ آیت کفار کے متعلق ہے، اس لئے اہل اسلام کے لئے علماء و اتقیاء کی شفاعت کا اس آیت سے ناممکن ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِیْدًا یعنی اللہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن پیغمبر امت کی شہادت طلب کی جائے گی۔ جب ہر پیغمبر اپنی تبلیغ کی شہادت دے دے گا تو امت

وقت کفار سے سرکشی اور کفر و شرک کی دلیل طلب کی جائے گی، لیکن کافروں کو کوئی جواب بن نہ پڑے گا اور اس وقت ان پر واضح ہوگا کہ حق الوہیت محض اللہ ہی کو ہے اور دنیا میں جو کچھ بہتان تراشیاں کرتے تھے وہ بیکار اور تباہ کن تھیں۔ عذابِ الٰہی سے کوئی بھی نہ بچا سکا۔

مقصودِ بیان

خدا تعالیٰ خلاق مطلق ہے، صاحبِ ارادہ ہے، مالک بااختیار ہے۔ تخلیق ارادہ اور مشیت میں کسی غیر کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کا فیضان اللہ کے انتخاب پر موقوف ہے۔ کسی کی رائے اور پسندیدگی کو اس میں دخل نہیں ہے۔ اللہ تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ چونکہ شرکت فی الالوہیت بھی نقائص میں سے ہے، اس لئے وہ اس سے بھی پاک ہے۔ یہاں سے مہتم بالشان مبحث پر روشنی پڑتی ہے۔ عموماً فلاسفہ قائل ہیں کہ وجود مشترک معنوی ہے اس کے دو فرد ہیں واجب اور ممکن۔ دونوں پر اس کا اطلاق بر سبیل اشتراک معنوی ہوتا ہے، لیکن بطور تشکیک دوسرے صفات مثلاً علم، قدرت، حیات وغیرہ بھی کلی مشکک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فردِ اعلیٰ واجب اور فردِ اسفل ممکن ہے، لیکن جب خدا کو ہر قسم کی شرکت سے پاک مانا جائیگا جیسا کہ قرآن کا اعلان ہے تو پھر نہ کوئی صفت مشترک رہ سکتی ہے نہ مشکک۔ ایسا عقیدہ رکھنا بالکل غلط اور کفر انگیز ہو جائے گا۔ بلکہ تمام صفاتِ کمالیہ کا اطلاق خدا تعالیٰ پر حقیقۃً اور ممکنات پر مجازاً ہوگا اور چونکہ حقیقت و مجاز میں اشتراک معنوی نہیں ہوتا، اس لئے صفاتِ کمالیہ میں اشتراک نہ ہوگا۔ یہ مسئلہ نہایت دقیق ہے جو بہت زیادہ دقتِ نظر کا محتاج ہے اور مقام زیادہ طول کی اجازت نہیں دیتا صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ باری تعالیٰ کی تمام صفات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول حصہ صفاتِ ذاتیہ کا ہے مثلاً وجود حیات وغیرہ۔ دوسرا حصہ صفات فعلیہ غیر ذو الاضافۃ کا ہے جیسے الوہیت، ربوبیت، خالقیت، رازقیت وغیرہ۔ مؤخر الذکر حصہ میں بعض صریح کوئی شریک نہیں ہو سکتا نہ کوئی ادنیٰ درجہ کا رازق، خالق اور الٰہ ہو سکتا ہے نہ اعلیٰ درجہ کا۔ اگرچہ کفار اللہ کو اللہ اکبر اور دوسرے معبودوں کو الٰہ اصغر کہتے ہیں، لیکن قرآن نے ان کے عقیدہ کی تغلیط کر دی اور ذاتِ الٰہیہ کو واحد مطلق الٰہ مطلق اور خالق مطلق قرار دیا۔ اب جب کہ خدا تعالیٰ کی صفات فعلیہ ذو الاضافۃ غیر مشترک قرار پائیں تو یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ ان سے اعلیٰ درجہ کی صفات (یعنی صفات فعلیہ غیر ذو الاضافۃ اور صفاتِ ذاتیہ) بدرجۂ اولیٰ غیر مشترک ہونی چاہئیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ باری تعالیٰ کی تمام صفات ممکنات کی صفات سے متغایر بالذات ہیں۔ اشتراک و تشکیک قطعاً نہیں ہے اور اس باب میں [illegible] کا قول بالکل صحیح ہے جو وحدت وجود بلکہ تمام صفات کی وحدت کا قائل ہے۔ واللہ اعلم وعلمہٗ اتم۔

اللہ عالمِ کل ہے۔ ہر غائب سے اس کے سامنے حاضر ہے۔ اللہ چونکہ اللہ ہے، اس لئے کوئی الٰہ نہیں ہو سکتا کسی کو حقیقی حمد کا استحقاق نہیں۔ مستوجب ستائش صرف خدا ہے۔ آغاز و انجام سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ عالم میں تصرف اسی کا ہے۔ اسی کی حکومت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ملائکہ یا انسان جو متصرف یا حاکم نظر آتے ہیں وہ حقیقت میں متصرف اور حاکم نہیں بلکہ ذرائع اور آلات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عالم میں جو انقلاب و تغیر ہوتا ہے عارف کی نظر میں اس سب کا بانی اور فاعل خدا ہی ہے۔ شبانہ روز کا دورہ اگرچہ سورج کے طلوع و غروب کا منت کش ہے، لیکن فی الحقیقت اذنِ خداوندی اور تاثیر الٰہی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا لتسکنوا کا نقطہ بتا رہا ہے کہ رات آرام کے لئے خدا نے بنائی ہے جسمانی تعب کو دور کرنا اور دماغی کوفت کو زائل کرنا تخلیق شب کی اصل غرض ہے۔ لہٰذا جو لوگ رات کو کام کرتے اور دن کو سوتے ہیں وہ خلافِ فطرت عمل کرتے ہیں۔ اسی طرح دن کاروبار کے لئے بنایا ہے۔ پس جو لوگ بغیر خاص مجبوری کے دن کو آرام کرتے اور دوپہر تک خوابِ غفلت میں سرشار رہتے ہیں وہ ضابطۂ قدرت کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ من فضلہ کے لفظ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ مال و جاہ وبال نہیں، روزی کمانی ممنوع نہیں بلکہ طلب معاش قانونِ فطرت کے موافق ہے، مگر اس کو عطیۂ خداوندی اور فضلِ ربانی سمجھ کر حاصل کرنا لازم ہے۔ ظاہری اسباب حصول معاش کے کچھ بھی ہوں، مگر دینے والا خدا ہی کو سمجھنا چاہیئے۔ لعلکم تشکرون سے ثابت ہوتا ہے کہ شبانہ روز کا وجود اور ان کے منافع کی تخلیق شکرِ الٰہی کو واجب کر رہی ہے۔ وغیرہ۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوأُ

قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا پھر وہ لوگوں پر شرارت کرنے لگا ہم نے اس کو اتنے خزانے دیئے تھے کہ ان کی کنجیاں ایک زور آور جماعت کو

بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ ۝ وَابْتَغِ

جھکا کر جھکا دیتی تھی جب اس سے اس کی قوم نے کہا کہ اترا مت اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا اور

فِيمَآ اٰتٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ

اللہ نے دیا ہے اُس میں دارِ آخرت کا بھی خواہاں ہو اور اپنا دنیوی حصہ بھی نہ بھول اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے تجھ سے بھلائی کی ہے تو بھی (لوگوں سے) بھلائی کر

وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ ۭ

اور ملک میں تباہی کی کوشش نہ کر اللہ تباہی پیدا کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا کہنے لگا یہ تو مجھے ایک علم کے سبب ملا ہے جو میرے پاس ہے

اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ۭ

کیا اس کو معلوم نہ ہوا کہ اللہ نے اس سے پہلے بہت سی قوموں کو ہلاک کر دیا جو قوت میں اس سے سخت اور جمعیت میں اس سے بہت زیادہ تھیں

وَلَا يُسْـَٔــلُ عَنْ ذُنُوْبِهِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝ فَخَرَجَ عَلٰي قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ

اور مجرموں سے ان کے گناہوں کا عذر بھی نہ پوچھا جائے گا (ایک روز) قارون بن سنور کر اپنی قوم کے سامنے نکلا جو لوگ دنیوی زندگی کے طالب تھے کہنے لگے

الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ

کاش ہم کو بھی ایسا ہی ملتا جیسا قارون کو دیا گیا ہے یہ بڑا نصیبہ ور ہے اور جن کو علم دیا گیا تھا وہ بولے حیف ہے تم پر

ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝ فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ

اللہ کا ثواب ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور یہ بات انھیں کے دلوں میں ڈالی جاتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں پھر ہم نے قارون کو

الْاَرْضَ ۣ فَمَا كَانَ لَهٗ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۤ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ ۝ وَاَصْبَحَ

اور اسکے گھر کو زمین میں دھنسا دیا اس وقت اللہ کے سوا کوئی جماعت ہوئی کہ اس کی مدد کرتی اور نہ وہ خود بچ سکا اور کل جو

الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَاَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ ۚ

لوگ اس جیسے ہونے کی تمنا کرتے تھے صبح کو کہنے لگے کہ اے خرابی یہ تو اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور تنگ کرتا ہے

لَوْلَآ اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا ۭ وَيْكَاَنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ع تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا

اگر اللہ ہم پر احسان نہ فرماتا تو ضرور ہم کو بھی دھنسا دیتا اے عجب کافر کامیاب نہیں ہوتے وہ دارِ آخرت ہم اُن لوگوں کو دیں گے جو

لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ مَنْ جَاۗءَ بِالْحَسَنَةِ

ملک میں عزور کرنا اور فساد پھیلانا نہیں چاہتے اور انجام بخیر پرہیزگاروں کا ہی ہے جو شخص نیکی لے کر آئے گا

فَلَهُ خَيْرٌ مِّنْهَا ۖ وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ إِلَّا مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

اُس کو اس سے بہتر ملے گا اور جو بدی لے کر آئے گا تو بدکاروں کو صرف اُن اعمال کی سزا ملے گی جو وہ کیا کرتے تھے

تفسیر انسان چھوٹے حوصلے اور بڑے دعوے والا انسان کبھی خیال کرنے لگتا ہے۔ اگر شریعت کی پابندی کی گئی تو آمد کے تمام ذرائع بند ہو جائیں گے۔ حرام و حلال کی تفصیل تحصیل مال سے روک دے گی۔ پھر صدقات و زکوٰۃ اور امداد کا قانون رہے سہے سرمایہ کو بھی تباہ کر دے گا اور میں تہیدست کنگال ہو کر رہ جاؤں گا۔ رہا اجر آخرت تو وہ کس نے دیکھا ہے۔ نقد چھوڑ کر ادھار کی امید پر جینا وہم ہے۔ جب ایسے خام خیال رکھنے والے انسان سے کہا جاتا ہے کہ بھائی ذرا غور تو کرو کہ یہ مال کہاں سے آیا۔ کیا یہ تمام دولت خداداد نہیں ہے کیا تم ساتھ لے کر دنیا میں آئے تھے۔ اگر خداداد ہے تو حکم خدا کے موافق اس کو خرچ بھی کرو، بندگانِ خدا کو بھی اس میں سے دو تو وہ نہایت سرکشی و غرور سے کہنے لگتا ہے تم بے وقوف ہو اتنا نہیں سمجھتے کہ اگر یونہی خداداد دولت ہوتی تو دوسروں کے پاس بھی ہوتی۔ فی الحقیقت یہ میری کمائی ہوئی ہے۔ میری قوتِ بازو اور دماغی کاوش کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنے علم و ہنر اور پیہم محنت سے اس کو حاصل کیا ہے دوسروں کا اس میں کیا حق ہے۔ میں کیوں کسی کو کچھ دوں۔ یہ ننگے بھوکے لوگ زکوٰۃ و صدقات کے بہانے سے میری دولت کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ غرض کوتاہ بصیرت والے آدمی کے نزدیک جاہ و حشم اور خیل و خدم اور شان و شوکت اور نام و نمود ہی سرمایۂ صد افتخار ہوتا ہے۔ وہ کسی طرح ایسا تصور بھی دماغ میں نہیں آنے دیتا کہ یہ زوال پذیر ہے ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں۔ یہ نفس کا بندہ اور پندار نفس کا پرستار مساوات و ہمدردی کو کیا جانے۔ جو لوگ ظاہر پرست اور نمائش پر مرنے والے ہوتے ہیں وہ ایسے مغرور کی دولت دیکھ کر منہ میں پانی بھر لاتے ہیں۔ دل سے تمنا کرتے ہیں کہ کاش ہمارے پاس بھی اس کی طرح مال ہوتا تو ہم بھی ایسے ہی مزے اڑاتے جیسے یہ اڑاتا ہے۔ لیکن جن کی نگاہیں دور رس ہیں جو زمانہ کے ادل بدل اور الٹ پھیر سے واقف ہیں وہ بے کار زر دھن کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ شخص اللہ کی آزمائش میں مبتلا ہے۔ اس کا مال وبال اور جی کا جنجال ہے انشاء اللہ زوال ہے۔ درحقیقت ثوابِ آخرت اور اجرِ الٰہی لازوال نعمت ہے اس کے مقابلہ میں اس کی کوئی ہستی نہیں۔ اہلِ دنیا کی طبقاتی کشمکش یونہی جاری رہتی ہے تاآں کہ آزمائش کا زمانہ ختم ہو چکتا ہے۔ غیبی اسباب قلی کو ہنری فورڈ بناتے ہیں وہی اسباب پھر سرِ پُر غرور کو خاک پر لے آتے ہیں۔ آن کی آن میں سرمایہ برباد اور جاہ و جلال تباہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت آن تمنا کرنے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ پر بھروسہ کر کے اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کا اسی طرح نتیجۂ بد ہوتا ہے جو لوگ دولت کو دیکھ کر پہلے رکھنے لگتے ہیں عافیت کی قدر اس وقت ان کو آتی ہے اور وہ سجدۂ شکر ادا کرتے ہیں کہ اچھا ہوا اس ملعون کی طرح ہم سرمایہ دار نہ تھے ورنہ آخرت تباہ ہو جاتی اور دنیا میں یونہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بعد حسرت و یاس جان دینی ہوتی۔ ایسے پُر غرور پُر نخوت سرمایہ دار ہر زمانے میں ہوتے ہیں اور ان کا انجام انتہائی حسرت آفریں اور عبرت انگیز ہوتا ہے۔ اسی گروہ میں سے ایک قارون بھی تھا جس کا ذکر ان آیات میں مفصل کیا گیا ہے۔

تحلیلِ اجزاء إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ۔ ابن عباس، ابراہیم نخعی، سماک بن حرب، عبداللہ بن حارث بن نوفل، قتادہ، مالک بن دینار اور ابن جریر وغیرہ کے قول کے موافق قارون حضرت موسیٰ کے چچا کا لڑکا تھا کیونکہ قاہث کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام یصہار اور دوسرے کا نام عمران تھا عمران موسیٰ کا باپ اور یصہار قارون کا باپ تھا، لیکن توریت کے سفر عدد کے سولہویں باب میں قارون (قارح) کو اظہار بن قہات بن لاوی کا بیٹا قرار دیا ہے۔ قرآن پاک سے قارون کا مالدار ہونا معلوم ہوتا ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ مغرور و خود پسند، خود غلط اور مفسد تھا۔ وہ کس قسم کی فساد انگیزی کرنا چاہتا تھا؟ اس کا تذکرہ نہیں ہے۔ ہاں توریت میں کسی قدر تفصیل سے مذکور ہے، لیکن وہ عبرت انگیزی، نصیحت آفرینی، موعظت خیزی جو قرآنی طرز ادا میں ہے۔ توریت کے بیان میں مفقود ہے۔ ہم توریت کی عبارت نقل کرتے ہیں جس سے وجہ فساد اور حالت تباہی پر مفصل واضح روشنی پڑتی ہے۔ مختصر جملے یہ ہیں :-

اور قارح (قارون) بن اظہار بن قہات بن لاوی نے کچھ لوگوں کو ساتھ لیا الخ۔ ڈھائی سو شخص جو سرگروہ نامی اور جماعت کے مشہور تھے موسیٰ سے مقابلہ کے لئے اٹھے اور موسیٰ و ہارون کی مخالفت پر جمع ہوئے اور ان سے کہا تم کیوں آپ کو خداوند کی جماعت سے بڑا جانتے ہو۔ موسیٰ نے پھر قارح سے کہا اے اولادِ لاوی سن رکھو اب تم کہانت (امامت و خلافت) کو بھی چاہتے ہو سو تو اور تیرے گروہ والے خداوند کی مخالفت پر اکٹھے ہو گئے اور ہارون کون ہے کہ تم اس کی شکایت کرتے ہو۔

(قارون چاہتا تھا کہ موسیٰ اور ہارون کے خلاف لوگوں کو اکسا کر خود سردار بن جائے خصوصاً کہانت کے عہدہ کا اس کو بڑا رشک تھا کہ اس عہدہ پر موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون کو کیوں مقرر کر دیا ہے)

تب موسیٰ کا غصہ بھڑکا اور خداوند سے عرض کیا ان کے ہدیہ کی طرف سے میں نے ان سے ایک گدھا بھی نہیں لیا نہ ان میں سے کسی کو دکھ دیا پھر موسیٰ نے قارح سے کہا تو اور تیرا سارا گروہ اور ہارون کل خداوند کے حضور میں پہنچیں اور ہر ایک شخص اپنا اپنا عود سوز لے کر اس میں بخور (ادیان وغیرہ خوشبو کی چیز جس کو جلایا جاتا ہے) ڈالے۔ تو ہر ایک آدمی نے اپنا اپنا عود سوز لیا اور اس میں آگ بھری اور اس پر بخور ڈالا اور جماعت کے خیمہ کے دروازہ پر موسیٰ اور ہارون آکر کھڑے ہوئے اور قارح نے اس سارے گروہ کو ان کی مخالفت پر جماعت کے خیمہ کے دروازہ پر جمع کیا تب خداوند کا جلال اس سارے گروہ کے سامنے ظاہر ہوا اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون کو خطاب کر کے فرمایا۔ تم آپ کو اس گروہ میں سے جدا کر دو تاکہ میں انہیں پل میں ہلاک کر دوں۔ تب موسیٰ نے کہا میری صداقت کا یہ ثبوت ہے کہ اگر یہ آدمی اس موت سے مریں جس موت سے سب مرتے ہیں یا ان پر کوئی حادثہ آئے جو سب پر آتا ہے تو میں خدا کا رسول نہیں، لیکن اگر خداوند کوئی نئی بات پیدا کر دے اور زمین اپنا منہ پھیلا دے اور ان کو اس سمیت جو ان کا ہے نگل جائے اور جیتے جی گور میں چلے جائیں تو تم جان لینا کہ ان لوگوں نے خداوند کی اہانت کی، اور یوں ہوا کہ جوں ہی موسیٰ یہ سب باتیں کہہ چکا تو زمین جو ان کے نیچے تھی پھٹی اور زمین نے اپنا منہ کھولا اور انہیں اور ان کے گھروں اور ان سب آدمیوں کو جو قارح کے تھے اور ان کے سب مال کو نگل گئی اور سب جو ان کے ساتھ تھے جیتے جی گور میں گئے اور زمین نے انہیں چھپا لیا اور جماعت کے درمیان سے فنا ہو گئے اور سارے بنی اسرائیل جو ان کے پاس تھے ان کا چلانا سن کے بھاگے۔ انہوں نے کہا ایسا نہ ہو کہ زمین ہم کو بھی نگل جائے۔ انتہیٰ۔

مذکورہ بالا توریت کے سفر عدد کی صراحت ہے جس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں اول یہ کہ قارون کو حضرت ہارون کے عہدۂ کہانت پر رشک تھا۔ وہ خود امامت کا خواستگار تھا۔ دوسرے یہ کہ قارون اور اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ موسیٰ نے از خود بغیر حکم خداوندی کے ہارون کو کہانت دے دی ہے، لیکن قرآن نے وجہ فساد کی کوئی صراحت نہیں فرمائی۔ زمین میں قارون کا مع مکان کے دھنسنا قرآن میں بھی مذکور ہے، مگر اس کے ساتھ والوں کا زندہ زمین سما جانا مذکور نہیں۔ ممکن ہے قصہ کو مختصر کرنے کے لئے صرف قارون کے ذکر پر اکتفا کی گئی ہو۔ رہا قارون کا کیمیا گر ہونا اور علم سے علم کیمیا مراد لینا یہ صرف افسانہ ہے، تحقیق سے اس کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔

فَبَغٰى عَلَيْهِمْ لیعنی قارون نے بنی اسرائیل کے خلاف شرارت کی۔ سب سے بڑھ گیا تو سب کو اپنے زیر اثر کرنا چاہا۔ گویا حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کا مقابلہ کرنے لگا۔ مفسرین نے وجہ تنازع حکم زکوٰۃ کو قرار دیا ہے۔ یعنی حضرت موسیٰ نے قارون کو زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا تو اس نے موسیٰ کو ذلیل کرنے پر کمر باندھی۔ ایک فاحشہ عورت کو کچھ مال دے کر آمادہ کیا کہ وہ علی الاعلان موسیٰ پر زنا کرنے کی تہمت لگائے، لیکن بحکم الٰہی وبہ ہیبت موسیٰ عورت نے بھرے جلسے میں قارون کے اغوا کرنے اور موسیٰ کے پاک دامن ہونے کا اظہار کر دیا۔ حضرت موسیٰ کو غصہ آیا۔ آپ نے بددعا کی اور قارون زمین میں دھنس گیا۔ ممکن ہے یہ واقعہ صحیح ہو، لیکن احادیث مقدسہ اور آیاتِ قرآنیہ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ ابن کثیر اور خطیب وغیرہ اہل تفسیر نے کچھ تابعین کے حوالے سے اس داستان کو بہت طوالت کے ساتھ نقل کیا ہے ہم اس کو لا اصل سمجھتے ہیں، اس لئے بغاوت کرنے کا صحیح مطلب وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔ یہ مطلب توریت کی صراحت کے بھی مطابق ہے۔

وَاٰتَيْنٰهُ مِنَ الْكُنُوْزِ الخ۔ مفاتح مفتح (بفتح میم کی جمع ہے۔ مفتح خزانہ کو کہتے ہیں۔ قارون کے پاس اتنا خزانہ تھا جس کو اٹھانے کے لئے ایک گروہ کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس قول کو نیشاپوری نے پسند کیا ہے۔ ابن عباس اور حسن بصری کے نزدیک مفاتح مفتح کی جمع (بکسر میم) کنجی کو کہتے ہیں۔ چونکہ پرانے زمانے میں ایسے نازک قفل اور چھوٹی چھوٹی باریک کنجیاں نہ ہوتی تھیں بلکہ مضبوط قسم کے بھدے قفل اور بڑی بڑی کنجیوں کا رواج تھا اور قارون کے پاس ہر جنس کے الگ الگ صندوق ہوں گے جن کی مجموعی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی ہوگی، اس لئے ان کی کنجیوں کو اٹھانے کے لئے چند آدمیوں یا چند خچروں کی ضرورت پڑتی ہوگی۔ دس بیس من لوہے کی کنجیاں اس زمانے میں ہونی ممکن تھیں۔ اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ قارون کثرتِ مال ومنال اور عزت ظاہرہ پر مغرور ہو گیا تھا اور سب سے زیادہ مالدار ہونے کو ہی سب سے معزز ہونے کی علامت سمجھنے لگا تھا۔ یہاں تک کہ موسیٰ کی نبوت اور ہارون کی کہانت سے بھی انکار کرنے لگا تھا۔ اسی کی تائید کرتی ہے دوسری روایت جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس نے موسیٰ سے مناظرہ کیا اور کہنے لگا اللہ نے مجھے تم پر فضیلت عطا کی ہے، اگر میرا مرتبہ تم سے زیادہ نہ ہوتا تو سب سے زیادہ مال دار مجھے کیوں بنایا جاتا۔ اگر آپ چاہیں تو مجھ سے مقابلہ کر لیجئے میں آپ کے لئے بددعا کروں آپ میرے لئے بددعا کریں۔ موسیٰ نے دعوت قبول کر لی۔ قارون اور اس کے ساتھیوں نے مروجہ دستور کے مطابق قربانی پیش کر کے اور بخور جلانے کے بعد بددعا کی، لیکن موسیٰ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ جب حضرت موسیٰ نے بددعا کی تو قارون اور اس کے ساتھیوں کو مکان سمیت زمین نگل گئی۔ یہ روایت توریت کی مذکورہ بالا صراحت کے موافق ہے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے جب قارون کو بہت زیادہ غلط مغرور پندار میں دیکھا تو نصیحت کی [illegible] اتنا اترانا اچھا نہیں [illegible] نہ زیادہ ترانا خدا کو پسند نہیں۔ مطلب

آخرت مسلمان کا مقصد ہونا چاہیئے ۔ خداداد مال کو سعادتِ آخرت حاصل کرنے کے لئے صرف کرو ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب کچھ دے کر مفلس کنگال بن جاؤ بلکہ خود بھی کھاؤ۔

وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا۔ دنیا میں جو نعمتیں تمہارے لئے مباح ہیں ان کو حاصل کرنے کا تم کو حق ہے تم اپنے روپے سے اپنا حق حاصل کر سکتے ہو (حدیث پاک میں آیا ہے تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیرے اہل و عیال کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیرے مہمان کا بھی تجھ پر حق ہے ۔ پس ہر حقدار کو اس کا حق پہنچاؤ)

وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ یعنی جس طرح نے خدا نے تم پر احسان کیا ہے تم بھی مخلوقِ خدا کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور اپنی دولت میں سے ان کو بھی دو ۔ حضرت علی کا ارشاد ہے کہ آدمی کو چاہیئے اپنی صحت، قوت اور تونگری کو غفلت میں نہ ڈالے بلکہ ان میں سے ہر ایک نعمت کے ذریعہ دارِ آخرت کی تلاش کرے ۔ ایک حدیث میں وارد ہے حضور والا نے فرمایا بندے کو چاہیئے کہ اپنی ذات سے آخرت کے لئے سامان کرے ۔ دنیا سے آخرت کے واسطے کمائے، بڑھاپے سے پہلے جوانی میں سامان کرے اور موت سے پہلے زندگی میں تیاری کر لے ۔ پس قسم ہے اس خدا کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے موت کے بعد جنت یا جہنم کے علاوہ کوئی اور ٹھکانا نہیں ہے ۔

ہم نے احسان کی تفسیر عطا وجود سے کی ہے ۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ عمومی مراد ہو یعنی صحت قوت جوانی عزت دولت اور ہر نعمت خدا نے عطا فرمائی ہے اور یہ احسان خدا کا ہے لہٰذا ان چیزوں کو خلقِ خدا کے کام میں لاؤ ۔ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ کہنے سے اسی طرف اشارہ ہے کہ یہ چیزیں تم خود کہیں سے نہیں لائے بلکہ خدا داد ہیں اور جب خدا داد ہیں تو بندگانِ خدا کی امداد میں صرف کرنا ان کو لازم ہے ۔

وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ الخ۔ فساد سے عمومی فساد مراد ہے ۔ شرک انکارِ نبوت نخوت و غرور، زکوٰۃ کی بندش اہلِ ضرورت کی امداد نہ کرنی سب ہی فساد کی شاخیں ہیں ۔ لیکن شاید فساد سے سیادت بنی اسرائیل کی خصوصاً مراد ہو جیسا کہ توریت کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے ۔

قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي الخ۔ اس فقرہ کا بیان چند طرز سے بیان کیا گیا ہے ۔ قتادہ اور سدی نے علم کا ترجمہ خیر کیا ہے یعنی یہ مال جو مجھ کو ملا ہے اس کی وجہ میری قابلیت اور ذاتی خوبی ہے میں اس کے لائق تھا ۔ میرے اندر ایسی خوبیاں تھیں کہ جن کی وجہ سے یہ مال ملا ہے ۔

عبد الرحمٰن بن زید نے اس طرح بیان کیا ہے کہ اگر اللہ مجھ سے راضی نہ ہوتا اور میرے اندر فضیلت نہ پاتا تو مجھے نہ دیتا ۔ بعض علماء نے اس طرح تفسیر کی ہے کہ مجھے جو کچھ عطا کیا گیا ہے وہ میرے استحقاق کو جان کر عطا کیا گیا ہے ۔

میرے نزدیک زیادہ واضح اور مناسب سیاق مطلب یہ ہے کہ کفار عمل نے کہا مجھے جو کچھ ملا ہے میرے علم و ہنر کے سبب ملا ہے ۔ میں کمائی سے واقف، تجارت میں ماہر اور ذی علم تجربہ کار ہوں ۔ بات یہ تھی کہ فرعون کے زمانہ میں قارون سرکاری ملازم تھا اپنی قوم کی غداری کر کے حکومتِ وقت کا منظورِ نظر بن گیا تھا ۔ قبطی گورنمنٹ اس کی قدر کرتی تھی، اس لئے بنی اسرائیل کو لوٹ کر اپنا خزانہ بھرنے کے مواقع بکثرت اس کو ملے تھے ۔ پھر دوسری دور میں بھی وہ با عزت سمجھا جاتا تھا ۔ تجارت کرتا تھا اور کامیاب تاجر تھا ۔ اور اسی طرح غریبوں کا خون چوس کر سرمایہ دار بن گیا تھا ۔ بعض لوگوں نے علم سے مراد علم کیمیا لے لیا ہے ۔ لیکن اس کی وقعت افسانہ سے زیادہ نہیں ہے ۔ محقق حکیم ابن خلدون شیخ التفسیر ابن کثیر اور دیگر علماء نے (باستثنار قوتِ اعجاز و کرامت) کیمیا کا ناممکن ہونا بیان کیا ہے ۔ غرض قارون اپنی دولت مندی و سرمایہ داری کو ذاتی محاسن کا نتیجہ استحقاق کا اقتضا اور رضائے الٰہی کا مظاہرہ سمجھتا تھا ۔ اس کے اس خیال کو باطل کرنے کے لئے خود تعالیٰ نے فرمایا :-

أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِن قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ الخ۔ یعنی اگر سرمایہ داری ذاتی کمال اور علمی استحقاق کا نتیجہ ہوتی تو پھر گزشتہ اقوام کیوں برباد ہوتیں کیا ان کے پاس ہر قسم کی قوت و طاقت یا جتھے اور جماعت کی کچھ کمی تھی اور کثرتِ مال رضائے الٰہی کی علامت ہوتی تو پہلی قوموں کو کیوں تباہ کیا جاتا وہ تو بہت زیادہ مالدار تھیں

وَلَا يُسْأَلُ عَن ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ اس آیت کا تفسیری مطلب علماء نے مختلف طور پر بیان کیا ہے ۔ مجاہد نے فرمایا ملائکہ کو مجرمین کے پوچھنے، پتہ لگانے اور علامت شناخت کرنے کی ضرورت نہ ہوگی ۔ کالے منہ اور نیلی آنکھیں ان کا مجرم ہونا ظاہر کریں گی ۔ قتادہ نے فرمایا کفار بلا حساب جہنم میں جائیں گے ان کے گناہوں کی کثرت اس حد تک پہنچ گئی ہوگی کہ باز پرس کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوگی ۔ میرے نزدیک دونوں مطلب کسی قدر کمزور ہیں اوّل اس لئے کہ فرشتوں کو تو کسی کے دریافت کرنے اور پتہ لگانے کی ضرورت نہ دنیا میں ہے نہ آخرت میں ہوگی نہ ان کو شناخت کرنے کے لئے کسی خاص علامت کی احتیاج ہے ۔ اللہ نے خود ان کو وہ علم یقینی عطا فرما دیا ہے کہ وہ کسی علامت اور سوال کے محتاج ہی نہیں ہیں پھر کفار کی کیا تخصیص ہے ۔ دوسرا مطلب اس لئے ضعیف ہے کہ قرآن پاک میں صاف صراحت کر دی گئی ہے کہ فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ اس آیت میں واضح طور پر ثابت ہو رہا ہے کہ باز پرس اور سوال سب سے ہوگا کوئی مستثنیٰ نہ ہوگا ۔ لہٰذا صحیح مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن مجرموں سے ان کے گناہوں کے اسباب و وجوہ دریافت نہ کئے جائیں گے ۔ گناہوں کی تفصیل تو ضرور دریافت کی جائے گی، لیکن کفر و شرک کے بعد وجوہ معاصی دریافت نہ کئے جائیں گے ۔

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ۔ جب موسیٰ سے مناظرہ اور مباہلہ کرنے کے لئے قارون گھر سے نکل کر اس خیمہ کی طرف چلا جہاں شفق علیہ طور پر بددعا کرنا قرار پایا تھا تو انتہائی شان و شوکت، آرائش، زیبائش اور مکمل جلوس کے ساتھ نکلا۔ ہر قوم میں کچھ لوگ کوتاہ نظر اور پست حوصلہ ہوتے ہیں۔ بنی اسرائیل میں بھی بعض لوگ ایسے موجود تھے جن کی نظریں دنیاوی اسباب آرائش کی ٹیپ ٹاپ کو دیکھ کر خیرہ ہو سکتی تھیں۔ جب انہوں نے قارون کا یہ تجمل امیرانہ اور ترک شاہانہ دیکھا تو ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کہنے لگے۔ یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ قَارُوْنُ الخ۔ قارون بڑا خوش نصیب اور بخت آور ہے۔ کاش ہمارے پاس بھی یہ مال و منال اور جاہ و جلال ہوتا، لیکن ہر قوم میں کچھ بالغ نظر رکھنے والے بھی ہیں۔ ان کی نگاہ حال سے ہٹ کر استقبال کی طرف اٹھتی ہے۔ وہ انجام بین ہوتے اور آخری نتیجہ ہی ان کے نزدیک قابلِ اعتبار ہوتا ہے ایسے لوگوں کی بنی اسرائیل میں بھی کمی نہ تھی۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الخ۔ کہنے لگے ارے کمبختو! یہ جاہ و حشم بے مقدار ہے، قابلِ بھروسہ وہ اجر اخروی ہے جو ایماندار اور نیکو کاروں کو آخرت میں خدا کی طرف سے ملے گا۔ خوب یاد رکھو کہ پرستارانِ نفس اور بندگانِ خواہش کو اجر اخروی حاصل نہ ہوگا۔ اس کے حصول کے لئے ناجائز خواہشات کو روکنا اور حرام مال سے نظر کو بلند رکھنا لازم ہے۔ اگر تم اجر آخرت چاہتے ہو تو قارون کی دولت و شان کو دیکھ کر لالچ نہ کرو۔

وَلَا یُلَقّٰهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ۔ سدی نے جنت کی طرف ضمیر راجع کی ہے اور اس فقرہ کا مطلب یوں بیان کیا ہے کہ جنت کو صرف وہی لوگ پا سکتے ہیں جو اس فریب دھوکہ باز ٹیپ ٹاپ سے اپنے نفس کو روکے رکھتے ہیں۔ ابن جریر نے نصیحت کی طرف ضمیر راجع کر کے یہ مطلب لکھا ہے کہ اس نصیحت کا انہی لوگوں پر اثر ہوتا ہے جو صابر ہوتے ہیں۔ مآل دونوں تفسیروں کا ایک ہی ہے۔ صابرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو نظر فریب اور جاذب نفس ناجائز زینت سے اپنے نفس کو روکے رہتے ہیں۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ الخ۔ بعض آثار میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے حکم میں اس وقت زمین کو دے دیا گیا تھا۔ آپ نے زمین کو حکم دیا اس کو نگل جا زمین نے اس کو نگل لیا۔ کچھ شیطان کہنے لگے موسیٰ نے قارون کو اس لئے ہلاک کیا کہ اس کے مال پر قبضہ خود کر لیں۔ حضرت موسیٰ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ نے زمین کو دوبارہ حکم دیا قارون کے اس مکان کو جس میں اس کی تمام دولت کے انبار تھے نگل لے۔ چنانچہ مکان پورے مال سمیت تہ زمین ہو گیا اور لوگوں کو شبہ کا موقع بھی نہ رہا۔ آیت میں اس کی کچھ تفصیل نہیں۔ توریت کی مذکورۂ بالا اصراحت میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ آیت مذکورہ سے صرف قارون کا زمین میں دھنسنا ثابت ہوتا ہے، لیکن توریت کا بیان اس کی جماعت کی تباہی کو بھی ظاہر کر رہا ہے۔ ممکن ہے اس کی پوری جماعت بھی دھنسا دی گئی ہو۔

وَاَصْبَحَ الَّذِیْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهٗ بِالْاَمْسِ یعنی کل جن لوگوں نے قارون کی طرح ہو جانے کی تمنا کی تھی ان کو اپنے خیال پر قارون کی ہلاکت کے بعد ندامت ہوئی۔ اس وقت وہ کہنے لگے کہ واقعی رزق کی تنگی فراخی اللہ کے دستِ قدرت میں ہے۔ اللہ کا بڑا کرم ہوا کہ ہماری حالت قارون کی طرح نہ ہوئی۔ اگر اس کی مہربانی نہ ہوتی اور قارون کی طرح ہم بھی دولت مند ہو کر مغرور ہو جاتے تو جو سزا اس کو ملی وہ ہم کو بھی ملتی۔ بات یہ ہے کہ انسان عقلی ایمان سے شہودی ایمان کی طرف ترقی کرتا ہے۔ بنی اسرائیل کو اگرچہ پہلے سے فضیلت ایمان حاصل تھی مگر ان کا ایمان اتنا پختہ نہ تھا جتنا قارون کو دھنستے دیکھنے کے بعد ہوا۔ اسی لئے بعض کم علم ضعیف الایمان لوگوں نے قارون کی شان و شوکت اور حشمت و دولت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔ علو سے مراد ہے جبر و ظلم (عکرمہ) یا سرکشی میں حد سے تجاوز کرنا (سعید بن جبیر) یا ناحق تکبر (مسلم البطین و ابن جریج) اور فساد سے مراد (مسلم البطین کے نزدیک) ناحق مال لینا (اور ابن جریج کے نزدیک گناہ کرنا ہے۔

ابن جریر نے حضرت علیؓ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ اگر آدمی کے دل میں خواہش پیدا ہو کہ اس کی جوتی کا تسمہ دوسرے آدمی کی جوتی کے تسمے سے بہتر ہو تو وہ اسی حکم (تکبر) میں داخل ہو جائے گا۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ کی مراد یہ ہے کہ جو شخص بطور تفاخر اپنی جوتی کی برتری اور خوبصورتی کا خواستگار ہو وہ متکبر ہے اور اگر کوئی شخص دوسرے کے مقابلے کے بغیر فی نفسہٖ خوبصورتی کو پسند کرتا ہے تو وہ متکبر نہیں ہے۔ کیونکہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے خدمتِ گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے کہ میری چادر خوبصورت ہو۔ کیا یہ بھی تکبر ہے؟ ارشاد فرمایا نہیں، بلکہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو پسند فرماتا ہے۔

بات یہ ہے جب آدمی کی روحانی قوت کمزور اور ملکی طاقت مغلوب ہو جاتی ہے اور مادی قوتیں اپنا تسلط کر لیتی ہیں تو انسان شہوانی اور غضبی قوتوں کے افراط کا شکار ہو جاتا ہے۔ شہوانی قوت کے افراط کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر شخص سے اپنے کو بڑھا چڑھا کر رکھنا چاہتا ہے۔ حسن و دولت، صحت، قوت، عزت، شہرت، حکومت اور ہمہ دانی میں اپنا نظیر کسی کو نہیں سمجھتا اور اگر بادل ناخواستہ کسی کو اپنے سے برتر پاتا ہے یا پاتا بھی ہے تو تمنا اور خواہش ہر وقت اسی بات کی رکھتا ہے کہ میں ہر چیز میں ہر شخص

پر تیجہ جاؤں۔ یہی ارادہ علو ہے اور اگر قوت غضبی کا افراط ہو تو عمومی جبر ہر گروہ پر تسلط، قہر، ظلم، سفاکی، خونریزی یا سیاسی ظلم کی بربادی، آبادیوں کی ویرانی اور اسی قسم کی دیگر حرکات اس سے سرزد ہوتی ہیں جس سے ملک میں تباہی، امن عالم میں خرابی اور سکون عالم میں بے چینی پیدا ہو جاتی ہے اسی کو ارادۂ فساد کہا گیا ہے اور مذکورہ بالا دونوں قوتوں کے افراط سے بچنے والوں کو متقی کہا گیا ہے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ اخروی بہبودی اور ابدی نجات و سعادت انہیں لوگوں کو حاصل ہوگی جنہوں نے مادی قوتوں کو عقل کے تابع بنا لیا ہو اور شہوت و غضب کے افراط سے اجتناب کر رہے ہوں۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا الخ۔ اوپر کی آیت میں مابعت کی طرح کا ایک عام ضابطہ بیان فرمایا تھا کہ جو کی قوت خیر قوت شر پر غالب ہوگی وہ آخرت میں فلاح یاب ہوں گے اور جن کی قوت شر قوت خیر پر غالب ہوگی (یعنی وہ لوگ جو دنیا میں کبر لعا فرا اور ملک میں تباہی پھیلا کر فساد کرتے رہے) ان کی عاقبت برباد ہوگی۔ [illegible] اور صورت نار کا اظہار فرمایا ہے۔ قاعدہ تو یہ ہونا چاہیے جو نیکی کرے اس کو بدی کے مناسب ہر اول اجر دیا جائے لیکن رأفت رحمانی کا تقاضا اس سے کچھ بھی زیادہ ہو گیا ہے ارشاد ہوتا ہے جو نیکی کرے گا اس کو اس کے عمل سے بہتر جزا ملے گی اور جو بدی کرے گا اس کو بدی کے موافق ہی سزا دی جائے گی۔

یہاں تفصیل طلب دو مبحث ہیں (۱) نیکی کی جزا کتنی ملے گی؟ اس کی تعیین حقیقی طور پر تو نہیں کی جا سکتی البتہ اتنی صراحت دوسری آیات میں ضرور مذکور ہے کہ دس گنا ثواب سے لے کر سات سو گنا ثواب تک دیا جائے گا۔ ہر نیکی کی جزا کو غلہ کی ایک بالی قرار دیا گیا ہے جس میں سو دانے ہوں اور ہر بالی سے اسی قسم کی سات بالیاں پیدا ہوں اس حساب سے سات سو کی تعیین بھی نہیں کی جا سکتی کیونکہ جانا ہے شطرنج اور چاول کا حساب لگایا جائے تو غیر قابل شمار تعداد تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ (۲) بدی کی سزا اتنی ہی دی جائے گی جتنی بدی ہوگی۔ اگر گناہ کافر سے سرزد ہوا ہے تو اس کو سزا ملنی یقینی ہے اور اگر مسلم سے صادر ہوا ہے تو امید ہے کہ خدا تعالیٰ آخرت میں اپنی رحمت سے معاف فرما دے یا شروع ہی سے مغفرت فرما دے لیکن اگر سزا ہی دی گئی تو گناہ سے زائد نہ دی جائے گی یعنی اس کی مدت محدود ہوگی۔ دوامی عذاب نہ ہوگا۔ ایک وقت ایسا آئے گا کہ بد قسمت مسلم گنہگار کو بھی رہائی عطا کر دی جائے گی۔ ہذا ما صرح بہ العلماء۔

مقصود بیان نسبی اشتراک کی وجہ سے کافر و مومن کو ہم قوم کہا جا سکتا ہے جس طرح قارون باوجود کافر ہونے کے موسیٰ کا ہم قوم تھا۔ قارون بڑا مالدار تھا جس کے خزانہ کی کنجیوں کو ایک طاقتور جماعت اٹھاتی تھی۔ دنیوی مالی و شوکت پر ریجھنا اور فخر کرنا برا ہے۔ اپنی دولت سے خود فائدہ اٹھانا بھی جائز ہے اور دوسروں کو فائدہ پہنچانا تو نہایت ضروری ہے۔ اگر سرمایہ دار سرمایہ کے انبار اپنے پاس جمع رکھیں گے اور دوسروں کو کچھ نہ دیں گے تو ملک میں فساد ہوگا اور فساد انگیزی بری چیز ہے وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ سے اسی طرف اشارہ ہے۔ دولت کو اپنی طاقت و علم کا نتیجہ سمجھنا غلطی ہے۔ یہ خداداد نعمت ہے۔ ظاہری شان و شوکت کو دیکھ کر ضعیف الایمان لوگوں کے منہ میں بھی پانی بھر آتا ہے اور ان کے قدم بھی ڈگمگانے لگتے ہیں جس طرح قارون کی حالت کو بعض اسرائیلیوں نے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔ آخرت کا ثواب دنیا کی ہر نعمت سے بڑھ چڑھ کر ہوگا۔ علم بے دینی سے علم شہودی کی طرف معنوی دماغ کے لوگ ترقی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے کسی فعل کا انجام بد اس فعل کے ارتکاب سے بعض رہنے کا سبب ہوتا ہے۔ کسی عقیدہ یا فعل کی اچھائی برائی کا یقین ان کو اس وقت ہوتا ہے جب اچھا برا نتیجہ ان کے سامنے آ جائے۔ لیکن روشن بصیرت رکھنے والے نتیجہ کے محتاج نہیں ہوتے وہ مقدمات عقلیہ کو ترتیب دے کر وقوع سے پہلے ہی نتیجہ نکال لیتے ہیں۔ ان کی نظر پہلے ہی انجام پر ہوتی ہے۔ فوری اچھائی برائی ان کو راغب یا متنفر نہیں بنا سکتی۔ حضرت موسیٰ کی قوم میں بھی دونوں طرح کے آدمی تھے۔ کچھ بلند خیال روشن دماغ اور انجام بین تھے جن کو قارون کی شان اور آن بان ہیچ نظر آتی تھی، کیونکہ پہلے ہی سے وہ اس کی بد انجامی کو سمجھ گئے تھے مگر انجام بد دیکھ کر ان کی آنکھیں کھلیں۔ ہر چیز میں اپنی ذات کو بڑا سمجھنا یا بڑھانے کی تمنا کرنا یا ملک میں تباہی پھیلانا، ایسے کام کرنا جن سے بربادی اور برائی پیدا ہوتی ہو موجب عذاب آخرت ہے۔ متقی وہ ہے جو ناز و فخر تعلی شیخی اور ظلم و سفاکی کی تحریک سے متنفر اور پاک ہو۔ اللہ رحیم بھی ہے اور عادل بھی۔ وہ اپنی رحمت کے سبب ہر بھلائی کی جزا مسلمانوں کو بہت زیادہ دے گا لیکن بدی کی سزا اصل جرم سے زائد نہ دے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نجات ابدی اللہ کی رحمت پر موقوف ہے۔ اعمال حسنہ اس کے موجب نہیں۔

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ قُلْ رَّبِّیْۤ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى وَمَنْ هُوَ

جس اللہ نے تم پر یہ قرآن نازل کیا ہے وہ یقیناً معاد کی طرف تم کو لوٹا کر لے جانے والا ہے (اے نبی) تم کہہ دو کہ میرا رب خوب واقف ہے کہ کون ہدایت لیکر آیا ہے اور کون

فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ وَمَا كُنتَ تَرْجُو أَن يُلْقَىٰ إِلَيْكَ الْكِتَابُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ

صریح گمراہی میں ہے اور تم کو توقع نہ تھی کہ تم پر کتاب اتاری جاتی مگر تمہارے رب کی مہربانی ہوئی پس تم کافروں کے

ظَهِيرًا لِّلْكَافِرِينَ ۝ وَلَا يَصُدُّنَّكَ عَنْ آيَاتِ اللَّهِ بَعْدَ إِذْ أُنزِلَتْ إِلَيْكَ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ

ہرگز مددگار نہ ہو اور جب اللہ کی آیتیں تم پر نازل کر دی گئیں تو اس کے بعد ان کی تبلیغ سے رکاوٹ تم کو نہ روکیں تم اپنے

وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ وَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ

رب کی طرف بلاؤ اور مشرکوں میں سے ہرگز نہ ہو اور اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کی پرستش نہ کرو اس کے سوا کوئی معبود نہیں سوا اس کی ذات کے

هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ ع ۱۲

ہر چیز فنا ہونے والی ہے اسی کی بادشاہی ہے اور تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر لے جایا جائیگا

تفسیر

(۱) اللہ نے ان کو خرد و ہوش ارادہ و اختیار دیا ہے اور چونکہ ہر آدمی کے اندر رحمانی اور شیطانی دونوں طرح کی قوتیں ہیں، اس لئے ہر شخص کو اختیار حاصل ہے کہ خیر و شر اور اچھائی برائی میں سے جس کو چاہے اپنے لئے انتخاب کرلے اور وہ عقل و ہوش جو دوسرے جانور کو نہیں دیا گیا اس سے کام لے کر اپنے خیالات افکار و اقوال اعمال کی اچھائی برائی خود پہچان لے۔ قیاس تمثیل، استقراء، حدس اور تجربہ وغیرہ سے اشیاء کا ضرر انگیز اور نافع ہونا سمجھے اور آیات نفسی و آفاقی میں غور کر کے خدا کو ذات و صفات میں وحدہٗ لاشریک جانے

(۲) فرشتوں کے اندر اللہ نے صرف روحانیت پیدا کی ہے وہ مادہ اور مادیات سے پاک ہیں، اس لئے ان میں نہ کوئی تم ہے نہ مادہ نہ مرد نہ عورت نہ ان میں توالد و تناسل کا امر جاری ہے نہ علاقۂ زوجیت ہے نہ ارتباط محبت۔ جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اضطراراً طبعاً فطرۃً اسی کی طرف جھکتے اور وہی کرتے ہیں، اس لئے شر کا صدور اس سے ناممکن ہے اسی بنا پر ان کے محاسبۂ اعمال کی ضرورت نہیں رہی۔ دوسری مخلوق وہ یا تو خیر و شر کی پہچان سے بالکل ہی قاصر اس کو سمجھنے اور شناخت کرنے والی طاقت عطا ہی نہیں کی گئی ہے یا کم از کم ماوراء الحس خیر و شر کے ادراک سے عاجز ہے۔ اس کو نفس کلی اور قوت ناطقہ فطرت سے نہیں دی گئی۔ لہٰذا وہ بھی شرعاً مکلف نہیں اور نہ محاسبۂ اعمال پر ماخوذ ہو سکتی ہے

صرف انسان ایسی مخلوق ہے جو علاوہ شہوانی اور غضبی قوتوں کا حامل ہونے کے نفس مدرکہ کا فرودگاہ اور مظہر ہے۔ اس کے رونگٹے رونگٹے کو روحانی پرتو اندازیاں بھی جگمگا رہی ہیں اور شیطانی کرشمہ سازیاں اعجوبہ کاریاں بھی ہر وقت بر روئے ظہور رہی ہیں۔ وہ عالم صغیر ہے جو عالم کبیر کا مجموعہ ہے۔ یہی وہ برزخ کبریٰ ہے جو دوسری کائنات اور خدا کے درمیان کرسی نشین ہے۔ پس اسی بنا پر یہ اچھائی برائی کا مکلف اور صحیح یا غلط افکار و اعمال کے نتائج اٹھانے پر مجبور ہے۔ اس کو عقل نظری صرف اس لئے دی گئی ہے کہ صحیح عقائد و افکار کا مسکن اپنے دل کو بنائے اور اسی لئے اس کو عقل عطا کی گئی ہے کہ اپنی حرکات زندگی کو رائگاں نہ سمجھتے ہوئے اچھائی کو اختیار کرے اور برائی سے پرہیز رکھے۔

(۳) اور چونکہ دانش کی روشنی میں ناقابل شک وضاحت کے ساتھ یہ بات پڑھی جاسکتی ہے کہ کسی صاحب خرد دانشمند، مالک ہوش مختار شخص کے اعمال بلکہ دماغی افکار کی لہریں بھی نتائج سے خالی نہ ہونی چاہئیں، اس لئے ہر انسان کے عقیدہ و عمل کا پس منظر ضرور ہے اور کسی کا کوئی فعل رائگاں نہیں جاسکتا، اپنے اپنے کرتوت کا اچھا برا انجام ضرور اٹھانا ہوگا۔

(۴) اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ انسان کے بدن کے تمام حرکات، زبان سے نکلے ہوئے الفاظ یہاں تک تنفس کی لہریں اور حرکات قلب کا انقباض و انبساط فنا نہیں ہو جاتا بلکہ کائنات فضائی میں مخلوط ہو کر باقی رہتا ہے اور چونکہ اللہ ساری کائنات کا علم رکھتا ہے، اس لئے انسان کے تمام گزشتہ اور موجودہ اعمال و احوال و اقوال وغیرہ اس کے پیش نظر ہیں۔ وہ واقف ہے کہ کس کی ذہنی اور اعضائی حرکات صحیح ہیں اور کس کی غلط۔

(۵) جب اللہ کے علم سے کوئی چیز غائب نہیں تو وہ اپنے علم کے موافق ہر شخص سے حساب فہمی ضرور کرے گا اور کسی کو وہاں یہ عذر پیش کرنے کا موقع نہ ملے گا کہ ہم لاعلم لاعقل اور مجبور تھے کیونکہ ہوش و حواس اور دانش و فہم ملنے کے بعد یہ عذر بے بنیاد ہوگا۔

(۶) مگر چونکہ خدا تعالیٰ مہربان ہے، اس لئے اس نے عقل کا چراغ عطا کرنے کے باوجود بھی رہرو کی ہدایت کے لئے رہنما بھی بھیجے اور رہنماؤں کو اس راہ زندگی میں پیش آنے والے

تمام موڑ منازل اور نشیب و فراز بھی بتا دئے تاکہ وہ راستہ چلنے والوں کو اطلاع دیدیں اور یہ بھی سمجھا دیا کہ فلاں فلاں منزلوں پر ناز نگر موجود ہیں ان سے خود بھی ہوشیار رہنا اور ساتھ چلنے والوں کو بھی ہوشیار کرنا اور یہ بھی تلقین کر دی کہ سفر میں کس قسم کا سامان ساتھ رکھنا، مختلف منازل میں کس قسم کے توشہ کی ضرورت پڑے گی اور آخری پڑاؤ پر کیا چیز درکار ہوگی۔ پھر رہنماؤں کو مختلف قسم کے ہتھیار بھی دیدئے تاکہ وہ لٹیروں کا مقابلہ ان ہتھیاروں سے کریں اور اپنے قافلہ والوں کو ہتھیار تقسیم کر دیں تاکہ وہ بھی اپنی حفاظت کر سکیں۔ ان تمام چیزوں کی عطا اپنی رحمت سے کی۔ ان رہنماؤں کا نام انبیاء اور ان ہدایات کے مجموعہ کا نام توریت، انجیل، زبور، قرآن اور صحف رکھا۔

تفصیل مذکورہ سے یہ امر واضح ہو گیا کہ انسان مکلف ہے۔ اس کے تمام اعمال و عقائد کا نتیجہ ضرور سامنے آنے والا ہے۔ انبیاء کو اس کی ہدایت کے لئے اللہ نے اپنی رحمت سے بھیجا۔ اگرچہ کسی کا استحقاق نہ تھا کیونکہ خیر و شر کو سمجھنے کے لئے اللہ نے عقل عطا فرما دی تھی۔ انبیاء کا سب سے پہلا فرض ہے کہ خود اپنی ذات کی اصلاح کریں اور اپنی زندگی کو دوسروں کے لئے عمل کا نمونہ بنائیں، شرک سے بچنے اور نیک اعمال کرنے کی دوسروں کو ہدایت کرتے ہیں تو پہلے خود بھی ایسا ہی کریں۔ گمراہ کرنے والے شیطانوں کے بہکانے میں نہ آئیں۔ کافروں کی ہم آہنگی نہ اختیار کریں۔ کسی سبب سے بھی ان ہدایات کی خلاف ورزی نہ کریں جو اللہ کی طرف سے مل چکی ہیں۔ بلکہ دنیا کے لئے راشد، مرشد اور مہتدی ہادی ہو جائیں۔

تحلیلِ اجزاء اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ ...... یعنی قرآن کے احکام کو واجب العمل بنانے والا اللہ تم کو معاد کی طرف لوٹا کر ضرور لے جائے گا۔ لفظ معاد کی تفسیر میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں۔ بخاری نے ابن عباسؓ کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاد سے مراد مکہ ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ہجرت کے بعد اے نبی ہم مکہ میں تم کو ضرور لوٹا لائیں گے اور دینِ حق بلند ہوگا۔ کذا رواہ النسائی وابن جریر و رواہ منہ العوفی عن ابن عباس۔ ضحاک نے بیان کیا ہے کہ جب حضور اقدسؐ نے مکہ کو چھوڑا اور جحفہ تک پہنچے تو بیت اللہ کی محبت نے دل میں جوش اور مکہ کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے آیت مذکورہ نازل فرمائی (رواہ ابن ابی حاتم) ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ضحاک کے قول مذکور سے اس آیت کا مدنی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اگرچہ باقی سورت مکی ہے۔ ابن ابی حاتم نے کہا کہ روایت مذکورہ کے راوی علاوہ ضحاک کے سعید بن جبیر، مجاہد، عطیہ اور یحییٰ بھی ہیں۔

ابن ابی حاتم نے نعیم القاری کی روایت کے موافق معاد سے بیت المقدس کے مراد ہونے کی بھی صراحت کی ہے۔

ابن عباسؓ کا ایک قول اور ابو سعید خدری کی صراحت ہے کہ معاد سے مراد جنت ہے یعنی آپ کو آپ کا رب جنت میں لے جائے گا، لیکن ابن عباسؓ کا مشہور قول یہ ہے کہ معاد سے مراد روزِ قیامت ہے۔ مجاہد، عکرمہ، عطاء، سعید بن جبیر، ابو قزعہ، ابو مالک، ابو صالح اور بکثرت تابعین کے مشہور اقوال سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ حسن بصری نے مؤخر الذکر دونوں قولوں کو جمع کر کے اس طرح مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ آپ کو اٹھائے گا اور پھر جنت میں لے جائے گا۔

شیخ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ان روایات میں کچھ اختلاف نہیں۔ مطابقت آسان ہے۔ کیونکہ ابن عباسؓ کے نزدیک جو معاد سے فتح مکہ کی طرف اشارہ ہونا پایا جاتا ہے تو اس کی توجیہ بالکل ظاہر ہے۔ ابن عباسؓ جانتے تھے کہ مکہ کا فتح ہونا اسلام کا بول بالا ہونا اور لوگوں کا جوق جوق اسلام میں داخل ہونا حضور والا کی وفات کی علامت ہے اور وفاتِ اقدس کا تتمہ ظہورِ قیامت بطور لزوم ہے اور حشر کا بپا ہونا میدانِ فلسطین میں مروی ہے۔ پھر یوم القیامہ کا مرجع حضورؐ کے لئے جنت ہے تو گویا فتح مکہ سے لے کر دخولِ جنت تک ہر چیز معاد ہے جو باہم مربوط ہے۔ میں کہتا ہوں کہ شیخ کی توجیہ خوب ہے، لیکن فرض قرآن سے اس کی مناسبت واضح نہیں ہوتی، اس لئے اگر اس طرح توجیہ کی جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ فرضیتِ قرآن سے مختلف نتائج پیدا ہوئے تھے۔

(۱) مشرکوں کی سرکشی، مومنوں کی کمزوری، وطن کا ترک، عیال و مال سے دست کشی وغیرہ۔

(۲) زندگی کو ہدایت کے موافق سنوارنا، تمام شرعی تکالیف کو برداشت کرنا، حرام و حلال کی پابندی کا نفس پر بار ڈالنا اور اعلانِ حق میں مشقتیں اٹھانا۔

(۳) کافروں کا مسلمانوں کو دکھ پہنچانا، اہلِ ایمان کا صبر کرنا، کافروں سے مقابلہ کرنا اور کوشش کرنا کہ زندگی کا کوئی لمحہ رائگاں نہ جائے۔ فرضیتِ قرآن کے یہ تین نتائج بہت زیادہ جلی ہیں۔ ہر نتیجہ کے اعتبار سے معاد کی تفسیر کرنی مناسب ہے۔ اول نتیجہ کے مناسب فتح مکہ کی بشارت ہے اور یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس وقت اگرچہ مشرک غالب اور مومن کمزور ہیں اور گھر بار چھوڑ کر تعلقات توڑ کر سب سے منہ موڑنا پڑا ہے، لیکن اس کا نتیجہ اور ثمرہ فتح مکہ کی شکل میں نمودار ہوگا۔ فرضیتِ قرآن کی وجہ سے مسلمانوں پر جو مصیبت آئی ہے تو اسی فرضیت کے سبب سرخروئی بھی حاصل ہوگی۔ دوسرے نتیجہ کے مناسب معاد کی تفسیر راحت موت اور جنت سے کی جا سکتی ہے۔ گویا اس صورت میں یہ ظاہر کرنا مقصود ہوگا کہ جب مسلمانوں نے ہدایتِ قرآنی کے موافق اپنی زندگیوں کو سدھارا، حرام و حلال کی پابندی کی، فرائض و واجبات ادا کئے اور ممنوعات و مکروہات کو نفس سے روکا تو اس تکلیف کی ان کو کچھ پرواہ نہ ہونی چاہئے کیونکہ ان کو موت کی راحت اور آخر میں جنت حاصل ہوگی۔ جہاں کوئی قید نہ ہوگی۔ یہ چند روزہ زندگی کے قیود ہیں جن کا انجام کامل آزادی اور عیش و راحت ہے۔ تیسرے نتیجہ کے مناسب روزِ قیامت

اور بیت المقدس مراد لینا ہے۔ کیونکہ فرضیت قرآن کی وجہ سے مسلمانوں کو کافروں نے ستایا ہر طرح طرح سے تکلیفیں دیں اور مسلمانوں نے تمام اذیتوں کو برداشت کیا اور ہر حکم تعلیم قرآن کے موافق اپنے مطلب سے غافل نہ رہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ ایک مقرر وقت اور مقرر جگہ میں کافروں سے حساب فہمی کی جائے۔ جو کچھ دکھ دیا تھا انہوں نے مسلمانوں سے کئی ہیں ان کا انصاف کیا جائے، بدلہ دلوایا جائے اور اہلِ ایمان کی آنکھیں ٹھنڈی کی جائیں۔ اس تقریر پر معاد سے میدانِ فلسطین اور روزِ محشر مراد لینا مناسب ہوگا۔ فرضیت قرآن کے تمام نتائج باہم وابستہ اور مربوط ہیں اسی طرح معاد کے تمام تفسیری معانی بھی باہم تعلق رکھنے والے ہیں اور ایک کے بعد دوسرا ظاہر ہونے والا ہے۔ اول فتح مکہ پھر حضورؐ کی وفات رحلت موت پھر میدانِ حشر روزِ قیامت مسلمانوں اور کافروں کا محاسبہ۔ کافروں کی تکلیف، مسلمانوں کی راحت اور آخر میں جنت۔ واللہ اعلم۔

قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰى الخ۔ اس میں مسلمانوں کو بشارت اور کافروں کو وعید ہے اور واضح ایما ہے اس بات کی طرف کہ اللہ کے علم سے کوئی چیز غائب نہیں۔ ہدایت و ضلالت کا امتیاز ہی معیارِ صرف امتیازِ نتیجہ ہے جس کا نتیجہ اچھا ہے وہ ہدایت ہے جس کا نتیجہ برا ہے وہ ضلالت ہے اور چونکہ نتیجہ سے واقف اللہ ہی ہے اسی لئے مسلمانوں کو ان کے انجام نیک و بد اور کافروں کے انجام بد پر مطلع فرمایا ہے، اس لئے مسلمانوں کی زندگی کا دستور العمل ہدایت آگین اور کافروں کا قانونِ زندگی ضلالت آفرین ہے۔ غرض یہ کہ مرنے کے بعد ہر ایک کو اپنا ٹھکانا دکھایا جائے گا بلکہ دنیا میں ہی کچھ زمانہ فتح مکہ کے بعد غلبۂ اسلام اور ذلتِ کفر کی شکل میں سامنے آجائے گا۔

اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ۔ اس آیت سے غرض یہ ہے کہ نبوت کوئی استحقاقی چیز نہیں کہ کسی کو یہ کہنے کا موقع مل سکے کہ فلاں شخص کو کیوں ملی اور فلاں کو کیوں نہ ملی۔ نہ رسول پاکؐ پہلے سے نبوت کی آس لگائے بیٹھے تھے نہ پہلے آپ کو علم تھا کہ مجھ کو نبی بنایا جائے گا۔ اللہ نے رحمت فرمائی نبوت عطا کی، کتاب اتاری اور ہدایت عامہ کا حکم دیا۔

فَلَا تَكُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْكٰفِرِيْنَ۔ حضور اقدسؐ کے متعلق تو یہ احتمال ہی نہ تھا کہ آپ کفر نوازی اور کافروں کی کفر میں پشت پناہی کریں گے یا کبھی خود شرک آمیز اعمال کے مرتکب ہوں گے۔ درحقیقت یہ کلام تعریض آمیز ہے۔ غرض خطاب اصلاح اہلِ اسلام ہے۔ مدعا یہ ہے کہ مسلمانوں کو اسلام کے مقابلہ میں کافروں کی پشت پناہی نہ کرنی چاہیئے۔ کافروں کی دوستی، قرابت اور رشتہ داری یا حکومت و تسلط کی وجہ سے کبھی ایسی حرکت نہ کرنی چاہیئے جو کفر نواز ہو بلکہ مشرکوں کے گروہ سے بھی الگ ہو جانا چاہیئے جو جس قوم میں ہوتا ہے اس کا فرد سمجھا جاتا ہے اور مسلمانوں کے لئے زیبا نہیں کہ ظاہراً یا باطناً ان کو کافروں کے گروہ کا فرد سمجھا جائے، اس لئے کفر نوازی اور آمیزش اہلِ شرک سے بالکل اجتناب ضروری ہے بلکہ اللہ کے احکام کی تعمیل لازم ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت دوستی قرابت اور طمع و ہیبت مسلمانوں کو حکم شریعت سے نہ روکے۔ اس کے لئے لازم ہے کہ سب سے الگ ہو کر ایک کا ہو جائے اور دوسروں کو بھی اپنا ایسا بنانے کی کوشش کرے۔ جس رنگ میں خود رنگا ہوا ہے دوسروں کو بھی اسی رنگ میں رنگنے کی کوشش بے دریغ کرے۔ صرف اس لئے کہ،

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ الخ۔ دنیا کا ہر رشتہ ناطہ، دوستی اور محبت فانی ہے، ہر لالچ و خوف زوال پذیر ہے، ہر دکھ سکھ ناپائیدار ہے۔ آخر میں کوئی کام آنے والا نہیں ہے۔ ہر قسم کی قوت و قدرت تو اللہ ہی کو حاصل ہے آخر میں اسی سے واسطہ پڑے گا۔ پھر اس کے حکم کو چھوڑ کر دوسروں کے کہنے پر چلنا، خود اپنے کو تباہی کے غار میں گرانا اور اپنے پاؤں میں کلہاڑی مارنا ہے۔

مقصودِ بیان

رسولِ پاکؐ اور جماعت اہلِ اسلام کو فتح مکہ کی بشارت اور بشارت میں اتباع قرآنی کی ضمنی ہدایت اور اس بات کی طرف پُر لطف تلمیح کہ اس کامرانی کا ذریعہ صرف تعمیل شریعت ہے۔ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ سے اس طرف اشارہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کا معیار نتیجہ کا حسن و قبح ہے اور چونکہ نتائج سے واقف اللہ ہی ہے۔ اس لئے وہی ہدایت و گمراہی سے بھی واقف ہے یعنی کسی کو زیبا نہیں کہ خود ساختہ راہِ زندگی کو موجبِ فلاح اور صحیح سمجھے۔ سیدھا راستہ وہی ہے جو اللہ نے بتایا۔ نبوت کسبی چیز نہیں نہ حضورؐ پہلے سے نبوت کے امیدوار تھے۔ نہ آپ کے پیشِ نظر حصولِ نبوت تھا۔ یہ صرف رحمت الٰہیہ ہے۔ کافروں کی پشت پناہی نہ کرنی چاہیئے نہ اس طور پر کہ ان کو دکھانے کو وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو ان کو پسند ہو نہ اسلام کے مقابلہ میں ان کی مدد کی جائے۔ حکم الٰہی کے مقابلے میں کسی دوسرے کا حکم ماننا کفر ہے۔

بَعْدَ اِذْ اُنْزِلَتْ کو اگر قید احترازی قرار دیا جائے تو یہ مسئلہ مستنبط ہو جائے گا کہ جب تک آیاتِ الٰہیہ کا نزول نہ ہوا ہو اعمال پر انسان مکلف نہ ہوگا۔ اہلِ کفر کے گروہ میں شامل ہونا یعنی ان کا جزو بن جانا ممنوع ہے۔ اللہ کی طرف آنے کی دعوت دینی اور جہاں تک ممکن ہو اسلام کی طرف بلانا فرض ہے۔ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ سے جو امر مستفاد ہوتا ہے وہ چونکہ کسی زمان و مکان اور قوم و وطن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اس لئے اطلاق و ابہام دلالت کر رہا ہے کہ مسلمان پر لازم ہے کہ ہر وقت اور ہر جگہ تبلیغ اسلام کو پیشِ نظر رکھے اور مسلمان کہلانے سے کبھی شرم نہ کرے۔ اللہ کے سوا ہر چیز فنا پذیر اور ناپائیدار ہے۔ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ سے نسفی نے سات چیزوں کو مستثنیٰ کیا ہے: عرش،

کرسی، لوح و قلم، دوزخ و جنت مع ملائکہ عذاب و ثواب، حوریں، ارواح۔ علامہ نسفی کو شاید آیت سے دھوکہ ہو گیا، اسی لئے استثناء کرنے پر مجبور ہوئے کُلُّ شَیْءٍ ہَالِکٌ کا یہ مطلب نہیں کہ ہر چیز آخر میں معدوم ہو جائے گی۔ ہالک کا ترجمہ معدوم صرف غلط ہے بلکہ ہالک کے معنی ہیں زوال پذیر کیفیت، کمیت، ہیئت شکل، جوہر، اور دیگر تغیرات کو قبول کرنے والی یعنی حادث کائنات۔ ایسی صورت میں کسی استثناء کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ جنت ہو یا دوزخ، فرشتے ہوں یا روحیں یا غلمان۔ عرش و کرسی ہوں یا اللہ کی کوئی اور فیبی مخلوق سب حادث مسبوق بالعدم اور ممکن بالذات ہیں۔ قدم ذاتی، وجوب الوجود، غیر منتہی و غیر مبتدی ہونا اللہ کے لئے مخصوص ہے واللہ اعلم۔

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ تِسْعٌ وَسِتُّوْنَ اٰيَةً وَسَبْعُ رُكُوْعَاتٍ

سورۂ عنکبوت مکی ہے اس میں ۶۹ آیات اور سات رکوع ہیں

اس سورت کی ۶۷ اور بقول بیضاوی و صاحب معالم ۶۹ آیات ہیں۔ (۱۹۸۱) کلمات اور (۴۵۹۵) حروف ہیں۔

ابن عباسؓ، حسن بصری، عکرمہ، عطاء خراسانی اور جابر بن یزید کے اقوال کے مطابق پوری سورت مکی ہے۔ مفسر سراج نے لکھا ہے کہ شروع کی دس آیات مدنی ہیں۔ ایک قول حسن بصری کا بھی یہی ہے۔ قتادہ اور یحییٰ بن سلام کے نزدیک پوری سورت مدنی ہے۔ ایک روایت میں ابن عباسؓ سے بھی یہی مروی ہے۔

حضرت علیؓ کا قول ہے کہ اس سورت کا نزول مکہ اور مدینہ کے درمیان ہوا تھا۔ یہی زیادہ صحیح ہے جو لوگ مدنی کہتے ہیں ان کی مراد یہ ہے کہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی اور جو لوگ مکی کہتے ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ مدینہ پہنچنے سے پہلے اس کا نزول ہوا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو نہایت مہربان بڑا رحم والا ہے

الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا

کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ صرف اتنا کہہ دینے پر کہ ہم ایمان لے آئے اُن کو چھوڑ دیا جائے گا اور اُنکی آزمائش نہ کی جائے گی ہم ان سے پہلے

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ اَمْ حَسِبَ

لوگوں کو بھی آزما چکے ہیں پس اللہ تفصیلی طور پر اُن لوگوں کو جان لے گا جو سچے تھے اور جھوٹوں کو بھی تفصیلی طور پر جان لے گا کیا بد کاریاں کرنے والوں

الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاۗءَ

نے سمجھ رکھا ہے کہ ہم سے نکل بھاگیں گے کیا بُرا حکم کرتے ہیں جو شخص اللہ سے ملنے کی اُمید رکھتا

اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ

ہے تو اللہ کا وعدہ ضرور آئے گا اور وہ سننے والا جاننے والا ہے جو شخص محنت کرتا ہے تو وہ صرف اپنے ہی فائدے کے لئے محنت کرتا ہے

اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ

اللہ تو دنیا جہان سے بے نیاز ہے اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ہم اُن کے گناہ ضرور دور

سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِىْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

کردیں گے　اور ضرور اُن کو　بہتر سے بہتر　اعمال کا　بدلہ　دیں گے

تفسیر نظامِ کائنات کو چلانے والا صرف ایک قانونِ قدرت یا قانون تنازع للبقا ہے۔ اس کی تشریح کسی قدر تفصیل طلب ہے۔ رات دن کا تبادل، سورج کا طلوع و غروب، چاند کا زوال و عروج، نور و ظلمت کی کشمکش، سردی گرمی کا تصادم، مد و جزر کا تقابل، صعود و ہبوط کا تخالف، سکون و حرکت کا باہمی تصادم، موت و حیات کا اختلاف اور ہستی و نیستی کی کشاکش دنیا میں ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور انتہائے کائنات تک جاری رہے گی۔ قوی ضعیف کو کھا جاتا ہے، طاقتور کمزور کو مغلوب کر لیتا ہے، اصلح غیر اصلح کی جگہ قائم ہو جاتا ہے اور حق باطل پر قابو پا لیتا ہے۔ یہی مقتضائے فطرت ہے، قانونِ نیچر ہے، ضابطۂ قدرت ہے، معمولِ الٰہی سنتِ ربانی ہے، اس سے انحراف ناممکن اور خلاف ورزی محال ہے۔

تنازع للبقاء کا قانون تمام کائنات میں ساری و جاری ہے۔ فطرت صحیح اور طاقتور کو بقائے زندگی کے لئے چھانٹ لیتی ہے اور کمزور و غیر صحیح کو فنا و موت کے لئے چھوڑ دیتی ہے۔ ہر وجود اپنے کو باقی رکھنے کے لئے طبعی عشق رکھتا ہے اور دوسرے کو اپنے راستہ سے ہٹانے یا مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر ہستی یہی کر رہی ہے اور اسی کے لئے اس کی ساری جد و جہد ہے، اس لئے دنیا میں بقا کی خواہش و طلب سے کشاکش کی ایک باہمی جنگ قائم ہو گئی ہے۔ ناقابل شمار فوجیں ہیں جو آپس میں لڑ رہی ہیں، ٹکرا رہی ہیں، خود کو باقی رکھنے اور دوسروں کو فنا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، لیکن اس کشمکشِ حیات میں کامیابی اور بقا اسی کے لئے ہے جس کے اندر بقا کی صلاحیت، زندگی کو قائم رکھنے کی جدوجہد اور غیر معمولی قوت دفاع ہے جو طاقتور اور ساعی للبقاء ہے وہ فتح پاتا ہے جو کمزور و شکست ہے وہ شکست کھا کر فنا و ہلاک ہو جاتا ہے۔ یہی طبعی انتخاب اور نیچرل سلیکشن ہے۔ اس حالت کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ہر وجود کے بقاء کے لئے کسی دوسری ہستی پر تگا و طاری ہونا لازم ہو گیا اور ہر طاقت کے پیدا ہونے کے لئے ضروری ٹھہرا کہ کوئی طاقت کمزور ہو کر فنا ہو جائے۔

ذرا عالم نباتات کا بغور مطالعہ کرو۔ جو درخت طاقتور ہوتا ہے اس کی پرورش کے لئے زمین کی ساری قوتیں گہوارہ کا کام دیتی ہیں اور زمین اس کو اپنی گود میں لے لیتی ہے اور جو درخت کمزور ہوتا ہے زمین اس کو چھانٹ دیتی ہے اور وہ خشک ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ بڑے تناور درخت کی زمین کے اندر پھیلی ہوئی جڑیں اور جڑوں کے ریشے زمین کی رطوبت اور تمام قوت نمو کو کھینچ لیتے ہیں اور چاروں طرف کے چھوٹے چھوٹے کمزور پودوں کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا وہ سوکھ کر معدوم ہو جاتے ہیں۔ تم طرح طرح کے درخت لگاؤ ہزاروں تخم زمین کے اندر دفن کر دو، کونپل اسی میں پھوٹے گی جو صحیح اور طاقتور ہو گا پھل اسی میں آئے گا اور زندگی اسی کو ملے گی جو اصلح ہو گا، غیر اصلح کو زمین قبول نہ کرے گی کسی قسم کی امداد نہ دے گی اور اس کے لئے موت کا اعلان کر دے گی۔

کتنے ہی درخت اُگے اور طرح طرح کی سبزیاں سطحِ زمین پر آگئیں، مگر جن میں ضعف و نقص پیدا ہو گیا وہ سب کے سب چھانٹ دیئے گئے اور جو تندرست رہے باقی رکھے گئے۔ جنگل میں صدہا درخت ہیں جو سرسبز ہیں۔ پھلوں اور پھولوں سے لدے ہوئے ہیں۔ باقی وہی رہیں گے جو پالے جائیں گے انہیں کو زندہ رکھا جائے گا، مگر جو سوکھ گئے ان کی شاخوں میں سبز پتے نہ رہے اور ان کے سائے میں راحت و آرام نہ رہا وہ کاٹ دیئے جائیں گے ان کی لکڑیاں چولہوں اور بھٹیوں میں جل جل کر پکاریں گی کہ دنیا میں زندگی صرف طاقتور اور اصلح کے لئے ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ طاقتور اور قابلِ بقا حیوانات باقی رہتے ہیں، کمزور اور غیر اصلح مٹ جاتے ہیں۔ یا تو وہ خود اپنی جگہ خالی کر دیتے ہیں کیونکہ کمزوری کا نتیجہ موت ہے یا کوئی طاقت ان کو اپنا لقمہ بنا لیتی ہے۔ ہوا میں اڑنے والے جانور چھوٹے چھوٹے کیڑوں اور بھنگوں کو ہلاک کر کے اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں۔

کیا تم ناواقف ہو کہ کتنے ہی حیوانات ہیں جو زمین کی گود میں پیدا ہوئے پھر اس نے انہیں کو قبول کیا جو اصلح تھے، کتنے ہی انواعِ حیوانات کی نسلیں ہیں جو مدتوں تک زمین پر چلی پھریں، مگر باقی وہی رہیں جو اصلح تھیں۔ کیا یہ غلط ہے کہ کتنے ہی شہر ایک وقت میں آباد ہوتے ہیں پھر آگے چل کر چند شہروں کی آبادی بڑھتی اور قائم رہتی ہے اور باقی اجڑ جاتے ہیں اور انسانوں کے لئے زاغ و زغن کے آشیانے بنتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ جو آباد رہا وہ اصلح تھا جو ناقابل رہا وہ اجڑ گیا۔ کیا اس میں شک ہے کہ زمین ہر جگہ کی ایک ہی طرح کی زمین ہے، مگر ہر زمین آباد نہیں۔ آباد وہی ہوتی ہے جو آبادی کے لئے اصلح ہے۔ تم کہتے ہو کہ اس کی ہوا اچھی ہے اس کا پانی صاف و شیریں ہے اس کا موسم خوشگوار ہے، الفاظ بہت ہو گئے پر مطلب سب کا ایک ہے۔ یوں کہو کہ جو زمین آباد رہنے کے لئے اصلح تھی وہ آباد رہی جو اصلح نہ تھی وہ آباد نہ ہوئی۔ اس کا اصلح نہ ہونا دیکھو کہ چٹیل میدان ہے جنگل ہے اشرف المخلوقات کی جگہ سانپوں اور کیڑوں کا مسکن ہے۔

کیا وجہ ہے کہ ایک زمین شور ہے اس پر کچھ نظر نہیں آتا۔ اگر کچھ دکھائی دیتا ہے تو خارستان اور دوسری زمین سبزیوں اور پھلوں سے فردوس بریں کا ہم پلہ نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی اصلح نہیں ہے۔ وہاں پھول نہیں اُگتا دوسری اصلح ہے۔ پس وہ دلفریب رنگتوں اور روح پرور عطر بیزیوں سے جاں نواز بنائی جائے گی اور حسن و خوبی کا باغ وہاں آراستہ ہوگا۔

اب ذرا عالم انسانی پر بھی گہری نظر ڈالو۔ انسان کو انفرادی حالت میں بھی جانچو اور اجتماع کی حالت میں بھی دیکھو۔ اس کا جسم طرح طرح کے عضلاتِ داخلی و خارجی سے مرکب ہے اور ان سب کے افعال و خواص میں باہم ترکیب و امتزاج کا اعتدال ہے اور پھر اس سے قوت و ضعف، صحت و بیماری اور نقص و سلامتی کی مختلف حالتیں اس پر آتی رہتی ہیں۔ پس سب سے پہلے تو اس کے اندر بھی شکار کا برچھا، طلب سود و نفع کا ولولۂ فطری اور ہجوم و مدافعت کا بڑھنا ہٹنا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے کو باقی رکھنے اور قوی بنانے کے لئے جن چیزوں کا محتاج ہے ان ہر ایک چیز کو جد و جہد کر کے حاصل کرتا ہے اور اپنے وجود کے بقا کے لئے صدہا وجودوں کو مٹا دیتا ہے، وہ جانوروں کو ہلاک کرتا اور ان کا گوشت کھاتا ہے، سبزیاں اور پھل اپنی غذا بناتا ہے کیونکہ وہ اصلح ہے اور اصلح غیر اصلح کو مٹا دیتا ہے۔ وہ اپنے تمام اعمالِ حیات میں فوائد کو حاصل کرتا ہے اور مضرت کو دور کرتا ہے یعنی اپنے کو باقی رکھنے کے لئے اپنی قوتوں کو مضبوط بناتا اور ضعف و اضمحلال سے بچاتا ہے۔ پھر تم کو دکھائی دے گا جب انسان کے اندر ضعف پیدا ہو گیا، نقص و فتور آ گیا، اعتدال سے انحراف ہو گیا، اس کے کارخانۂ جسم میں کوئی پرزہ ٹوٹ گیا یا کمزور پڑ گیا یا زنگ آلود ہو گیا سو اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ ہلاک ہو جائے گا اور باقی رہنے کے قابل نہ رہے گا۔ فطرت اس کو چھانٹ دے گی کیونکہ وہ پکار کر کہہ رہی ہے کہ میری دنیا صرف اصلح کے لئے ہے، ناقص یہاں بس نہیں سکتا۔ اس کے بعد ذرا اجتماعی حالت کو بھی دیکھو طاقتور گھرانے اور نسلیں کمزور گھرانے اور نسلوں کو شکست دیتی ہیں۔ قوی قومیں کمزور قوموں کو ہلاک کر دیتی ہیں جس جماعت اور قوم کے پاس طاقت ہے وہ طاقت کے حق کا حربہ لے کر اٹھتی ہے اور کہتی ہے کہ خدا کی زمین میرے لئے ہے کیونکہ میں طاقتور ہوں مصلح ہوں تم کمزور ہو نااہل اور مضر ہو۔ پس تمام قومیں اس کے دعوے کے آگے جھک جاتی ہیں اور اپنی جگہ خالی کر دیتی ہیں تاکہ طاقت والی قومیں اس پر قابض ہو جائیں۔ یعنی فطرت اصلح اقوام کو بقا کے لئے چھانٹ لیتی اور غیر اصلح کو چھانٹ دیتی ہے۔

اس تبصرہ کا حاصل یہ ہے کہ بقا کے لئے قوت اور حصول قوت کی جد و جہد ضروری ہے۔ زندگی کے راستہ کو ہموار بنانے کے لئے کانٹوں کو چھانٹ دینا اور راستہ کے تمام پتھروں کو ہٹا دینا اور غاروں خندقوں کو پاٹ دینا لازم ہے۔

مصائب کی برداشت، مختلف طاقتوں سے تصادم، جفاکشی، محنت اور ہر مقابل قوت سے ٹکراؤ لابدی ہے مسلمان بھی اس دنیا میں زندہ رہنے کا دعوی لے کر آیا تھا وہ بھی اس فطری قانون سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتا۔ اس کے راستہ میں بھی بڑے بڑے ٹیلے، اونچے پہاڑ، نوکیلے پتھر اور گہری خندقیں تھیں جن پر قابو پا لینا اس کے لئے لازم تھا اور بغیر قوت برداشت کے سب پر غالب آ لینا ناممکن تھا، اس لئے کڑی سے کڑی تکلیفیں جھیلنی اور جگر پاش صبر فرسا اذیتوں کو اٹھانا ضروری تھا تاکہ قوت مقاومت اور تابِ تصادم کے بل بوتے پر اپنی اپنی زندگی کو باقی رکھ سکے۔ اسی کی تعلیم آیاتِ مذکورہ میں دی گئی ہے۔

لیکن یاد رکھو کہ آیاتِ مذکورہ میں اصلح اور غیر اصلح، قابلِ بقا اور ناقابلِ زندگی ہونے کا معیار دوسری قوموں کے نظریات سے بالکل مختلف بتایا ہے۔ فقط تشدد اور جنگ و جدال ہی کو اصلح ہونے کی علت نہیں قرار دیا نہ فقط ایمان اور صحیح الیقان کو ذریعۂ بقا بتایا بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح، قول عمل اور پوری زندگی میں سچائی کا حامل ہونا اور پھر اس کے ساتھ ساتھ بقا کی جد و جہد، حصولِ قوت کی کوشش، مصائب کی برداشت اور صبر و تحمل رکھنا موجب غلبہ اور سبب بقا قرار دیا۔ گویا صاف طور پر اعلان کر دیا کہ صرف جسمانی طاقت، مال و دولت کی کثرت، جماعت کی افزونی، اسلحہ کی بیشی اور علوم و صنائع کی فراوانی مسلمان کا مطمح نظر نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ اعلانِ صداقت، اشاعتِ حقانیت، اصلاح اعمال اور برداشت مصائب ہی مسلمان کا شعار اولیں ہونا لازم ہے۔ اس مجموعۂ اسباب سے حق کا باطل پر غلبہ اور اسلام کا کفر پر عمومی تسلط ہو جائے گا اور ان سب کے لئے جد و جہد اور کوشش و سعی شرطِ اولیں ہے۔

تحلیلِ اجزاء اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔ مطلب یہ ہے کہ صرف زبان سے اقرارِ ایمان کر لینا اُن مواعید کا مستحق نہیں بنا دیتا جو اہلِ ایمان سے کئے گئے ہیں۔ دنیوی برتری اور عروج و کامرانی عطا کرنے کا جو وعدہ کیا گیا ہے وہ ان لوگوں سے نہیں کیا گیا جن کے لبوں پر تو دعوئ ایمان ہے اور دلوں میں نفاق یا عناد یا جحود یا انکار یا ضعف ہے۔ جب تک ایمان دلوں میں راسخ نہ ہو اور اسلام کی صداقت کا یقین رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں اثر نہ کر جائے اس وقت تک وعدۂ قرآنی کے ایفاء کی امید بے حاصل ہے، رسوخ ایمان اور ثباتِ یقین کی علامت یہ ہے کہ ہر طرح کی مصیبت اور تکلیف پر صبر ہو اور صبر اضطراری نہیں بلکہ اختیاری ہو مقابلہ کی کوشش اور مقاومت کی جد و جہد کی جائے۔ مالی اور جانی قربانی کی جائیں۔

حدیث میں وارد ہے کہ (ہر شخص کی امتحان اس کے مرتبہ کے موافق لیا جاتا ہے) سب سے سخت امتحان انبیاء کا لیا جاتا ہے۔ پھر ان کے بعد درجہ بدرجہ بزرگی و برتری

کا لحاظ کرتے ہوئے دوسرے لوگوں کی آزمائش ہوتی ہے (الحدیث)

نتیجۂ ارشاد یہ نکلا کہ جو شخص سچے دل سے ایمان لے آئے اور اسلام کے احکام کا پابند بھی ہو گیا تب بھی اس کو یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس تدبیر میں جو مصائب و تکالیف لکھی جا چکی ہیں ان میں وہ مبتلا ہونے سے بچ جائے گا۔ ایمان سے مصائب مقدرہ کا ازالہ نہیں ہوتا بلکہ مومن پر بلاؤں کا نزول صدق و کذب کی جانچ کے لئے ہوتا ہے۔ مومن صادق مصائب نازلہ کو اللہ کی طرف سے سمجھ کر صبر کرتا اور اپنے دل میں طمانیت پاتا ہے اور ضعیف الایمان شخص اہل و عیال کی ہلاکت، مال کی بربادی، تجارت میں خسارہ اور جسمانی امراض میں اپنے گھر کو گھرا دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے اور کفریہ کلمات بکنے لگتا ہے۔

آیت مذکورہ کا نزول عمار بن یاسر، ولید بن ولید اور سلمہ بن ہاشم کے حق میں ہوا تھا۔ ان بزرگوں کو مکہ کے کافر طرح طرح سے تکلیفیں دیتے تھے۔ گرم ریت پر برہنہ بدن لٹاتے اور اوپر سے گرم اور بھاری پتھر سینہ پر رکھتے تھے۔ غریب بیکس مومنوں کی پشت ریت کی گرمی سے جھلس جاتی۔ تڑپتے پھڑکتے مگر منہ سے آواز نہ نکلتی۔ ان کے علاوہ دوسرے ایمان دار بھی سخت ترین دکھ میں مبتلا تھے۔ برادری کا چھوٹنا، مال اسباب اور گھر بار سے دست بردار ہونا، عزت و آبرو کا ضائع ہونا وغیرہ وغیرہ مصائب کو برداشت کرنا ہر مسلمان پر پڑ رہا تھا بالآخر وہ بھی انسان تھے اور انسان کا کلیجہ ان کا بھی تھا، مصائب ٹوٹنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ مجبور ہو کر بعض حضرات نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر اپنے دکھ کی شکایت کی اور دعا کے ملتجی ہوئے۔ آثار غضب چہرۂ مبارک پر نمودار ہوئے اور فرمایا تم سے پہلے دیندار آرے سے چیرے گئے مگر وہ دین سے نہ ہٹے۔ لوہے کے کنگھے ان کے سروں میں کئے گئے کہ گوشت چیرے کے ہڈی تک پہنچ گئے مگر ان کی دینی استقامت کو لغزش نہ ہوئی قسم ہے خدا کی یہ دین تو پھیل کر رہے گا یہاں تک کہ صنعاء سے لے کر حضر موت تک سوار امن سے جائے گا، لیکن تم جلدی کر رہے ہو۔ او کما قال۔ (رواہ البخاری)

بعض اہل روایت نے صراحت کی ہے کہ آیات مذکورہ مہجع بن عبد اللہ کے متعلق نازل ہوئیں۔ آپ حضرت عمر بن خطاب کے آزاد کردہ تھے۔ جب جنگ بدر میں شہید ہو گئے تو حضور والا ﷺ نے ان کا مرتبہ شہادت ظاہر فرمایا۔ لیکن شہید کے والدین اور بیوی کو انتہائی غم تھا۔ اس وقت آیت مذکورہ کا نزول ہوا۔

عبد بن حمید ابن منذر اور شیخ ابن جریر وغیرہ کی روایت کے مطابق آیت کا نزول ان مومنوں کے متعلق ہوا تھا جو اپنی بعض خاص مجبوریوں کے سبب مکہ میں رہ گئے تھے۔ صحابۂ کرام کے ساتھ ہجرت نہ کر سکے تھے۔ مدینہ کے کچھ مسلمانوں نے حکم ہجرت کے نزول کے بعد ان کو لکھا کہ زبانی اقرار بے سود ہے جب تک ہجرت نہ کرو گے تمہارا اسلام قابل قبول نہ ہو گا، اس لئے کہ ہجرت کا عمومی حکم نازل ہو چکا ہے۔ چونکہ وہ لوگ بر خلوص مومن تھے، اس لئے ہجرت کے لئے باوجود کثیر موانع کے تیار ہو گئے اور ایک مقرر تاریخ پر مکہ سے چل دیئے۔ مکہ کے کافروں کو خبر ہوئی تو انہوں نے پیچھا کیا۔ اللہ کی راہ میں سفر کرنے والے لڑنے کو تیار ہو گئے۔ کچھ شہید ہو گئے اور کچھ بچ کر نکل گئے۔ اس پر اللہ نے آیت ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ... نازل فرمائی۔ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ شروع کی یہ آیات ضرور مدنی ہیں باقی سورت مدنی ہو یا نہ ہو۔

بعض لوگوں نے مورد نزول بلال حبشی، مقداد، صہیب رومی، عمار اور عمار کی والدہ سمیہ کو قرار دیا ہے۔ بہر حال حکم عام ہے اور مسلمانوں کو راہ اسلام میں مصائب برداشت کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ الخ حاصل مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کا تکالیف میں مبتلا ہونا، استقامت رکھنا اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہر طرح مصائب کو برداشت کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ گزشتہ انبیاء کی امتوں کے برگزیدہ انسان بھی گوناگوں اذیتیں اٹھا چکے ہیں۔ لیکن ان کے پائے استقامت کو لغزش نہ ہوئی کسی کو آرے سے چیرا گیا کسی کا گوشت قینچیوں سے کاٹا گیا، کسی کو آگ کے بھرے ہوئے گڑھوں میں ڈال کر جلایا گیا، کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر صلیب پر لٹکایا گیا، بنی اسرائیل کے بچوں کو پیدا ہوتے ہی ذبح کرا دیا گیا، مسیح کے حواریوں پر روم میں طرح طرح کے ظلم توڑے گئے وغیرہ وغیرہ۔ پس امت محمدیہ کے پر خلوص ایمان کو بھی ضرور جانچا جائے گا، مصائب مقدرہ میں مبتلا کیا جائے گا، مگر ان کو صبر و استقامت کے ساتھ ہر تکلیف اٹھانی اور کافروں کے مقابلے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ خواہ اس راستہ میں ان کو جسمانی تکلیف پہنچے یا مالی اولاد کی قربانی کرنی پڑے یا گھر بار چھوڑ کر وطن سے منہ موڑ کر راہ جہاد میں نکلنا پڑے۔

فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الخ۔ اس فقرہ پر بظاہر یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ عالم الغیب ہے۔ ہر چیز کی تخلیق سے پہلے اس کو اس کے متعلق پورا علم تھا۔ پھر آزمائش کرنے کے بعد علم حاصل کرنے اور صادق و کاذب میں فرق کرنے کے کیا معنی ہیں؟

اس شبہ کا ازالہ دو طرح سے کیا جا سکتا ہے۔ (۱) اللہ اگرچہ عالم الغیب ہے۔ اس کو تخلیق سے پہلے ہر شخص کے احوال و افعال کا علم تھا، لیکن اسی علم الٰہی پر ثواب و عذاب کو

مرتب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ انسان مکلف ہے اور مکلف جب تک کوئی اختیاری کام نہ کرے از روئے انصاف وہ کسی نتیجہ کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا پس اس تقدیر پر آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ امتحان انسانی صرف اس لئے ہے کہ خدا تعالیٰ کو ایسا علم حاصل ہو جائے جس سے صادق و کاذب کے بارے میں اللہ تعالیٰ امتیاز و تفرقہ کیا جا سکے اور عذاب و ثواب دیا جا سکے۔ (۲) علم الٰہی دو قسم کا ہے ایک تخلیق سے پہلے دوسرا وقوع حوادث اور تخلیق کے بعد۔ اول الذکر علم ازلی ابدی سرمدی ہے اللہ کی صفات لا متناہیہ میں سے ہے۔ اس کے علم کے لئے صرف مشاہدہ ذات کافی ہے چونکہ ذات الٰہی تمام کائنات کے لئے سرچشمہ ہے اور وہ اپنی ذات کو بہ علم حضوری جانتا ہے اور ہر وقت جانتا ہے۔ اس لئے کل کائنات کو بھی جانتا ہے اور ہر وقت جانتا ہے نہ کسی کے پیدا ہونے سے اس کے علمی صفت میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ کسی کے مرنے سے کمی آتی ہے وہ ہر تغیر و تبدل سے پاک ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو حوادث کے پیدا ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ علم کی یہ قسم نہ باری تعالیٰ کے لئے صفت کمال ہے نہ قدیم ہے۔ اس میں کمی بیشی اور زوال و تغیر ہوتا رہتا ہے۔ امتحان کے بعد جو علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہی زوال پذیر تفصیلی علم ہے جس کا تعلق ہر شخص اور ہر واقعہ سے پیدائش و بعثت کے بعد ہوتا ہے۔ اس تقدیر پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ (اگرچہ اللہ کو ابتدا وقت کے علم کے لحاظ سے ہر چیز سے واقفیت ہے لیکن) وہ امتحان کے بعد لوگوں کی صداقت و کذب کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے جو صدور اعمال اور ارتکاب افعال پر موقوف ہے تاکہ صادق و کاذب میں تفرقہ و امتیاز کیا جا سکے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّسْبِقُوْنَا الخ۔ گزشتہ آیات میں مسلمانوں کو مصائب پر صبر کرنے اور اعدائے اسلام کے مقابلے کی کوشش کی ترغیب دی تھی۔ اس آیت میں اہل کفر کو شرک پرستی، ظلم اور سفاکی سے وعید آمیز باز داشت کی گئی ہے تاکہ مسلمانوں کا جذبہ صبر بلند ہو جائے اور مصائب کے مقابلے میں پائے استقلال کو لغزش نہ ہونے پائے۔ مطلب یہ ہے کہ بدکار لوگوں کو یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ وہ اللہ کے پیچھے سے چھوٹ سکیں گے یا خدا کی گرفت سے باہر ہو سکیں گے۔ یعنی کافروں کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ابھی کفر پرستی، ظلم توڑی، بدکاری اور ستم گاری میں یوں ہی ہمیشہ کے لئے آزاد رہیں گے اور یوں ہی مسلمانوں پر ان کا اقتدار رہے گا اور یوں ہی مسلمان مار کھاتے اور تکلیف اٹھاتے رہیں گے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اللہ کے پنجے سے وہ چھوٹ نہیں سکتے۔ اس کی گرفت سے باہر نہیں ہو سکتے۔ ان سے ضرور انتقام لیا جائے گا۔ مسلمانوں کو ضرور ترقی ہوگی، غلبہ نصیب ہوگا اور کافروں کو دنیا میں تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

مَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ الخ۔ اس آیت کا مطلب علماء نے مختلف طور پر بیان کیا ہے۔ قرطبی نے اہل تفسیر کے بیان کا دعویٰ کرتے ہوئے رجاء کے معنی خوف اور لقاء اللہ سے مراد موت ہونے کی صراحت کی ہے یعنی جو شخص موت سے ڈرتا ہو اور اس وجہ سے راہ اسلام میں جہاد کرنے سے پیچھے رہنا چاہے تو اس کو ایسا نہ کرنا چاہیئے کیونکہ موت تو آکر رہے گی، اس کا وقت مقرر ہے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا جس شخص کو قیامت کے برپا ہونے اور حساب فہمی کا ڈر ہو تو اس کا ہونا لازم ہے ایک مقرر وقت پر ایسا ضرور ہوگا۔ سعید بن جبیر نے رجاء کے معنی آرزو اور لقاء اللہ کے معنی اللہ کے سامنے جانا فرمائے یعنی جس کو اللہ سے ملنے کی آرزو ہو اس کو ان مصائب [illegible] چاہیئے اور کافروں کی ایذا رسانی سے تنگدل ہو کر پیچھے نہ ہٹنا چاہیئے کیونکہ اللہ سے ملاقات ضرور ہوگی اور چند روزہ مصائب کا خاتمہ ضرور ہوگا۔

اس کلام میں مسلمانوں کو ہجرت، جہاد اور مصائب پر صبر رکھنے کی مزید ترغیب ہے کیونکہ جب موت ضرور آنے والی ہے اور اس کا وقت مقرر ہے تو اسلام سے روگرداں ہونے اور راہ فرار اختیار کرنے کے بعد موت کے پنجے سے رہائی ناممکن ہے اور نہ جہاد و ہجرت سے موت اپنے وقت سے پہلے آسکتی ہے نہ کفار کی ایذاء رسانی موت کو قبل از وقت بلا سکتی ہے پھر قیامت ضرور ہونی ہے۔ اللہ کے سامنے ضرور جانا ہے۔ مصائب چند روزہ کا اختتام لازمی طور پر ہوگا اور آخرت میں حساب فہمی کے بعد عذاب و ثواب بھی ضرور ہوگا۔ لہٰذا آخرت کی فلاح کے اسباب حاصل کرنا اور اخروی سرخ روئی کے موجبات کو فراہم کرنا لازم ہے۔

وَمَنْ جَاھَدَ فَاِنَّمَا یُجَاھِدُ لِنَفْسِہٖ الخ۔ عربی زبان میں جہاد کے معنی کوشش کے ہیں، اصطلاح شریعت میں کبھی میدان جنگ میں اعدائے اسلام سے لڑنے کو جہاد کہا جاتا ہے کبھی اسلام کی اشاعت، اعلاء کلمۃ اللہ اور اصلاح نفس و خلق کی ہر کوشش پر جہاد کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ تمام اعمال حسنہ عقائد صحیحہ اور حسن معاملات کو جہاد میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ سیاق و سباق اگرچہ آیت میں اول کے معنی مراد ہونے پر دلالت کر رہا ہے۔ لیکن دوم معنی چونکہ اول معنی کو بھی شامل ہے، اس لئے اسی کو مراد لینا زیادہ مناسب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی نجات کی کوشش کرنے سے اللہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ وہ مخلوق کی ہر عبادت اور فرماں پذیری سے بے نیاز ہے۔ اگر تمام عالم اس کی عبادت میں ہر وقت غرق رہے تب اس کو نفع نہیں اور سب نافرمان سرکش ہو جائیں تب اس کا کوئی نقصان نہیں۔ اصلاح اعمال، عبادت، ریاضت نفس اور مصائب و تکالیف پر صبر کرنے کا فائدہ خود انسان کو پہنچتا ہے جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ الخ۔ سیئات اور [illegible]

اوامر و نواہی کی مخالفت کے سبب ۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا ۔ لہٰذا اس تخلیق کا شکریہ واجب ہے اور جو لا تعداد لاتعداد نعمتیں اور اس کی لطف اندوزی ریشفے اور قوتیں انسان کی زندگی کو برسر ظہور لائی ہیں ، اس لئے ہر نعمت بجائے خود موجب شکر ہے ۔ پھر تخلیق کے بعد بقائے زندگی لاتعداد اسباب سے وابستہ ہے ۔ ہر منٹ میں ہو سکتا پھیر مرتبہ قلب کی انقباض اور انبساطی حرکت ہوتی جس کی وجہ سے بدن کے ہر جزو کو بھیجا غذا پہنچتی اور فضلات واپس جاتے ہیں ۔ پھر ان کثیف اجزاء کا تصفیہ نفس کے ذریعہ سے ہوتا ہے ۔ سانس کے چلنے سے اجزا نفس کے ذریعہ باہر نکل جاتے ہیں اور بعض اجزا جسم میں داخل ہو جاتے ہیں پھر پورے بدن کی گرمی قائم رکھنے اور وظائفِ حیات کو پورا کرنے کے لئے ایک کہربائی طاقت کی بھی ضرورت ہے جو مخفی طور پر رگ رگ اور رونگٹے رونگٹے میں سرایت کئے ہوئے ہے اور ہر وقت برسر عمل رہتی ہے ۔ یہ تو بقائے جسم کے ضروری اسباب ہیں جن کا اجمالی خاکہ بھی تفسیر کے چند در چند صفحات چاہتا ہے ۔ رہا علمی ، ادراکی اور روحانی قیمتی تحفہ تو اس کو تفصیل و اسط کے ساتھ بیان کرنا انسانی قدرت سے خارج ہے مثال کے طور پر اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ آن کی آن میں انسان کا تصور عرش بریں تک پہنچ کر واپس آجاتا ہے ۔ ایسی کون سی طاقت انسان کے دماغ میں ہے جو اتنی سریع السیر اور زود اثر ہے ۔ تخیل کی رسائی کی انتہا نہ اب تک قائم کی جا سکی ہے نہ کی جا سکتی ہے ۔ وجہ تخیل اور رفتار تخیل کو بیان کیا جا سکتا ہے اور دوسری چیزوں سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف نظر ہی کو دیکھو ایک سیکنڈ میں آسمان تک پہنچتی ، واپس لوٹ آتی ہے ۔ ایک پل میں تمام فضائی کائنات اور آسمان ایک افق سے دوسرے افق تک واضح طور پر سما جاتا ہے ۔ یہ ہیں انسان پر اللہ کے تخلیقی احسان و انعامات ، لیکن ہر شخص فطرۃً ہر احسان کا تفصیلی شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہے ۔ اگر شبانہ روز بغیر خور و خواب کے شکر ہی ادا کرتا رہے تب بھی شکرِ نعمت سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا کیونکہ شکر ادا کرنا بھی اسی طاقت کے استعمال سے ہو گا جو خدا نے دی ہے ۔ اگر زبان کے اعصاب حرکت نہ کریں ، دل کے اندر ادائے شکر کی لہریں نہ پیدا ہوں تو زبان کس طرح حرکت کرے ۔ غرض یہ کہ انعام و احسان کا بدلہ ادا کرنے کے لئے جب انسان کوشش کرتا ہے تو مزید احسانات کے جال میں پھنس جاتا ہے ۔ حاصل یہ نکلا کہ تخلیقی طور پر ہر انسان خواہ نبی مرسل ہو یا ادنیٰ درجہ کا جاہل کوئی بھی قصور وری سے اپنی ذات کو بری نہیں کر سکتا ، لیکن یہ قصور چونکہ اضطراری ہے انسان کے اختیار و ارادہ کو اس میں دخل نہیں ہے ، اس لئے اس قصور پر کوئی بھی ماخوذ نہیں ہے ۔ اسی بنا پر با وجود فطری قصور وار ہونے کے اہل سنت انبیاء کو معصوم کہتے ہیں ۔ کیونکہ فطری قصور سے عصمتِ ارادی پر کوئی دھبہ نہیں آتا ۔

سئیات کی دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ نے جس کام کو کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیا ہے اس کی مخالفت کی جائے ۔ اوامر و نواہی کی مخالفت کرنے والے کو عرفِ شریعت میں گناہگار صاحب السئیات اور مجرم کہتے ہیں اور جب یہ جرم حد سے بڑھ جاتا ہے تو کفر تک نوبت پہنچ جاتی ہے ۔ جو لوگ ہوشیار اور عقلمند ہیں وہ اپنے گناہوں کو حد سے نہیں بڑھنے دیتے ۔ اور گناہ کرنے کے بعد فوراً لوٹ آتے ہیں یعنی اگر نا دانستہ ان سے کوئی گناہ ہو بھی جاتا ہے تو وہ ندامت کے ساتھ توبہ کر لیتے ہیں اور کوشش کر کے اعمال صالحہ کی طرف توجہ کرتے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر ان کے نامۂ اعمال میں ایک گناہ لکھا ہوتا ہے تو اسی کے ساتھ چند نیکیاں بھی درج ہوتی ہیں ۔ آیت مذکورہ میں اللہ نے ایسے ہی لوگوں کے لئے وعدہ فرمایا کہ نیکوکار اہل ایمان کی نیکیوں کے سبب ہم ان کے گناہ ساقط کرتے ہیں ، لیکن یہ کوئی نہ سمجھ لے کہ بدی اور نیکی کا مقابلہ ہونے کے بعد بدی ساقط ہو گئی اور نیکی سے بدی کا معاوضہ ہو گیا ۔ ایسے آدمی کے لئے نہ آئندہ کوئی عذاب رہا نہ ثواب ۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے ۔ (نہیں ایسا نہیں ہو گا نیکیوں سے (جس طرح) ان کے گناہ ساقط ہو جائیں گے (اسی طرح) ان کو ثواب بھی ملے گا ۔ گویا اس کا مطلب یہ نکلا کہ نیکوکار مومن پر دوہرا احسان ہو گا ۔ ایک تو گناہ کا بھی مواخذہ نہ ہو گا دوسرے ثواب بھی ملے گا ۔

مقصودِ بیان

صرف زبان سے اقرار ایمان کر لینا کافی نہیں ہے جب تک استحکام اسلام کے لئے پیش آنے والی مصیبت کی برداشت صبر و استقلال سے نہ کی جائے ۔ اہل ایمان پر جو مصیبت آتی ہے وہ درحقیقت ان کے ایمان کی پختگی کو جانچنے کے لئے آتی ہے ۔ مصیبت سے تنگ دل ہو کر بے صبری کرنے والوں اور پائے استقامت کو لغزش نہ دینے والوں کا امتحان اللہ اس طور پر کرتا ہے ۔ مصائب مقدرہ کا ازالہ ایمان سے نہیں ہوتا (جس طرح نزول مصائب ایمان کی وجہ سے نہیں ہوتا) بد کردار لوگوں کو یہ خیال نہ کر لینا چاہیئے کہ وہ اللہ کی گرفت سے باہر ہیں ، اللہ کے پنجے سے کوئی مخلوق خارج نہیں ہے ۔ موت سے ڈر کر جہاد نہ کرنے سے اور اعانتِ اسلام و صداقت سے دست کش ہونا ممنوع ہے ۔ کیونکہ موت ایک مقررہ وقت پر آئے گی نہ پہلے آسکتی ہے نہ ٹالی جا سکتی ہے ۔ اللہ سے ملنے کی آرزو کرنی مناسب ہے ۔ بقائے نفس و قوم کی اسلام و اہل اسلام کی بقا و ترقی کی کوشش کرنی ہر مومن پر فرض ہے اور چونکہ آیت میں کسی خاص وقت کی خصوصیت نہیں ظاہر کی گئی ہے اس لئے بغیر قیدِ زمان و مکان دین کی حفاظت و ترقی کی جدوجہد کرنی ضروری ہے ۔ انسان کی کوششوں سے خدا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ انسان کی جدوجہد خود اسی کے لئے اچھا یا برا نتیجہ پیدا کرتی ہے ۔ نیکیاں کرنے سے اہل ایمان کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں اور نیکیوں کی بھی پوری جزا ملتی ہے ۔ حکم آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان و عمل صالح پر قائم رہو ۔ اسلام کے راستہ میں پیش آنے والی مصیبت کو استقلال کے ساتھ برداشت کرو ۔ جہاد کرو اور دین کے لئے ہمہ تن کوشش بن جاؤ وغیرہ ۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا

ہم نے انسان کو ماں باپ سے اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے لیکن اگر ماں باپ اس بات پر تم کو مجبور کریں کہ تم اللہ کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہراؤ جن کی

تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ○ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ

خود تم کو واقفیت نہیں ہے تو ان کا کہنا نہ مانو تم سب کو میرے ہی پاس لوٹ کر آنا ہے جو کچھ تم کرتے تھے میں تم کو بتا دوں گا اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے

لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ ○ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ

ان کو ہم ضرور نیکوں میں شامل کریں گے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہہ تو دیتے ہیں کہ ہم ایمان لائے لیکن جب اللہ کی راہ میں ان کو ایذا پہنچائی

جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللَّهِ ۖ وَلَئِن جَاءَ نَصْرٌ مِّن رَّبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۚ

جاتی ہے تو وہ لوگوں کی ایذا دہی کو اللہ کے عذاب کی طرح قرار دے دیتے اور اگر تمہارے رب کی طرف سے کوئی مدد آ جاتی ہے تو کہنے لگتے ہیں ہم بھی تو تمہارے ساتھ

أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ ○ وَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيَعْلَمَنَّ

تھے کیا اللہ اس چیز سے بخوبی واقف نہیں ہے جو جہان والوں کے دلوں میں ہے اور اللہ مومنوں کو بھی ضرور جان لے گا اور منافقوں کو بھی

الْمُنَافِقِينَ ○ وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا اتَّبِعُوا سَبِيلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطَايَاكُمْ

ضرور جان لے گا کافروں نے مسلمانوں سے کہا تم ہماری راہ پر چلو ہم تمہارے گناہوں کا بار اٹھا لیں گے

وَمَا هُم بِحَامِلِينَ مِنْ خَطَايَاهُم مِّن شَيْءٍ ۖ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ○ وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ

حالانکہ وہ ان کے گناہوں کا کوئی بار اٹھانے والے نہیں واقعی وہ جھوٹے ہیں یہ لوگ بلاشبہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے

وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ ۖ وَلَيُسْأَلُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ○ ع

اور اپنے بوجھ کے ساتھ اور بوجھ بھی اور قیامت کے دن ان کی افترا پردازیوں کی بازپرس ضرور ہوگی

تفسیر دینی استقامت، مذہبی استقلال اور ایمان کی پختگی کا امتحان یوں تو ہر مالی جسمانی اور جائیدادی نقصان سے ہوتا ہے۔ افلاس ایمان کو کمزور کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ ایمان میں واقعی کمزوری ہو۔ اہل و عیال کے مصائب اور حوصلہ فرسا امراض کا سلسلہ استقلال یا استقامت کو کھو دیتا ہے۔ بشرطیکہ پہلے سے کچھ ضعف عزیمت ہو۔ لیکن سب سے بڑھ کر دماغی توازن کو خراب کر دینے والی اور کوہ استقلال کو جڑوں سے ہلا دینے والی چیزیں صرف تین ہیں۔ یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں کہ بہترین دانشمند اور روشن دماغ مفکر بھی متحیر ششدر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

(۱) اگر زید کے مسلمان ہونے پر یا اسلام پر قائم رہنے سے بوڑھے والدین فاقوں سے مرنے لگیں، ان کی حالت خراب ہو جائے، ان کی بربادی یقینی ہو جائے۔ ایک سامنے بوڑھی ضعیفہ ماں اپنی کمزور نگاہ سے ٹٹولتی ہوئی لاٹھی ٹیکتی آئے اور اپنی شفقت بھری گود میں نوجوان بیٹے کو لے کر رو رو کر اپنی ضعیفی اور بیچارگی بیان کرے اور دوسری طرف سے ضعیف العمر نحیف القویٰ باپ آ کر سات فاقوں سے جھکی ہوئی کمر کو دکھائے اور وہ دونوں مل کر اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنے حقوق بتائیں، تربیت، الفت، مروت، رشتہ اور قومیت

کا واسطہ دیں تو ایسے وقت بڑے بڑے پہاڑ بھی اپنی جگہ سے جنبش کر جاتے ہیں اور اگر اس طرح کام نہ چلے تو بکیس والدین اپنا آخری حربہ اس طرح استعمال کریں اور بیٹے کو اس کے مذہب کا حوالہ دے کر کہتا ہیں کہ چونکہ مسلمانوں کے خدا، مسلمانوں کے رسول اور مسلمانوں کے قرآن نے ماں باپ کی اطاعت و فرماں برداری کرنے کا غیر مشروط ناقابل تبدیل حکم دیا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم ہمارا کہنا نہیں مانتے اور اپنی ضد پر جمے ہو۔ کیا تم کو اپنے خدا اپنے رسول اور اپنے قرآن کے حکم کی بھی پرواہ نہیں۔ یہ جملہ ایسا سخت ہوتا ہے کہ اچھے دماغ رکھنے والا آدمی بھی سر بسر جھکا دیتا ہے اور کوئی چارہ نہیں ہوتا اور کوئی جواب نہیں بن پڑتا۔ اگر ماں باپ کا حکم مانتا ہے تو اسلام و ایمان کو خیرباد کہنا پڑتا ہے اور اگر حکم نہیں مانتا تو خدا اور رسول اور قرآن کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور اس طرح اسلام میں ضعف آتا ہے۔

(۲) بعض لوگ اسلام کی بیخ کنی اور بربادی کی نیت سے یا مالی فائدہ حاصل کرنے کے لئے بظاہر مسلمان ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کے دلوں میں ایمان نہیں ہوتا۔ رسول کی صداقت اور قرآن کی حقانیت سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ جب اسلام کے جامہ میں نمودار مسلمانوں کے سامنے آجاتے ہیں تو سیدھے سادے بلکہ سمجھدار مسلمان دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ منافقوں کا گروہ دل سے مسلمان ہوتا ہی نہیں ہے، اس لئے راہِ اسلام میں جب کبھی کسی دکھ کو برداشت کرنے کا موقع آتا ہے تو پیٹھ دکھا دیتے ہیں اور علی الاعلان یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ مسلمان ہونے سے ہم پر یہ مصیبت پڑی اور اگر کچھ مال دولت اور کسی قسم کے فائدہ کا ظہور ہوا تو مخلص مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں اور اپنا حصہ قائم رکھتے ہیں۔ ناواقف بھولے مسلمانوں کو بھی ان کی اس حرکت سے یہ خیال گزرتا ہے کہ شاید اسلام تمام مصائب کے نزول کی جڑ ہے۔ کافروں کی فارغ البالی اور مسلمانوں کی خستہ حالی دیکھ کر ان کے ضعفِ ایمانی کو مزید تائید مل جاتی ہے اور اس طرح منافقوں کے نفاق کا زہریلا اثر مسلمانوں کے دلوں میں اثر کر جاتا ہے۔

(۳) کافروں کے بڑے سردار امیدیں دلاتے ہیں، آس بندھواتے ہیں اور پکار پکار کر کہتے ہیں کہ دیکھو ہمارے راستہ پر چلو۔ اگر یہ راستہ غلط ہوتا تو ہم اس پر کیوں چلتے۔ ہم تم سے زیادہ عقلمند، جہاندیدہ، تجربہ کار اور ذی علم ہیں۔ یقین سمجھو کہ یہ راستہ سیدھا ہے اور بالفرض اگر ہمارا قول غلط بھی ہو تو اس راستہ پر چلنے سے ہمارا نقصان زیادہ اور تمہارا کم ہوگا۔ کیونکہ ہمارا جتھا، ہماری طاقت، ہماری دولت اور ہماری عزت تم سے بہت زیادہ ہے۔ پھر تم کو کیا اندیشہ ہے۔ اچھا اگر یہ بھی نہیں مانتے تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تم پر اپنے باپ دادا کے دین پر چلنے سے جو بربادی اور تباہی آئے گی ہم اس کو اپنے سر لیں گے اور تم پر کوئی وبال نہ آنے دیں گے۔

مذکورہ تینوں گروہوں کے اقوال و تدبیر عمل کو نقل کر کے خدا تعالیٰ نے ہر ایک کے قول کا اور طاغوتی تدبیر کا رد آیتِ مذکورہ میں فرما دیا ہے۔ اگر والدین کی تباہی اور بربادی کا خیال اسلام اور بقائے اسلام سے مانع ہو تو صاف طور پر فرما دیا کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک (بہر حال) ضروری ہے۔ یعنی ان کی امداد و اعانت لازم ہے۔ مال و جسم سے خدمت کرنی لازم ہے۔ لیکن حکم الٰہی کے خلاف ان کی اطاعت حرام ہے۔ اگر وہ شرک و کفر کا حکم دیں اور توحید و ایمان سے روکیں تو ان کے مشورہ کی خلاف ورزی لازم ہے۔ اس صورت سے ایمان و اسلام بھی سالم رہے گا اور ماں باپ کی امداد و اعانت بھی ہوتی رہے گی۔ منافقوں کی نفاق انگیزی سے بچنے کے لئے اگرچہ کوئی تفصیلی ہدایت نہیں، مگر ایک قاعدہ کلیہ بیان فرما کر اہلِ نفاق کی پہچان بتا دی جس کا مضمون یہ ہے کہ جو دکھ میں اسلام سے برگشتہ ہو جائے اور موجب مصائب اسلام کو خیال کرے اور سکھ میں کسی لالچ کی وجہ سے اسلام کی طرف آجائے وہ منافق ہے (اس سے اہلِ ایمان کو پرہیز رکھنا ضروری ہے) تیسرے گروہ کے متعلق فرمایا کہ قیامت کے دن کوئی کسی کا بار اپنے اوپر نہیں اٹھا سکتا یعنی قیامت کے احوال دنیا کے احوال سے جدا حیثیت رکھتے ہیں۔ وہاں دوسرے کے گناہوں کا بوجھ کوئی اپنی ذات پر نہیں لے سکتا۔ ہاں اپنے گمراہ ہونے اور دوسروں کو گمراہ کرنے کا بار ضرور اٹھانا پڑے گا۔ یعنی گمراہ ہونے والے کی سزا اکہری اور گمراہ کرنے والے کی سزا دوہری ہوگی مگر گمراہ کرنے والوں کی دوہری سزا ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ گمراہ ہونے والے اور اغوا کرنے والوں کے راستہ پر چلنے والے عذاب سے بچ جائیں گے۔ ان پر عذاب ضرور ہوگا۔

تحلیلِ اجزاء وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ الخ - یہ آیت اور سورۂ لقمان و احزاب کی وہ آیات جن میں والدین کا حکم شرک آفریں ماننے کی ممانعت ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کے حق میں نازل ہوئیں۔ حضرت سعد ان چند بزرگ ہستیوں میں سے ایک تھے جن کو سبقت فی الاسلام کا شرف حاصل تھا اور جو عشرۂ مبشرہ میں داخل تھے۔ آپ اپنی ماں حمنہ کی خدمت بہت زیادہ کرتے تھے اور ماں بھی اپنی دوسری اولاد سے آپ کو بہت زیادہ چاہتی تھیں۔ جب آپ مسلمان ہو گئے اور ماں کو اطلاع ہوئی تو وہ ناراض ہوئی اور کہنے لگی تو باپ دادا کے مذہب سے پھر گیا۔ واللہ جب تک اسلام سے نہ پھرے گا میں کھاؤں گی نہ پیوں گی نہ سایہ میں بیٹھوں گی یوں ہی مر جاؤں گی تاکہ عمر بھر تو مطعون و نالائق رہے اور لوگ تجھے ماں کا قاتل کہیں۔ چنانچہ ایک رات دن وہ اسی حالت پر رہی۔ حالت بگڑنے لگی، دوسرے دن بھی بھوک ہڑتال قائم رکھی۔ آخر لوگوں نے زبردستی منہ چیر کر حلق میں کچھ کھانا پانی ڈالا۔ مگر وہ ضد پر قائم رہی اور کہنے لگی سعد! کیا تجھے اللہ نے ماں کی فرماں برداری کا حکم نہیں دیا ہے تو میں تجھے حکم دیتی ہوں کہ اپنے سابق مذہب پر آجا۔ حضرت سعدؓ نے یہ فتنہ بارگاہِ رسالت میں عرض کیا اس وقت آیاتِ مذکورہ کا نزول ہوا۔ (رواہ مسلم و احمد و ابوداؤد و النسائی و الترمذی) معالم اور قرطبی میں اتنا

نازل ہوئی کہ سعد نے ماں کا کہنا نہ مانا اور فرمایا ماں! اگر تیری سو جانیں ہوں اور ایک ایک کر کے نکل جائیں تب بھی خدا کی قسم میں محمدؐ کی نبوت و ہدایت کا انکار نہ کروں گا۔ اب تیرا دل چاہے کھا چاہے نہ کھا۔ یہ سن کر والدہ مایوس ہو گئی اور بالآخر کھانے پینے لگی۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ اللہ کا قطعی یقینی حکم ہے کہ والدین کے ساتھ دنیوی معاملات میں اچھا سلوک کیا جائے (خواہ وہ کافر ہوں یا مسلم) لیکن اگر وہ شرک و کفر کے لئے کہتے ہوں یا اصرار سے کہیں تو ہرگز نہ ماننا چاہیے۔

آیت مذکورہ میں اور سورۂ لقمان اور نساء کی بعض آیات میں نیز صحیح احادیث میں اطاعتِ والدین کا حکم دیا گیا ہے، اس لئے اہلِ علم نے صراحت کی ہے کہ ماں باپ کی نافرمانی گناہ کبیرہ ہے۔ علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ مالی سلوک اور جسمانی خدمت کے لحاظ سے والدہ کا حق مقدم ہے اور ادب و فرماں پذیری میں والد کا حق مرجح ہے۔

وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي الخ۔ یعنی اگر ماں باپ شرک کرنے کا حکم دیں اور ایسی چیز کو اللہ کا شریک بنوانا چاہیں جن کے شریک ہونے کا انسان کو علم نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ کا الوہیت و ربوبیت اور دیگر صفات میں کوئی شریک نہ موجود ہی نہیں اور نہ انسانی علم اس کے شریک کو جائز ثابت کر سکتا ہے۔ اس لئے اگر والدین شریک بنانے کا حکم دیں تب بھی ان کا حکم نہ مانا جائے۔ بلکہ حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ معصیتِ خالق کے ہر معاملہ میں کسی مخلوق کا کوئی حکم قابلِ پذیرائی نہیں۔ حضور نے فرمایا تھا لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق اور شرک تو سب سے بڑا گناہ ہے۔ پھر ماں باپ ہوں یا کوئی اور کسی کے کہنے سے اللہ کا شرک کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ الخ۔ صالحین کے گروہ چار ہیں (۱) انبیاء، صدیقین، شہداء، مومنین کاملین۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور ایمان پر قائم رہے یعنی اللہ کے حکم کے مقابلے میں دوسرے کے حکم کی پرواہ نہ کی اور نیک کام کئے۔ معصیتِ خالق میں کسی مخلوق کی اطاعت نہ کی۔ ایسے لوگ قیامت کے دن زمرۂ صالحین میں داخل و شامل کئے جائیں گے۔ کم از کم اولیاء کے ساتھ شامل ہوں گے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ الخ۔ بعض دیہاتی دوسروں کی دیکھا دیکھی یا کسی خاص غرض کو پیشِ نظر رکھ کر مسلمان ہو جاتے ہیں۔ مسلمان ہونے کے بعد اگر اس سال ان کی بیویوں کی نرینہ اولاد ہوتی یا مویشی کی نسل بکثرت ہوتی یا نخلستان کی فصل اچھی ہوتی یا کوئی اور دنیوی فائدہ ہوتا تو کہتے یہ دین مبارک ہے اور اگر تقدیر سے لڑکی ہوتی یا فصل خراب ہو گئی یا نسل میں کمی ہو گئی تو منحوس سمجھ کر مرتد ہو جاتے۔ اسی طرح بعض لوگ بے دلی سے مسلمان تو ہو جاتے، لیکن جہاں دشمنانِ اسلام کی یورش کا خطرہ ہوا یا افلاس و فقر کا حملہ ہوا یا کوئی اور سختی جھیلنی پڑی فوراً منہ موڑ کر چل دیتے اور اسلام کے حلقے سے نکل جاتے اور مسلمان ہونے کو نزولِ مصائب کا موجب قرار دینے لگتے، لیکن اگر کسی طرف سے مالِ غنیمت آیا یا مسلمانوں کی ترقی کی کوئی راہ دکھائی دی فوراً مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو جاتے اور کہنے لگتے ہم بغیر کسی شک کے تمہارے ساتھ ہیں۔ ایمان کی قوت اور کمزوری خلوص اور نفاق برداشتِ مصائب کی ہمت اور بزدلی سے خدا ہی واقف ہے، وہی دلوں کے اسرار کو جانتا ہے۔ مومنین مخلصین اور اہلِ نفاق اس کی نظر میں ممتاز ہیں، لیکن مسلمانوں کو مطلع کرنے کے لئے اس نے ایمان کی کمزوری اور نفاق کی علامات آیاتِ مذکورہ میں بیان فرما دیں تاکہ تمام اہلِ ایمان پرکھ سکیں اور اہلِ نفاق سے پرہیز رکھیں۔ منافقوں کے ضعفِ ایمانی کا اثر مخلص مسلمانوں کے دلوں تک نہ پہنچنے پائے اور منافقوں کو بھی تنبیہ ہو جائے۔ وہ بھی جان لیں کہ اللہ ہمارے پورے حال سے واقف ہے۔ ہماری کوئی چال اور نیت اس سے چھپ نہیں سکتی۔

فَإِذَا أُوذِيَ فِي اللَّهِ الخ یعنی جب کسی ضعیف الایمان مسلمان یا بدباطن منافق کی مخالفت اس کے شیطانی دوست کرتے ہیں اور راہِ اسلام میں کچھ دکھ پہنچتا ہے تو وہ مرتد ہو جاتا ہے اور اپنی جہالت و حماقت کی وجہ سے خلق کی طرف سے اندیشۂ ایذاء کو اس عذابِ الٰہی کے برابر قرار دے لیتا ہے جو قیامت کے دن اہلِ کفر پر مسلط ہو گا۔ حاصل یہ کہ دنیوی مال و ثروت کے لئے تو بڑی بڑی تکلیفیں اٹھاتا ہے، لیکن راہِ اسلام میں شیطانی دوستوں کے فتنہ میں پڑ کر اللہ کی طرف سے منہ موڑ لیتا ہے اور دنیاوی فقر و مصائب کو آخرت کے عذاب کا ہم پلہ سمجھتا ہے۔

وَلَئِن جَاءَ نَصْرٌ مِّن رَّبِّكَ لَيَقُولُنَّ إِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ۔ یعنی اگر مسلمان ہونے کے بعد روزی میں فراخی، دولت میں اضافہ، پیداوار میں کثرت، نسل میں افزونی یا کسی اور قسم کا فائدہ ہوا یعنی مسلمانوں کی فتح کی خبر کہیں سے آئی یا مالِ غنیمت آیا تو مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ہم پہلے سے تمہارے ساتھ ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ ہمارا تمہارا گروہ ایک ہے۔ گویا وہ خدا کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ خدا تعالیٰ اس عمل اور خیال کے رد میں فرماتا ہے۔

أَوَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِمَا فِي صُدُورِ الْعَالَمِينَ ۝ کیا اللہ کو کائنات کے اسرارِ سربستہ اور مخلوق کی مخفی باتوں کا علم نہیں ہے؟ ہے اور ضرور ہے۔ پھر مسلمانوں کو فریب دینے کے لئے دنیوی لالچ کو پیشِ نظر رکھ کر گروہِ اسلام میں شمول کا دعویٰ بے سود ہے۔

ایک شبہ: سورۂ عنکبوت مکی ہے اور مکہ میں منافق نہ تھے۔ یا خالص مومن تھے یا کافر۔ نفاق پر آمادہ کرنے والی چیز یا لالچ ہے یا خوف اور مکہ میں مسلمانوں

کے پاس نہ مال افغانہ دولت کی فراواں تھی جس کا لالچ ہوتا نہ رعب کی طاقت تھی جس کا خوف ہوتا۔ پھر اس جگہ اہل نفاق کا تذکرہ کیا معنی رکھتا ہے؟

ازالہ۔ (۱) ہوسکتا ہے کہ باقی سورت کی تو مگر یہ آیات مدنی ہوں۔ کیونکہ قرآن پاک کا استقراء کرنے کے بعد اہل تحقیق اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ پوری سورت کوئی بھی کی یا مدنی نہیں ہے۔ سوا ان چھوٹی چھوٹی سورتوں کے جن کی آیات بہت ہی قلیل تعداد میں ہیں۔

(۲) ہوسکتا ہے کہ بطور پیشین گوئی خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کرنے کے لیے آگاہ کر دیا ہو کہ مدینہ میں پہنچ کر تمہارے اندر قوت پیدا ہوگی، چاروں طرف سے مال غنیمت آئے گا تو ایک گروہ منافقوں کا بھی کو بار ہو جائے گا جس کا طریق عمل یہ ہوگا

(۳) آیات میں بیان ان منافقوں کا نہیں ہے جو مدنی زندگی کی پیداوار تھے بلکہ مکہ میں ہی بعض ضعیف الایمان دیہاتی ایسے آ گئے تھے جو اسلام کی سادگی اور صداقت کو دیکھ کر مسلمان تو ہو جاتے تھے مگر ان کے دلوں میں ایمان جمتا نہ تھا۔ حرث و نسل کی طلب ان کے دلوں سے ایمان کو نکال دیتی اور مال و متاع کی افزونی مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہونے پر آمادہ کر دیتی تھی چونکہ ان کے ایمان پختہ نہ تھے اور اسلام سے مقصود صرف دنیوی لالچ ہوتا تھا جس کو نصر من اللہ فرمایا گیا ہے، اس لئے ان کی حالت کمزور اور عدم استقلال میں اہل نفاق سے کم نہ تھی۔

(۴) آیت میں کسی خاص گروہ یا خاص شخص کا بیان نہیں ہے بلکہ بطور مثل مسلمانوں کو متنبہ کرنے کے لئے بیان کیا ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ زبانوں سے ایمان کا اقرار کرتے ہیں اور دکھ پڑتا ہے تو اس سے ایسے بھاگتے ہیں جیسے عذاب الٰہی سے بھاگنا چاہیئے۔ مراد یہ ہے کہ تم کو ایمان میں پختہ ہونا چاہیئے۔ کہیں دنیوی مصائب سے تنگ ہو کر ڈگمگا نہ جانا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الخ۔ نضر بن حارث اور بعض دوسرے کافر سردار مکہ کے غریب مسلمانوں کو اسلام سے روکتے اور موروثی مذہب کی طرف بلاتے تھے لیکن مسلمانوں کے دلوں میں عذاب الٰہی کا خوف سما چکا تھا، اس لئے اسلام سے مرتد کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ امر ضروری تھا کہ آئندہ عذاب کی طرف سے مسلمانوں کو مطمئن کر دیا جائے، اس لئے کہتے تھے کہ قیامت اور اس کا عذاب کہاں رکھا ہے اور اگر بالفرض پیش بھی آئے گا تو ہم تمہارا بار خود اٹھالیں گے تم کو تکلیف نہ ہونے دیں گے۔ لہٰذا تم بے کھٹکے اسلام کو چھوڑ دو۔ اس قول کا مفہوم خدا تعالیٰ نے ان آیات میں بیان فرما دیا ہے پھر ان بدخود غلط کافروں کے قول کا رد بھی فرمایا ہے

وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ یعنی دوسروں کے گناہوں کو اپنے اوپر اٹھانے کا دعویٰ کرنے والے کفار قیامت کے دن ذرہ برابر دوسروں کے گناہوں کو اس طور پر نہ اٹھا سکیں گے کہ سب بار اپنے اوپر لے کر اصل خطا کاروں کو سبکدوش کر دیں۔ ہاں یہ ضرور ہوگا کہ جن کو گمراہ کیا ہے

وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ الخ۔ ان کا بار بھی ان گمراہ کرنے والوں پر ڈالا جائے گا۔ دونوں گروہ سزایاب ہوں گے۔

حضور اقدس ﷺ نے ہرقل شاہ روم کو جو نامہ مبارک بھیجا تھا اس میں تحریر فرمایا تھا کہ اگر تو نے میری ہدایت سے منہ موڑا تو تجھ پر تیری غریب رعایا کی گمراہی کا بوجھ بھی ہوگا جتنا ان میں سے ہر ایک پر ہوگا۔ ان سب کا مجموعہ تیرے اوپر قیامت کے دن ہوگا (کیونکہ ہدایت و ضلالت میں وہ تیرے تابع اور پیرو ہیں۔ تو ہدایت پر ہوگا تو وہ بھی ہدایت پر ہوں گا تو وہ بھی ہدایت پر آجائیں گے تو گمراہی پر جما رہے گا تو وہ بھی جمے رہیں گے۔ درحقیقت ان کا گمراہی پر جمنا تیری وجہ سے ہوگا۔ لہٰذا تجھے ان سب کا بار اٹھانا پڑے گا۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے **كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ** الحدیث یعنی تم میں سے ہر شخص سے قیامت کے دن اس کے زیر دستوں کی ہدایت و ضلالت اور نیکی و بدی کے متعلق بازپرس ہوگی کیونکہ تم ان کے سرپرست اور نگراں ہو۔ ان کی (اچھائی) برائی تمہاری ذات سے وابستہ ہے اور جب دنیا میں تم ان کے پیشوا ہو وہ تمہارے پیرو ہیں تو آخرت میں بھی تم ان کے پیشوا اور وہ تمہارے پیرو ہوں گے۔ ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی کار خیر کو جاری کرتا ہے اُس کو اپنے نیکی کرنے کا بھی اجر ملے گا اور ان تمام لوگوں کی مثل بھی ثواب ملے گا جو اس طریقۂ خیر پر قیامت تک چلیں گے اور جو دنیا میں بُرا طریقہ جاری کرے گا اس پر اپنی بدکاری کا وبال بھی ہوگا اور ان لوگوں میں سے ہر ہر فرد کی برابر بھی وبال جو اس طریقہ پر قیامت تک چلیں گے، مگر اول صورت میں نیکوکاروں کے اجر میں سے کوئی حصہ کم نہ کیا جائے گا اور دوسری صورت میں بدکاروں کی سزا میں بھی کوئی تخفیف نہ کی جائے گی۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ جب کسی شخص نے کسی کو ظلماً قتل کیا تو قاتل کے گناہ کی برابر آدمؑ کے سب سے اول بیٹے پر بھی گناہ ہوگا کیونکہ ناحق قتل کرنے کا طریقہ اسی نے ایجاد کیا ہے۔

مقصودِ بیان دنیوی معاملات میں ماں باپ سے حسن سلوک کرنا واجب ہے۔ مالی امداد اور جسمانی خدمت لازم ہے اگرچہ وہ کافر ہوں، لیکن کسی گناہ کے کام میں خصوصاً شرک و کفر کی تعلیم و اعتراف کو ماں باپ کا حکم نہ ماننا ضروری ہے خواہ کتنا ہی اصرار سے وہ حکم دیں اور گمراہ کرنے

کی ظاہر کریں۔ ومِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ الخ سے بطور اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی سچی محبت اور رسول کی اطاعت کا دعویٰ کرنے والا ہمیشہ ایمان کے ساتھ شریعت وسنت پر قائم رہتا ہے۔ اس معاملہ میں کسی شیطانی دوست کے طعن وتشنیع کی پرواہ نہیں کرتا ہاں لیکن اگر اس نے کسی شیطانی ملامت کا اثر لیا اور طریق سنت پر چلنے میں سستی کی تو وہ محبت کے دعوے میں جھوٹا ہے۔ اللہ کے معاملہ میں کسی مخلوق کے افعال واقوال اور تعلقات کی پرواہ نہیں ہوتی۔ اس کی نظر اللہ کے مقابلہ میں تمام مخلوقات کی خوشنودی کو رائی کے دانے سے بھی زیادہ حقیر سمجھتی ہے۔ پس اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے اس جاہل مدعی اسلام گروہ کو جو معمولی تعلقات کے نباہنے اور دنیوی شرم کا بہانہ کرکے طریق سنت سے روگرداں ہو جاتا ہے اور رسم ورواج کے جال میں پھنس کر اپنی مجبوری ظاہر کرکے کہتا ہے کہ دنیا مجھے نہیں کرنے دیتی کیا کروں۔ بیوی بچوں اور دوستوں سے مجبور ہوں، جانتا ہوں کہ یہ کام اچھا نہیں، مگر آخر دنیا میں رہ کر دنیاداری کرنی پڑتی ہے۔ دنیوی لالچ کے لئے مسلمان ہونا قابل قبول نہیں۔ جب تک دل میں ایمان پختہ نہ ہو مؤمن نہیں کہا جا سکتا۔ قیامت کے دن کوئی کسی کا گناہ اپنے اوپر اٹھا کر اس کو سبکدوش نہیں کر سکتا۔ اس کے خلاف دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ گنہگار کو شفاعت کرکے اللہ سے معافی کا حکم دلایا جائے گویا گنہگار کو سبکدوش کرا دیا جائے، مگر گناہ اپنے اوپر نہ لے جائیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دوسروں کے گناہوں کا بار اپنے اوپر لیا جائے، مگر ان پر بوجھ قائم رہے۔ ان دونوں صورتوں کا تحقق ہوگا۔ آیت مذکورہ سے اس کی نفی نہیں ہوتی۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ

ہم نے نوح کو ان کی قوم کے پاس بھیجا　وہ قوم والوں میں پچاس کم ایک ہزار برس کے رہے　پھر ان لوگوں کو طوفان نے پکڑ لیا

وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ○ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ

کیونکہ وہ ظالم تھے　ہم نے نوح کو اور کشتی والوں کو بچا لیا　اور دنیا جہان والوں کے لئے اس قصہ کو نشان قدرت بنایا　اور ابراہیم کو بھی ہم نے بھیجا

لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ

جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو　اللہ کے سوا تم محض　بتوں کی

دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ

پرستش کرتے ہو　اور جھوٹی باتیں تراشتے　ہو　اللہ کے سوا جن کی تم پرستش کرتے ہو　وہ تمہیں　روزی دینے کا　اختیار نہیں

رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ وَاِنْ

رکھتے　پس اللہ کے ہاں سے　روزی طلب کرو　اور اس کی عبادت کرو اور اس کا شکر کرو　اسی کے پاس تم کو لوٹ کر جانا ہے　اور اگر تم

تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○ اَوَلَمْ يَرَوْا

جھٹلاؤ گے تو تم سے پہلے بہت سی امتیں جھٹلا چکی ہیں　رسول کے ذمہ تو بس کھول کر پہنچا دینا　ہے　کیا انہوں نے نہیں

كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ○ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ

کیونکر اللہ ابتداءً مخلوق کو پیدا کرتا ہے پھر کس طرح دوبارہ پیدا کرے گا بلاشبہ یہ بات اللہ پر آسان ہے　(اے نبی) تم کہہ دو کہ ملک میں چل پھر کر

فَانْظُرُوا كَيْفَ بَدَأَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ يُنْشِئُ النَّشْأَةَ الْآخِرَةَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

دیکھو کہ اللہ نے کس طرح ابتداءً مخلوق کو پیدا کیا پھر اللہ ہی پچھلی بار پیدا کرے گا یقیناً اللہ سب کچھ کر سکتا ہے

يُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ وَيَرْحَمُ مَنْ يَشَاءُ ۖ وَإِلَيْهِ تُقْلَبُونَ ○ وَمَا أَنْتُمْ بِمُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ

جس کو چاہے گا سزا دے گا اور جس پر چاہے گا رحم فرمائے گا اسی کے پاس تم سب کو پلٹ کر جانا ہے تمہارا بس نہ زمین میں چل سکتا ہے

وَلَا فِي السَّمَاءِ ۖ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ○ وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللّٰهِ

نہ آسمان میں اور اللہ کے سوا نہ تمہارا کوئی حمایتی ہے نہ مددگار اور جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں کا اور اس کے

وَلِقَائِهِ أُولٰئِكَ يَئِسُوا مِنْ رَحْمَتِي وَأُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○

پاس جانے کا انکار کیا وہی میری رحمت سے ناامید ہو گئے اور انہی کے لئے دردناک عذاب ہے

تفسیر انسان ضعیف البنیان انسان پست اور کمزور حالت سے ترقی کر کے بلندی اور قوت کے اس اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں اس کو اپنے سوا کوئی نظر نہیں آتا طفل شیر خوار، پہلوان زماں اور نادار فاقہ مست انسان قارون دوراں بن جاتا ہے۔ ادنیٰ اقلی شہنشاہ اور ذلیل فقیر امیر عالی جاہ بن جاتا ہے۔ انسان کی ترقی یہ علو یہ برتری ممنون کوشش اور نتیجہ محنت نہیں ہوتی بلکہ ہمہ گیر قدرت کا ادنیٰ کرشمہ اور ربوبیت عامہ کا واضح مظاہرہ ہوتا ہے۔ احوال کا اقتضاء تو یہ ہوتا ہے کہ ہالادست پر مجبورت انسان غیبی انعامات اور بلا معاوضہ قدرتی احسانات کے سامنے جھک جاتا اور اپنی ترقی یافتہ حالت کو دیکھ کر اپنی فطری اصلی کمزوری پر غور کرتا اور بجائے سر تفاخر بلند کرنے کے اس واحد بے ہمتا اور قادر یگانہ کے سامنے سر نیاز خم کر دیتا جس نے پست ترین درجہ سے نکال کر قوت و سطوت کی بالائی منزل پر پہنچایا، لیکن وہ حرکاوہ ایسا نہیں کرتا جس قدر طاقت ،صحت، دولت اور عزت و حکومت میں وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اس کو اپنی ذاتی قوت دماغی اور عقلی کمال کا دعویٰ ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنی ہمہ دانی، ہمہ گیری اور ہمہ آفرینی کے جھوٹے خیال میں مست ہو کر خالق سے منہ موڑتا اور معبود سے رشتہ توڑ لیتا ہے۔ عبدیت کے دائرہ سے نکل کر عموماً الوہیت کا اظہار کرنے لگتا ہے لیکن اس سے بڑھ کر زیادہ قابل افسوس اور حیرت آفریں یہ بات ہوتی ہے کہ جس مغرور نخوت پرست انسان کا عجب آگیں سر خالق السموات والارض کی بارگاہ میں نہیں جھکتا۔ وہ انسانیت کبریٰ کی اس قدر تذلیل کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے کہ پست ترین درجہ کے عناصر جمادی، نباتی اور حیوانی کائنات فضائی اور سماوی مخلوقات کے سامنے سر بسجود ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ فطرت رکھنے والا ادنیٰ ہستیوں کو اپنا مسجود و معبود بنا لیتا ہے۔ چاند، سورج، دوسرے سیارے، آگ، پانی، خوبصورت پتھر، بلند قامت تناور درخت اور تعجب آفریں جانور اور اشرف الکائنات انسان کو اپنے سے بالاتر او حامل الوہیت نظر آنے لگتے ہیں۔ الٰہ المطلق سے منہ موڑنا اور ادنیٰ مخلوق کو خالق و رزاق سمجھ کر اس سے رشتہ جوڑنا یہ معقول فعل فطرت کو قلب کرنے والے اور نیچر کو الٹ دینے والے ہوتے ہیں، مگر اقتضائے فطرت کے خلاف محسوس پرستی کا فدائی اور مرئیات کا شیدا اپنے ضمیر، دماغ، اچھے ذہنی قویٰ، اپنی روح اور اپنی فطرت اعلیٰ کو قربان کر دیتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

کسی کے آنے سے ساقی کے ایسے ہوش اڑے
شراب سیخ پہ ڈالی کباب شیشہ میں

جوتی کو ٹوپی کی جگہ اور ٹوپی کو جوتی کی جگہ استعمال کرنے والے بے وقوف جاہل انسان باوجود اس قدر جہالت اور علمی بے مائگی کے اپنے خلا اور معارف میں بے مثال سے بہت بلند سمجھا ہوتا ہے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ اس کے صندوقوں میں چاندی اور سونے کے انبار، بدن میں رگوں میں سرخ سیال خون کا بکثرت دوران اور ملک میں طوی تسلط ہوتا ہے۔ صحت و دولت کی ہوتی جب ایک غلط انداز نظر سے اس کو دیکھ لیتی ہے تو وہ اتنا خماریوں کے نشہ سے ایسا بدمست ہو جاتا ہے کہ خون کی جگہ شراب اس کی رگ رگ میں دوڑنے لگتی ہے۔ ہل من مبارز کی آواز ہر وقت بلند کرتا اور انا ولا غیری کا دعویٰ ہر آن جاری رکھتا ہے۔ طغیان کی اس حد تک جب انسان پہنچ جاتا ہے تو اسی کی قوم میں سے کسی برگزیدہ با صفا آدمی کو خدا تعالیٰ مورد وحی اور مہبط اسرار بنا کر مذکورہ بالا بدمست انسانوں کا شکر ہوش اتارنے کے لئے مامور فرماتا ہے، لیکن روح

کی صفائی قلب کا نور اور آفتاب صداقت کی کوئی کرن چمکدار کیوں نظر نہیں آ سکتی۔ گمراہ انسان باوجود دنیاوی رعونت کے بھی تباہی کے غار میں گرا دینے والے راستہ پر چلنا نہیں چھوڑتا انبیاء کرام کی ذاتی ہستی کی مالی کمزوری اس کی نظر میں معیار ذلت قرار پاتی ہے۔ پر جبروت انسان کی بارگاہ میں ذلیل انسان کی رسائی کیونکر ممکن ہے۔ مرسلین کی آواز بے صدا ثابت ہوتی ہے۔ بالآخر زہر کھانے کا نتیجہ ہلاکت ہونا لازمی ہے۔ آگ میں گھسنے کا اثر سوختگی ضروری ہے۔ اتمام حجت ہو چکتا ہے، وقت آ جاتا ہے، قدرت کا پیمانہ تحمل چھلکنے لگتا ہے۔ دست خبیث انسان کی نجاست سے سطح زمین کو پاک کر دیا جاتا ہے۔ اسی مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے آیات مذکورہ میں حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کے احوال کا تذکرہ فرمایا ہے اور کفار مکہ کو بلکہ کفار عالم کے لئے حامل العبرت درس نصیحت دیا ہے۔

تحلیل اجزاء

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖ الخ۔ ابتدائی آیت میں مصائب پر صبر رکھنے اور اشاعت اسلام میں جدوجہد کرنے کی ہدایت تھی جس سے مفہوم ہو رہا کامرانی و غلبہ و تسلط کا وعدہ بھی مترشح ہو رہا تھا۔ ان آیات میں اس جگہ سے حضرت موسیٰ کی قوم کے تذکرے تک گزشتہ اہل ایمان کی جفاکشی، صبر، استقامت اور کافروں کے مظالم، غرور، سفاکی اور بے دریغ ستم رانی کی تصویر کشی کر کے انجام کار اہل حق کی عزت اور عمومی کامرانی کی صراحت فرمائی ہے تاکہ کافروں کو تنبیہ ہو جائے کہ اگر وہ مسلمانوں کے آزار کے درپے اسی طرح رہے اور ظلم و ستم سے باز نہ آئے اور سچے دل سے مسلمان نہ ہوئے تو ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو گزشتہ اعدائے اہل کا ہوا۔ اس سے مسلمانوں کو صبر کی تلقین برداشت مصائب کی حوصلہ افزائی اور انجام کار کامیابی کی بشارت دینی بھی مقصود ہے۔ اس آیت میں صراحت ہے کہ طوفان سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی عمر نو سو پچاس (۹۵۰) برس تھی۔ لیکن طوفان کے بعد آپ کتنے زمانہ تک زندہ رہے؟ اس کی کوئی وضاحت نہیں فرمائی۔ ابن عباسؓ کا قول مروی ہے کہ طوفان کے بعد ساٹھ برس زندہ رہے اور آپ کی باقی اولاد سام، حام، یافث کی نسل ہی پھیلی۔ ابن کثیر نے اسی قول کو قریب صحت قرار دیا ہے۔ عکرمہ کا قول ہے کہ حضرت نوح کی عمر سترہ سو برس کی ہوئی۔ یہ قول مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔ عوف بن شداد کی روایت کے موافق سولہ سو پچاس (۱۶۵۰) برس کی عمر ہوئی۔ تین سو پچاس سال کی عمر میں نبوت ملی اور نو سو پچاس سال تبلیغ کی۔ ساڑھے تین سو برس طوفان کے بعد زندہ رہے۔ یہ قول صراحت قرآن کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن میں طوفان سے قبل کل مدت نو سو پچاس برس خواہ حالت نبوت میں ہو یا نبوت سے پہلے ظاہر فرمائی گئی ہے۔ صرف مدت تبلیغ نو سو پچاس برس نہیں قرار دی ہے۔ ابو سعود نے فرمایا حضرت نوح کی کل عمر ۱۲۵۰ سال ہوئی۔ طوفان سے قبل ایک ہزار سال اور طوفان کے بعد ۲۵۰ سال زندہ رہے۔ یہ قول بھی صراحت قرآنی کے خلاف معلوم ہوتا ہے کیونکہ طوفان سے قبل ایک ہزار سال کی عمر ہونے کی اس میں صراحت ہے اور قرآنی صراحت ۹۵۰ برس کی ہے۔ لہٰذا اول الذکر قول جس کو ابن کثیر نے ترجیح دی ہے زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے واللہ اعلم۔

توریت سفر الخلیقۃ کے پانچویں اور چھٹے باب کے مطالعہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوح کی عمر ۹۵۰ برس کی ہوئی۔ جہاں مختلف اشخاص کی عمریں بتائی ہیں وہاں حضرت نوح کی عمر کی بھی صراحت کی۔ ہم بعینہ عبارت نقل کرتے ہیں۔ وھو ہذا:۔

آدم کی عمر ۱۳۰ برس کی ہوئی تو اس کا بیٹا سیت (شیث) پیدا ہوا۔ شیث کی ۱۰۵ برس کی عمر میں انوس پیدا ہوا۔ سیت کی کل عمر ۹۱۲ برس کی ہوئی۔ ۹۰ برس کی عمر میں انوس سے قینان پیدا ہوا۔ انوس کی کل عمر ۹۰۵ برس کی ہوئی۔ ۷۰ برس کی عمر میں قینان کے محلل ایل، محلل ایل کے یارد پیدا ہوا۔ محلل ایل کی عمر ۸۹۵ برس کی ہوئی۔ ۱۶۲ برس کی عمر میں یارد کے حنوک پیدا ہوا یارد کی عمر ۹۶۲ برس کی ہوئی۔ ۶۵ برس کی عمر میں حنوک کے متوسلح پیدا ہوا جبکہ حنوک کی عمر ۳۶۵ برس کی ہوئی۔ حنوک کو خدا نے لے لیا اور وہ غائب ہو گیا۔ متوسلح ۱۸۷ برس کا تھا کہ اس سے ملک پیدا ہوا۔ متوسلح کی کل عمر ۹۹۹ برس کی ہوئی۔ ۱۸۲ برس کی عمر میں ملک سے نوح پیدا ہوا۔ ملک کی کل عمر ۷۰۰ برس کی ہوئی۔ ۵۰۰ برس کی عمر میں نوح سے سام، حام، یافث پیدا ہوئے نوح کی عمر ۶۰۰ برس کی تھی کہ طوفان آیا اور طوفان کے بعد نوح ساڑھے تین سو برس زندہ رہا۔ نوح کی پوری عمر ۹۵۰ برس کی ہوئی۔ گویا صراحت توریت کے موافق حضرت نوح کی عمر جس وقت چھ سو برس کی تھی اس وقت طوفان آیا تھا، لیکن قرآن کی صراحت کے بموجب جب ساڑھے نو سو برس کی عمر تھی اس وقت طوفان آیا تھا۔ توریت نے اگرچہ ساڑھے نو سو برس کی عمر ہونے کا اقرار کیا ہے مگر اس میں طوفان کے بعد کی عمر کو بھی شامل کر لیا ہے۔ مگر قرآن نے مدت قبل از طوفان کی ظاہر کی ہے اور طوفان کے بعد کی عمر کچھ نہیں بتائی۔ ممکن ہے قرآن کی آیت فَلَبِثَ فِیْهِمْ الخ کا مطلب بھی یہ ہو کہ طوفان سے پہلے اور طوفان کے بعد کی کل عمر ۹۵۰ برس ہوئی۔ حاصل ارشاد قرآنی یہ ہے کہ نوح ساڑھے نو سو برس تک [illegible] مہلت [illegible] طرف بلاتے رہے [illegible] وعظ کے ذریعہ سے ڈرایا، بدکاروں کو نیک اعمال کرنے کی نصیحت کی لیکن بدکاروں نے نہ مانا۔ بے حیائی پر قائم رہے۔ انجام کار طوفان عظیم آیا اور سب ظالموں کو [illegible] آگ میں [illegible] گیا۔ صرف نوح اور ان کے ساتھی کشتی میں سوار ہونے والے (اہل ایمان اور ہر نوع کے جانوروں کا ایک جوڑا) محفوظ رہے۔ [illegible]

[illegible] حضرت نوح کی بیوی کافرہ تھی اس کو بھی غرق کر دیا گیا۔ بعض اہل بصیرت نے جو اس کو گروہ ناجیہ میں داخل کیا ہے غلطی کی ہے۔

[illegible] قصہ کی غرض [illegible] کہ نوح نے اتنی طویل مدت تک تبلیغ کی اور [illegible] سیکڑوں برس کا فروں [illegible] لیکن راہ حق سے منہ موڑا۔ چند بزرگ مسلمان ہوئے تھے

تو اس کے متعلق ہو کہ اللہ مختارِ کل ہے مجبور و مضطر نہیں وہ جس بداعمال کو چاہے گا عذاب دے گا اور جس کو چاہے گا معاف کر دے گا۔ یعنی اگر خدا بداعمال شخص کو سزا دینے پر مجبور ہو جائے تو مختار نہ رہے گا اور یہ کمال قدرت کے منافی ہے۔ ہاں انسان مختارِ مطلق نہیں اس کو اپنے مرکز کی طرف لوٹ کر جانا ضرور پڑے گا۔

وَمَآ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ الخ۔ یعنی اگر یہ اعتقاد ہو کہ قیامت کے دن اللہ سے زبردستی کر کے آسمانی اور زمینی مخلوق کوئی کام کرا لے گی یا اس کو اقتدارِ مطلق سے روک دے گی تو اس کا امکان نہیں بلکہ تم کو اللہ نے ہر دو جگہ زمین و آسمان پر اقتدار و تصرف کامل طور پر ہے نہ سیارے نہ ستارے اور فرشتے اس کی منشاء کے خلاف کچھ کر سکتے ہیں نہ عناصر جمادات، نباتات اور دوسرے مظاہر کونیہ سرتابی کر سکتے ہیں۔ اللہ کے مقابلہ میں وہاں تمہارا کوئی کارساز مددگار اور حامی نہ ہوگا۔ یہی حماقت ہے کہ مجبور محض بے کس بے بس مخلوق کی پرستش کی جائے اور مختار کل قادرِ مطلق کارساز حقیقی خالق کی طرف سے منہ موڑ لیا جائے۔

وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ الخ۔ اوپر کی آیت میں فرمایا تھا کہ اللہ جس پر رحم کرنا چاہے گا رحم کرے گا کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ اس سے معلوم ہوا تھا کہ خدا فقط عذاب دینے پر ہی قادر نہیں ہے بلکہ رحم کرنے پر بھی قادر ہے۔ لیکن عذاب کس کو دیا جائے گا اور رحم سے فائدہ اٹھانے کا کس کو موقع ملے گا؟ اس کی تفصیل اس جگہ بیان نہیں کی۔ ہاں اس آیت میں بطور اخبار اس کو ظاہر کر دیا کہ جو لوگ آیاتِ الٰہیہ (توحید الوہیت و ربوبیت اور دیگر احکام قطعیہ) کے منکر ہیں خصوصاً اللہ کے پاس جانے اور قیامت بپا ہونے کو نہیں مانتے وہ لوگ اللہ کی رحمت سے مایوس ہیں یعنی ان کو اخروی رحمت کا خیال اس وقت ہوتا جب وہ دارِ آخرت کے قائل ہوتے اور خدا کو یگانہ بے ہمتا جانتے۔ جب وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک سمجھتے ہیں اور دوسروں کو اپنا کارساز مانتے ہیں اور آخرت کے قائل ہی نہیں ہیں تو ان کو رحمتِ الٰہی کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ کہ کافر چونکہ خود ہی رحمتِ خدا کے امیدوار نہیں ہوتے، اس لئے قیامت کے دن وہ رحمت سے مایوس ہی رہیں گے اور قطعاً بغیر شک و شبہ کے ان کو سخت ترین دکھ کی مار کھانی پڑے گی۔ جب اس آیت میں کافروں کے متعلق رحمت سے مایوس ہونے کی صراحت کر دی تو اس سے کافروں کے علاوہ دوسرے لوگ خواہ وہ نیکوکار ہوں یا بدکار (بشرطیکہ عقیدۃً مؤمن ہوں) ضرور امیدوارِ رحمت قرار پائے۔ اب یہ اللہ کا اختیار ہے کہ جس پر چاہے رحم فرمائے اور نہ چاہے نہ رحم فرمائے مگر کوفر کے علاوہ کسی کو اپنی رحمت سے مایوس نہیں فرمایا اسی مضمون کو ایک اور آیت میں بھی بصراحت ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغۡفِرُ اَنۡ يُّشۡرَكَ بِهٖ وَيَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِكَ لِمَنۡ يَّشَآءُ یعنی اللہ جرم شرک کو تو معاف نہیں کرے گا اور شرک کے علاوہ ہر گناہ جس شخص کو چاہے گا معاف کر دے گا۔

مقصودِ بیان

طوفان سے قبل حضرت نوح کی عمر ساڑھے نو سو برس کی تھی۔ قوم نوح اپنی بدکاری کے سبب طوفان سے ہلاک ہوئی تھی۔ کشتی میں سوار ہونے والے محفوظ رہے تھے۔ اللہ کا تحمل بہت ہی وسیع ہے۔ بدکاروں کو ڈھیل دی جاتی ہے بالکل آزاد نہیں چھوڑ دیا جاتا، اس لئے اگر بظاہر فوری طور پر بدکاروں کی گرفت نہ ہو تو مطمئن نہ ہونا چاہیئے بلکہ عذابِ الٰہی سے ہر وقت ڈرتے رہنا چاہیئے۔ ثابت قدم رہتے ہوئے یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ آخر کامیابی ہماری ہی ہوگی۔ حضرت ابراہیم کی قوم بت پرست اور بت تراش تھی۔ اِفۡكًا کا لفظ بتا رہا ہے کہ جن چیزوں کی وہ مورتیاں بناتے تھے وہ واقع کے خلاف بھی ہوتی تھیں اور ان کا عقیدہ بھی واقعیت و حقانیت سے خالی تھا۔ اللہ کے علاوہ کوئی بھی رازق نہیں نہ رزق دے سکتا ہے۔ لہٰذا طلبِ رزق اللہ ہی سے کرنی چاہیئے۔ چونکہ رزق کا لفظ ہر نعمت و راحت کو شامل ہے خواہ روحانی ہو یا جسمانی، علم و معرفت ہو یا قوانینِ زندگی یا کھانے پینے کی چیزیں یا پہننے کا لباس یا رہنے کے مکان یا عزت، حکومت اور دولت، اس لئے ہر شخص پر لازم ہے کہ اخلاقی معاشرتی سماجی سیاسی غرض پوری زندگی کے ضوابط و اصول کی طلب بھی بارگاہِ الٰہی سے کرے۔ یعنی اس کتاب پر عمل کرے جو اللہ نے دستور العمل بنا کر بھیجی ہو انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر (جبکہ وہ خدائی ضابطہ کے خلاف ہوں) عمل نہ کرے۔ علم و عرفان کی طلب بھی اللہ ہی سے کرے اور ان کے علاوہ جسمانی زندگی کے لئے جو چیزیں (لوازم و مناسبات) مطلوب ہوں ان کے حصول کے لئے بھی دستِ طلب خدا ہی کی طرف بڑھائے۔ خلق میں سے کسی کو کارساز معطی اور مالکِ عطا نہ سمجھے۔ فَابۡتَغُوۡا عِنۡدَ اللّٰهِ الرِّزۡقَ کے الفاظ اس پورے مقصد پر دلالت کر رہے ہیں۔ وَاعۡبُدُوۡهُ کے بعد وَاشۡكُرُوۡا لَهٗ فرمانا بتا رہا ہے کہ انسان کی تمام عمر کی عبادت بطور شکریہ ہونی چاہیئے۔ یہ سمجھ کر عبادت کرنی چاہیئے کہ اللہ نے جو انعام ہم پر کئے ہیں ہم اس کا شکر ادا کرنے کے لئے عبادت کرتے ہیں۔ عبادت سے اپنا استحقاق نہ سمجھ لینا چاہیئے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ ہماری یہ عبادت ہم کو یقینی طور پر نجاتِ آخرت یا دنیوی کامرانی کا مستحق بنا دیتی ہے۔ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ سے یہ امر ظاہر کرنا مقصود ہے کہ چونکہ آخرت میں لوٹ کر اللہ ہی کے پاس جانا ہو گا اور اصلی وہی ہے۔ اس کے سوا کائنات میں سے کسی چیز سے واسطہ نہ پڑے گا۔ لہٰذا اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی پرستش کرنی اور اس کو کارساز سمجھنا حماقت ہے۔ وَمَا عَلَى الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ سے یہ مطلب واضح ہوتا ہے کہ کافروں کی سرکشی سے نبی کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ رسول کا کام صرف رہنمائی ہے رہبری نہیں، لیکن رہبری غیر مبہم الفاظ میں کھول کر ہونا چاہیئے تاکہ سننے والے سمجھ جائیں۔ اسی لئے ہمارے آقا ہر شخص سے اس کی سمجھ کے موافق اور احوال کے موجب گفتگو فرماتے اور ہدایت کرتے تھے۔ جاہل بدوی غلام اور قریش کے سردار اعظم سب حضور کی گفتگو سے کافی طور پر مطلب سمجھ جاتے تھے۔ اَوَلَمۡ يَرَوۡا کے لفظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کا خلاق علی الاطلاق اور قادر بے مثال ہونا تو اتنا واضح ہے کہ اگر چاہو تو آنکھوں سے دیکھ لو اور قیامت کا امکان بھی بدیہی ہے پھر اس کا انکار کرنا گویا بدیہی مرئی اور محسوس کے وجود کا انکار کرنا ہے۔ وما یأتی عنہ الا المعرۃ المجنون۔ يُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ

دیزیمم من یشاء سے اللہ کے اختیار اور ارادہ کی ہمہ گیری ثابت ہو رہی ہے اور معلوم ہو رہا ہے کہ اعمال موجب تو انہیں مگر خدا پر کسی عمل کی جزا دینی واجب ہے بلکہ وہ مختار مطلق ہے جو چاہے کرے۔ وما انتم بمعجزین سے اللہ کی کامل قدرت کا اظہار اور تمام کائنات کا عجز بیان کرنا مقصود ہے تاکہ کافروں کے اس عقیدہ کا استیصال ہو جائے جس کی وجہ سے وہ مظاہر کو معبود قرار دیتے تھے۔ اولئک یئسوا سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ کافروں پر قیامت کے دن اللہ کی رحمت نہ ہوگی، وہ خود ہی حشر نشر کے قائل نہیں۔ خدا نے بھی ان کو اپنی رحمت سے دور ہی مایوس کر دیا۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا اقْتُلُوهُ أَوْ حَرِّقُوهُ فَأَنْجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ

سو ابراہیم کی قوم کا سوائے اس کے کوئی جواب نہ تھا کہ کہنے لگے اس کو مار ڈالو یا جلا ڈالو مگر اللہ نے اس کو آگ سے بچا لیا اس واقعہ میں ایمان رکھنے

لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ

کے لئے قدرت کی بڑی نشانیاں ہیں ابراہیم بولے کہ تم نے اللہ کے سوا بتوں کو صرف دنیوی زندگانی میں باہم محبت کرنے کے لئے خدا بنا رکھا ہے

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا وَمَأْوَاكُمُ النَّارُ

پھر قیامت کے دن تم میں بعض بعض کا انکار کر جاویں گے اور تم میں سے ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہوگا

وَمَا لَكُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ۝ فَآمَنَ لَهُ لُوطٌ ۘ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَىٰ رَبِّي ۖ إِنَّهُ هُوَ

اور اس وقت تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا پس ابراہیم پر لوط ایمان لے آئے اور کہنے لگے میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرتا ہوں بیشک وہ

الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ

غالب حکیم ہے ہم نے ابراہیم کو اسحٰق و یعقوب عطا کئے اور اُن کی نسل میں نبوت و کتاب مقدر

الْكِتَابَ وَآتَيْنَاهُ أَجْرَهُ فِي الدُّنْيَا ۖ وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ لَمِنَ الصَّالِحِينَ ۝

کی اور دنیا میں اُن کو اُن کا اجر دیا اور آخرت میں تو وہ بلاشبہ نیکوں میں سے ہوں گے

تفسیر

دنیا میں انسان تین طرح کے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جس کے اس گوشت، ہڈی اور کھال سے بنے ہوئے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں مختلف طبقات اور رنگوں سے بنی ہوئی آنکھیں بھی ان کے چہرے پر ہیں جن سے دیکھتے ہیں، لیکن ان ظاہری آنکھوں اور کانوں کے علاوہ ان کے پاس نہ اور کوئی طاقت دیکھنے والی ہے نہ سننے والی حواس کی عقلیں اندھی اور فہم و دانش کی طاقتیں بہری ہیں گویا ان کا باطن کو رو کر ہے ظاہر اگرچہ شنوا و بینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حق و باطل کی ہر آواز کو سنتے ہیں، مگر ندائے حق کا اثر ان کی باطنی قوت پر نہیں ہوتا کذب و صدق کی صورتیں ان کو ضرور نظر آتی ہیں، لیکن حق کی تصویر ان کی روحوں پر ثبت نہیں ہوتی۔ پس حقیقۃً وہ بہرے اور اندھے ہوتے ہیں۔ اب اگر ان کے کانوں میں وہ کلام ڈالا جائے جس کے سمجھنے کے لئے صداقت کیش دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ حقانیت کی کوئی ایسی تصویر دکھائی جاتی ہے جس کے دیکھنے کے لئے عقل کی آنکھوں کا وجود لازم ہوتا ہے تو ان کی سمجھ میں نہ کچھ آتا ہے نہ آنکھوں سے کچھ دکھائی دیتا ہے نہ کانوں سے کچھ سنائی دیتا ہے۔ اگر کچھ دکھائی دیتا ہے تو حق باطل کی شکل میں۔ اگر کچھ سمجھ میں آتا ہے تو وہمی وسواس کے رنگ میں۔ فہم و وہم کی ماہیت ہو حقیقت شک کی کیفیت میں اور اصلی جلوہ تمویہ کاری کے پردوں میں۔ بس یہی وجہ ہوتی ہے کہ وہ صاحب وحی کو دروغ گو، صادق کو کاذب، اہل حق کو باطل پرست، صاحب حقیقت کو حامل شک اور علمبردار صداقت کو ملمع ساز کہتے ہیں اور دلائل و براہین کا مقابلہ دھمکیوں اور تہدید سے کرنے لگتے ہیں۔ حضرت ابراہیم کی قوم بھی باطل کے انتہائی درجہ پر تھی، بطالت پرست تھی، ان کی روحیں مردہ، عقل افسردہ اور دل سنگ پر مردہ تھے۔ حضرت ابراہیم نے جب ان کو برہان اور عقلی دلائل سے سمجھایا تو بجائے اقرار حق اور تسلیم صداقت کے انہوں نے الٹی دھمکیاں دینی شروع کر دیں اور بجائے

اس کو مار ڈالو اس کو جلا ڈالو۔ وہ نہیں سمجھے کہ سچائی حق مار دینے سے مر جاتا ہے اور صداقت جلانے سے جل جاتی ہے یہ ان کی خام خیالی اور پراگندہ حالی تھی۔ اس گروہ اپنے مقصد کو پورا نہ کر سکے اپنی کوششوں میں ناکام رہے اور اللہ نے حضرت ابراہیم کو بچا لیا۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو ظاہری چشم و گوش تو اول گروہ کی طرح رکھتا ہے لیکن اس کی اندرونی حالت قدرے اس سے مختلف ہوتی ہے۔ اس کی باطنی آنکھوں میں کسی قدر بینائی ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کو حق کی روشنی کا ایک دھندلا انداز پرتو کبھی دکھ جاتا ہے۔ اس کے روحانی کانوں میں کچھ سننے کی طاقت ہوتی ہے جس کے سبب ندائے حق کی خفیف گونج کی کچھ آہٹ اس کو سنائی دے جاتی ہے لیکن یہ پرتو اور یہ ندا اپنی پوری کیفیات اور ساری رعنائیوں کو لے کر اس پر اثر انداز نہیں ہوتی کیونکہ اس کی باطنی نور تقبل کی پوری اثر پذیری کی طاقت و صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر وہ تمام علائق و عوائق سے ٹوٹ نہ جائے تو کسی اثر کو قبول کرنے کی ان سے امید کی جا سکے، لیکن ایسا ناممکن ہوتا ہے۔ دوستی کے روابط رشتہ داری کے عواطف شب جاہ اور دنیوی فوائد کے جذبات سنگ راہ بن جاتے ہیں اور وہ اپنے اندر ان تمام موانع کو مغلوب کرنے والی طاقت نہیں پاتے۔ اس لئے راہ حق پر گامزن ہونے کی ہمت نہیں کرتے۔ حضرت ابراہیم کی قوم کے بعض اشخاص کی یہی کیفیت تھی۔ ان کو پیام ابراہیم میں صداقت کا کچھ شائبہ محسوس ہوتا تھا، لیکن دنیوی تعلقات کے دواعی اور موانع قبول حق سے مانع ہوتے تھے۔ ایسے ہی لوگوں سے حضرت ابراہیم نے فرمایا تھا کہ قیامت کے دن تمہارے یہ تعلقات کام نہیں آئیں گے۔ آج کے دوست کل تم سے بیزار ہوں گے۔ وہاں کوئی حمایت نہیں کرے گا۔

تیسرا گروہ وہ ہے جو ظاہر میں چشم و گوش پہلے دونوں گروہوں کی طرح رکھتا ہے لیکن اس کی باطنی حالت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس کی دانش رسا چشم حقیقت بینا اور گوش ہوش شنوا ہوتے ہیں وہ جلوہ حق دیکھتا ہے تو اس کا عکس اپنی روحوں پر ثبت کر لیتا ہے، ندائے صداقت سن لیتا ہے تو اس گوش دل کے گوشوں میں جگہ دیتا ہے اور داعی حق کی آواز پر لبیک کہتا ہوا تمام موانع و عوائق کو ٹھکراتا ہوا، مصائب و آلام کو روندتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ اس گروہ میں سے حضرت لوط تھے جو ندائے ابراہیمی کو سن کر دوڑ پڑے، صداقت کا یقین کر لیا اور تمام روابط و علائق کو چھوڑ کر راہ حق میں نکل کھڑے ہوئے۔

تحلیل اجزاء

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا الخ۔ یعنی قوم ابراہیم کو ابراہیم کی بات کا کوئی جواب بن نہ پڑا۔ بس قتل کرنے اور جلانے کی دھمکی دینے لگے بلکہ ابراہیم کو جلانے کا انہوں نے مشورہ بھی کر لیا۔ مطلب یہ کہ اس بدبخت قوم پر اس نصیحت کا کچھ اثر نہ ہوا اس کے کہ وہ خیر خواہ کے دشمن ہو گئے۔ قتل کرنے اور جلانے کا مشورہ کرنے لگے بالآخر جلا دینے پر اتفاق رائے ہو گیا۔ ممکن ہے اس اتفاق کی وجہ یہ ہوکہ حضرت ابراہیم نے ان کو دوزخ کی آگ سے ڈرایا تھا، اس لئے ضد میں آکر آپ کو جلانے کی انہوں نے ٹھان لی۔ چنانچہ مدت تک لکڑیاں جمع کرتے رہے پھر ان کو آگ لگائی اور حضرت ابراہیم کو منجنیق میں بٹھا کر اس میں پھینک دیا۔ یہ منظر دیکھ کر کائنات کا ذرہ ذرہ لرز گیا۔ اللہ کا خلیل اور واحد خلیل کلمہ حق کہنے اور اعلان توحید کرنے کی پاداش میں آگ میں پھینکا جا رہا تھا، لیکن کسی کو چوں کرنے کی مجال نہیں تھی۔ حضرت ابراہیم پر مختلف فرشتوں نے درخواست کی کہ پروردگار سے نجات کی دعا کیجئے لیکن اللہ کا خلیل ایمان یقین اور رضیت کے اس مرتبہ پر پہنچ چکا تھا کہ اس وقت کائنات فرشی و عرشی میں سے کسی کی اس درجہ تک رسائی نہ تھی، اس لئے سوا خاموشی کے کچھ جواب نہ دیا۔ بالآخر ایمان کا امتحان ختم ہوا اور ابتلاء گزر گیا۔ الٰہی حق کی دستگیری کہہ۔ یہ دار رحمن کی رحمت جوش میں آئی۔ آگ کو حکم ہوا ٹھنڈی پڑ جا (اور خبردار ابراہیم کا بال بیکا نہ ہو) ابراہیم کے سلامتی بن جا۔

فَأَنْجَاهُ اللَّهُ مِنَ النَّارِ الخ۔ اللہ نے آگ سے ان کو بچا لیا۔ یعنی آگ میں ضرور گرے، آگ ان کے لئے گلزار بن گئی۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ جو لوگ اہل ایمان میں جو یقین رکھتے کہ اسباب سے نتائج بغیر اذن الٰہی کے نہیں پیدا ہوتے تو سمجھتے ہیں کہ آگ گرم کیوں ہے، صرف اس لئے کہ اللہ نے اس کو گرمی عطا کی ہے۔ پس آگ کو گرمی عطا کرنے والا خدا اس سے گرمی چھین بھی سکتا ہے۔ جو بجنہ ایمان رکھتے۔ اس بات پر کہ کافروں کو مومنوں پر عارضی تسلط عطا کرنا بھی خدا ہی کا کام ہے اور اس میں بھی اس کی مصلحت ہوتی ہے کافروں کو ڈھیل دینے اور چیرہ دست بنانے سے کبھی مقصود یہ ہوتا ہے کہ اہل ایمان کی آزمائش ہو جائے ان کے مراتب میں اضافہ اور درجات میں ترقی دی جائے جن کا اعتقاد ہے اس امر پر کہ دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ اور طاغوتی طاقتوں کی انتہائی سر بلندیاں اللہ کے ایک دوست کی بھی جان نہیں لے سکتیں۔ جب تک اللہ ہی کا حکم نہ ہو اس کی ادنیٰ غیبی طاقت کے مقابلے میں یہ تمام فسوں آفرینیاں اور شیطانی دسیسہ کاریاں ہیچ ہیں۔ ایسے مومن اس واقعہ سے گوناگوں عبرتیں حاصل کرتے ہیں۔ ان کی نصیحت کے لئے اسی قصہ میں سرمایہ صد موعظت پنہاں ہے یعنی یہ اللہ کی غیبی قدرت کا مشاہدہ اہل حق کی نجات کا یقین، کافروں کی کوتاہ دستی کا علم اور انجام کار حق کا باطل پر غالب آجانا اس واقعہ سے واضح ہو جاتا ہے اس لئے وہ راہ صداقت میں ہر سختی اور مصیبت پر صبر کرتے ہیں۔ کافروں سے ان کو کوئی خوف نہیں رہتا تکالیف سے تنگ دل نہیں ہوتے۔ ان کی نظر ہر وقت اللہ پر ہوتی ہے اور آخر میں اپنے غالب ہونے کا ان کو یقین ہوتا ہے۔

وَقَالَ إِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَوْثَانًا مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ الخ۔ حضرت ابراہیم نے یہ بھی فرمایا کہ تم لوگوں نے یہ بت پرستی جو آپس کے تعلقات کو قائم رکھنے اور میل محبت کو برقرار رکھنے کے لئے اختیار کی ہے۔ یعنی بت پرستی اور شرک پر تم ہے رہنے سے تمہارا مقصد یہ ہے کہ آپس کی محبت یگانگت اور ربط و ضبط قائم رہے۔ اگر شرک چھوڑ دو گے تو اپنے دوستوں

أَنْ جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالُوا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ

ہمارے فرستادے لوطؑ کے پاس پہنچے تو لوطؑ اُن کو دیکھ کر مغموم دل تنگ ہوئے فرشتوں نے کہا تم خوف وغم نہ کرو

إِنَّا مُنَجُّوكَ وَأَهْلَكَ إِلَّا امْرَأَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ○ إِنَّا مُنْزِلُونَ عَلَىٰ أَهْلِ

ہم تم کو اور تمہارے گھر والوں کو سوائے تمہاری بیوی کے بچالیں گے تمہاری بیوی پیچھے رہ جانیوالوں میں سے ہے ہم ان بستی والوں پر ان کی بدکاریوں

هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ○ وَلَقَدْ تَرَكْنَا مِنْهَا

کی وجہ سے آسمان سے عذاب شدید نازل کریں گے ہم نے اس بستی کے کچھ ظاہر نشان

آيَةً بَيِّنَةً لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ○

اُس قوم کی عبرت کے لئے چھوڑ دیئے ہیں جو سمجھدار ہیں

تفسیر اس خاکی کرہ پر رہنے والے آدمی کچھ اچھے ہیں کچھ برے۔ یہاں نیک بھی بستے ہیں اور بد بھی۔ ظالم بھی عادل بھی۔ بدمعاش بھی نیک معاش بھی۔ ناس بھی کافر و مومن بھی شیطان بھی فرشتے بھی۔ ان تمام طبقات خیر و شر کو مراتب و مدارج کے لحاظ سے ہم چار اصناف پر تقسیم کرتے ہیں (۱) وہ نیک گروہ جس سے کبھی بدی کا ظہور ہی نہیں ہوتا۔ وہ انسان کے بھیس میں فرشتہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی اتفاقاً کبھی خفیف ترین فروگذاشت ہو بھی جاتی ہے تو وہ اتنی کمزور ہوتی ہے کہ قابل توجہ اور گرفت کے قابل نہیں ہوتی۔ پھر بھی اس گروہ کے ارادہ اور قصد کو دخل نہیں ہوتا۔ کبھی قصداً اس سے کوئی ادنیٰ لغزش بھی نہیں ہوتی۔ بالارادہ کوئی غیر محسوس حرکت بھی وہ خلاف فطرت نہیں کرتا۔ یہ گروہ انبیاء اور بہت بلند مرتبہ علماء کا ہے۔

(۲) وہ شریر لوگ جن کی زندگی شیطانی زندگی اور جن کی موت طاغوتی موت ہوتی ہے۔ اس کی زندگی کی کوئی نقل و حرکت شرارت سے خالی نہیں ہوتی۔ اس کا ہر کام خلاف فطرت ہوتا ہے۔ اس کی طینت اور سرشت خراب اس کا عمل اور قول غلط۔ اس کے افکار و خیالات غیر صحیح ہوتے ہیں۔ اس کا سارا سلسلۂ حیات گوناگوں برائیوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس گروہ سے اگر اتفاقاً کوئی نیکی سرزد ہو بھی جاتی ہے تو اس میں اس کے ارادہ اور قصد کو کوئی دخل نہیں ہوتا گویا غلطی سے اس سے کوئی نیکی صادر ہو جاتی ہے۔ یہ گروہ ان کفار و فساق کا ہے جن کو آدمی بجائے شیطان کہنا زیادہ مناسب ہے جو کائنات کی لعنت اور زمین کے کندھوں کا بار ہوتا ہے۔

(۳) وہ بشری گروہ جس کی نیکیاں اور بدیاں پلہ بہ پلہ ہوتی ہیں۔ اس کے اندر خیر و شر کا ایک خاص توازن و تناسب ہوتا ہے۔ لیکن نیکیوں کا پلہ کسی قدر بھاری ہوتا ہے اس میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور برائیاں بھی وہ مخالف کا کام بھی کرتا ہے اور فطرت کے موافق بھی۔ لیکن مجموعی حیثیت سے نیکیاں کسی قدر زیادہ نظر آتی ہیں۔

(۴) وہ انسانی جتھا جو اپنی زندگی میں دونوں رنگ رکھتا ہے۔ لیکن شر کے نقوش اس کے صفحۂ ہستی پر زیادہ ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ نیکیاں بھی کرتا ہے۔ لیکن اس کی برائیاں نیکیوں سے وزنی ہوتی ہیں۔ یہ چار گروہ عمران بشری کے ہیں۔

موخر الذکر دونوں گروہ اس زندگی میں آزاد رہتے ہیں۔ فطرت ان سے کوئی مواخذہ نہیں کرتی اور نہ ان کو غیر معمولی انعامات سے سرفراز کرتی ہے۔ ان کی زندگی مدھم چال سے چلتی ہے جس میں کوئی غیر معمولی انجوبہ کاری نظر نہیں آتی۔ ان کو نیکی یا بدی کی کوئی پاداش اس دنیا میں محسوس طور پر نہیں ملتی۔ یوں تو ہر فعل کا نتیجہ حاصل ہوتا ہے اور کوئی تخم عمل بغیر پھل کے نہیں رہتا اور کسی کی کوشش رائیگاں نہیں جاتی۔ لیکن ان دونوں گروہوں کے اعمال اقوال اور رفتار زندگی میں چونکہ خیر یا شر کا بہت زیادہ نمایاں جلوہ نظر نہیں آتا اس لئے ان کے اعمال کے نتائج بھی بہت ہی خفی ہوتے ہیں۔ ان کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ یہ ہمارے عمل کی پاداش اور وہ ہمارے فعل کی جزا ہے۔ قدرت ان کی زندگی میں کوئی غیر معمولی سانحہ رونما نہیں کرتی۔ نہ خیر کی طرف سے کوئی محیر العقول اعانت علاوہ برسر ظہور نہیں آتا بلکہ ان کا بیم دیائے زندگی اعمال و نتائج کے مدھم نقوش اور غیر مرئی کیفیات اور غیر محسوس لہروں کو لئے ہوئے بہتا ہے۔

اول الذکر طبقہ اس زمین کی زینت، کائنات کا فخر اور خیر و برکت کا سرچشمہ ہوتا ہے جس کے سوتوں سے قدرت کی رحمت کا شیریں پانی پھوٹ کر بنی آدم کے دلوں کی کھیتیوں کو شاداب کرتا ہے۔ یہ گروہ وہ آفتاب کرۂ گیتی ہوتا ہے جس کی کرنیں انسانی دنیا کے دلوں کو روشن کرتی ہیں یہ وہ درخت ثمر ور ہوتا ہے جس کے سایہ میں کائنات بشری زندگی کے بیابان اور

ریگستان کو طے کرتی ہوئی آرام لیتی ہے۔ یہی گروہ قدرت کا منظورِ نظر اور محبوب بن جاتا ہے۔ اس کو غالب کرنے اور عزت دینے کے لئے فطرت کی طرف سے اسباب عادیہ کا سلسلہ توڑ کر نہایت غیر معمولی اور حیرت آفریں واقعات برسرِ ظہور لا کر دکھائے جاتے ہیں۔ گو دائرۂ شر دشمنِ فطرت اپنے تمام طاغوتی لشکروں سے اس مقدس گروہ کا احاطہ کر لیتے ہیں اور ہر طرف سے مصائب و شدائد کے تیروں کی بارش ہونے لگتی ہے تو قدرتِ الٰہیہ ان کو اپنے دامنِ عصمت میں چھپا لیتی ہے اور فطرت کا غیبی ہاتھ اسباب کے تمام گھروندوں کو توڑ پھوڑ کر شیطان کے لشکروں کو جبر کر کے بڑھ کر ان کو اٹھا لیتا ہے اور بدامنیوں کے جال سے امن و عزت کے آشیانے پر لا کر بٹھا دیتا ہے۔ طبقۂ رہبر کو سوختہ کر دینے والی آگ سے بچانا، پر جبروت قاہر و سفاک بادشاہوں کے پنجے سے چھڑانا، بحر قلزم کو خشک کر کے مسلم شاہراہِ عام بنا دینا۔ ۱۲۰ سال کی عمر میں عالم سعید بیٹا عطا کرنا۔ دنیا کو غرق کرنے والے طوفان سے چند تختوں کی کشتی پر بٹھا کر نجات دینا، کافروں کے محاصرہ میں سے سب کو اندھا کر کے مقدس ہستی کو بچا نکالنا یہ اور اسی طرح کے اور کئی مظاہرات قدرت ہیں کہ عرف میں معجزات و کرامات کہا جاتا ہے۔ اس پاک گروہ کی عزت و سعادت اور نجات کے لئے اللہ کی طرف سے رونما ہونے سمجھتے ہیں۔ لیکن جس طرح ان کی عزت، نجات اور نصرت کے لئے قدرت اپنے عادی قانون اور روز مرہ کے دستور العمل کو توڑ دیتی ہے اسی طرح ثانی الذکر گروہ کی بربادی، تباہی، غرقی اور عذاب و دکھ کے لئے بھی قدرت سلسلۂ اسباب کی بعض معمولی کڑیاں بیچ سے نکال لیتی ہے۔ کبھی اسبابِ عادیہ غیر عادی شکل میں نمودار کر کے اس قوم سرکش کو غارت کر دیتی ہے۔ کبھی غیر معمولی زلزلہ آتا ہے، طوفانی ہوا کے جھکڑ چلتے ہیں، آسمان سے پتھر برستے ہیں، آگ برستی ہے، زمین کا تختہ الٹ جاتا ہے، ایک غیبی چیخ دلوں کو پھاڑ دیتی ہے وغیرہ وغیرہ حوادثات ظاہر ہو کر اس ناپاک قوم کے وجود سے دامنِ زمین کو پاک کر دیتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں یہاں گندھک کے بخارات بند تھے، اس لئے زلزلہ آیا، کوئی آتش آفریں مادہ تھا جس نے زمین کو پھاڑ کر شعلہ اٹھا کر آگ برسا دی۔ کچھ خالی اور بخاری اجزاء کی قوت تھی جس نے زمین کو پھاڑ کر تختہ الٹ دیا۔ غرض ظاہر پرست علماءِ طبیعت کی نظریں نظامِ اسباب سے اوپر نہیں اٹھتیں، لیکن اہلِ بصیرت خوب سمجھتے ہیں کہ مادہ کی وحدت اور صورتِ جسمیہ کا طبیعتِ واحدہ ہونا صورِ نوعیہ کے اختلاف کو نہیں چاہتا آثارِ مختلفہ، خواص جداگانہ، اشکالِ متعددہ، الوانِ متغیرہ کی تمام محض قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ حقیقت وہی ہے جو ہم متقدم الذکر تفسیری مطالب میں لکھ آئے ہیں کہ اسباب کا اختلاف بھی قدرت کے ہاتھ میں مرہون ہے یہی قدرت ناقابلِ بقا اور غیر صالح قوم کو برباد کرنے کے لئے اسبابِ عادیہ میں غیر معمولی تغیر پیدا کر کے زمین کے چہرے کی کثافت دور کر دیتی ہے اور خلافِ فطرت عمل کرنے والوں کو یک دم فنا کر کے ان کے ناپاک اعمال سے کائناتِ بشری کو نجات عطا فرما دیتی ہے۔ اول الذکر گروہ میں سے حضرت ابراہیم اور حضرت لوط تھے۔ فرشتوں نے آ کر بڑھاپے میں حضرت ابراہیم کو فرزند دلبند کی بشارت دی، حضرت لوط کو قومی ہلاکت سے مطلع کیا۔ رات ہی میں پاک گروہ کو ناپاک سرزمین سے باہر نکل جانے کا مشورہ دیا اور صبح ہوتے ہی زمین کا تختہ الٹ دیا۔ اوپر سے پتھر برسائے، انکار سے بھرے اور بد اعمالیوں نے کیا برسایا، غرض لعنت برسائی۔ فبعداً للقوم الظلمین۔

تحلیلِ اجزاء وَلُوطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِہٖ حضرت ابراہیم کے حقیقی بھتیجے لوط بن ہاران بابل سے ہجرت کر کے آپ کے ساتھ آ گئے تھے تو حران یا شام میں پہنچ کر یہ قرار پایا کہ دونوں بزرگ جدا جدا رہیں۔ جدائی کی اصل وجہ تبلیغ کی وسعت تھی حضرت ابراہیم نے اپنا قیام شام میں رکھا اور حضرت لوط کو بحیرہ مردار کی ساحلی آبادی کی طرف جس کا مرکزی شہر سدوم تھا، بھیج دیا۔ تاکہ شام والے ابراہیمی فیض سے بہرہ ور ہوں اور آپ کے نائب کنعان کے مشرقی جنوبی علاقہ میں توحید کا اعلان کریں۔ تعجب ہے بعض مفسرین نے اسرائیلی خرافات کو صحیح سمجھ کر جدائی کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ حضرت ابراہیم کے مویشی بھی تعداد میں زیادہ تھے اور حضرت لوط کے مویشی بہت تھے اس لئے چچا بھتیجے ایک جگہ نہ رہ سکے یہ محض خرافات ہے۔ شریف اور مہذب خاندانوں سے بھی ایسا اتفاق باوجود قریب ترین رشتہ دار ہونے کے بعید ہے چہ جائیکہ وہ کرم انبیاء کے درمیان جو رشتہ کے اعتبار سے بھی چچا بھتیجے تھے اور رشد و ہدایت کے لحاظ سے بھی ایک مرشد اور دوسرے مسترشد تھے۔ قوم لوط کا مفصل واقعہ ہم ایک سے زیادہ مرتبہ لکھ چکے ہیں، اس لئے یہاں تحلیل آیات کافی ہے۔

اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ لواطت کا ارتکاب سب سے پہلے قوم لوط نے کیا، ان سے پہلے کوئی اس حرکتِ شنیعہ سے واقف بھی نہ تھا، اس لئے حضرت لوط نے فرمایا تم بے حیائی کا کام کرتے ہو۔ ایسے کہ تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کئے۔

وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ اس فقرہ کا مطلب دو طرح سے بیان کیا گیا ہے ایک یہ کہ وہ لوگ رہزن اور لٹیرے بھی تھے۔ مسافروں کو لوٹ لیتے تھے۔ ان کے خوف سے راستے بند ہو گئے تھے۔ قطع السبیل کے یہی معنی ہیں۔ دوسرا مطلب قطع السبیل کا یہ ہے کہ لواطت سے راہِ نسل قطع ہو جاتی ہے۔ مادۂ تولید کی پیدائش اور قوتِ شہوانیہ کی تخلیق کی اصل غرض تو توالد و تناسل کا سلسلہ جاری کرنا ہے لیکن امرد پرستی سے راہِ توالد بند ہو جاتی ہے، اس لئے حضرت لوط نے فرمایا تم اپنی امرد پرستی سے راہِ تناسل کو قطع کر رہے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لوگ رہزنی بھی کرتے ہوں اور مسافروں سے بدفعلی بھی کرتے ہوں۔ اس صورت میں قطع السبیل سے دونوں معنی کی طرف اشارہ ہو جائے گا

وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ اس آیت کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ تم بری اور مکروہ مجلسوں میں جمع ہوتے ہیں دوسرا مطلب جو زیادہ معروف ہے اب تک کوئی اس سے واقف نہ تھا یعنی لواطت کی راہ غلیظ اور نجس ہے جس سے تمہارے سوا کوئی بھی اب تک واقف نہ تھا۔

دوسرے مطلب کی توضیح مختلف طور پر کی گئی ہے۔ ابن کثیر نے فرمایا نادی وہ جگہ یا نشست گاہ جہاں لوگ جمع ہوتے ہوں یعنی وہ لوگ چوپالوں اور نشستگاہوں میں جمع ہو کر افعال قبیحہ اور اقوال فاحشہ کے مرتکب ہوتے تھے، اس لئے ان کی مجلس کو منکر فرمایا۔ مجاہد نے فرمایا مجلس میں ایک دوسرے کے سامنے لواطت کرتے تھے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا گوز نکالتے اور پھر ہنستے تھے۔ بعض نے کہا مینڈھے اور مرغ لڑاتے تھے۔ حضرت ام ہانی نے مرفوعاً بیان کیا کہ مجالس میں بیٹھ کر راہ چلنے والوں کے کنکریاں مارتے تھے (رواہ احمد وابن جریر وابن ابی حاتم والترمذی وقال حسن غریب)

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا الخ۔ قوم لوط کے پاس اپنی بے حیائی کے جواز کی کوئی علت نہ تھی (آپس میں کہنے لگے لوط اور اس کے ساتھیوں کو اپنے دیس سے نکال دو۔ یہ یہاں فقط گزارہ کرنے آیا تھا، لیکن اس نے ہم پر حکمرانی شروع کر دی۔ یہ لوگ بڑے پاک ہیں ان کا گزارہ ہمارے ساتھ نہ ہوگا۔ حضرت لوط نے ان کو عذاب الٰہی سے ڈرایا) کہنے لگے اگر سچے ہو تو عذاب لے آؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کی عقلوں پر چربی چھا گئی تھی۔ وہ طاقت و دولت کے نشہ میں مست تھے۔ دماغ مسخ ہو چکے تھے اچھے کو برا اور برے کو اچھا سمجھنے لگے تھے۔ جب گناہ ترقی کر کے نیکی کی شکل میں آ جاتا ہے اور لوگ شر کو خیر اور قبیح کو حسن سمجھنے لگتے ہیں تو پھر ان سے بھلائی کی امید باقی نہیں رہتی اور نہ اہلِ اصلاح کی صحبت و نصیحت ان کے لئے مفید ہو سکتی ہے، اس لئے خیر خواہ مصلحین ان سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ حضرت لوط نے آخر کار ان سے کنارہ کش ہونا چاہا اور دعا کی رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَی الْقَوْمِ الْمُفْسِدِیْنَ۔ پروردگار مجھے اس تباہ کار قوم پر غالب فرما۔ مراد یہ تھی کہ مجھے ان سے علیحدہ کر دے، لیکن اس طور پر کہ ان کو بھی اپنی تباہ انگیز حرکات کی سزا مل جائے۔ دعا قبول ہوئی۔ بدکار قوم کی تباہی کا وقت آ گیا۔ تیر نشانہ پر بیٹھ گیا۔ ادھر ملک شام میں رحمت کو نازل کرنا بھی مقصود تھا۔ خلیل پر عنایت مبذول تھی اس لئے فرشتوں کو حکم ہوا جاؤ ہمارے خلیل کو فرزند سعید کی اور قوم لوط کو برباد کر دو اور اہلِ ایمان کو بچا لو

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰی حسب الحکم فرشتے امرد لڑکوں کی شکل میں حضرت ابراہیم کے پاس آئے دوپہر کا وقت تھا۔ آپ ملاطفت میں اپنے خیمے کے اندر تشریف فرما تھے تین نوجوانوں کو دیکھ کر خوش خلقی کے ساتھ ٹھہرایا، کھانے کے لئے روٹیاں اور تلا ہوا بچھڑا تیار کرایا، کھانے کا وقت آیا تو مہمانوں نے ہاتھ اٹھا لیا۔ اس زمانے کا دستور تھا اور اب بھی بعض قدامت پسند قوموں کا دستور ہے کہ دشمن کے گھر کا نمک نہ چکھتے تھے۔ حضرت ابراہیم کو دل میں اندیشہ ہوا کہ شاید یہ دشمن ہیں جو میری مہمانی کو قبول نہیں کرتے۔ مہمانوں نے کہا آپ کچھ اندیشہ نہ کریں ہم فرشتے ہیں آپ کو فرزند کی بشارت دینے آئے ہیں اور یہاں سے جا کر یہ سامنے والی بستی (سدوم) غارت کرنی مقصود ہے۔ حضرت ابراہیم نے فرمایا وہاں تو لوط بھی ہے۔ فرشتے نے جواب دیا ہم کو معلوم ہے۔ ہم لوط کو اور اس کے ساتھیوں کو بچا لیں گے البتہ لوط کی بیوی نہ بچے گی کیونکہ وہ پیچھے رہ جائے گی اور مڑ کر اپنی قوم کی تباہی کو دیکھ کر افسوس کرے گی۔ غرض فرشتے حضرت لوط کے گھر پہنچے۔ تین نوجوانوں کے وارد ہونے سے لوط کو تکلیف ہوئی اور دل ہی دل میں ناخوش ہوئے قوم کی حالت معلوم تھی۔ مہمانوں کی رسوائی کا اندیشہ تھا، لیکن خلق نبوت سے مجبور تھے ٹھہرا لیا کچھ ہی دیر میں لوگوں کو معلوم ہو گیا۔ جھنڈ بنا کر حرامی غیر مترقبہ دوڑ پڑے۔ لوط کے گھر کو گھیر لیا۔ آپ باہر نکلے۔ قوم کی خوشامد کی اپنی قوم سے نکاح کرا دینے پر تیار ہو گئے، لیکن بدکاروں نے ایک نہ سنی اور بولے ہماری غرض تم کو معلوم ہی ہے۔ یہ گفتگو فضول ہے۔ یہ کہہ کر گھر میں گھسنے لگے۔ حضرت نے مقابلہ کیا۔ بدبختوں نے زبردستی کی۔ اس وقت فرشتوں نے حضرت لوط پر اپنی حقیقت کھول دی۔ لوط کو اندر کھینچ لیا کافروں کو اندھا کر دیا۔ کیواڑ بند کر لئے۔ بدبخت بھاگے دیکھنا کل تم کو مع مہمان بڑے بھگتو گے ہیں۔ اب فرشتوں نے مفصل قصہ کہہ دیا کہ ہم اس قوم کو غارت کرنے آئے ہیں۔ فرشتے ہیں ہم کو اللہ نے بھیجا ہے تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو بچا لیں گے، لیکن تمہاری بیوی ضرور ہلاک ہوگی۔ غرض آسمان سے پتھر برسے، زمین سے شعلے نکلے۔ پورا تختہ الٹ دیا گیا۔ حضرت ابراہیم کو سدوم کی طرف سے دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ فرمایا اس وقت قوم لوط پر عذاب نازل ہو رہا ہے۔ قوم لوط کی بربادی کی کچھ نشانیاں اب بھی موجود ہیں۔ تباہ شدہ قوم کے کچھ آثار اب بھی باقی ہیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

یہ آیات قرآنیہ اور احادیث صحیحہ کا خلاصہ ہے جو قابلِ وثوق ہے۔ اس کے علاوہ اہلِ تفسیر نے اسرائیلیات سے اخذ کر کے طرح طرح کے افسانے نقل کئے ہیں جن کا ترک اولیٰ ہے۔ اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِیْنَ ۝ یعنی کہ اس بستی کی تباہی کے لئے اس لئے بھیجا گیا ہے کہ اس کے باشندے برابر بدکاریاں اور بے جا حرکات کا ارتکاب کر رہے ہیں (حضرت بڑے حلیم اور مہربان تھے آپ بدکار قوم کی سفارش کرنے لگے جس کی تفصیل دوسری آیت میں آئی ہے۔ یجادلنا فی قوم لوط ان ابراہیم لحلیم۔ اللہ کے نیک بندے بدکاروں کو تباہ ہوتے سے بچانے کے لئے غائبانہ اصرار کے ساتھ دعائیں کرتے ہیں اور غافل بدبخت انہیں کے دشمن بن جاتے ہیں۔ جب حضرت ابراہیم کی استدعا قبول نہ ہوئی تو آپ کو لوط کا خیال ہوا اور بولے اِنَّ فِیْهَا لُوْطًا وہاں تو لوط بھی ہے۔ اس کلام سے آپ کا مقصد یہ تھا کہ شاید یہ لوط کی موجودگی کی وجہ سے بدکار قوم سے عذاب ٹل جائے۔ کیونکہ لوط کا امر تو آپ کو پہلے معلوم ہی تھا اور یہ بھی یقین تھا کہ خدا تعالیٰ ان کو ذلت کے ساتھ تباہ نہیں کرے گا۔

قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِیْهَا یعنی فرشتوں نے کہا ہم اس بستی کے اندر والوں کو خوب جانتے ہیں جو لوگ مستحق عذاب ہیں ان کو بھی جانتے ہیں اور جو لوگ بچائے جانے کے قابل

ہیں ان سے بھی واقف ہیں۔ کَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ۔ یعنی لوط کی بیوی نجات یافتہ طبقہ میں داخل نہیں ہے بلکہ باقی گروہ میں شامل ہے۔ حضرت لوط کی بیوی اپنی قوم کی طرفدار اور باوجود ان کی حرکات شنیعہ کے ان سے محبت رکھنے والی تھی۔ حدیث میں وارد ہے کہ آدمی اپنے دوست کے ساتھ ہوگا لہٰذا اس کو دیکھ لینا چاہیئے کہ وہ کس سے دوستی کررہا ہے (کہانی السنن) سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا۔ یعنی فرشتوں کو حسین لڑکوں کی شکل میں دیکھ کر حضرت لوط کے چہرہ پر پژمردگی چھاگئی۔ آپ کو تکلیف ہوئی اور مہمانوں کی رسوائی کے اندیشہ سے شکستہ خاطر اور تنگدل ہوگئے۔

وَقَالُوْا لَا تَخَفْ فرشتوں کا یہ قول اس وقت کا ہے جبکہ قوم والوں نے آکر گھر کو گھیر لیا تھا۔ حضرت لوط باہر نکل آئے اور لوگوں کو گھر میں داخل ہونے سے روک رہے تھے اور وہ لوگ اپنے ارادہ سے باز نہ آتے تھے اور اس کی وجہ سے لوط کی پریشانی حد سے بڑھ گئی تھی تو آخر کار ملائکہ نے حقیقت حال پر لوط کو اطلاع دی۔

اِلَّا امْرَاَتَكَ الخ۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت لوط کی بیوی آپ کے پیچھے پیچھے چل دی تھی۔ تمام مومن یعنی لوط کے گھر والے جلد سے جلد اس بستی سے نکل جانے کی کوشش کررہے تھے، مگر بیوی کو قوم کی بربادی کا غم تھا۔ وہ بادل ناخواستہ پیچھے پیچھے جارہی تھی اور گردن موڑ کر آبادی کو دیکھ لیتی تھی۔ بالآخر اس پر بھی عذاب آیا اور وہ نمک بن گئی۔ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ الخ۔ یعنی اوپر سے پتھر کنکر اور انگارے برسائے گئے۔ اگرچہ پتھر کنکر اور ہر وہ چیز جس کا پتھراؤ ہوا تھا زمین کے اندر سے ہی نکل کر فضا میں پہنچی تھی، لیکن چونکہ اس پورے عذاب کے اصل اسباب کا نزول فرشتوں کے ذریعہ سے ہوا تھا اور فرشتے آسمان سے آئے تھے، اس لئے حقیقتہً عذاب اوپر سے ہی آیا تھا۔ ارباب طبیعت کوہ آتش فشاں کے پھٹنے زلزلہ آنے اور پتھراؤ ہونے کے اسباب مادی عنصری تغیرات کو قرار دیتے ہیں، لیکن ارباب دانش مادہ اور مادیات کے اندر کار فرما مخفی قوت قاہرہ کو جانتے ہیں اور اسی کو تغیرات مادیہ کی اصل علت سمجھتے ہیں، اس لئے علماء طبیعت کی تحقیقات کی صحت کے باوجود غیبی دستکاری سے مفر نہیں رہتا۔

مقصود بیان

حضرت لوط کی قوم موحد لواطت تھی۔ اقتضاء عقلی کی اصل غرض تناسل وتوالد ہے۔ اور لواطت ابطال تناسل کی موجب ہے۔ گویا علاوہ نقل کے عقل بھی اس کے فساد انگیز ہونے کی شاہد ہے۔ غالباً تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ کے لفظ سے اس طرف اشارہ ہے۔ مجالس میں بیٹھ کر امور شنیعہ کا ارتکاب ممنوع ہے۔ حضرت لوط کا استدلال آمیز وعظ بتا رہا ہے کہ انبیاء کی تعلیم خلاف حکمت نہیں ہوتی بلکہ مصلحت آفرین اور فوائد آگیں ہوتی ہے۔ نابینا لوگ عذاب الٰہی کے استہزاء سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ جیسا کہ قوم لوط کے جواب سے ظاہر ہے۔ ملائکہ کا دو متضاد خدمتوں پر مامور ہونا بتا رہا ہے کہ اللہ ایک ہی سبب سے دو متضاد نتائج پیدا فرمادیتا ہے۔ فرق صرف مقام ومحل کا ہوتا ہے۔ جیسا مقام ومحل ہوتا ہے سبب سے ویسا ہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم کو فرزند کی بشارت قوم لوط کی بربادی اور لوط کی نجات یہ مختلف نتائج فرشتوں کی ایک ہی مرتبہ کی آمد سے پیدا ہوئے۔ حضرت لوط اور دوسرے اہل ایمان کو محفوظ رکھنا ان لوگوں کی آنکھیں کھولنے اور عبرت دلانے کے لئے کافی ہے۔ جو عذاب الٰہی کو صرف مادی تغیرات کا معمولی ادنی کرشمہ سمجھتے ہیں، زلزلہ، طوفان، آتش فشانی اور زمین کے الٹنے کو اجزاء دخانیہ وبخاریہ کے انقلابات کا مظاہرہ کہتے ہیں۔ خوب سوچنا چاہیئے کہ ایک تباہ ہونے والی بستی میں سے صرف اہل ایمان اور صلاح پسند نفوس کو قبل از وقت بچا لینا اور پھر زمین کے اندر غیر معمولی اسباب ہلاکت کو حرکت میں لانا یقیناً قدرت الٰہیہ کا غیر معمولی مظاہرہ تھا اور تمام اسباب سے بالاتر قدرت کا ہمہ گیر ہاتھ ضرور کارفرما تھا۔ فرشتوں کا حضرت ابراہیم کو جواب دینا دلالت کررہا ہے کہ فرشتے جس کام پر مامور ہوتے ہیں وہ اس کی تفصیل اور پوری کیفیت سے واقف کردیئے جاتے ہیں اور ہر چیز کی کامل وضاحت ان پر پہلے سے ہی کردی جاتی ہے۔ حضرت لوط کی بیوی کا ہلاک ہونا بتا رہا ہے کہ رشتۂ زوجیت عذاب الٰہی سے نہیں بچا سکتا۔ شوہر اگرچہ نبی ہو لیکن خبث باطن کا زوال اس سے نہیں ہوتا۔ کفار کی بربادی پر رحم کھانا ممنوع ہے۔ اللہ کے نافرمانوں کی طرف میلان اگرچہ طبعی ہو حرام ہے۔ جس کی طرف میلان خاطر ہوتا ہے اسی کی طرف میلان کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ شروع میں فرشتوں کو لوط کے نہ پہچاننے سے یہ معلوم ہوا کہ ہر وقت اہل کشف کی حالت ایک طرح نہیں ہوتی۔ انکشاف روحانی اس وقت ہوتا ہے جب مادی دنیا سے نفس کی توجہ ہٹ کر عالم قدس سے اتصال ہوتا ہے۔ ورنہ مادی دنیا کی توجہ کے وقت وہ بھی معمولی انسانوں کی حالت رکھتے ہیں۔ اہل لوط سے بیوی کا استثناء کرنا بتا رہا ہے کہ بیوی اہل میں داخل ہوتی ہے وغیرہ۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ

اور مدین کی جانب ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا شعیب نے کہا میری قوم والو خدا کی عبادت کرو اور روز آخرت کی توقع رکھو

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي

اور ملک میں تباہی پھیلاتے نہ پھرو مگر انھوں نے شعیب کی تکذیب کی نتیجہ ہوا کہ ان کو زلزلے نے پکڑ لیا اور اپنے گھروں

دَارِهِمْ جَاثِمِينَ ۝ وَعَادًا وَثَمُودَا وَقَد تَّبَيَّنَ لَكُم مِّن مَّسَاكِنِهِمْ ۖ وَزَيَّنَ لَهُمُ

میں اوندھے پڑے رہ گئے اور عاد و ثمود کو بھی ہم نے ہلاک کیا اُن کے یہ کھنڈر مکانات تمہارے لئے نمودار ہیں اور شیطان نے

الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَكَانُوا مُسْتَبْصِرِينَ ۝ وَقَارُونَ

ان کی بدکاریاں آراستہ کر دکھائی تھیں اور اُن کو راہ سے روک دیا تھا حالانکہ وہ ہوشیار تھے اور قارون

وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ ۖ وَلَقَدْ جَاءَهُم مُّوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ وَمَا

و فرعون اور ہامان کو بھی ہم نے ہلاک کیا موسیٰ اُن کے پاس معجزات لے کر گئے۔ مگر انھوں نے ملک میں سرکشی کی لیکن ہم سے

كَانُوا سَابِقِينَ ۝ فَكُلًّا أَخَذْنَا بِذَنبِهِ ۖ فَمِنْهُم مَّنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا

چھوٹ کر نہ جا سکتے تھے ہم نے ہر ایک کی اس کے قصور کی سزا میں پکڑ کی اُن میں سے بعض تو ایسے تھے جن پر ہم نے پتھر برسانے والی آندھی بھیجی

وَمِنْهُم مَّنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ وَمِنْهُم مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ وَمِنْهُم مَّنْ أَغْرَقْنَا ۚ

اور بعض ایسے تھے جن کو سخت آواز نے پکڑ لیا اور بعض ایسے تھے جن کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور بعض ایسے تھے جن کو ہم نے ڈبو دیا

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝

اللہ ایسا نہیں کہ اُن پر ظلم کرتا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے تھے

تفسیر خالقِ عالم نے دو طرح کی مخلوق پیدا کی ہے۔ ایک وہ جو صاحبِ عقل، مالکِ فہم و شعور اور با اختیار و با ارادہ ہے۔ دوسری وہ جو نا فہم، بے عقل، غیر مختار اور تخیل و فکر سے عاری ہے، لیکن فطرتِ مخلوقات کی ہر نوع اور نوع کی ہر فرد اپنے خالق کی مسخر، مطیع اور منقاد ہے۔ کسی کو مجال نہیں جو دائرۂ مخلوقیت سے نکل کر قانونِ فطرت سے جو تمام کائنات کو محیط ہے سرتابی کر سکے۔ ہر نوع جمادات کا جو قانونِ نوعی و شخصی ہے وہ اس کی پابند ہے۔ ہر نوع نباتات بھی فطرت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ پتھر، ہیرا، سونا، چاندی یا کوئی دوسری معدنی چیز اپنی نوعی حدود سے قدم آگے نہیں رکھ سکتی۔ نہ نظامِ نوعی سے سرتابی کر سکتی ہے۔ سونے کا جو وزن، رنگ، تخلیقی ہے وہی ہوگا۔ چاندی کے جو اجزاء ترکیبی ہیں تحلیل کے بعد وہی اسی وزن و تناسب کے ساتھ برآمد ہوں گے جو فطرۃً مقرر ہیں۔ کیکر، شیشم کا درخت سیب نہیں پیدا کرتا۔ کبھی انار کا درخت سامنے درخت کی برابر نہیں ہوتا۔ ذی حس حیوانات کی بھی یہی حالت ہے۔ ہر نوع کے خواص، فرائض، وظائف اور کیفیات جدا جدا ہیں۔ نہ اختلاط ہے نہ اختلال، نہ پراگندگی نہ ابتری۔ گویا تمام جامد اور نامی دنیا اپنے نوعی فرض کی تکمیل میں مستغرق ہے اور قانونِ فطرت کی [illegible] خلاق کے بنائے ہوئے قانون کو بے چون و چرا مان لینا اور اس پر کاربند ہونا ہی عبادت [illegible] گزار ہے اور کوئی بھی انتظامِ عالم میں برہمی پیدا کرنے کی ساعی نہیں ہے۔ ہاں [illegible] انسانوں کی اصطلاح میں انسان کہا جاتا ہے وہ اگرچہ فطرۃً قانونِ قدرت سے [illegible] ہے۔ اس کی

قومی اور شخصی طبیعت اور دماغی وجسمانی اعضا قانونِ تخلیق کے فرماں بردار اور بندۂ بے دام ہیں، لیکن جہاں تک ہوش وخرد کا تعلق ہے، فہم وخرد کا تسلط ہے، اختیار والوہ کا تصرف ہے۔ انسان سرکشی سے نافرمان، نافرمان اور عصیاں شعار ہے۔ تمام حسنات وصالحات کا بدی کا اور اس کی جزا وسزا کا اقرار ہے جس کے اعتراف پر تخلیق مجبور کر رہی ہے۔ ہر لمحہ قیامت صغریٰ ہے، ہر عمل دوسرے عمل کا نتیجہ ہے، ہر تغیر سابق تغیر کی پاداش ہے، مگر عصیاں شعار انسان اقتضائے تخلیق کو بیا ئے استکبار سے ٹھکرا کر قیامت کبریٰ یوم حشر اور ہر جزا وسزا کا انکار کر دیتا ہے۔ اس کو پاداش عمل کا قانون عجیب اور ناقابل اقرار نظر آتا ہے جب ابتدائے دونیکیوں کی جڑ کو اپنی بے راہ روی اور بداعتقادی کے تبر سے کاٹ دیتا ہے تو قانونِ فطرت پر اسے کون چیز کاربند رکھ سکتی ہے، کون سبب حسنات وطیبات کی طرف اس کو مائل کر سکتا ہے۔ وہ ہر وقت نظام عالم کو درہم برہم کرنے کی کوشش میں غرق رہتا ہے۔ جس کا اولین مظاہرہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ خلاق کائنات کی ہستی سے ہی انکار کر دیتا ہے یا صفات ربوبیت والوہیت دوسری مخلوق میں بھی نمایاں ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ بہر حال وہ اپنے خدا کے سامنے خصوصیت کے ساتھ سر جھکانے سے گریز کرتا ہے اور سجدۂ عبدیت ادا کرنے سے انکار کرتا ہے۔ یہ سب سے پہلی فطرت کی قانون شکنی ہوتی ہے۔ جب ضوابط فطرت کی زنجیر کی ابتدائی کڑی وہ توڑ دیتا ہے تو پھر مزید دست درازی کرتا ہے۔ وزن، ناپ اور دیگر معاملات میں خلق خدا سے بے ایمانی کرنا، قتل وغارت کا بازار گرم کرنا، معصوم آبرو پر حملے کرنا اور امن عام کو برباد کرنا شروع کر دیتا ہے۔ غرض قانونِ حضرت کی ایک ایک کڑی کھول ڈالتا ہے۔ آخر کار یہ نوبت پہنچ جاتی ہے کہ اپنی تمام بداعمالیوں، بے ضابطگیوں اور قانون شکنیوں کو استحسان کا جامہ پہنا دیتا ہے، ظلم کو قانون کی شکل دے دیتا ہے۔ تکبر وغرور اور استبداد کو خودداری کہنے لگتا ہے، خود پرستی اور خود غرضی کو خودی کہنے لگتا ہے۔

اس وقت عظیم رحمت وقہر کی ہمہ گیر قوت بروئے کار آتی ہے۔ کسی نیک بندے کو پیغمبری کا خلعت پہنا کر بھیجا جاتا ہے۔ پیغمبر سب سے پہلے فطرت کی قانون شکنی کی مخالفت کرتا ہے۔ آخرت پر یقین رکھنے اور جزا وسزا کے برحق سمجھنے کی تلقین کرتا ہے۔ اللہ کی عبادت کا حکم دیتا ہے۔ ملک میں ہر قسم کے فتنہ وفساد کرنے سے روکتا ہے، لیکن جو شخص قانون شکنی کی آخری حد پر پہنچ چکا ہوتا ہے وہ بھلا کب خیر کو خیر اور شر کو شر ماننے پر تیار رہتا ہے۔ وہ تو بد کو نیک اور نیک کو بد سمجھتا ہے۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ ایسے سرکش انسانوں کو غیر معمولی حوادث نازل کر کے برباد کر دیا جاتا ہے۔ اصحاب مدین، قارون، فرعون، قوم صالح، قوم ہود سب کو اسی قانون شکنی کی پاداش میں غارت کیا گیا۔

حضرت شعیب کی قوم والے مشرک بھی تھے، قیامت کے منکر بھی تھے۔ غارت گر اور رہزن بھی تھے، ناپ تول میں بے ایمانی بھی کرتے تھے اور ان حرکات سے ملک میں فساد اور بدامنی پھیلتی تھی۔ حضرت شعیب نے ان باتوں سے منع کیا، توحید کی تعلیم دی، قیامت سے ڈرایا وہ تمام حرکات کرنے سے روکا جن سے امن عام کی تباہی پیدا ہوتی تھی لیکن بدکیش قوم نے نہ مانا۔ سرتابی کی پاداش میں غیبی دستِ قدرت نے زمین کے اندرونی اسباب کو حرکت دی۔ زلزلہ آیا، زمین پھٹی، سخت آواز نکلی۔ سب لوگ گھروں میں مر کر رہ گئے۔ حضرت شعیب اور آپ کے ساتھی اہل ایمان محفوظ رہے۔ قدرت نے اپنا ہمہ گیر تسلط دکھا دیا۔ غرض کلام ظاہر ہے کہ انبیاء سے سرکشی کرنے کی سزا ہلاکت ومنافی ہے۔ ہونے کو سب مرتے ہیں اور مریں گے۔ نیک بھی مرے اور بد بھی، لیکن غیبی ہلاکت کا صرف مفسد کافر ہی شکار ہوئے۔ جو لوگ قانونِ قدرت کی خلاف ورزی کر کے اصلاح کو فساد امن کو بے چینی اور عدل کو ظلم میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اللہ کا پوشیدہ ہاتھ ان کو صفحۂ ہستی سے عبرت انگیز دردناک طریق سے مٹا دیتا ہے اور اہل صلاح قائم رہتے ہیں۔ پس ہدایت محمدیہ کا انکار کرنے والے اور تعلیم حق سے عدول کرنے والے خوب سمجھ لیں کہ قدرت کی ہمہ گیری گزشتہ انبیاء اور ان کی قوموں پر ہی ختم نہیں ہو گئی بلکہ اب بھی ان کو وہی مجموعی تصرف اور ہمہ گیر اقتدار حاصل ہے جو پہلے تھا۔ فتدبروا وتفکروا واسلموا للہ ولا تکونوا من المفسدین۔

فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ الخ حضرت شعیب نے اپنی قوم کو تین نصیحتیں فرمائیں۔ اول اللہ کی پرستش کا حکم دیا۔ اللہ کی ہستی کا اقرار ایک کو بھی تھا۔ خالق عالم وخدا ہی کو جانتے تھے، لیکن مشرک فی العبادت تھے، بتوں کی پرستش کرتے تھے یعنی اللہ کے سوا دوسروں کی عظمت ایسی کرتے تھے جیسی خدا کی کرنی چاہئے۔ سب سے زیادہ محبت وعظمت کئے جانے کا استحقاق تو صرف خدا کو ہے، مالکین حسی تو پرست دولت دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرنے والے اپنی جانوں، اپنے مالوں اور اپنے فرضی معبودوں سے زیادہ رکھتے ہیں۔ الد سب سے زیادہ محبوب چیز ان کی نظروں میں کوئی ہوتی ہے یہی شرک فی العبادۃ ہے۔ قوم شعیب بھی اسی ضلالت میں مبتلا تھی۔ حضرت شعیب نے ان کو اس گمراہی سے روکا اور چونکہ وہ لوگ قیامت کا بھی انکار کرتے تھے، حقیقت کے لحاظ سے بھی وہ قیامت کے قائل نہ تھے اور ان کی بداعمالی انکار پر دلالت کرتی تھی، اس لئے نبی نے قیامت کا امیدوار رہنے کی ہدایت کی۔ امیدوار رہنے سے مراد ہے یقین رکھنا یعنی ان سے فرمایا کہ قیامت کے آنے کا یقین رکھو۔ ابن جریر نے اس جگہ رجاء کے معنی خوف لکھے ہیں یعنی قیامت سے ڈرتے رہنے کی ان کو نصیحت کی اور چونکہ قوم شعیب کی اخلاقی ومعاشرتی زندگی بھی تباہ کرنے والی تھی۔ بے ایمانی کر کے پرایا مال لینا یا رہزنی کر کے ڈاکہ مار کے قدرت کے قانون سعی وجہد کو توڑنا ہے کسی شخص کے لئے جائز نہیں کہ دوسرے کے حاصل کردہ پر دست درازی کرے، نہ مکاری اور فریب سے نہ جبر وظلم سے بلکہ ضابطۂ قدرت کی حدود میں رہ کر اپنی زندگی کو باقی رکھنے کی

کوشش کرنی تعلیم فطری ہے لیکن قوم شعیب اس کی خلاف ورزی کرتی تھی، اس لئے پیغمبر نے ان کو فساد انگیزی سے روکا۔ جب انہوں نے نہ مانا اور پھر اصرار انکار کیا اور شعیب کو جھوٹا سمجھا حق کو ناحق اور صدق کو کذب بنایا تو غیبی عذاب آگیا فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ اس جگہ زلزلہ کا عذاب مذکور ہے دوسری آیت میں خوفناک آواز سے ہلاکت مراد آتی ہے دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔ سخت زلزلے کے ساتھ زمین کے پھٹنے یا باصطلاح فلاسفہ بخاری روحانی اجزا کے گردش کرنے سے خوفناک آواز ضرور پیدا ہوتی ہے، اس لئے یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ قوم شعیب کی ہلاکت زلزلہ سے ہوئی تھی۔ اور یہ بھی غلط نہیں کہ خوفناک آواز سے ان کے کلیجے پھٹ گئے تھے۔ عَادًا وَّثَمُوْدَا ملک یمن میں علاقہ حضرموت کے قریب احقاف نام کی کچھ بستیاں تھیں اس ضلع میں ریگ زار ریت کے ٹیلے تھے اور عربی زبان میں احقاف ریت کے ٹیلوں کو کہتے ہیں۔ اس جگہ عرب کی ابتدائی قوم آباد تھی جس کا زمانہ عروج شاہ حورابی سے بھی پہلے تھا وہ لوگ بڑے قد آور طاقتور بڑے تمدن کے مالک، دولتمند اور پر جبروت تھے، مگر مشرک تھے، بت پرست تھے۔ بت پرستی اور خدا پرستی میں ہمیشہ سے چلا آیا ہے۔ حضرت ہود کو ان کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا۔ انہوں نے سرکشی کی غارت کر دیئے گئے۔ قوم ثمود بھی بہت پرانی عرب قوم تھی۔ عاد کے بعد تھی، مگر حضرت ابراہیم سے بہر حال پہلے تھی اور بہت پہلے تھی۔ اس کی آبادی وادی قریٰ کے قریب مقام حجر میں تھی۔ اس کی ہدایت کے لئے اللہ نے حضرت صالح کو بھیجا۔ جب سرتابی کی تو غیبی اسباب ہلاکت کو حرکت دے کر تباہ کر دیا گیا۔

وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ان اقوام ہالکہ کے کچھ عبرت آفریں نشانات اور آثار اب بھی موجود ہیں جو سیاح طبقہ کو معلوم ہیں۔ جو لوگ مدینہ سے جلنے میں حضور اقدس کے ساتھ جو مسلمان تھے انہوں نے قوم ثمود کے کھنڈر اور ان کا کنواں دیکھا تھا۔ یوں بھی شام سے حجاز کو جاتے وقت سر راہ ان کی بستی کے فرسودہ بوسیدہ نشان دکھائی دیتے ہیں اور احقاف کے علاقہ میں عاد کے آثار اب تک موجود ہیں۔

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ الخ۔ دنیوی انتظام کا سلیقہ، معاملات میں حسن تدبیر، گھریلو زندگی کے سماجی اور سیاسی تعلقات کی درستگی۔ یہ اس قسم کی تمام چیزیں جسمانی حواس کی صحت کی علامت ہیں۔ اسی کا نام بصیرت فی الدنیا ہے، لیکن قوم ملک اور دنیا کے لئے انجام کار کون سا نظام مفید ہے اور کون سا مضر، تعمیر عالم کے کون سے قواعد ہیں اور تخریب کے کون سے فطری اصول و ضوابط کیا ہیں اور غیر فطری اصول و ضوابط کیا ہیں۔ مرنے کے بعد دوسری زندگی کا تصور اور جزا سزا کا خیال پیدائش کی اصل غرض۔ قبل الوجود اور ما بعد الموت کے احوال عالم روح کی ادراکی اور عقلی قوتوں کی صحت کو چاہتا ہے۔ جب تک عقل مادہ اور فطرت سلیم نفس پاک نہ ہو ان چیزوں کی طرف توجہ اور توجہ سے صحیح نتائج کا اخذ نہیں ہو سکتا۔ مادی حواس مادیات میں انتہائی انہماک کے بعد بھی صحیح رہتے ہیں بلکہ ان کی صحت اس انہماک سے مزید ترقی کر جاتی ہے، مگر اس سے نفس کی سادگی، فطرت کی سلامت روی اور عقل کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔ نیز حواس رکھنے والا چونکہ حسن تدبیر اور مادی زندگی کی کامیابی پر نظر رکھتا ہے اور واقعی اس کو دنیوی امور میں بصیرت کاملہ ہوتی ہے، اس لئے وہ اپنی ہر تدبیر کو صحیح اور تمام عقائد و افعالی و اعمال کو راستی پر سمجھتا ہے۔ حالانکہ مادی حواس کی درستگی سے عقل کی روشنی اور رسائی پر استدلال کرنا قطعاً غلط ہے۔ خانگی زندگی یا سماجی و سیاسی تعلقات میں دنیوی کامیابی سے عقلی بصیرت روحانی بصارت اور مافوق المادہ قوت ادراک کی صحت لازم نہیں۔ مبدء و معاد اور تعمیری اصلاحی ضوابط کو سمجھنا مادی حواس کا کام نہیں۔ گر جہالت مرکبہ بری بلا ہے۔ نتائج کا معمولی حسن دلفریب ہوتا ہے اور دنیوی نتیجہ کی دلفریبی اعمال کی رسمی کے نیوت کے لئے کوتاہ نظر رکھنے والوں کی آنکھوں میں کافی معلوم ہوتی ہے۔ وہ نادانی کے باوجود اپنے کو دانا سمجھتے ہیں، اپنی ہر حرکت (سکون کو حق سمجھتے ہیں) اور اس وجہ سے سیدھے راستے پر آنا گوارا ہی نہیں کرتے۔ عاد و ثمود کی یہی حالت تھی۔ دنیوی امور میں اعلیٰ بصیرت رکھتے تھے، کاروبار میں خوب ہوشیار تھے۔ شیطانی اغوا سے اپنے اعمال کو برحق جانتے تھے ان کی اسی حالت کو آیت مذکورہ میں خدا تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ الخ۔ اس آیت میں جس ہامان کا تذکرہ ہے وہ وہی ہامان تھا جو فرعون مصر کا وزیر تھا۔ ایرانی ہامان مراد نہیں ہے۔ یہ تینوں حماقت مآب انسان بھی اگرچہ جاہ و حشمت والے اور اصحاب مال و ثروت تھے اور دنیوی عقل خوب رکھتے تھے لیکن ان کی غلط روی نے صحت جستجو پر آمادہ نہ ہونے دیا اور تدبیر دنیوی کی کامیابی پر مغرور ہو گئے کہ حضرت موسیٰ ایسے پر جلال باعظمت نبی نے آیات قدرت، دلائل صداقت اور معجزات نبوت پیش کئے مگر انہوں نے ایک بات بھی نہ مانی۔ لیکن اللہ کی گرفت سے نہ چھوٹ سکے، احاطہ قدرت سے باہر نہ ہو سکے بالآخر پکڑے گئے۔ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ یعنی عاد ثمود و قارون، فرعون اور ہامان میں سے ہر ایک کو اللہ نے اس کے گناہ کی پاداش میں پکڑا جس کی تفصیل یہ ہے کہ۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا۔ قوم عاد کو آندھی کے طوفان سے ہلاک کیا۔ ایسی تند اور تیز آندھی آئی کہ کنکریوں کو جڑ سے اکھاڑ کر دور پھینک دیا اور آدمیوں کو اڑا کر پہاڑوں اور درختوں کی چوٹیوں تک لے جا کر زمین پر دے پٹکا اور مِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ قوم ثمود کو زلزلہ اور غیبی چیخ سے ہلاک کیا۔ ایسا زلزلہ آیا کہ گھٹنوں کے بل زمین پر تمام کفار گر پڑے اور غیبی ہیبت ناک گڑگڑاہٹ ہوئی کہ گھروں کے اندر سب کے سب مر کر رہ گئے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ الخ۔ اور قارون کو زمین میں دھنسا دیا اور فرعون و ہامان کو بحر قلزم میں غرق کر دیا۔

مقصد بیان اللہ کی پرستش کرنا قیامت کو حق سمجھنا اور ملک کو برباد کرنے والے اعمال سے پرہیز رکھنا لازم ہے یہی تعلیم الٰہی ہے۔ اس سے سرتابی کرنے والے تباہ کر دیئے جاتے ہیں حضرت شعیب کی تعلیم اور ان کی قوم کا نتیجہ۔ ظاہر کر کے مسلمانوں کو اصول تعلیم الٰہی پر کاربند ہونے کی ترغیب اور کافروں کو بربادی کی وعید۔ آیت وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ

اس دلالت کر رہی ہے اس بات پر کہ دنیوی بصارت و دانش رکھنے سے عقل اصلاحی اور تعمیری تا ان زندگی کا مالک ہونا لازم نہیں۔ عاد و ثمود اگرچہ دنیوی معاملات میں خوب بصیرت رکھتے تھے لیکن باغوائے شیطانی اپنے غلط اور زیغ سے اعمال کو صحیح اور راست سمجھتے تھے۔ حقانیت و بطلان اور صداقت و کذب میں تفرقہ نہیں کر سکتے تھے۔ آیت وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مُّوْسٰى الخ بتلاتی ہے کہ سبب تکبر و انانیت کی چربی آدمی کی آنکھوں پر چھا جاتی ہے اور احساس خودداری اور خود پسندی اور خود غرضی کا خبط سوار ہو جاتا ہے اور مغرور انسان بادۂ نخوت سے سرشار ہو کر کوس لمن الملکی بجانے لگتا ہے تو داعی حق اور منادی صداقت کی کوئی دلیل، کوئی معجزہ اور قدرت کی کوئی نشانی اس کا طاغوتی نشہ نہیں اتار سکتی۔ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کسی کو ظلم سے برباد نہیں کرتا بلکہ انسان کے بد اعمال خود اس کی تباہی کے اسباب ہوتے ہیں۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَيْتًا

جن لوگوں نے اللہ کے سوا کارساز بنا رکھے ہیں ان کی مثال اس مکڑی کی ایسی ہے جس نے گھر بنا لیا ہو

وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا

اور سب سے کمزور گھر مکڑی کا ہوتا ہے کاش ان کو واقفیت ہوتی جس چیز کو یہ اللہ کے سوا

يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ

پکارتے ہیں اس سے خدا واقف ہے اور وہ غالب و با حکمت ہے یہ مثالیں ہیں جو لوگوں کو سمجھانے

نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

کے لئے ہم بیان کرتے ہیں مگر انہیں صرف جاننے والے ہی سمجھتے ہیں اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو مصلحت سے پیدا

بِالْحَقِّ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ع

کیا ہے اس میں ایمان داروں کے لئے نشان قدرت ہے

تفسیر: زبان میں روانی، قوت واہمہ میں جولانی اور حافظہ میں طغیانی ایسے اوصاف ہیں جو عوام کے دماغوں پر تلبیس کا پردہ ڈال دیتے ہیں۔ غلط کو صحیح اور جھوٹ کو سچ کر دکھاتے ہیں۔ وہم فہم کی جگہ لے لیتا ہے اور تخیل تعقل پر دست درازی کرنے لگتا ہے، لیکن جامۂ صداقت پہننے سے جھوٹ سچ نہیں بن سکتا۔ شک حقیقت نہیں ہو سکتا۔ غلط کو صحت واقعیہ کی جگہ نہیں دی جا سکتی۔ اہل نظر فریب تلبیس کا تار پود دیکھ کر اصل حقیقت کو روشناس کرا دیتے ہیں اور ہر قسم کے اشتباہ کی ٹٹی دور کر کے توہمات و تخیلات کو واقعی حد و خال کے ساتھ نمودار کر دیتے ہیں۔ جھوٹ سچ اور غلط صحیح کے امتیاز کے لئے اہل حق عقلی دلائل بھی بیان کرتے ہیں، تمثیلات و تشبیہات سے سمجھاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود جن کی فطرت سلیم اور عقل سادہ نہیں ہوتی وہ بار بار شک کے گرداب میں پھنسے رہتے ہیں۔ وہم و فہم اور تخیل و تعقل کا امتیاز ان کو نہیں ہوتا۔ ہاں جو واقعی حقیقت رس دماغ رکھتے ہیں ان کو ضرور معقول براہین اور محسوس و تیم محسوس تشبیہات سے فائدہ حاصل ہوتا ہے اور باطل کا پردہ ان کی نظروں سے اٹھ کر جلوۂ حق نمودار ہو جاتا ہے۔

اللہ کو چھوڑ کر دوسروں سے مدد طلب کرنی ایک ایسا بدیہی منکر ہے کہ جو کسی ثبوت کا محتاج نہیں ہے لیکن فریب کار دھوکہ بازی کے ماہر تمام دینی اور دنیوی امور میں غیر اللہ سے استمداد کے جواز بلکہ وجوب کی ایسی پُر فریب دلائل بیان کرتے ہیں اور ایسا جال بچھاتے ہیں کہ غریب مفلس دماغ والے اس میں بکثرت پھنس جاتے ہیں کبھی کہتے ہیں، دیکھو دنیا میں کوئی کام بغیر وساطت و وسیلہ کے نہیں چلتا۔ بونے کے بغیر غلہ میسر نہیں آتا، پیسنے پکانے کے بغیر غذا نہیں ہوتی۔ لقمہ ہاتھ سے اٹھا کر منہ میں رکھنے اور دانتوں سے چبانے کے بغیر شکم پُری نہیں ہوتی۔ ہر انسان اپنی ضروریات معاش کی تحصیل کے لئے دوسرے انسانوں کا محتاج اور دست نگر ہے بلکہ نباتات حیوانات

آگ، پانی، مٹی، ہوا، چاند، سورج اور تمام ستاروں کی امداد کے بغیر کوئی آدمی بھی زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ رہیں ضروریات تمدنی تو وہ بغیر اجتماعیت اور باہمی امداد کے حاصل ہی نہیں ہو سکتیں۔ مذہب نام ہی باہمی امداد و استمداد کا ہے۔ عمارتوں کا بننا، آبادیوں کا بسنا، حکومتوں کا کاروبار ہونا، تجارتوں کا چلنا، لین دین کا فروغ، قوانین و ضوابط کا اجرا، سیاست کا انتظام اور امن و عافیت کی زندگی باہمی تعاون پر ہی موقوف ہے اور تعاون نام ہے مدد کرنے کا۔ اس لئے اللہ کے علاوہ دوسروں سے امداد کرنی نہ فقط جائز بلکہ واجب ہے۔ یہ اور اس طرح کی دوسری پوچ پھر دلیلیں، اہل باطل فریب میں پھنسانے کے لئے بیان کرتے ہیں لیکن ان کو نہیں معلوم کہ وہ دوسروں کو کارساز ثابت کرنے کے لئے جس قدر ہوائی قلعے بناتے ہیں وہ خانۂ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔ کاش ان کو علم ہوتا کہ یہ نظام قدرت ایک قادرِ مطلق کے زیرِ حکم چل رہا ہے۔ کائنات میں سے کسی میں خود دوسرے کی مدد کرنے کی طاقت نہیں۔ اور کیا طاقت ہو سکتی ہے جبکہ ہر ایک خود ہی دوسرے کا محتاج ہے۔ کیا محتاج بھی دوسرے کا حقیقی کارساز ہو سکتا ہے۔ کیا مفلس بھی دوسروں کو مال دے سکتا ہے۔ انسان ضعیف البیان ہے اور کل کائنات اپنی ہستی میں خدا سے بے نیاز نہیں؛ نہ کسی کے پاس جہان پیدا اور حقیقت رس علم ہے نہ ہمہ گیر قوت و غلبہ پھر کیا کوئی کسی کی کارسازی کر سکتا ہے۔ درحقیقت تمام موجودات اور ساری کائنات قدرتی مشین کے پرزے ہیں۔ صانعِ عالم نے جو پرزہ جہاں لگا دیا ہے اور جو خدمت سپرد کر دی ہے وہ خدمتِ مفوضہ کی سرانجام دہی میں مشغول ہے۔ اپنا اختیار اس کا کچھ بھی نہیں۔ سورج مشرق سے نکل کر مغرب میں ڈوبتا ہے، پھلوں کو پکاتا، زردنیا میں روشنی اور حرارت پیدا کرتا ہے۔ یہ تمام خدمات اس کے لئے قدرت کی عطا کردہ ہیں۔ سورج کو یہ اختیار بالکل نہیں کہ رات کو روشنی پیدا کرے۔ یا مغرب سے نکل کر مشرق میں غروب ہو، اگرمی کی بجائے سردی پیدا کرے۔ اسی طرح ساری کائنات اپنا اپنا فرض ادا کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ حقیقی کارساز وہی ہے جو سب پر غالب اور ہمہ گیر علم رکھنے والا ہے۔ آسمان و زمین کو کس نے بنایا، کیا سورج یا چاند نے، ستاروں نے یا سیاروں نے، پانی نے یا ہوا نے اور آگ نے، انسانوں نے یا حیوانوں نے، یا کسی اور فرضی دیوتا نے۔ پس قابلِ استمداد وہی کارسازِ حقیقی ہے جو کل عالم کا خالق اور ہمہ گیر واقفیت رکھنے والا ہے۔

تحلیلِ اجزاء مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ۔ اس ظاہری دنیا کے پرستار اور اسباب کے گورکھ دھندے میں پھنسنے والے تمام دنیوی حوائج کو پورا کرنے والا مختلف فرضی دیوتاؤں کو جانتے ہیں۔ کوئی عالم بالا کی مقدس روحوں کو غیبی کارساز سمجھتا ہے۔ کوئی نصارا ایشری کی گردش کرنے والی اور ان کی رہنے والی کائنات کو تاثیراتِ فی الارض کا سببِ حقیقی خیال کرتا ہے۔ کوئی مختلف و متصرف انبیاء و اولیاء کی ارواحِ پاک کو حاضر ناظر جان کر پکارتا ہے۔ کوئی قبول بتوں، درختوں، دریاؤں اور موہوم معبودوں کی پرستش کرتا ہے اور سلسلۂ عالم کی باہم وابستگی کو اپنی پکار کی علت قرار دیتا ہے۔ غرض اللہ کو چھوڑ کر دوسری جاندار اور بے جان مخلوق کی طرف دستِ طلب بڑھاتا ہے اور قاضی الحاجات سمجھتا ہے۔ حالانکہ اللہ کے سوا کوئی بھی قاضی الحاجات نہیں۔ کسی کو بھی کارسازی کی قدرت نہیں۔ کوئی بھی مختارِ مطلق نہیں۔ جتنے دلائل غیر اللہ سے استمداد کے بیان کئے جاتے ہیں وہ سب کمزور اور لچر ہیں۔ مکڑی کا جال بہت زیادہ کمزور ہوتا ہے۔ محسوس پرستوں کی کل عقلی کائنات مکڑی کے جال کی طرح کمزور ہے لیکن حقائق کو سمجھنے سے ان کے دماغ قاصر ہیں۔ غیر محسوس اور دیکھی جانے والی غیبی حقیقت کی کارفرمائی اور اسباب و سبب کی تاثیر کا فرق وہ نہیں سمجھتے۔ کاش ان کو علم ہوتا کہ جس چیز کو وہ کارفرما اور کارساز سمجھتے ہیں وہ خود مختارِ مطلق نہیں بالکل بے اختیار ہے۔ عالم کا خیر و شر رزق و اولاد، صحت و مال کچھ بھی اس کی دسترس میں نہیں۔ تمام کائنات خالقِ کائنات کی آلۂ کار ہے اور بس ان آلات میں خود کچھ بھی تاثیر نہیں۔ اس سے آگے خدا تعالیٰ نے اپنی کارسازی کو ثابت کرنے اور اپنی ذات کے سوا ساری کائنات کی فرضی کارفرمائی باطل کرنے کے لئے تین دلائل مجمل طور پر بیان فرمائیں۔ پہلی دلیل کی طرف لفظ وَهُوَ الْعَزِيْزُ سے اشارہ ہے دوسری دلیل کی طرف لفظ الْحَكِيْمُ اشارہ کر رہا ہے۔ تیسری دلیل پر آیت خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ دلالت کر رہی ہے۔ تینوں دلائل کا مختصراً بیان یہ ہے کہ قاضی الحاجات اور کارساز ہونے کے لئے تین امور کی ضرورت ہے۔ (۱) کارساز کے لئے سب پر غالب اور قادرِ مطلق ہونا ضروری ہے تاکہ کارسازی اور حاجت روائی ہو۔ جو امر مانع ہو اس کو دور کر کے بگڑی کو بنایا جا سکے۔ کیونکہ جو خود کمزور، ضعیف اور مغلوب ہوگا، وہ دوسرے کا کام کیا بنا سکے گا (۲) ہمہ گیر علم اور حقیقت رس حکمت بھی لازم ہے ورنہ منافع و مضار اور اچھے برے نتائج کا امتیاز کس طرح ممکن ہے۔ (۳) قاضی الحاجات ہونے کے لئے خلاقِ مطلق ہونا بھی لابدی ہے ورنہ جب کائنات اپنے وجود ہستی میں اس سے بے نیاز ہوگی تو ظاہر ہے کہ تمام اقتضائیات وجود میں بھی بے نیاز ہوگی اور چونکہ اللہ کے سوا کوئی بھی قادرِ مطلق حکیم کامل عالم کل اور خلاق عالم نہیں اسی نے آسمان زمین اور ہر چیز کو بنایا۔ وہی آغاز و انجام اور وسطی احوال سے باخبر ہے۔ اسی کا تصرف و اقتدار ہمہ گیر ہے اس لئے وہی قاضی الحاجات اور کارسازِ حقیقی ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی نہ ہمہ گیر علم رکھتا ہے، نہ ذاتی اقتدار نہ قوتِ تخلیق لہٰذا

کسی میں قاضی الحاجات ہونے کی اہلیت نہیں۔

فائدہ : - چونکہ پہلے اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بیان کر دیا کہ مشرکین کو دنیا ہی میں ہلاک کر دیا ہے اور مکذبین کو آخرت میں عذاب کرے گا اور ان کے معبود دنیا جہان میں انھیں کچھ بھی فائدہ نہ دیں، گر اور ان کا رکوع و سجدہ کرنا عذاب کو نہیں روک سکتا تو اب ان کے معبود بنانے کو مکڑی کے جالا بنانے کے ساتھ تشبیہ دی۔ یہ نہ تو پناہ لینے والے کو پناہ دے سکتا ہے اور نہ ٹھہرنے والے کو آرام دے سکتا ہے۔ اس کے بعد ان کے معبودوں کی کمزوری اور ایک مثل اور اپنے خالق برحق ہونے کو بیان کر کے امر توحید کو ثابت کیا ہے۔ اس کے بعد اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً فرمانا توحید کی دلیل ہے۔

مقصود بیان اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو کارساز سمجھنا بے بنیاد اور خلاف دانش ہے۔ مخلوق کے پرستاروں کے پاس اپنے عقیدہ وعمل کے ثبوت کے لئے کوئی مضبوط دلیل نہیں۔ قاضی الحاجات ہونے کے لئے اوصاف سہ گانہ کی ضرورت ہے۔ غلبہ، علم، قوت تخلیق۔

قرآن کی بیان کردہ امثال حکمت و بصیرت سے پر ہیں مگر ان سے فائدہ اندوزی ہر شخص کا کام نہیں۔ باہر کی روشنی دیکھنے کے لئے دماغ کی روشنی ضروری ہے۔ پس عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ پیر پرستوں، قبر پرستوں، تعزیہ پرستوں، صلیب پرستوں، ستارہ پرستوں، آتش پرستوں اور تمام غیر اللہ کی پرستش کرنے والوں کو۔ اللہ کی وحدانیت کو خوب سمجھ کر چشم بصیرت سے دیکھیں اور غور کریں۔